سورۃ الاعراف

تحقیق و ترتیب

محمد طاہر ہاشمی

ایم۔اے علوم اسلامیہ

ایم۔اے تاریخ

تعارف سورۃ الاعراف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس سورۃ پاک کا نام الاعراف ہے۔ یہ ۲۰۶ آیتوں اور چوبیس رکوعوں پر مشتمل ہے۔ اور اس کے الفاظ کی تعداد ۳۳۲۵ ہے۔
یہ سورۃ بھی مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ اگرچہ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اس کی پانچ یا آٹھ آیتیں مدنی ہیں (واسال اہل القریۃ الخ) لیکن محققین کا مختار قول یہ ہے کہ اس کی تمام آیتیں بلا استثناء مکی ہیں۔ اور حضرت ابن عباس (رض) سے بھی بسند صحیح یہی مروی ہے۔

سورۃ الانعام اور الاعراف کا زمانہ نزول قریب قریب ہے یعنی ہجرت سے پہلے مکی دور کے آخری سالوں میں اس کا نزول ہوا۔
اس سورۃ میں بھی خطاب انھیں لوگوں سے ہے جو سورۃ الانعام میں مخاطب تھے یعنی مشرکین عرب۔ اس لیے انھیں کے عقائد باطلہ کی تردید، انھیں کے اوہام فاسدہ کا بطلان، انھیں کی غلط کاریوں کا ازالہ اور انھیں کی کج فہمیوں کی اصلاح پر سارا زور صرف کیا گیا ہے۔ فرق صرف اجمال اور تفصیل کا ہے۔ سابقہ سورت میں جو مسائل اجمالا مذکور ہوئے تھے یہاں انھیں تفصیلا بیان کر دیا گیا ہے۔ پہلے بھی بتایا گیا تھا کہ انبیاء کرام نے جب اپنی اپنی قوموں کو توحید کی دعوت دی اور اس کے لیے ناقابل تردید دلائل پیش کئے تو ان میں غور و فکر کرنے کے بجائے ان کی قوموں نے ان کا مذاق اڑایا، ان کی تکذیب کی۔ اور انھیں اذیت پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔
اس سورۃ میں متعدد انبیاء کرام نوح، ہود، صالح، لوط، شعیب (علیہم السلام) کا نام لے کر ان کے احوال بیان فرمائے اور ان کی قوموں نے جو ناروا سلوک اور معاندانہ برتاؤ اپنے مخلص، پاکباز رہنماؤں کے ساتھ کیا اس کا ذکر کیا۔ اور اس حقیقت کو بڑی فصاحت سے آشکار کیا جب مزاج بگڑ جاتا ہے اور فطرت سلیمہ مسخ ہو جاتی ہے تو اس وقت حق پذیری کی استعداد بے کار اور مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ صداقت کا آفتاب اپنی تمام تابناکیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے لیکن آنکھیں اس کے نور کو نہیں دیکھ سکتیں۔ دلائل کی زبان اعلان حق کر رہی ہوتی ہے لیکن کان اسے سن ہی نہیں سکتے۔ اور دل و دماغ حق سمجھنے کی روفیق سے محروم ہو جاتے ہیں۔ افہام و تفہیم، ترغیب و ترہیب کوئی چیز کارگر ثابت نہیں ہوتی۔
مختلف رسولوں کے احوال بتانے کے بعد کئی رکوعوں میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے واقعات تفصیلا بیان فرمائے آپ کو دو قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا۔ ایک فرعون اور اس کے حواری اور دوسرے آپ کی اپنی قوم بنی اسرائیل، پہلا طبقہ حکمران تھا جسے بے پناہ اختیارات اور مراعات حاصل تھیں۔ ملک کی ساری دولت و ثروت ان کی ملکیت تھی۔ عیش و عشرت کے سب سامان انھیں میسر تھے۔ وہ کسی قیمت پر ان سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔ حتی کہ جب ان کے مقرر کئے ہوئے معیار کے مطابق حق واضح ہو گیا۔ اور ان کے بلائے ہوئے جادوگر معجزات نبوت کے سامنے اپنے نظر فریب سحر کی بے سروپائی کا اعتراف کر کے باطل سے تائب ہو گئے۔ اور حضرت کلیم (علیہ السلام) پر صدق دل سے ایمان لے آئے۔ تب بھی فرعونی ذہنیت نے قبول حق سے گریز اختیار کیا۔

کیونکہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لانے کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے ناجائز اختیارات اور مراعات سے محروم ہو جائیں۔ ان کی لوٹ کھسوٹ پر پابندیاں لگا دی جائیں۔ اور ان کی عیش و نشاط کی بساط الٹ دی جائے، وہ اس کے لیے کسی طرح آمادہ نہ تھے۔ دوسرا طبقہ جس سے آپ کو واسطہ پڑا تھا وہ آپ کی اپنی قوم بنی اسرائیل تھی جو مدت دراز سے غلامی کی زندگی گزار رہی تھی۔ ان کی ہمتیں پست اور ولولے سرد ہو چکے تھے۔ ذلت کی پستیوں میں پڑے رہنے میں وہ بڑی لذت محسوس کرتے تھے۔ ان کی تن آسانی کا یہ عالم تھا کہ عزت کی بلندیوں تک پہنچنے کے لیے وہ کسی جدوجہد کے لیے آمادہ نہ تھے وہ چاہتے تھے کہ لڑت بغیر فتوحات کے دروازے ان پر کھول دیئے جائیں۔ اور تو اور انھیں کھانے پینے کے لیے بھی ہاتھ پاؤں ہلانے نہ پڑیں۔ بلکہ آسمان سے پکا پکایا کھانا ان کے دستر خوانوں پر چن دیا جائے۔ ان کی تعمیری قومیں اتنی فرسودہ اور افسردہ ہو چکی تھیں کہ جدت فکر اور ندرت عمل کا ان کے ہاں تصور تک نہ تھا۔ دوسروں کی تقلید اور پیروی کے لیے وہ ہر لمحہ آمادہ آمادہ تھے۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی برکت سے دو فرعون کی غلامی سے آزاد ہو کر وادی سینا میں پہنچے اور وہاں کے بت پرستوں کو دیکھا تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے اپنے لیے ایسا ہی بت خانے بنانے کی فرمائشیں شروع کر دیں اور آپ کی سرزنش پر بظاہر تو خاموش ہو گئے لیکن جب آپ چلہ کشی کے لیے کوہ طور پر تشریف لے گئے تو خداوند حی وقیوم کو چھوڑ کر فوراً سامری کے بنائے بچھڑے کی پوستش شروع کر دی۔

ان تمام واقعات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ احکام الٰہی سے وابستہ اور پیہم سرکشی، بے پناہ قوت واختیار کا خمار اور ایسے ہی غلامانہ زندگی افراد واقوام کے ذہنوں کو بگاڑ دیتی ہے۔ اور انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ ان بگڑی ہوئی ذہنیتوں کی اصلاح کی جائے تاکہ ایک ایسا معاشرہ معرض وجود میں آجائے جو طاقتور ہونے کے باوجود انصاف پرست ہو۔ نظم وضبط کا پابند ہونے کے باوجود غلامانہ بے بسی کا شکار نہ ہو۔ اور اس میں حقوق اور فرائض کے ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہوں۔ لیکن جو بد نصیب اللہ کے پیغمبروں کی مشفقانہ پند و موعظت کو قبول نہیں کرتا اور اپنی گمراہی پر بضد رہتا ہے تو مکافات کا قانون اسے پیس کر رکھ دیتا ہے اور اس کا نام و نشان تک صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔

نوح انسانی کے عہد طفولیت میں ہر قوم کی طرف الگ الگ نبی مبعوث ہوئے جو وقتی اور مقامی ضروریات کے پیش نظر اصلاح احوال کے لیے کوشاں رہے لیکن آخر میں وہ نبی مکرم اور رسول معظم تشریف لایا جس کی دعوت زمان و مکان کی حدبندیوں سے ناآشنا تھی۔ وہ تمام انسانوں کا قیامت تک کے لیے ہادی و مرشد بن کر جلوہ افروز ہوا تھا۔ اس لیے کھلے الفاظ میں یہ اعلان فرما دیا۔ یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا۔ اے لوگو! میں تم تمام کی طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں۔ اس مقام پر ان عظیم مقاصد کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے جن کی تکمیل کے لیے اس نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مبعوث فرمایا گیا تھا۔

سورۃ الاعراف

سورت کا نام:

زیادہ مشہور اور محقق یہ ہے کہ اس سورت کا نام "الاعراف" ہے۔ علامہ سید محمد حسینی زبیدی متوفی 1205ھ نے لکھا ہے کہ یہ لفظ عرف سے بنا ہے اس کا معنی بلندی ہے اور اس کا معنی جاننا اور پہچاننا بھی ہے۔ الاعراف جنت میں اور دوزخ کی درمیانی سرحد کا نام ہے۔ اصحاب الاعراف کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں، وہ اپنی نیکیوں کی وجہ سے دوزخ کے مستوجب نہ ہوں اور برائیوں کی وجہ سے جنت کے مستحق نہ ہوں، پس وہ جنت اور دوزخ کے درمیان حجاب میں ہوں گے اور یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اہل جنت اور اہل نار کو پہچاننے والے ہوں گے، ایک قول یہ ہے کہ اصحاب الاعراف انبیاء ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ اصحاب الاعراف ملائکہ ہیں۔ قرآن مجید میں ہے "ونادی اصحٰب الاعراف: اصحاب الاعراف نے ندا کی" (الاعراف:48)۔ (تاج العروس، ج6 ص194، مطبوعہ المطبعہ الخیریہ، مصر، 1306ھ)

اس سورت کا نام الاعراف اس لیے ہے کہ اس سورت میں الاعراف کا ذکر ہے: "وبینہما حجاب وعلی الاعراف رجال یعرفون کلا بسیمٰہم ونادوا اصحب الجنۃ ان سلم علیکم لم یدخلوھا وھم یطمعون: اور جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان ایک حجاب ہے اور الاعراف پر کچھ مرد ہوں گے جو جنتیوں اور دوزخیوں میں سے ہر ایک کو ان کی علامت سے پہچان لیں گے اور وہ جنتیوں کو پکار کر کہیں گے تم پر سلامتی ہو، وہ (اصحاب الاعراف) جنت میں داخل نہیں ہوں گے اور وہ اس کے امیدوار ہوں گے "

حدیث میں بھی اس سورت کو سورۃ الاعراف سے تعبیر فرمایا ہے: مروان بن الحکم بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے حضرت زید بن ثابت (رض) نے کہا کہ کیا وجہ ہے کہ تم مغرب کی نماز میں قصار مفصل (سورۃ البینہ 98 سے لے کر آخر قرآن تک چھوٹی چھوٹی سورتیں) پڑھتے ہو! حالانکہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مغرب کی نماز میں بڑی بڑی سورتیں پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ مروان نے کہا: میں نے پوچھا بڑی بڑی سورتیں کون سی ہیں؟ حضرت زید نے کہا: الاعراف اور دوسری الانعام ہے۔ حدیث کے راوی ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں میں نے ان سے خود پوچھا تو انھوں نے فرمایا: المائدہ اور الاعراف۔ (سنن ابوداؤد ج1، رقم الحدیث:812، صحیح البخاری ج 1، رقم الحدیث:764، سنن النسائی ج2، رقم الحدیث:989)۔

سورۃ فاتحہ کے بعد پہلی سات سورتیں جن میں ایک سو یا اس سے زیادہ آیتیں ہیں، ان کو السبع الطوال کہا جاتا ہے، وہ یہ ہیں: البقرہ، آل عمران، النساء، المائدہ، الانعام، الاعراف اور الانفا، اور جن سورتوں میں ایک سو آیتیں ہوں، ان کو ذوات المئین کہتے ہیں اور جن میں اس سے کم آیات ہوں ان کو مثانی کہتے ہیں اور ان کے بعد مفصل ہیں۔ سورۃ الحجرات سے البروج تک طوال مفصل ہیں اور البروج سے

البینہ تک اوساط مفصل ہیں اور البینہ سے آخر قرآن تک قصار مفصل ہیں۔(در مختار ورد المحتار، ج1 ص363، مطبوعہ دراحیاء التراث العربی، بیروت)

بعض علماء نے کہاہے کہ اس سورت کانام المص ہے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے: عروہ بن الزبیر بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے سنا کہ حضرت زید بن ثابت (رض) نے مروان سے فرمایا: اے عبد الملک کیا تم (ہمیشہ) مغرب میں قل ھو اللہ احد اور انا اعطیناک الکوثر پڑھتے ہو؟ اس نے کہا: ہاں! آپ نے قسم کھا کر فرمایا: بیشک میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مغرب کی نماز میں بڑی بڑی سورتیں پڑھتے ہوئے دیکھاہے۔ المص۔(سنن النسائی، ج2، رقم الحدیث 988، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت)

لیکن مشہور اور محقق قول یہی ہے کہ اس سورت کانام الاعراف ہی ہے اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے: حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ مغرب کی نماز میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سورۃ الاعراف کو پڑھا اور اس کو دو رکعتوں میں تقسیم کیا۔(سنن النسائی، ج2، رقم الحدیث: 990، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت 1412ھ)۔

الاعراف کا معنی اور مصداق: علامہ قرطبی متوفی 668ھ نے لکھاہے کہ الاعراف العرف کی جمع ہے اور اس کا معنی بلند جگہ ہے۔ البتہ یحیٰی بن آدم نے کہا: کہ میں نے کسائی سے اس کے واحد کے متعلق پوچھا تو وہ خاموش رہے (الجامع لاحکام القرآن، جز8، ص190، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی 310ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: عامر بیان کرتے ہیں کہ حضرت حذیفہ (رض) نے فرمایا: اصحاب الاعراف وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں بھی ہوں اور گناہ بھی ہوں۔ ان کے گناہ ان کو جنت سے روک دیں اور ان کی نیکیاں ان کو دوزخ سے روک لیں۔ وہ اسی حالت میں رہیں گے حتی کہ اللہ اپنی مخلوق کے درمیان فیصلہ فرمادے گا۔ پھر ان کے درمیان اپنا حکم جاری فرمائے گا۔

شعبی بیان کرتے ہیں کہ حضرت حذیفہ (رض) نے فرمایا: اصحاب الاعراف وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور گناہ برابر ہوں۔ اللہ فرمائے گا: میرے فضل اور میری بخشش سے جنت میں دخل ہو جاؤ تم پر آج نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ تم مغموم ہو گے۔

سعید بن جبیر بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود (رض) نے فرمایا: جس شخص کا ایک گناہ بھی نیکیوں سے زیادہ ہوا وہ دوزخ میں داخل ہو جائے گا اور جس شخص کی ایک نیکی بھی اس کے گناہوں سے زیادہ ہوئی وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ پھر حضرت ابن مسعود نے یہ آیت تلاوت کی: "والوزن یومئذن الحق فمن ثقلت موازینہ فاولئک ھم المفلحون۔ ومن خفت موازینہ فاولئک الذین خسروا انفسھم بماکانو بایتنایظلمون: اور اس دن اعمال کا وزن کرنا برحق ہے پس جن (کی نیکیوں) کے پلڑے بھاری ہوئے تو وہی کامیاب ہونے والے

ہیں۔ اور جن (کی نیکیوں) کے پلڑے ہلکے ہوئے تو یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو خسارے میں ڈالا کیونکہ وہ ہماری آیتوں کے ساتھ ظلم کرتے تھے "(الاعراف:7۔8)

پھر فرمایا: ایک رائی کے دانہ کے برابر وزن سے بھی میزان کا پلڑا جھک جاتا ہے اور فرمایا: جس شخص کی نیکیاں اور گناہ برابر ہوں وہ اصحاب الاعراف میں سے ہوگا، ان کو پل صراط پر ٹھہرا دیا جائے گا، پھر وہ اہل جنت اور اہل دوزخ کو پہچان لیں گے۔ جب وہ اہل جنت کی طرف دیکھیں گے تو کہیں گے سلام علیکم اور جب ان کی نظر بائیں جانب کی طرف پھیری جائے گی تو وہ اہل دوزخ کو دیکھیں گے اور کہیں گے: اے ہمارے رب، ہمیں ظالم لوگوں کے ساتھ نہ کرنا اور دوزخیوں کے ٹھکانوں سے اللہ کی پناہ چاہیں گے اور جو نیکیوں والے ہوں گے ان کو ان کی نیکیوں کا نور دیا جائے گا وہ اس نور کی روشنی میں اپنے سامنے اور اپنے آگے چلیں گے، اس دن ہر بندے اور ہر بندی کو نور دیا جائے گا اور جب وہ پل صراط پر پہنچیں گے تو اللہ ہر منافق اور ہر منافقہ کا نور سلب فرمالے گا اور جب اہل جنت منافقوں کا حال دیکھیں گے تو کہیں گے: اے ہمارے رب! ہمارا نور مکمل کردے۔ اور رہے اصحاب الاعراف تو ان کا نور بھی ان کے سامنے ہوگا اور ان سے چھینا نہیں جائے گا، اور اس موقع کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ قول نقل فرمایا ہے: وہ (اصحاب الاعراف) جنت میں داخل نہیں ہوئے اور وہ اس کے امیدوار ہیں۔ (الاعراف:46) حضرت ابن سعد نے فرمایا: جب بندہ ایک نیکی کرتا ہے تو اس کی دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور جب وہ ایک برائی کرتا ہے تو اس کی صرف ایک برائی لکھی جاتی ہے۔ پھر فرمایا جس کی دس نیکیوں پر ایک گناہ غالب آگیا وہ ہلاک ہوگیا (یعنی جس کی نیکیوں کو دس سے ضرب دینے کے باوجود اس کے گناہ زیادہ ہوئے) عبد اللہ بن حارث بیان کرتے ہیں کہ الاعراف جنت اور دوزخ کے درمیان ایک دیوار ہے اور اصحاب الاعراف اس جگہ ہوں گے حتیٰ کہ جب اللہ ان کو عافیت میں لینا چاہے گا تو ان کو ایک دریا کی طرف لے جائے گا جس کو حیات کہا جاتا ہے، اس کے دونوں کنارے سونے کے سرکنڈے ہیں جن میں موتی جڑے ہوئے ہیں اور ان کی مٹی مشک ہے ان کو اس دریا میں ڈالا جائے گا، حتیٰ کہ ان کا رنگ سفید چمک دار ہو جائے گا، پھر اللہ ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمائے گا: تم جو چاہو تمنا کرو، پھر وہ تمنا کریں گے اور جب ان کی تمنائیں ختم ہو جائیں گی تو اللہ ان سے فرمائے گا: تم نے جو تمنائیں کی ہیں، تم کو وہ بھی ملیں گی اور ان کا ستر گنا اضافہ بھی ملے گا۔ وہ جنت میں داخل ہونگے درآنحالیکہ ان کے سینوں پر سفید تل ہوں گے جن سے وہ پہچانے جائیں گے اور ان کو کہا جائے گا یہ جنت کے مساکین ہیں۔ (جامع البیان، جز8، ص249 تا 251، ملتقطاً مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415ھ)

علامہ قرطبی متوفی 668ھ نے لکھا ہے کہ ثعلبی نے ذکر کیا ہے: الاعراف پل صراط پر ایک بلند جگہ ہے۔ اس پر حضرت عباس، حضرت حمزہ، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت جعفر ذوالجناحین (رض) ہوں گے۔ وہ اپنے محبت کرنے والوں کو پہچان لیں گے جن کے

چہرے سفید ہوں گے اور ان سے بغض رکھنے والوں کو بھی پہچان لیں گے ان کے چہرے سیاہ ہوں گے، اور زہراوی نے بیان کیا ہے کہ یہ ہر امت کے نیک لوگ ہوں گے جو لوگوں کے اعمال پر گواہ ہوں گے۔ نحاس نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ یہ لوگ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک دیوار پر ہوں گے، زجاج نے کہا یہ انبیاء ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے صغیرہ گناہوں کا دنیا میں تکلیفوں اور مصیبتوں سے کفارہ ادا نہیں ہوا اور ان کے کبیرہ گناہ نہیں ہوں گے۔ ان کو جنت میں جانے سے روک لیا جائے گا تا کہ ان کو غم ہو جو ان کے صغائر کے مقابلہ میں ہو۔ حضرت ابو حذیفہ کے غلام حضرت سالم (رض) نے یہ تمنا کی تھی کہ وہ اصحاب الاعراف میں سے ہوں۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ ملائکہ ہیں جو لوگوں کو جنت اور دوزخ میں داخل کرنے سے پہلے مومنوں اور کافروں کو ممتاز کریں گے یہ ابو مجلز کا قول ہے۔ ان پر اعتراض کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب الاعراف کو رجال کہا ہے اور فرشتوں کو رجال نہیں کہا جاتا۔ انھوں نے اس کا جواب دیا کہ فرشتے مذکر ہیں مونث نہیں ہیں اس لیے ان پر رجال کا اطلاق بعید نہیں ہے۔ علامہ قرطبی مالکی نے اور بھی کئی اقوال لکھے ہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن، جز8، ص190۔ 191، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415ھ)

سورۃ الاعراف کی آیتوں کی تعداد اور ان کی صفات: یہ سورت بالاتفاق مکی ہے اور اس کی دو سو چھ آیتیں ہیں۔ امام رازی، علامہ قرطبی اور دیگر مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کی آٹھ آیتیں مدنی ہیں۔ آیت 163 سے لے کر آیت 170 تک جو وسئلھم عن القریۃ سے شروع ہوتی ہیں، نیز امام رازی نے لکھا ہے یہ سورت، سورت ص کے بعد نازل ہوئی ہے۔

حضرت جابر بن زید اور حضرت ابن عباس (رض) کے نزدیک یہ سورت ترتیب نزول کے اعتبار سے انتالیسویں سورت ہے۔ اور سورۃ ص کے بعد اور سورۃ جن سے پہلے نازل ہوئی ہے۔۔

علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ متعدد رجال نے حضرت ابن عباس اور حضرت ابن الزبیر (رض) سے روایت کیا ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور اس سے کوئی آیت مستثنیٰ نہیں ہے۔ (روح المعانی، جز8، ص82)

اس سورت کی تمام آیات محکم ہیں۔ البتہ ابن زید کے نزدیک اس سورت کی حسب ذیل دو آیتیں منسوخ ہیں: " واملی لھم ان کیدی متین : اور میں انھیں مہلت دیتا ہوں، بیشک میری خفیہ تدبیر بہت پکی ہے " (الاعراف: 183)

اس آیت کو منسوخ قرار دینا اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اس آیت میں خبر ہے اور نسخ انشاء (احکام) میں ہوتا ہے۔ خبر کو منسوخ قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے غلط خبر دی تھی اور اب صحیح خبر دی ہے۔ (العیاذ باللہ) اور احکام میں نسخ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ایک آیت میں ایک حکم مطلق بیان فرمایا تھا اور اب دوسری آیت میں اس حکم کی مدت یا استثناء کو بیان فرما دیا اور نسخ کا معنی اس حکم کی مدت یا استثناء کا بیان ہے۔ اس لیے احکام میں نسخ جائز ہے۔

دوسری آیت یہ ہے: "**خذ العفو وامر بالعرف واعرض عن الجٰھلین**: معاف کرنا اختیار کیجیے اور نیکی کا حکم دیجیے اور جاہلوں سے منہ پھیر لیجیے "(الاعراف:199)

اس آیت کے متعلق سدی اور ابن زید نے یہ کہا ہے: کہ یہ آیت، آیت جہاد سے منسوخ ہے۔ لیکن یہ قول بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اس آیت میں کفار اور مشرکین اور دیگر فساق اور فجار کی باطل باتوں اور قبیح حرکتوں سے ملول خاطر نہ ہوں۔ آپ ان کی سختیوں کے باوجود ان کے ساتھ نرم سلوک کرتے تھے۔ ان کی بدی کا جواب نیکی سے اور ان کی برائیوں کا جواب اچھائیوں سے دیتے تھے اور اسی پاکیزہ سیرت پر برقرار رہنے کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے صحیح یہی ہے کہ سورۃ الاعراف کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔

الاعراف، الانعام سے زیادہ طویل ہے کیونکہ الانعام ایک پارہ کی ہے اس میں 20 رکوع اور 165 آیتیں ہیں۔ اور الاعراف سوا پارہ کی ہے اس میں چوبیس رکوع اور 206 آیتیں ہیں۔

سورۃ الاعراف کا زمانہ نزول: علامہ ابن عاشور نے لکھا ہے کہ میں اس پر مطلع نہیں ہو سکا کہ سورۃ الاعراف کے نزول کی صحیح تاریخ کیا ہے۔ جابر بن زید سے مروی ہے کہ یہ سورت سوہ جن سے پہلے اور سورۃ ص کے بعد نازل ہوئی ہے اور صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس (رض) سے روایت ہے کہ سورۃ جن ابتداء اسلام میں نازل ہوئی ہے، جب سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت کا ظہور ہوا تھا اور یہ ایام حج کا موقع تھا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے اصحاب کے ساتھ عکاظ کے بازار کی طرف جا رہے تھے اور یہ غالباً بعثت کا دوسرا سال تھا۔ اور میں یہ گمان نہیں کرتا کہ سورۃ اعراف اس مدت میں نازل ہوئی تھی کیونکہ سات طویل سورتیں بعثت کے ابتدائی دور میں نازل نہیں ہوئیں۔ (التحریر والتنویر، جز8، ص6-7)

اس سورت کے مضامین پر غور کرنے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت اسی زمانہ میں نازل ہوئی ہے جس زمانہ میں سورۃ الانعام نازل ہوئی تھی۔ اس لیے ہم اب سورت کے مضامین اور مقاصد کو بیان کر رہے ہیں جن پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ سورت مکی دور کے وسط میں نازل ہوئی ہے۔

سورۃ الاعراف کے مضامین اور مقاصد: مکی سورتوں میں سورۃ الاعراف سب سے لمبی سورت ہے۔ اس سورت میں اسلام کے بنیادی عقائد بیان کیے گئے ہیں اور اس میں تنبیہ اور تہدید کا رنگ نمایاں ہے۔ اس کے مضامین اور مقاصد کی فہرست حسب ذیل ہے:

1۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس سورت کو اس عنوان سے شروع کیا گیا ہے کتب انزل الیک (الآیۃ) یہ عظیم کتاب ہے جو آپ کی طرف نازل کیا گئی ہے۔ لہٰذا آپ کے دل میں اس سے تکلیف نہ ہو تاکہ آپ اس کے ساتھ ڈرائیں اور یہ ایمان والوں کے لیے نصیحت ہے (الاعراف:2) یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دائمی معجزہ ہے اور قیامت تک کے لیے آپ کی نبوت پر دلیل ہے۔ کیونکہ

چیلنج کے باوجود کوئی شخص اس کی کسی سورت یا آیت کی نظیر نہیں لا سکا۔ سو پہلے آپ کی رسالت پر دلیل کا ذکر فرمایا۔ اس کے بعد پیغام رسالت کا ذکر فرمایا اور توحید اور دین اسلام کو قبول کرنے کی دعوت دی۔

2۔اس سورت کی آیت 11 سے آیت 27 تک حضرت آدم (علیہ السلام) کا قصہ بیان فرمایا ہے۔ اس میں حضرت آدم کی پیدائش کا ذکر ہے اور فرشتوں کے حضرت آدم کو سجدہ کرنے کا ذکر ہے اور شیطان کے تکبر کرنے اور حضرت آدم کے ساتھ اس کی دشمنی اور اس کے راندہ درگاہ ہونے کا بیان ہے۔ حضرت آدم کی جنت سے ہجرت اور ان کا زمین پر نزول ذکر فرمایا ہے۔

3۔اس سورت کی آیت 35 میں وحی رسالت کا بیان ہے۔ اے اولاد آدم! اگر تمہارے پاس تم میں سے رسول آئیں اور تم سے میری آیتوں کا بیان کریں تو جس نے تقویٰ اور نیکی کو اختیار کیا تو ان لوگوں پر نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔

4۔اس سورت کی آیت 36 سے آیت 41 تک مشرکین اور مکذبین کے اخروی انجام کا ذکر فرمایا۔ کفار اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایمان نہ لانے کے جو باطل عذر بیان کریں گے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو جو جواب دیا جائے گا، اس کا ذکر فرمایا اور ان کے عذاب کا بیان فرمایا ہے۔

5۔اس سورت کی آیت 44 سے آیت 45 تک آخرت میں خصوصاً حشر کے دن مومنین کے حالات اور ان کا اہل دوزخ سے مکالمہ بیان فرمایا ہے اور آیت 46 سے آیت 49 تک اہل اعراف کا ان سے مکالمہ بیان فرمایا ہے اور آیت 50 سے آیت 52 تک اہل دوزخ کی گفتگو بیان فرمائی ہے۔

6۔اس سورت کی آیت 53 سے آیت 58 تک اللہ تعالیٰ نے اپنے وجود اور اپنی وحدانیت پر دلائل قائم فرمائے ہیں اور اس ضمن میں اپنی عطا کردہ نعمتوں سے استدلال فرمایا ہے۔ مثلاً آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا فرمانا، اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے سورج، چاند اور ستاروں کا مسخر ہونا اور زمین سے پھلوں کو پیدا فرمانا اور اللہ تعالیٰ نے زمین میں جو نعمتیں پیدا فرمائی ہیں اور انسانوں کو اس کائنات سے فوائد حاصل کرنے کا جو اختیار عطا فرمایا ہے اور اس کو دیگر مخلوقات پر جو فضیلت عطا فرمائی ہے، یہ تمام نعمتیں انسانوں کو یاد دلائی ہیں۔

7۔اس سورت کی آیت 59 سے آیت 171 تک انبیاء سابقین (علیہم السلام) کا تذکرہ فرمایا ہے۔ آیت 59 سے آیت 64 تک حضرت نوح (علیہ السلام) کا ذکر فرمایا ہے۔ انھوں نے اپنی قوم کو توحید کا پیغام دیا، ان کی قوم نے اس کا کیا جواب دیا اور پھر ان پر جو غرقابی کا عذاب آیا، آیت 65 سے آیت 72 تک حضرت ہود (علیہ السلام) کا ذکر ہے اور ان کے پیغام کو مسترد کرنے پر ان کی قوم کے اوپر عذاب بھیجنے کا ذکر ہے۔ آیت 73 سے آیت 79 تک حضرت صالح (علیہ السلام) کا ذکر ہے۔ انھوں نے حضرت صالح (علیہ السلام) کی دعوت کو مسترد کیا اور ان کی اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور پھر ان پر عذاب آیا۔ آیت 80 سے آیت 84 تک حضرت لوط (علیہ

السلام) کا ذکر ہے۔ ان کی قوم ہم جنس پرستی کا شکار تھی۔ حضرت لوط (علیہ السلام) کے منع فرمانے کے باوجود باز نہ آئی اور عذاب کا شکار ہوئی۔ آیت 85 سے آیت 102 تک حضرت شعیب (علیہ السلام) کا ذکر ہے۔ ان کی قوم ناپ تول میں کمی کرنے میں مبتلا تھی۔ حضرت شعیب (علیہ السلام) کے منع کرنے کے باوجود باز آئی اور عذاب کا شکار ہوئی۔ اس قصہ کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے مختلف اطوار سے مشرکوں کو اپنے عذاب سے ڈرایا ہے اور اپنی رحمت کے حصول کی طرف متوجہ کیا ہے۔ آیت 103 سے آیت 171 تک حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا طویل قصہ بیان فرمایا ہے۔ ان کے معجزات، فرعون کے دربار میں ان کا جانا، فرعون کے ساحروں پر غالب آنا، بنو اسرائیل کی فرعون سے نجات اور ان پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور اس کے مقابلہ میں ان کی سرکشی، ان تمام امور کا تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ ان آیتوں کے ضمن میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بھی خطاب ہے اور سابقہ قوموں کی سرکشی کی وجہ سے ان پر جو عذاب آیا اس سے اہل مکہ کو ڈرایا ہے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا ہے اور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کی بشارت دی ہے اور آپ کے دین اور آپ کی امت کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔

8۔ آیت 172 سے آیت 206 تک اہم امور یہ ہیں: آیت 172 سے آیت 174 تک اولاد آدم سے میثاق لینے کا ذکر ہے۔ آیت 174 تا 175 میں بلعم باعور کا ذکر ہے۔ آیت تا 186 تک وقوع قیامت کا علم اور علم غیب کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔ آیت 189 تا 190 سے دوبارہ انسان کی پیدائش اور حضرت آدم اور حضرت حواء کا ذکر ہے۔ آیت 191 تا 198 تک شرک کا تفصیل سے رد فرمایا ہے۔ آیت 199 تا 206 تک مکارم اخلاق، شیطان کے اغواء سے بچنے، اتباع وحی اور رجوع الی اللہ کا بیان فرمایا ہے۔

سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف کی باہمی مناسبت:

1۔ ہم نے پہلے بھی ذکر کیا تھا کہ جو امور سورۃ الانعام میں اجمالاً بیان کیے گئے، ان کو اس سورت میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً انبیاء سابقین (علیہم السلام) کا الانعام میں اجمالاً ذکر تھا اس سورت میں ان کا ذکر بہت تفصیل سے کیا گیا ہے گویا کہ سورۃ الانعام بہ منزلہ متن ہے اور سورۃ الاعراف بہ منزلہ شرح ہے۔

2۔ سورۃ الانعام میں اجمالاً فرمایا تھا "ھوالذی خلقکم من طین: وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا" (الانعام:2) اور اس سورت میں بہت تفصیل سے بتایا ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کس طرح پیدا ہوئے اور اولاد آدم سے میثاق لینے کا ذکر فرمایا ہے۔

3۔ سورۃ الانعام میں فرمایا تھا "کتب علی نفسہ الرحمۃ: اس نے (محض اپنے کرم سے) اپنی ذات پر رحمت لازم کرلی ہے" اور اس سورت میں اس رحمت کو تفصیل سے بیان فرمایا: "ورحمتی وسعت کل شیء فسا کتبہا للزین یتقون ویوتون الزکوۃ والذین ھم بایتنا یومنون: اور

میری رحمت ہر چیز کو محیط ہے سو میں دنیا اور آخرت کی بھلائی ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو اللہ سے ڈرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور جو لوگ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں" (الاعراف:156)

4۔ الانعام کے آخر میں فرمایا تھا: "وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ: اور یہ کہ میرا سیدھا راستہ یہی ہے لہٰذا اس پر چلو" (الانعام:153)۔ اور اس سورت کے اول میں اس سیدھے راستہ کا بیان کرتے ہوئے فرمایا: "كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰي لِلْمُؤْمِنِيْنَ: یہ عظیم کتاب ہے جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے سو آپ کے دل میں اس (کی تبلیغ) سے تنگی نہ ہو تاکہ آپ اس کے ساتھ ڈرائیں اور یہ ایمان والوں کے لیے نصیحت ہے (اے لوگو) اس کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی جانب سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اور اللہ کو چھوڑ کر (اپنے) دوستوں کی پیروی نہ کرو" (الاعراف:203)۔

5۔ الانعام میں فرمایا تھا: "ثُمَّ اِلٰي رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ: پھر تمہیں اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے تو وہ تمہیں اس چیز کی خبر دے گا جس میں تم اختلاف کرتے تھے" (الانعام:164)۔ اور اس سورت کے شورع میں اس دن کے احوال کی تفصیل بیان فرمائی: "فَلَنَسْــَٔـلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْــَٔـلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ۔ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَاۗىِٕبِيْنَ: تو جن لوگوں کی طرف رسول بھیجے گئے ہم ان سے ضرور سوال کریں گے اور بیشک ہم رسولوں سے بھی ضروری سوال کریں گے اور ہم ان پر ان کے احوال اپنے علم سے ضرور بیان کریں گے اور ہم (ان سے) غائب نہ تھے" (الاعراف:6-7)

6۔ سورۃ الانعام میں فرمایا تھا: "من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالہا و من جاء بالسیئۃ فلا یجزی الا مثلہا و ہم لا یظلمون: جو شخص ایک نیکی لے کر آئے تو اس کے لیے اس کی مثل دس نیکیاں ہیں اور جو شخص برائی لے کر آئے تو اسے صرف اسی ایک برائی کی سزا دی جائے گی اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا" (الانعام:160)۔ اور نیک اعمال پر جزاء اور برے اعمال پر سزا میزان پر نیکیوں اور برائیوں کے وزن کرنے کے بعد مترتب اور متحقق ہو گی اور وزن کرنے کا بیان سورۃ الاعراف میں ہے: "وَالْوَزْنُ يَوْمَىِٕذِۨ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ: اور اس دن اعمال کا وزن کرنا برحق ہے، پھر جن (کی نیکیوں) کے پلڑے بھاری ہوئے تو وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔ اور جن کی (نیکیوں) کے پلڑے ہلکے ہوئے تو یہ وہی ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو خسارے میں ڈالا کیونکہ وہ ہماری آیتوں کے ساتھ ظلم کرتے تھے" (الاعراف:8-9)۔

یہ چند وجوہ سورۃ الانعام اور الاعراف میں باہم ربط اور مناسبت کی ہیں جو خاتم الحفاظ حافظ جلال الدین سیوطی (رح) کی نکات آفرینی سے ماخوذ ہیں۔ سورۃ الاعراف کے تعارف میں یہ چند ضروری امور بیان کرنے کے بعد ہم اب اس سورت کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ الہ العالمین! اس سورت اور باقی تمام سورتوں کی تفسیر میں میری غیب سے مدد فرما، مجھے غلطیوں اور لغزشوں سے محفوظ اور مامون رکھ

اور مجھے صراط مستقیم پر قائم اور بر قرار رکھ اور مجھے وہ مضامین القا فرما جو حق اور صواب ہوں اور تیری رضا اور تیرے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خوشنودی کا موجب ہوں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

آیت: الٓمّٓصٓ ۚ ①

لغات القرآن: [الٓمّٓصٓ

ترجمہ: الف، لام، میم، صاد (حقیقی معنی اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی بہتر جانتے ہیں)

تشریح: المص کی تحقیق: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الف لام میم صاد (الاعراف: 1)۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو بھی ان حروف مقطعات سے شروع فرمایا تاکہ ایک بار پھر یہ تنبیہ ہو کہ قرآن مجید مجز کلام ہے اور اس چیلنج کی طرف پھر اشارہ ہو کہ کوئی جن اور انسان قرآن مجید کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثل بھی نہیں لا سکتا اور یہ صف اللہ تعالیٰ کا کلام ہے کیونکہ یہ قرآن عربوں کی لغت اور ان کے حروف تہجی مثلا الف، لام، میم، صاد وغیرہ سے مرکب ہے۔ اگر منکرین کے زعم کے مطابق یہ کسی انسان کا کلام ہے تو ان ہی حروف سے مرکب کرکے وہ بھی قرآن مجید کی کسی ایک سورت کی مثل بنا کر لے آئیں کیونکہ یہ کلام ان حروف ھجاء سے مرکب ہے جن سے تمام اہل عرب اپنے کلام کو مرکب کرتے ہیں اور جب باوجود شدید مخالفت اور علوم و معارف کی روز افزوں ترقی کے چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی کوئی منکر اس کلام کی نظیر نہ لا سکا تو روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ یہ قرآن کسی انسان کا کلام نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی متوفی 606ھ لکھتے ہیں: حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ المص کا معنی ہے انا اللہ افصل (میں اللہ، تفصیل کرتا ہوں) امام رازی نے اس سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ ان حروف کی رعایت سے اس کا معنی انا اللہ اصلح (میں اللہ اصلاح کرتا ہوں) بھی ہو سکتا ہے اور اول الذکر کی ثانی الذکر پر ترجیح کی کوئی دلیل نہیں ہے اور میم کی رعایت سے انا اللہ الملک (میں اللہ بادشاہ ہوں) بھی ہو سکتا ہے اس لیے ان حروف کو اول الذکر معنی پر محمول کرنا ترجیح بلا مرجح اور بلا دلیل ہے بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ المص اللہ تعالیٰ کا اسم ہے، لیکن یہ بھی بلا دلیل ہے کیونکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ المص کسی نبی کا نام ہو یا کسی فرشتے کا نام ہو بلکہ تحقیق یہ ہے کہ المص اس سورت کا اسم لقب ہے اور یہ اس سورت کا اسم بھی ہو سکتا ہے۔ (تفسیر کبیر ج 5 ص 194، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1415ھ)

زیادہ صحیح یہ ہے کہ حروف مقطعات اوائل سورۃ کے اسرار ہیں اللہ تعالیٰ نے اس راز سے صرف نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مطلع فرمایا ہے اور نبی کے وسیلہ اور فیض سے اللہ تعالیٰ نے اولیاء عارفین اور علماء کاملین میں سے جن کو چاہا، ان اسرار سے مطلع فرمایا ان حروف کی زیادہ تحقیق اور وضاحت ہم نے البقرہ میں کر دی ہے۔

(تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

الف عدد بقاعد ابجد ایک ہے ل کا عدد ۳۰ میم کا عدد ۴۰۔

اس کا ترجمہ تو وہی ہے جو شروع سورۃ بقرہ میں بیان ہوا کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اس نے یکتا قرآن کریم بے مثل ذات مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر تیس پاروں میں چالیس سال کی عمر کے بعد نازل فرمایا۔ اور صادر کے عدد نوے باعتبار حرف کے ہیں اور باعتبار تحریر حروف مکتوبی میں ص ۹۰ الف کا ایک دکے چار کل پچانوے ہوئے یہ عدد مکہ کے ہوتے ہیں۔ گویا اس سے یہ عبادت بنی انا اللہ الواحد الذی انزال الکتب الذی لیس کمثلہ علی محمد الذی ھو فرید الکائنات علی راس اربعین و کل لہ کل ملکہ۔ اور علامہ نسفی (رح) نے فرمایا قال الزجاج المختار فی تفسیرہ ما قال ابن عباس (رض) انا اللہ اعلم و افضل۔

ابن عباس (رض) فرماتے ہیں الف سے انا لام سے اللہ میم سے اعلم اور صاد سے افضل یعنی میں اللہ ہوں سب کچھ جانتا ہوں اور سب سے بہتر فیصلہ دیتا ہوں۔ اور اگر مقطعات کے اعتبار سے اسماء الٰہی عزوجل کا اول تسلیم کیا جائے تو الف سے انا۔ لام سے لطیف۔ میم سے مھیمن۔ صاد سے صور۔ گویا یہ عبادت بنتی ہے۔ انا لطیف مھیمن صادق۔ ہم لطیف اور حفاظت فرمانے والے سچے ہیں۔ یا المص میں حضور سید یوم النشور کو رموز کے ساتھ منادی بنایا گیا اور فرمایا اے محبوب لطیف مخافظت امت سچ فرمانے والے۔ ایک کتاب آپ کی طرف اتاری گئی تو آپ کے دل میں رکاوٹ نہ ہو اس سے کہ شاید قریش مکہ اور کفار عالم نہ مانیں اور اس سے اعراض کریں اس کی تکذیب کریں اس لیے کہ تم تو اس سے ڈر سناؤ اور مسلمانوں کو نصیحت دو۔

کتاب ای ھو کتاب انزلناہٗ الیک فلایکن فی صدرک حرج منہ شک فیہ وسمی الشک حرجاً لان الشاک ضیق الصدر حرجہ کما ان لامتیقن منشر الصدر منفسحۃ اے لا شک فی انہ منزال من اللہ۔ او حرج منہ بتبلیغہ لان کان یخاف قومہ و تکذیبھم لہ واغراضھم عنہ واذاھم فکان یضیق صدرہ من الاذی ولا ینشط لہ فامنہ اللھو نھاہ عن المبالات بھم والنھی متوجہ الی الجرح وفیہ من المبالغۃ ما فیہ (تفسیر نسفی) ترجمہ۔

یہ وہ کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اتاری تو نہ ہو تمہارے سینہ میں حرج اس سے یعنی یہ شک نہ ہو اور شک کا نام حرج اس لیے رکھا کہ شک کرنے والا دل میں تنگی محسوس کرتا ہے جیسے یقین کرنے والے منشرح الصدر ہوتا ہے اور دل میں وسعت محسوس کرتا ہے۔ تو معنی یہ ہوئے کہ اس میں شک نہیں کہ یہ قرآن اللہ کی طرف سے نازل ہوا یا تنگی محسوس کریں اس کے پہنچانے میں۔ اس لیے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی قوم سے اس امر کا خوف کھاتے تھے کہ تبلیغ سے وہ قبول کرنے میں اعراض وانحراف

کریں گے اور تکذیب کریں گے تو اس صورت ہی کا نام ضیق صدر ہے اور اذیت کفار کا خوف بھی اس معنی میں ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو امن دی اور ان کی پروا کرنے سے منع فرمایا اور حرج سے منع فرمانا بمعنی مبالغہ ہے۔

(تفسیر الحسنات۔ علامہ سید ابو الحسنات محمد احمد قادری)

تشریح۔

یہ حروف مقطعات ہیں، جن کے تعلق سے اسلم راہ یہی ہے، کہ کہہ دیا جائے کہ اپنے اس کلام سے اللہ تعالیٰ کی کیا مراد ہے؟ اسے وہی حق تعالیٰ ہی جانے۔۔ یا۔۔ اس کے بتانے سے اس کا وہ رسول جانے جن پر ان کلمات کو نازل فرمایا گیا ہے۔ ان کلمات کو قرآن کریم میں رکھنے کی حکمت یہ ہو سکتی ہے، تاکہ ایمان والوں کے ایمان کا امتحان ہو جائے، کہ کیا وہ قرآن کریم انھیں باتوں کو مانتے ہیں جو ان کی سمجھ میں آجائیں۔۔ یا۔۔ ان باتوں کو بھی مانتے ہیں جو ان کی سمجھ سے باہر ہیں۔

پہلی صورت میں وہ کتاب کی بجائے اپنی سمجھ پر ایمان لانے والے ہوئے۔ کتاب الٰہی پر ایمان لانا تو یہ ہے، کہ اس کی ہر ہر بات پر ایمان لاؤ، خواہ وہ تمہاری سمجھ میں آئے۔۔ یا۔۔ نہ آئے۔ ہم تو صرف اس بات کے مکلّف ہیں کہ ان مقطعات کو کلام الٰہی مانیں، جنھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل فرمایا گیا ہے اور بس۔ رہ گیا اس کے اسرار و رموز کو سمجھنا؟ وہ ہمارے لیے ضروری نہیں۔ اب اگر اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں اور دوسرے نیک بندوں کو اس کے معانی اور خدائی مراد کا علم دیدے، تو یہ ایک دوسری بات ہے۔ وہ قادر مطلق ہے جو چاہے کرے۔ یہ تو رہا اسلم راستہ اور اس میں ہی زیادہ احتیاط ہے۔۔ مگر۔۔ ایک سالم راستہ یہ بھی ہے کہ اس کی ایسی تاویل کی جائے، جو کسی محکم آیت سے نہ ٹکرائے اور نہ ہی کسی شان والے کی شان گھٹائے۔۔ نیز۔۔ اس تاویل کو قبول کر لینے میں کوئی شرعی۔۔ یا۔۔ عقلی قباحت بھی نہ ہو۔

اسی نکتے کو سامنے رکھ کر کہا گیا ہے کہ المص قرآن۔۔ یا۔۔ اسی سورۃ کا نام ہے۔۔ یا۔۔ ان میں ہر ایک حرف اشارہ ہے خدا کے ناموں میں سے کسی ایک کی طرف، جیسے 'ا' سے الہ 'ل' سے لطیف، 'م' سے ملک، اور 'ص' سے صبور۔۔ یا۔۔ ہر حرف کنایہ ہے ایک صفت سے، جیسے 'الف' سے اکرام، 'لام' سے لطف، 'میم' سے مجد اور 'صاد' سے صدق۔۔ یا۔۔ بعضے حروف ناموں پر دلالت کرتے ہیں اور بعضے افعال پر۔ تو اصل میں یوں ہوگا۔

'انا اللہ اعلم وافصل'

۔۔ یعنی۔۔ میں خدا ہوں کہ جانتا ہوں اور بیان کرتا ہوں۔۔ یا۔۔ سب سے زیادہ جاننے والا ہوں اور حق کو باطل سے جدا کرتا ہوں۔۔ المختصر۔۔

(تفسیر اشرفی۔ علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

آیت مبارکہ:

كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢﴾

لغۃ القرآن: كِتٰبٌ : ایک کتاب ہے] [اُنْزِلَ : نازل کیا گیا] [اِلَيْكَ : آپ کی طرف] [فَلَا : پس نہیں] [يَكُنْ : ہو] [فِي : میں] [صَدْرِكَ : آپ کے سینے] [حَرَجٌ : کوئی تنگی] [مِّنْهُ : اس بارے میں] [لِتُنْذِرَ : تاکہ آپ ڈرائیں] [بِهٖ : اس کو] [وَذِكْرٰي : اور نصیحت ہے] [لِلْمُؤْمِنِيْنَ : سب ایمان والوں کیلئے] [

ترجمہ:

(اے حبیب مکرّم !) یہ کتاب ہے (جو) آپ کی طرف اتاری گئی ہے سو آپ کے سینہ (انور) میں اس (کی تبلیغ پر کفار کے انکار و تکذیب کے خیال) سے کوئی تنگی نہ ہو (یہ تو اتاری ہی اس لیے گئی ہے) کہ آپ اس کے ذریعے (منکرین کو) ڈر سنا سکیں اور یہ مومنین کے لیے نصیحت (ہے)

تشریح:

اف یہ سورۃ ہجرت سے کچھ عرصہ پہلے نازل ہوئی اس وقت کفار و مشرکین کی اسلام دشمنی حد کمال تک پہنچ چکی تھی۔ آیات الٰہی کی تکذیب، احکام شرعی کا مذاق، مسلمانوں پر جور و جفا اور رحمٰن عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ظلم و ستم ان کا مقصد حیات بن کر رہ گیا تھا۔ انھیں راہ راست کی ساری کوششیں بظاہر بے اثر معلوم ہو رہی تھیں۔ جس سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دل نازک کو سخت صدمہ پہنچتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود فرمان خداوندی یہ تھا کہ دعوت حق دیتے چلو۔ پیغام حق سناتے رہو۔ راہ راست کی طرف بلاتے رہو۔ اس لیے اس سورت کے آغاز میں اپنے محبوب کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہدایت فرمائی جا رہی ہے کہ آپ ان کفار کے معاندانہ رویہ سے تنگ دل نہ ہوں بلکہ اپنا فرض ادا کرتے چلے جائیں۔ اور اس کتاب مقدس کی تبلیغ میں سرگرم رہیں۔ لفظ حرج۔ حرجۃ سے ماخوذ ہے۔ اور حرجہ گھنے درختوں کے اس جھنڈ کو کہتے ہیں جن کی شاخیں آپس میں اتنی الجھی ہوئی ہوتی ہیں کہ ان میں سے کوئی گزر نہیں سکتا۔ اور گزرنے والا وہاں پہنچ کر حیران و ششدر ہو جاتا ہے حرج من الحرجۃ التی ہی مجتمع الشجر المشتبک الملتف الذی لایجد السالک فیہ سبیلا وضحاینفذ منہ (المنار) اسی مناسبت سے تنگی دل کو بھی حرج کہتے ہیں کیونکہ مخالفت کی آندھیوں میں انسان پریشان ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس لیے مفسرین کرام نے اس کا معنی تنگی دل سے کیا ہے۔ حرج ای ضیق ای لایضیق صدرک بالابلاغ (قرطبیؒ)

۲ف آیت کے اس حصہ میں نزول قرآن کا مقصد بیان ہو رہا ہے کہ کفار اور منکرین کے لیے تو یہ انذار (ڈرانے) کا کام دیتا ہے اور انھیں بتا رہا ہے کہ اگر تم باز نہ آئے تو تمہارا انجام بڑا عبرتناک ہوگا۔ اور مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدا کرتا ہے اور انھیں ہر آن وہ عہد یاد دلاتا ہے جو انھوں نے اسلام قبول کرتے وقت اپنے رب سے باندھا تھا۔ ذکر کا معنی ہے صرف یاد کرانا۔ لیکن ذکری کا معنی بہت زیادہ اور بار بار یاد کرانا ہے۔ والذکری کثرۃ الذکر وھو ابلغ من الذکر۔ (مفردات راغب)۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری)

کِتٰبٌ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ : اے محبوب ! ایک کتاب تمہاری طرف اتاری گئی۔} یعنی اے حبیب ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، یہ کتاب یعنی قرآن پاک آپ کی طرف اس لیے نازل کیا گیا تاکہ آپ اس کے ذریعے لوگوں کو اللہ عَزَّوَجَلَّ کے عذاب سے ڈرائیں۔ پس آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دل میں لوگوں کے سابقہ طرز عمل کی وجہ سے اور اس خیال سے کہ لوگ نہ مانیں گے اور اس پر اعتراض کریں گے اور اسے جھٹلانے لگیں گے اس کی تبلیغ فرمانے سے کوئی تنگی نہ آئے، آپ ان کفار کی مخالفت کی ذرہ بھر پروانہ کریں۔

تکالیف کی وجہ سے تبلیغ دین میں دل تنگ نہیں ہونا چاہیے :

اس آیت میں حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تسکین و تسلی اور حوصلہ افزائی ہے اور اس کے ذریعے امت کے تمام مبلغین کو درس اور سبق ہے کہ لوگوں کے نہ ماننے یا تکلیفیں دینے کی وجہ سے تبلیغ دین میں دل تنگ نہیں ہونا چاہیے۔ نیکی کی دعوت کا کام ہی ایسا ہے کہ اس میں تکالیف ضرور آتی ہیں۔ اسی لیے تمام انبیاء کرام (علیہ السلام) نے بے پناہ تکلیفیں اٹھائیں اور ان کے واقعات قرآن پاک میں بکثرت موجود ہیں۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا آگ میں ڈالا جانا، اپنے ملک سے ہجرت کرنا، لوگوں کا آپ کو تنگ کرنا یونہی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا ہجرت کرنا، فرعون کا آپ کے مقابلے میں آنا، آپ کو جادوگر قرار دینا، آپ کو گرفتار کرنے کے منصوبے بنانا یونہی سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بے پناہ تکلیفیں اٹھانا، لوگوں کا آپ پر مَعَاذَاللہ کوڑا پھینکنا، راستے میں کانٹے بچھانا، آپ کو شہید کرنے کے منصوبے بنانا، آپ کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کرنا، آپ کو جادوگر، کاہن، شاعر کہنا، آپ سے جنگ کرنا وغیرہ یہ ساری چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ راہ تبلیغ میں تکالیف آنا ایک معمول کی چیز ہے اور انھیں برداشت کرنا انبیاء کرام (علیہ السلام) کی سنت ہے۔ آیت میں فرمایا گیا کہ یہ قرآن مومنوں کیلئے نصیحت ہے، اب یہاں آج کے مومنین و مسلمین سے بھی عرض ہے کہ ذرا اپنے احوال و اعمال پر غور کریں کہ کیا یہ قرآن سے نصیحت حاصل کر رہے ہیں ؟ یا انھیں قرآن کھولنے، پڑھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوتی ؟

(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

عظمت قرآن اور احوال آخرت کا بیان :

قرآن مجید سے کفار کا انکار حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قلب مبارک کو بہت تکلیف دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ آپ کے سینہ پاک میں ان کے انکار سے کوئی تنگی نہیں آتی چاہیے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا : مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤى۔ ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نہیں اتارا کہ آپ مشکل میں پڑیں۔ (طہ : 2) معلوم ہوا مبلغ کو قوم کی مخالفت سے دلبرداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے ایسے حبیب ہیں کہ آپ کا پریشان ہونا اللہ تعالیٰ کو گوارا نہیں۔

آپ کے قلب مبارک سے جب بھی بوجھ آتا تو اللہ قرآن اتار کر آپ کو تسلی عطا فرماتا۔ اور اسی لئے قرآن کو اکٹھا نہ اتارا گیا بلکہ اس کے اتارنے میں حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رضامندی کو بھی شامل رکھا گیا۔

یعنی قرآن اس لیے اتارا گیا تاکہ اس کے ذریعے تمام انسانوں کو عذاب آخرت سے ڈرایا جائے مگر اس سے وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جن کے دل میں جذبہ ایمان ہے۔ اسی لیے دوسری جگہ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا: هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ۔ یعنی "قرآن پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے۔" (بقرہ: 2)۔

اس کا بھی یہی معنی ہے کہ قرآن سے ہدایت صرف پرہیزگار ہی لیتے ہیں۔ یہ اسی طرح ہے جیسے کہا جائے کہ یہ ایم اے کی کتاب ہے یا یہ بی اے کی کتاب ہے، یعنی اس کو پڑھنے والے ایم اے یا بی اے کا کورس پاس کر لیتے ہیں۔ اسی طرح قرآن پر عمل کرنے والے مومنین اور متقین بن جاتے ہیں۔ ورنہ قرآن تو ساری انسانیت کے لیے ہدایت ہے۔ ارشاد ہوا هُدًى لِّلنَّاسِ (بقرہ 185)

(تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

تشریح صوفیانہ

المص، کتب اِنزل اِلیک فلا یکن فی صدرک حرج منہ لتنذر بہ وذکری اللمؤمنین محبوب آپ کی طرف کتاب اتاری ہے تو اس سے آپ کا جی نہ بھرے تاکہ آپ اس سے ڈرسنائیں اور مسلمانوں کو نصیحت فرمائیں۔ "الف" ذات احدیت کی طرف اشارہ ہے "ل" ذات مع صفت علم کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ "م تمیمیت جامعہ کی طرف اشارہ ہے یعنی کامل تر جامعیت تو محمد کے یہی معنی ہیں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یعنی آپ کا نفس اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حقیقت۔ "ص" صورت فخذیہ کی طرف اشارہ ہے جو کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا جسم انور ہے اور ظاہر ہے۔ حضرت ابن عباس (رض) سے روایت ہے۔ جبل بمکۃ کان علیہ عرش الرحمٰن حین لا لیل ولا نہار "۔ جبل مکہ پر عرش الرحمٰن ہے جب نہ رات ہو نہ دن"

مومن کا دل اللہ کا عرش ہے:

اس وقت نہ رات ہے نہ دن تو پہاڑ کا اشارہ حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جسد اطہر کی طرف ہے اور عرش رحمان سے آپ کے قلب انور کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ " قلب المومن عرش اللہ " یعنی مومن کا دل اللہ کا عرش ہے اور حدیث قدسی میں آیا ہے! " لا یسعنی ارضی ولا سمائی ویسعنی قلب عبدی المومن " یعنی میں نہ اپنی زمین میں اور نہ اپنے آسمان میں سماتا ہوں اور میں اپنے مومن بندے کے دل میں سما جاتا ہوں۔ " حین لا لیل ولا نہار یعنی جب نہ رات ہو نہ دن سے وحدت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ قلب جب ارض نفس کے ظل میں واقع ہو اور اپنی صفات کی ظلمت کے ساتھ محجوب ہو اور جب اس پر شمس روح کا نور طلوع ہو اور اس کی ضوء باری سے روشنی ہو دن میں ہے اور جب معرفت کے ساتھ وحدت حقیقیہ کی اور شہود ذاتی کی طرف پہنچتا ہے اور اس کے نزدیک نور و ظلمت برابر ہوتے ہیں یہ وہ وقت ہے جب نہ رات ہو اور نہ دن ہو اور عرش رحمان اس

وقت کے علاوہ نہیں ہوگا، توآیت کا اول سے آخر تک معنی وجود کل ہے۔ کتب اِنزل اِلیک یعنی آپ کی طرف اپنا علم اتارا تو اس کے اٹھانے سے آپ کا دل تنگ نہ پڑے تو اس کی عظمت کے لئے اس کی گنجائش نہیں تو وحدت میں فناء کے ساتھ اور عین الجمع میں استغراق کے ساتھ اور تفصیل سے خود فراموشی کی متلاشی ہوں اس لئے کہ حضور رسالت مآب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مقام فناء میں خلق سے حق کے ساتھ محجوب ہیں، جو کچھ بھی آپ پر وجود لوٹاتا ہے اور اس سے شہود ذاتی کے پردے ہیں اور آپ پر تفصیل کے ساتھ ظاہر ہیں جس سے آپ کا ظرف تنگ ہو جاتا ہے اور آپ پر بوجھ اور ثقل بڑھ جاتا ہے اس لئے اس ارشاد کے ساتھ مخاطب فرمایا! الم نشرح لک صدرک ووضعنا عنک وزرک کیا ہم نے آپ کا سینہ کشادہ فرما کر آپ پر سے آپ کا بوجھ نہیں آتار لیا۔ (سورۃ الم نشرح آیت ۱۔ ۲) یعنی کیا ہم نے وجود د موہوب حقانی کے ساتھ اور فناء کے بعد تمکین کے ساتھ استقامت سے آپ کے سینے کو کھول کر آپ کا بوجھ نہیں آتار لیا، اس لئے آپ کا سینہ مبارک جمع تفصیل اور حق و خلق کے لئے وسیع ہے تو عین اجمع میں آپ پر بوجھ باقی نہیں اور نہ دونوں میں سے ایک دوسرے سے حجاب ہے۔ لتنذر بہ یعنی ایمان غیبی کے ساتھ مومنوں کو انذار کر میں یعنی ڈرائیں، یعنی اس سے آپ کا سینہ تنگ نہ پڑے کہ آپ کو انذار پر تمکن کیا گیا ہے اور تذکیر یعنی نصیحت کر میں اس لئے کہ اگر فناء کے حال میں تنگی باقی ہو تو وجود میں حق کے سوا کسی کو نہ دیکھیں اور حق کی طرف عدم محض کی نظر کے ساتھ دیکھیں تو انذار و تذکیر کیسے ہے؟ اور امر و نہی قسم کی تقدیر پر ہے تو اس کا معنی اس کے اول سے اس کے آخر تک کُل کے ساتھ یا اسم اعظم اللہ کے ساتھ ہے اس لئے "ص" حامل عرش اور عرش ذات و صفات کی گنجائش اور یہ مجموعہ اسم اعظم ہے اس لئے کہ آپ پر اس کے علم کی کتاب نازل ہوئی یا اس قرآن کے لئے آپ پر کتاب اتاری گئی۔

(تفسیر ابن العربی۔ محی الدین ابن عربی۔ صائم)

آیت مبارکہ:

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ③

لغۃ القرآن: اِتَّبِعُوْا : تم سب پیروی کرو] [مَآ : نہیں] [اُنْزِلَ : نازل کیا گیا] [اِلَيْكُمْ : تمہاری طرف] [مِنْ رَّبِّكُمْ : تمہارے رب کی طرف سے] [وَلَا : اور نہ] [تَتَّبِعُوْا : تم سب پیری کرو] [مِّنْ : سے] [دُوْنِهٖٓ : اس کے سوا] [اَوْلِيَآءَ : دوست] [قَلِيْلًا : بہت کم] [مَا : نہیں] [تَذَكَّرُوْنَ : سب نصیحت حاصل کرو]

ترجمہ: (اے لوگو!) تم اس (قرآن) کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اور اس کے غیروں میں سے (باطل حاکموں اور) دوستوں کے پیچھے مت چلو، تم بہت ہی کم نصیحت قبول کرتے ہو

تشریح:

آیت سابقہ میں اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم دیا کہ اس کتاب کی تبلیغ میں کسی قسم کی کوتاہی روانہ رکھیں۔ اب اپنے بندوں کو ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ ہم نے اپنے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذریعہ ان کی طرف جو شریعت، جو احکام نازل کیے ہیں اس کی تعمیل سے سر مو انحراف نہ کریں اور انھیں چھوڑ کر کسی اور نظام قانون کا اتباع نہ کرنے لگیں۔ علماء محققین نے تصریح کی ہے کہ جس طرح احکام قرآنی منزل من اللہ ہیں اسی طرح وہ احکام جن کو زبان رسالت نے بیان کیا ہے وہ بھی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذاتی رائے نہیں بلکہ وحی الٰہی ہی ہیں یعنی الکتاب والسنۃ (القرطبیّ) ویعم القرآن والسنۃ لقولہ تعالیٰ ومایںطق عن الھوی ان ھوالا وحی یوحی (بیضاوی) علامہ بیضاوی فرماتے ہیں کہ ان سے مراد کتاب وسنت دونوں ہیں کیونکہ سنت نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی منزل من اللہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے کہ میرا محبوب اپنی ذاتی خواہش سے تو بولتا بھی نہیں۔ جو بذریعہ وحی اسے حکم ملتا ہے وہی اس کی زبان پر آتا ہے۔

(بیضاوی و تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری)

احادیث کے حجت ہونے کے دلائل اور ان کی حجیت کی وضاحت :

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ذکر فرمایا تھا اور اس بات کا ذکر فرمایا تھا کہ امت کو ڈرانے اور نصیحت کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید نازل فرمایا ہے اور اب اس آیت میں امت کو یہ حکم دیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے وہ اس کی اتباع کریں اور اس پر عمل کریں اور اس آیت میں احادیث مبارکہ کے حجت ہونے پر دلیل ہے، کیونکہ جس طرح نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر قرآن مجید نازل کیا گیا ہے اسی طرح آپ پر احادیث مبارکہ کی گئی ہیں، فرق یہ ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ اور معانی دونوں نازل ہوئے ہیں، اور احادیث کے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر صرف معانی نازل ہوئے اور ان معانی کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے، اس آیت کے علاوہ اور بھی متعدد آیات میں احادیث مبارکہ کے حجت ہونے پر دلیل ہے، ان میں سے بعض آیات یہ ہیں :

" وما اتا کم الرسول فخذوہ وما نہا کم عنہ فانتھوا : رسول تم کو جو (احکام) دیں ان کو قبول کرو اور جن کاموں سے تم کو منع کریں ان سے باز رہو " (الحشر : 7) ۔ اگر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صرف قرآن مجید کے احکام پر عمل کرانے اور فقط قرآن مجید کی آیات پہنچانے پر مامور ہوتے اور قرآن مجید کے علاوہ احکام دینے مجاز نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ یہ آیت نازل نہ فرماتا۔

نیز فرمایا : " قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم : آپ کہیے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم کو محبوب بنالے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا " (آل عمران : 31) ۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت اور مغفرت کے حصول کو آپ کی اتباع پر موقوف کردیا ہے، کیونکہ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ اگر تم اللہ کی محبت چاہتے ہو تو قرآن مجید پر عمل کرو بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اگر تم اللہ کی محبت چاہتے ہو تو میری یعنی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اتباع کرو۔

" وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیھم :

اور ہم نے آپ کی طرف قرآن نازل کیا تاکہ آپ لوگوں سے بیان فرمائیں کہ ان کی طرف کیا نازل کیا گیا ہے " (النحل : 44)۔اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعلیم اور تبیین کے بغیر قرآن مجید کے معانی معلوم نہیں ہو سکتے، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا ہے۔آپ کے احکام کی اطاعت اور آپ کے افعال کی اتباع قیامت کے مسلمانوں پر واجب ہے۔صحابہ کرام (رض) نے آپ سے براہ راست احکام حاصل کیے اور آپ کو دیکھ کر آپ کی سنت کی پیروی کی۔اب سوال یہ ہے کہ بعد کے لوگوں کو آپ کے احکام اور آپ کے افعال کا کس ذریعہ سے علم ہوگا۔اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے افعال کو ہمارے اعمال کے لیے نمونہ بنایا ہے۔لہٰذا جب تک آپ کے افعال ہمارے افعال کے سامنے نہ ہوں ہم اپنے اعمال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے افعال کے مطابق کیسے کر سکیں گے اور آپ کے احکام کی اطاعت کیسے کر سکیں گے اور جب کہ آپ کے احکام اور آپ کے افعال کی اطلاع صرف احادیث سے ہی ممکن ہے تو معلوم ہوا کہ جس طرح صحابہ کرام (رض) کے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات مبارکہ اللہ کی حجت تھی اسی طرح ہمارے حق میں آپ کی احادیث مبارکہ اللہ کی حجت ہیں۔اور اگر ان احادیث کو معتبر ماخذ نہ مانا جائے تو بندوں پر اللہ کی حجت ناتمام رہے گی۔

نیز اس پر غور کرنا چاہیے کہ اگر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نہ بتلاتے تو ہمیں کیسے معلوم ہوتا کہ صلوۃ سے مراد یہ معروف نماز ہے۔اذان کے ان مخصوص الفاظ کا کیسے پتہ چلتا، تکبیر تحریم سے لے کر سلام پھیرنے تک نماز کے تمام ارکان، واجبات، سنن اور آداب کا ہمیں کیسے علم ہوتا۔زکوۃ کے نصاب اور ادائیگی کی مقدار کا اور اس کی تمام شرائط اور موانع کا ہمیں کیسے علم ہوتا، اسی طرح روزہ کی تمام تر تفصیلات، اس کی قضا اور کفارہ کا بیان ہمیں کیسے معلوم ہوتا۔حج اور عمرہ کے ارکان، واجبات، مستحبات اور مفسدات کیسے معلوم ہوتے۔ان میں سے کسی چیز کا بھی قرآن مجید میں بیان نہیں ہے۔عہد رسالت میں صحابہ کرام کو یہ تمام تفصیلات براہ راست آپ سے سن کر اور آپ کو دیکھ کر حاصل ہوئیں اور بعد کے مسلمانوں کو ان احادیث سے معلوم ہوئیں جو متعدد اسانید سے صحابہ کرام سے مروی ہیں اور بعد میں ان احادیث کی باقاعدہ تدوین کی گئی اور آج ان سے استفادہ کے لیے صحاح ستہ اور دیگر کتب احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جس طرح قرآن مجید کے معانی کے مبین اور معلم ہیں، اسی طرح آپ بعض احکام کے شارع بھی ہیں جیسا کہ قرآن مجید کی اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے :یحل لہم الطیبات ویحرم علیہم الخبائث : (وہ رسول) پاک چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتے ہیں " (الاعراف : 157)

اس سلسلہ میں حسب ذیل احادیث ہیں، امام ابوداود متوفی 275 ھ روایت کرتے ہیں : حضرت مقدام بن معدیکرب بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : سنو ! مجھے کتاب دی گئی ہے اور اس کے ساتھ اس کی مثل بھی، سنو ! عنقریب

ایک شکم سیر شخص اپنے تخت پر بیٹھا ہوا کہے گا تم (صرف) اس قرآن کو لازم پکڑ لو اس میں جو چیزیں تم حلال پاؤان کو حلال قرار دو، اور اس میں جن چیزوں کو تم حرام پاؤان کو حرام قرار دو، سنو تمہارے لیے پالتو گدھے کا گوشت حلال نہیں ہے اور نہ تمہارے لیے ہر چکلیوں والا درندہ حلال ہے اور نہ ذمی کی راستہ میں پڑی ہوئی چیز، سوا اس صورت کے کہ اس چیز کا مالک اس سے مستغنی ہو اور جو شخص کسی قوم کے پاس جائے اس قوم پر اس کی میزبانی کرنا لازم ہے۔ اگر وہ اس کی مہمان نوازی نہ کریں تو اس مہمان کے لیے ان لوگوں سے بہ قدر ضیافت مال چھین لینا جائز ہے۔

حدیث کا یہ آخری جملہ اس صورت پر محمول ہے جب مہماں حالت اضطرار میں ہو اور اس کے پاس اپنا پیٹ بھرنے کے لیے میزبان کا مال لینے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ ہو ورنہ قرآن مجید اور دیگر احادیث میں مسلمانوں کو ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے کھانے سے منع فرمایا ہے۔ (سنن ابو داؤد ج 4 رقم الحدیث 4604۔ سنن الترمزی ج 4 رقم الحدیث 2672 تا 2673۔ سنن ابن ماجہ ج 1 رقم الحدیث 12-13۔ مسند احمد ج 4 ص 130۔131۔ طبع قدیم۔ المستدرک ج 1 ص 109۔ سنن دارمی ج 1 رقم الحدیث 586)۔

نیز امام عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی سمرقندی متوفی 255ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: حضرت حسان بیان کرتے ہیں کہ حضرت جبرائیل نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اسی طرح سنت نازل کرتے تھے جس طرح قرآن مجید نازل کرتے تھے۔ (سنن دارمی، رقم الحدیث 588، مطبوعہ دار الکتاب العربی، بیروت)

مکحول بیان کرتے ہیں کہ سنت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ سنت ہے جس پر عمل کرنا فرض ہے اور اس کو (بہ طور انکار یا اہانت) ترک کرنا کفر ہے۔ اور دوسری قسم وہ سنت ہے جس پر عمل کرنا باعث فضیلت ہے اور جس کے ترک کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے (سنن دارمی، رقم الحدیث 589)

سعید بن جبیر بیان کرتے ہیں کہ ایک دن انھوں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ایک حدیث بیان کی تو ایک شخص نے کہا کتاب اللہ میں اس کے خلاف ہے۔ انھوں نے کہا میں تو کو ایسا کرتے ہوئے نہ دیکھوں کہ میں تم کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حدیث بیان کروں اور تم اس حدیث کا کتاب اللہ سے معارضہ کرو۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم سے زیادہ کتاب اللہ کو جاننے والے تھے۔ (سنن دارمی، رقم الحدیث 590)۔

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ جو حدیث بظاہر قرآن مجید کے خلاف ہو لیکن کسی باریک اور خفی وجہ سے اس کی قرآن مجید کے ساتھ مطابقت ہو سکتی ہو تو اس کو قرآن مجید کے معارض اور خلاف قرار نہیں دیا جائے گا۔ مثلاً قرآن مجید میں نماز میں مطلقاً قرآن پڑھنے کا حکم ہے اور کسی خاص سورت کو پڑھنے کا حکم نہیں دیا بلکہ فرمایا ہے: " فاقرء واما تیسر من القرآن: تمہیں جتنا قرآن پڑھنا آسان لگے اتنا پڑھ لیا کرو" (المزمل: 20)۔ اس کے بر خلاف حدیث میں ہے: حضرت عبادہ بن الصامت (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول

اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص سورۃ فاتحہ نہ پڑھے، اس کی نماز نہیں ہوگی۔ (صحیح البخاری، ج 1 رقم الحدیث 765، صحیح مسلم کتاب الصلوۃ: 34 (394) 850۔ سنن ابوداؤد ج 1 رقم الحدیث 822۔ سنن الترمذی ج 1 رقم الحدیث 247۔ سنن النسائی ج 2 رقم الحیدث 911۔ سنن ابن ماجہ ج 1 رقم الحدیث 837۔ سنن کبریٰ للنسائی ج 5 رقم الحدیث 8009)۔ لیکن اس حدیث کا محمل یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ کے بغیر نماز کامل نہیں ہوگی۔ مطلّقاً قرآن مجید نماز میں پڑھنا فرض ہے اور سورۃ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے اور اگر کسی نے نماز میں سورۃ فاتحہ کو نسیاناترک کردیا تو سجدہ سہو واجب ہوگا اور اگر اس کو عمداًترک کردیا تو نماز اس میں واجب الاعادہ ہوگی۔ اس لیے یہ حدیث قرآن مجید کے خلاف نہیں ہے۔

البتہ جو حدیث صرح قرآن کے خلاف ہو اور اس کی کوئی صحیح توجیہ ممکن نہ ہو تو اس کو قرآن مجید کے مقابلہ میں ترک کردیا جائے گا اور اس کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کلام نہیں ہے اور کسی زندیق نے اس حدیث کو گھڑ کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف منسوب کردیا اور اصطلاحاً وہ حدیث موضوع قرار دی جائے گی۔ اس کی مثال یہ حدیث ہے:

امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی المتوفی 360ھ اپنی سند کے ساتھ حضرت ضحاک بن زمل الجہنی سے ایک طویل حدیث روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صبح کی نماز کے بعد صحابہ سے فرمایا آج رات تم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہے؟ حضرت ضحاک نے ایک طویل خواب بیان کیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی تعبیر بیان فرمائی۔ اس تعبیر میں آپ کا یہ ارشاد بھی ہے دنیا (کی عمر) سات ہزار سال ہے اور میں اس کے آخری ہزار میں ہوں۔ (الحدیث) (المعجم الکبیر ج 8 رقم الحدیث 8146۔ دلائل النبوۃ للبیہقی ج 7 ص 36۔ 38۔ کنزالعمال ج 14 رقم الحدیث 3833۔ مجمع الزوائد ج 8 ص 184)

اس حدیث کی سند میں ایک راوی سلیمان بن عطا القرشی ہے جو مسلمہ بن عبداللہ الجہنی سے روایت کرنے میں منفرد ہے۔ حافظ جمال الدین ابوالحجاج یوسف المزوی المتوفی 742ھ اس کے متعلق لکھتے ہیں: امام بخاری نے کہا اس کی احادیث میں مناکیر ہیں۔ امام ابوزرعہ نے کہا یہ منکر الحدیث ہے۔ (تہذیب الکمال فی اسماء الرجال ج 8 ص 89، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1414ھ)

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی 852ھ اس کے متعلق لکھتے ہیں: امام ابن حبان نے کتاب الضعفاء میں اس کے متعلق لکھا ہے یہ ایک بوڑھا شخص تھا جو مسلمہ بن عبداللہ الجہنی سے ایسی چیزیں روایت کرتا تھا جو موضوعات کے مشابہ ہیں اور ثقہ راویوں کی احادیث کے مشابہ نہیں ہیں اور امام ابوحاتم نے اس کو منکر الحدیث کہا (تہذیب التہذیب ج 4 ص 191، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1415ھ)۔

امام ابن حاتم رازی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے جس میں سے چھ ہزار سال گزر چکے ہیں۔ (تفسیر ابن ابی حاتم ج 8 ص 2499، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ 1417 ھ)۔

امام ابن ابی حاتم نے اس حدیث کی سند ذکر نہیں کی جس سے اس کا حال معلوم ہوتا۔ البتہ یہ حدیث صریح قرآن کے خلاف ہے اور اس حدیث کا موضوع اور جھوٹ ہونا بالکل ظاہر ہے کیونکہ اگر یہ حدیث صحیح ہوتی اور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کے ایک ہزار سال بعد قیامت نے آنا ہوتا تو ہر شخص کو معلوم ہو جاتا کہ اب قیامت کے آنے میں کتنا وقت باقی رہ گیا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں ہے: " لاتاتیکم الا بغتۃ: قیام تم پر اچانک ہی آئے گی " (الاعراف: 187)۔

علاوہ ازیں اب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کے بعد ایک ہزار اور چار سو سال سے زیادہ سال گزر چکے ہیں، جبکہ اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ آپ کی بعثت کے بعد دنیا کی عمر ایک ہزار سال ہے گویا چار سو سال پہلے قیامت آجانا چاہیے تھی، لہٰذا اس حدیث کا جھوٹ ہونا بالکل واضح ہے۔ کسی زندیق نے ایک جعلی سند بنا کر ایک جھوٹ کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف منسوب کردیا۔ معاذ اللہ امام عبدالرحمٰن بن علی بن الجوزی المتوفی 597 ھ نے اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ حضرت انس (رض) سے روایت کیا ہے اور اس کے متعلق لکھا ہے۔ یہ حدیث رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر وضع کی گئی ہے اور اس کو وضع کرنے والا العلاء بن زیدل ہے۔ ابن المدینی نے کہا کہ وہ حدیث وضع کرتا تھا۔ امام ابو حاتم رازی اور امام ابو داؤد نے کہا کہ وہ متروالحدیث ہے اور امام ابن حبان نے کہا کہ اس نے حضرت انس (رض) سے ایک من گھڑت مجموعہ روایت کیا ہے جس کا ذکر جائز نہیں ہے۔ ملا علی بن سلطان محمد القاری المتوفی 1014 ھ نے بھی اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے (موضوعات کبیر، ص 98، مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی)۔

امام علی بن عمر الدارقطنی متوفی 385 ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تمہارے پاس عنقریب میری مختلف احادیث آئیں گی پس تمہارے پاس میری جو حدیث کتاب اللہ اور میری سنت (معروفہ) کے موافق پہنچے، وہ میری حدیث ہے اور تمہارے پاس میری جو حدیث کتاب اللہ اور میری سنت (معروفہ) کے مخالف پہنچے، وہ میری حدیث نہیں ہے۔

امام دارقطنی نے اس حدیث کو چار مختلف اسانید کے ساتھ روایت کیا ہے (سنن دار قطنی ج 4 رقم الحدیث 4427 تا 4430۔ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1412 ھ)

(تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ:

وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ④

لغۃ القرآن: وَكَمْ : اور کتنی] [مِنْ : سے] [قَرْيَةٍ : ایک بستی] [اَهْلَكْنٰهَا : ہم نے ہلاک کردیا انہیں] [فَجَآءَهَا : تو آیا ان پر] [بَاْسُنَا : ہمارا عذاب] [بَيَاتًا : راتوں رات] [اَوْ : یا] [هُمْ : وہ] [قَآئِلُوْنَ : سب دوپہر کو آرام کرنے والے تھے]

ترجمہ: اور کتنی ہی بستیاں (ایسی) ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر ڈالا سو ان پر ہمارا عذاب رات کے وقت آیا یا (جبکہ) وہ دوپہر کو سو رہے تھے

تشریح: بسا اوقات انسان اپنی معاشی خوشحالی اور دنیاوی عزو جاہ کی وجہ سے یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ زندگی جو راستہ اس نے اختیار کر رکھا ہے وہی راہ راست ہے اور اس کا آفتاب اقبال اسی طرح ہمیشہ درخشاں رہے گا اس لیے وہ کسی رہنما کی دعوت کو غور سے سننا ہی گوارا نہیں کرتا۔ یہی حالت مکہ کے سرداروں اور دولت مندوں کی تھی۔ وہ اپنے جاہ وجلال اور عزت وو قار پر اتنے مطمئن تھے کہ وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیغام کی طرف متوجہ ہونا ہی غیر ضروری سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان آیات میں ان کی چشم ہوش سے غفلت کا پردہ اٹھانے کے لیے سابقہ قوموں کے عبرت ناک انجام کا ذکر فرماتے ہیں کہ تمہاری طرح وہ بھی دنیا کی فنا پذیر لذتوں میں محو تھے اور ہمارے انبیاء کی دعوت پر غور و فکر تک کرنا اپنے لیے کسر شان سمجھتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے ہدایت قبول کرنے سے پیہم انکار کیا تو ایسے لمحوں میں اللہ تعالیٰ کا عذاب ان پر نازل ہوا۔ جب کہ وہ خواب راحت کے مزے لوٹ رہے تھے۔ ان کی خبر تک نہ ہوئی اور ان کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ اس لیے اے اہل مکہ اس ڈھیل پر مت غرور کرو۔ مہلت کی گھڑیوں کو غنیمت جانو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں بھی ایسے ہول ناک انجام سے دوچار ہونا پڑے۔ کم خبر یہ ہے اور کثرت کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ فجاء ھا میں "فا" ترتیب کے لیے نہیں بلکہ محض عطف کے لیے ہے۔ فقال الفراء الفاء بمعنی الواو فلا یلزم الترتیب (قرطبیؒ) اور علامہ بیضاوی نے اہلکنا کا معنی کیا ہے اردنا اہلاک اہلہا یعنی جب ہم نے ان کے ہلاک کرنے کا ارادہ کیا تو ان پر عذاب بھیجا۔ اس حالت میں "فاء" اپنے معنی پر رہے گی اور بعض علماء نے اسے فاء تفصیلیہ بتایا ہے یعنی ہلاکت کی تفصیل کا بیان ہے کہ بعض قوموں پر رات کو عذاب نازل ہوا جیسے قوم لوط اور بعض پر دوپہر کے وقت جب وہ قیلولہ کر رہے تھے جیسے حضرت شعیب کی قوم پر۔ قیلولہ کہتے ہیں دوپہر کے وقت سونا یا صرف آرام کرنا۔ وہی نوم نصف النہار و قیل الاستراحۃ نصف النہار اذا اشتد الحرون لم یکن معہا نوم۔ (قرطبیؒ و ضیاء القرآن

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کے کفر ' مشرکوں کے شرک اور ان کی بد کرداریوں کا انجام بیان کیا ہے اور ساتھ ہی اس بات کا بھی ذکر فرمایا ہے کہ تم محض اس کو ایک نصیحت سمجھ کر نظر انداز نہ کر دینا تمہارے رب کا یہ مستقل قانون رہا ہے کہ جب بھی لوگوں نے اللہ کے رسول کی دعوت کو قبول کرنے اور اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے سے انکار کیا ہے تو انھیں ہر چند سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن جب وہ اپنی ضد پر اڑے رہے تو پھر بالآخر اللہ کا عذاب ان پر ٹوٹا اور ان کو اس طرح تباہ کر دیا گیا ہے کہ وہ بعد کے آنے والوں کے لیے عبرت کا نمونہ بن گئے۔ پھر اس عذاب کی ہول ناکی کو بیان کرنے کے لیے فرمایا گیا کہ ہمارا عذاب کبھی رات کو آیا ' کبھی دن کو آیا۔ کوئی سا لمحہ بھی اس کے عذاب کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتا وہ جب چاہے کسی نافرمان قوم کو رات کو پکڑ

لیتا ہے اور سوتے میں فنا کر دیتا ہے اور جب چاہے تو دن دہاڑے اس کا عذاب آتا ہے اور کوئی اسے روکنے والا نہیں ہوتا۔ اس میں قاء لون کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ قیلولہ سے ہے۔ ہمارے یہاں یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ قیلولہ کا معنی دوپہر کو سونا ہے حالانکہ سونا اس کے لوازم میں سے نہیں ہے بلکہ اس کا معنی دوپہر کو آرام کرنا ہے۔ عرب کا ملک چونکہ گرم ملک ہے اس وجہ سے وہاں دوپہر میں لوگ مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے اپنے مقاموں ' ڈیروں ' خیموں اور باغوں میں دوپہر کو آرام کریں یہاں اس کا ذکر صرف اس لحاظ سے کیا جارہا ہے کہ جس طرح رات کو سونے والوں پر عذاب آتا ہے اسی طرح دن دہاڑے جاگنے والوں اور خوش گپیاں کرنے والوں اور دوپہر کو آرام کرنے والوں پر بھی آتا ہے۔ بگڑے ہوئے لوگوں کی چونکہ راتیں جاگتی ہیں اور عموماً دن سویا کرتے ہیں۔ شاید اس کی طرف بھی اشارہ کیا جارہا ہے کہ تم اپنی بدمستیوں اور نافرمانیوں میں کسی حال میں بھی اور کسی وقت بھی اللہ کے عذاب سے مامون نہیں ہو۔ اس نے تمہیں ایک مہلت عمل دے رکھی ہے وہ محض اپنی رحمت سے اس میں ڈھیل دیتا رہتا ہے کہ شاید تم اپنی بدکرداریوں سے توبہ کرکے راہ راست اختیار کرلو لیکن اگر تم نے اپنی روش ترک نہ کی تو اللہ کا یہ قانون ضرور حرکت میں آئے گا کہ تم اللہ کے عذاب کے شکار ہو جاؤ اور اگر تمہیں ہمارے رسول کی بار بار تنبیہات کے باوجود بھی یقین نہیں ہو رہا کہ تم پر اللہ کا عذاب آسکتا ہے تو تم اپنے گردوپیش میں پھیلی ہوئی ان بستیوں کو دیکھ لو جو اللہ کے عذاب سے تباہ ہو چکی ہیں۔ تم اپنے تجارتی اسفار میں ان بستیوں کے کھنڈرات سے گزرتے ہو اور پھر ان پر گزرنے والی قیامت کی تفصیلات سینہ بہ سینہ تم تک پہنچ چکی ہیں۔ تمہارے عام افراد بھی ان کی تاریخ سے واقف ہیں اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ جس طرح تم پر اللہ کا رسول آیا ہے اسی طرح ان قوموں کی طرف بھی ان کی ہدایت کے لیے اللہ کی طرف سے رسول آئے تھے اور پھر جب انھوں نے وہی رویہ اختیار کیا جو تم اختیار کر چکے ہو تو پھر ان پر اللہ کا عذاب آیا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ جس طرح آج تمہارے عجب اور تکبر کا عالم یہ ہے کہ تم اللہ کے رسول کی دعوت پر کان دھرنے کے لیے تیار نہیں ہو بلکہ تم اللہ کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ نہایت ذلت آمیز رویہ اختیار کرنے سے بھی جھجھکتی نہیں ہو۔ لیکن جب اللہ کا عذاب آتا ہے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم جیسے بگڑے ہوئے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس وقت عذاب سے بچنے کے لیے اپنے جرائم کا بار بار اعتراف کیا جاتا ہے اور دہائی دی جاتی ہے کہ یا اللہ ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے اپنی زندگیوں میں بہت ظلم کیا ہم نے خود اپنے آپ پر بھی ظلم ڈھایا کہ ہمیں بار بار ہدایت کی جاتی رہی لیکن ہم نے ہمیشہ اس سے اعراض کیا۔ اگر ہمیں موقع دیا جائے تو ہم اپنی اصلاح کرنے کو تیار ہیں لیکن اللہ کا عذاب جب آتا ہے تو پھر وہ اس آہ وزاری پر بھی رکتا نہیں۔ عذاب کا شکار لوگ ہزار منت سماجت کریں اور رونے دھونے سے بیشک آسمان سر پر اٹھا لیں لیکن ان کی آہ وزاری پر اس لیے توجہ نہیں فرمائی جاتی کہ چونکہ تم نے اللہ کے رسول کی دعوت پر توجہ نہیں کی تھی آج تمہاری گریہ وزاری پر کوئی توجہ نہیں کی جائے گی۔ اس لیے یہاں بتایا جارہا ہے کہ جن معذب قوموں کے تم کھنڈرات سے گزرتے ہو ان پر جب اللہ کا عذاب آیا تھا تو انھوں نے ہر چند اپنے گناہوں اور اپنے جرائم کا اعتراف کیا اور اللہ سے معافیاں مانگیں لیکن ان کی ایک نہ سنی گئی اور وہ فنا کر دیئے گئے تم بھی اسی صورت

حال سے دوچار ہونے والے ہو وہ وقت دور نہیں جب تمہاری یہ سب اکڑ فوں نکل جائے گی اس لیے اگر تم اپنی جان کے دشمن نہیں ہو گئے ہو اور تم نے اپنی نسلوں کو تباہ کرنے کا ارادہ نہیں کر لیا ہے تو آج اپنا رویہ بدلنے کی کوشش کرو۔ آج بدل جاؤ گے تو سب کچھ بچ جائے گا اور نہیں بدلو گے تو کل کو تمہارے آنسو بھی کام نہیں آئیں گے اور تم اپنے جرم کا اعتراف بھی کرو گے تو یہ اعتراف بھی تمہارے لیے سود مند نہیں ہو گا۔

اللہ کے رسول جس قوم کی طرف مبعوث ہوتے ہیں اسے بالعموم دو چیزوں سے ڈراتے ہیں ایک ان کی پاداش عمل میں اچانک آنے والے عذاب سے اور دوسرے قیامت کے دن اللہ کے سامنے جواب دہی سے اور اس کے نتیجے میں ملنے والی سزا سے چنانچہ یہاں تک ذکر اس عذاب کا ہوا ہے جو کسی وقت بھی قریش مکہ یا مشرکین مکہ پر آسکتا ہے اور اس طرح کے عذاب پہلے کئی قوموں پر آچکے ہیں جو اصلًا اس بات کی خبر دیتے ہیں کہ یہاں انسان خودرو گھاس کی طرح پیدا نہیں ہوا کہ پاؤں سے مل دل کے ختم ہو جائے بلکہ اس کا ایک آقا ہے جس نے اسے ایک مقصد زندگی دے کر دنیا میں بھیجا ہے یہ جب تک اس مقصد زندگی کے مطابق اجتماعی ذمہ داریوں کو ادا کرتا ہے تو وہ دنیا میں ہر لحاظ سے پھلتا پھولتا اور آسودگی سے زندگی گزارتا ہے لیکن جب وہ اللہ کے احکام سے اجتماعی طور پر انکار کرنے لگتا ہے اور پھر اس کا انکار اللہ کے خاص قانون کی حدود سے ٹکرانے لگتا ہے اور اللہ کی مشیت کی برداشت سے آگے بڑھ جاتا ہے تو پھر اس پر اللہ کے عذاب کی گرفت آتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تک قومیں انفرادی بداعمالیوں کا شکار رہتی ہیں لیکن اجتماعی طور پر اللہ کی حدود کو پامال نہیں کرتیں یا اجتماعی طور پر اللہ کے رسول اور اس کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار نہیں کرتیں تو اللہ ایسی قوموں کو برداشت کرتا ہے اور ان کا معاملہ صرف آخرت پر چھوڑتا ہے لیکن جب وہ اجتماعی زندگی میں حد سے آگے بڑھ جاتی ہیں تو پھر اس کائنات کا حقیقی شہنشاہ ان نام نہاد زمین کے باسیوں اور اس کے حکمرانوں پر عذاب کے ذریعے گرفت کرتا ہے اور انھیں دنیا سے مٹا کر اپنی زمین ان سے بہتر لوگوں کے حوالے کر دیتا ہے اور پھر وہ ایک مدت تک آزمائش کے ترازو میں تلتے رہتے ہیں۔ شاید یہی وہ بات ہے جس کا اقبال مرحوم نے ذکر کیا ہے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے

مگر کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

چنانچہ ان آیات میں اب تک قرآن کریم اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قریش مکہ کو اللہ کے اس عذاب سے ڈرایا اور پہلے جو قومیں اس عذاب کا شکار ہو چکی ہیں ان کی تاریخ کے حوالے سے انھیں یقین دلانے کی کوشش کی)

(تفسیر روح القرآن۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم نے کتنی ہی بستیوں کو ہلاک کر دیا، پس ان پر ہمارا عذاب (اچانک) رات کے وقت آیا یا جس وقت وہ دوپہر کو سو رہے تھے۔

مشکل الفاظ کے معانی اور آیات سابقہ سے مناسبت : " باس " علامہ محمد طاہر پٹنی متوفی 986ھ نے لکھا ہے کہ باس کا معنی ہے خوف شدید اور جنگ میں شدت۔ (مجمع بحار الانوار، ج 1 ص 144 ۔ 145، مطبوعہ مکتبہ دار الامان المدینہ المنورہ، 1415ھ) اور سب سے زیادہ خوف نزول عذاب کے وقت ہوگا۔ اور علامہ راغب اصفہانی متوفی 502ھ نے لکھا ہے کہ باس کا معنی عذاب بھی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے " واللہ اشد باسا واشد تنکیلا : اور اللہ کی گرفت بہت مضبوط ہے اور اللہ کا عذاب بہت سخت ہے " (النساء : 84)۔ (المفردات ص 66 مطبوعدہ مکتبہ مرتضویہ 1362ھ)

بیاتا او ھم قائلون : بیت کے معنی ہیں رات کا وقت اور قیلولہ کا معنی ہے دوپہر کا وقت۔ حدیث میں ہے انہ کان لایبیت مالا ولا یقبلہ۔ یعنی جب آپ کے پاس مال آتا تو آپ اس کو رات تک روکتے نہ دوپہر تک۔ اگر صبح مال آتا تو دوپہر سے پہلے اس کو تقسیم کر دیتے اور اگر دوپہر کے بعد مال آتا تو اس کو رات آنے سے پہلے تقسیم کر دیتے۔ (الفائق ج 1 ص 127 طبع بیروت، النہایہ ج 1 ص 170، طبع ایران، مجمع بحار الانوار، طبع مدینہ منورہ)

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو احکام شرعیہ کی تبلیغ کرنے اور عذاب الٰہی سے ڈرانے کا حکم دیا تھا اور لوگوں کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے احکام کو قبول کرنے اور آپ کی پیروی کرنے کا حکم دیا تھا اور اس آیت میں ان کو وعید سنائی ہے کہ پچھلی امتوں میں سے جن لوگوں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی اور ان کے پیغام کو قبول نہیں کیا ان پر اچانک اللہ کا عذاب آگیا بعض پر رات کے وقت اور بعض پر دوپہر کو آرام کے وقت میں۔

ایک اشکال کا جواب : اس آیت میں فرمایا ہے اور ہم نے کتنی ہی بستیوں کو ہلاک کر دیا پس ان پر ہمارا عذاب (اچانک) رات کے وقت آیا یا جس وقت وہ دوپہر کو سو رہے تھے، اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس آیت کا بظاہر معنی یہ ہے کہ پہلے ان بستیوں کو ہلاک کر دیا اور پھر ان پر عذاب آیا۔ حالانکہ ان پر عذاب نازل کرنا ہی ان کی ہلاکت تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں عبارت میں ایک لفظ محذوف ہے اور مراد یہ ہے کہ ہم نے کتنی ہی بستیوں کو ہلاک کرنے کا حکم دیا یا ان کو ہلاک کرنے کا ارادہ کیا۔ پس ان پر ہمارا عذاب آیا۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے : " یا ایہا الذین امنوا اذا قمتم الی الصلوۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق : اے ایمان والو جب نماز کے لیے کھڑے ہو تو اپنے چہروں کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھو لو " (المائدہ : 6)۔

حالانکہ چہروں اور ہاتھوں کو نماز کے لیے قیامت کے وقت نہیں اس سے پہلے دھویا جاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بھی ایک لفظ محذوف ہے اور مراد یہ ہے کہ اے ایمان والو ! جب تم نماز کے لیے کھڑے ہونے کا ارادہ کرو تو اپنے چہروں کو اور کہنیوں سمیت اپنے ہاتھوں کو دھو لو۔

) تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ:

فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝۵

لغۃ القرآن: فَمَا : تو کیا ہے] [كَانَ : ہے] [دَعْوٰىهُمْ : ان کی پکار] [اِذْ : جب] [جَآءَهُمْ : آیا ان کے پاس] [بَاْسُنَآ : ہمارا عذاب] [اِلَّآ : مگر] [اَنْ : کہ] [قَالُوْٓا : سب نے کہا] [اِنَّا : بیشک ہم] [كُنَّا : ہم ہوجائیں گے] [ظٰلِمِيْنَ : سب ظالم]

ترجمہ: پھر جب ان پر ہمارا عذاب آگیا تو ان کی پکار سوائے اس کے (کچھ) نہ تھی کہ وہ کہنے لگے کہ بیشک ہم ظالم تھے

تشریح: گزشتہ امتوں میں سے جب کسی پر عذاب آتا تو اسے دیکھ کر وہ لوگ ضرور ایمان لاتے، جیسے فرعون نے ڈوبتے ہوئے کہا: اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِيْلَ۔ میں ایمان لاتا ہوں کہ وہی معبود واحد ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں (یونس 90) مگر عذاب کے اترنے کے بعد کسی قوم کا ایمان لانا انھیں فائدہ نہ دے سکا کیونکہ فرشتہ موت کے دیکھ لینے کے بعد ایمان قبول نہیں کیا جاتا۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ کے ہاں ایمان بالغیب یعنی بن دیکھے ماننے کا اعتبار ہے جب فرشتے نظر آگئے اور عالم غیب دیکھ لیا تو پھر اللہ اور رسول پر ایمان لانا تو نہ ہوا یہ تو اپنی آنکھوں پہ ایمان لانا ہوا۔ (برہان القرآن۔علامہ قاری محمد طیب)

نزول عذاب کے وقت معذبین کا اعتراف جرم:

ابن جریر کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ جس بستی کو ہم نے ہلاک کیا جب ان پر ہماری پکڑ رات کو یا دوپہر کو آئی تو وہ پکار رہے تھے کہ انہوں نے اپنے نفوس کے ساتھ برا کیا ہے اور اپنے رب کے متعلقات گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں اور اس کے امر و نہی کی مخالفت کی ہے۔

(دَعْوٰىهُمْ) : اس مقام پر ان کی پکار مراد ہے۔ دعوی دو معنوں میں آتا ہے۔ 1۔ دعا۔ 2۔ حق بات کا دعوی کرنا۔ دعا کا معنی اس آیت میں ہے: "فمازالت تلک دعواہم" اور شاعر نے بھی اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔

وَاِنْ نَزَلَتْ رِجْلِي دَعَوْتُكَ اِشْتَفِي ۔۔۔ بِدَعْوَاكَ مِنْ مَذَلٍّ بِهَا فَيَهُوْنُ

(ترجمہ: اگر میرا پاؤں پھسلا تو تیری اس دعا نے مجھے شفاء دی کہ پھسلنے والا کون ہے پس وہ مجھ پر آسان ہوا)

ہم "الباس، الباساء، الشدۃ" کا معنی پہلے شواہد کے ساتھ ذکر کر آئے۔ اس آیت میں اس بات پر واضح دلالت ہے جو جناب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت میں آیا ہے اس وقت تک کوئی قوم ہلاک نہیں ہوتی جب تک وہ کثرت سے گناہ نہیں کرتی۔ آیت کی تفسیر اسی طرح کی گئی ہے۔

ہمیں ابن حمید نے حضرت عبداللہ (رض) سے نقل کیا کہ جناب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کوئی قوم اس وقت تک ہلاک نہیں ہوتی جب تک وہ کثرت سے جرائم اور گناہ نہیں کرتی، ابو سنان راوی کہتے ہیں میں نے عبدالملک سے کہا یہ کیسے ہوتا ہے۔ تو اس نے یہ آیت پڑھ دی۔ "فماکان دعواھم اذ جاء ھم باسنا۔۔"

سوال: "فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ" یہ کس طرح فرمایا ان کو اس طرح پکارنا کیسے ممکن ہوا حالانکہ ان پر ہلاکت والا عذاب آچکا؟ کیا انہوں نے ہلاکت سے قبل یہ کہا؟ اگر قبل از ہلاکت کہا تو پھر انہوں نے عذاب کی آمد سے پہلے کہا حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کے متعلق بتلارہے ہیں کہ انہوں نے اس وقت کہا جب وہ عذاب آگیا اس سے پہلے نہیں کہا؟ یا عذاب آنے کے بعد کہا، یہ وہ حالت ہے جس نے ان کی ہلاکت ہوئی تو پھر یہ ان کے متعلق کس طرح کہنا درست ہے۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا معائنہ کرلیا اور رسولوں کی بات کی حقیقت کو جان لیا؟

الجواب : تمام امتوں کی ہلاکت ایک لمحہ میں نہیں ہوئی کہ ان کے اول وآخر میں کوئی فاصلہ نہ ہو بلکہ ان میں بعض طوفان سے غرق ہوئے اور ان عذابوں کے اسباب کے ابتدائی ظہور سے ان کو معلوم ہو گیا کہ وہ اس عذاب سے ہلاک ہوں گے اور آخری سبب کے ظہور سے تمام کی ہلاکت عام ہو گئ۔ اول وآخر کے مابین مدت ہلاکت میں فاصلہ مخفی نہیں بعض کو علامات ظاہر کر کے تین دن کی مہلت دی گئ جیسا قوم صالح اور ان کے ہم مثل اس وقت جب انہوں نے رسولوں کے بتلائے ہوئے عذاب کی ابتدا کا معائنہ کیا تو ان کو یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب اب ان پر ٹوٹ کر رہے گا اس وقت پکارنے لگے ہائے ہماری ہلاکت ہم تو ظالم تھے اب جب کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ان کے آنگن میں اتر پڑا اس وقت کا ایمان ان کے لیے نفع بخش نہ رہا اس سے درحقیقت اللہ تعالیٰ نے اپنی سطوت وعذاب سے مشرکین کو ان کے کفر اور تکذیب رسالت پر ڈرایا اور اس سے ڈرایا جو رسولوں کی نافرمانی کے نتیجہ میں پہلی امتوں پر اترا جبکہ انہوں نے رسولوں کی بجائے ظالم حکمرانوں کی پیروی کی۔

(تفسیر طبری۔ابی جعفر محمد بن جریر طبری)

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی 310ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں : حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : کوئی قوم اس وقت تک عذاب سے ہلاک نہیں ہوئی جب تک کے انھوں نے خود اس عذاب کا عذر بیان نہیں کیا۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے عبدالملک سے پوچھا یہ کس طرح ہو سکتا ہے تو انھوں نے یہ آیت پڑھی : جب ان پر ہمارا عذاب آیا تو اس وقت ان کی یہی چیخ و پکار تھی کہ بیشک ہم ہی ظالم تھے۔

(الاعراف : 5)۔(جامع البیان ج 8 ص 158۔دار الفکر، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج 5 ص 1439، 1438، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز)

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نافرمانی اور آپ کی مخالفت کرنا دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب کا سبب ہے۔ جب ایسے لوگ غفلت اور لہو ولعب میں مشغول ہوتے ہیں تو ان پر اچانک عذاب آجاتا ہے۔ ہر سرکش مجرم پر جب دنیا میں عذاب آتا ہے تو وہ اپنے جرم کا اعتراف کرلیتا ہے اور اس پر نادم ہوتا ہے۔ گزشتہ امتوں کی نافرمانی اور ان پر اچانک عذاب کے نزول کے واقعات کو بیان کرکے اس امت کو تنبیہ کرنا مقصود ہے۔ تاکہ وہ اپنے گناہوں سے باز آجائیں اور اپنی اصلاح کرلیں اور اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ کفار پر عذاب نازل کرنا اللہ تعالیٰ کا عین عدل ہے۔

(تفسیر تبیان القرآن۔علامہ غلام رسول سعیدی)

اب ذرا دیکھئے کہ دنیا کے عذاب کا منظر نظروں کے سامنے ہے ' جھٹلانے والے عذاب الٰہی کی گرفت میں ہیں اور وہ اعتراف کر رہے ہیں کہ بیشک وہ ظالم تھے ' حق ان کے سامنے واضح ہو جاتا ہے اور وہ حق کا اعتراف بھی کرلیتے ہیں لیکن اب یہ اعتراف ان کے لیے مفید مطلب نہیں ہے۔ یہ عذاب اب ندامت اور اعتراف کی وجہ سے نہیں ٹل سکتا ' نہ اب توبہ مفید ہے اس لیے کہ توبہ وندامت کا وقت چلا گیا ہے اور توبہ کا دروازہ بند ہے۔

یہ منظر ابھی چل رہا ہے اور دنیا کی سطح پر وہ عذاب الٰہی سے کچلے جارہے ہیں ' کہ اچانک دیکھنے والے اپنے آپ کو میدان حشر میں پاتے ہیں ' کوئی وقفہ درمیان میں نہیں ہے۔ سیاق کلام ایک ریل پر چل رہا ہے جو جڑی ہوئی ہے اور منظر کے بعد منظر سامنے آتا ہے۔ زمان ومکان کی طنابیں کھنچ جاتی ہیں اور دنیا وآخرت باہم مل جاتے ہیں۔ عذاب دنیا ابھی ختم نہیں ہوا کہ آخرت کا عذاب شروع ہو جاتا ہے۔ اچانک دوسرا منظر سامنے ہے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن۔ سید قطب شاہ)

آیت مبارکہ: فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

لغۃ القرآن: فَلَنَسْـَٔلَنَّ: تو البتہ ضرور ھم پوچھیں گے][الَّذِيْنَ: وہ لوگ جو][اُرْسِلَ: بھیجے گئے][اِلَيْهِمْ: انکی طرف][وَلَنَسْـَٔلَنَّ: اور البتہ ضرور ھم پوچھیں گے][الْمُرْسَلِيْنَ: پیغمبروں]

ترجمہ: پھر ہم ان لوگوں سے ضرور پرسش کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور ہم یقیناً رسولوں سے بھی (ان کی دعوت و تبلیغ کے ردِّ عمل کی نسبت) دریافت کریں گے

تشریح: قوم کس قدر بھی اکھڑ مزاج ہو اور تباہی کے گڑھے پر کھڑی ہو اسے آخر وقت تک سمجھانا۔ انبیاء (علیہ السلام) کی سنت ہے کیونکہ ہر نبی سے اپنی امت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ جس طرح نبی سے اس کی امت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اسی طرح امت سے سوال ہو گا کہ اس نے اپنے نبی کی دعوت کا کیا جواب دیا۔ چنانچہ قیامت کے دن تمام انبیاء (علیہ السلام) وقت مقررہ کے مطابق اپنی اپنی امت کو لے کر عدالت کبریا میں حاضر ہوں گے سب سے پہلے حضرت نوح (علیہ السلام) رب کی بارگاہ میں پیش ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہر فرد کے سامنے اس کا اعمال نامہ پیش فرمائیں گے۔ جس میں ایک بات بھی حقیقت کے خلاف نہ ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر بات پر حاوی ہے۔ (فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

قیامت کے دن رسولوں اور ان کی امتوں سے سوالات:

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا کہ رسولوں کی مخالفت کرنے کی وجہ سے دنیا میں اچانک عذاب آجاتا ہے۔ اب اس آیت میں فرمایا ہے کہ ان سے ان کی بد اعمالیوں پر مواخذہ ہو گا۔ اور آخرت میں اللہ تعالیٰ ہر شخص سے سوال کرے گا خواہ وہ نیک ہو یا بد۔ اللہ تعالیٰ امتوں سے ان کے اعمال کے متعلق سوال کرے گا اور یہ کہ ان کی طرف جو رسول بھیجے گئے تھے، انھوں نے ان کو تبلیغ فرمائی تھی یا نہیں اور انھوں نے رسولوں کی تبلیغ کا کیا جواب دیا تھا۔ اور رسولوں سے بھی ان کی تبلیغ کے متعلق سوال کرے گا اور یہ کہ ان کی امتوں نے ان کی تبلیغ کا کیا جواب دیا تھا انجام کار ان کی امت ایمان لائی یا نہیں! اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی دیگر آیات میں بھی اس مضمون کو بیان فرمایا ہے: "ویوم ینادیھم فیقول ماذا اجبتم المرسلین: اور جس دن اللہ ان کو ندا فرما کر ارشاد فرمائے گا تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا؟" (القصص:65)۔ "فوربک لنسئلنھم اجمعین۔ عما کانوا یعملوان: سو آپ کے رب کی قسم ہم ان سب سے ضرور سوال کریں گے۔ ان تمام کاموں کے متعلق جو وہ کرتے تھے" (النحل:92-93)۔ ان آیتوں میں امتوں سے سوال کے متعلق ارشاد ہے۔ اور

رسولوں سے سوال کا ذکر اس آیت میں ہے: "یوم یجمع اللہ الرسل فیقول ماذا اجبتم قالو الا علم لنا انک انت علام الغیوب: جس دن اللہ رسولوں کو جمع فرمائے گا، پھر فرمائے گا تم کو کیا جواب دیا گیا؟ وہ کہیں گے ہم کو کچھ علم نہیں، بیشک تو ہی سب غیبوں کا جاننے والا ہے" (المائدہ:109)۔

اور اس حدیث میں بھی رسولوں سے سوال کے متعلق اشارہ ہے: امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256ھ روایت کرتے ہیں: حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم میں سے ہر شخص محافظ اور مصلح ہے اور تم میں سے ہر شخص سے اس کے ماتحت لوگوں کے متعلق سوال ہو گا۔ امام محافظ اور مصلح ہے اور اس سے اس کی رعایا (عوام) کے متعلق سوال ہو گا۔ ایک شخص اپنے اھل کا محافظ اور مصلح ہے اور اس سے اس کے اھل کے متعلق سوال ہو گا۔ اور عورت اپنے خاوند کے گھر کی محافظہ اور مصلحہ ہے اور اس سے اس گھر کی حفاظت اور اصلاح کے متعلق سوال ہو گا۔ خادم اپنے مالک کے مال کا محافظ ہے اور اس سے اس کے مال کے متعلق سوال ہو گا اور ایک شخص اپنے باپ کے مال کا محافظ اور مصلح ہے اور اس سے اس مال کے متعلق سوال ہو گا۔ اور تم میں سے ہر شخص محافظ اور مصلح اور اس سے اپنے زیر انتظام اور زیر حفاظت چیزوں اور لوگوں کے متعلق سوال ہو گا۔ (صحیح البخاری، ج 1 رقم الحدیث 893، ج3 رقم الحدیث: 2558۔ 2751 ج5، رقم الحدیث 5188۔ 51200 ج7 رقم الحدیث 7138، صحیح مسلم الامارۃ: 20 (829) 4643۔ سنن الترمزی، ج3، رقم الحدیث: 1711۔ سنن ابوداود، ج3، رقم الحدیث: 2928، مسند احمد، ج2 ص 111 طبع قدیم)

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی 310ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابن عباس (رض) نے اس آیت (الاعراف :6) کی تفسیر میں فرمایا: اللہ تعالیٰ لوگوں سے سوال کرے گا کہ انھوں نے رسولوں کو کیا جواب دیا اور رسولوں سے ان کی، کی ہوئی تبلیغ کے متعلق سوال کرے گا۔ (جامع البیان، جز8، ص 159، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415ھ)۔

امام ابو عیسی محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی 279ھ روایت کرتے ہیں: حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کوئی ابن آدم اس وقت تک اپنے رب کے سامنے سے قدم نہیں ہٹا سکے گا جب تک اللہ تعالیٰ اس سے پانچ چیزوں کے متعلق سوال نہ کرے۔ اس نے اپنی عمر کن کاموں میں فنا کی، اس نے اپنی جوانی کن کاموں میں گزاری، اس نے اپنا مال کہاں سے حاصل کیا اور کن کاموں میں خرچ کیا اور اس نے جو علم حاصل کیا تھا، اس کے مطابق کیا عمل کیا؟ (سنن الترمذی، (سنن الترمذی، ج4، رقم الحدیث 2424، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1414ھ)

قیامت کے دن مجرموں سے سوال کرنے اور سوال نہ کرنے کے محامل: ان آیات سے یہ معلوم ہوا کہ فارسے ان کے اعمال کے متعلق سوال کیاجائے گا لیکن قرآن مجید کی بعض آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار سے سوال نہیں کیاجائے گا: "فیو مئذ لایسئل عن ذنبہ انس ولا جان: سواس دن کسی گناہ گار کے گناہوں کے متعلق کسی انسان اور جن سے سوال نہیں کیاجائے گا" (الرحمن:39)۔ "ولایسئل عن ذنوبہم المجرمون: اور مجرموں سے ان کے گناہوں کے متعلق سوال نہیں کیاجائے گا" (القصص:78)۔

امام رازی نے اس سوال کے متعدد جوابات دیے ہیں۔

1۔ لوگوں سے ان کے اعمال کے متعلق سوال نہیں کیاجائے گا۔ کیونکہ کراماً کاتبین نے ان کے تمام اعمال لکھے ہوئے ہیں اور وہ ان کے صحائف اعمال میں محفوظ ہیں لیکن ان سے یہ سوال کیاجائے گا کہ ان کے ان اعمال کا داعیہ، باعثہ اور محرک کیا تھا، جس کی وجہ سے انھوں نے اعمال کیے۔

2۔ کبھی سوال لاعلمی کی بناپر علم کے حصول کے لیے کیاجاتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں محال ہے اور کبھی سوال زجر و توبیخ اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے کیاجاتا ہے جیسے کوئی شخص کہے میں نے تم پر اتنے احسانات کیے تھے پھر تم نے میرے ساتھ یہ دغابازی اور فراڈ کیوں کیا؟ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "الم نجعل لہ عینین۔ ولساناو شفتین۔ وھدیناہ النجدین۔ فلا اقتحم العقبۃ: کیاہم نے انسان کی دو آنکھیں نہیں بنائیں۔ اور زبان اور دو ہونٹ۔ اور ہم نے اس کو (نیکی اور بدی کے) دونوں واضح راستے دکھادیے۔ تو وہ (نیک عمل کی) دشوار گھاٹی میں سے کیوں نہیں گزرا" (البلد:8۔11)۔

اور ان آیتوں میں سوال کرنے کا یہی معنی مراد ہے

3۔ قیامت کا دن بہت طویل ہو گا اور اس میں بندوں کے مختلف احوال اور معاملات ہوں گے۔ کسی وقت میں اللہ تعالیٰ سوال نہیں فرمائے گا اور کسی دوسرے وقت میں سوال فرمائے جیسے کسی وقت میں شفاعت نہیں ہو گی اور کسی وقت میں شفاعت ہو گی۔ اور کسی وقت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں ہو گا اور کسی وقت میں اس کا دیدار ہو گا۔

اس آیت کے آخر میں فرمایا ہے: "ہم غائب تو نہ تھے "یعنی ہم ان کے کاموں کو دیکھ رہے ہیں، ان کی باتوں کو سن رہے ہیں اور ہم کو معلوم ہے کہ وہ کیا چھپاتے ہیں اور کیا ظاہر کرتے ہیں اور ہم قیامت کے دن ان کے تمام کاموں کی خبر دیں گے، خواہ وہ کام کم ہوں یا زیادہ۔ وہ معمولی ہوں یا غیر معمولی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وماتسقط من ورقۃ الا یعلمہا ولا حبۃ فی ظلمت الارض ولا رطب ولا یابس الا فی کتب مبین: اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اس کو جانتا ہے اور نہ کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں ہوتا ہے اور نہ کوئی خشک وتر مگر وہ روشن کتاب میں مرقوم ہے" (الانعام:59) (تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

(توضرور ہم) قیامت کے دن (سوال کرینگے ان سے، جن کی طرف رسول روانہ (کئے گئے) تاکہ وہ پیغام رسالت کو قبول کریں اور رسولوں پر ایمان لائیں۔۔ یہ سوال بھی ملامت اور عذاب کے طور پر ہو گا۔۔ (اور) یونہی (ضرور ہم پوچھیں گے رسولوں سے) کہ کیا تم نے فریضہ ءرسالت ادا کر دیا تھا اور حکم پہنچا دیا ہے۔

ان سے یہ سوال سرفرازی اور تکریم کیلئے ہو گا، تاکہ ان کے جواب سے اہل محشر پر ان کی فضلیت و عظمت ظاہر کر دی جائے۔۔ یا یہ کہ۔۔ امتوں سے یہ سوال ہو گا، کہ کیا تم نے انبیاء کرام کی فرمان برداری کی تھی اور انبیاء سے یہ استفسار ہو گا، کہ کیا تم نے امت پر مہربانی کی تھی۔ لیکن وہ ایسا وقت ہو گا کہ خوف وہیبت کی وجہ سے امتی لوگ کچھ نہ بول سکیں گے۔۔ نیز۔۔ انبیاء کرام ادب ولحاظ کر کے خاموش رہیں گے۔۔ تو۔۔ (ضرور ہم خود ہی بتادینگے اپنے علم سے) کہ ہر ایک نے کیا کیا ہے اور ان کا کہنا سننا کیا تھا۔

(اور) ہماری شان تو یہ ہے، کہ (ہم تو کہیں سے غائب نہیں)۔۔ الغرض۔۔ نہ ہم ان سے دور تھے، نہ ان سے غائب، اور نہ ہی ان کے افعال واقوال سے بے خبر۔ قیامت کا دن عدل وانصاف کے ظہور کا دن ہے۔۔۔

(اور عمل کی تول اس دن) بالکل (ٹھیک ہے) جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

'عمل کی تول' سے مراد یہ ہے 'کہ اس دن واضح کر دیا جائے گا، کہ راجح عمل کون ہے؟ اور کمزور کون ہے؟ اور ان میں کھرا کون ہے اور کھوٹا کون ہے؟۔۔۔

(توجس کا وزن بھاری ہوا، وہی کامیاب ہیں)۔۔ الغرض۔۔ جس کے اعمال بھاری ہوں گے، یعنی وہ نیکیاں جو تولی جائینگی اگر جھل ہو نگی، تو ان نیکیوں کو انجام دینے والا کامیاب و سرفراز ہو گا۔ (تفسیر اشرفی۔ علامہ محمد مدنی میاں اشرفی)

یہاں علماء نے فرمایاہے کہ یہ سوال وجواب ہمارے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق نہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾" (1)

اور آپ سے جہنمیوں کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔

اور نہ کوئی بد باطن کافر یہ کہہ سکے گا کہ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تبلیغ نہیں فرمائی۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

آیت مبارکہ:

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۞

لغۃ القرآن: فَلَنَقُصَّنَّ : پھر البتہ ضرور ہم بیان کریں گے] [عَلَيْهِمْ : ان پر] [بِعِلْمٍ : کسی علم کے ساتھ] [وَمَا : اور نہ] [كُنَّا : ہم ہوجائیں گے] [غَآئِبِيْنَ : سب غائب]

ترجمہ: پھر ہم ان پر (اپنے) علم سے (ان کے سب) حالات بیان کریں گے اور ہم (کہیں) غائب نہ تھے (کہ انھیں دیکھتے نہ ہوں)

تشریح: اس آیت میں شبہ کا ازالہ کر دیا گیا جو شاید کسی کے دل میں پیدا ہو کہ کیا اللہ تعالیٰ کو ان باتوں کا علم نہ تھا کہ ان کے متعلق پوچھنا شروع کر دیا۔ بتایا کہ ہمارے علم سے تو کوئی چیز مخفی نہیں اور ہمارا علم محیط ہر لمحہ ان کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے تھا۔ اس پرسش میں حکمت یہ ہے کہ خود ان کی زبان سے ان باتوں کو منوالیا جائے۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری)

اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ حاضر ہے کوئی چیز اس کے علم سے پوشیدہ نہیں ہے اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نے تمام امتوں پر ان کے احوال ظاہر کر دے گا کہ انھوں نے انبیاء کرام (علیہم السلام) کی تعلیمات کو کس حدتک قبول کیا۔ (تفسیر امداد الکرم)

اس آیت کا یہی مطلب ہے۔ **والوزن یومئذ الحق**۔ اور اس دن تول ضروری ہونی ہے۔ یعنی عمل تولے جائیں گے اور راجح و مرجوح کا فرق کیا جائے گا اس طرح کہ اللہ تعالیٰ ایک میزان قائم فرمائے گا جس کا ہر ایک پلہ اتنی وسعت رکھے گا کہ تمام کائنات اس میں آجائے اور اس کی حقیقت وہی جانتا ہے۔ ابن جوزی (رح) کہتے ہیں کہ حدیث میں ہے کہ حضرت داؤد (علیہ السلام) نے بارگاہ الٰہی میں میزان دیکھنے کی درخواست کی جب میزان دکھائی گئی اور آپ نے اس کے پلڑوں کی وسعت دیکھی تو عرض کیا الٰہی کس کا مقدور ہے اس کے پلڑے کو نیکیوں سے بھر سکے۔ ارشاد ہوا اے داؤد میں جب اپنے بندوں سے راضی ہوتا ہوں تو اس میزان کا پلڑا ایک کھجور سے بھر دیتا ہوں یعنی تھوڑی نیکی بھی مقبول ہو جائے تو فضل الٰہی سے اتنی بڑھ جاتی ہے کہ میزان کو بھر دے۔ (ملخص از رواح المعانی)

انصاف کا تقاضا اور شہادت کی اہمیت:۔ یعنی کسی قوم پر ایسا عذاب آنا اس کے جرائم کی مکمل سزا نہیں ہوتی بلکہ اس کی مثال ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کسی عادی مجرم کو گرفتار کر لیا جائے تاکہ آئندہ اس کے ظلم سے لوگ محفوظ رہیں بالفاظ دیگر اس قوم کے مظالم دوسری اقوام کو بھی متاثر نہ کرنے لگیں۔ پھر ایسے مجرموں پر اللہ تعالیٰ کی عدالت میں باقاعدہ مقدمہ پیش ہوگا۔ ایک فریق تو رسول ہوں گے جو ان

کی طرف بھیجے گئے تھے اور دوسرا فریق یہ مجرم قوم ہو گی، دونوں کی شہادتیں ہوں گی، رسول کی شہادت یہ ہو گی کہ یا اللہ میں نے اس قوم کو تیرا پیغام پہنچا دیا تھا۔ مگر چونکہ قوم کو سزا کا خوف ہو گا اس لیے اسے رسول کی شہادت کے خلاف شہادت دینے کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آئے گا پھر اللہ تعالیٰ ان پر پوری حقیقت حال واضح فرمائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ سے تو کسی وقت بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں تھی مگر اللہ تعالیٰ کی اس وضاحت کے باوجود ان پر فرد جرم عائد نہیں کی جائے گی بلکہ ان کے ان اعضاء و جوارح کو اللہ تعالیٰ زبان عطا کریں گے جن سے اس جرم کے دوران کام لیے گئے تھے وہ ان مجرموں کے خلاف شہادت دیں گے پھر جب شہادت کے نصاب کی تکمیل ہو جائے گی تو اس وقت ان پر فرد جرم عائد ہو جائے گی اور انھیں سزا دی جائے گی جیسا کہ قرآن کی بعض دوسری آیات میں یہ وضاحت موجود ہے۔

مندرجہ بالا تصریحات سے ضمناً چند باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ دنیا میں بیشمار مجرم ایسے ہیں جو ظلم و ستم کرتے رہتے ہیں مگر کسی قسم کی سزا پائے بغیر وہ اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کا تقاضا یہ ہے کہ ان مجرموں کو سزا ضرور ملنی چاہیے اور علی رؤس الشہادات ملنی چاہیے تاکہ کسی کو اس کے جرم کی سزا نہ زیادہ ملے اور نہ اس پر ظلم ہو اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو ایک دوسری زندگی ملے جس میں ایسے تمام تر مقدمات کے فیصلے ہوں۔

فیصلہ کرنے کے لیے شہادت ضروری ہے:۔ اور دوسری بات یہ مستنبط ہوتی ہے کہ قاضی محض اپنے علم کی بناپر مقدمے کا فیصلہ نہیں دے سکتا بلکہ فیصلہ اور سزا شہادتوں کی بناپر ہی دیئے جاسکتے ہیں اور اس کی دلیل یہ واقعہ ہے کہ دور نبوی میں مدینہ میں ایک فاحشہ عورت رہتی تھی لوگوں کی اس کے ہاں آمد و رفت کی وجہ سے اس کی فحاشی کھل کر سامنے آچکی تھی اور زبان زد عام تھی اس کے متعلق ایک دفعہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ "اگر شہادتوں کا نصاب اور نظام نہ ہوتا تو میں اس عورت کو رجم کر دیتا۔"

(بخاری۔ کتاب الطلاق۔ باب لو کنت راجما بغیر بیّنۃ۔۔) (تفسیر تیسیر القرآن۔ مولانا عبد الرحمٰن کیلانی)

اس آیت میں اس بات کی وضاحت کر دی کہ کسی نالائق کے دل میں یہ سوال پیدا نہ ہو کہ اللہ کو ان باتوں کا علم نہ تھا کہ ان سے پوچھنا شروع کر دیا۔ فرمایا کہ ہمارے علم سے تو کوئی چیز پوشیدہ نہیں اور ہمارا علم ہر لحہ پر محیط ہے۔ اس پرسش میں حکمت یہ ہے کہ خود ان کی زبان سے ان باتوں کو منوالیا جائے اور یہ بھی دیکھا جائے کہ ایسے نازک وقت میں قوموں کے لوگ حقیقت بتاتے ہیں یا جھوٹ کے عادی۔ اس جگہ بھی جھوٹ بولتے ہیں اور رسولوں سے سوال کرنے میں یہ حکمت ہے کہ اس مقدمہ کا ایک فریق وہ بھی ہیں اور برابری اور عدل کا تقاضا ہے کہ باتیں دونوں طرف سے پوچھی جائیں تاکہ ایک فریق کو یہ اعتراض پیدا ہی نہ ہو کہ ہم سے شہادت طلب کی گئی لیکن دوسرے فریق کو پوچھا تک نہیں گیا۔ فرمایا ہم دونوں فریقوں کی داستان کی کیسٹ ان کو سنوا دیں گے جس سے بات خود بخود صاف

ہو جائے گی کہ رسولوں نے اس طرح وحدت پیش کی اور جھٹلانے والوں نے اس طرح ان کو جواب دیا بلکہ ان کے سامنے پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا جائے گا وہ اس طرح کہ یہ رسول اپنی امت کو اس طرح کہہ رہا ہے اور یہ اس کی امت اس کو اس طرح جواب دے رہی ہے تا کہ کسی کے انکار کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ (تفسیر عروۃ الوثقیٰ۔ عبد الکریم اثری)

یعنی قیامت کے دن ہم اپنے علم کی بنیاد پر لوگوں کو ان تمام اعمال کا حال سنائیں گے جو وہ دنیا میں کرتے تھے۔ جب وہ عمل کر رہے تھے تو ہم اس وقت غائب نہیں تھے، ہم ان کو دیکھ رہے تھے، ان کے تمام اعمال ہمارے علم میں تھے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: (وَلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ۭ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ)[یونس:٦١]"اور نہ تم کوئی عمل کرتے ہو، مگر ہم تم پر شاہد ہوتے ہیں، جب تم اس میں مشغول ہوتے ہو اور تیرے رب سے کوئی ذرہ برابر (چیز) نہ زمین میں غائب ہوتی ہے اور نہ آسمان میں اور نہ اس سے کوئی چھوٹی چیز ہے اور نہ بڑی مگر ایک واضح کتاب میں موجود ہے۔" اور فرمایا: (يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ)[المجادلۃ:٦،٧]"جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا، پھر انھیں بتائے گا جو انھوں نے کیا۔ اللہ نے اسے محفوظ رکھا اور وہ اسے بھول گئے اور اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بیشک اللہ جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ کوئی تین آدمیوں کی کوئی سرگوشی نہیں ہوتی مگر وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اور نہ کوئی پانچ آدمیوں کی مگر وہ ان کا چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم ہوتے ہیں اور نہ زیادہ مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے، جہاں بھی ہوں، پھر وہ انھیں قیامت کے دن بتائے گا جو کچھ انھوں نے کیا۔ یقیناً اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔"

وَّمَا كُنَّا غَاۗىِٕبِيْنَ: سیدنا ابو موسیٰ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم کسی سفر میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ تھے تو ہم جب کسی وادی پر چڑھتے تو "لا الہ الا اللہ" اور "اللہ اکبر" کہتے اور اپنی آواز کو بلند کرتے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اے لوگو! اپنی جانوں پر رحم کرو، تم نہ کسی بہرے کو پکار رہے ہو اور نہ غائب کو، وہ تو تمہارے ساتھ ہے، سننے والا ہے اور قریب ہے۔" [بخاری، کتاب الجھاد، باب مایکرہ من رفع الصوت فی التکبیر: ٢٩٩٢۔ مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب استحباب خفض الصوت بالذکر: ٢٧٠٤] (تفسیر دعوۃ القرآن۔ ابو نعمان سیف اللہ خالد)

آیت مبارکہ:

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ⑧

لغۃ القرآن: وَالْوَزْنُ : اور وزن] [يَوْمَئِذٍ : اس دن] [الْحَقُّ : حق] [فَمَنْ : پھر جس نے] [ثَقُلَتْ : بھاری ہوگئے] [مَوَازِيْنُهٗ : اس کے پلڑے] [فَ اُولٰٓئِكَ : تو وہی لوگ] [هُمُ : وہ] [الْمُفْلِحُوْنَ : سب کامیاب ہونے والے ہیں]

ترجمہ: اور اس دن (اعمال کا) تولا جانا حق ہے، سو جن کے (نیکیوں کے) پلڑے بھاری ہوں گے تو وہی لوگ کامیاب ہوں گے

تشریح:

مشکل الفاظ کے معانی اور آیت سابقہ سے مناسبت :

" وزن " علامہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ وزن کا معنی ہے کسی چیز کی مقدار کی معرفت حاصل کرنا۔ اور عرف عام میں ترازو سے کسی چیز کے تولنے کو وزن کرنا کہتے ہیں۔ (المفردات، ص 523، مطبوعہ ایران، 362ھ)۔

علامہ جار اللہ زمخشری متوفی 583ھ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس (رض) نے بیان کیا ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کھجور کے درخت پر لگی ہوئی کھجوروں کو فروخت کرنے سے منع فرمایا حتی کہ اس درخت سے کھجوروں کو کھایا جائے اور ان کا وزن کیا جائے۔ ان کے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص نے پوچھا وزن سے کیا مراد ہے ؟ فرمایا اس کی مقدار کا اندازہ کیا جائے۔ (الفائق ج 3، ص 358، مطبوعہ بیروت، 1417ھ، النہایہ، ج 5 ص 182، مطبوعہ ایران، 1367ھ، تاج العروس، ج 10، س 360، مطبوعہ مصر)۔

" میزان " علامہ زبیدی حنفی متوفی 1205ھ لکھتے ہیں : جس آلہ کے ساتھ چیزوں کا وزن کیا جائے اس کو میزان کہتے ہیں۔ زجاج نے کہا ہے کہ جو میزان قیامت میں ہوگی اس کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے۔ تفسیر میں ہے کہ وہ ایک ترازو ہے جس کے دو پلڑے ہیں۔ دنیا میں میزان اتاری گئی تاکہ لوگ عدل کے ساتھ باہم معاملہ کریں اور اس کے ساتھ اعمال کا وزن کیا جائے گا۔ (تاج العروس، ج 9، ص 361، مطبوعہ المطبعہ الخیریہ، مصر 1306ھ)۔

" موازین " یہ میزان کی جمع ہے۔ اس جگہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ قیامت کے دن میزان تو صرف ایک ہوگی۔ پھر یہاں جمع کا صیغہ کیوں لایا گیا ہے۔ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ موزون کی جمع ہے اور موزون متعدد ہوں گے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اھل عرب واحد پر بھی تعظیماً جمع کا اطلاق کردیتے ہیں اور تیسرا جواب یہ ہے کہ جو اعمال وزن اور حساب کے لائق ہیں ان کی تین قسمیں ہیں۔ افعال قلوب، افعال جوارح (ظاہری اعضاء کے افعال) اور اقوال اور ہوسکتا ہے کہ ان تینوں کے لیے الگ الگ میزان ہوں۔ ایک قول یہ ہے کہ وزن کرنے والوں کی اکثریت کے اعتبار سے میزان کو جمع کرکے لایا گیا ہے۔

اس سے پہلی آیت میں قیامت کے دن انبیاء کرام (علیہم السلام) اور ان کی امتوں سے سوال کرنے کا ذکر تھا اور یہ قیامت کے دن کا ایک حال ہے اور دوسرا حال میزان پر اقوال اور اعمال کا وزان کرنا ہوگا۔ سو اس آیت میں قیامت کے دن کا یہ دوسرا حال بیان فرمایا ہے۔

اعمال کے وزن کے متعلق مذاہب علماء :

مجاہد، ضحاک، اعمش اور بہ کثرت متاخرین کامذہب یہ ہے کہ قیامت کے اعمال کو وزن کرنے سے مراد عدل اور قضاء ہے۔ کیونکہ دنیامیں لین دین میں عدل کاذریعہ ترازو میں وزن کرنا ہے اور وزن کرنے کو عدل اور قضاء لازم ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جس شخص کے اعمال کا میزان میں وزن کیا جائے گا تو وہ اللہ کے عادل اور حکیم ہونے کا اقرار کرے گا یا نہیں۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے عادل اور حکیم ہونے کا اقرار کرے گا تو اس کے لیے میزان کی کوئی حاجت نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کی نیکیوں اور گناہوں کے متعلق جو بھی فیصلہ فرمائے گا، وہ اس کو تسلیم ہوگا اور اگر وہ شخص اللہ تعالیٰ کو عادل اور صادق نہیں مانتا تو پھر وہ نیکیوں اور گناہوں کے کیے ہوئے وزن کو بھی نہیں مانے گا تو پھر میزان میں اس کے کیے ہوئے وزن کا کوئی فائدہ نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب کسی نیک مسلمان کے اعمال کا وزن کیا جائے گا اور اس کی نیکیوں کا پلڑہ گناہوں کے پلڑے سے بھاری ہوگا تو اس مسلمان شخص اور اس کے دوستوں کو فرحت اور مسرت حاصل ہوگی اور تمام اہل محشر کے سامنے اس کے جنتی ہونے پر حجت قائم ہوگی۔ جو لوگ دنیامیں اس کو حقیر سمجھتے تھے، ان کے سامنے اس کی عزت و توقیر اور وجاہت ظاہر ہوگی اور وہ اپنے محبین کے سامنے سرخرو ہوگا اور یہ میزان کا بہت بڑا فائدہ ہے۔

(تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

اعمال کے وزن سے کیا مراد ہے؟ میزان کی شکل و صورت کیسی ہوگی؟ کس چیز کا وزن کیا جائے گا۔ اعمال کا یا ان صحائف کا جن میں اعمال مرقوم ہوں گے؟ ان سوالات کے متعلق کتب تفسیر میں لمبی چوڑی بحثیں کی گئی ہیں۔ فرقہ معتزلہ کی رائے یہ ہے کہ اعمال اعراض ہیں۔ ان کے مادی اور محسوس اجسام نہیں ہیں۔ اس لیے ان کا وزن کیا جانا ناممکن ہے۔ نیز جب اللہ تعالیٰ ہر شخص کے اچھے اور برے اعمال پر خوب آگاہ ہے تو پھر انھیں ترازو میں رکھ کر تولنا اور یہ دیکھنا کہ نیکی کا پلڑا جھکتا ہے یا برائی کا۔ یہ سب تکلف محض ہے۔ اس لیے وزن اعمال کا جہاں جہاں ذکر ہوا ہے معتزلہ کے نزدیک اس کا مطلب عدل و انصاف سے فیصلہ کرنا ہے لیکن علماء اہل سنت والجماعت نے ان کی اس رائے کو غلط اور فاسد قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ اگر اس طرح تاویلات کا دروازہ کھول دیا جائے تو پھر ہر چیز میں تاویل ہو سکتی ہے۔ شیاطین اور جنات سے مراد اخلاق مذمومہ، ملائکہ سے مراد صفات محمودہ اور صراط سے مراد دین حق لیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ سلف صالحین، صحابہ کرام اور تابعین نے اس قسم کی تاویلات کو ہرگز اختیار نہیں کیا۔ نیز اعمال کے تولنے کی غرض و غایت یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص کی نیکیاں اتنی ہیں اور برائیاں اتنی۔ جیسے معتزلہ نے سمجھا ہے۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ حقائق جو اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے موجود ہیں ان کو آشکارا کر دیا جائے۔ اور ہر خاص و عام کو اپنے اعمال کی حقیقت پر مطلع کر دیا جائے۔ ایسی پیچیدگیاں اور الجھنیں پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عالم غیب کی جن حقیقتوں سے ہم کو آگاہ کیا گیا ہے اور تقریب فہم کے لیے ان کو بعض ایسے عنوانوں سے تعبیر کیا گیا ہے جن سے ہم مانوس ہیں۔ تو ہم اپنے ذہنوں کی تنگ دامانی کے پیش نظر عالم غیب کے ان حقائق کو بھی ان محسوس قالبوں میں ڈھالنے لگتے ہیں جن کے ہم عادی ہیں۔ اور اس طرح قسم قسم کی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان امور کو صحیح طور پر سمجھنے کا یہی محفوظ طریقہ ہے کہ جتنا کچھ اس مخبر صادق (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں بتایا ہے صدق دل سے اس پر ایمان لے آئیں اور اس کی تفصیلات میں جانے کی کوشش نہ کریں۔ قرآن نے بتایا کہ اعمال کا وزن ہوگا اور اس کے لیے ترازو رکھا جائے گا۔ اور سنت صحیحہ نے بتایا کہ اس میزان کے دو پلڑے ہوں گے۔ ہم اس پر بے چون وچرا ایمان لے آئیں۔ وہ ترازو کیسا ہوگا۔ اس کے پلڑوں کی نوعیت کیا ہوگی۔ اور اعمال جو مجردات ہیں ان کو کیونکر تولا جائے گا اس کے علم کو اللہ اور اس کے رسول مکرم کی طرف تفویض کر دیں اور ان کی تفصیلات متعین کرنے میں اپنا وقت ضائع اور ذہن پریشان نہ کریں۔ اگر انسانی عقل نے آج حرارت اور روشنی کے درجات کو ناپنے، ہوا اور پانی کے دباؤ کا اندازہ کرنے کے لیے مقیاس اور آلات ایجاد کر لیے ہیں تو اس قادر مطلق کی قدرت کاملہ سے کیا بعید ہے کہ وہ ایسا ترازو پیدا فرما دے جس میں اعمال نیک و بد کو تولا جاسکے۔ والوزن یومئذ الحق کی ترکیب میں علماء کے دو قول ہیں۔ الوزن موصوف الحق صفت مبتداء اور یومئذ خبر۔ یا الوزن مبتداء اور الحق خبر میں نے ترجمہ میں اس دوسرے قول کو ہی اختیار کیا ہے۔

(تفسیر ضیاء القرآن:

پیر محمد کرم شاہ الازہری)

حضرت ابن عباس (رض)، جمہور صحابہ، تابعین اور علماء راسخین کامذہب یہ ہے کہ قیامت کے دن اعمال کا حقیقتاً وزن کیا جائے گا۔ مانعین کا اس پر اعتراض یہ ہے کہ اعمال از قبیل اعراض ہیں اور وزن اجسام کا کیا جاتا ہے، اعراض کا نہیں کیا جاتا۔ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اعراض کے مقابلہ میں اجسام

پیدا فرمادے اور ان اجسام کا وزن کیا جائے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ نیک اعمال حسین اجسام میں متمثل کر دیے جائیں گے اور بد اعمال قبیح اجسام میں متشکل کر دیئے جائیں گے اور ان کا وزن کیا جائے گا۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ نفس اعمال کا وزن نہیں کیا جائے گا بلکہ صحائف اعمال کا وزن کیا جائے گا۔ موخر الذکر دونوں جوابوں کے متعلق احادیث ہیں، جن کا ہم عنقریب ذکر کر رہے ہیں۔ (تفسیر کبیر ج 5 ص 203۔204 مع التلخیص والتوضیح، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت، 1415 ھ)

قرآن مجید سے میزان کے ثبوت پر دلائل :

" ونضع الموازین القسط لیوم القیامۃ فلا تظلم نفس شیئا وان کان مثقال حبۃ من خردل اتینا بہا وکفی بنا حاسبین : اور قیامت کے دن ہم انصاف کی میزان رکھیں گے سو جن کی میزان کے (نیکی کے) پلڑے بھاری ہوئے وہی فلاح پانے والے ہوں گے۔ اور جن کی میزان کے (نیکی کے) پلڑے ہلکے ہوئے تو یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی جانوں کو نقصان میں ڈالا، اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

" فاما من ثقلت موازینہ۔ فھو فی عیشۃ راضیۃ۔ واما من خفت موازینہ فامہ ھاویۃ : سو جس (کی نیکی) کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو اس کا ٹھکانا ہاویہ (دیکتی آگ کا گہرا گڑھا) ہو گا۔

احادیث اور آثار سے میزان کے ثبوت پر دلائل :

حضرت سلمان فارسی (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : قیامت کے دن میزان کو رکھا جائے گا، اگر اس میں آسمانوں اور زمینوں کو رکھا جائے تو وہ اس کی بھی گنجائش رکھتی ہے۔ پس فرشتے کہیں گے : اے رب اس میں کس کو وزن کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں اپنی مخلوق سے جس کو چاہوں گا، فرشتے کہیں گے تو پاک ہے ہم تیری اس طرح عبادت نہیں کرسکے جو تیری عبادت کا حق ہے (الحدیث) امام حاکم متوفی 405 ھ نے کہا ہے کہ یہ حدیث امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔ (المستدرک ج 4 ص 586، مطبوعہ دار الباز مکہ مکرمہ)

حافظ ذہبی متوفی 848 ھ نے امام حاکم کی موافقت کی ہے۔ (تلخیص المستدرک ج 4 ص 586، مطبوعہ دار الباز مکہ مکرمہ) امام عبداللہ بن المبارک متوفی 181 ھ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ (کتاب الزہد، رقم الحدیث، 1357، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت) امام ابوبکر محمد بن الحسین آجری متوفی 360 ھ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے (الشریعہ، ص 339، مطبوعہ دار السلام، ریاض)

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا : نیکیوں اور برائیوں کا میزان میں وزن کیا جائے گا۔ اس میزان کی ایک ڈنڈی اور دو پلڑے ہیں۔ رہا مومن تو اس کا عمل حسین صورت میں آئے گا اور اس کو میزان کے ایک پلڑے میں رکھا جائے گا تو اس کی نیکیوں کا پلڑا، برائیوں کے پلڑے کے مقابلہ میں بھاری ہوگا۔ (شعب الایمان ج 1 ص 264 رقم الحدیث : 284۔ الجامع لاحکام القرآن، جز 7، ص 151 مطبوعہ دار الفکر، بیروت 1415 ھ)

عبید اللہ بن عمیر نے کہا قیامت کے دن اقدام اس طرح ہوں گے جیسے ترکش میں تیر۔ خوش قسمت وہ شخص ہے جسے اپنے قدموں کے لیے جگہ مل جائے اور میزان کے پاس ایک فرشتہ ندا کرے گا، سنو فلاں بن فلاں (کی نیکیوں) کا پلڑا بھاری ہے، اس نے ایسی کامیابی حاصل کی ہے کہ پھر کبھی ناکام نہیں ہوگا۔ سنو فلاں بن فلاں (کی نیکیوں) کا پلڑا ہلکا ہے یہ ناکام ہوگیا ہے اس کے بعد کبھی کامیاب نہیں ہوگا (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج 5 ص 1441 مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ المکرومہ 1417ھ)

حضرت علی بن ابی طالب (رض) بیان کرتے ہیں کہ جس شخص کا ظاہر اس کے باطن سے یادہ راجح ہو قیامت کے دن میزان میں اس (کی نیکیوں) کا پلڑا ہلکا ہوگا اور جس شخص کا باطن اس کے ظاہر سے زیادہ راجح ہو قیامت کے دن میزان میں اس (کی نیکیوں) کا پلڑا بھاری ہوگا۔ (الدر المثور ج 3 ص 70 مطبوعہ ایران البدور السافرۃ رقم الحدیث 918)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ سول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دو لفظ زبان پر آسان ہیں اور میزان میں بھاری ہیں اور رحمٰن کو محبوب ہیں۔ سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔ (صحیح البخاری ج 7 رقم الحدیث 1406 رقم الحدیث 7563۔ صحیح مسلم، الذکر: 31 (2694)۔ سنن الترمذی ج 5 رقم الحدیث 3467، ج 2 رقم الحدیث 3806)

حضرت ابومالک اشعری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا وضو نصف ایمان ہے اور الحمد للہ میزان کو بھرلیتا ہے (صحیح مسلم الطہارۃ (223) سنن الترمذی ج 5 رقم الحدیث: 3517۔ سنن الدارمی ج رقم الحدیث: 653)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے تمام آسمانوں اور زمینوں اور جو کچھ انمیں ہے اور ان کے درمیان ہے، اور ان کے نیچے ہے۔ اگر تم ان کو لے کر آؤ اور اس کو میزان کے ایک پلڑے میں رکھ دو اور کلمہ شہادت کو دوسرے پلڑے میں رکھ دو تو وہ پہلے پلڑے سے بھاری ہوگا۔ (المعجم الکبیر ج 12 ص 254 رقم الحدیث: 13024، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میری امت میں سے ایک شخص کو قیامت کے دن تمام لوگوں کے سامنے بلایا جائے گا۔ اس کے (گناہوں کے) ننانوے رجسٹر کھولے جائیں گے ان میں سے ہر رجسٹر حد نظر تک ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم ان میں سے کسی چیز کا انکار کرتے ہو، وہ کہے گا نہیں! اے میرے رب! پھر فرمائے گا کیا میرے لکھنے والے فرشتوں نے تم پر کوئی زیادتی کی ہے؟ وہ کہے گا نہیں اے میرے رب! پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیوں نہیں میرے پاس تمہاری ایک نیکی ہے اور آج تم پر کوئی ظلم نہیں ہوگا پھر اس کے لیے ایک پرچی نکالی جائے گی جس پر لکھا ہوگا اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمد عبدہ ورسولہ وہ کہے گا اے میرے رب! یہ ایک پرچی اتنے بڑے رجسٹروں کے سامنے کیا وقعت رکھتی ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا بیشک تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ پھر ایک پلڑے میں یہ پرچی ہوگی اور دوسرے پلڑے میں وہ رجسٹر ہوں گے پھر ان رجسٹروں کا پلڑا ہلکا ہوگا اور اس پرچی کا پلڑا بھاری ہوگا اور اللہ کے نام کے مقابلہ میں کوئی چیز بھاری نہیں ہوسکتی۔ (سنن الترمذی ج 4 رقم الحدیث 2548۔ سنن ابن ماجہ ج 2 رقم الحدیث 4300۔ المستدرک ج 1 ص 529)

حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قیامت کے دن میزان کو قائم کیا جائے گا۔ پھر ایک شخص کو لایا جائے گا اور اس کے گناہوں کو ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے گا۔ وہ پلڑہ جھک جائے گا اور اس کو دوزخ میں بھیج دیا جائے گا۔ جب وہ پیٹھ موڑ کر جائے گا تو رحمٰن کے پاس سے اس کو ایک بلانے والا بلائے گا۔ جلدی نہ کرو، جلدی نہ کرو اس کی ایک نیکی باقی ہے۔ پھر کلمہ شہادت کی ایک پرچی لائی جائے اور اس آدمی کی نیکیوں کے پلڑے میں رکھ دی جائے گی اور اس سے میزان جھک جائے گی۔ (مسند احمد رقم الحدیث 7066۔ مجمع الزوائد، ج 10، ص 82)

حضرت ابوالدرداء (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اچھے اخلاق سے بڑھ کر میزان میں کوئی چیز بھاری نہیں ہے۔ (سنن ابوداؤد ج 4 رقم الحدیث 4799۔ سنن الترمذی ج 3، رقم الحدیث 2009۔ مسند احمد ج 10 رقم الحدیث 27587۔ صحیح ابن حبان، ج 2، رقم الحدیث 481، مصنف ابن ابی شیبہ، ج 8 ص 516۔ الادب المفرد، رقم الحدیث 270۔ مصنف عبدالرزاق، رقم الحدیث 20157۔ شرح السنہ ج 2 رقم الحدیث: 783۔ حلیۃ الاولیاء ج 5 ص 243۔ الشریعہ، رقم الحدیث: 864)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص نے اللہ پر ایمان اور اس کے وعدہ کی تصدیق کی وجہ سے اللہ کی راہ میں گھوڑے کو باندھا، اس گھوڑے کا چارہ، اس کا پانی اور اس کی لید اور اس کا پیشاب قیامت کے دن میزان میں وزن کیا جائے گا۔ (صحیح البخاری، ج 3، رقم الحدیث 2853، المستدرک، ج 2 ص 92۔ سنن کبری للبیہقی ج 10 ص 27۔ شرح السنہ رقم الحدیث 2648)

امام ابن المبارک متوفی 181 ھ نے حماد بن سلیمان سے روایت کی ہے کہ قیامت کے دن ایک شخص آئے گا۔ وہ اپنے نیک اعمال کو بہت کم جان رہا ہوگا۔ وہ اسی کیفیت میں ہوگا کہ بادل کی طرح ایک چیز آئے گی اور اس کی نیکیوں کے پلڑے میں جا گرے گی۔ اس سے کہا جائے گا یہ وہ چیز ہے جو تم لوگوں کو نیکیوں کی تعلیم دیتے

تھے۔ تمہارے بعد تمہاری تعلیم سے نیکیاں ظہور میں آئیں اور تم کو ان کا اجر دیا گیا۔ (کتاب الزہد لابن المبارک، رقم الحدیث 1384، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

حضرت عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: دو خصلتیں ایسی ہیں کہ جو مسلمان شخص بھی ان کی حفاظت کرے گا، وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ وہ دونوں آسان کام ہیں اور کم لوگ ان کو کرتے ہیں۔ (پہلی خصلت یہ ہے کہ) ہر نماز کے بعد دس مرتبہ سبحان اللہ کہے، دس مرتبہ الحمد للہ کہے، اور دس مرتبہ اللہ اکبر کہے۔ یہ زبان سے ڈیڑھ سو بار پڑھنا ہے اور میزان میں یہ ڈیڑھ ہزار نیکیاں ہیں (اور دوسری خصلت یہ ہے کہ) اور جب بستر پر جائے تو چونتیس مرتبہ اللہ اکبر کہے، اور تینتیس مرتبہ الحمد للہ کہے اور تینتیس مرتبہ سبحان اللہ کہے۔ یہ زبان سے ایک سو مرتبہ پڑھنا ہے اور میزان میں ایک ہزار نیکیاں ہیں تو بتاؤ تم میں سے کون شخص ایک دن رات میں ڈھائی ہزار نیکیاں کرتا ہے۔ (سنن ابو داؤد ج 4 رقم الحدیث 5065۔ سنن الترمذی ج 5 رقم الحدیث 3421۔ سنن ابن ماجہ ج 1 رقم الحدیث 926۔ سنن النسائی ج 3 رقم الحدیث 1347۔ مصنف عبدالرزاق ج 2 رقم الحدیث 3189)

آیا میزان میں صرف مسلمانوں کا وزن ہوگا یا کافروں کا بھی وزن ہوگا؟

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ آیا صرف مسلمانوں کے اعمال کا وزن کیا جائے گا یا کافروں کے اعمال کا بھی وزن کیا جائے گا۔ بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ صرف مسلمانوں کے اعمال کا وزن کیا جائے گا اور کافروں کے اعمال کا وزن نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ قرآن مجید میں ہے۔ "اولئک الذین کفروا بایت ربھم ولقائہ فحبطت اعمالھم فلانقیم لھم یوم القیمۃ وزنا: یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیتوں اور اس سے ملاقات کا انکار کیا سو ہم قیامت کے ان کے لیے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے" (الکہف: 105)۔

لیکن اس مسئلہ میں تحقیق یہ ہے کہ جن کافروں کو اللہ تعالیٰ جلد دوزخ میں ڈالنا چاہے گا ان کو بغیر وزن اعمال کے دوزخ میں ڈال دے گا اور بقیہ کافروں کے اعمال کا وزن کیا جائے گا جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے "ومن خفت موازینہ فاولئک الذین خسروا انفسھم فی جھنم خلدون: اور جن کی میزان کے پلڑے ہلکے ہوئے تو یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو نقصان میں ڈالا وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے" (المومنون: 103)

اسی طرح بعض مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ بغیر وزن اعمال اور بغیر حساب کے جنت میں داخل کردے گا۔ امام مسلم روایت کرتے ہیں: حضرت عمران بن حصین (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میری امت میں سے ستر ہزار جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے۔ صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو نہ دم کراتے ہوں گے، نہ بدشگونی نکالتے ہوں گے اور نہ جسم کو لوہے کے داغ سے جلاتے ہوں اور وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہوں گے۔

امام بخاری نے اس حدیث کو حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے اس حدیث کو حضرت ان عباس (رض) سے روایت کیا ہے۔ (صحیح مسلم، ایمان، 367) (216) 509، صحیح البخاری، 7 رقم الحدیث 1542، سنن الترمزی، ج 4 رقم الحدیث، 2454، مسند احمد، ج 1 ص 454،443،403، 271،401۔

امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی 360 ھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابن عباس (رض) نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: قیامت کے دن شہید کو لایا جائے گا اور اس کو حساب کے لیے کھڑا کیا جائے گا۔ پھر صدقہ دینے والے کو لایا جائے گا اور اس کو حساب کے لیے کھڑا کیا جائے گا۔ پھر مصیبت میں مبتلا شخص کو لایا جائے گا اس کے لیے میزان قائم کی جائے گی نہ اس کے اعمال کا رجسٹر کھولا جائے گا اور اس پر اتنا اجر وثواب انڈیل دیا جائے گا کہ عیش و آرام میں رہنے والے محشر میں یہ تمنا کریں گے کہ کاش دنیا میں ان کے جسموں کو قینچی سے کاٹ ڈالا جاتا اور ان کو بھی ایسا اجر وثواب مل جاتا۔ (المعجم الکبیر ج 12 رقم الحدیث 12829، حلیۃ الاولیاء ج 3 ص 91)۔

ان مسلمانوں کی مغفرت کی صورتیں جن کی نیکیاں گناہوں کے برابر یا گناہوں سے کم ہوں گی:

آیت 8 میں فرمایا ہے: پس جن (کی نیکیوں) کے پلڑے بھاری ہوئے تو وہی کامیاب ہیں۔اس آیت سے مراد مومن ہیں اور آیت 9 میں فرمایا ہے: اور جن (کی نیکیوں) کے پلڑے ہلکے ہوئے تو وہی اپنی جانوں کو نقصان میں ڈالنے والے ہیں کیونکہ وہ ہماری آیتوں پر ظلم کرتے تھے۔اس آیت سے کافر مراد ہیں۔ کیونکہ وہی اللہ کی آیتوں کا انکار کرکے ان پر ظلم کرتے تھے۔

ان آیتوں میں صالح اور نیک مسلمانوں کا ذکر فرمایا ہے جن کی نیکیوں کے پلڑے بھاری ہوں گے اور کافروں کا ذکر فرمایا ہے جن کی نیکیوں کے پلڑے ہلکے ہوں گے۔ اس آیت میں ان مسلمانوں کا ذکر نہیں ہے ج کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں اور نہ ان مسلمانوں کا ذکر ہے جن کی نیکیاں برائیوں سے کم ہوں، رہے وہ مسلمانجن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں تو وہ اعراف میں ہوں گے اور بعد میں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کو جنت میں داخل فرمادے گا اور رہے وہ مسلمان جن کے گناہ نیکیوں سے زیادہ ہوں تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل اور اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت سے جنت میں داخل فرمادے گا یا کچھ عذاب دے کر یا بغیر عذاب دیے ان کو محض اپنے فضل و کرم سے دوزخ سے نجات دے گا اور جنت میں داخل فرمادے گا۔

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت سے نجات کے متعلق یہ حدیث ہے امام مسلم روایت کرتے ہیں: حضرت ابوہیرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ہر نبی کی ایک مقبول دعا ہوتی ہے اور ہر نبی نے اس مقبول دعا کو دنیا ہی میں جلد خرچ کرلیا اور میں نے اپنی اس دعا کو قیامت کے دن اپنی امت کے لیے چھپا کر رکھا ہے اور یہ انشاء اللہ میری امت میں سے ہر اس شخص کو حاصل ہوگی جو اس حال میں فوت ہوا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ کیا ہو۔ (صحیح البخاری ج 7 رقم الحدیچ 6304۔ صحیح مسلم الایمان: 338 (199) 483۔ سنن الترمذی ج 5 رقم الحدیث 3613۔ سنن ابن ماجہ ج 2 رقم الحدیث 4307۔ موطا امام مالک، رقم الحدیث: 492، مسند احمد، ج 3، رقم الحدیث 10315۔ صحیح ابن حبان رقم الحدیث 6461۔ مصنف عبدالرزاق، رقم الحدیث 20864)

محض اپنے فضل سے عذاب دینے کے بعد دوزخ سے نجات دینے کے متعلق یہ حدیث ہے۔امام مسلم روایت کرتے ہیں: حضرت ابوسعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اہل جنت کو جن تمہیں داخل فرمائے گا اور اپنی رحمت سے جس کو چاہے گا، جنت میں داخل فرمائے گا اور اہل جہنم میں سے جس کو چاہے گا جہنم میں داخل کردے گا۔ پھر فرمائے گا دیکھو، جس کے دل میں رائی کے ایک دانہ کے برابر بھی ایمان ہو، اس کو جہنم سے نکال لو، پس وہ لوگ جہنم میں سے اس حال میں نکالے جائیں گے کہ ان کا جسم جل کر کوئلہ ہوچکا ہوگا۔ پھر ان کو آب حیات کی نہر میں ڈالا جائے گا اور وہ اس نہر میں سے اس طرح تروتازہ ہو کر نکلنا شروع ہوں گے جیسے دانہ پانی کے بہاؤ والی مٹی میں سے زردی مائل ہو کر اگ پڑتا ہے۔ (صحیح البخاری ج 1 رقم الحدیث: 22، ج 7، رقم الحدیث: 6560۔ صحیح مسلم، ایمان، 304 (184) 449)۔

اور محض اپنی رحمت سے بغیر عذاب دیے ہوئے جنت میں داخل کرنے کے متعلق یہ حدیث ہے۔امام مسلم روایت کرتے ہیں حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن مومن کو اپنے رب عزوجل کے قریب کی جائے گا حتی کہ اللہ اس کے اوپر اپنی رحمت کا پر رکھ دے گا اور اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کرائے گا اور فرمائے گا تم (اس گناہ کو) ہپانتے ہو؟ وہ کہے گا ہاں میرے رب میں پہچانتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے دنیا میں تم پر ستر کیا تھا (تمہارا پردہ رکھا تھا) اور آج میں تمہیں بخش دیتا ہوں۔ پھر اس کو اس کی نیکیوں کا اعمال نامہ دیا جائے گا اور رہے کافر اور منافق تو ان کو تمام لوگوں کے سامنے بلایا جائے گا اور کہا جائے گا یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا تھا۔ (صحیح البخاری، ج 3، رقم الحدیث: 2441۔ صحیح مسلم، التوبہ: 52، (2768) (6882)۔ السنن الکبریح 6، رقم الحدیث 1242، سنن ابن ماجہ، ج 1، رقم الحدیث: 183)

(تفسیر تبیان القرآن-علامہ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ:

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝

لغۃ القرآن: وَمَنْ : اور جو] [خَفَّتْ : ہلکے ہوگئے] [مَوَازِيْنُهٗ : اس کے پلڑے] [فَ اُولٰٓئِكَ : تو وہی لوگ] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [خَسِرُوْٓا : سب نے نقصان میں ڈال رکھا ہے] [اَنْفُسَهُمْ : اپنے نفسوں کو] [بِمَا : اس وجہ سے جو] [كَانُوْا : تھے سب] [بِاٰيٰتِنَا : ہماری آیات کو] [يَظْلِمُوْنَ : وہ سب ظلم کرتے]

ترجمہ: اور جن کے (نیکیوں کے) پلڑے ہلکے ہوں گے تو یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو نقصان پہنچایا، اس وجہ سے کہ وہ ہماری آیتوں کے ساتھ ظلم کرتے تھے

تشریح: انسان کو زمین پر بھیجتے وقت ہدایت کی گئی تھی کہ اب تیرا رہنا، مرنا اور محشر کے دن اٹھنا زمین سے ہی ہوگا۔ لہٰذا زمین ہی تیرا ٹھکانا اور اس میں تیرے لیے زینت کا سامان ہے۔ ہاں یاد رکھنا میری طرف سے تیری رہنمائی کے لیے احکام نازل ہوتے رہیں گے۔ جس نے اس رہنمائی کے مطابق زندگی بسر کی۔ اسے دنیا اور آخرت میں خوف وخطر نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر بسنے کے لیے وسائل اور کچھ اختیارات دیے ہیں تاکہ اسے آزمائے کہ وسائل کس طرح بروئے کار لاتا اور اپنے اختیارات کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔ وسائل اور اختیارات کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق استعمال کرنا گویا کہ اس کا شکر ادا کرنا ہے۔ لیکن لوگوں کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے اختیارات سے تجاوز اور اللہ کے دیے ہوئے وسائل کو غلط استعمال کرکے اس کے شکر گزار بندے بننے کے بجائے باغی اور نافرمان ثابت ہوتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا انسان کے لیے کھلا پیغام ہے کہ اپنے رب کا شکر ادا کرے گا تو وہ تجھے مزید عنایت فرمائے گا۔ شکر کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو اللہ کی تابع داری میں لگائے۔ اس کی دی ہوئی طاقت کو اس کے بندوں کی خدمت اور دین کی سربلندی پر صرف کرے اس کے دیے ہوئے مال کو غریبوں اور مسکینوں پر خرچ کرے۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

روز قیامت اعمال کا تولا جانا:

جب روز قیامت کی بات ہوئی تو اس پر مزید روشنی ڈالی جارہی ہے کہ اس دن اعمال کا تولا جانا برحق ہے چنانچہ جس کے اچھے اعمال بھاری نکلے اور گناہ ہلکے، وہ کامیاب ہوگیا۔ اور جس کے نیک اعمال اس کے گناہوں سے ہلکے یعنی کم رہے وہ نقصان میں چلا گیا اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کی آیات یعنی قرآن سے زیادتی کرتے تھے۔ بایں طور کہ اس پر ایمان نہ لاتے تھے یا اس پر عمل نہ کرتے تھے۔

یاد رہے روز قیامت ایک ترازو قائم کیا جائے گا۔ جسے میزان عدل کہتے ہیں۔ جس میں نیکیاں اور گناہ تولے جائیں گے جس کی نیکیاں اس کے گناہوں پر غالب آگئیں وہ جنت میں چلا گیا اور جس کے گناہ غالب آگئے وہ دوزخ میں چلا گیا۔ (درمنثور بروایت ابوالشیخ جلد 3 صفحہ 419)

روز قیامت اعمال کو کیسے تولا جائے گا؟

اگر کہا جائے کہ اعمال تو حرکات وسکنات کا نام ہے یہ کیسے تولے جائیں گے تو اس کا جواب یہ ہے کہ روز قیامت اعمال کے تولے جانے کی کئی صورتیں حدیث میں وارد ہوئی ہیں، مثلاً۔

1۔ حدیث مبارکہ میں ایک اشارہ یہ ہے کہ بعض اعمال کے لکھے ہوئے دفاتر تولے جائیں گے۔ جیسے ایک روایت کے مطابق گناہوں کی 99 فہرستوں کے مقابلے میں کلمہ طیبہ کی تحریر بھاری آئے گی چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) سے مروی ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

"روز قیامت میرے ایک امتی کے گناہوں کے 99 دفتر کھولے جائیں گے۔ ہر دفتر حد نظر تک طویل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس شخص سے کہے گا: کیا تم ان گناھوں میں سے کسی سے انکار کرتے ہو؟ وہ کہے گا: یا اللہ! نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تمہارے پاس کوئی نیکی ہے؟ وہ خوفزدہ ہو کر کہے گا: یا اللہ! نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ہاں! ہمارے پاس تمہاری ایک نیکی ہے اور آج تم پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ پھر ایک کاغذ کا ٹکڑا نکالا جائے گا جس پر لکھا ہوگا اشھد ان لا الہ الا اللہ اشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ۔ وہ عرض کرے گا یا اللہ اتنے بڑے دفتروں کے مقابلہ میں اس کاغذ کی کیا حیثیت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ پھر وہ سارے دفاتر ایک پلڑے

میں رکھے جائیں گے اور وہ کاغذ ایک پلڑے میں۔ فطاشت السجلات وثقلت البطاقۃ۔ تو وہ بڑے بڑے دفاتر اڑ جائیں گے اور کاغذ کا ٹکڑا بھاری ہو جائے گا۔" ابن ماجہ کتاب الزھد باب 35 حدیث 4300"۔

2۔ اور ایک اشارہ یہ ہے کہ جن چیزوں کے ذریعے اعمال کیے جاتے ہیں وہ بھی تولی جائیں گی چنانچہ حدیث طیبہ میں ہے کہ وضو کا جو پانی اعضا پر خشک ہو جائے پونچھا نہ جائے وہ نیکی والے پلڑے میں رکھا جائے گا۔ (ابن عساکر)

اور ایک روایت میں ہے کہ " شہید کا لہو اور علماء کے قلم کی سیاہی (جن سے وہ تفسیر و حدیث و فقہ لکھتے ہیں) تولی جائے گی تو علماء کی سیاہی خون شہدا سے بھاری نکلے گی "۔ (در منثور جلد 3 صفحہ 423)

اسی طرح یہ حدیث بھی ہے کہ "قربانی کا جانور اپنے سینگوں اور کھروں کے ساتھ نیکیوں والے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا"۔

حضرت ابوہریرہ (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے ایمان واخلاص کے ساتھ جہاد کے لیے گھوڑا تیار کیا روز قیامت وہ گھوڑا اپنے پانی اور اپنے پیشاب اور لید سمیت میزان میں رکھ دیا جائے گا (بخاری کتاب الجہاد حدیث 2853)

3۔ اور یہ اشارہ بھی ہے کہ روز قیامت اعمال کو مختلف جسمانی شکلیں دی جائے گی جیسے حدیث میں ہے کہ جس مال کی زکوۃ نہ دی گئی وہ گنجے سانپ کی شکل میں آئے گا اسی طرح دیگر اعمال کی جسمانی شکلیں مذکور ہوئی ہیں تو ممکن ہے بعض اعمال کو جسمانی شکلوں میں تولا جائے۔

تو چونکہ اعمال کا وزن کئی طرح ہوگا کبھی دفاتر کو تولا جائے گا اور کبھی اشیاء کو اور کبھی اعمال کی جسمانی شکلوں کو، اس لئے موازین جمع کا صیغہ لایا گیا اور ارشاد ہوا وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ۔ "ہم وزن کے پیمانے انصاف کے ساتھ رکھیں گے۔" (انبیاء 47)۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ میزان عدل میں ہر عمل کا وزن عامل کے اخلاص کے مطابق زیادہ یا کم ہوگا۔ لہٰذا اخلاص والی چھوٹی سی نیکی پہاڑوں سے بھی بہت وزنی ہو گی۔

اسی لیے حضرت ابوسعید خدری (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: } } میرے صحابہ کو برا نہ کہو کیوں کہ اگر تم احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرو تو وہ میرے کسی صحابی کے ایک مد (ساڑھے چار سیر) یا نصف مد جو خرچ کرنے کے برابر نہیں ہو سکتا "۔ بخاری کتاب فضائل اصحاب النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حدیث 3673) گویا صحابہ کرام (رض) کی ادنٰی نیکی میں خلوص وجذبہ کا وہ وزن ہے جو پوری امت کی پہاڑوں جیسی نیکیوں سے بھی زائد ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اپنی امت کے میزان کے وقت وہاں موجود ہونا:

یہ بھی یاد رہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی امت کے اعمال کے تولے جانے کے وقت وہاں موجود ہوں گے تاکہ اپنی امت کی مدد کر سکیں۔

حضرت انس بن مالک (رض) کہتے ہیں میں نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ آپ میرے لئے شفاعت فرمائیں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں شفاعت کروں گا۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں آپ کو روز قیامت کہاں ڈھونڈوں؟ آپ نے فرمایا تم مجھے سب سے قبل صراط پر ڈھونڈنا۔ میں نے عرض کیا اگر میں آپ سے صراط پر نہ مل سکوں تو؟ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا فاطلبنی علی المیزان: پھر تم مجھے میزان عدل پہ ڈھونڈنا۔ میں نے عرض کیا: اگر میں آپ کو میزان پر نہ پاؤں تو؟ آپ نے فرمایا فاطلبنی عند الحوض فانی لااخطی ھذہ الثلاثۃ المواضع، تب تم مجھے حوض کوثر پہ تلاش کرنا کیونکہ میں ان تینوں مقامات کے سوا کہیں نہیں ہوں گا"۔ (ترمذی کتاب صفۃ القیامۃ حدیث 2433) امام ترمذی نے اس حدیث کے بعد کہا یہ حدیث غریب ہے۔

(تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

ایک اور حدیث میں ہے جسے ابن ابی الدنیا اور نمیری کتاب الاعلام میں حضرت عبداللہ سے راوی ہیں فرماتے ہیں کہ بروز قیامت حضرت آدم صفی علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مقام مقرر ہوگا۔ عرش عظیم کی وسعت میں جو سبز رنگ کے دو ٹیلے ہوں گے گویا خرما کے دو درخت ہیں اس پر سے آپ اپنی اولاد کی آمد و رفت ملاحظہ کریں گے کہ کون جنت میں جا رہا ہے اور کون جہنم کو کہ آپ پکاریں گے۔ یا احمد یا احمد۔

تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جواب میں فرمائیں گے لبیک یا ابا البشر۔

تو حضرت آدم (علیہ السلام) فرمائیں گے یہ آدمی تو آپ کی امت سے ہے اسے جہنم کی طرف لے جایا جارہا ہے۔
تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ پھر میں کمر کس کر فرشتوں کے پیچھے لپکوں اور کہوں اے اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتو ٹھہرو تو وہ عرض کریں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم سختی سے پابند حکم ہیں جو حکم ہو اس کے خلاف نہیں کرتے لہٰذا ہم تو تعمیل حکم سے معذور ہیں۔ یہ جواب سن کر حضور مایوسانہ طور پر سیدھا ہاتھ لحیہ مبارک پر رکھ کر عرش کی طرف متوجہ ہوں اور بارگاہ الٰہی میں عرض کریں اے میرے رب تو نے مجھ سے یہ وعدہ کررکھا ہے کہ مجھے میری امت کے معاملہ میں غمگین نہ فرمائے گا کہ عرش کی طرف سے ندا آئے گی۔

اطیعوا محمد اور ردوا ھذا العبد الی المقام۔

اے فرشتو میرے محبوب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم کی پیروی کرو اور اس گناہ گار بندے کو اس کے مقام اول کی طرف لے جاؤ۔
پھر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک سپید کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نکالیں اور اسے میزان کے پلڑے میں داہنی طرف ڈال دیں۔ اور فرمائیں بسم اللہ تو وہ پلہ گناہوں کے پلے سے بھاری ہو جائے اور کوئی آواز دینے والا پکارے۔ سعد و سعد جدہ وثقلت موازینہ انطلقوا بہ الی الجنتہ۔
مبارک ہے اور اس کی کوشش بارآور ہوئی ہے اور اس کے اعمال حسنہ کا وزن بھاری ہو گیا لے جاؤ اسے جنت کی طرف۔
تو کہے اے میرے رب کے بھیجے ہوئے فرشتو! ذرا ٹھہرو تاکہ میں اس ذات اقدس سے معلوم کروں کہ یہ منصب عظمٰی بارگاہ حق میں انھیں کیونکر ملا۔ پھر وہ عرض کرے میرے ماں باپ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نثار کیا نورانی حسن اور کیا برگزیدہ خلق آپ نے پایا ہے آپ کون ہیں کہ میری تمام پریشانیاں ماند ہو گئیں اور آپ کی رحمت غالب آ گئی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرمائیں میں تیرا نبی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہوں اور یہ چھوٹا سا ورقہ وہ ہے جس میں تیری درود خوانی ہے۔ جو تو مجھ پر پڑھا کرتا تھا۔ آج میں نے اس کا بدلہ تجھے پورا دلوا دیا۔ تو حاجت مند تھا۔ اس حدیث میں اظہار کرامت مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ اولین وآخرین انبیاء پر عطا فرمائی۔

تعریف وزن اعمال و حقیقت میزان

اخرج ابن المبارک عن حماد بن ابی سلیمان بمعناہ۔ وقیل الوزن عبارۃ عن القضاء السوی والحکم العادل واستعمال لفظ الوزن فی ھذا المعنی شائع فی اللغۃ والعرف بطریق الکنایۃ وبہ قال مجاہد والاعمش والضحاک۔ آگے چل کر فرماتے ہیں اذ لا توصف بثقل ولا خفۃ سلمان امکان وزنھا لکن لا فائدۃ فی ذلک۔ اذ المقصود انما ھو العلم بتفاوت الاعمال واللہ تعالیٰ عالم بذلک۔ (روح المعانی) ترجمہ
ابن مبارک اور حماد بن ابی سلیمان رحمہم اللہ ہم معنی مضمون بیان فرماتے ہیں، چنانچہ کہا گیا ہے کہ وزن عبادت ہے برابر کے فیصلہ سے اور عادلانہ حکم سے لفظ وزن کا استعمال اس معنی میں لغتاً و عرفاً بطریق کنایہ ہے۔ یہی قول مجاہد (رح) کا ہے اور اسی طرف اعمش اور ضحاک رحمہم اللہ بھی ہیں آگے چل کر فرماتے ہیں۔ ثقل و خفت یہاں مراد نہیں بلکہ اس سے مقصود ہے تفاوت عمل معلوم کرلینا اور حقیقت کا اللہ ہی عالم ہے۔

(تفسیر الحسنات۔ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)

آیت مبارکہ:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ۧ۱۰

لغۃ القرآن: وَ : اور] [لَقَدْ : البتہ تحقیق] [مَكَّنّٰكُمْ : ہم نے ٹھکانا دیا تمہیں] [فِي الْاَرْضِ : زمین میں ہے] [وَ : اور] [جَعَلْنَا : ہم نے کردیا] [لَكُمْ : تمہارے لیے] [فِيْهَا : اس میں] [مَعَايِشَ : زندگی کے سامان] [قَلِيْلًا : بہت کم] [مَا : نہیں] [تَشْكُرُوْنَ : تم سب شکر ادا کرو]

ترجمہ: اور بیشک ہم نے تم کو زمین میں تمکّن و تصرّف عطا کیا اور ہم نے اس میں تمہارے لیے اسباب معیشت پیدا کیئے، تم بہت ہی کم شکر بجالاتے ہو

تشریح:

اپنے احسانات کا ذکر فرما کر اپنے بندوں کو شکر گزاری کی ترغیب دی جارہی ہے یعنی وہ ذات پاک جس نے تمہیں اس کرہ ارضی پر آمادہ کیا۔ اور مزید برآں اس میں روئیدگی کی وہ صلاحیتیں ودیعت فرمادیں کہ ضرورت کی ساری چیزیں اس سے اگتی ہیں۔ جابجا پانی کے چشمے ابل رہے ہیں۔ اس کے ان احسانات عظیمہ کے پیش نظر تو تم پر واجب تھا کہ تم اس کے احکام کی تعمیل میں ذرا سستی نہ کرتے لیکن یہ کتنی افسوس ناک بات ہے کہ تم پھر بھی ناشکری کرتے ہو۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری)

مشکل الفاظ کے معانی اور آیات سابقہ سے مناسبت :

ولقد مکنکم : یعنی اے بنو آدم ہم نے تمہارے لیے زمین کو مستقر بنایا اور زمین میں تمہیں جگہ دی، یا ہم نے تم کو زمین پر قبضہ دیا اور زمین میں تصرف کرنے کی قدرت دی۔

معایش : یہ معیشت کے جمع ہے۔ جن چیزوں سے زندگی بسر کی جاتی ہے۔ مثلاً کھانے پینے کی چیزیں۔ ان کو معیشت کہتے ہیں۔ علامہ طاہر پٹنی متوفی 986ھ نے لکھا ہے کہ جو چیزیں حیات کا آلہ ہیں، مثلاً زرعی پیداوار اور دودھ دینے والے جانوروں کے تھن ان کو معیشت کہتے ہیں۔ (مجمع بھار الانوار، ج 3 ص 719، مطبوعہ دار الایمان، مدینہ منورہ 1415ھ)

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء (علیہم السلام) کی دعوت کو قبول کرنے اور ان کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا تھا۔ اس کے بعد ان کی پیروی نہ کرنے پر ان کو دنیا کے عذاب سے ڈرایا۔ اور ہم نے کتنی ہی بستیوں کو ہلاک کر دیا۔ ان پر ہمارا عذاب اچانک رات کے وقت آیا یا جس وقت وہ دوپہر کو سو رہے تھے (الاعراف : 4) پھر ان کو آخرت کے عذاب اور مواخذہ سے ڈرایا پس ہم ان لوگوں سے ضرور بازپرس کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے (الاعراف : 6)۔ پھر فرمایا : پس جن (کی نیکیوں) کے پلڑے بھاری ہوئے تو وہی کامیاب ہیں۔ اور جن کی نیکیوں کے پلڑے ہلکے ہوئے تو وہی اپنی جانوں کو نقصان میں ڈالنے والے ہیں (الاعراف : 8-9) اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بندوں پر اپنی نعمتوں کو یاد دلایا ہے اور انھیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی ترغیب دی ہے تاکہ وہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرکے اس کا احسان مانیں اور اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی دعوت اور ان کے پیغام کو قبول کریں اور ان کی اطاعت اور اتباع کریں کیونکہ نعمتوں کی کثرت زیادہ اطاعت کو واجب کرتی ہے۔

معایش کی تفصیل :

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جو معایش (اسباب زیست) بنائے ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے کہ بعض معایش کو اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قدرت کاملہ سے پیدا کیا۔ مثلاً دریاؤں میں پانی پیدا کیا، آسمان سے بارش نازل فرمائی، پھلوں اور غلوں کو اگایا، حلال جانور پیدا کیے اور بعض اسباب زیست وہ ہیں جن کو انسان اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت سے اپنے اکتساب کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔ جیسے انسان تجارت اور محنت مزدوری کرکے رزق حاصل کرتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت یہ ہے کہ انسان زمین میں بستے ہیں اور اس میں تصرف کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی فہم و دانش اور قوت و توانائی سے ہر دور میں انسان کی فوز و فلاح، اس کی بہتری، سہولت اور مصلحت کے لیے نت نئے ذرائع اور وسائل تلاش کر رہے ہیں۔ پہلے انسان پتوں سے بدن ڈھانپتا تھا، پھر سوت اور ریشم کے لباس کا دور آیا اور اب انسان پٹرولیم سے بھی لباس بنانے لگا ہے۔ پہلے لکڑی اور کوئل سے آگ حاصل کرتا تھا، پھر قدرت گیس کا دور آیا۔ برقی توانائی کے بعد ایٹمی توانائی کا دور آیا۔ پہلے بری سفر، خچروں اور گھوڑوں سے اور بحری سفر بادبانی کشتیوں سے کیا جاتا تھا۔ پھر موٹر کاروں ریل گاڑیوں اور دخانی جہازوں کا دور آیا اور اب ہوائی جہازوں، ہیلی کاپٹروں اور راکٹوں کا دور ہے۔ بہت سی بیماریوں کا پہلے پتا نہ تھا لوگ ان میں مبتلا ہو کر مر جاتے تھے۔ اب ان بیماریوں اور ان کے علاج کا پتا چلا لیا گیا ہے۔ مثلاً ذیابیطس ہے، ہائی بلڈ پریشر ہے، دل اور دماغ کے پیچیدہ امراض ہیں۔ فالج ہے، دماغ کی رگ کا پھٹ جانا ہے۔ سرجری کا طریقہ ایجاد ہوا اور طب کی دنیا میں بہت سے لاینحل مسئلے حل ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے ان اسباب زیست اور ان سے فائدہ اٹھانے والی قوتوں کو انسان کی بہتری اور اس کی مصلحت کے لیے بنایا ہے اور یہ مادی فوائد اس لیے عطا کیے ہیں کہ ان کی مدد سے انسان روحانی حیات میں تزکیہ اور جلاء کو حاصل کرے اور اپنے باطن کو پاک اور صاف کرکے اپنے آپ کو اخروی نعمتوں کا اہل بنائے۔ سو انسان کو چاہیے کہ وہ ان نعمتوں کے نتیجے میں اپنے آپ کو گناہوں سے پاک رکھے اور ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا زیادہ سے زیادہ شکر ادا کرے۔

شکر کا لغوی اور اصطلاحی معنی :

علامہ سید محمد مرتضی زبیدی متوفی 1205ھ لکھتے ہیں : علامہ مجد الدین فیروز آبادی متوفی 897ھ نے قاموس میں لکھا ہے کہ شکر کا معنی ہے احسان کو پہچاننا اور اس کو بیان کرنا۔ اور علامہ فیروز آبادی نے بصائر میں لکھا ہے کہ شکر کی تین قسمیں ہیں۔

شکر بالقلب : یہ نعمت کا تصور کرنا ہے۔

شکر باللسان :

یہ نعمت دینے والے کی حمد و ثناء کرنا اور زبان سے تعظیم کرنا ہے اور

شکر بالجوارح :

یہ بہ قدر استحقاق، نعمت کے بدلہ میں کوئی نعمت دینا ہے (بعض علماء نے اس کی تعریف میں کہا یہ تعظیماً کھڑے ہونا، یا ہاتھوں اور پیروں کو بوسہ دینا ہے اور سجدہ کرنا ہے) نیز علامہ فیروز آبادی نے کہا کہ شکر پانچ بنیادوں پر مبنی ہے :

1۔ منعم کے سامنے شکر کرنے والے کا عجز و انکسار سے پیش آنا۔ 2۔ منعم سے محبت کرنا۔ 3۔ اس نعمت کا اعتراف کرنا۔ 4۔ اس نعمت پر منعم کی تعریف کرنا۔ 5۔ منعم کی نعمت کو اس کی ناپسندیدہ جگہ استعمال نہ کرنا۔

یہ پانچ امور شکر کی اساس اور بناء ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک امر بھی نہ ہو تو شکر ادا نہیں ہوگا۔ یہ پانچ امور شکر کا مرجع اور مدار ہیں۔

جنید بغدادی نے کہا : شکر یہ ہے کہ تم یہ گمان کرو کہ تم اس نعمت کے اہل نہ تھے۔ ابو عثمان نے کہا : شکر یہ ہے کہ تم یہ جان لو کہ تم منعم کا شکر ادا کرنے سے عاجز ہو۔ رویم نے کہا : شکر یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو منعم کی خدمت کے لیے فارغ کرلو۔ شبلی نے کہا : شکر یہ ہے کہ تم نعمت کو نہ دیکھو، نعمت دینے والے کو دیکھو۔ اس کا معنی یہ ہے کہ نعمت میں مشغول ہونے کی وجہ سے تم منعم سے غافل نہ ہو جاو۔ اور کمال شکر یہ ہے کہ بندہ نعمت اور معم دونوں کا مشاہدہ کرے۔ کیونکہ بندہ جس قدر زیادہ نعمت کا مشاہدہ کرے گا، اس قدر زیادہ شکر ادا کرے گا، اور اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتا ہے کہ اس کا بندہ اس کی نعمت کو دیکھے اور اس کا اعتراف کرے اور اس پر اس کی ثناء اور تعریف کرے، اور اس نعمت کی وجہ سے اللہ سے محبت رکھے۔ سوا اس کے کہ وہ نعمت فنا ہو جائے یا گم ہو جائے۔

علامہ فیروز آبادی نے کہا : علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ شکر اور حمد میں سے کون افضل ہے۔ حدیث میں ہے حمد شکر کی سردار ہے۔ جس شخص نے اللہ کی حمد نہیں کی، اس نے اللہ کا شکر ادا نہیں کیا۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ اقسام اور اسباب کے اعتبار سے شکر حمد سے عام ہے۔ (کیونکہ حمد صرف زبان سے ہوتی ہے اور شکر، زبان، دل اور اعضاء اور جوارح سے بھی ہوتا ہے) اور متعلق کے اعتبار سے شکر حمد سے خاص ہے۔ کیونکہ شکر صرف نعمت پر ادا کیا جاتا ہے جبکہ حمد میں یہ قید نہیں ہے۔ (وہ مطلقاً زبان سے کسی کی ثناء کرنے کو کہتے ہیں) مثلاً یہ نہیں کہا جائے گا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی حیات، اس کی سمع اور بصر اور اس کے علم پر اس کا شکر ادا کرتے ہیں بلکہ یوں کہا جائے گا کہ ہم ان اوصاف پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ کی نعمتوں پر ہم دل میں جو اس کی تعظیم کرتے ہیں یا سجدہ شکر بجالاتے ہیں، تو اس کو حمد نہیں کہا جائے گا۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اور ہم زبان سے جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کی ثناء اور تعریف کرتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی حمد بھی ہے اور اس کی شکر بھی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان میں عوم و خصوص من وجہ کی نسبت ہے۔

شکور کا معنی ہے بہت زیادہ شکر ادا کرنے والا۔ قرآن مجید میں حضرت نوح (علیہ السلام) کے متعلق ہے انہ کان عبدا شکورا (بنو اسرائیل : 3) یعنی وہ اپنے رب کا شکر ادا کرنے کے لیے اس کی بہت کوشش سے عبادت کرتے تھے، اور شکور اللہ تعالیٰ کی بھی صفت ہے۔ واللہ شکور حلیم (التغابن : 17) اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ بندوں کے

کم اعمال پر دگنا چوگنا بلکہ بہت زیادہ اجر عطافرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بندوں کا شکر کرتا ہے یعنی ان کو بخش دیتا ہے۔ اللہ کی طرف جب شکر کی نسبت ہو تو اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کا راضی ہونا اور ثواب عطافرمانا۔ (تاج العروس، ج 3، ص 312، مطبوعہ المطبعہ الخیریہ، مصر، 1306ھ)

علامہ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی متوفی 806ھ لکھتے ہیں: شکر کا لغوی معنی یہ ہے کسی نعمت پر زبان، دل یا دیگر اعضاء سے منعم کی تعظیم و تکریم کرنا۔ اور شکر کا اصطلاحی معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کو سمع، بصر اور دیگر نعمتیں جو عطا کی ہیں ان کو اپنے مقاصد تخلیق کے مطابق خرچ کرنا۔ (کتاب التعریفات، ص 65، مطبوعہ المطبعہ الخیریہ، مصر 1306ھ)

امام محمد بن غزالی متوفی 606ھ لکھتے ہیں: دل کا شکر یہ ہے کہ نعمت کے ساتھ خیر اور نیکی کا قصد کیا جائے اور زبان کا شکر یہ ہے کہ اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی جائے اور باقی اعضاء کا شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں خرچ کیا جائے، اور ان نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی معصیت میں صرف ہونے سے بچایا جائے۔ حتیٰ کہ آنکھوں کا شکر یہ ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ چیزوں کو دیکھے اور اس کی ناپسندیدہ چیزوں کو دیکھنے سے باز رہے۔ یعنی جن چیزوں کے دیکھنے میں اجر و ثواب ہے ان کو دیکھے اور جن چیزوں کا دیکھنا گناہ ہے ان کو دیکھے۔ علی ھذا القیاس۔ تمام اعضاء کا حکم ہے۔ (احیاء العلوم ج 3 ص 338، مطبوعہ دار الخیر، بیروت، 1413ھ)

شکر کے متعلق قرآن مجید کی آیات:

" واشکروالی ولاتکفرون: اور میرا شکرادا کرتے رہو، اور میری ناشکری نہ کرو" (البقرہ: 152)۔ " مایفعل اللہ بعذابکم ان شکرتم وامنتم وکان اللہ شاکراعلیما: اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکرادا کرو اور ایمان لے آؤ اور اللہ شکر کی جزا دینے والا اور جاننے والا ہے" (النساء: 147)۔ " وسنجزی الشاکرین: اور ہم عنقریب شکرادا کرنے والوں کو اچھی جزا دیں گے" (آل عمران: 145)۔ " اعملوا آل داؤد شکرا و قلیل من عبادی الشکور: اے آل داؤد! شکر بجالانے کے لیے نیک کام کرو، میرے بندوں میں شکرادا کرنے والے کم ہیں" (سبا: 13)۔ " لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید: اگر تم شکر کروگے تو میں تم کو یقینا اور زیادہ دوں گا اور اگر تم ناشکری کروگے تو بیشک میرا عذاب ضرور سخت ہے" (ابراہیم: 7)۔

شکرادا کرنے کے طریقوں کے متعلق احادیث:

ہم اس سے پہلے یہ بیان کرچکے ہیں کہ نعمت ملنے پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرنا اس نعمت کا شکر ہے۔ اس کے متعلق یہ حدیث ہے امام ابن ماجہ متوفی 273ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب کوئی بندہ اللہ کی دی ہوئی نعمت پر الحمد للہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس سے افضل نعمت عطافرماتا ہے (سنن ابن ماجہ، ج 2، قم الحدیث 3805، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415ھ)

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی 310ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: حضرت حکم بن عمیر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب تم نے الحمد للہ رب العالمین کہا تو تم نے اللہ تعالیٰ کا شکرادا کردیا اور اللہ تعالیٰ تمہاری نعمت میں زیادتی کرے گا۔ (جامع البیان ج 1 ص 90، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415ھ)

امام احمد بن حنبل متوفی 241ھ روایت کرتے ہیں: حضرت اسود بن سریع (رض) بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی ثناء اور تعریف میں الحمد للہ سے زیادہ کوئی کلمہ پسند نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود الحمد للہ سے اپنی ثنا کی ہے۔ (مسند احمد، ج 5، رقم الحدیث: 15586، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1414ھ)۔

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: نعمت خواہ کتنی پرانی ہو جائے جب بھی بندہ اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نیا ثواب عطافرماتا ہے اور مصیبت خواہ کتنی پرانی ہو جائے جب بھی بندہ اس پر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو نیا ثواب اور اجر عطافرماتا ہے۔ نعمت پر شکرادا کرنے سے اس نعمت کی مسوئلیت کم ہو جاتی ہے اور مصیبت پر صبر کرنے سے اس کے ثمرات کی حفاظت ہوتی ہے۔ (نوادر الاصول ج 2 ص 203، مطبوعہ دار الجبل، بیروت، 1412ھ)

شکر کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر کی جائے اور اس کی کسی نعمت کی بے قدری نہ کی جائے۔

حضرت عائشہ صدیقہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرے پاس تشریف لائے اور اپنے گھر میں روٹی کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا دیکھا۔ آپ اس کے پاس چل کر گئے۔ آپ نے اس کو اٹھایا، اس پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا: اے عائشہ! اللہ کی نعمتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ جس نعمت کی لوگ ناقدری کرتے ہیں، ان کے پاس وہ نعمت بہت کم دوبارہ آتی ہے۔ (نوادر الاصول، ج4، ص174، مطبوعہ دار الجبل، بیروت، 1412ھ)

شکر کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کم چیز پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے اور اللہ کی نعمت کا اظہار کیا جائے۔

حضرت نعمان بن بشیر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس نے قلیل چیز کا شکر ادا نہیں کیا اس نے کثیر چیز کا بھی شکر ادا نہیں کیا اور اللہ کی نعمت کا بیان کرنا شکر ہے اور اس کو ترک کرنا کفر ہے۔ (علامہ احمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے) (مسند احمد، ج14، رقم الحدیث: 18361، مطبوعہ دار الحدیث قاہر، 1416ھ)

شکر کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بندوں کا شکر ادا کیا جائے۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو بندوں کا شکر ادا نہیں کرتا، وہ اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔ (سنن ابوداود، ج4، رقم الحدیث 4811۔ سنن الترمذی ج3، رقم الحدیث 1961۔ مسند احمد ج7 رقم الحدیث 4795، مطبوعہ قاہرہ، صحیح ابن حبان، رقم الحدیث 2070۔ الادب المفرد، رقم الحدیث: 218۔ مسند ابویعلی، رقم الحدیث: 1122)

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص کو کوئی چیز دی گئی تو وہ اس کے بدلہ میں کوئی چیز دے۔ اگر کوئی چیز نہ ملے تو اس کی تعریف کرے۔ جس نے اس کی تعریف کی اس نے اس کا شکر کیا اور جس نے اس کو چھپایا، اس نے کفر کیا۔ (سنن ابوداود، ج4 رقم الحدیث: 4813، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1414ھ)

حضرت اسامہ بن زید (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص کے ساتھ کوئی نیکی کی گئی اور اس نے اس نیکی کرنے والے سے کہا جزاک اللہ خیرا اس نے اس شخص کی پوری تعریف کردی۔ (سنن الترمذی، ج3، رقم الحدیث: 2042، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1414ھ)

راحت کے ایام میں مصیبت کے ایام کو یاد کرنا بھی شکر ہے۔

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص مصیبت میں مبتلا کیا گیا ہو پھر اس کو یاد کرے تو اس نے شکر ادا کیا اور اگر اس نے اس مصیبت کو چھپایا تو اس نے ناشکری کی۔ (سنن ابوداود، ج4 رقم الحدیث: 4814، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1414ھ)

شکر کی فضیلت کے متعلق احادیث:

حضرت صہیب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھے مومن کے حال پر تعجب ہوتا ہے۔ اس کے ہر حال میں بھلائی ہے۔ اگر اس کو راحت پہنچے تو وہ شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کی فلاح ہے اور اگر اس کو ضرر پہنچے تو وہ صبر کرتا ہے اور یہ بھی اس کا فلاح ہے۔ (صحیح مسلم، زہد: 64، (2999) 7365۔ مسند احمد، ج4، ص332۔ 333، ج6، 15، طبع قدیم)

حضرت ابوامامہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کہ میرے رب نے مکہ کی وادی کو پیش کیا تاکہ اس کو میرے لیے سونا بنادے۔ میں نے کہا: نہیں! اے میرے رب! میں ایک دن سیر ہو کر کھاؤں گا اور ایک دن بھوکا رہوں گا، جب میں بھوکا ہوں گا تو تجھے یاد کروں گا تجھ سے فریاد کروں گا اور جب میں سیر ہوں گا تو تیرا شکر ادا کروں گا اور تیری حمد کروں گا۔ (سنن الترمذی، جلد4 رقم الحدیث: 2354۔ مسند احمد، جلد8 رقم الحدیث 22252، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

حضرت فضیل بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے اصحاب میں سے ایک شخص سے ملاقات کی۔ آپ نے اس سے پوچھا تمہارا کیا حال ہے؟ اس نے کہا میں ٹھیک ہوں، آپ نے پھر پوچھا تمہارا کیا حال ہے؟ اس نے کہا میں ٹھیک ہوں اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں، آپ نے فرمایا میں تم سے یہی سننا چاہتا تھا۔ (کتاب الدعاء للطبرانی، رقم الحدیث 1939)

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ایمان کے دو نصف ہیں، نصف میں صبر ہے اور نصف میں شکر ہے۔ (شعب الایمان، رقم الحدیث : 9715، الجامع الصغیر، ج 1 رقم الحدیث : 3106) (تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

پہلی آیات میں قیامت کے دن اعمال کا وزن کرنے، انبیاء اور امتوں سے ان کے کردار کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے کا ذکر کرنے کے ساتھ ہی فرمایا کہ ہم نے ہی تمہیں زمین میں ٹھہرایا اور تمہاری حیثیت کا انتظام کیا۔ اب فرمایا کہ اے انسان ہم نے تمہیں پیدا کیا اور بہترین شکل و صورت سے مزین کیا۔ پھر تمہارے باپ آدم کو مسجود ملائکہ کا اعزاز بخشا۔

اس آیت کے الفاظ اور انداز سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو بیک وقت پیدا فرما کر انھیں شکل و صورت سے نوازا بعد ازاں ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں جبکہ قرآن مجید میں ہی موجود ہے کہ سب سے پہلے صرف آدم (علیہ السلام) کو پیدا کیا گیا پھر اس سے اس کی بیوی کو پیدا کیا اور ان سے بیشمار مرد وزن کی تخلیق کا سلسلہ شروع کیا۔ [النساء آیت : ۱]

یہاں (وَلَقَدْ خَلَقْنٰکُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰکُمْ) کہ ہم نے تمہیں پیدا کیا اور ہمیں نے تمہاری شکلیں بنائیں۔ یہاں مخاطب کی ضمیر (کُم) لائی گئی ہے جس کے اہل علم نے تین مفہوم لیے ہیں :

1 آدم (علیہ السلام) تمام انسانوں کے باپ اور نمائندہ ہیں ان کے لیے جمع کی ضمیر استعمال کی گئی ہے۔

2 تمام ارواح آدم (علیہ السلام) کی پشت یعنی جبلت میں تھیں اور عالم ارواح میں ان کی شکلیں متعین کردی تھیں۔ جس بنا پر جمع مخاطب کی ضمیر لائی گئی ہے۔ سورۃ الاعراف آیت : ۱۷۲ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) سے اس کی اولاد کو پیدا فرما کر استفسار کیا کہ میں تمہارا رب ہوں یا نہیں ؟ تمام بنی آدم نے جواب دیا (بلٰی) کیوں نہیں تو ہی ہمارا رب ہے۔

3 آیت کے الفاظ پر معمولی غور کیا جائے تو یہ حقیقت خود بخود واضح ہوتی ہے تخلیق اور شکلوں کے بارے میں جمع مخاطب کی ضمیر لائی گئی ہے لیکن سجدے کا ذکر کرتے ہوئے واضح الفاظ استعمال فرمائے ہیں کہ ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ وہ آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کریں۔

گویا کہ ملائکہ نے آدم (علیہ السلام) کی پوری اولاد کو نہیں بلکہ صرف حضرت آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کیا تھا۔

(عَنْ أَبِیْ مُوسَی الْأَشْعَرِیِّ (رض) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) إِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ مِنْ قَبْضَۃٍ قَبَضَہَا مِنْ جَمِیعِ الْأَرْضِ فَجَاءَ بَنُو آدَمَ عَلٰی قَدْرِ الْأَرْضِ جَاءَ مِنْہُمُ الْأَحْمَرُ وَالْأَبْیَضُ وَالْأَسْوَدُ وَبَیْنَ ذٰلِکَ وَالسَّہْلُ وَالْحَزْنُ وَالْخَبِیثُ وَالطَّیِّبُ) [رواہ ابو داؤد : کتاب السنہ، باب فی القدر]

" حضرت ابو موسیٰ اشعری (رض) بیان کرتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو مٹی سے پیدا کیا۔ جو ساری زمین سے لی گئی آدم کی اولاد زمین کے مطابق ہوئی۔ ان میں سرخ، سفید، سیاہ اور درمیانی رنگت کے لوگ ہیں ان میں سخت ہیں اور نرم طبیعت کے ہیں کچھ نیک اور بد ہیں۔ "

(عَنْ أَبِیْ ھُرَیْرَۃَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خَیْرُ یَوْمٍ طَلَعَتْ عَلَیْہِ الشَّمْسُ یَوْمُ الْجُمُعَۃِ فِیْہِ خُلِقَ اٰدَمُ وَفِیْہِ اُدْخِلَ الْجَنَّۃَ وَفِیْہِ اُخْرِجَ مِنْھَا وَلَا تَقُوْمُ السَّاعَۃُ اِلَّا فِیْ یَوْمِ الْجُمُعَۃِ)

[رواہ مسلم : باب فَضْلِ یَوْمِ الْجُمُعَۃِ]

" حضرت ابوہریرہ (رض) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان بیان کرتے ہیں کہ ایام میں سب سے بہتر دن جمعہ کا دن ہے اس دن آدم (علیہ السلام) کو پیدا کیا گیا اسی دن ان کو جنت میں داخلہ ملا اور جمعہ کو ہی ان کا جنت سے اخراج ہوا۔ اور اسی دن ہی قیامت برپا ہوگی۔ "

(وَعَنْ اَنَسٍ (رض) اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ لَمَّا صَوَّرَ اللّٰہُ اٰدَمَ فِی الْجَنَّۃِ تَرَکَہٗ مَا شَاءَ اللّٰہُ اَنْ یَّتْرُکَہٗ فَجَعَلَ اِبْلِیْسُ یُطِیْفُ بِہٖ یَنْظُرُ مَا ھُوَ فَلَمَّا رَاٰہُ اَجْوَفَ عَرَفَ اَنَّہٗ خُلِقَ خَلْقًا لَا یَتَمَالَکُ) [رواہ مسلم]

"حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا' جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کی جنت میں شکل وصورت بنائی اس پیکر کو جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا جنت میں اسی طرح رہنے دیا ابلیس اس کے گرد گھوما اور وہ غور کرتا رہا کہ یہ کیا ہے؟ جب اس نے مجسمہ کو دیکھا کہ یہ اندر سے کھوکھلا ہے' تو سمجھ گیا کہ یہ ایسی مخلوق تخلیق کی جارہی ہے' جو مستقل مزاج نہیں ہوگی۔" (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

احسانات کے ذکر سے ملامت بھی اور دعوت بھی

اس آیت کے الفاظ کو دیکھیں تو ان میں چونکہ عمومیت پائی جاتی ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس میں خطاب پوری نوع انسانی کو ہے کیونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام نوع انسانی کی طرف اللہ کے رسول بن کے آئے اور یہ قرآن سب کی طرف اللہ کا پیغام ہے اس لیے تمام انسانوں سے خطاب کرکے فرمایا جارہا ہے کہ دیکھو اس زمین پر اللہ نے تمہیں رہنے کی سہولتیں عطافرمائیں اور اسی میں تمہاری زندگی کے امکانات رکھے اور تمہارے پھلنے پھولنے کے اسباب پیدا فرمائے۔ زمین کا ایک ایک انچ اس نے تمہارے لیے مسخر کردیا اور زمین میں مضمر قوتیں تمہاری خدمت میں لگادیں اس کے مدفون خزانے تمہاری قوت تسخیر کے لیے ہموار کردیئے گئے۔ اس کی فضائیں اس کی ہوائیں اس کے سمندر' اس میں چمکنے والے سورج اور چاند اور اس پر تنی ہوئی آسمان کی چھت سب تمہاری خدمت میں لگادی گئی اور پھر اس میں تمہارے لیے روزی کا سامان رکھا گیا' معیشت کی راہیں کھولی گئیں' قسم قسم کے غلے اگائے گئے اور نوع بہ نوع پھل پیدا کیے گئے۔ خوبصورتی کے وہ وہ مناظر رکھے گئے کہ آدمی دیکھ کر دنگ رہ جائے آنے جانے کے لیے راستے کھول دیئے گئے' پانی کو حکم دیا گیا کہ ہماری کشتیوں کو اٹھائے پھرے' ہواؤں نے ہمارے بادبانوں کو سہارا دیا اور ہمارے لیے جوہر عقل کی وہ نعمت عطا کی گئی جس نے ہمیں ایجادات کی دولت مرحمت کی اور ہم اس قابل ہوئے کہ ہواؤں میں اڑنے لگے اور سمندر کی گہرائیوں کی خبر لانے لگے اور پوری زمین ہماری لیے ہاتھ کی لکیروں کی طرح سمٹ کے رہ گئی۔ ان تمام احسانات کا ذکر فرمانے کے بعد اس کا نتیجہ ہمارے لیے چھوڑ دیا گیا کہ خود سوچو کہ اس کے بعد تمہیں کیا کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی محسن کے احسانات کا بدلہ احسان شناسی سے ہوتا ہے اور احسان شناسی کا حق اطاعت اور خدمت کی صورت میں ادا کیا جاتا ہے۔ اللہ کے احسانات کا بدلہ بھی انسان کی طرف سے یہ ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کی بندگی اور اس کی اطاعت کرے اور اس کے احکام کو قبول کرکے اس کے عطا کردہ مقاصد کو اپنی زندگی کے مقاصد بنائے اور اس کی طرف سے آنے والے رسول کی زندگی کو اپنے لیے رہنما سمجھے لیکن اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس کو ادائے شکر نہیں بلکہ کفران نعمت کہا جائے گا۔ انسانوں نے چونکہ بالعموم یہی رویہ اختیار کیا اس لیے نہایت افسوس سے فرمایا گیا کہ تم بہت کم شکر بجالاتے ہو۔ بجائے اللہ کی عبادت واطاعت کے تم نے اس کے شریک بنا رکھے ہیں اور بجائے اس کے رسول کی دعوت کو قبول کرنے کے تم نے اس کے رسول کی مخالفت میں کمر باندھ رکھی ہے۔

اگر سیاق کلام کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں خطاب قریش مکہ سے ہے اور ان پر جو اللہ نے احسانات کیے ان کا تذکرہ فرمایا جارہا ہے اس لحاظ سے اس آیت کی تشریح یہ ہوگی کہ اے قریش ہم نے تمہیں اس سرزمین حرم میں اقتدار بخشا اور تمہیں یہاں کے اختیارات کا مالک بنایا کیونکہ تمکین فی الارض کا معنی زمین میں اختیار واقتدار بخشنا ہے۔ سورۃ یوسف میں حضرت یوسف (علیہ السلام) کے حوالے سے یہی لفظ اختیار کیا گیا اور یہاں چونکہ خطاب قریش سے ہے اس لیے الارض سے مراد سرزمین حرم ہوگا اور معایش سے اشارہ ان معاشی سہولتوں اور برکتوں کی طرف ہے جو ایک وادی غیر ذی زرع میں حضرت ابراہیم کی دعا اور بیت اللہ کی برکت سے اہل عرب کو عموماً اور قریش کو خصوصاً حاصل ہوئیں ہم جانتے ہیں کہ مکہ کے سرزمین میں کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی۔ وہاں تو کھجور کے درخت بھی دیکھنے کو نہیں ملتے۔ خشک پہاڑ اور پتھریلی زمین کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا چنانچہ ابراہیم (علیہ السلام) نے جب اپنی اولاد کو یہاں ٹھہرایا اور اللہ کا گھر تعمیر کیا تو اللہ سے دعا کی کہ یا اللہ میری اولاد کے دل میں اپنے گھر کی محبت پیدا فرما اور ان کو پھلوں کا رزق عطا فرما۔ چنانچہ اللہ نے ان کی دعا ایسی قبول فرمائی کہ حرم کی سرزمین مرجع خلائق بن گئی اور دنیا بھر کی نعمتیں اس سرزمین میں کھینچ کے آنے لگیں۔ اس سے چند میل کے فاصلے پر ایسی وادیاں بسائی گئیں جس میں ضرورت کی ہر چیز اگنے لگی اور قسم قسم کے پھل مکہ کے بازاروں میں دستیاب ہونے لگے۔ آنحضرت کی بعثت کے وقت بھی مکہ میں ہر طرح کی نعمتیں میسر تھیں اور آج بھی وہاں جانے والا ہر شخص اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھتا ہے کہ وہاں بظاہر کوئی چیز اگتی نظر نہیں آتی لیکن دنیا کی ہر نعمت اس کے بازاروں میں دکھائی دیتی ہے اور پھر اللہ نے مزید احسان قریش پر یہ فرمایا کہ

حضور کی بعثت سے پہلے پورا عرب نفرتوں کا جہنم بن چکا تھا۔ کسی کی نہ جان سلامت تھی نہ مال' راہ چلتے قافلے لوٹ لیے جاتے تھے' ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے لیے درندوں سے کم نہ تھا۔ لیکن قریش کو اللہ کے گھر کے متولی ہونے کے باعث احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا یہ اپنا تجارتی قافلہ لے کر جب دوسرے ملکوں کی طرف جاتے تھے تو راستے میں پڑنے والے عرب قبیلے نہ صرف کہ ان پر حملہ نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی حفاظت کرنا اور ان کو سہولتیں بہم پہنچانا اپنا فرض سمجھتے تھے اس طرح قریش کو تجارت میں وہ آسانی پیدا ہوئی کہ جس کا اس زمانے میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اور اللہ کے اس گھر کی وجہ سے سرزمین حرم امن کا گہوارہ بن گئی۔ کوئی شخص حرم کی حدود میں اور خاص طور پر بیت اللہ کے پاس اپنے باپ کے قاتل پر بھی ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ پورا عرب جو نفرتوں کی آگ میں جل رہا تھا اس میں مکہ کی سرزمین ایک جنت کا نمونہ تھی۔ جس میں قریش کو اللہ نے اقتدار اور اختیار بخش رکھا تھا اور انھیں حصول رزق کی آسانیاں بہم پہنچا رکھی تھیں چنانچہ ان پر اپنے احسانات کا ذکر فرما کر انھیں یاد دلایا جا رہا ہے کہ تمہیں چاہیے تو یہ تھا کہ اللہ کے ان احسانات کا تم شکر ادا کرتے اور تم اللہ کی بندگی کرتے ہوئے شیطانی قوتوں کے راستے پر چلنے سے انکار کر دیتے لیکن افسوس یہ ہے کہ تم نے اللہ کی اطاعت کی بجائے شیطان کی اطاعت کی اور اللہ کے رسول پر ایمان لانے کی بجائے تم نے رسول کی مخالفت پر کمر باندھ لی حالانکہ شیطان پہلے دن سے تمہارا دشمن چلا آرہا ہے لیکن تم عجیب بیوقوف ہو کہ اپنے دشمن کو پہچاننے کی بجائے اس کی اطاعت کر رہے ہو (تفسیر روح القرآن۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

آیت مبارکہ:

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿١١﴾

لغۃ القرآن: وَ : اور] [لَقَدْ : البتہ تحقیق] [خَلَقْنٰكُمْ : ہم نے پیدا کیا تمہیں] [ثُمَّ : پھر] [صَوَّرْنٰكُمْ : ہم نے شکلیں بنائیں تمہاری] [ثُمَّ : پھر] [قُلْنَا : ہم نے کہا] [لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ : فرشتوں سے] [اسْجُدُوْا : تم سب سجدہ کرو] [لِاٰدَمَ : آدم کو] [فَسَجَدُوْٓا : تو سب نے سجدہ کیا] [اِلَّآ اِبْلِيْسَ : سوائے ابلیس کے] [لَمْ : نہیں] [يَكُنْ : ہو] [مِّنَ : سے] [السّٰجِدِيْنَ : سجدہ کرنے والوں]

ترجمہ: اور بیشک ہم نے تمہیں (یعنی تمہاری اصل کو) پیدا کیا پھر تمہاری صورت گری کی (یعنی تمہاری زندگی کی کیمیائی اور حیاتیاتی ابتداء وارتقاء کے مراحل کو آدم (علیہ السلام) کے وجود کی تشکیل تک مکمل کیا)، پھر ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ وہ سجدہ کرنے والوں میں سے نہ ہوا

تشریح: پہلے ان احسانات کا ذکر فرمایا جن سے ہماری زندگی وابستہ تھی۔ اب ہمیں اپنی تخلیق اور ان نوازشات کی طرف متوجہ کیا جن سے ہمیں اور ہمارے باپ ابوالبشر آدم (علیہ السلام) کو سرفراز فرمایا گیا تھا۔ کلام میں ایک عقدہ حل طلب ہے۔ ارشاد ہے کہ ہم نے تمہیں پیدا فرمایا پھر تمہیں دلفریب صورت بخشی (ثم قلنا للملئکۃ) پھر ہم نے فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا حالانکہ ہماری تخلیق اور تصویر سے پہلے آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ امام رازی (رح) نے اس کے متعدد جوابات دیئے ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک بھی سب سے پسندیدہ جواب یہ ہے کہ ولقد خلقنا کم کا معنی ہے ولقد خلقنا اباکم وصورنا کم ای صورنا آدم ثم قلنا للملئکۃ الخ۔ یعنی ہم نے تمہارے باپ آدم کو پیدا کیا اور اس کی صورت بنائی اور پھر ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اسے سجدہ کرو۔ اور یہ اسلوب بیان قرآن میں عام ہے کہ خطاب حاضرین کو ہوتا ہے لیکن اس سے مراد ان کے اسلاف ہوتے ہیں جیسے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہم عصر یہودیوں کو فرمایا گیا۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری)

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ : اور بیشک ہم نے تمہیں پیدا کیا۔ } یہاں سے ایک اور عظیم نعمت یاد دلائی جارہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) اور ان کی تمام اولاد پر فرمائی اور یہ نعمت ایسی ہے کہ صرف یہی نعمت ادائے شکر کے لازم ہونے کے لیے کافی ہے چنانچہ ارشاد ہوا کہ بیشک ہم نے تمہیں پیدا کیا۔ یہاں یا تو یہ مراد ہے کہ ہم نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو پیدا کیا اور ان کی پشت میں ان کی اولاد کی صورت بنائی یا یہاں حضرت آدم (علیہ السلام) ہی کا تذکرہ ہے کہ ہم نے آدم علیہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو پیدا کیا، ان کی صورت بنائی اور پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ انھیں سجدہ کریں۔ بقیہ تفصیلی واقعہ آیت مبارکہ میں بھی موجود ہے اور تخلیق آدم و سجدۂ آدم کا واقعہ سورۃ بقرہ آیت 34 میں بھی مذکور ہو چکا ہے۔ یہاں اس قصے کے بیان کا مقصد ایک مرتبہ پھر اللہ عَزَّوَجَلَّ کی عظیم نعمت کو یاد دلانا ہے۔ شرف انسانیت کو بیان کرنا ہے اور اللہ عَزَّوَجَلَّ کے دوست اور دشمن کی روش کو دکھانا ہے کہ دیکھو دوست بھول کر بھی خطا کرتا ہے تو کس طرح گریہ وزاری کرتا ہے اور محبوب حقیقی کو منانے کی کوشش کرتا ہے اور دشمن خدا قصداً تکبر سے حکم الٰہی کی خلاف ورزی کرتا ہے اور توبہ و معافی طلب کرنے کی بجائے غرور و تکبر اور حیلہ و تاویل کی راہ اپناتا ہے اور اپنا قصور ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتا بلکہ الٹا تقدیر کا بہانا بنا کر خود کو قصور وار قرار دینے کی بجائے کہتا ہے کہ یا اللہ ! یہ میرا نہیں بلکہ تیرا قصور ہے کیونکہ تو نے ہی مجھے گمراہ کیا ہے۔ یہ مضمون چند آیات کے بعد موجود ہے۔ گویا اس قصے کے ذریعے فرمان بردار اور نافرمان کا راستہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

(۱) امام عبد الرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابو الشیخ نے، اور بیہقی نے شعب الایمان میں اور امام حاکم نے تصحیح بھی کی ہے۔ ابن عباس (رض) سے روایت کیا کہ لفظ آیت " ولقد خلقنکم ثم صورنکم " سے مراد ہے کہ تم کو پیدا کیا مردوں کے صلبوں سے اور صورتیں بنائیں عورتوں کے رحموں میں بنائی گئیں۔

(۲) امام فریابی نے ابن عباس (رض) سے روایت کیا کہ انھوں نے اس آیت کے بارے میں فرمایا کہ آدم کی پشت میں ان کو پیدا کیا گیا پھر رحموں میں تمہاری صورتیں بنائی گئیں۔

(۳) امام ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس (رض) سے روایت کیا کہ " خلقنکم " یعنی ہم نے آدم (علیہ السلام) کو پیدا فرمایا " ثم صورنکم " پھر اس کی اولاد کی (صورتیں بنائیں)

(۴) امام ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے مجاہد (رح) سے روایت کیا کہ لفظ آیت " ولقد خلقنکم " یعنی آدم کو پیدا فرمایا " ثم صورنکم " یعنی آدم (علیہ السلام) کی اولاد کی شکل و صورت بنائی۔

(۵) امام عبد ابن حمید، ابن جریر اور ابن منذر نے قتادہ (رح) سے روایت کیا کہ لفظ آیت " ولقد خلقنکم ثم صورنکم " یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم کو مٹی سے پیدا فرمایا پھر تمہاری صورتیں بنائی، تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں ایک پیدائش کے بعد دوسری پیدائش میں (پہلے) جما ہوا خون پھر گوشت کی بوٹی پھر ہڈی پھر ہڈیوں کو گوشت چڑھانا۔

(۶) امام عبد الرزاق اور ابو الشیخ نے کلبی (رح) سے روایت کیا کہ لفظ آیت " ولقد خلقنکم ثم صورنکم " یعنی انسانوں کو پیدا کیا گیا رحم میں پھر ان کی صورت بنائی گئی پھر ان کے کانوں کو ان کی آنکھوں کو اور ان کی انگلیوں کو شق کیا۔ (تفسیر در منثور۔ امام جلال الدین سیوطیؒ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : " اور ہم نے تم کو پیدا کیا پھر تمہاری صورت بنائی، پھر ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو، تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا اور وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا "

آیات سابقہ سے مناسبت : اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنی اس نعمت کا ذکر فرمایا تھا کہ اس نے انسانوں کو زمین میں بسایا اور ان کو اسباب زیست فراہم کیے اور اس آیت میں ان پر اپنی ایک اور نعمت کا ذکر فرمایا ہے اور اس میں انسان کی تخلیق کی ابتداء کا ذکر فرمایا ہے کہ اس نے انسانوں کے باپ حضرت آدم (علیہ السلام) کو پیدا فرمایا اور انھیں مسجود ملائکہ بنایا اور باپ پر جو انعام کیا جاتا ہے وہ بیٹے پر انعام کے قائم مقام ہوتا ہے، کیونکہ باپ کا شرف اور اس کا بلند مقام بیٹے کے لیے باعث فخر ہوتا ہے۔ اور اس سے منشا یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس قدر انعامات سے نوازا ہے تو پھر ان کا ایمان نہ لانا اور کفر پر ڈٹے رہنا اللہ تعالیٰ

کی ناشکری اور اس کی احسان فراموشی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس پر تنبیہ فرمائی ہے۔ تم اللہ کے ساتھ کس طرح کفر کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے تو اس نے تم میں جان ڈالی، پھر وہ تمہاری جان نکالتا ہے پھر تمہیں زندہ کرے گا۔ (البقرہ: 28)۔

ایک اشکال کا جواب: اس آیت میں فرمایا ہے: اور ہم نے تم کو پیدا کیا پھر تمہاری صورت بنائی۔ پھر ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہم کو پیدا کیا، پھر حضرت آدم کو فرشتوں سے سجدہ کرایا۔ حالانکہ سب سے پہلے حضرت آدم (علیہ السلام) کو پیدا کیا گیا اور ان کو مسجود ملائکہ بنایا اس کے بعد ان کی نسل سے ہم کو پیدا فرمایا۔ اس اعتراض کے حسب ذیل جوابات ہیں:

1۔ اس آیت میں "ہم نے تم کو پیدا کیا" اس سے مراد ہے ہم نے تمہارے باپ آدم کو پیدا کیا اور ہم نے تمہارے باپ آدم کی صورت بنائی جیسا کہ ایک اور آیت میں بھی انسان سے مراد آدم ہے۔ "ولقد خلقنا الانسان من سللۃ من طین: اور بیشک ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا" (المومنون: 12)۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ھوالذی خلقکم من نفس واحدۃ وجعل منہاز وجہا لیسکن الیھا: (اللہ) وہی ہے جس نے تم کو ایک ذات سے پیدا کیا اور اسی ذات سے اس کی بیوی کو بنایا تاکہ وہ اس کی طرف سکون حاصل کرے"

2۔ مجاہد نے یہ بیان کیا ہے کہ "تم کو پیدا کیا" اس سے مراد یہ ہے کہ آدم کو پیدا کیا اور "پھر تمہاری صورت بنائی" اس سے مراد ہے حضرت آدم (علیہ السلام) کی پشت میں ان کی اولاد کی صورت بنائی۔

3۔ اس آیت میں ایک لفظ مقدر ہے۔ "پھر ہم تمہیں خبر دیتے ہیں" اور پوری آیت کا معنی اس طرح ہوگا اور ہم نے تم کو پیدا کیا پھر تمہاری صورت بنائی پھر ہم تمہیں خبر دیتے ہیں کہ پھر ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو۔

حضرت آدم (علیہ السلام) کی سوانح کے بعض اہم واقعات: اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت آدم (علیہ السلام) اور ابلیس لعین کا قصہ سات سورتوں میں ذکر فرمایا ہے۔ (البقرہ، الاعراف، الحجر، بنو اسرائیل، الکہف، طہ، ص)۔ ہم اس قصہ کے مباحث کی تفسیر اور تفصیل سورۃ البقرہ میں بیان کر چکے ہیں یہاں پر ہم بعض ان امور کو بیان کریں گے جن کو وہاں ہم نے ذکر نہیں کیا تھا۔ یہاں پر ہم احادیث اور آثار کی روشنی میں حضرت آدم (علیہ السلام) کی سوانح بیان کر رہے ہیں۔

حضرت آدم (علیہ السلام) کی مرحلہ وار تخلیق: امام ابوالقاسم علی بن الحسن بن عساکر متوفی 571ھ روایت کرتے ہیں: حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ اپنی پسندیدہ چیزیں پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق عرش پر مستوی ہوا اور فرشتوں سے فرمایا: میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ (البقرہ: 30) پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل (علیہ السلام) کو مٹی لینے کے لیے زمین پر بھیجا۔ زمین نے کہا: میں اس بات سے تم سے اللہ کی پناہ طلب کرتی ہوں کہ مجھ سے کوئی چیز کم کی جائے یا میری کوئی چیز خراب کی جائے۔ حضرت جبرائیل لوٹ اور مٹی نہیں لی اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: یارب! اس نے مجھ سے تیری پناہ طلب کی اور میں نے اس کو پناہ دے دی، پھر حضرت میکائیل کو بھیجا، اس نے پھر اسی طرح کہا وہ بھی لوٹ آئے، پھر حضرت عزرائیل کو بھیجا اس نے ان سے بھی اللہ کی پناہ طلب کی۔ انھوں نے کہا میں اس بات سے اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں کہ میں اللہ کے حکم پر عمل کرائے بغیر لوٹ جاؤں، انھوں نے زمین کے ہر خطہ سے مٹی لے کر جمع کی اور اس کو خلط ملط کر دیا۔ اس میں سرخ مٹی بھی تھی اور سفید بھی۔ یہی وجہ ہے کہ بنو آدم مختلف رنگ کے ہیں۔ وہ اس مٹی کو لے کر اوپر چڑھے اور اس کو گیلا کر دیا، پھر اس گندھی ہوئی مٹی کو پڑا رہنے دیا حتیٰ کہ وہ سڑ گئی۔ جیسا کہ وہ سڑ گئی۔ جیسا کہ اس آیت میں ارشاد ہے: ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حما مسنون: اور بیشک ہم نے انسان کو بجتی ہوئی خشک مٹی سے بنایا جو پہلے سیاہ بدبودار گارا تھی" (الحجر: 26)

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اپنے ہاتھوں سے بنایا تاکہ ابلیس خود ان کو ان سے بڑا نہ سمجھے اور وہ جمعہ کے دن چالیس سال کے برابر عرصہ تک بشر کی صورت میں پتلا بنے ہوئے پڑے رہے۔ فرشتے ان کو دیکھ کر خوف زدہ ہوتے تھے اور ابلیس سب سے زیادہ خوف زدہ ہوتا تھا۔ اس پتلے کو مارنے سے ایسی آواز آتی تھی جیسے مٹکے کو مارنے سے آواز آتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "خلق الانسان من صلصال کالفخار: اس نے انسان کو ٹھیکری کی طرح بجتی ہوئی سوکھی مٹی سے بنایا" (الرحمٰن: 14)۔ ابلیس کہتا تھا اس کو کس لیے بنایا گیا ہے، اس نے فرشتوں سے کہا اس سے مت ڈرو! یہ اندر سے کھوکھلا ہے۔ اگر مجھ کو اس پر مسلط کیا گیا تو میں اس کو ہلاک کر دوں گا۔ جب اس میں روح پھونکنے کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "فاذا سویتہ ونفخت فیہ من روحی فقعوالہ سجدین: سو جب میں اس کو درست

کرلوں اور اس میں اپنی طرف سے (پسندیدہ) روح پھونک دوں تو تم سب اس کے لیے سجدہ میں گر جانا" (الحجر: 29)۔ جب اس پتلے میں روح پھونکی اور وہ ان کے سر میں داخل ہوئی تو ان کو چھینک آئی۔ فرشتوں نے ان سے کہا کہو الحمد للہ تو انھوں نے کہا الحمد للہ، اور جب روح ان کی آنکھوں میں داخل ہوئی تو انھوں نے جنت کے پھلوں کی طرف دیکھا اور جب روح ان کے پیٹ میں پہنچی تو ان کو طعام کی خواہش ہوئی اور انھوں نے پیروں تک روح کے پہنچنے سے پہلے ہی جنت کے پھلوں کی طرف چھلانگ لگانی چاہی۔ جیسا کہ ارشاد ہے: "خلق الانسان من عجل: انسان جلد باز پیدا کیا گیا ہے" (37)۔ پھر ابلیس کے سوا تمام فرشتوں نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کیا، جیسا کہ اس آیت میں ارشاد ہے: "فسجد الملائکۃ کلھم اجمعون: الا ابلیس استکبر وکان من الکافرین۔ قال یا ابلیس مامنعک ان تسجد ما خلقت بیدی۔ استکبرت ام کنت من العالین۔ قال انا خیر منہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین۔ قال فاخرج منھا فانک رجیم: پس تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ سوا ابلیس کے، اس نے گھمنڈ کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔ فرمایا اے ابلیس تجھے اس کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تو نے اب گھمنڈ کیا یا تو پہلے ہی سے گھمنڈ کرنے والوں میں سے تھا۔ اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اس کو مٹی سے بنایا۔ فرمایا تو اس (جنت) سے نکل جا بیشک تو مردود ہو گیا" (مختصر تاریخ دمشق، ج4، ص215-217، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1404ھ)

حضرت آدم (علیہ السلام) کو ان کی اولاد کا مشاہدہ کرانا: امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی 279ھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو پیدا کیا تو ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا تو قیامت تک ان کی اولاد کی پیدا ہونے والی روحیں ان کی پشت سے جھڑ گئیں۔ اور ان میں سے ہر انسان کی دونوں آنکھوں کے سامنے نور کی شعاعیں تھیں۔ پھر ان لوگوں کو حضرت آدم کے سامنے پیش کیا۔ حضرت آدم نے پوچھا: اے میرے رب! یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: یہ تمہاری اولاد ہیں۔ حضرت آدم نے ان میں سے ایک شخص کو دیکھا وہ شخص اور اس کی نور کی شعاعیں انھیں بہت اچھی لگیں۔ پوچھا اے میرے رب! یہ کون شخص ہے؟ فرمایا یہ تمہاری اولاد کے آخری لوگوں میں سے ایک شخص ہے اس کا نام داؤد ہے۔ کہا اے میرے رب! تو ان کی کتنی عمر مقرر کی ہے؟ فرمایا ساٹھ سال، کہا اے میرے رب! میری عمر میں سے اس کی عمر کے چالیس سال زیادہ کر دے۔ جب حضرت آدم کی عمر پوری ہو گئی تو ان کے پاس ملک الموت آئے۔ کہا کیا میری عمر میں سے ابھی چالیس سال باقی نہیں ہیں؟ انھوں نے کہا کیا یہ چالیس سال آپ نے اپنے بیٹے داؤد کو نہیں دیے تھے؟ حضرت آدم نے انکار کر دیا سو ان کی اولاد نے بھی انکار کر دیا اور حضرت آدم بھول گئے سو ان کی اولاد بھی بھول گئی اور حضرت آدم نے (اجتہادی خطا کی سو ان کی اولاد نے بھی خطا کی۔ (سنن الترمذی، ج5، رقم الحدیث: 3087)۔

حافظ ابن عساکر متوفی 571ھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابی بن کعب (رض) اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "واذ اخذ ربک من بنی آدم من ظھورھم ذریتھم واشھدھم علی انفسھم الست بربکم قالوا بلی شھدنا ان تقولوا یوم القیامۃ انا کنا عن ھذا غافلین: اور جب آپ کے رب نے بنو آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کی جانوں پر انھیں گواہ بنا دیا (فرمایا) کیا میں تمہارا رب نہیں؟ سب نے کہا کیوں نہیں! ہم نے گواہی دی تاکہ قیامت کے دن تم یہ نہ کہو کہ ہم اس سے بے خبر تھے" (الاعراف: 172)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں تم پر سات آسمانوں کو گواہ کرتا ہوں اور تم تمہارے باپ آدم کو گواہ کرتا ہوں تاکہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم کو اس کا علم نہ تھا۔ جان لو کہ میرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ لہٰذا تم میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، میں عنقریب تمہارے پاس رسول بھیجوں گا جو تم کو میرا عہد اور میثاق یاد دلائیں گے اور تم پر اپنی کتابوں کو نازل کروں گا، انھوں نے کہا ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو ہمارا رب اور ہمارا معبود ہے اور تیرے سوا ہمارا کوئی رب نہیں ہے، حضرت آدم نے ان میں غنی اور فقیر کو اور خوبصورت اور بدصورت لوگوں کو دیکھا، حضرت آدم نے کہا: اے میرے رب اگر تو اپنے تمام بندوں کو ایک جیسا کر دیتا! فرمایا مجھے یہ پسند ہے کہ میرا شکر ادا کیا جائے۔ حضرت آدم نے ان میں انبیاء (علیہم السلام) کو دیکھا ان کے چہرے چراغ کی طرح منور تھے۔ ان کو رسالت اور نبوت کے میثاق کے ساتھ خاص کیا گیا تھا۔ اس کے متعلق یہ آیت ہے: "واذ اخذنا من النبیین میثاقھم ومنک ومن نوح وابراھیم وموسی وعیسیٰ ابن مریم سے، اور ہم نے ان سے پختہ عہد لیا" (الاحزاب: 7)۔ (تاریخ دشمق، ج4 ص219-220، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1404ھ)

حضرت آدم (علیہ السلام) کی آزمائش: حضرت ابوالدرداء (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو پیدا کیا تو ان کے دائیں کندھے پر مارا اور سفید رنگ کی ان کی اولاد نکالی۔ وہ چیونٹی کے مثل تھے۔ اور بائیں کندھے پر مارا اور اس سے ان کی سیاہ رنگ کی

اولاد نکالی، وہ کوئلوں کی طرح تھے۔ پھر دائیں جانب والوں کے لیے فرمایا یہ جنت کی طرف ہیں اور مجھے کوئی پروانہیں ہے اور بائیں جانب والوں کے لیے فرمایا یہ دوزخ کی طرف ہیں اور مجھے کوئی پروانہیں ہے۔

ابراہیم مزنی (رح) سے پوچھا گیا: کیا فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ کیا تھا؟ انھوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو کعبہ کی طرح کر دیا تھا اور فرشتوں کو ان کی طرف سجدہ عبادت کرنے کا حکم دیا۔ جس طرح اس نے اپنے بندوں کو کعبہ کی طرف سجدہ کرنے کا حکم دیا ہے۔

قتادہ نے کہا: حضرت آدم (علیہ السلام) کو جنت میں رہنے اور کھانے پینے کا حکم دیا اور ایک درخت سے منع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو آزمائش میں مبتلا کیا جس طرح اس سے پہلے فرشتوں کو مبتلا کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کو اطاعت میں مبتلا کیا ہے، جس طرح اس سے پہلے زمین اور آسمان کو اطاعت میں مبتلا کیا تھا۔ ان سے فرمایا: تم دونوں خوشی یا ناخوشی سے حاضر ہو جاؤ انھوں نے کہا: ہم خوشی سے حاضر ہوتے ہیں۔ (حم السجدۃ: 11) سو حضرت آدم (علیہ السلام) کو آزمائش میں مبتلا کیا اور ان کو جنت میں رکھا۔ فرمایا کہ جہاں سے چاہو، فراخی سے کھاؤ اور ایک درخت سے کھانے سے منع فرمادیا۔ یہ آزمائش قائم رہی حتیٰ کہ انھوں نے اس ممنوع کا ارتکاب کرلیا۔ اس وقت ان کی شرم گاہ کھل گئی اور ان کو جنت سے اتار دیا گیا۔ حضرت آدم نے کہا: اے میرے رب اگر میں توبہ کرلوں اور اصلاح کرلوں تو کیا جنت کی طرف لوٹا دیا جاؤں اور تب انھوں نے کہا: "ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین: اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر زیادتی کی، اور اگر تو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے" (الاعراف: 23)۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے توب کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی اور اللہ کے دشمن ابلیس نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور نہ توبہ کی، لیکن اس نے قیامت تک کی مہلت مانگی تو اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کی دعا قبول کرلی۔ حضرت آدم کو معاف کر دیا اور شیطان کو قیامت تک کی مہلت دے دی۔ (تاریخ دمشق ج 4 ص 220۔ 221۔ ملخصا مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1404ھ)

حضرت آدمؑ کا سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے دعا کرنا اور اس حدیث کی تحقیق:

اام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی 360ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: حضرت عمر بن خطاب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب حضرت آدم (علیہ السلام) سے (اجتہادی) خطا سرزد ہو گئی تو انھوں نے سر اٹھا کر عرش کی طرف دیکھا اور کہا: ل تجھ سے (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے بخش دے، اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی محمد کیا ہے! اور محمد کون ہیں؟ تب انھوں نے تیرا نام برکت والا ہے، تو نے جب مجھے پیدا کیا تھا، تو میں نے عرش کی طرف سر اٹھا کر دیکھا تو اس میں لکھا ہوا تھا: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، تو میں نے جان لیا کہ اس سے زیادہ مرتبہ والا کون شخص ہو گا جس کا نام تو نے اپنے نام کے ساتھ ملا کر لکھا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی اے آدم وہ تمہاری اولاد میں آخر النبیین ہیں اور ان کی امت تمہاری اولاد میں سے آخری امت ہے اور اے آدم اگر وہ نہ ہوتے تو میں تم کو (بھی) پیدا نہ کرتا۔

(المعجم الصغیر، ج 2، ص 83، مطبوعہ مکتبہ سلفیہ مدینہ منورہ، المعجم الصغیر، ج 2، رقم الحدیث 992، مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت المعجم الاوسط، ج 7، رقم الحدیث 6498، مطبوعہ مکتبہ المعارف، ریاض، الشریعہ للاجری، ص 370 تا 373، ریاض المستدرک ج 2 ص 615، مطبوعہ دار البازمکہ المکرمہ، دلائل النبوۃ، للبیہقی، ج 5 ص 489، دار الکتب العلمیہ، بیروت، وفاء الوفاء لابن الجوزی، ص 33، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ لائل پور، مجمع لازوائد، ج 8، ص 253، مطبوعہ دار الکتاب العربیہ بیروت، مجمع البحرین ج 6 ص 151، مطبوعہ مکتبہ الرشد، ریاض۔ الخصائص الکبری، ج 1 ص 6، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ لائل پور (کتب تاریخ وسیرت) البدایہ والنہایہ للحافظ ابن الکثیر، ج 1، ص 81، ج 2، ص 322، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، المواہب اللدنیہ، ج 1 ص 35، ج 3، ص 418، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، شرح مواہب للزرقانی ج 1 ص 44، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت، سبل الھدی والرشاد، ج 1 ص 85، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، سیرت حلبیہ، ج 1، ص 354، مطبوعہ شرکہ مکتبہ ومطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی والولادہ بمصر، قصص الانبیاء للحافظ ابن کثیر، ج 1 ص 30، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ۔ (کتب تفسیر) در منثور، ج 1 ص 142، مطبوعہ دار الفکر بیروت، تفسیر ثعالبی، ج 1 ص 53، مطبوعہ موسسہ الاعلمی بیروت، روح البیان، ج 1، ص 113، مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ کوئٹہ، روح المعانی، ج 1، ص 237، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت۔ (دیگر کتب) فتاوی ابن تیمیہ، ج 2، ص 151، مطبوعہ السعودیہ العربیہ، شفاء السقام

للسب کی، ص 120، مطبوعہ حیدر آباد دکن۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے در منثور، ج 1، ص 142، اور الخصائص ج 1 ص 6 میں اور علامہ علی متقی ھندی نے کنزل اعمال ج 11، ص 455 میں اس حدیث کو امام ابو نعیم کی دلائل النبوۃ کے حوالے سے بھی درج کیا ہے۔ میں نے امام ابو نعیم کی دلائل النبوۃ کو حرفاً حرفاً دیکھا ہے۔ اس میں یہ حدیث نہیں ہے اس سلسلہ میں ان بزرگ محدثین کو تسامح ہوا ہے)

امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح الاسناد لکھا ہے لیکن یہ ان کا تساہل ہے۔ علامہ ذہبی نے لکھا ہے بلکہ یہ حدیث موضوع ہے۔ (تلخیص المستدرک، ج 6، ص 615) علامہ ذہبی کا اس حدیث کو موضوع لکھنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی سند میں کوئی وضاع راوی نہیں ہے اور ذہبی نے اس کے موضوع ہونے پر کوئی دلیل نہیں دی۔ صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث سنداً ضعیف ہے۔ جیسا کہ امام بیہقی نے دلائل النبوۃ اور حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ اور قصص الانبیاء میں اس کی تصریح کی ہے کہ اس کا ایک راوی عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم ضعیف ہے۔ علامہ ذہبی نے بھی اس کو ضعیف ہی لکھا ہے۔ وضاع نہیں قرار دیا اور فضائل میں ضعیف احادیث کا اعتبار کیا جاتا ہے اور قوی دلیل یہ ہے کہ حافظ ابن تیمیہ نے اس حدیث سے وسیلہ کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ (فتاوی ابن تیمیہ، ج 2، ص 151، مطبوعہ السعودیہ العربیہ)

ہر چند کہ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کو اکثر ائمہ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے لیکن بعض ائمہ حدیث نے اس کی تعدیل اور تحسین بھی کی ہے۔ حافظ جمال الدین یوسف مزی اس کے متعلق لکھتے ہیں: امام ترمذی اور امام ابن ماجہ نے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کی احادیث سے استدلال کیا ہے۔ امام ابو حاتم کا دوسرا قول یہ ہے کہ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم ابن ابی الرجال سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور ابو احمد بن عدی نے کہا اس کی احادیث حسن ہیں لوگوں نے ان کو حاصل کیا ہے۔ اور بعض نے اس کو صادق قرار دیا ہے اور یہ ان راویوں میں سے ہے جن کی احادیث لکھی جاتی ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔ (تہذیب الکمال ج 1 ص 196، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1414ھ، تہذیب التہذیب، ج 6، ص 162، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1415ھ)۔ نیز امام ابن جوزی نے الوفاء میں اس حدیث کو جس سند سے ذکر کیا ہے اس میں عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نہیں ہے، شیخ ابن تیمیہ نے بھی اسی سند کے ساتھ اس حدیث کا ذکر کیا ہے، لہٰذا عبدالرحمٰن بن زید کی وجہ سے جو اس حدیث کو ضعیف کہا گیا ہے وہ اعتراض اصلاً ساقط ہو گیا۔

حضرت آدم کے سکون کے لیے حضرت حوا کو پیدا کرنا: حافظ ابوالقاسم علی بن الحسن بن عساکر متوفی 571ھ روایت کرتے ہیں: حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) اور دیگر کئی صحابہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ابلیس کو جنت سے نکالا گیا اور اس پر لعنت کی گئی اور حضرت آدم (علیہ السلام) کو جنت میں رکھا گیا۔ حضرت آدم (علیہ السلام) جنت میں گھبراتے تھے اور ان کی کوئی بیوی نہیں تھی جس سے وہ سکون حاصل کرتے۔ ایک دن وہ سو گئے۔ بیدار ہوئے تو ان کے سرہانے ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی جس کو اللہ عزوجل نے ان کی پسلی سے پیدا کیا تھا۔ حضرت آدم (علیہ السلام) نے اس سے پوچھا: تم کون ہو؟ اس نے کہا میں ایک عورت ہوں۔ آپ نے پوچھا: تمہیں کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ اس نے کہا: تاکہ آپ مجھ سے سکون حاصل کریں۔ فرشتوں نے پوچھا: اے آدم! اس کا نام کیا ہے؟ انھوں نے کہا: اس کا نام حواء ہے۔ فرشتوں نے پوچھا: آپ نے اس کا نام حوا کیوں رکھا۔ انھوں نے کہا کیونکہ یہ حی (زندہ) سے پیدا کی گئی ہے۔ اللہ عزوجل نے فرمایا: اور ہم نے فرمایا اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور اس سے فراخی سے کھاؤ جہاں سے تم چاہو اور تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم حد سے بڑھنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ (البقرہ۔ 35) نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پھر شیطان نے ان دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا تاکہ ان کے لیے ان کی شرم گاہوں کو ظاہر کرا دے جو ان سے چھپائی ہوئی تھیں اور کہا (اے آدم و حواء) تمہارے رب نے تمہیں اس درخت سے صرف اس لیے منع کیا ہے کہ کہیں تم فرشتہ بن جاؤ یا ہمیشہ رہنے والوں میں سے ہو جاؤ۔ اور ان دونوں سے قسم کھا کر کہا کہ بیشک میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں۔ پھر فریب سے انھیں (اپنی طرف) جھکا لیا تو جب انھوں نے اس درخت کو چکھا تو ان کی شرم گاہیں ان پر ظاہر ہو گئیں اور وہ اپنے بدن پر جنت کے پتے جوڑنے لگے اور ان کے رب نے انھیں ندا فرمائی کیا اس درخت سے میں تم دونوں کو نہیں روکا تھا؟ اور تم سے (یہ) نہیں کہا تھا کہ شیطان تم دونوں کا کھلا ہوا دشمن ہے۔ (الاعراف: 21۔ 22)۔ اس درخت سے کھانے میں حوا نے سبقت کی، پھر حضرت آدم (علیہ السلام) سے کہا تم بھی کھالو، کیونکہ میں نے کھایا تو مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ (حضرت آدم (علیہ السلام) نے اپنے اجتہاد سے یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ نے تنزیہاً ممانعت کی ہے، تحریماً منع نہیں فرمایا۔ اس لیے کھانے میں کوئی حرج نہیں اور یہ بھول گئے کہ یہ ممانعت تحریماً تھی۔ یا انھوں نے اپنے اجتہاد سے یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ نے

اس معین درخت سے منع فرمایا ہے۔ اگر میں اس نوع کے کسی اور درخت سے کھالو تو پھر حرج نہیں ہے اور یہ بھول گئے کہ اللہ تعالیٰ کی منشا اس درخت کی نوع سے منع کرنا تھا۔ پھر جب انھوں نے اس درخت سے کھالیا اور وہ بے لباس ہو گئے اور پتوں سے جسم چھپانے لگے تو انھوں نے کہا، اس نے تیری قسم کھائی تھی اور میرا یہ گمان نہیں تھا کہ تیری مخلوق میں سے کوئی شخص تیری قسم جھوٹی بھی کھا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان دونوں نے عرض کیا اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اور اگر تو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ فرمایا اترو تمہارے بعض، بعض کے لیے دشمن ہیں اور تمہارے لیے زمین میں ٹھہرنے کی جگہ اور ایک وقت تک فائدہ اٹھانا ہے (الاعراف: 23۔24)۔ (مختصر تاریخ دمشق، ج4 ص222، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1404ھ)

حضرت آدم (علیہ السلام) کا دنیا میں تشریف لانا: عطایان کرتے ہیں کہ حضرت آدم (علیہ السلام) جنت میں فرشتوں کی تسبیح اور ان کی آواز سنتے تھے۔ زمین پر آنے کے بعد یہ نعمت ان سے جاتی رہی۔ انھوں نے اپنے رب عزوجل سے اس کی شکایت کی۔ ان سے کہا گیا کہ یہ بھی آپ کی اس (ظاہری) خطا کا ثمرہ ہے، البتہ میں آپ کے لیے ایک بیت اتاروں گا۔ آپ اس کے گرد طواف کریں جس طرح فرشتے عرش کے گرد طواف کرتے ہیں۔ حضرت آدم (علیہ السلام) بستیوں اور جنگلوں کی مسافت طے کرکے اس بیت کے پاس آئے اس کے گرد طواف کیا اور اس کے پاس نماز پڑھی اسی طرح اس بیت کا طواف کرتے رہے، حتیٰ کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کے زمانہ میں طوفان آیا اور اللہ تعالیٰ نے اس بیت کو اٹھالیا اور قوم نوح کو غرق کردیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان ہی بنیادوں پر حضرت نوح (علیہ السلام) کے زمانہ میں طوفان آیا اور اللہ تعالیٰ نے اس بیت کو اٹھالیا اور قوم نوح کو غرق کردیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان ہی بنیادوں پر حضرت نوح (علیہ السلام) سے وہ بیت بنوایا۔ حضرت ابن عباس (رض) نے بیان کیا ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) نے ہند سے پیدل چل کر چالیس مرتبہ حج کیا۔ (مختصر تاریخ دمشق، ج4، ص223، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1404ھ)

حضرت آدم (علیہ السلام) کی وفات: حضرت ابی بن کعب بیان کرتے ہیں کہ حضرت آدم (علیہ السلام) پر جب وفات کا وقت آیا تو انھوں نے اپنے بیٹوں سے کہا: اے بیٹو! میں جنت کے پھلوں کی خواہش کر رہا ہوں، وہ جنت کے پھل ڈھونڈنے چلے گئے۔ ان کے سامنے سے فرشتے آئے، ان کے پاس کفن اور خوشبو تھی، اور کدالیں اور پھاوڑے تھے۔ انھوں نے حضرت آدم کے بیٹوں سے کہا: تم کیا تلاش کر رہے ہو؟ انھوں نے کہا ہمارا باپ بیمار ہے ہم اس کے لیے جنت کے پھل ڈھونڈ رہے ہیں۔ فرشتوں نے کہا: واپس جاؤ تمہارے باپ کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ فرشتے آئے تو حضرت حواء نے ان کو پہچان لیا۔ وہ حضرت آدم کے پاس گئیں۔ حضرت آدم (علیہ السلام) نے فرمایا: مجھ سے دور رہو۔ تمہاری وجہ سے میں فتنہ میں مبتلا ہوا تھا۔ مجھے اور میرے رب عزوجل کے فرشتوں کو تنہا چھوڑ دو۔ پھر فرشتوں نے حضرت آدم کی روح قبض کرلی۔ ان کو غسل دیا، ان کو کفن پہنایا اور ان کے جسم پر خوشبو لگائی اور ان کے لیے قبر کھود کر لحد بنائی ان پر نماز جنازہ پڑھی۔ پھر ان کی قبر میں اترے اور ان کو قبر میں داخل کیا اور قبر پر کچی اینٹیں رکھیں۔ پھر ان کی قبر سے نکلے اور ان کی قبر کو مٹی سے پر کردیا۔ پھر کہا: اے آدم کے بیٹو! یہ تمہارے لیے کفن دفن کا طریقہ ہے۔ (مختصر تاریخ دمشق، ج4 ص226، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1404ھ)

حضرت آدم (علیہ السلام) کا برزخ میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے مباحثہ: امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256 روایت کرتے ہیں: حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کہ حضرت آدم اور حضرت موسیٰ (علیہما السلام) میں مباحثہ ہوا۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اے آدم! آپ ہمارے باپ ہیں! آپ نے ہمیں نامراد کیا اور جنت سے نکال دیا۔ ان سے حضرت آدم نے کہا۔ اے موسیٰ! تم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے ساتھ سرفراز کیا، اور اپنے دست قدرت سے تمہارے لیے تورات لکھی۔ کیا تم مجھے اس کام پر ملامت کر رہے ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے مجھے پیدا کرنے سے چالیس سال پہلے میرے متعلق مقدر کر دیا تھا! نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا پھر حضرت آدم (علیہ السلام) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر غلبہ پا گئے۔ (صحیح البخاری ج7 رقم الحدیث 6614۔ صحیح مسلم قدر: 13 (2652) 6618۔ سنن ابو داود، ج4 رقم الحدیث: 4701، السنن الکبریٰ ج6، رقم الحدیث 11329)

حضرت آدم اور حضرت موسیٰ (علیہما السلام) میں یہ مباحثہ ہو سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی زندگی میں حضرت آدم (علیہ السلام) کی قبر کے پاس ہوا ہو یا ہو سکتا ہے کہ دونوں کے وصال کے بعد عالم برزخ میں یہ مباحثہ ہوا ہو۔ حضرت آدم (علیہ السلام) نے شجر ممنوع کھانے پر تقدیر کا عذر اپنی زندگی میں پیش نہیں کیا بلکہ زندگی میں اپنے اس فعل پر اظہار ندامت اور توبہ اور استغفار ہی کرتے رہے، جبکہ ان کا یہ فعل بھولے سے ہوا تھا اور یہ گناہ نہیں تھا۔ اس لیے حضرت آدم (علیہ

السلام) کی اس مثال کو سامنے رکھ کر کوئی شخص اپنے دانستہ گناہوں پر یہ عذر پیش نہیں کر سکتا کہ اس کی تقدیر میں یونہی لکھا تھا۔ جب تک انسان دار التکلیف میں ہے، اس پر مکلفین کے احکام جاری ہوں گے۔ اس کو ملامت کی جائے گی اور اس پر حد یا تعزیر حسب عمل جاری ہوگی اور اگر بغیر توبہ کے مر گیا تو عذاب کا مستحق ہوگا۔ حضرت آدم (علیہ السلام) کا فعل اول تو حقیقتاً معصیت نہیں تھا۔ ثانیاً انھوں نے جو کچھ فرمایا وہ دار التکلیف سے جانے کے بعد فرمایا۔

(تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدیؒ)

آیت مبارکہ:

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ﴿۱۲﴾

لغۃ القرآن:

قَالَ : فرمایا] [مَا : نہیں] [مَنَعَكَ : روکا تجھے] [اَلَّا : کہ نہ] [تَسْجُدَ : تو سجدہ کرے] [اِذْ : جب] [اَمَرْتُكَ : میں نے حکم دیا تجھے] [قَالَ : فرمایا] [اَنَا : میں] [خَیْرٌ : بہتر ہے] [مِّنْهُ : اس بارے میں] [خَلَقْتَنِیْ : تو نے پیدا کیا مجھے] [مِّنْ : سے] [نَّارٍ : آگ] [وَّخَلَقْتَهٗ : اور تو نے پیدا کیا اسے] [مِنْ : سے] [طِیْنٍ : مٹی]

ترجمہ: ارشاد ہوا: (اے ابلیس!) تجھے کس (بات) نے روکا تھا کہ تو نے سجدہ نہ کیا جبکہ میں نے تجھے حکم دیا تھا، اس نے کہا: میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو تو نے مٹی سے بنایا ہے

تشریح:

بسا اوقات کسی چیز کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتے وقت اس کی ظاہری شکل و صورت کو ہی پیش نظر رکھا جاتا ہے اور اس کے جوہر ذاتی سے قطع نظر کر لی جاتی ہے۔ ابلیس کو فقط یہی یاد رہا کہ آدم کی تخلیق خاک سے اور اس کی آگ سے ہوتی ہے اور آگ افضل ہے خاک سے۔ اس لیے افضل کوئی کب زیب دیتا ہے کہ وہ اپنے سے کم تر کو سجدہ کرے۔ اس نادان کو یہ سمجھ نہ آئی کہ آدم کے سر پر خلافت ارضی کا تاج ہے۔ اس کا دل وہ آئینہ ہے جس میں آفتاب حقیقت کی کرنیں نور افشاں ہیں۔ نفخت فیہ من روحی کا سر نہاں اس سے اوجھل رہا۔ اسے یہ بھی سوجھی کہ جب نور سجدہ کناں ہے تو نار کو سجدہ کرنے میں تائل کیوں ہو۔ (بعض لوگ حضور رحمۃ للعلمین صلوۃ اللہ وسلامہ علیہ کی ظاہری بشریت میں یوں کھو کر رہ جاتے ہیں کہ حقیقت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جلوہ سامانیوں کو ان کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی

ف

دل بینا بھی کر خدا سے طلب ! آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

اور یہ بھی اس کی سراپا غلط فہمی تھی کہ آگ خاک سے افضل ہے۔ حالانکہ اپنی صفات و خاصیات کے اعتبار سے جو رفعت خاک کو حاصل ہے وہ آگ کو نصیب نہیں۔ متانت و وقار، حلم و صبر خاک کے خواص ہیں۔ اس کے برعکس طیش و تیزی غرور اور ارتفاع آگ کے لوازم ہیں۔ اسی وجہ سے آدم سے لغزش ہوئی تو فوراً نادم ہو کر تائب ہوئے اور مقام قرب پر فائز ہوئے ثم اجتباہ ربہ فتاب علیہ وھدی۔ اور ابلیس سے نافرمانی ہوئی تو وہ اس پر اڑ گیا اور ابدی شقاوت کا شکار ہو گیا۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ)

قال انا خیر منہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین۔

بولا کہ میں اس سے بہتر ہوں تو نے اسے خاک سے اور مجھے آگ سے پیدا کیا۔

اس کا یہ کہنا خود نظری اور تکبر کا اظہار تھا اور اپنی برتری کے جاہلانہ تصور کے پیش نظر نہ جھکنا انانیت اور حسد کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مٹی رزانت یعنی وزن میں اور اس کے وقار میں افضل ہے اور اس مٹی سے حلم و حیا اور صبر ہے اور یہی مٹی توبہ و استغفار کی طرف جھکاتی ہے۔ اور آگ میں طیش اور حدت اور بلندی کی طرف میلان ہے اور یہ آمادہ کرتی ہے تکبر کی طرف اور مٹی ملکوں کی تیاری کرتی ہے اور آگ ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے۔ آگ مظنہ خیانت وافنا ہے اور مٹی امانت اور بڑھانے کا سبب ہے۔ مٹی آگ کو بجھا دیتی ہے اور اسے ضائع کر دیتی ہے اور آگ اسے یعنی مٹی کو تلف نہیں کر سکتی۔ یہ وہ فضائل تراب تھے جس سے ابلیس جاہل رہا حتیٰ کہ اس کا قدم فاسد قیاسوں کی طرف پھسل گیا اور اول من قاس ابلیس۔ یعنی سب سے پہلے جس نے غلط قیاس کیا وہ شیطان ہے یہ قول قیاس کے متعلق آیا اس لیے کہ کسی شے ثابت شدہ پر قیاس کرنا مردود ہے جبکہ نص بھی موید ہو اور شیطانی قیاس امر منصوص پر عناد اتھا۔

(تفسیر الحسنات۔ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادریؒ)

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو مٹی سے، فرشتوں کو نور سے اور ابلیس و جنات کو آگ سے پیدا فرمایا۔ ابلیس فرشتوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے سجدہ کرنے کا حکم میں شامل تھا اور جب اس نے سجدہ نہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے سجدہ نہ کرنے کی وجہ دریافت فرمائی تو ابلیس نے جواب دیا کہ وہ آدم سے افضل ہے کیونکہ حضرت آدم (علیہ السلام) کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور ابلیس کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے۔ حالانکہ فضیلت کی بات یہ نہیں کہ کون کسی چیز سے پیدا کیا گیا ہے یا کس نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ اصل میں افض ہے وہ جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرتا ہے۔

ابلیس جن تھا یا فرشتہ

اس میں اختلاف ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا یا جنوں میں سے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ فرشتوں میں سے نہیں تھا بلکہ جنوں میں سے تھا کیونکہ یہ نص قطعی ہے کہ ابلیس جنوں میں سے تھا۔ (قرآن: ۱۸، ۵۰) نیز فرشتے معصوم ہوتے ہیں جبکہ ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، فرشتے نوری مخلوق ہیں جبکہ ابلیس آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور فرشتوں کی اولاد نہیں ہوتی جبکہ جنوں کا قبیلہ اور اولاد ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے پہلے جنوں کو زمین پر آباد فرمایا۔ جب انھوں نے آپس میں بغض و عناد کی وجہ سے فساد اور خون ریزی کا بازار گرم کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ ان کو جنگلوں اور پہاڑوں میں بھگا دیا۔ ان جنوں میں سے ایک ابلیس بھی تھا جو اس وقت ابھی بچہ تھا اور فرشتے اس کو اپنے ساتھ لے گئے، چنانچہ وہ فرشتوں کے ساتھ عبادت کرتا تھا اور اسی لیے فرشتوں کے ساتھ اسے بھی سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ (تفسیر بحر محیط: سورۃ بقرہ زیر آیت نمبر ۳۴)

ابلیس اسی (۸۰۰۰۰) سال فرشتوں کے ساتھ رہا اور بیس ہزار (۲۰۰۰۰) سال فرشتوں کو وعظ کرتا رہا۔ (حاشیہ صاوی علی الجلالین، سورۃ بقرہ زیر آیت نمبر ۳۴) اور وہ آسمان دنیا کا رئیس تھا۔ (تفسیر در منثور، سورۃ بقرہ زیر آیت نمبر ۳۴) نیز وہ فرشتوں کا مرشد بھی تھا اور ان سے زیادہ علم والا تھا۔ وہ کبھی زمین پر، کبھی آسمان پر اور کبھی جنت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا اور اس وجہ سے اسے غرور ہو گیا تھا کہ وہ فرشتوں سے افضل ہے۔ (تفسیر خازن، سورۃ بقرہ زیر آیت نمبر ۳۴)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "بیشک شیطان اور اس کا قبیلہ تمہیں دیکھتا ہے جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھ سکتے۔" (قرآن: ۷: ۲۷)

یعنی شیطان تمہیں نظر نہیں آتا مگر وہ تمہیں ہر وقت اور ہر جگہ دیکھتا ہے اور تمہارے دل کی گہرائی سے اٹھنے والے خیالات کو بھی جانتا ہے حتیٰ کہ جلیل القدر نبی حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے خواب پر بھی آگاہ تھا جس میں حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کو ذبح کرنے کا اشارہ ملا تھا۔ بعض جن مسلمان ہیں مگر شیطان جنوں کا ایسا قبیلہ ہے جو مسلمان نہیں۔ سارے شیاطین ابلیس کی اولاد ہیں اور وہ ان کا باپ ہے۔ (حاشیۃ صاوی علی الجلالین: سورۃ بقرہ زیر آیت نمبر ۳۴)

شیطان کی ہٹ دھرمی

ایک دفعہ شیطان نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے عرض کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بڑے مقبول ہیں میری شفاعت فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول فرمائے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے دعا فرمائی۔ حکم الٰہی ہوا: شیطان کو کہو کہ وہ حضرت آدم (علیہ السلام) کی قبر کو سجدہ کر دے تو اس کی توبہ قبول ہو جائے گی۔

شیطان نے پھر تکبر کیا اور کہا: میں نے آدم کو اس وقت سجدہ نہیں کیا تھا جب وہ زندہ تھا تو اب مردہ کو کیسے سجدہ کر سکتا ہوں؟ (تفسیر در منثور، سورۃ بقرہ زیر آیت نمبر ۳۴) (تفسیر امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

سجدہ کا لغوی اور شرعی معنی: علامہ ابن اثیر جزری متوفی 606ھ لکھتے ہیں: سجدہ کا لغت میں معنی ہیں سر نیچے کرنا، جھکنا، عاجزی اور خاکساری کرنا اور اس کا فقہی معنی ہے زمین پر پیشانی رکھنا اور اس سے بڑھ کر عاجزی اور تذلل متصور نہیں ہے۔ (النہایہ، ج 2، ص 302۔ 309، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت 1418ھ مجمع بحار الانوار ج 3 ص 37، مطبوعہ مکتبہ دار الایمان مدینہ منورہ 1415ھ)

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی 502ھ لکھتے ہیں: سجدہ کا شرعی معنی ہے: اللہ کے لیے تذلل اور عاجزی کرنا اور اس کی عبادت کرنا اور یہ انسان، حیوانات اور جمادات سب کو شامل ہے اور اس سجدہ کی دو قسمیں ہیں۔ سجدہ بالاختیار اور سجدہ بالتسخیر۔ سجدہ بالاختیار پر انسان ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے: " فاسجدوا للہ واعبدوا: سو اللہ کے لیے سجدہ کرو اور اس کی عبادت کرو" (النجم: 63)۔ اور سجدہ بالتسخیر اور سجدہ بالاختیار دونوں کی مثال یہ آیت ہے: " وللہ یسجد ما فی السموات ومافی الارض من دابۃ والملائکۃ وھم لایستکبرو: اور آسمانوں اور زمینوں میں جو چیزیں ہیں وہ سب اللہ ہی کو سجدہ کرتی ہیں، (ہر قسم کے) جاندار اور سب فرشتے اور وہ تکبر نہیں کرتے" (النحل: 149)۔ اور صرف سجدہ بالتسخیر کی مثال یہ آیتیں ہیں: " والنجم والشجر یسجدان: اور زمین پر پھیلنے والے پودے اور اپنے تنے پر کھڑے درخت سجدہ کرتے ہیں" (الرحمٰن: 6)۔ " وللہ یسجد من فی السموات والارض طوعا وکرھا وظلالھم بالغدو والاصال: آسمانوں اور زمینوں میں جو بھی ہیں، وہ (سب) خوشی یا مجبوری سے اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور ان کے سائے (بھی) صبح اور شام کو" (الرعد: 15)۔ قرآن مجید میں سجدہ کا اطلاق سجدہ عبودیت کی بجائے سجدہ تعظیم پر بھی کیا گیا ہے: "اسجدوا لادم: آدم کو سجدہ کرو" (البقرہ: 34)۔ " وخروا لہ سجدا: اور (ماں، باپ اور بھائی سب) یوسف کے لیے سجدہ میں گر گئے" (یوسف: 100)۔

سجدہ کا اطلاق نماز پر بھی کیا گیا ہے: " ومن اللیل فسبحہ وادبار السجود: رات کے کچھ وقت میں اس کی تسبیح کیجیے اور نمازوں کے بعد (بھی)" (ق: 40)۔

حضرت آدم سے افضل ہونے پر ابلیس کا یہ استدلال کہ آگ مٹی سے افضل ہے: اس آیت میں فرمایا ہے کہ ابلیس نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو سجدہ نہ کرنے کی یہ وجہ بیان کی: اس نے کہا: میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔ ابلیس کے جواب کی وضاحت یہ ہے کہ آگ مٹی سے بہتر ہے۔ کیونکہ آگ گرم خشک ہے اور مٹی سرد خشک ہے۔ اور حرارت برودت سے افضل ہے۔ کیونکہ گرمی حیات کے اور جوانی کے مناسب ہے اور ٹھنڈک موت اور بڑھاپے کے مناسب ہے اور حیات اور جوانی، موت اور بڑھاپے سے افضل ہے۔ نیز آگ تاثیر اور فعل کرتی ہے اور مٹی اثر قبول کرتی ہے اور انفعال کرتی ہے اور فعل، انفعال سے افضل ہے اور آگ کا خاصہ بلندی کی طرف جانا اور مٹی کا خاصا پستی کی طرف آنا ہے اور بلندی پستی سے افضل ہے۔ سو ان تین وجوہ سے آگ مٹی سے افضل ہے اور ابلیس آگ سے اور حضرت آدم سے افض (رح) ہوا اور افض (رح) کا مفضول کو سجدہ کرنا حکمت کے خلاف ہے۔

آگ سے مٹی کے افضل ہونے کی دس وجوہات: ابلیس کی یہ دلیل متعدد وجوہ سے باطل ہے کسی مرکب کی چار علتیں ہوتی ہیں۔ علت مادی، علت صوری، علت فاعلی اور علت غائی، ابلیس نے اپنے اور حضرت آدم کے درمیان صرف علت مادی سے تقابل کیا اور باقی تین علتوں سے صرف نظر کر لی۔ ثانیاً علت مادی کے اعتبار سے حضرت آدم، ابلیس سے افضل ہیں کیونکہ مٹی آگے سے حسب ذیل وجوہ سے افضل ہے:

1۔ آگ کی طبیعت کا تقاضا چیزوں کو علی الفور جلانا اور ان کو تلف کرنا ہے جبکہ مٹی کسی چیز کو تلف یا ضائع نہیں کرتی۔ 2۔ مٹی میں انسانوں اور حیوانوں کا رزق پیدا ہوتا ہے اور کپاس پیدا ہوتی ہے جس سے انسانوں کا لباس حاصل ہوتا ہے جبکہ آگ میں کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی۔ 3۔ مٹی میں اگر ایک دانہ ڈالا جائے تو اس کی برکت سے وہ کم و بیش سات سو گنا زیادہ پیدا ہوتا ہے جبکہ آگ کسی چیز کو بڑھانا تو کجا اصلاً نیست و نابود کر دیتی ہے۔ 4۔ آگ کو اپنے وجود میں مٹی کی احتیاج ہے۔ کیونکہ آگ زمین کے بغیر نہیں متحقق ہو گی۔ جبکہ زمین کو اپنے وجود میں آگ کی احتیاج نہیں ہے۔ 5۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کے بہ کثرت منافع اور فوائد کا قرآن مجید میں ذکر فرمایا ہے: " الم نجعل الارض مھادا: کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا" (النباء: 6)۔ " الم نجعل الارض کفاتا۔ احیاء واموتا۔ وجعلنا فیھا رواسی: کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہ بنایا۔ زندوں اور مردوں کے لیے۔ اور ہم نے اس میں بلند مضبوط پہاڑ پیدا کر دیے" (المرسلات: 25۔ 27)۔ " ھوالذی خلق لکم مافی الارض

جمیعا: وہی ہے جس نے تمہارے نفع کے لیے زمین کی سب چیزوں کو پیدا کیا" (البقرہ: 29)۔ اس کے برخلاف قرآن مجید کی اکثر اور بیشتر آیتوں میں آگ کو عذاب قرار دیا گیا ہے اور اس سے ڈرایا گیا ہے۔

6۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ نے زمین کو برکت قرار دیا ہے: " قل ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یومین و تجعلون لہ اندادا۔ ذلک رب العالمین۔ وجعل فیہا رواسی من فوقہا و بارک فیہا و قدر فیہا اقواتھا فی اربعۃ ایام۔ سواء للسائلین: آپ کہئے تم بیشک اس کے ساتھ ضرور کفر کرتے ہو جس نے دو دن میں زمین بنائی اور تم اس کے لیے شریک بناتے ہو، یہ پروردگار ہے سارے جہانوں کا۔ اور جس نے زمین کے اوپر بھاری پہاڑوں کو گاڑ دیا اور اس میں برکت دی، اور اس میں اس کے باشندوں کے لیے چار دنوں میں غذائیں رکھ دیں، جو طلب کرنے والوں کے لیے برابر ہیں" (حم السجدہ: 9-10)۔ " ونجیناہ ولوطا الی الارض التی بارکنا فیہا للعالمین: اور ہم نے ابراہیم اور لوط کو اس زمین کی طرف نجات دی جس میں ہم نے تمام جہان والوں کے لیے برکت فرمائی ہے" (الانبیاء: 71)۔ " ولسیمان الریح عاصفۃ تجری بامرہ الی الارض التی بارکنا فیہا: اور سلیمان کے لیے تیز ہوا مسخر کر دی جو ان کے حکم سے اس زمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکت رکھی" (الانبیاء: 81)۔ اس کے برخلاف آگ کی یہی صفت ہے کہ وہ چیزوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔

7۔ مٹی کے شرف کے لیے یہ کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں اپنا گھر (البیت الحرام) بنایا ہے جس میں ہر وقت طواف کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو سجدے کیے جاتے ہیں، اس کی عبادت کی جاتی ہے اور تسبیح، تہلیل اور تمجید کی جاتی ہے۔ علی ھذا القیاس۔ مسجد نبوی ہے، مسجد اقصیٰ ہے اور بیشمار مساجد ہیں جن میں دن رات اس کی حمد اور عبادت کی جاتی ہے اس کے برخلاف آگ میں ایسی کوئی فضیلت نہیں ہے۔

8۔ زمین میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے نفع کے لیے، معدنیات، دریا، سمندر، چشمے، پھلوں کے باغات، غلہ سے لدے ہوئے کھیت، سواریوں کے لیے اصناف واقسام کے جانور اور طرح طرح کے لباس پیدا کیے ہیں اور اس کے مقابلہ میں آگ کے اندر ایسا کوئی نفع نہیں ہے۔

9۔ آگ کی زیادہ سے زیادہ فضیلت یہ ہے کہ اس کی حیثیت زمین کے خادم کی ہے۔ اول تو آگ کا وجود زمین کے وسیلہ سے ہے۔ آگ یا لکڑیوں کو جلا کر حاصل ہوتی ہے یا گوبر کو جلا کر۔ یا قدرتی گیس سے اور تیل سے حاصل ہوتی ہے اور ان تمام چیزوں کا حصول زمین سے ہوتا ہے۔ ثانیاً آگ سے کھانا پکایا جاتا ہے یا حرارت حاصل کی جاتی ہے اور کھانے کے اجزاء ترکیبی بھی زمین سے حاصل ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ مٹی اصل اور مخدوم ہے اور آگ فرع اور خادم ہے اور اس کو مٹی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔

10۔ ابلیس لعین کا مادہ خلقت (مارج من نار) بھڑکنے والی آگ ہے اور بھڑکنے والی آگ اور شعلے فی نفسہ ضعیف ہیں۔ ہوا ان کو ادھر سے ادھر لے جاتی ہے اور ان کا بھڑکنا ہوا کے تابع ہے۔ اور مٹی فی نفسہ قوی ہے۔ ہوا اس کو اپنے زور سے ادھر ادھر نہیں لے جا سکتی بلکہ مٹی کی دیواریں اور پہاڑ ہوا کے لیے سد راہ بن جاتے ہیں قوی، ضعیف سے افضل ہوتا ہے اس لیے مٹی آگ سے افضل ہے۔ ثانیاً ابلیس لعین کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ آدم (علیہ السلام) کو مٹی سے بنایا گیا۔ حضرت آدم (علیہ السلام) کا پتلا مٹی اور پانی کو گوندھ کر دونوں سے بنایا گیا تھا اور پانی بھی آگ سے افضل ہے کیونکہ پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ نیز پانی کے افضل ہونے کے لیے یہ آیت کافی ہے: " وجعلنا من الماء کل شیء حی: اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے بنایا" (الانبیاء: 30)۔۔ الغرض حضرت آدم (علیہ السلام) کا مادہ خلقت مٹی اور پانی ہے اور یہ دونوں آگ سے افضل ہیں۔ اس لیے ابلیس لعین کا یہ کہنا غلط تھا کہ " میں آدم سے بہتر ہوں"۔

حضرت آدم کا چاروں علتوں کی وجہ سے ابلیس سے افضل ہونا: علت مادی کے بعد دوسری فضیلت کی وجہ علت صوری ہے اور علت صوری کے اعتبار سے بھی حضرت آدم (علیہ السلام) افضل ہیں: " لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم: بیشک ہم نے انسان کو سب سے حسین تقویم (ساخت) میں بنایا" (التین: 4)

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256ھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ الحدیث۔ (صحیح البخاری، ج 7، رقم الحدیث: 6237۔ صحیح مسلم بر 115 (2612) 6532۔ مسند احمد، ج 2، ص 244، 251، 315، طبع قدیم)

علت صوری کے بعد تیسری فضیلت کی وجہ علت فاعلی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کو حرف کن سے پیدا فرمایا اور حضرت آدم (علیہ السلام) کو خاص اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا: " قال یا ابلیس مامنعک ان تسجد لما خلقت بیدی: فرمایا: اے ابلیس! تجھے اس کے لیے سجدہ کرنے سے کس نے روکا جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا؟" (ص: 38)۔ " اذ قال ربک للملئکۃ انی خالق بشرا من طین۔ فاذا سویتہ ونفخت فیہ من روحی فقعوا لہ سجدین: جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا بیشک میں مٹی سے بشر بنانے والا ہوں۔ تو جب میں اسے درست کرلوں اور اس میں اپنی طرف کی (خاص) روح پھونک دوں تو تم اس کے لیے سجدہ کرتے ہوئے گرجانا" (ص: 71۔72)

فضیلت کی چوتھی وجہ علت غائی ہے اور حضرت آدم (علیہ السلام) کی غایت تخلیق اللہ تعالیٰ کی نیابت اور زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت ہے۔ فرمایا: " واذ قال ربک للملئکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃ: اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا بیشک میں زمین میں (اپنا) نائب بنانے والا ہوں" (البقرہ: 30)۔

اور اس سے بڑھ کر کسی مخلوق کی اور کیا فضیلت ہوسکتی ہے کہ وہ اللہ کا نائب اور اس کا خلیفہ ہو۔ اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ حضرت آدم (علیہ السلام) علت مادی، صوری، فاعلی اور غائی ہر اعتبار سے ابلیس لعین سے افضل ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا تو ابلیس پر لازم اور واجب تھا کہ وہ آپ کو سجدہ کرے لیکن اس نے اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کے مقابلہ میں فاسد قیاس کیا اور اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ حضرت آدم سے افضل ہے اور افضل کا مفعول کو سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔ بعض علماء ظاہر نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ مطلقاً قیاس اور اجتہاد کرنا جائز نہیں ہے۔ اس لیے ہم یہاں پر قیاس اور اجتہاد کی تحقیق کررہے ہیں۔

ابلیس کے باطل قیاس کی بناپر منکرین قیاس کے دلائل اور ان کا تجزیہ: امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی 311ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: ابن سیرین نے کہا سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کیا تھا اور سورج اور چاند کی پرستش صرف قیاس کی وجہ سے کی گئی ہے۔ حسن بصری نے کہا سب سے پہلے جس نے قیاس کیا تھا، وہ ابلیس ہے۔ (جامع البیان، جز8، ص173، مطبوعہ دارالفکر، بیروت، 1415ھ۔ سنن دارمی ج1، رقم الحدیث 191، طبع بیروت، 1407ھ)۔

حافظ ابو نعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی متوفی 430ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: " عمرو بن جمیع بیان کرتے ہیں کہ میں، ابن ابی لیلیٰ اور (امام ابوحنیفہ، حضرت جعفر بن محمد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عبداللہ بن شبرمہ نے کہا میں اور (امام) ابوحنیفہ، حضرت جعفر بن محمد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت جعفر بن محمد نے ابن ابی لیلیٰ سے پوچھا: تمہارے ساتھ کون ہے؟ انھوں نے کہا یہ وہ شخص ہے جس کو امور دین میں بہت مہارت اور بصیرت حاصل ہے۔ حضرت جعفر نے کہا: شاید یہ دین کے معاملات میں اپنی رائے سے قیاس کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا نعمان! (الی قولہ) حضرت جعفر نے امام ابوحنیفہ سے کہا۔ اے نعمان! مجھے میرے والد نے میرے دادا سے یہ حدیث روایت کی ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس نے سب سے پہلے دین کے معاملہ میں اپنی رائے سے قیاس کیا، وہ ابلیس تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا: (حضرت) آدم کو سجدہ کرو اس نے کہا: میں اس سے بہتر ہوں، تونے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے، سو جس نے دین میں اپنی رائے سے قیاس کیا، اس کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ابلیس کے ساتھ اکٹھا کرے گا۔ ابن شبرمہ کی روایت میں یہ اضافہ ہے، پھر حضرت جعفر نے ان سے پوچھا: قتل نفس اور زنا میں کونسا گناہ زیادہ بڑا ہے؟ امام ابوحنیفہ نے کہا: قتل نفس۔ حضرت جعفر نے کہا: اللہ تعالیٰ نے قتل نفس کے لیے صرف دو گواہ کافی قرار دیے۔ پھر زنا کے ثبوت کے لیے چار مردوں کی گواہی کیوں ضروری ہے؟ پھر پوچھا: نماز اور روزے میں کونسا فرض زیادہ اہم ہے؟ امام ابوحنیفہ نے کہا نماز! حضرت جعفر نے کہا: پھر کیا وجہ ہے کہ حائض عورت صرف روزے کی قضا کرتی ہے اور نماز کی قضا کا حکم نہیں ہے؟ پھر کہا: تمہارے قیاس کرنے پر افسوس ہے! اللہ سے ڈرو اور دین میں اپنی رائے سے قیاس نہ کرو" (حلیۃ الاولیاء، ج3، ص196۔197، دارالکتاب العربی، بیروت، 1407ھ، ایضاً ج3، رقم الحدیث: 3797، دارالکتب العلمیہ، بیروت، 1418ھ)

حضرت جعفر بن محمد نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جو حدیث روایت کی ہے، اس کے متعلق قاضی محمد بن علی بن محمد شوکانی متوفی 1250ھ اور نواب صدیق حسن خان بھوپالی متوفی 1307ھ لکھتے ہیں: "اس حدیث کی سند میں غور کرنا چاہیے۔ میرا گمان یہ ہے کہ یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد

نہیں ہے اور یہ حدیث کلام نبوت کے مشابہ نہیں ہے" (فتح القدیر، ج 2، ص 193، مطبوعہ عالم الکتب، بیروت۔ فتح البیان، ج 3، ص 262، مطبوعہ المطبعہ الکبری بولاق، مصر، 1301ھ)

اس حدیث کی سند میں ایک راوی ہے۔ سعید بن عنبسہ۔ اس کے متعلق حافظ شمس الدین محمد بن احمد ذہبی متوفی 748ھ لکھتے ہیں: یحییٰ نے کہا: یہ کذاب ہے اور ابو حاتم نے کہا: یہ صادق نہیں۔ اس نام کا ایک دوسرا شخص ہے وہ مجہول ہے۔ اس نام کا ایک تیسرا شخص ہے۔ امام ابن جوزی نے اس پر کوئی طعن نہیں کیا لیکن یہ متعین نہیں ہے کہ اس سند میں کونسا شخص مراد ہے۔ (میزان الاعتدال، ج 3، ص 223، مکتبہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ج 3 ص 1416ھ)

اس حدیث کا ایک اور راوی ہے عمرو بن جمیع، اس کے متعلق حافظ ذہبی لکھتے ہیں: 'ابن معین نے اس کو کذاب قرار دیا۔ امام دار قطنی اور ایک جماعت نے کہا: یہ متروک ہے۔ ابن عدی نے کہا: اس پر حدیث گھڑنے کی تہمت ہے۔ امام بخاری نے کہا: یہ منکر الحدیث ہے' (میزان الاعتدال، ج 5، ص 304، مطبوعہ دار الکتب العلمی، بیروت، 1416ھ)

نظام معتزلی اور بعض اہل الظاہر قیاس کے منکر ہیں اور صحابہ کرام، تابعین عظام اور ان کے بعد کے جمہور علماء قیاس کے قائل ہیں اور قیاس سے جو احکام مستنبط ہوں، ان پر عمل کرنا شرعاً جائز ہے اور عقلاً واقع ہے۔ بعض شوافع اور ابوالحسین بصری کے نزدیک اس پر عمل کرنا عقلاً واجب ہے' (الجامع لاحکام القرآن، جز 7، ص 155، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415ھ)

مجوزین قیاس کا احادیث سے استدلال: امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256ھ نے اپنی صحیح میں یہ عنوان قائم کیا ہے: جس شخص نے کسی پیش آمدہ مسئلہ کو ایسی متعارف اصل پر قیاس کیا ہو جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیا ہو تاکہ سوال کرنے والا اس مسئلہ کو سمجھ سکے، اور اس عنوان پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے: ' حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی اور سوال کیا کہ میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی۔ پھر وہ حج کرنے سے پہلے فوت ہو گئی۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کرلوں؟ آپ نے فرمایا: اس کی طرف سے حج کرلو۔ یہ بتاؤ کہ اگر تمہاری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تم اس کو ادا کرتیں؟ اس نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: پھر اللہ کا قرض ادا کرو۔ وہ ادا کیے جانے کا زیادہ حق دار ہے' (صحیح البخاری، ج 8، رقم الحدیث: 7315، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1412ھ)

نیز امام بخاری نے ایک باب کا یہ عنوان قائم کیا ہے۔ قرآن مجید کے مطابق قاضیوں کا اجتہاد کرنا اور یہ کہا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صاحب حکمت کی تعریف کی ہے جبکہ وہ حکمت سے فیصلے کرے اور حکمت کی تعلیم دے اور از خود کوئی حکم نہ دے اور خلفاء سے مشورے کرے اور اہل علم سے تبادلہ خیال کرے، اور اس پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے: 'حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا صرف دو (قسم کے) آدمیوں پر حسد (رشک) کرنا جائز ہے۔ ایک وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو اور اس مال کو راہ حق میں خرچ کرنے پر اس کو مسلط کردیا ہو اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے حکمت دی ہو وہ اس کے مطابق فیصلے کرتا ہو اور لوگوں کو تعلیم دیتا ہو' (صحیح البخاری، ج 8، رقم الحدیث: 7316، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1412ھ)

نیز امام بخاری نے ایک باب کا یہ عنوان قائم کیا: جن احکام کی معرفت دلائل سے ہو پھر دلائل کی یہ تفسیر کی کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے گھوڑوں کے احکام بیان فرمائے اور جب آپ سے گدھوں کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے ان کا حکم اس آیت سے مستنبط کیا فمن یعمل مثقال ذرۃ خیر یرہ اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے گوہ کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: میں اس کو کھاتا ہوں اور نہ اس کو حرام کرتا ہوں اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دستر خوان پر گوہ کھائی گئی ہے۔ اس سے حضرت ابن عباس (رض) نے یہ استدلال کیا ہے کہ گوہ حرام نہیں ہے اور اس عنوان کے تحت یہ حدیث سند کے ساتھ بیان کی ہے۔ 'حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: گھوڑے تین قسم کے ہیں۔ گھوڑا کسی کے لیے باعث اجر ہوتا ہے اور کسی کی پردہ پوشی کا سبب ہوتا ہے اور کسی کے حق میں گناہوں کا بوجھ ہوتا ہے۔ وہ شخص جس کے لیے اس کا گھوڑا باعث اجر ہے، یہ وہ شخص ہے جس نے گھوڑے کو اللہ کے راستہ میں باندھ دیا۔ وہ چراگاہ یا باغ میں اس کی رسی دراز کردیتا ہے۔ وہ اس چراگاہ یا باغ سے جو کچھ کھاتا ہے، وہ اس کی نیکیاں ہیں اور اگر وہ اس کی رسی کاٹ دے اور وہ

کسی ایک ٹیلے یا دو ٹیلوں پر جائے تو اس کے چلنے اور اس کی لید کے بدلہ میں اس کی نیکیاں ہیں اور اگر وہ کسی دریا سے پانی پیئے خواہ اس کا قصد پانی پلانے کا نہ ہو پھر بھی اس کی نیکیاں ہیں اور اس گھوڑے میں اس شخص کے لیے اجر ہے۔ اور ایک شخص نے گھوڑے کو اس لیے رکھا کہ وہ اپنی ضروریات میں دوسروں سے مستغنی رہے اور ان سے سوال کرنے سے بچا رہے اور اس پر کسی کو سوار کرنے میں یا اس پر کس کا بوجھ لادنے میں اللہ کے حق کو فراموش نہ کرے تو یہ گھوڑا اس کے گناہوں کی پردہ پوشی کا سبب ہے۔ اور ایک وہ شخص ہے جس نے اپنے گھوڑے کو فخر کرنے اور ریاکاری کے لیے رکھا تو یہ اس کے اوپر گناہ ہے، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے گدھوں کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: مجھ پر ان کے متعلق کوئی خصوصی حکم نازل نہیں ہوا مگر یہ آیت جو تمام احکام کو جامع ہے: ' فمن یعمل مثقال ذرۃ خیر ایرہ۔ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ: جس نے ایک ذرہ کے برابر نیکی کی وہ اس کی جزا پائے گا اور جس نے ایک ذرہ کے برابر برائی کی وہ اس کی سزا پائے گا' (الزلزال: 7۔8) ' (صحیح البخاری، ج 8، رقم الحدیث: 3756۔ صحیح مسلم، الزکوۃ: 24 (987) 2254۔ سنن النسائی، ج 6، رقم الحدیث: 3563) ۔اس حدیث میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک مخصوص اور جزی حکم پر ایک عام اور کلی حکم سے استدلال کیا ہے اور اس حدیث میں پیش آمدہ مسائل اور جزئیات پر شرعی کلیات سے استدلال کرنے کی دلیل ہے۔

مجوزین قیاس کا آثار صحابہ اور اقوال علماء سے استدلال: علامہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت سے مسائل کا استنباط کرنا اور اجتہاد کرنا، اور امت کا اجماع برحق اور واجب ہے، اور اہل علم کے لیے لازماً فرض ہے۔ اس کے ثبوت میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی احادیث اور صحابہ اور تابعین کی روایات موجود ہیں۔ ابو تمام مالکی نے کہا: کہ قیاس کے جواز پر امت کا اجماع ہے، یہی وجہ ہے کہ ائمہ اربعہ نے ربا الفضل میں چھ چیزوں (سونا، چاندی، گندم، جو، نمک اور کھجور) پر دوسری چیزوں کو قیاس کیا ہے اور ان میں بھی زیادتی کے ساتھ بیع کو حرام قرار دیا ہے اور جب حضرت ابو بکر (رض) نے بیعت لینے سے انکار کیا تو حضرت علی (رض) نے فرمایا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے دین میں آپ پر راضی ہوگئے تو ہم اپنی دنیا میں آپ پر کیوں راضی نہیں ہوں گے۔ حضرت علی (رض) نے امام کو نماز پر قیاس کیا، اور حضرت ابو بکر (رض) نے زکوۃ کو نماز پر قیاس کیا اور کہا: بہ خدا اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوۃ کو جمع کیا ہے میں ان میں تفریق نہیں کروں گا، اور حضرت علی (رض) نے صحابہ کرام کے سامنے شراب کی حد کو حد قذف پر قیاس کیا اور فرمایا: انسان شراب کے نشہ میں ہذیان بکتا ہے اور ہذیان میں لوگوں پر تہمت لگاتا ہے لہٰذا اس کی حد بھی اسی کوڑے ہوگی، اور پھر اس حد پر تمام صحابہ کا اجماع ہوگیا اور حضرت عمر (رض) نے حضرت ابو موسیٰ اشعری سے فرمایا: کہ جن نئے مسائل میں تم کو تشوش ہو اور کتاب اور سنت میں ان کی تصریح نہ ہو تو ان کے متعلق تم قیاس سے کام لو اور جو چیز حق کے مشابہ ہو اس پر عمل کرو۔ اس حدیث کو امام دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ (سنن دار قطنی، ج 4، رقم الحدیث: 4452، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1417 ھ)

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256 ھ روایت کرتے ہیں: ' حضرت عبداللہ بن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب (رض) شام کے علاقہ میں گئے۔ حتی کہ جب وہ مقام سرغ میں پہنچے تو ان سے لشکر کے امراء نے ملاقات کی، جن میں حضرت ابو عبیدہ بن جراح اور ان کے اصحاب بھی تھے۔ انھوں نے یہ خبر دی کہ شام میں وبا پھیل چکی ہے۔ اب ان کا اس میں اختلاف ہوا کہ وہ شام میں داخل ہوں یا نہ ہوں۔ بعض صحابہ نے کہا: ہم ایک کام کے لیے آئے ہیں اور اس کام کو کیے بغیر واپس نہیں جائیں گے اور بعض نے یہ کہا: کہ آپ کے ساتھ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب ہیں اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ آپ ان کو وبا میں جھونک دیں۔ حضرت عمر نے ان لوگوں کو مجلس سے اٹھا دیا اور انصار کو بلایا انھوں نے بھی مہاجرین کی طرح مشورہ دیا اور ان میں بھی اسی طرح اختلاف ہوا۔ پھر آپ نے ان کو بھی اٹھا دیا اور قریش کے عمر رسیدہ لوگوں کو بلایا۔ انھوں نے بالاتفاق یہ کہا کہ لوگوں کو اس بلا میں نہ ڈالیں اور واپس چلیں۔ پھر حضرت عمر نے اعلان کر دیا کہ ہم صبح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراح نے کہا: کیا آپ اللہ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں! حضرت عمر نے فرمایا: اے ابو عبیدہ! کاش تمہارے علاوہ کوئی اور شخص یہ بات کہتا! ہم اللہ کی ایک تقدیر سے اللہ کی دوسری تقدیر کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ بتاؤ اگر تمہارے پاس اونٹ ہوں او تم ایک وادی میں جاؤ جس کے دو کنارے ہوں، ایک سرسبز ہو اور ایک بنجر ہو۔ اگر تم سرسبز کنارے کی طرف جاؤ پھر بھی اللہ کی تقدیر کی طرف جاؤ گے اور اگر بنجر کنارے کی طرف جاؤ پھر بھی اللہ کی تقدیر کی طرف جاؤ گے۔ اس وقت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف آ گئے جو کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا: اس کے

متعلق میرے پاس ایک حدیث ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب تمہیں کسی علاقہ میں بلا کا علم ہو تو وہاں نہ جاؤ۔ اور جب تم کسی علاقہ میں ہو اور وہاں وبا آ جائے تو وہاں سے نہ نکلو۔ پھر حضرت عمر نے اللہ کی حمد کی اور وہاں سے واپس لوٹ گئے۔ (صحیح البخاری، ج 7 رقم الحدیث 5729، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1412ھ)

اس مضمون کی احادیث آثار اور اقوال ائمہ بہ کثرت ہیں اور ان میں یہ دلیل ہے کہ قیاس دین کی ایک اصل اصی ہے۔ مجتہدین اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور علماء اس سے استدلال کرتے ہیں اور احکام کا استنباط کرتے ہیں۔ اس پر ہر دور کے علماء کا اجماع رہا ہے اور چند شاذ لوگوں کی مخالفت سے اس اجماع پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو قیاس ممنوع اور مذموم ہے یہ وہ قیاس ہے جس کی اصل کتاب اور سنت میں موجود نہ ہو اور جو نصوص صریحہ سے متصادم ہو جیسے ابلیس کا قیاس تھا۔ اس نے اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کے مقابلہ میں قیاس کیا۔ حالانکہ قیاس اس وقت کیا جاتا ہے جب کسی مسئلہ میں صریح حکم نہ ہو۔ قرآن میں نہ حدیث میں۔ مخالفین قیاس نے اپنے موقف کی تائید میں جو روایات ضعیفہ اور اقوال رکیکہ پیش کیے ہیں. بر تقدیر ثبوت ان کا محمل اس قسم کا قیاس ممنوع اور مذموم ہے جس کی اصل کتاب، سنت اور اجماع امت میں موجود نہ ہو' (الجامع لاحکام القرآن، جز 7، ص 155-156، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415ھ)

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی متوفی 606ھ لکھتے ہیں: 'قیاس کرنا واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "فاعتبروا یا اولی الابصار: اے آنکھیں رکھنے والو! عبرت حاصل کرو" (الحشر: 2)۔ اس آیت میں قیاس کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سب سے زیادہ بصیرت رکھنے والے تھے اور قیاس کی شرائط پر سب سے زیادہ مطلع تھے اور اس آیت میں آپ کو بھی قیاس کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ آپ بھی قیاس کرتے تھے' (المحصول، ج 4، ص 1356-1364، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ، ریاض، 1417ھ)

اور ہم اس سے پہلے اس بحث میں صحیح بخاری کے حوالے سے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قیاس کرنے کے ثبوت میں حدیث پیش کر چکے ہیں۔

(تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدیؒ)

سجدہ کا حکم ہوتے ہی تمام ملائکہ آدم (علیہ السلام) کے حضور سر بسجود ہوئے لیکن شیطان نے حضرت آدم (علیہ السلام) کا احترام و مقام دیکھ کر حسد اور تکبر کی وجہ سے سجدہ ریز ہونے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ وہ جرم پر جرم اور گستاخی پر گستاخی کرتا چلا گیا۔ اس جگہ اجمال ہے جبکہ دوسرے مقامات پر شیطان کے انکار کی تفصیلات یوں بیان کی گئی ہیں۔

(وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ط قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا) [الاسراء: ٦١]

"اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو ابلیس کے علاوہ سب نے سجدہ کیا اور اس نے کہا کہ کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔"

(اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ) [الاعراف: ١٢]

"میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے اور اسے مٹی سے پیدا کیا ہے۔"

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

آیت مبارکہ:

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ○۱۳

لغۃ القرآن: قَالَ : فرمایا] [فَاهْبِطْ : پھر اتر جا] [مِنْهَا : اس سے] [فَمَا : تو نہ] [يَكُوْنُ : ہوسکتی ہے] [لَكَ : تیرے لیے] [اَنْ : کہ] [تَتَكَبَّرَ : تو تکبر کرے] [فِيْهَا : اس میں] [فَاخْرُجْ : پس تو نکل جا] [اِنَّكَ : بیشک تو ہی] [مِنَ : سے] [الصّٰغِرِيْنَ : ذلیل ہونے والوں]

ترجمہ: ارشاد ہوا: پس تو یہاں سے اتر جا تجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تو یہاں تکّبر کرے پس (میری بارگاہ سے) نکل جا بیشک تو ذلیل و خوار لوگوں میں سے ہے

تشریح:

جب ابلیس کا تکبر اور حسد اس کے کلام اور عمل سے ظاہر ہو گیا تو رب تعالٰی نے اس کے دلائل کا جواب نہیں دیا بلکہ اس سے فرمایا کہ تو اس نورانی جماعت ملائکہ سے یا جنت سے یا آسمانوں سے نیچے گر کر زمین پر پہنچ۔ تجھے ان مبارک مجلسوں مبارک مقامات پر رہ کر غرور تکبر کرنا کسی طرح جائز نہ تھا کہ یہ مجلسیں یہ مقامات تو متواضعین عجز و انکسار کرنے والوں کے لئے ہیں یہاں متکبر لوگ نہ تو آسکتے ہیں نہ رہ سکتے ہیں بلکہ تو ظاہری زمین سے بھی نکل جا ویرانوں، جزیروں، سمندروں میں رہو۔ ظاہر زمین اولاد آدم علیہ السلام کے لئے ہے یہاں تیرا چکر رہے گا یہاں مارا مارا پھرے گا ہر طرف سے لعنت و پھٹکار کھاتا رہے گا تو وہاں ذلیلوں حقیروں میں سے ایک ہو گا اس عتابانہ کلام کو سن کر اس اوندھی سمجھ والے نے معافی نہ مانگی بلکہ زیادہ جرم و قصور کرنے کے لئے لمبی عمر مانگی بولا اے مولٰی! مجھے قیامت کے دوسرے نفخہ تک مہلت دے جب موت کا وقت نکل چکا ہو رب تعالٰی نے فرمایا کہ تیری یہ دعا کچھ ترمیم سے منظور ہے کہ تجھے نفخ اولٰی تک مہلت ہے اس وقت تک قیامت تک رہنے والوں کو بھی موت آئے گی۔ اور تجھے بھی۔ خیال رہے کہ تکبر وہ عیب ہے جس کی وجہ سے دل میں سختی پیدا ہوتی ہے سخت دل والا اللہ کی ہر رحمت سے محروم ہے سخت زمین میں پیداوار نہیں ہوتی ٹھنڈا سخت لوہا پرزہ وغیرہ نہیں بنتا ٹھنڈا سخت سونا زیور نہیں بنتا سخت آٹا روٹی نہیں بنتا یونہی سخت دل انسان کچھ بھی نہیں بنتا تکبر ہر جگہ ہی برا ہے مگر مدینہ منورہ کی سرزمین میں زیادہ برا ہے اے مدینہ جانے والے اپنی ساری برائیاں اپنے گھر چھوڑ جا وہاں بجز اور ندامت لے کر جا۔ شیطان کے اس واقعہ سے عبرت پکڑ۔

(تفسیر نعیمی)

نکل جاؤ! ہماری بارگاہ قرب و رحمت میں صرف ان کے لیے جگہ ہے جو ہمارے ہر حکم کے سامنے سرافگندہ ہوں۔ اکڑی ہوئی گردن والوں کا یہاں کیا کام۔ حضرت ابن مسعود (رض) فرماتے ہیں کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔ لا یدخل الجنتہ احد فی قلبہ مثقال ذرۃ من خردل من کبر (مسلم) یعنی جس کے دل میں رائی کے دانہ جتنا غرور ہو گا اس پر جنت کے دروازے بند ہوں گے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

"قال فاهبط منها" یہ نیا جملہ ہے جس میں رب تعالی کے اس فرمان عالی کا ذکر ہے جو شیطان کی مذکورہ بکو اس کے جواب میں ارشاد ہوا قال کا فاعل اللہ تعالی ہے مگر اس میں گفتگو ہے کہ رب تعالٰی نے براہ راست بلا واسطہ اس سے یہ کلام فرمایا یا کسی فرشتے کے ذریعہ۔ ظاہر یہ ہے کہ براہ راست ہی یہ کلام فرمایا کہ رب نے کہا ابلیس نے سنا مگر چونکہ یہ کلام عزت کا نہیں بلکہ ذلت و خواری کا ہے اس لئے اس کلام سے ابلیس کی عزت نہ بڑھی نہ اسے کلیم اللہ کہا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے رب تعالی کا کلام فرمانا عزت و عظمت کا تھا لہٰذا اس کلام سے موسیٰ علیہ السلام کی عزت افزائی ہوئی اور وہ کلیم اللہ کے خطاب سے نوازے گئے (روح المعانی و کبر وغیرہ) غرضیکہ کلام بہت قسم کا ہے، پیار کا، کاروبار کا، عزت و وقار کا، عذاب و قہر کا۔ موسیٰ علیہ اسلام سے کلام ہوا، عزت و وقار کا حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے معراج میں کلام فرمایا محبت و پیار کا فرشتوں سے کلام ہوتا ہے ملکی انتظام و کاروبار کا انہیں سے ان میں سے کوئی کلام نہیں ہوا ہے بلکہ اس سے قہر و غضب کا ہوا۔

چونکہ تیری اصلی بد ذاتی آج ظاہر ہوئی لہذا تو اتر جا۔ گویا اب تک تیری عزت تیرا عروج تیری ظاہری اطاعت کی وجہ سے تھا اھبط بنا ہے ھبوط سے جس کے معنی ہیں اوپر سے نیچے گرنا، بلندی سے نیچے پھینکا جانا خواہ جگہ کی بلندی ہو یا درجہ اور رتبہ کی یہاں دونوں احتمال ہیں اس لئے منھا میں کئی احتمال ہو سکتے ہیں۔ (1) اس سے مراد جنت ہے۔ (2) اس سے مراد آسمان ہیں۔ (3) اس سے مراد جماعت ملائکہ ہے ان تین صورتوں میں ھبوط کے معنی ہیں اونچی جگہ سے گرنا، دھکیلا جانا، اس سے مراد اس کا پچھلا درجہ اور قرب الٰہی ہے جو اسے اب تک میسر تھا یا اس سے مراد اس کی شکل و صورت ہے کیونکہ اب تک وہ فرشتوں کی صورت میں تھا بڑا خوبصورت۔ ان دونوں صورتوں میں ھبوط سے مراد ہے درجہ سے گرنا لہٰذا اس کی پانچ تفسیریں ہیں۔ (تفسیر کبیر و خازن معانی وغیرہ) خیال رہے کہ فاھبط امر عذاب ہے نہ کہ امر شرعی (روح البیان)

(تفسیر نعیمی۔

صاغر اس ذلیل و حقیر کو کہتے ہیں جو اپنی ذلت اور پستی پر خوش ہو۔ الصاغر الراضی بالمنزلۃ الدنیۃ (قاموس) اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا نافرمان ذلیل و حقیر ہوتا ہے۔ شیطان کس مقام عزت پر فائز تھا۔ اور جب حکم الٰہی سے سرتابی کی تو ذلت و رسوائی کی پستیوں میں پھینک دیا گیا۔

شیطان کے ساتھ طویل مکالمہ اس کی فضیلت کا موجب نہیں :

یہ اللہ تعالیٰ اور شیطان کے درمیان مکالمہ ہے۔ سورۃ ص میں یہ مکالمہ بہت تفصیل کے ساتھ آیت 74 سے آیت 84 تک ذکر فرمایا ہے۔ ان آیات کا ترجمہ یہ ہے : "اے ابلیس تجھ کو اس سجدہ کرنے سے کس نے منع کیا جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا، کیا تو نے (اب) تکبر کیا یا تو (ابتدء) تکبر کرنے والوں میں سے تھا۔ اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے پیدا کیا۔ فرمایا تو اس (جنت) سے نکل جا، کیونکہ بیشک تو مردود ہو گیا اور بیشک قیامت کے دن تک تجھ پر میری لعنت ہے۔ اس نے کہا اے میرے رب! پھر مجھے اس دن تک مہلت دے جس میں لوگ اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا بیشک تو مہلت پانے والوں میں سے ہے۔ اس دن تک جس کی میعاد ہمیں معلوم ہے۔ اس نے کہا پس تیری عزت کی قسم میں ان سب کو ضرور بہکاؤں گا۔ ماسوا ان کے جو تیرے پر خلوص بندے ہیں۔ فرمایا یہ حق ہے اور میں حق ہی فرماتا ہوں۔ میں تجھ سے اور تیرے سب پیروکاروں سے جہنم بھر دوں گا"۔ قرآن مجید میں اتنا طویل کلام کسی نبی کے ساتھ مذکور نہیں ہے۔ اس وجہ سے یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اگر اللہ کے ساتھ ہم کلام ہونے سے کوئی شرف اور مقام حاصل ہوتا ہے تو از روئے قرآن زیادہ شرف اور مقام تو ابلیس لعین کو حاصل ہو گیا اس کے دو جواب ہیں۔ پہلا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے اللہ تعالیٰ نے جو کلام فرمایا تھا وہ براہ راست کلام فرمایا تھا اور ابلیس لعین سے فرشتوں کی وساطت سے کلام فرمایا تھا۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے بہ طور انعام اور اکرام کلام فرمایا تھا اور ابلیس لعین سے بہ طور اہانت کلام فرمایا۔

ابلیس کو جنت سے اترنے کا حکم دیا گیا تھا یا آسمان سے ! :

اللہ تعالیٰ نے فرمایا : " یہاں سے اتر "۔ امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری نے لکھا ہے : اس کا معنی یہ ہے کہ جنت سے اتر جا۔ کیونکہ اللہ کے حکم کے مقابلہ میں تکبر کرنے والا یہاں نہیں رہتا۔ (جامع البیان، جز 8، ص 174، مطبوعہ دار الفکر)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی نے حضرت ابن عباس (رض) سے نقل کیا ہے کہ ابلیس جنت عدن میں رہتا تھا۔ حضرت آدم (علیہ السلام) کو اسی جنت میں پیدا کیا گیا تھا اور ابلیس کو اسی جنت سے نکلنے کا حکم دیا گیا تھا۔ (تفسیر کبیر، ج 5، ص 210، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

اور علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبیؒ متوفی (668ھ) لکھتے ہیں : ایک تفسیر یہ ہے کہ تو آسمان سے اتر جا کیونکہ آسمان رہنے والے وہ فرشتے ہیں جو متواضع ہیں۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ تو اپنی موجودہ صورت سے دوسری صورت میں منتقل ہو کیونکہ تو نے آگ کی صورت پر فخر اور تکبر کیا سو اس کی صورت تاریک اور سیاہ بنادی گئی اور اس کی روشنی اور چمک زائل ہو گئی۔ تیسری تفسیر یہ ہے کہ زمین سے سمندروں کے جزیروں کی طرف منتقل ہو جا اور اب وہ زمین میں صرف اس طرح داخل ہو سکے گا جس طرح چور داخل ہوتے ہیں۔ تاہم پہلی تفسیر راجح ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن، جز 7، ص 156، مطبوعہ دار الفکر، 1415ھ)

شیخ اشرف علی تھانوی متوفی 1364ھ اور مفتی محمد شفیع دیوبندی متوفی 1396ھ نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔ چنانچہ شیخ تھانوی نے لکھا ہے تو آسمان سے نیچے اتر، تجھ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ تو تکبر کرے (خاص کر) آسمان میں رہ کر۔ (بیان القرآن، ج 1، ص 315، مطبوعہ تاج کمپنی لاہور، معارف القرآن، ج 3، ص 526، مطبوعہ ادارۃ المعارف، کراچی، 1993ء)

علامہ قرطبیؒ، شیخ تھانوی اور مفتی محمد شفیع نے جس تفسیر پر اعتماد کیا ہے کہ شیطان کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اترنے کا حکم دیا تھا یہ معتزلہ کے مذہب کے مطابق ہے۔ کیونکہ معتزلہ اس کے قائل نہیں ہیں کہ جنت بنی ہوئی ہے اور حضرت آدم کا پتلا جنت میں تیار کیا گیا اور ابلیس جنت میں رہتا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ جنت کا ابھی بنانا عبث ہے۔ جنت کو قیامت کے بعد بنایا جائے گا۔ اس لیے امام رازی نے لکھا ہے کہ بعض معتزلہ نے کہا کہ ابلیس کو آسمان سے اترنے کا حکم دیا گیا تھا۔ (تفسیر کبیر، ج 5، ص 210، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1415ھ)

امام رازی نے بعض معتزلہ فرمایا ہے، کیونکہ اکثر معتزلہ بھی اس کے قائل ہیں کہ جنت بنائی جا چکی ہے اور ابلیس کو جنت سے نکالا گیا تھا۔ مشہور معتزلی مفسر جار اللہ زمخشری متوفی 528ھ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو آسمان سے اترنے کا حکم دیا (کشاف، ج 2 ص 90) اور ایک دوسرے معتزلی مفسر قاضی ابو محمد عبدالحق بن غالب بن عطیہ اندلسی متوفی 546ھ نے لکھا ہے اس کو جنت سے اترنے کا حکم دیا گیا تھا۔ (المحرر الوجیز، ج 7، ص 19، مطبوعہ مکتبہ تجاریہ، مکہ مکرمہ)

تواضع کرنے والے کے لیے سربلندی اور تکبر کرنے والے کے لیے ذلت اور پستی: اس آیت میں مذکور ہے کہ ابلیس نے تکبر کیا اور اپنے آپ کو حضرت آدم سے بڑا اور اچھا سمجھا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو جنت سے نکال دیا اور فرمایا تو ذلیل ہونے والوں میں سے ہے اور اس کے بعد کی آیت میں مذکور ہے کہ حضرت آدم نے (باوجود بھولے سے شجر ممنوع سے کھانے کے فعل پر) توبہ اور استغفار سے کام لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے سر پر تاج کرامت رکھا اور زمین کی خلافت انھیں سونپ دی اور ان کو اپنا نائب بنایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے تواضع کرے، اللہ تعالیٰ اس کو بلند کرتا ہے اور جو تکبر کرے اور بڑا بنے تو اللہ تعالیٰ اس کو رسوا اور ذلیل کرتا ہے۔

حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ تواضع کرو۔ حتیٰ کہ کوئی شخص دوسرے پر فخر نہ کرے۔ اور کوئی شخص کسی کے خلاف بغاوت نہ کرے۔ (صحیح مسلم، صفۃ الجنۃ: 64، (2865) 7074۔ سنن ابو داود، ج 4، رقم الحدیث 4895، سنن ابن ماجہ، ج 2 رقم الحدیث: 4214)۔

حضرت ابوسعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص اللہ سبحانہ کے لیے ایک درجہ تواضع کرتا ہے، اللہ اس کا ایک درجہ بلند فرماتا ہے، اور جو شخص اللہ کے سامنے ایک درجہ تکبر کرتا ہے اللہ اس کو ایک درجہ پست کر دیتا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس کو سب سے نچلے طبقہ میں کر دیتا ہے۔

(سنن ابن ماجہ، ج 2، رقم الحدیث: 4176، تہذیب تاریخ دمشق، ج 4، دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1407ھ)

عالیش بن ربیعہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب (رض) نے منبر پر فرمایا: اے لوگو! تواضع کرو، کیونکہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو اللہ کے لیے تواضع کرتا ہے، اللہ اس کو سربلند کرتا ہے، اور فرماتا ہے سربلند ہو اللہ تجھے سربلند کرے۔ وہ خود اپنے آپ کو حقیر سمجھتا ہے، اور لوگوں کے نزدیک بہت عظیم ہوتا ہے۔ اور جو شخص تکبر کرتا ہے، اللہ اس کو ہلاک کر دیتا ہے اور فرماتا ہے: دفع ہو، وہ خود اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اور لوگوں کی نگاہوں میں بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ (المعجم الاوسط، ج 9۔ رق، ا؛ ضدہث "8303، مطبوعہ مکتبہ المعارف، الریاض، 1415ھ)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص نے اپنے مسلمان بھائی کے لیے تواضع کی، اللہ اس کو سربلند کرتا ہے اور جس نے اس پر بڑائی ظاہر کی، اللہ اس کو پست کر دیتا ہے۔ (المعجم الاوسط، ج 8، رقم الحدیث: 7707۔ الترغیب والترھیب، ج 3، ص 535۔ مجمع الزوائد، ج 8، ص 83)

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے) جس نے میرے لیے اس طرح تواضع کی یہ فرما کر آپ نے اپنی ہتھیلی سے زمین کی طرف اشارہ کیا، میں اس کو اس طرح بلند کرتا ہوں۔ یہ فرما کر آپ نے اپنی ہتھیلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ (المعجم الصغیر، رقم الحدیث: 645۔ مجمع الزوائد، ج 8، ص 82، طبع قدیم، مجمع الزوائد، ج 8، ص 157، 156، طبع جدید) (تفسیر تبیان القرآن)

تکبر کی مذمت:

اس سے معلوم ہوا کہ تکبر ایسا مذموم وصف ہے کہ ہزاروں برس کا عبادت گزار اور فرشتوں کا استاد کہلانے والا ابلیس بھی اس کی وجہ سے بارگاہ الٰہی میں مردود ٹھہرا اور قیامت تک کے لیے ذلت و رسوائی کا شکار ہو گیا۔ ذیل میں ہم تکبر کی مذمت پر مشتمل 4 احادیث اور عاجزی کے فضائل کے بیان میں 4 احادیث اور ایک حکایت ذکر کر رہے ہیں تاکہ مسلمان ابلیس کے انجام کو سامنے رکھتے ہوئے ان احادیث کو بھی پڑھیں اور تکبر چھوڑ کر عاجزی اختیار کرنے کی کوشش کریں، چنانچہ

(1)۔۔ حضرت حذیفہ (رض) سے روایت ہے، سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ’’کیا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے بدترین بندے کے بارے میں نہ بتاؤں؟ وہ بداخلاق اور متکبر ہے۔

(2)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ’’جو تکبر کی وجہ سے اپنا تہبند لٹکائے گا تو قیامت کے دن اللہ عَزَّوَجَلَّ اس کی طرف رحمت کی نظر نہ فرمائے گا۔

(3)۔۔ حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) سے روایت ہے، سرورِ کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ’’قیامت کے دن تکبر کرنے والے چیونٹیوں کی طرح آدمیوں کی صورت میں اٹھائے جائیں گے، ہر طرف سے ذلت انھیں ڈھانپ لے گی، انھیں جہنم کے قید خانے کی طرف لے جایا جائے گا جس کا نام ’’بولس‘‘ ہے، آگ ان پر چھا جائے گی اور انھیں ’’طِیْنَۃُ الْخَبَالْ‘‘ یعنی جہنمیوں کی پیپ اور خون پلایا جائے گا۔

(4)۔۔حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) سے روایت ہے، تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جس کے دل میں رائی کے دانے جتنا بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ (1)

عاجزی کے فضائل:

(1)۔۔حضرت عیاض بن حمار (رض) سے روایت ہے، سرکار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "اللہ عَزَّوَجَلَّ نے میری طرف یہ وحی فرمائی ہے کہ تم لوگ عاجزی اختیار کرو اور تم میں سے کوئی دوسرے پر فخر نہ کرے۔ (2)

(2)۔۔اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ (رض) سے روایت ہے، سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "اے عائشہ! عاجزی اپناؤ کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ عاجزی کرنے والوں سے محبت، اور تکبر کرنے والوں کو ناپسند فرماتا ہے۔ (3)
(3)۔۔حضرت انس جہنی (رض) سے روایت ہے، سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جس نے قدرت کے باوجود اللہ عَزَّوَجَلَّ کے لیے اعلیٰ لباس ترک کر دیا تو اللہ عَزَّوَجَلَّ قیامت کے دن اسے لوگوں کے سامنے بلا کر اختیار دے گا کہ ایمان کا جو جوڑا چاہے پہن لے۔ (4)
(4)۔۔حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جو اپنے مسلمان بھائی کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ عَزَّوَجَلَّ اسے بلندی عطا فرماتا ہے اور جو مسلمان بھائی پر بلندی چاہتا ہے اللہ عَزَّوَجَلَّ اسے پستی میں ڈال دیتا ہے۔ (5)
فاروق اعظم (رض) کی عاجزی:
جب حضرت عمر فاروق (رض) شام کی طرف تشریف لے گئے تو حضرت سیدنا ابو عبیدہ (رض) بھی ان کے ساتھ تھے یہاں تک کہ آپ (رض) ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں گھٹنوں تک پانی تھا، آپ اپنی اونٹنی پر سوار تھے، آپ اونٹنی سے اترے اور اپنے موزے اتار کر اپنے کندھے پر رکھ لئے، پھر اونٹنی کی لگام تھام کر پانی میں داخل ہو گئے تو حضرت ابو عبیدہ (رض) نے عرض کی: اے امیر المومنین! (رض)، آپ یہ کام کر رہے ہیں مجھے یہ پسند نہیں کہ یہاں کے باشندے آپ کو نظر اٹھا کر دیکھیں۔ حضرت عمر فاروق (رض) نے ارشاد فرمایا "افسوس! اے ابو عبیدہ! اگر یہ بات تمہارے علاوہ کوئی اور کہتا تو میں اسے اُمتِ محمدی عَلٰی صَاحِبِہَا الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے لیے عبرت بنا دیتا، ہم ایک بے سروسامان قوم تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کے ذریعے عزت عطا فرمائی، جب بھی ہم اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ عزت کے علاوہ سے عزت حاصل کرنا چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ہمیں رسوا کر دے گا۔ (تفسیر صراط الجنان)

آیت مبارکہ:

قَالَ اَنۡظِرۡنِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ ۝۱۴

لغۃ القرآن: قَالَ : فرمایا] [اَنْظِرْنِيْٓ : تو مہلت دے مجھے] [اِلٰي : تک] [يَوْمِ : دن] [يُبْعَثُوْنَ : وہ سب اٹھائے جائیں گے]

ترجمہ: اس نے کہا: مجھے اس دن تک (زندگی کی) مہلت دے جس دن لوگ (قبروں سے) اٹھائے جائیں گے

تشریح:

حکمت الٰہی کا تقاضا یہی تھا کہ اسے مہلت دی جائے اور جب تک یہ دنیا موجود ہے اس وقت تک حق و باطل کی آویزش جاری رہے۔ اس لیے اس کی درخواست قبول کر لی گئی۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

اس بات کی تحقیق کہ ابلیس لعین کو کتنی زندگی کی مہلت دی ہے :

جس دن سب لوگ اٹھائے جائیں گے وہ حشر کا دن ہے اور اس دن کے بعد کسی کو موت نہیں آئے گی۔ ابلیس لعین نے یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ وہ اس عمومی قاعدہ سے بچ جائے کہ "ہر شخص کو موت آنی ہے" اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا ہے : " تو مہلت پانے والوں میں سے ہے " اور سورۃ الحجر میں فرمایا ہے " تجھے وقت معین تک مہلت دی گئی ہے "۔ " قال فانک من المنظرین۔ الی یوم الوقت المعلوم : فرمایا بیشک تو مہلت پانے والوں میں سے ہے : اس دن تک جس کا وقت (ہمیں) معلوم ہے " (الحجر : 37۔38، ص 80۔81)

امام رازی، علامہ قرطبی اور دیگر مفسرین نے ایک روایت کی بناء پر یہ کہا ہے کہ الوقت المعلوم سے مراد نفخہ اولیٰ ہے۔ یعنی جب پہلا صور پھونکا جائے گا اور سب لوگوں کو موت آئے گی تو اس کو بھی موت آجائے گی اور ابلیس لعین کو بھی معلوم تھا کہ اس کو نفخہ اولی تک مہلت دی گئی ہے۔ وہ روایت یہ ہے : " امام ابن جریر طبری متوفی 310ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں : اللہ تعالیٰ نے ابلیس لعین کو یوم حشر تک مہلت نہیں دی لیکن اس کو وقت معلوم تک مہلت دی ہے اور یہ وہ دن ہے جس دن میں پہلا صور پھونکا جائے گا اور آسمان و زمین کی ہر چیز ہلاک ہو جائے گی۔ سو وہ بھی مر جائے گا " (جامع البیان، جز 8، ص 175، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 415ھ)

اگر وقت معلوم سے مراد پہلے صور پھونکنے کا دن ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ابلیس لعین کو معلوم ہو گیا کہ وہ کس دن مرے گا اور یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی سنت کے خلاف ہے۔ وہ کسی مخلوق کو اس بات پر مطلع نہیں فرماتا کہ اس نے کس دن مرنا ہے ورنہ انسان تمام عمر گناہ کرتا رہے اور مرنے سے صرف ایک دن پہلے اپنے گناہوں سے توبہ کرلے تو اس طرح اگر ابلیس لعین کو معلوم ہو جاتا کہ وہ اس دن مرے گا جس دن پہلا صور پھونکا جائے گا تو وہ ساری عمر لوگوں کو گمراہ کرتا رہتا اور مرنے سے ایک پہلے توبہ کرلیتا۔ امام رازی متوفی 606ھ نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ وہ اس دن بھی توبہ نہیں کرے گا۔ لہٰذا صرف موت کے دن کے علم سے اس کا گمراہ کرنے پر دلیر ہونا لازم نہیں آتا۔ جس طرح انبیاء (علیہم السلام) کو اپنے معصوم ہونے کا علم ہے اور اس کے باوجود وہ کسی گناہ پر دلیر ہونا تو کجا اس کے قریب بھی نہیں جاتے۔ (تفسیر کبیر، ج 5، ص 211، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1415ھ)

میں کہتا ہوں کہ اس اعتراض کا زیادہ واضح جواب یہ ہے کہ اگر ابلیس لعین کو یہ معلوم بھی ہو جائے کہ اس کو پہلے صور پھونکنے کے دن تک مہلت دی گئی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو اپنے مرنے کا دن معلوم ہو جائے کیونکہ یہ کسی کو معلوم نہیں کہ صور کب پھونکا جائے گا اور قیامت کب آئے گی دوسرا جواب یہ ہے کہ وقت معلوم سے مراد نفخہ اولی ہے۔ اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ ابلیس لعین کو بھی یہ معلوم ہو کہ وقت معلوم سے مراد نفخہ اولی ہے حتیٰ کہ اسکو اپنے مرنے کے دن کا علم ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ چیز صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہو اور تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ صرف سدی کا قول ہے کہ وقت معلوم سے مراد نفخہ اولی ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد نہیں ہے اور نہ کسی صحیح سند سے ثابت ہے اور سدی غیر معتبر شخص ہے۔ اس لیے صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے کہ اس نے ابلیس لعین کو کب تک زندہ رہنے کی مہلت دی ہے۔ ہمیں صرف یہ معلوم ہے کہ اس کو یوم حشر تک کی مہلت نہیں دی گئی۔ (تفسیر تبیان القرآن)

(قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِىْ كَرَّمْتَ عَلَىَّ لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلًا)

[الاسراء : ٦٢]

" شیطان نے کہا دیکھ لے اسے تو نے مجھ پر بزرگی دی ہے لیکن اگر مجھے قیامت تک تو نے ڈھیل دی تو میں اس کی اولاد پر غلبہ حاصل کرلوں گا تھوڑے لوگ ہی بچیں گے۔ "

(قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ) [ص : ٨٢]

" کہنے لگا تیری عزت کی قسم ! میں ان سب کو بہکا دوں گا۔ "

(قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ) [الحجر : ٣٣]

" شیطان نے کہا میں ایسا نہیں کہ انسان کو سجدہ کروں جسے تو نے کالی اور سڑی ہوئی کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا ہے۔ "

حسد اور تکبر وہ بری چیز ہے کہ جس سے انسان کے تمام اعمال غارت اور بسا اوقات دنیا ہی میں ذلت و رسوائی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تکبر کا مفہوم اور اس کے نقصانات یوں ذکر فرمائے ہیں:

(اَلْکِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ) [رواہ مسلم: کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانہ]

"تکبر حق بات کو چھپانا اور لوگوں کو حقیر جاننے کا نام ہے۔"

(عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ (رض) عَنِ النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ مِّنْ کِبْرٍ)

[رواہ مسلم: کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانہ]

"حضرت عبداللہ (رض) سے روایت ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔"

(عَنْ أَبِیْ ھُرَیْرَۃَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یَقُوْلُ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ اَلْکِبْرِیَاءُ رِدَاءِیْ وَالْعَظْمَۃُ إِزَارِیْ مَنْ نَازَعَنِیْ وَاحِدًا مِّنْھُمَا أَلْقَیْتُہٗ فِیْ جَھَنَّمَ) [رواہ ابن ماجۃ: کتاب الزھد، باب البراءۃ من الکبر والتواضع]

"حضرت ابوہریرہ (رض) کہتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تکبر میری چادر ہے اور عظمت میرا ازار ہے جو ان میں سے کوئی ایک مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا میں اس کو جہنم میں پھینک دوں گا۔" (تفسیر فہم القرآن)

جب شیطان کو مردود اور راندہ درگاہ ٹھہرایا تو اس کی آتش غضب اور بھڑکی اس نے اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگی پروردگار عالم نے اسے مہلت دے دی اس لیے کہ اس میں مقربین بارگاہ عزوجل کا امتحان بھی ہو جائے اور اس میں قلوب احباب بھی سمجھ سکیں گے کہ جب ایسا سرکش و متکبر بھی عرض کرنے سے مہلت پا سکتا ہے تو جو اس پاک ذات سے محبت رکھتے ہیں ان کی عرض و معروض کیسے رد ہوگی حضرت سعدی (رح) نے خوب فرمایا۔

اے کریمے کہ از خزانہ غیب گبر و ترسا وظیفہ خور داری

دوستاں را کجا کنی محروم تو کہ با دشمناں نظر داری

اس سوال کی جسارت ابلیس کو باوجود تکبر و غرور اور نافرمانی کے اس وجہ سے ہوئی کہ اسے حلم ذوالجلال کا حال معلوم تھا اور وہ پروردگار کے حلم و رحمت سے واقف تھا اس کا خیال تھا کہ شاید اس حربے سے وہ موت کے عذاب و سختی سے بچ جائے گا مگر قیامت سے پہلے اس کی موت دی جائے گی۔ پھر اس نے پروردگار کے حضور اپنے جوش و انتقام اور حسد اور غضب کا اظہار کیا اور کہا۔ (تفسیر الحسنات)

آیت مبارکہ:

قَالَ اِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ۝۱۵

لغۃ القرآن: قَالَ : فرمایا] [اِنَّکَ : بیشک تو ہی] [مِنَ : سے] [الْمُنْظَرِیْنَ : مہلت دیے جانے والوں]

ترجمہ: ارشاد ہوا: بیشک تو مہلت دیئے جانے والوں میں سے ہے

تشریح:

قیامت کے دن جب لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے تو پھر انھیں کبھی موت نہیں آئے گی۔ شیطان نے اس دن تک زندگی کی مہلت مانگی تاکہ اس کو موت نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے طویل زندگی کی مہلت تو عطا فرما دی مگر موت اس پر بھی آئے گی، لہٰذا قیامت کے قریب جب زمین و آسمان کی ہر چیز ہلاک ہوگی تو ان کے ساتھ شیطان بھی

ہلاک ہو جائے گا، پھر جب سب دوبارہ زندہ ہوں گے تو شیطان بھی زندہ ہو جائے گا۔ شیطان کو اتنی طویل زندگی دینے کی ایک حکمت یہ ہو سکتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ بندوں کی آزمائش کرے کہ کون اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے اور کون شیطان کا غلام؟ (تفسیر امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

رب نے اس کی دعا کچھ ترمیم سے قبول فرمالی اس سے دو مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ کفار کی بعض دعائیں قبول ہو جاتی ہیں۔ دیکھو شیطان کی یہ دعا کچھ ترمیم سے قبول ہو گئی دوسرے یہ کہ دعا سے عمر دراز ہو جاتی ہے۔ جب شیطان مردود کی دعا سے عمر میں زیادتی ہو گئی تو اگر انبیاء کرام اولیاء عظام کی دعاؤں سے یا بعض نیک اعمال کی برکت سے عمر لمبی ہو جاوے تو کیا مضائقہ ہے۔ (تفسیر نور العرفان۔ مفتی احمد یار خاں نعیمیؒ)

یعنی جب تو نے یہ درخواست کی تو سمجھ لے کہ یہ پہلے سے علم الٰہی میں طے شدہ ہے کہ تجھ کو مہلت دی جائے۔ جب حکمت الٰہیہ مقتضی ہوئی کہ حق تعالیٰ اپنی صفات کمالیہ و شہنشاہانہ عظمت و جبروت کا مظاہرہ کرے تو اس نے عالم کو پیدا فرمایا۔ (اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۭ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ڏ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا) 65۔الطلاق: 12) یعنی زمین و آسمان کی تخلیق اور ان کے کل نظم و نسق سے مقصود یہ ہے کہ خدا کی قدرت کاملہ اور علم محیط وغیرہ صفات کی معرفت لوگوں کو حاصل ہو۔ اسی معرفت الٰہیہ کو آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ میں بعض سلف کی تفسیر کے موافق عبادت سے تعبیر فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ تخلیق عالم سے یہ غرض بوجہ اتم جب ہی پوری ہو سکتی ہے کہ مخلوقات میں اس کی ہر قسم کی صفات و کمالات کا اظہار ہو، اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ عالم میں مطیع و وفادار اور باغی و مجرم ہر قسم کی مخلوق موجود ہو۔ نیز اعداء اللہ کو پوری زور آزمائی اور ان کے پیدائشی اختیار و قوت کے تمام وسائل استعمال کرنے کی آخری حد تک مہلت و آزادی دی جائے پھر انجام کار حکومت الٰہیہ کا لشکر غالب ہو، دشمن اپنے کیفر کردار کو پہنچیں اور بعد امتحان آخری کامیابی دوستوں کے ہاتھ رہے، اس کے بدون کل صفات کمالیہ کے ظاہر ہونے کی صورت نہیں۔ پس خیر و شر اور منبع خیر و شر کا پیدا کرنا، اسی حکمت سے ہے کہ جو غرض تخلیق عالم کی ہے یعنی "صفات کمالیہ کا مظاہرہ" وہ بغیر اس کے پوری نہ ہو سکتی تھی (وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ١١٨؀ۙ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ) 11۔ ہود: 18-19) اسی لیے ضروری ہوا کہ عدو اکبر ابلیس لعین کو جو منبع شر ہے پوری مہلت دی جائے کہ وہ تا قیام قیامت اپنے قویٰ و وسائل کو جی کھول کر استعمال کرلے لیکن یہ چیز ظاہر ہے کہ براہ راست اس محیط کل اور قادر مطلق کے مقابلہ پر ممکن نہ تھی، اس لیے ضروری ہوا کہ خدا کی طرف سے بطور نیابت و خلافت ایک ایسی مخلوق مقابلہ پر لائی جائے جس سے ابلیس لعین کو آزادی کے ساتھ جنگ آزمائی کا موقع مل سکے۔ (وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا) 17۔الاسراء: 64) اور پھر جب تک وہ مخلوق حق نیابت اور وظیفہ خلافت ادا کرتی رہے، خاص شاہی فوج (ملائکہ) سے اس کو کمک پہنچائی جائے اور باوجود ضعف و قلّت کے اپنے فضل رحمت سے انجام کار دشمنوں کے مقابلہ میں مظفر و منصور کیا جائے۔ پس خوب سمجھ لو کہ یہ زمین ابلیس اور آدم کا میدان جنگ ہے اور چونکہ پوری طرح جان توڑ مقابلہ اسی وقت ہو سکتا تھا کہ دونوں حریف ایک دوسرے سے خار کھائے ہوں اس لیے تکویناً دو صورتیں ایسی پیش آگئیں جن سے ہر ایک کے دل میں دوسرے کی دشمنی جاگزیں ہو جائے۔ ابلیس آدم کو سجدہ نہ کرنے کی بناء پر نیچے گرایا گیا اور آدم کو ابلیس کی وسوسہ اندازی کی بدولت جنت سے علیحدہ ہونا پڑا۔ ان واقعات سے ہر ایک کے دل میں دوسرے کی عداوت کی جڑ قائم ہو کر معرکہ کارزار گرم ہو گیا۔ والحرب سجال وانما العبرۃ للخواتیم۔ (تفسیر عثمانی۔ شبیر احمد عثمانی)

ابلیس کے عزائم:۔

شیطان چونکہ سیدنا آدم (علیہ السلام) کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے راندہ درگاہ الٰہی ہوا تھا اس لیے وہ سیدنا آدم (علیہ السلام) کا دشمن بن گیا اس نے اپنے کسی قصور کا احساس نہ کیا اور ان گناہوں کی سزا کا اصل سبب سیدنا آدم (علیہ السلام) کو قرار دیا اور قیامت تک اللہ سے مہلت بھی مانگی اور آدم (علیہ السلام) اور اس کی اولاد کو بہکانے اور ورغلانے کا اختیار بھی مانگا تو اللہ نے اسے یہ اختیار دے دیا۔ اس عرصے میں سیدنا آدم (علیہ السلام) اور ان کی اولاد کو بہکا کر اور گمراہ کرکے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ آدمی فی الواقع خلافت ارضی کا اہل نہیں ہے اور میں نے جو اسے سجدہ نہیں کیا تو اس معاملہ میں میں ہی راہ راست پر تھا۔

(تفسیر تیسیر القرآن۔ عبدالرحمٰن کیلانی)

ابلیس کا مقصد اولاد آدم کی کثیر ترین تعداد کو گمراہ کرنا تھا تاکہ آدم (علیہ السلام) سے انتقام لے سکے جن کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور کر دیا گیا اور جب اللہ نے اس کی طلب مان لی تو عناد و تمرد میں اور آگے بڑھ کر کہا کہ جب تو نے مجھے گمراہ کر ہی دیا ہے تو اب ان انسانوں کو میں چین سے نہیں رہنے دوں گا، ان کے درپے ہو جاؤں گا، اور انھیں تیری سیدی راہ (دین اسلام) سے گمراہ کروں گا انھیں ہر طرف سے گھیر لوں گا، بھلائی سے روکوں گا، اور برائی کو خوبصورت بنا کر پیش

کروں گا۔ تاکہ وہ سرکشی پر اتر آئیں۔ اور پھر نتیجہ یہ ہوگا کہ ان میں سے اکثر لوگ ناشکری کریں گے، تیری عبادت نہیں کریں گے، اور عقیدہ توحید پر قائم نہیں رہیں گے، اور حکمت الٰہی دیکھیئے کہ ابلیس کا یہ ظن اور وہم واقعہ کے مطابق ہوگیا کہ اکثر و بیشتر انسانوں نے اس کی اتباع کی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ سبا کی آیت (20) میں فرمایا ہے: اور ابلیس نے بنی آدم کے بارے میں اپنا گمان سچ کر دکھایا، پس مومنوں کی ایک جماعت کے سواسب اس کی پیروی کی، اسی لیے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شیطان سے تمام جہات سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی ہے، امام احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) درج ذیل دعا صبح وشام کبھی بھی نہیں چھوڑتے تھے۔ (تفسیر تیسیر البیان القرآن۔ محمد لقمان سلفی)

اللہ تعالیٰ نے شیطان کو مہلت دے دی:

قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا تجھے مہلت دی جاتی ہے، مسلمان کا فرض منصبی ہے کہ تعلق باللہ قائم رکھنے میں اپنی ہر ممکن کوشش صرف کرے کیونکہ شیطان (جو انسان کا بدترین دشمن ہے) ہر وقت کمربستہ ہو کر مختلف طریقوں سے انسان کو گمراہ کرنے میں شب و روز لگا ہوا ہے۔ علمائے کرام کو قرآن مقدس اور حدیث کی تفہیم، تعلیم و تعلم سے محروم کرکے منطق، فلسفہ میں مشغول کر دیتا ہے، صوفیائے عظام کو بدعات میں مشغول کرکے اتباع کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے محروم کرکے جہنم کے گڑھے میں دھکیلتا ہے لیکن وہ علماء جو باعمل اور متبع شریعت ہیں وہ اس سے منتقلی ہیں انہوں نے مبارک قدموں کی خاک پاک سرمہ چشم کو معمول بنایا ہے، چونکہ دشمن طاقتور اور قوی ہے اس واسطے اللہ تعالی کے ساتھ تعلق محکم کرکے تزویر شیطانی سے بچنا چاہئے۔

(تفسیر لاہوری۔ احمد علی لاہوری)

آیت مبارکہ:

قَالَ فَبِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۱۶

لغۃ القرآن: قَالَ : فرمایا] [فَبِمَآ : تو اس وجہ سے کہ] [اَغْوَيْتَنِيْ : تو نے گمراہ کیا مجھے] [لَاَقْعُدَنَّ : ضرور بالضرور میں بیٹھوں گا] [لَهُمْ : ان کے لیے] [صِرَاطَكَ : تیرے راستے پر] [الْمُسْتَقِيْمَ : سیدھے]

ترجمہ: اس (ابلیس) نے کہا: پس اس وجہ سے کہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے (مجھے قسم ہے کہ) میں (بھی) ان (افراد بنی آدم کو گمراہ کرنے) کے لیے تیری سیدھی راہ پر ضرور بیٹھوں گا (تاآنکہ انھیں راہ حق سے ہٹادوں)

تشریح: کوئی ٹھوکر کھا کر سنبھل جائے تو اس کی خوش نصیبی، اور جو ٹھوکر کھا کر سنبھلنا تو در کنار جان بوجھ کو ٹھوکر پر ٹھوکر کھاتے چلے جانا ہی اپنا شیوہ بنالے تو اسے ہلاکت کے گڑھے میں گرنے سے کیوں بچایا جائے۔ شیطان نے ایک حکم عدولی کی۔ اس پر نادم اور تائب ہونے کے بجائے اور اکڑتا چلا گیا اور آدم کے حسد نے اسے یوں حواس باختہ اور گستاخ کر دیا کہ رب العزت کو چیلنج دے دیا کہ جس انسان کی تو نے اتنی تکریم کی ہے اور جس کو سجدہ نہ کرنے کے جرم میں تو نے مجھے اپنی درگاہ رحمت سے دھتکار دیا ہے۔ ان کو میں اپنے مکروفریب کے شکنجہ میں یوں کسوں گا کہ وہ تیرے نافرمان اور میرے فرمان بردار بن جائیں گے۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری)

بولا اچھا۔ جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے۔ یہ دیکھیں۔ کس کو blame کر رہا ہے۔ پہلے خود نافرمانی کی۔ Simple حکم دیا تھا اللہ نے کوئی ایسا حکم تو نہیں تھا جو کہ ناممکن تھا۔ impractical تھا یا impossible تھا۔ کوئی اڑنے کا حکم تو نہیں دیا جا رہا تھا۔ جھکنے کا حکم دیا جا رہا تھا۔ تکبر کیا۔ بات نہ مانی۔ تکبر کے بارے میں حدیث آتی ہے۔ کہ جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ تکبر شیطان کی صفت ہے۔ تو شیطان کو جب

اللہ نے جنت سے محروم کرنے کا فیصلہ کیا اور تکبر کی وجہ سے جنت سے نکال دیا اس کو تو انسانوں کے لیے کوئی اللہ کے فیصلے بدل تو نہیں جائیں گے۔ انسان بھی تکبر کریں گے وہ بھی جنت میں داخل نہیں ہوں گے۔ تو لہٰذا تکبر سے بہت پناہ مانگنی چاہیے۔ اور دعا مانگنی چاہیے اللہ مجھے تکبر سے بچا۔ اور کیسے تکبر جو ہے وہ آتا ہے۔ پتہ تھوڑی چلتا ہے۔ محسوس تھوڑی ہوتا ہے کہ ہم تکبر میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ ہم خود پسندی میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ ہمیں اپنی تعریف سننے کا شوق ہے۔ کیا ہے ہم شہرت کے طلب گار ہو گئے ہیں۔ پتہ نہیں چلتا انسان کو۔ بڑے بڑے پردے پڑ جاتے ہیں اس پر۔ تو اللہ کی معرفت کا نور انسان کو چاہیے تا کہ وہ ان چیزوں کو پہچان جائے اور کنٹرول کرے۔ اور دعا بہترین چیز ہے۔ دعا کرے کہ اللہ مجھے تکبر سے بچائے تو خود تکبر کیا اس نے اور الزام اللہ پر ڈال دیا۔ کہا کہ اللہ تو نے گمراہ کیا۔ سجدہ نہ کرنے کے معاملے میں خود تو بالکل صحیح سمجھا اپنا قصور نہ مانا اور اس سے بڑھ کر blame اللہ پر ڈال دیا۔ کہ اللہ ایسا حکم دیا کیوں جو میں کر نہیں سکتا۔ تو نے مجھے گمراہ کیا۔ یہ ہے شیطانیت یہ ہے ابلیسیت۔ اس کے مقابلے میں ہم آدم (علیہ السلام) کو دیکھیں گے انھوں نے فوراً اقرار کیا قصور کا۔ تو اپنا قصور مان لینا انسانیت ہے۔ اور دوسرے پر الزام ڈال دینا ابلیسیت ہے۔ یہ کہنا کہ ہم تو کرنا چاہ رہے ہیں فلاں نہیں کرنے دیتا۔ ہم تو یوں کرنا چاہتے ہیں وہ نہیں کرنے دیتا۔ یہ چیز اچھی نہیں ہے۔ اس سے بچنا چاہیے۔ اس سے avoid کرنا چاہیے۔ شیطان نے تو اللہ کو blame کر دیا کہ تو نے حکم ہی کیوں دیا ایسا۔ بعض دفعہ کیا پتہ لوگوں کے دل میں خیال آتا ہو کہ اللہ نے ہمیں ایسی شریعت دی کیوں جس پر ہم عمل نہیں کر سکتے۔ کیوں حکم دیا ہمیں پردے کا۔ سیولیس پہننے کا حکم دیتا ہم کتنے فرمان بردار ا ہوتے۔ میوزک سنتے اور ڈانس کرتے یہ نیکی ہوتا ہم کتنے فرمان بردار ہوتے۔ کیوں حکم دیا ہمیں کہ اپنے کو پیٹو اور ستر کور کرو۔ نمازیں پڑھو اور مصیبت سے بچو۔ اور یہ کرو۔ شریعت اتنی مشکل ہے ہم نہیں عمل کر سکتے اس کے اوپر۔ تو کیا کیا۔ سارا blame اللہ پر ڈال دیا۔ کہ شریعت ہے ہی ایسی ہم کیا کریں۔ تو یہی چیز کیا بن جاتی ہے۔ ابلیسیت بن جاتی ہے۔ تو اس نے کہا اللہ سے کہ اچھا جس طرح تو نے مجھے گمراہ کیا ہے۔

میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر بیٹھ جاؤں گا۔ ان انسانوں کیلئے۔ کہاں بیٹھنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس نے صراط مستقیم پر۔ وہ جو ہم دعا کرتے ہیں نہ گڑگڑا کر۔ اہدنا الصراط المستقیم۔ اللہ تو ہمیں ہدایت سے سیدھے راستے کی۔ ہم کیا سمجھتے ہیں کہ سیدھا راستہ جو ہے اب اس پر ایک دفعہ جو آ گیا وہ ہر طرح شیطان کے شر سے محفوظ ہو گیا۔ ہو نہیں سکتا۔ وہ وہیں تو بیٹھا ہوا ہے۔ محفوظ ہے راستہ کہ اگر شیطان کو پہچان لیا تو انشاء اللہ صراط مستقیم جو ہے وہ محفوظ رہے گی۔ لیکن اگر شیطان کو نہ پہچانا تو وہ تو بیٹھا ہوتا ہے وہاں پر۔ اس نے کہا کہ میں تو بیٹھوں گا تیرے سیدھے راستے پر۔ اب جو لوگ اپنی مرضی سے اپنی choice سے بھٹک رہے ہیں ان پر شیطان کا کیا کام۔ ان پر تھوڑی محنت کرے گا۔ ان پر تھوڑی ٹائم ضائع کرے گا۔ آیا ہو گا کہیں سے time management کا کورس کر کے۔ اس نے کہا میں نہیں ٹائم ضائع کرتا ان پر۔ وہ تو پہلے ہی بھٹک رہے ہیں۔ جو پہلے ہی کسینوز میں بیٹھے ہیں۔ شراب پی رہے ہیں۔ جوا کھیل رہے ہیں اور زنا کر رہے ہیں۔ اللہ سے اور اللہ کے رسول سے غافل ہیں۔ پتہ کچھ نہیں کہ قرآن میں کیا لکھا ہے۔ وہ تو خود ہیں شیطان۔ وہ تو ہیں ہی اس کے ساتھی۔ اس کو تو محنت ان پر کرنی ہے۔ فوکس ان پر کرنا ہے جو خود سیدھے راستے پر چل رہے ہیں۔ جو خود بہکے ہیں ان کو بہکنے میں شیطان کی ضرورت نہیں۔ جو نہیں بہکنا چاہتے ان کے راستے آئے گا۔ اب بتائیں کہ شیطان قرآن نہ پڑھنے والوں پر زیادہ آتا ہے یا پڑھنے والوں پر۔ ہمارا تصور کیا ہے کہ جو نہیں پڑھتے ان پر آتا ہے۔ ہم تو اتنے اعلیٰ ہیں۔ ہم تو قرآن پڑھ رہے ہیں۔ جتنا آپ قرآن پڑھیں گی اتنا وہ آپ پر آئے گا۔ اس کا حملہ ان پر شدید تر ہو جاتا ہے۔ انہی سے سب سے زیادہ خطرہ ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو بہت سنبھال کر رکھئے۔ آپ سب سے زیادہ قیمتی ہیں اس وقت۔ اس لیے کہ علم ہے نہ اس وقت آپ کے پاس۔ اور آپ عبادت کر رہی ہیں۔ اب وہ کیا چاہتا ہے۔ کہ اس علم اور اس عبادت کے ساتھ تکبر شامل کر دے۔ اور اللہ سے بدگمانی شامل کر دے۔ اب شیطان کا aim ہے۔ اس کو تم عالم چاہیے۔ اس کو سکالرز چاہیے ہوتے ہیں۔ شیطان کو بھی عالم چاہیے۔ جتنا پیارا اس کو عالم لگتا ہے جاہل نہیں لگتا۔ اس لیے کہ عالم جتنا دین میں بگاڑ پیدا کر سکتے ہیں۔ جاہل تو بیچارے نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگ تو شیطان کے لیے Prime ٹارگٹ بن جاتے ہیں۔ وہ ان کو فوکس کر لیتا ہے air mart کر لیتا ہے۔ کہ یہ یہ علم حاصل کرنے والے ان کے پاس قرآن کا علم ہے۔ ان کو میں اپنی ٹیم میں شامل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تو وہ بہت زیادہ ان پر آتا ہے جو قرآن پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ اور طریقہ بھی اس نے بتایا کہ کیسے کیسے آتا ہوں۔ طریقے بھی اس کو دیکھتے ہیں تو اس نے کہا کہ میں تو تیرے سیدھے راستے پر جا کر بیٹھ جاؤں گا ان کیلئے۔ پھر کیا کرے گا۔ (تفسیر تنویر۔ محترمہ زاہدہ تنویر)

1۔ امام ابن شیبہ، عبد بن حمید، ابن منذر اور ابو الشیخ نے مجاہد (رح) سے روایت کیا کہ لفظ آیت " لاقعدن لہم صراطک المستقیم " سے مراد راہ حق ہے۔

(2) امام عبد بن حمید نے ابن عباس (رض) سے روایت کیا کہ لفظ آیت " لاقعدن لھم صراطک المستقیم " یعنی مکہ کے راستہ میں۔

(3) امام عبد بن حمید، ابن جریر اور ابو الشیخ نے عون بن عبداللہ (رض) سے روایت کیا کہ کوئی جماعت مکہ کی طرف نکلتی ہے تو ابلیس بھی ان کی گنتی کے برابر ان کے ساتھ اپنے شیاطین تیار کرتا ہے۔

(4) امام ابن منذر نے مجاہد (رح) سے روایت کیا کہ ساتھیوں کی کوئی جماعت مکہ کی طرف نکلتی ہے تو ابلیس بھی ان کی گنتی کے برابر ان کے ساتھ اپنے شیاطین تیار کرتا ہے۔

(5) امام ابو الشیخ نے ضحاک (رح) سے روایت کیا کہ انھوں نے اس آیت کے بارے میں فرمایا کہ میں (راستے میں) ان کے لیے بیٹھوں گا اور ان کو تیرے راستہ سے روکوں گا۔

(6) امام احمد، نسائی، ابن حبان، طبرانی اور بیہقی نے شعب الایمان میں سبرہ بن فاکہہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا شیطان ابن آدم کے راستہ میں بیٹھتا ہے۔ اس کے لیے بیٹھتا ہے اسلام کے راستہ سے اور کہتا ہے تو اسلام لے آیا اور تو نے اپنا دین اور اپنے آباؤ اجداد کا دین چھوڑ دیا ہے۔ (اگر) اس نے اس کا کہنا نہ مانا اور اسلام لے آیا پھر اس کے لیے بیٹھتا ہے ہجرت کے راستہ سے۔ اور اس سے کہتا ہے کہ کیا تو ہجرت کرتا ہے اور اپنی زمین اور اپنے آسمان کو چھوڑ رہا ہے۔ اور مہاجر اپنی قدرت اور غنا میں گھوڑے کی مثل ہے پس ابن آدم نے نافرمانی کی اور اس نے ہجرت کی تو اس کے لیے بیٹھتا ہے جہاد کے راستہ میں اور اسے کہتا ہے یہ نفس کا جہاد ہے اور مال کا (اگر) تو قتال کرے گا تو مارا جائے گا۔ بیوی (دوسری جگہ) نکاح کرے گی اور مال کو تقسیم کردیا جائے گا۔ اس نے اس کا کہنا نہ مانا اور جہاد کرلیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص ان میں سے ایسا کرے اور مرجائے یا اس کا جانور اس کی گردن توڑ دے اور وہ مرگیا تو اللہ تعالیٰ پر اس کا حق ہے کہ اس کو جنت میں داخل کردے۔ (تفسیر در منثور۔ امام جلال الدین سیوطیؒ)

اغوا کا معنی:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ابلیس لعین کا یہ قول نقل فرمایا کہ اے رب تو نے مجھے اغواء کیا یعنی گمراہ کیا۔ اس لیے ہم اغواء کا معنی بیان کررہے ہیں۔ علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی 502 ھ لکھتے ہیں: (اغواء غوی سے بنا ہے اور) جہالت کی وجہ سے کبھی تو انسان کا کوئی عقیدہ ہی نہیں ہوتا، صحیح نہ فاسد اور کبھی جہالت کی وجہ سے انسان کا فاسد عقیدہ ہوتا ہے اس کو غی اور غوایت کہتے ہیں۔ قران مجید میں ہے: " ماضل صاحبکم وماغوای: تمہارے پیغمبر نہ گمراہ ہوئے اور نہ ان کا فاسد عقیدہ تھا " (النجم: 2) "

اس کا معنی عذاب بھی ہے کیونکہ عذاب غوایت کے سبب سے ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے: " فسوف یلقون غیا: وہ عنقریب عذاب میں ڈال دیے جائیں گے " (مریم: 59)

اس کا معنی ناکامی، نامرادی اور محرومی بھی آتا ہے: " وعسی آدم ربہ فغوی: آدم نے اپنے رب کی (بہ ظاہر) نافرمانی کی تو وہ (جنت سے محروم ہوگئے) (ہ: 121) اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف اغوا کی نسبت ہو تو اس کا معنی گمراہی کی سزا دینا ہے۔ حضرت نوح (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا: " ولاینفعکم نصحی ان اردت ان انصح لکم ان کان اللہ یرید ان یغویکم ھو ربکم والیہ ترجعون: اور اگر میں تمہاری خیر خواہی چاہوں تو میری خیر خواہی تمہیں فائدہ نہیں پہنچا سکتی اگر اللہ نے تمہیں تہاری گمراہی پر عذاب پہنچانے کا ارادہ فرمالیا ہو حالانکہ وہ تمہارا رب ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤگے " (ھود: 34) (الفردات، ج 2، ص 478، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، 1418ھ)

قرآن مجید اور احادیث میں اغواء کا لفظ زیادہ تر گمراہ کرنے کے معنی میں وارد ہے۔ احادیث میں یہ مثالیں ہیں: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: " من یطع اللہ ورسولہ فقد رشد ومن یعصہما فقد غوی: جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت پالی اور جس نے ان کی نافرمانی کی وہ گمراہ ہوگیا " (صحیح مسلم، المعہ، رقم الحدیث: 48۔ مسند احمد، ج 4، ص 256، دار الفکر، طبع قدیم)۔

حدیث معراج میں ہے حضرت جبرائیل نے آپ سے کہا: "لواخذت الخمر غوت امتك: اگر آپ خمر (انگور کی شراب) لے لیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی" (صحیح البخاری، ج2 رقم الحدیث: 3394، صحیح مسلم، الایمان، 272، مسند احمد، ج2، ص282)

ابلیس لعین کا جبر اور قدر میں حیران ہونا اور جبر و قدر میں صحیح مذہب:

اللہ تعالیٰ نے شیطان کے اس قول کا ذکر سورۃ الحجر اور سورۃ ص میں بھی فرمایا ہے: " قال رب بما اغویتنی لازینن لھم فی الارض ولا غوینھم امعین۔ الا عبادك منھم المخلصین: اس نے کہا اے میرے رب چونکہ تو نے مجھے گمراہ کر دیا تو میں ضرور ان کے لیے زمین میں (برے کاموں کو) خوش نما بنا دوں گا، اور میں ضرور ان سب کو گمراہ کر دوں گا۔ ماسوا تیرے ان بندوں کے جو صاحب اخلاص ہیں" (الحجر: 39۔40)۔ " قال فبعزتك لاغوینھم اجمعین۔ الا عبادك منھم المخلصین: اس نے کہا تیری عزت کی قسم میں ضرور ان سب کو گمراہ کر دوں گا۔ ماسوا تیرے ان بندوں کے جو صاحب اخلاص ہیں" (ص: 82۔83)۔

ابلیس لعین نے اپنے کلام میں اللہ تعالیٰ کی طرف بھی گمراہ کرنے کی نسبت کی ہے اور اپنی طرف بھی گمراہ کرنے کی نسبت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف گمراہ کرنے کی نسبت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جبر کا عقیدہ رکھتا تھا۔ یعنی ہر کام اللہ کرتا ہے اور مخلوق مجبور محض ہے۔ اور اپنی طرف گمراہ کرنے کی نسبت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قدر کا عقیدہ رکھتا تھا یعنی انسان اور جن ہر فعل کے خالق ہیں اور ان کے افعال میں اللہ تعالیٰ کا کوئی دخل نہیں ہے، سو وہ جبر اور قدر میں متردد تھا اور اس وادی میں حیران اور سرگشتہ تھا۔

اہل سنت کا مسلک یہ ہے کہ کسی بھی فعل کا کسب اور ارادہ انسان کرتا ہے اور اس ارادہ کے مطابق اللہ تعالیٰ اس فعل کو پیدا فرماتا ہے۔ سو اللہ عزوجل خالق ہے اور انسان کاسب اور صاحب اختیار ہے اور ادب کا تقاضا یہ ہے کہ انسان نیک اور اچھے افعال کی نسبت اللہ عزوجل کی طرف کرے اور برے افعال کی نسبت اپنے نفس کی طرف کرے جیسے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا: " واذا مرضت فھو یشفین: اور جب میں بیمار ہوں تو وہی شفا عطا فرماتا ہے" (الشعراء: 80)۔

ابلیس لعین نے عمداً نافرمانی کی اور تکبر کیا اور پھر کہا بما اغویتنی تو نے مجھے گمراہ کیا اور حضرت آدم (علیہ السلام) سے بھولے سے خطا ہو گئی پھر بھی عرض کیا ربنا ظلمنا انفسنا اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ ابلیس لعین کی اکڑ اور بے ادبی کی وجہ سے اس کو راندہ درگاہ کیا اور قیامت تک کے لیے اس کے گلے میں لعنت کا طوق ڈالا اور حضرت آدم (علیہ السلام) کے ادب اور ان کی تواضع کی وجہ سے ان کے سر پر تاج کرامت رکھا اور زمین پر ان کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا۔

(تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ:

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ وَعَنۡ اَيۡمَانِهِمۡ وَعَنۡ شَمَآٮِٕلِهِمۡ‌ؕ وَلَا تَجِدُ اَكۡثَرَهُمۡ شٰكِرِيۡنَ ۝۱۷

لغۃ القرآن: ثُمَّ : پھر] [لَاٰتِيَنَّهُمْ : البتہ ضرور میں آؤں گا ان کے پاس] [مِّنْۢ : سے] [بَيْنِ بَيْنِ : درمیان] [] [اَيْدِيْهِمْ : ان کے ہاتھ] [وَ مِّنْ : سے] [خَلْفِهِمْ : ان کے پیچھے] [وَعَنْ : اور سے] [اَيْمَانِهِمْ : ان کے دائیں] [وَعَنْ : اور سے] [شَمَآئِلِهِمْ : ان کے بائیں] [وَلَا : اور نہ] [تَجِدُ : پائے گا] [اَكْثَرَهُمْ : ان میں سے اکثر] [شٰكِرِيْنَ : شکر کرنے والے]

ترجمہ: پھر میں یقیناً ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے ان کے پاس آؤں گا، اور (نتیجتاً) تو ان میں سے اکثر لوگوں کو شکر گزار نہ پائے گا

تشریح:

یعنی میں اولاد آدم کو راہ راست سے بھٹکانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ انھیں ہر سمت سے اپنے گھیرے میں لے لوں گا۔ شکوک و شبہات کے کانٹے چبھوؤں گا۔ ان کے سامنے نیکی کے راستہ میں سد سکندری بن کر کھڑا ہو جاؤں گا اور اگر یہ کوئی نیکی کر بیٹھیں گے تو اس میں ریا کی زہر گھولنے کی سعی کروں گا۔ غرض یہ کہ اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کروں گا۔ ای لاصدنھم عن الحق وار غبھم فی الدنیا واشککھم فی الاخرۃ (قرطبیؒ)

شیطان کو فرشتوں میں ایک اہم مقام حاصل تھا بلکہ وہ فرشتوں کا واعظ اور مرشد تھا مگر حضرت آدم (علیہ السلام) سے حسد نے اسے تکبر اور سرکشی کی اس حد تک پہنچا دیا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کو چیلنج کر دیا کہ جس انسان کو سجدہ نہ کرنے کے جرم میں تو نے مجھے مردود کر دیا میں انھیں سیدھے راستہ سے بہکانے میں ہر ممکن کوشش کروں گا اور ان کے دلوں میں ایسے وسوسے ڈالوں گا کہ اکثر تیرے ناشکر گزار ہو جائیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "ان میں سے تو جس کو بھی اپنی آواز سے بہکانا چاہے تجھے اجازت ہے۔ لیکن میرے مخلص بندوں پر تجھے کوئی غلبہ نہیں ہو گا۔ (قرآن: ۱۷: ۶۵) بہر حال جن نادانوں نے تیری پیروی کی میں تیرے سمیت ان سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔

قیامت کے دن دوزخی شیطان کو ملامت کریں گے کہ اس نے انھیں گمراہ کر دیا۔ شیطان کہے گا: "میرا تم پر کوئی غلبہ تو تھا نہیں (میں نے تمہیں برائی کرنے پر مجبور کیا ہو) میں نے تو تمہیں صرف (برائی کی) دعوت دی اور تم نے میری دعوت قبول کر لی، لہٰذا اب مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ (قرآن، ۱۴، ۲۲)

(تفسیر امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

ابلیس لعین کا صراط مستقیم سے بہکانے کی سعی کرنا: یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ شیطان کو علم تھا کہ صراط مستقیم کیا ہے اور وہ لوگوں کو اس صحیح رستہ اور منہج قویم سے بھٹکانے کے لیے دن رات ہمہ وقت کوشش کرتا رہتا ہے اور اس سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔ (تبیان القرآن)

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں "سامنے سے مراد یہ ہے کہ میں ان کی دنیا کے متعلق وسوسے ڈالوں گا اور پیچھے سے مراد یہ ہے کہ ان کی آخرت کے متعلق وسوسے ڈالوں گا اور دائیں سے مراد یہ ہے کہ ان کے دین میں شبہات ڈالوں گا اور بائیں سے مراد یہ ہے کہ ان کو گناہوں کی طرف راغب کروں گا۔ چونکہ شیطان بنی آدم کو گمراہ کرنے، شہوتوں اور قبیح افعال میں مبتلاء کرنے میں اپنی انتہائی سعی خرچ کرنے کا عزم کر چکا تھا یا وہ انسان کی اچھی بری صفات سے واقف تھا یا اس نے فرشتوں سے سن رکھا تھا، اس لیے اسے گمان تھا کہ وہ بنی آدم کو بہکالے گا اور انھیں فریب دے کر خداوند عالم کی نعمتوں کے شکر اور اس کی طاعت و فرمان برداری سے روک دے گا۔ (صراط الجنان)

انسانوں کو بہکانے میں شیطان کی کوششیں:

امام ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی متوفی 303ھ روایت کرتے ہیں: حضرت سبرہ بن ابی فاکہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ شیطان ابن آدم کے تمام راستوں میں بیٹھ جاتا ہے اور اس کو اسلام کے راستہ سے بہکانے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے تم اسلام قبول کرو گے اور اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ دو گے؟ وہ شخص شیطان کی بات نہیں مانتا اور اسلام قبول کر لیتا ہے۔ پھر اس کو ہجرت کرنے کے راستہ سے ورغلانے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے تم ہجرت کرو گے اور اپنے وطن کی زمین اور آسمان کو چھور دو گے اور مہاجر کی مثال تو کھونٹے سے بندھے ہوئے اس گھورے کی طرح ہے جو ادھر سے ادھر بھاگ رہا ہو اور اس کھونٹے کی حدود سے نکل نہ سکتا ہو۔ وہ شخص اس کی بات نہیں مانتا اور ہجرت کر لیتا ہے۔ پھر شیطان اس کے جہاد کے راستہ میں بیٹھ جاتا ہے وہ اس شخص سے کہتا ہے کہ تم جہاد کرو گے اور اپنی جان اور مال کو آزمائش میں ڈالو گے، اگر تم جہاد کے دوران مارے گئے تو تمہارے بیوی کسی اور شخص سے نکاح کر لے گی اور تمہارا مال تقسیم کر دیا جائے گا۔ وہ شخص شیطان کی بات نہیں مانتا اور جہاد کرنے چلا جاتا ہے۔ پس رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: سو جس شخص نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر یہ حق ہے کہ وہ اس کو جنت میں داخل کر دے اور جو مسلمان قتل کیا گیا تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر اس کو جنت میں داخل کرنا ہے اور جو مسلمان غرق کیا گیا تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر اس کو جنت میں داخل کرنا ہے اور جس مسلمان کو اس کی سواری نے ہلاک کر دیا تو اللہ کے ذمہ کرم پر اس کو جنت میں داخل کرنا ہے" (سنن نسائی ج 6 رقم الحدیث: 3134۔ صحیح ابن حبان، ج 10، رقم الحدیث: 4593۔ مسند

اح، دج 3 ص 483، دار الفکر، طبع قدیم۔ مسند احمد ج 5 رقم الحدیث : 15958، دار الفکر، طبع جدید۔ مسند احمد، ج 12 رقم الحدیث : 15900۔ دار الحدیث القاہر، شیخ احمد شاکر نے اس کے تحت لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند حسن ہے۔ المعجم الکبیر، ج 7، رقم الحدیث : 6558، موارد الظمان، ج 2، رقم الحدیث : 1601۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند حسن ہے۔ الاصابہ ج 2 ص 15، دار الفکر، بیروت، 1398ھ) (تبیان القرآن)

شیطان سے پناہ مانگنے کی ترغیب :

ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا رہے اور اس میں کسی طرح سستی اور غفلت کا مظاہرہ نہ کرے۔ حضرت ابو بکر صدیق (رض) سے روایت ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ’’شیطان سے پناہ مانگنے میں غفلت نہ کرو کیونکہ تم اگرچہ اسے دیکھ نہیں رہے لیکن وہ تم سے غافل نہیں۔

امام محمد غزالی (رح) فرماتے ہیں " شیطان کے شر سے اپنے آپ کو حتی الامکان بچاؤ اور اس سلسلے میں تمہارے لیے سب سے بڑی یہی دلیل کافی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فرمایا :

" وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ (۹۷) وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ (۹۸) "

ترجمہ کنزالعرفان : اور تم عرض کرو : اے میرے رب ! میں شیطانوں کے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ اور اے میرے رب ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ شیطان میرے پاس آئیں۔

تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو سارے جہان سے بہتر، سب سے زیادہ معرفت رکھنے والے، سب سے زیادہ عقلمند اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ رتبہ اور فضیلت رکھنے والے ہیں، انھیں اس بات کی ضرورت ہے کہ شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگیں تو تمہاری حیثیت ہی کیا ہے ! حالانکہ تم جاہل، عیب و نقص والے اور غفلت میں ڈوبے ہوئے ہو (تو کیا تم شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ لینے کے محتاج نہیں ہو ؟ یقیناً محتاج ہو اور بہت زیادہ محتاج ہو)۔

شیطان سے حفاظت کی دعا :

حضرت جندب (رض) سے روایت ہے، سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا : " تم میں سے جو شخص رات کے وقت اپنے بستر پر جائے تو یہ کہہ لیا کرے " بِسْمِ اللّٰهِ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ "

حضرت شقیق بلخی (رح) کا طریقہ :

حضرت شقیق بلخی (رح) فرماتے ہیں " روزانہ صبح کے وقت شیطان میرے پاس آگے پیچھے، دائیں بائیں سے آتا ہے، میرے سامنے آکر کہتا ہے " تم خوف نہ کرو بیشک اللہ عَزَّوَجَلَّ بڑا غفور و رحیم ہے۔ یہ سن کر میں یہ آیت پڑھتا ہوں :

" وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى (۸۲) "

ترجمہ کنزالعرفان : اور بیشک میں اس آدمی کو بہت بخشنے والا ہوں جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیا پھر ہدایت پر رہا۔

(مراد یہ کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا تو ہے لیکن اس آیت کے مطابق ان لوگوں کو بخشنے والا ہے جو توبہ و ایمان و اعمالِ صالحہ والے ہیں للہذا میں عمل سے بے پرواہ نہیں ہوسکتا) اور شیطان میرے پیچھے سے مجھے یہ خوف دلاتا ہے کہ میری اولاد محتاج ہو جائے گی۔ تب میں یہ آیت پڑھتا ہوں :

" وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا "

ترجمہ کنزالعرفان : اور زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ کرم پر نہ ہو۔

(مراد یہ کہ مجھے رزق کی فکر ڈال کر اللہ سے غافل نہ کر کیونکہ رزق تو اسی کے ذمہ کرم پر ہے۔) پھر شیطان میری دائیں طرف سے آکر میری تعریف کرتا ہے، اس وقت میں یہ آیت پڑھتا ہوں :

" وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ "

ترجمہ کنزالعرفان : اور اچھا انجام پرہیزگاروں کیلئے ہی ہے۔ 5۔۔اعراف : ۱۲۸۔
(یعنی مجھے اچھا کہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں اچھا تب ہوں گا جب میرا انجام اچھا ہوگا اور انجام تب اچھا ہوگا جب میں متقی بنوں گا) پھر شیطان میری بائیں طرف سے نفسانی خواہشات میں سے کچھ لے کر آتا ہے تو میں یہ آیت پڑھتا ہوں :
" وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ "
ترجمہ کنزالعرفان : اور ان کے درمیان اور ان کی چاہت کے درمیان رکاوٹ ڈال دی گئی۔
(مراد یہ کہ نفسانی خواہشات سے دور رہنے میں ہی کامیابی ہے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری)
انسان کے آگے آخرت ہے پیچھے دنیا اور شیطان دونوں کو تباہ کرتا ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ شیطان انسان کی پچھلی زندگی کو توبہ نہ کرنے سے اور اگلی زندگی کو مائل بہ نیکی ہونے سے روک کر تباہ کرتا ہے اور دائیں بائیں سے اس کا حملہ آور ہونا یہ ہے کہ انسان کے دائیں طرف نیکی لکھنے والا فرشتہ ہے اور بائیں طرف بدی لکھنے والا۔ شیطان انسان کو نیکی سے روک کر دائیں فرشتے کو معطل کرتا اور گناہوں میں مبتلا کرکے بائیں فرشتے کو مصروف رکھتا ہے اور یوں وہ انسان کو اکثر ناشکرا بنا دیتا ہے کبھی کفر میں مبتلا کرکے اور کبھی بد عملی میں۔
چاروں طرف سے شیطانی حملوں سے بچنے کی دعاء :
حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہر صبح وشام یہ دعا فرمایا کرتے تھے :
اللھم احفظنی من بین یدی و من خلفی و عن یمینی و عن شمالی و من فوقی واعوذ بعظمتک ان اغتال من تحتی۔اے اللہ ! میرے آگے پیچھے اور دائیں بائیں اور اوپر سے میری حفاظت فرما اور میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ مجھے نیچے سے فتنہ میں ڈال دیا جائے (ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان وغیرہم)
تو جو شخص یہ دعا صبح وشام پڑھ لیا کرے وہ شیطان کے تمام حملوں سے محفوظ رہے گا۔ مروی ہے کہ شیطان نے جب چار اطراف سے حملہ کرنے کی بات کی تو اللہ تعالیٰ نے شیطان سے فرمایا : تم نے دو طرفیں چھوڑ دی ہیں، اوپر والی اور نیچے والی، تو جو شخص تیرے گمراہ کرنے سے گناہ کرنے کے بعد اوپر کو ہاتھ اٹھائے گا یا نیچے سجدے میں گرے گا میں اسے معاف کر دوں گا۔ (تفسیر برہان القرآن۔علامہ قاری محمد طیب)
شیطان نے انسانوں کے خلاف اپنی فتنہ سامانیوں کے لیے ایک جہت کا ذکر نہیں کیا یعنی " ومن فوقھم " (اور ان کے اوپر سے) نہیں کہا۔ حضرت ابن عباس (رض) نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ انسانوں پر اللہ کی رحمت اوپر سے نازل ہوتی ہے اس لیے اس جہت کو شیطان سے آزاد رکھا گیا۔ اسی طرح ومن تحت ارجلھم (اور ان کے قدموں کے نیچے سے) نہیں کہا اس لیے اگر اس کے حقیقی معنی مراد لیے جائیں تو اس جہت سے کوئی کارروائی ناممکن اور ممتنع ہوتی ہے۔ قول باری ہے ولا تقربا ھذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین۔ مگر اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے) اللہ تعالیٰ نے درخت سے دونوں کے قرب کو مقرون کر دیا۔ البتہ یہ بات معلوم ہے کہ اس میں یاد کی شرط لگائی تھی اور جان بوجھ کر اس کا علم رکھتے ہوئے کھانے کی شرط عائد کی تھی۔ اس لیے کہ نسیان اور خطا کی بنا پر کسی کام کے کر لینے میں جس پر کوئی دلیل قاطع موجود نہ ہو، مواخذہ نہیں ہوتا۔ ان دونوں کا درخت سے کھا لینا معصیت کبیرہ نہیں تھی بلکہ دو وجوہ سے معصیت صغیرہ تھی۔ ایک تو یہ کہ دونوں اس معصیت کی وعید کو بھول گئے تھے اور یہ خیال کر بیٹھے تھے کہ یہ نہی استحباب پر مبنی ہے ایجاب پر مبنی نہیں ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا (فنسی ولم نجد لہ عزماً۔ سو ان سے بھول ہو گئی اور ہم نے ان میں پختگی نہیں پائی) دوسری وجہ یہ ہے کہ انھیں ایک متعین درخت کا اشارہ دیا گیا تھا اور انھوں نے اس سے عین درخت مراد سمجھی تھی جبکہ جنس درخت مراد تھی جس طرح حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سونا اور ریشم ہاتھ میں پکڑ کر فرمایا تھا ھذان مھلکا امتی۔ یہ دونوں چیزیں میری امت کے لیے مہلک ہیں) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جنس سونا اور جنس ریشم مراد لی تھی، صرف وہی سونا اور ریشم مراد نہیں تھے جنہیں آپ نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ (تفسیر احکام القرآن للجصاص۔ابو احمد بن علی الرازی)
ابلیس لعین کے اس دعوی کا سبب کہ اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوں گے۔
اس کے بعد ابلیس لعین نے اللہ تعالیٰ سے کہا اور تو اکثر لوگوں کو شکر گزار نہیں پائے گا۔

ابلیس نے انسانوں کے متعلق جو گمان کیا تھا کہ ان میں اکثر انسان ناشکرے اور کافر ہوں گے، سو انسانوں نے بعد میں اس کے گمان کو سچ کر دکھایا اور فی الواقع اکثر انسان ناشکرے اور کافر ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: " ولقد صدق علیهم ابلیس ظنہ فاتبعوہ الافریقا من المومنین : اور بیشک ابلیس نے ان پر اپنا گمان سچ کر دکھایا سو مومنوں کے ایک گروہ کے سوا سب انسانوں نے اس کی پیروی کی " (سبا: 20)۔

اب یہاں پر ایک بحث ہے کہ ابلیس نے یہ قول یقین اور جزم سے کیا تھا یا یہ اس کا محض گمان تھا۔ اگر یہ اس نے یقین سے کہا تھا تو اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس نے کسی طرح یہ لوح محفوظ میں یہ لکھا ہوا دیکھ لیا تھا۔ یا اس نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول سن لیا تھا: " و قلیل من عبادی الشکور : میرے شکر گزار بندے بہت کم ہیں "۔ یا جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو خبر دی کہ میرے شکر گزار بندے بہت کم ہیں تو اس نے سن لیا تھا۔ یا اس نے فرشتوں سے یہ بات سن لی تھی یا جب فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا کیا تو اس کو زمین میں بنائے گا جو زمین میں فساد کرے گا تو اس سے اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اکثر انسان شکر گزار نہیں ہوں گے۔ اور یا یہ قول محض ابلیس کا گمان تھا اور گمان کا منشاء یہ تھا کہ جب وہ حضرت آدم (علیہ السلام) کو بہکا سکتا ہے تو ان کی اولاد کو بہکانا تو اس کے لیے آسان تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان کی انیس قوتیں ہیں جن کا تعلق لذات جسمانیہ سے ہے اور ایک قوت عقل ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت پر ابھارتی ہے۔ وہ انیس قوتیں یہ ہیں: پانچ حواس ظاہرہ، پانچ حواس باطنہ، اور شہوت اور غضب، اور سات دیگر قوتیں ہیں جاذبہ ممسکہ، ھاضمہ، دافعہ، قاذفہ، نامیہ اور مولدہ۔ اور ابلیس لعین کے نزدیک یہ آسان تھا کہ وہ انیس قوتوں کے تقاضوں کو بھڑکائے اور ایک قوت کے تقاضوں کو کم کرے۔ اس لیے اس نے یہ دعوی کیا کہ اور تو اکثر لوگوں کو شکر گزار نہیں پائے گا۔

(تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ:

قَالَ اخۡرُجۡ مِنۡهَا مَذۡءُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ؕ لَمَنۡ تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنۡكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ○۱۸

لغۃ القرآن: قَالَ : فرمایا] [اخْرُجْ : نکل جا] [مِنْهَا : اس سے] [مَذْءُوْمًا : مزمت کیا ہوا] [مَّدْحُوْرًا : دھکتارا ہوا] [لَمَنْ : البتہ جو] [تَبِعَكَ : تیری پیروی کی] [مِنْهُمْ : ان سے] [لَاَمْلَئَنَّ : البتہ ضرور میں بھر دوں گا] [جَهَنَّمَ : جہنم] [مِنْكُمْ : تم میں سے] [اَجْمَعِيْنَ : تمام]

ترجمہ: ارشاد باری ہوا: (اے ابلیس!) تو یہاں سے ذلیل و مردود ہو کر نکل جا، ان میں سے جو کوئی تیری پیروی کرے گا تو میں ضرور تم سب سے دوزخ بھر دوں گا

تشریح:

اللہ تعالیٰ نے شیطان کو ذلیل و مردود کرکے نکال دیا کہ ہمیشہ اس پر لعنت پڑتی رہے گی۔ ہر قرآن پڑھنے والا پڑھنے سے قبل اس پر لعنت کرتے ہوئے کہتا ہے: اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم اور اللہ نے فرمایا کہ میں جہنم کو تجھ سے اور تیرے پیروکاروں سے بھروں گا۔ دوسری جگہ یوں فرمایا گیا۔

لاملئن جھنم منك وممن تبعك منھم اجمعین۔ میں جہنم کو تجھ سے اور تیرے پیروکاروں سے بھروں گا۔" (ص، 85)

اسی لیے شیطان کو طویل تر عمر دی گئی کہ ایک طرف وہ اور اس کی شیطانی فوج ہے جو انسان کو گناہ کی طرف بلاتی ہے اور دوسری طرف انبیاء و اولیاء اور علماء ربانیین کی رحمانی فوج ہے جو انسان کو نیکی کی طرف بلاتی ہے۔ اب انسان کا امتحان ہے کہ وہ کیا راستہ اختیار کرتا ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

قَالَ اخۡرُجۡ مِنۡهَا : (اللہ نے) فرمایا: تو یہاں سے نکل جا۔} فرمایا کہ تو یہاں سے ذلیل و مردود ہو کر نکل جا آج فرشتوں میں ذلیل اور آئندہ ہر جگہ ذلیل و خوار ہو کہ لعنت کی مار تجھ پر پڑتی رہے۔ معلوم ہوا کہ پیغمبر کی دشمنی تمام کفروں سے بڑھ کر ہے، شیطان عالم وزاہد ہونے کے باوجود نبی کی تعظیم سے انکار پر ایسا ذلیل ہوا۔

{ لَاَمۡلَـَٔنَّ جَہَنَّمَ مِنۡکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ : میں ضرور تم سب سے جہنم بھر دوں گا۔ } یعنی اے شیطان ! تجھ کو بھی اور تیری اولاد کو بھی اور تیری اطاعت کرنے والے آدمیوں کو بھی سب کو جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ جہنم کو جنوں اور انسانوں سے بھرا جائے گا:

اس سے معلوم ہوا کہ دوزخ میں شیطان، جنات اور انسان سب ہی جائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے جہنم کو بھر دے گا۔ اسی چیز کو بیان کرتے ہوئے ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"وَتَمَّتۡ کَلِمَۃُ رَبِّکَ لَاَمۡلَـَٔنَّ جَہَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ (۱۱۹)"

اور تمہارے رب کی بات پوری ہو چکی کہ بیشک میں ضرور جہنم کو جنوں اور انسانوں سے ملا کر بھر دوں گا۔

اور حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا" جہنم اور جنت میں مباحثہ ہوا تو جہنم نے کہا: مجھ میں جبّار اور متکبر لوگ داخل ہوں گے۔ جنت نے کہا: مجھ میں کمزور اور مسکین لوگ داخل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے جہنم سے فرمایا" تم میرا عذاب ہو، میں جس کو چاہوں گا تمہارے ذریعے عذاب دوں گا۔ جنت سے فرمایا" تم میری رحمت ہو، میں تمہارے ذریعے جس پر چاہوں گا رحم کروں گا اور تم میں سے ہر ایک کو پر ہونا ہے۔

(تفسیر صراط الجنان)

ابلیس نکالا گیا:

پچھلی آیت میں گزرا کہ شیطان قیامت تک مہلت ملنے پر پھولا نہ سمایا اور کہنے لگا کہ میں آدم کی وجہ سے ذلیل و خوار تو ہوا ہوں لیکن اب میں اس سے دل کھول کر بدلہ لونگا اور اس کی اولاد میں سے بہت سوں کو گمراہ کرکے چھوڑوں گا آگے کا حال اس آیت میں ہے۔

ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی بات سن کر فرمایا۔ تو ذلیل و خوار اور مردود ٹھہرایا گیا ہے چل یہاں سے نکل ہمیں اس کی پروا نہیں کہ تو آدم کی اولاد کو بہکا کر غلط راستے پر چلائے گا اس میں ہمارا کیا جائے گا ہم تجھ کو اور تیرا کہنا ماننے والوں کو اکٹھا دوزخ میں جھونک دیں گے پھر آدم کو حکم ہوا کہ تو اپنی بیوی سمیت جنت میں رہ۔ تم دونوں کو یہاں ہر قسم کی آزادی ہے مگر ہاں یہ درخت جو سامنے نظر آرہا ہے اس کے پاس مت پھٹکنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔

آدم (علیہ السلام) کا قصہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے وہاں کہا گیا ہے کہ آدم کی پیدائش سے پہلے اللہ نے فرشتوں سے کہہ دیا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے ظاہر ہو گیا تھا کہ اس کو خاص قوتیں دے کر اس کے ذمہ کچھ کام ڈالا جائے گا اور اس طرح اس کا امتحان لیا جائے گا کہ یہ وہ کام ٹھیک طور پر کرتا ہے یا نہیں۔ سورۃ الانعام کی آخری آیت میں سب انسانوں سے صاف طور پر کہہ دیا گیا کہ تم سب کو اللہ نے زمین پر خلیفہ بنایا ہے اور اس سے تمہارا امتحان مقصود ہے اس سورت میں آدم کو اسی امتحان کے لیے تیار کرنے کا ذکر ہے اسے جنت میں رکھا گیا جس سے یہ سمجھانا مقصود تھا کہ آدم کی اور ان کی اولاد کی اصل جگہ یہ ہے۔ پابندی اس لیے لگائی گئی کہ دنیا میں جا کر اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں میں رہنا یہیں سیکھ جائے اور گناہ کا مطلب اور اس کے معاف کرنے کا طریقہ بھی اسے معلوم ہو جائے۔

(تفسیر درس قرآن۔ قرآن بورڈ آسٹریلیا)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: " فرمایا یہاں سے ذلیل اور دھتکارا ہوا ہو کر نکل جا، البتہ جو لوگ تیری پیروی کریں گے میں تم سب سے دوزخ کو بھر دوں گا"

کیا تمام اہل بدعت اور گمراہ فرقے دوزخی ہیں؟ جب ابلیس لعین نے اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ چیلنج دیا کہ وہ اصحاب اخلاص کے سوا سب لوگوں کو گمراہ کردے گا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہاں سے مذء وم اور مدحور ہو کر نکل جا۔ علامہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ مذء وم کا معنی ہے مذموم، جس کی مذمت کی گئی ہو اور مدحور کا معنی ہے دور کیا ہوا۔ (المفردات، ج 1، ص 243، 221، طبع بیروت) وہ کس چیز سے دور کیا ہوا ہے، مفسرین نے اس کی متقارب تفسیریں کی ہیں، یعنی اللہ کی رحمت سے دور کیا ہوا، یا جنت سے دور کیا ہوا یا توفیق سے دور کیا ہوا۔

امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ تمام اصحاب بدعات اور اصحاب ضلالات جہنم میں داخل ہوں گے کیونکہ وہ سب ابلیس کے تابع ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: البتہ جو لوگ تیی پیروی کریں گے میں تم سب سے دوزخ کو بھر دوں گا۔ (الاعراف: 18) (تفسیر کبیر ج 5، ص 216، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1415ھ)

یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ ابلیس کے پیروکاروں سے جہنم کو بھر دے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ ہر ہر پیروکار کو جہنم میں ڈال دے گا۔ اس لیے جو اہل بدعت اور اصحاب ضلالت اپنی بدعت اور ضلالت سے کفر تک پہنچ گئے ہوں گے وہ دوام اور خلود کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے اور جن کی بدعت اور ضلالت کفر سے کم درجہ کی ہو گی، وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہیں، وہ چاہے تو انھیں کچھ سزا دینے کے بعد دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل فرما دے گا اور اگر وہ چاہے تو انھیں ابتداء جنت میں داخل کر دے گا۔ جس طرح فاسق اور گناہ کبیرہ کے مرتکبین بھی ابلیس کے پیروکار ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ تمام فساق کو دوزخ میں نہیں ڈالے گا۔ جس طرح فاسق اور گناہ کبیرہ کے مرتکبین بھی ابلیس کے پیروکار ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ تمام فساق کو دوزخ میں نہیں ڈالے گا۔ بعض فساق کو کچھ عرصہ کے عذاب کے بعد دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل فرمادے گا اور اگر وہ چاہے تو انھیں ابتداء جنت میں داخل کر دے گا۔ جس طرح فاسق اور گناہ کبیرہ کے مرتکبین بھی ابلیس کے پیروکار ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ تمام فساق کو دوزخ میں نہیں ڈالے گا۔ بعض فساق کو کچھ عرصہ کے عذاب کے بعد دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کر دے گا اور بعض فساق کو اپنے فضل سے معاف فرمادے گا اور بعض کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت سے معاف فرمائے گا اور ان کو دوزخ میں نہیں ڈالے گا اور ابتداء جنت میں داخل فرمادے گا۔

آیت مبارکہ:

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۹

لغۃ القرآن: وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ : اور اے آدم رہو تم] [وَزَوْجُكَ : اور تمہاری بیوی] [الْجَنَّةَ : جنت میں] [فَكُلَا : پس تم دونوں کھاؤ] [مِنْ : سے] [حَيْثُ : جہاں " سے "] [شِئْتُمَا : تم دونوں چاہو] [وَلَا : اور نہ] [تَقْرَبَا : تم دونوں قریب جانا] [هٰذِهِ الشَّجَرَةَ : اس درخت کے] [تَكُوْنَا : پس تم دونوں ہوجاؤ گے] [مِنَ الظّٰلِمِيْنَ : ظالموں میں سے]

ترجمہ: اور اے آدم ! تم اور تمہاری زوجہ (دونوں) جنت میں سکونت اختیار کرو سو جہاں سے تم دونوں چاہو کھایا کرو اور (بس) اس درخت کے قریب مت جانا ورنہ تم دونوں حد سے تجاوز کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے

تشریح:

آدم (علیہ السلام) کو سجدہ نہ کرنے کے جرم میں ابلیس جنت سے نکال دیا گیا۔ اور آدم و حوا کو نعیم جنت سے لطف اندوز ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن یہ گل و ریحان کی وادی جہاں لطف و سرور اور نکہت و نور کی نسیم محو خرام ناز تھی، ایک ایسے راہرو کی آخری منزل نہیں ہو سکتی جس کے ناصبور دل اور سیمابی فطرت کی قسمت میں کانٹوں کو پھول، ریگستانوں کو گلستان اور ظلمت کدوں کو بقعہ نور بنانا لکھا جاچکا تھا۔ کوثر و سلسبیل کی نرم خیز موجیں اس دل کو نہ بہلا سکیں جس کو اس کے خالق نے طوفان خیز سمندروں کو زیر نگیں کرنے کی صلاحیت عطا فرمائی تھی۔ اب اس کو گوشہ عافیت سے نکال کر عمل کے میدان میں لا کھڑا کرنے کی دو صورتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ تسبیح و تہلیل کرتے ہوئے فرشتوں کا ایک جلوس ہمراہ ہوتا اور آدم کی سواری جنت سے روانہ ہو کر اس خاکدان ارضی میں اترتی۔ دوسری صورت وہ تھی جو اختیار کی گئی۔ بظاہر پہلی صورت شان آدم کے زیادہ شایاں معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت اس کی مقتضی نہ ہوئی۔ اس طرح بیشک آپ ناز و نعمت اور عزت و جاہ کے مظہر بن کر تو ظاہر ہوتے لیکن سوز عشق، درد فراق، آتش شوق، نیاز مندی اور نالہ وزاری کے بلند، لطیف اور پاکیزہ جذبات سے آپ کے دل کی دنیا ناآشنا رہتی اور قرب و رضا کا وہ مقام جو محض عجز و انکساری، گریہ وزاری، دل کی بے چینی اور روح کی بے قراری کے عوض بخشا جاتا ہے وہاں تک آپ کی رسائی نہ ہوتی۔ اس لیے قصد و نیت کے بغیر اس شجر

ممنوعہ کو چھو بیٹھے۔ غیرت الٰہی اتنا بھی برداشت نہ کر سکی زیر عتاب لا کر جنت سے نکال دیا۔ نگاہ کرم کے برگشتہ ہونے سے غم واندوہ کے بادل گھر آئے۔ شور و فغاں کی بجلیاں کڑکنے لگیں۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ جس نے شجر محبت کی آبیاری کی۔ ماہی بے آب کی طرح تڑپتے ہوئے دل کی سوز و گداز نے اسے زندگی کی حرارت بخشی۔ یہاں تک کہ آپ کی وہ ساری کی ساری صلاحیتیں بیدار ہو گئیں جن کا خلافت الٰہی کے تخت پر متمکن ہونے سے پہلے بیدار ہونا ضروری تھا۔ نظر سر الخلافۃ والمحبۃ والمحنۃ والتحقق بمظاھر الجمال والجلال کالتواب والغفور والعفو والقھار والستار (روح البیان) ترجمہ:۔ یوں گریہ پیہم کی برکت سے خلافت کا راز آشکارا ہوا۔ محبت اور محنت کی حقیقت پر آگاہی حاصل ہوئی۔ اور جمال و جلال خداوندی کے آپ مظہر بنے۔ مختلف اسماء حسنی تواب، غفار، قہار اور ستار کی جلوہ نمائی ہوئی۔

ترجمہ: اور مت نزدیک جانا اس (خاص) درخت کے ورنہ تم دونوں ہو جاؤ گے اپنا نقصان کرنے والوں سے (تفسیر ضیاء القرآن)

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) اور حضرت حوا (علیہاالسلام) کو حکم دیا کہ جنت میں رہو، جہاں سے جی چاہے کھاؤ مگر اس مخصوص درخت کے قریب نہ جانا۔ شیطان جو حضرت آدم (علیہ السلام) کے حسد میں جل رہا تھا اس نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ جس درخت سے تمہیں منع کیا گیا ہے اس کی خاصیت یہ ہے کہ جو اس کا پھل کھالے اس کے اندر فرشتوں کے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں یا اسے ہمیشہ کی زندگی مل جاتی ہے، اگر تم اس کا پھل کھالو تو تم ہمیشہ جنت میں رہو گے اور یہ اللہ تعالیٰ کے قریب اور مقبول بندوں کے رہنے کی جگہ ہے، لہٰذا تم بھی ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے قریب میں رہو گے۔ نیز شیطان نے ان کے سامنے قسم اٹھائی کہ وہ ان کا بڑا خیر خواہ ہے۔ حضرت آدم و حواء (علیہاالسلام) کا گمان یہ تھا کہ کوئی اللہ تعالیٰ کی جھوٹی قسم نہیں اٹھا سکتا کیونکہ شیطان سے پہلے کسی نے اللہ تعالیٰ کی جھوٹی قسم نہیں اٹھائی تھی۔ شیطان پہلا بد نصیب تھا جس نے اللہ تعالیٰ کی جھوٹی قسم اٹھائی، چنانچہ حضرت آدم و حوا علیہاالسلام شیطان کی جھوٹی قسم کی وجہ سے اس کے فریب میں آ گئے اور قرب خداوندی کے خیال سے حکم خداوندی بھول گئے اور اس درخت کا پھل کھا بیٹھے حالانکہ ان کا کھانے کا ارادہ نہیں تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اور ہم نے اس سے پہلے آدم (علیہ السلام) سے (اس درخت کے قریب نہ جانے کا) عہد لیا تھا لیکن وہ بھول گئے اور ہم نے ان کا (نافرمانی کا) قصد نہیں پایا"۔ (قرآن: ۲۰، ۱۱۵)

اس درخت کا پھل کھانے کے نتیجے میں ان کے نورانی اور جنتی لباس غائب ہو گئے اور ان کی شرمگاہیں ظاہر ہو گئیں۔ اس سے پہلے ان دونوں میں سے کسی نے خود اپنا ستر نہ دیکھا تھا۔ اس پر انھیں شرمندگی محسوس ہوئی اور وہ جنتی درختوں یعنی انجیر وغیرہ کے پتوں سے اپنی شرمگاہوں کو چھپانے لگے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسانی شرمگاہوں کو چھپانا انسانی فطرت اور حضرت آدم و حوا علیہاالسلام کی سنت ہے اور ان کو بے نقاب کرنا شیطان کا کام ہے۔

اس درخت کا پھل کھانا حضرت آدم و حواء (علیہاالسلام) کی اجتہادی غلطی اور نسیان تھا۔ یہ گناہ نہیں تھا کیونکہ اس کو کہتے ہیں جس میں انسان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ارادہ کرتا ہے جبکہ یہاں پر ارادہ نہیں تھا بلکہ نسیان تھا اور یہ عصمت انبیاء کے منافی نہیں ہے۔ اس کی مزید تشریح کے لیے سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۳۶ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ گناہ نہیں تھا تو پھر حضرت آدم و حوا (علیہاالسلام) کو سزا کیوں ملی یعنی ان کی شرمگاہیں ظاہر ہو گئیں اور انھیں جنت سے نیچے اتار دیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس درخت سے کھانے کا نتیجہ اور اثر تھا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بھول کر زہر کھالے تو اس کا یہ فعل گناہ نہیں ہے لیکن زہر کھانے کے بعد اس کا مر جانا اس زہر کا لازمی نتیجہ ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس درخت کا پھل کھانے میں بے لباس ہونے کا اثر رکھا تھا تو خواہ انھوں نے بھول کر اس سے کھایا اس کا اثر ظاہر ہو گیا۔ اور رہا جنت سے اتر کر زمین پر آنا تو وہ آپ نے بہر حال زمین پر آنا تھا کیونکہ آپ کو پیدا ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ آپ زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ بنیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کی پیدائش سے پہلے فرشتوں کو فرمایا: ''میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہو''۔ (قرآن: ۲، ۳۰) (تفسیر امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

حضرت آدم (علیہ السلام) کی خطاء اور ان کا جنت سے زمین پر آنا:

فرشتوں کے سجود آدم (علیہ السلام) اور شیطان کے جنت سے اخراج کے بعد آدم (علیہ السلام) کو جنت میں ٹھہرایا گیا۔ وہاں وہ اکیلے پن کے سبب وحشت محسوس کرتے تھے تو ایک دن ان کے پہلو سے حضرت سیدہ حوا کو پیدا کیا گیا اور ان سے آدم (علیہ السلام) کا نکاح کیا گیا۔

حضرت حوا (رض) کا حق مہر کیا تھا:

امام صاوی (رح) نے ذکر کیا ہے کہ آدم (علیہ السلام) جنت میں سو رہے تھے کہ ان کی دائیں پسلی سے سیدہ حوا کو پیدا کر دیا گیا۔ جب آپ بیدار ہوئے تو ان کو اپنے پاس موجود پایا اور ان کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا، فرشتوں نے کہا: مہ یاآدم حتی تودی مھرھا فقال ما مھرھا فقالوا ان تصلی عشرون صلوۃ علی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، اے آدم رک جاؤ پہلے اس کا مہر ادا کرو، حضرت آدم نے کہا: اس کا مہر کیا ہے، فرشتوں نے کہا اس کا مہر یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پہ بیس مرتبہ درود شریف پڑھو۔ (تفسیر صاوی علی الجلالین جلد اول صفحۃ 23 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

تب حضرت آدم (علیہ السلام) اور حضرت حوا کو حکم ہوا کہ وہ دونوں جنت میں ٹھہریں اور یہاں کا جو پھل وہ چاہیں کھائیں مگر گندم کے درخت کے قریب نہ جائیں ورنہ وہ خود پر زیادتی کرنے والے ہوں گے یعنی جنت سے نکال دیئے جائیں گے۔

جنت پیدا ہو چکی ہے اور آدم (علیہ السلام) اسی میں ٹھہرے تھے:

الجنۃ کا معرف باللام ہونا بتاتا ہے کہ آدم (علیہ السلام) کو اسی معروف جنت میں ٹھہرایا گیا جو قیامت کے دن اہل ایمان کو ملے گی۔ کیونکہ لفظ الجنۃ قرآن میں ہر جگہ اسی معروف جنت کے لیے ہے جیسے:

فان الجنۃ ھی الماوی۔ واللہ یدعوا الی الجنۃ۔ ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ وغیرہ للذا کسی قرینہ صارفہ کے بغیر اسے اس معنی سے ہٹانا جائز نہیں۔ بعض بہکے ہوئے لوگ کہتے ہیں یہاں الجنۃ سے دنیا کا کوئی باغ مراد ہے وہاں آدم (علیہ السلام) کو ٹھہرایا گیا تھا مگر یہ نظریہ قرآن اور صدہا احادیث صحیحہ کے خلاف ہے۔

عورت مرد کے تابع ہے:

اسکن انت وزوجک الجنۃ سے معلوم ہوا جنت کی رہائش حقیقتاً آدم (علیہ السلام) کے لیے تھی۔ البتہ حضرت حواء وہاں ان کی بیوی ہونے کی وجہ سے ٹھہرائی گئیں۔ اسی لیے وزوجک فرمایا گیا۔ پتہ چلا جہاں شوہر رہتا ہو عورت کو وہیں اس کے ساتھ رہنا چاہیے یہ نہیں کہ عورت شوہر کو اپنے پاس رکھے اور نہ ہی عورت کے لیے یہ جائز ہے کہ مرد کی رہائش سے بڑھ کر اچھی رہائش کا مطالبہ کرے۔ قرآن میں ہے: اسکنوھن من حیث سکنتم من وجدکم۔ تم اپنی عورتوں کو وہاں ٹھہراؤ جہاں تم ٹھہرے ہو، اپنی گنجائش کے مطابق۔" (الطلاق: 6) (تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

حکمتیں

1۔ جنت میں رکھنے کی یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) اور ان کی زوجہ جنت کی سہولتوں، بہاروں اور نعمتوں کو اچھی طرح دیکھ لیں اور ان سے لطف اندوز ہو لیں۔ تاکہ دنیا کی عارضی نعمتوں کو جنت کے مقابلے میں خاطر میں نہ لائیں اور دوبارہ یہاں آنے کی کوشش کریں

2۔ شاید اس کی یہ بھی حکمت ہو کہ وہ آسمانی نظام کا براہ راست مشاہدہ کریں تاکہ بحیثیت خلیفہ زمین کے انتظامات کرنے میں انھیں سہولت رہے۔

3۔ بطور آزمائش اس درخت سے اس لیے منع کیا گیا کہ وہ خدا کے منع کردہ امور سے بچنے کی تربیت پائیں اور غلطی ہونے کی صورت میں معذرت کا رویہ اختیار کریں۔

4۔ اس میں یہ حکمت بھی ہو سکتی ہے کہ انھیں شیطان کے ساتھ عداوت اور دشمنی کا مزید مشاہدہ ہو۔ تاکہ دنیا میں جا کر شیطانی اثرات وحرکات سے بچنے کی ہر وقت کوشش کرتے رہیں۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

آیت مبارکہ:

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ۝۲۰

لغۃ القرآن: فَوَسْوَسَ : پھر وسوسہ ڈالا] [لَهُمَا : ان دونوں کے لیے] [الشَّيْطٰنُ : شیطان نے] [لِيُبْدِيَ :] [لَهُمَا : ان دونوں کے لیے] [مَا : نہیں] [وُرِيَ : چھپائی گئی تھیں] [عَنْهُمَا : ان دونوں سے] [مِّنْ : سے] [سَوْاٰتِهِمَا : ان دونوں کی شرمگاہیں] [وَ : اور] [قَالَ : فرمایا] [مَا : نہیں] [نَهٰكُمَا : روکا تم دونوں کو] [رَبُّكُمَا : تم دونوں کے رب نے] [عَنْ : کے بارے میں] [هٰذِهِ : ان] [الشَّجَرَةِ : درخت] [اِلَّآ : مگر] [اَنْ : کہ] [تَكُوْنَا : تم دونوں ہوجاؤ] [مَلَكَيْنِ : فرشتے] [اَوْ : یا] [تَكُوْنَا : تم دونوں ہوجاؤ] [مِنَ : سے] [الْخٰلِدِيْنَ : ہمیشہ رہنے والوں]

ترجمہ: پھر شیطان نے دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا تاکہ ان کی شرم گاہیں جو ان (کی نظروں) سے پوشیدہ تھیں ان پر ظاہر کردے اور کہنے لگا: (اے آدم وحوا!) تمہارے رب نے تمہیں اس درخت (کا پھل کھانے) سے نہیں روکا مگر (صرف اس لیے کہ اسے کھانے سے) تم دونوں فرشتے بن جاؤ گے (یعنی علائق بشری سے پاک ہو جاؤ گے) یا تم دونوں (اس میں) ہمیشہ رہنے والے بن جاؤ گے (یعنی اس مقام قرب سے کبھی محروم نہیں کئے جاؤ گے)

تشریح:

علامہ ابو عبداللہ القرطبیؒ نے وسوسہ کے دو معنی لکھتے ہیں۔ا۔ الصوت الخفی :۔ دھیمی دھیمی آواز۔ (۲) حدیث النفس :۔ دل کے خیالات۔ شیطان نے کس طرح آدم (علیہ السلام) کے دل میں وسوسہ ڈالا؟ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ آدم (علیہ السلام) جنت کے دروازے پر آئے اور شیطان نے چپکے سے ان کو یہ بات کہہ دی بعض کی رائے یہ ہے کہ وہ سانپ کے منہ میں داخل ہو کر جنت میں گیا اور آدم کو بہکایا وغیرہ وغیرہ لیکن زیادہ صحیح رائے حضرت حسن بصری (رح) کی ہے کہ شیطان کو یہ قوت دی گئی تھی کہ وہ زمین پر رہتے ہوئے آدم وحوا کے قلوب میں وسوسہ ڈال سکے۔ قال الحسن کان یوسوس من الارض الی السماء والی الجنۃ بالقوۃ الفوقیۃ التی جعلہ اللہ تعالیٰ لہ (رازی) وقیل من خارج السلطنۃ التی جعلت لہ (قرطبیؒ) صوفیاء کرام کے نزدیک تو دور سے توجہ باطنی کا اثر مسلمات سے ہے لیکن حکماؤ فلاسفہ بھی اس کے منکر نہیں۔ قدیم فلاسفۃ اشراقیین دور دراز سے محض اپنی قلبی توجہ سے اپنے شاگردوں کی اصلاح وتربیت کیا کرتے تھے۔ مسمریزم میں بھی عامل محض اپنی توجہ سے معمول کو بے ہوش کرتا ہے اور اس سے اپنی مرضی کے مطابق کام کراتا ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ)

معلوم نہیں کہ شیطانی وسوسہ کس طرح عمل پیرا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہم شیطان کی حقیقت سے واقف نہیں جس سے ہم اس کے اعمال کی نوعیت سے خبردار ہو جائیں یا یہ معلوم کر سکیں کہ وہ انسان تک رسائی کیونکر حاصل کرتا ہے اور اس کو کس طرح گمراہ کرتا ہے۔ لیکن ہمیں مخبر صادق کے ذریعہ یہ علم حاصل ہے کہ شیطان کسی نہ کسی طرح انسان کو گمراہ کرتا ہے اور ان غیبی حقائق کے بارے میں مخبر صادق حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی سچا اور یقینی ذریعہ علم ہیں۔ شیطان انسان کو مختلف طریقوں سے گمراہ کرتا ہے اور یہ تمام طریقے انسانی شخصیت میں کمزور مقامات کے ذریعے سے سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ انسانی شخصیت میں فطری کمزوریاں ہیں ان سے انسان صرف پختہ ایمان اور یاد الٰہی کے ذریعے سے بچ سکتا ہے اور ایمان اور ذکر کے بعد صورت یہ ہو جاتی ہے کہ شیطان کا انسان پر کوئی کنٹرول نہیں رہتا۔ اس کی سازشیں کمزور پڑ جاتی ہیں اور انسان پر ان کا اثر نہیں ہوتا۔ اس طرح شیطان نے ان کو بہکایا اور ان کی شرمگاہیں جو ایک دوسرے پوشیدہ تھیں ان کو ان پر ظاہر کر دیا گیا اور یہ تھا اس کا اصل مقصد ان کی شرمگاہیں تھیں اور ان کو کسی دوسری مادی چیز سے چھپانے کی ضرورت تھی۔ شیطان نے ان پر اپنی اسکیم ظاہر نہ کی تھی البتہ وہ ان کی خواہشات کی راہ سے داخل ہو گیا۔ اس نے کہا" تمہارے رب نے تمہیں جو اس درخت سے روکا ہے اس کی وجہ سے اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کہیں فرشتے نہ بنا جاؤ یا تمہیں ہیشگی کی زندگی حاصل نہ ہو جائے۔"

یوں شیطان انسانی خواہشات کے ساتھ کھیلا۔ ہر انسان یہ خواہش رکھتا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے یا طویل عرصے تک عمر پائے اور اسے خلود نصیب ہو۔ اور اس کو ایسی سلطنت ملے جو محدود زندگی سے آگے ہو۔

بعض قراءتوں میں (ملکین) لفظ ل کی زیر کے ساتھ آیا ہے۔ (ملکین) جس کے معنی دو بادشاہ کے ہوتے ہیں۔

سورۃ طہ کی آیت آیت "ھل ادلک علی شجرۃ الخلد وملک الایبلی"۔ (۲۰ : ۱۲۰) "کیا میں خلود کا درخت نہ بتاؤں اور ایسی بادشاہت جو ختم ہونے والی نہ ہو۔" اس صورت میں شیطان نے انھیں دائمی عمر اور دائمی حکومت کا لالچ دیا۔ یہ دونوں چیزیں انسان کی خواہشات میں سرفہرست ہیں۔ جنسی خواہش کی اصل حقیقت بھی یہ ہے کہ جنسی تعلق واتصال کے ذریعے ایک انسان خلود ہی چاہتا ہے یعنی اس کی اولاد ہو اور نسلا بعد نسل وہ زندہ رہے اور اگر ملکین پڑھیں تو مراد یہ ہو گی کہ دونوں فرشتے بن جاؤ گے اور انسان کی جسمانی ضروریات سے فارغ ہو جاؤ گے اور ملائکہ کی طرح زندگی بھی دائمی ہو گی لیکن پہلی قرات اگرچہ مشہور قرات نہیں ہے' سورۃ طہ کی آیت سے زیادہ موافق ہے اور اس سورۃ میں شیطان کا دھوکہ بھی انسانی خواہشات کی حدود کے اندر رہتا ہے۔

شیطان لعین چونکہ جانتا تھا کہ اللہ نے ان کو بصراحت اس درخت سے منع کر دیا ہے اور یہ کہ اللہ کی جانب سے ممانعت کی وجہ سے ان کے دل میں کھٹکا موجود ہے۔ اور قوت مدافعت ان کے اندر پائی جاتی ہے۔ اس لیے اس وسوسہ اندازی میں وہ انسانی خواہشات اور کمزوریوں سے استفادے کے ساتھ ساتھ ناصح مشفق بن کر اور قسمیں اٹھا کر کہتا ہے

آیت "وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ (21)

"اور اس نے قسم کھا کر ان سے کہا کہ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں۔"

آدم اور ان کی بیوی اللہ کی اس تنبیہ کو بھول جاتے ہیں کہ شیطان ان کا دشمن ہے۔ یہ بھول ان کی شخصی خواہش اور شیطان کی قسموں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا تھا کہ تم احکام الٰہیہ کی اطاعت کرو چاہے کسی حکم کی علت سمجھو یا نہ سمجھو۔ یہ دونوں یہ بھی بھول گئے کہ اللہ کی تقدیر اور حکم کے سوا کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر اللہ نے ان کے لیے خلود نہیں لکھا اور دائمی حکومت نہیں لکھی تو یہ مقصد کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔؟

(تفسیر فی ظلال القرآن۔ سید قطب شہید)

ابلیس کی وسوسہ اندازی، حضرت آدم کا زمین پر آنا اور توبہ کرنا:

اس جگہ یہ سوال ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) جنت میں تھے اور ابلیس لعین کو جنت سے نکال دیا گیا تھا تو اس نے حضرت آدم (علیہ السلام) اور حضرت حوا کے دلوں میں وسوسہ کس طرح ڈالا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وسہ ڈالنے کے لیے دونوں کا ایک جگہ پر ہونا ضروری نہیں ہے۔ ابلیس زمین پر رہتے ہوئے آسمان اور جنت میں رہنے والوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کر سکتا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) اور حضرت حوا جنت کے دروازے کے قریب کھڑے تھے اور ابلیس لعین جنت کے دروازہ پر کھڑا تھا اور اس نے وہاں سے وسوسہ ڈالا اور تیسرا جواب ایک ضعیف روایت پر مبنی ہے۔ یہ وہب بن منبہ کی روایت ہے۔ جس کو امام عبدالرزاق نے اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے اور امام ابن جریر، علامہ قرطبی اور حافظ ابن کثیر نے اس کو اپنی اپنی تفاسیر میں درج کیا ہے اور دوسرے مفسرین نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے: "امام عبدالرزاق بن ہمام متوفی 211ھ اپنی سند کے ساتھ وہب بن منبہ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) اور ان کی زوجہ کو جنت میں رکھا اور ان کو اس درخت سے منع کیا، اس درخت کی شاخیں بہت گھنی تھیں اور فرشتے اپنے دوام اور خلود کے لیے اس درخت سے کھاتے تھے جب ابلیس لعین نے ان کو ورغلانے کا ارادہ کیا تو سانپ کے پیٹ میں داخل ہو گیا۔ اس وقت اونٹ کی طرح سانپ کی چار ٹانگیں تھیں اور وہ اللہ کی مخلوق میں بہت حسین جانور تھا۔ سانپ جنت میں داخل ہوا تو ابلیس اس کے پیٹ سے نکل آیا اور اس نے اس ممنوع درخت سے پھل توڑا اور اس کو حضرت حوا کے پاس لے کر آیا اور ان سے کہا دیکھو یہ کیسے درخت کا پھل ہے۔ اس کی خوشبو کیسی عمدہ ہے۔ اس کا کتنا لذیذ ذائقہ ہے اور کتنا حسین رنگ ہے۔ حضرت حواء نے اس درخت سے کھالیا۔ پھر اس کو حضرت آدم کے پاس لے کر گئیں اور کہا دیکھیں اس کی کتنی نفیس خوشبو ہے، کتنا لذیذ ذائقہ ہے اور کتنا حسین رنگ ہے۔ حضرت آدم نے بھی اس سے کھالیا۔ پھر ان دونوں کی شرم گاہیں ظاہر ہو گئیں۔ پھر حضرت آدم (شرم سے) درخت (کی گھنی شاخوں) میں داخل ہو گئے تو ان کو ان کے رب نے ندا فرمائی اے آدم! تم کہاں ہو؟ انھوں نے کہا: اے رب! میں یہاں ہوں۔ فرمایا تم اس سے باہر نہیں آتے؟ عرض کیا: اے رب مجھے تجھ سے حیا آتی ہے! پھر حوا سے فرمایا: تم نے میرے بندہ کو دھوکا دیا! تم کو جب بھی حمل ہو گا تو تم کو تکلیف ہو گی، اور جب بھی وضع حمل کا وقت آئے گا تو تمہیں موت کا مزہ آجائے گا! اور سانپ سے فرمایا تم اس ملعون کو اپنے پیٹ میں داخل کرکے لے گئے جس نے میرے بندہ کو دھوکا دیا، اب تم پیٹ کے بل چلتے رہو گے اور تمہارا رزق صرف مٹی

ہوگا، تم بنوآدم کے دشمن رہوگے اور بنوآدم تمہارے دشمن ہوں گے۔ تم ان کو ڈسنے کی کوشش کروگے اور وہ تم کو پتھروں اور لاٹھیوں سے ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہب سے کسی نے پوچھا کیا فرشتے بھی کھاتے ہیں؟ انھوں نے کہا اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے" (تفسیر عبدالرزاق، ج 1، ص 316، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت، 1411ھ۔ جامع البیان، ج 1، ص 336۔ 337، دار الفکر بیروت، 1415ھ۔ الجامع لاحکام القرآن، ج 1، ص 1294۔ 295۔ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی 310ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ وہ درخت جس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور ان کی زوجہ کو منع فرمایا تھا، گندم کا تھا۔ جب ان دونوں نے اس درخت سے کھایا تو ان کی شرم گاہیں ظاہر ہو گئیں۔ وہ ان کو جنت کے پتوں سے چھپانے لگے۔ وہ انجیر کے درخت کے پتے تھے جو ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے تھے۔ حضرت آدم پیٹھ موڑ کر جنت کی طرف چل دیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ندا فرمائی: اے آدم! کیا تم مجھ سے بھاگ رہے ہو، انھوں نے کہا: نہیں! اے رب! لیکن اے رب تیری عزت کی قسم! مجھے یہ گمان نہ تھا کہ کوئی شخص تیرے نام کی جھوٹی قسم کھا سکتا ہے، فرمایا میں تم کو ضرور زمین کی طرف اتاروں گا اور تم کو روزی مشقت سے حاصل ہوگی۔ پھر حضرت آدم اور حضرت حوا کو زمین کی طرف اتارا گیا اور انھیں لوہے کی صنعت کی تعلیم دی اور نہیں کھیتی باڑی کا حکم دیا۔ انھوں نے فصل اگائی اور اس میں پانی دیا۔ پھر فصل پکنے کے بعد دانہ کو کوٹا اور اس کو بھوسے سے الگ کیا، پھر اس کو پیسا، پھر آٹا گوندھا، پھر روٹی پکائی۔ (جامع البیان، جز 8، ص 187۔ 188، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

تفسیر در منثور میں علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے امام ابن منذر نے ابو غنیم سعید بن حدین الحضرمی (رح) سے روایت کیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا کو جنت میں ٹھہرایا تو آدم جنت میں گھومنے کے لیے نکلے۔ ابلیس نے ان کے غائب ہونے کو غنیمت جانا اور اس مکان میں پہنچ گیا جس میں حوا تھی اس نے ایک بانس کے ساتھ سیٹی بجائی جس کو حوا نے سن لیا حالانکہ حوا اور ابلیس کے درمیان ستر خیمے تھے اور بعض بعض کے اندر تھے حوا اس پر جھانکیں ابلیس مسلسل سیٹی بجاتا رہا کہ سننے والوں نے اس طرح کی لذت شہوت اور سماع کبھی نہیں سنا تھا۔ یہاں تک کہ حوا کا عضو دوسرے کے ساتھ باقی نہیں رہا مگر اس میں خلجان اور اضطراب پیدا ہوگیا۔ کہنے لگیں۔ میں اللہ کی تجھ کو قسم دیتی ہوں جو عظیم ذات ہے۔ اگر تو نے مجھ سے دور نہ کیا تو مجھے ہلاک کر دے گا۔ اس نے بانس (یعنی بانسری کو) اپنے منہ سے نکال لیا۔ پھر اس کو الٹ دیا پھر دوسری آواز میں سیٹی بجنے لگی تو اس سے رونا نوحہ کرنا اور غم برپا ہوگیا۔ سننے والوں نے ایسی آواز نہ سنی تھی یہاں تک کہ اس کا دل کٹنے لگا غم سے اور رونے سے کہنے لگیں میں اس اللہ کی تجھ کو قسم دیتی ہوں جو عظیم ذات ہے تو مجھ سے باز آجا تو وہ رک گیا حوا نے اس سے کہا یہ کیا چیز ہے جو تو لایا ہے۔ (پہلے) تو میں خوش ہو گئی اور (پھر) میں غم گین ہو گئی۔ اس نے کہا میں نے جنت میں تمہارے گھر اور تمہاری عزت جو خاص طور پر تم کو ملی اس کا ذکر کیا۔ اور میں تمہارے اس مقام و مرتبہ سے خوش ہوا۔ اور میں نے یہ بھی ذکر کیا کہ تم دونوں کو اس سے نکال دیا جائے۔ تو میں تمہارے لیے رو دیا۔ اور تمہارے اوپر غم کرنے لگا۔ تمہارے رب نے اس درخت کے کھانے سے تم کو اس لیے منع کیا کہ تم مر جاؤ گے یا تم نکالے جاؤ گے۔ اے حوا میری طرف دیکھ میں اس کو کھاتا ہوں اگر میں مر جاؤں یا میری خلقت میں کوئی تبدیلی آجائے تو پھر تم اس سے نہ کھانا۔ میں تم کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ میں تمہارے لیے خیر خواہی کرنے والوں میں سے ہوں۔ ابلیس چلا یہاں تک کہ اس نے اس درخت میں سے لے کر کھالیا اور وہ کہہ رہا تھا اے حوا مجھے دیکھ کیا میری خلقت میں کوئی تبدیلی ہوئی یا کیا میں مر گیا میں نے تجھ کو بتا دیا جو کچھ میں نے تجھ کو بتایا تھا۔

آدم (علیہ السلام) جنت کا چکر لگانے کے بعد اپنی جگہ پر واپس آئے تو حوا کو غمزدہ حالت میں اوندھے منہ لیٹے ہوئے دیکھا۔ آدم نے اس اس سے کہا تیرا کیا حال ہے؟ اس نے کہا میرے پاس ایک نصیحت کرنے والا مہربان آیا تھا آدم نے فرمایا افسوس ہے تجھ پر شاید کہ وہ ابلیس تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے ہم کو ڈرایا ہے حوا نے کہا اے آدم اللہ کی قسم وہ اس درخت کی طرف گیا تھا اور اس میں سے کھایا تھا اور میں نے دیکھا کہ نہ وہ مرا اور نہ اس کے جسم میں کوئی تبدیلی ہوئی۔ حوا برابر آپ کو اس کے دھوکے اور مکر میں ڈالتی رہی۔ یہاں تک کہ آدم و حوا دونوں اس درخت کی طرف چلے۔ آدم نے اپنے ہاتھ کو پھل کی طرف بڑھایا کہ اس کو لے لیں تو جنت کے سب درختوں نے آواز دی اے آدم اس کو نہ کھاؤ اگر تو نے اس میں سے کھالیا تو یہاں سے نکالا جائے گا آدم نے معصیت کا پختہ ارادہ کیا ہوا تھا۔ تو درخت کو لینے کے لیے اس کو پکڑا تو درخت نے لمبا ہونا شروع کیا۔ اور انھوں نے اس کو پکڑنے کے لیے اپنے ہاتھ کو بڑھایا جب اپنا ہاتھ پھل پر رکھا تو وہ سخت ہوگیا جب اللہ تعالیٰ نے

معصیت پر ان کے پختہ ارادہ کو دیکھا تب انھوں نے اس پھل کو لیا اور اس میں سے کھالیا۔ اور حوا کو بھی دیا تو انھوں نے بھی کھالیا۔ (کھانے میں) ان کے دن سے جنت کا حسین و جمیل لباس اتر گیا۔ اور ان کی شرم گاہیں ظاہر ہو گئیں تو وہ جنت کے پتوں سے (اپنے بدن کو) ڈھانپنے لگے۔ اور جنت کے پتے چپکانے لگے۔ اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں جو دکھائی دے رہا تھا۔

رب تعالیٰ نے جنت میں ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا اے آدم تو یہاں سے باہر نکل جا آدم نے عرض کیا اے میرے رب مجھے تیر طرف نکلتے ہوئے حیا آتی ہے۔ فرمایا شاید کہ تو نے اس درخت میں سے کھالیا کہ جس سے میں نے تجھ کو منع کیا تھا۔ عرض کیا اے میرے رب جس کو تو نے میرے ساتھ کر دیا ہے یعنی حوا کو اس نے مجھ کو بہکا دیا فرمایا اے آدم تو کب تک چھپائے گا۔ کہا تو نہیں جانتا اے آدم کہ ہر چیز میری ہے۔ اور مجھ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے نہ اندھیرے میں اور نہ روشنی میں؟ پھر (اللہ تعالیٰ نے) ان کی طرف فرشتے کو بھیجا انھوں نے ان کی گردنوں میں کچھ ڈالا یہاں تک کہ ان کو جنت سے نکال دیا۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے انھیں ننگا کھڑا کیا گیا اور ابلیس بھی ان کے ساتھ تھا پس اس وقت ابلیس کو ان دونوں کے ساتھ نیچے اتار دیا گیا۔ پھر آدم نے اپنے رب سے (چند) کلمات سیکھ لئے۔ (جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے) ان کی توبہ قبول فرمائی۔ اور ان سب کو نیچے اتار دیا گیا۔

(۳) حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں، ابن جریر، ابن ابی حاتم ابو الشیخ اور ابن عساکر نے وھب بن منبہ (رح) سے روایت کیا کہ انھوں نے لفظ آیت "لیبدی لھما ما وری عنھما من سواتھما" کے بارے میں فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک پر نور غالب تھا جس کی وجہ سے ان میں سے کوئی بھی دوسرے کی شرم گاہ کو نہ دیکھتا تھا۔ جب دونوں سے لغزش ہو گئی تو ان دونوں سے فوراً اتر گیا۔

(۴) امام ابن ابی حاتم نے سدی (رح) سے روایت کیا کہ انھوں نے اس آیت کے بارے میں فرمایا شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تاکہ وہ ان کے لباس کو پھاڑ ڈالے۔ وہ جانتا تھا کہ ان دونوں کی شرم گاہیں ہیں کیونکہ وہ فرشتوں کی کتابوں میں پڑھا کرتا تھا آدم اس بات کو نہیں جانتے تھے اور ان دونوں کا لباس ظفر یعنی ناخن کی طرح تھا۔ (تفسیر در منثور۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت آدم نے اس درخت سے کھالیا تو ان سے کہا گیا آپ نے اس درخت سے کیوں کھایا؟ جس سے میں نے آپ کو منع فرمایا تھا۔ انھوں نے کہا: مجھ سے حوا نے کہا تھا۔ فرمایا: میں نے اس کو یہ سزا دی ہے کہ اس کو حمل بھی مشقت سے ہوگا اور وضع حمل بھی مشقت سے ہوگا۔ اس وقت حوا رونے لگیں۔ ان سے کہا گیا کہ تم اور تمہاری اولاد روتی رہے گی۔ (جامع البیان، جز:8، ص:189، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت آدم (علیہ السلام) نے عرض کیا: اے میرے رب! اگر میں تجھ سے توبہ اور استغفار کروں؟ فرمایا پھر میں تمہیں جنت میں داخل کر دوں گا اور رہا ابلیس تو اس نے اللہ تعالیٰ سے توبہ کا سوال نہیں کیا بلکہ مہلت کا سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو وہ چیز عطا فرمادی جس کا اس نے سوال کیا تھا۔

ضحاک نے بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو جن کلمات کی تلقین کی تھی، وہ یہی تھے ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخسرین۔ (جامع البیان، جز:8، ص:190، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

حضرت آدم کے فرشتہ اور دائمی بننے کی طمع پر اعتراضات اور ان کے جوابات:

ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ ابلیس لعین نے حضرت آدم (علیہ السلام) کے دل میں فرشتہ بننے کی خواہش کس طرح پیدا کی۔ جبکہ حضرت آدم علیہ السلا دیکھ چکے تھے کہ فرشتوں نے تو حضرت آدم (علیہ السلام) کی فضیلت کا اعتراف کیا تھا اور ان کو سجدہ کیا تھا۔ نیز کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فرشتے نبی سے افضل ہوتے ہیں ورنہ حضرت آدم فرشتے بننے کی طمع میں اس ممنوع درخت سے نہ کھاتے!

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات مفضول میں وہ وصف ہوتا ہے جو افضل میں نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت آدم فرشتہ اس لیے بننا چاہتے ہوں کہ ان کو بھی فرشتوں کی طرح قدرت اور قوت حاصل ہو جائے یا وہ بھی فرشتوں کی طرح اپنی خلقت میں جوہر نورانی ہو جائیں یا وہ بھی فرشتوں کی طرح عرش اور کرسی کے ساکنین میں سے ہو جائیں!

دوسرا سوال یہ ہے کہ ابلیس لعین نے یہ کہا تھا کہ آپ اس درخت سے کھا کر ہمیشہ رہنے والوں میں سے ہو جائیں گے اور حضرت آدم نے اس کی طمع میں اس درخت سے کھایا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ انھوں نے یہ یقیین کر لیا کہ کچھ لوگ ہمیشہ رہنے والے ہیں اور ان پر موت نہیں آئے گی اور اس سے موت اور قیامت کا انکار لازم آتا ہے اور یہ کہ دوام اور خلود تو حشر کے بعد ہوگا۔ حشر سے پہلو خلود کا عقیدہ رکھنا کفر ہے سو موت سے اور قیامت سے پہلے خلود کی طمع کرنا کفر ہے اور اس سے العیاذ باللہ حضرت آدم (علیہ السلام) کا کفر لازم آتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ چند لوگوں کے خلود سے قیامت کا انکار لازم نہیں آتا۔ اللہ تعالی خود فرماتا ہے: "ونفخ فی الصور فصعق من فی السموات ومن فی الارض الا من شاء اللہ: اور صور پھونکا جائے گا تو سب آسمانوں والے اور زمینوں والے بے ہوش ہو جائیں گے مگر جنہیں اللہ چاہے گا" (الزمر: 68)۔

اس اعتراض کا دوسرا جواب یہ ہے کہ خلود کا معنی طویل زمانہ بھی ہو سکتا ہے حضرت آدم (علیہ السلام) نے یہی معنی مراد لیا ہو۔ اور اس کا تیسرا جواب یہ ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) اور حضرت حوا نے یہ یقین نہیں کیا تھا کہ کچھ لوگ ہمیشہ رہنے والے ہیں اور ان پر موت نہیں آئے گی اور نہ یہ ان کا گمان تھا انھوں نے محض وفور شوق سے اس شجر ممنوع سے کھالیا۔

آیا شجر ممنوع سے کھانا گناہ تھا؟ اگر گناہ نہیں تھا تو سزا کیوں ملی؟ اور آدم و ابلیس کے معرکہ میں کون کامیاب رہا؟

ایک سوال یہ ہے کہ اس درخت سے کھانے کی ممانعت تنزیہاً نہیں تھی، تحریماً تھی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ تم دونوں نے (قصداً) اس درخت سے کھایا تو تم ظالموں میں سے ہو جاؤگے اور جس کام کا ارتکاب ظلم ہو وہ گناہ کبیرہ ہوتا ہے۔ اور گناہ کبیرہ عصمت نبوت کے منافی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب ابلیس لعین سے حضرت آدم (علیہ السلام) کا مکالمہ ہوا اور ان کے دل میں اس کو کھانے کا شوق پیدا ہوا تو وفور شوق میں وہ یہ بھول گئے کہ اس سے کھانے کی ممانعت تحریماً تھی اور انھوں نے اپنے اجتہاد سے یہ سمجھا کہ یہ ممانعت تنزیہاً تھی۔ اس لیے آپ کا اس درخت سے کھانا اجتہادی خطا اور نسیان پر مبنی تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: " ولقد عہدنا الی آدم من قبل فنسی ولم نجد لہ عزما: اور بیشک ہم نے اس سے پہلے آدم سے (اس درخت کے قریب نہ جانے کا) عہد لیا تھا، سو وہ بھول گئے اور ہم نے ان کا (نافرمانی کا) قصد نہ پایا" (طہٰ: 115)۔

اور اجتہادی خطا اور نسیان گناہ نہیں ہے۔ لہٰذا حضرت آدم (علیہ السلام) کی عصمت پر کوئی حرف نہیں آیا، اور ان کا توبہ اور استغفار کرنا ان کی تواضع اور انکسار ہے، اور ان کی ندامت اور شرمندگی اس وجہ سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس ممانعت کو کیوں بھول گئے، اس کو یاد کیوں نہیں رکھا۔ ہر چند کہ بھول چوک سے بچے رہنا انسان کی قدرت اور اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن ان کے بلند مقام کے اعتبار سے وہ یہ سمجھے تھے کہ ایک آن کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کو یاد نہ رکھنا یا کسی چیز کے شوق سے اس قدر مغلوب ہونا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یاد نہ رہے۔ یہ بھی تقصیر ہے اور وہ اسی بنا پر ندامت اور شرمندگی سے روتے رہے اور اللہ تعالیٰ سے توبہ اور استغفار کرتے رہے۔ تاہم آپ کا یہ فعل گناہ نہیں تھا۔ باقی رہا یہ اعتراض کہ پھر آپ کو سزا کیوں ملی اور کپڑے کیوں اتر گئے اور جنت سے کیوں اتارے گئے سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس درخت سے کھانے کا لازمی اثر اور نتیجہ تھا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بھولے سے زہر کھالے تو ہر چند کہ اس کا یہ فعل گناہ نہیں ہے لیکن زہر کھانے کے بعد لازماً اس کی موت واقع ہو جائے گی کیونکہ زہر کھانے کا لازمی اثر اور نتیجہ موت ہے۔ سو اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس شجر کو بے لباس ہونے کا سبب بنایا تھا تو خواہ آپ نے بھولے سے اس شجر کو کھایا، لیکن بے لباس ہونے کا لازمی اثر اور انتیجہ اس پر مرتب ہوگیا۔ یہ کوئی سزا نہیں تھی۔ اور رہا جنت سے اتر کر زمین پر آنا تو وہ آپ نے بہر حال زمین پر آنا تھا۔ کیونکہ آپ کو پیدا ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ آپ زمین پر اللہ کے خلیفہ اور نائب بنیں، اور یہ نہ کہا جائے کہ اس معرکہ میں ابلیس کامیاب ہو گیا اور آپ ناکام ہو گئے۔ کیونکہ ابلیس تو جنت میں صرف آپ کا عارضی قیام برداشت نہیں کر رہا تھا اور آپ زمین پر اس لیے آئے کہ زمین پر اپنی اولاد میں سے اپنے پیروکاروں کو قیامت کے دن دائمی طور پر اپنے ساتھ لے کر جنت میں جائیں۔ سو آپ اپنی بیشمار اولاد کے ساتھ دوام اور ہیشگی کے لیے جنت میں جائیں گے اور ابلیس اپنے پیروکاروں کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں جائے گا۔ سو اس معرکہ کے نتیجہ میں کامیاب حضرت آدم (علیہ السلام) ہیں اور ناکام ابلیس لعین ہے

(تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدیؒ)

حضرت آدم نے پھل کیسے کھالیا؟

آدم و حوا شیطان کی قسموں سے متاثر ہوئے کہ خدا کا نام لے کر کون جھوٹ بولنے کی جرات کر سکتا ہے، شاید وہ یہ سمجھے کہ واقعی اس کے کھانے سے ہم فرشتے بن جائیں گے، یا پھر کبھی فنا نہ ہوں گے۔ اور حق تعالیٰ نے جو نہی فرمائی تھی اس کی تعلیل یا تاویل کر لی ہوگی، لیکن غالباً (فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ) اور (اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى) وغیرہ سے نسیان ہوا، اور یہ بھی خیال نہ رہا کہ جب وہ مسجود ملائکہ بنائے جا چکے، پھر ملک بننے کی کیا ضرورت رہی۔ (فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا) واضح ہو کہ امر و نہی کبھی تو تشریعاً ہوتے ہیں اور کبھی شفقتاً۔ اس کو یوں سمجھو کہ مثلاً ایک تو ریل میں بدون ٹکٹ سفر کرنے کی ممانعت ہے یہ تو قانونی حیثیت رکھتی ہے جس کا اثر کمپنی کے حقوق پر پڑتا ہے اور ایک جو گاڑیوں میں لکھا ہوتا ہے کہ مت تھوکو کہ اس سے بیماری پھیلتی ہے۔ یہ نہی شفقتاً ہے جیسا کہ بیماری پھیلنے کی تعلیل سے ظاہر ہے۔ اسی طرح خدا کے اوامر و نواہی بعض تشریعی ہیں جن کی خلاف ورزی کرنے والا قانونی مجرم سمجھا جاتا ہے اور جن کا ارتکاب کرنا ان حقوق کے منافی ہے جن کی حفاظت کرنا تشریع کا منشا تھا۔ دوسرے وہ اوامر و نواہی ہیں جن کا منشا تشریع نہیں محض شفقت ہے جیسا کہ طب نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وغیرہ کی بہت سی احادیث میں علماء نے تصریح کی ہے۔ شاید آدم (علیہ السلام) نے اکل شجرہ کی ممانعت کو نہی شفقت سمجھا، اسی لیے شیطان کی وسوسہ اندازی کے بعد اس کی خلاف ورزی کرنے کو زیادہ بھاری خیال نہ کیا۔ مگر چونکہ انبیاء (علیہم السلام) کی چھوٹی سی لغزش بھی ان کے مرتبہ قرب کے لحاظ سے عظیم و ثقیل بن جاتی ہے اس لیے اپنی غلطی کا ظاہری نقصان اٹھانے کے علاوہ مدت دراز تک توبہ و استغفار میں مشغول گریہ و بکا رہے آخر کار ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ، فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى کے نتیجہ پر پہنچ گئے

بود آدم دیدہ نور قدیم موئے در دیدہ بود کوہ عظیم۔

نسیان ہوا اور یہ بھی خیال نہ رہا کہ جب میں مسجود ملائکہ بن چکا ہوں تو اب ملک (فرشتہ) بننے کی کیا ضرورت رہی۔ کما قال تعالی فنسی ولم نجد لہ عزما۔ مگر اس کو قرب الٰہی کا ذریعہ سمجھ کر چلے اور ظاہر ہے کہ اگر بھول کر کوئی کام خلاف حکم سرزد ہو جائے تو اس کو لغزش اور خطاء اجتہادی کہتے ہیں یہ اگر معصیت ہے تو محض صورۃ معصیت ہے اور حقیقۃ معصیت وہ ہے جو دیدہ دانستہ ہو (کاندھلوی) (تفسیر گلدستہ۔ محمد اسحاق)

آیت مبارکہ:

وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝۲۱

لغۃ القرآن: وَقَاسَمَهُمَآ : اور اس نے قسم کھا کر کہا ان دونوں سے] [اِنِّيْ : بیشک میں] [لَكُمَا : تم دونوں کے لیے] [لَمِنَ : یقینا میں سے] [النّٰصِحِيْنَ : خیر خواہوں سے ہوں]

ترجمہ: اور ان دونوں سے قسم کھا کر کہا کہ بیشک میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں

تشریح: جنت کی جو نعمتیں اور آسائشیں حضرت آدم (علیہ السلام) و حوا کو حاصل تھیں، اس کے حوالے سے شیطان نے دونوں کو بہلایا اور یہ جھوٹ بولا کہ اللہ تمہیں ہمیشہ جنت میں رکھنا نہیں چاہتا، اس لیے اس درخت کا پھل کھانے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس کی تاثیر ہی یہ ہے جو اسے کھا لیتا ہے، وہ فرشتہ بن جاتا ہے یا دائمی زندگی اسے حاصل ہو جاتی ہے۔ پھر قسم کھا کر اپنا خیر خواہ ہونا بھی ظاہر کیا، جس سے حضرت آدم (علیہ السلام) و حوا متاثر ہو گئے اس لیے اللہ والے اللہ کے نام پر آسانی سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ (تفسیر مکہ۔ فہد کمپلیکس سعودی عرب)

ابلیس نے اپنی بات کا یقین دلانے کے لیے اللہ کا نام لے لے کر قسمیں کھائیں۔ آدم (علیہ السلام) اب اس کو جھٹلا نہ سکے کیونکہ یہ بات آپ کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتی تھی کہ شیطان لاکھ نافرمان اور بے ایمان اور میرا دشمن سہی لیکن وہ جھوٹی قسم بھی کھا سکتا ہے۔ کریم الفطرت انسان کو اپنی پاک نفسی کے باعث کسی عیار کے مکر و فریب میں آجانا کوئی مشکل بات نہیں ف

ان الکریم اذا تشاء خدعتہ وتری اللئیم مجر بالالخدع

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) جب اپنے کسی غلام کو عبادت الٰہی میں ذوق و شوق سے سر گرم دیکھتے تو اسے آزاد کر دیتے۔ چنانچہ آپ کے اکثر غلام اپنے آپ کو آزاد کرانے کے لیے لمبی لمبی نمازیں پڑھا کرتے اور آپ حسب عادت انھیں آزاد کر دیتے۔ آپ کو عرض کی گئی کہ آپ کے غلاموں کی یہ عبادتیں اللہ کی رضاء کے لیے نہیں بلکہ آپ کو فریب دینے کے لیے ہیں۔ تو آپ فرماتے۔ من خادعنا باللہ خدعنا: جو ہمیں اللہ کے نام سے دھوکہ دیتا ہے ہم اس کے دھوکہ میں آنے کے لیے تیار ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ)

حضرت آدم (علیہ السلام) اور حضرت حواء نے سمجھا کہ کوئی شخص اللہ کے نام سے جھوٹی قسم نہیں اٹھا سکتا تو ان کے دل میں درخت گندم سے کچھ کھانے کی رغبت پیدا ہو گئی۔

جھوٹی قسم اٹھانے والا شیطان کا پیروکار ہے:

سب سے پہلے جھوٹی قسم اٹھانے والا شیطان ہے۔ جھوٹی قسم اٹھانے والا شخص نہ صرف لوگوں کو دھوکا دیتا ہے بلکہ نام خدا کی توہین بھی کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

الکبائر الاشراک باللہ وعقوق الوالدین وقتل النفس والیمین الغموس۔ "کبیرہ گناہ یہ ہیں جیسے اللہ کے ساتھ شرک، والدین کی نافرمانی، کسی جان کا قتل اور جھوٹی قسم۔" (بخاری کتاب الایمان والنذور باب 16 حدیث 6675)

افسوس صد افسوس! آج ملک عزیز پاکستان میں عدالتوں کے باہر ایسے لوگ ملتے ہیں جو جھوٹی قسم اٹھانے اور جھوٹی گواہی دینے کا کاروبار کرتے ہیں، ان سے معاوضہ طے کر لو اور جس کے خلاف جو چاہو ان سے قسم اٹھوا لو یا گواہی دلوا لو۔ یقیناً یہ لوگ شیطانی لشکر اور معاشرے کا ناسور ہیں، اللہ انھیں ہدایت دے۔

(تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

یہ قسم شیطان کی قاسم باب مفاعلہ پر ہے جو مسابقت کے لیے ہے۔ کہ ابلیس کی قسم جھوٹی تھی اگر یہ قسم ابلیس کی ایسی صورت میں ہوتی کہ وہ قسم کھاتا اور آدم وحوا (علیہما السلام) اس کی تصدیق کرتے تو قسم دونوں کی طرف منسوب ہوتی لیکن چونکہ ابلیس لعین کی قسم جھوٹی تھی اور اس جھوٹی قسم سے حضرت آدم (علیہ السلام) کو دھوکا دیا اور پہلی جھوٹی قسم کھانے والوں میں ابلیس ہی کہلایا۔ حضرت آدم (علیہ السلام) بھول گئے ارشاد باری عزوجل ہے۔ فنسی ولم نجد لہ عزماً فدلھما بغرور۔ پس شیطان نے نیچے گرا دیا ان کو دھوکا سے۔

بغوی (رح) نے لکھا ہے کہ ابلیس نے دونوں کو فریب دیا۔ عربی محاورہ میں مازال بفلان یدلی فلان بغرور۔ وہ اس کو برابر فریب دیتا رہا اور اس سے چکنی چپڑی باتوں سے پیش آتا رہا غرور سے مراد بے حقیقت فریب۔ دلھما کا مصدر تدلیہ ہے ادلاک معنی نیچے اترنا ہے شیطان نے ان دونوں کو نیچے گرا دیا۔ یہاں مراتب درجات سے اتارنا مراد نہیں بلکہ مکانی طور پر نیچے اترنا مراد ہے یعنی جنت سے زمین پر اتار دیا۔ شیطان نے حضرت حوا کو دھوکا دیا۔ حضرت حوا نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو اس کے کھانے کی رغبت دی لیکن اس کا اثر دونوں پر پڑا اس لیے ہما فرمایا۔ غرور بمعنی دھوکا ہے ابلیس نے جھوٹی قسم کے ذریعہ ان دونوں کو اتار دیا۔ شیطان ہی وہ ہے جس نے سب سے پہلے اللہ کی جھوٹی قسم کھائی۔ (تفسیر خازن)

حضرت آدم (علیہ السلام) کو اس کا گمان تک نہ تھا کہ کوئی اللہ عزوجل کی قسم کھا کر جھوٹ کہہ سکتا ہے۔ بنابریں آپ (علیہ السلام) نے اس کا اعتبار کر لیا اور حقیقت یہ ہے کہ مومن اگر دھوکا کھا سکتا ہے تو قسم سے ہی کھا سکتا ہے۔ حضرت ابن عمر (رض) فرماتے ہیں کہ خدعنا باللہ انخدعنا لہ۔ جو ہمیں اللہ کی قسم کے ساتھ دھوکا دے تو ہم اس کے دھوکا میں آتے ہیں۔ (تفسیر الحسنات۔ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادریؒ)

اس سے معلوم ہوا کہ سب سے پہلا تقیہ شیطان نے کیا کہ دل میں آدم (علیہ السلام) سے دشمنی رکھ کر زبان سے دوستی ظاہر کی۔

(تفسیر نور العرفان۔ احمد یار خاں نعیمیؒ)

جنت میں آدم وحوا کا لباس

شیطان نے قسم کا دھوکا دے کر اس درخت یعنی گیہوں کے دانے کھانے پر کہ جس کو منع کیا گیا تھا ان کو آمادہ کر کے جنت سے نکلوا دیا۔ گیہوں کے کھاتے ہی ان کے ستر کھل گئے، جنت کے کپڑے بدن پر سے اتر گئے، جو بدن چھپا ہوا تھا وہ ظاہر ہو گیا۔ انجیر کے پتے لے کر ستر چھپانے لگے۔ حضرت آدم (علیہ السلام) جب جنت میں آباد ہوئے تو ان کو ایک کپڑا پہنایا گیا تھا وہ چھین لیا گیا۔ کچھ کچھ انگلیوں پر اس کا نشان باقی رہ گیا جس نشان کو ناخن کہتے ہیں۔ حضرت آدم (علیہ السلام) کا قد ساٹھ گز کا تھا۔ جب گیہوں کے کھانے سے حضرت آدم (علیہ السلام) کا جنتی لباس اتر گیا تو وہ شرما کر بھاگے، مگر قد لمبا اور سر پر بال ہونے کے سبب سے ان کے بال جنت کے پیڑوں میں الجھ گئے۔ اس وقت آواز دے کر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) سے یہ فرمایا کہ آدم کیا تو مجھ سے بھاگتا ہے۔ عرض کیا: "نہیں مگر مجھ کو تجھ سے شرم آتی ہے"۔ فرمایا: "ہم نے جو کچھ تجھ کو جنت کی نعمتیں دیں کیا وہ تجھے کافی نہ تھیں جو تو مناہی کی (ممنوعہ) چیز کی طرف مائل ہوا"۔ عرض کیا: "اے ہمارے پروردگار قسم ہے تیری عزت کی! میں نے یہ نہ جانا تھا، کہ کوئی تیری جھوٹی قسم بھی کھاتا ہے"۔ فرمایا: "قسم ہے مجھ کو اپنی عزت کی کہ میں تجھ کو زمین میں اتاروں گا، پھر محنت مشقت سے تو زندگی بسر کرے گا"۔ (تفسیر مظہر القرآن۔ شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی)

آیت مبارکہ:

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۲۲

لغۃ القرآن: فَدَلّٰىهُمَا : پس اس نے کھینچ لیا ان دونوں کو] [بِغُرُوْرٍ : دھوکے سے] [فَلَمَّا : تو جب] [ذَاقَا : ان دونوں نے چکھ لیا] [الشَّجَرَةَ : درخت کو] [بَدَتْ :] [لَهُمَا : ان دونوں کے لیے] [سَوْاٰتُهُمَا : ان دونوں کے ستر] [وَطَفِقَا : اور لگے دونوں] [يَخْصِفٰنِ : وہ چپکانے] [عَلَيْهِمَا : ان دونوں پر] [مِّنْ : سے] [وَّرَقِ : پتوں] [الْجَنَّةِ : جنت کے] [وَنَادٰىهُمَا : اور آواز دی ان دونوں کو] [رَبُّهُمَآ : ان کے رب نے] [اَلَمْ : کیا نہیں] [اَنْهَكُمَا : میں نے روکا تھا تم دونوں کو] [عَنْ : سے] [تِلْكُمَا : اس] [الشَّجَرَةِ : درخت] [وَاَقُلْ : اور میں نے کہا " نہ تھا "] [لَّكُمَآ : تم دونوں سے] [نَّ : بیشک] [الشَّيْطٰنَ : شیطان کے] [لَّكُمَآ : تم دونوں کا] [عَدُوٌّ : دشمن ہے] [مُّبِيْنٌ : کھلا]

ترجمہ: پس وہ فریب کے ذریعے دونوں کو (درخت کا پھل کھانے تک) اتار لایا، سو جب دونوں نے درخت (کے پھل) کو چکھ لیا تو دونوں کی شرم گاہیں ان کے لیے ظاہر ہو گئیں اور دونوں اپنے (بدن کے) اوپر جنت کے پتے چپکانے لگے، تو ان کے رب نے انھیں ندا فرمائی کہ کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت (کے قریب جانے) سے روکا نہ تھا اور تم سے یہ (نہ) فرمایا تھا کہ بیشک شیطان تم دونوں کا کھلا دشمن ہے

تشریح:

قسمیں کھا کر فریب دے کر آخر کار اس درخت ممنوع کے کھانے کی طرف مائل ہی کر لیا۔

جنت میں گناہ کرنے سے حضرت آدم و حوا کا لباس عزت اتار لیا گیا تھا جس پر وہ نہایت شرمندہ ہو کر جنت کے درختوں کے پتے اپنے بدن پر ڈھانکتے تھے۔ پھر دنیا میں خدا نے آدم (علیہ السلام) کو کپڑا بنانا سکھایا جس سے ستر ڈھانکنا میسر آیا۔ اس بات کو خدا اپنی بڑی نعمت من آیات اللہ کہتا ہے اور لباس کا نازل کرنا فرما کر ایک

اور لباس کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی پرہیزگاری کا لباس بہتر ہے۔اس کے بعد اولاد آدم کو متنبہ کرتا ہے کہ دیکھو اب تم شیطان کے بہکانے میں نہ آنا کہیں لباس تقویٰ تمہارا نہ اتار لے جس سے تم برہنہ ہو جاؤ۔ شیطان اور اس کی ذریت تم کو دیکھتے ہیں اور وہ تم کو نظر نہیں آتے کیونکہ ان کا مادہ آتش لطیف چیز ہے جو محسوس بحس بصرہ نہیں۔ پھر فرماتا ہے کہ ان خبیثوں سے کافر ہی دوستی رکھتے ہیں۔ (تفسیر حقانی۔ابو محمد عبدالحق حقانی)

آدم ہوا جب پیدا ہوئے تو بچے نہ تھے دونوں پورے قد اور مکمل دماغی اور بدنی قوت والے انسان تھے لیکن چھل بٹے، فریب، جعل سازی، دھوکا بازی سے قطعی ناآشنا تھے۔ اگر شیطان ان کو سجدہ کرنے سے انکار نہ کر دیتا تو ہمیشہ ایسے ہی بھولے بھالے پاک صاف بے گناہ رہتے پر ہمیشہ جنت کی فضا میں وہاں کا نورانی لباس پہنے سے کرتے کھاتے پیتے پھرا کرتے۔

ظاہر بات ہے کہ جب کوئی خود پاک صاف دل کا کھرا ہو تو دوسرے کو خواہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو اتنا دھوکے باز فریبی دل کا کھوٹا نہیں سمجھ سکتا شیطان بھی پہلے دھوکے باز بے ایمان نہ تھا اس کے غرور نے اسے مردود کر دیا اور پھر اس نے دشمنی کی ٹھان لی اور دشمنی ایسی بری بلا ہے کہ دشمن کو زک دینے کے لیے سب کچھ سکھا دیتی ہے ایسی حالت میں حضرت آدم اور ان کی بیوی کا اس کی بات اور قسم کا اعتبار کرنا فطری بات تھی یہاں سے سمجھ لینا چاہیے کہ انسان بذات خود بھولا بھالا اور ایماندار ہے بگڑتا ہے تو کسی کے بہکانے سے بگڑتا ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور راہ نمائی کا محتاج ہے۔

(تفسیر درس قرآن آسٹریلیا قرآن بورڈ)

اب یہ دھوکہ تمام ہوا اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے آگیا۔ شیطان نے ان کو اللہ کی اطاعت سے پھیر کر اللہ کی معصیت میں مبتلا کر دیا اور یہ سب کچھ اس نے گہری سازش اور دھوکے سے کیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس جوڑے کو دنیا میں اتار دیا۔ آیت " (فدلھما بغرو) (۷ : ۲۲) "اس نے دھوکہ دے کر یہ مقصد حاصل کیا۔"
اب انھیں اس بات کا شعور ہوا کہ ان کے جسم میں شرمگائیں بھی ہیں۔ یہ شرمگاہیں پہلے ان کی نظروں سے اوجھل تھیں۔ چنانچہ انھوں نے جنت کے درختوں کے پتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر ان کو اپنی شرمگاہوں پر رکھنا شروع کر دیا۔ ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان شرمگاہوں سے مراد وہ جسمانی حصے ہیں جن کے ظاہر ہونے سے انسان فطرتاً شرمندہ ہوتا ہے اور ان مقامات کو صرف وہی شخص ننگا اور ظاہر کر سکتا ہے جس کی فطرت' کسی جاہلی سوسائٹی کی وجہ سے فساد پذیر ہو چکی ہو۔

آیت " فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُورٍ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْءٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَن تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَأَقُل لَّكُمَا إِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِينٌ (22)

تب ان کے رب نے انھیں پکارا "کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہ روکا تھا' اور نہ کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔"

ان دونوں نے اللہ کی جانب سے آنے والی یہ جواب طلبی سنی کیونکہ انھوں نے نصیحت کو بھلا دیا اور نافرمانی کی۔ سوال یہ ہے کہ اللہ کی جانب سے آنے والی اس ندا کی کیفیت کیا تھی؟ ویسی ہی طرح پہلی مرتبہ اللہ نے انھیں خطاب کیا تھا' جس طرح فرشتوں کو خطاب کیا تھا۔ جس طرح ابلیس کو خطاب کیا تھا۔ یہ سب امور غیبی امور ہیں اور ان کے بارے میں ہم صرف گمان رکھتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا ہوگا اور اللہ جو چاہتا ہے' کرتا ہے۔

اس پکار کے مقابلے میں' معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کی اس منفرد مخلوق انسان کی شخصیت کا ایک دوسرا اہم پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ وہ بھول بھی جاتا ہے اور اس سے غلطی بھی سرزد ہو جاتی ہے اور یہ کہ اس میں ایسی کمزوریاں بھی ہیں جن کے راستے سے شیطان اس پر انداز ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ یہ انسان نہ ہمیشہ غلطی پر ہوتا ہے اور نہ ہمیشہ صحیح راستے پر ہوتا ہے۔ البتہ یہ ہے کہ وہ اپنی غلطی اور لغزش کا ادراک کر لیتا ہے اور اس ادراک کے بعد وہ طلب مغفرت کرتا ہے اور نادم ہو جاتا ہے۔ واپس ہو کر توبہ کرتا ہے اور شیطان کی طرح معصیت اصرار نہیں کرتا۔ وہ اپنے رب سے معصیت پر معاونت طلب نہیں کرتا۔

(تفسیر فی ظلال القرآن۔ سید قطب شہید)

ممکن ہے جنت میں گندم درخت کی صورت میں ہو۔ بہر حال حضرت آدم (علیہ السلام) اور حضرت حوا نے جو نہی وہ گندم کھائی تو ان جسموں سے جنتی لباس اتر گیا وہ ایک دوسرے کے سامنے برہنہ ہو گئے۔ پہلے انھوں نے کبھی اپنی جائے ستر بھی نہیں دیکھی تھی تو وہ جنتی درختوں سے اپنی جائے ستر ڈھانپنے لگے۔

میاں بیوی کو برہنگی اختیار نہیں کرنی چاہیے:

معلوم ہوا میاں بیوی کو تنہائی میں بھی ایک دوسرے کے سامنے بلاضرورت برھنہ نہیں ہونا چاہیے حضرت آدم و حوا جنت میں تنہا تھے مگر ان سے برہنگی برداشت نہ ہوئی۔ آج مسلمانوں پہ بے حیا انگریزی تہذیب کی یلغار ہے مسلمان اس کے پیچھے بگٹٹ دوڑ رہے ہیں خصوصاً یورپین ممالک اور امریکہ و کینیڈا میں رہنے والے مسلمانوں کا حال زیادہ پتلا ہے مگر ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ یورپین اور امریکن بعد میں ہیں مسلمان پہلے ہیں اب سنیں اس بارہ میں ارشاد رسول کیا ہے:

حضرت عتبہ بن عبدالسلمی (رض) سے مروی ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

اذا اتی احدکم اھلہ فلیستتر ولا یتجرد تجرد العیرین۔ جب تم میں سے کوئی بیوی کے پاس جائے تو خود کو چھپائے اور یوں برہنہ نہ ہو جیسے گدھا گدھی ہوتے ہیں (ابن ماجہ کتاب النکاح باب 28)

شیطان انسان کو ننگا کرنا چاہتا ہے:

یہ بھی معلوم ہوا کہ شیطان انسان کو ننگا کرنا چاہتا ہے شیطان نے پہلے انسان کے جسم سے لباس اتروایا اور وہ تمام انسانوں سے یہی سلوک کرنا چاہتا ہے۔ مغربی اقوام پر شیطان مکمل مسلط ہے تو اس نے انھیں خوب برہنہ کیا ہے اور وہ مسلمانوں کے پیچھے بھی پڑا ہوا ہے دیکھئے ہم کہاں تک بچتے ہیں۔ شیطان نے مغربی اقوام کی مٹی پلید کرکے رکھ دی ہے اور انسانوں کی انسانیت سے گرا کر جانوروں کی سطح پر پہنچا دیا ہے۔ خصوصاً عورت کی جس طرح تذلیل کی ہے وہ خون کے آنسو رلانے والی کہانی ہے۔ اگر ہم نے ان کی پیروی کی تو ہمارا حشر بھی انہی جیسا ہوگا اللہ تعالیٰ اپنے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صدقے میں امت مسلمہ کی شیطان کے شر سے پناہ عطا فرمائے۔ (تفسیر برہان القرآن علامہ قاری محمد طیب)

پوشیدہ اعضاء کا چھپانا انسانی فطرت میں داخل ہے۔ لہٰذا جو شخص ننگے ہونے کو فطرت سمجھتا ہے جیسے مغربی ممالک میں ایک طبقے کا رجحان ہے تو وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کی فطرتیں مسخ ہو چکی ہیں۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم قادری)

چنانچہ روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو فرمایا کہ کیا میں نے تمہیں اس درخت سے منع نہ کیا تھا۔ عرض کی بیشک لیکن میں یہ سمجھا کہ دنیا میں کون ہے جو تیری قسم کر جھوٹ بولے تو ارشاد ہوا کہ مجھے میری عزت وجلال کی قسم اب میں تمہیں زمین پر اتاروں گا وہاں تمہاری زندگی محنت و مشقت اور پشیمانی کے پسینوں میں گزرے گی۔ چنانچہ آپ کو زمین پر اتار دیا اور آپ کو لوہا گھڑنے کی تعلیم دے کر زراعت اور کھیتی باڑی کا حکم دیا کہ کھیت کو پانی دو پھر کاٹو پھر آٹا پیس کر اسے گوندھو روٹیاں پکا کر کھاؤ۔ خازن آگے ارشاد ہے۔

واقل لکما ان الشیطان لکما عدو مبین۔ اور تمہیں نہ کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔ (تفسیر الحسنات۔ سید محمد احمد قادریؒ)

فوائد

1: معلوم ہوا کہ آدم (علیہ السلام) نے گناہ نہ کیا۔ گناہ میں ارادہ ضروری ہے۔ جو کچھ ہوا خطاً ہوا۔ اس لیے اس کا ذمہ دار ابلیس کو بنایا۔ جو آدم (علیہ السلام) کو گناہ گار مانے وہ گمراہ ہے۔

2: آدم (علیہ السلام) کو یہ وہم بھی نہ تھا کہ کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی جھوٹی قسم کھا سکتا ہے۔ آپ نے گندم وغیرہ کھایا نہیں فقط چکھا تھا کہ جنتی لباس اتار لیا گیا۔

3: اس سے پہلے ان کے تمام جسم پر ناخن کا لباس تھا۔ اس خطا کے بعد وہ ناخن تمام جگہ سے سکڑ کر صرف انگلیوں کی نوکوں پر رہ گیا۔ (تفسیر روح البیان) اور ان بزرگوں نے انجیر کے پتے جسم شریف پر لپیٹے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ستر کھولنا آدم (علیہ السلام) کے وقت سے ہی معیوب ہے۔ عقل انسانی اسے برا سمجھتی ہے۔ ورنہ ان پر ستر کے شرعی احکام اس وقت تک نہ آئے تھے۔ اب جو ننگا ہونا پسند کرتے ہیں وہ فطرت انسانی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ خیال رہے کہ فرشتوں سے پردہ نہیں، رب سے حیا ہے۔

4: گندم چکھتے وقت رب کا منع نہ فرمانا بعد میں منع فرمانا ان حکمتوں کی بنا پر ہے جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

5: مگر تم بھول گئے اور دوست دشمن میں فرق نہ کر سکے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہی شخص کامیاب رہ سکتا ہے جو دوست دشمن میں تمیز کرے۔ (تفسیر نعیمی)

آیت مبارکہ:

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ ۲۳

لغۃ القرآن: قَالَا : دونوں نے کہا] [رَبَّنَا : اے ہمارے رب] [ظَلَمْنَآ : ہم نے ظلم کیا] [اَنْفُسَنَا : اپنی جانوں پر] [وَاِنْ : اور اگر] [لَّمْ : نہیں] [تَغْفِرْ : تو نے معاف کیا] [لَنَا : ہمارے لیے] [وَتَرْحَمْنَا : اور " نہ " تو نے رحم کیا ہم پر] [لَنَكُوْنَنَّ : ضرور ہم ہوجائیں گے] [مِنَ الْخٰسِرِيْنَ : خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا] [

ترجمہ: دونوں نے عرض کیا: اے ہمارے رب ! ہم نے اپنی جانوں پر زیادتی کی؛ اور اگر تو نے ہم کو نہ بخشا اور ہم پر رحم (نہ) فرمایا تو ہم یقیناً نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے

تشریح:

اگرچہ یہ خطا سہوا اور بلا قصد سرزد ہوئی تھی لیکن آدم (علیہ السلام) سراپا ندامت بن کر توبہ کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ کاملین کا یہی شیوہ ہے کہ معمولی سی خطا پر بھی کانپ اٹھتے ہیں اور آنسوؤں کے دریا بہا دیتے ہیں۔ اور اپنی عمر بھر کی عبادتوں اور ریاضتوں کو پرکاہ کی اہمیت بھی نہیں دیتے بلکہ اپنے رب کریم کے دامن رحمت میں ہی پناہ تلاش کرتے ہیں۔ علی عادۃ الاولیاء والصالحین فی استعظامھم الغیر من السیئات واستصغارھم العظیم من الحسنات (کشاف) امام ابی حیان اندلسی (رح) نے یہاں خوب لکھا ہے کہ پانچ چیزیں آدم کی نجات کا باعث بنیں۔ (۱) اپنی غلطی کا اعتراف (۲) اس پر ندامت (۳) اپنے آپ کو اس پر ملامت کرنا (۴) توبہ (۵) اور رحمت الٰہی پر آس۔ اور پانچ چیزیں شیطان کی تباہی کا باعث بنیں۔ (۱) اپنے جرم کو تسلیم نہ کرنا (۲) نادم نہ ہونا (۳) ارتکاب جرم پر اپنے آپ کو ملامت نہ کرنا بلکہ اس کے صادر ہونے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر دینا (فبما اغویتنی) (۴) توبہ نہ کرنا (۵) اور رحمت الٰہی سے مایوس ہو جانا۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری ؒ)

اللہ تعالیٰ نے جونہی آدم (علیہ السلام) اور ان کی بیوی سے فرمایا کہ کیا میں نے تمہیں اس درخت کے قریب نہ جانے اور شیطان کی دشمنی سے آگاہ نہیں کیا تھا؟ یہ فرمان سنتے ہی دونوں نہایت عاجزی اور شرمساری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور ان الفاظ میں معافی مانگنے لگے اے ہمارے رب ! اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے اپنے آپ پر ہی ظلم کیا ہے۔ اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم نقصان پانے والوں میں ہوں گے۔ آخرت کا خسارہ واضح ہے دنیا کی زندگی میں نقصان یہ ہے کہ تو نے ہمیں عزت و عظمت سے نوازا لیکن ہم اپنی غلطی کی وجہ سے یہ مقام کھو چکے ہیں۔ اس سے پہلی آیت میں "دَلَّ" کا لفظ آیا ہے جس کا معنی ہے اوپر سے نیچے آنا یہ گراوٹ روحانی بھی ہو سکتی ہے اور مکانی بھی۔ یہاں دونوں قسم کا تنزل پایا جاتا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۳۲ تا ۳۷ کی تفسیر میں ہم نے عرض کیا ہے کہ اس مقام پر تینوں قسم کی مخلوق کی فطرت کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔ ملائکہ نے معمولی لغزش پر لفظ "سبحان" کے ساتھ معذرت کی انھیں اسی طرح ہی قرب الٰہی حاصل رہا۔ شیطان اپنے گناہ پر مصر رہا تو ہمیشہ کے لیے راندہ درگاہ اور لعنتی قرار پایا۔ آدم (علیہ السلام) اپنی خطا پر معذرت خواہ ہوئے تو ان کی معذرت قبول کر لی گئی تاہم یہ حکم ہوا تم سب کے سب زمین پر اتر جاؤ کیونکہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ زمین تمہارے لیے عارضی طور پر جائے قرار اور ایک معین مدت تک زیست کا سامان ہے ہاں یاد رکھو کہ اب تمہیں زمین میں جینا اور مرنا ہے اور اسی سے ہی محشر کے دن اٹھایا جانا ہے۔ آدم (علیہ السلام) کو زمین پر اتارتے وقت کہا گیا تھا کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو یہاں ایک دوسرے کا دشمن ہونے سے مراد پہلا دشمن شیطان ہے جو انسان کا ابدی اور ازلی دشمن ہے جس کی دشمنی میں کوئی شک نہیں۔ جس نے دشمن پر بھروسہ کیا وہ مارا گیا اور بسا اوقات میاں بیوی بھی آپس میں دشمن اور ایک دوسرے کے مخالف ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اولاد بھی ماں باپ کی مخالف اور دشمن بن جایا کرتی ہے۔

حضرت آدم (علیہ السلام) کی فطرت کا تذکرہ کرتے ہوئے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔

(عَنۡ اَنَسٍ (رض) اِنَّ النَّبِیَّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ کُلُّ ابۡنِ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَیۡرُ الۡخَطَّاءِ یۡنَ التَّوَّابُوۡنَ)

[رواہ الترمذی : کتاب صفۃ القیامۃ]

" حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں بلاشبہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ابن آدم خطا کرنے والا ہے اور خطاکاروں میں اچھے وہ ہوتے ہیں جو توبہ کرتے ہیں۔"

(عَنۡ اَبِیۡ ہُرَیۡرَۃَ (رض) اَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کَانَ یَقُوۡلُ فِیۡ سُجُوۡدِہٖ اَللّٰھُمَّ اغۡفِرۡلِیۡ ذَنۡبِیۡ کُلَّہٗ دِقَّہٗ وَجِلَّہٗ وَاَوَّلَہٗ وَآخِرَہٗ وَعَلَانِیَتَہٗ وَسِرَّہٗ) [رواہ مسلم : کتاب الصلاۃ]

" حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں بلاشبہ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے سجدوں میں پڑھا کرتے تھے اے اللہ میرے چھوٹے اور بڑے پہلے اور بعد والے، علانیہ اور پوشیدہ کیے تمام کے تمام گناہ معاف فرمادے۔" (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

جیسے ہی انھیں تنبہ ہوا اور پروردگار نے انھیں ان کی غلطی پر ٹوکتے ہوئے پکارا تو بے ساختہ ان پر وہ کیفیت طاری ہوئی جو گناہ کے شدید احساس کے بعد طاری ہوتی ہے اور فوراً انھوں نے اپنے رب کے دروازے پر دستک دی اور جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے انھوں نے سب سے پہلے نجانے کتنی گریہ وزاری کے بعد اپنے رب سے وہ کلمات سیکھے جن سے وہ اپنے رب کو پکار سکیں اور پھر انھوں نے اپنے رب کو پکارتے ہوئے کہا کہ اے ہمارے رب ! ہم کوئی عذر پیش نہیں کرتے کہ ہم سے یہ گناہ کیوں سرزد ہوا ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے یہ حرکت کرکے آپ کی شان میں کوئی کمی نہیں کی بلکہ اپنے نفسوں کو تباہ کیا اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا ہے۔ کیونکہ ہماری جانیں آپ کی عطیہ ہیں ' ہمارا جسم آپ کی دین ہے ' ہمارے احساسات آپ کی عطا کردہ نعمت ہیں ' ہماری قوتیں سراسر آپ کی بخشش ہیں ' ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ سب آپ کا ہے اس لحاظ سے ان سب کا آپ کے سامنے جھکنا آپ کا حق ہے ہم نے اس حق کو کسی دوسرے کے حوالے کرکے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ اب ہم اپنے اس گناہ کا اعتراف کرتے ہوئے آپ ہی سے دست بستہ پوری عاجزی کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ آپ ہمارے اس گناہ کو معاف فرمادیں ہم اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ آپ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں۔

جس نے دیا ہے درد وہی چارہ گر بھی ہے
کہنی ہے چارہ گر سے ہی خود چارہ گر کی بات

ہمارے اس درد کی چارہ گری صرف آپ کے ہاتھ میں ہے اس لیے ہم آپ ہی کے دروازے پر دستک دیتے ہیں اور آپ ہی کے آستانے پر سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس آستانے کے سوا ہمارا کوئی آستانہ نہیں اور اس خزانے کے سوا کوئی اور خزانہ نہیں جہاں سے یہ قیمتی سوغات ملتی ہو اس لیے آپ ہم پر رحم فرمائیں اور ہمارے گناہ کو معاف فرمادیں کیونکہ ہماری معافی کا تعلق سراسر آپ کے رحم و کرم سے ہے۔ گناہ گار کا گناہ صرف رحم و کرم کے پانی ہی سے دھل سکتا ہے اس کے علاوہ دنیا کے سمندر بھی اس گندگی کو ختم نہیں کرسکتے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (رح) کے حالات میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ وہ اللہ کے گھر کا طواف کررہے تھے کہ انھوں نے عالم غیب سے ایک آواز سنی کہ کسی شخص کا نام لے کر کہا جارہا ہے کہ ہمارے گھر سے نکل جاؤ تمہارا یہاں آنا ہمیں منظور نہیں۔ شیخ نے اس نام کے آدمی کو تلاش کرنا شروع کیا حتیٰ کہ وہ انھیں مل گئے پوچھا کہ یہ آواز جو میں سن رہا ہوں آپ کو بھی سنائی دیتی ہے یا نہیں ؟ کہنے لگے میں بھی سنتا ہوں پوچھا پھر آپ یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے انھوں نے نہایت تعجب سے شیخ کی طرف دیکھا اور کہا بھلے آدمی آپ ہی مجھے بتائیں میں کہاں جاؤں ؟ کیا اس دروازے کے علاوہ کوئی اور دروازہ ہے جہاں جاکر دستک دوں یا اس آستانے کے علاوہ کوئی اور آستانہ ہے جہاں جاکر سر جھکاؤں جب اس چوکھٹ کے سوا کوئی اور چوکھٹ نہیں تو میں تو جب تک معافی نہیں مل جاتی یہیں جبہ سائی کرتا رہوں گا اور یہیں اپنا سر پٹختار ہوں گا۔ اس لیے حضرت آدم اور حضرت حوا بھی یہ فرما رہے ہیں کہ تیرے سوا اور آستانہ کوئی نہیں کہ جہاں ہم جاکر معافی کے طلبگار ہوں اس لیے تو نے اگر ہمیں معاف نہ فرمایا تو پھر ہماری نامرادی اور تباہی میں کوئی کسر باقی نہیں رہ جائے گی اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ گناہ ابلیس سے بھی ہوا لیکن اس نے بجائے عجز واعتراف کے انکار وبغاوت کا راستہ اختیار کیا اور ہمیشہ کے لیے راندہ درگاہ ہوگیا اور گناہ حضرت آدم اور حضرت حوا سے بھی ہوا لیکن وہ فوراً اللہ کی بارگاہ میں جھک گئے جس سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ گناہ فرشتوں اور اللہ کے پیغمبروں کے سوا ہر مخلوق سے ہوسکتا ہے کیونکہ

؎ چلے بچ کر کوئی کتنا وہ ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے

کوئی چال لڑکھڑاہٹ سے پاک نہیں ہوتی' کوئی عمل معصیت کی جراہتوں سے محفوظ نہیں ہوتا' کوئی خیال آوارہ خیالی سے بچا ہوا نہیں ہوتا۔ یہاں قدم قدم پر محرکات شر اور آلودگیوں کے بھنور موجود ہیں جن سے ہر وقت محفوظ رہنا اولاد آدم کے لیے آسان نہیں کسی بھی وقت گناہ کا ظہور ہو جانا بالکل ممکن ہے اس لیے حضرت آدم کا رویہ ہمیں یہ راستہ دکھاتا ہے کہ تم گناہوں سے معصوم پیدا نہیں کیے گئے ہو تمہارا کام یہ ہے کہ کبھی اپنے اندر انکار کی جرأت نہ پیدا ہونے دینا یہ ابلیس کا رویہ ہے تم سے اگر غلطی ہو جائے اور کبھی معصیت کے راستے پر پڑ جاؤ تو تنبہ ہو جانے کے بعد فوراً توبہ کا راستہ اختیار کرنا یہی ابلیس اور آدم کے رویے میں فرق ہے اور اللہ کریم کا یہ وعدہ ہے کہ کسی کے گناہ اگر زمین و آسمان کے درمیانی حصے کو بھر بھی دیں لیکن وہ جب بھی اخلاص اور عاجزی کے ساتھ ہم سے معافی مانگے گا اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا یقین دلا دے گا تو ہم اسے معاف کر دیں گے بلکہ اس کا کرم اس حد تک بے پایاں ہے کہ وہ صرف گناہوں کو معاف ہی نہیں کرتا' بلکہ گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیتا ہے۔ سورۃ الفرقان میں اس نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو آدمی توبہ کرتا ہے اور پھر نیک عمل کا راستہ اختیار کر لیتا ہے:

فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ ط (الفرقان: ۷۰)

(تو اللہ ان لوگوں کے گناہوں کو نیکیوں سے تبدیل کر دیتا ہے)

بلکہ بعض دفعہ تو یہ رحمت ایسے جھوم کر برستی ہے کہ گناہ صرف نیکی ہی میں تبدیل نہیں ہوتا بلکہ معافی اور توبہ کی صورت میں ڈھیروں نیکیوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک صحابی کا واقعہ ہے کہ ایک دن نیند نہ کھلنے کے باعث ان کی تہجد چھوٹ گئی جب آنکھ کھلی تو فجر کی اذان ہو چکی تھی۔ فجر کی نماز پڑھی لیکن دل غم سے نڈھال ہو رہا تھا اور بار بار آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے کہ ہائے مجھ سے تہجد کیوں چھوٹ گئی۔ پورا دن اللہ سے معافی مانگتے گزرا کہ میں یہ غفلت کی نیند کیوں سویا جس کی وجہ سے میری تہجد رہ گئی چنانچہ دوسرے روز رات کو سوتے ہوئے جب تہجد کا وقت ہوا تو دیکھا کہ انھیں کوئی جگا رہا ہے انھیں حیرت ہوئی کہ میری خواب گاہ میں کون آ گیا پوچھا کہ تم کون ہو؟ وہ بولا میں شیطان ہوں۔ پوچھا: تم کیوں آئے ہو؟ کہا میں اس لیے آیا ہوں کہ تمہیں تہجد کے لیے اٹھادوں۔ انھوں نے حیران ہو کر کہا کہ شیطان تو لوگوں کو تہجد کے وقت سلاتا ہے تاکہ وہ تہجد نہ پڑھ سکیں تم کیسے شیطان ہو جو مجھے تہجد کے لیے اٹھا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ کل تمہاری تہجد چھوٹ گئی اور تم نے دن بھر رو رو کر برسوں کی تہجدیں اپنے نام لکھوالیں۔ میں آج اس لیے آیا ہوں کہ اٹھو تہجد پڑھو اور ایک ہی تہجد کا ثواب پاؤ۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آج پھر اگر تمہاری تہجد چھوٹ جائے تو تم برسوں کی تہجدیں پھر اپنے نام لکھوالو۔ اس سے معلوم ہوا کہ تہجد پڑھنے سے تو ایک تہجد کا ثواب ملتا ہے لیکن معافی اور توبہ کی صورت میں نجانے کتنی تہجدوں کا ثواب مل جاتا ہے۔ جس اللہ کی کرم نوازیوں کا یہ عالم ہے اسے پکارنے والا کیسے محروم رہ سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت آدم اور حضرت حوا نے جب اپنی اس غلطی پر پروردگار کو مغفرت و توبہ کے لیے پکارا اور پھر بار بار عاجزی سے اس بات کا اظہار بھی کیا کہ یا اللہ تیرے سوا کوئی دروازہ نہیں جہاں ہم جائیں' تیرے سوا کوئی معاف کرنے والا نہیں اگر آپ نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کھایا تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ سورۃ البقرہ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے پھر ان کی توبہ قبول فرمالی اور گناہ کا یہ داغ جو ان کے دامن پر لگ گیا تھا اسے دھو ڈالا اور قیامت تک کے لیے ان کے اس حسن عمل کے طفیل یہ اصول ٹھہرا:

التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ

(گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ نہیں کیا)

اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حوا جب دنیا میں تشریف لائے ہیں تو وہ اللہ سے گناہ کی مغفرت کی سند لے کر آئے ہیں یعنی ان کا دامن ان چھینٹوں سے بالکل پاک ہو چکا تھا وہ زمین پر اس لیے نہیں بھیجے گئے تھے کہ وہ گناہ گار ہونے کے بعد جنت میں رہ نہیں سکتے تھے بلکہ ان کا زمین پر بھیجا جانا گناہوں کی معافی کے بعد تھا اور وہ اس لیے تھا کہ انھیں ان کی پیدائش سے بھی پہلے زمین پر اللہ اپنا خلیفہ بنا چکا تھا۔ پہلے پارے میں اللہ نے اس واقعے کو بیان کرنے سے پہلے فرمایا ہے کہ ہم نے فرشتوں کو یہ بات بتائی تھی کہ ہم زمین پر آدم کو اپنا خلیفہ بنا رہے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم کی پیدائش سے پہلے اور جنت میں انھیں بھیجنے سے پہلے اور اس واقعے کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے یہ بات طے ہو چکی تھی کہ حضرت آدم زمین پر اللہ کے نائب اور خلیفہ ہوں گے اور وہ زمین پر اللہ کی طرف سے اللہ کے احکام کی تنفیذ کریں گے تو اس حقیقت کے باوجود یہ سمجھنا کہ حضرت آدم اور حضرت حوا اپنے گناہ کی سزا کے طور پر دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ یہ

سراسر قرآن مجید اور پہلی آسمانی کتابوں کی صراحتوں کے خلاف ہے۔ اسی طرح یہ بات کہنا کہ وہ جب زمین پر آئے تو وہ گناہ گار تھے یہ بھی حقیقت کے خلاف ہے کیونکہ قرآن کریم واضح طور پر یہ بات بیان کر چکا ہے کہ ان کے زمین پر آنے سے پہلے اللہ ان کی توبہ قبول فرما چکا تھا اس کے باوجود عیسائیوں کا اس مغالطے میں مبتلا ہونا کہ انسان بھی شیطان کی طرح اس دنیا میں لعنتی ہو کر اترا ہے' ایک بہت بڑی گمراہی ہے جس میں آج تک عیسائی دنیا مبتلا ہے اور پھر اس غلط عقیدے کو اختیار کرنے کے نتیجے میں عیسائیوں نے جس طرح گمراہیوں کے ردے پر ردے چڑھائے ہیں اور جس طرح کج رویوں کا راستہ اختیار کیا ہے وہ بجائے خود ایک داستان ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ حضرت آدم اور حضرت حوا ایک گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے گناہ گار ہو گئے تھے اور وہ اسی حالت میں دنیا میں اتارے گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جتنی ان کی اولاد پیدا ہوئی وہ ان کے گناہ کی وجہ سے گناہ گار ٹھہری۔ ذرا اس عقیدے کی غیر معقولیت پر توجہ فرمایئے کہ فرض کریں حضرت آدم و حوا اگر گناہ گار بھی ہیں تو اس کے نتیجے میں ان کی اولاد کیسے گناہ گار ٹھہرے گی کیا باپ کا گناہ اور اس کی غلطیاں اولاد کو گناہ گار بنا دیتی ہیں؟ کیا عیسائی دنیا کے قانون میں واقعی ایسا ہے کہ اگر باپ جرم کرے تو اس کی پاداش میں اس کی اولاد کو پکڑ لو؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے قانون میں اس حقیقت کو قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں اور اسلام تو صاف صاف اس کی تردید کرتا ہے اور پھر اس پر بھی مزید جہالت یہ ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ ہر انسان پیدائشی طور پر گناہ گار ہے تو اب اس کے گناہوں سے نجات حاصل کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا غیر انسانی بیٹا دنیا میں آکر انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بنے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو (جو عیسائیوں کے بقول اللہ کا بیٹا ہیں) دنیا میں بھیجا گیا اور وہ صلیب پر چڑھ کر انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بنے اور اس طرح انسان اپنے گناہوں سے پاک ہو سکا۔ لیکن قرآن یہاں صاف بتا رہا ہے کہ حضرت آدم و حوا نے اللہ سے اپنے گناہ کی معافی مانگی اور توبہ کی تو اللہ نے یہ توبہ قبول فرمائی اور اس کے بعد انھیں دنیا میں اترنے کا حکم دیا۔ (تفسیر روح القرآن۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

اس جگہ سوال ہوتا ہے کہ شیطان نے حضرت آدم (علیہ السلام) اور حضرت حوا سے جو کچھ کہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے شیطانی وسوسہ میں آکر جان بوجھ کر وہ چیز کھالی جس سے انھیں روکا گیا تھا۔ لہٰذا یہ بھول کر کھانا تو نہ ہوا پھر عصمت انبیاء کرام کا مسئلہ کدھر گیا۔

حضرت آدم (علیہ السلام) کا بھول جانا خلاف عصمت نبوت نہیں ہے:

اس کا جواب یہ ہے کہ جب شیطان نے آدم و حوا کے سامنے درخت گندم کے بارے میں اللہ کی قسم اٹھائی کہ اسے کھا کر آپ فرشتے یا جنت میں ہمیشہ رہنے والے بن جائیں گے تو حضرت آدم (علیہ السلام) کے دل میں اس کے کھانے کی رغبت پیدا ہو گئی مگر انھوں نے اس وقت کچھ نہیں کھایا پھر بعد میں وہ رغبت کسی وقت غالب آگئی اور آپ بھول کر اسے کھا گئے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے روزے دار پر کھانے پینے کی رغبت سوار ہوتی ہے مگر وہ نہیں کھاتا پیتا۔ لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ رغبت ذہن پر غالب آجاتی ہے اور وہ بھول کر کھانے پینے لگتا ہے اسی طرح آدم (علیہ السلام) بھول گئے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ولقد عھدنا الی آدم من قبل فنسی ولم نجد لہ عزما۔" ہم نے آدم علیہ السلام سے پہلے سے عہد لیا تھا مگر وہ بھول گئے اور ہم نے ان کا ارادہ نہ پایا (طہ: 115)

تو جس طرح روزہ دار کا بھول کر کھانا پینا گناہ نہیں نہ اس سے روزہ ٹوٹتا ہے اسی طرح آدم (علیہ السلام) کا بھول کر درخت گندم سے کھانا گناہ نہ تھا لہٰذا مسئلہ عصمت انبیاء پر کوئی اعتراض نہیں آتا۔ بلکہ حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ اللہ روزے دار کو بھلا دیتا ہے تاکہ وہ کھا پی بھی لے اور اس کا روزہ بھی نہ ٹوٹے۔

مگر جتنا بڑا مقام اتنا بڑا امتحان کے مطابق آدم (علیہ السلام) کے نسیان پر بھی گرفت ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے روکا نہ تھا؟ تب انھوں نے استغفار کیا تو ان کی خطا معاف فرمائی گئی۔

شیطان نے گناہ کیا مگر توبہ مانگنے کی جگہ اس نے زندہ رہنے کی مہلت مانگی تو اسے مہلت دے دی گئی۔ آدم (علیہ السلام) سے خطا ہوئی تو انھوں نے توبہ کی تو ان کی خطا کی بخشش دے دی گئی۔ جس نے جو مانگا مل گیا۔

معلوم ہوا کہ اگر انسان سے کوئی غلطی ہو جائے تو اسے فوراً توبہ کرنی چاہیے۔ آدم (علیہ السلام) کی غلطی گناہ کے زمرے میں سے نہ تھی وہ محض نسیان تھا مگر انھوں نے اس پر بھی طویل توبہ کی جبکہ ہم دن رات گناہ پر گناہ کرتے ہیں اور مائل بہ توبہ نہیں ہوتے کس قدر غفلت ہے ہماری۔

حضرت آدم (علیہ السلام) کی دعا کا وسیلہ مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قبول کیا جانا:

اس جگہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ دعا ربنا ظلمان انفسنا وان لم تغفر لنا الخ حضرت آدم علیہ السلام نے جنت میں مانگی تھی کیونکہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا: اھبطوا۔ کہ یہاں سے زمین کی طرف اتر جاؤ۔ معلوم ہوا کہ وہ اس دعا کے بعد جنت سے زمین پر بھیجے گئے لہٰذا یہ وہ دعا نہیں جس پر ان کی توبہ قبول کی گئی کیونکہ آپ نے زمین پر اتر کر عرصہ تک توبہ کی تب ان کی خطا کو معاف کیا گیا اور اس کی وضاحت حدیث میں ہے۔

چنانچہ حضرت عمر فاروق (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب آدم سے خطا ہوئی تو انھوں نے دعا کی:

اسئلک بحق محمد الا غفرت لی۔ اے اللہ میں تجھ سے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حق (ان کے مقام و مرتبہ) کے وسیلہ سے مانگتا ہوں کہ میری خطا کو معاف فرما دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا محمد کون ہیں؟ عرض کیا: اے اللہ جب تو نے مجھے پیدا کیا تو میں نے ساق عرش پر لکھا دیکھا لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ تو میں نے جان لیا کہ تیری بارگاہ میں ان سے بڑھ کر کوئی معزز نہیں کیونکہ تو نے ان کا نام اپنے نام سے ملا کر لکھا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ھو آخر نبی من ولدہ وامتہ آخر الامم ولولاہ ماخلقتک۔ اے آدم وہ آپ کی اولاد میں سب سے آخری نبی ہیں اور ان کی امت سب سے آخری امت ہے اور اگر وہ نہ ہوتے تو میں آپ کو بھی پیدا نہ کرتا (المعجم الصغیر للطبرانی جلد 2 صفحہ 83 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد دعوائے نبوت کرنے والا صرف شکل میں انسان ہے:

یہ حدیث جہاں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے توسل کرنے کے جواز پر دلالت کر رہی ہے وہاں آپ کا درجہ سب انبیاء کرام سے بلند تر ثابت کر رہی ہے اور آپ کی شان ختم نبوت کی کھلی دلیل بھی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے آدم علیہ السلام جناب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کی اولاد میں سے آخری نبی ہیں۔ لہٰذا جو انسان کا بچہ ہے وہ تو آپ کے بعد دعویٰ نبوت نہیں کر سکتا اور جو دعویٰ نبوت کرے تو سمجھ کہ وہ انسان کا بچہ اور بندے دا پتر ہے ہی نہیں۔ وہ صرف شکل انسان والی رکھتا ہے حقیقت میں وہ انسانیت سے خارج ہے۔ (تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

فوائد

اس سے دو مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ توبہ و استغفار ہمارے دادا کی میراث ہے۔ ہم کو ضرور کرنی چاہیے۔ دوسرے یہ کہ خطا کو اپنی طرف نسبت کرنی چاہیے۔ اور نیک کام کو رب کی طرف۔ یہ سنت نبوی ہے۔ شیطان نے اپنی گمراہی کو رب کی طرف نسبت کیا کہ بولا بما اغویتنی تو نے مجھے گمراہ کر دیا۔ وہ مردود ہوا۔

اللہ کے رحم و کرم کے بغیر کوئی بھی کامیاب نہیں اور نقصان سے خالی نہیں۔

آیت مبارکہ:

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝٢٤

لغۃ القرآن: قَالَ : فرمایا] [اهْبِطُوْا : تم سب اتر جاؤ] [بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ : تمہارے بعض بعض کیلیے] [عَدُوٌّ : دشمن ہیں] [وَ : اور] [لَّكُمْ : تمہارے لیے] [فِي الْاَرْضِ : زمین میں ہے] [مُسْتَقَرٌّ : ٹھکانا ہے] [وَّمَتَاعٌ : اور فائدہ اٹھانا ہے] [اِلٰى : تک] [حِيْنٍ : ایک وقت]

ترجمہ: ارشاد باری ہوا: تم (سب) نیچے اتر جاؤ تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہیں، اور تمہارے لیے زمین میں معیّن مدت تک جائے سکونت اور متاع حیات (مقرر کر دیئے گئے ہیں گویا تمہیں زمین میں قیام و معاش کے دو بنیادی حق دے کر اتارا جا رہا ہے، اس پر اپنا نظام زندگی استوار کرنا)

تشریح: دونوں حضرات کو جنت سے اتر جانے کا حکم ہوا کیونکہ حضرت آدم (علیہ السلام) کی تخلیق کا اصل مقصد تو انھیں زمین میں خلیفہ بنانا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدم سے پہلے ہی فرشتوں کے سامنے بیان فرما دیا تھا اور سورۃ بقرہ میں صراحت سے مذکور ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اولاد آدم نے آپس میں عداوت و

دشمنی بھی کرنا تھی اور جنت جیسی مقدس جگہ ان چیزوں کے لائق نہیں لہٰذا مقصدِ تخلیقِ آدم کی تکمیل کیلئے اور اس کے مابعد رونما ہونے والے واقعات کیلئے حضرت آدم (علیہ السلام) کو زمین پر اتارا گیا۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم قادری)

حضرت آدمؑ و ابلیس کو دو متحارب فریقوں کے طور پر زمین پر بھیجا

زمین پر حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو بھیجتے ہوئے بعض بنیادی حقیقتوں کا شعور بھی بخشا۔ سب سے پہلی یہ حقیقت ان پر منکشف فرمائی گئی کہ ہم تمہیں زمین پر محض انتقال مکانی کے لیے نہیں بھیج رہے بلکہ تمہارے بھیجنے کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک کو ہم زمین کے دار الامتحان میں بھیج کر یہ امتحان کرنا چاہتے ہیں کہ تمہیں جس آزمائش میں ڈالا جارہا ہے اس میں تم پورا اترتے ہو یا نہیں وہ آزمائش یہ ہے کہ صرف تمہیں ہی نہیں بھیجا جارہا بلکہ تمہارے ساتھ ابلیس کو بھی بھیجا جارہا ہے۔ زمین پر تمہارا جانا در حقیقت ایک معرکہ کارزار میں اترنا ہے۔ ایک طرف تم اور تمہاری اولاد ہوگی اور دوسری طرف ابلیس اور اس کا لاؤ لشکر ہوگا۔ ابلیس نے جس طرح حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو بہکانے کی کوشش کی اور اپنی حد تک تو اس نے انھیں بہکا ہی دیا لیکن اللہ نے اپنی رحمت سے انھیں تھاما اور وہ اپنی عاجزی اور استغفار سے اللہ کی اس راہ ہدایت کو پانے میں کامیاب ہوگئے اور اپنی اولاد کے لیے بھی انھوں نے اس راستے کا دروازہ کھول دیا کہ اگر تم سے کبھی غلطی ہوجائے تو بجائے شیطان کی روش اختیار کرنے کے تمہاری روش یہ ہونی چاہیے کہ تم فوراً اللہ سے مغفرت طلب کرو اور اپنے گناہوں سے توبہ کرو اس طرح اللہ تمہیں اپنی رحمت سے نوازے گا۔ (تفسیر روح القرآن۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

سب کے سب اتر جاؤ' اس کرہ ارض پر جابسو' سوال یہ ہے کہ اس وقت یہ لوگ کہاں تھے؟ جنت کہاں ہے؟ یہ غیبی امور سے متعلق باتیں ہیں اور اس بارے میں ہم اسی قدر جانتے ہیں جس قدر ہمیں وہ ذات باری بتادے جس کے ہاتھ میں غیب کی کنجیاں ہیں۔ اب جب کہ وحی کا سلسلہ ختم ہوچکا ہے تو کسی انسان کی جانب سے ان غیبی امور و مقامات کی تلاش ایک فضول کوشش ہوگی۔ اسی طرح جو لوگ ان امور کا انکار کرتے ہیں اور اپنی سائنسی اور غیر یقینی معلومات کی اساس پر کرتے ہیں وہ بھی اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہیں اور ان کا یہ موقف محض خود سری اور مکابرہ ہے۔ اس لیے کہ وہ اس عالم غیب کی بات کرتے ہیں، جہاں تک انھیں یہ رسائی حاصل نہیں ہے لیکن ان لوگوں کی خود سری کا عالم یہ ہے کہ یہ سرے سے عالم غیب کا انکار کرتے ہیں حالانکہ عالم غیب نے بھی تک انسان کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ ان لوگوں کے علم کا موضوع مادہ ہے اور مادے کی دنیا میں بھی اب تک کے معلوم سے مجہول زیادہ ہے۔

اب یہ پہلا راؤنڈ ختم ہوا۔ اس کے بعد معرکہ آدم و ابلیس کے نئے راؤنڈ ہوں گے۔ ان میں انسان صرف اس صورت میں کامیاب ہوگا کہ اس نے اپنے رب کی پناہ لی ہوگی اور اگر اس نے اپنے دشمن کو دوست بنالیا تو ظاہر ہے کہ وہ شکست کھائے گا۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ کوئی قصہ یا کہانی نہیں ہے بلکہ ان آیات میں انسان کی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے تاکہ اس کے مزاج' اس کی نشوونما' اس کے ماحول' نظام قضا و قدر جو اس کی زندگی کو متاثر کرتا ہے اور وہ نظام جو اللہ نے اس کے لیے پسند کیا' وہ ابتلاء جس سے اس نے دوچار ہونا ہے اور وہ انجام جس تک اس نے پہنچنا ہے' کے بارے میں حقائق سامنے آسکیں اور یہ وہ باتیں ہیں جو اسلامی تصور حیات کی بنیادوں میں شامل ہیں۔

جیسا کہ اس سے پہلے ہم کہہ آئے ہیں' قصہ تخلیق انسانیت سے ہی میں جو پہلی حقیقت معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کی تخلیق اور انسان کی تخلیق کے درمیان ایک فطری ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ یہ دونوں اللہ کے نظام قضا و قدر کے اندر کام کرتے ہیں۔ اس حقیقت کے ادراک سے ہم اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ انسان کی تخلیق جو ایک تقدیر اور منصوبے کے مطابق ہوئی محض اتفاقی بات نہ تھی اور اس کائنات' انسان اور نظام قضا و قدر کے درمیان مکمل توافق ہے۔

جو لوگ اللہ کی معرفت سے محروم ہیں وہ ذات باری کی قدر نہیں کرسکتے جس طرح کہ اس کا حق ہے۔ یہ لوگ اللہ کے کاموں اور ان کے نظام قضا و قدر کو ان پیمانوں سے ناپتے ہیں جو انسان کے چھوٹے چھوٹے کاموں اور منصوبوں کے لیے وضع ہوئے ہیں۔ وہ جب دیکھتے ہیں تو ان کی سمجھ میں صرف یہ بات آتی ہے کہ انسان بھی اس دنیا کی دوسری مخلوقات کی طرح کی ایک مخلوق ہے۔ انھوں نے جب یہ دیکھا کہ اس عظیم کائنات میں یہ زمین ایک ذرہ کے برابر ہے تو انھوں نے کہا کہ یہ کوئی معقول بات نہیں ہے کہ انسان کی پیدائش کے پیچھے کوئی مقصد تلاش کیا جائے' لہٰذا اس انسان کی اس کائنات میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے یہ کہا

کہ انسان کا وجود یہاں محض اتفاق سے ہو گیا اور اس انسان کے ارد گرد جو کائنات ہے وہ اس کے وجود اور نشو و نما کے سخت خلاف ہے۔ یہ محض تیرت کے ہیں جو یہ لوگ اللہ کے افعال اور اس کے نظام قضا و قدر کے بارے میں چلاتے ہیں۔ اور وہ بھی محض اپنی محدود انسانی معیار عقل و دانش کے مطابق۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ پوری کائنات انسان کی ملکیت ہوتی تو وہ اس چھوٹے سے کرہ ارض کو خاطر ہی میں نہ لاتا اور نہ اس چھوٹی سی مخلوق کی پروا کرتا جو اس پر چلتی ہے۔ کیونکہ انسان اس پوری کائنات کی عظیم مملکت کا اہتمام نہیں کر سکتا۔ نہ وہ اس کی ہر چیز کی تدبیر کر سکتا ہے' نہ ہر چیز کا اندازہ کر سکتا ہے اور نہ وہ اس جہان کی تمام اشیاء کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس جہان کا بادشاہ اللہ ہے اور آسمانوں اور زمینوں میں سے کوئی ایک ذرہ بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہے۔ اللہ اس عظیم کائنات کا تھامنے والا ہے اور اس کائنات کی کوئی چیز اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتی اگر اللہ کا حکم نہ ہو۔ یہاں کوئی چیز بھی اللہ کی مشیت کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔ انسان جب اللہ کی ہدایت کو ترک کر دے اور اپنی خواہشات نفسانیہ کی پیروی شروع کر دے تو وہ مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اگر اس مصیبت کو وہ علم کا نام دیتا ہے تو یہ اس کی مرضی ہے۔ وہ اللہ کو اپنے اوپر قیاس کرتا ہے اور اللہ کے افعال و اعمال کو اپنے افعال پر قیاس کرتا ہے حالانکہ اللہ کے افعال واقدار انسان کے قیاس سے باہر ہیں۔ یہ انسان کی غلط فہمی ہے کہ وہ اپنی خواہش کو اپنی کم ظرفی کی وجہ سے حقیقت سمجھتا ہے۔

سر جیمس جینز اپنی کتاب "کائنات جو ایک راز ہے" انسان کے گمراہانہ تصورات کے بارے میں کہتا ہے۔

"ہم جب اس زمین پر کھڑے ہوتے ہیں' جو ریت کا ایک چھوٹا سا دانہ ہے تو ہم یہ کوشش کرتے ہیں کہ ہم اس پوری کائنات کی طبیعت اور ماہیت کو معلوم کریں جو ہمارے ارد گرد اور زمان و مکان کی ناقابل تصور وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہم یہ بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس کو وجود میں لانے کی غرض و غایت کیا ہے؟ جب ہم اس کائنات کو دیکھتے ہیں تو سب سے پہلے تو ہم حیرانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ہماری نظریں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کائنات کس طرح ہمیں خوف میں مبتلا نہ کرے جبکہ اس کی وسعتیں اس قدر بڑی ہیں کہ ہماری عقل ان کا ادراک نہیں کر سکتی۔ پھر اسی کائنات پر ایک طویل عرصہ گزر گیا ہے اور ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور اس کے مقابلے میں انسان کے ذخیرہ علم جو تاریخ ہے وہ ان زمانوں کے مقابلے میں ایک لمحہ ہے۔ پھر یہ اس اعتبار سے بھی خوفناک ہے کہ اس کے اندر ایک خوفناک وحدت پائی جاتی ہے۔ پھر یہ اس لیے بھی خوفناک ہے کہ اس کائنات کے اندر ہمارا وطن یہ زمین اس قدر چھوٹی ہے کہ دنیا کے سمندروں کے ایک چھوٹے سے ریت کے کنکر کو اگر ایک ملین ٹکڑے کیا جائے تو اس سے بھی کم ہے۔ لیکن اس کائنات کی سب سے زیادہ خوفناکی اس پہلو سے ہے کہ یہ ایک بے مطلب چیز ہے۔ جس طرح ہماری زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بے مطلب ہے۔ ہمارے جذبات' ہمارے' مقاصد' ہمارے اعمال' ہمارے فنون اور ہمارے ادیان سب کے سب اس کائنات کے نظام کے ساتھ غیر مانوس ہیں اور اس کے نظام کے ساتھ بے میل ہیں۔ اگر ہمارے ادیان سب کے سب اس کائنات کے نظام کے ساتھ غیر مانوس ہیں اور اس کے نظام کے ساتھ بے میل ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اس کائنات اور ہماری زندگی کے درمیان مستقل دشمنی اور تضاد ہے تو یہ بات غلط نہ ہو گی اس لیے کہ اس کائنات کی فضا کی اکثریت اس قدر ٹھنڈی ہے کہ جہاں زندگی ممکن نہیں ہے۔ تمام انواع حیات وہاں منجمد ہو جاتے ہیں اور اکثر مادی اجزاء اس قدر گرم ہیں کہ ان میں زندہ رہنا محال ہے۔ اس فضائے کائنات میں ایسی شعاعیں ہر وقت باہم متصادم ہوتی رہتی ہیں کہ اجرام فلکی باہم متصادم رہتے ہیں اور یہ شعاعیں بسا اوقات زندگی کی دشمن ہو سکتی ہیں بلکہ کسی بھی وقت زندگی ختم کر سکتی ہیں۔"

"یہ کائنات جس میں حالات نے ہمیں لا کر پھینک دیا ہے اگر یہ بات سچ نہیں ہے کہ ہم یہاں اس کائنات کی کسی غلطی کی وجہ سے زندہ ہیں تو یہ بات بہر حال قرین قیاس ہے کہ انسان کا وجود یہاں محض اتفاق اور مصاوفت سے ہو گیا ہے۔"

یہ ہیں ان لوگوں کے خیالات۔ یاد رہے کہ اس سے قبل ہم اس نکتے پر بحث کر آئے ہیں کہ اس کائنات کا دشمن حیات ہونا اور یہ فرض کر لینا کہ یہ کائنات کسی مدبر اور کنٹرول کرنے والے کے بغیر ہے' اور یہ کہ اس نے اوپر انسان جیسی مخلوق اور مطلق زندگی کا وجود میں آجانا محض اتفاق کے طور پر ہے کسی عام آدمی کی عقل میں آنے والی بات نہیں ہے چہ جائیکہ کوئی بڑا عالم یا سائنس دان ایسی باتیں کرے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ کائنات اس کے اندر پائے جانے والی ہر قسم کی زندگی کے قاتل ہے اور کوئی اس کے اوپر قوت مدبرہ بھی نہیں ہے تو یہ زندگی کس طرح وجود میں آگئی؟ سوال یہ ہے کہ یہ زندگی کائنات سے زیادہ طاقتور ہے کہ یہ کائنات کے

علی الرغم وجود میں آگئی اور باوجود اس کے وجود میں آگئی کہ کائنات اس کے وجود میں آنے کے خلاف تھی۔ کیا انسان وجود میں آنے سے قبل اس عظیم کائنات سے زیادہ قوی تھا' اور اس طرح وہ زبردستی یہاں آکر کھڑا ہو گیا۔

میں کہتا ہوں یہ ایک ایسی سوچ ہے جس پر توجہ ہی نہ دینا چاہیے۔ اگر یہ نام نہاد علماء فقط یہ کہنے پر اکتفاء کرتے کہ ہمارے ذرائع علم اس کائنات کی تفسیر و توضیح نہیں کر سکتے ہیں اور یہ خرافات نہ بکتے جو وہ میٹا فزکس کے بارے میں بکتے ہیں' جن پر کوئی سند ان کے پاس نہیں ہے تو وہ اپنا فرض ادا کر جاتے اگرچہ یہ فرض بھی ناقص ہوتا۔ البتہ وہ کہہ دیتے کہ ہمارے ارد گرد جو کائنات ہے یہ ایک معمہ ہے لیکن وہ اپنے دائرہ علم سے بہت آگے بڑھ جاتے ہیں اور مفروضوں' بلا دلیل تصورات اور انسانی خواہشات کے پیدا کردہ فنی مزعومات کی دلدل میں جا پھنستے ہیں جو غیر محفوظ علاقے ہیں۔

ہم مسلمان الحمد للہ جب اس کائنات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں نہ خوف دامن گیر ہوتا ہے اور نہ ہم اس حیرت میں پڑتے ہیں' جس کا اظہار سر جیمس جینز نے کیا ہے بلکہ ہم تو اس کائنات کے خالق کے بارے میں ڈر جاتے ہیں اور ہمیں وہ جمال وجلال نظر آتا ہے جو اس کائنات ہماری دوست بن جاتی ہے اس لیے کہ اس کو بھی خالق نے پیدا کیا ہے اور ہمیں بھی۔ دونوں کے اندر پورا توافق اور ہم آہنگی ہے۔ ہم اس کی ضخامت اور اس کی باریکی سے حیرت زدہ ضرور ہوتے ہیں لیکن خوفزدہ نہیں ہوتے اور ہمیں یہ شعور اور احساس آکر نہیں پکڑتا کہ اب ہم آج یا کل برباد ہو رہے ہیں اس لیے کہ ہمارا اور اس کائنات کا رب ایک ہے۔ ہم اس کے ساتھ نہایت ہی انس و محبت اور اعتماد اور یقین کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ ہمارا رزق اور ضروریات اور ہماری معاش اور معیشت کے ذخائر اسی میں ہیں اور ہمیں اس کائنات کے خالق کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

آیت " وَلَقَدْ مَكَّنَّا كُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (10)

"ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لیے یہاں سامان زیست فراہم کیا' مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔"

قصہ تخلیق آدم سے ہمیں جو دوسری حقیقت معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کی جملہ زندہ مخلوق کے مقابلے میں انسان ایک معزز' برتر اور مکرم مخلوق ہے۔ اس نے اس جہان میں نہایت ہی اہم رول ادا کرنا ہے۔ اس نے نہایت ہی وسیع میدان میں تگ ودو کرنی ہے اور اس کے ساتھ یہاں کئی جہانوں کا معاملہ ہے۔ لیکن یہ تمام امور اللہ وحدہ کی بندگی اور غلامی کی حدود میں ہیں۔ اس انسان کی یہاں وہ پوزیشن نہیں جو اسے وہ مکاتب فکر دیتے ہیں جو حواس خمسہ اور مادیت کے اندر محدود ہیں۔ یہ مکاتب فکر انسان کو اس کائنات کا ایک موثر عامل نہیں سمجھتے۔ ان مذاہب و تصورات میں تمام اہمیت مادے اور اس کے اثرات کو دی جاتی ہے۔ اسی طرح نظریات ارتقاء کے قائلین اسے اس سے بھی گھٹیا مقام دیتے ہیں یعنی حیوانات میں سے ایک حیوان۔ ان لوگوں کو انسان کی انسانی خصوصیات سے کوئی غرض اور واسطہ نہیں ہے۔ یا وہ اسے فرائیڈ کے نظریہ جنسیت کے زاویہ سے دیکھتے ہیں جو انسان کو محض جنس کے گندے تالات کا ایک کیڑا سمجھتا ہے اور وہ اسی گندے تالاب کے ذریعے ہی ترقی کرتا ہے۔ لیکن اسلام اس منفرد مخلوق یعنی انسان کو جو عزت و کرامت عطا کرتا ہے وہ اس مقام تک نہیں پہنچتی کہ وہ الہ بن جائے جیسا کہ جدید روشن خیالی کے دور میں پیدا ہونے والے تصورات حیات نے اسے الہ بنا دیا ہے۔ اسلامی تصور حیات اسے سچائی اور اعتدال کا درجہ دیتا ہے جو درست اور صحت مند ہے۔

پھر اس منفرد مخلوق حضرت انسان کی تخلیق کا اعلان عالم بالا کی ایک نہایت ہی پر وقار تقریب میں کیا گیا' اور جیسا کہ ہم نے قرآنی نصوص کی روشنی میں کہا اس تقریب میں ایک مکمل انسان پیش کیا گیا۔ اس میں یہ اعلان بھی کیا گیا کہ وہ اس زمین کا خلیفہ ہے۔ جنت میں اس پر جو ابتلا آئی وہ بھی اسی غرض کے لیے تھی کہ وہ فرائض خلافت کی ادائیگی کے لیے تیار ہو جائے' جیسا کہ دوسری آیات میں آتا ہے کہ یہ پوری کائنات صرف زمین نہیں' انسان کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ وہ اس کے لیے مفید و معاون ہے اور زمین و آسمان میں جس قدر چیزیں ہیں انسان کے لیے مسخر کر دی گئیں۔

پھر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کو جو کردار سپرد کیا ہے وہ بھی بہت ہی عظیم ہے۔ اس پورے کرہ ارض کو ترقی دینا اور اس کے اوپر اللہ کا نظام خلافت قائم کرنا چاہے اس زمین کا حج بڑا ہو یا چھوٹا' بہر حال یہ ایک عظیم ڈیوٹی ہے جو انسان کے سپرد کی گئی۔

اس قصے اور قرآن کریم کی دوسری آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایک منفرد مخلوق ہے اور یہ صرف اس کرہ ارض پر ہی منفرد نہیں ہے بلکہ یہ پوری کائنات میں منفرد مخلوق ہے۔ دوسرے ستاروں میں ملائکہ جنات اور وہ تمام مخلوقات ہیں جن کے بارے میں صرف اللہ جانتا ہے۔ ان مخلوقات کے دوسرے فرائض ہیں' یہ تمام مخلوقات اپنا علیحدہ مزاج اور طبیعت رکھتی ہیں۔ ان کی طبیعت ان کے فرائض کے ساتھ مناسب ہے۔ البتہ انسان ایک منفرد مخلوق ہے جس کے فرائض اور وظائف بھی منفرد ہیں اور اس پر قرآن کی یہ آیت دلالت کرتی ہے۔

آیت "انا عرضنا الامانۃ علی السموت والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان انہ کان ظلوما جھولا"۔ (۳۳ : ۷۲) "

"ہم نے اس امانت کو آسمانوں' زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے لیکن انسان نے اسے اٹھالیا' بیشک وہ ظالم اور جاہل تھا۔"

گویا انسان اس پوری کائنات میں اپنی خصوصیات کے اعتبار سے منفرد ہے۔ ان خصوصیات میں ظلم اور جہل دونوں شامل ہیں۔ اس ظلم اور جہل کے ساتھ اسے ذاتی خود مختاری دی گئی ہے اور علم و معرفت کی استعداد دی گئی ہے۔ ذاتی ارادہ دیا گیا ہے اور جس قدر وہ جہل و ظلم پر قادر ہے اسی قدر وہ عدل اور علم پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ غرض انسانی صلاحیتوں کی یہ رنگارنگی ہی اس کی اہم خصوصیت ہے۔

اب ذرا دیکھئے کہ اس منفرد مخلوق کا معاملہ اپنے رب کے ساتھ براہ راست ہے۔ اس نے اسے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا ہے پھر عالم بالا کی پروقار تقریب میں اس کا اعلان کیا ہے اور اسے گویائی عطا کی۔ پھر اسے جنت میں داخل کیا اور کہا کہ کھاؤ جہاں سے چاہو ماسوائے ممنوعہ درخت کے۔ اس کے بعد اسے خلافت کا مقام عطا کیا' خود اپنے کلام کے ساتھ۔ پھر اللہ نے اسے تعلیم دی جیسا کہ آیت سورۃ بقرہ میں ہم نے اس کی تشریح کردی ہے کہ اسماء سے مراد الفاظ کے معانی ہیں یعنی لفظ اور مدلول وہ چیز ہے جس پر علم و معرفت کا تبادلہ ممکن ہوا ہے۔ ان ہی کے ذریعے سے تمام انسانوں کے علم میں اضافہ ہوا ہے اور آدم کو جنت میں بھی اور اس کے بعد بھی اللہ نے وصیت کی اور اسے ایسی خصوصی صلاحیتیں دیں جو صرف انسان میں ہیں اور کسی اور مخلوق کو نہیں دی گئیں اور پھر اپنی مزید ہدایت دے کر رسولوں کو بھیجا پھر اللہ نے اپنے اوپر اپنی مخلوق کے ساتھ رحمت کرنا فرض کرلیا کہ اگر وہ توبہ کرلیں اور معافی کے خواستگار ہوں تو انھیں معاف کردیا جائے اور یہ اس منفرد مخلوق پر اللہ کا آخری کرم ہے۔

یہ انسان عالم بالا کے ساتھ بھی باہم ہم سفر ہے۔ فرشتے اس کی تکریم میں سجدہ کرتے ہیں۔ پھر اس کی حفاظت کے لیے بھی فرشتے مقرر ہیں۔ ان میں سے بعض وحی لانے کے فرائض سرانجام دیتے ہیں اور اللہ کے جو بندے یہ کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر ثابت قدمی اختیار کرتے ہیں تو ان پر اللہ فرشتے نازل کرتا ہے' جو اسے خوشخبری دیتے ہیں۔ اس طرح جو لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں ان کی بھی یہ فرشتے نصرت کرتے ہیں اور انھیں فتح کی خوشخبری دیتے ہیں پھر یہ فرشتے کفار پر مسلط کئے جاتے ہیں جو انھیں قتل بھی کرتے ہیں اور ان کی ارواح کو بھی عذاب دیتے ہیں۔ غرض یہ اور دوسرے معاملات ایسے ہیں جن میں انسان کا فرشتوں کی دنیا سے بھی رابط و معاملہ ہے۔

پھر انسان کا جنات کے ساتھ بھی معاملہ ہے۔ ان کے صالحین کے ساتھ بھی اور ان کے شر پسندوں کے ساتھ بھی انسان اور شیطان اعظم کے درمیان جو معرکہ ہوا اس کے بارے میں تو قارئین جان چکے ہیں۔ یہ عظیم معرکہ اب بھی جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ لیکن نیک جنوں کے ساتھ انسان کا باہم ربط بھی بعض آیات میں مذکور ہے اور جنات کی تسخیر بھی قرآن سے ثابت ہے جس طرح حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے قصے میں مذکور ہے کہ انھوں نے جنات کو مسخر کرلیا تھا۔

اسی طرح یہ انسان اس پوری مادی کائنات کے ساتھ بھی مربوط ہے۔ خصوصا زمین اور اس کے ارد گرد ستاروں اور سیاروں کے ساتھ۔ اس زمین پر تو انسان اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے۔ انسان کے لیے اس کی تمام قوتیں مسخر کردی گئی ہیں' اس کے خزانے اور پیداوار انسان کے لیے وقف ہے۔ اور انسان کے اندر وہ قوت اور استعداد ودیعت کردی گئی ہے جو اس کی کنہ تک مسلسل پہنچ رہا ہے اور اس کے طبیعی قوانین کا انکشاف کرتا چلا جاتا ہے اور اس طرح وہ اس زمین پر عظیم کردار ادا کر رہا ہے۔ یوں اس کا اس کائنات کی تمام زندہ مخلوق کے ساتھ ربط ہے۔ پھر اپنی طبیعت کی بوقلمونیوں کی وجہ سے وہ خود اپنے نفس کے اندر بہت دور تک معرفت کے گھوڑے دوڑاتا

ہے۔ یہ آسمانوں تک معراج حاصل کرتا ہے اور فرشتوں کے مقامات سے بھی آگے چلا جاتا ہے۔ لیکن اس وقت جب وہ اللہ کا بندہ خاص ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ گر جائے تو محض ایک حیوان کی سطح تک بھی اتر آتا ہے۔ جب وہ اپنی خواہشات کو اپنا الہ بنالے۔ اس وقت اس کی انسانیت گندے حیوانی تالاب میں لت پت ہو جاتی ہے۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان ایک وسیع و عریض میدان درجات ہے جو عالم حس کے اندر اور اس کے آگے ورائے حس کی حدود تک پھیلا ہوا ہے اور اس کا اس میں معاملہ ہے۔۔ یاد رہے کہ انسان کے سوا کسی اور مخلوق کے لیے یہ مقامات نہیں ہیں' جیسا کہ اس قصے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے۔

تیسری حقیقت یہ ہے کہ یہ منفرد مخلوق' اپنی اس انفرادیات کے باوجود بعض پہلوؤں سے کمزور بھی ہے اور اپنی ان کمزوریوں کی وجہ سے اس بات کا امکان ہے کہ اسے شر کی طرف کھینچا جاسکتا ہے۔ وہ ذاتی اور سفلی خواہشات کے پیچھے درجہ اسفل تک بھی گر سکتا ہے۔ اس کی ایک کمزوری تو یہ ہے کہ وہ یہاں باقی رہنا چاہتا ہے۔ پھر وہ اقتدار کا بھی بھوکا ہے اور اس اندر اقتدار کی سخت خواہش ہے۔ جب وہ اللہ کی ہدایت کو پس پشت ڈال دیتا ہے تو اس کی کمزریوں میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ خالص خواہشات نفسانیہ کا بندہ بن جاتا ہے یا وہ ایسے دشمن شیطان کا پیروکار بن جاتا ہے' جس نے یہ ڈیوٹی اپنے ذمے لے رکھی ہے کہ وہ اسے گمراہ کرے گا' اس مقصد کے لیے انتھک کوشش جاری رکھے گا اور اس مقصد کے حصول کے لیے وہ تمام ذرائع ووسائل کام میں لائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم کی وجہ سے اسے پوری طرح اس کی فطرت کے سپرد نہیں کر دیا۔ نہ اسے اپنی عقل اور سوچ کے حوالے کر دیا ہے۔ بلکہ اس کی ہدایت کے لیے اور اسے انجام بد سے ڈرانے کے لیے رسولوں کا سلسلہ بھیجا ہے (تفسیر فی ظلال القرآن۔ قطب شاہ شہید)

پھر (فرمان ہوا) اے آدم وحواء اور اے ابلیس، تم سب (اترو) زمین پر، اور جان لو کہ (تم میں ایک دوسرے کا دشمن ہے)۔ تمہاری اولادوں کا بھی یہی حال ہوگا، کہ ان میں بعض بعض کا دشمن ہوگا۔

یہ فرمان سن کر حضرت آدم مغموم و مجزون ہوئے کہ شاید اب ان کی بہشت کی طرف واپسی نہ ہو۔

تو ارشاد ہوا (اور) فرمایا کہ (تمہارے لیے زمین میں ٹھہراؤ) ہے (اور کچھ وقت تک رہن بہن ہے) یعنی یہ زمین تمہاری قرارگاہ اور آرام کی جگہ ہے، ایک وقت تک۔ یعنی تمہاری عمروں کے ختم ہونے تک۔۔ نیز۔۔

(فرمان ہوا) کہ (اسی میں جیوگے) یعنی زندگی بسر کروگے (اور اسی میں مروگے)۔ یعنی اسی میں تمہاری قبر ہوگی جس میں تم مدفون ہوگے، (اور) پھر (اسی نکالے جاؤگے) حساب وجزاکے واسطے۔

حضرت آدم نے اس خطاب کے مضمون سے سمجھ لیا کہ دوبارہ جنت میں جائینگے۔ حضرت آدم کے مذکورہ بالات سے لباس کی اہمیت پتہ چلتا ہے اور ستر پوشی کی ضرورت کا علم ہو جاتا ہے۔ ستر پوشی انسانی حیا کا تقاضہ اور اس کی فطرت سلیمہ کا مطالبہ ہے۔۔ چنانچہ۔۔ اللہ تعالی تمام نبی آدم کو اور اہل عرب کو خصوصا جن کی عادت تھی کہ وہ بیت اللہ شریف میں ننگے ہو کر طواف کرتے تھے اور کہتے، کہ ہم وہ لباس پہن کر طواف نہیں کرتے جن سے ہم نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے۔۔

(تفسیر اشرفی۔ علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

ثابت بنانی (رح) راوی ہیں کہ جب حضرت آدم (علیہ السلام) زمین پر تشریف لے آئے اور وقت وفات آیا تو ملائکہ نے آپ کو اپنے احاطہ میں لے لیا۔ حضرت حوا ان کے گرد پھرنے لگیں۔ پھر آپ نے فرمایا اے میرے رب کے فرشتوں مجھے چھوڑو یہاں اس لیے کہ آج مجھے وہ مصیبت پہنچی ہے جو تمہیں نہیں پہنچی۔

پھر جب آپ (علیہ السلام) کی وفات ہو گئی تو ملائکہ (علیہم السلام) نے آپ (علیہم السلام) کو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دیا۔ تین بار اور حنوط کرکے یعنی خوشبو لگا کر تین کپڑوں میں کفن دیا۔ پھر قبر تیار کی اور سراندیپ یعنی لنکا میں دفنایا اور آپ (علیہ السلام) کی اولاد کو فرمایا یہ طریقہ تجہیز و تکفین کا ہے آدم (علیہ السلام) کے بعد ہے۔ (تفسیر الحسنات۔ علامہ سید محمد احمد قادری)

آیت مبارکہ:

قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ○ ۲۵

لغۃ القرآن: قَالَ : فرمایا] [فِيْهَا : اس میں] [تَحْيَوْنَ : تم سب زندگی گزارو گے] [وَفِيْهَا : اور اسی میں] [تَمُوْتُوْنَ : تم سب مرو گے] [وَمِنْهَا : اور اسی سے] [تُخْرَجُوْنَ : تم سب نکالے جاؤگے]

ترجمہ: ارشاد فرمایا: تم اسی (زمین) میں زندگی گزاروگے اور اسی میں مروگے اور (قیامت کے روز) اسی میں سے نکالے جاؤگے

تشریح:

گزشتہ آیات میں حضرت آدم (علیہ السلام) کے لباس و طعام کا ذکر ہوا اب یہاں سے ان کی اولاد کے لباس و طعام کی اہمیت اور اس کے متعلقہ احکام کا بیان ہے اور چونکہ گزشتہ آیات میں تخلیق آدم کا بیان ہوا تو یہاں سے بار بار اے اولاد آدم! کے الفاظ سے خطاب کیا جارہا ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) اور حضرت حوا (علیہ السلام) کو جنت سے زمین پر اترنے کا حکم دیا اور زمین کو ان کے ٹھہرنے کی جگہ بنایا تو وہ تمام چیزیں بھی ان پر نازل فرمائیں جن کی دین یا دنیا کے اعتبار سے انھیں حاجت تھی۔ ان میں سے ایک چیز لباس بھی ہے جس کی طرف دین اور دنیا دونوں کے اعتبار سے حاجت ہے۔ دین کے اعتبار سے تو یوں کہ لباس سے ستر ڈھانپنے کا کام لیا جاتا ہے کیونکہ ستر عورت نماز میں شرط ہے اور دنیا کے اعتبار سے یوں کہ لباس گرمی اور سردی روکنے کے کام آتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے جس کا ذکر اس آیت میں فرمایا۔ آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین طرح کے لباس اتارے دو جسمانی اور ایک روحانی۔ جسمانی لباس بعض تو ستر عورت کے لیے اور بعض زینت کے لیے ہیں، یہ دونوں اچھے ہیں اور روحانی لباس ایمان، تقویٰ، حیا اور نیک خصلتیں ہیں۔ یہ تمام لباس آسمان سے اترے ہیں کیونکہ بارش سے روئی اون اور ریشم پیدا ہوتی ہے، یہ بارش آسمان سے آتی ہے اور وحی سے تقویٰ نصیب ہوتا ہے اور وحی بھی آسمان سے آتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ لباس صرف انسانوں کے لیے بنایا گیا اسی لیے جانور بے لباس ہی ہوتے ہیں۔ ستر عورت چھپانے کے قابل لباس پہننا فرض ہے اور لباس زینت پہننا مستحب ہے۔ لباس اللہ عَزَّوَجَلَّ کی بہت بڑی نعمت ہے اس لیے اس کے پہننے پر اللہ عَزَّوَجَلَّ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

سرکارِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا لباس:

حضور انور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) زیادہ تر سوتی لباس پہنتے تھے اون اور روئی کا لباس بھی کبھی کبھی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے استعمال فرمایا۔ لباس کے بارے میں کسی خاص پوشاک یا امتیازی لباس کی پابندی نہیں فرماتے تھے۔ جبہ، قبا، پیرہن، تہبند، حلہ، چادر، عمامہ، ٹوپی، موزہ ان سب کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے زیب تن فرمایا ہے۔ پائجامہ کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پسند فرمایا اور منیٰ کے بازار میں ایک پائجامہ خریدا بھی تھا لیکن یہ ثابت نہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پائجامہ پہنا ہو۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم قادری)

تمہارا مسکن اصلی و معتاد یہی زمین ہے اگر خرق عادت کے طور پر کوئی شخص کسی وقت ایک معین وقت کے لیے اس سے اوپر اٹھالیا جائے مثلاً حضرت مسیح (علیہ السلام) تو وہ اس آیت کے منافی نہیں۔ کیا جو شخص چند روز یا چند گھنٹے کے لیے زمین سے جدا ہو کر ہوائی جہاز میں مقیم ہو یا فرض کیجئے وہیں مر جائے وہ فیھا تحیون وفیھا تموتون کے خلاف ہوگا؟ کیونکہ وہ اس وقت زمین پر نہیں ہے معلوم ہوا کہ اس قسم کے قضایا کلیہ کے رنگ میں استعمال نہیں ہوتے۔ (حاشیہ علامہ عثمانی) (تفسیر ضیاء القرآن)

حیات مسیح پر مرزائیوں کے سوال کا جواب:

مرزائی لوگ یہاں سے استدلال کرتے ہیں کہ عیسیٰ (علیہ السلام) آسمان پر زندہ نہیں رہ سکتے کیونکہ انسان کی زندگی زمین ہی پر رکھی گئی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فِيهَا تَحْيَوْنَ قدم زمین ہی پر جیوگے۔ تو پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی آسمان پر کیسے مان لی جائے؟ کیا وہ اولاد آدم میں سے نہیں ہیں؟ مگر یہ استدلال غلط ہے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا آسمان پر عارضی قیام ہے اور بحکم خدا ہے جو قادر مطلق ہے۔ وہ پہلے بھی زمین پر تھے بعد میں زمین ہی پر آئیں گے۔ یہ آسمان پر ان کا

عارضی اور خارق عادت قیام اسی طرح ہے جیسے آدم (علیہ السلام) اور حضرت حوا کو کچھ عرصہ جنت میں رکھا گیا یا حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) معراج پر تشریف لے گئے آدم علیہ السلام اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آسمان میں کتنا عرصہ رہے یہ اللہ ہی جانتا ہے، اگر ان کا آسمان پر کچھ عرصہ رہنا ممکن ہے تو عیسٰی (علیہ السلام) کا رہنا کیوں ممکن نہیں۔

انسان کا چاند یا کسی اور سیارے پر رہنا ممکن نہیں:

فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ۔ سے معلوم ہوا انسان چاند پر جا کر آباد نہیں ہو سکتا ماسوائے عارضی کے جیسا کہ بعض اہل مغرب کے ہاں یہ خبط ہے۔ انسان صرف زمین ہی پر رہ سکتا ہے۔ اسی لیے ان دوسری جگہ یہ بھی فرمایا گیا: وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ " تمہارے لیے زمین ہی میں ٹھہرنا اور ایک مدت تک برتاؤ کرنا ہے۔" (انعام۔64۔اعراف۔24)۔ (تفسیر برہان القرآن۔علامہ قاری محمد طیب)

قیامت کے دن یہ رب کا قانون ہے مگر قدرت یہ بھی ہے کہ بعض کو قیامت میں زمین سے نہ اٹھائے جیسے حضرت ادریس (علیہ السلام) کو وہ یہاں سے وفات پا کر جنت میں پہنچ چکے اور اب مع جسم وہاں زندہ ہیں۔ وہاں سے نہ نکلیں گے۔ رب فرماتا ہے ورفعناہ مکانا علیا۔ لٰہذا آیت پر کوئی اعتراض نہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ حضرت عیسٰی (علیہ السلام) کا آسمان پر رہنا عارضی ہے۔ پھر آپ زمین پر تشریف لائیں گے یہاں ہی وفات پائیں گے۔ یہاں سے ہی اٹھیں گے۔

(تفسیر نور العرفان۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی)

بعث بعد الموت کی تذکیر و یاددہانی:

سو اس سے واضح فرمادیا گیا کہ انسان کو مرنے کے بعد پھر اسی زمین سے اٹھایا جائے گا۔ سو بعث بعد الموت کی تذکیر و یاددہانی کے طور پر ارشاد فرمایا گیا کہ اسی سے تم لوگوں کو نکالا جائے گا یعنی قیامت کے روز تاکہ تم زندگی بھر کے اپنے اپنے کئے کرائے کا پورا پورا بدلہ پاسکو۔ پس دنیا کی اس عارضی منزل کو تم کہیں اپنی حقیقی منزل اور اصل اور آخری ٹھکانا نہ سمجھ لینا کہ یہ اساس و بنیاد ہے دائمی خسارے اور ناکامی کی۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ بلکہ اس کو کسب آخرت کی فرصت اور اس کا موقع سمجھتے ہوئے آخرت کی اپنی اصل اور حقیقی زندگی کیلئے کمائی کرنا۔ وباللہ التوفیق۔ بہر کیف اس سے ان تمام مراحل کو بیان فرمادیا گیا جن سے آدم اور اولاد آدم کو گزرنا ہے۔ سو ان کو بتادیا گیا کہ ان تمام مراحل سے گزر کر تم نے بالآخر لوٹ کر ہمارے ہی پاس آنا ہے۔ سو اس وقت ہم تمہیں بتادیں گے کہ تم نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ اور حیات دنیا کے میدان مقابلہ سے تم سرخرو ہو کر لوٹے ہو یا نامراد ہو کر۔ والعیاذ باللہ۔ اللہ ہمیشہ صراط مستقیم پر گامزن رکھے۔ آمین۔

(تفسیر مدنی کبیر۔ مولانا اسحاق مدنی کشمیر)

آیت مبارکہ:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝۲۶

لغۃ القرآن: يٰبَنِيْٓ : اے اولاد !] [اٰدَمَ : آدم] [قَدْ : تحقیق] [اَنْزَلْنَا : ہم نے اتاری] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [لِبَاسًا : لباس " پردہ "] [يُوَارِيْ : وہ چھپائے] [سَوْاٰتِكُمْ : تمہارے ستر کو] [وَرِيْشًا : اور زینت ہے] [وَلِبَاسُ : اور لباس] [التقوی : تقویٰ کا] [ذٰلِكَ : وہ] [خَيْرٌ : بہتر ہے] [ذٰلِكَ : وہ] [مِّنْ : سے] [اٰيٰتِ : احکام] [اللّٰهِ : اللہ] [لَعَلَّهُمْ : تاکہ وہ] [يَذَّكَّرُوْنَ : سب نصیحت حاصل کریں]

ترجمہ: اے اولادِ آدم ! بیشک ہم نے تمہارے لیے (ایسا) لباس اتارا ہے جو تمہاری شرم گاہوں کو چھپائے اور (تمہیں) زینت بخشے اور (اس ظاہری لباس کے ساتھ ایک باطنی لباس بھی اتارا ہے اور وہی) تقویٰ کا لباس ہی بہتر ہے۔ یہ (ظاہر و باطن کے لباس سب) اللہ کی نشانیاں ہیں تاکہ وہ نصیحت قبول کریں

تشریح:

عرب کے بعض مشرک قبیلے طواف کعبہ کے وقت اپنا لباس اتار دیتے۔ مرد اور عورتیں مادر زاد برہنہ ہو کر طواف کرتے۔ اور اسے کما تقویٰ خیال کیا جاتا۔ نہ صرف عرب بلکہ دنیا کی اکثر قومیں اپنی مذہبی رسوم و عبادات کی ادائیگی کے وقت شرم و حیا کی چادر اتار پھینکتی ہیں۔ ہردوار اور بنارس میں اشنان کرنے والوں کے متعلق کسے معلوم نہیں کہ وہاں عریانی اور برہنگی کا کتنا شرمناک مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اور آج تو ثقافت و فن کی کسی محفل میں گرمی پیدا ہی نہیں ہوتی جب تک شرم و حیا کی ساری قدروں کو پاؤں تلے نہ روند ڈالا جائے۔ اس لیے یہاں خطاب کسی خاص قوم یا قبیلہ کو نہیں بلکہ لباس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے ساری اولادِ آدم کو خطاب فرمایا جارہا ہے۔ آیت میں لباس کے دو فائدے بیان کیے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ستر عورت کا کام دیتا ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ انسان کی آسائش اور زینت کا باعث ہے۔

لفظی تحقیق : انزلنا کا لغوی معنی تو اوپر سے نیچے اتارنا ہے۔ یہاں لباس کے لیے اس کا استعمال بطور مجاز ہے۔ یعنی بارش جو کپاس وغیرہ کی روئیدگی اور حیوانات (جن کی اون سے گرم کپڑے بنتے ہیں) کی زندگی کا سبب ہے۔ وہ کیونکہ اوپر سے نازل ہوتی ہے تو گویا لباس بھی اوپر سے ہی نازل ہوا۔ تسمیته المسبب باسم السبب۔ اور بعض علما نے کہا انزل بمعنی خلق ہے۔ اور یہ استعمال بھی عام ہے۔ جیسے وانزل لکم من الانعام ثمانية ازواج۔ سواۃ : جسم کا وہ حصہ جس کا ننگا کرنا قبیح ہو۔ شریعت اسلامیہ میں مرد کے لیے ناف سے لے کر گھٹنوں تک ڈھانپنا ضروری ہے اور عورت کے لیے نامحرم سے سارے بدن کا ڈھانپنا لازمی ہے۔ ریش : پرندوں کے پر و بال۔ وہ ان کے لیے زیب و زینت کا باعث بھی ہیں۔ اسی طرح لباس انسان کے لیے۔

دنیا کا کوئی قیمتی سے قیمتی لباس بھی اس کی خوبصورتی اور پائیداری کا مقابلہ نہیں کر سکتا

اذا المرء لم يلبس ثيابا من التقى تقلب عريانا وان كان كاسيا

جب تک کوئی شخص تقویٰ کا لباس زیب تن نہ کرے گا تو وہ ننگا ہے اگرچہ اس نے کپڑے پہنے ہوئے ہوں

وخير لباس المرء طاعة ربه ولا خير فيمن كان لله عاصيا

اطاعت خداوندی سب سے بہتر لباس ہے اور جو اللہ کا نافرمان ہو اس میں نام کی بھلائی نہیں ہے

لباس، اس کے لیے ایسے مواد کا مہیا کر دینا جس سے یہ تیار ہو سکے، اس کے علاوہ انسان میں لباس کی خواہش ودیعت کر دینا، پھر اسے لباس تیار کرنے کی سمجھ عطا فرما دینا یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت، حکمت اور علم کی ناقابل انکار دلیلیں ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری)

حضرت آدم (علیہ السلام) اور حضرت حوا] سے خطا سرزد ہونے کی وجہ سے ان کا لباس اتر گیا جس کی بناء پر اولادِ آدم کو لباس پہننے اور گناہوں سے بچنے کا حکم دے کر فرمایا ہے کہ لباس پہننے اور گناہوں سے پرہیزگاری اختیار کرنے میں تمہاری خیر ہے یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جس سے نصیحت حاصل کرو۔ خیر سے مراد ظاہری کثافت، یا موسم کی حدّت و برودت سے بچاؤ اور بے حیائی سے بچنا ہے۔ لباس کی فرضیت کے لیے انزلنا اور اسے آیت اللہ قرار دیا ہے۔ جس لباس سے انسان کی حیا، عفّت اور عزت و وقار پامال ہو وہ نہیں پہننا چاہیے لباس کو ظاہری زینت اور شرافت نفس کا ضامن قرار دے کر اس کی اہمیت و فرضیت کو انزلنا کے ساتھ بیان فرمایا کہ ہم نے تمہارے لیے لباس اتارا۔ لفظ انزلنا میں لباس کی فرضیت کے ساتھ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی اون، روئی اور چمڑا پیدا کرنے کے ساتھ تمہیں لباس سینے اور پہننے کا سلیقہ سمجھایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے لباس کی ضرورت و اہمیت بیان کرتے ہوئے صرف مسلمان یا کسی خاص قبیلے اور قوم کو ہی مخاطب نہیں فرمایا بلکہ لباس کی مقصدیت اجاگر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ لباس آدمی کی زینت اور ستر پوشی کا مظہر ہے۔

)يَابَنِيٓ آدَمَ قَدۡ أَنزَلۡنَا عَلَيۡكُمۡ لِبَاسًا يُوَارِي سَوۡءَاتِكُمۡ وَرِيشًا وَلِبَاسُ التَّقۡوَىٰ ذَٰلِكَ خَيۡرٌ (

[الاَعراف : ۲٦]

"اے آدم کی اولاد ! ہم نے تمہارے لیے لباس نازل کیا جو تمہارے جسموں کو ڈھانپنے کے ساتھ تمہارے وجود کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ ہے۔ بہترین لباس پرہیزگاری کا لباس ہے۔"

ریش :

ریش پرندے کے پروں کو بھی کہا جاتا ہے جو اس کا لباس ہونے کے ساتھ ساتھ حسن و زیبائی کا باعث اور پھر اس کی اڑان اور پرواز کا ذریعہ بھی ہیں۔ انسان کیونکہ پوری مخلوق میں ظاہری اور معنوی اعتبار سے خوبصورت ترین پیدا کیا گیا ہے۔"

)لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ) [التین : ۴]

" بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین انداز میں تخلیق کیا ہے۔"

اس لیے ضروری ہے کہ وہ ایسا لباس زیب تن کرے جو وضع قطع اور رنگ و ڈیزائن کے اعتبار سے اس کی قد و قامت نکھار و سنوار میں اضافہ کرے۔ لباس کا دوسرا مقصد تقویٰ قرار پایا۔ یہاں تقویٰ کے دونوں معنی لینے چاہئیں۔ ظاہری کثافت و نجاست اور موسموں کی حدت و برودت، ہوا اور فضا کے برے اثرات سے اپنے آپ کو بچانا اسی کے باعث آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمیشہ موسم کے مطابق لباس زیب تن فرماتے۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ گرمیوں میں آپ کھلا کرتا پہنتے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے تو بسا اوقات سامنے بیٹھا ہوا آدمی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آستینوں سے بغلوں کے قریب بازوؤں کی سفیدی دیکھ لیتا تھا۔

) وَاِنَّہٗ یَرۡفَعُ حَتّٰی یُرٰی بَیَاضُ اِبۡطَیۡہِ) [مشکوٰۃ: کتاب الاستسقاء]

"آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس قدر ہاتھ بلند کیے کہ بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی۔"

اور اسی طرح آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سردیوں میں نسبتاً چست لباس استعمال فرماتے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک دفعہ وضو کرنے لگے تو کہنیوں کو دھونے کے لیے آستینیں چڑھانا چاہیں، جب اوپر نہ ہو پائیں تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اچکن اتارنا پڑی۔

) اَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لَبِسَ جُبَّۃً رُوۡمِیَّۃً ضَیِّقَۃَ الۡکُمَّیۡنِ) [رواہ البخاری و مسلم : کتاب اللباس]

" بلاشبہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک رومی جبہ پہنا جس کی آستینیں تنگ تھیں۔"

لباس کا دوسرا مقصد شرم و حیا کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ہے۔ قرآن کریم اس کو تقویٰ سے تعبیر کرتا ہے۔ اگر لباس موسم کے مطابق نہیں تو صحت کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے اور اگر شریعت کے تقاضے پورے نہیں کرتا تو حیا کے رخصت ہونے کا خدشہ ہے۔ اسی بنا پر خاص کر عورت کو شرم و حیا کی تلقین فرماتے ہوئے پردے کا حکم دیا ہے۔

" جناب عبداللہ بن مسعود (رض) کہتے ہیں رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب کوئی عورت بے پردہ باہر نکلتی ہے تو شیطان صفت لوگ اس کو اپنی نظروں کا نشانہ بناتے ہیں۔" [رواہ الترمذی :]

اور یہ بھی فرمایا کہ عورتیں زیادہ باریک لباس نہ پہنیں۔ جس سے ان کا جسم نظر آئے۔ لباس پہننے کے باوجود برہنہ دکھائی دینے والی عورتوں پر پھٹکار کے الفاظ استعمال کیے۔

" حضرت عائشہ صدیقہ (رض) بیان کرتی ہیں (میری بہن) اسماء بنت ابی بکر (رض) رسول پاک (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئیں اور وہ باریک کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی طرف سے چہرہ پھیر لیا اور فرمایا کہ اے اسماء ! جب عورت جوان ہو جائے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ اس کے ہاتھوں اور چہرے کے علاوہ جسم کا کوئی حصہ نظر آئے۔"

[مشکوۃ، کتاب اللباس]

دوسری روایات میں یہ وضاحت موجود ہے کہ چہرے کا ڈھانپنا نہایت ضروری ہے کیونکہ اگر چہرہ ننگا ہو تو پردے کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔

غرور اور تکبر سے بچیے:

) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَا اَسْفَلَ مِنَ الْکَعْبَیْنِ مِنَ الْاِزَارِ فِی النَّارِ) [مشکوۃ]

" حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص ٹخنوں سے نیچے تہبند رکھے گا اس کے ٹخنوں کو آگ میں جلایا جائے گا۔"

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ملبوسات کے رنگ وڈیزائن:

) عَنْ سَمُرَةَ (رض) اَنَّ النَّبِیَّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ اِلْبَسُوا الثِّیَابَ الْبِیضَ فَاِنَّهَا اَطْهَرُ وَاَطْیَبُ وَ کَفِّنُوْا فِیْهَا مَوْتَاکُمْ (

" حضرت سمرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ سفید کپڑے پہنا کرو کیونکہ یہ زیادہ صاف ستھرے اور نفیس ہوتے ہیں۔ اور اپنے فوت ہونے والوں کو سفید کپڑوں میں کفن دیا کرو۔" [مشکوٰۃ: کتاب اللباس]

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سفید لباس پسند کرنے کے باوجود رنگ دار لباس بھی زیب تن کرتے تھے۔ خصوصاً وفود سے ملاقات کرتے ہوئے گیروُرنگ کا لباس پہنتے۔ بالکل کالا، سبز اور سرخ رنگ کا لباس کبھی بھی استعمال نہیں کیا۔ مخصوص لباس اور ہمیشہ ایک ہی رنگ اختیار کیے رکھنا نیکی کی نمائش اور جاہل صوفیا کا طریقہ ہے۔ احادیث کی مقدس دستاویزات میں کالے یا سرخ رنگ کے لباس کے جو اشارات ملتے ہیں اس سے مراد سرخی یا سیاہی مائل کپڑے ہیں۔ حافظ ابن قیم (رض) نے لکھا ہے کہ بالکل سیاہ، سبز اور سرخ لباس آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نہیں پہنا۔ حدیث میں ایسے رنگوں سے مراد ان رنگوں کا غالب ہونا ہے۔ البتہ دستار مبارک اور سردیوں میں اوپر لپینے والی چادر خالص کالے رنگ کی استعمال فرمائی۔

) عَنْ عَمْرِو بْنِ حُرَیْثٍ (رض) قَالَ رَأَیْتُ النَّبِیَّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عَلَی الْمِنْبَرِ وَعَلَیْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءَ (

" حضرت عمرو بن حریث (رض) کہتے ہیں کہ میں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو منبر پر تشریف فرما دیکھا اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سیاہ پگڑی سجائے ہوئے تھے۔" [مشکوٰۃ: کتاب اللباس]

وضع قطع کے اعتبار سے چند معمولی تبدیلیوں کے علاوہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وہی لباس استعمال فرمایا جو اس زمانے میں لوگ پہنا کرتے تھے۔ اس دور میں لوگ اکثر قمیص کے ساتھ تہبند اور سر پر دستار سجایا کرتے تھے۔ یہی بڑے اور معزز لوگوں کا لباس ہوا کرتا تھا۔ البتہ معاشرے میں پاجامہ اور شلوار بھی لوگوں کے زیر استعمال تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن قیم (رض) نے اس بات کی طرف اشارے دیے ہیں کہ نبی محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شلوار بھی پہنا کرتے تھے۔ جبکہ صحابہ کرام (رض) سے شلوار یا پاجامہ اور سروں پر ٹوپیاں پہننے کے تو کافی ثبوت موجود ہیں۔

) عَنْ سَهْلِ بْنِ مُعَاذِ بْنِ أَنَسٍ عَنْ أَبِیهِ أَنَّ رَسُولَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ مَنْ أَکَلَ طَعَامًا ثُمَّ قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی أَطْعَمَنِی هٰذَا الطَّعَامَ وَرَزَقَنِیهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِنِّی وَلَا قُوَّةٍ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ قَالَ وَمَنْ لَبِسَ ثَوْبًا فَقَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی کَسَانِی هٰذَا الثَّوْبَ وَرَزَقَنِیهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِنِّی وَلَا قُوَّةٍ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ) [رواہ ابوداؤد: کتاب اللباس]

" حضرت سہل بن معاذ بن انس اپنے باپ سے بیان کرتے ہیں بلاشبہ رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص کھانا کھائے تو کہے تمام تعریفات اس اللہ کے لیے جس نے مجھے یہ کھانا کھلایا اور مجھے بغیر مشقت کے عنایت فرمایا تو اس کے تمام اگلے اور پچھلے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔ جو کوئی کپڑا پہنے تو کہے تمام تعریفات اس اللہ تعالیٰ کے لیے جس نے مجھے یہ کپڑا پہنایا اور مجھے بغیر کسی مشقت کے عنایت فرمایا تو اس کے اگلے اور پچھلے تمام گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔"

(تفسیر فہم القرآن۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

حضرت ابوامامہ (رض) سے مروی ہے کہ عمر فاروق (رض) نے نیا کپڑا پہنا اور یہ پڑھا: الحمدللہ الذی کسانی ما اواری بہ عورتی واتجمل بہ فی حیاتی۔ اللہ کے لیے سب تعریف ہے جس نے مجھے یہ لباس دیا جس میں میں اپنی ستر ڈھانپ سکتا ہوں اور اس سے اپنی زندگی میں زینت حاصل کرتا ہوں، پھر کہا کہ رسول

اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جو شخص نیا لباس پہنتے ہوئے یہ دعا پڑھے اور پرانے لباس کو صدقہ کردے وہ زندگی میں اور مرنے کے بعد اللہ کی حفاظت میں رہے گا۔ (ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد)

ستر عورت لازم ہے:

يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا، اس سے معلوم ہوا الباس کا سب سے پہلا مقصد ستر عورت ہے اگر یہ مقصد حاصل نہ ہو تو لباس بے معنی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مرد اور عورت کی جائے ستر (چھپانے والی جگہ) کیا ہے؟ تو مرد کی جائے ستر اس کی ناف سے گھٹنوں تک ہے، حضرت ابو ایوب انصاری (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: **مافوق الركبتين من العورة وما اسفل من السرة من العورة** "گھٹنوں کے اوپر اور ناف سے نیچے جو ہے جائے ستر ہے۔" (سنن دار قطنی جلد اول صفحہ 183 حدیث 879 مطبوعہ دار الفکر بیروت)

اور عورت کی جائے ستر اس کا سارا جسم سوائے چہرے اور دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں کے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ (رض) سے مروی ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا "جب عورت کو حیض آنے لگے تو اس کے چہرے اور ہاتھوں پاؤں کے سوا کچھ نظر نہ آئے۔" (سنن ابو داؤد کتاب الادب)

لہٰذا عورت کا ننگے سر، ننگے بازو اور چست کپڑوں کے ساتھ گھر سے نکلنا حرام اور سخت گناہ ہے۔ کیونکہ ایسی عورت لباس کے باوجود بے لباس اور ننگی ہے۔ کیونکہ اس نے لباس کا سب سے اہم مقصد پورا نہیں کیا اور حدیث میں اس پہ وعید شدید ہے۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ قرب قیامت میں کچھ ایسی عورتیں آئیں گی لابسات عاریات یعنی انھوں نے کپڑے پہنے ہوں گے پھر بھی ننگی ہوں گی، لایدخلن الجنة ولا یجدن ریحھا، وہ جنت میں نہ جائیں گی، بلکہ جنت کی خوشبو بھی نہ پائیں گی۔" (مسلم کتاب اللباس)

حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شبِ معراج بعض عورتوں کو جہنم میں بالوں کے ذریعے لٹکے ہوئے دیکھا اور آپ کو بتایا گیا کہ یہ عورتیں غیر مردوں کو اپنے بال دکھاتی تھیں۔

یعنی یہ اس کی قدرت کی نشانیاں ہیں کہ اس نے آسمان سے بارش برسا کر کپاس اگائی اور اس سے ہمارے لیے لباس پیدا کیا اور ہمیں جذبہ ستر پوشی دیا۔
(تفسیر برہان القرآن۔ قاری محمد طیب

آیت مبارکہ:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭاِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭاِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝27

لغۃ القرآن: يٰبَنِيْٓ : اے اولاد !] [اٰدَمَ : آدم] [لَا : نہیں] [يَفْتِنَنَّكُمُ : ہرگز فتنے میں ڈالے تمہیں] [الشَّيْطٰنُ : شیطان نے] [كَمَآ : جیسا کہ] [اَخْرَجَ : نکالا] [اَبَوَيْكُمْ : تمہارے ماں باپ کو] [مِّنَ : سے] [الْجَنَّةِ : جنت] [يَنْزِعُ : وہ اترواتا تھا] [عَنْهُمَا : ان دونوں سے] [لِبَاسَهُمَا : ان کا لباس] [لِيُرِيَهُمَا : تاکہ وہ دکھائے ان دونوں کو] [سَوْاٰتِهِمَا : ان دونوں کے ستر] [اِنَّهٗ : بیشک یہ حقیقت ہے] [يَرٰىكُمْ : دیکھتا ہے تمہیں] [هُوَ : وہ] [وَقَبِيْلُهٗ : اور اس کا قبیلہ] [مِّنْ : سے] [حَيْثُ :

جہاں " سے "] [لَا : نہیں] [تَرَوْنَهُمْ : تم سب دیکھتے انہیں] [اِنَّا : بیشک ہم] [جَعَلْنَا : ہم نے مقرر کیا] [الشَّيٰطِيْنَ : شیطان] [اَوْلِيَآءَ : دوست] [لِلَّذِيْنَ : ان لوگوں کو جو] [لَا : نہیں] [يُؤْمِنُوْنَ : وہ سب ایمان لاتے ہیں]

ترجمہ: اے اولادِ آدم! (کہیں) تمہیں شیطان فتنہ میں نہ ڈال دے جس طرح اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکال دیا، ان سے ان کا لباس اتروا دیا تاکہ انھیں ان کی شرم گاہیں دکھادے۔ بیشک وہ (خود) اور اس کا قبیلہ تمہیں (ایسی ایسی جگہوں سے) دیکھتا (رہتا) ہے جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھ سکتے۔ بیشک ہم نے شیطانوں کو ایسے لوگوں کا دوست بنادیا ہے جو ایمان نہیں رکھتے

تشریح: اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو خبردار کیا ہے کہ شیطان تمہارا دشمن ہے اور تمہیں نظر بھی نہیں آتا مگر وہ تمہیں ہر وقت اور جگہ دیکھتا ہے، تمہارے دل کے ارادوں سے باخبر ہے اور وہ تمہارے پاس شیطان اور دشمن کے روپ میں نہیں آتا بلکہ دوست اور خیر خواہ کے رنگ میں تمہیں دھوکا دیتا ہے، لہٰذا اس کی فتنہ پردازی اور وسوسہ اندازی سے بچنے کی پوری پوری کوشش کرو۔

شیطان کو اللہ تعالیٰ نے اتنی طاقت دی ہے کہ وہ انسان کے دل کی گہرائی سے اٹھنے والے خیالات کو بھی جانتا ہے حتیٰ کہ جلیل القدر نبی حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے خواب پر بھی آگاہ تھا جس میں حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کو ذبح کرنے کا اشارہ ملا تھا۔ اگر شیطان کا علم اتنا وسیع ہے جو لوگوں کو گمراہ کرتا ہے تو انبیائے کرام (علیہم السلام) کی وسعت علم کا کیا عالم ہوگا جو تمام جنوں، فرشتوں اور انسانوں سے افضل ہیں اور لوگوں کو شیطانی گمراہیوں سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتے ہیں۔

حضرت ذوالنون مصری (رح) نے فرمایا: اگر شیطان تمہیں دیکھتا ہے اور تم اس کو نہیں دیکھ سکتے تو تم اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو جو شیطان کو دیکھتا ہے اور شیطان اس کو نہیں دیکھ سکتا۔ (تفسیر مظہری) اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ اے میرے پروردگار! میں شیطان مردود سے تیری پناہ میں آتا ہو۔ آمین

(تفسیر امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

حدیث میں ہے کہ شیطان انسان کے جسم میں خون کے ساتھ گردش کرتا ہے الشیطان یجری من الانسان مجری الدم۔ اس شیطان کا نام قرین ہے جو ہر وقت انسان کے ساتھ رہتا ہے لیکن حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جو کوئی بسم اللہ پڑھ کر فضائے حاجت کو جائے تو شیطان اس کا ستر نہیں دیکھ سکتا۔ دوسرے کا نام خنزب ہے جو عبادات میں وسوسہ ڈالتا ہے۔

تیرے کا نام ولہان ہے جو بازاروں اور میلوں میں انسان کو وسوسہ ڈالتا ہے۔ یہ سب ابلیس کے قبیلے ہیں۔

انہ یرٰلکم ھو وقبیلہ۔ وہ شیطان تمہیں دیکھتا ہے۔ یہ اس کے فتنہ کی وجہ ظاہر فرمائی اور ڈرایا کہ اس کے فتنہ سے بچنا اس لیے کہ وہ بمنزلہ دشمن کے ہے اور تمہیں ایسی چال سے دھوکا دیتا ہے کہ تمہیں اس کا شعور بھی نہیں ہوتا اور اس کا کنبہ یعنی اس کی ذریت یا لشکر۔ انہ۔ کا مرجع شیطان ہے۔ ہر جماعت کو قبیل کہتے ہیں۔ قبیلہ ایک خاندان کو کہتے ہیں۔ (روح المعانی)

حضرت ابن عباس (رض) فرماتے ہیں کہ قبیلہ سے مراد ابلیس کی اولاد ہے۔

من حیث لاترونھم کہ تم انھیں نہیں دیکھ سکتے۔ حضرت ذوالنون (رح) نے فرمایا اگر وہ تمہیں دیکھتا ہے اور تم اسے نہیں دیکھ سکتے تو اس سے مدد چاہو جو اسے بھی دیکھتا ہے اور اسے وہ نہیں دیکھ سکتا اور وہ اللہ کریم ستار ورحیم ہے۔

انا جعلنا شیاطین اولیاء للذین لایومنون۔

بے شک ہم نے بنادیا ہے شیطانوں کو دوست ان کا جو ایمان نہیں لاتے۔

اس میں اس امر کی دلیل ہے کہ خالق افعال اللہ تعالیٰ ہے خواہ وہ افعال خیر سے ہوں یا شر سے یعنی ہم نے ابلیس اور اس کی ذریت کو ان انسانوں کا دوست اور مددگار بنایا ہے جو ایمان نہیں رکھتے۔ (تفسیر الحسنات۔ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)

حضرت آدم کے جنت سے باہر آنے کا سبب ان کا خلیفہ بننا تھا یا شجر ممنوع سے کھانا:۔

انبیاء (علیہم السلام) کے قصص اور واقعات بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ بعد کے لوگ اس سے سبق حاصل کریں اور انبیاء (علیہم السلام) کی پاکیزہ سیرتوں پر عمل پیرا ہوں اور راہ حق میں ان کی دی ہوئی قربانیوں کو اپنے لیے مشعل راہ بنائیں۔ یہاں پر یہ بتلانا ہے کہ ابلیس لعین کی وسوسہ اندازیوں سے حضرت آدم (علیہ السلام) کی اولاد کو خبردار رہنا چاہیے۔ وہ جنت سے ان کے ماں باپ کے اخراج کا سبب بن چکا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی اولاد بھی اس کی فریب کاریوں اور کفر و شرک اور گناہوں کو زینت دینے اور ان کی طرف مائل کرنے کی وجہ سے کفر و شرک یا حرام کاموں میں مبتلا ہو جائیں اور اس کے نتیجہ میں جنت سے عارضی یا دائمی طور پر محروم ہو جائیں۔

اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس کے بہکانے پر شجر ممنوع سے کھانے کی وجہ سے حضرت آدم کو جنت سے زمین کی طرف بھیجا گیا ہے اور سورۃ بقرہ :30 میں فرمایا ہے: میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خلافت کی وجہ سے زمین پر بھیجے گئے اور بظاہر ان دونوں آیتوں میں تعارض ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کو زمین پر بھیجنے کا سبب حقیقی کار خلافت انجام دینا ہے اور سبب ظاہری شجر ممنوع سے کھانا ہے۔

جنات کے انسانوں کو دیکھنے اور انسانوں کے جنات کو نہ دیکھنے کی تحقیق: اس آیت میں فرمایا ہے کہ شیطان اور اس کا قبیلہ انسانوں کو دیکھتا ہے اور انسان اس کو نہیں دیکھ سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنات اور شیاطین میں ایسی قوت ادارک پیدا کی ہے جس کی وجہ سے وہ انسانوں کو دیکھ لیتے ہیں اور عام انسان میں ایسی قوت ادراک پیدا نہیں کی جس کی وجہ سے وہ جنات اور شیاطین کو دیکھ سکیں۔ کیونکہ جنات اور شیاطین کے جسم لطیف ہیں۔ اسل لیے ان کی شعاع بصر بہت قوی ہے وہ اجسام لطیفہ اور اجسام کثیفہ دونوں کو دیکھ لیتی ہے اور عام انسانوں کے اجسام کثیف ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی ان شعاع بصر لطیف اجسام کو نہیں دیکھ سکتی۔ البتہ انبیاء (علیہم السلام) بہ طور معجزہ اور اولیاء کرام بہ طور کرامت جنات اور شیاطین کو دیکھ لیتے ہیں۔ اس لیے ہم نے کہا ہے کہ عام انسان جنوں کو نہیں دیکھ سکتے یعنی خاص انسان ان کو دیکھ لیتے ہیں۔

حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنات کو مسخر کردیا تھا اور وہ ان سے سخت مشقت والے اور کٹھن کام لیتے تھے۔

" ومن الجن من یعمل بین یدیہ باذن ربہ ومن یزغ منہم عن امرنا نذقہ من عذاب السعیر۔ یعملون لہ مایشاء من محاریب وتماثیل وجفان کالجواب وقدور راسیات: اور بعض جنات میں سے سلیمان کے تابع کردیے تھے جو ان کے سامنے ان کے رب کے حکم سے کام کرتے تھے اور (انہیں بتادیا کہ) ان میں سے جو ہمارے حکم کی نافرمانی کرے گا ہم اسے بھڑکتی ہوئی آگ کا عذاب چکھائیں گے۔ سلیمان جو کچھ چاہتے تھے، وہ ان کے لیے بناتے تھے، اونچے قلعے، اور مجسمے، حوض کی مثل بڑے بڑے ٹب اور (چولہوں پر) گڑی ہوئی بڑی بڑی دیگیں" (سبا: 12۔13)

اور ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی شیطان کو دیکھا۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا گزشتہ رات ایک بہت بڑا جن مجھ پر حملہ آور ہوا تاکہ میری نماز فاسد کردے میں نے ارادہ کیا کہ اس کو مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ باندھ دوں۔ حتی کہ صبح کو تم سب اس کو دیکھ لیتے۔ (مسلم کی ایک روایت میں ہے: بیشک اللہ کا دشمن ابلیس آگ کا ایک شعلہ میرے منہ پر مارنے کے لیے آیا، میں نے تین بار کہا میں تجھ سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں، پھر میں نے کہا میں تجھ پر اللہ کی لعنت تامہ کرتا ہوں، وہ پیچھے نہیں ہٹا تو میں نے اس کو پکڑنے کا ارادہ کیا اور اگر ہمارے بھائی سلیمان کی دعا نہ ہوتی تو وہ بندھا ہوا ہوتا اور مدینہ کے بچے اس سے کھیلتے) پھر مجھے اپنے بھائی سلیمان کی یہ دعا یاد آئی: اے میرے رب مجھے بخش دے اور مجھے ایسی بادشاہی عطا فرما جو میرے بعد اور کسی کے لائق نہ ہو۔ (ص: 35) پھر آپ نے اس کو ناکام واپس کردیا۔ (صحیح البخاری، ج 1، رقم الحدیث: 3284۔ 1210۔461، صحیح مسلم، المساجد: 39، (541) 1189، 40 (542) 1190، سنن النسائی، ج 1 رقم الحدیث: 549)

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256 ھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے رمضان کی زکوۃ کی حفاظ پر مجھے مامور فرمایا، پھر ایک شخص میرے پاس آیا اور وہ مٹھی بھر کر اناج لے جانے لگا، میں نے اس کو پکڑ لیا اور کہا بخدا میں تجھ کو ضرور پکڑ کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس لے جاؤں گا۔ اس نے کہا میں محتاج ہوں، میرے اہل و عیال ہیں اور مجھے سخت ضرورت ہے۔ میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ صبح مجھ سے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پوچھا تمہارے گزشتہ رات کے قیدی نے کیا کیا، میں نے کہا یا رسول اللہ! اس نے مجھ سے سخت ضرورت اور

عیال کی شکایت کی مجھے اس پر رحم آیا میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ آپ نے فرمایا اس نے تم سے جھوٹ بولا وہ پھر آئے گا۔ سو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ پھر آئے گا۔ کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تھا وہ پھر آئے گا۔ سو میں گھات لگا کر بیٹھ گیا اور وہ دوسری رات مٹھی بھر اناج اٹھا کر لے جانے لگا میں نے اس کو پکڑ لیا اور میں نے کہا میں تجھ کو ضرور پکڑ کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس لے جاؤں گا۔ اس نے کہا مجھے چھوڑ دو۔ میں محتاج ہوں اور مجھ پر عیال کی ذمہ داری ہے۔ میں دوبارہ نہیں آؤں گا۔ مجھے اس پر رحم آیا۔ میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ صبح ہوئی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھ سے پوچھا: اے ابوہریرہ تمہارے قیدی نے کیا کیا؟ میں نے کہا یا رسول اللہ! اس نے سخت حاجت اور عیال کی شکایت کی مجھے اس پر رحم آیا اور میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ آپ نے فرمایا اس نے تم سے جھوٹ بولا۔ وہ پھر آئے گا۔ میں تیسری رات پھر اس کی گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے آکر اناج اٹھایا اور میں نے اس کو پکڑ لیا۔ میں نے اس سے کہا تین بار ہو چکی ہے، میں تجھ کو پکڑ کر ضرور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس لے کر جاؤں گا۔ تو کہتا ہے میں نہیں آؤں گا اور تو پھر آجاتا ہے ہے۔ اس نے کہا مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہیں چند ایسے کلمات بتاؤں گا، جن سے اللہ تعالیٰ تم کو نفع دے گا۔ میں نے کہا: وہ کلمات کیا ہیں؟ اس نے کہا جب تم بستر پر سونے کے لیے جاؤ تو پوری آیۃ الکرسی پڑھ لیا کرو تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ تمہاری حفاظت کرے گا اور صبح تک شیطان تمہارے پاس نہیں آئے گا۔ میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ صبح مجھ سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تمہارے گزشتہ رات کے قیدی نے کیا کیا؟ میں نے کہا اس نے کہا تھا میں تمہیں چند ایسے کلمات سکھاؤں گا جن کی وجہ سے اللہ تمہیں نفع دے گا۔ آپ نے فرمایا: وہ کلمات کیا ہیں! میں نے عرض کیا اس نے مجھ سے کہا: جب تم بستر پر سونے کے لیے جاؤ تو اول سے آخر تک آیۃ الکرسی پڑھو اور اس نے مجھ سے کہا: پھر اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرتا رہے گا اور صبح تک شیطان تمہارے قریب نہیں آئے گا اور صحابہ نیکی پر بہت حریص تھے۔ تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہر چند کہ وہ جھوٹا ہے، لیکن یہ بات اس نے سچ کہی ہے۔ اے ابوہریرہ! کیا تم جانتے ہو کہ تین راتوں تک تم سے کون باتیں کرتا رہا، انھوں نے کہا نہیں! آپ نے فرمایا: وہ شیطان تھا۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 2311، سنن الترمذی، ج4 رقم الحدیث: 2889)

پہلی حدیث میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے شیطان کو دیکھنے کا ذکر اور دوسری حدیث میں حضرت ابوہریرہ (رض) کے شیطان کو دیکھنے کا ذکر ہے۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شیطان کو اس کی اصل صورت میں دیکھا یہ آپ کا معجزہ ہے اور عام انسان اس پر قادر نہیں ہیں اور حضرت ابوہریرہ نے شیطان کو انسان کی صورت میں دیکھا، اور سورۃ اعراف میں جو فرمایا ہے تم اس کو نہیں دیکھ سکتے، اس کا معنی یہ ہے کہ عام انسان جنات اور شیاطین کو ان کی اصل شکل میں نہیں دیکھ سکتے۔

جنات کے انسانوں پر تصرف کرنے کا بطلان: عام طور پر لوگوں میں مشہور ہے کہ جنات انسانوں پر مسلط ہو کر ان کے اعضاء میں تصرف کرتے ہیں۔ ان کی زبان سے بولتے ہیں اور ان کے ہاتھوں اور پیروں سے افعال صادر کرتے ہیں۔ پھر کوئی عامل آکر جن اتارتا ہے اور آئے دن اخبارات میں اس کے متعلق اخلاق سوز خبریں چھپتی رہتی ہیں۔ ہم نے شرح صحیح مسلم جلد سابع (7) میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے اور اس کے اوپر بہت دلائل قائم کیے ہیں۔ ان پر قوی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ ممکن ہو کہ ایک شخص کے اعضاء پر کسی جن کا تصرف ہو تو ایک شخص کسی کو قتل کر دے اور کہے کہ یہ قتل میں نے نہیں کیا، جن نے کیا ہے، میرے اعضائے پر اس وقت جن کا تصرف تھا تو کیا شریعت اور قانون میں اس کو اس قتل سے بری قرار دیا جائے گا اور اگر بالفرض شریعت کی رو سے وہ بے قصور ہو تو کیا قرآن اور حدیث میں ایسی ہدایت ہے کہ جو شخص جن کے زیر اثر ہو کر کسی شخص کو قتل کر دے تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی متوفی 606ھ لکھتے ہیں: نیز اگر جنات اور شیاطین لوگوں کو مخبوط کرنے اور ان کی عقل کو ضائع کرنے پر قادر ہوں تو اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ وہ انسان کے بہت بڑے دشمن ہیں تو وہ اکثر انسانوں کی عقلوں کو ضائع کیوں نہیں کرتے۔ خصوصاً علماء، فضلاء اور عبادت گزار زاہدوں کی (بلکہ ان علماء کے ساتھ ایسا زیادہ کرنا چاہیے جو جنات پر انسانوں کے تصرف کا انکار کرتے ہیں اور یہ ناکارہ بھی ان میں شامل ہے) کیونکہ جنات کی علماء اور زاہدوں کے ساتھ عداوت بہت زیادہ ہے اور جب کہ ایسا نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ جنات اور شیاطین کو انسانوں پر کسی وجہ سے قدرت حاصل نہیں ہے اور اس نظریہ کے بطلان پر قرآن مجید کی یہ آیت واضح دلیل ہے۔ شیاطین قیامت کے دن دوزخیوں سے کہے گا: " وماکان لی علیکم من سلطان الاان دعوتکم فاستجبتم لی: اور مجھے تم پر کوئی غلبہ نہ تھا مگر یہ کہ میں نے تمہیں بلایا اور تم نے میری بات مان لی " (ابراہیم: 20)۔ (تفسیر کبیر، ج5، ص224، داراحیاء التراث العربی، بیروت، 1415ھ)

(تفسیر تبیان القرآن۔علامہ غلام رسول سعیدی)

لباس کا حکم دینے کے بعد بنی آدم کو شیطان سے بچنے کا حکم تاکہ جسمانی حفاظت کے ساتھ اس کا کردار بھی سلامت رہے۔

بنی نوع انسان کو لباس پہننے کا حکم دے کر لباس کو پرہیزگاری اور ہر قسم کی خیر قرار دیا ہے۔آدمی شریعت کے مطابق لباس کا اہتمام کرکے ظاہری و باطنی گناہوں سے تبھی بچ سکتا ہے جب شیطان کو اپنا دشمن جان کر اس کی شرارت، سازش اور فتنہ انگیزیوں سے بچنے کی کوشش کرے۔اس احساس کو بیدار کرنے اور انسان کی غیرت کو ابھارنے کے لیے یہ کہہ کر غیرت دلائی گئی ہے کہ تمہیں شیطان سے بچنے کا اس لیے بھی حکم دیا جاتا ہے کہ یہ تمہارا ایسا دشمن ہے کہ جس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے برہنہ کرکے نکلوایا تھا یہ تمہارا ایسا دشمن ہے کہ وہ اور اس کے چیلے چانٹے تمہیں وہاں سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھ سکتے۔شیطان اور اس کی اولاد جنّات میں سے ہیں اور جنّات کو اللہ تعالیٰ نے ایسی آگ سے بنایا ہے جو ہمیں نظر نہیں آتی اور پھر شیطان کو یہ قوت بھی دی کہ وہ کئی روپ بدل کر انسان کو گمراہ کرتا ہے۔اس لیے فرمایا وہ اور اس کی اولاد تمہیں دیکھتی ہے جبکہ تم انھیں نہیں دیکھ سکتے۔اس سے ثابت ہوا کہ شیطان اور اس کی دشمنی انسان کے لیے انتہائی خطرناک ہے آدمی اپنے سے کئی گنا بڑے دشمن کے ساتھ آمنے سامنے کچھ نہ کچھ مقابلہ کرسکتا ہے لیکن ایسا دشمن جو ان دیکھے وار کرے اس کا مقابلہ کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے اس آیت میں صرف شیطان کو آدمی کا دشمن قرار نہیں دیا گیا بلکہ شیطان کا ایک ایک روحانی اور جسمانی فرزند آدمیت کا دشمن ہے۔یاد رہے قرآن مجید کی آخری سورۃ الناس میں جنات کے ساتھ بعض انسانوں کو بھی شیطان قرار دیا ہے۔شیطان تو انسان کے دل میں صرف برائی کی طاقت اور خیال پیدا کرتا ہے جبکہ انسان کے روپ میں جو شیطان ہوتے ہیں وہ عورت کی شکل میں عورتوں کو اور مرد کی صورت میں مردوں کو الگ الگ اور مردوزن کے اختلاط سے بے حیائی اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی دعوت دیتے ہیں۔جس کا مظاہرہ تفریح کے نام پر ٹی وی، کیبل ڈراموں، آرٹ کونسلوں اور مختلف قسم کی سماجی تقریبات میں سامنے آتا ہے۔سب سے پہلے شیطان انسان کے اندر جسمانی اور اخلاقی بے حیائی پیدا کرتا ہے۔جب کسی انسان اور معاشرہ میں بے حیائی پیدا ہوجائے تو اس سے ہر گناہ اور جرم کی توقع کی جاسکتی ہے ایسے لوگوں کو سمجھایا جائے تو وہ اسے اپنے بڑوں کی روایت اور معاشرے کا کلچر قرار دیتے ہیں۔جب انھیں مزید توجہ دلائی جائے تو وہ یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ کام ناپسند ہوتا تو لوگ اس طرح اپنی خوشیوں کا اظہار نہ کرتے۔اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف کوئی پتہ حرکت نہیں کرسکتا۔لہٰذا ہم جو کچھ کررہے ہیں اس کی مرضی اور منشاء کے مطابق کرتے ہیں۔اے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! انھیں بتلائیں اور سمجھائیں کہ اللہ تعالیٰ بے حیائی کو ہرگز پسند نہیں کرتا اور نہ بے حیائی کو اپنانے اور پھیلانے کا حکم دیتا ہے۔شیطان کے دوستوں کا اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں ہوتا۔جس کی بناء پر وہ ایسی باتیں کہتے اور حرکات کرتے ہیں۔اللہ اپنے بندوں کو ہر قسم کی بے حیائی سے روکتا ہے اللہ تعالیٰ کے نام بے حیائی کی نسبت کرنا پرلے درجے کی جہالت ہے جو ایمان سے تہی دامن شخص ہی کرسکتا ہے بے حیا لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں وہ بات کرتے ہیں جس کا علم و دانش اور شرم و حیا کے ساتھ دور کا واسطہ نہیں ہوتا۔

) عَنْ عُقْبَةَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ إِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَافْعَلْ مَا شِئْتَ)

[رواہ البخاری: کتاب احادیث الانبیاء، باب حدیث الغار]

"حضرت عقبہ (رض) فرماتے ہیں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بلاشبہ لوگوں نے نبوت کے کلام سے جو چیز حاصل کی اس میں یہ ہے کہ جب تجھ میں شرم و حیاء نہ رہے تو پھر جو مرضی کرتا رہ۔"

) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ (رض) قَالَ كَانَتِ الْمَرْأَةُ تَطُوفُ بِالْبَيْتِ وَهِيَ عُرْيَانَةٌ فَتَقُولُ مَنْ يُعِيرُنِي تِطْوَافًا تَجْعَلُهُ عَلَى فَرْجِهَا وَتَقُولُ الْيَوْمَ يَبْدُو بَعْضُهُ أَوْ كُلُّهُ فَمَا بَدَا مِنْهُ فَلَا أُحِلُّهُ فَنَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ) [رواہ مسلم: کتاب التفسیر، باب قول اللہ تعالیٰ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ]

"حضرت عبداللہ بن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایام جاہلیت میں عورت برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتی اور کہتی کوئی ہے جو مجھے عاریتاً کپڑا دے اور میں اس سے شرم گاہ ڈھانپ لوں۔پھر کہتی آج یا تو کچھ شرم گاہ کھلی رہے گی یا پوری کھلی رہے گی بہر حال جتنی بھی کھلی رہے گی اسے کسی پر حلال نہیں کروں گی۔آیت (خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ) اسی بارے میں نازل ہوئی" (تفسیر فہم القرآن۔میاں محمد جمیل)

شیطان کی فریب کاری اور حضرت آدم (علیہ السلام) کے ساتھ اس کی دشمنی و عداوت کا بیان فرما کر بنی آدم کو متَنَبّہ اور ہوشیار کیا جارہا ہے کہ وہ شیطان کے وسوسے، اغواء اور اس کی مکاریوں سے بچتے رہیں۔ جو حضرت آدم (علیہ السلام) کے ساتھ ایسی فریب کاری کر چکا ہے وہ ان کی اولاد کے ساتھ کب در گزر کرنے والا ہے۔ اس میں مومن، کافر، ولی، عالم، پرہیزگار سب سے خطاب ہے، کوئی اپنے آپ کو ابلیس سے محفوظ نہ جانے چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "اے آدم کی اولاد ! تمہیں شیطان فتنہ میں نہ ڈالے جیسے اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکال دیا، ان دونوں سے ان کے لباس اتروا دیئے تاکہ انھیں ان کی شرم کی چیزیں دکھادے۔ { اِنَّہٗ یَرٰیکُمْ ہُوَ : بیشک وہ خود تمہیں دیکھتا ہے۔ } یعنی شیطان اور اس کی ذریت سارے جہان کے لوگوں کو دیکھتے ہیں جبکہ لوگ انھیں نہیں دیکھتے۔ جہاں کسی نے کسی جگہ اچھے کام کا ارادہ کیا، اسے اس کی نیت کی خبر ہو گئی اور فوراً بہکا دیا۔

شیطان سے مقابلہ کرنے اور اسے مغلوب کرنے کے طریقے :

یاد رہے کہ جو دشمن تمہیں دیکھ رہا ہے اور تم اسے نہیں دیکھ رہے اس سے اللہ تعالیٰ کے بچائے بغیر خلاصی نہیں ہو سکتی جیسا کہ حضرت ذوالنون (رح) فرماتے ہیں " شیطان ایسا ہے کہ وہ تمہیں دیکھتا ہے اور تم اسے نہیں دیکھ سکتے لیکن اللہ تعالیٰ تو اسے دیکھتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتا تو تم اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ سے مدد چاہو۔

لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے اس کے نقصان سے بہت زیادہ ڈرے اور ہر وقت اس سے مقابلے کے لیے تیار رہے۔

امام محمد غزالی (رح) فرماتے ہیں " صوفیاءِ کرام کے نزدیک شیطان سے جنگ کرنے اور اسے مغلوب کرنے کے دو طریقے ہیں :

(1)۔۔ شیطان کے مکروفریب سے بچنے کے لیے صرف اللہ تعالیٰ کی پناہ لی جائے، اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں کیونکہ شیطان ایک ایسا کتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تم پر مُسلَّط فرمادیا ہے، اگر تم اس سے مقابلہ وجنگ کرنے اور اسے (خود سے) دور کرنے میں مشغول ہو گئے تو تم تنگ آجاؤ گے اور تمہارا قیمتی وقت ضائع ہو جائے گا اور بالآخر وہ تم پر غالب آجائے گا اور تمہیں زخمی و ناکارہ بنادے گا اس لیے اس کے مالک ہی کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا اور اسی کی پناہ لینی ہو گی تاکہ وہ شیطان کو تم سے دور کردے اور یہ تمہارے لیے شیطان کے ساتھ جنگ اور مقابلہ کرنے سے بہتر ہے۔

(2)۔۔ شیطان سے مقابلہ کرنے، اسے دفع دور کرنے اور اس کی تردید و مخالفت کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ میں (امام غزالی) کہتا ہوں : میرے نزدیک اس کا جامع اور بہترین طریقہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا دونوں طریقوں کو بروئے کار لایا جائے لہٰذا سب سے پہلے شیطان مردود کی شرارتوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ لی جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ ہمیں شیطان لعین سے محفوظ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ اس کے بعد بھی اگر تم یہ محسوس کرو کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ لینے کے باوجود شیطان تم پر غالب آنے کی کوشش کر رہا ہے اور تمہارا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تو تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تمہارا امتحان لینا چاہتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے مجاہدے اور عبادت میں تمہاری قوت کی سچائی و صفائی دیکھے اور تمہارے صبر کی جانچ فرمائے۔ جیسا کہ کافروں کو ہم پر مسلط فرمایا حالانکہ اللہ تعالیٰ کفار کے عزائم اور ان کی شرانگیزیوں کو ہمارے جہاد کئے بغیر ملیا میٹ کر دینے پر قادر ہے لیکن وہ انھیں صفحہ ہستی سے ختم نہیں فرماتا بلکہ ہمیں ان کے خلاف جہاد کرنے کا حکم دیتا ہے تاکہ جہاد، صبر، گناہوں سے چھٹکارا اور شہادت سے ہمیں بھی کچھ حصہ مل جائے اور ہم اس امتحان میں کامیاب و کامران ہو جائیں تو اسی طرح ہمیں شیطان سے بھی انتہائی جاں فشانی کے ساتھ مقابلہ اور جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، پھر ہمارے علماء کرام فرماتے ہیں کہ شیطان سے مقابلہ کرنے اور اس پر غلبہ حاصل کرنے کے تین طریقے ہیں :

(1)۔۔ تم شیطان کے مکروفریب اور اس کی حیلہ سازیوں سے ہوشیار ہو جاؤ کیونکہ جب تمہیں اس کی حیلہ سازیوں کا علم ہو گا تو وہ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا، جس طرح چور کو جب معلوم ہو جاتا ہے کہ مالک مکان کو میرے آنے کا علم ہو گیا ہے تو وہ بھاگ جاتا ہے۔

(2)۔۔ جب شیطان تمہیں گمراہیوں کی طرف بلائے تو تم اسے رد کر دو اور تمہارا دل قطعاً اس کی طرف متوجہ نہ ہو اور نہ تم اس کی پیروی کرو کیونکہ شیطان لعین ایک بھونکنے والے کتے کی طرح ہے، اگر تم اسے چھیڑو گے تو وہ تمہاری طرف تیزی کے ساتھ لپکے گا اور تمہیں زخمی کر دے گا اور اگر تم اس سے کنارہ کشی اختیار کر لو گے تو وہ خاموش رہے گا۔

(3)۔۔اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ ذکر کرتے رہو اور ہمہ وقت خود کو اللہ تعالیٰ کی یاد میں مصروف رکھو(1)۔(2)

کیا انسان جنوں کو دیکھ سکتے ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے جنوں کو ایسا علم وادراک دیا ہے کہ وہ انسانوں کو دیکھتے ہیں اور انسانوں کو ایسا ادراک نہیں ملا کہ وہ ہر وقت جنوں کو دیکھ سکیں البتہ بعض اوقات انسان بھی جنات کو دیکھ لیتے ہیں۔

مخلوق کے لیے وسیع علم وقدرت ماننا شرک نہیں:

اس آیت مبارکہ سے یہ بھی معلوم ہے کہ شیطان کا علم اور اس کی قدرت بہت وسیع ہے کہ ہر زبان میں ہر جگہ، ہر آدمی کو وسوسے ڈالنے کی طاقت رکھتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس قدر وسیع علم وقدرت ماننا شرک نہیں بلکہ قرآن سے ثابت ہے لیکن ان لوگوں پر افسوس ہے جو شیطان کی وسعت علم کو تو فوراً مان لیتے ہیں لیکن حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے ایسا وسیع علم ماننے کو شرک قرار دیتے ہیں۔

{اِنَّا جَعَلۡنَا الشَّيٰطِيۡنَ اَوۡلِيَآءَ لِلَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ : بیشک ہم نے شیطانوں کو ایمان نہ لانے والوں کا دوست بنادیا ہے۔} یعنی شیطان بظاہر کفار کا دوست ہے اور کفار دل سے شیطان کے دوست ہیں ورنہ شیطان درحقیقت کفار کا بھی دوست نہیں وہ تو ہر انسان کا دشمن ہے کہ سب کو اپنے ساتھ جہنم میں لیجانے کی کوشش کرنا اس کا مطلوب و مراد ہے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

بیت الخلاء میں داخلہ سے قبل دعا کی ضرورت واہمیت:

جب شیاطین انسان کو ہر وقت دیکھتے ہیں تو اسے چاہیے کہ ضرور تأبر ہنگی سے قبل ماثور دعائیں پڑھ لیں تاکہ وہ ان کی نظر سے بچ جائے۔ حضرت زید بن ارقم (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جب کوئی شخص بیت الخلاء میں جانے لگے تو اس سے قبل یہ دعا پڑھ لے اللھم انی اعوذ بک من الخبث والخبائث اے اللہ! میں خبیث مردانہ وزنانہ جنات سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔" (ابو داؤد کتاب الطہارۃ باب 3 حدیث 5)

اور حضرت علی المرتضیٰ (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جنات اور بنی آدم کے درمیان پردہ حائل کرنا اس طرح ہے کہ جب کوئی شخص بیت الخلا میں جائے تو کہہ لے: بسم اللہ۔" (ابن ماجہ کتاب الطہارۃ باب 9) اسی طرح اگر میاں بیوی مجامعت سے قبل (لباس اتارنے سے پہلے) بسم اللہ پڑھ لے تو وہ بھی شیاطین کی نظروں سے چھپ جاتے ہیں ورنہ شیاطین انھیں دیکھتے رہیں گے۔ (برہان القرآن۔ قاری علامہ محمد طیب)

فوائد

1: اس میں مومن، کافر، ولی، عالم، پرہیزگار سب سے خطاب ہے کوئی اپنے کو ابلیس سے محفوظ نہ جانے۔

2: یعنی حضرت آدم وحوا کے ستر ایک دوسرے کو نظر پڑے بے پردگی کے ساتھ۔ اس سے دو مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ فرشتوں اور جنات وغیرہ سے پردہ نہیں۔ پردہ صرف انسانوں سے ہے۔ دوسرے یہ کہ خاوند بیوی بھی ایک دوسرے کے سامنے آزادی سے ننگے نہ رہیں۔ بلکہ اکیلے میں بھی انسان ستر چھپائے۔ رب تعالیٰ سے شرم کرے۔

3: یعنی شیطان اور اس کی ذریت سارے جہان کے لوگوں کو دیکھتے ہیں لوگ انھیں نہیں دیکھتے۔ جہاں کسی نے کسی جگہ اچھے کام کا ارادہ کیا اسے اس کی نیت کی خبر ہو گئی فوراً بہکایا۔ جب رب نے گمراہ گر کو اتنا علم دیا کہ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو سارے عالم کے ہادی ہیں انھیں بھی حاضر و ناظر بنایا تاکہ دوا بیماری سے کمزور نہ ہو۔ افسوس ان پر ہے جو شیطان کی وسعت علم و نظر کا اقرار کریں اور حضور کے لیے انکاری ہو جائیں۔

4: معلوم ہوا کہ شیطان اولیاء من دون اللہ ہے۔ جہاں ولی من دون اللہ کی برائی آئی ہے وہاں شیطان مراد ہے نہ کہ اولیاء اللہ۔ یہ آیت ان تمام آیات کی تفسیر ہے۔

5: یعنی شیطان بظاہر کفار کا دوست ہے اور کفار دل سے شیطان کے دوست ہیں ورنہ شیطان درحقیقت کفار کا بھی دوست نہیں وہ تو ہر انسان کا دشمن ہے لہٰذا یہ آیت اس آیت کے خلاف نہیں جس میں فرمایا گیا کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ وہاں حقیقت کا ذکر ہے اور یہاں ظاہر حال کا۔

آیت مبارکہ:

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَیْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۸

لغۃ القرآن: وَاِذَا : اور جب] [فَعَلُوْا : وہ سب کر بیٹھیں] [فَاحِشَةً : کوئی برا کام] [قَالُوْا : ان سب نے کہا] [وَجَدْنَا : پایا ہم نے] [عَلَیْهَآ : اس پر] [اٰبَآءَنَا : اپنے آباؤ اجداد کو] [وَاللّٰهُ : اور اللہ] [اَمَرَنَا : حکم دیا ہے ہمیں] [بِهَا : اس کے] [قُلْ : آپ کہہ دیں] [نَّ اللّٰهَ : بیشک اللہ تعالیٰ] [لَا : نہیں] [یَاْمُرُ : حکم دیتا] [بِالْفَحْشَآءِ : بےحیائی کا] [اَتَقُوْلُوْنَ : کیا تم سب کہتے ہو] [عَلَي اللّٰهِ : اللہ تعالیٰ پر] [مَا لَا : جو نہیں] [تَعْلَمُوْنَ : تم سب جانتے ہو]

ترجمہ: اور جب وہ کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں (تو) کہتے ہیں: ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی (طریقہ) پر پایا اور اللہ نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ فرما دیجئے کہ اللہ بے حیائی کے کاموں کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ (کی ذات) پر ایسی باتیں کرتے ہو جو تم خود (بھی) نہیں جانتے

تشریح:

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَیْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ط قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ط اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (الاعراف : ۲۸)

"اور جب یہ لوگ کوئی شرمناک کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریق پر پایا ہے اور اللہ نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ ان سے کہو! اللہ بے حیائی کا کبھی حکم نہیں دیا کرتا۔ کیا تم اللہ پر وہ تہمت جوڑتے ہو، جس کے باب میں تم کو کوئی علم نہیں؟"

شیطان کی چال

اولاد آدم کے ذکر کے ضمن میں یہاں قریش اور عربوں کا حال بطور خاص بیان کیا جارہا ہے کہ ذرا اندازہ کیجیے کہ کس طرح شیطان نے ان لوگوں کو فتنے کی نذر کیا اور بہکایا ہے اور کس طرح ان کو چکمہ دے کر اپنے جال میں پھنسا لیا ہے۔ ان کا حال یہ ہے کہ جس طرح حضرت آدم و حوا کو اس نے جنت میں بہکا کر ان کے کپڑے اتروا دیئے اور جنت میں ان کو بے لباس کر دیا تھا اس نے انھیں بہکا کر اور گمراہ کر کے حرم میں بے لباس کر دیا ہے اور حال یہ ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ اس گمراہی کو سمجھیں الٹا اس پر دلیل بازی سے کام لے رہے ہیں اور ان کی جسارت کی انتہا یہ ہے کہ اسے اللہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے بھی نہیں ڈرتے۔ مفسرین نے اس کی صراحت کی ہے کہ مشرکین عرب کا حال یہ تھا کہ وہ جب کعبہ کے طواف کے لیے آتے تو یہ خیال کرتے کہ ہمارے کپڑے چونکہ آلائش دنیا اور زینت دنیا میں داخل ہیں اس لیے انھیں پہن کر ہم اللہ کے گھر کا طواف نہیں کر سکتے کیونکہ اللہ کا گھر تو ایک پاکیزہ جگہ ہے اور طواف ایک عبادت ہے اگر ہم دنیا کے لباس میں طواف کریں گے تو عبادت کی حرمت پامال ہو جائے گی۔ قریش نے اس گمراہی سے اگرچہ اپنے آپ کو بچا رکھا تھا لیکن باقی پورا عرب اس گمراہی میں مبتلا تھا اور قریش ان کی اس گمراہی کے پیدا کرنے اور انھیں اس گمراہی پر باقی رکھنے میں مدد و معاون بنے ہوئے تھے یعنی ان کو یہ بات سمجھاتے تھے کہ تمہارا لباس چونکہ آلائش دنیا سے آلودہ ہے اس لیے اب تمہارے طواف کی ایک ہی صورت ہے کہ یا تو کسی قریشی سے اس کا لباس مستعار لے لو اور اگر تم اس کا انتظام نہیں کر سکتے (اور ظاہر ہے کہ اس کا انتظام ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ قریش کس کس کو اپنا لباس دیتے) تو پھر مجبوری ہے کہ تم مادر زاد ننگے ہو کر اللہ کے گھر کا طواف کرو اور یہ بات صرف مردوں تک محدود نہیں تھی عورتیں بھی اس گمراہی کا شکار تھیں وہ بھی بالکل برہنہ ہو کر طواف کرتی تھیں۔ ممکن ہے کسی کو یہ خیال ہو کہ یہ بات بظاہر قرین عقل معلوم نہیں ہوتی

کہ قوم کے بیشتر افراد اتنی بڑی گمراہی کا شکار ہو جائیں لیکن اس بات کی کیا تاویل ممکن ہے کہ یہ ہمارا زمانہ جسے روشنی اور ترقی کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ کیا اس میں آج بھی مندروں اور کلیساؤں میں عیاشی اور نفس پروری کا سامان میسر نہیں؟ اور کیا وہاں کے پروہت اور پجاری اس طرح کی شیطنت کے محافظ بن کے نہیں بیٹھے ہوئے؟ اور انھوں نے اس قسم کی گمراہیوں کو کیا مذہبی تقدس کا درجہ نہیں دیا؟ اگر آج یہ ساری خباثتیں موجود ہیں تو چودہ سو سال پہلے اس کے وجود کو ہم خلاف عقل کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ اس لیے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عرب کے لوگ اس گمراہی میں مبتلا تھے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ طواف جیسی مقدس عبادت فساق و فجار کی نظر بازیوں اور شرارتوں کی جولاں گاہ بن کے رہ گئی تھی اور حرم کی نظر بازیوں کی لذیذ ورنگین داستانیں ان کی فاسقانہ شاعری میں اس طرح نمایاں ہوئیں کہ آج بھی آدمی انھیں پڑھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ شیطان نے حرم میں گھسنے کے لیے کیسا مقدس مذہبی لبادہ اختیار کیا اور کس کامیابی کے ساتھ اس نے اللہ کی سب سے بڑی عبادت کو اپنی عبادت میں تبدیل کر دیا۔

آباؤاجداد کے طرز عمل سے استدلال

عجیب بات یہ ہے کہ جب مشرکین عرب سے یہ کہا جاتا تھا کہ تم کس قدر پستی میں اتر گئے ہو کہ اللہ کے گھر میں تم نے کپڑے تک اتار دیئے ہیں تو وہ جواب میں دو باتیں کہتے تھے۔ ایک تو یہ بات کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس کی صداقت کی دلیل یہ ہے کہ ہم نے اپنے آباؤاجداد کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔ اندازہ فرمایئے کہ اس بے سروپا دلیل پر اتنی بڑی گمراہی کی بنیاد رکھنا کس قدر تعجب خیز ہے لیکن انھیں اپنی اس دلیل پر اصرار تھا حالانکہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ یہ جس طرح اپنے اعمال کی دلیل اپنے آباؤاجداد کے عمل کو بنا رہے ہیں اسی طرح آنے والی نسل موجودہ لوگوں کو اپنے اعمال کی دلیل بنائے گی اور اسی طرح یہ سلسلہ پہلے بھی چلتا آیا ہے اور آئندہ بھی چلتا جائے گا حالانکہ یہ بات سمجھنا مشکل نہیں کہ غلطیاں ہر دور میں ہوئی ہیں جس طرح آج کے لوگ غلطیاں کر رہے ہیں اسی طرح ان کے آباؤاجداد نے بھی کی ہیں اور کل کو آنے والی نسلیں بھی وہ غلطیاں کریں گی اس لیے ایک نسل کی غلطی یا گمراہی دوسری نسل کے لیے جواز نہیں بن سکتی۔ ہاں کوئی چیز اگر جواز بن سکتی ہے تو ضروری ہے کہ یا تو اس کے ساتھ علم کی روشنی ہو اور یا ہدایت کی سند ہو۔ محض یہ بات کہ پہلے ایسی غلطی ہوتی رہی ہے اور اب بھی ہونی چاہیے۔ اس سے زیادہ بے اصل بات اور کوئی نہیں ہو سکتی اس لیے یہاں قرآن پاک نے اس کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

قریش کی دلیل کا جواب

دوسری بات وہ یہ کہتے تھے کہ یہ چونکہ مذہبی معاملہ ہے اس لیے ہمارے آباؤاجداد اگر ایسا ہی کرتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی نے اس بات کا حکم دیا ہو گا کیونکہ مذہب کی کوئی بات تو اللہ کے حکم کے بغیر اختیار نہیں کی جا سکتی۔ اس کے جواب میں پروردگار نے دو باتیں ارشاد فرمائیں:

1. برہنگی ایک فاحشہ ہے یعنی ایسی بات ہے جس کو کھلی ہوئی بے حیائی کہا جاتا ہے اور عرب اپنی تمام بداخلاقیوں کے باوجود برہنگی کو بے حیائی سمجھتے تھے اور اسے ناپسند کرتے تھے کوئی بھی عزت والا عرب اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی مجلس میں کپڑے اتار دے۔ اگرچہ ان کے بازاری اور گرے پڑے لوگ ایک دوسرے کے سامنے ننگا ہو جانے اور راستوں میں رفع حاجت کے لیے بیٹھ جانے میں کوئی عیب نہیں سمجھتے تھے لیکن ایسا طبقہ تو ہر دور میں موجود رہا ہے۔ سوال تو ان لوگوں کا ہے جو عوام کو لیڈ کیا کرتے ہیں وہ برہنگی کو بہر حال ایک بے حیائی سمجھتے تھے اور کبھی بھی اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے چنانچہ اس مسلمہ امر کو دلیل بناتے ہوئے پروردگار ارشاد فرماتے ہیں کہ جب برہنگی ایک بے حیائی ہے تو تم یہ بتلاؤ کہ اگر تم اللہ کی ذات اور اس کی صفات کے بارے میں کچھ بھی جانتے ہو تو کیا تم اس بات کا تصور کر سکتے ہو کہ اللہ کبھی بے حیائی کا حکم دے گا؟ اور اگر وہ واقعی بے حیائی کا حکم نہیں دیتا تو پھر تم یہ کیسے کہتے ہو کہ اللہ نے ہمیں برہنہ طواف کرنے کا حکم دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے بھی تم سے یہ بات کہی اس نے تم سے جھوٹ کہا اور ایک غلط مفروضہ پر اس نے تمہاری دینی زندگی تباہ کر دی۔

2 اگر واقعی تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ نے تمہیں اس بات کا حکم دیا ہے تو پھر تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت ہونا چاہیے۔ کوئی علمی ثبوت جو تمہیں حضرت اسماعیل یا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے پہنچا ہو۔ کوئی ایسی سینہ بہ سینہ روایت جس کی سند ان بزرگوں سے متصل ہو۔ یقینا تمہارے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں تو پھر کیا تم اللہ پر ایک ایسی بات کہہ رہے ہو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں یعنی جس کی کوئی علمی سند تمہارے پاس نہیں تو بغیر علمی سند کے اور بغیر کسی آگاہی کے اللہ کریم کے بارے میں کوئی بات کہنا یہ تو اللہ پر افترا کرنے والی بات ہے اور تم جانتے ہو کہ اللہ کے بارے میں کوئی تہمت باندھنا اور اس کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنا کتنا

بڑا جرم ہے کیا تم نے کبھی اس کی ہول ناکی کے بارے میں سوچا ہے؟ البتہ ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ اللہ کن باتوں کا حکم دیتا اور کن باتوں کو پسند کرتا ہے اور وہ کیا بنیادیں ہیں جن پر دینی عمارت اٹھائی جا سکتی ہے: (تفسیر روح القرآن۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اور جب وہ کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے ان ہی کاموں پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور ہمیں اللہ نے ان کاموں کا حکم دیا ہے، آپ کہیے بیشک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہو جن کا تمہیں علم نہیں ہے"

فاحشہ کا معنی اور مراد، اور کافر کے اس قول کا رد کہ اللہ نے فاحشہ کا حکم دیا ہے: فاحشہ: علامہ راغب اصفہانی نے لکا ہے کہ جو بات یا جو کام بہت زیادہ برا ہو، اس کو فحش، فحشاء اور فاحشہ کہتے ہیں۔ (المفردات، ج 2، ص 483، مکتبہ نزار مصطفی، مکہ مکرمہ 1418ھ)

علامہ ابن اثیر جزری متوفی 606ھ نے لکھا ہے کہ ہر وہ گناہ اور معصیت جس کی برائی زیادہ ہو، اس کو فحش، فحشاء اور فاحشہ کہتے ہیں اور فاحشہ زنا کے معنی میں بہ کثرت مستعمل ہے اور ہر برے قول اور فعل کو فاحشہ کہا جاتا ہے۔ کسی کی بات کے سختی اور جارحیت سے جواب دینے کو بھی فحش کہتے ہیں (النہایہ، ج 3، ص 372، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1418)

مجاہد نے کہا اس آیت میں فاحشہ سے مراد، زمانہ جاہلیت میں مشرک مردوں اور عورتوں کا برہنہ طواف کرنا ہے (جامع البیان جز 8، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415ھ)

مشرکین برہنہ طواف کرنے کے جواز میں دو دلیلیں پیش کرتے تھے۔ ایک دلیل یہ تھی کہ ہم اپنے باپ دادا کی تقلید کرتے ہیں وہ اسی طرح کرتے تھے۔ اس دلیل کا اللہ تعالیٰ کئی بار رد فرما چکا ہے کہ جاہلوں اور کافروں کی تقلید کرنا جائز نہیں ہے اور دوسری دلیل یہ پیش کرتے تھے کہ اس طرح بے حیائی سے طواف کرنے کا ہمیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ دوسرا رد یہ فرمایا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے برہنہ طواف کرنے کا حکم دیا ہے۔ تم کسی کتاب کے معتقد ہو نہ کسی نبی کے، اور اللہ کا حکم یا نبی سے معلوم ہوتا ہے اور یا اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب سے۔

(تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

حضرت عطاء (رح) کا قول ہے کہ بے حیائی سے مراد شرک ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہر قبیح فعل اور تمام صغیرہ کبیرہ گناہ اس میں داخل ہیں اگرچہ یہ آیت خاص ننگے ہو کر طواف کرنے کے بارے میں آئی ہے۔ جب کفار کی ایسی بے حیائی کے کاموں پر ان کی مذمت کی گئی تو اس پر انھوں نے اپنے قبیح افعال کے دو عذر بیان کئے، ایک تو یہ کہ اُنھوں نے اپنے باپ دادا کو یہی فعل کرتے پایا لہٰذا ان کی اتباع میں یہ بھی کرتے ہیں۔ اس عذر کا بار بار قرآن میں رد کر دیا گیا کہ یہ اتباع تو جاہل و بدکار کی اتباع ہوئی اور یہ کسی صاحب عقل کے نزدیک جائز نہیں۔ اتباع تو اہل علم و تقویٰ کی کی جاتی ہے نہ کہ جاہل گمراہ کی۔ ان کا دوسرا عذر یہ تھا کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ نے انھیں ان افعال کا حکم دیا ہے۔ یہ محض افتراء و بہتان تھا چنانچہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس کا رد فرماتا ہے کہ اے حبیب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، تم جواب میں فرماؤ: بیشک اللہ عَزَّوَجَلَّ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ عَزَّوَجَلَّ پر وہ بات کہتے ہو جس کی تمہیں خبر نہیں؟" اللہ عَزَّوَجَلَّ نے بے حیائی کا نہیں بلکہ ان چیزوں کا حکم دیا ہے جو بعد والی آیت میں مذکور ہیں۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

اہل عرب کا ننگے ہو کر طواف کعبہ کرنا:

حضرت عروہ بن زبیر (رض) سے مروی ہے کہ کہا:

كانت العرب تطوف بالبيت عراة الا ان تعطيهم الحمس ثيابا۔ اہل عرب ننگے بدن کے ساتھ کعبۃ اللہ کا طواف کرتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ اگر قریش ہمیں لباس دے دیں تو ہم اس نے طواف کر سکتے ہیں (اگر نہ دیں تو پھر ننگے ہی طواف کیا جائے)۔ مسلم کتاب الحج حدیث 151) حتیٰ کہ ان کی عورتیں بھی ننگے طواف کرتی تھیں مگر وہ رات کو آتی تھیں وہ اس برہنگی پر فخریہ اشعار بھی کہتی تھیں۔ (مسلم حوالہ مذکورہ)

گویا شیطان نے انھیں گمراہی و بے حیائی کی انتہا تک پہنچا دیا۔ کفار عربیہ بھی سمجھتے تھے کہ جن کپڑوں میں وہ گناہ کرتے ہیں ان میں وہ طواف کیسے کر سکتے ہیں لہٰذا ننگے ہی طواف کیا جائے۔ اللہ نے انھیں سمجھایا کہ اللہ تو بے حیائی پسند نہیں فرماتا پھر تم اللہ پر جھوٹ کیوں گھڑتے ہو کہ اس نے بے لباس ہو کر طواف کرنے کا حکم دیا ہے۔ کیا تمہارے اندر کوئی آسمانی کتاب اتری ہے جس میں یہ لکھا ہے۔

کعبہ کے حرمت حضور تاجدار کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بحال فرمائی:

کفار عرب برہنہ طواف کے ذریعے کعبۃ اللہ کی شدید بے حرمتی کرتے تھے پیارے آقا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لائے تو کعبہ کی حرمت بحال ہو گئی۔ آپ کی شدید محنت سے کعبہ کفار کی عریانی تو بت پرستی سے پاک ہوگیا۔ اگر آپ نہ آتے تو کعبۃ اللہ کی حرمت بحال نہ ہوتی۔

یہی نہیں، بلکہ کعبۃ اللہ کو بت خانہ بنادیا گیا تھا۔ کعبۃ اللہ کی دیواروں پر 360 بت نصب تھے، جن کو انصاب کہا جاتا تھا۔ العرب طواف بھی کرتے تھے اور ساتھ ساتھ اپنے جھوٹے خداؤں کی پرستش بھی جاری رکھتے تھے۔ اگر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت مبارکہ نہ ہوتی سے بڑا تو کعبۃ اللہ بت خانہ کی شکل ہی میں رہتا۔ اپنے تشریف لا کر اسے بت خانہ سے خانۂ خدا میں تبدیل کر دیا۔

امام احمد رضا خان فاضل بریلوی (رح) کعبہ کو نور کہہ کر اس حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں:

ناریوں کا دور تھا دل جل رہا تھا نور کا تم کو دیکھا ہو گیا ٹھنڈا کلیجہ نور کا

خلاف شرع امور میں خاندان کی بات نہ مانی جائے:

وَجَدْنَا عَلَیۡہَاۤ اٰبَآءَنَا۔ سے معلوم ہوا اگر سارا خاندان ایسا حکم دے جو اللہ و رسول کے خلاف ہو تو اسے ٹھکرا کر اللہ و رسول کی اطاعت لازم ہے۔ یہ بہانہ نہیں چل سکتا کہ یہ ہمارے خاندان کا فیصلہ ہے۔ آج کی نام نہاد مسلم خاندان قرآن میں مذکور احکام میراث کو پس پشت ڈال کر اپنی مرضی سے میراث کی تقسیم کرتے ہیں، یہ سب حرام اور ظلم ہے۔ کئی لڑکیوں کو ان کی مرضی پوچھے بغیر بھاری مہر کے عوض نکاح کے نام پر بیچ دیا جاتا ہے۔ اسلام میں ان چیزوں کی ہر گز گنجائش نہیں ہے۔

بے حیائی میں اللہ کی رضا نہیں ہو سکتی:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاۡمُرُ بِالۡفَحۡشَآءِ۔ سے معلوم ہوا کسی بے حیائی کو مذہبی تقدس کا لبادہ نہیں اوڑھایا جاسکتا۔ کفار عرب نے برہنہ طواف کو مذہبی رنگ دے رکھا تھا اللہ تعالی نے اس کا رد فرمایا۔ آج کی گمراہ پیر فقیر نامحرم مریدہ عورتوں سے ٹنگے دبواتے اور تنہائی میں ان سے ملتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیر باپ ہوتا ہے مگر یہ سب حرام کام ہیں۔ ایسے نام نہاد پیروں کو جوتے مار کر گھروں سے نکال دینا چاہیے، ان کو گھروں میں بٹھانا دیوثی و بے غیرتی ہے۔ کئی گھروں کی عزت اسی بے غیرتی کے سبب لٹ چکی ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی بھی اپنی مریدہ عورتوں سے ٹانگیں دبواتا تھا جیسا کہ "سیرت المھدی" وغیرہ میں اس کی صراحت موجود ہے۔

(تفسیر برہان القرآن۔ علامہ و قاری محمد طیب)

آیت مبارکہ:

قُلۡ اَمَرَ رَبِّیۡ بِالۡقِسۡطِ ۟ وَاَقِیۡمُوۡا وُجُوۡہَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ وَّادۡعُوۡہُ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ ۬ؕ کَمَا بَدَاَکُمۡ تَعُوۡدُوۡنَ ؕ﴿۲۹﴾

لغۃ القرآن: قُلْ : کہہ دیں] [اَمَرَ : اس نے حکم دیا ہو] [رَبِّيْ : میرا رب] [بِالْقِسْطِ : انصاف کی] [وَاَقِيْمُوا : اور تم سب قائم کرو] [وُجُوْهَكُمْ : اپنے چہروں کو] [عِنْدَ : نزدیک] [كُلِّ : ہر طرح] [مَسْجِدٍ : نماز] [وَّادْعُوْهُ : اور تم سب پکارو اسے] [مُخْلِصِيْنَ : سب خالص کرتے ہوئے] [لَهُ : اس

سے] [الدِّيْنَ : دين] [كَمَا : جیسا کہ] [بَدَاَكُمْ : اس نے ابتدا کی تمہاری] [تَعُوْدُوْنَ : تم سب لوٹو گے]

ترجمہ: فرمادیجئے : میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے، اور تم ہر سجدہ کے وقت و مقام پر اپنے رخ (کعبہ کی طرف) سیدھے کر لیا کرو اور تمام تر فرمان بر داری اس کے لیے خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کیا کرو۔ جس طرح اس نے تمہاری (خلق وحیات کی) ابتداء کی تم اسی طرح (اس کی طرف) پلٹو گے

تشریح:

قَسَط اور عدل کے معانی: قسط کا معنی ہے کسی چیز کے دو برابر حصے کرنا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "واقیموا الوزن بالقسط: اور انصاف کے ساتھ وزن کو درست رکھو" (الرحمٰن: 9)۔ قَسَط کا معنی ہے ظلم کرنا اور اَقسَطَ کا معنی ہے عدل کرنا۔ قرآن مجید میں ہے: واما القاسطون فکانوا لجہنم حطبا: اور رہے ظالم لوگ تو وہ جہنم کا ایندھن ہیں" (الجن: 15)۔ " واقسطوا ان اللہ یحب المقسطین: اور انصاف کرو، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو بہت پسند فرماتا ہے" (الحجرات: 9)۔ (المفردات، ج 2، س 423، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1418ھ)

عدل، عدالت اور معادلہ۔ ان کا معنی ہے مساوات۔ عدل اور عدل دونوں کا معنی مساوات ہے۔ لیکن عدل امور معنویہ میں مساوات کو کہتے ہیں اور عدل امور محسوسہ میں مساوات کو کہتے ہیں۔ مثلاً وزن۔ پیائش اور عدد میں مساوات کو کہتے ہیں اور عدل کی محسوسات میں مساوات اس آیت میں ہے: " ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء: اور تم بیویوں کے درمیان ہر گز عدل نہ کر سکو گے) " (النساء: 129)۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ انسان کی فطرت میں کسی ایک طرف میلان کرنا ہے۔ اس لیے انسان اپنی بیویوں کے درمیان محبت میں مساوات کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: " ان اللہ یامر بالعدل والاحسان: بیشک اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے" (النحل: 90)

عدل کا معنی ہے مکافات اور بدلہ میں مساوات:

خیر کا بدلہ خیر اور شر کا بدلہ اس کے مساوی شر۔ مثلاً: " جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا: برائی کا بدلہ اس جیسی اتنی ہی برائی ہے" (الشوریٰ: 42)۔ اور احسان کا معنی ہے نیکی کے بدلہ میں اس سے زیادہ نیکی کی جائے اور برائی کے بدلہ میں اس سے کم برائی کی جائے۔ جتنی رقم کسی سے قرض لی تھی، اتنی ہی واپس کر دینا عدل ہے۔ اور اس سے زیادہ رقم واپس کرنا احسان ہے اور کسی نے دس گھونسے مارے ہوں تو بدلہ میں اس کو دس گھونسے مارنا عدل ہے اور صرف ایک گھونسا مارنا احسان ہے۔ (المفردات، ج 2، س 423، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1418ھ)

اخلاص کا معنی:

اخلاص، خالص سے بنا ہے۔ جس چیز میں کسی چیز کی آمیزش کا شبہ ہو، جب وہ اس سے صاف ہو جائے تو اس کو خالص کہتے ہیں۔ یعنی جو چیز ملاوٹ سے پاک ہو۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اخلاص کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت صرف اس کی رضاجوئی یا اس کے حکم کی فرمان بر داری کی نیت سے کی جائے۔ اس میں کسی کو دکھانے یا سنانے کی نیت نہ ہو اور نہ اس کام پر اپنی تعریف سننے کی خواہش ہو۔ اخلاص کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اللہ کی پرستش اور اس کی رضاجوئی کے سوا ہر ایک کی پرستش اور اس کی رضاجوئی سے بری ہو جائے۔ (المفردات، ج 1، ص 204، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1418ھ)

قرآن مجید میں اخلاص کے ساتھ عبادت کرنے کا حکم:

اس سے پہلی آیت میں یہ فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فحشاء (بے حیائی کرنے) کا حکم نہیں دیا۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس چیز کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قسط (عدل) کا حکم دیا ہے اور قبلہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے اور اخلاص کے ساتھ اللہ سے دعا کرنے اور اس کی عبادت کرنے کا حکم دیا ہے۔

قسط سے مراد ہے لاالہ الا اللہ کا اعتقاد رکھنا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: " شھد اللہ انہ لا الہ ھو والملئکۃ واولوا العلم قائما بالقسط لا الہ الا ھو العزیز الحکیم: اللہ نے گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور فرشتوں نے اور علما نے درآنحالیکہ وہ عدل کے ساتھ قائم ہیں یہ کہ اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ بہت عزت والا بڑی حکمت والا "

اس آیت میں دوسرا حکم یہ دیا ہے کہ قبلہ کی طرف رخ کرو اور اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور اس کی عبادت کرو۔

عمل میں اخلاص کے فوائد اور ثواب کے متعلق احادیث:

امام ابو عیسیٰ ترمذی متوفی 279ھ روایت کرتے ہیں: حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس میں مسلمان میں یہ تین اوصاف ہوں اس کے دل میں کبھی کھوٹ (کینہ اور فساد) نہیں ہوگا۔ اس کے عمل میں اللہ کے لیے اخلاص ہو، وہ ائمہ مسلمین کے لیے خیر خواہی کرے اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ لازم ہے۔ (الحدیث) (سنن ترمذی، ج 4، رقم الحدیث: 2667، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1414ھ)

امام احمد بن شعیب نسائی توفی 303ھ روایت کرتے ہیں: مصعب بن سعد اپنے والد (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ اس امت کے ضعیف لوگوں کی دعاؤں، ان کی نمازوں اور ان کے اخلاص کی وجہ سے اس امت کی مدد فرماتا ہے۔ (سنن نسائی، ج 6، رقم الحدیث: 3178، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت، 1412ھ)

حضرت معاذ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اپنے دین میں اخلاص رکھو تمہارا قلیل عمل (بھی) کافی ہوگا۔ امام حاکم نے کہا یہ حدیث صحیح ہے۔ (المستدرک، ج 4، ص 306، حلیۃ الاولیاء ج 1، ص 244، الجامع الصغیر، ج 1، رقم الحدیث: 298، الجامع الکبیر، ج 1، رقم الحدیث: 731)

حضرت ضحاک بن قیس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اپنے تمام اعمال اخلاص کے ساتھ کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اخلاص کے بغیر کسی عمل کو قبول نہیں کرتا۔ حافظ سیوطی نے اس حدیث کو صحیح لکھا ہے۔ (سنن دار قطنی، ج 1، رقم الحدیث: 130۔ الجامع الصغیر، ج 1، رقم الحدیث: 299۔ الجامع الکبیر، ج 1، رقم الحدیث: 732)

حضرت ابو درداء بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ کی عبادت اخلاص کے ساتھ کرو۔ پانچ (فرض) نمازیں پڑھو اور اپنے اموال کی زکوۃ خوشی سے ادا کرو۔ اپنے مہینہ (رمضان) کے روزے رکھو، اپنے بیت (کعبہ) کا حج کرو۔ (اور) اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ۔ حافظ الہیثمی نے اس حدیث کو ضعیف لکھا ہے (حلیۃ الاولیاء، ج 5، ص 166، مجمع الزوائد، ج 1، ص 45، الجامع الصغیر، ج 1، رقم الحدیث 300، الجامع الکبیر، ج 1، رقم الحدیث: 733)

حضرت عمر بن خطاب (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اعمال کا مدار صرف نیت پر ہے۔ ہر شخص کے عمل کا وہی ثمرہ ہے جس کی اس نے نیت کی ہے تو جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے اور جس شخص کی ہجرت دنیا کی طرف ہو جس کو وہ پائے یا کسی عورت کی طرف ہو جس سے وہ نکاح کرے، تو اللہ کے نزدیک اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے جس کی اس نے نیت کی ہے۔ (صحیح البخاری، ج 1، رقم الحدیث: 1۔ صحیح مسلم، الامارۃ: 155، (1907)۔ سنن ابو داود، ج 2، رقم الحدیث: 2201، سنن الترمزی، ج 3، رقم الحدیث: 1653، سنن النسائی، ج 1، رقم الحدیث: 75۔ سنن ابن ماجہ، ج 2، رقم الحدیث: 4227۔ مسند احمد، ج 1، ص 25۔ مسند الحمیدی، رقم الحدیث: 28۔ صحیح ابن خزیمہ، رقم الحدیث: 142۔ سنن کبری للبیہقی، ج 1، ص 298، المنتقی، رقم الحدیث: 64۔ صحیح ابن حبان، ج 2، رقم الحدیث: 388۔ حلیۃ الویاء، ج 8 ص 42۔ سنن دار قطنی، ج 1 رقم الحدیث: 128)

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن میری امت کے تین گروہ ہوں گے۔ ایک گروہ ان لوگوں کا ہوگا جنہوں نے خالص اللہ عزوجل کے لیے عبادت کی ہوگی۔ ایک گروہ ان لوگوں کا ہوگا جنہوں نے دکھاوے کے لیے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ہوگی۔ اور ایک گروہ ان

لوگوں کا ہوگا جنہوں نے دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ہوگی۔ تو جس نے دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ہوگی، اس سے اللہ تعالیٰ فرمائے گا، تو نے میری عبادت سے کس چیز کا ارادہ کیا تھا؟ وہ کہے گا دنیا کا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا یقیناً جس چیز کو تو نے جمع کیا تھا، اس نے تجھ کو نفع نہیں دیا اس کو دوزخ میں لے جاؤ اور جس نے ریاکاری کے لیے عبادت کی تھی، اس سے اللہ تعالیٰ فرمائے گا تیری عبادت صرف ریاکاری کے لیے تھی، اس میں سے میری طرف کوئی چیز نہیں پہنچی اور وہ ریا تجھے آج نفع نہیں دے گا، اس کو دوزخ میں لے جاؤ اور جس نے خالص اللہ عزوجل کے لیے عبادت کی تھی، اس سے فرمائے گا تو نے میری عبادت کرنے سے کس چیز کا ارادہ کیا تھا۔ وہ شخص کہے گا تیری عزت اور جلال کی قسم! تو ضرور مجھ سے زیادہ جاننے والا ہے۔ میں تیری رضاجوئی اور جنت کے لیے تیری عبادت کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرے بندہ نے سچ کہا اس کو جنت کی طرف لے جاؤ۔ (حافظ الہیثمی نے کہا اس حدیث کی سند میں، ایک راوی عبید بن اسحاق کو جمہور نے ضعیف کہا ہے اور ابو حاتم رازی اور ابن حبان نے اس کی توثیق کی ہے اور اس کی سند کے باقی راوی ثقہ ہیں) (شعب الایمان، ج 5، رقم الحدیث: 16808۔ المعجم الاوسط، ج 6، رقم الحدیث: 5101۔ مجمع الزوائد، ج 10، ص 350)

عمل میں اخلاص نہ ہونے سے نقصان اور عذاب کے متعلق احادیث:

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب قیامت کے دن مہر زدہ نامہ اعمال لائیں گے، اللہ تبارک و تعالیٰ فرمائے گا، اس صحیفہ کو قبول کرلو اور اس صحیفہ کو چھوڑ دو فرشتے کہیں گے تیری عزت کی قسم! ہم نے وہی لکھا ہے جو اس نے عمل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم نے سچ کہا (لیکن) اس کا عمل میری ذات کے لیے نہیں تھا۔ آج میں صرف اسی عمل کو قبول کروں گا جو میری ذات کے لیے کیا گیا ہوگا۔ حافظ الہیثمی نے کہا: یہ حدیث دو سندوں سے مروی ہے اور اس کی ایک سند صحیح ہے۔ (المعجم الاوسط، ج 7، رقم الحدیث: 2129، سنن دار قطنی، ج 1، رقم الحدیث: 129، مجمع الزوائد، ج 10، ص 35)

حضرت ابو درداء (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کسی نیک عمل کو باقی رکھنا نیک عمل کرنے سے زیادہ دشوار ہے۔ ایک شخص تنہائی میں کوئی نیک عمل کرتا ہے تو اس کا اجر ستر گنا لکھ دیا جاتا ہے۔ پھر شیطان اس کو بہکاتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ اس عمل کا لوگوں سے ذکر کرتا ہے اور اس کا اعلان کر دیتا ہے۔ پھر اس کی وہ نیکی (مخفی نیکیوں کے بجائے) ظاہر نیکیوں میں لکھ دی جاتی ہے اور تنہائی میں عمل کرنے کی وجہ سے جو اس کا زیادہ اجر تھا، وہ کم کر دیا جاتا ہے اور شیطان اس کو مسلسل ورغلاتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ چاہتا ہے کہ اس کی اس نیکی کا ذکر کیا جائے اور اس نیکی پر اس کی تعریف کی جائے۔ پھر اس کے عمل کو ظاہری نیکیوں سے بھی کاٹ دیا جاتا ہے اور یہ لکھ دیا جاتا ہے کہ اس نے یہ عمل ریاکاری کے طور پر کیا تھا۔ سو جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے، وہ اپنے دین کی حفاظت کرتا ہے اور بیشک ریاکاری شرک ہے۔ (شعب الایمان، ج 5، رقم الحدیث: 6813، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1410ھ)

(ہر چند کہ اس حدیث کی سند میں مجہول راوی ہیں لیکن اس کا معنی صحیح ہے اور درج ذیل حدیث میں اس کی تائید ہے)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے جس کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا وہ ایک شہید ہوگا۔ اس کو لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو دی ہوئی نعمتیں بتلائے گا۔ جن کا وہ اعتراف کرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم نے ان نعمتوں کے مقابلہ میں کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا: میں نے اپنے مال کو نیکی کے ہر اس راستہ میں تیری خاطر خرچ کیا جو تجھ کو پسند ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم نے جھوٹ بولا تم نے تو یہ اس لیے کیا تھا تاکہ یہ کہا جائے کہ یہ بہت سخی ہے۔ سو وہ کہا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ (صحیح مسلم، الامارۃ: 152 (1905) 4840۔ سنن الترمذی، ج 4، رقم الحدیث: 2389۔ سنن النسائی، ج 6، رقم الحدیث: 3137، سنن کبری للبیہقی، ج 9، ص 198)

اخلاص ہونے پر فائدہ اور اخلاص نہ ہونے کے نقصان کے متعلق ایک اسرائیلی روایت:

امام محمد بن غزالی متوفی 505ھ لکھتے ہیں: اسرائیلیات میں مذکور ہے کہ ایک عابد بہت بڑے عرصہ تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا رہا۔ اس کے پاس کچھ لوگ آئے اور انھوں نے کہا کہ فلاں جگہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ایک درخت کی عبادت کرتے ہیں۔ وہ عابد غضبناک ہوا اور کلہاڑا کندھے پر رکھ کر اس درخت کو کاٹنے کے لیے چل پڑا راستے میں ابلیس اس کو ایک بوڑھے آدم کی شکل میں ملا اور پوچھا: کہاں جارہے ہو؟ اس نے کہا: میں درخت کو کاٹنے جارہا ہوں۔ ابلیس نے کہا: تمہارا اس درخت سے کیا تعلق ہے؟ تم بلاوجہ اپنی عبادت کو چھوڑ کر ایک غیر اہم کام کے درپے ہو رہے ہو۔ عابد نے کہا: یہ کام بھی میری عبادت ہے۔ ابلیس نے کہا: میں تم

کو وہ درخت کاٹنے نہیں دوں گا۔ پھر ان دونوں میں کشتی ہوئی۔ عابد نے اس کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور اس کے سینہ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ ابلیس نے کہا: مجھے چھوڑ دو۔ میں تم کو ایک مشورہ دیتا ہوں۔ عابد نے اس کو چھوڑ دیا۔ ابلیس نے کہا: اے شخص! اللہ نے تم سے یہ کام ساقط کر دیا ہے۔ اور تم پر اس کو فرض نہیں کیا۔ اور تم اس درخت کی عبادت نہیں کرتے اور اگر کوئی اور عبادت کرتا ہے تو اس کا تم سے مواخذہ نہیں ہوگا اور اس زمین میں اللہ تعالیٰ کے انبیاء بہت ہیں۔ اگر اللہ چاہے گا تو اس درخت کی پرستش کرنے والوں کی طرف اپنا کوئی نبی بھیج دے گا۔ اور اس نبی کو اس درخت کے کاٹنے کا حکم دے گا۔ عابد نے کہا: میں اس درخت کو ضرور کاٹوں گا اور ابلیس کو کشتی کے لیے للکارا اور عابد ابلیس کو پچھاڑ کر اس کے سینہ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ آخر ابلیس عاجز آ گیا اور اس سے کہنے لگا تمہارا کیا مشورہ ہے؟ میں تم کو درمیانی راہ بتاتا ہوں۔ وہ تمہارے لیے زیادہ بہتر اور زیادہ فائدے مند ہو گی۔ عابد نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ ابلیس نے کہا: مجھے چھوڑ دو تاکہ میں تم کو تفصیل سے بتاؤں! عابد نے اس کو چھوڑ دیا۔ ابلیس نے کہا: تم فقیر آدمی ہو۔ تمہارے پاس مال نہیں ہے۔ لوگ تمہاری کفالت کرتے ہیں اور تم ان پر بوجھ ہو۔ اور شاید کہ تمہارے دل میں خواہش ہو کہ تم اپنے بھائیوں کی مالی امداد کرو اور اپنے پڑوسیوں کے ساتھ غم خواری کرو اور تم سیر ہو کر کھاؤ اور لوگوں سے مستغنی رہو؟ عابد نے کہا: ہاں! ابلیس نے کہا: پھر درخت کاٹنے سے باز آ جاؤ اور تمہیں ہر رات اپنے سرہانے دو دینار مل جائیں گے۔ صبح کو تم وہ دو دینار لے لینا اور ان کو اپنے اوپر اور اپنے عیال کے اوپر خرچ کرنا اور اپنے بھائیوں کے اوپر صدقہ کرنا تو یہ تمہارے اور دیگر مسلمانوں کے لیے اس درخت کے کاٹنے سے زیادہ سود مند ہوگا۔ اور اس درخت کے بعد وہاں اور درخت اگ سکتا ہے اور اس کے کاٹنے سے ان کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا اور تمہارے مسلمان ضرورت مند بھائیوں کو اس درخت کے کاٹنے سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ عابد ابلیس کی اس پیشکش پر غور کرنے لگا اور بے ساختہ کہنے لگا بات تو اس بوڑھے کی سچی ہے۔ میں نبی تو ہوں نہیں جو مجھ پر اس درخت کا کاٹنا لازم ہو اور نہ اللہ نے مجھے اس درخت کے کاٹنے کا حکم دیا ہے۔ حتیٰ کہ میں اس درخت کے نہ کاٹنے کی وجہ سے گناہ گار ہو جاؤں اور جو صورت اس نے بتائی ہے اس میں زیادہ نفع ہے۔ سو دونوں نے قسم کھا کر اس بات پر معاہدہ کر لیا۔ عابد لوٹ آیا۔ اس نے اپنے معبد میں رات گزاری۔ صبح کو اسے اپنے سرہانے دو دینار مل گئے۔ اس نے وہ دینار لے لیے۔ اسی طرح اگلے دن بھی ہوا۔ تیسری صبح کو عابد کو اپنے سرہانے کوئی چیز نہیں ملی۔ وہ غضب ناک ہوا اور کلہاڑی کندھے پر ڈال کر چل پڑا۔ اس کے سامنے سے ابلیس ایک بوڑھے کی صورت میں آتا ہوا ملا۔ اس نے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ عابد نے کہا میں اس درخت کو کاٹوں گا۔ ابلیس نے کہا: تم جھوٹ بولتے ہو۔ خدا کی قسم! تم اس درخت کو کاٹنے پر قادر نہیں ہو۔ اور تمہارے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔ عابد پہلی بار کی طرح اس سے کشتی کے لیے آگے بڑھا۔ ابلیس نے کہا: اب یہ نہیں ہو سکتا۔ اور ایک ہی ہلے میں اس کو پچھاڑ دیا اور عابد چڑیا کی طرح اس کے پیروں میں گر پڑا اور ابلیس اس کے سینہ پر بیٹھ گیا۔ ابلیس نے کہا باز آ جاؤ ورنہ میں تم کو ذبح کر دوں گا۔ عابد نے غور کیا تو اس کو ابلیس کے مقابلہ میں بالکل طاقت محسوس نہیں ہوئی۔ عابد نے کہا تم مجھ پر غالب آ گئے۔ اب مجھ کو چھوڑ دو اور یہ بتاؤ کہ میں پہلی بار تم پر کس طرح غالب آیا تھا اور اس بار کیوں نہ غالب آ سکا!

ابلیس نے کہا: اس لیے کہ پہلی بار تم اللہ کے لیے غضب ناک ہوئے تھے۔ اور تمہاری نیت آخرت تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہارے لیے مسخر کر دیا اور اس بار تم اپنے نفس اور دنیا کے لیے غضب ناک ہوئے تو میں نے تم کو پچھاڑ دیا۔ (احیاء العلوم، ج 4، ص 284-285، مطبوعہ دار الخیر، بیروت، 1413ھ)

اخلاص سے کیا ہوا کم عمل بغیر اخلاص کے زیادہ اعمال سے افضل ہے: علامہ عبد الرءوف المناوی المتوفی 1021ھ لکھتے ہیں: علامہ ابن الکمال نے کہا ہے کہ لغت میں اخلاص کا معنی ہے عبادت میں ریا کو ترک کرنا۔ اور اصطلاح میں اس کا معنی ہے جس چیز کی آمیزش کا شائبہ بھی ہو اس سے دل کو خالص کر لینا۔ پس جس شخص کی کسی فعل سے غرض صرف ایک ہو اور وہ غرض اللہ کا تقرب اور اس کی رضا جوئی ہو اور اس کے دل میں دنیا کی محبت بالکل نہ ہو حتیٰ کہ اس کا کھانا پینا بھی طبعی تقاضوں کی وجہ سے نہ ہو بلکہ محض اللہ کے حکم پر عمل کرنے اور اس کے حکم کی اطاعت کے لیے تقویت حاصل کرنے اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت پر عمل کرنے کے لیے ہو تو اس سنیت سے اس کا ہر عمل اخلاص سے ہوگا، اور جس شخص کی اپنے فعل سے غرض واحد ہو اور وہ غرض ریا اور دکھاوا ہو، ایسا شخص اپنے نفس اور دنیا سے محبت کرتا ہے اور اس کے دل و دماغ میں ہر وقت اپنے نفس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی دھن سمائی رہتی ہے اور اس کے دل میں اللہ کی محبت کے لیے بالکل جگہ نہیں ہوتی۔ ایسے شخص کی عبادات ریا سے بالکل محفوظ نہیں رہتیں، اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر کبھی روحانیت کا غلبہ ہوتا ہے کبھی نفسانیت کا غلبہ ہوتا ہے اور کبھی ان کے افعال میں اخلاص ہوتا ہے اور کبھی ان کے افعال میں ریا ہوتا ہے۔

امام غزالی نے کہا ہے عبادت کم ہو، لیکن اس میں ریا اور تکبر نہ ہو اور اس عبادت کا باعث اخلاص ہو تو اللہ تعالیٰ کی نزدیک اس عبادت کی غیر متناہی قیمت ہے اور عبادت بہت زیادہ ہو لیکن اخلاص سے خالی ہو تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی کوئی قیمت اور حیثیت نہیں ہے۔ الا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے اس کے تدارک کی کوئی سبیل پیدا فرمادے۔ اس لیے اہل بصیرت زیادہ عمل میں کوشش نہیں کرتے بلکہ اخلاص کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قدر و قیمت صاف شفاف اور صیقل چیز کی ہوتی ہے، کثرت کی نہیں ہوتی۔ ایک سچا موتی ہزار ٹھیکریوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ جو لوگ بہت زیادہ نمازیں پڑھتے ہیں، اور بہ کثرت روزے رکھتے ہیں اور نمازوں میں اخلاص اور خضوع اور خشوع کے درپے نہیں ہوتے اور نہ روزوں میں للّٰہیت کے جذبہ کی کوشش کرتے ہیں، اپنی نمازوں اور روزوں کی بڑی تعداد سے دھوکا کھاتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ بے مغز اخروٹوں کے ڈھیر کی کیا قدر و قیمت ہے۔ (فیض القدیر، ج 1، ص 414۔ 415، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ 1418ھ)

انسانوں کے حشر کی کیفیت:

اس کے بعد فرمایا: جس طرح اس نے تم کو ابتدا میں پیدا کیا ہے، اسی طرح تم لوٹو گے۔

محمد بن کعب نے اس کی تفسیر میں کہا: جس کو اللہ تعالیٰ نے ابتداء اہل شقاوت میں سے پیدا کیا ہے وہ قیامت کے دن اہل شقاوت سے اٹھے گا خواہ وہ پہلے نیک کام کرتا ہو، اور جس کو اللہ تعالیٰ نے ابتداءً اہل سعادت سے پیدا کیا، وہ قیامت کے دن اہل سعادت سے اٹھے گا خواہ وہ پہلے برے کام کرتا رہا ہو۔ جیسے ابلیس لعین کو اللہ تعالیٰ نے اہل شقاوت سے پیدا کیا تھا وہ پہلے نیک کام کرتا تھا لیکن وہ انجام کار کفر کی طرف لوٹ گیا اور جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے جادوگر اپنی ابتداء خلقت کے اعتبار سے سعادت کی طرف لوٹ گئے۔ مجاہد اور سعید بن جبیر نے بھی اس آیت کی اسی طرح تفسیر کی ہے۔ (جامع البیان، ج 8، ص 206، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415ھ) (تبیان القرآن)

حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "قیامت کے دن سب سے پہلے ایک شہید کا فیصلہ ہوگا، جب اسے لایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتیں یاد دلائے گا۔ وہ ان نعمتوں کا اقرار کرے گا، پھر اللہ عَزَّوَجَلَّ ارشاد فرمائے گا: تو نے ان نعمتوں کے بدلے میں کیا عمل کیا؟ وہ عرض کرے گا: میں نے تیری راہ میں جہاد کیا یہاں تک کے شہید ہو گیا۔ اللہ عَزَّوَجَلَّ ارشاد فرمائے گا: تو جھوٹا ہے، تو نے جہاد اس لیے کیا تھا کہ تجھے بہادر کہا جائے اور وہ تجھے کہہ لیا گیا۔ پھر اس کے بارے میں جہنم میں جانے کا حکم دے گا تو اسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر اس شخص کو لایا جائے گا جس نے علم سیکھا، سکھایا اور قرآن پاک پڑھا، وہ آئے گا تو اللہ تعالیٰ اسے بھی اپنی نعمتیں یاد دلائے گا، وہ بھی ان نعمتوں کا اقرار کرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے دریافت فرمائے گا: تو نے ان نعمتوں کے بدلے میں کیا کیا؟ وہ عرض کرے گا: میں نے علم سیکھا اور سکھایا اور تیرے لیے قرآن کریم پڑھا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: تو جھوٹا ہے، تو نے اس لیے علم سیکھا تا کہ تجھے عالم کہا جائے اور قرآن پاک اس لیے پڑھا کہ تجھے قاری کہا جائے اور وہ تجھے کہہ لیا گیا۔ پھر اسے بھی جہنم میں ڈالنے کا حکم ہوگا تو اسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا پھر ایک مالدار شخص کو لایا جائے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کا مال عطا فرمایا تھا، اسے لا کر نعمتیں یاد دلائی جائیں گی تو وہ بھی ان نعمتوں کا اقرار کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: تو نے ان نعمتوں کے بدلے کیا کیا؟ وہ عرض کرے گا: میں نے تیری راہ میں جہاں ضرورت پڑی وہاں خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: تو جھوٹا ہے، تو نے یہ سخاوت اس لیے کی تھی کہ تجھے سخی کہا جائے اور وہ کہہ لیا گیا۔ پھر اس کے بارے میں جہنم کا حکم ہوگا تو اسے بھی منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

{ کَمَا بَدَاَکُمْ تَعُوْدُوْنَ: اس نے جیسے تمہیں پیدا کیا ہے ویسے ہی تم پلٹو گے۔ } حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ابتدا ہی سے بنی آدم میں سے بعض کو مومن اور بعض کو کافر پیدا فرمایا، پھر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انھیں ویسے ہی لوٹائے گا جیسے ابتداء میں پیدا فرمایا تھا، مومن مومن بن کر اور کافر کافر بن کر۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت محمد بن کعب (رح) فرماتے ہیں "جسے اللہ تعالیٰ نے ابتداء ہی سے شقی اور بدبخت لوگوں میں سے پیدا کیا ہے وہ قیامت کے دن اہل شقاوت سے اٹھے گا چاہے وہ پہلے نیک کام کرتا ہو جیسے ابلیس لعین، اسے اللہ تعالیٰ نے بدبختوں میں سے پیدا کیا تھا، یہ پہلے نیک اعمال کرتا تھا بالآخر کفر کی طرف لوٹ

گیااور جسے اللہ تعالیٰ نے ابتداء ہی سے سعادت مند لوگوں میں سے پیدا کیا وہ قیامت کے دن سعادت مندوں میں سے اٹھے گا اگرچہ پہلے وہ برے کام کرتا رہا ہو، جیسے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانے کے جادو گر، یہ پہلے فرعون کے تابع تھے لیکن بعد میں فرعون کو چھوڑ کر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لے آئے۔
(صراط الجنان)

انسان دنیامیں خالی ہاتھ آیا تھااور روز قیامت خالی ہاتھ ہی اٹھے گا۔ اور وہ اللہ کو مانتے ہوئے آیا تھااور اسی کو مانتے ہوئے اٹھے گااور ہر کفر و شرک سے بیزار ہوگا یعنی اسے دین فطرت پر پیدا کیا گیااور وہ اسی دین پر اٹھے گا اسی لیے حضرت ابوہریرہ (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مامن مولود الا یولد علی فطرۃ الاسلام ثم ابواہ یھودانہ وینصرانہ اویمجسانہ۔ یعنی "ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت اسلام پہ پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی، عیسائی یا مجوسی بنادیتے ہیں۔" (بخاری کتاب الجنائز باب 79 حدیث 1359) (برہان القرآن)

اس آیت کی دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے جس طرح انسان ماں کے پیٹ سے ننگے پیر، ننگے بدن اور غیر مختون پیدا ہوا تھا، وہ حشر میں بھی اسی طرح ننگے پیر، ننگے بدن اور غیر مختون اٹھے گا۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256ھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم محشر میں ننگے پیر، ننگے بدن اور غیر مختون اٹھائے جاؤگے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: "کما بدانا اول خلق نعیدہ وعدا علینا انا کنا فعلین: جس طرح ہم نے پہلے پیدائش کی ابتداء کی تھی، اسی طرح ہم پھر اس کو دہرائیں گے، یہ ہمارا وعدہ ہے، ہم اس کو ضرور (پورا) کرنے والے ہیں" (الانبیاء: 104)۔ اور سب سے پہلے جس کو لباس پہنایا جائے گا، وہ حضرت ابراہیم ہیں۔ (مسلم کی ایک روایت میں ہے: حضرت عائشہ نے پوچھا: یارسول اللہ! عورتیں اور مرد دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہوں گے؟ آپ نے فرمایا: اے عائشہ! وہ دن اس سے بہت ہولناک ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھیں)۔ (صحیح البخاری، ج4، رقم الحدی: 3447۔ صحیح مسلم، الحشر: 68(2859)7068۔ سنن الترمذی ج4، رقم الحدیث: 2431۔ سنن النسائی، ج4۔ رقم الحدیث: 2087۔ صحیح ابن حبان، ج16، رقم الحدیث: 7347۔ مسند احمد، ج1، رقم الحدیث: 2096۔ سنن کبری للبیہقی، ج2، ص138۔ المعجم الکبیر، ج12، رقم الحدیث: 12314) (تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝۳۰

لغۃ القرآن: فَرِيْقًا : ایک فریق کو] [هَدٰي : اس نے ہدایت دی] [وَ : اور] [فَرِيْقًا : ایک گروہ کو] [حَقَّ :" جو " حق ہے] [عَلَيْهِمُ : ان پر] [الضَّلٰلَةُ : گمراہی] [اِنَّهُمُ : بیشک ان] [اتَّخَذُوا : ان سب نے بنا لیا] [الشَّيٰطِيْنَ : شیطان] [اَوْلِيَآءَ : دوست] [مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ : اللہ کے علاوہ کی] [وَيَحْسَبُوْنَ : اور وہ سب گمان کرتے ہیں] [اَنَّهُمْ : بیشک وہ] [مُّهْتَدُوْنَ : سب ہدایت پانے والے ہیں]

ترجمہ: ایک گروہ کو اس نے ہدایت فرمائی اور ایک گروہ پر (اس کے اپنے کسب و عمل کے نتیجے میں) گمراہی ثابت ہو گئی۔ بیشک انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو دوست بنالیا تھا اور وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں

تشریح: یعنی وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی دی ہوئی سمجھ سے صحیح کام لیا اور اس کے عطا فرمودہ اختیار اور آزادی کو اس کے حکم کا پابند بنا دیا انھیں راہ ہدایت دکھادی گئی اور اس پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمادی گئی۔ اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شریروں اور مفسدوں سے دوستی و محبت کا رشتہ جوڑ لیا۔ ان کے مقدر میں گمراہی لکھ دی گئی اور وہ بدنصیب اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں عین صواب ہے۔ اور یہ صرف اس وقت کے باطل پرستوں کا خیال نہ تھا بلکہ آج بھی راہ حق سے بھٹکے ہوئے افراد اور قومیں بڑی شدومد اور وثوق سے اپنی گمراہی کو عین حق کہتی ہیں۔ ان پر گمراہی مسلط کرنے کی وجہ بیان فرمادی کہ انھوں نے خود شیطان کی وفاقت اختیار کی اور اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور خود کردہ راہ پہ چلا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ایک گروہ کو اللہ نے ہدایت دی اور ایک گروہ گمراہی پر ڈٹا رہا، انھوں نے اللہ کو چھور کر شیطانوں کو اپنا کارساز بنالیا، اور ان کا یہ زعم ہے کہ وہی ہدایت یافتہ ہیں"

ابتداء فطرت میں ہر انسان کا ہدایت یافتہ ہونا:

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ایسی صلاحیت اور استعداد کے ساتھ پیدا کیا، جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات اور اس کی وحدانیت کی معرفت حاصل کرسکے اور اس کو خیر اور شر کے دونوں راستے دکھادیے۔ پھر بعض انسانوں نے اس فطری صلاحیت کو ضائع کردیا اور شیطان نے ان کو دنیا کی رنگینیوں اور دل فریبیوں کے دام میں پھانس لیا، ان کو ضمیر نے سرزنش کی نبیوں اور رسولوں اور ہر دور کے علماء حق نے ان کو اللہ کے دین کو قبول کرنے کی دعوت دی لیکن وہ شیطان کے بتائے ہوئے راستے پر ڈٹے رہے اور وہ یہ گمان کرتے تھے کہ جو راستہ انھوں نے اختیار کیا ہے وہی برحق ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "الم نجعل لہ عینین۔ ولسانا و شفتین۔ وھدیناہ النجدین: کیا ہم نے اس کی دو آنکھیں نہیں بنائیں؟ اور زبان اور دو ہونٹ؟ اور ہم نے اسے (نیکی اور بدی کے) دونوں واضح راستے دکھادیے" (البلد: 8-10)

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی 261ھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ہر مولود فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر آپ فرماتے پڑھو، اے لوگو! اپنے اوپر اللہ کی بنائی ہوئی سرشت (فطرت اسلام) کو لازم کرلو جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی سرشت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی یہی دین راست ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (الروم: 30)۔ دوسری روایت میں ہے: جو شخص بھی پیدا ہوا وہ اس فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی اور نصرانی بنادیتے ہیں۔ جیسے اونٹ سالم اور کامل الاعضاء پیدا ہوتا ہے کیا تم اس میں کوئی نقص دیکھتے ہو؟ حتی کہ تم اس کے اعضاء کاٹتے ہو۔ صحابہ نے کہا: یارسول اللہ! یہ بتایئے! جو شخص بچپن میں فوت ہوجائے؟ آپ نے فرمایا اللہ ہی جاننے والا ہے وہ کیا کرنے والا تھا؟ (صحیح مسلم، قدر: 22،23،(2758) 6632،6633۔ صحیح البخاری، ج 2، رقم الحدیث: 1359۔ سنن ابوداود، ج 4۔ رقم الحدیث: 4714۔ سنن ترمذی، ج 4، رقم الحدیث: 2145۔ موطا امام مالک، رقم الحدیث: 569۔ مسند احمد، ج 3، رقم الحدیث: 8570)

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ ہر بچہ اسلام کی صلاحیت اور استعداد کے ساتھ پیدا ہوتا ہے پھر اگر اس کے ماں باپ یا اس میں سے کوئی ایک مسلمان ہو تو وہ اسلام پر برقرار رہتا ہے اور اگر اس کے ماں باپ کافر ہوں تو دنیا میں اس پر کفر کا حکم جاری ہوتا ہے اور اگر بالغ ہونے کے بعد بھی وہ اپنے اختیار سے اسی کفر پر برقرار رہے تو وہ آخرت کے حکم کے اعتبار سے بھی کافر ہوگا۔ اور اگر اس پر سعادت غالب آجائے اور وہ اسلام قبول کرلے تو پھر وہ مسلمان ہوگا اور اگر وہ بالغ ہونے سے پہلے مرگیا تو اس کو آخرت میں عذاب نہیں ہوگا اور صحیح بخاری میں آپ کا ارشاد ہے کہ مشرکین کی اولاد بھی جنت میں ہوگی۔ (صحیح البخاری، ج 8، رقم الحدیث: 7047)

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو فطرت اسلام پر پیدا کیا اسی وجہ سے سب نے عالم میثاق میں اللہ کی ربوبیت کا اقرار کیا لیکن اللہ تعالیٰ کو ازل میں علم تھا کہ کون اس فطرت کے مطابق ہدایت پر رہے گا اور کون کفر میں مبتلا ہوگا اور اس پر ڈٹ جائے گا اور شیطان کو اپنا کارساز بنالے گا۔ اس لیے فرمایا: ایک گروہ کو اللہ نے ہدایت دی اور ایک گروہ گمراہی پر ڈٹا رہا، انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا کارساز بنالیا اور ان کا یہ زعم ہے کہ وہی ہدایت یافتہ ہیں۔

(تفسیر تبیان القرآن)

امام احمد بن حنبل (رح) نے مسند 223/5 میں یہ روایت درج فرمائی ہے۔ حضرت ابن مسعود (رض) فرماتے ہیں۔ صادق و مصدوق پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس کے سوا کوئی معبود نہیں اس کی قسم، تم میں سے بعض لوگ جنتیوں والے عمل کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کے اور جنت کے درمیان ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا مگر تقدیر غالب آجاتی ہے اور ان کا خاتمہ جہنمیوں والے کسی عمل پر ہو جاتا ہے اور وہ جہنم میں چلے جاتے ہیں۔ اور کوئی بندہ ایسا ہوتا ہے کہ جہنمیوں والے عمل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے رمیان ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے پھر اچانک تقدیر کالکھا غالب آتا ہے تو اس کا خاتمہ جنتیوں والے کسی عمل پر ہو جاتا ہے اور یہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ (تفسیر ابن مسعودؓ)

مشرکین عرب طرح طرح کے شرکیہ عقائد اور افعال اور خود ساختہ بے شرمی اور بے مروتی کے اعمال میں مبتلا تھے وہ مرد و عورت ننگے ہو کر طواف کرتے تھے اسی کو کار ثواب سمجھ کر بڑے فخر سے کرتے اور ایک دوسرے کو مبارکباد بھی دیتے اس کے علاوہ ان میں یہ رسم بھی جاری رہی کہ حج کے ایام میں کھانا پینا بھی چھوڑ دیتے تھے اور صرف اتنا وقت گزارا کھاتے تھے جس سے سانس چلتا رہے اور موت واقع نہ ہو خصوصاً گھی، گوشت، دودھ اور دیگر پاکیزہ غذاؤں سے بالکلیہ اجتناب کرتے تھے۔

ان کے اس بے ہودہ طریقہ کار کے خلاف یہ آیات نازل ہوئیں اور ان کی دو اور ان کی دونوں بے حد رسموں کی تردید ہوئی پہلی آیت میں پہلی رسم کی دوسری آیت میں دوسری قسم کی تردید ہے ارشاد فرمایا

"یبنی آدم خذوازینتکم عند کل مسجد" یہاں تک پہلی رسم کی تردید ہے "وکلواواشربوا" یہاں سے اختتام آیت تک دوسری رسم کی تردید ہے۔

نماز میں ستر پوشی فرض ہے اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی:

اس آیت سے جمہور صحابہ اور تابعین رحمۃاللہ علیہم اور مجتہدین (رح) نے کئی احکام نکالے ہیں اول یہ کہ اس میں جس طرح ننگے طواف کو منع کیا گیا ہے اسی طرح ننگے نماز پڑھنا بھی حرام اور باطل ہے کیونکہ حدیث میں سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ الطواف بالبیت صلاۃ یعنی کعبۃ اللہ کا طواف نماز کے حکم میں ہے (مشکوۃ)

جب کہ لفظ مسجد سے جمہور مفسرین (رح) کے نزدیک مراد سجدہ ہے تو بحالت سجدہ عریانی کی ممانعت خود آیت میں صراحت کے ساتھ آجاتی ہے اور جب سجدہ میں عریانی ممنوع ہوئی تو رکوع قیام اور قعود اور نماز کے تمام افعال میں اس کا لازم ہونا ظاہر ہے کہ سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشادات میں اس کو اور بھی واضح کر دیا ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ کسی بالغ عورت کی نماز بغیر دوپٹے کے جائز نہیں۔ (ترمذی)

اور نماز کے علاوہ دوسری حالت میں بھی ستر پوشی کا فرض ہونا دوسری آیات اور روایات حدیث سے ثابت ہے جن میں سے ایک آیت اسی صورت میں گزر چکی یعنی "یبنی آدم قد انزلنا علیکم لباسا یواری سوآتکم" خلاصہ یہ ہے کہ ستر پوشی انسان کے لیے پہلا انسانی اور اسلامی فرض ہے جو ہر حالت میں اس پر فرض ہے اور لازم ہے پھر نماز اور طواف میں بدرجہ اولیٰ فرض ہے۔

نماز کے لئے زینت والا لباس بہتر ہے:

آیت کریمہ میں لباس کو لفظ "زینت" سے تعبیر فرما کر اشارہ ہوا کہ نماز کے لیے بہتر یہ ہے کہ صرف ستر پوشی پر اکتفاء نہ ہو، بلکہ اپنی وسعت کے لحاظ سے بہتر اور اچھے اور صاف ستھرے لباس کا اہتمام کیا جائے، میلے کچیلے، بدبودار کپڑے پہن کر نماز پڑھنے سے نماز اور مسجد دونوں کی توہین اور بے احترامی ہے، جس سے اجتناب ضروری اور لازم ہے۔ جو لوگ مزدوری کرتے ہیں، اور نماز انہی کام والے میلے کچیلے کپڑوں میں پڑھتے ہیں، ان کی نماز نہایت ناقص ہوتی ہے۔

اور بعض علماء کا فتوی ہے کہ مسجد کی صفوں کے میلا ہونے کے پیش نظر ایسے لوگوں کو (خاص کر گیراج میں کام کرنے والے لوگ) مسجد میں نماز پڑھنے سے روکا جائے، اور باہر صحن میں نماز پڑھنے کا کہا جائے۔ پس محض ستر عورت پر اکتفاء نہ ہو، بلکہ پسندیدہ، مرغوب، نظیف و پاکیزہ کپڑوں میں اس عظیم عبادت نماز کی ادائیگی کا اہتمام ہو، اسی لئے ارشاد ہوا "خذوازینتکم"۔

حضرت امام حسنؓ نمازوں کے لئے خاص لباس کے اہتمام کی تاکید فرماتے تھے، اور اپنی نمازوں کے لئے مخصوص علی لباس تیار کئے تھے جو صرف نماز کے وقت زیب تن فرما کر نماز ادافرماتے تھے۔ (تفسیر منازل العرفان)

آیت مبارکہ:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝۳۱

لغۃ القرآن: يٰبَنِيْٓ : اے اولاد !] [اٰدَمَ : آدم] [خُذُوْا : سب تھام لو] [زِيْنَتَكُمْ : اپنی زینت] [عِنْدَ : نزدیک] [كُلِّ : ہر طرح] [مَسْجِدٍ : سجدے " نماز "] [وَّكُلُوْا : اور تم سب کھاؤ] [وَاشْرَبُوْا : اور تم سب پیو] [وَلَا : اور نہ] [تُسْرِفُوْا : تم سب اسراف کرو] [اِنَّهٗ : بیشک یہ حقیقت ہے] [لَا : نہیں] [يُحِبُّ : پسند کرتا ہے] [الْمُسْرِفِيْنَ : اسراف کرنے والوں کو]

ترجمہ: اے اولاد آدم ! تم ہر نماز کے وقت اپنا لباس زینت (پہن) لیا کرو اور کھاؤ اور پیو اور حد سے زیادہ خرچ نہ کرو کہ بیشک وہ بے جا خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا

تشریح: نماز کے وقت پاک اور اچھا لباس زیب تن کرو۔ بدبودار اور قابل نفرت لباس سے دوسرے نمازیوں کو تنگ نہ کرو، لباس یعنی ستر پوشی تو دوسرے اوقات میں بھی واجب ہے، نماز کا ذکر اس لیے ہے کیونکہ مشرکین کعبہ کے طواف کے وقت لباس اتار دیتے تھے۔

آیت "خُذُوازِينَتَكُم" سے معلوم ہونے والے احکام :

اس آیت میں ستر چھپانے اور کپڑے پہننے کا حکم دیا گیا اور اس میں دلیل ہے کہ ستر عورت نماز، طواف بلکہ ہر حال میں واجب ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز جہاں تک ہو سکے اچھے لباس میں پڑھے اور مسجد میں اچھی حالت میں آئے۔ بدبودار کپڑے، بدبودار منہ لے کر مسجد میں نہ آئے۔ ایسے ہی ننگا مسجد میں داخل نہ ہو۔

مسجدیں پاک صاف رکھنے سے متعلق 3 احادیث :

(1)۔۔ حضرت ابو سعید خدری (رض) سے روایت ہے، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جو مسجد سے اذیت کی چیز نکالے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنائے گا۔

(2)۔۔ حضرت واثلہ بن اسقع (رض) سے روایت ہے، تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: " مساجد کو بچوں اور پاگلوں، خرید و فروخت اور جھگڑے، آواز بلند کرنے، حدود قائم کرنے اور تلوار کھینچنے سے بچاؤ۔

(3)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جو کسی کو مسجد میں باآواز بلند گمشدہ چیز ڈھونڈتے سنے تو کہے "اللہ عَزَّوَجَلَّ وہ گمشدہ شے تجھے نہ ملائے، کیونکہ مسجدیں اس کام کیلئے نہیں بنائی گئیں

قیمتی لباس میں نماز :

امام اعظم ابو حنیفہ حضرت نعمان بن ثابت (رض) نماز تہجد کے لیے بیش قیمت قمیص، پاجامہ، عمامہ اور چادر پہنتے تھے جس کی قیمت ڈیڑھ ہزار درہم تھی، آپ (رض) ہر رات تہجد ایسے لباس میں پڑھتے تھے اور فرماتے تھے کہ "جب ہم لوگوں سے اچھے لباس میں ملتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے اعلیٰ لباس میں ملاقات کیوں نہ کریں۔ (5)

{ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا : اور کھاؤ اور پیو۔ } شانِ نزول : کلبی کا قول ہے کہ بنی عامر زمانہ حج میں اپنی خوراک بہت ہی کم کر دیتے تھے اور گوشت اور چکنائی تو بالکل کھاتے ہی نہ تھے اور اس کو حج کی تعظیم جانتے تھے۔ مسلمانوں نے انھیں دیکھ کر عرض کیا : یا رسول اللہ ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ہمیں ایسا کرنے کا زیادہ حق ہے۔ اس پر یہ نازل ہوا (6) کہ کھاؤ اور پیو، گوشت ہو خواہ چکنائی ہو اور اسراف نہ کرو اور وہ (یعنی اسراف) یہ ہے کہ سیر ہو چکنے کے بعد بھی کھاتے رہو یا حرام کی پروانہ کرو اور یہ بھی اسراف ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں کی اس کو حرام کر لو۔ حضرت عبد اللہ بن عباس (رض) نے فرمایا " کھاؤ جو چاہو اور پہنو جو چاہو اور اسراف اور تکبر سے بچتے رہو۔ (1) اس سے معلوم ہوا کہ محض ترکِ دنیا عبادت نہیں ترکِ گناہ عبادت ہے۔

بسیار خوری کی مذمت حدیث سے۔

اس آیت میں وَلَا تُسْرِفُوْا کہہ کر بسیار خوری (ضرورت سے زیادہ کھانا) سے روکا گیا ہے اور یہ انسانی صحت کے لیے نسخۂ کیمیا ہے، زیادہ کھانا محض اور محض بیماری ہے اور دنیا و آخرت کا خسارہ ہے۔

حضرت مقدام بن معدی کرب (رض) سے مروی ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا :

ماملأ آدمی وعاء شرا من بطن، بحسب ابن آدم اکلات یقمن صلبہ فان کان لا محالۃ فثلث لطعامہ و ثلث لشرابہ و ثلث لنفسہ، جو برتن بھرے جاتے ہیں ان میں سب سے برا برتن پیٹ ہے اور ابن آدم کے لئے چند لقمے کافی ہیں جن سے اس کی کمر سیدھی رہے اور اگر اس نے ضرور کھانا ہی ہو تو معدے کے تین حصے بنالے ایک کھانے کے لئے ایک پانی کے لئے اور ایک سانس لینے کے لیے (ترمذی کتاب الزھد باب 47 حدیث ۲۳۸۰)

حضرت عبد اللہ بن عمر (رض) فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے ڈکار لی، آپ نے فرمایا :

کف جشاءک عنا فان اطولکم جوعا یوم القیامۃ اکثر کم شبعا فی دار الدنیا، " ہمارے سامنے ڈکار نہ لو۔ کیونکہ روز قیامت تم میں سے وہ لوگ زیادہ بھوکے ہوں گے جو دنیا میں زیادہ سیر ہوتے ہیں "۔ (ابن ماجہ کتاب الاطعمہ حدیث 3350)

اسی طرح حضرت سلمان فارسی (رض) عنہٗ کو کسی دعوت میں کھانے پر مجبور کیا گیا تو انھوں نے فرمایا، بس یہی کافی ہے، میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا آپ نے فرمایا :

ان اکثر الناس شبعا فی الدنیا اطولھم جوعا یوم القیامۃ " دنیا میں زیادہ سیر ہونے والے روز قیامت زیادہ بھوکے ہوں گے " (ابن ماجہ کتاب الاطعمہ حدیث 3351)

حضرت انس بن مالک (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا :

ان من السرف ان تاکل کل ما اشتھیت، " یہ بات بھی حد سے بڑھنے میں سے ہے کہ جو جی میں آئے کھاتے جاؤ "۔ (ابن ماجہ کتاب الاطعمہ حدیث 3352)

(تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

قرآن کی آدھی آیت میں پورا علم طب :

خلیفہ ہارون رشید کا ایک عیسائی طبیب علم طب میں بہت ماہر تھا، اس نے ایک مرتبہ حضرت علی بن حسین واقد (رح) سے کہا، علم دو طرح کا ہے (1) علمِ ادیان۔ (2) علمِ ابدان۔ اور تم مسلمانوں کی کتاب قرآن پاک میں علم طب سے متعلق کچھ بھی مذکور نہیں۔ آپ (رح) نے اس عیسائی طبیب کو جواب دیا : اللہ تعالیٰ نے ہماری کتاب کی آدھی آیت میں پوری طب کو جمع فرما دیا ہے۔ عیسائی طبیب نے حیران ہو کر پوچھا : وہ کونسی آیت ہے؟ آپ (رح) نے فرمایا : وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے " وَّكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا " کھاؤ اور پیو اور حد سے نہ بڑھو۔

اشیاء کی حلت و حرمت کا اصول :

آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ کھانے اور پینے کی تمام چیزیں حلال ہیں سوائے ان کے جن پر شریعت میں دلیل حرمت قائم ہو کیونکہ یہ قاعدہ مقررہ مُسَلَّمَہ ہے کہ تمام اشیاء میں اصل اباحت ہے مگر جس پر شارع نے ممانعت فرمائی ہو اور اس کی حرمت دلیل مستقل سے ثابت ہو۔ (صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم)

علامہ آلوسی لکھتے ہیں: ایک نصرانی طبیب نے علی بن حسین بن واقد سے کہا: تمہارے قرآن میں علم طب کے متعلق کچھ نہیں ہے۔ علی بن حسین نے کہا: اللہ تعالیٰ نے تمام طب کو اس آیت کے آدھے حصہ میں بیان کر دیا ہے: یعنی "کھاؤ، پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔" تو طبیب بولا: مگر تمہارے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے طب کے بارے میں کیا کہا ہے؟ علی بن حسین نے جواب دیا کہ ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے طب کو چند الفاظ میں جمع کر دیا ہے، یعنی "معدہ ساری بیماریوں کا گھر ہے اور اس کی حفاظت تمام دواؤں کی اصل ہے اور بدن کے ہر حصہ کو اتنا دو جتنا اس کا حق ہے"۔ یہ سن کر نصرانی طبیب کہنے لگا: "تمہارے قرآن اور تمہارے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جالینوس کے لیے طب کا کچھ بھی نہیں چھوڑا۔" (تفسیر روح المعانی) یعنی ان دو جملوں میں اصول طب کو اس قدر جمع کر دیا گیا ہے کہ جالینوس کی طب بھی اس میں سمٹ گئی ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اگر کھانے پینے میں بے احتیاطی نہ کرے تو معدہ درست رہتا ہے اور انسان بیماری سے محفوظ رہتا ہے۔ (تفسیر امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

آیت مبارکہ:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۳

لغۃ القرآن: قُلْ : کہہ دیں] [اِنَّمَا : حقیقت میں] [حَرَّمَ : حرام کردے گا] [رَبِّيَ : میرا رب] [الْفَوَاحِشَ : بےحیائی کے] [مَا : نہیں] [ظَهَرَ : ظاہر ہیں] [مِنْهَا : اس سے] [وَمَا : اور نہ] [بَطَنَ : چھپی ہیں] [وَالْاِثْمَ : اور گناہ کو] [وَالْبَغْيَ : اور بغاوت کو] [بِغَيْرِ الْحَقِّ : ناحق] [وَ : اور] [اَنْ : کہ] [تُشْرِكُوْا : تم سب شریک بناؤ] [بِاللّٰهِ : اللہ کا] [مَالَمْ : جو نہیں] [يُنَزِّلْ : اس نے اتاری] [بِهٖ : اس کو] [سُلْطٰنًا : غلبہ] [وَّاَنْ : اور یہ کہ] [تَقُوْلُوْا : تم سب کہو] [عَلَي اللّٰهِ : اللہ تعالیٰ پر] [مَا لَا : جو نہیں] [تَعْلَمُوْنَ : تم سب جانتے ہو]

ترجمہ: فرما دیجئے کہ میرے رب نے (تو) صرف بے حیائی کی باتوں کو حرام کیا ہے جو ان میں سے ظاہر ہوں اور جو پوشیدہ ہوں (سب کو) اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو اور اس بات کو کہ تم اللہ کا شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی سند نہیں اتاری اور (مزید) یہ کہ تم اللہ (کی ذات) پر ایسی باتیں کہو جو تم خود بھی نہیں جانتے

تشریح:

حلت و حرمت میں انسانی خواہش کو کوئی دخل نہیں۔ بلکہ حلال وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ حلال فرمادے اور حرام وہ ہے جسے وہ حرام قرار دے۔ پہلے کفار و مشرکین کی حرام کردہ اشیاء کے متعلق بتایا کہ یہ محض ان کی اپنی گھڑی ہوئی باتیں ہیں حقیقت سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ اس آیت میں ان امور کی تصریح فرمائی جن کو اس علیم و حکیم نے حرام قرار دیا ہے۔ یہاں حرام کے مختلف انواع کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ (۱) فواحش اس کا واحد فاحشہ ہے جس کا معنی انتہائی قبیح فعل ہے۔ لیکن عرف عام میں اس کا معنی زنا ہے۔ قرآن نے بھی زنا کے متعلق یہی لفظ استعمال کیا ہے۔ انہ کان فاحشۃ۔ مطلب یہ ہوا کہ ہر قسم کا زنا حرام ہے۔ چوری چھپے کیا جائے یا اعلانیہ۔ دوسری قسم اثم ہے۔ اس کا لغوی معنی گناہ ہے لیکن شراب کے کثیر التعداد ناموں سے ایک یہ بھی ہے۔ حسن بصری (رح) نے یہاں اثم کا معنی شراب کیا ہے۔ قال الحسن الاثم الخمر قال الشاعر:۔ شربت الاثم حتی ضل عقلی۔ کذاک الاثم تذھب بالعقول (القرطبیؒ) میں نے شراب (اثم) پی یہاں تک کہ میں بیہوش ہوگیا۔ شراب اسی طرح عقل کو ضائع کر دیتی ہے۔ تیسری قسم البغی ہے۔ اس کا معنی ہے ظلم میں حد سے تجاوز کرنا۔ الظلم و تجاوز الحد فیہ۔ (القرطبیؒ)

چوتھی قسم شرک ہے۔ پانچویں قسم اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹی باتوں کا منسوب کرنا یعنی جو حکم اس نے نہ دیا ہو اس کے متعلق یہ کہنا کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ (رازی و قرطبی و ضیاء)

اس آیت میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذریعے ان مشرکین سے خطاب ہے جو برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی پاک چیزوں کو حرام کر لیتے تھے، ان سے فرمایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں حرام نہیں کیں اور ان سے اپنے بندوں کو نہیں روکا، جن چیزوں کو اس نے حرام فرمایا وہ یہ ہیں جو اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے (1) بے حیائیاں، چاہے ظاہری ہوں یا باطنی، قولی ہوں یا فعلی۔ (2) گناہ۔ (3) ناحق زیادتی۔ (4) ہر طرح کا کفر و شرک۔

{ اَلْفَوَاحِشَ : بے حیائیاں۔ } ہر وہ قول اور فعل جو برا اور فحش ہو اسے فاحشہ کہتے ہیں (1) آیت میں "اَلْفَوَاحِشَ" سے مراد ہر کبیرہ گناہ ہے، جو علانیہ کیا جائے وہ "مَا ظَهَرَ" یعنی ظاہری ہے اور جو خفیہ کیا جائے وہ "مَا بَطَنَ" یعنی باطنی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ "فَوَاحِشُ" سے وہ گناہ مراد ہیں جن میں شرعی سزا لازم نہ ہو اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد زنا ہے، جو بدکاری علی الاعلان ہو (جیسے اجرت دے کر پیشہ ور عورتوں سے بدکاری کرنا، کلبوں اور ہوٹلوں سے کال گرلز، سوسائٹی گرلز بک کر کے بدکاری کرنا) یہ "مَا ظَهَرَ" ہے اور جو زنا خفیہ طریقے سے کیا جائے جیسے کسی جوان لڑکی یا عورت سے عشق و محبت کے نتیجے میں یا پیار کا جھانسا دے کر زنا کرنا، یہ "مَا بَطَنَ" ہے۔

ظاہری و باطنی بے حیائیوں کو حرام قرار دیئے جانے کی وجہ:

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "اللہ عَزَّوَجَلَّ سے زیادہ کوئی غیور نہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تمام ظاہری اور باطنی فَوَاحِشُ یعنی بے حیائیوں کو حرام کر دیا۔

حضرت سعد بن عبادہ (رض) نے فرمایا: "اگر میں کسی کو اپنی بیوی کے ساتھ دیکھ لوں تو تلوار کی دھار سے اس کی جان نکال کے رکھ دوں۔ جب یہ بات رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سنی تو ارشاد فرمایا: "تم سعد کی غیرت پر تعجب کرتے ہو! حالانکہ اللہ تعالیٰ کی قسم! میں ان سے زیادہ غیرت مند ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے زیادہ غیور ہے، اسی غیرت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بے حیائی کے کاموں کو حرام فرما دیا ہے، چاہے بے حیائی ظاہر ہو یا پوشیدہ۔

{ وَالْاِثْمَ : اور گناہ۔ } فواحش کی طرح "اَلْاِثْمَ" کی تفسیر میں بھی چند قول ہیں (1) ہر صغیرہ گناہ "اَلْاِثْمَ" ہے۔ (2) وہ گناہ کہ جس پر شرعی سزا لازم نہ ہو "اَلْاِثْمَ" ہے۔ (3) ہر گناہ "اَلْاِثْمَ" ہے چاہے صغیرہ ہو یا کبیرہ۔

{ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ : اور ناحق زیادتی۔ } "اَلْبَغْيَ" کا معنی ہے: ظلم، تکبر، لوگوں پر زیادتی کرنا اور ان سب چیزوں میں حد سے بڑھ جانا۔ ناحق زیادتی کا معنی ہے "کسی شخص کا اس چیز کو طلب کرنا جو اس کا حق نہیں جبکہ اپنے حق کو طلب کرنا اس میں داخل نہیں۔ (تفسیر صراط الجنان)

اللہ اور اس کے رسول پر کذب بیانی کرنا:

یعنی اپنے جی سے حلال و حرام ٹھہرانا، اپنی خواہشوں کی پیروی اور ثواب کی خاطر دین میں بدعتیں ایجاد کرنا، من مرضی سے شریعت تصنیف کر کے اس کو اللہ کی طرف منسوب کرنا۔

اس اعتبار سے جو شخص رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف جھوٹی اور من گھڑت حدیث منسوب کرتا ہے وہ بالواسطہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ جھوٹ لگاتا ہے۔

(عَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ اَبِيهِ قَالَ قُلْتُ لِلزُّبَيْرِ (رض) اِنِّي لَا اَسْمَعُكَ تُحَدِّثُ عَنْ رَّسُولِ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) كَمَا يُحَدِّثُ فُلَانٌ وَفُلَانٌ قَالَ اَمَا اِنِّي لَمْ اُفَارِقْهُ وَلٰكِنْ سَمِعْتُهُ يَقُولُ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ) [رواہ البخاری: کتاب العلم، باب اثم من کذب علی النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)]

"حضرت عامر بن عبداللہ بن زبیر اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے والد زبیر (رض) سے کہا میں نے آپ کو نہیں سنا کہ آپ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے حدیث بیان کریں جس طرح فلاں فلاں آدمی بیان کرتا ہے۔ حضرت زبیر (رض) نے کہا میں نے ہمیشہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ بات سنی کہ آپ نے فرمایا جو کوئی میری جانب جھوٹ کی نسبت کرے اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم سمجھے۔"

(عَنۡ اَنَسِ بۡنِ مَالِكٍ (رض) قَالَ كَانَ رَسُولُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یَتَعَوَّذُ یَقُولُ "اللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوذُ بِکَ مِنَ الۡکَسَلِ وَاَعُوذُ بِکَ مِنَ الۡجُبۡنِ وَاَعُوذُ بِکَ مِنَ الۡھَرَمِ وَاَعُوذُ بِکَ مِنَ الۡبُخۡلِ")

[رواہ البخاری: کتاب الدعوات، باب التعوذ من ارذل العمر]

"حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہوئے یہ دعا کیا کرتے تھے اے اللہ میں سستی، بزدلی، ناکارہ پن، بڑھاپے اور بخل سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔" (تفسیر فہم القرآن)

بے حیائی حرام ہے:

اثم سے عام گناہ مراد ہیں اور بعض مخصوص گناہوں کو مناسبت مقام یا اہمیت کی وجہ سے بیان فرما دیا۔ اثم وہ گناہ ہے جس کا تعلق گناہ کرنے والے کے سوا دوسرے لوگوں سے نہ ہو۔ واللہ اعلم۔

تمام بے حیائی کی باتیں اللہ نے حرام کر دی ہیں۔ کشف عورت بھی بے حیائی ہے اللہ نے اس کو بھی حرام کر دیا لیکن باوجود کشف عورت کے حرمت اور ستر عورت۔ فرض نماز کی ادائیگی بھی برہنہ بدن نماز پڑھنے سے ہو جائے گی کیونکہ نماز کی حالت میں ستر عورت ہونا واجب ہے مگر شرط نہیں ہے ہاں گناہ گار ضرور ہو گا۔ البتہ اجماع علماء ہے کہ نماز میں ستر عورت ہونا فرض ہے (بغیر ستر عورت کے نماز نہیں ہوتی)

اوڑھنی کے بغیر نماز:

حضرت عائشہ (رض) کی مرفوع روایت بھی ہے کہ اللہ بالغہ عورت کی نماز بغیر اوڑھنی کے قبول نہیں فرماتا ہے۔ رواہ ابوداؤد والترمذی والحاکم وابن خزیمۃ۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور حاکم نے صحیح کہا۔

برہنہ طواف کرنا:

امام ابو حنیفہ نے فرمایا کہ اگر کوئی برہنہ طواف کرے گا تو گناہ گار ضرور ہو گا مگر فرض طواف ادا ہو جائے گا۔ حضرت ابوہریرہ (رض) کا بیان ہے کہ حج وداع سے ایک سال پہلے جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابو بکر کو امیر حج بنا کر بھیجا تو آپ نے مجھے ایک جماعت کے ساتھ مقرر فرما کر حکم دیا کہ قربانی کے دن سب لوگوں میں اعلان کر دو اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ کوئی برہنہ طواف کرے گا۔

حضرت عثمان (رض) کی حیاء داری:

حضرت عائشہ (رض) کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) گھر کے اندر دونوں رانیں یا دونوں پنڈلیاں کھولے لیٹے ہوئے تھے اتنے میں حضرت ابو بکر نے داخلہ کی اجازت طلب کی۔ آپ نے اسی حالت پر (لیٹے لیٹے) اجازت دیدی، پھر عمر داخل ہونے کے خواستگار ہوئے آپ نے اسی حالت میں ان کو بھی اجازت دے دی۔ کچھ دیر کے بعد عثمان طالب اجازت ہوئے تو آپ کپڑوں کو ٹھیک کر کے بیٹھ گئے۔ رواہ مسلم۔

ران کو ڈھانپنا ضروری ہے:

حضرت محمد بن جحش کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت معمر کی طرف سے گزر معمر حبوہ بنائے بیٹھے تھے ران کا کچھ حصہ کھلا ہوا تھا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا معمر اپنی ران ڈھانک لو۔ ران بھی پوشیدنی عضو ہے۔ رواہ احمد والبخاری فی التاریخ والحاکم فی المستدرک۔ حافظ نے کہا اس حدیث کے تمام راوی سوائے ابو کثیر کے صحیح کے راوی ہیں۔ ابو کثیر کی روایت ایک جماعت نے لی ہے اور اس کے متعلق میں نے کسی کی طرف سے جرح اور تعدیل نہیں پائی۔

مسئلہ امام اعظم کے نزدیک زانو بھی پوشیدنی اعضاء میں داخل ہے۔ حضرت علی (رض) کی روایت ہے میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا آپ فرما رہے تھے زانو پوشیدنی اعضاء میں سے ہے۔ اس حدیث کی روایت میں عقبہ بن علقمہ راوی ہے جس کو ابو حاتم رازی اور نصر بن منصور نے ضعیف کہا ہے۔

عورت کا لباس : رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بالغہ کی نماز بغیر اوڑھنی کے قبول نہیں کی جاتی۔ یہ بھی فرمایا عورت (سراسر) پوشیدنی ہے۔ رواہ الترمذی من حدیث ابن مسعود۔ ابوداؤد نے مرسلاً بیان کیا ہے کہ لڑکی جب بالغ ہو جائے تو اس کے چہرے اور پہنچوں سے دونوں ہاتھوں کے علاوہ دیکھا جانا درست نہیں۔

حضرت ام سلمہ (رض) کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دریافت کیا۔ کیا عورت صرف کرتہ اور اوڑھنی پہن کر بغیر تہبند پہنے نماز پڑھ سکتی ہے۔ فرمایا (پڑھ سکتی ہے) اگر کرتہ اتنا لمبا ہو کہ قدموں کی پشت کو ڈھانک رہا ہو۔ رواہ الدار قطنی۔

مسئلہ : امام اعظم کے نزدیک باندی کے پردہ کے اعضاء مرد کے پردہ کے اعضاء کی طرح ہیں لیکن پیٹ اور پشت بھی پوشیدنی اعضاء میں داخل ہیں۔

باندی اور آزاد عورت کا فرق :

بیہقی نے بروایت نافع لکھا ہے کہ صفیہ بنت ابی عبید نے بیان کیا کہ ایک عورت اوڑھنی پہنے چادر ڈالے نکلی۔ حضرت عمر نے پوچھا یہ کون ہے۔ جواب دیا گیا آپ ہی کی اولاد میں سے فلاں شخص کی باندی ہے۔ آپ نے حضرت حفصہ کے پاس پیام بھیجا اور فرمایا کیا وجہ کہ تم نے اوڑھنی اور چادر پہنا کر باندی کو بیاہتا آزاد عورتوں جیسا بنا دیا یہاں تک کہ میں اس کو آزاد شوہر والی عورتوں میں سمجھنے لگا اور آزاد شوہر والی خیال کرکے قریب تھا کہ میں اس کی گرفت کرتا باندیوں کو آزاد شوہر والی عورتوں جیسا نہ بنایا کرو۔ بیہقی نے لکھا ہے حضرت عمر (رض) کے اس کے متعلق اقوال صحیح الروایۃ ہیں۔

نماز میں لباس ضروری ہے :

طحاوی نے حضرت ابن عمر (رض) کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو دو کپڑے پہن لیا کرے کیونکہ اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کے سامنے آنے وقت زینت کی جائے (یعنی پورا لباس پہنا جائے) بخاری نے حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک شخص کھڑا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے صرف ایک کپڑا پہن کر نماز پڑھنے کا حکم دریافت کیا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کیا تم میں سے ہر ایک کے پاس دو کپڑے ہوتے ہیں (یعنی ہر شخص کو تو دو کپڑے اور پورا جوڑا پہننے کی توفیق نہیں۔ پھر ایک کپڑا ہی پہن کر نماز پڑھے گا)۔ پھر مدت کے بعد ایک شخص نے حضرت عمر سے یہی مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا جب اللہ نے کشائش عطا فرما دی ہے تو لوگوں نے بھی کشائش سے کام لیا لوگوں نے پورے کپڑے پہن کر نماز پڑھی، کسی نے تہبند اور چادر پہن کر کسی پائجامہ اور کرتہ پہن کر کسی نے پائجامہ اور چوغہ پہن کر کسی نے تبان اور قبا و تبان اور قمیص پہن کر۔ اور شاید یہ بھی فرمایا کسی نے تبان اور چادر پہن کر (تفسیر مظہری، تفسیر گلدستہ)

آیت مبارکہ:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ۝۳۴

لغۃ القرآن: وَلِكُلِّ : اور کے لیے] [اُمَّةٍ : بہترین امت] [اَجَلٌ : معین] [فَاِذَا : پس جب] [جَآءَ : آیا ہو] [اَجَلُهُمْ : ان کا وقت] [لَا : نہیں] [يَسْتَاْخِرُوْنَ : وہ سب پیچھے ہوتے] [سَاعَةً : ایک لحظہ] [وَلَا : اور نہ] [يَسْتَقْدِمُوْنَ : وہ سب آگے ہوتے ہیں]

ترجمہ: اور ہر گروہ کے لیے ایک میعاد (مقرر) ہے پھر جب ان کا (مقررہ) وقت آجاتا ہے تو وہ ایک گھڑی (بھی) پیچھے نہیں ہٹ سکتے اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں

تشریح:۔ اس آیت کے نزول سے پہلے کچھ لوگ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے اور کہا کہ آپ کہتے ہیں اللہ کی نافرمانی سے عذاب آتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی گناہ کرتا ہے اور اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس آیت میں اسے جو جواب دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اے شخص تو اس لیے کچھ دن کے لیے بچا ہوا ہے

کہ تیری قوم کو مہلت ملی ہوئی ہے۔ وہ گناہگار شخص قوم کی پناہ میں ہے اور جب تک وہ اس کی خبر گیری کرتی رہے گی وہ بچارہ سکتا ہے لیکن یہ قوم ایک دن فنا ہو گی اور پھر اس شخص کا کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔

2۔ امت کو مہلت ملنا دنیا کی بناوٹ میں داخل ہے تاکہ وہ اپنے افراد کو سیدھے راستے پر چلائے جب وہ اس قابل نہ رہے گی ختم ہو جائے گی جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی عزت نیک نامی برباد ہو جائے گی اور وہ ذلیلوں کی طرح زندگی بسر کرے گی اس کا وقار اور دبدبہ جاتا رہے گا اور دوسری قومیں اس پر مسلط کر دی جائیں گی اور یہ اس کا نتیجہ ہوگا کہ وہ اپنے عروج کے زمانے میں جب اس کو مہلت ملی ہوئی تھی اپنے افراد کو نہ سنبھال سکی۔ افراد کو یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ ہمارے گناہوں سے ہماری قوم تباہ ہو گی اس کی تباہی ہماری یقینی تباہی ہے۔ (تفسیر درس قرآن آسٹریلیا)

جو قوم اپنی کوتاہیوں سے سبق نہیں سیکھتی اور مسلسل زوال پذیر رہتی ہے تو آخر کار اس پر عذاب کی ایک ایسی گھڑی آجاتی ہے کہ اس میں لمحہ بھر بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل س۔
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

(تفسیر امداد الکرم)

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر ذی روح اور چیز کی موت اور فنا کا وقت مقرر کر رکھا ہے جب وقت آئے گا تو اس میں لمحہ بھر تقدیم و تاخیر نہیں ہو گی۔ یہی اصول قوموں اور امتوں کے لیے مقرر کیا گیا ہے جب کسی قوم کے زوال اور تباہی کا وقت آتا ہے تو پھر اس کے اڑوس پڑوس کی اقوام اور خیر خواہ اسے ہر گز نہیں بچا سکتے۔ افراد اور اقوام کی اجل یعنی موت میں فرق یہ ہے کہ افراد کی عمر اور مدت کے لیے سال، مہینے، ایام اور لمحے مقرر کیے گئے ہیں اور لوگ انھی کو شمار کرتے ہیں جب یہ مدت پوری ہو جائے تو انسان لقمہ اجل بن جاتا ہے۔ عام طور پر قوموں اور امتوں کا معاملہ اس سے قدرے مختلف ہوتا ہے ان کی موت، ایمان، اخلاق اور کردار کے حوالے سے واقع ہوتی ہے۔ بد کردار اور بے عمل قوم کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ بسا اوقات اللہ تعالیٰ اپنے غضب سے پوری کی پوری قوم کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ جس طرح قوم نوح، عاد، ثمود اور قوم لوط کے واقعات اس کی دلیل ہیں۔ تاہم جب کوئی قوم یا علاقے کے افراد برائی کے اس درجے کو پہنچ جائیں جس سے اس خطے کا نظام بگڑنے کے قریب پہنچ جائے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کی جگہ دوسری قوم کو مسلط کر دیتا ہے۔ اس حقیقت کو سورۃ البقرۃ، آیت ۲۵۱ اور ۲۵۲ میں بیان کرتے ہوئے ظالم قوم کی تبدیلی کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل اور اپنی قدرت کی نشانی قرار دیا ہے اور سورۃ محمد میں فرمایا اگر تم اللہ تعالیٰ کے احکام سے منہ پھیر وگے تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا جو تم جیسے نہیں ہوں گے۔ یہاں قوموں کے زوال اور ان کی تباہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اجل اور ساعت کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اجل سے مراد موت کا فیصلہ کن مرحلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں قوم کی موت یا زوال کی گھڑی متعین ہے۔ جب وہ گھڑی اپنے وقت کو پہنچ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ صادر ہو جاتا ہے جس کے صدور میں لشکر و سپاہ، قوم کی شان و شکوہ، مادی اور عسکری وسائل رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ اسی حقیقت کو یہاں بیان کیا گیا ہے کہ جب کسی امت کی مقررہ گھڑی آجاتی ہے تو اس میں لمحہ بھر کے لیے آگا پیچھا نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہی فرد کی موت کا معاملہ ہے جب موت کا وقت آن پہنچے تو ولی کی ولایت، صابر کا صبر موت کو ٹال نہیں سکتا۔ (یونس: ۴۹)

موت کا نقشہ :

(عَنۡ عَبۡدِ اللَّہِ (رض) قَالَ خَطَّ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خَطًّا مُرَبَّعًا، وَخَطَّ خَطًّا فِي الۡوَسَطِ خَارِجًا مِنۡهُ، وَخَطَّ خُطُطًا صِغَارًا إِلَى ہٰذَا الَّذِي فِي الۡوَسَطِ، مِنۡ جَانِبِہِ الَّذِي فِي الۡوَسَطِ وَقَالَ ہٰذَا الۡإِنۡسَانُ، وَہٰذَا أَجَلُهُ مُحِيطٌ بِہِ أَوۡ قَدۡ أَحَاطَ بِہِ وَہٰذَا الَّذِي ہُوَ خَارِجٌ أَمَلُهُ، وَہٰذِہِ الۡخُطُطُ الصِّغَارُ الۡأَعۡرَاضُ، فَإِنۡ أَخۡطَأَهُ ہٰذَا نَهَشَهُ ہٰذَا، وَإِنۡ أَخۡطَأَهُ ہٰذَا نَهَشَهُ ہٰذَا) [رواہ البخاری : باب فِي الۡأَمَلِ وَطُولِہِ]

" حضرت عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مربع کی صورت بنائی اور اس کے درمیان ایک خط کھینچا جو مربع سے باہر نکل رہا تھا اور کچھ چھوٹے چھوٹے خط اس کے دائیں بائیں کھینچے درمیان والی لکیر پر انگلی رکھ کر فرمایا یہ انسان ہے اور اس کو چاروں طرف سے اجل گھیرے ہوئے ہے۔ باہر نکلنے والا خط اس کی امید ہے اور چھوٹے چھوٹے خط اس کی خواہشات ہیں ایک خواہش ختم ہوتی ہے تو دوسری آگھیرتی ہے۔" (تفسیر فہم القرآن)

موت کے لیے ہر وقت تیار رہیں:

چونکہ موت کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہے اس لیے ہر وقت موت کیلئے تیار رہنا چاہیے اور ہر وقت گناہوں سے دور اور نیک اعمال میں مصروف رہنا چاہیے۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا" پانچ چیزوں کو پانچ سے پہلے غنیمت جانو۔ (1) اپنے بڑھاپے سے پہلے جوانی کو۔ (2) اپنی بیماری سے پہلے صحت کو۔ (3) اپنی محتاجی سے پہلے مالداری کو۔ (4) اپنی مصروفیت سے پہلے فراغت کو۔ (5) اپنی موت سے پہلے زندگی کو۔ (1)

حضرت حسن بصری (رح) اپنے وعظ میں فرماتے " جلدی کرو جلدی کرو کیونکہ یہ چند سانس ہیں، اگر رک گئے تو تم وہ اعمال نہیں کر سکو گے جو تمہیں اللہ تعالیٰ کے قریب کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو اپنے نفس کی فکر کرتا ہے اور اپنے گناہوں پر روتا ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

اس آیت میں قانون کا ذکر ہے اور تقدیر کی تبدیلی والی آیت میں رب کی قدرت کا ذکر ہے۔ رب فرماتا ہے یمحوا اللہ مایشاء ویثبت وعندہ ام الکتاب۔ اسی لیے حضرت آدم (علیہ السلام) کی دعا سے حضرت داؤد کی عمر چالیس سال زیادہ ہو گئی۔ لہٰذا یہ واقعات اس آیت کے خلاف نہیں۔ شیطان کی دعا سے اس کی عمر لمبی کر دی گئی۔ رب نے فرمایا انک من المنظرین جب شیطان مردود کی دعا سے عمر میں زیادتی ہو سکتی ہے۔ تو صالحین کی دعا یا نیک اعمال سے بھی عمریں بڑھ سکتی ہیں بگڑی تقدیریں بن سکتی ہیں۔ (تفسیر نور العرفان)

کیا عمر بڑھتی ہے؟

ا۔ امام ابن ابی حاتم، طرابی، ابوالشیخ، ابن مردویہ، خطیب نے تالی التلخیص میں اور ابن النجار نے تاریخ میں ابو درداء (رض) سے روایت کیا کہ ہم نے آپس میں ذکر کیا عمر کے زیادہ ہونے کا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ہم نے کہا جس نے صلہ رحمی کی تو اس کی عمر میں زیادتی کر دی جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا اس کی عمر میں زیادتی نہیں ہوتی (کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے فرمایا لفظ آیت " فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون "لیکن کوئی آدمی جس کی نیک اولاد ہو اور وہ اللہ تعالیٰ سے اس کے بعد دعا کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس تک پہنچا دیتے ہیں یہ وہ چیز ہے جو اس کی مدت میں تاخیر کر دیتی ہے۔ اور دوسرے لفظ میں یوں ہے تو ان کی دعا اس کی قبر میں ملتی ہے۔ اور یہ ہوتا ہے عمر کا زیادہ ہونا۔

۲۔ امام عبدالرزاق، ابن جریر، ابن منذر نے زہر کے طریق سے ابن المسیب (رح) سے روایت کیا کہ حضرت عمر (رض) کو نیزہ مارا گیا تو کعب (رح) نے فرمایا اگر عمر (رض) اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تو ان کی موت موخر ہو جاتی۔ ان سے کہا گیا کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا؟ لفظ آیت " فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون" کعب نے فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے (یہ بھی) فرمایا لفظ آیت " ومایعمر من معمر ولاینقص من عمرۃ الا فی کتب "زہری نے فرمایا کوئی ایسا نہیں ہے کہ اس کی عمر لکھی گئی ہے۔ اور یہ دیکھا گیا جب اس کی مدت حاضر نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ موخر کر دیتے ہیں جو چاہتے ہیں اور کم کر دیتے ہیں (جو چاہتے ہیں) اور فرمایا لفظ آیت " فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون"

(۳) امام ابن سعد نے طبقات میں کعب (رض) سے روایت کیا کہ بنی اسرائیل میں ایک بادشاہ تھا۔ جب ہم نے اس کا ذکر کیا تو ہم نے عمر کا بھی ذکر کیا۔ اور جب ہم نے عمر کا ذکر کیا تو ہم نے اس کا بھی ذکر کیا۔ اور اس کے پہلو میں ایک نبی (رہتے) تھے کہ ان کی طرف وحی کی جاتی تھی اللہ تعالیٰ نے نبی کو وحی فرمائی کہ اس سے کہو کہ اپنا معاہدہ لکھ لے وصیت بھی لکھ دے کیونکہ وہ تین دن تک مرنے والا ہے نبی نے اس کو اس بات کی خبر دیدی۔ جب تیسرا دن تھا تو وہ دیوار اور تخت کے درمیان گر پڑا پھر اپنے رب سے درخواست کی اور کہا اے اللہ اگر تو چاہتا ہے کہ میں حکم میں انصاف کرنے والا تھا۔ اور جب معاملات بکھر جاتے ہیں تو میں آپ سے ہدایت اور رہنمائی طلب کرتا ہوں آپ میری عمر میں زیادتی کر دیجئے یہاں تک کہ میرے بچے بڑے ہو جائیں اور اپنی امت کی تربیت کروں تو اللہ تعالیٰ نے نبی کی طرف وحی

بھیجی کہ اس نے ایسا ایسا کہا ہے۔ اور اس نے سچ کہا ہے۔ میں نے اس کی عمر میں پندرہ سال زیادہ کر دیئے اور اس (مدت) میں اس کے بچے بڑے ہو جائیں گے اور اس کی امت بھی پرورش پالے گی جب عمر (رض) کو نیزہ مارا گیا تو کعب نے فرمایا اگر عمر (اللہ تعالیٰ سے) سوال کریں تو وہ ضرور ان کو باقی رکھیں گے۔ عمر (رض) کو اس بات کی خبر دی گئی تو فرمایا اے اللہ مجھے قبض کر لے (یعنی موت دیدے) اس حال میں کہ نہ تو میں عاجز ہوں اور نہ مجھ پر ملامت کی جائے۔

(۴) امام ابن سعد نے ابن ابی ملیکہ (رض) سے روایت کیا کہ جب عمر کو نیزہ مارا گیا تو کعب تشریف لائے اور دروازے کے پاس رونا شروع کر دیا اور کہہ رہے تھے اللہ کی قسم اگر امیر المومنین اللہ تعالیٰ پر قسم کھالیں ان کی موت میں تاخیر دے دی جائے تو ضرور ان کی تاخیر کر دی جائے گی۔ ابن عباس ان کے پاس تشریف لائے اور عرض کیا اے امیر المومنین یہ کعب اس طرح اور اس طرح کہتا ہے فرمایا تب تو میں اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کروں گا۔

(۵) امام بیہقی نے دلائل میں اور ابن عساکر نے یحیٰی بن عبدالرحمٰن بن لبسہ (رح) سے روایت کیا کہ وہ اپنے باپ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ سعد بن ابی وقاص (رض) تشریف لائے اور فرمایا اے میرے رب میرے بیٹے چھوٹے ہیں مجھ سے موت کو موخر فرمادیں یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائیں تو ان سے موت بیس سال کے لیے موخر کر دی گئی۔

(۶) احمد نے ثوبان (رض) سے روایت کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص کو یہ خوش لگے کہ اس کی موت موخر کر دی جائے اور رزق میں اضافہ کر دیا جائے تو اس کو چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔

(۷) امام حکیم ترمذی نے ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو آدمی میری امت کے معاملات میں کسی چیز کا نگران بنایا گیا اور اس کی نیت اچھی رہی تو رعب ڈال دیا جائے گا لوگوں کے دلوں میں اور جب اس نے لوگوں کی طرف خیر اور بھلائی کا ہاتھ بڑھایا تو محبت ڈال دی جائے گی اس کی ان کے دلوں میں اور جب اس نے زیادہ کر دیا ان کے مالوں کو تو اللہ تعالیٰ بھی زیادہ کریں گے اس پر اس کے مال کو اور جب ضعیف کو انصاف دلائے گا قوی سے۔ تو اللہ تعالیٰ قوت دیں گے اس کی بادشاہی کو اور جب انصاف کرے گا تو اس کی عمر میں زیادتی فرمادیں گے۔

(۸) امام ابن ابی شیبہ نے ابن عمر (رض) سے روایت کیا کہ جو شخص اپنے رب سے ڈر گیا اور صلی رحمی کی تو اس کی عمر میں زیادتی کر دی جائے گی اور اس کا مال بڑھ جائے گا اور اس سے اس کے اہل وعیال محبت کریں گے۔ (تفسیر در منثور)

آیت مبارکہ:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۳۵

لغۃ القرآن: يٰبَنِيْٓ : اے اولاد !] [اٰدَمَ : آدم] [اِمَّا : اگر] [يَاْتِيَنَّكُمْ : آئے تمہارے پاس] [رُسُلٌ : کئی رسول] [مِّنْكُمْ : تم میں سے] [يَقُصُّوْنَ : وہ سب بیان کرتے تھے] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [اٰيٰتِيْ : میری آیتیں] [فَمَنِ : پھر جو] [اتَّقٰى : بچا رہے] [وَاَصْلَحَ : اور " اپنی " اصلاح کرلے] [فَلَا : پس نہیں] [خَوْفٌ : کوئی خوف] [عَلَيْهِمْ : ان پر] [وَلَا : اور نہ] [هُمْ يَحْزَنُوْنَ : وہ سب غم گین ہوں گے [

ترجمہ: اے اولاد آدم ! اگر تمہارے پاس تم میں سے رسول آئیں جو تم پر میری آیتیں بیان کریں پس جو پرہیزگار بن گیا اور اس نے (اپنی) اصلاح کر لی تو ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ (ہی) وہ رنجیدہ ہوں گے

تشریح: قوم کی اجتماعی تباہی کا اشارہ دینے کے بعد بنی آدم کو اجتماعی خطاب اور نصیحت کرتے ہوئے نیک وبد کا انجام بیان کیا ہے یہی قرآن مجید کا اسلوب ہے کہ وہ انتباہ اور نصیحت کو برابر چلاتے ہوئے لوگوں کو اچھے اور برے انجام سے آگاہ کرتا ہے تاکہ سننے والا ایک لمحہ میں فیصلہ کر سکے۔
اللہ تعالیٰ نے جب آدم (علیہ السلام) اور ان کی زوجہ مکرمہ کو زمین پر اترنے کا حکم صادر فرمایا تو اس وقت نصیحت فرمائی کہ تم سب کے سب زمین پر اتر جاؤ۔ بس جب تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو اس کی پیروی کرو اور جو اس ہدایت کی پیروی کریں گے انھیں کوئی خوف وخطر اور رنج وملال نہیں ہوگا۔ جنہوں نے انکار کیا اور جھٹلانے کا رویہ اختیار کیا انھیں آگ میں جھونکا جائے گا اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہاں قوموں کے زوال اور ان کے فنا کا ذکر ہوا ہے لہٰذا انھیں اجتماعی طور پر مخاطب کرتے ہوئے بنی آدم کے الفاظ استعمال کر کے وہ نصیحت یاد دلائی گئی ہے جو بنی نوع انسان کے جد اعلیٰ کو زمین پر اترنے کے وقت دی گئی تھی چنانچہ ارشاد ہوا کہ اے بنی آدم جب میرے رسول تمہارے سامنے میرے احکام بیان کریں تو میری نافرمانی سے بچ کر تمہیں اپنی اصلاح کرنا چاہیے۔ جس کا دوسرا مفہوم یہ ہے میں نے اول روز کے فرمان کو اس طرح پورا کر دیا ہے کہ تمہارے پاس میرے رسول میرے احکام لے کر پہنچ چکے ہیں جن میں آخری رسول محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں لہٰذا جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈر کر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیروی کر کے اپنی اصلاح کریں گے انھیں کوئی خوف وغم نہیں ہوگا اور جنہوں نے میرے احکام کی تکذیب کی اور ان کے ساتھ تکبر کا رویہ اختیار کیا انھیں آگ میں جھونکا جائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔
(عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ (رض) عَنِ النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ مِنْ کِبْرٍ قَالَ رَجُلٌ إِنَّ الرَّجُلَ یُحِبُّ أَنْ یَکُوْنَ ثَوْبُہٗ حَسَنًا وَنَعْلُہٗ حَسَنَۃً قَالَ إِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ الْکِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ) [رواہ مسلم : کتاب الایمان، باب تحریم الکبر]
” حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ ایک آدمی نے کہا بلاشبہ بندہ یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اور جوتے اچھے ہوں، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے تکبر حق کو جھٹلانا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔“ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)
رسول کا ان لوگوں کی جنس سے ہونا جن کی طرف اس کو مبعوث کیا گیا : اس آیت میں اولاد آدم سے مراد اہل مکہ ہیں اور رسل سے مراد سید الرسل، خاتم الانبیاء (علیہ الصلوۃ والسلام) ہیں اور آپ کے متعلق جمع کا صیغہ اس لیے استعمال فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ میں اپنے رسول کو اسی سنت کے مطابق بھیجا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ پہلی امتوں میں اپنے رسول بھیجتا رہا تھا۔ رسولوں کو اس صفت کے ساتھ مقید فرمایا ہے کہ وہ خود تم میں سے ہیں۔ اس قید کے متعلق امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی 606ھ فرماتے ہیں۔ اس کی حسب ذیل وجوہ ہیں :
(الف) جب رسول لوگوں کی جنس سے ہوگا تو لوگوں پر اللہ کی حجت بہ طریق اولی پوری ہوگی۔
(ب)۔ لوگوں کو اس رسول کے حالات اور اس کا پاک دامن ہونا پہلے سے معلوم ہوگا۔
(ج) لوگوں کو اس کی قوت اور طاقت کا حال پہلے سے معلوم ہوگا اور جب اس سے معجزات کا ظہور ہوگا تو وہ جان جائیں گے کہ یہ افعال اس کی قوت اور طاقت سے باہر ہیں تو یہ معجزات لامحالہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ظاہر ہوئے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا : " ولوجعلنہ ملکا لجعلنہ رجلا : اور اگر ہم فرشتہ کو رسول بناتے تو ضرور اس کو مرد ہی بناتے " (الانعام : 9)
کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کسی جن یا فرشتہ کو اس کی اصل حقیقت کے اعتبار سے رسول بناتا تو یہ گمان کیا جاسکتا تھا کہ یہ معجزات اس کی اپنی غیر معمولی قوت سے ظہور میں آئے ہیں اور جب انسان کو رسول بنایا گیا اور اس نے چاند کو دو ٹکڑے کیا اور ڈوبا ہوا سورج لوٹایا اور درختوں سے کلمہ پڑھوایا تو معلوم ہوگیا کہ یہ افعال انسان کی قوت میں نہیں ہیں تو ضرو اللہ کا فعل ہیں اور یہ شخص ضرور اللہ کا نمائندہ اور اس کا رسول ہے جس کی تصدیق کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ غیر معمولی افعال پیدا کیے ہیں اور اس کی تائید کے لیے معجزات ظاہر فرمائے ہیں۔
(د)۔ اگر وہ رسول کسی اور جنس سے ہوتا تو لوگ اس کے ساتھ الفت اور محبت نہ ہوتی۔ (تفسیر کبیر، ج 5، ص 235، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی 668ھ سے لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ رسول لوگوں کی جنس سے ہوں گے تاکہ رسولوں کی دعوت کا قبول کرنا زیادہ قریب ہو۔ (الجامع لاحکام القرآن، ج 7، ص 182، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415ھ)

علامہ ابن عاشور لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ رسول تم میں سے ہوں گے یعنی بنو آدم سے ہوں گے۔ اس میں بنو آدم کو یہ تنبیہ ہے کہ وہ یہ توقع نہ کیں کہ ان کے پاس فرشتوں میں سے کوئی رسول آئے گا، کیونکہ رسول مرسل الیہم کی جنس سے ہوتا ہے اور اس آیت میں پچھلی امتوں کے ان جاہلوں پر تعریض ہے جنھوں نے اپنے رسولوں کی رسالت کا اس لیے انکار کیا تھا کہ وہ ان کی جنس سے تھے۔ مثلاً قوم نوح نے کہا: "مانرک الا بشرا مثلنا: (اے نوح!) ہم تمھیں صرف اپنے ہی جیسا بشر دیکھتے ہیں" (ھود: 27)۔

اور مکہ کے مشرکین نے بھی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت کا صرف اس لیے انکار کیا کہ آپ بشر تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وما منع الناس ان یومنوا اذ جاء ہم الھدی الا ان قالوا ابعث اللہ بشر رسولا۔ قل لو کان فی الارض ملائکۃ یمشون مطمئنین لنزلنا علیھم من السماء ملکا رسولا: اور لوگوں کو ایمان لانے سے صرف اس چیز نے روکا جب ان کے پاس ہدایت آچکی تھی کہ انھوں نے کہا کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا؟۔ آپ کہئے کہ اگر زمین میں (رہنے والے) فرشتے ہوتے جو (اس میں) اطمینان سے چلتے پھرتے تو ہم ضرور ان پر آسمان سے کوئی فرشتہ ہی رسول بنا کر اتارتے" (بنی اسرائیل: 94-95)

ان آیتوں میں یہ تصریح ہے کہ رسول مرسل الیہم کی جنس سے ہوتا ہے: (التحریر والتنویر، ج 8، ص 108، مطبوعہ تیونس)

صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی 1367ھ اعلی حضرت قدس سرہ کے ترجمہ کے ساتھ ملا کر سورۃ بنو اسرائیل کی آیت 94-95 کی تفسیر میں لکھتے ہیں: اور کس بات نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا جب ان کے پاس ہدایت آئی مگر اسی نے کہ بولے کیا اللہ نے آدمی کو رسول بنا کر بھیجا (رسولوں کو بشر ہی جانتے رہے اور ان کے منصب نبوت اور اللہ تعالیٰ کے عطا فرمائے ہوئے کمالات کے مقر اور معترف نہ ہوئے۔ یہی ان کے کفر کی اصل تھی۔ اور اسی لیے وہ کہا کرتے تھے کہ کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا اس پر اللہ تعالیٰ اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فرماتا ہے کہ اے حبیب ان سے) تم فرماؤ اگر زمین میں فرشتے ہوتے چین سے چلتے تو ان پر ہم رسول بھی فرشتہ اتارتے (کیونکہ وہ ان کی جنس سے ہوتا لیکن جب زمین میں آدمی بستے ہیں تو ان کا ملائکہ میں سے رسول طلب کرنا نہایت ہی بے جا ہے)

نوٹ: ترجمہ اعلی حضرت قدس سرہ کا ہے اور قوسین میں صدر الافاضل (رح) کی تفسیر ہے۔

مفتی احمد یار خاں نعیمی متوفی 1391ھ بنو اسرائیل آیت 95 کی تفسیر میں لکھتے ہیں: یعنی اگر زمین میں بجائے انسانوں کے فرشتے بستے ہوتے تو نبی بھی فرشتہ ہی آتا۔ کیونکہ نبی تبلیغ کے لیے تشریف لاتے ہیں اور قوم کو تبلیغ وہی کر سکتا ہے جو قوم کی زبان اور اس کے طور طریقوں سے واقف ہو۔ ان کے دکھ دردوں سے خبردار ہو اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ نبی قوم کی جنس سے ہو۔ تعجب ہے کہ کفار فرشتوں کو انسان سے افضل سمجھتے تھے اس لیے کہتے تھے کہ فرشتہ نبی کیوں نہ ہوا۔ حالانکہ انسان فرشتوں سے افضل ہے۔ فرشتوں نے انسان کو سجدہ کیا نہ کہ انسان نے فرشتوں کو۔ (نور العرفان، ص 464، مطبوعہ ادارہ کتب اسلامیہ، گجرات)

رسول کا لوگوں کی جنس سے ہونا اس لیے ضروری ہے کہ اگر وہ لوگوں کی جنس سے نہ ہو تو اس کے افعال امت کے لیے نمونہ اور واجب الاتباع نہیں ہو سکیں گے کیونکہ لوگ کہہ سکیں گے کہ وہ اور جنس سے ہے اور ہم اور جنس سے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ افعال اس کی جنس سے ممکن اور سہل ہوں اور ہماری جنس سے ممکن اور سہل نہ ہوں اور پھر اللہ تعالیٰ کی حجت بندوں پر پوری نہیں ہو گی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمام رسول نوع انسان اور ہماری جنس سے بشر بنائے اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فرمایا آپ کہئے میں بشر اور رسول ہوں۔ "قل سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا: آپ کہئے میرا رب پاک ہے میں صرف بشر اللہ کا بھیجا ہوا (رسول) ہوں" (بنی اسرائیل: 93)۔ "قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی انما الٰھکم الہ واحد: آپ کہئے میں صرف بشر ہوں تمہاری مثل (خدا نہیں ہوں) میری طرف وحی کی جاتی ہے بیشک تمہارا اور میرا معبود ایک ہی ہے" (الکھف: 110)

کفار آپ کو محض بشر کہتے تھے رسول نہیں مانتے تھے اور بشریت کو رسالت کے منافی سمجھتے تھے اور یہی ان کا کفر تھا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ آپ عام انسان اور عام بشر نہیں ہیں بلکہ انسان کامل اور افضل البشر اور سید البشر ہیں اور کوئی شخص کسی وجودی وصف میں آپ کا مماثل نہیں ہے بلکہ سب عدم الوہیت میں آپ کے

مماثل ہیں یعنی جس طرح ہم خدا نہیں ہیں اسی طرح آپ بھی خدا نہیں۔ بعض لوگ غلو کرکے کہتے ہیں کہ آپ نہ خدا ہیں نہ خدا سے جدا ہیں۔ نہ اللہ کے عین ہیں نہ غیر ہیں۔ یہ باطل نظریہ ہے۔ اللہ تعالیٰ واجب ہے آپ ممکن ہیں۔ اللہ تعالیٰ قدیم ہے آپ حادث ہیں۔ اللہ تعالیٰ معبود ہے۔ آپ عابد ہیں۔ اور ممکن واجب کا اور حادث قدیم کا اور عباد معبود کا غیر ہوتا ہے۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ آپ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ آپ کی رضا اللہ کی رضا ہے۔ آپ کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے۔ آپ کی بیع اور شراء اللہ کی بیع اور شراء ہے۔ آپ کے ساتھ معاملہ اللہ کے ساتھ معاملہ ہے، اور آپ اللہ کے نائب مطلق ہیں اور اللہ کے اذن اور اس کے حکم سے مختار کل ہیں، جس کو چاہیں نواز دیں اور جنت عطا فرمادیں۔ لیکن آپ کا چاہا کبھی اللہ کے چاہے کے مخالف نہیں ہوتا۔ آپ اللہ کے تابع اور اللہ کے موافق ہیں۔ العیاذ باللہ اللہ کے مخالف اور باغی نہیں ہیں۔ (تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

اجراء نبوت پہ مرزائیوں کے غلط استدلال کا رد:

مرزائی لوگ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ سے استدلال کرتے ہیں کہ اب بھی رسولوں کی آمد ہو سکتی ہے کیونکہ اللہ فرمارہا ہے کہ اگر تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول آئیں الخ۔ حالانکہ یہ استدلال باطل ہے۔ یہاں تو صرف مقام رسالت بتایا جارہا ہے کہ رسول کے آنے پر جو شخص ایمان لے آئے وہ اہل جنت میں سے ہے جو نہ لائے ہوں اہل جہنم میں سے ہے۔ یہ اسی طرح ہے کہ کسی شخص کے نافرمان بیٹوں سے کہا جائے اگر ایک شخص تمہارا باپ ہے تو اس کی تعظیم لازم ہے۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ مزید کوئی شخص ان کا باپ بن سکتا ہے، بلکہ ماننا یہ ہے کہ جو تمہارا باپ ہے اسی کی تعظیم لازم ہے۔

اسی طرح اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی کی طرف اشارہ ہے۔ پھر جب اللہ نے حضور سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خاتم النبیین قرار دیا اور آپ نے اس کی تشریح لا نبی بعدی سے فرمادیں اس پر صدہا احادیث دال ہیں تو ان سب سے منہ موڑ کر اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ سے اجراء رسالت پر استدلال کرنا کس قدر گمراہی ہے۔ مزید واضح کیا گیا ہے۔

اہل تشیع کی مزعومہ امامت منصوصہ کا رد:

اس جگہ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ الخ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسولان گرامی ہیں وہ عظیم ہستیاں ہیں جو بنی آدم کی ہدایت کے لیے اللہ کی طرف سے مقرر کی گئی ہیں تو جو ان کی پیروی کرلیں تو نجات اخروی پالیتا ہے اور ان کا منکر دائمی جہنم کا مستحق بن جاتا ہے۔ اہل تشیع انبیاء کے بعد بارہ اماموں کے لیے یہی منصب مانتے ہیں، مگر یہ قرآن پہ زیادتی ہے۔ قرآن مجید کی روشنی میں انبیاء و مرسلین کے سوا کسی انسان کو یہ منصب حاصل نہیں ہے کہ اس کا ماننے والا مسلمان ہو اور نہ ماننے والا کافر، اماموں کے لیے یہی منصب ماننا انھیں بھی انبیاء ماننے کے مترادف ہے اور یہ کفر ہے۔

ہم اہل تشیع سے پوچھتے کہ کیا سارے قرآن میں کہیں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے: یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ وَّاَئِمَّۃٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ الخ یعنی اگر تمہارے پاس تم میں سے انبیاء اور ائمہ آجائیں الخ۔ اگر سارے قرآن میں ایسا کہیں نہیں ہے تو پھر اماموں کے لیے انبیاء والا منصب مان کر وہ قرآن کے دشمن کیوں بنتے ہیں؟

(تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

مختار کل کی وضاحت:

ہم نے جو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق مختار کل لکھا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کل اختیار دے کر خود معطل ہوگیا ہے، معاذ اللہ یہ صریح کفر ہے۔ نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو کچھ کرنا چاہیں اس پر آپ قادر اور مختار ہیں کیونکہ یہ صرف اللہ عزوجل کی شان ہے کہ وہ جو چاہے کرتا ہے۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو چاہتے تھے کہ تمام کافر اسلام لے آئیں خصوصاً ابوطالب کے لیے آپ کی بڑی خواہش اور بہت کوشش تھی کہ وہ مسلمان ہو جائیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس لیے مختار کل کا ہمارے نزدیک صرف یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کل مخلوق سے زیادہ اختیار عطا فرمایا ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی مرضی کے تابع ہو کر جس معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں، اللہ اپنے فضل و کرم سے اس کو قبول فرمالیتا ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کے اذن اور اس کے حکم سے بھی دعا فرماتے ہیں اور اپنی وجاہت کی بناء پر بھی دعا فرماتے ہیں اور بعض امور میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت اور قدرت سے براہ راست تصرف بھی فرماتے ہیں۔ ان تمام امور کے ثبوت میں احادیث صحیحہ وارد ہیں۔

نیک مسلمان حشر کے دن آیا گھبراہٹ میں مبتلا ہوں گے یا نہیں !

نیز اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے : سو جو شخص اللہ سے ڈرا اور نیک ہو گیا تو ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔ خوف کا تعلق مستقبل سے ہے، اور غم کا تعلق ماضی سے ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کو قیامت کے دن نہ مستقبل میں عذاب کا خوف ہوگا اور نہ ماضی میں انھیں اپنے کیے ہوئے کاموں کا کوئی غم ہوگا۔ کیونکہ دنیا میں انھوں نے سب نیک کام کیے اور اگر اغواءِ شیطان یا شامت نفس سے کوئی غلط کام ہو گیا تو انھوں نے مرنے سے پہلے اس پر توبہ کرلی اور اپنی اصلاح کرلی۔

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ نیک مسلمانوں کو قیات کی ہول ناکیوں سے کوئی خوف اور غم ہوگا یا نہیں۔ بعض علماء کا موقف یہ ہے کہ ان کو قیامت کی ہول ناکیوں اور اس دن کی سختیوں سے کوئی غم اور خوف نہیں ہوگا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " لایحزنہم الفزع الاکبر : سب سے بڑی گھبراہٹ انھیں غم گین نہیں کرے گی " (الانبیاء 103)

اور بعض علماء کا مسلک یہ ہے کہ نیک مسلمانوں کو بھی اس دن گھبراہٹ ہوگی ان کی دلیل یہ آیت ہے : " یوم یفر المرء من اخیہ۔ وامہ ابیہ۔ وصاحبتہ وبنیہ۔ لکل امرء منہم یومئذ شان یغنیہ : جس دن انسان اپنے بھائی سے بھاگے گا۔ اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے ان میں سے ہر شخص کو اس دن اپنی فکر ہوگی جو اسے (دوسروں سے) بے پروا کردے گی " (عبس : 34۔ 37)

اول الذکر علماء اس آیت کا یہ جواب دیتے ہی کہ اگرچہ وقتی طور پر نیک مسلمانوں کو بھی فکر اور پریشانی ہوگی لیکن مآل کار انھیں امن اور عافیت اور فرحت اور سرور حاصل ہوگا جیسا کہ اس آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا : " وجوہ یومئذ مسفرۃ ضاحک مستبشرہ، ووجوہ یومئذ علیہا غبرۃ۔ ترھقھا قترہ۔ اولئک ھم الکفرۃ الفجرۃ : اس دن بعض چہرے روشن ہوں گے۔ مسکراتے ہوئے شاداب۔ اور اس دن کئی چہرے غبار آلود ہوں گے۔ ان پر سیاہی چھائی ہوگی۔ وہی لوگ کافر بدکار ہوں گے " (عبس : 38۔42)

گنہ گار مسلمانوں کے لیے دائمی عذاب کا نہ ہونا : اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا : جن لوگوں نے رسولوں کی پیش کی ہوئی اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے تکبر کیا سو وہی لوگ دوزخی ہیں اور وہی اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ہمارے علماء نے اس آیت سے معتزلہ اور خوارج کے خلاف استدلال کیا ہے کہ گناہ گار مسلمانوں کو اگر دوزخ میں ڈالا گیا تو ان کو عذاب کے بعد دوزخ سے نکال لیا جائے گا کیونکہ دوزخ کے عذاب کا دوام اور خلود صرف کافروں کے لیے ہے جیسا کہ اس آیت میں کافروں کے متعلق بہ طریقہ حصر فرمایا ہے کہ وہی دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ (تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

مسائلِ حلال وحرام بیان کرنے کے بعد کچھ آخرت کا حال بیان کرنا بھی ضرور تھا کہ جہاں اس دنیا کے تمام افعال نیک وبد کا بدلہ دیا جاتا ہے اور آخرت کی پہلی گھاٹی یا اول سیڑھی انسان کی موت ہے کہ پھر اس کے بعد سے وہاں کا دوسرا کارخانہ شرع ہوتا ہے اس لیے سب سے اول یہ فرمایا لکل امۃ اجل الخ کہ دنیا میں ہر ایک قوم کا ایک وقت معین ہے کہ جس کے افراد کے بعد دیگر فنا ہونے سے وہ قوم فنا ہو جاتی ہے (پچاس ساٹھ برس میں وہ دور تمام ہو جاتا ہے۔ کل شاہجہاں کے لاکھوں سپاہی ہزاروں خادم تھے آج ان میں سے ایک خدمتگار تو کیا ان کی فوج میں سے کسی گھوڑے کی زین اور لگام بھی دکھائی نہیں دیتی نہ اس وقت کا کوئی موافق ہے نہ مخالف ہائے یہ سب کے سب کہاں چلے گئے اور اپنے عہد کی چیزیں بھی ساتھ لے گئے۔ وہ شاندار دربار اور اس کے امراء کہاں غائب ہوگئے۔ وہ ان کے محل کے تجمل اور ان کے سامان کہاں چھپ گئے ؟ ع زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے سو یہ ایک وقت ہر شخص کے لیے ایسا معین ہے کہ نہ کوئی اس سے آگے بڑھ سکے نہ ۲ پیچھے ہٹ سکے اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ہر قوم مخالف انبیاء کے عذاب کے لیے ایک وقت معین ہے ان کی جلدی سے پہلے نہیں ہو سکتا ہٹانے سے ہٹ نہیں سکتا۔

اب عالم آخرت کی سرگذشت شروع کرتا ہے اور وہاں کے عتاب وثواب کا سبب بھی بتلاتا ہے کہ روز ازل ہم نے کہہ دیا تھا کہ اے بنی آدم ! میں اپنے رسول تمہارے پاس بھیجوں گا وہ تمہیں میری آیات سنائیں گے۔ پھر جس نے تقویٰ اور اصلاح اختیار کیا تو ان کے لیے کچھ خوف وغم نہیں اور جنہوں نے اس کو جھٹلایا سو وہ ہمیشہ جہنم میں رہا کریں گے۔

اب وقت موت سے لے کر ہمیشہ تک کا ان کا حال بیان فرماتا ہے کہ ان کو ان کی تقدیر کا لکھا پیش آتا ہے۔ وہ یہ کہ بوقت نزع فرشتے جو ان کی جان قبض کرنے کو آتے ہیں تو ان سے پوچھتے ہیں کہ اب وہ تمہارے معبود کہاں ہیں جن کو تم اللہ کا شریک کرتے تھے۔ جواب دیں گے کہ اب وہ کھو گئے اور اپنے کافر ہونے کا اقرار کریں گے۔ آسمان میں اس کے انوار متجلی ہیں ان کی تجلیات اجرام علویہ میں بے انتہا ہیں۔ آفتاب' ماہتاب' ستارے سب نورانی چیزیں اسی لیے افلاک سے متعلق ہیں۔ اسی لیے ملائکہ اور ارواح مقدسہ کے لیے افلاک مسکن قرار پایا ہے اور بعد موت کے پاک روحیں اور نفوس مطہرہ اسی دار البہجۃ والسرور و فضاء النور کی طرف صعود کرتی ہیں اور نفوس خبیثہ بعد مفارقت بدن کے عالم سفلی یعنی اس زمین تاریک و تار کی طرف ان کی مناسبت طبعی سے پھینکے جاتے ہیں۔ اس لیے فرماتا ہے ان الذین کذبوا بایاتنا واستکبروا عنہا لا تفتح لہم ابواب السماء الخ کہ کفار و متکبرین کے لیے نہ آسمان کے دروازہ کھلتے ہیں نہ یہ جنت میں داخل ہوں گے جیسا کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہونا محال ہے اسی طرح ان کا اس عالم قدس میں۔ اس سے پہلی آیتوں قال

۱؎ کسی حکیم و فیلسوف نے موت طبعی کے دور کرنے کی تو کیا بڑھاپا روکنے کی بھی تدبیر نہیں نکالی۔ اسی طرح اقبال و ادبار قومی کا بھی ایک وقت مقرر ہے جس طرح اقبال کسی کے زائل کرنے سے زائل نہیں ہو جاتا اسی طرح ادبار بھی کسی تدبیر سے نہیں رک سکتا اور جو آ جاوے تو جا نہیں سکتا۔ یہ ہیں خدائی پیادے اور اس کے احکام مبرم بھلا کوئی ان سے سرتابی تو کرے۔ ۱۲منہ

۲؎ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ ایماندار کی روح کو ملائکہ آسمانوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہاں ان کے لیے دروازے افلاک کے کھلتے ہیں (مشکواۃ) روح پاک اس تن کے قفس سے نکل کر سماوات کی طرف اس طرح دوڑتی ہے کہ جس طرح بلبل قفس سے نکل کر چمن کی طرف اڑتی ہے

تو ئی آں دست پرور مرغ گستاخ
کہ بودت آشیاں بیروں ازیں کاخ
چرا ازان آشیان بیگانہ گشتی
چو دوناں چغد ایں ویرانہ گشتی
بیفشاں بال و پر زآمیزش خاک
بپر تا کنگر ایوان افلاک

ارواح خبیثہ جو اس دنیائے تنگ و تاریک کے لذائذ پر غش ہیں (اخلد الی الارض) وہ وہاں نہیں جانے پاتیں۔ بعض انبیاء زندہ ہی آسمانوں پر چلے گئے۔
(تفسیر حقانی۔ابو محمد عبدالحق حقانی)

آیت مبارکہ:

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۳۶

لغۃ القرآن: وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ جو] [كَذَّبُوْا : انھوں نے جھٹلایا] [بِاٰيٰتِنَا : ہماری آیات کو] [وَ : اور] [اسْتَكْبَرُوْا : سب نے تکبر کیا] [عَنْهَآ : ان سے] [اُولٰٓىِٕكَ : وہی لوگ] [اَصْحٰبُ النَّارِ : دوزخ والے ہیں] [هُمْ : وہ] [فِيْهَا : اس میں] [خٰلِدُوْنَ : سب ہمیشہ رہنے والے ہیں]

ترجمہ: اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان (پر ایمان لانے) سے سرکشی کی، وہی اہل جہنم ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں

تشریح: اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلے میں سرکشی برتیں گے وہی اہل دوزخ ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ "

کیونکہ اللہ کے عہد ونصیحت کو فراموش کرنے اور استکبار اور تکذیب کی وجہ سے یہ لوگ اپنے دوست، شیطان سے مل چکے ہیں اور ان پر اللہ کا یہ فیصلہ نافذ ہو گیا ہے کہ "جو لوگ تم میں سے اس کی اطاعت کریں گے تو ان سب سے میں جہنم کو بھر دوں گا۔"

اب یہاں سے اللہ کے سامنے پیشی کا منظر شروع ہوتا ہے۔ جس کی طرف سابقہ سبق کے آخر میں اشارہ کیا گیا تھا۔

آیت " وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (34)

"ہر قوم کے لیے مہلت کی ایک مدت مقرر ہے' پھر جب کسی قوم کی مدت آن پوری ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی تاخیر و تقدیم بھی نہیں ہوتی۔" اس کے بعد یوم و حساب کا منظر شروع ہوتا ہے' فیصلے اور سزا و جزاء کے مناظر آتے ہیں۔ گویا یہ متقین اور مستکبرین کے انجام کی تفصیل ہے۔ یہ منظر اسی طرح ہے جس طرح قرآن کریم مناظر قیامت کو پیش کرتا ہے،۔ قارئین کو یوں نظر آتا ہے کہ واقعات عملاً رونما ہو رہے ہیں۔

قرآن کریم نے مناظر قیامت کے بیان میں ایک خاص اسلوب اپنایا ہے۔ حشر و نشر' حساب و کتاب' انعام و اکرام اور عذاب اور سزا کے بیان میں نہایت ہی موثر اسلوب اپنایا ہے۔ یہاں صرف یہ نہیں ہے کہ قرآن نے موجودہ دنیا کے بعد آنے والے جہان کے کچھ اوصاف گنوا دیئے ہیں بلکہ اس کے مناظر کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ وہ مناظر محسوس اور مجسم نظر آتے ہیں۔ ان کے اندر افراد چلتے پھرتے اور زندہ نظر آتے ہیں اور نہایت ہی واضح شکل و صورت میں۔ قرآن کریم کی دنیا میں جب ایک مسلم زندگی بسر کرتا ہے تو وہ ان مشاہدات اور مناظر کو اپنی آنکھوں سے جگہ جگہ دیکھتا ہے۔ وہ ان سے متاثر ہوتا ہے۔ کبھی اس کا دل دھڑکتا ہے' کبھی اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں' کبھی وہ بری طرح خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ پوری طرح مطمئن اور ہشاش وبشاش ہو جاتا ہے۔ کبھی اسے آگ کے شعلہ ہائے جوالہ نظر آتے ہیں۔ اور کبھی اسے جنت کی باد نسیم محسوس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں زندہ رہنے والا مومن اس دن سے پوری طرح واقف ہوتا ہے اور جو لوگ ان مناظر کے بارے میں آیات کو غور سے پڑھتے ہیں' وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اس دنیا کے مقابلے میں در حقیقت میدان حشر میں زندہ رہ رہے ہیں۔ وہ قرآن کی دنیا میں اس طرح گم ہو جاتے ہیں جس طرح کوئی انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتا ہے۔ ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں چلا جاتا ہے اور یہ انتقال محسوس طور پر ہوتا ہے۔ غرض اس کے احساس و شعور میں عالم آخرت آنے والا مستقبل نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسا حال ہوتا ہے جس کا وہ مشاہدہ کر رہا ہوتا ہے۔

یہاں جن مناظر کو پیش کیا گیا ہے وہ طویل ترین مناظر میں سے ہیں اور ان میں زندگی بھرپور نظر آتی ہے۔ یہ مسلسل مناظر ہیں اور ان لوگوں کے ڈائیلاگ بھی موجود ہیں اور زندہ اور بھرپور مکالمات کو حیرت انگیز الفاظ میں منتقل کیا گیا ہے۔ اس طرح مکمل طور پر جس طرح آنکھوں سے دیکھ کر کوئی کسی منظر کو محفوظ کر لیتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے اس سے قبل کہا یہ مناظر قصہ آدم پر تبصرے کے بعد آئے ہیں جبکہ آدم جنت سے نکال دیئے گئے تھے۔ ان کے ساتھ بیوی کا اخراج بھی ہو گیا تھا اور یہ اخراج شیطان کی وسوسہ اندازی کے نتیجے میں عمل میں آیا تھا۔ اس کے بعد بنی آدم کو یہ تنبیہ بھی کر دی گئی تھی کہ شیطان کے فتنوں سے بچو وہ تمہیں اس طرح نقصان نہ پہنچا دے جس طرح تمہارے باپ کو جنت سے نکلوایا۔ اس تنبیہ کے ساتھ کہ اگر انھوں نے آنے والے رسولوں کو چھوڑ کر شیطان کا اتباع اختیار کیا تو وہ جہنم کی سزا کے مستحق ہوں گے۔ ان باتوں کے بعد قیامت کے دن اللہ کے سامنے حضوری کے شاہد پیش کئے گئے۔ یہ شاہد اس طرح پیش کئے گئے کہ گویا یہ قصہ آدم کے متصلاً پیش آ رہے ہیں۔ اچانک رسولوں کی بعثت اور ان کے مقاصد سامنے آ جاتے ہیں' اچانک ان لوگوں کا منظر سامنے آ جاتا ہے جو شیطان کے پیروکار ہیں' اچانک وہ لوگ سامنے آ جاتے ہیں جو شیطان کے مخالف ہیں اور جنت کے وارث ہیں۔ وہ عالم بالا سے یہ پکار سنتے ہیں "کہ یہ ہے وہ جنت جس کے تم وارث ہو' اس لیے کہ تمہارے عمل اچھے تھے۔" آیت "ان تلکم الجنتہ التی "۔ یوں نظر آتا ہے کہ مسافر گھروں کو واپس آ رہے ہیں' مہاجر اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں اور اب انھوں نے اس دار النعیم میں ہمیشہ رہنا ہے۔

اس قصے اور اس تبصرے کے اندر جو ہم آہنگی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے قصہ آتا ہے اور اس کے مناظر عالم بالا میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس پر تبصرہ اور شاید قیامت آئے اس ہم آہنگی میں جو خوبصورتی ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ یہ کہانی عالم بالا میں فرشتوں کے سامنے شروع ہوتی ہے۔ اس وقت آدم و حوا کی تخلیق کی تقریب سعید تھی۔ آدم اور حوا کو جنت میں رکھا گیا تھا' اور شیطان کی وسوسہ اندازی سے جنت سے ان کے اخراج کے واقعات پیش آئے اخراج اس لیے ہوا کہ انھوں

نے مکمل اطاعت اور بندگی نہ کی اور عالم بالا ہی میں یہ مناظر آغاز و انجام یکجا ہو جاتے ہیں اور ان کے درمیان انسانی زندگی کے طویل مناظر پیوست ہیں۔ گویا ایک ہی اسٹیج پر یہ تمام مناظر آغاز' درمیان اور انجام پیش ہو گئے۔ نہایت ہی ہم آہنگی اور مناسب انداز و پیرائے ہیں۔

اب ہم میدان حشر میں آ گئے ہی اور اس میں اللہ کے سامنے ان لوگوں کو پیش کیا گیا ہے جو اللہ پر بہتان باندھتے ہیں۔ ان لوگوں کا افتراء اور بہتان یہ ہے کہ انھوں نے آباؤاجداد سے کچھ رسومات اور ضابطے ورثے میں پائے ہیں اور کچھ ضابطے اور قوانین خود انھوں نے اپنی جانب سے وضع کئے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ من جانب اللہ ہیں۔ ان لوگوں کی بھی پیشی ہے جن لوگوں نے اللہ کے بھیجے ہوئے رسولوں کو جھٹلایا حالانکہ وہ یقینی شریعت کر آئے تھے۔ اس کے مقابلے میں انھوں نے ظن و تخمین سے کام لے کر علم ویقین کو رد کر دیا' یہ لوگ دنیا میں عیش و عشرت کرتے رہے اور زمانہ ابتلاء خوب مستی سے گزارا اور رسولوں نے ان کے سامنے جو پیغام پیش کیا وہ بھی ان تک پہنچا جسے قبول کرنا ان کی قسمت میں نہ تھا۔ (تفسیر فی ظلال القرآن۔ سید قطب شاہ)

وَاسْتَکْبَرُوا عَنْہَا: اور آیات کے مقابلے میں تکبر کریں گے۔ } آیات کے مقابلے میں تکبر کا معنی ہے انھیں تسلیم نہ کرنا۔

تکبر کی بہت بڑی قباحت:

اس سے معلوم ہوا کہ تکبر کی بہت بڑی قباحت یہ ہے کہ آدمی جب تکبر کا شکار ہوتا ہے تو نصیحت قبول کرنا اس کیلئے مشکل ہو جاتا ہے، چنانچہ قرآن پاک میں ایک جگہ منافق کے بارے میں فرمایا گیا:

"وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ ۚ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ(٢٠٦)" (1)

اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈرو تو اسے ضد مزید گناہ پر ابھارتی ہے تو ایسے کو جہنم کافی ہے اور وہ ضرور بہت برا ٹھکانا ہے۔

اور حدیث مبارک میں ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "حق کی مخالفت اور لوگوں کو حقیر جاننا تکبر ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

خیال رہے کہ کفار کے مقابل تکبر کرنا عبادت ہے۔ مسلمان کے مقابل تکبر حرام ہے نبی کے مقابل تکبر کفر ہے۔ یہاں تیسرا تکبر مراد ہے۔ یہی تکبر شیطان نے کیا۔ اس کا انجام معلوم ہے۔ اس لیے انھیں اصحاب النار اور خالدون فرمایا کہ یہ دونوں حال کافروں کے ہیں۔ (نور العرفان۔)

آیت مبارکہ:

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۚ أُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ۖ حَتّٰٓى إِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوٓا أَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۖ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى أَنْفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ○٣٧

لغۃ القرآن: فَمَنْ : پھر جو] [اَظْلَمُ : بڑا ظالم] [مِمَّنِ : اس سے جو] [افْتَرٰي : باندھے] [عَلَي اللّٰهِ : اللہ تعالیٰ پر] [كَذِبًا : جھوٹ] [اَوْ : یا] [كَذَّبَ : جھٹلایا] [بِاٰيٰتِهٖ : اس کی آیتوں کو] [اُولٰٓئِكَ : وہی لوگ] [يَنَالُهُمْ : پہنچے گا ان کو] [نَصِيْبُهُمْ : ان کا حصہ] [مِّنَ : سے] [الْكِتٰبِ : کتاب] [حَتّٰٓي : یہاں تک کہ] [اِذَا : جب] [جَآءَتْهُمْ : آئے ان کے پاس] [رُسُلُنَا : ہمارے رسول] [يَتَوَفَّوْنَهُمْ : وہ فوت کریں گے انہیں] [قَالُوْٓا : سب نے کہا] [اَيْنَ : جہاں کہیں بھی] [مَا : نہیں] [كُنْتُمْ : ہو تم] [تَدْعُوْنَ : تم سب پکارو گے] [مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ : اللہ کے علاوہ کی] [قَالُوْا : ان سب

نے کہا] [ضَلُّوْا : وہ سب گمراہ ہوگئے] [عَنَّا : ہم سے] [وَشَہِدُوْا : اور وہ سب گواہی دیں گے] [عَلٰي : پر] [اَنْفُسِهِمْ : ان کے دلوں کی] [اَنَّهُمْ : بیشک وہ] [كَانُوْا : تھے سب] [كٰفِرِيْنَ : سب کو کفر کی حالت میں]

ترجمہ: پھر اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھے یا اس کی آیتوں کو جھٹلائے ؟ان لوگوں کو ان کا (وہ) حصہ پہنچ جائے گا (جو) نوشتۂ کتاب ہے، یہاں تک کہ جب ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) آئیں گے کہ ان کی روحیں قبض کرلیں (تو ان سے) کہیں گے : اب وہ (جھوٹے معبود) کہاں ہیں جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے تھے ؟ وہ (جواباً) کہیں گے کہ وہ ہم سے گم ہوگئے (یعنی اب کہاں نظر آتے ہیں) اور وہ اپنی جانوں کے خلاف (خود یہ) گواہی دیں گے کہ بیشک وہ کافر تھے

تشریح: جتنی عمر ان کے لیے مقرر ہے جو مال و دولت، بیوی اور اولاد ان کی قسمت میں لکھی جاچکی ہے وہ بہر حال ان کو مل کر رہے گی۔

۴۸ف فرشتے قبض روح کے وقت بطور زجر و توبیخ انھیں کہیں گے کہ بلاؤان اپنے بناوٹی خداؤں کو جن کی ساری عمر تم عبادت کرتے رہے تاکہ وہ تمہیں ہمارے قبضہ سے چھوڑائیں۔ اس وقت غفلت کے پردے اٹھ جائیں گے اور حقیقت منکشف ہو جائے گی۔ اور وہ جواب دیں گے کہ آج تو ان کا ہمیں کوئی نام و نشان نہیں مل رہا۔ اور صد حیف ! کہ ہم نے کفر میں اپنی زندگی برباد کردی۔ ومعنی تدعون تعبدون (قرطبی) یعنی یہاں تدعون بمعنی تعبدون ہے۔ واین الالہۃ التی کنتم تعبدونھا (بیضاوی) علامہ بیضاوی نے اس کا یہ مفہوم لکھا ہے کہ فرشتے انھیں کہیں گے کہ وہ خدا کہاں ہیں جن کی تم عبادت کیا کرتے تھے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

دوزخ اور عذاب موت کا ذکر

حاصل مطلب یہ ہے کہ ملک الموت اور ان کے مددگار فرشتے مشرکوں کو مرتے وقت عذاب سے ڈراتے ہیں جس سے ان کو بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے۔ فرشتے جھڑک کر ان سے دریافت کرتے ہیں کہ جن کو تم خدا کے سوا دنیا میں پکارتے اور پوجتے تھے وہ اب کہاں ہیں، ان کو بلاؤ کہ تم کو اس عذاب سے بچاویں۔ وہ لوگ جواب دیں گے کہ ہم کو معلوم نہیں کہ وہ کدھر گم ہوگئے، وقت پر ہمارے کچھ کام نہ آئے۔ ہم کو ان سے کچھ توقع اور امید نہیں ہے۔ یہ ان کا موت کے وقت اپنی جانوں پر کفر کا اقرار ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے دوزخ کا داروغہ کہے گا کہ داخل ہو آگ میں ہمراہ اور امتوں کے جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں۔ پھر دوزخ میں داخل ہوتے ہی ایک امت دوسری امت کو لعنت کرنے لگے گی۔ مشرک مشرکوں کو، یہود یہود کو لعنت کرنے لگیں گے پچھلی امت کے لوگ پہلی امت کے لوگوں کے حق میں خدا تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ "اے پروردگار ! انھوں نے ہم کو تیرے راستہ سے بہکایا تھا ان کو دوچند عذاب کر"۔ جواب ملے گا کہ تم سب کے واسطے دوچند عذاب ہے۔ لیکن تم نہیں جانتے کیونکہ ہم نے ہر ایک کو اس کے عمل کے موافق سزا دی ہے اور پہلی امت کے لوگ پچھلی امت کے لوگوں سے کہیں گے کہ تم پر کچھ نہیں ہے۔ جس طرح ہم گمراہ ہوئے اسی طرح تم بھی گمراہ ہوئے اب اپنے کئے کی سزا چکھو۔ مطلب یہ ہے کہ بہکانے والوں کو دوگنا عذاب یوں ہوگا کہ ایک اپنے بد عملوں کا اور دوسرا لوگوں کو بہکانے کا اور بہکنے والوں کو ایک بہکاوے میں آجانے کا اور اللہ کے رسول کی نصیحت نہ سننے کا اور دوسرا بد عملوں کا۔

(تفسیر مظہر القرآن۔ شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی)

اللہ پر بہتان باندھنے اور اس کی آیتوں کو جھٹلانے کی تفصیل :

اس سے پہلی آیت میں کافروں کے متعلق فرمایا تھا کہ انھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کو ماننے سے تکبر کیا۔ اب اسی سیاق میں فرمایا : پس اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ کے متعلق جھوٹی باتیں گھڑ کر بہتان باندھے یا اللہ کی آیوں کو جھٹلائے !

اللہ پر بہتان باندھنے والے وہ کافر ہیں جنھوں نے بتوں کو یا ستاروں کو اللہ کا شریک بنایا یا وہ کافر جنھوں نے دو خدا اقرار دیے ایک یزداں اور ایک اہرمین۔ یا وہ جنھوں نے اللہ کے لیے بیٹیاں اور بیٹے ٹھہرائے۔ اسی طرح وہ کافر جنھوں نے بحیرہ، سائبہ، حامی اور وسیلہ کو از خود حرام قرار دیا اور پھر اس حرمت کو اللہ تعالیٰ کی طرف

منسوب کیا۔ اسی طرح اس کے عموم میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو از خود کوئی مسئلہ گھڑ لیتے ہیں اور اپنی طرف سے کسی مستحب کام کو فرض یا واجب قرار دیتے ہیں اور اس کے عموم میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو قرآن اور حدیث کی صریح نصوص کے مقابلہ میں اپنے پیروں اور مولویوں کے اقوال کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس کے بعد ان کافروں کا ذکر کیا جو اللہ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اس سے مراد وہ کافر ہیں جو اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت اور اس کی الوہیت کے دلائل کا انکار کرتے ہیں یا اس س سے مراد وہ کافر ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتابوں، خصوصاً قرآن مجید کا انکار کرتے ہیں یا اس سے مراد وہ کافر ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسولوں خصوصاً سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت کا انکار کرتے ہیں۔

کتاب یا لوح محفوظ میں اللہ پر بہتان باندھنے والوں کی سزا: اس کے بعد فرمایا ان لوگوں کو کتاب کے مطابق ان کا حصہ ملتا رہے گا۔ کتاب کی دو تفسیریں ہیں ایک تفسیر یہ ہے کہ کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے اور ایک تفسیر یہ ہے کہ کتاب سے مراد نوشتہ تقدیر ہے۔

اگر کتاب سے مراد لوح محفوظ ہو تو اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں ان کافروں کے لیے جتنا عذاب لکھ دیا تھا، ان کو وہ عذاب مل کر رہے گا۔ یہ تفسیر ابو صالح اور حسن سے مروی ہے۔ (جامع البیان، ج 8، ص 222، دار الفکر)

پھر بعض علماء نے حسب ذیل آیات سے اس عذاب کی تفصیل بیان کی ہے: " ویوم القیامۃ تری الذین کذبوا علی اللہ وجوھھم مسودۃ: جن لوگوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا تھا، آپ قیامت کے دن ان کے منہ کالے دیکھیں گے " (الزمر: 60)۔ " ونحشر المجرمین یومئذ زرقا: اور ہم مجرموں کو اس حال میں اٹھائیں گے کہ ان کی آنکھیں نیلی ہوں گی "۔ " یعرف المجرمون بسیماھم فیوخذ بالنواصی والاقدام: اس دن مجرم اپنی صورتوں سے پہچانے جائیں گے ان کو پیشانی کے بالوں اور پاؤں سے پکڑا جائے گا " (الرحمٰن: 41)۔ " اذا الاغلال فی اعناقھم والسلسل یسحبون: جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی ان کو اس حال میں گھسیٹا جائے گا " (المومن: 71)

خلاصہ یہ ہے کہ کافروں کے چہرے، سیاہ آنکھیں نیلی ہوں گی اور ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی وہ اپنے چہروں سے پہچانے جائیں گے اور ان کو پیشانی اور پیروں سے پکڑ کر گھسیٹا جائے گا۔ ان آیات کے علاوہ قرآن مجید میں ان کے عذاب کی اور بھی کوئی صورتیں بیان فرمائی ہیں۔

کتاب کی تفسیر میں دیگر اقوال: امام عبدالرحمٰن بن علی بن محمد جوزی حنبلی متوفی 597ھ لکھتے ہیں: کتاب کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں: مجاہد نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ ان کے اعمال سے جو کچھ ان کے لیے مقدر کردیا گیا ہے وہ ان کو ضرور حاصل ہوگا۔ حسن نے کہا: ان کے لیے گمراہی یا ہدایت جو بھی مقدر کردی گئی ہے وہ ان کو ضرور حاصل ہوگی۔

حضرت ابن عباس سے ایک اور روایت ہے کہ ان کے لیے خیر اور شر جو کچھ مقدر کردیا گیا ہے وہ ان کو ضرور حاصل ہوگا۔ ربیع نے کہا: ان کے لیے جس قدر رزق، عمر اور عمل مقدر کردیا گیا ہے وہ ضرور ان کو حاصل ہوگا۔ عکرمہ اور ابو صالح نے کہا: ان کے لیے جو عذاب مقرر کردیا گیا ہے وہ ان کو ملے گا۔ زجاج نے کہا: ان کے لیے کتاب میں جو جزا بیان کی گئی ہے وہ ان کو ضرور ملے گی۔ اور کتاب کی پانچ تفسیریں کی گئی ہیں: 1۔ لوح محفوظ۔ 2۔ اللہ کی تمام کتابیں۔ 3۔ قرآن کریم۔ 4۔ ان کے اعمال نامے۔ 5۔ قضا و قدر۔ (زاد المسیر، ج 3، ص 193۔ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، 1407ھ)

تقدیر کے متعلق ہم نے شرح صحیح مسلم، ج 7 میں تفصیل سے لکھا ہے خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ازل میں علم تھا کہ بندہ اپنے اختیار اور ارادہ سے کیا کرے گا اور کیا نہیں کرے گا اور وہ اپنے اعمال کے نتیجہ میں جنت کا مستحق ہوگا یا جہنم کا۔ اس کے اسی علم سابق کا نام تقدیر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب ہمارے فرشتے ان کی روحیں قبض کرنے کے لیے پہنچیں گے، اس سے مراد ملک الموت اور اس کے معاون فرشتے ہیں۔ اس آیت سے مراد کفار کو سرزنش کرنا ہے کہ وہ اپنے آباء واجداد کی تقلید کو ترک کرکے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت پر ایمان لے آئیں اور اللہ تعالیٰ کو وحدہ لاشریک لہ مان لیں۔ (تفسیر تبیان القرآن)

فوائد

1۔ یعنی لوح محفوظ یا ان کے نوشتہ تقدیر میں ان کا جو رزق یا عمر لکھا ہے وہ تو انہیں ملے ہی گا۔ پھر عذاب آوے گا۔ اس سے اصلی رزق و عمر مراد ہے۔ ورنہ بد عملی سے رزق و عمر گھٹ جاتے ہیں۔ جیسے نیکی سے عمر و رزق میں برکت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا آیت و حدیث میں تعارض نہیں۔

2۔اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ جان نکالنے صرف ملک الموت (علیہ السلام) نہیں آتے بلکہ ان کے ساتھ ان کے ماتحت فرشتے اور بھی آتے ہیں۔ ملک الموت کا آنا اس آیت میں مذکور ہے۔ قل یتوفکم ملک الموت الذی وکل بکم۔ اور ماتحتوں کا آنا اس آیت سے معلوم ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ کہ یہ جان نکالنے والے فرشتے بیک وقت ہر جگہ پہنچ کر مرنے والوں کی جان نکال لیتے ہیں تو ایک وقت میں چند جگہ موجود ہو جانا اللہ والوں کے نزدیک باذن الہی مشکل نہیں۔ ایسے ہی قبر میں سوال کرنے والے ماں کے پیٹ میں بچہ بنانے والے فرشتے یہ طاقت رکھتے ہیں۔ حاضر ناظر ہونا بعض بندوں کی صفت ہے۔

3۔ یہ سوال مشرکین سے ان کے بتوں کے متعلق ہوگا۔ مومن کی مدد موت کے وقت ضرور ہوتی ہے۔ اسی لیے آگے فرمایا گیا۔ کانوا کفرین۔ مسلمانوں کو حکم ہے کہ مرنے والے کے پاس بیٹھ کر کلمہ پڑھیں۔ تاکہ اسے کلمہ یاد آوے۔ یہ مومنوں کی مدد ہے لہٰذا اس آیت کو مومنین باولیاء اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔ بہر حال موت یا اس کے بعد کسی کی مدد نہ پہنچنا کفار کا عذاب ہے۔

4۔ یہ اقرار اور وقت ہوگا اور اپنے کفر کا انکار دوسرے وقت ہوگا۔ لہٰذا اس آیت اور دوسری آیت واللہ ربنا ما کنا مشرکین میں کوئی تعارض نہیں۔

آیت مبارکہ:

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ۭ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۗءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ڛ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۸

لغۃ القرآن: قَالَ : فرمایا] [ادْخُلُوا : تم سب داخل ہوجاؤ] [فِيْٓ : میں] [أُمَمٍ : امتوں] [قَدْ : تحقیق] [خَلَتْ : گزر چکے ہیں] [مِنْ قَبْلِكُمْ : تم سے پہلے] [مِّنَ : سے] [الْجِنِّ : جنوں کے] [وَالْاِنْسِ : اور انسانوں کے] [فِي : میں] [النَّارِ : آگ کے] [كُلَّمَا : جب بھی] [دَخَلَتْ : داخل ہوگی] [أُمَّةٌ : ایک گروہ] [لَّعَنَتْ : لعنت کرے گی] [أُخْتَهَا : اپنی " مذہبی " بہن " دوسری " کو] [حَتّٰٓي : یہاں تک کہ] [اِذَا : جب] [ادَّارَكُوْا : سب اکٹھے ہوں گے] [فِيْهَا : اس میں] [جَمِيْعًا : سب کو] [قَالَتْ : اس نے کہا] [أُخْرٰىهُمْ : ان کی پچھلی] [لِأُوْلٰىهُمْ : اپنے سے پہلی کے متعلق] [رَبَّنَا : اے ہمارے رب] [هٰٓؤُلَاۗءِ : یہ لوگ] [اَضَلُّوْنَا : سب نے گمراہ کیا تھا ہمیں] [فَاٰتِهِمْ : پس دے انہیں] [عَذَابًا : عذاب] [ضِعْفًا : دگنا] [مِنَ النَّارِ : آگ سے] [قَالَ : فرمایا] [لِكُلٍّ : ہر ایک کے لیے] [ضِعْفٌ : دگنا ہے] [وَلٰكِنْ : اور لیکن] [لَا : نہیں] [تَعْلَمُوْنَ : تم سب جانتے ہو]

ترجمہ: اللہ فرمائے گا: تم جنوں اور انسانوں کی ان (جہنّمی) جماعتوں میں شامل ہو کر جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں دوزخ میں داخل ہو جاؤ۔ جب بھی کوئی جماعت (دوزخ میں) داخل ہوگی وہ اپنے جیسی دوسری جماعت پر لعنت بھیجے گی، یہاں تک کہ جب اس میں سارے (گروہ) جمع ہو جائیں گے تو ان کے پچھلے اپنے اگلوں کے حق میں کہیں گے کہ اے ہمارے ربّ! انہی لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا سو ان کو دوزخ کا دوگنا عذاب دے۔ ارشاد ہوگا: ہر ایک کے لیے دوگنا ہے مگر تم جانتے نہیں ہو

تشریح:

ادّارکو: (مل جائیں) ماضی کا صیغہ ہے۔ اصل میں تدار کو تھا جو تدارک سے بنا ہے۔ تدارک کا مادہ درک ہے۔ درک کے معنی ہیں پالینا۔ تدارک کے معنی ہیں ایک دوسرے کو پالینا۔ باہم مل جانا۔ یہاں مراد یہ ہے کہ جب وہ سب دوزخ میں ایک دوسرے سے مل جائیں گے۔

ضعف (دگنا) ضعف کے معنی ایک چیز کے برابر اور اتنی ہی اس کے ساتھ اور ملا دینا خواہ کتنی ہی دفعہ ہو۔ کم سے کم ایک دفعہ ملانا۔ جس سے وہ چیز دگنی ہو جائے۔

دوزخیوں کا جھگڑا:

جب کافر اپنے منہ سے اپنے کفر کا اقرار کرلیں گے تو اقراری مجرم ہو جائیں گے پھر ان کو سزا دی جائے گی۔

ارشاد ہے کہ اللہ کی طرف سے حکم ہو گا اب تم جنوں اور انسانوں کے ان تمام کاموں کے ساتھ جو تم سے پہلے اپنے کفر کی آفت میں مبتلا تھیں مل کر دوزخ میں جاؤ کیونکہ کفر کی یہی سزا ہے ہم نے تم سب کو دنیا میں اپنی کتابیں اور رسول بھیج کر بتادیا تھا اگر تم دنیا ہی میں اس کو سمجھ جاتے تو آج آگ کے عذاب سے بچ جاتے لیکن تم نہیں مانے تو اب اس کا عذاب بھگتو۔ چنانچہ وہ سب دوزخ میں داخل ہوتے جائیں گے اور ایک دوسرے کو کوستے جائیں گے جب لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرتے سب کے سب دوزخ میں جا کر جمع ہو جائیں گے تو پچھلے لوگ اگلوں کو دیکھ کر اپنی بھڑاس اور طرح نکالیں گے وہ ان کے لئے بددعا کرنی شروع کردیں گے کہیں گے اے ہمارے رب ان کم بختوں نے ہمیں گمراہ کیا ان کو ہم سب سے دگنا عذاب دے۔

عجیب بات ہے کہ ایسے بے لاگ اور صاف ڈراوے کے بعد آدمی دنیا میں وہی باتیں کرتا رہے جن کے انجام سے اسے ڈرایا جارہا ہے.برے کام کرنے والے دوسروں کو براکام کرتے دیکھ کر ہی تو براکام کرتے ہیں عجوبہ دوست نظر آتے ہیں کل وہی انھیں کو اللہ سے دگنا عذاب دینے کی خود درخواست کریں گے۔

جھگڑا فضول ہے:

پچھلی آیت میں بیان ہوا کہ جب دنیا میں اللہ کی آیتوں کو پیٹھ کے پیچھے پھینکنے والے جان کنی کے وقت فرشتوں کی صورتیں دیکھ کر اور ان کا سوال سن کر لاجواب ہو جائیں گے اور صاف سمجھ جائیں گے کہ واقعی ہم کافر ہیں ہمیں اللہ کی کتابوں اور اللہ کے رسولوں نے دنیا میں لاکھ سمجھایا کہ کفر نہ کرو ورنہ مرنے کے بعد سزا ملے گی مگر اس وقت ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا اس وقت ہم صاف دیکھ رہے ہیں کہ جو کچھ انھوں نے کہا تھا اور رسول نے سمجھایا تھا وہ بالکل ٹھیک تھا قیامت کے دن انھیں ختم ہو گا کہ اپنے جیسے اور لوگوں کے ساتھ مل کر جہنم میں جاؤ چنانچہ جو لوگ آگے پیچھے اس میں داخل ہوں گے اور ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرتے جائیں گے داخل ہونے کے بعد پچھلے لوگ اپنے رب سے درخواست کریں گے کہ ان سے پہلے لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا اس لئے ان کو ہم سے دگنا عذاب ملنا چاہیے اس درخواست کا جواب اس آیت میں ہے۔

ارشاد ہے کہ اچھی بات ہے چونکہ وہ آپ بھی بہکے اور تم کو بھی بہکایا اس لیے انھوں نے دو جرم کیے اس حساب سے تم ٹھیک کہتے ہو ان کو دوہرا عذاب ملنا چاہیے چنانچہ ان کو دوہرا عذاب ملے گا لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں کہ خود تمہارے اوپر بھی دو جرم عائد ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ تم نے برے کام کیے دوسرا یہ کہ اپنی سمجھ سے کام نہ لیا قرآن شریف میں تمہیں بتایا گیا کہ دیکھو تم سے پہلے لوگوں نے برے کام کیے اور ان کو ان کی سزا دنیا میں دی گئی یہ بتانے کے لئے کہ برائی کا پھل برا ہے لیکن تم نے ایک نہ سنی۔ اس لیے تم بھی دوہرے مجرم ہوں اور تمہیں بھی دوہری سزا ملے گی۔ اس بنا پر فیصلہ یہ ہے کہ اگلوں پچھلوں دونوں کو دوہری سزا ملے گی یہ فیصلہ سن کر پہلے لوگ پچھلوں کو چھڑائیں گے کہ ہمارے لیے تم دوگنی سزا دیے جانے کی درخواست کرنے اٹھے تھے کیا ہاتھ آیا الٹی منہ کی کھائی تم میں کیا سرخاب کا پر تھا جو تم کو کم سزا ملتی مجرم مجرم سب برابر کیونکہ ان کے گناہ برابر۔ اس لیے اپنے اپنے کیے کو تمہیں بھی بھرنا پڑے گا اور ہمیں بھی۔ اپنے کرتوتوں کی سزا میں یہ عذاب تمہیں بھی بھگتنا ہے اور ہمیں بھی اللہ ہی اپنا رحم کرے ورنہ اسے جان چھوٹتی نظر نہیں آتی کاش اس بات کو ہم لوگ دنیا ہی میں سمجھ لیں کہ ایک روز مرنا ہے

رہے گر کوئی تا قیامت سلامت

پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت۔

قرآن مجید کی باتیں اٹل ہیں :
قرآن مجید کی آیتیں تمہارے سامنے ہیں آنکھیں کھول کر دیکھو اور کان لگا کر سنو کے آخر یہ کیا کہتی ہیں ان کے متعلق سوچنے کا وقت ہمارے پاس یہی ہے اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ یہ وقت بہت جلد ختم ہو جائے گا اور موت کے بعد جونہی ادھر کی آنکھیں بند ہو کر ادھر کی آنکھیں کھلیں گی تو معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ قرآن مجید تھا وہ بالکل سچ تھا لیکن اس وقت آنکھوں کا کھلنا کچھ کام نہ آئے گا اور سوائے پچھتاوے کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔
ان آیتوں میں نافرمانوں کے انجام کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ یقیناً دل دہلا دینے والا ہے۔ جو لوگ اس دنیا میں اپنی خواہشیں پوری کرنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں اور دنیا کے عیش و عشرت میں کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتے ان کے لیے پہلے رکوع میں حقیقت حال کو واضح کر دیا گیا ہے ان سے کہا گیا ہے کہ دنیا کی ساری چیزیں انسان کے آرام کے لیے بنائی گئی ہیں لیکن تمہیں ان کے استعمال کا طریقہ سیکھنا چاہیے اللہ کے تمام رسول جو وقتاً فوقتاً دنیا میں آتے رہے ہیں ان کا کام یہی تھا کہ انسان کو ان کے استعمال کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ بتائیں کیونکہ اس کا ایک دشمن جو بڑا خطرناک ہے اس کے پیچھے لگا ہوا ہے جس کا کام یہی ہے کہ رسولوں نے دنیا کی چیزوں سے فائدہ اٹھانے کا جو طریقہ بتایا ہے اس پر انسان کو نہ چلنے دے اور بیچارے کا بیڑہ غرق کر دے وہ انسان سے کہتا ہے کہ تجھ میں ارادہ موجود، قوت موجود اور تیرے سامنے عیش و عشرت کے سامان موجود۔ حیف ہے کہ تو اپنی من مانی نہ کرے اور خواہ مخواہ خیالی باتوں سے ڈر کر دنیا کے مزے چھوڑ دے۔ وہ کہتا ہے کہ ارے نادان! جنت دوزخ کو کس نے دیکھا ان دیکھی چیزوں کی رغبت بیکار ہے اور ایسے ہی ان سے ڈرنا بیکار ہے مجھے ایسی کیا پڑی کے نقد مال کو چھوڑ کر کورے والوں پر سختیاں جھیلیں اور پرہیزگاری کے لیے پاپڑ بیلے۔
قرآن مجید کہتا ہے کہ دنیا کی پاکیزہ چیزوں سے اعتدال کے ساتھ فائدہ اٹھاؤ، بے حیائی چھپی اور کھلی دونوں قسم کی بدکاریوں سے گناہ سے کسی پر ناحق ظلم و زیادتی کرنے سے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کا کہنا ماننے سے اور اللہ کا غلط تصور کرنے سے بچو۔ یہ چیزیں تمہارے اوپر حرام ہیں حلال چیزوں سے اعتدال کے ساتھ فائدہ اٹھانا حرام چیزوں سے بچنا بس یہی تعلیم اللہ نے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ تم کو دی ہے اس پر عمل کرو تو کرو ورنہ جب آنکھ بند ہو گئی تو کہنا نہ ماننے والوں کی پوری پوری شامت آجائے گی اللہ کے فرشتے بھی ان کے سامنے آجائیں گے۔ بدن سے ان کی جان کھینچیں گے اور کہیں گے بولو رسولوں کا کہنا کیوں نہ مانا۔ آج وہ شیطان اور اس کے اہالی موالی کہاں ہیں جن کے اشاروں پر تم چلتے تھے۔ انھیں پکارو کہ تمہیں اس آفت سے جو تمہارے سر پر آ پڑی ہے۔ بچائیں۔ وہ لوگ مایوسی کی حالت میں ادھر ادھر دیکھیں گے اور منہ سے سوائے اس کے کچھ نہ نکلے گا کہ ہائے ان کا تو کہیں نام و نشان نہیں ہے۔ اس جواب میں جتنی بے کسی اور مایوسی بھری ہوئی ہے اس کا اندازہ اسی وقت کر لینا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے بصد عجز و زاری اسی دنیا میں التجا کرنی چاہیے کہ یا اللہ ہم پر یہ مصیبت نہ ڈالنا اور اس کے ساتھ ہی ہمیں پختہ ارادہ کر لینا چاہیے کہ خواہ کچھ ہو ہم دنیا میں فقط اسی طرح زندگی بسر کریں گے جو اللہ تعالیٰ کی ساری کتابوں کے خلاصہ یعنی قرآن مجید میں لکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کے سارے رسولوں کے سردار محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کرکے دکھایا ہے۔ (درس قرآن آسٹریلیا)
قرآن مجید میں ہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ برے کی سزا اس کی برائی کے برابر ہو گی۔
لیکن یہاں دوگنا عذاب بیان کیا جا رہا ہے اس کا مفہوم حدیث میں اس طرح بیان ہوا ہے جو گناہ پہلے لوگوں کی وجہ سے دوسری نسل میں منتقل ہوں گے اس میں گناہ ایجاد کرنے والوں کو ان کے بعد آنے والے لوگوں کے گناہوں کا حصہ بھی ملے گا اور اکثر یہی ہوتا آ رہا ہے کہ نہ صرف ایک نسل کے گناہ کسی نہ کسی صورت میں دوسری نسل میں منتقل ہوتے رہتے ہیں بلکہ پہلے لوگوں کے گناہوں کے نتیجہ میں نئی نسل اپنے گناہوں میں مزید اضافہ کرتی ہے۔ اس طرح ہر نسل اپنے بعد آنے والی نسل کے لیے پہلے سے زیادہ گناہ چھوڑتی ہے۔ نتیجتاً مجرموں کی غالب اکثریت اپنے ہی نہیں بلکہ دوسروں کے گناہوں کے ذمہ دار بنتے ہیں۔ اسی بناء پر انھیں دوگنا عذاب دیا جائے گا کیونکہ ان کے گناہوں کی نوعیت بھی دوگنی ہو گی۔ جہنمیوں کا ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانا ان کے لیے کوئی فائدہ مند نہیں ہو گا اس لیے جہنمیوں کے پیشوا اپنے سے پیچھے آنے والوں کو کہیں گے تمہارا ہم کو اپنے گناہوں کا ذمہ دار ٹھہرانا تمہیں کچھ فائدہ نہیں دے گا اور تم سزا کے حوالے سے ہم پر کوئی امتیاز نہیں رکھتے لہٰذا اپنے کیے کی سزا بھگتتے رہو۔ اس طرح جہنمی عذاب میں مبتلا رہ کر ایک دوسرے پر پھٹکار بھیجتے رہیں گے۔

(عَنْ اَبِیْ ہُرَیْرَۃَ (رض) قَالَ قَالَ النَّبِیُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ فَاَبَوَاہُ یُہَوِّدَانِہٖ اَوْ یُنَصِّرَانِہٖ اَوْ یُمَجِّسَانِہٖ کَمَثَلِ الْبَہِیْمَۃِ تُنْتَجُ الْبَہِیْمَۃَ ہَلْ تَرٰی فِیْہَا جَدْعَاءَ) [رواہ البخاری : کتاب الجنائز، باب ما قیل فی اولاد المشرکین]

" حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہر نو مولود فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی بنادیتے ہیں جس طرح جانور کسی کو جنم دیتا ہے تو کیا تم ان میں کسی کو مقطوع الاعضا پاتے ہو ؟ (فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

دوزخ میں کفار کے احوال : ان دو آیتوں میں کفار کے دوزخ میں داخل ہونے کی کیفیت کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس دوزخ میں داخل ہو جاؤ جس میں تم سے پہلے گزرے ہوئے جن اور انس داخل ہو چکے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام کفار ایک ہی مرتبہ دوخ میں نہیں داخل ہوں گے۔ بلکہ پہلے ایک جماعت داخل ہو گی اس کے بعد دوسری جماعت داخل ہو گی اور ان میں سابق اور مسبوق ہوں گے اور بعد میں آنے والے پہلوں کے حال کا مشاہدہ کریں گے۔ پھر فرمایا : جب بھی کوئی جماعت (دوزخ میں) داخل ہو گی تو وہ اپنی جیسی جماعت پر لعنت کرے گی۔ اس کا معنی یہ ہے کہ مشرکین مشرکین پر لعنت کریں گے۔ اسی طرح یہود، یہود پر لعنت کریں گے اور نصاری، نصاری پر۔

پھر فرمایا تو بعد والے پہلوں کے متعلق کہیں گے : اس کی تفسیر میں تین قول ہیں۔ امت کے آخر امت کے اول سے کہیں گے، آخری زمانہ کے لوگ پہلے زمانہ کے لوگوں سے کہیں گے جنہوں نے اس بد عقیدگی کو شروع کیا تھا، اور تیسرا قول یہ ہے کہ دوزخ میں آخر میں داخل ہونے والے، پہلے داخل ہونے والوں سے کہیں گے جنہوں نے ان کو گمراہ کیا تھا۔

پھر فرمایا : وہ کہیں گے اے ہمارے رب ! ہم کو انھوں نے گمراہ کیا تھا سو تو ان کو دگنا آگ کا عذاب دے۔

ضعف کا معنی : ضعف کا معنی ہم نے دگنا کیا ہے۔ کیونکہ ضعف کا اکثر استعمال اسی معنی میں ہوتا ہے۔

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی 502 ھ نے لکھا ہے ضعف کا معنی شے اور اس کی مثل ہے۔ دس کا ضعف بیس اور سو کا ضعف دو سو ہے۔ (المفردات ج 2 ص 387 مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ، ریاض)

علامہ مجد الدین ابن اثیر الجزری المتوفی 606 ھ نے لکھا ہے : ضعف کا معنی دگنا ہے۔ کہا جاتا ہے اگر تم مجھے ایک درہم دو تو میں تمہیں اس کا ضعف دوں گا یعنی دو درہم دوں گا۔ ایک قول یہ ہے کہ کسی شے کا ضعف اس کی ایک مثل ہے اور دو ضعف دو مثلیں ہیں۔ ازہری نے کہا ہے کہ کلام عرب میں ضعف کا معنی ایک مثل سے لے کر زیادہ امثال تک ہے، اور یہ دو مثلوں میں منحصر نہیں ہے۔ بس کم از کم ضعف ایک مثل میں منحصر ہے اور اکثر ضعف کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اسی اعتبار سے یہ حدیث ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز، تنہا نماز پر پچیس درجہ ضعف ہوتی ہے۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث المساجد : 247، النہایہ، ج 3 ص 82، مطبوع دار الکتب العلمیہ، 1418 ھ)

دو گنے عذاب پر ایک سوال کا جواب : پھر فرمایا : اللہ فرمائے گا ہر ایک کے لیے دگنا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے۔ اس کا بظاہر معنی یہ ہے کہ وہ جس قدر عذاب کے مستحق ہوں گے ان کو اس کا دگنا عذاب دیا جائے گا اور یہ عدل کے خلاف ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کفار کو ان کے جرائم کے مطابق ہی عذاب ہوگا۔ لیکن ان کو یہ عذاب مسلسل ہوتا رہے گا۔ مثلاً ان کو درد کی ایک کیفیت لاحق ہو گی اس کے بعد پھر اس کی مثل لاحق ہو گی۔ اور پھر ایک مثل لاحق ہو گی اور یہ سلسلہ مسلسل جاری رہے گا۔ اس لیے فرمایا ہر ایک کے لیے دگنا عذاب ہے اور ہم ضعف کا معنی بیان کر چکے ہیں کہ کسی شے کی ایک مثل سے لے کر غیر متناہی امثال تک ضعف ہے۔

(تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ:

وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝۳۹

لغۃ القرآن: وَقَالَتْ : اور کہا] [اُوْلٰىهُمْ : ان کی پہلی] [لِاُخْرٰىهُمْ : اپنی پچھلی " جماعت " سے] [فَمَا : تو نہ] [كَانَ : ہے] [لَكُمْ : تمہارے لیے] [عَلَيْنَا : ہم پر] [مِّنْ : سے] [فَضْلٍ : فضل " کرنے "] [فَذُوْقُوا : تو تم سب مزہ چکھو] [الْعَذَابَ : عذاب کو] [بِمَا : اس وجہ سے جو] [كُنْتُمْ : ہو تم] [تَكْسِبُوْنَ : تم سب عمل کرتے ہو]

ترجمہ: اور ان کے اگلے اپنے پچھلوں سے کہیں گے : سو تمہیں ہم پر کچھ فضیلت نہ ہوئی پس (اب) تم (بھی) عذاب (کا مزہ) چکھو اس کے سبب جو کچھ تم کماتے تھے

تشریح:

پہلی امتیں پچھلی امتوں کو یا پیشوا اپنے پیروؤں کو کہیں گے کہ ہمارے اور تمہارے جرم کی نوعیت میں فرق نہیں کیونکہ اگر ہم تمہیں گمراہی کی طرف بلانے کے مجرم ہیں تو تم اس کو قبول کرنے کے مجرم ہو۔ تمہارے پاس عقل تھی۔ آسمانی کتاب تھی۔ اس کو سمجھانے والے تھے۔ حق کی طرف دعوت دینے والے تھے۔ انھیں چھوڑ کر جو تم ہمارے ساتھ ہو لیے۔ سچی دعوت کو رد کرکے جو جھوٹی دعوت قبول کی۔ راہ راست سے منہ موڑ کر غلط راستے پر جو تم چل نکلے تھے۔ کیا یہ تمہارا قصور نہ تھا؟ (تفسیر ضیاء القرآن)

آیت 39:

کافر کے اعمال اور روح دونوں مردود :

یعنی نہ زندگی میں ان کے اعمال کے لیے آسمانی قبول و رفعت حاصل ہے۔ نہ موت کے بعد ان کی ارواح کو آسمان پر چڑھنے کی اجازت ہے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ بعد موت کافر کی روح کو آسمان کی جانب سے سجین کی طرف دھکے دیئے جاتے ہیں اور مومن کی روح ساتویں آسمان تک صعود کرتی ہے۔ مفصل احوال کتب احادیث میں ملاحظہ کرو۔

اور ایک روایت حضرت عبداللہ بن عباس (رض) اور دوسرے صحابہ کرام سے اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی ہے کہ منکرین و کفار کی ارواح کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے، یہ روحیں نیچے پٹک دی جائیں گی،

مومن اور کافر کی موت کا حال :

اور اس مضمون کی تائید حضرت براء بن عازب (رض) کی اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور امام احمد (رح) نے مفصل نقل کیا ہے، جس کا اختصار یہ ہے کہ :

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کسی انصاری صحابی کے جنازہ میں تشریف لے گئے، ابھی قبر کی تیاری میں کچھ دیر تھی تو ایک جگہ بیٹھ گئے، اور صحابہ کرام آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گرد خاموش بیٹھ گئے، آپ نے سر مبارک اٹھا کہ فرمایا کہ مومن بندہ کے لیے جب موت کا وقت آتا ہے تو آسمان سے سفید چمکتے ہوئے چہروں والے فرشتے آتے ہیں، جن کے ساتھ جنت کا کفن اور خوشبو ہوتی ہے، اور وہ مرنے والے کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں، پھر فرشتہ موت عزرائیل (علیہ السلام) آتے ہیں، اور اس کی روح کو خطاب کرتے ہیں کہ اے نفس مطمئنہ رب کی مغفرت اور خوشنودی کے لیے نکلو، اس وقت اس کی روح اس طرح بدن سے

بآسانی نکل جاتی ہے جیسے کسی مشکیزہ کا دہانہ کھول دیا جائے تو اس کا پانی نکل جاتا ہے، اس کی روح کو فرشتہ موت اپنے ہاتھ میں لے کر ان فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے، یہ فرشتے اس کو لے کر چلتے ہیں، جہاں ان کو کوئی فرشتوں کا گروہ ملتا ہے وہ پوچھتے ہیں یہ پاک روح کس کی ہے، یہ حضرات اس کا وہ نام و لقب لیتے ہیں، جو عزت و احترام کے لیے اس کے واسطے دنیا میں استعمال کیا جاتا تھا، اور کہتے ہیں کہ یہ فلاں ابن فلاں ہے، یہاں تک یہ فرشتے بھی ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ ساتویں آسمان پر پہنچتے ہیں اس وقت حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندے کا اعمال نامہ علیّین میں لکھو، اور اس کو واپس کر دو، یہ روح پھر لوٹ کر قبر میں آتی ہے، اور قبر میں حساب لینے والے فرشتے آ کر اس کو اٹھاتے اور سوال کرتے ہیں، کہ تیرا رب کون ہے اور تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ کہ میرا رب اللہ تعالیٰ ہے اور دین اسلام ہے، پھر سوال ہوتا ہے کہ یہ بزرگ جو تمہارے لیے بھیجے گئے ہیں کون ہیں وہ کہتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں، اس وقت ایک آسمانی ندا آتی ہے کہ میرا بندہ سچا ہے، اس کے لیے جنت کا فرش بچھا دو اور جنت کا لباس پہنا دو اور جنت کی طرف اس کا دروازہ کھول دو، اس دروازہ سے اس کو جنت کی خوشبوئیں اور ہوائیں آنے لگتی ہیں، اور اس کا نیک عمل ایک حسین صورت میں اس کے پاس اس کو مانوس کرنے کے لیے آ جاتا ہے۔

اس کے بالمقابل کافر و منکر کا جب وقت موت آتا ہے تو آسمان سے سیاہ رنگ مہیب صورت فرشتے خراب قسم کا ٹاٹ لے کر آتے ہیں، اور بالمقابل بیٹھ جاتے ہیں، پھر فرشتہ موت اس کی روح اس طرح نکالتا ہے جیسے کوئی خار دار شاخ گیلی اون میں لپٹی ہوئی ہو اس میں سے کھینچی جائے یہ روح نکلتی ہے تو اس کی بدبو مردار جانور کی بدبو سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے، فرشتے اس کو لے کر چلتے ہیں راہ میں جو دوسرے فرشتے ملتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ یہ کس کی خبیث روح ہے، یہ حضرات اس وقت اس کا وہ برے سے برا نام و لقب ذکر کرتے ہیں جن کے ساتھ وہ دنیا میں پکارا جاتا تھا کہ یہ فلاں بن فلاں ہے، یہاں تک کہ سب سے پہلے آسمان پر پہنچ کر دروازہ کھولنے کے لیے کہتے ہیں تو اس کے لیے آسمان کا دروازہ نہیں کھولا جاتا، بلکہ حکم یہ ہوتا ہے کہ اس بندہ کا اعمال نامہ سجّین میں رکھو، جہاں نافرمان بندوں کے اعمال نامے رکھے جاتے ہیں، اور اس روح کو پھینک دیا جاتا ہے، وہ بدن میں دوبارہ آتی ہے فرشتے اس کو بٹھا کر اس سے بھی وہی سوالات کرتے ہیں جو مومن بندہ سے کئے تھے، یہ سب کا جواب یہ دیتا ہے ھاہ ھاہ لا ادری، یعنی میں کچھ نہیں جانتا، اس کے لیے جہنم کا فرش، جہنم کا لباس دے دیا جاتا ہے، اور جہنم کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے جس سے اس کو جہنم کی آنچ اور گرمی پہنچتی رہتی ہے، اور اس کی قبر اس پر تنگ کر دی جاتی ہے، نعوذ باللہ منہ

وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ۔

کافروں کا جنت میں جانا محال ہے:

یہ تعلیق بالمحال کے طور پر فرمایا۔ ہر زبان کے محاورات میں ایسی امثال موجود ہے جن میں کسی چیز کے محال ہونے کو دوسری محال چیز پر معلق کر کے ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی جس طرح یہ ناممکن ہے کہ اونٹ اپنی اسی کلانی اور جسامت پر رہے اور سوئی کا ناکہ ایسا ہی تنگ اور چھوٹا ہو۔ اس کے باوجود اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے۔ اسی طرح ان مکذبین و متکبرین کا جنت میں داخل ہونا محال ہے کیونکہ حق تعالیٰ جہنم میں ان کے خلود کی خبر دے چکا ہے اور علم الٰہی میں یہی سزا ان کے لیے ٹھہر چکی ہے پھر خدا کے علم اور اخبار کے خلاف کیسے وقوع میں آ سکتا ہے۔ (تفسیر گلدستہ۔ محمد اسحاق)

کفار کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولنے کے متعدد محامل: اس سے پہلی آیتوں میں بھی کفار کے عذاب کا ذکر فرمایا تھا یہ آیت بھی اس سلسلہ سے متعلق ہے۔ اس آیت میں فرمایا ہے کہ ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ اس کی حسب ذیل تفسیریں ہیں:

1۔ علی بن طلحہ، اور مجاہد وغیرہ نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ کفار کے اعمال اور ان کی دعاؤں کی قبولیت کے لیے آسان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور اس کی دلیل درج ذیل آیات ہیں: "الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ: اس کی طرف پاک کلمے چڑھتے ہیں اور اللہ نیک عمل کو بلند فرماتا ہے" (فاطر: 10)۔ "کلا ان کتب الابرار لفی علیین: حق یہ ہے کہ بیشک نیکی کرنے والوں کا نامہ اعمال ضرور (ساتویں آسمان کے اوپر) علیین میں ہے" (المطففین: 18)

2۔ امام رازی نے اس آیت سے یہ مستنبط کیا ہے کہ کافروں پر آسمان سے کوئی خیر اور برکت نازل نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "ولو ان اھل القری امنوا و تقوا لفتحنا علیھم برکت من السماء والارض و لکن کذبوا فاخذ نھم بماکانوا یکسبون: اور اگر بستیوں والے ایمان لے آتے اور (اللہ سے) ڈرتے رہتے تو ہم

ضرور ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کو کھول دیتے لیکن انھوں نے (اللہ کی آیتوں کو) جھٹلایا تو ہم نے انھیں ان کے ان کاموں کی وجہ سے گرفت میں لے لیا جو وہ کرتے تھے" (الاعراف: 96)

3۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ کافروں کی روحوں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوں گے حتی کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے، اور اونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہونا محال ہے اور جو محال پر موقوف ہو وہ بھی محال ہوتا ہے۔ کفار کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جانے اور جنت میں ان کے داخل نہ ہو سکنے پر حسب ذیل حدیث میں دلیل ہے:

کافروں کے لیے آسمان کا دروازہ نہ کھولنے کے متعلق حدیث: امام احمد بن حنبل متوفی 241ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: حضرت براء بن عازب (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک انصاری کے جنازہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اتھ گئے۔ جب ہم قبر پر پہنچ کر خاموشی سے بیٹھ گئے تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دو یا تین بار فرمایا: قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ طلب کو۔ پھر آپ نے فرمایا جب مسلمان بندہ دنیا سے منقطع ہو کر آخرت کی طرف روانہ ہونے لگتا ہے تو ملک الموت آکر اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے: اے پاکیزہ روح اللہ کی مغفرت اور اس کی رضا کی خاطر نکل۔ پھر وہ روح جسم سے اس طرح نکلتی ہے جس طرح پانی کے قطرے مشک سے نکلتے ہیں۔ جب فرشتے اس روح کو لے کر فرشتوں کی جماعت کے پاس سے گزرتے ہیں تو وہ پوچھتے ہیں یہ پاکیزہ روح کون ہے؟ وہ اس کا وہ نام بتاتے ہیں جو دنیا میں اس کا اچھا نام تھا، جب وہ آسمان دنیا کے سامنے پہنچ کر اس کا دروازہ کھلواتے ہیں تو وہ کھول دیا جاتا ہے اور اسی طرح وہ ساتویں آسمان تک پہنچ جاتے ہیں۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ میرے اس بندہ کے نامہ اعمال کو علیین میں لکھ دو اور اس کو زمین کی طرف لوٹا دو۔ پھر اس کی روح اس کے جسم میں لوٹادی جاتی ہے۔ پھر اس کے پاس دو فرشتے آکر اس کو بٹھاتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے! وہ پوچھتے ہیں تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے میرا دین اسلام ہے! وہ پوچھتے ہیں یہ کون شخص ہے جو تم میں مبعوث کیا گیا تھا؟ وہ کہتا ہے یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں تمہیں ان کا علم کیسے ہوا؟ وہ کہتا ہے میں نے اللہ کی کتاب میں پڑھا، میں ان پر ایمان لایا اور ان کی تصدیق کی۔ پھر ایک منادی اعلان کرتا ہے کہ میرے بندہ نے سچ کہا، اس کے لیے جنت سے فرش بچھا دو اور اس کو جنت کا لباس پہنا دو اور اس کے لیے جنت کی کھڑی کھول دو (الی قولہ) اور جب کافر کی دنیا سے روانگی کا وقت آتا ہے تو اس کے پاس سیاہ رنگ کے فشتے ٹاٹ لے کر آتے ہیں۔ پھر ملک الموت آکر اس کے سرہانے بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں اے خبیث روح! اللہ کے غصہ اور غضب کی طرف نکل! اس کی روح جسم کے اجزاء میں پھیل جاتی ہے اور اس کو اس طرح کھینچ کر نکالا جاتا ہے جس طرح گیلے اون سے لوہے کی سیخ کو کھینچ کر نکالا جاتا ہے۔ روح کے نکلتے ہی وہ اس کو ٹاٹ میں لپیٹ لیتے ہیں۔ وہ روح سخت بدبودار ہوتی ہے۔ وہ اس کو لے کر جہاں سے گزرتے ہیں فرشتے پوچھتے ہیں یہ کون خبیث روح ہے؟ پھر وہ اس کا وہ نام بتاتے ہیں جو دنیا میں اس کا بہت برا نام تھا۔ جب وہ اس روح کو لے کر آسمان دنیا پر پہنچتے ہیں اور آسمان کا دروازہ کھلواتے ہیں تو ان کے لیے دروازہ نہیں کھولا جاتا۔ پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ آیت پڑھی۔ لا تفتح لھم ابواب السماء ولا یدخلون الجنتہ حتی یلج الجمل فی سم الخیاط۔ اللہ فرماتا ہے اس کا اعمال نامہ زمین کے سب سے نچلے طبقہ سجین میں پھینک دو۔ پھر اس کی روح کو نیچے پھینک دیا جاتا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: "ومن یشرک باللہ فکانما خر من السماء فتخطفہ الطیر او تھوی بہ الریح فی مکان سحیق: اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا تو گویا آسمان سے گر پڑا پھر اسے (مردار خور) پرندے اچک لیتے ہیں یا اسے آندھی کسی دور جگہ میں پھینک دیتی ہے")۔ پھر اس کی روح اس کے جسم میں لوٹادی جاتی ہے پھر فرشتے اس کو قبر میں بٹھاتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں تیارب کون ہے؟ وہ کہتا ہے افسوس میں نہیں جانتا! پھر پوچھتے ہیں تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے افسوس میں نہیں جانتا! پھر پوچھتے ہیں یہ کون شخص ہیں جو تم میں مبعوث کیے گئے تھے؟ وہ کہے گا افسوس میں نہیں جانتا پھر ایک منادی آسمان سے ندا کرے گا، اس کے لیے دوزخ سے فرش بچھا دو اور اس کے لیے دوزخ کی کھڑکی کھول دو اور اس کی قبر کو تنگ کر دیا جائے گا حتی کہ اس کی پسلیاں ایک طرف سے دوسری طرف نکل جائیں گی۔ پھر ایک بد شکل اور بدبودار شخص آئے گا اور کہے گا میں تیرا خبیث عمل ہوں اور وہ کافر کہے ا۔ اے میرے رب قیامت قائم نہ کرنا۔ (مسند احمد، ج 4، ص 288۔ 289) دار الفکر، طبع قدیم مسند احمد، ج 6، رقم الحدیث: 18559، طبع جدید دار الفکر اس کی سند صحیح ہے، مسند احمد، ج 14، رقم الحدیث: 18443۔ دار الحدیث قاہر، سنن ابوداود، رقم الھدیث: 4753۔ سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 4462۔ مجمع الزوائد ج 5 ص 49۔ 50)

نوٹ : مسند احمد کی روایت میں بہت زیادہ تفصیل ہے۔ سنن ابو داؤد اور سنن ابن ماجہ اور سنن ابن ماجہ کی روایت میں اتنی تفصیل نہیں ہے لیکن نفس مضمون واحد ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن۔علامہ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُجْرِمِيْنَ ○۴۰

لغۃ القرآن: اِنَّ : بیشک] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [كَذَّبُوْا : انھوں نے جھٹلایا] [بِاٰيٰتِنَا : ہماری آیات کو] [وَ : اور] [اسْتَكْبَرُوْا : سب نے تکبر کیا] [عَنْهَا : اس سے] [لَا : نہیں] [تُفَتَّحُ : کھولے جائیں گے] [لَهُمْ : ان کے لیے] [اَبْوَابُ : دروازے] [السَّمَآءِ : آسمان] [وَلَا : اور نہ] [يَدْخُلُوْنَ : سب داخل ہوں گے] [الْجَنَّةَ : جنت کو] [حَتّٰي : یہاں تک کہ] [يَلِجَ : داخل ہوجائے] [الْجَمَلُ : اونٹ] [فِي : میں] [سَمِّ الْخِيَاطِ : سوئی کے ناکے] [وَكَذٰلِكَ : اور اسی طرح] [نَجْزِي : ہم بدلہ دیا کرتے ہیں] [الْمُجْرِمِيْنَ : مجرموں کا]

ترجمہ: بیشک جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے سرکشی کی ان کے لیے آسمان (رحمت و قبولیت) کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور نہ ہی وہ جنت میں داخل ہو سکیں گے یہاں تک کہ سوئی کے سوراخ میں اونٹ داخل ہو جائے (یعنی جیسے یہ ناممکن ہے اسی طرح ان کا جنت میں داخل ہونا بھی ناممکن ہے)، اور ہم مجرموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں

تشریح: جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلایا اور ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیا مرنے کے بعد ان کی روحیں آسمانوں سے اوپر نہیں جا سکیں گی (کیونکہ اوپر صرف نیک لوگوں کی روحیں جا سکتی ہیں) اور قیامت کے دن وہ جنت میں بھی داخل نہیں ہو سکیں گی بلکہ ان کا جنت میں جانا ایسا ہی ناممکن ہوگا جیسے ایک اونٹ کا سوئی کے باریک سوراخ سے گزرنا ناممکن ہے، للذا وہ دوزخ میں رہیں گے اور دوزخ کی آگ ہی ان کا اوڑھنا اور بچھونا ہو گی یعنی ہر طرف سے دوزخ کی آگ میں گھرے رہیں گے۔

کافروں کے لیے آسمان کا دروازہ نہ کھولنے کے متعلق چند احادیث کا خلاصہ

ایک انصاری (رض) کو قبر میں دفن کرنے کے بعد حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ (رض) سے فرمایا: قبر کے عذاب سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرو، پھر آپ نے فرمایا: اس دنیا میں جب نیک آدمی کی زندگی کا وقت پورا ہو جاتا ہے تو خوبصورت شکل میں موت کے فرشتے اس کی روح سے کہتے ہیں: اے پاکیزہ روح! اپنے رب کی مغفرت اور رضا کی طرف نکل۔ جب فرشتے اس کی روح کو اوپر لے جاتے ہیں تو اس کے لیے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور اس کو عرش کے پاس علیین میں پہنچا دیا جاتا ہے، پھر اس کی روح کو اس کے جسم میں لوٹا دیا جاتا ہے اور دو فرشتے قبر میں اس سے پہلا سوال کرتے ہیں: تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے: میرا رب اللہ ہے، پھر دوسرا سوال کرتے ہیں: تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے: میرا دین اسلام ہے، پھر تیسرا سوال کرتے ہیں: یہ کون شخص ہے جو تم میں مبعوث کیا گیا تھا؟ وہ کہتا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کا رسول ہے، میں ان پر ایمان لایا اور ان کی صدیق کی، پھر اوپر سے ندا آئے گی: میرے بندے نے سچ کہا، اس کے لیے جنت کا فرش بچھا دو، اس کو جنت کا لباس پہنا دو اور اس کے لیے جنت کی کھڑکی کھول دو، پھر وہ جنت کی خوشبو سے معطر ہو کر سو جاتا ہے۔

لیکن جب برے آدمی کی زندگی کا وقت ختم ہو جاتا ہے تو سیاہ شکل میں موت کے فرشتے اس کی روح سے کہتے ہیں : اے خبیث روح ! اللہ تعالیٰ کے غضب اور جلال کی طرف نکل۔ جب فرشتے اس کی روح کو اوپر لے جاتے ہیں تو آسمانوں کے فرشتے اس خبیث روح کے لیے دروازے کھولنے سے انکار کر دیتے ہیں، چنانچہ اس کی روح کو زمین کے سب سے نچلے حصہ یعنی سجین میں پھینک دیا جاتا ہے، پھر اس کی روح کو جسم میں لوٹایا جاتا ہے اور دو فرشتے قبر میں اس سے پہلا سوال کرتے ہیں : تیرا رب کون ہے ؟ وہ کہتا ہے : ہائے افسوس ! میں نہیں جانتا، پھر دوسرا سوال کرتے ہیں : تیرا دین کیا ہے ؟ وہ کہتا ہے : ہائے افسوس ! میں نہیں جانتا، پھر تیرا سوال کرتے ہیں : یہ کون شخص ہے جو تم میں مبعوث کیا گیا تھا ؟ وہ کہتا ہے : ہائے افسوس ! میں نہیں جانتا، پھر ایک منادی آسمان سے ندا کرے گا : اس کے لیے دوزخ کا فرش بچھا دو، اس کو دوزخ کا لباس پہنا دو اور اس کے لیے دوزخ کی کھڑکی کھول دو، پھر جہنم کی تپش سے بے قرار رہتا ہے۔ (مسند احمد : ج ۴ : ص ۲۸۷ اور دیگر کتب حدیث و تفسیر) حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جب تم میں سے کوئی آدمی مر جاتا ہے تو اسے قبر میں صبح و شام اس کا دائمی ٹھکانا دکھاتا جاتا ہے۔ اگر وہ جنتی ہے تو اسے جنت میں اپنا محل دکھایا جاتا ہے اور اگر وہ دوزخی ہے تو اسے جہنم میں اس کا ٹھکانا دکھایا جاتا ہے کہ قیامت کے دن تجھے جہنم کے اس حصہ میں پھیکا جائے گا۔ (بخاری، کتاب الجنائز، باب ۹۰) (تفسیر امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

اب مسلسل (۱۱) گیارہ آیات میں اللہ کے باغیوں اور اس کے تابعداروں کا یکے بعد دیگرے کردار اور انجام بیان کیا جاتا ہے۔

عربی زبان میں "تکذیب" کا معنی حقیقت کو جھٹلانا یا اس کا انکار کرنا ہے۔ تکبر کا مفہوم یہ ہے کہ حقیقت جاننے کے باوجود اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کے ساتھ تکذیب اور تکبر کا رویہ اختیار کریں گے ان کے بارے میں دوٹوک اور قطعی طور پر فرما دیا گیا ہے کہ ان کے لیے نہ آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور نہ ہی ان کو جنت میں داخلہ نصیب ہوگا۔ اس فرمان میں قطعیت اور مزید تاکید پیدا کرنے کے لیے فرمایا کہ ان کا جنت میں داخلہ اتنا ہی ناممکن ہے جتنا اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزرنا محال ہے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ مجرم اپنے جرائم کی پوری طرح سزا پاتے رہیں مجرموں کے نیچے بھی جہنم کی دہکتی ہوئی آگ اور ان کے اوپر اور چاروں طرف بھی آگ ہی آگ ہوگی۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب اور ان کے ساتھ استکبار کا رویہ اختیار کرتے ہیں ایسے ظالموں کو ایسی ہی سزا دی جائے گی۔

" حضرت براء بن عازب (رض) بیان کرتے ہیں ہم نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ انصار کے کسی آدمی کے جنازہ کے لیے نکلے قبرستان پہنچے تو ابھی قبر کھودی نہیں گئی تھی۔ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیٹھ گئے تو ہم بھی آپ کے ارد گرد بیٹھ گئے جیسے ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی آپ اس کے ساتھ زمین کو کرید رہے تھے آپ نے سر اٹھاتے ہوئے دو یا تین مرتبہ فرمایا قبر کے عذاب سے پناہ مانگو پھر فرمایا۔۔ جب کافر دنیا کو چھوڑ کر آخرت کی طرف جا رہا ہوتا ہے تو اس کی طرف آسمان سے سیاہ چہروں والے فرشتے آتے ہیں ان کے ہاتھ میں بدبودار بوری ہوتی ہے وہ حد نگاہ تک اس کے پاس بیٹھ جاتے ہیں، پھر اس کے پاس ملک الموت آتا ہے یہاں تک کہ اس کے سر کے پاس بیٹھ جاتا ہے تو وہ کہتا ہے اے خبیث نفس ! اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب کی طرف چل۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا وہ اس کی روح کو اس طرح نکالتے ہیں جس طرح گرم سلائی کو روئی سے نکالا جاتا ہے وہ اس کو نکال کر تھیلے میں ڈالتے ہیں اس سے اتنی بدبو نکلتی ہے جس طرح زمین سے لاش کی گندی بدبو نکلتی ہے وہ اسے کو لے کر آسمانوں کی طرف بڑھتے ہیں ان کا گذر فرشتوں کے جس گروہ کے پاس سے ہوتا ہے وہ دریافت کرتے ہیں یہ خبیث روح کون سی ہے وہ کہتے ہیں یہ فلاں بن فلاں ہے۔ اس کے برے نام لے کر اس کو بلاتے ہیں یہاں تک کہ وہ آسمان دنیا تک پہنچتے ہیں وہ اس کو کھلوانا چاہتے ہیں مگر اسے کھولا نہیں جاتا، پھر نبی معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس آیت مبارکہ کی تلاوت فرمائی : "ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے یہاں تک کہ سوئی کے سوراخ میں اونٹ داخل ہو جائے "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس کے لیے سجین یعنی زمین کی تہہ میں ٹھکانا لکھو۔ پھر اس کی روح کو نیچے پھینک دیا جاتا ہے پھر نبی معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس آیت مبارکہ کی تلاوت فرمائی "جو اللہ کے ساتھ شرک کرے گا گویا کہ وہ آسمان سے گرا اور اسے پرندے اچک لیں یا اس کو ہوائیں کسی دور دراز مقام پر پھینک دیں" [رواہ احمد] (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

اقبال مرحوم نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے۔

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

لیکن جن لوگوں کا رویہ اسی طرح کا ہو جائے کہ وہ دلیل کی کسی بات کو سننے پر آمادہ نہ ہوں اور اپنی انا کے گنبد سے باہر جھانکنا بھی انھیں گوارا نہ ہو ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں بلکہ اس کو اپنی انا کا مسئلہ بنا کر اس دعوت کے ساتھ حقارت کا سلوک کرتے ہیں۔ انھیں یہ بات کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہوتی کہ وہ اپنے دنیوی تفوق کے باوجود ایک غریب آدمی کی بات چاہے وہ اپنے شخصی کردار میں کیسا ہی عظیم کیوں نہ ہو قبول کرلیں وہ دلیل کے وزن کو نہیں دیکھتے بلکہ دولت کے وزن سے ہر چیز کو جانچتے ہیں۔ ان کے نزدیک کردار میں عظمت نہیں ہوتی بلکہ نسب کے حوالوں اور زمینی نسبتوں کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو استکبار کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ ایک ایسا خطرناک مرض ہے جس کسی کو بھی لاحق ہو جاتا ہے کوئی بھی عقل یا ہدایت کی بات اس کے دماغ میں داخل ہونا تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جس خرابی کا آغاز تکذیب سے ہوتا ہے وہ بڑھتے بڑھتے جب استکبار کی شکل اختیار کر جاتی ہے تو پھر بالعموم اللہ کی طرف سے ایسے لوگوں کی محرومی کا فیصلہ ہو جاتا ہے اس آیت کریمہ میں جہالت اور کفر کے اس رویے کی ابتدا اور انتہا کو ذکر فرما کر ایک طرح سے قرآن کریم کے مخاطبین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تم جس رویے کی طرف بڑھ رہے ہو ایسا نہ ہو کہ یہ رویہ تمہیں محرومی کی منزل تک پہنچا دے۔ اس لیے اگر بچنا چاہتے ہو تو اس سے بچنے کی کوشش کرو ورنہ سوچ لو کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ کہ تم اس رویے کے ساتھ جب تک زندہ رہو گے تمہارے لیے آسمانوں کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے کیونکہ اللہ کا یہ قانون ہے کہ جو لوگ بھی ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں ان کے لیے آسمانوں کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔ اب سوال یہ ہے کہ آسمانوں کے دروازے نہ کھولے جانے سے مراد کیا ہے؟

آسمانوں کے دروازے نہ کھولے جانے کا مفہوم

تفسیر بحر محیط میں حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے اس آیت کی تفسیر میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے اعمال اور ان کی دعاؤں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے یعنی ان کا کوئی عمل قبولیت کے مقام کو نہیں پہنچے گا اور اسی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی کوئی دعا بھی قبول نہیں ہوگی کیونکہ اعمال کی قبولیت کا دارومدار ایمان پر ہے جب کسی کو ایمان کی دولت نصیب ہوتی ہے تو اس کے اعمال کو آسمانوں میں اس جگہ رکھا جاتا ہے جس کو قرآن کریم میں علیین کہا گیا ہے اور جب کسی کے اعمال قبولیت کے مقام کو پہنچ جاتے ہیں تو پھر ان اعمال کی برکت سے اللہ تعالیٰ صاحب عمل کی دعائیں بھی قبول فرماتا ہے۔ قرآن کریم میں ایک دوسری آیت میں اسی مضمون کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے جس میں ارشاد ہے:

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ط (فاطر: ۱۰)

یعنی انسان کے کلمات الطیبات' اللہ کے پاس لے جائے جاتے ہیں اور ان کا نیک عمل ان کو اٹھاتا ہے۔

یعنی انسان کے اعمال صالحہ انسان کی مناجاتوں اور دعاؤں کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک پہنچانے کا باعث بنتے ہیں اور جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں کہ کسی بھی عمل کو عمل صالح بننے کے لیے ایمان کی ضرورت ہے اور کسی بھی دعا کو قبولیت کے مقام تک پہنچنے کے لیے عمل صالح کی ضرورت ہے اور یہ آپس میں لازم و ملزوم ہیں اگر ایمان میسر نہیں ہوگا تو کسی عمل کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی اور اگر اعمال صالح نہیں ہوں گے یعنی شریعت کے مطابق نہیں ہوں گے تو اللہ کے یہاں دعائیں قبولیت کا مقام حاصل نہیں کر پائیں گی۔ یہ صحیح ہے کہ دعائیں تو اللہ کافروں کی بھی سنتا ہے اور بدعمل مسلمانوں کی بھی لیکن اس حوالے سے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جہاں تک کافر کی دعاؤں کا تعلق ہے ان کی دعائیں اس لیے سنی جاتی ہیں تاکہ دنیا میں وہ جو انسانی بھلائی کے کام کرتے ہیں ان کا بدلہ ان کو دنیا ہی میں دے دیا جائے اور رزق اور زندگی اور اس کے متعلقات کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اپنے ذمے لے رکھا ہے وہ اس لیے عطا کر دیا جاتا ہے تاکہ قیامت کے دن اسی کے حوالے سے ان سے ایمان نہ لانے کی بازپرس کی جائے۔ البتہ بدعمل مسلمانوں کی دعائیں اس لیے بعض دفعہ قبول کرلی جاتی ہیں تاکہ یہی دعائیں اور اس کے جواب میں عطا کی جانے والی نعمتیں ان کے لیے آزمائش بنا دی جائیں اور اس طرح انھیں آزمایا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں پا کر شکر کرتے ہیں یا کفرانِ نعمت کرتے ہیں لیکن وہ دعائیں جو انسان کے لیے خیر کا باعث بنتی ہیں اور جس سے ایک مومن کے ایمان و عمل میں ترقی ہوتی ہے اور جس کے نتیجے میں دلوں کو سکون کی

دولت ملتی ہے یہ دعائیں تو صرف اسی وقت نصیب ہوتی ہیں جب انسان اعمال صالحہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اگر وہ اس میں کوتاہی کرتا ہے تو بعض دفعہ دنیا ہی میں اس کو تنبیہ کرنے یا آزمائش کے لیے بعض تکالیف میں مبتلا کیا جاتا ہے اور پھر جب وہ اپنے رب کو ان تکالیف کے ازالے کے لیے پکارتا ہے اور بار بار اپنی مصیبتوں کا حوالہ دیتا ہے تو ادھر سے ایک ہی آواز آتی ہے جس کو اکبر مرحوم نے نہایت احسن طریق سے ذکر کیا ہے۔

جب میں کہتا ہوں کہ یا اللہ میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامہ اعمال دیکھ

تو اس تفسیر کے مطابق یہاں یہی فرمایا جارہا ہے کہ ان کے لیے آسمانوں کے دروازے نہیں کھولے جاتے یعنی نہ ان کے اعمال قبولیت کا مقام پاتے ہیں اور نہ ان کی دعائیں سنی جاتی ہیں۔

ایک اور روایت میں حضرت عبداللہ ابن عباس (رض) اور بعض دوسرے صحابہ کرام سے اس آیت کی تفسیر میں یہ بات نقل کی گئی ہے کہ آسمان کے دروازے نہ کھولے جانے سے مراد یہ ہے کہ کفار کی ارواح کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے یعنی ان کی روحیں نیچے پٹخ دی جائیں گی۔ اس روایت کی تائید حضرت براء ابن عازب (رض) کی روایت کردہ ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جسے ایک سے زیادہ محدثین نے ذکر کیا ہے جس کا اختصار یہ ہے کہ :

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کسی انصاری صحابی کے جنازہ میں تشریف لے گئے۔ ابھی قبر کی تیاری میں کچھ دیر تھی تو ایک جگہ بیٹھ گئے اور صحابہ کرام آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گرد خاموش بیٹھ گئے ' آپ نے سر مبارک اٹھا کر فرمایا کہ مومن بندہ کے لیے جب موت کا وقت آتا ہے تو آسمان سے سفید چمکتے ہوئے چہروں والے فرشتے آتے ہیں جن کے ساتھ جنت کا کفن اور خوشبو ہوتی ہے اور وہ مرنے والے کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں ' پھر فرشتہ موت عزرائیل (علیہ السلام) آتے ہیں اور اس کی روح کو خطاب کرتے ہیں کہ اے نفس مطمئنہ رب کی مغفرت اور خوشنودی کے لیے نکلو ' اس وقت اس کی روح اس طرح بدن سے بآسانی نکل جاتی ہے جیسے کسی مشکیزہ کا دہانہ کھول دیا جائے تو اس کا پانی نکل جاتا ہے ' اس کی روح کو فرشتہ موت اپنے ہاتھ میں لے کر ان فرشتوں کے حوالہ کر دیتا ہے ' یہ فرشتے اس کو لے کر چلتے ہیں ' جہاں ان کو کوئی فرشتوں کا گروہ ملتا ہے وہ پوچھتے ہیں یہ پاک روح کس کی ہے ' یہ حضرات اس کا وہ نام و لقب لیتے ہیں جو عزت و احترام کے لیے اس کے واسطے دنیا میں استعمال کیا جاتا تھا اور کہتے ہیں کہ یہ فلاں ابن فلاں ہے۔ یہاں تک کہ یہ فرشتے روح کو لے کر پہلے آسمان پر پہنچتے ہیں اور دروازہ کھلواتے ہیں ' دروازہ کھولا جاتا ہے۔ یہاں سے اور فرشتے بھی ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ ساتویں آسمان پر پہنچتے ہیں۔ اس وقت حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندے کا اعمال نامہ علیین میں رکھو اور خود اس کو واپس کر دو یہ روح پھر لوٹ کر قبر میں آتی ہے اور قبر میں حساب لینے والے فرشتے آکر اس کو بٹھاتے اور سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے اور تیرا دین کیا ہے ؟ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ تعالیٰ ہے اور دین اسلام ہے۔ پھر سوال ہوتا ہے کہ یہ بزرگ جو تمہارے لیے بھیجے گئے ہیں کون ہیں ؟ وہ کہتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں ' اس وقت ایک آسمانی ندا آتی ہے کہ میرا بندہ سچا ہے ' اس کے لیے جنت کا فرش بچھا دو اور جنت کا لباس پہنا دو اور جنت کی طرف اس کا دروازہ کھول دو اس دروازہ سے اس کو جنت کی خوشبوئیں اور ہوائیں آنے لگتی ہیں اور اس کا نیک عمل ایک حسین صورت میں اس کے پاس اس کو مانوس کرنے کے لیے آجاتا ہے۔

اس کے بالمقابل کافر و منکر کا جب وقت موت آتا ہے تو آسمان سے سیاہ رنگ مہیب صورت فرشتے خراب قسم کا ٹاٹ لے کر آتے ہیں اور بالمقابل بیٹھ جاتے ہیں ' پھر فرشتہ موت اس کی روح اس طرح نکالتا ہے جیسے کوئی خار دار شاخ جو گیلی اون میں لپٹی ہوئی ہو اس میں سے کھینچی جائے ' یہ روح نکلتی ہے تو اس کی بدبو مردار جانور کی بدبو سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے ' فرشتے اس کو لے کر چلتے ہیں ' راہ میں جو دوسرے فرشتے ملتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ یہ کس خبیث کی روح ہے ' یہ حضرات اس وقت اس کا وہ برے سے برا نام و لقب ذکر کرتے ہیں جن کے ساتھ وہ دنیا میں پکارا جاتا تھا کہ یہ فلاں بن فلاں ہے ' یہاں تک کہ سب سے پہلے آسمان پر پہنچ کر دروازہ کھولنے کے لیے کہتے ہیں تو اس کے لیے آسمان کا دروازہ نہیں کھولا جاتا بلکہ حکم ہوتا ہے کہ اس بندہ کا اعمال نامہ سجین میں رکھو جہاں نافرمان بندوں کے اعمال نامے رکھے جاتے ہیں اور اس روح کو پھینک دیا جاتا ہے ' وہ بدن میں دوبارہ آتی ہے فرشتے اس کو بٹھا کر اس سے بھی وہی سوالات کرتے ہیں جو مومن بندہ سے کیے تھے ' یہ

سب کا جواب یہ دیتا ہے ھَاہْ ھَاہْ لَا اَدْرِیْ یعنی میں کچھ نہیں جانتا' اس کے لیے۔۔ جہنم کا فرش' جہنم کا لباس دے دیا جاتا ہے اور جہنم کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے جس سے اس کو جہنم کی آنچ اور گرمی پہنچتی رہتی ہے اور اس کی قبر اس پر تنگ کر دی جاتی ہے۔ نعوذ باللہ منہ

اس حدیث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کفار کی ارواح آسمان تک لے جائی تو جاتی ہیں لیکن آسمان کا دروازہ ان کے لیے نہیں کھلتا وہ وہیں سے پھینک دی جاتی ہیں۔ اس حدیث کی روشنی میں آیت کے اس ٹکڑے کا مفہوم تو واضح ہے البتہ اس کا مرادی معنی مراد لیتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ضمنی طور پر اس آیت سے یہ بات بھی مفہوم ہوتی ہے کہ جس طرح آسمان پر صاحب ایمان لوگوں کا خیر مقدم ہوگا اور وہ نہایت عزت واحترام سے جنت میں لے جائے جائیں گے۔ اس کے بالکل برعکس کافروں کے ساتھ نہایت توہین آمیز رویہ اختیار کیا جائے گا۔ انھیں مجرموں اور بدمعاشوں کی طرح ہنکاتے ہوئے اس مقام تک پہنچا دیا جائے گا جو ان کے لیے مقدر ہوگا۔

اس کے بعد کے جملے کہ وہ کافر لوگ جنت میں داخل نہیں ہوں گے تاوقتیکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہ ہو جائے۔ یہ اس قسم کا اسلوب بیان ہے جس کو تعلیق بالمحال کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح اونٹ کے سوئی کے ناکے میں داخل ہونا محال ہے اسی طرح ان متکبرین کا جنت میں داخل ہونا بھی محال ہے۔ تعبیر کا یہ اسلوب قدیم صحیفوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً انجیل میں ہے:

(اور یسوع نے اپنے شاگردوں سے کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہی میں داخل ہونا مشکل ہے اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو)

استکبار کا انجام

قرآن اور انجیل کی تعبیر میں بس یہ فرق ہے کہ سیدنا مسیح نے سبب استکبار یعنی دولت کا حوالہ دیا ہے اور قرآن نے اصل جرم یعنی استکبار کا اور پیچھے ہم حضرت آدم اور ابلیس کے قصے میں یہ پڑھ چکے ہیں کہ ابلیس کے جنت سے نکالے جانے کا اصل سبب استکبار ہی تھا کیونکہ استکبار ایک ایسی تباہ کن برائی ہے کہ جس دل میں یہ پیدا ہو جاتی ہے اس کے بعد اس کی روحانی اور اخلاقی موت کا واقع ہونا یقینی ہو جاتا ہے وہ اس کے نتیجے میں قبولیت کی استعداد کھو دیتا ہے وہ ایمان سے اتنا دور نکل جاتا ہے جس کے بعد لوٹ آنے کے سارے امکانات ختم ہو جاتے ہیں' انسانیت دم توڑ جاتی ہے' اخلاق کی ایک ایک قدر آہستہ آہستہ موت کا شکار ہو جاتی ہے ایسی صورت حال میں ایسے شخص کے جنت میں داخل ہونے کی کیا امید کی جا سکتی ہے اس لیے یہ بات فرمائی گئی ہے کہ جس طرح اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزرنا قطعی محال ہے اسی طرح ایسے شخص کا داخل ہونا بھی بالکل محال ہے اس میں ہمارے لیے سوچنے کی دعوت بھی موجود ہے کیونکہ جدید تعلیم نے جو فکری گمراہیاں پیدا کی ہیں ان میں سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ یہاں کا ہر پڑھا لکھا آدمی جہل مرکب کا شکار ہے یعنی ایک شخص جس نے ساری عمر انگریزی زبان پڑھی اور ان علوم وفنون کے سیکھنے میں زندگی گزار دی جس کا علوم اسلامی سے کوئی دور کا رشتہ نہیں اور وہ عربی زبان کی شدبدھ سے بھی واقف نہیں لیکن جب کبھی تاریخ مذاہب' حقیقت مذاہب یا خود اسلام پر بات ہوتی ہے تو وہ اپنے آپ کو ایک اتھارٹی سمجھتا ہے اور جن لوگوں نے علوم اسلامیہ کی تحصیل میں عمریں کھپائیں ہیں نہایت تحقیر کے انداز میں ان کی طرف رجوع کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ دنیا کے سارے علوم بھی آدمی حاصل کرلے تو یہ سامنے کی بات ہے کہ ان کا تعلق زمینی معلومات اور انسانی عقل سے ہے اور مذہب وحی الٰہی کے نتیجے میں ملتا ہے یہ انسان کی نارسائی سے وجود میں نہیں آیا بلکہ اللہ کی ابدی راہنمائی سے عطا ہوا ہے جس میں کسی غلطی کا امکان نہیں اور یہ ان پیغمبروں کے واسطے سے انسانوں کو پہنچا ہے جو معصوم پیدا ہوتے ہیں اور پھر جس کی تفہیم و تشریح میں ان لوگوں نے زندگیاں کھپائیں ہیں جو تقویٰ اور پارسائی میں اپنی مثال آپ تھے لیکن جو شخص ان تمام کے مقابلے میں اپنی ذات اور اپنے فہم پر اصرار کرتا ہے وہ حقیقتاً استکبار کا مریض ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے اکبر مرحوم نے کہا تھا کہ

انھوں نے دین کب سیکھا ہے رہ کر شیخ کے گھر میں
پلے کالج کے چکر میں مرے صاحب کے دفتر میں

اس آیت کریمہ میں ایسے ہی لوگوں کے لیے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں ایک مجرمین کا اور دوسرا ظالمین کا۔ ایک سے زیادہ مرتبہ ان دونوں الفاظ کی تشریح ہو چکی ہے اسے اگر پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ ایسے لوگ جو استکبار کے مریض ہیں وہ انسانیت کے مجرم بھی ہیں اور خود اپنی جانوں کے لیے ظالم بھی ہیں۔ اگلی آیت کریمہ میں ایسے لوگوں کو قیامت میں جو عذاب دیا جائے گا اس کی مزید شدت کو بیان کیا جا رہا ہے۔ (تفسیر روح القرآن۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

آیت مبارکہ:

لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الظّٰلِمِيْنَ ○۴۱

لغۃ القرآن: لَهُمْ : ان کے لیے] [مِّنْ : سے] [جَهَنَّمَ : جہنم] [مِهَادٌ : بچھونا ہوگا] [وَّ مِّنْ : سے] [فَوْقِهِمْ : ان کے اوپر] [غَوَاشٍ :" اسی کا " اوڑھنا ہوگا] [وَكَذٰلِكَ : اور اسی طرح] [نَجْزِي : ہم بدلہ دیا کرتے ہیں] [الظّٰلِمِيْنَ : سب ظالموں کا]

ترجمہ: اور ان کے لیے (آتش) دوزخ کا بچھونا اور ان کے اوپر (اسی کا) اوڑھنا ہوگا، اور ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں

تشریح:

لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ط وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الظّٰلِمِيْنَ۔

(الاعراف: ۴۱)

" ان کے لیے جہنم ہی کا بچھونا اور اوپر سے اسی کا اوڑھنا ہوگا اور ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیں گے "۔

مھاد۔ غواش کا مفہوم

" مہاد " کا معنی ہے بچھونا اور " غواش " غاشیہ کی جمع ہے جس کا معنی ہے ڈھانپ لینے والی چیز ' اس سے مراد ہے اوڑھنا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے لیے اوپر اور نیچے سے جہنم ہی اوڑھنا بچھونا ہوگی۔ کسی شخص کو نہایت اذیت دینا مقصود ہو تو اس کے لیے سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ اسے دہکتے انگاروں پر لٹا دیا جائے۔ آگ سے بڑا عذاب شاید ہی دنیا میں کوئی ہو۔ آدمی کے جسم کو آگ کی لپٹ بھی چھو جائے تو ناقابل برداشت ہوتی ہے چہ جائیکہ اسے آگ کے بستر پر لٹا دیا جائے جب تک اس کی کھال جل کر اور اس کی چربی پگھل کر اس کے کوئلوں کو نہیں بجھاتی اس کی اذیت میں کمی نہیں آسکتی لیکن ایسی اذیت کے بارے میں تصور کرنا بھی کس قدر تکلیف دہ ہے جس میں صرف آگ کا بستر ہی نہ ہو بلکہ اس کے اوپر بھی آگ کا لحاف دے دیا جائے یعنی نیچے دہکتے انگارے بچھا دیئے جائیں اور اوپر آگ ہی سے اسے ڈھانپ دیا جائے۔ (روح القرآن)

حضرت سوید بن غفلہ (رض) فرماتے ہیں " جب اللہ تعالیٰ اس بات کا ارادہ فرمائے گا کہ جہنمی اپنے ماسواسب کو بھول جائیں تو ان میں سے ہر شخص کے لیے اس کے قد برابر آگ کا ایک صندوق بنایا جائے گا پھر اس پر آگ کے تالوں میں سے ایک تالا لگا دیا جائے گا، پھر اس شخص کی ہر رگ میں آگ کی کیلیں لگا دی جائیں گی، پھر اس صندوق کو آگ کے دوسرے صندوق میں رکھ کر آگ کا تالا لگا دیا جائے گا، پھر ان دونوں کے درمیان آگ جلائی جائے گی تو اب ہر کافر یہ سمجھے گا کہ اس کے سوا اب کوئی آگ میں نہ رہا۔ (تفسیر صراط الجنان)

امام ابو الحسن القطان نے الطوالات میں، ابو الشیخ اور ابن مردویہ نے براء (رض) سے روایت کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کافر کو اس کی قبر میں آگ میں سے دو لوح (یعنی طوق) پہنائے جائیں گے۔ اسی کو فرمایا لفظ آیت " لھم من جھنم مھاد و من فوقھم غواش "

امام ابن مردویہ نے عائشہ (رض) سے روایت کیا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ آیت "لھم من جھنم مھاد ومن فوقھم غواش "تلاوت فرمائی اور فرمایا یہ طبقات ہیں اس کے اوپر کی جانب اور طبقات ہیں اس کے نیچے کی جانب یہ معلوم نہیں کہ اس کے اوپر زیادہ ہیں یا اس کے نیچے والے طبقات اسے اوپر اٹھاتے ہیں۔ اور اوپر والے طبقات اسے نیچے دباتے ہیں اور ان کے درمیان تنگ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اس طرح پھنس جاتا ہے جیسے نیزے میں لوہا پھنستا ہے۔

(تفسیر در منثور۔علامہ جلال الدین سیوطیؒ)

اس ہولناک عذاب کا تصور کرنا بھی انسانی احساس کے لیے بہت تکلیف دہ ہے چہ جائیکہ اسے برداشت کرنا۔ چنانچہ یہاں اس عذاب کو ان مستکبرین کے لیے بیان کیا جارہا ہے کہ قیامت کے دن یہ لوگ اس عذاب سے دوچار کیے جائیں گے۔ اے کاش ! آج دنیا میں اس عذاب سے بچنے کے لیے وہ کوئی کوشش کریں۔

اصلاح وتربیت کے دو موثر طریقے

دنیا میں اصلاح اور تربیت کے لیے جتنے طریقے اختیار کیے گئے ہیں یا جتنے اسلوب آزمائے گئے ہیں ان میں سب سے موثر دو ہی طریقے ہیں ایک ہے ترغیب اور دوسرا ہے ترہیب یعنی کسی بھی آدمی کو اگر آپ آمادہ عمل کرنا چاہیں تو اسے یا تو اس کے عمل کے نتیجے کے طور پر کسی بہت بڑے انعام کی ترغیب دیجئے اور یا پھر اسے کسی بہت برے انجام سے ڈرائیے یہی دو طریقے ہیں جس سے کسی بھی شخص کو آمادہ حرکت یا آمادہ عمل کیا جاسکتا ہے۔ آپ نے بارہا تجربہ کیا ہوگا کہ ایک شخص جو کوئی پابندی قبول کرنے یا کسی طرح کی زحمت اٹھانے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتا لیکن اگر آپ اسے یقین دلا دیجئے کہ اس کے نتیجے میں تمہیں بہت بڑا کوئی منصب مل سکتا ہے یا کوئی مالی منفعت حاصل ہوسکتی ہے تو آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ وہ شخص سرتاپا عمل بن جائے گا۔ مثال کے طور پر ایک شخص اپنے گھر میں لحاف میں لیٹا پڑا ہے شدید سردی کا موسم اور باہر ہلکی پھلکی پھوار اور یخ بستہ رات۔ اس کی بیوی کو اچانک یاد آتا ہے کہ صحن میں کچھ چیزیں پڑی رہ گئی ہیں نہ اٹھائی گئیں تو بارش سے خراب ہو جائیں گی وہ بچے کو لیے لیٹی ہوئی اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ میں اس حال میں اٹھ کر اگر باہر نکلوں گی تو اندیشہ ہے کہیں بیمار نہ پڑ جاؤں۔ آپ ماشاء اللہ صحت مند ہیں باہر جائیں اور صحن میں جو چیزیں پڑی ہیں وہ اٹھا لائیں وہ کہتا ہے بھاڑ میں جائیں یہ چیزیں میں ان کی خاطر اپنی صحت کو داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ اس نے ہرچند اصرار کیا لیکن یہ شخص اپنے لحاف سے نکلنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اچانک باہر دروازے پر دستک ہوئی اس نے وہیں سے پکار کر پوچھا کون ہے جواب ملا کہ یہاں سے چار میل کے فاصلے پر گیسٹ ہاؤس سے میں آیا ہوں وہاں تیرے افسر اعلیٰ تشریف لائے ہیں انھوں نے اسی وقت تمہیں طلب کیا ہے اگر تم نے تساہل کیا تو نوکری سے نکال دیئے جاؤ گے یہ شخص جو لحاف سے نکلنے پر مستعد نہیں تھا وہ فوراً لحاف سے نکلا گرم کپڑے پہنے ' دُھسہ اوڑھا ' چھتری لی اور اس کے ساتھ ہوگیا۔ چار میل گیا اور چار میل واپس آیا لیکن سردی نے نہ جانے سے اسے روکا اور نہ آنے سے جبکہ یہ شخص اپنے صحن تک جانے کے لیے تیار نہیں تھا دونوں طرح کی صورتحال میں فرق یہ ہے کہ اس کے صحن میں جو چیزیں پڑی خراب ہو رہی تھیں وہ اتنی قیمتی نہیں تھیں جسے یہ آسانی سے بنا نہ سکتا ہو اس لیے ان چیزوں کی خرابی کا ڈر اس کو ہلانے میں کامیاب نہ ہوسکا لیکن جب اس کے سامنے ایک ایسا خوف آیا یعنی نوکری سے نکالے جانے کا تو فوراً اس کی قوت متخیلہ نے پوری صورتحال کو اس کے سامنے متشکل کردیا۔ اس نے تصور میں دیکھا کہ اگر میری نوکری جاتی رہی تو گھر کا چولہا بجھ جائے گا ' بچے سکول کی فیس نہیں دے سکیں گے ' کرائے کا مکان چھن جائے گا ' ہمارا سامان فٹ پاتھ پر پڑا ہوگا ' زندگی موت سے بدتر ہوجائے گی۔ اس خوفناک انجام نے اس کو ہلاکے رکھ دیا اور وہ سردی کا مقابلہ کرنے پر تیار ہوگیا۔ اسی طرح آپ دیکھتے ہیں کہ غلامی کے دنوں میں لوگوں نے مالی فوائد کی خاطر ایمان بیچے ' عہدہ و منصب کی خاطر اسلامی غیرت کو تیاگ دیا ' جاگیریں حاصل کرنے کے لیے اپنی قوم کے افراد جنگوں میں جھونک دیئے ' محض فاتحین کا قرب حاصل کرنے کے لیے آزادی کے بدلے میں غلامی لے لی۔ اس سے یہ بات سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ ترغیب اور ترہیب یہ دو ایسے محرکات ہیں جو انسان کو غلط یا صحیح کرنے پر آمادہ کردیتے ہیں۔ قرآن کریم کا اسلوب بھی یہ ہے کہ اس نے جہاں پاکیزہ فکر اور طہارت قلب کے ذریعے انسان کو بدلا وہیں اسے ان دونوں فطری محرکات سے بھی آمادہ عمل کرنے کی کوشش کی چنانچہ پہلے جہنم کے عذاب کا ذکر فرما کر ترہیبی محرک کا ذکر کیا اور اب اگلی آیتوں میں جنت اور اس کی نعمتوں کا ذکر فرمایا جارہا ہے تاکہ انسان کو اندازہ ہوسکے کہ اگر میں ایمانی زندگی اختیار کروں تو مجھے دنیا اور آخرت میں ایک آسودہ اور کامیاب زندگی نصیب ہوسکتی ہے۔ (تفسیر روح القرآن۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

آیت مبارکہ:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ۡ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۴۲

لغۃ القرآن: وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ جو] [اٰمَنُوْا : سب ایمان لائے] [وَعَمِلُوا : اور سب نے اعمال کیے] [الصّٰلِحٰتِ : نیک] [لَا : نہیں] [نُكَلِّفُ : ہم تکلیف دیتے] [نَفْسًا : کسی شخص کو] [اِلَّا : مگر] [وُسْعَهَآ : اس کی طاقت کے مطابق] [اُولٰٓئِكَ : وہی لوگ] [اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ : جنت والے ہیں] [هُمْ : وہ] [فِيْهَا : اس میں] [خٰلِدُوْنَ : سب ہمیشہ رہنے والے ہیں]

ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، ہم کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلّف نہیں کرتے، یہی لوگ اہل جنت ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے

تشریح:

قرآن کریم میں ترغیب اور ترہیب نیز نافرمانوں کے بیان کے ساتھ فرمانبر داروں کا بیان سلسلہ وار چلتا ہے تاکہ انذار و تبشیر کا تقاضا پورا ہو گزشتہ دو تین رکوعات میں اہل جہنم کے کردار اور ان کے انجام کا بیان ہوتا رہا آیت بالا میں ان کے بالمقابل اہل جنت کا تذکرہ بیان فرمایا ارشاد ہوا کہ جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اعمال صالحہ بجالائے ان کے لیے جنت ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

درمیان میں بطور جملہ معترضہ ارشاد فرمایا کہ ہم کسی شخص کو ایسا حکم نہیں دیتے جو اس کی قوت و طاقت سے باہر ہو جیسے سورۃ بقرہ کے آخر میں ارشاد فرمایا "لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا" شریعت کا اصول ہے کہ تکلیف مالایطاق ممنوع ہے اللہ تعالیٰ شانہ کی رحمت واسعہ کا یہی تقاضا ہے کہ اپنے بندوں کو ان کی طاقت و استطاعت کی بنیاد پر مکلّف بنایا جائے اور اسی کے مطابق انھیں احکام شرعیہ کا حکم دیا جائے جیسے فرمایا "ما جعل علیکم فی الدین من حرج"

اہل جنت جن نعمتوں اور راحتوں میں ہوں گے قرآن حکیم میں بار بار ہر جگہ ان کا ذکر ہے یہاں ایک خاص نعمت کا تذکرہ فرمایا اور وہ یہ کہ دنیا میں ان کے دلوں میں تھوڑا بہت بغض اور کینہ ہوتا تھا اور کدورتوں کی بھرمار ہوتی تھی جنت دار الخلد میں ایسی چیزوں کی گنجائش نہیں ہوگی وہاں پہنچنے سے پہلے پہلے اس طرح کے بغض اور کینہ سے ان کے سینوں کو صاف اور پاک کیا جائے گا اور یہ تمام نقائص ان کے قلوب سے دور کئے جائیں گے کیونکہ دنیا کے ماحول سے جنت کا ماحول سراسر ممتاز اور پاکیزہ ہے جنتی ماحول میں بغض و عداوت، بدگمانی، بدخواہی، کبر و غرور اور دیگر تمام روحانی امراض کا نام و نشان تک نہ ہوگا سورۃ واقعہ میں ارشاد ہے "لایسمعون فیھا لغوا ولا تاثیما الا قیلا سلاما سلاما"

حضرت سدی (رح) فرماتے ہیں کہ جنتی جب جنت کی طرف لے جائے جائیں گے تو جنت کے دروازہ کے سامنے ایک درخت ہوگا جس کے نیچے دو نہریں جاری ہوں گی، ایک نہر سے پانی پیتے ہی دنیا کے سب تکدر دھل جائیں گے، اور دوسری نہر میں غسل کرتے ہی سب تر و تازہ صاف ہو جائیں گے پھر فرشتے انہیں کہیں گے : دل

صاف ہوگئے آئندہ کبھی ناگواری نہیں ہوگی ہمیشہ زندہ رہوگے موت کبھی نہیں آئے گی ہمیشہ جوان رہوگے بڑھاپا نہیں آئے گا خوش رہوگے مایوسی نہیں آئے گی۔ (ابن ابی حاتم)

صحیح بخاری میں ہے کہ سرورکائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں جو پہلی جماعت داخل ہوگی ان کے چہرے چودہویں رات کے چاند کی طرح ہوں گے پھر جو لوگ ان کے بعد داخل ہوں گے ان کے چہرے ایسے روشن ہوں گے جیسے کوئی بہت روشن ستارہ ہو ان سب کے دل ایک شخص کے دل کی طرح ہوں گے نہ ان کے درمیان کوئی اختلاف ہوگا اور نہ ہی آپس میں کچھ بغض وحسد ہوگا۔

(یہ جو فرمایا کہ ان کے دل ایک ہی شخص کے دل پر ہوں گے) اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے قلوب میں ایسی یگانگت ہوگی کہ گویا سب شخص واحد ہیں ان کے درمیان باہمی کسی طرح کی کوئی رنجش اور افتراق نہیں پایا جائے گا جیسے چند چھوٹے بچے آپس میں کھیلتے اور رہ رہے ہوں۔

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ سید کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ جب مومنین دوزخ سے چھوٹ جائیں گے (یعنی پل صراط سے پار ہو جائیں گے) تو ان کو جنت دوزخ کے درمیان ایک پل پر روک دیا جائے گا اور آپس میں ایک دوسرے پر دنیا میں جو کوئی ظلم اور زیادتی ہوگئی تھی اس کا بدلہ دیا جائے گا (تاکہ جنت میں رنجش اور کدورت کے ساتھ داخل نہ ہوں)

یہاں تک کہ جب حقوق کی ادائیگی سے صاف ستھرے ہو جائیں گے تو انہیں جنت میں داخلہ کی اجازت ہو جائے گی (یہ بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا):

قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان ہے یہ لوگ اپنے جنت والے گھر کو اس سے زیادہ پہچاننے والے ہوں گے جو ان کا گھر دنیا میں تھا۔ (رواہ البخاری)

اہل جنت کی نعمتوں کا اجمالی تذکرہ فرمانے کے بعد ان کے تشکر کا تذکرہ فرمایا کہ جنت میں جنتی اللہ تعالیٰ شانہ کا شکر ادا کرتے ہوئے یوں کہیں گے "الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ "سب تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جس نے ہم کو یہاں تک پہنچا دیا اور ہم ہدایت پانے والے نہ تھے اگر اللہ ہم کو ہدایت نہیں دیتا یہ سب کچھ اس کا کرم اور عنایت ہے کہ ہمیں ابدی جنت عطا فرمائی دنیا میں ہمیں ایمان کی دولت اور عمل صالح کی توفیق نصیب فرمائی، یہ اس کا فضل ہے اگر وہ ہدایت نہ دیتا تو کسی کو ہدایت نہ ملتی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس دنیاوی ہدایت کو دخول جنت کا ذریعہ بنا دیا یہ اس کی عنایت ہے اللہ کے ذمہ کسی کا کچھ واجب نہیں دوسرے مقام پر ارشاد ہے "وقالوا الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ واورثنا الارض نتبوا من الجنتہ حیث نشاء" (الزمر) مطلب یہ ہے کہ جنت میں جانے کا حقیقی اور اصلی سبب اللہ تعالیٰ شانہ کی رحمت اور کرم ہے، اعمال صالحہ ظاہری اسباب ہوتے ہیں، اور وہ بھی توفیق الٰہی کے تابع ہیں۔

"لقد جاءت رسل ربنا بالحق ونودوا ان تلکم الجنتہ اورثتموھا بما کنتم تعملون" تحقیق اللہ تعالیٰ کے رسول حق بات لے کر آئے ہم نے ان کی بات سنی اور تسلیم کی ایمان لائے اور اعمال صالح انجام دیئے اور پھر ان کو پکارا جائے گا اے ایمان والو اہل جنت (پکارنے والا فرشتہ کہے گا) یہ ہے تمہاری جنت جو تمہیں وراثت میں دی گئی ہے اس چیز کے بسبب اب جو تم عمل کرتے تھے۔

وراثت کے متعلق حدیث شریف میں آیا ہے کہ ہر شخص کے 2 ٹھکانے ہیں ایک جنت میں اور ایک دوزخ میں عالم برزخ میں دونوں ٹھکانے انسان کو دکھا دیے جاتے ہیں پھر اگر وہ صاحب ایمان ہے تو اسے جنت والا ٹھکانہ دے دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر تم ایمان نہ لاتے تو تمہیں دوزخ والا ٹھکانہ مل جاتا اسی طرح کافروں مشرکوں کو دوزخ میں اس کے ٹھکانے پر پہنچایا جاتا ہے اور اسے بتایا جاتا ہے کہ اگر وہ ایمان لے آتا تو اسے جنت والا ٹھکانہ مل جاتا۔ مفسرین کرام (رح) فرماتے ہیں کہ مومن کو جنت میں اس کا اپنا ٹھکانہ بھی مل جاتا ہے اور کافر کا وہ ٹھیک عنہ بھی اسے حاصل ہو جاتا ہے جو اسے ایمان لانے کی صورت میں ملتا۔

اسی طرح کافر کو دوزخ میں اسکا اپنا مقام بھی حاصل ہو جاتا ہے اور اس مومن کا مقام بھی جو ایمان نہ لانے کی صورت میں اس کو ملتا اس طرح گویا ایمان داروں کو کافروں کی اور کافروں کو ایمان داروں کی وراثت مل جائے گی۔ (تفسیر منازل العرفان۔ عبدالستار شاہ)

اس آیت میں مسلمانوں کیلئے بہت پیاری تسلی ہے کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ احکام کا پابند نہیں کرتا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جنت میں جانے کیلئے کوئی بہت زیادہ مشقت برداشت نہیں کرنا پڑے گی بلکہ اکثر وبیشتر احکام وہ ہیں جن پر آدمی نہایت سہولت کے ساتھ عمل کرلیتا ہے جیسے نماز، روزہ اور دیگر عبادات۔ زکوۃ اور حج تو لازم ہی اس پر ہیں جو اپنی سب ضروریات کے بعد زکوۃ اور حج کی ادائیگی کی بقدر زائد رقم رکھتے ہوں۔ یونہی ماں باپ، بہن بھائیوں، رشتے داروں اور پڑوسیوں کے حقوق وغیرہ کی ادائیگی بھی عمومی زندگی کا حصہ ہے۔ یونہی ذکر و درود بھی روح کی غذا ہے اور یہی اعمال جنت میں لے جانے والے ہیں۔ تو جنت میں جانے کا راستہ اللہ عَزَّوَجَلَّ نے نہایت آسان بنایا ہے، صرف اپنی ہمت کا مسئلہ ہے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم قادری)

اللہ کا شکر:

حقیقت میں انسان کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں کہ اسے مرنے کے بعد جنت مل جائے دنیا میں نیک کام اپنے بل بوتے کے موافق کیے آنکھیں بند ہوئیں تو فرشتے خوشخبری لے کر آئے قیامت میں حکم ہو گیا کہ جاؤ تمہارا ٹھکانہ جنت ہے وہاں جاکر رہو دل میں سے ساری برائیاں، باہمی رنجش، بغض، کینہ، حسد نکال دی گئیں۔ ایک دوسرے کو مبارک باد کہتے ہوئے جنت میں داخل ہوئے اسے دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ تمام نعمتیں موجود، ارمان نکالنے کی پوری آزادی، اس سے بڑھ کر اور خوش نصیبی کیا ہوگی۔ اس کے لئے جنتیوں کی زبان پر خدا کا شکر اور اس کی حمد وثناء جاری ہوگی جیسا کہ اس آیت میں بیان ہے۔

ارشاد ہے کہ جنتی جنت میں داخل ہو کر کہیں گے کہ ہماری کیا مجال تھی جو اس آرام و آسائش کی جگہ میں پہنچتے یہ سب اللہ کا فضل اور انعام ہے لائق ستائش اور شکر وہی ہے کہ جس نے اپنی رحمت سے ہمیں یہاں پہنچنے کا راستہ بتایا اگر اس کا فضل و کرم شامل حال نہ ہوتا تو ہم یہاں نہ پہنچ سکتے تھے۔ اب ہمیں صاف نظر آرہا ہے کہ اللہ کے رسول جو باتیں ہمیں بتاتے تھے وہ سولہ آنے سچ تھیں اور ان میں جھوٹ کی ملاوٹ ذرا بھی نہ تھی۔ اس پر ان کو غیب سے آواز سنائی دے گی جو عام اعلان کر دے گی کہ لو یہ جنت ہے تم اس کے مالک بنائے گئے ہو اور یہ اس کا بدلہ ہے جو تم دنیا میں کرتے تھے وہاں تم نے اپنی خواہشوں کو ہماری تابعداری میں روکا اور ہمیشہ رسول اور قرآن مجید کی ہدایت کے مطابق ایسے کام کرتے رہے جن سے جنت میں لے یہاں ہم نے تمہیں اس کے بدلے میں جنت دی۔ (درس آسٹریلیا)

فوائد

1۔ اس سے چند مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ ایمان اعمال پر مقدم ہے۔ پہلے مومن بنو۔ بعد میں نیک کام کرو۔ دوسرے یہ کہ کوئی شخص نیک اعمال سے بے نیاز نہیں خواہ کسی طبقہ اور کسی جماعت کا ہو۔

2۔ یعنی ہر مسلمان اپنی طاقت کے مطابق نیک اعمال کرلے۔ جنت کا مستحق ہے۔ امیر صدقہ دے کر فقیر مومن صالح صدقہ لے کر جنتی ہیں اور کوئی بھی جنت میں پہنچ کر وہاں سے نہ نکلے گا۔ جیسا کہ خالدون سے پتہ لگا۔ (تفسیر نور العرفان۔ احمد یار خاں نعیمی)

آیت مبارکہ:

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۗ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۴۳

لغۃ القرآن: وَنَزَعْنَا : اور ہم نکال ڈالیں گے] [مَا : جو] [فِي : میں] [صُدُوْرِهِمْ : ان کے سینوں] [مِّنْ : سے] [غِلٍّ : کینہ ہوگا] [تَجْرِيْ : چلتی ہیں] [مِّنْ : سے] [تَحْتِهِمُ : ان کے نیچے] [الْاَنْهٰرُ : نہریں] [وَقَالُوا : اور ان سب نے کہا] [الْحَمْدُ : سب تعریف] [لِلّٰهِ : اللہ کے لیے] [الَّذِيْ : جو] [

هَدٰىنَا : ہدایت دی ہمیں] [لِهٰذَا : اس کی] [مَا : اور نہ] [كُنَّا : ہم ہوجائیں گے] [لِنَهْتَدِيَ : کہ ہدایت پاتے] [لَوْلَآ : کیوں نہ] [اَنْ : کہ] [هَدٰىنَا : ہدایت دی ہمیں] [اللّٰهُ : اللہ] [لَقَدْ : البتہ تحقیق] [جَاۗءَتْ : آجائیں] [رُسُلُ : رسولوں کو] [رَبِّنَا : ہمارے رب] [بِالْحَقِّ : حق کے ساتھ] [وَنُوْدُوْٓا : اور وہ سب آواز دیے جائیں گے] [اَنْ : کہ] [تِلْكُمُ : یہ ہے] [الْجَنَّةُ : جنت] [اُوْرِثْتُمُوْهَا : تم سب وارث بنائے گئے ہو اس کے] [بِمَا : اس وجہ سے جو] [كُنْتُمْ : ہو تم] [تَعْمَلُوْنَ : تم سب کرتے ہو]

ترجمہ: اور ہم وہ (رنجش و) کینہ جو ان کے سینوں میں (دنیا کے اندر ایک دوسرے کے لئے) تھا نکال (کے دور کر) دیں گے ان کے (محلوں کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی، اور وہ کہیں گے: سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا، اور ہم (اس مقام تک کبھی) راہ نہ پا سکتے تھے اگر اللہ ہمیں ہدایت نہ فرماتا، بیشک ہمارے رب کے رسول حق (کا پیغام) لائے تھے، اور (اس دن) ندا دی جائے گی کہ تم لوگ اس جنت کے وارث بنا دیئے گئے ہو ان (نیک) اعمال کے باعث جو تم انجام دیتے تھے

تشریح: دنیا میں بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے بسا اوقات متقی اور پارسا لوگوں کے تعلقات بھی کشیدہ ہوجاتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے متعلق کدورت اور ملال پیدا ہوجاتا ہے کیونکہ ان کی یہ مخالفت اور باہمی رنجش نیک نیتی پر مبنی ہوتی ہے اس لیے جب قیامت کے دن انھیں جنت میں داخل ہونے کا اذن ملے گا تو ان کے آئینہ قلب سے ان رنجشوں اور کدورتوں کا غبار صاف کردیا جائے گا اور وہ سابقہ مخالفتوں کا کوئی اثر محسوس نہیں کریں گے۔ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے کہ مجھے توقع ہے کہ میں عثمان (رض) طلحہ (رض) اور زبیر (رض) انھیں لوگوں میں سے ہیں جن کے متعلق اس آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ ویروی عن علی (رض) انہ قال: ارجوان اکون انا و عثمان وطلحۃ والزبیر من الذین قال اللہ تعالیٰ فیھم ونزعنا الخ۔ اور بعض علما نے اس آیت کا یہ معنی بھی بتایا ہے کہ اہل جنت میں جو باہمی فرق مراتب ہوگا اس کی وجہ سے وہ آپس میں حسد نہیں کریں گے۔ ہر شخص اپنے حال پر مطمئن اور شاکر ہوگا۔ (ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری)

غل کا معنی ہے خفیہ طریقے سے کسی چیز کا داخل ہونا اسی لیے خیانت کو بھی غلول کہتے ہیں اور کینہ فساد و حسد جو دل میں ہوا سے غل کہتے ہیں۔ تفسیر کبیر۔

یعنی مومنین کی آپس میں جو عداوت و کینہ و بغض دنیاوی تھے وہ ہم دور فرما کر پاک صاف کرکے جنت میں داخل کریں گے۔ تحتھم سے مراد تحت بستانھم ہے۔ انہار۔ دودھ۔ شراب طہور وغیرہ کی مختلف نہریں عطا ہوں گی۔ (تفسیر الحسنات)

بغض و کینہ کی مذمت:

یہاں چونکہ بغض و کینہ کا تذکرہ ہوا اس کی مناسبت سے یہاں بغض و کینہ کا مفہوم اور اس کی مذمت بیان کی جاتی ہے۔ چنانچہ امام محمد غزالی (رح) فرماتے ہیں: جب آدمی عاجز ہونے کی وجہ سے فوری غصہ نہیں نکال سکتا تو وہ غصہ باطن کی طرف چلا جاتا ہے اور وہاں داخل ہو کر کینہ بن جاتا ہے۔ کینہ کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کو بھاری جاننا، اس سے نفرت کرنا اور دشمنی رکھنا اور یہ بات ہمیشہ ہمیشہ دل میں رکھنا۔

احادیث میں بغض و کینہ کی شدید مذمت بیان کی گئی ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا" لوگوں کے اعمال ہر ہفتہ میں دو مرتبہ پیر اور جمعرات کے دن پیش کئے جاتے ہیں اور ہر مسلمان بندے کی مغفرت کردی جاتی ہے سوائے اس بندے کے جو اپنے بھائی کے ساتھ کینہ رکھتا ہو۔ کہا جاتا ہے" اسے چھوڑ دو یا مہلت دو حتّٰی کہ یہ رجوع کرلیں۔

حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: " بغض رکھنے والوں سے بچو کیونکہ بغض دین کو مونڈ ڈالتا (یعنی تباہ کردیتا) ہے۔

نوٹ: بغض و کینہ کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے لیے " احیاء العلوم" کی تیسری جلد کا مطالعہ فرمائیں۔

مسلمانوں کو آپس میں کیسا ہونا چاہیے ؟

مسلمانوں کو آپس میں کیسا ہونا چاہیے اس کیلئے درج ذیل 5 احادیث کا مطالعہ فرمائیں :

(1)۔۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری (رض) سے روایت ہے، تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا : "ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے، پھر آپ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل فرمائیں۔ (5) یعنی جس طرح یہ ملی ہوئی ہیں مسلمانوں کو بھی اسی طرح ہونا چاہیے۔

(2)۔۔ حضرت نعمان بن بشیر (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا : "مسلمانوں کی آپس میں دوستی اور رحمت و شفقت کی مثال جسم کی طرح ہے، جب جسم کا کوئی عُضْو بیمار ہوتا ہے تو بخار اور بے خوابی میں سارا جسم اس کا شریک ہوتا ہے۔

(3)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا : "تم میں اچھا وہ شخص ہے جس سے بھلائی کی امید ہو اور جس کی شرارت سے امن ہو اور تم میں برا وہ شخص ہے جس سے بھلائی کی امید نہ ہو اور جس کی شرارت سے امن نہ ہو۔

(4)۔۔ حضرت انس (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا : "اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ! بندہ مومن نہیں ہوتا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔"

(5)۔۔ حضرت انس (رض) سے روایت ہے، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا : "گفتگو کرتے وقت اچھے طریقے سے بات کرنا، جب کوئی گفتگو کرے تو اچھے انداز میں اس کی بات سننا، ملاقات کے وقت مسکراتے چہرے کے ساتھ ملنا اور وعدہ پورا کرنا مومن کے اخلاق میں سے ہے۔

{ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ : اور وہ کہیں گے تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ } مومنین جنت میں داخل ہوتے وقت کہیں گے : تمام تعریفیں اس اللہ عَزَّوَجَلَّ کے لیے ہیں جس نے ہمیں اچھے اعمال کی ہدایت دی اور ہمیں ایسے عمل کی توفیق دی جس کا یہ اجر و ثواب ہے اور ہم پر فضل و رحمت فرمائی اور اپنے کرم سے عذاب جہنم سے محفوظ کیا۔

اچھے عمل کی توفیق ملنے پر اللہ تعالیٰ کی حمد کی جائے :

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کی حمد اور اس کا شکر جنت میں بھی ہوگا کیونکہ وہ حمد و شکر ہی کا مقام ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ علم و عمل اور ہدایت کی توفیق اللہ عَزَّوَجَلَّ ہی کی عطا سے ہے لہٰذا کسی کو علم یا اچھے عمل کی توفیق ملے تو اللہ عَزَّوَجَلَّ کی حمد کرے اور اسے اللہ عَزَّوَجَلَّ ہی کی توفیق جانے۔ اسی وجہ سے ہمیں بکثرت لاحول شریف پڑھنے کا فرمایا گیا ہے کیونکہ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ کا معنی ہے کہ نیکی کی توفیق اور برائی سے بچنے کی طاقت نہیں مگر اللہ عَزَّوَجَلَّ ہی کی توفیق سے۔

وَنُوْدُوْا اَنْ تِلْکُمُ الْجَنَّۃُ اُوْرِثْتُمُوْہَا : اور انھیں ندا کی جائے گی کہ یہ جنت ہے، تمہیں اس کا وارث بنادیا گیا۔ } مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ جب جنتی جنت میں داخل ہوں گے تو ایک ندا کرنے والا پکارے گا : تمہارے لیے زندگانی ہے کبھی نہ مرو گے، تمہارے لیے تندرستی ہے کبھی بیمار نہ ہو گے، تمہارے لیے عیش ہے کبھی تنگ حال نہ ہوگے۔

جنت کو دو وجہ سے میراث فرمایا گیا۔ ایک یہ کہ کفار کے حصہ کی جنت بھی وہی لیں گے یعنی کافروں کے ایمان لانے کی صورت میں جو جنتی محلات ان کیلئے تیار تھے وہ ان کے کفر کی وجہ سے اہل ایمان کو دیدیئے جائیں گے تو یہ گویا ان کی میراث ہوئی۔ دوسرے یہ کہ جیسے میراث اپنی محنت و کمائی سے نہیں ملتی اسی طرح جنت کا ملنا بھی اللہ عَزَّوَجَلَّ کے فضل و کرم سے ہوگا، اپنے اعمال تو ظاہری سبب ہوں گے اور وہ بھی حقیقتاً جنت میں داخلے کا سبب بننے کے قابل نہیں ہوں گے کیونکہ ہمارے اعمال تو ہیں ہی ناقص، یہ تو صرف سابقہ نعمتوں کا شکرانہ بن جائیں یا جہنم سے چھٹکارے کا ذریعہ بن جائیں تو بھی بہت ہے۔ ان کے بھروسے پر جنت کی طمع تو خود فریبی ہے۔

اللہ عَزَّوَجَلَّ کا فضل :

یہاں مفسرین نے ایک بہت پیاری بات ارشاد فرمائی اور وہ یہ کہ جنتی جنت میں داخل ہوں گے تو کہیں گے کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کا شکر ہے جس نے ہمیں ہدایت دی یعنی وہ اپنے عمل کی بات نہیں کریں گے بلکہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے فضل کی بات کریں گے اور اللہ عَزَّوَجَلَّ فرمائے گا کہ تمہیں تمہارے اعمال کے سبب اس جنت کا وارث بنادیا گیا۔

گویا بندہ اپنے عمل کو ناچیز اور ہیچ سمجھ کر صرف اللہ کریم کے فضل پر بھروسہ کرتا ہے تو اللہ عَزَّوَجَلَّ اپنے فضل سے اس کے ناقص عمل کو بھی شرف قبولیت عطا فرما کر قابل ذکر بنادیتا ہے اور فرماتا ہے کہ تمہیں تمہارے اعمال کے سبب جنت دیدی گئی۔

جنت میں داخلے کا سبب :

یہاں مفسرین نے یہ بحث بھی فرمائی ہے کہ جنت میں داخلے کا سبب کیا ہے، اللہ عَزَّوَجَلَّ کا فضل یا ہمارے اعمال۔ تو حقیقت یہی ہے کہ جنت میں داخلے کا سبب تو اللہ عَزَّوَجَلَّ کا فضل ہی ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے :

"فَضْلًا مِّن رَّبِّكَ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (۵۷)"

تمہارے رب کے فضل سے، یہی بڑی کامیابی ہے۔

اور یہی مضمون حدیث مبارک میں بھی ہے، چنانچہ بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا : "تم میں سے کسی شخص کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ صحابہ کرام (رض) نے عرض کی : یارسول اللہ ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، آپ کو بھی نہیں؟ ارشاد فرمایا : " مجھے بھی نہیں، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے فضل اور رحمت میں ڈھانپ لے، پس تم اخلاص کے ساتھ عمل کرو اور میانہ روی اختیار کرو۔ (1)

البتہ بہت سی آیات میں اعمال کو بھی جنت میں داخلے کا سبب قرار دیا گیا ہے تو دونوں طرح کی آیات واحادیث میں تطبیق یہ ہے کہ جنت میں داخلے کا حقیقی سبب تو اللہ عَزَّوَجَلَّ کا فضل ہے لیکن ظاہری سبب نیک اعمال ہیں۔ (تفسیر صراط الجنان)

کفار کی جنتوں کا مسلمانوں کو وراثت میں ملنا : اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے : اور ان کو یہ ندا کی جائے گی کہ تم اپنے نیک اعمال کی وجہ سے جنت کے وارث کیے گئے ہو (الاعراف : 43)

ہر کافر اور مومن کے لیے جنت میں ایک ٹھکانا بنایا گیا ہے، لہٰذا جب اہل جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے اور اہل دوزخ میں داخل ہو جائیں گے تو اہل دوزخ کو جنت دکھائی جائے گی تاکہ وہ اس میں اپنا ٹھکانا دیکھ لیں اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ تمہارے ٹھکانے ہیں اگر تم ایمان لے آتے اور اللہ کی اطاعت کرتے تو تم کو جنت میں یہ ٹھکانے دے دیے جاتے۔ پھر اہل جنت سے کہا جائے گا کہ اے اہل جنت، تم ان ٹھکانوں کو بہ طور وراثت لے لو کیونکہ تم نیک عمل کرتے تھے، پر جنت میں کافروں کے ٹھکانے اہل ایمان میں تقسیم کر دیے جائیں گے۔ اسی طرح ہر کافر اور مومن کے لیے دوزخ میں بھی ایک ٹھکانا بنایا گیا ہے اور مسلمانوں کے جنت میں داخل ہونے کے بعد ان کو دوزخ میں ان کے ٹھکانے دکھائے جائیں گے کہ اگر وہ ایمان نہ لاتے تو ان کو دوزخ کے ان ٹھکانوں میں رکھا جاتا۔ پھر ان کے حصہ کی دوزخیں کافروں کو دی جائیں گی اور یہ اس لیے ہے کہ قیامت کے دن کافر اللہ تعالیٰ سے یہ نہ کہہ سکے کہ اگر میں ایمان لاتا تو تو نے میرے لیے جنت میں کوئی ٹھکانا تو بنایا ہی نہیں تھا تو مجھے جنت میں کس جگہ رکھتا؟

اس مضمون پر حسب ذیل احادیث دلالت کرتی ہیں : امام احمد بن حنبل متوفی 241ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں : حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہر دوزخی جنت میں اپنا ٹھکانا دیکھے گا پھر یہ کہے گا : کاش اللہ مجھے ہدایت دے دیتا ! اور یہ دیکھنا اس کے لیے حسرت کا باعث ہوگا اور ہر جنتی دوزخ میں اپنا ٹھکانا دیکھے گا پھر کہے گا : اگر اللہ مجھے ہدایت دے دیتا ! اور یہ دیکھنا اور کے لیے حسرت کا باعث ہوگا اور ہر جنتی دوزخ میں اپنا ٹھکانا دیکھے گا پھر کہے گا : اگر اللہ مجھے ہدایت نہ دیتا تو میں یہاں ہوتا اور یہ دیکھنا اس کے لیے شکر کا موجب ہوگا۔ (مسند احمد، ج 1، ص 512، طبع قدیم دار الفکر، اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ مسند احمد ج 9، رقم الحدیث 10600، دار الحدیث قاہرہ، 1416ھ۔ مجمع الزوائد، ج 10، ص 399)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے : ہر دوزخ میں داخل ہونے والے کو جنت میں اس کا ٹھکانا دکھایا جائے گا بشرطیکہ وہ ایمان لے آتا، تاکہ اسے حسرت ہو، اور ہر جنت میں داخل ہونے والے کو دوزخ میں اس کا ٹھکانا دکھادیا جائے گا اگر وہ برے کام کرتا تاکہ وہ زیادہ شکر کرے (مسند احمد، ج 2، ص 541، اس کی سند صحیح ہے۔ مسند احمد ج 9، رقم الحدیث : 1092۔ مجمع الزوائد، ج 1، ص 399)

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی 261ھ روایت کرتے ہیں : حضرت ابو موسیٰ اشعری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ایک یہودی یا نصرانی دے گا اور فرمائے گا یہ تمہارا دوزخ کی آگ سے فدیہ ہے۔ (صحیح مسلم، التوبہ 49۔ (2767) (6878

علامہ نووی اس کی شرح میں لکھتے ہیں : ایک روایت میں ہے جب کوئی مسلمان شخص فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں ایک یہودی یا عیسائی کو دوزخ میں داخل کردیتا ہے اور ایک روایت میں ہے قیامت کے دن بعض مسلمان پہاڑوں کے برابر گناہ لے کر آئیں گے اللہ تعالیٰ ان کے گناہ بخش دے گا اور ان گناہوں کو یہودیوں اور عیسائیوں کے اوپر ڈال دے گا۔ اس حدیث کا وہی معنی ہے جو حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت میں ہے (جس کو ابھی ہم نے بیان کیا ہے)۔
جنت میں دخول کا حقیقی سبب اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے نہ کہ نیک اعمال : نیز اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ تم اپنے اعمال کی وجہ سے جنت میں داخل ہوئے ہو حالانکہ قرآن مجید کی دیگر آیات اور احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنت اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملتی ہے نہ کہ بندہ کے عمل سے :
" ومن یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہ مہ من النبیین والصدیقین والشداء والصالحین وحسن اولئک رفیقا۔ ذالک الفضل من اللہ وکفی باللہ علیما : جو لوگ اللہ اور (اس کے) رسول کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا جو کہ انبیاء صدیقین شہداء اور صالحین ہیں اور یہ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں اور یہ اللہ کی طرف سے فضل ہے اور وہ کافی جاننے والا ہے۔ "
" فاماالذین امنوا بالہ واعتصموا بہ فسید خلھم فی رحمۃ منہ وفضل : سو جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اس (کے دامن رحمت) کو مضبوطی سے تھام لیا تو عنقریب اللہ ان کو اپنی رحمت اور فضل میں داخل کرے گا۔ "
" والزین امنوا وعملوا الصلحت فی روضات الجنت لھم مایشاء ون عند ربھم ذلک ھو الفضل الکبیر : جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے وہ جنتوں کے باغوں میں ہوں گے ان کے لیے ان کے رب کے پاس ہر وہ چیز ہوگی جس کو وہ چاہیں گے یہی ہے بہت بڑا فضل " (الشوری : 22)
" ان المتقین فی مقام امین۔ فی جنت وعیون۔ یلبسون من سندس واستبرق متقابلین۔ کزلک وزوجناھم بحور عین۔ یدعون فیھا بکل فاکہۃ امنین۔ لا یذوقون فیھا الموت الا الموتۃ الاولی ووقاھم عذاب الجحیم۔ فضلا من ربک۔ زلک ھو الفوز العظیم : بیشک متقی لوگ امن کی جگہ میں ہوں گے۔ جنتوں میں اور چشموں میں۔ وہ باریک اور موٹے ریشم کا لباس پہنے آمنے سامنے ہوں گے۔ ایسا ہی ہوگا ہم بڑی آنکھوں والی حوروں کو ان کی زوجیت میں دیں گے۔ وہ وہاں پر ہر قسم کے پھل اطمینان سے طلب کریں گے۔ وہ پہلی موت کے سوا جنت میں کسی موت کا مزہ چکھیں گے اللہ نے ان کو دوزخ کے عذاب سے بچایا۔ (انہیں یہ سب نعمتیں ملیں) آپ کے رب کے فضل سے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے " (الدخان : 51۔ 57)
" لیجزی الذین امنوا وعملوا الصلحت من فضلہ : تاکہ اللہ اپنے فضل سے ان لوگوں کو جزا دے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے " (الروم : 45)
" جنت عدن یدخلونھا یحلون فیھا من اساور من ذھب ولؤلؤا ولباسھم فیھا حریر وقالوا الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن ان ربنا لغفور شکور۔ الذی احلنا دار المقامۃ من فضلہ : وہ دائمی جنتوں میں داخل ہوں گے، وہاں ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور ان جنتوں میں ان کا لباس ریشم کا ہوگا۔ اور وہ کہیں گے کہ اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے غم کو دور کردیا، بیشک ہمارا رب بہت بخشنے والا اور جزا دینے والا ہے، جس نے ہم کو اپنے فضل سے دائمی مقام میں اتارا " (فاطر : 33۔ 35)
اور احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان عمل سے نہیں، اللہ کے فضل سے جنت میں جائیں گے۔
امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256ھ روایت کرتے ہیں : حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : تم میں سے کسی شخص کو اس کا عمل ہرگز جنت میں داخل نہیں کرے گا، صحابہ نے کہا یا رسول اللہ ! آپ کو بھی نہیں ؟ آپ نے فرمایا : مجھ کو بھی نہیں سوا اس کے کہ اللہ مجھے اپنے فضل اور رحمت سے ڈھانپ لے۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث : 5673۔ صحیح مسلم، المنافقین 75 (2816) 6983۔ مسند احمد، ج 2، ص 482، 488، 503، 514، طبع قدیم، دار الفکر، المعجم الکبیر، ج 7، رقم الحدیث : 7218۔ المعجم الاوسط، ج 3، رقم الحدیث : 2315۔ مسند البزار، ج 4، رقم الحدیث : 3447۔ 3448)

دخول جنت کے لیے اعمال کو سبب قرار دینے کے محامل :

اب جبکہ قرآن مجید کی متعدد آیات اور احادیث سے یہ ثابت ہو گیا کہ مسلمان اپنے عمل کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ کے فضل سے جنت میں جائیں گے تو سورۃ الاعراف کی اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اور جنتیوں کو یہ ندا کی جائے گی کہ تمہارا جنت میں داخلہ تو اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہوا ہے اور تمہارے نیک اعمال کی وجہ سے تم کو کفار کی چھوڑی ہوئی جنتیں بہ طور وراثت مل جائیں گی، اور اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ جنت میں دخول کا ایک سبب حقیقی ہے اور ایک سبب ظاہری ہے۔ سبب حقیقی تو اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی متعدد آیات اور احادیث میں بیان فرمایا ہے اور اس کا سبب ظاہری مسلمانوں کے نیک اعمال ہیں جیسا کہ سورۃ الاعراف کی اس آیت میں بیان فرمایا ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ نیک اعمال فی نفسہ جنت میں دخول کا سبب نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے نیک اعمال کو دخول جنت کا سبب بنایا ہے تو اصل چیز تو اللہ کا کرم اور اس کا فضل ہے۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ انسان بالغ ہونے کے بعد عبادات اور نیک اعمال شروع کرتا ہے اور عبادت اور نیک اعمال شروع کرنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ اس کو غیر متناہی نعمتیں عطا کر چکا ہے۔ اب اس کے یہ نیک اعمال تو پچھلی نعمتوں کا ہی شکر ادا کرنے کے لیے ناکافی ہیں چہ جائیکہ وہ ان نیک اعمال کی وجہ سے کسی نئے اجر کا مستحق ہو ان نعمتوں کے مقابلہ میں جو عبادات اور شکر کی کمی ہے اگر اللہ اس کو ہی معاف کر دے تو یہ اس کا بہت بڑا کرم ہے، کسی اور اجر وثواب کے مطالبہ کا کیا جواز ہے ! ایک شخص کسی کو دس کروڑ روپے پہلے ہی دے دے پھر وہ شخص اس کے ہاں پچاس ساٹھ سال کام کرے جس کی اجرت پچاس لاکھ روپے بنتی ہو، اب وہ کام کرنے والا اس سے اپنی اجرت کا مطالبہ کرے تو وہ شخص یہ نہیں کہے گا کہ میرے تو پہلے ہی کرور پچاس لاکھ روپے تمہاری طرف نکلتے ہیں، اگر میں پچھلا قرض ہی معاف کر دوں تو بڑی بات ہے۔ آئندہ اجرت کے مطالبہ کا کیا جواز ہے؟ (تبیان القرآن)

جنتیوں اور دوزخیوں کی آپس میں بات چیت کا ذکر قرآن کریم کی مختلف صورتوں میں موجود ہے کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے چنانچہ اس آیت کریمہ میں بھی اسی قسم کے ایک مکالمہ کا ذکر ہے سورۃ صافات میں بھی ایسے ہی ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ جنت والا ایک شخص اپنے ایک دوست سے ملاقات کا خواہشمند ہوگا جب اسے جنت میں نہ پائے گا تو جہنم میں تلاش کرے گا" فاطلع فراٰہ فی سواء الجحیم "وہ دوزخ میں جھانک کر دیکھے گا تو اس کا دوست اسے جہنم کے درمیان میں پڑا ہوا ملے گا۔ جنت ساتوں آسمانوں سے اوپر ہے اور جہنم ساتوں زمینوں سے نیچے ہے کروڑوں میلوں کے فاصلے کے باوجود بھی وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے اور ان میں مکالمہ ہوگا جنت والا کہے گا تاللہ ان کدت لتردین خدا کی قسم قریب تھا کہ تو مجھے ہلاک کر دیتا اگر میں تیری باتوں میں آ کر قیامت کا انکار کر دیتا تو آج میں بھی تیرے ساتھ جہنم میں ہوتا مگر رب العزت کا احسان عظیم ہے کہ میں تمہاری باتوں سے متاثر نہ ہوا اور قیامت کا انکار نہ کیا اور اللہ تعالیٰ شانہ نے مجھے اپنی رحمت کے مقام جنت میں پہنچا دیا۔

تو یہاں بھی اسی قسم کا مکالمہ ہے تو فرمایا:

"ونادی اصحب الجنۃ اصحب النار" اور جنت والے دوزخ والوں کو پکاریں گے کہ ہم نے پالیا اس چیز کو جو ہمارے رب نے ہم سے وعدہ کیا بالکل سچ اور حق۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ یہ تھا کہ اگر تم ایمان لاؤ گے تقوی اور عمل صالح کی راہ اختیار کرو گے انبیاء (علیہم السلام) کے حکموں پر چلو گے معاسی سے اجتناب کرو گے تو میں تمہیں جنت میں پہنچاؤں گا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور رحمت کی منزل جنت میں داخل فرمایا۔

"فھل وجدتم ما وعد ربکم حقا" اب یہ بتاؤ کہ تمہارے رب نے تمہارے ساتھ جو وعدہ کیا تھا کیا تم نے بھی اسے سچ پایا؟ تمہارے ساتھ اس کا وعدہ یہ تھا کہ اگر کفر اور شرک اختیار کرو گے انبیاء کرام (علیہم السلام) اور اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب کرو گے تو تمہیں جہنم میں پہنچا دیا جائے گا اب بتاؤ تو سہی کیا وہ وعدہ پورا ہوا اور تم اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئے؟

"قالوا نعم" وہ جواب دیں گے ہاں وہ وعدہ بھی سچا ہو گیا اور اس کے مطابق ہم تباہی کے مقام دوزخ میں پہنچ گئے اس قسم کا مکالمہ صحیحین کی حدیث میں بھی آیا ہے جنگ بدر میں جب بڑے بڑے سردار کافر مارے گئے تو سید کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حکم دیا کہ ان کی لاشوں کو گھسیٹ کر اس خبیث ومخبث کنویں میں ڈال دو کئی لاشوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے اور کچھ سلامت تھیں ان کی ٹانگوں میں رسی ڈال کر ان کو بشمول ابو جہل گھسیٹ کر اس کنویں میں گرا دیا گیا۔

مقام جنگ سے مدینہ کی طرف روانگی کے وقت سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کنوئیں پر کھڑے ہو کر ائمہ کفر صنادید قریش سے یہی خطاب فرمایا "ھل وجدتم ماوعد کم ربکم حقاً فانا قد وجدنا ماوعدنا ربنا حقا" ہم نے تو اپنے رب کا وعدہ سچا پایا کیا تم نے بھی اپنے رب کا وعدہ سچا پا لیا ہے؟ آپ نے ہر ایک کو اس کے اور اس کے باپ کا نام لے کر خطاب فرمایا یافلان بن فلان کہتے ہوئے اور یہ بھی ارشاد فرمایا گیا بد نصیبو کتنا اچھا ہوتا کہ اگر تم ایمان لے آتے آج تمہارا یہ حال نہ ہوتا جس عذاب میں مبتلا ہو۔

علماء کرام نے فرمایا جتنا کسی نبی کا مقام اونچا ہوتا ہے اتنا ہی اس کے ماننے والوں کا مرتبہ اور مقام اونچا ہوگا اور اس کے نہ ماننے والے بد نصیبوں کا عذاب بھی اتنا بڑا اور زیادہ ہوگا۔

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس خطاب اور مکالمہ پر حضرت فاروق اعظم (رض) نے عرض کیا "یارسول اللہ! ما تکلم الا اجساداالا ارواح لھا" آپ ایسے مردوں سے خطاب فرمارہے ہیں جن میں روحیں موجود نہیں ہیں یہ تو مرے ہوئے ہیں اور مردار ہیں اس پر سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا "والذی نفس محمد بیدہ ماانتم باسمع لما اقول منہم" قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان ہے میں جو باتیں کر رہا ہوں تم ان کو ان سے زیادہ نہیں سنتے یعنی میری باتوں کو یہ اسی طرح سن رہے ہیں جیسا کہ تم سن رہے ہو البتہ اتنا فرق ہے کہ وہ جواب نہیں دے سکتے۔

حضرت قتادہ (رح) اس کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کفار کو تھوڑی دیر کے لئے زندہ فرمایا اور انہیں سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بات سنوائی تاکہ ان کی حسرت وافسوس اور پشیمانی اور شرمساری وندامت میں اضافہ ہو اور دوسرے لوگوں کے لیے عبرت ہو بہرحال آیت کریمہ کے مطابق جنتی لوگ دوزخیوں سے یہی پوچھیں گے اور وہ جواب دیں گے کہ ہم نے اس وعدہ عذاب اور جہنم کو پالیا۔

" فاذن مؤذن بینھم ان لعنۃ اللہ علی الظلمین " پھر ان کے درمیان ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ ظالموں پر اللہ تعالیٰ شانہ کی لعنت ہو جن لوگوں نے کفر شرک کیا انبیاء اور رسول (علیہ السلام) اور کتابوں کو جھٹلایا توحید اور قیامت کا انکار کیا وہ ظالم ہیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اور اس کی رحمتوں سے دور ہیں ظالموں کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا "الذین یصدون عن سبیل اللہ " یہ ظالم خود بھی گمراہ ہیں اسلام کی طرف نہیں آتے اور دوسرے لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ کے راستے سے منع کرتے اور روکتے ہیں ہر پیغمبر کے دور میں معاند، مالدار، سرمایہ دار، اور قومی سرداروں کا یہی شیوہ اور طریقہ رہا ہے کہ عوام الناس کو طرح طرح کے حربے اور چالوں کے ذریعہ توحید الہی اور احکام الہی قبول کرنے سے اور انبیاء کرام (علیہم السلام) کی تصدیق کرنے اور ان پر ایمان لانے سے روک دے اور منع کرچکے ہیں قرآن کریم میں جابجا اس کا تذکرہ موجود ہے۔

" ویبغونھا عوجا" اور اس میں کجی اور عیب تلاش کرتے ہیں۔ یعنی اسلام اور احکام اسلام کی ایسی عیب جوئی کرتے ہیں اور اپنی طرف سے ایسے خود ساختہ عیوب ونقائص اور گمراہ کن باتیں شامل کرتے ہیں کہ کوئی شخص اسلام کے قریب آنے اور اسے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو۔

یہود ونصاری اسلام کے حقیقی دشمن ہیں :

مخالفین اسلام اسلام کے خلاف پراپیگنڈہ کو موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں چونکہ تمام روئے زمین پر برحق دین الہی صرف اسلام ہی ہے جس کی تمام تعلیمات نفس وخواہشات اور شیطانی ہتھکنڈوں کے خلاف ہیں جس کی پاکیزہ تعلیمات فطرت انسانی کے عین مطابق ہیں جس کی تعلیمات کی بنیاد توحید ورسالت اور عقیدہ آخرت پر مبنی ہے جس میں قدم قدم پر جائز وناجائز اور ثواب وگناہ کا تذکرہ ہے اس لیے کرہ ارض پر اور شیطانی مذاہب اور ادیان ہیں سب کے سب اسلام کے دشمن اور اس کے مٹانے اور کمزور کرنے کے درپے ہیں۔

خیر القرون سے لے کر آج تک یہ سارے ادیان ہر محاذ پر اسلام کے خلاف کام کرتے چلے آرہے ہیں مگر دین الہی کو صفحہ ہستی سے مٹانے پر عاجز رہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے اسلام کی حقانیت کے ثبوت کے لیے یہی ایک بات کافی ہے کہ سارا جہاں اپنے بیشمار وسائل کے باوجود اس غیر مسلح نہتے اسلام کو مٹانے اور کمزور کرنے سے بدستور عاجز ہے۔

بظاہر یہودیت، نصرانیت، بدھ مت، ہندومت، مجوسیت، صابیت، اشتراکیت وغیرہ اگرچہ مختلف عقائد و نظریات رکھتے ہیں مگر اسلام دشمنی اور اسلام کی بدخواہی میں یہ سارے متحد اور متفق ہیں اللہ تعالیٰ کی شان دیکھئے جس اسلام نے طہارت و نظافت کو جزو ایمان قرار دیا ہے اور ظاہری و باطنی طہارت پر ایمان کی بنیاد رکھی ہے۔ طہارت بدن، طہارت مکان، طہارت لباس، طہارت برتن، طہارت پانی، وغیرہ بہت سی طہارتوں کے حصول پر مسلمان کو پرکھا اور مکلّف بنایا ہے۔ اس کے خلاف گائے کا پیشاب پینے والوں نے دنیا کو باور کرانے کی لاحاصل سعی ناتمام کی ہے کہ ہم پاکیزہ ہیں اگر ہمارے اوپر یا ہمارے کھانے پر مسلمان کا سایہ پڑ جائے تو ہم اور ہمارا کھانا ناپاک اور نجس ہو جاتے ہیں یہ کتنا گھٹیا احمقانہ اور بے سروپا عقیدہ ہے ہندوؤں کا۔

بہرحال کافروں اور غیر مسلمانوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسلام کی اتنی عیب جوئی کی جائے کہ کوئی اس کے قریب نہ جائے اور کوئی اسے قبول ہی نہ کرے یہ سب حربے سورج کو انگلی سے چھپانے کی ناکام ہتھکنڈے ہیں یہودیوں اور نصرانیوں نے ہمیشہ یہی ہتھیار استعمال کیا ہے اور کر رہے ہیں یہودی تو اس معاملے میں بہت ہی آگے ہیں یہاں تک کہ انہوں نے نصرانیت کو بھی الجھنوں میں ڈال کر نہ ادھر کا بنایا نہ ادھر کا۔ آج عیسائیت ان کے رحم و کرم پر جی رہی ہے اسے اپنے دین کا کوئی پتہ نہیں اور اسلام دشمنی میں عیسائی بھی وہی کچھ کر رہے ہیں جو انہی یہود نے سکھایا اور بتایا۔

اور وہ مسلمانوں کو طرح طرح سے شکار کرنے اور اسلام سے دور اور بدظن کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں انہوں نے لوگوں کو مفت تعلیم مفت علاج اور ملازمتوں کا لالچ دے کر ان کے ایمان اور اسلامی اقدار پر چھاپہ مار رہے ہیں ہسپتال قائم کر رہے ہیں سکول بنا رہے ہیں سڑک اور پل بنا رہے ہیں این جی اوز چلا رہے ہیں یہاں تک کہ عورتوں کے ذریعہ بھی اپنے نظریات و کفریات کی اشاعت کر رہے ہیں جو کہ درحقیقت اسلام کے خلاف سازش ہے یورپ والے اسلام دشمن سرگرمیوں پر بے انتہا دولت خرچ کر رہے ہیں این جی اوز کی آڑ میں مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔

اسی طرح غیر مسلم قومیں اسلام کی حدود کو اکثر اپنے پراپیگنڈے کا ذریعہ بناتی ہیں کہتے ہیں کہ اسلام نے وحشیانہ سزائیں مقرر کی ہیں قطع ید اور زنا کی صورت میں رجم کو غیر انسانی سزا بناتے ہیں اور یورپ میں جو ڈکیتیاں ہو رہی ہیں ان سے صرف نظر کرکے اپنے کو انسان اور مہذب کہنے سے نہیں شرماتے۔

سعودی عرب کے ملک میں قطع ید نے وہ امن اور سلامتی قائم کیا ہوا ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ یورپ کو چھوڑیئے آج روشن خیال لوگ جو کسی مصلحت کے تحت اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں وہ بھی قرآن حدیث اور سرور دوجہاں حضرت محمد عربی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لائے ہوئے نظام پر تنقید کرتے ہیں اور یورپ کی اقتداء پر فخر کرکے اپنے نامہ اعمال کو سیاہ کر رہے ہیں یہ مفلوک الحال فخر کرکے اپنے نامۂ اعمال کو سیاہ کر رہے ہیں۔ یہ مفلوک الحال فقراء حق نمک ادا کرتے ہوئے اپنے ایمان پر خود ڈاکہ ڈال رہے ہیں کاش انہیں معلوم ہوتا کہ روز قیامت ان کا حشر یہود و نصاری اور بدھوں اور ہندوؤں کے ساتھ ہوگا قرآن حکیم نے یہ فیصلہ سنایا" ومن یتولھم منکم فانہ منھم "جو کوئی کسی غیر مسلم کے قانون و عمل سے محبت رکھے گا تو اس کا حشر انہی کے ساتھ ہوگا۔

اسی طرح ان اقوام میں سب سے بڑا جرم جس سے انسانی شرافت والی نسل کا خانہ خراب ہوا یعنی زنا، یہ ان کے ہاں عام ہے اور اس پر کوئی قدغن اور پابندی نہیں اگر رضامندی سے ہو، البتہ ایک سے زائد نکاح پر پابندی ہے یورپی مرد اور عورت کو پچاس تک دوست اور آشنا رکھنے کی کھلی اجازت ہے البتہ دوسرے نکاح پر پابندی ہے یہ کیسی الٹی سمجھ اور الٹی سوچ ہے؟ اس سوچ والوں سے پوچھئے کہ تمہاری شرافت اور مہذب انسانی نسل کا بیڑہ کیسے غرق ہوا؟ مہذب قوموں کے اندر جانوروں، کتوں، گدھوں، گھوڑوں اور اونٹوں کی نسل کا تحفظ موجود ہے کہ جب جانوروں کو خریدتے ہیں تو ان کی نسل کو ذہن میں رکھ کر خریدتے ہیں وغیرہ۔

" وھم بالاخرۃ کفرون " اور وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں کافر ویسے ہی آخرت کا منکر ہے جس کے سبب وہ ابدی دوزخی ہے مگر مشکل یہ ہے کہ مسلمان آخرت پر ایمان تو رکھتا ہے مگر مال دولت اور دنیوی زندگی کے آرام و عیش اور پر تکلف زندگی کی فکر نے اسے آخرت سے غافل بنا کر رکھا ہے۔

دعا: اے ارحم الرحمین دنیا کی محبت سے نجات عطا فرما اور آخرت کا طالب بنا۔ آمین۔ (منازل العرفان)

آیت مبارکہ:

وَنَادٰۤى اَصۡحٰبُ الۡجَـنَّةِ اَصۡحٰبَ النَّارِ اَنۡ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلۡ وَجَدْتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمۡ حَقًّا‌ ؕ قَالُوۡا نَعَمۡ‌ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيۡنَهُمۡ اَنۡ لَّعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيۡنَ ۝۴۴

لغۃ القرآن: وَنَادٰي : اور آواز دیں گے] [اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ : جنت والے] [اَصْحٰبَ النَّارِ : دوزخ والوں کو] [اَنْ : کہ] [قَدْ : تحقیق] [وَجَدْنَا : پایا ہم نے] [مَا : نہیں] [وَعَدَنَا : وعدہ کیا تھا ہم سے] [رَبُّنَا : ہمارا رب ہے] [حَقًّا : حقیقی] [فَهَلْ : تو کیا] [وَجَدْتُّمْ : تم نے پایا ہے] [مَا : جو] [وَعَدَ : وعدہ کیا تھا] [رَبُّكُمْ : تمہارا رب] [حَقًّا : حقیقی] [قَالُوْا : ان سب نے کہا] [نَعَمْ : ہاں !] [فَاَذَّنَ : تو اعلان کرے گا] [مُؤَذِّنٌ : ایک اعلان کرنے والا] [بَيْنَهُمْ : انکے درمیان] [اَنْ : کہ] [لَّعْنَةُ : لعنت] [للّٰهِ : اللہ] [عَلَي : پر] [الظّٰلِمِيْنَ : سب ظالموں کا]

ترجمہ: اور اہل جنت دوزخ والوں کو پکار کر کہیں گے : ہم نے تو واقعتاً اسے سچا پالیا جو وعدہ ہمارے رب نے ہم سے فرمایا تھا، سو کیا تم نے (بھی) اسے سچا پایا جو وعدہ تمہارے رب نے (تم سے) کیا تھا؟ وہ کہیں گے : ہاں۔ پھر ان کے درمیان ایک آواز دینے والا آواز دے گا کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے

تشریح:

جنت میں رہنے والے کچھ لوگ جنت کے کنارے پر آ کر جہنم میں جھانکیں گے تو کچھ ایسے ظالموں کو پہچان لیں گے جو انھیں زندگی میں تنگ کیا کرتے اور اسلام کا مذاق اڑایا کرتے تھے تو وہ ان کو پکار کر کہیں گے : اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ جن نعمتوں کا وعدہ کیا تھا ہم نے ان کو جنت میں پالیا اور تمہیں اللہ تعالیٰ نے جس عذاب سے ڈرایا تھا کیا تم نے بھی اس عذاب کو پالیا؟ تو وہ شرمندہ ہو کر ہاں کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکیں گے کیونکہ اس وقت وہ بالفعل عذاب میں مبتلا ہوں گے، پھر اہل جنت اور دوزخ والوں کے درمیان ایک منادی اعلان کرے گا کہ اہل جہنم پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اس لیے پڑی ہے کہ وہ خود ظالم تھے۔ دوسروں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے تھے۔ صراط مستقیم میں نقائص پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے اور آخرت کے بھی منکر تھے۔ (تفسیر امداد الکرم)

ظالموں اور مجرموں کو مزید شرم دلانے کے لیے یہ سوال کیا جائے گا۔ امام رازی (رح) فرماتے ہیں کہ جنت اور دوزخ کے درمیان بے حد و قیاس دوری ہے۔ پھر اتنی دور سے جنتیوں کی آواز دوزخیوں تک کیونکر پہنچے گی۔ امام موصوف اس کا جواب لکھتے ہیں کہ صرف بعد مسافت آواز کے سنے جانے سے مانع نہیں۔ عندنا البعد الشدید والقرب الشدید لیس من موانع الادراک (کبیر) ریڈیو کی ایجاد نے اس کی تصدیق کر دی اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ علمی طور پر ہمارے علماء کرام کے نزدیک بھی یہ بات ثابت شدہ تھی کہ بعد مکانی آواز کی لہروں کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ ان طے شدہ علمی مسلمات کی روشنی میں اگر یہ اعتقاد رکھا جائے کہ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے محبت کیش غلاموں کا درود شریف سنتے ہیں تو اسے شرک کہنا کیوں کر درست ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

اہل جنت کی شان اور ان کی قوتوں کا عروج

سب سے پہلے تو اس آیت کریمہ میں اللہ کے انعام و بخشش کے حوالے سے غور فرمایئے کہ اہل جنت وہی لوگ ہیں جو دنیا میں اہل دنیا کے ستائے ہوئے اور نظر انداز کیے ہوئے لوگ تھے جنھوں نے دینی زندگی گزارنے کے لیے نجانے کیسے کیسے دکھ اٹھائے اور قدم قدم پر ہر طرح کی محرومیوں سے واسطہ پڑتا رہا۔ اب جبکہ وہ جنت میں پہنچ گئے ہیں تو اچانک ان کے دائرہ اثر ' دائرہ کار ' ان کی شخصیت کی وسعتوں اور ان کی توانائیوں میں حیرت انگیز وسعت پیدا ہو گئی ہے بلکہ ایک طرح سے انقلاب

حال واقع ہوگیا ہے کہ ان کی تمام توانائیوں ' تمام حواس اور عقل وخرد میں ایک ایسا تغیر واقع ہوا ہے کہ ان کی یہ قوتیں جو دنیا میں طبعی قوانین کے مطابق نہایت محدود دائرے میں کارفرمارہ سکتی تھیں اب ان کے سامنے کوئی روک باقی نہیں رہی۔ ان کی نگاہیں لامحدود حد تک دیکھ سکتی ہیں ان کی سماعتیں لامحدود حد تک سن سکتی ہیں یعنی دنیا میں جو طبعی قوانین کارفرما تھے وہ یکسر ختم کردیئے گئے ہیں اب آخرت میں ایک نئی دنیا اور وہاں کے قوانین سے واسطہ ہے اور اہل جنت کو وہاں کے حالات کے مطابق نئی توانائیاں عطا کی گئی ہیں۔ چنانچہ انہی حیرت انگیز قوتوں کے باعث وہ اہل جہنم کو اپنے سامنے پائیں گے حالانکہ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ جنت کی وسعتوں کا حال یہ ہے کہ زمین وآسمان کی وسعتیں اس کے سامنے ہیچ ہیں اور پھر جہنم اس سے نجانے کتنی دوری پر واقع ہے اور خود اس کی وسعتوں کا عالم کیا ہے لیکن ان کی قوتوں کے سامنے یہ تمام وسعتیں سمٹ جائیں گی اور وہ نہایت آسانی سے اہل جہنم سے باتیں کرسکیں گے۔ اگرچہ قرآن کریم کی بیان کردہ یہ باتیں حیران کن ہیں لیکن آج کے سائنسی دور میں ہمارے لیے یہ باتیں حیران کن نہیں ہونی چاہئیں کیونکہ انسان نے قدرت کے محض چند ضمنی قوانین کو دریافت کرکے ایسی ایسی ایجادات کرلی ہیں جو سابقہ ادوار میں کبھی تصور بھی نہ کی جاسکتی تھیں۔ ایسی دوربینیں ایجاد ہوگئی ہیں جن کے ذریعے سے ہزاروں میل کی مسافت پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ٹیلی فون کی ایجاد سے ملکوں کے فاصلے سمٹ گئے ہیں۔ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے کسی بھی ملک کے پروگرام ٹیلی ویژن سکرین پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ ایسے آلات ایجاد ہوگئے ہیں جن سے لاکھوں میل کی مسافت سے نبض کی حرکت محسوس کی جاسکتی اور دل کی دھڑکنیں سنی جاسکتی ہیں۔ اگر اس دنیا میں یہ سب کچھ ممکن ہوگیا ہے تو آخرت میں جبکہ نئے قوانین نافذ ہوچکے ہوں گے اور قانون طبعی کی نارسائیوں سے انسان نکل چکا ہوگا تو اس میں قرآن کریم کے بیان کردہ احوال کو حیران کن کس طرح کہا جاسکتا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ اس آیت کریمہ میں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اہل جنت کی خوشی ان کی ایک ایک ادا سے پھوٹی پڑ رہی ہوگی وہ جنت کی نعمتوں اور اللہ کی بخششوں کو محسوس کرتے ہوئے خوشی سے جھوم رہے ہوں گے۔ اسی کیفیت میں قدرت جب ان کے سامنے اہل جہنم کو منکشف فرمائے گی تو خوشیوں کے اس طوفان میں ان کی زبان سے یہ سوال نکلے گا کہ او جہنم والو ہم سے تو اللہ نے جن باتوں کا وعدہ فرمایا تھا ہم نے ان میں سے ایک ایک بات کو سچا پایا ہے تو کیا تم نے بھی ان باتوں کو سچا پایا ہے جو عذاب کے سلسلے میں تم سے کہی گئی تھیں اور تمہیں بار بار اللہ کے نبی تنبیہ کرتے رہے تھے کہ اگر تم نے اپنی حالت نہ بدلی تو تمہیں جہنم کے ہولناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا تو اس کے جواب میں اہل جہنم اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکیں گے کہ ہاں۔ یہ ان کا مختصر جواب ان کے طویل سے طویل جواب پر بھی بھاری ہوگا کیونکہ جب کوئی مجرم اپنی سزا کو سامنے دیکھتا ہے تو تب اسے اپنے جرم کی سنگینی کا صحیح احساس ہوتا ہے۔ پھر وہ گردن جھکا لیتا ہے اور اندر سے بری طرح ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اس کی ٹوٹی ہوئی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے چنانچہ یہ بھی اپنے جرم کے بوجھ تلے دبے ہوئے نعم کے سوا کچھ نہیں کہہ سکیں گے۔ لیکن اسی ایک مختصر جواب پر ان کا کیس مکمل ہوجائے گا تو ایک پکارنے والا ان کی سزا کا اعلان کرتے ہوئے کہے گا کہ اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر۔ لعنت کا مفہوم ہے اللہ کی رحمت سے دوری یہ انتہائی سزا ہے جو اللہ کی جانب سے کسی کو مل سکتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ہر طرح کا تعلق ان کے پروردگار سے ٹوٹ چکا ہے اب یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہیں گے اور کبھی بھی اللہ کی رحمت ان کو نصیب نہیں ہوگی اس کے بعد اس کا سبب بیان کیا گیا ہے کہ یہ اتنی بڑی ہولناک سزا کو اس لیے پہنچے ہیں کہ ان کی فرد جرم بہت طویل ہے جن کے تین بڑے بڑے عنوانات ہیں اور یہ بات مشرکین مکہ سے سنا کے کہی جارہی ہے کہ تم بھی انہی جرائم کا ارتکاب کررہے ہو۔ خوب اندازہ کرلو کل کو تمہیں بھی ایسی ہی صورت حال سے واسطہ پڑنے والا ہے وہ تین جرائم یہ ہیں۔

1 یہ لوگ اللہ کے راستے سے روکا کرتے تھے۔ 2 اللہ کے دین میں کجی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ 3 آخرت کے منکر تھے۔

یہ تینوں عنوانات ہیں جس میں بیشمار ذیلی جرائم شامل ہیں مثلاً اللہ کے راستے سے روکنا یعنی دین قبول کرنے سے روکنا اور اگر کسی طرح دین قبول کرلیا ہے تو اس کے امکانات پر پہرے بٹھا دینا۔ اذیتوں اور مظالم کی انتہا کرکے دین کی برکات کو ظاہر نہ ہونے دینا' محرکات شر کو فروغ دے کر خیر کی قوتوں کے پھلنے پھولنے کے مواقع ختم کردینا' دین کا راستہ مشکل بنا کر لوگوں میں اسے اجنبی بنا دینا' علی ہذا القیاس یہ ایک طویل فہرست ہے۔

جہاں تک دین میں کجی پیدا کرنے کا تعلق ہے اس سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جو قلب ونگاہ کو آلودہ کرنے اور فکری ژولیدگی پیدا کرنے کے لیے کی جاتی ہیں۔ تعلیم اور ابلاغ کے واسطے سے دل ودماغ کو اس طرح پراگندہ کردینا کہ صحیح راستے کی طرف سفر اس کے لیے ممکن نہ رہے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو ایسا مخلوط ماحول دینا

جس میں جنسی آوارگی کو کھل کھیلنے کا موقع ملے۔ غیر نصابی سرگرمیوں کے نام سے ایسی مصروفیات پیدا کردینا جس سے انسانیت سرپیٹ کے رہ جائے' وضعی علوم کے ذریعے ایسے ایسے طریقے ایجاد کرنا جس سے فطری سادگی ختم ہوجائے اور ہر سیدھی بات کو بھی الجھا ہوا دکھایا جائے۔ جس طرح آنکھ کا فوکس بدل جائے یا آئینہ نگاہ میں تبدیلی آجائے تو ہر چیز ٹیڑھی دکھائی دیتی ہے اسی طرح جب سوچ کے زاویئے بدل دیئے جائیں تو ہر فطری حقیقت الجھی ہوئی دکھائی دیتی ہے اس طرح کی کوئی کوشش بھی اللہ کے دین میں کجی پیدا کرنے کی کوشش کہلاتی ہے۔

جہاں تک آخرت سے کفر کا تعلق ہے یہ تمام جرائم کی بنیاد اور ام الامراض ہے کیونکہ انسان میں بگاڑ کی جتنی صورتیں پیدا ہوتی یا محکم ہوتی ہیں اس کی بنیاد اس وقت پڑتی ہے جب آدمی اسی دنیا کی زندگی کو منزل قرار دے کر آخرت سے انکار کردیتا ہے۔ اس خشت اول کے ٹیڑھا ہوجانے کے بعد پوری دیوار ٹیڑھی اٹھتی چلی جاتی ہے جب دنیوی زندگی اخروی زندگی سے کٹ جاتی ہے تو پھر بے خدا تہذیب' بے خدا تمدن اور بے مقصد زندگی کو پیدا ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اللہ کے سامنے جوابدہی کا احساس ہی انسان کو برائی سے روکتا ہے جیسے ہی یہ تصور کمزور یا فنا ہوتا ہے تو ہر چیز فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے اس لیے ان تین جرائم کو بنیادی جرائم قرار دے کر اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور جہنم کو ان جرائم کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

قیامت کے دن جنتی مسلمان گناہ گار مسلمانوں کو طعنہ نہ دیں گے :

یہاں دوزخ والوں سے مراد کفار جہنمی ہیں نہ کہ گناہ گار مومن، کیونکہ جنتی مسلمان ان گنہگاروں کو طعنہ نہ دیں گے بلکہ ان کی شفاعت کرکے وہاں سے نکالیں گے جیساکہ حدیث پاک میں ارشاد ہوا۔ یہاں آیت میں مسلمانوں کے ساتھ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے اسی وعدے کی تکمیل کا بیان ہے جو قرآن میں مذکور ہے :

"رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۗۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ (۱۹۳) رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ (۱۹۴) فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَ قٰتَلُوْا وَ قُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (۱۹۵)" (1)

اے ہمارے رب ! بیشک ہم نے ایک نداد ینے والے کو ایمان کی ندا (یوں) دیتے ہوئے سنا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لے آئے پس اے ہمارے رب ! تو ہمارے گناہ بخش دے اور ہم سے ہماری برائیاں مٹادے اور ہمیں نیک لوگوں کے گروہ میں موت عطا فرما۔ اے ہمارے رب ! اور ہمیں وہ سب عطا فرما جس کا تونے اپنے رسولوں کے ذریعے ہم سے وعدہ فرمایا ہے اور ہمیں قیامت کے دن رسوانہ کرنا۔ بیشک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ تو ان کے رب نے ان کی دعا قبول فرمالی کہ میں تم میں سے عمل کرنے والوں کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا وہ مرد ہو یا عورت۔ تم آپس میں ایک ہی ہو، پس جنھوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں انھیں ستایا گیا اور انھوں نے جہاد کیا اور قتل کردیے گئے تو میں ضرور ان کے سب گناہ ان سے مٹادوں گا اور ضرور انھیں ایسے باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں (یہ) اللہ کی بارگاہ سے اجر ہے اور اللہ ہی کے پاس اچھا ثواب ہے۔

جنتیوں کا جہنمیوں سے کلام کرنا ان کی ذلت و رسوائی میں اضافہ کرنے کیلئے ہوگا کیونکہ دنیا میں عموماً کافر مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے اور انھیں طعنے دیتے تھے اور ان پر پھبتیاں کستے تھے۔ آج اس کا بدلہ ہو رہا ہوگا۔ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے : پھر ایک ندا دینے والا پکارے گا۔ } پکارنے والے حضرت اسرافیل (علیہ السلام) ہیں یا دوسرا فرشتہ جس کی یہ ڈیوٹی ہوگی اور ظالمین سے مراد کفار ہیں جیساکہ اگلی آیت سے معلوم ہو رہا ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

حشر کے دن کفار کی توبہ کارگر نہیں ہوگی :

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حشر کے دن جب کفار یہ اعتراف کریں گے کہ ان کے رب نے ان سے سچا وعدہ کیا تھا اور وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اعتراف کریں گے اور شرک سے بیزاری کا اظہار کریں گے اور شیطان اور دوسرے گمراہ کرنے والوں کی مذمت کریں گے اور اپنے کیے پر نادم ہوں گے تو کیا ان کا برائی پر نادم ہونا اور حق کا اعتراف کرلینا ان کی توبہ کے قائم مقام نہیں ہے اور کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا : " وھو الذی یقبل التوبۃ عن عبادہ ویعفوا عن السیئات : اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور گناہوں کو معاف فرمادیتا ہے " (الشوری : 25)

اس کا جواب یہ ہے کہ حشر کا دن دار الجزاء ہے اور دار العمل دنیا ہے۔ ان کی توبہ اور ایمان کی جگہ دنیا تھی۔ حشر کے دن توبہ کرنا مفید ہے نہ ایمان لانا۔ قرآن مجید میں ہے اللہ تعالیٰ غرغرہ موت کے وقت بھی توبہ قبول نہیں فرماتا : " ولیست التوبۃ للذین یعملون السیئات حتی اذا حضر احدہم الموت قال انی تبت الئٰن ولا الذین یموتون وھم کفار : ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو مسلسل گناہ کرتے رہتے ہیں حتی کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئے تو وہ کہے کہ میں نے اب توبہ کی اور نہ ان لوگوں کی توبہ قبول ہوتی ہے جو حالت کفر پر مرتے ہیں " (النساء : 18)

اور جب غرغرہ موت کے وقت توبہ قبول نہیں ہوتی تو موت کے بعد توبہ کیسے قبول ہوگی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ غرغرہ موت کے وقت اور موت کے بعد انسان غیب کا مشاہدہ کرلیتا ہے اور غیب کے مشاہدہ کے بعد ایمان لانا معتبر نہیں ہے، معتبر غیب پر ایمان لانا ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ۝۴۵

لغۃ القرآن: الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [يَصُدُّوْنَ : وہ سب روکتے تھے] [عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ : اللہ کی راہ سے] [وَيَبْغُوْنَهَا : اور وہ سب تلاش کرتے تھے اس میں] [عِوَجًا : کجی] [وَهُمْ : اور وہ] [بِالْاٰخِرَةِ : آخرت کے بدلے] [كٰفِرُوْنَ : سب انکار کرنے والے تھے]

ترجمہ: (یہ وہی ہیں) جو (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکتے تھے اور اس میں کجی تلاش کرتے تھے اور وہ آخرت کا انکار کرنے والے تھے

تشریح: جنتی اور جہنمیوں کا اپنے اپنے مقام اور انجام کا اعتراف۔

جب جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں چلے جائیں گے تو جہنمیوں کو ان کی ذلت کا احساس دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ جنتیوں کو جہنمیوں کے ساتھ سوال وجواب کرنے کا موقع عنایت فرمائے گا۔ جنتی حضرات جہنمیوں سے جنت کی آسائش وزیبائش، انعام وکرام اور جنت کی بیش بہا نعمتوں کا تذکرہ کرکے کہیں گے کہ ہم نے رب کریم کی طرف سے وہ سب کچھ پالیا جس کا ہمارے رب نے ہمارے ساتھ دنیا میں وعدہ فرمایا تھا۔ اے مجرمو ! تم بتاؤ کہ کیا تم نے وہ بلائیں اور سزائیں دیکھ لیں جن کو تم دنیا کی زندگی میں جھٹلایا کرتے تھے۔ جہنمی ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے اقرار کریں گے کہ ہاں ہم اپنے جرائم اور گناہوں کی سزا پارہے ہیں۔ جب ذلت و خواری کی حالت میں اپنے کیے کی سزا کا اعتراف کررہے ہوں گے تو ان کی ذلت وحسرت میں اضافہ کرنے کے لیے ان پر موسلادھار پھٹکار کا سلسلہ جاری ہوگا کہ ظالموں پر واقعتاً اللہ تعالیٰ کی لعنت اور پھٹکار ہونی چاہیے۔ لعنت کرنے والے ملائکہ اور جنتی ہوں گے ، یہاں ظالموں کے ظلم کی وضاحت بھی کردی گئی ہے کہ یہ لوگ ہر برائی اور گمراہی کے طلبگار ہونے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں رکاوٹ بنتے اور اپنے قول اور فعل کے ساتھ آخرت کا انکار کیا کرتے تھے۔ (فہم القرآن)

جو لوگ اللہ کے راستے کو ٹیڑھا کرتے ہیں۔ تحریف کردیتے ہیں۔ سیدھی بات کو الٹے الٹے معنی بنادیتے ہیں۔ نیکیوں کو گناہ بنا کر out of fasion بنا کر دکھاتے ہیں۔ گناہوں کو گلیمرائز کرتے ہیں۔ خوبصورت بناتے ہیں۔ آراستہ کرتے ہیں۔ جو divercions ہیں ان کو تو ایسا بنا کر دکھاتے ہیں کہ جیسے انسان ہے ہی ایسا۔ جو چیزیں اللہ نے حرام کردیں۔ ان کو سجاتے سنوارتے ہیں۔ ان پر رغبت دلاتے ہیں۔ اللہ کے سیدھے راستے کو ٹیڑھا کیا۔ روکا اللہ کے راستے کو لوگوں سے اپنی حرکتوں کی وجہ سے۔ اور اس کے اندر ٹیڑھ نکالا۔ اور وہ آخرت کے منکر تھے۔ یہ کام وہی کرسکتا ہے جو آخرت کو نہ مانے۔ عمل پر اثر کرنے والی جو چیز ہے وہ ہے ایمان بالآخرت۔ آخرت کا صحیح تصور جو دل میں بیٹھ گیا۔ آخرت کن پیرامیٹرز پر آئے گی۔ ان پیرامیٹرز پر آئے گی جو قرآن نے بتادیئے۔ جو حدیث میں آئے۔ اس کے علاوہ کسی بھی انسان کا بنایا ہوا نظریہ لے لیا آخرت کا یا کوئی خود ساختہ نظریہ follow کرنا شروع کردیا آخر کا۔ انسان کا عمل ٹھیک نہیں ہوگا۔ اس میں ضرور ہی disballence ہوگا۔ اب کیا ہوگا جنتیوں اور جہنمیوں کے درمیان۔ (تفسیر تنویر)

اَلَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ : جو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔} یہاں اللہ عَزَّوَجَلَّ نے جہنمیوں کو ظالم قرار دیا اور ان کے اوصاف یہ بیان کئے کہ وہ دوسروں کو اللہ عَزَّوَجَلَّ کے راستے سے روکتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے دین میں تبدیلی چاہتے تھے کہ دینِ الٰہی کو بدل دیں اور جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے مقرر فرمایا ہے اس میں تغیر ڈال دیں۔ تیسرا وہ قیامت کا انکار کرتے تھے۔

مسلمان کہلانے والے بے دین لوگوں کا انجام :

یہاں یہ وعیدیں بطور خاص کافروں کے متعلق ہیں لیکن جو مسلمان کہلانے والے بھی دوسروں کو دین پر عمل کرنے سے منع کرتے ہیں اور وہ لوگ جو دین میں تحریف و تبدیلی چاہتے ہیں جیسے بے دین و ملحد لوگ جو دین میں تحریف و تغییر کی کوششیں کرتے رہتے ہیں ایسے لوگ بھی کوئی کم مجرم نہیں بلکہ وہ بھی جہنم کے مستحق ہیں۔

جنتیوں اور جہنمیوں کے باہمی مکالمے :

یہاں آیتِ مبارکہ میں جیسا مکالمہ بیان کیا گیا ہے جنتیوں اور جہنمیوں کے درمیان ایسے مکالمے قرآن پاک میں اور جگہ بھی مذکور ہیں چنانچہ سورۃ صافّات میں ہے : فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ (۵۰) قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ (۵۱) یَّقُوْلُ اَىِٕنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِیْنَ (۵۲) ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِیْنُوْنَ (۵۳) قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ (۵۴) فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ (۵۵) قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِیْنِ (۵۶) وَ لَوْ لَا نِعْمَةُ رَبِّیْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِیْنَ (۵۷)" (1)

پھر جنتی آپس میں سوال کرتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے۔ ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا : بیشک میرا ایک ساتھی تھا۔ مجھ سے کہا کرتا تھا : کیا تم (قیامت کی) تصدیق کرنے والوں میں سے ہو؟ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہمیں جزاسزا دی جائے گی؟ جنتی (دوسرے جنتیوں سے) کہے گا : کیا تم (جہنم میں) جھانک کر دیکھوگے ؟ تو وہ جھانکے گا تو (اپنے) اس (دنیا کے) ساتھی کو بھڑکتی آگ کے درمیان دیکھے گا۔ وہ جنتی کہے گا : خدا کی قسم، قریب تھا کہ تو ضرور مجھے (بھی گمراہ کرکے) ہلاک کر دیتا اور اگر میرے رب کا احسان نہ ہوتا تو ضرور میں بھی (عذاب میں) پیش کئے جانے والوں میں سے ہوتا۔

نیز سورۃ مدثر میں ہے :

"كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ (۳۸) اِلَّاۤ اَصْحٰبَ الْیَمِیْنِ (۳۹) فِیْ جَنّٰتٍ یَتَسَآءَلُوْنَ (۴۰) عَنِ الْمُجْرِمِیْنَ (۴۱) مَا سَلَكَكُمْ فِیْ سَقَرَ (۴۲) قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ (۴۳) وَ لَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِیْنَ (۴۴) وَ كُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِیْنَ (۴۵) وَ كُنَّا نُكَذِّبُ بِیَوْمِ الدِّیْنِ (۴۶) حَتّٰۤى اَتٰىنَا الْیَقِیْنُ (۴۷)" (2)

ہر جان اپنے کمائے ہوئے اعمال میں گروی رکھی ہے مگر دائیں طرف والے، باغوں میں ہوں گے، وہ پوچھ رہے ہوں گے مجرموں سے، کون سی چیز تمہیں دوزخ میں لے گئی؟ وہ کہیں گے : ہم نمازیوں میں سے نہیں تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور بیہودہ فکر والوں کے ساتھ بیہودہ باتیں سوچتے تھے اور ہم انصاف کے دن کو جھٹلاتے رہے یہاں تک کہ ہمیں موت آئی۔

کفر اور بد عملی کی بڑی وجہ :

آیت کے آخر میں فرمایا کہ وہ آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کفر و عناد اور بد عملی کی بڑی وجہ قیامت کا انکار یا اسے بھلانا ہے اگر بندے کے دل میں قیامت کا خوف ہو تو جرم کرنے کی ہمت ہی نہ کرے۔ اسی لیے بزرگانِ دین نے روزانہ کچھ وقت موت، قبر اور قیامت کے متعلق غور و فکر کرنے کا مقرر فرمایا ہے کہ یہ فکر دل کی دنیا بدل دیتی ہے اور ایسی ہی سوچ کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ "لمحہ بھر غور و فکر کرنا پوری رات قیام کرنے سے بہتر ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

آیت مبارکہ:

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ ۚ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۚ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ○ ۴۶

لغۃ القرآن: وَبَيْنَهُمَا : اور ان دونوں کے درمیان] [حِجَابٌ : ایک پردہ ہوگا] [وَعَلَي : اور پر] [الْاَعْرَافِ : اعراف] [رِجَالٌ : کچھ آدمی ہوں گے] [يَعْرِفُوْنَ : وہ سب پہنچانتے ہیں] [كُلًّا : ہر ایک کو] [بِسِيْمٰهُمْ : ان کی نشانی سے] [وَنَادَوْا : اور وہ سب آواز دیں گے] [اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ : جنت والوں کو] [اَنْ : کہ] [سَلٰمٌ : سلامتی ہے] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [لَمْ : نہیں] [يَدْخُلُوْهَا : وہ سب داخل ہوئے ہوں گے اس میں] [وَهُمْ : اور وہ] [يَطْمَعُوْنَ : سب امید رکھتے ہوں گے]

ترجمہ: اور (ان) دونوں (یعنی جنتیوں اور دوزخیوں) کے درمیان ایک حجاب (یعنی فصیل) ہے، اور اعراف (یعنی اسی فصیل) پر کچھ مرد ہوں گے جو سب کو ان کی نشانیوں سے پہچان لیں گے۔ اور وہ اہل جنت کو پکار کر کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو۔ وہ (اہل اعراف خود ابھی) جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے حالانکہ وہ (اس کے) امیدوار ہوں گے

تشریح:

آیت کریمہ میں تین مقامات کا تذکرہ ہے:

پہلا مقام فضیلت اور رحمتوں والا مقام یعنی جنت ہے دوسرے مقام میں نقمتوں اور عذابوں کے سوا کچھ نہیں یعنی دوزخ تیسرے مقام میں معاملہ بین بین کا ہوگا نہ دائمی راحت اور نہ عذاب یعنی اعراف۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ اہل جنت اور اہل دوزخ جن کے لیے دوام ثابت ہے یہ دو جماعتیں ہوگی، اور ہر جماعت اپنے اپنے مقام اور مستقل پر ہوگی اور ان دونوں کے درمیان ایک اونچا پردہ (دیوار) حائل ہوگا۔ یہ پردہ ایک دیوار کی صورت میں ہوگا جس کو "بینھما حجاب" سے تعبیر فرمایا ہے اس پردہ کے باوجود آپس میں ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے اور بات چیت کر سکیں گے جیسے ارشاد ہے "ونادی اصحب الجنتہ اصحب النار" اور عنقریب دوسری آیت میں دوزخیوں کا جنتیوں سے پانی طلب کرنے کا ذکر آرہا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اہل جنت اور اہل دوزخ کے درمیان کچھ جھروکے ہوں گے جن سے وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے اور بات کر سکیں گے۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ یہ پردہ ایسا ہوگا کہ جنت کا اثر اہل دوزخ کی طرف اور دوزخ کا اثر اہل جنت کی طرف نہیں پہنچنے دے گا البتہ آپس میں ایک دوسرے کی آواز پہنچے گی اور آپس کا مکالمہ جاری ہوگا۔ واللہ اعلم۔

پھر اس کا جواب دیتے ہوئے کہ دیوار کے درمیان میں حائل ہوتے ہوئے آواز کیسے پہنچے گی؟ تحریر فرماتے ہیں کہ امور آخرت کو امور دنیا پر قیاس نہیں کیا جاسکتا اور یہ عمومی قاعدہ ہے۔ صاحب روح المعانی نے درست فرمایا لیکن اب تو دنیا میں بھی لاسلکی نظام نے یہ ثابت کر دیا کہ آواز پہنچنے اور بات کرنے کے لئے درمیان میں کسی چیز کا حائل ہونا اور ایک دوسرے سے بعید ہونا مانع نہیں موجودہ وقت یہ سب چیزیں واقع ہیں ایک شخص مشرق بعید میں بیٹھے ہوئے بے تکلف مغرب کے لوگوں سے بات کر رہا ہے بلکہ انہیں دیکھ بھی رہا ہے۔

پھر فرمایا کہ اعراف پر بہت سے لوگ ہوں گے، جو ہر ایک کو، یعنی اہل جنت اور اہل نار کو ان کی نشانیوں اور علامات سے شناخت کریں گے، اور پہچانیں گے۔

لفظ "اعراف" "عرف" کی جمع ہے، ہر چیز کے بلند حصے کو عرف کہا جاتا ہے۔ آیت کریمہ میں جس اعراف کا ذکر ہے اس سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ البتہ مفسرین حضرات (رح) نے فرمایا ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان جو دیوار ہو گی، جسے حجاب سے تعبیر فرمایا ہے، وہ اعراف کہلائے گی۔

آیت کریمہ میں اس کی تصریح ہے کہ اعراف میں بہت سے لوگ ہوں گے، جو اہل جنت کو پہچانتے ہوں گے، اور اہل دوزخ کو بھی۔ اور یہ پہچاننا ہر ایک فریق کو علامتوں سے ہوگا، کیونکہ میدان حشر میں بھی اہل جنت کے چہرے سفید نورانی ہوں گے، اور تروتازہ اور خوش بھی، جبکہ اہل دوزخ کے چہرے پژمردہ اور سیاہ ہوں گے، اور ان کی آنکھیں نیلی ہوں گی۔ اور جنت و دوزخ کے داخلہ کے بعد ہر فریق کی صورتوں کا ممتاز ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ اعراف والے اہل جنت کو اور اہل دوزخ کو ان کی نشانیوں سے پہچان لیں گے، خود تو ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے، البتہ دخول کے امیدوار ہو رہے ہوں گے کہ انہیں بھی جنت میں داخلہ نصیب ہو جائے گا، اسی طمع اور امید کے حال میں وہ جنت والوں سے خطاب کریں گے کہ تم پر سلام ہو: سلم علیکم۔

ان کا یہ کہنا بطور اخبار یا تحیہ کے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دنیاوی تکلیفوں سے بچا دیا، اور آئندہ ہمیشہ کے لیے ہر قسم کی تکلیفوں سے محفوظ رہو گے۔

یہ "اصحاب اعراف" کون ہوں گے؟ اس کے بارے میں حضرات مفسرین نے حضرات سلف سے متعدد اقوال نقل کیے ہیں، مشہور ترین قول یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نیکیوں کی وجہ سے پل صراط کو پار کریں گے، دوزخ سے تو بچ گئے، لیکن ان کی نیکیاں اس قدر نہ تھیں کہ جنت کے داخلہ کا ذریعہ بن جائیں، یعنی ان کی نیکیاں اور گناہ برابر ہیں۔ کمَامَرَّ۔ چنانچہ انہیں اعراف پر لوگوں کے درمیان فیصلہ ہونے تک روکا جائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ شانہ اپنی رحمت و فضل سے ان کو جنت میں داخل فرما دیں گے۔

ان کا یہ کہنا بطور اخبار یا تحیہ کے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دنیاوی تکلیفوں سے بچا دیا، اور آئندہ ہمیشہ کے لیے ہر قسم کی تکلیفوں سے محفوظ رہو گے۔

یہ "اصحاب اعراف" کون ہوں گے؟ اس کے بارے میں حضرات مفسرین نے حضرات سلف سے متعدد اقوال نقل کیے ہیں، مشہور ترین قول یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نیکیوں کی وجہ سے پل صراط کو پار کریں گے، دوزخ سے تو بچ گئے، لیکن ان کی نیکیاں اس قدر نہ تھیں کہ جنت کے داخلہ کا ذریعہ بن جائیں، یعنی ان کی نیکیاں اور گناہ برابر ہیں۔ کمامر۔ چنانچہ انہیں اعراف پر لوگوں کے درمیان فیصلہ ہونے تک روکا جائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ شانہ اپنی رحمت و فضل سے ان کو جنت میں داخل فرما دیں گے۔

"اعراف" والے حضرات اہل جنت سے بھی خطاب کریں (جس کا ابھی ذکر ہوا) اور اہل دوزخ سے بھی خطاب کریں گے، جب وہ دوزخیوں کی ہلاکت و بدحالی کا ملاحظہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ جل شانہ سے عرض کریں گے: اے ہمارے رب! ہمیں ظالموں سے شمار نہ فرمانا۔ یعنی دوزخ میں داخل نہ فرمانا۔ اسی طرح وہ اہل جہنم کے سرداروں اور بڑوں کو جب دیکھ کر پہچانیں گے، جنہیں اپنی جماعت پر گھمنڈ تھا، اور تکبر کرتے تھے، نہ خود دین حق قبول کرتے تھے، اور نہ اپنے ماننے والوں کو قبول کرنے دیتے تھے، اور اہل ایمان کا مذاق اڑا کر انہیں حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے، اور نہ صرف یہ کہ ان کو اپنے طور پر حقیر جانتے تھے، بلکہ یوں کہتے تھے کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ جل شانہ کی رحمت شامل ہو ہی نہیں سکتی۔ "لا ینالھم اللہ برحمۃ"

تو اصحاب اعراف ان متکبر سرداروں سے کہیں گے کہ تمہاری جماعت نے تمہیں کچھ فائدہ نہ دیا، جن کے تم سردار بنے ہوئے تھے، اور جو کچھ تم تکبر کرتے تھے، اس نے بھی تم کو فائدہ نہ پہنچایا۔ یہ اہل ایمان کیا وہ لوگ نہیں ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت میں شامل نہ فرمائے گا؟ اب بتاؤ تمہاری وہ قسمیں کہاں گئیں؟ اور تمہاری وہ غرور کہاں گیا؟ یہ سب ختم ہو گئے۔ آج دیکھو وہ لوگ کیسے کامیاب ہو گئے؟ اور رحمت الٰہی کے مستحق بنے؟ اور جنت میں شاداں و خراماں داخل ہو گئے؟ اور ابدی سعادتوں کو حاصل کر گئے؟ انہیں فرمایا جائے گا" ادخلوا الجنۃ لا خوف علیکم ولا انتم تحزنون "جنت میں داخل ہو جاؤ نہ تم پر اب کچھ خوف ہے نہ آئندہ کبھی تم رنجیدہ اور پریشان ہوگے وہ تو اپنے ایمان کی وجہ سے کامیاب ہو گئے اور تمہارا تکبر تمہیں کھا گیا تم کفر پر جمے رہے تباہ ہو گئے۔

(تفسیر منازل العرفان)

ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے اپنی تفسیروں میں عبداللہ بن حارث کی وساطت سے حضرت ابن عباس (رض) : کا قول نقل کیا ہے کہ اعراف جنت و دوزخ کے درمیان ایک دیوار ہوگی اور اصحاب اعراف وہ لوگ ہوں گے جن کو اللہ وہاں روک دے گا پھر جب اللہ ان کو معاف کرنا چاہے گا تو سب سے پہلے ان کو ایک نہر کی طرف لے جائے گا جس کا نام نہر حیات ہوگا جس کے دونوں کنارے سونے کے موتیوں سے جڑے ہوئے ہوں گے اور اس کی مٹی مشک کی ہوگی اس نہر میں اصحاب اعراف کو ڈالا جائے گا (نہاتے ہی) ان کے رنگ درست ہو جائیں گے اور سینے پر ایک سفید چمکدار تل نمودار ہو جائے گا تو اللہ ان کو طلب فرما کر دریافت فرمائے گا کہ اب تمہاری کیا تمنا ہے جو چاہو مانگو۔ وہ لوگ اپنی تمنا ظاہر کریں گے جب ان کی ساری تمنائیں ختم ہو جائیں گی (اور کوئی تمنا کرنا باقی نہ رہے گی) تو اللہ فرمائے گا تم کو وہ چیزیں دی گئیں جن کی تم نے تمنا کی اور اتنی ہی اور بھی اور ستر ہزار گنا مزید۔ چنانچہ وہ جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے مگر ان کے سینوں پر ایک سفید تل چمکتا ہوگا اسی سے ان کی پہچان ہوگی۔ یہ لوگ مساکین اہل جنت (جنتیوں میں مسکین) کہلائیں گے۔

ابوالشیخ نے ابن منکدر کے طریقہ سے ایک مزنی شخص کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اعراف کے متعلق دریافت کیا گیا' فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جو باپ کی اجازت کے بغیر جہاد کو گئے ہوں گے اور باپ کی نافرمانی کرنے کی حالت میں ہی جہاد میں شہید ہو گئے ہوں گے چونکہ باپ کے نافرمان تھے اس لیے ان کو جنت سے روک دیا جائے گا لیکن راہ خدا میں شہید ہوئے تھے اس لیے دوزخ میں بھی نہیں بھیجا جائے گا۔

طبرانی نے ضعیف سند سے حضرت ابو سعید (رض) خدری کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اصحاب اعراف کے متعلق دریافت کیا گیا فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جو باپ کی نافرمانی کی حالت میں راہ خدا میں مارے گئے ہوں گے شہادت ان کو دوزخ میں جانے سے روک دے گی اور باپ کی نافرمانی جنت میں نہیں جانے دی گی۔ ان کا گوشت اور چربی پگھل جائے گی یہاں تک کہ اللہ جب سب مخلوق کے حساب سے فارغ ہو جائے گا اور ان کے علاوہ اور کوئی باقی نہیں رہے گا تو اس کی رحمت ان کو بھی ڈھانک لے گی اور اپنی رحمت سے ان کو بھی جنت میں داخل فرمائے گا۔

طبرانی اور بیہقی نے نیز حارث بن اسامہ نے اپنی مسند میں اور سعید بن منصور' ابن جریر' ابن ابی حاتم' ابن مردویہ اور ابوالشیخ نے اپنی تفسیروں میں حضرت عبدالرحمٰن مزنی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اصحاب اعراف کے متعلق دریافت کیا گیا فرمایا وہ ایسے لوگ ہوں گے جو راہ خدا میں مارے گئے ہوں گے۔ میں کہتا ہوں شاید ان شہداء سے مراد وہی شہداء ہیں جنہوں نے باپوں کی نافرمانی کی حالت میں جہاد کیا ہوگا۔ اس طرح مذکورہ بالا دونوں حدیثوں میں مطابقت ہو جائے گی۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ مذکورہ شہداء کا ذکر بطور تمثیل کیا گیا ہے یہ ان لوگوں کی جماعت کے کچھ افراد ہوں گے جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی یہ مقصد نہیں ہے کہ اصحاب اعراف بس یہی لوگ ہوں گے دوسرے نہیں ہوں گے اس کا ثبوت بعض ان احادیث سے ملتا ہے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے کہ اصحاب اعراف وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں بدیاں برابر ہوں گی ابن ابی داؤد اور ابن جریر نے ابن عمر بن حزم بن جریر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اصحاب اعراف کے متعلق دریافت کیا گیا' فرمایا یہ وہ بندے ہوں گے جن کا فیصلہ سب سے آخر میں ہوگا جب رب العٰلمین تمام بندوں کے فیصلے سے فارغ ہو جائے گا تو ان سے فرمائے گا کہ تمہاری نیکیوں نے دوزخ سے تو تم کو نکال لیا (یعنی بچا لیا) اور تم جنت میں بھی (نیکیوں کی کمی کی وجہ سے) نہیں جاسکے' اب تم آزاد ہو جنت میں جہاں چاہو سیر کرتے پھرو۔ سیوطی (رح) نے کہا یہ روایت مرسل حسن ہے۔ ابن مردویہ اور ابوالشیخ نے دو طریقوں سے حضرت جابر بن عبداللہ (رض) کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ان لوگوں کا حکم پوچھا گیا جن کی نیکیاں بدیاں برابر ہوں گی فرمایا یہی اصحاب اعراف ہوں گے جو جنت میں نہیں جاسکے ہوں گے مگر داخلہ جنت کی طمع رکھتے ہوں گے۔

بیہقی نے حضرت حذیفہ (رض) کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن اللہ سب کو جمع کرے گا اہل جنت کو جنت میں جانے کا اور دوزخیوں کو دوزخ کا حکم دیا جائے گا۔ پھر اصحاب اعراف سے فرمائے گا تم کو کس چیز کا انتظار ہے وہ عرض کریں گے ہم تیرے حکم کے منتظر ہیں ارشاد ہوگا تمہاری نیکیوں نے دوزخ میں جانے سے تو تم کو بلاشبہ بچا لیا (مگر) تمہارے جرائم جنت میں جانے سے بھی تمہارے لیے آڑ بن گئے اب جاؤ میری مغفرت اور رحمت سے (جنت میں) چلے جاؤ۔ سعید بن منصور اور ابن جریر' ابوالشیخ' بیہقی' ہناد اور حذیفہ کا بیان ہے کہ اعراف والے وہ لوگ ہوں گے جن کی بدیاں جنت میں

پہنچانے سے قاصر ہوں گی اور نیکیاں دوزخ سے ان کو بچالیں گی ایسے لوگوں کو ٹھہرالیا جائے گا یہاں تک کہ اللہ جب لوگوں کا فیصلہ کر چکے گا تو اچانک ان کو دیکھ کر فرمائے گا اٹھو تم بھی جنت میں چلے جاؤ میں نے تمہیں بخش دیا۔

عبدالرزاق نے حضرت حذیفہ کا قول نقل کیا ہے کہ اعراف والے وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں بدیاں برابر ہوں گی وہ جنت و دوزخ کی درمیانی دیوار پر فروکش ہوں گے اور جنت میں داخلہ کے آرزومند (آخر) جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ بغوی نے اپنی سند سے بروایت سعید بن جبیر' حضرت ابن مسعود (رض) : کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کا حساب ہوگا۔ بدیوں سے جس کی ایک نیکی بھی زائد ہو گی وہ جنت میں چلا جائے گا اور جس کی بدیاں زائد ہوں گی وہ دوزخ میں پہنچ جائے گا اللہ نے فرمایا ہے : (فمن ثقلت موازینہ فاؤلئک ہم المفلحون و من خفت موازینہ فاؤلئک الذین خسروا انفسہم) پھر فرمایا دانہ برابر وزن کی نیکیوں اور بدیوں سے بھی میزان میں ہلکا بھاری پن ہو جائے گا پھر آپ نے فرمایا جس کی نیکیاں بدیاں برابر ہوں گی وہ اعراف والے ہوں گے۔ صراط (کے آخری سرے) پر ان کو روک لیا جائے گا (جہاں سے) وہ اہل جنت اور اہل نار کو پہچان لیں گے جب جنتیوں کو دیکھیں گے تو پکار کر کہیں گے سلام علیکم اور جب دوزخیوں کی طرف نظر پھیر کر دیکھیں گے تو کہیں گے اے ہمارے رب ہم کو ان ظالموں کے ساتھ نہ کر دینا نیکیوں والوں کو ایک نور عطا فرمایا جائے گا جو ان کے دائیں طرف اور سامنے کی جانب رواں ہوگا اس روز ہر بندہ کو نور دیا جائے گا جب لوگ پل صراط پر آئیں گے تو اللہ ہر منافق مرد و عورت کا نور سلب کر لے گا۔ منافقوں کی اس حالت کو دیکھ کر مومن عرض کریں گے اے ہمارے رب ہمارے نور کو کم نہ فرمانا۔ رہے اصحاب اعراف تو ان کے سامنے کا نور سلب نہیں کیا جائے گا لیکن ان کے گناہ ان کو چلنے سے روک دیں گے مگر سامنے کا نور چونکہ سلب نہیں ہوگا اس لیے ان کے دل میں طمع باقی رہے گی اسی کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے : (لم یدخلوہا وہم یطمعون) آخر ان کو بھی جنت میں داخل کر دیا جائے گا جنت کے اندر سب سے آخر میں داخل ہونے والے یہی ہوں گے۔

ہناد نے مجاہد کا قول بیان کیا ہے کہ اصحاب اعراف وہ لوگ ہوں گے جو نیکوکار فقہاء اور علماء ہوں گے اور اعراف جنت و دوزخ کے درمیان ایک دیوار ہو گی شاید اس قول کی مراد یہ ہے کہ وہ مومن فقہا اور علماء جنہوں نے گناہوں کا ارتکاب کیا ہوگا اور جن کی نیکیاں بدیاں برابر ہوں گی اچھے برے عمل مخلوط ہوں گے امید ہے کہ اللہ ان پر رحم فرمائے گا۔

بیہقی نے ابو مجلز کا قول نقل کیا ہے کہ اعراف ایک اونچی جگہ ہو گی جہاں ملائکہ فروکش ہوں گے اور وہاں سے اہل جنت اور اہل نار کو دیکھ کر ہر فریق کو اس کی علامت سے پہچان لیں گے۔ یہ قول غلط ہے کیونکہ اصحاب اعراف کو رجال (مرد) فرمایا اور ملائکہ مرد نہیں۔ علاوہ ازیں مذکورہ بالا احادیث بھی اس قول کی تردید کر رہی ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اصحاب اعراف انبیاء یا اولیاء یا شہداء ہوں گے جو اہل جنت و اہل نار کو دیکھ کر پہچان لیں گے اس قول کی تردید بھی گزشتہ احادیث اور آئندہ آیات سے ہوتی ہے۔

بعض کے نزدیک مشرکوں کے بچے اہل اعراف ہوں گے یہ قول بھی غلط ہے اللہ نے اصحاب اعراف کو رجال فرمایا اور گزشتہ احادیث بھی اس قول کے خلاف ہیں۔ سیما یا سام اِبِلٌسے ماخوذ ہے (اونٹوں کو چراگاہ میں نشان لگا کر چھوڑ دیا) وَسَمَ عَلَی القلبِسے ماخوذ ہے (دل پر نشان لگا دیا) اس آخری صورت میں مادہ مثال وادی (وسم) ہوگا جیسے جاہ وجہ سے بنایا گیا ہے۔

و نادوا اصحب الجنتہ ان سلم علیکم لم یدخلوہا وہم یطمعون : اور اہل اعراف جنت والوں سے پکار کر کہیں گے تم پر سلامتی ہو (اس وقت تک) وہ جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے مگر (داخلہ کے) آرزومند ہوں گے حسن نے کہا اللہ ان کو امید دلائے گا کیونکہ ان پر کرم کرنا مقصود ہوگا (ورنہ کافروں کی امید تو منقطع ہی کر دے گا) لَمۡ یَدۡخلوہَاالخ جملہ مستانفہ ہے ما قبل سے اس کا ترکیبی اختلاط نہیں ہے یا رجال کی صفت ہے یا نادوا کی ضمیر فاعل سے حال ہے جو لوگ قائل ہیں کہ اصحاب اعراف انبیاء اور ملائکہ ہوں گے ان کے نزدیک اصحاب الجنتہ سے حال ہوگا۔ (تفسیر مظہری)

آیت مبارکہ:

وَاِذَا صُرِفَتۡ اَبۡصَارُهُمۡ تِلۡقَآءَ اَصۡحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوۡا رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ۝٤٧

لغۃ القرآن: وَاِذَا : اور جب] [صُرِفَتْ : پھیری جائیں گی] [اَبْصَارُهُمْ : ان کی نگاہیں] [تِلْقَاءَ اَصْحٰبِ النَّارِ : آگ والوں کی طرف] [قَالُوْا : ان سب نے کہا] [رَبَّنَا : اے ہمارے رب] [لَا : نہیں] [تَجْعَلْنَا ": شامل " کر ہمیں] [مَعَ : ساتھ] [الْقَوْمِ : قوم] [الظّٰلِمِيْنَ : سب ظالموں کا]

ترجمہ: اور جب ان کی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف پھیری جائیں گی تو وہ کہیں گے : اے ہمارے ربّ ! ہمیں ظالم گروہ کے ساتھ (جمع) نہ کر

تشریح:

اعراف کا معنٰی بلندی ہے جو جنت اور جہنم کے درمیان لامتناہی طول و عرض اور بلند و بالا قسم کی دیوار ہو گی اور اس میں ایک دروازہ بھی ہو گا جس کا قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر سورۃالحدید آیت ۱۳ میں کیا گیا ہے اس پر تشریف فرما لوگوں کو اصحاب الاعراف کے نام سے پکارا جائے گا یہ کون حضرات ہوں گے ان کے بارے میں قرآن و حدیث میں دو اور دو چار کے الفاظ میں وضاحت نہیں ملتی۔ البتہ مفسرین نے متقدمین کے اقوال سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی۔ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ ان سے مراد وہ اصحاب ہوں گے جنھوں نے والدین کی اجازت کے بغیر قتال فی سبیل اللہ میں حصہ لیا ہو گا۔ یہ بالآخر جنت میں داخل ہوں گے۔ ایسے حضرات کو الاعراف پر براجمان کیا جائے گا تاکہ انھیں ان کی کمزوریوں کا کچھ نہ کچھ احساس دلایا جائے۔ یہ اہل جنت کو ان کے نام اور اعزازات سے پہچان کر ان کی خدمت میں سلام عرض کرتے ہوئے اس امید کا اظہار کریں گے گو ہمیں اب تک تمہاری رفاقت کا اعزاز اور جنت میں داخلہ نصیب نہیں ہوا لیکن ہمیں اپنے رب کے فضل و کرم سے پوری امید ہے کہ وہ ہمیں اپنی جنت میں داخلہ عطا فرمائے گا اس گفتگو کے بعد ان کے چہروں کو جہنم کی طرف پھیر دیا جائے گا وہ جہنم کی بلاؤں اور سزاؤں اور ان میں مبتلا جہنمیوں کو دیکھ کر اپنے رب سے عاجزانہ درخواست کریں گے۔ بار الٰہا ! ہمیں جہنم کی ہولناکیوں اور ظالموں کی معیت سے محفوظ فرما کر جنت میں داخلہ نصیب فرما۔ پھر وہ جہنمیوں کے نام اور ان کے چہروں سے پہچانتے ہوئے انھیں شرم دلائیں گے کہ افرادی قوت، اسباب و وسائل کی کثرت اور تمہارا انکار و استکبار تمہیں جہنم میں داخل ہونے سے نہ بچا سکے اور جن لوگوں کو تم دنیا میں حقیر سمجھ کر ان کے ایمان اور صالح کردار پر طعنہ زنی کرتے تھے کہ یہ لوگ کسی صورت میں ہم سے بہتر نہیں ہو سکتے۔ اگر یہ واقعی اللہ کے پسندیدہ لوگ ہیں تو انھیں ہمارے مقابلہ میں دنیا کی نعمتیں کیوں حاصل نہیں ہو سکیں۔ اے جہنم والو ! یہ بھی دنیا میں کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ آخرت میں بھی اللہ کے فضل و کرم سے محروم رہیں گے۔

اب دیکھو کہ یہ خوش نصیب کس طرح اپنے رب کی نعمتوں سے سرفراز کیے جا رہے ہیں۔ اصحاب الاعراف کی جہنمیوں کے ساتھ اس گفتگو کے بعد انھیں جنت میں داخلہ کی اجازت دیتے ہوئے اطمینان دلایا جائے گا کہ اب تمہیں کوئی خوف اور غم نہیں ہو گا۔ کیونکہ وہ اعراف پر بیٹھے ہوئے جہنم کی ہولناکیوں کو دیکھتے ہوئے خوفزدہ تھے اس لیے جنت میں داخلہ عنایت کرکے انھیں حزن و ملال اور خوف و خطر سے مامون رہنے کی تسلی دی گئی ہے۔ کیونکہ جنت آسائش و آرام اور سکون و اطمینان کا گہوارا ہے۔ جب یہ لوگ جنت میں داخل ہو جائیں گے تو جہنمی آہ و زاریاں کرکے ان سے فریاد کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ماکولات اور مشروبات تمہیں عنایت کیے ہیں ان میں سے پانی اور کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ ہمیں بھی عنایت کیجیے۔ ان کے جواب میں جنتی فرمائیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کا اکل و شرب کافروں پہ حرام کر رکھا ہے اس لیے ہم تم کو پانی کا ایک گھونٹ اور کھانے کے لیے ایک ذرّہ بھی نہیں دے سکتے۔

ا۔ اَھآؤمآءِ کا اشارہ لایا گیا ہے جو قریب کے لیے استعمال ہوتا ہے ممکن ہے کہ جہنمیوں کی حسرتوں اور ذلتوں میں اضافہ کرنے کے لیے جنت اور دوزخ کے درمیان واقع اس دیوار کا دروازہ ایک دفعہ کھول دیا جائے جس سے یہ جنتیوں کو قریب سے دیکھ سکیں۔

۲۔ اصحاب الاعراف اونچی دیوار پر بیٹھے جنتیوں کو بھی دیکھ رہے ہوں گے شاید ان کے لیے قریب کا اشارہ کیا گیا ہے۔

۳۔ رجال سے مراد مفسرین نے جنت اور جہنم کے سردار لیے ہیں۔ (تفسیر فہم القرآن)

(۱) ابن ابی شیبہ، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے عکرمہ (رح) سے روایت کیا کہ انھوں نے لفظ آیت "واذا صرفت ابصارھم تلقاء اصحب النار" کے بارے میں فرمایا جب ان کے چہرے صرف اہل جہنم کی طرف کر دیئے جائیں گے (تو اس وقت وہ یہ دعا کریں گے) کیونکہ جب وہ جنت والوں کو دیکھیں گے تو اس وقت ان کے چہرے جہنم والوں سے پھر چکے ہوں گے۔

(۲) امام ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے ابن زید (رح) سے روایت کیا کہ انھوں نے لفظ آیت "واذا صرفت ابصارھم تلقاء اصحب النار" کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ جہنم والوں کے چہروں کو سیاہی اور ان کی آنکھوں کے نیلے رنگ کو دیکھیں گے تو کہیں گے لفظ آیت "قالوا ربنا لا تجعلنا مع القوم الظلمین"

(۳) امام عبد بن حمید نے ابو مجلز (رح) سے روایت کیا کہ انھوں نے لفظ آیت "واذا صرفت ابصارھم" کے بارے میں فرمایا کہ جب جنت والوں کی آنکھوں کو پھیرا جائے گا دوزخیوں کی طرف لفظ آیت "قالوا ربنا لا تجعلنا مع القوم الظلمین" (یعنی دوزخ والوں کی طرف تو کہیں گے اے ہمارے رب ہم کو اس ظالم قوم کے ساتھ نہ کرنا) (تفسیر در منثور)

آیت مبارکہ:

وَنَادٰۤى اَصۡحٰبُ الۡاَعۡرَافِ رِجَالًا یَّعۡرِفُوۡنَهُمۡ بِسِیۡمٰهُمۡ قَالُوۡا مَاۤ اَغۡنٰى عَنۡکُمۡ جَمۡعُکُمۡ وَمَا کُنۡتُمۡ تَسۡتَکۡبِرُوۡنَ ۝۴۸

لغۃ القرآن: وَنَادٰٓي : اور آواز دیں گے] [اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ : اعراف والے] [رِجَالًا : مرد] [يَّعْرِفُوْنَهُمْ : وہ سب پہچانتے ہوں گے انہیں] [بِسِيْمٰىهُمْ : ان کی نشانی سے] [قَالُوْا : ان سب نے کہا] [مَآ : نہیں] [اَغْنٰى : کام آئی] [عَنْكُمْ : تم سے] [جَمْعُكُمْ : تمہاری جماعت] [وَمَا : اور نہ] [كُنْتُمْ : ہو تم] [تَسْتَكْبِرُوْنَ : تم سب تکبر کرتے]

ترجمہ: اور اہل اعراف (ان دوزخی) مردوں کو پکاریں گے جنہیں وہ ان کی نشانیوں سے پہچان رہے ہوں گے (ان سے) کہیں گے: تمہاری جماعتیں تمہارے کام نہ آسکیں اور نہ (وہ) تکبر (تمہیں بچا سکا) جو تم کیا کرتے تھے

تشریح: گزشتہ آیات میں ہم نے یہ پڑھا ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک دیوار ہو گی جس کی چوٹیوں پر کچھ لوگ ہوں گے جنھیں اصحاب الاعراف کہا گیا ہے وہ وہاں سے جنت اور جہنم کو دیکھ سکیں گے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن چونکہ دنیا کے طبعی قوانین کو ختم کر دیں گے اور آخرت کے وہ حیرت انگیز قوانین نافذ ہوں گے جن کے نتیجے میں انسانی استعداد اور اس کے حواس میں بے پناہ وسعت پیدا ہو جائے گی آج جن چیزوں کو انسان نہیں دیکھ سکتا وہاں وہ بڑی آسانی سے بتمام و کمال ان چیزوں کو دیکھے گا اور جن آوازوں کو محدود حد تک سن سکتا ہے انھیں بے پایاں وسعتوں کے ساتھ سنے گا آج غفلت اور بے خبری کا جو پردہ ہماری صلاحیتوں پر تنا ہوا ہے اسے اتار دیا جائے گا اور ہر انسانی قوت کی طرح نگاہ بھی نہایت تیزی سے کام کرے گی ہر اوٹ کے پیچھے دیکھ سکے گی حتیٰ کہ عالم اسباب کے ماوراء جو کچھ ہے اسے بھی جھانک سکے گی۔ قرآن کریم میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

لَقَدۡ کُنۡتَ فِیۡ غَفۡلَۃٍ مِّنۡ ھٰذَا فَکَشَفۡنَا عَنۡکَ غِطَآءَکَ فَبَصَرُکَ الۡیَوۡمَ حَدِیۡدٌ

" تو اس سے غفلت میں تھا پس ہم نے تجھ سے ہر پردے کو ہٹا دیا ہے آج تیری نظر نہایت تیز ہے "۔

چنانچہ جنت اور جہنم اپنی تمام وسعتوں اور مسافتوں کے باوجود اہل جنت اور اہل جہنم کے لیے سامنے کی چیزوں میں تبدیل کر دی جائیں گی۔ اہل جنت اہل جہنم کو دیکھ سکیں گے اور اہل جہنم اہل جنت کو۔ دونوں ایک دوسرے سے باتیں کر سکیں گے اور ایک دوسرے کے احوال کو دیکھ سکیں گے۔ اسی طرح اصحاب اعراف بھی ان دونوں کو دیکھیں گے۔ سب سے پہلے ان کی نگاہ اہل جنت پر پڑے گی اور وہاں کے باسیوں کو وہ پہچانیں گے اور پھر ان کی نگاہ جہنم کی طرف پھیری جائے گی تو وہ جہنم کی ہولناکیوں کو دیکھ کر اللہ سے دعا کریں گے کہ یا اللہ ہمیں ان سے محفوظ رکھنا اور پھر وہ جہنم کے بڑے بڑے لوگوں کو پہچان کر ان سے سوالات کریں گے۔ چنانچہ پیش نظر آیات میں انہی سوالات کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

وَنَادٰٓی اَصۡحٰبُ الۡاَعۡرَافِ رِجَالًا یَّعۡرِفُوۡنَھُمۡ بِسِیۡمٰھُمۡ قَالُوۡا مَآ اَغۡنٰی عَنۡکُمۡ جَمۡعُکُمۡ وَمَا کُنۡتُمۡ تَسۡتَکۡبِرُوۡنَ ۔ اَھٰٓؤُلَآءِ الَّذِیۡنَ اَقۡسَمۡتُمۡ لَا یَنَالُھُمُ اللّٰہُ بِرَحۡمَۃٍ ط اُدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡکُمۡ وَلَآ اَنۡتُمۡ تَحۡزَنُوۡنَ ۔ (الاعراف : ۴۸، ۴۹)

" پھر یہ اعراف کے لوگ دوزخ کی چند بڑی بڑی شخصیتوں کو ان کی علامتوں سے پہچان کر پکاریں گے کہ دیکھ لیا تم نے آج نہ تمہارے جتھے تمہارے کسی کام آئے اور نہ وہ ساز وسامان جن کو تم بڑی چیز سمجھتے تھے اور کیا یہ اہل جنت وہی لوگ نہیں ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ان کو تو خدا اپنی رحمت میں سے کچھ بھی نہ دے گا ؟ داخل ہو جاؤ جنت میں ' تمہارے لیے نہ خوف ہے نہ رنج "۔

اہل جنت و جہنم کی علامات

پیش نظر آیت کریمہ اور گزشتہ سے پیوستہ آیت کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اصحاب اعراف اہل جنت کو ان کی علامتوں سے پہچانیں گے اور جہنم کے بڑے بڑے لوگوں کو ان کی علامتوں سے پہچانیں گے اور پھر ان سے کچھ سوال کریں گے۔ سوال یہ ہے کہ وہ ان کو کس طرح پہچانیں گے ؟ قرآن کریم سے بھی ہمیں اس کا جواب ملتا ہے اور احادیث پاک سے بھی۔ مسلم شریف کی ایک روایت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا گیا کہ حضور آپ ہمیں قیامت کے دن کس طرح پہچانیں گے فرمایا کسی کے گھوڑے اگر پنج کلیان ہوں (یعنی گھوڑے کی پیشانی اور اس کے چاروں پاؤں اگر سفید ہوں تو انھیں پنج کلیان کہا جاتا ہے) تو کیا باقی گھوڑوں میں سے انھیں پہچاننا مشکل ہے ظاہر ہے کہ ان کا پہچاننا مشکل نہیں بلکہ ان کی ان علامتوں سے باقی گھوڑوں میں سے ان کو آسانی سے پہچان لیا جائے گا اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس امت کے نیک لوگوں اور نمازیوں کو پنج کلیان بنایا ہے یعنی ہم جو اپنے اعضا وضو میں دھوتے ہیں یعنی چہرہ ' دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں یہ پانچوں اعضا قیامت کے دن نہایت روشن ہوں گے۔ ان اعضا کی روشنی سے رسول پاک (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی امت کے نیک لوگوں کو پہچانیں گے اور اہل جنت بھی انہی علامتوں کے ساتھ جنت میں داخل کیے جائیں گے اور ہر دیکھنے والا انھیں انہی علامتوں سے پہچانے گا اسی طرح اہل جہنم کی بھی معلوم ہوتا ہے کچھ علامتیں ہیں مثلاً سورۃ لہب میں یہ بتایا گیا ہے کہ ابولہب کی بیوی قیامت کے دن اس حال میں اٹھائی جائے گی کہ اس کی گردن میں لکڑیوں کا گٹھا باندھنے والی رسی ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں جن لوگوں نے بھی اللہ کے رسول اور ان کے پیروکاروں کو جن اسباب کے تحت اذیتیں پہنچائی ہوں گی وہی ان کے ستم رانی کے طریقے ان کی علامت بنا دیئے جائیں گے۔ اس طرح قرآن کریم سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن صاحب ایمان لوگوں کے چہرے نہایت روشن اور تروتازہ ہوں گے۔ لیکن اس کے برعکس کافروں کے چہرے نہایت سیاہ اور مکروہ ہوں گے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جو بڑے بڑے کفار ہوں گے جنھوں نے ائمہ کفر کی طرح اپنا رول ادا کیا ہوگا وہ اپنے چہروں کی بڑھی ہوئی سیاہی اور چہروں پر پڑی ہوئی لعنت سے پہچانے جائیں گے۔ جتنا کوئی بڑا کافر ہوگا اس کا چہرہ اتنا ہی زیادہ سیاہ اور مکروہ ہوگا اور کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان کے چہروں پر اور بھی کوئی ایسی علامتیں ہوں جن کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنے میں کوئی دشواری نہ پیش آئے کہ یہ ابوجہل ہے اور یہ ابولہب۔ ایسی ہی علامتوں سے اصحاب اعراف ان اہل جہنم کے بڑے بڑے کافروں کو پہچانیں گے اور پھر ان سے مختلف سوالات کریں گے۔ پہلا سوال ان کے رویے اور ان کے بعض مزعومات کے حوالے سے ہوگا ان کا رویہ یہ تھا کہ اسلام اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مقابلے میں انھیں اپنی افرادی قوت ' اپنی کثرت تعداد اور اپنے مال و دولت پر بڑا فخر اور ناز تھا اور وہ بات بات پر مسلمانوں کو یہ طعنہ دیتے تھے کہ تمہارا دین اگر سچا

ہوتا تو کیا اس کے قبول کرنے والے تم جیسے بے بس اور بے کس لوگ ہوتے۔ اللہ تعالیٰ اپنی سچائی کے لیے یقیناً ان لوگوں کو کھڑا کرتا جن کی بات میں وزن ہوتا' لوگ جنھیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہوتے۔ تم غریب لوگ جنھیں کسی مجلس میں بار نہیں ملتا' تمہاری بات سننے کا کوئی روادار نہیں' تمہیں معاشرے میں کوئی عزت کا مقام حاصل نہیں' عزت اور اہمیت کی بات بھی تمہاری زبانوں پر آجانے کے بعد اہمیت کھو دیتی ہے' لوگ اسے سننے کے روادار نہیں ہوتے تو جس دین کو تم جیسے لوگ پسند کرتے ہیں یہ بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس دین میں کوئی قابل قبول بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زاویہ نگاہ بدل جانے سے الفاظ کا مفہوم اور حقیقتوں کے مصداق بدل جاتے ہیں غریب لوگوں نے آگے بڑھ کر اسلام کو سینے سے لگایا تو اشراف مکہ کی نگاہ میں یہ بات اسلام کی سبکی کا باعث بن گئی اور اسی کو دلیل بنا کر انھوں نے اسلام کو سچا مذہب اور سچا دین سمجھنے سے انکار کر دیا لیکن یہی بات قیصر روم کی نگاہ میں بالکل ایک دوسرا مفہوم رکھتی ہے۔ آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب خطوط کے ذریعے سلاطین عالم کو اسلام کی دعوت دی تو قیصر روم کو بھی اسی سلسلے میں آپ نے ایک مکتوب گرامی لکھا۔ چنانچہ جب اس کو یہ مکتوب ملا تو بجائے اس کے کہ وہ کسریٰ ایران کی طرح توہین آمیز رویہ اختیار کرتا اور اس مکتوب کو پھاڑ کر پھینک دیتا اس نے نہایت احترام سے اس کو وصول کیا اور کہا کہ یہاں کچھ عرب اگر تجارت کے سلسلے میں آئے ہوئے ہوں تو انھیں میرے پاس لاؤ تاکہ اس نبوت کے دعوے دار کے بارے میں میں ان سے تحقیق کر سکوں اتفاق سے ابوسفیان جو ان دنوں اسلام کے بدترین دشمن تھے وہ وہاں موجود تھے۔ انھیں ان کے ساتھیوں سمیت قیصر روم کے سامنے پیش کیا گیا۔ قیصر نے جہاں اور کئی سارے سوالات کیے وہیں ان سے یہ بھی ایک سوال کیا کہ اس نبی پر ایمان لانے والے کون لوگ ہیں امیر یا غریب؟ ابوسفیان نے جواب دیا کہ غریب لوگ ہیں۔

قیصر بجائے اس کے کہ اشراف مکہ کی طرح اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کرتا کہ جس نبی کی دعوت کو غریب لوگ قبول کریں وہ اس قابل نہیں کہ اس پر غور بھی کیا جاسکے اس نے اس کے بالکل برعکس یہ کہا کہ اگر واقعی اس پر ایمان لانے والے غریب لوگ ہیں تو وہ اللہ کا سچا نبی ہے کیونکہ نبیوں پر سب سے پہلے ایمان لانے والے ہمیشہ غریب لوگ ہی ہوتے ہیں۔ امراء تو اس وقت شریک ہوتے ہیں جب قافلہ بن جاتا ہے۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ امراء کا طبقہ چونکہ اپنے ساتھ بیشمار مالی مفادات رکھتا ہے معاشرے میں حاصل کردہ مقام و مرتبہ کے تحفظ کی اسے فکر رہتی ہے وہ جب دیکھتا ہے کہ نئے دین کی دعوت کو قبول کرنے کے نتیجے میں بہت سارے مالی مفادات کو چھوڑنا پڑے گا ہو سکتا ہے بہت کچھ ایثار کرنا پڑے تو مال و دولت کی محبت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی شخصی بزدلی کے باعث وہ اسلام کی طرف آنے سے انکار کر دیتا ہے اور مال و دولت کے وہ پتھر جو اس کی ذات کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں وہ اسے ایثار و قربانی کے اس دریا میں اترنے سے روکتے ہیں وہ جانتا ہے کہ اگر میں ان پتھروں سمیت دریا میں اترا تو ڈوب جاؤں گا اس لیے کسی بھی انقلاب کے پس پردہ اگر آپ جھانک کے دیکھیں تو انقلاب کی جان اور انقلاب کی قوت ہمیشہ غربا کا طبقہ رہا۔ امراء میں ایسے خوش قسمت لوگ بھی ہوتے ہیں جو شروع ہی میں پیغمبر کی دعوت کو قبول کرکے اپنے مال و دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور اللہ کے یہاں بڑے مقام کے مالک بن جاتے ہیں لیکن طبقہ امراء کے بیشتر لوگ ہمیشہ انقلاب کی آگ سے دور رہتے ہیں بلکہ عموماً ان کا مقام اور ان کا اثر ورسوخ اور ان کا مال و دولت انقلاب کے رستے کی رکاوٹ بنتا ہے اور وہ اگر شریک ہوتے بھی ہیں تو اس وقت جب وہ دیکھتے ہیں کہ اب یہ انقلاب اپنی کامیابیوں کی طرف بڑھ رہا ہے یہی حال اشراف مکہ کا بھی تھا وہ اپنے موجودہ مقام و مرتبہ' اپنی خوشحالی اور خوش عیشی کو کسی طرح چھوڑنے کو تیار نہیں تھے بلکہ اسے اپنی صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے۔ اس لیے سب سے پہلا سوال جو اصحاب اعراف ان اہل جہنم کے بڑے بڑے سرداروں سے کریں گے وہ یہی ہوگا کہ بتاؤ تمہاری یہ جمعیت اور تمہارا مال و دولت تمہارے کس کام آیا جسے تم اپنے سچا ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے اس دلیل نے تمہیں کیا فائدہ دیا اور دوسرا سوال ان کے استکبار کے حوالے سے ہوگا۔ ان سے پوچھا جائے گا کہ دیکھو تم دنیا میں ہمیشہ مسلمانوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور تم پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی غریب آدمی تمہیں مخاطب کرنے کی جرأت بھی کرسکے اور اسی تکبر کے نتیجے میں تم ان کی کسی بات کو وزن دینے کو تیار نہیں تھے بلکہ تم قسمیں کھا کھا کر یہ کہتے تھے کہ یہ غریب لوگ جن کو جنت کی طلب نے اندھا کر دیا ہے نجانے یہ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے یہ کبھی اللہ کی رحمت کے سزاوار نہیں ہو سکتے اگر یہ اس کی رحمت کے مستحق ہوتے تو دنیا میں اس بے سروسامانی کے ساتھ زندگی نہ گزارتے یہ نان شبینہ کے محتاج لوگ کیا اس قابل ہیں کہ انھیں جنت کا وارث بنا دیا جائے۔ اصحاب اعراف ان سے کہیں گے کہ دیکھو جن لوگوں کے بارے میں تم قسمیں کھا کر یہ کہتے تھے کہ یہ کبھی اللہ کی رحمت کے مستحق نہیں ہوں گے وہی آج جنت میں ہیں اور تم جہنم میں پڑے جل رہے ہو۔ بتاؤ تمہارے اس تکبر نے تمہیں آخر کیا فائدہ پہنچایا۔ اہل جہنم سے یہ سوال اصلاً مشرکین مکہ' مشرکین عرب اور دنیا بھر کی

لادینی قوتوں سے کیا جارہا ہے۔ اس لیے کہ ہر جگہ کا کفرانہی دو امراض کا شکار ہے کہ یا ان کو اپنی جمعیت اور اپنے مال و دولت کی کثرت پر ناز ہے اور اسی کو وہ اپنے برسر حق ہونے کی دلیل بھی سمجھتے ہیں اور یا انھیں اپنی قوت کے باعث تکبر کا مرض لاحق ہوگیا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو جنت کا مستحق بھی سمجھتے ہیں اور غریب مسلمانوں کو نہ وہ دنیا میں کسی قابل سمجھتے ہیں اور نہ آخرت کا سزاوار جانتے ہیں اور یہاں واقعاتی دنیا کو سامنے رکھ کر اور انجام سے پردہ اٹھا کر یہ بتایا جارہا ہے کہ اللہ کے یہاں نجات پانے اور کسی مقام کو حاصل کرنے کے لیے لاؤلشکر کی کثرت اور دولت اور قوت کی فراوانی کوئی معنی نہیں رکھتی بلکہ وہاں جو چیز عزت حاصل کرسکے گی وہ ہر آدمی اور ہر قوم کا کا ایمان و عمل اور اس کا ذاتی کردار ہوگا۔

جنت میں داخل ہونے کا مفہوم کیا ہے ؟ اور اس کے مخاطب کون ہیں ؟

اس کے بعد فرمایا جنت میں داخل ہو جاؤ جنت میں جانے کے بعد نہ تمہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ حزن ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ یہ جنت میں داخلے کا حکم کسے دیا جارہا ہے ؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے جس کی طرف ہمارے بیشتر مفسرین گئے ہیں کہ یہ حکم اصحاب اعراف کو ہے کیونکہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو جہنم سے بچا لیے جائیں گے لیکن ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے دونوں کے درمیان اپنے بہتر انجام کی آرزو لیے منتظر ہوں گے انہی سے فرمایا جارہا ہے کہ اب تم جنت میں داخل ہو جاؤ تم اب تک جس خوف اور جن اندیشوں کا شکار رہے ہو آئندہ اس کا کوئی امکان نہیں ہوگا اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس سے مراد اہل جنت ہوں' ان کو جنت میں داخلے کا حکم دیا جارہا ہے اگر یہ مراد لیا جائے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہل جنت تو جنت میں پہنچ چکے ان کو داخلے کا حکم دینے کا کیا مطلب ؟ بات اصل میں یہ ہے کہ عربی زبان میں فعل ہر جگہ اپنے ابتدائی معنی ہی پر دلیل نہیں ہوا کرتا بلکہ بعض مواقع میں وہ تمکن و استمرار پر دلیل ہوتا ہے یعنی مقصود اس سے یہ نہیں ہوتا کہ یہ کام کرو بلکہ مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کام کے جو حقیقی فوائد اور حقیقی مقاصد ہیں انھیں حاصل کرو اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اپنے خاندان کو جب ان کے وطن سے مصر میں بلایا تو آپ کے بھائی اپنے والدین سمیت جب مصر میں داخل ہوئے تو حضرت یوسف (علیہ السلام) نے باقاعدہ دربار میں ان کا استقبال کیا۔ والدین کو اپنے پہلو میں بٹھایا اور اس کے بعد فرمایا، جس کو قرآن کریم بیان کرتا ہوا کہتا ہے :

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰی یُوْسُفَ اٰوٰٓی اِلَیْہِ اَبَوَیْہِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ اٰمِنِیْنَ

" پس جب وہ یوسف کی خدمت میں حاضر ہوئے اس نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا مصر میں داخل ہو انشاء اللہ امن کے ساتھ " (یوسف : ۹۹)

غور فرمایئے ! انھیں مصر میں داخل ہونے کے لیے کہا جارہا ہے حالانکہ وہ مصر میں داخل ہو چکے ہیں اس لیے اس کا مفہوم داخل ہونا تو مراد نہیں لیا جاسکتا یقینا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) انھیں اس داخلے پر مبارکباد دے رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ یہ نہ سمجھئے کہ آپ مصر میں ایک مہمان کے طور پر تشریف لائے ہیں بلکہ یہ آپ کا وطن ہے اب آپ کو یہیں زندگی گزارنی ہے اس لیے یہاں ایک معزز شہری کے طور پر جو رول آپ کو ادا کرنا چاہیے اسے ادا کیجیے اور وطن کی جو نعمتیں آپ کی ضرورت ہوں اور آپ کو مطلوب ہوں انھیں آگے بڑھ کر حاصل کیجیے اور ان کا حق ادا کیجیے۔ اس آیت کریمہ میں بھی معلوم ہوتا ہے اہل جنت سے یہی کہا جارہا ہے کہ اب آپ جنت میں اللہ کے فضل سے آچکے ہیں اس کی ایک ایک نعمت پر آپ کا حق ہے اب یہاں کبھی آپ کو اندیشے پریشان نہیں کریں گے یہاں سے کبھی آپ کو نکالا نھیں جائے گا بس یوں سمجھئے کہ یہ جنت آپ کے لیے ہے اور آپ اس کے لیے ہیں اب آپ کو یہاں خوش عیشی کی زندگی گزارنی ہے۔ بقول شاعر

مزے لوٹو کلیم اب بن پڑی ہے

بڑی اونچی جگہ قسمت لڑی ہے

اہل جہنم اصحاب اعراف کے سوالوں کا سوائے خاموشی کے اور کوئی جواب نہیں دے سکیں گے لیکن اسی اثناء میں جب اللہ تعالیٰ اصحاب اعراف کو جنت میں داخلے کا حکم دیں گے تو ان کی محرومیاں اور بھڑک اٹھیں گی اور یہ بے ساختہ اہل جنت کو پکارنا شروع کردیں گے۔ چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں اسی کا ذکر فرمایا جارہا ہے اور ساتھ ہی جہنم میں پہنچانے والے ان اعمال کا بھی ذکر کیا جارہا ہے جن کی وجہ سے یہ لوگ جہنم میں پہنچے ہیں اور ہر زمانے کے لوگ ایسے ہی اعمال کے نتیجے میں جہنم میں

پہنچیں گے اس لیے اس میں جہاں اہل جہنم کے انجام کو دیکھتے ہوئے عبرت حاصل ہوتی ہے وہیں ان کی فرد جرم کو دیکھتے ہوئے ہر دور کا انسان اس سے بچنے کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

خلاصہ تفسیر آیات یہ ہے کہ

اعراف والے جہنم کے کفار میں سے بہت سوں کو ان کے چہروں سے پہچان کر ملامت کریں گے اور کہیں گے تمہارا تکبر اور غرور اور تمہاری جتھہ بندی تمہارے کام نہ آئی تم صہیب و بلال وغیرہ دیکھ کر دنیا میں تحقیر کرتے اور قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ ان پر قسم بخدا اللہ کی رحمت نہ ہو گی دیکھو آج انھیں تو مژدہ ہے ان کو بے غمی اور بے خوفی کا اور ان کو بشارتیں مل گئیں اور جنت میں داخل کر دیئے گئے۔ جہنمی اس کا جواب نہ دے سکیں۔

سید المفسرین ابن عباس (رض) سے مروی ہے کہ جب اعراف والے بھی جنت میں داخل ہو جائیں تو جہنمیوں کو بھی طمع ہو۔ تو وہ جنت میں گئے ہوئے اعرافیوں کے لیے بارگاہ رحمت میں عرض کریں الٰہی جنت میں ہمارے رشتہ دار ہیں ہمیں اتنی اجازت دے کہ ہم انھیں دیکھیں ان سے بات کریں۔

چنانچہ اتنی اجازت انھیں مل جائے گی۔ جب وہ جنتیوں کو جو ان کے رشتہ دار تھے ایمان کے بدلے نعمتوں میں دیکھیں اور پہچانیں کہ فلاں فلاں ہمارا رشتہ دار ہے تو پکاریں اور کہیں یہ سرد پانی یہ انعمہ واطعمہ لذیذہ سے کچھ ہمیں بھی دو تو جنت والے ان کی سیہ روئی اور پریشان حالی کی وجہ سے انھیں نہ پہچانیں۔ صورتیں بگڑی ہوں گی اور وہ جنتیوں کا نام لے کر پکاریں کوئی اپنے باپ کا نام لے کر پکارے کوئی بھائی کو پکارے کہ میں جل گیا مجھ پر پانی ڈالو۔ میں بھوک میں مر رہا ہوں مجھے کچھ کھانے کو دو۔

اہل جنت جواب دیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر جنت کی ہر نعمت حرام کر دی ہے۔ تم نے حرام وحلال میں اپنی خواہشوں کی پیروی کی اور دعوت پر تمسخر کرتے تھے اور آخرت کو بھول گئے اور اسلام کا تمسخر کرنے لگے۔ اب آج ہم تمہیں بھلا چکے دنیا میں تم نے اس دن کو بھلایا اور آیات قرآن کا انکار کرتے رہے۔

اب تفسیر نسفی سے پڑھئے (ترجمہ)

اور پکاریں اعراف والے بہت سے لوگوں کو جو کافروں کے سردار ہوں گے پہچانیں گے۔ انھیں ان کے چہروں سے کہیں گے نہیں مستغنی کیا تمہاری جمعیت نے اور مال کثیر اور تمہاری جماعتوں نے یہ ما نافیہ ہے اور وہ جو تم تکبر کرتے تھے یعنی تمہارے استکبار نے جو حق کے ساتھ اور لوگوں کے مقابلہ میں کرتے تھے اور کہتے تھے کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر تم قسمیں کھاتے تھے اور حلف اٹھایا کرتے تھے دنیا میں اس کے مشار الیہ فقراء مومنین تھے۔ مثل صہیب رومی اور سلمان پارسی کے اور مثل ان کی بلال وغیرہ کے کہ ان پر اللہ اپنی رحمت نہ کرے گا یعنی تمہاری قسمیں ہوئی تھیں کہ انھیں اللہ رحمت فرما کر جنت میں داخل نہ کرے گا یہ ان کا کہنا بہ نت تحقیر تھا اس لیے کہ وہ فقراء مومنین سے تھے تو کہا جائے اصحاب اعراف کو داخل ہو جاؤ تم سب جنت میں یہ فرمایا جائے گا اس وقت جبکہ جنتی جہنمی دونوں فریق ان کے چہروں سے پہچان لیے جائیں گے تو ارشاد ہو تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تمہیں کوئی غم تو اس کے بعد مایوس ہو کر

ونادی اصحب النار اصحب الجنتہ ان افیضوا علینا من الماء او ممارزقکم اللہ

جہنمی لوگ پکاریں اہالیان جنت کو کہ ہم پر بھی کچھ فیض کرو پانی اور اس نعمت سے جو اللہ نے تمہیں رزق سے دیں۔

اس میں اس امر کی دلیل ہے کہ جنت جہنمیوں سے بلند ہو گی اور وہ نیچے سے پکاریں گے اور مانگیں گے پھلوں اور فواکہات سے مایوسی کے عالم میں۔ اس لیے کہ متحیر جو کچھ مانگتا ہے اس میں ضروری نہیں ہوتا کہ اس کا مانگنا اسے مفید ہی ہو تو جنتی جواب دیں گے۔

قالو ان اللہ حرمھما علی الکفرین۔ بیشک اللہ نے کھانا پانی حرام فرمایا ہے۔ کافروں پر۔

یہ جواب ان کی ذلت کی وجہ میں فرمایا جائے ورنہ حرام حلال مشیت الٰہی عزوجل پر ہے جسے چاہے بخشے جسے چاہے نہ اے یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے آگے صفت کفار بیان کی۔ (تفسیر الحسنات)

آیت مبارکہ:

اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ○۴۹

لغت القرآن: اَهٰۤؤُلَآءِ : کیا یہ ہیں] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [اَقْسَمْتُمْ : تم نے قسمیں کھائیں] [لَا : نہیں] [يَنَالُهُمُ : پہنچائے گا انہیں] [اللّٰهُ : اللہ] [بِرَحْمَةٍ : کوئی رحمت] [ادْخُلُوا : تم سب داخل ہوجاؤ] [الْجَنَّةَ : جنت کو] [لَا : نہیں] [خَوْفٌ : کوئی خوف] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [وَلَآ : اور نہ " ان لوگوں کی جو "] [اَنْتُمْ : تم] [تَحْزَنُوْنَ : سب غم گین ہوگے]

ترجمہ: کیایہی وہ لوگ ہیں (جن کی خستہ حالت دیکھ کر) تم قسمیں کھایا کرتے تھے کہ اللہ انھیں اپنی رحمت سے (کبھی) نہیں نوازے گا؟ (سن لو! اب انہی کو کہا جارہا ہے:) تم جنت میں داخل ہوجاؤنہ تم پر کوئی خوف ہوگا اور نہ تم غم گین ہوگے

تشریح: دنیادار اور متکبر لوگ جب حضرت بلال حبشی (رض) اور حضرت سلمان فارسی (رض) جیسے مسکین اور نادار مسلمانوں کو دیکھتے تو ان سے نفرت کرتے اور قسمیں کھا کر کہتے: اگر اللہ تعالیٰ ان فقیروں پر راضی ہوتا تو آج یہ غربت کا شکار نہ ہوتے۔ دراصل اللہ تعالیٰ ہم پر راضی ہے اس لیے آج بھی ہم عیش و عشرت کر رہے ہیں اور کل جنت بھی ہمیں ملے گی، چنانچہ اعراف والے جہنم کے متکبرین کو دنیا کی ڈینگیں اور شیخیاں یاد کرائیں گے کہ تمہارے تو سارے دعوے الٹ ثابت ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہی ناداروں کو جنت میں داخل کردیا ہے اور تم جہنم میں جل رہے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر دنیا میں اہل ایمان تنگدست ہوں اور کافر دولت مند ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کافروں سے راضی ہے۔ دراصل اللہ تعالیٰ تو صرف ان لوگوں سے راضی ہوتا ہے جو اس کی اطاعت کرتے ہیں چاہے وہ امیر ہوں یا غریب۔ (تفسیر امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

اہل اعراف دوزخ میں جلنے والے دشمنان اسلام سے کہیں گے کہ دیکھو جنت میں جو لوگ مزے لوٹ رہے ہیں کیا انہی کے بارہ میں تم دنیا میں کہتے تھے کہ انھیں اللہ کی رحمت نہیں مل سکتی دیکھ لو آج وہ جنت کی بہاریں لوٹ رہے ہیں اور تم آگ میں جل رہے ہو۔ پھر اہل اعراف جنتی لوگوں کی طرف رخ کرکے کہیں گے اب تم جنت کے مزے اڑاؤ کوئی خوف و غم تمہارے قریب نہ آئے گا۔

صاف معلوم ہورہا ہے کہ اعراف میں بعض لوگوں کا کسی وقت تک رکھا جانا اس لیے ہوگا تاکہ وہ اہل جنت کو بشارت دے کر ان کی خوشی میں اضافہ کریں اور کفار کو جہنم میں جانے پہ سرزنش کرکے ان کے دکھ میں اضافہ کا سبب بنیں۔ جب یہ مقصد پورا ہوجائے گا تو اہل اعراف بھی رحمت الٰہی کے صدقے جنت میں بھیج دیے جائیں گے۔ (تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

غریبوں کی غربت کا مذاق اڑانے سے بچا جائے:

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں مومن کی فقیری یا کافر کی امیری سے دھوکا نہ کھانا چاہیے نیز کسی غریب کی غربت کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔ غریبوں کی بے کسی کا مذاق اڑانا کافروں کا طریقہ ہے۔ قرآن پاک میں کئی جگہ موجود ہے کہ کفار مسلمانوں کو غریب ہونے کی وجہ سے طعنے دیتے تھے۔ مسلمان کو غربت کے طعنے دینا ایذاء مسلم اور حرام فعل ہے۔ ایذاءِ مسلم کے مرتکب لوگوں کو اس حدیث مبارک سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ صحابہ کرام (رض) نے عرض کی: ہم میں مفلس وہ ہے کہ جس کے پاس درہم اور ساز وسامان نہ ہو۔ ارشاد فرمایا: " میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوۃ (وغیرہ اعمال) لے کر آئے اور اس کا حال یہ ہو

کہ اس نے (دنیا میں) اسے گالی دی، اسے تہمت لگائی، اس کا مال کھایا، اس کا خون بہایا، اسے مارا۔ اس کی نیکیوں میں سے کچھ اس مظلوم کو دے دی جائیں گی اور کچھ اس مظلوم کو، پھر اگر اس کے ذمہ حقوق کی ادائیگی سے پہلے اس کی نیکیاں (اس کے پاس سے) ختم ہو جائیں تو ان مظلوموں کی خطائیں لے کر اس ظالم پر ڈال دی جائیں گی، پھر اسے آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم قادری)

بغوی نے لکھا ہے کہ بعض علماء تفسیر نے ایک اور مطلب بیان کیا ہے وہ یہ کہ اصحاب اعراف جب اہل جہنم سے مذکورہ بالا بات کہیں گے تو وہ جواب دیں گے اگر وہ (ضعفاء) جنت میں چلے گئے تو تم کو کیا' تم تو نہیں جاسکے! اور نہ جاسکتے ہو وہ قسم کھائیں گے کہ تم دوزخ میں ضرور آؤ گے یہ سن کر وہ ملائکہ جو اصحاب اعراف کو پل صراط پر روکے ہوئے ہوں گے اہل نار سے کہیں گے کیا یہ اصحاب اعراف وہی لوگ ہیں جن کے متعلق تم نے کہا تھا کہ ان کو اللہ کی رحمت نہیں ملے گی پھر اصحاب اعراف کی طرف رخ کرکے کہیں گے جاؤ تم جنت میں بے خوف و رنج چلے جاؤ۔

بغوی نے عطاء کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا اصحاب اعراف جب جنت میں چلے جائیں گے تو دوزخیوں کو بھی کچھ کشور کار کی طمع پیدا ہو جائے گی اور عرض کریں گے پروردگار ہمارے کچھ رشتہ دار جنت میں ہیں ہمیں اجازت مل جائے کہ ہم ان کو دیکھ لیں اور کچھ بات چیت کرلیں۔ چنانچہ (اجازت کے بعد) وہ اپنے جنتی قرابت داروں اور ان کی راحت و عیش کی حالت دیکھ لیں گے اور ان کو پہچان لیں گے مگر وہ ان دوزخیوں کے چہروں کی سیاہی کی وجہ سے ان کو نہیں پہچانیں گے۔ (تفسیر مظہری۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی)

آیت مبارکہ:

وَنَادٰٓى اَصۡحٰبُ النَّارِ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّةِ اَنۡ اَفِيۡضُوۡا عَلَيۡنَا مِنَ الۡمَآءِ اَوۡ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ‌ؕ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَۙ ۝۵۰

لغۃ القرآن: وَنَادٰي : اور آواز دیں گے] [اَصْحٰبُ النَّارِ : دوزخ والے ہیں] [اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ : جنت والوں کو] [اَنْ : کہ] [اَفِيْضُوْا : تم سب " وہاں سے " لوٹو] [عَلَيْنَا : ہم پر] [مِنَ : سے] [الْمَآءِ : پانی] [اَوْ : یا] [مِمَّا :" اس " سے جو] [رَزَقَكُمُ : رزق دیا تم کو] [اللّٰهُ : اللہ] [قَالُوْٓا : سب نے کہا] [نَّ اللّٰهَ : بیشک اللہ تعالیٰ] [حَرَّمَهُمَا : حرام کردیا ہے ان دونوں کو] [عَلَي الْكٰفِرِيْنَ : سب کافروں پر]

ترجمہ: اور دوزخ والے اہل جنت کو پکار کر کہیں گے کہ ہمیں (جنّتی) پانی سے کچھ فیض یاب کردو یا اس (رزق) میں سے جو اللہ نے تمہیں بخشا ہے۔ وہ کہیں گے: بیشک اللہ نے یہ دونوں (نعمتیں) کافروں پر حرام کردی ہیں

تشریح:

اہل اعراف سے مکالمے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان ہونے والی بات چیت کا تذکرہ فرمایا ہے " ونادی اصحب النار اصحب الجنتہ ان افیضوا علینا " دوزخ والے جنت والوں سے پکار کر کہیں گے کہ خدا کے لئے ہمارے اوپر تھوڑا سا جنت کا پانی بہا دو تمہارے پاس باغات ہی نہریں ہیں ہر قسم کی آسائش اور راحت کی نعمتیں ہیں دیکھو ہم شدت پیاس کے عالم میں یہاں تڑپ رہے ہیں لہٰذا مہربانی کرو ہمیں تھوڑا سا پانی دے دو یا اس روزی میں سے کچھ دے دو جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا کی ہے ہم یہاں بھوک اور پیاس میں نہایت بے تاب ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں میں سے ہمیں بھی کچھ دے دو۔

ایسے جہنمیوں کی حالت تو اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ عذاب میں جل رہے ہوں گے جب وہ پیاس سے بے تاب ہو جائیں گے تو وہ پانی کی طرف اس طرح دوڑتے ہوئے جائیں گے جس طرح پیاسا اونٹ پانی پر جاتے ہیں، مگر وہ جہنم کا پانی "لھم شراب من حمیم" ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا۔ اگر صرف ایک گھونٹ حلق سے نیچے اتار دیں گے تو وہ آنتوں کو کاٹ کر ٹکڑہ ٹکڑہ کرکے نیچے اتار دے گا۔

اس کے ساتھ کھانے کے لیے تو "ان شجرۃ الزقوم طعام الاثیم" (دخان) سورۃ واقعہ میں ارشاد ہے: "ثم انکم ایھا الضالون المکذبون لاکلون من شجر من زقوم فمالئون منھا البطون فشاربون علیہ من الحمیم فشاربون شرب الھیم" جہنم کا تھوہڑ نہایت بے پناہ کڑوا ہوگا، اور بہت ہی بدبودار اور مہلک ہوگا۔ اعاذنا اللہ منہً بکرمہ۔ آمین۔

دوزخیوں کی فرمائش کے جواب میں اہل جنت کا جواب یوں ہوگا۔

" قالوا ان اللہ حرمھما علی الکفرین "جنت والے کہیں گے: بلاشبہ یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ نے دوزخیوں پر، یعنی کافروں پر حرام کر دیا ہے۔ جب کافروں پر جنت کی خوشبو تک حرام ہو تو کھانے پینے کی چیزوں کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ (تفسیر منازل العرفان۔ عبدالستار شاہ)

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں ایک جہنمی اپنے جنتی باپ یا بھائی کو پکار کر کہے گا اور میرے سگے بھائی او میرے باپ میں جہنم میں جل رہا ہوں خدارا مجھ پر کچھ پانی برسا دو۔ تو اسے کہا جائے گا اسے جواب دو۔ ان اللہ حرمھما علی الکفرین۔ کہ اللہ نے جنت کا کھانا پینا کافروں پر حرام کیا ہے۔ (تفسیر ابن جریر جلد 5 صفحہ 508) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہنم میں ہمیشہ رہنے والے کفار ہی ہیں، کوئی مومن ہمیشہ جہنم میں نہ رہے گا۔

پانی جیسی عظیم نعمت کی قدر و قیمت:

اس جگہ پانی کی اہمیت اور اس کا عظیم نعمت ہونا معلوم ہو رہا ہے۔ اہل جہنم جنتیوں سے پہلا سوال یہی کریں گے کہ ان پہ پانی کے چند قطرے گرا دو۔ گویا پانی کی قدر و قیمت پیاسے سے پوچھنی چاہیے کفار نے دنیا میں اللہ کے دیے ہوئے کھانے اور پانی کی قدر نہ کی اور اس کا شکر نہ بجالائے تو انھیں دوزخ کی بھوک پیاس سے دوچار کیا گیا۔ ہمیں چاہیے کہ پانی کی قدر و قیمت کا احساس کریں، پانی پی کر اللہ کی حمد بجالائیں، اس نعمت کا شکر ادا کریں، پانی کو ضائع ہونے سے بچائیں۔ تاکہ یہ پانی کسی اور کے کام آجائے۔ کئی لوگ بلا مقصد پانی کو ضائع کرتے ہیں۔ وضوء کرنے بیٹھ جائیں تو پانی کی ٹوٹی پوری کھول دیتے اور مسلسل کھلی رکھتے ہیں اور اس قدر پانی بہہ جاتا ہے کہ اس سے نہایا جاسکتا ہے، ایسا کرنا حرام ہے۔ ٹوٹی سی تھوڑی سی کھولو اور سر کا مسح کرتے ہوئے اسے بند کر دو۔

اور پانی کا اللہ کی راہ میں خرچ کرنا یعنی پیاسوں کو پلانا عظیم ثواب ہے۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے مروی ہے کہ "ایک فاحشہ عورت نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلایا تو اللہ نے اسے بخش دیا، یعنی اس کے تمام فواحش معاف فرما دیے۔" (بخاری کتاب احادیث الانبیاء حدیث 3467) اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے: فی کل کبد رطبۃ اجر، "ہر پیاسے جگر کے سیراب کرنے میں بڑا اجر ہے۔" (بخاری کتاب المساقاۃ حدیث 6323) (تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

کافروں کو دوزخ میں کھانے پینے سے محروم رکھنے کی سزا دینا: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اہل دوزخ چونکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان پر جو غریبوں اور مسکینوں کے حقوق فرض کیے تھے ان کو ادا نہیں کرتے تھے، وہ بھوکوں کو کھانا کھلاتے تھے نہ پیاسوں کو پانی پلاتے تھے، سو اللہ تعالیٰ دوزخ میں آگ کے عذاب کے علاوہ ان پر بھوک اور پیاس کا عذاب بھی نازل کرے گا پھر وہ بھوک اور پیاس کی شدت سے بلبلا کر اہل جنت سے فریاد کریں گے کہ تم ہم پر کچھ پانی ڈال دو یا تم کو جو طام دیا ہے، اس طعام سے کچھ دے تو اہل جنت ان کو جواب دیں گے کہ اللہ نے پانی اور طعام کو ان لوگوں پر حرام کر دیا ہے جنہوں نے دنیا میں اس کی توحید کو ماننے سے انکار کیا تھا، اور اس کے رسولوں کی تکذیب کی تھی۔

پھر فرمایا: ان لوگوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنالیا تھا۔ حضرت ابن عباس نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ جب بھی ان کو اللہ کے دین کو دعوت دی جاتی تو یہ دعوت دینے والوں کا مذاق اڑاتے تھے۔

پھر فرمایا: تو آج کے دن ہم انھیں بھلا دیں گے جس طرح انھوں نے اس دن کی ملاقات سے بے پرواہ ہو کر ایمان لوانے کو اور نیک اعمال کو چھوڑ رکھا تھا۔

حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک بندے سے فرمائے گا: کیا میں نے تیرا انکاح نہیں کیا تھا؟ میں تجھے عزت نہیں دی تھی؟ اور کیا میں نے تیرے لیے گھوڑے اور اونٹ مسخر نہیں کیے تھے؟ اور کیا تو سرداری اور افسری نہیں کرتا تھا؟ وہ کہے گا کیوں نہیں؟ پھر فرمائے گا: تو مجھ سے ملاقات کا یقین رکھتا تھا؟ وہ کہے گا نہیں! پھر اللہ فرمائے گا ہم آج تجھے بھلا دیتے ہیں جس طرح تو نے ہمیں بھلا دیا تھا۔ (تفسیر ابن کثیر ج 3 ص 176)

اللہ کی راہ میں پانی خرچ کرنے کی اہمیت اور اجر وثواب : اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سب سے عظیم نعمت پانی ہے کیونکہ دوزخ کے عذاب میں گرفتار کافر سب سے پہلے پانی کا سوال کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کی راہ میں سب سے زیادہ ثواب پانی خرچ کرنے کا ہے۔

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : سب سے افضل صدقہ پانی کا ہے۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ جب اہل دوزخ، اہل جنت سے فریاد کریں گے تو یہ کہیں گے کہ ہم پر پانی انڈیل دو، یا کچھ اس رزق سے دے دو جو اللہ نے تم کو دیا ہے۔ (مسند ابویعلی، ج 5، رقم الحدیث : 2673۔ المعجم الاوسط ج 2، رقم الحدیث : 1015۔ شعب الایمان، ج 3، رقم الحدیث : 3380۔ تفسیر ابن ابی حاتم، ج 5، ص 1490۔ تفسیر ابن کثیر ج 3، ص 176۔ مطبوعہ دارالاندلس بیروت، تفسیر در منثور، ج 3، ص 468، مطبوعہ دارالفکر، بیروت)

امام ابوداود روایت کرتے ہیں : حضرت سعد (رض) نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا : کس چیز کا صدقہ کرنا آپ کو زیادہ پسند ہے ؟ آپ نے فرمایا : پانی کا۔ (سنن ابوداود، رقم الحدیث : 679۔ سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث : 3684)

ان احادیث سے یہ واضح ہوگیا کہ پانی پلانے سے اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ قرب حاصل ہوتا ہے اور احادیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کتے کو پانی پلانے سے بھی عمر بھر کے گناہوں کو بخش دیا۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : ایک شخص جارہا تھا اس کو بہت شدید پیاس لگی۔ اس نے کنوئیں میں اتر کر پانی پیا تو اس نے دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی وجہ سے کیچڑ چاٹ رہا تھا۔ اس نے سوچا اس کتے کو بھی ایسے ہی پیاس لگی ہے جیسے مجھے لگی تھی، اس نے کنوئیں میں اتر کر اپنے موزہ میں پانی بھرا پھر باہر آکر اس موزہ سے کتے کو پانی پلایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کو قبول فرمایا اور اس کو بخش دیا۔ صحابہ نے پوچھا : یارسول اللہ کیا جانوروں کے ساتھ نیکی کرنے کا بھی اجر ملتا ہے ؟ آپ نے فرمایا : ہر تر جگر کے ساتھ نیکی میں اجر ہے۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث : 2363۔ صحیح مسلم، سلام : 531 (2244) 5751۔ سنن ابوداود، رقم الحدیث : 2550۔ شعب الایمان، ج 3، رقم الحدیث : 3372)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک کتا کنوئیں کی منڈیر کے گرد گھوم رہا تھا۔ جس کو پیاس نے ہلاک کردیا تھا، اچانک بنو اسرائیل کی فاحشہ عورتوں میں سے ایک عورت نے اس کو دیکھ لیا اس نے اپنا موزہ اتارا اور اس میں پانی بھر کر اس کو پلایا۔ اس سبب سے اس عورت کو بخش دیا گیا۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث : 3467۔ صحیح مسلم، سلام : 155، (2245) 5753)

مرثد بن عیاض بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا یارسول اللہ ! مجھے وہ عمل بتلایئے جو مجھے جنت میں داخل کردے۔ آپ نے پوچھا : کیا تمہارے والدین میں سے کوئی ایک زندہ ہے ؟ اس نے کہا نہیں ! آپ نے کئی بار یہ سوال کیا، پھر فرمایا : تم پانی پلاؤ، اس نے کہا : میں کیسے پانی پلاؤں ؟ آپ نے فرمایا : جب لوگوں کے پاس پانی نہ ہو تو ان کو پانی لا کردو۔ (مسند احمد ج 5 ص 368۔ المعجم الکبیر، ج 17، ص 370، حافظ الہیثمی نے کہا اس کی سند صحیح ہے، مجمع الزوائد، ج 3، ص 131)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : دو شخص جنگل میں سفر کر رہے تھے۔ ایک عابد تھا اور دوسرا گناہ گار تھا۔ عابد کو سخت پیاس لگی اور وہ بےہوش ہو کر گرگیا۔ اس کے ساتھی کے پاس ایک ڈول میں پانی تھا وہ دل میں کہنے لگا بہ خدا اگر یہ نیک بندہ پیاسا مرگیا جبکہ میرے پاس پانی تھا تو میں کبھی کوئی خیر حاصل نہیں کرسکوں گا اور اگر میں نے اس کو اپنا پانی پلا دیا تو میں یقیناً مرجاؤں گا۔ پھر اس نے اللہ پر توکل کیا اور اس کو پانی پلانے کا عزم کرلیا۔ اس نے اس بےہوش عابد پر پانی چھڑکا اور اس کو اپنے حصہ کا پانی پلا دیا تو وہ کھڑا ہوگیا۔ حتیٰ کہ دونوں نے جنگل کی مسافت کو طے کرلیا۔ وہ گناہ گار آدمی جب قیامت کے دن حساب کے لیے کھڑا کیا گیا تو اس کو دوزخ میں بھیجنے کا حکم دیا گیا۔ فرشتے اس کو لے جارہے تھے کہ اس شخص نے اس عابد کو دیکھ لیا، اس نے عابد سے کہا : اے فلاں شخص ! کیا تم مجھے پہچانتے ہو ؟ عابد نے پوچھا تم کون ہو ؟ اس نے کہا : میں وہ شخص ہوں جس نے جنگل کے دن تم کو اپنے اوپر ترجیح دی تھی ! عابد کہے گا ہاں ! میں تم کو پہچان لیا ! پھر وہ فرشتوں سے کہے گا ٹھہرو، ٹھہرو، پھر وہ کھڑا ہو کر اپنے رب سے دعا کرے گا اور کہے گا اے میرے رب ! تو جانتا ہے اس شخص نے جو مجھ پر احسان کیا تھا ! اور کس طرح اس نے مجھے اپنے اوپر ترجیح دی تھی ! اے میرے رب ! اس کو میری خاطر بخش دے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا وہ تمہاری خاطر ہے، پھر

وہ عابد آئے گااور اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر اس کو جنت میں داخل کر دے گا۔ (المعجم الاوسط، رقم الحدیث : 2970، اس حدیث کی روایت میں ابوظلال متفرد ہے امام بخاری اور امام حبان نے اس کی توثیق کی ہے اور اس میں کلام ہے، مجمع الزوائد ج 3، رقم الحدیث : 132۔133، مطبوعہ بیروت)
(تفسیر تبیان القرآن۔علامہ غلام رسول سعیدی)

حکایت :

ایک لڑکی نے خواب میں جنت اور دوزخ دیکھی، میدان محشر کا منظر دیکھا، آگے بڑھ کر اپنے والد کو جنت میں دیکھا، بڑے خوش وخرم حالت میں، پوچھا : ابا جان ! میری والدہ کہاں ہیں ؟ والد نے کہا : وہ جہنم میں ہے، وہاں جا کر جب والدہ کو دیکھا تو وہ سخت عذاب میں تھی، والدہ نے بیٹی سے فرمائش کی کہ اپنے والد کے پاس جاؤ، اسے خدا کا واسطہ دے کر میرے لیے تھوڑا سا پانی لے کر آؤ۔ لڑکی والد کے پاس پہنچ کر کہنے لگی : ابا جان ! ایک گلاس جنت کا پانی مجھے دے دو، میری والدہ نہایت تباہ کن حالت میں ہے۔ باپ نے کہا : بیٹی یہ جنت کا پانی دوزخیوں پر حرام ہے۔ لڑکی نے زبردستی گلاس پانی سے بھرا ہوا اٹھا کر بھاگ گئی۔ ایک فرشتہ نے اس سے گلاس لے کر واپس کیا، اور اسے مکا مارا، اسی حالت میں خواب سے بیدار ہو گئی، تو اس کا ہاتھ شل اور ناکارہ تھا۔

فرمایا : "الذین اتخذوا دینھم لھواً و لعباً و غرتھم الحیوۃ الدنیا" دوزخی کافروں کا تعارف ہو رہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنایا، یا یوں کہو کہ انہوں نے کھیل اور تماشا کو اپنا دین قرار دیا تھا، اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں، اور ان کے برحق دین کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اس کی ایک نظیر یہ ہے : "واذا مروا بھم یتغامزون" (المطففین)

جب ایمان والوں کے پاس سے گزرتے تھے، تو ان کا مذاق اڑاتے تھے اور اشارے کرتے تھے اور کہتے رہتے تھے : دیکھو ! یہ جنت کے وارث اور حوروں کے خاوند جا رہے ہیں، جن کے پاس نہ پہننے کو کپڑا، اور نہ کھانے کو روٹی، اور نہ مکان، نہ سواری، نہ خادم، نہ سرمایہ۔ یہ لوگ اپنے آپ کو جنت کے وارث کہتے ہیں۔ طرح طرح کے استہزاء اور طعن و تشنیع کیا کرتے تھے۔ اس قسم کے استہزاء منافقین بھی کرتے تھے۔ سورۃ توبہ میں ارشاد ہے : " قل اباللہ وآیاتہ ورسولہ کنتم تستھزءون" بد بختو ! کیا تم اللہ تعالیٰ اس کی آیات اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ استہزاء (ٹھٹھا) کرتے ہو ؟

اللہ تعالیٰ نے منافقین کی بھی مذمت فرمائی ہے، جو کافروں کی طرح دین الٰہی، اور پیغمبروں کا مذاق اڑاتے تھے، اور اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنالیا تھا۔ در اصل ان کی بد نصیبی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا، ارشاد فرمایا :

"وغرتھم الحیوۃ الدنیا" کہ دنیا کی زندگی، اور اس کی نیرنگیوں نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا۔ انہوں نے دنیا کے آرام وآسائش کو ہی اول وآخر سمجھ لیا تھا، اور دنیا ہی کو اصلی منزل سمجھ کر مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے، اور زندہ ہونے کو محال جانتے تھے، اور کہتے تھے : بس یہی زندگی اصلی ہے، اس کے بعد کچھ نہیں۔ سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مناجات ہے : اللھم لا تجعل الدنیا اکبر ھمنا ولا مبلغ علمنا۔ اور دوسری روایت میں یہ زیادتی بھی ہے : ولا غایۃ رغبتنا۔ (رواہ الترمذی) اے اللہ تعالیٰ ! دنیا ہی کو ہمارا منتہائے مقصود نہ بنادے کہ ہم اس میں مشغول ہو کر آخر کو بھول جائیں۔

حضرت امام غزالی (رح) نے یہ دعا نقل کی ہے : "اللھم صغر الدنیا باعیننا و عظم جلالک فی قلوبنا و وفقنا لمرضاتک وثبتنا علی دینک" (نسائی) زندگی کیا ہے ؟ کھانا پینا، رہنا سہنا، پہننا، جائیداد، بیوی، اقتدار، کاروبار وغیرہ۔ یہ سب چار روزہ ہیں۔ یہی چیزیں انسان کو آخرت سے بےگانہ اور غافل کرنے والی ہیں، جو شخص ان چیزوں میں الجھ کر رہ گیا، وہ دھوکہ کھا گیا، وہ دنیا میں شاید چار دن خوش رہے، مگر ابدی سعادتوں سے محروم ہی رہا، اسے جنت کی خوشحالی میسر نہیں آسکے گی۔ مزید بدقسمتی یہ ہوگی جو فرمایا : " فالیوم ننسھم کما نسوا لقاء یومھم ھذا" آج کے دن ہم انہیں فراموش کر دیں گے، یعنی نظر انداز کریں گے، جس طرح انہوں نے اس قیامت کے دن کو فراموش کیا تھا۔ وہ ہمیشہ کہتے رہتے تھے : کوئی حساب کتاب نہیں، نہ جنت ہے، نہ دوزخ، مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں، مرنے والوں میں سے آج تک کوئی زندہ نہیں ہوا وغیرہ۔ "نسیان" کا لفظی معنی بھول جانا، وہ یہاں مراد نہیں ہے، کیونکہ اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر محال ہے۔ اس کا مطلب وہی ہے جو "وھو خادعھم" میں بیان ہوا کہ ان کے ساتھ مخادعت اور نسیان والا سلوک ہوگا، یعنی نظر اندازی اور رحمت وعنیات سے دوری اور محرومی۔

"وماکانوا باٰیتنا یجحدون" جنت اور رحمت الٰہی سے دوری کا دوسرا سبب یہ ہوگا کہ وہ دنیا میں ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے۔ انبیاء کرام (علیہم السلام) کی تکذیب کرتے تھے۔ کافر کے پاس اگر برے اعمال کا انبار نہ بھی ہو، اس کے ابدی دوزخی ہونے کے لیے تنہا کفر ہی کافی ہے۔ پھر اتمام حجت کے لیے فرمایا: "ولقد جئنٰھم بکتبٍ فصلنہ" البتہ تحقیق ہم لائے ہیں، بھیجے ہیں ان کے پاس کتاب، جس میں ہم نے تفصیل بیان کی ہے۔ یہ ایسی مفصل کتاب ہے جس میں عقائد حقہ، مبدا اور معاد، امور تکوینیہ، امور واحکام شرعیہ، احقاق حق، ابطال باطل، امثال، مواعظ، تذکیرات ثلاثہ، دلائل عقلیہ ونقلیہ وغیرہ تمام چیزوں کی دلکش وروح پرور انداز پر تفصیل بیان ہے۔ پھر انداز بیان فصاحت و بلاغت کی وہ اصول اور گرانقدر انمول موتیوں سے مرکب ترکیبی جملے جن سے مسائل اور احکام تک ذہنوں کی رسائی، اور غیر منصوص احکام کا استنباط، دلالت واشارات، الغرض جس طرح یہ کتاب اپنے نظم و مبانی کے اعتبار سے بے مثال ہے، اسی طرح مسائل اور احکام کے اعتبار سے مزید لاثانی اور بے مثال ہے۔ یہ ہدایت، رحمت، برکت، موعظت، نور وروشنی والی کتاب ہے۔ ذکری وھدیً للناس وھدیً للعلمین بھی ہے۔

تفصیل کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ رب العزت سبحانہ نے صاحب کتاب رسول اکرم سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذمہ یہ فرض منصبی لازم کیا ہوا ہے کہ "لتبین للناس مانزل الیہم" (النحل) کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ وحی کے اغراض و مقاصد، اور تفصیلات کو لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کر دیں، تاکہ کسی کو کسی مسئلہ میں اشتباہ نہ رہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا: ثم ان علینا بیانہ۔ یہ ہمارے ذمہ ہے کہ اس کے ہر حکم کو آپ کو بیان کرکے سمجھائیں۔

"ھل ینظرون الا تاویلہ۔ یوم یاتی تاویلہ یقول الذین نسوہ من قبل"۔ فرمایا جو لوگ اس کتاب پر ایمان نہیں لاتے جو کہ اللہ تعالیٰ کے علم کے ساتھ نازل ہوئی، جس میں ہر چیز کی تفصیل بھی ہے، اور وہ سراسر ہدایت اور رحمت بھی ہے، آخر یہ لوگ کسی چیز کے منتظر ہیں؟ کیا وہ اس تاویل کا انتظار کر رہے ہیں؟ تاویل سے مراد عاقبت وانجام، اور اظہار مصداق ہے۔ تو انہیں خوب سمجھ لینا چاہیے کہ جس دن وہ عاقبت وانجام کا بشکل عذاب ظہور ہوگا، تو پھر اس روز ندامت وافسوس انہیں کچھ کام نہ آئے گا۔ (تفسیر منازل العرفان۔ عبد الستار شاہ)

آیت مبارکہ:

الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝٥١

لغت القرآن: الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [اتَّخَذُوا : ان سب نے بنا لیا] [دِيْنَهُمْ : اپنے دین کو] [لَهْوًا : تماشا] [وَّ : اور] [لَعِبًا : کھیل] [وَّغَرَّتْهُمُ : اور دھوکے میں ڈالے رکھا انہیں] [الْحَيٰوةُ : زندگی] [الدُّنْيَا : دنیوی] [فَالْيَوْمَ : چناچنہ آج] [نَنْسٰىهُمْ : ہم بھلا دیں گے انہیں] [كَمَا : جیسا کہ] [نَسُوْا : سب بھول گئے] [لِقَآءَ : ملاقات " سے "] [يَوْمِهِمْ : اپنے دن] [هٰذَا : یہ] [وَمَا : اور نہ] [كَانُوْا : تھے سب] [بِاٰيٰتِنَا : ہماری آیات کو] [يَجْحَدُوْنَ : سب انکار کر رہے ہیں] [

ترجمہ: جنہوں نے اپنے دین کو تماشا اور کھیل بنا لیا اور جنہیں دنیوی زندگی نے فریب دے رکھا تھا، آج ہم انھیں اسی طرح بھلا دیں گے جیسے وہ (ہم سے) اپنے اس دن کی ملاقات کو بھولے ہوئے تھے اور جیسے وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے

تشریح: نسیان (بھلا دینے) کا کیا معنی ہے؟ امام رازی نے دو قول نقل کیے ہیں۔ 1۔ نسی بمعنی ترک یعنی ہم انھیں چھوڑ دیں گے۔ اور ان کو نجات نہیں دیں گے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ ہم ان سے ایسا برتاؤ کریں گے جیسے ہم نے ان کو فراموش کر دیا ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

۔آخرت میں جنت کی نعمتیں صرف ان خوش نصیب لوگوں کے لیے مخصوص ہیں جو اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق اپنی زندگی گزارتے ہیں اور جو لوگ اپنے دین کو کھیل تماشا بنا لیتے ہیں یعنی دین کا مذاق اڑاتے ہیں اور آخرت کے حساب وکتاب کو بھلا کر صرف اسی دنیا میں مگن ہو جاتے ہیں تو ان کی سزا کے طور پر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بھی انھیں نظرانداز کر دے گا، یعنی جیسا تم اس جہاں میں کروگے ویسا ہی اس جہاں میں بھروگے۔ (تفسیر امداد الکرم)

کفار پر جنتی نعمتیں اس لیے حرام کی گئیں کہ انھوں نے اس دین اسلام کو جو اللہ نے ان کے لیے پسند فرمایا کھیل بنا لیا یعنی اس کا مذاق اڑایا۔ دینھم لھوا ولعبا۔ کا یہ معنی بھی ہے کہ کفار اپنے دین کو سنجیدگی سے نہیں لیتے اسے ہنسی کھیل سمجھتے ہیں۔ جیسے یہود ونصاریٰ اپنی مذہبی کتابوں میں جو پسند کریں باقی رکھتے ہیں، جو چاہیں نکال دیتے ہیں چنانچہ بائبل کے ہر نئے ایڈیشن میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ مشرکین جس بت کو چاہیں سجا کر رکھ لیتے ہیں جسے چاہیں اٹھا کر پھینک دیتے ہیں۔ غریب لوگ لکڑی کے بت پوجتے ہیں اگر مال ہاتھ آجائے تو لکڑی والا بت چھوڑ کر لوہے یا پتھر کا قیمتی بت لے آتے اور اسے پوجنا شروع کر دیتے ہیں۔ گویا انھوں نے اپنے خداؤں کو کھلونے بنا لیا ہے۔

اسی طرح کفار اپنے مذہبی تہواروں کو کھیل کود اور تماشے میں اڑا دیتے ہیں۔ عیسائیوں کی کرسمس، ہندوؤں کی دیوالی اور سکھوں کی بیساکھی کھیل تماشوں بلکہ شراب نوشی، محرمات اور رقص وسرود کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ جبکہ اہل اسلام عید پہ اللہ کے حضور سربسجود ہو کر سجدہ شکر بجالاتے ہیں اور فطرانہ وقربانی کی شکل میں غرباء کی مدد کرتے ہیں۔

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کفار نے دنیوی زندگی سے دھوکا کھایا اور اسے ہی حقیقی زندگی سمجھ کر آخرت سے منکر ہو گئے۔ اس لیے ان پر اخروی نعمتیں حرام کر دی گئیں۔ معلوم ہوا دنیا میں کھو کر آخرت سے غافل ہونا کافر کا کام ہے۔ مومن دنیا میں رہ کر آخرت کی تیاری میں لگا رہتا ہے۔ (برہان القرآن)

اس آیت میں کفار کی ایک بری صفت بیان کی جارہی ہے کہ ان کفار نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا لیا اس طرح کہ اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کرتے ہوئے جسے چاہا حرام کہہ دیا اور جسے چاہا حلال قرار دے دیا اور جب انھیں ایمان قبول کرنے کی دعوت دی گئی تو یہ ایمان والوں سے مذاق مسخری کرنے لگ گئے، انھیں دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا کہ دنیا کی لذتوں میں مشغول ہو کر اپنے اخروی انجام کو بھول گئے اور اہل وعیال کی محبت میں گرفتار ہو کر اللہ عَزَّوَجَلَّ کی محبت سے دور ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی محبت سخت خطرناک ہے۔ اسی لیے حدیث مبارک میں فرمایا گیا کہ دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے۔ (صراط الجنان)

الذین اتخذوا۔۔ ولعبا الخ اہل جنت اور اہل دوزخ اور اصحاب اعراف کی اس گفتگو سے کسی حد تک اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عالم آخرت میں انسانی قوتوں کا پیمانہ کس قدر وسیع ہو جائے گا وہاں آنکھوں کی بینائی اتنے بڑے پیمانے پر ہوگی کہ دوزخ وجنت اور اعراف کے لوگ جب چاہیں گے ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے، اور وہاں آواز اور سماعت بھی اس قدر بڑھ جائے گی کہ مختلف دنیاؤں کے لوگ بآسانی گفت وشنید کر سکیں گے، یہ اور ایسے ہی بیانات جو ہمیں قرآن میں ملتے ہیں اس بات کا تصور دلانے کیلئے کافی ہیں کہ وہاں زندگی کے قوانین ہماری موجودہ دنیا کے قوانین طبعی سے بالکل مختلف ہوں گے، اگرچہ ہماری شخصیتیں یہی رہیں گی، جن لوگوں کے دماغ اس عالم طبعی کی حدود میں موجودہ زندگی اور اس کے مختصر پیمانوں سے وسیع تر کسی چیز کا تصور ان میں نہیں سما سکتا وہ قرآن وحدیث کے ان بیانات کو بڑی حیرت واستعجاب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور بسا اوقات ان کا مذاق اڑا کر اپنی خفیف العقلی کا مزید ثبوت بھی دینے لگتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان بیچاروں کا دماغ جتنا تنگ ہے زندگی کے امکانات اتنے تنگ نہیں ہیں، آج کل کی نئی نئی ایجادات نے تو اس مسئلہ کو حل ہی کر دیا ہے، اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے ہزاروں میل دور سے اس طرح باتیں کر سکتے ہیں گویا کہ آپ کے روبرو موجود ہے جس سے آپ بالمشافہ گفتگو کر رہے ہیں، نیز ایسی ایجادات نے کہ جن کے ذریعہ موٹی موٹی دیواروں کے آر پار تاریک رات میں اس طرح دیکھ سکتے ہیں گویا کہ رائی اور مرئی کے درمیان کوئی شئی حائل نہیں ہے، ان نئی ایجادات اور مشاہدات کے بعد بھی قرآنی معلومات کے سلسلہ میں انکار وعناد کا رویہ اختیار کرنا حمق اور بے عقلی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ (حاشیہ بر تفسیر جلالین)

جہنمیوں کا جہنم میں جانا اور ان پر جنت کی نعمتوں کا حرام ہونا اس لیے ہوگا کہ یہ دین کو کھیل تماشا سمجھتے ہوئے دنیا کی عیش وعشرت میں غرق ہو کر آخرت کو بھول چکے تھے۔

کھیل تماشا وقتی طور پر دل بہلانے اور ایک حد تک صحت کے لیے مفید ہوتا ہے بشر طیکہ اس میں وقت اور دولت کا ضیاع اور بے حیائی کا عنصر شامل نہ ہو۔ اگر یہ چیزیں کسی کھیل اور گیم میں شامل ہو جائیں تو فائدہ کے بجائے صحت اور وقت کا نقصان ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ کھیل کود انسان پوری زندگی اختیار نہیں کر سکتا کیونکہ کھیلنے کودنے سے آدمی کا پیٹ نہیں بھرتا اور نہ ہی زندگی بھر کوئی شخص اسے اختیار کر سکتا ہے۔ یہاں کھیل تماشا کا ذکر کر کے یہ بتلانا مقصود ہے کہ سنجیدہ انسان کے سامنے ایسی چیزوں کی کوئی حیثیت اور حقیقت نہیں ہوتی۔

جہنم میں داخل ہونے والوں کا دین کے ساتھ یہی رویہ تھا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو وقت کا ضیاع سمجھا، دین کے احکام کو ناروا پابندی جانا، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو اپنے لیے غلامی تصور کرتے ہوئے اس سے روگردانی کی اور دنیا کی لذّات، جاہ و حشمت اور ترقی میں اس طرح غرق ہوئے کہ دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں دائمی تصور کر لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب انھیں سمجھانے والا سمجھانے کی کوشش کرتا تو اس کے ساتھ استہزاء اور جھگڑا کیا کرتے تھے جس کے بدلہ میں آج جہنم میں ان کی آہ وزاریوں کو یکسر فراموش کر دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کے بھولنے سے مراد کسی قسم کا نسیان نہیں بلکہ اس کے بھولنے سے مراد یکسر طور پر مسترد کر دینا ہے۔

بظاہر "ھم" کا اشارہ اہل مکہ کی طرف ہے لیکن قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بنی نوع انسان کو رہتی دنیا تک مخاطب کیا گیا ہے کیونکہ انسان کی رہنمائی کے لیے یہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے اس لیے اس میں ہدایت کے متعلق تمام تفصیلات اور ہدایات بیان کر دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو اپنے قطعی اور جامع علم کے مطابق نازل فرمایا ہے یہی وجہ ہے اس کی ہدایت کے مقابلہ میں کوئی ہدایت اور رہنمائی نہیں ہو سکتی جو کچھ اس میں دنیا اور آخرت کے حوالے سے حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ وہ من وعن آج تک پورے ہوئے ہیں اور ہمیشہ عقل، علم اور سچائی کے اصولوں پر پورے اترتے رہیں گے۔ جو فرد اور قوم اس کی رہنمائی میں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارے گی۔ وہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سزاوار ہوگی۔ ہر قسم کی کامیابی پا کر آخرت میں سرخرو ہوگی۔ لیکن رحمت اور ہدایت انھی لوگوں کو حاصل ہوگی جو قرآن مجید پر کامل ایمان لائیں گے۔ (تفسیر فہم القرآن)

ابن ابی الدنیا اور رضیا نے زید بن رفیع کا بیان نقل کیا ہے کہ دوزخی دوزخ میں داخل ہو کر مدت تک آنسوؤں سے روئیں گے پھر مدت تک لہو کے آنسو بہائیں گے۔ دوزخ کے کارندے ان سے کہیں گے بدبختو تم دنیا میں نہیں روئے آج تم کس سے فریاد کر رہے ہو' وہ چیخ کر پکاریں گے اے جنت والو' اے گروہ پدراں و مادراں ! اے اولاد ! ہم قبروں سے پیاسے نکلے تھے' میدان حشر میں بھی پوری مدت پیاسے رہے اور آج بھی پیاسے ہیں' اللہ نے پانی اور جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے' ہماری طرف بھی اس میں سے کچھ بہا دو۔ چالیس (دن یا مہینے یا سال) تک مانگتے رہیں گے مگر کوئی جواب نہیں دے گا آخر ان کو جواب ملے گا تم کو (یونہی یہاں ہمیشہ) رہنا ہے یہ سن کر وہ ہر بھلائی سے ناامید ہو جائیں گے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اسی آیت کی تشریح میں حضرت ابن عباس : (رض) کا بیان نقل کیا ہے کہ آدمی اپنے بھائی کو پکارے گا اور کہے گا بھائی میری فریاد رسی کر میں جل گیا وہ جواب دے گا ان اللّٰہ حرمھما علی الکافرین۔

فالیوم ننسٰھم کما نسوالقآء یومھم ہذا وماکانوا باٰیتنا یجحدون : پس آج ہم بھی ان کو ایسے ہی فراموش کر دیں گے جیسے انھوں نے اس دن کی پیشی کو فراموش کر دیا تھا اور جیسے ہماری آیات کا انکار کر دیا تھا۔ فراموش کر دینے سے مراد ہے دوزخ میں ڈال کر چھوڑ دینا اور قیامت کے دن کی پیشی کو بھولنے سے مراد ہے ایسے اعمال ترک کر دینا جو قیامت کے دن فائدہ رساں ہوں۔ (تفسیر مظہری)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس طرح کفار نے روز قیامت کو بھلا دیا ہم بھی انھیں روز قیامت اپنی رحمت سے نظر انداز کر دیں گے۔

یہاں فالیوم ننسٰھُمْ کے تحت حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں اللہ کا کفار کو بھلا دینا یہ ہے کہ وہ انھیں ہمیشہ کے لیے جہنم میں جلنے کے لیے چھوڑ دے گا ورنہ اللہ رب العزت تو بھولنے سے پاک ہے۔ (ابن جریر)۔ (تفسیر برہان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○۵۲

لغۃ القرآن: وَ : اور] [لَقَدْ : البتہ تحقیق] [جِئْنٰهُمْ : ہم لائے ان کے پاس] [بِكِتٰبٍ :" ایسی " کتاب] [فَصَّلْنٰهُ : ہم نے تفصیل سے بیان کیا ہے اسے] [عَلٰي : پر] [عِلْمٍ : علم] [هُدًى : ہدایت] [وَّرَحْمَةً : اور رحمت] [لِّقَوْمٍ : اس قوم کیلئے] [يُّؤْمِنُوْنَ : وہ سب ایمان لاتے ہیں]

ترجمہ: اور بیشک ہم ان کے پاس ایسی کتاب (قرآن) لائے جسے ہم نے (اپنے) علم (کی بنا) پر مفصّل (یعنی واضح) کیا، وہ ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے

تشریح: یہ مکالمہ اور گفتگو جو اہل اعراف اور اہل جہنم کے درمیان یا اہل جنت اور اہل جہنم کے درمیان ہو گی اس کے بیان کرنے کی غرض وغایت بتائی جارہی ہے یعنی اس کا مقصد قصہ گوئی اور داستان سرائی نہیں بلکہ مدعا یہ ہے کہ تم اس سے عبرت حاصل کرو۔ اور وہ لغزشیں اور قصور جن کی وجہ سے بڑے بڑے نامور لوگ آتش جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے ان سے اجتناب کرو تاکہ اس روز دردناک انجام سے تمہیں دوچار نہ ہونا پڑے۔ اور ان کی غلط کاریوں میں سے بڑی خطرناک غلط کاریاں یہ ہیں جن کا ذکر اس سے پہلی آیت میں کیا گیا:۔

ا۔ احکام الٰہی کو لہو ولعب سمجھنا یعنی سنجیدگی سے ان کو قبول نہ کرنا بلکہ ان کو مذاق اور کھیل بنائے رکھنا۔ جی چاہا تو مان لیا اور جی چاہا تو انکار کر دیا۔

۲۔ دنیا کی محبت میں ایسا غرق ہو جانا اور اس پر اتنا فریفتہ ہو جانا کہ حلال حرام کی تمیز ہی نہ رہے۔

۳۔ روز قیامت کا انکار۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

گزشتہ آیت میں کہا گیا کہ کفار ہماری آیات سے انکار کرتے ہیں اس لیے ان پر جنتی نعمتیں حرام کر دی جائیں گی اب اس کی مثال دی جارہی ہے کہ ہم نے انھیں قرآن جیسی کتاب عطا فرمائی جس میں ہر چیز کا علمی احاطہ کیا گیا ہے۔ اس میں حقوق اللہ و حقوق العباد، عقائد واعمال۔ انسان کے جسمانی وروحانی تقاضوں کا تحفظ اور گزشتہ وآئندہ کی خبریں ہیں۔ الغرض اس میں انسانی راہ نمائی کا کوئی پہلو تشنہ وضاحت نہیں۔ اور اس میں مومنوں کے لیے ہدایت ورحمت کاملہ ہے پھر بھی کفار اس سے اعراض کرتے ہیں تو وہ جنتی نعمتوں سے محروم کیوں نہ رہیں۔ معلوم ہوا قرآن ہدایت کامل ہے۔ اب اس کے بعد کسی نئی کتاب یا نئے نبی کی ضرورت نہیں ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

مفصل کتاب

پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اتمام حجت کے لیے فرمایا ولقد جئنھم تکب البتہ تحقیق ہم لائے ہیں ان کے پاس کتاب فصلنہ ہم نے اس میں تفصیل بیان کی ہے یعنی ایسی مفصل کتاب ہے جس میں عقائد حقہ کی تفصیل اور انکار باطلہ کی تردید ہے اس میں احکام الٰہی کے وہ تمام بنیادی اصول بیان کر دیے گئے ہیں جن کی انسانوں کو ضرورت رہتی ہے اور تفصیل کی صورت یہ ہے کہ بعض اوقات اسی کتاب میں کوئی چیز ایک مقام پر اجمالی طور پر بیان ہوتی ہے تو دوسری جگہ پر تفصیل کے ساتھ بیان کر دی جاتی ہے چنانچہ قرآن پاک کی لمبی سورتوں میں تفصیلی احکامات ہیں ان میں مسائل بھی بیان ہوئے ہیں اور دلائل بھی ان میں نظیریں اور مثالیں بھی بیان ہوئی ہیں لمبی سورتوں کے بعد درمیانی سورتیں اور پھر چھوٹی سورتیں ہیں لمبی سورتوں میں تفصیل ہے تو چھوٹی سورتوں میں خلاصے بیان ہوئے ہیں گویا اکثر احکام کی تفصیل خود قرآن میں موجود ہے۔

تفصیل کا دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اکرم (علیہ السلام) کے ذمہ یہ چیز لگائی ہے "لتبین للناس مانزل الیھم" (النحل) کہ جو وحی نازل کی گئی ہے آپ اس کو کھول کر بیان کر دیں تاکہ کسی کو اشتباہ نہ رہے اس کی خوب وضاحت کر دیں اگر نبی کی زبان سے بھی وضاحت نہ ملے تو پھر قرآن پاک میں غور کرو اس میں کوئی نہ کوئی اصول ضرور دیا گیا ہو گا جس کی روشنی میں مسئلہ حل کیا جا سکتا ہو مثلاً سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے ھوالذی خلق لکم مافی الارض جمیعاً زمین کی تمام چیزیں اللہ نے تمہارے فائدے کے لیے پیدا کی ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر پیداوار سے استفادہ حاصل کر سکتا ہے سوائے اس چیز کے کہ جس کی حرمت ثابت ہو جائے یا وہ کسی دوسرے کی ملکیت ہو یہ ایک اصول ہے جس کے تحت کسی چیز پر حلت وحرمت کا حکم لگایا جا سکتا ہے ایسے ہی اصولوں کی روشنی میں مجتہدین بعض مسائل کا حل اجتہاد کے ذریعے پیش کرتے ہیں سورۃ نساء میں بھی ایسے صاحبان علم کے متعلق فرمایا یستنبطونہ منھم یہ لوگ قرآن پاک سے استنباط کرکے حل پیش

کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی صلاحیت عطا کی ہے کہ گہرائی سے چیزیں نکال لیتے ہیں ان میں مجتہدین اربعہ اور دیگر متجہدین شامل ہیں گویا قرآن پاک کے احکام کی تفصیل کا یہ بھی ایک ذریعہ ہے کہ مجتہدین کرام اس کی تفصیلات بیان کرتے ہیں۔

قرآن کے علوم پنجگانہ

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (رح) ابتدائی طالب علموں کو سمجھاتے ہیں کہ قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے اس کے پانچ علوم کو اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہیے فرماتے ہیں پہلا علم تذکیر باآلاء اللہ ہے اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لیے جو نعمتیں پیدا فرمائی ہیں اور جو احسان جتلایا ہے یہ انسان کے لیے باعث نصیحت ہے انسان ان نعمتوں میں غور و فکر کرکے اور ان سے استفادہ حاصل کرکے نصیحت پکڑ سکتا ہے قرآن پاک کا دوسرا علم تذکیر بایام اللہ ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں سابقہ قوموں کے حالات اور واقعات بیان کیے ہیں اور پھر مجرمین کو سزائیں دی گئی ہیں مطیعین کو جو انعام دیے گئے ہیں ان کا تذکرہ کیا ہے یہ واقعات بھی انسان کے لیے باعث عبرت اور ب اعث نصیحت ہیں شاہ صاحب (رح) فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کا تیسرا علم تذکیر بموت ومابعدالموت ہے اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد پیش آنے والے حالات کو وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے ان کو جان کر انسان اپنی آخرت کی زندگی کی فکر کرتا ہے چوتھے نمبر پر علم احکام ہے اس حصہ میں اللہ نے حلت و حرمت، جائزہ ناجائز اور تمام ادامر دنواہی کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں جو کہ اس دنیا کی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہیں اور انہی علوم پر آخرت کی زندگی کا انحصار ہے اور پانچویں نمبر پر علم مخاصمت یا علم مباحثہ ہے اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے تمام سابقہ ادیان کی تردید فرمائی ہے اس حصہ قرآن میں دلائل اور شواہد ہیں یہود و نصاریٰ کے عقائد باطلہ، مشرکین کفار اور منافقین کے غلط عقائد کو آشکارا کیا ہے ان کے تعصب اور ہٹ دھرمی کا پردہ چاک ہے مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس مفصل کتاب قرآن پاک میں تمام علوم کو جمع کرکے بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لیے حجت تمام کردی ہے اس مفصل کتاب کی آمد کے بعد کسی انسان کے لیے کوئی بہانہ باقی نہیں رہ جاتا جس کے ذریعے وہ اللہ کی بارگاہ میں عذر پیش کرسکے کہ اسے احکام الٰہی کی خبر نہیں ہوسکی یا وہ اسے سمجھنے سے قاصر رہا ہے اسی لیے فرمایا کہ ہم ان کے پاس ایک کتاب لائے ہیں جس کو ہم نے تفصیل سے بیان کیا ہے اعلی علم یعنی علم کے ساتھ قرآن پاک کی تمام تفصیلات علم پر مبنی ہیں اور کوئی چیز خلاف واقع نہیں ہے اللہ تعالیٰ علیم کل ہے اس کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں لہٰذا اس کے بیان کرنے میں کوئی غلطی بھی نہیں ہوسکتی۔

حلت و حرمت کا بیان

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حلال، عرام محکم، متشابہ، تبشیر، تنذیر، قصص، غزوات اور تمثیل وغیرہ تمام چیزیں قرآن پاک میں موجود ہیں جو چیزیں انسانی جسم و روح کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں انھیں حلال قرار دیا گیا ہے اور جن چیزوں میں انسانی جسم و روح کے لیے قباحت ہے ان کو حرام قرار دیا ہے بعض چیزوں کو خرابی تو واضح ہوتی ہے مگر بعض کی قباحت پوشیدہ ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اور اس پر حرمت کا حکم لگاتا ہے ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نھی دواء الخبیث یعنی خبیث دوائی کے استعمال سے منع فرمایا ہے خبیث کے لیے ناپاک ہونا ضروری نہیں مگر یہ مہلک ضرور ہوتی ہے جیسے سنکھیا ہے اگر کچا سنکھیا تھوڑی مقدار میں بھی استعمال کیا جائے تو جان لیوا ثابت ہوتا ہے اس لیے اس سے منع کردیا گیا البتہ اگر کسی مستند معالج کی زیر نگرانی ٹھیک اور مبدر کرلیا جائے یعنی اس کا کشتہ تیار کرلیا جائے تو معالج کی تجویز کردہ مقدار دوائی کے طور پر استعمال کی جاسکتی ہے اگر اس کا کچا استعمال کیا جائے گا یا مقدار سے زیادہ استعمال کیا جائے تو یہ معدے اور جگر کو پھاڑ کر رکھ دے گا جس سے انسانی جسم کے نازک حصوں سے خون جاری ہو کر آدمی کو ہلاک کردے گا اس طرح بہتا ہوا خون بھی حرام ہے اس میں مضر صحت جراثیم پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح مردار بھی انسانی صحت کے لیے سخت مضر اور حرام ہے۔ (تعلیقاً)

مشتبہات کا بیان

قرآن پاک میں محکم اور متشابہ دونوں اقسام کی آیات موجود ہیں سورۃ آل عمران کی ابتداء میں آتا ہے وہی اللہ کی ذات ہے جس نے آپ پر کتاب نازل کی ہے منہ آیت محکمت اس میں محکم آیات ہیں " واخر متشبھت " اور بعض دوسری متشابہ ہیں محکم آیتوں کے معانی تو واضح ہیں البتہ متشابہ آیات کی حقیقت کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے جیسے حروف مقطعات الم، الر، حم وغیرہ ہیں یا جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق آتا ہے " الرحمٰن علی العرش استویٰ " (طہٰ) اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے اس کیفیت کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے جو کہ انسانی عقل میں آنے والی چیز نہیں ہے سورۃ فتح میں " یداللہ فوق ایدھم " اللہ کا ہاتھ کیسا ہے دوسری جگہ پنڈلی کا ذکر بھی آتا ہے ان چیزوں

کی کیفیت کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا یہ متشابہات ہیں اور ان پر ایمان لے آنا ہی کافی ہے اگر اس میں کرید کی جائے کہ اللہ کا ہاتھ یا چہرہ کیسا ہے اسے جاننے کی کوشش کی جائے گی تو انسان کافر ہو جائے گا ایمان یہی ہونا چاہیے کہ یہ چیزیں ویسے ہی ہیں جیسی اس کی شان کے لائق ہیں قرآن پاک میں کہیں اہل ایمان کے لیے بشارت ہے اور کہیں منکرین کے لیے انذار ہے کہیں قصص بیان کرکے فرمایا "ان فی ذلک لعبرۃ لاولی الابصار" (آل عمران) ان میں اہل عقل وخرد کے لیے عبرت کا سامان ہے کہیں وعظ وتذکیر ہے کبھی انبیاء کی زبان سے اور کبھی اولیاء کی زبان سے کبھی مومنین اور کبھی ملائکہ کی زبان سے عبرت اور نصیحت کی باتیں بیان کی گئی ہیں قرآن پاک میں بہت سی تمثیلات بھی بیان کی گئی ہیں شیخ ابوبکر بن عربی (رح) فرماتے ہیں کہ ایک ایک لمبی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے ہزار مثالیں ہزار اوامر اور ہزار نواہی بیان فرماتے ہیں بعض اوقات بعض امور مثال کے بغیر واضح نہیں ہوتے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں بیشمار مثالیں بھی بیان فرمائی ہیں۔

ہدایت اور رحمت

فرمایا جو مفصل کتاب ہم علم کے ساتھ لائے ہیں اس میں ھدی ہدایت ہے یعنی یہ انسان کی کماحقہ رہنمائی کرتی ہے کوئی بھی مشکل درپیش ہوا اگر انسان قرآن پاک کی طرف رجوع کرے گا تو لازماً رہنمائی حاصل کرے گا پھر یہ بھی ہے کہ جتنا زیادہ رجوع کرے گا اتنا زیادہ مستفید ہوگا مفسر قرآن امام رازی (رح) نے امام شافعی (رح) کا واقعہ نقل کیا ہے کہ امام صاحب (رح) کو ایک مسئلہ کا حل مطلوب تھا آپ بار بار قرآن کی ورق گردانی کرتے تھے حتیٰ کہ آپ نے تین سو مرتبہ قرآن پاک کو اول تا آخر تلاوت کیا پھر ایک مقام پر آکر نگاہ ٹک گئی اور آپ کا مسئلہ حل ہوگیا امام شافعی (رح) دوسری صدی کے مجتہد امام، محدث، نیک اور صالح انسان تھے آپ نے ایک مسئلہ کے لیے اتنی محنت کی، حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری (رح) فرماتے ہیں کہ امام شافعی (رح) من اذکیاء امۃ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کے ذہین ترین لوگوں میں سے ہیں امام صاحب (رح) کا اپنا بیان ہے کہ زمانہ طالب علمی میں متواتر سولہ سال تک انھوں نے رات بھر ایک گلاس پانی بھی نہ پیا کہ کہیں مطالعہ میں خلل نہ آجائے اس زمانے میں ہماری محنتیں ان لوگوں کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتی ہیں آج تو مسٹر پرویز جیسے انگریزی دان تھوڑی بہت عربی پڑھ کر مجتہدین بن جاتے ہیں اور پھر قرآنی آیات کا نعوذ باللہ جھٹکا کرنے لگتے ہیں امام ابوحنیفہ (رح) کا حال امام شافعی (رح) سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے امام مالک (رح) امام احمد (رح) جیسے لوگوں کو اللہ نے کیسی صلاحیتیں بخشی تھیں آج لوگ ان کا اتباع کرتے ہیں اور ان کے فتویٰ پر چلتے ہیں ان حضرات کے امت پر بہت احسانات ہیں اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے انھوں نے قرآن وسنت کی بہت اچھے طریقے سے وضاحت فرمائی ہے مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک مجسم ہدایت ہے جب بھی کوئی اس سے استفادہ حاصل کرنا چاہے گا اس کو مفید پائے گا۔

فرمایا یہ قرآن پاک ہدایت بھی ہے ورحمۃ اور رحمت بھی جو شخص قرآنی اصولوں پر عمل پیرا ہوگا تو اللہ کی رحمت اور مہربانی اس کی طرف متوجہ ہوگی یہ رحمت دنیا میں بھی حاصل ہوگی اور آخرت میں بھی مگر یہ ان لوگوں کے لیے ہے لقوم یومنون جو اس پر ایمان لاتے ہیں ایمان کے بغیر قرآن کریم سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ولایزید الظلمین الا خساراً (بنی اسرائیل) ظالموں کیلئے قرآن کریم ان کے خسارے میں اضافہ کرتا ہے اسی سورۃ میں یہ بھی ہے ومایزیدھم الا نفوراً یہ کتاب ایمان سے محروم لوگوں کے لیے مزید نفرت کا باعث بنتی ہے اسی طرح عنادیوں کے لیے مزید وبال ہے اور بعض کے اندھے پن میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے مقصد یہ کہ یہ کتاب الٰہی اہل ایمان کے لیے منبع ہدایت اور رحمت ہے۔

مصداق کا انتظار

فرمایا جو لوگ اس کتاب پر ایمان نہیں لاتے وہ کس چیز کے منتظر ہیں ھل ینظرون الا تاویلہ یہ منکرین اس کتاب کے اظہار مصداق کا انتظار کر رہے ہیں؟ مگر انھیں خوب سمجھ لینا چاہیے کہ جس دن اس کتاب کی حقیقت تاویل اور مصداق ظاہر ہوگا اس دن افسوس کرنا کچھ کام نہ آئے گا اس کا مصداق تو یہ ہے کہ قیامت واقع ہوجائے اور مکذبین پر عذاب ٹوٹ پڑے تو کیا یہ لوگ قیامت کے منتظر ہیں کہ وہ برپا ہوگی تو قرآن پر ایمان لائیں گے؟ مگر یاد رکھو! یوم یاتی تاویلہ جس دن اس کا مصداق ظاہر ہوجائے گا یقول الذین نسوہ من قبل تو جو لوگ اس سے پہلے اسے فراموش کرچکے ہوں گے وہ اس وقت کہیں گے قد جاءت رسل ربنا بالحق، تحقیق ہمارے رب کے رسول سچی بات لائے تھے اس وقت رسولوں اور کتابوں کا اقرار کریں گے مگر وہ اقرار مفید نہیں ہوگا پھر مایوس ہوکر شفاعت کے طالب ہوں گے اور کہیں گے فھل لنا من شفعاء فیستقعولنا کیا کوئی ہمارا سفارشی ہے جو ہماری سفارش کرے تاکہ ہم کسی طرح بچ جائیں جب کوئی سفارش بھی میسر نہ ہوگی تو تمنا کریں گے او نرد یا ہمیں

دنیامیں واپس پلٹادیا جائے فنعمل غیر الذی کنا نعمل تو وہ کام نہیں کریں گے جو پہلے کیا کرتے تھے یعنی اگر مہلت دیدی جائے تو اللہ کی وحدانیت اور اس کے رسولوں اور کتابوں پر ایمان لے آئیں گے نیکی کے کام کریں گے اور کفر اور شرک سے بیزار ہوں غیر اللہ کی پرستش نہیں کریں گے اہل ایمان سے تمسخر نہیں کریں گے مگر قرآن پاک نے صاف انکار کردیا کہ نہ تو انھیں دنیامیں دوبارہ بھیجا جائے گا اور نہ ان کو کوئی سفارش مفید ہوگی انبیاء، ملائکہ، شہداء، مومنین کوئی مشرک کے حق میں سفارش نہیں کریے گا اور نہ وہ قبول ہوگی سورۃ بقرہ میں ہے "ولا تقفعہا شفاعۃ" کسی کی سفارش مفید نہیں ہوگی دوبارہ دنیامیں آنے کی قرآن نے بار بار نفی کی ہے سورۃ یٰسین میں ہے "الم یروا کم اھلکنا قبلھم من القرون انھم الیھم لایر جعون" کتنے لوگوں کو ہم نے ہلاک کردیا مگران میں سے کوئی بھی پلٹ کر نہیں آئے گا دنیا کی زندگی ایک دفعہ ہی ملتی ہے اور آزمائش بھی ایک ہی مرتبہ ہوتی ہے انسان پاس ہوگیا یا فل، دوبارہ موقع ملنے کا کوئی قانون نہیں ہے بہر حال فرمایا کہ جب تمام پردے اٹھ جائیں گے تو پھر منکرین سفارش تلاش کریں گے یا دنیامیں واپس جانے کی خواہش کا اظہار کریں گے مگران کی کوئی تمنا پوری نہ ہوسکے گی اور وہ عذاب کے مستحق ٹھہریں گے۔

خسارے کا سودا

ایسے بے نصیب لوگوں کے متعلق فرمایا قد خسروا انفسھم بیشک انھوں نے اپنی جانوں کو خسارے میں ڈالا اللہ تعالیٰ نے جسم، جان، روح، عقل، شعور، قویٰ عطا کیے تھے رہنمائی کے لیے انبیاء اور کتابیں بھیجی تھیں اور اس کے بعد فرمایا تھا" فمن شاء فلیو من و من شاء فلیکفی (الکہف) اپنے ارادے سے جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے انکار کردے یہ اس کی اپنی مرضی ہے کہ وہ کس قسم کا سودا کرنا چاہتا ہے ایسے لوگوں کے متعلق جنہوں نے ایمان قبول نہ کیا سورۃ بقرہ میں موجود ہے" فمار بحت تجار تھم "ان کی تجارت نے انھیں کوئی فائدہ نہ دیا اور زندگی کی قیمتی متاع کو خسارے کے سودے میں ضائع کردیا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس تجارت کی وضاحت یوں فرمائی ہے صحیحین کی حدیث میں آتا ہے کل الناس یغدوا قائع نفسہ فمو یقھا اور معتقھاہر شخص ہر روز اپنے نفس کو بیچتا ہے پھر یا تو اسے جہنم کی آگ سے آزاد کرالیتا ہے نیکی کے کام کرتا ہے، ایمان لاتا ہے اور یا پھر کفر اور شرک میں مبتلا ہو کر اپنے نفس کو ہلاک کردیتا ہے یہ ایسی تجارت ہے جو ہر انسان ہر روز کرتا ہے اور پھر جیسی تجارت کرتا ہے اس کے مطابق نفع یا نقصان کا حقدار بنتا ہے سعدی صاحب (رح) نے بھی کہا ہے کہ انسان کی زندگی برف کی ڈلی کی مانند ہے۔

عمر برف است وآفتاب تموز

اندکے ماند وخواجہ غرہ ہنوز

جو کہ مسلسل پگھل رہی ہے مگر صاحب کو پتہ ہی نہیں چل رہا ہے جب برف کی ڈلی دھوپ میں پڑی ہو تو وہ کتنی دیر تک قائم رہ سکے گی انسان کی زندگی کا بھی یہی حال ہے مگر وہ دھوکے میں پڑا ہوا ہے اگر اس نے متاع زندگی سے کوئی اچھی تجارت کرلی کوئی نیکی کمالی، ایمان کی دولت حاصل کرلی تو خسارے سے بچ جائے گا ورنہ مارا جائے گا سورۃ عصر میں واضح طور پر موجود ہے ان الانسان لفی خسر انسان سراسر گھاٹے میں ہے ماسوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، اعمال صالحہ انجام دیے حق کی وصیت کی اور صبر کی وصیت کی ان چار گروہوں کے علاوہ باقی سب نے اپنی جانوں کو خسارے میں ڈالا وضل عنھم مکانو یفترون اور گم ہوگئیں ان سے وہ باتیں جو وہ افتراء کیا کرتے تھے بڑی ڈھینگیں مارتے تھے، غرور وتکبر کرتے تھے سب ختم ہوجائیں گے کوئی چیز باقی نہیں رہے گی اور انھیں اپنے کئے کی سزامل کررہے گی۔

(تفسیر معالم العرفان۔ صوفی عبدالحمید سواتی)

فوائد

1: یعنی قرآن شریف جو ان کی زبان، ان کے ملک میں ہے نازل ہوا جس سے انھیں بہت عزت ملی کہ تمام جہان ان کا دست نگر ہوگیا معلوم ہوا کہ قرآن کریم کے لیے عموماً اور اہل عرب کے لیے خصوصاً بڑی نعمت ہے۔

2: اس سے معلوم ہوا کہ قرآن شریف میں ہر علم تفصیل وار مذکور ہے۔ جسے رب قوت قدسیہ دے وہ اس سے ہر علم حاصل کرسکتا ہے۔

3: حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن کی رحمت عامہ سارے عالم کے لیے ہے کہ اس کی برکت سے دنیا میں ظاہری عذاب آنے بند ہو گئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر رحمت خاصہ اور ہدایت صرف مومنوں کے لیے ہے۔ لہٰذا آیات میں کوئی تعارض نہیں۔ رب حضور کے بارے میں فرماتا ہے۔ رحمۃ للعالمین اور فرماتا ہے وبالمومنین رؤوف رحیم۔ (تفسیر نور العرفان)

آیت مبارکہ:

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝۵۳

لغۃ القرآن: هَلْ : نہیں] [يَنْظُرُوْنَ : وہ سب انتظار کررہے ہیں] [اِلَّا : مگر] [تَاْوِيْلَهٗ : اس کا انجام] [يَوْمَ : وہ دن] [يَاْتِيْ : آئیں گی] [تَاْوِيْلَهٗ : اس کا انجام] [يَقُوْلُ : وہ کہے گا] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [نَسُوْهُ : سب نے بھلا دیا تھا اسے] [مِنْ قَبْلُ : اس سے قبل] [قَدْ : تحقیق] [جَآءَتْ : آجائیں] [رُسُلُ : رسولوں کو] [رَبِّنَا : ہمارے رب] [بِالْحَقِّ : حق کے ساتھ] [فَهَلْ : تو کیا] [لَنَا : ہمارے لیے] [مِّنْ : سے] [شُفَعَآءَ : سفارشیوں] [فَيَشْفَعُوْا : پس وہ سب سفارش کریں] [لَنَآ : ہمارے لیے] [اَوْ : یا] [نُرَدُّ : ہم لوٹا دیے جائیں] [فَنَعْمَلَ : تو ہم عمل کریں گے] [غَيْرَ : نہ] [الَّذِيْ : جو] [كُنَّا : ہم ہوجائیں گے] [نَعْمَلُ : ہم عمل کرتے] [قَدْ : تحقیق] [خَسِرُوْٓا : سب نے نقصان میں ڈال رکھا ہے] [اَنْفُسَهُمْ : اپنے نفسوں کو] [وَضَلَّ : اور جاتے رہے] [عَنْهُمْ : ان کو] [مَا :" اسے " جو] [كَانُوْا : تھے سب] [يَفْتَرُوْنَ : وہ سب گھڑتے رہتے]

ترجمہ: وہ صرف اس (کہی ہوئی بات) کے انجام کے منتظر ہیں، جس دن اس (بات) کا انجام سامنے آجائے گا وہ لوگ جو اس سے قبل اسے بھلا چکے تھے کہیں گے: بیشک ہمارے رب کے رسول حق (بات) لے کر آئے تھے، سو کیا (آج) ہمارے کوئی سفارشی ہیں جو ہمارے لیے سفارش کردیں یا ہم (پھر دنیا میں) لوٹا دیئے جائیں تاکہ ہم (اس مرتبہ) ان (اعمال) سے مختلف عمل کریں جو (پہلے) کرتے رہے تھے۔ بیشک انھوں نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا اور وہ (بہتان وافتراء) ان سے جاتا رہا جو وہ گھڑا کرتے تھے۔

تشریح: اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حق و باطل کو بالکل واضح کردیا ہے۔ اس کے باوجود جن لوگوں نے قرآن کو نظرانداز کردیا کیا وہ اس دن کے انتظار میں ہیں کہ قیامت قائم ہوجائے اور ان کے جرائم کی سزا انھیں سامنے نظر آجائے تو پھر وہ ایمان لائیں گے؟ حالانکہ اس دن جب انھیں اپنا انجام نظر آجائے گا تو وہ انبیائے کرام (علیہم السلام) کے پیغام صداقت اور اپنی افتراپردازیوں کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوجائیں گے اور التجائیں کریں گے کہ آج کوئی ان کی سفارش کردے یا انھیں دنیا میں واپس جانے کا ایک اور موقع دیا جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کریں گے، مگر تب توبہ کا وقت گزر چکا ہوگا اور سوائے پشیمانی کے کچھ حاصل نہ ہوگا، لہٰذا آج حق کا ساتھ دینا ہی فائدہ مند ہے کل کا پچھتانا بے سود ہوگا۔ (تفسیر امداد الکرم)

قرآن مجید کی ہدایت سے روگردانی کرنے اور آخرت کو بھول جانے کا انجام اور جہنمیوں کی حسرتوں کا بیان۔

قرآن مجید میں لفظ تاویل سترہ آیات میں آیا ہے ان مقامات کی تلاوت سے یہ حقیقت عیاں ہوئی ہے کہ یہ لفظ مختلف معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ سورۃ آل عمران آیت ۷ میں تفسیر اور تشریح کے لیے استعمال ہوا۔ سورۃ النساء، آیت : ۵۹ میں نتیجہ اور انجام مراد ہے۔ الاعراف، آیت : ۵۳ سورۃ یونس، آیت : ۳۹ میں ایسے واقعہ کا ظہور پذیر ہونا جس کی کسی رسول یا نبی نے خبر دی ہو۔ سورۃ یوسف میں تین دفعہ خواب کی تعبیر کے معنی میں آیا ہے، سورۃ الکھف، آیت : ۷۸ اور ۸۲ میں کسی کام کے محرک اور سبب کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مندرجہ بالا حوالہ جات میں اس آیت کا حوالہ بھی شامل ہے یہاں دو مرتبہ تاویل کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ انبیاء (علیہ السلام) بیان کیا کرتے تھے۔ اس کا من و عن سچا ثابت ہونا۔

دنیا کے اسباب و وسائل اور ان کی ہوس میں مدہوش ہو کر آخرت کو بھول جانے والے قیامت کے دن جب کھلی آنکھوں سے اپنا انجام اور جہنم کی ہولناکیاں دیکھیں گے تو اس بات کا برملا اظہار کریں گے کہ واقعی ہمارے رب کے فرستادہ رسول قیامت کے بارے میں حق اور سچ فرماتے تھے۔ لیکن ہماری بدبختی کہ ہم نے انکار کر دیا۔ اس اعتراف کے باوجود مجرموں کو اس کا کچھ فائدہ نہیں پہنچے گا پھر وہ بڑی حسرت اور آہ وزاری کے ساتھ اس بات کا اظہار کریں گے کہ کاش آج کوئی سفارش کرنے والا ہماری سفارش کرے تاکہ ہم جہنم سے نجات پائیں یا ہمیں ایک دفعہ دنیا میں واپس لوٹایا جائے تاکہ ہم برے اعمال کے بجائے صالح اعمال کر سکیں۔ یہ فریاد بھی مسترد کر دی جائے گی۔ سورۃ الانعام آیت ۲۷، ۲۸ میں بیان ہوا ہے کاش آپ دیکھیں جب یہ لوگ جہنم کی آگ کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے تو وہ فریاد کریں گے۔ کاش ہمیں واپس لوٹایا جائے اور ہم اپنے رب کی آیات کی تکذیب ہرگز نہ کریں گے اگر انھیں دنیا میں ایک دفعہ لوٹا بھی دیا جائے تو یہ وہی کچھ کریں گے جو پہلے کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ یہ بڑے جھوٹے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچانے والے ہیں۔ (تفسیر فہم القرآن)

ہَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ : کا ہے کی راہ دیکھتے ہیں۔ } یعنی وہ کفار جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلایا، ان کا انکار کیا اور ان پر ایمان نہ لائے وہ صرف اس قرآن کے بیان کئے ہوئے آخری انجام کا انتظام کر رہے ہیں حالانکہ قیامت کے دن جب اس قرآن کا بتایا ہوا انجام آئے گا تو وہ کافر جو اس سے پہلے بھولے ہوئے تھے، نہ اس پر ایمان لاتے تھے اور نہ اس کے مطابق عمل کرتے تھے اقرار کرتے ہوئے بول اٹھیں گی کہ بیشک ہمارے رب عَزَّوَجَلَّ کے رسول جو تعلیمات لائے تھے وہ سب حق تھیں یعنی حشر و نشر، قیامت کے دن اٹھنا اور ثواب و عذاب یہ سب حق ہے۔ لیکن اس وقت ان کا اقرار کوئی فائدہ نہ دے گا اور جب اپنی جانوں کو عذاب میں دیکھیں گے اور یہ نظارہ کریں گے کہ مسلمانوں کی شفاعت ہو رہی ہے اور انبیاء و اولیاء، علماء و صلحاء، چھوٹے بچے، ماہ رمضان اور خانہ کعبہ وغیرہ شفاعت کر رہے ہیں، تب کف افسوس ملتے ہوئے کہیں گے " ہے کوئی جو ہماری بھی سفارش کر دے اور اگر یہ نہیں تو ہمیں دنیا میں ہی واپس بھیج دیا جائے تاکہ پہلے جو اعمال کئے تھے انھیں چھوڑ کر نیک اعمال کر لیں، کفر کی بجائے ایمان لے آئیں، معصیت و نافرمانی کی بجائے اطاعت اور فرمان برداری اختیار کر لیں مگر نہ انھیں کسی کی شفاعت نصیب ہو گی اور نہ دنیا میں واپس بھیجے جائیں گے کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایمان اور عمل کا وقت ضائع کر کے اپنی جانیں نقصان میں ڈالیں اور اب پچھتانے کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں بچا۔

وَضَلَّ عَنۡہُمۡ : اور ان سے کھو گئے۔ } کفار جو کہتے تھے کہ بت خدا کے شریک ہیں اور اپنے پجاریوں کی شفاعت کریں گے، اب آخرت میں انھیں معلوم ہو گیا کہ ان کے یہ دعوے جھوٹے تھے۔

جنتیوں اور جہنمیوں کے احوال بیان کرنے کا مقصد :

اوپر متعدد آیات میں اللہ عَزَّوَجَلَّ نے جنتیوں اور جہنمیوں کے احوال کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے، ان کے مکالمے، جنتیوں کی نعمتیں اور جہنمیوں کے عذاب، جنتیوں کی خوشیاں اور جہنمیوں کی حسرتیں یہ سب چیزیں بیان کی گئیں۔ آیات میں جو کچھ بیان ہوا اس میں بنیادی طور پر مسلمانوں اور کافروں کے انجام کا بیان کیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ اصحاب اعراف کا بھی بیان ہے جن کی نیکیاں اور گناہ برابر ہوں گے۔ اب یہاں مسلمانوں کا ایک وہ گروہ بھی ہو گا جن کے گناہ زیادہ اور نیکیاں کم ہوں گی اور یونہی وہ لوگ بھی ہوں گے جو نیکیوں کے باوجود کسی گناہ پر پکڑے جائیں گے۔ ان تمام چیزوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں اپنی آخرت کی فکر کرنی چاہیے۔ سب سے پہلے تو کفر سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس میں وہ تمام ذرائع مثلاً فلمیں، ڈرامے، مزاحیہ پروگرام اور دینی معلومات کی کمی داخل ہیں جو آج کے زمانے

میں کفریات کا سبب بنتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگرچہ کوئی مسلمان ہمیشہ کیلئے جہنم میں نہیں جائے گا لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ کچھ گناہ گار مسلمان ضرور جہنم میں جائیں گے لہٰذا ہمیں جہنم کے عذاب اور اس کی ہولناکیوں سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ سرکارِ دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سیدُ المعصومین ہیں لیکن اس کے باوجود تعلیم امت کیلئے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عذابِ جہنم سے کس قدر پناہ مانگتے تھے اس کا اندازہ احادیث طیبہ کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ یونہی صحابہ و تابعین اور بزرگان دین بھی ہمیشہ جہنم کے عذاب سے خائف اور لرزاں و ترساں رہتے تھے۔ ترغیب کیلئے یہاں چند احادیث و واقعات پیش خدمت ہیں :

(1)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یوں دعا مانگا کرتے "اللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ عَذَابِ جَہَنَّمَ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ" اے اللہ! عَزَّوَجَلَّ، میں جہنم کے عذاب سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور قبر کے عذاب سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

(2)۔۔ حضرت حُمرَان (رض) فرماتے ہیں، تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (ایک مرتبہ) ان آیات کریمہ :

"اِنَّ لَدَیْنَاۤ اَنْكَالًا وَّ جَحِیْمًا (ۙ۱۲) وَّ طَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّ عَذَابًا اَلِیْمًا (۱۳)"

ترجمہ کنزالعرفان : بیشک ہمارے پاس بھاری بیڑیاں اور بھڑکتی آگ ہے اور گلے میں پھنسنے والا کھانا اور دردناک عذاب ہے۔

کی تلاوت فرمائی تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر غشی طاری ہو گئی۔

(3)۔۔ حضرت بَرَاء بن عازب (رض) فرماتے ہیں کہ "ہم سرکار مدینہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہمراہ ایک جنازہ میں شریک تھے، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قبر کے کنارے بیٹھے اور اتنا روئے کہ آپ کی چشمان اقدس سے نکلنے والے آنسوؤں سے مٹی نم ہو گئی۔ پھر فرمایا "اے بھائیو! اس قبر کے لیے تیاری کرو۔"

(4)۔۔ حضرت سلیمان بن سحیم (رض) فرماتے ہیں "مجھے اس شخص نے بتایا جس نے خود حضرت عمر (رض) کو اس طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کہ آپ (رض) نماز میں جھکتے، اٹھتے اور سوز و گداز کی حالت میں نماز ادا کرتے، اگر کوئی ناواقف شخص آپ (رض) کی اس حالت کو دیکھتا تو کہتا کہ ان پر جنون طاری ہے۔ آپ (رض) کی یہ کیفیت جہنم کے خوف کی وجہ سے اس وقت ہوتی کہ جب آپ یہ آیت :

"وَ اِذَاۤ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَیِّقًا مُّقَرَّنِیْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا (ؕ۱۳)"

ترجمہ کنزالعرفان : اور جب انھیں اس آگ کی کسی تنگ جگہ میں زنجیروں میں جکڑ کر ڈالا جائے گا تو وہاں موت مانگیں گے۔

یا اس جیسی کوئی اور آیت تلاوت فرماتے۔

(5)۔۔ حضرت عبداللہ رومی (رح) فرماتے ہیں "مجھے امیر المومنین حضرت عثمان غنی (رض) کے بارے میں یہ بات پہنچی ہے کہ انھوں نے ارشاد فرمایا : "اگر میں جنت اور جہنم کے درمیان ہوں اور مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ ان میں سے کس کی طرف جانے کا مجھے حکم دیا جائے گا تو میں اس بات کو اختیار کروں گا کہ میں یہ معلوم ہونے سے پہلے ہی راکھ ہو جاؤں کہ میں کہاں جاؤں گا۔

(6)۔۔ ایک انصاری نوجوان کے دل میں جہنم کا خوف پیدا ہوا تو اس کی وجہ سے وہ گھر میں ہی بیٹھ گئے، جب نبیٔ اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے پاس تشریف لائے تو وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعظیم میں کھڑے ہو گئے، پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مقدس سینے سے چمٹ گئے، اس کے بعد ایک چیخ ماری اور ان کی روح پرواز کر گئی، غمگسار آقا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ کرام (رض) سے ارشاد فرمایا : "اپنے بھائی کے کفن دفن کی تیاری کرو، جہنم کے خوف نے اس کا جگر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔

(7)۔۔ حضرت ابو سلیمان دارانی (رح) فرماتے ہیں "(مشہور تابعی بزرگ) حضرت طاؤس (رض) (کا جہنم کے خوف کی وجہ سے یہ حال تھا کہ آپ) سونے کے لیے بستر بچھاتے اور اس پر لیٹ جاتے، پھر ایسے تڑپنے لگتے جیسے دانہ ہنڈیا میں اچھلتا ہے، پھر اپنے بستر کی گدی بنا دیتے، پھر اسے بھی لپیٹ دیتے اور قبلہ رخ ہو کر بیٹھ جاتے یہاں تک کے صبح ہو جاتی اور فرماتے "جہنم کی یاد نے عبادت گزاروں پر نیند حرام کر دی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں جہنم کے عذابات سے ڈرنے اور اپنی آخرت کی فکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ (تفسیر صراط الجنان)

تمہاری بدنصیبی تمہارے انجام کی منتظر ہے

کفر کے نتیجے میں جس طرح کی زندگی وجود میں آتی ہے اس کے فکری رشتوں ' عملی صورتوں اور پھر ان کے انجام کو گزشتہ آیات میں پوری طرح کھول دینے کے بعد روشنی کی ایک کرن دکھائی گئی تھی وہ تھی اللہ کی کتاب جو انسانی زندگی کی بہتری اور کامیابی کی نوید لے کر آئی تھی اس کو پوری طرح بیان کر دینے کے بعد اب فرمایا جا رہا ہے کہ تمہیں نہ کفر کی بدصورتی سوچنے پر مجبور کرتی ہے ' نہ اس کے برے کردار تمہارے رویے میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں اور نہ اس کی کتاب کے پیش کردہ حقائق تمہارے لیے کوئی بھلائی کا راستہ کھولتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اصلاً اس بات کا انتظار کر رہے ہو کہ ہمارے کفر اور ہماری بداعمالیوں کا جو بھی نتیجہ ہو سکتا ہے اور جو انجام بھی ہمارا منتظر ہے وہ سامنے آتا ہے تو آ ہی جائے یعنی تم سوچنے سمجھنے سے اس حد تک معذور ہو گئے ہو اور خیر و شر کے پیمانوں کو اس حد تک توڑ چکے ہو کہ تمہیں اب اس سے بھی غرض نہیں کہ اس کا انجام آخر کیا ہوگا تم تو نشے کے عادی لوگوں کی طرح اپنی بداطواریوں کی افیون کھا کر اس طرح مست ہو چکے ہو کہ تمہیں شاید تمہارا انجام ہی ہلا سکے تو ہلائے ورنہ اور کوئی چیز تمہیں حرکت نہیں دے سکتی لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جس دن وہ انجام تمہارے سامنے آ جائے گا اور اس کی دو صورتیں ممکن ہیں ایک تو یہ کہ اللہ کے عذاب کا کوڑا تم پر برسے اور دوسری صورت یہ ہے کہ قیامت کے دن تم اللہ کی عدالت میں جوابدہی کے لیے کھڑے کیے جاؤ۔ دوسری صورت تو بہرحال ہو کے رہے گی ہو سکتا ہے پہلی صورت پیش آ جائے یعنی دنیا میں ہی اللہ کا عذاب آ جائے تو تم یقین رکھو کہ اس وقت جب تم اپنا انجام اپنے سامنے دیکھو گے تو آج جبکہ تم پچھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتے اور تمہارا تکبر کسی بات کو خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں ہوتا اس دن تم بار بار چیخو گے اور بڑھ بڑھ کر اعتراف کرو گے کہ اللہ کے نبی جو تعلیم تمہارے پاس لے کر آئے تھے وہ بالکل سچ اور حق تھی۔ تم نے اسے قبول نہ کر کے خود اپنی عاقبت تباہ کی لیکن یہ تمہارا اعتراف اس وقت تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ قیامت کے دن تو اس لیے فائدہ پہنچنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا کہ وہ دارالعمل نہیں دارالجزاء ہے۔ عمل کا گھر یہ دنیا ہے جب اس دنیا سے گزر گئے تو عمل کا وقت ختم ہو گیا اور اگر اللہ کا عذاب دنیا میں آ جاتا ہے تو وہ تمہارے لیے موت کا پیغام ہوگا اور موت جب سامنے آ جاتی ہے تو پھر حق کو قبول کرنا بھی فائدہ نہیں دیتا ' ہزار توبہ کی جائے قبول نہیں ہوتی۔ فرعون نے بحر قلزم میں ڈوبتے ہوئے کلمہ پڑھ کر ایمان لانے کی کوشش کی تھی تو حضرت جبرائیل نے تھپڑ مار کر یہ کہا تھا کہ اب تمہیں ایمان کی یاد آئی حالانکہ تم اس سے پہلے نافرمان اور مفسد رہے۔ اب جب کافر دیکھیں گے کہ ان کی توبہ کے قبول ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو پھر اپنے ان شفاعت کرنے والوں کو پکاریں گے دنیا میں جن کے بھروسے پر انھوں نے اسلام کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا تھا پوچھیں گے کہ جن کو ہم نے اللہ کی صفات میں شریک ٹھہرایا کسی کو دیوتا مانا ' کسی کو اوتار ' کہیں بت پرستی ہوتی رہی اور کہیں مظاہر پرستی ان میں سے ایک ایک کو پکاریں گے کہ کیا آج ہماری کوئی سفارش کرے گا یا نہیں جب ادھر سے انھیں مکمل محرومی ہو گی تو پھر وہ آخری درخواست پیش کریں گے کہ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہمیں دنیا میں بھیج کر ایک اور موقع دیا جائے۔ اگر ایسا موقع ہمیں مل جائے تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ اب دنیا میں جا کر ہم اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کریں گے نافرمانی نہیں کریں گے۔ اللہ کی طرف سے آواز آئے گی کہ دنیا میں جہاں تک تمہارے سمجھانے بجھانے کا تعلق ہے وہ حق ادا ہو چکا تم پر پوری طرح اتمام حجت کر دیا گیا لیکن اس وقت تم نے ایک نہ سنی جس کے نتیجے میں تمہارا سب کچھ تباہ ہو گیا اور جو کچھ تم دنیا میں کرتے رہے تھے ان میں سے ایک ایک چیز ہوا میں اڑ گئی ہے اور جو سکہ آخرت میں چل سکتا تھا اسے تم نے ہمیشہ نظر انداز کیا اس لیے آج تمہارے لیے یا ان سب کے لیے جو بھی تمہاری طرح یہ کفر کی زندگی گزار کر ہمارے پاس آئیں گے ناکامیوں اور محرومیوں کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ کاش تم نے دنیا میں ہمارے پیغمبر کی بات سنی ہوتی اس کی پیش کرہ تعلیمات کو قبول کیا ہوتا اور ہمارے آستانے پر سر جھکایا ہوتا اور بجائے فرضی معبودوں کو پکارنے کے اللہ کو پکارا ہوتا تو آج تمہارا یہ انجام نہ ہوتا۔

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے

کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا (تفسیر روح القرآن)

کفار کے اخروی خسارہ کا بیان :

اللہ تعالیٰ نے کفار کی ہدایت کے لیے جو رسول بھیجے تھے اور جو کتابیں نازل فرمائی تھیں، ان رسولوں نے یہ فرمایا تھا کہ اگر تم ایمان نہ لائے تو تم کو سخت عذاب ہوگا۔ اسی طرح آسمانی کتابوں میں بھی یہ وعید بیان کی گئی تھی، یا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے رسولوں نے یہ فرمایا تھا کہ قیامت آئے گی اور سب کچھ فنا ہو جائے گا اور پھر ان کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور ایمان نہ لانے والوں کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ ان وعیدوں کے باوجود کفار ایمان نہ لائے تو ان کے ظاہر حال کے تقاضے سے اللہ تعالیٰ نے

فرمایا کیا وہ ایمان لانے کے لیے اس انتظار میں ہیں کہ وہ وعید واقع ہو جائے یعنی ان پر سخت عذاب آ جائے جو ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دے یا قیامت آ جائے اور ان کا مواخذہ کرکے ان کو دوزخ میں ڈال دیا جائے اور جب وہ وعید واقع ہو جائے گی یعنی قیامت آ جائے گی تو اس وقت وہ اعتراف کریں گے کہ ان کے پاس اللہ کے رسول، اللہ کا سچا پیغام لے کر آئے تھے اور اس وقت وہ اعتراف کریں گے کہ ان کے پاس اللہ کے رسول، اللہ کا سچا پیغام لے کر آئے تھے اور اس وقت وہ صرف دو چیزوں میں سے کسی ایک کی خواہش کر سکیں گے ایک یہ کہ کوئی ان کی اللہ تعالیٰ کے حضور سفارش کرکے ان کی مغفرت کرائے یا ان کو دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے اور وہ دوبارہ دنیا میں جا کر کفر اور شرک اور برے کاموں کی بجائے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے رسولوں کی رسالت کا اقرار کریں لیکن ان میں سے ان کی کوئی خواہش پوری نہیں ہو گی اور سوائے نقصان کے ان کے پلے میں کچھ نہیں رہے گا اور جن جھوٹے خداؤں کی وہ دنیا میں پرستش کرتے تھے، وہ ان کے کسی کام نہ آسکیں گے اور جن باطل مذاہب کو ثابت کرنے لیے وہ دنیا میں سر دھڑ کی بازی لگاتے تھے، ان کا جھوٹ اور باطل ہونا اس دن واضح ہو جائے گا۔ (تفسیر تبیان القرآن)

فوائد

1: اس سے معلوم ہوا کہ جسے حضور سے ایمان نہ ملے اسے اور کسی ذریعہ سے ایمان نہیں مل سکتا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہدایت کا آخری ذریعہ ہیں۔ اور اب حضور کے بعد کوئی نبی نہیں آنے والا۔

2: اس دن سے مراد یا تو ان کی موت کا دن ہے کہ وہ فرشتوں کو دیکھ کر یہ کہیں گے یا قیامت کا دن مگر دوسرا احتمال زیادہ قوی ہے اور آئندہ مضمون کے مناسب۔

3: حضور کا تشریف لانا گویا تمام رسولوں کا تشریف لانا ہے۔ دیکھو عرب میں حضور کے سوا کوئی رسول حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کے وقت سے تشریف نہ لائے مگر یہاں جمع فرمایا گیا۔

4: قیامت میں کفار جب دیکھیں گے کہ مسلمانوں کی شفاعت نبیوں ولیوں علماء چھوٹے بچوں ماہ رمضان خانہ کعبہ وغیرہ نے کی تب کف افسوس ملتے ہوئے یہ کہیں گے اس سے چند مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ مسلمانوں کی شفاعت ہو گی دوسرے یہ کہ کفار کی شفاعت نہ ہو گی۔ تیسرے یہ کہ شفاعت کرنے والے بہت ہوں گے اسی لیے وہ شفاء جمع کے صیغے سے کہیں گے۔ لیکن اول قیامت بے کسی وقت حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سوا شفاعت کوئی نہ کرے گا اسی لیے شفیع المذنبین حضور ہی کا لقب ہے۔ شفاعت کبری حضور ہی کریں گے۔ دروازہ شفاعت آپ ہی کے ہاتھ پر کھلے گا۔ لہٰذا آیت میں تعارض نہیں۔

5: اس طرح کہ ایمان اور نیک اعمال اختیار کریں۔ کفر اور گناہوں سے بچیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان بھی عمل میں سے ہے یعنی عمل قلب، جہاں ایمان کے ساتھ عمل کا ذکر ہو وہاں جسم کے عمل مراد ہوتے ہیں۔

6: اس طرح کہ ایمان و عمل کا وقت ضائع کر بیٹھے اور بعد میں پچھتائے۔

7: معلوم ہوا کہ جھوٹے معبود ان کا ساتھ چھوڑیں گے محبوبین خدا ہم گنہگاروں کا ساتھ نہ چھوریں گے۔ اگر وہ بھی ساتھ چھوڑ دیں تو فرق کیا رہا ہے۔

(تفسیر نور العرفان)

آیت مبارکہ:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا ۙ وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۵۴

لغۃالقرآن: اِنَّ : بیشک] [رَبَّكُمُ : اپنے رب کی] [اللّٰهُ : اللہ] [الَّذِيْ :جو] [خَلَقَ : اس نے پیدا کیے] [السَّمٰوٰتِ : آسمانوں کی] [وَالْاَرْضَ : اور زمین کو] [فِي :میں] [سِتَّةِ :چھ] [اَيَّامٍ :دن] [ثُمَّ : پھر] [اسْتَوٰى :جا ٹھہرا] [عَلَي :پر] [الْعَرْشِ : عرش] [يُغْشِي :وہ ڈھانپتا ہے] [الَّيْلَ :رات کو] [النَّهَارَ :دن کو] [يَطْلُبُهٗ :وہ پیچھے آتا ہے اس کے] [حَثِيْثًا :تیزی سے] [وَّالشَّمْسَ : اور سورج] [وَالْقَمَرَ : اور چاند کو] [وَالنُّجُوْمَ : اور ستاروں کو] [مُسَخَّرٰتٍۢ :وہ تابع کیے ہوئے ہیں] [بِاَمْرِهٖ : اپنے حکم کو] [اَلَا :کیا نہیں] [لَهُ : اس سے] [الْخَلْقُ :پیدا کرنا] [وَالْاَمْرُ : اور حکم] [تَبٰرَكَ :بہت برکت والا ہے] [اللّٰهُ : اللہ] [رَبُّ :رب ہے] [الْعٰلَمِيْنَ :تمام جہانوں کا]

ترجمہ: بیشک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین (کی کائنات) کو چھ مدتوں (یعنی چھ ادوار) میں پیدا فرمایا پھر (اپنی شان کے مطابق) عرش پر استواء (یعنی اس کائنات میں اپنے حکم واقتدار کے نظام کا اجراء) فرمایا۔ وہی رات سے دن کو ڈھانک دیتا ہے (درآنحالیکہ دن رات میں سے) ہر ایک دوسرے کے تعاقب میں تیزی سے لگا رہتا ہے اور سورج اور چاند اور ستارے (سب) اسی کے حکم (سے ایک نظام) کے پابند بنا دیئے گئے ہیں۔ خبردار! (ہر چیز کی) تخلیق اور حکم وتدبیر کا نظام چلانا اسی کا کام ہے۔ اللہ بڑی برکت والا ہے جو تمام جہانوں کی (تدریجاً) پرورش فرمانے والا ہے

تشریح: قیامت کے دن پیش آنے والے عبرت انگیز اور سبق آموز واقعات بیان کرنے کے بعد اب پھر توحید باری کے روشن دلائل پیش فرمائے جارہے ہیں۔ عام طور پر صبح سے لے کر شام تک کے وقت کو یوم (دن) کہا جاتا ہے۔ لیکن یہاں اس وقت کا ذکر ہو رہا ہے جب کہ نہ سورج تھا اور نہ صبح وشام کا وجود تھا۔ اس لیے آیت کریمہ میں یوم سے مراد مطلق وقت ہے۔ اور لفظ یوم کا اطلاق اسی معنی میں عموماً ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔ الیوم یعبر بہ عن وقت طلوع الشمس الی غروبھا وقد یعبر عن مدۃ من الزمان ای مدۃ کانت (مفردات القرآن) اور حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا کہ آیت میں یوم سے مراد وقت کی وہ مقدار ہے جو ہمارے ہزار سال کے برابر ہے۔ وعن ابن عباس ان ھذہ الایام ایام الاخرۃ کل یوم مال سنۃ (نیشاپوری) ویوم عن الستۃ الایام کالف سنۃ مما تعدون (ابن جریر وغیرہ من المفسرین) امام ابن جریر اور دیگر مفسرین نے یہی لکھا ہے کہ یہاں دن سے مراد ایک ہزار سال کی مدت ہے یعنی کائنات ارضی وسماوی کی تخلیق چھ ہزار سال کے عرصہ میں آہستہ آہستہ مختلف مدارج حیات طے کرتے ہوئی۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو چشم زدن میں اس ساری کائنات کو پیدا فرما دیتا۔ لیکن اس کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کی جو جلوہ گری اس تدریج میں ہے وہ اہل فکر و نظر سے پنہاں نہیں۔ اگر کوئی چیز دفعۃً معرض وجود میں آجائے تو گمان ہوسکتا ہے کہ یہ محض اتفاقیہ امر تھا جو از خود ظہور پذیر ہوگیا۔ لیکن اگر کوئی چیز مختلف مدارج طے کرتی ہوئی ضعف سے قوت، خامی سے پختگی اور نقص سے کمال کی طرف تدریجاً بڑھتی چلی جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی حکیم وعلیم ذات ہے جس کی توجہ اور تدبیر سے یہ سب کچھ نمودار ہو رہا ہے۔

سلف صالح کا مسلک تو یہ تھا کہ وہ ایسی آیات کی حقانیت پر ایمان رکھتے لیکن ان میں قیل وقال سے گریز اختیار کرتے۔ جیسے حضرت امام مالک (رح) سے مروی ہے کہ کسی شخص نے آکر اس آیت کا مطلب دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے عرش پر کس طرح استواء فرمایا تو آپ نے تھوڑے سے توقف کے بعد فرمایا۔ الاستواء معلوم والکیف غیر معقول والایمان بہ واجب والسؤال عنہ بدعۃ الخ یعنی ہمیں یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش پر استواء فرمایا لیکن اس کی کیفیت کیا تھی وہ ہمارے فہم سے بالاتر ہے لیکن اس پر ایمان واجب ہے اور اس کے متعلق گفتگو بدعت ہے۔ علماء متاخرین نے اس کے مفہوم کو وضح کرتے ہوئے فرمایا کہ استویٰ کا یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھ گیا۔ کیونکہ وہ مکان اور جلوس سے پاک ہے۔ بلکہ اس کا مدعا یہ ہے کہ کائنات ارضی وسماوی کی باگ ڈور اس اپنے دست قدرت میں تھام لی اور حکم وحکمرانی کو اپنے لیے مخصوص فرمالیا۔ استوی المراد منہ کمال قدرتہ فی تدبیر الملک والملکوت۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے میں چھ دن کیوں صرف کئے؟ جبکہ وہ قادر مطلق ہے اور صرف لفظ کن سے ایک لمحہ میں ساری کائنات پیدا کر سکتا ہے، اور پھر دن سے کتنا وقت مراد ہے؟ کیونکہ سورج ابھی پیدا ہی نہیں ہوا جس کے طلوع و غروب سے دن کا تعین ہوتا ہے، نیز اللہ تعالیٰ کا عرش پر جلوہ گر ہونے سے کیا مراد ہے؟ جبکہ وہ مکان سے پاک ہے، دراصل ان ساری باتوں کی حکمت اور حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا لیکن اگر کسی کام کی حکمت ہماری سمجھ میں نہ آئے تو بھی بغیر کسی تردد کے اس پر ایمان لانا ہمارے لیے فرض ہے۔

(تفسیر امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

چھ دنوں سے کیا مراد ہے ایک قول کے مطابق اس سے مراد چھ دنوں کا وقت ہے یعنی ایک سو چالیس (144) گھنٹے۔ جبکہ حضرت زید بن ارقم (رض) سے مروی ہے کہ چھ دنوں میں سے ہر ایک کی لمبائی ہزار برس ہے۔ (جیسے قیامت کا ایک دن ہزار برس کا ہے) حقیقت اللہ جانتا ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا اے ابوہریرہ! بیشک اللہ نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر عرش پر استواء فرمایا اس نے ہفتہ کو مٹی پیدا کی۔ اتوار کو سب پہاڑ، پیر کو سب درخت، منگل کو پانی، بدھ کو نور اور جمعرات کو سب جانور اور جمعہ کے دن آخری پہر میں (بعد عصر) آدم (علیہ السلام) کو پیدا فرمایا۔ (درمنثور جلد 3 صفحہ 472)

یہاں سے دو فوائد حاصل ہوئے:

(1)۔ اللہ کو عجلت پسند نہیں: وہ قادر مطلق چاہتا تو آن واحد میں ساری کائنات بنا دیتا مگر اس نے چھ دن میں کامکمل کیا تاکہ ہمیں ہر کام ٹھہر ٹھہر کر کرنے کی ہدایت ملے۔

(2)۔ لامذہبیت کارد: یعنی کائنات از خود نہیں بنی بلکہ اللہ نے اپنے حکم سے بنائی ہے۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ فضاء میں کچھ گیسیں جمع ہوئیں پھر وہ از خود پھٹیں تو ان سے سوج، چاند، زمین اور دیگر سیارے بن گئے۔ یہ نظریہ غلط ہے۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ اللہ کے حکم سے گیسیں جمع ہوئیں پھر اس کے حکم سے پھٹیں اور یوں اللہ نے اس سے آسمان و زمین شمس و قمر اور دیگر سیارے بنائے تو بات قابل تسلیم ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں اگر آسمان و زمین کو یکدم پیدا کیا جاتا تو ممکن تھا کوئی کہتا کسی حادثے سے یہ سب کچھ پیدا ہو گیا ہے اسی لیے سب کچھ چھ دنوں یعنی چھ زمانوں میں پیدا کیا گیا۔

[65]۔ استوی علی العرش: کالغوی معنی تو عرش پر قرار پکڑنا ہے جیسے فاستویٰ علی سوقہ۔ یعنی "کھیتی اپنی پنڈلیوں پر سیدھی کھڑی ہو گئی" (فتح: 29)۔ مگر یہ معنی شان رب العزت کے خلاف ہے کیونکہ اللہ کسی چیز پر قرار پکڑنے سے پاک ہے ورنہ وہ عاجز اور حادث ٹھہرا۔ لہٰذا اہل سنت کے نزدیک عرش پر استواء اللہ کی ایک شان ہے جس پر ایمان لازم ہے مگر اس کی حقیقت اللہ ہی جانتا ہے۔

ام المومنین سیدہ ام سلمہ (رض) فرماتی ہیں:

الکیف غیر معقول والاستواء غیر مجھول والاقرار بہ ایمان والجحود بہ کفر، استواء معلوم ہے مگر معنی معلوم نہیں۔ اس پر ایمان لازم ہے اور انکار کفر۔ (درمنثور جلد 3 صفحہ 473)

حضرت امام مالک (رض) سے اس کا معنی پوچھا گیا تو آپ کو پسینہ آ گیا، پھر فرمایا اس پر ایمان لازم ہے مگر اس کی کیفیت نہیں جانی جا سکتی۔ پھر آپ نے سوال کرنے والے کو بدعتی قرار دے کر مجلس سے نکال دیا۔ (درمنثور جلد 3 صفحہ 474) (تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

مسئلہ کو بڑی جامعیت کے ساتھ علامہ غلام رسول سعیدیؒ صاحب نے بیان فرمایا ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: " بیشک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا، پھر وہ عرش پر جلوہ فرما ہوا، وہ رات سے دن کو چھپا لیتا ہے (اور دن) اس کے پیچھے تیزی سے دوڑتا ہے اور سورج اور چاند اور ستارے سب اس کے حکم کے تابع ہیں، سنو پیدا کرنا اور حکم دینا اسی کی شان کے لائق ہے اللہ بہت برکت والا ہے تمام جہانوں کا رب "

اہم اور مشکل الفاظ کے معانی: رب: یہ اصل میں مصدر ہے۔ اس کا معین ہے کسی شئے کو تدریجاً اپنے کمال تک پہنچایا۔ یہ بہ طور اسم فاعل کے مستعمل ہوتا ہے اس کا معنی ہے تمام موجودات کی تربیت اور ان کی مصلحتوں کا متکفل۔ اس لفظ کا بغیر اضافت کے مطلقاً اللہ عزوجل کے غیر کے لیے بولنا جائز نہیں ہے اور اضافت کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر دونوں کے لیے بولنا جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے اس کی مثال ہے: ربکم ورب ابائکم الاولین (الصفت: 126) اور غیر اللہ کے لیے استعمال کی مثال یہ آیت ہے: "اذکرنی عند ربک فانسہ الشیطان ذکر ربہ: اپنے رب (مالک، بادشاہ) کے سامنے میرا ذکر کرنا، پس شیطان نے اس کو بھلا دیا کہ وہ اپنے رب کے سامنے ذکر کرتا" (یوسف: 42)

اللہ: یہ اس کا اسم ذات (علم) ہے جو واجب الوجود ہے، تمام عبادتوں کا مستحق ہے، اور اس کی ہر صفت قدیم بالذات ہے، وحدہ لاشریک ہے وہ تمام مخلوق کا خالق ہے اور تمام کمالات کا جامع ہے اور ہر قسم کا عیب اور نقص اس کے حق میں محال ہے، یہ نام اس کے ساتھ مخصوص ہے، اس کے علاوہ کسی اور کا یہ نام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ھل تعلم لہ سمیا: کیا تم اس نام کا کوئی اور شخص جانتے ہو؟" (مریم: 65)

فی ستتۃ ایام: ایام یوم کی جمع ہے۔ اس سے مراد طلوع شمس سے غروب شمس تک کا وقت ہے۔ اور کبھی اس سے مطلقاً زمانہ کی مدت مراد ہوتی ہے، خواہ وہ کتنی ہی مدت ہو۔ (المفردات: ج2، 720)

علامہ زبیدی نے لکھا ہے کہ یوم کا مشہور معنی ہے طلوع شمس تک کی مقدار، اور صحیح کے نزدیک ایک طلوع شمس سے لے کر دوسرے طلوع شمس تک کی مقدار یوم ہے یا ایک غروب سے لے کر دوسرے غروب تک کی مقدار، اور مطلقاً زمانہ کے معنی میں بھی یوم کا استعمال ہوتا ہے۔ (تاج العروس، ج9، ص115، مطبوعہ مصر)
ستۃ ایام (چھ دن) اس سے مراد ہے ایام دنیا میں سے چھ دنوں کی مقدار۔ کیونکہ وہاں سورج کا طلوع اور غروب نہیں تھا۔ اللہ تالیٰ چاہتا تو ایک لمحہ میں سات آسمان اور سات زمینیں پیدا فرما دیتا لیکن اللہ تعالیٰ نے اطمینان اور تدریج کی تعلیم کے لیے تمام آسمانوں اور زمینوں کو چھ دن میں پیدا فرمایا۔

استوی: لغت میں اسواء کا معنی ہے کسی چیز کا کسی چیز سے بلند ہونا۔ کسی چیز کا کسی چیز پر بیٹھنا۔ نیز اس کا معنی ہے کسی چیز کا قصد کرنا۔ کسی شئے کا معتدل ہونا، اللہ تعالیٰ کے استواء کا معنی ہے اس کی زات اور صفات کا ہر چیز سے بلند ہونا۔ اللہ تعالیٰ کا اپنی شان کے لائق عرش پر جلوہ فرما ہونا۔

عرش: بادشاہ کا تخت: گھر کی چھت کو بھی عرش کہتے ہیں۔ چھپّر کو بھی عرش کہتے ہیں۔ امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ اللہ کے عرش کی حقیقت کو کوئی شخص نہیں جانتا ہم صرف اس کا نام جانتے ہیں۔ ایک قوم نے یہ کہا ہے کہ فلک اعلی عرش ہے اور کرسی فلک الکوکب ہے۔ اور اس پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے: امام بیہقی اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوذر (رض) نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا: یارسول اللہ! یارسول اللہ! آپ پر سب سے عظیم آیت کون سی نازل ہوئی ہے؟ آپ نے فرمایا: آیۃ الکرسی! پھر آپ نے فرمایا: اے ابوذر! سات آسمان کرسی کے مقابلہ میں ایک انگوٹھی کی طرح ہیں جو کسی جنگل کی زمین میں پڑی ہو۔ اور عرش کی کرسی پر فضیلت اس طرح ہے جیسے جنگل کی زمین کی فضیلت اس انگوٹھی پر ہے۔ (الاسماء والصفات، ج405، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت) (المفردات، ج2، ص429، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، 1418ھ)

قدیم فلاسفہ کا یہ قول تھا کہ آسمان نو ہیں اور ہر اوپر والا آسمان نچلے آسمان کو اس طرح محیط ہے جس طرح پیاز کے چھلکے ایک دوسرے کو محیط ہوتے ہیں۔ نواں آسمان فلک الافلاک ہے۔ تمام ثوابت (غیر متحرک ستارے) اس میں مرکوز ہیں۔ اور آٹھواں آسمان فلک اطلس ہے۔ پھر ہر آسمان میں سات سیاروں میں سے ایک سیارہ مرکوز ہے اور ان سیاروں کی یہ ترتیب ہے: زحل، مشتری، مریخ شمس، زہرہ، عطارد اور قمر، اور شریعت میں سرف سات آسمانوں کا ذکر ہے۔ جن علماء نے اطلاقات شرعیہ کو فلاسفہ کے اقوال کے مطابق کرنے کا قصد کیا انھوں نے کرسی کو آٹھوں آسمان اور عرش کو نواں آسمان قرار دیا۔ لیکن یہ عبث کوشش ہے کیونکہ فلاسفہ کے اقوال کسی یقینی دلیل پر مبنی نہیں ہیں بلکہ وہ صرف ظن، تخمین، وہم اور قیاس پر مبنی ہیں۔ جبکہ وحی دلیل قطعی ہے۔ اس لیے وحی الٰہی کو یونانی فلسفیوں کے اقوال کے تابع کرنا صحیح نہیں ہے۔ نیز یہ واضح رہے کہ قدیم فلسفہ یونان اور چیز ہے اور سائنس اور چیز ہے۔ فلاسفہ کے نظریات ان کے عقلی اور وہمی دلائل پر مبنی ہوتے ہیں جبکہ سائنس کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر ہے۔ جس قدر ایجادات ہوئی ہیں، برقی آلات، برقی سواریاں، برقی ساز وسامان، ریڈیو، ٹی، وی، ٹیلی فون اور مختلف امراض ایلوپیتھک دوائیں اور طبّی آلات اور شوگر، بلڈ پریشر اور کلسٹرول ناپنے کے پیمانے۔ یہ سب سائنس کی بدولت حاصل ہوئے ہیں ان میں سے کوئی چیز فلسفیوں کے

اقوال سے حاصل نہیں ہوئی۔ سائنس دان اپنے حساب کتاب کے ذریعہ کئی سال پہلے بتا دیتے ہیں کہ فلاں مہینہ کی فلاں تاریخ کو فلاں وقت پر سورج یا چاند گرہن لگے گا اور اتنی دیر تک رہے گا اور فلاں فلاں ملک میں فلاں فلاں وقت پر نظر آئے گا اور فلاں فلاں ملک میں نظر نہیں ائے گا اور آج تک اس کے سر مو خلاف نہیں ہوا۔ اسی طرح جب وہ چاند کی طرف راکٹ چھوڑتے ہیں تو بتا دیتے ہیں کہ اس کا آخری کیپسول جس میں خلا نورد ہوتے ہیں، وہ فلاں تاریخ کو اتنے بجے سمندر کے فلاں علاقہ میں گرے گا اور کبھی اس کے خلاف نہیں ہوا۔

یہ سب کچھ ایک کمپیوٹرائزڈ نظام کے تحت ہو رہا ہے۔ اور یہ سب صحیح حساب و کتاب اور سائنس کا کرشمہ ہے۔ بعض لوگ جو فلسفہ اور سائنس کا فرق بھی نہیں جانتے، وہ یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ پہلے سائنس دان کہتے تھے کہ سورج اور چاند ساکن ہیں اور اب کہتے ہیں کہ متحرک ہیں۔ اس لیے سائنس کے مطابق قرآن مجید کی تفسیر کرنا صحیح نہیں ہے۔ وہ کل کچھ کہتی ہے، آج کچھ کہتی ہے۔ حالانکہ یہ لوگ نہیں جانتے کہ فلسفہ ایک نظریہ ہے اور سائنس تجربہ اور مشاہدہ ہے اور آج دنیا کے ہر شعبہ میں ترقی سائنس کی بنیاد پر ہے۔ اور قرآن مجید کی کوئی تصریح سائنس کے خلاف نہیں ہے۔ اسی طرح رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کوئی ارشاد جو صحیح سند سے ثابت ہو، سائنس کے خلاف نہیں ہے۔ اور اگر کوئی ضعیف روایت سائنس کے خلاف ہو تو اس کا سبب اس متن کا ضعف نہیں ہے۔ بلکہ اس سند کا ضعف ہے۔ نیز ہم سائنس کے تابع ہو کر قرآن مجید کی تفسیر کرنا صحیح نہیں ہے۔ وہ کل کچھ کہتی ہے، آج کچھ کہتی ہے۔ حالانکہ یہ لوگ نہیں جانتے کہ فلسفہ ایک نظریہ ہے اور سائنس تجربہ اور مشاہدہ ہے اور آج دنیا کے ہر شعبہ میں ترقی سائنس کی بنیاد پر ہے۔ اور قرآن مجید کی کوئی تصریح سائنس کے خلاف نہیں ہے۔ اسی طرح رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کوئی ارشاد جو صحیح سند سے ثابت ہو، سائنس کے خلاف نہیں ہے۔ اور اگر کوئی ضعیف روایت سائنس کے خلاف ہو تو اس کا سبب اس متن کا ضعف نہیں ہے۔ بلکہ اس سند کا ضعف ہے۔ نیز ہم سائنس کے تابع ہو کر قرآن مجید کی تفسیر نہیں کرتے بلکہ سائنس کے ذریعہ قرآن مجید کی حقانیت کا اظہار کرتے ہیں کہ جو بات اب سائنس سے ثابت ہوئی ہے، وہ بہت پہلے قرآن مجید نے بتا دی تھی۔ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ جو لوگ سائنس کے مخالف ہیں، وہ اپنی عام زندگی میں بلکہ عبادات میں بھی سائنسی ایجادات سے استفادہ کرتے ہیں۔ پٹرول کاروں، بسوں، ریل گاڑیوں اور ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہیں۔ بجلی کی روشنی اور پنکھوں سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ ٹیلی فون اور ٹیلی گراف سے فائدہ اٹھاتے ہیں، مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر پر تقریریں کرتے ہیں اور گھڑیوں کے حساب سے نماز پڑھاتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی کے اعلانات سے یا گھڑیوں کے حساب سے سحر اور افطار کرتے ہیں۔ رمضان، عید الفطر، عید الاضحیٰ اور حج کے مہینوں کا علم بھی ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کے ذریعہ ہوتا ہے اور ان سب کا ثبوت سائنسی تحقیقات کا مرہون منت ہے۔ یا تو یہ لوگ اب سے ایک ہزار سال پہلے کے طور طریقوں کے مطابق زندگی بسر کریں یا پھر سائنس کے اصولوں پر اعتراض کرنا چھوڑ دیں۔ (تفسیر تبیان القرآن)

قرآن کریم نے مادی کائنات کے آغاز و انجام کا ایک خاص تصور دیا ہے۔ یہ تصور ڈیڑھ سو برس پہلے تک انسان کے لیے بالکل نامعلوم تھا۔ یقیناً نزول قرآن کے زمانے میں تو اس کا شاید تصور بھی کسی انسان کے لیے محال تھا۔ مگر جدید کائنات کے علم نے حیرت انگیز (کسی مسلمان کے لیے تو یہ بالکل حیرت انگیز نہیں ہے۔ ہاں غیر مسلموں کے لیے ضرور ہو سکتا ہے) طور پر اس کی تصدیق کی ہے۔

قرآن کریم میں مظاہر فطرت، تخلیق اور دیگر اہم موضوعات کا تذکرہ ایک مسلسل اور مربوط انداز کی بجائے پورے قرآن میں پھیلا ہوا۔ جس کا مقصد موقعہ محل کے مطابق اس سے اللہ کی توحید کا استدلال کرنا ہے۔ چنانچہ متعدد سورتوں میں پھیلے ہوئے اجزا کو یکجا کر کے ہم تخلیق کائنات اور سماوات وارض کے مختلف ارتقائی مراحل کا قرآنی تصور حاصل کر کے جدید سائنسی تحقیقات سے ان کا موازنہ کر سکتے ہیں۔

ان آیات سے تخلیق کے چند نکات بالکل واضح ہیں۔

۱۔ عام تخلیق کے لیے چھ ادوار کا ہونا۔ (جن کا دورانیہ اربوں کھربوں سالوں پر محیط ہے، صحیح علم تو اللہ ہی کے پاس ہے۔)

۲۔ آسمان اور زمین کے وجود کا آپس میں جڑا ہونا۔

۳۔ کائنات کی تخلیق ابتدائی نوعیت کے ایسے مادے سے جو ایک بڑے تودے کی شکل میں تھا اور بالآخر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

۴۔ آسمانوں اور زمینوں کے درمیان مخلوق کی تخلیق۔

۵۔آسمانوں اور زمینوں کا مقررہ وقت پر طے شدہ وقت کے مطابق وخاتمہ۔

تشکیل کائنات سے متعلق چند جدید سائنسی معلومات

کائنات کی ابتداء

Big Bang Teory

انیسویں صدی کے نصف اول میں چند علماء یورپ کا یہ خیال تھا کہ شاید کائنات ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ لیکن جدید سائنسی تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ کائنات ہمیشہ سے موجود نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی ایک ابتدا ہے اور اس کا ایک انجام بھی مقدر ہے۔

جدید طبیعات کا ایک قانون (Second law of the rmodynamics) "احرکیات حرارت کا دوسرا قانون" ہے۔اس کا ایک ضمنی قانون جسے "ضابطہ ناکارگی" (Law of enterophy) کہا جاتا ہے۔ ثابت کرتا ہے کہ کائنات ہمیشہ سے موجود نہیں ہو سکتی۔ یہ قانون بتاتا ہے کہ حرارت، مسلسل، باحرارت وجود سے بے حرارت وجود میں منتقل ہوتی رہتی ہے مگر اس چکر کو الٹا نہیں چلایا جاسکتا کہ خود بخود حرارت، کم حرارت والے جسم سے زیادہ حرارت والے جسم میں منتقل ہونے لگے۔ ناکارگی دستیاب توانائی (Available Energy) اور غیر دستیاب توانائی (Unavailable Energy) کے درمیان تناسب کا نام ہے اور اسی بناپر کہا جاسکتا ہے کہ کائنات کی ناکارگی مسلسل بڑھ رہی ہے۔ اور ایک وقت ایسا آنا مقدر ہے جب تمام موجودات کی حرارت یکساں ہو جائے گی اور کوئی کارآمد توانائی باقی نہیں رہے گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کیمیائی اور طبعی عمل کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور زندگی بھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گی۔ لیکن اس حقیقت کے پیش نظر کہ کیمیائی اور طبعی عمل جاری اور زندگی کے ہنگامے قائم ہیں یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ کائنات ازل سے موجود نہیں۔ وگرنہ اخراج حرارت کے لازمی قانون کی وجہ سے اس کی توانائی کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی اور یہاں زندگی کی ہلکی سی رمق بھی موجود نہ ہوتی۔ اسی جدید تحقیق کا حوالہ دیتے ہوئے ایک امریکی عالم حیوانات (Edward Futher Kesel) لکھتا ہے:

"اس طرح غیر ارادی طور پر سائنس کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ کائنات اپنا ایک آغاز (Beginning) رکھتی ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے اس نے خدا کی صداقت کو ثابت کر دیا ہے۔ کیونکہ جو چیز اپنا آغاز رکھتی ہو وہ اپنے آپ شروع نہیں ہو سکتی۔ یقیناً وہ ایک محرکِ اول، ایک خالق، ایک خدا کی محتاج ہے۔" (The evidence of God , p51) چنانچہ کائنات کے وجود میں آنے کا مسلمہ جدید ترین نظریہ یہ ہے کہ ابتداًمادہ مرکوز اور مجتمع (Concentrated and Condensed) حالت میں تھا۔

(اَوَلَمۡ یَرَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ کَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰہُمَا ؕ وَ جَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ) [سورۃ الانبیاء : ۳۰]

"کیا کافروں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ ارض و سماوات آپس میں گڈمڈ تھے پھر ہم نے انھیں الگ الگ کیا اور ہر جاندار چیز کو پانی سے زندگی بخشی کیا پھر بھی یہ لوگ (اللہ تعالیٰ کی خلاقی) پر ایمان نہیں لاتے؟"

یہ مادہ بالکل توازن کی حالت میں تھا اس میں کسی قسم کی کوئی حرکت نہ تھی پھر اچانک یہ ایک عظیم دھماکہ (Big Bang) (یہ عظیم دھماکہ ایک اندازہ کے مطابق 15 کھرب سال پہلے ہوا) سے پھٹ پڑا اور اس نے ایک عظیم گیسی بادل یا قرآن کے لفظ میں دخان (ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ وَ ہِیَ دُخَانٌ) کی صورت اختیار کر لی۔ سائنس کی یہ دریافت قرآنی بیان کی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔ یہ گیسی بادل بہت عظیم الجثۃ تھا اور آہستہ آہستہ گردش کر رہا تھا۔ یہ عظیم سدیم (Primery nebula) انجام کار متعدد ٹکڑوں میں بٹ گیا جن کی لمبائی چوڑائی اور مقدار مادہ بہت ہی زیادہ تھا۔ نجمی طبیعات (Astrophysicist) کے ماہرین اس کی مقدار کا اندازہ سورج کے موجودہ مادہ کے ایک ارب سے لگا کر ایک کھرب گنا تک لگاتے ہیں۔ ان اعداد سے ابتدائی گیسی مقدار مادہ (Hydrogen and Helium) کے ان ٹکڑوں کے عظیم جثوں کا کچھ تصور ملتا ہے جن سے بعد میں عمل انجماد (Condensation) کے ذریعے کہکشائیں وجود میں آئیں۔

وسعت کائنات

یہ کائنات جس کا ابھی تک انسان احاطہ نہیں کر سکا ہے اتنی وسیع ہے کہ اس کو تصور میں لانا ہی مشکل ہے اگر ساری دنیا کے ریگستانوں اور سمندروں کے کنارے پائی جانے والی ریت اکٹھی کر لی جائے تو ریت کے اس عظیم ڈھیر میں جتنی حیثیت، ریت کے ایک ذرے کی ساری ریت کے مقابلے میں بنتی ہے کائنات کے مقابلے میں ہماری زمین کی شاید اتنی حیثیت بھی نہیں بنتی۔ اگر ہم ایک خیالی جہاز تصور کریں جو روشنی کی ہیبت ناک رفتار یعنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ (1,86,000 Miles/Sec) کی رفتار سے سفر کر سکتا ہو کائنات کے گرد گھومے تو اس ہوائی جہاز کو پورا چکر لگانے میں ایک ارب سال لگیں گے۔ پھر بھی ہمارا یہ فرضی جہاز کبھی کائنات کا چکر مکمل نہ کر سکے گا کیونکہ اتنی وسعت کے باوجود یہ کائنات ٹھہری ہوئی نہیں بلکہ غبارے کی طرح پھیل رہی ہے اور اس کے پھیلنے کی رفتار اتنی ہے کہ ہر 130 کروڑ سال بعد کائنات کے تمام فاصلے دگنے ہو جاتے ہیں۔ کائنات کا یہ پھیلاؤ جدید سائنس کی سب سے مرعوب کن دریافت اور اب یہ ایک نہایت مستحکم تصور ہے اور بحث صرف اس بات پر مرکوز ہے کہ یہ امر کس طرح انجام پا رہا ہے۔ جبکہ قرآن نے 14,00 سال پہلے اس کا انکشاف کر دیا تھا۔

(وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ) [سورۃ الذاریات: ۴۷]

"آسمان کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اور ہم ہی اس میں توسیع کر رہے ہیں۔"

نزول قرآن کے وقت کسی بھی شخص کے لیے ناممکن تھا کہ وہ وسعت کائنات کا مطالعہ و مشاہدہ کر سکتا ہو۔ چنانچہ سائنس کی یہ دریافت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ قرآن خالق کائنات یعنی اللہ کا کلام ہے۔

نظام شمسی اور کہکشائیں

نظام شمسی ایک ایسے نظام کو کہتے ہیں جس کے مرکز میں ایک سیارہ ہو اور اس کے گرد مختلف سیارے اپنے اپنے مداروں میں چکر لگا رہے ہوں۔ چنانچہ کائنات کے جس نظام شمسی میں ہم رہتے ہیں اس کے مرکز میں سورج ہے اور اس کے گرد بشمول ہماری زمین ۹ سیارے چکر لگا رہے ہیں۔ صرف اس نظام کی وسعت کا یہ حال ہے کہ سورج کی (یاد رہے کہ روشنی 1,86,000 میل فی سیکنڈ کی تیز ترین رفتار سے سفر کرتی ہے) روشنی کو اپنے بعید ترین سیارے یعنی پلوٹو (Pluto) جو کہ اعداد میں دیکھیں تو سورج سے تین ارب سر سٹھ کروڑ بیس لاکھ میل (3,66,2000000) دور ہے، کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں اور پلوٹو سورج کے گرد ساڑھے سات ارب میل کے دائرے میں چکر لگا رہا ہے۔ ہماری زمین جو سورج سے ساڑھے نو کروڑ میل دور ہے اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتی ہے۔ سورج کے گرد انیس کروڑ میل کا دائرہ ہے جو ایک سال میں پورا ہوتا ہے۔ یہ تمام سیارے اپنے سفر میں اس طرح مصروف ہیں کہ ان کے گرد اکتیس چاند بھی اپنے اپنے سیاروں کے گرد گھوم رہے ہیں۔ ان کے علاوہ تیس ہزار چھوٹے سیاروں (Asteroids) کا ایک حلقہ، ہزاروں دمدار ستارے (Comets) اور لاکھوں شہاب ثاقب ہیں جو اسی طرح گردش میں مصروف ہیں۔ ان سب کے درمیان میں سورج ہے جس کا قطر (Diameter) آٹھ لاکھ پینسٹھ ہزار میل ہے اور وہ زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا ہے، پھر یہ سورج خود بھی رکا ہوا نہیں۔ سورج کس طرح سفر کر رہا ہے؟ کیلیفورنیا کی ایک رصدگاہ کے ڈائریکٹر آر جی ایٹکن کا اندازہ ہے کہ سورج اپنے نظام شمسی سمیت اپنی کہکشاں کے ساتھ چوبیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کسی نامعلوم منزل کی طرف جا رہا ہے۔ جو جدید انکشاف کے مطابق سورج مجمع النجوم شلیاق کے مرکز جس کو Solar Apex کا گیا ہے کی طرف جا رہا ہے۔ یہ دریافت بھی قرآن کی صداقت کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے جیسا کہ قرآن نے چودہ صدیاں قبل ہی یہ اعلان کر دیا تھا۔

(وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ) [یس: ۳۸]

"اور سورج اپنی مقررہ گزرگاہ پر چل رہا ہے یہ زبردست علیم ہستی کا مقرر کردہ اندازہ ہے۔"

علمائے فلکیات کے ایک جدید اندازے کے مطابق ہر کہکشاں (Galaxy) میں دو کھرب ستارے ہیں اور اب تک معلوم کائنات میں تقریباً دو کھرب یہ کہکشائیں ہیں۔ جو کہکشاں ہم سے قریب ترین ہے وہاں سے روشنی کو ہم تک پہنچنے میں تقریباً نو لاکھ سال لگ جاتے ہیں۔ یہ کہکشاں مراۃ السلسلہ (Andromida) نامی مجمع النجوم میں واقع ہے۔ لہٰذا روشنی کو ان ستاروں سے جو معلوم سماوی جہاں کے اس سرے پر واقع ہیں ہم تک پہنچنے میں اربوں سال لگ جاتے ہیں۔ کائنات کی پہنائیاں اس قدر وسیع ہیں کہ ان کی پیمائش کے لیے خاص اکائیاں مثلاً نوری سال اور پارسک وغیرہ وضع کی گئیں ہیں۔ نوری سال یا سال نوای اس فاصلہ کو کہتے ہیں جو روشنی

ایک سال میں طے کرتی ہے اور یہ تقریباً 58 کھرب ستر ارب میل کے برابر ہوتا ہے اور پارسک 3.26 نوری سال یا ایک نیل 92 کھرب میل کے لگ بھگ ہے۔
(فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخَالِقِيۡنَ)

کائنات کی ان وسعتوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ اس حدیث میں ذرا بھی مبالغہ نہیں جس میں بتایا گیا ہے وہ آخری آدمی جسے اللہ تعالیٰ دوزخ سے نکال کر جنت میں بھیجے گا اور اسے وہ وسیع و عریض باغ دکھا کر کہا جائے گا یہ سب تمہارا ہے تو وہ حیران ہو کر کہے گا۔" یا اللہ تو اللہ ہو کر مجھ سے مذاق کرتا ہے۔" طرّہ پھر اس پہ یہ کہ یہ کہکشائیں بھی ٹھہری ہوئی نہیں ہیں بلکہ اپنے محور پر گردش کر رہی ہیں۔ چنانچہ وہ کہکشاں جس میں ہمارا نظام شمسی واقع ہے اس کا اپنے محور پر ایک دور 20 کروڑ سال میں پورا ہوتا ہے۔ یہ ساری حرکتیں اور گردشیں حیرت انگیز طور پر نہایت تنظیم اور باقاعدگی کے ساتھ ہو رہی ہیں۔ نہ ان میں باہم کوئی ٹکراؤ ہوتا ہے اور نہ رفتار میں کوئی فرق پڑتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق Big Bang کے وقت اگر مادے کے پھیلنے کی رفتار میں ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے لاکھویں حصے جتنا بھی فرق پڑ جاتا تو ساری کائنات آپس میں ٹکرا کر درہم برہم ہو جاتی ! (سُبۡحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمۡدِهٖ سُبۡحَانَ اللّٰهِ الۡعَظِيۡمِ)

یہ نظام اس حد تک مربوط اور مستند (Accurate) ہے کہ ایک کہکشانی نظام جو اربوں متحرک ستاروں پر مشتمل ہوتا ہے دوسرے کہکشانی نظام میں حرکت کرتا ہوا داخل ہوتا ہے اور پھر اس سے نکل جاتا ہے مگر باہم کسی قسم کا ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا ! اس عظیم اور حیرت انگیز نظام کو دیکھ کر انسانی عقل بے اختیار اعتراف کرتی ہے کہ کوئی تو ہے، زبردست، غیر معمولی طاقت اور علم والا جس نے اس اتھاہ نظام کو قائم کر رکھا ہے۔

یہاں پر یہ واقعہ باعث بصیرت و تقویت ایمان ہوگا جس کا تعلق مشہور ماہر فلکیات سر جیمز جینز (Sir James Jeans) England (1877-1946) سے ہے۔ موصوف مشہور کتاب (The Mysterious Universe) کے مصنف ہیں۔ اس واقعہ کو علامہ عنایت اللہ مشرقی نے بیان کیا ہے انھی کے الفاظ میں سنیے۔

" 1909 کا ذکر ہے، اتوار کا دن تھا اور زور کی بارش ہو رہی تھی۔ میں کسی کام سے نکلا تو جامعہ کیمبرج کے مشہور ماہر فلکیات سر جیمز جینز پر نظر پڑی جو بغل میں انجیل دبائے چرچ کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے قریب ہو کر سلام کیا۔ انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوبارہ سلام کیا تو متوجہ ہوئے اور کہنے لگے تم کیا چاہتے ہو؟ میں نے کہا دو باتیں۔ اول یہ کہ زور سے بارش ہو رہی ہے اور آپ نے چھتری بغل میں دبا رکھی ہے۔ سر جیمز جینز اپنی بدحواسی پر مسکرائے اور چھاتہ تان لیا۔ دوم یہ کہ آپ جیسا شہرہ آفاق آدمی گرجا میں عبادت کے لیے جا رہا ہے۔ یہ کیا؟ میرے اس سوال پر پروفیسر جیمز جینز لمحہ بھر کے لیے رک گئے اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔ "آج شام کی چائے میرے ساتھ پیو" چنانچہ شام کو میں ان کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ ٹھیک 4 بجے لیڈی جیمز باہر آ کر کہنے لگیں : " سر جیمز تمہارے منتظر ہیں" اندر گیا تو ایک چھوٹی میز پر چائے لگی ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب تصورات میں کھوئے ہوئے تھے۔ کہنے لگے : " تمہارا سوال کیا تھا؟" میرے بولنے کا انتظار کیے بغیر ہی اجرام فلکی کی تخلیق، ان کے حیرت انگیز نظام، بے انتہا پہنائیوں اور فاصلوں، ان کی پیچیدہ راہوں اور مداروں نیز باہمی کشش اور طوفان ہائے نور پر وہ ایمان افروز تفصیلات پیش کیں کہ میرا دل اللہ کی اس داستان کبریا اور جبروت پر دہلنے لگا، اور ان کی اپنی کیفیت یہ تھی کہ سر کے بال سیدھے اٹھے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے حیرت و خشیت کی دو گونہ کیفیتیں عیاں تھیں، اللہ کی ہیبت اور دانش سے ان کے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے اور آواز لرز رہی تھی۔ فرمانے لگے، عنایت اللہ خاں ! جب میں خدا کے تخلیقی کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو میری ہستی اللہ کے جلال سے لرزنے لگتی ہے اور جب میں کلیسا میں خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر کہتا ہوں " تو بہت بڑا ہے" تو میری ہستی کا ذرہ ذرہ میرا ہم نوا بن جاتا ہے۔ مجھے بے حد خوشی اور سکون نصیب ہوتا ہے۔ مجھے دوسروں کی نسبت عبادت میں ہزار گنا زیادہ کیف ملتا ہے کہو عنایت اللہ خاں ! تمہاری سمجھ میں آیا کہ میں گرجے کیوں جاتا ہوں؟"

علامہ مشرقی کہتے ہیں کہ پروفیسر جیمز کی اس تقریر نے میرے دماغ میں عجیب کہرام مچا دیا۔ میں نے کہا : " جناب والا آپ کی روح افروز تفصیلات سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔ اس سلسلے میں قرآن پاک کی ایک آیت یاد آئی ہے اگر اجازت ہو تو پیش کروں۔" فرمایا ضرور چنانچہ میں نے یہ آیت پڑھی۔
(وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالۡاَنۡعَامِ مُخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهٗ كَذٰلِكَ اِنَّمَا يَخۡشَى اللّٰهَ مِنۡ عِبَادِهِ الۡعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ غَفُوۡرٌ) [سورۃ فاطر : ۲۸]

" اور اسی طرح انسانوں، جانوروں اور مویشیوں کے لیے بھی رنگ مختلف ہیں بلاشبہ اللہ کے بندوں میں سے اس سے ڈرتے وہی ہیں جو علم رکھنے والے ہیں اللہ تعالیٰ یقیناً ہر چیز پر غالب اور بخشنے والا ہے۔"

آیت سنتے ہی پروفیسر بولے "کیا کہا ! اللہ سے صرف اہل علم ڈرتے ہیں۔ حیرت انگیز، بہت عجیب، یہ بات جو مجھے ۵۰ برس کے مسلسل مطالعہ و مشاہدہ کے بعد معلوم ہوئی، محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کس نے بتائی۔ کیا قرآن میں واقعی ہی یہ آیت موجود ہے؟ اگر ہے تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) امی تھے، انھیں یہ عظیم حقیقت خود بخود معلوم نہیں ہو سکتی۔ انھیں یقیناً اللہ نے بتائی تھی۔ بہت خوب بہت عجیب۔" (بحوالہ: "ماہنامہ نقوش") (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

یغشی اللیل النہار : وہ رات سے دن کو چھپالیتا ہے۔

حثیثا : حث کا معنی کسی کو برانگیختہ کرنا ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ دن رات کو جلد طلب کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت پر دلیل : اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے آخرت کے احوال بیان فرمائے تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت پر دلائل بیان فرمائے ہیں تاکہ ان دلائل میں غور و فکر کرکے اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان لایا جائے اور توحید اور رسالت پر ایمان لانے سے ہی انسان کی آخرت بہتر ہوتی ہے۔

آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش کسی فاعل مختار اور قادر پر موقوف ہے، کیونکہ ان کا اجسام مخصوصہ، صور مخصوصہ اور اوضاع مخصوصہ پر ہونا کسی مرجح اور مخصص کا تقاضا کرتا ہے، اور اس مرجح کا واجب الوجود ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ ممکن اپنے وجود میں پھر کسی مخصص اور مرجح کا محتاج ہوگا اور قطعی تسلسل کے لیے ہمیں ایک واجب الوجود فاعل کو ماننا پڑے گا اور واجب الوجود کا واحد ہونا ضروری ہے کیونکہ تعدد وجباء محال ہے اور یہ اس لیے محال ہے کہ اگر دو واجب الوجود فرض کیے جائیں تو نفس وجوب ان دونوں میں مشترک ہوگا۔ اور چونکہ اثنینیت بلا امتیاز باطل ہے اس لیے ان میں ایک مابہ الامتیاز بھی ہوگا پس ان میں سے ہر ایک مابہ الاشتراک اور مابہ الامتیاز سے مرکب ہوگا اور ہر مرکب حادث اور ممکن ہوتا ہے اور یہ خلاف مفروض ہے کیونکہ ان کو واجب فرض کیا تھا اور لازم آیا کہ یہ ممکن ہیں اور یہ خرابی تعدد وجباء ماننے سے لازم آئی۔ اس لیے واجب الوجود صرف ایک ہوگا دو نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہی خالق ہے اور وہ واحد ہے۔

زمینوں اور آسمانوں کو چھ دنوں میں بنانے کی حکمت : اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں بنایا ہے حالانکہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو ایک لمحہ میں بھی بنا سکتا تھا اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی ایک حد اور مدت مقرر فرمائی ہے۔ سردیوں اور گرمیوں کے موسم بنائے لیکن یہ موسم بھی تدریجاً ظہور میں آتے ہیں۔ سخت سردی اچانک سخت گرمی میں تبدیل نہیں ہوتی بلکہ تدریجاً سردی سے گرمی اور گرمی سے سردی کی طرف موسم کا انتقال ہوتا ہے۔ انسان کی پیدائش کا عمل بھی اچانک وجود میں نہیں آتا۔ بلکہ نطفہ نو ماہ میں تدریجاً انسان کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح نباتات کی روئید گی ہے۔ کفار پر جو دنیا میں عذاب آئے، وہ بھی اچانک نہیں آئے۔ ان کو بار بار تنبیہ کی گئی ڈرایا گیا اور ہر طرح حجت پوری کرنے کے بعد ان پر عذاب بھیجا گیا جبکہ وہ فوری عذاب کا مطالبہ کرتے تھے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی حد اور مدت مقرر کی ہے اور اسی سنت کے مطابق زمینوں اور آسمانوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے چھ دنوں میں بنایا ہے۔ نیز جو چیز دفعتاً وجود میں آئے، اس کے متعلق یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید یہ اتفاقی حادثہ ہے اور جس چیز کو ایک معین مدت میں تدریجاً بنایا جائے، اس کو اتفاقی حادثہ قرار دینا صحیح نہیں ہوگا بلکہ ہر ذی شعور یہ کہے گا کہ اس کو قادر اور حکیم نے ایک خاص منصوبہ اور خاص مصلحت سے بنایا ہے۔ سو زمینوں اور آسمانوں کا چھ دنوں میں بننا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ کائنات کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ اس غالب اور قوی، زبردست علیم و حکیم اور قادر و قیوم کی حکمت اور قدرت کا ساختہ پر اختہ ہے۔ اور اسمیں مخلوق کو یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ کسی کام کے کرنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے بلکہ ہر کام اطمینان اور صحیح منصوبہ بندی سے کرنا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کو ایک لمحہ میں پیدا کرنے پر قادر تھا اس کے باوجود اس نے چھ دنوں میں زمینوں اور آسمانوں کو بنایا۔

حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ چھ دن اتوار، پیر، منگل، بدھ، جمعرات اور جمعہ ہیں۔ تمام خلق ان ہی ایام میں مجتمع ہوئی اور ان ہی ایام میں حضرت آدم (علیہ السلام) پیدا کیے گئے۔ اس میں اختلاف ہے کہ ان میں سے ہر دن ایام دنیا کی مقدار کے برابر تھا یا ہر دن میں ایک ہزار سال کا تھا، جیسا کہ مجاہد اور امام احمد بن حنبل

نے اس کی تصریح کی ہے اور حضرت ابن عباس سے بھی ایک روایت ہے۔ بہر حال یوم السبت (ہفتہ کا دن) میں کوئی چیز پیدا نہیں کی گئی کیونکہ یہ ساتواں دن ہے اور اس کا نام سبت رکھا گیا ہے جس کا معنی ہے قطع کرنا۔ پیدائش کا سلسلہ اس دن منقطع ہو گیا تھا۔ (تفسیر ابن کثیر ج 7 ص 178، مطبوعہ دار الاندلس، بیروت)

چھ دنوں کی تفصیل میں احادیث کا اضطراب اور معتبر حدیث کی تعیین:

امام عبداللہ بن محمد بن جعفر المعروف بابی الشیخ المتوفی 396ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ یہود نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آکر آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے متعلق سوال کیا۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اتوار اور پیر کے دن زمین کو بنایا اور منگل کے دن پہاڑوں کو بنایا اور ان میں نفع بخش چیزوں کو بنایا اور بدھ کے دن درخت، پانی، شہر، آباد اور بنجر زمین کو بنایا۔ یہ چار دن ہیں جیسا کہ اس آیت میں ہے: " قل ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یومین وتجعلون لہ انداداذلک رب العالمین۔ وجعل فیہارواسی من فوقہاوبارک فیہاوقدر فیہااقواتھافی اربعۃایام۔ سواء للسائلین: آپ کہیے بیشک تم ضرور اس کا کفر کرتے ہو جس نے دو دنوں میں زمین کو بنایا اور تم اس کے لیے شریک قرار دیتے ہو یہ ہے رب العالمین۔ اور زمین میں اس کے اوپر سے بھاری پہاڑوں کو نصب کر دیا اور اس میں برکت فرمائی، اور اس زمین میں (اس کے باشندوں کی) غذائیں چار دنوں میں مقدر فرمائیں جو مانگنے والوں کے لیے برابر ہیں" (حم السجدہ: 9-10)

اور دوسری روایت میں ہے: حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: اللہ عزوجل نے سب سے پہلے اتوار اور پیر دو دنوں میں زمین کو بنایا اور اس کے باشندوں کی روزی چار دنوں میں مقدر فرمائی۔ پہاڑ نصب کیے، دریا جاری کیے، درخت اگائے اور سمندر رواں کیے اور یہ منافع منگل اور بدھ دونوں میں بنائے۔ پھر یہ آیت پڑھی: " ثم استوی الی السماء وھی دخان فقال لہاوللارض ائتیاطوعااو کرھاقالتااتیناطائعین۔ فقضٰھن سبع سموت فی یومین: پھر آسمان کی طرف قصد فرمایا آنحالیکہ وہ دھواں تھا تو اسے اور زمین کو فرمایا تم دونوں حاضر ہو جاؤ خواہ خوشی سے خواہ ناخوشی سے، ان دونوں نے کہا ہم خوشی سے حاضر ہوئے۔ تو ان کو دو دنوں میں پورے سات آسمان بنا دیا"۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ دو دن جمعرات اور جمعہ ہیں۔ (کتاب العظمۃ، ص 291-292، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1414ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اتوار اور پیر کو زمین بنائی اور منگل اور بدھ کو اس میں پہاڑ نصب کیے، دریا جاری کیے اور درخت اگائے اور جمعرات اور جمعہ کو آسمان بنائے اور ہفتہ کا دن فراغت کا تھا۔ یہود اس دن چھٹی مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس دن اللہ تعالیٰ نے آرام فرمایا تھا۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے اس قول پر ناراض ہوئے اور آپ نے یہ آیت پڑھی: " ولقد خلقنا السموات والرض ومابینہمافی ستۃایام ومامسنامن لغوب۔ فاصبر علی مایقولون وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشّمس وقبل الغروب: اور بیشک ہم نے آسمانوں اور زمینوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، چھ دنوں میں بنایا اور ہمیں کوئی تھکاوٹ نہیں ہوئی۔ تو آپ ان کی باتوں پر صبر کیجیے اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجیے طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب سے پہلے" (کتاب العظمۃ، ص 292، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت 1414ھ)

حضرت عبداللہ بن سلام (رض) بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اتوار اور پیر کو دونوں میں زمین کو پیدا کیا اور اس میں منگل اور بدھ کو دو دنوں میں اس کے باشندوں کی روزی مقدر کی اور جمعرات اور جمعہ کو دو دنوں میں آسمانوں کو پیدا کیا اور جمعہ کی آخری ساعت میں (عصر اور مغرب کے درمیان) حضرت آدم کو عجلت سے پیدا کیا اور یہی وہ ساعت ہے جس میں قیامت واقع ہو گی۔ (کتاب الاسماء والصفات للبیہقی، ص 383، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: اللہ نے اتوار اور پیر کو زمین بنائی اور منگل کے دن پہاڑ بنائے اور دریا اور درخت بدھ کو بنائے اور پرندے، وحشی جانور، درندے، حشرات الارض اور آفت (مصیبت) جمعرات کو بنائی اور انسان کو جمعہ کے دن بنایا اور ہفتہ کے دن پیدا کرنے سے فارغ ہو گیا۔ (کتاب العظمۃ، ص 293، مطبوعہ بیروت، 1414ھ)

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی 261ھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: اللہ عزوجل نے ہفتہ کے دن مٹی (زمین) پیدا کی اور اتوار کے دن اس میں پہاڑ نصب کیے اور پیر کے دن درخت پیدا کیے اور منگل کے دن ناپسندیدہ چیزیں پیدا

کیں اور بدھ کے دن نور پیدا کیا اور جمعرات کے دن زمین میں جانور پیدا کیے، اور جمعہ کی آخری ساعت میں عصر اور مغرب کے درمیان آدم (علیہ السلام) کو پیدا کیا۔
(صحیح مسلم، المنافقین: 27 (2789) 6920۔ مسند احمد، ج3، رقم الحدیث: 8349۔ سنن کبری للنسائی، رقم الحدیث: 13557)
علامہ ابوالعباس احمد بن عمر بن ابراہیم القطبی المتوفی 656ھ اس حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں: نور سے مراد اجسام نیرہ ہیں مثلا سورج، چاند اور ستارے اور یہ حدیث اس بات کو متضمن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بدھ کے دن تمام آسمانوں کو پیدا کیا کیونکہ یہ تمام سیارے آسمانوں میں ہیں اور ان کا نور اور روشنی آسمان اور زمی کے درمیان ہے۔
تحقیق یہ ہے کہ اس حدیث میں آسمانوں کی پیدائش کی تصریح نہیں ہے اور اس میں ہفتہ کے پورے سات دن ذکر کیے گئے ہیں اور اگر ان سات دنوں کے بعد کسی ایک دن میں آسمانوں کو پیدا فرمایا تو آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش آٹھ دنوں میں قرار پائے گی اور یہ قرآن مجید کی تصریح کے خلاف ہے۔آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے سلسلہ میں معتمد قرآن مجید کی یہ آیات ہیں: ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یومین (الایات) (حم السجدہ: 9-12)۔ (المعجم، ج7، ص343، مطبوعہ دار ابن کثیر، بیروت، 1417ھ)) تفسیر تبیان القرآن)
ابن جریر کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں: اے لوگو! تمہارا آقا اور معاملات کی اصلاح کرنے والا وہی معبود ہے جو ہر چیز کا معبود ہے جس آسمان اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا اور وہ اتوار، سوموار، منگل، بدھ، جمعرات، جمعہ ہیں جیسا مجاہد نے نقل کیا۔

مجھے مثنی نے مجاہد سے نقل کیا کہ مخلوق کی ابتداعرش، پانی، ہوا سے فرمائی اور زمین کو پانی سے بنایا اور تخلیق کی ابتدا اتوار، سوموار، منگل، بدھ، جمعرات اور تمام مخلوق کا اکٹھ جمعہ کو ہوا۔ یہود حق کی طرف ہفتہ کو لوٹے، ان چھ ایام میں ہر دن ایک ہزار سال کے برابر تھا۔
(ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ) ہم استواء عرش کا معنی اور اس کے متعلق اختلاف پہلے نقل کر آئے۔ فلیراجع الیہ۔
(یُغْشِی اللَّیْلَ النَّہَارَ) : یعنی وہ رات کو دن پر وارد کرکے اللہ تعالیٰ اس پر پہنا دیتا ہے یہاں تک کہ اس کی تروتازگی اور نور چلا جاتا ہے اور رات دن کا پیچھا کرتا ہے۔
شواہد:
مجھے مثنی نے ابن عباس سے "حثیثا" کا معنی "تیز" کیا ہے۔
مجھے محمد بن الحسین نے سدی سے (یُغْشِی اللَّیْلَ النَّہَارَ) کا مطلب یہ ذکر کیا کہ وہ رات سے دن کو ڈھانپ لیتا ہے جس سے اس کی روشنی جاتی رہتی ہے اور وہ اس کا پیچھا تیزی کے ساتھ کرکے اسے پالیتا ہے۔
(وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ):
ابن جریر کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ بیشک تمہارا رب وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور سورج اور چاند ستارے پیدا کیے۔ یہ سب اس کے حکم سے ہے اور وہ اس کے حکم پر چل رہے ہیں سنو تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی ہے اور اللہ تعالیٰ کا حکم نہ لوٹایا جاسکتا ہے اور نہ اس کی کوئی مخالفت کرسکتا ہے اس کے ماسوا اشیا ایسی نہیں اور مشرکین کے الہہ جو ذرہ بھر نفع اور نقصان کے مالک نہیں نہ ان کو تخلیق کی طاقت ہے نہ ان کا حکم کسی پر چلتا ہے ہمارا معبود اللہ تعالیٰ برکت دھندہ ہے ہر چیز کی عبادت اسی ہی کیلئے ہے اور رب العالمین ہے۔
مجھے مثنی نے عبدالعزیز شامی سے اس نے اپنے والد سے جو کہ صحابی تھے انہوں نے نقل کیا کہ جناب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے اپنے نیک عمل پر اللہ تعالیٰ کی تعریف نہ کی بلکہ اپنے نفس کی تعریف کی اس کا شکر کم ہوگیا اور اس کے عمل حبط ہوگئے اور جس کا یہ خیال ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے امر میں سے کوئی چیز بنائی ہے گویا اس نے انبیاء (علیہم السلام) پر اتاری ہوئی وحی کی اس نے ناشکری کی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (اِلَالَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبَارَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ) خبردار خلق وامر اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے وہ رب العالمین برکتوں والا ہے۔ (تفسیر طبری۔ابی جعفر محمد بن جریر طبری)
سید قطب شاہ لکھتے ہیں:

اسلام کا نظریہ توحید ایسا عقیدہ ہے جو اللہ کی ذات و صفات کے بارے میں ہر قسم کے انسانی تصورات کا قلع قمع کر دیتا ہے۔ اللہ کے افعال کی کیفیات کی بھی وہ نفی کرتا ہے' کیونکہ اللہ ایسا ہے جیسا کوئی بھی نہیں ہے۔ چنانچہ انسانی تصور اللہ کی کوئی تصویر نہیں کھینچ سکتا' کیونکہ انسانی تصور اور انسانی عقل وہی تصاویر اللہ پر چسپاں کرے گا جو وہ اپنے ماحول سے اخذ کرے گا اور اس میں ان اشکال کا دخل ہو گا جو انسان دیکھتا ہے اور اللہ کی ذات ایسی ہے جیسا کوئی اور ذات نہیں ہے لہٰذا انسانی تصور اللہ کی کوئی تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ اور جب ذات باری انسانی تصور کے دائرہ تصویر کشی سے باہر ہے تو اللہ کے افعال کی کیفیات بھی دائرہ عقل سے وراء ہیں۔ انسان صرف یہی کر سکتا ہے کہ ذات باری اور افعال باری کے آثار ہی ہمارے فہم و ادراک کا موضوع ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ ایسے سوالات کہ اللہ نے آسمان و زمین کو کس طرح پیدا کیا؟ اللہ پھر عرش پر کیسے متمکن ہوا؟ اور وہ عرش کیسا ہے جس پر باری تعالیٰ متمکن ہوا؟ یہ تمام سوالات لغو سوالات ہیں اور اسلامی تصورات و عقائد کے اصول کے خلاف ہیں۔ ایسے سوالات سے بھی لغو بات ہے اور کوئی شخص جو اسلامی تصورات و عقائد کے ان اصولوں سے واقف ہے' وہ کبھی ان سوالات کا جواب دینے کی سعی نہیں کرے گا۔ اسلامی فرقوں میں سے بعض لوگوں نے ان سوالات کے جوابات دینے کی سعی کی ہے' جو نہایت ہی افسوسناک مشغلہ تھا۔ اسلامی افکار کی تاریخ ایسے مباحث سے بھری پڑی ہے اور یہ مباحث اس وقت پیدا ہوئے جب اسلامی فکر کو یونان کی اکفار کی بیماری لاحق ہوئی۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

خلاصہ یہ ہے کہ صحیح مسلم کی اس حدیث میں صرف زمین کی پیدائش سات دنوں میں ذکر کی گئی ہے جبکہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں یہ تصریح ہے کہ تمام زمینوں اور آسمانوں کی پیدائش چھ دنوں میں کی گئی ہے اس لیے یہ حدیث صریح قرآن کے خلاف ہونے کی وجہ سے غیر معتبر ہے۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ امام بخاری اور دیگر حفاظ حدیث نے اس حدیث پر تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے اس کو کعب احبار سے سنا ہے یعنی یہ اسرائیلیات سے ہے اور حدیث مرفوع نہیں ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، ج 3، ص 178) زمینوں اور آسمانوں کی پیدائش کے سلسلہ میں مضطرب اور متعارض احادیث وارد ہیں جن میں سے ہم نے بعض کو ذکر کیا ہے۔ ان احادیث میں وہی حدیث معتبر ہے جو قرآن مجید کے مطابق ہے اور سورۃ حم السجدہ میں اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے کہ چار دنوں میں سے اللہ تعالیٰ نے دو دنوں میں زمینوں کو بنایا اور باقی دو دنوں میں پہاڑوں اور زمین کے باشندوں کی غذاؤں کے لیے دوسری چیزوں کو بنایا اور اس کے بعد دو دنوں میں آسمانوں کو بنایا اور اس کے موافق وہ روایت ہے جس کو امام بیہقی نے حضرت عبداللہ بن سلام (رض) سے روایت کیا ہے۔ (کتاب الاسماء والصفات، ص 383، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

اور امام محمد بن جعفر بن جریر متوفی 310ھ کی یہ روایت بھی قرآن مجید کے موافق ہے: حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ یہود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے اور آپ سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اتوار اور پیر کو زمین بنائی اور منگل کو اس میں پہاڑ اور دیگر نفع آور چیزیں بنائیں اور بدھ کو درخت، دریا، شہر اور آباد اور ویران زمینیں بنائیں۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: بیشک تم ضرور اس کا کفر کرتے ہو جس نے دو دنوں میں زمین کو بنایا اور تم اس کے لیے شریک قرار دیتے ہو یہ ہے رب العالمین۔ اور زمین میں اس کے اوپر سے بھاری پہاڑوں کو نصب کر دیا اور اس میں برکت فرمائی اور اس زمین میں (اس کے باشندوں کی) غذائیں چار دنوں میں مقدر فرمائی جو مانگنے والوں کے لیے۔ برابر ہیں (حم السجدہ: 9۔10)۔ اور جمعرات کے دن اللہ نے آسمان کو پیدا کیا اور جمعہ کے دن ستاروں کو، سورج کو، چاند کو اور فرشتوں کو پیدا کی اور جمعہ کے دن آخری تین ساعات میں سے پہلی ساعت میں ہر مرنے والے شخص کی موت پیدا کی، اور دوسری ساعت میں انسان کو نفع دینے والی چیزوں کی آفت پیدا کی اور تیسری اور آخری ساعت میں آدم کو پیدا کی اور ان کو جنت میں رکھا اور ابلیس کو انھیں سجدہ کرنے کا حکم دیا اور ساعت کے آخر میں ابلیس کو جنت سے نکال دیا۔ یہود نے پوچھا: اے سیدنا محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)) پھر کیا ہوا؟ آپ نے فرمایا پھر اللہ عرش پر جلوہ فرما ہوا۔ انھوں نے کہا: آپ نے ٹھیک بتایا ہے کاش! آپ اس بات کو مکمل کر دیتے! انھوں نے کہا: پھر (ہفتہ کے دن) اللہ نے آرام کیا۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سخت غضب ناک ہوئے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی اور بیشک ہم نے آسمانوں اور زمینوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، چھ دنوں میں بنایا اور ہمیں کوئی تھکاوٹ نہیں ہوئی۔ تو آپ ان کی باتوں پر صبر کیجیے اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجیے طلوع آفتاب

سے پہلے اور غروب آفتاب سے پہلے۔ (ق۔ 30۔ 39)۔ (جامع البیان جز 24، ص 118-119، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، المستدرک، ج 2، ص 450۔ 451۔ امام ذہبی نے امام حاکم کی موافقت کی ہے، تلخیص المستدرک، ج 2، ص 450۔ 451۔ الدر المنثور، ج 7، ص 14، طبع بیروت)

عرش پر استواء اور اللہ تعالیٰ کی دیگر صفات کے متعلق شیخ ابن تیمیہ کا موقف:

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "پھر وہ عرش پر جلوہ فرما ہوا۔

شیخ احمد بن عبدالحلیم بن تیمیہ متوفی 728ھ لکھتے ہیں: اللہ پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ نے اپنی کتاب میں اپنی جو صفات بیان کی ہیں، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو آپ کی صفات بیان کی ہیں ان پر بغیر تحریف اور بغیر تکیف اور تمثیل کے ایمان لایا جائے (یعنی ان صفات کی کوئی تاویل نہ کی جائے نہ ان کی مخلوق کے ساتھ مثال دی جائے) بلکہ یہ ایمان رکھا جائے کہ اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سمیع اور بصیر ہے اور اللہ نے جس چیز کے ساتھ خود کو موصوف کیا ہے اس کی نفی نہ کیا جائے اور اللہ کے کلمات کو بدلا نہ جائے اور اس کے اسماء اور اس کی آیات کو بدلا نہ جائے۔ نہ ان کا کوئی معنی متعین کیا جائے اور نہ مخلوق کی صفات سے ان کی مثال دی جائے کیونکہ اللہ سبحانہ کا کوئی ہم نام ہے نہ اس کا کوئی کفو ہے، نہ کوئی اس کی مثیل اور نظیر ہے نہ اس کا مخلق پر قیاس کیا جائے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ خود اپنے آپ کو اور دوسروں کو زیادہ جاننے والا ہے اور اس کا قول سب سے زیادہ سچا ہے۔ ھر اس کے تمام رسول سچے ہیں، بہ خلاف ان لوگوں کے جو بغیر علم کے اللہ کے متعلق باتیں کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون۔ وسلام علی المرسلین۔ والحمد للہ رب العالمین: آپ کا رب عزت والا ہے آپ کا رب ہر اس عیب سے پاک ہے جو (کفار) بیان کرتے ہیں اور سلام ہو رسولوں پر، اور تمام خوبیاں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے" (الصافات: 180۔ 182)۔

رسولوں کے مخالفین اللہ کی جو صفات بیان کرتے تھے اللہ نے ان سے اپنی برات فرمائی ہے اور رسولوں نے جو اللہ کی نقص اور عیب سے برات بیان کی تھی ان پر سلام بھیجا ہے۔ (الی قولہ) اللہ سبحانہ کے لیے سمع اور بصر ثابت ہے کیونکہ اس نے فرمایا ہے (ھو السمیع البصیر، (الی قولہ) اللہ کے لیے چہرہ ثابت ہے کیونکہ اس نے فرمایا ہے ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرم اور کل شیء ھالک الا وجھہ اور اللہ کے لیے دو ہاتھ ثابت ہیں کیونکہ اس نے فرمایا ہے۔ مامنعک ان تسجد لما خلقت بیدی اور اللہ کے لیے دو آنکھیں ثابت ہیں کیونکہ اس نے فرمایا ہے واصبر لحکم ربک فانک باعیننا اور اللہ کے لیے عرش پر استوا ثابت ہے کیونکہ اس نے فرمایا ہے الرحمٰن علی الرش استوی اور اس طرح کی سات آیتیں ہیں۔ (العقیدۃ الواسطیہ مع شرحہ، ص 15۔ 63۔ ملخصا مطبوعہ دار السلام، ریاض 1414ھ)

اس کے بعد احادیث سے استدلال کرتے ہوئے شیخ ابن تیمیہ لکھتے ہیں: اللہ آسمان دنیا کی طرف اپنی شان کے لائق نازل ہوتا ہے جیسا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ہر رات کے آخری تہائی حصہ میں ہمارا رب آسمان دنیا کی طرف نازل ہوتا ہے (صحیح بخاری و صحیح مسلم) اللہ خوش ہوتا ہے اور ہنستا ہے کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ کو اپنے بندہ کی توبہ سے اس سے زیادہ کوشی ہوتی ہے جتنی تم میں سے کسی ایک کو گم شدہ اونٹنی کے ملنے سے خوشی ہوتی ہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم) اللہ ان دو آدمیوں کو دیکھ کر ہنستا ہے جن میں سے ایک دوسرے کو قتل کرتا ہے اور دونوں جنت میں داخل ہو جاتے ہیں (صحیح بخاری و صحیح مسلم) اللہ کی ٹانگ اور قدم ہے۔ کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جہنم میں لوگوں کو ڈالا جاتا رہے گا حتی کہ وہ کہے گی کیا اور زیادہ بھی ہیں حتی کہ رب العزت اس میں اپنی ٹانگ رکھ دے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ اس میں اپنا قدم رکھ دے گا۔ (بخاری و مسلم)۔ (العقیدۃ الواسطیہ ص 80-83، ملخصا مع شرحہ مطبوعہ دار السلام ریاض 1414ھ)

شیخ ابن تیمیہ کی ان عبارات کا بظاہر یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا چہرہ، آنکھیں دو ہاتھ، ٹانگ اور قدم ہے اور وہ عرش پر مستوی ہے۔ شرح القیدۃ الواسطیہ میں لکھا ہے اس کا معنی ہے وہ عرش پر بلند ہے یا چڑھنے والا یا اس پر مستقر ہے۔ اللہ کی یہ صفات مخلوق کی صفات کی طرح نہیں ہیں اور ان کی کوئی مثال نہیں ہے۔ ان صفات کی کوئی تاویل اور توجیہ کرنا جائز نہیں چونکہ ان صفات کا قرآن اور سنت میں ذکر ہے اس لیے ان کو اسی طرح ماننا لازم ہے۔ بظاہر یہ عقیدہ اشاعرہ اور دیگر متقدمین کے عقیدہ کی مثل ہے لیکن شیخ ابن تیمیہ کے معاصر اور بعد کے چقہ علماء نے یہ کہا ہے کہ شیخ ابن تیمیہ کے ان اقوال سے اللہ تعالیٰ کے لیے جہت اور جسمیت کا ماننا لازم آتا ہے اس بناء پر بعض علماء راسخین نے شیخ ابن تیمیہ کو گمراہ کہا اور بعض نے ان کی تکفیر کر دی۔

استواء اور صفات کے مسئلہ میں شیخ ابن تیمیہ کے مخالفین :

حافظ احمد بن علی ابن حجر عسقلانی متوفی 852ھ لکھتے ہیں : شیخ ابن تیمیہ نے عقیدہ حمویہ اور واسطیہ میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہاتھ ، پیر، چہری اور پنڈلی کا جو ذکر آیا ہے وہ اس کی صفات حقیقیہ ہیں اور اللہ تعالیٰ عرش پر بذاتہ مستوی ہے اس سے کہا گیا کہ اس سے تحیز اور انقسام لازم آئے گا تو اس نے کہا میں یہ نہیں جانتا کہ تحیز اور انقسام اجسام کے خواص میں سے ہے اسی وجہ سے ابن تیمیہ کے متعلق کہا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے تحیز اور انقسام کا قائل ہے۔ (الدرالکامنہ ، ج 1، ص 154، مطبوعہ دار الجبل، بیروت)

علامہ احمد بن حجر ہیثمی مکی متوفی 974ھ لکھتے ہیں : ابن تیمیہ کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ جسمیت، جہت، اور انتقال سے موصوف ہے اور وہ عرش کے برابر ہے نہ چھوٹا نہ بڑا۔ اللہ تعالیٰ اس قبیح افتراء سے پاک ہے جو کہ صریح کفر ہے۔ (الفتاوی الحدیثیہ ص 100، مطبوعہ مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ، بہ مصر، 1356ھ)

تبیان القرآن جلد ثانی میں النساء 158 کی تفسیر میں ہم نے بہ کثرت علماء کی عبارات نقل کی ہیں جنہوں نے اس مسئلہ میں شیخ ابن تیمیہ کی تکفیر کی ہے۔

استواء اور صفات کے مسئلہ میں شیخ ابن تیمیہ کے موافقین : ملا علی بن سلطان محمد القاری المتوفی 1014ھ لکھتے ہیں : شیخ عبداللہ انصاری حنبلی قدس سرہ نے شرح منازل السائرین میں شیخ ابن تیمیہ سے اس تہمت کو دور کیا ہے کہ وہ اللہ کے لیے جہت کے قائل تھے اور اللہ تعالیٰ کو جسم مانتے تھے اور انھوں نے شیخ مذکور سے تکفیر اور تضلیل کی نفی کی ہے ان کی عبارت یہ ہے :

شیخ ابن تیمیہ نے اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی صفات کو ان کے ظاہری معنی پر محمول کرکے اور ان کے معانی متبادرہ کے اعتقاد کی تلقین کرکے ان اسماء اور صفات کی حرمت کو محفوظ کیا ہے۔ کیونکہ جب امام مالک (رح) سے سوال کیا گیا کہ الرحمٰن علی العرش استوی میں اللہ تعالیٰ کے عرش پر استواء کا کیا معنی ہے ؟ تو امام مالک نے پہلے سر جھکا کر غور کیا پھر کہا استواء معلوم ہے (کسی چیز پر مستقر ہونا یا کسی چیز پر بلند ہونا) اور اس کی کیفیت عقل میں نہیں آسکتی (کہ اللہ کس طرح عرش پر مستوی ہے) اور اس استواء پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کا سوال کرنا بدعت ہے۔ امام مالک نے اس کے معنی کے معلوم ہونے اور اس کی کیفیت کے انسانی عقل میں نہ آنے کے درمیان فرق کیا ہے۔ امام مالک (رح) کا یہ جواب اللہ تعالیٰ کی صفات سے متعلق تمام مسائل میں کافی شافی ہے۔ سمع، بصر، علم، حیات، قدرت، ارادہ، اللہ کا نزول، غضب، رحمت اور اس کا ہنسنا۔ ان تمام الفاظ کے معانی معلوم ہیں اللہ کے ساتھ ان کے اتصاف کی کیفیت انسان کی عقل میں نہیں آسکتی، کیونکہ کسی چیز کی کیفیت تب عقل میں آتی ہے جب اس کی ذات اور کنہ کا علم حاصل ہوچکا ہو۔ اور جب اس کی ذات غیر معلوم ہے تو اس کی صفات کی کیفیت کیسے عقل میں آسکتی ہے اور اس باب میں صحیح موقف یہ ہے کہ اللہ کو اسی صفت کے ساتھ موصوف کیا جائے جس صفت کے ساتھ خود اللہ نے اپنے آپ کو موصوف کیا ہے اور اس کے رسول نے جس صفت کے ساتھ اس کو موصوف کیا ہے اور ان صفات میں نہ کوئی تحریف کی جائے (بایں طور کہ از خود ان صفات کا کوئی معنی یا محمل بیان کیا جائے) نہ ان صفات کو معطل کیا جائے (یعنی ان کی نفی کی جائے) نہ ان کی کیفیت بیان کی جائے (ان کی کوئی تاویل کی جائے) اور نہ ان کی کوئی مثال بیان کی جائے، بلکہ اللہ کے اسماء اور اس کی صفات کو ثابت کیا جائے اور ان سے مخلوقات کی مشابہت کی نفی کی جائے۔ پس تمہارا صفات کو ثابت کرنا تشبیہ سے منزہ ہو اور تمہارا نفی کرنا تعطیل سے منزہ ہو۔ سو جس نے استواء کی حقیقت کی نفی کی، وہ معطل ہے اور جس نے مخلوقات کے مخلوقات پر استواء کے ساتھ تشبیہ دی، وہ مشبہ ہے۔ اور جس نے یہ کہا کہ اللہ کے استواء کی مثل کوئی چیز نہیں ہے وہ موحد ہے اور منزہ ہے۔ یہاں تک علامہ عبداللہ انصاری حنبلی کا کلام ہے۔ اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق شیخ ابن تیمیہ کا اعتقاد اسلام صالحین اور جمہور متاخرین کے اعتقاد کے موافق ہے اور ان کی عبارت پر یہ طعن اور تشنیع صحیح نہیں ہے۔ ان کا یہ کلام بعینہ امام اعظم ابو حنیفہ (رح) کے موافق ہے جو انھوں نے الفقہ الاکبر میں تحریر فرمایا ہے۔ (ہم عنقریب اس عبارت کو نقل کریں گے) اس سے معلوم ہوگیا کہ شیخ ابن تیمیہ پر یہ اعتراض کرنا صحیح نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے جہت اور جسم کا عقیدہ رکھتے تھے۔ (مرقات، ج 8، ص 251 - 252، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان، 1390ھ)

نوٹ : شیخ ابن تیمیہ نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر مبارک زیارت کے لیے سفر کو حرام کہا ہے اس بناپر شیخ ابن تیمیہ کی تکفیر کو ملا علی قاری رحمہ الباری نے شرح الشفاء علی نسیم الریاض، ج 3، ص 514 میں صحیح قرار دیا ہے اور ان کی یہ کتاب مرقات کے بعد کی تصنیف ہے۔ اس لیے مرقات میں جو انھوں نے شیخ ابن تیمیہ کو اس امت کا ولی کہا ہے، اس سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔

علامہ محمد امین بن محمد المختار الحکنی الشنقیطی لکھتے ہیں : عرش پر استواء اور اللہ تعالیٰ کی دیگر صفات کے معاملہ میں دو باتوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے ایک یہ کہ اللہ جل وعلا حوادث کی مشابہت سے منزہ ہے۔ دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جن صفات کے ساتھ اپنے آپ کو موصوف کیا ہے یا اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جن صفات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو موصوف کیا ہے ان صفات پر ایمان رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے بعد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے زیادہ اللہ کی صفات کو جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنے لیے جس وصف کو ثابت کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ کے لیے کسی وصف کو ثابت کیا، پھر شخص نے اللہ تعالیٰ سے اس وصف کی یہ زعم کرتے ہوئے نفی کی کہ وہ وصف اللہ کی شان کے لائق نہیں ہے تو اس نے اپنے آپ کو اللہ جل وعلا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے زیادہ عالم قرار دیا۔ سبحانک ھذا بہتان عظیم۔ اور جس نے یہ اعتقاد رکھا کہ اللہ کا وصف مخلوق کے اوصاف کے مشابہ ہے تو وہ مشبہ، ملحد اور گمراہ ہے اور جس نے اللہ جل وعلا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ثابت کیے ہوئے اوصاف کو اللہ کے لیے مانا جبکہ وہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہ اوصاف، مخلوقات کی صفات کی مشابہت سے منزہ ہیں تو وہ مومن ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کمال اور جلال کو اور مشابہت خلق سے تنزیہ کو ماننے والا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس بات کو واضح فرمادیا ہے : " لیس کمثلہ شیء وھو السمیع البصیر : اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سننے والا ہے اور دیکھنے والا ہے " (الشوری : 11)۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے صفات کمال اور جلال کو ثابت فرمایا ہے اور مخلوق کے ساتھ مشابہت کی نفی فرمائی ہے۔ (اضواء البیان، ج 2، ص 272-273، مکتبہ ابن تیمیہ، قاھرہ، 1408ھ)

استواء اور صفات کے مسئلہ میں متقدمین احناف کا موقف :

امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت متوفی 150ھ فرماتے ہیں : اللہ نہ جوہر نہ عرض ہے، نہ اس کی کوئی حد ہے نہ اس کا کوئی منازع ہے نہ اس کا کوئی شریک ہے نہ اس کی کوئی مثال ہے اور اس کا ہاتھ ہے اور اس کا چہرہ ہے اور اس کا نفس ہے۔ قرآن مجید میں اللہ نے جو چہرہ، ہاتھ اور نفس کا ذکر کیا ہے، وہ اس کی صفات بلا کیف ہیں اور یہ توجیہ نہ کیا جائے کہ ہاتھ سے مراد اس کی قدرت یا نعمت ہے کیونکہ اس توجیہ میں اس کی صفت کو باطل کرنا ہے اور یہ قدریہ اور معتزلہ کا قول ہے لیکن اس کا ہاتھ اس کی صفت بلا کیف ہے اور اس کا غضب اور اس کی رضا اس کی صفات میں سے بلا کیف دو صفتیں ہیں (الفقہ الاکبر مع شرحہ، ص 36-37، مطبوعہ شرکہ مکتبہ و مطبعہ مصطفیٰ البابی، مصر، 1375ھ)

علامہ کمال الدین محمد بن عبدالواحد المعروف بابن الھمام الحنفی المتوفی 861ھ لکھتے ہیں : اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے اور یہ ایسا استواء نہیں ہے جیسا ایک جسم کا دوسرے جسم پر استواء ہوتا ہے کہ وہ اس سے مماس ہوتا ہے۔ یا اس کی محاذات (سمت) میں ہوتا ہے بلکہ جو استواء اس کی شان کے لائق ہو جس کو اللہ سبحانہ ہی زیادہ جاننے والا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اس پر ایمان لانا واجب ہے کہ اللہ عرش پر مستوی ہے اور مخلوق کے ساتھ اس کی مشابہت کی نفی کی جائے۔ رہا یہ کہ استواء علی العرش سے مراد عرش پر غلبہ ہو تو یہ ارادہ بھی جائز ہے۔ البتہ اس ارادہ کے واجب ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے اور واجب وہی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ البتہ اگر یہ کدشہ ہو کہ عام لوگ استواء سے وہی معنی سمجھیں گے کہ جو جسم کے لوازم سے ہے کہ اللہ عرش سے متصل ہے یا عرش کے مماس ہے یا عرش کی محاذات میں ہے تو استواء کو غلبہ سے تعبیر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح کتاب اور سنت میں جو ایسے الفاظ ہیں جن سے جسمیت ظاہر ہوتی ہے مثلاً انگلی، قدم اور ہاتھ ان پر ایمان لانا واجب ہے کیونکہ انگلی اور ہاتھ وغیرہ اللہ کی صفت ہیں۔ ان سے مراد یہ مخصوص اعضاء نہیں ہیں بلکہ وہ معنی مراد ہے جو معنی اللہ کی شان کے لائق ہے اور اللہ سبحانہ ہی اس معنی کو زیادہ جاننے والا ہے اور کبھی ہاتھ اور انگلی کی تاویل قدرت اور قہر سے کی جاتی ہے اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا حجر اسود اللہ کا دایاں ہاتھ ہے اس کی تاویل کی جاتی ہے تاکہ عام لوگوں کی عقلیں اللہ تعالیٰ کی جسمیت کی طرف نہ منتقل ہوں۔ اس تاویل سے یہ ارادہ بھی ممکن ہے لیکن اس پر جزم

اور یقین نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے اصحاب (ماتریدیہ) کے قول کے مطابق یہ الفاظ متشابہات سے ہیں اور متشابہ کا حکم یہ ہے کہ اس دنیا میں ان کی مراد متوقع نہیں ہے۔ (مسائرہ مع شرح المسامرہ، ج 1، ص 31-36، دائرۃ المعارف الاسلامیہ، مکران)

واضح رہے کہ استواء اور ہاتھ وغیرہ کی علامہ ابن ہمام نے جو تاویل بیان کی ہے امام ابو حنیفہ اور دیگر اسلاف نے اس تاویل سے منع کیا ہے۔

استواء اور صفات کے مسئلہ میں متقدمین شافعیہ کا موقف :

امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی شافعی متوفی 458ھ لکھتے ہیں : اللہ تعالیٰ کے لیے صرف ان صفات کو بیان کرنا جائز ہے جن پر کتاب اللہ دلالت کرتی ہو یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت دلالت کرتی ہو، یا اس پر اس امت کے متقدمین کا اجماع ہو یا جس پر عقل دلالت کرتی ہو۔ مثلاً حیات، قدرت، علم، ارادہ، سمع، بصر، کلام اور اس کی مثل صفات ذاتیہ، اور مثلاً خلق کرنا، رزق دینا، زندہ کرنا، مارنا، معاف کرنا، سزا دینا اور ان کی مثل صفات فعلیہ اور جن صفات کا اثبات، اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خبر سے ہوا، جیسے چہرہ، دو ہاتھ، آنکھ، یہ اس کی صفات ہیں۔ اور جیسے عرش پر مستوی ہونا اور آنا اور نازل ہونا اور اس طرح دوسری اس کے فعل کی صفات۔ یہ صفات اس لیے ثابت ہیں کہ قرآن اور حدیث میں ان کا ذکر ہے، ان صفات کو اس طرح مانا جائے کہ ان صفات کی مخلوق کے ساتھ مشابہت نہ ہو۔ (کتاب الاسماء والصفات، ص 110-111)، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

سفیان ثوری نے کہا اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جن اوصاف کو اپنے لیے ثابت کیا ہے، ان کی فارسی یا عربی میں تفسیر کرنا جائز نہیں ہے۔ (کتاب الاسماء والصفات، ص 314، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

امام ابوالحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی التوفی 516ھ لکھتے ہیں : کلبی اور مقاتل نے کہا استوی کا معنی ہے استقر (قرار پکڑا) ابو عبیدہ نے کہا اس کا معنی ہے صعد (چڑھا)۔ معتزلہ نے کہا اس کا معنی ہے استولی (اللہ عرش پر غالب ہے) اور اہل سنت یہ کہتے ہیں کہ عرش پر استواء اللہ کی صفت بلا کیف ہے۔ انسان کے لیے اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کا علم وہ اللہ عزوجل کے سپرد کر دے۔ (اس کے بعد انھوں نے امام مالک سے سوال اور ان کا جواب لکھا ہے) سفیان ثوری، اوزاعی، لیث بن سعد، سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن المبارک اور دیگر علماء اہل سنت نے اس آیت کی تفسیر میں کہا یہ آیت اور دیگر صفات کے متعلق آیات، آیات متشابہات میں سے ہیں ان کو اسی طرح بلا کیف (یعنی استواء کی کیفیت جانے بغیر) ماننا چاہیے۔ (معالم التنزیل، ج 2 ص 137-138، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1414ھ)

استواء اور صفات کے مسئلہ میں متقدمین مالکیہ کا موقف :

امام حافظ ابو عمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر مالکی اندلسی متوفی 463ھ لکھتے ہیں : الرحمٰن علی العرش استوی (طٰہ : 5) کی تفسیر میں امام مالک سے سوال کیا گیا کہ اللہ عرش پر کس طرح مستوی ہے؟ امام مالک نے فرمایا : استوی کا معنی معلوم ہے (بلند ہے یا بیٹھا ہے) اور اس کی کیفیت مجہول ہے اور تمہارا اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے اور میرا گمان ہے کہ تم بد عقیدہ ہے۔ حضرت ابن مسعود (رض) نے فرمایا : اللہ عرش کے اوپر ہے اور اس سے تمہارا کوئی عمل مخفی نہیں ہے۔

ابن المبارک نے کہا رب تبارک وتعالیٰ سات آسمانوں کے اوپر عرش پر ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : ہر رات کے آخری تہائی حصہ میں ہمارا رب تبارک وتعالیٰ آسمان دنیا کی طرف نازل ہوتا ہے۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث : 1145، الموطا، رقم الحدیث : 214، مسند احمد، ج 2، ص 487)

اس قسم کے جو اطلاقات قرآن اور سنت میں ہیں ان کے متعلق علماء اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کی کیفیت کو جانے بغیر ان پر ایمان لانا حق ہے۔ وہ کہتے ہیں اللہ نازل ہوتا ہے اور کیفیت نزول کو بیان نہیں کرتے اور نہ کیفیت استواء کو بیان کرتے ہیں۔ عباد بن عوام سے شریک نے کہا : بعض لوگ ان احادیث کا انکار کرتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے نزول کا ذکر ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس یہ احادیث ان ہی اسانید سے پہنچی ہیں جن اسانید سے نماز، زکوۃ، روزے اور حج کے احکام کے متعلق احادیث پہنچی ہیں اور ہم نے اللہ عزوجل کو ان احادیث سے ہی پہچانا ہے امام شافعی نے فرمایا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت صرف اتباع ہے، اور بعض لوگوں نے یہ توجیہ کی کہ رب کے نزول کا معنی یہ ہے کہ اس کی رحمت اور اس کی نعمت نازل ہوتی یہ توجیہ باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور

اس کی نعمت تورات اور دن کے ہر وقت میں نازل ہوتی ہے۔اس میں رات کے آخری تہائی حصہ یا کسی اور وقت کی خصوصیت کا کیا دخل ہے ؟البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت میں اللہ تعالیٰ خصوصیت کے ساتھ اپنی رحمت سے دعا قبول فرماتا ہے۔ کیونکہ حضرت ابوذر (رض) نے پوچھا: یارسول اللہ ! کس وقت میں دعا زیادہ قبول ہوتی ہے آپ نے فرمایا: آدھی رات کے بعد۔ (مسند احمد، ج 5، ص 179) ۔اور ہمیشہ نیک لوگ رات کے پچھلے پہر اٹھ کر استغفار کرتے ہیں۔قرآن مجید میں ہے والمستغفرین بالاسحار (آل عمران : 17) رات کے پچھلے اٹھ کر استغفار کرنے والے (الاستذکار ج 8، ص 151-153، مطبوعہ موسسہ الرسالہ، بیروت، 1414ھ)

نیز امام ابن عبدالبر مالکی اندلسی متوفی 463ھ لکھتے ہیں: ایوب بن صلاح مخزومی نے ہم سے فلسطین میں بیان کیا کہ ہم امام مالک کے پاس بی تھے ہوئے تھے ایک عراق نے آپ کے پاس آکر سوال کیا کہ اللہ عرش پر کس طرح مستوی ہے ؟امام مالک نے غور کرنے کے بعد فرمایا: تم نے اس چیز کے متعلق سوال کیا ہے جو مجہول نہیں ہے اور تم نے اس کیفیت کے متعلق سوال کیا ہے جو عقل میں نہیں آسکتی اور تم بدعقیدہ شخص ہو۔ پھر اس شخص کو آپ کی مجلس سے نکال دیا گیا۔ یحییٰ بن ابراہیم بن مزین نے کہا: امام مالک نے اس قسم کی باتوں میں بحث کرنے سے اس لیے منع فرمایا کیونکہ ان میں حد، صفت اور تشبیہ ہے اور اس میں نجات تب ہوگی جب اللہ تعالیٰ کے ان اقوال پر توقف کیا جائے جس میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی صفت، چہرے اور ہاتھوں سے بیان کی ہے اور کشادہ کرنے اور استواء سے اپنی صفت بیان کی ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: " فاینما تولوافثم وجہ اللہ : سو تم جس طرف بھی پھرو وہیں اللہ کا چہرہ ہے " (البقرہ: 115) ۔" بل یداہ مبسوطتٰن : بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کشادہ (کھلے ہوئے) ہیں " (المائدہ: 64) ۔" والارض جمیعا قبضتہ یوم القیامۃ والسموات مطویات بیمینہ : قیامت کے دن سب زمینیں اس کی مٹھی میں ہوں گی اور تمام آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہوں گے " (الزمر : 67) ۔" الرحمٰن علی العرش استوی: رحمٰن عرش پر جلوہ فرما ہے " (طہٰ: 5) ۔

اس لیے مسلمان کو وہی کہنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق فرایا ہے اور اسی پر توقف کرنا چاہیے اور اس سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے اور اس کی تفسیر نہیں کرنی چاہیے اور یہ نہیں کہنا چاہیے کہ یہ کس طرح ہے کیونکہ اس میں ہلاکت ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو قرآن مجید پر ایمان لانے کا مکلّف کیا ہے اور ان کو اس کی ان آیتوں کی تاویل میں غور کرنے کا مکلّف نہیں کیا جن آیتوں کا اس نے علم عطا نہیں کیا۔ (التمہید، ج 7، ص 152، مطبوعہ مکتبہ قدوسیہ، لاہور، 1404ھ)

امام مالک نے عمر بن الحکم سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا: میری ایک باندی بکریوں کو چراتی تھی ایک دن ایک بکری گم ہوگئی میں نے اس کے متعلق اس سے پوچھا تو اس نے کہا اس کو بھیڑیا کھا گیا۔ مجھے اس پر افسوس ہوا ل۔ میں بھی آخر انسان ہوں میں نے اس کو تھپڑ مار دیا، اور مجھ پر (پہلے سے) ایک غلام کو آزاد کرنا تھا۔ کیا میں اس غلام کی جگہ اس باندی کو آزاد کردوں ؟رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس باندی سے پوچھا: اللہ کہاں ہے ؟اس نے کہا۔ آسمان میں۔ آپ نے پوچھا: میں کون ہوں ؟اس نے کہا: آپ رسول اللہ ہیں۔ تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس کو آزاد کردو۔ (الموطا رقم الحدیث : 1511، صحیح مسلم، صلوۃ 33 (537) 1179، سنن ابوداود رقم الحدیث : 930)

امام ابن عبدالبر فرماتے ہیں: نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس باندی سے جو سوال کیا کہ اللہ کہا ہے ؟ تو اس نے کہا: آسمان میں۔ تمام اہل سنت (اور وہ محدثین ہیں) اس پر متفق ہیں اور وہ وہی کہتے ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ اللہ عرش پر مستوی ہے۔ (طہٰ: 5) ۔اور اللہ عزوجل آسمان میں اور اس کا علم ہر جگہ ہے اور یہ قرآن مجید کی ان آیات سے بالکل ظاہر ہے: " ءامنتم من فی السماء ان یخسف بکم الارض فاذاھی تمور : کیا تم اس سے بےخوف ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تمہیں زمین میں دھنسا دے تو وہ اس سے لرزنے لگے " (الملک: 16) ۔" الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ : پاک کلمے اسی کی طرف چڑھتے ہیں اور نیک عمل کو اللہ بلند فرماتا ہے " (فاطر: 10) ۔" تعرج الملائکۃ والروح الیہ : فرشتے اور جبرائیل اسی کی طرف چڑھتے ہیں ") المعارج: 4) ۔قرآن مجید میں اس کی بہت مثالیں ہیں اور ہم نے اپنی کتاب تمہید میں اس سے زیادہ بیان کیا ہے (الاستذکار، ج 23، ص 167-168، طبع بیروت، 1414ھ)

ہمیشہ سے مسلمانوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جب ان پر کوئی آفت آتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے لیے اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں۔ ہرچند کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی جہت نہیں ہے لیکن چونکہ علو اور بلندی کو باقی جہات پر شرف اور فضیلت حاصل ہے اس لیے دعا کے وقت آسمان کی طرد یکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عرش کو پیدا کیا، اس کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے بندوں کو اس کی ضرورت تھی تاکہ وہ دعا کے وقت حیران نہ ہوں کہ وہ کس کی طرف

منہ کریں جیسے اس نے کعبہ کو پیدا کیا تا کہ لوگ عبادت کے وقت اس کی طرف منہ کریں۔ حالانکہ اللہ کا حقیقت میں گھر ہے نہ اس کو اس کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اس نے آسمان کو پیدا کیا تا کہ لوگ جان لیں کہ وہ اپنی دعاؤں میں کس طرف متوجہ ہوں۔

امام ابن عبدالبر مالکی اندلسی 463ھ فرماتے ہیں: معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ استواء کا مجازی معنی مراد ہے اور وہ ہے استولی یعنی اللہ عرش پر غالب ہے۔ یہ اس لیے صحیح نہیں ہے کہ پھر عرش کی خصوصیت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تو ہر چیز پر غالب ہے اور کلام میں اصل یہ ہے کہ اس کو حقیقت پر محمول کیا جائے اور اللہ کے کلام کو اشہر اور اظہر وجوہ پر محمول کرنا لازم ہے جب تک کہ حقیقت پر محمول کرنے سے کوئی ایسا مانع نہ ہو جس کا مانع ہونا سب کے لیے واجب التسلیم ہو۔ اور اگر ہر مجاز کے مدعی کا ادعا مان لیا جائے تو پھر کوئی عبارت ثابت نہیں ہوگی۔ اور اللہ عزوجل نے اپنے کلام میں جن الفاظ سے خطاب کیا ہے ان سے ان ہی معانی کا ارادہ کیا ہے جن معانی کا اہل عرب اپنے محاورات اور خطابات میں ان الفاظ سے ارادہ کرتے تھے، اور استواء کا معنی اور مفہوم لغت میں معلوم ہے اور وہ ہے کسی چیز پر ارتفاع اور بلند ہونا اور کسی چیز پر قرار اور جگہ پکڑنا ابوعبیدہ نے استواء کا معنی بیان کرتے ہوئے کہا: "بلند ہوا" عرب کہتے ہیں استویت فوق الدابہ میں سواری کے اوپر بلند ہوا یا بیٹھا۔ حافظ ابن عبالبر نے کہا: استواء کا معنی بلندی پر جگہ پکڑنا ہے اور اس کی دلیل حسب ذیل آیات میں ہے: "لتستووا علی ظھورہ ثم تذکروا نعمۃ ربکم اذا استویتم علیہ: تا کہ تم ان کی پشت کے اوپر بیٹھو اور جب تم ان کی پشت کے اوپر بیٹھ جاؤ تو تم اپنے رب کی نعمت کو یاد کرو" (الزخرف: 13)۔ "واستوت علی الجودی: اور کشتی جودی پہاڑ کے اوپر ٹھہر گئی" (ھود: 44)۔ "فاذا استویت انت و من معک علی الفلک: اور جب آپ اور آپ کے ساتھی کشتی کے اوپر بیٹھ جائیں" (المومنون: 28)

۔

ہم عرش پر اللہ کے استواء کی کیفیت کو نہیں جانتے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ عرش پر مستوی نہ ہو جیسے ہمیں یہ معلوم ہے کہ ہمارے بدنوں میں ہماری روحیں ہیں لیکن ہمیں معلوم نہیں کہ ہمارے بدن میں ہماری روح کس کیفیت سے ہے اور اس کیفیت کے علم نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہماری روحیں نہ ہوں، اس طرح عرش پر اللہ کے استواء کی کیفیت کے علم نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ عرش پر مستوی نہ ہو۔ (التمہید، ج 7، ص 131-137، ملخصا و موضحا مطبوعہ المکتبہ القدوسیہ، لاہور، 1404ھ)

استواء اور دیگر صفات کے مسئلہ میں متقدمین حنابلہ کا موقف: امام جمال الدین عبدالرحمٰن بن علی بن محمد جوزی حنبلی متوفی 597ھ لکھتے ہیں: بعض لوگوں نے کہا کہ استوی بمعنی استولی ہے۔ ائمہ لغت کے نزدیک یہ معنی مردود ہے۔ ابن الاعرابی نے کہا عرب استوی کو استولی کے معنی میں نہیں پہچانتے، جس شخص نے یہ کہا اس نے بہت غلط کیا۔ استوی فلان علی کذا (فلاں شخص نے فلاں پر غلبہ پایا) یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ شخص اس سے بعید ہو اور وہ اس پر قادر نہ ہو۔ پھر بعد میں اس پر قدرت اور غلبہ حاصل کرے، اور اللہ عزوجل ہمیشہ سے تمام چیزوں پر غالب ہے۔ ہم ملحدہ کے صفات کو معطل کرنے سے اور مجسمہ کی تشبیہ سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔ (زادالمسیر، ج 3، ص 213، مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت، 1407ھ)

علامہ محمد بن احمد السفارینی الحنبلی التوفی 1188ھ لکھتے ہیں: حنبلیوں کا مذہب سلف صالحین کا مذہب ہے۔ وہ اللہ کو ان اوصاف کے ساتھ موصوف کرتے ہیں جن کے ساتھ خود اللہ نے اپنے آپ کو موصوف کیا ہے۔ اور جن اوصاف کے ساتھ اس کے رسول نے اس کو موصوف کیا ہے، بغیر کسی تحریف اور تعطیل کے اور تکییف اور تمثیل کے، اللہ کی ذات ذوات میں سے کسی ذات کے مشابہ نہیں اور اس کی صفات کمالیہ میں سے کوئی صفت ممکنات کی کسی صفت کے مشابہ نہیں ہے۔ قرآن مجید اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات وارد ہیں، ان کو اسی طرح قبول کرنا اور تسلیم کرنا واجب ہے جس طرح وہ وارد ہوئی ہیں۔ ہم اس کے وصف کی حقیقت سے عدول نہیں کرتے اور نہ اس کے کلام میں تحریف کرتے ہیں اور نہ اس کے اسماء اور صفات میں، اور جو کچھ اس باب میں وارد ہے اس میں کوئی زیادتی نہیں کرتے اور جو شخص اس صراط مستقیم سے انحراف کرے تم اس کو چھوڑ دو۔ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ (لوامع الانوار البہیہ، ج 1، ص 107، مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت، 1411ھ)

نیز علامہ سفارینی حنبلی لکھتے ہیں: امام احمد (رض) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو اسی وصف کے ساتھ موصوف کیا جائے گا جس وصف کے ساتھ خود اللہ نے اپنے آپ کو موصوف کیا ہے اور جس وصف کے ساتھ اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو موصوف کیا ہے۔ ہر وہ چیز جو نقص اور حدوث کو واجب کرتی ہو اللہ

تعالیٰ اسے سے حقیقتاً منزہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑے کمال کا مستحق ہے۔ سلف کا مذہب یہ ہے کہ اس قسم کی چیزوں میں غور نہیں کرنا چاہیے اور ان میں سکوت کرنا چاہیے اور ان کا علم اللہ کے سپرد کردینا چاہیے۔ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: یہ وہ پوشیدہ چیز ہے جس کی تفسیر نہیں کی جائے گی اور انسان پر واجب ہے کہ اس کے ظاہر پر ایمان لائے اور اس کا علم اللہ کے سپرد کردے۔ ائمہ سلف مثلاً زہری، امام مالک، امام اوزاعی، سفیان ثوری، لیث بن اسد، عبداللہ بن المبارک امام احمد اور اسحاق سب یہی کہتے تھے کہ یہ متشابہات ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کے سوا کسی کے لیے ان کی تفسیر کرنا جائز نہیں ہے۔ (لوامع الانوار البہیہ، ج 1، ص 96۔ 99، ملخصاً، مطبوعہ بیروت، 1411ھ)

استواء اور دیگر صفات کے مسئلہ میں متاخرین کی آراء: امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی متوفی 606ھ لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستقر ہونا ممکن نہیں ہے اور اس پر متعدد عقلی دلائل ہیں۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ عرش پر مستقر ہو تو اس کی جو جانب عرش کے قریب ہوگی وہ جانب لازماً متناہی ہوگی اور جو چیز متناہی ہو وہ زیادتی اور کمی کو قبول کرسکتی ہے اور جو چیز زیادتی اور کمی کو قبول کرسکے وہ حادث ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ قدیم ہے۔ اور اگر وہ جانب غیر متناہی ہو تو اللہ تعالیٰ کی ذات میں انقسام لازم آئے گا کیونکہ عرش بہرحال متناہی ہے تو اللہ تعالیٰ کی ذات کی ایک جانب عرش سے مماس ہوگی اور ایک جانب فارغ ہوگی اور اس سے انقسام لازم آئے گا اور یہ بیان سابق سے محال ہے۔

امام رازی نے اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستقر ہونے کو باطل قرار دینے کے لیے بارہ دلیلیں قائم کی ہیں۔ جو اکثر مشکل اور دقیق ہیں اور عام فہم نہیں ہیں۔ بہرحال ان کی ایک اور قدرے آسان دلیل یہ ہے:

اگر اللہ تعالیٰ کی ذات عرش پر مستقر ہو تو اللہ تعالیٰ کی ذات عرش سے اعظم ہوگی یا مساوی ہوگی یا اصغر ہوگی۔ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات عرش سے اعظم ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کی ذات میں انقسام لازم آئے گا کیونکہ اب اللہ تعالیٰ کی ذات کا بعض عرش پر مستقر ہوگا اور بعض اس سے زائد ہوگا اور اس سے اس کا منقسم ہونا لازم آئے گا اور اگر اللہ تعالیٰ عرش کے مساوی ہو تو اس کا متناہی ہونا لازم آئے گا کیونکہ عرش متناہی ہے اور جو متناہی کے مساوی ہو وہ متناہی ہوتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کی ذات عرش سے اصغر ہو تو اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات کا متناہی اور منقسم ہونا لازم آئے گا اور یہ تمام صورتیں بداہتہً باطل ہیں۔ (تفسیر کبیر، ج 5، ص 252-258، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1415ھ)

علامہ عبداللہ بن عمر بیضاوی شافعی متوفی 685ھ لکھتے ہیں: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ کا امر بلند ہوا یا غالب ہوا اور ہمارے اصحاب سے یہ منقول ہے کہ عرش پر استواء اللہ تعالیٰ کی صفت بلا کیف ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر اس طرح مستوی ہے جس طرح اس نے ارادہ کیا در آنحالیکہ وہ عرش پر استقرار اور جگہ پکڑنے سے منزہ ہے۔ (انوار التنزیل مع الکازرونی، ج 3، ص 26، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1416ھ)

علامہ محمد بن یوسف المشہور بابن حبان اندلسی التوفی 710ھ لکھتے ہیں: اس آیت کا معنی ہے: اللہ عرش پر غالب ہے۔ ہر چند کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب ہے لیکن عرش چونکہ مخلوقات میں سب سے عظیم جسم ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ عرش پر غالب ہونے کا ذکر فرمایا۔ امام جعفر صادق، حسن بصری، امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہم اللہ سے یہ منقول ہے کہ استواء معلوم ہے (مستقر ہونا یا بلند ہونا) اور اس کی کیفیت مجہول ہے اور اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کا انکار کفر ہے اور اس کا سوال کرنا بدعت ہے۔ (مدارک التنزیل علی الخازن ج 2، ص 10، مطبوعہ پشاور)

علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی متوفی 792ھ لکھتے ہیں: اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب کہ دین حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مکان اور جہت منتفی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ قرآن اور سنت میں ایسی بیشمار تصریحات ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کے لیے مکان اور جہت کا ثبوت ہوتا ہے اور باوجود اختلاف آراء اور سنت میں ایسی بیشمار تصریحات ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کے لیے مکان اور جہت کا ثبوت ہوتا ہے اور باوجود اختلاف آراء اور تفرق ادیان کے سب لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کے لیے بلند جانب کی طرف دیکھتے ہیں اور دعا کے وقت آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جہت سے منزہ ہونا عام لوگوں کی عقلوں سے ماوراء ہے حتیٰ کہ جو چیز کسی سمت اور جہت میں نہ ہو لوگ اس کے وجود کا انکار کرتے ہیں تو ان سے خطاب کرنے کے لیے زیادہ مناسب اور ان کے عرف کے زیادہ قریب اور ان کو دین حق کی دعوت دینے کے زیادہ لائق یہ تھا کہ ان سے ایسا کلام کیا جائے جس میں بظاہر تشبیہ ہو اور ہر چند کہ اللہ تعالیٰ ہر سمت اور جہت سے منزہ

ہے لیکن چونکہ بلند جانب تمام جوانب میں سب سے اشرف ہے اس لیے اس جانب کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص کیا گیا اور عقلاء اللہ تعالیٰ کے لیے آسمان کی طرف اس لیے نہیں متوجہ ہوتے کہ ان کا انقاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے بلکہ اس وجہ سے کہ آسمان دعا کا قبلہ ہے۔ کیونکہ تمام خیرات اور براکت اور انوار اور بارشیں آسمان سے نازل ہوتی ہیں۔ (شرح المقاصد ج 4، ص 50-51، مطبوعہ منشورات الرضی، قم ایران، 1409ھ)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی 668ھ لکھتے ہیں: اکثر متقدمین اور متاخرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اللہ سبحانہ کی جہت اور مکان سے تنزیہ ضروری ہے کیونکہ جو چیز مکان میں ہو اس کو حرکت اور سکون اور تغیر اور حدوث لازم ہے یہ متکلمین کا قول ہے۔ اور سلف اول (رض) اللہ تعالیٰ سے جہت کی نفی نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے جہت ثابت کرتے تھے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے اور رسولوں نے بھی اس طرح فرمایا ہے اور سلف صالحین میں سے کسی نے اس کا انکار نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ حقیتاً عرش پر مستوی ہے، البتہ ان کو اس کا علم نہیں ہے کہ اس کے استواء کی حقیقت میں کیا کیفیت ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن، 7، ص 197، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی 1270ھ لکھتے ہیں: استوی کا معنی ہے بلند ہے۔ (اللہ عرش پر بلند ہے) اس بلندی سے وہ بلندی ماد نہیں ہے جو مکان اور مساف کی بلندی ہوتی ہے، یعنی کوئی شخص ایسی جگہ پر ہو جو جگہ دوسری جگہوں سے بلند ہو بلکہ اس سے وہ بلندی مراد ہے جو اللہ کی شان کے لائق ہے۔ تمہیں یہ معلوم ہوگا کہ سلف کا مذہب اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اس کی ماد کو اللہ پر چھوڑ دیا جائے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ عرش پر اس طرح مستوی ہے جس طرح اس کا ارادہ ہے درآنحالیکہ وہ استقرار اور جگہ پکڑنے سے منزہ ہے اور استواء کی تفسیر استیلاء (غلبہ پانے) سے کرنا باطل ہے۔ کیونکہ جو شخص اس کا قائل ہے کہ استواء کا معنی استیلاء ہے، وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ کا غالب ہونا ہمارے غالب ہونے کی مثل ہے بلکہ اس پر لازم ہے کہ وہ یہ کہے کہ وہ ایسا غالب ہے جو اس کی شان کے لائق ہے تو پھر اس کو چاہیے کہ وہ ابتداءً یہ کہے کہ وہ عرش پر اس طرح مستوی ہے جو اس کی شان کے لائق ہے۔ (روح المعانی ج 8، ص 136، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

اعلی حضرت امام احمد رضا متوفی 1340ھ نے اس آیت کا ترجمہ کیا ہے: "پھر عرش پر استواء فرمایا جیسا اس کی شان کے لائق ہے"

صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی 1367ھ لکھتے ہیں: یہ استواء متشابہات میں سے ہے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں کہ اللہ کی اس سے جو مراد ہے حق ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃالہ علیہ نے فرمایا کہ استواء معلوم ہے اور اس کی کیفیت مجہول اور اس پر ایمان لانا واجب۔ حضرت مترجم قدس سرہ نے فرمایا: اس کے معنی یہ ہیں کہ آفرینش کا خاتمہ عرش پر جا ٹھہرا۔ واللہ اعلم باسرار کتابہ (خزائن العرفان، ص 353، مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور)

استواء علی العرش اور اللہ تعالیٰ کی دیگر صفات کے مسئلہ میں ہم نے کافی طویل بحث کی ہے اور تمام قابل ذکر متقدمین اور متاخرین کے مذاہب اور ان کی آراء تفصیل سے بیان کی ہیں تاکہ ہمارے قارئین کو اس مسئلہ میں ہر پہلو سے مکمل واقفیت ہو جائے۔ بہر حال ہمارا اس مسئلہ میں وہی موقف ہے جو امام ابو حنیفہ (رح) اور دیگر سلف صالحین کا ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

ثم استوی الی السماء وھی دخان فقال لھا وللارض ائتیا طوعاً او کرھا قالتا اتینا طائعین۔ فقضھن سبع سموات فی یومین۔ پھر آسمان کی طرف قصد فرمایا اور وہ دھواں تھا یعنی بخار اور اوپر کو بلند ہونے والا اور زمین سے فرمایا کہ دونوں حاضر ہو خوشی ہو یا ناخوشی سے دونوں نے عرض کیا ہم رغبت کے ساتھ حاضر ہوئے۔ تو انھیں پورے سات آسمان کر دیا وہ دن میں یہ کل چھ دن ہوئے ان میں سب سے آخر دن جمعہ ہے۔ چار دن کی تفصیل اس سے اوپر کی آیت میں ہے۔

وجعل فیھا رواسی من فوقھا وبرک فیھا وقدر فیھا اقواتھا فی اربعۃ ایام سواء للسائلین۔

اور اس میں یعنی زمین میں اس کے اوپر سے لنگر ڈالے پہاڑوں کے اور اس میں برکت رکھی اور دریا۔ پتھر۔ بن۔ درخت اور پھل اور قسم قسم کے حیوانات پیدا کر کے اس میں اس کے بسنے والوں کی روزیاں مقرر کیں یہ سب ملا کر چار دن میں یعنی دو دن زمین کی پیدائش اور دو دن میں یہ سب ٹھیک جواب پوچھنے والوں کو۔

یعنی ہفتہ سے جمعہ تک باعتبار ملائکہ کچھ اشیا پیدا کئے اور کچھ اس امر کے اظہار کو کہ ہر کام میں تدریج حکمت الٰہی ہے اور اس امر کے اظہار کے لیے دن رکھا گیا اور اس امر کے اظہار کے لیے کہ ہر شے علیحدہ علیحدہ پیدا کی گئی۔ اس میں اس امر کی دلیل ہے کہ تدبیر عالم اور مشیت تصرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اور اس کی مشیت پر

ہی تمام نظام ہے۔ پھر عرش پر استواء فرمایا جیسا کہ اس کی شایان شان ہے یعنی عرش کی طرف مشیت وقدرت کا استیلاء ہوا۔ اضافت استیلاء الی العرش کی خصوصیت اس لیے ہے کہ عرش عظیم سب سے بڑی مخلوق اور سب سے بلند ہے اگرچہ استیلاء ذات خالق تمام مخلوق پر ہے۔

اور عرش کی تفسیر یہ ہے کہ وہ تخت ہے اور استواء کے معنی ہیں کہ استقرار علی الخلائق عرش پر ٹھہرا یعنی آخری پیدا وار عرش عظیم ہوا اور استقرار بمعنی قرار باطل محض ہے اس لیے کہ تخلیق عرش سے قبل جبکہ نہ کوئی مکان تھا اس وقت بھی ذات واجب تعالیٰ الآن کا کمان تھی۔ اس طرز بیان کی یوں ضرورت تھی کہ خلائق پر ظاہر ہو جائے کہ تغیرات خلق صفات کو ان سے ہے یہی وجہ ہے کہ صادق اور حسن اور امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہم اللہ سے منقول ہے اور یہی عقیدہ اہل سنت ہے کہ استواء معلوم ہے اور اس کی کیفیت مجہول ہے اور اس پر ایمان واجب اور اس کا انکار کفر اور اس سے سوال بدعت ہے آگے ارشاد ہے۔

رات دن کو ایک دوسرے سے ڈھانپا ہے یعنی رات سے دن اور دن سے رات ملحق ہے کہ جلد اس کے پیچھے لگا آتا ہے۔ حثیث یہ حث سے ہے۔

حث حثا وحثث تحثیثا واحث احثاثا واحتث احتثاثا واستحث استحثاث الرجل علی الامر حضہ ونشطر علی فعلہ۔ الحثیث والحثوث السریع یقال وثی حثیثا ای مسرعاً۔

والحثات والحثات السرعۃ (منجد) خلاصہ یہ کہ سرعت اور جلدی کے معنی میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔

یعنی جلدی جلدی آتا ہے اور طالب سے یہاں رات مراد ہے گویا کہ اندھیرے روشنی طلب کرتا ہے یعنی دن کو رات چاہتی ہے اور سورج اور چاند اور تارے یعنی پیدا فرمائے سورج چاند اور ستارے مسخر ہیں یعنی مذلل ہیں اور سوج، چاند، ستارے اس کے حکم میں مسخر ہیں اس سے امر تکوین مراد ہے اور جب ذکر فرمایا کہ جو پیدا کیئے وہ سب مسخر بالامر ہیں تو فرمایا خبردار اسی کے ہاتھ ہے پیدا کرنا اور حکم دینا یعنی وہی وہ ذات ہے جس نے تمام اشیاء پیدا فرمائیں اور اسی کے قبضہ اقتدار میں حکم ہے۔ برکت والا ہے اللہ یعنی بھلائیاں بیشمار رکھنے والا یا ہمیشہ اس کے احسانات ہیں یا پیدا کرنے میں برکت والا ہے یا ہیشگی اسے ہے اور اس میں برکت ہے چاہنے والا ہے جہان کا اپنے رب سے دعا کرو گڑگڑا کر اور آہستہ یعنی حضور قلب اور غایت عجز سے اور آہستہ سے اور تضرع ضراعت سے ہے اور ذلت سے جھکنا اور تملق کرنا ہے۔ منجد میں ہے۔

ضرع ضرعا فرسہ اذلہ ضرع ضراعۃ وضرع ضرعا وضرع ضراعۃ ضعف الیہ خضع وتذلل فھو ضارع۔

خلاصہ یہ معلوم ہوا کہ نہایت تذلل اور عجز کے ساتھ اپنے رب عزوجل کو پکارو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم بہرے اور غائب کو نہیں پکارتے تم تو سمیع وقریب کو پکارتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہوتے ہو اور حضرت حسن (رح) سے مروی ہے کہ دعاء سر اور علانیہ میں ستر ضعف کا فرق ہے بیشک وہ حد سے بڑھنے والے لوگوں کو پسند نہیں فرماتا۔ معتد کہتے ہیں اسے جو حد امر سے متجاوز ہو جائے ہر چیز میں دعا سے ہو یا کسی معاملہ سے ہو۔ ابن جریج (رح) سے مروی ہے دعا میں آوازیں بلند کرنا اور چیخنا مکروہ اور بدعت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ دعا میں اسہاب ہے اذھب عقلہ اسھب سھبا لکلام وفی الکلام اطال اسھب ذھب عقلہ۔ بہکنا یا کلام میں طول دینا یا عقل جاتی رہنا (منجد) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا عنقریب ایسی قوم آئے گی جو دعا میں حد سے متجاوز ہوگی اور انسان کے لیے یہ کافی ہے کہ اپنی دعا میں کہے اللھم انی اسئلک الجنۃ یا اس کے قریب اور کچھ قول وعمل سے یا کہے واعوذ بک من النار یا اس کے قریب کا کوئی سوال۔ پھر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ آیت کریمہ انہ لایحب المعتدین تک تلاوت فرمائی اور اس مضمون کو وضاحت سے علامہ روح المعانی نے بھی بیان کیا۔

(تفسیر الحسنات۔ علامہ ابوالحسنات محمد احمد قادریؒ)

آیت مبارکہ:

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۭاِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ۚ۵۵

لغۃ القرآن: اُدْعُوْا : تم سب پکارو] [رَبَّكُمْ : اپنے رب کو] [تَضَرُّعًا : عاجزی کرتے ہوئے] [وَّخُفْيَةً : اور چپکے چپکے] [اِنَّهٗ : بیشک یہ حقیقت ہے] [لَا : نہیں] [يُحِبُّ : پسند کرتا ہے] [الْمُعْتَدِيْنَ : سب زیادتی کرنیوالوں کو]

ترجمہ: تم اپنے رب سے گڑگڑا کر اور آہستہ (دونوں طریقوں سے) دعا کیا کرو، بیشک وہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا

تشریح: اپنی تمام حاجات اور مشکلات میں بارگاہ الٰہی کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا جارہا ہے اور ساتھ ہی دعا کی قبولیت کے لیے جن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے ان کا ذکر بھی فرمادیا کہ انسان نخوت و غرور کو دل سے نکال کر غفلت و کاہلی سے اپنے آپ کو پاک کرکے سراپا عجز وانکسار بن کر اپنے رب کے حضور میں دست دعا دراز کرے۔ دوسری یہ کہ چلا کر دعا نہ مانگے۔ کیونکہ آداب بارگاہ ربانی کے خلاف ہے اور اس میں ریا اور دکھلاوا کا بھی بہت امکان ہے بلکہ آہستہ آہستہ خاموشی سے اپنے دل نیاز مند کی حکایت درد وآرزو پیش کرے۔ ذکر الٰہی میں اصل تو یہی ہے لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ ذکر بالجہر ممنوع ہے درست نہیں۔ کیونکہ بعض مقامات پر اور بعض حالات اور حکمتوں کے پیش نظر ذکر بالجہر سری سے افضل ہو جاتا ہے سلسلہ عالیہ چشتیہ میں ذکر بالجہر کا مقصد یہی ہے کہ طالب مولا غفلت ونسیان کی نیند سے بیدار ہو، دل میں حرارت پیدا ہو جس سے محبت وعشق الٰہی کے شعلے بھڑک اٹھیں۔ اور یہ تو بہر حال ضروری ہے کہ دل میں ریا اور نمود کا گزر نہ ہو۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

دعا کے آداب میں شکر و حمد، درود اور توبہ استغفار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جلالت و منزلت کا تقاضا اور فقیر کی شان یہ ہے کہ مانگتے وقت غایت درجے کی انکساری اور درماندگی کا اظہار کرتے ہوئے اس کے سامنے دست سوال دراز کرنا چاہیے۔ شاہ ولی اللہ (رض) نے لکھا ہے کہ دعا مانگنے والا اس بے بسی اور بے چارگی کا اظہار کرے جس طرح مردہ غسّال کے ہاتھ میں ہو۔

(رُوحُ الدُّعَاءِ اَنْ یَّرٰی کُلَّ حَوْلٍ وَّقُوَّۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَیَصِیْرَ کَالْمَیِّتِ فِیْ یَدِ الْغَسَّالِ) [حجۃ اللّٰہ]

" دعا کی روح یہ ہے کہ دعا کرنے والا ہر قسم کی طاقت و قوت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو تصور کرے اور اس کی قوت و عظمت کے سامنے اپنے آپ کو اس طرح بے بس سمجھے جس طرح نہلانے والے کے ہاتھوں میت ہوتی ہے۔ "

اللہ تعالیٰ کو انکساری اس قدر پسند ہے کہ جب انسان پریشانیوں کے ہجوم، مسائل کے گرداب اور مصائب کے طوفانوں میں پھنس جاتا ہے۔ عزیز واقربا، دوست و احباب منہ پھیر چکے ہوتے ہیں، لوگوں کی بے وفائی کے جھٹکوں اور حالات و واردات کے تھپیڑوں نے اسے زمین کی پستیوں پر دے مارا ہوتا ہے تمام وابستگیاں ختم اور ہر قسم کی امیدیں دم توڑ گئی ہیں۔ اب نہ اٹھنے کی ہمت ہے اور نہ بیٹھنے کی سکت ہر دم بستر کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ جسمانی طور پر اس قدر کمزوری کا عالم ! کہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا ہے۔ ہاتھ اٹھانا چاہتا ہے مگر ہمت اور طاقت ختم ہو چکی ہے۔ کیونکہ بیماری اور غم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھانے کے قابل نہیں رہا۔

معذوریاں، مجبوریاں :

ان مجبوریوں اور معذوریوں میں ایک آواز اس کے کانوں کو مس کرتی ہے۔ آواز میں یہ تحریک اور امید دلائی جارہی ہے کہ میرے کمزور، ناتواں اور گناہ گار بندے تجھے اپنی درماندگیوں، لاچاریوں اور کمزوریوں پر نگاہ رکھنے کی بجائے میری رحمت پر امید رکھنی چاہیے کیونکہ میرے بغیر کوئی چارہ گر اور تیرا پرسان حال اور تیری غلطیاں معاف کرنے والا نہیں۔ امید کی اس پکار نے اس کے کمزور جسم میں طاقت، ناتواں ہاتھوں میں سکت اور شکستہ دل میں ایک امید پیدا کردی ہے۔ وہ کانپتے وجود، لرزتے ہاتھوں کو اس کی بارگاہ اقدس میں پھیلا دیتا ہے۔ اس کی زبان سے نہایت نحیف آواز نکلتی ہے کہ اے رحیم وکریم مالک میں ہر طرف سے ٹھکرایا ہوا اور ہر جانب سے بے آسرا ہو کر تیری بارگاہ پاک میں اپنا دامن حاجت پھیلا رہا ہوں۔ تو میری فریاد قبول فرما۔ میں تیرے در کا محتاج اور تیری رحمت کا طلب گار ہوں اس کے جواب میں آواز آتی ہے :

(قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ) [الزمر : ۵۳]

"(اے نبی) کہہ دو کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ وہ تو غفورالرحیم ہے۔" (تفسیر فہم القرآن)

دا کی ترغیب اور فضیلت میں احادیث:

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی 216ھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابوذر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ عزوجل سے یہ روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام کیا ہے اور میں نے تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کر دیا سو تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو، اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہو ماسوا اس کے جس کو میں ہدایت دوں، سو تم مجھ سے ہدایت طلب کرو میں تم کو ہدایت دوں گا۔ اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہو ماسوا اس کے جس کو میں ہدایت دوں، سو تم مجھ سے ہدایت طلب کرو میں تم کو ہدایت دوں گا۔ اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو ماسوا اس کے جس کو میں کھانا کھلاؤں سو تم مجھ سے کھانا طلب کرو، میں تم کو کھانا کھلاؤں گا۔ اے میرے بندو! تم سب بے لباس ہو ماسوا اس کے جس کو میں لباس پہناؤں سو تم مجھ سے لباس مانگو میں تم کو لباس پہناؤں گا۔ اے میرے بندو! تم سب دن رات گناہ کرتے ہو اور میں تمام گناہوں کو بخشتا ہوں، سو تم مجھ سے بخشش طلب کرو، میں تم کو بخش دوں گا۔ اے میرے بندو! تم کسی نقصان کے مالک نہیں ہو کہ مجھے نقصان پہنچا سکو، اور تم کسی نفع کے مالک نہیں ہو کہ مجھے نفع پہنچا سکو۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اول اور آخر اور تمہارے انسان اور جن، تم میں سب سے زیادہ متقی شخص کی طرح ہو جائیں تو میرے ملک میں کچھ اضافہ نہیں کر سکتے، اور اے میرے بندو! اگر تمہارے اول اور آخر اور تمہارے انسان اور جن، تم میں سب سے زیادہ بدکار شخص کی طرح ہو جائیں تو میرے ملک سے کوئی چیز کم نہیں کر سکتے، اور اے میرے بندو! اگر تمہارے اول اور آخر اور تمہارے انسان اور جن کسی ایک جگہ کھڑے ہو کر مجھ سے سوال کریں اور میں ہر فرد کا سوال پورا کر دوں تو جو کچھ میرے پاس ہے اس سے صرف اتنا کم ہوگا جس طرح سوئی کو سمندر میں ڈال کر (نکالنے سے) اس میں کمی ہوتی ہے۔ اے میرے بندو! یہ تمہارے اعمال ہیں جن کو میں تمہارے لیے جمع کر رہا ہوں، پھر میں تم کو ان کی پوری پوری جزا دوں گا، پس جو شخص خیر کو پائے وہ اللہ کی حمد کرے اور جس کو خیر کے سوا کوئی چیز (مثلاً آفت یا مصیبت) پہنچے وہ اپنے نفس کے سوا اور کسی کو ملامت نہ کرے۔ (صحیح مسلم، البر والصلہ: 55 (2577) 6450۔ سنن الترمذی، رقم الحدیث: 2495۔ سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 4257، کتاب الاسماء والصفات للبیہقی ص 263)

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم میں سے جس شخص کے لیے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا، اس کے لیے رحمت کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اللہ سے جس چیز کا بھی سوال کیا جائے ان میں سے پسندیدہ سوال عافیت کا ہے۔ جو مصیبتیں نازل ہو چکی ہیں اور جو نازل نہیں ہوئیں ان سب میں دعا سے نفع ہوتا ہے۔ سوا اے اللہ کے بندو! دعا کرنے کو لازم کر لو۔ (سنن الترمذی، رقم الحدیث: 3548، المستدرک ج 1، ص 498)

حضرت ثوبان (رض) بیان کرتے ہیں کہ تقدیر کو صرف دعا مسترد کر سکتی ہے اور عمر میں صرف نیکی سے اضافہ ہوتا ہے اور انسان گناہ کرنے کی وجہ سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے۔ (یہ حدیث حسن ہے) (صحیح ابن حبان، ج 2، رقم الحدیث: 872۔ المستدرک ج 1، ص 493۔ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا اور ذہبی نے ان کی موافقت کی)

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کیا میں تم کو یہ نہ بتاؤں کہ کس چیز کی وجہ سے تم کو اپنے دشمنوں سے نجات ملے گی اور کس چیز کے سبب سے تمہارے رزق میں زیادتی ہوگی! تم اپنے دن اور رات میں اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرو، کیونکہ دعا مومن کا ہتھیار ہے۔ (مسند ابو یعلی، ج 3، رقم الحدیث: 1812، مجمع الزوائد، ج 10، ص 147)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: بندہ کا اپنے رب عزوجل سے سب سے زیادہ قرب سجدہ میں ہوتا ہے سو تم (سجدہ میں) بہت دعا کیا کرو۔ (صحیح مسلم، صلوۃ: 215، (482) 1064۔ سنن ابو داؤد، رقم الحدیث: 875۔ سنن النسائی، رقم الحدیث: 1137)

عبداللہ بن صفوان بیان کرتے ہیں کہ ان کی حضرت ام الدرداء (رض) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے پوچھا کیا آپ حج کو جا رہے ہیں؟ میں نے کہا: ہاں! انھوں نے کہا ہمارے لیے خیر کی دعا کریں، کیونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے تھے جو مسلمان شخص اپنے بھائی کے حق میں اس کی پس پشت دعا کرتا ہے اس کی دعا قبول

ہوتی ہے اور اس کے سرہانے ایک فرشتہ مقرر کیا ہوا ہوتا ہے جب بھی وہ اپنے بھائی کے لیے خیر کی دعا کرتا ہے تو وہ فرشتہ کہتا ہے آمین اور تمہارے لیے بھی اس کی مثل ہو۔ (تفسیر تبیان القرآن)

یہ ہدایات ایسے وقت میں دی جارہی ہیں جبکہ مطالعہ کرنے والا نفسیاتی طور پر ان کو قبول کرنے کے لیے پوری طرح آمادہ ہو جاتا ہے۔ وہ دعاء اور رجوع الی اللہ کی حالت میں ہوتا ہے اور اس عظیم کارخانہ قدرت کے مطالعہ کے بعد اللہ کے سامنے عاجزی اور فروتنی کی حالت میں ہوتا ہے۔ خفیہ سے مراد یہ ہے کہ چیخ و پکار نہ کرو، دھیمی آواز سے پکارو کیونکہ اللہ کی جلالت شان کے لائق یہ ہے کہ انسان اسے نہایت ہی نرم اور دھیمی آواز میں پکارے اور اس انداز میں جس سے معلوم ہو کہ اللہ قریب ہے اور سن رہا ہے۔

مسلم کی روایت ہے۔ حضرت ابو موسیٰ (رض) روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ ایک روایت میں آتا ہے ایک غزوہ میں تھے، لوگوں نے زور زور سے اللہ اکبر کہنا شروع کر دیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا لوگو ذرا نرمی کے ساتھ اور اپنے دل میں پکارو، تم کسی بہرے کو نہیں پکار رہے اور نہ کسی ایسے شخص کو پکار رہے ہو جو غائب ہے، تم تو سننے والی قریب ذات کو پکار رہے ہو جو تمہارے ساتھ ہے۔

یہاں قرآن کریم کا یہ اسلوب لوگوں کے اندر یہ احساس پیدا کر رہا ہے کہ اللہ کی ذات جلیل القدر ہے اور قریب ہے اور دعا اور پکارنے کے وقت قرآن کریم عملاً ایسی ہئیت اور شکل پیدا کرنا چاہتا ہے جس سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ پکارنے والا ذات باری کی برتری کی وجہ سے چیخنے اور چلانے سے حیا کرتا ہے۔ جن لوگوں کے دل میں اللہ کی جلالت قدر بیٹھی ہوئی ہے وہ اللہ کی جناب میں شور و شغب سے دور رہتے ہیں۔

غرض اس عاجزانہ دعا اور انکساری اور خشوع و خضوع کی فضا میں، اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس بات کی ممانعت کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے لیے اس حاکمیت کا دعوی کریں جو وہ ایام جاہلیت میں کیا کرتے تھے کیونکہ حاکمیت اور اقتدار اعلی کا حق صرف اللہ کو ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ممانعت بھی آجاتی ہے کہ فساد فی الارض سے باز رہو، جبکہ اسلامی شریعت کے نظام کے ذریعے اللہ نے اس کی اصلاح کر دی ہے۔ جو شخص عاجزی، تضرع اور نہایت ہی خفیہ طریقے سے اللہ کو پکارتا ہے جو قریب بھی ہے اور سننے والا بھی ہے تو ظاہر ہے کہ ایسا شخص زمین میں اصلاح کے بعد فساد نہیں پھیلاتا کیونکہ ان دونوں تاثرات کے درمیان ایک گہرا داخلی اور نفسیاتی ربط ہے۔

قرآن کا منہاج اصلاح یہ ہے کہ وہ دلوں کی گہری سوچوں اور نفسیاتی میلانات کو لے کر چلتا ہے اور یہ منہاج وہی ذات اختیار کر سکتی ہے جو لطیف و خبیر ہے۔
(تفسیر فی ظلال القرآن)

دعا مانگنے کے فضائل:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کا حکم دیا گیا، اس مناسبت سے ہم یہاں دعا مانگنے کے 3 فضائل بیان کرتے ہیں، چنانچہ

(1)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی چیز دعا سے بزرگ تر نہیں۔

(2)۔۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جس شخص کے لیے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا تو اس کے لیے رحمت کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ سے کئے جانے والے سوالوں میں سے پسندیدہ سوال عافیت کا ہے۔ جو مصیبتیں نازل ہو چکیں اور جو نازل نہیں ہوئیں ان سب میں دعا سے نفع ہوتا ہے، تو اے اللہ عَزَّوَجَلَّ کے بندو! دعا کرنے کو (اپنے اوپر) لازم کرلو۔

(3)۔۔ حضرت جابر بن عبداللہ (رض) سے روایت ہے، رسولُ اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "کیا میں تمہیں وہ چیز نہ بتاؤں جو تمہیں تمہارے دشمن سے نجات دے اور تمہارے رزق کو وسیع کر دے" رات دن اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے رہو کہ دعا مومن کا ہتھیار ہے۔

ایک دعا سے حاصل ہونے والے فوائد:

ایک دعا سے آدمی کو پانچ فائدے حاصل ہوتے ہیں:

(1)۔۔ دعا مانگنے والا عبادت گزاروں کے گروہ میں شمار ہوتا ہے کہ دعا فی نَفْسِہٖ یعنی بذات خود عبادت بلکہ عبادت کا مغز ہے۔

(2)۔۔ جو شخص دعا کرتا ہے وہ اپنے عاجز اور محتاج ہونے کا اقرار اور اپنے پروردگار عَزَّوَجَلَّ کی قدرت اور کرم کا اعتراف کرتا ہے۔

(3)۔۔دعا مانگنے سے شریعت مطہرہ کے حکم کی بجاآوری ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا اور دعا نہ مانگنے والے پر حدیث میں وعید آئی۔
(4)۔۔سنت کی پیروی ہوگی کہ حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دعا مانگا کرتے اور اوروں کو بھی تاکید فرماتے۔
(5)۔۔دعا سے آفات و بَلِیّات دور ہوتی ہیں اور مقصود حاصل ہوتا ہے۔
{اِنَّہٗ لَایُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ : بیشک وہ حد سے بڑھنے والے کو پسند نہیں فرماتا۔} یعنی لوگوں کو دعا وغیرہ جن چیزوں کا حکم دیا گیا ان میں حد سے بڑھنے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا۔
حضرت ابونَعامہ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مُغَفَّل نے اپنے بیٹے کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا: اے اللہ! عَزَّوَجَلَّ، میں تجھ سے جنت کی دائیں طرف سفید محل کا سوال کرتا ہوں۔ تو فرمایا "اے بیٹے! اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرو اور جہنم سے پناہ مانگو کیونکہ میں نے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "عنقریب میری امت کے کچھ لوگ وضو اور دعا میں حد سے بڑھیں گے۔
دعا میں حد سے بڑھنے کی صورتیں:
یاد رہے کہ دعا میں حد سے بڑھنے کی مختلف صورتیں ہیں جیسے انبیاء کرام (علیہ السلام) کا مرتبہ مانگنا یا آسمان پر چڑھنے کی دعا کرنا، اسی طرح جو چیزیں محال یا قریب بہ محال ہیں ان کی دعا کرنا، ہمیشہ کے لیے تندرستی اور عافیت مانگنا، ایسے کام کے بدلنے کی دعا مانگنا جس پر قلم جاری ہوچکا مثلاً لمبا آدمی کہے میرا قد کم ہو جائے یا چھوٹی آنکھوں والا کہے کہ میری آنکھیں بڑی ہو جائیں۔ اسی طرح گناہ کی دعا مانگنا، رشتہ داروں سے تعلقات ٹوٹ جانے کی دعا کرنا، اللہ تعالیٰ سے حقیر چیز مانگنا، لَغْو اور بے فائدہ دعا مانگنا، رنج و مصیبت سے گھبرا کر اپنے مرنے کی دعا کرنا، صحیح شرعی غرض کے بغیر کسی کی موت یا بربادی کی دعا مانگنا، کسی مسلمان پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہونے یا اسے جہنم میں داخل کئے جانے کی دعا مانگنا، سب مسلمانوں کے سب گناہ بخشے جانے کی دعا مانگنا اور کافر کی مغفرت کی دعا کرنا وغیرہ۔
(تفسیر صراط الجنان)
حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا میں اپنے بندہ کے گمان کے مطابق ہوتا ہوں اگر وہ میری یاد دل میں کرتا ہے تو میں بھی اس کا ذکر اپنے باطن میں کرتا ہوں اور اگر وہ میرا ذکر جماعت میں کرتا ہے تو میں اس کا ذکر ایسی جماعت میں کرتا ہوں جو اس کی جماعت سے برتر ہوتی ہے (یعنی ملائکہ کی جماعت) متفق علیہ۔
اس حدیث سے ذکر جہری و خفی دونوں کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس حدیث سے جہری ذکر کی سری ذکر سے برتری ثابت ہوتی ہے مگر یہ استدلال غلط ہے۔ اللہ کسی کا ذکر سری کرلے یا جماعت کے سامنے دونوں برابر ہیں بلکہ ذکر سری کو جہری پر فضیلت حاصل ہے ایک اور آیت ہے اللہ نے فرمایا ہے: (فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَآءَکُمْ اَوْاَشَدَّ ذِکْرًا) اس میں بھی جہری ذکر مراد نہیں ہے، بلکہ کثرت ذکر کا حکم ہے۔
علماء کا اجماع ہے کہ سری ذکر افضل ہے اور جہری ذکر بدعت ہے ہاں چند مقامات میں جہری ذکر کی ضرورت ہے جیسے اذان، اقامت، تکبیرات، تشریق، امام کے لیے نماز میں تکبیرات انتقال (نیز تکبیر تحریمہ) اگر نماز کے اندر کوئی حادثہ ہو جائے تو مقتدی کا سبحان اللہ کہنا، حج میں لبیک کہنا وغیرہ۔ ہدایہ کے حواشی میں ابن ہمام نے لکھا ہے کہ تکبیرات تشریق (کی حد بندی) میں امام ابوحنیفہ (رح) نے حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) کے مسلک کو اختیار کیا ہے آپ عرفہ کے دن (یعنی نو ذی الحجہ) کی فجر سے یوم نحر کی نماز عصر تک تکبیر کہتے تھے۔ رواہ ابن ابی شیبۃ (رض) اور صاحبین (رح) نے حضرت علی (کرم اللہ وجہہ) کے مسلک کو اختیار کیا ہے آپ یوم عرفہ کی فجر کے بعد سے آخری ایام تشریق کی نماز عصر تک تکبیر کہتے تھے۔ رواہ ابن ابی شیبہ۔ وکذا روی محمد بن الحسن عن ابی حنیفۃ بسندہ۔ اس کے بعد ابن ہمام نے لکھا ہے جو شخص صاحبین کے قول پر فتویٰ دیتا ہے وہ تقاضاء ترجیح کے خلاف کرتا ہے کیونکہ امام اور صاحبین کا اختلاف محض تکبیر کہنے میں نہیں ہے بلکہ بلند آواز سے یعنی جہری تکبیر کہنے میں بھی ہے (صاحبین جہر کے اور امام صاحب سر کے قائل ہیں) اور ذکر میں اصل اخفاء ہے جہر سے ذکر کرنا بدعت ہے اور جب جہر اور اخفاء میں تعارض پڑ جائے (دونوں کا روایتی ثبوت ملتا ہو) تو اخفاء قابل ترجیح ہے (لہٰذا صاحبین کے قول پر فتویٰ تقاضاء ترجیح کے خلاف ہے) سری ذکر افضل ہے صحابہ (رض) اور تابعین (رح) کا اسی پر اتفاق رہا ہے۔ حسن (رح) کا قول ہے کہ سری دعا اور جہری دعا میں ستر ہزار درجہ کا فرق ہے۔ مسلمان بہت لگن سے

دعائیں کرتے تھے مگران کی آواز قطعاً سنائی نہیں دیتی تھی صرف لبوں کی سرسراہٹ محسوس ہوتی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (ادعوا ربکم تضرعًا وخفیۃ) اور عبد صالح کے تذکرہ میں فرمایا ہے اذ نادی ربہ نداءً خفیا حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بہترین ذکر خفی ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو بقدر کفایت ہو۔ رواہ احمد وابن حبان فی صحیحہ والبیہقی فی شعب الایمان۔

حضرت ابو موسیٰ (رض) کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خیبر پر جہاد کیا تو راستہ میں مسلمان ایک وادی سے گزرے اور انھوں نے چلا کر تکبیریں کہیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اپنے لیے سکون اختیار کرو۔ تم کسی بہرے یا غیر حاضر کو نہیں پکار رہے ہو بلکہ اس کو پکار رہے ہو جو سننے والا ہے اور قریب ہے۔ راوہ البغوی۔

میں کہتا ہوں اس حدیث سے اگرچہ ذکر خفی کی افضیلت ثابت ہوتی ہے مگر اپنے لیے سکون اختیار کرو کا لفظ بتارہا ہے کہ ذکر خفی کا حکم اور ذکر جہری کی ممانعت صرف تقاضائے شفقت کے زیر اثر تھی یہ وجہ نہ تھی کہ ذکر جہری جائز ہی نہ ہو۔ (تفسیر مظہری)

دعا میں اصل خفاء ہے :

جب عالم خلق وامر کا مالک اور تمام برکات کا منبع وہی ذات ہے تو دنیاوی واخروی حوائج میں اسی کو پکارنا چاہیے۔ الحاح واخلاص اور خشوع کے ساتھ بدون ریاکاری کے ساتھ آہستہ آہستہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعا میں اصل اخفاء ہے اور یہی سلف کا معمول تھا، بعض مواقع میں جہر واعلان کسی عارض کی وجہ سے ہوگا جس کی تفصیل روح المعانی وغیرہ میں ہے۔۔

خود اللہ جل شانہ نے ایک مرد صالح کی دعا کا ذکر ان الفاظ سے فرمایا ہے (آیت) اذ نادی ربہ نداء خفیا، یعنی جب انھوں نے رب کو پکارا آہستہ آواز سے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو دعا کی یہ کیفیت پسند ہے کہ پست اور آہستہ آواز سے دعا مانگی جائے۔

پست آواز سے دعاء کی فضیلت :

حضرت حسن بصری (رح) فرماتے ہیں کہ علانیہ اور جہراً دعا کرنے میں اور آہستہ پست آواز سے کرنے میں ستر درجہ فضیلت کا فرق ہے، سلف صالحین کی عادت یہ تھی کہ ذکر ودعا میں بڑا مجاہدہ کرتے اور اکثر اوقات مشغول رہتے تھے مگر کوئی ان کی آواز نہ سنتا تھا، بلکہ ان کی دعائیں صرف ان کے اور ان کے رب کے درمیان رہتی تھیں، ان میں بہت سے حضرات پورا قرآن حفظ کرتے اور تلاوت کرتے رہتے تھے، مگر کسی دوسرے کو خبر نہ ہوتی تھی، اور بہت سے حضرات بڑا علم دین حاصل کرتے، مگر لوگوں پر جتلاتے نہ پھرتے تھے، بہت سے حضرات راتوں کو اپنے گھروں میں طویل طویل نمازیں ادا کرتے مگر آنے والوں کو کچھ خبر نہ ہوتی تھی، اور فرمایا کہ ہم نے ایسے حضرات کو دیکھا ہے کہ وہ تمام عبادات جن کو وہ پوشیدہ کرکے ادا کرسکتے تھے کبھی نہیں دیکھا گیا کہ اس کو ظاہر کرکے ادا کرتے ہوں، ان کی آوازیں دعاؤں میں نہایت پست ہوتی تھیں (ابن کثیر، مظہری)

خلاصہ یہ ہے کہ دعاء کے دو آداب اس سے پہلی آیت میں بتلائے گئے۔ ایک عاجزی اور تضرع کے ساتھ ہونا، دوسرے خفیہ وآہستہ ہونا، یہ دونوں صفتیں انسان کے ظاہر جسد سے متعلق ہیں، کیونکہ تضرع سے مراد یہ ہے کہ اپنی ہیئت بوقت دعاء عاجزانہ، فقیرانہ بنالے، متکبرانہ یا بے نیازانہ نہ ہو، اور خفیہ ہونے کا تعلق بھی منہ اور زبان سے ہے

آہستہ ذکر کرنے کی فضیلت :

سری ذکر افضل ہے صحابہ (رض) اور تابعین کا اسی پر اتفاق رہا ہے۔ خفیا حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بہترین ذکر خفی ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو بقدر کفایت ہو۔ رواہ احمد وابن حبان فی صحیحہ والبیہقی فی شعب الایمان۔

حضرت ابو موسیٰ (رض) کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خیبر پر جہاد کیا تو راستہ میں مسلمان ایک وادی سے گزرے اور انھوں نے چلا کر تکبیریں کہیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علی وآلہ وسلم) نے فرمایا اپنے لیے سکون اختیار کرو۔ تم کسی بہرے یا غیر حاضر کو نہیں ل پکار رہے ہو بلکہ اس کو پکار رہے ہو جو سننے والا ہے اور قریب ہے۔ راوہ البغوی۔

میں کہتا ہوں اس حدیث سے اگرچہ ذکر خفی کی افضیلت ثابت ہوتی ہے مگر اپنے لیے سکون اختیار کرو کا لفظ بتا رہا ہے کہ ذکر خفی کا حکم اور ذکر جہری کی ممانعت صرف تقاضائے شفقت کے زیر اثر تھی یہ وجہ نہ تھی کہ ذکر جہری جائز ہی نہ ہو۔

ذکر کی تین اقسام:

ذکر کی تین اقسام ہیں (۱) بلند آواز سے چیخ کر۔ یہ عام صورتوں میں باجماع علماء مکروہ ہے ہاں خاص صورتوں میں اگر مصلحت و دانش کا تقاضا ہو تو درست (بلکہ ضروری) ہے اور اخفاء سے افضل ہے۔ جیسے اذان کہنا اور حج میں لبیک پڑھنا' شاید چشتی صوفیہ نے مبتدی کو جہری ذکر کی تلقین مصلحت ہی کے تحت کی ہے شیطان کو بھگانا' غفلت دور کرنا' نسیان کو زائل کرنا' دل میں گرمی پیدا کرنا' آتش محبت کو ریاضت کے ذریعہ سے تیزی کرنا اور دوسرے فوائد اس سے وابستہ ہیں لیکن ریاکاری اور شہرت طلبی سے اجتناب ضروری ہے۔

(۲) زبان سے چپکے چپکے ذکر کرنا' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): کا ارشاد ہے' ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تیری زبان تروتازہ رہے۔ رواہ الترمذی وابن ماجۃ۔ اس حدیث میں یہی مراد ہے۔ امام احمد اور ترمذی کی روایت ہے کہ عرض کیا گیا سب سے بڑا عمل کون سا ہے فرمایا (سب سے افضل عمل) یہ ہے کہ دنیا کو چھوڑتے وقت تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تروتازہ ہو۔ حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کے کچھ فرشتے راستوں میں گھومتے اور اہل ذکر کو تلاش کرتے رہتے ہیں اگر کچھ لوگوں کو ذکر خدا میں مشغول پاتے ہیں تو باہم ایک دوسرے کو پکارتا ہے ادھر آؤ مقصد مل گیا چنانچہ سب آکر اہل ذکر کو اپنے پروں سے گھیر لیتے ہیں اور دنیوی آسمان تک یونہی سلسلہ جوڑ لیتے ہیں ان کا رب ان سے پوچھتا ہے باوجودیکہ وہ خود ان سے زیادہ واقف ہوتا ہے۔ میرے بندے کیا کہہ رہے تھے فرشتے عرض کرتے وہ تیری پاکی تیری بڑائی تیری حمد اور تیری بزرگی بیان کر رہے تھے (یعنی سبحان اللہ' اللہ اکبر' الحمد للہ اور المجد للہ کہہ رہے تھے) اللہ فرماتا ہے کیا انھوں نے مجھے دیکھا ہے فرشتے عرض کرتے ہیں نہیں بخدا انھوں نے جھے نہیں دیکھا۔ اللہ فرماتا ہے پھر اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو ان کی کیا حالت ہوتی فرشتے عرض کرتے ہیں اگر وہ تجھے دیکھ پاتے تو تیری عبادت اور قوت سے کرتے تیری بزرگی بہت زیادہ بیان کرتے اور تیری پاکی کا اظہار اور کثرت سے کرتے اللہ فرماتا ہے وہ کیا مانگتے تھے فرشتے عرض کرتے ہیں وہ تجھ سے جنت کے خواستگار تھے اللہ فرماتا ہے کیا انھوں نے جنت کو دیکھا ہے فرشتے عرض کرتے ہیں نہیں پروردگار انھوں نے جنت کو نہیں دیکھا اللہ فرماتا ہے پھر اگر وہ جنت کو دیکھ لیتے تو ان کی کیا حالت ہوتی فرشتے عرض کرتے ہیں اگر وہ جنت کو دیکھ پاتے تو ان کو جنت کی حرص' رغبت اور طلب اور زیادہ ہو جاتی اللہ فرماتا ہے وہ کس چیز سے پناہ مانگتے تھے فرشتے عرض کرتے ہیں دوزخ سے۔ اللہ فرماتا ہے کیا انھوں نے دوزخ کو دیکھا ہے فرشتے عرض کرتے ہیں نہیں پروردگار بخدا انھوں نے دوزخ کو نہیں دیکھا اللہ فرماتا ہے پھر اگر وہ دیکھ پاتے تو ان کی کیا کیفیت ہوتی فرشتے عرض کرتے ہیں اگر دیکھ پاتے تو دوزخ سے فرار و خوف ان کا اور زیادہ ہو جاتا۔ اللہ فرماتا ہے تم گواہ رہو کہ میں نے ان کو بخش دیا۔ جماعت ملائکہ میں سے ایک فرشتہ عرض کرتا ہے۔ اہل ذکر میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو ذکر میں شریک نہ تھا اپنے کسی کام سے آیا تھا اللہ فرماتا ہے وہ سب ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ بیٹھنے والا بدنصیب نہیں ہو سکتا۔ رواہ البخاری۔ مسلم نے بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے۔

بغیر زبان کے صرف قلبی اور روحی اور نفسی ذکر کرنا۔ یہی ذکر خفی ہے جس کو اعمالنامے لکھنے والے فرشتے بھی نہیں سن پاتے۔ ابو یعلی نے حضرت عائشہ (رض) کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا وہ ذکر خفی جس کو اعمالناموں کے لکھنے والے فرشتے بھی نہیں سن پاتے وہ ذکر جلی سے ستر ہزار درجے فضیلت رکھتا ہے جب قیامت کا دن ہوگا اور اللہ حساب کے لیے سب لوگوں کو جمع کرے گا اور فرشتے اعمال نامے اور تمسکات لے کر حاضر ہوں گے تو اللہ ان سے فرمائے گا دیکھو (اس بندہ کی) کوئی چیز رہ تو نہیں گئی فرشتے عرض کریں گے ہم کو جو کچھ معلوم ہوا اور ہماری نگرانی میں جو کچھ ہوا ہم نے سب کا احاطہ کرلیا اور لکھ لیا کوئی بات نہیں چھوڑی اللہ فرماتا ہے اس کی ایک نیکی ایسی بھی ہے جس کا تم کو علم نہیں میں تم کو بتاتا ہوں وہ نیکی ذکر خفی ہے۔

میں کہتا ہوں اس ذکر کا سلسلہ نہیں ٹوٹتا نہ اس میں کوئی سستی آتی ہے (یعنی ذکر قلبی ہمہ اوقات جاری رہ سکتا ہے)

انہ لایحب المعتدین: یعنی دعاء میں حد ادب سے نہ بڑھے۔ مثلاً جو چیزیں عادتاً یا شرعاً محال ہیں وہ مانگنے لگے یا معاصی اور لغو چیزوں کی طلب کرے، یا ایسا سوال کرے جو اس کی شان و حیثیت کے مناسب نہیں یہ سب اعتداء فی الدعاء میں داخل ہے۔

دعاء میں حد سے آگے نہ بڑھو:

بغوی نے اپنی سند سے ابوداؤد وسجستانی کے سلسلہ سے حسب روایت ابو نعامہ بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ (رض) بن مغفل نے اپنے بیٹے کو یوں دعا مانگتے سنااے اللہ میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ جب میں جنت میں جاؤں تو مجھے جنت کے دائیں جانب سفید محل عطافرمانا حضرت عبداللہ (رض) نے فرمایا بیٹے اللہ سے جنت کی دعا کر اور دوزخ سے اس کی پناہ طلب کر میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا تھا آپ فرمارہے تھے اس امت میں آئندہ کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو طہارت اور دعا حد (سنت) سے آگے بڑھ جائیں گے۔ کذاروی ابن ماجۃ وابن حبان فی صحیحہ۔

ابو یعلی نے مسند میں حضرت سعد (رض) کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا عنقریب کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو دعا میں حدود (سنت) سے تجاوز کریں گے آدمی کے لیے اتنا کہنا کافی ہے اے اللہ میں تجھ سے جنت کا اور اس قول و عمل کا جو جنت سے قریب کر دے خواستگار ہوں اور دوزخ سے اور دوزخ کے قریب لے جانے والے قول و عمل سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ ابو یعلی نے کہا آدمی کے لیے اتنا کہنا کافی ہے۔ آخر کلام تک۔ معلوم نہیں یہ حضرت سعد کا قول ہے یا فرمان نبوی کا حصہ ہے۔

حد سے آگے بڑھنے والے۔

عطیہ نے کہا المعتدین سے وہ لوگ مراد ہیں جو ناجائز طور پر مسلمان کے لیے بددعا کرتے ہیں۔ (مثلاً یوں کہتے ہیں اے اللہ ان پر لعنت بھیج۔ ایسی بددعائیں کرنے میں سب سے آگے رافضی ہیں جو صحابہ کرام اور بعض اہل بیت پر لعنت کرتے ہیں۔ ابن جریج نے کہا اعتدائ سے مراد ہے چیخ چیخ کر دعا کرنا جس کی ممانعت اس فرمان رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں آئی جو حضرت ابو موسیٰ (رض) کی روایت سے منقول ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اپنے اوپر نرمی اختیار کرو تم نہ کسی بہرے کو پکار رہے ہو۔ نہ کسی غیر حاضر کو۔

میں کہتا ہوں اعتدائ سے مراد ہے حد شریعت سے تجاوز کرنا اس کے اندر تمام مذکورہ بالا صورتیں بھی آجاتی ہیں اور ایسی دعا کرنا بھی اس میں شامل ہے جس میں کوئی گناہ یا قطع رحم ہورہا ہو اور یہ الفاظ بھی اعتداء ہی کے ذیل میں آتے ہیں۔ میں نے دعا کی مگر میری دعا قبول نہ ہوئی۔ میں دعا کررہا ہوں اور میری دعا ضرور قبول ہوگی۔ یا اللہ سے ایسے نام لے کر کرے جو شریعت (قرآن و حدیث) میں مذکور نہیں ہیں (مثلاً بھگوان ' پرماتما ' ایشور وغیرہ)۔

حرام خور کی دعاء:

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک بار کسی شخص کا (بطور تمثیل) ذکر فرمایا کہ طویل سفر کرتا ہے۔ پراگندہ مو، اور غبار آلود چہرہ والا ہے آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا دعاء کرتا ہے اے میرے رب اے میرے رب۔ مگر اس کا کھانا حرام کا ہے اس کا پینا حرام کا ہے اس کا لباس حرام کا ہے اس کی پرورش ہی حرام سے ہے ایسے شخص کی دعا کیسے قبول ہوگی۔ (رواہ مسلم الترمذی من حدیث ابوہریرہ)

دعاء قبول ہوتی رہتی:

مسلم اور ترمذی نے حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بندہ کی دعا برابر قبول ہوتی ہے بشرطیکہ وہ گناہ کی اور قطع رحم کی دعا نہ کرے اور دعا میں جلد بازی سے بھی کام نہ لے عرض کیا گیا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جلد بازی سے کیا مراد ہے فرما (مثلا) کہنے لگے میرے خیال میں دعا قبول نہیں ہوگی یہ خیال کرکے تھک کر دعا کرنی چھوڑ دے۔ امام احمد نے حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دل ظروف ہیں بعض بعض سے زیادہ سمائی والے ہیں لوگو! اللہ سے دعا کرتے وقت یقین رکھا کرو کہ تمہاری دعا ضرور قبول ہوگی اللہ اس بندہ کی دعا قبول نہیں کرتا جو بے توجہ دل سطحی طور پر کرتا ہے ترمذی نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بھی یہ حدیث نقل کی ہے۔ قبول دعا کا یقین رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کا یقین رکھے کہ اللہ کریم ہے سخی ہے بخل نہیں کرسکتا لیکن دعا کے قبول نہ ہونے کا سبب انسان کی معصیت اور خطا کاری ہے گویا اللہ کی رحمت وجود پر نظر رکھتے ہوئے تو دعا قبول ہونے کا یقین رکھا جائے اور اپنے اعمال کی نحوست کو دیکھتے ہوئے دعا کے رد ہونے کا اندیشہ دل گیر رہے

حد سے بڑھنے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے:

اللہ تعالیٰ ایک برگزیدہ بندے کا ذکر فرماتا ہے کہ وہ جب اپنے رب کو پکارتا تھا تو بہت ہی پست آواز میں پکارتا تھا۔ آواز کو بلند کرنا بہت ہی مکروہ ہے۔ انہ لایحب المعتدین کی تفسیر میں ابن عباس فرماتے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دعا میں اپنی حد سے تجاوز کرنے کو خدا پسند نہیں کرتا۔ ابو مجلز کہتے ہیں کہ منازل انبیاء حاصل ہونے کی دعا نہ مانگا کرو۔ سعد نے اپنے بیٹے کو دیکھا کہ یوں دعا مانگ رہا ہے کہ اے خدا میں جنت اور جنت کی نعمتیں اور جنت کے ریشمی کپڑے مانگتا ہوں اور دوزخ سے پناہ مانگتا ہوں اور اس کی زنجیروں اور بیڑیوں سے۔ تو باپ نے کہا تم نے خیر مانگنے میں بھی انتہا کر دی۔ (تفسیر گلدستہ)

دعا کے بعض آداب :

دعاء میں رونا یا رونے والی صورت بنانا چاہیے : ادعوا ربکم تضرعاً سے معلوم ہوا کہ دعاء میں تضرع ہونا چاہیے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) سے مروی ہے کہ حضور سرور کونین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، اللہ کے خوف سے روؤ اگر رونہ سکو تو رونے والی صورت بناؤ۔ " (ابن ماجہ کتاب الزہد باب 19)

یہ بھیمعلوم ہوا کہ دعاء میں چلانا برا ہے : وَّخُفۡیَۃً کہہ کر آہستہ دعاء کی ترغیب دی گئی۔ حضرت حسن تابعی فرماتے ہیں صحابہ کرام (رض) طویل دعائیں کرتے مگر ہلکی سی منمناہٹ کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ (ابن جریر)

یاد رہے اجتماعی دعا میں اونچی آواز سے مانگنا برا نہیں تاکہ سب لوگ سن لیں مگر مقصد سے زائد چلانا بہر حال برا ہے۔ کئی لوگ دکھاوے کے لیے چلا چلا کر دعا کرتے ہیں یہ برا ہے۔

نماز میں آمین آہستہ کہنی چاہیے :

جہری نمازوں میں امام کے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے بعد امام اعظم علیہ الرحمہ کے نزدیک مقتدی حضرات کو آہستہ سے دل میں آمین کہنی چاہیے۔ ان کی دلیل بھی یہ آیت ہے۔ کیونکہ آمین دعا ہے اور دعا میں آہستگی ہی اللہ کو محبوب و مطلوب ہے۔ اس قدر زور سے نماز میں آمین کہنا کہ مسجد گونج اٹھے : ادعوا ربکم تضرعا وخفیۃ۔ کے خلاف ہے۔ اور حدیث طیبہ میں بھی یہی مذکورہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نماز میں آہستہ آمین کہتے تھے۔

حضرت علقمہ بن وائل اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔ پڑھا، فقال آمین وخفض بھا صوتہ۔ تو آپ نے آمین کہا اور اس کی آواز آہستہ رکھی۔ (ترمذی جلد اول صفحہ 63 مطبوعہ نور محمد کراچی)

ابراہیم نخعی (تابعی) فرماتے ہیں امام چار چیزوں کو آہستہ کہے، سبحانک اللہ وبحمدک، اعوذ باللہ بسم اللہ، اور آمین۔ (کتاب الآثار صفحہ 16 مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی)

اسی طرح حضرت سمرہ بن جندب (رض) کے بارہ میں مروی ہے کہ وہ دو سکتے کرتے تھے، ایک نماز کے افتتاح میں دوسرا ولا الضالین کہنے کے بعد۔ اس بارہ میں حضرت ابی بن کعب (رض) سے پوچھا گیا انھوں نے فرمایا جیسے سمرہ بن جندب کرتے ہیں وہی صحیح ہے۔ (آثار السنن بروایت دار قطنی جلد اول صفحہ 96) اب پہلا سکتہ ثناء پڑھنے کے لیے تھا اور فاتحہ کے بعد والا سکتہ آمین کہنے کے لیے تھا۔

حضرت وائل بن حجر (رض) سے مروی ہے کہ فرمایا :

لم یکن عمر ولا علی یجھران ببسم اللہ الرحمان الرحیم ولا بآمین۔ حضرت عمر فاروق اور مولا علی (رض) (نماز میں) بسم الرحمان الرحیم اور آمین کو اونچا نہیں پڑھتے تھے۔ (جامع الرضوی بحوالہ طبرانی، تہذیب الآثار، طحاوی)

حضرت ابوہریرہ (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا :

اذا امن الامام فامنوا فانہ من وافق تامینہ تامین الملائکۃ غفر لہ ما تقدم من ذنبہ۔ جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو، کہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین سے موافق ہو اس کی بخشش کر دی جائے گی۔ (بخاری کتاب صفۃ الصلوۃ حدیث 749، مسلم کتاب الصلوۃ حدیث 410)

یہاں یہ بات قابل غور کہ مقتدیین کو حکم ہوا کہ اپنی آمین کو فرشتوں کی آمین سے موافق رکھو، اب فرشتوں کی آمین خفیہ ہے تو مقتدیوں کی آمین بھی خفیہ ہی ہونی چاہیے۔

اور وہ جو ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ (رض) سے مروی ہے کہ حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب ولا الضالین کے بعد آمین کہتے تو اسے پہلی صف والے سنتے تھے اور اس سے مسجد گونج جاتی تھی۔ (ابن ماجہ کتاب الصلاۃ باب الجہر بالتامین صفحہ 62)
تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کبھی لوگوں کو آمین کہنے کی تعلیم دینے کے لیے ہلکی سی بلند آواز سے آمین کہتے کہ پہلی صف والے سن لیتے۔ رہے یہ الفاظ کہ اس سے مسجد گونج جاتی تھی تو یہ راوی کا اپنا خیال ہے، اگر مسجد گونج جاتی ہو تو صرف پہلی صف والوں ہی کے سننے کا کیا معنی ہے؟ پھر تو آخری صف تک سب کو سن لینا چاہیے۔ (تفسیر برہان القرآن)

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بہت دفعہ بار بار دعا کرنے کے باوجود دعا قبول نہیں ہوتی پھر دعا کرنے کا کیا فائدہ ہے! اس کا جواب یہ ہے کہ جب بندہ دعا کرتا ہے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اللہ کا محتاج ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو اپنا حاجت روا اور کارساز مانتا ہے تو اس کی دعا قبول ہو یا نہ ہو اس دعا کا یہ فائدہ کم تو نہیں ہے کہ اسے اللہ کی معرفت ہوتی ہے، دعا قبول نہ ہونے کے باوجود جب وہ بار بار اللہ ہی کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے تو اس کے اس ایمان اور یقین کا اظہار ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک سوال اور گدا کے لیے اللہ کے در کے سوا اور کوئی دروازہ نہیں ہے۔ وہ رد کرے یا قبول، وہ اس کے سوا اور کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا، کسی سے سوال نہیں کرتا، کسی کے آگے نہیں گڑگڑاتا اور یہ دعا کا بہت بڑا فائدہ ہے جس سے بندہ کے توحید پر ایمان کا اظہار ہوتا ہے۔

اگر انسان بار بار دعا کرتا رہے اور اس کی دعا قبول نہ ہو اور وہ اس پر صبر کرے تو اللہ اس سے کوئی مصیبت ٹال دیتا ہے۔

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: تم میں سے جو شخص دعا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا سوال اس کو عطا فرماتا ہے یا اس کی مثل اس سے کوئی مصیبت دور کر دیتا ہے بشرطیکہ وہ کسی گناہ یا قطع رحم کی دعا نہ کرے۔ (سنن ترمذی رقم الحدیث: 3392، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

بعض اوقات انسان کی دعا قبول نہ ہو اور وہ اس پر صبر کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض اس کو آخرت میں اجر عطا فرماتا ہے۔ حضرت ابوسعید (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو مسلمان ایسی دعا کرے جس میں گناہ نہ ہو اور نہ قطع رحم ہو تو اللہ اس کو تین چیزوں میں سے ایک چیز ضرور عطا فرماتا ہے یا تو اس کی دعا جلد قبول فرمالیتا ہے یا اس دعا کو اس کے لیے آخرت میں ذخیرہ کر دیتا ہے یا اس کی مثل اس سے کوئی مصیبت دور فرما دیتا ہے۔ صحابہ نے کہا پھر تو ہم بہت دعا کریں گے، آپ نے فرمایا اللہ بہت دینے والا ہے۔

(اس حدیث کی سند حسن ہے، مسند احمد ج 10 مطبوعہ دار الحدیث قاہرہ، 1416ھ، رقم الحدیث: 11075، المستدرک، ج 1، ص 493)

ہمیں چونکہ مستقبل اور عاقبت امور کا پتا نہیں ہوتا اس لیے ہم بعض اوقات کسی ایسی چیز کی دعا کرتے ہیں جو انجام کار ہمارے لیے مضر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دعا کو قبول نہ کرکے ہمیں اس نقصان سے بچالیتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔ " وعسی ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم وعسی ان تحبوا شیئا وھو شر لکم واللہ یعلم وانتم لا تعلمون: ہو سکتا ہے کہ کسی چیز کو تم برا سمجھو! اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے حق میں بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے" (البقرہ: 216)۔ میں نے البقرہ: 186 کی تفسیر میں دعا پر کافی مفصل گفتگو کی ہے اور ان عنوانات پر تقریر کی ہے، اللہ سے دعا کرنے کے متعلق احادیث، ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے متعلق احادیث، فرض نمازوں کے بعد دعا کرنے کے متعلق احادیث، فرض نمازوں کے بعد دعا کرنے کے متعلق فقہاء اسلام کی آراء، طلب جنت کی دعا کرنے کا قرآن اور سنت سے بیان، دعا قبول ہونے کی شرائط اور آداب اور دعا قبول نہ ہونے کی وجوہات۔ اس آیت کی تفسیر میں، میں دعا کی فضیلت میں چند احادیث بیان کروں گا اور چپکے چپکے دعا کرنے کے فوائد اور نکات بیان کروں گا۔ ہمارے زمانہ میں بعض لوگ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے شدید مخالف ہیں۔ ہرچند کہ سورۃ بقرہ کی تفسیر میں میں اس کے متعلق چند احادیث بیان کرچکا ہوں لیکن بعض محبین کی فرمائش پر میں یہاں مزید تتبع کرکے احادیث اور آثار کو بیان کروں گا۔ فاقول و باللہ التوفیق وبہ الاستعانۃ یلیق۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ○۵۶

لغۃ القرآن: وَلَا : اور نہ] [تُفْسِدُوْا : تم سب فساد برپا کرو] [فِي الْاَرْضِ : زمین میں ہے] [بَعْدَ : اس کے بعد کہ] [اِصْلَاحِهَا : اس کی اصلاح] [وَادْعُوْهُ : اور تم سب پکارو اسے] [خَوْفًا : ڈرتے ہوئے] [وَّطَمَعًا : اور طمع کرتے ہوئے] [اِنَّ : بیشک] [رَحْمَتَ : رحمت] [اللّٰهِ : اللہ] [قَرِيْبٌ : قریب ہوں] [مِّنَ : سے] [لْمُحْسِنِيْنَ : سب نیکی کرنے والوں کو]

ترجمہ: اور زمین میں اس کے سنور جانے (یعنی ملک کا ماحول حیات درست ہو جانے) کے بعد فساد انگیزی نہ کرو اور (اس کے عذاب سے) ڈرتے ہوئے اور (اس کی رحمت کی) امید رکھتے ہوئے اس سے دعا کرتے رہا کرو، بیشک اللہ کی رحمت احسان شعار لوگوں (یعنی نیکوکاروں) کے قریب ہوتی ہے

تشریح: اے اللہ سے رو رو کر دعاء کرنے والو ! زمین میں فساد نہ کرو جبکہ نفاذ اسلام کے ذریعے اس میں اصلاح کر دی گئی ہے مطلب یہ کہ دوسروں پر ظلم کرکے اور ان کے حقوق چھین کر بازار فساد گرم نہ کرو کیونکہ ایسے شخص کی دعا قبول نہیں کی جاتی نہ ایسے لوگوں کا رونا اللہ کو پسند ہے۔ آگے فرمایا اللہ کو خوف وامید کے ساتھ پکارو، خوف یہ کہ شاید گناہوں کے سبب دعا رد کر دی جائے اور امید یہ کہ اللہ اپنی رحمت سے دعا قبول اور گناہ معاف فرمائے گا۔ اسی لیے حدیث میں ہے کہ ایمان خوف وامید کے درمیان ہے۔ (تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا اس میں دو لفظ متضاد اور متقابل آئے ہیں صلاح اور فساد، صلاح کے معنی درستی اور فساد کے معنی خرابی کے آتے ہیں، امام راغب (رح) نے مفردات القرآن میں فرمایا کہ فساد کہتے ہیں کسی چیز کے اعتدال سے نکل جانے کو خواہ یہ نکلنا تھوڑا سا ہو یا زیادہ، اور ہر فساد میں کمی بیشی کا مدار اسی اعتدال سے خروج پر ہے، جس قدر خروج بڑھے گا فساد بڑھے گا فساد کے معنی خرابی پیدا کرنا اور اصلاح کے معنی درستی کرنا ہے اس لیے وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا کے معنی یہ ہوئے کہ "زمین میں خرابی نہ پیدا کرو بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی درستی فرمادی ہے"۔

امام راغب (رح) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کی اصلاح کرنا اس کی کئی صورتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اس کو اول ہی ٹھیک ٹھیک اور درست پیدا فرمایا، جیسے (آیت) واصلح بالہم دوسرے یہ کہ اس میں جو فساد آگیا تھا اس کو دور کر دیا، جیسے (آیت) یصلح لکم اعمالکم، تیسری یہ کہ اس کو صلاح کا حکم دیا جائے، اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب زمین کی اصلاح و درستی فرمادی تو اس کے بعد تم اس میں فساد اور خرابی نہ ڈالو، اس میں زمین کی درستی کرنے کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں، ایک ظاہری درستی کہ زمین کو کھیتی اور درخت اگانے کے قابل بنایا، اس پر بادلوں سے پانی برسا کر زمین سے پھل پھول نکالے، انسان اور دوسرے جانداروں کے لیے زمین سے ہر قسم کی ضروریات زندگی اور آسائش کے سامان پیدا فرمائے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ زمین کی باطنی اور معنوی اصلاح فرمائی، اس طرح کہ زمین پر اپنے رسول اپنی کتابیں اور ہدایات بھیج کر اس کو کفر و شرک اور گمراہی سے پاک کیا اور ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں مفہوم یعنی ظاہری اور باطنی ہر طرح کی اصلاح اس آیت میں مراد ہو، تو اب معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو ظاہری اور باطنی طور پر درست فرمادیا ہے، اب تم اس میں اپنے گناہوں اور نافرمانیوں کے ذریعے فساد نہ مچاؤ، اور خرابی پیدا نہ کرو۔

زمین کی درستی اور خرابی کیا ہے اور لوگوں کے گناہوں کا اس میں کیا دخل ہے

جس طرح اصلاح کی دو قسمیں ظاہری اور باطنی ہیں اسی طرح فساد کی بھی دو قسمیں ہیں، زمین کی ظاہری اصلاح تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا جسم بنایا ہے کہ نہ پانی کی طرح نرم ہے جس پر قرار نہ ہو سکے، اور نہ پتھر لوہے کی طرح سخت ہے جس کو کھودا نہ جاسکے، ایک درمیانی حالت میں رکھا گیا ہے، تاکہ انسان اس کو نرم کرکے اس میں کھیتی اور درخت اور پھول پھل اگا سکے، اور کھود کر اس میں کنویں اور خندقیں، نہریں بنا سکیں، مکانات کی بنیادیں مستحکم کر سکیں، پھر اس زمین کے اندر اور باہر ایسے سامان پیدا فرمادیئے جن سے زمین کی آبادی ہو، اس میں سبزی اور درخت اور پھول پھل اگ سکیں، باہر سے ہوا، روشنی، گرمی، سردی پیدا کی، اور پھر بادلوں کے ذریعے اس پر پانی برسایا جس سے درخت پیدا ہو سکیں، مختلف ستاروں اور سیاروں کی سرد گرم کرنیں ان پر ڈالی گئیں جن سے پھولوں پھلوں میں رنگ اور رس بھرے گئے، انسان کو فہم و عقل عطا کی گئی، جس کے ذریعہ اس نے زمین سے نکلنے والے کام مواد لکڑی، لوہا، تانبہ، پیتل، ایلومینیم وغیرہ کے جوڑ توڑ لگا کر مصنوعات کی ایک نئی دنیا بناڈالی، یہ سب زمین کی اصلاح ظاہری ہے جو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے فرمائی۔

اور اصلاح باطنی وروحانی کامدار ذکر اللہ، تعلق مع اللہ اور اس کی اطاعت پر ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اول تو ہر انسان کے قلب میں ایک مادّہ اور جذبہ خدا کی اطاعت اور یاد کا رکھ دیا ہے (آیت) فالھمھا فجورھا و تقوھا، اور انسان کے گردوپیش کے ہر ذرے ذرے میں اپنی قدرت کاملہ اور صنعت عجیبہ کے ایسے مظاہر رکھے کہ ان کو دیکھ کر معمولی فہم وادراک رکھنے والا بھی بول اٹھے کہ (آیت) فتبرک اللہ احسن الخلقین، اس کے علاوہ اپنے رسول بھیجے کتابیں نازل فرمائیں جن کے ذریعہ مخلوق کا رشتہ خالق کے ساتھ جوڑنے کا پورا انتظام فرمایا۔

اس طرح گویا زمین کی مکمل اصلاح ظاہری اور باطنی ہو گئی، اب حکم یہ ہے کہ ہم نے اس زمین کو درست کر دیا ہے تم اس کو خراب نہ کرو۔

جس طرح اصلاح کی دو قسمیں ظاہری اور باطنی بیان کی گئی ہیں اسی طرح اس کے بالمقابل فساد کی بھی دو قسمیں ظاہری اور باطنی ہیں، اور اس ارشاد ربانی کے ذریعہ دونوں ہی کی ممانعت کی گئی ہے۔

اگرچہ قرآن اور رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اصل وظیفہ اور فرض منصبی اصلاح باطنی ہے، اور اس کے بالمقابل فساد باطنی سے روکنا ہے، لیکن اس دنیا میں ظاہر و باطن کے اصلاح و فساد میں ایک ایسا ربط ہے کہ ایک کا فساد دوسرے کے فساد کا موجب بن جاتا ہے، اس لیے شریعت قرآن نے جس طرح باطنی فساد کے دروازے بند کئے ہیں اسی طرح ظاہری فساد کو بھی منع فرمایا چوری ڈاکہ، قتل اور بے حیائی کے تمام طریقے دنیا میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کا فساد پیدا کرتے ہیں، اس لیے ان چیزوں پر خصوصیت سے پابندیاں اور سخت سزائیں مقرر فرمائی، اور عام گناہوں اور جرائم کو بھی ممنوع قرار دیا، کیونکہ ہر جرم وگناہ کہیں ظاہری فساد کا موجب ہوتا ہے کہیں باطنی فساد کا، اور اگر غور سے دیکھا جائے تو ظاہری فساد باطنی فساد کا سبب بنتا ہے، اور ہر باطنی فساد ظاہری فساد کا موجب ہوتا ہے۔

ظاہری فساد کا باطنی کے لیے مستلزم ہونا تو اس لیے ظاہر ہے کہ وہ اطاعت احکام آلٰہیہ کی خلاف ورزی ہے، اور خدا تعالیٰ کی نافرمانی ہی کا دوسرا نام فساد باطنی ہے، البتہ فساد باطنی کس طرح فساد ظاہری کا سبب بنتا ہے، اس کا پہچاننا کسی قدر غور و فکر کا محتاج ہے، وجہ یہ ہے کہ یہ سارا جہان اور اس کی ہر چھوٹی بڑی چیز سب مالک الملک و الملکوک کی بنائی ہوئی اور اس کے تابع فرمان ہے، جب تک انسان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے لگے تو دنیا کی ساری چیزیں درپردہ انسان کی نافرمان ہو جاتی ہیں، جس کو بظاہر انسان اپنی آنکھ سے نہیں دیکھتا، لیکن ان چیزوں کے آثار و خواص اور نتائج و فوائد میں غور کرنے سے بدیہی طور پر اس کا ثبوت مل جاتا ہے۔

ظاہر میں تو یہ دنیا کی ساری چیزیں انسان کے استعمال میں رہتی ہیں، پانی اس کے حلق میں اترے تو پیاس بجھانے سے انکار نہیں کرتا، کھانا اس کی بھوک رفع کرنے سے نہیں رکتا، لباس اور مکان اس کی سردی گرمی کی آسائشوں کو مہیا کرنے سے انکار نہیں کرتا۔

لیکن عواقب اور نتائج کو دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز اپنا کام پورا نہیں کر رہی، کیونکہ اصل مقصد ان تمام چیزوں اور ان کے استعمال کا یہ ہے کہ انسان کو آرام وراحت میسر آئے، اس کی پریشانی اور تکلیف دور ہو اور بیماریوں کو شفاء ہو۔

ان دنیا کے حالات پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ آج کل سامان راحت اور سامان شفاء کی زائد از قیاس فراوانی کے باوجود انسانوں کی اکثریت انتہائی پریشانیوں اور بیماریوں کا شکار ہے، نئے نئے امراض، نئی نئی مصیبتیں برس رہی ہیں، کوئی بڑے سے بڑا انسان اپنی جگہ مطمئن اور آسودہ نہیں ہے، بلکہ جوں جوں یہ سامان بڑھتے جاتے ہیں اسی انداز سے مصائب وآفات اور امراض اور پریشانیاں بڑھتی جاتی ہیں " مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی "

آج کا انسان جس کو برق و بھاپ اور دوسری مادی رنگینیوں نے مسحور بنا رکھا ہے، ذرا ان چیزوں سے بلند ہو کر سوچے تو اس کو معلوم ہوگا کہ ہماری ساری کوششیں اور ساری مصنوعات و ایجادات ہمارے اصل مقصد یعنی اطمینان و راحت کے حاصل کرنے میں فیل اور ناکام ہیں، اس کی وجہ بجز اس معنوی اور باطنی سبب کے نہیں ہے کہ ہم نے اپنے رب اور مالک کی نافرمانی اختیار کی تو اس کی مخلوقات نے معنوی طور پر ہم سے نافرمانی شروع کر دی

چوں از و گشتی ہمہ چیز از تو گشت

کہ ہمارے لیے حقیقی آرام و راحت مہیا نہیں کرتی، مولانا رومی (رح) نے خوب فرمایا ہے

خاك و باد و آب و آتش بندہ اند با من و تو مردہ با حق زندہ اند

یعنی دنیا کی یہ سب چیزیں اگرچہ ظاہر میں بے جان و بے شعور نظر آتی ہیں، مگر حقیقت میں اتنا ادراك ان میں بھی ہے کہ مالک کے تابع فرمان کام کرتی ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب غور سے دیکھا جائے تو ہر گناہ اور خدا تعالیٰ سے غفلت اور اس کی ہر نافرمانی دنیا میں نہ صرف باطنی فساد پیدا کرتی ہے بلکہ ظاہری فساد بھی اس کا لازمی ثمرہ ہوتا ہے، اسی کو مولانا رومی (رح) نے فرمایا ہے

ابر نا ید از پئے منع زکوۃ وز زنا افتد و با اندر جہات

اور یہ کوئی شاعرانہ تخیل نہیں، بلکہ وہ حقیقت ہے جس پر قرآن و حدیث ناطق ہے، لیکن سزا کا ہلکا سا نمونہ اس دنیا میں امراض، وباؤں، طوفانوں، سیلابوں کی صورت میں سامنے آتا رہتا ہے۔

اس لیے (آیت) وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِہَا کے مفہوم میں جیسے وہ جرائم اور گناہ داخل ہیں جن سے ظاہری طور پر دنیا میں فساد پیدا ہوتا ہے اسی طرح ہر نافرمانی اور خدا تعالیٰ سے غفلت و معصیت بھی اس میں شامل ہے، اسی لیے آیت مذکورہ میں اس کے بعد فرمایا وادْعُوْہُ خَوْفًا وَّطَمَعًا یعنی اللہ تعالیٰ کو پکارو خوف اور امید کے ساتھ، یعنی اس طرح کہ ایک طرف دعا کے ناقابل قبول ہونے کا خوف لگا ہو اور دوسری طرف اس کی رحمت سے پوری امید بھی لگی ہوئی ہو، اور یہی امید و بیم طریق استقامت میں روح انسانی کے دو بازو ہیں، جن سے وہ پرواز کرتی اور درجات عالیہ حاصل کرتی ہے۔

اور ظاہر اس عبارت سے یہ ہے کہ امید و بیم دونوں مساوی درجہ میں ہونا چاہیے، اور بعض علماء نے فرمایا کہ مناسب یہ ہے کہ حیات اور تندرستی کے زمانہ میں خوف کو غالب رکھے، تاکہ اطاعت میں کوتاہی نہ ہو، اور جب موت کا وقت قریب آئے تو امید کو غالب رکھے، کیونکہ اب عمل کی طاقت رخصت ہو چکی ہے، امید رحمت ہی اس کا عمل رہ گیا ہے۔ (بحر محیط)

اور بعض محققین نے فرمایا کہ اصل مقصد دین کے صحیح راستہ پر قائم رہنا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر مداومت کرنا ہے، اور مزاج و طبائع انسانوں کے مختلف ہوتے ہیں، کسی کو غلبہ خوف سے یہ مقام استقامت اور دوام اطاعت حاصل ہوتا ہے، کسی کو غلبہ محبت و رجا سے سو جس کو جس حالت سے اس مقصد میں مدد ملے اس کو حاصل کرنے کی فکر کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دعا کے دو آداب اس سے پہلی آیت میں بتلائے گئے، ایک عاجزی اور تضرع کے ساتھ ہونا، دوسرے خفیہ و آہستہ ہونا، یہ دونوں صفتیں انسان کے ظاہر جسد سے متعلق ہیں، کیونکہ تضرع سے مراد یہ ہے کہ اپنی ہیئت بوقت دعا عاجزانہ، فقیرانہ بنالے، متکبرانہ یا بے نیازنہ نہ ہو، اور خفیہ ہونے کا تعلق بھی منہ اور زبان سے ہے۔

اس آیت میں دعا کے لیے دو آداب باطنی اور بتلائے گئے، جن کا تعلق انسان کے دل سے ہے وہ یہ کہ دعا کرنے والے کے دل میں اس کا خطرہ بھی ہونا چاہیے کہ شاید میری دعا قبول نہ ہو، اور امید بھی ہونی چاہیے کہ میری دعا قبول ہو سکتی ہے، کیونکہ اپنی خطاؤں اور گناہوں سے بے فکر ہو جانا بھی ایمان کے خلاف ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ سے مایوس ہو جانا بھی کفر ہے، قبولیت دعا کی جب ہی توقع کی جا سکتی ہے جب کہ دونوں حالتوں کے درمیان درمیان رہے۔

پھر آخر میں فرمایا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ " یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت قریب ہے نیک عمل کرنے والوں سے "۔ اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اگرچہ بوقت دعا خوف اور امید دونوں ہی حالتیں ہونی چاہیئں، لیکن ان دونوں حالتوں میں سے امید ہی کی جانب راجح ہے، کیونکہ رب العالمین اور رحیم الرحماء کے

جو دو احسان میں نہ کوئی کمی ہے نہ بخل، وہ برے سے برے انسان بلکہ شیطان کی بھی دعا قبول کر سکتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے قریب ہونے کے لیے محسن یعنی نیک عمل ہونا درکار ہے۔

اسی لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ بعض آدمی لمبے لمبے سفر کرتے ہیں، اور اپنی ہیئت فقیرانہ بناتے ہیں، اور اللہ کے سامنے دعا کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہیں، مگر ان کا کھانا بھی حرام ہے اور پینا بھی حرام ہے، اور لباس بھی حرام کا ہے، سو ایسے آدمی کی دعا کہاں قبول ہو سکتی ہے۔ (مسلم، ترمذی، عن ابی ہریرہ)

اور ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ بندہ کی دعا اس وقت تک قبول ہوتی رہتی ہے جب تک وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے، اور جلد بازی نہ کرے، صحابہ کرام نے دریافت کیا، جلد بازی کا کیا مطلب ہے، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ یوں خیال کر بیٹھے کہ میں اتنے عرصہ سے دعا مانگ رہا ہوں اب تک قبول نہیں ہوئی، یہاں تک کہ مایوس ہو کر دعا چھوڑ دے (مسلم، ترمذی)

اور ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے جب دعا مانگو تو اس حالت میں مانگو کہ تمہیں اس کے قبول ہونے میں کوئی شک نہ ہو۔

مراد یہ ہے کہ رحمت خداوندی کی وسعت کو سامنے رکھ کر دل کو اس پر جماؤ کہ میری دعا ضرور قبول ہو گی، یہ اس کے منافی نہیں کہ اپنے گناہوں کے شامت کے سبب یہ خطرہ بھی محسوس کرے کہ شاید میرے گناہ دعاء کی قبولیت میں آڑے آجائیں۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ نبینا وسلم۔ (تفسیر معارف القرآن۔ مفتی محمد شفیع)

اس آیت میں امید کی بیم پر ترجیح کا اظہار ہے اور ذریعہ اجابت دعا (یعنی حسن عمل) پر تنبیہ ہے اور اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ کریم ورحیم مالک کی طرف سے دعا کو رد کر دینا محض تمہاری بداعمالی کی نحوست اور نیکوکاری کو ترک کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے (ورنہ وہ رحیم اور داتا ہے کسی کی دعا رد نہیں کرتا)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک بار کسی شخص کا (بطور تمثیل) ذکر فرمایا کہ طویل سفر کرتا ہے پراگندہ مو اور غبار آلود چہرہ والا ہے آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا کر دعا کرتا ہے اے میرے رب اے میرے رب مگر اس کا کھانا حرام ہے اور اس کا پینا حرام کا ہے اس کا لباس حرام کا ہے اس کی پرورش ہی حرام سے ہے ایسے شخص کی دعا کیسے قبول ہو گی۔ رواہ مسلم والترمذی من حدیث ابی ہریرہ (رض)۔ مسلم اور ترمذی نے حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بندہ کی دعا برابر قبول ہوتی ہے بشرطیکہ وہ گناہ کی اور قطع رحم کی دعا نہ کرے اور دعا میں جلد بازی سے بھی کام نہ لے عرض کیا گیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جلد بازی سے کیا مراد ہے فرمایا (مثلاً) کہنے لگے میرے خیال میں دعا قبول نہیں ہو گی یہ خیال کر کے تھک کر دعا کرنی چھوڑ دے۔ امام احمد نے حضرت عبداللہ بن عمر (رض) کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دل ظروف ہیں بعض بعض سے زیادہ سمائی والے ہیں لوگو! اللہ سے دعا کرتے وقت یقین رکھا کرو کہ تمہاری دعا ضرور قبول ہو گی اللہ اس بندہ کی دعا قبول نہیں کرتا جو بے توجہ دل سطحی طور پر کرتا ہے ترمذی نے حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت سے بھی یہ حدیث نقل کی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قبول دعا کا یقین رکھتے ہوئے دعا کی جائے لیکن المعتدین کی تفسیر میں بیان کیا گیا تھا کہ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ میری دعا قبول ہو جائے گی۔ یہ ایک شبہ کیا جا سکتا ہے جس کا ازالہ یہ ہے کہ قبول دعا کا یقین رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کا یقین رکھے کہ اللہ کریم ہے سخی ہے بخل نہیں کر سکتا لیکن دعا کے قبول نہ ہونے کا سبب انسان کی معصیت اور خطاکاری ہے گویا اللہ کی رحمت وجود پر نظر رکھتے ہوئے تو دعا قبول ہونے کا یقین رکھا جائے اور اپنے اعمال کی نحوست کو دیکھتے ہوئے دعا کے رد ہونے کا اندیشہ دل گیر رہے۔

قریب کو بصیغہ مذکر لانے کی وجہ یا یہ ہے کہ رحمت بمعنی رحم ہے یا موصوف مذکر محذوف ہے یعنی امر قریب۔ یا یوں کہا جائے کہ فعیل (صیغہ صفت) فعیل مصدری کے (وزن میں) مشابہ ہے جیسے نقیض (اور فعیل) مصدری مذکر بھی ہے اور مونث بھی یا یہ کہا جائے کہ قربت نسبی سے جو لفظ قریب آتا ہے وہ مذکر ہے

اور قرب مسافت سے جو لفظ قریب بنتا ہے وہ مذکر بھی ہے اور مونث بھی (اور یہاں قرب مکانی ہی مراد ہے) ابو عمرو بن العلاء نے کہا اگر قرابت نسب مقصود ہو تو عورت کے لیے قریبۃ کہا جاتا ہے اور قرب مسافت مراد ہو تو عورت کے لیے بھی قریب بولا جاتا ہے۔ (تفسیر مظہری۔علامہ ثناء اللہ پانی پتی)

انبیاء کرام کے تشریف لانے۔ حق دعوت احکام بیان کرنے عدل قائم ہو جانے کے بعد زمین میں فساد کفر و ظلم و معصیت سے نہ پھیلاؤ اور اللہ تعالیٰ کو خشوع و خضوع سے آہستہ خوف و امید عطا کے ساتھ یاد کرو اللہ عزوجل کی رحمت نیک بندوں کے قریب ہے اور وہی ذات پاک جس کا نام اللہ عزوجل ہے ہوائیں بھیجتا ہے جس میں بشارت بارش کی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی آگے آگے رحمت ہوتی ہے یعنی بارش ہونے سے وہ مردہ زمین بنجر زمین سرسبز ہوتی ہے اس سے یہ واضح فرمایا کہ جیسے خاک میں جو سبزہ ملا ہوا ہوتا ہے وہ بارش سے پھر سرسبز شاداب ہو جاتا ہے اسی طرح مردہ قبر سے خاک میں مل کر جب فنا ہو جاتا ہے تو سبزہ کی صورت میں اسے بھی ہم قبروں سے زندہ کریں گے۔ ہماری قدرت کا یہ مشاہدہ کرنے کے بعد عاقل سلیم الحواس کو سمجھ لینا چاہیے کہ سوکھی لکڑی سے جو پھل نکلتا ہے سوکھی خاک شدہ گھاس کو جو سرسبز کر سکتا ہے وہ مردوں کو زندہ کیوں نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے مومن کافر کا فرق قبول ہدایت میں ایسا ہی رکھا ہے جیسے ایک اچھی زمین ہے جس سے چھینٹا پڑتے ہی سبزہ پھل پھول نکل آتے ہیں اور خراب زمین ہو تو اس سے بارش سے کیچڑ ہی بڑھتی ہے۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست در باغ لالہ روید و در شورہ بوم و خس

تو خراب زمین جیسے بارش سے نفع اندوز نہیں ہوتی ایسے ہی جبلی کافر قرآنی بارش سے محروم رہتا ہے اور مومن کا ایمان تروتازہ ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی آیتوں میں ایسی واضح مثالیں بار بار پیش کر کے ہدایت فرماتا ہے۔

ترجمہ :۔ اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ اصلاح کے بعد سیسہ کاری سے بعد اطاعت کے یا شرک سے بعد توحید کے یا ظلم سے بعد انصاف کے اور اس سے دعا کرو ڈرتے اور خواہش کرتے یعنی خوفزدہ اور دعوت سے امیدوار قبولیت کے یا جہنم سے یا فرق یے یا تلاقی یعنی ملنے کے دن قیامت سے یا عاقبت کے انجام سے بیشک اللہ کی رحمت نیکوں کے قریب ہے رحمت کا قریب ب تاویل رحم یا ترحم ہے۔

اقول و باللہ التوفیق۔ یا رحمت ذات اقدس مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کا خطاب ہے اور یہ امر اظہر من الشّمس ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رحمت ہیں اور خدا عزوجل کی رحمت ہیں وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعلمین۔ سے واضح ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اللہ تعالیٰ نے رحمت بنا کر سارے جہان کے لیے بھیجا بلکہ صفت رحمت کے ساتھ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو رحمتہ اللعالمین فرمایا یہ صفت ربوبیت میں اپنی ذات کو رب العالمین فرمایا تو ان رحمت اللہ قریب من المحسنین کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کی رحمت تو جہان بھر کے لیے ہیں لیکن نیکوکاروں کے لیے قریب بھی ہیں تبرک اللہ رب العالمین بھی صفت الٰہی عزوجل ہے رسول من رب العالمین بھی اس کی صفت ہے تو رحمتہ اللہ یقیناً تو عالم کے لیے ہے لیکن محسنین کے قریب ہے اور وہ ذات اقدس سرور عالم رحمت مجسم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے۔

اب سوال قرب میں ہے کہ وہ رحمت جو قریب ہے بجسد النور قریب ہے یا بجسد البشر اس پر زیادہ تامل کی ضرورت نہیں۔

تا محسنین کے مدارج ہیں جو ان میں ارفع و اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں کہ روحانیت و جسمانیت سے بالا ہو چکے ہیں ان سے بجسد النور اور بجسد البشر قریب ہے اور مجھ جیسے سیہ کاروں سے وہ بطور توجہ والتفات و ترحم قریب ہیں۔

دو عالم بکا کل گرفتار داری بہر موبزاراں سیہ کاری داری

تو سر نا بہار حمتی یا محمد نظر جانب ہر گناہ گار داری

اللھم صل وسلم و بارک علی سندنا و مولنا محمد معدن الجود والکرم وابنہ الکریم والہ الکرام و بارک وسلم

اور وہ ذات سبحان ہے کہ ہوائیں بھیجتا ہے بشریٰ مژدہ دیتی بشر جمع ہے بشر کی اس لیے کہ ہوا بشارت دیتی ہے بارش کی اس کے آگے رحمت الٰہی ہے یعنی اس ہوائے مبشر کے آگے نعمت ہے اور وہ غیث ہے جو نعمتوں کے لیے بارش میں آتا ہے حتیٰ کہ جب اٹھا لائیں یعنی وہ باطل ہوا اٹھا لائیں پانی یا بادل بھاری۔ پانی سے بھرے

ہوئے تو چلاتے ہیں ہم انھیں یعنی بادلوں کو کسی مردہ شہر یا زمین کی طرف اس شہر کی طرف جس پر بارش نہ ہو مردنی چھاچکی ہو یا زمین مردہ جس پر سبزہ نہ ہو۔
علامہ راغب (رح) مفردات میں کہتے ہیں۔
انواع موت حسب انواع حیات ہیں۔
تحقیق لفظ موت
اولاً یہ کہ زوال قوت نامیہ کو بھی کہتے ہیں۔ خواہ وہ انسان میں ہو یا حیوان میں۔ یا پھر نباتات میں۔
جیسے فرمایا و یحی الارض بعد موتھا۔ فسقنہ الی بلد میت واحیینا بہ بلدۃ میتا۔ یہاں عدم نمونیات بمعنی موت ہے۔
دوسرے بمعنی زوال قول حاسہ جیسے یلیتنی مت قبل ھذا۔ ءاذامامت لوف اخرج حیا۔ ءاذامتنا وکناترابا ذٰلک رجع بعید۔
تیسرے زوال قول عاقلہ کو بھی موت کہا جاتا ہے جو محض جہالت ہوتی ہے یا کفر و حجد انک لا تسمع الموتی۔ کہ کفار کی جہالت کو موت کہا۔
چوتھے ایسا غم جو مکدر حیات ہو جیسے فرمایا و یاتیہ الموت من کل مکان وماھو بمیت
پانچویں نیند کے معنی میں موت و وفات کا استعمال ہے۔ حدیث میں ہے النوم موت خفیف والموت نووم ثقیل وھوالذی یتوفکم بالیل۔ اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا لا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء۔ تو یہاں نفی موت قبض ارواح کے مقابلہ میں ہے۔ اس میں متنبہ کیا کہ وہ نعمت الٰہی میں ہیں۔ چھٹے زوال قوت حیوانیہ کے معنی میں اور جس میں روح کا جسم سے علیحدہ ہونا لازم ہو جیسے فرمایا کل نفس ذائقہ الموت۔
ساتویں بمعنی تحلیل جیسے انک میت وانھم میتون۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہوئے کہ انک ممتوت لانہ لابد لاحد من الموت۔ کما قیل والقول حتم فی رقاب العباد۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہاں میت سے مراد ابانۃ روح عن الجسد کے معنی نہیں ہیں بلکہ وہ اشارہ ہے اس طرف جو انسان پر ہر حال تحلل و نقص کی صورت میں عائد ہوتا ہے اس لیے کہ انسان جب تک دنیا میں رہتا ہے تھوڑا تھوڑا تحلیل ہوتا جاتا ہے یعنی جزء فجزء۔ مثنوی عطار میں اسی کی موافقت میں یہ شعر ہے۔
ہم چوں سبزہ بارہار وئیدہ ام ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام
اور ایک جماعت نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے بمقابلہ کفار انک میت وانھم میتون۔ سے یہ تعبیر کی۔ میت اور مائت میں فرق ہے چنانچہ کفار کو میتون کہا اور حضور کو میت بمنی مائت فرمایا جو متحلل کے معنی میں آتا ہے۔ اور قاضی علی بن عبد العزیز (رح) فرماتے ہیں۔
لیس فی لغتنا مائت علی حسب ما قالو والمیت مخفف عن المیت وانما یقال موت مائت قال تعالیٰ فسقنہ الی بلد میت۔ بلدۃ میتا۔
آٹھویں موت بمعنی جنون والموتۃ شبہ الجنون انہ ھو موت۔ موت دیوانگی کے مشابہ ہے گویا کہ یہ موت ہی ہے۔ نویں موت بمعنی موت القلب ہے۔ دسویں موت بمعنی امر سکنہ موتانہ ہے۔ (تفسیر الحسنات۔ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)
خوف اور امید کی حالت میں دعا مانگنی چاہیے:
اس سے معلوم ہوا کہ دعا اور عبادات میں خوف و امید دونوں ہونے چاہئیں اس سے اِنْ شَآءَ اللہ عَزَّوَجَلَّ جلد قبول ہوگی۔ اسی مفہوم پر مشتمل ایک حدیث بخاری شریف میں ہے چنانچہ حضرت براء بن عازب (رض) سے روایت ہے، سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جب تم سونے لگو تو نماز جیسا وضو کر لیا کرو، پھر دائیں کروٹ لیٹ کر کہو "اَللّٰھُمَّ اَسْلَمْتُ وَجْھِیْ اِلَیْکَ وَفَوَّضْتُ اَمْرِیْ اِلَیْکَ وَاَلْجَاْتُ ظَھْرِیْ اِلَیْکَ رَغْبَۃً وَّرَھْبَۃً اِلَیْکَ لَا مَلْجَاَ وَلَا مَنْجَاَ مِنْکَ اِلَّا اِلَیْکَ اَللّٰھُمَّ آمَنْتُ بِکِتَابِکَ الَّذِیْ اَنْزَلْتَ وَبِنَبِیِّکَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ "ترجمہ: اے اللہ! میں نے اپنا چہرہ تیری طرف کر دیا اور اپنا معاملہ تیرے سپرد کر دیا اور تجھ سے رغبت اور خوف رکھتے ہوئے اپنی پیٹھ جھکا دی، تیرے سوا کوئی جائے پناہ اور نجات کی جگہ نہیں۔ اے اللہ! میں تیری کتاب پر ایمان لایا جو تو نے نازل فرمائی اور تیرے نبی پر ایمان لایا جنہیں تو نے بھیجا۔" (اگر رات کو سوتے وقت یہ پڑھو گے تو) اگر اس رات میں مر گئے تو تم فطرت پر ہو گے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)
آداب دعاء:

دعاء میں آداب دعاء و عبودیت کا لحاظ رکھنا بھی آداب دعاء سے ہے دعاء کے آداب کا لحاظ نہ رکھنا بھی دعاء میں حد سے تجاوز کرنا ہے،آداب دعاء میں یہ بھی داخل ہے کہ دعاء محالات عقلیہ وعادیہ کی نہ مانگی جائے، مثلاً یہ کہ اے اللہ تو مجھے دنیا میں خلود نصیب فرمایا میری جوانی لوٹا دے اور نہ معاصی کی طلب و تمنا کی جائے مطلب یہ ہے کہ دعاء اپنی حیثیت اور مرتبہ سے بڑھ کر نہ کی جائے، بلکہ شان عبودیت کے ساتھ لجاجت کے لہجہ میں خشوع قلب کے ساتھ دعاء مانگی جائے، دعاء چلا چلا کر بھی نہ مانگنی چاہیے (نعوذ باللہ) تمہارا پروردگار نہ گراں گوش ہے اور نہ دور، چلا چلا کر دعاء کرنے سے حدیث شریف میں بھی ممانعت آئی ہے صحیح بخاری اور مسلم میں یہ روایت آئی ہے کہ ایک موقعہ پر لوگ چلا چلا کر زور زور سے دعاء مانگ رہے تھے اس پر آپ نے فرمایا "جسے تم پکار رہے ہو وہ نہ اونچا سنتا ہے اور نہ وہ دور ہے وہ تو قریب ہے اور خوب سنتا ہے "حنفیّہ نے یہیں سے استدلال کیا ہے کہ نماز میں سورۃ فاتحہ کے بعد آمین بھی چونکہ دعاء ہے لہٰذا آمین آہشتہ کہنی چاہیے (جصاص) دعاء کرتے وقت امید وبین کی کیفیت ہونی چاہیے، اس کے عذاب کا خوف بھی ہو اور اس کی رحمت کی امید بھی اس طرح دعاء کرنے والے کا شمار محسنین میں ہوتا ہے، یقیناً اللہ کی رحمت ایسے لوگوں کے قریب ہے۔ (تفسیر جلالین۔علامہ جلال الدین سیوطی)

قرآن میں مختلف پہلوؤں سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا کچھ اور الٰہ ہوتے تو یہ درہم برہم ہو کر رہ جاتے، یہ تو قائم ہی اس بناپر ہیں کہ ان کے اندر اللہ کے ارادے کے سوا کسی اور ارادے کی کارفرمائی نہیں ہے۔ اس تکوینی توحید کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بندے اپنے دائرہ اختیار میں بھی صرف اسی اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت واطاعت کریں، کسی اور کو اس عبادت واطاعت میں شریک نہ بنائیں ورنہ اس زمین کا سارا نظام عدل و شریعت درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اس کائنات کے قیام وبقاکے لیے جس طرح تکوینی توحید ناگزیر ہے اسی طرح اس زمین کے امن وعدل کے لیے خدا کی تشریعی توحید بھی لازمی ہے۔ خدا کے ملک میں کسی اور کو الہ و معبود بنانا اس کے ملک میں فساد وبغاوت برپا کرنا ہے جس سے بڑا کوئی اور جرم نہیں۔

لاتفسدوا کے ساتھ بعد اصلاحہا کی قید اس فعل کی شناعت کے اظہار کے لیے ہے۔ یعنی ملک میں فساد پیدا کرنا بجائے خود سب سے بڑا جرم ہے لیکن یہ جرم سنگین سے سنگین تر ہو جاتا ہے جب یہ اصلاح کے بعد واقع ہو اس لیے کہ یہ بگڑی ہوئی چیز کو بگاڑنا نہیں بلکہ بنی ہوئی چیز کو بگاڑنا ہوا۔

کائنات کے صلاح و فساد کی بنیاد:

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ خالق کائنات نے جب اس دنیا کو بنایا تو اس کو بناکر یوں ہی انتشار اور بدامنی کے حال میں چھوڑ نہیں دیا بلکہ آدم اور ان کی ذریت کو اس دنیا میں بھیجنے سے پہلے ہی ان سے توحید یعنی اپنی ہی عبادت اور اپنی ہی اطاعت کا اقرار لیا۔ اس کا ذکر اسی سورۃ کی آیات 172، 173 میں آگے آرہا ہے۔ پھر ذریت آدم سے، جیسا کہ آیت 35، 36 میں گزرا، یہ وعدہ فرمایا کہ تمہاری ہدایت کے لیے میں اپنے رسول بھیجوں گا، تم ان کی پیروی کرنا، جو ان کی پیروی کریں گے وہ فلاح پائیں گے، جو تکبر کر کے ان سے اعراض کریں گے وہ ہلاک ہوں گے۔ پھر اپنے اس وعدے کے بموجب اللہ تعالیٰ نے برابر اپنے رسول بھیجے جن کی تفصیل آگے آیت 59 سے 92 تک آرہی ہے۔ ان رسولوں کی سرگزشت میں، جیسا کہ آیت 69، 74، 85، 100، 102 سے واضح ہوگا، یہ دکھایا ہے کہ اولاد آدم کے مختلف گروہوں نے جب جب اللہ کی صراط مستقیم سے ہٹ کر اس دنیا میں فساد برپا کیا ہے خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے ان کو انذار کیا ہے اور جب انھوں نے اس انذار کی پرواہ نہیں کی ہے تو خدا نے ان کی جڑ کاٹ دی ہے اور ان کی خلافت دوسروں کو سونپی ہے کہ دیکھے وہ اس خلافت کا حق کس طرح ادا کرتے ہیں۔ اس طرح یہ دنیا بار بار شیطان اور اس کی ذریات کی کوششوں سے بگڑی ہے اور بار بار انبیاء و مصلحین کے ذریعہ سے اس کی اصلاح ہوئی ہے۔ اس پہلو سے معاملہ پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں جس قوم کو بھی اپنے پچھلوں کی خلافت ملی ہے ایک فساد کو مٹا کر اس کی اصلاح کی شکل میں ملی ہے اور اگر خلافت پانے والی قوم نے خلافت پا کر اس میں فساد برپا کیا ہے تو یہ اس نے ایک بگڑی ہوئی چیز کو نہیں بگاڑا ہے بلکہ ایک بنی ہوئی چیز کو بگاڑا ہے اور یہ چیز اس کے جرم کو سنگین سے سنگین تو بنا دیتی ہے۔

اس کائنات میں حشر کے دن مروں کو زندہ کرنے کی نشانی:

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا تھا کہ وہ آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے والا ہے، وہی کائنات میں حاکم اور تصرف کرنے والا ہے اور اس نے انسان کے لیے کائنات کو مسخر کر دیا ہے اور اس نے انسان کو یہ ہدایت دی کہ وہ اپنی ہر ضرورت میں اور ہر آفت اور مصیبت میں اللہ تعالیٰ سے دعا کریں اور اس نے یہ بیان فرمایا کہ اس کی

رحمت نیکی کرنے والوں کے قریب اور اب اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ وہی رزاق ہے اور حصول رزق کا اہم ذریعہ آسمانی بارش ہے جس کی وجہ سے دریاؤں، چشموں اور کنوؤں میں انسانوں اور جانوروں کے لیے پینے کا پانی اور کھیتوں کو سیراب کرنے کے لیے پانی فراہم ہوتا ہے۔ اور جس طرح وہ بنجر زمین کو بارش کے ذریعہ سرسبز اور زندہ فرماتا ہے اسی طرح وہ قیامت کے دن مردوں کو زندہ فرمائے گا۔

امام ابوداود الطیالسی اور امام بیہقی وغیرہما نے حضرت ابورزین عقیلی سے روایت کیا ہے کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ مخلوق کو کس طرح دوبارہ زندہ فرمائے گا اور مخلوق میں اس کی کیا علامت ہے؟ آپ نے فرمایا: کیا تم کبھی اپنی قوم کی خشک اور قحط زدہ زمین کے پاس سے نہیں گزرے! اور پھر اس زمین کو سبزہ سے لہلہاتے ہوئے نہیں دیکھا! انھوں نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: یہ مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔ یہ حدیث صحیح ہے اور اس آیت کے موافق ہے۔ (التذکرہ ص 210، دارالکتب العلمیہ، بیروت)

حضرت ابوہریرہ (رض) نے کہا جب پہلا صور پھونکنے کے بعد لوگ مر جائیں گے تو عرش کے نیچے سے ان پر بارش ہوگی اور وہ اس طرح اگنے لگیں گے جس طرح بارش سے سبزہ اگتا ہے حتیٰ کہ جب ان کے اجسام مکمل ہو جائیں گے تو ان میں روح پھونک دی جائے گی۔۔ پھر ان پر نیند طاری کر دی جائے گی اور وہ اپنی قبروں میں سو جائیں گے اور جس وقت دوسرا صورت پھونکا جائے گا تو ان کے سروں اور آنکھوں میں نیند کا خمار ہوگا اور ان کی ایسی کیفیت ہوگی جس طرح کسی سوئے ہوئے شخص کو اچانک بیدار کرنے سے ہوتی ہے اور اس وقت وہ یہ کہیں گے: "یویلنا من بعثنا من مرقدنا ھذا ما وعد الرحمٰن وصدق المرسلون: ہائے افسوس ہمیں ہماری خواب گاہوں سے کس نے اٹھا دیا (پھر ایک منادی کہے گا) یہ وہ ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں نے سچ کہا تھا" (جامع البیان، جز 8، ص 274، دارالفکر، بیروت، 1415ھ)

(تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ:

وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۵۷

لغۃ القرآن: وَهُوَ: اور وہ] [الَّذِيْ: جو] [يُرْسِلُ: بھیجتا ہے] [الرِّيٰحَ: ہوائیں] [بُشْرًاۢ: خوشخبری] [بَيْنَ يَدَيْ: پہلے] [رَحْمَتِهٖ: اپنی رحمت سے] [حَتّٰى: یہاں تک کہ] [اِذَآ: جب "کہ"] [اَقَلَّتْ: اٹھا لاتی ہے] [سَحَابًا: بادل] [ثِقَالًا: بھاری] [سُقْنٰهُ: ہم ہانک دیتے ہیں اسے] [لِبَلَدٍ: شہر کی طرف] [مَّيِّتٍ: مردہ] [فَاَنْزَلْنَا: پھر ہم نے نازل کیا] [بِهِ: اس کے ذریعے] [الْمَآءَ: پانی] [فَاَخْرَجْنَا: پھر ہم نے نکالی] [بِهٖ: اس کو] [مِنْ: سے] [كُلِّ: ہر طرح] [الثَّمَرٰتِ: پھل] [كَذٰلِكَ: اسی طرح] [نُخْرِجُ: ہم نکالیں گے] [الْمَوْتٰى: مردوں کو] [لَعَلَّكُمْ: تاکہ تم] [تَذَكَّرُوْنَ: سب نصیحت حاصل کرو]

ترجمہ: اور وہی ہے جو اپنی رحمت (یعنی بارش) سے پہلے ہواؤں کو خوشخبری بنا کر بھیجتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ (ہوائیں) بھاری بھاری بادلوں کو اٹھالاتی ہیں تو ہم ان (بادلوں) کو کسی مردہ (یعنی بے آب وگیاہ) شہر کی طرف ہانک دیتے ہیں پھر ہم اس (بادل) سے پانی برساتے ہیں پھر ہم اس (پانی) کے ذریعے (زمین سے) ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں۔ اسی طرح ہم (روز قیامت) مردوں کو (قبروں سے) نکالیں گے تاکہ تم نصیحت قبول کرو

تشریح:

یہاں اپنی ربوبیت کی ایک اور شان دکھائی۔ یعنی جب خشک سالی کی وجہ سے کھیت اور باغات اپنی ساری شادابیاں اور بہاریں کھو چکے ہوتے ہیں۔ جب روئیدگی کی قوت فرط تشنگی سے دم توڑنے لگتی ہے تو اس وقت رحمت خداوندی مائل بہ کرم ہوتی ہے۔ ابر رحمت نامعلوم وادیوں سے نکل کر آسمان پر چھا جاتا ہے اور موسلادھار بارش برسنے لگتی ہے اور اس کے حیات بخش قطروں کی وجہ سے کائنات کی ہر چیز میں زندگی انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔ یہ احسان عظیم جتلانے کے بعد فوراً منکرین قیامت کو ان کے فکر کی کوتاہی پر متنبہ فرمادیا کہ تمہیں یہ بہت محال نظر آتا ہے کہ ہزار ہا ہزار سال کے بعد مدفون مردے کیونکہ اپنی قبروں سے دامن جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ فرمایا کہ تم ہر وقت ہماری قدرت کے کرشمے دیکھ رہے ہو۔ جو قادر و قیوم آن واحد میں ویران اور اجڑے ہوئے علاقوں کو آباد اور شاداب کر دیتا ہے اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ وہ مارنے کے بعد پھر زندہ کر دے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

دراصل اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مردوں کو زندہ کرنے کی ایک مثال بیان فرمائی ہے یعنی خشک اور مردہ زمین جس پر سبزے کا نام ونشان نہ ہو اور ہر طرف گرد وغبار اڑا رہی ہو جب اس پر رحمت کی بارش برستی ہے تو اس میں سے سرسبز و شاداب پیداوار نکل آتی ہے اور ساری زمین پر سبزہ ہی سبزہ نظر آتی ہے۔ اسی طرح قیامت کے قریب ساری مخلوق مر کر مٹی کے ساتھ مل چکی ہوگی، کہیں زندگی کا نام ونشان نہیں ہوگا۔ جب حضرت اسرافیل اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندگی کا صور پھونکیں گے تو زمین سے اگنے والے پودوں کی طرح تمام مردے زندہ ہو کر زمین سے باہر نکل آئیں گے اور ساری زمین پر انسان ہی انسان نظر آئیں گے۔
(تفسیر امداد الکرم)

وہ اللہ ایسا ہے کہ باران رحمت سے پہلے خوشخبری دینے کے لیے ہواؤں کو بھیج دیتا ہے۔

بُشْرًاً یہ لفظ بُشُراً کا مخفف ہے اور بُشُراً بَشِیر کی جمع ہے۔ رحمت سے مراد بارش۔ باد مشرق (پُروا ہوا) ابر کو اٹھا کر لاتی ہے باد شمالی اب کو جمع کرتی ہے۔ باد جنوبی اب کو چکر دیتی ہے اور باد مغرب (پچھوا ہوا) بادل کو منتشر کر دیتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ (رض) کا بیان ہے میں نے خود سنا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرمارہے تھے ہوا' اللہ کی بھیجی ہوئی راحت ہے یہ رحمت کو بھی لاتی ہے اور عذاب کو بھی (اس کو برا نہ کہو اور اللہ سے اس کی خیر کی طلب کرو اور اس کی خرابی سے اللہ کی پناہ کے خواستگار رہو۔ رواہ البخاری فی الادب وابوداؤد والحاکم ورواہ البغوی من طریق الشافعی وعبدالرزاق۔ حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابوہریرہ (رض) اور حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا جب سب لوگ اول صور پھونکنے سے مر جائیں گے تو اللہ زیرین عرش سے پانی برسائے گا جس کا نام آب حیات ہوگا۔ جیسے مردوں کی منی۔ اس بارش سے لوگ قبروں کے اندر کھیتی کی طرح اگیں گے جب اجسام کی تکمیل ہو جائے گی تو ان کے اندر روح پھونک دے گا پھر ان پر ایک نیند طاری کر دی جائے گی جس کی وجہ سے وہ قبروں سے اٹھیں گے اس وقت سروں اور آنکھوں میں ان کو نیند کا اثر محسوس ہو رہا ہوگا اور کہیں گے ہائے افسوس ہم کو خواب گاہ سے (یا خواب سے) کس نے اٹھا دیا۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دونوں مرتبہ صور پھونکنے کی درمیانی مدت چالیس ہوگی لوگوں نے پوچھا ابوہریرہ (رض) کیا چالیس دن کی مدت ہوگی۔ حضرت ابوہریرہ (رض) نے فرمایا مجھے اس سے انکار ہے لوگوں نے کہا تو کیا چالیس مہینے کی فرمایا مجھے اس سے بھی انکار ہے لوگوں نے کہا تو کیا چالیس سال کی۔ فرمایا میں یہ بھی نہیں کہتا (یعنی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے چالیس کا لفظ فرمایا دن مہینہ یا برس کی صراحت نہیں فرمائی) پھر اللہ آسمان سے پانی برسائے گا جس سے انسان سبزی کی طرح اگیں گے انسان کی ہر چیز فنا ہو جاتی ہے صرف ایک ہڈی رہ جاتی ہے دم گزے کی ہڈی اسی سے قیامت کے دن تمام (اعضاء اور اجزاء) جوڑے جائیں گے۔ ابن ابی داؤد نے بھی البعث میں یہ حدیث نقل کی ہے۔ انس (رض) کی روایت میں اتنی صراحت ہے کہ دونوں مرتبہ صور پھونکنے کی درمیانی مدت چالیس سال کی ہوگی۔ اسی چلہ میں اللہ بارش کرے گا۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس (رض) کا بیان نقل کیا ہے کہ دونوں مرتبہ صور پھونکنے کی درمیانی مدت میں جو چالیس کی ہوگی زیرین عرش سے پانی کاایک نالہ جاری ہو جائے گا (یعنی بارش ہوگی) جس سے انسان چوپایہ اور پرندے کاہر فنا شدہ حصہ جسم اگ آئے گا اگر پہلے کسی نے ان کو دیکھا ہوگا تو اگنے کے بعد دیکھ کر پہچان لے گا پھر روحوں کو چھوڑ کر اجسام سے ان کا جوڑ لگا یا جائے گا آیت (واذاالنفوس زوجت) کا یہی معنی ہے۔ ابن جریر نے سعید بن جبیر کی روایت سے بھی یہ اثر نقل کیا ہے حلیمی نے کہا تمام روایات کا اتفاق ہے کہ دونوں مرتبہ صور پھونکنے کی درمیانی مدت چالیس سال ہوگی۔ ابن مبارک نے مرسلاً حسن کی روایت سے بھی ایسا ہی نقل کیا ہے۔ (تفسیر مظہری)

اب پھر توحید کے آفاقی دلائل کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے کہ صرف ایک ہی ذات کبریا ہے جو کائنات کا نظام سنبھالے ہوئے ہے اسی کے حکم سے ہواؤں اور فضاؤں میں تبدیلی آتی ہے یہ اسی کی رحمت کا کرشمہ ہے کہ پہلے ٹھنڈی ہوائیں چلاتا ہے تاکہ لوگوں کے دل ٹھنڈی ہوا سے مسرور ہو جائیں اور بارش آنے سے قبل اپنا سازوسامان سنبھال لیں۔ گھٹاٹوپ ہوائیں نہ معلوم بادلوں کو کہاں سے کہاں اٹھائے ہوئے ہزاروں میل دور لے جاتی ہیں۔ جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم صادر ہوتا ہے وہیں بارش کا نزول ہوتا ہے اس طرح اجڑی ہوئی بستیاں تروتازہ ویران کھیتیاں شاداب اور نہ صرف مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے بلکہ فضا مہلک جراثیم سے پاک اور درختوں کا پتہ پتہ گردوغبار سے صاف ہو جاتا ہے ہرسو سہانا موسم جس سے روحانی اور جسمانی طور پر تسکین پہنچتی ہے اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ میوہ جات سے اپنے بندوں کو لطف اندوز ہونے کا موقعہ فراہم کرتا ہے بارش کی مثال سے استدلال پیش کرتے ہوئے مرنے کے بعد جی اٹھنے کا عقیدہ سمجھایا گیا ہے کہ لوگو! غور کرو کہ اگر مردہ زمین کو زندہ کیا جاسکتا ہے اور اس میں مدتوں پڑے ہوئے بیج باغ و بہار کا منظر پیش کر سکتے ہیں تو کیا انسان کو پیدا کرنا خالق کل کے لیے مشکل ہے؟ ہرگز نہیں اسی طرح ہی اللہ تعالیٰ تمہیں پیدا فرمائے گا۔

(عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَا بَیْنَ النَّفْخَتَیْنِ اَرْبَعُوْنَ قَالُوْا یَا اَبَا هُرَیْرَةَ اَرْبَعُوْنَ یَوْمًا قَالَ اَبَیْتُ قَالُوْا اَرْبَعُوْنَ شَهْرًا قَالَ اَبَیْتُ قَالُوْا اَرْبَعُوْنَ سَنَةً قَالَ اَبَیْتُ ثُمَّ یُنْزِلُ اللّٰہُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَیَنْبُتُوْنَ کَمَا یَنْبُتُ الْبَقْلُ قَالَ وَلَیْسَ مِنَ الْاِنْسَانِ شَیْءٌ لَا یَبْلٰی اِلَّا عَظْمًا وَاحِدًا وَّھُوَ عَجْبُ الذَّنَبِ وَمِنْہُ یُرَکَّبُ الْخَلْقُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ) [متفق علیہ] وَفِیْ رِوَایَةٍ لِّمُسْلِمٍ قَالَ کُلُّ ابْنِ اٰدَمَ یَاکُلُہُ التُّرَابُ اِلَّا عَجْبَ الذَّنَبِ مِنْہُ خُلِقَ وَفِیْہِ یُرَکَّبُ [متفق علیہ]

” حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دو صور پھونکنے کا عرصہ چالیس ہوگا۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے ان کے شاگردوں نے کہا چالیس دن؟ حضرت ابوہریرہ (رض) نے فرمایا کہ میں یہ نہیں کہتا انھوں نے استفسار کیا چالیس ماہ ہیں؟ حضرت ابوہریرہ (رض) نے جواباً فرمایا میں یہ نہیں کہتا انھوں نے پھر پوچھا چالیس سال ہیں؟ ابوہریرہ (رض) فرماتے ہیں میں یہ بھی نہیں کہتا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ بارش نازل فرمائے گا۔ لوگ یوں اگیں گے جس طرح انگوری اگتی ہے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، انسان کی دمچی کے علاوہ ہر چیز بوسیدہ ہو جائے گی۔ روز قیامت اسی سے تمام اعضاء کو جوڑا جائے گا۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا انسان کے تمام اعضاء کو مٹی کھا جائے گی۔ لیکن دمچی کو نہیں کھائے گی انسان اسی سے پیدا کیا جائے گا اور جوڑا جائے گا۔“ (تفسیر فہم القرآن)

پچھلی آیات میں ان نعمتوں کا ذکر تھا جو عالم علوی سے متعلق ہیں درمیان میں عجز و انکساری اور تضرع و عاجزی کے ساتھ دعا اور اذکار کا بیان ہوا جو کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے استحقاق اور حقدار ہونے کے اسباب ہیں اب ان آیات میں ان نعمتوں کا بیان ہے جو عالم سفلی سے متعلق ہیں۔

ان آیات کریمہ میں بہت سی چیزوں کی نشاندہی فرمائی جو توحید باری تعالیٰ کے لئے واضح دلائل اور علامات ہیں مثلا ہواؤں کو ترتیب دے کر ایک خاص اندازہ اور مخصوص رفتار کے ساتھ بھیجنا پھر انہیں ہواؤں کے ذریعہ بادلوں کو جہاں جہاں ضرورت ہو وہاں تک پہنچانا سمندر کی لہروں سے بادلوں کو پیدا کرنا اور ان میں پانی جمع کرنا زمین کے مختلف حصوں پر بارش برسانا اور بارش کے ذریعہ مردہ اور خشک زمین کو زندہ کرنا اور سرسبز و شاداب کرنا ہر قسم کے درخت سبز غلہ گھاس پھل پھول میوہ طرح طرح کی ہزاروں قسم کی غذائی اشیاء پیدا کرنا یہ ساری چیزیں رب العزت سبحانہ نے تمہارے لئے بلا قیمت مفت پیدا فرمائیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بارش بادلوں سے برستی ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے پس جن آیات میں آسمان سے بارش برسنا مذکور ہے وہاں بھی لفظ سماء سے بادل مراد ہے اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ براہ راست آسمان سے بارش کا نزول ہو ایک روایت میں ہے کہ بارش میں آسمان کے پانی کا بھی تعلق ہے مثلاً آب زم زم شریف میں اگر دوسرا پانی شامل کریں تو سارا متبرک ہو جاتا ہے اسی طرح بارش کے پانی میں آسمان کا پانی شامل کیا جاتا ہے تاکہ برکت ہو جائے اس بارے میں حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ اگر بارش میں آسمانی پانی شامل نہ ہوتا تو جتنی بھی بارش ہوتی زمین سے کوئی چیز نہ اگتی۔ (عزیزی)

دوسری بات یعنی اگر یہ تسلیم ہو کہ بارش صرف بادل سے ہوتی ہے تو کیا یہ خود بخود برستی ہے یا اسے کوئی حکم دیتا ہے؟ اور یہ چیز ہمارے مشاہدہ میں ہے کہ بعض اوقات کئی گھنٹے اور کئی دن بادل موجود ہوتے ہیں مگر بارش نہیں برستی اور اگر برستی ہے رکتی نہیں اور پھر کسی کی مرضی کی جگہ پر نہیں برستی بلکہ جہاں اسے حکم ہوتا ہے وہاں برستی ہے معلوم ہوا کہ یہ بادل محض علامت ہے (تاکہ لوگ ہوشیار اور بیدار ہوں، اپنے سازوسامان کی حفاظت کی کوئی تدبیر کریں) اور اسے چلانے والی حکم دینے والی کوئی مخفی طاقت ہے جس کی مرضی اور حکم پر بادل نمودار ہو کر برسنے اور نہ برسنے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔

حدیث میں ارشاد ہے کہ زمین میں جتنے کام ہوتے ہیں ان کا صدر دفتر سدرۃ المنتہیٰ پر ہے وہیں سے سارے احکامات جاری ہوتے ہیں اور بسا اوقات لوگوں کی بد عملی اور گناہ و نیز فریضۂ زکوٰۃ و عشر کی عدم ادائیگی کی وجہ سے بارش کا سلسلہ رک جاتا ہے۔ (رواہ الترمذی)

حضرت امام غزالی (رح) فرماتے ہیں کہ نسل انسانی کے لیے مرد اور عورت دونوں کا اختلاط ضروری ہے تنہا مرد اور تنہا عورت کافی نہیں اسی طرح آسمان اور زمین میں میاں بیوی کا سا تعلق ہے آسمان نے پانی برسایا زمین نے اسے اپنے اندر جذب کر لیا ان دونوں کے اختلاط سے ہزاروں قسم کے ثمرات پھل فروٹ فواکہ، وسبزی ترکاری غلہ گیہوں وغیرہ پیدا ہو گئے یہی ان کی نسل کہلاتی ہے۔ (احیاء العلوم)

"وھو الذی یرسل الریح بشرا بین یدی رحمتہ" اللہ تعالیٰ وہی ذات پاک قادر مطلق ہے کہ ہواؤں کو بھیجتا ہے جو اس کی رحمت یعنی بارش سے پہلے خوشخبری دینے والی ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ عام عادت اللہ یہ ہے کہ بارش سے پہلے ایسی ٹھنڈی ہوائیں بھیجتے ہیں جن سے خود بھی انسان کو راحت اور بشاشت حاصل ہوتی ہے اور وہ گویا آنے والی بارش کی خبر اور مژدہ پہلے دے دیتی ہیں اس لئے یہ ہوائیں دو چیزوں یعنی دو نعمتوں کا مجموعہ ہیں خود بھی انسان اور عام مخلوقات کے لئے نافع اور مفید ہے اور بارش کے آنے سے پہلے بارش کی خوشخبری دیتے ہیں تاکہ انسان اپنی جان و مال اور سامان کی حفاظت اور تحفظ کر سکے۔

"حتی اذا اقلّت سحابا ثقالا" یعنی وہ ہوائیں جب بھاری بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں۔ بھاری بادلوں سے مراد پانی سے بھرے ہوئے بادل ہیں جو ہوا کے کاندھوں پر سوار ہو کر اوپر جاتے ہیں اور اس طرح ہزاروں لاکھوں وزن کا پانی ہوا پر سوار ہو کر اوپر پہنچ جاتا ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس میں نہ کوئی مشین کام کرتی ہے نہ کوئی انسانی محنت اس میں شامل ہے جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہو جاتا ہے تو خود بخود دریا سے بخارات (مان سون) اٹھنا شروع ہو جاتے ہیں اور اوپر جا کر بادل بنتا ہے اور یہ لاکھوں گیلن پانی سے بھرا ہوا جہاز خود بخود ہوا کے دوش پر سوار ہو کر آسمان کی طرف چڑھتا ہے پھر جہاں بارش برسانا مقصود ہو وہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کے حکم سے پانی برساتا ہے۔ فرمایا "سقنہ لبلد میت" کہ جب ہواؤں نے بھاری بادلوں کو اٹھا لیا تو ہم نے ان بادلوں کو ہانک دیا یعنی چلا دیا ایک مرے ہوئے شہر کی طرف مرے ہوئے شہر سے مراد وہ بستی ہے جو پانی نہ ہونے کے سبب ویران ہو رہی ہے اس جگہ بجائے عام زمین کے خصوصیت سے شہر اور بستی کا ذکر کرنا اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اصل مقصد برگ و باران اور ان سے زمین کی سیرابی کا انسان کی ضروریات مہیا کرنا ہے جس کا مسکن شہر ہے۔

"فانزلنا بہ الماء" پھر ہم نے اس کے ذریعہ اپنی حکمت و مصلحت کے تحت بندوں اور جانوروں کی فلاح و آبادی کی خاطر ہواؤں کو چلا کر بادلوں کو ہانک دیا وہاں جہاں ضرورت ہو پانی نازل کرتے ہیں تاکہ خشک زمین سیراب ہو کر:

"فاخرجنا بہ من کل الثمرات" ہم پانی کے ذریعہ ہر قسم کے پھل اور میوہ پیدا کرتے ہیں دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا "لنخرج بہ حبا و نباتا وجنت الفافا" پھر اس کے ذریعہ غلہ سبزیاں اور گھنے باغات پیدا کرتے ہیں۔ فرمایا "وجعلنا من الماء کل شیئ حی" (الانبیاء) ہر چیز کی حیات اور نشو و نما کا انحصار پانی پر ہے تمام جاندار انسان حیوانات بلکہ نباتات اور حشرات الارض تک کی مخلوقات کی حیات پانی کے ساتھ وابستہ ہے پھر فرمایا "کذلک نخرج الموتی لعلکم تذکرون" کہ ہم اسی طرح مردوں کو قبروں سے نکال کر زندہ کریں گے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے مردہ زمین کو زندہ کیا اور اس سے غلہ درخت پھل اور پھول نکالے

اسی طرح قیامت کے دن مردوں کو زمین سے نکال کر باہر کریں گے۔ سورۃ حم سجدہ میں فرمایا "ومن ایاتہ انک تری الارض خاشعۃ فاذاانزلنا علیھا الماء اھتزت وربت ان الذی احیاھا لمحی الموتی وھو علی کل شیئ قدیر" اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تو زمین کو دیکھتا ہے کہ وہ دبی ہوئی ہے پھر جب ہم اتارتے ہیں اس پر پانی تو وہ لہلہانے لگتی ہے اور بڑھنے لگتی ہے بلاشبہ جس میں اس کو زندہ فرمایا وہ مردوں کو زندہ کردے گا بیشک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ قیامت میں صور دو مرتبہ پھونکا جائے گا: پہلے صور پر تمام عالم فنا ہو جائے گا کوئی چیز باقی نہیں رہے گی اور دوسرے صور پر دوبارہ از سرنو نیا عالم پیدا ہوگا اور سب مردے زندہ ہو جائیں گے حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ دونوں صور کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ ہوگا اور ان چالیس سالوں میں عرش عظیم سے مسلسل بارش ہوتی رہے گی اور یہ پانی ماء الحیاۃ کہلائے گا جس کا نزول ہوگا جس سے خاکی قالب لحمی قالب کی شکل اختیار کرے گا جس کو کبھی تغیر اور فنا نہیں ہوگا انسان کا پہلا وجود ماء الفنا اور زمینی پانی سے تھا اور یہ عرشی پانی ماء الحیاۃ ہی ہوگا جب دوسرا نفخہ پھونکا جائے گا تو تیار شدہ قالبوں میں روحیں منتقل ھوں گی اور مردے زندہ ہو کر کھڑے ہو جائیں گے۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، علوم القرآن وغیرہ)

"والبلد الطیب یخرج نباتہ باذن ربہ والذی خبث لا یخرج الا نکدا" اور اچھی زمین سبزہ نکلتا ہے اس کے رب کے حکم سے اور جو خراب زمین ہے اس میں سے نہیں نکلتا مگر ناقص۔

"نکِد" بے مقصد اور بے فائدہ اور مقدار اصلی سے کم تر چیز مراد ہے بارش تو ہر جگہ ہوتی ہے اچھی باصلاحیت زمین پر بھی اور ناکارہ زمین پر بھی اس کا نزول اور فیضان عام ہے لیکن اچھی زمین بارش کو قبول کرتی ہے اور اس کے اندر بارش کا پانی جذب ہوتا ہے جس سے باغ و بہار اور ہر قسم کے میوے پھل غلہ اور تمام غذائی اشیا بکثرت پیدا ہو جاتی ہیں اور مخلوقات ان سے نفع اور فائدہ حاصل کرتی ہے لیکن ناکارہ، ناقابل کاشت، بنجر، شورہ اور سخت زمین جو پانی کو جذب نہیں کرتی، یا اس میں اگنے کی صلاحیت کا فقدان ہے اس زمین سے کوئی نفع مند اور فائدہ بخش چیز پیدا نہیں ہوتی۔

بعض مفسرین (رح) نے فرمایا کہ اس آیت میں مومن اور کافر کی تمثیل ہے مومن کا دل طیب ہے اور پاکیزہ ہے اس کے سامنے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایتیں وحی کے ذریعہ آتی ہیں اور وہ جب قرآن کی آیات کی سماعت کرتا ہے وہ اس کے قلب و باطن پر اثر کر جاتی ہیں اور وہ ہر قسم کے اعمال صالح کے لئے تیار ہوتا ہے وہ عبادات کی لذتوں کو ایسا محسوس کرتا ہے جیسے کہ مختلف قسم کے پھل فروٹ میوے ترکاریاں سبزیاں ہوں جبکہ کافر اپنے خبث باطن کی وجہ سے اس میں ہدایت اور انوار و برکات وحی سے متنفع نہیں ہوتا کیونکہ اس کا باطن خباثت کی وجہ سے تمام دینی لذتوں سے محروم رہتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہدایت آسمانی کتابیں اور انبیاء (علیہ السلام) پھر ان کے نائب علماء و مشائخ کی تعلیم وتربیت بھی بارش کی طرح سارے انسانوں کے لئے عام ہے اور وحی الہی بمنزلہ بارش ہے مگر جس طرح باران رحمت سے ہر زمین فائدہ نہیں اٹھاتیں اسی طرح اس روحانی بارش کا فائدہ بھی صرف وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جن میں یہ صلاحیت ہے اور جن لوگوں کے قلوب ناکارہ زمین کی طرح بے صلاحیت ہوں تو قرآنی ہدایات اور وحی الہی کے فوائد و برکات وہاں موثر نہیں ہوتے اور وہ لوگ بدستور اپنی گمراہی اور سرکشی پر جمے رہیں گے اور ہر قسم کی ہدایت سے محروم رہیں گے۔

"کذلک نصرف الایت لقوم یشکرون" ہم اپنے دلائل قدرت پھیر پھیر کر ہر طرح سے بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو قدردان اور شکر گزار ہیں۔

باران کہ در لطافت طبعش خلاف نیست

در باغ لالہ روید ودر شورہ بوم و خس (تفسیر منازل العرفان)

ایک لطیف نکتہ

یہاں ان آیات میں جو بارش کی مثال دی گئی اور اس پورے رکوع میں جو کچھ کہا گیا اس سے ایک نہایت لطیف امر کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ جب رب العالمین اپنی رحمت و شفقت سے رات کی تاریکی میں ستارے، چاند، سورج سے روشنی کرتا ہے اور خشکی کے وقت زمین کو سرسبز و شاداب کرنے اور انسان اور حیوان کی زندگی کا سامان مہیا فرمانے کے لیے اوپر سے بارش بھیجتا ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایسا مہربان خدا اپنے مخلوق کو جہل اور ظلم کی اندھیریوں سے نکالنے کے لیے کوئی روحانی

چاند و سورج پیدا نہ کرے اور بنی آدم کی روحانی غذا تیار کرنے اور قلوب کی کھیتیوں کو سیراب کرنے کے لیے باران رحمت نازل نہ فرمائے۔ بلاشبہ اس نے ہر زمانہ کی ضرورت اور اپنی حکمت کے موافق پیغمبروں کو بھیجا جن کے منور سینوں سے دنیا میں روحانی روشنی پھیلی اور وحی الٰہی کی لگاتار بارشیں ہوئیں۔ (محمد اسحاق)

پانی کی خاصیت۔ کیفیت۔ نوعیت۔ طہارت۔ صفائی وغیرہ میں کوئی فرق نہیں ہوتا لیکن بارش سے فائدہ وہی زمین اٹھاتی ہے جس میں استعداد ہو۔ شور زمین پر کتنی ہی بارش ہو کبھی سرسبز نہیں ہوگی۔ جو زمین عمدہ۔ نرم۔ پاکیزہ اور شیریں ہے اس پر جب پانی برستا ہے تو شاداب سبزہ۔ پھول و پھل اور بہترین ثمرات پیدا ہوتی ہیں اور جو زمین شور۔ ریتلی اور پتھریلی ہے اس میں کچھ پیدا نہیں ہوتا اور اگر کچھ پیدا ہوا بھی تو بے کار ناقص۔ جھاڑ جھنکار۔ یہی حالت کافر و مسلم کی ہے۔ دلائل قدرت سب کے لیے یکساں ہیں۔ تبلیغ رسل سب کے لیے برابر ہے۔ احکام شرع سب کے لیے مساوی ہیں۔ قرآنی ہدایات سب کے لیے کھلی ہوئی ہیں مگر قرآنی ہدایات سے وہی روحیں شاداب ہوں گی جن میں قبولیت حق کی استعداد ہے۔ جن کے قلوب پاکیزہ اور نور فطرت کے حامل ہیں وہ اس قرآنی باران رحمت سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ایمان۔ اطاعت۔ عبادت۔ فرمان برداری۔ خوش خلقی نیک سیرت کے حامل بن جاتے ہیں لیکن مثل شور زمین کے تیرہ باطن۔ سنگدل۔ کور دماغ اور خبیث روح رکھنے والے کافر قرآنی موعظت اور شرعی فیضان سے محروم رہتے ہیں۔ نہ ان کو ایمان کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ نہ اطاعت و عبادت سے مسرت ہوتی ہے۔ نہ ان کے اعمال و افعال اور اخلاق واطوار درست ہوتے ہیں۔ اسی کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا جس علم وہدایت کے ساتھ خدا نے مجھے بھیجا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے زمین پر بہت زیادہ بارش ہوئی۔ زمین کے ایک صاف عمدہ ٹکرے نے تو پانی کو قبول کیا اور گھاس چارہ سبزہ بہت اس میں سے نکلا۔ ان میں بعض ٹکڑے ایسے بھی تھے جن میں پانی جمع ہوگیا اور وہاں رک گیا۔ پس اس سے بھی لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔ پیا اور پلایا کھیتیاں کیں۔ باغات تازہ کئے۔ زمین کے جو چٹیل اور پتھریلے ٹکڑے تھے ان پر بھی وہ پانی برسا لیکن نہ تو وہاں رکا اور نہ وہاں کچھ اگا۔ یہی مثال ہے کہ جس نے دین خدا کی سمجھ پیدا کی اور میری بعثت سے اس نے فائدہ اٹھایا یا خود دیکھا اور دوسروں کو سکھلایا۔ اور ایسے بھی ہیں کہ جس نے کچھ توجہ نہ کی، نہ نفع اٹھایا اور نہ میری لائی ہوئی ہدایت کو قبول کیا۔ یا اللہ ہمیں اپنے دین کی سمجھ عطا فرما اور اپنے رسول پاک (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہدایات کا اتباع کامل نصیب فرما اور ہم ہم کو اس گروہ میں شامل ہونے سے بچا کہ جس نے نہ دین اسلام کی قدر کی۔ نہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات گرامی کو پہچانا۔ نہ آپ کی ہدایت کو قبول کیا اور نہ ان سے نفع اٹھایا۔ آمین (درس قرآن محمد احمد)

دعا کیجئے: یا اللہ قرآنی ہدایات جو مثل باران رحمت کے ہیں ان سے ہمارے دلوں کو زندہ فرمادے۔ اور ہماری روحوں کو سرسبز و شاداب فرمادے۔ اور ہم کو ایمان حقیقی اپنی اطاعت و عبادت، خوش خلقی، نیک سیرت کا حامل بنادے۔ یا اللہ ہماری قلبی استعداد اور صلاحیتوں کو درست فرمادے تاکہ قرآنی موعظت اور شرعی فیضان سے ہم محروم نہ رہیں۔ آمین۔ (درس قرآن۔ محمد اسحاق)

واخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین

آیت مبارکہ:

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ۭ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ۝۵۸

لغۃ القرآن: وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ : اور عمدہ شہر "زرخیز زمین"] [يَخْرُجُ : نکلتی ہے] [نَبَاتُهٗ : اس کی کھیتی] [بِاِذْنِ : حکم سے] [رَبِّهٖ : اس کے رب] [وَالَّذِيْ : اور جس نے] [خَبُثَ : خراب ہے] [

لَا :نہیں] [يَخْرُجُ :نکلتی ہے] [اِلَّا :مگر] [نَكِدًا :ناقص] [كَذٰلِكَ :اسی طرح] [نُصَرِّفُ :ہم پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں] [الْاٰيٰتِ :واضع دلائل] [لِقَوْمٍ :"اس "قوم کے لیے] [يَّشْكُرُوْنَ : وہ سب شکر کرتے ہیں]

ترجمہ: اور جو اچھی (یعنی زرخیز) زمین ہے اس کا سبزہ اللہ کے حکم سے (خوب) نکلتا ہے اور جو (زمین) خراب ہے (اس سے) تھوڑی سی بے فائدہ چیز کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ اسی طرح ہم (اپنی) آیتیں (یعنی دلائل اور نشانیاں) ان لوگوں کے لیے بار بار بیان کرتے ہیں جو شکر گزار ہیں

تشریح: ان دو آیتوں کو اگر بنظر غور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح جسم کی بقاء اور نشو ونما کے لیے قدرت نے ہزاروں سامان مہیا فرمادیئے ہیں اسی طرح روحانی ترقی واصلاح کو بھی عنایت الٰہی نے نظر انداز نہیں کیا۔ اگر وہاں ٹھنڈی ہوائیں، بادل اور بارش کا انتظام فرمایا ہے تو یہاں بھی اپنے برگزیدہ رسولوں کو اپنی وحی اور ہدایت سے سرفراز فرما کر مبعوث فرمایا ہے۔ اور جس طرح بارش برسنے سے اچھی زمین رشک جناں بن جاتی ہے اور ردی اور شور زمین میں تھور اور سیم کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور خار دار جھاڑیاں اگ آتی ہیں اسی طرح نبوت کے فیض تربیت سے اچھی استعداد والے فائدہ اٹھا کر صدیقیت وفاروقیت کے مناصب رفیعہ پر فائز ہو جاتے ہیں۔ اور بد طینت اور خبیث فطرت اس ابر کرم کی برکت سے محروم ہو جاتے ہیں اور ان کی شر پسندی، خبث باطن جو مصلحت اور فریب کے نقابوں میں مستور ہوتا ہے بے نقاب ہو جاتا ہے اور ان کی اخلاقی پستی اور گندی ذہنیت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ دانشور شیراز (رح) نے کیا خوب فرمایا ہے

باراں کہ در لطافت طبعش کلام نیست در باغ لالہ روید ودر شورہ بوم خنس

گویا یہ آیتیں بعد میں آنے والے کئی رکوعوں کے لیے بطور تمہید ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ)

جب رحمت کی بارش برستی ہے تو اچھی زمین اس کو قبول کرلیتی ہے اور اسی سے خوب پیداوار نکلتی ہے جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے، جبکہ خراب زمین اس پانی کو قبول نہیں کرتی اور اس سے پیداوار بھی نہیں نکلتی اور اگر کچھ پیداوار نکلے تو وہ بھی خراب ہوتی ہے، اس لیے لوگوں کو اس سے فائدہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح جب انبیاء کرام (علیہم السلام) اللہ تعالیٰ کا پیغام سناتے ہیں تو شکر گزار بندے اس کو قبول کرتے ہیں اور اس پر عمل کرکے لوگوں کو فیض پہنچاتے ہیں مگر ناشکرے لوگ اس پیغام کا انکار کرکے زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ (تفسیر امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

جب بارش برستی ہے تو اچھی زمین سے بکثرت پودے اور پھل پھول اگتے ہیں جبکہ بنجر اور شور زدہ زمین سے کچھ پیدا نہیں ہوتا یا چند بیکار تنکے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح اللہ نے قرآنی آیاد کو بارش کی طرح انسانوں کے دلوں پر برسایا تو جن دلوں میں مادۂ قبولِ حق تھا ان سے ایمان اور عمل صالح کے پودے اگ آئے اور نیکی کی بہار آگئی اور جن دلوں میں یہ مادہ نہ تھا ان پر قرآن نے کچھ اثر نہ کیا، تو کمی قرآن میں نہیں کمی ان دلوں میں ہے۔ (تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

اچھی اور خراب زمینوں میں مسلمانوں اور کافروں کی مثال :

اللہ تعالیٰ نے مومن اور کافر کے لیے یہ مثال بیان فرمائی ہے۔ مومن کی مثال اچھی زمین ہے اور کافر کی مثال خراب زمین ہے اور نزول قرآن کی مثال بارش ہے۔ سو جس طرح اچھی زمین پر بارش ہو تو اس سے سبزہ، پھل، پھول اور غلہ پیدا ہوتا ہے، اسی طرح وہ پاکیزہ روحیں جو جہالت اور برے اخلاق سے مبرا اور منزہ ہوتی ہیں، جب وہ نور قرآن سے مزین ہو جاتی ہیں، تو ان سے عبادات معارف اور اخلاق حمیدہ ظاہر ہوتے ہیں اور جس طرح خراب زمین پر بارش ہو تو اس سے کم پیداوار ہوتی ہے، اسی طرح جب خراب روحوں پر قرآن پاک کی تلاوت کی جائے تو ان سے بہت کم معارف الٰہیہ اور اخلاق حمیدہ ظاہر ہوتے ہیں۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256 ھ روایت کرتے ہیں : حضرت ابو موسیٰ اشعری (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : اللہ تعالیٰ نے مجھے جو ہدایت اور علم دے کر بھیجا ہے، اس کی مثال اس کثیر بارش کی طرح ہے جو زمین پر برستی ہو۔ ان زمینوں میں سے بعض صاف ہوتی ہیں جو بہت زیادہ خشک اور تر گھاس اگاتی ہیں اور بعض زمینیں سخت ہوتی ہیں وہ پانی کو روک لیتی ہیں۔ اللہ اس زمین سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ وہ اس سے پانی پیتے ہیں۔ اپنے جانوروں کو پلاتے ہیں اور کھیتی باڑی کرتے ہیں اور بعض زمینیں ہموار اور چکنی ہوتی ہیں وہ پانی کو روکتی ہیں نہ گھاس کو اگاتی ہیں۔ پس یہ مثال اس شخص کی ہے جو اللہ

کے دین کی فہم حاصل کرتا ہے۔ اور اللہ نے مجھے جو دین دے کر بھیجا ہے وہ اس کو نفع دیتا ہے۔ پس وہ علم حاصل کرتا ہے اور لوگوں کو تعلیم دیتا ہے۔ اور اس شخص کی مثال ہے جو اس دین کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتا اور اس ہدایت کو قبول نہیں کرتا جس کے ساتھ مجھے مبعوث کیا گیا ہے۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 79۔ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1412ھ)

وحی الٰہی اور دین اسلام کی مثال نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بارش سے دی ہے اور فقہاء کی مثال اس زمین سے دی ہے جو بارش سے سیراب ہونے کے بعد سبزہ اگاتی ہیں اور لوگ اس سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح فقہاء آپ کی احادیث سے مسائل نکالتے ہیں اور لوگ ان سے فائدہ حاصل کرتے ہیں اور محدثین کی مثال اس زمین سے دی ہے جو اپنے اندر پانی جمع کرلیتی ہے اور لوگ اس پانی سے فائدہ حاصل کرتے ہیں، اسی طرح محدثین احادیث کو جمع کرتے ہیں اور لوگ ان سے فیض یاب ہوتے ہیں اور کفار اور منافقین کی مثال اس زمین سے دی ہے جو بارش سے نہ خود فائدہ اٹھاتی ہے نہ لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔

(تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

بارش کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے نباتات کا ظہور اور نمود ہوتا ہے بارش تو ہر کسی کے لیے یکساں ہوتی ہے مگر اس کے اثرات اور نتائج مختلف ہوتے ہیں زمین چٹیل اور بنجر ہوگی تو اس سے کسی چیز کا اخراج نہیں ہوگا۔ اگر زمین زرخیز اور ہموار ہوگی تو نہ صرف وہ زمین ٹھنڈی ہوگی بلکہ اس سے مختلف قسم کی فصلیں اور پودہ جات پیدا ہوں گے۔ زمین شوریلی ہوگی تو اس سے مزید کلر شورا ابھر کر سامنے آئے گا۔ اس پر کھڑے ہوئے پانی میں تعفن کے سوا کچھ پیدا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنے ارشادات کو مختلف انداز میں بیان کرتا ہے تاکہ لوگ شکر ادا کریں۔

بظاہر یہ بارش اور زمین کی مثال ہے لیکن حقیقت میں اس کا تعلق دین کے ساتھ ہے کیونکہ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷ اور ۱۸ میں دین اور بارش کو مترادف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ جس طرح بارش سے مردہ زمین زندہ ہوجاتی ہے اسی طرح عقیدہ توحید اپنانے اور دین اسلام کو اختیار کرنے سے مسلمان کی روحانی زندگی میں بہار ہوتی ہے۔ اس کے ذوق و شوق میں اضافہ اور نیکی کے عمل میں ترقی ہوتی ہے۔

(عَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَیْبٍ (رض) عَنْ اَبِیہِ عَنْ جَدِّہٖ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اِذَا اسْتَسْقٰی قَالَ اَللّٰہُمَّ اسْقِ عِبَادَکَ وَبَہَاءِمَکَ وَانْشُرْ رَحْمَتَکَ وَاَحْیِ بَلَدَکَ الْمَیِّتَ)

[رواہ ابوداؤد: باب رَفْعِ الْیَدَیْنِ فِی الاِسْتِسْقَاءِ]

"حضرت عمرو بن شعیب (رض) بیان کرتے ہیں بلاشبہ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب بارش کے لیے دعا کرتے تو فرماتے اَللّٰہُمَّ اسْقِ عِبَادَکَ وَبَہِیْمَتَکَ وَانْشُرْ رَحْمَتَکَ وَاَحْیِ بَلَدَکَ الْمَیِّتَ

"اے اللہ اپنے بندوں اور جانوروں کو بارش کے ذریعے پانی پلا اور اپنی رحمت کو پھیلاتے ہوئے مردہ زمین کو زندہ کردے" (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

آیت مبارکہ:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۵۹

لغۃ القرآن: لَقَدْ : البتہ تحقیق] [اَرْسَلْنَا : بھیجا ہم نے] [نُوْحًا : نوح کو] [اِلٰي : تک] [قَوْمِهٖ : اس کی قوم] [فَقَالَ : پس اس نے کہا] [يٰقَوْمِ : اے میری قوم] [اعْبُدُوا : تم سب عبادت کرو] [اللّٰهَ : اللہ] [

مَا : نہیں] [لَکُمْ : تمہارے لیے] [مِنْ اِلٰہٍ : کوئی معبود] [غَیْرُہٗ : اس کے سوا] [اِنِّیْٓ : بیشک میں] [اَخَافُ : ڈرتا ہوں] [عَلَیْکُمْ : تم پر] [عَذَابَ : عذاب] [یَوْمٍ : دن] [عَظِیْمٍ : بڑے]

ترجمہ: بیشک ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف بھیجا سو انھوں نے کہا: اے میری قوم (کے لوگو!) تم اللہ کی عبادت کیا کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، یقیناً مجھے تمہارے اوپر ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف آتا ہے

تشریح: اب چند جلیل القدر انبیاء جو مکہ اور عرب میں مشہور تھے کا تذکرہ اور ان کی قوموں نے ان سے جو سلوک روا رکھا اس کا بیان شروع ہو رہا ہے تاکہ حقیقت واضح ہو جائے کہ رب کریم جس طرح انسان کی حیات ظاہری کی بقا اور اس کی توانائیوں کی نشو ونما کے لیے ہر ضرورت کے وقت بارش نازل فرماتا ہے اور اس سے ہر چیز اپنی استعداد کے مطابق استفادہ کرتی ہے اسی طرح انسان کی روحانی زندگی کے لیے بھی رسالت کا ابر رحمت بارہا امڈ کر آیا۔ اس سے ہدایت زبانی کی بارشیں برسیں اور نیک فطرت لوگ اس سے مستفید ہوئے اور بد فطرت لوگ انبیاء کی مخالفت اور عداوت پر اتر آئے اور طرح طرح کی حجت بازیوں کے باعث اس نعمت سے اپنے کو محروم کر دیا۔ نیز اس سے اپنے محبوب کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دلجوئی بھی فرما دی کہ اے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اہل مکہ کی ایذاء رسانی اور بے التفاتی اور اعتراضات سے غمزدہ نہ ہو۔ تم سے پہلے بھی ہمارے انبیاء کے ساتھ ان کی قوموں نے ایسا ہی سلوک کیا لیکن وہ ان کی ستم کیشیوں کے باوجود کلمہ حق کہتے رہے۔ اسی طرح آپ بھی اپنی تبلیغی سرگرمیاں تیز تر کر دیجئے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

تذکیر بایام اللہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی اور ایمان نہیں لائے بلکہ اپنے کفر و شرک پر جمے رہے اور انبیاء (علیہم السلام) پر طرح طرح کے بہتان باندھے اور ان کی مخالفت کی اور انہیں تکلیف پہنچائی پس اپنے مسلک کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔

قرآن مجید امت حاضرہ کی یاد دہانی اور عبرت دلانے کے لیے جگہ جگہ انبیاء سابقین کے اور ان کی امتوں کے واقعات مختلف انداز میں ذکر فرمائے ہیں کہیں ایک نبی کا تذکرہ فرمایا کہیں متعدد انبیاء کرام (علیہم السلام) کا تذکرہ فرمایا پھر یہ واقعات کہیں مختصر ہیں اور کہیں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں یہاں سورۃ اعراف میں حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب (علیہم السلام) کی تبلیغ وتذکیر اور ان کی امتوں کی تکذیب انکار پھر اس پر ان کی سزا اور تعذیب اور ہلاکت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے دشمن فرعون کا اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کا بہت تفصیل کے ساتھ تذکرہ ہے پھر اسی ترتیب سے سورۃ شعراء میں ان کا تذکرہ فرمایا ہے کیونکہ عبرت دلانا مقصود ہے اس لئے یہ تکرار نہایت ہی مفید ہے۔

حضرت نوح (علیہ السلام) کی بعثت اس زمانے کے تمام انسانوں کے لئے تھی جو اس وقت دنیا میں آباد تھے آپ (علیہ السلام) حضرت آدم (علیہ السلام) سے دس قرن بعد مبعوث ہوئے آپ (علیہ السلام) سے پہلے جتنے پیغمبر مبعوث ہوئے وہ سب کے سب انبیاء گزرے ہیں ان میں رسول کوئی نہیں تھا دنیا میں سب سے پہلے رسول آپ ہیں۔ کما فی حدیث الشفاعۃ فی الصحیحین۔

حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر حضرت نوح (علیہ السلام) کے والد ماجد تک تقریباً تمام لوگ مومن موحد گزرے ہیں شرک اور اصنام پرستی کا رواج نہ تھا "کان الناس امۃ واحدۃ" (سورۃ البقرہ) حضرت نوح (علیہ السلام) سے چند وقت پہلے اصنام پرستی کا دور شروع ہوا ہے کچھ بڑے صالح نیک لوگوں نے عبادت گاہ اور مساجد تیار کئے تھے وہاں رات دن عبادت واذکار میں مشغول رہتے تھے مرور زمانہ کے بعد یکے بعد دیگرے وہ سب وفات پا گئے ان کے متبعین ان کی جدائی پر غمگین و پریشان ہوئے جب وہ عبادت گاہوں میں بیٹھتے تھے تو اپنے اسلاف اور بزرگوں کا تذکرہ کرکے ان کی جدائی پر غم زدہ رہتے تھے۔

شیطان نے موقع کو غنیمت سمجھ کر عمامہ و قبا و عصا کے ساتھ ان کی محفل میں آیا ایک خیر خواہ ناصح بن کر انہیں بتایا کہ اپنے بزرگوں کے مجسمے بنا کر مسجدوں میں رکھو جب عبادت میں مصروف ہوں تو انہیں دیکھتے رہو اور ان کے قدموں پر بوسہ دیا کرو تمہاری پریشانی دور ہو جائے گی اور عبادت میں لطف و سرور بھی پہلے کی طرح حاصل ہوگا انہوں نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ آہستہ آہستہ عبادت کی شکل صورت تبدیل ہوئی اور بات صرف قدم بوسی اور سجدے کی حد تک رہ گئی۔

یہ نسل ختم ہوئی تو نئی نسل نے شیطان کے ورغلانے پر ان مجسموں کو معبود کا درجہ دے کر ان کی عبادت شروع کی رفتہ رفتہ یہ وبا کی طرح پوری آبادی میں پھیل گئی وہاں سے دوسرے علاقوں تک یہ رسم بد عام ہو گئی اور دیگر اقوام بھی اس کی لپیٹ میں آ کر غرق ہو گئیں تب حضرت نوح (علیہ السلام) مبعوث ہوئے بعثت کے وقت بقول حضرت ابن عباس (رض) آپ کی عمر چالیس سال تھی اور بقول حضرت وہب بن منبہ (رح) کی عمر پچاس سال تھی۔

ساڑھے نو سو سال کا بڑا عرصہ تبلیغ میں گزارا (سورۃ العنکبوت) پوری جماعت انبیاء میں آپ کا ایک خاص امتیازی مقام ہے کہ اتنی بڑی مدت جو کہ پشتوں پر مشتمل ہو آپ نے مسلسل تبلیغ میں گزاری اور تبلیغ کے سلسلے میں اتنی تکالیف برداشت کیں جن کی مثال ملنی مشکل ہے اور لوگ آپ کو مار مار کر زخمی کر دیتے آپ بے ہوش ہو جاتے اور وہ آپ کو کہیں پھینک دیتے جب آپ ہوش میں آتے تو دوبارہ تبلیغ شروع کرتے اور ان کے لئے ہدایت کی دعا کرتے۔

پھر آپ کی تبلیغ اتنی ہمہ گیر ہوتی کہ کوئی کسر اٹھانہ رکھتے محفلوں میں، تقریبات میں، بازاروں میں، صحراؤں میں، گھروں میں، اجتماعات میں، انفرادی طور پر یہاں تک کہ سوئے ہوئے لوگوں کے بستروں میں جا جا کر ہر وقت صبح و شام رات دن تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھتے اور انہیں مختلف قسم کے عذاب اور و مواخذوں سے ڈراتے اور جنت کی خوش خبری سناتے مال و اولاد عزت و خوشحالی و کا یقین دلاتے بارشوں اور ملکی آبادی باغات دیگر راتوں کا وعدہ دیتے اور اتنی محنت و جانفشانی سے تبلیغ کرتے کہ اپنی ذاتی راحتوں سے بے خبر رہتے (تفسیر عزیزی، قرطبیؒ، معالم وغیرہ)

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت نوح (علیہ السلام) نے تبلیغ دین کے جو راہنما اصول وضع کیے وہ اتنے بابرکت اور قیمتی ہیں جو رہتی دنیا تک حق و صداقت کے مبلغین کے لیے نمونہ ہیں ساڑھے نو سو سال شب و روز خلوت و جلوت میں لوگوں کو دعوت حق دینا اور مسلسل اس دعوت میں منہمک اور مشغول رہنا اور کسی قسم کی تعب و تھکاوٹ محسوس نہ کرنا اور کوئی حرف شکایت زبان پر نہ لانا یہ منصب نبوت ہی کا طرہ امتیاز ہے اور صبر واستقلال کی وہ شان و ہمت ہے جس کے سامنے پہاڑ بھی عاجز ہیں قرآن کریم میں متعدد مقامات میں آپ کی شان تبلیغ اور دعوت حق کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے سورۃ ھود میں قدرے تفصیل کے ساتھ آپ کا تذکرہ ہے۔

بالآخر ہزار سالہ تبلیغ کا نتیجہ سفر نکلا اور تقریباً بقول حضرت ابن عباس صرف اسی آدمیوں نے ایمان قبول کیا اور کعب الاحبار کہتے ہیں کہ 72 لوگ ایمان لائے اور جب حضرت نوح (علیہ السلام) ہر طرح ہر سمت سے مایوس ہو گئے باوجود یکیہ تقریباً 70 سال اسی حال میں گزرے کہ پوری قوم کی نسل منقطع ہو گئی کسی عورت سے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا اور بارشیں بند ہو گئیں معیشت پر تباہی آئی لیکن لوگ وہی کے وہی رہے بہت تنگ آئے پریشان ہوئے نہایت مایوسی کے عالم میں ہاتھ اٹھا کر اپنے محسن حقیقی کے سامنے الحاح وزاری شروع کی اور قوم کی تباہی کی التجا کی بالآخر دعا منظور ہوئی طوفان آنے کا مژدہ سنایا گیا فرشتوں نے کشتی بنانے پر مدد کی کشتی بن گئی ہر قسم کے زمینی جانوروں کے لیے خانے بنائے گئے آسمان کے دروازے کھل گئے زمینی تنور سے پانی نکلنا شروع ہوا جن کو نجات دلانا تھی انہیں کشتی میں سوار کیا گیا۔

جبل ابو قبیس سے حضرت آدم (علیہ السلام) کو نکال کر ان کے جسد خاکی کو تابوت میں رکھ کر کشتی میں رکھا گیا دس رجب المرجب کو کشتی روانہ ہوئی دس محرم کو چھ ماہ مسلسل پانی پر رہنے کے بعد جبل جودی پر رک گئی ڈرامہ بازوں کا ڈرامہ اختتام کو پہنچا سارے ڈرامہ باز غرق ہوئے پوری انسانیت تباہ ہو گئی بیوی اپنے نافرمان بیٹے کنعان سمیت ڈوب گئی باقی تینوں فرمانبردار بیٹے سام حام یافث نجات پا گئے ان ہی کی نسل سے دوبارہ انسانیت روئے زمین پر پھیل گئی جبکہ اسی آدمی جو کشتی میں سوار تھے ان کی نسل کوئی نہیں رہی۔ یہ ہے مختصر قصہ روداد آدم ثانی سیدنا حضرت نوح کا۔ (تفسیر منازل العرفان۔ عبد الستار شاہ)

حضرت نوح (علیہ السلام) کا نام و نسب اور ان کی تاریخ ولادت:

حافظ اسماعیل بن عمر بن کثیر شافعی متوفی 774ھ لکھتے ہیں: حضرت نوح (علیہ السلام) کا شجرہ نسب یہ ہے: نوح بن مالک بن متوشلخ، بن خنوخ (ادریس) ابن یرد بن صلاہیل بن قینن بن انوش بن شیث بن آدم ابوالبشر (علیہ السلام)۔

امام ابن جریر وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کی وفات کے ایک سو چھبیس سال بعد حضرت نوح (علیہ السلام) پیدا ہوئے اور اہل کتاب کی تاریخ میں مذکور ہے کہ ان دونوں کے درمیان ایک سو چھیالیس سال کا عرصہ ہے۔

امام ابن حبان نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے: حضرت ابوامامہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے پوچھا یارسول اللہ! کیا حضرت آدم نبی تھے؟ فرمایا: ہاں! وہ ایسے نبی تھے جن سے کلام کیا گیا۔ پوچھا حضرت آدم اور حضرت نوح کے درمیان کتنا عرصہ ہے؟ فرمایا: دس قرن (صدیاں) یہ حدیث صحیح ہے۔ (صحیح ابن حبان، ج14، رقم الحدیث: 6190، المعجم الکبیر، ج8، رقم الحدیث: 7545، امام طبرانی کی روایت میں یہ اضافہ ہے یارسول اللہ! رسول کتنے ہیں؟ فرمایا: 313۔ المستدرک، ج2، ص262۔ مجمع الزوائد، ج1، ص196۔ مسند احمد، ج5، ص179، 178۔ مسند البزار، ج1، ص160)

اس حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت آدم اور حضرت نوح کے درمیان ایک ہزار سال ہیں۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ امام محمد بن سعد متوفی 230ھ اپنی سند کے ساتھ عکرمہ سے روایت کرتے ہیں: حضرت آدم اور حضرت نوح کے درمیان دس قرن (قرن کا معنی ہے ایک صدی یا ایک صدی کے لوگ، نسلیں) ہیں اور وہ سب اسلام پر تھے۔ (الطبقات الکبری، ج1، ص42، مطبوعہ دار صادر، بیروت)

حافظ ابن کثیر نے اس حدیث کو صحیح البخاری کے حوالہ سے درج کیا ہے۔ لیکن یہ ان کا وہم ہے۔ یہ حدیث صحیح البخاری میں ہے نہ صحاح ستہ کی کسی اور کتاب میں۔

حضرت نوح (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے اس وقت مبعوث کیا جب بتوں کی عبادت اور شیطانوں کی اطاعت شروع ہو چکی تھی اور لوگ کفر اور گمراہی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ حضرت نوح (علیہ السلام) پہلے رسول ہیں جن کو بندوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا۔ بعثت کے وقت ان کی عمر میں اختلاف ہے ایک قول یہ ہے کہ ان کی عمر اس وقت پچاس سال تھی اور دوسرا قول یہ ہے کہ ان کی عمر اس وقت تین سو پچاس سال تھی اور امام ابن جریر نے حضرت ابن عباس (رض) کے حوالے سے لکھا ہے ان کی عمر اس وقت چوراسی سال تھی۔

بت پرستی کی ابتدا کیسے ہوئی؟

امام ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ محمد بن قیس سے روایت کیا ہے کہ حضرت آدم اور حضرت نوح کے درمیان کچھ نیک لوگ تھے اور ان کے پیروکار ان کی اقتداء کرتے تھے۔ جب وہ نیک لوگ فوت ہوگئے تو ان کے پیروکاروں نے کہا: اگر ہم ان کی تصویریں بنالیں۔ جب وہ فوت ہوگئے اور ان کی دوسری نسل آئی تو ابلیس نے ان کے دل میں یہ خیال ڈالا کہ ان کے آباء ان تصویروں کی عبادت کرتے تھے اور اسی سبب سے ان پر بارش ہوتی تھی۔ سو انھوں نے ان تصویروں کی عبادت کرنی شروع کردی، اور امام ابن ابی حاتم نے عروہ بن الزبیر سے روایت کیا ہے کہ ود، یغوث، یعوق، سواع اور نسر حضرت آدم (علیہ السلام) کی اولاد میں سے تھے اور "ود" ان میں سب سے نیک تھے۔ (جامع البیان، جز29، ص122، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415ھ)

امام ابن ابی حاتم نے باقر سے روایت کیا ہے کہ ود ایک نیک شخص تھا اور وہ اپنی قوم میں بہت محبوب تھا۔ جب وہ فوت ہوگیا تو اس کی قوم کے لوگ بابل کی سرزمین میں اس کی قبر کے گرد بیٹھ کر روتے رہے۔ جب ابلیس نے ان کی آہ و بکا دیکھی تو وہ ایک انسان کی صورت میں متمثل ہو کر آیا اور کہنے لگا میں نے تمہارے رونے کو دیکھا ہے، تمہارا کیا خیال ہے میں تمہارے لیے ود کی ایک تصویر بنادوں۔ تم اپنی مجالس میں اس تو تصویر کو دیکھ کر اسے یاد کیا کرو۔ انھوں نے اس سے اتفاق کیا۔ اس نے ود کی تصویر بنادی جس کو وہ اپنی مجلسوں میں رکھ کر اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ جب ابلیس نے یہ منظر دیکھا تو کہا میں تم میں سے ہر ایک کے گھر میں ود کا ایک مجسمہ (بت) بنا کر رکھ دوں تاکہ تم میں سے ہر شخص اپنے گھر میں ود کا ذکر کیا کرے انھوں نے اس کو مان لیا۔ پھر ہر گھر میں ود کا ایک بت بنا کر رکھ دیا۔ پھر ان کی اولاد بھی یہی کچھ کرنے لگی۔ پھر اس کے بعد جو نسلیں آئیں وہ یہ بھول گئیں کہ ود ایک انسان تھا وہ اس کو خدا مان کر اس کی عبادت کرنے لگیں۔ انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اس بت کی پرستش شروع کردی سو اللہ کو چھوڑ کر جس بت کی سب سے پہلے پرستش شروع کی گئی وہ ود نام کا بت تھا۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج10 ص3375۔ 3376۔ مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ کرمہ، 1417ھ)

حضرت نوح (علیہ السلام) کی بعثت اور ان کا اول رسل ہونا:

خلاصہ یہ ہے کہ ہر وہ بت جس کی وہ عبادت کرتے تھے اصل میں اللہ کا کوئی نیک بندہ تھا جس کی انھوں نے تصویر اور اس کا مجسمہ بنالیا تھا۔ امام بخاری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ حضرت ام حبیبہ اور حضرت ام سلمہ (رض) نے بیان کیا کہ انھوں نے حبشہ میں ایک گرجا دیکھا جس کا نام ماریہ تھا۔ انھوں نے اس کی خوبصورتی کا اور اس میں رکھی ہوئی تصاویر کا ذکر کیا تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جب ان میں کوئی نیک

شخص مر جاتا تھا تو وہ اس کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیتے اور اس میں یہ تصویریں رکھ دیتے تھے۔ یہ لوگ اللہ عزوجل کے نزدیک بدترین مخلوق ہیں۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث 427۔ صحیح مسلم، المساجد، 16 (528) 1161۔ سنن نسائی، رقم الحدیث: 703)

غرض یہ کہ جب زمین میں بت پرستی عام ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ اور اپنے رسول حضرت نوح (علیہ السلام) کو بھیجا۔ وہ لوگوں کو اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کی دعوت دیتے تھے اور ان کو غیر اللہ کی عبادت سے منع کرتے تھے اور حضرت نوح زمین پر اللہ تعالیٰ کے سب سے پہلے رسول ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کی طرف بھیجا جیسا کہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث شفاعت میں ہے۔ قیامت کے دن لوگ حضرت نوح (علیہ السلام) کے پاس جائیں گے اور کہیں گے: "اے نوح! آپ زمین والوں کی طرف سب سے پہلے رسول ہیں" (الحدیث) (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 4712۔ صحیح مسلم، الایمان: 327، (194) 472۔ سنن الترمذی، رقم الحدیث: 2442۔ سنن کبری للنسائی، رقم الحدیث: 11286۔ سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 3307)

حضرت نوح (علیہ السلام) کی تبلیغ کا بیان:۔

حضرت نوح (علیہ السلام) نے اپنی قوم کو نو سو پچاس سال تبلیغ کی جیسا کہ اس آیت میں ارشاد ہے: " ولقد ارسلنا نوحا الی قومہ فلبث فیھم الف سنۃ الا خمسین عاما: اور ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا وہ ان میں پچاس سال کم ایک ہزار سال رہے" (العنکبوت: 14)۔

سورۃ نوح میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح (علیہ السلام) کی تبلیغ کرنے اور اس کے جواب میں ان کی قوم کے انکار کرنے اور ان سے مایوس ہونے کے بعد حضرت نوح (علیہ السلام) کا ان کے لیے عذاب کی دعا کرنے کا تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔ ان آیات کا ترجمہ یہ ہے: " بیشک ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو ڈرائیں اس سے پہلے کہ ان کے اوپر دردناک عذاب آجائے۔ نوح نے کہا اے میری قوم! میں تمہیں واضح طور پر ڈرانے والا ہوں۔ کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرتے رہو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ تمہارے لیے تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور ایک مقرر وقت تم کو مہلت دے گا، بیشک جب اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آجائے تو وہ موخر نہیں ہوتا کاش تم جانتے۔ نوح نے دعا کی اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کو رات اور دن (حق کی) دعوت دی، (لیکن) میری اس دعوت سے ان پر بھاگنے کے سوا اور کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور بیشک جب بھی میں نے ان کو بلایا کہ تو انھیں بخش دے تو انھوں نے اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے اوپر اپنے کپڑے لپیٹ لیے اور ضد کی اور بہت تکبر کیا۔ میں نے پھر انھیں بلند آواز سے پکارا، پھر میں نے ظاہراً اور خفیہ طریقہ سے (بھی) انھیں سمجھایا۔ میں نے کہا تم اپنے رب سے بخشش طلب کرو، بیشک وہ بہت بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر موسلا دھار بارش بھیجے گا۔ وہ مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد کرے گا، وہ تمہارے لیے باغات اگائے گا اور تمہارے لیے دریا بہادے گا۔ تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ کی عظمت کو نہیں مانتے۔ حالانکہ اس نے تمہیں مرحلہ وار پیدا کیا ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے سات آسمان ایک دوسرے کے اوپر بنائے۔ اور ان میں چاند کو روشن اور سورج کو چراغ بنایا۔ اور اللہ نے تمہیں ایک نوع کی روئیدگی سے اگایا۔ پھر تم کو وہ اس زمین میں لوٹائے گا اور (دوبارہ) تم کو نکالے گا۔ اور اللہ نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا۔ کہ تم اس کے کشادہ راستوں میں چلو۔ نوح نے دعا کی اے میرے رب! انھوں نے میری نافرمانی کی اور اس کی پیروی کی جس نے ان کے مال اور اولاد میں نقصان کے سوا اور کوئی زیادتی نہیں کی۔ اور انھوں نے بہت بڑا مکر کیا۔ اور ان کافروں نے کہا تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور ود اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر کو ہرگز نہ چھوڑنا۔ اور یقینا انھوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کر دیا اور اے میرے رب ظالموں کے لیے صرف گمراہی کو زیادہ کرنا۔ وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے غرق کیے گئے پھر آگ میں ڈال دیے گئے تو انھوں نے اللہ کے مقابلہ میں کسی کو اپنا مددگار نہ پایا۔ اور نوح نے دعا کی اے میرے رب زمین پر کوئی بسنے والا کافر نہ چھوڑ۔ اگر تو نے انھیں چھوڑا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی اولاد بھی بدکار کافر ہی ہو گی۔ اے میرے رب! میری مغفرت فرما اور میرے ماں باپ کی مغفرت فرما اور جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہوا اور تمام مومن مردوں اور مومن عورتوں کی مغفرت فرما اور ظالموں کے لیے صرف ہلاکت کو زیادہ فرما۔ (نوح: 1-28)"

حضرت نوح (علیہ السلام) کی قوم پر طوفان کا عذاب:

جب حضرت نوح (علیہ السلام) کی اس طویل عرصہ تک تبلیغ کا کوئی اثر نہ ہوا اور چند نفوس کے سوا کوئی مسلمان نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو کشتی بنانے کا حکم دیا اور انھیں یہ خبر دی کہ قوم نوح پر طوفان کا عذاب آئے گا اور حضرت نوح (علیہ السلام) اور دیگر ایمان والوں کو کشتی کے ذریعے اس طوفان سے بچا لیا جائے گا۔ اس کا بیان سورۃ ھود کی چند آیات میں ہے۔ ان کا ترجمہ یہ ہے:

"انھوں نے کہا اے نوح! بیشک تم ہم سے بحث کرتے رہے ہو اور تم ہم سے بہت زیادہ بحث کر چکے ہو، پس اگر تم سچے ہو تو ہمارے پاس اس عذاب کو لے آؤ جس سے تم ہم کو ڈراتے رہے ہو۔ (حضرت) نوح نے کہا: اگر اللہ چاہے گا تو وہی تمہارے پاس اس عذاب کو لائے گا اور تم (اسے) عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اور اگر اللہ نے تمہیں گمراہی پر برقرار رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے تو اگر میں تمہاری خیر خواہی کا ارادہ کر بھی لوں تب بھی مِیْ خیر خواہی تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، وہ تمہارا رب ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ کیا وہ (مشرکین مکہ) یہ کہتے ہیں کہ اس کلام کو خود انھوں نے گھڑ لیا ہے۔ آپ کہئے اگر (بالفرض) میں نے اس کلام کو گھڑ لیا ہے تو میرا گناہ مجھ پر ہو گا اور میں تمہارے گناہوں سے بری ہوں۔ اور نوح کی طرف وحی کی گئی کہ آپ کی قوم میں سے صرف وہی لوگ صاحب ایمان ہوں گے جو پہلے ہی ایمان لا چکے ہیں تو آپ ان کے کرتوتوں سے غم نہ کریں۔ اور آپ ہماری وحی کے مطابق ہماری آنکھوں کے سامنے کشتی بنایئے اور جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کی مجھ سے آپ کوئی سفارش نہ کریں وہ ضرور غرق کیے جائیں گے۔ اور نوح کشتی بنا رہے تھے اور جب بھی ان کی قوم کے (کافر) سردار ان کے پاس سے گزرتے تو ان کا مذاق اڑاتے، نوح نے کہا: اگر تم ہمارا مذاق اراتے ہو تو عنقریب ہم بھی تمہاری ہنسی اڑائیں گے جیسا کہ تم ہماری ہنسی اڑا رہے ہو۔ پس عنقریب تم جان لوگے کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو رسوا کرے گا اور کس پر دائمی عذاب آتا ہے۔ حتیٰ کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور تنور جوش مارنے لگا تو ہم نے کہا: (اے نوح!) ہر قسم سے ایک جوڑا، دو عدد (نر اور مادہ) اس کشتی میں سوار کر لو اور اپنے اہل کو (بھی) ماسوا ان کے جن کے متعلق غرقابی کا قول واقع ہو چکا ہے اور ایمان والوں کو (بھی) سوار کر لو اور جو ان پر ایمان لائے تھے وہ بہت ہی کم تھے۔ اور نوح نے کہا اس کشتی میں سوار ہو جاؤ، اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا اللہ کے سانم سے ہے، بیشک میرا رب ضرور بخشنے والا، بہت رحم فرمانے والا ہے۔ وہ کشتی ان کو پہاڑوں جیسی موجوں کے درمیان سے لے جا رہی تھی اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا جو ان سے الگ تھا، اے میرے بیٹے ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ اور کافروں کے ساتھ نہ رہو۔ اس نے کہا: میں ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لیتا ہوں جو مجھے پانی سے بچا لے گا، نوح نے کہا: آج کے دن اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں ہے مگر وہی بچے گا جس پر اللہ رحم رمائے گا اور ان کے درمیان ایک موج حائل ہو گئی تو وہ ڈوبنے والوں میں سے ہو گیا۔ اور حکم دیا گیا کہ اے زمین اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان رک جا اور پانی خشک کر دیا گیا اور کام پورا کر دیا گیا اور کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی اور کہا گیا کہ ظالم لوگوں کے لیے دوری ہے۔ اور نوح نے اپنے رب کو پکار کر عرض کیا: اے میرے رب! بیشک میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور یقیناً تیرا وعدہ سچا ہے اور تو تمام حاکموں سے بڑا حاکم ہے۔ فرمایا اے نوح! بیشک وہ آپ کے اہل سے نہیں ہے یقیناً اس کے کام نیک نہیں ہیں، آپ مجھ سے وہ چیز نہ مانگیں جس کا آپ کو علم نہیں، میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ نادانوں میں سے نہ ہو جائیں۔ نوح نے کہا: اے میرے رب! میں اس بات سے تیری پناہ میں آتا ہوں کہ میں تجھ سے ایسی چیز کا سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں اور اگر تو نے میری مغفرت نہ کی اور مجھ پر رحم نہ فرمایا تو میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤں گا۔ فرمایا گیا: اے نوح کشتی سے اترو ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ تم پر اور ان جماعتوں پر جو تمہارے ساتھ ہیں اور کچھ جماعتیں ایسی ہیں جن کو ہم (عارضی) فائدہ پہنچائیں گے پھر انھیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا" (ھود: 32۔48)۔ (تفسیر تبیان القرآن)

حضرت نوح (علیہ السلام) کا تذکرہ قرآن مجید میں اجمالاً و تفصیلاً تینتالیس 43 مقامات پر مذکور ہے۔ طوفان نوح کا تذکرہ قرآن کریم نے جغرافیائی لحاظ سے بیان نہیں کیا بلکہ اسے قوم نوح کے ساتھ مقید کرکے بیان کیا اس سے مورخین نے ایک اختلافی نتیجہ اخذ کیا اور کہا: علماء اسلام میں سے ایک جماعت، بعض ماہر فلکیات و طبقات الارض اور تاریخ طبعیات کی رائے ہے کہ یہ طوفان تمام کرہ ارضی پر نہیں آیا تھا بلکہ صرف اس خطہ میں محدود تھا جہاں حضرت نوح (علیہ السلام) کی قوم آباد تھی (یعنی نینوی، عراق، دجلہ و فرات مابین) اور یہ علاقہ مساحت کے اعتبار سے ایک لاکھ چالیس ہزار مربع کلومیٹر ہے کیونکہ اس زمانے میں انسانی آبادی بہت ہی محدود تھی اور وہی خطہ تھا جہاں حضرت نوح اور ان کی قوم آباد تھی۔

ابھی حضرت آدم (علیہ السلام) کی اولاد کا سلسلہ اس سے زیادہ وسیع نہ ہوا تھا جو کہ اس علاقہ میں آباد تھا لہٰذا وہی مستحق عذاب تھے اور انھی پر طوفان کا یہ عذاب بھیجا گیا باقی رہ زمین کو اس سے کوئی علاقہ نہ تھا (بلکہ باقی کرہ ارض انسانی آبادی سے خالی تھا) علماء یہود و نصاریٰ بھی یہی کہتے ہیں اور بعض علمائے اسلام ماہرین فلکیات اور طبقات الارض اور علماء طبعیات کے نزدیک یہ طوفان تمام کرہ ارض پر حاوی تھا مگر صحیح مسلک یہی ہے کہ طوفان خاص تھا عام نہ تھا۔ پوری تحقیق قصص القرآن میں ہے اور یہ بات قرین قیاس ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کی بعثت کافتہ للناس سارے اقوام عالم کے لئے نہیں تھی بلکہ یہ منصب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مخصوص ہے نوح (علیہ السلام) کی بعثت صرف انکی قوم کے لئے ہے یہ معنی تقریباً لفظ "الی قومہ" چالیس کے قریب مقامات میں مذکور ہے۔

دوسری وجہ تاریخی حوالے سے یہ ہے کہ بعثت نوح کے وقت دنیا کی آبادی نہایت محدود اور مختصر تھی کیونکہ انکی بعثت حضرت آدم (علیہ السلام) سے صرف دس قرن بعد ہے البتہ طوفان کے بعد پھر اکناف و اطراف عالم میں آہستہ آہستہ انسانی آبادی عام ہوتی گئی اور ظاہر بھی یہی ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کی بعثت سارے جہاں کے لیے نہیں بلکہ ایک مخصوص قوم کے لئے ہے جن کی تعداد لاکھوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہے تو پھر پورے عالم پر طوفان آنے کا کوئی مطلب نہ ہوگا۔

حضرت نوح (علیہ السلام) نے عقیدہ توحید کے ساتھ قوم کے سامنے یہ واضح فرمایا کہ اگر تم میری بات کو تسلیم نہیں کروگے اور اپنے پروردگار برحق کو واحد لاشریک نہیں مانوگے اور اللہ تعالیٰ کے سوا غیروں کی پرستش کروگے تو میں بیشک ڈرتا ہوں اور میرا خوف برحق ہے کہ تم پر بڑے دن کا عذاب آئے گا بڑے دن سے مراد قیامت کا دن ہے جو بہت ہولناک اور سخت بھی ہے اور طویل و لمبا بھی ہے اور ساری خلقت کے اجتماع کا بھی دن ہے تو ہر اعتبار سے بڑا ہی رہا۔ چنانچہ نوح (علیہ السلام) نے اپنی قوم کو بڑے دن کے عذاب سے خبردار کرکے انہیں توحید و ایمان کی دعوت دے دی اور انھیں بڑے دن کے عذاب سے ڈرایا۔

" قال الملامن قومہ انالنرک فی ضلل مبین "آپ کی دعوت اور پیغام کے جواب میں قوم کے سرداروں نے کہا ہم تو تمہیں کھلی گمراہی میں دیکھ رہے ہیں تم عجیب و غریب بہکی باتیں کر رہے ہو اور اپنے باپ دادوں کے دین کو باطل کہتے ہو اور آباء و اجداد کے دین کو مٹانا چاہتے ہو تاریخ انبیاء (علیہم السلام) شاہد ہے کہ حق کی مخالفت میں ہمیشہ بڑے لوگ ہی پیش پیش رہے ہیں اور ہر پیغمبر کے اولین پیروکار غریب لوگ ہی ہوتے ہیں اور مالداروں سرمایہ داروں کے خدمت میں سوائے لعن طعن عیب جوئی اور کبر و غرور کے کچھ نہیں ہوتا وجہ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ اگر حق قبول کرلیں گے تو ان کی سرداری اور منصب خاک میں مل جائے گا اور ان کی حیثیت عام لوگوں کے ساتھ برابر ہو جائے گی۔

ابوسفیان بن حرب 20 سال تک اسلام اور سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف برسرپیکار رہا پھر تھک ہار کر اسلام قبول کیا ایک روز وہ اور سہیل بن عمرو حضرت امیر المومنین فاروق اعظم (رض) سے ملنے آئے اور ادھر سے حضرت بلال اور حضرت خباب بن ارت بھی تشریف لائے حضرت فاروق اعظم (رض) کے دربان نے اندر جاکر اطلاع کردی حضرت فاروق اعظم (رض) نے دربان سے کہا کہ قریش کے سرداروں سے کہو تم اپنی باری کا انتظار کرو اور حضرت بلال و خباب کو میرے پاس لاؤ چنانچہ ایسا ہی ہوا اس پر حضرت ابوسفیان نے سہیل سے کہا دیکھو ہمیں سرداروں کو نظرانداز کرکے انتظار کا کہا اور غلاموں کو پہلے موقع دیا حضرت سہیل نے کہا بہت اچھا کیا۔ جبکہ آپ اور میں بیس سال تک اسلام کے خلاف لڑتے رہے جب قیامت برپا ہوگی وہاں بھی اللہ تعالیٰ کے حضور یہ لوگ سبقت کریں گے اور ہم پیچھے ہی رہیں گے ہمیں ہماری سرداری نے پیچھے دھکیلا انہیں فقر نے آگے رکھا۔

تو ظاہر ہے کہ جو جواب حضرت نوح کو ملا یہی جواب قوم کے سرداروں نے اپنے اپنے زمانے میں ہر پیغمبر کو دیتے رہے خود سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی ان حالات سے گزرنا پڑا یہاں تک کہ قوم کے بڑوں نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مجنون تک کہا۔

" قال یقوم لیس بی ضللۃ ولکنی رسول من رب العلمین "ارے میری قوم میں گمراہی میں تو ملوث نہیں ہوں گمراہی تو کیا میں اعلی درجے کی ہدایت پر ہوں اور اللہ تعالیٰ رب العالمین کا برحق رسول ہوں تمہیں گمراہیوں سے نکال کر حق و صداقت اور ہدایت پر لانے کے لئے بھیجا گیا ہوں۔

" ابلغکم رسلت ربی وانصح لکم "میں اپنے رب کے برحق روشن پیغامات تم تک پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی اور نجات کی بات کرتا ہوں تاکہ تم شرک و کفر کی اندھیریوں سے نکل کر اسلام کی روشنی میں قدم رکھو اور دنیا و آخرت کا فلاح حاصل کرو اور جہنم کے ابدی عذاب سے بچ جاؤ اور جنت کی راحتوں تک پہنچ جاؤ۔

بہر حال نوح (علیہ السلام) نے قوم سے کہا کہ مجھے گمراہ مت سمجھو میں تمہارا خیر خواہ ہوں میں تمہیں وہی نصیحت کہتا ہوں جو اللہ تعالیٰ کا ہر نبی کہتا آیا ہے اور :
" واعلم من اللہ مالا تعلمون " اور میں اللہ تعالیٰ کا پیغام بصیرت کے ساتھ لے کر آیا ہوں اور وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے میں قطعی یقینی علم کی بات کرتا ہوں وحٰ الٰہی کے اسرار و برکات کے مطابق تمہاری راہنمائی کرنے آیا ہوں میں ایمان اور کفر دونوں کے انجام سے واقف ہوں جبکہ تم کچھ بھی نہیں جانتے لہذا میرے پیچھے چلو میری باتوں پر ایمان لاؤ ہر طرح کی کامیابی حاصل کرو۔

او عجبتم ان جاء کم ذکر من ربکم علی رجل منکم : کیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو کہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نصیحت آئی ہے تم ہی میں سے ایک مرد پر ؟ مطلب یہ ہے کہ اس میں کونسی انوکھی اور باعث تعجب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحی اس کے بندوں میں سے تمہاری قوم میں سے ایک شخص پر آ جائے۔ یہ تو معروف بات ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو خلافت عطا فرمائی توان کی بعض خصوصیات ان کی اولاد میں بھی رکھیں چنانچہ آپ کی اولاد میں سے اللہ تعالیٰ نے ایسے باکمال صاحب استعداد بندے پیدا کیے جنہیں نبوت اور رسالت سے سرفراز فرمایا تو اسی طرح تم ہی میں سے ایک مرد کو یہ شرف بخشا کہ اس کے پاس نصیحت اور آسمانی وحی آئی لہذا کسی نبی یا رسول کا اس کی اپنی قوم میں سے ہونا اور آنا کوئی اچنبھے اور تعجب کی بات نہیں بلکہ یہ تو عین فطرت کا تقاضا ہے۔

دراصل کفار کا نظریہ یہ تھا کہ اگر کوئی رسول ہماری طرف آتا ہے تو اس کو ہماری طرح کا انسان نہیں ہونا چاہیے بلکہ ضرور ہے کہ وہ فرشتہ ہو جو نہ کچھ کھائے نہ پیئے نہ سوئے نہ گلیوں بازاروں میں پھرے نہ اس کی بیوی ہو نہ بچے ہوں۔ یہی کافروں کا خود ساختہ عقیدہ ہوتا تھا۔ سورۃ انعام کے شروع میں گزر چکا ہے کہ کافر لوگ کہتے تھے کہ کوئی فرشتہ کیوں نازل نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ہم کسی فرشتے کو نازل کر دیتے تو ان کا کام ہو چکا ہوتا کیونکہ یہ لوگ فرشتہ کو برداشت کرنے کی سکت اور طاقت ہی نہ رکھتے اور فوراً ہلاک ہو جاتے ہیں اور اگر ہم فرشتے کو انسانی صورت میں بھیج دیتے تو یہ پھر اسی شک و شبہ میں مبتلا رہتے کہ یہ تو ہماری طرح کا انسان ہے پس ایمان نہ لاتے اور ضد اور ہٹ دھرمی پر جمے رہتے۔

مطلب یہ ہے کہ انسانوں میں جب فرشتوں کے دیکھنے اور ان سے استفادہ کرنے کی قوت برداشت نہیں تو ضروری ہوا کہ ان کی ہدایت کے لیے ان میں سے ان کی زبان بولنے والا انسان نبی بن کر تشریف لائے۔

" لینذر کم ولتتقوا ولعلکم ترحمون " تاکہ یہ نبی تم کو اللہ کے عذاب اور کفر و شرک کے انجام سے ڈرائے اور تاکہ تم تقوی اختیار کر کے جہنم کے عذاب سے بچ جاؤ اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور آخرت پر اور آسمانی کتابوں پر اور پیغمبروں پر ایمان لائے گا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کی طرف متوجہ ہو گی جیسا کہ چند آیت پہلے ذکر ہوا تھا " ان رحمت اللہ قریب من المحسنین " کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت نیک لوگوں کے قریب ہوتی ہے۔

پھر دعوت کا نتیجہ جو سامنے آیا وہ یہ ہے کہ " فکذبوہ " پس قوم کے لوگوں نے عموماً اور بڑے سرداروں نے خصوصاً آپ کو اور آپ کے پیغام کو جھٹلا دیا پس جب اللہ تعالیٰ کا عذاب پہنچا تو " فانجینہ والذین معہ فی الفلک " تو ہم نے نوح (علیہ السلام) اور آپ کے ساتھ کشتی میں سوار بیاسی کے قریب لوگوں کو بچا لیا یہ کشتی عجیب کشتی تھی تورات کے بیان کے مطابق 450 فٹ لمبی تھی 75 فٹ چوڑی اور 45 فٹ اونچی تھی۔

" واغرقنا الذین کذبوا باتینا۔ انھم کانوا قوما عمین " اور ہماری آیات کو جھٹلانے والوں کو ہم نے طوفان کے پانی میں غرق کر دیا بیشک وہ لوگ اندھے تھے ظاہری اندھے نہیں تھے باطنی اندھے تھے۔ فرمایا : " فانھا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور " (الحج) ان کی ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ سینوں میں رکھے ہوئے دل اندھے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

جب انسان مادیات کی محبت میں غرق ہو جاتا ہے اور انبیاء کرام (علیہم السلام) کی تعلیمات سے محروم ہو جاتا ہے تو جیسا کہ پرندہ شکاری کے قفس میں بند ہوتا ہے یہ شخص اسی طرح خواہشات کے قفس میں بند ہو کر ابلیس کے تسلط اور گرفت میں پھنس جاتا ہے فطری استعداد اور پیدائشی صلاحیتوں سے یکسر محروم ہو جاتا ہے اس جہنم کا راستہ اختیار کر جاتا ہے قوم نوح کا یہیں شیوہ ہے جس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ (منازل العرفان)

طوفان نوح اور کشتی کی بعض تفاصیل :

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کی کشتی میں کتنے آدمی تھے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ یہ اسی نفر تھے۔ ان کے ساتھ ان کی عورتیں بھی تھیں۔ اور کعب احبار سے روایت ہے کہ یہ بہتر (72) نفس تھے۔ حضرت نوح کی بیوی جوان کی کل اولاد حام، سام، یافث اور یام کی ماں تھیں، اور یام کو اہل کتاب کنعان کہتے ہیں اور یہی غرق ہوگیا تھا حضرت نوح کی بیوی بھی غرق ہونے والوں کے ساتھ غرق ہو گئی تھی کیونکہ وہ کافرہ تھی۔

مفسرین کی ایک جماعت نے بیان کیا ہے کہ یہ طوفان زمین کے پہاڑوں سے پندرہ ذراع (ساڑھے بائیس فٹ) تک بلند ہوگیا تھا اور یہ طوفان تمام روئے زمین پر کوئی جگہ ایسی نہیں بچی تھی جہاں پر یہ طوفان نہ آیا ہو۔

قتادہ وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) اور ان کے متبعین دس رجب کو کشتی میں سوار ہوئے تھے وہ ایک سو پچاس دن تک سفر کرتے رہے اور دس محرم کو وہ کشتی سے باہر آئے اور اس دن انھوں نے روزہ رکھا۔ امام احمد نے اپنی سند کے ساتھ روایت یا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہود کے پاس سے گزر ہوا انھوں نے دس محرم کو روزہ رکھا ہوا تھا۔ آپ نے پوچھا یہ کیسا روزہ ہے؟ انھوں نے کہا اس دن اللہ نے حضرت موسیٰ اور بنو اسرائیل کو غرق سے نجات دی تھی اور اسی دن جودی پر کشتی ٹھہری تھی تو حضرت نوح اور حضرت موسیٰ (علیہما السلام) نے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے روزہ رکھا۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا حضرت موسیٰ اور اس روزے کے تمہاری بہ نسبت ہم زیادہ حقدار ہیں۔

امام ابن اسحاق نے کہا کہ اہل کتاب نے ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح سے فرایا تم لوگ کشتی سے اترو اور ان تمام جانوروں کو اتارو جو تمہارے ساتھ ہیں۔

بعض جاہل فارسیوں نے اور اہل ہند نے وقوع طوفان کا انکار کیا اور بعض نے اقرار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ طوفان ارض بابل (عراق) میں آیا تھا یہ بے دین مجوسیوں کا قول ہے ورنہ تمام اہل ادیان کا اس پر اتفاق ہے اور تمام رسولوں سے منقول ہے اور تواتر سے ثابت ہے کہ طوفان آیا تھا اور یہ تمام روئے زمین پر چھا گیا تھا۔

حضرت نوح (علیہ السلام) کی عمر:

اہل کتاب کا قول یہ ہے کہ جس وقت حضرت نوح (علیہ السلام) کشتی میں سوار ہوئے تھے اس وقت ان کی عمر چھ سو سال تھی اور حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ وہ اس کے بعد تین سو پچاس سال زندہ رہے لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ قرآن مجید میں یہ تصریح ہے کہ وہ بعثت کے بعد اپنی قوم میں نو سو پچاس سال تک رہے۔ پھر اس کے بعد ان ظالموں پر طوفان آیا۔ پھر اللہ جانتا ہے کہ وہ طوفان آنے کے بعد کتنا عرصہ زندہ رہے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ چوراسی سال کی عمر میں ان کی بعثت ہوئی اور طوفان کے بعد وہ ساڑھے تین سو سال زندہ رہے اس حساب سے ان کی عمر ایک ہزار سات سو اسی سال ہے۔

امام ابن جریر، امام ازرقی اور دیگر مورخین نے کہا ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کی قبر مسجد حرام میں ہے اور یہ قوی قول ہے۔ (البدایہ والنہایہ، ج 1، ص 100۔ 120، ملخصاً، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

بعض محققین نے لکھا ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کی قوم اس علاقہ میں رہتی تھی جو آج دنیا میں عراق کے نام سے مشہور ہے اور اس کی جائے وقوع موصل کے نواح میں ہے اور جو روایات کردستان اور آرمینیہ میں زمانہ قدیم سے تواتر کے ساتھ منقول ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے بعد حضرت نوح (علیہ السلام) کی کشتی اسی علاقہ میں کسی مقام پر ٹھہری تھی۔

قصہ نوح نازل کرنے کے فوائد:

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ وہ آسمان سے بارش نازل فرما کر مردہ زمین کو زندہ فرماتا ہے اور اس آسمانی بارش کی وجہ سے زمین میں روئیدگی ہوتی ہے جو انسانوں کی مادی حیات کا سبب ہے۔ اور اب اس آیت میں حضرت نوح (علیہ السلام) کی بعثت کا ذکر ہے جو سب سے پہلے رسول ہیں جن کو انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا اور رسولوں کا بھیجنا انسانوں کی روحانی حیات کا سبب ہے اور جس طرح مادی حیات انسانوں کے لیے نعمت ہے اسی طرح روحانی حیات بھی انسانوں کے لیے نعمت ہے۔ حضرت نوح (علیہ السلام) کا قصہ نازل کرکے حسب ذیل امور پر تنبیہ کی گئی ہے۔

1۔اس قصہ سے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دینا ہے کہ مشرکین مکہ جو آپ کے کھلے ہوئے معجزات اور روشن دلائل کو دیکھنے کے باوجود ایمان نہیں لاتے تو آپ اس سے ملول خاطر نہ ہوں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔اس کائنات میں جب سب سے پہلے رسول آئے تو ان کے دلائل اور معجزات دیکھنے کے باوجود ان کی قوم ان پر ایمان نہیں لائی تھی اور ہمیشہ سے رسولوں کے ساتھ یہی ہوتا رہا ہے۔

2۔اس قصہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ منکرین کا انجام بالآخر عذاب الٰہی میں مبتلا ہونا ہے اور یہ دنیا میں ان کا حصہ ہے اور آخرت میں ان کو دائمی عذاب ہوگا اور مومنین کو اللہ تعالیٰ دنیا میں بالآخر سرفرازی اور آخرت میں سرخروئی عطا فرماتا ہے۔

3۔اس قصہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ دنیا میں کافروں کو لمبے عرصہ تک ڈھیل دیتا ہے، لیکن بالآخر ان کو اچانک اپنی گرفت میں لے لیتا ہے تو کافر اس ڈھیل سے مغرور اور مومن اس سے ملول نہ ہوں۔

4۔یہ قصہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کی صداقت پر دلالت کرتا ہے۔کیونکہ آپ امی تھے آپ نے کسی استاذ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا نہ کسی کتاب کا مطالعہ کیا تھا اور جب آپ نے یہ قصہ ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا تو واضح ہو گیا کہ آپ اس قصہ پر صرف اللہ تعالیٰ کی وحی سے مطلع ہوئے تھے اور وحی صرف نبی پر ہوتی ہے اس سے ثابت ہوا کہ آپ کی نبوت بر حق تھی۔

اللہ تعالیٰ کے مستحق عابدت ہونے پر دلیل :

اس آیت میں تین چیزیں مذکور ہیں۔حضرت نوح (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہاری عبادت کا کوئی مستحق نہیں ہے، مجھے تم پر عظیم دن کے عذاب کا خوف ہے۔

حضرت نوح (علیہ السلام) نے پہلے اپنی قوم کو عبادت کا حکم دیا پھر اس کی دلیل ذکر فرمائی کہ وہی تمہاری عبادت کا مستحق ہے۔اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے کیونکہ ان کو دنیا میں جو نعمتیں حاصل ہوئیں وہ سب اللہ نے عطا فرمائیں، ہر نعمت کو عطا فرمانے والا اور ہر مصیبت کو دور کرنے والا وہی ہے، اس کے سوا کوئی نہیں ہے تو پھر وہی عبادت کا مستحق ہے سو تم اسی کی عبادت کرو۔انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے محسن کی تعظیم اور تکریم کرتا ہے، اس کی تعریف کرتا ہے اور اس کا شکر ادا کرتا ہے۔سب سے بڑا اور حقیقی محسن اللہ تعالیٰ ہے تو پھر وہی عبادت کا مستحق ہے اور اسی کی عبادت کرنے کا حضرت نوح (علیہ السلام) نے اپنی قوم کو حکم دیا۔

اس کے بعد فرمایا : مجھے تم پر عظیم دن کے عذاب کا خوف ہے۔اس خوف سے مراد یقین ہے یا ظن۔اگر اس سے مراد یقین ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کا یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی ان پر عذاب نازل فرمائے گا اور آخرت میں بھی ان کو عذاب ہوگا۔اور اگر خوف بمعنی ظن ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کو غالب گمان تو یہ تھا کہ یہ منکرین اپنے انکار اور کفر پر ڈٹے رہیں گے اور لامحالہ ان پر عذاب آئے گا لیکن ایک مرجوح امکان یہ بھی تھا کہ یہ سب لوگ ایمان لے آئیں اور ان پر جو عذاب متوقع ہے وہ ٹل جائے۔اس لیے فرمایا مجھے تم پر عذاب کا خوف ہے۔

اس عذاب سے مراد عذاب طوفان بھی ہو سکتا ہے اور عذاب قیامت بھی اور چونکہ نوح (علیہ السلام) نے عظیم دن کا عذاب فرمایا ہے تو اس سے بہ ظاہر قیامت کے دن کا عذاب مراد ہے۔کیونکہ عظیم دن سے قیامت کا دن ہی متبادر ہوتا ہے۔(تفسیر تبیان القرآن۔علامہ غلام رسول سعیدی)

حضرت نوح (علیہ السلام) اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے درمیان مشابہت : قرآن نے حضرت نوح (علیہ السلام) اور ان کی قوم کے درمیان جس معاملہ اور مکالمہ کا ذکر کیا ہے، بعینہٖ ایسا ہی معاملہ مکہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کی قوم کے درمیان پیش آ رہا تھا، جو پیغام حضرت نوح (علیہ السلام) کا تھا وہی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا تھا، ان کے علاوہ دیگر انبیاء کے جو قصے بیان ہوئے ہیں ان میں بھی یہی دکھایا گیا ہے کہ ہر نبی کی قوم کا رویہ اہل مکہ کے رویہ سے اور ہر نبی کی تقریر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تقریر سے ہو بہو مشابہ ہے، اس سے قرآن یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ انسانی گمراہی ہر زمانہ میں بنیادی طور پر ایک ہی طرح کی رہی ہے اور خدا کے بھیجے ہوئے معلموں کی دعوت بھی ہر عہد اور ہر سرزمین میں یکساں رہی ہے، اور لوگوں کا انجام بھی ٹھیک ایک جیسا ہوا ہے۔

(تفسیر جلالین۔امام جلال الدین سیوطی)

آیت مبارکہ:

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۝۶۰

لغۃالقرآن: قَالَ : فرمایا] [الْمَلَاُ : سرداروں نے] [مِّنْ : سے] [قَوْمِهٖٓ : اس کی قوم] [اِنَّا : بیشک ہم] [لَنَرٰىكَ : یقینا دیکھ رہے ہیں تجھے] [فِي : میں] [ضَلٰلٍ : گمراہی] [مُّبِيْنٍ : واضح]

ترجمہ: ان کی قوم کے سرداروں اور رئیسوں نے کہا: (اے نوح!) بیشک ہم تمہیں کھلی گمراہی میں (مبتلا) دیکھتے ہیں

تشریح: قوم کے رؤوساء اور دوسروں کو ملأ کہتے ہیں کیونکہ ان کا زرق برق لباس اور ظاہری آن بان اور شان و شوکت آنکھوں کو پر کر دیتی ہے ھم الاشراف فانھم یملاؤن العیون رواء (بیضاوی) جب حضرت نوح (علیہ السلام) نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی تو بجائے اس کے کہ آپ کی قوم کا سربرآور دہ طبقہ آپ کی دعوت میں سنجیدگی سے غور و فکر کرکے اسے قبول کرتا۔ الٹا وہ بگڑ گیا۔ گویا نوح نے یہ کہا کر ان کی سیادت کو چیلنج کر دیا ہے اور ان کے احساس نخوت کو ٹھیس لگا دی ہے۔ انھوں نے جھٹ حضرت نوح (علیہ السلام) پر الزام لگا دیا کہ نوح (علیہ السلام) بھٹک گیا ہے اور سیدھی راہ چھوڑ کر غلط راستہ پر چل نکلا ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

معلوم ہوا زمانہ نوح (علیہ السلام) سے لے کر دین کے مخالف اکثر بڑے لوگ ہی رہے ہیں یعنی سرمایہ دار طبقہ جبکہ دین کا ساتھ اکثر غرباء نے دیا ہے۔ آج بھی دینداری غرباء ہی میں زیادہ ہے۔ وہی زیادہ طور پر مسجدوں میں حاضر ہوتے اور نماز باجماعت ادا کرتے ہیں۔ علامہ اقبال جواب شکوہ میں فرماتے ہیں کہ قدرت خداوندی کہتی ہے ؎

آ کے ہوتے ہیں جو مسجد میں صف آرا تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب
امراء نشہ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملت بیضاء غرباء کے دم سے

(تفسیر برہان القرآن)

جب کوئی شخص گمراہی کی حدیں پار کرلیتا ہے تو وہ ان لوگوں کو گمراہ سمجھتا ہے جو اسے راہ ہدایت کی طرف بلاتے ہیں اور جب کسی کی فطرت مسخ ہو جاتی ہے تو وہ بھی خود سری کے اس مقام تک جا پہنچتا ہے۔ یوں اقدار بدل جاتی ہے اور حق و باطل کے پرکھنے کا معیار بدل جاتا ہے۔ انسان نفسانی خواہشات کے تابع ہو جاتا ہے۔ الا یہ کہ انسان اللہ کی اقدار اور پیمانوں کو نہیں اپنالیتا اس لیے کہ یہ اقدار اور پیمانے غیر متبدل ہوتے ہیں اور ان کے اندر کبھی انحراف نہیں ہوتا۔

جو لوگ آج کے دور میں ہدایات اللہ سے لیتے ہیں ان کو دور جدید کی جاہلیت گمراہ کہتی ہے اور جو محض جاہلیت جدید سے ہدایت اخذ کرے، مغربی تہذیب کے گندے نالے میں گر جائے اور اس کریہہ ماحول میں اترائے اسے وہ ہدایت یافتہ اور ترقی یافتہ کہتے ہیں۔

آج جو عورت اپنے گوشت کو ننگا نہیں کرتی، اپنے جسم کو عریاں نہیں کرتی، اور جو اس پست حالت کو قبول نہیں کرتی اس کے بارے میں جدید جاہلیت کیا کہتی ہے؟ یہ دنیا جدید دور کی اس پاک وصاف اور صالح عورت کو رجعت پسند کہتی ہے اسے پسماندگی اور دیہاتی پن کا طعنہ دیا جاتا ہے اور جاہلیت جدید نے اپنے پورے ذرائع ابلاغ اور میڈیا کو اس مقصد کے لیے مصروف کرر کھا ہے کہ وہ ہماری عورت کی اس پاکیزگی نظافت اور سربلندی کو ختم کرکے اسے جنسیت کے اس گندے تالاب میں گرادے جو نہایت ہی کریہہ المنظر ہے۔

جن لوگوں کو ترجیحات کھیل کود سے بلند ہیں، جو فلموں، سینماؤں اور ٹیلی ویژن کے جنون سے سربلند ہیں اور جو لوگ رقص و سرود اور جام و سبو کی فحاشیوں اور عیاشیوں سے اپنے آپ کو دور رکھنا چاہتے ہیں، یہ جاہلیت ان کے بارے میں کیا کہتی ہے؟ یہ کہتی ہے کہ یہ لوگ جامد اور کوڑ مغز ہیں، اپنے آپ کو گم، غیر مہذب

اور غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ جاہلیت ہر وقت اسی کام میں لگی ہوئی ہے کہ وہ تمام لوگوں کو اس گندگی میں ڈال دے اور لوگ سب کے سب عیاشی اور فحاشی میں زندگی بسر کریں۔ غرض جاہلیت ہر دور میں جاہلیت ہوتی ہے وہ اشکال و ظروف تو بدلتی ہے مگر اس کی ماہیت وہی رہتی ہے۔

حضرت نوح (علیہ السلام) ان کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ گمراہ نہیں ہیں۔ وہ ان کے سامنے اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کی دعوت کیا ہے اور اس دعوت کا سرچشمہ کیا ہے؟ یہ کہ انھوں نے اپنی سوچ اور فکر سے اس دعوت کو نہیں شروع کیا نہ ان کی شروع کیا نہ ان کی یہ ذاتی خواہش ہے۔ وہ تو رب العالمین کے رسول ہیں اور حامل رسالت ہیں۔ وہ نہایت ہی امانت و دیانت سے اللہ کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق نصیحت کرتے ہیں اور وہ جو تعلیمات دیتے ہیں وہ بھی رب العالمین کی طرف سے ہیں۔ یہ تعلیمات ان کے قلب پر اترتی ہیں اور یہ کہ ان کا رب العالمین کے ساتھ مسلسل رابطہ ہے جبکہ تم لوگ اللہ کے ساتھ رابطہ نہیں رکھتے۔

(تفسیر فی ظلال القرآن)

اہم اور مشکل الفاظ کے معانی:

الملاء: مال دار اور معاشرہ میں با اثر لوگ جن کی لوگوں کے دلوں پر ہیبت چھائی رہتی تھی مجلس میں ان ہی کی طرف نگاہیں اٹھتی تھیں اور وہ محفل میں صدر نشین ہوتے تھے اور وہ نوح (علیہ السلام) سے مقابلہ اور مناظرہ کرتے تھے۔

فی ضلال مبین: وہ نوح (علیہ السلام) سے کہتے تھے کہ آپ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں۔ یعنی اللہ کی توحید، اپنی نبوت، احکام شرعیہ اور قیامت اور آخرت کے متعلق آپ جو کچھ کہتے ہیں، وہ خطا پر مبنی ہے اور غلط ہے۔

لیس بی ضلالۃ: کفار نے حضرت نوح کی طرف کھلی گمراہی کے جس عیب کی نسبت کی تھی، اس کی حضرت نوح نے اپنی ذات سے نفی کی اور اپنی سب سے مکرم اور مشرف صفت کا بیان کیا اور وہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی جانب سے مخلوق کی طرف رسول اور پیغام رساں ہیں اور ان کو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور ان کی خیر خواہی کرتے ہیں۔ تبلیغ رسالات یعنی پیغام پہنچانے کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جن چیزوں کا مکلّف کیا ہے، یعنی اوامر اور نواہی، ان کا بیان کرتے ہیں، ان کے لیے کیا کام کرنا ضروری ہیں اور کن کاموں کا نہ کرنا ضروری ہے اور یہ کہ کن کاموں پر دنیا میں ان کی مذمت ہوگی اور آخرت میں عذاب ہوگا اور کن کاموں پر ان کی دنیا میں تحسین ہوگی اور آخرت میں ثواب ہوگا۔ یہ وہ پیغامات ہیں جن کو وہ اپنے رب کی طرف سے پہنچاتے تھے، اور نصیحت اور خیر خواہی کا معنی یہ ہے کہ ان کو ایمان اور اعمال صالحہ کی تلقین اور ترغیب دیتے تھے اور کفر اور معصیت سے روکتے تھے اور ان کو عذاب الٰہی سے ڈراتے تھے

پھر فرمایا میں اللہ کی طرف سے ان باتوں کو جانتا ہوں جن کو تم نہیں جانتے۔ یعنی میں جانتا ہوں کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کی تو وہ تم کو طوفان کے عذاب میں مبتلا کرے گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے اور اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں اللہ کی توحید اور صفات کو جانتا ہوں جس کو تم نہیں جانتے اور اس کا مقصد ان علوم کے حصول کی ترغیب دینا ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

قَالَ يٰقَوۡمِ لَيۡسَ بِىۡ ضَلٰلَةٌ وَّلٰـكِنِّىۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝۶۱

لغۃ القرآن: قَالَ: فرمایا] [يٰقَوۡمِ: اے میری قوم] [لَيۡسَ: "کہ "نہ ہو] [بِىۡ: مجھ کو] [ضَلٰلَةٌ: کوئی گمراہی] [وَّلٰـكِنِّىۡ: اور لیکن میں] [رَسُوۡلٌ: ایک رسول] [مِّنۡ: سے] [رَّبِّ: رب ہے] [الۡعٰلَمِيۡنَ: تمام جہانوں کا]

ترجمہ: انھوں نے کہا: اے میری قوم! مجھ میں کوئی گمراہی نہیں لیکن (یہ حقیقت ہے کہ) میں تمام جہانوں کے رب کی طرف سے رسول (مبعوث ہوا) ہوں

تشریح: یہ بہتان عظیم سن کر بھی پیغمبر کے جذبہ خیر خواہی میں فرق نہ آیا اور بڑی فراخ دلی سے ان کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔ فرمایا اے بھلے مانسو! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اپنے دل سے گھڑ کر نہیں کہہ رہا بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے وہی پیغام جوں کا توں تمہیں پہنچا رہا ہوں۔ نیز اس دعوت کی تہ میں میری کوئی ذاتی غرض یا منفعت پنہاں نہیں۔ محض تمہاری خیر خواہی مطلوب ہے۔ تمہارا علم ادھورا اور ناتمام ہے کیونکہ اس کا ماخذ اندھی تقلید اور نفس پرستی ہے اور میرا علم کامل اور یقینی ہے۔ کیونکہ میرے علم کا سرچشمہ ذات باری ہے۔ اب تم خود فیصلہ کرلو کہ راہ راست سے کون بھٹکا ہوا ہے۔ اپنے مقام رفیع کو کتنی وضاحت سے پیش فرمایا اور اپنی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا انھیں یقین دلانے کی کتنی دلسوز کوشش کی۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

نوح (علیہ السلام) کی تقریر اوّل:

آیت ۶۱: قَالَ یٰقَوۡمِ لَیۡسَ بِیۡ ضَلٰلَۃٌ (انہوں نے فرمایا اے میری قوم مجھ میں تو ذرا غلطی نہیں) یہاں ضلال نہیں کہا جیسا کہ انھوں نے کہا کیونکہ ضلالت ضلال میں سے خاص ہے۔ پس یہ لفظ اپنی ذات سے ضلال کی نفی کے لیے زیادہ بلیغ ہے گویا اس طرح کہا لیس بی شیء من الضلال مجھ میں ضلال نام کی کوئی چیز نہیں۔ پھر نفی ضلالۃ کی تاکید کے لیے استدراک کیا اور فرمایا وَّلٰکِنِّیۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (لیکن میں پروردگار عالم کا رسول ہوں) کیونکہ ان کا اللہ کی طرف سے رسول ہونا یہ ان کی رسالت کا مقصود ہے اور اس معنی میں ہے کہ وہ سیدھے راستے پر ہے پس وہ ہدایت کے اعلیٰ درجہ پر تھے۔ (تفسیر مدارک التنزیل۔ عبد اللہ بن احمد بن محمد بن محمود نسفی)

نوح (علیہ السلام) کی تقریر اوّل:

آیت ۶۱: قَالَ یٰقَوۡمِ لَیۡسَ بِیۡ ضَلٰلَۃٌ (انہوں نے فرمایا اے میری قوم مجھ میں تو ذرا غلطی نہیں) یہاں ضلال نہیں کہا جیسا کہ انھوں نے کہا کیونکہ ضلالت ضلال میں سے خاص ہے۔ پس یہ لفظ اپنی ذات سے ضلال کی نفی کے لیے زیادہ بلیغ ہے گویا اس طرح کہا لیس بی شیء من الضلال مجھ میں ضلال نام کی کوئی چیز نہیں۔ پھر نفی ضلالۃ کی تاکید کے لیے استدراک کیا اور فرمایا وَّلٰکِنِّیۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (لیکن میں پروردگار عالم کا رسول ہوں) کیونکہ ان کا اللہ کی طرف سے رسول ہونا یہ ان کی رسالت کا مقصود ہے اور اس معنی میں ہے کہ وہ سیدھے راستے پر ہے پس وہ ہدایت کے اعلیٰ درجہ پر تھے۔ (تفسیر مدنی)

آیت مبارکہ:

اُبَلِّغُکُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّیۡ وَاَنۡصَحُ لَکُمۡ وَاَعۡلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝۶۲

لغۃ القرآن: اُبَلِّغُکُمْ : میں پہنچاتا ہوں تمہیں] [رِسٰلٰتِ : پیغامات] [رَبِّيْ : میرا رب] [وَاَنْصَحُ : اور میں خیر خواہی کرتا ہوں] [لَكُمْ : تمہارے لیے] [وَ : اور] [اَعْلَمُ : میں جانتا ہوں] [مِنَ اللّٰهِ : اللہ سے] [مَا لَا : جو نہیں] [تَعْلَمُوْنَ : تم سب جانتے ہو]

ترجمہ: میں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا رہا ہوں اور تمہیں نصیحت کر رہا ہوں اور اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے

تشریح:

ربط:۔ اوپر کی آیت میں حضرت نوح علیہ الصلوۃ والسلام کے رسول برحق ہونے کا بیان تھا، اب یہاں اس آیت میں فرائض رسالت کا ذکر ہے۔

مطلب:۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا کہ میں ایک رسول برحق ہوں اور تمہیں اللہ تعالیٰ کے احکامات پہنچانے والا ہوں۔

نکات :۔ اُبَلِّغُكُمۡ۔ میں تم کو پہنچاتا ہوں، حضرت ابو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قرات میں یہ مخفف یعنی ابلغُکم ہے جو ابلاغ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پیغام پہنچانے کے ہیں۔ حضرت حفص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قرات میں یہ مشدد ہے جو تبلیغ سے ماخوذ ہے جس کے معنی احکام پہنچانے کے ہیں۔ دونوں کا مطلب ایک ہے صرف باب کا فرق ہے۔ رِسٰلٰتِ رَبِّیۡ۔ اپنے رب کے پیغامات، یہ رسالۃ کی جمع ہے جس کے معنی خدائی پیغام کے ہیں۔ بعض قاریوں کی قرات میں یہ بصیغہ مفرد رسلۃ ربی ہے۔ وَاَنۡصَحُ ۔اور میں نصیحت کرتا ہوں، نصیحت کے معنی خیر خواہی کے ہیں۔ یعنی میں تمہاری خیر خواہی کی باتیں تمہیں سناتا ہوں۔ لَكُمۡ۔ تم کو اس میں فائدے کے معنوں میں ہے پیغمبر کی نصیحت میں صرف مخلوق کی خیر خواہی مطلوب ہوتی ہے۔ وَاَعۡلَمُ۔ اور خوب جانتا ہوں۔ مِنَ اللّٰهِ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یعنی پیغمبر کا یہ علم اس کا اپنا ذاتی نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ اللہ ہی کی طرف سے عطا کیا ہوا ہوتا ہے۔ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۶۲۰۰۰۔ وہ باتیں جو تم نہیں جانتے، اس موصول میں عذاب طوفانی یا قیامت کے دن کے عذاب کی طرف اشارہ ہے ہو سکتا ہے کہ اس میں نصیحت کے آخری نتیجے کی طرف اشارہ ہو یعنی میں رب العالمین کی طرف سے ایک رسول برحق ہوں اور حقائق اور اسرار کے انجام سے واقف ہوں جن کو تم نہیں جانتے۔

مقصد :۔ اس آیت کا مقصد حضرت نوح علیہ الصلوۃ والسلام کے رسول برحق ہونے کا ثبوت ہے اور رسول کے اپنی امتوں ے زیادہ عالم اور واقف ہونے کا اظہار ہے۔

(تفسیر کاشف البیان۔ قاری محمد عبد الطیف ہوتی)

رسول کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ مبلغ، فصیح، ناصح اور اللہ کے دین کا ایسا عالم ہوتا ہے کہ ان صفات میں اللہ کی مخلوق میں سے کوئی اور پیغمبر کا مقابلہ نہیں کر سکتا، جیسا کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عرفہ کے دن صحابہ کرام (رض) سے فرمایا، جبکہ وہ بہت کثیر تعداد میں جمع تھے۔ سیدنا جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "(اے لوگو!) تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا تو تم کیا کہو گے ؟" سب نے جواب دیا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے (اللہ کا پیغام) پہنچا دیا، اپنے فرض کو ادا فرما دیا اور امت کی خیر خواہی کی، تو آپ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "اے اللہ! تو گواہ رہ، اے اللہ! تو گواہ ہو جا۔" [مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : ۱۲۱۸]

(تفسیر دعوۃ القرآن۔ ابو نعمان سیف اللہ خالد)

انبیاء کرام (علیہم السلام) بندوں کو عقائد، اعمال، شریعت و طریقت کے مسائل و احکام وقصص و امثال پہنچاتے ہیں اور ان کو سمجھاتے ہیں۔ انبیاء کو خصوصاً وہ علوم دیئے جاتے ہیں جو اوروں کے پاس نہیں ہوتے۔ (تفسیر کنز العرفان۔ بشیر احمد مجددی)

اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر کی شان پوسٹ مین کی طرح صرف احکام پہنچا دینا نہیں بلکہ وہ احکام پہنچاتے بھی ہیں انھیں لوگوں میں جاری بھی کرتے ہیں اور قبول بھی کراتے ہیں۔ یہ ان کی نصیحت ہے اور رب کی طرف سے خصوصی علم بھی لے کر آتے ہیں۔ جو دوسروں کو نہیں ملتے۔ رسالات کے جمع فرمانے سے معلوم ہوا کہ وہ حضرات عقائد، اعمال، تصوف یعنی شریعت و طریقت کے تمام مسائل پہنچاتے ہیں۔ ((تفسیر نور العرفان۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی)

دعوت الی القرآن کی تائید:

اُبَلِّغُكُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّیۡ وَاَنۡصَحُ لَكُمۡ وَاَعۡلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ:

یہاں سے ہم دعوت الی القرآن کی تائید حاصل کرتے ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کو کہا جا رہا ہے کہ اگر تم نے قرآن کو نہ مانا تو قوم نوح کی طرح ہو جاؤ گے، نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تمہیں اپنے رب کا پیغام پہنچانے آیا ہوں اور تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ کفر و شرک سے بچو میں تمہارا خیر خواہ ہوں کیونکہ میں اللہ کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، تذکیر بایام اللہ کے سلسلے میں جتنی قوموں کا ذکر آ رہا ہے، اس میں پہلے پیغمبر کی تبلیغ کا ذکر ہوتا ہے، جس میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا تذکرہ ہوتا ہے پھر ان کے پیغمبر کے ساتھ بحث و مباحثے کا ذکر اور پھر اس کا نتیجہ ہوتا ہے۔

مخلص اور سچے خیر خواہ:

ہر قوم کے پیغمبر نے اپنی قوم کو کہا ہے کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، بے طمع دوست صرف تین قسم کے ہیں (۱) اللہ تعالی (۲) انبیائے اکرام علیہم السلام (۳) اولیائے کرام، باقی سب غرض کے یار ہوتے ہیں۔ ماں، باپ، بیٹا، زوج اور دوست وغیرہ سب۔ (تفسیر لاہوری۔ مولانا احمد علی لاہوری)

آیت مبارکہ:

اَوَ عَجِبۡتُمۡ اَنۡ جَآءَكُمۡ ذِكۡرٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَلٰى رَجُلٍ مِّنۡكُمۡ لِيُنۡذِرَكُمۡ وَلِتَتَّقُوۡا وَلَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ۝۶۳

لغۃ القرآن: اَوَعَجِبْتُمْ : اور کیا تم نے تعجب کیا ہے] [اَنْ :کہ] [جَآءَكُمْ : آچکی ہے تمہارے پاس] [ذِكْرٌ : ایک نصیحت] [مِنْ رَّبِّكُمْ : تمہارے رب کی طرف سے] [عَلٰي : پر] [رَجُلٍ : آدمی] [مِّنْكُمْ : تم میں سے] [لِيُنْذِرَكُمْ : تاکہ وہ ڈرائے تمہیں] [وَلِتَتَّقُوْا : اور تاکہ تم سب بچ جاؤ] [وَلَعَلَّكُمْ : اور تاکہ] [تُرْحَمُوْنَ : سب پر رحم کیا جائے]

ترجمہ: کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہے کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے تم ہی میں سے ایک مرد (کی زبان) پر نصیحت آئی تاکہ وہ تمہیں (عذاب الٰہی سے) ڈرائے اور تم پرہیزگار بن جاؤ اور یہ اس لیے ہے کہ تم پر رحم کیا جائے

تشریح: یہاں ان کے ایک اور شبہ کا ازالہ فرمایا۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ کوئی انسان بھی نبوت و رسالت کے مرتبہ پر فائز ہو سکتا ہے۔ اور ذات ربانی سے براہ راست فیض حاصل کرکے لوگوں تک پہنچا سکتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کام کوئی فرشتہ ہی کر سکتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ تمہاری یہ حیرت وپریشانی بے محل ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر اپنے کسی کامل اور برگزیدہ بندے کو نعمت نبوت سے سرفراز کرنا چاہے تو اس میں کوئی استحالہ نہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری)

حضرت نوح (علیہ السلام) کی رسالت پر قوم نوح کے استبعاد اور تعجب کی وجوہات:

حضرت نوح (علیہ السلام) کی قوم اپنی جنس میں سے ایک انسان کے رسول بنانے کو مستبعد خیال کرتی تھی اور اس پر تعجب کرتی تھی۔ ان کے اس استبعاد اور تعجب کی حسب ذیل وجوہات ہو سکتی ہیں:

1۔ رسول بھیجنے کا مقصد چند احکام کا مکلّف کرنا ہے اور اس تکلیف سے اللہ کو کوئی فائدہ نہیں کیونکہ وہ نفع اور ضرر سے پاک ہے اور نہ بندہ کو اس سے کوئی فائدہ ہے کیونکہ ان احکام کی وجہ سے وہ اس دنیا میں مشقت میں مبتلا ہوتا ہے اور ان احکام پر عمل کرنے کی وجہ سے آخرت میں ثواب کا حصول متوقع ہے۔ تو اللہ تعالیٰ ان احکام کا مکلّف کیے بغیر بھی اس ثواب کو پہنچانے پر قادر ہے تو پھر ان احکام کا مکلّف کرنا عبث ہوگا اور اللہ تعالیٰ عبث کام سے پاک ہے لہٰذا کسی رسول کی بعثت باطل ہو گئی۔ کیونکہ رسول صرف احکام پہنچانے کے لیے مبعوث کیا جاتا ہے۔

2۔ اگر احکام کے مکلّف کیے جانے کو مان بھی لیا جائے تو تب بھی رسول کا بھیجنا غیر ضروری ہے کیونکہ رسول اچھے کاموں کا حکم دے گا اور برے کاموں سے روکے گا اور اچھائی اور برائی کے ادراک کے لیے عقل کافی ہے سو جو کام عقل کے نزدیک اچھا ہوگا اس کو ہم کریں گے اور جو برا ہوگا اس کو ترک کردیں گے پھر کسی رسول کو بھیجنے کی کیا ضرورت ہے!

3۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ رسول کا بھیجنا ضروری ہے تو پھر کسی فرشتے کو بھیجنا چاہیے، کیونکہ ان کی ہیبت زیادہ سخت ہو گی اور ان کی پاکیزگی زیادہ اکمل ہو گی، ان کا کھانے پینے سے مستغنی ہونا معلوم ہے اور ان کا گناہوں سے معصوم ہونا اور جھوٹ سے دور ہونا متحقق ہے۔

4۔اور اگر یہ مان لیا جائے کہ کسی بشر کو رسول بنایا جائے تو اس بشر کو رسول بنانا چاہیے جو معاشرہ میں اپنی دولت اور حکومت کی وجہ سے معزز ہو جس کی لوگوں کے دلوں میں عزت ہو اور اس کا رعب اور دبدبہ ہو، جبکہ حضرت نوح (علیہ السلام) کے پاس مال تھا نہ حکومت۔

ان وجوہات کی بناء پر حضرت نوح (علیہ السلام) کے دعوی نبوت اور رسالت پر ان کی قوم کو تعجب ہوتا تھا اور وہ ان کے رسول ہونے کو مستبعد گردانتے تھے۔ اور جن باتوں کو حضرت نوح وحی کہتے تھے، وہ ان کو حضرت نوح کے دماغ کی خرابی (العیاذ باللہ) خیال کرتے تھے اس لیے کہتے تھے کہ تم کھلی گمراہی میں ہو۔

قوم نوح کے استبعاد اور تعجب کا ازالہ :

حضرت نوح (علیہ السلام) نے ان کے اس تعجب اور انکار کو زائل کیا بایں طور کہ اللہ کو کسی کی نیکی سے فائدہ اور کسی کی برائی سے کوئی نقصان نہیں لیکن ان اللہ نے ان لوگوں کو سخت احکام کا مکلّف کیا تاکہ اس کے حکم پر عمل کرنے والوں کو ثواب اور نافرمانی کرنے والوں کو عذاب ہو اور اس سے اس کا فضل اور عدل ظاہر ہوگا۔ وہ رحیم و کریم بھی ہے اور قہر و غضب کرنے والا بھی ہے اور ان احکام کی تکلیف اور رسولوں کی بعثت سے اس کی ان صفات کا ظہور ہوگا۔ عقل تمام احکام کے حسن اور قبح کا ادراک نہیں کر سکتی اور عقل یہ معلوم نہیں کر سکتی کہ اللہ کی نعمتوں پر اس کا شکر کس طرح ادا کیا جائے، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کی ادائیگی کے اوقات اور طریقوں کو محض عقل سے نہیں جانا جا سکتا۔ اس لیے ضروری تھا کہ اللہ اپنا کوئی رسول بھیجے جو بندوں کو یہ بتائے کہ اللہ کس فعل سے راضی اور کس فعل سے ناراض ہوتا ہے اور اگر اللہ فرشتہ کو رسول بنا دیتا تو لوگ اس سے کیسے استفادہ کرتے وہ اس کو دیکھ سکتے تھے نہ اس کا کلام سن سکتے تھے اور چونکہ فرشتہ اور انسان الگ الگ جنس سے ہیں تو فرشتہ کے افعال انسانوں کے لیے نمونہ اور حجت نہ بنتے، اور رہا یہ کہ اللہ نے کسی تونگر اور حاکم کو رسول نہیں بنایا بلکہ ایک نادار شخص کو رسول بنایا تو اس میں اللہ کی حکمتیں ہیں کیونکہ جو شخص مشاعرہ میں ذی اقتدار ہو لوگ اسے رسول تو کیا خدا بھی مان لیتے ہیں۔ جیسے فرعون اور نمرود کو لوگوں نے خدا مان لیا تھا۔ اللہ یہ چاہتا تھا کہ لوگ دولت اور حکومت کی طاقت کی بناء پر اس کی وحدانیت کو نہ مانیں بلکہ علم اور حکمت کی بناء پر اور دلائل اور معجزات کی قوت سے اللہ کی وحدانیت کو مانیں۔

اس لیے اس نے ایک انسان کو رسالت کے لیے منتخب کیا اور اس میں یہ قوت اور صلاحیت رکھی کہ وہ اللہ سے وحی حاصل کر سکے اور مخلوق کو پہنچا سکے۔ اس کا غیب اور شہادت دونوں سے رابطہ ہو وہ بذریعہ وحی اللہ کے عذاب پر مطلع ہو کر لوگوں کو اس سے ڈرائے اور ان کو ایمان لانے اور نیک عمل کرنے کی ترغیب دے تاکہ ان پر رحم کیا جائے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو طوفان سے نجات دے دی اور منکرین اور مکذبین کو غرق کر دیا کیونکہ ان کے دل توحید، نبوت، احکام شرعیہ اور آخرت کو ماننے سے اندھے بن گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "قد جاء کم بصائر من ربکم فمن ابصر فلنفسہ و من عمی فعلیھا : بیشک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ہدایات کی روشن نشانیاں آ گئیں تو جس نے (ان کو) آنکھیں کھول کر دیکھ لیا تو اس میں اسی کا فائدہ ہے اور جو اندھا بنا رہا تو اس میں اسی کا فائدہ ہے اور جو اندھا بنا رہا تو اس میں اسی کا نقصان ہے" (الانعام : 104) (تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

ہر نبی کی قوم کو یہ تعجب ہوا کہ ایک انسان کا اللہ سے رابطہ کیسے ہو گیا اور جو فرشتہ اس پر کلام لاتا ہے وہ انھیں نظر کیوں نہیں آتا اور یہ کہ اللہ نے اسی کو اپنی رسالت کے لیے کیوں چنا۔ اللہ تعالیٰ اس کا جواب دے رہا ہے کہ اس میں کیا تعجب ہے کہ اللہ اپنی رسالت کے لیے کسی مرد کو منتخب کر لے تاکہ وہ تمہیں ڈرائے اور تم پرہیزگاری اختیار کرو اور اللہ تم پر رحم کرے۔

اس جگہ علیٰ رجُلٍ سے معلوم ہوا مرد ہی نبی بن سکتا ہے عروت نہیں۔ اسی لیے دوسری جگہ ارشاد ہوا۔ ومارارسلنا قبلک الا رجالا نوحی الیھم۔ "اور ہم نے آپ سے قبل مرد ہی رسول بنائے جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔" (انبیاء : 7) (تفسیر برہان القرآن۔ قاری علامہ محمد طیب)

قوم کے سرداروں کا جہالت و سَفاہَت سے بھرپور جواب سن کر کمال خلق کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت نوح (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ "اے میری قوم! مجھ میں کوئی گمراہی کی بات نہیں بلکہ میں تو اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کی طرف سے تمہاری ہدایت کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں کیونکہ جب دنیاوی بادشاہ کسی ناتجربہ کار اور جاہل کو اپنا وزیر نہیں بناتا یا کوئی اہم عہدہ نہیں سونپتا تو اللہ تَبارَکَ وَتَعَالٰی جو سب بادشاہوں کا بادشاہ ہے وہ کیسے کسی بیوقوف یا کم علم کو منصب نبوت سے سرفراز فرما سکتا ہے اور میرا کام تو اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کے پیغامات تم تک پہنچانا اور تمہاری بھلائی چاہنا ہے۔

نبوت اور گمراہی جمع نہیں ہو سکتی :

آیت نمبر 61 سے معلوم ہوا کہ نبوت اور گمراہی دونوں جمع نہیں ہو سکتیں اور کوئی نبی ایک آن کے لیے بھی گمراہ نہیں ہو سکتے۔ اگر نبی ہی گمراہ ہوں تو پھر انھیں ہدایت کون کرے گا۔

مبلغ کو چاہیے کہ مخاطب کی جہالت پر شفقت و نرمی کا مظاہرہ کرے:

حضرت نوح (علیہ السلام) کی قوم کی بکواس اور آپ (علیہ السلام) کے جواب کی طرف نظر کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) نہایت حلیم و کریم بزرگ تھے کہ انتہائی بدتمیزی کے ساتھ دیئے گئے جواب کے مقابلے میں نہایت شفقت و محبت اور خیر خواہی کے ساتھ جواب عطا فرما رہے ہیں اور یہ وہی تعلیم ہے جو اللہ عَزَّوَجَلَّ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو فرمائی تھی۔ چنانچہ فرعون کی طرف بھیجتے ہوئے اللہ عَزَّوَجَلَّ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہ السلام) سے فرمایا:

"فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ (۴۴)"

تو تم اس سے نرم بات کہنا اس امید پر کہ شاید وہ نصیحت قبول کرلے یا (اللہ سے) ڈر جائے۔

اور یہ وہی حکم ہے جو اللہ عَزَّوَجَلَّ نے ہمیں ارشاد فرمایا ہے:

"اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ (۱۲۵)"

اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے اس طریقے سے بحث کرو جو سب سے اچھا ہو، بیشک تمہارا رب اسے خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے گمراہ ہوا اور وہ ہدایت پانے والوں کو بھی خوب جانتا ہے۔

اس سے مبلغین کو بھی درس حاصل کرنا چاہیے کہ مخاطب کی جہالت پر برانگیختہ ہونے کی بجائے حتی الامکان نرمی اور شفقت کے ساتھ جواب دیا جائے

پیغمبر کا ہر حکم وارشاد علم پر مبنی ہوتا ہے: کہ اس نے مجھے وحی و نبوت سے نوازا ہے جبکہ تم سب لوگ محض ظن و گمان اور خیال و تخمین کے پیچھے چلتے ہو۔ سو یہ پیغمبر کی ایک امتیازی شان ہوتی ہے کہ ان کا ہر قول و فعل اور حکم وارشاد علم صحیح کی ٹھوس بنیاد پر قائم واستوار ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے پاس اس خالق ومالک کی طرف سے وحی آتی ہے جو اس ساری کائنات کا خالق ومالک اور اس میں حاکم و متصرف ہے۔ اور ایسا خالق ومالک اور اس شان کا حاکم و متصرف کہ نہ اس کی اس تخلیق میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ اس کے اس حکم و تصرف میں جبکہ وحی کے نور سے محروم دنیا کا سارا کام محض ظن و تخمین اور اندازہ و قیاس پر چلتا ہے۔ سو پیغمبر کے حکم وارشاد کا کوئی بدلہ اور مقابلہ کسی سے ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔ سو یہیں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جو لوگ نور وحی پر ایمان سے محروم ہیں وہ کس قدر محروم اور بدنصیب لوگ ہیں۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ بہر کیف حضرت نوح نے اپنی قوم سے کہا کہ میں خداوند قدوس کے پیغام تم لوگوں کو پہنچا رہا ہوں۔ اگر تم لوگ ناقدری کر کے ان سے منہ موڑو گے اور ان کے جواب میں اعراض اور روگردانی برتو گے تو اس کے نتیجے میں تمہیں بڑا ہولناک بھگتان بھگتنا پڑے گا۔ اور تم لوگ حق و ہدایت کی سب سے بڑی دولت سے محروم ہو کر دنیا و آخرت کے سب سے بڑے نقصان اور انتہائی ہولناک خسارے میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اور تمہارے لیے اندھیرے ہی اندھیرے ہوں گے۔ اور میں تمہارے لیے سچی خیر خواہی کرتا ہوں۔ تم لوگ چونکہ صرف ظاہر اور مادیت و محسوسات کو دیکھنے کے عادی ہو اور انہی پر تکیہ و آسرا کئے ہو اس لیے تم کو عذاب کا ڈراوا عجیب لگتا ہے، لیکن میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ تم لوگ اگر اپنی ظاہری چمک دمک کے ساتھ اپنے ان روگوں اور عیبوں کو بھی دیکھ لیتے جو تم نے اپنے سفید کپڑوں کے نیچے چھپا رکھے ہیں تو تمہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ میں کتنی سچی بات کہتا ہوں اور تمہارا کس قدر خیر خواہ ہوں۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

پیغمبر کا بشر اور جنس بشر سے ہونا قدرت کا ایک مستقل انعام واحسان ہے:

یعنی یہ تو عقل و فطرت کے عین مطابق اور خداوند قدوس کی رحمت بے کراں اور عنایت بے نہایت کا عظیم الشان مظہر و مقتضٰی ہے۔ کہ اس نے اس عظیم الشان طریقے سے تمہارے لیے دارین کی ابدی سعادت و سرخروئی اور دائمی فوز و فلاح کا انتظام فرمایا۔ کہ تمہیں نور ہدایت کی دولت سے نوازا اور تمہارے اپنے اندر ہی سے ایک شخص کو نبوت و رسالت کے شرف سے سرفراز فرما کر نوازا۔ تاکہ تم اس سے حق بات کو صحیح طور پر اور آسانی سے سمجھ کر اپنا سکو۔ آخر اس میں تعجب یا انکار کی

کون سی بات ہو سکتی ہے؟ سو تم لوگ کتنے ناشکرے اور کس قدر بے انصاف ہو جو اپنے خالق ومالک کی ان عظیم الشان عنایات کی اس طرح بے قدری اور ناشکری کرتے ہو؟۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ سو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ پیغمبر کا بشر اور نوع انسانی میں سے ہونا قدرت کا مستقل انعام واحسان ہے جس سے حضرت حق۔ جل مجدہ۔ نے دنیا کو نوازا اور سرفراز فرمایا ہے۔ لیکن انسان کی ناشکری اور بے انصافی ہمیشہ یہی رہی کہ اس نے قدرت کے اس احسان کو پہچاننے اور اس کی قدر کرنے کی بجائے الٹا اسی کو مورد الزام واعتراض بنایا۔ (تفسیر مدنی کبیر۔اسحاق مدنی کشمیر)

حقیقت یہ ہے کہ ساراعالم انسان میں ہے۔ صوفیاء فرماتے ہیں ذکر الٰہی یعنی وحی خدا آتی ہے رسول پر مگر آتی ہے ان کی امت کے لئے نوح علیہ السلام نے فرمایا جاء کم ذکر ساتھ ہی فرمایا علی رجل منکم پر براہ راست وحی آئے تو وہ ہلاک ہو جاویں وحی کا تحمل سینہ رسول کرتا ہے لو انزلنا ھذا القرآن علی جبل الخ، جیسے ٹھنڈے شیشہ کے ذریعہ سورج کو دیکھا جاتا ہے، براہ راست آنکھ سورج کو نہیں دیکھ سکتی۔ یونہی کلام الٰہی بذریعہ نبی سناجاتا ہے ان کا سینہ جلال بناکر ہم تک پہنچاتا ہے یہ سب کچھ مومنوں کے لئے ہے، رہے کفار ان کے لئے نبی کی ذات گویا آتشی شیشہ ہے، جو سورج کی شعاعوں کو اور تیز کر کے کپڑے کو جلا دیتا ہے۔ یونہی کفار کے لئے کلام ہلاکت وعذاب کا باعث ہو جاتا ہے۔ چونکہ یہ دونوں جلالی وجمالی انسانوں کے لئے انسان پہنچا سکتا ہے۔ اس لئے نبی انسان ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا علی رجل منکم دیکھو غار ثور میں ہجرت کے موقعہ پر سکینہ حضور ﷺ پر آیا مگر صدیقؓ کے لئے آیا اگر براہ راست صدیقؓ پر آتا تو آپ نہ رہتے۔ (تفسیر نعیمی۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی)

نبی کا آنا قابل تعجب کیوں ہے؟

یعنی اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ تم ہی میں سے خدا کسی ایک فرد کو اپنی پیغام رسانی کے لیے چن لے۔ آخر اس نے ساری مخلوق میں سے منصب خلافت کے لیے آدم (علیہ السلام) کو کسی مخصوص استعداد کی بنا پر چن لیا تو کیوں نہیں ہو سکتا کہ اولاد آدم میں سے بعض کامل الاستعداد لوگوں کو منصب نبوت ورسالت کے لیے انتخاب کر لیا جائے تاکہ وہ لوگ براہ راست خدا سے فیض پا کر دوسروں کو ان کے انجام سے آگاہ کریں اور یہ اس پر آگاہ ہو کر بدی سے بچ جائیں اور اس طرح خدا کے رحم و کرم کے مورد بنیں۔

تقویٰ کے باوجود اللہ سے ڈرو:

تقویٰ موجب رحمت نہیں۔ رحمت تو اللہ کی ایک مہربانی ہے (جس کے حصول کا ذریعہ اللہ نے تقویٰ کو بنادیا ہے ورنہ تقویٰ سے قطعی طور پر مستحق رحمت ہو جانا اور رحمت کا واجب ہو جانا ضروری نہیں) متقی کو اپنے تقویٰ پر کامل اعتماد کر کے بے غم نہ ہونا چاہیے بلکہ تقوی کے باوجود اللہ کے عذاب سے ڈرتے رہنا چاہیے۔

ابو نعیم نے حضرت علی (رض) کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ نے بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر کے پاس وحی بھیجی کہ تمہاری امت میں جو طاعت گزار لوگ ہوں ان سے کہہ دو کہ اپنے اعمال پر بھروسہ نہ کرلیں۔ قیامت کے دن حساب کے وقت میں جس کو عذاب دینا چاہوں گا عذاب دوں گا اور تمہاری امت میں جو گناہ گار ہیں ان سے کہہ دو کہ اپنے کو خود ہلاکت میں نہ ڈالو (یعنی ہلاکت کا یقین کرکے رحمت سے مایوس نہ ہو) کیونکہ میں بڑے بڑے گناہ بخش دوں گا اور مجھے پروانہ ہو گی۔ (تفسیر گلدستہ۔ محمد اسحاق)

فوائد

۔ حضرات انبیاء کرام عقائد، شریعت کے اعمال، طریقت کے اشغال سب ہی کچھ لوگوں کو بتاتے ہیں۔

۔ خدا جب دین لیتا ہے تو عقل بھی چھین لیتا ہے دیکھو کفار پتھروں لکڑیوں کو خدا تو مان لیتے تھے مگر انسان کو نبی ماننے سے گھبراتے تھے کہتے تھے کہ نبوت اتنا اونچا درجہ ہے جسے انسان برداشت نہیں کر سکتا وہ یہ نہ سمجھے کہ الوہیت تو نبوت سے کہیں اعلیٰ ہے اور لکڑی پتھر انسانوں سے کہیں ادنی تو الوہیت انہیں کیسے مل گئی۔ یہ فائدہ او عجبتم الخ سے حاصل ہوا۔

۔ نبوت صرف انسان کو اور انسانوں میں بھی صرف مردوں کو عطا ہوئی کوئی جن فرشتہ عورت کبھی نبی نہ ہوئے۔ یہ فائدہ علی رجل منکم سے حاصل ہوا۔ دوسری جگہ ارشاد ہے وما ارسلنا من قبلک الا رجالا نوحی الیھم

۔ نبی بشیر بھی ہوتے ہیں نذیر بھی مگر ان کی نذارت عام ہوتی ہے۔ بشارت خاص۔ یہ فائدہ لینذر کم سے حاصل ہوا یعنی وہ خوشخبری صرف مومنوں کو دیتے ہیں مگر ڈراتے سب کو ہیں کفار کو بھی اور مومنوں کو بھی۔

۔ ایمان تقوی پرہیز گاری جس کو ملتی ہے۔ نبی کے واسطے ان کے وسیلہ سے ملتی ہے۔ یہ فائدہ والتتقوا الخ سے حاصل ہوا۔ ان کے بغیر کوئی، کچھ بھی، رب سے نہیں لے سکتا۔

بے اون کے واسطے خدا کچھ عطا کرے　　　　حاشا غلط غلط یہ ہوس بے بصر کی ہے

۔ اللہ تعالی اپنے بندوں پر نبی کے ذریعہ رحمت فرماتا ہے۔ بلکہ وہ خود سراپا رحمت ہوتے ہیں، ان سے نسل انسانی کو فخر حاصل ہوتا ہے یہ فائدہ ولعلکم ترحمون سے حاصل ہوا ترحمون میں رحمت مطلق ہے۔ (تفسیر نعیمی۔ مفتی احمد یار خاں نعیمیؒ)

آیت مبارکہ:

فَكَذَّبُوۡهُ فَاَنۡجَيۡنٰهُ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗ فِى الۡفُلۡكِ وَاَغۡرَقۡنَا الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمًا عَمِيۡنَ ۝٦٤

لغۃ القرآن: فَكَذَّبُوْهُ :تو ان سب نے جھٹلایا اسے] [فَاَنْجَيْنٰهُ :تو ہم نے بچا لیا اسے] [وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ جو] [مَعَهٗ : اس کے ساتھ] [فِي :میں] [الْفُلْكِ :کشتی] [وَاَغْرَقْنَا : اور ہم نے غرق کردیا] [الَّذِيْنَ :وہ لوگ جو] [كَذَّبُوْا : انھوں نے جھٹلایا] [بِاٰيٰتِنَا :ہماری آیات کو] [اِنَّهُمْ : بیشک وہ] [كَانُوْا :تھے سب] [قَوْمًا :قوم ہے] [عَمِيْنَ : اندھے]

ترجمہ: پھر ان لوگوں نے انھیں جھٹلایا سو ہم نے انھیں اور ان لوگوں کو جو کشتی میں ان کی معیّت میں تھے نجات دی اور ہم نے ان لوگوں کو غرق کردیا جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا، بیشک وہ اندھے (یعنی بے بصیرت) لوگ تھے

تشریح: افہام و تفہیم اور وعظ و نصیحت کا یہ سلسلہ ایک دو روز میں ہی ختم نہیں ہوا بلکہ حضرت نوح (علیہ السلام) ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کی مخالفت برداشت کرتے رہے اور ان کی ہدایت پذیری کے لیے جان توڑ کوشش کرتے رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اللہ کے نبی کا ظرف ہی اتنا وسیع حوصلہ اتنا بلند اور دل اتنا شفیق ہوتا ہے کہ وہ تکذیب وافتراء کے باوجود وعظ و نصیحت سے دست بردار نہیں ہوتا۔ آخر جب اتنا عرصہ دراز گزر گیا اور ان میں قبول ہدایت کی رغبت پیدا نہ ہوئی تو عذاب الٰہی طوفان کی شکل میں ظاہر ہوا اور آپ کے فرمان برداروں کے سوا سب کو تباہ و برباد کردیا۔

یہ الفاظ خود اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ طوفان صرف مکذبین و منکرین کے لیے بطور سزا کے آیا تھا۔ ساری دنیا سے اس کا تعلق نہ تھا۔ عراق کی سرزمین خصوصا کوہ ارارات کی وادیوں میں اب تک ایک مہیب طوفان کے نشانات اہل فن کو ملتے رہتے ہیں۔ توراۃ میں اس طوفان کے سلسلہ میں یہ تصریحات ملتی ہیں:۔ " اور نوح چھ سو برس کا تھا جب طوفان کا پانی زمین پر آیا "۔ (پیدائش ٧: ٦) " جب نوح (علیہ السلام) کی عمر چھ سو برس کی ہوئی دوسرے مہینہ کی سترھویں تاریخ کو اسی دن بڑے سمندر کے سب سوتے پھوٹ نکلے اور آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں اور چالیس دن اور چالیس رات زمین پر پانی کی جھڑی لگی رہی "۔ (پیدائش ٧: ١١، ١٢) طوفان نوح (علیہ السلام) کا تخمینی سال ٣٢٠٠ ق م ہے۔ فی الفلک کے لفظ سے یہ دھوکا نہ ہوا کہ یہ کوئی چھوٹی موٹی ڈونگا ناؤ تھی۔ محققین اثریات کا خیال ہے کہ یہ خاصہ بڑا جہاز اوپر نیچے تین درجوں کا تھا اور اس کی پیمائش توراۃ میں حسب ذیل دی جاتی ہے۔ اس کی لمبائی ٣٠٠ ہاتھ اور اس کی چوڑائی ٥٠ ہاتھ اور اس کی اونچائی ٣٠ ہاتھ کی "۔ (پیدائش ٦: ٥) گویا اتنا

بڑا مسافروں کا جہاز (LINER) جو برطانیہ اور امریکہ کے درمیان عموماً چلتے ہیں۔ حسب روایت توراۃ یہ جہاز ۱۵۰ دن (یا ۵ مہینے) چلتا رہا۔ (ماخوذ از تفسیر ماجدی) واللہ اعلم بالصواب۔) تفسیر ضیاء القرآن)

۔ حضرت نوح (علیہ السلام) مسلسل تبلیغ دین کرتے رہے اور کفار مسلسل ان کی تکذیب میں لگے رہے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے آپ کو آپ کے ساتھیوں سمیت کشتی میں سوار کرکے بچالیا اور باقی سب لوگ غرق کردیئے گئے۔ ایک عظیم سیلاب آیا اور ساری قوم بہہ گئی بلکہ چند مومنین کے سوا سب نسل انسانی ختم ہو گئی کیونکہ اس وقت صرف اسی علاقہ میں انسان آباد تھے۔ یہ واقعہ محققین کے نزدیک 3200 قبل مسیح ہوا۔

طوفان نوح ساری زمین پہ نہیں آیا تھا:

واغرقنا الذین کذبوا بآیتنا: سے معلوم ہوا ساری روئے زمین پر طوفان نوح نہ آیا تھا۔ یہ صرف قوم نوح میں سے مکذبین پر آیا اور قوم نوح کے مکذبین ساری روئے زمین پر آباد نہ تھے وہ حدود عراق ہی میں رہتے تھے یا ان میں سے کچھ لوگ جزیرہ عرب میں پھیل گئے تھے۔ لہٰذا اسی علاقہ میں (جزیرہ عرب میں) طوفان کا آنا متصور ہے۔

اور اس پر بخاری شریف کی وہ حدیث بھی دال ہے کہ قوم نوح کے بت جنہیں وہ پوجتے تھے بعد میں جزیرہ عرب کے مختلف علاقوں سے برآمد ہوئے اور مختلف قبائل عرب نے ان کی پوجا شروع کردی۔ (بخاری کتاب التفسیر حدیث 4920) اس کی تفصیل سورۃ نوح میں آئے گی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفان نوح جزیرۂ عرب ہی میں آیا تھا۔ اور وہ جو قرآن میں ہے کہ اللہ نے نوح (علیہ السلام) کو حکم فرمایا کہ کشتی میں ہر جانور کا ایک جوڑا سوار کرلو، تو اس سے بھی یہ دلیل نہیں لی جاسکتی کہ ساری زمین پہ طوفان آیا تھا۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جس علاقہ میں طوفان آیا تھا وہاں جو جانور رہتے تھے ان کا ایک ایک جوڑا سوار کرلیا گیا اور قرآن یا حدیث صحیح میں کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ ساری روئے زمین پہ طوفان آیا تھا۔ صاحب روح المعانی علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ کی تحقیق بھی یہی ہے اور اسی کو ذہن زیادہ قبول کرتا ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ دشمنان دین آخر کار ہلاک ہوتے ہیں، خواہ انھیں کتنی ہی لمبی مہلت دی جائے، مگر بالآخر ان کے لیے ہلاکت مقرر ہے اس میں دور حاضر کی طاغوتی طاقتوں کے لیے درس عبرت ہے۔ انھیں جان لینا چاہیے کہ اگر وہ اسلام دشمنی سے باز نہیں آتے تو ان کے لیے بالآخر ہلاکت و رسوائی ہی مقرر ہے۔
(تفسیر برہان القرآن)

اس آیت کریمہ میں قرآن کریم وضاحت کرتا ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کی طویل ترین تبلیغی کاوشوں اور انتہائی تھکا دینے والی مساعی کے باوجود قوم نوح نے آپ کی دعوت کو رد کردیا۔ انھوں نے ہرچند کوشش کی کہ وہ آپ پر ایمان لاکر اللہ کے عذاب سے بچ جائیں لیکن وہ بجائے بات سن کردینے کے آپ کے درپے آزار ہوگئے اور آپ کی جان لینے کے منصوبے باندھنے لگے لیکن حضرت نوح (علیہ السلام) نے اپنی تبلیغی کاوشوں کو پھر بھی ترک نہیں کیا۔ رات دن اس کام میں جتے رہے اس کا اندازہ ہمیں سورۃ نوح کی ان آیات سے ہوتا ہے جس میں حضرت نوح (علیہ السلام) اللہ سے دعا مانگتے ہوئے اپنی تبلیغی رپورٹ بھی پیش کررہے ہیں۔ پیغمبر سچائی کا پیکر ہوتا ہے اور پھر جب وہ اپنی تبلیغی مساعی کو اللہ کے سامنے پیش کرتا ہے تو اس میں کسی کمی کا تو گمان ہوسکتا ہے مبالغے کا وہم بھی نہیں ہوسکتا۔ اندازہ فرمایئے کہ خود حضرت نوح (علیہ السلام) اپنی تبلیغی کاوشوں کو کس طرح بیان فرمارہے ہیں۔ قرآن کریم کی زبان میں آپ نے فرمایا:

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا وَّ نَہَارًا۔ فَلَمۡ یَزِدۡہُمۡ دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًا۔ وَاِنِّیۡ کُلَّمَا دَعَوۡتُہُمۡ لِتَغۡفِرَ لَہُمۡ جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَہُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ وَاسۡتَغۡشَوۡا ثِیَابَہُمۡ وَاَصَرُّوۡا وَاسۡتَکۡبَرُوا اسۡتِکۡبَارًا۔ ثُمَّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُہُمۡ جِہَارًا۔ ثُمَّ اِنِّیۡۤ اَعۡلَنۡتُ لَہُمۡ وَاَسۡرَرۡتُ لَہُمۡ اِسۡرَارًا۔ فَقُلۡتُ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّکُمۡ ج اِنَّہٗ کَانَ غَفَّارًا۔

"بولا اے رب! میں بلاتا رہا اپنی قوم کو رات اور دن۔ پھر میرے بلانے سے اور زیادہ بھاگنے لگے اور میں نے جب کبھی ان کو بلایا' تاکہ تو ان کو بخشے' ڈالنے لگے انگلیاں اپنے کانوں میں اور لپیٹنے لگے اپنے اوپر کپڑے اور ضد کی اور غرور کیا' بڑا غرور۔ پھر میں نے ان کو بلایا برملا' پھر میں نے ان کو کھول کر کہا اور چھپ کر کہا چپکے سے۔ تو میں نے کہا گناہ بخشواؤ اپنے رب سے' بیشک وہ بخشنے والا ہے" (نوح: ۵-۱۰)

لیکن نوح (علیہ السلام) کے ہمدردی میں ڈوبے ہوئے یہ الفاظ بھی ان کی قوم کو راہ راست پر نہ لاسکے۔ وہ مسلسل اپنے عناد اور ہٹ دھرمی پر قائم رہے جب آپ نے اپنی ساڑھے نو سو سال کی پیہم دعوت و تبلیغ کا ان پر کوئی اثر نہ دیکھا تو سخت ملول و پریشان خاطر ہوئے تب پروردگار نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّہٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِکَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۔ (ہود: ۳۶)

"اور نوح پر وحی کی گئی کہ جو ایمان لے آئے' وہ لے آئے۔ اب ان میں سے کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے۔ پس ان کی حرکات پر غم نہ کر"۔

جب حضرت نوح (علیہ السلام) کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان کے ابلاغ حق میں کوتاہی نہیں ہے بلکہ خود نہ ماننے والوں کی استعداد کا قصور ہے اور ان کی اپنی سرکشی کا نتیجہ' تب ان کے اعمال اور کمینہ حرکات سے متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں یہ دعا فرمائی:

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ دَیَّارًا۔ اِنَّکَ اِنْ تَذَرْ ھُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَکَ وَلَا یَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا۔ (نوح: ۲۷)

"اے پروردگار! تو کافروں میں سے کسی کو بھی زمین پر باقی نہ چھوڑ۔ اگر تو ان کو یونہی چھوڑ دے گا تو یہ تیرے بندوں کو بھی گمراہ کریں گے اور ان کی نسل بھی انہی کی طرح نافرمان پیدا ہو گی"۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح (علیہ السلام) کی دعا قبول فرمائی اور اپنے قانون جزائے اعمال کے مطابق سرکشوں کی سرکشی اور متمردوں کے تمرد کی سزا کا اعلان کر دیا اور حفظ ماتقدم کے لیے پہلے حضرت نوح (علیہ السلام) کو ہدایت فرمائی کہ وہ ایک کشتی تیار کریں' تاکہ اسباب ظاہری کے اعتبار سے وہ اور مومنین قانتین اس عذاب سے محفوظ رہیں۔ جو خدا کے نافرمانوں پر نازل ہونے والا ہے۔ حضرت نوح (علیہ السلام) نے جب حکم رب میں کشتی بنانی شروع کی تو کفار نے ہنسی اڑانا اور مذاق بنانا شروع کر دیا اور جب کبھی ان کا ادھر سے گزر ہوتا تو کہتے کہ خوب! جب ہم غرق ہونے لگیں گے تب تو اور تیرے پیرو اس کشتی میں محفوظ رہ کر نجات پا جائیں گے' کیسا احمقانہ خیال ہے۔ حضرت نوح (علیہ السلام) بھی ان کی انجام کار سے غفلت اور اللہ کی نافرمانی پر جرأت دیکھ کر ان ہی کے طرز پر جواب دیتے اور اپنے کام میں مشغول رہتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ان کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔

وَاصْنَعِ الْفُلْکَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِنَّھُمْ مُّغْرَقُوْنَ۔

"(اے نوح!) تو ہماری حفاظت میں ہماری وحی کے مطابق سفینہ تیار کیے جا اور اب مجھ سے ان کے متعلق کچھ نہ کہو' یہ بلاشبہ غرق ہونے والے ہیں" (ھود: ۳۷)

آخر سفینہ نوح (علیہ السلام) بن کر تیار ہو گیا۔ اب اللہ کے وعدہ عذاب کا وقت قریب آیا اور حضرت نوح (علیہ السلام) نے اس پہلی علامت کو دیکھا جس کا ذکر ان سے کیا گیا تھا' یعنی زمین کی تہہ میں سے پانی کا چشمہ ابلنا شروع ہو گیا۔ تب وحی الٰہی نے ان کو حکم سنایا کہ کشتی میں اپنے خاندان کو بیٹھنے کا حکم دو اور تمام جانداروں میں سے ہر ایک کا ایک جوڑا بھی کشتی میں پناہ گیر ہو اور وہ مختصر جماعت (تقریباً اسی ۸۰ نفر) بھی جو تجھ پر ایمان لا چکی ہے کشتی میں سوار ہو جائے۔ جب وحی الٰہی کی تعمیل پوری ہو گئی تو اب آسمان کو حکم ہوا کہ پانی برسنا شروع ہو اور زمین کے چشموں کو امر کیا گیا کہ وہ پوری طرح ابل پڑیں۔

اللہ کے حکم سے جب یہ سب کچھ ہوتا رہا تو کشتی بھی اس کی حفاظت میں پانی پر ایک مدت تک محفوظ تیرتی رہی تا آنکہ تمام منکرین و معاندین غرق آب ہو گئے اور خدائے تعالیٰ کے قانون "جزائے اعمال" کے مطابق اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئے۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا یہ عذاب اللہ کی حکمت اور مصلحت کے مطابق جب اپنے اختتام کو پہنچا تو سفینہ نوح "جودی" پہاڑ پر جا ٹھہرا۔ توراۃ میں "جودی" کو "اراراط" کے پہاڑوں میں سے بتایا گیا ہے۔ اراراط، درحقیقت جزیرہ کا نام ہے یعنی اس علاقے کا نام ہے جو فرات اور دجلہ کے درمیان "دیار بکر" سے بغداد تک مسلسل چلا گیا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون کے مطابق کفار کی جڑ کاٹ کے رکھ دی اور حضرت نوح (علیہ السلام) اور آپ پر ایمان لانے والوں کو محض اپنی رحمت سے نجات عطا فرمائی اور پھر انہی کی نسل سے سلسلہ نوع انسانی آگے بڑھا۔ آیت کریمہ کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ "بیشک یہ لوگ اندھے تھے"۔ یہاں اندھا ہونے سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ نور بصارت سے محروم تھے یعنی ان کی آنکھیں بینائی سے خالی تھیں اور وہ دیکھنے سے عاجز ہو گئے تھے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ دل کے اندھے اور نور بصیرت سے محروم تھے اور یہ وہ اندھا پن ہے جو انسان کی گمراہی کا باعث بنتا ہے۔ آنکھوں کا اندھا ہونا اس کا ہدایت اور ضلالت سے کوئی تعلق نہیں۔ آنکھوں والے ہدایت سے محروم رہتے ہیں اندھے ہدایت پا کر عبداللہ ابن ام مکتوم بن جاتے ہیں۔ اس لیے قرآن کریم نے ارشاد فرمایا:

فَاِنَّہَا لَا تَعۡمَی الۡاَبۡصَارُ وَ لٰکِنۡ تَعۡمَی الۡقُلُوۡبُ الَّتِیۡ فِی الصُّدُوۡرِ۔ (الحج: ۴۶)
"آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ سینوں میں دل اندھے ہوتے ہیں"۔
اقبال نے اسی کی روشنی میں نصیحت کرتے ہوئے کہا
دل کا نور کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

(تفسیر روح القرآن)

فوائد

ف 1: اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے دشمنوں پر اس وقت تک دنیاوی عذاب نہیں آتا جب تک وہ پیغمبر کی نافرمانی نہ کریں۔ رب فرماتا ہے وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا آپ کی کشتی میں چالیس مرد چالیس عورتیں تھیں مگر آپ کی اولاد کے سوا کسی کی نسل نہ چلی۔ اس لیے آپ کو آدم ثانی کہتے ہیں۔
ف 2: یعنی ان کے پاس نبوت کی شان دیکھنے والی آنکھ نہ تھی۔ ان کے دل اندھے تھے اگرچہ آنکھیں کھلی تھیں۔ اس لیے بہت سے نابینا صحابی بن گئے۔ اور بہت سے انکھیارے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھنے کے باوجود صحابی تو کیا مومن بھی نہ بنے۔ (تفسیر نور العرفان)

آیت مبارکہ:

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمۡ هُوۡدًا‌ ؕ قَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَـكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ‌ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ۝٦٥

لغۃ القرآن: وَاِلٰي : اور کی طرف] [عَادٍ : حد سے تجاوز کرنے والا] [اَخَاهُمۡ : ان کے بھائی] [هُوۡدًا : ہود کو] [قَالَ : فرمایا] [يٰقَوۡمِ : اے میری قوم] [اعۡبُدُوا : تم سب عبادت کرو] [اللّٰهَ : اللہ] [مَا : نہیں] [لَكُمۡ : تمہارے لیے] [مِنۡ اِلٰهٍ : کوئی معبود] [غَيۡرُهٗ : اس کے سوا] [اَفَلَا : تو کیا نہیں] [تَتَّقُوۡنَ : تم سب ڈرتے]

ترجمہ: اور ہم نے (قوم) عاد کی طرف ان کے (قومی) بھائی ہود (علیہ السلام) کو (بھیجا)، انھوں نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کیا کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں، کیا تم پرہیزگار نہیں بنتے

تشریح: قوم عاد عرب کی قدیم اقوام میں سے تھی۔ جن کی قوت و شوکت اور حکومت و فرماں روائی کے بڑے مبالغہ انگیز افسانے زباں زد عوام تھے۔ ان کا یہ نام ان کے ایک دادے کے نام پر پڑ گیا تھا۔ جس کا شجرہ یہ بتایا جاتا ہے۔ وھو عاد بن عوص بن ارم بن سام بن شالح بن ارفخشد بن سام بن نوح (علیہ السلام)۔ حضرت ہود اسی قوم کی ایک معزز شاخ کے چشم وچراغ تھے۔ آپ کا نسب نامہ یہ ہے ہود بن عبداللہ بن رباح بن الجلود بن عاد الخ (قرطبیؒ) ان کا مسکن احقاف کا علاقہ تھا جو یمن کا ایک حصہ ہے اور ان کا پایہ تخت حضر موت تھا۔ یہ علاقہ اس وقت بہت سرسبز وشاداب تھا۔ یہ قوم اپنی قوت و وجاہت میں لاضواب تھی۔ دور دراز تک ارد گرد کا علاقہ ان کے زیر نگین تھا۔ لیکن بد قسمتی سے یہ بھی شرک میں مبتلا تھے۔ اور اپنے ہر کام کے لیے الگ الگ خدا بنا رکھے تھے۔ ان کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ہود (علیہ السلام) کو مبعوث فرمایا اور انھوں نے انھیں باطل معبودوں سے قطع تعلق کرنے اور اپنے مولائے حقیقی سے رشتہ عبودیت جوڑنے کی دعوت دی۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

حضرت ہود (علیہ السلام) اور ان کی قوم عاد اولیٰ کی گفتگو بیان فرمائی ہے۔ حضرت ہود (علیہ السلام) کی قوم یمن کے علاقہ احقاف میں آباد تھی اور انھوں نے کئی معبود بنا رکھے تھے۔ آپ نے انھیں فرمایا: صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو کیونکہ اس کے سوا اور کوئی عبادت کے لائق نہیں، تو قوم کے سرداروں نے کہا: ہمارے خیال میں تو نادان ہے اور جھوٹ بول رہا ہے۔ آپ نے فرمایا: میں نادان نہیں ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں اور اللہ تعالیٰ نے تم ہی میں سے ایک مرد یعنی مجھے رسول بنایا ہے اور تمہیں قوم نوح سے زیادہ طاقتور بنایا ہے، لہٰذا تم اس کی نعمتیں یاد کرکے اس کے احکام کی پیروی کرو تاکہ تم فلاح پاجاؤ۔

ارم قبیلہ کی دو شاخیں ہیں: ایک نام عاد اولیٰ ہے جس کی طرف حضرت ہود (علیہ السلام) نبی بنا کر بھیجے گئے۔ دوسری شاخ کا نام ثمود یا عاد ثانیہ ہے جس کی طرف حضرت صالح (علیہ السلام) نبی بنا کر بھیجے گئے اور ارم کا لفظ عاد اولیٰ اور ثمود دونوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ ان دونوں شاخوں کا اصل ارم ہے۔

(تفسیر امداد الکرم)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی (ہم قبیلہ) ہود کو بھیجا، انھوں نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہاری عبادت کا کوئی مستحق نہیں ہے، تو کیا تم نہیں ڈرتے"۔

حضرت ھود (علیہ السلام) کا شجرہ نسب:

حضرت ھود (علیہ السلام) کا شجرہ نسب یہ ہے: ھود بن عبداللہ بن رباح بن الجارود بن عاد بن عوض بن ارم بن سام بن نوح نبی اللہ (علیہ السلام)۔

ایک قول یہ ہے کہ ھود (علیہ السلام) نے جامع دمشق میں ایک باغ بنایا تھا اور ان کی قبر وہیں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان کی قبر مکہ میں ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ ان کی قبر یمن میں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو سب سے پہلا نبی مبعوث کیا وہ ادریس (علیہ السلام) ہیں۔ (یہ حافظ ابن عساکر کی تحقیق ہے۔ جمہور کے نزدیک حضرت نوح (علیہ السلام) اول رسل ہیں) پھر حضرت نوح، پھر حضرت ابراہیم، پھر حضرت اسماعیل، پھر حضرت اسحاق، پھر حضرت یعقوب، پھر حضرت یوسف، پھر حضرت لوط، پھر حضرت ھود بن عبداللہ علیہم السلام۔

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: دس نبیوں کے علاوہ باقی تمام انبیاء بنو اسرائیل سے مبعوث ہوئے ہیں۔ وہ دس نبی یہ ہیں: حضرت نوح، حضرت ھود، حضرت لوط، حضرت صالح، حضرت شعیب، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت عیسیٰ اور حضرت سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (یہ گیارہ بنتے ہیں)

حضرت ھود (علیہ السلام) کی قوم عاد کی طرف بعثت:

حضرت ھود (علیہ السلام) کی قوم عاد تھی یہ لوگ بت پرست تھے۔ انھوں نے بھی ود، سواع، یغوث اور نسر کی طرح بت بنا لیے تھے ان کے ایک بت کا نام ھبار تھا اور ایک بت کا نام صمود تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف حضرت ھود کو بھیجا، حضرت ھود کا تعلق اس قبیلہ سے تھا جس کا نام الخلود تھا۔ حضرت ھود متوسط نسبت کے تھے

اور مکرم جگہ کے رہنے والے تھے بہت حسین و جمیل تھے اور عاد کی طرح جسیم تھے۔ اور آپ کی داڑھی بہت دراز تھی۔ حضرت ھود نے ان لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دی اور ان کو یہ حکم دیا کہ وہ اللہ کو ایک مانیں اور لوگوں پر ظلم نہ کریں۔ اس کے علاوہ انھیں اور کوئی حکم نہیں دیا اور انھیں نماز یا کسی اور حکم شرعی کی دعوت نہیں دی، لیکن انھوں نے اللہ کو ماننے سے انکار کیا اور حضرت ھود (علیہ السلام) کی تکذیب کی اور انھوں نے کہا: ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے عاد کے بھائی کی طرف ھود کو بھیجا اور حضرت ھود ان کی قوم کے ایک فرد تھے اور ان کے دینی بھائی نہ تھے۔ (مختصر تاریخ دمشق، ج 27، ص 146۔149، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1411ھ)

حضرت ھود نے کہا: یاد کرو تم قوم نوح کے جانشین ہو اور تم کو معلوم ہے جب انھوں نے نافرمانی کی تو ان پر کس طرح عذاب آیا تھا تم اس سے عبرت کیوں نہیں پکڑتے۔ اللہ تعالیٰ نے متعدد سورتوں میں قوم عاد کی تفسیل بیان کی ہے ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر حسب ذیل ہے:

عاد کی قوت اور سطوت اور ان پر عذاب نازل ہونے کے متعلق قرآن مجید کی آیات:

اور یاد کیجیے عاد کے بھائی (ہم قبیلہ) کو جب انھوں نے اپنی قوم کو "الاحقاف" میں ڈرایا اور ان سے پہلے کئی ڈرانے والے پیغمبر گزر چکے تھے کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو مجھے تم پر ایک عظیم دن کے عذاب کا خوف ہے۔ (الاحقاف: 21)

یمامہ، عمان، بحرین، حضر موت اور مغربی یمن کے بیچ میں جو صحرائے اعظم "الدہنا" یا "الربع الخالی" کے نام سے واقع ہے وہ الاحقاف ہے یہ بہت بڑا ریگستان ہے۔ ہر چند کہ یہ آبادی کے قابل نہیں ہے لیکن اس کے اطراف میں کہیں کہیں آبادی کے لائق تھوڑی زمین ہے۔ خصوصاً اس حصہ میں جو حضرت موت سے نجران تک پھیلا ہوا ہے۔ اگرچہ اس وقت بھی وہ آباد نہیں ہے تاہم زمانہ قدیم میں اسی حضرت موت اور نجران کے درمیانی حصہ میں "عاد ارم" کا مشہور قبیلہ آباد تھا، جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کی نافرمانی کی پاداش میں نیست و نابود کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (قوم عاد نے) کہا کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم کو ہمارے معبودوں سے برگشتہ کر دو، تو تم وہ (عذاب) ہم پر لے آؤ جس کا تم ہم سے وعدہ کر رہے ہو، اگر تم سچوں میں سے ہو۔ ھود نے فرمایا: علم تو اللہ ہی کے پاس ہے اور میں تمہیں وہی پیغام پہنچاتا ہوں جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں، لیکن میں گمان کرتا ہوں کہ تم جاہل لوگ ہو۔ پھر جب انھوں نے اس (عذاب) کو بادل کی طرح اپنے میدانوں کی طرف آتے دیکھا تو کہنے لگے یہ بادل ہے جو ہم پر برسے گا (نہیں) بلکہ یہ وہ عذاب ہے جس کو تم نے جلدی طلب کیا ہے یہ ایک (سخت) آندھی ہے جس میں دردناک عذاب ہے۔ یہ ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے برباد کر ڈالے گی، پھر انھوں نے اس حال میں صبح کی کہ ان کے گھروں کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی ہم مجرموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔ اور بیشک ہم نے انھیں ان چیزوں پر قدرت دی تھی جن پر تمہیں قدرت نہیں دی۔ اور ہم نے ان کے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تو ان کے کان اور آنکھیں اور دل ان کے کچھ کام نہ آسکے کیونکہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور ان کو اس عذاب نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ (الاحقاف: 22-26)

جس وقت ان پر عذاب آیا اس وقت قحط اور خشک سالی تھی جب انھوں امنڈتا ہوا بادل دیکھا تو خوش ہو کر کہنے لگے بہت برسنے والی گھٹا آئی ہے اب سب ندی نالے بھر جائیں گے اور خوش حالی آجائے گی لیکن یہ بڑے زور کی آندھی تھی جو سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلتی رہی اور اس کے زور کے سامنے آدمی، رخت اور جانور تنکوں کی مانند تھے۔ یہ آندھی ہر چیز کو اکھاڑ کر پھینک رہی تھی اور ہر چیز تباہ کر رہی تھی اور سوائے مکانوں کے کھنڈرات کے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (حضرت ھود نے اپنی قوم سے کہا) کیا تم ہر اونچے مقام پر فضول کاموں کے لیے یادگار تعمیر کرتے ہو۔ اور اس امید پر بلند و بالا عمارات بناتے ہو کہ تم ان میں ہمیشہ رہو گے۔ اور جب تم کسی کو پکڑتے ہو تو سخت جابروں کی طرح پکڑتے ہو۔ سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اور اس سے ڈرو جس نے تمہاری ان چیزوں سے مدد کی جن کو تم جانتے ہو۔ اس نے تمہاری چوپایوں اور بیٹوں سے مدد کی۔ اور باغوں اور چشموں سے۔ بیشک مجھے تم پر عظیم دن کے عذاب کا خوف ہے۔ انھوں نے کہا ہمارے لیے برابر ہے آپ نصیحت کریں یا نصیحت کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔ یہ صرف وہی پرانے لوگوں کی عادت ہے۔ اور ہم عذاب یافتہ نہیں ہوں گے۔ سو انھوں نے ھود کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو ہلاک کر دیا، بیشک اس میں ضرور نشانی ہے اور ان کے اکثر لوگ مومن نہ تھے۔ اور بیشک آپ کا رب ہی ضرور غالب ہے، بے حد رحم فرمانے والا۔ (الشعراء: 128۔140)

نیز فرمایا: کیا آپ نے نہ دیکھا کہ آپ کے رب نے قوم عاد کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ ارم (کے لوگ) ستونوں (کی طرح لمبے قد) والے۔ جن کی مثل شہروں میں کوئی پیدا نہ کیا گیا تھا۔ (الفجر: 6-8)

نیز فرمایا: رہی قوم عاد تو اس نے زمین میں ناحق سر کشی کی اور کہا ہم سے زیادہ قوت والا کون ہے؟ کیا انھوں نے یہ نہیں جانا کہ اللہ جس نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ قوت والا ہے اور وہ ہماری آیتوں کا انکار (ہی) کرتے رہے۔ سو ہم نے (ان کی) نحوست کے دنوں میں ان پر خوفناک آواز والی آندھی بھیجی تا کہ ہم انھیں دنیا کی زندگی میں ذلت والا عذاب چکھائیں اور آخرت کا عذاب تو یقیناً زیادہ ذلت والا ہے اور ان کی بالکل مدد نہیں کی جائے گی۔ (حم السجدہ: 15۔16)

نیز فرمایا: بیشک ہم نے ان پر نہایت سخت، تیز آواز والی آندھی بھیجی (ان کے حق میں) دائمی نحوست کے دن میں۔ وہ آندھی لوگوں کو (اس طرح) اٹھا کر (زمین پر) دے مارتی تھی گویا کہ وہ کھجور کے اکھڑے ہوئے درختوں کی جڑیں ہیں۔ تو کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا خوف دلانا۔ (القمر: 19۔21)

نیز فرمایا: اور رہے قوم عاد کے لوگ تو وہ ایک سخت گرجتی ہوئی نہایت تیز آندھی سے ہلاک کیے گئے۔ اللہ نے اس آندھی کو ان پر سات راتوں اور آٹھ دنوں تک متواتر مسلط کر دیا تھا وہ آندھی جڑ کاٹنے والی تھی، سو (اے مخاطب اگر) تو (اس وقت وہاں موجود ہوتا تو) اس قوم کو اس طرح گرا ہو دیکھتا کہ گویا وہ گری ہوئی کھجوروں کے تنے (پڑے) ہیں۔ سو کیا تجھ کو ان میں کا کوئی بچا ہوا نظر آتا ہے۔ (الحاقہ: 6۔8)

قوم عاد کے وطن کی تاریخی حیثیت:

اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ قوم عاد الاحقاف میں رہتی تھی۔ (الاحقاف: 21)

علامہ محمد بن مکرم بن منظور الافریقی المصری التوفی 711ھ لکھتے ہیں:

الاحقاف کا معنی ہے ریگستان، جوہری نے کہا کہ الاحقاف عاد کا وطن ہے، ازہری نے کہا یہ یمن کے شہروں کا ریگستان ہے قوم عاد یہاں رہتی تھی۔ (لسان العرب، ج 9، ص 52، مطبوعہ نشر ادب الحوذۃ ایران، 1405ھ)

علامہ سید محمد مرتضی زبیدی حنفی متوفی 1205ھ لکھتے ہیں: حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: الاحقاف ارض مہرہ اور عمان کے درمیان ایک وادی ہے۔ ابن اسحاق نے کہا: الاحقاف عمان سے لے کر حضرت موت تک ایک وادی ہے۔ قتادہ نے کہا: الاحقاف ارض یمن میں بلندی پر ایک ریگستان ہے۔ یاقوت حموی نے کہا ان تینوں اقوال میں اختلاف نہیں ہے۔ (تاج العروس، ج 6، ص 74، مطبوعہ مطبعہ الخیریہ، مصر، 1306ھ۔ معجم البلدان، ج 1، ص 115، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1399ھ)

علامہ پیر محمد کرم شاہ الازہری متوفی 1418ھ (رح) لکھتے ہیں: قرآن کریم میں احقاف سے مراد وہ ریگستان ہے جو عمان سے حضرت موت تک پھیلا ہوا ہے، اس کا کل رقبہ تین لاکھ مربع میل بتایا جاتا ہے اسے الربع الخالی بھی کہتے ہیں۔ بعض مقامات پر ریت اتنی باریک ہے کہ جو چیز وہاں پہنچے، اندر دھنستی چلی جاتی ہے۔ بڑے بڑے مہم جو سیاح بھی اس کو عبور کرنے کی جرات نہیں کرتے۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں کسی زمانہ میں اپنے عہد کی ایک طاقتور زبردست اور متمول قوم آباد تھی۔ (ضیاء القرآن، ج 4، ص 490، مطبوعہ ضیاء القرآن، پبلیکیشنز، لاہور، 1399ھ)

سید ابوالاعلی مودودی لکھتے ہیں: الاحقاف صحرائے عرب (الربع الخالی) کے جنوب مغربی حصہ کا نام ہے جہاں آج کوئی آبادی نہیں ہے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ عاد کا علاقہ عمان سے یمن تک پھیلا ہوا تھا۔ اور قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ ان کا اصل وطن الاحقاف تھا۔ جہاں سے نکل کر وہ گردوپیش کے ممالک میں پھیلے اور کمزور قوموں پر چھا گئے۔ آج کے زمانہ تک بھی جنوبی عرب کے باشندوں میں یہی بات مشہور ہے کہ عاد اسی علاقہ میں آباد تھے۔ موجودہ شہر سے تقریباً 152 میل کے فاصہ پر شمال کی جانب میں حضرت موت میں ایک مقام ہے جہاں لوگوں نے حضرت ہود کا مزار بنا رکھا ہے اور وہ قبر ھود کے نام سے ہی مشہور ہے۔ ہر سال پندرہ شعبان کو وہاں عرس ہوتا ہے اور عرب کے مختلف حصوں سے ہزاروں آدمی وہاں جمع ہوتے ہیں۔ یہ قبر اگرچہ تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے لیکن اس کا وہاں بنایا جانا اور جنوبی عرب کے لوگوں کا کثرت سے اس کی طرف رجوع کرنا کم از کم اس بات کا ثبوت ضرور ہے کہ مقامی روایات اسی علاقہ کو قوم عاد کا علاقہ قرار دیتی ہیں۔

الاحقاف کی موجودہ حالت کو دیکھ کر کوئی شخص یہ گمان نہیں کر سکتا کہ کبھی یہاں ایک شاندار تمدن رکھنے والی طاقتور قوم آباد ہو گی۔ اغلب یہ ہے کہ ہزاروں برس پہلے یہ ایک شاداب علاقہ ہوگا اور بعد میں آب و ہوا کی تبدیلی نے اسے ریگ زار بنادیا ہوگا۔ آج اس کی حالت یہ ہے کہ وہ ایک لق ودق ریگستان ہے جس کے اندرونی حصوں میں جانے کی بھی کوئی ہمت نہیں رکھتا۔ 1843ء میں بویریا کا ایک فوجی آدمی اس کے جنوبی کنارہ پر پہنچ گیا۔ وہ کہتا ہے کہ حضرت موت کی شمالی سطح مرتفع پر سے کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو یہ صحرا ایک ہزار فیٹ نشیب میں نظر آتا ہے۔ اس میں جگہ جگہ ایسے سفید قطعے ہیں جن میں کوئی چیز گر جائے تو وہ ریت میں غرق ہوتی چلی جاتی ہے اور بالکل بوسیدہ ہو جاتی ہے۔ عرب کے بدو اس علاقہ سے بہت ڈرتے ہیں اور کسی قیمت پر وہاں جانے کے لیے راضی نہیں ہوتے۔ ایک موقع پر جب بدو اسے وہاں لے جانے پر راضی نہ ہوئے تو وہ اکیلا وہاں گیا۔ اس کا بیان ہے کہ یہاں کی ریت بالکل سفوف کی طرح ہے۔ میں دور سے ایک شاقول اس میں پھینکا تو وہ پانچ منٹ کے اندر اس میں غرق ہو گیا اور اس رسی کا سرا جل گیا جس کے ساتھ وہ بندھا ہوا تھا۔

مفصل معلومات کے لیے ملاحظہ ہو: Arabia And The Isles Harold ingrams, London, 1946

(تفہیم القرآن، ج 4، ص 615، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، مارچ 1983ء)

صالحین کے عرس کی تحقیق:

سید ابوالاعلی مودودی کے اس اقتباس سے جہاں الاحقاف کی تاریخی حیثیت پر روشنی پڑتی ہے، وہاں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ نبیوں اور مقدس اور برگزیدہ بندوں کا عرس منانا صرف اہل سنت بریلی مکتبہ فکر کی اختراع نہیں ہے بلکہ دنیا کے ہر خطہ میں مسلمان بزرگوں کا عرس مناتے ہیں۔ عرس کی معنوی اصل یہ ہے۔

امام محمد بن عمر الواقد متوفی 2074ھ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہر سال شہداء احد کی قبروں کی زیارت کرتے تھے، جب آپ گھاٹی میں داخل ہوتے تو بہ آواز بلند فرماتے: السلام علیکم، کیونکہ تم نے صبر کیا، پس آخرت کا گھر کیا ہی اچھا ہے! پھر حضرت ابوبکر (رض) ہر سال اسی طرح کرتے تھے۔ پھر حضرت عمر بن خطاب ہر سال اسی طرح کرتے تھے۔ پھر حضرت عثمان (رض)۔ (کتاب المغازی، ج 1، ص 313، مطبوعہ عالم الکتب بیروت، 1404ھ، دلائل النبوۃ، ج 3، ص 308، مطبوعہ بیروت، شرح الصدور، ص 210، دار الکتب العلمیہ، بیروت 404۔ در منثور، ج 4، ص 568، مصنف عبدالرزاق، 573 (قدیم) رقم الحدیث (جدید) 6745۔

اور عرس کی لفظی اصل یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ قبر میں منکر نکیر آکر سوال کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تم اس شخص کے متعلق کیا کہا کرتے تھے اور جب مردہ یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور کلمہ شہادت پڑھتا ہے تو اس کی قبر وسیع اور منور کر دی جاتی ہے اور اس سے کہتے ہیں کہ اس عروس کی طرح سو جاؤ جس کو اس کے اہل میں سب سے زیادہ محبوب کے سوا کوئی بیدار نہیں کرتا۔ (الحدیث) (سنن الترمذی، رقم الحدیث: 1073، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

اس حدیث میں مومن کے لیے عروس کا لفظ وارد ہے اور عروس کا لفظ عرس سے ماخوذ ہے اور یہ عرس کی لفظی اصل ہے۔ عرس کی حقیقت یہ ہے کہ سال کے سال صالحین اور بزرگان دین کے مزارات کی زیارت کی جائے۔ ان پر سلام پیش کیا جائے اور ان کی تعریف و توصیف کے کلمات کہے جائیں اور اتنی مقدار سنت ہے، اور قرآن شریف پڑھ کر اور صدقہ و خیرات کا انھیں ثواب پہنچانا یہ بھی دیگر احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور ان کے وسیلہ سے دعا کرنا اور ان سے اپنی حاجات میں اللہ سے دعا کرنے اور شفاعت کرنے کی درخواست کرنا اس کا ثبوت امام طبرانی کی اس حدیث سے ہے جس میں عثمان بن حنیف نے ایک شخص کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے دعا کرنے اور آپ سے شفاعت کی درخواست کرنے کی ہدایت کی۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ (المعجم الصغیر، ج 1، ص 1184۔183، مطبوعہ مکتبہ سلفیہ، مدینہ منورہ، 1388ھ، حافظ منذری متوفی 656ھ نے بھی اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ (الترغیب والترہیب، ج 1، ص 474۔476، اور شیخ ابن تیمیہ متوفی 728ھ نے بھی اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ فتاوی ابن تیمیہ، ج 1، ص 274۔273)

اسی طرح امام ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر (رض) کے زمانہ میں ایک بار قحط پڑ گیا تو حضرت بلال بن حارث (رض) نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر مبارک پر حاضر ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ! اپنی امت کے لیے بارش کی دعا کیجیے کیونکہ وہ ہلاک ہو رہے ہیں۔ (الحدیث) (المصنف، ج 12، ص 32، مطبوعہ کراچی، حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس حدیث کے متعلق فرمایا کہ اس کی سند صحیح ہے، فتح الباری، ج 2، ص 495-496، مطبوعہ لاہور)
ان تمام مباحث کی تفصیل کے لیے شرح صحیح مسلم جلد 7 کا مطالعہ فرمائیں۔
خلاصہ یہ ہے کہ ہر سال صالحین کے مزارات کی زیارت کے لیے جانا، ان کو سلام پیش کرنا اور ان کی تحسین کرنا نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور خلفاء راشدین کی سنت ہے۔ اور ان کے لیے ایصال ثواب کرنا اور ان کے وسیلہ سے دعا کرنا اور ان سے شفاعت کی درخواست کرنا بھی صحابہ کرام کی سنت ہے اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، اور ہمارے نزدیک عرس منانے کا یہی طریقہ ہے۔ باقی اب جو لوگوں نے اس میں اپنی طرف سے اضافات کرلیے ہیں، وہ بزرگان دین کی نذر اور منت مانتے ہیں اور ڈھول، باجوں گاجوں کے ساتھ جلوس کی شکل میں ناچتے گاتے ہوئے اوباش لڑکے چادر لے کر جاتے ہیں اور چادر چڑھانے کی بھی منت مانی جاتی ہے اور مزارات پر سجدے کرتے ہیں اور مزار کے قریب میلہ لگایا جاتا ہے اور مزامیر کے ساتھ گانا بجانا ہوتا ہے اور موسیقی کی ریکارڈنگ ہوتی ہے تو یہ تمام امور بدعت سیہ قبیحہ ہیں۔ علماء اہل سنت وجماعت ان سے بری اور بیزار ہیں۔ یہ صرف جہلاء کا عمل ہے اور ہم اللہ تعالیٰ سے ان کی ہدایت کی دعا کرتے ہیں۔
(تفسیر تبیان القراان)

آیت مبارکہ:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝٦٦

لغۃ القرآن: قَالَ :فرمایا] [الْمَلَاُ :سرداروں نے] [الَّذِيْنَ :وہ لوگ جو] [كَفَرُوْا :سب نے کفر کیا] [مِّنْ :سے] [قَوْمِهٖٓ :اس کی قوم] [اِنَّا :بیشک ہم] [لَنَرٰىكَ :یقینا دیکھتے ہیں تجھے] [فِيْ :میں] [سَفَاهَةٍ :بےوقوفی] [وَّاِنَّا :اور بیشک ہم] [لَنَظُنُّكَ :یقینا گمان کرتے ہیں تجھے] [مِنَ :سے] [الْكٰذِبِيْنَ :جھوٹوں]

ترجمہ: ان کی قوم کے سرداروں اور رئیسوں نے جو کفر (یعنی دعوت حق کی مخالفت ومزاحمت) کر رہے تھے کہا: (اے ہود!) بیشک ہم تمہیں حماقت (میں مبتلا) دیکھتے ہیں اور بیشک ہم تمہیں جھوٹے لوگوں میں گمان کرتے ہیں

تشریح: آپ کی شفقت بھری دعوت کا ردعمل یہ ہوا کہ آپ کی قوم کے سرداروں نے آپ کو بیوقوف اور جھوٹا تک کہنا شروع کر دیا لیکن آپ کی جبین پر بل تک نہ آیا۔ اور نوح (علیہ السلام) کی طرح بڑی نرمی اور وضاحت سے اپنی سچائی اور اپنی دعوت کی صداقت کو واضح فرمایا۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ شفقت وخلوص کے مجسموں کو ان دل آزار الزامات سے متہم کیا جاتا ہے اور وہ بڑے حوصلے اور ہمت سے اپنا کام کرتے چلے جاتے ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری)
حضرت ھود (علیہ السلام) کے قصہ اور حضرت نوح (علیہ السلام) کے قصہ کے مابین فرق:
حضرت ھود (علیہ السلام)، حضرت نوح (علیہ السلام) کے بعد مبعوث ہوئے تھے اس لیے حضرت ھود (علیہ السلام) کے قصہ کو حضرت نوح (علیہ السلام) کے قصہ کے بعد ذکر فرمایا ہے اور اس قصہ میں مذکور ابتدائی آیات تقریبا ویسی ہی ہیں جیسی حضرت نوح (علیہ السلام) کے قصہ میں ذکر کی گئی، البتہ بعض وجوہ سے ان میں فرق ہے:

1۔ حضرت نوح (علیہ السلام) کے قصہ میں عبادت کا حکم دینے کے بعد انھوں نے فرمایا تھا مجھے تم پر ایک عظیم دن کے عذاب کا خطرہ ہے (الاعراف: 59)۔ اور اس قصہ میں حضرت ھود نے عبادت کا حکم دینے کے بعد فرمایا: تو کیا تم نہیں ڈرتے! (الاعراف: 65)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) پہلے رسول تھے اور ان سے پہلے دنیا میں کسی بڑے عذاب کے نازل ہونے کا واقعہ پیش نہیں آیا تھا، اس لیے انھوں نے کہا: مجھے تم پر ایک عظیم دن کے عذاب کا خطرہ ہے، اور چونکہ حضرت ھود (علیہ السلام)، حضرت نوح (علیہ السلام) کے بعد مبعوث ہوئے تھے اور طوفان نوح کا واقعہ تواتر سے مشہور ہو چکا تھا، اس لیے انھوں نے صرف اس کہنے پر اکتفا کیا تو پس کیا تم ڈرتے نہیں ہو!

2۔ حضرت نوح (علیہ السلام) سے منکروں نے کہا تھا! ہم آپ کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتے ہیں (الاعراف: 60) اور حضرت ھود (علیہ السلام) سے منکروں نے کہا: ہم آپ کو حماقت میں مبتلا پاتے ہیں اور ہم آپ کو جھوٹوں سے گمان کرتے ہیں۔ (الاعراف: 66)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) بہت بڑی کشتی بنا کر خود کو تھکا رہے تھے اور آپ نے لوگوں کو ایک بہت بڑے طوفان کی آمد سے خبردار کیا تھا اور چونکہ اس سے پہلے طوفان کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی تھی اس لیے منکرین نے کہا آپ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں، اور حضرت ھود (علیہ السلام) نے بتوں کی عبادت کو باطل قرار دیا تھا اور ان کی عبادت کو بے وقوفی فرمایا تھا اس لیے انھوں نے بھی مقابلتاً توحید کی دعوت دینے کو بے وقوفی کہا۔

3۔ حضرت نوح (علیہ السلام) نے فرمایا تھا: میں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور حضرت ھود (علیہ السلام) نے فرمایا: میں تمہارا قابل اعتماد خیر خواہ ہوں۔ (الاعراف: 68) حضرت نوح (علیہ السلام) چونکہ دعوت کی بار بار تجدید کرتے تھے اس لیے انھوں نے جملہ فعلیہ استعمال فرمایا اور حضرت ھود (علیہ السلام) ثبوت اور استقرار کے ساتھ دعوت دیتے تھے اس لیے اس کو جملہ اسمیہ کے ساتھ تعبیر فرمایا: نیز حضرت ھود کی قوم نے ان کو جھوٹوں کی طرف منسوب کیا تھا اس لیے انھوں نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا تم تو مجھے پہلے امین کہتے تھے اور میں تمہارے نزدیک معتمد تھا تو اب اچانک میں بیوقوف کیسے ہو گیا!

4۔ حضرت نوح (علیہ السلام) کے قصہ میں یہ فرمایا تھا: کیا تمہیں اس پر تعجب ہے کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے تم ہی میں سے ایک مرد کے ذریعہ نصیحت آئی ہے تاکہ وہ تم کو ڈرائے۔ (الاعراف: 62) اور حضرت ھود (علیہ السلام) نے اس کے بعد یہ بھی فرمایا: اور یاد کرو جب قوم نوح کے بعد اللہ نے تم کو ان کا جانشین بنا دیا اور تمہاری جسامت کو بڑھا دیا سو تم اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔ (الاعراف: 69)

حضرت ھود (علیہ السلام) نے اپنی قوم پر اللہ تعالیٰ کی دو نعمتوں کا ذکر فرمایا ایک تو یہ کہ انھیں حضرت نوح (علیہ السلام) کے بعد ان کی زمین کا وارث بنایا اور دوسری یہ کہ ان کو قوم نوح سے زیادہ بڑی جسامت اور قوت عطا فرمائی۔ امام بغوی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ان کی قامت اسی ذراع (ایک سو بیس فٹ) تھی۔ وہب نے کہا: ان میں سے ایک آدمی کا سر بڑے گنبد کی طرح تھا۔ (معالم التنزیل، ج 2، ص 142، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت) حضرت ھود نے فرمایا: ان نعمتوں کو یاد کرو یعنی ایسے عمل کرو جو ان نعمتوں کے لائق ہوں یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اس کی نعمتوں کا شکر کرو۔

حضرت نوح اور ھود (علیہما السلام) کے مقابلہ میں سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زیادہ عزت اور وجاہت:

حضرت نوح (علیہ السلام) کے قصہ میں مذکور ہے کہ جب منکروں نے حضرت نوح (علیہ السلام) کی طرف ایک عیب کی نسبت کی اور ان سے کہا کہ آپ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں تو انھوں نے اس عیب سے خود اپنی برات کی اور کہا: اے میری قوم مجھ میں گمراہی نہیں ہے (الاعراف: 60) اور حضرت ھود (علیہ السلام) کے قصہ میں مذکور ہے کہ جب منکروں نے ان سے کہا کہ ہم آپ کو حماقت میں مبتلا پاتے ہیں تو انھوں نے خود اپنی برات کی اور کہا: اے میری قوم مجھ میں حماقت نہیں ہے۔

اور جب سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف مشرکین نے عیوب کی نسبت کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی برات کے لیے نہیں چھوڑا بلکہ اللہ نے آپ کی طرف سے برات بیان کی۔ ولید بن مغیرہ نے آپ کو مجنون کہا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "ما انت بنعمۃ ربک بمجنون۔ وان لک لاجرا غیر ممنون۔ وانک لعلی خلق عظیم: آپ اپنے رب کے فضل سے (ہرگز) مجنون نہیں ہیں۔ اور یقیناً آپ کے لیے غیر متناہی اجر وثواب ہے۔ اور بیشک آپ خلق عظیم پر فائز ہیں" (القلم: 2-4)

عاص بن وائل نے آپ کو ابتر (مقطوع النسل) کہا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا (انا اعطینٰک الکوثر۔ فصل لربک وانحر۔ ان شانئ ھو الابتر: بیشک ہم نے آپ کو خیر کثیر عطا فرمائی۔ تو آپ اپنے رب کے لیے نماز پڑھیں اور قربانی کریں۔ یقیناً آپ کا دشمن ہی ابتر (مقطوع النسل ہے)

جب اللہ نے اپنی کسی حکمت کی وجہ سے چند دن آپ پر وحی نازل نہیں کی تو ایک مشرک عورت نے کہا (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان کے رب نے چھوڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "والضحی واللیل اذا سجی۔ ماودعک ربک وما قلی: چاشت کی قسم۔ اور رات کی قسم جب سیاہی پھیل جائے۔ آپ کے رب نے آپ کو نہیں چھوڑا اور نہ وہ آپ سے بیزار ہوا" (الضحی۔ 1۔ 3)

جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سب لوگوں کو، کوہ صفا پر جمع کرکے دعوت توحید کی تو ابولہب نے کہا تبالک تم پر تباہی ہو تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "تبت یدا ابی لھب وتب ما اغنی عنہ مالہ وما کسب۔ سیصلی نارا ذات لہب۔ وامراتہ حمالۃ الحطب: ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ تباہ ہو گیا۔ اس کو اس کے مال اور کمائی نے کوئی فائدہ نہ دیا۔ وہ عنقریب سخت شعلوں والی آگ میں داخل ہوگا۔ اور اس کی عورت (بھی) لکڑیوں کا گٹھا (سر پر) اٹھائے ہوئے" (اللھب: 1۔ 4)

رسول اللہ کا مقام تو بہت بلند ہے آپ کے قرابت دار اور اصحاب بھی اللہ کو اتنے عزیز تھے کہ اگر کسی نے ان کو عیب لگایا تو اللہ تعالیٰ نے اس عیب سے ان کی برات بیان کی، حضرت ام المومنین عائشہ (رض) پر جب منافقین نے تہمت لگائی تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ نور کی دس آیتوں میں (النور: 11۔ 20)۔ حضرت عائشہ (رض) کی برات بیان کی۔ اور جب منافقین نے صحابہ کرام کو سفہاء (جاہل احمق) کہا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی برات بیان کی۔ قرآن مجید میں ہے: " قالوا انومن کما امن السفہاء الا انہم ھم السفہاء ولکن لا یعلمون: انھوں نے کہا: کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جس طرح یہ بیوقوف ایمان لائے ہیں سنو یقیناً وہی بیوقوف ہیں، لیکن وہ نہیں جانتے " (البقرہ: 13) (تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ:

قَالَ يٰقَوۡمِ لَيۡسَ بِىۡ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّىۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ○٦٧

لغۃ القرآن: قَالَ: فرمایا] [يٰقَوْمِ: اے میری قوم] [لَيْسَ: ''کہ ''نہ ہو] [بِيْ: مجھ کو] [سَفَاهَةٌ: کوئی بےوقوفی] [وَّلٰكِنِّيْ: اور لیکن میں] [رَسُوْلٌ: ایک رسول] [مِّنْ: سے] [رَبِّ: رب ہے] [الْعٰلَمِيْنَ: تمام جہانوں کا]

ترجمہ: انھوں نے کہا: اے میری قوم! مجھ میں کوئی حماقت نہیں لیکن (یہ حقیقت ہے کہ) میں تمام جہانوں کے رب کی طرف سے رسول (مبعوث ہوا) ہوں

تشریح: کفار نے سمجھا کہ ہود (علیہ السلام) پر ان کے جھوٹے خداؤں نے اثر کر دیا ہے اور وہ دماغ چھوڑ بیٹھے ہیں اس لیے ساری قوم کو گمراہ کہہ رہے ہیں آپ نے انھیں جواب دیا مجھے کچھ دماغی عارضہ لاحق نہیں کیونکہ میں اللہ کا رسول ہوں اور انبیاء و رسل کسی دماغی عارضہ میں مبتلا نہیں ہو سکتے ورنہ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا دماغ پہلے ہی درست نہ تھا اگر اس نے دعویٰ نبوت کیا ہے تو ایسے پاگل شخص سے یہی متوقع ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

اس سے معلوم ہوا کہ نبوت اور سفاہت جمع نہیں ہو سکتی نبی کامل عقل والے ہوتے ہیں اور ہمیشہ ہدایت پر ہوتے ہیں۔ ایک آن کے لیے بھی رب سے غافل نہیں ہوتے ورنہ لکن کے معنی درست نہیں ہو سکتے خیال رہے کہ تمام جہان کی عقل نبی کی عقل کی نسبت سے ایسی ہے جیسے قطرہ سمندر کی نسبت سے۔

(تفسیر نور العرفان)

حضرات انبیاء واقف تھے کہ کافر انتہائی گمراہ اور احمق ہیں لیکن انھوں نے تہذیب اور حلم سے کام لے کر مقابلہ سے پہلو تہی کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء اپنی امتوں کے کتنے ہی خواہ کافروں پر کتنے مہربان' قوت برداشت میں کتنے کامل اور حسن خطاب کے ذریعہ دلوں کو ہدایت کی طرف کس قدر کھینچنے والے تھے اس گفتگو کو نقل کرکے اللہ نے بندوں کو تعلیم دی ہے کہ بیوقوفوں سے کس طرح خطاب کیا جائے۔ (تفسیر گلدستہ)

عقلمند، انبیائے کرام کی قدر اور بیوقوف مخالفت کرتے ہیں:

دراصل بات یہ ہے کہ ہر عقل مند ہمیشہ ہر ایک معاملہ میں پورے غور و خوض کے بعد کسی معاملے کا فیصلہ کرتا ہے۔ وہ انسان بڑا ہی ناعاقبت اندیش اور بے وقوف ہے کہ کسی بات کی تہہ تک پہنچنے سے پہلے کوئی قطعی فیصلہ کر لے۔ انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کرنے والے بیوقوفوں کو پہلے یہ سوچ لینا چاہئے تھا کہ یہ حضرات کیا کہہ رہے ہیں؟ کیوں کہہ رہے ہیں؟ اس کہنے میں کیا ان کی کوئی ذاتی غرض یا دنیوی نفع مطلوب ہے؟ یا محض ہماری خیر خواہی کی بنا پر کہہ رہے ہیں؟ اور آیا ان کی اتباع کرنے میں ہمارا نفع ہے یا نقصان؟ آیا اس قسم کے آدمی پہلے بھی ہوتے آئے ہیں اور ان کی موافقت کرنے والوں کو کیا پھل ملا اور مخالفت کرنے والوں نے کیا نتیجہ بھگتا؟ وغیرہ وغیرہ، اگر یہ لوگ عقلمندی سے کام لیتے تو کبھی ان کی مخالفت نہ کرتے۔ بالخصوص مرنے کے بعد کے حالات حضرات انبیاء علیہم السلام ہی بتلا سکتے تھے، اگر مخالفت کرنے والے عقلمند ہوتے تو ان کی قدر کرتے کہ یہ حضرات مرنے کے بعد کی مصیبتوں سے بچنے کیلئے ہماری رہنمائی فرمارہے ہیں۔ ان کا بڑا ہی احسان ہے۔

انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے انسان ہوتے ہیں:

اب جو شخص یا جو قوم اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور چیدہ انسان کا مذاق اُڑائے اور ٹھٹھا کرے، اس سے بڑھ کر بھی کوئی احمق اور بے وقوف ہو سکتا ہے؟ انبیاء علیہم السلام کا پر گزشتہ قومیں ہمیشہ مذاق اڑاتی رہیں اور عذاب الٰہی میں مبتلا ہو کر لعنت کی موت سے نابود ہوئیں۔ (تفسیر لاہوری)

مرزا غلام احمد قادیانی کا مراق:

مگر یہ سچے انبیاء و رسل کی بات ہے جھوٹے نبی اکثر پاگل لوگ ہی تھے اور پاگل پن ہی میں انھوں نے دعویٰ نبوت کیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کو بھی مراق کی بیماری تھی اس نے خود کہا مجھے بھی کبھی کبھی مراق کا دورہ پڑتا ہے۔ (رویو قادیان صفحہ 11 بابت اگست 1946) ایک قادیانی محقق نے کہا مرزا صاحب کا مراق (جنون) موروثی نہ تھا بلکہ خارجی اثرات سے پیدا ہوا تھا۔ (رسالہ رویو قادیان صفحہ 10 بابت اگست 1926ء) اور ہندوستان کے مشہور حکیم شمس الاطباء حکیم غلام جیلانی لکھتے ہیں مراق مالیخولیا کی ایک قسم ہے جس میں مریض کو خودی کے خیالات آتے ہیں اور وہ بڑے بڑے دعوے کرتا ہے (مخزن حکمت بحوالہ سیارہ ڈائجسٹ قادیانیت صفحہ 32)

گویا مرزا قادیانی نے مراق کی وجہ سے دعویٰ نبوت کیا تھا۔ حضور خاتم المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد باب نبوت بند ہو گیا ہے اب جو دعویٰ نبوت کرے وہ یقیناً پاگل ہے۔ تاریخ اسلام میں ایسے کئی پاگل ہوئے ہیں خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ میں ایک شخص نے دعویٰ نبوت کیا اسے پکڑ کر لایا گیا خلیفہ نے کہا تمہیں کس کی طرف بھیجا گیا ہے؟ اس نے کہا آپ کی طرف۔ خلیفہ نے کہا تم سخت احمق اور شیطان ہو، اس نے کہا: جیسے لوگ ہوں ویسا ہی نبی ہوتا ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

آیت مبارکہ:

أُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ۝۶۸

لغۃ القرآن: اُبَلِّغُكُمْ : میں پہنچاتا ہوں تمہیں] [رِسٰلٰتِ : پیغامات] [رَبِّيْ : میرا رب] [وَاَنَا : اور میں ہی] [لَكُمْ : تمہارے لیے] [نَاصِحٌ : ایک خیر خواہ] [اَمِيْنٌ : امین ہوں]

ترجمہ: میں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا رہا ہوں اور میں تمہارا امانت دار خیر خواہ ہوں

تشریح: ابن جریر کہتے ہیں : ان آیات میں اللہ تعالیٰ حضرت ہود (علیہ السلام) کا قول نقل فرمارہے ہیں کہ اے لوگوں میں اپنے رب کا پیغام تم تک پہنچاتا ہوں اور تمہیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم دینے اور جو کچھ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لایا ہوں اس کی تصدیق کی طرف بلانے میں خیر خواہ ہوں پس تم میری نصیحت کو قبول کرو میں وحی الٰہی کا امین ہوں اور رسالت کی امانت میرے پاس ہے میں نہ تو جھوٹ بولتا ہوں اور نہ تغیر و تبدل کرتا ہوں بلکہ جس طرح پہنچانے کا حکم ہے اسی طرح پہنچاتا ہوں کیا تم اس بات میں تعجب کر رہے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے گمراہی پر تذکیر اور نصیحت کے لئے مجھ پر اپنی وحی اتاری ہے جبکہ میں تم ہی میں سے ایک ہوں، اس لیے آیا ہوں تاکہ میں اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے تمہیں ڈراؤں تم اپنے نفوس کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ اور قوم نوح جنہوں نے اپنے رسول کو جھٹلایا ان پر اترنے والے عذاب کو یاد کرو۔ انہوں نے اپنے رب کا انکار کیا تمہارے رب نے ان کے بعد تمہیں ان کا نائب بنایا اور جب ان کو ہلاک کر دیا تو ان کے بدلے میں تمہیں لے آیا۔ اب تمہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے کہ کہیں تم پر تمہاری معصیت و کفر کے نتیجے میں اسی قسم کا عذاب نہ ٹوٹ پڑے اور تمہیں ہلاک کرکے اور دوسری قوم کو تمہاری جگہ لے آئے۔ قوم نوح میں اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ گزرا۔ اور قوم نوح کے مقابلے میں تمہارے اجسام اور قویٰ مضبوط اور بڑے بنائے یہ تم پر اللہ تعالیٰ کا انعام ھوا۔ تم اللہ تعالیٰ کے اس اجسام اور قویٰ میں قوت دینے پر شکر ادا کرو عبادت کو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کرو اور اس کے ساتھ اوچان و انداد کو شریک بنانا چھوڑ دو۔ تاکہ تم کامیابی پاؤ اور آخرت کی نعمتوں میں تمہیں خلود و بقاء مل جائے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں طلبات میں کامیابی پا سکو۔ (تفسیر طبری۔ ابو جعفر محمد بن جریر طبری)

۔ کافروں نے جملہ اسمیہ بولا تھا اور کہا تھا انا لنظنك اس کے مقابلہ میں حضرت ہود نے بھی ناصح بصیغہ اسم فاعل فرمایا۔ کلبی نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں آج تک تمہارے اندر رہا اور امین رہا لہٰذا اب مجھ پر جھوٹے ہونے کی بد گمانی کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ حضرات انبیاء واقف تھے کہ کافر انتہائی گمراہ اور احمق ہیں لیکن انھوں نے تہذیب اور حلم سے کام لے کر مقابلہ سے پہلو تہی کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء اپنی امتوں کے کتنے بہی خواہ کافروں پر کتنے مہربان' قوت برداشت میں کتنے کامل اور حسن خطاب کے ذریعہ دلوں کو ہدایت کی طرف کس قدر کھینچنے والے تھے اس گفتگو کو نقل کرکے اللہ نے بندوں کو تعلیم دی ہے کہ بیوقوفوں سے کس طرح خطاب کیا جائے۔ (تفسیر مظہری۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی)

اس سے دو مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ جاہلوں کی بد تمیزی پر تحمل کرنا سنت انبیاء ہے۔ دیکھو ہود (علیہ السلام) نے ان کی سخت اور بد تمیز گفتگو کا جواب سختی سے نہ دیا بلکہ نرمی سے دیا۔ دوسرے یہ کہ اپنے فضائل بیان کرنا تبلیغ کے لیے یا خدا کے شکر کے لیے سنت انبیاء ہے فخر کے لیے نہیں۔ (تفسیر نور العرفان)

پیغمبر کی دعوت خالص خیر خواہی پر مبنی ہوتی ہے :

نہ تو تمہارے ساتھ اس خیر خواہی میں کسی ذاتی غرض کا کوئی شائبہ ہے اور نہ ہی اس پیغام ربانی میں کسی آمیزش کا کوئی سوال۔ جس کے ساتھ مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا ہے۔ پس اس کو قبول کرنے اور صدق دل سے اپنانے میں خود تمہارا اپنا ہی بھلا اور فائدہ ہے، دنیا کی اس عارضی اور فانی زندگی میں بھی اور اس کے بعد آخرت کے اس حقیقی اور ابدی جہاں میں بھی۔ سو پیغمبر کی دعوت خالص خیر خواہی اور صدق و اخلاص پر مبنی ہوتی ہے۔ اس میں ذاتی اغراض یا نفسانی خواہشات کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا۔ حضرت ھود (علیہ السلام) کے اس جواب میں بھی وہی پیغمبرانہ ادب عالی پایا جاتا ہے جو حضرت نوح کے جواب میں اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ آپ نے بھی اپنی قوم کی بد تمیزی اور سوء ادبی کا کوئی نوٹس تک نہیں لیا۔ بلکہ اس سے چشم پوشی کرتے ہوئے اصل حقیقت کو ان کے سامنے رکھ دیا۔ سو یہ پیغمبر ہی کی شان اور انہی کا ظرف ہو سکتا ہے کہ وہ ایسی باتوں کے جواب میں ایسے اغماض اور چشم پوشی سے کام لیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں بھی اس کا کوئی حصہ نصیب فرمادے۔ آمین۔ اور حضرت ہود (علیہ السلام) کے اس جواب سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ امانت رسول کی ایک نمایاں صفت ہوتی ہے۔ سو پیغمبر ایسا امین ہوتا ہے کہ خداوند

قدوس کی طرف سے جو پیغام ان کے حوالے کیا جاتا ہے اس میں وہ سر مو کوئی کمی بیشی نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اس کو پوری دیانتداری کے ساتھ جوں کا توں آگے پہنچاتا ہے۔ عَلٰی نَبِیِّنَا وَعَلَیْھِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ۔ (تفسیر مدنی کبیر۔ مولانا محمد اسحاق آزاد کشمیر)

وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ: سیدنا تمیم داری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "دین خیر خواہی کرنے (کا نام) ہے۔" ہم نے پوچھا، کس کی خیر خواہی؟ آپ نے فرمایا: "اللہ کی، اس کی کتاب کی، اس کے رسول کی، مسلمانوں کے حکمرانوں کی اور عام مسلمانوں کی۔" [مسلم، کتاب الایمان، باب بیان اِن الدین النصیحۃ: ۵۵]

سیدنا جریر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے نماز قائم کرنے، زکوۃ ادا کرنے اور ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کرنے پر بیعت کی۔ [بخاری، کتاب الایمان، باب قول النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): الدین النصیحۃ: ۵۷۔ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان اِن الدین النصیحۃ: ۵۶] (تفسیر دعوۃ القرآن)

آیت مبارکہ:

اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ؕ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِى الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۶۹

لغۃ القرآن: اَوَعَجِبْتُمْ : اور کیا تم نے تعجب کیا ہے] [اَنْ :کہ] [جَآءَكُمْ :آچکی ہے تمہارے پاس] [ذِكْرٌ : ایک نصیحت] [مِنْ رَّبِّكُمْ :تمہارے رب کی طرف سے] [عَلٰي :پر] [رَجُلٍ :آدمی] [مِّنْكُمْ :تم میں سے] [لِيُنْذِرَكُمْ :تاکہ وہ ڈرائے تمہیں] [وَاذْكُرُوْٓا :اور تم سب یاد کرو] [اِذْ :جب] [جَعَلَكُمْ :بنایا تمہیں] [خُلَفَآءَ :جانشین] [مِنْۢ بَعْدِ :اسکے بعد] [قَوْمِ :قوم] [نُوْحٍ :نوح کی] [وَّزَادَكُمْ :اور زیادہ دیا تمہیں] [فِي :میں] [الْخَلْقِ :پیدائش] [بَصْۜطَةً :پھیلاؤ] [فَاذْكُرُوْٓا :سو تم سب یاد کرو] [اٰلَآءَ :نعمتوں کو] [اللّٰهِ :اللہ] [لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ :تاکہ تم سب فلاح پا جاؤ]

ترجمہ: کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہے کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے تم ہی میں سے ایک مرد (کی زبان) پر نصیحت آئی تاکہ وہ تمہیں (عذاب الٰہی سے) ڈرائے، اور یاد کرو جب اس نے تمہیں قوم نوح کے بعد (زمین پر) جانشین بنایا اور تمہاری خلقت میں (قد و قامت اور) قوت کو مزید بڑھا دے، سو تم اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ

تشریح: قوم عاد پر انعامات الٰہیہ:

یعنی قوم نوح کے بعد دنیا میں تمہاری حکومتیں قائم کیں اور اس کی جگہ تم کو آباد کیا۔ شاید یہ احسان یاد دلا کر اس پر بھی متنبہ کرنا ہے کہ بت پرستی اور تکذیب رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بدولت جو حشر ان کا ہوا وہ کہیں تمہارا نہ ہو۔

جسمانی قوت اور ڈیل ڈول کے اعتبار سے یہ قوم مشہور تھی۔

بصطۃً لمبائی اور قوت۔ کلبی اور سدی نے کہا قوم ثمود میں سب سے لمبا آدمی سو ہاتھ کا اور سب سے چھوٹا ستر ہاتھ کا ہوتا تھا۔ ابو حمزہ یمنی نے صرف ستر ہاتھ کہا ہے۔ حضرت ابن عباس (رض) کے قول میں اسی ہاتھ مروی ہے۔

جو احسانات مذکور ہوئے وہ اور ان کے علاوہ خدا کے دوسرے بیشمار احسانات یاد کرکے اس کے شکر گزار اور فرمان بردار بننا چاہیے نہ یہ کہ منعم حقیقی سے بغاوت کرنے لگو۔ (تفسیر گلدستہ۔ محمد اسحاق)

چونکہ قوم نوح کے بعد ہود (علیہ السلام) کی قوم بنی عاد کو زمین پہ (حدود یمن میں) بسایا گیا تو وہ قوم نوح کے جانشین ٹھہرے۔ اسی طرح بنی عاد کے بعد صالح (علیہ السلام) کی قوم بنی ثمود کو بسایا گیا جیسے فرمایا گیا: واذ کرواذ جعلکم خلفاء من بعد عادٍ (اعراف: 74) تو وہ قوم عاد کے جانشیں ٹھہرے۔ تو ہر قوم اپنے سے پہلی قوم کی جانشیں تھی۔ مگر حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت پوری روئے زمین کی گزشتہ قوموں کی جانشین ٹھہرائی گئی اور فرمایا گیا: وھوالذی جعلکم خلئف الارض (انعام: 165) معلوم ہوا امت محمدیہ کے بعد کوئی امت نہیں، لہٰذا اس کا رسول آخری رسول ہے۔ اسی لیے حدیث طیبہ میں ہے کہ "میں آخری نبی ہوں اور تم آخری امت ہو۔" (ابن ماجہ کتاب الفتن)

قوم عاد دوسری قوموں کی نسبت طویل قد و قامت اور مضبوط اعصاب والے لوگ تھے۔ ایک جگہ قرآن میں ہے کہ انھوں نے اپنی طاقت کے نشے میں کہا: مَنْ اشد منا قوۃً۔ ہم سے طاقتور کون ہے۔" (فصلت: 15) اس جگہ بعض تفاسیر میں قوم عاد کی طویل القامتی کے بارہ میں مبالغہ آمیز ناقابل یقین روایات مذکور ہیں مگر یہ ضعیف و ناقابل حجت ہیں۔

جب قوم عاد نے کہا کہ اے ہود! جس عذاب سے تو ہمیں ڈراتا ہے وہ ہم پر لے آ، ہم اپنے بتوں کی پرستش سے رکنے والے نہیں۔ کیونکہ ہمارے باپ دادا ان کی پرستش کرتے تھے ہم باپ دادا کا طریقہ نہیں چھوڑ سکتے۔ تو آپ نے فرمایا تو سمجھو اللہ کا عذاب آیا ہی چاہتا ہے تمہیں اس کے مطالبہ کی ضرورت نہیں۔ معلوم ہوا دین سے ہٹ کر باپ دادا اور خاندان کی اطاعت جائز نہیں۔ یہ کفار کا طریقہ ہے کہ وہ باپ دادا کی تقلید کرتے ہیں خدا اور رسول کی نہیں۔ (تفسیر برہان القرآن)

ایک اعتراض کا جواب

اس آیت کریمہ میں سب سے پہلے قوم ہود کا ایک اعتراض نقل کیا ہے جسے وہ ازراہ تعجب یعنی مذاق اڑاتے ہوئے پیش کیا کرتے تھے اور ایسا ہی اعتراض گزشتہ رکوع میں قوم نوح کی طرف سے بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اعتراض کا اگرچہ جواب نہیں دیا کیونکہ یہ اعتراض اس قابل نہیں کہ اسے گفتگو کا موضوع بنایا جائے لیکن بین السطور میں اور قرآن پاک کی بعض دوسری جگہوں میں اس کا جواب بھی موجود ہے اور یہاں لِیُنْذِرَ کُمْ سے اس جواب کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ قوم ہود کا اعتراض یہ ہے کہ نبوت و رسالت ایک بہت بڑا اعزاز اور ایک بڑا نازک منصب ہے جو شخص اپنے رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ حقیقت میں اللہ سے اپنے خاص تعلق کا دعویٰ کرتا ہے۔ ظاہر ہے اللہ سے خاص تعلق کے لیے انسانوں سے بڑھ کر کسی مخلوق میں سے ہونا ضروری ہے کیونکہ انسانوں میں تو ایسی طاقت نہیں کہ وہ براہ راست اللہ سے خاص تعلق پیدا کرلیں اور ہود چونکہ ہماری طرح کے ایک آدمی ہیں جو خصوصیات اور صلاحیتیں ہم میں ہیں انہی کے حامل وہ بھی ہیں اس لیے ان کا یہ دعویٰ کہ اللہ کے ساتھ ان کا خاص تعلق ہے اور اللہ براہ راست اپنا کلام ان پر اتارتا ہے یہ سراسر ایک تعجب خیز بات ہے جس پر اعتماد کرنا بہت مشکل ہے۔ قرآن کریم نے مختلف جگہ اس کا جواب دیتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا ہے اور گزشتہ قوموں کی تاریخ کے حوالے سے یہ بتایا ہے کہ انسان بھی عجیب واقع ہوا ہے اس نے ہمیشہ نبوت اور بشریت میں تضاد محسوس کیا یہ سمجھتا ہے کہ نبی بشر نہیں ہوسکتا اور بشر نبی نہیں ہوسکتا اور جب وہ اپنے جیسے ایک بشر کو نبوت کا دعویٰ کرتا ہوا سنتا ہے تو اسے نبی ماننے سے انکار کردیتا ہے حالانکہ دو باتیں بالکل سامنے کی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ نبوت یقینا ایک بہت بڑا منصب ہے اور یہ اسی کو ملنا چاہیے جو مخلوق میں سب سے اعلیٰ اور بلند ہو۔ سوال یہ ہے کہ کیا مخلوقات میں انسان سے کوئی بالاتر مخلوق بھی ہے؟ تمام مخلوقات میں تین مخلوقات سب سے فوقیت رکھتی ہیں۔ جنات، فرشتے اور انسان جہاں تک جنات اور فرشتوں کا تعلق ہے تخلیق آدم کے وقت ان دونوں کو حضرت آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان ان دونوں کا مسجود اور ان دونوں سے فائق ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ انسان کو اللہ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے اب اگر نبی ہونا ایک بڑے

مرتبے کی بات ہے تو اسے یقینا اشرف المخلوقات میں سے ہی ہونا چاہیے اس لیے اللہ نے تمام انبیاء ورسل انسانوں ہی میں سے مبعوث کیے اور وہ سب انسان تھے۔
دوسری بات یہ کہ سوال اللہ کے قرب کا نہیں وہ تو جسے چاہے اپنے قرب سے نواز سکتا ہے سوال انسانوں کی اصلاح کا ہے غور فرمایئے اگر انسانوں کی اصلاح کے لیے کسی فرشتے یا جن کو بھیجا جاتا تو کیا انسان اس سے پوری طرح استفادہ کر سکتے تھے؟ اور کیا وہ انسانوں کی زندگی کے لیے نمونہ بن سکتے تھے کیونکہ نمونہ بننے کے لیے ضروری ہے کہ نبی کے اندر وہی احساسات ' وہی ضروریات ' وہی فعلی اور انفعالی قوتیں اور وہی خواہشیں اور وہی داعیے ہوں جو انسانوں میں پائے جاتے ہیں چنانچہ جب وہ انسانوں کے سامنے اپنی ضروریات پر ضبط کر کے دکھائے ' اپنے احساسات پر پاکیزگی کا پہرہ بٹھائے ' اپنی فعلی اور انفعالی قوتوں کو اللہ کی اطاعت کا امین بنا دے اور اپنے جذبات اور خواہشات پر تقویٰ کی مہر ثبت کر دے تو اس کی زندگی کا یہ رویہ اور اس کی یہ صفات یقینا باقی انسانوں کے لیے اسوہ بن کر روشنی کا سامان کریں گی۔ اسے جب بھوک لگے گی اور وہ روزہ رکھ کر صبر کرے گا تو اس سے دوسرے انسانوں کو صبر کی تلقین ہو گی۔ اسے جب کبھی بیماری آئے گی اور وہ بیماری میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرے گا تو اس سے انسانوں کو اللہ سے رجوع کرنے کا سلیقہ آئے گا۔ وہ جب زخمی ہو کر زخموں کا علاج کرے گا اور ساتھ ساتھ اللہ سے شفا بھی مانگے گا تو اس کا یہ رویہ انسانوں کے لیے سنت بن جائے گا اور اللہ سے شفا مانگنے کا طریقہ سکھائے گا۔ اسی طرح اگر اس کے سامنے دولت کے انبار لگا دیئے جائیں لیکن وہ پھر بھی زہد و استغنا کی تصویر بنا رہے تو اس سے اس پر ایمان لانے والوں کو زہد و استغنا کی وہ تعلیم ملے گی جس سے حبِّ دنیا میں کمی آئے گی اور قناعت اور استغناء انسانی سیرت کا جوہر بن جائے گا غرضیکہ انسانوں کی اصلاح کے لیے یہ ضروری تھا کہ انسانوں ہی میں سے کسی کو نبوت و رسالت کے منصب پر فائز کیا جاتا چنانچہ لِیُنْذِرَ کُمْ سے انہی باتوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے نبیوں کا انسان اور بشر ہونا اللہ کے قرب کے حصول میں رکاوٹ نہیں بلکہ یہ تمہاری اصلاح اور تمہاری زندگی کی راہنمائی کے لیے ایک بنیادی ضرورت ہے اس لیے تمہیں اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے بلکہ تمہیں اس پر اللہ کا شکرادا کرنا چاہیے کہ اس نے تمہاری تربیت اور اصلاح کے لیے تمہی میں سے ایک شخص کو اٹھایا ہے یہ تمہاری جنس اور نوع سے تعلق رکھتا ہے ' تمہارے ہی قبیلوں میں سے کسی قبیلے کا فرزند ہے ' تم اس کے شخصی اور خاندانی پس منظر سے واقف ہو ' وہ تمہارے ہی ماحول میں پلا بڑھا ہے ' وہ تمہاری معاشرت کا ایک نمائندہ فرد ہے ' تمہارے ماحول نے ہر طرح کا رطب و یابس اس کے سامنے رکھا ہے۔ اسے بھی روایات اخذ کرنے اور زندگی گزارنے کے وہی امکانات ملے ہیں جو تمہارے سامنے ہیں اس کے باوجود وہ پتھروں میں اگر ہیرے کی مانند ہے تو یہ اس کے اللہ کے رسول ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے تو تمہیں آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ میں ہاتھ دینا چاہیے اور اسے اپنے جیسا دیکھ کر اپنے اندر ایک اعتماد پیدا کرنا چاہیے کہ جن اوصاف حمیدہ سے اللہ کا یہ عظیم بندہ متصف ہے مجھے بھی کوشش کرنی چاہیے کہ میں کسی نہ کسی حد تک انھیں اپنے اندر پیدا کر سکوں۔
دوسرا احسان یہ ذکر فرمایا کہ لوگو! قوم نوح کے مٹ جانے کے بعد اللہ نے تمہیں اس کا جانشین بنایا ہے یعنی جس طرح اس زمین کے ایک بڑے حصے پر اللہ نے انھیں قیام کی سہولتیں بخشیں اور پھر اقتدار عطا کیا اسی طرح زمین کے ایک بڑے حصے پر آج تم آباد ہو۔ اللہ نے تم پر جسمانی اور معنوی نعمتوں کے دروازے کھولے ہیں۔ تم اپنے قد و قامت اور اپنی قوت و طاقت میں اپنے وقت کی نمایاں قوم ہو پھر اللہ نے تمہیں عقل و خرد کا ایسا جوہر عطا کیا ہے جس کی وجہ سے تم نے صنعت و ایجادات کی ایک دنیا کو وجود بخشا ہے۔ اس پر تمہیں اللہ کا شکرادا کرنا چاہیے اور آگے بڑھ کر اللہ کے نبی کی دعوت کو قبول کرنا چاہیے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ بجائے اس کے کہ تم اللہ کے ان احسانات کا شکرادا کرو تم کفران نعمت کرتے ہوئے اللہ کے ساتھ ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہو اور تمہاری اصلاح و تربیت کے لیے جس نبی کو بھیجا گیا ہے تم اس کی دعوت قبول کرنے کی بجائے اسے اذیتیں پہنچا رہے ہو۔ تمہارے اندر اگر سوچنے سمجھنے کی کچھ بھی صلاحیت موجود ہے تو پھر اللہ کی نعمتوں اور اس کی قدرتوں کو یاد کرو اور اس کا جو منطقی نتیجہ ہونا چاہیے اس کے مطابق اپنی زندگی تبدیل کرو۔ یہی وہ کامیابی کا راستہ ہے۔ منعم کی نعمتوں کو دیکھتے ہوئے اور محسن کے احسانات کی احسان شناسی کرتے ہوئے زندگی گزارنا یہ فلاح و کامرانی کا راستہ ہے۔ تم اگر چاہو تو یہ راستہ تمہارے لیے روشن ہو سکتا ہے لیکن اگر تم نے اپنے اندر احسان شناسی اور شکر نعمت کا جذبہ پیدا نہ کیا تو پھر یقینا تم اس نعمت سے محروم ہو جاؤ گے اس آیت کریمہ میں ایک لفظ استعمال ہوا ہے بَصْطَۃً اور سورۃ البقرہ میں یہی لفظ سین کے ساتھ استعمال ہوا ہے دونوں ایک ہی لفظ ہیں اس کا معنی کشادگی ' وسعت اور پھیلاؤ کے ہوتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قوم ہود کو جسمانی و عقلی دونوں اعتبار سے تفوق اور برتری عطا فرمائی ہے۔ عرب کی روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد صحت جسمانی کے اعتبار سے بھی نمایاں تھی اور اپنے عقلی کارناموں کے اعتبار سے بھی اس کی بڑی دھوم تھی۔ آیت کریمہ کے آخری جملے میں اَلَآئَ اللّٰہِ کا لفظ آیا ہے اَلَآئَ جمع ہے اِلًی ' اِلَی ' اَلْیٌ۔ اس کے معنی نعمت کے بھی

ہوتے ہیں اور کرشمہ 'شان 'کارنامہ اور عجوبہ کے بھی ہیں۔ یہاں دونوں ہی معنی مراد لیے جاسکتے ہیں اور قرآن کریم میں اس لفظ کو انہی مختلف معانی میں استعمال کیا ہے مطلب یہ ہے کہ خدا کی نعمتوں اور اس کے احسانات کو بھی یاد رکھو اور یہ بھی فراموش نہ کرو کہ وہ تم سے یہ نعمتیں چھین لینے کی بھی قدرت رکھتا ہے۔ اتنی واضح اور موثر ترغیب کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ قوم عاد اپنے رویے پر شرمندہ ہوتی اور وہ اللہ کی نعمتوں اور اس کے احسانات کو یاد کرکے صرف اسی کی اطاعت اور اس کی بندگی کا عہد کرتی لیکن قومیں جب بگڑتی ہیں تو ان کی محرومیاں بڑی شدید ہوتی ہیں اس قوم نے بھی نصیحت اختیار کرنے کی بجائے ہٹ دھرمی کا راستہ اختیار کیا (تفسیر روح القرآن۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

اہم نوٹ: کوئی صحیح العقیدہ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشریت کا انکار نہیں کرتا اور نہ کرسکتا ہے۔ جبکہ قرآن و حدیث اور ائمہ اسلام کی تصریحات سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور باقی بھی تمام انبیائے کرام صلوٰۃ اللہ وسلامھم کی بشریت قطعاً ثابت ہے۔ اس کا انکار کفر ہے اور کوئی مسلمان کافر نہیں ہو سکتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر انبیائے کرام کی بشریت وآدمیت ان آیات میں واضح کی گئی ہے۔

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا.

"فرمادیجئے: میرا رب (ان خرافات میں الجھنے سے) پاک ہے میں تو ایک انسان (اور) اللہ کا بھیجا ہوا (رسول) ہوں"۔

بنی اسرائیل، 93:17

سورۃ المؤمنون میں فرمایا:

وَقَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ.

"اور ان کی قوم کے (بھی وہی) سردار (اور وڈیرے) بول اٹھے جو کفر کر رہے تھے اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلاتے تھے اور ہم نے انہیں دنیوی زندگی میں (مال و دولت کی کثرت کے باعث) آسودگی (بھی) دے رکھی تھی (لوگوں سے کہنے لگے) کہ یہ شخص تو محض تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہے، وہی چیزیں کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور وہی کچھ پیتا ہے جو تم پیتے ہو"۔

المومنون 33:23

وَلَئِنْ أَطَعْتُم بَشَرًا مِّثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا لَّخَاسِرُونَ.

"اور اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت کرلی تو پھر تم ضرور خسارہ اٹھانے والے ہوگے"۔

ایضاً: 34

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو حق کی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس بھیجا تو انہوں نے بھی ان کو بشر کہہ کر نبی ماننے سے انکار کردیا۔

رب تعالیٰ فرماتا ہے۔

فَقَالُوا أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُونَ.

"سو انہوں نے (بھی یہی) کہا کہ کیا ہم اپنے جیسے دو بشروں پر ایمان لے آئیں حالانکہ ان کی قوم کے لوگ ہماری پرستش کرتے ہیں"۔

ایضاً: 47

فَكَذَّبُوهُمَا فَكَانُوا مِنَ الْمُهْلَكِينَ.

"پس انہوں نے (بھی) ان دونوں کو جھٹلادیا سو وہ بھی ہلاک کیے گئے لوگوں میں سے ہوگئے"۔

ایضاً: 48

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ.

”تم فرماؤاس ظاہر صورت انسانی میں تو میں تم جیسا آدمی ہی ہوں مجھے وحی آتی ہے“۔
الکھف 110:18

لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر انبیاء کرام علیہ السلام بشر تھے آپ کی بشریت کا انکار کفر ہے کہ قرآن کا انکار ہے مگر صرف بشر ہی نہ تھے بلکہ آپ ایسے بشر تھے جن کو وحی کی گئی اور جس بشر کو وحی کی جائے وہ نبی ہوتا ہے جیسے سربراہ ملک۔ بشر ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ بادشاہ بھی ہوتا ہے اور اس وصف میں کوئی اس کی برابری نہیں کر سکتا ہر بشر بادشاہ نہیں ہوتا ہمارا وزیر اعظم انسان ہوتا ہے مگر ملک میں ایک ہی ہوتا ہے اس جیسا دوسرا اس وصف میں اس کا شریک نہیں ہو سکتا نبی انسان اور بشر ہوتا ہے مگر نبوت و رسالت ایسی صفتیں ہیں جن کی بنا پر کوئی دوسرا ان جیسا نہیں ہوتا۔ جب کسی بشر اور انسان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت لگ جائے تو وہ تمام انسانوں سے ممتاز ہو جاتا ہے وحی والا آدمی رسول ہوتا ہے نبی ہوتا ہے دوسرا آدمی ہزار فضیلت رکھتا ہو نبی کی مثل نہیں ہو تا جب عالم اور جاہل برابر نہیں، زندہ اور مردہ برابر نہیں، مومن اور کافر برابر نہیں، نیک اور بد برابر نہیں پھر نبی اور غیر نبی کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟ ہاں ظاہری شکل و صورت میں، کھانے پینے میں، تندرست اور بیمار ہونے میں، بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں، بعض امور میں ظاہری مشابہت و مماثلت موجود ہے لیکن فضائل کو نظر انداز کر کے مماثلت کی رٹ لگانے سے تو کوئی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ فضائل و کمالات والوں کو عام آدمی کی طرح کہتے رہنا دراصل ان کے فضائل و کمالات کا انکار۔ ان سے بغض و حسد اور منافقت کی علامت ہے۔ آپ فوجی افسر کو کیپٹن۔ میجر، کرنل، بریگیڈئر او جنرل نہ کہیں اور محض انسان کہتے رہیں۔ صدر، وزیر اعظم سیکرٹریز اور دوسرے عہدیداروں کو صرف ان کے ناموں سے پکاریں اور ان کے عہدوں کا ذکر نہ کریں۔ ماں باپ، چچا، تایا، استاد، محدث، مفسر، مورخ، سائنس دان، عالم، فقیہ، ولی کو آدمی ہی کہتے رہیں اور ان کو ان محترم ناموں سے نہ بلائیں جو ان کمالات کے آئینہ دار ہیں تو آپ نے گویا ان صاحبان کمال کے فضل و کمال کا انکار کیا ہے لہٰذا انبیائے کرام آدمی ہیں، بشر ہیں مگر یہی کچھ نہیں وہ رسول ہیں، نبی ہیں اللہ کے محبوب ہیں۔ اس تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں۔ مخلوق خدا کی نجات کا ذریعہ ہیں، مقبول شفاعت ہیں، ماذون من اللہ ہیں۔ اللہ کے بنانے سے تمام دنیا کے حاکم غیر مشروط ہیں، مطاع ہیں امر ہیں، نہی ہیں، حلال و حرام کرنے والے ہیں، متبوع ہیں، مصطفیٰ ہیں، مرتضی ہیں، مجتبی ہیں بشر تھے مگر رسول بشر نہ کہ عام بشر۔ وہ بشر ہونے کے ساتھ نور تھے اور ہیں کسی بریلوی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ وہ بشر نہیں ہر ایک کو موت آنی ہے نبی ہو یا غیر نبی مگر رسول کی موت بھی نرالی ہے اور حیات بھی۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَن نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ.

”کیا وہ لوگ جنھوں نے برائیاں کما رکھی ہیں یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم انہیں اُن لوگوں کی مانند کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے (کہ) اُن کی زندگی اور ان کی موت برابر ہو جائے۔ جو دعویٰ (یہ کفّار) کر رہے ہیں نہایت برا ہے“۔
الجاثیہ 21:45

جب نیک و بد برابر نہیں ہو سکتے تو نبی اور غیر نبی کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟ گو شکل و شباہت، کھانے پینے، سونے، اور بیماری، تندرستی میں ایک جیسے نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں برابر نہیں۔ بڑا بنیادی فرق ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نور بھی ہیں اور بشر بھی

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن اور حدیث پاک میں نور بھی کہا گیا ہے اور بشر بھی۔ ہاں قرآن و حدیث سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مسلمانوں نے کبھی کسی نبی کو اپنے جیسا بشر کہا ہو۔ ہم مسلمان ہیں لہٰذا ہمیں بھی سرکار کا ادب و احترام کرنا چاہیے۔ اس میں قصور جہالت کا ہے یا ان متعصب لوگوں کا جو ادب و احترام سے ہٹ کر نبی کو اپنے جیسا بشر کی رٹ لگائے رکھتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کی شازش و اتباع میں ایسا ہو رہا ہے تاکہ مسلمانوں کے دلوں سے اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت و محبت ختم ہو جائے۔ اس کی نشاندہی علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے۔

وہ فاقہ کش جو موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمد اس کے بدن سے نکال دو

جبکہ قرآن کریم نے نبی کو بشر بھی کہا ہے، نور بھی کہا ہے، ان میں کوئی تعارض نہیں۔ اس کا منکر قرآن کا منکر ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نور بھی ہیں بے مثل نور، بشر بھی ہیں بے مثل بشر۔ البتہ جس ذات پاک کو اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ ترین صفات سے نوازا ہے اس کو صرف بشر کہنا اس پر اصرار و تکرار کرنا، اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ شخص حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باقی صفات کا منکر ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی ورسول ماننے سے انسان مسلمان کہلاتا ہے۔ صرف بشر بشر کا قول کفار کا ہے اہل ایمان کا نہیں۔ ہم اہل ایمان ہیں۔ کوئی قرآن وحدیث سے ثابت کرے کہ اہل ایمان اپنے نبی کو اپنے جیسا بشر کہہ کر مسلمان ہوتے تھے یا ہو سکتے ہیں۔ مسئلہ نور وبشر کا نہیں مسئلہ ادب وبے ادبی کا ہے۔ اللہ بھی نور ہے، ملائکہ بھی نور ہیں، حور وغلمان بھی نور ہیں، سورج بھی نور ہے قرآن بھی نور ہے، نبی بھی نور ہے ایمان بھی نور، ہماری آنکھ بھی نور ہے، ہماری عقل بھی نور ہے، افسوس آج کے لوگ کا عجب حال ہے۔

بقول اقبال رحمۃ اللہ علیہ :

تنگ بر ما رہگزار دین شد است

ہر لئیمے راز دار دین شد است

قرآن وحدیث اور علماء ومحدثین، فقہاء وصوفیا سب نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نور کہا اور مانا ہے مثلاً قرآن میں دیکھئے:

قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللّٰهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ٥

المائدہ، 15:5

''بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آ گیا ہے اور ایک روشن کتاب (یعنی قرآن مجید)۔''

يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ٥

الصّف، 8:61

''یہ (منکرینِ حق) چاہتے ہیں کہ وہ اللہ کے نور کو اپنے منہ (کی پھونکوں) سے بجھا دیں، جب کہ اللہ اپنے نور کو پورا فرمانے والا ہے اگرچہ کافر کتنا ہی ناپسند کریں۔''

وَدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا٥

الاحزاب؛ 46:33

''اور اس کے اِذن سے اللہ کی طرف دعوت دینے والا اور منوّر کرنے والا آفتاب (بنا کر بھیجا ہے)۔''

اسی طرح کتب سیر، احادیث، تفاسیر اور بائبل میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نور فرمایا گیا ہے مثلاً ابن ہشام، 1 : 144، تاریخ الامم والملوک الطبری، 576، صحیح مسلم، مشکوٰۃ، 513، 515، 517 میں سورج وچاند جیسا چہرہ فرمایا۔

انجیل برناباس شائع کردہ جماعت اسلامی، البدایہ والنہایہ میں بھی آپ کا نور ہونا ثابت ہے لہٰذا ہر مسلمان حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نور مناتا ہے۔ نور کے مقابلہ میں ظلمت ہے یعنی اندھیرا اور تاریکی۔ کوئی مسلمان سرکار دوجہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق یہ گستاخی نہیں کر سکتا۔ جب آپ کی نورانیت ثابت ہے تو آپ غور کریں کہ یہ نورانیت کہاں سے آئی تو قرآن میں جواب ہے کہ

اللّٰهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ.

النور، 35:24

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اس کے نور کی مثال (جو نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شکل میں دنیا میں روشن ہے)۔''

تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نورانیت بھی اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہوئی اس لئے آپ کو نور من نور اللہ بھی کہنا قرآن وسنت اور بائبل کی رو سے جائز ثابت ہوا جبکہ منکرین کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نورانیت کے خلاف ایک دلیل بھی نہیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشریت کا انکار کسی

مسلمان کو نہیں لیکن نورانیت اور بشریت میں تضاد ثابت کرنا نری جہالت ہے۔ نور کے مقابلہ میں ظلمت یعنی اندھیرا اور تاریکی ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بشر بھی ہیں اور نور بھی ہیں اور یہی اللہ کی قدرت کا کمال ہے۔ پس شریعت کے دلائل سے نورانیت کا انکار کرنا جہالت و تعصب کے سوا کچھ بھی نہیں۔
(منہاج الفتاویٰ۔ مفتی عبدالقیوم ہزاروی)

فوائد

1: اس سے معلوم ہوا کہ علم تاریخ بھی اچھی چیز ہے بشر طیکہ صحیح ہو۔ اور گزشتہ قوموں کے حالات سے سبق لینا ضرور ہے نیز اللہ کی نعمتوں میں غور کرنا عبادت ہے کہ اس سے بہت عبرت ہوتی ہے۔

2: اللہ نے انھیں سلطنت اور قوت بدنی عطا فرمائی تھی چنانچہ شداد ابن عاد جیسا بڑا بادشاہ انھیں میں ہوا۔ ان میں پست قد آدمی ساٹھ ہاتھ اور لمبا آدمی سو ہاتھ کا تھا۔ بڑے قوت والے اور شہ زور تھے ان کا سر خیمہ کے برابر آنکھیں پرندوں کے گھونسلوں کی طرح تھیں۔

3: معلوم ہوا کہ خدا کی نعمتوں کو یاد کرنا اور یاد رکھنا عبادت۔ اس میں محفل میلاد شریف بھی داخل ہے کہ اس میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ولادت کا چرچا ہے اور ولادت حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ (تفسیر نور العرفان)

آیت مبارکہ:

قَالُوۡۤا اَجِئۡتَنَا لِنَعۡبُدَ اللّٰهَ وَحۡدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا‌ ۚ فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ○۔

لغۃ القرآن: قَالُوۡۤا : ان سب نے کہا] [اَجِئۡتَنَا : کیا تو آیا ہے ہمارے پاس] [لِنَعۡبُدَ : تاکہ ہم عبادت کریں] [اللّٰهَ : اللہ] [وَحۡدَهٗ : اس اکیلے کی] [وَنَذَرَ : اور ہم چھوڑ دیں] [مَا : نہیں] [كَانَ : ہے] [يَعۡبُدُ : وہ عبادت کرے] [اٰبَآؤُنَا : ہمارے باپ دادا] [فَاۡتِنَا : پس لے آ ہمارے پاس] [بِمَا : اس وجہ سے جو] [تَعِدُنَاۤ : تو وعدہ کرتا ہے ہم سے] [اِنۡ : اگر] [كُنۡتَ : آپ تھے] [مِنَ : سے] [الصّٰدِقِيۡنَ : سب سچوں کو]

ترجمہ: وہ کہنے لگے: کیا تم ہمارے پاس (اس لئے) آئے ہو کہ ہم صرف ایک اللہ کی عبادت کریں اور ان (سب خداؤں) کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے؟ سو تم ہمارے پاس وہ (عذاب) لے آؤ جس کی تم ہمیں وعید سناتے ہو اگر تم سچے لوگوں میں سے ہو

تشریح: کسی چیز کو ماننے یا نہ ماننے کے لیے وہ اپنی عقل ناقص کے فتوی کے پابند تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکتی تھی کہ اس کارخانہ ہستی کے مختلف نوعیت کے بیحد و بے حساب کام ایک ذات کی مشیت وارادہ سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے تو ہر کام کے لیے الگ الگ معبود بنا رکھے تھے۔ اور اس باطل کو حق یقین کرنے کے لیے ان کے پاس ایک اور زبردست سہارا تھا وہ یہ کہ ان کے آباؤاجداد کا یہی عقیدہ تھا اور وہ کسی قیمت پر ان کی اندھی پیروی سے دستکش ہونے پر آمادہ نہ تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے نبی کو پند و نصیحت کو بڑی سرد مہری سے ٹھکرا دیا۔ اور انھیں صاف صاف کہہ دیا کہ جس عذاب کی تم ہمیں ہر وقت دھمکیاں دیتے رہتے ہو اسے لے آؤ۔ ایسا برتاؤ کوئی اس قوم کی ہی خصوصیت نہیں۔ جب کبھی حق و صداقت کے کسی علم بردار نے اپنی قوم کو ان کی غلط روی سے روکا تو انھوں نے کم و بیش ایسا ہی جواب دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر آباؤاجداد گمراہ ہوں تو آنکھیں بند کیے ہوئے ان کے پیچھے دوڑتے چلے جانا کوئی عقلمندی نہیں۔ لیکن اگر آباؤاجداد حق پر ہوں بلکہ حق کے علم بردار رہے

ہوں اور ان کی زندگیاں، ان کا عمل اور ان کا وجود ہی اسلام کی حقانیت کی روشن دلیل ہو جیسے بفضل اللہ تعالیٰ اہل سنت و جماعت کے اسلاف کرام تھے توان کی اقتداء اور پیروی عین ہدایت اور سعادت ہے۔ حضرت غوث اعظم۔ حضرت خواجہ اجمیر، حضرت داتا گنج بخش، حضرت غوث العلمین، بہاؤالحق والدین زکریاملتانی۔ حضرت مجدد الف ثانی وغیر ہم من الاولیاء الکاملین قدست اسرار ھم وہ روشن چراغ ہیں جن کی درخشانیوں اور تابانیوں کے باعث صراط مستقیم منور ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

حضرت ہود (علیہ السلام) نے اپنی قوم کو فرمایا:

تم میرے ساتھ ان معبودوں کے بارے میں جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے خود بنا رکھے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں کوئی دلیل نازل نہیں کی۔ تم ان کی عبادت چھوڑ دو اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو ورنہ تم پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا عذاب نازل ہوگا۔ قوم کے سرداروں کو یہ بات ناگوار گزری اور انھوں نے کہا: ہم تو اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں تم جس عذاب کی دھمکی دے رہے ہو وہ ابھی لے آؤ اگر تم سچے ہو۔ اس پر حضرت ہود (علیہ السلام) نے فرمایا: تمہارے اوپر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے اب تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں کہ کب نازل ہوگا، چنانچہ سخت ہوا کا طوفان آیا جو آٹھ دن جاری رہا جس نے ہر چیز کو تہس نہس کر دیا اور اس طاقتور قوم کے لاشے کھجور کے کٹے ہوئے تنوں کی طرح زمین پر بکھرے پڑے تھے۔ اس آندھی میں حضرت ہود (علیہ السلام) کے ساتھ وہی لوگ محفوظ رہے جو آپ پر ایمان لائے اور شرک سے توبہ کر لی۔ (تفسیر امداد الکرم)

اللہ تعالیٰ کی توحید اور استحقاق عبادت پر دلیل:

حضرت ھود (علیہ السلام) نے اپنی قوم کو بت پرستی ترک کرنے اور خدائے واحد کی عبادت کرنے کی دعوت دی، اور اس پر یہ قوی دلیل قائم کی کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر بہت زیادہ انعام کیے ہیں اور بداہت عقل اس پر دلالت کرتی ہے کہ ان انعامات میں اور ان نعمتوں کے دینے میں ان بتوں کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اور عبادت انتہائی تعظیم کا نام ہے اور انتہائی تعظیم کا وہی مستحق ہے جس نے انتہائی نعمتیں عطا کی ہوں، اور جب انتہائی نعمتیں اللہ نے عطا کی ہیں تو وہی عبادت کا مستحق ہے اور بت اس کے لائق اور سزاوار نہیں ہیں کہ ان کی عبادت کی جائے۔

حضرت ھود (علیہ السلام) کی اس قوی اور قطعی دلیل کا ان کی قوم سے کوئی جواب نہیں بن پڑا اور انھوں نے جان چھڑانے کے لیے اپنے باپ دادا کی تقلید کا سہارا لیا اور کہا کیا آپ ہمارے پاس اس لیے آئے ہیں کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں اور ان کی عبادت چھوڑ دیں۔ جن کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے سو آپ ہمارے پاس وہ (عذاب) لے آئیں جس کا آپ ہم سے وعدہ کرتے رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ھود (علیہ السلام) سے یہ نقل کیا کہ انھوں نے کہا: یقیناً تمہارے رب کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب نازل ہو گیا۔ اس پر یہ اعتراض ہے کہ اس وقت تک تو عذاب نازل نہیں ہوا تھا، پھر حضرت ھود (علیہ السلام) نے کیسے فرمادیا کہ تم پر عذاب نازل ہو گیا اس کا جواب یہ ہے کہ جس چیز کا مستقبل میں واقع ہونا یقینی اور قطعی ہو اس کو ماضی کے ساتھ تعبیر کر دیتے ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ نے تم پر عذاب نازل کر دیا اس معنی میں ہے کہ اس نے تم پر عذاب نازل کرنے کا ارادہ کر لیا اور حضرت ھود (علیہ السلام) کے نزدیک اس عذاب کا واقع ہونا یقینی تھا۔

اس کے بعد حضرت ھود (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم مجھ سے ان ناموں کے متعلق جھگڑ رہے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں جن کے متعلق اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی اس آیت سے مراد یہ ہے کہ تم بتوں کو الہ کہتے ہو حالانکہ ان میں الوہیت کا کوئی معنی نہیں ہے۔ تم نے کسی بت کا نام عزی رکھا ہے حالانکہ اس میں عزت کا کوئی معنی نہیں ہے۔ اور تمہارے مذہب کے ثبوت پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ھود (علیہ السلام) کی قوم کا انجام اور ان پر عذاب کے نزول کو بیان کیا۔ (تفسیر تبیان القرآن)

قوم ہود کے بتوں کے نام:

محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ وہ لوگ اصنام کی پرستش کرتے تھے۔ ایک صنم کا نام تھا صمد اور دوسرے کا نام صمود، اور ایک کا نام تھا ہبا۔

قوم عاد کا وفد:

حضرت حارث بکری (رض) فرماتے ہیں میں اپنے ہاں سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں علا بن حضرمی کی شکایت لے کر چلا جب میں ربذہ میں پہنچا تو بنو تمیم کی ایک بڑھیا لا چار ہو کر بیٹھی ہوئی ملی۔ مجھ سے کہنے لگی اے اللہ کے بندے مجھے سرکار رسالت مآب میں پہنچنا ہے۔ کیا تو میرے ساتھ اتنا سلوک کرے گا کہ مجھے دربار رسالت میں پہنچا دے؟ میں نے کہا آؤ چنانچہ میں نے اسے اپنے اونٹ پر بٹھا لیا اور مدینے پہنچا دیکھا کہ مسجد لوگوں سے بھری ہوئی ہے سیاہ جھنڈے لہرا رہے ہیں اور حضرت بلال (رض) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے تلوار لٹکائے کھڑے ہیں میں نے پوچھا کیا بات ہے؟ لوگوں نے کہا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت عمرو بن عاص (رض) کی ماتحتی میں کہیں لشکر بھیجنے والے ہیں۔ میں تھوری دیر بیٹھا رہا اتنے میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی منزل میں تشریف لے گئے۔ میں آپ کے پیچھے ہی گیا۔ اجازت طلب کی اجازت ملی جب میں نے اندر جا کر سلام کیا تو آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا کیا تم میں اور بنو تمیم میں کچھ چشمک ہے؟ میں نے کہا حضور اس کے ذمہ دار وہی ہیں۔ میں اب حاضر خدمت ہو رہا تھا تو راستے میں قبیلہ تمیم کی ایک بڑھیا عورت مل گئی جس کے پاس سواری وغیرہ نہ تھی اس نے مجھ سے درخواست کی اور میں اسے اپنی سواری پر بٹھا کر یہاں لایا ہوں وہ دروازے پر بیٹھی ہوئی ہے۔ آپ نے اسے بھی اندر آنے کی اجازت دی۔ میں نے کہا یا رسول اللہ ہم میں اور بنو تمیم میں کوئی روک کر دیجئے۔ اس پر بڑھیا تیز ہو کر بولی اگر آپ نے ایسا کر دیا تو پھر آپ کے ہاں کے بے بس کہاں پناہ لیں گے؟ میں نے کہا سبحان اللہ! تیری اور میری تو وہی مثل ہوئی کہ بکری اپنی موت کو آپ اٹھا کر لے گئی، میں نے ہی تجھے یہاں پہنچایا، مجھے اس کے انجام کی کیا خبر تھی؟ اللہ نہ کرے کہ میں بھی عادی قبیلے کے وفد کی طرح ہو جاؤں۔ تو حضور نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ ہئ عادیوں کے وفد کا قصہ کیا ہے؟ باوجود یہ کہ آپ کو مجھ سے زیادہ اس کا علم تھا لیکن یہ سمجھ کر کہ اس وقت آپ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے قصہ شروع کر دیا کہ حضور جس وقت عادیوں میں قحط سالی نمودار ہوئی تو انھوں نے قیل نامی ایک شخص کو بطور اپنے قاصد کے بیت اللہ شریف دعا وغیرہ کرنے کے لیے بھیجا۔ یہ معاویہ بن بکر کے ہاں آکر مہمان بنا۔ یہاں شراب وکباب اور راگ رنگ میں ایسا مشغول ہوا کہ مہینے بھر تک جام لنڈھاتا رہا اور معاویہ کی دو لونڈیوں کے گانے سنتا رہا ان کا نام جرادہ تھا۔ مہینے بھر کے بعد مہرہ کے پہاڑوں پر گیا اور اللہ سے دعا مانگنے لگا کہ باری تعالیٰ میں کسی بیمار کی دوا کے لیے یا کسی قیدی کے فدیئے کے لیے نہیں آیا یا اللہ عادیوں کو تو وہ پلا جو پلایا کرتا تھا اتنے میں وہ دیکھتا ہے کہ چند سیاہ رنگ کے بادل اس کے سر پر منڈلا رہے ہیں ان میں سے ایک غیبی صدا آئی کہ ان میں سے جو تجھے پسند ہو قبول کر لے۔ اس نے سخت سیاہ بادل کو اختیار کیا اسی وقت دوسری آواز آئی کہ لے لے خاک راکھ جو عادیوں میں سے ایک کو بھی نہ چھوڑے۔ عادیوں پر ہوا کے خزانے میں سے صرف بقدر انگوٹھی کے حلقے کے ہوا چھوڑی گئی تھی جس نے سب کو غارت اور تہ و بالا کر دیا۔ ابو وائل کہتے ہیں۔ یہ واقعہ سارے عرب میں ضرب المثل ہو گیا تھا جب لوگ کسی کو بطور وفد کے بھیجتے تھے تو کہہ دیا کرتے تھے کہ عادیوں کے وفد کی طرح نہ ہو جانا۔ اسی طرح مسند احمد میں بھی یہ روایت موجود ہے سنن کی اور کتابوں میں بھی یہ واقعہ موجود ہے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر گلدستہ)

خلاصہ تفسیر

حضرت ہود (علیہ السلام) نے جب انھیں ہدایت فرمائی اور خدا عزوجل کا حکم سنایا تو بولے آپ ہمارے پاس کیا اس لیے آئے ہیں کہ ہم اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ دیں اور آپ کے بتائے ہوئے خدا کو پوجیں تو اس کے لیے ہم آمادہ نہیں اور آپ کا کہانہ ماننے پر آپ عذاب سے ہمیں ڈراتے ہیں، لہٰذا لائیں وہ عذاب تاکہ ہم آپ کی سچائی دیکھ لیں تو حضرت ہود (علیہ السلام) نے جواب میں ذرا سختی اختیار فرماتے ہوئے انھیں کہا کہ جب تم اتنے سرکش و سخت ہو تو یقیناً تم پر عذاب واجب ہو گیا اب تم ان فرضی معبودوں کو پوجتے رہو جس کے نام تم نے گھر لیے ہیں ان کی صداقت میں تمہارے پاس خدا کی طرف سے کوئی سند نہیں لہٰذا اب اس عذاب کے منتظر رہو اور میں بھی اس وقت کا منتظر ہوں۔ قوم عاد یمن کے ایک حصہ احقاف میں آباد تھی یہ علاقہ بڑا وسیع تھا۔ عمان سے حضر موت تک پھیلا ہوا تھا اسے رمل عالج اور رمقان بھی کہتے تھے یہ لوگ بہت مالدار اور طاقتور اور سرکش تھے جب ان کی سرکشی بڑھ گئی تو حضرت ہود (علیہ السلام) نے عذاب کی دعا مانگی امساک باراں کا عذاب آگیا۔

توجب عذاب آیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں محفوظ رکھا جو حضرت ہود پر ایمان لائے اور جھٹلانے والوں کی جڑیں اکھاڑ دیں۔ اس کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ قوم عاد احقاف میں آباد تھی۔ یہ مقام عمان اور حضر موت کے درمیان یمن کا ایک ریگستان ہے انھوں نے حضرت ہود (علیہ السلام) کی مخالفت کی اور فسق و فجور سے زمین بھر دی۔ دنیا کی

قوموں کو اپنی جفاکاری اور زور و قوت سے پامال کر ڈالا یہ لوگ تمام کے تمام بت پرست تھے ان کے بت کا نام صدا تھا اور ایک کا صمود اور ایک بت ہبا تھا۔ ان کی پرستش کے مقابلہ میں حضرت ہود (علیہ السلام) کی مخالفت کی اور نہیں اس کا زعم تھا کہ ہم سے زیادہ زور آور کون ہے۔

چند آدمی ان میں ایسے بھی تھے جو آپ پر ایمان لائے مگر چونکہ وہ گنتی کے تھے اس وجہ میں وہ ایمان چھپائے رہے ان میں سے ایک مرثد بن سعد تھے۔ جب قوم نے سرکشی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور اپنے نبی حضرت ہود (علیہ السلام) کی تکذیب و توہین میں حد سے بڑھ گئے اور زمین فسادات پر کر دی۔ مضبوط عمارتیں اور بڑے بڑے محل تعمیر کئے گویا انھوں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ ہمیں ہمیشہ دنیا میں رہنا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلا عذاب یوں رونما ہوا کہ امساک باراں ہوا جس سے وہ تنگ ہوئے۔

ان میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی مصیبت آئی تو کچھ لوگ بیت اللہ حاضر ہوتے اور بارگاہ رحمت میں دعا کرتے۔ چنانچہ انھوں نے ایک وفد ترتیب دیا اور مکہ معظّمہ کو روانہ کیا اس وفد میں قیل بن عنز اور نعم بن ہزال اور مرثد بن سعد تھے یہ وہی لوگ تھے جو حضرت ہود (علیہ السلام) پر خفیہ ایمان لائے ہوئے تھے اس زمانہ میں مکہ معظّمہ کے اندر عمالیق آباد تھے اور ان کا سردار معاویہ بن بکر تھا۔ اس کا ننھال قوم عاد میں تھا چونکہ یہ وفد اس کے ننھال میں تھا اس نے ان کا احترام کیا اور میزبانی میں نہایت پر تکلف انتظام کیا یہ لوگ وہاں مقیم ہوئے شراب نوشی میں لونڈیوں کے ناچ رنگ دیکھتے رہے ایک مہینہ اسی رنگ میں رلی میں گزر گیا اور وفد یہ بھی بھول گیا کہ ہم یہاں کس مصیبت کے لیے آئے تھے۔ اور قوم کو وہاں کس مصیبت میں چھوڑ کر آئے ہیں۔

معاویہ بن بکر خود انھیں یاد دلانا یوں پسند نہیں کرتا تھا کہ کہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ اسے ہمارا قیام اب بار ہے آخر اس نے یہ تجویز کی کہ باندیوں کو ایسے اشعار دیئے جن میں قوم عاد کی مصیبت کا ذکر تھا۔ غرض کہ جب باندیوں نے وہ ظلم گائی تو ان لوگوں کو یاد آیا کہ ہم تو یہاں قوم کی مصیبت پر فریاد کرنے کے لیے آئے تھے۔

مختصر یہ کہ وہ اس خیال کے آتے ہی بیت اللہ میں جا کر دعا کرنے کو روانہ ہوئے۔ تو مرثد نے انھیں کہا قسم بخدا تمہاری دعا سے اس وقت تک پانی برسنا ممکن نہیں جب تک تم اپنے نبی کی پیروی نہ کرو۔

یہ پہلی بار تھی کہ مرثد نے حضرت ہود (علیہ السلام) پر ایمان کا اظہار کیا۔ یہ سنتے ہی ان کے ساتھیوں نے مرثد کو چھوڑ دیا اور اسے تنہا چھوڑ کر خود بیت اللہ عزوجل گئے اور دعا کرنے لگے۔ ابھی دعا سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تین ابر بھیجے ایک سفید ایک سرخ اور ایک سیاہ پھر آسمان سے ندا آئی کہ اے قیل اپنے اوپر اپنی قوم کے لیے تینوں ابروں میں سے ایک ابر اختیار کر لے اس نے سیاہ ابر اختیار کیا اور سیاہ ابر اس امید پر اختیار کیا کہ اس میں بہت پانی ہوگا۔ چنانچہ یہ ابر قوم عاد کی طرف چلا جب قوم نے وہ سیاہ بادل دیکھا تو وہ خوش ہوئے اور کہنے لگے جس کا تذکرہ پ ۲۶ رکوع ۳ میں ہے۔

فلمارَاوہ عارضا مستقبل اودیتھم قالواھذا عارض ممطرنا

تو جب انھوں نے دیکھا بادل۔ بادل آسمان کے کناروں سے پھیلا ہوا ان کی وادیوں میں بولے یہ بادل ہے جو ہم پر برسے گا۔

بل ھوما استعجلتم بہ ریح فیھا عذاب الیم۔ بلکہ وہ وہی تھا جس کی تم جلدی کر رہے اور کہہ رہے تھے۔

فاتنا بما تعدنا ان کنت من الصدقین۔ یعنی تو لاؤ جس کا ہمیں وعدہ دے رہے ہو اگر تم سچے ہو۔ تو اس کالے بادلے سے بجائے پانی برسنے کے ایک آندھی آئی جس میں دردناک عذاب تھا۔ تدمر کل شی بامر ربھا تباہ کر دیا ہر شے کو اپنے رب کے حکم سے فاصبحوا لایری الا مسکنھم تو صبح کی ایسے حال میں کہ نہ نظر آیا کچھ سوا خالی مکانوں کے۔ چنانچہ اس سے ایک شدید آندھی چلی کہ اونٹوں اور آدمیوں کو اڑا اڑا کر کہیں سے کہیں پھینک دیا۔ یہ حال دیکھ کر لوگ سہم سہم کر گھروں میں پناہ گزین ہوئے اور دروازے بند کر لیے لیکن ہوا کی تیزی سے دروازے اکھڑ گئے اور وہ اندر کے اندر ہی تباہ ہو گئے۔ پھر قدرت الٰہی عزوجل سے سیاہ پرندے ایسے آئے جنہوں نے ان کی لاشیں اٹھا کر سمندر میں پھینک دیں۔ حضرت ہود (علیہ السلام) ان لوگوں کو ساتھ لے کر جو ایمان لا چکے تھے عاد کی آبادی سے علیحدہ ہو گئے اور سلامت رہے۔ پھر آپ ایمان والوں کو ہمراہ لے کر مکہ معظّمہ شریف لے آئے اور آخر عمر تک یہیں رہے اور انتقال فرمایا۔ (تفسیر الحسنات)

آیت مبارکہ:

قَالَ قَدۡ وَقَعَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ رِجۡسٌ وَّ غَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوۡنَنِىۡ فِىۡۤ اَسۡمَآءٍ سَمَّيۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوۡۤا اِنِّىۡ مَعَكُمۡ مِّنَ الۡمُنۡتَظِرِيۡنَ ○۷۱

لغۃ القرآن: قَالَ :فرمایا] [قَدْ :تحقیق] [وَقَعَ :واقع ہوگیا] [عَلَيْكُمْ :تم پر] [مِنْ رَّبِّكُمْ :تمہارے رب کی طرف سے] [رِجْسٌ :ناپاک] [وَّ غَضَبٌ :اور غضب] [اَتُجَادِلُوْنَنِيْ :کیا تم سب جھگڑتے ہو مجھ سے] [فِيْٓ :میں] [اَسْمَآءٍ :ان ناموں] [سَمَّيْتُمُوْهَآ :رکھ لیا ہے انہیں] [اَنْتُمْ :تم] [وَاٰبَآؤُكُمْ : اور تمہارے باپ دادا نے] [مَا :نہیں] [نَزَّلَ :اس نے اتاری] [اللّٰهُ :اللہ] [بِهَا :اس کے] [مِّنْ : سے] [سُلْطٰنٍ :کوئی دلیل] [فَانْتَظِرُوْٓا :پس تم سب انتظار کرو] [اِنِّيْ :بیشک میں] [مَعَكُمْ : تمہارے ساتھ ہوں] [مِّنَ :سے] [لْمُنْتَظِرِيْنَ :انتظار کرنے والوں]

ترجمہ: انھوں نے کہا: یقیناً تم پر تمہارے رب کی طرف سے عذاب اور غضب واجب ہو گیا۔ کیا تم مجھ سے ان (بتوں کے) ناموں کے بارے میں جھگڑ رہے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے (خود ہی فرضی طور پر) رکھ لیے ہیں جن کی اللہ نے کوئی سند نہیں اتاری؟ سو تم (عذاب کا) انتظار کرو میں (بھی) تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔

تشریح:

جب قوم عاد نے کہا کہ اے ہود! جس عذاب سے تو ہمیں ڈراتا ہے وہ ہم پر لے آ، ہم اپنے بتوں کی پرستش سے رکنے والے نہیں۔ کیونکہ ہمارے باپ دادا ان کی پرستش کرتے تھے ہم باپ دادا کا طریقہ نہیں چھوڑ سکتے۔ تو آپ نے فرمایا تو سمجھو اللہ کا عذاب آیا ہی چاہتا ہے تمہیں اس کے مطالبہ کی ضرورت نہیں۔ معلوم ہوا دین سے ہٹ کر باپ دادا اور خاندان کی اطاعت جائز نہیں۔ یہ کفار کا طریقہ ہے کہ وہ باپ دادا کی تقلید کرتے ہیں خدا اور سول کی نہیں۔ (تفسیر برہان القرآن)

وقع بمعنی وجب یا نزل ہے۔ رجس سے مراد عذاب ہے لیکن بعض علماء نے فرمایا ہے کہ جس کا معنی دل کی سیاہی ہے جو انکار حق سے آئینہ دل پر تہ در تہ جمتی چلی جاتی ہے اور اس کی فطری نورانیت اور صفائی کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ وقیل عنی بالرجس الدین علی القلب بزیادۃ الکفر (قرطبیؒ)
اسماء سے مراد وہ بت ہیں جن کی وہ پرستش کیا کرتے تھے یعنی الاصنام التی عبدوھا (قرطبیؒ) یعنی جن کو تم اپنا الٰہ اور معبود سمجھ رہے ہو ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ بلکہ یہ تمہاری اپنی من گھڑت باتیں ہیں جن کے لیے تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں۔ صاحب تفسیر مظہری لکھتے ہیں کہ قوم عاد اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل تو تھے اور یہ بھی مانتے تھے کہ وہ زمین و آسمان کا خالق ہے۔ لیکن اپنے بتوں کو بھی الوہیت اور خالقیت میں یا مستحق عبادت ہونے میں اللہ وحدہ لاشریک کا ساجھی مانتے تھے (مظہری) اسماء سے مراد مسمّٰی ہے اور سمیتموھا کا مفعول ثانی الہۃ محذوف ہے۔ فی اسماء ای اشیاء مسمیات سمیتموھا الہۃ (مظہری) ای فی اشیاء سمیتموھا الھۃ (بیضاوی) ان کے بتوں کے نام یہ تھے۔ صمود، صداء اور ہباء وغیرہ۔

ترجمہ: سو تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔ پھر ہم نے نجات دے دی ہود کو اور جو ان کے ہمراہ تھے اپنی خاص رحمت سے اور ہم نے کاٹ کر رکھ دی جڑ ان لوگوں کی جنھوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو ۹۵ف اور نہ تھے وہ ایمان لانے والے۔ اور قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح (علیہ السلام) کو بھیجا ۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

آیت کریمہ کے پہلے جملہ میں ایک لفظ استعمال ہوا ہے قَدْ وَقَعَ جس کا معنی ہے واقع ہو گیا یا واجب ہو گیا یہ فعل ماضی ہے جو کسی فعل کے وقوع پذیر ہونے پر دلالت کرتا ہے یعنی یہ فعل آئندہ نہیں بلکہ ماضی میں ہو چکا ہے حالانکہ یہاں حضرت ہود (علیہ السلام) اپنی قوم سے یہ کہنا چاہیے ہیں کہ جس عذاب کا تم تقاضا کر رہے ہو وہ مستقبل میں تم پر آ کر رہے گا لیکن اسے مستقبل کے صیغے کی بجائے ماضی کے صیغے سے ادا کرنا در حقیقت اس کی قطعیت کو ظاہر کرنا ہے یعنی اس عذاب کے آنے کو اس حد تک یقینی سمجھو کہ گویا وہ آ چکا ہے۔ اسی طرح اس کے بعد لفظ استعمال ہوا ہے رجسٌاس کے بھی تین معنی کیے جا سکتے ہیں۔ اہل علم نے اس کے تینوں معنی مراد لیے ہیں ایک معنی ہے پھٹکار یعنی تم پر اللہ کی پھٹکار پڑ چکی ہے یہ گویا ہدایت سے تمہاری محرومی کا فیصلہ ہے جسکے نتیجے میں اللہ کا غضب بھڑکے گا اور تم پر اللہ کا عذاب آ جائے گا دوسرا معنی ہے عذاب کہ جس عذاب کا تم مطالبہ کر رہے ہو وہ یوں سمجھو کہ عذاب تم پر آ گیا اور اس عذاب کی شدت کا حال یہ ہے کہ وہ صرف عذاب ہی نہیں بلکہ اس میں اللہ کا غضب بھی شامل ہے۔ تیسرا اس کا معنی ہے گندگی اور ناپاکی۔ اس سے مراد یہاں کفر و شرک اور اعمال و عقائد کی گندگی و ناپاکی ہے اور رجس اور غضب میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس عذاب کا تم مطالبہ کر رہے ہو اس میں اب دیر نہیں اس کو آیا ہی سمجھو اس لیے کہ جس ناپاکی اور گندگی سے خدا کا غضب بھڑکتا ہے اس کی بہت بڑی کھیپ تم نے اپنے اوپر لاد لی ہے۔ رجس کا اتنا بڑا انبار جمع کر لینے کے بعد اب اللہ کے عذاب کو دور نہ سمجھو۔ جس طرح کسی مکان میں گیس بھر جائے تو اب اس مکان کے جل جانے میں کوئی دیر نہیں ہوتی اگر کوئی اڑتا ہوا شعلہ بھی وہاں جا پڑا تو پورا مکان بھک سے اڑ جائے گا کیونکہ گیس ایک آتش پذیر مادہ ہے جس مکان میں بھی وہ پھیل جائے گا اس کے جل جانے میں تاخیر نہیں ہو گی۔ اسی طرح شرک اللہ سے بغاوت اور اس کی بندگی کے سوا دوسروں کی بندگی' یہ بھی آتش پذیر مادہ کی طرح ہیں بلکہ اگر انھیں عذاب پذیر کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا عجیب بات یہ ہے کہ ان چیزوں کو جمع کرنے والا کبھی ان سے توبہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر تو ایسا کرنے والا کوئی ایک شخص ہے تو وہ تو اپنا انجام آخرت میں بھگتے گا لیکن اگر اس کا ارتکاب کرنے والی پوری قوم ہے تو ان پر اللہ کا عذاب آ جانا لازم ہو جاتا ہے یہی وہ بات ہے جو حضرت ہود (علیہ السلام) اپنی قوم سے فرما رہے ہیں کہ نادانو! تم آگ سے کھیل رہے ہو لیکن تمہیں اس کا بالکل اندازہ نہیں۔ عذاب تمہارے سر پر تلا کھڑا ہے لیکن تم اپنی عیاشیوں میں مصروف ہو بلکہ تمہاری جسارتوں کا عالم یہ ہے کہ تم پیغمبر کی دعوت پر غور کرنے کی بجائے اپنے آباؤ اجداد کے عمل کو سب سے بڑی دلیل سمجھ بیٹھے ہو اور انھوں نے تمہارے سپرد جو مشرکانہ اعتقادات کیے ہیں جس کے ساتھ کوئی دلیل نہیں تمہیں ان پر اصرار ہے۔ انہی کا حوالہ دے کر یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ تم مجھ سے ایسی چیزوں کے بارے میں بحث کر رہے ہو جن کے نام تو بیشک تم نے کچھ رکھ چھوڑے ہیں لیکن ان ناموں کا کو مسمّٰی موجود نہیں یعنی تم کسی کو بارش کا' کسی کو ہوا کا' کسی کو دولت کا' اور کسی کو بیماری کا رب کہتے ہو حالانکہ ان میں سے کوئی بھی فی الحقیقت کسی چیز کا رب نہیں۔ ان کے شریک خدا ہونے کی کوئی دلیل نہ عقل و فطرت کے اندر موجود ہے نہ اللہ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے کہیں یہ خبر دی ہے کہ اس نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے۔ پھر وہ کیا چیز ہے جس کی بناء پر تم ان کو معبود بنائے بیٹھے ہو اور ان کی حمایت میں مجھ سے لڑ رہے ہو۔

اس آیت کے آخری جملے میں فرمایا کہ اے برادران قوم اگر تمہیں میری دعوت کسی طرح قابل قبول نہیں اور تم شرک اور بداعمالیوں سے کسی طرح تائب ہونے کے لیے تیار نہیں ہو اور تمہاری جراتوں کا حال یہ ہے کہ تم اللہ کے عذاب کا مطالبہ کرنے لگے ہو تو تمہارے کرتوتوں کے باعث عذاب کا آنا تو یقینی ہے البتہ وہ کب آتا ہے یہ میرے بس میں نہیں تم بھی انتظار کرو میں بھی انتظار کرتا ہوں لیکن یاد رکھو تمہارا یہ رویہ باقی رہا تو تمہیں زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ان کی انتہائی شرارت و بغاوت اور اپنے پیغمبر کی تعلیم سے بے پناہ بغض و عناد کی پاداش اور قانون جزاء کا وقت آن پہنچا اور غیرت حق حرکت میں آئی اور عذاب الٰہی نے سب سے پہلے خشک سالی کی شکل اختیار کی' عاد سخت گھبرائے پریشان ہوئے اور عاجز و درماندہ نظر آنے لگے تو حضرت ہود (علیہ السلام) کو جوشِ ہمدردی نے اکسایا اور مایوسی کے بعد پھر ایک مرتبہ ان کو سمجھایا کہ راہ حق اختیار کر لو' میری نصائح پر ایمان لے آؤ کہ یہی نجات کی راہ ہے' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ورنہ

پچھتاؤگے لیکن بدبخت و بدنصیب قوم پر کوئی اثر نہ ہوا' بلکہ بغض و عناد اور دوبالا ہوگیا۔ تب ہولناک عذاب نے ان کو آگھیرا' آٹھ دن اور سات راتیں پیہم تیز و تند ہوا کے طوفان اٹھے اور ان کو اور ان کی آبادی کو تہ و بالا کرکے رکھ دیا تنومند اور قوی ہیکل انسان جو اپنی جسمانی قوتوں کے گھمنڈ میں سرمست تھے اس طرح بے حس و حرکت پڑے نظر آتے تھے جس طرح آندھی سے تناور درخت بے جان ہو کر گرجاتا ہے' غرضیکہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے۔ (تفسیر روح القراان)

فوائد

1۔ یعنی ہم تم کو تمہاری پاک سیرت و صورت اور تمہارے معجزے دیکھ کر سچا نہیں مانیں گے۔ بلکہ عذاب دیکھ سچا مانیں گے سچ ہے خدا جب دین لیتا ہے عقل بھی چھین لیتا ہے۔

2۔ قرآن کریم میں آئندہ یقینی واقعات کو ماضی سے تعبیر فرمادیتے ہیں۔ چونکہ عذاب آنا یقینی تھا للذا فرمایا گیا کہ سمجھو عذاب آہی گیا۔

3۔ جن کی حقیقت کچھ نہیں صرف فرضی نام ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مشرکوں نے جن بتوں کو گھڑ رکھا ہے۔ مہادیو، گنیش، ہنومان وغیرہ یہ سب فرضی نام ہیں۔ نہ یہ مخلوق کبھی تھی نہ آئندہ ہو سکتی ہے۔ ہنومان کے چوتڑوں پر دم، گنیش کے منہ پر سونڈ، کسی کے سر پر سینگ ایسے انسان کبھی ہوئے نہیں صرف رضی قصے ہیں۔ اب بعض جاہل مسلمانوں کا ان کو ولی یا نبی کہنا نری حماقت ہے۔ ان کی انسانیت بلکہ ان کی ہستی ہی ثابت نہیں ولایت و نبوت کیسی۔

4: کہ کسی نبی نے اس مخلوق کا ذکر نہ فرمایا ایسے ہی ہندوؤں کے بتوں کرشن، رام چندر وغیرہ کی کسی نبی کسی رسول نے خبر نہ دی للذا ان کا ثبوت نہیں۔

5: اپنی ہلاکت و عذاب کے تم بھی منتظر رہو میں بھی انتظار کرتا ہوں۔

آیت مبارکہ:

فَاَنۡجَيۡنٰهُ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعۡنَا دَابِرَ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ ۝

لغۃ القرآن: فَاَنْجَيْنٰهُ :تو نجاد دی ہم نے اسے] [وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ جو] [مَعَهٗ : اس کے ساتھ] [بِرَحْمَةٍ :کوئی رحمت] [مِّنَّا :ہم سے] [وَقَطَعْنَا : اور کاٹ دی ہم نے] [دَابِرَ :جڑ] [الَّذِيْنَ :وہ لوگ جو] [كَذَّبُوْا : انھوں نے جھٹلایا] [بِاٰيٰتِنَا :ہماری آیات کو] [وَمَا : اور نہ] [كَانُوْا :تھے سب] [مُؤْمِنِيْنَ :سب ایمان رکھنے والے]

ترجمہ: پھر ہم نے ان کو اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے اپنی رحمت کے باعث نجات بخشی اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا اور وہ ایمان لانے والے نہ تھے

تشریح: حضرت ہود (علیہ السلام) کی قوم پر عذاب نازل ہونے کا واقعہ:

اس کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ قوم عاد احقاف میں رہتی تھی، احقاف عمان اور حضر موت کے درمیان علاقہ یمن میں ایک ریگستان ہے۔ قوم عاد نے زمین کو فسق سے بھر دیا تھا۔ یہ لوگ بت پرست تھے ان کے ایک بت کا نام "صُدَاء" اور ایک کا "صُمُود" اور ایک کا "ہَبَاء" تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں حضرت ہود (علیہ السلام) کو مبعوث فرمایا آپ نے انھیں توحید کا حکم دیا، شرک و بت پرستی اور ظلم و جفاکاری کی ممانعت کی، لیکن وہ لوگ نہ مانے اور آپ کی تکذیب کرنے لگے اور کہنے لگے ہم سے

زیادہ زور آور کون ہے ؟ان میں سے صرف چند آدمی حضرت ہود (علیہ السلام) پر ایمان لائے جو بہت تھوڑے تھے اور وہ بھی مجبوراً اپنا ایمان چھپائے رکھتے تھے۔ اُن مومنین میں سے ایک شخص کا نام مرثد بن سعد تھا، وہ اپنا ایمان مخفی رکھتے تھے۔ جب قوم نے سرکشی کی اور اپنے نبی حضرت ہود عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی تکذیب کی اور زمین میں فساد کیا اور ستم گاریوں میں زیادتی کی اور بڑی بڑی مضبوط عمارتیں بنائیں تو اللہ تعالیٰ نے ان پر بارش روک دی، تین سال بارش نہ ہوئی اب وہ بہت مصیبت میں مبتلا ہوئے اور اس زمانہ میں دستور یہ تھا کہ جب کوئی بلا یا مصیبت نازل ہوتی تھی تو لوگ بیت الحرام میں حاضر ہو کر اللہ تعالیٰ سے اس مصیبت کو دور کرنے کی دعا کرتے تھے، اسی لیے ان لوگوں نے ایک وفد بیت اللہ کو روانہ کیا اس وفد میں تین آدمی تھے جن میں مرثد بن سعد بھی تھے یہ وہی صاحب ہیں جو حضرت ہود (علیہ السلام) پر ایمان لائے تھے اور اپنا ایمان مخفی رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں مکہ مکرمہ میں عمالیق کی سکونت تھی اور ان لوگوں کا سردار معاویہ بن بکر تھا، اس شخص کا ننھیال قوم عاد میں تھا، اسی علاقہ سے یہ وفد مکہ مکرمہ کے حوالی میں معاویہ بن بکر کے یہاں مقیم ہوا۔ اس نے ان لوگوں کی بہت عزت کی اور نہایت خاطر و مدارت کی، یہ لوگ وہاں شراب پیتے اور باندیوں کا ناچ دیکھتے تھے۔ اس طرح انھوں نے عیش و نشاط میں ایک مہینہ بسر کیا۔ معاویہ کو خیال آیا کہ یہ لوگ تو راحت میں پڑ گئے اور قوم کی مصیبت کو بھول گئے جو وہاں گرفتار بلا ہے مگر معاویہ بن بکر کو یہ خیال بھی تھا کہ اگر وہ ان لوگوں سے کچھ کہے تو شاید وہ یہ خیال کریں کہ اب اس کو میزبانی گراں گزرنے لگی ہے اس لیے اس نے گانے والی باندی کو ایسے اشعار دیئے جن میں قوم عاد کی حاجت کا تذکرہ تھا جب باندی نے وہ نظم گائی تو ان لوگوں کو یاد آیا کہ ہم اس قوم کی مصیبت کی فریاد کرنے کے لیے مکہ مکرمہ بھیجے گئے ہیں۔ اب انھیں خیال ہوا کہ حرم شریف میں داخل ہو کر قوم کے لیے پانی برسنے کی دعا کریں، اس وقت مرثد بن سعد نے کہا کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کی قسم، تمہاری دعا سے پانی نہ برسے گا، البتہ اگر تم اپنے نبی کی اطاعت کرو اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو تو بارش ہوگی، اس وقت مرثد نے اپنے اسلام کا اظہار کر دیا۔ ان لوگوں نے مرثد کو چھوڑ دیا اور خود مکہ مکرمہ جا کر دعا کی اللہ تعالیٰ نے تین قسم کے بادل بھیجے، ایک سفید، ایک سرخ اور ایک سیاہ۔ اس کے ساتھ آسمان سے ندا ہوئی کہ اے قَیل ! اپنے لیے اور اپنی قوم کے لیے ان میں سے ایک بادل اختیار کر، اس نے اس خیال سے سیاہ بادل کو اختیار کیا کہ اس سے بہت پانی برسے گا چنانچہ وہ بادل قوم عاد کی طرف چلا اور وہ لوگ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے مگر اس سے ایک ہوا چلی جو اس شدت کی تھی کہ اونٹوں اور آدمیوں کو اڑا اڑا کر کہیں سے کہیں لے جاتی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ لوگ گھروں میں داخل ہوئے اور اپنے دروازے بند کر لئے مگر ہوا کی تیزی سے بچ نہ سکے اس نے دروازے بھی اکھیڑ دیئے اور ان لوگوں کو ہلاک بھی کر دیا اور قدرت الٰہی سے سیاہ پرندے نمودار ہوئے جنہوں نے ان کی لاشوں کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا۔ حضرت ہود (علیہ السلام) مومنین کو لے کر قوم سے جدا ہو گئے تھے اس لیے وہ سلامت رہے، قوم کے ہلاک ہونے کے بعد وہ ایمانداروں کو ساتھ لے کر مکہ مکرمہ تشریف لائے اور آخر عمر شریف تک وہیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں یہ واقعہ یوں قلمبند کیا ہے:

قوم عاد کا قصہ

محمد بن اسحاق وغیرہ نے لکھا ہے کہ احقاف یعنی عمان و حضر موت کے درمیان ریگستان میں قوم عاد رہتی تھی اللہ نے اس کو ڈیل ڈول اور جسمانی طاقت بہت زیادہ عطا فرمائی تھی لیکن انھوں نے خداداد طاقت سے ملک میں تباہی مچا رکھی تھی اور چاروں طرف کے لوگوں کو روند ڈالا تھا یہ لوگ بتوں کی پوجا کرتے تھے ان کے تین بت تھے صدا۔ سمود۔ ہبا اللہ نے ان کے ایک درمیانی خاندان کے ایک شخص ہود (علیہ السلام) کو ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا۔ حضرت ہود (علیہ السلام) اگرچہ متوسط النسب تھے مگر اخلاق و فضائل ذاتی میں سب سے برتر تھے حضرت ہود (علیہ السلام) نے قوم کو توحید کی دعوت دی اور حکم دیا کہ کسی پر ظلم نہ کرو اس سے زیادہ اور کسی بات کا حکم نہیں دیا۔ قوم نے آپ کی تکذیب کی اور بولے ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے ان لوگوں نے عظیم الشان عمارتیں اور کارخانے بنائے تھے اور جابرانہ اقتدار پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اس سرکشی کی پاداش میں اللہ نے تین برس تک ان سے بارش روک لی جس کی وجہ سے لوگ سخت دکھ اور بے چینی میں مبتلا ہو گئے اس زمانہ کا دستور تھا کہ جب کوئی لاینحل مصیبت آتی تو (مشرک بھی) اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے اور کعبہ کو جا کر مسلم اور مشرک سب مختلف المذاہب سب لوگ حرم میں جمع ہو کر دعا کرتے تھے مکہ میں اس زمانہ میں عمالقہ یعنی عملیق بن لادر بن سام بن نوح کی اولاد رہتی تھی جن کا سردار معاویہ بن بکر تھا معاویہ کی ماں کلہدہ بنت الخیر تھی الخیر قوم عاد ہی کا ایک فرد تھا گویا معاویہ بن بکر کی ننھیال قوم عاد میں کی تھی اسی ناطہ سے قیل بن عنز اور یقیم بن ہزال بن ہزیل اور عتیل بن ضد بن عاد

اکبر اور مرثد بن سعد بن عفیر (یہ شخص درپردہ مومن تھا) اور معاویہ بن بکر کا ماموں حثیمہ بن جثیر ہر ایک اپنے اپنے قبیلہ کے کچھ لوگوں کو لے کر مکہ کو چل دیا پھر لقمان بن عاد اصغر بن عاد اکبر کو عاد والوں نے بھیج دیا غرض مجموعی تعداد ستّر ہو گئی سب لوگ مکہ پہنچ کر معاویہ بن بکر کے پاس ٹھہرے اور ایک مہینہ تک ٹھہرے رہے روز شرابیں پیتے اور معاویہ بن بکر کی دو خوش آواز گانے والی باندیاں جن کو جراد تین کہا جاتا تھا ان کو گانا سناتی تھیں۔ اسی طرح دو مہینے گزر گئے ایک مہینہ میں تو پہنچے ہی تھے اور ایک مہینہ قیام میں گزرا معاویہ بن بکر نے کہا یہ لوگ آئے تو فریاد اور دعا کرنے مگر غفلت میں پڑے ہوئے ہیں وہاں میرے ننھیال والے تباہ ہو رہے ہیں لیکن کیا کیا جائے یہ مہمان ہیں ان کو نکالتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے اگر میں ان سے کہتا ہوں کہ جس کام کے لیے آئے تھے اس کی تکمیل کے لیے جاؤ تو یہ خیال کریں گے کہ میں ان کی مہمانی سے تنگ آگیا ہوں ادھر لوگ بھوکے پیاسے مر رہے ہوں گے اسی شش و پنج میں تھا کہ اپنی باندیوں سے مشورہ طلب کیا باندیوں نے کہا آپ کچھ شعر کہہ دیں۔ ہم وہ شعر یاد کر کے ان کے سامنے گائیں گی۔ گانا سن کر ضرور ان میں حرکت پیدا ہو گی اور معلوم بھی نہ ہو کہ ان شعروں کا تصنیف کرنے والا کون ہے معاویہ نے اس رائے کو پسند کیا اور حسب ذیل شعر کہے۔

اے قیل اور ہیثم اٹھ شاید اللہ بارش سے ہم کو سیراب فرمادے جس سے قوم عاد سیراب ہو ان لوگوں کی تو ایسی حالت ہو گئی کہ سخت پیاس کی وجہ سے بات بھی نہیں کر سکتے نہ بوڑھے کی امید ہے نہ بچے کی۔ پہلے عورتیں عافیت سے تھیں مگر اب عورتیں بھی سخت پیاسی ہو گئیں۔ قوم عاد کو کھانے کے لیے علی الاعلان درندے گشت کر رہے ہیں اور کسی عاد والے کے تیروں کا ان کو اندیشہ نہیں اور تم لوگ یہاں مزے میں سارے دن رات گزار رہے ہو اے وفد والو تمہارا برا ہو تم کو سلامتی اور خوش آمدید نصیب نہ ہو۔

باندیوں نے یہ اشعار گائے تو وفد والے آپس میں کہنے لگے تم کو قوم نے آئی ہوئی مصیبت کو ٹالنے کی دعا کرنے بھیجا تھا اور تم نے یہاں تاخیر کر دی اب حرم میں چلو اور قوم کے لیے بارش کی دعا کرو۔ مرثد بن مسعود بن عفیر جو درپردہ مومن ہو گیا تھا بولا خدا کی قسم تمہاری دعاؤں سے بارش نہیں ہو گی ہاں اگر اپنے نبی کا حکم مانو گے اور اپنے رب سے توبہ کرو گے تو بارش ہو گی۔ اس وقت مرثد نے اپنا اسلام ظاہر کر دیا اور مندرجہ ذیل شعر کہے۔

عاد نے اپنے پیغمبر کی نافرمانی کی جس کی وجہ سے پیاسے ہو گئے آسمان پر ایک قطرہ نہیں برساتا ان کا ایک بت ہے جس کو صمود کہا جاتا ہے اور اس کے سامنے صدا اور ہبا بھی ہیں۔ اللہ نے رسول کے ذریعہ سے ہم کو راہ ہدایت دکھائی ہم نے سیدھا راستہ دیکھ لیا اور نابینائی جاتی رہی جو معبود ہود کا ہے وہی میرا معبود ہے اللہ ہی پر بھروسہ ہے اور اسی سے آس ہے۔

اہل وفد نے معاویہ بن بکر سے کہا مرثد کو روک لو یہ ہمارے ساتھ مکہ کو نہ جائے لیکن مرثد بن سعد معاویہ کے گھر سے نکل گیا اور وفد والوں کو دعا کرنے سے پہلے ہی جا پکڑا جس مصیبت کو دور کرنے کی دعا کرنے کے لیے نکلے تھے اگر دعا کر چکتے تو اس سے سنگین مصیبت میں سب گرفتار ہو جاتے۔ مگر دعا کرنے سے پہلے ہی مرثد آ پہنچا ادھر اہل وفد دعا کرنے کھڑے ہوئے اور ادھر مرثد نے علیحدہ دعا کرنی شروع کی اے اللہ تنہا میرا سوال میرے لیے پورا کر دے اور وفد والے جو دعا کر رہے ہیں اس میں مجھے شامل نہ فرما۔ قیل بن عنز وفد کا سردار تھا اس لیے وفد والوں نے دعا کی اے اللہ قیل کی دعا قبول فرما اور ہماری درخواست کو اس کی دعا کے ساتھ شامل کر دے۔ اس دعا کے وقت لقمان بن عاد جو قوم عاد کا ایک سردار تھا الگ رہا جب وفد والے دعا کر چکے تو لقمان نے دعا کی الٰہی میں تیرے سامنے تنہا اپنی گزارش لے کر آیا ہوں میری دعا قبول فرما یہ کہہ کر لقمان نے اپنے لیے درازی عمر کی دعا کی چنانچہ اس کی عمر سات گدوں کی برابر ہوئی۔ قیل بن عنز نے دعا کی تھی الٰہی اگر ہود (علیہ السلام) سچے ہیں تو ہم کو سیراب فرما ہم مرے جا رہے ہیں دعا کے نتیجہ میں اللہ نے تین رنگ کے بادل نمودار فرمائے سفید' سرخ' سیاہ اور ابر میں سے ایک منادی نے ندا دی اے قیل اپنے اور اپنی قوم کے لیے ان بادلوں میں سے ایک کا انتخاب کر لے۔ قیل نے کہا میں کالے بادل کا انتخاب کرتا ہوں کالی گھٹا سے خوب بارش ہوتی ہے۔

منادی نے ندا دی تو نے راکھ پسند کی' قوم عاد میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا۔ اس کے بعد وہ کالا بادل جس کا انتخاب قیل نے کیا تھا۔ اپنے سارے عذاب کو لے کر عاد کی طرف روانہ ہو گیا اور قوم کی بستیوں پر پہنچ کر کالی گھٹا بن گیا لوگ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے اس ابر سے ہم پر ضرور بارش ہو گی۔ اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا نہیں بلکہ یہ وہ عذاب ہے جس کے جلد آ جانے کے تم خواستگار تھے یہ ایک آندھی ہے جس کے اندر دردناک عذاب ہے یہ آندھی اپنے رب کے حکم

سے ہر چیز کو تباہ کر دے گی بادل کے اندر سب سے پہلے ایک عورت کو جس کا نام مہدر تھا تباہ کن طوفان دکھائی دیا اور طوفان کو دیکھ کر وہ بے ہوش ہو گئی کچھ دیر کے بعد ہوش میں آئی اور لوگوں نے پوچھا تجھے کیا نظر آیا تو کہنے لگی میں نے آگ کے شعلوں کی طرح ایک آندھی دیکھی جس کو کچھ لوگ (جانور کی طرح) کھینچ کر لا رہے تھے اللہ نے یہ طوفان قوم عاد پر سات رات اور آٹھ دن مسلط رکھا جس نے ہر چیز کو تباہ کر دیا۔ قوم عاد میں سے کوئی زندہ نہ بچا۔ البتہ حضرت ہود اور آپ کے مومن ساتھی ایک باڑہ بنا کر اس کے اندر بیٹھ کر امن سے رہے طوفانی ہوا اندر آتی تو نرم نرم ہوا بن کر بدن پر لگتی اور پر نشاط تنفس کا سبب بن جاتی تھی اور لدی ہوئی اونٹیوں کو لگتی تو اٹھا کر اوپر لے جاتی اور کہیں پتھروں سے جا پٹکتی تھی دعا کرنے کے بعد مکہ سے لوٹ کر عاد کا وفد پھر معاویہ بن بکر کے پاس جا کر ٹھہر گیا عاد کی مصیبت کو تیسرا روز تھا کہ ایک اونٹنی سوار چاندنی رات میں وفد کے پاس آ پہنچا اور واقعہ کی اطلاع دی۔ اہل وفد نے پوچھا جب تم روانہ ہوئے تھے تو ہود اور ان کے ساتھی کہاں تھے مخبر نے کہا میں نے ان کو سمندر کے ساحل پر چھوڑا تھا لوگوں کو اس کے بیان میں شک ہوا لیکن ہر ملہ بنت بکر نے کہا رب مکہ کی قسم اس نے سچ کہا ہے۔

اہل روایت نے لکھا ہے کہ مرثد بن سعد لقمان بن عاد اور قیل بن عنز کی دعائیں مکہ میں قبول ہو گئی تھیں اور ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ تمہاری درخواستیں منظور ہیں تم اپنے لیے سوال کا انتخاب کر لو ہاں موت ضرور آئے گی دوامی زندگی حاصل ہونے کا کوئی راستہ نہیں۔ چنانچہ مرثد نے دعا کی الٰہی مجھے سچائی اور نیکی عطا کر اس کی دعا قبول ہو گئی۔ لقمان نے دعا کی الٰہی مجھے عمر عطا کر دریافت کیا گیا جتنی پسند کرو۔ لقمان نے سات گدوں کی عمر پسند کی دعا قبول ہوئی لقمان نے یہ دستور بنا لیا کہ گدھ کا نر بچہ انڈے سے نکلا ہوا پکڑ لیتا تھا اور اس کو اپنے پاس رکھتا تھا جب اپنی عمر پر وہ مر جاتا تو دوسرا بچہ پکڑ لیتا تھا اس طرح جب سات بچے اس نے ایک کے بعد ایک پکڑ کر پالے ہر گدھ کی عمر اسی سال ہوئی آخری گدھ لبد تھا جب لبد بھی مر گیا تو لقمان کا بھی اس کے ساتھ انتقال ہو گیا۔ قیل نے کہا جو حال میری قوم کا ہو وہی میرا ہو۔ ندا آئی ان کیلئے تو ہلاکت مقدر ہے قیل نے کہا مجھے پروا نہیں ان کے بعد مجھے زندہ رہنے کی ضرورت نہیں چنانچہ جو عذاب قوم پر آیا تھا وہی اس پر آیا اور یہ بھی ہلاک ہو گیا۔

سدی کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر بغیر بارش کا ایک طوفان مسلط کیا تھا جب انھوں نے دیکھا کہ اونٹوں کو ان کے بار سمیت طوفان اٹھا کر آسمان اور زمین کے درمیان لے جا رہا ہے تو بھاگ کر گھروں میں گھس گئے اور دروازے بند کر لیے مگر طوفان نے وہاں بھی نہ چھوڑا دروازے اکھاڑ کر اندر گھس کر سب کو ہلاک کر دیا اور لاشوں کو باہر لا کر پھینک دیا اس کے بعد اللہ نے سیاہ رنگ کے کچھ پرندے بھیج دیئے اور پرندوں نے لاشوں کو اٹھا کر سمندر میں جا پھینکا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ طوفان نے ان پر ریت پاٹ دیا سات رات اور آٹھ دن وہ ریت میں دبے رہے ریت کے اندر سے ان کے کراہنے کی آواز آتی تھی پھر ہوا نے ان کے اوپر سے ریت اڑا دیا اور اٹھا کر ان کو سمندر میں جا گرایا ہمیشہ ہوا ایک خاص اندازہ سے چلتی ہے مگر اس روز اس کی رفتار کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا اندازہ کرنے والے بھی اندازہ کرنے سے عاجز ہو گئے۔ (تفسیر مظہری)

فوائد

1: اس سے دو مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ نبی ولی اور کوئی مومن اللہ کی رحمت سے بے نیاز نہیں سب اس کی رحمت کے حاجت مند ہیں۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کو رسول کے طفیل اور ان کی ہمراہی کی برکت سے رحمت ملتی ہے اسی لیے فرمایا والذین معہ۔ جس سے معلوم ہوا کہ نبی کی ہمراہی نجات کا سبب ہے۔

2: اس طرح کہ ان کا ایک فرد باقی نہ بچا اور نسل بھی ختم کر دی گئی۔ آئندہ کوئی ان کا نام لیوا نہ رہا۔ (تفسیر نور العرفان)

آیت مبارکہ:

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ قَدْ جَاۗءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْۗءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○۷۳

لغۃ القرآن: وَاِلٰي : اور کی طرف] [ثَمُوْدَ :ثمود] [اَخَاهُمْ : ان کے بھائی] [صٰلِحًا :صالح کو] [قَالَ :فرمایا] [يٰقَوْمِ :اے میری قوم] [اعْبُدُوا :تم سب عبادت کرو] [اللّٰهَ : اللہ] [مَا :نہیں] [لَكُمْ : تمہارے لیے] [مِنْ اِلٰهٍ :کوئی معبود] [غَيْرُهٗ : اس کے سوا] [قَدْ :تحقیق] [جَاۗءَتْكُمْ : آئی ہے تمہارے پاس] [بَيِّنَةٌ :روشن دلیل] [مِنْ رَّبِّكُمْ :تمہارے رب کی طرف سے] [هٰذِهٖ :یہ] [نَاقَةُ : اونٹنی] [اللّٰهِ : اللہ] [لَكُمْ :تمہارے لیے] [اٰيَةً : ایک نشانی] [فَذَرُوْهَا :تو تم سب چھوڑ دو اسے] [تَاْكُلْ :وہ کھاتی پھرے] [فِيْٓ :میں] [اَرْضِ :زمین] [اللّٰهِ : اللہ] [وَلَا : اور نہ] [تَمَسُّوْهَا :تم سب ہاتھ لگانا اسے] [بِسُوْۗءٍ :برائی سے] [فَيَاْخُذَكُمْ :ورنہ پکڑ لے گا تمہیں] [عَذَابٌ : عذاب ہے] [اَلِيْمٌ :دردناک]

ترجمہ: اور (قوم) ثمود کی طرف ان کے (قومی) بھائی صالح (علیہ السلام) کو (بھیجا)، انھوں نے کہا: اے میری قوم ! اللہ کی عبادت کیا کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، بیشک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل آ گئی ہے۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے نشانی ہے، سو تم اسے (آزاد) چھوڑے رکھنا کہ اللہ کی زمین میں چرتی رہے اور اسے برائی (کے ارادے) سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ تمہیں دردناک عذاب آ پکڑے گا

تشریح: قصہ انسانیت کی کتاب کا اب ایک اور صفحہ الٹا جاتا ہے۔ اس صفحہ میں تاریخ کے ناپیدار کنار سمندر کی گہرائیوں کی ایک عظیم لہر اٹھی ہے۔ انسانیت کی کشتی ایک بار پھر منحرف ہو کر پیچھے چلی گئی ہے اور اب وہ مکمل جاہلیت کے چنگل میں ہے۔ حق و باطل کے درمیان کشمکش کا ایک نیا منظر سامنے ہے اور مکذبین اور جھٹلانے والوں کی ایک نئی قتل گاہ منظر پر آنے والی ہے۔

آیت " وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ "۔ (۷ : ۷۳)

" اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اس نے کہا " اے برادران قوم ' اللہ کی بندگی کرو ' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ "

یہ وہی کلمہ ہے جس سے اس جہان کا آغاز ہوا اور اسی پر اس کا اختتام ہوگا۔ اعتقاد طرز عمل اور نقطہ نظر کی وہی سمت ہے جو دعوت و تبلیغ میں اختیار کی جا رہی ہے۔ وہی انداز کلام و گفتگو ہے جو روز اول سے جاری ہے۔ تمام انبیاء کے ہاں یہی طرز تبلیغ ہے۔

ہاں یہاں ایک عنصر کا اضافہ ہے۔ حضرت صالح (علیہ السلام) کی دعوت کی پشت پر اب استدلال کے ساتھ ساتھ ایک معجزہ بھی نظر آتا ہے اور یہ معجزہ خود قوم ثمود کے مطالبے کے نتیجے میں اللہ کی قدرت کاملہ کا مظہر ہے اور حضرت صالح (علیہ السلام) کی دعوت کی تصدیق و تائید کے لیے ہے۔

آیت "قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ هَـٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً" (۷ : ۷۳)

" تمہارے پاس تمہارے رب کی کھلی دلیل آ گئی ہے۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے ایک نشانی کے طور پر ہے "۔

یہاں سیاق کلام سے اصل مطلوب یہ ہے کہ دعوت اسلامی اپنے اصولوں کے اعتبار سے ایک ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس پر جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا انجام کیا ہوتا ہے اور جو لوگ انکار کرتے ہیں اور اس دعوت کو جھٹلاتے ہیں ان کا حشر کیا ہوتا ہے۔ اس لیے قصوں کی اہم اہم جھلکیاں دی گئی ہیں۔ یہاں یہ تفصیل اس لیے نہیں دی گئی کہ انھوں نے اس طرح معجزے کا مطالبہ کیا اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے انھیں معجزہ دکھایا بلکہ صرف یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ان کو دعوت دی گئی اور اس کے بعد معجزہ دکھایا گیا۔ ناقہ کے بارے میں بھی صرف اسی قدر کہا گیا کہ وہ اللہ کی جانب سے ایک نشانی تھی۔ یہ اللہ کی ناقہ تھی اور ایک معجزہ تھی۔ اس انداز کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک غیر معمولی ناقہ تھی یا اس ناقے کی پیدائش معجزانہ انداز میں ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ اللہ کی نشانی کہلائی۔ یہی وجہ ہے کہ اسے "اللہ کی اونٹنی" کے الفاظ سے پکارا گیا اور وہ نشانی تھی اس بات کی کہ حضرت صالح (علیہ السلام) کی نبوت برحق ہے۔

(تفسیر فی ظلال القرآن۔ سید قطب شہید)

قوم ثمود کی اجمالی تاریخ:

حضرت صالح (علیہ السلام) جس قوم میں پیدا ہوئے اس کا نام ثمود ہے۔ قوم ثمود بھی سامی اقوام کی ایک شاخ ہے۔ عاد اولی کی ہلاکت کے وقت جو ایمان والے حضرت ھود (علیہ السلام) کے ساتھ بچ گئے تھے یہ قوم ان ہی کی نسل سے ہے۔ اس کو عاد ثانیہ کہا جاتا ہے۔ قوم ثمود، ثمود نام کے ایک شخص کی طرف منسوب ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں اس کا نسب یہ ہے کہ ثمود بن عابر بن ارم بن سام بن نوح۔ یہ قوم مقام الحجر میں رہتی تھی جو حجاز اور شام کے درمیان وادی القری ہے۔ (معالم التنزیل، ج 2، ص 145) حجاز اور شام کے درمیان وادی القری تک جو میدان نظر آتا ہے یہ سب الحجر ہے۔ آج کل یہ جگہ فج الناقہ کے نام سے مشہور ہے۔ ثمود کی بستیوں کے کھنڈرات اور آثار آج تک موجود ہیں اور اس زمانہ میں بھی بعض مصری محققین نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ انھوں نے ایک مکان دیکھا جس کو پہاڑ کاٹ کر بنایا گیا ہے اس میں متعدد کمرے اور ایک بڑا حوض ہے۔ مشہور مورخ مسعودی نے لکھا ہے الحجر کا یہ مقام جو حجر ثمود کہلاتا ہے، شہر مدین سے جنوب مشرق میں اس طرح واقع ہے کہ خلیج عقبہ اس کے سامنے پڑتی ہے اور جس طرح عاد کو عاد ارم کہا گیا ہے اسی طرح ان کی ہلاکت کے بعد ان کو ثمود ارم یا عاد ثانیہ کہا جاتا ہے۔ ثمود کے زمانہ کا ٹھیک تعین تو نہیں کیا جا سکا لیکن یہ بات بہر حال یقینی ہے کہ یہ قوم حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے بہت پہلے صفحہ ہستی پر نمودار ہو کر مٹ چکی تھی۔ ثمود بھی اپنے پیش رو بت پرستوں کی طرح ایک بت پرست قوم تھی۔ اور اس کے عقائد اور اعمال کی اصلاح کے لیے حضرت صالح (علیہ السلام) کو مبعوث کیا گیا۔

حضرت صالح (علیہ السلام) کا نسب اور قوم ثمود کی طرف ان کی بعثت:

امام بغوی متوفی 516ھ نے حضرت صالح (علیہ السلام) کا نسب اس طرح لکھا ہے: صالح بن عبید بن آسف بن ماسح بن عبید بن خ اور بن ثمود (معالم التنزیل، ج 2، ص 145) حضرت صالح (علیہ السلام) نے قوم ثمود کو بار بار بت پرستی سے منع کیا اور خدائے واحد کی عبادت کرنے کی ہدایت کی لیکن ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ حضرت صالح کی مخالفت کرتے تھے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے اور یہ کہتے تھے اگر ہمارا طریقہ غلط ہوتا اور ہمارا دین باطل ہوتا تو آج ہم کو یہ دھن دولت، سرسبز و شاداب باغات، میوہ جات اور پھلوں کی کثرت اور یہ بلند، عالی شان، مضبوط اور مستحکم مکان حاصل نہ ہوتے۔ تم خود اپنا حال دیکھو اور اپنے پیروکاروں کی غربت اور افلاس پر نظر ڈالو اور پھر بتاؤ کہ خدا کے نزدیک مقبول تم ہو یا ہم ہیں۔

حضرت صالح (علیہ السلام) نے فرمایا تم جن مضبوط مکانوں اور دیگر سامان زیست پر فخر کر رہے ہو، اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ لائے تو یہ سب ایک پل میں فنا ہو جائیں گے۔ انھوں نے حضرت صالح (علیہ السلام) کی دعوت کو مسترد کر دیا اور مطالبہ کیا کہ اگر واقعی آپ اللہ کے نبی ہیں تو اللہ کی طرف سے کوئی نشان دکھائیں تب صالح (علیہ السلام) نے فرمایا تمہارا مطلوبہ نشان اس اونٹنی کی شکل میں موجود ہے۔ اللہ نے تمہارے اور اس کے درمیان پانی کی باری مقرر فرما دی ہے ایک دن یہ پانی پیے گی اور ایک دن تم پیو گے، اونٹنی کی پوری تفصیل حسب ذیل ہے:

قوم ثمود کا حضرت صالح سے معجزہ طلب کرنا اور معجزہ دیکھنے کے باوجود ایمان نہ لانا اور ان پر عذاب کا نازل ہونا: حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر متوفی 774ھ لکھتے ہیں: مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ ایک دن ثمود اپنی مجلس میں جمع ہوئے وہاں حضرت صالح (علیہ السلام) بھی آ گئے۔ حضرت صالح (علیہ السلام) نے حسب معمول ان کو

اللہ پر ایمان لانے اور بت پر ستی ترک کرنے کی دعوت دی، ان کو وعظ اور نصیحت کی اور اللہ کے عذاب سے ڈرایا۔ ثمود نے پتھر کی ایک چٹان کی طرف اشارہ کرکے کہا اگر آپ اس چٹان سے ایسی صفت کی ایک اونٹنی نکالیں جو دس ماہ کی گابھن ہو اور فوراً بچہ دے دے تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ حضرت صالح (علیہ السلام) نے ان سے پختہ قسمیں لیں کہ اونٹنی نکلنے کے بعد وہ ایمان لے آئیں گے۔ پھر صالح (علیہ السلام) نے نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ ان کا مطالبہ پورا کردے۔ تب اللہ تعالیٰ نے اس چٹان سے ایک بہت بڑی اونٹنی نکال دی جو ان کی طلب کردہ صفات کے مطابق تھی۔ جب انھوں نے یہ عظیم الشان معجزہ دیکھا تو ان میں سے بہت لوگ ایمان لے آئے لیکن اکثر اپنے کفر اور گمراہی پر قائم رہے۔ حضرت صالح (علیہ السلام) نے کہا یہ اللہ کی اونٹنی ہے جو تمہارے لیے نشانی ہے اس کو اللہ کی زمین پر کھانے دو وہ جہاں چاہتی چرتی تھی، ایک دن وہ پانی پینے جاتی اور ایک دن قوم ثمود جاتی اور جس دن وہ پانی پینے جاتی توں کنوئیں کا سارا پانی پی جاتی۔ ثمود اپنی باری پر اگلے دن کی ضروریات کے لیے پانی جمع کرکے رکھتے تھے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس دن وہ سب لوگ اس اونٹنی کا دودھ پی لیتے تھے۔ پھر شیطان نے ان کو فتنہ میں مبتلا کردیا۔ ایک شخص ولد الزنا تھا اس کی آنکھیں نیلی اور رنگ سرخ تھا اس کا نام قیدار بن سالف بن جندع تھا وہ ان کا رئیس تھا، سب کے مشورہ سے اس نے اس اونٹنی کی ٹانگیں کاٹ کر اس کو ہلاک کردیا۔

امام ابن جریر وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ ثمود پانی کی باری کی تقسیم سے تنگ آچکے تھے لیکن وہ اس اونٹنی کو قتل کرنے سے ڈرتے تھے۔ تب صدوق نام کی ایک حسین اور مالدار عورت نے مصدع اور قیدار کے سامنے یہ پیشکش کی کہ اگر تم دونوں اس اونٹنی کو قتل کردو تو میں خود اور ایک حسین اور مالدار عورت نے مصدع اور قیدار کے سامنے یہ پیشکش کی کہ اگر تم دونوں اس اونٹنی کو قتل کردو تو میں خود اور ایک اور حسین لڑکی تم کو عیش کے لیے بہ طور انعام دی جائیں گی۔ آخر یہ طے ہوگیا کہ وہ راستہ میں چھپ کر بیٹھ جائیں گے اور جب اونٹنی چراگاہ کی طرف جائے گی تو اس کو قتل کردیں گے اور سات اور آدمیوں نے ان کی مدد کی اور یہ نو آدمی مل کر اس اونٹنی کو قتل کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔

انہوں نے یہ سازش کی تھی کہ وہ اونٹنی کو قتل کرکے حضرت صالح (علیہ السلام) اور ان کے اہل کو بھی قتل کردیں گے پھر ان کے وارثوں سے کہیں گے کہ ہم تو موقع واردات پر موجود ہی نہ تھے۔ یہ لوگ گھات لگا کر بیٹھ گئے اور جب اونٹنی سامنے آئی تو مصدع نے اس کو تیر مارا اور قیدار نے اس کی ٹانگیں کاٹ کر اس کو ہلاک کردیا۔ اس کا بچہ یہ دیکھ کر پہاڑی میں غائب ہوگیا۔ حضرت صالح (علیہ السلام) کو جب اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے فرمایا: آخر وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا، اب اللہ کے عذاب کا انتظار کرو جو تین دن کے بعد تم کو تباہ کردے گا۔ پھر چمک اور کڑک کا عذاب آیا اور اس نے رات میں سب کو تباہ کردیا۔ (البدایہ والنہایہ، ج 1 ص 135، 134۔ مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1974ء) قوم ثمود کی سرکشی اور ان پر عذاب نازل کرنے کے متعلق قران مجید کی آیات: کذبت ثمود بطغوھا۔ اذ انبعث اشقھا۔ فقال لھم رسول اللہ ناقۃ اللہ و سقیھا۔ فکذبوہ فعقروھا۔ فدمدم علیھم ربھم بذنبھم فسوھا۔ ولا یخاف عقبھا: ثمود نے اپنی سرکشی سے (اپنے رسول کو) جھٹلایا۔ جب ان میں کا سب سے بدبخت اٹھا۔ تو اللہ کے رسول نے ان سے کہا اللہ کی اونٹنی کو (ایذا پہنچانے) اور اس کے پانی کی باری (کو بند کرنے) سے احتراز کرو۔ تو انھوں نے اس (رسول) کو جھٹلایا اور اس کی کونچیں کاٹ دیں۔ تو ان کے رب نے ان کے گناہ کے سبب ان پر ہلاکت ڈال دی، اس بستی کو پیوند زمین بنا دیا۔ اور وہ ان کو سزا دینے سے نہیں ڈرتا" (الشمس: 11۔15)

قوم ثمود کے نو آدمیوں کی سازش کے متعلق قرآن مجید میں ہے: " وکان فی المدینۃ تسعۃ رھط یفسدون فی الارض ولا یصلحون۔ قالوا تقاسموا باللہ لنبیتنہ واھلہ ثم لنقولن لولیہ ما شھدنا مھلک اھلہ وانا لصدقون۔ ومکروا مکرا ومکرنا مکرا وھم لایشعرون۔ فانظر کیف کان عاقبۃ مکرھم انا دمرناھم وقومھم اجمعین۔ فتلک بیوتھم خاویۃ بما ظلموا ان فی ذلک لایۃ لقوم یعلمون۔ وانجینا الذین امنوا وکانوا یتقون: اور ثمود کے شہر میں نو شخص ملک میں فساد کرتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے کہا: سب آپس میں اللہ کی قسم کھا کر عہد کرو کہ ہم ضرور صالح اور ان کے اہل پر شب خون ماریں گے پھر ہم ان کے وارث سے کہیں گے کہ اس گھر کے لوگوں کے قتل کے موقع پر ہم حاضر ہی نہ تھے اور بیشک ہم ضرور سچے ہیں۔ انھوں نے سازش کی اور ہم نے خفیہ تدبیر کی اور ان کو پتا ہی نہ چلا۔ تو آپ دیکھئے کہ ان کی سازش کا کیسا انجام ہوا بیشک ہم نے ان کو اور ان کی ساری قوم کو ہلاک کردیا۔ سو یہ ان کے ویران گھر گرے پڑے ہیں کیونکہ انھوں نے ظلم کیا تھا اور بیشک اس میں جاننے والوں کے لیے (عبرت کی) نشانی ہے۔ اور ہم نے ان لوگوں کو نجات دے دی جو ایمان لا چکے تھے اور اللہ سے ڈرتے تھے" (48۔53) (تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

اونٹنی کا قاتل ایک شخص تھا یا پوری قوم ثمود:

قوم ثمود کا قیدار کو اونٹنی کے قتل کے لیے بلانا اور اس کا اونٹنی کو قتل کرنا، اس کا ذکر ان آیات میں ہے: "کذبت ثمود بالنذر۔ فقالوا ابشرا منا واحدا نتبعہ انا اذا لفی ضلل وسعر۔ ءالقی الذکر علیہ من بیننا بل ھو کذاب اشر۔ سیعلمون غدا من الکذاب الاشر۔ انا مرسلوا الناقۃ فتنۃ لھم فارتقبھم واصطبر۔ ونبءھم ان الماء قسمۃ بینھم کل شرب

محتضر۔ فنادوا صاحبہم فتعاطی فعقر۔ فکیف کان عذابی و نذر۔ انا ارسلنا علیہم صیحۃ واحدۃ فکانوا کہشیم المحتظر: ثمود نے ڈرانے والے رسولوں کو جھٹلایا۔ انھوں نے کہا: کیا ہم اپنوں میں سے ایک بشر کی اتباع کریں، تب تو ہم یقیناً ضرور گمراہی اور عذاب میں ہوں گے۔ کیا ہم میں سے صرف اسی پر وحی نازل کی گئی بلکہ وہ بڑا جھوٹا متکبر ہے۔ عنقریب وہ (قیامت کے دن) جان لیں گے کہ کون بڑا جھوٹا متکبر ہے۔ بیشک ہم ان کی آزمائش کے لیے اونٹنی بھیجنے والے ہیں تو (اے صالح!) آپ (ان کے انجام کا) انتظار کریں اور صبر سے کام لیں۔ اور ان کو بتا دیجیے کہ پانی ان کے (اور اونٹنی کے) درمیان تقسیم کیا ہوا ہے، ہر ایک اپنے پینے کی باری پر حاضر ہوگا۔ تو انھوں نے اپنے ساتھ کو پکارا سو اس نے (اونٹنی کو پکڑا اور) اس کی کونچیں کاٹ دیں۔ تو کیسا ہوا میرا عذاب اور ڈرانا۔ بیشک ہم نے ان پر ایک خوفناک آواز بھیجی تو وہ کانٹوں کی باڑ لگانے والے کی بچی ہوئی باڑ کے چورے کی طرح (ریزہ ریزہ ہو کر) رہ گئے" (القمر: 23-31)

(حضرت صالح (علیہ السلام) نے جب انھیں عذاب کی خبر سنائی تو انھوں نے انتقاماً حضرت صالح (علیہ السلام) کو قتل کرنے کی سازش کی۔ جب وہ لوگ اپنے منصوبہ کے مطابق حضرت صالح (علیہ السلام) کو قتل کرنے کے لیے گئے تو اللہ تعالیٰ نے راستہ ہی میں ان پر پتھر برسا کر ان کو ہلاک کر دیا اور یہ اللہ کی خفیہ تدبیر تھی)

سورۃ القمر کی ان آیات میں بتایا ہے کہ ایک شخص (قیدار) نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ کر اس کو ہلاک کیا تھا اور سورۃ الاعراف اور سورۃ الشّمس میں فرمایا کہ قوم ثمود نے اس کی کونچیں کاٹی تھیں۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ ہر چند کہ یہ ایک شخص کا فعل تھا لیکن چونکہ پوری قوم اس مجرم کی پشت پر تھی اور وہ دراصل اس جرم میں ثمود کی مرضی کا آلہ کار تھا اس لیے اس کا الزام پوری قوم ثمود پر عائد کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر وہ گناہ جو قوم کی خواہش پر کیا جائے یا جس گناہ پر قوم راضی ہو وہ ایک قومی گناہ ہے بلکہ جو گناہ قوم کے درمیان علی الاعلیان کیا جائے اور قوم اس کو برا نہ جانے وہ بھی قومی گناہ ہے۔

اونٹنی کے معجزہ ہونے کی وجوہات:

اس اونٹنی کو "اللہ کی اونٹنی" اس اونٹنی کی تعظیم اور تکریم کے طور پر فرمایا ہے جیسے کعبہ کو بیت اللہ فرمایا ہے۔ اور اونٹنی کا معجزہ ہونا اس وجہ سے ہے کہ پتھر کی چٹان پھٹ گئی اور اس سے اونٹنی نکل آئی اور یہ خلاف عادت اور معجزہ ہے اور اونٹنی کا صرف اپنی باری پر پانی پینے کے لیے آنا اور کنوئیں کا سارا پانی پی جانا، اور دیگر حیوانات کا اس دن کنوئیں پر نہ آنا اور دوسرے دن آنا یہ تمام باتیں خلاف عادت اور معجزہ ہیں۔

قوم ثمود کے عذاب کی مختلف تعبیریں اور ان میں وجہ تطبیق:

ایک اعتراض یہ ہے کہ قوم ثمود کے عذاب کو متعارض اور متضاد عنوانوں سے تعبیر فرمایا گیا ہے، ایک جگہ اس عذاب کو الرجفہ (زلزلہ) (الاعراف: 78) سے تعبیر فرمایا اور ایک جگہ اس عذاب کو الطاغیہ (حد سے تجاوز کرنے والی چیز) سے تعبیر فرمایا (الحاقہ: 5) اور متعدد جگہ اس کو الصیحہ (ہولناک آواز) سے تعبیر فرمایا۔ (ھود: 67، الحجر: 83، القمر: 31)۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں یہ عذاب ایک خوفناک زلزلہ کی صورت میں آیا تھا اور زلزلہ میں ہولناک آواز ہوتی ہے اس لیے اس کو الصیحہ سے بھی تعبیر فرمایا اور چونکہ یہ آواز بہت زیادہ حد سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے اس لیے اس کو الطاغیہ سے بھی تعبیر فرمایا۔

قرآن مجید کی ان سورتوں میں قوم ثمود کا ذکر کیا گیا ہے۔ الاعراف، ھود، الحجر، الشعراء، النمل، فصلت، النجم، القمر، الحاقہ، الشّمس۔

قوم ثمود کے قصہ کے متعلق احادیث اور آثار:

امام عبدالرزاق بن ھمام متوفی 211ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: ابوالطفیل بیان کرتے ہیں کہ ثمود نے کہا: اے صالح! اگر آپ سچے ہیں تو کوئی نشانی دھائیں! حضرت صالح نے ان سے کہا: زمین کے کسی پہاڑ کی طرف نکلو تو وہ پہاڑ پھٹ پڑا اور اس کے شگاف سے اونٹنی اس طرح نکل آئی جس طرح حاملہ کے پیٹ سے بچہ نکلتا ہے۔ حضرت صالح نے ان سے فرمایا: یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے نشانی ہے اس کو اللہ کی زمین میں چھوڑ دو تاکہ کھاتی پھرے اور اس کو برائی کے ارادہ سے نہ چھونا ورنہ تم کو دردناک عذاب اپنی گرفت میں لے لے گا۔ (الاعراف: 73)۔ اس کے لیے پینے کی باری ہے اور تمہارے لیے پینے کی باری کا ایک دن مقرر ہے۔ (الشعراء: 155) جب وہ اس پابندی سے تنگ آ گئے تو انھوں نے اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ حضرت صالح نے ان سے فرمایا: تم صرف تین دن اپنے گھروں میں فائدہ اٹھالو پھر تم پر عذاب آئے گا یہ اللہ کا وعدہ ہے جو کبھی جھوٹا نہ ہوگا۔ (ھود: 65) ایک اور سند سے روایت ہے کہ حضرت صالح (علیہ السلام) نے ان سے فرمایا تم پر عذاب آنے کی علامت یہ ہے کہ پہلے دن جب تم صبح کو اٹھو گے تو تمہارے چہرے زرد ہوں گے، دوسری صبح کو تمہارے چہرے سرخ ہوں گے اور

تیسرے دن صبح کو تمہارے چہرے سیاہ ہوں گے، جب انھوں نے یہ علامت دیکھی تو انھوں نے خوشبو لگائی اور عذاب کے استقبال کے لیے تیار ہو گئے۔ (تفسیر عبدالرزاق، ج 1، رقم الحدیث: 911۔ الدر المنثور، ج 3، ص 492۔ تفسیر امام ابن ابی حاتم، ج 5، ص 1515)

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) الحجر کے پاس سے گزرے تو آپ نے فرمایا: نشانیوں کا سوال نہ کرنا کیونکہ حضرت صالح کی قوم نے نشانیوں کا سوال کیا تھا وہ اس راستہ سے آتے تھے اور اس راستہ سے لوٹتے تھے انھوں نے اپنے رب کی حکم عدولی کی انھوں نے اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ ایک دن وہ اونٹنی ان کا پانی پیتی تھی اور ایک دن وہ اس کا دودھ پیتے تھے تو انھوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں پھر ایک ہولناک آواز نے ان کو پکڑ لیا آسمان کے نیچے جتنے بھی لوگ تھے۔ سب کو اللہ نے ہلاک کر دیا۔ ماسوا ایک شخص کے جو اللہ کے حرم میں تھا، عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! وہ شخص کون تھا؟ فرمایا ابو رغال۔ جب وہ حرم سے باہر آیا تو وہ بھی اس عذاب میں گرفتار ہو گیا۔ (تفسیر عبدالرزاق، ج 1، رق الحدیث: 915، اس کی سند صحیح ہے، مسند احمد، ج 11، رقم الحدیث: 14012، مطبوعہ دار الحدیث قاہر، جامع البیان، جز 8، ص 298۔ مجمع الزوائد، ج 7، ص 50، المستدرک، ج 2، ص 320)

امام ابوداؤد نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے کہ جب ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ طائف گئے تو ہم ایک قبر کے پاس سے گزرے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہ ابو رغال کی قبر ہے۔ اس حرم کی وجہ سے اس سے عذاب دور ہو گیا تھا جب وہ حرم سے نکلا تو اس جگہ اس کو وہی عذاب آپہنچا تو اس کو دفن کر دیا گیا اور اس کی علامت یہ ہے کہ اس کے ساتھ سونے کی ایک شاخ بھی دفن کی گئی تھی۔ اگر تم اس قبر کو کھودو گے تو اس شاخ کو حاصل کر لوگے تو لوگوں نے اس قبر کو کھود کر اس سے وہ سونے کی شاخ نکال لی۔ (سنن ابوداود، رقم الحدیث: 3088۔ تفسیر عبدالرزاق، رقم الحدیث: 916۔ جامع البیان، جز 8، ص 299)

امام بخاری اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ الحجر سے گزرے تو ہم سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جن لوگوں نے اپنی جان پر ظلم کیا تھا ان کے گھروں کے پاس سے بغیر روئے نہ گزرنا کہیں تم پر بھی ویسا عذاب نہ آجائے پھر آپ نے اونٹنی کو تیزی سے دوڑایا اور اس مقام کو پیچھے چھوڑ دیا۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 3380۔ صحیح مسلم، زہد، 2980۔39، 7329۔ تفسیر عبدالرزاق، رقم الحدیث: 918۔ جامع البیان، جز 8، ص 300) (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَاذْكُرُوٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝۷۴

لغۃ القرآن: وَاذْكُرُوٓا : اور تم سب یاد کرو] [اِذْ : جب] [جَعَلَكُمْ : بنایا تمہیں] [خُلَفَآءَ : جانشین] [مِنْ بَعْدِ : اسکے بعد] [عَادٍ : عاد کے بعد] [وَّبَوَّاَكُمْ : اور اس نے ٹھکانا دیا تمہیں] [فِي الْاَرْضِ : زمین میں ہے] [تَتَّخِذُوْنَ : تم سب بناتے ہو] [مِّنْ : سے] [سُهُوْلِهَا : اس کی نرم مٹی] [قُصُوْرًا : محل] [وَّتَنْحِتُوْنَ : اور تم سب تراشتے ہو] [الْجِبَالَ : پہاڑوں] [بُيُوْتًا : گھروں کی صورت میں

] [فَاذْكُرُوْٓا :سو تم سب یاد کرو] [اٰلَآءَ :نعمتوں کو] [اللّٰہِ :اللہ] [وَلَا :اور نہ] [تَعْثَوْا :تم سب پھرو] [فِي الْاَرْضِ :زمین میں] [مُفْسِدِيْنَ :سب فساد مچانے والے]

ترجمہ: اور یاد کرو جب اس نے تمہیں (قوم) عاد کے بعد (زمین میں) جانشین بنایا اور تمہیں زمین میں سکونت بخشی کہ تم اس کے نرم (میدانی) علاقوں میں محلات بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر (ان میں) گھر بناتے ہو، سو تم اللہ کی (ان) نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد انگیزی نہ کرتے پھرو

تشریح: حضرت صالح (علیہ السلام) کے وعظ کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ آپ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ان احسانات اور انعامات کو فراموش نہ کرو جن سے اس نے تم کو نوازا ہے۔ قوم عاد کی ہلاکت کے بعد غلبہ واقتدار تمہیں بخشا گیا۔ تم کو فن تعمیر میں وہ مہارت عنایت کی کہ میدانی علاقوں میں تم شاندار محلات تعمیر کرتے ہو اور پہاڑی علاقوں میں سنگین چٹانوں کو چیر پھاڑ کر مکان بناتے ہو۔ ان کی عمارات کے آثار آج بھی موجود ہیں جو ایک وسیع رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں جو فن تعمیر میں ان کی مہارت کی گواہی دے رہے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیاوی علوم میں مہارت بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ اور یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ جب کوئی قوم راہ راست سے بھٹک جاتی ہے تو کوئی علمی ترقی اسے اس کے دردناک انجام سے نہیں بچا سکتی۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری)

یاد رہے قوم عاد کے بعد اسی علاقہ میں ثمود کو بسایا گیا البتہ عاد کا مرکز حدود شام میں تھا اور ثمود کا حدود یمن میں۔ ان دونوں کے درمیان علاقہ حجاز ہے یعنی مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ۔ یہ دونوں قومیں اس سارے علاقہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اسی لیے قرآن میں ان دونوں قوموں کا بار بار ذکر ہے کیونکہ کفار مکہ اور یہود مدینہ شام و یمن کے سفروں میں ان کے کھنڈرات دیکھتے تھے اور ان کی عبرت ناک تاریخ سے کچھ کچھ واقف تھے۔

حضرت عمرو بن خارجہ (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قوم ثمود کو اللہ نے طویل عمریں دیں۔ ان میں سے کوئی شخص پتھروں سے مکان بناتا پھر وہ پرانا ہو کر گر جاتا اور وہ آدمی ابھی زندہ ہوتا۔ یہ حالت دیکھ کر انھوں نے پہاڑوں میں گھر بنانے شروع کر دیئے انھیں کریدتے اور ان میں کمرے بناتے تاکہ یہ جلد گر نہ سکیں۔" (تفسیر ابن جریر) سعودی عرب کے شمال میں مدائن صالح کے نام سے علاقہ ہے جہاں قوم ثمود کے بنائے ہوئے پہاڑی گھر آج بھی موجود ہیں۔ سعودی گورنمنٹ نے ان کی جدید تزئین وآرائش کی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے قوم ثمود ابھی یہاں سے اٹھ کر گئی ہے۔

(1)۔ امت محمدیہ کی چھوٹی عمر اور بڑا اجر: گزشتہ قوموں کو لمبی عمریں دی گئیں جیسے قوم ثمود کا ابھی ذکر ہوا کہ وہ پہاڑوں کو کرید کر ان میں گھر بناتے تھے اس کے مقابلہ میں امت محمدیہ کو چھوٹی عمریں دی گئیں اکثر لوگ ستر برس سے قبل فوت ہو جاتے ہیں مگر انھیں نیکیوں پر بڑے اجر کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ جیسے من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا۔ یعنی ایک نیکی پر دس نیکیوں کا ثواب۔ (انعام: 160)

(2)۔ اونچے گھر بنانا جائز ہے: بشرطیکہ مقصد تکبر نہ ہو۔ قوم ثمود کو یہ نعمت گنوائی گئی کہ تتخذون من سھولھا قصورًا۔ کہ تم ہموار زمین پہ محلات کھڑے کرتے ہو۔ معلوم ہوا اگر اللہ مال دے تو اچھا گھر بنانا یا خریدنا برا نہیں، بشرطیکہ اس کا مقصد دوسروں پر اپنی بڑائی کا اظہار نہ ہو اور جہاں حدیث میں اونچے گھر کے گرا دینے کا حکم ہے اس سے مراد وہ ہے جو تکبر کے لیے ہو۔ (تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

آیہ مذکور سے معلوم ہوا کہ یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ قوم ثمود کا مسکن کہاں تھا؟ لیکن دوسری سورۃ میں ہے کہ یہ الحجر میں رہتے تھے' جو حجاز اور شام کے درمیان کا علاقہ ہے حضرت صالح (علیہ السلام) ان کو یاد دلاتے ہیں کہ ذرا دیکھو کہ اللہ نے تم پر کس قدر انعام کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین پر نہایت ہی ترقی یافتہ اور سیاسی اعتبار سے ایک قوت تھے۔ ان کے جغرافیہ کی طرف جو اشارہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں پہاڑ بھی تھے اور ہموار علاقے بھی تھے۔ وہ ہموار علاقوں میں عالیشان محل بناتے تھے اور پہاڑوں کو بھی تراش کر مکانات بناتے تھے۔ گویا اس مختصر آیت میں ان کی تہذیب اور ان کے تمدن کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

حضرت صالح (علیہ السلام) یہ بھی بتاتے تھے۔ گویا اس مختصر آیت میں ان کی تہذیب اور ان کے تمدن کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ حضرت صالح (علیہ السلام) یہ بھی بتاتے ہیں کہ عاد کے بعد قوم ثمود کو عروج حاصل ہوا۔ اگرچہ یہ لوگ قوم کی سرزمین میں نہ رہتے تھے۔ ہاں یہ حقیقت واضح ہے کہ وہ عاد کی تہذیب کے بعد نمودار ہونے والی تہذیب کے حامل تھے اور حجر سے باہر بھی دور دراز علاقوں تک ان کی مملکت پھیلی ہوئی تھی۔ اس طرح وہ خلیفۃ اللہ فی الارض کے منصب پر فائز

تھے اس لیے حضرت صالح ان کو نصیحت کرتے ہیں کہ تمہارا کام فساد فی الارض نہیں ہے اور تمہیں اپنی شان و شوکت پر غرور نہیں کرنا چاہیے۔ تمہیں چاہیے کہ ذرا پچھلی اقوام کے انجام کو نگاہ میں رکھو۔

یہاں سیاق قصہ میں ایک دوسرا خلا بھی ہے جس کا ذکر نہیں ہوا' یہ کہ حضرت صالح (علیہ السلام) کی دعوت کو بعض لوگوں نے قبول کرلیا اور مطیع فرمان لوگ تھے اور بعض لوگوں نے تکبر کرکے اسے رد کردیا۔ کسی علاقے کے بااثر لوگ ہمیشہ دعوت اسلامی کو سب سے آخر میں قبول کرتے ہیں کیونکہ اس دعوت کا منشا یہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنی بڑائیاں اور خدائیاں چھوڑ کر صرف الہہ واحد کو بڑا اور بادشاہ تسلیم کرلیں جو رب العالمین ہے۔ اس سے قبل یہ بڑے لوگ ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ جن ضعفاء نے اپنی گردنوں سے طاغوت کی غلامی کا جوا اتار پھینکا ہے اور اللہ کے سوا تمام غلامیوں سے آزاد ہوگئے ہیں ان پر تشدد کریں۔۔ چنانچہ حضرت صالح (علیہ السلام) کی قوم کے بڑے اور بااثر لوگ ان ضعفاء پر تشدد کرتے ہیں جو ایمان لائے ہیں اور ان کے نئے قسم قسم کا فتنہ و فساد پیدا کرتے ہیں۔ (تفسیر فی ظلال القرآن، سید قطب شہید)

آیۃ سے حاصل ہونے والے مسائل

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر: ۱

قولہ تعالیٰ: آیت: وبوا کم فی الارض اس میں کلام محذوف ہے، اصل عبارت ہے وبوا کم فی الارض منازل (اور اس نے تمہیں زمین میں گھروں کا ٹھکانا دیا) آیت: تتخذون من سھولھا قصورا یعنی تم ہر جگہ عالیشا محل بناتے ہو۔ آیت: وتنحتون الجبال بیوتا انھوں نے پہاڑوں میں اپنی طویل اور لمبی عمروں کے لیے مکانات بنائے، کیونکہ چھت اور بنیادیں ان کی عمریں ختم ہونے سے پہلے بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ حسن نے حا کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی ایک لغت ہے اور اس میں حروف حلقیہ میں سے ایک ہے، پس اسی لیے یہ باب فعل یفعل کے وزن پر آیا ہے۔

مسئلہ نمبر: ۲

جنہوں نے عالی شان اور بلند و بالا محلات بنانے کو جائز قرار دیا ہے انھوں نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی: آیت: قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبت من الرزق (الاعراف: ۳۲) (آپ فرمایئے: کس نے حرام کیا اللہ کی زینت کو جو پیدا کیا اس نے اپنے بندوں کے لیے اور (کس نے حرام کیے) لذیذ پاکیزہ کھانے)

بیان کیا گیا ہے کہ حضرت محمد بن سیرین (رح) کے صاحبزادے نے گھر تعمیر کیا اور اس پر مال کثیر خرچ کیا، جب اس کا ذکر حضرت محمد بن سیرین (رح) سے کیا گیا تو آپ نے فرمایا: میں اس میں کوئی حرج نہیں دیکھتا کہ کوئی آدمی ایسا مکان بنائے جو اس کے لے نفع بخش ہو۔

اور روایت ہے کہ حضور نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اذا انعم اللہ علی عبد احب ان یری اثر النعمۃ علیہ (جامع ترمذی، کتاب الاستیذان والادب، جلد ۲، صفحہ ۱۰۵۔ ایضا، حدیث نمبر ۲۷۴۴، ضیاء القرآن پبلی کیشنز) (جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر احسان وانعام فرمائے تو پسندیدہ یہ ہے کہ اس پر اس نعمت واحسان کا اثر دکھائی دے) اور نعمت واحسان کے آثار میں سے خوبصورت مکان اور اچھا لباس ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ اگر کوئی مال کثیر کے عوض حسین و جمیل کنیز خریدے تو اس کے لیے جائز ہے، حالانکہ اس سے کمتر بھی اس کے لیے کافی ہو سکتی ہے، تو یہ مکان اور محل بھی اسی طرح ہیں۔ لیکن بعض دوسروں نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ ان میں امام بصری (رح) وغیرہ ہیں اور انھوں نے اس ارشاد نبوی سے استدلال کیا ہے: اذا اراد اللہ بعبد شرا اھلک مالہ فی الطین واللبن (جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے بارے شر کا ارادہ فرمائے تو وہ اپنا مال مٹی اور اینٹوں میں ضائع کر دیتا ہے) اور دوسری حدیث میں ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: من بنی فوق ما یکفیہ جاء بہ یوم القیامۃ یحملہ علی عنقہ (مجمع الزوائد، کتاب البیوع، جلد ۱، صفحہ ۱۲۱، حدیث نمبر ۶۲۸۱) (جس نے اپنی حاجت اور ضرورت سے زیادہ عمارت بنائی تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ وہ اسے اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہوگا)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس کے بارے اسی طرح میں کہتا ہوں، کیونکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے: وماانفق المومن من نفقۃ فان خلفھا علی اللہ عزوجل الاماکان فی بنیان اومعصیۃ (سنن دار قطنی، کتاب البیوع، جلد ۳، صفحہ ۲۸) (بندہ مومن جو مال بھی خرچ کرے تو اس کی جگہ اور عطا فرمانا اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہوتا ہے سوائے اس کے جو عمارت یا معصیت (برائی) میں خرچ ہو) اسے حضرت جابر بن عبداللہ (رض) نے روایت کیا ہے اور دار قطنی نے اسے نقل کیا ہے۔ اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے: لیس لابن آدم حق فی سوی ھذہ الخصال بیت یسکنہ وثوب یواری عورتہ وجلف الخبز والمائ، اخرجہ الترمذی (جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد ۲، صفحہ ۵۷) (آدمی کا ان چیزوں کا سوا میں کوئی حق نہیں گھر جو اسے رہائش کافی ہو، کپڑا جو اس کے لیے ستر عورت کا کام دے، خشک روٹی اور پانی (اسے ترمذی نے نقل کیا ہے۔

مسئلہ نمبر: ۳

قولہ تعالیٰ: آیت: فاذکروا الاء اللہ یعنی تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ کفار بھی منعم علیہم ہیں۔ اس کے بارے بحث سورۃ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ آیت: ولاتعثوا فی الارض مفسدین سورۃ البقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔ اس میں العثی اور العثو دو لغتیں ہیں۔ اور اعمش نے تا کے کسرہ کے ساتھ تعثوا پڑھا ہے انھوں نے اسے عثی یعثی سے لیا ہے نہ کہ عثا یعثو سے۔ (تفسیر قرطبی۔ ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی)

فوائد

ف 1: اس طرح کہ قوم عاد کو ہلاک کرکے تم کو بسایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی نعمتوں کا یاد کرنا عبادت ہے۔ میلاد شریف بھی عبادت ہے۔ کہ اس میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی یاد ہے جو تمام نعمتوں سے اعلی نعمت ہے۔

ف 2: قوم ثمود نے گرمیوں کے لیے بستی میں محل بنائے تھے اور سردی کے موسم کے لیے پہاڑوں میں گرم مکانات تعمیر کیے تھے۔ جیسا کہ آج کل بھی دولت مند لوگ کرتے ہیں۔ ان کی عمریں اتنی لمبی ہوتی تھیں کہ مکانات ان کی موجودگی میں فنا ہو جاتے تھے۔ (روح البیان)

ف 3: یعنی زمین میں کفر و گناہ نہ کرو کہ اس سے رب کے عذاب آتے ہیں اور فساد پھیلتا ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ چوری، ڈکیتی، شراب، جوا وغیرہ چھوڑ دو۔ (تفسیر نور العرفان، احمد یار خاں نعیمی)

آیت مبارکہ:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝۷۵

لغۃ القرآن: قَالَ: فرمایا] [الْمَلَاُ: سرداروں نے] [الَّذِیْنَ: وہ لوگ جو] [اسْتَكْبَرُوْا: سب نے تکبر کیا] [مِنْ: سے] [قَوْمِهٖ: اس کی قوم] [لِلَّذِیْنَ: ان لوگوں کو جو] [اسْتُضْعِفُوْا: سب کمزور سمجھے جاتے تھے] [لِمَنْ: جس کو] [اٰمَنَ: ایمان لایا] [مِنْهُمْ: ان سے] [اَتَعْلَمُوْنَ: کیا تم سب جانتے ہو] [اَنَّ: کہ بیشک] [صٰلِحًا: صالح کو] [مُّرْسَلٌ: بھیجا ہوا ہے] [مِنْ رَّبِّهٖ: اپنے رب سے] [قَالُوْۤا: سب نے کہا] [اِنَّا: بیشک ہم] [بِمَاۤ: "اس" پر جو] [اُرْسِلَ: بھیجے گئے] [بِهٖ: اس کو] [مُؤْمِنُوْنَ: سب ایمان لانے والے ہو]

ترجمہ: ان کی قوم کے ان سرداروں اور رئیسوں نے جو متکّبر و سرکش تھے ان غریب پسے ہوئے لوگوں سے کہا جو ان میں سے ایمان لے آئے تھے : کیا تمہیں یقین ہے کہ واقعی صالح (علیہ السلام) اپنے رب کی طرف سے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں ؟ انھوں نے کہا : جو کچھ انھیں دے کر بھیجا گیا ہے بیشک ہم اس پر ایمان رکھنے والے ہیں

تشریح: رؤساء قبیلہ کی شدید مخالفت کے باوجود چند خوش نصیب ایسے بھی تھے جو حضرت صالح (علیہ السلام) پر ایمان لے آئے۔ ان کی مالی حالت کمزور تھی اور معاشرہ میں بھی انھیں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اس لیے بڑوں نے ازراہ تعجب پوچھا کیا تم سچ مچ صالح پر ایمان لے آئے ہو۔ جب انھوں نے اعتراف کیا تو منکر رئیس بولے ہم تو ہر گز ایمان نہیں لائیں گے۔ (ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری)

بااثر لوگوں کی طرف سے یہ سوال تہدید اور ڈرانے کے لیے کیا گیا تھا۔ ان لوگوں نے اس بات کو بہت ہی برا سمجھا کہ یہ غریب لوگ بھی صالح کے جنبہ دار بن گئے ہیں اور یہ حضرت صالح (علیہ السلام) کی تصدیق کر رہے ہیں ؟۔

لیکن حقیقت یہ ہوتی ہے کہ ضعیف لوگ جب ایمان لے آتے ہیں تو وہ ضعیف نہیں رہتے۔ ایمان ان کے دلوں کو قوت اور جرات سے بھر دیتا ہے۔ ان کے دلوں کے اندر اطمینان اور یقین پیدا ہو جاتا ہے ' انھیں اپنے نظریات پر اعتماد ہوتا ہے ' لہٰذا اب دنیاوالوں کی تہدید و تخویف اور ڈراوے دھمکاوے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ نہ مذاق اور استہزاء کا ان پر اثر ہوتا ہے۔ اب وہم مستکبرین کو خاطر میں نہیں لاتے اور ایمان کا اعلان کر دیتے ہیں۔ اور جواب میں یہ مستکبرین بھی تہدید آمیز لہجے میں یہ بتا دیتے ہیں کہ اچھا ہم تو اس دعوت کا صاف صاف انکار کر رہے ہیں۔

حالانکہ صالح (علیہ السلام) واضح دلائل لے کر آئے تھے ' ان دلائل و معجزات کے بعد پھر شک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ اکابرین قوم اس لیے انکار نہ کر رہے تھے کہ ان کے سامنے دلائل و معجزات کی کوئی کمی تھی بلکہ وہ اس لیے منکر تھے کہ وہ ایک ایسے نظام مملکت کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے تھے جس میں صرف رب العالمین کی اطاعت ہوتی ہو۔ مسئلہ حاکمیت اور اقتدار اعلی کا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے دل میں حاکمیت واقتدار کی ایک اعلی اور گہری خواہش پائی جاتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے شیطان انسان پر حملہ آور ہوتا ہے۔

چنانچہ انھوں نے قولی انکار کے بعد کافرانہ کارروائی کی اور اللہ کی اس ناقہ پر دست درازی کی جو در حقیقت نبی وقت کی تائید کیلئے بطور معجزہ لائی گئی تھی اور جس کے بارے میں نبی وقت نے قبل از وقت ان کو متنبہ کر دیا تھا کہ وہ اس پر دست درازی سے باز رہیں ورنہ وہ ایک دردناک عذاب سے دوچار ہوں گے۔

(تفسیر فی ظلال القرآن۔ سید قطب شاہ شہید)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (رح) اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ انبیاء کی بعثت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی عبادت کی دعوت دیں کفر اور شرک سے منع کریں اور ان کے عقیدے اور عمل کی اصلاح کریں بعض اوقات لوگ رسومات باطلہ میں مبتلا ہوتے ہیں تو نبی کا یہ بھی فرض ہوتا ہے کہ وہ قوم کو ایسی قبیح رسومات سے نجات دلائے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ انبیاء کی بعثت کا ایک اور مقصد رفع التظالم من بین الناس ہوتا ہے یعنی وہ لوگوں کے درمیان ظلم و زیادتی کو ختم کرتے ہیں فان تظالمھم یضیق علیھم کیونکہ اگر وہ ایک دوسرے پر ظلم کریں تو ان پر تنگی واقع ہو جاتی ہے تو حضرت صالح (علیہ السلام) نے بھی اپنی بعثت کا پورا پورا حق ادا کیا اور لوگوں کو ہر طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی۔

ہر نبی کے دور میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ اولین ایماندار غریب لوگ ہی ہوتے ہیں امیر لوگ اگر ایمان لائیں بھی تو بڑی دیر کے بعد ابتداء میں ظلم و ستم کا نشانہ ہمیشہ غریب لوگ ہی بنتے رہے ہیں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد بھی ہے بدا الاسلام غریبا و سعود کما بدا فطوبی الغرباء یعنی اسلام کی ابتداء ہمیشہ غریب لوگوں سے ہوئی اور آخر میں بھی یہ غرباتک ہی محدود ہو کر رہ جائے گا لہٰذا غرباء کے لیے خوشخبری ہے چنانچہ حضرت صالح (علیہ السلام) کی قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے کمزور مگر اہل ایمان لوگوں سے ان کے ایمان کا امتحان لینا چاہا تو وہ کامیاب نکلے مگر سرداران قوم اپنی ضد پر اڑے رہے اور کہنے لگے قال الذین استکبروا انا بالذی امنتم بہ کفرون قوم کے متکبرین نے کہا کہ جس چیز پر تم ایمان لائے ہو ہم تو اس کا انکار کرتے ہیں۔

کفر کا معنی انکار کرنا ہے مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ ضروریات دین میں سے کسی چیز کا انکار کرنے سے کفر لازم آتا ہے اگر کوئی شخص دن کے کسی جزو میں توحید، رسالت، قیامت، ملائکہ یا کتب سماویہ وغشرہ کا انکار کر دے تو وہ کافر ہو جائے گا کفر کا معنی حق بات کو چھپا دینا بھی ہوتا ہے کسان کو بھی عربی زبان میں کافر کہتے

ہیں کیونکہ وہ دانے کو زمین میں چھپا دیتا ہے مفسرین بیان کرتے ہیں کہ ان الذین ستر واالحق عناداًجو عناد کی وجہ سے حق کو چھپا دیتے ہیں وہ کافر ہیں اور شرک یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات و صفات کو مانتے ہوئے اس کی صفات مختصہ میں کسی مخلوق کو شریک کرلے وہ بھی کافروں کی طرح ناپاک ہو جاتا ہے منافق کی تعریف یہ ہے کہ وہ زبان سے اقرار کرتا ہے مگر دل سے انکار کرتا ہے اور ملحد وہ شخص ہوتا ہے جو دین میں کج روی اختیار کرتا ہے خدا کی صفات کے ایسے معانی بیان کرتا ہے جو نہ اللہ کی مراد ہوتے ہیں نہ اس کے رسول کی اور نہ باقی اہل ایمان ایسا سمجھتے ہیں۔

(تفسیر معالم العرفان۔ عبد الحمید سواتی)

آیت مبارکہ:

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝۷۶

لغۃ القرآن: قَالَ : فرمایا] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [اسْتَكْبَرُوْا : سب نے تکبر کیا] [اِنَّا : بیشک ہم] [بِالَّذِيْٓ : اس پر جو] [اٰمَنْتُمْ : تم ایمان لائے ہو] [بِهٖ : اس کو] [كٰفِرُوْنَ : سب انکار کرنے والے تھے]

ترجمہ: متکبر لوگ کہنے لگے : بیشک جس (چیز) پر تم ایمان لائے ہو ہم اس کے سخت منکر ہیں

تشریح: معلوم ہوا انبیاء کرام (علیہم السلام) پر ایمان لانے والے اکثر غریب و پسماندہ لوگ تھے حضور سرور کونین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر بھی ایمان لانے والے ابتدائی لوگ اکثر غرباء اور معاشرے کے کمزور افراد تھے۔ مالدار لوگوں نے اکثر دین کا مقابلہ کیا چنانچہ قوم ثمود کے سردار اور سرمایہ دار لوگوں نے کمزوروں سے جو اہل ایمان تھے کہا کہ کیا تم صالح کو رسول سمجھتے ہو؟ ہم تو اس کی کسی بات پر ایمان نہیں رکھتے۔ اہل ایمان نے کہا حضرت صالح (علیہ السلام) جو کچھ بھی لے کر آئے ہیں خواہ وہ وحی ہے یا معجزات و کمالات ہم ان کی ہر بات پر ایمان رکھتے ہیں۔

قوم اس اونٹنی سے بہت تنگ آ گئی، اس واسطے کہ جس دن اس کی باری ہوتی تھی تو وہ ان کے کنوؤں کا سب پانی پی جاتی تھی اور جس دن قوم کی باری ہوتی تو کنوؤں کا پانی ان کے جانوروں کو کافی نہ ہوتا تھا اور دوسرے یہ کہ گرمی کے دنوں میں پہاڑ کی آڑ میں چلی جاتی کہ وہاں خنکی ہوتی ہے اور قوم کے چوپائے اس سے ڈر کر پہاڑ سے میدان میں بھاگ آتے اس سبب سے انھیں نقصان پہنچتا تھا۔ دو عورتیں عنبرہ اور صدوقہ نام کی جن کے چوپائے بہت تھے ان پر یہ صورت بہت شاق ہوئی تو انھوں نے قیدار بن سالف اور مصدع بن دہر کو آمادہ کیا اور ان دونوں نے اونٹنی کے پاؤں کاٹ کر اسے ہلاک کر ڈالا۔ ان کا یہ فعل ان پر عذاب نازل ہونے کا سبب بن گیا ۔۔ الغرض ۔۔ قوم نے حضرت صالح کی ہدایات کا پاس و لحاظ نہیں کیا۔ (تفسیر اشرفی۔ علامہ محمد مدنی اشرفی)

تکبر گناہوں کی بنیاد ہے جو انسان سے کفر بھی کروا دیتا ہے :

یہ آیت بتا رہی ہے کہ جن لوگوں کے پاس مال تھا اور ریاست تھی وہ اپنی سرمایہ داری اور سرداری کے گھمنڈ میں ہوتے تھے اور ہر قوم کے ایسے متکبرین ہی نے انبیاء کرام کی نافرمانی کی۔ مال و دولت کی کثرت اللہ کی نعمت ہے، انسان کو چاہیے کہ اس نعمت پہ وہ اللہ کا شکر ادا کرے اور اس کا سر اللہ کے حضور غریب لوگوں سے زیادہ جھکے۔ مگر عموماً انسان اس کی وجہ سے شاکر بننے کی بجائے متکبر بن جاتا ہے، اپنے سے کم تر لوگوں کی تذلیل کرتا ہے۔ بلکہ ان پہ ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیتا ہے اور کفر تک بکنے لگتا ہے۔ (تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

عناد اور ہٹ دھرمی محرومی کی جڑ بنیاد۔ والعیاذ باللہ : یعنی اگرچہ تمہاری اس معقول بات کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں لیکن ہم نے ماننا پھر بھی نہیں۔ سو یہ ہے اس ضد و عناد کا نمونہ جو انسان کی اپنی بڑائی کے جھوٹے گھمنڈ اور زعم کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ اور جس سے انسان دلائل حق کے سامنے لاجواب ہو جانے کے باوجود حق کو ماننے اور قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اور یہ چیز محرومیوں کی محرومی اور خرابی و فساد کی جڑ بنیاد ہے۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ سو قوم صالح کے ان منکر کھڑ پینچوں

نے ان مومنین صالحین سے کہا کہ تم نے اگر صالح کو رسول مان لیا اور ان کی دعوت کو قبول کرلیا تو کرتے رہو۔ ہم تو بہر حال اور کسی بھی قیمت پر ان کو ماننے والے نہیں اور اس کا صاف انکار کرتے ہیں۔ سو یہ ان منکرین و متکبرین کی جھنجھلاہٹ کا آخری اظہار تھا جو انھوں نے اس موقع پر کیا۔ (تفسیر مدنی کبیر)

یعنی جس انقلاب کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور تمہارے سینوں میں جو کروٹیں لیتا ہوا محسوس ہو رہا ہے ہم تو اس کو کسی طرح قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کی کامیابی کا مطلب تو یہ ہوگا کہ تم کل کو حکمران ہوگے اور ہم تمہاری چاکری کریں گے۔ کم از کم ہماری زندگی میں تو ایسا ہونا ممکن نہیں گمان یہ کہتا ہے کہ اس کے بعد ان کی جھنجھلاہٹ میں مزید اضافہ ہوگیا ہوگا انھوں نے مسلمانوں کو ادھیرنے کھدیڑنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہوگی۔ ہر جگہ ان کا تمسخر اڑایا ہوگا کہ ماشاء اللہ کیا بات ہے ان کی۔ یہ مستقبل کے حکمران ہیں جو تا پہننے کو نصیب نہیں کبھی ڈھنگ کے کپڑے انھوں نے نہیں دیکھے۔ ایک وقت کھانے کو ملتا ہے تو دوسرے وقت فاقہ ہوتا ہے اور خواب یہ حکمرانی کے دیکھ رہے ہیں پھر وقت کے ساتھ ساتھ ان کی جھنجھلاہٹ اور ان کے غصے میں اضافہ ہوتا گیا حتیٰ کہ انھوں نے وہ اقدام کر ڈالا جس نے امان کی وہ دیوار توڑ ڈالی جس کی وجہ سے وہ اب تک پناہ میں تھے اور عذاب کا وہ بند کھول دیا جس کے بندھے رہنے کی وجہ سے آج تک وہ اللہ کے غضب سے بچے ہوئے تھے۔ (تفسیر روح القرآن)

یہاں عجیب لطف ہے کہ مومنین نے اپنا ایمان رسالت پر مبنی فرمایا اور کہا کہ جو کچھ لے کر وہ بھیجے گئے ہم اس پر ایمان لے آئے اور کفار نے اپنا کفر ان کے ایمان پر مبنی کیا کہ جس پر تمہارا ایمان ہے ہم اس کے انکار ہیں۔ اس سے اشارۃً معلوم ہوا کہ ایمان عام مسلمانوں کا سا چاہیے۔ (تفسیر نور العرفان)

آیت مبارکہ:

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۝"

لغۃ القرآن: فَعَقَرُوا : پھر ان سب نے کاٹ ڈالا] [النَّاقَةَ : اونٹنی کو] [وَعَتَوْا : اور سب نے سرکشی کی] [عَنْ : کے بارے میں] [اَمْرِ : حکم] [رَبِّهِمْ : اپنے رب کو] [وَقَالُوْا : اور ان سب نے کہا] [يٰصٰلِحُ : اے صالح] [ائْتِنَا : لے آ ہم پر] [بِمَا : اس وجہ سے جو] [تَعِدُنَاۤ : تو وعدہ کرتا ہے ہم سے] [اِنْ : اگر] [كُنْتَ : آپ تھے] [مِنَ : سے] [الْمُرْسَلِيْنَ : پیغمبروں]

ترجمہ: پس انھوں نے اونٹنی کو (کاٹ کر) مار ڈالا اور اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی اور کہنے لگے : اے صالح ! تم وہ (عذاب) ہمارے پاس لے آؤ جس کی تم ہمیں وعید سناتے تھے اگر تم (واقعی) رسولوں میں سے ہو

تشریح: عقر کا لغوی معنی اونٹ کے پاؤں کی کونچیں کاٹ دینا ہے لیکن ذبح کے معنی میں بھی عام مستعمل ہوتا ہے۔ قال الازھری العقر ھو قطع عرقوب البعیر ثم جعل النحر عقرا (مظہری) قوم ثمود میں حضرت صالح کے وعظ و نصیحت کا سلسلہ عرصہ دراز تک جاری رہا۔ اور آپ کے خلاف عداوت کا جذبہ بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ ساری قوم کے مشورہ اور رضامندی سے ایک بدبخت جس کا نام قدار بن سالف تھا (قرطبیؒ) اس نے اکیلے یا اپنے چند ساتھیوں کی امداد سے اس اونٹنی کو ہلاک کر دیا۔ اور حضرت صالح (علیہ السلام) کے قتل کی بھی سازش کرنے لگے۔ اور ان کی بے باکی حالت ہو گئی کہ اللہ کے نبی کو چیلنج دے دیا کہ اب وہ عذاب لے آؤ جس سے تم ہر وقت ہمیں ڈرایا کرتے تھے۔ حضور کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فرمایا کہ پہلے زمانہ کا بدبخت ترین آدمی وہ تھا جس نے صالح کی اونٹنی کو مار ڈالا اور آئندہ زمانہ کا بدبخت ترین آپ کا قاتل ہے۔ قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لعلی اشقی الاولین عاقر ناقۃ صالح واشقی الآخرین قاتلک (مظہری) (تفسیر ضیاء القرآن)

صالح (علیہ السلام) کی اونٹنی :

کہتے ہیں کہ وہ اونٹنی اس قدر عظیم الجثہ اور ڈیل ڈول کی تھی کہ جس جنگل میں چرتی دوسرے مویشی ڈر کر بھاگ جاتے اور اپنی باری کے دن جس کنویں سے پانی پیتی کنواں خالی کر دیتی۔ گویا جیسے اس کی پیدائش غیر معمولی طریقہ سے ہوئی تو لوازم و آثار حیات بھی غیر معمولی تھے۔ آخر لوگوں نے غیظ میں آ کر اس کے قتل پر اتفاق کر لیا۔ اور بدبخت قدار نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ بعدہ، خود حضرت صالح کے قتل پر بھی تیار ہونے لگے اور اس طرح خدا کے احکام کو جو صالح اور ناقہ کے متعلق تھے پس پشت ڈال دیا۔

قتل کرنے والا اگرچہ صرف قدار بن سالف تھا لیکن چونکہ سب کی رضامندی سے یہ فعل ہوا تھا اس لیے قتل کی نسبت سب کی طرف کر دی۔ قذار ایک ٹھگنا نیلی آنکھوں والا سرخ رنگ کا آدمی تھا جیسے فرعون تھا۔

قوم کی بدبختی :

ایسے کلمات انسان کی زبان سے اس وقت نکلتے ہیں جب خدا کے قہر و غضب سے بالکل بے خوف ہو جاتا ہے۔ عاد اولیٰ کی طرح ثمود بھی اس مرتبہ پر پہنچ کر عذاب الٰہی کے مورد بنے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ (تفسیر گلدستہ)

چنانچہ قوم ثمود کے متکبر سرداروں نے سازش کر کے حضرت صالح (علیہ السلام) کی اونٹنی کو ذبح کرا دیا اور حضرت صالح (علیہ السلام) کو کہا کہ ہم نے اونٹنی کو ہلاک کر دیا ہے تم اسے نقصان پہنچانے پر جس عذاب کی ہمیں دھمکی دیتے تھے وہ عذاب لے آؤ اگر تم سچے ہو، چنانچہ صرف تین دنوں کے بعد ایک سخت آواز کے ساتھ زلزلہ آیا جس کی وجہ سے صبح کے وقت سب اپنے گھروں میں اوندھے منہ مرے پڑے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح (علیہ السلام) اور ان کے اہل ایمان ساتھیوں کو محفوظ رکھا۔ اس تباہی کو دیکھ کر حضرت صالح (علیہ السلام) نے ان مردوں سے خطاب کیا : میں نے تمہیں اپنے رب کا پیغام پہنچایا اور تمہاری خیر خواہی کرتے ہوئے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرو ورنہ اچانک عذاب آئے گا لیکن جو قوم اپنے خیر خواہوں کی بات نہیں سنتی اس کا یہی حشر ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ مردے بھی سنتے ہیں کیونکہ مرنے کے بعد بھی روح کا انسانی جسم اور قبر کے ساتھ ایک قسم کا تعلق قائم رہتا ہے۔ اسی لیے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت یہ ہے کہ جب ہم قبرستان کے پاس سے گزریں تو اہل ایمان کو مخاطب کر کے انھیں سلام (السلام علیکم) کہیں اور پھر ان کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔ (ابن ماجہ : ابواب الجنائز : باب ٣٦) اور غزوہ بدر کے بعد حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس گڑھے کے کنارے تشریف لے گئے جس میں کفار کے لاشے پڑے تھے۔ آپ نے انھیں مخاطب کیا : اے ابوجہل، اے امیہ، اے عتبہ، اے شیبہ ! میرے ساتھ میرے رب نے عذاب کا جو وعدہ کیا تھا کیا تم نے اسے سچ نہیں پایا؟ یہ سن کر حضرت فاروق اعظم (رض) نے عرض کی : یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! آپ ان جسموں سے کیسے خطاب کر رہے ہیں جن میں روح نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا : میرا کلام تم ان سے زیادہ نہیں سن رہے ہو فرق صرف اتنا ہے کہ وہ جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ (بخاری، کتاب المغازی، باب ٨، مسلم، کتاب الجنہ، باب ١٧) جب کافر قبر میں سنتا ہے تو پھر مومن کیں نہیں سن سکتا؟ اس پر تفصیل بحث سورۃ نمل آیت نمبر ٨٠ میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ (تفسیر امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

پچھلے سبقوں میں تین پرانی قوموں کے حالات آپ نے پڑھے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ان میں کیا برائیاں تھیں جن کو ان کی طرف بھیجے ہوئے رسولوں نے دور کرنا چاہا اور وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے رسولوں کی بات نہ سنی اور اسی نافرمانی کی وجہ سے آسمانی اور زمینی آفتوں کا شکار ہوئے۔

تینوں قوموں میں مشترک برائی یہ تھی کہ وہ جسمانی طاقت، مال و دولت اور دوسروں پر حکم چلانے ہی کو سب کچھ سمجھے ہوئے تھے۔ ان کی نظر اس زندگی کے جاہ و جلال سے اوپر نہیں جاتی تھی۔ زبردست لوگ سب کچھ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے اور زیر دستوں کی شب و روز کی محنت کا پورا معاوضہ نہ دیتے اور ان کے خون پسینہ کی کمائی پر گلچھرے اڑاتے۔ حضرت آدم (علیہ السلام) کی تعلیم یہ نہ تھی ان کے ہاں ذات پات کوئی وقعت نہ رکھتی تھی۔ انسانوں میں طبقہ بندی کا نام و نشان نہ تھا اور سب لوگ اللہ کو اپنا خالق اور رب مان کر اسی کے آگے جھکتے تھے اور اپنی اپنی بساط کے مطابق کام کر کے محنت کی پیداوار کو مل بانٹ کر اپنی اپنی ضرورتوں میں صرف کرتے تھے۔ جب اللہ کو بھول گئے تو اس کی جگہ من مانے معبود بن گئے اور اسی کے ساتھ مساوات رخصت ہوئی اور فرقہ بندی کے ساتھ تو تو، میں میں شروع

ہو گئی۔ ضرورت کی چیزوں پر قبضہ کرکے بیٹھنے میں مزا آنے لگا اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا ہر وقت عمل دخل ہو گیا دبنگ لوگ اونچے درجے کے بن بیٹھے اور سیدھے سادے لوگوں کو نیچے دھکیل دیا رسولوں نے سمجھایا کہ دیکھو دنیا ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی اس میں بڑے بڑے تباہ اور ہلاک کرنے والے حادثے کسی وقت بھی واقع ہو سکتے ہیں اس افراط و تفریط کی زندگی میں تم ان سے بچنے کا کوئی سامان نہیں کرسکتے مالدار اور اپنی شان و شوکت کے چوکیدار اس پر بھڑک اٹھے اور کہا کہ کسی کی کیا مجال کہ ہمارا بال بیکا کرسکے ہمارے پاس قوت ہے سامان ہے تابعدار خادم ہیں ہم ہر ایک حادثے کے لئے تیار ہیں ہم دیکھیں گے کون ہے جو ہماری طرف ٹیڑھی نگاہ سے دیکھے۔

آپ نے دیکھا کہ اونچے طبقے والے کیسے اکڑ گئے رسولوں کی بات اگر سنی تو کچھ نچلے طبقے کے مفلس اور نادار لوگوں نے سنی تینوں پیغمبروں نے کوشش کی کے سرکش لوگ اپنی اکڑفوں سے باز آجائیں اور آپس میں بھائی بھائی بن کر آنے والے خطرے سے بچنے کی ملکر تیاری کریں حضرت نوح (علیہ السلام) جانتے تھے کہ پانی کا زبردست طوفان آنے والا ہے حضرت ہود (علیہ السلام) آنے والی آندھی سے خبردار تھے حضرت صالح (علیہ السلام) زلزلے کی آمد سے واقف تھے لیکن ان سے بچنے کی ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ غرور میں مبتلا لوگ اپنی شیخیاں چھوڑ دیں اللہ کو اپنے سے زیادہ قوت والا مانیں اور سب مل کر اس کی تابعداری میں لگ جائیں تاکہ وہ راضی ہو کر ان لوگوں پر سے عذاب ہٹا دے ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب کوئی بڑی مصیبت آتی ہے تو اس سے پہلے بدکار لوگوں غرور میں مبتلا نظر آتے ہیں اور وہ اپنے غرور کی وجہ سے ہی عام لوگوں کے ساتھ مل کر بیٹھنا یا کسی بات میں برابر کا شریک ہونا پسند نہیں کرتے چنانچہ غریبوں کا نبی کے دین کو قبول کرلینا ہی ان کے دین سے دور ہو جانے کا باعث بن جاتا ہے۔ (تفسیر درس قرآن آسٹریلیا قرآن بورڈ)

آیت مبارکہ:

فَاَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ دَارِهِمۡ جٰثِمِیۡنَ ۝۷۸

لغۃ القرآن: فَاَخَذَتْهُمُ :تو پکڑ لیا ان کو] [الرَّجْفَةُ :زلزلے نے] [فَاَصْبَحُوْا :پس وہ سب ہوگئے] [فِي :میں] [دَارِهِمْ :اپنے گھر] [جٰثِمِيْنَ :سب اوندھے منہ گرے ہوئے]

ترجمہ: سو انھیں سخت زلزلہ (کے عذاب) نے آپکڑا پس وہ (ہلاک ہو کر) صبح اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے

تشریح: قوم ثمود کے کفار میں سے چند شریر لوگوں نے جن کی تعداد نو تھی۔ انھوں نے اللہ کی اونٹنی کے پاؤں کاٹ دیئے جس سے وہ فوت ہو گئی اور تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ قرآن مجید میں ہے: وکان فی المدینۃ تسعۃ رھطٍ یفسدون فی الارض۔ "شہر میں نو افراد تھے جو زمین میں فساد کرتے تھے۔" (نمل: 48) تب خدا کا غضب جوش میں آیا اور ایک زبردست زلزلے سے ساری قوم یک لخت مار دی گئی۔ قوم ثمود کی ہلاکت کا مفصل واقعہ سورۃ ہود رکوع 5 اور سورۃ قصص رکوع 8 میں بھی مذکور ہے۔ وہاں بھی اس کی بعض تفصیلات درج ہیں۔

معلوم ہوا گناہ پر رضا گناہ اور کفر پر رضا کفر ہے۔ قوم ثمود میں اونٹنی کے قاتل صرف نو افراد تھے مگر ساری قوم ماری گئی کیونکہ ساری قوم ان کے اس فعل بد سے متفق اور راضی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر مجرموں کا ساتھ دینے والے مبتلائے عذاب ہو جاتے ہیں تو صالحین سے محبت و معاونت کرنے والے رحمت حق کے مستحق کیوں نہیں بن سکتے۔ (تفسیر برہان القرآن)

قوم صالح کے عذاب کی حقیقت اور نوعیت ؟ : سو دعوت حق کے انکار اور اس کی تکذیب کا نتیجہ و انجام بہر حال ہلاکت و تباہی ہے۔ اس لیے اس بدبخت قوم پر آخر کار عذاب آ کر رہا۔ سو اس حرف " فاء " کے نیچے گویا کہ ان کی پوری داستان سمٹی ہوئی موجود ہے کہ حضرت صالح (علیہ السلام) کی عمر بھر کی تعلیم و تلقین کے باوجود جب وہ بدبخت اور نا ہنجار قوم نہ مانی اور وہ اپنے کفر و انکار اور تکذیب و ہٹ دھرمی ہی پر اڑی رہی تو آخر کار ان پر وہ آخری عذاب آ کر رہا جو ان کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ اور جس سے ان کے وجود کو ہمیشہ کے لیے صفحہء ہستی سے مٹا دیا گیا۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ سو دعوت حق کی تکذیب اور انکار کا آخری نتیجہ و انجام بہر حال ہلاکت و تباہی اور دائمی خسارہ ہے۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ اس بدبخت قوم کے عذاب کے لیے یہاں پر { رُجفہ } کا لفظ آیا ہے جس کے معنیٰ " شدت کی حرکت "، " تھر تھراہٹ " اور " کپکپی " کے آتے ہیں۔ اسی لیے عام طور پر اس کا ترجمہ " زلزلہ " ہی کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ عذاب زلزلے ہی کا ہو، بلکہ یہ محض اس عذاب کی شدت اور ہولناکی کی ایک تعبیر ہے۔ کیونکہ اس عذاب میں شدت اور ہولناکی کے کئی پہلو تھے۔ اسی لیے دوسرے مقام پر اس کے لیے { صَیحَۃ } کا لفظ آیا ہے جسکے معنیٰ " سخت ڈانٹ " اور " انتہائی ہولناک آواز " کے آتے ہیں۔ ایک اور جگہ اس کے لیے " صَاعِقہ " کا لفظ آیا ہے جس کے معنی " کڑکے " کے آتے ہیں۔ ایک اور جگہ اس کو { طاغیہ } کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ سو یہ اس عذاب کی شدت اور ہولناکی کا بیان و اظہار ہے۔ (تفسیر مدنی کبیر)

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ غزوہ تبوک کے سفر میں رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور صحابہ کرام کا گزر اس مقام حجر پر ہوا جہاں قوم ثمود پر عذاب آیا تھا۔ تو آپ نے صحابہ کرام کو ہدایت فرمائی کہ اس عذاب زدہ بستی کی زمین میں کوئی اندر نہ جائے اور نہ اس کے کنوئیں کا پانی استعمال کرے (مظہری)

اور بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ قوم ثمود پر جب عذاب آیا تو ان میں بجز ایک شخص ابورغال کے کوئی نہیں بچا۔ یہ شخص اس وقت حرم مکہ میں پہنچا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حرم مکہ کے احترام کے سبب اس وقت اس کو عذاب سے بچا لیا اور بالآخر جب یہ حرم سے نکلا تو وہی عذاب جو اس کی قوم پر آیا تھا اس پر بھی آگیا اور یہیں ہلاک ہو گیا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے لوگوں کو مکہ سے باہر ابورغال کی قبر کا نشان بھی دکھلایا اور یہ بھی فرمایا کہ اس کے ساتھ ایک سونے کی چھڑی بھی دفن ہو گئی تھی۔ صحابہ کرام نے قبر کھولی تو سونے کی چھڑی مل گئی وہ نکال لی اس روایت میں یہ بھی ہے کہ طائف کے باشندے بنو ثقیف اسی ابورغال کی اولاد ہیں۔ (مظہری)

ان معذب قوموں کی بستیوں کو اللہ تعالیٰ نے آنے والی نسلوں کے لیے عبرت کدے بنا کر قائم رکھا ہے اور قرآن کریم نے عرب کے لوگوں کو بار بار اس پر متنبہ کیا ہے کہ تمہارے سفر شام کے راستہ پر یہ مقامات آج بھی داستان عبرت بنے ہوئے ہیں۔ (آیت) لم تسکن من بعد ھم الاقلیلا،

قوم صالح (علیہ السلام) کے واقعہ عذاب کے آخر میں ارشاد ہے (آیت) فَتَوَلّٰی عَنْہُمْ وَقَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسَالَۃَ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَکُمْ وَلٰکِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ یعنی قوم پر عذاب نازل ہونے کے بعد حضرت صالح (علیہ السلام) اور ان پر ایمان لانے والے مومنین بھی اس جگہ کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے گئے۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت صالح (علیہ السلام) کے ساتھ چار ہزار مومنین تھے ان سب کو لے کر یمن کے علاقہ حضر موت میں چلے گئے اور وہیں حضرت صالح (علیہ السلام) کی وفات ہوئی اور بعض روایات سے ان کا مکہ معظّمہ چلے جانا اور وہیں وفات ہونا معلوم ہوتا ہے۔

ظاہر عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صلح (علیہ السلام) نے چلتے وقت اپنی قوم کو خطاب کرکے فرمایا کہ اے میری قوم میں نے تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچادیا اور تمہاری خیر خواہی کی مگر افسوس تم خیر خواہوں کو پسند ہی نہیں کرتے۔

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ جب ساری قوم عذاب سے ہلاک ہو چکی تو اب ان کو خطاب کرنے سے کیا فائدہ۔ جواب یہ ہے کہ ایک فائدہ تو یہی ہے کہ اس سے لوگوں کو عبرت ہو اور یہ خطاب ایسا ہی ہے جیسے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غزوہ بدر میں مرے ہوئے قریشی مشرکین کو خطاب کرکے کچھ کلمات ارشاد فرمائے تھے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت صالح (علیہ السلام) کا یہ فرمانا نزول عذاب اور ہلاکت قوم سے پہلے ہوا ہو اگرچہ بیان میں اس کو موخر ذکر کیا ہے۔

(تفسیر معارف القراان)

اگرچہ اونٹنی کو ہلاک کرنے والا ایک شخص تھا لیکن اس کو تائید ساری قوم کی حاصل تھی اور وہ اس کی حرکت پر رضا مند تھے اس لیے اس کی سزا بھی صرف ایک شخص کو نہیں بلکہ ساری قوم کو دی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی سرکش اور نافرمان کو قوم کی تائید و حمایت حاصل ہو تو ساری قوم مجرم قرار دی جاتی ہے اور سبھی کو اس کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

آیت مبارکہ:

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ۝٧٩

لغۃ القرآن: فَتَوَلّٰى : پھر منہ پھیرا] [عَنْهُمْ : ان کو] [وَ : اور] [قَالَ : فرمایا] [يٰقَوْمِ : اے میری قوم] [لَقَدْ : البتہ تحقیق] [اَبْلَغْتُكُمْ : میں نے پہنچا دیا تھا تمہیں] [رِسَالَةَ : پیغام] [رَبِّيْ : میرا رب] [وَنَصَحْتُ : اور میں نے خیر خواہی کی] [لَكُمْ : تمہارے لیے] [وَلٰكِنْ : اور لیکن] [لَا : نہیں] [تُحِبُّوْنَ : سب محبت کرتے] [النّٰصِحِيْنَ : خیر خواہوں سے ہوں] [

ترجمہ: پھر (صالح (علیہ السلام) نے) ان سے منہ پھیر لیا اور کہا: اے میری قوم! بیشک میں نے تمہیں اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا تھا اور نصیحت (بھی) کر دی تھی لیکن تم نصیحت کرنے والوں کو پسند (ہی) نہیں کرتے

تشریح: اس وقت صالح ان سے منہ موڑ کر چلے اور کہا اے میری قوم میں نے تو تم کو اپنے رب کا حکم پہنچا دیا تھا اور تمہاری خیر خواہی کی تھی لیکن تم خیر خواہوں کو ہی پسند نہیں کرتے تھے۔

ایک شبہ

زلزلہ سے ساری قوم ہلاک ہو چکی تو پھر ان مردوں کو حضرت صالح نے کس طرح مخاطب بنایا اور لقد ابلغتکم کس سے فرمایا۔

ازالہ: مردوں سے خطاب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی کیا تھا بدر کے مقتولین کو جب ایک گڑھے میں ڈال دیا گیا تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (نام لے لے کر) ان کو مخاطب بنایا۔ صحیحین میں حضرت ابو طلحہ (رض) کی روایت سے آیا ہے کہ بدر سے تیسرے دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اونٹنی کسوانے کا حکم دیا اونٹنی پر پالان باندھ دیا گیا پھر آپ صحابہ (رض): کو لے کر پیدل چل دیئے صحابہ (رض): کو خیال ہوا کہ کسی ضروری کام سے کہیں تشریف لیے جا رہے ہیں لیکن آپ جا کر اس کنویں کے کنارے کھڑے ہو گئے (جس کے اندر مقتولین کی لاشیں پھینک دی گئی تھیں) اور پکارنے لگے اے ابو جہل بن ہشام اے امیہ بن خلف اے عتبہ بن ربیعہ اے شیبہ بن ربیعہ کیا تمہارے لیے اس وقت یہ امر باعث مسرت ہوتا کہ کاش تم نے اللہ اور اس کے رسول کا حکم مان لیا ہوتا اللہ اور اس کے رسول نے جس چیز کی تم کو وعید کی تھی کیا تم نے اس کو صحیح پا لیا میں نے تو اس وعدہ کو حق پا لیا جو اللہ نے مجھ سے کیا تھا تم اپنے نبی کے لیے بدترین قبیلہ ہو تم نے میری تکذیب کی اور دوسرے لوگوں نے مجھے سچا جانا تم مجھ سے لڑے اور دوسرے لوگوں نے میری مدد کی۔ اے گروہ شر تم کو اللہ نے میری طرف سے سزا دے دی میں امین تھا تم نے مجھے خائن قرار دیا میں سچا تھا تم نے مجھے جھوٹا کہا حضرت عمر (رض) نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا تین روز کے بعد آپ ان کو پکار رہے ہیں بے جان لاشوں سے آپ کس طرح کلام فرما رہے ہیں فرمایا تم میری بات کو ان سے زیادہ نہیں سن رہے ہو جو

کچھ میں ان سے کہہ رہا ہوں اس وقت وہ سن رہے ہیں لیکن لوٹا کر جواب نہیں دے سکتے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ حضرت صالح نے مردوں کو خطاب اس لیے کیا کہ آنے والے لوگوں کو عبرت ہو۔ بعض کا قول ہے کہ آیت میں تقدیم تاخیر ہے (جو واقعہ پہلے ہوا ترتیب عبارت میں اس کو پیچھے ذکر کیا ہے اور جو واقعہ پیچھے ہوا ترتیب عبارت میں اس کو پہلے ذکر کر دیا) اصل کلام اس طرح تھا۔ فَتَوَلّٰی عَنۡہُمۡ وَقَالَ یٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُکُمۡ رِسَالَۃَ رَبِّیۡ وَنَصَحۡتُ لَکُمۡ وَلٰکِنۡ لَّا تُحِبُّوۡنَ النّٰصِحِیۡنَ فَاَخَذَتۡہُمُ الرَّجۡفَۃُ فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ دَارِہِمۡ جٰثِمِیۡنَ۔

قصہ ثمود

محمد بن اسحاق' وہب بن منبہ' ابن جریر اور حاکم نے اسناد کے ساتھ حضرت عمرو بن خارجہ (رض) کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب قوم عاد تباہ کر دی گئی تو ثمود ان کی بستیوں میں بس گئے اور ان کے جانشین ہوگئے یہ خوب پھلے پھولے انھوں نے لمبی لمبی عمریں پائیں لوگ مٹی (کچی پکی اینٹوں) کے مکان بناتے تھے مکان گر جاتے تھے مگر بنانے والا زندہ رہتا تھا مجبور ہو کر انھوں نے پہاڑوں کو تراش تراش کر غاروں کے اندر مکان بنا لیے معاش کی طرف سے یہ لوگ بڑی کشائش میں تھے آخر ملک میں انھوں نے تباہی پھیلائی اور اللہ کے سوا دوسروں کو پوجنے لگے۔ اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے صالح کو پیغمبر بنا کر بھیجا یہ لوگ خالص عرب تھے اور صالح نسبی لحاظ سے متوسط درجہ کے تھے۔ مگر اخلاق فاضلہ کے لحاظ سے سب سے برتر تھے صالح ابتداء رسالت کے وقت نوجوان تھے اور قوم کو اللہ کی طرف بلاتے بلاتے سفید مو ہوگئے مگر سوائے قلیل آدمیوں کے کسی نے آپ کی پیروی نہیں کی اور قلیل بھی وہ تھے جن کو کمزور سمجھا جاتا تھا (یعنی غریب تھے) صالح برابر جمے رہے اور تبلیغ کرتے رہے اور اللہ کے عذاب سے بہت زیادہ ڈراتے اور خوف دلاتے رہے آخر قوم والوں نے کہا کوئی ایسی نشانی دکھاؤ جس سے تمہارے قول کی سچائی ثابت ہو۔ حضرت صالح (علیہ السلام) نے فرمایا کون سی نشانی چاہتے ہو قوم والوں نے کہا کل تم ہمارے ساتھ ہمارے تہوار کے میلے میں چلو یہ تہواری میلہ سال میں ایک معین دن ہوتا تھا جہاں لوگ اپنے بتوں کو لے کر جاتے تھے۔ پھر تم اپنے معبود سے دعا کرو اور ہم اپنے معبودوں سے دعائیں کریں اگر تمہاری دعا قبول ہو گئی تو ہم تمہارے ساتھ ہو جائیں گے اور اگر ہماری دعا قبول ہو گئی تو تم ہمارے ساتھ ہو جانا۔ حضرت صالح (علیہ السلام) نے فرمایا بہت اچھا چنانچہ قوم والے میلہ کو بت لے کر گئے اور صالح بھی ان کے ساتھ گئے قوم والوں نے بتوں سے دعائیں کیں کہ صالح (علیہ السلام) کی دعا قبول نہ ہو۔ پھر جندع بن عمرو بن جواس نے جو ثمود کا سردار تھا۔ حضرت صالح سے کہا یہ پتھر جو حجر کے ایک گوشہ میں الگ تھلگ پڑا ہے جس کو کاثبہ کہا جاتا ہے اس کے اندر سے بختی اونٹ کی شکل کی ایک بڑے پیٹ والی دس ماہہ گابھن خوب بالوں سے بھرپور اونٹنی برآمد کر دو اگر ایسا کرو گے تو ہم تم کو سچا مان لیں گے اور تم پر ایمان لے آئیں گے۔ حضرت صالح (علیہ السلام) نے ان سے ایمان کا پختہ وعدہ لے لیا تو کھڑے ہو کر دو رکعت نماز پڑھی اور اپنے مالک سے دعا کی۔ یکایک پتھر میں سے ایک ایسی آواز نکلنے لگی جیسی پیدائش کے وقت بیانے والی اونٹنی کی نکلتی ہے پھر اس ٹیلہ سے وہی آواز نکلنے لگی یکدم پتھر شق ہو گیا اور اس کے اندر سے فرمائش کے مطابق اونٹنی برآمد ہو گئی اس کے دونوں پہلوؤں کی درمیانی چوڑائی بہت زیادہ تھی پھر اس کے پیٹ سے اسی کی طرح ایک بچہ پیدا ہوا یہ دیکھ کر جندع بن عمر اور اس کے قبیلہ کے کچھ لوگ مسلمان ہوگئے اور سرداران ثمود نے بھی ایمان لانے کا وعدہ کر لیا لیکن ذواب بن عمرو بن لبید اور حباب مجاور اصنام اور دباب بن صحر کاہن نے ان کو منع کر دیا یہ تینوں شخص ثمود کے سردار تھے۔ حضرت صالح (علیہ السلام) نے قوم والوں سے کہا ایک دن یہ اونٹنی پانی پئے گی اور ایک دن تمہارے جانوروں کو پانی کا کوٹہ ملے گا اس کے بعد کچھ مدت تک اونٹنی ایک بچہ کے ساتھ آزاد پھرتی درختوں کی پتیاں چرتی اور پانی پیتی رہی مگر ایک دن ناغہ کرکے پانی پیتی تھی اور اس طرح پیتی تھی کہ کنوئیں میں سر ڈال کر سب پانی پی جاتی۔ ایک قطرہ بھی باقی نہ چھوڑتی تھی اور اس دوران میں ٹانگیں چیر کر کھڑی ہو جاتی تھی اور لوگ جتنا چاہتے اس کا دودھ دوہ لیتے' جتنا پیا جاتا پیتے اور جتنے برتن تھے سب بھر کر رکھ لیتے تھے پھر اونٹنی بغیر ٹانگیں چیرے باہر نکل آتی۔ معاملہ یونہی چلتا رہا۔

گرمی کے زمانے میں اونٹنی وادی کے اوپر آجاتی اور اس کے خوف سے تمام مویشی بکریاں گائے اور اونٹ بھاگ کر وادی کے اندر چلے جاتے اور سردی کے زمانہ میں اونٹنی وادی کے اندر اتر جاتی تو تمام جانور اوپر آجاتے (اس طرح اونٹنی تو گرمی سردی کی تکلیف سے بچ جاتی اور) تمام جانور گرمی اور سردی کی طرف سے دکھی رہتے۔ اس سے مویشیوں کو نقصان پہنچا اور لوگوں کو یہ بات اتنی کھلی کہ وہ اللہ کے حکم سے سرکشی کرنے لگے اور اونٹنی کو قتل کر ڈالنے کے درپے ہوگئے یہاں تک کہ اونٹنی کو مار ڈالنے پر متفق الرائے ہوگئے قبائل ثمود میں دو عورتیں تھیں ایک کا نام صدوف اور دوسری کا نام عنیزہ تھا' عنیزہ کی کنیت ام غنم تھی یہ غنم بن مجاز کی بیٹی اور

ذواب بن عمرو کی بیوی تھی اور بڑھیا سال خوردہ ہو گئی تھی اس کی متعدد خوبصورت بیٹیاں تھیں اس کے پاس اونٹ گائے اور بکریاں بھی بہت تھیں بڑی مالدار تھی۔ صدوف مختار کی بیٹی تھی اور خوبصورت جوان تھی اس کے پاس بھی اونٹ گائے اور بکریاں بہت تھیں بڑی مالدار تھی دونوں کو حضرت صالح (علیہ السلام) سے سخت عداوت تھی اور چونکہ اونٹنی سے ان کے جانوروں کو سخت ضرر پہنچتا تھا اس لیے اونٹنی کو قتل کرا دینے کی دونوں خواستگار تھیں۔ صدوف نے ایک ثمودی شخص کو جس کا نام حباب تھا آمادہ کیا اور کہا تو اگر اونٹنی کو قتل کر دے تو میں تیری ہو جاؤں گی حباب نے انکار کر دیا صدوف نے اپنے چچا کے بیٹے سے جس کا نام مصدع بن مہرج بن مختار تھا۔ یہی کہا اور چونکہ صدوف بہت حسین اور بڑی مالدار تھی اس لیے مصدع نے صدوف کی درخواست مان لی۔ ادھر عنیزہ بنت غنم نے قذار بن سالف سے کہا اگر تو اونٹنی کو قتل کر دے تو پھر میری جس بیٹی کو چاہے لے لینا۔ قذار سرخ رنگ نیلگوں چشم پستہ قد آدمی تھا۔ اہل روایت کا خیال ہے کہ وہ حرامی تھا۔ سالف کے بستر پر پیدا ہوا تھا اس لیے اس کو قذار بن سالف کہا جاتا تھا۔ یہ شخص قوم میں باعزت اور طاقتور تھا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے آیت (واذانبعث اشقاہا) کی تفسیر کے ذیل میں فرمایا تھا وہ ابو زمعہ کی طرح اپنی قوم میں باعزت صاحب عزم اور طاقتور تھا۔ رواہ البخاری من حدیث عبداللہ بن زمعۃ۔ غرض مصدع اور قذار تیار ہو گئے۔ قبیلہ ثمود میں سے اپنی مدد کے لیے سات آدمی انھوں نے اور اپنے ساتھ لیے اور چل دیئے قذار اونٹنی کی واپسی کی راہ میں ایک پتھر کی آڑ لے کر گھات لگا کر بیٹھ گیا اور مصدع دوسرے راستہ میں جا چھپا' اونٹنی مصدع کی طرف سے گزری مصدع نے تیر مارا جس سے اونٹنی کی ٹانگ کا عضلہ چھد گیا ادھر ام غنم عنیزہ اپنی حسین ترین بیٹی کو لے کر قذار کے پاس آ پہنچی اور قذار کو بھڑکایا اور گھات کی جگہ سے اس کو اٹھا کر لے آئی' قذار نے آتے ہی اونٹنی پر تلوار کا وار کیا جس سے اس کی کونچ کھل گئی اونٹنی بھاگی اور اپنے بچہ کو تنبیہ کرنے کے لیے اس نے چیخ ماری قذار نے اس کے سینہ پر برچھا مارا اور اونٹنی کو قتل کر دیا پھر بستی والوں نے آ کر اس کا گوشت بانٹ لیا اور پکایا' بچہ نے ماں کی یہ حالت دیکھی تو بھاگ کر ایک محفوظ پہاڑ پر چلا گیا اس پہاڑ کا نام کسی نے صور لکھا ہے اور کسی نے فازہ۔ حضرت صالح تشریف لائے تو بستی والوں نے کہا یا نبی اللہ ہمارا کوئی قصور نہیں فلاں شخص نے اونٹنی کو قتل کیا ہے حضرت صالح (علیہ السلام) نے فرمایا بچہ کی تلاش کرو اگر وہ تم کو مل جائے گا تو ممکن ہے تم سے عذاب ٹل جائے لوگ بچہ کی تلاش میں نکلے اور پہاڑ کے اوپر دیکھ کر پکڑنے کے لیے گئے مگر اللہ نے پہاڑ کو اتنا اونچا کر دیا کہ پرندے بھی اس کی چوٹی تک نہ پہنچ سکیں۔

روایت میں آیا ہے کہ بچہ نے حضرت صالح (علیہ السلام) کو دیکھا تو آنسوؤں سے رو دیا اور تین چیخیں ماریں پھر ایک پتھر پھٹا اور بچہ اس میں گھس گیا حضرت نے فرمایا بچہ کی ہر چیخ تمہارے لیے ایک دن کی مہلت (کی طرف اشارہ ہے) صرف تین دن تک گھروں میں رہ سکتے ہو یہ وعدہ عذاب غلط نہیں ہو سکتا۔

ابن اسحاق کی روایت میں آیا ہے کہ جو نو آدمی اونٹنی کو قتل کرنے کے لیے نکلے تھے ان میں سے چار شخص بچہ کو قتل کرنے نکلے ان میں مصدع بن مہرج اور اس کا بھائی ذاب بن مہرج بھی تھا مصدع نے اس کے تیر مارا جس سے اس کا دل چھید گیا۔ مصدع نے اس کو ٹانگ پکڑ کر کھینچا اور سب نے نیچے لا کر ماں کی طرح اس کا گوشت بھی آپس میں بانٹ لیا۔ حضرت صالح (علیہ السلام) نے فرمایا تم لوگوں نے حرمت خداوندی کو توڑا اب اللہ کے عذاب اور انتقام کے لیے تیار ہو جاؤ۔ لوگوں نے آپ کی بات کا مذاق بنایا اور استہزاء کے طور پر کہنے لگے صالح عذاب کب آئے گا اس کی علامت کیا ہو گی ثمودیوں کی زبان میں اتوار کو اوّل پیر کو عون منگل کو دبار بدھ کو جبار جمعرات کو مونس جمعہ کو عروبہ اور سنیچر کو شیار کہتے تھے بدھ کے روز انھوں نے اونٹنی کو قتل کیا تھا۔ حضرت صالح نے جواب میں فرمایا جب مونس کی صبح ہو گی تو تمہارے چہرے زرد ہوں گے عروبہ کی صبح اٹھوگے تو تمہارے چہرے سرخ ہوں گے اور شیار کی صبح کو تمہارے منہ کالے ہو جائیں گے پھر اوّل (اتوار) کے دن صبح کو تم پر عذاب آ جائے گا یہ بات سن کر وہ نو آدمی جنہوں نے اونٹنی کو قتل کیا تھا آپس میں کہنے لگے آؤ صالح کو ہی ختم کر دیں اگر یہ سچا ہے تو (عذاب آنے سے) پہلے ہی ہم اس کو قتل کر چکیں گے اور جھوٹا ہے تو اونٹنی کے پاس اس کو بھیج دیں گے اس مشورہ کے بعد رات کو شب خون مارنے کے لیے حضرت صالح (علیہ السلام) کے مسکن پر پہنچے لیکن فرشتوں نے پتھر مار مار کر ان کو دفع کر دیا جب ان کے ساتھ والوں نے دیکھا کہ دیر ہو گئی اور وہ واپس نہیں لوٹے تو صالح کے گھر پہنچے دیکھا کہ ان کے آدمی پتھروں سے کچلے پڑے ہیں کہنے لگے صالح تو نے ان کو قتل کیا ہے یہ کہہ کر حضرت صالح کو قتل کرنے کا ارادہ کیا لیکن دوسرے ساتھ والوں نے جو مسلح تھے ان سے کہا تم صالح کو کبھی قتل نہیں کر سکتے صالح نے وعدہ کیا ہے کہ تین روز کے بعد تم پر عذاب آئے گا اگر یہ سچے ہیں تو ان کو قتل کرنے کا ارادہ کر کے تم اپنے رب کے غضب کو اور بھڑکا رہے ہو اور اگر یہ جھوٹے ہیں تو جو کچھ تم ارادہ کر رہے ہو وہ اس کے بعد ہو جائے گا

یہ تقریر سن کر لوگ اسی رات کو منتشر ہوگئے پھر جمعرات کی صبح ہوئی تو ان کے چہرے زرد ہوگئے معلوم ہوتا تھا کہ چھوٹے بڑے عورت مرد ہر ایک کے چہرہ پر خلوف (ایک زرد خوشبو) ملی ہوئی ہے یہ علامت دیکھ کر ان کو عذاب کا یقین ہوگیا اور سمجھ گئے کہ صالح نے صحیح بات کہی تھی (پھر توبہ کرنے کے بجائے) حضرت صالح کو قتل کرنے کے لیے تلاش کرنے لگے لیکن آپ بھاگ کر ثمود کے قبیلہ بنی غنم میں پہنچ کر قبیلہ کے سردار کے پاس جس کا نام تقبل تھا اور کنیت ابوہرب جا ٹھہرے تھے یہ شخص مشرک ضرور تھا مگر اس نے آپ کو چھپالیا اس لیے تلاش کرنے والوں کی دسترس سے آپ باہر رہے اور صبح کو حضرت صالح کے مومن ساتھیوں کے پاس جا کر ان کو طرح طرح سے اذیتیں دے کر صالح کا پتہ پوچھنے لگے ایک شخص نے جس کا نام صدع بن ہرم تھا حضرت سے دریافت کیا یا نبی اللہ یہ لوگ آپ کا پتہ بتانے کے لیے ہم کو اذیتیں دے رہے ہیں کیا ہم ان کو آپ کا پتہ نشان بتادیں آپ نے فرمایا ہاں تم کو کہہ دو کہ میرے پاس صالح ہے مگر تم اس پر دسترس نہیں پاسکتے (اس شخص نے حسب اجازت کہہ دیا مگر) وہ لوگ اس کو چھوڑ کر چل دیئے اور جس عذاب میں مبتلا تھے اس نے ان کو آگے کچھ کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا بلکہ ایک دوسرے کو دیکھ کر اس کے چہرے کی زردی بتاتا تھا اسی میں شام ہوگئی تو سب چیخ پڑے' میعاد مقررکا ایک دن گزر گیا جب دوسرے دن کی صبح ہوئی تو ان کے چہرے سرخ ہوگئے معلوم ہوتا تھا خون سے رنگے ہوئے ہیں یہ دیکھ کر چیخنے اور چلانے اور رونے لگے شام ہوئی تو چیخ کی میعاد کے دو دن گزر گئے اب عذاب آ ہی پہنچا تیسرے دن کی صبح ہوئی تو سب کے منہ کالے ہوگئے جیسے تارکول مل دیا گیا ہو' یہ دیکھ کر (مزید) روئے پیٹے شام ہوئی تو حضرت صالح مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے کر شام کی طرف چل دیئے اور فلسطین کے ایک ریگستان میں جا کر فروکش ہوگئے اتوار کی صبح ہوئی تو لوگوں نے کفن پہن لیے' مردہ کی خوشبو مل لی اور زمین پر پڑ گئے کبھی آسمان کی طرف دیکھتے تھے کبھی زمین کی طرف سمجھ نہ سکے کہ عذاب کدھر سے آئے گا جب خوب دن چڑھ گیا تو زلزلہ نے ان کو آدبوچا اور سب گھروں کے اندر پڑے کے پڑے رہ گئے اور ایک ایسی زور کی چیخ آسمان کی طرف سے آئی جس میں ابر کی ہر کڑک اور زمین کی ہر تڑک سے زیادہ قوت تھی جس سے سب کے دل سینوں کے اندر پھٹ گئے اور ہر بچہ بڑا ہلاک ہوگیا صرف ایک اپاہج لڑکی بچ گئی جس کا نام ذریعۃ بنت سلف تھا یہ کافر تھی اور حضرت صالح سے اس کو سخت دشمنی تھی عذاب کو دیکھنے سے اس کے پاؤں یک دم کھل گئے اور تیزی سے بھاگ کر یہ قرح یعنی وادی القریٰ میں پہنچ گئی اور عذاب کی جو کیفیت اس نے دیکھی تھی وادی القریٰ کے باشندوں سے بیان کردی پھر پانی مانگا اور پانی پیتے ہی مر گئی۔

حضرت عبداللہ بن دینار کے چچا کے بیٹے کی روایت سے بخاری نے صحیح میں بیان کیا ہے کہ غزوہ تبوک میں جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حجر میں فروکش ہوئے تو حکم دیا لوگ یہاں کے کنوئیں کا پانی نہ پئیں' نہ جانوروں کو پلائیں لوگوں نے عرض کیا ہم نے تو اس پانی سے آٹا گوندھ لیا ہے اور پانی لے بھی لیا ہے فرمایا گوندھے ہوئے آٹے کو پھینک دو اور پانی کو بہادو۔

بغوی نے حضرت ابن عمر (رض) کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حکم دیا تھا کہ حجر کے کنوئیں سے لیا ہوا پانی بہادیں اور گوندھا ہوا آٹا اونٹوں کو کھلادیں اور اس کنوئیں کا پانی لیں جس کا پانی اونٹنی پیتی تھی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ ابوالزبیر نے حضرت جابر (رض) کا قول نقل کیا کہ جب غزوہ تبوک میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا گزر حجر سے ہوا تو صحابہ کو حکم دیا تم میں سے کوئی اس (ویران) بستی میں نہ جائے نہ ان کا پانی پیو ان عذاب یافتہ لوگوں کی طرف سے گزرو تو روتے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہیں تم پر بھی وہی عذاب نہ آجائے جو ان پر آیا تھا پھر فرمایا تم اپنے رسول سے معجزات نہ طلب کرو۔ یہ صالح کی قوم تھی جس نے اپنے رسول سے معجزہ طلب کیا تھا تو اللہ نے ایک اونٹنی برآمد کردی جو اس پہاڑی راستہ سے پانی پر جاتی اور (پانی پی کر) اس راستہ سے واپس آتی تھی اور اپنی باری کے دن ان کا (سارا) پانی پی جاتی تھی ان لوگوں نے اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی اور اونٹنی کو قتل کردیا نتیجہ میں اللہ نے ان سب لوگوں کو ہلاک کردیا جو اس سرزمین میں مشرق سے مغرب لے کر مغرب تک آسمان کے خیمہ کے نیچے رہتے تھے صرف ایک آدمی بچا جس کو ابورغال کہا جاتا تھا یہ ہی قبیلہ ثقیف کا مورث اعلیٰ تھا یہ اس وقت حرم کے اندر تھا اور حرم میں ہونے کی وجہ سے اللہ کے عذاب سے بچ گیا لیکن جب حرم سے باہر نکلا تو اس پر بھی وہی عذاب آیا جو دوسروں پر آیا تھا اور وہیں دفن ہوگیا دفن ہونے کے وقت اس کے پاس سونے کی ایک سلاخ بھی تھی جو اسی کے ساتھ زمین میں دب گئی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ کو ابورغال کی قبر بھی دکھائی اور لوگوں نے تلواروں سے (کرید کر) زمین کھود کر سونے کی وہ ڈنڈی برآمد کرلی۔ قوم ثمود میں سے جو لوگ حضرت صالح پر ایمان لائے تھے ان کی تعداد چار ہزار تھی۔ حضرت صالح ان لوگوں کو لے کر حضرموت چلے گئے۔ حضرموت میں پہنچ کر آپ کی وفات ہوگئی اسی لیے اس

بستی کا نام حضر موتھو گیا پھر ان لوگوں نے ایک بستی بسائی جس کا نام حاصورا ہوا۔ بعض علماء روایت کا قول ہے کہ حضرت صالح کی وفات مکہ میں ہوئی وفات کے وقت آپ کی عمر ۵۸ سال کی تھی آپ صرف بیس سال اپنی قوم میں رہے تھے۔ (تفسیر مظہری۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ)

آیت مبارکہ:

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ۝۸۰

لغۃ القرآن: وَلُوْطًا : اور لوط کو] [اِذْ : جب] [قَالَ : فرمایا] [لِقَوْمِهٖٓ : اپنی قوم سے] [اَتَاْتُوْنَ : کیا تم سب ارتکاب کرتے ہو] [الْفَاحِشَةَ : بدکاری کا] [مَا : نہیں] [سَبَقَكُمْ : سبقت کی تم سے] [بِهَا : اس کے] [مِنْ اَحَدٍ : کسی ایک کو] [مِّنَ : سے] [الْعٰلَمِيْنَ : تمام جہانوں کا]

ترجمہ: اور لوط (علیہ السلام) کو (بھی ہم نے اسی طرح بھیجا) جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم (ایسی) بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو جسے تم سے پہلے اہل جہاں میں سے کسی نے نہیں کیا تھا

تشریح: حضرت لوط (علیہ السلام) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے بھتیجے تھے۔ ان کے والد کا نام ہاران تھا۔ بعضوں نے عمران لکھا ہے۔ لوط (علیہ السلام) کی پرورش اور نشو ونما حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے زیر سایہ ہوئی، چنانچہ وہ اور حضرت سارہ ملت ابراہیمی کے پہلے مسلم اور "السابقون الاولون" ہیں۔ حضرت لوط (علیہ السلام) کا نام قرآن کریم کی چودہ سورتوں میں ستائیس مرتبہ مذکور ہے۔

حضرت لوط (علیہ السلام) اور ان کی بد کردار قوم کا مفصل قصہ سورۃ ہود سورۃ حجر سورۃ شعراء اور سورۃ عنکبوت میں مذکور ہے۔ دوسرے مقامات پر مختصراً تھوڑا تھوڑا مذکور ہے اور کل ستائیس مقامات ہیں۔ یہاں سورۃ اعراف میں ان کی صرف ایک بدکاری کا تذکرہ ہے، وہ یہ کہ مرد مردوں سے اپنی شہوت پوری کرتے تھے۔

حضرت لوط (علیہ السلام) نے ان سے فرمایا کہ یہ بے حیائی خلاف فطرت ایسا برا کام ہے جسے تم سے پہلے جہانوں میں سے کسی نے بھی نہیں کیا۔ یہ جانوروں سے بھی بدتر کام ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی شریعت کے خلاف کام ہے، یہ انسانی فطرت کے خلاف کام ہے، یہ انسانی فطرت کے بھی خلاف ہے، اور نہایت برا اور بے مقصد بے عمل ہے۔ اس قوم کی دوسری بد کرداری یہ تھی کہ راہزنی اور لوٹ مار کرتے تھے، فرمایا: "وتقطعون السبیل" (عنکبوت) حضرت لوط (علیہ السلام) نے بارہ تیرہ سال تک مسلسل انہیں سمجھایا، اور نہایت سوز وگداز سے انہیں تبلیغ کی، لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ وہ بیک وقت کفر وشرک اور اس منحوس عمل اگلا مبازی میں مبتلا رہے، انہوں نے آپس میں کہا کہ لوط (علیہ السلام) اور اس کے ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال دو، یہ پاکیزہ بننا چاہتے ہیں، اور ہمیں گندہ اور ناپاک کہتے ہیں۔ یہ بات انہوں نے مذاق واستہزاء کرکے کہی کہ وہ پاکیزہ بننا چاہتے ہیں۔ لوط (علیہ السلام) شب وروز انہیں تبلیغ کرتے رہتے تھے، اور وہ کبھی تو ان کو شہر سے نکالنے کی دھمکی دیتے تھے، اور کبھی یہ کہتے کہ اگر تو واقعی سچا ہے تو لے آؤ وہ عذاب جس سے تو ہمیں ڈرایا کرتا ہے۔

وہ دراصل عذاب کے بارے میں مذاق کرتے تھے، اور لوط (علیہ السلام) اور ان کے کہنے پر یقین نہیں کرتے تھے، کیونکہ جو لوگ خدا کے منکر، رسالت کے منکر، اور قیامت کے منکر ہوں ان کو تو کسی عذاب کا یقین ہی نہیں ہوتا۔ اس پورے عرصہ میں قوم میں سے کوئی شخص بھی مسلمان نہیں ہوا، البتہ ان کی بچیاں مسلمان ہو گئیں، مگر ان کی بیوی نوح (علیہ السلام) کی بیوی کی طرح بدستور کافرہ رہی، اور قوم کے اوپر آنے والے عذاب میں ہلاک ہو گئی۔

حضرت لوط (علیہ السلام) جن بستیوں کی طرف مبعوث ہوئے وہ کل سات بستیاں تھیں، تین چھوٹی، اور چار بڑی بستیاں ہوتی تھیں، جن کی مرکزی بڑی بستی کا نام "سدّوم" تھا۔ دوسری "عامورا" تیسرا "اومہ" چوتھی "صبویر" پانچویں "صوغر" چھٹی "بالع" ساتویں "صبوہیم" قرآن کریم نے ان کے مجموعہ کو "موتفکۃ" اور "موتفکات" کے ناموں سے ذکر کیا ہے، یعنی الٹی ہوئی بستیاں۔ یہ بستیاں اردن اور بیت المقدس کے درمیان واقع تھیں۔ یہ علاقہ اس زمانہ میں نہایت سرسبز و

شاداب، گنجان درختوں اور مچھلیوں کا گھوارہ شمار ہوتا تھا۔ عذاب آنے کے بعد ایسا سمٹ گیا کہ وہاں بربادی، اور نہایت تلخ و بدبودار پانی، اور شورہ ناک عذاب کے پانی کے سوا کچھ باقی نہیں رہا، جنہوں نے خدائی نعمتوں کی مسلسل ناشکری کی، انہیں صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا کر انتقام کا نشانہ بنایا گیا۔

"ولوطا اذ قال لقومہ اتاتون الفاحشۃ" حضرت لوط (علیہ السلام) نے جب اپنی قوم سے کہا: کیا تم ایسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو" ما سبقکم بھا من احد من العلمین "کہ تم سے پہلے جہاں بھر میں یہ کام کسی نے کبھی نہیں کیا؟ زنا ہو یا لواطت دونوں حرام اور بے حیائی کے گندے عمل ہیں۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ یہ لواطت طبعاً، عقلاً شرعاً اور عرفاً ہر لحاظ سے قبیح و حرام ہے۔ زنا قطعاً حرام ہے، اگرچہ طبعی محل میں ہوتا ہے، مگر لواطت کا تعلق تو غیر طبعی محل سے ہے، لہٰذا اس کا جرم زنا سے بھی شدید اور سخت ہے۔ کہتے ہیں کہ سدوم اور اس کے اطراف میں باغات بہت بکثرت تھے، ادھر ادھر کی بستیوں سے بچے بکثرت پھل توڑنے کے لیے آتے تھے، شیطان نے باغ والوں کو پٹی پڑھائی کہ آنے والوں یعنی بچوں کو سزا دیدو، ان کے ساتھ یہ فعل کرو، پھر وہ تمہارے پھل توڑنے کے لیے نہیں آئیں گے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا، اس طرح اس فعل بد کی ابتداء ہوئی، اور لوگ آہستہ آہستہ اس فعل بد کے عادی ہو گئے، اور ان کی فطرت مسخ ہو گئی۔ اس سے پہلے اس کام کا پورے عالم میں نہ رواج تھا اور نہ اس کو کوئی جانتا تھا۔

"انکم لتاتون الرجال شھوۃ من دون النساء بل انتم قوم مسرفون" تم مردوں پر شہوت رانی کرتے ہوئے دوڑتے ہو، عورتوں کو چھوڑ کر۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری تسکین اور جائز مقصد پورا کرنے کے لیے عورتوں کو پیدا فرمایا ہے، تم انہیں چھوڑ کر غیر فطری، غیر اخلاقی، بے حیائی کا ارتکاب کرکے نہایت بدکار ہو، کیونکہ حیوانات میں بھی یہ کام نہیں ہوتا۔ خوب اندازہ لگاؤ کہ تم حیوانات سے بھی بدتر ہو۔

"وماکان جواب قومہ الا ان قالوا اخرجوھم من قریتکم انھم اناس یتطھرون" تو نہیں تھا قوم کا جواب سوائے اس کے کہ انہوں نے کہا کہ لوط اور اس کے ماننے والوں کو اپنے شہر سے نکال باہر کرو، یہ بڑے پاکباز بنے پھرتے ہیں، انہیں ہم گناہگاروں کی بستی سے کیا سروکار؟ انہیں یہاں سے کسی اور اچھی جگہ چلے جانا چاہیے۔ لوط (علیہ السلام) نے پہلے سے کہا تھا: "انی لعملکم من القالین" (الشعراء) میں تمہارے عمل سے نفرت کرتا ہوں۔ اور دعا کرتے رہے۔ "رب نجنی واھلی مما یعملون" (الشعراء) اس عرصہ میں لوگوں نے آپ کو کئی مرتبہ مارا پیٹا، گالیاں دیں، آپ پر پتھر برسائے، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا تمسخر اڑایا۔

"فانجینہ واھلہ الا امراتہ" ہم نے آپ کو اور آپ کی دونوں پاکیزہ بچیوں کو بچایا، سوائے بیوی کے کہ وہ اپنی قوم کے مذہب پر تھی، اور انہی کے ساتھ جہنم رسید ہو گئی۔ حضرت لوط (علیہ السلام) بحکم الٰہی راتوں رات بچیوں کو ساتھ لے کر وہاں سے ہجرت فرمائی، اور بیوی ساتھ جانے سے منکر ہوئی۔ صحیح روایت یہی ہے کہ وہ جانے پر تیار نہیں ہوئی۔ پیچھے سے فرشتوں کے سردار حضرت جبریل (علیہ السلام) نے کاروائی شروع کرکے وہ نظارہ پیش کیا کہ الامان والحفیظ۔ فرمایا: وامطرنا علیھم مطرا۔ ہم نے ان پر خاص قسم کی بارش برسائی۔ سورۃ ہود میں یوں ارشاد فرمایا۔ "فلما جاء امرنا جعلنا عالیھا سافلھا وامطرنا علیھا حجارۃ من سجیل منضود مسومۃ عند ربک وماھی من الظلمین ببعید" جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے زمین کے اوپر والے حصے کو نیچے والا حصہ کر دیا، اور ہم نے اس زمین پر کنکر کے پتھروں کی بارش برسادی، جو لگاتار گر رہے تھے، جو آپ کے رب کے پاس نشان لگے ہوئے تھے۔

سورۃ حجر میں فرمایا: فاخذ تھم الصیحۃ مشرقین فجعلنا عالیھا سافلھا وامطرنا علیھم حجارۃ من سجیل۔ اور سورۃ ذاریات میں فرمایا۔ لنرسل علیھم حجارۃ من طین مسومۃ عند ربک للمسرفین۔ اسی طرح سورۃ شعراء۔ سورۃ نمل سورۃ عنکبوت اور دیگر سورتوں میں مختلف الفاظ اور مختلف کلمات کے ساتھ اس بدنصیب، گمراہ، ناعاقبت اندیش قوم کی تباہی اور ہلاکت کا بیان ستائیس مقامات پر مختلف رنگ میں مذکور ہے۔

ان سب آیات کریمہ کے ملانے سے معلوم یہی ہوتا ہے کہ حضرت لوط (علیہ السلام) کی قوم پر تینوں طرح کا عذاب آیا، فرشتہ کی چیخ نے بھی پکڑا، ان کی سرزمین کا تختہ بھی الٹ دیا گیا، فرشتہ نے باقی زمین سے اس حصہ کو کاٹ کر الگ کر دیا، اور اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر طشت کی طرح آسمانوں تک اوپر اٹھالیا، پھر اسے الٹا کر واپس اسی جگہ پٹخ دیا، اوپر کا حصہ آبادی والا نیچے، اور نیچے والا حصہ اوپر رکھ دیا، کہیں پورے علاقے کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا، اور ان پر پتھر کنکر بھی برسادیئے۔

اس قوم کا عذاب گشتہ تمام عذابوں سے ممتاز اور نرالا رہا۔ جو لوگ اپنے پیغمبر کو بستی سے نکالنا چاہتے ہیں ان کا حشر یہ ہوا جو رہتی دنیا تک لوگوں کے لیے سامان عبرت ہے۔ اسی لیے فرمایا: "وماھی من الظلمین ببعید" (ہود) اور سورۃ صافات میں فرمایا۔ "وانکم لتمرون علیھم مصبحین وبالیل افلا تعقلون" تم وہاں سے گزرتے ہو،

اور نظروں سے مقام عذاب کا مشاہدہ بھی کرتے ہو، پھر کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے ہو؟ گزشتہ دونوں آیتوں کی تصریح سے معلوم ہوا کہ جو پتھر ان لوگوں پر برسائے گئے وہ عام پتھر نہ تھے، بلکہ وہ پتھر ایسے تھے جو مٹی سے پکا کر بنائے گئے ہوں، جیسے کہ اینٹوں کو بناتے ہیں، جس کا ترجمہ کنکر سے کیا گیا۔ اور مسومۃ کا مطلب یہ ہے کہ ہر پتھر پر نشان لگا ہوا تھا کہ یہ فلاں شخص پر ہی گرے گا اور سورۃ ہود میں "منضود" کا کلمہ جو مذکور ہے اس کا معنی ہے کہ لگاتار یہ پتھر برسائے گئے تھے۔

نکتہ:

اگر کوئی یہ سمجھے کہ لواطت کا کام مردوں نے کیا، عورتیں اور بچے بے گناہ تھے، وہ کیوں ہلاک ہوئے؟ پہلا جواب تو یہ ہے کہ اصل سبب ہلاکت کا کفر و شرک رہا ہے، جیسے کہ قوم نوح، قوم عاد اور قوم ثمود کی ہلاکت سے معلوم ہوا، البتہ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ مردوں کی ہلاکت کے اسباب دو رہے، یعنی کفر و شرک اور لواطت، باقی عورتوں اور بچوں کی ہلاکت کا سبب ایک ہی رہا، یعنی کفر و شرک، جس کا واضح ثبوت اور مثال پیغمبر کی بیوی کی ہلاکت ہے۔

نکتہ:

قرآن حکیم کی تصریح سے معلوم ہوا کہ حضرت لوط (علیہ السلام) کی قوم جس فاحشہ اور بدکرداری میں مبتلا رہی، اور اسے اپنی شہوت رانی کا واحد ذریعہ بنایا، یہ عمل ان سے پہلے کسی قوم نے نہیں کیا۔ یہ عمل عقلاً فطرتاً اخلاقاً شرعاً ہر اعتبار سے مذموم اور نہایت قبیح ہے، اور کبائر میں سے ہے، پس اس کی سزا کیا ہو؟ اس بارے میں صاحبین امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ یہ بھی ایک طرح کا زنا ہے، اس کی سزا بھی وہی ہے جو سزا زنا کی ہے، یعنی غیر شادی شدہ کیلئے سو کوڑے، اور شادی شدہ کے لیے رجم و سنگساری۔

حضرت امام شافعی (رح) کا بھی یہی قول ہے اور ان کا ایک قول یہ بھی ہے کہ دونوں یعنی فاعل اور مفعول کو قتل کیا جائے، اور یہ بھی ان کا قول ہے کہ دونوں کو سنگسار کیا جائے خواہ شادی شدہ ہوں یا نہ ہوں۔ حضرت امام (رح) کا بھی یہی قول ہے۔ اور حضرت امام ابو حنیفہ (رح) نے فرمایا کہ اس کی کوئی ایسی سزا مقرر نہیں کہ ہمیشہ ہر وقت اسی کو اختیار کیا جائے، بلکہ اگر حاکم مناسب سمجھے تو دونوں کو قتل کر دے، اور اگر یہ مناسب سمجھے تو انہیں جیل میں ڈالدے، یہاں تک کہ وہیں مر جائیں، یا پختہ توبہ کریں، پھر اگر توبہ کے بعد اس عمل کو دوبارہ کریں، تو پھر ان کی سزا قتل ہے۔

حضرت علی سے روایت ہے کہ ایسے لوگوں کو آگ میں جلایا جائے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ آبادی میں جو سب سے اونچی عمارت ہو وہاں سے اوندھے منہ کرکے پھینک دیا جائے، پھر پیچھے سے پتھر مارے جائیں۔ بہر حال یہ تمام سزائیں تعزیر کے قبیلے سے ہیں۔ تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جائے۔

نکتہ:

اس شنیع فعل کے موجد قوم لوط کے لوگ ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے وہ سزا دی اور تباہ کیا کہ ان کے مردار اجسام اور لاشوں سے زمین کے اوپر والے حصے کو ہمیشہ کے لیے پاک فرمایا، یہ مردار عمل اس وقت تقریباً دنیا کے بہت حصوں میں موجود ہے، اور یورپ کی تہذیب یافتہ انسانی شرافت کے دشمن اسے پسندیدہ عمل قرار دیتے ہوئے باقاعدہ اسے قانونی شکل اور تحفظ دے چکے ہیں، حتی کہ برطانوی اور فرانسیسی پارلیمنٹ تو یہ قانون تالیوں کی گونج میں فخریہ طور پر پاس کر چکے ہیں کہ اگر دو بالغ مرد، اسی طرح دو بالغہ عورتیں رضامندی سے ہم جنسی کا اہتمام کرلیں تو وہ کر سکتے ہیں، اور ان پر کوئی جرم عائد نہیں ہوتا، البتہ اگر کسی کے ساتھ زبردستی ہو تو پھر قابل مواخذہ ہے۔ خنزیر کھانے والے لوگ اسی طرح بے غیرت ہوتے ہیں، انگریز، عیسائی اور سکھ قوم خنزیر پالنے اور کھانے میں مشہور ہیں، اور ان کا شمار دنیا کے بدترین بے حیاؤں میں ہے، سکھوں میں یہ رواج عام ہے کہ چار بھائیوں کی ایک بیوی ہوتی ہے۔ انگریزوں کا معاشرہ اور ازدواجی قانون اتنا غیر مہذب اور ناپاک ہے کہ کتوں سے بدتر اور مردار ہے۔

مقام عبرت:

وماھی من الظلمین ببعید: زمانہ رسالت کا ظالم ہو یا آج کا فاسق و فاجر غیر مہذب درندہ صفت انسان ہو، اسے چاہیے کہ اس منظر کو بغور مطالعہ کرے، اور بچشم عبرت دیکھ کر اس فعل شنیع سے توبہ کرے، اور اللہ تعالیٰ کی گرفت اور بطش شدید سے اس کی پناہ طلب کرے۔ یہ ہولناک منظر آج بھی موجود ہے۔ بیت المقدس اور نہر اردن کے درمیان آج بھی یہ قطعہ زمین بحر لوط یا بحر میت اور بحر مردار کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی زمین سطح سمندر سے چار سو فٹ سے زیادہ گہرائی میں ہے۔

اس کے ایک خاص حصہ پر ایک دریا کی صورت میں ایک نہایت پر خطر، بدبودار، عجیب قسم کا گاڑھا پانی موجود ہے، جس میں کوئی بھی جاندار مچھلی یا مینڈک یا مگرمچھ، یا اور کوئی ذی روح جانور زندہ نہیں رہ سکتا، اس لیے اس کو بحر میت بولتے ہیں۔ سدّوم کا یہی مقام اور جائے وقوع ہے۔" نعوذ باللہ من عذابہ وغضبہ"

(تفسیر منازل العرفان۔عبد الستار شاہ)

مزید وضاحت کرتے ہوئے علامہ غلام رسول سعیدیؒ فرماتے ہیں:

حضرت لوط (علیہ السلام) کا شجرہ نسب :

امام ابو القاسم علی بن الحسن بن عساکر متوفی 571 لکھتے ہیں : حضرت لوط (علیہ السلام) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے بھتیجے تھے۔ ان کا شجرہ نسب یہ ہے : لوط بن ھاران (ھاران حضرت ابراہیم کے بھائی تھے) بن تارخ بن ناحور بن ساروع بن ارعو بن نافع بن غابر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح بن لمک بن متوشلخ بن خنوخ (یہ حضرت ادریس ہیں) بن مھلاییل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم (علیہ السلام)۔

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ جس شخص نے سب سے پہلے اللہ کی راہ میں قتال کیا وہ حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن ہیں جب اہل روم نے حضرت لوط (علیہ السلام) کو قید کر لیا تو حضرت ابراہیم نے ان سے قتال کیا اور حضرت لوط کو چھڑایا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں سب سے پہلے حضرت عثمان (رض) نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان کے متعلق کوئی خبر نہیں ملی، آپ ان کے متعلق خبروں کے منتظر تھے کہ قریش کی ایک عورت آئی اور کہنے لگی اے ابوالقاسم ! میں نے آپ کے داماد کو سفر میں دیکھا ہے، ان کی اہلیہ کمزور لوگوں کے ساتھ دراز گوش پر سوار تھیں اور وہ اس کو چلا رہے تھے اور اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : اللہ ان دونوں کا صاحب ہو، بیشک لوط (علیہ السلام) کے بعد عثمان اپنے اہل کے ساتھ اللہ کی طرف ہجرت کرنے والے پہلے شخص ہیں۔

حضرت لوط (علیہ السلام) کا مقام بعثت :

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو ارض مقدسہ کی طرف بھیجا گیا اور حضرت لوط (علیہ السلام) کو چار شہروں کی طرف بھیجا گیا : سدوم، اموراء، عاموراء اور صبویراء۔ ان میں سے ہر شہر میں ایک لاکھ جنگ جو لوگ تھے ان کا مجموعہ چار لاکھ تھا۔ ان میں سب سے بڑا شہر سدوم تھا۔ حضرت لوط اسی میں رہتے تھے، یہ شام کے شہروں میں سے ہے اور فلسطین سے ایک دن اور رات کی مسافت پر واقع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کو مہلت دی تھی انھوں نے اسلامی شرم وحیاء کے حجاب چاک کر دیے اور بہت بڑی بے حیائی کا ارتکاب کیا۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اپنے دراز گوش پر سوار ہو کر قوم لوط کے شہروں میں جاتے اور ان کو نصیحت کرتے وہ ان کی نصیحت کو قبول کرنے سے انکار کرتے تھے۔

حضرت لوط (علیہ السلام) کی قوم جس علاقہ میں رہتی تھی اس کو آج کل شرقی اردن کہا جاتا ہے۔ یہ جگہ عراق اور فلسطین کے درمیان میں واقع ہے۔ توراۃ میں اس علاقہ کے صدر مقام کا نام سدوم بتایا گیا ہے جو یا تو بحیرہ مردار کے قریب کسی جگہ واقع تھا یا اب بحیرہ مردار میں غرق ہو چکا ہے۔ اب صرف بحیرہ مردار ہی اس کی ایک یادگار باقی ہے جسے آج تک بحر لوط کہا جاتا ہے۔ اردن کی وہ جانب جہاں آج بحر مردار یا بحر لوط واقع ہے، اس کے قریب رہنے والوں کا اعتقاد ہے کہ یہ تمام حصہ جو اب سمندر نظر آتا ہے کسی زمانہ میں یہ خشک زمین تھی اور اس پر شہر آباد تھے سدوم اور عاموراوغیرہ یہاں تھے۔ جب قوم لوط پر عذاب آیا اور اس زمین کا تختہ الٹ دیا گیا اور سخت زلزلے آئے تب یہ زمین تقریباً چار سو میٹر سمندر سے نیچے چلی گئی اور پانی ابھر آیا۔ اس سے اس کا نام بحر مردار اور بحر لوط ہے۔ اس زمانہ کے محققین نے بھی بحر مردار کے ساحل پر بعض تباہ شدہ بستیوں کے آثار دیکھ کر یہ یقین کر لیا ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جس جگہ کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے۔

حضرت لوط کے ہاں فرشتوں کا حسین اور نوخیز لڑکوں کی شکل میں مہمان ہونا :

حضرت ابن عباس (رض) نے بیان کیا کہ جب بدمعاشوں نے یہ سنا کہ حضرت لوط (علیہ السلام) کے پاس مہمان آئے ہیں تو وہ حضرت لوط (علیہ السلام) کے دروازہ پر پہنچے۔ حضرت لوط (علیہ السلام) نے دروازہ بند کر دیا اور کہا تم میری بیٹیوں سے نکاح کر لو۔ (ھود : 67) حضرت لوط کو اپنے مہمانوں کی بے حرمتی کا اندیشہ تھا اور ان کے ہاں یہ دستور تھا کہ ایک شخص صرف ایک عورت سے نکاح کرتا تھا، انھوں نے کہا : تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری بیٹیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے اور تم جانتے ہو

کہ ہماری خواہش کیا ہے۔ (ھود: 79) حضرت لوط نے فرمایا: اللہ سے ڈرو اور مجھے اپنے مہمانوں کے متعلق شرمندہ نہ کرو، کیا تم میں کوئی نیک آدمی نہیں ہے؟ انھوں نے حضرت لوط کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور دروازہ توڑ کر اندر گھس گئے۔ پھر حضرت جبرائیل اپنی اصل صورت میں آ گئے اور کہا: اے لوط! پریشان نہ ہوں، ہم فرشتے ہیں یہ ہم تک نہیں پہنچ سکتے، ہمیں ان کو عذاب دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت جبرائیل نے کہا: آپ رات کے کسی حصہ میں اپنے گھر والوں کو لے کر اس بستی سے نکل جائیں، وہ لوگ جب اندر آئے تو حضرت جبرائیل نے اپنے پر ان کے چہروں پر مل دیے ان کے چہرے خون آلود ہو گئے اور ان کی آنکھیں کل زمین پر گر پڑیں۔ تب انھوں نے کہا اے لوط، تمہارے پاس جادو گر تھے جنھوں نے ہمیں اندھا کر دیا وہ ٹھوکریں کھاتے ہوئے باہر نکلے اور جیسے ہی صبح ہوئی، ان کو عذاب نے آ لیا۔

قوم لوط میں ہم جنس پرستی کی ابتداء:

حضرت لوط (علیہ السلام) کی قوم میں عورتوں کی بجائے مردوں سے نفسانی خواہش پوری کرنے کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ ان کے باغات میں پھل تھے اور ان کے گھروں سے باہر لٹکتے رہتے تھے، ایک بار ان کے ہاں قحط پڑ گیا اور پھلوں میں کمی ہو گئی۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ جو پھل باہر لٹکے ہوئے ہوتے ہیں اگر تم مسافروں کو ان کے کھانے سے منع کر دو تو تمہارے لیے کشادگی ہو جائے گی۔ انھوں نے سوچا کس طرح منع کریں پھر انھوں نے یہ قانون بنایا کہ جو مسافر بھی پھل توڑے گا اس کو ان کے ساتھ نکاح کرنا ہو گا اور اس کو چار درہم رمانہ دینا ہو گا۔ اس طرح تمہارے پھل محفوظ رہیں گے اور یوں ان کو ہم جنس پرستی کی لت پڑ گئی اور یہ وہ قبیح فعل تھا جو ان سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا تھا۔

قوم لوط میں اس عمل کی ابتداء کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک دن ان کے مردوں کے پاس شیطان انتہائی خوبصورت بچے کی شکل میں آیا اور اس نے ان کو اپنے ساتھ اس عمل کی دعوت دی۔ انھوں نے اس کے ساتھ یہ عمل کیا پھر ان کو اس عمل کی لت پڑ گئی۔

حضرت لوط کی بیوی کی خیانت اور قوم لوط کی بری عادتیں:

حضرت نوح اور حضرت لوط (علیہما السلام) کی بیویوں نے خیانت کی تھی۔ ان کی یہ خیانت زنا نہیں کی تھی۔ حضرت نوح (علیہ السلام) کی بیوی کی خیانت یہ تھی کہ اس نے حضرت نوح (علیہ السلام) کے متعلق لوگوں سے یہ کہا تھا کہ یہ مجنون ہیں۔ اور حضرت لوط (علیہ السلام) کی بیوی کی خیانت یہ تھی کہ جب ان کے پاس فرشتے بہ صورت مہمان آئے تو اس نے لوگوں کو جا کر بتا دیا کہ حضرت لوط (علیہ السلام) کے پاس مہمان آئے ہوئے ہیں۔ ضحاک نے کہا حضرت نوح اور حضرت لوط (علیہما السلام) کی بیویوں کی خیانت چغلی کرنا تھی۔

حسن بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قوم لوط کو دس عادتوں کی وجہ سے ہلاک کیا گیا اور میری امت میں اس سے ایک عادت زیادہ ہو گی۔ ان کے مرد ہم جنس پرست تھے، وہ غلیل سے شکار کرتے تھے، کنکریاں مارتے تھے، حمام میں کھیلتے تھے، دف بجاتے تھے، شراب پیتے تھے، داڑھی کٹاتے تھے اور مونچھیں لمبی رکھتے تھے، سیٹی بجاتے تھے اور تالیاں پیٹتے تھے، ریشم پہنتے تھے اور میری امت میں ان سے ایک عادت زیادہ ہو گی کہ عورتیں عورتوں سے جنسی خواہش پوری کریں گی۔ (کنزل العمال، 10314، مختصر تاریخ دمشق، ج 21، ص 236۔ 241، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1410ھ)

عمل میں قوم لوط کی عقلی قباحتیں:

امام رازی متوفی 606ھ نے قوم لوط کے عمل (اغلام) کی حسب ذیل عقلی خرابیاں بیان کی ہیں:۔

1 اکثر لوگ اولاد کے حصول سے احتراز کرتے ہیں کیونکہ اولاد کی وجہ سے انسان پر ان کی پرورش کا بوجھ پڑ جاتا ہے جس کو اٹھانے کے لیے انسان کو زیادہ مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے جماع کو بہت بڑی لذت کے حصول کا سبب بنا دیا ہے، انسان اس لذت کے حصول کے لیے جماع کے فعل کا اقدام کرتا ہے۔ اور جماع کے بعد خواہی نخواہی بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سل انسانی کی بقاء کے لیے جماع میں یہ لذت رکھی ہے۔ اب اگر انسان اس لذت کو کسی اور طریقہ سے حاصل کرلے جس سے بچہ پیدا نہ ہو تو اس سے وہ حکمت مطلوبہ حاصل نہیں ہو گی اور اس سے نسل انسانی منقطع ہو گی اور یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہے اس لیے اس عمل کا حرام ہونا ضروری ہوا۔

2۔ مرد اپنی فطرت اور وضع کے اعتبار سے فاعل ہے اور عورت منفعل ہے اور جب اس عمل کے نتیجہ میں مرد خود منفعل ہوگا تو یہ فطرت اور حکمت کے خلاف ہے۔
3۔ قضاء شہوت کے لیے مرد کا عورت کے ساتھ یہ عمل کرنا جانوروں کے شہوانی عمل کے مشابہ ہے، اس عمل کو صرف اس وجہ سے اچھا قرار دیا گیا ہے کہ یہ حصول اولاد کا سبب ہے۔ اور جب یہ عمل اس طریقہ سے کیا جائے جس میں حصول اولاد ممکن نہ ہو تو یہ نری حیوانیت ہے اور انسانیت کے بلند مقام سے حیوانوں کی پستی میں جا گرنا ہے۔
4۔ جب مرد، مرد کے ساتھ یہ فعل کرے گا تو مان لیا کہ فاعل کو اس عمل سے لذت حاصل ہو گی مگر اس مفعول کو بہت بڑا عار اور عیب لاحق ہوگا، جو تمام عمر اس کی ذلت اور رسوائی کا سبب ہوگا اور وہ کبھی فاعل کے ساتھ آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکے گا تو ایسی چند منٹ کی خسیس اور گھٹیاں لذت کے حصول کا کیا فائدہ جس سے دوسرے شخص کو تمام عمر کے لیے عیب لگ جائے۔
5۔ اس عمل کے بعد فاعل اور مفعول میں دائمی عداوت ہو جاتی ہے اور مفعول کو فاعل کی شکل سے نفرت ہو جاتی ہے اور بعض اوقات مفعول فاعل کو قتل کرنے کا منصوبہ بناتا ہے۔ اس کے برعکس شوہر اپنی بیوی کے ساتھ جب یہ عمل کرتا ہے تو ان میں الفت اور محبت اور بڑھتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے: " خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیہا و جعل بینکم مودۃ و رحمۃ: اس نے تمہارے تمہاری ہی جنس سے جوڑے پیدا کیے تا کہ تم ان سے سکون پاؤ اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی ہے " (الروم: 31)
6۔ اللہ تعالیٰ نے رحم میں منی کو جذب کرنے کی بہت زبردست قوت رکھی ہے پس جب مرد عورت کے ساتھ یہ عمل کرتا ہے تو مرد کے عضو کی نالی سے منی کے تمام قطرات منجذب ہو کر عورت کے رحم میں پہنچ جاتے ہیں، اس کے برعکس جب مرد، مرد کے ساتھ یہ عمل کرے گا تو مفعول کی مقعد میں چونکہ منی کو جذب کرنے کی صلاحیت نہیں ہے تو اس عمل کے بعد فاعل کے عضو کی نالی میں کچھ قطرات اور ذرات رہ جاتے ہیں جن میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے جس سے عضو سوج جاتا ہے اور مہلک قسم کے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً سوزاک وغیرہ۔

قرآن مجید میں عمل قوم لوط کی مذمت:

قرآن مجید کی حسب ذیل آیات میں قوم لوط کے عمل کی مذمت فرمائی گئی ہے: " اتاتون الذکران من العالمین۔ وتذرون ما خلق لکم ربکم من ازواجکم بل انتم قوم عادون: کیا تم جہان والوں میں سے مردوں کے پاس آتے ہو؟۔ اور اپنی ان بیویوں کو چھوڑ دیتے ہو جو تمہارے رب نے تمہارے لیے پیدا کی ہیں بلکہ تم لوگ حد سے بڑھنے والے ہو " (الشعراء: 165۔166)۔ " انکم لتاتون الرجال شھوۃ من دون النساء بل انتم قوم مسرفون: بیشک تم عورتوں کو چھور کر نفسانی خواہش کے لیے مردوں کے پاس آتے ہو بلکہ تم تو حیوانوں کی حد سے (بھی) تجاوز کرنے والے ہو " (الاعراف: 81)

احادیث میں عمل قوم لوط کی مذمت اور سزا کا بیان:

امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث متوفی 275ھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جن لوگوں کو تم قوم لوط کا عمل کرتے پاؤ تو فاعل اور مفعول بہ دونوں کو قتل کردو۔ (سنن ابو داود، رقم الحدیث: 4462۔ سنن الترمزی رقم الحدیث: 1461۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 2561۔ شعب الایمان رقم الحدیث: 5836)

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: مجھے اپنی امت پر جس چیز کا سب سے زیادہ خوف ہے وہ قوم لوط کا عمل ہے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: 1462۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 2563۔ المستدرک ج 4، ص 357)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرایا: جب اہل ذمہ پر ظلم کیا جائے گا تو دشمن کی حکومت ہو جائے گی اور جب زنا بہ کثرت ہوگا تو قیدی بہ کثرت ہوں گے اور جب قوم لوط کا عمل کرنے والے زیادہ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنا دست رحمت مخلوق سے اٹھالے گا پھر وہ کوئی پروا نہیں کرے گا کہ وہ کس وادی میں ہلاک ہوتے ہیں " (المعجم الکبیر، ج 2، رقم الحدیث: 1755۔ مجمع الزوائد، ج 6، ص 255)۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے سات قسم کے لوگوں کو سات آسمانوں کے اوپر سے لعنت فرماتا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک پر تین بار لعنت کو دہراتا ہے۔ فرماتا ہے: جس نے قوم لوط کا عمل کیا، وہ ملعون ہے، جس نے اوم لوط کا عمل کیا وہ ملعون ہے، جس نے قوم لوط کا عمل کیا، وہ ملعون ہے۔ جس نے غیر اللہ کے لیے ذبح کیا وہ ملعون ہے، جس نے جانوروں کے ساتھ بدفعلی کی وہ ملعون ہے، جس نے اپنے ماں باپ سے تعلق توڑا وہ ملعون ہے۔ جس نے ایک عورت اور اس کی بیٹی کو ایک نکاح میں جمع کیا وہ ملعون ہے، جس نے اللہ کی حدود کو بدلا وہ ملعون ہے۔ جس نے اپنے آپ کو اپنے مالکوں کے غیر کی طرف منسوب کیا وہ ملعون ہے" (المعجم الاوسط، ج 9، رقم الحدیث: 8492۔ مجمع الزوائد، ج 6، ص 272)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: چار شخص ایسے ہیں جو اللہ کے غضب میں صبح کرتے ہیں اور اللہ کی ناراضگی میں شام کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا یا رسول اللہ! وہ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: وہ مرد جو عورتوں کی مشابہت کریں اور وہ عورتیں جو مردوں کی مشابہت کریں، اور جو لوگ جانوروں سے بدفعلی کریں اور جو لوگ مردوں سے خواہش پوری کریں۔ (المعجم الاوسط، ج 7، رقم الحدیث: 6854۔ شعب الایمان، رقم الحدیث: 5830۔ الکامل لابن عدی، ج 6، ص 2233، مجمع الزوائد)

محمد بن المنکدر بیان کرتے ہیں کہ حضرت خالد بن ولید نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ میں نے عرب کے بعض قبیلوں میں یہ دیکھا ہے کہ وہاں مرد کے ساتھ اس طرح فعل کیا جاتا ہے جس طرح عورت کے ساتھ فعل کیا جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر (رض) نے اس مسئلہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب سے مشورہ کیا۔ ان میں حضرت علی بن ابی طالب (رض) بھی تھے۔ انھوں نے کہا: یہ وہ گناہ ہے جس کو صرف ایک امت نے کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو اس امت پر عذاب بھیجا اس کا آپ لوگوں کو علم ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اس شخص کو آگ میں جلا دیا جائے پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب کا اس پر اجماع ہوگیا کہ اس کو آگ میں جلا دیا جائے۔ پھر حضرت ابوبکر نے اس شخص کو آگ میں جلانے کا حکم دیا۔ یہ حدیث حسن ہے۔ (شعب الایمان، رقم الحدیث (5389:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ جو شخص قوم لوط کا عمل کرتا ہو اس کے متعلق نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اوپر والے اور نیچے والے دونوں کو رجم (سنگسار) کردو۔ (سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 2562۔ المستدرک ج 4، ص 355۔ المعجم الاوسط، ج 4، رقم الحدیث: 3128۔ مجمع الزوائد، ج 6، ص (272

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ عزوجل اس مرد کی طرف نظر رحمت نہیں فرماتا جو مرد سے جنسی خواہش پوری کرے یا عورت سے عمل معکوس کرے۔ (سنن الترمذی، رقم الحدیث: 1168۔ صحیح ابن حبان، رقم الحدیث: 4191)

حضرت ابن عباس (رض) سے سوال کیا گیا کہ لوطی کی حد کیا ہے؟ فرمایا اس کو شہر کی سب سے اونچی عمارت سے نیچے پھینکا جائے، پھر اس کو سنگسار کردیا جائے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، ج 9، ص 529۔ السنن الکبری، ج 8، ص 332)

یزید بن قیس نے بیان کیا کہ حضرت علی نے لوطی کو سنگسار کیا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، ج 9، ص 530۔ السنن الکبری، ج 8، ص 332)

زہری نے بیان کیا کہ اگر لوطی شادی شدہ ہو تو اس کو سنگسار کیا جائے اور اگر کنوارا ہو تو اس کو سو کوڑے مارے جائیں۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، ج 9، ص 531۔ مصنف عبدالرزاق، ج 7، ص 363۔ السنن الکبری، ج 8، ص 333)

عمل میں قوم لوط کی سزا میں مذاہب فقہاء:

علامہ موفق الدین عبداللہ بن احمد بن قدامہ حنبلی متوفی 620ھ لکھتے ہیں: اس فعل کی سزا میں امام احمد سے مختلف روایتیں ہیں ایک روایت یہ ہے کہ اس کی سزا یہ ہے کہ وہ کنوارہ ہو یا شادی شدہ، اس کو سنگسار کردیا جائے۔ حضرت علی، حضرت ابن عباس، جابر بن زید، عبداللہ بن معمر اور زہری کا بھی یہی مسلک ہے، کیونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ جب مرد، مرد سے خواہش پوری کرے تو وہ دونوں زانی ہیں اور حضرت ابوبکر صدیق (رض) سے ایک روایت یہ ہے کہ

اس کو جلا دیا جائے اور دوسری روایت یہ ہے کہ دونوں کو قتل کر دیا جائے کیونکہ سنن ابوداود میں یہ حدیث ہے کہ تم جن کو قوم لوط کا عمل کرتے ہوئے پاؤ تو فاعل اور مفعول بہ دونوں کو قتل کر دو۔ (المغنی، ج 9، ص 58، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1405ھ)

امام شافعی کے نزدیک اگر وہ شادی شدہ ہے تو اس کو سنگسار کیا جائے گا اور اگر وہ کنوارہ ہے تو اس کو کوڑے مارے جائیں گے، اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ فعل زنا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فعل وطی حرام ہونے میں زنا کے مشابہ ہے۔ (شرح المہذب، ج 20، ص 22، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی 668ھ لکھتے ہیں: امام مالک کے نزدیک فاعل کو رجم کیا جائے گا خواہ وہ کنوارا ہو یا شادی شدہ۔ اسی طرح مفعول اگر بالغ ہو تو اس کو بھی سنگسار کیا جائے گا۔ امام مالک سے دوسری روایت یہ ہے کہ اگر وہ شادی شدہ ہے تو اس کو سنگسار کیا جائے گا اور اگر وہ کنوارہ ہے تو اس کو قید کیا جائے گا اور اس کو سزا دی جائے گی۔ عطاء، ابراہیم نخعی اور ابن المسیب کا بھی یہی مذہب ہے۔

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی متوفی 1252ھ لکھتے ہیں: امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس فعل میں مطلقاً حد نہیں ہے بلکہ تعزیر ہے۔ امام ابویوسف کے نزدیک اگر اس نے کسی اجنبی کے ساتھ یہ فعل کیا ہے تو اس پر حد ہے، کنوارے کو سو کوڑے مارے جائیں گے اور شادی شدہ کو سنگسار کیا جائے گا اور اگر اس نے اپنے غلام، باندی یا بیوی کے ساتھ یہ فعل کیا ہے تو اس پر بالاتفاق حد نہیں ہے بلکہ تعزیر ہے۔ زیادات میں مذکور ہے اگر کوئی شخص اس فعل کا عادی ہے تو پھر اس کی سزا خلیفہ کی طرف مفوض ہے۔ اگر وہ مناسب سمجھے تو اس کو قتل کر دے، اگر چاہے تو اس کو کوڑے مارے اور اگر چاہے تو اس کو قید کر دے۔ فتح القدیر میں مذکور ہے اگر کوئی شخص بار بار یہ فعل کرے تو مفتی بہ قول پر اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ درر غرر میں مذکور ہے تعزیر یہ ہے کہ اس کو آگ میں جلا دیا جائے یا اس پر دیوار گرا دی جائے یا اس کو بلندی سے گرا دیا جائے پھر اس کو سنگسار کیا جائے۔ الحاوی میں مذکور ہے اس کو کوڑے مارنا زیادہ صحیح ہے۔ فتح القدیر میں مذکور ہے اس کو قید میں رکھا جائے حتی کہ وہ توبہ کر لے یا مر جائے اور اگر وہ اس فعل کا عادی ہو تو اس کو خلیفہ المسلمین قتل کر دے۔ (رد المحتار، ج 3، ص 155-156، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، 1407ھ)

قوم لوط پر عذاب کی کیفیت:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وامطرنا علیھم مطرا فانظر کیف کان عاقبۃ المجرمین: سو ہم نے ان پر پتھر برسائے سو دیکھو مجرموں کا کیسا انجام ہوا" (الاعراف: 84)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ دیکھئے کہ قوم لوط کے جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کی اور انھوں نے دلیری سے بے حیائی کے کام کیے اور مردوں سے خواہش نفس پوری کی، ان کا کیسا انجام ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے جبرائیل (علیہ السلام) کو حکم دیا انھوں نے اپنا پر ان شہروں کے نیچے داخل کیا اور اس زمین کو اکھاڑ کر بلند کیا حتی کہ آسمان والوں نے کتوں اور مرغوں کی چیخ و پکار کو سنا پھر انھوں نے بلندی سے اس زمین کو پلٹ دیا اور ان پر پتھروں کی کنکریاں برسائیں۔ (الجامع لاحکام القرآن، جز 7، ص 222)

جب عذاب الٰہی کا وقت آگیا اور رات کی ابتداء ہوئی تو فرشتوں کے اشارہ پر حضرت لوط اپنے خاندان سمیت دوسری طرف سے نکل کر سدوم سے رخصت ہو گئے لیکن ان کی بیوی نے ان کی رفاقت سے انکار کر دیا اور راستہ ہی سے لوٹ کر سدوم واپس آ گئی۔ جب رات کا پچھلا پہر ہوا تو پہلے تو ایک ہیبت ناک چیخ نے اہل سدوم کو تہ و بالا کر دیا پھر آبادی والی زمین کو اوپر اٹھا کر الٹ دیا گیا اور اوپر سے پتھروں کی بارش نے ان کا نام و نشان مٹا دیا اور وہی ہوا جو اس سے پہلے کفار کی نافرمانی اور سرکشی کا انجام ہو چکا ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ:

اِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ شَهۡوَةً مِّنۡ دُوۡنِ النِّسَآءِ‌ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ مُّسۡرِفُوۡنَ ۝۸۱

لغۃ القرآن: اِنَّكُمْ :بیشک تم] [لَتَاْتُوْنَ :یقینا سب آتے ہو] [الرِّجَالَ :مردوں کے پاس] [شَهْوَةً : خواہش بجھانے کے لیے] [مِّنْ :سے] [دُوْنِ :سوا] [النِّسَآءِ :عورتوں] [بَلْ :بلکہ] [اَنْتُمْ :تم] [قَوْمٌ :ایک قوم نے] [مُّسْرِفُوْنَ :سب حد سے تجاوز کرنے والے]

ترجمہ: بیشک تم نفسانی خواہش کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس آتے ہو بلکہ تم حد سے گزر جانے والے ہو

تشریح: معلوم ہوا مرد کا مرد سے شہوت پوری کرنا ہر طریقہ سے حرام ہے کیونکہ لفظ شَہْوَۃً اسم نکرہ ہے یعنی مرد کا مرد کے ساتھ کوئی بھی طریقہ قضاء شہوت جائز نہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ دخول ہی کی صورت میں ہو اور بَلْ اَنتم قَوْمٌ مُسْرِفُوْنَ سے پتہ چلا مرد کا اپنی بیوی سے بھی غیر فطری عمل حرام ہے کیونکہ وہ بھی اسراف ہے۔ اسراف کا معنی حد سے بڑھنا ہے اور شوہر کا بیوی سے غیر فطری فعل اللہ کی مقرر کردہ حد سے بڑھنا ہے۔ حدیث میں ایسے شخص کو ملعون قرار دیا گیا ہے۔ (ابوداؤد کتاب النکاح باب 45) ایک حدیث میں ہے کہ ایسے شخص نے اس دین سے انکار کیا جو محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل ہوا۔

)تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

اِنَّکُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ شَہۡوَۃً: بیشک تم مردوں کے پاس شہوت سے جاتے ہو۔ } یعنی ان کے ساتھ بد فعلی کرتے ہو اور وہ عورتیں جنہیں اللہ عَزَّوَجَلَّ نے تمہارے لیے حلال کیا ہے انھیں چھوڑتے ہو۔ انسان کو شہوت اس لیے دی گئی کہ نسل انسانی باقی رہے اور دنیا کی آبادی ہو اور عورتوں کو شہوت کا محل اور نسل چلانے کا ذریعہ بنایا کہ ان سے معروف طریقے کے مطابق اور جیسے شریعت نے اجازت دی اس طرح اولاد حاصل کی جائے، جب آدمیوں نے عورتوں کو چھوڑ کر ان کا کام مردوں سے لینا چاہا تو وہ حد سے گزر گئے اور انھوں نے اس قوت کے مقصد صحیح کو فوت کر دیا کیونکہ مرد کو نہ حمل ہوتا ہے اور نہ وہ بچہ جنتا ہے تو اس کے ساتھ مشغول ہونا سوائے شیطانیت کے اور کیا ہے۔ علمائے تاریخ کا بیان ہے کہ قوم لوط کی بستیاں نہایت سرسبز و شاداب تھیں اور وہاں غلّے اور پھل بکثرت پیدا ہوتے تھے، زمین کا دوسرا خطہ اس کی مثل نہ تھا۔ اس لیے جابجا سے لوگ یہاں آتے تھے اور انھیں پریشان کرتے تھے، ایسے وقت میں ابلیس لعین ایک بوڑھے کی صورت میں نمودار ہوا اور ان سے کہنے لگا کہ اگر تم مہمانوں کی اس کثرت سے نجات چاہتے ہو تو جب وہ لوگ آئیں تو ان کے ساتھ بد فعلی کرو اس طرح یہ فعل بد انھوں نے شیطان سے سیکھا اور ان میں رائج ہوا۔

لواطت کی مذمت:

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اغلام بازی حضرت لوط (علیہ السلام) کی قوم کی ایجاد ہے اسی لیے اسے "لواطت" کہتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ لڑکوں سے بد فعلی حرام قطعی ہے اور اس کا منکر کافر ہے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی احادیث اور بزرگان دین کے آثار میں لواطت کی شدید مذمت بیان کی گئی ہے، چنانچہ

(1)۔۔ حضرت جابر بن عبداللہ (رض) سے روایت ہے، سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "کہ مجھے تم پر قوم لوط والے عمل کا سب سے زیادہ خوف ہے۔ (1)

(2)۔۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے، تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تین بار ارشاد فرمایا: "لَعَنَ اللّٰہُ مَنۡ عَمِلَ عَمَلَ قَوۡمِ لُوۡطٍ" اس شخص پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو جو قوم لوط والا عمل کرے۔ (2)

(3)۔۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جس شخص کو قوم لوط والا عمل کرتے پاؤ تو کرنے والے اور کروانے والے دونوں کو قتل کر دو۔ (3)

(4)۔۔ حضرت خزیمہ بن ثابت (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ حق بات ارشاد فرمانے سے حیا نہیں فرماتا "تم عورتوں کے پاخانہ کے مقام میں وطی نہ کرو۔ (4)

(5)--حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "اللہ عَزَّوَجَلَّ ایسے شخص پر نظر رحمت نہیں فرماتا جو اپنی عورت کے پیچھے کے مقام میں آئے یعنی وطی کرے۔(5)

(6)--حضرت ابو سعید صعلو کی رَحْمَۃُاللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں "عنقریب اس امت میں ایسی جماعت پیدا ہوگی جن کو لوطی کہا جائے گا اور ان کی تین قسمیں ہیں: ایک وہ جو محض دیکھتے ہیں، دوسرے وہ جو ہاتھ ملاتے ہیں اور تیسرے وہ جو اس خبیث عمل کا ارتکاب کرتے ہیں۔(6)

(7)--امیرُ المومنین حضرت علی المرتضٰی (رض) ارشاد فرماتے ہیں: "جو شخص خود کو لواطت کے لیے پیش کرے اللہ عَزَّوَجَلَّ اسے عورتوں کی شہوت میں مبتلا کر دے گا اور اسے قیامت کے دن تک قبر میں مردود شیطان کی صورت میں رکھے گا۔(7)

(8)--حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں کہ "بد فعلی کا مرتکب اگر توبہ کئے بغیر مر جائے تو قبر میں خنزیر کی شکل میں بدل دیا جاتا ہے۔(1)

(9)--حضرت سیدنا حسن بن ذکوان (رض) فرماتے ہیں جس کا خلاصہ ہے: "خوبصورت لڑکوں کے ساتھ نہ بیٹھا کرو کیونکہ ان کی صورتیں کنواری عورتوں کی صورتوں جیسی ہوتی ہیں نیز وہ عورتوں سے زیادہ فتنہ میں ڈالنے والے ہیں۔(2)

(10)--ایک تابعی بزرگ (رض) فرماتے ہیں: "میں نوجوان سالک (یعنی عابد وزاہد نوجوان) کے ساتھ بے ریش لڑکے کے بیٹھنے کو سات درندوں سے زیادہ خطرناک سمجھتا ہوں۔(3)

(11)--حضرت سیدنا سفیان ثوری (رض) (جن کی معرفت، علم، زہد و تقویٰ اور نیکیوں میں پیش قدمی مشہور و معروف ہے) ایک حمام میں داخل ہوئے، آپ (رض) کے پاس ایک خوبصورت لڑکا آ گیا تو آپ (رض) نے فرمایا "اسے مجھ سے دور کرو! اسے مجھ سے دور کرو! کیونکہ میں ہر عورت کے ساتھ ایک شیطان دیکھتا ہوں جبکہ ہر لڑکے کے ساتھ دس (10) سے زیادہ شیطان دیکھتا ہوں۔(4)

(12)--حضرت امام احمد بن حنبل (رض) کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا، اس کے ساتھ ایک خوبصورت بچہ بھی تھا، آپ (رض) نے پوچھا "تمہارے ساتھ یہ کون ہے؟ اس نے عرض کی: "یہ میرا بھانجا ہے۔ تو آپ (رض) نے ارشاد فرمایا: "آئندہ اسے لے کر میرے پاس نہ آنا اور اسے ساتھ لے کر راستے میں نہ چلا کر تاکہ اسے اور تمہیں نہ جاننے والے بد گمانی نہ کریں۔(5)

لواطت کی عقلی اور طبّی خباثتیں:

لواطت کا عمل عقلی اور طبّی دونوں اعتبار سے بھی انتہائی خبیث ہے، عقلی اعتبار سے اس کی ایک خباثت یہ ہے کہ یہ عمل فطرت کے خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالٰی نے فطری اعتبار سے مرد کو عمل کرنے والا اور عورت کو خاص مقام میں عمل قبول کرنے والا بنایا ہے اور لواطت انسان تو انسان جانوروں کی بھی فطرت کے خلاف ہے کہ جانور بھی شہوت پوری کرنے کے لیے نر کی طرف یا مادہ کے خاص مقام کے علاوہ کی طرف نہیں بڑھتا، اس لیے لواطت کرنے والا اپنی فطرت کے خلاف چل رہا ہے اور فطرت کے خلاف چلنا عقلی اعتبار سے انتہائی قبیح ہے۔ دوسری خباثت یہ ہے کہ اس کی وجہ سے نسل انسانی میں اضافہ رک جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالٰی نے نسل انسانی میں اضافے کا یہ طریقہ مقرر فرمایا ہے کہ مرد اور عورت دونوں میں شہوت رکھی اور اس شہوت کی تسکین کے لیے جائز عورت کو ذریعہ بنایا، جب یہ اپنی شہوت پوری کرتے ہیں تو اس کے نتیجے میں عورت حاملہ ہو جاتی اور کچھ عرصے بعد اس کے ہاں ایک انسان کی پیدائش ہوتی ہے اور اس طرح انسانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اب اگر شہوت کو اس کے اصل ذریعے کی بجائے کسی اور ذریعے سے تسکین دی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نسل انسانی میں اضافہ رک جائے گا اور اس صورت میں انتہائی سنگین مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا، جیسے وہ ممالک جن میں لواطت کے عمل کو رواج دیا گیا ہے آج ان کا حال یہ ہو چکا ہے کہ وہ دوسرے ممالک کے لوگوں کو اپنے ہاں بلوا کر اور انہیں آسائشیں دے کر اپنے ملک کے لوگوں کی تعداد بڑھانے پر مجبور ہیں۔

تیسری خباثت یہ ہے کہ اس عمل کی وجہ سے انسانیت ختم ہو جاتی ہے کیونکہ مرد کا عورت سے اپنی شہوت کو پورا کرنا جانوروں کے شہوانی عمل سے مشابہت رکھتا ہے لیکن مرد و عورت کے اس عمل کو صرف اس لیے اچھا قرار دیا گیا ہے کہ وہ اولاد کے حصول کا سبب ہے اور جب کسی ایسے طریقے سے شہوت کو پورا کیا جائے جس میں اولاد حاصل ہونا ممکن نہ ہو تو یہ انسانیت نہ رہی بلکہ نری حیوانیت بن گئی اور کسی کا مرتبہ انسانی سے گر کر حیوانوں میں شامل ہونا عقلی اعتبار سے انتہائی قبیح ہے۔

چوتھی خباثت یہ ہے کہ لواطت کا عمل ذلت ورسوائی اور آپس میں عداوت اور نفرت پیدا ہونے کا ایک سبب ہے جبکہ شوہر کا اپنی بیوی کے ساتھ جماع کرنا عزت کا ذریعہ اور ان میں الفت و محبت بڑھنے کا سبب ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً" (1)

اور اس کی نشانیوں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے بنائے تاکہ تم ان کی طرف آرام پاؤاور تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھی۔

اور عقل سلیم رکھنے والے کے نزدیک وہ عمل ضرور خبیث ہے جو ذلت ورسوائی اور نفرت و عداوت پیدا ہونے کا سبب بنے۔

طبّی طور پر اس کی خباثت کے لیے یہی کافی ہے کہ انسان کی قوت مدافعت ختم کرکے اسے انتہائی کرب کی زندگی گزارنے پر مجبور کردینے والا اور ابھی تک لاعلاج مرض پھیلنے کا بہت بڑا سبب لواطت ہے اور جن ممالک میں لواطت کو قانونی شکل دے کر عام کرنے کی کوشش کی گئی ہے ان میں دیگر ممالک کے مقابلے میں ایڈز کے مرض میں مبتلا افراد کی تعداد بھی زیادہ ہے۔

اور اس کی دوسری طبّی خباثت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کے رحم میں منی کو جذب کرنے کی زبردست قوت رکھی ہے اور جب مرد اپنی بیوی کے ساتھ جماع کرتا ہے تو اس کے جسم کا جو حصہ عورت کے جسم میں جاتا ہے تو رحم اس سے منی کے تمام قطرات جذب کرلیتا ہے جبکہ عورت اور مرد کے پچھلے مقام میں منی جذب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھی گئی اور جب مرد لواطت کا عمل کرتا ہے تو اس کے بعد لواطت کے عمل کے لیے استعمال کیے گئے جسم کے حصے میں منی کے کچھ قطرات رہ جاتے ہیں اور بعض اوقات ان میں تعفّن پیدا ہوجاتا ہے اور جسم کے اس حصے میں سوزاک وغیرہ مہلک قسم کے امراض پیدا ہوجاتے ہیں اور اس شخص کا جینا دشوار ہوجاتا ہے۔

(تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری)

آیت مبارکہ:

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْیَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ یَّتَطَهَّرُوْنَ ۝۸۲

لغۃ القرآن: وَمَا :اور نہ] [كَانَ :تھا] [جَوَابَ :جواب] [قَوْمِهٖۤ :اس کی قوم] [اِلَّاۤ :مگر] [اَنْ :کہ] [قَالُوْۤا :سب نے کہا] [اَخْرِجُوْهُمْ :تم سب نکال دو انہیں] [مِّنْ :سے] [قَرْیَتِكُمْ :اپنی بستی] [اِنَّهُمْ :بیشک وہ] [اُنَاسٌ :"ایسے "لوگ ہیں "کہ "] [یَّتَطَهَّرُوْنَ :وہ سب بہت پاک بنتے ہیں]

ترجمہ: اور ان کی قوم کا سوائے اس کے کوئی جواب نہ تھا کہ وہ کہنے لگے: ان کو بستی سے نکال دو بیشک یہ لوگ بڑے پاکیزگی کے طلب گار ہیں

تشریح: حضرت لوط (علیہ السلام) کے وعظ سے وہ بھڑک اٹھے اور کہنے لگے ذرا دیکھو تو اس لوط کو اور اس کے حیلوں کو۔بڑے پاکباز بنے پھرتے ہیں۔ہم ایسے رجعت پسند لوگوں کا وجود اپنے ترقی پسند معاشرہ میں برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔انھیں بیک زبان کہہ دو کہ اپنے زہد و تقدس سمیت یہاں سے تشریف لے جاویں اور ہماری محفل عیش و طرب کو اپنے ان وعظوں سے بے لطف نہ بنائیں۔انسان پریشان ہو کر رہ جاتا ہے جب وہ یہ پڑھتا ہے کہ اس ذلیل اور غلیظ فعل کو جس سے انسان کی عقل سلیم کو طبعی نفرت ہے صرف عہد قبل از تاریخ کے اہل سدوم نے ہی اپنے لیے پسند نہیں کیا بلکہ یونان کے بڑے بڑے فلسفی اس کا ایک جائز اور

پسندیدہ فعل شمار کیا کرتے تھے۔ اور تہذیب جدید کے موجد (یورپ) اور سرپرست (امریکہ) کے بڑے بڑے اہل قلم اس کو قانونی طور پر جائز قرار دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں۔ کئی ممالک نے اسے قانونی طور پر جائز کر دیا ہے جن میں جرمنی کو سبقت حاصل ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

قوم لوط کا آخری جواب:

یعنی آخری بات انھوں نے یہ کہی کہ جب ہم سب کو یہ گندہ سمجھتے ہیں اور آپ پاک بننا چاہتے ہیں تو گندوں میں پاکوں کا کیا کام۔ لہٰذا انھیں اپنی بستی ہی سے نکال دینا چاہیے کہ یہ روز روز کی رکاوٹ ختم ہو۔ خیر وہ ملعون تو کیا نکالتے ہاں حق تعالیٰ نے لوط اور ان کے متعلقین کو عزت و عافیت کے ساتھ صحیح وسالم ان بستیوں سے نکال لیا اور ان بستیوں پر عذاب مسلط کر دیا۔ جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ لوط کے متعلقین میں سے صرف ان کی بیوی آپ سے علیحدہ رہی اور معذبین کے ساتھ ہلاک ہوئی کیونکہ اس کا ساز باز ان معذبین سے تھا۔ لوط کے یہاں جو مہمان وغیرہ آتے ان کی اطلاع یہی کیا کرتی اور ان کو بدکاری کی ترغیب دیتی تھی۔ یا جیسا کہ بعض نے لکھا ہے مردوں کی طرح عورتوں میں بھی 'مساحقہ کا رواج ہوگیا۔ یہ عورت اس میں مبتلا تھی۔ بہر حال عذاب ان سب پر آیا جو اس مہلک مرض میں مبتلا تھے اور نہایت ڈھٹائی کے ساتھ نبی کا مقابلہ اور تکذیب کرتے تھے یا جو کفر و فحش کے سسٹم میں ان کے معین ومددگار تھے۔

چند ایمان والے:

بعض مفسرین نے فرمایا کہ اہل سے مراد عام ہے اپنے گھر والے اور دوسرے متعلقین جو مسلمان ہو چکے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ گنے چنے چند مسلمان تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے عذاب سے بچانے کے لیے حضرت لوط (علیہ السلام) کو حکم دے دیا کہ بیوی کے سوا دوسرے اہل و متعلقین کو لے کر آخر رات میں اس بستی سے نکل جائیں اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں۔ کیونکہ جس وقت آپ بستی سے نکل جائیں گے تو بستی والوں پر فوراً عذاب آجائے گا۔

حضرت لوط (علیہ السلام) نے حکم خداوندی کی تعمیل کی اپنے اہل و متعلقین کو لے کر آخر شب میں سدوم سے نکل گئے۔ (تفسیر گلدستہ)

اچھے عمل کو برا اور برے عمل کو اچھا سمجھنے کی اوندھی سوچ:

اس سے معلوم ہوا کہ جب کسی کے دن برے آتے ہیں تو اسے اوندھی سوجھتی ہے کہ اسے اچھی چیزیں بری لگنا اور بری چیزیں اچھی نظر آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ آج کل کے حالات دیکھے جائیں تو ہمارے معاشرے میں بھی لوگوں کی ایک تعداد ایسی ہے جن میں یہ وبا عام نظر آتی ہے اور یہ لوگ جب کسی کو دین کے احکام پر عمل کرتا دیکھتے ہیں تو ان کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور اس خرابی کے باعث داڑھی رکھنے کو برا اور نہ رکھنے کو اچھا سمجھتے ہیں۔ داڑھی والے کو حقارت کی نظر سے اور داڑھی منڈے کو پسند کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ داڑھی والے کے ساتھ رشتہ کرنے کو باعث عار اور بغیر داڑھی والے سے رشتہ کرنے کو قابل فخر تصور کرتے ہیں۔ نماز روزے کی پابندی اور سنتوں پر عمل کرنے والے انھیں اپنی نگاہوں میں عجیب نظر آتے اور گانے باجوں، فلموں ڈراموں میں مشغول لوگ زندگی کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہوتے نظر آتے ہیں۔ عورتوں کا پردہ کرنا فرسودہ عمل اور بے پردہ ہونا جدید دور کا تقاضا سمجھتے ہیں۔ صرف اپنی بیوی کے ساتھ تعلق قائم رکھنے کو تنگ ذہنی اور غیر عورتوں سے ناجائز تعلقات کو روشن خیالی کہتے ہیں۔ اپنی عورتوں کے غیر مردوں سے دور رہنے کو اپنی بے عزتی جبکہ ان کا غیر مردوں سے ملنے اور ان سے تعلقات قائم کرنے کو اپنی عزت تصور کرتے ہیں۔ حرام کمائی کو اپنا حق اور ضرورت جبکہ حلال کمائی کو اپنی حق تلفی قرار دیتے ہیں۔ امانت و دیانت داری اور سچائی کو بھولا پن جبکہ خیانت، جھوٹ، دھوکا اور فریب کاری کو اپنی چالاکی اور مہارت سمجھتے ہیں۔ سرِ دست یہ چند مثالیں پیش کی ہیں ورنہ تھوڑا سا غور کریں تو اچھے کام کو برا اور برے کام کو اچھا سمجھنے کی ہزاروں مثالیں سامنے آجائیں گی۔ اے کاش! مسلمان اپنے رب تعالیٰ کے اس فرمان پر غور کریں اور اپنی روش سے باز آجائیں، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"اَفَمَنۡ زُیِّنَ لَہٗ سُوۡٓءُ عَمَلِہٖ فَرَاٰہُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰہَ یُضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ۫ۖ فَلَا تَذۡہَبۡ نَفۡسُکَ عَلَیۡہِمۡ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَصۡنَعُوۡنَ (۸)" (1)

تو کیا وہ شخص جس کیلئے اس کا برا عمل خوبصورت بنا دیا گیا تو وہ اسے اچھا (ہی) سمجھتا ہے (کیا وہ ہدایت یافتہ آدمی جیسا ہو سکتا ہے؟) تو بیشک اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور راہ دکھاتا ہے جسے چاہتا ہے، تو حسرتوں کی وجہ سے ان پر تمہاری جان نہ چلی جائے۔ بیشک اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

کسی جگہ نیک بندوں کا موجود ہونا امن کا ذریعہ ہے :

کفار کے نبی (علیہ السلام) اور ان کے صحابہ کو وہاں سے نکالنے کی بات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی بستی میں اللہ عَزَّوَجَلَّ کے پیارے بندوں کا رہنا اس جگہ امن رہنے کا ذریعہ ہے اور ان کا وہاں سے نکل جانا عذاب کا ذریعہ۔ وہ لوگ خود انھیں نکال کر اپنے عذاب کا سامان کرنا چاہتے تھے۔ (تفسیر صراط الجنان)

آیت مبارکہ:

فَاَنۡجَیۡنٰهُ وَاَهۡلَهٗۤ اِلَّا امۡرَاَتَهٗ ۖ كَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ ۝۸۳

لغۃ القرآن: فَاَنْجَیْنٰهُ :تو نجاد دی ہم نے اسے] [وَاَهْلَهٗ :اور اس کے گھر والوں کو] [اِلَّا :مگر] [امْرَاَتَهٗ :اسکی بیوی] [كَانَتْ :ہے] [مِنَ :سے] [الْغٰبِرِيْنَ :پیچھے رہنے والوں]

ترجمہ: پس ہم نے ان کو (یعنی لوط (علیہ السلام) کو) اور ان کے اہل خانہ کو نجات دے دی سوائے ان کی بیوی کے، وہ عذاب میں پڑے رہنے والوں میں سے تھی

تشریح: اللہ کے نافرمان اللہ کے بندوں کے لیے خطرہ بن گئے تھے' تو اللہ نے اپنے بندوں کو نجات دی اور نافرمان طبقات اور فرمان بر داروں کے درمیان نظریاتی تفریق کر دی گئی۔ حضرت لوط (علیہ السلام) کی بیوی اگرچہ ان کی بیوی تھی لیکن وہ ہلاکت سے نہ بچ سکی کیونکہ اس کا نظریاتی اتحاد ان لوگوں کے ساتھ تھا جو ہلاک ہونے والے تھے۔

ان لوگوں کو سخت بارشوں نے آلیا اور ان بارشوں میں زبردست طوفان تھے' یوں نظر آتا تھا کہ سب لوگ بارش میں غرق ہو گئے اور پانی اس طرح امڈ رہا تھا جس طرح موجیں اور یوں اس سرزمین کو ان ناپاک لوگوں سے پاک کر دیا گیا۔ کیونکہ وہ روحانی طور پر ناپاک ہو گئے تھے اور گندگیوں میں آلودہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ وہ گندگی میں زندہ رہے اور گندگی کے اندر ہی ان کو موت نے آلیا۔

اب تکذیب کرنے والی اقوام کی تاریخ کا آخری صفحہ الٹا جاتا ہے یہ صفحہ اس دور کی اقوام میں سے قوم شعیب یعنی اہل مدین سے متعلق ہے۔ (فی ظلال القرآن)

تفسیر آیت 83:

غَابِرِیْن : (رہ جانے والے) غابر کی جمع ہے جو غبر سے بنا ہے اور اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ غبر کے معنی گزر جانا اور باقی رہجانا۔ دونوں ہیں یہاں آخری معنی مراد ہیں اور غابرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضرت لوط (علیہ السلام) اور ان کے گھر والوں اور ساتھیوں کے چلے جانے بعد اس بستی میں باقی رہ گئے تھے۔

آخر تباہ ہوئے :

اکثر لوگ اس خبط میں مبتلا ہوتے ہیں کہ جو ہم جانتے ہیں وہ دوسرا نہیں جانتا۔ انھیں اپنی معلومات سب سے بڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ محض اپنی خواہشوں کو اپنا امام بناتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے ان کے پیچھے ہو لیتے ہیں وہ سراسر برے کام کرتے ہیں لیکن سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں یہی کرنے کے قابل ہیں بات فقط اتنی ہوتی ہے کہ انھیں بہت سے لوگ ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے مل جاتی ہیں اور دوسروں کی کمزوری کی وجہ سے ان کے ہاتھ میں زور آ جاتا ہے لیکن انتظامی کائنات کچھ اس طرح چل رہا ہے کہ ہر زمانے میں اللہ کے رسول انسانوں کی طرف بھیجے جاتے رہے جبکہ سب سے آخری رسول امام الانبیاء خاتم النبیین محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کے بعد کوئی نبی تو نہیں آئے گا لیکن اس کا انتظام کر دیا گیا ہے کہ دین کے مجدد آتے رہیں گے اور آپ کے فرمان بھولے ہوئے لوگوں کو یاد دلاتے رہیں گے رسول کی ظاہری آنکھوں کے علاوہ باطنی آنکھیں بھی کھلی ہوئی ہوتی ہیں اور وہ ہر چیز کو اپنی اندرونی روشنی سے دیکھتا ہے اسے صاف نظر آتا ہے کہ دنیا کے خود غرض لوگ جو کچھ کر رہے ہیں وہ انھیں تباہی کی طرف لے جا رہا ہے ان کے اعمال کا وبال چند ہی روز میں ان کے سر پر پڑنے والا ہے انھیں یقین ہوتا ہے کہ اس عالم کے کارخانے کا بنانے والا ان کے کاموں کو پسند نہیں کرتا اور جب ان کی بد فعلی عہد سے گزر جائیں گی تو وہ اپنی بیشمار قوتیں اور طاقتوں میں سے کوئی زبردست طاقت ان کے اوپر کسی نہ کسی شکل میں مسلط کر دے گا اور وہ ان کا تہس نہس کر کے رکھ دے گی یہ بات وہ ان سر پھرے لوگوں کو سمجھاتے ہیں لیکن ان کی

سمجھ میں نہیں آتی اور نتیجتاً وہ تباہی سے دوچار ہوتے ہیں۔ حضرت لوط (علیہ السلام) کی قوم اسی غلط فہمی میں مبتلا تھی۔ حضرت لوط (علیہ السلام) نے انھیں لاکھ سمجھایا لیکن ان کی سمجھ میں ان کی بات نہ آئی۔ آخر نتیجہ وہی ہوا جس کا اس آیت میں ذکر ہے۔

ارشاد ہے کہ لوط (علیہ السلام)، ان کے گھر والوں اور ماننے والوں کو ہم نے بچا لیا۔ وہ حسب ہدایت راتوں رات اس بستی کو چھوڑ جانے کی وجہ سے عذاب سے بچ گئے لیکن حضرت لوط (علیہ السلام) کی بیوی نے قوم کا ساتھ دیا مفسرین کے مطابق یہ بدنصیب عورت حضرت لوط (علیہ السلام) کے گھر میں آباد ہونے اور ان کی دو لڑکیوں کی ماں ہونے کے باوجود ان پر ایمان نہ لائی اور ان کی نصیحت اور وعظ کو دل سے نہ مانا بلکہ اپنی قوم کی ہم خیال اور ہمدرد رہی۔ ظاہر داری سے اپنے خاوند اور بیٹیوں کے ہمراہ چل تو پڑی مگر مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتی رہی۔ نافرمان قوم کی اس محبت نے اسے بھی ان کے ساتھ ہی تباہ کر دیا اور ایک پتھر نے سر توڑ کر اس کا خاتمہ کر دیا۔ (تفسیر درس قرآن آسٹریلیا)

حضرت لوط (علیہ السلام) اپنے گھر والوں کے ساتھ رات کے وقت نکلے جیسے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے: آیت: بقطع من الیل (ہود: ۸۱) پھر حضرت جبرائیل امین (علیہ السلام) کو حکم دیا گیا تو انھوں نے اپنا پر ان بستیوں کے نیچے داخل کیا اور ان تمام کو نیچے سے اکھیڑ ڈالا اور انھیں اوپر اٹھا لیا یہاں تک کہ اہل آسمان نے مرغوں کی پکار اور کتوں کے بھونکنے کی آواز سن لی، پھر ان کے اوپر والے حصہ کو نیچے کر دیا (یعنی الٹا کر کے زمین پر دے مارا) اور ان پر کنکر کی پتھریاں برسائیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس پر جو ان میں سے غائب تھا۔ اور آپ نے حضرت لوط (علیہ السلام) کی بیوی کو پا لیا، آپ کے پاس ایک پتھر تھا پس اسے قتل کر دیا۔ اور بیان کیا گیا ہے کہ وہ چار بستیاں تھیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ پانچ تھیں۔ اور ان میں چار لاکھ افراد تھے۔ اس کا بیان سورۃ ہود میں حضرت لوط (علیہ السلام) کے قصہ میں ذرا تفصیل کے ساتھ آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ (تفسیر قرطبی)

یعنی یہ پورا علاقہ اور اس پر بسنے والی یہ قوم اللہ کے عذاب کا شکار ہوئی صرف ایک حضرت لوط (علیہ السلام) کا گھر اس عذاب سے محفوظ رہا۔ اس گھر کے رہنے والوں کو سر شام ہی وہاں سے نکل جانے کا حکم ملا جب یہ لوگ اگلی صبح تک اس گھر سے اتنا دور نکل گئے کہ عذاب کے اثرات سے محفوظ رہ سکتے تھے تب اللہ کا عذاب اس قوم پر آدھمکا اور اس بری طرح انھیں تباہ کیا کہ آج ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں۔ اس آیت کریمہ میں اہل کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوط (علیہ السلام) کے ساتھ صرف آپ کے اہل خانہ کو اس عذاب سے بچایا گیا تھا البتہ آپ کی بیوی چونکہ اسی قوم کی ایک فرد تھی تو قومی عصبیت نے اسے حق کو قبول کرنے سے روکا اور وہ بھی اپنی قوم کے ساتھ اس عذاب کا شکار ہوئی۔ اندازہ فرمایئے! اللہ تعالیٰ کے فیصلے کتنے بے لاگ ہیں کہ بچانے پر آتا ہے تو ہر اس شخص کو بچاتا ہے جس کے پاس ایمان کی دولت ہو چاہے وہ اپنی ذات میں کتنا بھی بے قیمت کیوں نہ ہو اور پکڑنے پر آتا ہے تو پکڑ سخت کرتا ہے۔ (روح القرآن تعلیقا)

فوائد

1: اس سے معلوم ہوا کہ بال بچے بیوی سب نبی کے اہل بیت میں شامل ہیں۔ لہٰذا حضور کی ازواج اور اولاد سب آل رسول اور اہل بیت نبی ہیں۔

2: اس عورت کا نام واہلہ تھا۔ آپ پر ایمان نہ لائی بلکہ اپنی قوم کی جاسوسی کرتی تھی۔ معلوم ہوا کہ نبی کی بیوی کافرہ ہو سکتی ہے۔ زانیہ نہیں ہو سکتی۔ رب فرماتا ہے الخبیثات للخبیثین۔ آپ کی دو لڑکیاں تھیں۔ رعوز اور رینا۔ یہ دونوں اور سارے مسلمان بچا لیے گئے۔ باقی لوگ ہلاک کر دیئے گئے۔

آیت مبارکہ:

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝۸۴

لغۃ القرآن: وَاَمْطَرْنَا : اور بارش برسائی ہم نے] [عَلَيْهِمْ : ان پر] [مَّطَرًا : زور کی بارش] [فَانْظُرْ : پس دیکھ] [كَيْفَ : کیسے] [كَانَ : ہے] [عَاقِبَةُ : انجام] [الْمُجْرِمِيْنَ : مجرموں کا]

ترجمہ: اور ہم نے ان پر (پتھروں کی) بارش کر دی سو آپ دیکھئے کہ مجرموں کا انجام کیسا ہوا

تشریح: جب حضرت لوط (علیہ السلام) کی کوئی کوشش کارگرنہ ہوئی اور ان کی سرکشی اور نافرمانی بڑھتی ہی چلی گئی تو ان پر آگ اور پتھروں کی ایسی تباہ کن بارش کی گئی کہ وہ بالکل خاک سیاہ بنا کر رکھ دیئے گئے۔ قرآن حکیم میں دوسری جگہ ہے کہ ان کی بستیوں کو الٹ کر رکھ دیا گیا۔ آج بھی بحر مردار کو جواردن کے اسی علاقہ میں ہے بحر لوط کہا جاتا ہے اور محققین کا خیال ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں قوم لوط پر عذاب نازل ہوا۔ اور آثار قدیمہ کے ماہرین کو اس بحیرہ کے گردونواح میں اس برباد شدہ قوم کے کچھ آثار بھی ملے ہیں۔ علاقہ سدوم کی تباہی کا زمانہ تازہ تخمینوں کے مطابق ۲۰۶۱ قبل مسیح ہے۔

اسلامی معاشرہ کو اس اخلاقی پستی سے بچانے کے لیے حضور رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس جرم کا ارتکاب کرنے والے کے لیے سخت سزا تجویز فرمائی ہے۔ ابو داؤد، ابن ماجہ، ترمذی، نسائی اور دار قطنی میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ فرمان مروی ہے۔ من وجد تم وہ یعمل عمل قوم لوط فا قتلوا الفاعل والمفعول یعنی جس کو قوم لوط کا فعل کرتے ہوئے دیکھو تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کردو۔ حضرت ابو بکر صدیق (رض) کے عہد خلافت میں حضرت خالد (رض) نے آپ کی خدمت میں ایسے مجرم کی سزا کے متعلق خط لکھا۔ آپ نے سب صحابہ کو مشورہ کے لیے طلب کیا اور مسئلہ پیش کیا۔ حضرت علی (رض) نے فرمایا کہ ایسے شخص کی سزا یہ ہے کہ مجرم کو تلوار سے قتل کر کے اس کی لاش جلادی جائے۔ سب صحابہ نے آپ کی رائے کی تائید کی۔ چنانچہ خالد کو یہی لکھا گیا اور انھوں نے اسی کے مطابق عمل کیا۔ حضرت ابو حنیفہ (رح) فرماتے ہیں کہ حاکم وقت کو اختیار ہے کہ مجرم کو ایسی عبرت ناک سزا دے تا کہ کسی اور کو اس کے ارتکاب کی جرات نہ ہو۔ (ضیاء القرآن)

اس بستی پر اللہ کا عذاب اس طرح آیا کہ پہلے اس پوری بستی کو الٹ دیا گیا پھر اس پر ایسے پتھروں کی بارش کی گئی جو پکی ہوئی مٹی سے تیار ہوئے تھے اور اس زور کی بارش ہوئی کہ پتھروں کی تہہ لگ گئی اور ایک ڈھیر پر دوسرا ڈھیر کھڑا ہو گیا اور عجیب بات یہ کہ ان میں سے ہر پتھر پر کوئی نہ کوئی نشان لگا ہوا تھا۔ بعض اہل تفسیر کا خیال ہے کہ ہر پتھر پر اس مجرم کا نشان تھا جس مجرم کے سر پر جا کر اس پتھر کو پڑنا تھا۔ اس طرح اس قوم کا نام و نشان تک مٹا دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قوم اپنے تمام شہروں سمیت بحر مردار کے نیچے دفن ہے اس لیے اس بحر مردار کو بحر لوط کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بعض اہل علم کا خیال یہ ہے کہ اس قوم پر حاصب کا عذاب آیا تھا یعنی ان پر ایک زور دار آندھی آئی تھی جو صحرا سے اٹھی اور صحرائی سنگ ریزے اٹھاتی ہوئی اس قوم پر جا پڑی۔ پھر آہستہ آہستہ اس میں مزید تیزی آتی گئی جس کی وجہ سے ان کی عمارتیں بھی ڈھے گئیں۔ ایک ایک شخص ان سنگ ریزوں کا شکار ہوا اور لاشیں ان کی عمارتوں کے نیچے دب گئیں اور پھر نجانے کب تک ان پر یہ سنگ باری ہوتی رہی اور پھر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زمین پھٹی اور یہ اپنی بستیوں سمیت زمین کی آغوش میں سما گئے اور بحر مردار نے اوپر سے ان کو ڈھانپ لیا۔ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے۔ (تفسیر روح القرآن)

چنانچہ جب ان پر عذاب آیا تو جبرائیل (علیہ السلام) نے ساری بستیاں زمین سے اٹھالیں اور انھیں زمین پر الٹا پھینک دیا اور جو لوگ اس وقت بستیوں سے باہر تھے ان پر آسمان سے پتھر گرے کوئی جہاں تھا وہیں ڈھیر ہو گیا۔

یہاں سے تین فوائد حاصل ہوئے :

1۔ لواطت کی حرمت اور اس کا عذاب :

جس فعل کی وجہ سے ایک قوم پر عذاب الٰہی آیا اس کی حرمت اور سنگینی میں کیا شک ہے اور حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قوم لوط والا عمل کرنے پر تین بار اللہ کی لعنت ہے۔ (مسند احمد بن حنبل جلد اول صفحہ 309)

2۔ لواطت کی شرعی سزا :

چونکہ قوم لوط کو ہلاک کیا گیا اس سے معلوم ہوا کہ اس فعل کی سزا موت ہے اسی لئے حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے مروی ہے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب کوئی شخص قوم لوط والا فعل کرے تو فاعل و مفعول دونوں کو قتل کردو۔ (ابو داؤد کتاب الحدود باب 28۔ ترمذی کتاب الحدود باب 24) اس سے مراد یہ ہے کہ جب مفعول کی رغبت بھی شامل ہو۔ اگر جانی اعضاء کے تلف کرنے کی دھمکی پر اس سے یہ فعل کیا گیا یا وہ بچہ ہے جو رغبت ظاہر نہیں کر سکتا تو وہ معذور ہے اور قوم لوط کی ہلاکت سے معلوم ہوا کہ اس سال کی سزا قتل ہی ہے البتہ وہ گولی پھانسی یا کسی بھی صورت میں ہو سکتی ہے۔

3۔ رحمت خدا بر جمیع الوری طفیل محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) :

قوم لوط کافی لوگ تھے جب انھوں نے یہ فعل شنیع جائز سمجھ لیا تو تباہ کر دیئے گئے آج یورپ وامریکہ میں لواطت کو جائز قرار دیا گیا ہے جو شخص کسی لوطی کو وہاں برا کہے اسے وہاں پولیس پکڑ کر جیل میں ڈالتی ہے بلکہ دنیا میں جس لوتی کو ستایا جائے برطانیہ گورنمنٹ اور دوسرے یورپین ممالک کی حکومتیں اسے ویزہ دیتی اور اسے اپنے ہاں پناہ دے کر امن مہیا کرتی ہیں تاکہ وہ ان کے زیر سایہ اس گناہ عظیم کو دھڑلے سے کرے، اسے کوئی پریشان کرنے والا نہ ہو۔ اس کے باوجود امریکہ ویورپ پر عذاب کیوں نہیں آتا؟ تو یہ صدقہ ہے رحمت مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا آپ کے آنے کے بعد پہلی قوموں والے عذابات موقوف ہو گئے ہیں۔ اور اس رحمت کا حصہ کفار کو بھی مل رہا ہے۔ کیونکہ آپ تمام کائنات کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں، آپ کی رحمت کا دامن اپنوں اور بیگانوں سب پر محیط ہے۔

(تفسیر برہان القرآن)

مکافات عمل قدرت کا ایک اٹل قانون ودستور: سو مکافات عمل قدرت کا اٹل قانون ہے۔ اس لیے ہر شخص نے اپنے کیے کرائے کا بدلہ بہر حال پانا ہے خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ اور یہ خداوند قدوس کے اٹل قانون اور بے لاگ فیصلے کا ایک اور مظہر ہے کہ مجرم اپنے کئے کا بدلہ بہر حال پا کر رہے گا، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ اور اپنے ایمان و عمل سے محرومی کی صورت میں اس کو نہ کسی کی کوئی دوستی کام آئے گی نہ کسی کی قرابت ورشتہ داری۔ (تفسیر مدنی کبیر)

(لگتا ہے کہ عذابِ آخرت پر مؤخر کر دیا گیا ہے۔ یا کسی موقع پر اچانک سامنے ہوگا۔ واللہ ورسولہ اعلم!)

آیت "وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ مَّطَرًا" سے معلوم ہونے والے مسائل:

اس آیت سے دو مسئلے معلوم ہوئے،

(1)۔۔ یہ بدکاری تمام جرموں سے بڑا جرم ہے کہ اس جرم کی وجہ سے قوم لوط پر ایسا عذاب آیا جو دوسری عذاب پانے والی قوموں پر نہ آیا۔

(2)۔۔ مجرموں کے تاریخی حالات پڑھنا، ان میں غور کرنا بھی عبادت ہے تاکہ اپنے دل میں گناہوں سے نفرت پیدا ہو، اسی طرح محبوب قوموں کے حالات میں غور کرنا محبوب ہے تاکہ اطاعت کا جذبہ پیدا ہو۔ (تفسیر صراط الجنان)

فوائد

1: اس طرح کہ پہلے تو زمین کا تختہ لوٹا گیا کہ حضرت جبرائیل نے اس پورے طبقہ کو آسمان تک اٹھایا پھر الٹا کرکے گرا دیا۔ پھر اس الٹے ہوئے پر ایسے پتھر برسے جو گندھک اور آگ سے مرکب تھے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ وہاں کے باشندے زمین میں دھنسائے گئے اور جو سفر میں تھے وہ بارش سے ہلاک ہوئے۔

2: اس سے دو مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ یہ بدکاری تمام جرموں سے بڑا جرم ہے کہ قوم لوط پر ایسا عذاب آیا جو دوسری معذب قوموں پر نہ آیا تھا۔ اب بھی اسلام میں زانی کی وہ سزا ہے جو قاتل کی بھی نہیں۔ یعنی سنگسار کرنا۔ دوسرے یہ کہ مجرموں کے تاریخی حالات پڑھنا۔ ان میں غور کرنا بھی عبادت ہے تاکہ اپنے دل میں گناہوں سے نفرت پیدا ہو۔ اسی طرح محبوب قوموں کے حالات میں غور کرنا محبوب ہے تاکہ اطاعت کا جذبہ پیدا ہو۔ (تفسیر نور العرفان)

آیت مبارکہ:

وَاِلٰى مَدۡيَنَ اَخَاهُمۡ شُعَيۡبًا‌ ؕ قَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَـكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ‌ ؕ قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ بَيِّنَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ‌ فَاَوۡفُوا الۡكَيۡلَ وَالۡمِيۡزَانَ وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡيَآءَهُمۡ وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِهَا‌ ؕ ذٰ لِكُمۡ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ‌ۚ ۝۸۵

لغۃ القرآن: [وَاِلٰي مَدْيَنَ : اور بیشک ہم بھیج چکے ہیں] [مدین والوں کی طرف] [اَخَاهُمْ : ان کے بھائی] [شُعَيْبًا : شعیب کو] [قَالَ : انہوں نے کہا] [يٰقَوْمِ : اے میری قوم] [اعْبُدُوا : تم لوگ بندگی

کرو] [اللّٰہَ : اللہ کی] [مَا لَکُمْ : نہیں ہے تمہارے لیے] [مِّنْ اِلٰہٍ : کوئی بھی الہ] [غَیْرُہٗ : اس کے علاوہ] [قَدْ جَآءَتْکُمْ : آچکی ہے تمہارے پاس] [بَیِّنَۃٌ: ایک واضح (نشانی] [] [مِّنْ رَّبِّکُمْ : تمہارے رب (کی طرف] [سے] [فَاَوْفُوا : پس تم لوگ پورا کرو] [الْکَیْلَ : ناپنے کو] [وَالْمِیْزَانَ : اور ترازو کو] [وَلَا تَبْخَسُوا : اور حق سے کم تم مت دو [النَّاسَ : لوگوں کو] [اَشْیَآءَھُمْ : ان کی چیزیں] [وَلَا تُفْسِدُوْا : اور نظم مت بگاڑو] [فِي الْاَرْضِ : زمین میں] [بَعْدَ اِصْلَاحِھَا : اس کی اصلاح کیے جانے کے بعد] [ذٰلِکُمْ : یہ] [خَیْرٌ : بہتر ہے] [لَّکُمْ : تمہارے لیے] [اِنْ : اگر] [کُنْتُمْ : تم لوگ ہو] [مُّؤْمِنِیْنَ : ایمان لانے والے]

ترجمہ: اور مدین کی طرف (ہم نے) ان کے (قومی) بھائی شعیب (علیہ السلام) کو (بھیجا)، انھوں نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کیا کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، بیشک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے روشن دلیل آچکی ہے سو تم ناپ اور تول پورے کیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دیا کرو اور زمین میں اس (کے ماحول حیات) کی اصلاح کے بعد فساد بپانہ کیا کرو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم (اس اُلوہی پیغام کو) ماننے والے ہو

تشریح: آیت نمبر ۸۵ سے ۹۳ تک اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت شعیب (علیہ السلام) اور ان کی قوم (اہل مدین) کی گفتگو بیان فرمائی ہے۔ مدین سے مراد بحر احمر کے کنارے کوہ طور کے جنوب مشرق کا علاقہ ہے۔ یہ لوگ مشرک تھے اور ناپ تول میں خیانت کرتے تھے۔ حضرت شعیب (علیہ السلام) نے انھیں فرمایا: میں تمہارے پاس رب کا پیغام لے کر آیا ہوں جو میری نبوت کی واضح دلیل ہے۔ نیز میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ صرف ایک خدا کی عبادت کرو، ناپ تول کو پورا کرو، لوگوں کی چیزوں میں کمی کرکے انھیں دھوکا نہ دو اور اس زمین کو انبیاء کرام (علیہم السلام) نے احکام الٰہی پر عمل کرکے پرامن بنایا تھا اب تم احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرکے اس میں فتنہ و فساد برپا نہ کرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم مجھ پر یقین رکھتے ہو۔ (تفسیر امداد الکرم)

حضرت سیدنا ابراہیم (علیہ السلام) کی بیوی قطورا سے آپ کا ایک بیٹا ہوا جس کا نام مدین رکھا گیا اس کی اولاد کو قوم مدین کہا گیا۔ یہ قوم خلیج عقبہ کے دائیں ساحل پر اقامت پذیر ہوئی پھر وہاں سے پھیلتے ہوئے جبلی طور تک جا پہنچی اور اس قوم کی وجہ سے یہ علاقہ بھی مدین کہلانے لگا۔ یہ لوگ کچھ عرصہ دین ابراہیمی پر قائم رہے پھر ان میں کفر شرک آگیا تب ان میں شعیب (علیہ السلام) کو مبعوث فرمایا گیا حضرت شعیب (علیہ السلام) کے نسب میں اختلاف ہے۔ بہر حال آپ چند واسطوں سے مدین بن ابراہیم (علیہ السلام) سے جاملتے ہیں آپ موسیٰ (علیہ السلام) کے سسر ہیں آپ کی بیٹی سیدہ صفورا موسیٰ (علیہ السلام) کی بیوی ہیں موسیٰ (علیہ السلام) کا سن ولادت محققین کے نزدیک تقریبا 1500 قبل مسیح ہے تو یہی عہد شعیب (علیہ السلام) ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

حضرت شعیب (علیہ السلام) کو ان کے حسن استدلال اور فصیحانہ انداز کلام کی وجہ سے خطیب الانبیاء کہا جاتا ہے۔ آپ کے تبلیغی وعظوں کا خلاصہ جو قرآن نے ہمیں بتایا ہے وہ یہ ہے کہ آپ کی قوم دو خرابیوں میں مبتلا تھی اور آپ نے انھیں کی اصلاح کے لیے اپنی کوششیں وقف کردیں۔ ایک تو یہ کہ اگرچہ آپ کی قوم کا سلسلہ نسب موحد اعظم حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے جاملتا تھا لیکن مرور وقت اور دوسری مشرک قوموں سے میل جول کے باعث وہ شرک میں مبتلا ہو گئے تھے اس لیے حضرت شعیب (علیہ السلام) نے سب سے پہلے انھیں یہ سمجھایا کہ خدا ایک ہی ہے اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس کے اس کے بغیر کسی اور کی پرستش کرنا سخت نادانی ہے اور دوسری خرابی جو ان میں جڑ پکڑ چکی تھی یہ تھی کہ وہ تاجر پیشہ قوم ہونے کے باعث لین دین میں دھوکہ وفریب سے باز نہیں آتے تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد زیادہ دولت کماؤ بن کر رہ گیا تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ کسی بڑی سے بڑی بے ایمانی اور فریب کاری کا جائز سمجھتے تھے۔ کم تولنا، کم ناپنا نیز دوسرے لوگوں سے کوئی چیز خریدتے وقت ان کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر اس کی قیمت کم دینا ان کے نزدیک ہرگز معیوب نہ تھا۔ حضرت شعیب (علیہ السلام) نے اس سے بھی ان کو روکا۔

آخر میں اپنی قوم کو تنبیہ فرمائی کہ اگر تم نے توحید کی جگہ شرک اور ہدایت کی جگہ گمراہی اختیار کی یا تجارتی اصولوں کو اپنی ذاتی منفعت کے لیے پامال کیا تو امن وہدایت کی پر سکون فضا میں فتنہ و فساد کے شعلے بھڑک اٹھیں گے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

حضرت شعیب (علیہ السلام) ۔ عذاب آگ اور زلزلہ

حضرت شعیب (علیہ السلام) کی دو امتیں ہیں اور سوا حضرت شعیب (علیہ السلام) کے اور کوئی نبی دو امتوں کی ہدایت کے لیے نہیں بھیجا گیا۔ ایک امت ان کی یہ قبیلہ ہے جس کا نام مدین ہے، اور حضرت شعیب (علیہ السلام) بھی اسی قبیلہ سے ہیں۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب (علیہ السلام) کو اس قبیلہ کا بھائی فرمایا ہے اور دوسری امت بن کے رہنے والے لوگ ہیں جن کو اصحاب الدی کہ فرمایا ہے اصحاب الدی کہ کے لوگ کم تولتے اور کم ناپتے تھے اور یہ لوگ پیڑوں کی بھی پوجا کیا کرتے تھے۔ لیکن قبیلہ مدین اور اصحاب الئی کہ ایک ہی امت تھے، جن کی ہدایت کے لیے حضرت شعیب (علیہ السلام) بھیجے گئے تھے۔ حضرت شعیب (علیہ السلام) نے بڑی عمر پائی ہے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے وقت تک زندہ تھے اور ایک قبطی کو مار کر مصر سے مدین کو جب حضرت موسیٰ گئے تو ان کی ملاقات حضرت شعیبؑ سے ہوئی۔ اور دو بہنیں جن کا قصہ سورۃ قصص میں آوے گا وہ ہی حضرت شعیب (علیہ السلام) کی بیٹیاں تھیں، جن میں سے ایک کا نکاح حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے ہوا تھا۔ حضرت شعیب (علیہ السلام) نابینا تھے اور بڑے فصیح تھے۔ اس واسطے ان کو خطیب الدنیا کہتے ہیں۔ قرآن شریف میں حضرت شعیب (علیہ السلام) کی امت کے عذاب کا تین جگہ ذکر ہے: (۱) ایک یہاں سورۃ اعراف میں زلزلہ کا ذکر ہے۔ (۲) ایک سورۃ ہود میں چنگھاڑ کا ذکر ہے۔ (۳) ایک سورۃ شعراء میں عذاب بادل کا ذکر ہے جس میں آگ برسی تھی۔ یہ تینوں عذاب ایک ساتھ ہی اس طرح آئے کہ وہ لوگ اپنے گھروں میں تھے تو زلزلہ آیا جب گھروں سے باہر نکلے تو سخت گرمی معلوم ہوئی اور بادل کی صورت کا ایک ٹکڑا سایہ کا نظر آیا۔ پہلے ایک شخص ان میں سے اس سایہ میں گیا اور اس نے سایہ کی ٹھنڈک کی تعریف کی۔ اس کی تعریف سن کر سب لوگ اس چھاؤں میں چلے گئے۔ اتنے میں آسمان سے ایک سخت چیز کی آواز آئی اور پھر اسی بادل سے آگ برسی۔ جس سے سب لوگ ایک دم ہلاک ہو گئے۔ حضرت شعیب (علیہ السلام) کئی امتوں کے لیے بھیجے گئے تھے۔ حقیقت میں یہ ایک ہی امت کا عذاب تین ٹکڑوں کا ہے اور اس امت کے ہر ایک ٹکڑے کے ساتھ عذاب کے ایک ایک ٹکڑے کا اللہ نے ذکر فرمایا ہے۔ ان موقعوں کے احوال پر غور کر کے عبرت پکڑو اور نافرمانی نہ کرو، ورنہ ایک دن تم بھی یوں ہلاک کر دیئے جاؤ گے۔ اس کے بعد حضرت شعیب (علیہ السلام) مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے: "تمہیں سے ایک فرقہ میری رسالت پر ایمان لایا اور ایک فرقہ ایمان نہیں لایا تو تم ان لوگوں کی سختیوں پر صبر اور سہارے سے کام لو۔ جو ایمان نہیں لائے اور صبر بھی وہاں تک کہ خدائے تعالیٰ تم میں فیصلہ کرے وہ بہت اچھا فیصلہ کرنے والا ہے"۔ (تفسیر مظہر القرآن۔ شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی)

حضرت شعیب (علیہ السلام) نے اپنی قوم کو پہلے توحید کا درس دیا اور انھیں کوئی معجزہ بھی دکھایا جس کا ذکر یہاں نہیں ہے نہ حدیث میں مذکور ہے: البتہ قد جاء تکم بینۃ کہہ کر اس کی طرف اجمالی اشارہ کیا گیا ہے۔

قوم مدین میں کفر شرک کے علاوہ ناپ تول میں کمی اور ایک دوسرے کو مالی معاملات میں دھوکا دینے کی خرابی بھی جڑ پکڑ گئی تھی۔ حضرت شعیب (علیہ السلام) نے انھیں درس توحید کے بعد یہ تلقین فرمائی کہ لوگو ناپ تول پورا کیا کرو اور دوسروں کو ان کی چیزیں کم کر کے مت دو یعنی ہر صاحب حق کو اس کا پورا حق دو۔

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت شعیب (علیہ السلام) کے ذریعے پیغام حق ان کی قوم تک پہنچایا تو پھر فرمایا کہ میری زمین میں کفر ظلم اور ناپ تول میں کمی کے ساتھ فساد نہ پھیلاؤ۔ ناپ تول میں کمی سے تم کو دنیا میں عارضی فائدہ تو ہو سکتا ہے مگر اس پر پکڑ بھی شدید ہوگی۔ لہٰذا اگر تم اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے والے ہو اور اس کے حرام کیے ہوئے کو حرام اور حلال کو حلال جانتے ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

حضرت شعیب (علیہ السلام) اہل مدین کے ہم قوم تھے اور آپ (علیہ السلام) انبیاءِ بنی اسرائیل میں سے نہ تھے۔ قَدْ جَآءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ: بیشک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے روشن دلیل آ گئی۔ } اس آیت سے ثابت ہوا کہ حضرت شعیب (علیہ السلام) معجزہ لے کر آئے تھے البتہ قرآن پاک میں معین نہیں کیا گیا کہ ان کا معجزہ کیا اور کس قسم کا تھا۔ حضرت شعیب (علیہ السلام) کے معجزات میں سے ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو بکریاں تحفے میں دے کر فرمایا" یہ بکریاں سفید اور سیاہ بچے جنیں گی۔ چنانچہ جیسے آپ (علیہ السلام) نے فرمایا ویسے ہی ہوا۔

یہ بات بھی یاد رہے:

قد جاء تکم بینۃ من ربکم " تحقیق تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بینہ، نشانی، واضح دلیل، معجزہ آگیا ہے۔ بینہ کا لفظ ان چاروں معانی پر مشتمل ہے۔ یہاں بینۃ سے چاروں معانی مراد لیے جاسکتے ہیں۔ سورۃ بینہ میں اللہ تعالیٰ نے دو دفعہ اس لفظ سے سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات مراد لی ہے۔ نبی کی ذات، صفات، اعمال، کردار، گفتار، معجزات، سب پر بینہ کا اطلاق ہوتا ہے، حتی کہ پیغمبر کی شکل وصورت، اور آواز بھی بینہ شمار ہوتے ہیں۔ حضرت رومی (رح) نے فرمایا:

خرق عادت ہرچہ اور معجزہ است۔

روئے او، آواز او ہم معجز ہست (تفسیر منازل العرفان۔ عبدالستار شاہ)

روایت میں آیا ہے کہ اہل مدین سر راہ بیٹھ جاتے اور جو شخص مسلمان ہونے کے لیے حضرت شعیب (علیہ السلام) کے پاس جانا چاہتا اس کو روکتے اور کہے شعیب بڑا جھوٹا ہے کہیں تجھے دین کی طرف سے بگاڑ نہ دے۔ یہ لوگ مسلمانوں کو بھی ڈراتے اور قتل کر ڈالنے کی دھمکیاں دیتے تھے کذا اخرج ابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابن عباس (رضی اللہ عنہما) (تفسیر مظہری۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی)

وتبغونھا عوجاً" اور دین کے راستے میں کجی تلاش کرتے ہو۔ دین الٰہی جو کہ تمام بھلائیوں اور سچائیوں کا گہوارہ ہے، اس میں خواہ مخواہ پراپیگنڈے کے ذریعہ خامیاں اور نقائص تلاش کرتے ہو، تاکہ کوئی شخص اس کو قبول کرنے پر تیار نہ ہو، دراصل مشرکین وکفار اور یہود ونصاریٰ اسی طرح دوسرے تمام باطل فرقے اسلام دین اہی کی مخالفت پر سب متفق ہیں، کیونکہ شیاطین اور اس کے گماشتہ حواری کبھی یہ نہیں چاہتے کہ اسلام اور اسلامی اقدار کو برتری حاصل ہو۔ یہ کوئی نئی اور وقتی بات نہیں، یہ ازل سے ابد تک رہے گا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

حضرت ضماد بن ثعلبہ کا قبیلہ از دشنوءۃ سے ہے۔ آپ (رض) اسلام لانے سے پہلے بہت بڑے کاہن اور طبیب تھے، وہ مکہ آئے تو سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، اس پر مشرکین نے کہا کہ وہ تو پاگل ہے، اس کے پاس جا کر کیا کروگے؟ کہنے لگے: میں طبیب ہوں، اگر وہ پاگل ہے تو اس کا علاج کروں گا۔ پس وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت گرامی میں حاضر ہو کر علاج کی پیش کش کی، تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ طبیب صاحب خطبہ سننے کے بعد اپنے مرض کفر کے علاج کا خواہاں ہو کر فوراً اسلام قبول کیا۔ زہے سعادت! (رض)۔ (تفسیر منازل العرفان)

{ فَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ: تو ناپ اور تول پورا پورا کرو۔ } حضرت شعیب (علیہ السلام) سے قوم میں شرک کے علاوہ بھی جو گناہ عام تھے ان میں سے ایک ناپ تول میں کمی کرنا اور دوسرا لوگوں کو ان کی چیزیں کم کرکے دینا اور تیسرا لوگوں کو حضرت شعیب (علیہ السلام) سے دور کرنے کی کوششیں کرنا تھا۔ حضرت شعیب (علیہ السلام) نے اپنی قوم کو ناپ تول میں کمی کرنے اور لوگوں کو ان کی اشیاء گھٹا کر دینے سے منع کیا اور زمین میں فساد کرنے سے روکا کیونکہ اس بستی میں اللہ تعالیٰ کے نبی تشریف لے آئے اور انھوں نے نبوت کے احکام بیان فرمادیئے تو یہ بستی کی اصلاح کا سب سے قوی ذریعہ ہے لہٰذا اب تم کفر وگناہ کرکے فساد برپا نہ کرو۔

کفار بھی بعض احکام کے مُکلَّف ہیں:

اس سے معلوم ہوا کہ بعض احکام کے کفار بھی مکلّف ہیں کیونکہ حضرت شعیب (علیہ السلام) نے اپنی کافر قوم کو ناپ تول درست کرنے کا حکم دیا اور نہ ماننے پر عذاب الٰہی آگیا، بلکہ قیامت میں کافروں کو نماز چھوڑنے پر بھی عذاب ہوگا جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ جب جنتی کافروں سے پوچھیں گے کہ تمہیں کیا چیز جہنم میں لے گئی تو وہ کہیں کے:

"لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ "

ہم نمازیوں میں سے نہیں تھے۔

ناپ تول پورا نہ کرنے والوں کے لیے وعید:

حضرت نافع (رض) فرماتے ہیں: "حضرت عبداللہ بن عمر (رض) ایک بیچنے والے کے پاس سے گزرتے ہوئے یہ فرما رہے تھے: "اللہ عَزَّوَجَلَّ سے ڈر! اور ناپ تول پورا پورا کر! کیونکہ کمی کرنے والوں کو میدان محشر میں کھڑا کیا جائے گا یہاں تک کہ ان کا پسینہ ان کے کانوں کے نصف تک پہنچ جائے گا۔ 3۔۔ بغوی، المطففین، تحت الآیۃ: ۳، ۴/۴۲۸۔

آگ کے دو پہاڑ:

حضرت مالک بن دینار (رح) ارشاد فرماتے ہیں: "میں ایک مرتبہ اپنے پڑوسی کے پاس گیا تو اس پر موت کے آثار نمایاں تھے اور وہ کہہ رہا تھا: "آگ کے دو پہاڑ، آگ کے دو پہاڑ۔ آپ (رح) فرماتے ہیں، میں نے اس سے پوچھا: کیا کہہ رہے ہو؟ تو اس نے بتایا: اے ابو یحییٰ! میرے پاس دو پیمانے تھے، ایک سے دیتا اور دوسرے سے لیتا تھا۔ حضرت مالک بن دینار (رح) فرماتے ہیں "میں اٹھا اور ایک پیمانے کو دوسرے پر (توڑنے کی خاطر) مارنے لگ گیا۔ تو اس نے کہا: "اے ابو یحییٰ! جب بھی آپ ایک کو دوسرے پر مارتے ہیں معاملہ زیادہ شدید اور سخت ہو جاتا ہے۔ پس وہ اسی مرض میں مر گیا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ناپ تول میں کمی کرنے سے محفوظ فرمائے، آمین۔ (تفسیر صراط الجنان)

آیت مبارکہ:

وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۠ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۸۶

لغۃ القرآن: [وَلَا تَقْعُدُوْا: تم لوگ مت بیٹھو] [بِكُلِّ صِرَاطٍ: ہر ایک راہ پر] [تُوْعِدُوْنَ: دھمکی دیتے ہوئے] [وَتَصُدُّوْنَ: اور روکتے ہوئے] [عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اللہ کی راہ سے] [مَنْ: اس کو جو] [اٰمَنَ: ایمان لایا] [بِهٖ: اس پر] [وَتَبْغُوْنَهَا: اور تلاش کرتے ہوئے اس میں] [عِوَجًا: کوئی کجی] [وَاذْكُرُوْٓا: اور یاد کرو] [اِذْ: جب] [كُنْتُمْ: تم لوگ تھے] [قَلِيْلًا: تھوڑے سے] [فَكَثَّرَكُمْ: پھر اس نے کثرت دی تم کو] [وَانْظُرُوْا: اور غور کرو] [كَيْفَ: کیسا] [كَانَ: تھا] [عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ: نظم بگاڑنے والوں کا انجام]

ترجمہ: اور تم ہر راستہ پر اس لیے نہ بیٹھا کرو کہ تم ہر اس شخص کو جو اس (دعوت) پر ایمان لے آیا ہے خوفزدہ کرو اور (اسے) اللہ کی راہ سے روکو اور اس (دعوت) میں کجی تلاش کرو (تاکہ اسے دین حق سے برگشتہ اور متنفر کر سکو) اور (اللہ کا احسان) یاد کرو جب تم تھوڑے تھے تو اس نے تمہیں کثرت بخشی، اور دیکھو فساد پھیلانے والوں کا انجام کیسا ہوا

تشریح: حضرت شعب (علیہ السلام) سے ایک گروہ آپ پر ایمان آیا اور وہ جب حضرت شعیب (علیہ السلام) کے پاس جاتے تو منکرین ان کے راستے میں بیٹھ جاتے اور انھیں کہتے: تم اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو۔ شعیب تو جھوٹا ہے اس کا دین بھی جھوٹا ہے، للذا تم اس دین سے باز آ جاؤ ورنہ ہم تمہیں قتل کر دیں گے۔ اس پر حضرت شعیب نے منکروں سے کہا: تم اہل ایمان کو تنگ نہ کرو بلکہ اللہ تعالیٰ کا احسان یاد کرو جب تم غریب اور تھوڑے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے

تمہاری اولاد اور دولت میں اضافہ کر دیا۔اب اگر تم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے باز نہ آئے تو فساد پھیلانے والوں کا انجام تم دیکھ سن چکے ہو، پھر تم بھی انتظار کرو کب فیصلہ کی گھڑی آئے اور تمہیں بھی پہلی منکر قوموں کی طرح تباہ و برباد کر دیا جائے۔ (تفسیر امداد الکرم)

وہ لوگ ان راستوں پر بیٹھ جاتے جو حضرت شعیب (علیہ السلام) کی قیام گاہ کی طرف جاتے اور جب انھیں کوئی شخص ادھر جاتا ہوا ملتا تو اس کے سامنے حضرت شعیب (علیہ السلام) کی مذمت کرتے اور آپ کے عقائد کو اس طرح پیش کرتے کہ یہ معلوم ہونے لگے کہ یہ عقائد سراسر باطل ہیں۔اور ان کے اس پروپیگنڈے کے باوجود بھی اگر کوئی اللہ کا بندہ حضرت شعیب (علیہ السلام) کے پاس جانے پر بضد ہوتا تو پھر ڈنڈے کے زور سے اسے روکتے۔ان کے اس طرز عمل پر ان کو سرزنش کی جارہی ہے کہ ایسا کرنا چھوڑ دو۔اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

پچھلی امتوں کے احوال اور گزرے ہوئے زمانوں میں سرکشی کرنے والوں کے انجام و مآل عبرت کی نگاہ سے دیکھو اور سوچو۔ظاہر یہ ہے کہ یہ کلام بھی حضرت شعیب (علیہ السلام) کا ہے۔آپ اپنی قوم سے فرمارہے ہیں کہ اپنے سے پہلی امتوں کے تاریخی حالات معلوم کرنا، قوم کے بننے بگڑنے سے عبرت پکڑنا حکم الٰہی ہے۔ ایسے ہی بزرگان دین کی سوانح عمریاں اور خصوصاً حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیرت طیبہ کا مطالعہ بہترین عبادت ہے اس سے تقویٰ، رب عَزَّوَجَلَّ کا خوف اور عبادت کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

ڈرا دھمکا کر ناجائز رقم بٹورنے والے :

حضرت شعیب (علیہ السلام) نے مدین کو راستہ پر بیٹھنے سے منع فرمایا کیونکہ وہ راستہ پر بیٹھ کر ایمان والوں کو ڈراتے تھے اور اللہ کے راستہ پر چلنے سے لوگوں کو روکتے تھے۔

حضرت ابن عباس، قتادہ اور مجاہد نے بیان کیا ہے کہ وہ ان راستوں پر بیٹھ جاتے تھے جو حضرت شعیب (علیہ السلام) کی طرف جاتے تھے اور جو لوگ حضرت شعیب (علیہ السلام) کی طرف جانا اچتے تھے ان کو روکتے تھے اور کہتے تھے ان کے پاس نہ جاؤ وہ کذاب ہیں، جیسا کہ قریش نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ کرتے اور یہ اس آیت کا ظاہری معنی ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) نے کہا : اس سے مراد ڈاکہ ڈالنا ہے جو لوگ راستہ پر چلنے والے مسافروں کو ڈرا دھمکا کر لوٹ لیتے ہیں۔اس کی پوری تفصیل اور تحقیق المائدہ : 33 میں گزر چکی ہے۔

بعض علماء نے کہا : اس زمانہ میں اس سے مراد ناجائز ٹیکس وصول کرنے والے ہیں جو لوگوں سے جبراً وہ وصول کرتے ہیں جو شرعاً ان پر لازم نہیں ہیں۔ ہمارے زمانہ میں حکمرانوں نے ہر چیز پر انواع و اقسام کے ٹیکس عائد کیے ہوئے ہیں اور عوام کے ٹیکسوں سے صدر، وزیر اعظم، وفاقی وزراء، گورنر اور صوبائی وزراء کی رہائش کے لیے عالی شان محل نما بنگلے اور کوٹھیاں ہیں۔ان کے سفر کرنے کے لیے خصوصی طیارے ہیں۔یہ سال میں ان گنت مرتبہ بیرونی دوروں پر جاتے ہیں اور اپنے ساتھ خوشامدیوں کے ٹولے کو لے جاتے ہیں اور ان کو شاپنگ کے لیے بڑی بڑی رقمیں دی جاتی ہیں۔ان کے اللوں تللوں پر مشتمل اخراجات لاکھوں روپیہ سے متجاوز ہیں۔ غریب عوام کے کھانے کے لیے روٹی بمشکل میسر ہوتی ہے، سر چھپانے کے لیے چھت کا سایہ حاصل کرنا بہت کٹھن ہے اور یہ عوام کے خون پسینے سے کمائی ہوئی رقم سے جبراً ٹیکس وصول کرکے بے دردی سے اپنی عیاشیوں پر خرچ کرتے ہیں۔ قومی منصوبوں کے نام پر عالمی بینک سے قرض لیتے ہیں اور اس رقم کو اپنی عیاشیوں میں خرچ کر دیتے ہیں اور قوم کو قرض میں گرفتار کر دیتے ہیں۔

ہمارے زمانہ میں غنڈے، مسٹنڈے اور دہشت گرد دکانوں اور گھروں سے زبردستی بھتہ وصول کرتے ہیں۔ فطرانہ، زکوٰۃ اور چرم ہائے قربانی 9 بھی جبراً وصول کرتے ہیں اور اس رقم کو اسلحہ خریدنے اور اپنی رنگ رلیوں اور عیاشیوں پر خرچ کرتے ہیں۔گاڑیاں چھین کر ڈاکے ڈالتے ہیں اور قتل و غارت گری کی وارداتیں کرتے ہیں۔ وہ بھی اس آیت کے عموم میں داخل ہیں۔

قوم شعیب کو ترغیب اور ترہیب :

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب کا یہ قول نقل فرمایا: اور یاد کرو جب تم تعداد میں کم تھے تو اللہ نے تم کو زیادہ کر دیا۔اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ ان کو اللہ کی اطاعت پر برانگیختہ کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ان کو دور رہنے کی ترغیب دی جائے۔اس آیت کے تین محمل ہیں۔ایک یہ کہ تم عدد میں کم تھے تو تم کو تعداد میں زیادہ کر دیا۔دوسرا یہ ہے تمہارے پاس مال کم تھا تو تم کو زیادہ مال عطا کیا اور تیسرا یہ کہ تم جسمانی طور پر کمزور تھے تو تم کو طاقتور کر دیا۔

اس کے بعد فرمایا: غور سے دیکھ لو مفسدوں کا کیا انجام ہوا ہے۔پہلی آیت میں ان کو ایمان لانے کی ترغیب دی تھی اور اس آیت میں ان کو ترہیب کی ہے اور ایمان نہ لانے پر ڈرایا ہے۔(تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَاِنْ كَانَ طَآىٕفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِیْۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ طَآىٕفَةٌ لَّمْ یُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى یَحْكُمَ اللّٰهُ بَیْنَنَاۚ وَ هُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ۝۸۷

لغۃ القرآن: [وَاِنْ : اور اگر] [كَانَ : ہے] [طَآىٕفَةٌ: ایک ایسا گروہ] [مِّنْكُمْ :تم میں سے] [اٰمَنُوْا :جو ایمان لایا] [بِالَّذِیْۤ: اس پر] [اُرْسِلْتُ : میں بھیجا گیا] [بِهٖ : جس کے ساتھ] [وَطَآىٕفَةٌ: اور ایک ایسا گروہ] [لَّمْ یُؤْمِنُوْا :جو ایمان نہیں لایا] [فَاصْبِرُوْا :تو صبر کرو] [حَتّٰى :یہاں تک کہ] [یَحْكُمَ :فیصلہ کرے] [اللّٰهُ : اللہ] [بَیْنَنَا :ہمارے مابین] [وَهُوَ :اور وہ] [خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ :فیصلہ کرنے والوں کا بہترین ہے]

ترجمہ: اور اگر تم میں سے کوئی ایک گروہ اس (دین) پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں ایمان لے آیا ہے اور دوسرا گروہ ایمان نہیں لایا تو (اے ایمان والو!) صبر کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ فرمادے، اور وہ سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے

تشریح: یعنی اگر تم میری رسالت میں اختلاف کرکے دو فرقے ہوگئے کہ ایک فرقے نے مانا اور ایک منکر ہوا تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ ہمارے درمیان فیصلہ کردے کہ تصدیق کرنے والے ایمانداروں کو عزت دے اور ان کی مدد فرمائے اور جھٹلانے والے منکرین کو ہلاک کرے اور انھیں عذاب دے اور اللہ عَزَّوَجَلَّ سب سے بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے کیونکہ وہ حاکم حقیقی ہے اس کے حکم میں نہ غلطی کا احتمال ہے نہ اس کے حکم کی کہیں اپیل ہے۔(تفسیر صراط الجنان)

حضرت شعیب (علیہ السلام) کی قوم آپ کی دعوت کے مقابلے میں اس مقام تک پہنچ گئی تھی جب آدمی کے پاس دلائل ختم ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اپنے انکار اور اپنی ہٹ دھرمی کو سخن سازیوں اور کٹ حجتیوں میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے چنانچہ حضرت شعیب کی موثر اور مدلل دعوت نے ان کی زبانیں بہت حد تک گنگ کردی تھیں اور ان کا سرمایہ استدلال بری طرح مفلس ثابت ہو رہا تھا۔اب انھوں نے یہ رویہ اختیار کیا کہ بات بات میں الجھاؤ پیدا کرو اور سیدھی سادھی بات جو معمولی غور و فکر سے سمجھ میں آسکتی ہو اس پر اعتراض کرو تاکہ سادہ دل لوگ اس دعوت کو قبول کرنے سے بچے رہیں چنانچہ اسی سلسلے کا ان کا یہ اعتراض بھی تھا کہ تم بار بار ہمیں یہ کہتے ہو کہ جس دعوت کو میں لے کر آیا ہوں اس کے قبول کرنے پر تمہاری دنیوی اور اخروی کامرانی کا دارومدار ہے اور اگر تم نے اس دعوت کو قبول نہ کیا تو تم دنیا میں عذاب کا شکار کر دیئے جاؤ گے اور آخرت میں ہمیشہ کے لیے جہنم تمہارا ٹھکانا ہوگا۔اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ تمہاری قوم کا ایک حصہ تم پر ایمان لایا ہے اور دوسرے حصے نے تمہیں ماننے سے انکار کیا ہے لیکن انجام کے اعتبار سے دونوں اپنی اپنی حالت پر قائم ہیں۔ایمان لانے والے پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ایمان لانے سے ان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی جس طرح حالات کے ہاتھوں وہ پہلے مجبور تھے اب بھی مجبور ہیں۔معاشرے میں جو عزت

انھیں پہلے بھی حاصل نہیں تھی اب ان کی حالت اس سے بھی دگرگوں ہے۔ رہا دوسرا گروہ تو وہ ایمان نہ لانے کے باوجود اسی طرح اپنی خوشحالیوں میں مست ہے ایسا نہیں ہوا کہ ایمان نہ لانے کی وجہ سے ان کے حالات بگڑ گئے ہوں وہ پہلے بھی معاشرے کا بااثر اور موثر طبقہ تھا اب بھی اسے وہی حیثیت حاصل ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان و عمل کے حوالے سے تمہاری باتیں سخن سازی کے سوا کچھ نہیں۔ اگر ان کی کوئی حقیقت ہوتی تو مسلمان آج سرفراز ہوتے اور کافر اپنے زخم چاٹ رہے ہوتے۔ اس کے جواب میں دو باتیں ارشاد فرمائی گئیں۔ اس آیت کریمہ میں غور کرنے سے یہ دونوں باتیں سمجھ میں آتی ہیں ایک تو اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور دوسرا اصحاب ایمان لوگوں کی خاص حیثیت کو واضح کیا ہے۔ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اس کا قانون یہ ہے کہ جب اس کا کوئی رسول کسی قوم کی طرف مبعوث ہوتا ہے تو اگر اس کی قوم اس کی تمام تر دعوتی کوششوں کے باوجود ایمان لانے سے یکسر انکار کر دے اور پھر وہ انکار پر اڑی رہے تو اللہ کے رسول کی جانب سے ان پر اتمام حجت ہو جانے کی وجہ سے جلدی ان پر اللہ کا عذاب آ جاتا ہے لیکن اگر صورتحال یہ ہو کہ قوم کا ایک حصہ ایمان لائے اور دوسرا اپنے کفر پر جما رہے تو اللہ تعالیٰ ایمان نہ لانے والوں کو تاحد امکان مہلت دیتا ہے کیونکہ ایک طبقے کا ایمان لانا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس سرزمین میں نمی باقی ہے اگر مزید محنت کی جائے تو ممکن ہے کچھ اور لوگ ایمان لانے کے لیے تیار ہو جائیں اس لیے انھیں مہلت دی جاتی ہے تاکہ پیغمبر اور اہل ایمان اپنی کوششوں کو مزید تیز کریں اور اس لسّی (چھاچھ) میں اگر کچھ مکھن کے اثرات باقی ہیں تو مسلسل بلونے سے انھیں نکالنے میں کامیاب ہو جائیں لیکن اگر ایمان لانے کا یہ سلسلہ بالکل رک جاتا ہے تو پھر پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والوں کو ہجرت کا حکم دیا جاتا ہے اور پیچھے رہ جانے والی کافر قوم پر اللہ کا عذاب نازل ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ تم پر چونکہ ابھی اللہ کا عذاب نہیں آیا تو تم اور صاحب ایمان لوگ برابر ہو ایسا نہیں بلکہ تمہیں ایمان لانے کے لیے مہلت دی جا رہی ہے کہ تم اگر آپ اپنے دشمن نہیں ہو گئے ہو تو تمہیں اس مہلت سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور دوسری بات جس کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ موجود ہے وہ یہ ہے کہ اے کافر لوگو! تمہیں اس کا احساس نہیں کہ تم پر جو اللہ کا عذاب ابھی تک نہیں برسا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ ایمان لے آئے اور ان کی وجہ سے تمہاری مہلت دراز ہو گئی۔ تمہیں تو ان کا ممنون احسان ہونا چاہیے کہ تمہاری قیامت ان کی وجہ سے ٹلی ہوئی ہے اور ان کا وجود تمہارے لیے باعث نعمت ہے لیکن اگر اس نعمت سے تم نے فائدہ نہ اٹھایا تو مہلت اپنی طبعی عمر کے بعد ختم ہو جائے گی اور تم پر اللہ کا عذاب آ جائے گا اس لیے یہاں فرمایا گیا ہے کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاؤ اور انتظار کرو کہ کب اللہ تعالیٰ تم میں فیصلہ فرماتے ہیں لیکن یہ بات یاد رکھو کہ یہ فیصلہ ٹلنے والا نہیں لیکن اس کے اچھے یا برے ہونے کا دارومدار تمہارے اپنے فیصلے پر ہے چاہو تو ایمان لا کر دنیا اور آخرت کی کامرانیاں خرید لو اور چاہو تو کفر پر قائم رہ کر دونوں جہانوں کی روسیاہیاں مول لے لو۔

دعوتی استدلال اور ان کے اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب جب اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتا ہے اور اس کے باوجود بھی پیغمبر کی قوم دعوت قبول کرنے کی بجائے نہ صرف کہ اپنی مخالفت سے باز نہیں آتی بلکہ اس کی مخالفت انتقام کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور وہ آخری اقدام پر تل جاتی ہے کہ یا تو اس پیغمبر کو قتل کر دیا جائے اور یا اسے اپنی بستیوں سے نکال دیا جائے کیونکہ ہماری اور اس کی زندگی میں جو بعد المشرقین ہے ان کا ایک ساتھ چلنا ناممکن ہے۔ ہم اپنی زندگی کا رویہ بدل نہیں سکتے اور پیغمبر اپنی ذمہ داریوں کے حوالے سے ہم پر تنقید سے رک نہیں سکتے۔ ہمارے اعصاب آہستہ آہستہ اس تنقید کی برداشت سے جواب دیتے جا رہے ہیں اور پھر یہ بات بھی ہے کہ ہمارا پسماندہ اور زیر نگیں طبقہ اس دعوت کے زیر اثر باغی ہوتا جا رہا ہے۔ اب ہمیں آخری اقدام کر ہی گزرنا چاہیے چنانچہ یہ وہ فیصلہ کن مرحلہ ہوتا ہے جب اللہ کی جانب سے فیصلے کا وقت قریب آ جاتا ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

حضرت شعیب (علیہ السلام) نے ان کو منصفانہ منصوبے کو اپنانے کا مشورہ دیا اور یہ آخری حد تھی جہاں تک وہ انکو رعایت دے سکتے تھے' اس سے پیچھے وہ ایک قدم بھی نہ ہٹ سکتے تھے۔ وہ یہ کہ ان کی قوم کفر و اسلام کی اس کشمکش میں غیر جانبدار ہو کر انتظار کرے اور مسلمانوں کو اذیت نہ دے۔ قوم جس دین کو چاہے اختیار کرے یہاں تک کہ اللہ خود کوئی فیصلہ کر دے۔

لیکن طاغوتی قوتیں اس بات کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتیں کہ اس کرہ ارض پر ایمان کا معمولی وجود بھی ہو اور وہ ایسی جماعت کی شکل میں ہو جو طاغوت کی اطاعت نہ کرتی ہو۔ اس کرہ ارض پر ایسی جماعت مسلمہ' جو صرف اللہ کی غلام ہو' جو اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے سوا کسی اور اقتدار کو نہ تسلیم کرتی ہو' اپنی زندگی میں اللہ کے قانون کے سوا کسی اور کا قانون نہ مانتی ہو اپنی اجتماعی زندگی میں اللہ کے نظام کے سوا کسی اور نظام کی قائل نہ ہو۔ ایسی جماعت کا مجرد پایا جانا ہی طاغوت کے وجود کے لیے

خطرہ ہوتا ہے۔ اگرچہ اس قسم کی جماعت خود اپنے دائرے کے اندر ہی محدود کیوں نہ ہو' طاغوتی قوتوں کو فی الحال نہ بھی چھیڑتی ہو اور طاغوت کو وہ اپنی طبعی انجام تک پہنچنے کیلئے انتظار کر رہی ہو۔

حقیقت یہ ہے طاغوتی قوتوں نے اپنے اوپر از خود یہ بات لازم کر لی ہے کہ وہ اسلامی قوتوں کے خلاف بر سر جنگ رہیں گے اگرچہ اسلامی قوتیں جنگ سے بچنا چاہیں کیونکہ حق کا وجود ہی ان قوتوں کے لیے خوفناک ہوتا ہے اور طاغوت ہر وقت حق سے کانپتا رہتا ہے۔ حق کا وجود ہی اس کشمکش کے آغاز کا باعث ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی سنت ہے۔ اگر کوئی سمجھے کہ حق ہے اور باطل اس کے خلاف نہ اٹھ رہا ہو' تو ایسے اہل حق کو غور کرنا چاہیے کہ وہ حق پر ہیں بھی کہ نہیں؟ (تفسیر فی ظلال القرآن)

فوائد

1: جیسے بارش سے زمین کا ہر رقبہ سرسبز نہیں ہوتا کچھ محروم بھی رہتا ہے۔ ایسے ہی نبی کی تعلیم سے سارے انسان ہدایت پر نہیں آتے بعض محروم رہتے ہیں۔ بلکہ نبوت کی بارش سے دل کے حال کا ظہور ہوتا ہے۔ قدرت نے جیسا تخم سینے میں ودیعت رکھا ہے اسی کا ظہور ہوگا۔

2: دنیاوی حکام بھی حاکم ہیں مگر مجازی۔ جن کے حکم میں غلطی ہو سکتی ہے۔ رب تعالی حاکم حقیقی ہے جس کے حکم میں نہ غلطی کا احتمال ہے۔ نہ اس کے حکم کی کہیں اپیل ہے۔ للذا یہ آیت بالکل حق ہے۔ اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ (تفسیر نور العرفان)

آیت مبارکہ:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ۝۸۸

لغۃ القرآن: [قَالَ :کہا] [الْمَلَاُ :سرداروں نے] [الَّذِيْنَ :جنہوں نے] [اسْتَكْبَرُوْا :گھمنڈ کیا] [مِنْ قَوْمِهٖ :ان کی قوم میں سے] [لَنُخْرِجَنَّكَ :ہم لازما نکال دیں گے آپ کو] [يٰشُعَيْبُ :اے شعیب] [وَالَّذِيْنَ :اور ان کو جو] [اٰمَنُوْا :ایمان لائے] [مَعَكَ :آپ کے ساتھ] [مِنْ قَرْيَتِنَآ :اپنی بستی سے] [اَوْ :یا] [لَتَعُوْدُنَّ :تم لوگ لازما واپس ہوگے] [فِيْ مِلَّتِنَا :ہماری ملت میں] [قَالَ :انہوں نے کہا] [اَوَلَوْ :اور کیا اگر] [كُنَّا :ہم ہوں] [كٰرِهِيْنَ :کراہیت کرنے والے (واپسی سے)]

ترجمہ: ان کی قوم کے سرداروں اور رئیسوں نے جو سرکش و متکبر تھے کہا: اے شعیب! ہم تمہیں اور ان لوگوں کو جو تمہاری معیت میں ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے بہر صورت نکال دیں گے یا تمہیں ضرور ہمارے مذہب میں پلٹ آنا ہوگا۔ شعیب (علیہ السلام) نے کہا: اگرچہ ہم (تمہارے مذہب میں پلٹنے سے) بیزار ہی ہوں

تشریح: حضرت شعیب (علیہ السلام) کا وعظ سرتاپا حقیقت تھا۔ اس میں صداقت کا نور چمک رہا تھا۔ ہر لفظ اخلاص و شفقت کا آئینہ تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ آپ کا وعظ سننے کے بعد ان کے دل پسیج جاتے اور ان کی آنکھوں سے غفلت کی پٹی دور ہو جاتی۔ لیکن وہاں تو مسلسل سرتابیوں کی وجہ سے دل کا آئینہ زنگ آلود ہو چکا تھا۔ وہ آپ کے ساتھ

شائستہ انداز میں گفتگو کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھے فوراجبر و تشدد پر اتر آئے۔ اور باطل کا ہمیشہ سے یہی رویہ رہا ہے۔ دلیل و برہان کے میدان میں شکست کھانے کے بعد وہ حق کو اپنی قوت سے کچلنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان لوگوں نے بھی ادب و تہذیب کے سارے تقاضوں کو پس پشت ڈال کر آپ کی دھمکی دینی شروع کر دی کہ اے شعیب (علیہ السلام) ! اگر تم اور تمہارے چیلے ہمارے مذہب میں لوٹ نہ آئے تو تمہارا بوریا بستر اٹھا کر شہر سے باہر پھینک دیا جائے گا اور تمہیں جلاوطن کر دیا جائے گا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

متکبر سرداروں نے حضرت شعیب (علیہ السلام) سے کہا: بہتر یہی ہے کہ تم ہمارے دین میں واپس آ جاؤ ورنہ ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اس بستی سے نکال دیں گے۔ حضرت شعیب (علیہ السلام) نے جواب دیا: ہم تمہارے دین کو کیسے قبول کر لیں جبکہ ہم اس کو ناپسند کرتے ہیں اور بفرض محال اگر ہم تمہارا شرک والا دین قبول کر لیں جس سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں نجات دی ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم پہلے غلط تھے اور اب صحیح ہیں حالانکہ یہ دونوں باتیں حقیقت کے منافی ہیں اور اللہ تعالیٰ پر بہتان ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں شرک کی ہدایت نہیں کی اس لیے ہمارا دوٹوک جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور ہم اس خالص توحید کو چھوڑ کر تمہارا دین قبول نہیں کر سکتے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اگر کچھ اور چاہے تو وہ قادر مطلب ہے، وہ ہمارا رب ہے، اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ ہم اس پر توکل رکھتے ہیں اور اس کی بارگاہ میں التجاء کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ! ہمیں توحید پر قائم رکھ اور ہمارے درمیان ایسا فیصلہ صادر فرما جو ہمارے حق اور ان کے باطل کو روز روشن کی طرح واضح کر دے۔ (امداد الکرم)

حضرت شعیب (علیہ السلام) نے جب قوم کی برائیوں پر نشاندہی کی تو وہاں کا سرمایہ دار طبقہ جو ناپ تول میں کمی کر کے اپنی تجوریاں بھر رہا تھا بگڑ گیا اور وہ آپ کو دھمکی دینے لگے کہ اے شعیب اگر تم اور تمہارے ساتھی ہمارے دین پر آ کر ہماری طرح بت پرستی کرو تو بہتر وگرنہ ہم تم سب کو اپنی بستی سے نکال دیں گے۔ آپ نے فرمایا جب ہم تمہارے دین سے بیزار ہیں تو تم دھمکیوں کے زور پر ہمیں اپنے دین پر لانے کا خیال دماغ سے نکال دو۔ (برہان)

ہم لوگوں کو یہ زیبا ہی نہیں کہ مسلمان ہو کر تمہارے دین میں آئیں۔ مگر یہ کہ اللہ چاہے یعنی البتہ یوں ہو سکتا ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ ہلاک کرنا چاہے اور اس کے لیے ایسا ہی مقدر ہو۔ وہ ہمارا رب ہے اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے ہمارا بھروسہ اسی پر ہے ہم تمام امور میں اسی کے بھروسہ پر ایمان میں ثابت قدم میں وہی ہمیں اس دین پر قائم رکھے گا اور وہی زیادہ ایقان کی توفیق دے گا۔ اے ہمارے رب ہم اور ہماری قوم میں حق کھول دے۔ علامہ زجاج (رح) نے فرمایا اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ اے رب ہمارے حقانیت واضح کرنے کو ان پر ایسا عذاب نازل فرما جس سے ان کا باطل ہونا اور حضرت شعیب کا معہ ان کے متبعین کے حق پر ہونا ظاہر ہو جائے اور تیرا فیصلہ سب سے بہتر ہے اور اس کی قوم کے کافر سردار بولے کہ تم شعیب کے متبع ہوئے تو ضرور تم خسران و نقصان میں رہو گے تو انھیں رجفہ یعنی زلزلہ نے پکڑ لیا تو صبح اپنے گھر میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

حضرت ابن عباس (رض) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس سرکش قوم پر جہنم کا دروازہ کھولا جس سے انھیں اتنی شدید گرمی آئی جس سے ان کے سانس بند ہو گئے ٹھنڈی جگہ انھیں کہیں نہ ملی سایہ دار مقام نے بھی کوئی فائدہ نہ دیا۔ پانی سے بھی سکون میسر نہ ہوا۔ سراسیمگی میں پناہ چاہی تہ خانوں میں لیکن وہاں گرمی نے سکون نہ دیا۔ بلکہ باہر سے زیادہ پریشان ہوئے جنگل میں بھاگے یہاں انھیں ابر نظر آیا کہ اس میں نہایت سرد اور خوشگوار ہوا تھی۔ یہاں سب جمع ہوئے اور ایک دوسرے کو پکارا کہ یہاں آ جاؤ جب مرد عورت سب جمع ہو گئے تو وہ ابر آگ برسانے لگا گویا آتش فشاں پہاڑ کا لاوا بن گیا اور سب کے سب اس میں جل کر ہلاک ہو گئے۔

قتادہ (رح) کہتے ہیں کہ حضرت شعیب (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے اصحاب ایکہ کی طرف بھی مبعوث فرمایا تھا۔ یہ اسی طرح کے آتش فشاں ابر سے ہلاک ہوئے اور اہل مدین زلزلہ میں ہلاک ہوئے اور ایک ہولناک آواز سے ہلاک ہوئے آخر ش ان کی ہلاکت دیکھ کر آپ نے فرمایا اے میری قوم میں تمہیں اپنے رب کا پیغام پہنچا چکا اور تمہاری بھلائی چاہی مگر تم نے نصیحت قبول نہ کی تو اب تمہاری ہلاکت پر میں کیوں غم کروں جبکہ تم کافر رہے۔ (تفسیر الحسنات)

قوم کی ہلاکت کا باعث اس کے رہنما:

حضرت شعیب (علیہ السلام) کی قوم کے سرداروں کی بے ادبی ان کی ہلاکت کا سبب بنی، اس سے معلوم ہوا کہ قوم کے سردار قوم کی ہلاکت کا باعث بنتے ہیں اگر یہ درست ہو جائیں تو قوم کو اعلیٰ درجے پر پہنچا دیتے ہیں اور بگڑ جائیں تو ذلت کی گہری کھائیوں میں گرا دیتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلم حکمرانوں اور مسلم رہنماؤں

کے اعمال، اخلاق اور کردار کی درستی نے جہاں مسلم عوام کی سیرت و کردار کو بدل کر رکھ دیا وہیں غیر مسلم بھی اس سے بہت متاثر ہوئے اور ان میں سے بہت سے دامن اسلام سے وابستہ ہوگئے جبکہ بہت سے اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی سے باز آ گئے اسی طرح جب مسلم حکمرانوں اور مسلم رہنماؤں کے اعمال، اخلاق اور کردار میں بگاڑ پیدا ہوا اور وہ عیش و طرب اور لہو ولعب کی زندگی گزارنے میں مشغول ہوگئے تو مسلم عوام کی عملی اور اخلاقی حالت اس قدر گر گئی کہ ہنود و یہود تک ان کا حال دیکھ کر شرما گئے اور اسی وجہ سے کفار کے دلوں سے مسلمانوں کا خوف اور دبدبہ جاتا رہا اور وہ ایک ایک کرکے مسلمانوں کے مفتوحہ علاقوں پر قابض ہوتے چلے گئے اور آج مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ پچاس سے زائد ممالک میں تقسیم ہیں اور دنیا کے انتہائی قیمتی ترین وسائل کے مالک ہونے کے باوجود کفار کے قبضے میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (تفسیر صراط الجنان)

یہاں سے دو فوائد حاصل ہوئے:

1۔ جھوٹے لوگ دلائل کے سامنے عاجز آکر دھمکیوں پر اتر آتے ہیں۔ قوم مدین کے سرمایہ دار لوگ چونکہ ناپ تول میں کمی کے مرتکب تھے اس لئے کوئی معقول جواب نہ دے سکے بلکہ دھمکیوں پر اتر آئے اور جھوٹے لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ قبول حق کی توفیق کم ہی لوگوں کو ملتی ہے۔

2۔ مجرم طبقہ کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے۔ قوم شعیب کے کفار نے اہل ایمان کو دھمکی دی مگر وہ ان کی دھمکیوں سے خوفزدہ نہیں ہوئے کیونکہ اللہ حق کا ساتھی ہے وہ اہل حق کو جلد یا بدیر ضرور غالب کرتا ہے اس کا ارشاد ہے: ان تنصروا اللہ ینصرکم۔ (تفسیر برہان القرآن)

حضرت شعیب (علیہ السلام) پر کفر میں لوٹنے کے اعتراض کے جوابات:

قرآن مجید میں ہے اولتعودن فی ملتنا اس کا معنی ہے۔ " یا پھر تم ہمارے دین میں واپس ہو جاؤ" اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب (علیہ السلام) پہلے ان کے دین میں شامل تھے۔ گویا آپ پہلے (العیاذ باللہ) کافر تھے۔ اس سوال کے متعدد جواب دیے گئے ہیں

1۔ حضرت شعیب (علیہ السلام) کے پیروکار ان کے دین میں داخل ہونے سے پہلے کافر تھے۔ سو ان کی قوم کے کافر سرداروں نے حضرت شعیب کو تغلیبا ان کے پیروکاروں میں شامل کرکے یہ کہا کہ تم ہمارے دین میں واپس آ جاؤ۔

2۔ کافر سرداروں نے عوام پر تلبیس اور اشتباہ ڈالنے کے لیے اس طرح کہا تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ حضرت شعیب (علیہ السلام) پہلے ان کے ہی ہم عقیدہ تھے اور پھر ان سے منحرف ہو کر کسی نئے دین میں داخل ہوگئے اور حضرت شعیب نے جواب بھی ان کے ایہام کے موافق دیا کہ اگر ہم تمہارے دین میں واپس آ گئے۔

3۔ حضرت شعیب (علیہ السلام) ابتداء میں اپنے دین کو مخفی رکھتے تھے۔ اس سے انھوں نے یہ سمجھا کہ وہ اپنی قوم کے دین پر ہیں۔

4۔ اس آیت میں عود صیرورت کے معنی میں ہے یعنی یا پھر تم ہمارے دین میں آ جاؤ اور ہم نے اسی اسلوب پر اس آیت کا ترجمہ کیا ہے۔

حضرت شعیب (علیہ السلام) نے طور استفہام انکار اور تعجب کے فرمایا کہ تم ہمیں اپنے دین میں داخل ہونے کے لیے کہتے ہو کیا تم ہمیں ہماری مرضی اور پسند کے خلاف اپنے دین میں داخل کرلوگے، تم کو یہ علم نہیں کہ توحید کا عقیدہ ہمارے دلوں میں پیوست ہے اس کو کوئی نہیں نکال سکتا۔ تم ہمیں اس بستی سے نکالنے کی دھمکی دیتے ہو تو سن لو کہ دین کی محبت کے مقابلہ میں وطن کی محبت کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

کوئی نبی کبھی بھی شرک اور گناہ نہیں کرتا، نہ اعلان نبوت سے پہلے اور نہ بعد میں، اس لیے یہاں شرک میں واپس آنے کی دعوت صرف ان لوگوں کو ہے جو پہلے مشرک تھے، پھر حضرت شعیب (علیہ السلام) پر ایمان لائے تھے۔ اس دعوت میں حضرت شعیب (علیہ السلام) تغلیباً شامل ہیں حقیقتاً شامل نہیں ہیں یا ابتدائی زمانہ میں حضرت شعیب (علیہ السلام) کے سکوت سے مشرکین کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ وہ بھی مشرک تھے حالانکہ ہر نبی ہمیشہ سے بچا مومن ہوتا ہے۔ (تفسیر امداد الکرم)

آیت مبارکہ:

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَ مَا يَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ اَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ۝۸۹

لغۃ القرآن: [قَدِ افْتَرَيْنَا : ہم تو گھڑ چکے ہوں گے] [عَلَي اللّٰهِ : اللہ پر] [كَذِبًا : ایک جھوٹ] [اِنْ : اگر] [عُدْنَا : ہم واپس ہوں گے] [فِيْ مِلَّتِكُمْ : تمہاری ملت میں] [بَعْدَ اِذْ : اس کے بعد کہ جب] [نَجّٰىنَا : نجات دی ہم کو] [اللّٰهُ : اللہ نے] [مِنْهَا : اس سے [وَمَا يَكُوْنُ : اور نہیں ہوگا (ممکن)] [لَنَاۤ : ہمارے لیے] [اَنْ : کہ] [نَّعُوْدَ : ہم واپس ہوں] [فِيْهَاۤ : اس میں] [اِلَّاۤ اَنْ : سوائے اس کے کہ] [يَّشَآءَ : چاہے] [اللّٰهُ : اللہ] [رَبُّنَا : جو ہمارا رب ہے] [وَسِعَ : وسیع ہوا] [رَبُّنَا : ہمارا رب] [كُلَّ شَيْءٍ : ہر چیز پر] [عِلْمًا : بلحاظ علم کے] [عَلَي اللّٰهِ : اللہ ہی پر] [تَوَكَّلْنَا : ہم نے بھروسہ کیا] [رَبَّنَا : اے ہمارے رب] [افْتَحْ : تو فیصلہ کردے] [بَيْنَنَا : ہمارے درمیان] [وَبَيْنَ قَوْمِنَا : اور ہماری قوم کے درمیان] [بِالْحَقِّ : حق کے ساتھ] [وَاَنْتَ : اور تو] [خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ : فیصلہ کرنیوالوں کا سب سے بہتر ہے]

ترجمہ: بیشک ہم اللہ پر جھوٹا بہتان باندھیں گے اگر ہم تمہارے مذہب میں اس امر کے بعد پلٹ جائیں کہ اللہ نے ہمیں اس سے بچالیا ہے، اور ہمارے لیے ہرگز (مناسب) نہیں کہ ہم اس (مذہب) میں پلٹ جائیں مگر یہ کہ اللہ چاہے جو ہمارا رب ہے۔ ہمارا رب از روئے علم ہر چیز پر محیط ہے۔ ہم نے اللہ ہی پر بھروسہ کرلیا ہے، اے ہمارے رب! ہمارے اور ہماری (مخالف) قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرمادے اور تو سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے

تشریح: حضرت شعیب (علیہ السلام) اور آپکے مومن ساتھی سرمایہ دار کفار کی دھمکیوں میں نہ آئے بلکہ انھوں نے کہا کہ ہم تمہارا دین اختیار کرکے اللہ پر افترا کے مرتکب نہیں ہوسکتے۔ جب کہ اللہ نے ہمیں سیدھی راہ عطا فرمادی ہے۔ ہاں اگر اللہ ہم سے کسی کا دین سے پھر جانا چاہے تو وہ تقدیر الہی ہے اور اللہ کی تقدیر اس کے علم کی بنیاد پر ہے اس نے اپنے علم سے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے لہٰذا ہم اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں یعنی اگر تم ہمیں بستی سے نکالنا چاہتے ہو تو نکال دو اللہ ہمارا کارساز ہے مگر ہم ایمان نہیں چھوڑ سکتے۔) تفسیر برہان القرآن(

پہلے اپنا پختہ ارادہ اور عزم بتایا کہ ہم براہ راست کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنیکے لیے تیار نہیں اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے پر آمادہ ہیں لیکن اس میں خودی کی کچھ بو آرہی تھی اس لیے فوراً اپنے عزم وارادہ کی بے بسی کا اعتراف کیا اور ہر چیز اپنے مولائے حقیقی کے حوالہ کردی۔ یعنی ہمارا ہدایت پر ثابت قدم رہنا اسی وقت تک ہے جب تک اس کی نظر کرم اور توفیق ہمارے شامل حال ہے۔ ورنہ ہماری سمجھ، نیکی اور تقوی کسی کام نہیں آسکتے۔ سبحان اللہ! کیا مقام ہے پیغمبر کا۔ بارگاہ ربانی میں اتنی عزت وتوقیر کے باوجود دل ہر لحہ اپنے مالک کی بے نیازی سے لرزاں وترساں ہے مومن کی کیفیت بھی ایسی ہی ہونی چاہیے کہ اپنی ہر نیکی کو اپنے رب کا فضل تصور کرے اور اپنے علم، عمل اور تقوی پر ذرا گھمنڈ نہ کرے اور ہر لغزش سے اس کی پناہ مانگتا رہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

حضرت شعیب (علیہ السلام) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمہارے دین میں دخول سے محفوظ رکھا ہے اور ہمیں اب کفر میں داخل ہونے پر کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت میں یہی ہو تو پھر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے اور ہر چیز میں اس کی حکمت بالغہ ہے، سو تم یہ طمع نہ کرو کہ اللہ کی مشیت میں یہی ہو تو پھر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے اور ہر چیز میں اس کی حکمت بالغہ ہے، سو تم یہ طمع نہ کرو کہ اللہ کی مشیت میں یہ ہوگا کہ وہ اپنے مخلص بندوں کو ایمان پر ثابت قدم نہیں رکھے گا اور وہ ہمیں گمراہی میں مبتلا کر دے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے بلند و برتر ہے کہ وہ اپنے مخلص بندوں اور مومنوں کو مرتد کرنا چاہے اور ان کو کفر اور گمراہی میں ڈالنا چاہے یہ چیز اللہ کی حکمت کے خلاف ہے اور ہم نے ہر چیز اور ہر بات میں اللہ ہی پر توکل کر لیا ہے اور جو اللہ پر توکل کرے تو وہ اس کو کافی ہے۔ " ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ: اور جو اللہ پر توکل کرے تو وہ اسے کافی ہے " (الطلاق: 3)

شیطان انبیاء (علیہ السلام) کو گمراہ نہیں کر سکتا:

یاد رہے کہ گمراہ ہونے سے نبی (علیہ السلام) خارج ہیں کیونکہ وہ قطعی معصوم ہوتے ہیں اور شیطان انھیں گمراہ نہیں کر سکتا۔ رب عَزَّوَجَلَّ فرماتا ہے:

"اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ" (1)

بیشک میرے بندوں پر تیرا کچھ قابو نہیں۔

حضرت شعیب (علیہ السلام) کا یہ فرمان کہ " ہمارا رب اللہ عَزَّوَجَلَّ چاہے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" در حقیقت اللہ تعالیٰ کی مَشِیَّت کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔

{ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا: ہمارے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔} یعنی جو ہو چکا اور جو آئندہ ہوگا سب چیزوں کو اللہ تعالیٰ اَزل سے ہی جانتا ہے لہٰذا سعادت مند وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم میں سعید ہے اور بد بخت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم میں شقی ہے۔ (2)

یہ آیت ان آیات کی تفسیر ہے جن میں فرمایا گیا کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے، یعنی اللہ عَزَّوَجَلَّ کا علم اور اس کی قدرت گھیرے ہوئے ہے ورنہ اللہ تعالیٰ جسم و مکان سے اور اس اعتبار سے گھیرنے اور گھرنے سے پاک ہے۔ اس کی مزید تفصیل سورۂ نساء کی آیت نمبر 126 کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

{ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا: ہم نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا۔} یعنی ہم نے ایمان پر ثابت قدم رہنے اور شریر لوگوں سے خلاصی پانے میں اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کیا۔ (3)

توکل کا حقیقی مفہوم:

توکل کا مفہوم یہ ہے کہ اسباب پر اعتماد کرتے ہوئے نتیجہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا جائے، توکل ترکِ اسباب کا نام نہیں بلکہ اسباب اختیار کرتے ہوئے مُسَبِّبُ الاسباب پر اعتماد کرنے کا نام ہے۔ حضرت انس بن مالک (رض) فرماتے ہیں "ایک شخص نے عرض کی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، میں اونٹنی کو باندھ کر توکل کروں یا اسے کھلا چھوڑ کر توکل کروں؟ ارشاد فرمایا: "اسے باندھ کر توکل کرو۔ (1)

{ رَبَّنَا: اے ہمارے رب۔} جب حضرت شعیب (علیہ السلام) کو قوم کے ایمان لانے کی امید نہ رہی تو آپ (علیہ السلام) نے یوں دعا فرمائی "رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ" اے ہمارے رب! ہم میں اور ہماری قوم میں حق کے ساتھ فیصلہ فرمادے اور تو سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے۔ زجاج نے کہا کہ اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمارے امر کو ظاہر فرمادے، اس سے مراد یہ ہے کہ ان پر ایسا عذاب نازل فرما جس سے ان کا باطل پر ہونا اور حضرت شعیب (علیہ السلام) اور ان کے مُتَّبِعِین کا حق پر ہونا ظاہر ہو۔ (تفسیر صراط الجنان)

توکل کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ:

علامہ راغب اصفہانی متوفی 502ھ نے لکھا ہے کہ توکل کے دو معنی ہیں ایک معنی ہے کسی کو والی بنانا اور دوسرا معنی ہے کسی پر اعتماد کرنا۔ (المفردات، ج 2، ص 689، مطبوعہ نکتبہ نزار مصطفیٰ، مکہ المکرمہ)

علامہ محمد طاہر پٹنی متوفی 986ھ لکھتے ہیں: توکل یہ ہے کہ تمام معاملات کو اللہ کے حوالے کر دیا جائے جو مسبّب الاسباب ہے اور اسباب ادیہ سے قطع نظر کر لی جائے اور دوسری تعریف یہ ہے کہ جو چیز انسان کی طاقت سے باہر ہے اس میں سعی اور کوشش کو ترک کر دیا جائے اور جو سبب اس کی طاقت میں ہے اس کے حصول کی

سعی کی جائے اور یہ گمان نہ کرے کہ مسبّب کا حصول اس سبب سے ہوا ہے بلکہ اس کے حصول کا اللہ کی جانب سے اعتقاد رکھے۔ اس کی ائید اس حدیث سے ہوتی ہے :

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا : یا رسول اللہ ! میں اونٹنی کو باندھ کر توکل کروں یا اس کو کھلا چھوڑ کر توکل کروں، آپ نے فرمایا : اس کو باندھ کر توکل کرو۔ (سنن الترمذی، رقم الحدیث : 2525، دار الفکر بیروت، جامع الاصول، ج 11، رقم الحدیث : 9505، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1418ھ)

لوہے سے داغنے اور دم کرانے پر توکل سے بری ہونے کا اشکال :

بہ ظاہر اس حدیث کے معارض یہ حدیث ہے : حضرت مغیرہ بن شعبہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جس شخص نے گرم لوہے سے داگ لگایا یا دم کرنے کو طلب کیا تو وہ توکل سے بری ہوگیا۔ (سنن الرمذی، رقم الحدیث : 2062۔ سنن ابوداود، رقم الحدیث : 3865۔ سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث : 3490۔ مسند احمد، ج 4، ص 249، طبع قدیم۔ مسند احمد، ج 6، رقم الحدیث : 18225، طبع جدید۔ مسند حمیدی، رقم الحدیث : 763۔ مصنف ابن ابی شیبہ ج 8، ص 69۔ مسند عبد بن حمید، رقم الحدیث، 393۔ السنن الکبری للبیہقی، ج 9، ص 341۔ جامع الاصول، ج 7، رقم الحدیث : 5634۔ شعب الایمان، ج 2، رقم الحدیث : 1165) اس حدیث کا یہ معنی نہیں ہے کہ جس شخص نے علاج کی نیت سے اپنے کسی عضو پر گرم لوہے سے داغ لگایا یا کسی شخص سے دم کرایا تو وہ توکل سے بری ہوگیا کیونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خود علاج کرنے کی ہدایت کی ہے۔

دوا کرنے اور علاج کرانے کے متعلق احادیث :

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمایا : ہر بیماری کی دوا ہے پس جب کسی بیماری کی دوا حاصل ہو جائے تو وہ اللہ کے اذن سے تندرست ہو جاتا ہے۔ (صحیح مسلم، الطب : 69، (2204) 5637۔ السنن الکبری للنسائی، ج 4، رقم الحدیث : 7556۔ مسند احمد، ج 3، ص 335، جامع الاصول، ج 7، رقم الحدیث : 5627)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : اللہ نے کوئی بیماری نازل نہیں کی مگر اس کی دوا بھی نازل کی ہے۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث : 5678۔ سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث : 3439۔ جامع الاصول، ج 7، رقم الحدیث : 5630۔ السنن الکبری للنسائی ج 4، رقم الحدیث : 7555)

حضرت اسامہ بن شریک (رض) بیان کرتے ہیں کہ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ ! کیا ہم دوا کریں آپ نے فرمایا دوا کرو، کیونکہ اللہ نے جو بیماری بنائی ہے اس کے لیے دوا بھی بنائی ہے سوائے بڑھاپے کی بیماری کے۔ (سنن ابوداود، رقم الحدیث : 3855۔ سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث : 3436۔ سنن الترمذی، رقم الحدیث : 2045۔ السنن الکبری للنسائی، ج 4، رقم الحدیث : 7553۔ مسند الحمیدی، رقم الحدیث : 84۔ مسند احمد، ج 4، ص 278۔ جامع الاصول، ج 6، رقم الحدیث : 5628۔ الادب المفرد، رقم الحدیث : 291۔ صحیح ابن حبان، ج 13، رقم الحدیث : 6061۔ مصنف ابن ابی شیبہ ج 8، ص 1، 2۔ المعجم الکبیر، ج 1، رقم الحدیث : 469۔ سنن کبری للبیہقی، ج 9، ص 443)

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت سعد بن معاذ کو تیر کے زخم کی وجہ سے گرم لوہے سے داغ لگایا۔ (سنن ابوداود، رقم الحدیث : 3866۔ جامع الاصول، ج 7، رقم الحدیث : 5684)

دوا اور دم سے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا علاج کرانا :

سہل بن سعد (رض) سے سوال کیا گیا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کس چیز سے علاج کیا گیا تھا ؟ انھوں نے کہا : اب اس چیز کو مجھ سے زیادہ جاننے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ حضرت علی (رض) ڈھال میں پانی لے کر آتے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس سے زخم کو دھوتیں پھر چٹائی کو جلایا گیا اور اس کی راکھ زخم میں بھر دی گئی۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث : 243۔ صحیح مسلم، جہاد : 100 (1790) 4561۔ سنن الترمذی، رقم الحدیث : 2092۔ سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث : 3464۔ مسند احمد، ج 8، رقم الحدیث : 22863۔ صحیح ابن حبان، ج 13، رقم الحدیث : 6578)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) گردن کی دونوں جانبوں کی رگوں اور کندھوں کے درمیان فصد لگواتے تھے اور آپ سترہ، انیس اور اکیس تاریخ کو فصد لگواتے تھے۔ (نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تمہاری بہترین دوا فصد لگانا ہے)۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 5696۔ سنن الترمذی، رقم الحدیث: 2058،3860۔ سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 3483۔ صحیح ابن حبان، ج13، رقم الحدیث: 6077۔ مسند احمد، ج4، رقم الحدیث: 12192۔ سنن کبری للبیہقی، ج9، رقم الحدیث: 340۔ جامع الاصول، ج7، رقم الحدیث: 5674)

حضرت سلمی (رض) جو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت کرتی تھیں وہ بیان کرتی ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیر میں جب بھی کوئی چھالا یا زخم ہوتا تو آپ مجھے حکم دیتے کہ میں اس پر مہندی لگا دوں۔ (سنن الترمذی، رقم الحدیث: 2054۔ سنن ابو داود، رقم الحدیث: 3858۔ مسند عبد بن حمید، رق الحدیث: 1563۔ مسند احمد، ج6، ص462۔ جامع الاصول، ج7، رقم الحدیث: 5645)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیمار ہوتے تو حضرت تو حضرت جبرائیل آکر آپ پر ان کلمات سے دم کرتے باسم یبریک ومن کل داء یشفیک ومن شر حاسد اذا حسد وشر کل ذی عین۔ (صحیح مسلم، اطلب: 39 (2185) 5595)

اشکال مذکور کا جواب:

جب ان متعدد احادیث صحیحہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بیماری میں علاج کرنے کا حکم دیا ہے اور آپ نے خود بھی بیماری میں علاج کیا ہے اور آپ پر دم کیا گیا ہے اور آپ نے صحابہ کا داغ لگانے سے علاج کیا ہے، تو واضح ہوگیا کہ دوا، دم اور علاج کے ذریعہ اسباب کی رعایت کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے جیسا کہ کھانے کے ذریعہ بھوک کو دور کرنا اور پانی کے ذریعہ پیاس کو دور کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غار حراء میں کئی کئی دنوں کا کھانا لے کر جاتے تھے۔ ازواج مطہرات کو ایک سال کی خوراک فراہم کرتے تھے۔ جنگ احد میں آپ دو زرہیں پہن کر گئے تھے، بیماری میں علاج کرتے تھے، دم کراتے تھے۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ کسی مقصود کے اسباب کو حاصل کرنا توکل کے منافی نہیں ہے کیونکہ آپ سید المتوکلین ہیں، اور جس حدیث میں ہے کہ جس شخص نے گرم لوہے سے جسم کو داغا یا دم کرایا، وہ توکل سے بری ہوگیا۔ اس کی تاویل یہ ہے کہ جس نے ان کو شفا کا قطعی اور یقینی سبب گمان کیا اور اس سے غافل ہوگیا کہ شفاء اللہ نے دینی ہے تو وہ توکل سے بری ہوگیا، اور جس نے یہ گمان کیا کہ یہ محض اسباب غالبہ ہیں اور شفا کی صرف اللہ سے سے امید رکھی تو اس کا توکل اپنے حال پر ہے جیسا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیرت مبارکہ سے ظاہر ہے۔

توکل کی تعریف پر ایک اور اشکال کا جواب:

یہ حدیث بھی بظاہر توکل کی تعریف کے خلاف ہے۔

حضرت عمر بن خطاب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اگر تم اللہ پر اس طرح توکل کرو جس طرح توکل کرنے کا حق ہے تو تمہیں اس طرح رزق دیا جائے گا جس طرح پرندوں کو رزق دیا جاتا ہے، وہ صبح کو خالی پیٹ ہوتے ہیں اور شام کو ان کا پیٹ بھرا ہوا ہوتا ہے۔ (سنن الترمذی، رقم الحدیث: 2351۔ جامع الاصول، ج10، رقم الحدیث: 7619۔ مسند احمد، ج1، رقم الحدیث 205۔ سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 4114۔ کتاب الزہد لابن المبارک، رقم الحدیث: 559۔ مسند ابو یعلی، ج1، رقم الحدیث: 247۔ صحیح ابن حبان، رقم الحدیث: 730۔ المستدرک، ج4، ص318۔ حلیہ الاولیاء، ج10، ص69۔ شعب الایمان، ج2، رقم الحدیث: 1182)

اللہ تعالیٰ پر کماحقہ توکل کرنے کا معنی یہ ہے کہ تم یہ یقین رکھو کہ ہر چیز کو وجود میں لانے والا صرف اللہ ہے اور کسی چیز کا ملنا یا نہ ملنا، نفع اور نقصان، فقر اور غناء، مرض اور صحت، امتحان میں کامیابی اور ناکامی، موت اور حیات اور ان کے علاوہ دوسری چیزیں سب اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اختیار میں ہیں۔ پھر اس یقین کے ساتھ اپنے مطلوب کو حاصل کرنے کے لیے اسباب کو بروئے کار لایا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسے ہی شاد کام کرے گا جیسے وہ رندوں کو شاد کام کرتا ہے وہ صبح رزق کی تلاش میں خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو بھرے ہوئے پیٹ کے ساتھ واپس آتے ہیں اس حدیث کا معنی یہ نہیں ہے کہ کسب کو ترک کردیا جائے کیونکہ پرندے بھی رزق کی تلاش میں سعی اور کسب کرتے ہیں۔

امام غزالی متوفی 505ھ فرماتے ہیں قناعت اور توکل کے بعض مدعی بغیر زاد راہ کے سفر کرتے ہیں اور وہ یہ نہیں جانتے کہ یہ بدعت ہے، صحابہ اور سلف صالحین سے منقول نہیں ہے بلکہ سلف صالحین زاد راہ لے کر سفر کرتے تھے اور ان کا توکّ زاد راہ پر نہیں اللہ پر ہوتا تھا۔ (احیاء العلوم، ج4، ص221، مطبوعہ دار الخیر، بیروت، 1413ھ)

حضرت شعیب (علیہ السلام) جب اپنی قوم کے ایمان لانے سے مایوس ہوگئے تو انھوں نے دعا کی: اے ہمارے رب ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ فرمادے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ ان کی کافر قوم پر عذاب نازل فرمائے جس سے حضرت شعیب کا اور ان کے متبعین کا حق پر ہونا واضح ہو جائے۔

(تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّـخٰسِرُوْنَ۝۹۰

لغۃ القرآن: [وَقَالَ : اور کہا] [الْمَلَاُ : سرداروں نے] [الَّذِيْنَ : جنہوں نے] [كَفَرُوْا : انکار کیا] [مِنْ قَوْمِهٖ : ان کی قوم میں سے] [لَىِٕنِ : بیشک اگر] [اتَّبَعْتُمْ : تم لوگوں نے پیروی کی] [شُعَيْبًا : شعیب کی] [اِنَّكُمْ : تو یقینا تم لوگ] [اِذًا : پھر تو] [لَّـخٰسِرُوْنَ : ضرور ہی خسارہ پانے والے ہوگے]

ترجمہ: اور ان کی قوم کے سرداروں اور رئیسوں نے جو کفر (وانکار) کے مرتکب ہو رہے تھے کہا: (اے لوگو!) اگر تم نے شعیب (علیہ السلام) کی پیروی کی تو اس وقت تم یقیناً نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے

تشریح: مدین کے رئیسوں نے جب حضرت شعیب (علیہ السلام) کی تبلیغ کو اثرانداز ہوتے ہوئے محسوس کیا تو اپنی قوم کو معاشی بدحالی سے خوفزدہ کرنا شروع کر دیا۔ انھیں بتایا کہ اگر تم نے شعیب (علیہ السلام) کی بات مان لی اور کم تولنا، کم ناپنا وغیرہ ہتھکنڈوں کو استعمال کرنا چھوڑ دیا تو سن لو! یہ دولت وثروت کی فراوانی، تجارت کی گہما گہمی اور معاشی فارغ البالی سب ختم ہو کر رہ جائیں گی۔ پھر تم ہوگے اور تمہاری فاقہ مستیاں! اس روکھے پھیکے تقدس کو پھر بیٹھے چاٹتے رہنا۔ بیمار ذہن کچھ ایسا ہی سوچا کرتا ہے۔ اصولوں کی پابندی میں اسے اپنی ناکامی، راہ راست پر چلنے میں اپنی ہلاکت کے خدشات اور دین حق پر ایمان لانے میں اسے مہیب خطرات دکھائی دینے لگتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ نبی ایسے ہی بیمار ذہنوں کے علاج کے لیے مبعوث کیا جاتا ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

یہ ہیں خدوخال اس معرکے کے جو انسانی تاریخ میں بار بار دہرایا جاتا ہے اگرچہ اس کی نوعیت کبھی نہیں بدلتی۔ طاغوتی قوتیں سب سے پہلے داعی کی طرف متوجہ ہوتی ہیں کہ وہ دعوت کو بند کر دے لیکن جب وہ اپنی ایمانی قوت پر اور اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے ڈٹ جاتا ہے' دعوت کو جاری رکھتا ہے' اس راہ میں ہر قسم کی مشکلات کو انگیز کرتا ہے اور دھمکیوں اور طاغوتی قوتوں کے حجم سے مرعوب نہیں ہوتا تو یہ قوتیں داعی کے متبعین کو اذیت دینا شروع کر دیتی ہے۔ ان پر یہ مصائب محض ان کے دین کی وجہ سے توڑے جاتے ہیں۔ ان ظالموں کے پاس اپنے ظلم کے لیے کوئی جواز نہیں ہوتا لیکن ان کے پاس مار دھاڑ اور پکڑ دھکڑ کی ظاہری قوتیں ہوتی ہیں۔ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی جس سے وہ اپنی جاہلیت پر عوام کو مطمئن کر سکیں۔ خصوصا ان لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکتے جنہوں نے حق کو پہچان لیا اور جن کی نظروں میں باطل خفیف و حقیر ٹھہرا کیونکہ ان لوگوں نے اپنا دین اللہ کے لیے خالص کر دیا اور ہر قسم کا اقتدار اللہ کے حوالے کر دیا۔ ان کی نظروں میں اس کے سوا کوئی مقتدر اعلیٰ ہوتا ہی نہیں ہے۔ یہ اللہ کی سنت جاریہ ہے کہ جب حق و باطل علیحدہ علیحدہ متمیز ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے بالمقابل آجاتے ہیں تو پھر ان کے درمیان فیصلہ کن معرکہ ہوتا ہے اور اللہ خود فیصلہ کر دیتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

مسلمانوں کو وارننگ

اس وارننگ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ شعیب تمہیں جس زندگی کی دعوت دے رہے ہیں وہ اللہ کی بندگی کے سواہر بندگی سے بغاوت کی دعوت ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آج تک تم ہمارے دست نگر رہے ہو۔ پشتوں سے تم ہماری چاکری کرتے چلے آئے ہو۔ ہمارے فیصلوں کے خلاف سوچنے کی بھی تم نے کبھی ہمت نہیں کی' تمہاری زندگی کا کوئی فیصلہ ہماری مرضی کے خلاف کبھی نہیں ہوا لیکن شعیب کی دعوت تمہیں اللہ کی بندگی کے سوا باقی سب سے آزادی کی دعوت دے رہی ہے وہ تمہیں مساوات انسانی کا سبق پڑھا رہے ہیں۔ تم یہ سمجھنے لگے ہو کہ اللہ نے سب انسانوں کو آزاد اور برابر پیدا کیا ہے اگر تم نے اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار نہ کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا ہم سے کھلا تصادم ہو گا اور پھر تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم کس طرح کے نقصان اور خسارے میں پڑ جاؤ گے۔ تمہارے مستقبل کے ساتھ ساتھ تمہارے بچوں کا مستقبل بھی تاریک ہو جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہاری زندگیوں کے لیے خطرات پیدا ہو جائیں۔ تمہاری خواتین کی عزتیں پامال ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے' تمہاری معاشی زندگی ایک عذاب بن کے رہ جائے اور تمہارے لیے زندگی کا سانس لینا زندگی کا سب سے مشکل مسئلہ بن جائے۔ اگر تم ان خطرات کا مقابلہ کر سکتے ہو تو پھر شوق سے شعیب پر ایمان لاؤ اور اس کی دعوت کو قبول کرو اور اگر ان خطرات کا مقابلہ کرنا تمہارے بس کی بات نہیں تو پھر تمہیں ایمان لانے سے پہلے سو دفعہ سوچ لینا چاہیے۔

دوسرا اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ شعیب جس ایمانداری اور راست بازی کی دعوت دے رہا ہے اور اخلاق و دیانت کے جن مستقل اصولوں کی پابندی کرانا چاہتا ہے' اگر ان کو مان لیا جائے تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ ہماری تجارت کیسے چل سکتی ہے اگر ہم بالکل ہی سچائی کے پابند ہو جائیں اور کھرے کھرے سودے کرنے لگیں اور ہم جو دنیا کی دو سب سے بڑی تجارتی شاہراہوں کے چوراہے پر بستے ہیں اور مصر و عراق کی عظیم الشان متمدن سلطنتوں کی سرحد پر آباد ہیں اگر ہم قافلوں کو چھیڑنا بند کر دیں اور بے ضرر اور پرامن لوگ ہی بن کر رہ جائیں تو جو معاشی اور سیاسی فوائد ہمیں اپنی موجودہ جغرافی پوزیشن سے حاصل ہو رہے ہیں وہ سب ختم ہو جائیں گے اور آس پاس کی قوموں پر ہماری جو دھونس قائم ہے وہ باقی نہ رہے گی۔ یہ بات صرف قوم شعیب کے سرداروں ہی تک محدود نہیں ہے۔ ہر زمانے میں بگڑے ہوئے لوگوں نے حق، راستی اور دیانت کی روش میں ایسے ہی خطرات محسوس کیے ہیں۔ ہر دور کے مفسدین کا یہی خیال رہا ہے کہ تجارت اور سیاست اور دوسرے دنیوی معاملات جھوٹ اور بے ایمانی اور بداخلاقی کے بغیر نہیں چل سکتے۔ ہر جگہ دعوت حق کے مقابلہ میں جو زبردست عذرات پیش کیے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی رہا ہے کہ اگر دنیا کی چلتی ہوئی راہوں سے ہٹ کر اس دعوت کی پیروی کی جائے گی تو قوم تباہ ہو جائے گی۔ دونوں مطالب میں سے کوئی مطلب بھی مراد لیا جائے مقصود قوم شعیب کا ان لوگوں کو ڈرانا دھمکانا اور وارننگ دینا تھا کہ اگر تم نے شعیب (علیہ السلام) پر ایمان لانے کی غلطی کی یا ایمان لا کر ان کے اتباع پر ثابت قدم رہے تو پھر سوچ لو تمہارا انجام کیا ہو گا جب اس قوم کی جسارتیں اس حد تک پہنچ گئیں کہ پہلے حضرت شعیب (علیہ السلام) کو براہ راست دھمکی دی کہ اگر تم نے ہمارے دین کی مخالفت نہ چھوڑی اور نئے دین کی دعوت بند نہ کی تو ہم تمہیں اپنے شہر سے نکال دیں گے جب دیکھا کہ انھوں نے اس سے کوئی اثر قبول نہیں کیا اور ان کی ثابت قدمی میں کوئی فرق نہیں آیا تو پھر مسلمانوں کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی گویا انھوں نے اپنے تئیں یہ فیصلہ کر لیا کہ اب اس معاملے کو ختم کر کے ہی دم لینا ہے تو اللہ کا غضب جوش میں آیا اور اس کے دائمی قانون کے مطابق ان کی نافرمانی کے نتیجے میں اللہ کا عذاب ان پر ٹوٹ پڑا۔

(تفسیر روح القرآن)

احکامِ الٰہیہ کی پابندی میں اپنی ناکامی سمجھنے والے غور کریں:

حضرت شعیب (علیہ السلام) کی قوم کے سرداروں کی یہ روش ان کی بیمار ذہنیت کا پتا دیتی ہے کہ احکام الٰہیہ کی پابندی میں اپنی ناکامی جبکہ راہ راست پر چلنے میں اپنی ہلاکت اور دین حق پر ایمان لانے میں انھیں مُہیب خطرات نظر آنے لگے اور انھوں نے دوسروں کو بھی دین حق سے دور کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس طرح کی بیمار ذہنیت کے حامل افراد کی ہمارے معاشرے میں بھی کوئی کمی نہیں، اسلام کے اصول و قوانین کو اہمیت نہ دینے والوں، شریعت کے قوانین میں تبدیلی کی رٹ لگانے والوں، زکوٰۃ کو ٹیکس تصور کرنے والوں، رشوت کو اپنا حق سمجھنے والوں، ناپ تول میں کمی کرنے والوں، پردے کو عورت کی آزادی کے خلاف قرار دینے والوں، اسلامی سزاؤں کو ظلم و بربریت شمار کرنے والوں کو چاہیے کہ اہل مدین کے حالات اور ان کے انجام پر غور کریں۔ ہمارے ہاں بھی کتنے لوگ یہ نعرہ لگانے

والے ہیں کہ "اگر سودی نظام کو چھوڑ دیا تو ہم نقصان میں پڑ جائیں گے اور ہماری ترقی رک جائے گی۔ اس جملے میں اور اہل مدین کے جملے میں کتنا فرق ہے اس پر غور فرمالیں۔ (تفسیر صراط الجنان)

آیت مبارکہ:

فَاَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دَارِهِمۡ جٰثِمِيۡنَ ۝

لغۃ القرآن: [فَاَخَذَتۡهُمُ :پھر پکڑا ان کو] [الرَّجۡفَةُ :زلزلے نے] [فَاَصۡبَحُوۡا :تو وہ ہوگئے] [فِيۡ دَارِهِمۡ :اپنے (اپنے)گھر میں] [جٰثِمِيۡنَ :اوندھے منہ گرے ہوئے]

ترجمہ: پس انھیں شدید زلزلہ (کے عذاب) نے آ پکڑا، سو وہ (ہلاک ہو کر) صبح اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے

تشریح: قوم شعیب پر آنے والا عذاب اور اس میں عبرت کا سامان

قوم شعیب پر جو عذاب آیا اس کی نوعیت اور کیفیت کیا تھی اس کے لیے جب ہم قرآن کریم میں اس واقعہ کی تفصیل پڑھتے ہیں تو مختلف آیات میں ہمیں تین الفاظ کا استعمال ملتا ہے۔ متذکرہ آیت میں عذاب کو الرجفۃ سے تعبیر کیا گیا ہے اور سورۃ ھود کی آیت نمبر ۹۴ میں اس کی تعبیر لفظ صیحۃ سے کی گئی ہے جس کے معنی ڈانٹ ' کڑک اور چیخ کے ہیں۔ پھر سورۃ شعراء میں آیت نمبر ۱۸۹ میں اس عذاب کو عذاب یوم الظلۃ سے ذکر فرمایا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عذاب دور سے دیکھنے میں غبار یا دھویں کے ایک ستون یا پہاڑ کی شکل میں نظر آ رہا تھا۔ ان تمام تعبیرات کو سامنے رکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم پر پہلے زلزلہ آیا اس میں یخ بستہ ہوائیں بھی تھیں۔ زلزلے اور ہواؤں کی گونج اور بادل کی گرج نے ایسی صورتحال پیدا کر دی تھی جسے صیحۃ سے تعبیر کیا گیا ہے زلزلہ جب تیز رفتاری سے آتا ہے تو اس میں گونج پیدا ہوتی ہے اور یہی گونج بعض دفعہ دلوں کو پھاڑ دیتی ہے۔ ہو سکتا ہے اسی وجہ سے وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ گر کے رہ گئے ہوں کہ زمین نے ان کو سہارا دینا چھوڑ دیا اور دلوں نے کام کرنا چھوڑ دیا اور پھر اس زلزلے سے پہاڑوں کے پھٹنے کے باعث تیزی سے غبار اٹھا آسمان پر ایسی خوفناک گھٹا اٹھی جس نے ایک پہاڑ کی شکل اختیار کر لی اور پوری قوم نے یوں محسوس کیا جیسے ایک سائبان کی مانند پہاڑ ان کے سروں پر چھا گیا ہے۔ زمین ان کو نگل جانا چاہتی ہے اور ساتھ بادلوں کی کڑک نے اس ہولناکی میں مزید اضافہ کر دیا۔ اس پوری صورتحال کو اگر ذہن میں لانا ممکن ہو تو اس سے اس عذاب کی دھندلی سی تصویر ذہن میں پیدا ہوتی ہے۔ ایسے ہولناک عذاب کے بعد یہ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ یہ قوم کس طرح کی ہمہ گیر تباہی کا شکار ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس قوم کی تباہی مدت ہائے دراز تک آس پاس کی قوموں میں ضرب المثل بنی رہی۔ (تفسیر روح القرآن)

قرآن کریم میں حضرت شعیب (علیہ السلام) کی امت کے عذاب کا تذکرہ تین مقامات پر آیا ہے، ایک یہاں یعنی سورۃ اعراف میں زلزلہ کا ذکر ہے ایک سورۃ ہود میں آسمانی چیخ کا ذکر ہے، اور ایک سورۃ شعراء میں عذاب کے بادل کا ذکر ہے جس میں سے آگ برسی تھی، یہ تینوں عذاب ایک ساتھ اس طرح آئے کہ وہ لوگ اپنے گھروں میں تھے تو زلزلہ آیا جب گھروں سے باہر نکلے تو سخت گرمی معلوم ہوئی تو بادل کی شکل کا آسمان پر ایک ٹکڑا نظر آیا جس کا گھنا سایہ تھا پہلے ایک شخص اس سایہ میں گیا اس نے آ کر سایہ کی ٹھنڈک کی تعریف کی، لوگ اس کی تعریف سن کر اس بادل کے سایہ میں چلے گئے اسی دوران آسمان سے ایک سخت چیخ کی آواز آئی اور پھر اسی بادل سے آگ برسی جس سے سب لوگ ہلاک ہو گئے۔

مدین کی تباہی مدتہائے دراز تک آس پاس کی قوموں میں ضرب المثل رہی ہے چنانچہ زبور میں ایک جگہ آیا ہے کہ "اے خدا، فلاں فلاں قوموں نے تیرے خلاف عہد کیا ہے لہٰذا تو ان کے ساتھ وہی معاملہ کر جو تو نے مدیان کے ساتھ کیا تھا" (۸۳۔ ۵ تا ۹) (تفسیر جلالین)

چنانچہ زبور داؤد میں ایک جگہ آتا ہے کہ اے خدا فلاں فلاں قوموں نے تیرے خلاف عہد باندھ لیا ہے لہٰذا تو ان کے ساتھ وہی کر جو تو نے مدیان کے ساتھ کیا اور یسع نبی ایک جگہ بنی اسرائیل کو تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ آشور والوں سے نہ ڈرو اگرچہ وہ تمہارے لیے مصریوں کی طرح ظالم بنے جا رہے ہیں لیکن کچھ دیر نہ

گزرے گی کہ رب الافواج ان پر اپنا کوڑا برسائے گا اور ان کا وہی حشر ہو گا جو مدیان کا ہوا۔ اگلی آیت کریمہ میں نہایت موثر انداز میں اس عذاب کا نتیجہ بیان کیا گیا۔
گزشتہ دو آیات میں قوم شعیب کے بڑے لوگوں نے حضرت شعیب اور مسلمانوں کو دھمکی دیتے ہوئے دو باتیں کہیں ایک یہ کہ تمھیں ہم اپنے شہروں سے نکال دیں گے اور دوسری یہ بات کہ اگر تم نے شعیب کا اتباع نہ چھوڑا تو تم نقصان اٹھاؤ گے اور تباہ ہو جاؤ گے۔ اس آیت کریمہ میں تلمیح کے انداز میں دونوں باتوں کا ذکر فرمایا گیا کہ جن لوگوں نے حضرت شعیب کی تکذیب کی ہم نے ان کی بستیوں کو اس طرح مٹایا کہ ان کی بستیوں سے گزرنے والا کوئی شخص دیکھ کر اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ بستیاں کبھی آباد بھی رہی ہوں گی۔ اس قدر ہمہ گیر تباہی کہ وہ بالکل بے آباد کھنڈرات پر مشتمل ایک ویرانہ معلوم ہوتی تھیں جس میں زندگی کا دور دور تک کوئی نشان نہ تھا اور یہ تباہ ہونے والی اور مٹ جانے والی بستیاں ان لوگوں کی تھیں جو حضرت شعیب اور مسلمانوں کو وہاں سے نکالنا چاہتے تھے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے سر پر جو عذاب تلا کھڑا ہے چند دنوں کی بات ہے اس کے نتیجے میں وہ خود ان بستیوں سے نکال دیئے جائیں گے اور دوسری بات یہ بیان فرمائی کہ شعیب کی قوم نے مسلمانوں کو دھمکاتے ہوئے یہ کہا کہ اگر تم نے شعیب کا اتباع نہ چھوڑا تو تم نقصان اٹھاؤ گے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اب ان بستیوں پر ٹوٹنے والے عذاب کو دیکھو اور اس کے نتیجے میں بستیوں کی تباہی ملاحظہ کرو اور پھر فیصلہ کرو کہ نقصان اٹھانے والا کون ہے۔ حضرت شعیب اور ان پر ایمان لانے والوں نے نقصان اٹھایا اور یا ان لوگوں نے نقصان اٹھایا جو انھیں نقصان کی دھمکیاں دیتے اور تباہی اور بربادی سے ڈراتے تھے۔ یہی وہ عبرت کی چیزیں ہیں کہ اگر آدمی کی آنکھوں کا پانی مر نہیں گیا تو قدم قدم پر اس کے لیے عبرت کا سامان موجود ہے اور اسی عبرت ہی کے لیے ان واقعات کو بیان کیا جا رہا ہے۔
ممکن ہے کہ آپ نے عذاب آنے سے پہلے اس قوم سے آخری بات کہتے ہوئے منہ پھیرا ہو اور ہجرت کر کے ان بستیوں سے نکل گئے ہوں اور ان پر یہ بات واضح کر دی ہو کہ میں آج تک تمہارے غم میں گھلتا رہا اور تمہارے ساتھ خیر خواہی میں میں نے کمی نہیں چھوڑی لیکن تم ایک ایسی قوم ہو جنھیں خیر خواہوں کی خیر خواہی متاثر نہیں کرتی وہ اپنے کافرانہ طرز عمل کو کبھی بدلنے کے لیے تیار نہیں ہوتے پھر ایسے لوگوں پر اگر عذاب ٹوٹتا ہے تو میں اس پر کیا افسوس کروں اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی تباہی مکمل ہو جانے کے بعد آپ نے ان کی لاشوں پر کھڑے ہو کر مسلمانوں اور آنے والے دور کے انسانوں کی نصیحت کے لیے یہ بات فرمائی کہ اے میری قوم کے لوگو ! میں نے اللہ کا پیغام تمہیں پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور یہاں تک خیر خواہی کی کہ تمہاری گالیاں سن کر دعائیں دیتا رہا تم نے اپنے دروازے مجھ پر بند کیے لیکن میں نے اپنے دل کے دروازے ہمیشہ تمہارے لیے کھلے رکھے لیکن تم نے بجائے اس خیر خواہی کی قدر کرنے کے جو طرز عمل اختیار کیا اب اس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ میں پہلے دن سے تمہیں تنبیہ کرتا رہا کہ اگر تم نے کفر سے توبہ نہ کی اور مجھ پر ایمان نہ لائے تو وہ دن دور نہیں جب عذاب تمہاری کمر توڑ دے گا لیکن تمہیں اپنے کفر کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی اس لیے آج میں اگر تم پر غم کھاؤں تو کس بات کا غم کھاؤں ؟ اس لیے کہ یہ سب کچھ تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اللہ کا تو قانون ہی یہ ہے کہ جب بندے کبھی اپنی حالت کی شکایت کرتے ہیں تو وہ ہمیشہ انھیں اعمال کا جائزہ لینے کا حکم دیتا ہے۔ اکبر نے ٹھیک کہا

جب میں کہتا ہوں کہ یا اللہ میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامہ اعمال دیکھ

یہاں تک پانچ معذب قوموں کا تذکرہ ہوا اور کسی حد تک تفصیل سے بتایا گیا کہ یہ وہ قومیں ہیں جن کی طرف اللہ کے رسول آئے لیکن انھوں نے ان کی دعوت کو قبول کرنے سے جب انکار کیا تو اس کا نتیجہ عذاب کی صورت میں نکلا یہ محض تاریخی واقعات نہیں بلکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کے بعد مشرکین مکہ اور دیگر لوگوں نے جو رویہ آپ کی دعوت کے ساتھ اختیار کیا یہ واقعات انھی کے انجام کے آئینے کے طور پر پیش کیے گئے تاکہ مشرکین مکہ اور دوسرے لوگ اچھی طرح اس آئینہ میں اپنی شکل دیکھ لیں کہ جن قوموں پر اللہ کا عذاب آیا ان کی طرف بھی اللہ کے نبی اور رسول آئے تھے جس طرح آج ان کی طرف اللہ کے ایک رسول آئے ہیں۔ ان رسولوں نے ان کے سامنے اللہ کا پیغام رکھا تھا اور جب تک انھیں تبلیغ و دعوت کا موقع ملا انھوں نے کامل خیر خواہی ' دلسوزی ' ہمدردی اور جانسپاری سے وہ پیغام ان کے سامنے پیش کیا۔ جس طرح آج آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ ان کی قوموں نے ان کی ہمدردی اور خیر خواہی کی قدر کرنے کی بجائے معاندانہ رویہ اختیار کیا۔ ہر قدم پر ان کی تبلیغ و دعوت کے راستے میں روڑے اٹکائے ' ان کے لیے معاشی دشواریاں پیدا کیں ' ہر ممکن اذیتیں پہنچائیں ان پر ایمان لانے والوں کو بری طرح ایمان لانے کی سزائیں دیں حتیٰ کہ ان کا جینا دوبھر کر دیا اور جیسے جیسے پیغمبر تبلیغ و دعوت میں سرگرمی

دکھاتے ویسے ویسے ان کی مخالفتوں میں شدت پیدا ہوتی جاتی حتیٰ کہ وہ پیغمبر اور مسلمانوں کو ملک بدر کرنے یا قتل کرنے کے منصوبے باندھنے لگے۔ بالکل اس طرح جس طرح مشرکین مکہ اور مدینے کے اہل کتاب نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ طرز عمل اختیار کیا کہ آپ کو سالوں تک کبھی ایک لمحے کے لیے چین نہ لینے دیا۔ آپ کے قتل کرنے کا ایک مکمل منصوبہ بنایا گیا لیکن اللہ نے آپ کی حفاظت فرمائی آپ ہجرت کرنے میں کامیاب ہوگئے تو دار الہجرت میں بھی آپ کو چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ سابقہ کافر امتوں کے ساتھ مشرکین مکہ کی یہ یکسانی اور پہلے رسولوں کے ساتھ آنحضرت کی ہم آہنگی کیا یہ بتانے کے لیے کافی نہیں کہ یہ واقعات دوسروں کے پیرائے میں مشرکین مکہ اور دوسرے لوگوں کو سمجھانے کے لیے ہیں کہ وہ قومیں تمہاری طرح کا رویہ اختیار کرکے تباہ ہوگئیں تم اگر بچنا چاہتے ہو تو اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کرو اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لا کر دنیا اور آخرت بنالو۔ (تفسیر روح القرآن)

آیت مبارکہ:

الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ۝٩٢

لغۃ القرآن: [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جنہوں نے] [كَذَّبُوْا : جھٹلایا] [شُعَيْبًا : شعیب کو] [كَاَنْ : تو گویا کہ] [لَّمْ يَغْنَوْا : وہ رہتے ہی نہ تھے] [فِيْهَا : اس میں] [اَلَّذِيْنَ : جنہوں نے] [كَذَّبُوْا : جھٹلایا] [شُعَيْبًا : شعیب کو] [كَانُوْا : تھے] [هُمُ : وہ لوگ ہی] [الْخٰسِرِيْنَ : خسارہ پانے والے]

ترجمہ: جن لوگوں نے شعیب (علیہ السلام) کو جھٹلایا (وہ ایسے نیست و نابود ہوئے) گویا وہ اس (بستی) میں (کبھی) بسے ہی نہ تھے۔ جن لوگوں نے شعیب (علیہ السلام) کو جھٹلایا (حقیقت میں) وہی نقصان اٹھانے والے ہوگئے

تشریح: جن لوگوں نے شعیب (علیہ السلام) کو جھٹلایا وہ ایسے تھے گویا ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ کس قدر حسرت ہے اس کے اندر۔ جن گھروں کو سجانے سنوارنے کے لیے انھوں نے جھوٹ اور سود اور دھوکا غلط طریقے اختیار کیے تھے وہ گھر تو سب رہ گئے ساری سجاوٹ سارا فرنیچر سب کچھ گھر کا رہ گیا۔ کون چلا گیا۔ لوگ خود چلے گئے۔ آیت۔ کان لم یغنوا فیھا۔۔ غ۔ ن۔ ی۔ مطلب ہوتا ہے کسی مقام پر عیش سے رہنا۔ جو luxurious ان کے گھر بنے تھے۔ آراستہ گھر تھے۔ وہ گھر رہ گئے۔ اور شعیب (علیہ السلام) کو جھٹلانے والے وہاں سے نکال لیے گئے۔ ختم کردیئے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ شعیب (علیہ السلام) کی بات مانیں گے تو خسارے میں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے۔ شعیب (علیہ السلام) کو جنھوں نے جھٹلایا آخر کار وہی برباد ہوگئے۔ یہ ultimate نتیجہ نکلتا ہے اللہ کے احکامات کو توڑنے کا۔ یا اللہ کے احکامات کو جھٹلانے کا۔ جو جھٹلاتے ہیں وہی اصل میں خسارے میں رہتے ہیں۔ (تفسیر تنویر۔ زاہدہ تنویر)

لفظ غنی کی تحقیق کرتے ہوئے علامہ قرطبی لکھتے ہیں۔ غنیت بالمکان اذا قمت بہ و غنی القوم فی دارھم ای طال مقامھم فیھا والمغنی المنزل والجمع المغانی۔ خلاصہ عبارت یہ ہے کہ غنی کا معنی ہے کسی جگہ مدت دراز تک اقامت گزیں رہنا اور رہائش گاہ کو مغنی کہتے ہیں اور اس کو جمع مغانی ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب مسلسل نافرمانی اور سرکشی کے باعث ان پر عذاب الٰہی آیا تو وہ ہلاک و برباد ہو کر رہ گئے۔ اور ان کے شاندار محلات اور کشادی حویلیوں میں الو بولنے لگے۔ جہاں زندگی اپنے تمام نخروں سمیت محو خرام تھی وہاں خاک اڑنے لگی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا یہاں کبھی کوئی آباد ہوا ہی نہیں۔

یعنی وہ تو اس خوف کی وجہ سے شعیب (علیہ السلام) پر ایمان نہیں لاتے تھے کہ اگر انھوں نے ان کی شریعت پر عمل شروع کردیا تو وہ مفلوک الحال اور کنگال ہوجائیں گے اور ان کی معاشی بدحالی کا آغاز ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ تنبیہ فرماتے ہیں کہ ان کے یہ سب اندیشے غلط ثابت ہوئے اور نتیجہ اس کے برعکس نکلا۔ وہ لوگ جنھوں نے اللہ کے نبی کے دامن میں پناہ لی وہ تو دین و دنیا میں کامیاب ہوگئے اور جنھوں نے اوپ کی نافرمانی کی ان کی دنیا بھی برباد اور آخرت بھی برباد ہوگئی وہ لوگ جو محض نام نہاد اور بے بنیاد اقتصادی زبوں حالی کے خوف سے شریعت اسلامیہ کے واضح احکام میں ردوبدل کرنے کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ اہل مدین کے حالات کا بغور

مطالعہ کریں ان پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل میں صرف عقبی کی نجات ہی نہیں بلکہ دنیا کی خوشحالی بھی مضمر ہے۔ اور ان سے سرتابی کرنے والے صرف اپنی قیامت ہی خراب نہیں کرتے بلکہ اپنے ہاتھوں اپنی اس زندگی کو بھی تمام حقیقی خوشیوں اور راحتوں سے محروم کر دیتے ہیں۔
(تفسیر ضیاء القرآن)

تکذیب انبیاء و رسل کا انجام نہایت برا۔ وَالْعِیَاذ بِاللّٰہِ :

سو ارشاد فرمایا گیا کہ آخرکار آ پکڑا ان لوگوں کو ایک ایسے ہول ناک عذاب نے جس کے نتیجے میں وہ اپنے گھروں میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے تھے۔ اور جس اوندھے پن کو انھوں نے زندگی بھر اپنائے رکھا تھا، آخرکار وہ سب اسی کی آغوش میں پہنچ گئے اور وہ ایسے ہو گئے کہ گویا کہ وہ وہاں پر کبھی رہے بسے ہی نہ تھے۔ والعیاذ باللہ۔ حضرات انبیاء و رسل اور ان کے پیغام حق کی تکذیب و عداوت کا نتیجہ و انجام نہایت ہی ہول ناک ہے۔ والعیاذ باللہ۔ سو اس طرح شعیب (علیہ السلام) اور ان کے ساتھیوں کو نکال باہر کرنے کی دھمکیاں دینے والے خود ہمیشہ کے لیے مٹ گئے۔ اور یہی انجام ہوتا ہے حضرات انبیاء و رسل اور ان کے پیام حق اور اہل حق سے عداوت و دشمنی رکھنے کا۔ کہ ایسے لوگ بالآخر صفحہ ہستی سے مٹ کر اور اپنے آخری انجام کو پہنچ کر رہتے ہیں۔ مگر ابنائے کفر و باطل کی مت ایسی مار دی جاتی ہے کہ ان کو یہ بات سمجھ نہیں آتی۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ سو کوئی مانے یا نہ مانے، تسلیم کرے یا نہ کرے، حق اور حقیقت بہر حال یہی ہے کہ حق کی تکذیب و مخالفت اور اس سے دشمنی و عداوت کا نتیجہ و انجام بڑا ہی ہول ناک ہوتا ہے۔ اور ایسا کہ اس سے پھر نکلنے اور بچنے کی کوئی صورت ممکن نہیں رہتی۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ سو وہی لوگ جو کل اپنے غرور اور تکبر میں مبتلا ہو کر حضرت شعیب کو یہ دھمکی دے رہے تھے کہ اگر تم ہمارے دین میں واپس نہ آئے تو ہم تمہیں اس ملک سے نکال باہر کریں گے، وہی آج ایسے مر مٹ چکے تھے جیسے کہ وہ کبھی اس ملک میں رہے بسے ہی نہیں تھے۔ سو اللہ کا عذاب بڑا ہی سخت اور نہایت ہی ہول ناک ہوتا ہے۔ سو ارشاد فرمایا گیا کہ جن لوگوں نے جھٹلایا تھا شعیب کو وہی تھے خسارے والے۔ والعیاذ باللہ ۔ (تفسیر مدنی کبیر)

حضرت شعیب (علیہ السلام) سے قوم کے لوگ اس خوف کی وجہ سے آپ پر ایمان نہیں لاتے تھے کہ اگر انھوں نے ان پر ایمان لا کر ان کی شریعت پر عمل شروع کر دیا تو وہ معاشی بدحالی کی دلدل میں پھنس جائیں گے، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تنبیہ فرمائی کہ جس خوف کی وجہ سے وہ قبول ایمان سے دور تھے وہ درست ثابت نہ ہوا بلکہ نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا کہ جنھوں نے اللہ عَزَّوَجَلَّ کے نبی پر ایمان لا کر ان کی شریعت کی پیروی کی وہ تو دین و دنیا دونوں میں کامیاب ہو گئے اور جنھوں نے اللہ عَزَّوَجَلَّ کے نبی حضرت شعیب (علیہ السلام) کو جھٹلایا اور آپ کی نافرمانی کی، ان کی دنیا تو برباد ہوئی، اس کے ساتھ آخرت بھی برباد ہو گئی۔ لہٰذا نقصان تو ان لوگوں نے اٹھایا ہے جو سرکش اور نافرمان تھے نہ کہ انھوں نے جو تابع اور فرمان بردار تھے۔

اقتصادی اور معاشی بہتری اسلامی احکام پر عمل کرنے میں ہے :

اہل مدین کے حالات میں ان لوگوں کے لیے بہت عبرت ہے کہ جو محض نام نہاد اور بے بنیاد اقتصادی زبوں حالی کے خوف سے شریعت اسلامیہ کے واضح احکام میں ردوبدل کرنے کیلئے پیچ وتاب کھاتے نظر آتے ہیں، ایسے حضرات کو چاہیے کہ مدین والوں کے حالات کا بغور مطالعہ کریں اور اپنی اس روش کو بدل کر صحیح اسلامی سوچ اپنانے کی کوشش کریں اور معاشی بہتری کے لیے اسلام کے دیئے ہوئے اصول و قوانین پر عمل کریں پھر دیکھیں کہ کیسے یہ اقتصادی اور معاشی طور پر مضبوط ہوتے ہیں۔ (تفسیر صراط الجنان)

آیت مبارکہ:

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ۝۹۳

لغۃ القرآن: [فَتَوَلّٰي :تو انہوں نے رخ پھیرا] [عَنْهُمْ :ان سے] [وَقَالَ :اور کہا] [يٰقَوْمِ :اے میری قوم] [لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ :میں پہنچا چکا تم کو] [رِسٰلٰتِ رَبِّيْ :اپنے رب کے پیغامات] [وَنَصَحْتُ :اور میں نے خیرخواہی کی] [لَكُمْ :تمہاری] [فَكَيْفَ :تو (اب)کیسے] [اٰسٰي :میں افسوس کروں] [عَلٰي قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ :ایک انکار کرنے والی قوم پر]

ترجمہ: تب (شعیب (علیہ السلام)) ان سے کنارہ کش ہوگئے اور کہنے لگے: اے میری قوم! بیشک میں نے تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے تھے اور میں نے تمہیں نصیحت (بھی) کردی تھی پھر میں کافر قوم (کے تباہ ہونے) پر افسوس کیونکر کروں.

تشریح: یہ بیان جو متعدد رکوعوں میں پھیلا ہوا ہے اس سے مدعا صرف داستان سرائی اور قصہ گوئی نہیں بلکہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کو جھنجھوڑنا ہے۔ ان کے سامنے ان قوموں کا حال بیان کیا جن سے عرب کا بچہ بچہ واقف تھا جن کے کھنڈرات ان کے تجارتی کاروانوں کی گزرگاہوں کے ارد گرد واقع تھے، جن کی خوشحالی، بالادستی، غلبہ واقتدار کی بڑی شہرت تھی اور پھر انبیاء کرام (علیہم السلام) کی نافرمانی کے باعث ان کی تباہی وبربادی کے دلخراش واقعات سب کو معلوم تھے یہ بتا کر انھیں آگاہ کیا کہ میرا حبیب اور میرا مصطفے علیہ التحیۃ والثناء بھی انھیں تعلیمات کو کامل اور مکمل صورت میں تمہارے ساتھ لے آیا ہے جو پہلے نبیوں نے اپنی اپنی امتوں کو اپنے زمانہ میں ان کی عقلی بیداری کے مطابق انھیں دیں۔ اگر تم نے بھی انکار اور عناد کی روش اختیار کی تو یاد رکھو تمہارا بھی وہی انجام ہوگا جو پہلے منکرین کا ہوتا آیا ہے۔ دونوں جہان کی سعادت اور سلامتی مطلوب ہے تو میرے پیارے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کرو اور اس کا دامن رحمت مضبوطی سے تھام لو۔

(تفسیر ضیاء القرآن)

وَقَالَ: اور فرمایا۔} جب حضرت شعیب (علیہ السلام) سے قوم پر عذاب آیا تو آپ نے ان سے منہ پھیر لیا اور قوم کی ہلاکت کے بعد جب آپ ان کی بے جان نعشوں پر گزرے تو ان سے فرمایا "اے میری قوم! بیشک میں نے تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی لیکن تم کسی طرح ایمان نہ لائے۔

مردے سنتے ہیں:

کفار کی ہلاکت کے بعد حضرت شعیب (علیہ السلام) نے ان سے جو کلام فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ مردے سنتے ہیں۔ حضرت قتادہ (رض) فرماتے ہیں "اللہ عَزَّوَجَلَّ کے نبی حضرت شعیب (علیہ السلام) نے اپنی قوم کو سنایا، بیشک اللہ عَزَّوَجَلَّ کے نبی حضرت صالح (علیہ السلام) نے اپنی قوم کو سنایا اور اللہ عَزَّوَجَلَّ کی قسم! رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی قوم کو سنایا۔

مُردوں کے سننے کی قوت سے متعلق بخاری شریف میں ہے "جب ابو جہل وغیرہ کفار کو بدر کے کنویں میں پھینک دیا گیا تو اس وقت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے خطاب فرمایا "فَهَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا" تو کیا تم نے اس وعدے کو سچا پایا جو تم سے تمہارے رب نے کیا تھا؟ حضرت عمر فاروق (رض) نے عرض کی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، آپ ایسے جسموں سے کلام فرما رہے ہیں کہ جن کے اندر روحیں نہیں۔ ارشاد فرمایا "وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ مَا اَنْتُمْ بِاَسْمَعَ لِمَا اَقُولُ مِنْهُمْ" اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان ہے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے تم ان سے زیادہ نہیں سنتے۔

(تفسیر صراط الجنان)

ابلغتکم رسلت ربی۔ رب کے پیغامات پہنچائے تھے کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی جو رسول لے کر آتے ہیں۔ اللہ کا پیغام پہنچا رہے ہوتے ہیں۔ اور جو قوم نہیں مانتی اس کا تو تباہ ہونا لازمی ہوتا ہے۔ کیا پتہ ہم اس وقت دنیا میں دیکھ رہے ہیں کہ کتنے لوگ ہیں جو اللہ کی بات نہیں مان رہے اور معاشی طور پر وہ پنپ رہے ہیں۔ خوشحال ہیں۔ لیکن واقعی اگر ہم ان کی زندگیوں میں دیکھیں جس کرب میں وہ قومیں مبتلا ہیں۔ وہ بھی اپنی جگہ عبرت کی داستان ہیں۔ یہ موضوع انشاء اللہ چلتا رہے گا ۔ ہم اس کو ڈسکس کرتے رہیں گے۔ سورۃ طہٰ۔ میں یہ مضمون اپنے عروج پر اپنے کلائمکس پر پہنچتا ہے۔ کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ جو اللہ کی آیات سے منہ

موڑیں گے اللہ ان کو تنگ زندگی دے گا۔ تنگ معیشت آیت ۔ معیشۃ ضنکا۔ اللہ تنگ زندگی ان کو دے گا۔ سامان آرائش کے آرام کے بہت ہوں گے۔ لیکن زندگیوں کے اندر سکون نام کی چیز نہیں ہوتی۔ خوشی کا سامان ہوگا۔ خوشی نام کی چیز زندگیوں میں نہیں ہوتی۔ اور جتنا انسان اللہ کی آیات اور اللہ کی شریعت پر زندگی گزارتا ہے اتنی اس کی زندگی کے اندر خوشی اور سکون اور یہ چیزیں سرایت کرتی ہیں۔ اللہ سے دعا ہمیں کرنی چاہیے کہ اس پر یقین کرنے والا اور عمل کرنے والا بنادے۔ تو ہم نے انبیاء اور رسولوں کا تذکرہ پڑھا۔ کیسے رسول قوموں کی طرف بھیجے گئے۔ انھوں نے اللہ کا پیغام ان کو دیا۔ توحید کا پیغام ان کو دیا۔ قوموں نے کس طرح بات نہ مانی رسولوں کا کس طرح مذاق اڑایا۔ ان کی بات کو رد کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون ان پر نافذ ہوا اور وہ تباہ کر دی گئیں۔ اب یہاں پر یوں سمجھیں کہ خلاصہ بیان کیا جارہا ہے۔ کہ جب انبیاء اور رسول کسی قوم میں بھیجے جاتے تھے۔ تو ان کی قوموں کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا تھا۔ کیسے ان کو تیار کیا جاتا تھا کہ وہ رسول کی دعوت کو قبول کرلیں۔ پتہ یہ چلا کہ اللہ تعالیٰ جب ہدایت کے طور پر انبیاء اور رسول کسی قوم کی طرف بھیجتا تھا تو پہلے پوری طرح یہ تیاری کی جاتی تھی کہ قوم یہ پیغام قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ کوئی ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ قوم کا دل کھل جائے۔ جس میں ذرا بھی ایمان کی رمق موجود ہوتی جس میں ذرا بھی خیر ہوتی اس کا دل کھل جاتا۔ اور جس کے دلوں پر سختی چھا چکی ہوتی۔ گناہوں کا زنگ جن کے دلوں میں اتنا زیادہ چڑھ گیا ہوتا کہ وہ کس طرح نہ اترتا تھا تو ان حالات کے باوجود ان کے دل نہ کھلے ہدایت کے لیے تو انھوں نے کس کا برا کیا۔ کس کا برا نہ کیا سوائے اپنے اور وہ سوائے اپنے اور وہ تباہ کر دیئے گئے۔ تو یہاں ان حالات کا ذکر آرہا ہے جو ان قوموں پر وارد ہوا کرتے تھے رسولوں کے آنے سے پہلے۔ یا جب رسول ان میں موجود ہوتے تھے تب فرمایا۔ (تفسیر تنویر)

عذاب کے آنے سے قبل شعیب (علیہ السلام) اپنے ساتھیوں کے ساتھ شہر سے نکل گئے تب عذاب آیا۔ اس کے بعد آپ جب شہر سے گزرے اور سب کفار کو مرے پڑے دیکھا تو فرمایا میں نے تمہیں اپنے رب کے پیغام پیہم پہنچائے اور نصیحت میں کمی نہ چھوڑی اب مجھے تمہارے مرنے پر افسوس نہیں۔

معلوم ہوا کہ دشمنان اسلام کے مرنے پر افسوس نہیں کرنا چاہیے خواہ قریبی رشتہ دار ہوں۔ اہل مدین شعیب (علیہ السلام) کے خونی و نسبی رشتہ دار تھے مگر آپ نے ان کے مرنے پر افسوس نہ کیا کیونکہ وہ دشمنان اسلام تھے۔ دشمن دین کے مرنے پر شکر بجالانا چاہیے کہ اللہ نے دین کا راستہ آسان فرمادیا۔ دوسری جگہ فرمایا گیا: فلا تاس علی القوم الفسقین۔ (مائدہ: 26) (تفسیر برہان القرآن)

آیات کا مقصد یہ ہے کہ رسول تباہی کی درخواست اس وقت اللہ سے کرتا ہے جبکہ پیمانہ صبر لبریز ہو جائے اور جب پوری مایوسی ہو، جب وہ تمام احکام تم تک پہنچا چکا ہو، ساری باتیں سنا چکا ہو، اب بھی اگر تم نہ مانو، تجھے تمہارے مٹ جانے پر قطعاً افسوس نہیں۔

انبیاء (علیہم السلام) بدرجہ غایت شفیق اور مہربان ہوتے ہیں، آخرت تک ہوش میں ہوتے، اور جاگتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح قوم میں اصلاح ہو اور دقت سے بچ جانے، مگر جب قلب و جگر پر مردنی چھا جائے غفلت و جہالت آنکھوں کی بینائی ضائع کر دے، تو پھر مہربانی کی کیونکہ توقع کی جاسکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ بھی نہیں چاہتے، کہ اس کے پیارے بندے ایک دم زندگی سے محروم ہو جائیں، اور نافرمانوں میں شمار ہوں، اس لیے وہ رسولوں کے علاوہ مصیبتیں بھیجتا ہے، مشکلات میں مبتلا کرتا ہے، تاکہ دل پسیجیں، متاثر ہوں، اور طبیعتوں میں گداز پیدا ہو، اور جب یہ ذرائع ناکام رہیں، اور امید کی کوئی کرن باقی نہ رہے، تو پھر ہلاکت کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ (تفسیر سراج البیان)

فوائد

ف 1: یعنی قوم کی ہلاکت کے بعد جب آپ اس محفوظ جگہ سے منتقل ہوئے، جہاں آپ محدود تھے تو ان بے جان نعشوں پر گزرے اور ان سے یہ کلام کیا (روح البیان وغیرہ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام ان کی وفات کے بعد کا ہے۔

ف 2: اس سے معلوم ہوا کہ مردے سنتے ہیں، کیونکہ شعیب (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے ان کی ہلاکت کے بعد کلام فرمایا۔ حضور نے ابو جہل وغیرہ سے بعد ان کی ہلاکت کے ان کی لاشوں پر کھڑے ہو کر کلام فرمایا۔

ف 3: یعنی تم لوگ اس قابل نہیں کہ تم پر رنج و غم کیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کافر کی ہلاکت یا موت پر غم کرنا جیسا کہ بعض مسلمانوں نے تلک یا گاندھی کی موت پر سیاہ کپڑے پہنے، یا اس کے مرثیے لکھے، یہ سب ناجائز ہے۔ بلکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے، ابوجہل کی موت کی خبر پا کر سجدہ شکر ادا کیا، کسی کی موت پر خوشی نہیں بلکہ دنیا فتنہ سے خالی ہو گئی، اس پر خوشی ہے۔ گلے ہوئے عضو کے کٹ جانے پر رنج و غم کیسا۔ (تفسیر نور العرفان)

آیت مبارکہ:

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ۝۹۴

لغۃ القرآن: [وَمَآ اَرْسَلْنَا: اور ہم نے نہیں بھیجا] [فِيْ قَرْيَةٍ: کسی بستی میں] [مِّنْ نَّبِيٍّ: کوئی بھی نبی] [اِلَّآ: مگر یہ کہ] [اَخَذْنَآ: ہم نے پکڑا] [اَهْلَهَا: اس کے لوگوں کو] [بِالْبَاْسَاۗءِ: سختی سے] [وَالضَّرَّاۗءِ: اور تکلیف سے] [لَعَلَّهُمْ: تاکہ وہ] [يَضَّرَّعُوْنَ: عاجزیں کریں]

ترجمہ: اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا مگر ہم نے اس کے باشندوں کو (نبی کی تکذیب و مزاحمت کے باعث) سختی و تنگی اور تکلیف و مصیبت میں گرفتار کر لیا تاکہ وہ آہ وزاری کریں

تشریح: اللہ تعالیٰ نے یہاں ایک بنیادی اصول ذکر فرمایا ہے کہ ہم قوموں کو تباہ و برباد کرنے سے پہلے غربت و افلاس اور جسمانی امراض کے ذریعے جھنجوڑا کرتے ہیں تاکہ بڑا عذاب آنے سے پہلے اپنی اصلاح کی طرف توجہ کریں۔ گویا کہ اس معمولی اور عارضی گرفت کے پیچھے۔ اللہ تعالیٰ کی دائمی شفقت اور حکمت پنہاں ہوتی ہے کہ لوگوں کو احساس ہو کہ اگر ہم نے نافرمانی کی روش اختیار کیے رکھی تو کوئی ہولناک عذاب ہمیں اچک لے گا۔

لہٰذا ہمیں خدا کی نافرمانی کے بجائے اس کی اطاعت میں رہنا چاہیے اس میں ہمارے رب کی خوشنودی اور دنیا و آخرت کی بھلائی ہے۔ جب لوگ ان جھٹکوں سے سمجھنے اور سلجھنے کی کوشش نہیں کرتے تو پھر اللہ تعالیٰ دوسری آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ غربت و افلاس کی جگہ مال کی فراوانی اور کشادگی دیتا ہے۔ بیماری اور عوارض کی جگہ صحت اور فراغت آجاتی ہے یہ چیزیں اس قدر کھلے انداز میں دے دی جاتی ہیں کہ لوگ اپنے آباؤ اجداد پر آنے والے مصائب اور آلام کو یہ کہہ کر بھول جاتے ہیں کہ یہ تو حالات کے مدوجزر کا نتیجہ تھا، ایسا ہوہی جایا کرتا ہے۔ بعض لوگ اسے منصوبہ بندی کا فقدان قرار دیتے ہیں اور اپنی کوششوں پر اتراتے ہوئے خود فریبی کا شکار ہو کر کہتے ہیں کہ اگر ہمارے بزرگ یہ احتیاطی تدابیر اختیار کرتے تو فلاں فلاں آفت سے مامون رہ سکتے تھے۔ اسی لیے قوم ثمود نے پہاڑوں کو تراش تراش کر محفوظ محلات اور مضبوط قلعے بنائے اور قوم عاد نے دعویٰ کیا کہ "مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً" "ہم سے زیادہ طاقتور کون ہو سکتا ہے؟" لیکن اللہ کے عذاب نے انھیں تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ دیکھنے والا سمجھتا تھا کہ یہاں کبھی کوئی بندہ، بشر رہا ہی نہیں۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اکثر اوقات اللہ تعالیٰ کا عذاب کنگال اور کمزور لوگوں کے بجائے معاشی لحاظ سے خوشحال اور سیاسی اعتبار سے صاحب اقبال لوگوں پر آتا ہے۔ یہ عذاب اس قدر اچانک آیا کرتا ہے کہ وہ اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ جب اللہ کا عذاب آجائے تو کسی قوم کی سیاسی برتری اور معاشی خوشحالی اسے ہرگز نہیں بچا سکتی۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

نمونہ کے لیے تذکیر بایام اللہ کے ضمن میں پانچ پیغمبروں کی امتوں کی ہلاکت کا بیان ہوا۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں صرف یہی پانچ پیغمبر تو مبعوث نہیں ہوئے، بلکہ ہر قوم اور ہر بستی کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول آیا۔ اور اپنی قوم تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا۔ اب یہاں آیات بالا میں بحیثیت مجموعی اقوام عالم کی ذہنیت اور ناکامی کے اسباب کا تذکرہ ہے۔ یعنی ایک عمومی دستور کا بیان ہے کہ انعام اور سزا کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا اصول ہمیشہ یکساں رہا ہے، اس میں کبھی تبدیلی نہیں آئی۔ اگر کسی قوم پر

انعام ہوتا ہے تو وہ بھی کسی خاص بنیاد کی وجہ سے، اور اگر کسی کو سزا ملتی ہے تو اس کے لیے بھی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ سنت اللہ ہمیشہ جاری ہے، اور انعام وسزا کے اسباب ذرائع کے تحت فیصلہ ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

" وماارسلنافی قریۃ من نبی " نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں رسول۔ قریہ کسی بھی آبادی کو کہتے ہیں، خواہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ تو فرمایا: ہمارا دستور ہر نبی کی بعثت کے ساتھ یہی رہا ہے کہ " اخذ نا اھلھا بالباساء والضراء " کہ ہم پکڑتے ہیں کہ اس بستی کے رہنے والوں کو بدحالی اور تکلیف کے ساتھ۔ سورۃ انعام میں بھی اس عمومی دستور اور قانون کا تذکرہ فرمایا: " ولقد ارسلناالی امم من قبلک فاخذ نھم بالباسا والضراء لعلھم یتضرعون۔ فلولااذ جاء ھم باسنا تضرعواو لکن قست قلوبھم وزین لھم الشیطن ماکانوایعملون۔ فلما نسواماذ کروابہ فتحنا علیھم ابواب کل شیء۔ حتی اذافرحوابمااوتوااخذ نھم بغتۃ فاذاھم مبلسون۔ فقطع دابر القوم الذین ظلمواوالحمد للہ رب العالمین "۔

سورۃ انعام اور سورۃ اعراف کی یہ مذکورہ آیتوں کا تقریباً خلاصہ اور مطلب ایک ہی ہے، جیسا کہ دونوں آیتوں کے کلمات سے معلوم ہوتا ہے۔ پچھلی آیتوں میں امتوں کی ہلاکت کا بیان ہوا، اور سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خطاب کرکے عموم ضابطہ ارشاد فرمایا کہ جب کسی قوم یا بستی کی طرف ہم اپنا رسول بھیج کر انہیں یوں ہی نہیں چھوڑ دیتے، بلکہ انہیں خوب آزماتے ہیں۔

عام طور پر آزمائش کے دو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں: ایک یہ کہ لوگوں کو مشکل اور تکلیف میں ڈال کر آزمایا جائے کہ وہ کس حد تک صبر اور برداشت سے کام لے سکتے ہیں، اور دوسرا یہ کہ آرام اور راحت وخوشحالی دے کر آزمائش کی جائے کہ یہ کس طرح شکر ادا کرتے ہیں۔ دوسرے مقام پر فرمایا: " ونبلوکم بالشر والخیر فتنۃ " (انبیاء) ہم تمہیں بھلائی اور برائی کے ذریعہ آزمائیں گے، تو یہاں بھی یہی فرمایا کہ ہم نے بستی والوں کو آزمایا تکلیف اور بدحالی دے کر۔ باساء بیرونی تکلیف کو کہتے ہیں، قحط اور خشک سالی وارد ہو جائے، زلزلہ اور سیلاب آجائے، اور طوفان آجائے، مہنگائی اور بدامنی آجائے، سخت سردی اور گرمی کی لہر آجائے۔ یہ سب بیرونی مصیبتیں ہیں، جو کسی قوم پر نازل ہو سکتی ہیں۔

اور الضَّرَاء انسان کی اندرونی تکلیف کو کہتے ہیں، جیسے وباء کی بیماری، ذہنی پریشانی، بدنی امراض، خوف وخطرہ، بھوک وپیاس وغیرہ۔ یہ سب اندرونی تکالیف ہیں۔ فرمایا: ہماری آزمائش کی پہلی صورت یہ ہے کہ کسی قوم کو اندرونی یا بیرونی تکلیف میں مبتلا کردیں، اور ایسا کرنے سے مقصود یہ ہوتا ہے: (لعلھم یضرعون) تاکہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑائیں اور اپنی بے بسی عجز وانکساری کا اظہار کریں۔ جب کوئی مشکل درپیش ہوتی ہے تو عام طور پر لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور خوب دعا کرتے اور توبہ کرتے رہتے ہیں۔ حدیث میں فرمایا: " عَجَباًلاَمر المومن ان اصابہ ضراء فصبر فکان خیر لہ وان اصابہ سراء فشکر فکان خیر اًلہ "

یعنی مومن کی حالت بڑی عجیب ہے، اگر اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے اور یہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے، اور اگر اس کو راحت پہنچتی ہے، صحت وعافیت، عزت وترقی، مال واولاد وغیرہ تو شکر کرتا ہے، یہ چیز اس کے لیے بہتر ہوتی ہے۔ دراصل ایمان انہی دو چیزوں صبر اور شکر سے مرکب ہے، نصف حصہ صبر اور نصف حصہ شکر میں اور مومن کبھی بھی آزمائش سے نہیں نکلتا۔ صبح وشام مصائب کا شکار رہتا ہے، یہاں تک کہ گناہوں سے چاندی کی طرح نکھر کر صاف ہو جاتا ہے۔ یہی عجز ونیاز، صبر وشکر اسے اونچے اور بلند وبالا مقامات تک پہنچا دیتا ہے۔

آزمائش کا دوسرا طریقہ یہ ارشاد فرمایا:

" ثم بدلنامکان السیئۃالحسنۃ " پھر ہم برائی کو بھلائی میں بدل دیتے ہیں، تکلیف کے بعد راحت اور بیماری کے بعد صحت، غم، وپریشانی کے بعد خوشحالی، غربت وفقر کے بعد مال ودولت کی فراوانی، خوف کے بعد امن وسلامتی، یہاں تک کہ یہ تمام آسائشیں بڑھ کر عام ہو جاتی ہیں۔ فرمایا: " حتی عفوا " کے معنی ہیں، بڑھنا، پھلنا پھولنا، زیادہ ہونا۔ یعنی ہر قسم کی فراوانی اور بہتات کا حصول۔

" وقالواقد مس اباء ناالضراء والسراء " پس انہوں نے بجائے شکر واقرار نعمت کے الٹا ناشکری اور کفران نعمت کرکے یہ کہا کہ یہ چیزیں خواہ از قبیل تکالیف ہوں، یا راحت وسکون کا حصول ہو، یہ کوئی نئی چیزیں نہیں ہیں۔ یہ ہمارے آباء واجداد کے زمانے میں بھی آتی رہی ہیں۔ ان چیزوں کا تعلق زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ ہے۔ دنیا کے دور اسی طرز پر چلا کرتے ہیں، یہ ہمارے اوپر کوئی خاص احسان اور تمغہ عنایت نہیں۔ دنیا دراصل انہیں رنگوں اور نیرنگیوں کا نام ہے، کبھی کیسا کبھی کیسا،

وغیرہ۔ افسوس کہ لوگوں نے ماضی سے، اور ہلاک شدہ نافرمان و ناشکرا اقوام کی ہلاکت سے کوئی سبق نہیں سیکھا، بلکہ انہیں روز مرہ کا معمول سمجھ کر ان سے پہلو تہی کرکے ناشکری پر اتر آئے۔ یہ کافر و ناشکر انسان کی مثال ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے علم میں کسی نافرمان قوم کی ہلاکت و تباہی کا فیصلہ ہو جاتا ہے، تو اتمام حجت کے طور پر ہلاکت سے پہلے ان لوگوں کو دو طرح آزمایا جاتا ہے: پہلے یہ کہ انہیں طرح طرح کی پریشانیوں سے آزمایا جائے، تاکہ معلوم ہو کہ وہ کہاں تک گڑگڑائیں گے، اور توبہ و عاجزی کے ساتھ صبر کریں گے۔

دوسرے یہ کہ ان بدحالیوں، پریشانیوں کو امن وراحت اور مال و خوشحالی کے ساتھ تبدیل کرکے، انہیں خوب راحتوں اور خوشحالیوں کا مالک بنا کر آزمایا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کریں گے یا نہیں۔ لیکن جب پہلی صورت میں وہ بجائے عجز و نیاز، تضرع و عاجزی کے مزید طغیانی اور سرکشی پر، اور تکذیب حق پر اتر آئے، اور دوسری صورت میں بجائے شکر و احسان مندی کے الٹا وہ یہ کہتے رہے کہ یہ خوشحالی و بدحالی ہمارے باپ دادوں پر آتی رہی ہیں، یہ دنیا کا الٹ پھیر اور گردش ہے، لہٰذا ہم ان چیزوں کے بدلے اپنا دین نہیں چھوڑ سکتے۔

جب یہ سب کچھ ظاہر ہو کر ان کی خرمستی نہیں ختم ہوتی" فاخذ نھم بغتۃ "کا فیصلہ ہو کر رہے گا، اور ایسے ناشکرو بے صبر قوموں کے مقدر میں سوائے ہلاکت کے کچھ نہ ہوگا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے نہ تنگدستی اور سختی سے عبرت لی، اور نہ خوشحالی اور نعمتوں پر شکر گزار ہوئی، لہٰذا ان کی گرفت کا اچانک فیصلہ ہوا، اور وہ مبتلائے عذاب ہو کر ہمیشہ کے لیے صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ (تفسیر منازل العرفان)

سابقہ آیات میں پانچ حضرات انبیاء کے واقعات کا بیان ہوا ہے، قرآن کریم کا مقصد واقعات بیان کرنے سے کچھ قصہ خوانی نہیں ہوتا بلکہ واقعہ سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے اس کو عبرت و نصیحت کیلئے بیان کرنا ہوتا ہے، سابق میں ایک ایک نبی کا الگ الگ واقعہ اور اس کا نتیجہ بیان کرنے کے بعد اب وہ جامع ضابطہ بیان کیا جارہا ہے جو ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء (علیہم السلام) کی بعثت کے موقع پر اختیار فرمایا ہے وہ یہ کہ جب کسی قوم میں کوئی نبی بھیجا گیا تو پہلے اس قوم کے خارجی ماحول کو قبول دعوت کیلئے سازگار بنانے کیلئے تنبیہات و ترغیبات سے کام لیا گیا یعنی ان کو فقر و فاقہ نیز مصائب و آفات، میں مبتلا کیا گیا، تاکہ ان کا دل نرم پڑے اور شیخی و تکبر سے اکڑی ہوئی گردنیں کچھ نرم پڑیں، ان کا غرور طاقت اور نشہ دولت دور ہو، جب اس سازگار ماحول میں بھی ان کا دل قبول حق کی طرف مائل نہیں ہوتا، تو ان کو خوشحالی کے فتنہ میں گرفتار کیا جاتا ہے یہیں سے ان کی بربادی کی تمہید شروع ہوتی ہے، ان کی تنگدستی کو فراخ دستی سے بدحالی کو خوشحالی سے بیماری کو صحت و عافیت سے بدل دیا جاتا ہے، تاکہ وہ اس پر اللہ کا شکر ادا کریں، مگر جب وہ نعمتوں سے مالا مال ہونے لگتی ہے تو اپنے برے دن بھول جاتی ہے اور ان کے کج فہم رہنما تاریخ کا یہ احمقانہ تصور ذہن میں بٹھا دیتے ہیں کہ حالات کا اتار چڑھاؤ اور قسمت کا بناؤ بگاڑ کسی قادر و حکیم کے انتظام میں اخلاقی بنیادوں پر نہیں ہے بلکہ خارجی اور داخلی اسباب سے کبھی اچھے اور کبھی برے دن آتے ہی رہتے ہیں، لہٰذا مصائب و آفات کے نزول سے کوئی اخلاقی سبق لینا اور کسی ناصح کی نصیحت قبول کرکے خدا کے آگے زاری و تضرع کرنے لگنا بجز ایک طرح کی نفسیانی کمزوری کے کچھ نہیں یہی وہ احمقانہ ذہنیت ہے جس کا نقشہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس حدیث میں کھینچا ہے، لایزال البلاء بالمؤمن حتی یخرج نقیاً من ذنوبہ، والمنافق مثلہٗ کمثل الحمار لایدری فیما ربطہٗ اھلہ ولا فیم ارسلوہٗ، (ترمذی کتاب الزھد ماجاء فی الصبر علی البلاء المستدرک للحاکم ۴۹۷)، یعنی مصیبت مومن کی تو اصلاح کرتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ جب وہ اس بھٹی سے نکلتا ہے تو ساری کھوٹ صاف ہو کر نکلتا ہے لیکن منافق کی حالت بالکل گدھے کی سی ہوتی ہے جو کچھ نہیں سمجھتا کہ اس کے مالک نے کیوں اسے باندھا تھا اور کیوں اسے کھول دیا، پس جب کسی قوم کا حال یہ ہوتا ہے کہ نہ مصائب سے اس کا دل خدا کے آگے جھکتا ہے اور نہ نعمتوں پر وہ شکر گزار ہوتی ہے تو ایسی قوم کسی حال میں اصلاح قبول نہیں کرتی ہے۔

آپ کے زمانہ کے حالات اور سورۃ اعراف:

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے جس ضابطہ کا ذکر فرمایا ہے ٹھیک یہی ضابطہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کے موقع پر بھی برتا گیا، اور شامت زدہ قوموں کے جس طرز عمل کی طرف اشار فرمایا گیا ہے ٹھیک وہی طرز عمل سورۃ اعراف کے نزول کے زمانہ میں اہل مکہ سے ظاہر ہو رہا تھا، حدیث میں عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس (رض) دونوں کی متفقہ روایت ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کے بعد جب قریش کے لوگوں نے آپ کی دعوت کے خلاف سخت رویہ اختیار کرنا شروع کیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دعاء کی کہ خدایا، یوسف (علیہ السلام) کے زمانہ میں جیسا ہفت سالہ

قحط پڑا تھا ویسے ہی قحط سے ان لوگوں کے مقابلہ میں میری مدد فرما چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں سخت قحط میں مبتلا کر دیا، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگ مردار کھانے لگے چمڑے ہڈیاں تک کھا گئے آخر کار مکہ کے لوگوں نے جن میں ابوسفیان پیش پیش تھا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے درخواست کی کہ ہمارے لیے خدا سے دعاء کیجئے، آپ نے دعاء فرمائی اور آپ کی دعاء کی برکت سے اللہ نے وہ برا وقت ٹال دیا اور بھلے دن آئے تو ان لوگوں کی گردنیں پہلے سے زیادہ اکڑ گئیں، اور جن کے دل کچھ پسیج گئے تھے ان کو بھی اشرار قوم نے یہ کہہ کر ایمان سے روکنا شروع کر دیا کہ میاں یہ تو زمانہ کا اتار چڑھاؤ ہے پہلے بھی آخر قحط آتے ہی تھے، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اس مرتبہ ذرا لمبا قحط پڑ گیا لہٰذا ان چیزوں سے دھوکا کھا کر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پھندے میں نہ پھنس جانا یہ باتیں اس زمانہ میں ہو رہی تھیں جب سورۃ اعراف نازل ہو رہی تھی، اس لیے قرآن مجید کی یہ آیات ٹھیک اپنے موقع پر چسپاں ہیں۔

(تفسیر جلالین۔ امام جلال الدین سیوطیؒ)

مومن اور مصیبتیں

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مومن مرد اور مومن عورت کی جان، مال اور اولاد پر ہمیشہ مصیبتیں آتی رہتی ہیں حتی کہ وہ اللہ سے اس حال میں ملاقات کرتا ہے کہ اس کے اوپر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ (سنن الترمذی، رقم الحدیث: 2407۔ مسند احمد، ج3، رقم الحدیث: 8918، صحیح ابن حبان، رقم الحدیث: 913۔ المستدرک، ج1، ص346)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب میں اپنے بندے کی دنیا میں دو آنکھیں لے لیتا ہوں تو میرے نزدیک اس کے لیے جنت کے سوا اور کوئی جزا نہیں ہے۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 5653۔ سنن الترمذی، رقم الحدیث: 2408۔ جامع الاصول، ج6، رقم الحدیث: 4625)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قیامت کے دن اہل عافیت جب مصیبت اٹھانے والوں کا ثواب دیکھیں گے تو یہ تمنا کریں گے کہ کاش ان کی کھال کو دنیا میں قینیچی سے کاٹ دیا جاتا۔ (سنن الترمذی، رقم الحدیث: 2410۔ المشکوۃ، رقم الحدیث: 1570۔ الترغیب و الترہیب، ج4، ص282)

پس مسلمانوں کو چاہیے کہ جب ان پر مصائب آئیں تو وہ یہ یقین کریں کہ یہ ان کے گناہوں کی وجہ سے ہیں اور ان کے گناہوں کا کفارہ ہو جائیں گے۔ وہ ان مصائب پر صبر کریں اور ان پر واویلا نہ کریں اور حرف شکایت زبان پر نہ لائیں اور جب ان پر اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہو تو اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کریں اور اگر انھوں نے رنج و راحت کے ایام کو گردش دوراں اور زمانہ کی عادت پر محمول کیا تو پھر ان کا یہ عمل کافروں کے عمل کے مشابہ ہوگا۔

آیت مبارکہ:

ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۹۵

لغۃ القرآن: [ثُمَّ : پھر] [بَدَّلْنَا : ہم نے بدل دیا] [مَكَانَ السَّيِّئَةِ : برائی کی جگہ کو] [الْحَسَنَةَ : بھلائی سے] [حَتّٰي : یہاں تک کہ] [عَفَوْا : وہ لوگ بڑھے (ترقی کی)] [وَّقَالُوْا : اور کہا [قَدْ مَسَّ : چھو چکی ہے] [اٰبَآءَنَا : ہمارے باپ دادوں کو] [الضَّرَّآءُ : تکلیف (بھی)] [وَالسَّرَّآءُ : اور خوشی (بھی

)] [فَاَخَذْنٰهُمْ :تو ہم نے پکڑا ان کو] [بَغْتَةً :اچانک] [وَّهُمْ : اور وہ] [لَا يَشْعُرُوْنَ :شعور نہیں رکھتے تھے]

ترجمہ: پھر ہم نے (ان کی) بدحالی کی جگہ خوش حالی بدل دی، یہاں تک کہ وہ (ہر لحاظ سے) بہت بڑھ گئے۔ اور (ناشکری سے) کہنے لگے کہ ہمارے باپ دادا کو بھی (اسی طرح) رنج اور راحت پہنچتی رہی ہے سو ہم نے انھیں اس کفران نعمت پر اچانک پکڑ لیا اور انھیں (اس کی) خبر بھی نہ تھی

تشریح: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے انبیاء کی تکذیب کے باعث ان کی قوموں پر بھیجے گئے مصائب سے جب انھوں نے سبق نہ لیا تو ہم نے مصائب کی جگہ انھیں آسانیاں دے دیں تاکہ ان کی رسی دراز ہو جائے چنانچہ ان کی رسی اس قدر دراز ہوئی کہ وہ کہنے لگے یہ دکھ سکھ تو ہمارے باپ دادا کو بھی آیا کرتے تھے نا ان کا دکھ کسی نبی کی تقریب کے باعث تھا، نہ ان کا سکھ کسی نبی پر ایمان لانے کے سبب سے تھا۔ یہی حال ہمارا ہے لہٰذا اگر ہمیں پہلے مصائب آئے پھر آسانیاں پہنچیں تو یہ معمول کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے وہ اسی دھوکا میں تھے کہ ہم نے انھیں اچانک پکڑ لیا اور وہ بیخبر ہو کر دنیا میں منہمک تھے دوسری جگہ قرآن میں ہے۔ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓي اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ "جب وہ اللہ کی دی ہوئی نصیحت کو بھول گئے تو ہم نے ان پر ہر نعمت کا دروازہ کھول دیا یہاں تک کہ جب وہ دی گئی نعمتوں پر خوش ہو گئے تو ہم نے انھیں اچانک پکڑ لیا تب وہ مایوس پڑے تھے۔ چنانچہ ظالموں کی جڑ کاٹ دی گئی اور سب تعریف اللہ رب کائنات کے لیے۔" (انعام : 44) (برہان)

یعنی ان پر انعام و اکرام کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ اولاد، مال، عزت و وقار اور ہر قسم کی آسائش انھیں مہیا کر دی جاتی ہیں تاکہ وہ اپنے محسن حقیقی کو پہچان کر اس کی نافرمانی سے باز آجائیں اور اس کی اطاعت و فرمان برداری اختیار کرلیں۔ لیکن اگر وہ مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹنے کے بعد بھی بیدار نہ ہوئے اور نعمت و احسان کی فراوانی کے باوجود بھی ان کے دلوں میں اپنے مہربان اور کریم پروردگار کے لیے شکر گزاری کا جذبہ پیدا نہیں ہوا تو پھر ان کی اصلاح کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ وہ جسم کے ایسے کرم خوردہ عضو کی طرح ہیں جس کا کاٹ دینا باقی جسم کی عافیت کے لیے از بس ضروری ہے۔ علامہ قرطبیؒ لفظ عفو کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ اضداد سے ہے۔ اس کا معنی بڑھنا اور زیادہ ہونا بھی ہے اور مٹ جانا بھی۔ یہاں پہلے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ حضرت ابن عباس (رض) نے عفوا کا معنی کثروا کیا ہے وعفا : من الاضداد۔ عفا : کثر وعفا : درس وقال ابن زید : کثرت اموالہم (قرطبیؒ) (ضیاء القرآن)

یہاں دو فوائد حاصل ہوئے :

1۔ دنیوی آسائشوں میں اللہ سے غافل ہو جانا کفار کا کام ہے۔

یعنی یہ کفار کی حالت تھی کہ ان پر آسائشوں کے دروازے کھولے گئے تو وہ اللہ سے غافل ہو گئے تب انھیں اچانک پکڑ لیا گیا۔ مومن کو چاہیے کہ آسائشوں اور نیٹو میں خدا کو یاد رکھے۔ مگر عموما یہ ہوتا ہے کہ دولت مل جانے پر کئی لوگ بے دین ہو جاتے ہیں نماز روزہ ترک کر دیتے ہیں اور ان کی عورتوں کے سروں سے پردہ غائب ہو جاتا ہے یہ اللہ کی پکڑ ہے۔ مومن کا کام یہ ہے کہ وہ مصیبت کے آنے پر صبر سے کام لے اور نعمت کے ملنے پر شکر بجالائے۔ گویا ہر حال میں اللہ ہی کی طرف متوجہ رہے۔

حضرت صہیب رومی (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : مومن کا حال کتنا عجیب ہے اس کا ہر معاملہ ہی خیر والا ہوتا ہے اور یہ حال صرف مومن کا ہے اگر اس کو خوشی ملے تو شکر ادا کرتا ہے اور وہ اس کے لئے خیر ہے اور اگر اسے تکلیف آئی تو صبر کرتا ہے تو وہ بھی اس کے لیے خیر ہے۔ (مسلم کتاب الزھد باب 14 حدیث 2,997)۔

2۔ کسی کی دنیوی راحت اس کی صداقت کی دلیل نہیں :

کفار پر نعمتوں کے دروازے کھولے گئے مگر یہ اس لیے تھا تاکہ انھیں توبہ کی مہلت نہ ملے اور اچانک پکڑے جائیں۔ یہی حال بعض ظالم حکمرانوں اور عیاش لوگوں کا ہے وہ چند دن داد عیش دیتے ہیں پھر اچانک داعی اجل آتا اور انھیں اٹھا کرلے جاتا ہے اور انھیں توفیق توبہ بھی نہیں ملتی۔ اللہ کی خفیہ تدبیر سے ڈرنا چاہیے۔

(تفسیر برہان القرآن)

بجائے اس کے کہ وہ ان مصائب اور تکالیف سے عبرت حاصل کرتے اور اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتے وہ یہ کہہ کر اپنے دلوں کو تسلی دے دیتے کہ یہ ژالہ باری جس نے ہمارے کھیتوں اور باغوں کا ستیاناس کر دیا ہے، یہ قحط جس نے زمین سے روئیدگی کی ساری قوت چھین لی ہے۔ یہ زلزلہ جس کے ہوش ربا جھٹکوں نے ہماری بارونق اور آباد بستیوں کو زیروزبر اور فلک بوس عمارتیں کو پیوند زمین کر دیا ہے۔ یہ جنگ جس کی ہلاکت خیزیوں نے قیامت برپا کر دی ہے۔ یہ ہماری کسی اخلاقی کمزوری یا کاروباری بددیانتی اور غریبوں پر ظلم وتعدی کی سزا نہیں بلکہ پہلے بھی اکثر یوں ہوتا رہا ہے۔ موسمی تغیرات یا سیاسی حالات کی وجہ سے یہ حادثات رونپذیر ہوگئے ہیں۔ ان گزری ہوئی قوموں کو ہم رہنے دیں۔ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر ذرا اپنا مغاسبہ کریں۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد کونسی ایسی مصیبت ہے جس سے ہم دو چار نہیں ہوئے۔ سیلابوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو مشرقی اور مغربی پاکستان کے دریا اپنی قہر آلود موجوں سے ہمارے ہزار رہاگاؤں کو بہالے جاتے ہیں۔ سینکڑوں بڑے بڑے شہروں کی بنیادیں لرز اٹھتی ہیں۔ جان ومال کے نقصانات کا اندازہ کروڑوں روپیہ سے زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن کیا ہم اس سے کچھ عبرت حاصل کرتے ہیں کہ اس سال مون سون کی ہوائیں بڑے زور شور سے اٹھیں اور پہاڑوں سے آکر ٹکرائیں اور متواتر کئی دنوں تک موسلادھار بارش برستی رہی جس کی وجہ سے یہ طغیانی آگئی اور فلاں فلاں گاؤں اور شہر غرقاب ہوگئے۔ پھر سیلاب زدگان کی امداد کے لیے رقص وسرود کی محفلیں ترتیب دی جاتی ہیں جہاں ننگے اور فحش گانے ہوتے ہیں اور ان ذلیل حرکات سے جو رقم اکٹھی ہوتی ہے وہ بھی اکثر وبیشتر امدادی پروگرام کے منتظموں کی جیب سے یوں چمٹ کر رہ جاتی ہے کہ باہر نکلنے کا نام نہیں لیتی۔ آج کی مادہ پرستانہ ذہنیت جس نگاہ سے ان حادثات کو دیکھتی ہے اور پھر اس کے لیے جو علاج تجویز کرتی ہے ان تباہ ہونے والی قوموں کا بھی یہی حال تھا۔ اسی کو قرآن نے اپنے معجزانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اور بیان کا مقصد یہ نہیں کہ ہم گزشتہ اقوام کی کج فہمیوں پر طنزیہ قہق ہے لگاویں یا رسمی طور پر اظہار افسوس کر دیں۔ بلکہ مقصد وحید یہ ہے کہ ہم اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں اور ان مہلت کی گھڑیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آپ کو اس دردناک انجام سے بچائیں جس سے سابقہ قوموں کو اپنی سرکشیوں کے باعث دوچار ہونا پڑا تھا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

ناگہانی آفات اور مسلمانوں کی حالت زار:

ان گزری ہوئی قوموں کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے موجودہ حالات پر تھوڑا غور کرلیں اور اپنے گریبان میں جھانک کر اپنا محاسبہ کرنے کی کوشش کریں کہ ایسی کون سی مصیبت ہے جس سے ہم دوچار نہیں ہوئے، اب بھی طوفان، زلزلے، سیلاب آتے ہیں لیکن ان سے عبرت حاصل کرنے کی بجائے ان کی سائنسی تحقیقات پر غور کیا جاتا ہے اور جو لوگ اس مصیبت میں مبتلا ہوں ان کا تماشا دیکھا جاتا ہے۔ بقیہ ان چیزوں کو دیکھ کر عبرت حاصل کرنا، توبہ کی طرف راغب ہونا، بارگاہ الٰہی میں رجوع کرنا، برے اعمال چھوڑ دینا، نیک اعمال میں مشغول ہو جانا، ظلم وستم اور بددیانتی کو چھوڑ دینا یہ سب کچھ پھر بھی نہیں کیا جاتا بلکہ افسوس ! ہمارے دل کی سختی کا تو یہ عالم ہے کہ طوفان کا سن کر اللہ عَزَّوَجَلَّ سے پناہ مانگنے اور اپنے گناہوں سے توبہ کرنے کی بجائے خوشی خوشی ساحل سمندر کی طرف طوفان کا نظارہ کرنے دوڑتے ہیں، گویا آنے والے طوفان جو ممکن تھا کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کا عذاب ہوں اسے بھی اپنی تفریح کا ایک ذریعہ سمجھ لیتے ہیں، زلزلہ یا سیلاب کی تباہی دیکھ کر عبرت پکڑنے کی بجائے ان مصیبت زدوں کی جان ومال اور عزت وآبرو پر ڈاکے ڈالنے لگ گئے۔ ان مصیبت کے ماروں کے لیے امداد رقص وسرور کی محفلیں سجا کر، بے حیاء عورتوں کے ڈانس دکھا کر، فحش اور گندے گانے سنا کر جمع کرنے لگ گئے۔ اللہ تعالیٰ ہماری قوم کو عقل سلیم عطا فرمائے۔

بادل، آندھی وغیرہ کو دیکھ کر سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا عمل مبارک کیا تھا اسے اس حدیث پاک کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیں، حضرت عائشہ صدیقہ (رض) سے مروی ہے کہ جب رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تیز آندھی کو ملاحظہ فرماتے اور جب بادل آسمان پر چھا جاتے تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چہرۂ اقدس کا رنگ مُتَغَیَّر ہو جاتا اور آپ کبھی حجرہ سے باہر تشریف لے جاتے اور کبھی واپس آجاتے، پھر جب بارش ہو جاتی تو یہ کیفیت ختم ہو جاتی۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو ارشاد فرمایا" اے عائشہ (رض) ! مجھے یہ خوف ہوا کہ کہیں یہ بادل اللہ عَزَّوَجَلَّ کا عذاب نہ ہو جو میری امت پر بھیجا گیا ہو۔ (تفسیر صراط الجنان)

آیت مبارکہ:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۹۶

لغۃ القرآن: [وَلَوْ : اور اگر] [اَنَّ : یہ کہ] [اَهْلَ الْقُرٰٓي : ان بستیوں والے] [اٰمَنُوْا : ایمان لاتے] [وَاتَّقَوْا : اور تقوی اختیار کرتے] [لَفَتَحْنَا : تو ہم ضرور کھول دیتے] [عَلَيْهِمْ : ان پر] [بَرَكٰتٍ : برکتیں] [مِّنَ السَّمَآءِ : آسمان سے] [وَالْاَرْضِ : اور زمین سے] [وَلٰكِنْ : اور لیکن] [كَذَّبُوْا : انہوں نے جھٹلایا [فَاَخَذْنٰهُمْ : تو ہم نے پکڑا ان کو] [بِمَا : بسبب اس کے جو] [كَانُوْا : جو وہ تھے] [يَكْسِبُوْنَ : کماتے]

ترجمہ: اور اگر (ان) بستیوں کے باشندے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں کھول دیتے لیکن انھوں نے (حق کو) جھٹلایا، سو ہم نے انھیں ان اعمال (بد) کے باعث جو وہ انجام دیتے تھے (عذاب کی) گرفت میں لے لیا

تشریح: اللہ تعالیٰ نے فرقان مجید کی سورۃ نساء کی آیت ۱۱۵ میں ایک اصول بیان فرمایا ہے کہ ہدایت واضح ہونے کے باوجود جو شخص ہمارے رسول کی مخالفت کرے گا ہم اسے ادھر ہی پھیر دیں گے جدھر وہ جانا چاہتا ہے۔ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۲۰ میں فرمایا کہ جو دنیا چاہتے ہیں اسے اس کے نصیب کی دنیا دے دیتے ہیں۔ جو آخرت چاہتا ہے اسے آخرت عطا کر دیتے ہیں۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اگر لوگ ایمان اور تقویٰ کا راستہ اختیار کریں گے تو ہم ان کے لیے زمین و آسمان کی برکات کے دروازے کھول دیں گے۔ لیکن انسانوں کی اکثریت ہمیشہ اس طرح رہی ہے کہ وہ ایمان اور پرہیزگاری کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے من مانی اور خدا کی نافرمانی میں دنیا کی ترقی سمجھتے ہیں۔ جو اللہ کی ذات اور اس کی تعلیمات کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ جب لوگ نیکی کے بجائے برائی، حلال کی جگہ حرام، اور خدا کی اطاعت کے بجائے نافرمانی کا رویہ اختیار کرتے ہیں تو پھر اکثر اوقات دنیا میں ہی انھیں اپنے کیے کی سزا مل جاتی ہے۔ یہاں اہل ایمان اور تقویٰ اختیار کرنے والوں کو زمین و آسمان کی برکات کی خوشخبری دی گئی ہے۔ برکت کی جمع برکات ہے جب اللہ تعالیٰ کسی چیز میں برکت پیدا فرماتا ہے تو وہ چیز تعداد اور مقدار میں تھوڑی ہونے کے باوجود آدمی کو کفایت کر جاتی ہے۔ اور انسان اس پر مطمئن ہوتا ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کی عمر میں برکت ڈال دی جائے تو وہ تھوڑی مدت میں وہ کارہائے نمایاں سرانجام دے پاتا ہے کہ لوگ اس سے مدت تک استفادہ کرتے ہیں۔ خورد و نوش میں برکت ڈال دی جائے تو آدمی کے لیے پانی کے چند گھونٹ اور خوراک کے چند لقمے ہی کافی ہوتے ہیں۔ لیکن جب برکت اٹھالی جائے تو پیٹ بھر کھانے کے باوجود طبیعت سیر نہیں ہوتی اور انواع واقسام کے کھانے بھی اس کی قوت و توانائی میں اضافہ نہیں کرتے۔ جب برکت اٹھ جاتی ہے تو بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ گھر میں سب کچھ ہونے کے باوجود نہ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اور ہر نعمت میسر ہونے کے باوجود انسان اس سے اس لیے استفادہ نہیں کر سکتا کہ وہ چیزیں استعمال کرنے سے اس کی صحت مزید بگڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے گویا کہ کسی چیز سے برکت اٹھالی جائے تو انسان اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آج دنیا کی غالب اکثریت اسی حالت سے دوچار ہے۔ کھیت سرسبز و شاداب، فیکٹریاں دن رات ٹھک ٹھک چل رہی ہیں، ذرائع مواصلات پہلے سے کہیں زیادہ اور ہر چیز کی فراوانی ہے لیکن انسان روحانی اور جسمانی اعتبار سے اپنے ہی آپ میں کھویا ہوا، مضطرب اور پریشان دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے سرور دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کھانا کھانے کے بعد اور مختلف مواقعوں پر اللہ تعالیٰ سے برکت کی دعا فرمایا کرتے تھے۔

"مگر جو شخص ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور مومنوں کی راہ چھوڑ کر اور راہ اختیار کرے تو ہم اسے ادھر پھیر دیتے ہیں جدھر کا اس نے رخ کیا ہے، پھر ہم اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین ٹھکانا ہے۔ [النساء : ۱۱۵]

"جو شخص آخرت کی کھیتی چاہتا ہے ہم اس کی کھیتی بڑھا دیتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے اس میں سے کچھ دے دیتے ہیں اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔" [الشوریٰ : ۲۰]

"حضرت عبداللہ بن بسر (رض) بیان کرتے ہیں رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرے والد کے پاس آئے تو ہم نے آپ کو کھانا پیش کیا۔ آپ نے کھانا کھایا پھر آپ کو کھجوریں پیش کیں۔ آپ کھجوریں کھا کر گٹھلیاں اپنی دونوں انگلیوں کے درمیان رکھتے جاتے ہیں۔ شعبہ کہتے ہیں میرا خیال ہے کہ اگر اللہ نے چاہا تو وہ بالکل درست ہے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دونوں انگلیوں کے درمیان گٹھلیاں رکھ کر پھینکتے جاتے، پھر آپ کو پانی دیا گیا۔ تو آپ نے نوش فرمایا پھر برتن دائیں جانب بیٹھے شخص کے حوالے کیا میرے والد نے آپ کی سواری کی لگام پکڑی ہوئی تھی انھوں نے کہا ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اے اللہ ! ان کے رزق میں برکت فرما اے اللہ ! ان کے گناہ معاف فرما اور ان پر رحم فرما۔"

(عَنْ اَنَسٍ (رض) قَالَ رَاٰی النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عَلٰی عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ (رض) اَثَرَ صُفْرَۃٍ فَقَالَ مَھْیَمْ اَوْمَہْ قَالَ قَالَ تَزَوَّجْتُ امْرَاَۃً عَلٰی وَزْنِ نَوَاۃٍ مِنْ ذَھَبٍ فَقَالَ بَارَکَ اللّٰہُ لَکَ اَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاۃٍ) [رواہ البخاری :]

"حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عبدالرحمٰن بن عوف (رض) پر زرد رنگ کے کچھ اثرات دیکھے آپ نے استفسار فرمایا یہ کیا ہے ؟ حضرت عبدالرحمٰن نے کہا میں نے سونے کی ایک ڈلی مہر کے عوض ایک عورت سے نکاح کیا ہے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ تیرے لیے بابرکت بنائے ولیمہ کرو خواہ ایک ہی بکری سے کرو۔"

(عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ (رض) قَال قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) إِذَا أَکَلَ أَحَدُکُمْ طَعَامًا فَلْیَقُلْ اللّٰھُمَّ بَارِکْ لَنَا فِیہِ وَأَطْعِمْنَا خَیْرًا مِنْہُ وَإِذَا سُقِیَ لَبَنًا فَلْیَقُلْ اللّٰھُمَّ بَارِکْ لَنَا فِیہِ وَزِدْنَا مِنْہُ) [رواہ ابوداؤد : کتاب الأشربۃ]

"حضرت عبداللہ بن عباس (رض) بیان کرتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھائے تو کہے اے اللہ ہمارے لیے اس کھانے میں برکت ڈال دے اور ہمیں اس سے بہتر کھانا کھلا اور جب دودھ پیے تو کہے اے اللہ ! ہمارے لیے اس میں برکت ڈال دے اور ہمیں اس سے زیادہ عنایت فرما۔" (تفسیر فہم القرآن)

وَلَوْ اَنَّ اَھْلَ الْقُرٰی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا : اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے۔ } پہلی آیت میں بیان ہوا کہ جب ان قوموں نے نافرمانی اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا عذاب نازل کیا اور اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ اگر وہ لوگ اطاعت و فرمان برداری کرتے تو اس صورت میں آسمانی اور زمینی برکتیں انھیں نصیب ہوتیں چنانچہ ارشاد فرمایا کہ "اگر بستیوں والے اللہ عَزَّوَجَلَّ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور قیامت کے دن پر ایمان لاتے اور خدا اور رسول کی اطاعت اختیار کرتے اور جس چیز سے اللہ عَزَّوَجَلَّ اور رسول عَلَیہِ السَّلَام نے منع فرمایا اس سے باز رہتے تو ضرور ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں کھول دیتے اور ہر طرف سے انھیں خیر پہنچتی، وقت پر نافع اور مفید بارشیں ہوتیں، زمین سے کھیتی پھل بکثرت پیدا ہوتے، رزق کی فراخی ہوتی، امن و سلامتی رہتی اور آفتوں سے محفوظ رہتے۔ (تفسیر صراط الجنان)

نیک اعمال نزول رحمت کا سبب ہیں اور بد اعمال نزول عذاب کا باعث ہیں :

اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ اگر بستیوں والے اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاتے اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتے اور جن چیزوں سے اس نے منع کیا ہے ان سے باز رہتے تو اللہ ان پر آسمانوں اور زمینوں سے برکتوں کے دروازے کھول دیتا۔ آسمان سے بارشیں نازل فرماتا اور زمین سبزہ اور فصل اور فصل اگاتی اور ان کے

جانوروں اور مویشیوں میں کثرت ہوتی اور ان کو امن اور سلامتی حاصل ہوتی لیکن انھوں نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر اور ان کی معصیت کی وجہ سے ان پر خشک سالی اور قحط کو مسلط کر دیا۔

اس کے بعد دوسری آیتوں سے مقصود انھیں اس بات سے ڈرانا ہے کہ کہیں ان کی غفلت کے اوقات میں ان پر اچانک عذاب آ جائے۔ مثلاً جس وقت یہ سوئے ہوں یا دن کے کسی وقت میں جب یہ لہو ولعب میں مشغول ہوں تو ان پر اچانک عذاب آ جائے۔ پھر فرمایا: کیا یہ اللہ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف ہو گئے ہیں اور اللہ کی خفیہ تدبیروں میں سے یہ ہے کہ ان کی بے خبری میں اچانک ان پر عذاب آ جائے۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ ایمان صحیح اخروی سعادت اور دنیاوی کشادگی کا سبب ہے اور کفر اور معصیت عذاب کا لازمی نتیجہ ہے۔ ان آیات میں مسلمانوں کو اعمال صالحہ کی ترغیب دی ہے اور کافروں کو عذاب سے ڈرایا ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

تقویٰ رحمتِ الٰہی ملنے کا ذریعہ ہے:

اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی رحمت الٰہی کا ذریعہ ہے۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"وَمَن يَّـتَّقِ اللّٰہَ يَجۡعَلۡ لَّہٗ مَخۡرَجًا"

اور جو اللہ سے ڈرے اللہ اس کے لیے (دنیا و آخرت کی مصیبتوں سے) نکلنے کا راستہ بنا دے گا۔

مصائب کی دوری کے لیے نیک اعمال کرنے جائز ہیں:

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیاوی مصائب دور کرنے کے لیے نیک اعمال کرنے جائز ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کیلئے عمل کیا جائے تاکہ وہ اپنی رحمت فرماتے ہوئے ہماری حاجت پوری کر دے، اسی لیے بارش کیلئے نماز اِستِسقاء اور گرہن میں نماز کسوف پڑھتے ہیں۔ یہاں ہم ظاہری اور باطنی مصائب کی دوری کے لیے احادیث میں مذکور چند اعمال ذکر کرتے ہیں تاکہ مسلمان ان پر عمل کرکے اپنے مصائب دور کرنے کی کوشش کریں۔

(1)۔۔ امُّ المومنین حضرت امِّ سلمہ (رض) فرماتی ہیں: میں نے سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس مسلمان پر کوئی مصیبت آئے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّاۤ اِلَيۡہِ رَاجِعُوۡنَ" پڑھے (اور یہ دعا کرے) "اَللّٰھُمَّ اۡجُرۡنِیۡ فِیۡ مُصِيۡبَتِیۡ وَاَخۡلِفۡ لِیۡ خَيۡرًا مِّنۡہَا" "اے اللہ! میری اس مصیبت پر مجھے اجر عطا فرما اور مجھے اس کا بہتر بدل عطا فرما" تو اللہ تعالیٰ اس کو اس سے بہتر بدل عطا فرمائے گا۔

(2)۔۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "یہ دل ایسے زنگ آلود ہوتے رہتے ہیں جیسے لوہا پانی لگنے سے زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ان دلوں کی صیقل کیا ہے؟ ارشاد فرمایا" موت کی زیادہ یاد اور قرآن کریم کی تلاوت۔

(3)۔۔ حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) سے روایت ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جو شخص روزانہ رات کے وقت سورۂ واقعہ پڑھے تو وہ فاقے سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

(4)۔۔ حضرت عطاء بن ابی رباح (رض) فرماتے ہیں "مجھے خبر ملی ہے کہ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا" جو دن کے شروع میں سورۂ یٰسٓ پڑھ لے تو اس کی تمام ضرورتیں پوری ہوں گی۔

{ وَلٰكِنۡ كَذَّبُوۡا: مگر انھوں نے تو جھٹلایا۔} یعنی ایمان لانے کی صورت میں تو ہم انھیں زمینی اور آسمانی برکتوں سے نوازتے لیکن وہ ایمان نہ لائے اور اللہ عَزَّوَجَلَّ کے رسولوں (علیہ السلام) کو جھٹلانے لگے تو ہم نے انھیں ان کے اعمال کی وجہ سے عذاب میں گرفتار کر دیا۔

وسعتِ رزق سعادت بھی ہے اور وبال بھی:

اس آیت سے ثابت ہوا کہ جب انسان اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ ہو تو رزق میں وسعت اور فراخ دستی سعادت ہے اور جب ناشکرا ہو تو یہ اس کے لیے وبال ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے

"وَاِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّكُمۡ لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ وَلَئِنۡ كَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِىۡ لَشَدِيۡدٌ"

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے اعلان فرمادیا کہ اگر تم میرا شکرادا کروگے تو میں تمہیں اور زیادہ عطا کروں گا اور اگر تم ناشکری کروگے تو میرا عذاب سخت ہے۔
(تفسیر صراط الجنان)

آیت مبارکہ:

اَفَاَمِنَ اَهۡلُ الۡقُرٰٓى اَنۡ يَّاۡتِيَهُمۡ بَاۡسُنَا بَيَاتًا وَّهُمۡ نَآٮِٕمُوۡنَ ۝٩٧

لغۃ القرآن:]اَفَاَمِنَ: تو کیا امن میں ہوئے][اَهۡلُ الۡقُرٰٓى: بستیوں والے][اَنۡ: (اس سے) کہ][يَّاۡتِيَهُمۡ: پہنچے ان کو][بَاۡسُنَا: ہماری سختی][بَيَاتًا: رات کے وقت][وَّهُمۡ: اور وہ][نَآٮِٕمُوۡنَ: سوئے ہوئے ہوں]

ترجمہ: کیااب بستیوں کے باشندے اس بات سے بے خوف ہوگئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب (پھر) رات کو آپہنچے اس حال میں کہ وہ (غفلت کی نیند) سوئے ہوئے ہیں

تشریح:

سابقہ آیات میں پانچ اقوام کی تباہی اور اس کے اسباب بیان کرتے ہوئے دنیا میں جزاء وسزا کا ایک عمومی اصول بیان فرمایا اور اس کے بعد ایمان اور تقویٰ کی ترغیب دیتے ہوئے زمین وآسمان کی برکات کی خوشخبری سنائی اب پھر مجرموں کو وارننگ دی جارہی ہے۔
یعنی کیا لوگ سنت الٰہیہ کو دیکھتے ہوئے بھی اس قدر بے خوف ہوگئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو خوشحالی اور فراوانی دے کر اور شدائد ومصائب میں مبتلا کرکے آزماتا ہے۔ اس کے بعد ناشکروں اور نافرمانوں اور جھٹلانے والوں کو تباہ وبرباد کرتا ہے اور ان کی تباہی اور ہلاکت کے میدان تمہاری نظروں کے سامنے ہیں جو تباہ ہوئے اور جنہوں نے ان بستیوں کو خوب آباد کیا اور تباہی کے بعد پیچھے آنے والوں کے لیے چھوڑ دیا، کیا وہ اس سے بے خوف ہوگئے ہیں کہ ان پر بھی اچانک عذاب الٰہی آجائے اور وہ غفلت اور بے خبری میں مبتلا ہوں اور تباہ وبرباد ہوجائیں۔ عذاب دن کے کسی وقت میں آئے یا رات کو کسی ایسے وقت میں آئے کہ وہ غافل ہوں یاد رہے کہ نیند میں انسان اس طرح غرق ہوتا ہے کہ اس کے اندر کوئی شعور اور ارادہ نہیں رہتا اور نہ کوئی کام کرنے کی قوت ہوتی ہے۔ نہ وہ احتیاطی تدابیر اختیار کرسکتا ہے۔ نہ کسی معمولی کیڑے مکوڑے کے خلاف مدافعت کرسکتا ہے۔ اللہ جیسی عظیم قوت کے مقابلے میں تو وہ کیا کرے گا؟ جس کے مقابلے میں کوئی انسان نہایت بیداری اور قوت وحکمت کے ساتھ بھی کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

قریٰ کا واحد "قَرْيَة" ہے یہ لفظ شہر اور دیہات دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے اسے شہر اور بستیوں کے لیے استعمال فرمایا ہے سورۃ زخرف آیت: ۳۱ میں ہے کہ لوگ شہروں کے رہنے والے ہوں یا دیہاتوں کے بسنے والے۔ (فہم)
قریٰ سے مراد مکہ مکرمہ اور اس کے گرد ونواح کی بستیاں ہیں، کیونکہ انھوں نے ہی حضور نبی مکرم محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جھٹلایا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لفظ عام ہے اور تمام بستیوں کو شامل ہے۔ آیت: ان یاتیھم باسنا یعنی ان پر ہمارا عذاب آجائے۔ بیاتا رات کے وقت۔ (تفسیر قرطبیؒ)
انھیں وارننگ اور انتباہ کیا جارہا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی بغاوت اور نافرمانیاں کرکے کس طرح پرسکون اور امن میں رہ سکتے ہو؟ یہ تو اللہ کی حکمت اور اس کی طے شدہ پالیسی ہے کہ وہ باغی اور نافرمانوں کو ایک وقت مقرر تک مہلت دیتا ہے اگر وہ لوگوں کے جرائم اور گناہوں کی وجہ سے پکڑنے پر آجائے تو زمین پر چلنے والی کوئی چیز باقی نہ رہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ لوگوں کو مدت معینہ تک مہلت دیتا ہے۔ جب مہلت ختم ہوجاتی ہے تو ایک لمحہ تقدیم یا تاخیر نہیں ہونے پاتی۔ (النحل، آیت: ٦١)
اس لیے لوگوں کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارا عذاب رات کی تاریکیوں میں ان کو نیند کی حالت میں اچک سکتا ہے اور اگر ہم چاہیں تو دن دیہاڑے لوگوں کو فنا کی گھاٹ اتار سکتے ہیں۔ سورۃ القصص آیت ۷۱ تا ۷۲ میں فرمایا:

(قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ جَعَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکُمُ النَّہَارَ سَرۡمَدًا اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ مَنۡ اِلٰہٌ غَیۡرُ اللّٰہِ یَاۡتِیۡکُمۡ بِلَیۡلٍ تَسۡکُنُوۡنَ فِیۡہِ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ۔ قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ جَعَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکُمُ النَّہَارَ سَرۡمَدًا اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ مَنۡ اِلٰہٌ غَیۡرُ اللّٰہِ یَاۡتِیۡکُمۡ بِضِیَآءٍ اَفَلَا تَسۡمَعُوۡنَ ۔) [سورۃ القصص، آیت : ۷۱، ۷۲]

"اے نبی لوگوں سے فرمادیجیے اگر اللہ تعالیٰ تم پر رات کو قیامت تک طویل کر دے تو کون ہے صبح کی روشنی لانے والا اور اگر وہ دن کو قیامت تک لمبا کر دے تو کون ہے رات لانے والا جس میں تم سکون پاتے ہو؟"

قوم لوط پر صبح کے وقت عذاب آیا جو قیامت تک رات کی تاریکی نہیں پا سکتے۔ قوم مدین پر رات کی تاریکیوں میں عذاب نازل ہوا جنھیں قیامت تک صبح دیکھنا نصیب نہیں ہوگی۔ ایسے ہی یہاں عذاب کا اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو دن اور رات میں کسی وقت بھی تمہیں پکڑ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے خوف ہونے والے نقصان ہی پایا کرتے ہیں، یاد رہے مکر کے لفظ کی نسبت لوگوں کی طرف ہو تو اس کا مطلب مکر وفریب ہوتا ہے جب اس لفظ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کا معنٰی تدبیر ہوا کرتا ہے۔ دنیا کی تاریخ اٹھا کے دیکھیے۔ 2005ء میں رمضان المبارک کے دوسرے دن کشمیر میں صبح 9 بجے ایسا زلزلہ آیا کہ چالیس سیکنڈ کے اندر 70000 انسان موت کا لقمہ بنے اور لاکھوں مکان زمین بوس ہوگئے۔ 1948ء میں رات کے وقت بلوچستان میں زلزلہ آیا تو بیس سیکنڈ میں کوئٹہ شہر مکمل طور پر تباہ ہوگیا۔ (تفسیر فہم القرآن)

مسائل:

(1)...... سبق حاصل کرنے کی نیت سے تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ (...... اللہ تعالیٰ کے امتحان کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں بھی تکلیف کی شکل میں امتحان مسلط ہوتا ہے اور کبھی راحت کی شکل میں۔ (۲).... اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے غفلت اس قوم کا شیوہ ہے جن کی تباہی مقدر ہے۔ (۳..... اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے ورنہ غفلت کی صورت میں معمولی عذاب بڑے عذاب کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ (...... ایمان اور تقوی کی وجہ سے برکت کے دروازے کھلتے ہیں۔ (... دن رات کسی وقت بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے غافل نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔

آیت مبارکہ:

اَوَاَمِنَ اَهۡلُ الۡقُرٰٓى اَنۡ يَّاۡتِيَهُمۡ بَاۡسُنَا ضُحًى وَّهُمۡ يَلۡعَبُوۡنَ ۝۹۸

لغۃ القرآن: [اَوَ اَمِنَ : اور کیا امن میں ہوئے] [اَهۡلُ الۡقُرٰٓي : بستیوں والے] [اَنۡ : (اس سے) کہ] [يَّاۡتِيَهُمۡ : پہنچے ان کو] [بَاۡسُنَا : ہماری سختی] [ضُحًى: چاشت کے وقت] [وَّهُمۡ : اور وہ] [يَلۡعَبُوۡنَ : کھیل رہے ہوں]

ترجمہ: یا بستیوں کے باشندے اس بات سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب (پھر) دن چڑھے آ جائے اس حال میں کہ (وہ دنیا میں مدہوش ہو کر) کھیل رہے ہوں؟

تشریح:

ضحیٰ اصل میں اس ضوء شمس کو کہتے ہیں جبکہ وہ تیزی سے چمک جائے اور وہ مشغول لہو ولعب ہوں۔ (تفسیر الحسنات)

ان آیات سے ایک تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کی گرفت یا عذاب دفعۃً آتا ہے، جبکہ لوگ مطلقاً اس سے غافل اور بے خبر ہوتے ہیں خواہ یہ عذاب دن کے وقت آئے جبکہ لوگ اپنے کاروبار، کام کاج یا کھیل تفریح میں مشغول ہوں اور خواہ رات کے وقت آ جائے جبکہ وہ غفلت کی نیند سو رہے ہوں۔ یعنی موت کی طرح اس عذاب کا بھی کوئی وقت مقرر نہیں بلکہ موت کے آثار تو بسا اوقات محسوس ہونے لگتے ہیں مگر ایسی گرفت ہمیشہ ناگہانی طور پر آتی ہے اور دوسری یہ بات کہ جب ان

لوگوں میں بھی کفر وعصیان اور سرکشی کی وہی امراض وعلامات پائی جائیں جن کی بناپر پہلی قوموں پر عذاب آیا تھاتو آخران پر کیوں نہیں آسکتا پھران لوگوں کے نڈر ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ (تفسیر تیسیر القرآن)

یہاں بستیوں والوں سے مراد مکہ مکرمہ اور آس پاس کی بستیوں والے ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد ہر اس بستی کے افراد ہیں جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کے نبی کو جھٹلایا۔ اس آیت اور اس سے اگلی آیت میں انھیں اللہ عَزَّوَجَلَّ کے عذاب سے ڈرایا جارہا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو ان کی غفلت کے اوقات میں مثلاً رات کو سوتے وقت یا دن میں اس وقت جب یہ کھیل کود میں پڑے ہوں ان پر اللہ عَزَّوَجَلَّ کا عذاب نازل ہو جائے کیونکہ عذاب الٰہی اکثر غفلت کے وقت آتا ہے اور غفلت زیادہ تر رات کے آخری حصے میں یا پورے دن چڑھے ہوتی ہے۔

نیک اعمال کرنے اور عذاب الٰہی سے ڈرنے کی ترغیب:

ان آیات میں جہاں کفار کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے وہیں مسلمانوں کو بھی نیک اعمال کرنے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے رہنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

" یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ "

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور ضرور تمہیں موت صرف اسلام کی حالت میں آئے۔

حضرت انس (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "اے مسلمانوں کے گروہ! اللہ تعالیٰ نے تمہیں جس چیز کی رغبت دی ہے اس میں رغبت رکھو اور جس چیز سے یعنی اپنے عذاب، جھڑک اور جہنم سے ڈرایا ہے تو اس سے بچو اور ڈرو۔ اگر جنت کا ایک قطرہ تمہارے ساتھ دنیا میں ہو جس میں تم اب موجود ہو تو وہ تمہارے لیے اسے اچھا کر دے اور اگر جہنم کا ایک قطرہ تمہاری اس دنیا میں آجائے تو وہ اسے تم پر خراب کر دے۔ (تفسیر صراط الجنان)

اللہ کے عذاب سے کبھی نڈر اور بے خوف نہیں ہونا چاہیے۔ والعیاذ باللہ: کہ اللہ کا عذاب کبھی بھی اور کسی بھی شکل وصورت میں آسکتا ہے۔ والعیاذ باللہ۔ یعنی اللہ پاک کا عذاب ان پر بے فکری اور بے خوفی کے کسی بھی ایسے موقع پر آسکتا ہے جبکہ یہ لوگ آرام وراحت کے مزے لوٹ رہے ہوں اور تعیش وتفریح کے سامان سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ اور تاریخ قانون وقدرت کے اس عظیم اور اٹل ضابطے کی ہمیشہ تصدیق وتائید کرتی چلی آئی ہے۔ اور آج تک اس کے مظاہر جابجا سامنے آتے رہتے ہیں۔ ابھی کچھ ہی عرصہ قبل امریکی ریاست میکسیکو میں جو تباہ کن زلزلہ آیا تھا اس سے چند ہی منٹوں کے اندر چار ہزار انسان لقمہ اجل بن گئے اور کروڑوں بلکہ اربوں کھربوں روپے کی مالیت کی فلک بوس عمارتیں وغیرہ پیوند خاک ہو کر رہ گئیں۔ اور ترقی وکمال کے دعویدار اور تسخیر کائنات کا گھمنڈ رکھنے والے اسی امریکہ بہادر کی ایک اور ریاست کولمبیا میں گزشتہ سال طوفان باد وباراں اور زلزلے نے جو تباہی مچائی اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہاں کے پچاس ہزار آبادی والے ایک پورے شہر کو اجتماعی قبرستان قرار دے دیا گیا۔ اسی طرح گزشتہ سال ہی دوسری شیطانی سپر پاور روس کے شہر آزر بائیجان میں زلزلے کے کچھ ہی جھٹکوں نے چند ہی سیکنڈوں میں اسی ہزار انسانوں کو لقمہ اجل بنادیا۔ اور تسخیر کائنات کا دعویٰ اور گھمنڈ رکھنے والی اس سپر پاور سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ وہ اپنے نت نئے ترقی یافتہ ذرائع ووسائل سے اس تباہ کاری سے ان لوگوں کو قبل از وقت خبردار ہی کر دیتی۔ اور اسی روس میں چرنوبل کے ایٹمی توانائی گھر سے گیس خارج ہونے سے جو ہولناک تباہی آئی وہ لوگوں کے سامنے ہے۔ اور تین سال قبل ہندوستان کی ریاست بھوپال میں ایک کارخانے سے زہریلی گیس لیک ہونے سے ہولناک حادثہ پیش آیا جس سے پچاس ہزار انسان اور بیشمار دوسرے جانور اس بری طرح متاثر ہوئے کہ بیان سے باہر ہے۔ سو وہ بھی اسی تازیانہ عبرت کا ایک نمونہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ سو یہ سب کچھ اسی قانون خداوندی اور دستور الٰہی کا ایک مظہر اور ثبوت ہے جس کو یہاں اس آیت کریمہ میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ اور دیگر کتنے ہی ایسے حوادث وواقعات ہیں جو جگہ جگہ اور طرح طرح سے وقتاً فوقتاً رونما ہوتے رہتے ہیں اور اپنی زبان حال سے پکار پکار کر دنیا کو درس عبرت اور دعوت غور وفکر دیتے ہیں۔ لیکن غافل انسان پھر بھی نہ آنکھ کھولتا ہے نہ اس سے کوئی سبق لیتا ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ سو غفلت ولاپرواہی بیماریوں کی بیماری اور محرومیوں کی

محرومی ہے۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ سو عقل و نقل کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت و پکڑ سے کبھی بے خوفی اور لاپرواہی نہ برتی جائے۔ اللہ تعالیٰ ہر طرح کے شرور و فتن اور مصائب و آلام سے ہمیشہ اپنی پناہ میں رکھے۔ آمین۔ اللھم فخذ نا بنواصینا الی ما فیہ حبک والرضا۔ (تفسیر مدنی کبیر)

آیت مبارکہ:

اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۹۹

لغۃ القرآن: [اَفَاَمِنُوْا :تو کیا وہ لوگ بےخوف ہوئے] [مَكْرَ اللّٰهِ : اللہ کی تدبیر سے] [فَلَا يَاْمَنُ :پس بےخوف نہیں ہوتے] [مَكْرَ اللّٰهِ : اللہ کی تدبیر سے] [اِلَّا :مگر] [الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ :خسارہ پانے والے]

ترجمہ: کیا وہ لوگ اللہ کی مخفی تدبیر سے بے خوف ہیں؟ پس اللہ کی مخفی تدبیر سے کوئی بے خوف نہیں ہوا کرتا سوائے نقصان اٹھانے والی قوم کے

تشریح:

اَفَاَمِنُوْا (ہاں تو کیا وہ بے فکر ہو گئے) یہ افامن اہل القری کی تکریر کے لیے لایا گیا مَکْرَ اللّٰہِ (اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے) بندے کو اس طرح پکڑ نا کہ اس کو شعور بھی نہ ہو۔ حضرت شبلی (رح) سے روایت ہے کہ کفار کے ساتھ اس کی خفیہ تدبیر یہ ہے کہ ان کو اس حالت میں چھوڑ دیا جس میں وہ تھے۔ ربیع بن خیثم کی بیٹی نے اپنے والد کو کہا کہ میں لوگوں کو دیکھتی ہوں کہ وہ سوتے ہیں اور تم نہیں سوتے۔ تو وہ کہنے لگے اے بیٹی تمہارا باپ اس بات سے خوف زدہ ہے کہ اس پر بیات نہ آجائے۔ گویا تو اس آیت کی طرف اشارہ کیا ان یاتیھم بأسنا بیاتا۔ فَلَا یَاْمَنُ مَکْرَ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ (پس اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے کوئی بے فکر نہیں ہوتا سوائے ان کے جن کی شامت ہی آگئی ہو) مگر کافر جنہوں نے اپنے آپ کو نقصان میں ڈالا یہاں تک کہ وہ جہنم میں پہنچ گئے۔ (تفسیر مدارک التنزیل ابو البرکات عبد اللہ بن احمد محمد بن محمود النسفی)

اللہ کے مکر سے مراد وہ خفیہ تدبیر ہے جس سے وہ بے خبر ہوں تاکہ انسان اللہ سے ڈرتے رہیں اور اللہ کے احکام میں محتاط رہیں۔ اور جو لوگ نہ ڈریں گے وہ خسارے میں رہیں کیونکہ عافیت کوشی، غفلت اور حد سے گزر جانے اور لاپرواہی کا نتیجہ خسران مبین ہی ہو سکتا ہے۔ کیا یہ لوگ اللہ کی چال اور تدبیر سے بے خوف ہو گئے ہیں حالانکہ یہ وہی لوگ ہیں جن کے آباؤاجداد کو ہلاک کر دیا گیا اور ان کے بعد یہ اس دنیا کے وارث بنائے گئے اور جنہیں ان کی غفلت ہی کی وجہ سے برباد کیا گیا کہ ان کی بربادی میں ان کے لیے کوئی ہدایت اور عبرت نہیں ہے؟ (تفسیر فی ظلال القرآن)

مکر کے لغوی معنی ہیں "خفیہ تدبیر" جبکہ عام محاورہ میں دھوکا اور فریب کو "مکر" کہا جاتا ہے، یہاں اس کا لغوی معنی یعنی خفیہ تدبیر مراد ہے۔

''مکر'' یا ''خداع'' کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنے دھوکہ یا فریب نہ ہوں گے کیونکہ یہ عیب ہیں بلکہ اس کے معنی ہوں گے دھوکے کی سزا دینا یا خفیہ تدبیر کرنا۔ جب اس کی نسبت بندوں کی طرف ہو تو مکر کے معنی دھوکہ، مکاری، دغا بازی اور خداع کے معنی فریب ہوں گے (علم القرآن)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے خاص غضب کا ذکر ہے چنانچہ فرمایا گیا "کیا کفار اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف ہیں اور اس کے ڈھیل دینے اور دنیوی نعمتیں دینے پر مغرور ہو کر اس کے عذاب سے بے فکر ہو گئے ہیں سن لو! اللہ عَزَّوَجَلَّ کی خفیہ تدبیر سے صرف تباہ ہونے والے لوگ ہی بے خوف ہوتے ہیں اور اس کے مخلص بندے اس کا خوف رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہیے:

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے خوف کا دل سے نکل جانا سخت نقصان کا سبب ہے، اللہ عَزَّوَجَلَّ کی ڈھیل یا اس کا کسی بندے کو گناہ پر نہ پکڑنا یہ اس کی خفیہ تدبیر ہے لہٰذا ہر وقت اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ ترغیب کے لیے چند حکایات پیش کی جاتی ہیں۔

(1)۔۔ حضرت جبرائیل (علیہ السلام) ایک مرتبہ بارگاہ رسالت میں روتے ہوئے حاضر ہوئے تو رحمت دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دریافت کیا "اے جبرائیل (علیہ السلام)! تمہیں کس چیز نے رلا دیا؟ انھوں نے عرض کی: جب سے اللہ تعالیٰ نے جہنم کو پیدا فرمایا ہے، میری آنکھیں اس وقت سے کبھی اس خوف کے سبب خشک نہیں ہوئیں کہ مجھ سے کہیں کوئی نافرمانی نہ ہو جائے اور میں جہنم میں ڈال دیا جاؤں۔

(2)۔۔ جب ابلیس کے مردود ہونے کا واقعہ ہوا تو حضرت جبرائیل اور حضرت میکائیل عَلَیْہِمَا الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام رونے لگے تو رب تعالیٰ نے دریافت کیا (حالانکہ وہ سب جانتا ہے) "تم کیوں روتے ہو؟ انھوں نے عرض کی: اے رب عَزَّوَجَلَّ! ہم تیری خفیہ تدبیر سے بے خوف نہیں ہیں۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: تم اسی حالت پر رہنا (یعنی کبھی مجھ سے بے خوف مت ہونا)۔

(3)۔۔ حضرت انس بن مالک (رض) فرماتے ہیں کہ ایک بار میں نے حضرت عمر فاروق (رض) کو ایک باغ کی دیوار کے پاس دیکھا کہ وہ اپنے آپ سے فرما رہے تھے "واہ! لوگ تجھے امیر المومنین کہتے ہیں اور تو اللہ عَزَّوَجَلَّ سے نہیں ڈرتا، اگر تو نے رب تعالیٰ کا خوف نہ رکھا تو اس کے عذاب میں گرفتار ہو جائے گا۔

(4)۔۔ حضرت ربیع بن خیثم (رح) کی صاحب زادی نے ان سے کہا: ابا جان! میں دیکھتی ہوں کہ سب لوگ سوتے ہیں اور آپ نہیں سوتے اس کی وجہ کیا ہے؟ فرمایا: اے میری نور نظر! تیرا باپ رات کو سونے سے ڈرتا ہے۔ آپ (رح) کا اشارہ اوپر مذکور آیت کی طرف تھا۔

(5)۔۔ حضرت حسن بصری (رض) چالیس برس تک نہیں ہنسے، جب ان کو بیٹھے ہوئے دیکھا جاتا تو یوں معلوم ہوتا گویا ایک قیدی ہیں جسے گردن اڑانے کے لیے لایا گیا ہو، اور جب گفتگو فرماتے تو انداز ایسا ہوتا گویا آخرت کو آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر بتا رہے ہیں، اور جب خاموش رہتے تو ایسا محسوس ہوتا گویا ان کی آنکھوں میں آگ بھڑک رہی ہے، جب ان سے اس قدر غمگین وخوف زدہ رہنے کا سبب پوچھا گیا تو فرمایا "مجھے اس بات کا خوف ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے میرے بعض ناپسندیدہ اعمال کو دیکھ کر مجھ پر غضب فرمایا اور یہ فرما دیا کہ جاؤ! میں تمہیں نہیں بخشتا تو میرا کیا بنے گا؟ (تفسیر صراط الجنان)

(۱) امام ابن ابی حاتم نے ہشام بن عروہ (رح) سے روایت کیا کہ ایک آدمی نے اپنے دوست کی طرف لکھا کہ جب اللہ تعالیٰ سے اس چیز کو پائے جو تیرے لیے خوشی کا باعث ہو امن میں نہ ہو جا کہ شاید اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خفیہ تدبیر ہو۔

(۲) امام ابن ابی حاتم نے زید بن اسلم (رح) سے روایت کیا کہ اللہ تبارک نے فرشتوں سے فرمایا یہ کیا ڈرنا ہے حالانکہ میں نے تم کو اس مقام اور مرتبہ پر فائز کیا جس پر تمہارے علاوہ کسی کو نہیں کیا فرشتوں نے عرض کیا اے ہمارے رب ہم امن میں نہیں ہیں آپ کی خفیہ تدبیر سے اور آپ کی تدبیر سے نہیں امن میں ہوتی مگر وہ قوم جو خسارہ پانے والی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے بے خوف نہ ہونا

(۳) امام عبداللہ بن احمد نے زوائد الزھد میں علی بن ابی حلیمہ (رح) سے روایت کیا ہے کہ ذر بن عبداللہ خولانی (رح) سے روایت کیا کہ جب عشاء کی نماز پڑھتے تو مسجد ہی میں پڑے رہتے۔ جب مسجد سے نکلنے کا ارادہ کرتے تو اس آیت کو بلند آواز سے پڑھتے یعنی لفظ آیت "فلا یامن مکر اللہ الا القوم الخسرون"۔

(۴) امام ابن ابی حاتم نے اسماعیل بن رفع (رض) سے روایت کیا کہ اللہ کی خفیہ تدبیر سے امن میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بندے کا گناہ پر قائم ہونا حالانکہ وہ اللہ پر مغفرت کی امید رکھتا ہے۔ (تفسیر در منثور۔ امام جلال الدین سیوطیؒ)

اب حضور سرور کونین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لائے ہوئے دین اور آپ کی کتاب کے مقابلہ میں کھڑی ہونے والی طاغوتی طاقتوں کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ کیا وہ اس بات سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب ان کے رات کو غافل سوتے ہوئے یا ان دن کو دنیا کے کھیل میں مصروف ہونے کی حالت میں اچانک آجائے۔ کیا وہ اللہ کی تدبیر سے بے خوف ہوگئے ہیں؟ اور جو اللہ کی تدبیر سے بے خوف ہو جائیں وہی خسارے میں رہتے ہیں۔ چنانچہ کفار مکہ اور اللہ رب العزت کی پکڑ اچانک آئی وہ ہجری دو میں مدینہ شریف کو (معاذاللہ) تباہ کرنے کے لیے نکلے مگر بدر میں دھر لیے گئے اور ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔

پھر یہود مدینہ نے اسلام کے خلاف سازشیں کیں وہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گئے اور انھیں عہد نبوی میں ہی مدینہ طیبہ سے نکال دیا گیا اور عہد فاروقی میں جزیرہ عرب سے بھی باہر دھکیل دیے گئے پھر قیصر وکسریٰ اپنی کثیر دولت کے انبار اور لمبی فوجیوں کی قطاریں لے کر اسلام کے مقابلہ میں آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ آج امریکہ دہشت گردی سے مقابلہ کے بہانے اسلام اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے غلام بنانے نکلا ہے مگر وہ جلد ہی اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔

فلا یامن مکر اللہ الا القوم الخسرون۔ (تفسیر برہان القرآن)

اللہ تعالیٰ ہمارے ایمان کی حفاظت فرمائے اور ہمیں اپنی خفیہ تدبیر سے ڈرتے رہنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین

آیت مبارکہ:

اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ○

لغۃ القرآن: [اَوَ : اور کیا] [لَمْ يَهْدِ : رہنمائی نہیں کی] [لِلَّذِيْنَ : ان کے لیے جو] [يَرِثُوْنَ : وارث ہوئے] [الْاَرْضَ : زمین کے] [مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ : اس کے رہنے والوں (کی ہلاکت) کے بعد] [اَنْ : کہ] [لَّوْ : اگر] [نَشَآءُ : ہم چاہیں] [اَصَبْنٰهُمْ : تو ہم پہنچیں ٹھیک ان کو ہی] [بِذُنُوْبِهِمْ : بسبب ان کے گناہوں کے] [وَنَطْبَعُ : اور ہم چھاپ لگا دیتے ہیں] [عَلٰي : پر] [قُلُوْبِهِمْ : ان کے دلوں] [فَهُمْ : تو وہ] [لَا يَسْمَعُوْنَ : کچھ نہ سنیں]

ترجمہ: کیا یہ (حقیقت) واضح نہ ہوئی ان لوگوں پر جو وارث بنے زمین کے اس کے اصلی مالکوں (کی تباہی) کے بعد کہ اگر ہم چاہیں تو سزا دیں انھیں ان کے گناہوں کی وجہ سے اور مہر لگا دیں ان کے دلوں پر تاکہ وہ کچھ سن ہی نہ سکیں۔

تشریح:

گزشتہ رکوعات میں جن اقوام کی تباہی کا ذکر ہوا وہ جزیرۃ العرب میں یا اس کے آس پاس واقع تھیں۔ قوم نوح عراق میں، قوم عاد شام میں، قوم ثمود یمن، میں قوم لوط فلسطین، میں قوم شعیب حدود اردن میں۔ اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو علاقہ حجاز میں بھیجا گیا جو ان علاقوں کا مرکزی مقام تھا اور ان قوموں کی تباہی کا نقشہ قرآن میں بار بار اسی لیے کھینچا گیا کہ کفار مکہ و یہود مدینہ ان اقوام کی تاریخ سے نہ صرف واقف بلکہ اپنے تجارتی سفروں میں ان کے کھنڈرات دیکھتے رہتے تھے۔ اسی حوالے سے فرمایا جا رہا ہے کہ زمین کے پہلے مال کو یعنی گزشتہ قوموں کے بعد جو لوگ زمین کے وارث بنے ہیں کیا انھیں بھی یہ ہدایت نہیں ملی کہ اگر ہم چاہیں تو پہلے لوگوں کی طرح انھیں بھی ان کے گناہوں کے سبب ہلاک کر دیں؟ یعنی اگر ہم نے انھیں ڈھیل دے رکھی ہے تو یہ اسی رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحمت کا صدقہ ہے جس کی وہ تکذیب کرتے ہیں۔

گزشتہ منکروں اور اس امت کے منکروں کے عذاب میں فرق:

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کے دشمنوں کو گزشتہ قوموں جیسے عذابات سے تباہ تو نہ کیا کیونکہ ایسے عذابات آپ کی وجہ سے موقوف کر دیئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ماکان اللہ لیعذبھم وانت فیھم۔ مگر کفار کو میدان جہاد میں اتار کر ذلت و خواری سے دوچار کیا گیا اور اس امت کے کفار کے لیے یہی عذاب رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قاتلوھم یعذبھم اللہ بایدیکم ویخزھم وینصرکم علیہم ویشف صدور قوم مؤمنین۔ کفار سے جہاد کرو اللہ انھیں تمہارے ہاتھوں عذاب دے گا انھیں رسوا کرے گا تمہیں ان پر غلبہ دے گا اور مومنوں کے دلوں کو شفا (راحت) پہنچائے گا۔" (توبہ: 14)

لہٰذا بعض معاسر مفسرین کا یہاں یہ لکھنا کہ کفار مکہ پہ عذاب نہ آیا کیونکہ حکمت الٰہیہ اس کی متقاضی نہ تھی، درست نہیں ہے۔ کفار مکہ پہ عذاب آیا مگر اس کی صورت جداگانہ تھی۔ اس آیت میں دور حاضر کی اسلام دشمن طاغوتی طاقتوں کے لیے بھی تازیانہ عبرت ہے کہ وہ اللہ کی پکڑ سے بے خوف نہ رہیں۔

مگر کفار کو گزشتہ قوموں کی ہلاکت سے ہدایت اس لیے نہیں ملتی کہ مسلسل کفر و طغیان کے سبب ان کے دلوں پر مہر لگا دی جاتی ہے پھر ان کے کان آواز حق نہیں سنتے (اور ان کی آنکھیں راہ حق نہیں دیکھتیں) (تفسیر برہان القرآن)

کفار مکہ کے دلوں پر مہر لگانے کی توجیہ:

اس کے بعد فرمایا: اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے کفر اور عناد کی سزا کے طور پر ہم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اب یہ ایمان نہیں لا سکتے۔ اور مہر سے مراد یہ ہے کہ ان کے دلوں پر ایسی علامات ثبت کر دی ہیں جن سے فرشتے پہچان لیتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اور اس آیت میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ تسلی دینا ہے کہ اگر آپ کی پیہم تبلیغ کے باوجود یہ ایمان نہیں لاتے تو آپ غم نہ کریں آپ کی تبلیغ کی اثر آفرینی میں کوئی کمی نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ ان کو سزا دینے کے لیے ہم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ اس کے بعد فرمایا پھر وہ کچھ نہیں سنتے۔ حالانکہ بظاہر وہ سنتے تو تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک سننا وہ ہے جو سننے کے بعد اس کو قبول کرے اور چونکہ وہ قبول نہیں کرتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ سننے والے نہ تھے۔

اس آیت کی ایک اور تقریر یہ ہے کہ کفار مکہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو منصب نبوت کے بے اہل نہ کہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ نبی کو فرشتہ ہونا چاہیے آپ ﷺ تو ہماری طرح بشر ہیں اس لیے ہم آپ ﷺ کے دین میں داخل نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ یہ بات نہیں ہے کہ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نبوت کے لائق نہیں بلکہ حقیقت میں تم ان کے امتی نہیں بن سکتے اور ان کے دین میں داخل نہیں ہو سکتے۔

سابقہ امتوں کے عذاب سے کفار مکہ کا سبق حاصل نہ کرنا:

اس پوری آیت کی دوسری تقریر یہ ہے کہ پچھلی امتوں کے بعد جو لوگ اس خطہ زمین پر آ کر آباد ہوئے انھوں نے اس زمین پر آثار عذاب دیکھ کر یہ سبق کیوں حاصل نہیں کیا کہ پچھلی امتوں پر ان کے انکار اور تکذیب کی وجہ سے عذاب آیا تھا سو اگر انھوں نے بھی انکار کیا اور تکذیب کی روش برقرار رکھی تو ان پر بھی عذاب آ سکتا ہے۔ پھر خود ہی فرمایا: انھوں نے یہ سبق اس لیے حاصل نہیں کیا کہ ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں اور یہ مہر لگانا ان پر جبر اور ظلم نہیں ہے بلکہ ان کے متواتر کفر اور عناد کا نتیجہ ہے اور جب ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے تو وہ کسی نصیحت کو قبول کرنے کے لیے نہیں سنتے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

مہر کس طرح لگتی ہے:

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رض) عَنْ رَسُولِ اللَّهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا أَخْطَأَ خَطِيئَةً نُكِتَتْ فِي قَلْبِهِ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ فَإِذَا هُوَ نَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ وَتَابَ سُقِلَ قَلْبُهُ وَإِنْ عَادَ زِيدَ فِيهَا حَتَّى تَعْلُوَ قَلْبَهُ وَهُوَ الرَّانُ الَّذِي ذَكَرَ اللَّهُ (كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ)) [رواہ الترمذی: کتاب تفسیر القرآن، باب وَمِنْ سُورَةِ وَيْلٌ لِلْمُطَفِّفِينَ (حسن)]

"حضرت ابوہریرہ (رض) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں آپ نے فرمایا بلاشبہ جب بندہ گناہ کرتا ہے اس کے دل پر سیاہ نکتہ لگا دیا جاتا ہے جب وہ اس گناہ کو چھوڑتا اور توبہ واستغفار کرتا ہے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر وہ دوبارہ گناہ کرتا ہے تو اس سیاہ نکتے میں اضافہ کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کی سیاہی دل پر غالب آ جاتی ہے یہی وہ زنگ ہے جس کا تذکرہ اللہ نے کیا ہے" کیوں نہیں ان کے اعمال کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ پڑ چکا ہے۔
" (تفسیر فہم القرآن)

دل سارے اعضاء کا بادشاہ ہے:

اگر یہ درست نہ ہو تو سارے اعضاء نیکی چھوڑ دیتے ہیں۔ حضرت نعمان بن بشیر (رض) سے مروی ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

الاان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب۔" یاد رکھو ! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اگر وہ درست ہو تو سارا جسم درست اور اگر وہ کراب ہو تو سارا جسم خراب ہے اور وہ دل ہے۔" (بخاری کتاب الایمان 39) اور دل کی درستگی تلاوت قرآن مبین، صحبت صالحین اور اتباع علماء ربانیین سے وابستہ ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

آیت مبارکہ:

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآىِٕهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۱۰۱

لغۃ القرآن: [تِلْكَ الْقُرٰي : یہ بستیاں] [نَقُصُّ : ہم سناتے ہیں] [عَلَيْكَ : آپ کو] [مِنْ اَنْۢبَاۗىِٕهَا : جن کی خبروں میں سے] [وَلَقَدْ جَاۗءَتْهُمْ : اور آچکے ہیں ان کے پاس] [رُسُلُهُمْ : ان کے رسول] [بِالْبَيِّنٰتِ : واضح (نشانیوں)کے ساتھ] [فَمَا كَانُوْا :تو وہ لوگ نہیں تھے] [لِيُؤْمِنُوْا :کہ ایمان لاتے] [بِمَا : اس پر جس کو] [كَذَّبُوْا : انہوں نے جھٹلایا] [مِنْ قَبْلُ : اس سے پہلے] [كَذٰلِكَ : اس طرح] [يَطْبَعُ : چھاپ لگاتا ہے] [اللّٰهُ : اللہ] [عَلٰي قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ : انکار کرنے والوں کے دلوں پر]

ترجمہ: یہ وہ بستیاں ہیں جن کی خبریں ہم آپ کو سنا رہے ہیں، اور بیشک ان کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر آئے تو وہ (پھر بھی) اس قابل نہ ہوئے کہ اس پر ایمان لے آتے جسے وہ پہلے جھٹلا چکے تھے، اس طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے

تشریح: گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان قوموں کی تباہی کے کچھ احوال بیان فرمائے ہیں جنھوں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی اور آخر دم تک منکر ہی رہے جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہریں لگا دیں۔ نیز ان قوموں نے انبیائے کرام (علیہم السلام) سے وعدے بھی کئے کہ اگر وہ انھیں معجزہ دکھائیں تو وہ ایمان لے آئیں گے مگر معجزہ دیکھنے کے باوجود ان میں سے اکثر ایمان نہ لائے، لہٰذا میرے پیارے نبی ! آپ اہل مکہ کی ہٹ دھرمی سے کبیدہ خاطر نہ ہوں کیونکہ جاہل قوموں نے پہلے انبیائے کرام (علیہم السلام) کے ساتھ بھی ایسا ہی رویہ روا رکھا تھا۔ (تفسیر امداد الکرم)

ہر بعد میں آنے والوں کو چاہیے کہ پہلے لوگوں سے عبرت سیکھیں:

ہلاک شدہ چند اقوام، مثلاً قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط، قوم شعیب (علیہم السلام) کے جو واقعات اور ان کی ہلاکت و تباہی سے ان کے بعد آنے والی قومیں عبرت حاصل کریں آیت کریمہ میں اسی بات پر تنبیہ ہو رہی ہے فرمایا کہ جو امتیں ہلاک کی گئیں، ان کی جگہ جو لوگ زمین پر آباد ہوئے، کیا ان کے بعد میں آنے والوں کو ان واقعات سے عبرت نہ ہوئی ؟ اور کیا انہیں اس بات کا علم نہیں کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے بعد میں آنے والوں کو بھی ان کے شرک و کفر اور گناہوں کے سبب ہلاک کر دیں ؟

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ گزشتہ لوگوں کی طرح ان کو بھی ہلاک کرنے پر قادر ہے۔ دراصل یہ لوگ نہ عبرت پکڑتے ہیں، اور نہ ہی ہدایت حاصل کرتے ہیں، بلکہ گزشتہ لوگوں کی طرح شرک وکفر پر جمے رہتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے، جیسے سورۃ بقرہ میں فرمایا: "ختم اللہ علی قلوبھم" اور سورۃ نساء میں فرمایا: "بل طبع اللہ علیھا بکفرہم" دوسرے مقام پر فرمایا: "فلمازاغواازاغ اللہ قلوبھم" (الصّف) علی ھذاالقیاس۔ دوسرے بہت سے مقامات پر بیان فرمایا کہ جو لوگ مسلسل حق سے اعراض کرتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ ان کے قلوب پر مہر لگائی جاتی ہے، یہ قدرت کی طرف سے ایسے نافرمان لوگوں کی سزا ہوتی ہے۔

تلک القری نقص علیک من انبائھا" یہ بستیاں ہیں جن کے قصے ہم آپ کو سناتے ہیں۔

"ولقد جاء تھم رسلھم بالبینت" ۔۔تا۔۔ قلوب الکفرین" اور ان کے پاس ان کے پیغمبر واضح معجزات لے کر آئے، اور وہ لوگ ایسے نہ تھے کہ جس چیز کو انہوں نے جھٹلا دیا تھا (یعنی اس سے پہلے جھٹلا دیا تھا) اس پر ایمان لے آتے۔ ان کے پاس حق آیا، تو اس کی تکذیب جو پہلے کردی تھی اسی تکذیب پر جمے رہے۔ پس ایسے ہی اللہ تعالیٰ کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔ جیسے فرمایا: کلا بل ران علی قلوبھم ماکانوایکسبون" (المطففین)

"وماوجدنا لاکثرھم من عھد" اور ہم نے ان میں سے اکثر لوگوں میں عہد کا پورا کرنا نہ پایا۔ انسانوں کا یہ عجیب مزاج ہے کہ اکثر وبیشتر لوگ مفاد پرست ہی ہوتے ہیں کہ جب مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں تو بڑے زور و شور سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، اور پکے مشرک بھی اس وقت اپنے باطل معبودوں کو نظرانداز کردیتے ہیں، اور یہ بھی وعدہ کرتے ہیں کہ اگر یہ مصیبت دور ہوئی تو ایمان قبول کرتے ہیں، لیکن جب مصیبت دور ہوگئی تو سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ "لئن انجیتنا من ھذہ لنکونن من الشکرین فلمانجاھم الی البر اذاھم یشرکون" (العنکبوت)

"وان وجدنا اکثرھم لفسقین" اور بیشک ہم نے ان کے اکثر کو فاسق پایا۔ اب فسق یا نافرمانی کی تین قسمیں ہیں، جن میں سے کسی نہ کسی قسم میں اکثر لوگ مبتلا ہوتے ہیں: پہلی قسم کا نافرمان وہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام کا صریحاً انکار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے نبیوں کو جھوٹا کہتا ہے۔ ایسا آدمی کافر ہوتا ہے۔ یہ سب سے بڑا فاسق شمار ہوتا ہے۔ دوسرا فاسق وہ ہے جو زبان سے تسلیم کرتا ہے، مگر دل سے انکار کرتا ہے۔ اس کو عام اصطلاح میں اعتقادی منافق کہتے ہیں، اور یہ بھی فاسق ہے۔ تیسرا فاسق وہ ہے جو دل وزبان سے اقرار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اور اس کے رسولوں کی رسالت، اور آسمانی کتابون اور روز قیامت اور دیگر سارے احکام کو مانتا ہے، مگر عمل نہیں کرتا۔ یہ عملی منافق ہے، مگر ابدی دوزخی نہیں، اور کافر بھی نہیں، مگر بہت گندا، اور نہایت براہی ہے۔ اور آج ایسے لوگوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔

ایسے عملی منافقوں کی تعداد بنسبت اعتقادی منافقوں کی بہت زیادہ ہے۔ منافق عملی پورے معاشرے پر بوجھ ہیں، انہی کی وجہ سے اسلام کمزور اور غیر مسلموں کی نظر میں معیوب اور ناقابل قبول ہے۔ اسلامی معاشرہ انہی منافقوں کی وجہ سے بدنام بھی ہے۔

تاریخی واقعات کے نتائج کا بیان:

گزشتہ واقعات اور نافرمانوں کی ہلاکت اور تباہی پر غور کرنے سے جو نتائج معلوم ہوئے، وہ اختصار کے ساتھ یہ ہیں:

1۔ قبول حق کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ آباء واجداد کی تقلید ہے۔

2۔ انبیاء (علیہم السلام) کی بعثت اپنی قوم، اپنی برادری، اپنی بستی میں ہوا کرتی ہے۔

3۔ انبیاء (علیہم السلام) منصب نبوت کے حامل ہوتے ہیں، ان میں کوئی بادشاہ یا امیر و سردار نہیں ہوتے۔

4۔ اصولی پیغام سب کا ایک ہی ہوتا ہے، فروعی مسائل ہر ایک کے الگ الگ ہوتے ہیں۔

5۔ پیغمبر کبھی ایک دوسرے سے اختلاف نہیں کرتے، بلکہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں۔

6۔ انبیاء (علیہم السلام) کا انتخاب کسی قوم کے ہاتھ میں نہیں ہوتا، بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

7۔ انبیاء کرام (علیہم السلام) مالدار نہیں ہوتے، اور نہ ہی دنیاوی ساز وسامان کے طلبگار ہوتے ہیں۔

8۔انبیاء کرام (علیہم السلام) مخلص، محنتی، جفاکش ہوتے ہیں، اور سب کچھ برداشت بھی کرتے ہیں۔

9۔سارے انبیاء (علیہم السلام) کے ساتھ یہی ہوا کہ غریبوں میں ان کی مقبولیت ہوئی، وہ بھی جزوی طور پر، اور امیر و سردار ہر محاذ پر ان کی مخالفت پر کمربستہ رہے۔

10۔سارے انبیاء (علیہم السلام) کے ساتھ مجموعی طور پر قوموں، امتوں کا رویہ معاندانہ رہا ہے۔

11۔جب تک لوگوں کے ایمان لانے سے مکمل ناامید نہیں ہوئے کوئی بد دعاء نہیں کی۔

12۔آخری نتیجہ ہمیشہ ان کے حق میں رہا، اور نافرمان اقوام، انبیاء (علیہم السلام) کے دشمن اور ان کے ساتھ جبر و تشدد کرنے والے، ان کو پریشان اور ان کی تکذیب کرنے والے، ان کے راستے روکنے والے، ان پر تہمت لگانے والے، اور ان کے رفقاء مٹھی بھر ساتھیوں پر ظلم و ستم ڈھانے والے، حرف غلط کی طرح صفحہ ہستی سے ہمیشہ کے لیے مٹ گئے، اور طرح طرح کے عذابوں کے ذریعہ ہلاک و برباد ہوگئے۔ دنیا کی کوئی طاقت بھی انہیں عذاب الٰہی کے شکنجہ سے نجات نہ دے سکی، بچانہ سکی۔ (تفسیر منازل العرفان)

معلوم ہوا ایک بار غلطی کرکے اس پر اڑ جانا اور سیدھی راہ کی طرف جان بوجھ کر نہ لوٹنا کفار کا کام ہے۔ مومن کو غلطی کا احساس ہو جانے کے بعد فوراً اصلاح کر لینی چاہیے۔ امام اعظم ابو حنیفہ (رح) نے اپنے وصال سے تین دن قبل اپنے تمام فتوؤں پر نظر ثانی کی اور ان میں اسے اسی 80 فتوؤں سے رجوع فرمالیا۔ یہ آپ کی خدا خوفی، انابت الی اللہ اور ثقاہت بلکہ فقہ حنفی کی عظمت پر روشن دلیل ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا علم غیب اور آپ کی رسالت پر دلیل :

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح، حضرت ھود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب (علیہم السلام) کی امتوں کے احوال بیان فرمائے کہ ان رسولوں کی قوموں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی اور انجام کار ایسے عذاب سے دوچار ہوئے جس کی وجہ سے صفحہ ہستی سے ان کا نام و نشان مٹ گیا اور خصوصیت کے ساتھ ان پانچ قوموں کے احوال اس لیے بیان فرمائے کہ یہ قومیں جزیرہ نما عرب اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں میں رہنے والی تھیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ ڈھیل دی اور ان کو بہ کثرت نعمتیں عطافرمائیں جس کی وجہ سے انھوں نے یہ زعم کرلیا کہ ان کا موقف درست ہے اور رسولوں کا پیش کیا ہوا دین غلط ہے۔ اور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی اسی علاقہ میں مبعوث فرمایا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان پانچ قوموں کے احوال بیان فرما کر مکہ والوں کو تنبیہ فرمائی کہ تم کفر اور تکذیب میں گزشتہ قوموں کی پیروی نہ کرنا ورنہ تم بھی عذاب الٰہی کے مستحق ہو جاؤ گے !

اس آیت میں سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت پر بھی دلیل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ آپ کو ان پانچ قوموں کے احوال سے مطلع فرمایا اور آپ نے کسی سے سنے یا کسی کتاب میں پڑھے بغیر ان قوموں کے احوال بیان فرمائے جس سے معلوم ہوا کہ آپ کو یہ خبریں صرف وحی الٰہی سے حاصل ہوئی ہیں اور جس پر وحی نازل ہو وہی نبی ہوتا ہے۔ نیز آپ نے یہ غیب کی خبریں بیان کی ہیں اور نبی وہی ہوتا ہے جو غیب کی خبریں دیتا ہے۔ سو آپ کا نبی ہونا واضح ہوا۔ ان خبروں کے علاوہ اور بھی بہت سے غیوبات کا آپ کو علم ہے بلکہ آپ کو سب رسولوں سے زیادہ غیب کا علم ہے تاہم آپ کو عالم الغیب کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ عالم الغیب کا لفظ عرف اور شرع میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے البتہ آپ کو مطلع علی الغیب کہنا درست ہے۔

تمام نبی حامل معجزہ ہیں :

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا : بیشک ان بستیوں والوں کے پاس ان کے رسول واضح معجزات لے کر آئے۔

اس آیت سے یہ تو صراحتاً معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پانچ رسولوں کو واضح معجزات عطافرمائے تھے اگرچہ ذکر صرف حضرت صالح (علیہ السلام) کے اس معجزہ کا کیا ہے کہ انھوں نے ایک پتھر کی چٹان سے اونٹنی نکالی، اور اس آیت سے اشارۃً یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو معجزہ دے کر بھیجا کیونکہ اگر نبی کے پاس معجزہ نہ ہو تو وہ کس بنیاد پر اپنی رسالت کو ثابت کرے گا اور اگر نبی کے پاس معجزہ نہ ہو تو نبی صادق اور نبی کاذب میں امتیاز کا کوئی ذریعہ نہیں رہے گا۔ علاوہ ازیں اس حدیث میں اس پر بھی دلیل ہے کہ ہر نبی کو معجزہ عطافرمایا گیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ہر نبی کو اس قدر معجزات دیے گئے ہیں جن کی وجہ سے ایک بشر ان پر ایمان لے آئے اور مجھے وحی (قرآن مجید) عطا کی گئی جو اللہ نے مجھ پر نازل فرمائی پس مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن میرے متبعین تمام نبیوں سے زیادہ ہوں گے۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 4981۔ صحیح مسلم، الایمان: 239 (152) 378۔ مسند احمد، ج 2، ص 341۔ 451۔ السنن البری للنسائی، رقم الحدیث: (1129

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزہ کا دیگر انبیاء (علیہم السلام) کے معجزات سے امتیاز:

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ ہر نبی کو اتنے معجزات دیے گئے جن کی وجہ سے کوئی بشر ایمان لاسکے اور مجھے قرآن مجید دیا گیا ہے جس کی مثل کسی کو نہیں دی گئی اس لیے فرمایا میرے متبعین سب سے زیادہ ہوں گے۔ اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ مجھے جو معجزہ دیا گیا ہے اس پر جادو یا شعبدہ وغیرہ کا مگان نہیں کیا جاسکتا جبکہ دوسرے انبیاء کے معجزات کے متعلق یہ گمان کیا جاسکتا ہے۔ اس کا تیسرا معنی یہ ہے کہ انبیاء سابقین (علیہم السلام) کے معجزات ان کے زمانوں کے ساتھ گزر گئے اور ان کے زمانوں میں بھی ان معجزات کا مشاہدہ صف ان لوگوں نے کیا تھا جو اس موقع پر موجود تھے اور ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا معجزہ قران مجید ہے جو قیامت تک باقی رہے گا اور اس میں جو فصاحت اور بلاغت ہے اور غیب کی خبریں ہیں اس کی نظیر لانے سے بلکہ اس کی ایک سورت کی بھی نظیر لانے سے تمام جن اور انس اجتماعی اور انفرادی طور پر ناکام اور عاجز رہے، اور علم کی روز افزوں ترقی اور مخالفین کی کثرت کے باوجود اب تک عاجز ہیں۔ قرآن مجید کی پیش گوئیوں کو کوئی جھٹلا نہیں سکا اور قرآن مجید کا دعوی ہے کہ اس میں کمی اور زیادتی نہیں ہو سکتی اور کوئی شخص اس میں کمی اور بیشی ثابت نہیں کرسکا۔ ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد سے لے کر قیامت تک ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سوا کسی نبی کی نبوت پر کوئی دلیل یا معجزہ قائم نہیں ہے۔

معجزہ کی تعریفات:

علامہ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی حنفی متوفی 816ھ لکھتے ہیں: "وہ کام جو اللہ کی عادت جاریہ کے خلاف ہو اور خیر اور سعادت کی دعوت دیتا ہو اور اس کام کو پیش کرنے والا نبوت کا مدعی ہو اور اس خلاف عادت کام سے اس کے اس دعوی کے صدق کے اظہار کا قصد کیا گیا ہو کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔ اس خلاف عادت کام کو معجزہ کہتے ہیں۔" (کتاب التعریفات ص 153، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1418ھ)

علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی متوفی 793ھ لکھتے ہیں: "معجزہ وہ کام ہے جو خرق (خلاف) عادت ہو اور اس کے ساتھ اس کے معارضہ کا چیلنج مقرون ہو اور اس کا معارضہ نہ کیا جاسکے ایک قول یہ ہے کہ معجزہ وہ امر ہے جس سے نبوت یا رسالت کے مدعی کے صدق کے اظہار کا قصد کیا گیا ہو اور بعض علماء نے اس میں یہ قید بھی لگائی ہے کہ وہ امر اس کے دعویٰ کے موافق ہو اور بعض علماء نے یہ قید بھی لگائی ہے کہ وہ امر زمانہ تکلیف کے مقارن ہو کیونکہ ایام تکلیف کے ختم ہونے کے بعد بھی خوارق (اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ کے خلاف امور یا کام) کا ظہور ہوگا لیکن ان سے تصدیق کا قصد نہیں کیا جائے گا۔ (شرح المقاصد ج 5، ص 11، مطبوعہ منشورات الشریف الرضی، ایران، 1409ھ)"

علامہ کمال الدین عبدالواحد بن ہمام حنفی متوفی 861ھ لکھتے ہیں: "معجزہ اس خلاف عادت کام کو کہتے ہیں جو دعوی نبوت سے مقرون ہو اور اس سے نبوت کے مدعی کا صدق ظاہر ہو" (المسامرہ، ص 213، مطبوعہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ، مکران، بلوچستان)

علامہ ابوالحسن علی بن محمد ماوردی شافعی متوفی 450ھ لکھتے ہیں: "معجزہ اس فعل کو کہتے ہیں جو عام بشر کی عادت اور اس کی طاقت کے خلاف ہو اور وہ فعل حقیقتاً صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت سے صادر ہوا ہو، اور بظاہر وہ مدعی نبوت سے صادر ہوا ہو" (اعلام النبوۃ، ص 42، مطبوعہ دار احیاء العلوم بیروت، 1408ھ)

معجزہ کی شرائط:

علامہ احمد بن محمد القسطلانی متوفی 923ھ لکھتے ہیں: "معجزہ وہ کام ہے جو خلاف عادت ہو اور معارضہ کے چیلنج کے ساتھ مقرون ہو اور انبیاء (علیہم السلام) کے صدق پر دلالت کرتا ہو۔ اس کو معجزہ اس لیے کہتے ہیں کہ بشر اس کی مثال لانے سے عاجز ہے۔ اس کی حسب ذیل شرائط ہیں:

1۔ معجزہ وہ کام ہونا چاہیے جو خلاف عادت ہو جیسے چاند کا دو ٹکڑے ہونا، انگلیوں سے پانی کا پھوٹ پڑنا، لاٹھی کا عصا بن جانا، پتھر سے اونٹنی کا نکالنا۔ اس قید سے وہ کام خارج ہو گئے جو عادت کے مطابق ہوں۔

2۔ اس فعل کے معارضہ اور مقابلہ کو طلب کیا جائے اور بعض نے کہا اس فعل کے ساتھ رسالت کا دعوی مقرون ہو۔

3۔ مدعی رسالت نے جس فعل کو صادر کیا ہے کوئی شخص اس فعل کی مثل نہ لاسکے۔ اور بعض نے کہا معارضہ سے مامون ہونے کے ساتھ دعوی رسالت ہو۔ اس قید سے وہ امور خلاف عادت نکل گئے جو دعوی نبوت سے پہلے صادر ہوں جیسے اعلان نبوت سے پہلے ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر بادل کا سایہ کرنا اور شق صدر وغیرہ۔ ان کو ارہاص کہتے ہیں۔ اسی طرح اس قید سے اولیاء اللہ کی کرامات بھی خارج ہو گئیں کیونکہ ان کے ساتھ دعوی نبوت مقرون نہیں ہوتا۔

قاضی ابوبکر باقلانی نے کہا ہے کہ معجزہ کی تعریف میں جو تحدی کی شرط لگائی گئی ہے یعنی اس فعل کے معارضہ اور مقابلہ کو طلب کیا جائے اس کی دلیل کتاب میں ہے نہ سنت میں نہ اس پر اجماع ہے اور بیشمار معجزات ایسے ہیں جن کی صدور میں معارضہ اور مقابلہ کو طلب نہیں کیا جاتا۔ مثلاً کنکریوں کا کلمہ پڑھنا، انگلیوں سے پانی کا پھوٹ پڑنا، ایک صاع (چار کلو گرام) طعام سے دو سو آدمیوں کو پیٹ بھر کر کھلا دینا، آنکھ میں لعاب دہن ڈالنا، بکری کے گوشت کا کلام کرنا، اونٹ کا شکایت کرن اور بڑے بڑے معجزات، اور تحقیق یہ ہے کہ سوائے قرآن مجید کے اور کسی معجزہ میں تحدی نہیں کی گئی۔

4۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ فعل مدعی نبوت کے دعوی کے موافق ہو۔ اگر وہ خلاف عادت فعل مدعی نبوت کے خلاف ہو تو وہ معجزہ نہیں ہو گا بلکہ وہ اہانت ہو گی۔

واضح رہے کہ قرآن اور حدیث میں معجزہ کا لفظ استعمال نہیں ہوا بلکہ معجزہ کے لیے آیت، بینہ، اور برہان کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اذا جاءتہم ایۃ (الانعام: 24)۔ لقد جاءتہم رسلہم بالبینات (الاعراف: 101)۔ فذانک برھانان من ربک (القصص: 32) (المواہب اللدنیہ، ج 2، ص 191۔ 194، ملخصا، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1416ھ)

افعال غیر عادیہ کی دیگر اقسام:

معجزہ کے علاوہ خرق عادت فعل کی حسب ذیل قسمیں ہیں:

1۔ ارہاص: جو خلاف عادت امر نبی کے لیے اعلان نبوت سے پہلے ظاہر ہو۔ جیسے اعلان نبوت سے پہلے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر بادل کا سایہ کرنا۔

2۔ کرامت: مومن کامل کے ہاتھ سے جو خلاف عادت کام صادر ہو، جیسے غوث اعظم کا مردوں کو زندہ کرنا۔

3۔ معونت: عام مومن کے ہتھ سے جو خلاف عادت کام صادر ہو۔ جیسے ایک شخص نے اپنے پالتو کتے کے متعلق دعا کی کہ وہ اس کے گھر کے اندر نہ آئے صرف باہر رہا کرے، سو ایسا ہی ہو گیا۔

4۔ استدراج: کسی کافر کے ہاتھ پر اس کے دعویٰ کے موافق خلاف عادت کام صادر ہو جیسے دجال کئی کام کرے گا۔

5 اہانت: جو کافر نبوت کا مدعی ہو اس کے ہاتھ پر خلاف عادت امر ظاہر ہو لیکن وہ امر اس کے دعوی کا مکذب ہو، جیسے ایک کانے شخص نے مسیلمہ کذاب سے کہا: تم دعا کرو کہ میری آنکھ بینا ہو جائے۔ مسیلمہ کذاب نے دعا کی تو اس کانے کی صحیح آنکھ بھی بینا ہو گئی اور وہ مکمل اندھا ہو گیا۔ یا جیسے مرزا غلام احمد قادیانی نے پیش گوئی کی کہ اس کا نکاح محمدی بیگم سے ہو گا لیکن اس کا نکاح مرزا سلطان محمد سے ہو گیا۔ پھر مرزا غلام احمد نے پیش گوئی کی کہ مرزا سلطان محمد مر جائے گا اور محمدی بیگم بعد میں اس کے نکاح میں آجائے گی لیکن ہوا یہ کہ مرزا غلام احمد مر گیا اور سلطان محمد اس کی موت کے بعد دیر تک زندہ رہا، نیز مرزا نے پیش گوئی کی کہ عیسائی پادری آتھم 5 ستمبر 1884ء کے دن مر جائے گا (اس وقت وہ بیمار تھا اور ہسپتال میں زیر علاج تھا) لیکن اس تاریخ وہ تندرست ہو گیا اور زندہ رہا اور عیسائیوں نے اس کا جلوس نکالا۔

معجزات، انبیاء کے اختیار میں ہونے پر محدثین، فقہاء اور متکلمین کے دلائل:

علامہ عبدالرحمٰن بن محمد الانباری المتوفی 577ھ لکھتے ہیں:

معجزہ میں شرط یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہو کیونکہ معجزہ اس حیثیت سے دلالت کرتا ہے کہ وہ مدعی نبوت کے لیے اللہ کی جانب سے تصدیق ہے۔ اگر معجزہ اللہ کا فعل نہ ہو تو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے مدعی نبوت کی تصدیق کی ہے۔ (کتاب الاداعی الی الاسلام، ص 281، مطبوعہ دار البشاء الاسلامیہ، 1409ھ)

علامہ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی متوفی 816ھ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

ایک قوم نے معجزہ میں یہ شرط لگائی ہے کہ وہ نبی کی قدرت میں نہ ہو کیونکہ اگر معجزہ نبی کا مقدور ہوگا جیسے اس کا ہوا کی طرف چڑھنا اور پانی پر چلنا تو وہ اللہ کی طرف سے تصدیق کے قائم مقام نہیں ہوگا اور یہ اعتراض کچھ وزن نہیں رکھتا کیونکہ جب نبی اس فعل پر قادر ہوگا اور دوسر کوئی شخص اس پر قادر نہیں ہوگا تو وہ فعل معجزہ ہوگا۔ علامہ آمدی نے کہا: آیا معجزہ نبی کی قدرت میں ہے یا نہیں؟ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ بعض ائمہ نے یہ کہا کہ ہوا کی طرف چڑھنے اور پانی پر چلنے میں محض چڑھنا یا چلنا معجزہ نہیں ہے، کیونکہ یہ نبی کے لیے مقدور ہے اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نبی کے لیے اس پر قدرت پیدا کردے، اس مثال میں جو چیز معجز ہے وہ اس مثال میں نفس قدرت ہے اور یہ قدرت نبی کا مقدور نہیں ہے (کیونکہ یہ قدرت اللہ کے پیدا کرنے سے ہوتی ہے) اور بعض ائمہ نے کہا کہ اس مثال میں ہوا کی طرف چڑھنا یا پانی پر چلنا ہی معجز ہے (نہ کہ اس پر قدرت) کیونکہ یہ فعل مخارق (مخالف) عادت ہے اور یہ فعل اللہ تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے اور یہی قول زیادہ صحیح ہے۔ (شرح المواقف، ج 8، ص 223-224، مطبوعہ ایران)

علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی متوفی 1067ھ اس قول کے زیادہ صحیح ہونے کی وجہ بیان کرتے ہیں:

کیونکہ مقصود یہ ہے کہ دوسرے اس فعل سے عاجز ہوں اور اس سے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تصدیق حاصل ہو جائے گی اور یہی مقصود ہے۔ نیز لکھتے ہیں جو اس کے قائل ہیں کہ معجزہ نبی کی قدرت میں نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ نفس قدرت معجز ہے اور یہ نبی کا مقدور نہیں ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نفس قدرت کو معجزہ نہیں کہتے بلکہ اس خاص فعل کو معجزہ کہتے ہیں اور اس خاص فعل (مثلاً اس مثال میں ہوا کی طرف چڑھنا) پر نبی قادر ہے اور اس کا غیر قادر نہیں ہے اور معجزہ سے یہی مقصود ہے (حاشیہ سیالکوٹی علی شرح المواقف، ج 8، ص 224، مطبوعہ ایران)

اس بحث میں زیادہ واضح بات یہ ہے کہ جو ائمہ یہ کہتے ہیں کہ مثلا ہوا کی طرف چڑھنا یہ مخصوص فعل معجز نہیں ہے بلکہ اس پر نفس قدرت معجز ہے ان پر یہ اعتراض ہے کہ اس میں خلاف عادت افعال کی کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ عام عادت کے مطابق جو افعال ہوتے ہیں مثلاً پہاڑ پر چڑھنا، یا زمین پر چلنا ان افعال میں بھی نفس قدرت اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے ہوتی ہے تو پھر چاہیے کہ ان عام عادی افعال میں بھی نفس قدرت معجز ہو پھر اس دلیل سے عام عادت کے مطابق افعال بھی معجزہ قرار پائیں گے!

حقیقت یہ ہے کہ عام انسانوں کی عادت کے مطابق افعال ہوں یا انبیاء (علیہم السلام) کے خلاف عادت افعال ہوں ان افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور ان افعال کے کا سب انسان اور انبیاء (علیہم السلام) ہیں اور ان افعال کے ساتھ دو قدرتیں متعلق ہوتی ہیں ایک قدرت بہ حیثیت خلق، یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور ایک قدرت بہ حیثیت کسب، یہ انسان اور انبیاء کا کام ہے، اور جس طرح عام افعال عادیہ ہمارے اختیار میں دیے گئے ہیں اسی طرح خلاف عادت افعال اور معجزات انبیاء (علیہم السلام) کے اختیار میں دیے گئے ہیں۔

امام محمد بن غزالی متوفی 505ھ لکھتے ہیں:

نبی کو فی نفسہ ایک ایسی صفت حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کے خلاف عادت افعال ہوں ان افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور ان افعال کے کاسب انسان اور انبیاء (علیہم السلام) ہیں اور ان افعال کے ساتھ دو قدرتیں متعلق ہوتی ہیں ایک قدرت بہ حیثیت خلق، یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور ایک قدرت اور ایک قدرت بہ حیثیت کسب، یہ انسان اور انبیاء کا کام ہے، اور جس طرح عام افعال عادیہ ہمارے اختیار میں دیے گئے ہیں اسی طرح خلاف عادت افعال اور معجزات انبیاء (علیہم السلام) کے اختیار میں دیے گئے ہیں۔

امام محمد بن غزالی متوفی 505ھ لکھتے ہیں:

نبی کو فی نفسہ ایک ایسی صفت حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کے خلاف عادت افعال (معجزات) پورے ہوتے ہیں جس طرح ہماری ایک صفت ہے جس کی وجہ سے ہماری حرکات قدرت اور اختیار سے ہوتی ہیں اگرچہ قدرت اور مقدور دونوں اللہ تعالیٰ کا فعل ہیں۔ (احیاء العلوم، ج 5، ص 53، مطبوعہ دار الخیر، بیروت، 1413ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی 852ھ نے بھی امام غزالی کی اس عبارت سے استدلال کیا ہے۔ (فتح الباری، ج 12 ص 367، مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ، لاہور، 1041ھ)

علاہ سعد الدین تفتازانی متوفی 793ھ اس بحث میں لکھتے ہیں:

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہر چیز کو وجود میں لانے والا صرف اللہ وحدہ لاشریک ہے۔ خصوصا مردوں کو زندہ کرنے، لاٹھی کو سانپ بنانے، چاند کو شق کرنے اور پتھر کے سلام کرنے میں۔ علاوہ ازیں حکیم قادر مختار نے انبیاء (علیہم السلام) کو معجزات صادر کرنے کے لیے جو قدرت اور اختیار عطا کیا ہے وہ مطلب کی افادیت میں کافی ہے۔ اسی وجہ سے معتزلہ کا یہ مذہب ہے کہ معجزہ یا اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے یا اس کے حکم سے واقع ہوتا ہے یا اس کے قدرت اور اختیار دینے کی وجہ سے واقع ہوتا ہے۔ (شرح المقاصد ج 5 س 17، مطبوعہ ایران)

علامہ تفتازانی کی اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض معجزات محض اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتے ہیں اور ان میں نبی کا بالکل دخل نہیں ہوتا اور بعض معجزات کو اللہ تعالیٰ نبی کے قبضہ اور اختیار میں کر دیتا ہے اور وہ جب چاہتے ہیں ان معجزات کو صادر کرتے ہیں۔

علامہ محمد بن احمد سفارینی حنبلی متوفی 1188ھ لکھتے ہیں:

شیخ ابن تیمیہ نے کہا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جو معجزات، قدرت، فعل اور تاثیر سے متعلق ہیں، ان کی حسب ذیل انواع ہیں:

1۔ بعض فضا میں ہیں استسقاء اور استصحاء (بارش کا طلب کرنا اور بادلوں کا چھٹنا) میں بادلوں کا آنے اور جانے میں آپ کی اطاعت کرنا۔

3۔ انسانوں، جنات اور حیوانوں میں آپ کا تصرف کرنا۔

4۔ درختوں، لکڑیوں اور پتھروں میں آپ کا تصرف کرنا۔

5۔ آسمان کے فرشتوں کا آپ کی تائید کرنا۔

6۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعا کا قبول ہونا۔

7۔ ماضی اور مستقبل کے غیوب کی خبریں دینا۔

8۔ کھانے پینے کی چیزوں اور پھلوں کا زیادہ ہو جانا۔ ان کے علاوہ اور کئی انواع کے معجزات ہیں جن میں آپ کی نبوت اور رسالت کے دلائل اور علامات ہیں۔ (لوامع الانوار الالٰہیہ، ج 2، ص 293۔294، مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت، 1411ھ)

شیخ ابن تیمیہ کی اس تحریر سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض معجزات نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اختیار میں ہوتے ہیں کیونکہ انھوں نے لکھا ہے کہ بادل آپ کی اطاعت کرتے تھے اور آپ انسانوں، حیوانوں، درختوں اور پتھروں میں تصرف کرتے تھے۔

معجزات پر انبیاء کے اختیار کے ثبوت میں احادیث:

جنات اور شیاطین پر تصرف کے متعلق یہ حدیث ہے:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: گزشتہ رات ایک بہت زبردست جن نے مجھ پر حملہ کرنا چاہا تاکہ میری نماز خراب کرے، اللہ نے مجھے اس پر قدرت دی اور میں نے اس کو دھکا دیا، میں نے ارادہ کیا کہ اس کو مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون کے ساتھ باندھ دوں حتی کہ تم سب اس کو دیکھو پھر مجھے اپنے بھائی سلیمان کی یہ دعا یاد آئی "اے اللہ مجھے بخش دے اور مجھے ایسی سلطنت عطا فرما جو میرے بعد کسی اور کو سزاوار نہ ہو۔

(ص:35) پھر اللہ نے اس کو ناکام لوٹا دیا۔ (صحیح مسلم المساجد: 39 (541) 1189۔ صحیح البخاری، رقم الحدیث: 461۔ السنن الکبری للنسائی، ج 2، رقم الحدیث: 1440)

علامہ نووی نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو شیطان کے باندھنے پر قدرت دی تھی لیکن آپ نے حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی دعا کے پیش نظر ادباً اور تواضعاً ایسا نہیں کیا۔

درختوں پر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تصرف کے متعلق یہ حدیث ہے:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک اعرابی آیا اور کہنے لگا: میں کس طرح پہچانوں کہ آپ نبی ہیں! آپ نے فرمایا: اگر میں کھجور کے اس خوشہ کو درخت سے بلاؤں تو تم گواہی دوگے کہ میں اللہ کا رسول ہوں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو بلایا تو کھجوروں کا وہ خوشہ درخت سے اترا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے آکر گر گیا پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: لوٹ جاؤ تو وہ لوٹ گیا پھر وہ اعرابی مسلمان ہوگیا۔ یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے۔ (سنن الترمذی، رقم الحدیث: 3648۔ مسند احمد ج 1، رقم الحدیث: 1954۔ صحیح ابن حبان رقم الحدیث: 6523۔ المعجم الکبیر ج 12، رقم الحدیث: 12622۔ دلائل النبوۃ للبیہقی ج 6، ص 15، سنن دارمی رقم الحدیث: 24۔ جامع الاصول، ج 11، رقم الحدیث: 8895)

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ مسجد کی چھت کھجور کے شہتیروں پر بائی گئی تھی اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان میں سے ایک شہتیر سے ٹیک لگا کر خطبہ دیتے تھے۔ جب آپ کا منبر بنایا گیا اور آپ اس پر بیٹھ گئے تو ہم نے اس شہتیر کے رونے کی آواز سنی جس طرح اونٹنی اپنے بچے کے فراق میں روتی ہے حتی کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے پاس آئے آپ نے اس پر ہاتھ رکھا تو وہ پرسکون ہوگیا۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 3585۔ سنن الترمذی، رقم الحدیث: 3647۔ سنن النسائی رقم الحدیث: 1395۔ جامع الاصول، ج 11، رقم الحدیث: 8897۔ مسند احمد، ج 3، ص 300)

اور انسانوں پر تصرف کے متعلق یہ حدیث ہے:

حضرت کعب بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب غزوہ تبوک کے لیے جا رہے تھے تو اثناء سفر میں ہم نے ایک سفید پوش شخص کو ریگستان سے آتے ہوئے دیکھا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کن ابا خیثمہ، ابوخیثمہ ہو جا تو وہ ابوخیثمہ ہوگیا۔ (صحیح مسلم توبہ، 53 (2769) 6883)

علامہ نوووی لکھتے ہیں کہ قاضی عیاض نے فرمایا: کہ کن یہاں تحقق اور وجود کے لیے ہے یعنی اے شخص تجھے چاہیے کہ تو حقیقتاً ابوخیثمہ ہو جا۔ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ قاضی عیاضنے جو کہا ہے وہ صحیح ہے۔ (صحیح مسلم بشرح النووی ج 11، ص 6910، مطبوعہ مکتبہ الباز مکہ مکرمہ، 1417ھ)

علامہ ابوالعباس قرطبی مالکی متوفی 656ھ نے بھی یہی لکھا ہے۔ (المفہم، ج 7، ص 96، مطبعہ دار ابن کثیر، بیروت، 1417ھ)

علامہ ابی مالکی متوفی 828 نے بھی قاضی عیاض کے حوالے سے یہی تقریر کی ہے۔ (اکمال اکمال المعلم، ج 9، ص 189، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1415ھ)

انبیاء کے اختیار میں معجزات ہونے پر ایک اشکال کا جواب:

معجزات پر نبی کی قدرت نہ ہونے پر بعض علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے: وماکان لرسول ان یاتی بایۃ الا باذن اللہ لکل اجل کتاب: کسی رسول کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ کوئی نشانی لے آئے مگر اللہ کے اذن سے، ہر وعدہ کے لیے ایک نوشتہ تقدیر ہے۔ (الرعد: 38)

اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں نشانی (آیت) سے مراد کفار کے فرمائشی معجزات ہیں۔ اور اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ کوئی نبی اللہ کی دی ہوئی طاقت اور قدرت سے بھی کوئی معجزہ پیش نہیں کر سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ جب معجزات پر قدرت عطا فرماتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا اذن ہی ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں تصریح ہے کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے اذن سے مادر زاد اندھوں اور برص کے مریضوں کو تندرس کرتے تھے اور اللہ کے اذن سے مردوں کو زندہ کرتے تھے۔

علامہ نووی شافعی متوفی 676ھ اور علامہ محمود بن احمد عینی حنفی متوفی 855ھ نے یہ حدیث جریج کی شرح میں لکھا ہے کہ بعض اوقات اولیاء اللہ کی کرامات ان کی طلب اور ان کے اختیار سے واقع ہوتی ہیں اور یہی صحیح مذہب ہے۔ (شرح مسلم، ج 2، ص 314، مطبوعہ کراچی، عمدۃ القاری، ج 7، ص 283، مطبوعہ مصر)
اور جب بعض اوقات الیاء اللہ کی کرامات ان کے اختیار سے واقع ہوتی ہیں تو بعض اوقات انبیاء (علیہم السلام) کے معجزات کا ان کے اختیار سے واقع ہونا زیادہ لائق ہے۔

معجزات کے صدور میں علماء دیوبند کا موقف :

علماء دیوبند کے نزدیک معجزہ صرف اللہ تعالیٰ کا فعل ہے، ظاہراً اور حقیقتاً نبی کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے خلق کے لحاظ سے نہ کسب کے لحاظ سے اور نبی سے معجزہ کا صدور ایسے ہے جیسے کاتب کے قلم سے لکھنے صدور ہو جیسے قلم بے اختیار ہوتا ہے ایسے ہی نبی بے اختیار ہوتا ہے۔ شیخ رشید احمد گنگوہی متوفی 1323ھ نے اس موضوع پر فارسی میں ایک طویل مقالہ لکھا ہے جس کو مکمل نقل کرنا تو مشکل ہے۔ ہم اس کی بعض عبارات نقل کر رہے ہیں جن سے ان کے مسلک پر روشنی پڑتی ہے۔

شیخ رشید احمد گنگوہی متوفی 1323ھ لکھتے ہیں :

عبض افعال خاصلہ الٰہیہ بعض اوقات فرشتوں اور نبیوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور ان افعال کے وقوع میں میں ان کی کوئی قوت، اختیار، قدرت اور اقتدار نہیں ہوتا، لہٰذا ان افعال کو کھانے اور پہننے کی طرح افعال اختیار یہ اور اعمال مقدور میں سے شمار نہیں کرنا چاہیے اور ان کی مثال کاتب اور قلم کی سی ہے، جس طرح لکھنے میں قلم کی کوئی قدرت اور اختیار نہیں ہے اسی طرح ان افعال کے صدور میں نبیوں کا بھی کوئی اختیار نہیں ہے۔ (فتاوی رشیدیہ کامل، ص 173، ملخصا، مطبوعہ کراچی)
مولانا حیدر علی ٹون کی نے اپنی بعض تصنیفات میں لکھا ہے : اور وہ جو عوام کا گمان ہے کہ کرامت اولیاء کا خود اپنا فعل ہوتا ہے یہ باطل ہے۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے جس کو وہ ولی کے ہاتھ پر اس کی تکریم اور تعظیم کے لیے ظاہر فرماتا ہے اور ولی کا اور نہ ہی نبی کا اس کے صدور میں اختیار ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ و تقدس کے افعال میں کسی کا اختیار نہیں ہے۔ (فتاوی رشیدیہ کامل، ص 175، مطبوعہ کراچی)۔ بلکہ یہ اس پر مبنی ہے کہ معجزہ نبی کا فعل نہیں ہے بلکہ خدا تعالیٰ کا فعل ہے جس کو اس نے نبی کے ہاتھ پر ظاہر فرمایا ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے افعال میں ان افعال کا کسب بندہ سے ہے اور ان افعال کا خلق خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور معجزہ میں بندہ کا کسب بھی نہیں ہوتا۔ پس اس آیت کا معنی یہ ہے : " ومارمیت اذرمیت ولکن اللہ رمی : آپ نے خاک کی مٹھی نہیں پھینکی جب کہ آپ نے صورتاً خاک کی مٹھی پھینکی تھی لیکن وہ خاک کی مٹھی حقیقتاً اللہ نے پھینکی تھی" (الانفال : 17)
اور یہ معنی بھی مراد نہیں ہے کہ آپ نے خاک کی مٹھی خلقاً نہیں پھینکی جبکہ آپ نے خاک کی مٹھی کسباً پھینکی تھی، اس لیے کہ یہ بھی تمام افعال میں جاری ہے۔ (فتاوی رشیدیہ کامل ص 176، مطبوعہ کراچی)
سو افعال اختیاریہ میں عادتاً تصرف ہوتا ہے ظاہراً اور فعل حق تعالیٰ کا مخفی ہے اور معجزات و تصرفات میں ظاہر بھی عجز ہے مثل قلم کے۔ (فتاوی رشدیہ کامل، ص 177، مطبوعہ کراچی)

معجزات کے صدور میں علماء اہل سنت کا موقف :

اس مسئلہ میں ہمارا موقف یہ ہے کہ معجزات اور کرامات ہوں یا عام افعال، تمام افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ عام افعال عادیہ میں جس طرح عام مسلمانوں کا کسب اور اختیار ہوتا ہے اور ان کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اسی طرح معجزات اور کرامات میں کسب اور اختیار انبیاء اور اولیاء کا ہوتا ہے اور ان افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ جیسا کہ ہم نے امام غزالی اور حافظ ابن حجر عسقلانی سے صراحتاً نقل کیا ہے اور شیخ ابن تیمیہ، علامہ نووی، علامہ عینی، علامہ تفتازانی اور علامہ میر سید شریف جرجانی ایسے محدثین، فقہاء صدور میں انبیاء اور اولیاء کا مطلقاً دخل نہیں ہوتا۔ خلقاً نہ کسباً جیسے قرآن مجید کا نزول۔ مردوں کو زندہ کرنا، چاند کا شق ہونا وغیرہ۔

شیخ رشید احمد گنگوہی نے اپنے موقف کے ثبوت میں لکھا ہے کہ ومارمیت اذرمیت کا یہ معنی نہیں ہے کہ آپ نے خلقاً خاک کی مٹھی نہیں پھینکی جبکہ آپ نے کسباً خاک کی مٹھی پھینکی تھی لیکن اہل سنت کے معتمد اور مستند مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں یہی لکھا ہے کہ آپ نے خاک کی مٹھی خلقاً نہیں پھینکی جبکہ آپ نے خاک کی مٹھی کسباً پھینکی تھی۔ ان عبارات کو نقل کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ اس آیت کا شان نزول اور پس منظر بیان کردیں :

امام حسین بن محمد فرا بغوی متوفی 516ھ لکھتے ہیں : مفسرین نے بیان کیا ہے کہ جب جنگ بدر کے دن مسلمانوں اور کافروں کے لشکر بالمقابل ہوئے تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خاک آلود کنکریوں کی ایک مٹھی بھر کر کفار کے چہروں پر ماری اور فرمایا : ان کے چہرے قبیح ہو جائیں تو ہر کافر کی آنکھوں یا منہ یا نتھنوں میں اس میں سے کچھ نہ کچھ گر گیا اور اس کے بعد کافروں کو شکست ہو گئی۔ (معالم التنزیل، ج 2، ص 200، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1414ھ)

واضح رہے کہ مفسرین نے لکھا ہے کہ خاک کی مٹھی کفار کے چہروں پر مارنے کا واقعہ جنگ بدر میں پیش آیا تھا۔ لیکن احادیث میں یہ ہے کہ یہ واقعہ غزوہ حنین میں پیش آیا تھا۔ (صحیح مسلم مغازی، 81(1777)4539۔ مسند الحمیدی، رقم الحدیث 459۔ مسند احمد، ج 1، ص 207، طبع قدیم، مسند احمد، ج 1، رقم الحدیث : 1775، طبع جدید دار الفکر، جامع الاصول، ج 8، رقم الحدیث : 6161)

بہر حال خاک کی مٹھی ایک ہزار کافروں کے منہ پر ماری جائے اور وہ خاک ہر کافر کی آنکھوں اور منہ میں چلی جائے یہ فعل خرق عادت اور معجزہ ہے تو اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی : "ومارمیت اذرمیت ولکن اللہ رمی : اور آپ نے خاک کی مٹھی نہیں ماری جب آپ نے ماری تھی لیکن اللہ نے وہ مٹھی ماری تھی" (الانفال :17)

شیخ رشید احمد گنگوہی نے لکھا ہے اس میں خلق اور کسب دونوں کی نفی ہے اور یہ معنی نہیں ہے کہ خاک کی مٹھی آپ نے خلقاً نہیں ماری جب آپ نے وہ مٹھی کسباً ماری تھی تاکہ معجزہ میں نبی کا کسب ثابت ہو لیکن اس کے برخلاف اہل سنت کے مستند اور معتمد مفسرین نے اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے کہ خاک کی مٹھی آپ نے خلقاً نہیں جبکہ آپ نے وہ مٹھی کسباً ماری تھی اور معجزہ پر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کسب اور اختیار ثابت کیا ہے۔

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی متوفی 606ھ لکھتے ہیں : اللہ تعالیٰ نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے خاک کی مٹھی مارنے کو ثابت بھی کیا ہے اور آپ سے اس کی نفی بھی کی ہے اس لیے معنی پر حمل کرنا واجب ہے جبکہ آپ نے خاک کی مٹھی خلقاً نہیں ماری اور کسباً ماری تھی۔ (تفسیر کبیر، ج 5، ص 466، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1415ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی 1270ھ نے بھی امام رازی کی اس عبارت کو نقل کرکے اس سے بندوں کے کسب کرنے پر استدلال کیا ہے۔ (روح المعانی، ج 9، ص 185) اس کے بعد مزید لکھتے ہیں : میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے جو خاک کی مٹھی کو پھینکنا ثابت کیا گیا ہے اس سے مادوہی مخصوس پھینکنا ہو جس نے عقلوں کو حیران کر دیا ہے اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے اس کا اثبات حقیقتاً ہو کہ آپ نے یہ فعل اس قدرت سے کیا جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عطا کی گئی تھی اور وہ قدرت اللہ تعالیٰ کے اذن سے موثر تھی۔ لیکن چونکہ عام انسانوں کی قدرت سے اس قسم کا اثر واقع نہیں ہو سکتا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس فعل کی آپ سے نفی کی اور اس کو اپنے لیے ثابت فرمایا۔ (روح المعانی، ج 9، ص 186، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علاہ ابوالبرکات احمد بن محمد نفسی حنفی متوفی 710ھ لکھتے ہیں : اس آیت میں یہ بیان ہے کہ بندہ کا فعل بندہ کی طرف کسباً منسوب ہوتا ہے اور اللہ کی طرف خلقاً منسوب ہوتا ہے۔ (مدارک علی ھامش الخازن، ج 2، ص 185، مطبوعہ پشاور)

علامہ احمد شہاب الدین خفاجی حنفی متوفی 1069ھ لکھتے ہیں : اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ آپ نے خلقاً وہ مٹھی نہیں پھینکی جب آپ نے کسباً وہ مٹھی پھینکی تھی۔ (عنایۃ القاضی علی البیضاوی، ج 4، ص 261، مطبوعہ دار صادر بیروت، 1283ھ)

علامہ سلیمان بن عمر المعروف بالجمل متقی 1204ھ لکھتے ہیں۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فعل کی نفی باعتبار ایجاد کے حقیقتاً ہے اور آپ کے لیے فعل کا اثبات باعتبار کسب ہے۔ (الفتوحات الالٰہیہ، ج 2، ص 235، مطبوعہ قدیمی کتب خانہ، کراچی)

ان کثیر حوالہ جات سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ انبیاء (علیہم السلام) سے بہ اعتبار کسب کے معجزات صادر ہوتے ہیں اور ان کو خلق اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت اور اس کے اذن سے ان معجزات کو صادر کرتے ہیں۔ البتہ جن معجزات کے ساتھ انبیاء (علیہم السلام) کا فعل متعلق نہیں ہوتا وہ محض اللہ تعالیٰ کا فعل ہیں جیسے قرآن مجید کا نزول، مردوں کو زندہ کرنا اور چاند کا شق ہونا۔ مدت سے یہ ارادہ تھا کہ میں معجزات کے متعلق ایک مفصل بحث لکھیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھ کو اب یہ توفیق عطا کی۔ وما توفیقی الا باللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

پہلے تکذیب کرنے کی وجہ سے بعد میں ایمان نہ لانے کی توجیہات :

اللہ تعالیٰ نے ان بستیوں کی خبریں بیان کرتے ہوئے فرمایا: بیشک ان بستیوں والوں کے پاس ان کے رسول واضح معجزات لے کر آئے ہیں پس وہ ان پر یمان لانے کے لیے بالکل تیار نہ ہوئے کیونکہ اس سے پہلے وہ ان کی تکذیب کر چکے تھے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے پہلے تکذیب سے مراد یہ ہے کہ عالم میثاق میں جب ارواح سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ماننے کا عہد لیا گیا تو انھوں نے ناپسندیدگی سے زبانی اقرار کیا تھا اور دل میں تکذیب قائم رکھی تھی اور اسی سابق تکذیب کی وجہ سے انھوں نے عالم اجسام میں آنے کے بعد بھی تکذیب کی۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ شروع میں جب انبیاء (علیہم السلام) نے ان کو تبلیغ کی اور توحید کی دعوت دی تو انھوں نے اپنے باپ دادا کی تقلید کی وجہ سے انکار کر دیا۔ پھر بعد میں جب ان پر دلائل اور معجزات کی وجہ سے حق واضح ہو گیا تو پھر انھوں نے اپنے سابق انکار سے رجوع کرنا اپنے لیے باعث عار اور اپنی انا کے خلاف سمجھا اور اسی انکار پر قائم رہے۔ اس کی تیسری توجیہ یہ ہے کہ اگر ہم ان کو ان کی موت کے بعد دوبارہ زندہ کر دیں اور پھر ان کو دنیا میں بھیجیں تو یہ پھر بھی اللہ، اس کے رسول اور احکام شرعیہ کی تکذیب کریں گے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے: "ولو ردوا لعادوا لما نھوا عنہ: اور اگر انھیں دنیا میں لوٹا دیا گیا تو پھر یہ دوبارہ وہی کام کریں گے جن سے ان کو منع کیا گیا تھا"

اس کی چوتھی توجیہ یہ ہے کہ رسولوں کے آنے سے پہلے یہ کفر پر اصرار کرتے تھے تو رسولوں کے آنے کے بعد بھی ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ پانچویں توجیہ یہ ہے کہ معجزات دیکھنے سے پہلے یہ کفر کرتے تھے تو معجزات دیکھنے کے بعد بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اس کے بعد فرمایا: اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔ یعنی جب یہ کفر اور سرکشی میں حد سے بڑھ جاتے ہیں تو بہ طور سزا اللہ ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ○ ۱۰۲

لغۃ القرآن: [وَمَا وَجَدْنَا : اور ہم نے نہیں پایا] [لِاَكْثَرِهِمْ : ان کے اکثر کے لیے] [مِّنْ عَهْدٍ : وعدہ کی کوئی پابندی] [وَاِنْ : اور بیشک] [وَّجَدْنَآ : ہم نے پایا] [اَكْثَرَهُمْ : ان کے اکثر کو] [لَفٰسِقِيْنَ : یقینا نافرمانی کرنے والے]

ترجمہ: اور ہم نے ان میں سے اکثر لوگوں میں عہد (کا نباہ) نہ پایا اور ان میں سے اکثر لوگوں کو ہم نے نافرمان ہی پایا

تشریح: وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ۔ یہ دلوں پر مہر لگنے کا نتیجہ اور اثر بیان ہوا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی گروہ کے دلوں پر مہر کر دیا کرتا ہے تو ان کی مت اس طرح ماری جاتی ہے کہ کوئی نشانی بھی ان کو دکھاؤ وہ اپنی جگہ سے کھسکنے کا نام نہیں لیتے۔ بار بار قسمیں کھا کھا کے عہد کریں گے کہ اگر فلاں معجزہ دکھا دو تو ہم مان لیں گے لیکن وہ معجزہ بھی دکھا دیا جائے تو کسی نئے معجزے کا مطالبہ شروع کر دیں گے اور اپنے پہلے عہد سے پھر جائیں گے۔ لفظ 'فاسق' یہاں عہد شکن

کے مفہوم میں ہے۔ یہی مضمون زیادہ وضاحت سے سورۃ انعام میں یوں بیان ہوا ہے۔ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَاءَتْهُمْ آيَةٌ لَيُؤْمِنُنَّ بِهَا قُلْ اِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَا اِذَا جَاءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۰۹) وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۱۱۰) : اور وہ بڑی پکی قسمیں کھا کے یقین دلاتے ہیں کہ اگر کوئی معجزہ ان کو دکھایا جائے تو وہ ضرور اس پر ایمان لے آئیں گے۔ کہہ دو کہ معجزے تو اللہ ہی کے پاس ہیں۔ اور تمہیں کیا پتہ کہ اگر معجزہ بھی آجائے گا جب بھی وہ ایمان لانے والے نہیں اور ہم ان کے دلوں اور ان کی بصیرتوں کو اسی طرح الٹ دیں گے جس طرح وہ پہلی بار ایمان نہیں لائے اور ان کی سرکشی میں ان کو بھٹکتا چھوڑ دیں گے)۔ آگے حضرت موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت میں بھی یہی حقیقت ان الفاظ میں واضح کی گئی ہے۔ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَاءِيْلَ ۔ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (جب ان پر کوئی آفت آتی وہ کہتے، اے موسیٰ، ہمارے واسطے اپنے رب سے، اس وعدے کی بنا پر جو اس نے تم سے کر رکھا ہے، دعا کرو۔ اگر) تم نے یہ بلا ہمارے سر سے ٹال دی تو ہم تمہارے بات ضرور مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تمہارے ساتھ جانے دیں گے۔ پھر جب ہم اس آفت کو کچھ دیر کے لیے، جس تک لازماً ان کو پہنچنا ہوتا، ٹلا دیتے تو وہ دفعۃً اپنا عہد توڑ دیتے۔ (تفسیر تدبر القرآن)

کفار کے دلوں پر مہر ثبت ہونے اور ان کی ہلاکت کا سبب، اللہ کے ساتھ ان کی عہد شکنی تھی۔

کفار کی ہلاکت اور ان کی گمراہی کا سبب بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ایسا اس لیے ہوا کہ ہم نے ان کی اکثریت کو نافرمان اور بد عہد پایا تھا۔ عہد سے مراد وہ ازلی عہد ہے جو روز آفرینش اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان سے لیا تھا کہ کیا میں تمہارا رب ہوں یا نہیں؟ جس کی تفسیر اسی سورۃ کی آیت ۱۷۲ میں بیان کی جائے گی انشاء اللہ عہد سے مراد وہ اقرار اور عہد ہے جو آدمی ایمان لاتے ہوئے کلمہ شہادت کے الفاظ میں اقرار کرتا ہے۔ جس کا مختصر مفہوم یہ ہے کہ کلمہ پڑھنے والا اقرار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا میرا کوئی خالق، مالک اور معبود نہیں، محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرے رسول، رہنما اور مقتدا ہیں، میں انھی کی اتباع میں زندگی بسر کروں گا۔ اس عہد کے تحت وہ عہد و اقرار بھی شامل ہیں جو ہم ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں یہ تین قسم کے عہد و اقرار ہیں جن پر پورا اترنا انسان کی ذمہ داری ہے اگر کوئی جان بوجھ کر عہد شکنی کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اسے باز پرس ہوگی۔ یہاں انسانوں کی اکثریت کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے ان کو عہد شکن اور نافرمان ہی پایا ہے۔ جو لوگ جمہوریت کو حق و باطل، صحیح اور غلط کا معیار قرار دیتے ہیں۔ انھیں اس اصول پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ کیونکہ حق و باطل، غلط اور صحیح کا معیار لوگوں کی اکثریت نہیں بلکہ اس کا معیار مسلمہ اقدار اور قرآن و سنت کے اصول ہیں۔ لوگوں کی اکثریت تو لکیر کی فقیر ہوا کرتی ہے۔

(عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ (رض) قَالَ مَا خَطَبَنَا نَبِيُّ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اِلَّا قَالَ لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ) [رواہ احمد]

"حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے ہر خطبے میں یہ فرماتے جو امانت دار نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں اور جو عہد کی پاسداری نہیں کرتا اس کا کوئی دین نہیں۔" (تفسیر فہم القرآن۔ محمد جمیل)

دعاؤں سے مصیبت ٹلنے کے بعد اللہ کو فراموش کر دینا:

ان لوگوں سے مراد پچھلی امتوں کے کافر لوگ ہیں اور عہد سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام روحوں سے عالم میثاق میں لیا تھا۔ امام ابن جریر طبری متوفی 310ھ اپنی سند کے ساتھ سے روایت کرتے ہیں:

حضرت ابی بن کعب بیان کرتے ہیں کہ اس عہد سے یہ مراد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کی پشت سے تمام روحوں کو نکال کر عہد لیا فرمایا: الست بربکم قالوا بلی (الاعراف: 172) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا کیوں نہیں! تو یقیناً ہمارا رب ہے۔ اور اب یہ اس وعدہ کو فراموش کر کے شرک کرنے لگے اور مختلف بتوں کی پرستش کرنے لگے۔

اس عہد سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ جب انسان پر مصیبت پڑتی ہے تو وہ توبہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر معافی مانگتا ہے اور عہد کرتا ہے کہ اب اگر اس مصیبت سے نجات دے دی تو وہ ضرور اللہ کی اطاعت اور شکر گزاری کرے گا اور جیسے ہی اللہ اس مصیبت سے نجات دے دیتا ہے تو وہ پھر شرک اور ناشکری کرنے لگتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے: " قل من ینجیکم من ظلمت البر والبحر تدعونہ تضرعا وخفیۃ لئن انجانا من ھذہ لنکونن من الشکرین۔ قل اللہ ینجیکم منہا و من کل کرب

ث انتم تشر کون: آپ پوچھیے تمہیں خشکی اور سمندر کی تاریکیوں سے کون نجات دیتا ہے جسے تم عاجزی اور چپکے زپ کے سے پکارتے ہو، اگر ہمیں اس (مصیبت) سے نجات دے دی تو ہم ضرور شکر کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ آپ کہیے کہ تم کو اس مصیبت سے اللہ ہی نجات دیتا ہے اور ہر مصیبت سے، پھر تم شرک کرتے ہو"

نیز فرماتا ہے: "واذا مس الانسان ضر دعا ربہ منیبا الیہ ث اذا خولہ نعمۃ منہ نسی ماکان یدعوا الیہ من قبل وجعل للہ اندادا لیضل عن سبیلہ: اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب ہی کی طرف رجوع کرتا ہوا اس کو پکارتا ہے، پھر جب اللہ اسے کوئی نعمت عطا فرما دیتا ہے تو وہ اس تکلیف کو بھول جاتا ہے جس کے لیے وہ اللہ کو پکارتا تھا اور اللہ کے لیے شریک بنانے لگتا ہے تاکہ اللہ کے راستے سے لوگوں کو گمراہ کرے" (الزمر: 8)۔ اس آیت میں فرمایا ہے کہ اکثر لوگوں کو عہد پورا کرنے والا نہ پایا۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ پچھلی امتوں میں سب کافر اور فاسق اور عہد فراموش نہ تھے، بعض ایسے بھی تھے جو اپنے رسولوں پر ایمان لے آئے تھے، نیک عمل کرتے تھے اور عہد پورا کرتے تھے گو ایسے نیک لوگ بہت کم تھے۔

یہاں تک حضرت نوح، حضرت ھود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب (علیہم السلام) اور ان کی امتوں کے قصص بیان فرمائے اب اس کے بعد والی آیتوں سے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

مصیبت کے وقت عہد و پیمان اور بعد میں اس کے برخلاف:

آیت میں عہد کی جو تفسیر بیان کی گئی ہے اس کو پیش نظر رکھ کر اپنے احوال پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اندر بھی عملی اعتبار سے ایسی کمزوریاں پائی جاتی ہیں کہ کوئی بیمار پڑتا ہے یا مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے عہد و پیمان کرتا ہے کہ اے اللہ! عَزَّوَجَلَّ، ایک مرتبہ مجھے اس مصیبت سے چھٹکارا دیدے، دوبارہ ساری زندگی تیری فرمانبرداری میں گزاروں گا مگر جیسے ہی وہ مصیبت دور ہوتی ہے تو یہ سب عہد و پیمان پسِ پشت ڈال دیئے جاتے ہیں اور وہی پرانی موج مستی اور غفلت و معصیت کی زندگی لوٹ آتی ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

آیت مبارکہ:

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۱۰۳

لغۃ القرآن: [ثُمَّ: پھر] [بَعَثْنَا: ہم نے بھیجا] [مِنْۢ بَعْدِهِمْ: ان کے بعد] [مُّوْسٰي: موسیٰ کو] [بِاٰيٰتِنَاۤ: اپنی نشانیوں کے ساتھ] [اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ: فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف] [فَظَلَمُوْا: تو انہوں نے ظلم کیا] [بِهَا: ان (نشانیوں) پر] [فَانْظُرْ: تو غور کرو] [كَيْفَ: کیسا] [كَانَ: تھا] [عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ: نظم بگاڑنے والوں کا انجام]

ترجمہ: پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے (درباری) سرداروں کے پاس بھیجا تو انھوں نے ان (دلائل اور معجزات) کے ساتھ ظلم کیا، پھر آپ دیکھئے کہ فساد پھیلانے والوں کا انجام کیسا ہوا؟

تشریح: مذکورہ بالا انبیاء کے بعد فرعون جو اپنے آپ کو خدا یا مظہر خدا سمجھتا تھا کی طرف اور اس کے درباریوں کی طرف حضرت موسیٰ کلیم (علیہ السلام) مبعوث کیے گئے۔ اور انھیں زبردست معجزے عطا کیے گئے تاکہ کسی کو آپ کی صداقت میں شک نہ رہے۔ ہر خاص و عام سمجھ لے کہ ایسے معجزے دکھانے والا صرف اللہ تعالیٰ کا

رسول ہی ہو سکتا ہے۔ یہاں ظلم بمعنی کفر ہے۔ کیونکہ معجزات کے ساتھ ظلم یہی ہے کہ ان کو دیکھ کر دعوت حق قبول کرنے کے بجائے اس کا شدومد سے انکار کر دیا جائے۔ اسی لیے فکفروا بھاکے بجائے فظلموا بھافرمایا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

اس سے قبل قوم نوح (علیہ السلام) سے لے کر قوم شعیب (علیہ السلام) تک جن اقوام کا ذکر کیا گیا۔ وہ محض قبائل تھے جن کے پاس کوئی منظّم حکومت یا فوج نہ تھی۔ اب اس نبی کا ذکر کیا جارہا ہے جسے اپنے دور کی عظیم طاغوتی طاقت سے ٹکر لینے کے لیے بھیجا گیا یعنی فرعونی سلطنت جس کا پایہ تخت مصر کے قدیم شہر ممفس میں تھا جس کے کھنڈرات آج بھی قاہرہ سے چند میل دور دریائے نیل کے کنارے موجود ہیں۔ اللہ کا نبی مادی وسائل سے مالا مال اپنے وقت کی عظیم طاغوتی سلطنت کے مقابلہ میں بے سروسامان کھڑا ہوا۔ اللہ نے اسے اپنی نشانیاں دے کر بھیجا یعنی ید بیضاء اور لکڑی کا عصا۔ مگر فرعون اور اس کے حواریوں نے ان نشانیوں پر ایمان لانے کی بجائے انھیں جادو قرار دے کر ان کا مذاق اڑایا تب ان فساد پرستوں کا جو انجام ہوا وہ ہر دور کے فسادیوں کے لیے درس عبرت ہے۔

معلوم ہوا انبیاء ورسل کافر گورنمنٹوں سے ٹکر لینے اور انھیں دین اسلام کے آگے جھکانے کے لیے آتے تھے کیونکہ وہ سچے انبیاء تھے جبکہ باب نبوت بند ہو جانے کے بعد جھوٹے نبی کفار کی سرپرستی میں کھڑے ہوئے جیسے مرزا قادیانی عیسائیوں کی مدد سے کھڑا ہوا اور زندگی بھر انہی کی غلامی کرتا رہا۔ اور اسی غلامی میں جہنم واصل ہوا۔ (تفسیر برہان القرآن)

یہاں سے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے احوال کا تفصیلی بیان شروع ہوتا ہے جو درجنوں آیات پر مشتمل ہے۔

بنی اسرائیل کا اصل وطن فلسطین تھا۔ حضرت یوسف (علیہ السلام) کے زمانہ میں یہ لوگ مصر جا کر آباد ہو گئے۔ مصر کے اصلی باشندے قبطی تھے، کچھ عرصہ بعد فرعون اور قبطیوں نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا اور ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھانے شروع کر دیئے حتیٰ کہ ایسا موقع بھی آیا کہ وہ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ذبح کرا دیتا اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتا۔ (قرآن: ۲، ۴۹) جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف بھیجا تو آپ نے فرعون سے کہا: میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں اور میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں، لہٰذا تم بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو تاکہ میں انھیں لے کر اپنے وطن فلسطین میں چلا جاؤں جہاں وہ آزادی سے زندگی گزار سکیں۔ فرعون نے کہا: اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو کوئی معجزہ دکھاؤ، چنانچہ آپ (علیہ السلام) نے اپنا لکڑی کا عصا زمین پر پھینکا تو وہ سچ مچ کا زندہ اژدہا بن گیا۔ وہ اژدھا منہ کھول کر فرعون کی طرف لپکا تو فرعون نے گھبرا کر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے درخواست کی کہ اس کو پکڑو، پھر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اژدھا کو پکڑا تو وہ لکڑی کا عصا بن گیا، اور دوسرا معجزہ یہ ظاہر ہوا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ہاتھ گریبان میں ڈال کر نکالا تو وہ چمکنے لگا۔ (تفسیر امداد الکرم)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا قصہ: ثم بعثنا۔۔ وملاہ (الآیۃ)، یہاں سے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا قصہ شروع ہو رہا ہے، جو مذکورہ انبیاء کے بعد آئے اور بنی اسرائیل کے جلیل القدر انبیاء میں سے ہیں جنہیں فرعون مصر اور اس کی قوم کی طرف دلائل و معجزات دے کر بھیجا گیا تھا، بنی اسرائیل اصالۃً ملک شام کے علاقہ فلسطین میں کنعان کے رہنے والے تھے، حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اپنے مصری وزارت مالیات کے زمانہ میں اپنے خاندان کو مصر بلا لیا تھا، یہ لوگ مصر آکر آباد ہوگئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے، اسی خاندان بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پیدا ہوئے فرعون اور اس کی قوم کی ہدایت کیلئے آپ کو معجزے دے کر بھیجا گیا۔

فرعون موسیٰ کون تھا: فرعون شاہان مصر کا لقب ہے کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں ہے، لفظ فرعون کے معنی ہیں سورج دیوتا کی اولاد، قدیم اہل مصر سورج کو جو ان کا مہادیو یا رب اعلیٰ تھا، رَع کہتے تھے اور لفظ فرعون اسی کی طرف منسوب تھا، مصر کا حاکم اور فرمانروا خود کو اسی کا جسمانی مظہر اور نمائندہ ہونے کا دعویدار ہوتا تھا، اسی لیے مصر میں جو خاندان برسر اقتدار آتا تھا وہ اپنے آپ کو سورج ونسی بنا کر پیش کرتا تھا جیسا کہ ہندوستان میں بھی بہت سے خاندان خود کو سورج ونسی اور چندرونسی بتاتے ہیں۔

تین ہزار قبل مسیح سے شروع ہو کر عہد سکندر تک فراعنہ کے اکتیس (۳۱) خاندان مصر پر حکمراں رہے ہیں اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ کا فرعون کون ہے؟ عام مورخین عرب اور مفسرین اس کو عمالقہ کے خاندان کا فرد بتاتے ہیں، کسی نے اس کا نام ولید بن ریان بتایا ہے اور کوئی مصعب بن ریّان بتاتا

ہے ارباب تحقیق کی رائے ہے کہ اس کا نام ریّان تھا، ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس کی کنیت ابو مرّہ تھی یہ سب اقوال قدیم مورخین کی تحقیقی روایات پر مبنی ہیں، مگر اب جدید مصری اثری تحقیقات اور حجری کتبات کے پیش نظر اس سلسلہ میں دوسری رائے سامنے آئی ہے وہ یہ کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ کا فرعون ریمسیس ثانی کا بیٹا منفتاح ہے جس کا دور حکومت ۱۲۹۲ق م سے شروع ہو کر ۱۲۲۵ق م پر ختم ہوتا ہے۔ (قصص القرآن)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے قصہ کے سلسلہ میں دو فرعونوں کا ذکر آتا ہے ایک وہ جس کے زمانہ میں آپ پیدا ہوئے اور جس کے گھر میں آپ نے پرورش پائی دوسرا وہ جس کے پاس آپ اسلام کی دعوت اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ لے کر پہنچے تھے اور جو بالآخر غرق ہوا موجودہ زمانہ کے محققین کا عام خیال یہ ہے کہ پہلا فرعون ریمسیس (رعمسیس) دوم تھا اور جس فرعون کا زیر تفسیر آیتوں میں ذکر ہے وہ ریمسیس دوم کا بیٹا منفتاح تھا، اسی بادشاہ نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا تھا ان پر طرح طرح کے مظالم کرتا تھا جس کی تفصیل سورۃ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

فرعون اور اس کے درباری امراء نے جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی دعوت کو ٹھکرا دیا تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فرعون کے سامنے یہ دوسرا مطالبہ رکھا کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر دے تاکہ وہ اپنے آبائی وطن جا کر عزت و احترام کی زندگی بسر کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو نو معجزے عطا کئے تھے ان میں سے دو عظیم معجزے، معجزہ عصاء اور ید بیضاء، حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جب فرعون کے سامنے دلیل صداقت کے طور پیش کئے تو یہ معجزے دیکھ کر ایمان لانے کے بجائے فرعون اور اس کے درباریوں نے معجزوں کو جادو قرار دے کر کہہ دیا یہ تو بڑا ماہر جادوگر ہے جس سے اس کا مقصد تمہاری حکومت کو ختم کرنا ہے۔ (تفسیر جلالین)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: " پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کی جماعت کو بھیجا سو انھوں نے ان نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا، تو آپ دیکھیے کہ فساد کرنے والوں کا کیا انجام ہوا "

حضرت آدم سے حضرت موسیٰ اور حضرت موسیٰ سے ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک کا زمانہ:

امام محمد بن سعد نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت آدم اور حضرت نوح کے درمیان دس قرن ہیں اور وہ سب اسلام پر تھے۔ (الطبقات الکبری ج 1، ص 42، مطبوعہ دار صادر، بیروت)

نیز امام محمد بن سعد نے محمد بن عمر بن واقد اسلمی سے روایت کیا ہے کہ حضرت آدم اور حضرت نوح کے درمیان دس قرن ہیں اور قرن ایک سو سال کی مدت ہے۔ اور حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کے درمیان دس قرن ہیں اور حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ بن عمران کے درمیان دس قرن ہیں اور حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ بن عمران اور حضرت عیسیٰ کے درمیان ایک ہزار نو سو سال ہیں اور اس زمانہ میں رسالت منقطع نہیں تھی اور اس مدت میں بنو اسرائیل کی طرف ایک ہزار نبی بھیجے گئے اور حضرت عیسیٰ اور ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے میلاد کے درمیان پانچ سو انہتر سال کی مدت ہے۔ (الطبقات الکبری ج 1 ص 53، مطبوعہ دار صادر، بیروت)

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کے تین ہزار سال بعد حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پیدا ہوئے اور حضرت آدم (علیہ السلام) کے پانچ ہزار چار سو انہتر سال بعد ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ولادت ہوئی اور یہ 1419 ھ ہے۔ اس حساب سے حضرت آدم (علیہ السلام) کی ولادت سے اب تک 6941 سال گزر چکے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

امام ابوالقاسم علی بن الحسن ابن عساکر متوفی 571 ھ لکھتے ہیں: سب سے پہلے جس نبی کو مبعوث کیا گیا وہ حضرت ادریس ہیں۔ پھر حضرت نوح، پھر حضرت ابراہی، پھر حضرت اسماعیل، پھر حضرت اسحاق، پھر حضرت یعقوب بن اسحاق پھر حضرت یوسف بن یعقوب، پھر حضرت لوط، پھر حضرت ھود، پھر حضرت صالح، پھر حضرت شعیب، پھر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام۔ (یہ امام ابن عساکر کی تحقیق ہے اور حافظ ابن کثیر کے نزدیک سب سے پہلے حضرت نوح کو مبعوث کیا گیا) (مختصر تاریخ دمشق ج 25 ص 300، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1409 ھ)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی پیدائش، پرورش، نکاح، نبوت اور فرعون کو تبلیغ:

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) تک حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا نسب اس طرح ہے: حضرت موسیٰ بن عمران بن قاھث بن عزر بن لادی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم (علیہ السلام) (البدایہ والنہایہ ج 1، ص 237، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

امام عبدالرحمٰن بن علی الجوزی المتوفی 597ھ لکھتے ہیں: علماء سیرت نے بیان کیا ہے کہ کاہنوں نے فرعون (فرعون، مصر کے بادشاہوں کا لقب ہے۔ اس کا نام ولید بن مصعب بن ریان تھا، جدید تحقیق یہ ہے کہ یہ ریمیس ثانی کا بیٹا منفتاح تھا اس کا دور حکومت 1292 قبل مسیح سے لے کر 1225 قبل مسیح پر ختم ہوتا ہے) سے کہا کہ بنو اسرائیل میں ایک ایسا بچہ پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں سے تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ تب فرعون نے حکم دیا کہ بنو اسرائیل کے نو مولود بیٹوں کو قتل کر دیا جائے۔ پھر قبطیوں نے فرعون سے شکایت کی کہ اگر تم اسی طرح بنو اسرائیل کے نو مولود بیٹوں کو قتل کرتے رہے تو ہماری خدمت کے لیے بنو اسرائیل میں سے کوئی باقی نہیں بچے گا! تب وہ ایک سال پیدا ہونے والے بیٹوں کو قتل کرا دیتا اور ایک سال پیدا ہونے والے بیٹوں کو چھوڑ دیتا۔

حضرت ہارون (علیہ السلام) اس سال پیدا ہوئے جس سال کے بیٹوں کو قتل نہیں کیا گیا تھا۔ اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اس سال پیدا ہوئے جس سال کے بیٹوں کو قتل کرانا تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ حضرت ہارون کی پیدائش کے ایک سال بعد پیدا ہوئے اور ایک قول یہ ہے کہ وہ حضرت ہارون کی پیدائش کے تین سال بعد پیدا ہوئے۔ وہب بن منبہ نے بیان کیا ہے کہ فرعون نے ستر ہزار نوزائیدہ لڑکوں کو قتل کرا دیا۔ جب حضرت موسیٰ کی والدہ کو حضرت موسیٰ کا حمل ہوا تو کسی کو معلوم نہیں ہوا اور انھوں نے حضرت موسیٰ کی ولادت کی۔ ان کی بہن مریم کے سوا اور کسی کو خبر نہیں دی۔ جب حضرت موسیٰ پیدا ہوئے تو ڈھونڈنے والے ان کے پاس پہنچے انھوں نے حضرت موسیٰ کو تنور میں ڈال دیا لیکن وہ سلامت رہے۔ پھر انھوں نے تین ماہ تک ان کو چھپا کر رکھا۔ پھر ان کو اندیشہ ہوا تو انھوں نے حضرت موسیٰ کو تابوت میں رکھ کر دریا میں ڈال دیا۔ پانی اس تابوت کو بہا کر فرعون تک لے گیا۔ فرون نے جب تابوت کھولا اور ان کو دیکھا تو کہا یہ میرے دشمن عبرانیوں میں سے ہے یہ ذبح ہونے سے کیسے بچ گیا! اس کی بیوی آسیہ نے کہا یہ ایک سال سے بڑی عمر کا ہے اور تم نے اس سال پیدا ہونے والے لڑکوں کو ذبح کا حکم دیا تھا۔ اس کو چھوڑ دو یہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگا۔

فرعون کے ہاں صرف بیٹیاں پیدا ہوتی تھیں اس لیے اس نے حضرت موسیٰ کو رہنے دیا اور ان سے محبت کرنے لگا۔ حضرت موسیٰ کی والدہ کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ حضرت موسیٰ فرعون کے گھر پہنچ گئے انھوں نے ان کی بہن مریم کو فرعون کے ہاں بھیجا تاکہ معلوم ہو کہ فرعون نے حضرت موسیٰ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے۔ ان کی بہن دوسری عورتوں کے ساتھ آسیہ کے پاس گئیں اور وہاں معلوم ہوا کہ بہت سی دودھ پلانے والی عورتوں کو بلایا گیا ہے لیکن حضرت موسیٰ نے کسی کا دودھ نہیں پیا۔ تب حضرت موسیٰ کی بہن نے کہا: "ھل ادلکم علی اھل بیت یکفلونہ لکم وھم لہ ناصحون: آیا میں تمہیں ایسے گھر والوں کی طرف رہنمائی کروں جو تمہارے لیے اس بچہ کی پرورش کریں اور وہ اس کے خیر خواہ ہوں" (القصص: 12)

انہوں نے پوچھا وہ کون ہیں؟ اس نے کہا وہ عمران کی بیوی حنہ ہے۔ انھوں نے اس کو بلوایا۔ حضرت موسیٰ کی والدہ آئیں تو حضرت موسیٰ نے ان کا دودھ پی یا اور سو گئے۔

جب حضرت موسیٰ کے دودھ پینے کی مدت ختم ہو گئی تو ایک دن فرعون کو اپنی گود میں لے کر بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت موسیٰ نے فرعون کی داڑھی پکڑ کر کھینچ لی۔ فرعون کے کہا جلاد کو بلاؤ اس کو ابھی ذبح کراتے ہیں۔ آسیہ نے کہا: یہ ناسمجھ بچہ ہے پھر اس نے یاقوت اور انگارے حضرت موسیٰ کے سامنے ڈالے۔ حضرت موسیٰ نے انگارہ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا جس سے ان کی زبان جل گئی اور اس میں لکنت پیدا ہو گئی جس کو دور کرنے کے لیے انھوں نے اللہ سے دعا کی تھی: "واحلل عقدۃ من لسانی۔ یفقھوا قولی: اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ لیں" (طہٰ: 27-28)۔

پھر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) جوان ہو گئے وہ فرعون کی سواریوں پر سوار ہوتے اور اس کی طرح لباس پہنتے۔ اور لوگ انھیں موسیٰ بن فرعون کہتے تھے۔ ایک دن حضرت موسیٰ شہر گئے تو وہاں دو آدمیوں کو لڑتے ہوئے دیکھا ایک ان کی قوم بنو اسرائیل سے تھا اور دوسرا ان کے دشمن قبطیوں میں سے تھا۔ اس اسرائیلی نے قبطی کے خلاف حضرت موسیٰ سے مدد طلب کی۔ حضرت موسیٰ نے قبطی کے ایک گھونسا مارا جس سے وہ مر گیا۔ (حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا اس کو گھونسا مارنا تادیباً تھا۔ آپ کا اس کو قتل کرنے کا قصد نہیں تھا اور نہ عادتاً ایک گھونسا کھا کر کوئی مرتا ہے۔ وہ قضاء الٰہی سے مر گیا اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا فعل کسی وجہ سے بھی گناہ

نہیں تھا۔ آپ کا اس پر نادم ہونا اور اس پر استغفار کرنا آپ کے انکسار اور تواضع کی وجہ سے تھا) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اس قتل پر نادم ہوئے اور آپ اپنے گرفتار ہونے کی وجہ سے خوف زدہ تھے۔ دوسرے دن وہ اسرائیل کسی اور شخص سے لڑ رہا تھا اور اس نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے پھر اس کے خلاف مدد طلب کی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اس اسرائیلی کی مدد کا ارادہ کیا اور اس نے غلط فہمی کی وجہ سے یہ سمجھا کہ شاید آپ اس کو مارنے لگے ہیں۔ اس نے کہا: کیا آپ مجھے اس طرح قتل کرنا چاہتے ہیں جس طرح آپ نے کل ایک شخص کو قتل کر دیا تھا (القصص: 15-18) تب لوگوں کو معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ قاتل ہیں۔ وہ حضرت موسیٰ کو پکڑنے کے لیے نکلے حضرت موسیٰ خوف زدہ ہو کر اس شہر سے نکلے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو مدین کے راستہ پر لگا دیا۔ (المنتظم، ج1، ص 217-219، طبع بیروت)

اس کے بعد کا واقعہ سورۃ القصص میں اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے بیان فرمایا ہے: (حضرت) موسیٰ مدین پہنچے تو دیکھا وہاں لوگ ایک کنوئیں سے پانی نکال رہے ہیں اور اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں اور ان سے دور ایک طرف دو عورتیں کھڑی ہیں جو اپنے جانوروں کو پانی کی طرف جانے سے روک رہی ہیں۔ (حضرت) موسیٰ نے ان سے پوچھا تم کیوں الگ کھڑی ہو؟ انھوں نے کہا: ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں جب تک کہ یہ لوگ اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر واپس لے جائیں اور ہمارے باپ بہت بوڑھے ہیں تو (حضرت) موسیٰ نے ان کی بکریوں کو پانی پلا دیا پھر سائے کی طرف آ گئے اور کہا: اے میرے رب میں یقیناً اس خیر اور برکت کا محتاج ہوں جو تو نے مجھ پر نازل کی ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد ان دو عورتوں میں سے ایک عورت شرم و حیا سے چلتی ہوئی آئی اس نے کہا: میرے والد آپ کو بلاتے ہیں تاکہ آپ کو پانی پلانے کی اجرت دیں، جب (حضرت) موسیٰ ان لڑکیوں کے باپ کے پاس گئے تو انھوں نے ان کو اپنے حالات بتائے، ان لڑکیوں کے والد نے کہا: آپ ڈریں نہیں! آپ نے ظالم لوگوں سے نجات پا لی ہے۔ ان لڑکیوں میں سے ایک نے کہا: اے ابا جان آپ انھیں اجرت پر رکھ لیں، بیشک آپ جس کو اجرت پر رکھیں ان میں وہی بہترین ہے جو قوی اور امانت دار ہو۔ ان کے والد نے کہا: میں یہ چاہتا ہوں کہ میں ان دو لڑکیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ کر دوں اس (مہر) پر کہ تم آٹھ سال تک اجرت پر میرا کام کرو اور اگر تم دس سال پورے کر دو تو یہ تمہاری طرف سے (تبرع) ہوگا، اور میں تم کو مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا، تم انشاء اللہ مجھے نیکوکاروں میں سے پاؤ گے۔

(حضرت) موسیٰ نے کہا: یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہو گئی میں ان میں سے جو مدت بھی پوری کر دوں تو مجھ پر کوئی تاوان نہیں اور ہمارے قول پر اللہ نگہبان ہے۔ پھر جب (حضرت) موسیٰ نے مدت پوری کر دی تو وہ اپنی بیوی کو لے کر چلے تو انھوں نے پہاڑ طور کی طرف ایک آگ دیکھی، انھوں نے اپنی اہلیہ سے کہا: ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے شاید میں تمہارے پاس اس کی کچھ خبر لاؤں یا آگ کی کوئی چنگاری لاؤں تاکہ تم تاپو۔ پھر جب (حضرت) موسیٰ آگ کے پاس آئے تو انھیں میدان کے داہنے کنارے سے برکت والے مقام میں ایک درخت سے ندا کی گئی کہ اے موسیٰ! بیشک میں ہی اللہ ہوں تمام جہانوں کا پروردگار، اور یہ کہ آپ اپنا عصا ڈال دیں پھر جب (حضرت) موسیٰ نے اسے اس طرح لہراتے ہوئے دیکھا گویا وہ سانپ ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر چل دیے اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھا (ندا آئی) اے موسیٰ! سامنے آئیے اور خوف نہ کیجیے بیشک آپ امن والوں میں سے ہیں۔ آپ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالیے وہ سفید چمکتا ہوا بے عیب نکلے گا، اور اپنا بازو اپنی طرف (سینے سے) ملائیں خوف دور ہونے کے لیے، سو یہ دو مضبوط دلیلیں آپ کے رب کی طرف سے ہیں فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف (آپ دعوت دیں) بیشک وہ فاسق لوگ ہیں۔ (حضرت) موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! میں نے ان میں سے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ اور میرے بھائی ہارون جو مجھ سے زیادہ فصیح زبان والے ہیں تو انھیں میری مدد کے لیے میرے ساتھ رسول بنا کر بھیج دے تاکہ وہ میری تصدیق کریں بیشک میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے۔ فرمایا: ہم عنقریب آپ کے بازو کو آپ کے بھائی کے ساتھ مضبوط کر دیں گے اور آپ دونوں کو غلبہ عطا فرمائیں گے تو وہ ہماری نشانیوں کے باعث آپ تک نہ پہنچ سکیں گے، آپ اور آپ کے متبعین ہی غالب رہیں گے۔ پس جب ان کے پاس (حضرت) موسیٰ ہماری کھلی ہوئی نشانیاں لے کر پہنچے تو انھوں نے کہا: یہ تو صرف من گھڑت جادو ہے اور ہم نے یہ باتیں اپنے پہلے باپ دادا کے زمانہ میں (کبھی) نہیں سنیں اور (حضرت) موسیٰ نے کہا: میرا رب اس کو خوب جانتا ہے جو میرے رب کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے (اور وہ خوب جانتا ہے) کہ آخرت کا انجام کس کے لیے اچھا ہوگا، بیشک ظالم لوگ فلاح نہیں پاتے۔ اور فرعون نے کہا: اے درباریو! میں تمہارے لیے اپنے سوا کوئی معبود نہیں جانتا سوائے ہامان! میرے لیے کچھ اینٹوں کو آگ سے پکاؤ پھر میرے

لیے ایک اونچی عمارت بناناتا کہ میں موسیٰ کے معبود کو جھانک کر دیکھوں اور بیشک میں اس کو جھوٹوں سے گمان کرتا ہوں۔فرعون اور اس کے لشکر نے زمین میں بے جا تکبر کیا اور یہ زعم کیا کہ وہ ہماری طرف نہیں لوٹائے جائیں گے تو ہم نے اس کو اور اس کے لشکر کو پکڑ لیا سو ہم نے ان سب کو دریا میں پھینک دیا تو آپ دیکھئے کہ ظالموں کا کیسا انجام ہوا۔ (القصص : 23۔40)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی زندگی کے اہم واقعات کو قرآن مجید کی اس سورت اور دیگر سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ان کی تفصیل اور تحقیق ہم ان آیتوں کی تفسیر میں انشاء اللہ بیان کریں گے۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی وفات :

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس ملک الموت آئے اور کہا : اپنی رب کی دعوت پر چلیئے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ایک تھپڑ مارااور ملک الموت کی آنکھ نکال دی۔ ملک الموت اللہ کے پاس گئے اور عرض کیا : تو نے مجھے ایسے بندے کے پاس بھیجا ہے جس کا مرنے کا ارادہ ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کی آنکھ لوٹا دی اور فرمایا : میرے بندہ کے پاس جا کر کہو تم زندگی چاہتے ہو، اگر تم زندگی چاہتے ہو تو ایک بیل کی پشت پر ہاتھ رکھ دو، جس قدر بال آپ کے ہاتھ کے نیچے آئیں گے، آپ اتنے سال زندہ رہیں گے۔ حضرت موسیٰ نے کہا : پھر کیا ہوگا؟ کہا پھر موت ہوگی ؟فرمایا : پھر ابھی عنقریب، اے میرے رب ! مجھے ارض مقدسہ سے ایک پتھر پھینکنے کے فاصلے پر موت عطافرمانا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : اگر میں اس جگہ ہوتا تو میں تمہیں ان کی قبر راستے کے ایک جانب کثیب احمر کے پاس دکھاتا۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث : 1339،3407۔ صحیح مسلم فضائل انبیاء : 157۔158 (2372) 6034۔6033۔ سنن النسائی رقم الحدیث : 2089، مسند احمد، ج 2، ص 369،315) امام عبدالرحمٰن بن علی بن جوزی متوفی 597 ھ لکھتے ہیں : ابو عمران جونی نے کہا جب موسیٰ (علیہ السلام) پر موت کا وقت آیا تو موسیٰ (علیہ السلام) رو رہے تھے، فرمایا : میں موت کی وجہ سے نہیں رو رہا بلکہ اس لیے رو رہا ہوں کہ موت کے وقت میری زبان ذکر الٰہی سے خشک ہو جائے گی۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی تین بیٹیاں تھیں۔ان کو بلا کر فرمایا : اے میری بیٹیو ! عنقریب بنواسرائیل تمہارے سامنے دنیا پیش کریں گے تم اس میں سے کسی چیز کو قبول نہ کرنا۔ علماء سیر نے بیان کیا ہے کہ حضرت ہارون (علیہ السلام) کی وفات کے تین سال بعد حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی وفات ہوئی۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے بعد حضرت یوشع کے لیے وصیت کی تھی اور آپ باب لد پر فوت ہوئے تھے۔

امام ابو جعفر طبری نے کہا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔اس میں اختلاف ہے کہ حضرت موسیٰ سرزمین شام میں فوت ہوئے یا نہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ میدان تیہ میں فوت ہوئے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا : حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون سب میدان تیہ میں فوت ہوئے اور حضرت یوشع کے سوا کوئی بیت المقدس میں داخل نہیں ہوا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ چالیس سال بعد حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بنواسرائیل کے ساتھ میدان تیہ سے نکل آئے تھے اور بنواسرائیل سے فرمایا تھا : اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور اس میں جہاں سے چاہو کھاؤ۔امام ابن جریر نے کہا یہی قول صحیح ہے۔اور حضرت موسیٰ نے ہی بنو اسرائیل کے نیک لوگوں کے ساتھ جبارین کی اس بستی کو فتح کیا تھا۔ کیونکہ اہل سیرت کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت موسیٰ نے ہی عوج بن عنق سے قتال کیا تھا۔ عوج ان کا بادشاہ تھا اور بلعام ان لوگوں میں سے تھا جن کو حضرت موسیٰ نے قید کیا تھا اور پھر قتل کر دیا تھا۔ (تاریخ طبری، ج 1، ص 434۔436، ملخصاً)

ابوالحسین بن المناوی نے کہا یہود کو یہ معلوم نہیں کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قبر کہا ہے اگر ان کو معلوم ہوتا تو وہ اللہ کو چھوڑ کر ان کو خدا بنا لیتے۔ (المنتظم ج 1، ص 253۔254، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415 ھ)

حافظ ابوالقاسم علی بن حسن بن عساکر متوفی 571 ھ لکھتے ہیں : جب حضرت موسیٰ اپنی والدہ، اپنی اولاد اور اپنی اہلیہ سے الوداع ہوگئے تو آپ نے حضرت یوشع کو بلایا اور انھیں لوگوں پر خلیفہ بنا دیا اور ملک الموت کے پاس گئے ملک الموت نے ان سے کہا : اے موسیٰ موت کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ حضرت موسیٰ نے ان سے فرمایا : مجھ پر اللہ کا حکم جاری کر دو۔ وہ دونوں بستی سے نکلے تو انھوں نے دیکھا کہ حضرت جبرائیل، حضرت میکائیل اور حضرت اسرافیل کھڑے ہوئے ان دونوں کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر وہ سب مل جل کر چلنے لگتے حتی کہ وہ ایک قبر کے پاس سے گزرے جس پر سفید عمامہ باندھے ہوئے لوگ کھڑے تھے ان سے مشک کی خوشبو آرہی

تھی۔ حضرت موسیٰ نے ان سے پوچھا: تم یہ کس کی قبر کھود رہے ہو ؟ انھوں نے کہا: ایک ایسے بندہ کی جس سے اللہ محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتا ہے۔ حضرت موسیٰ نے کہا: کیا تم مجھے اجازت دوگے کہ میں اس قبر میں اتر کر اس کو دیکھ لوں ؟ انھوں نے کہا: ہاں ! جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) قبر میں اترے تو وہ جنت تک کشادہ کر دی گئی اور جنت کی تروتازگی اور اس کی خوشبو پہنچنے لگی۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اس قبر میں لیٹ گئے پھر دعا کی اے اللہ مجھے وہ بندہ بنادے جس سے تو محبت کرتا ہے اور وہ تجھ سے محبت کرتا ہے پھر ملک الموت نے ان کی روح کو قبض کر لیا۔ پھر جبرائیل (علیہ السلام) نے آگے بڑھ کر ان کی نماز جنازہ پڑھی اور پھر قبر پر مٹی ڈال دی گئی۔ (مختصر تاریخ دمشق ج 25، ص 392۔ 393، الکامل فی التاریخ، ج 1، ص 112)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قبر:

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا شب معراج میں کثیب احمر کے پاس حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے قریب سے گزرا وہ اپنی قبر میں کھڑے ہوئے نماز پڑ رہے تھے۔ (صحیح مسلم فضائل 164 (2374) 2375، سنن النسائی: 1631)

علامہ بدر الدین محمد بن احمد عینی حنفی متوفی 855ھ لکھتے ہیں:

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قبر کس جگہ واقع ہے اس میں اختلاف ہے اور اس سلسلہ میں حسب ذیل اقوال ہیں:

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قبر کس جگہ واقع ہے اس میں اختلاف ہے اور اس سلسلہ میں حسب ذیل اقوال ہیں:

1۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کی قبر میدان تیہ میں ہے۔ ضحاک نے بیان کیا ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) ایک پتھر پھینکنے کے فاصلہ کے برابر ارض مقدسہ میں داخل ہوئے تھے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: حضرت موسیٰ (علیہما السلام) کی قبر معلوم نہیں ہے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو مبہم رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا: اگر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کی قبروں کو یہود جان لیتے تو ضرور ان کو اپنا خدا بنالیتے۔ ابن اسحاق نے کہا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قبر کا صرف رخمہ کو علم تھا یہ وہ شخص ہے جو اس پر مطلع تھا کہ حضرت ہارون (علیہ السلام) کو میدان تیہ میں دفن کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی عقل سلب کر لی تاکہ وہ کسی کو بتا نہ سکے۔

2۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قبر بیت المقدس کے باب لد کے قریب ہے۔ طبری نے کہا: یہی قول صحیح ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ قول کیسے صحیح ہو سکتا ہے حالانکہ حضرت ابن عباس، وہب اور عام علماء نے یہ کہا ہے کہ ان کی قبر میدان تیہ میں ہے۔

3۔ حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں ذکر کیا ہے کہ ان کی قبر عالیہ اور عویلہ کے درمیان ہے اور یہ مسجد قدم کے نزدیک دو محلے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ ان کی قبر خواب میں وہاں دکھائی گئی تھی۔ ایک قول یہ ہے کہ عالیہ معروف جگہ ہے اور عویلہ ایک گرجے کے پاس ہے۔ (مختصر تاریخ دمشق، ج 25، ص 398، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1409ھ)

4۔ بصری اور البلقاء کے درمیان وادی مآب میں ان کی قبر ہے۔

5۔ حافظ ابو القاسم نے کعب الاحبار سے روایت کیا ہے کہ ان کی قبر دمشق میں ہے اور حافظ ابن حبان نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قبر مدینہ اور بیت المقدس کے درمیان مدین میں ہے۔ اس پر محمد بن عبد الواحد الضیاء نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مدین بیت المقدس کے قریب ہے نہ ارض مقدسہ کے، اور مشہور یہ ہے کہ ان کی قبر اریحا میں ہے جو ارض مقدسہ میں ہے اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قبر کثیب احمر کے پاس ہے جیسا کہ حدیث میں ہے اور اس قبر کے پاس دعا مستجاب ہے۔

علامہ یحییٰ بن شرف نووی متوفی 676ھ لکھتے ہیں: بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے بیت المقدس کے قریب موت کی دعا کی اور بیت المقدس میں مدفون ہونے کی دعا نہیں کی۔ کیونکہ ان کو یہ خدشہ تھا کہ ان کی قبر لوگوں میں مشہور ہو جائے گی تو لوگ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس حدیث سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ فضیلت والی جگہوں میں دفن ہونا مستحب ہے اور صالحین کی قبروں کے پاس مدفون ہونا مبارک ہے۔ (صحیح مسلم بشر النواوی، ج 10، ص 6231۔ 6232، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ، مکہ مکرمہ) (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ۙ۱۰۴

لغۃ القرآن: [وَقَالَ : اور کہا] [مُوْسٰي : موسیٰ نے] [يٰفِرْعَوْنُ : اے فرعون] [اِنِّيْ :کہ میں] [رَسُوْلٌ: رسول] [مِّنْ :سے] [رَّبِّ :رب] [الْعٰلَمِيْنَ :تمام جہانوں]

ترجمہ:اور موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: اے فرعون ! بیشک میں تمام جہانوں کے رب کی طرف سے رسول (آیا) ہوں

تشریح: جیسے شاہان، ایران کو کسری اور شاہان روم کو قیصر کیا جاتا تھا اسی طرح مصر کے بادشاہوں کا لقب فرعون تھا۔ اس زمانہ میں مصر کے لوگ سورج کو سب سے بڑا دیوتا یقین کرتے تھے۔ اور جب تک کوئی بادشاہ اپنی مصری رعایا کے دلوں میں یہ تاثر نہ پیدا کر دیتا کہ وہ سورج کا اوتار ہے اس کی حکومت کو استحکام نصیب نہ ہوتا۔ اسی لیے انھوں نے اپنے لیے فرعون کا لقب تجویز کیا جو رع سے ماخوذ ہے۔ اور سورج کو مصری زبان میں رع کہتے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو جس فرعون سے واسطہ پڑا تھا وہ اس خاندان کا ایک ہی بادشاہ تھا یا دو بادشاہ تھے، بعض کا یہ خیال ہے کہ دو فرعون تھے۔ جس فرعون کے عہد میں آپ کی ولادت ہوئی اور جس کے محل میں آپ نے پرورش پائی اس کا نام رعمسیس دوم تھا۔ جس کا عہد حکومت ۱۲۹۲ سے ۱۲۲۵ قبل مسیح تک تھا۔ اور جس فرعون کے زمانہ میں آپ پیغمبر بن کر آئے اس کا نام منفتہ یا مفتاح تھا جو اپنے باپ رعمسیس دوم کے بعد تخت نشین ہوا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

فرعون کے دعوی خدائی کا رد:

حضرت موسیٰ نے کہا: اے فرعون ! فرعون مصر کے بادشاہوں کا لقب ہے، جیسے حبشہ کے بادشاہوں کا لقب نجاشی ہے۔ روم کے بادشاہوں کا لقب قیصر ہے اور ایران کے بادشاہوں کا لقب کسری ہے۔ ہندو بادشاہ اپنے آپ کو راجہ کہلواتے تھے اور مسلمان بادشاہ اپنے آپ کو سلطان کہلاتے تھے۔ فرعون کا نام قابوس تھا۔ یا ولید بن مصعب بن ریان تھا۔ جدید تحقیق یہ ہے کہ اس کا نام منفتاح تھا۔

فرعون خدائی کا دعویٰ دار تھا اس لیے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے ابتدائی کلام میں یہ فرمایا کہ میں رب العالمین کا نمائندہ (رسول) ہوں اور اس کلام سے فرعون کے دعویٰ خدائی کا رد فرمایا کیونکہ عبادت کا مستحق وہ ہے جو تمام جہانوں کا رب ہو۔ آسمانوں، زمینوں، سورج، چاند اور ستاروں کا پیدا کرنے والا ہو۔ پتھروں، درختوں، حیوانوں اور انسانوں کا پیدا کرنے والا ہو، فرعون ان تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ تمام چیزیں تو فرعون سے پہلے بھی تھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرعون کا خدائی کا دعویٰ باطل ہے۔ عبادت کا مستحق اور خدا وہی ہے جو تمام جہانوں کا پیدا کرنے والا ہے۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون کے درمیان پہلی ملاقات میں جو مکالمات ہوئے اور واقعات پیش آئے تھے وہ اس طرح تھے۔

"موسیٰ نے کہا "اے فرعون، میں کائنات کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں۔ میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں، میں تم لوگوں کے پاس تمہارے رب کی طرف سے صریح دلیل ماموریت لے کر آیا ہوں، للذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔ فرعون نے کہا "اگر تو کوئی نشانی لایا ہے اور اپنے دعوے میں سچا ہے تو اسے پیش کر"۔ موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک وہ ایک جیتا جاگتا اژدھا تھا۔ اور اس نے اپنی جیب سے ہاتھ نکالا اور سب دیکھنے والوں کے سامنے وہ چمک رہا تھا۔ اس پر فرعون کی قوم کے سرداروں نے آپس میں کہا کہ "یقینا یہ شخص بڑا ماہر جادو گر ہے"۔ تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ اب کہو کیا کہتے ہو؟"۔ پھر ان سب نے فرعون کو مشورہ دیا کہ اسے اور اس کے بھائی کو انتظار میں رکھیے اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیج دیجئے۔ کہ ہر ماہر فن جادو گر کو آپ کے پاس لے آئیں"۔

حق و باطل اور ایمان و کفر کے مابین یہ پہلا معرکہ ہے، اس منظر میں ایک جانب رب العالمین کی طرف سے دعوت دی جا رہی ہے مد بالمقابل وہ طاغوتی طاقت ہے جس نے ربوبیت کے تمام حقوق اپنے لیے خاص کیے ہوئے ہیں اور زندگی کے ان معاملات میں رب العالمین کی اطاعت نہیں کی جاتی۔ (تفسیر تبیان القرآن)

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ

موسیٰ نے کہا "اے فرعون، میں کائنات کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں

ذرا انداز خطاب ملاحظہ ہو۔ "اے فرعون!" آپ نے اسے مائی لارڈ سے خطاب نہیں فرمایا۔ جس طرح عموماً لوگ اس لفظ کو غیر اللہ کے لیے استعمال کرتے ہیں اور انھیں اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ فی الحقیقت لارڈ اور مولیٰ کون ہے؟ ہاں آپ نے بادشاہ کو بڑی عزت سے اس کے لقب سے پکارا، اس لفظ کے استعمال کے ذریعہ آپ نے فرعون کو بتادیا کہ آپ صرف فرعون ہیں اور دوسری یہ حقیقت بھی اس کے سامنے کھول دی کہ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ، "میں اس کائنات کے مالک کا نمائندہ ہوں" حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جو حقیقت پیش کی یہی حقیقت آپ سے پہلے آنے والے تمام رسولوں نے بھی پیش کی تھی اور وہ یہ تھی کہ تمام جہانوں کا اب صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ ایک ہی حاکم ہے اور پوری زندگی میں اس کی اطاعت ضروری ہے۔ آج کل کے ماہرین ادیان جو کچھ کہتے ہیں عقائد میں بھی تغیر اور ارتقاء کا عمل ہوتا رہا ہے اور وہ سماوی ادیان کو بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں کرتے تو ان حضرات کا یہ نظریہ باطل ہے، کیونکہ ادم (علیہ السلام) سے نبی آخر الزماں تک تمام رسولوں کا عقیدہ ایک ہی رہا ہے، اس میں صرف اللہ حاکم اور مطاع رہا ہے، اور یہ نہیں رہا کہ پہلے متعدد الٰھوں کے نظریات تھے پھر تین خداؤں اور پھر ایک خدا کا عقیدہ جاری ہوگیا۔ یہ تو تھی صورت اسلام کی۔ رہی جاہلیت تو اس کے اندر جو اختلاف واضطراب رہا ہے اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ روح پرستی، متعدد الہوں کی پرستش، سورج کی پرستش، دو خداؤں کی پرستش، ایک خدا کی مشرکانہ پرستش اور بے خدا جاہلیت وغیرہ۔ لہٰذا سماوی ادیان رسولوں کی تعلیمات اور جاہلی ادیان کے افکار کو ایک ہی اصول پر نہیں پرکھا جاسکتا۔

غرض حضرت موسیٰ اور فرعون اور اس کے ٹولے کے درمیان جو آمنا سامنا ہوا، یہی صورت ہر نبی کو اپنے اپنے دور میں پیش آئی۔ حضرت موسیٰ سے پہلے آنے والوں کو بھی اور ان کے بعد آنے والوں کو بھی۔ ہر دور میں حکمرانوں نے یہ سمجھا کہ یہ دعوت ان کے اقتدار کے خلاف سازش ہے جس طرح فرعون نے یہ سمجھا کہ یہ درحقیقت ان کے اقتدار اعلیٰ کے خلاف ایک تحریک ہے۔ جب کوئی یہ عقیدہ پیش کرتا ہے کہ اللہ وحدہ رب العالمین ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی حاکمیت کے سوا تمام دوسری حاکمیتیں باطل نہیں اور اللہ کے سوا وہ تمام لوگ جو عوام سے اپنا قانون منواتے ہیں وہ وہ دراصل طاغوت ہیں۔ اور اس اعلان کو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اس دعوے کے ساتھ پیش فرمایا کہ وہ اللہ رب العالمین کی جانب سے رسول ہیں اور وہ جو بات کرتے ہیں وہ اللہ کی جانب سے کرتے ہیں اور ان کا اللہ کی جانب سے یہ فریضہ ہے کہ وہ لوگوں تک یہ دعوت پہنچائیں۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

عادت الٰہی:

خداوند ذوالجلال کی سنت یہ ہے کہ جب کسی برگزیدہ بندہ کو خلعت نبوت ورسالت سے سرفراز فرماتے ہیں تو اس کے ہاتھ پر ایسے خارق عادت افعال ظاہر فرماتے ہیں کہ جو قوت بشریہ کی حدود سے بالکل خارج ہوتے ہیں اور تمام افراد بشر اس کے مثل لانے سے عاجز ہوتے ہیں۔ ایسے افعال کو معجزہ کہتے ہیں جیسے آگ کا ابراہیم (علیہ السلام) کے حق میں برد اور سلام ہوجانا اور موسیٰ (علیہ السلام) کے عصا کا سانپ بن جانا اور عیسیٰ (علیہ السلام) کے ہاتھ پھیر دینے سے کوڑھی اور مادرزاد اندھے کا اچھا ہوجانا اور صالح (علیہ السلام) کی دعا سے صخرہ میں سے ایک حاملہ اونٹنی کا برآمد ہوجانا اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی انگلی کے اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے ہوجانا۔ (تفسیر گلدستہ)

اس سے معلوم ہوا کہ سب سے پہلے نبی کی پہچان فرض ہوتی ہے۔ پھر دوسری چیزوں کی۔ اسی لیے ہمارے حضور نے سب سے پہلی تبلیغ میں فرمایا کہ مجھے پہچانو، میں کیسا ہوں۔ (تفسیر نور العرفان)

قبطیوں کا بنو اسرائیل کو غلام بنانا:

اس کے بعد حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ میں چونکہ اللہ تعالیٰ کا فرستادہ اور اس کا رسول ہوں اس لیے مجھ پر واجب ہے کہ میں حق اور صداقت کے سوا کوئی بات نہ کہوں۔ میرے رسول ہونے پر ایک قوی دلیل موجود ہے اور جب میری رسالت ثابت ہے تو اے فرعون میں تجھے یہ حکم دیتا ہوں کہ تو بنو اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔

مصر کے قدیم باشندے قبطی تھے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی بعثت سے چار سو سال پہلے جب حضرت یوسف (علیہ السلام) یہاں پر آئے اور ان کی اولاد یعنی بنو اسرائیل یہاں پھیل گئی تو مصر کے بادشاہ یعنی فرعون نے ان کو غلام بنالیا اور وہ بنو اسرائیل سے بیگار لیتے تھے۔ان سے جانوروں کا دودھ نکلواتے، زمینوں کی کھدائی کراتے اور دیگر مشقت کے کام لیتے تھے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے بنو اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانا چاہی۔اس لیے فرمایا: فرعون بنو اسرائیل کو ان کے ساتھ بھیج دے۔فرعون نے کہا: اگر تم اپنے دعویٰ کے مطابق اللہ کے رسول ہو تو اس دعویٰ پر کوئی دلیل پیش کرو۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۝۱۰۵ۭ

لغۃ القرآن: [حَقِيْقٌ: لازم ہوں [عَلٰٓي : (اس) پر] [اَنْ : کہ] [لَّآ اَقُوْلَ : میں نہ کہوں] [عَلَي اللّٰهِ : اللہ پر] [اِلَّا : مگر] [الْحَقَّ : حق]] ۭقَدْ جِئْتُكُمْ : میں لایا ہوں تمہارے پاس] [بِبَيِّنَةٍ : واضح (نشانیاں)] [مِّنْ رَّبِّكُمْ : تمہارے رب (کی طرف) سے] [فَاَرْسِلْ : پس تو بھیج [مَعِيَ : میرے ساتھ] [بَنِيْٓ اِ سْرَاۗءِيْلَ : بنی اسرائیل کو]

ترجمہ: مجھے یہی زیب دیتا ہے کہ اللہ کے بارے میں حق بات کے سوا (کچھ) نہ کہوں۔ بیشک میں تمہارے رب (کی جانب) سے تمہارے پاس واضح نشانی لایا ہوں، سو تو بنی اسرائیل کو (اپنی غلامی سے آزاد کرکے) میرے ساتھ بھیج دے

تشریح: یعنی ایسا معجزہ جو تمہاری سمجھ میں بھی آجائے۔ (آیت) "حقیق علی۔۔الحق"۔ پیغمبر کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا وصف اس کی غیر متزلزل وغیر مشتبہ دیانت، اور امانت وراست بازی ہوتی ہے اسی لیے موسیٰ (علیہ السلام) اپنے متعلق سب سے پہلے اسی کو اعلان فرماتے ہیں حقیق۔ قیل معناہ جدیر وقیل واجب (راغب) (آیت) "قد جئتکم"۔صیغہ جمع مخاطب سے مراد کل فرعونی ہیں۔

۔بنو اسرائیل اصلا ایک موحد قوم تھی اور اس وقت ایک مشرک تاجدار کے ظلم وستم کی تختہ مشق بنی ہوئی تھی۔اسی لیے موسیٰ (علیہ السلام) کا پہلا مطالبہ قدرۃ یہی ہے کہ میں ان موحدوں کو اس مشرکانہ وجاہلی فضا سے دور اور الگ لے جا کر ایک الگ خطہ زمین میں آباد کروں گا۔آج (1365ھ 1946ء میں) ہندوستان میں جو تحریک ایک مستقل اور جداگانہ اسلامی آبادکاری کی پاکستان کے نام سے چلی ہوئی ہے اس تحریک کو خلاف اسلام کہنے والے علماء براہ کرم اس آیت پر خلوئے ذہن کے ساتھ غور فرمائیں۔ (تفسیر ماجدی)

سیدنا موسیٰ (علیہ السلام) کے فرعون سے مطالبات:۔

موسیٰ (علیہ السلام) نے فرعون کے پاس پہنچ کر اسے دو باتیں ارشاد فرمائیں ایک یہ کہ میں اللہ رب العالمین کا فرستادہ ہوں اور میرے اس بیان کی صداقت کے طور پر مجھے دو معجزے بھی عطا کیے گئے ہیں لہٰذا تم اپنی خدائی سے دستبردار ہو کر ایمان لے آؤ (جیسا کہ بعض دوسری آیات قرآنی میں اس کی وضاحت موجود ہے) اور دوسری یہ کہ بنی اسرائیل کو آزاد کرکے میرے ہمراہ روانہ کردو تاکہ میں انھیں یہاں سے فلسطین کی طرف لے جاؤں) ان دو آیات میں کئی امور قابل غور اور وضاحت طلب ہیں مثلاً:

۱۔ سیدنا موسیٰ (علیہ السلام) کو یہ کیسے جرات ہوئی کہ ایک اتنی عظیم الشان سلطنت کے مالک جابر اور متکبر بادشاہ کے سامنے نڈر ہو کر اسے ایمان لانے کی بھی دعوت دے دی اور بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ بھی کر دیا بالخصوص ان حالات میں کہ وہ ان مصریوں کا ایک آدمی قتل کر کے یہاں سے بھاگے تھے اور انھیں اس بات کا خطرہ بھی تھا کہ کہیں فرعونی مجھے اسی سابقہ جرم میں گرفتار کر کے قتل نہ کر دیں۔

فرعون کے سامنے سیدنا موسیٰ (علیہ السلام) کی بے مثال جرات کی وجوہ:۔

اس کا صحیح جواب تو یہی ہے کہ انبیاء ورسل کو جو ذمہ داری سونپی جاتی ہے انھیں اپنی جان پر کھیل کر بھی ذمہ داری ادا کرنا ہی پڑتی ہے چنانچہ کئی انبیاء (علیہم السلام) اسی ذمہ داری کو ادا کرتے ہوئے شہید بھی کر دیئے گئے تاہم رسولوں کی حد تک ان کی جان بچانے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ خود اپنے ذمے لے لیتے ہیں اور سیدنا موسیٰ (علیہ السلام) نے جب فرعون کے پاس آنے سے پیشتر اپنی جان کا خطرہ محسوس کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ یقین دہانی کرا دی تھی کہ وہ تجھے قتل نہ کر سکیں گے پھر آپ کو چند باتوں کی تائید مزید بھی حاصل تھی ایک یہ کہ آپ فرعون کے دربار کے ماحول سے پوری طرح واقف تھے اور اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ یہیں گزار کر گئے تھے اس لیے آپ پر دربار اور درباریوں کی وہ مرعوبیت طاری نہ ہو سکتی تھی جو ایک اجنبی کے لیے ہو سکتی تھی دوسرے آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ میرے بھائی ہارون کو نبوت عطا کر کے اس کام میں میرا مددگار بنا دے آپ کی یہ دعا بھی قبول ہوئی اور جب آپ فرعون کے پاس گئے تو سیدنا ہارون (علیہ السلام) بھی آپ کے ساتھ تھے۔ آپ کو اصل خطرہ اس بات کے نتیجے سے قطعاً نہ تھا کہ آپ اللہ کا پیغام من وعن انھیں پہنچا دیں بلکہ اس بات سے تھا کہ میں ان سے بھاگا بھی ہوں تو اس جرم کی پاداش میں وہ مجھے پکڑ کر مار ہی نہ ڈالیں تو اس بات کی یقین دہانی اللہ تعالیٰ نے کرا دی کہ وہ ایسا ہرگز نہ کر سکیں گے۔

۲۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے جو یہ فرمایا کہ ''میں اللہ رب العالمین کا فرستادہ ہوں'' تو وہ اس لحاظ سے تھا کہ فرعون اور فرعونی سب یہ بات تسلیم کرتے تھے کہ اس کائنات اور اس میں موجود تمام چیزوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے جو ان کے تمام دیوی دیوتاؤں سے برتر ہے اور فرعون کا خدائی کا دعویٰ اس لحاظ سے تھا کہ وہ تمام لوگوں کا کارساز اور حاجت روا اور مشکل کشا ہے موسیٰ (علیہ السلام) نے انھیں یہ بتلایا کہ جس اللہ کا میں رسول ہوں وہ تمہارے عقیدے کے مطابق بھی تمہاری خدائی سے بہت بلند و بالا ہے۔

۳ سیدنا یوسف علیہ اسلام نے اپنے والدین اور اپنے بھائیوں کو چار سو سال پیشتر کنعان سے مصر میں بلا لیا تھا یہیں ان کی نسل بڑھتی اور پھلتی پھولتی رہی اس وقت اس کی حیثیت ایک حکمران قوم کی تھی۔ کچھ مدت بعد ان میں وہ تمام امراض پیدا ہو گئے جو کسی قوم کی موت کا سبب بن جاتے ہیں اور جب موسیٰ (علیہ السلام) پیدا ہوئے تو یہ بنی اسرائیل جو لاکھوں کی تعداد تک پہنچ چکے تھے فرعونیوں کے ماتحت محکوم قوم کی حیثیت سے نہایت ذلت کی زندگی بسر کر رہے تھے جس کا ذکر قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ سیدنا موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی قوم کی اس مظلومانہ اور ذلت کی زندگی کا بچپن ہی سے شدید احساس ہو گیا تھا اور اسی بنا پر انھوں نے ایک اسرائیلی کی حمایت میں ایک فرعونی کو نادانستہ طور پر مار ڈالا تھا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بھی سیدنا موسیٰ (علیہ السلام) کی رسالت کا دوسرا بڑا مقصد بنی اسرائیل کی آزادی قرار دیا۔ (تفسیر ماجدی تعلیقا)

معجزہ رسول کی صداقت کا ثبوت:

سو موسیٰ نے ان سے کہا یقینا میں تمہارے پاس ایک روشن دلیل لے کر آیا ہوں تمہارے رب کی طرف سے۔ یعنی عصا و ید بیضاء کا وہ معجزہ جس سے قدرت نے آپ کو نوازا تھا اور جو آنجناب کی صداقت و حقانیت کو واضح کرنے کے لیے ایک عظیم الشان معجزہ اور کافی و وافی نشانی اور دلیل تھی۔ سو معجزہ پیغمبر کی حقانیت و صداقت کی روشن دلیل اور واضح نشان ہوتا ہے لیکن معجزہ پیغمبر کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ قدرت و اختیار میں ہوتا ہے۔ وہی اپنی مشیت و مرضی سے جس پیغمبر کے ہاتھ پر جو معجزہ جب اور جیسے چاہے ظاہر فرمائے۔ اسی لیے حضرت موسیٰ نے اس کی تصریح فرما دی۔ یعنی میں تمہارے اس رب کی طرف سے ایک روشن دلیل اور کھلا معجزہ لے کر آیا ہوں اور یہ ایک کھلا اور واضح ثبوت ہے اس بات کا کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور جو کچھ میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں وہ سب اس اللہ کی طرف سے ہے۔ اور اللہ کے پیغام کو ماننے میں خود تم ہی لوگوں کا بھلا اور فائدہ ہے اور اس سے اعراض اور روگردانی میں خود تمہارا ہی نقصان ہے۔

دنیامیں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور میں تم لوگوں کا سچا اور حقیقی خیر خواہ ہوں کہ میں تمہیں ہلاکت و تباہی سے بچا کر دارین کی سعادت و سرخروئی کی راہ پر ڈالنا چاہتا ہوں۔ اس لیے تم لوگ میری بات مانو کہ اسی میں تمہارا بھلا ہے۔ (تفسیر مدنی کبیر)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے دربار فرعون میں تمام اہل دربار کو آگاہ کیا کہ اللہ نے انھیں رسول بنا کر بھیجا ہے اور فرمایا مجھے کیا حق ہے کہ اللہ پر جھوٹ باندھوں؟ میں تمہارے پاس کھلی دلیل لے کر آیا ہوں یعنی عصا اور ید بیضا۔ لہٰذا اے فرعون! بنی اسرائیل کو آزاد کردے یعنی پہلے تم اللہ کی توحید اور میری رسالت پر ایمان لاؤ پھر بنی اسرائیل کو آزاد کرو اور ان سے جبری مشقت و محنت کا کام لینا چھوڑو اور انھیں ایک آزاد قوم کی حیثیت سے رہنے کا حق دو۔ (تفسیر برہان القرآن)

حضرت یوسف (علیہ السلام) کے زمانہ میں بنی اسرائیل فلسطین سے ہجرت کرکے مصر آگئے تھے لیکن مصریوں نے رفتہ رفتہ انھیں اپنا غلام بنا لیا۔ ان پر ہر قسم کے مظالم توڑے جاتے۔ ان سے ہر طرح کی بیگار لی جاتی۔ یہ اپنے مصری آقاؤں کی زمینیں آباد کرتے، ان کے محلات تعمیر کرتے۔ ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے فرعون سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کی قوم بنی اسرائیل کو آزاد کردے اور انھیں اجازت دے کہ وہ یہاں سے سکونت ترک کرکے اپنے آبائی وطن میں رہائش پذیر ہوں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

موسیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ:

سو ارشاد فرمایا گیا کہ حضرت موسیٰ نے فرعون سے کہا کہ تو بھیج دے میرے ساتھ بنی اسرائیل کو۔ سو حضرت موسیٰ کے مشن کا ایک اہم حصہ بنی اسرائیل کی فرعون کی غلامی سے آزادی و رہائی دلانا بھی تھا کہ وہ ان کو آزاد کردے اپنی غلامی سے۔ سو دعوت توحید کے علاوہ حضرت موسیٰ کے مشن کا یہ بھی ایک اہم حصہ تھا کہ صدیوں سے غلامی میں جکڑی ہوئی قوم بنی اسرائیل کو فرعون سے آزادی دلائی جائے، تاکہ وہ اس کی غلامی سے نجات پا کر واپس اپنے ملک میں جائیں اور وہاں جا کر آزادانہ طور پر اپنے رب کی عبادت و بندگی کریں۔ بہرکیف حضرت موسیٰ نے فرعون سے کہا کہ تو بنی اسرائیل کو اپنی قید اور غلامی سے رہا کردے اور ان کو آزادی دے دے تاکہ یہ لوگ اپنی آبائی سرزمین ارض مقدسہ میں جا بسیں۔ (ابن کثیر، صفوۃ التفاسیر وغیرہ)۔ اور دوسرا قول اس بارے میں یہ بھی ہے کہ تو ان کو آزادی دے دے تاکہ یہ تین دن کی مسافت کے فاصلے پر صحرا میں جا کر اپنے رب کی عبادت کریں۔ (محاسن التاویل وغیرہ)۔ (تفسیر مدنی کبیر)

آیت مبارکہ:

قَالَ اِنۡ كُنۡتَ جِئۡتَ بِاٰيَةٍ فَاۡتِ بِهَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ۝۱۰۶

لغۃ القرآن: [قَالَ : اس نے کہا] [اِنْ : اگر] [كُنْتَ جِئْتَ : تو لایا ہے] [بِاٰيَةٍ : کوئی نشانی] [فَاْتِ : تو لے آ] [بِهَآ : اسے] [اِنْ : اگر] [كُنْتَ : تو ہے] [مِنَ الصّٰدِقِيْنَ : سچ کہنے والوں میں سے]

ترجمہ: اس (فرعون) نے کہا: اگر تم کوئی نشانی لائے ہو تو اسے (سامنے) لاؤ اگر تم سچے ہو

تشریح:

اس آیت اور اس کے بعد والی آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام نے اپنی رسالت کی تبلیغ مکمل فرمائی تو فرعون نے حضرت موسیٰ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام سے کہا: اگر آپ کے پاس اپنی صداقت کی کوئی نشانی ہے تو میرے سامنے اسے ظاہر کریں تاکہ پتا چل جائے کہ آپ اپنے دعوے میں سچے ہیں یا نہیں تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنا عصا زمین پر ڈال دیا، وہ فوراً ایک ظاہر اژدہا بن گیا۔

عصائے کلیم اژدہائے غضب:

تفسیر صاوی میں ہے "جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے لاٹھی پھینکی تو وہ زرد رنگ کا ایک بال دار اژدہا بن گئی، اس کے دونوں جبڑوں کے درمیان تقریباً ایک سو بیس فٹ کا فاصلہ تھا، وہ اپنی دم پر کھڑا ہو گیا، اس کا ایک جبڑا زمین پر تھا اور دوسرا جبڑا فرعون کے محل کی دیوار پر تھا، وہ اژدہا فرعون کو پکڑنے کے لیے دوڑا تو فرعون اپنا تخت چھوڑ کر بھاگ گیا۔ (تفسیر صراط الجنان)

لاٹھی اژدہا بن گئی:

جس کے اژدھا ہونے میں کسی طرح کی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی کہتے ہیں کہ وہ اژدھا منہ کھول کر فرعون کی طرف لپکا آخر فرعون نے بدحواس ہو کر موسیٰ (علیہ السلام) سے اس کے پکڑنے کی درخواست کی۔ موسیٰ (علیہ السلام) کا ہاتھ لگانا تھا کہ پھر عصا بن گیا۔

حضرت ابن عباس (رض) اور سدی کی طرف اس قول کی نسبت کی گئی ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی لاٹھی اژدہا بن گئی۔ یہ اژدہا زرد رنگ کا تھا اس کے اوپر بال تھے سر پر کلغی تھی اتنا منہ کھولے تھا کہ دونوں جبڑوں کے درمیان اسی ہاتھ کا فاصلہ تھا ایک میل زمین سے اونچا تھا نچلا جبڑا زمین پر اور بالا جبرا قصر کی دیوار کے اوپر رکھے تھا اور اوپر کھڑا ہو کر فرعون کی طرف بڑھتا تھا۔ روایت میں آیا ہے کہ اژدہے نے فرعون کا قبہ منہ میں بھر لیا

یعنی ہاتھ گریبان میں ڈال کر اور بغل میں دبا کر نکالا تو لوگوں نے کھلی آنکھوں دیکھ لیا کہ غیر معمولی طور پر سفید اور چمکدار تھا۔ یہ روشنی اور چمک کسی مرض۔برص وغیرہ کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قلب منوّر کی روشنی بطریق اعجاز ہاتھ میں سرایت کر جاتی تھی۔ (تفسیر گلدستہ)

ہر پیغمبر کے معجزات قوم کے مذاق کے آئینہ دار ہوتے ہیں

پیشتر اس کے کہ ہم ان معجزات کی وضاحت کریں یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ معجزات کے بارے میں سنت الٰہی یہ رہی ہے کہ وہ قوموں کے مذاق اور رجحانات کے آئینہ دار ہوتے ہیں کہ جس چیز کا ان میں عام چلن ہوتا ہے اور جسے عزت کی علامت سمجھا جاتا ہے اور جس میں آگے بڑھنے اور کمال حاصل کرنے کو کوئی بڑا کارنامہ خیال کیا جاتا ہے پیغمبر کو اسی طرح کے معجزات دیئے جاتے ہیں۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے میں عربوں میں سب سے زیادہ قدر و عظمت کلام میں فصاحت و بلاغت کو حاصل تھی اور پوری عرب سوسائٹی پر خطیبوں اور شاعروں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی جب کوئی شخص پوری عرب سوسائٹی کی ذہانت کو چیلنج کرنا چاہتا تھا تو بیت اللہ کی دیوار پر اپنا کوئی نہ کوئی بے مثال قصیدہ یا خطبہ آویزاں کر دیتا تھا۔ یہ ایک طرح سے چیلنج ہوتا تھا کہ کوئی شخص اگر میرے جیسا باکمال ہے تو وہ اس جیسا قصیدہ یا خطبہ لکھ کر لائے۔ بڑے بڑے میلوں اور اجتماعات میں شاعری اور خطابت کے معرکے بپا ہوتے تھے اور اس میں فصاحت و بلاغت کے کمالات کا مقابلہ ہوتا تھا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب تشریف لائے تو آپ کو چونکہ اس صورت حال سے واسطہ پڑا اس لیے آپ کو سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم کی شکل میں عطا کیا گیا جس کی فصاحت و بلاغت نے تمام فصحاء وبلغاء کو عاجز و درماندہ کر دیا۔ ابھی اس کی چند ابتدائی اور مختصر سورتیں نازل ہوئی تھیں کہ عرب کے بڑے بڑے زبان آور گنگ ہو کر رہ گئے۔ شیخ سعدی نے ٹھیک کہا

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست

کتب خانہ چند ملت بشست

کہ حضور ایک ایسے یتیم تھے کہ ابھی ان پر پورا قرآن بھی نازل نہیں ہوا تھا کہ کتنی ملتوں کے کتب خانے اس کے سامنے درماندہ ہو گئے تھے۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانے میں مصر کی سوسائٹی میں سب سے زیادہ زور سحر و شعبدہ کا تھا اور اس ماحول میں ساحروں کو بڑا مقام حاصل تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو وہ معجزات عطا فرمائے جس نے سوسائٹی کے ان باکمال لوگوں کو درماندہ کر کے رکھ دیا اور بڑے بڑے ساحروں کا طلسم پاش پاش کر ڈالا۔ چنانچہ جیسے ہی فرعون نے آپ سے نشانی کا مطالبہ کیا تو آپ نے اللہ کے حکم سے اپنا عصا اس کے سامنے پھینکا جو کوئی خاص قسم کا عصا نہیں تھا بلکہ ایک عام قسم کی لکڑی تھی جس کے بارے میں قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور پہلی حاضری میں جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے پوچھا کہ اے موسیٰ تیرے ہاتھ میں کیا ہے تو آپ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ میری لٹھیا ہے میں بکریاں چراتا ہوا تھک جاتا ہوں تو کمر کے پیچھے اس کے اوپر ہاتھوں سے ٹیک لگا کر ستا لیتا ہوں اور درختوں سے اس کے ذریعے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اور بھی کچھ کام اس سے لے لیتا ہوں یعنی چرواہے جس طرح کے

عصا اپنے پاس رکھا کرتے تھے یہ بھی اسی طرح کا ایک عصا تھا لیکن جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اسے فرعون کے سامنے پھینکا تو وہ اچانک ایک سچ مچ کا اژدھا بن گیا۔ قرآن کریم کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے قد و قامت میں تو ایک بہت بڑا اژدھا تھا لیکن اپنی چستی اور سرعت رفتار میں اتنا تیز تھا کہ دوڑتا ہوا چھوٹا سا سانپ معلوم ہوتا تھا حالانکہ جتنے بڑے جسم کا اژدھا ہوتا ہے وہ دوڑنے اور ہلنے میں اتنا ہی سست ہوتا ہے لیکن اس اژدھا کی صفات غیر معمولی تھیں اور پھر یہاں اس کے لیے ثُعۡبَانٌ مُّبِیۡنٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض اس طرح کا اژدھا نہیں تھا کہ ہو تو وہ لاٹھی کی شکل کا لیکن ذرا سی حرکت اس میں پیدا ہو گئی ہو یا اس میں سر اور دم نکل آئے ہوں بلکہ وہ فی الواقع سچ مچ کا اژدھا تھا جس میں ایک اژدھا کی تمام صفات و خصوصیات موجود تھیں۔ دوسرا معجزہ آپ کو ید بیضا کی صورت میں عطا کیا گیا کہ آپ اپنا ہاتھ جو ہر لحاظ سے خوبصورت ہاتھ تھا کیونکہ ہر پیغمبر اپنے دور کا خوبصورتی کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے اس لیے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ جیسے برص زدہ ہاتھ بالکل سفید ہوتا ہے شاید اس طرح آپ کا ہاتھ ہو۔ نہیں بلکہ آپ کا ہاتھ اس طرح تھا کہ جب آپ اسے بغل میں دبا کر نکالتے تو وہ اس طرح چمکتا کہ لوگ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ کر مبہوت ہو کر رہ جاتے۔ اس کی چمک نہ تو آنکھوں کو چکاچوند کرتی تھی اور نہ بدنما معلوم ہوتی تھی بلکہ غیر معمولی معجزے کی شکل میں دیکھنے والوں کو حیران کر دیتی تھی۔ ناظرین کے لفظ سے ایک اور بات کی طرف بھی راہنمائی ملتی ہے وہ یہ کہ ہاتھ میں جو چمک ظاہر ہوتی تھی وہ محض فریب نظر کی نوعیت کی نہیں تھی جیسی عام طور پر سحر اور شعبدہ کی صورت میں ہوتی ہے بلکہ غور و تامل سے دیکھنے والوں کو اس کی تابانی اور چمک بالکل اصلی اور حقیقی معلوم ہوتی تھی۔ (کیونکہ وہ اصل تھی) (تفسیر روح القرآن)

فرعون اور اس کے ٹولے نے بھی اس اعلان کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اللہ کی ربوبیت کے اعلان کا مفہوم کیا ہے؟ یہ بات ان کی نظروں سے اوجھل نہ تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اس دعوت کے نتیجے میں ان کی حکومت کا خاتمہ یقینی ہے۔ اس دعوت سے ایک عظیم انقلاب برپا ہو جائے گا۔ اس کی حکومت کے قانونی جواز کے لیے یہ اعلان ایک چیلنج ہے اور یہ کھلی بغاوت اور مخالفت ہے۔ لیکن انھوں نے سوچا کہ وہ موسیٰ کو جھوٹا ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ رسول رب العالمین ہیں اس لیے انھوں نے فی الفور معجزات کا مطالبہ کر دیا۔

قَالَ اِنۡ كُنۡتَ جِئۡتَ بِاٰيَةٍ فَاۡتِ بِهَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ۔ فرعون نے کہا "اگر تو کوئی نشانی لایا ہے اور اپنے دعوے میں سچا ہے تو اسے پیش کر"

فرعون نے مطالبہ معجزات کا راستہ اس لیے اختیار کیا کہ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ حضرت موسیٰ رب العالمین کے رسول نہیں اور جھوٹا دعویٰ کر رہے ہیں تو آپ کی دعوت یہاں ہی ختم ہو جائے گی اور آپ کی ہوا اکھڑ جائے گی اور جن لوگوں کو یقین ہی نہ رہے گا تو پھر جو چاہیں کہتے پھریں۔ وہ ایک بے دلیل دعویٰ کے مدعی ہوں گے اور اس کے لیے کوئی خطرہ نہ ہوں گے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

آیت مبارکہ:

فَاَلۡقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ ثُعۡبَانٌ مُّبِيۡنٌ ۝ۚ

لغۃ القرآن: [فَاَلۡقٰى : تو انہوں نے ڈالا] [عَصَاهُ : اپنا عصا] [فَاِذَا : تو جب ہی] [هِىَ : وہ] [ثُعۡبَانٌ مُّبِيۡنٌ : ایک واضح (جیتا جاگتا) اژدھا تھا]

ترجمہ: پس موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنا عصا (نیچے) ڈال دیا تو اسی وقت صریحاً اژدہا بن گیا

تشریح:۔ فرعون نے موسیٰ (علیہ السلام) سے معجزہ طلب کیا آپ نے اس کے آگے اپنا عصا ڈال دیا تو بہت بڑا اژدھا بن گیا، اتنا بڑا کہ بقول مجاہد اس کے دونوں جبڑوں کے درمیان چالیس ذراع (قریباً بیس میٹر) کا فاصلہ تھا۔ وہ اژدھا فرعون کی طرف بڑھا۔ فرعون اسے دیکھ کر خوف کے مارے بھاگ اٹھا اور اس کا پاخانہ نکل گیا۔ فرعون نے موسیٰ (علیہ السلام) سے فریاد کی کہ اے موسیٰ! تجھے اس رب کا واسطہ جس نے تجھے بھیجا ہے اس اژدھا کو پکڑ لو، میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تم پہ

ایمان لے آؤں گا اور بنی اسرائیل کو تمہارے ساتھ بھیج دوں گا۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اسے دوبارہ پکڑا تو وہ پھر لکڑی کا عصا ہی تھا۔ (تفسیر ابن ابی حاتم جلد 5 صفحہ 1532)

کیا دربار فرعون میں عصائے موسیٰ حقیقی طور پر اژدھا نہیں بنا تھا؟

یہاں نیچری، پرویزی اور قادیانی فرقوں کے لوگ کہتے ہیں کہ عصا کا اژدھا بننا یہاں ایک تمثیل ہے اس کا معنی یہ ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے دلائل بڑے اژدھا کی طرح فرعون کی باتوں پر غالب آگئے مگر یہ گمراہ کن نظریہ ہے۔ موسیٰ (علیہ السلام) کا عصا اس سے قبل اس وقت بھی عصا بنا تھا جب آپ کو مدین سے مصر واپس آتے ہوئے راستے میں نبوت عطا فرمائی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قال القھا یا موسیٰ فالقاھا فاذا ھی حیۃ تسعی۔ قال خذھا۔ ولاتخف سنعیدھا سیر تھاالاولی۔ اے موسیٰ! اپنا عصا پھینکیں آپ نے اسے پھینکا تو وہ سانپ بن گیا جو دوڑنے لگا۔ اللہ نے فرمایا: اے موسیٰ! اسے پکڑلو اور ڈرو نہیں ہم اسے واپس پہلے جیسا عصا بنادیں گے۔" (طہٰ: 19)

اس جگہ پر ملحدین کیا یہی تاویل کریں کہ عصا دلیل بن گیا تھا اور موسیٰ (علیہ السلام) کے دوبارہ پکڑنے سے پھر عصا بن گیا؟ اگر اس جگہ انھیں ماننا پڑتا ہے کہ واقعتاً عصا سے اژدھا بن گیا تھا تو یہاں دربار فرعون میں ایسا ہونے سے کیا چیز مانع ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

فرعون کے مطالبہ پر آپ نے دو معجزے پیش کیے۔ ایک تو آپ نے اپنا لکڑی کا عصا پھینکا تو وہ اژدہا بن کر پھنکارنے لگا۔ دوسرا آپ نے اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالا اور جب نکالا تو وہ جگمگا رہا تھا اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کو اس کی چمک خیرہ کر رہی تھی۔ قرآن کریم میں جہاں کہیں معجزات کا ذکر آتا ہے تو بعض طبیعتوں پر بڑی وحشت طاری ہو جاتی ہے اور اس خوف سے کہ کہیں ان واقعات کو قوانین فطرت کے خلاف پا کر علماء طبعیین قرآن کی تکذیب نہ کرنے لگیں۔ وہ ان واقعات کی ایسی رکیک تاویلیں کرتے ہیں جن کو قرآن کے الفاظ ہرگز قبول نہیں کرتے۔ حالانکہ یہاں ان کے پریشان اور وحشت زدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ بات بالکل سیدھی سی ہے کہ خالق کائنات کے متعلق آپ کا عقیدہ کیا ہے۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ کائنات کو پیدا کرنے کے بعد وہ اب ایک بے بس اور بے اختیار تماشائی بن کر رہ گیا ہے اور اس کو اس میں ردوبدل کا کوئی اختیار نہیں تو پھر آپ معذور ہیں۔ قرآن جس خدا پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے وہ ایسا بے بس اور بے کس خدا نہیں۔ لیکن اگر آپ اسے کائنات کا خالق تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو رب اور قدیر بھی یقین کرتے ہیں تو پھر آپ پریشان کیوں ہوں۔ وہ مالک ہے اور اس پر قادر ہے کہ چاہے تو چھوٹے سے انڈے سے سانپ پیدا کر دے اور چاہے تو اس معمول سے ہٹ کر لکڑی کے ایک ڈنڈے کو سانپ بنادے۔ اگر علماء طبعیین اس بات پر مصر ہوں کہ جو قواعد اور سنن اس مادی کائنات میں کارفرما ہیں وہ اٹل ہیں ان میں ردوبدل ممکن نہیں تو ہم ان سے پوچھیں گے کہ کیا آپ کا علم فطرت کے تمام قوانین اور سنن کو محیط ہے؟ ممکن ہے کہ یہ تخلیق کسی ایسے قاعدہ کے مطابق ہو۔ جہاں تک ابھی آپ کے علم کی رسائی نہ ہوئی ہو۔ نیوٹن اور بڑے بڑے سائنس دان اس کے معترف ہیں کہ ان کا علم ناتمام فطرت کے تمام قوانین وضوابط کو محیط نہیں بلکہ وہ ابھی تک صرف چند اسرار کی نقاب کشائی کر سکے ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

ثعبان اژدہا کو کہا جاتا ہے اور اس کے ساتھ مبین کی صفت لگا کر اس حقیقت کو واضح فرما دیا گیا کہ وہ کوئی خیالی اور شعبدہ بازی کی نوعیت کی چیز نہ تھا، بلکہ سچ مچ کا اور ایک کھلم کھلا اژدہا تھا، اور ایسا کھلم کھلا کہ اس کے بارے میں کسی شک وشبہہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ بلکہ وہ اپنی تمام خصوصیات اور صفات کے ساتھ ایک اژدہا تھا۔ بہر کیف فرعون کیلئے یہ بات چونکہ نہایت ہی حیران کن اور غیظ وغضب میں ڈالنے والی بات تھی کہ ایک شخص اور وہ بھی اسی کی رعیت اور غلام قوم میں کا ایک شخص خدا کا رسول بن کر آئے۔ جبکہ فرعون خود اپنے تئیں خدائی کا دعویدار بنا ہوا تھا۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو سب سے بڑے دیوتا یعنی سورج کا اوتار اور لوگوں کا رب اعلیٰ بنا ہوا تھا۔ اور وہ لوگوں سے کہتا تھا اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی۔ سو ایسے میں حضرت موسیٰ کی طرف سے آنجناب کے اللہ تعالیٰ کے رسول بن کر آنے کے دعوے اور اعلان سے اس کو بہت تعجب بھی ہوا۔ اور اس کے سخت غیظ وغضب کا باعث بھی۔ اس لیے اس نے چھوٹتے ہی اور غضبناک انداز میں حضرت موسیٰ سے کہا کہ لاؤ تم پیش کرو کوئی نشانی، اگر تم واقعی سچے ہو اپنے اس دعوی رسالت میں۔ تو اس پر حضرت موسیٰ نے عصا اور ید بیضاء کے دونوں معجزے اس کے سامنے پیش کر دیئے۔ (تفسیر مدنی)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی لاٹھی اژدھا بن گئی تھی۔ وہ بہت بڑا اژدھا تھا۔ مجاہد نے کہا ہے کہ اس کے دو جبڑوں کے درمیان چالیس ذراع (ساٹھ فٹ) کا فاصلہ تھا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی لاٹھی ڈالی تو وہ بہت بڑا اژدھا بن گیا جو اپنا منہ کھولے ہوئے فرعون کی طرف دوڑ رہا تھا۔

جب فرعون نے دیکھا کہ وہ اژدھا اس کو کھانے کے لیے دوڑ رہا ہے تو وہ تخت کے اندر گھس گیا اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے فریاد کی کہ اس کو روک لے سو انھوں نے اس کو روک لیا۔ (جامع البیان، ج 6، ص 20، مطبوعہ دار الفکر، تفسیر امام ابن ابی حاتم، ج 5، ص 533)

علامہ سید محمود آلوسی متوفی 1270ھ لکھتے ہیں: روایت ہے کہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے لاٹھی پھینکی تو وہ زرد رنگ کا ایک بال دار اژدھا ہو گیا اس کے دونوں جبڑوں کے درمیان اسی ذراع (ایک سو بیس) فٹ کا فاصلہ تھا۔ وہ اپنی دم پر کھڑا ہو گیا اور وہ زمین سے تقریباً ایک میل بلند تھا۔ اس کا ایک جبڑا زمین پر تھا اور دوسرا جبڑا فرعون کے محل کی دیوار پر تھا۔ وہ فرعون کے پکڑنے کے لیے دوڑا۔ فرعون اپنا تخت چھوڑ کر بھاگا در آنحالیکہ اس کے دست جاری تھے۔ بعض روایات میں ہے کہ اس ایک دن میں اس کے چار سو دست جاری ہوئے اور بعض روایات میں ہے کہ اس کے پیٹ میں بیماری ہو گئی جو تادم مرگ دور نہ ہو سکی۔ ایک روایت میں ہے کہ فرعون کا جبہ اس نے اپنی داڑھوں میں پکڑ لیا۔ اس نے لوگوں پر حملہ کیا لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی اور پچیس ہزار آدمی رش میں مارے گئے۔ پھر فرعون نے چیخ کر کہا: اے موسیٰ میں تمہیں اس ذات کی قسم دے کر کہتا ہوں جس نے تمہیں بھیجا ہے، تم اس اژدھے کو پکڑ لو۔ میں تم پر ایمان لے آؤں گا اور تمہارے ساتھ بنو اسرائیل کو بھیج دوں گا حضرت موسیٰ نے اس اژدھے کو پکڑ لیا تو وہ پھر لاٹھی ہو گیا۔ (روح المعانی، ج 9، ص 20، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

بہ ظاہر اس روایت میں کافی مبالغہ ہے لیکن علامہ آلوسی ایک ثقہ عالم ہیں۔ انھوں نے اس روایت کو اعتماد کے ساتھ نقل کیا ہے اس لیے اس کی کچھ نہ کچھ اصل ضرور ہو گی کیونکہ اگر وہ عام اژدھا ہوتا تو چند لوگ مل کر اس کو مار ڈالتے۔ لہٰذا اتنی بات یقینی ہے کہ وہ اژدھا بہت بڑا اور غیر معمولی جسیم اور خوفناک تھا اور یہ بھی بعید نہیں ہے کہ خوف اور دہشت سے جب فرعون تخت چھوڑ کر بھاگا ہو تو اس کے دست نکل گئے ہوں تاہم ان کی گنتی بعید از قیاس ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جب اس کے درباری اور دیگر قبطی اژدھے کو دیکھ کر خوفزدگی سے بھاگے ہوں تو بھگدڑ میں بہت سے درباری اور قبطی مارے گئے ہوں لیکن ان کا پچیس ہزار ہونا، نا قابل فہم ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

نوٹ یہ بات صرف علامہ آلوسیؒ نے ہی نہیں فرمائی اور مفسرین نے بھی لکھی ہے، تفسیر طبری میں ابی جعفر محمد بن جریر طبری فرماتے ہیں:

ہمیں محمد بن عبد الاعلی نے قتادہ سے (ثُعۡبَانٌ مُّبِيۡنٌ) کی تفسیر میں ذکر کیا کہ وہ لاٹھی ایک بہت بڑے سانپ میں بدل گئی۔ قتادہ کے علاوہ لوگوں نے کہا: "شہر کے برابر"

ہمیں بشر نے قتادہ سے نقل کیا کہ (ثُعۡبَانٌ مُّبِيۡنٌ) کا مطلب یہ ہے: وہ سانپ بن گیا۔ قریب تھا کہ وہ اس پر حملہ آور ہو جائے۔

مجھے موسیٰ بن ہارون نے سدی سے اس کا معنی یہ بتلایا ہے: (الثعبان): نر سانپ جو اپنا منہ کھولے ہوئے تھا۔ نچلا جبڑہ زمین پر اور بالائی جبڑہ محل کی دیوار پر تھا۔ پھر وہ فرعون کو پکڑنے کے لئے اس کی طرف متوجہ ہوا فرعون دیکھ کر کانپ اٹھا اس نے فرعون پر حملہ کر دیا فرعون کا پاخانہ نکل گیا اس سے پہلے اس کا کبھی پاخانہ نہ نکلا تھا۔ فرعون چلایا: اے موسیٰ اسے پکڑو۔ میں تجھ پر ایمان لاتا ہوں اور بنی اسرائیل کو تمہارے ساتھ روانہ کرتا ہوں۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے پکڑا تو وہ عصا بن گیا۔

مجھے عبد الکریم بن الھیثم نے ابن عباس سے (ثُعۡبَانٌ مُّبِيۡنٌ) کی تفسیر میں ذکر کیا کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے لاٹھی ڈالی تو وہ سانپ بن گئی اس کا ایک جبڑا قبہ کی نچلی اور دوسرا قبہ کی بالائی جانب رکھا۔ ابراہیم کہتے ہیں: سفیان نے انگلی اور انگوٹھے کے اشارہ سے فاصلہ سمجھایا۔ جب اس نے اللہ کے مہمان فرعون پر جھپٹنا چاہتا تو فرعون کہنے لگا اے موسیٰ اسے پکڑو انہوں نے جب ہاتھ سے پکڑا تو وہ لاٹھی بن گئی۔

ہمیں عباس بن الولید نے ابن عباس سے اس طرح نقل کیا کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی لاٹھی ڈالی وہ بڑا سانپ بن گیا اور اس نے اپنا منہ کھولا اور فرعون کی طرف بڑھا فرعون نے اس کا رخ دیکھ کر تخت سے چھلانگ لگا دی اور موسیٰ سے فریاد کی کہ وہ اسے روکیں چنانچہ آپ نے روک دیا۔

مجھے مثنی نے ابن عباس (رض) سے (ثُعۡبَانٌ مُّبِيۡنٌ) کا معنی نر سانپ نقل کیا ہے۔

مجھے مثنی نے ابن منبہ سے نقل کیا کہ جب موسیٰ فرعون کے پاس گئے موسیٰ (علیہ السلام) نے پوچھا کیا تم مجھے پہچانتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ پھر کہنے لگا: کیا تو نے بچپن ہمارے پاس نہیں گزارا؟ موسیٰ (علیہ السلام) نے اس کا جواب دیا۔ فرعون نے موسیٰ کو پکڑنے کا حکم دیا تو موسیٰ (علیہ السلام) نے لاٹھی ڈال دی تو وہ کھلا ہوا سانپ

بن گئی۔ اس نے لوگوں پر حملہ کر دیا جس سے سب بھاگ کھڑے ہوئے ان میں 25 ہزار آدمی مر گئے انہوں نے ایک دوسرے کو بھگدڑ میں کچل دیا فرعون شکست کھا کر بھاگ گا اور گھر میں گھس گیا۔

مجھے الحارث نے مجاہد سے (ثُعۡبَانٌ مُّبِيۡنٌ) کی تفسیر یہ ذکر کی ہے کہ اس کے دونوں جبڑوں کا فاصلہ 40 ہاتھ تھا۔

ہمیں ابن وکیع نے ضحاک (ثُعۡبَانٌ مُّبِيۡنٌ) کا معنی نر سانپ نقل کیا ہے۔ (تفسیر طبری) علاوہ ازیں حافظ ابن کثیر نے بھی بیان کیا ہے، لہٰذا غلام رسول سعیدی صاحب کا تعجب کرنا عجیب ہے۔

بعض تاریخی روایات میں حضرت ابن عباس سے منقول ہے کہ اس اژدھانے فرعون کی طرف منہ پھیلایا تو گھبرا کر تخت شاہی سے کود کر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی پناہ لی اور دربار کے ہزاروں آدمی اس کی دہشت سے مر گئے (تفسیر کبیر) لاٹھی کا سچ مچ سانپ بن جانا کوئی ناممکن یا محال چیز نہیں، ہاں عادت عامہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے حیرت انگیز اور قابل تعجب ضرور ہے، اور معجزہ و کرامت کا منشاء ہی یہ ہوتا ہے کہ جو کام عام آدمی نہ کر سکیں وہ انبیاء (علیہم السلام) کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جاری کر دیا جاتا ہے تاکہ عوام سمجھ لیں کہ ان کے ساتھ کوئی خدائی طاقت کام کر رہی ہے اس لیے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی لاٹھی کا سانپ بن جانا کوئی قابل تعجب و انکار نہیں ہو سکتا۔ (تفسیر معارف القرآن)

آیت مبارکہ:

وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِىَ بَيۡضَآءُ لِلنّٰظِرِيۡنَ۝۱۰۸

لغۃ القرآن: [وَّنَزَعَ : اور انہوں نے کھینچ نکالا] [يَدَهٗ : اپنا ہاتھ] [فَاِذَا : تو جب ہی] [هِىَ : وہ] [بَيۡضَآءُ : سفید تھا] [لِلنّٰظِرِيۡنَ : دیکھنے والوں کے لیے]

ترجمہ: اور اپنا ہاتھ (گریبان میں ڈال کر) نکالا تو وہ (بھی) اسی وقت دیکھنے والوں کے لیے (چمک دار) سفید ہو گیا

تشریح: حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو وہ چمک رہا تھا۔ پھر اسے واپس گریبان میں ڈالا تو وہ پہلے کی طرح ہو گیا (چمک جاتی رہی) (تفسیر ابن جریر جلد 6 صفحہ 17) یہ موسیٰ (علیہ السلام) کو دیا جانے والا دوسرا معجزہ تھا۔ (برہان)

اس آیت میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے دوسرے معجزے کا ذکر ہے کہ آپ نے اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال کر نکالا تو وہ دیکھنے والوں کے سامنے جگمگانے لگا اور اس کی روشنی اور چمک نور آفتاب پر غالب ہو گئی۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت موسیٰ عَلَيۡهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام نے فرعون کو اپنا ہاتھ دکھا کر پوچھا کہ " یہ کیا ہے؟ فرعون نے جواب دیا: آپ کا ہاتھ ہے۔ پھر حضرت موسیٰ عَلَيۡهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام نے اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال کر نکالا تو وہ جگمگانے لگا۔ (تفسیر صراط الجنان)

تفسیر مدارک التنزیل میں ابو البرکات عبدا ابن احمد محمد بن محمود النسفی فرماتے ہیں:

وَّنَزَعَ يَدَهٗ (اور اپنا ہاتھ باہر نکال لیا) اپنے گریبان سے فَاِذَا هِىَ بَيۡضَآءُ لِلنّٰظِرِيۡنَ (پس وہ اچانک سب دیکھنے والوں کیلئے بہت ہی چمکتا ہوا ہو گیا) یعنی وہ سفید تھا دیکھنے کے لیے اور دیکھنے کے لیے سفیدی وہی ہوتی ہے۔ جو سفیدی عجیب اور عام عادت کے خلاف ہو۔ لوگ اس کو دیکھنے کیلئے جمع ہوتے تھے۔ روایت میں ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے فرعون کو اپنا ہاتھ دکھا کر فرمایا یہ کیا ہے؟ اس نے کہا یہ تیرا ہاتھ ہے۔ پھر اس کو اپنے گریبان میں ڈال کر کھینچا اچانک وہ سفید تھا۔ اس کی شعاعیں سورج کی شعاعوں پر غالب آگئیں۔ حالانکہ موسیٰ (علیہ السلام) کا رنگ شدید گندمی تھا۔ (تفسیر مدارک التنزیل)

ایک بات یاد رکھنی چاہیئے نبی کو معجزات اس قسم کے ضرور دیئے جاتے ہیں جس کا اس وقت زور ہو (ہر زمانے میں کوئی کام عروج پر ہوتا ہے)۔ چونکہ اس زمانے میں جادو کا زور تھا لہٰذا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو یہ معجزات عطا ہوئے جو جادوگروں کو منہ کے بل لٹا سکیں، حضرت مسیح (علیہ السلام) کے زمانے میں طب کا زور

تھالہٰذا انھیں اندھوں اور کوڑھیوں کو شفا بخشا، مردے زندہ کرنے کے معجزے عطا ہوئے اگر قادیانی نبی ہوتا تو اسے سائنس کی ایجادات کی قسم کے معجزے ملتے کیونکہ آج کل اسی کا زور ہے۔ (تفسیر نور العرفان تعلیقا)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون :

(ف ا) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور بنی اسرائیل کے قصہ کو اللہ تعالیٰ نے تفصیل کے ساتھ متعدد مواقع پر ذکر فرمایا ہے کیونکہ اس میں صدہا نکات و معارف پنہاں ہیں۔ اس میں فرعون اور بنی اسرائیل کی تاریخ ہے آزادی اور حریت کے درس ہیں، ایمان ویقین کے روح پرور نظارے ہیں معجزات ہیں خوارق ہیں، بنی اسرائیل کی ذہنیت ہے، گویا وہ سب کچھ ہے جس کی نسل انسانی کو ضرورت ہے۔

مقصد یہ ہے کہ جب مصر میں فرعون نے ظلم واستبداد کا ارتکاب کیا، اور اسرائیلیوں پر طرح طرح کے ظلم وستم ڈھائے تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کو مبعوث فرمایا ، تاکہ ان کی رہنمائی کرے، اور انھیں اس عذاب الیم سے نجات دلائے۔

موسیٰ (علیہ السلام) نے فرعون سے کہا، میں اللہ کا رسول ہوں میرا یہ مطالبہ ہے کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیجدو،

اس نے نبوت ورسالت پر گواہی طلب کی آپ نے لٹھ کو زمین پر پھینکا، جو اژدھا بن گیا، اور ہاتھ باہر نکالا تو براق، اب وہ حیران ہوا، کہنے لگا ہو نہ ہو، یہ جادو ہے، اور بالآخر تمام جادوگروں کو اکٹھا کیا، اور کہا یہ بہت بڑا جادوگر ہے، ڈٹ کر اس کا مقابلہ کرو، ورنہ حکومت چھین لے گا، اور تم کہیں کے نہ رہو گے۔

ان دو معجزات میں نہایت لطیف اشارہ اس جانب تھا کہ جس طرح لکڑی ایسی بے ضرر چیز سانپ بن گئی ہے اسی طرح مومن اللہ کے فضل سے تیرے لیے خطرناک ثابت ہوں گے اور جس طرح میرا ہاتھ چمک اٹھا ہے، اسی طرح بنی اسرائیل کی خوابیدہ قسمت چمک اٹھے گی،

وہ لوگ جو معجزات کی خواہ مخواہ تاویل کرتے ہیں انھیں ان دو معجزات پر غور کرنا چاہیے۔

بات یہ ہے کہ اللہ کے بہت سے قانون ایسے ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے، اور جب کبھی اس قسم کا فوق الادراک قصہ سنتے ہیں انکار کر لیتے ہیں، اور یہ نہیں سوچتے کہ اللہ کے اختیار میں سب کچھ ہے،۔ (تفسیر سراج البیان۔ محمد حنیف ندوی)

ید بیضا اور نور مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) :

یاد رہے موسیٰ (علیہ السلام) کا صرف ہاتھ چمکتا تھا اور وہ بھی عند الطلب کسی خاص موقع پر۔ مگر حضور تاجدار دوجہاں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا سارا جسم مقدس نورانی تھا۔ آپ کے دندان مبارک سے نور کی شعاعیں نکلتی تھیں۔ آپ کے تبسم سے سیدہ عائشہ (رض) کو اندھیرے میں سوئی مل گئی۔

چنانچہ ام المومنین عائشہ صدیقہ (رض) فرماتی ہیں : میں بوقت سحر (صبح کی ہلکی سی روشنی میں) کچھ سی رہی تھی، مجھ سے سوئی گر پڑی۔ میں اسے ڈھونڈھنے لگی مگر وہ مجھے نہ ملی۔ اتنے میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لے آئے۔

فتبینت الابرۃ بشعاع نور وجھہ۔ تو آپ کے چہرۂ انور کے نور کی شعاؤں سے سوئی مل گئی۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ بات بتائی۔ آپ نے فرمایا : یا حمیراء الویل ثم الویل ثلاثا لمن حرم النظر الی وجھی۔ اے حمیرا اُس کے لیے ہلاکت ہے پھر ہلاکت ہے جو (بنظر ایمان) میرا چہرہ دیکھنے سے محروم ہوا، یہ آپ نے تین بار فرمایا۔ (خصائص کبری جلد اول باب الآیۃ فی وجہہ الشریف (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صفحۃ 62 مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت)

پھر حضور نور کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بغل مبارک سے نور نکلتا تھا۔ (بخاری ومسلم عن انس (رض)) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ کرام کی لاٹھیوں پر ہاتھ پھیرا تو وہ روشن چراغوں کی طرح چمکنے لگیں اور وہ سخت تاریک رات میں ان کی روشنی میں اپنے اپنے گھر پہنچ گئے۔ (مسند احمد بن حنبل جلد 3 صفحہ 138) انبیاء کو خدا نے معجزے دیئے۔ (تفسیر برہان القرآن)

دستِ اقدس کا کمال :

یہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے مبارک ہاتھ کا کمال تھا، اب سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دست اقدس کا کمال ملاحظہ فرمائیے، چنانچہ اعلیٰ حضرت (رح) فرماتے ہیں :

ہر خطِ کف ہے یہاں اے دست بیضائے کلیم

موجزن دریائے نور بے مثالی ہاتھ میں

یعنی اے پیارے موسیٰ (علیہ السلام) کے چمکتے ہوئے نورانی ہاتھ! تیری بڑی شان ہے لیکن ہمارے آقا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دست کرم کی ہر لکیر سے نور کا ایک بے مثال دریا موجزن ہے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب ہر لکیر کی یہ شان ہے تو پورے دست اقدس کی عظمت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔ (صراط الجنان)

آیت مبارکہ:

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۝۱۰۹

لغۃ القرآن: [قَالَ : کہا] [الْمَلَاُ : سرداروں نے] [مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ : فرعون کی قوم میں سے] [اِنَّ : بیشک] [هٰذَا : یہ] [لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ: یقینا ایک علم والا جادوگر ہے]

ترجمہ: قوم فرعون کے سردار بولے: بیشک یہ (تو کوئی) بڑا ماہر جادو گر ہے

تشریح: جب فرعون کے درباریوں نے لکڑی کے عصا کو مہیب اژدہا بنتے ہوئے دیکھا اور آپ کے ہاتھ کو آفتاب سے زیادہ چمکتا ہوا پایا تو وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ معجزہ ہے۔ اور فطرت اور قوانین فطرت کے خالق کی قدرت کا نمونہ ہے۔ وہ بے چارے یہی کہہ سکے کہ عام جادو کی طرح یہ بھی ایک نظر فریبی ہے لیکن اس سے بہر حال بہتر۔ اس لیے کہا کہ یہ تو بڑا ماہر جادو گر ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

آیہ کی تفہیم کے لئے پہلے معجزہ کے بارے تفصیل سے جاننے کی ضرورت ہے۔

معجزہ کا لغوی مفہوم

لفظِ معجزہ کا مادّہ اِشتقاق: عَجِزَ، یَعْجَزُ، عَجْزًا ہے، جس کے معنی: "کسی چیز پر قادِر نہ ہونا"، "کسی کام کی طاقت نہ رکھنا" یا "کسی اَمر سے عاجز آ جانا" وغیرہ ہیں۔ محاورۂ عرب میں کہتے ہیں: عَجِزَ فُلَانٌ عَنِ الْعَمَلِ "فُلاں آدمی وہ کام کرنے سے عاجز آ گیا"۔ ای کبر وصار لا یستطیعہ فھو عاجزٌ (المنجد: 488) یعنی اُس کام کا بجالانا مشکل بھی ہے اور وہ اُس کام کو کرنے کی اِستعداد بھی نہیں رکھتا۔۔۔ اُسے رُوبہ عمل لانے کی بنیادی صلاحیت اُس میں موجود نہیں، اِس لئے وہ یہ کام کرنے سے عاجز ہے۔ المفردات میں اِمام راغب اِصفہانی معجزے کا مفہوم بیان کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

والعجز أصله التّأخر عن الشئ،

وحصوله عند عجز الأمر، أی:

مؤخره... وصار فی التّعارف

إسماً للقصور عن فعل الشئ، وهو ضد القدرة.

"عجز" کے اصلی معنی کسی چیز سے پیچھے رہ جانے یا اُس کے ایسے وقت میں حاصل ہونے کے ہیں جبکہ اُس کا وقت نکل چکا ہو۔۔۔ عام طور پر یہ لفظ کسی کام کے کرنے سے قاصر رہ جانے پر بولا جاتا ہے اور یہ "القدرة" کی ضد ہے۔

(المفردات، بذیل عجز: 547)

معجزہ کا اِصطلاحی مفہوم

مختلف اَدوار میں اَربابِ علم و فن نے معجزہ کی مختلف تعریفات بیان کی ہیں۔ چند اہم تعریفات یہ ہیں:

1. أمر خارق العادة یعجز البشر عن أن یأتوا بمثله.

)المنجد:488(

معجزہ اُس خارقُ العادت چیز کو کہتے ہیں جس کی مثل لانے سے فردِ بشر عاجز آ جائے۔

2۔ قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اِعلم اَنّ معنٰی تسمیتنا ماجاءت بہ الاَنبیاء معجزۃ ھو اَن الخلق عجزوا عن الاِتیان بمثلھا.

)الشفاء، 349:1(

یہ بات بخوبی جان لینی چاہئے کہ جو کچھ انبیاء علیھم السلام اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں اُسے ہم نے معجزے کا نام اِس لئے دیا ہے کہ مخلوق اُس کی مثل لانے سے عاجز ہوتی ہے۔

3۔ اِمام خازن رحمۃ اللہ علیہ معجزہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

المعجزۃ مع التحدّی من النبی
قائمۃ مقام قول اللہ عزّوجلّ:
''صَدَقَ عَبْدِیْ فَاَطِیْعُوْہ وَ
اتَّبِعُوْہ'' ولاَن معجز النبی

شاھدٌ علٰی صدقہ فیمایقولہ وسُمِّیت المعجزۃُ معجزۃً لاَن الخلق عجزوا عن الاِتیانِ بمثلھا.

)تفسیر الخازن، 124:2(

معجزہ اللہ کے نبی اور رسول کی طرف سے (جملہ اِنسانوں کے لئے) ایک چیلنج ہوتا ہے اور باری تعالٰی کے اِس فرمان کا آئینہ دار ہوتا ہے کہ:

''میرے بندے نے سچ کہا، پس تم اُس کی (کامل) اِطاعت اور پیروی کرو''۔ اِس لئے کہ نبی و رسول کا معجزہ جو کچھ اُس نے فرمایا ہوتا ہے اُس کی حقّانیت اور صداقت پر دلیلِ ناطق ہوتا ہے اُسے (عرفاً و شرعاً) معجزہ کا نام اِس لئے دیا گیا ہے کہ اُس کی مثل (نظیر) لانے سے مخلوقِ اِنسانی عاجز ہوتی ہے۔

4۔ المعجزۃ عبارۃٌ عن اِظھار قدرۃ اللہ سبحانہ و تعالٰی وحکمتہ علٰی ید نبی مرسل بین اُمّتہ بحیث یعجز اَھل عصرہ عن اِیراد مثلھا.

)معارج النبوۃ، 377:4(

معجزہ اللہ سبحانہ و تعالٰی کی قدرت اور حکمت کا اُس کے برگزیدہ نبی کے دستِ مبارک پر اِظہار ہے تاکہ وہ اپنی اُمت اور اہلِ زمانہ کو اُس کی مثل لانے سے عاجز کر دے۔

5۔ ابو شکور سالمی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی معجزہ کی بڑی جامع تعریف کی ہے، فرماتے ہیں:

حد المعجزۃ اَن یظھر عقیب
السوال والدّعوٰی ناقضاً للعادۃ
من غیر اِستحالۃ بجمیع الوجوہ
ویعجز الناس عن اِتیان مثلہ
بعد التجھد والاِجتھاد اِذا کان
بھم حذاقۃ ورزانۃ فی مثل تلک الصنیعۃ.

) کتاب التمہید فی بیان التوحید از ابو شکور: 71(

معجزہ کی تعریف یہ ہے کہ سوال اور دعویٰ کے بعد (اللہ کے رسول اور نبی کے ہاتھ پر) کوئی ایسی خارقِ عادت چیز ظاہر ہو جو ہر حیثیت سے مُحال نہ ہو اور لوگ باوجود کوشش اور تدبیر کے اُس قسم کے معاملات میں پوری فہم و بصیرت رکھتے ہوئے بھی اُس کے مقابلے سے عاجز ہوں۔

مندرجہ بالا تعریفات سے یہ بات اظہر مِن الشمس ہو جاتی ہے کہ

معجزہ مِن جانبِ اللہ ہوتا ہے لیکن اُس کا صدُور اللہ کے برگزیدہ نبی اور رسول کے ذرِیعہ ہوتا ہے۔

معجزہ مروّجہ قوانینِ فطرت اور عالمِ اَسباب کے برعکس ہوتا ہے۔

معجزہ نبی اور رسول کا ذاتی نہیں بلکہ عطائی فعل ہے اور یہ عطا اللہ ربّ العزّت کی طرف سے ہوتی ہے۔

معجزے کا ظہور چونکہ رحمانی اور اُلوہی قوّت سے ہوتا ہے اِس لئے عقلِ اِنسانی اُس کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے اور تصویرِ حیرت بن کر سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ وہ اس کی حقیقت کا اِدراک نہیں کر سکتی۔

اِصطلاحِ معجزہ کی حقیقت

محدّثین، مفسّرین اور مفکّرین نے ہر ہر مسئلہ کے ہر ہر پہلو پر علم و حِکمت کے موتی بکھیرے ہیں اور کمالِ عرق ریزی سے اُمور و مسائل کی گتھیاں سُلجھانے کی سعی کی ہے۔ اَربابِ علم و دانش نے اپنے محدود پیرائے میں معجزہ کے بارے میں بھی علمی، فِکری اور اِعتقادی سطح پر حرفِ حق کی تلاش کا سفر جاری رکھا ہے اور تحقیق و جستجو کے محاذ پر دادِ شجاعت دی ہے۔ اِس ضمن میں بعض اہلِ سیر نے لکھا ہے کہ ''معجزہ'' کا لفظ اللہ ربّ العزّت نے قرآنِ مجید میں کسی ایک مقام پر بھی اِستعمال نہیں کیا۔ اِس لئے وہ اِحتیاطاً معجزات کے بیان اور اُن کے اِثبات کے لئے قرآنی لفظ ''آیات'' کا اِستعمال کرتے ہیں۔ یہ اِستعمال یقیناً دُرست ہے لیکن قرآن کا اُسلوب ہمارے پیشِ نظر رہنا چاہیئے۔ یہ بات ذِہن نشین رہنی چاہئے کہ قرآن اِصطلاحات اور مخصوص اَلفاظ کو بیان نہیں کرتا بلکہ وہ فقط نفسِ مضمون دیتا ہے اور ایمانیات کے بنیادی تصوّرات سے بحث کرتا ہے۔ بعد اَزاں اہلِ علم اُسے اِصطلاحی زبان دے کر ترسیلِ مفہوم کی سعی کرتے ہیں۔ یہی حال تصوّف کا بھی ہے۔ قرآنِ مجید میں تصوف کے لئے لفظ ''تزکیہ'' اور حدیث میں ''اِحسان'' کا لفظ آیا ہے مگر جب وہ باقاعدہ علم بنا تو اُسے تصوّف کا نام دیا گیا۔ اِسی طرح دیگر اِصطلاحاتِ علوم تشکیل پذیر ہوئیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ لفظِ آیات میں لفظِ معجزہ کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظِ ''آیات'' میں عمومیت ہے جبکہ لفظِ ''معجزہ'' میں خصوصیّت ہے۔ لفظِ ''معجزہ'' اصل فعل کے صدُور اور وُقوع کی کیفیّت کو بھی بیان کرتا ہے۔ اِنسان کی ساری ظاہری اور باطنی صلاحیتیں اور قوّتیں معجزہ کے صدُور پر عاجز رہ جاتی ہیں۔

اللہ ربّ العزّت نے قرآن مجید میں اِس فعل کو فقط آیات سے تعبیر نہیں کیا بلکہ متعدّد دُوسرے الفاظ کے ذریعہ بھی اُس کے بنیادی تصوّر کو واضح کیا ہے۔

لفظِ ''آیت'' کا مفہوم

لفظِ آیت کا معنٰی عموماً نشانی (علامت) لیا جاتا ہے، تاہم یہ لفظ تین معنوں میں اِستعمال ہوتا ہے:

1۔ آیت بمعنٰی قرآن کا جملہ

خدائے بزرگ و برتر نے کفّار و مُشرکین کو کھلا چیلنج دیتے ہوئے فرمایا:

قُلْ فَأْتُواْ بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُواْ مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَO

)یونس، 38:10(

آپ فرما دیجئے: ''پھر تم اُس کی مِثل کوئی (ایک) سورت لے آؤ اور (اپنی مدد کے لئے) اللہ کے سِوا جنہیں تم بُلا سکتے ہو بُلا لو، اگر تم سچے ہوo''

قرآن کے مُنفرد اُسلوب اور غیر متزلزل اِعتماد کی نظیر ممکن ہی نہیں۔ کفّار و مُشرکین اور اُن کے حواریوں کو قرآن کا کھلا چیلنج ہے کہ وہ کوئی ایک سورت یا آیت یا جملہ ہی بنا کر لائیں۔ قرآن بذاتِ خود حضور ختمی المرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک دائمی معجزہ ہے اور کسی معجزہ کی مِثال پیش کرنے سے عقلِ اِنسانی عاجز رہتی ہے۔

2۔ آیت بمعنیٰ واضح نشانی

قرآن میں آیت کا لفظ واضح نشانی کے معنوں میں بھی اِستعمال ہوا ہے۔ اِمام راغب اِصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''المفردات'' میں لکھا ہے:

ھی العلامۃ الظاھرۃ وحقیقتہ لکل شئ ظاھر ھو ملازم لشئ لا یظہر ظھورہ.

(المفردات، بذیل أیّ: 101)

اِس کے معنی علامتِ ظاہرہ یعنی واضح علامت کے ہیں۔ دراصل ''آیۃ'' ہر اُس ظاہر شئے کو کہتے ہیں جو دُوسری ایسی شئے کو لازِم ہو جو اُس کی طرح ظاہر نہ ہو۔

اِس معنی کے لحاظ سے اللہ ربّ العزّت نے اِنسان کو مطالعۂ اَنفس و آفاق کی طرف قرآنِ حکیم میں یوں مخاطب کیا ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ.

ہم عنقریب انہیں دنیامیں اور خود اُن کی ذات میں اپنی (قدرت و حکمت کی) نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ اُن پر کھل جائیگا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔

(السجدہ، 41:53)

3۔ آیت بمعنیٰ خارقِ عادت

آیت کا لفظ قرآنِ حکیم میں خارقِ عادت کے معنوں میں بھی اِستعمال ہوا ہے۔ خارقِ عادت اَیسے خِلافِ معمول اَفعال و واقعات کو کہتے ہیں جو عادتِ جاریہ کے برعکس ہوں اور اَسباب وعِلل کے اِحاطہ واِدراک میں نہ آسکیں۔ جیسا کہ اِرشادِ ربّانی ہے:

وَقَالَ الَّذِينَ لاَ يَعْلَمُونَ لَوْلاَ يُكَلِّمُنَا اللّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ.

(البقرہ، 2:118)

اور جو لوگ علم نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ: ''اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں فرماتا یا ہمارے پاس (براہِ راست) کوئی نشانی کیوں نہیں آتی''؟

گویا ہمیں ایسے واقعات کیوں نہیں دِکھائے جاتے جو ہماری عقل کو عاجز کر دیں اور ہم اُنہیں دیکھ کر دائرۂ اِیمان میں داخل ہو جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے براہِ راست اُن سے گفتگو کرنے کو یہ اللہ کی نشانیوں یعنی معجزات میں شمار کرتے۔ آیتِ مذکورہ میں اللہ کے نبی سے معجزہ طلب کیا جارہا ہے۔ باری تعالیٰ سے ہمکلامی خارقِ عادت بات ہے۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ.

(المومن، 40:78)

اور کسی رسول کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کوئی نشانی (کوئی آیت، کوئی معجزہ) اللہ کے حکم کے بغیر لے آئے۔

قرآنی اسلوب کی مزید مثالیں

خارقِ عادت واقعات کے لئے کلامِ مجید میں لفظِ ''آیت'' کے علاوہ تین اَلفاظ اور بھی مذکور ہیں:

1۔ مُبْصِرَةٌ

یہ لفظ بھی قرآن میں معجزہ کے معنی میں اِستعمال ہوا ہے، یعنی اَیسی بیّن وواضح نِشانی جو بذاتِ خود اِس طرح ظاہر ہو کہ اُس کے دیکھنے سے دیکھنے والے کی آنکھیں کھل جائیں اور اُس پر حقیقت اپنے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ واضح اور رَوشن ہو جائے، تشکیک و شبہات کا غبار چھٹ جائے اور کسی قسم کا اِبہام باقی نہ رہے:

وَآتَيْنَا ثَمُودَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً.

(بنی اِسرائیل، 17:59)

اور ہم نے قومِ ثمود کو (صالح علیہ السلام کی) اُونٹنی (کی) کھلی نِشانی دِی تھی۔

قومِ ثمود کی فرمائش پر اُونٹنی کا ظہور ایک معجزہ تھا۔ وہ ایک ایسی اُونٹنی تھی جو اللہ ربّ العزّت کی قدرتِ کاملہ کی آئینہ دار تھی۔

2۔ بیّنۃ

دُوسرا لفظ جو قرآن میں معجزہ کے مفہوم کی وضاحت کے لئے اِستعمال ہوا ہے ''بیّنۃ'' ہے۔ بینۃ اَیسی کھلی دلیل کو کہتے ہیں جو فریقِ مخالف کو اِنکار کی صورت میں حجت و ثبوت کے طور پر پیش کی جائے۔ اِس لحاظ سے اِس کا اِطلاق معجزہ پر بھی ہوتا ہے۔ جب اِس لفظ کے ساتھ آیت کا لفظ بھی آجائے تو اِس کے معنی کی مزید تائید بھی ہوتی ہے اور اِس مفہوم کو تقویت بھی عطا ہوتی ہے:

قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ هَـٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً.

(الاعراف، 73:7)

بیشک تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے ایک رَوشن دلیل آگئی ہے۔ یہ اللہ کی اُونٹنی تمہارے لئے نشانی ہے۔

ایک اور مقام پر اِرشاد فرمایا:

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ.

(الاسراء، 101:17)

اور بیشک ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو نو روشن نشانیاں دیں۔

مذکورہ بالا دونوں آیاتِ کریمہ میں بینۃ اور آیۃ کے اَلفاظ تقدیم و تاخیر کے ساتھ اِستعمال ہوئے ہیں۔ دونوں اَلفاظ معجزہ کے مفہوم کو واضح کر رہے ہیں۔ بینۃ اور آیۃ کے اَلفاظ سے معجزہ کے علاوہ کوئی دُوسرا مفہوم اَخذ نہیں کیا جا سکتا۔

3۔ بُرھَانٌ

قرآنِ حکیم میں معجزہ کے لئے اِستعمال ہونے والا تیسرا لفظ ''بُرھَانٌ'' ہے۔ برھان ایسی دلیل کو کہتے ہیں جو فریقِ مخالف کے تمام دلائل سے زیادہ وزنی اور ان پر حاوی ہو اور کسی تنازعہ کا فیصلہ کر دینے والی ہو:

اُسْلُكْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ وَاضْمُمْ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذَانِكَ بُرْهَانَانِ مِن رَّبِّكَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ O

اپنا ہاتھ اپنے گریبان کے اندر ڈالو (اور پھر نکالو) وہ بِلا کسی عیب (یعنی بیماری وغیرہ) کے سفید (روشن ہو کر) نکل آئے گا اور خوف (کو دُور کرنے) کے لئے اپنے بازو اپنے پہلو سے ملا لیا کرو۔

(القصص، 32:28)

پس یہ دو دلیلیں (یعنی دو معجزے) تمہارے ربّ کی طرف سے فرعون اور اُس کے سرداروں کی طرف ہیں۔ بیشک وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں o

یہاں قرآنِ حکیم میں معجزہ کے لئے لفظِ برھان اِستعمال ہوا ہے یعنی ایسی دلیل جس کے سامنے کوئی دلیل کام نہ آسکے۔ یہ ایسی برھانِ قاطعہ تھی جس کے سامنے بنی اِسرائیل کے سارے جادُوگروں کا نشہ ہرن ہو گیا۔ اُن کے طلسم کا حِصار ٹوٹ گیا، اُن کا فنِ جادوگری ناکام و لاجواب ہو گیا اور اُن کی جملہ قوّتیں بے بسی کی تصویر بن کر رہ گئیں۔

خارقِ عادت اَفعال کی اَقسام

اِس کارخانۂ قدرت میں اَن گنت دُنیائیں آباد ہیں۔ اِنسان اَشرفُ المخلوقات ہے لیکن اِس کائنات میں وہ تنہا ہی مخلوقِ خدا نہیں۔ خالقِ کائنات کی مخلوقات کا شمار ممکن ہی نہیں۔ نجانے اِن خلاؤں میں گردش کرنے والے اَربوں کھربوں سیّاروں میں زِندگی کن اَشکال اور کن مراحل میں اِرتقاء پذیر ہے! اگر ہم صرف اِس کرۂ ارضی پر بسنے والی مخلوقات، چرند، پرند، حشرات الارض اور آبی مخلوقات کی دُنیاؤں کی سیر کو نکلیں اور اِن مخلوقات کے معمولات کا مُشاہدہ کریں تو صنّاعِ اَزل کی قوّتِ تخلیق کے تصوّر کا ہلکا سا پرتو بھی ذہنِ اِنسانی کی تنگناؤں میں سماتا نظر نہیں آتا۔ اِسی طرح اِس کرۂ ارضی پر خلافِ معمول رُونما ہونے والے واقعات کا تسلسل بھی حیطۂ شعور میں آنا ممکن نہیں، یہ سلسلہ اِس حیرت

کدے میں اَزل سے جاری ہے اور اَبد تک جاری رہے گا، البتّہ نبوّت کی طرح معجزات کا دروازہ بھی نبی آخر الزّماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مقدّسہ کے بعد بند ہو چکا ہے۔ واضح رہے کہ تصرّفاتِ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سِلسلہ آج بھی جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا کہ قیامت کے دِن بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے پرچم شفاعت کے سائے تلے اَولادِ آدم کو ردائے عافیّت نصیب ہو گی۔

اِنسانی زِندگی میں دو طرح کے اَفعال وُقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ایک وہ اَفعال جو معمول کے مطابق اِنجام پاتے ہیں اور تھوڑا سا غور وفکر کرنے سے اُن کی توجیہہ ممکن ہوتی ہے۔ ہماری روز مرہ کی زندگی میں ان افعال و واقعات کی اَن گِنت مثالیں پائی جاتی ہیں جیسے کسی شخص کا بیماری کی وجہ سے فوت ہو جانا۔ دُوسرے وہ اَفعال جو معمول سے ہٹ کر بلکہ خلافِ معمول ہوتے ہیں اور اُن کی کامل توجیہہ کسی طور پر بھی ممکن نہیں ہوتی۔ اُنہیں خارقِ عادت اَفعال کہا جاتا ہے۔ یہ خلافِ معمول واقعات مختلف لوگوں سے مختلف شکلوں میں صادِر ہوتے ہیں۔ ان خلافِ معمول واقعات کو چار مختلف اَقسام میں تقسیم کیا گیا ہے:

معجزہ

اِرھاص

کرامت

اِستدراج

1۔ معجزہ

جب کسی نبی اور رسول کو خِلعتِ نبوّت ورِسالت سے سرفراز کیا جاتا تو کفّار و مُشرکین دعویٰ نبوّت کی صداقت کے طور پر اُس سے دلیل طلب کرتے۔ اِس پر قدرتِ خداوندی سے جو خارقِ عادت واقعہ اُس نبی یا رسول کے دستِ حق پرست سے صادِر ہوتا اُسے معجزہ کہتے ہیں۔

2۔ اِرھاص

وہ خلافِ معمول واقعات یا عجائبات جن کا ظہور کسی نبی یا رسول کی وِلادتِ باسعادت کے وقت یا پیدائشِ مبارکہ سے پہلے ہوتا، اِرھاص کہلاتے ہیں۔ اُن واقعات کا رُونما ہونا اِس اَمر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ پیدائش ایک غیر معمولی پیدائش ہے۔ مثلاً حضور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وِلادتِ پاک سے پہلے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آسمان سے سِتارے سائبان کی طرح زمین پر اُتر آئے ہیں اور کعبہ کے بت سجدہ ریز ہو گئے ہیں۔ سیدۂ کائنات بی بی آمنہ رضی اللہ عنھا کا اِرشادِ گرامی ہے کہ سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کے وقت میں نے سرزمینِ مکہ سے ہزاروں میل کے بُعد پر واقع شام کے محلات دیکھے اور یہ کہ میں نے اپنے اِردگرد خوشبوئیں محسوس کیں۔ کفّار و مشرکینِ مکہ چونکہ لڑکیوں کو زِندہ درگور کر دیتے تھے اِس لئے اِس ظلم کے مستقل خاتمے کی علامت کے طور پر جس سال سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادتِ باسعادت ہوئی، اُس سال شہرِ مکہ میں کوئی لڑکی پیدا نہ ہوئی۔ آمدِ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے میں ربِّ کائنات نے سب کو فرزند عطا فرمائے۔ گویا کارکنانِ قضاوقدر زبانِ حال سے اِعلان کر رہے تھے کہ والیِ کون ومکاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کسی عام اِنسان کی آمد نہیں۔ یہ تمام خارقِ عادت واقعات اِرھاص کہلاتے ہیں۔

3۔ کرامت

کرامت اُن خارقِ عادت اَفعال کو کہتے ہیں جو مومنین، صالحین اور اولیائے کرام کے ہاتھوں سے صادِر ہوتے ہیں۔ تاریخِ اِسلام اَولیاء وصوفیاء کی کرامات سے بھری پڑی ہے۔ مثلاً سیدنا سلیمان علیہ السلام کے صحابی حضرت آصف برخیا کا پلک جھپکنے سے قبل ملکہ سبا کا تخت آپ کی خدمت میں پیش کر دینا، امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا دورانِ خطبہ منبر پر ہی میدانِ جنگ کا مشاہدہ کرنا اور لشکرِ اسلام کے سپہ سالار کو عسکری ہدایات دینا اور حضرت خواجۂ اجمیر رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر لاکھوں ہندوؤں کا قبولِ اِسلام اُن کی کراماتِ جلیلہ میں سے ہے۔

4۔ اِستدراج

یہ وہ خلافِ عادت اَفعال ہوتے ہیں جو کسی کافر، مُشرک، فاسق، فاجر اور ساحر کے ہاتھ سے صادِر ہوں۔ مثلاً: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں سامری جادوگر نے سونے کا بچھڑا بنا کر اُس کے منہ سے آواز پیدا کرلی جس کے نتیجے میں بنی اِسرائیل نے اُس کی پرستش شروع کردی۔ اِسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دعوائے نبوّت کو چیلنج کرتے ہوئے فِرعون کے دربار میں جادوگروں نے اپنی لاٹھیاں زمین پر پھینکیں تو وہ اَژدھا بن گئیں۔ اِس قبیل کے تمام اَعمال اِستدراج کی ذیل میں آتے ہیں۔

حقیقتِ معجزہ

جہاں عقل عاجز آجاتی ہے وہاں سے معجزے کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ معجزہ ربِّ کائنات کی قدرت اور جلالت کا اِظہار ہوتا ہے۔ یہ وہ خارقِ عادت واقعات ہوتے ہیں جو اللہ کے برگزیدہ نبیوں اور رسولوں سے صادِر ہوتے ہیں۔ اُن کا بظاہر کوئی سبب نظر آتا ہے اور نہ کوئی اُن کی علّت دِکھائی دیتی ہے۔ یہ عقل کے دائرۂ اِدراک اور حیطۂ شعور میں نہیں آتے، لیکن جب اِنسان اپنے سر کی آنکھوں سے اُن کا ظہور ہوتے دیکھتا ہے تو سرِ تسلیم خم کرنے کے سِوا اُس کے پاس کوئی چارہ نہیں رہتا اور وہ کہہ اُٹھتا ہے کہ یہ معجزہ اللہ کے نبی سے صادِر ہوا ہے، اِس لئے یہ حق ہے۔ وہ لوگ جو معجزات و کرامات کے ردّ و قبول کا معیار اپنی سوچ، عقل، تجربہ اور مطالعہ کو قرار دیتے ہیں نہ صرف بہت بڑے اِعتقادی مغالطے کا شکار ہو جاتے ہیں بلکہ علم کے تکبّر میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اگر لکڑی آگ کے الاؤ میں گر کر جلا نہ کرے تو عقل کبھی بھی ذہنِ اِنسانی کی یہ رہنمائی نہ کرے کہ آگ جلانے والی شئے ہے۔ اِس لئے کہ جو بات مُشاہدہ اور تجربہ کے خِلاف ہو عقل اُسے ہرگز ہرگز تسلیم نہیں کرتی۔ مثلاً: اللہ کے برگزیدہ نبی سیدنا اِبراھیم علیہ السلام بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑیں اور آگ گلزار بن جائے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام قُمْ بِاِذْنِ اللہِ کہیں تو قبر سے مُردہ اُٹھ کھڑا ہو، حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیض اپنی آنکھوں سے لگائیں تو آپ علیہ السلام کی بینائی لوٹ آئے، حضرت صالح علیہ السلام پہاڑ پر اپنی چھڑی مبارک ماریں تو اُس کے اندر سے اُونٹنی برآمد ہو جائے، حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک درباری پلک جھپکنے سے پہلے اور جسم کو غائب کئے بغیر ہزاروں میل دُور سے ملکہ بلقیس کا تخت لاکر حاضر کردے یا پھر انگشتِ مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُٹھے اور چاند دو ٹکڑے ہو جائے، ڈوبتے سورج کی سمت دستِ اَقدس اُٹھائیں تو وہ غروب ہونے کے بعد واپس لوٹ آئے اور آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسمِ اَطہر کے لمس سے کھجور کا مرا ہوا درخت پھر سے زِندہ ہو جائے تو عقل اپنے دامنِ شعور کو تار تار نہیں کرے گی تو اور کیا کرے گی! ورائے عقل سرزد ہونے والے اِنہی واقعات کو معجزہ کہتے ہیں۔ عقل اِن معجزات کو سمجھنے سے معذور ہے۔ (فلسفہ معراج النبی۔ ڈاکٹر محمد طاہر القادری)

آیت مبارکہ:

يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ○۱۱۰

لغۃ القرآن: [يُّرِيْدُ : وہ ارادہ رکھتا ہے] [اَنْ : کہ] [يُّخْرِجَكُمْ : وہ تم لوگوں کو نکالے] [مِّنْ اَرْضِكُمْ : تمہاری زمین سے] [فَمَاذَا : (فرعون نے پوچھا) پھر کیا] [تَاْمُرُوْنَ : تم لوگ مشورہ دیتے ہو]

ترجمہ: (لوگو!) یہ تمہیں تمہارے ملک سے نکالنا چاہتا ہے، سو تم کیا مشورہ دیتے ہو

تشریح:

جب حضرت موسیٰ کے ان معجزوں کو دیکھنے کے بعد فرعون نے اپنے سرداروں اور درباریوں سے کہا کہ یقیناً یہ شخص ایک بڑا ماہر جادوگر ہے جو اپنے جادو کے زور سے تم لوگوں کو تمہاری اس سرزمین سے نکال باہر کرنا چاہتا ہے۔ تو تم لوگ مجھے کیا حکم دیتے ہو؟ اس بات سے فرعون کی بزدلی اور اس کی بوکھلاہٹ ملاحظہ ہو کہ کہاں تو وہ اپنے تئیں رب اعلیٰ ہونے کا دعویٰ کرتا تھا اور کہاں یہ کیفیت کہ وہ اپنے درباریوں سے کہتا ہے تم کیا حکم دیتے ہو؟ اور یہ سب خوف اور ڈر اس موسیٰ (علیہ السلام) سے ہے جو کہ تنہا اور بظاہر بے یار و مددگار تھا۔ سو اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حق کی قوت کتنی زبردست قوت ہوتی ہے اور نصرت و عنایت خداوندی کس قدر

عظیم الشان عنایت ہوتی ہے۔ اللہ نصیب فرمائے اور ہمیشہ ہر حال میں اس سے سرشار رکھے۔ آمین۔ بہر کیف حضرت موسیٰ کے معجزات دیکھنے کے بعد فرعون اور اس کے سرداروں کی حالت غیر ہو گئی۔ اس لیے اب وہ لوگ آپس میں موسیٰ کے مقابلے کے لیے مشورے کرنے لگے۔ (تفسیر مدنی کبیر)

معجزہ اور جادو میں فرق

معجزہ اور جادو میں یہ فرق ہے کہ معجزہ میں عادت سے باہر جو چیز خدائے تعالیٰ انبیاء کی تصدیق کے طور پر پیدا کرتا ہے وہ اصلی چیز ہوتی ہے: مثلا (۱)۔ حضرت صالح (علیہ السلام) کے معجزہ سے جو اونٹنی پتھر میں سے پیدا ہوئی وہ دراصل اونٹنی ہی تھی، لوگوں نے مدت تک اس کا دودھ پیا اور (۲)۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) جو مردہ کو زندہ کرتے تھے وہ درحقیقت وہی مردہ شخص ہوتا تھا اور (۳)۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی انگلیوں سے جو پانی کا چشمہ بہا وہ دراصل پانی ہی تھا لوگوں نے پیا اور ان کی پیاس بجھی۔ جادو میں ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی غریب جادوگر ٹھیکریوں کے روپے بنادے تو درحقیقت وہ روپے ہو جاویں۔ ایسا ہوتا تو کوئی جادوگر دنیا میں تنگ حال کیوں نظر آتا اور جادوگر محتاجوں کی طرح فرعون سے اپنے جادو کے کام کی مزدوری کیوں مانگتے۔ جادو کی اصل اتنی ہی ہے کہ لوگوں کے دیکھنے میں جادو کے اثر سے ٹھیکریاں روپے نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ ٹھیکریاں ہی رہتی ہیں۔ (تفسیر مظہر القرآن)

ہر نبی کا معجزہ اس چیز کی جنس سے ہوتا ہے جس چیز کا اس زمانہ میں چرچا ہو۔

اس زمانہ میں جادو کا بڑا چرچا تھا اور جادو کی بہت سی قسمیں تھیں اور جادو کی بعض قسمیں بہت بڑی اور بہت حیران کن تھیں اسی لیے فرعون کی قوم نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق خیال کیا کہ یہ بہت ماہر جادوگر ہیں۔ پھر انھوں نے آپس میں کہا: کہ انھوں نے اتنے بڑے جادو کو اس لیے پیش کیا ہے کہ شاید یہ ملک اور ریاست کے طلب گار ہیں۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے اس قول کو فرعون کی قوم کی طرف منسوب کیا ہے اور سورۃ الشعراء میں اس قول کو خود فرعون کی طرف منسوب کیا ہے، اور یہ بظاہر تعارض ہے۔ اس کو جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ قول فرعون کا بھی ہو اور اس کے درباریوں کا بھی ہو۔ سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ نے اس قول کو اس کے درباریوں کی طرف منسوب کیا اور سورۃ الشعراء میں اس قول کو خود فرعون کی طرف منسوب کیا۔

"اب تمہارا کیا مشورہ ہے؟"۔ اس کے متعلق مفسرین نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے یہ فرعون کا کلام ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ درباریوں کا کلام ہو۔

"بیشک تم ضرور مقربین میں سے ہو جاؤ گے" جادوگروں نے فرعون سے اجر کا سوال کیا تھا۔ جواب میں فرعون نے کہا تم مقربین میں سے ہو جاؤ گے۔ اس جواب میں ان کے اجر کا ذکر تو نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فرعون کا مطلب یہ تھا کہ بیشک تم کو اجر بھی ملے گا اور تم مقربین میں سے بھی ہو جاؤ گے۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ یہ ستر جادوگر تھے اور ایک ان کا سردار تھا جو ان کو جادو سکھاتا تھا یہ مجوسی شخص تھا۔ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس زمانہ میں جادو کا بہت چرچا تھا، جیسا کہ متکلمین نے کہا ہے کہ ہر نبی کو اس جنس سے معجزہ دیا جاتا ہے جس جنس کا اس زمانہ میں بہت غلبہ ہو۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ میں جادو کا بہت چرچا تھا تو ان کو ایسا معجزہ دیا گیا جو جادو کے مشابہ تھا، اور وہ جادوگروں کے تمام کمالات پر غالب آگیا، حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ میں طب اور حکمت کا بہت غلبہ تھا تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو مسیحائی کا ایسا کمال دے کر بھیجا جو ان کی تمام طب اور حکمت پر غالب آگیا اور ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں فصاحت اور بلاغت کا بہت غلبہ تھا تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایسا فصیح اور بلیغ کلام دے کر بھیجا جس کی نظیر لانے سے تمام جن اور انس عاجز ہو گئے۔

سحر کی تعریف اور سحر اور معجزہ میں فرق:

کسی خبیث اور بدکار شخص کے مخصوص عمل کے ذریعہ کسی غیر معمولی اور خلاف عادت کام کے ظہور کو سحر کہتے ہیں، اور یہ باقاعدہ کسی استاذ کی تعلیم سے حاصل ہوتا ہے اور اسی تعریف سے سحر کا معجزہ اور کرامت سے فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ معجزہ نبی کے ہاتھ سے ظاہر ہوتا ہے جس کی نیکی اور پاکیزگی معاشرہ میں مشہور ہوتی ہے اور سحر خبیث اور بدکار شخص سے ظاہر ہوتا ہے۔ نیز سحر کسی استاذ سے سیکھا جاتا ہے جب کہ معجزہ نبی سے بغیر کسی شخص کی تعلیم کے ظاہر ہوتا ہے، اور معجزہ نبی اس لیے پیش کرتا ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی بعادت اور نیکی اور پرہیزگاری کی دعوت دیتا ہے اور اپنے آپ کو اللہ کا فرستادہ اور رسول قرار دیتا ہے۔ جبکہ ساحر دعویٰ نبوت کی دلیل کے لیے سحر پیش کرتا ہے نہ وہ لوگوں کو عبادت اور پرہیزگاری کی دعوت دیتا ہے بلکہ اس کا مقصد لوگوں کو حیران کرنا اور کسی دنیاوی مفاد کو حاصل

کرنا ہوتا ہے، اور نبی دنیاوی مفادات سے بے نیاز ہوتا ہے اور اسی فرق سے سحر اور کرامت کا فرق بھی ظاہر ہو جاتا ہے کیونکہ کرامت بغیر تعلیم کے کسی نیک مسلمان کے ہاتھ سے ظاہر ہوتی ہے اور یہ کسبی نہیں وہبی ہوتی ہے جبکہ سحر کسب اور تعلیم سے کسی فاسق اور شریر شخص کے ہاتھ سے ظاہر ہوتا ہے۔ سحر کسی شخص کی طبیعت یا اس کی فطرت کا خاصہ نہیں ہے اور یہ بعض جگہوں، بعض اوقات اور بعض شرائط کے ساتھ مخصوص ہے۔ جادو کا معارضہ دیا جاتا ہے اور اس کو کوشش سے حاصل کیا جاتا ہے۔ سحر کرنے والا فسق کے ساتھ ملعون ہوتا ہے، ظاہری اور باطنی نجاست سے ملوث ہوتا ہے اور دنیا اور آخرت میں رسوا ہوتا ہے۔ اہل حق کے نزدیک سحر عقلاً جائز اور ثابت ہے اور قرآن اور سنت میں اس کا بیان ہے۔

معتزلہ نے کہا سحر کی کوئی حقیقت نہیں ہے یہ محض نظر بندی ہے اور اس کا سبب کرتب، ہاتھ کی صفائی اور شعبدہ بازی ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے: "وما کفر سلیمن ولکن الشیاطین کفروا یعلمون الناس السحر: اور سلیمان نے کوئی کفر نہیں کیا، البتہ شیاطین ہی کفر کرتے تھے، وہ لوگوں کو جادو (کے کفریہ کلمات) سکھاتے تھے" (البقرہ: 102)

اسی آیت میں مذکور ہے کہ سحر کے ذریعہ شوہر اور بیوی میں تفریق ہو جاتی تھی۔ نیز قرآن مجید میں ہے: "ومن شر النفثت فی العقد: آپ کہیے کہ میں گرہوں میں (جادو کی) بہت پھونک مارنے والی عورتوں کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں" (الفلق: 4)۔

نیز حدیث صحیح میں ہے کہ ایک یہودی لبید بن اعصم نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر سحر کر دیا تھا جس کی وجہ سے آپ تین راتیں بیمار رہے۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث: 7563) اس کی تحقیق بنی اسرائیل: 47 میں دیکھیں۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے قصہ میں ہے: "یخیل الیہ من سحرہم انہا تسعی: حضرت موسیٰ کی طرف یہ خیال ڈالا گیا کہ ان کے سحر کی وجہ سے وہ لاٹھیاں اور رسیاں دوڑ رہی ہیں" (طہ: 66)۔ اس سے معلوم ہوا کہ جادو کی کوئی حقیقت نہیں ہے یہ صرف نظر بندی ہے اور کسی کے ذہن میں خیال ڈالنا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ فرعون کے جادوگروں کا سحر یہی تخیل اور نظر بندی تھا۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جادو کی کوئی اور حقیقت نہیں۔ (شرح المقاصد، ج 5، ص 79۔ 81، ملخصاً و موضحاً مطبوعہ ایران، 1409ھ)

علامہ سید محمود آلوسی متوفی 1270ھ لکھتے ہیں: جس چیز کا سبب مخفی ہو اس کو سحر کہتے ہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب کام ہوتا ہے جو خرق عادت کے مشابہ ہوتا ہے۔ اس میں قول، عمل اور اعتقاد تینوں کا دخل ہے۔ اس میں شیطان کی مدح اور الفاظ شرکیہ پڑھ کر دم کیا جاتا ہے۔ ستاروں کی عبادت اور دوسرے جرائم کرنے پڑتے ہیں اور شیطان سے محبت کرنی ہوتی ہے۔ سحر وہی شخص کر سکتا ہے جس کا نفس خبیث ہو اور اس کو شیطان کے ساتھ مناسبت ہو۔ جس طرح فرشتے ان ہی لوگوں کے ساتھ تعاون کرتے ہیں جو دائمی عبادت کرتے ہوں اور اللہ کے ساتھ قرب میں فرشتوں کے مشابہ ہوں، اسی طرح شیاطین ان ہی لوگوں کے ساتھ تعاون کرتے ہیں جو قول، فعل اور اعتقاد کی خباثت اور نجاست میں شیاطین کے مشابہ ہوں۔ اس تعریف سے ساحر، نبی اور ولی سے ممیز ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو مختلف ترکیبوں، آلات اور دواؤں کے ذریعہ عجیب و غریب کام کر کے دکھاتے ہیں، وہ دراصل شعبدہ باز ہیں۔ ان کو ساحر مجازاً کہا جاتا ہے اور یہ بھی بعض کے نزدیک شرعاً مذموم ہے۔

علامہ نووی نے روضۃ الطالبین (ج 7، ص 198) میں یہ تصریح کی ہے کہ سحر بالاجماع حرام ہے۔ جمہور نے سحر کی یہ تعریف کی ہے کہ سحر ایک خلاف عادت کام ہے یہ اعمال مخصوصہ کے ذریعہ اس شخص سے صادر ہوتا ہے جس کا نفس خبیث اور شریر ہو جمہور کے نزدیک سحر کی حقیقت ہے اور ساحر ہوا میں اڑ سکتا ہے، پانی پر چل سکتا ہے، انسان کو قتل کر سکتا ہے اور انسان کو گدھا بنا سکتا ہے۔ ان تمام کاموں میں فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہے اور اللہ تعالیٰ نے ساحر کو یہ قدرت نہیں دی کہ وہ سمندر کو چیر دے، مردے کو زندہ کر دے اور پتھر کو گویا کر دیے اور اس طرح کے دوسرے کام جو انبیاء (علیہم السلام) کے معجزات ہیں۔ معتزلہ اور اہل سنت میں سے الاسترابازی کا یہ مذہب ہے کہ ساحر ایسے کاموں پر قادر نہیں ہوتا جن کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ورنہ نبوت کے اثبات کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

بعض محققین نے سحر اور معجزہ میں یہ فرق کیا ہے کہ معجزہ میں نبی تحدی (چیلنج) کرتا ہے کہ اس جیسا کام کر کے دکھاؤ اور سحر میں تحدی نہیں ہوتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عادت مستمرہ یہ ہے کہ جھوٹے نبی کے دعویٰ کے موافق خرق عادت ظاہر نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ منصب نبوت کو کذابین سے محفوظ رکھتا ہے۔

سحر اور ساحر کا شرعی حکم:

علامہ تفتازانی نے کہا ہے کہ جادو کا عمل کرنا کفر ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے اور حدیث میں جو سحر کو کبائر میں سے شمار فرمایا ہے یہ اس کے منافی نہیں ہے کیونکہ کفر بھی کبیرہ گناہ ہے، اور شیخ ابو منصور ماتریدی نے یہ کہا ہے کہ سحر کو مطلقاً کفر قرار دینا خطا ہے بلکہ اس کی حقیقت سے بحث کرنی چاہیے اگر جادو کے عمل میں کوئی ایسی چیز ہو جو ایمان کو رد کرتی ہو تو یہ کفر ہو گا ورنہ نہیں۔ پھر جو سحر کفر ہو اس میں مردوں کو قتل کر دیا جائے گا اور عورتوں کو نہیں قتل کیا جائے گا اور جس سحر کے ذریعہ کسی شخص کو ہلاک کر دیا جائے اس کے مرتکب کا حکم ڈاکوؤں کی طرح ہے۔ اس میں مرد اور عورت برابر ہیں اور جب ڈاکو توبہ کرلیں تو ان کی توبہ قبول کرلی جائے گی اور جن لوگوں نے یہ کہا کہ اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی انھوں نے خطا کی کیونکہ فرعون کے جادوگروں کی توبہ قبول کرلی گئی تھی۔ مدارک میں اسی طرح مذکور ہے اور یہی بات اصول کے قریب ہے۔ امام ابو حنیفہ سے مشہور روایت یہ ہے کہ جب کسی شخص کے متعلق یقین ہو جائے کہ وہ ساحر ہے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا اور اگر وہ کہے کہ میں جادو کو ترک کرتا ہوں تو اس کے قول کو قبول نہیں کیا جائے گا اور اگر وہ یہ کہے کہ میں پہلے جادو کرتا تھا اور اب مدت ہوئی اس کو چھوڑ چکا ہوں تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی اور اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ امام ابو حنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ ام المومنین حضرت حفصہ کی باندی نے ان پر جادو کرنے کا اعتراف کیا تو آپ نے حضرت عبدالرحمٰن بن زید کو اسے قتل کرنے کا حکم دیا اور حضرت عمر (رض) نے حکم دیا تھا کہ ہر ساحر اور ساحرہ کو قتل کردو، سو تین ساحروں کو قتل کر دیا گیا۔ ساحر کو مطلقاً قتل کرنے پر امام شافعی نے اعتراض کیا ہے کیونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس یہودی کو قتل نہیں کیا جس نے آپ پر جادو کیا تھا۔ اور مومن کا بھی اسی طرح حکم ہے۔ کیونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے: ذمیوں کے وہ حقوق ہیں جو مہاجرین کے ہیں اور ذمیوں کے وہ فرائض ہیں جو مہاجرین کے ہیں۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: 1731)

سحر کے سیکھنے اور سکھانے کا حکم:

جادو کے سیکھنے اور سکھانے میں بھی اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ کفر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "ولکن الشیاطین کفروایعلمون الناس السحر: لیکن شیاطین نے کفر کیا وہ لوگوں کو جاندو سکھاتے تھے" (البقرہ: 102)

اس آیت میں کفر کی علت جادو سکھانا ہے۔ لیکن اس پر اعتراض ہے کہ اس آیت کا یہ معنی نہیں ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ شیطانوں نے کفر کیا اور وہ اس کے باوجود جادو سکھاتے تھے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ جادو کا سیکھنا اور سکھانا حرام ہے اور جمہور علماء کا یہی مختار ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ یہ دونوں مکروہ کام ہیں۔ یہ بعض کا قول ہے اور چوتھا قول یہ ہے کہ یہ دونوں مباح ہیں۔ البتہ وہ جادو سکھانا مذموم ہے جس کا مقصد لوگوں کو گمراہ کرنا ہو۔ امام رازی کا یہی مختار ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ جادو کا علم قبیح ہے نہ مذموم، کیونکہ فی ذاتہ علم میں شرف اور فضیلت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون: کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں" (الزمر: 29)۔ اور جو شخص جادو کو نہ جانتا ہو وہ جادو اور معجزہ میں فرق نہیں کرسکے گا اور معجزہ کے معجز ہونے کا علم واجب ہے تو ثابت ہوا کہ جادو کا علم حاصل کرنا واجب ہے اور جو چیز واجب ہو وہ کیسے حرام اور قبیح ہو سکتی ہے، لیکن امام رازی کی دلیل پر یہ اعتراض ہے کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ فی نفسہ جادو کا علم قبیح ہے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جادو کا عمل کرنا ممنوع ہے اور چونکہ جادو کا علم جادو کے عمل کا ذریعہ ہے اس لیے وہ بھی ممنوع ہوگا کیونکہ شریعت میں ممنوع کا ذریعہ بھی ممنوع ہے۔ جیسے فی نفسہ زنا ممنوع ہے اور اس کے مقدمات مثلاً بوس و کنار اس فعل کے ارتکاب کا ذریعہ ہیں تو ان سے بھی منع فرما دیا اور فرمایا: "لا تقربواالزنی انہ کان فاحشۃ: زنا کے قریب بھی مت جاؤ کیونکہ وہ بے حیائی کا کام ہے" (الاسراء: 32)۔

اس پر اعتراض یہ ہے کہ ہم یہ نہیں مانتے کہ معجزہ اور سحر میں فرق کرنا سحر کے علم پر موقوف ہے کیونکہ اکثر بلکہ تقریباً تمام علماء کو معجزہ اور سحر میں فرق کا علم ہے۔ حالانکہ ان کو سحر کا علم نہیں ہے۔ نیز جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں ان میں فرق کو جاننے کے لیے یہ کافی ہے کہ معجزہ کا ظہور نبی پر ہوتا ہے جس کی نیکی لوگوں میں معروف ہوتی ہے اور وہ لوگوں کو اللہ کی عبادت اور نیکی اور پرہیزگاری کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے برخلاف سحر فاسق اور خبیث شخص سے صادر ہوتا ہے اور وہ کسی نیک کام کی دعوت نہیں دیتا اور اس پر تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر جادو کا علم حاصل کرنا واجب ہوتا تو حضرات صحابہ کرام، اخیار تابعین اور بعد کے ائمہ اور فقہاء

جادو کے بہت بڑے عالم ہوتے حالانکہ ان میں سے کسی سے بھی یہ منقول نہیں ہے تو کیاان اسلاف نے اس واجب کو ترک کر دیا تھااور صرف امام رازی نے اس واجب پر عمل کیا ہے ! (روح المعانی ج 1، ص 338 - 340، ملخصاً و موضحا، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت) (تفسیر تبیان القرآن)

ان آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پچھلی قوموں کے بعد حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو فرعون اور اس کی قوم کے پاس اپنی نشانیاں دے کر بھیجا۔ مگر انھوں نے انکار کیا۔ پھر دیکھنا چاہیے کہ مفسدوں کا انجام کیسا ہوا۔ اگرچہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ہر چند کہا کہ اے فرعون ! میں اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں۔ مجھے سزاوار ہے خدا کی طرف سے بجز سچ کے اور کوئی بات نہ کہوں۔ میں تمہارے پاس تمہارے خدا کی طرف سے کھلی دلیل لایا ہوں تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے۔ فرعون نے آپ کے جواب میں کہا کہ اگر واقعی تو کوئی معجزہ اور بڑی نشانی لایا ہے تو ہمارے سامنے لے آ اگر تو سچا ہے یہ سن کو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فوراً اپنا عصا ڈال دیا اور وہ ایک بڑا اژدھا بن کر چاروں طرف لہرانے لگا۔ پھر اپنا ہاتھ بغل میں داخل کرکے نکالا ہی تھا کہ دیکھنے والوں کو چمکتا نظر پڑا۔ اس پر فرعون کی قوم نے کہا کہ صاحب یہ تو بہت بڑا ماہر جادو گر ہے اس کا خاص ارادہ ہے کہ تمہیں تمہاری زمین میں سے نکال کھڑا کرے۔ پھر اب تمہاری کیا رائے ہے سب لوگوں نے اتفاق کیا غرضیکہ فرعون سے مناظرہ ہو کر اس مناظرہ کا اور پھر جادو گروں اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے مقابلہ کا اور جادو گروں کا مقابلہ سے عاجز ہو کر شریعت موسوی کے تابع ہو جانے کا یہ سب ذکر ان آیتوں میں مختصر طور پر ہے۔ سورۃ طٰہٰ اور سورۃ شعراء (پارہ ۱۶، پارہ ۱۹) میں اس قصہ کی تفصیل زیادہ آوے گی۔

سورۃ بقرہ میں گزر چکا ہے کہ اسرائیل حضرت یعقوب (علیہ السلام) کو اور ان کی اولاد کو کہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ سے چار سو برس پہلے اولاد یعقوب (علیہ السلام) میں سے حضرت یوسف (علیہ السلام) جس طرح ملک شام سے مصر میں آئے اس کا ذکر مفصل طور پر تو سورۃ یوسف (پارہ ۱۲، ۱۳) میں آوے گا۔ یہاں اسی قدر ذکر کافی ہے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی مصر کی سکونت کے سبب سے بنی اسرائیل مصر میں آئے اور حضرت یوسف (علیہ السلام) کی وفات کے بعد بنی اسرائیل مصر میں ذلیل حالت سے رہتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کا حکم حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو یہ تھا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) مصر سے بنی اسرائیل کو نکال کر ان کے قدیمی وطن ملک شام میں انھیں آباد کریں۔ اسی واسطے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جہاں فرعون سے اور باتیں کیں وہاں یہ بھی فرمایا تھا۔ (تفسیر مظہر القرآن۔ شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی)

مصر کا ایک علاقہ تھا جس کو صعید کہا جاتا تھا جس کی لمبائی بندرہ دن کی راہ تھی جو بہت سارے شہروں پر مشتمل تھا۔ اس زمانے اس خطے میں جادو گروں کے سردار رہا کرتے۔ انھیں میں دو بھائی ایسے تھے جو جادو میں یکتا تھے اور انھیں فن سحر پر پورا پورا عبور تھا۔۔ المختصر۔۔ فرعون نے اپنی قوم کے چودھریوں کے مشورے کو قبول کرتے ہوئے اس تجویز عمل کرنے کا حکم دیدیا۔

۔۔ چنانچہ۔۔ اس کام کیلئے جس گروہ کو تیار کیا گیا وہ جادو گروں کو اکٹھا کرکے لانے کیلئے صعید کی طرف نکل گیا اور وہاں کے جادو گروں کو فرعون کا پیغام پہنچایا۔۔

چنانچہ۔۔ جب مذکورہ بالا دو بھائیوں کے پاس فرعون کا پیغام پہنچا تو وہ اپنی ماں سے کہنے لگے کہ ہمیں مارے باپ کی قبر پر لیجایئے تاکہ ہم ان سے مشورہ لے لیں۔۔

الغرض۔۔ دونوں باپ کی قبر پر پہنچ کر عرض کرنے لگے کہ فرعون کے دربار میں دو ایسے آدمی آئے ہیں جنھوں نے اس پر زمین تنگ کر دی ہے ان کے پاس ایک عصا ہے جسے وہ سانپ بنادیتے ہیں جو شے اس کے آگے آتی ہے اسے کھا جاتا ہے بتایئے کہ ہم اس کا مقابلہ کریں۔۔ یا۔۔ نہ کریں۔ قبر سے آوز آئی کہ وہاں پہنچ کر معلوم کرنا کہ وہ عصا ان کی نیند کے وقت بھی اژدھا ہو جاتا ہے۔۔ یا۔۔ نہیں۔

اگر نیند کے وقت بھی سانپ ہو جاتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ جادو نہیں اس لیے کہ جادو گر کا جادو خواب کے وقت جاری نہیں ہو سکتا۔

۔۔ المختصر۔۔ اکٹھا کرنے والوں کی محنت سے مذکورہ بالا دونوں بھائی اپنے شاگردوں اور ساتھیوں کے ساتھ جن کی تعداد ایک روایت کے حساب سے بارہ ۱۲ ہزار اور ایک دوسری روایت کے حساب سے ستر ۷۰ ہزار تھی مصر آ گئے۔ مصر میں آنے کے بعد جب دونوں بھائیوں نے اپنے باپ سے سوال وجواب کی کیفیت اپنے لوگوں سے کہی تو انھوں نے حضرت موسیٰ کے سونے اور جاگنے اور عصا کے اژدھا ہونے کا حال بذات خود دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ موسیٰ (علیہ السلام) جب سوتے ہیں تو عصا اژدھا ہو کر ان کی پاسبانی کرتا ہے۔ اس بات سے ان جادو گروں کو بڑا تردد ہوا اور ان کے دلوں میں دغدغہ پیدا ہو گیا مگر انھوں نے اس حال کو پوشیدہ رکھا یہاں تک کہ فرعون نے موسیٰ (علیہ السلام) کو بلایا اور یہ بات قرار پائی کہ ساحروں سے مقابلہ کریں۔۔ چنانچہ۔۔ مقابلے کی مجلس کا انتظام ہوا۔۔ (تفسیر اشرفی)

آیت مبارکہ:

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ۝۱۱۱

لغۃ القرآن: [قَالُوْٓا : انہوں نے کہا] [اَرْجِهْ : تو ٹال دے اس کو] [وَاَخَاهُ : اور اس کے بھائی کو] [وَاَرْسِلْ : اور تو بھیج] [فِي الْمَدَآئِنِ : شہروں میں] [حٰشِرِيْنَ : جمع کرنے والوں کو]

ترجمہ: انھوں نے کہا: (ابھی) اس کے اور اس کے بھائی (کے معاملہ) کو موخر کر دو اور (مختلف) شہروں میں (جادو گروں کو) جمع کرنے والے افراد بھیج دو

تشریح:

مصر میں اس وقت فن جادو گری کو بڑا عروج حاصل تھا۔ درباریوں نے جب ان خدشات اور خطرات کے متعلق سنا تو بیک زبان پکار اٹھے کہ آپ کی قلمرو میں بڑے بڑے ماہر جادو گر موجود ہیں۔ آپ موسیٰ اور اس کے بھائی کو چند روز کی مہلت دیں اور اپنے خاص آدمی بھیج کر اپنی مملکت کے چند ساحر جمع کر لیں جو مجمع عام میں موسیٰ کے کرتبوں کی قلعی کھول دیں۔ اس تدبیر سے ہم اپنی حکومت اور اپنی قوم کی سروری کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

اب فرعون اور اس کے ٹولے کے درمیان مذاکرات شروع ہو گئے۔ اس وقت مصر میں کاہن اور جادو گر بڑی تعداد میں تھے۔ خود کاہن جادو گری کا کام بھی کرتے تھے۔ تمام بت پرستانہ مذاہب میں جادو دین کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ان ادیان کے کاہن اور مجاور جادو گری کا کام بھی کرتے تھے۔ آج کل ادیان کے جدید ماہرین اس صورت حالات کو دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ایک دور ایسا بھی رہا ہے کہ جادو گری سے دین کا آغاز ہوا۔ اور زیادہ پکے ملحد یہ یاوہ گوئی کرتے ہیں کہ جس طرح جادو بالکل دین قرار پا گیا ہے اسی طرح ہر ایک دین بھی ختم ہو جائے گا اور جس طرح سائنس نے جادو گروی کے دور کو ختم کر دیا ہے اسی طرح ایک وقت ایسا آئے گا کہ مذہب بھی ختم ہو جائے گا۔ بہر حال یہ ان کا خبط ہے جس میں وہ سائنس کے عنوان سے مبتلا ہیں۔

فرعون کے مشیروں نے اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ حضرت موسیٰ اور آپ کے بھائی کو وقت دے دیں اور اپنی ریاست کے اطراف واکناف سے بڑے بڑے جادو گروں کو طلب کریں تاکہ وہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی جادو گری کا مقابلہ کریں۔ (نعوذ باللہ)

فرعون نے اپنی معروف و مشہور فرعونیت کے باوجود حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے معاملے میں سرکشی کا مظاہرہ نہ کیا اور اس کا رویہ بیسویں صدی کے بعد کے فرعونوں سے زیادہ معقول رہا۔ آج کل کے فرعون دعوت اسلامی کا مقابلہ تشدد اور قید و بند اور باطل طریقوں سے کرتے ہیں۔ (فی ظلال القرآن)

دراصل "قوم فرعون کے سرداروں نے کہا ابھی اس کو اور اس کے بھائی کو انتظار میں رکھو اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیجو جو تمام ماہر جادو گروں کو جمع کر کے تمہارے پاس لائیں"۔

اس آیت کریمہ میں اَرۡجِہۡ کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ اصل میں اَرۡجِہُ ہے اِرۡجَاء کے معنی ٹالنے، کسی معاملے کو کسی دوسرے وقت پر مؤخر کرنے اور کسی کو منتظر بنانے کے ہیں۔ قرآن میں اس کے مختلف صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ یہاں یہ ہمزہ کے حذف اور ہ کے سکون کے ساتھ آیا ہے۔ تلفظ کا یہ اسلوب اہل عرب کے قاعدے کے مطابق ہے بعض دفعہ وہ لفظ کو ہلکا کرنے کے لیے اس طرح کا تصرف کر دیتے ہیں۔

قوم فرعون کے سرداروں نے فرعون کو مشورہ دیا کہ موسیٰ نے جو نشانیاں ہمارے سامنے پیش کی ہیں وہ اگرچہ سحر اور شعبدہ بازی کی قسم سے ہیں لیکن یہ عام قسم کا سحر اور جادو نہیں اس لیے ہمیں اس کے مقابلے میں کسی جلد بازی کا ثبوت نہیں دینا چاہیے۔ یوں تو اس شہر میں بھی بہت سے جادو گر ہوں گے لیکن ہو سکتا ہے وہ اس سطح کا جادو نہ کر سکیں۔ اس لیے مصلحت کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ موسیٰ اور ہارون کو ابھی انتظار میں رکھیں اور ان سے کہیں کہ ہم چند دنوں کے بعد تم سے بات کریں گے اور ہم تمہارے ان معجزات کو دیکھیں گے کہ ان کی اصل حقیقت کیا ہے اور اس دوران آپ اپنے پورے ملک میں اپنے کارندوں کو بھیج دیجئے کہ وہ تمام ملک کے بڑے بڑے جادو گروں کو ایک متعین دن میں یہاں جمع کر دیں چنانچہ قرآن کریم میں دوسری جگہ بتایا گیا ہے کہ بالآخر موسیٰ (علیہ السلام) اور ہارون (علیہ

السلام) کے ساتھ طے پایا کہ تمہارے اس جادو کا مقابلہ ہمارے جادو گر کریں گے اور اس کے لیے ہم نے عید کا دن اور دوپہر کا وقت مقرر کیا ہے۔ اس وقت لوگ آسانی سے جمع ہو سکیں گے۔ چنانچہ بہت بڑے گراؤنڈ میں اس کا انتظام کیا گیا۔ خود مصر کا حکمران اور رب کہلانے والا فرعون بنفس نفیس تخت حکومت پر فائز تھا اور تمام اعیان حکومت اس کے پہلو میں تھے۔ فوجیں دائیں بائیں پرے باندھے کھڑی تھیں درمیان میں بے پناہ انسانوں کا ہجوم تھا۔ سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں جادو گر اپنی اپنی جگہ کھڑے حکم کے منتظر تھے اور ایک طرف تنہا حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کھڑے تھے کہ اچانک آگے بڑھ کر بڑے بڑے جادو گروں نے ایک التجا کی بلکہ اپنی آرزو کا اظہار کیا جس سے ان کی ذہنی سطح اور اخلاقی پستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

آیت مبارکہ:

يَأْتُوكَ بِكُلِّ سَحِرٍ عَلِيمٍ ۝۳۷

لغۃ القرآن: [يَأْتُوكَ : وہ لوگ لے آئیں گے تیرے پاس] [بِكُلِّ سَحِرٍ عَلِيمٍ : ہر ایک جاننے والے جادوگر کو]

ترجمہ: وہ تمہارے پاس ہر ماہر جادو گر کو لے آئیں

تشریح: ارکان دربار و مشیران سلطنت نے مشورہ یہ پیش کیا کہ موسیٰ وہارون کو سردست مہلت دے دی جائے اور اس درمیان میں قلم رو بھر میں سرکاری ہرکاروں کے ذریعہ سے منادی کرا کے ماہرین فن جادو گروں کو جمع کر لیا جائے (آیت) "ارجہ"۔ یعنی انھیں روکے رکھیے، ٹالے رکھیے۔ یقال ارجأتہ وارجیتہ ای اخرتہ و قال ابن عباس اخرہ (قرطبیؒ) (تفسیر ماجدی)

یہ ان کا مشورہ تھا۔ کیا ہوا۔ اچھا اگر یہ sincere ہوئے نہ فرعون کے ساتھ۔ اور اگر فرعون ڈکٹیٹر نہ ہوتا۔ اس نے اپنے گرد اس طرح کے چاپلوسی لوگ نہ جمع کئے ہوتے۔ جو ارد گرد چاپلوسی لوگ ہوتے ہیں نہ ہاں میں ہاں ملانے والے۔ تعریفیں کرنے والے۔ انسان کے نفس کو بڑا موٹا کرتے ہیں جو نفس پرست لیڈر ہوتے ہیں انھیں yas sar بہت اچھے لگتے ہیں کہ ہماری تعریفیں کریں۔ ہم جو بات کہہ دیں اس کی واہ واہ کریں۔ یہ لگتے بہت اچھے ہیں مگر ultimately اس کو تباہ برباد کر دیتے ہیں اس شخص کو۔ اگر یہ کہیں مخلص ہوتے فرعون کے ساتھ تو یہ فرعون کو سمجھاتے اس پر پریشر ڈالتے کہ دیکھو یہ جادو نہیں ہے۔ یہ معجزہ ہے موسیٰ (علیہ السلام) جھوٹ نہیں بول رہے۔ یہ خوب جانتے تھے اچھی طرح کہ دوستی جھوٹ نہیں بول رہے۔ لیکن اپنی مراعات اپنے عیش بچانے کے لیے انھوں نے اپنے لیڈر کا بیڑہ غرق کر دیا۔ وہ ایک شعر ہے نا۔

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔

یہ ہی ہوا ان کے ساتھ۔ خود بھی ڈوبے۔ فرعون کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے۔

ہمارے لیے بڑا سبق ہے

کہ اپنے ارد گرد کبھی خوشامدی لوگوں کو جمع نہ کریں good time friend جب تک کرسی ہے۔ پاور ہے۔ پیسہ ہے یہ جمع رہے گے۔ اس لیے نہیں جمع رہیں گے کہ آپ بہت اچھے لگتے ہیں ان کو اس لیے کہ آپ کا پیسہ بہت اچھا لگتا ہے ان کو۔ آپ جو ان کے کام بنوا سکتے ہیں وہ اچھے لگتے ہیں ان کو، وہ پیسہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ کرسی ختم ہو جاتی ہے۔ لوگ چھٹ جاتے ہیں اور یہ کبھی بھی خیر خواہ نہیں ہوتے۔ فرعون کے درباری بالکل خیر خواہ نہیں تھے اس کے۔۔۔ پھنسوا دیا اس کو انھوں نے اپنی خاطر کہا کہ ٹھیک ہے بلاؤ جادو گروں کو۔ اب کیا ہوا۔ سارے جادو گر جمع کر لیے گئے۔ شہروں میں ڈھنڈورا پیٹ دیا گیا کہ یہ موسیٰ (علیہ السلام) میں ان کے مقابلے میں جادو گروں کو انوائیٹ کیا گیا ہے کہ وہ آئیں اور اپنا جادو دکھائیں۔ آپ دیکھیں کہ اگر موسیٰ (علیہ السلام) خود کہتے فرعون سے کہ تم سب کو جمع کرو۔ لوگوں کو سارے عوام کو جمع کرو میں اپنا معجزہ دکھانا چاہتا ہوں۔ فرعون کبھی نہیں مانتا۔ لیکن آپ دیکھیں کہ کفر کی طاقت کس کے لیے تھی حق کو ظاہر کرنے کے لیے۔ اللہ

کے یہ اپنے کام میں۔ فرعون کے resources اس کی men power اس کی سب کو جمع کیا اور کیا دکھایا۔ موسیٰ (علیہ السلام) کا معجزہ۔ تو یہ حدیث میں مضمون آتا ہے کہ بعض دفعہ اللہ تعالیٰ کافروں سے اور فاجروں سے بھی اپنے دین کا کام لے لیتا ہے۔ یہ فرعون سمجھ رہا تھا کہ میں اپنا کام کر رہا ہوں۔ وہ دراصل موسیٰ (علیہ السلام) کی عظمت تو یوں کے دلوں پر راسخ کرنے کا کام کر رہا تھا۔ فائدہ موسیٰ (علیہ السلام) کا ہوا اس ساری ایکسر سائز سے۔ (تفسیر تنویر)

عَلِیْمٌ سے مراد ہے ماہر جادوگر جو نظر بندی کرکے لوگوں کو لاٹھی کا سانپ اور ہاتھ کی معمولی جلد کو چمکدار شعاع ریز بنا کر دکھاتا ہے اور غیر واقعی چیز کو دیکھنے میں واقعی بنا دیتا ہے اس جگہ اس قول کا قائل سرداروں کو قرار دیا اور سورۃ الشعراء میں اس قول کی نسبت فرعون کی طرف کی گئی ہے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ قول بر طریق مشورہ سب کا تھا فرعون کا بھی اور سرداروں کا بھی یا فرعون نے شروع میں کہا تھا اور سرداروں نے یہی بات آپس میں مشورہ میں طے کر دی اور اپنے ماتحتوں سے بھی کہہ دی۔ یریدون ان یخرجکم یہ چاہتا ہے کہ اے قبطیو! تم کو یہاں سے نکال دے۔ ارضکم یعنی مصر۔ فماذا تامرونیہ کلام تو اسی قول کا حصہ ہے جو سرداروں نے فرعون سے اور خاص خاص امراء سے کہا تھا اس صورت میں امر بمعنی حکم حقیقتاً ہوگا (کیونکہ حقیقت میں فرعون اور اس کے خاص امراء کے ہاتھوں میں قوت آمرہ تھی) یا یہ آخری فقرہ انھوں نے آپس میں اور اپنے ماتحتوں سے کہا تھا تو اس وقت امر کا معنی ہوگا مشورہ دینا کیونکہ مشورہ دینے والا راستہ بتاتا ہے مشورہ طلب بات کی تعلیم دیتا ہے گویا حکم دیتا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

ابی جعفر محمد بن جریر طبری لکھتے ہیں

اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دی گئی ہے۔ سرداروں کا مشورہ فرعون کے خلاف تھا، کہ تم شہروں میں جمع کرنے والوں کو بھیجو جو ماہر جادوگروں کو جمع کر لائیں۔

ہمیں العباس نے ابن عباس سے نقل کیا کہ فرعون نے ہرکارے بھیجے جنہوں نے اس کے لیے پڑھے لکھے جادوگر جمع کر دیے جب وہ آگئے تو انہوں نے کہا کہ یہ جادوگر کیا عمل کرتا ہے۔ انہوں نے جواب دیا وہ سانپ بناتا ہے۔ وہ کہنے لگے اللہ کی قسم سرزمین مصر میں کوئی قوم سحر کے ذریعہ لاٹھیوں، رسیوں کو سانپ بنانے میں ہمارے جیسی ماہر نہیں۔ اگر ہم غالب ہوئے تو ہمیں ملے گا کیا؟ فرعون نے کہا: تم میرے قریب و خاص لوگ بن جاؤگے۔ اور ہر وہ چیز جو تم پسند کرو وہ مل جائے گا۔

مجھے عبدالکریم بن الہیثم نے ابن عباس سے نقل کیا کہ فرعون بولا کہ موسیٰ پر غلبہ اسی کے آدمیوں سے پا سکتے ہیں۔ اس نے بنی اسرائیل کے علما کو تیار کیا اور ان کو فرما نامی بستی میں جادو سیکھنے بھیج دیا۔ جیسے بچے کتاب کو تحریر میں سیکھتے ہیں۔ انہوں نے بہت جادو سیکھا۔ کہ موسیٰ نے فرعون نے اس پارٹی کو منگوایا اور ان کا معلم بھی ان کے ساتھ تھا۔ فرعون نے پوچھا: تو کیا کار کردگی کی ہے۔ میں نے ان کو ایسا جادو سکھایا کہ زمین میں جس کی کوئی طاقت نہیں رکھتا ہاں اگر آسمان سے کوئی معاملہ ہو تو الگ بات ہے۔ اس کے مقابلہ کی ان کو طاقت نہیں، زمین کا جادو ان پر غالب نہیں آسکتا۔ جب جادوگر آئے تو انہوں نے فرعون سے کہا: "ان لنا لااجرا ۔۔۔ "کیا ہمیں کچھ بدلہ ملے گا، اس نے کہا: تم مقرب بن جاؤگے۔ (تفسیر طبری)

فرعونی درباریوں کے اس قول سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں خدائی نشان اور جادو کے امتیازی فرق کا تصوّر بالکل واضح طور پر موجود تھا۔ وہ جانتے تھے کہ خدائی نشان سے حقیقی تغیر واقع ہوتا ہے اور جادو محض نظر اور نفس کو متاثر کرکے اشیاء میں ایک خاص طرح کا تغیر محسوس کراتا ہے۔ اسی بنا پر انھوں نے حضرت موسیٰ کے دعوائے رسالت کو رد کرنے کے لیے کہا کہ یہ شخص جادوگر ہے، یعنی عصا حقیقت میں سانپ نہیں بن گیا کہ اسے خدائی نشان مانا جائے، بلکہ صرف ہمیں ایسا اور ان کے ذریعہ سے لاٹھیوں اور رسیوں کو سانپوں میں تبدیل کرکے لوگوں کو دکھا دیا جائے تاکہ عامتہ الناس کے دلوں میں اس پیغمبرانہ معجزے سے جو ہیبت بیٹھ گئی ہے وہ اگر بالکلیہ دور نہ ہو تو کم از کم شک ہی میں تبدیل ہو جائے۔ (تفسیر تفہیم القرآن)

فرعون اور درباریوں کی مرعوبیت:۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) کی باتیں سن کر فرعون اور فرعونیوں کو واقعی یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ یہ شخص اس ملک میں انقلاب لا سکتا ہے اور اس کی وجوہ کئی تھیں ایک یہ کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے انہی میں رہ کر تربیت پائی تھی فنون جنگ سیکھے تھے بلکہ ایک دفعہ حبش پر چڑھائی کے دوران انھیں سپہ سالار بنا کر بھی بھیجا گیا اور وہ کامیاب و کامران واپس آئے تھے۔ وہ جرات مند' دلیر اور مضبوط قد و قامت کے مالک تھے اور ان کی صداقت کے سب لوگ معترف تھے۔ دوسرے یہ کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے یہ وضاحت کر دی تھی کہ میں اس اللہ تعالیٰ کا فرستادہ ہوں جسے تم بھی رب اکبر تسلیم

کرتے ہو۔ نیز یہ کہ میں بعینہٖ وہی بات کر رہا ہوں جو میرے پروردگار نے مجھے کہی ہے۔ تیسرے یہ کہ آپ کے معجزات نے فرعون اور فرعونیوں سب کو مرعوب اور دہشت زدہ بنادیا تھا۔

اور ان لوگوں نے جو موسیٰ (علیہ السلام) کو جادوگر کہہ دیا تو یہ محض ایک طفل تسلی، دل کے بہلاوے، وقت کو ٹالنے اور عوام الناس کو اندھیرے میں رکھنے کی غرض سے کہی گئی کہ شاید کچھ مدت گزرنے پر حالات کوئی دوسرا رخ اختیار کر جائیں۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ کوئی جادوگر نہ کبھی کوئی سیاسی انقلاب لایا ہے نہ لا سکتا ہے۔ (تفسیر تیسیر القرآن)

جادوگروں کا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے شکست کھا کر ایمان لانا:

امام بغوی نے حضرت سدی سے روایت کیا ہے کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا معجزہ عصا و ید بیضا دیکھا تو سوچا کہ اس پر اس سے بڑا جادوگر ہی غالب آسکتا ہے۔ اس نے بنی اسرائیل میں سے نوجوان جمع کیے تاکہ انھیں جادو سکھا کر موسیٰ (علیہ السلام) کے مقابلہ میں لایا جائے۔ تو انھیں وقت کے سب سے بڑے جادوگر کے سامنے پیش کیا گیا۔ ان کے استاذ نے کہا میں نے انھیں وہ جادو سکھایا ہے جس کا مقابلہ روئے زمین کے جادوگر مل کر نہیں کر سکتے سوا اس کے کہ اس کے مقابلہ میں آسمان سے کوئی چیز آجائے کیونکہ آسمانی حکم کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ ان نوجوانوں کے علاوہ بھی فرعون نے ہزاروں جادوگر جمع کر لیے۔ (تفسیر بغوی جلد 2 صفحہ 270)

کس قدر وہ احمق انسان تھا، پیغمبر خدا کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر پیغمبر کو ایسا معجزہ عطا فرمایا جس کے مقابلہ میں اس زمانہ کے سارے علوم عاجز آ گئے اور ان میں اس کے مقابلہ کی طاقت نہ رہی، یہی کچھ فرعون کے ساتھ ہوا۔ (تفسیر برہان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝۱۱۳

لغۃ القرآن: [وَجَآءَ السَّحَرَةُ : جادوگر لوگ] [فِرْعَوْنَ : فرعون کے پاس] [قَالُوْٓا : انہوں نے کہا] [اِنَّ : بیشک] [لَنَا : ہمارے لیے] [لَاَجْرًا : یقینا کچھ اجرت ہوگی] [اِنْ : اگر] [كُنَّا : ہم ہوئے] [نَحْنُ : کہ ہم ہی] [الْغٰلِبِيْنَ : غلبہ پانے والے ہوں]

ترجمہ: اور جادوگر فرعون کے پاس آئے تو انھوں نے کہا: یقیناً ہمارے لیے کچھ اجرت ہونی چاہیے بشرطیکہ ہم غالب آجائیں

تشریح: ملک کے گوشہ سے بڑے بڑے ماہر اور تجربہ کار جادوگر آ جمع ہوئے۔ انھیں علم تھا کہ جس مقصد کے لیے انھیں طلب کیا گیا ہے وہ بڑا اہم ہے۔ وہ فرعون کی بادشاہت کے متزلزل تخت کو سہارا دینے کے لیے بلائے گئے تھے۔ اس لیے انھوں نے فرعون سے پہلے ہی منوالیا کہ اگر انھوں نے موسیٰ کو شکست دے دی تو انھیں شاہانہ انعامات سے نوازا جائے گا اس مطالبہ میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ انھیں اپنی کامیابی کا کامل یقین تھا تبھی تو وہ انعامات کا وعدہ لے رہے تھے۔ فرعون جو نبوت کی پہلی ہی عتاب آلود نگاہ سے لرزہ براندام تھا یہ تسلی آمیز الفاظ سن کر خوشی سے اچھل پڑا اور کہنے لگا یقیناً تم پر انعام و اکرام کی بارش کی جائے گی۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ تم کو اپنے دربار کے خاص مقربین میں داخل کر لیا جائے گا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

قرآن کریم اب درمیانی تفصیلات چھوڑ کر ایک دوسرے منظر کو پیش کرتا ہے کہ کس طرح فرعون کے ٹولے نے لوگوں کو جمع کیا اور کن کن کو جمع کیا بلکہ پردہ اٹھتے ہی جادوگر سامنے آ جاتے ہیں اور یہ قرآن کریم کا بیان کردہ قصص میں نہایت ہی موثر اور پیارا اسلوب ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ ایک منظر کو لپیٹ کر دوسرا منظر سامنے لایا جاتا ہے۔

وَجَاءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۔ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۔ چنانچہ جادو گر فرعون کے پاس آ گئے۔ انھوں نے کہا "اگر ہم غالب رہے تو ہمیں اس کا صلہ تو ضرور ملے گا؟" فرعون نے جواب دیا "ہاں، اور تم مقرب بارگاہ ہو گے"۔

یہ لوگ پیشہ ور جادو گر تھے اور اسی طرح پیشہ ور کاہن تھے اور دونوں کاموں سے ان کا مقصد پیسے کمانا تھا۔ دنیا میں ہمیشہ پیشہ ور علمائے دین نے طاغوتی طاقتوں اور ظالم بادشاہوں کی خدمت کو اپنا فرض سمجھا ہے۔ نیز دنیا میں جب بھی اللہ کی حاکمیت کا نظام معطل ہوا ہے اور اللہ وحدہ کی بندگی ختم ہوئی ہے اس کی جگہ طاغوتی نظام قائم ہو گیا ہے اور جب طاغوتی نظام قائم ہوا ہے تو ایسے حکمرانوں کو پیشہ ور اہل دین کی ضرورت پیش آئی ہے اور ان حکمرانوں نے اہل پیشہ کو ان کے پیشے پر اجر دیا ہے اور انھوں نے دینی اعتبار سے اس طاغوتی نظام کو قبول کیا ہے۔ یوں دونوں کے درمیان باہم معاہدہ رہا ہے اور طاغوتی حکمرانوں نے ان پیشہ ور اہل دین کو پیسہ بھی دیا ہے اور مقرب بھی بنایا ہے۔

فرعون نے یقین دہانی کرائی کہ وہ اس کام پر انھیں اجرت بھی دے گا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کے مقربین میں سے بھی ہوں گے۔ یوں فرعون نے ان کو آمادہ کیا کہ وہ صرف موسیٰ کا بے جگری سے مقابلہ کریں اور سخت جدوجہد کریں۔ لیکن ان کو کیا پتہ تھا کہ معاملہ اس قدر آسان نہیں ہے کہ وہ چرب زبانی یا چالاکی سے حضرت موسیٰ کو شکست دے دیں گے یہاں تو ان کا واسطہ خدا، خدا کے رسول، خدائی معجزات اور خوارق عادت، حقائق و واقعات سے تھا، محض شعبدہ بازی اور تخیلاتی جادو گری نہ تھی۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

ابنائے دنیا کے نزدیک دنیا کا متاع فانی ہی سب کچھ: سو ان جادو گروں کی خست و دناءت ملاحظہ ہو کہ ایک طرف تو ان کے اپنے دین و مذہب اور ملک و ملت کے تحفظ و بقا کا مسئلہ ہے اور دوسری طرف اس نازک موقع پر بھی وہ سب سے پہلے اپنے ذاتی اور دنیوی مفاد کا مطالبہ کرتے ہیں۔ سو یہی حال ہوتا ہے ابنائے دنیا کا کہ ان کے نزدیک دنیا اور اس کا متاع فانی اور حطام زائل ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ اسی کیلئے جیتے اور اسی کیلئے مرتے ہیں۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ جبکہ مومن صادق کے نزدیک اصل چیز متاع ایمان و یقین اور فوز و فلاح آخرت ہے۔ دنیا تو ساری بھی اس کے سامنے ایک پر کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ سو اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایمان و یقین کی یہ دولت انسان کو کیسی عظمتوں اور رفعتوں سے نوازتی ہے کہ جس متاع دنیا کی ایمان و یقین کی دولت سے محروم لوگ پوجا کرتے ہیں وہ اس مومن صادق کے نزدیک پر کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ اللہم فنز دنا منہ وثبتنا علیہ یا ذاالجلال والاکرام۔ بہر کیف ارشاد فرمایا گیا کہ جب وہ جادو گر فرعون کی دعوت پر اس کے دربار میں پہنچ گئے تو وہ چھوٹتے ہی بولے کہ کیا ہمیں کوئی اجر بھی ملے گا اگر ہم غالب آ گئے؟ تو فرعون نے کہا کہ ہاں اور مزید یہ کہ تم لوگ ہمارے مقربین میں شامل ہو جاؤ گے۔ (تفسیر مدنی کبیر)

فرعونی جادو گروں نے آتے ہی پہلی بات سودا بازی کی شروع کی کہ ہم مقابلہ کریں اور غالب آ جائیں تو ہمیں کیا ملے گا۔ وجہ یہ تھی کہ اہل باطل کے سامنے صرف دنیا کے فوائد ہوتے ہیں اس لیے کوئی بھی کام کرنے سے پہلے معاوضہ اور اجرت کا سوال سامنے آتا ہے۔ بخلاف انبیاء (علیہم السلام) اور ان کے نائبین کے کہ وہ ہر قدم پر یہ اعلان کرتے ہیں کہ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، یعنی ہم جو پیغام حق تمہارے فائدہ کے لیے تمہیں پہنچاتے ہیں اس پر تم سے کسی معاوضہ کے طالب نہیں، بلکہ ہمارا معاوضہ صرف رب العالمین نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ فرعون نے ان کو بتلایا کہ تم لوگ اجرت چاہتے ہو، ہم اجرت بھی دیں گے اور اس سے بڑھ کر یہ بھی کہ تمہیں شاہی دربار کا مقرب بنالیں گے۔ فرعون سے یہ گفتگو کرنے کے بعد ساحروں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے مقابلہ کی جگہ اور وقت کا تعین کرایا۔

چنانچہ ایک کھلا میدان اور عید کے دن آفتاب بلند ہونے کے بعد کا وقت اس کام کے لیے تجویز) ہوا جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات میں ہے، قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى۔ بعض روایات میں ہے کہ اس موقعہ پر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ساحروں کے سردار سے گفتگو فرمائی کہ اگر میں تم پر غالب آ گیا تو کیا تم مجھ پر ایمان لے آؤ گے؟ اس نے کہا کہ ہمارے پاس ایسے جادو ہیں کہ ان پر کوئی غالب آ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے ہمارے مغلوب ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا) اور اگر بالفرض تم غالب آ گئے تو ہم علی الاعلان فرعون کی نظروں کے سامنے تم پر ایمان لے آئیں گے۔ (مظہری و قرطبیؒ) (معارف)

مصر میں حضرت موسیٰ کی دعوت تقریباً چالیس سال تک جاری رہی ہے۔ جادو گروں سے مقابلہ کا واقعہ اس کے آخری زمانہ کا ہے۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جادو گر حضرت موسیٰ کی دعوت سے آشنا رہے ہوں گے۔ تاہم ابھی تک ان کی آنکھ کا پردہ نہیں ہٹا تھا۔ جب انھوں نے اپنے مخصوص فن کے میدان میں حضرت موسیٰ کی برتری دیکھی تو حجابات اٹھ گئے۔ ان کو نظر آگیا کہ یہ جادو گری کا معاملہ نہیں بلکہ خدائی پیغمبری کا معاملہ ہے۔ وہ بے اختیار ہو کر خدا کے سامنے گر پڑے۔

جادو گروں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں پھینکیں تو خیال بندی کی وجہ سے وہ لوگوں کو چلتا پھرتا سانپ نظر آنے لگیں۔ مگر جب حضرت موسیٰ کا عصا سانپ بن کر میدان میں گھوما تو جادو گروں کی ہر لاٹھی اور رسی صرف لاٹھی اور رسی ہو کر رہ گئی۔ جادو گر جادو کے حدود کو جانتے تھے۔ اس واقعہ میں جادو گروں کو نظر آگیا کہ انسانی تدبیریں اپنے آخری کمال پر پہنچ کر بھی کتنی حقیر ہیں اور خدا کتنا عظیم اور کتنا زیادہ طاقتور ہے۔ اس کے بعد فرعون ان کو اپنے تمام اقتدار کے باوجود بے وقعت نظر آنے لگا۔ وہی جادو گر جو خدا کی عظمت کو دیکھنے سے پہلے فرعون سے انعام کے طالب تھے۔ اب انھوں نے فرعون کی طرف سے بدترین سزاؤں کی دھمکی کو بھی اس طرح نظر انداز کر دیا جیسے اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ (تفسیر تذکیر القرآن)

تمام لوگ جن پر اور جن کے کمال فن پر فرعون کو ناز تھا وہ سب کے سب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی نبوت پر ایمان لے آئے۔ رب العالمین کے سامنے سجدہ میں گر گئے اور انھوں نے اس بات کی وضاحت کر دی کہ ہم اس رب العالمین پر ایمان لائے ہیں جس کو موسیٰ وہارون (علیہ السلام) اپنا رب کہتے ہیں۔ کیونکہ فرعون تو خود اپنے آپ کو رب اعلیٰ کہلواتا تھا۔

وہی لوگ جو کچھ دیر پہلے فرعون سے بہترین انعام کے امیدوار تھے جب سچائی ان کے سامنے آئی تو انھوں نے فرعون اور اس کی طاقت، اس کو فوج اور سلطنت کی وسعت کو نظر انداز کر کے صرف اللہ کیو قوت وطاقت پر بھروسہ کر لیا۔ یہی ایمان کی سب سے بڑی قوت وطاقت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ۔

وہ لوگ جو تن تنہا بلا جھجک جابر ترین سلطان کے سامنے کلمہ حق کہہ کر اس پر ڈٹ جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو صرف اور صرف زور ایمانی کے بل پر ان دنیاوی جباروں اور قہاروں سے ٹکر لیتے ہیں جب کے پاس فوج بھی ہے خزانہ بھی ہے اور جی حضوریوں تنخواہ برداروں کی جماعتیں بھی ہیں۔

وہ لوگ جو شہادت پیش کرنے کا دم خم رکھتے ہیں۔ بہار ہو کر خزاں لا الہ الا اللہ کس طرح کامیاب ہوتے ہیں۔ کس طرح غیبی قوتیں ان کے قدموں کو چومتی ہیں۔ کس طرح باطل کے قلعوں پر حق کا جھنڈا لہراتے ہیں۔ تاریخ اس پر گواہ ہے کروڑوں عوامل ہیں جو واقعات کی شکل وصورت ترتیب دیتے ہیں۔ انسانی آنکھ دو چار کو دیکھ سکتی ہے۔ ظاہری عوامل کی طاقت انتہائی کم ہے۔ خفیہ اور پوشیدہ عوامل کی طاقت انتہائی زیادہ ہے ظاہری عوامل کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن وہ فرعون نمرود، ہامان اور قارون کس قدر بیوقوف ہیں جو ظاہری عوامل ہی کو سب کچھ مانتے ہیں اور غیب کی طاقتوں سے لاعلم اور لاپرواہیں وہ شخص کس قدر مضبوط ہے جو اپنا رشتہ لا الہ الا اللہ سے ملائے ہوئے ہے۔

ان آیات میں وحی اور القا " کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ انبیاء کرام (علیہ السلام) پر وحی نازل ہوتی ہے اور القا غیر پیغمبروں کے لیے ہے اس لاسل کی، اس وائرلیس، اس ٹیلی پی تھی سے بڑا ہتھیار اور کیا ہو سکتا ہے جو انسان کے دل کی دنیا کو بدل ڈالے اور اس طرح دنیا کا دل بدل ڈالے جیسا کہ اس واقعہ سے ظاہر ہے۔ وہ چیز جسے ہم توفیق الٰہی اور نور ایمانی کہتے ہیں جو ہمیں نیا دل اور نیا دماغ دیتی ہے وہ ہے قدرت کا اسلحہ خانہ۔۔ وہ جادو گر جو نظر بندی، مسمریزم اور طلسمات ہوش ربا کے استاد تھے جو اپنی طاقتیں پیغمبر وقت کے مقابلے میں لے آئے تھے جن پر فرعون اور اس کے سرداروں کو ناز اور گھمنڈ تھا۔ ایک ہی القا، ایک ہی توفیق الٰہی اور نور ایمان میں اللہ جانے کیا سے کیا ہو گئے اور کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ (تفسیر بصیرت القرآن)

آیت مبارکہ:

قَالَ نَعَمۡ وَاِنَّكُمۡ لَمِنَ الۡمُقَرَّبِيۡنَ۝۱۱۴

لغۃ القرآن: [قَالَ : اس نے کہا] [نَعَمْ : ہاں] [وَاِنَّكُمْ : اور بیشک تم لوگ] [لَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ : یقینا قریب کیے ہوؤں میں سے ہوگے]

ترجمہ: فرعون نے کہا: ہاں ! اور بیشک (عام اجرت تو کیا اس صورت میں) تم (میرے دربار کی) قربت والوں میں سے ہو جاؤ گے

تشریح:

اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ جب جادو گروں نے فرعون سے غلبہ کی صورت میں اجر کا مطالبہ کیا تو فرعون ان کو وعدہ دیا اور ساتھ یہ بھی لالچ دیا کہ تم کو قریبی بنا لیا جائے گا۔ اب جادو گر میدان میں موسیٰ (علیہ السلام) سے کہنے لگے تو اپنی لاٹھی پہلے ڈال یا ہم اپنی لاٹھیاں پہلے ڈالتے ہیں۔ (تفسیر طبری)

مقابلہ کی ابتداء:

یہ شاید اس بناء پر کہا کہ پیشتر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) فرعون کے روبرو عصا ڈال کر باذن اللہ اژدھا بنا چکے تھے۔

بعض روایات میں ہے کہ اس موقعہ پر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ساحروں کے سردار سے گفتگو فرمائی کہ اگر میں تم پر غالب آ گیا تو کیا تم مجھ پر ایمان لے آؤ گے ؟اس نے کہا کہ ہمارے پاس ایسے جادو ہیں کہ ان پر کوئی غالب آ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے ہمارے مغلوب ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا) اور اگر بالفرض تم غالب آ گئے تو ہم علی الاعلان فرعون کی نظروں کے سامنے تم پر ایمان لے آئیں گے۔ (مظہری و قرطبیؒ) (تفسیر گلدستہ)

اللہ تعالیٰ نے فرعون کے منہ سے سچی بات نکلوادی کہ وہ جادو گر مومن ہو کر غالب آئے، اور اللہ کے مقرب بن گئے۔ یہ جادو گر کل ستر ہزار تھے جن میں چار سردار تھے۔ شابور، عادور، حطط شمعون، جب انھیں پتہ لگا کہ موسیٰ (علیہ السلام) کا عصا آپ کے سونے کے حال میں بھی سانپ بن کر پہرہ دیتا ہے تو ان کے دل میں بیٹھ گیا کہ یہ جادو نہیں کیونکہ جادو، خود جادو گر کی بیداری میں کام کر سکتا ہے۔ نیند میں نہیں کر سکتا۔ (روح) (تفسیر نور العرفان)

جادو گروں سے مقابلہ:

مقابلے کے لیے عید کا دن طے ہوا جس میں عوام الناس کو بھی شمولیت کی عام دعوت دی گئی تھی اس بھرے مجمع میں فرعون اپنے سب درباریوں سمیت حاضر ہوا اور سیدنا موسیٰ (علیہ السلام) اور سیدنا ہارون (علیہ السلام) بھی بروقت پہنچ گئے اور جادو گروں کو چونکہ شاہی دربار سے بلاوا آیا تھا للذا انھوں نے آتے ہی یہ سوال کر دیا کہ انھیں ان کے ایسے بڑے مقابلہ کرنے کے عوض کچھ مزدوری بھی ملے گی ؟اسی ایک بات سے ایک جادو گر اور ایک نبی کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ جادو گر جو کچھ کرتا ہے اپنے پیٹ کی خاطر کرتا ہے اور یہی اس کا پیشہ ہوتا ہے جبکہ انبیاء (علیہم السلام) ہمیشہ اپنی قوم سے یہی کہتے رہے کہ ''ہم تم سے کچھ نہیں مانگتے ہمارا اجر اللہ کے ذمے ہے۔'' خیر جادو گروں کے اس سوال پر فرعون نے جادو گروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ صرف مزدوری کی کیا بات کرتے ہو تمہیں میرے ہاں مناصب بھی ملیں گے اور فرعون نے ایسا جواب اس لیے دیا کہ یہ اس کی عزت اور بے عزتی کا مسئلہ بن گیا تھا۔ (تفسیر تیسیر القرآن)

اس نے زیادہ رغبت دے دی اس لیے کہ بادشاہ کے قریب ہونا بہت بڑا مرتبہ ہے۔ امام شربنی (رح) نے لکھا ہے کہ فرعون کا ان سے مدد طلب کرنا واضح دلیل ہے کہ وہ عاجز اور بے بس بندہ تھا اور اسی طرح جادو گروں کا اجرت کا مطالبہ کرنا بھی دلیل تھی کہ وہ لوگوں کے دلوں پر قادر نہیں تھے ورنہ اپنے لئے سونا اور چاندی بناتے اجرت مانگنے پر مجبور نہ ہوتے جو دلوں پر قابو رکھنے اور قبضہ کا دعوی کرتے ہیں وہ جھوٹے ہیں۔ (تفسیر احسن الکلام)

عیسائی (انگریز) بھی بعض مسلمانوں کو القاب سے خوش کراتا ہے:

قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ

وہ تو سوال کرتے ہیں کہ ہمیں خزانہ شاہی سے مال عطا کرنا لیکن وہ کمبخت جواب دیتا ہے کہ میں تم کو اپنا مقرب بنالوں گا، یہی طریقہ قوم نصاریٰ نے اختیار کر رکھا ہے اور بڑی خوشی کے ساتھ بلا تکلیف مسلمانوں کا خون چوس رہے ہیں اور مسلمانوں کا ایمان سلب کر رہے ہیں، مسلمان مختلف قسم کے ہیں، جو تھوڑی بے ایمانی کرتا ہے، اس کو فقط "خان" کا خطاب ملتا ہے، جو زیادہ بے ایمانی کرتا ہے، اس کو خان صاحب "کا لقب ملتا ہے اور جو اعلیٰ درجہ کا بے ایمان اور دشمن اسلام ہو اس کو "خان بہادر اور سر کا تمغہ ملتا ہے۔ اسی طرح بعض نام نہاد مولوی ایمان فروش بنتے ہیں ان کو گورنمنٹ شمس العلماء کے نام سے خوش کرتی ہے۔ لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل، بر عکس نہند نام زنگی کافور۔ (تفسیر لاہوری)

آیت مبارکہ:

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ۝١١٥

لغۃ القرآن: [قَالُوْا : (جادوگر) بولے] [يٰمُوْسٰٓي : اے موسیٰ] [اِمَّآ : یا تو] [اَنْ : یہ کہ] [تُلْقِيَ : آپ ڈالیں] [وَاِمَّآ : اور یا پھر [اَنْ : یہ کہ] [نَّكُوْنَ : ہم ہوں] [نَحْنُ : کہ ہم ہی [الْمُلْقِيْنَ : ڈالنے والے ہوں]

ترجمہ: ان جادو گروں نے کہا: اے موسیٰ ! یا تو (اپنی چیز) آپ ڈال دیں یا ہم ہی (پہلے) ڈالنے والے ہو جائیں

تشریح: مقابلہ کی مقررہ تاریخ آگئی۔ مقام معین پر فریقین جمع ہوئے۔ ایک طرف ساحران مصر کا جم غفیر تھا جس کی پشت پناہی فرعون کر رہا تھا اور دوسری طرف موسیٰ و ہارون ایک مظلوم اور غلام قوم کے نمائندے، جن کے پاس ظاہری ساز و سامان سے کوئی چیز نہ تھی۔ جادو گروں نے اپنی بہادری اور شجاعت کا اظہار کرتے ہوئے موسیٰ (علیہ السلام) سے پوچھا۔ کہیئے پہل آپ کرنا چاہتے ہیں یا مقابلہ کا آغاز ہم کریں۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا تم ہی آغاز کرو۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ جادو گروں نے از راہ ادب آپ سے دریافت کیا۔ اور ان کی اتنی سی بات اللہ تعالیٰ کو پسند آگئی اور انھیں نعمت ایمان سے سرفراز فرمادیا۔ تادبوا مع موسیٰ (علیہ السلام) فکان ذلک سبب ایمانھم (قرطبیؒ) (تفسیر ضیاء القرآن)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: " جادو گروں نے کہا اے موسیٰ ! آیا آپ پہلے (عصا) ڈالیں گے یا ہم پہلے ڈالیں۔ موسیٰ نے کہا تم ڈالو، جب انھوں نے ڈالا تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور ان کو خوف زدہ کر دیا اور انھوں نے بہت بڑا جادو پیش کیا۔ اور ہم نے موسیٰ کو وحی فرمائی کہ تم اپنا عصا ڈال دو تو وہ فوراً ان کے جھوٹے طلسم کو نگلنے لگا۔ سو حق کا غلبہ ثابت ہو گیا اور جو کچھ وہ کرتے تھے اس کا بطلان ظاہر ہو گیا۔ پس فرعون اور اس کے درباری مغلوب ہو گئے اور ذلیل و خوار ہو کر واپس ہوئے "

حضرت موسیٰ اور فرعون کے جادو گروں کا مقابلہ:

جادو گروں نے حضرت موسیٰ سے کہا اے موسیٰ ! آیا آپ پہلے عصا ڈالیں گے یا ہم اپنی لاٹھیاں اور رسیاں پہلے ڈالیں، انھوں نے اپنے اس سوال میں حسن ادب کو ملحوظ رکھا اور اپنے ذکر سے پہلے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا ذکر کیا، اور اسی ادب کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان لانے کی توفیق دی۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا تم ڈالو، اس پر یہ اعتراض ہے کہ ان کا لاٹھیاں ڈالنا، حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے معجزہ کے مقابلہ میں معارضہ کرنا تھا، اور معجزہ کا معارضہ کرنا کفر ہے تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے معجزہ کے مقابلہ میں معارضہ کرنا تھا، اور معجزہ کا معارضہ کرنا کفر ہے تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ان کو کفر کرنے کا حکم کیونکر دیا جب کہ کفر کا حکم دینا بھی کفر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے معجزہ کا ثبوت اور غلبہ اس پر موقوف تھا کہ وہ اپنی لاٹھیاں ڈالیں اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا عصا ان لاٹھیوں کو نگل لے تو حضرت موسیٰ نے ان کو لاٹھیاں ڈالنے کا حکم اس حیثیت سے دیا تھا کہ ان کے معجزہ کا غلبہ ثابت ہوا اور وہ انجام کار ان جادو گروں کے ایمان لانے کا ذریعہ ہو۔

جب جادو گروں نے اپنی لاٹھیاں ڈالیں تو انھوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور ان کو خوفزدہ کر دیا، اس کا معنی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی قوت مخیلہ سے لوگوں کے دماغوں پر تاثیر کی اور لوگوں کی آنکھوں پر سحر کیا، سو ان کو وہ لاٹھیاں اور سانپ دوڑتے ہوئے معلوم ہونے لگے، ایک قول یہ ہے کہ ان لکڑیوں اور رسیوں میں پارہ بھرا ہوا تھا سورج کی تپش سے وہ پارہ حرکت کرنے لگا جس سے وہ لاٹھیاں اور رسیاں دوڑتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ اور لوگ ان سے خوفزدہ ہو گئے۔

اور ہم نے موسیٰ کو وحی فرمائی کہ تم اپنا عصا ڈال دو تو وہ فوراً ان کے جھوٹے طلسم کو نگلنے لگا۔

مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنا عصا ڈالا تو وہ بہت بڑا سانپ بن گیا اور جب اس نے اپنا منہ کھولا تو اس کے دو جبڑوں کے درمیان اسی ذراع (ایک سو بیس فٹ) کا فاصلہ تھا۔ اس نے ان کی تمام رسیوں اور لاٹھیوں کو نگل لیا، اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اس کو پکڑا تو وہ پہلے کی طرح لاٹھی بن گیا، اور یہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا عظیم الشان معجزہ تھا، کیونکہ وہ بہت بڑا اژدہا جو ہزاروں لاٹھیوں اور رسیوں کو نگل چکا تھا آن کی آن میں پہلے کی طرح متوسط لاٹھی بن گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے لاٹھیوں اور رسیوں کو معدوم کر دیا یا ان کو ریزہ ریزہ کر کے ہوا میں اڑا دیا اور کسی کو ان کے ریزہ ریزہ ہونے اور ہوا میں تحلیل ہونے کا پتہ نہ چل سکا اور یہ فعل صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی قدرت سے ظہور میں آیا، کیونکہ کسی چیز کو موجود کرنا یا معدوم کرنا، اللہ تعالیٰ ہی کا خاصہ ہے، حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا کام صرف لاٹھی کو پھینکنا اور اس کو پکڑنا تھا اور اس لاٹھی میں یہ صفت اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ تھی اور لاٹھی کو پھینکنا اور پکڑنا بھی اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے اذن کے تابع تھا، حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی شان اور خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ پر ایسے عظیم الشان معجزہ کو ظاہر فرمایا۔ تاہم بعض معجزات انبیاء (علیہم السلام) کی قدرت سے بھی ظہور میں آتے ہیں لیکن وہ قدرت بھی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہوتی ہے۔ اور در حقیقت وہی تمام معجزات کا خالق ہے۔ سو حق کا غلبہ ثابت ہو گیا اور جو کچھ انھوں نے کیا تھا اس کا بطلان ظاہر ہو گیا۔

حق کے غلبہ کے ظہور کا سبب یہ ہے کہ جادو گروں نے کہا کہ موسیٰ نے جو کچھ کیا اگر وہ جادو ہوتا تو ہماری لاٹھیاں اور رسیاں گم نہ ہوتیں اور جب وہ گم ہو گئیں تو معلوم ہوا کہ یہ کام اللہ سبحانہ کی خلق اور اس کی تقدیر سے ہوا ہے اس میں جادو کا کوئی دخل نہیں تھا، اور اسی وجہ سے معجزہ، جادو سے متمیز ہو گیا۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ۝۱۱۶

لغۃ القرآن: [قَالَ : انہوں نے کہا] [اَلْقُوْا : تم لوگ ڈالو] [فَلَمَّآ : پھر جب [اَلْقَوْا : انہوں نے پھینکا] [سَحَرُوْٓا : تو انہوں نے جادو کیا] [اَعْيُنَ النَّاسِ : لوگوں کی آنکھوں پر] [وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ : اور ان کو خوفزدہ کیا] [وَجَآءُوْ : اور وہ لائے] [بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ : ایک عظیم جادو]

ترجمہ: موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: تم ہی (پہلے) ڈال دو پھر جب انھوں نے (اپنی رسیوں اور لاٹھیوں کو زمین پر) ڈالا (تو انھوں نے) لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور انھیں ڈرا دیا اور وہ زبردست جادو (سامنے) لے آئے

تشریح: حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور جادو گر آمنے سامنے کھڑے ہوئے تو جادو گروں نے ادب کا انداز اپناتے ہوئے کہا اے موسیٰ (علیہ السلام) کیا آپ اپنا کمال میدان میں پہلے پیش کریں گے یا ہم کریں؟ آپ نے فرمایا تم پہلے پیش کرو تب انھوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور جو لمبی لمبی رسیاں اور بڑی بڑی لکڑیاں انھوں نے میدان میں پھینکی تھی وہ لوگوں کو یوں نظر آنے لگی جیسے وہ سانپ بن کر دوڑ رہی ہیں قرآن مجید میں ہے: فاذا حبالھم و عصیھم یخیل الیہ من سحر ھم انھا تسعی۔ "تو ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کے جادو کے سبب موسیٰ (علیہ السلام) کو یوں لگیں کہ دوڑ رہی ہیں۔" (طٰہ:66) امام قرطبی نے روایت درج کی ہے کہ وہ تین سو اونٹوں پر رسیاں اور بڑی لکڑیاں لاد کر لائے تھے۔

یہاں سے دو فوائد حاصل ہوئے:

1۔ جادو اور معجزہ میں فرق:

سَحَرُوْا اعین الناس۔ سے معلوم ہوا کہ جادو سے کسی چیز کی حقیقت نہیں بدلتی صرف دیکھنے والوں کی آنکھوں پر جادو کیا جاتا ہے نظر بندی کی جاتی ہے جبکہ معجزہ اور کرامت میں اشیاء کی حقیقت بدل دی جاتی ہے موسیٰ (علیہ السلام) کا عصا حقیقت سانپ بن گیا۔ اسی لیے وہ جادوگروں کی ساری رسیاں اور لکڑیاں نگل گیا اور اس کے بعد وہ وہی عصا تھا۔

2۔ احترام نبی کا صلہ:

جادوگروں نے موسیٰ (علیہ السلام) سے ادب سے کہا آپ کچھ ڈالیں گے یا ہم ڈالیں۔ امام قرطبی فرماتے ہیں ان کا یہ مؤدبانہ انداز تکلم اللہ کو پسند آیا اور انھیں ایمان عطا فرمادیا (قرطبی جلد 7 صفحہ 259) اگر کافر کو تعظیم نبی کے صدقے ایمان مل جاتا ہے تو مومن کو تعظیم نبی کے صدقے کیا صلہ ملتا ہے یہ اللہ ہی جانتا ہے۔

اسی لیے صحابہ کرام (رض) ٹوٹ کر تعظیم نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بجالاتے تھے۔ آپ کے جسم اقدس سے لگنے والے پانی کو زمین پر نہیں گرنے دیتے تھے آپ کی حجامت کے بالوں اور ناخنوں کو باہم بانٹ لیتے تھے اور آپ سے تعلق رکھنے والی ہر شے کی تکریم بجالاتے تھے تو اسی تعظیم رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی برکت سے صحابہ کی رام ساری دنیا پر چھاگئے اور انھوں نے دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کو خاک میں ملاکر رکھ دیا۔ (تفسیر برہان القرآن)

سیدنا موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ تم اپنا جتنا زور دکھانا چاہتے ہو دکھالو میں بعد میں اپنی صداقت کا معجزہ پیش کروں گا آپ کی اس اجازت کا مقصد یہ تھا کہ باطل اپنی تمام قوتوں کے ساتھ ظاہر ہو جائے تو اس پر بھرپور وار کر کے اس کی بے سروپائی کو عیاں کر دیا جائے تاکہ اس کے بعد کسی کے لیے شک وشبہ کی گنجائش نہ رہے۔ اور حق اپنی تمام تابانیوں کے ساتھ جلوہ نما ہو جائے۔

اس سے سحر کی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ سحر میں یہ طاقت نہیں ہوتی کہ وہ کسی چیز کی ماہیت کو بدل دے مثلاً رسیوں کو حقیقتاً سانپ بنا دیا اس کے بس سے باہر ہے۔ اس کا اثر نظر بندی تک محدود ہوتا ہے۔ یعنی ایک چیز ہوتی کچھ ہے لیکن جادو کے اثر سے دیکھنے والے اسے کوئی اور چیز سمجھنے لگتے ہیں۔ علامہ ابن حیان الاندلسی لکھتے ہیں۔ وفی قولہ سحروا اعین الناس دلالۃ علی ان السحر لایقلب علیناوانماھو من باب التخییل (بحر محیط) یعنی سحروا الخ کے کلمات سے معلوم ہوا کہ جادو کسی چیز کی حقیقت کو نہیں بدل سکتا۔ دوسری جگہ (سورۃ طہ) اسی واقعہ کا ذکر ان الفاظ سے کیا گیا۔ یخیل الیہ من سحرھم انھا تسعی: ان کے جادو سے موسیٰ (علیہ السلام) کو یہ خیال ہونے لگا کہ یہ رسیاں سانپ بن کر دوڑنے لگی ہیں۔ یہاں بھی تخییل کا ہی ذکر ہے۔ اگرچہ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ جادو کی ایک قسم تھی۔ اس کے علاوہ جادو کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس سے ماہیت شے بدلی جاسکتی ہے لیکن قرآن کے الفاظ سے یہ چیز ثابت نہیں ہوتی۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

آیت مبارکہ:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ۝

لغۃ القرآن: [وَاَوْحَيْنَآ : اور ہم نے وحی کیا] [اِلٰى مُوْسٰٓي : موسیٰ کی طرف] [اَنْ : کہ] [اَلْقِ : آپ ڈالیں] [عَصَاكَ : اپنا عصا] [فَاِذَا : پھر جب ہی] [هِيَ : وہ] [تَلْقَفُ : نگلنے لگا [مَا : اس کو جو] [يَاْفِكُوْنَ : وہ جھوٹی بناوٹ کررہے تھے]

ترجمہ: اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف وحی فرمائی کہ (اب) آپ اپنا عصا (زمین پر) ڈال دیں تو وہ فوراًان چیزوں کو نگلنے لگا جو انھوں نے فریب کاری سے وضع کر رکھی تھیں

تشریح: جب وہ اپنے فن سحر کا مظاہرہ کر چکے اور ان کی رسیاں سانپوں کی طرح بل کھا کر فضا میں لہرانے لگیں اور فرعون کو اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا۔ اور اس کی قوم اپنے ساحروں کے کمال پر عش عش کر اٹھی تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم دیا کہ اے حق کے علم بردار! اٹھ اور باطل کے خوشی سے تمتماتے ہوئے چہرہ پر زناٹے کا وہ چپت رسید کر کہ اس کا خمار اتر جائے۔ اور وہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائے۔ موسیٰ کلیم اللہ (علیہ السلام) نے لکڑی کا ڈنڈا جس پر وہ ٹیک لگائے اب تک باطل کی ہرزہ سرائی کا مشاہدہ کرتے رہے تھے میدان میں ڈال دیا۔ اچانک وہ ایک مہیب اژدہا بن کر ان لہراتے ہوئے سانپوں کی طرف لپکا اور ان کو نگلنا شروع کر دیا۔ اور آن واحد میں فرعونیوں کا سارا بنا بنایا کھیل ختم ہو کر رہ گیا۔ مجمع عام میں حق کا بول بولا ہوا۔ اور باطل کو شرمناک شکست ہوئی۔ اور ان کی جادو گری کی عظمت اور سطوت کا پردہ چاک ہو گیا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے عصا پھینکنے پر جب وہ اژدہا بن کر جادو گروں کی سب رسیاں اور لاٹھیاں نگل گیا تو روایات کے مطابق ساری قوم بنی اسرائیل آپ کی رسالت پر ایمان لے آئی۔ البتہ فرعون کی تبتی قوم میں سے کوئی شخص ایمان نہ لایا سوا سیدہ آسیہ زوجہ فرعون کے۔ وہ اس لیے ایمان لائیں کہ انھوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو بچپن میں ماں بن کر پالا تھا۔ اور یہ بھی مروی ہے کہ ان کے ایمان لانے پر فرعون نے انھیں محل کے اوپر سے زمین پر گرا کر شہید کر دیا۔ جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اس عظیم اژدھا کو پکڑا تو وہ پھر پہلے جیسا عصا بن گیا۔ یہ عظیم معجزہ دیکھ کر مقابلہ میں کھڑے تمام جادو گر سجدے میں گر گئے اور ایمان لے آئے۔ وہ اپنے علم کی بنیاد پر سمجھ گئے کہ ان کے مقابلے میں جادو نہیں اللہ کی قدرت کھڑی ہے۔

کیا عصائے موسیٰ (علیہ السلام) نے جادو گروں کی رسیوں اور لکڑیوں کو نہیں نگل لیا تھا؟

اس جگہ سید ابوالاعلی مودودی نے کہا ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) کا عصا اژدھا تو بنا تھا مگر جادو گروں کی رسیوں اور لکڑیوں کو اس کا نگل جانا درست نہیں بس اتنا ہوا کہ یہ معجزہ ان کے جادو پر غالب آگیا۔ اس طرح کے عصای موسیٰ سانپ بن کر جدھر گیا جادو گروں کی پھینکی ہوئی ہر لاٹھی لاٹھی بن کر رہ گئی اور رسی رسی بن کر (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ 69 مطبوعہ مکتبہ اسلامی دہلی) مگر یہ مودودی صاحب کی اپنی رائے ہے جو درست نہیں ہے۔

اول: اللہ تعالیٰ نے اس جگہ فرمایا: فاذا ہی تلقف ما یافکون۔ اور لقف یلقف کا معنی ہیں طعام کا نگلنا ہے (المنجد) گویا الفاظ قرآن کا معنی ہی یہ ہے کہ عصاء موسیٰ سب رسیوں اور لاٹھیوں کو یوں نگل گیا جیسے طعام کا نوالہ نگلا جاتا ہے۔

دوم: اس جگہ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے مروی ہے کہ فرمایا: ماابقت عصا ولا حبلًا الا ابتلع تھا اس عصا نے کوئی لاٹھی اور رسی نہ چھوڑی جو وہ نگل نہ گیا ہو۔ (ابن ابی حاتم جلد 5 صفحہ 1536 حدیث 8805)

سوم : مشہور تابعین سے بھی یہی تفسیر مروی ہے۔ چنانچہ حضرت قتادہ (رض) سے مروی ہے۔ فاکلت عصیھم وحبالھم۔ موسیٰ (علیہ السلام) کا عصا ان کی لاٹھیوں اور رسیوں کو نگل گیا۔ حضرت سدی علیہ الرحمہ نے فرمایا : فاکلت کل حیۃ۔ عصائے موسیٰ (علیہ السلام) ہر سانپ کو نگل گیا۔ (درمنثور جلد 3 صفحہ 514) تو بہتر یہی ہے کہ اسی تفسیر پہ اعتماد کیا جائے جو لغت عرب اور اقوال صحابہ وتابعین کے مطابق ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

ایک دوسری سرپرائز سامنے آتی ہے۔ایک عظیم واقعہ پیش آتا ہے۔فرعون اور اس کا ٹولہ اور جادوگر سب کے سب ششدر رہ جاتے ہیں۔ تمام لوگ دم بخود رہ جاتے ہیں اور اس عظیم میدان کے بیشمار اور عظیم سکتہ طاری ہو جاتا ہے جنہوں نے جادوگری کے اس عظیم عمل کو دیکھا۔

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنْ اَلْقِ عَصَاکَ فَاِذَا ہِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِکُوْنَ ۔ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۔ فَغُلِبُوْا ہُنَالِکَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِیْنَ ۔ ہم نے موسیٰ کو اشارہ کیا کہ پھینک اپنا عصا۔اس کا پھینکنا تھا کہ آن کی آن میں وہ ان کے اس جھوٹے طلسم کو نگلتا چلا گیا۔اس طرح جو حق تھا وہ حق ثابت ہوا اور جو کچھ انھوں نے بنا رکھا تھا وہ باطل ہو کر رہ گیا۔فرعون اور اس کے ساتھی میدان مقابلہ میں مغلوب ہوئے اور (فتح مند ہونے کے بجائے) الٹے ذلیل ہو گے۔

باطل ہمیشہ پھول جاتا ہے اور آنکھوں کو چکا چوند کر دیتا ہے، دلوں کو مرعوب کر دیتا ہے اور اکثر لوگ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ باطل غالب ہی رہے گا۔ یہ سیلاب کی طرح بہا کرلے جائے گا۔اور تمام چیزوں کو نیست و نابود کر دے گا لیکن جونہی اس کا واسطہ ایک سنجیدہ، پر عزم اور مضبوط سچائی سے ہوتا ہے تو اس سے غبارے کی طرح ہوا نکل جاتی ہے اور وہ بلبلے کی طرح بیٹھ جاتا ہے، خارپشت کی طرح سکڑ جاتا ہے اور محض گھاس کے شعلے کی طرح ہوتا ہے جو ایک منٹ میں بجھ جاتا ہے۔اب سچائی کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے۔اس کی بنیادیں مضبوط ہو جاتی ہیں اور جڑیں گہری ہو جاتی ہیں۔قرآن کریم نے یہاں جو انداز تعبیر اختیار کیا ہے،اس میں اس مفہوم کا پرتو موجود ہے۔ یہ تاثر ملتا ہے کہ حق ایک عظیم اور بھاری وجود کا مالک ہے اور اس کی زد بڑے زور سے پڑتی ہے اور وہ مستقلاً ثابت ہو جاتا ہے اور حق کے سوا تمام دوسرے امور ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور باطل کے تار و پود بکھر جاتے ہیں۔ سچائی باطل اور اس کے پیروکاروں پر غالب آجاتی ہے اور نہایت پھلنے پھولنے اور آنکھوں کو چندھیانے کے بعد یہ باطل بڑی تیزی سے سکڑ جاتا ہے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

فرعون 'اس کے اعیان حکومت 'اس کے امراء 'اس کی فوجیں اور دیکھنے والوں کا جم غفیر فتح کی جس خوشی میں اب تک سرشار نعرے لگا رہا تھا وہ یکسر ختم ہو کر رہ گیا۔ نعروں پر اوس پڑ گئی 'پہلے ایک سناٹا طاری ہوا پھر تنی ہوئی گردنیں جھکنے لگیں۔ ہر ایک نے نہایت ندامت اور شرمندگی محسوس کی اور دل اس بات کا اقرار کرنے لگے کہ واقعی حق وہی ہے جسے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) پیش کر رہے ہیں۔ان کے ہاتھ میں عصا کی صورت میں اللہ کی تائید و نصرت کا ایک نشان اور اللہ کی جانب سے سند ماموریت ہے جس کو یہ لوگ جادو کا کرشمہ سمجھ رہے تھے۔اس طرح اس پورے ماحول اور دلوں کی گہرائیوں میں حق غالب آگیا اور ان کی ساری کاوشیں باطل اور برباد ہو کر رہ گئیں۔اب وہ زبان سے چاہے بولیں یا نہ بولیں لیکن فضا کی ایک ایک لہر بول رہی تھی کہ کس حد تک عبرت کا مقام ہے کہ اپنے آپ کو رب الاعلیٰ کہلانے والا کس ذلت سے دوچار ہو رہا ہے۔ وہ دو بے نوا فقیروں کے سامنے سر جھکائے بیٹھا ہے اور اس کی فوجیں جن کی شجاعت کی دھاک پوری دنیا میں بیٹھی ہوئی تھی وہ نہایت سراسیمگی کی حالت میں کھڑی ہیں۔اس طرح یہ پورا مجمع ذلت اور رسوائی کی تصویر بن کر رہ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی رسوائی اور یہی ذلت اتنی بڑی تھی کہ فرعون اور اس کے حواریوں کو شرم سے ڈوب مرنا چاہیے تھا۔ لیکن ابھی وہ اس پر سوچ ہی رہے تھے کہ ذلت کا ایک اور زوردار حملہ ان پر ہوا جس نے انھیں بری طرح پامال کر کے رکھ دیا۔ (تفسیر روح القرآن)

اس سے معلوم ہوا کہ جب کوئی چیز کسی اور شکل میں ہو جاوے ہیئت تبدیل ہو تو اس کی بعض خصوصیات بھی اس میں آجاتی ہیں۔ عصا لاٹھی تھی۔لاٹھی کھایا پیا نہیں کرتی۔ مگر جب سانپ کی شکل میں ہوئی تو کھانے پینے لگی۔اس سے بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔ حضرت جبرائیل کا انسانی شکل میں آنا تو لباس پہننا حضرت ملک الموت کی موسیٰ (علیہ السلام) کے طمانچے سے آنکھ کا نکل جانا۔ وغیرہ۔ یہ سب اسی شکل کے احکام ہیں جو اس وقت ان کی تھی۔ حضور اللہ کا نور ہیں۔ مگر جب انسانی شکل میں ہیں تو کھاتے پیتے بھی ہیں۔ نکاح بھی کرتے ہیں۔ وصال کے روزے میں تکلیف نہ ہونا، نورانیت کی جلوہ گری ہے۔ (تفسیر نور العرفان تعلیقا)

آیت مبارکہ:

فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝١١٨ۚ

لغۃ القرآن: [فَوَقَعَ : پس واقع ہوا] [الْحَقُّ : حق] [وَبَطَلَ : اور باطل ہوا] [مَا : وہ جو] [كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ : وہ لوگ کیا کرتے تھے]

ترجمہ: پس حق ثابت ہو گیا اور جو کچھ وہ کر رہے تھے (سب) باطل ہو گیا

تشریح: (جیسا کہ اکثر دنیا میں حق و باطل کے تصادم کے موقعوں پر ہوتا رہتا ہے) آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو حق تھا وہ ظاہر بھی حق ہو کر اور جو باطل تھا اس کے بطلان کا بھی عملی ظہور ہو کر رہا۔ (تفسیر ماجدی)

یہ بالکل ویسی ہی بات ہے کہ مہ نخشب کے مقابلہ میں خورشید جہاں تاب نکل آئے۔ ظاہر ہے کہ ہزاروں مصنوعی چاند سورج ہوں جب بھی حقیقی سورج کے نکلتے ہی ان کی چمک دمک ملمع کی طرح غائب ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت موسیٰ کے معجزہ کے ظاہر ہوتے ہی ساحروں کا سارا طلسم غائب ہو گیا۔ اوپر ہم ظاہر کر چکے ہیں کہ معجزہ اور سحر کا حقیقی فرق میدان مقابلہ مقابلہ میں نمایاں ہوتا ہے۔ جب دونوں کا تصادم ہوتا ہے تو حق لازماً غالب ہوتا ہے باطل لازماً شکست کھاتا ہے۔ (تفسیر تدبر القرآن)

اس طرح جو حق تھا وہ حق ثابت ہوا اور جو انھوں نے بنار کھا تھا وہ باطل ہو کر رہ گیا۔ عصائے موسیٰ حق تھا۔ جب وہ آیا تو جو گھڑا ہوا جھوٹ تھا ختم ہو گیا۔ لیکن عصائے موسیٰ صرف موسیٰ (علیہ السلام) کے ہاتھ میں یہ صلاحیت رکھتا تھا جو جھوٹ کو ختم کر دے۔ اگر موسیٰ (علیہ السلام) نہ ہوتے اور وہ کسی اور کے ہاتھ میں یہ معجزہ نہ ہوتا۔ وہ باطل کو ضائع نہیں کر سکتا۔ لیکن جو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو معجزہ دیا گیا۔ قرآن۔ وہ نہ صرف نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہاتھ میں معجزہ تھا بلکہ آج بھی وہ معجزہ ہے۔ قرآن آج بھی معجزہ ہے۔ قرآن آج بھی باطل کو ختم کر سکتا ہے مسئلہ کیا ہے۔ اٹھانے والے ہاتھ نہیں ہیں۔ حامل قرآن نہیں ہیں۔ جو قرآن اٹھائیں اور اس طرح باطل کو رد کریں۔ آج جو باطل پھیل رہا ہے دنیا میں اس لیے نہیں کہ وہ بہت اچھا ہو گیا باطل اس لیے پھیل رہا ہے کہ آج حق کو اٹھانے والے حق کو پھیلانے والے نہیں ہیں۔ جب وہ میدان میں آ جائیں گے۔ باطل اسی طرح غائب ہو جائے گا۔ انشاء اللہ۔ (تفسیر تنویر)

چنانچہ اس معجزہ کو قرآن نے حق اور جادو کو باطل سے تعبیر فرمایا ہے لیکن ہر جادو محض تخیل نہیں ہوتا جمہور اہل سنت کا مسلک یہ ہے یہ سحر کئی قسم کا ہوتا ہے بعض قسم کا جادو تو وقعی تخیل ہوتا ہے مگر بعض قسم کے جادو مبنی بر حقیقت ہوتے ہیں جیسا کہ لبید بن اعصم یہودی کا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جادو چلانا اس لیے سرے سے جادو کی حقیقت کا انکار صحیح نہیں ہے ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے مقابلے میں جس جادو کا ذکر ہو رہا ہے وہ محض دھوکا تھا۔ (روح)

(تفسیر اشرف الحواشی۔ شیخ محمد عبدہ الفلاح)

(جیسا کہ اکثر دنیا میں حق و باطل کے تصادم کے موقعوں پر ہوتا رہتا ہے) آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو حق تھا وہ ظاہر بھی حق ہو کر اور جو باطل تھا اس کے بطلان کا بھی عملی ظہور ہو کر رہا۔ (تفسیر نور العرفان)

آیت مبارکہ:

فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ۝۱۱۹

لغۃ القرآن: [فَغُلِبُوْا : پس وہ مغلوب ہوئے] [هُنَالِكَ : وہیں] [وَانْقَلَبُوْا : اور وہ پلٹے] [صٰغِرِيْنَ : حقیر ہوتے ہوئے]

ترجمہ: سو وہ (فرعونی نمائندے) اس جگہ مغلوب ہو گئے اور ذلیل ہو کر پلٹ گئے

تشریح: فرعون اور اس کی قوم نے جب یہ ہوش ربا منظر دیکھا ہو گا تو ان پر کیا گزری ہو گی؟ شکست اور اتنی رسوا کن شکست اور وہ بھی مجمع عام میں۔ فرط ندامت سے پانی پانی ہو گئے ہوں گے۔ اب انھیں اس بات میں کوئی شبہ نہ رہا تھا کہ موسیٰ (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں۔ لیکن اپنی سیاسی اغراض اور مالی مصلحتوں کے پیش نظر وہ آپ پر ایمان لانے کے لیے تیار نہ تھے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

(غ ل ب) الغلبۃ ۔کے معنی قہراا ور بالادستی کے ہیں،

قلاب -قَلْبُ الشيء : (ق ل ب) قلب ۔الشئی کے معنی کسی چیز کو پھیرنے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پلٹنے کے ہیں ۔الانقلاب ۔کے معنی پھر جانے کے ہیں۔ (المفردات)

سو فرعون اور اس کے اعوان وانصار نے جس بڑے پیمانے پر اس مقابلے کا اہتمام کیا تھا اس کو انھوں نے میلے کے دن اور ایک کھلے میدان میں منعقد کرایا تھا، جیسا کہ دوسرے مقام پر اس کی تصریح موجود ہے، اور ملک بھر سے لوگوں کو اس کے لیے بطور خاص بلایا گیا تھا تا کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں جمع ہوں۔ اور اس طرح ان کے سامنے اپنی فتح کا ڈنکا پوری دھوم دھام سے بجایا جائے۔ مگر میدان مقابلہ میں نتیجہ اس کی توقعات کے بالکل الٹ نکلا۔ اور ان کو ایسی ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑا کہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ اور سرکاری خرچ اور اہتمام پر فرعون کی طرف سے جمع کردہ لوگوں کا وہ ہجوم فتح حق کی تشہیر اور اس کی منادی کا ایک بے مثال ذریعہ بن گیا، والحمد للہ جَلَّ وَعَلَا (تفسیر مدنی کبیر)

آیت مبارکہ:

وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۝۱۲۰

لغۃ القرآن: [وَاُلْقِيَ : اور ڈالے گئے] [السَّحَرَةُ : جادوگر لوگ] [سٰجِدِيْنَ : سجدہ کرنے والوں کی حالت میں]

ترجمہ: اور (تمام) جادوگر سجدہ میں گر پڑے

تشریح: مقابلہ میں جب انھوں نے اپنے جادو کی ناکامی اور اعجاز موسوی کی کامیابی دیکھی تو وہ مجبور ہو کر سجدہ میں گر پڑے اور اس پروردگار عالم پر ایمان لانے کا اعلان کر دیا۔ جس کی الوہیت اور وحدانیت کا اعلان موسیٰ وہارون (علیہما السلام) فرمایا کرتے تھے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

اس منظر میں ایک کے بعد خلاف توقع دوسرے مناظر آتے ہیں۔ اب ایک عظیم منظر اچانک نظروں کے سامنے ہے۔ وَاُلْقِیَ السَّحَرَۃُ سٰجِدِیْنَ۔ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ رَبِّ مُوْسٰی وَہٰرُوْنَ۔ اور جادو گروں کا حال یہ ہوا کہ گویا کسی چیز نے اندر سے انھیں سجدے میں گرا دیا۔ کہنے لگے ہم نے مان لیا رب العالمین کو۔ اس رب کو جسے موسیٰ اور ہارون مانتے ہیں۔

یہ ہے انسانی ضمیر میں سچائی کا رعب اور دبدبہ۔ انسانی شعور اچانک روشن ہو جاتا ہے اور جب کوئی دل قبولیت حق کے لیے تیار ہو جاتا ہے تو اس کے اندر اچانک سچائی کا چراغ روشن ہو جاتا ہے اور وہ یقین سے بھر جاتا ہے۔ یہ جادو گر اپنے فن کی حدود سے اور اس کی ماہیت سے اچھی طرح باخبر تے اور اگر نعوذ باللہ! حضرت موسیٰؑ جادو گر ہوتے تو وہ اور لوگوں کے مقابلے میں انھیں بہت جلد پہچان لیتے۔ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں جس معجزے کا ظہور ہوا وہ انسانی قدرت اور جادو کے دائرے سے ورا تھا۔ ایک ماہر فنکار اپنے فن کے بارے میں حقیقت کو بہت جلد تسلیم کر لیتا ہے، بشرطیکہ حقیقت اس پر منکشف ہو جائے۔ اس لیے کہ صاحب فن حقیقت کے قریب ہوتا ہے، اور اس کا علم ان لوگوں سے زیادہ ہوتا ہے جو صرف سطحی معلومات رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جادو گر چیلنج اور تحدی کے موقف کو چھوڑ کر تسلیم و رضا کا پیکر بن گئے کیونکہ وہ اپنے دلوں کے اندر یقین پار ہے تھے اور یہ حقیقت ان کے شعور کا حصہ بن گئی تھی۔

لیکن کوئی بھی طاغوتی طاقت اس بات کو نہیں سمجھ سکتی کہ انسان کا دل کس طرح نور سے بھر جاتا ہے یا یہ کہ انسان کو ایمان کی یہ شرح صدر کس طرح ہو جاتی ہے اور انسان کے دل میں یقین کی گرمی کس طرح پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ طاغوتی قوتیں چونکہ طویل عرصے تک لوگوں کو غلام بنائے رکھتی ہیں اس لیے انھیں یہ زعم ہو جاتا ہے کہ وہ معاملات کو اپنے ڈھب پر ڈالنے کی قوت رکھتی ہیں اور لوگوں کے دل و دماغ و پھر بدل سکتی ہیں۔ حالانکہ انسان کا دل تو رحمٰن کی انگلیوں میں ہوتا ہے، وہ جس طرح چاہے اسے پھیر دے۔ جادو گروں کی جانب سے اعلان شکست اور اعلان ایمان فرعون کے لیے ناقابل تصور اور تعجب خیز تھا۔ کیونکہ ان لوگوں کے دلوں میں تو ایمان کا شائبہ تک نہ تھا اور نہ ان کے ضمیر میں ایمان کا کوئی دخل و عمل اس کے علم میں تھا۔ پھر اس کے لیے یہ اچانک اعلان ایمان اس قدر خطرناک تھا کہ اس سے اس کی حکومت خطرے میں پڑ گئی۔ اس کے قدم ڈگمگانے لگے تھے۔ جادو گر صرف جادو گر ہی نہ تھے بلکہ وہ اس وقت کی عبادت گاہوں کے کاہن اور علماء و خطباء تھے، جب کسی ملک کے تمام مذہبی راہنما ایمان لے آئیں تو پھر حکومت کے لیے اپنی جگہ پر ٹھہرنا ممکن نہیں رہتا۔ خصوصاً ایسے حالات مبارزت میں کہ وہ مقابلے کے لیے میدان میں آئے ہوں۔ ایسے حالات میں کہ جب طاغوتی نظام بذات خود خطرے میں ہو تو اہل طاغوت سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔

(تفسیر فی ظلال القرآن)

جادو گروں کے ایمان لانے میں علم کی فضیلت:

امام ابن جریر نے ذکر کیا ہے کہ فرعون نے ستر ہزار جادو گر جمع کیے تھے اور انھوں نے ستر ہزار لاٹھیاں اور ستر ہزار رسیاں میدان میں پھینکی تھیں۔ امام ابن جوزی نے ذکر کیا ہے کہ وہ لاٹھیاں اور ستر ہزار رسیاں میدان میں پھینکی تھیں امام ابن جوزی نے ذکر کیا ہے کہ وہ لاٹھیاں اور رسیاں ایک مربع میل میں پھیلی ہوئی تھیں۔ امام رازی نے ذکر کیا ہے کہ وہ لاٹھیاں اور رسیاں اتنی تھیں کہ وہ تین سو اونٹوں کا بار تھیں اور جب ان سب لاٹھیوں اور رسیوں کو حضرت موسیٰ کے عصا نے نگل لیا اور وہ معمول کے مطابق موسیٰ (علیہ السلام) کے ہاتھ میں تھا تو جادو گروں نے آپس میں کہا یہ چیز جادو سے خارج ہے بلکہ یہ محض اللہ کا فعل ہے اور اس سے انھوں نے استدلال کیا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اللہ کے سچے نبی ہیں۔

متکلمین نے کہا یہ آیت فضیلت علم پر بہت قوی دلیل ہے، کیونکہ وہ جادو گر جادو کی حقیقت سے واقف تھے ان کو معلوم تھا کہ جادو کا انتہائی کمال کیا ہے اور اس وجہ سے انھوں نے جان لیا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ جادو کی حقیقت سے خارج ہے، اگر وہ جادو کے علم میں کامل نہ ہوتے تو وہ یہ استدلال نہیں کر سکتے تھے۔ وہ یہ سوچتے کہ شاید یہ ہم سے بڑے جادو گر ہیں، اس لیے یہ اس چیز پر قادر ہیں جس سے ہم عاجز ہیں، لیکن چونکہ وہ جادو کے علم میں کامل تھے اس لیے انھوں نے جان لیا کہ یہ جادو نہیں ہے بلکہ یہ خالق کائنات کی قدرت کا شاہکار ہے۔ پس وہ جادو کے علم میں کامل ہونے کی وجہ سے کفر سے ایمان کی طرف منتقل ہو گئے۔ سوچئے کہ جب جادو کے علم میں کمال کا یہ ثمرہ ہے تو دین اسلام اور شریعت کے علم میں کمال حاصل کرنے کا کیا ثمرہ ہو گا۔ (تفسیر تبیان القرآن)

فرعونی قوم تو مغلوب اور ذلیل ہو کر اپنے کفر کی طرف لوٹ گئی مگر جادو گر سجدے میں گر کر ایمان لے آئے۔ گویا اس دور کی علمی ترقی جو فن جادو گری کی شکل میں جلوہ گر تھی اعجاز نبوت کے سامنے سر نگوں ہو گئی۔

ہر نبی کا معجزہ تقاضائے وقت کے مطابق ہوتا ہے:

دور موسوی میں جادو گروں کو خدا مانا جارہا تھا خود فرعون بڑا جادو گر تھا اور اس نے سب جادو گر جمع کر رکھے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کو معجزہ عصا دے کر بھیجا جس کے آگے جادو کی ساری طاقت ختم ہو گئی۔ دور عیسیٰ (علیہ السلام) میں طب کو عروج تھا طبیبوں کو خدا مانا جارہا تھا اس کے مقابلہ میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے مردوں کو زندہ، کوڑھیوں کو شفایاب اور اندھوں کو بینا کر کے طبیبوں کو مات دیدی پھر کہا میں خدا نہیں خدا کا بندہ ہوں۔

جبکہ حضور سید عالم کا دور رسالت تا قیامت ہے اور آج سائنس اس قدر ترقی کر گئی ہے کہ انسان نے چاند پر جا قدم رکھا ہے اس کے مقابلہ میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو شان معراج عطا فرمائی گئی اور سائنس کی ساری ترقی اس کے آگے گرد راہ بن کر رہ گئی۔ سائنس نے آٹھ فاصلے سمیٹ کر رکھ دیے ہیں. برسوں کے سفر مہینوں میں اور مہینوں کے سفر گھنٹوں میں طے ہو رہے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں شب معراج رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے یوں فاصلے سمیٹے گئے کہ سائنس والے اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اسی طرح کرامات اولیاء کا بھی یہی رنگ ہے جیسا فتنہ نمودار ہوا اس کے مقابلہ میں اولیاء اللہ سے ویسی ہی کرامات صادر ہوتی ہیں حضور داتا گنج بخش علی بن عثمان ہجویری علیہ الرحمہ لاہور تشریف لائے تو یہاں ہندو جادو گر رائے راجو کی حکومت تھی جب اس نے آپ کو مرعوب کرنے کے لئے ہوا میں اڑنا شروع کیا تو آپ نے اپنی لکڑی کی کھڑا میں ہوا میں اچھال دیں جو اس کے سر پر جا کر لگاتار برسنے لگیں پھر چند ہی منٹ میں وہ آپ کے قدموں میں آ گرا اور اسلام لے آیا اور اور اولیاء میں بڑا درجہ پایا۔ آج وہی رائے راجو حضرت شیخ ہندی علیہ الرحمہ کے نام سے مشہور ہیں جن کی قبر حضور داتا گنج بخش علی ہجویری (رح) کے مزار کے قدموں میں واقع اور مرجع خلائق ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں

وَكُلُّ وَلِيٍّ لَهُ قَدَمٌ وَاِنِّیْ   عَلٰی قَدَمِ النَّبِیِّ بَدْرِ الْكَمَالِ"

ہر ولی کسی نہ کسی (نبی) کے قدم پر ہوتا ہے اور مَیں آسمان کمال کے بدر کامل سیدی رسول اللہ (ﷺ) کے قدموں پر ہوں۔ (قصیدہ غوثیہ)

یعنی وہ خود سجدے میں نہ گرے، بلکہ توفیق خداوندی نے دستگیری کی اور رب کی طرف سے گرائے گئے۔ شعر

مری طلب بھی تمہارے کرم کا صدقہ ہے

قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

(تفسیر نور العرفان)

آیت مبارکہ:

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۲۱

لغۃ القرآن: [قَالُوْٓا : انہوں نے کہا] [اٰمَنَّا : ہم ایمان لائے] [بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ : تمام جہانوں کے رب پر]

ترجمہ: وہ بول اٹھے : ہم سارے جہانوں کے (حقیقی) رب پر ایمان لے آئے

تشریح: (سب نے) بیک زبان (کہا کہ ہم مان گئے پروردگار عالم کو) اور پھر فوراہی یہ وضاحت کردی کہ رب العٰلمین سے ہماری مراد فرعون نہیں ہے جو خود کو رب العالمین سمجھتا ہے بلکہ رب سے مراد ہماری وہ ہے جو (پروردگار) ہے (موسیٰ وہارون کا) اور جس کی ربوبیت والوہیت کی دعوت حضرت موسیٰ وہارون پیش کررہے ہیں۔ (تفسیر اشرفی)

جادو گروں کا ایمان لانا :

چونکہ فرعون بھی اپنی نسبت اَنَارَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کہتا تھا، شاید اس لیے رَبُّ الْعَالَمِیْنَ کے ساتھ رَبِّ مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ کہنے کی ضرورت ہوئی۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہو گیا کہ بیشک جہان کا پروردگار وہی ہو سکتا ہے جس نے موسیٰ وہارون کو اپنی خاص ربوبیت سے بدون توسط اسباب ظاہرہ دنیا کے متکبروں پر علیٰ رؤس الاشہاد اس طرح غالب کرکے دکھلادیا۔

قاسم بن ابی بزہ کہتے ہیں کہ جادو گروں نے اپنا سر سجدے سے اٹھانے سے پہلے ہی جنت اور دوزخ کو دیکھ لیا

چھ لاکھ آدمی مسلمان ہوئے :

تاریخی روایات میں ہے کہ جادو گروں کے سردار مسلمان ہوگئے تو ان کو دیکھ کر قوم فرعون کے چھ لاکھ آدمی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لے آئے اور اعلان کردیا۔ (تفسیر گلدستہ)

قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۔ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَاۗءَتْنَا ۭ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ۔ (الاعراف : ۱۲۵، ۱۲۶)

" انھوں نے جواب دیا بہر حال ہمیں پلٹنا اپنے رب ہی کی طرف ہے تو جس بات پر ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آگئیں تو ہم نے انھیں مان لیا اے رب ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دنیا سے اٹھا تو اس حال میں کہ ہم تیرے فرمان بردار ہوں "۔

جادگروں کا جواب جو ایمان کی رفعتوں کا امین ہے

اے فرعون ! تم ہمیں موت سے ڈراتے ہو اور سولی پر چڑھانے اور ہاتھ پاؤں میں میخیں گاڑھنے کی دھمکیاں دیتے ہو لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جو لوگ اللہ رب العالمین پر ایمان لاتے ہیں وہ پہلے سے اس بات کا فیصلہ کرکے ایمان کا اعلان کرتے ہیں کہ یہ زندگی اللہ کی عطا ہے جب ضرورت پڑے گی اسی کے لیے اس کے دین کی خاطر قربان کردیں گے۔ مرنا تو ہر ایک کو ہے لیکن ایک مومن کے لیے اس سے بڑی سعادت اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس کی موت اللہ کے دین کے راستے میں آئے وہ تو اس بات کے انتظار میں رہتا ہے کہ یہ سر کا بوجھ جو میں کندھوں پر اٹھائے پھرتا ہوں یہ اللہ کی امانت ہے۔ کب وہ موقع آئے جب اللہ مجھ سے اس کا مطالبہ کرے اور میں اسے اس کے حوالے کردوں یہ یقین وہ قوت ہے جو ایک مومن کو موت پر غلبہ دے دیتی ہے وہ موت کو لقائے رب کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتا ہے اور اللہ سے ملاقات ایک مومن کی معراج ہے اس لیے اس کے دین کی خاطر موت کی وہ اس لیے تمنا کرتا ہے تاکہ اللہ کے حضور حاضری کا موقع ملے اور وہ اپنے آپ کو اس بحر ناپیدا کنار میں شامل کرکے لافانی بنالے۔

چنانچہ تم ہمیں جس چیز سے ڈرا رہے ہو وہ چونکہ ہمارا مقصود ہے اس لیے اس سے ڈر کیسا ہمارے لیے تو وہ نہ صرف عین سعادت ہے بلکہ ہمارا مطلوب بھی ہے تاریخ کے مختلف ادوار میں ہم اس حقیقت کو بار بار ایک زندہ قوت کے طور پر ابھرتا ہوا دیکھتے ہیں کہ جب بھی کبھی لوگوں میں اللہ سے محبت کا شعلہ روشن ہوا ہے اور موت کے آئینہ میں انھوں نے روئے دوست کی جھلک دیکھ لی ہے تو پھر ان کے لیے زندگی دشوار اور موت آسان ہو گئی ہے۔ ہماری قریبی تاریخ میں اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی کے جرم میں جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ان میں ایک محمد یحییٰ تھانیسری اور ان کے ساتھی بھی تھے جب ان کو پھانسی کی سزا سنائی گئی اور اس کے چند دنوں بعد ان کے بارے میں رپورٹ مانگی گئی تو جیل کے آفیسر زیہ جان کر حیران رہ گئے کہ مولانا اور ان کے ساتھی پہلے سے کہیں زیادہ صحت مند اور نہایت خوش و خرم شب و روز گزار رہے ہیں۔ انھیں حیرت ہوئی کہ پھانسی کے قیدی تو وقت سے پہلے ہی قریب المرگ ہو جایا کرتے ہیں۔ آخر ان کی خوشی اور صحت کا باعث کیا ہے۔ انھوں نے جب تحقیق کی تو انھیں معلوم ہوا کہ یہ لوگ چونکہ شہادت کو اپنے لیے خوشی کا باعث سمجھتے ہیں اور یہی ان کی زندگی کا حقیقی مطلوب بھی ہے اس لیے جیسے جیسے شہادت کا دن قریب آتا جاتا ہے ان کی خوشیوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جس عشق کی وارفتگیوں نے انھیں مسحور کر رکھا ہے اس میں موت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ ان میں سے ہر ایک کا عزم یہ ہے۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں

ایک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

اسی جذبہ سے سرشار ان نو وار دانِ ایمان نے فرعون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ تم ہمیں جو جان لینے کی دھمکیاں دے رہے ہو آخر یہ کس جرم کی سزا ہے؟ ہم نے اس شہر میں کوئی قانون شکنی نہیں کی ' کوئی اخلاقی جرم نہیں کیا۔ ہمارا جرم اگر کوئی ہے تو صرف یہ ہے کہ ہمارے سامنے اللہ کی نشانیاں آئیں ' اللہ کے دو بندوں کے ذریعے ہم نے اللہ کی وہ نشانیاں جب اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھیں اور ہمیں یقین ہو گیا کہ جن نشانیوں کو تم جادو سمجھ رہے ہو حقیقت میں وہ اللہ کے بندوں کی شناخت اور ان کی حقانیت کے دلائل ہیں جو اس بات کی شہادت دے رہی ہیں کہ حقیقی رب اس کائنات کا صرف وہ اللہ ہے جو رب العالمین ہے اور یہ موسیٰ اور ہارون دونوں اس کے نمائندہ ہیں۔ ہم پر جب یہ حقیقت منکشف ہوئی تو ہم اپنے رب پر ایمان لے آئے۔ ہم نے اس رب کو پہچان لیا جس کی طرف موسیٰ اور ہارون دعوت دے رہے ہیں یہ اگر جرم ہے تو ہمیں اس جرم کا اقرار ہے۔

خونے نہ کردہ ایم و کسے را نہ کشتہ ایم

جرمم ہمیں کہ عاشق روئے تو گشتہ ایم

(ہم نے کوئی جرم نہیں کیا اور نہ کسی کو قتل کیا ہے ہمارا جرم صرف یہ ہے کہ ہم تیرے روئے زیبا کے عشق میں مبتلا ہو گئے ہیں)

یہ اگر جرم ہے تو ہمیں اس کا سو بار اقرار ہے ہم اس جرم کی خاطر ہر سزا برداشت کرنے کو تیار ہیں تو نے اس جرم کی اگر سزا کا اعلان کر دیا ہے تو ہم اس سے خوفزدہ نہیں۔ ہمیں خوب معلوم ہے کہ ایمان کے نتیجے میں ایسی ہی قیامتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے البتہ ہمیں اپنے عجز کا بھی اعتراف ہے اس لیے اب ہم یہ معاملہ اللہ کے سپرد کرتے ہیں کہ یا اللہ ہم نے تیری رضا کی خاطر ایک اقدام کر ڈالا ہے لیکن اس کے نتائج برداشت کرنا ہماری ہمت سے فزوں تر ہے۔ اس کے لیے جس صبر کی ضرورت ہے وہ صبر صرف تیری بارگاہ سے ملتا ہے اس لیے تجھ سے التجا ہے کہ تو اس صبر کی دولت سے ہمارے دل کو مضبوط کر دے اور ہمیں اتنی قوت عطا فرما کہ اس راستے میں ہم جو آخری سانس لیں وہ سانس تیری اطاعت اور تیری فرمان برداری میں آنا چاہیے۔

اس منظر کو دوبارہ اپنے تصور میں تازہ کیجیے کہ یہ وہی جادوگر ہیں کہ جب وہ فرعون کے دربار میں اپنے کمال فن کے اظہار کے لیے لائے گئے تو کس طرح انھوں نے بھانڈوں اور نقالوں کی طرح انتہائی دناءت اور کمینگی کا ثبوت دیتے ہوئے حق و باطل کے اس معرکے میں اپنی قیمت وصول کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی بلند نگاہی میں سب سے بڑا مرتبہ یہ ہے کہ انھیں دولت دنیا سے کچھ ہاتھ آ جائے اور بادشاہ وقت کے تقرب کا سایہ انھیں نصیب ہو جائے لیکن اب یہی لوگ جب ایمان سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور ایمان کی روشنی ان کے دلوں میں پہنچتی ہے تو کس طرح ان کا دل اس روشنی سے جگمگا اٹھتا ہے کہ پست ہمتی اور دنیا طلبی کی کوئی پرچھائیں بھی ان کے سیرت و کردار میں دور دور تک دکھائی نہیں دیتی۔ حق کے لیے قربانی اور مصائب کے مقابلے میں استقامت کی وہ ایسی تصویر بن جاتے ہیں کہ یوں لگتا

ہے کہ وہ گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان نہیں بلکہ عزیمت و استقامت کے پہاڑ ہیں اور ان کے دلوں سے دنیا کی محبت تو دور کی بات ہے اس فانی دنیا میں رہنے کی ہوس بھی اس طرح نکل جاتی ہے کہ وہ آخرت کو اپنی منزل بنا کر باقی ہر چیز سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں اور اس سفر پر نکل کھڑے ہوتے ہیں جس سفر میں قدم قدم پر کھائیاں اور گھاٹیاں ہیں جس میں اللہ کی توفیق کے بغیر کوئی آدمی کبھی منزل تک نہیں پہنچ پاتا۔ اس لیے وہ دنیا سے ہر طرح کا تعلق توڑ کر صرف اللہ سے تعلق جوڑنے کی استدعا کرتے ہوئے اللہ ہی سے توفیق کے طلبگار ہوتے ہیں۔ اس سے ہمیں ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسان اپنی ذات میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں۔ وہ دنیا میں چاہے دنیا کے کیسے ہی عظیم منصب کو حاصل کر لے اور دولت دنیا سے بیشک اس کی تجوریاں بھر جائیں اور بیشک دنیا کی ہر نعمت اسے میسر آ جائے لیکن سیرت و کردار کی کوئی بلندی بھی اس کے قریب سے نہیں گزرتی۔ انسانیت ہمیشہ اس سے دامن کشاں رہتی ہے۔ وہ اللہ کی دھرتی پر اپنے آپ کو چاہے کتنا بڑا سمجھے لیکن حقیقت میں وہ دھرتی کے بوجھ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ حالات کا معمولی سا جھٹکا بھی اسے زمین پر ڈھیر کر کے رکھ دیتا ہے لیکن جب اسی شخص کو ایمان کی دولت نصیب ہوتی ہے تو وہ چیتھڑوں میں لپٹ کر بھی شاہوں کے تاج نوچتا ہے وہ فاقے میں ہو کر بھی سیر چشمی اور استغناء کی چلتی پھرتی تصویر ہوتا ہے۔ نہ اسے دولت اور عہدہ و منصب جھکنے پر مجبور کر سکتے ہیں اور نہ بڑی سے بڑی آزمائش کبھی اسے گرا سکتی ہے۔ وہ بظاہر نہایت نرم 'نہایت سادہ اور نہایت متواضع ہوتا ہے لیکن اس کے اندر کا انسان پہاڑوں سے زیادہ بلند 'سمندروں سے زیادہ گہرا 'پھولوں سے زیادہ دلآویز اور آندھیوں سے زیادہ پر عزم ہوتا ہے۔

ٹھیک کہا جگر مراد آبادی نے کہ انسان کی ساری کہانی کا حاصل یہ ہے۔

گرے اگر تو بس ایک مشت خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعت کونین میں سما نہ سکے

جادوگروں کی ساری سرگزشت ہمارے سامنے اسی حقیقت کو واشگاف کرتی ہے کہ انسان کی ضرورتیں بیشمار ہیں جن میں ایک بہت اہم ضرورت سائنس اور ٹیکنالوجی بھی ہے لیکن اس کی حقیقی قوت سیرت و کردار کی وہ پختگی ہے جسے ایمان کہتے ہیں جب وہ آدمی میں نہیں ہوتا تو آدمی سے زیادہ حقیر شے کوئی نہیں ہوتی وہ ٹیکنالوجی کا بادشاہ بھی بن جائے تو وہ انسان نہیں درندہ بن کر تاریخ کے افق پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ ٹیکنالوجی کے ساتھ اگر ایمان جمع ہو جائے تو پھر وہ قوت وجود میں آتی ہے جو اسلام کا اصل مطلوب ہے۔

حق و باطل کے معرکے میں فرعون اور آل فرعون کی ناکامی اور حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کی کامیابی سے جو صورت حال پیدا ہوئی اس نے فوری طور پر کیا صورت اختیار کی؟ جادوگروں کو انتہائی سزاؤں کی دھمکی کے علاوہ قرآن کریم اور کسی چیز کا ذکر نہیں کرتا۔ یقیناً اس کے بعد حالات میں کشیدگی بڑھ گئی ہوگی ہو سکتا ہے مخالف قوتوں نے نئی حکمت عملی کی تیاری میں چند دن انتظار کیا ہو۔ اگلی آیت کریمہ سے انتظار ہی کی کیفیت محسوس ہوتی ہے البتہ یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ حکومت اپنے زخم چاٹ رہی ہے لیکن عمائدین حکومت غصے میں جلے بھنے حکومت اور دوسرے لوگوں کو کوسنے دے رہے ہیں۔ (تفسیر روح القرآن)

اقبال فرماتے ہیں:

نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتیں ہیں زنجیریں

آیت مبارکہ:

رَبِّ مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ○۱۲۲

لغۃ القرآن: [رَبِّ مُوْسٰي وَهٰرُوْنَ : جو ہارون اور موسیٰ کا رب ہے]

ترجمہ: (جو) موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کا رب ہے

تشریح: جس رب کو موسیٰ و ہارون مانتے ہیں اور جس کا یہ پتہ دیتے ہیں اسے ماننا ہی ایمان ہے۔ (کنز العرفان)

معلوم ہوا کہ انبیاء کرام رب کی دلیل اور پہچان ہیں۔ یعنی رب العالمین وہ ہے جسے یہ دونوں پیغمبر رب فرمادیں نہ کہ فرعون۔ اور رب تعالیٰ کی درست و مقبول معرفت وہی ہے جو نبی کے ذریعہ حاصل ہو۔ (تفسیر نور العرفان)

جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔

پیغمبر سے پیش قدمی نہ کرنا ہی ادب بن گیا اور ساحروں کو ادب موسیٰ ملحوظ رکھنے سے ایمان ملا۔ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ادب وسیلہ ایمان ہے۔

(1) لاالہ الااللہ آدم صفی اللہ (2) لاالہ الااللہ نوح بحتی اللہ

(3) لاالہ الااللہ ابراھیم خلیل اللہ (4) لاالہ الااللہ موسیٰ کلیم اللہ

(5) لاالہ الااللہ داوٗد خلیفۃ اللہ (6) لاالہ الااللہ عیسیٰ روح اللہ

(7) لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ

اس آیت میں بھی جادو گروں نے رب موسیٰ وہارون کہا۔ (تفسیر فیوض القرآن۔ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی)

اس کے مشیروں کی ساری اسکیم خاک میں مل گئی انھوں نے تو جادو گروں کے کو جمع کرکے اس لیے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا مقابلہ کرایا تھا کہ لوگوں پر ثابت کردیں کہ موسیٰ (علیہ السلام) جو معجزے لے کر آئے ہیں وہ بھی ایک جادو ہے مگر جب تمام جادو گروں نے مل کر اس کے خدا کی طرف سے معجزہ ہونے کا اعتراف کیا اور اوہ ایمان لا کر سجدہ میں گر پڑے تو فرعون اور اس کے مشیروں کے لیے کسی طرح ممکن نہ رہا ہو کہ لوگوں کو موسیٰ (علیہ السلام) کے محض ایک جادو گر ہونے کا یقین دلا سکیں (تفسیر اشرف الحواشی۔ محمد عبدہ الفلاح)

رَبِّ مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ

آخر کیا وجہ تھی کہ جادو گر مغلوب ہوئے تو فوراً ایمان لے آئے اور وہ بھی انتہائی پختہ 'یقین اور استقامت والا ایمان! کہاں وہ فرعون سے انعام کی بھیک مانگ رہے تھے اور کہاں اب اسے خاطر میں نہ لاتے ہوئے نتائج سے بے پرواہو کر ڈنکے کی چوٹ پر اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔ جادو گروں کے اس رویے کی منطقی توجیہہ یہ ہے کہ جو شخص کسی فن کا ماہر ہوا سے اس فن کے ممکنات کی انتہا اور اس کے حدود و قیود (limitations) کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ وہ اپنے فن کے مخصوص میدان (field of specialization) میں کسی چیز کی قدر 'اہمیت 'معیار وغیرہ کو صحیح پہچان سکتا ہے۔ جادو گر جو اپنے فن کے منجھے ہوئے ماہرین تھے وہ فوراً پہچان گئے تھے کہ ان کے جادو کے مقابلے میں جو کچھ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے پیش کیا ہے وہ جادو سے ماوراء کوئی چیز ہے۔ لہٰذا جس حقیقت کا ادراک فرعون اور اس کے امراء نہ کر سکے وہ بجلی کی ایک کوند (flash) کی مانند آناً فاناً جادو گروں کے دلوں کے تاریک گوشوں کو روشن کر گئی اور ان کو ایسا ایمان نصیب ہوا جس کی جراتِ اظہار اور استقامت نے فرعون اور اس کے لاؤ لشکر کو پریشان کر دیا۔ (تفسیر بیان القرآن۔ ڈاکٹر اسرار احمد)

به پروردگار موسی وہارون. [[«رَبِّ» : بدل است. ذکر آن برای رفع توہمی است کہ در ذہن عامّہ مردم بود. وآن این کہ مردم، فرعون را (رَبِّ) خود می دانستند.]]

سیٰ اور ہارون کے رب کی طرف۔ [["ربّ" : یہ ایک متبادل ہے۔ اس کا تذکرہ اس وہم کو دور کرنا ہے جو لوگوں کے ذہنوں میں تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ لوگ فرعون کو اپنا رب مانتے تھے۔]] (تفسیر نور۔ مصطفٰی خرم دل)

آیت مبارکہ:

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۲۳

لغۃ القرآن: [قَالَ : کہا] [فِرْعَوْنُ : فرعون نے] [اٰمَنْتُمْ : تم لوگ ایمان لے آئے] [بِهٖ : اس پر] [قَبْلَ اَنْ : اس کے پہلے کہ] [اٰذَنَ : میں اجازت دیتا] [لَكُمْ : تم لوگوں کو] [اِنَّ : بیشک] [هٰذَا : یہ] [لَمَكْرٌ: یقینا ایک چال ہے] [مَّكَرْتُمُوْهُ : تم لوگوں نے تدبیر کی جس کی] [فِي الْمَدِيْنَةِ : اس شہر میں] [لِتُخْرِجُوْا : تاکہ تم لوگ نکالو] [مِنْهَآ : اس (شہر) سے] [اَهْلَهَا : اس کے لوگوں کو] [فَسَوْفَ : تو عنقریب] [تَعْلَمُوْنَ : تم لوگ جان لوگے]

ترجمہ: فرعون کہنے لگا: (کیا) تم اس پر ایمان لے آئے ہو قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا؟ بیشک یہ ایک فریب ہے جو تم (سب) نے مل کر (مجھ سے) اس شہر میں کیا ہے تاکہ تم اس (ملک) سے اس کے (قبطی) باشندوں کو نکال کرلے جاؤ، سو تم عنقریب (اس کا انجام) جان لوگے

تشریح: مقابلہ کے میدان میں شکست کیا کم تھی کہ جادوگروں نے مسلمان ہونے کا اعلان کرکے اس کی کمر توڑ دی لیکن تھا ذہین۔ حالات کی نزاکت کو فوراً بھانپ گیا۔ جادوگروں کو خطاب کرتے ہوئے فوراً بول اٹھا۔ اچھا! معلوم ہوگیا کہ تم بھی اسی باغی گروہ کے افراد ہو جن کا سرغنہ موسیٰ ہے۔ اور تم سب نے مل کر ہماری حکومت کا تختہ الٹنے اور قبطیوں کو ان کے وطن سے نکالنے کی سازش کررکھی ہے۔ ذرا ٹھیرو! ابھی تمہیں اس مکروفریب کا مزا چکھاتا ہوں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

فرعون نے جادوگروں سے کہا کہ میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں تم میری اجازت کے بغیر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے رب پر ایمان کیوں لائے ہو، یہ تم نے موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف سازش کی ہے تاہم تم مصر کے اصلی باشندوں یعنی قبطی کو یہاں سے نکال دو، لہٰذا تم اس سازش کی سزا کے لیے تیار ہو جاؤ، میں تمہارا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ کر تمہیں سولی پر چڑھا دوں گا۔ انھوں نے فرعون سے کہا: تو ہم سے اس بات کا انتقام لینا چاہتا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر کیوں ایمان لائے۔ تو اب آپ جو سزا چاہیں تجویز کریں ہم نے اپنے رب کی نشانیوں کو پہچان لیا ہے اور ہم سب کو ایک دن اسی کی طرف لوٹنا ہے، لہٰذا ہمیں موت کی پرواہ نہیں ہے، بلکہ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں صبر دے اور مرتے دم تک مسلمان رکھے۔

اس سے معلوم ہوا جو انسان اسلام کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے اور اس پر دل کی گہرائی سے ایمان لے آتا ہے تو پھر وہ مرنا گوارا کرلیتا ہے مگر اسلام کو چھوڑنا برداشت نہیں کرسکتا۔ (تفسیر امداد الکرم)

تفسیر سدی نے ابن عباس سے یہ نقل کی ہے۔

مجھے موسیٰ نے ابن عباس سے اور مرہ نے ابن مسعود سے اور دیگر اصحاب رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے نقل کیا کہ موسیٰ اور جادوگروں کے امیر کی ملاقات ہوئی تو موسیٰ (علیہ السلام) نے اسے کہا: تیرا کیا خیال ہے اگر میں تجھ پر غالب آگیا تو تو ایمان لے آئے گا اور تو اس بات کی گواہی دے گا کہ میں جو لایا ہوں وہ برحق ہے۔ ساحر نے جواب دیا کہ کل میں ایسا جادو پیش کروں گا جس پر جادو کو غلبہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ کی قسم! اگر تو مجھ پر غالب ہوا تو میں ضرور تجھ پر ایمان لے آؤں گا اور

تیری حقانیت کی گواہی دوں گا۔ فرعون ان کو دیکھ رہا تھا اسی لیے فرعون نے کہا: (اِنَّ ہٰذَا لَمَکۡرٌ مَّکَرۡتُمُوۡہُ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ) جب کہ تمہاری باہمی ملاقات ہوتی تو تم غلبہ پا کر اس شہر کے رہنے والوں کو یہاں سے نکالنا چاہتے ہو۔ (تفسیر طبری بحوالہ تفسیر سدی)

فرعون نے کہا: تم میری اجازت سے پہلے ایمان لے آئے۔ ظالم بادشاہوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ عوام کے قلوب پر بھی حکمرانی کرنا چاہتے ہیں، اور پختہ وفاداری اسی کو سمجھتے ہیں کہ عوام اسی دین پر رہیں جو بادشاہ اور حکمران ان کے لیے تجویز کریں۔ اسی بنیاد پر فرعون جو اپنی شکست سے بڑا سوختہ تھا، اور اس شکست کا ذمہ دار وہ جادوگروں کو سمجھتا تھا، مزید برآں یہ کہ جادوگروں کے متفقہ ایمان نے اس کی حکمرانی اور بادشاہت کے ایوانوں کو ہلا کر رکھ دیا، اب وہ اپنے مستقبل کو تاریک سمجھ کر اپنی تباہی کا منتظر رہتا تھا۔ تب اس نے دھمکی آمیز لہجہ میں نو مسلم ایمانداروں کو خطاب کر کے کہا کہ میری اجازت کے بغیر تم کیسے مسلمان ہو گئے؟

جب فرعون نے دیکھا کہ عوام کو اپنی خدائی اور حکومت کا وفادار رکھنے، اور موسیٰ (علیہ السلام) سے دور رکھنے کے لیے جادوگروں سے مقابلہ کا مظاہر کرایا تھا، اس کا نتیجہ برعکس نکلا، اور سارے جادوگر ہی موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لائے۔ پہلے ایک موسیٰ (علیہ السلام) تھا، اب ستر ہزار موسیٰ (علیہ السلام) تیار ہوئے، تو اب لینے کے دینے پڑ گئے، اور عوام کو اپنی طرف کرنے کے لیے اس نے جادوگروں کو خطاب کیا کہ تم میری اجازت سے پہلے کیوں مسلمان ہو گئے؟ "ان ھذا لمکر مکرتموہ" دوسرے مقام پر فرمایا: "انہ لکبیرکم الذی علمکم السحر" (طہ) بلاشبہ یہ ایک خفیہ تدبیر اور مکر ہے جو تم سب نے مل کر اس شہر میں کیا ہے۔ اب میری سمجھ میں آ گیا کہ یہی شخص ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا، یہ استاذ اور شاگردوں کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے۔ (تفسیر منازل العرفان)

حق و باطل کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت بالکل عیاں دکھائی دیتی ہے کہ حق ہمیشہ دلائل کی بنیاد پر باطل پر غالب رہا ہے اور غالب رہے گا۔ یہی بات قرآن مجید نے دوٹوک الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ "کافر اور مشرک چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھا دیں جبکہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ وہ اپنے نور کو ہر جانب پھیلا کر رہے گا۔ اس نے اپنے رسول کو دین حق اور ہدایت کے ساتھ اس لیے بھیجا ہے تا کہ اس کا دین تمام باطل ادیان پر غالب آ جائے خواہ یہ بات کفار کے لیے کتنی ہی ناگوار ہو۔ " (سورۃ الصّف: ۸، ۹)

سورۃ المجادلۃ کی آیت ۲۱ میں یہ فرمایا کہ "اللہ نے یہ بات لکھ چھوڑی ہے کہ میں اور میرے رسول غالب آ کر رہیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ قوت رکھنے والا غالب ہے۔ " یہی بات جادوگروں کے مقابلہ میں موسیٰ (علیہ السلام) کو تسلی دیتے ہوئے کہی گئی تھی۔ اے موسیٰ خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ یقین جانیے کہ آپ ہی غالب رہیں گے۔ جادوگر جہاں سے بھی حملہ آور ہو کامیاب نہیں ہوتا۔ " (طٰہٰ ۶۸ تا ۶۹) اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوا اور جو جادوگر تھوڑی دیر پہلے فرعون زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے جونہی ان کے سامنے حقیقت منکشف ہوئی تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید اور موسیٰ (علیہ السلام) کی رسالت پر ایمان لانے کا دوٹوک الفاظ میں نہ صرف اعلان کیا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہوئے تا کہ دیکھنے والے یہ جان جائیں کہ جادوگر موسیٰ (علیہ السلام) کے مقابلہ میں شکست کھا چکے ہیں۔ فرعون یہ ہزیمت کس طرح برداشت کر سکتا تھا اس لیے اس نے اپنی ذلت چھپانے اور لوگوں پر تسلط قائم رکھنے کے لیے ایمان لانے والوں پر سازش کا الزام لگایا کہ تم نے میری اجازت کے بغیر ایمان لانے کا اعلان کیا یہ تم جادوگروں کی ہمارے خلاف بہت بڑی سازش ہے تا کہ تم ہمیں اقتدار سے محروم کر کے ملک سے نکال دو۔ لیکن یاد رکھو کہ عنقریب تمہارا انجام تمہارے سامنے ہو گا۔ (تفسیر فہم القرآن)

آیت مبارکہ:

لَاُقَطِّعَنَّ اَيۡدِيَكُمۡ وَاَرۡجُلَكُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ۝۱۲۴

لغۃ القرآن: [لَاُقَطِّعَنَّ : میں لازما کاٹوں گا] [اَيۡدِيَكُمۡ : تمہارے ہاتھوں کو] [وَاَرۡجُلَكُمۡ : اور تمہارے پیروں کو] [مِّنۡ خِلَافٍ : مخالف (طرف) سے] [ثُمَّ : پھر] [لَاُصَلِّبَنَّكُمۡ : میں لازما سولی چڑھاؤں گا تم کو [اَجۡمَعِيۡنَ : سب کو]

ترجمہ: میں یقیناً تمہارے ہاتھوں کو اور تمہارے پاؤں کو ایک دوسرے کی الٹی سمت سے کاٹ ڈالوں گا پھر ضرور بالضرور تم سب کو پھانسی دے دوں گا

تشریح: کتنی دردناک سزا ہے جس کی وہ ان پاکبازوں کو دھمکی دے رہا ہے ایک طرف کا ہاتھ دوسری طرف کا پاؤں کاٹ کر زندہ سولی پر لٹادینا تاکہ تڑپ تڑپ کر سسک سسک کر دم توڑ دیں۔ عشق و محبت کے متوالوں کے علاوہ کون ہے جو اس سزا کو جھیلنے کے لیے بخوشی تیار ہو۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) نے فرمایا کہ دنیا میں پہلا سولی دینے والا اور پہلا ہاتھ پاؤں کاٹنے والا فرعون ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

موت ایک دن آئیگی ہی اب چاہے ابھی آئے۔۔ یا۔۔ دیر سے پھر ہمیں تیری زجر و توبیخ کا کیا خطرہ ؟ ہمیں اپنے رب کریم کی رحمت اور ثواب پر امید ہے اس لیے کہ ہمیں مرنے کے بعد اسی کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ اب اگر تو ہمارے ساتھ اپنی وعید پوری کرے تو اس سے ہم خوفزدہ نہیں۔

گویا وہ حضرت اس کی وعید سے الٹا خوش ہوئے اور انھیں اللہ تعالیٰ کی زیارت کا شوق پیدا ہوگیا۔ پھر انھوں نے فرعون کو مخاطب کرکے کہا کہ اے فرعون ! آخر ہم نے کون سی غلطی کی۔۔ (تفسیر اشرفی)

تشدد، تعذیب اور سخت اور عبرت آموز سزا۔ یہ ہیں وہ وسائل جو ہر طاغوتی نظام ، حق کے مقابلے میں لاتا ہے۔ اس لیے کہ حق کا مقابلہ کبھی بھی حجت اور استدلال سے نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ تشدد کے ہتھیار ہمیشہ سچائی کے خلاف استعمال ہوتے ہیں۔

لیکن جب نفس انسانی کو ایمانی سربلندی حاصل ہوجاتی ہے اور اس کے اندر ایمان کی حقیقت جاگزیں ہوجاتی ہے تو وہ اس کرہ ارض کی عظیم قوتوں کے مقابلے میں آکھڑا ہوتا ہے اور اسے سرکشوں اور طاغوتوں کے انتقام کی کوئی پروا نہیں ہوتی اور ایسے افراد کی زندگی میں نظریہ حیات کو دنیاوی زندگی پر برتری حاصل ہوجاتی ہے اور یہ فانی زندگی آنے والی دائمی زندگی کے مقابلے میں ہیچ نظر آتی ہے۔ جب نفس انسانی اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ وہ کیا ہے اور کیا چھوڑے یا کیا ہے یا وہ کیا پائے گا اور کیا کھوئے گا اور اس کو اس راہ میں کیا کیا مشکلات انگیز کرنی ہوں گی ؟ اور کیا کیا مشقتیں اٹھانی ہوں گی ؟ کیونکہ اس کا نصب العین دور افق پر روشن نظر آتا ہے اور اس کی نظر بلند ہوجاتی ہے اور وہ پھر نیچے راستے کے کانٹوں کی طرف دیکھتا ہی نہیں ہے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

فرعون کی بیکار دھمکی :

ساحرین توحید اور تمنائے لقاء اللہ کی شراب سے مخمور ہوچکے تھے، جنت و دوزخ گویا آنکھوں کے سامنے تھیں۔ بھلا وہ ان دھمکیوں کی کیا پروا کرسکتے تھے انھوں نے صاف کہہ دیا کہ کچھ مضائقہ نہیں جو کرنا ہو کر گزر پھر ہم کو اپنے خدا کے پاس جانا ہے تیرے سر ہو کر سہی۔ وہاں کے عذاب سے یہاں کی تکلیف آسان ہے اور اس کی رحمت و خوشنودی کے راستہ میں دنیا کی بڑی سے بڑی تکالیف و مصائب کا برداشت کرلینا بھی عاشقوں کے لیے سہل ہے۔

ھنیئًا لارباب النعیم نعیمھم۔ وللعاشق المسکین ما یتجرّع

مختلف جانبوں سے کاٹنے کا مطلب یہ ہے کہ دایاں ہاتھ اور بایاں پیر جس سے دونوں جانبین زخمی اور بدہیئت اور بیکار ہوجائیں۔ فرعون نے اس بدحالی پر قابو پانے اور اپنے درباریوں اور عوام کو قابو میں رکھنے کی کافی تدبیر کرلی تھی اور اس کی ظالمانہ سزائیں پہلے سے مشہور اور لوگوں کو لرہ براندام کردینے کے لیے کافی تھیں ۔ (تفسیر گلدستہ)

فرعون کی ان فرعونی دھمکیوں سے جہاں ایک طرف اس کی بو کھلاہٹ کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں اس سے اس کے ڈھیٹ پنے اور سٹنٹ بازی کی سیاست کا بھی پتہ چلتا ہے، کہ ان تمام جادو گروں کو وہ ملک کے کونے کونے سے خود سرکاری طور پر اور بطور خاص موسیٰ کے مقابلے کیلئے بلا کر لایا، اور اب ان کے اعلان حق کے بعد انہی سے کہتا ہے کہ یہ سب کچھ تم لوگوں کی ملی بھگت اور باہمی سازش تھی۔ جو تم لوگوں نے اس ملک میں رچائی تھی۔ تاکہ اس طرح تم لوگ اس ملک کے باشندوں کو اس سے نکال باہر کرو۔ اور سیاسی لوگوں کی سٹنٹ بازی کی یہ ملعون سیاست جب سے ابتک موجود و برقرار رہے، اِلّا ماشاء اللہ، اپنی کرسی اور اقتدار کی بقاء کیلئے ایسے لوگ ہر حربہ اختیار کرتے اور ہر قسم کی سٹنٹ بازی سے کام لیتے ہیں۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ (تفسیر مدنی)

آیت مبارکہ:

قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۝۱۲۵

لغۃ القرآن: [قَالُوْٓا : انہوں نے کہا] [اِنَّآ : بیشک ہم] [اِلٰی رَبِّنَا : اپنے رب کی طرف ہی] [مُنْقَلِبُوْنَ : لوٹنے والے ہیں]

ترجمہ: انھوں نے کہا: بیشک ہم اپنے رب کی طرف پلٹنے والے ہیں

تشریح: حق جب دل میں اتر جاتا ہے اور انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے تو وہ انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ اسی واقعہ سے اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ رذالت اور کمینگی کے گہرے کھڈ میں گرے ہوئے جادوگروں نے جب حق کو قبول کر لیا تو وہ چشم زدن میں انسانیت کے اس ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز ہو گئے جہاں نوری فرشتوں کی بھی رسائی نہیں۔ غیرت عشق نے انھیں اپنے ایمان کو کسی تقیہ کے غلاف میں لپیٹنے کی اجازت نہ دی۔ ایسی ہوش ربا سزا سننے کے بعد بھی ان کے پاؤں نہیں ڈگمگائے بلکہ باطل کے چیلنج کو بخوشی قبول کر لیا۔ برملا مجمع عام میں فرعون کے منہ پر اس کی دھمکی کا بڑی بے پرواہی اور بے نیازی سے جواب دے کر اس کو اور بیخ پا کر دیا۔ قربان جائے انسان حق کی دلربائی اور رعنائی پر ف

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

جب وہ لوگ ایمان لانے کے بعد اتنے جری اور نڈر ہو گئے تھے تو خاندان نبوت کا کیا کہنا، جن کے فیض نگاہ سے دنیا بھر کو ایمان، صداقت، شجاعت کی دولت ملی۔ کیا انھوں نے کسی کے ڈر سے، کسی مصلحت کے پیش نظر تقیہ کیا ہوگا۔ ہمارا تو یہ ایمان ہے ف

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی (تفسیر ضیاء القرآن)

حضرت علی المرتضی (رض) کے بارے میں تقیہ کا عقیدہ شدید گستاخی نبی و علی پہ مشتمل ہے:

ثابت جادو گروں نے فرعون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کلمہ حق کہا اور حدیث مبارکہ میں ہے کہ سب سے افضل جہاد ظالم حاکم کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے (ابو داؤد کتاب الملاحم باب 17 ترمذی کتاب الفتن باب 13)

اہل تشیع کہتے ہیں حضرات ابوبکر عمر اور عثمان (رض) کی حکومت غاصبانہ اور ظالمانہ تھی مگر حضرت علی نے تقیہ کرتے ہوئے ان کا ساتھ دیا اور ان کی بیعت کی۔ مگر اہل تشیع کا یہ نظریہ حقیقت میں حضرت علی شیر خداؓ کی توہین پر مبنی ہے۔ کیا داماد رسول حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہ جو سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی گود میں پل کر جوان ہوئے، کے دل میں موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لانے والے جادو گروں کے برابر بھی جذبہ ایمانی نہ تھا؟ اس کا جواب نہیں میں ہے۔ حضرت علیؓ نے خلفاء الثلاثہ کو جانشینان مصطفیٰ ﷺ سمجھا تب ان کی بیعت کی۔

جادو گروں کو صرف چند گھنٹے ایمان کے ساتھ صحبت موسیٰ (علیہ السلام) حاصل ہوئی تو ان کے دلوں میں اس قدر جذبہ ایمانی آ گیا کہ انھوں نے جان دے دی مگر باطل کے آگے سر نہ جھکایا۔ جبکہ مولا علی المرتضیٰ (رض) عنہٗ نے صحبت رسول خدا سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں بتیس برس گزارے۔ اگر چند گھنٹوں

پر مشتمل صحبت موسیٰ (علیہ السلام) میں یہ تاثیر ہے تو صحبت سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی 32 سالہ تاثیر کا کیا عالم ہوگا؟ کیا مولا علی المرتضیٰ شیر خدا (رض) میں کچھ بھی جذبہ ایمانی پیدا نہ ہوا تھا؟ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ حقیقت میں یہ سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور مولا علی المرتضیٰ (رض) کی شان میں شدید گستاخی و بے ادبی ہے۔

اس جگہ اہل تشیع کہتے ہیں کہ دراصل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی کو وصیت فرمائی تھی کہ میرے وصال کے بعد حالات تمہارے خلاف ہو جائیں گے ایسے میں اگر تمہیں مددگار ساتھی مل جائیں تو مقابلہ کرنا ورنہ جس کو لوگ خلیفہ بنائیں اس کی بیعت کرکے اپنی اور اپنے اہل خانہ کی جان بچا لینا۔ (ناسخ التواریخ، احتجاج طبرسی وغیرہ) اس لیے حضرت علی (رض) نے وصیت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مطابق بیعت کرلی، اگر انھیں یہ وصیت نہ کی گئی ہوتی تو وہ کبھی تقیہ سے کام نہ لیتے اور ڈٹ کر مقابلہ کرتے۔

مگر یہ اہل تشیع کا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پہ افتراء ہے تاکہ اس طرح عقیدۂ امامت کو کسی طرح بچایا جاسکتے۔ ہم پوچھتے ہیں کیا وجہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہی وصیت اپنے نواسے امام حسین (رض) کو کیوں نہ فرمائی، انھیں یہ حکم کیوں نہ دیا کہ وہ بھی حاکم وقت کی بیعت کرکے اپنی اور اپنے اہل خانہ کی جان بچالیں؟ کیا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنے داماد کی جان عزیز تھی اور نواسے کی جان عزیز نہ تھی؟ مالکم کیف تحکمون۔ (القلم: 36)

حضرت مولا علی المرتضی (رض) تو خلفائے راشدین کے ممد و معاون تھے، ہر معاملہ میں ان کی خیر خواہی کرتے، انھیں اپنے نیک مشوروں سے نوازتے اور ہر اہم کام میں ان کے دست و بازو بنتے تھے۔ اگر وہ ان کو خلفائے غاصبین سمجھتے ہوتے اور خود کو ان کے مقابلہ میں بے بس پاتے تو کم از کم اپنے گھر میں بیٹھ جاتے مگر غاصب حاکموں کے دست و بازو تو نہ بنتے اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ کسی ظالم کا ساتھ دینے والا بھی اس کے ظلم میں برابر کا شریک ٹھہرتا ہے۔ حتی کہ کتب شیعہ کہتی ہیں کہ جس نے کسی ظالم حاکم کو صرف قلم پکڑایا تاکہ وہ اس کے ساتھ فیصلہ لکھے تو وہ بھی اس کا ساتھی ٹھہرا۔ دیکھیے انوار نعمانیہ مصنفہ نعمت اللہ جزائری۔

(تفسیر برہان القرآن)

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ مومن کے دل میں خوف غیر اللہ نہیں ہوتا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی نبی کی صحبت کی برکت سے آن کی آن میں ولی ہو جاتا ہے۔ دیکھو آج ہی یہ جادوگر موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لائے اور آج ہی انھیں یہ قوت قلبی نصیب ہو گئی کہ سولی کا بھی انھیں خوف نہیں۔ (تفسیر نور العرفان)

یہ جادوگر فرعون کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے تھے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے انھیں ایمان کی دولت سے مالا مال فرمایا، تو انھیں صرف پانچ دس منٹ میں ایسی قوت اور جبروت نصیب ہوئی کہ فرعون نے ان کو ڈرایا دھمکایا اور خوفزدہ کیا۔ اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ ایمان سے پھر جاؤ، ورنہ میں تمہیں عبرت آموز سزائیں دوں گا تو وہ انتہائی بے باکانہ انداز میں فرعون سے کہنے لگے۔ فاقض ما انت قاض الخ۔ (سورطہ پ 16)۔ تو جو فیصلہ کرنے والا ہے کر گزر، یعنی اپنی تمام جباریت آزما کر دیکھ، لیکن ہمیں ایمان کی ایسی حلاوت نصیب ہو چکی ہے کہ اب نہیں پھریں گے۔ اب تو ایمان پر ہی ثابت قدم رہیں گے۔

آج کل کے ساحران کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہ وقت کے فرعون کے آگے سجدہ تو نہیں کرتے، لیکن لوگوں کا ایمان اتنا کمزور ہے کہ ڈرتے ہیں، بات نہیں کر سکتے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے مقابلے میں آنے والے جادوگروں کا ایمان صرف چند منٹ میں اتنا مضبوط بن گیا تھا کہ انھوں نے فرعون کے سامنے ایمان کا علم بلند کیا، لیکن آج کل 60، 70، 80 سال کا ایمان اتنا کمزور ہے کہ بے دینی اور بے عملی کے مقابلہ میں یہ لوگ چپ ہیں بول نہیں سکتے۔ حاکموں کا خوف دلوں میں ایسا راسخ ہے کہ اظہار کی جرات سے کاملا محروم ہیں۔ (تفسیر محمود۔ مفتی محمود صاحب)

آیت مبارکہ:

وَمَا تَنۡقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا بِاٰیٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتۡنَا ؕ رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۱۲۶﴾

لغۃ القرآن: [وَمَا تَنْقِمُ : اور تو انتقام نہیں لیتا] [مِنَّآ : ہم سے] [اِلَّآ اَنْ : سوائے اس کے کہ] [اٰمَنَّا : ہم ایمان لائے] [بِاٰیٰتِ رَبِّنَا : اپنے رب کی نشانیوں پر] [لَمَّا : جب] [جَآءَتْنَا : وہ آئیں ہمارے رب] [رَبَّنَآ : اے ہمارے پروردگار] [اَفْرِغْ : تو انڈیل دے] [عَلَیْنَا : ہم پر] [صَبْرًا : ثابت قدمی] [وَّ تَوَفَّنَا : اور تو موت دے ہم کو] [مُسْلِمِیْنَ : اس حال میں کہ ہم فرماں بردار ہوں]

ترجمہ: اور تمہیں ہمارا کونسا عمل برالگا ہے ؟ صرف یہی کہ ہم اپنے رب کی (سچی) نشانیوں پر ایمان لے آئے ہیں جب وہ ہمارے پاس پہنچ گئیں۔ اے ہمارے رب ! تو ہم پر صبر کے سر چشمے کھول دے اور ہم کو (ثابت قدمی سے) مسلمان رہتے ہوئے (دنیا سے) اٹھالے

تشریح:

یہ کہہ کر انھوں نے فرعون کو ایک اور چرکہ لگایا یعنی ہم سے اگر کوئی غلطی یا گناہ سرزد ہوتا اور تو ہمیں سزا دیتا تو کوئی معقول بات بھی تھی۔ اب تو ہمیں یہ سزا اس لیے دے رہا ہے کہ ہم نے اللہ کی وحدہ لاشریک مان لیا ہے اور اس کی آیات دیکھ کر اس کے رسول کی تصدیق کی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس سب سے بڑی اور روشن سچائی پر تو بھی ایمان لاتا اور ہمیں اس حق شناسی پر انعام دیتا۔ لیکن الٹا تو ہمیں اس لیے سولی پر لٹارہا ہے یہ خود تیری نادانی اور بدنصیبی کی کھلی دلیل ہے۔
فرعون کو کھری کھری سنانے کے بعد اب انتہائی خضوع و خشوع سے بارگاہ الٰہی میں عرض کرتے ہیں اے مولا ! امتحان کے ان مشکل ترین لمحوں میں ہمیں صبر عطافرما اور جب ہماری روحیں اس پیکر خاکی سے نکلنے لگیں تو لبوں پر تیری توحید کی شہادت ہو۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

جادو گروں کی ایمانی جرات :۔

فرعون کی یہ تیسری تدبیر بھی بری طرح ناکام ہو گئی وہ چاہتا یہ تھا کہ جادو گروں کو جسمانی عذاب اور قتل کی دھمکی دے کر اس سازش کے الزام کا اعتراف کروالے لیکن جادو گروں نے اپنے آپ کو ہر سزا کے لیے پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ان کا یہ ایمان لانا کسی سازش کا نتیجہ نہیں بلکہ اعتراف حق کا نتیجہ ہے یاد رہے کہ یہ وہی جادو گر ہیں جو مقابلے سے پہلے فرعون سے یہ پوچھ رہے تھے کہ اگر ہم نے اپنے مذہب کو موسیٰ (علیہ السلام) کے حملے سے بچالیا تو ہمیں کچھ انعام و اکرام بھی ملے گا؟ اور اب ایمان لانے کے بعد ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ وہ فرعون کی ہر سزا کو خندہ پیشانی سے قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں دوسری طرف وہی فرعون جو انھیں انعام و اکرام کے علاوہ کرسیاں (اعلیٰ مناصب) بھی دینے کا وعدہ کر رہا تھا اس مقابلے کے فوراً بعد ان کا جانی دشمن بن گیا۔ (تفسیر تیسیر القرآن)

جب جادو گروں کے دلوں میں شمع ایمان روشن ہو گئی اور انھوں نے ایمان و کفر کی حقیقت کو پالیا تو انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ ان کے اور فرعون کے درمیان ایسا نظریاتی اور اصولی اختلاف ہے، اور یہ کہ فرعون جو انتقامی کارروائی کی دھمکی دے رہا ہے وہ محض اس لیے دے رہا ہے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور ہم نے اللہ کو رب العالمین تسلیم کر لیا ہے۔ اور اس انداز میں ایمان لانا فرعون کے نظام حکومت کے لیے چیلنج ہے۔ اسی طرح فرعون کی حکومت کے اعلی ڈھانچے اور دستوری نظام کے لیے بھی یہ ایک چیلنج ہے۔ یعنی فرعون کا نظام ربوبیت جس بت پرستانہ تصورات پر قائم تھا وہ جڑ سے اکھڑ گئے تھے۔ جو شخص بھی رب العالمین وحدہ لاشریک کی طرف دعوت دیتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لے۔ اس لیے کہ اس ادراک ہی کی وجہ سے اہل ایمان کے لیے تمام مصائب و شدائد قابل

برداشت بن گئے۔اب وہ دار ورسن کے لیے تیار ہوگئے اس لیے کہ انھوں نے ایمان کا دعوی کردیا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ ان کا اور فرعون کا دین ان سے جدا ہے اس لیے کہ فرعون نے لوگوں کو غلام بنا کر اور اپنا قانون جاری کرکے اللہ کی رب العالمینی کا انکار کردیا ہے لہٰذا فرعون کافر ہے۔اس طرح ہر داعی کو یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ایمان کی طرف دعوت دے رہا ہے اور اس کی راہ میں روڑے اٹکانے والے کافر ہیں اور فرعونی نظام کے داعی ہیں۔اور یہ دشمنی محض (البغض فی اللہ) ہے۔اس کی تہ میں کوئی اور داعیہ، داعیہ ایمان کے سوا نہیں ہے۔

اس کے بعد اس منظر میں ہمیں نظر آتا ہے کہ ایمان کے سامنے پوری زندگی اور اس کی آسائشوں کی کوئی قیمت نہیں رہتی۔عزم وارادے کے سامنے رنج والم کے پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہوجاتے ہیں۔انسانی قوت شیطانی پر فتح یاب ہوتی ہے۔یہ ایک نہایت ہی فحت بخش اور حیران کن منظر ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اس منظر کی خوبصورتی کا بیان ممکن نہیں ہے۔خود نصوص قرآن ہی کو پڑھیے۔(تفسیر فی ظلال القرآن)

جادو گروں کا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے شکست کھا کر ایمان لانا:

اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی۔فرعون نے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے، سولی پر لٹکایا مگر وہ ان سے ان کا ایمان نہ چھین سکا وہ شہید ہوگئے مگر تاقیامت اہل ایمان کو جرات ایمانی کا درس دے گئے۔حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں یہ ستر جادو گر، دن کے آغاز میں جادو گر تھے اور دن کے آخر میں شہداء۔(ابن جریر طبری جلد 6 صفحہ 26) مروی ہے کہ وہ لوگ بوقت شہادت جنت میں اپنے گھر دیکھ رہے تھے۔(در منثور جلد 5 صفحہ 87) مطبوعہ بیروت)

معلوم ہوا نجات کا مدار حسن خاتمہ پر ہے:

جادو گروں نے اولاً اللہ کے رسول کا مقابلہ کیا بعد میں اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان پر فوت ہوگئے تو وارثان جنت بن گئے۔آج اہل تشیع حضرت عمر فاروق، ابو سفیان، امیر معاویہ، عمرو بن العاص اور خالد بن ولید (رض) کی وہ زندگی بطور طعن پیش کرتے ہیں جو اسلام سے قبل اسلام دشمنی میں گزری۔مگر جب وہ اسلام لے آئے اور اپنی زندگیاں دین اسلام کی ترویج واشاعت میں کھپادیں تو اب ان کو برا کہنا اپنا ایمان ضائع کرنے کے برابر ہے۔

حضرت عمرو بن العاص (رض) کہتے ہیں کہ جب میں اسلام لانے کے لیے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس حاضر ہوا تو میں نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہاتھ بڑھائیں میں آپ کے دست مبارک پہ بیعت اسلام کرنا چاہتا ہوں۔حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا، آپ نے فرمایا: یہ کیا؟ میں نے عرض کیا میں اس شرط پہ بیعت کرنا چاہتا ہوں کہ میرے تمام سابقہ گناہ (اسلام دشمن کاروائیاں) معاف کردیے جائیں۔نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

اماعلمت یا عمرو ان الاسلام یھدم ما قبلہ والھجرۃ ماکان قبلھا وان الحج یھدم ماکان قبلہ۔یعنی اسلام اپنے سے پہلے والے سارے گناہ مٹا دیتا ہے، ہجرت اپنے سے پہلے والے سب گناہوں کو مٹا دیتی ہے اور حج بھی اپنے سے قبل والے سارے گناہوں کو ختم کردیتا ہے۔(مسلم کتاب الایمان حدیث 192)

یہ حدیث شیعہ مورخ مرزا محمد تقی نے بھی "ناسخ التواریخ "حالات پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جلد صفحہ 333 حالات پیغمبر مطبوعہ تہران میں ذکر کی ہے۔کیا اہل تشیع کے لیے سابق جادو گروں کی ایمانی موت میں کوئی درس نصیحت نہیں ہے۔(تفسیر برہان القرآن)

غور کرنے کا مقام ہے کہ وہ لوگ جو کل تک بدترین کفر میں مبتلا تھے کہ فرعون جیسے بیہودہ انسان کو خدا مانتے تھے، اللہ تعالیٰ کی شان وعظمت سے بالکل ناآشنا تھے، ان میں یکبارگی ایسا انقلاب کیسے آگیا کہ اب پچھلے سب عقائد واعمال سے یکسر تائب ہو کر دین حق پر اتنے پختہ ہوگئے کہ اس کے لیے جان تک دینے کو تیار نظر آتے ہیں، اور دنیا سے رخصت ہونے کو اس لیے پسند کرتے ہیں کہ اپنے رب کے پاس چلے جائیں۔اور صرف یہی نہیں کہ ایمان کی قوت اور جہاد فی سبیل اللہ کی ہمت ان میں پیدا ہوگئی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی علم ومعرفت کے دروازے ان پر کھل گئے تھے یہی وجہ ہے کہ فرعون کے مقابلہ میں اس جرات مندانہ بیان کے ساتھ یہ دعا بھی کرنے لگے۔رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ۔یعنی اے ہمارے پروردگار ہمیں کامل صبر عطا فرما اور مسلمان ہونے کی حالت میں ہمیں وفات دے۔اس میں اشارہ اس معرفت کی طرف ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو انسان کا عزم وہمت کچھ کام نہیں آتا، اس لیے اسی سے ثابت قدمی کی دعا کی گئی۔اور یہ دعا جیسے معرفت حق کا ثمرہ اور نتیجہ ہے اسی طرح اس مشکل کے حل کا بہترین ذریعہ بھی ہے جس میں یہ لوگ اس وقت مبتلا تھے، کیونکہ صبر اور ثابت قدمی ہی وہ چیز ہے جو انسان کو اپنے حریف کے مقابلہ میں کامیاب کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

یورپ کی پچھلی جنگ عظیم کے اسباب و نتائج پر غور کرنے والے کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ مسلمان جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں، یہی وہ قوم ہے جو میدان جنگ میں سب سے زیادہ بہادر اور مصیبت ومشقت پر صبر کرنے میں سب سے آگے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت جرمنی اقوام میں فنون حرب کے ماہرین اس کی تاکید کرتے تھے کہ فوج میں دینداری اور خوف آخرت پیدا کرنے کی سعی کی جائے کیونکہ اس سے جو قوت حاصل ہوتی ہے وہ کسی دوسری چیز سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ (تفسیر المنار) (تفسیر معارف القرآن)

ساحروں میں ایمانی انقلاب :

افسوس ہے کہ آج مسلمان اور مسلم حکومتیں اپنے آپ کو قوی بنانے کے لیے ساری ہی تدبیریں اختیار کر رہے ہیں مگر اس گر کو بھول بیٹھے ہیں جو قوت اور وحدت کی روح ہے۔ فرعونی جادوگروں نے بھی اول مرحلہ میں اس کو سمجھ لیا تھا، اور عمر بھر کے خدا ناشناس منکر کافروں کو دم بھر میں نہ فقط مسلمان بلکہ ایک عارف کامل اور مجاہد وغازی بنا دینے کا یہ معجزہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے معجزہ عصا اور ید بیضاء سے کچھ کم نہ تھا۔ (تفسیر گلدستہ)

یاد رہے خاتمہ بالخیر کی دعا کرتے رہنا خاص شیوہ مومنین ہے۔ (آیت) "ربنا افرغ علینا صبرا"۔ یعنی ہم کو صبر سے اتنا بہرہ ور کر کہ ہم ہر سختی پر ثابت قدم رہیں۔ باوجود کمال عزم وہمت اپنے عزم وہمت پر تکیہ نہ کرنا اور اللہ ہی سے مدد چاہے جانا خاص شعار مومنین ہے۔ (تفسیر ماجدی)

آیت مبارکہ:

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ○۱۲۷

لغۃ القرآن: [وَقَالَ : اور کہا] [الْمَلَاُ : سرداروں نے] [مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ : فرعون کی قوم میں سے] [اَ : کیا] [تَذَرُ : تو نے چھوڑ رکھا ہے [مُوْسٰي : موسیٰ کو] [وَقَوْمَهٗ : اور اس کی قوم کو] [لِيُفْسِدُوْا : کہ وہ لوگ نظم بگاڑیں] [فِي الْاَرْضِ : زمین میں] [وَيَذَرَكَ : اور (تاکہ) وہ چھوڑ دے تجھ کو] [وَاٰلِهَتَكَ : اور تیرے معبودوں کو] [قَالَ : اس نے کہا] [سَنُقَتِّلُ : ہم قتل کرتے رہیں گے] [اَبْنَآءَهُمْ : ان کے بیٹوں کو] [وَنَسْتَحْيٖ : اور زندہ رکھیں گے] [نِسَآءَهُمْ : ان کی عورتوں کو] [وَاِنَّا : اور یقینا ہم] [فَوْقَهُمْ : ان کے اوپر] [قٰهِرُوْنَ : پوری طرح قابو یافتہ ہیں]

ترجمہ: اور قوم فرعون کے سرداروں نے (فرعون سے) کہا: کیا تو موسیٰ اور اس کی (اِنقلاب پسند) قوم کو چھوڑ دے گا کہ وہ ملک میں فساد پھیلائیں اور (پھر کیا) وہ تجھ کو اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دیں گے؟ اس نے کہا: (نہیں) اب ہم ان کے لڑکوں کو قتل کر دیں گے (تاکہ ان کی مردانہ افرادی قوت ختم ہو جائے) اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے (تاکہ ان سے زیادتی کی جاسکے)، اور بیشک ہم ان پر غالب ہیں

تشریح:

فرعون اپنے آپ کو سب سے بڑا رب کہلاتا تھا۔ مصر میں وہ براہ راست اپنی عبادت کراتا اور دوسرے علاقوں میں اپنے نام کے بت بنوا رکھے تھے جن کی عبادت کی جاتی جبکہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے لوگوں کو بتایا کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ اب قوم فرعون کے نزدیک فرعون کی عبادت سے انکار کرنا ملک میں فساد برپا کرنے کے مترادف تھا، چنانچہ انھوں نے فرعون کو موسیٰ (علیہ السلام) کے خلاف بھڑکایا کہ تم موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی قوم کو کنٹرول کرو۔ ورنہ تو تجھے رب سمجھتے ہیں اور نہ ہی تیرے نام پر بنائے ہوئے بتوں کو اور لوگوں کو تمہارے خلاف اکساتے ہیں، للذا یہ

لوگ تیرے اقتدار کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں، مگر فرعون حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے معجزہ کو دیکھ کر بہت زیادہ خوفزدہ ہو گیا تھا، اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے براہ راست ٹکر لی تو اس کا عصا اژدھا بن کر اس کو کھا جائے گا، تاہم اس نے اپنی قوم کے سرداروں کو اعتماد میں رکھنے کے لیے انھیں جواب دیا کہ آپ فکر نہ کریں ہم نے بنی اسرائیل کو ختم کرنے کے لیے پوری منصوبہ بندی کر لی ہے۔ ہم بہت جلد ان کے بیٹوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رہنے دیں گے، اس طرح ان کی نسل خود بخود ختم ہو جائے گی۔ (تفسیر امداد الکرم)

جادو گروں کی شہادت کے بعد بنی اسرائیل میں ایمانی جوش و خروش پیدا ہوا جس سے قوم فرعون سراسیمہ ہو گئی، وہ فرعون سے کہنے لگے اے بادشاہ! کیا تم موسیٰ اور اس کی قوم کو کھلی چھٹی دیے رکھو گے تاکہ وہ زمین میں فساد کریں اور تمھیں اور تمہارے خداؤں کی پرستش چھوڑے رکھیں؟

حضرت زجاج فرماتے ہیں فرعون نے اپنی شکل پر بت بنا کر اپنی مملکت میں پھیلا رکھے تھے تاکہ انھیں سجدہ کیا جائے۔ لفظ وَالِهَتَكَ (تمہارے خداؤں) میں انہی بتوں کی طرف اشارہ ہے۔ (قرطبی جلد 7 صفحہ 262)۔ فرعون نے جواب دیا ہم بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل اور ان کی بچیوں سے اجتناب کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیں گے کیونکہ ہم ان پر ہر طرح غالب ہیں۔

اہل ایمان ہمیشہ سے کفار کی دہشت گردی کا شکار رہے ہیں:

فرعون نے بنی اسرائیل کو ظلم کے ذریعے ان کے دین سے ہٹانا چاہا اور ہمیشہ ہر نبی کے دور میں اہل ایمان ایسے مظالم کا شکار رہے اور الٹا ظلم کرنے والے انھیں فسادی کہتے تھے۔ جیسے فرعونیوں نے بنی اسرائیل کے بارہ میں کہا: لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ۔ کہ یہ زمین فساد کرتے ہیں۔ آج امریکہ بھی یہی کر رہا ہے، مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دے کر عراق وافغانستان میں ان کے کون سے ہولی کھیل رہا اور ایران پر حملہ آوری کے لیے پر تول رہا ہے اور پاکستان میں ڈرون حملوں کے ذریعہ اب تک ہزاروں مسلمانوں کو خاک وخون میں نہلا چکا ہے۔

حالانکہ سب سے بڑا دہشت گرد وہ خود ہے۔ مگر یہ دہشت ہمیشہ نہیں چلے گی۔ حضرت علی المرتضیٰ (رض) کا مشہور قول ہے کہ کوئی قوم کفر کر کے زندہ رہ سکتی ہے مگر ظلم کر کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ فرعون نے سمجھا کہ وہ مسلمانوں کو دہشت گرد اور فسادی قرار دے کر ان کے خون سے ہمیشہ ہولی کھیلتا رہے گا، مگر ایسا نہ ہوا نہ ہوتا ہے۔ بالآخر وہ شکنجۂ قدرت میں ایسا آیا کہ نشان عبرت بن گیا اور ہر دور کے فرعون کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

فرعون کے معبود کی تفسیر میں اقوال:

فرعون کی قوم نے جب دیکھا کہ فرعون نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو گرفتار کیا نہ ان کو کوئی سزا دی تو انھوں نے یہ کہا: کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو زمین فساد کرنے کے لیے چھوڑ دے گا، تاکہ وہ تجھ کو اور تیرے معبودوں کو چھوڑے رہیں، فرعون نے حضرت موسیٰ سے اس لیے کوئی تعرض نہیں کیا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے معجزہ کو دیکھ کر بہت زیادہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس کو ڈر تھا کہ اگر حضرت موسیٰ نے اس پر عصا چھوڑ دیا تو وہ اژدہا بن کر اس کو کھا جائے گا۔ تاہم اس نے اپنا بھرم رکھنے کے لیے قوم کو جواب دیا کہ ہم عنقریب ان کے بیٹوں کو قتل کر دیں گے اور بیٹیوں کو چھوڑ دیں گے، گویا موجودہ نسل کے ختم ہونے کے بعد بنو اسرائیل کی صرف عورتیں رہ جائیں گی اور عورتوں سے تمھیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ گویا کہ یہ ایک طویل المیعاد منصوبہ تھا۔ اور اس سے وقتی طور پر قبطیوں کو تسلی دینا مقصود تھی۔

قبطیوں نے کہا تھا تاکہ وہ تجھ کو اور تیرے معبودوں کو چھوڑے رہیں۔ فرعون کے معبود کی تفسیر میں حسب ذیل اقوال ہیں:

1۔ فرعون نے اپنی قوم کے لیے چھوٹے چھوٹے بت بنا رکھے تھے اور اس نے اپنی قوم کو ان کی عبادت کرنے کا حکم دیا تھا اور خود کو وہ کہتا تھا کہ میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔ اور ان بتوں کا بھی رب ہوں۔

2۔ حسن بصری نے کہا: فرعون خود بھی بتوں کی عبادت کرتا تھا۔

3۔ امام رازی نے فرمایا کہ فرعون ستاروں کی تاثیر کا قائل تھا اور اس نے ستاروں کی صورتوں کے بت بنا رکھے تھے اور وہ خود بھی ان کی عبادت کرتا تھا اور قوم سے بھی ان کی عبادت کراتا تھا۔

4۔ امام ابن جریر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ فرعون کی ایک گائے تھی، جس کی اس کی قوم عبادت کرتی تھی اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب بھی وہ کوئی خوب صورت گائے دیکھتے تو فرعون اس کی عبادت کا حکم دیتا تھا۔ (تفسیر تبیان القرآن)

علماء مفسرین فرماتے ہیں کہ فرعونی سرداروں کے کہنے اور مشورہ جاری کرنے پر فرعون نے بنی اسرائیل، کے بارے میں تو یہ ضرور کہا کہ ان کے مردوں کو قتل کرتے رہیں گے، اور عورتوں کو باندیاں بنا کر اپنی خدمت کے لیے زندہ رہنے دیں گے، مگر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) و حضرت ہارون کے بارے میں اس مرحلہ پر بھی کچھ نہیں کہا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس غیر معمولی واقعہ نے فرعون کے ہوش و حواس پر اتنا اثر ڈالا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے نام لینے سے بھی خوف و گھبراہٹ محسوس کرتا تھا، وہ نہایت حواس باختہ، اور خوفزدہ تھا اسے یقین ہوچکا تھا کہ اس پر ہاتھ ڈالنے سے میری تباہی اور ہلاکت میرے مقدر میں ہوگی (چنانچہ ایسا ہی ہوگیا)

حضرت سعید بن جبیر (رح) فرماتے ہیں کہ فرعون کا یہ حال ہوگیا تھا کہ وہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو دیکھتا تو اس کا پیشاب خطا ہوجاتا تھا، اور یہ بالکل صحیح ہے، ہیبت حق کا یہی حال ہوتا ہے۔ (مظہری، ابن کثیر، معارف القرآن)

خلاصہ یہ ہے کہ فرعون نے جب جادو گروں کا دھمکی دی کہ تمہاری وجہ سے مجھے خفت ہوئی، اور میری خدائی لوگوں میں شرمندہ اور بدنام ہوئی، جب اس کا علم اس کے درباریوں کو ہوگیا تو وہ بطور خوشامد اور چاپلوسی فرعون سے کہا کیا تو موسیٰ (علیہ السلام) اور اس کی قوم کے (جو اس کے ماننے والے ہیں، خواہ بنی اسرائیل میں سے ہوں، خواہ جادوگر ہوں، خواہ وہ لوگ ہوں جو قوم فرعون میں سے مسلمان ہوگئے تھے) اسی طرح چھوڑے رکھے گا کہ وہ زمین میں بدامنی پھیلائیں، اور فساد کرتے رہیں، اور تیری خدائی کا مذاق اڑائیں، تیرے معبودوں کو باطل اور ناپاک کہتے رہیں۔ پہلے یہ شخص اکیلا تھا، اس کا مقابلہ آسان تھا، اور اب اس کے دین و مذہب کی جڑیں ایک حد تک مضبوط ہوچکیں، ہوسکتا ہے آئندہ اس کا مقابلہ ہمارے لیے مشکل ہو۔

تو فرعون نے انہیں تسلی دی کہ ان کی قوت پر ضرب لگائیں گے، ان کے لڑکوں کو حسب سابق مار ڈالیں گے، اور بچیوں کو اپنی قومی خدمت کے لیے زندہ رکھ چھوڑیں گے، یہاں تک کہ وہ مفلوج رہیں گے، اور کبھی بھی ہمارا مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔ فرعون خود کو انا ربکم الاعلی تو کہتا تھا، لیکن اپنے لیے معبود تجویز کر رکھے تھے، جن کی وہ عبادت کیا کرتا تھا۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کا یہ اعتقاد تھا کہ ستارے عالم سفلی کے مربی ہیں، اور وہ خود عالم ارضی یعنی نوع انسانی وغیرہ کا رب ہے۔ بعض علماء کرام نے یہ بھی کہا ہے کہ فرعون نے اپنی قوم کے لیے اپنے مجسمے بنا کر رکھے تھے کہ پورے ملک میں جہاں کہیں تم ہو میرے مجسمے کے ذریعہ میری پوجا کیا کرو۔ بنی اسرائیل اور نو مسلم لوگوں کو سخت پریشانی میں دیکھ کر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے انہیں کامیابی کے وہ بہترین آسمانی نسخے بتائے کہ ان پر عمل کرنے سے تمام مصائب اور پریشانیاں دور ہوجاتی ہیں، یعنی غمی و خوشی ہر حال میں اللہ تعالیٰ شانہ سے نصرت و مدد، اور استعانت طلب کرنا، اور مصائب و بلیات پر صبر کرکے ثابت قدم رہنا۔ یہ دونوں اعلیٰ درجے کے آسمانی نسخے ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ عزشانہ نے حضرات انبیاء (علیہم السلام) پر اتارا، اور انہیں عمل کرنے کا حکم عنایت فرمایا، اب بھی اگر کوئی ان پر عمل کرے تو کامیابی کو اپنے گھر کی دہلیز پر موجود پائے گا۔ ان شاء اللہ۔ (تفسیر منازل العرفان)

فرعون نے چار سو برس کی عمر پائی۔ تین سو بیس برس تو ایسی عیش و عشرت میں گزارے کہ اس مدت میں کبھی اس کے درد سر بھی نہ ہوا۔ اب ان پر قحط سالی مسلط ہوئی تاکہ اس سے خوفزدہ ہو کر یاد خدا کریں لیکن وہ کفر میں اس قدر راسخ ہوچکے تھے کہ ان سے بھی ان کی سرکشی میں کمی نہ آئی۔ بقیہ حال آئندہ رکوع میں مذکور ہے۔ (تفسیر الحسنات)

فوائد

۱: کیونکہ جادو گروں کے سجدہ میں گر جانے سے چھ لاکھ آدمی ایمان لے آئے، تو یہ سردار گھبرا کر کہنے لگے، موسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کیوں نہیں کرتا۔

۲: فرعون کے دربار میں آنے والے، خود فرعون کی پوجا کرتے تھے۔ اور دور رہنے والوں کے لیے فرعون کے نام پر پتھر، لکڑی وغیرہ کے بت بنوا دیئے گئے تھے، جن کی وہ پوجا کرتے تھے۔ الھتک سے یہی مراد ہے۔

۳: نساء عربی میں جوان لڑکی پر بولا جاتا ہے مگر یہاں چھوتی لڑکیوں پر نساء بولا گیا۔ کیونکہ وہ آئندہ نساء بننے والی تھیں۔ مجازاً انھیں نساء بولا گیا۔ جیسے طالب علم کو عالم کہہ دیتے ہیں۔

۴: یعنی ہماری برتری اور بنی اسرائیل سے بہتر ہونے میں کچھ شک نہیں۔ یہ محض منہ سے کہتے تھے۔ مگر ان کے دل دھڑکتے تھے۔
۵: اس سے پتہ لگا کہ فرعون پر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا رعب چھا گیا تھا۔ اسی لیے آپ سے کچھ تعرض نہ کیا بلکہ آپ کی قوم کے بچوں پر ظلم ڈھاتا رہا۔ (نور العرفان)

آیت مبارکہ:

قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۭ قَالَ عَسٰي رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ○۱۲۹ۧ

لغۃ القرآن: [قَالُوْٓا : انہوں نے کہا] [اُوْذِيْنَا : اذیت دی گئی ہم کو] [مِنْ قَبْلِ : اس سے پہلے] [اَنْ : کہ] [تَاْتِيَنَا : آپ آئے ہمارے پاس] [وَمِنْۢ بَعْدِ : اور اس کے بعد] [مَا : جب] [جِئْتَنَا : آپ آئے ہمارے پاس] [قَالَ : انہوں نے کہا] [عَسٰي : امید ہے] [رَبُّكُمْ : تمہارے رب (سے)] [اَنْ : کہ] [يُّهْلِكَ : وہ ہلاک کرے] [عَدُوَّكُمْ : تمہارے دشمن کو] [وَيَسْتَخْلِفَكُمْ : اور جانشین بنائے تم کو] [فِي الْاَرْضِ : زمین میں] [فَيَنْظُرَ : تو پھر وہ دیکھے] [كَيْفَ : کیسے] [تَعْمَلُوْنَ : تم لوگ عمل کرتے ہو]

ترجمہ: لوگ کہنے لگے: (اے موسیٰ!) ہمیں تو آپ کے ہمارے پاس آنے سے پہلے بھی اذیتیں پہنچائی گئیں اور آپ کے ہمارے پاس آنے کے بعد بھی (گویا ہم دونوں طرح مارے گئے، ہماری مصیبت کب دور ہوگی؟) موسیٰ (علیہ السلام) نے (اپنی قوم کو تسلی دیتے ہوئے) فرمایا: قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور (اس کے بعد) زمین (کی سلطنت) میں تمہیں جانشین بنا دے پھر وہ دیکھے کہ تم (اقتدار میں آکر) کیسے عمل کرتے ہو

تشریح:

بنی اسرائیل کو جب پتہ چلا کہ فرعون دوبارہ ان کے بیٹوں کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ گھبرا کر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے کہنے لگے: آپ (علیہ السلام) کے آنے سے پہلے بھی ہمارے بیٹوں کو قتل کرکے ہمیں تنگ کیا گیا اب آپ (علیہ السلام) کے آنے کے بعد پھر ہمارے بیٹوں کو قتل کرنے کی منصوبہ بندی ہو رہی ہے تو اب ہم کیا کریں۔ ہمارے یہ مصائب کب ختم ہوں گے؟ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: گھبرائیں نہیں، زمین کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، یہ فرعونی ہمیشہ حکمران نہیں رہیں گے، تم صبر کرو اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو۔ عنقریب اللہ تعالیٰ فرعون اور اس کی فوجوں کو ہلاک کرنے والا اور تمہیں اس ملک کا وارث بنا دے گا، لیکن یاد رکھنا وہ تمہاری آزمائش کا نیا دور ہوگا۔ اب تو اللہ تعالیٰ تمہیں غلامی اور غربت دے کر آزما رہا ہے، پھر تمہیں آزادی اور حکومت دے کر آزمائے گا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف وہی لوگ سرخرو ہوں گے جو مصائب میں صابر اور آسائش میں شاکر رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا یعنی فرعون کو غرق کر دیا اور قبطیوں کی سرزمین کا بنی اسرائیل کو مالک بنا دیا۔ یہ سورت مکی ہے اور مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کی حالت بھی کچھ اس طرح کی تھی، ایک طرف مشرکین مکہ کے مظالم تھے اور دوسری طرف فتح و نصرت کے وعدے تھے جو بالآخر فتح مکہ کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ (تفسیر امداد الکرم)
اب ہم کریں تو کیا کریں۔ جائیں تو کہاں جائیں؟

چنانچہ موسیٰ (علیہ السلام) کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ پورے ہوئے اور چند ہی برسوں بعد فرعون کو ساری قوم سمیت غرق کرکے بنی اسرائیل کو مصر پر حکومت عطا فرمائی گئی اور اللہ اپنے نیک بندوں کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کی قدر فرماتا ہے۔ اسی لئے حدیث مبارکہ میں ہے کہ "کی خبار آلود پراگندہ بالوں والے لوگ (اللہ کے ہاں اس قدر معزز ہوتے ہیں کہ) اگر کسی بات پر قسم اٹھالیں (کہ ایسا ہی ہوگا) تو اللہ تعالیٰ اسی طرح کر دیتا ہے"۔ (مسلم کتاب البر حدیث 138) (تفسیر برہان القرآن)

موسیٰ (علیہ السلام) نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کو ہلاک کردے گا اور حکومت واقتدار تمہیں بخش دیا جائے گا۔

بڑا ہی غور طلب جملہ ہے یعنی تمہیں حکومت واقتدار عطا فرمانے کے بعد وہ دیکھے گا کہ تم کہاں تک اس کی اطاعت وفرمان برداری کرتے ہو اور عدل وانصاف کے تقاضوں کو کہاں تک پورا کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ ہر قوم کو موقع دیتا ہے کہ وہ قوت واختیار کی مسند پر بیٹھ کر یہ ثابت کرے کہ کیا وہ اس کی اہل ہے یا نہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے علم غیب کی دلیل:

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو غیب کا علم دیا تھا کہ آئندہ پیش آنے والے واقعات بلا کم وکاست بیان فرمادیئے اور جیسا آپ (علیہ السلام) نے فرمایا تھا ویسا ہی ہوا کہ فرعون اپنی قوم کے ساتھ ہلاک کردیا گیا اور بنی اسرائیل ملک مصر کے مالک ہوئے۔ (تفسیر صراط الجنان)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اپنی قوم کو یہ سمجھا رہے ہیں کہ دنیا میں قوموں کے اوپر سختی اور نرمی، مصیبت اور راحت، قوت اور ضعف سبھی قسم کے حالات آتے ہیں اور ہر ایک میں انسان کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ انسان وہی ہے کہ ہر حالت میں اللہ کو پہچانے اور اس سے اپنا تعلق مضبوط کرے اور دنیا کی راحت وآرام مصیبت و آلام کو آنی جانی چیز سمجھے نا راحت من اللہ کو بھولے اور نا مصیبت میں اس کی یاد سے غافل ہو۔

بنی اسرائیل کے قصہ سے عبرت:

انسان کی سب سے زیادہ قابل اعتراض حیوانی خصلت یہ ہے کہ وہ دوسروں کو دبا کر رکھنا چاہتا ہے۔ اتفاق سے اگر کسی کو ایسے اسباب میسر آجائیں تو پھر وہ اپنے آپکو کیا سے کیا سمجھنے لگتا ہے فقط یہی نہیں کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا بلکہ وہ ان کو ذلیل کرکے اپنی مرضی کا تابع اور غلام بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ اللہ کی طرف سے رسول اس کے سمجھانے کے واسطے بھیجے جاتے ہیں جو اسے دنیا میں اونچ نیچ کا راز سمجھانا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آدمی کو اللہ نے قوت اور ضعف مختلف بنایا ہے سب کے حالات ایک سے نہیں رکھے اس سے وہ انسان کا امتحان لینا چاہتا ہے کہ قوت والا اپنی قوت سے کیا کام لیتا ہے اور کمزوروں کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے۔ مغرور لوگ رسولوں کا کہنا نہیں مانتے اور تباہ ہوتے ہیں لیکن ان کے بعد بھی ویسے ہی مغرور لوگ پیدا ہو جاتے ہیں اور جو پہلو نے کیا تھا وہی کرنے لگتے ہیں۔ انسانی ظلم وستم کا سب سے بڑا شکار غالبا بنی اسرائیل تھے۔ فرعون اپنی دولت اور اپنے مددگاروں کے بل پر ان کو طرح طرح کی اذیتیں دیتا تھا۔ اس کو گھمنڈ تھا کہ مجھ سے بڑھ کر طاقت اور قوت والا کوئی نہیں جو مجھے روکے۔ میں جو چاہے کروں مجھے کوئی ٹیڑھی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اس کی سرکشی کو ختم کرنے کے لیے تشریف لائے اور اس کو نیچا دکھایا۔

قرآن مجید میں یہ قصہ اللہ عزوجل نے ہر زمانے کے لوگوں کو سمجھانے کے لیے ذکر کیا ہے جس سے زبردست و کو سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی زبردستی ہمیشہ نہیں چلے گی اور ان کو یقیناً ایک نا ایک دن نیچے دیکھنا پڑے گا اور زیردستوں کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ اگر انھوں نے صبر سے کام لیا اور اللہ سے التجا کرتے رہے تو ان کو ضرور ظالموں کے پنجے سے رہائی حاصل ہوگی اور ان کو زبردست سے ان کی طاقت چھین کردے دی جائے گی تاکہ ان کو بھی آزمایا جائے کہ اب وہ اپنی قوت اور طاقت کو کس طرح کام میں لاتے ہیں اور پہلو کے عبرتناک انجام سے کیا سبق سیکھتے ہیں۔

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی اس وقت وہاں کی حالت کچھ ایسی ہی تھی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کہنا ماننے والوں پر کفار مکہ ظلم وستم ڈھا رہے تھے اور اہل اسلام بڑی بڑی اذیتوں کا شکار ہو رہے تھے قرآن مجید کے مؤثر الفاظ کا ان کے دل پر گہرا اثر ہوا اور انھیں یقین کامل ہو گیا کہ ہمارے ستانے والے ایک دن تباہ ہوں گے اور ان کی ساری اکڑفوں ختم ہو جائے گی اور اللہ اپنے فضل و کرم سے ہمیں ان پر غالب کرے گا اور ان کو نیچا دکھائے گا۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا بنی اسرائیل سے کہنا کے صبر کرو عنقریب اللہ عزوجل تمہارے دشمنوں کو تباہ کرکے تمہیں ان کی جگہ بٹھانے والا ہے اور پھر دیکھے گا کہ تم اپنی باری میں کسطرح کے لوگ ثابت ہوتے ہو مکہ کے مسلمانوں کے لیے پیغام میں مسرت تھا اور گویا ان کو پہلے ہی سے اس بات پر آمادہ کر رہا تھا کہ عنقریب کفار پر فتح دے کر اللہ ان کا امتحان لینے والا ہے۔ چنانچہ انھوں نے دل میں پختہ ارادہ کرلیا کہ ہم اپنے حقوق کو کمزوروں کے دبانے کے لیے نہیں بلکہ ان کی ہر طرح سے مدد کرنے کے لیے کام میں لائیں گے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اہل اسلام نے اپنے اس آدم کو پورا کر دکھایا۔ کمزور و ناتوان کی بدولت قوی اور توانا ہو گئے اور ظالموں نے ان کے سامنے ہر جگہ ہتھیار ڈال دیے لیکن افسوس کے آگے چل کر ان میں بھی ایسے لوگ پیدا ہونے لگے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو بھلا کر دوسروں پر زیادتی کی اور نتیجتاً انھوں نے بھی اس کی سزا پائی۔ (تفسیر درس قرآن آسٹریلیا)

آیت مبارکہ:

فَاِذَا جَآءَتۡهُمُ الۡحَسَنَةُ قَالُوۡا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوۡا بِمُوۡسٰى وَمَنۡ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝۱۳۱

لغۃ القرآن: [فَاِذَا : پھر جب بھی] [جَآءَتۡهُمُ : آتی ہے ان کے پاس] [الۡحَسَنَةُ : بھلائی] [قَالُوۡا : تو وہ لوگ کہتے ہیں] [لَنَا : ہمارے لیے ہے] [هٰذِهٖ : یہ] [وَاِنۡ : اور اگر] [تُصِبۡهُمۡ : آن لگتی ہے ان کو] [سَيِّئَةٌ: کوئی برائی] [يَّطَّيَّرُوۡا : تو وہ لوگ منحوس گردانتے ہیں] [بِمُوۡسٰي : موسیٰ کو] [وَمَنۡ : اور ان کو جو] [مَّعَهٗ : ان کے ساتھ ہیں] [اَلَاۤ : سن لو] [اِنَّمَا : کچھ نہیں سوائے اس کے کہ] [طٰٓئِرُهُمۡ : ان کی نحوست] [عِنۡدَ اللّٰهِ : اللہ کے پاس (سے) ہے] [وَلٰـكِنَّ : اور لیکن] [اَكۡثَرَهُمۡ : ان کے اکثر] [لَا يَعۡلَمُوۡنَ : جانتے نہیں ہیں]

ترجمہ: پھر جب انھیں آسائش پہنچتی تو کہتے : یہ ہماری اپنی وجہ سے ہے۔ اور اگر انھیں سختی پہنچتی، وہ موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے (ایمان والے) ساتھیوں کی نسبت بدشگونی کرتے، خبردار! ان کا شگون (یعنی شامت اعمال) تو اللہ ہی کے پاس ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ علم نہیں رکھتے

تشریح: فرعون کو بار بار قحط سالی اور پیداوار کی کمی کے جھٹکے دیئے گئے جبکہ اتصالی ختم ہوتی اور پیداوار بڑھنے لگتی تو وہ کہتے یہ ہمارا حق ہے ہم نے محنت کے ساتھ کھیتی باڑی کی تو زمین سے غلہ و اناج اگایا اور جب بارش بند اور پیداوار کم ہو جاتی تو کہتے جب سے موسیٰ ہمارے درمیان آیا ہے ہم مصائب کا شکار ہو گئے ہیں۔ گویا انھوں نے نعمت کے ملنے پر اللہ کا شکر ادا کرتے نہ مصیبت کے آنے پر اللہ کے حضور گڑگڑاتے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا موسیٰ (علیہ السلام) سے بدشگونی لینے کی کیا ضرورت ہے۔ ہر انسان کی قسمت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔

معلوم ہوا کہ راحت میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہ کرنا اور مصیبت میں اللہ کی طرف رجوع نہ کرنا کفار کا طریقہ ہے۔ فرعونی قوم کے مذکورہ حالی بد سے یہ درس ملتا ہے کہ مومن کو چاہیے کہ وہ راحت میں اللہ کا شکر بجالائے، وہ نعمت کو اللہ کی عطا جانے، اپنا حق نہ سمجھے اور مصیبت میں اپنے کردار پر غور کرے اور گناہوں کی معافی مانگے۔ (تفسیر برہان القرآن)

جب انسانی فطرت جادہ مستقیم سے منحرف ہو جاتی ہے تو اسے نظر نہیں آتا کہ اس کائنات کو دست قدرت چلا رہا ہے۔ ان کو اللہ کا نظام قضا و قدر نظر نہیں آتا جس کے تحت تمام چیزیں پیدا ہو رہی ہیں اور تمام واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ جب یہ فطرت اس حد تک خراب ہو جائے تو پھر وہ اس کائنات میں پائے جانے والے نوامیس قدرت کا ادراک نہیں کر سکتی۔ حالانکہ یہ قوانین قدرت مستقلاً یہاں رواں دواں ہیں۔ ایسے لوگ پھر کائنات کے واقعات کی تفسیر اور تشریح انفرادی واقعہ کے طور پر

کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں خیال کرتے کہ اس واقعہ کا کسی کلی اصول کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ ایسے لوگ دفتر خرافات لیے ہوئے بے آب وگیاہ وادیوں میں سر گرداں پھرتے رہتے ہیں۔ کسی اصول پر متفق نہیں ہوتے اور یہ کسی ایک راہ ورسم کے قائل نہیں ہوتے، ان کی سوچ منطقی نہیں ہوتی۔ خروشیف جیسے لوگ بھی یہ کہتے ہیں کہ "طبیعت" ہمارے خلاف جارہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ مادہ کس طرح ان کے خلاف جارہا ہے۔ لیکن وہ (فعال لما یرید) کا قائل ہی نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ بعض لوگ اصول الدین کا انکار کرتے ہوئے اور خدا اور خدا کی غیبی قدرت کا انکار کرکے بھی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

بجائے اس کے کہ وہ کچھ عبرت حاصل کرتے الٹا انھیں موسیٰ (علیہ السلام) کو ستانے کا ایک اور بہانہ ہاتھ آگیا۔ اگر انھیں راحت وآرام ہوتا تو کہتے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہم راہ راست پر ہیں۔ اور اگر تکلیف کا سامنا ہوتا تو کہتے کہ یہ موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی شامت اعمال ہے اور ان کی نحوست کا نتیجہ ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

اہل جاہلیت کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی تھی کہ اس کائنات میں سنت الٰہیہ جاری ہے اور قدرت کے بعض ضوابط کے مطابق یہاں واقعات رونما ہوتے ہیں، وہ ظاہری حالات کو دیکھ کر اور بت پرستی کے زیر اثر بعض عجیب توہمات پر یقین رکھتے تھے۔ اگر کوئی شخص کسی کام کا ارادہ کرتا تو کسی پرندے کے گھونسلے کے قریب جاتا اور گھونسلے سے پرندے کو اڑاتا۔ اگر پرندہ اس کے دائیں جانب سے اڑتا تو اسے "سانح" کہتے۔ اس سے وہ خوش ہوتے اور اس کام کو کر گزرتے۔ اگر پرندہ بائیں جانب سے اڑتا تو اسے وہ "بارح" کہتے اور اسے بدشگونی سمجھ کر اس کام سے باز آجاتے۔ تو اسلام نے اس خرافاتی سوچ کو کالعدم کردیا۔ اور اس کی جگہ غور وفکر کا سائنٹیفک انداز دیا۔ اور نتائج کو اللہ کے سنن جاریہ پر چھوڑ دیا کہ نتائج جو بھی نکلیں گے وہ اللہ کے نظام قضا وقدر کے مطابق ظاہر ہوں گے۔ اسلام نے تمام معاملات کو سائنسی اور علمی انداز پر چھوڑ دیا جس میں اہمیت انسان کے ارادے اور اس کی نیت، اس کی حرکت اور اس کی جدوجہد کو دی گئی۔ اور اللہ کے دائرہ قضا وقدر پر اللہ کی مشیت محیط ہے۔

(اَلَآ اِنَّمَا طٰۗىِٕرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ) "حالانکہ درحقیقت ان کی فال بد تو اللہ کے پاس تھی، مگر ان میں سے اکثر بے علم تھے"

اس دنیا میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں۔ ان کا سبب واحد یہ ہے کہ یہ اللہ کے حکم سے واقع ہوتے ہیں اور اللہ ہی کے ہاں سے ان کو اچھی بات نصیب ہوتی ہے جس میں ان کے لیے آزمائش ہے اور اللہ ہی کی طرف سے ان پر مصائب آتے ہیں اور یہ بھی آزمائش کے لیے ہیں۔ ونبلوکم بالشر والخیر فتنۃ والینا ترجعون "اور ہم خیر وشر میں مبتلا کرکے انھیں آزمائیں گے اور یہ آزمائش بڑا فتنہ ہے اور تم ہماری جانب لوٹوگے" انسان پر جو مشکلات آتی ہیں وہ اس کی شامت اعمال ہیں لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے اور اکثر تو ایسے ہیں جو سرے سے تقدیر الٰہی کے قائل ہی نہیں ہیں وہ اپنے نظریات کا اظہار سائنٹیف سوچ کے لفظ سے کرتے ہیں اور بعض اسے "قدرت کا عدم تعاون" کہتے ہیں مثلاً اشتراکی لوگ لیکن یہ سب حضرات حقیقت سے جاہل اور لاعلم ہیں۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

زمانہ جاہلیت میں اہل عرب اکثر پرندوں، جانوروں، آوازوں اور مختلف چیزوں سے بدشگونی لیتے، مثلاً جب وہ کسی اہم کام کے لیے گھر سے نکلتے اگر بائیں طرف پرندہ اڑتا دیکھتے تو اس کو بدشگونی سمجھتے یعنی جس کام کے لیے وہ جارہے ہیں اس میں کامیاب نہیں ہوں گے، لہٰذا وہ واپس گھر لوٹ آتے۔ یہ ایک قسم کا شرک ہے کیونکہ وہ اپنے نفع یا نقصان میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور چیز کو مستقل مؤثر کی حیثیت دے رہے ہیں حالانکہ کارساز حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ فال موافق ہو یا مخالف بہر صورت اپنے رب تعالیٰ پر توکل کرکے اپنا کام جاری رکھنا چاہیے۔ یہ پرندوں کا دائیں بائیں اڑنا کسی کام میں رکاوٹ نہیں بن سکتا، نیز بدشگونی لینے سے انسان کے اندر مایوسی اور اللہ تعالیٰ سے بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس نیک فال پکڑنا اچھی چیز ہے، اس سے انسان کا حوصلہ بلند ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت پر امید میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں:

۱۔ جو شخص بدفالی پکڑ کر اپنے کام سے لوٹ آیا اس نے شرک کیا۔ (مسند احمد: جلد ۲، ص ۲۲۰)

۲۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کسی چیز سے بدشگون نہیں لیتے تھے۔ آپ جب کسی عامل کو بھیجتے تو اس کا نام پوچھتے، اگر آپ کو اس کا نام اچھا لگتا تو آپ خوش ہوتے اور آپ کے چہرے سے خوشی دکھائی دیتی اور اگر آپ کو اس کا نام ناپسند ہوتا تو آپ کے چہرے پر کراہت دکھائی دیتی اور جب آپ کسی بستی میں داخل ہوتے تو آپ اس کا نام پوچھتے۔ اگر آپ کو اس کا نام اچھا لگتا تو اس سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خوش ہوتے اور آپ کے چہرے پر خوشی نظر آتی اور اگر آپ اس

کا نام ناپسند فرماتے تو آپ کے چہرے پر کراہت نظر آتی (ابوداؤد: کتاب الطب: باب الطیرۃ) مسلمانوں کو اپنی اولاد یا جگہوں وغیرہ کے نام اچھے رکھنے چاہئیں کیونکہ ناپسندیدہ ناموں سے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تکلیف ہوتی ہے۔ (تفسیر امداد الکرم)

بدفالی اور بدشگونی کو عربی میں تطیر کہتے ہیں۔ کیونکہ اہل عرب اکثر پرندوں کی آوازوں سے بدفالی پکڑتے۔ اس لیے یہ لفظ طیر سے مشتق ہوا۔ مشرک قوموں میں فال گیری کی رسم بہت قدیم سے ہے۔ ان کے اوہام پرست مزاج ہر چیز سے اثر قبول کرتے ہیں۔ کسی کام کو نکلے، راستے میں کوئی جانور سامنے سے گزر گیا۔ کسی پرندہ کی آواز کان میں پڑ گئی فوراً گھر واپس لوٹ آئے۔ اسلام نے جہاں اور مشرکانہ رسموں کی ممانعت کی وہاں اس نے تطیر (بدفالی) کا خاتمہ کر دیا۔ چنانچہ حضور پرنور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد گرامی ہے من رجعت الطیرۃ عن حاجتہ فقد اشرک جو کسی چیز سے بدفالی پکڑ کر اپنے مقصد سے لوٹ آیا اس نے شرک کیا۔ عرض کی گئی یارسول اللہ! ایسا شخص کیا کفارہ دے تاکہ اس کی توبہ قبول ہو؟ فرمایا یہ کہے اللہم لاطیر الاطیرک ولاخیر الا خیرک ولا الہ غیرک ثم یمضی لضاجتہ (قرطبی) اے اللہ تیری فال کے بغیر اور کوئی فال نہیں۔ تیری بھلائی کے بغیر اور کوئی بھلائی نہیں۔ اور تیرے سوا اور کوئی معبود نہیں یہ الفاظ کہہ کر اپنے کام کو چلا جائے تو اس کی توبہ قبول ہو گی۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

اہل عرب کا طریقہ تھا کہ وہ بات پرندوں جیسے الو اور کوا وغیرہ کو منحوس جانتے تھے۔ تو جب وہ کسی سفر پر جانے لگتے اور انھیں کوئی الو یا کوا نظر آجاتا تو واپس پلٹتے، وہ سمجھتے کہ آج کا سفر منحوس اور خطرناک ہے۔ اسی لئے حضرت رویفع بن ثابت (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جو شخص کسی بدشگونی کی وجہ سے سفر سے لوٹ آیا وہ شرک سے آلودہ ہوگیا"۔ (مجمع الزوائد جلد 5 صفحہ 106) ہاں نیک فالی یا نیک شگونی اچھی چیز ہے، یعنی کسی نیک آدمی سے ملاقات سے خوش ہو کر امید لگانا کہ ہمیں کوئی خیر ملے گی یا اچھا نام سن کر خوش ہونا اور اچھائی کی امید پیدا کرنا محمود ہے۔ جیسے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حدیبیہ میں تشریف فرما تھے تو کفار مکہ نے سہیل نامی شخص کو آپ کے پاس بھیجا، آپ نے اس کا نام سن کر کہا کہ تمہارا کام سہل ہوگیا۔ (بخاری کتاب الشروط) گویا نیک شگونی دعاء ہے اس لئے محمود ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۳۲

لغۃ القرآن: [وَقَالُوْا : اور انہوں نے کہا] [مَهْمَا : جو کچھ] [تَاْتِنَا بِهٖ : تو لائے گا ہمارے پاس] [مِنْ اٰيَةٍ : کوئی بھی نشانی] [لِّتَسْحَرَنَا : تاکہ تو جادو کرے ہم پر] [بِهَا : اس سے] [فَمَا نَحْنُ : تو ہم نہیں ہیں] [لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ : تیر ی بات ماننے والے]

ترجمہ: اور وہ (اہل فرعون متکبرانہ طور پر) کہنے لگے: (اے موسیٰ!) تم ہمارے پاس جو بھی نشانی لاؤ کہ تم اس کے ذریعے ہم پر جادو کر سکو، تب بھی ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں ہیں

تشریح: فرعون اور اس کے حواری اپنی سرکشی میں آگے بڑھ رہے ہیں، عزت نفس کے مجروح ہو جانے کی وجہ سے بہت ہی طیش میں ہیں اور غصے اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے یہ کہتے ہیں:

وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ۔

انھوں نے موسیٰ سے کہا کہ "تو ہمیں مسحور کرنے کے لیے خواہ کوئی نشانی لے آئے، ہم تو تیری بات ماننے والے نہیں ہیں"

یہ وہ حیوانی خودسری ہے جسے سدھایا نہیں جاسکتا، جس پر نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوتا، جسے کسی دلیل سے رد نہیں کیا جاسکتا، وہ نہ فکر و نظر جانتی ہے اور نہ غور و تدبر سے کام لیتی ہے، دلیل کا سامنا کرنے سے بھی پہلے وہ بات کو رد کر دیتی ہے، وہ دلیل کا راستہ ہی روک دیتی ہے۔ یہ وہ نفسیاتی حالت ہے جس میں ہر وہ شخص مبتلا ہو جاتا ہے جو جابرانہ انداز میں اور اپنی مصلحتوں کے لیے اقتدار میں ہوتا اور جسے دلیل نے شکست دے دی ہوتی ہے بلکہ دلیل و برہان اس کا پیچھا کر رہے ہوتے ہیں

لیکن اپنی مصلحتوں کی وجہ سے سچائی دلیل اور ثبوت کا سامنا نہیں کر سکتا۔ جب ایسے حالات ہوں تو پھر قادر مطلق اپنے خاص وسائل کام میں لاتا ہے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

موسیٰ (علیہ السلام) کافی عرصہ تک اس مقابلہ کے بعد بھی مصر میں مقیم رہے اور اپنے معجزات رکھا دکھا کر انھیں دعوت حق دیتے رہے۔ لیکن وہ اپنی ضد اور عناد پر اڑے رہے اور آخر صاف صاف کہہ دیا کہ آپ جو چاہیں جادو کے کرتب دکھاتے رہیں ہم ہر گز آپ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ تو تھی نہیں کہ انھیں موسیٰ (علیہ السلام) کی صداقت میں شک تھا آپ کی صداقت تو ان کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں تھی لیکن اس کو تسلیم کرنا ان کے لیے ٹیڑھی کھیر تھی۔ کیونکہ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے ناجائز اختیارات اور مراعات سے محروم ہو جائیں۔ ان کی لوٹ کھسوٹ پر پابندی لگادی جائے۔ اور ان کے عیش و عشرت کی محفلیں درہم برہم کر دی جائیں وہ اس کے لیے آمادہ نہ تھے۔ یہی رکاوٹیں ہیں جو ہر زمانہ میں حق قبول کرنے کے راستہ میں پہاڑ بن کر کھڑی ہو جایا کرتی ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

جادو گروں کی شکست کے بعد جادو گر تو ایمان لے آئے مگر فرعون کے ساتھ اس کی قوم کے لوگ اپنی سرکشی اور کفر پر اڑے رہے اور موسیٰ (علیہ السلام) کو واضح کہہ دیا کہ آپ جیسا بھی جادو گر کا کرشمہ دکھادیں وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ جب فرعونیوں نے ایمان نہ لانے کا آخری فیصلہ سنادیا تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ان کے لیے بد دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے ان پر مختلف قسم کے عذابوں کا سلسلہ شروع کر دیا جو تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد دیگرے ظاہر ہوئے۔ مثال کے طور پر پہلے اتنی کثرت سے بارش ہوئی کہ ان کی ہر چیز غرق ہو گئی اور پانی ان کی گردنوں تک پہنچ گیا، پھر ٹڈی دل نے ان کی فصلوں کو تباہ کر دیا، پھر ان کے کپڑوں، بالوں اور جسموں میں جوؤں کی کثرت نے انھیں بے چین کر دیا۔ اس کے بعد مینڈک ان کے گھروں، کھانوں اور بستروں میں اتنی کثرت سے آگئے کہ ان کا کھانا، پینا اور سونا حرام ہو گیا، پھر دریاؤں، کنوؤں اور گھروں میں ہر جگہ پینے کا پانی خون میں بدل گیا اور پیاس کی وجہ سے ان کی جان خطرے میں پڑ گئی اور لطف کی بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے گھرانے عذابوں سے محفوظ تھے۔ (تفسیر ابن ابی حاتم) ان واضح نشانیوں کے بعد بھی فرعونی عادی مجرموں کی طرح اپنے تکبر پر قائم تھے۔ (تفسیر امداد الکرم)

دل میں جب کسی سے عناد آجاتا ہے تو اس کی کوئی خوبی، دلیل اور منطق دلنشین نہیں ہوتی۔ فرعونیوں کو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور بنی اسرائیل کے ساتھ نہایت قلبی عناد تھا۔ اس لیے انھوں نے صریحاً کہا: موسیٰ (علیہ السلام) آپ لاکھ معجزے پیش کریں، ہم ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ جیسا کہ آج مغرب اور مغرب زدہ ذہنوں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ اسلام کے پیش کردہ جامع نظام حیات کو ایک معجزہ سمجھنے کی بجائے الٹا اس کے خلاف نتیجے نکالتے اور زہر افشانی کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ (تفسیر الکوثر)

فرعونیوں کی ڈھٹائی دیکھئے۔ سچ کہا ہے کہ ضد و بحث میں آدمی جان تک ہونے کو تیار ہو جاتا ہے اس وقت ہم دیکھ سکتے ہیں کہ موسیٰ (علیہ السلام) کا مطالبہ کچھ بڑا نہ تھا وہ فقط اتنا ہی تو چاہتے تھے کہ بنی اسرائیل کو ان کے ساتھ بھیج دیا جائے لیکن فرعون کی قوم کو ان کے غرور اور اقتدار میں اندھا باؤلا کر رکھا تھا ان کا تکبر کبھی اجازت نہ دے سکتا تھا کہ مفت کے غلاموں کو آسانی سے اپنے ہاتھ سے نکل جانے دیں۔ خود عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے تھے وہ زمانہ تو پھر بھی ہمارے زمانے سے کم مہذب تھا۔ ہم آجکل تہذیب و تمدن کے دعوے داروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ کمزور قوموں کو دبا کر رکھنا چاہتے ہیں اور ان سے اپنے مطلب کے کام نکال کر کچھ پیسے دے دیتے ہیں وہ کبھی اس بات پر رضامند نہیں ہوتے کہ ان کے اوپر سے اپنی گرفت ڈھیلی کریں جب آجکل کے مدعیان تہذیب کا یہ حال ہے تو فرعون کی قوم کی ڈھٹائی اور تکبر میں تعجب کی کوئی بات نئی نہیں۔ دیکھیے وہ حضرت موسیٰ سے کیا کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اے موسیٰ تو چاہے جتنی انوکھی باتیں دکھا ہم تیرے جال میں پھنسنے والے نہیں۔ (تفسیر درس قرآن آسٹریلیا)

جب حق کے مقابلہ میں ضد و عناد حد سے بڑھ جاتا ہے اور انسان ہر صورت میں مخالفت ہی کی ٹھان لیتا ہے تو اس مسخ شدہ ذہنیت میں مبتلا ہو کر ہر سیدھی سی سیدھی بات اور صاف سی صاف دلیل سے اسی طرح انکار کر سکتا ہے۔ بجنسہ یہی ذہنیت جاہلین عرب کی دین محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عناد میں رہی اور جاہلین فرنگ کی آج تک چلی آرہی ہے۔ سیرت نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے روشن سے روشن اور پاکیزہ سے پاکیزہ واقعات کو اس طرح توڑ مروڑ کر کے پیش کرنا۔ الٹے سے الٹے نتیجہ نکالنا یہ خاص الخاص جوہر آج کے "روشن خیال محققین فرنگ" کے ہیں۔ (تفسیر ماجدی)

آیت مبارکہ:

فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الطُّوْفَانَ وَ الْجَرَادَ وَ الْقُمَّلَ وَ الضَّفَادِعَ وَ الدَّمَ اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ۝۱۳۳

لغۃ القرآن: [فَاَرْسَلْنَا : پھر ہم نے بھیجا] [عَلَیْهِمُ : ان پر] [الطُّوْفَانَ : سائیکلون] [وَالْجَرَادَ : اور ٹڈی دل] [وَالْقُمَّلَ : اور بھنگے] [وَالضَّفَادِعَ : اور مینڈک] [وَالدَّمَ : اور خون] [اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ : کھلی کھلی نشانیاں ہوتے ہوئے] [فَاسْتَكْبَرُوْا : نتیجے میں انہوں نے گھمنڈ کیا] [وَكَانُوْا : اور وہ تھے (ہی)] [قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ : جرم کرنے والے لوگ]

ترجمہ: پھر ہم نے ان پر طوفان، ٹڈیاں، گھن، مینڈک اور خون (کتنی ہی) جداگانہ نشانیاں (بطور عذاب) بھیجیں، پھر (بھی) انھوں نے تکبر و سرکشی اختیار کیے رکھی اور وہ (نہایت) مجرم قوم تھے

تشریح: جب جادو گروں کے ایمان لانے کے بعد بھی فرعونی اپنے کفر و سرکشی پر جمے رہے تو ان پر اللہ عَزَّوَجَلَّ کی نشانیاں پے در پے وارد ہونے لگیں کیونکہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے دعا کی تھی کہ یارب! عَزَّوَجَلَّ، فرعون زمین میں بہت سرکش ہوگیا ہے اور اس کی قوم نے بھی عہد شکنی کی ہے انھیں ایسے عذاب میں گرفتار کر جو ان کے لیے سزا ہو اور میری قوم اور بعد والوں کے لیے عبرت و نصیحت ہو، تو اللہ تعالیٰ نے طوفان بھیجا، ہوا یوں کہ بادل آیا، اندھیرا ہوا اور کثرت سے بارش ہونے لگی۔ قبطیوں کے گھروں میں پانی بھر گیا یہاں تک کہ وہ اس میں کھڑے رہ گئے اور پانی ان کی گردنوں کی ہنسلیوں تک آگیا، ان میں سے جو بیٹھا وہ ڈوب گیا، یہ لوگ نہ ہل سکتے تھے نہ کچھ کام کر سکتے تھے۔ ہفتہ کے دن سے لے کر دوسرے ہفتہ تک سات روز اسی مصیبت میں مبتلا رہے اور باوجود اس کے کہ بنی اسرائیل کے گھر ان کے گھروں سے متصل تھے ان کے گھروں میں پانی نہ آیا۔ جب یہ لوگ عاجز ہوئے تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے عرض کی: ہمارے لیے دعا فرمائیے کہ یہ مصیبت دور ہو جائے تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو آپ کے ساتھ بھیج دیں گے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے دعا فرمائی تو طوفان کی مصیبت دور ہو گئی، زمین میں وہ سرسبزی و شادابی آئی جو پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ کھیتیاں خوب ہوئیں اور درخت خوب پھلے۔ یہ دیکھ کر فرعونی کہنے لگے "یہ پانی تو نعمت تھا اور ایمان نہ لائے۔ ایک مہینہ تو عافیت سے گزرا، پھر اللہ تعالیٰ نے ٹڈی بھیجی وہ کھیتیاں اور پھل، درختوں کے پتے، مکان کے دروازے، چھتیں، تختے، سامان، حتّٰی کہ لوہے کی کیلیں تک کھا گئیں اور قبطیوں کے گھروں میں بھر گئیں لیکن بنی اسرائیل کے یہاں نہ گئیں۔ اب قبطیوں نے پریشان ہو کر پھر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے دعا کی درخواست کی اور ایمان لانے کا وعدہ کیا، اس پر عہد و پیمان کیا۔ سات روز یعنی ہفتہ سے ہفتہ تک ٹڈی کی مصیبت میں مبتلا رہے، پھر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی دعا سے نجات پائی۔ کھیتیاں اور پھل جو کچھ باقی رہ گئے تھے انھیں دیکھ کر کہنے لگے "یہ ہمیں کافی ہیں ہم اپنا دین نہیں چھوڑتے چنانچہ ایمان نہ لائے، عہد وفا نہ کیا اور اپنے اعمال خبیثہ میں مبتلا ہو گئے۔ ایک مہینہ عافیت سے گزرا، پھر اللہ تعالیٰ نے قُمَّل بھیجے، اس میں مفسرین کا اختلاف ہے "بعض کہتے ہیں کہ قُمَّل گھن ہے، بعض کہتے ہیں جوں، بعض کہتے ہیں ایک اور چھوٹا سا کیڑا ہے۔ اس کیڑے نے جو کھیتیاں اور پھل باقی رہے تھے وہ کھا لئے، یہ کیڑا کپڑوں میں گھس جاتا تھا اور جلد کو کاٹتا تھا، کھانے میں بھر جاتا تھا، اگر کوئی دس بوری گندم چکی پر لے جاتا تو تین سیر واپس لاتا باقی سب کیڑے کھا جاتے۔ یہ کیڑے فرعونیوں کے بال، بھنویں، پلکیں چاٹ گئے، ان کے جسم پر چیچک کی طرح بھر جاتے حتّٰی کہ ان کیڑوں نے ان کا سونا دشوار کر دیا تھا۔ اس مصیبت سے فرعونی چیخ پڑے اور انھوں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے عرض کی: ہم توبہ کرتے ہیں، آپ اس بلا کے دور ہونے کی دعا فرمائیے۔ چنانچہ سات روز کے بعد یہ مصیبت بھی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی دعا سے دور ہوئی، لیکن فرعونیوں نے پھر عہد شکنی کی اور پہلے سے زیادہ خبیث تر عمل شروع کر دیئے۔ ایک مہینہ امن میں گزرنے کے بعد پھر حضرت موسیٰ (علیہ

السلام) نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے مینڈک بھیجے اور یہ حال ہوا کہ آدمی بیٹھتا تھا تو اس کی مجلس میں مینڈک بھر جاتے، بات کرنے کے لیے منہ کھولتا تو مینڈک کود کر منہ میں چلا جاتا، ہانڈیوں میں مینڈک، کھانوں میں مینڈک، چولھوں میں مینڈک بھر جاتے تو آگ بجھ جاتی تھی، لیٹتے تھے تو مینڈک اوپر سوار ہوتے تھے، اس مصیبت سے فرعونی رو پڑے اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے عرض کی: اب کی بار ہم پکی توبہ کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے عہد و پیمان لے کر دعا کی تو سات روز کے بعد یہ مصیبت بھی دور ہوئی اور ایک مہینہ عافیت سے گزرا، لیکن پھر انھوں نے عہد توڑ دیا اور اپنے کفر کی طرف لوٹے۔ پھر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے دعا فرمائی تو تمام کنوؤں کا پانی، نہروں اور چشموں کا پانی، دریائے نیل کا پانی غرض ہر پانی ان کے لیے تازہ خون بن گیا۔ اُنہوں نے فرعون سے اس کی شکایت کی تو کہنے لگا کہ "حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جادو سے تمہاری نظر بندی کر دی ہے۔ اُنہوں نے کہا: تم کس نظر بندی کی بات کر رہے ہو؟ ہمارے برتنوں میں خون کے سوا پانی کا نام و نشان ہی نہیں۔ یہ سن کر فرعون نے حکم دیا کہ "قبطی بنی اسرائیل کے ساتھ ایک ہی برتن سے پانی لیں۔ لیکن ہوا یوں کہ جب بنی اسرائیل نکالتے تو پانی نکلتا، قبطی نکالتے تو اسی برتن سے خون نکلتا، یہاں تک کہ فرعونی عورتیں پیاس سے عاجز ہو کر بنی اسرائیل کی عورتوں کے پاس آئیں اور ان سے پانی مانگا تو وہ پانی ان کے برتن میں آتے ہی خون ہو گیا۔ یہ دیکھ کر فرعونی عورت کہنے لگی کہ "تو پانی اپنے منہ میں لے کر میرے منہ میں کلی کر دے۔ مگر جب تک وہ پانی اسرائیلی عورت کے منہ میں رہا پانی تھا، جب فرعونی عورت کے منہ میں پہنچا تو خون ہو گیا۔ فرعون خود پیاس سے مُضطَر ہوا تو اس نے تر درختوں کی رطوبت چوسی، وہ رطوبت منہ میں پہنچتے ہی خون ہو گئی۔ سات روز تک خون کے سوا کوئی چیز پینے کی میسر نہ آئی تو پھر حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام سے دعا کی درخواست کی اور ایمان لانے کا وعدہ کیا۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے دعا فرمائی یہ مصیبت بھی دور ہوئی مگر وہ ایمان پھر بھی نہ لائے۔ (تفسیر صراط الجنان)

سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے: "ولقد اتینا موسیٰ تسع ایت بینت "نو آیات معجزات موسوی کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ وہ یہ ہیں: (۱) عصاء۔ (۲)۔ ید بیضا۔ (۳)۔ سنین۔ (۴)۔ نقص ثمرات۔ (۵)۔ طوفان۔ (۶)۔ جراد۔ (۷)۔ ضفادع۔ (۹) دم۔

اور حضرت ابن عباس کے علاوہ مجاہد، عکرمہ، شعبی، اور قتادہ بھی اسی کی تائید فرماتے ہیں۔ اول چار کا ذکر گزشتہ آیات میں ہوا، جبکہ باقی پانچوں کا تذکرہ اسی آیت کریمہ میں ہو رہا ہے۔ ان میں عصاء اور ید بیضاء آیات کبری ہیں، اور باقی سات آیات عذاب ہیں، جن سے فرعون اور اس کی قوم قبطیوں کی زندگی تنگ ہوئی اور وہ پریشان رہے۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی مدت اقامت مصر بیس سال ہے:

حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ یہ نو معجزات، یعنی آیات بینات نو سال میں تدریجاً یکے بعد دیگرے ظاہر ہوئے، رہ سال ایک نشانی ظاہر ہوتی تھی۔ آیات مذکورہ بالا میں پانچ عذاب مذکور ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ جادو گروں کے واقعہ کے بعد حضرت موسیٰ (علیہ السلام) فرعون کے پاس مصر میں بیس سال رہے، اور برابر یہ عذاب باری باری سے پیش آتے رہتے تھے، جو قوم فرعون کے لیے عذاب، اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے لیے معجزہ ہوتے تھے۔

ابن ماجہ کی حدیث میں ہے کہ صحابہ کرام نے سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ٹڈی کے بارے میں دریافت کیا، تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اکثر جنود اللہ تعالیٰ۔ اللہ تعالیٰ کے لشکروں میں تعداد کے اعتبار سے بہت بڑا لشکر ہے۔ (ابن ماجہ) واقعی ٹڈی بہت بڑا لشکر ہے، بظاہر یہ بہت چھوٹے نظر آتے ہیں، مگر جب کسی علاقہ پر ان کا یلغار ہوتا ہے، تو پناہ بخدا، کئی میلوں تک یہ لشکر باغات اور کھیتوں کو صاف کر دیتا ہے، اور کسی فوج اور لشکر کے قابو میں نہیں آتا، بھگانے سے بھاگتا نہیں، اور ختم کرنے سے ختم نہیں ہوتا، سڑکوں اور گھروں میں پہنچ جائے، تو سب کے لیے آفت جان بن جاتا ہے، کھیتوں میں فصلات اور کھیتوں کا ایسا صفایا کرتا ہے کہ سبزہ کا نام و نشان نہیں رہتا۔ (تفسیر منازل العرفان)

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر: ۱

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) جادو گروں پر غالب آنے کے بعد آل فرعون میں چالیس برس تک ٹھہرے رہے۔ اور محمد بن عثمان بن ابی شیبہ نے منجاب سے بیس سال کا عرصہ روایت کیا ہے، آپ انھیں نشانیاں یعنی ٹڈی، جوئیں، مینڈک اور خون کے معجزات دکھاتے رہے۔

مسئلہ نمبر ۲۔

قولہ تعالیٰ: آیت: الطوفان اس سے مراد شدید بارش ہے (ایضا، جلد ۲، صفحہ ۴۴۴) یہاں تک کہ وہ اس میں تیرنے لگے۔ حضرت مجاہد اور حضرت عطاء (رح) نے بیان کیا ہے کہ طوفان سے مراد موت ہے (تفسیر طبری، جلد ۹، صفحہ ۴۰)۔ اخفش نے کہا ہے: اس کا واحد طوفانۃ ہے (المحرر الوجیز، جلد ۲، صفحہ ۴۴۳)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مصدر ہے جیسا کہ رجحان اور نقصان مصدر ہیں، پس اس کے لیے واحد کا کوئی مطالبہ نہیں۔

نحاس نے کہا ہے: لغت میں طوفان وہ ہے جو ہلاک کرنے والا ہو چاہے وہ صوت ہو یا سیلاب، یعنی وہ ان پر چکر لگاتا رہا اور انھیں ہلاک کرتا رہا۔ اور سدی (رح) نے کہا ہے: بنی اسرائیل کو اس پانی کا ایک قطرہ تک نہیں پہنچا، بلکہ وہ قبطیوں کے گھروں میں داخل ہوا یہاں تک کہ وہ اپنی ہنسلیوں تک پانی میں کھڑے رہے۔ اور وہ پانی مسلسل سات دن تک ان پر رہا۔

اور یہ قول بھی ہے کہ چالیس دن تک رہا۔ تب انھوں نے کہا: ہمارے لیے رب سے دعا کیجئے وہ ہم سے اس عذاب کو دور فرمادے تو ہم تمہارے ساتھ ایمان لے آئیں گے، پس آپ نے رب کریم سے دعا کی تو اس نے ان سے طوفان کو اٹھالیا لیکن وہ ایمان نہ لائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس سال ان کے لیے گھاس اور فصلوں میں وہ کچھ اگایا جو اس سے پہلے نہ اگایا تھا، تو وہ کہنے لگے: وہ پانی تو نعمت تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر ٹڈی کو بھیج دیا اور یہ ایک معروف حیوان ہے، جراد مذکر و مونث دونوں صورتوں میں جرادۃ کی جمع ہے پس اگر تو ان کے درمیان فرق کرنا چاہے تو پھر صفت لگانا پڑے گی اور تو یہ کہے گا رایت جرادۃ ذکرا) (میں نے نر ٹڈی کو دیکھا(پس وہ ان کے پھلوں اور کھیتیوں سبھی کو کھا گئی یہاں تک کہ وہ چھتوں دروازوں کو کھانے لگی اور ان کے گھر گرنے لگے، لیکن بنی اسرائیل کے گھروں میں اس میں سے کوئی شے داخل نہ ہوئی۔

مسئلہ نمبر ۳۔ ٹڈی کو مارنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جب وہ کسی زمین میں آئے اور اسے خراب کرنے لگے بعض نے کہا ہے: اسے نہیں مارا جائے گا۔ اور تمام علمائے فقہ نے کہا ہے: اسے مار دیا جائے گا۔ فریق اول کا استدلال یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے بہت بڑی مخلوق ہے وہ اللہ تعالیٰ کا رزق کھاتی ہے اور اس پر قلم نہیں چلتا۔

اور اس وجہ سے بھی کہ یہ روایت ہے "تم ٹڈی کو قتل نہ کرو کیونکہ یہ اللہ الاعظم کا لشکر ہے" (شعب الایمان، لی محسنۃ الجراد والصبر علیھا، جلد ۷، صفحہ ۲۳۲، حدیث نمبر ۱۰۱۲۷)

اور جمہور نے کہا اس سے استدلال کیا ہے کہ اسے چھوڑنے میں اموال کا فساد ہے حالانکہ حضور نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مسلمانوں کو قتل کرنے کی رخصت دی ہے جب وہ کسی کا مال لینا چاہے، پس ٹڈی جب اموال کو برباد کرنے کا ارادہ کرے تو بدرجہ اولی اسے قتل کرنا جائز ہوگا۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ تمام نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ سانپ اور بچھو کو مارنا جائز ہے؟ کیونکہ وہ دونوں لوگوں کو اذیت دیتے ہیں پس اس طرح ٹڈی بھی ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت جابر اور حضرت انس بن مالک (رض) سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب ٹڈی کے خلاف دعا کرتے تو اس طرح کہتے: اللھم اھلک کبارہ واقتل صغارہ وافسد بیضہ اقطع دابرہ وخذ بافواھہ عن معایشنا وارزقنا انک سمیع الدعاء (اے اللہ! اس کے بڑوں کو ہلاک کردے اور اس کے چھوٹوں کو قتل کردے اور اس کے انڈوں کو فاسد کردے اور اس کے پیچھے آنے والوں کو قطع کردے اور ان کے مونہوں سے ہماری معیشت اور ہمارے رزق لے لے بیشک تو دعا کو سننے والا ہے)

ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ اللہ تعالیٰ کے لشکروں میں سے ایک لشکر کے خلاف اس کی دم کٹ جانے کی دعا کیسے کرتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: "بیشک ٹڈی سمندر میں ایک مچھلی کی چھینک (سے پیدا شدہ) ہے" (سنن ابن ماجہ، کتاب الصید، جلد ۱، صفحہ ۲۳۸۔ ایضا، حدیث نمبر ۳۲۱۱، ضیاء القرآن پبلی کیشنز)۔

مسئلہ نمبر: ۴

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن ابی اوفی (رض) کی روایت ہے انھوں نے بیان فرمایا: ہم سات غزوات میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ رہے اور ہم آپ کے ساتھ ٹڈی کھاتے رہے (صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، جلد ۲، صفحہ ۱۵۲)۔ المختصر اس کے کھانے میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں۔ جب اسے کوئی زندہ پکڑ لے اور اس کا سر کاٹ دیا جائے تو یہ بالاتفاق حلال ہے۔ اور یہ اس کو ذبح کرنے کے قائم مقام ہو جاتا ہے، البتہ علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کیا آدمی اس کے سبب موت کو جاننے کا محتاج ہوتا ہے جب اسے شکار کیا جائے یا نہیں؟۔

تو عام رائے یہی ہے کہ سبب موت جاننے کی ضرورت نہیں، اسے کھایا جائے گا جیسے بھی یہ مرے۔ ان کے نزدیک اس کا حکم مچھلی کے حکم کی مثل ہے۔ یہ نظریہ ابن نافع اور مطرف کا ہے۔ اور امام مالک (رح) کی رائے یہ ہے کہ سبب موت جاننا لازم اور ضروری ہے، مثلا اس کے سر کا کٹنا یا پاؤں کا یا اس کے پروں کا کٹ جانا، جب کہ اس کی موت اس سبب سے ہو یا اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا، کیونکہ آپ کے نزدیک وہ خشکی کا جانور ہے اور اس کا مردار حرام ہے۔ حضرت لیث مردہ ٹڈی کھانا مکرہ جانتے تھے۔ مگر جب کوئی اسے زندہ پکڑے پھر وہ مر جائے تو بیشک اسے پکڑنا ذبح کرنے کے مترادف ہے۔ یہی نظریہ حضرت سعید بن مسیب (رض) کا ہے۔

دارقطنی نے حضرت ابن عمر (رض) (سنن دارقطنی، کتاب الصید والذبائح، جلد ۴، صفحہ ۲۷۲) سے روایت نقل کہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "ہمارے لیے دو مردار حلال کیے گئے ہیں مچھلی اور ٹڈی اور دو خون (حلال کیے گئے ہیں) جگر اور تلی"۔ ابن نے بیان کیا ہے: احمد بن منیع، سفیان بن عیینہ نے ابوسعید سے بیان کیا ہے کہ انھوں نے حضرت انس بن مالک (رض) کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ حضور نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ازواج مطہرات ٹڈی بڑی طشتری میں رکھ کر ایک دوسرے کو بطور ہدیہ دیتی تھیں (سنن ابن ماجہ، کتاب الصید، جلد ۱، صفحہ ۲۳۹، ایضا، حدیث نمبر ۳۲۱۰، ضیاء القرآن پبلی کیشنز)۔ اسے ابن منذر نے بھی ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر ۵۔ محمد بن منکدر نے حضرت جابر بن عبداللہ (رض) سے اور انھوں نے حضرت عمر بن خطاب (رض) سے روایت بیان کی ہے انھوں نے بیان کیا میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "بیشک اللہ تعالیٰ نے ہزار پیدا فرمائی ہیں ان میں سے چھ سو سمندر میں ہیں اور چار سو خشکی میں ہیں۔ اور بلاشبہ ان امتوں میں سے سب سے پہلے ہلاک ہونے والی ٹڈی ہے پس جب ٹڈی ہلاک ہو جائے گی تو باقی امتیں موتیوں کی لڑی کی مثل اس کے پیچھے آئیں گی جب وہ کٹ جائے"۔ اسے حکیم ترمذی نے "نوادر الاصول" میں ذکر کیا ہے۔ اور فرمایا: بلاشبہ ان امتوں میں سب سے اول ہلاک ہونے والی ٹڈی ہے، کیونکہ اسے اس مٹی سے تخلیق کیا گیا ہے جو حضرت آدم (علیہ السلام) کی مٹی سے فالتو بچی تھی۔ پھر آدمیوں کے ہلاک ہونے کی وجہ سے وہ امتیں ہلاک ہو جائیں گی کیونکہ یہ ان کے لیے مسخر ہے۔

ہم قبط کے قصہ کی طرف رجوع کرتے ہیں پس انھوں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے معاہدہ کیا کہ اگر ان سے ٹڈی کو دور کر دیا جائے تو وہ ایمان لے آئیں گے، پس آپ (علیہ السلام) نے دعا فرمائی تو اسے دور کر دیا گیا۔ اور ان کی کھیتوں میں سے ابھی کچھ چیزیں باقی تھیں، تو وہ کہنے لگے: جو باقی ہے وہ ہمارے لیے کافی ہوگا۔ اور وہ ایمان نہ لائے تو اللہ تعالیٰ نے اس پر جوئیں بھیج دیں۔ اور یہ چھوٹا سا کیڑا ہے۔ یہ حضرت قتادہ (رح) نے کہا ہے: اور الدبی سے مراد اڑنے سے پہلے کی ٹڈی ہے۔ اس کی واحد دباۃ ہے۔ جب کوئی کیڑا زمین کی نباتات کھا جائے تو اس کے لیے کہا جاتا ہے: ارض مدیبۃ اور حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: قمل سے مراد وہ سوس (گھن) ہے جو گندم میں ہوتا ہے (المحرا الوجیز، جلد ۲، صفحہ ۴۴۴)۔ ابن زید نے کہا (زاد المسیر، جلد ۲، صفحہ ۱۹۱) ہے: اس سے مراد براغیث (مچھر) ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ چھوٹے چھوٹے سیاہ رنگ کے کیڑے ہیں۔ ابو عبیدہ نے کہا: اس سے مراد حمنان ہے اور یہ چچڑی کی ایک قسم ہے، اس کا واحد حمنانۃ ہے۔ پس یہ ان کے جانوروں اور ان کی کھیتیوں کو کھا گئی۔ اور ان کی جلد کے ساتھ چمٹ گئی، گویا کہ یہ ان پر چیچک ہے اور اس نے انھیں سونے اور قرار حاصل کرنے سے روک دیا۔ اور حبیب بن ابو ثابت نے کہا ہے: قبل سے مراد جعلان ہے (یعنی سیاہ رنگ کا کیڑا) اور اہل لغت کے نزدیک قمل چیچڑیوں کی ایک قسم ہے۔

ابو الحسن اعرابی عدوی نے کہا ہے: قمل چچڑی کی جنس سے ایک چھوٹا سا کیڑا ہے، لیکن یہ اس سے چھوٹا ہوتا ہے، اس کی واحد قملۃ ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اس کے خلاف نہیں ہے جو اہل تفسیر نے کہا ہے، کیونکہ یہ مراد لینا جائز ہے کہ یہ تمام اشیاء ان پر بھیجی گئی ہوں اور یہ تمام انھیں اذیت پہنچانے کے اعتبار سے جمع ہو سکتی

ہیں۔ بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ یہ عین شمس (اس وقت مصر کا دارالخلافہ) میں ریت کا ایک ٹیلہ تھا تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اس پر اپنا عصا مارا تو وہ قمل (جوئیں) بن گیا۔ قمل کی واحد قملہ ہے۔ عطا خراسانی نے کہا ہے: اسے قمل اور قمل دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

اور حسن کی قرات میں ہے والقمل یعنی قاف مفتوح اور میم ساکن ہے۔ پس وہ عجز وزاری کرنے لگے لیکن جب ان سے اسے دور کر دیا گیا تو وہ پھر ایمان نہ لائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر مینڈک مسلط کر دیئے۔ ضفادع، ضفدع کی جمع ہے۔ اور یہ وہ معروف جانور ہے جو پانی میں ہوتا ہے (اور اس میں ایک مسئلہ ہے اور وہ یہ ہے) کہ انھیں مارنے سے منع کیا گیا ہے۔ ابو داؤد اور ابن ماجہ نے صحیح اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ابو داؤد نے امام احمد بن حنبل سے، انھوں نے عبدالرزاق سے اور ابن ماجہ نے محمد بن یحییٰ نیشاپوری ذہلی سے اور انھوں نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے بیان کیا ہے کہ انھوں فرمایا: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صرد (موٹے سر سفید پیٹ اور سبز پیٹھ کا ایک پرندہ جو چھوٹے پرندہ کو شکار کرتا ہے۔ لٹورا) مینڈک، چیونٹی اور ہدہد کو مارنے سے منع فرمایا ہے (سنن ابن ماجہ، کتاب الصید، جلد ۱، صفحہ ۲۳۹، ایضا، حدیث نمبر ۳۲۱۳، ۳۲۱۴، ضیاء القرآن پبلی کیشنز)۔

سنن ابی داود، کتاب ابواب السلام، باب فی قتل الذر، حدیث نمبر ۴۵۸۳، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نسائی نے حضرت عبدالرحمٰن بن عثمان سے روایت کیا ہے کہ ایک حکیم نے حضور نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس دوا میں مینڈک کا ذکر کیا، تو حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسے اس کے مارنے سے منع فرمایا (سنن نسائی، کتاب الصید والذبائح، جلد ۲، صفحہ ۲۰۱۔ سنن ابی داؤد، کتاب ابواب النوم، باب قتل الضفدع، حدیث ۴۵۸۵، ضیاء القرآن پبلی کیشنز)۔ اسے ابو محمد عبدالحق نے صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ (رض) نے بیان کیا ہے: صرد پہلا پرندہ ہے جس نے روزہ رکھا ہے۔ جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) بیت اللہ شریف بنانے کے لیے شام سے حرم پاک کی طرف نکلے تو آپ کے ساتھ سکینہ (تیز رو ہوا) اور صرد تھے، پس صرد نے مخصوص جگہ کی طرف آپ کی رہنمائی کی اور سکینہ نے اس کی مقدار کی طرف، پس جب آپ اس خاص جگہ تک پہنچے تو سکینہ بیت اللہ شریف کی جگہ پر چلی اور پکار کر کہا: اے ابراہیم! میرے سائے کی مقدار پر (گھر) تعمیر کر دے۔ پس حضور نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صرد کو مارنے سے منع فرمایا ہے، کیونکہ اس نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی بیت اللہ شریف پر راہنمائی کی اور مینڈک کو مارنے سے منع کیا، کیونکہ یہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی لے جلائی جانی والی آگ پر پانی ٹپکاتا تھا۔ اور جب یہ فرعون پر مسلط ہوئے تو یہ آئے اور تمام جگہوں پر چھاگئے۔ جب یہ تنور کی طرف گئے تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں وہاں بھی ڈیرہ ڈال لیا حالانکہ ان میں آگ بھڑک رہی تھی، پس اللہ تعالیٰ نے اس کی آواز کو تسبیح بنا دیا۔ کہا جاتا ہے: تمام جانوروں سے زیادہ یہ تسبیح کرنے والا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) نے کہا ہے: تم مینڈک کو نہ مارو، کیونکہ اس کی وہ آواز جو تم سنتے ہو وہ تسبیح ہے۔

پس روایت ہے کہ اس (مینڈک) نے ان کے بستروں، برتنوں اور کھانے پینے کی چیزوں کو بھر دیا تھا ایک آدمی اپنی ٹھوڑی تک مینڈکوں میں بیٹھتا تھا اور جب وہ بات کرتا تو مینڈک اچھل کر اس کے منہ میں داخل ہو جاتا، تو انھوں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے شکوہ کیا اور کہنے لگے: ہم توبہ کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان سے انھیں دور کر دیا لیکن وہ دوبارہ اپنے کفر کی طرف لوٹ گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر خون بھیجا تو ان پر نیل خون بن کر بہنے لگا۔ اسرائیل اس سے پانی کے چلو بھرتے تھے اور قبطی خون کے۔ اسرائیلی قبطی کے منہ میں پانی انڈیلتا تھا تو وہ خون ہو جاتا تھا۔ اور قبطی اسرایلہ کے منہ میں خون انڈیلتا تھا تو وہ میٹھا او لذیذ پانی ہو جاتا تھا۔

آیت: ایت مفصلت یعنی ظاہر اور بین علامات، یہ مجاہد (رح) سے مروی ہے۔ زجاج نے کہا ہے: آیت: ایت مفصلت، حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور یہ روایت بھی ہے کہ آپ نے ایک نشانی ظاہر کی تھی اور وہ ایک نشانی آٹھ دن تک رہی۔ بعض نے کہا ہے: چالیس دنوں تک رہی۔ اور بعض نے کہا ہے: ایک مہینہ تک رہی پس اسی لیے فرمایا: آیت: مفصلت، فاستکبروا پس وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے سے تکبر کرتے رہے۔ (تفسیر قرطبیؒ)

آیت مبارکہ:

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ إِلَىٰ أَجَلٍ هُم بَالِغُوهُ إِذَا هُمْ يَنكُثُونَ ۝١٣٥

لغۃ القرآن: [فَلَمَّا : پھر جب] [كَشَفْنَا : ہم نے ہٹا دیا] [عَنْهُمُ : ان سے] [الرِّجْزَ : اس عذاب کو] [اِلٰی اَجَلٍ : ایک مدت تک] [هُمْ : (کہ) وہ] [بٰلِغُوْهُ : پہنچنے والے تھے اس کو] [اِذَا : جب ہی] [هُمْ : وہ لوگ] [يَنْكُثُوْنَ : عہد شکنی کرتے]

ترجمہ: پھر جب ہم ان سے اس مدت تک کے لیے جس کو وہ پہنچنے والے ہوتے وہ عذاب ٹال دیتے تو وہ فوراً ہی عہد توڑ دیتے

تشریح: قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے جب کوئی قوم کفر و شرک تکبر اور تمرد میں آگے ہی بڑھتی جائے تو اس کا وجود انسانی معاشرے میں کینسر کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ جس سے اس علاقے کے رہنے والے ہی نہیں بلکہ زمین و آسمان کی ہر چیز اس سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے اس پر لعنت بھیجتی ہے اس صورتحال میں اللہ تعالیٰ دنیا کے نظام کو چلانے اور قائم رکھنے کے لیے مجرم قوم کا صفایا کر دیتا ہے۔ اسی اصول کے تحت اب وقت آن پہنچا تھا کہ فرعون اور آل فرعون کو ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دیا جائے۔ (تفسیر فہم القرآن)

سیاق کلام میں ان تمام نشانیوں کو ایک جگہ لایا گیا، اس طرح کہ گویا بیک وقت ان سب کا ظہور ہوا، اور ان کے بعد جب اللہ نے ان مشکلات کو رفع فرمایا تو ایک ہی بات فرعونیوں نے بدعہدی کی، یہ انداز اس لیے اختیار کیا گیا کہ جب بھی کوئی نشانی آئی اور دور ہوئی تو انھوں نے پھر عہد وفا نہ کیا۔ یہ انداز بیان قرآن کے اسالیب میں سے ایک ہے، چونکہ واقعات ایک ہی جیسے تھے، اس لیے ایک ہی جگہ ان کے آغاز کی طرف اشارہ کر دیا گیا گویا ایک ہی دل کے ساتھ یہ تمام تجربات پیش آئے اور وہ دل اس قدر سخت ہو چکا تھا کہ کسی تجربے نے بھی اس کے اندر راہ نہ پایا۔ اور کسی نے عبرت نہ حاصل کی۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

سعید بن جبیر کے نزدیک رجز سے مراد طاعون ہے پانچ آیات کے ظہور کے بعد یہ چھٹی آیت عذاب تھی جس سے ایک دن میں ستّر ہزار آدمی مر گئے اور باہم دفن کرتے کرتے ان کو شام ہو گئی بخاری و مسلم نے صحیحین میں اور ترمذی و بغوی نے حضرت اسامہ (رض) بن زید کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا طاعون ایک عذاب ہے جو اللہ نے بنی اسرائیل پر اور تم سے پہلی قوموں پر بھیجا تھا اس لیے اگر کسی جگہ طاعون ہو تو خود وہاں نہ جاؤ اور اگر وہاں پیدا ہو جائے جہاں تم ہو تو وہاں سے مت بھاگو۔ امام احمد اور بخاری نے حضرت عائشہ (رض) کی روایت سے لکھا ہے کہ سول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا طاعون ایک عذاب ہے جس پر چاہتا ہے اللہ بھیج دیتا ہے مگر مومنوں کے لیے اللہ نے اس کو رحمت بنا دیا ہے۔ اگر کسی بستی میں طاعون پڑا ہو اور کوئی (مسلمان) وہاں بامید ثواب صبر کے ساتھ رکا رہے اور یہ یقین رکھتا ہو کہ اللہ نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہی اس کو پہنچے گا (اور طاعون میں مبتلا ہو کر مر جائے) تو اس کو شہید کی طرح ثواب ملے گا۔

میں کہتا ہوں یہ دونوں حدیثیں بتا رہی ہیں کہ طاعون بنی اسرائیل پر بھیجا گیا تھا قبطیوں پر بصورت عذاب آنا ان حدیثوں سے نہیں معلوم ہوتا۔ شاید فرعون کے بعد بنی اسرائیل پر طاعون کا عذاب آیا ہو۔

اگر سعید بن جبیر کا قول صحیح مان لیا جائے تو عصا اور ید بیضاء کے بعد تیسرا معجزہ کال اور پھلوں کی بربادی قرار پائے گا۔ کال دیہات والوں کے لیے اور پھلوں کی تباہی شہریوں کے لیے اس کے بعد طوفان سے رجز تک چھ معجزات ہوں گے آیت (ولقد اتینا موسیٰ تسع آیات) میں یہی نو نشانیاں مراد ہیں۔ (تفسیر مظہری)

اہم نکتہ: حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی دعا کی برکت سے۔ معلوم ہوا کہ بزرگوں کی دعا کافروں کو بھی فائدہ دے جاتی ہے تو ہم گناہ گار مومنوں کو کیوں نہ فائدہ دے گی۔ (تفسیر نور العرفان)

جب قحط سالی اور پیداوار میں کمی جیسے ہلکے ازآباد سے فرعونیوں کو ہدایت نہ ہوئی تو ان پر لگاتار پانچ شدید ترین عذابات بھیجے گئے۔ یعنی طوفان، مکڑی، جوئیں، مینڈک اور خون۔ ہر عذاب کے نزول پر وحضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے فریاد کرتے تھے کہ اگر یہ ٹل جائے تو وہ ایمان لے آئیں گے، مگر اس کے ٹل جانے پر وہ پھر تکبر کرنے لگتے۔ کیونکہ وہ تھے ہی مجرم لوگ۔

فرعونی قوم پر آنے والے پانچ خوفناک عذابات:

امام بغوی نے حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ جب فرعونیوں کو قحط سے ہدایت نہ ملی تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ان کے خلاف دعا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر طوفان بادوباراں بھیجا اس وقت اسرائیلی اور قبطی دونوں قومیں اکٹھی رہتی تھیں۔ ان کے گھر باہم ملے جلے تھے۔ قبطیوں کے گھر پانی سے بھر گئے۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا نہ وہ کھیتی باڑی کر سکتے تھے نہ کوئی اور کام، مگر اسرائیلیوں کے گھروں میں ایک قطرہ اب داخل نہ ہوا، یہ کیفیت ایک ہفتہ رہی۔ فرعونی بلبلا اٹھے۔ کہنے لگے اے موسیٰ! اپنے رب سے دعا کرو بارش روک لے اور پانی اتر جائے تو ہم ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو تمہارے ساتھ بھیج دیں گے۔ موسیٰ (علیہ السلام) کی دعا سے طوفان تھم گیا اور پانی اتر گیا۔ تب ان کی زمینوں میں کثرت سے غلہ اگنے لگا۔ ہر طرف خوشحالی آگئی۔ فرعونی کہنے لگے یہ طوفان تو ہمارے لئے نعمت تھا ہم موسیٰ پر ایمان نہ لائیں گے۔

تب ایک ماہ عافیت سے گزرا پھر اللہ تعالیٰ ان پر مکڑیاں بھیج دیں جو ان کے سب کھیت، پھل حتی کہ درختوں کے پتے کھا گئیں۔ یہی نہیں وہ گھروں کے دروازے اور چھتوں کے شہتیر ہضم کر گئی۔ مگر بنی اسرائیل کے گھروں میں ایک مکڑی داخل نہ ہوئی۔ قبطی چیخ اٹھے۔ کہنے لگے۔ اے موسیٰ! اپنے رب سے دعا کرو وہ یہ عذاب دور کر دے ہم آپ پر ایمان لائیں گے اور بنی اسرائیل کو بھی آزادی دیں گے۔ آپ نے دعا کی عذاب ٹل گیا مگر وہ ایمان نہ لائے کیوں کہ کچھ غلہ مکڑیوں سے بچ گیا تھا۔ کہنے لگے یہ ہمیں کافی ہے ہمیں اپنا دین نہیں ترک کرنا چاہیے۔

تب ایک ماہ عافیت سے گزرا، پھر اللہ تعالیٰ نے جوئیں بھیج دیں جو ان کے کپڑوں میں داخل ہو کر ان کے جسم چاٹنے لگیں۔ وہ ان کے بالوں میں بھر گئیں حتیٰ کہ آنکھوں کی پلکوں پر بھی چڑھ گئیں، وہ جب کھانے پینے کے لیے منہ کھولتے تو جوئیں منہ میں جا پڑتیں یہ عذاب پہلے عذابات سے سخت تر تھا وہ ایک لمحہ سو نہ سکتے تھے۔ کہنے لگے اے موسیٰ! ہم توبہ کرتے ہیں اگر یہ بلا ٹل جائے تو ہم ضرور بضرور ایمان لے آئیں گے آپ نے دعا فرمائی تو یہ عذاب جو حسب سابق ایک ہفتہ جاری رہا تھا ٹل گیا۔ مگر پھر وہ اپنی خباثت کی طرف لوٹ گئے کہنے لگے موسیٰ جادوگر ہے جو ریت کی جوئیں بنا کر ہم پر مسلط کر دیتا ہے۔

تب وہ ایک ماہ عافیت میں رہے پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر مینڈک بھیج دیے جو ان کے گھروں راستوں اور برتنوں میں داخل ہو گئے۔ وہ سونے لگتی ہے تو ان کے بستروں پر مینڈک چڑھ آتے۔ وہ بات کرنے لگتے تو کوئی مینڈک پھدک کر ان کے منہ میں داخل ہو جاتا۔ اس عذاب سے وہ اونچا اونچا رو پڑے۔ بولے اے موسیٰ! ہم سچی توبہ کرتے ہیں اور بہت سے وعدے معاہدے کئے چنانچہ ایک ہفتہ قائم رہنے کے بعد یہ عذاب ٹل گیا مگر عذاب ختم ہوتے ہیں وہ اپنے کفر کی طرف لوٹ گئے۔

پھر ایک ماہ بعد ان پر خون بھیج دیا گیا دریائے نیل خون بن گیا چشم خون اگلنے لگے کنویں خون سے بھر گئے مگر بنی اسرائیل جب اس میں سے کچھ لے تو پانی ہوتا اور قبطی لیتے تو خون۔ فرعون نے حکم دیا کہ ایک اسرائیلی اور ایک قبطی مل کر ایک برتن سے کھائیں اور پئیں مگر جب اسرائیلی پیتا تو پانی ہوتا اور قبطی پیتا تو خون، دونوں ایک مشکیزے سے پانی پیتے تو اسرائیل کے لئے پانی نکلتا اور قبطی کے لیے خون، قبطیوں نے کہا تم اپنے منہ میں پانی ڈال کر ہمارے منہ میں کلی کرو انھوں نے ایسے کیا مگر اسرائیلی کے منہ میں پانی ہوتا اور قبطی کے منہ میں آ کر خون (اللہ کی شان غلام قوم اپنے ظالم آقاؤں کے منہ میں تھوک رہی ہے) خود فرعون کا حال پیاس سے برا تھا اس نے درختوں کی ٹہنیاں چوسیں تو وہ پانی بھی اس کے منہ میں خون بن گیا۔ یہ عذاب بھی ایک ہفتہ رہا وہ خون پیتے رہے۔ (تفسیر بغوی جلد 2 صفحہ 278 مطبوعہ بیروت) (برہان القرآن)

آیت مبارکہ:

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ۝۱۳۶

لغۃ القرآن: [فَانْتَقَمْنَا : پس ہم نے انتقام لیا] [مِنْهُمْ : ان سے] [فَاَغْرَقْنٰهُمْ : تو ہم نے غرق کیا ان کو] [فِي الْيَمِّ : پانی میں] [بِاَنَّهُمْ : کیونکہ انہوں نے] [كَذَّبُوْا : جھٹلایا] [بِاٰيٰتِنَا : ہماری نشانیوں کو] [وَكَانُوْا : اور وہ تھے] [عَنْهَا : ان سے] [غٰفِلِيْنَ : غفلت برتنے والے]

ترجمہ: پھر ہم نے ان سے (بالآخر تمام نافرمانیوں اور بد عہدیوں کا) بدلہ لے لیا اور ہم نے انھیں دریا میں غرق کر دیا، اس لیے کہ انھوں نے ہماری آیتوں کی (پے در پے) تکذیب کی تھی اور وہ ان سے (بالکل) غافل تھے

تشریح:

جب اس قدر از آباد سے بھی وہ باز نہ آئے تو اللہ نے ایسے اسباب بہم پہنچائے کہ ساری قوم قبط کو فرعون سمیت اٹھا کر سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ محققین کے نزدیک اس سے بحر قلزم (Red Sea) کی مغربی شاخ مراد ہے جس کے مشرق میں صحرا سینا اور مغرب میں مصر واقع ہے۔ مورخین کے نزدیک غرقابی فرعون کا واقعہ سن 1691 قبل مسیح میں ظہور پذیر ہوا۔ (تفسیر برہان القرآن)

جب کسی کو سنبھلنے کے لیے مسلسل تنبیہات کی جائیں اور ساتھ ساتھ ہی اس پر عنایات کی بارش بھی ہوتی رہے اور دنیا کی ہر نعمت اس کو فراوانی سے عطا کی جائے لیکن وہ نعمتوں کا شکر ادا کرے اور نہ وہ تنبیہات کو درخور اعتنا سمجھے بلکہ اپنی جراتوں اور جسارتوں میں اس حد تک آگے بڑھ جائے کہ اللہ کی زمین کو ظلم سے بھر دے اور انسان اس کے مظالم سے بلبلا اٹھے تو پھر قدرت ایسے عادی مجرم کو جو سزا دیتی ہے اسے انتقام ہی کہنا چاہیے چنانچہ اسی لیے اس آیت کریمہ میں یہ فرمایا جارہا ہے کہ ہم نے پھر ان سے انتقام لیا یعنی ہم نے انھیں ان کے جرائم کی سزا دی کہ اللہ نے فرعون اور آل فرعون کو اس وقت کی معلوم دنیا کی سب سے بڑی حکومت عطا کی ' ملک کو ہر طرح کی دولت سے مالا مال کیا 'نعمتوں کی وہ فراوانی کہ کوئی ملک اور کوئی قوم اس معاملے میں ان کا ہمسر نہ تھا۔ بایں ہمہ ! انھوں نے بنی اسرائیل کو اپنے مظالم سے زار و نزار کر کے رکھ دیا تھا۔ ان کے قومی تشخص کو تباہ و برباد کیا اور ان کی نسلوں کو تہ تیغ کرنے سے باز نہ آئے۔ پھر جب اللہ نے مسلسل آزمائشوں میں مبتلا کر کے انھیں تنبیہات فرمائیں تو انھوں نے کسی تنبیہ کو بھی پلے نہیں باندھا بلکہ اپنے ظالمانہ رویے میں بڑھتے ہی چلے گئے تب اللہ کے انتقام کا کوڑا حرکت میں آیا کہ فرعون کو اس کی فوجوں سمیت سمندر میں غرق کر دیا۔ قرآن کریم نے اس کو نہایت اختصار سے بیان فرمایا ہے کہ جب فرعون کے مظالم کی انتہا ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم دیا کہ تم بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جاؤ اور اپنے باپ دادا کی سرزمین یعنی فلسطین میں جا کر اللہ کی منشاء کے مطابق ان کی تربیت کرو اور اللہ کے دین کی بالادستی پر مبنی ایک ریاست قائم کرو۔ چنانچہ موسیٰ (علیہ السلام) فلسطین یا ارض کنعان جانے کے لیے مصر سے رات کی تاریکی میں نکلے تو بجائے خشکی کا راستہ اختیار کرنے کے جو قریب بھی تھا آپ نے دور کا راستہ اختیار کیا جس کے راستے میں بحر احمر پڑتا تھا آپ چاہتے تھے کہ اس کو عبور کر کے بیابان شور اور سینا پہنچ جائیں یہ آپ نے دشوار گزار اور دور کا راستہ اللہ کے حکم سے اختیار کیا کیونکہ قریب کا اور خشکی کا راستہ اختیار کرنے میں اگرچہ آسانی اور سہولت تھی لیکن اس بات کا ہر وقت امکان تھا کہ فرعون کی فوجوں سے تصادم ہو جائے اور اگر ایسا ہو جاتا تو بنی اسرائیل جن کو صدیوں کی غلامی نے بزدل اور پست ہمت بنا دیا تھا وہ کسی طرح بھی فرعون کے مقابلے میں اس کی فوجوں سے لڑنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ تصادم اور مقابلے کی صورت میں یقیناً بنی اسرائیل کمزوری کا مظاہرہ کرتے۔ نتیجتاً اس نئی اٹھتی ہوئی اسلامی قوت کو بے پناہ نقصان پہنچ جاتا۔ توراۃ سے بھی اس توجیہ کی تائید نکلتی ہے۔ توراۃ میں مذکور ہے۔

" اور جب فرعون نے ان لوگوں کو جانے کی اجازت دے دی تو خدا ان کو فلستیوں کے ملک کے راستہ سے نہیں لے گیا اگرچہ ادھر سے نزدیک پڑتا تھا کیونکہ خدا نے کہا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ لڑائی بھڑائی دیکھ کر پچھتانے لگیں اور مصر کو لوٹ جائیں بلکہ خداوند ان کو چکر کھلا کر بحر قلزم کے بیابان کے راستے لے گیا"۔ (خروج باب ۱۳: ۱۷۔۱۸)

مزید یہ بات بھی ہے کہ اگر خشکی کے راستے موسیٰ (علیہ السلام) بنی اسرائیل کو لے کر خیریت سے فلسطین پہنچ جاتے تو سمندر کے پھٹنے 'بنی اسرائیل کے خیریت سے گزرنے اور فرعون اور آل فرعون کے تباہ ہونے کا جو حیرت انگیز معجزہ وجود میں آنے والا تھا اس کا اظہار نہ ہو سکتا اس لیے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) جب اپنی قوم کو

لے کر بحر قلزم کے راستے پر نکلے تو پرچہ نویسوں نے فرعون کو اطلاع کردی تو اس نے اسی وقت ایک زبردست فوج کو ساتھ لیا اور صبح ہونے سے پہلے ان کے سر پر جا پہنچا۔ کہا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کی تعداد اس وقت بچوں اور چوپایوں کے علاوہ چھ لاکھ تھی مگر پو پھٹنے کے وقت جب انھوں نے پیچھا مڑکے دیکھا تو فرعون کو سر پر پایا ' گھبرا کر کہنے لگے :

" کیا مصر میں قبریں نہ تھیں جو تو ہم کو مرنے کے لیے بیابان میں لے آیا ہے تو نے ہم سے یہ کیا کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا۔ کیا ہم تجھ سے مصر میں یہ بات نہ کہتے تھے کہ ہم کو رہنے دے کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کیونکہ ہمارے لیے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر ہوتا"

(خروج باب ۱۴: ۱۱۔۲۱)

موسیٰ (علیہ السلام) نے ان کو تسلی دی بلکہ پورے ایمانی جلال کے ساتھ فرمایا :

كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ

(ہر گز نہیں میرا رب میرے ساتھ ہے وہ ضرور مجھے راستہ دے گا)

یعنی یہ بحر قلزم میرا راستہ نہیں روک سکتا اور اللہ کے حکم کی موجودگی میں کوئی رکاوٹ میرے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی اس کے بعد آپ نے اللہ کی بارگاہ میں درخواست کی حکم آیا کہ اپنی لاٹھی کو پانی پر مارو۔ چنانچہ آپ نے اپنا عصا قلزم کے پانی پر مارا تو پانی پھٹ کر دونوں جانب دو پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا اور بیچ میں سے راستہ نکل آیا۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے حکم سے تمام بنی اسرائیل اس میں اتر گئے اور خشک زمین پر چلتے ہوئے اس سے پار ہو گئے۔ فرعون نے یہ دیکھا تو اپنی قوم سے کہنے لگا یہ میری کرشمہ سازی ہے کہ بنی اسرائیل کو تم جا پکڑو للذا بڑھے چلو۔ چنانچہ فرعون اور اس کا تمام لشکر بنی اسرائیل کے پیچھے اسی راستہ میں اتر گیا لیکن اللہ تعالیٰ کی کرشمہ سازی دیکھیے کہ جب بنی اسرائیل کا ہر فرد دوسرے کنارے پر سلامتی کے ساتھ پہنچ گیا تو پانی بحکم الٰہی پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا اور فرعون اور اس کا تمام لشکر جو ابھی درمیان ہی میں تھا غرق ہو گیا۔ جب فرعون غرق ہونے لگا اور ملائکہ عذاب سامنے نظر آنے لگے تو پکار کر کہنے لگا کہ میں اسی ایک وحدہٗ لاشریک لہٗ ہستی پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں فرمان برداروں میں سے ہوں مگر یہ ایمان چونکہ حقیقی ایمان نہ تھا بلکہ گزشتہ فریب کاریوں کی طرح نجات حاصل کرنے کے لیے یہ بھی ایک مضطربانہ بات تھی اس لیے اللہ کی طرف سے یہ جواب ملا :

آلْآنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ

" اب یہ کہہ رہا ہے حالانکہ اس سے پہلے جو اقرار کا وقت تھا اس میں تو نافرمان رہا تو درحقیقت مفسدوں میں سے تھا"۔

درحقیقت فرعون کی یہ پکار ایسی پکار تھی جو ایمان لانے اور یقین حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ عذاب الٰہی کا مشاہدہ کرنے کے بعد اضطراری اور بے اختیاری کی حالت میں نکلتی ہے اور مشاہدہ عذاب کے وقت ایسی صدا اور ایسے ایمان پر بھی اعتبار نہیں ہوتا۔ اس لیے اللہ کے ہاں اسے قبولیت نصیب نہیں ہوئی۔ اس لیے فرعون کا ایمان تو قبول نہیں کیا گیا البتہ یہ ضرور فرمایا :

الْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً

" آج کے دن ہم تیرے جسم کو ان لوگوں کے لیے جو تیرے پیچھے آنے والے ہیں نجات دیں گے کہ وہ عبرت کا نشان بنا رہے"۔

چنانچہ اس کے نتیجے میں اگلے ہی روز سمندر نے فرعون کی لاش باہر اگل دی۔ مصریوں نے اسے وہاں سے اٹھایا اور نہلانے دھلانے کے بعد اس کو حنوط کرکے دفن کر دیا لیکن اللہ نے اس نام نہاد رب کو ہر طرح کی تذلیل کا نشانہ بنا دیا کہ جو اپنے آپ کو مصر کے بحر و بر کا مالک سمجھتا تھا وہ سمندر کی موجوں سے اپنے آپ کو نہ بچا سکا اور پھر جو اپنی ناک اللہ کے سامنے زمین پر رکھنے کے لیے تیار نہیں تھا اسے ایسی ذلت کی مار پڑی کہ مچھلی اس کی آدھی ناک کھا گئی چنانچہ آج یہ ناک کٹا ذلت کی تصویر بنا مصر کے عجائب گھر میں لوگوں کے لیے عبرت بنا ہوا ہے۔

قرآن کریم نے اس حیرت انگیز واقعہ کو اختصار سے بیان فرمایا ہے لیکن واقعہ کے ضروری اجزاء جو باعث عبرت ہیں وہ اس اختصار میں بھی موجود ہیں البتہ توراۃ میں قرآن کریم کے بیان کردہ واقعات کے علاوہ کچھ اور بھی تفصیلات بیان کی گئی ہیں جو نصیحت و عبرت کے لحاظ سے اگرچہ چنداں ضروری نہیں لیکن دلچسپی کے حوالے

سے ضرور قابل مطالعہ ہیں۔ توراۃ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ فرعون اور اس کی قوم پر جب اللہ کی بھیجی ہوئی آفات کا سلسلہ جاری ہو گیا اور موسیٰ (علیہ السلام) کے ارشاد کے مطابق یکے بعد دیگرے "نشانات" کا ظہور ہونے لگا تو اس نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو بلا کر کہا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لے جا مگر ان کے چوپائے اور پالتو جانور یہیں چھوڑنے ہوں گے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اس شرط کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ایک جانور بھی تو روکنے کا حق نہیں رکھتا، تو فرعون غضبناک ہو کر کہنے لگا کہ اب یہ کبھی نہ جا سکیں گے اور تو اب میرے سامنے کبھی نہ آنا ورنہ میرے ہاتھ سے مارا جائے گا۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ یہ تو نے ٹھیک کہا اب میں کبھی تیرے سامنے نہ آؤں گا میرے اللہ کا یہی فیصلہ ہے اور اس نے مجھ کو بتا دیا ہے کہ تجھ پر اور تیری قوم پر ایسی سخت آفت آئے گی کہ تیرا اور کسی مصری کا پہلوٹھا زندہ نہیں رہے گا۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) فرعون سے یہ گفتگو کر کے دربار سے باہر نکل آئے اور پھر بنی اسرائیل سے یہ فرمایا کہ خداوند خدا کا ارشاد ہے کہ فرعون کا دل سخت ہو گیا ہے وہ اب تم کو یہاں سے اس وقت تک نہ جانے دے گا جب تک مزید نشان نہ دیکھ لے کہ جس سے تمام مصریوں میں کہرام مچ جائے مگر تم کو تیاری کر لینی چاہیے کہ مصر سے نکلنے کا وقت آ پہنچا اور خدائے تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ذریعہ بنی اسرائیل کو نکلنے سے پہلے قربانی اور عید فسح کا بھی حکم دیا اور اس کا طریقہ اور شرائط بھی بتا دیں، حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے یہ بھی کہا کہ اپنی عورتوں سے کہو کہ وہ مصری عورتوں کے پاس جائیں اور ان سے عید کے لیے سونے اور چاندی کے زیور اور قیمتی پارچہ جات مستعار مانگ لائیں اور مصری عورتوں نے آخر ان کو زیورات دے دیئے پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک رات فرعون سے لے کر معمولی مصری کا پہلوٹھا مر گیا اور تمام گھرانوں میں کہرام مچ گیا۔ یہ دیکھ کر مصری فرعون کے پاس دوڑے آئے اور اس کو مجبور کیا کہ اسی وقت تمام بنی اسرائیل کو مصر سے نکال دے تاکہ یہ نحوست یہاں سے دور ہو، ہم پر یہ سب آفتیں انہی کی بدولت آتی رہتی ہیں۔

تب فرعون نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے کہا کہ اسی وقت تم سب یہاں سے نکل جاؤ اور اپنے جانوروں، مویشیوں اور سب سامان کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ جب بنی اسرائیل رعمسیس (جشن کے شہر) سے نکلے تو بچوں اور جانوروں کے علاوہ وہ سب چھ لاکھ تھے اور جب وہ نکلے تو مصریوں کے زیورات کو بھی واپس نہ کر سکے اور مصریوں نے بھی مطالبہ نہ کیا۔

جب بنی اسرائیل نے جنگل کی راہ لی تو اب فرعون اور اس کے سرداروں کو اپنے فیصلہ پر سخت افسوس ہوا اور انھوں نے آپس میں کہا کہ ہم نے مفت میں ایسے اچھے چاکر اور غلام ہاتھ سے کھو دیئے اور فرعون نے حکم دیا کہ فوراً سرداروں، مصری نوجوانوں اور فوج کو تیاری کا حکم دو اور وہ کرّوفر کے ساتھ رتھوں میں سوار ہو کر نکل کھڑے ہوئے اور بنی اسرائیل کا تعاقب کیا۔

بنی اسرائیل رعمسیس سے سکات اور وہاں سے ایتام اور پھر مڑ کر مجدال اور بحر احمر کے درمیان فی ہیخروت کے پاس لعل صفون کے سامنے خیمہ زن ہو چکے تھے، بنی اسرائیل کے اس پورے سفر میں خدا ان کے ساتھ رہا اور وہ نورانی ستون کی تجلی کے ساتھ رات میں بھی ان کی راہنمائی کرتا اور دن میں بھی آگے آگے چلتا، غرض صبح کی پو پھٹ رہی تھی کہ فرعون نے سمندر کے کنارے بنی اسرائیل کو آ لیا، انھوں نے پیچھا پھر کر دیکھا اور فرعون کو لاؤ لشکر کے ساتھ اپنے قریب پایا تو بد دل اور خائف ہو کر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے جھگڑا کرنے لگے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ان کو بہت کچھ تسلی و تشفی دی اور بتایا کہ تمہارے دشمن ہلاک ہوں گے اور تم سلامتی و عافیت کے ساتھ نجات پاؤ گے اور پھر دربار خداوندی میں مناجات کرنے لگے:

" اور خداوند نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے کہا کہ تو کیوں مجھ سے فریاد کر رہا ہے، بنی اسرائیل سے کہو کہ وہ آگے بڑھیں اور تو اپنی لاٹھی اٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اسے دو حصے کر اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل جائیں گے۔۔ پھر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے۔

۔۔ اور خداوند نے سمندر کے بیچ ہی میں مصریوں کو تہ و بالا کر دیا اور پانی پلٹ کر آیا اور اس نے رتھوں اور سواروں اور فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں گیا تھا غرق کر دیا اور ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوڑا پھر بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور پانی ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ دیواروں کی طرح رہا۔

۔۔ اور اسرائیلیوں نے وہ بڑی قدرت جو خداوند نے مصریوں پر ظاہر کی دیکھی اور وہ لوگ خداوند سے ڈرے اور خداوند پر اور اس کے بندے موسیٰ پر ایمان لائے۔

توراۃ کی تفصیلات میں اگرچہ بہت زیادہ رطب و یابس اور دور از کار باتیں بھی ضمناً آ گئی ہیں مگر توراۃ اور قرآن کریم دونوں اس بارے میں ہم آہنگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قہرمانیت کے مظالم سے موسیٰ اور بنی اسرائیل کو ایک عظیم الشان نشان کے ذریعہ نجات دی۔ قرآن عزیز یہی کہتا ہے کہ یہ معجزہ اس طرح ظاہر ہوا کہ اللہ کے حکم سے موسیٰ (علیہ السلام) نے قلزم پر لاٹھی ماری اور دریا کا پانی بیچ میں خشکی دے کر دونوں جانب پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا اور توراۃ بھی اسی کی تائید کرتی ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں بعض ایسے نیک نام افراد بھی ہیں جو اپنی قومی خدمات کے باعث نہایت عزت کے مستحق ہیں لیکن معجزات کے حوالے سے انھوں نے بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔ مثلاً سر سید احمد خان جو ہماری قومی تاریخ کا ایک اہم نام ہے انھوں نے اس عظیم واقعے کو معجزہ ماننے سے انکار کیا ہے اپنی مشہور تفسیر میں وہ یہ فرماتے ہیں کہ غرق فرعون اور نجات بنی اسرائیل کا یہ واقعہ معجزہ نہ تھا بلکہ عام دنیوی سلسلہ اسباب و علل کے تحت بحر کے مد و جزر (جوار بھاٹا) سے تعلق رکھتا ہے یعنی صورتحال یہ پیش آئی کہ جس وقت بنی اسرائیل نے قلزم و عبور کیا تھا اس وقت اس کا پانی سمٹا ہوا تھا اور پیچھے کو ہٹ کر اس نے جزر اختیار کر رکھا تھا فرعون نے جب بنی اسرائیل کو اس آسانی سے پار ہوتے دیکھا تو اس نے بھی اپنی لشکر کو داخل ہو جانے کا حکم دے دیا مگر بنی اسرائیل پار ہو چکے تھے اور فرعونی لشکر ابھی دریا کی خشکی پر چل ہی رہا تھا کہ اس کے مد اور آگے بڑھنے کا وقت آ پہنچا اور فرعون اور اس کے لشکر کو اتنی بھی مہلت نہ ملی کہ وہ آگے بڑھ سکے یا پیچھے ہٹ سکے اور سب غرق ہو گئے۔

سید صاحب نے اپنے اس مزعومہ خیال کے مطابق بنی اسرائیل کے عبور کے متعلق ایک نقشہ بھی دیا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بنی اسرائیل نے قلزم کے شمالی دہانے پر جا کر اس کو عبور کیا ہے مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ قرآن عزیز کی تشریحات اس کا قطعی انکار کرتی ہیں اور سید صاحب کی بات کسی طرح بنائے نہیں بنتی۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر آپ نقشہ پر نظر ڈالیں جہاں بحر احمر واقع ہے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ دراصل بحر عرب کی ایک شاخ ہے جس کے مشرق میں سرزمین عرب واقع ہے اور مغرب میں مصر' شمال میں اس کی دو شاخیں ہو گئی ہیں ایک شاخ خلیج عقبہ جزیرہ نمائے سینا کے مغرب میں اور دوسری خلیج سویز اس کے مغرب میں واقع ہے یہ دوسری شاخ پہلی سے بڑی ہے اور شمال میں بڑی دور تک چلی گئی ہے بنی اسرائیل اسی کے درمیان سے گزرے ہیں اسی شاخ کے شمالی دہانہ کے سامنے ایک اور سمندر واقع ہے جس کا نام بحر روم ہے۔ قرآن کریم کی تمام تصریحات کو سامنے رکھیں تو وہ دو باتوں کو زیادہ صراحت سے بیان کرتا ہے ایک فلق یا فرق بحر یعنی دریا کا پھٹنا یا اس کا پھاڑ دینا اور دوسرے دونوں جانب پانی کا پہاڑ کی طرح کھڑا ہو جانا اور درمیان میں راستہ پیدا ہو جانا۔ عربی لغت میں فرق کے معنی دو ٹکڑے کر کے جدا کر دینے کے آتے ہیں اور فلق کے معنی بھی ٹکڑے کر دینا ہی ہے۔ اور طود کے معنی بڑے پہاڑ کے ہیں ان معنوی تشریحات کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کریم کی آیات کو دیکھئے وہ کہتا ہے کہ ہم نے سمندر کو پھاڑا اور پانی دونوں طرف بڑے بڑے پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا اور درمیان میں راستہ نکل آیا اس سے تصور میں جو صورت حال بنتی ہے وہ اسی طرح ممکن ہے کہ بنی اسرائیل نے دریا کے ایسے حصے سے عبور کیا ہو جو دہانہ یا کنارے کے سامنے کا حصہ نہ ہو بلکہ پانی کا ایسا حصہ ہو جو درمیان سے پھٹ کر دو حصے بن سکتا ہو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ قرآن عزیز صاف صاف اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ بنی اسرائیل خشکی کے راستے سے قلزم کے دہانہ یا کنارے سے نہیں گزرے تھے بلکہ دریا کے کسی درمیانی حصہ کو عبور کر کے میدان سینا میں پہنچے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ مد و جزر طولانی حصہ میں دہانہ کی جانب ہوا کرتا ہے۔ عرض میں اس طرح کبھی بھی نہیں ہوتا کہ پانی دونوں جانب سمٹ جائے اور بیچ میں خشکی کی راہ پیدا ہو جائے لہٰذا اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان معجزہ کا انکار کرتے ہوئے اس کو روز مرہ کے مادی اسباب کے نیچے لانے کی سعی کرنا قرآنی تصریحات کے بالکل خلاف اور اس کی تحریف کے مترادف ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون اور آل فرعون جیسے جرائم پیشہ لوگوں کو ان کے جرائم کی سزا دی کہ انھیں سمندر میں غرق کر دیا اور یہ سزا ان کو اس لیے نہیں دی کہ پروردگار اپنے بندوں کے لیے ظالم ہے بلکہ اس لیے دی کہ انھوں نے نہ صرف پیغمبر کی دعوت کو ماننے سے انکار کیا بلکہ اللہ کے ایک سے ایک بڑے نشان کو دیکھا 'ایک سے ایک بڑھ کر عذاب ان پر آیا اور ان میں سے ہر عذاب اپنے منہ سے بول رہا تھا کہ میں اللہ کی قدرت کا ظہور ہوں اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی صداقت کی دلیل ہوں لیکن ان ظالموں نے کسی سے بھی سبق سیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی بلکہ ہر ایک کا مذاق اڑایا اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو پیغمبر سمجھنے کی بجائے ہمیشہ جادوگر سمجھا۔ ایسے لوگوں کا انجام اس سے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ اللہ کی زمین کو ان سے خالی کرا دیا جائے۔ چنانچہ ان کو مٹا دینے کے بعد اللہ نے ان لوگوں کو زمین پر اقتدار عطا فرمایا جس کے ساتھ انھوں نے آج تک ظالمانہ رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ اگلی آیت کریمہ میں اسی کا تذکرہ فرمایا جا رہا ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

نوٹ: ا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کا بدلہ کفار سے رب خود لیتا ہے۔ اور مظلوم کا بدلہ قدرت لیتی ہے، اگرچہ کچھ دیر ہو۔

۲: دریائے قلزم میں۔ عربی میں یم بہت گہرے دریا کو کہتے ہیں، جس کی تہہ آسانی سے نہ معلوم ہو سکے۔ (تفسیر نور العرفان)

آیت مبارکہ:

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

لغۃ القرآن: [وَاَوْرَثْنَا : اور ہم نے وارث بنایا] [الْقَوْمَ الَّذِيْنَ : اس قوم کو جن کو] [كَانُوْا : تھے] [يُسْتَضْعَفُوْنَ : کمزور] [مَشَارِقَ الْاَرْضِ : اس زمین کے مشرقوں کا] [وَمَغَارِبَهَا : اور اس کے مغربوں کا] [الَّتِيْ : وہ (زمین)] [بٰرَكْنَا : ہم نے برکت دی] [فِيْهَا : جس میں] [وَتَمَّتْ : اور تمام ہوا] [كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى: آپ کے رب کا اچھا وعدہ] [عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ : بنی اسرائیل پر] [بِمَا : بسبب اس کے جو] [صَبَرُوْا : وہ لوگ ثابت قدم رہے] [وَدَمَّرْنَا : اور ہم نے تباہ کیا] [مَا : اس کو جو] [كَانَ يَصْنَعُ : کاریگری کرتا تھا] [فِرْعَوْنُ : فرعون] [وَقَوْمُهٗ : اور اس کی قوم] [وَمَا : اور اس کو] [كَانُوْا : تھے] [يَعْرِشُوْنَ : وہ بلند کرتے تھے]

ترجمہ: اور ہم نے اس قوم (بنی اسرائیل) کو جو کمزور اور استحصال زدہ تھی اس سرزمین کے مشرق و مغرب (مصر اور شام) کا وارث بنا دیا جس میں ہم نے برکت رکھی تھی، اور (یوں) بنی اسرائیل کے حق میں آپ کے رب کا نیک وعدہ پورا ہو گیا اس وجہ سے کہ انھوں نے (فرعونی مظالم پر) صبر کیا تھا، اور ہم نے ان (عالیشان محلات) کو تباہ و برباد کر دیا جو فرعون اور اس کی قوم نے بنا رکھے تھے اور ان چنائیوں (اور باغات) کو بھی جنہیں وہ بلندیوں پر چڑھاتے تھے

تشریح:

فرعونیوں کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل کا دور مظلومیت ختم ہوا اور ان کو برکت والی زمین کا وارث بنایا گیا۔ اس سے کون سا علاقہ مراد ہے، تو مختلف روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ اس سے فلسطین شام اور مصر کے علاقے مراد ہیں، یعنی ان علاقوں پر بنی اسرائیل کی حکومت قائم ہوئی۔

ارضِ فلسطین، شام اور مصر کا بابرکت ہونا :

ان علاقوں کا بابرکت ہونا اس طرح ہے کہ فلسطین میں بیت المقدس ہے جس کے بارے میں کہا گیا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ ۔ (بنی اسرائیل۔ 1) اور بیت المقدس کے آس پاس برکت سے انبیاء کرام کے مزارات مراد ہیں۔ ابن عساکر نے کعب الاحبار سے روایت کیا ہے کے توراۃ میں لکھا ہے آرزو شام خزانہ خدا ہے وہ اللہ کے مقرب بندے ہیں اور وہاں ابراہیم اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) کے مزارات ہیں۔ (در منثور جلد 3 صفحہ 527) فلسطین میں ہی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اتریں گے۔ جبکہ شام کے لیے یہ برکت ہے کہ حضرت زید بن ثابت (رض) کہتے ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "شام پر اللہ کی رحمت کے فرشتے پر پھیلائے ہوئے ہیں"۔ (ترمذی کتاب المناقب باب 73) اور شام میں چالیس ابدالوں کی موجودگی پر احادیث وارد ہیں جبکہ مصر کے لیے یہ برکت ہے کہ وہاں متعدد انبیاء بھیجے گئے جیسے یعقوب، یوسف، موسیٰ، ہارون اور یوشع بن نون علیہم السلام۔ پھر فلسطین، شام اور مصر سرسبز وزرخیز علاقے ہیں۔ اس لیے انھیں برکت والی سرزمین قرار دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان علاقوں کی حکومت عطا فرمائی۔ پھر ان کی بدعملیوں کے سبب ان سے یہ حکومت چھن گئی۔ آج یہود ان علاقوں پر اپنی حکومت ایک بار پھر قائم کرنے کے لیے امریکہ کی مدد سے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ فلسطین ان کے قبضہ میں آگیا ہے اور باقی کے لیے ان کی کوشش جاری ہے۔ حالانکہ اگر وہ اسلام لے آتے تو ان علاقوں پر انھیں کی حکومت ہوتی، مگر انھیں یہ حسد مار گیا ہے کہ نبوت بنی اسرائیل سے باہر کیوں چلی گئی ہے۔

]۔ فرعونیوں نے اونچے محلات کے ساتھ ساتھ سایہ دار درختوں کے پتوں اور بیلوں کے ذریعے باغات میں گھنے سائے والی چھتیں بنا رکھی تھیں جب یہ قوم غرق ہوئی تو ان کے محلات اور باغات اجڑ گئے۔ معلوم ہوا ظالموں کو اللہ کی پکڑ سے ڈرنا چاہیے وہ دیر سے پکڑتا اور سخت تر پکڑتا ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

بنی اسرائیل حضرت یوسف (علیہ السلام) کے دور میں مصر میں برسراقتدار آئے۔ اور مدت دراز تک انھیں اقتدار اور اختیار حاصل رہا لیکن اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے نہ صرف اقتدار سے محروم ہوئے بلکہ مصر میں انھیں تیسرے درجے کا شہری بنا دیا گیا۔ وہ مدت تک فرعون کے مظالم سہتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کو مبعوث فرمایا جناب موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت ہارون (علیہ السلام) کی بے مثال جدوجہد سے بنی اسرائیل کو مصر سے نکلنے میں کامیابی نصیب ہوئی اور ان کے لیے شام اور فلسطین کی فتح کا دروازہ کھول دیا گیا۔ جس سرزمین کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ اس کے مشرق سے لے کر مغرب تک اللہ تعالیٰ نے برکات وثمرات کے خزانے رکھے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ساتھ کیے ہوئے وعدے کو پورا فرمایا کہ انھیں آزادی جیسی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ فرعون اور اس کی قوم جو کچھ کرتی تھی اسے تباہ کر دیا گیا۔ "یَعْرِشُوْنَ" کا معنی کرتے ہوئے اہل علم نے لکھا ہے کہ اس سے مراد بڑے بڑے محلات اور انگوروں کے باغات ہیں جن کی بیلیں ٹہنیوں پر چڑھائی جاتی ہیں۔ دشمن کا خاتمہ اور آزادی کی نعمت بنی اسرائیل کو اس لیے حاصل ہوئی کہ انھوں نے طویل عرصہ تک صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے آزادی کے لیے جدوجہد کی۔

* صبر بے بسی اور بے کسی کا نام نہیں۔ صبر قوت برداشت، قوت مدافعت کو بحال رکھنے اور طبیعت کو شریعت کا پابند بنانے کا نام ہے۔ * دشمن کے مقابلے میں جرات، بہادری اور مستقل مزاجی کے ساتھ مسائل ومصائب کا سامنا کرنے سے مسائل حل ہوتے ہیں۔ آخرت میں بغیر حساب وکتاب کے جنت میں داخلہ نصیب ہوگا۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رفاقت ودستگیری حاصل ہوگی

مشکلات زندگی کا حصہ ہیں ان سے نکلنے کے لیے روحانی اور الہامی طریقے اختیار کرنے کے ساتھ مادی وسائل اپنانے کا حکم ہے مگر جب تک پوری دلجمعی اور صبر و استقلال کے ساتھ اسباب کو استعمال اور ان کے اثرات ونتائج کا انتظار نہ کیا جائے اس وقت تک مشکلات سے نکلنا ناممکن ہے۔ شریعت نے صبر واستقامت کو مشکلات سے نجات پانے کا اولین درجہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ جب تک آدمی مشکلات سے چھٹکارا پانے کے لیے اسباب کو مستقل مزاجی اور حوصلے کے ساتھ اختیار نہیں کرے گا تو نہ صرف اس کی جسمانی اور روحانی تکلیف میں اضافہ ہوگا بلکہ وہ اپنی جذباتیت اور عجلت پسندی کی وجہ سے دنیا وآخرت میں بہتر نتائج سے محروم رہے گا جو صبر و استقامت کے سبب اس کو حاصل ہونے والے تھے۔

(عَنْ اَبِیْ مَالِکِ الْاَشْعَرِیِّ (رض) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔۔ وَالصَّبْرُ ضِیَاءٌ)

[رواہ مسلم: کتاب الطہارۃ، باب فضل الوضوء]

"حضرت ابومالک اشعری (رض) بیان کرتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔۔ صبر روشنی ہے۔"

(عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ (رض) عَنِ النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ قَالَ رَبُّكُمْ عَزَّ وَجَلَّ مَنْ اَذْهَبْتُ كَرِيمَتَيْهِ ثُمَّ صَبَرَ وَاحْتَسَبَ كَانَ ثَوَابُهُ الْجَنَّةَ) [رواہ احمد]

"حضرت انس بن مالک (رض) نبی معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان نقل کرتے ہیں انھوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ اعلان کرتا ہے کہ جس کی دو محبوب چیزیں (دو آنکھیں) میں لے لوں تو پھر وہ صبر کرے اور مغفرت کی امید رکھے تو اس کا بدلہ جنت ہوگا۔ (" تفسیر فہم القرآن)

ہم انسان صرف زمان و مکان کے حدود کے اندر ہی سوچ سکتے ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ یہ واقعہ فلاں کے بعد یا اس سے پہلے ہوا کیونکہ ہم واقعات کو وقوع اور مرور کے بعد ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کا عروج اور ان کا اقتدار فرعون کی غرقابی کے بعد پیش آیا۔ لیکن اللہ علیم و خبیر اور ماکان و مایکون اس کے سامنے کھلے صفحات میں ہے۔ علم الٰہی مکان و زمان سے وراء ہے۔ اس کا عالم مثال بھی بلند ہے اور عالم علم تو اس کے عالم مثال تک بھی ایسا نہیں ہے۔

اب پردہ گرتا ہے، ایک طرف ہلاکت و بربادی کے مناظر تھے، دوسری جانب ضعفاء مسند اقتدار پر براجمان ہو رہے تھے۔ ایک سرکش اور متکبر اور گردن فراز سمندر میں سرنگوں تھے۔ ان سے وہ تمام برتریاں، تعمیرات اور سہولیات حیات چھوٹ گئیں۔ تمام باغ وراغ نظروں سے اوجھل ہوگئے، چشم زدن میں سب کچھ ان کی نظروں میں نابود تھا، اور اس منظر کشی میں قرآن نے چند الفاظ استعمال کیے اور اسے آڈیو کردیا۔

یہ مثال اللہ تعالیٰ مکہ کی ایک قلیل جماعت کے سامنے رکھتے ہیں۔ اہل شرک ان پر مظالم ڈھا رہے ہیں، شہر بدر کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان کے لیے شمع امید روشن کی جا رہی ہے۔ آج دنیا میں جہاں جہاں بھی لوگ اسلامی انقلاب کے لیے کام کر رہے ہیں ان کے لیے یہ شمع امید ہے۔ آج جو عواقب وہ جھیل رہے اور دار و رسن کو چوم رہے ہیں تو یقیناً اللہ اس دنیا کے مشرق و مغرب کو ان کے اقتدار میں دینے والا ہے کیونکہ انھوں نے صبر کیا مگر انعام کے طور پر نہیں آزمائش کے طور پر کہ دیکھا جائے کہ وہ کیا کرتے ہیں؟ (تفسیر فی ظلال القرآن)

آیت مبارکہ:

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰي قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓي اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ١٣٨

لغۃ القرآن: [وَجٰوَزْنَا : اور ہم نے پار کرایا] [بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ : بنی اسرائیل کو] [الْبَحْرَ : سمندر کے] [فَاَتَوْا : تو وہ پہنچے] [عَلٰي قَوْمٍ : ایک ایسی قوم پر] [يَّعْكُفُوْنَ : جو چپکے بیٹھے ہوئے تھے] [عَلٰٓي اَصْنَامٍ لَّهُمْ : اپنے کچھ بتوں پر] [قَالُوْا : انہوں نے کہا] [يٰمُوْسَى: اے موسیٰ] [اجْعَلْ : آپ بنادیں] [لَّنَآ : ہمارے لیے] [اِلٰهًا : ایک الہ] [كَمَا : جیسے کہ] [لَهُمْ : ان کے لیے] [اٰلِهَةٌ : کچھ الہ ہیں] [قَالَ : (موسی نے) کہا] [اِنَّكُمْ : بیشک تم لوگ] [قَوْمٌ: ایک ایسی قوم ہو] [تَجْهَلُوْنَ : جو غلط عقائد رکھتی ہے]

ترجمہ: اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر (یعنی بحر قلزم) کے پار اتارا تو وہ ایک ایسی قوم کے پاس جا پہنچے جو اپنے بتوں کے گرد (پرستش کے لئے) آسن مارے بیٹھے تھے، (بنی اسرائیل کے لوگ) کہنے لگے: اے موسٰی! ہمارے لیے بھی ایسا (ہی) معبود بنادیں جیسے ان کے معبود ہیں، موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: تم یقیناً بڑے جاہل لوگ ہو

تشریح: فرعون اور اس کی قوم نے جو ناروا سلوک حضرت کلیم (علیہ السلام) سے کیا اس کی روئیداد تو آپ اب پڑھ چکے۔ لیکن آپ کی اپنی قوم کا رویہ بھی آپ کے ساتھ بڑا ناشائستہ اور غیر مہذبانہ تھا۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنا عصا مارا۔ سمندر میں ایک شگاف پیدا ہو گیا جس میں سے گزرتے ہوئے وہ دوسرے کنارے پر پہنچ گئے اور فرعون اور اس کا لشکر ان کی آنکھوں کے سامنے غرق ہو گیا۔ یہ قافلہ اب جزیرہ نمائے سینا کے جنوب کی طرف ساحل کے کنارے روانہ ہوا۔ راستے میں ان کا گزر مفقہ کے مقام پر ہوا۔ جہاں مصریوں کا ایک بہت بڑا بت خانہ تھا۔ جس کے آثار اب بھی جزیرہ نما کے جنوب مغربی علاقہ میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے قریب ایک اور مقام بھی تھا جہاں قدیم زمانہ سے سامی قوموں کی چاند دیوی کا بت تھا۔ غالباً انھیں مقامات میں سے کسی کے پاس سے گزرتے ہوئے بنی اسرائیل کو ایک مصنوعی خدا کی ضرورت محسوس ہوئی ہو گی۔ (تفہیم القرآن)

لیکن قرطبیؒ نے قتادہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ قوم جن پر ان کا گزر ہوا وہ لخم تھی جو رقہ شہر میں سکونت پذیر تھی۔ اور گائے کی پرستش کیا کرتی تھی۔ قال قتادہ کان اولئک القوم من لخم وکانوا نزولا بالرقۃ وقیل کانت اصنامھم تماثیل البقر (قرطبیؒ) اور علامہ بیضاوی اور دوسرے مفسرین نے اس قول کے علاوہ یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ قوم عمالقہ کی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اپنے نبی کی صداقت کی آیات بینات دیکھنے کے باوجود بنی اسرائیل کا فوری طور پر شرک صریح کی طرف مائل ہو جانا اس بات کو بالکل واضح کر دیتا ہے کہ طبع انسانی ماحول سے کتنی جلدی متاثر ہوتی ہے اور غلامانہ زندگی فطرت سلیمہ کو کس طرح مسخ کر کے رکھ دیتی ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

مشکل اور اہم الفاظ کے معانی :

جاوزنا : اس کا معنی ہے عبور کرنا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا۔ اس آیت میں بائے تعدیہ ہے اس لیے اس کا معنی ہے عبور کرانا۔

یعکفون : عکوف کا معنی ہے کسی چیز کی طرف متوجہ ہونا اور بہ طور تعظیم کے اس کو لازم پکڑ لینا۔ الاعتکاف کا شرعی معنی ہے عبادت کی نیت سے مسجد میں قیام کرنا۔

اصنام : چاندی، پیتل یا کسی اور دھات سے یا مٹی یا لکڑی سے بنایا ہوا مجسمہ۔ مشرکین تقرب حاصل کرنے کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے۔ یہ مجسمہ کبھی کسی انسان کی واقعی صورت کے مطابق بنایا جاتا ہے اور کبھی خیالی صورت کے مطابق بنایا جاتا ہے جیسے حضرت ابراہیم، حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کے خیالی مجسمے بنائے گئے ہیں۔ عبادت کی نیت سے ان کی تعظیم کرنا شرک ہے جیسے حضرت ابراہیم، حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کے خیالی مجسمے بنائے گئے ہیں۔ عبادت کی نیت سے ان کی تعظیم کرنا شرک ہے اور صرف تعظیم کے لیے یہ مجسمے یا تصاویر رکھنا حرام ہے جیسے بعض لوگ علاء اور مشائخ کی تصیریں تبرک اور تعظیم کی نیت سے رکھتے ہیں۔ بعض لوگ زینت (ڈیکوریشن) کے نیت سے انسانوں اور جانوروں کے مسمے رکھتے ہیں یہ عمل بھی حرام ہے۔

الہ : معبود۔

مناسبت اور ربط آیات :

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل پر اپنی نعمتوں کا ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمنوں کو ہلاک کر دیا اور ان کی زمین کا ان کو وارث بنا دیا۔ اس کے بعد ایک بہت بڑی نعمت کا ذکر فرمایا اور وہ یہ ہے کہ ان کو سلامتی کے ساتھ سمندر سے گزار دیا، اور دوسری سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے اس کی کیفیت بیان فرمائی ہے کہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے سمندر کے پار پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ ایک قوم بتوں کی عبادت کر رہی ہے تو انھوں نے جہالت سے کہا : اے موسیٰ! ہمارے لیے بھی ایک ایسا معبود بنا دیجیے جیسے ان کے معبود ہیں۔

بنو اسرائیل نے کونسا سمندر پار کیا تھا اور کس جگہ کسی قوم کو بتوں کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا تھا؟

جس قوم کے پاس سے بنو اسرائیل کا گزر ہوا تھا اس کے متعلق امام ابن جریر طبری متوفی 310ھ لکھتے ہیں :

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی نے فرمایا : یہ قوم لخم تھی۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ کنعانیوں کی قوم تھی جس کے خلاف حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو قتال کا حکم دیا گیا تھا۔ (جامع البیان جز 9، ص 61، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

علامہ سید محمود آلوسی متوفی 1270ھ لکھتے ہیں :

جس سمندر کو بنواسرائیل نے عبور کیا تھا اس کا نام "بحر قلزم" ہے۔ علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں لکھا ہے کہ یہ دریائے نیل تھا لیکن یہ غلط ہے جیسا کہ البحر المحیط میں ہے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے دس محرم کو یہ سمندر عبور کیا تھا اور فرعون اور اس کا لشکر ہلاک ہو گیا تھا۔ اور بنواسرائیل اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے اس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ (روح المعانی ج 9، ص 40، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

شی محمد حفظ الرحمٰن سیوھاروی لکھتے ہیں :

بنواسرائیل نے بحر قلزم کو پار کرکے جس سرزمین پر قدم رکھا یہ عرب کی سرزمین تھی جو قلزم کے مشرق میں واقع ہے۔ یہ لق و دق بے آب و گیاہ میدان سے شروع ہوتی ہے جو توراۃ کی زبان میں بیابان میں شور، سین، وادی سینا (تیہ) کے نام سے مشہور ہے اور طور تک اس کا دامن وسیع ہے۔ یہاں شدید گرمی پڑتی ہے اور دور دور تک سبزہ اور پانی کا پتا نہیں۔

اس بات کا قطعی فیصلہ تو ناممکن ہے کہ وہ خاص مقام متیین کیا جاسکے جس سے بنی اسرائیل گزرے اور سمندر کو عبور کر گئے تاہم قرآن اور توراۃ کی مشترک تصریحات و نصوص سے یہ متعین کیا جاسکتا ہے کہ بنواسرائیل نے بحر قلزم (بحر احمر Read Sea) کے کسی کنارے اور دہانہ سے عبور کیا یا درمیانی کسی حصہ سے۔ بحر احمر دراصل بحر عرب کی ایک شاخ ہے جس کے مشرق میں سرزمین عرب واقع ہے اور مغرب میں مصر۔ شمال میں اس کی دو شاخیں ہو گئی ہیں ایک شاخ (خلیج عقبہ) جزیرہ نمائے سینا کے مشرق میں اور دوسری (خلیج سوئز) اس کے مغرب میں واقع ہے۔ یہ دوسری شاخ پہلی سے بڑی ہے اور شمال میں بڑی دور تک چلی گئی ہے، بنو اسرائیل اسی کے درمیان سے گزرے ہیں۔ اس شاخ کے شمالی دہانہ کے سامنے ایک اور سمندر واقع ہے جس کا نام بحر روم ہے اور بحر روم اور بحر احمر کے اس شمالی دہانہ کے درمیان تھوڑا سا خشکی کا حصہ ہے۔ یہی وہ راستہ تھا جہاں مصر سے فلسطین اور کنعان جانے والے کو بحر احمر عبور کرنا نہیں پڑتا تھا اور اس زمانہ میں یہ راہ قریب کی سمجھی جاتی تھی اور بنواسرائیل نے بحکم الٰہی یہ راہ اختیار نہیں کی تھی۔ اب اس خشک زمین کو کھود کر بحر احمر کو بحر روم سے ملا دیا گیا ہے اور اس ٹکڑے کا نام نہر سوئز ہے اور بحر احمر کے شمالی دہانہ پر سوئز کے نام سے ایک زہر آباد ہے جو مصر کی بندرگاہ شمار ہوتا ہے (قصص القرآن ج 1، ص 477،469۔471۔ مطبوعہ دار الاشاعت، کراچی)

شرک کے فعل کا جہالت اور حماقت ہونا :

بنواسرائیل نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے کہا : ہمار لیے بھی ایک ایسا معبود بنا دیجیے جیسے ان کے معبود ہیں۔ " یہ چیز ہدایت عقل کے خلاف ہے کہ جس چیز کو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بنائیں وہ حضرت موسیٰ کا، بنواسرائیل کا اور تمام جہان کا خالق اور مدبر ہو کیونکہ جو اپنے بننے میں حضرت موسیٰ کا محتاج ہو وہ ان کا اور تمام جہان کا محتاج الیہ اور خالق کیسے ہو سکتا ہے ؟ اس لیے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا تم کیسی جہالت اور بے عقلی کی باتیں کرتے ہو۔ عبادت انتہائی تعظیم کو کہتے ہیں اور انتاہائی تعظیم کا مستحق وہ ہے جس نے انتہائی انعام کیا ہو اور جو اپنے وجود میں غیر کا محتاج ہو اس میں کسی پر انعام کرنے کی استطاعت کہاں سے ہو گی اور جن لوگوں کو تم بتوں کی عبادت کرتے ہوئے دیکھ رہے ہو ان کے افعال تباہ و برباد ہونے والے ہیں اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں وہ سب غلط اور باطل ہے۔

بنواسرائیل کی ناشکری اور احسان فراموشی :

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے بنواسرائیل کی بتوں کی فرمائش کے جواب میں پہلے فرمایا : اپنے ہاتھوں سے اپنا خدا بنوانا جہالت کی بات ہے۔ پھر فرمایا : جن کو دیکھ کر تم فرمائش کر رہے ہو وہ سب تباہ و برباد ہونے والے ہیں۔ پھر تیسری بار فرمایا جو کچھ یہ بت پرست قوم کر رہی ہے وہ سراسر غلط ہے اور چوتھی بار ان کی حماقت پر تعجب کرتے ہوئے فرمایا : کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں ؟ حالانکہ اس نے تم کو (اس زمانہ میں) سب پر فضیلت دی ہے ! یعنی اللہ نے تم پر یہ احسان کیا کہ اس نے تم کو سب جہانوں پر فضیلت دی اور تم اس کا جواب اس احسان فراموشی کے ساتھ دے رہے ہو کہ اللہ کو چھوڑ کر پتھر کی بنائی ہوئی مورتیوں کی پرستش کرنا چاہتے ہو ! بنواسرائیل کی فضیلت یہ تھی کہ ان کے دین کو ثابت کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک اور اہم اور بڑی نعمت اور احسان کا ذکر کیا جبکہ انھیں فرعون اور اس کی قوم کی غلامی سے نجات دلائی جو کوئی سو سالوں سے ان پر طرح طرح کے ظلم کر رہے تھے۔ سو فرمایا : اور یاد کرو (اے بنواسرائیل !) جب ہم تم کو فرعون کے متبعین سے نجات دے دی جو تم کو برا عذاب دیتے تھے، وہ تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس میں

تمہارے رب کی طرف سے بہت سخت آزمائش تھی سو کتنے افسوس اور شرم کی بات ہے کہ جیسے ہی تم فرعون سے نجات پا کر سلامتی سے سمندر پار پہنچے اور آزاد فضا میں سانس لیا تو تم اللہ کا ان نعمتوں پر شکر کرنے کے بجائے اس کی عبادت میں شریک بنانے کے لیے فرمائشیں کرنے لگے !

واضح رہے کہ بت پرستی کے لیے معبود بنانے کا مطالبہ تمام اسرائیلیوں نے نہیں کیا تھا بلکہ بعض ناشکروں نے کیا تھا۔

کسی مسلمان موحد کو مشرک قرار دینے کا بطلان :

بعض لوگ مطلقاً یارسول اللہ ! کہنے کو شرک کہہ دیتے ہیں۔ حالانکہ شرک اس وقت ہوتا ہے جب کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کی عطا کے بغیر ازخود اپنی طاقت سے سنتے ہیں، ازخود اللہ کے اذن کے بغیر مدد کرتے ہیں، آپ خود موجود اور بصیر ہیں اور آپ کو ازخود علم حاصل ہے اور اگر آپ اللہ کی دی ہوئی طاقت سے ان اوصاف سے متصف ہوں تو شرک کیسے ہوگا۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے تو بنو اسرائیل کو اس وقت بھی مشرک نہیں کہا جب وہ یہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے لیے بھی ایک معبود بنادیں جس کی ہم عبادت کریں۔ حالانکہ اس سے بڑا شرک اور کیا ہوگا ! بلکہ صرف یہی فرمایا تم کیسی جہالت کی باتیں کرتے ہو اور یہ لوگ یارسول اللہ ! کہنے والے کلمہ گو مسلمانوں کو مشرک کہتے ہیں حالانکہ جو مسلمان کلمہ پڑھتے ہیں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اللہ کا بندہ کہتے ہیں وہ آپ کے متعلق یہ کیسے عقیدہ رکھ سکتے ہیں کہ آپ ازخود سنتے ہیں یا ازخود جانتے ہیں بلکہ وہ یہ عقیدہ رکھ سکتے ہیں کہ آپ ازخود سنتے ہیں یا ازخود جانتے ہیں بلکہ وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آپ کے تمام اوصاف اور کمالات عطائی ہیں۔ اس پر کسی نے یہ معارضہ کیا کہ پھر تو آپ کو عطائی خدا کہنا بھی صحیح ہوگا لیکن یہ محض مغالطہ آفرینی ہے کیونکہ خدا قدیم اور واجب الوجود ہوتا ہے وہ عطائی نہیں ہوسکتا۔ اس کے برخلاف علم، قدرت اور اختیار عطائی ہوسکتے ہیں اور ہیں، ہمیں علم اور اختیار ہماری حیثیت سے عطا کیا گیا اور انبیاء (علیہم السلام) کو ان کے مقام کے اعتبار سے علم اور اختیار عطا کیا گیا ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

بنی اسرائیل کی جہالت اور امت محمدیہ کی توحید پہ استقامت :

بنی اسرائیل کی برس صحبت رسول میں رہنے کے باوجود نحوست شرک سے آزاد نہ ہوئے اور موسیٰ (علیہ السلام) سے یہ شرکیہ مطالبہ کرنے لگے جب کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دنیا سے پردہ فرمائے ہوئے چودہ صدیوں سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ آج بھی کوئی مسلمان بت پرستی کا تصور نہیں کرسکتا۔ اور خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اللہ کی قسم ! مجھے یہ ڈر نہیں ہے کہ میری امت میرے بعد شرک میں مبتلاء ہوگی۔

حضرت عقبہ بن عامر (رض) سے روایت ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے منبر پہ خطبہ ارشاد فرمایا :

وانی واللہ ما اخاف علیکم ان تشرکوا بعدی ولکنی اخاف علیکم ان تنافسوا فیھا۔

"اللہ کی قسم ! مجھے تم پر یہ ڈر نہیں کہ میرے بعد تم شرک میں مبتلا ہوگے۔ ہاں مجھے یہ ڈر ہے کہ تم دنیا میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو گے"۔ (بخاری کتاب الجنائز باب 72)

یہ حدیث بخاری میں قریبا 6 بار آئی ہے۔ اس کے علاوہ مسلم کتاب الفضائل حدیث 30 اور مسند احمد بن حنبل جلد 4 صفحہ 149 میں بھی یہ حدیث مروی ہے۔ اس حدیث کے باوجود آج بعض اہل غلو چھوٹی چھوٹی باتوں پر مسلمانوں کو مشرک بنارہے ہیں۔ یارسول اللہ کہنے والا مشرک ہے، کسی نبی ولی کا وسیلہ پکڑنے والا مشرک ہے، بلکہ بعض شدت پسندوں کو کہتے سنا گیا ہے کہ ایسے لوگ ابوجہل و ابولہب سے بڑے مشرک ہیں، لاحول ولا قوۃ الا باللہ، گویا ان لوگوں کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قسم اٹھانے پر بھی یقین نہیں۔ کیسا خطرناک غلو ہے، وہ مومنوں کو اہل غلو سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ خود بدترین غلو میں مبتلا ہیں۔

اسلام کے طریقۂ عبادت کی خصوصیت :

اسلام کے سوا ہر مذہب سجدے کے لیے اپنے سامنے اپنے معبود کی ایک مجسم تصویر بصورت بت رکھتا ہے۔ کہنے کو ان کے مذہبی زعما یہی کہتے ہیں کہ وہ بت کو سجدہ نہیں کرتے بلکہ بھگوان یا فادر کو سجدہ کرتے ہیں اور بت اس کا ایک نشان ہے مگر یہ تصور مذہبی زعما تک محدود ہے ان کے عوام الناس بت ہی کو معبود جانتے اور حاجت روا سمجھتے ہیں۔ میں نے ان کی لکھی ہوئی کہانیاں پڑھی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ گناہ کرکے اپنے بت کے سامنے جاتے ہیں تو انھیں یوں لگتا ہے

جیسے ان کا بت انھیں غصہ سے گھور رہا ہے اور اس کی آنکھوں میں خوفناک چمک ہے اور جب وہ کوئی نیکی کرکے بت کے سامنے جاتے ہیں تو انھیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے بت کا چہرہ خوشی سے دمک رہا ہے اور اس کی آنکھیں مسکرا رہی ہیں۔
مگر یہ سب شیطان کا ڈالا ہوا وسوسہ وفریب ہے، بت ایک پتھر ہے، اس میں کوئی حس واحساس نہیں۔ مگر اسلام نے اس گمراہی کا راستہ بند کرتے ہوئے عبادت میں کسی مجسم تصویر کے سامنے رکھنے کا تصور ختم کر دیا۔ اور اللہ کے لیے کسی مجسم پیرایہ کا رکھنا حرام قرار دیا ہے، اگر اس کو حرام نہ کیا جاتا تو اہل اسلام بھی ایسی ہی گمراہیوں میں مبتلا ہو جاتے اور پتھروں کو حاجت روا ماننے اور ان کے آگے ماتھے رگڑنے لگتے۔ (تفسیر برہان القرآن)

آیت مبارکہ:

إِنَّ هَٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيهِ وَبَٰطِلٌ مَّا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ○[١٣٩]

لغۃ القرآن: [اِنَّ : یقینا] [هٰٓؤُلَآءِ : یہ !] [مُتَبَّرٌ: برباد کیا ہوا ہے] [مَّا : وہ] [هُمْ : یہ لوگ] [فِيْهِ : جس میں ہیں] [وَبٰطِلٌ: اور باطل ہے] [مَّا : وہ جو] [كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ : یہ لوگ کرتے ہیں]

ترجمہ: بلاشبہ یہ لوگ جس چیز (کی پوجا) میں (پھنسے ہوئے) ہیں وہ ہلاک ہو جانے والی ہے اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ (بالکل) باطل ہے

تشریح: یہ سارے بت پرست ان چیزوں کے ساتھ جس میں وہ پھنسے ہوئے ہیں ان سب کے مقدر میں بربادی ورسوائی ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ حق تعالیٰ ان کے دین اور ان کے خود ساختہ آئین کو توڑ دیگا اور ان کے بتوں کو ہمارے ہاتھ سے تڑوائیگا (اور) اچھی طرح جان لو کہ (انکے کرتوت ناحق ہیں)۔۔ الغرض۔۔ ان کی یہ بت پرستی باطل ہے جو زائل ہونے والی ہے۔ (تفسیر اشرفی)
آپ نے فرمایا اے بے وقوفو! ایسے لوگوں کی تقلید کرنے کے لیے بے قرار ہو جو عنقریب ہلاک وبرباد ہونے والے ہیں۔ اور وہ باطل جو انھوں نے اختیار کر رکھا ہے اس کی بے سروپائی بھی ظاہر ہونے والی ہے۔ التبار۔ الہلاک۔ متبر۔ مہلک۔ ہر ٹوٹے ہوئے برتن کو بھی متبر کہتے ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)
حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال تم نہیں جانتے وہ شرک سے پاک اور بلند تر ہے۔ یہ لوگ جس کام میں لگے ہوئے ہیں وہ تباہ ہونے والا ہے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں فضیلت اس لیے تو نہیں بخشی کہ تم اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی ایک حقیر چیز کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ۔
ابو واقد لیثی (رض) کا بیان ہے کہ جب لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مکہ شریف سے حنین کو روانہ ہوئے تو راستے میں انھیں بیری کا وہ درخت ملا جہاں مشرکین مجاور بن کر بیٹھا کرتے تھے، اور اپنے ہتھیار وہاں لٹکایا کرتے تھے، اس کا نام "ذاتِ انواط "تھا، تو صحابہ (رض) نے نبی سے عرض کیا کہ ایک ذات انواط ہمارے لیئے بھی مقرر کردیں آپ نے فرمایا "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم نے قوم موسیٰ (علیہ السلام) جیسی بات کہہ دی کہ "ہمارے لیے بھی معبود مقرر کر دیجیے جیسا ان کا معبود ہے، جس کے جواب میں حضرت کلیم اللہ نے فرمایا: تم جاہل لوگ ہو یہ لوگ جس شغل میں ہیں وہ ہلاکت خیز ہے، اور جس کام میں وہ ہیں وہ باطل ہے۔ (تفسیر طبری: ۱۳/۸۲، ابن کثیر: ۲/۳۹۵) (تفسیر تسہیل البیان)
توراۃ میں ہے کہ جب بنی اسرائیل سلامتی کے ساتھ بحر قلزم کو پار کرگئے اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے فرعون اور اس کی فوج کو غرق ہوتے اور پھر ان کی نعشوں کو ساحل پر تیرتے دیکھ لیا تو بتقاضائے فطرت بے حد مسرت اور خوشی کا اظہار کیا اور عورتوں نے خصوصیت کے ساتھ دف پر خوشی کے گیت گائے اور شادمانی اور خوش کامی کا ثبوت دیا۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے قوم کو جمع کرکے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اپنی قوم سے کہوں کہ وہ میں ہوں جس نے تم کو اس زبردست فتنہ سے نجات دی۔ سو میرا شکر ادا کرو اور میری ہی بندگی کرو۔ چنانچہ اللہ کا یہ فرمان بنی اسرائیل کو پہنچانے کے بعد موسیٰ (علیہ السلام) انھیں ساتھ لے کر جزیرہ نمائے سینا کے جنوبی علاقے کی طرف ساحل کے کنارے کنارے روانہ ہوئے۔ جنوب کے علاقے میں موجودہ شہر طور اور ابوزنیمہ کے درمیان تانبے اور فیروزے کی کانیں تھیں جن سے اہل مصر بہت فائدہ اٹھاتے تھے اور ان کانوں کی حفاظت کے لیے مصریوں نے چند مقامات پر چھاؤنیاں قائم کر رکھی تھیں۔ انہی چھاؤنیوں میں سے ایک

چھاؤنی مفقہ کے مقام پر جہاں مصریوں کا ایک بڑا بت خانہ تھا جس کے آثار اب بھی جزیرہ نما کے جنوبی مغربی علاقہ میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے قریب ایک اور مقام بھی تھا جہاں قدیم زمانے سے سامی قوموں کی چاند دیوی کا بت خانہ تھا۔ غالباً انہی مقامات میں سے کسی کے پاس سے گزرتے ہوئے بنی اسرائیل کو ایک مصنوعی خدا کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انھوں نے جب دیکھا کہ اس بت کدے میں ایک بہت بڑی تعداد میں لوگ بتوں کی پوجا میں بری طرح مشغول ہیں تو وہ دفعتاً اللہ کی ساری عنایات اور تجلیات جنھیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے بھول گئے اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے کہنے لگے کہ ہم کو بھی ایسے ہی معبود بنادو تاکہ ہم اسی طرح ان کی پرستش کریں۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جب ان کا یہ مشرکانہ مطالبہ سنا تو بے حد ناراض ہوئے۔ بری طرح ڈانٹا ' عار دلائی اور ملامت کرتے ہوئے کہا کہ بدبختو! خدائے واحد کی پرستش چھوڑ کر بتوں کی پوجا پر مائل ہو رہے ہو اور خدا کی ان تمام نعمتوں کو فراموش کر بیٹھے ہو جن کا مشاہدہ تم اپنی آنکھوں سے کر چکے ہو۔

قوموں کی حیات اجتماعی کے بعض جھول

قوموں کی حیات اجتماعی میں بعض ایسے جھول دکھائی دیتے ہیں جن کی کوئی تأویل یا توجیہ کرنا بعض دفعہ ممکن نہیں ہوتا۔ بنی اسرائیل ہی کو دیکھ لیجیے وہ تقریباً ساڑھے چار سو برسوں سے مصر کے قاہر و جابر بادشاہوں اور مصری قوم کے ہاتھوں میں غلام اور مظلوم چلے آرہے تھے اور غالب قوم کے سخت سے سخت مصائب و مظالم کا شکار بنے ہوئے تھے کہ اچانک ان جیسی مردہ قوم میں بجلی کی کڑک اور آفتاب کی چمک کی طرح ایک برگزیدہ ہستی سامنے آتی ہے اور اس کی صدائے حق اور اعلان ہدایت سے تمام قلمرو باطل لرزہ براندام ہو جاتی ہے اور ایوان ظلم و کفر میں بھونچال آجاتا ہے وہ دنیا کی ایک زبردست متمدن طاقت کے مقابلے میں یہ اعلان کرتی ہے کہ میں خدائے واحد کا رسول اور ایلچی ہوں اور تجھے ہدایت کی پیروی اور مظلوم قوم کی آزادی کا پیغام سنانے آیا ہوں۔ فرعون کی طاقت اپنے تمام مادی اسباب کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتی ہے مگر ہر مرتبہ شکست کا منہ دیکھتی ہے اور آخری بازی میں حق کی کامیابی اور باطل کی ہلاکت کا ایسا حیرت زا نقشہ سامنے آتا ہے کہ مادی طاقت قلزم میں غرق ہو جاتی ہے اور غلام و مظلوم قوم دنیوی اسباب و وسائل سے محروم آزادی کے گیت گاتی نظر آتی ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہی قوم جو ان تمام معرکہ ہائے حق و باطل کو آنکھوں سے دیکھ چکی ہے وہ آج موسیٰ (علیہ السلام) سے پہلا مطالبہ یہ کرتی ہے کہ ہم کو بھی ایسے ہی معبود بنا دے جس طرح کہ یہ پجاری بت خانے میں بیٹھے پوج رہے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اگرچہ بنی اسرائیل نبیوں کی اولاد تھے اور ابھی تک ان میں وہ اثرات ایک حد تک باقی بھی تھے جو ان کو باپ دادا سے ورثہ میں ملے تھے تاہم صدیوں سے مصری بت پرستوں میں بود و باش رکھنے اور ان کے حاکمانہ اقتدار میں غلام رہنے کی وجہ سے ان میں صنم پرستی کا جذبہ اس حد تک سرایت کر چکا تھا کہ مصر سے نکل آنے کے ستر برس بعد بھی اسے پوری طرح ختم نہیں کیا جاسکا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے خلیفہ اول حضرت یوشع بن نون اپنی آخری تقریر میں بنی اسرائیل کے مجمع عام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

" تم خداوند کا خوف رکھو اور نیک نیتی اور صداقت کے ساتھ اس کی پرستش کرو اور ان دیوتاؤں کو دور کردو جن کی پرستش تمہارے باپ دادا بڑے دریا کے پار اور مصر میں کرتے تھے اور خداوند کی پرستش کرو اور اگر خداوند کی پرستش تم کو بری معلوم ہوتی ہے تو آج ہی تم اسے جس کی پرستش کروگے چن لو۔ "

(یشوع باب ۲۴: ۱۴۔۱۵)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چالیس سال تک حضرت موسیٰ کی اور اٹھائیس سال تک حضرت یوشع کی تربیت و راہنمائی میں زندگی بسر کر لینے کے بعد بھی یہ قوم اپنے اندر سے ان اثرات کو نہ نکال سکی جو فراعنہ مصر کی بندگی کے دور میں اس کی رگ رگ کے اندر اتر گئے تھے۔ پھر بھلا کیونکر ممکن تھا کہ مصر سے نکلنے کے بعد فوراً ہی جو بت کدہ سامنے آگیا تھا اس کو دیکھ کر ان بگڑے ہوئے مسلمانوں میں سے بہتوں کی پیشانیاں اس آستانے پر سجدہ کرنے کے لیے بے تاب نہ ہو جاتیں جس پر وہ اپنے سابق آقاؤں کو ماتھا رگڑتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ اس لیے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے انھیں ڈانٹتے ہوئے فرمایا کہ تم بڑے ہی بے عقل ' وہمی اور جذباتی ہو تمہیں اللہ تعالیٰ نے ایک زندگی بخش پیغام کی صورت میں آب حیات عطا کیا ہے لیکن تم اسے نظرانداز کر کے بتوں کی پرستش کرنا چاہتے ہو حالانکہ بتوں کی پرستش ایک فریب نظر اور طلسم باطل کے سوا کچھ نہیں۔ یہ سب کچھ خدا کے ہاں برباد اور پامال ہو جائے گا لیکن جو ہدایت و شریعت تمہیں ملی ہے اس کے نتیجے میں تمہیں یہاں بھی سرفرازیاں ملیں گی اور آخرت میں بھی سرخرو ٹھہروگے لیکن تمہاری جہالت کی کیا انتہا ہے کہ تم اپنے لیے تباہی کا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہو۔ (تفسیر روح القرآن)

آیت مبارکہ:

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۴۰

لغۃ القرآن: [قَالَ : (موسی نے) کہا] [اَ : کیا] [غَيْرَ اللّٰهِ : اللہ کے علاوہ کو] [اَبْغِيْكُمْ : میں چاہوں تمہارے لیے] [اِلٰهًا : بطور الہ] [وَّ : حالانکہ] [هُوَ : اس نے] [فَضَّلَكُمْ : فضیلت دی ہے تم کو] [عَلَي الْعٰلَمِيْنَ : تمام جہانوں پر]

ترجمہ: (موسیٰ (علیہ السلام) نے) کہا: کیا میں تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی اور معبود تلاش کروں، حالانکہ اسی (اللہ) نے تمہیں سارے جہانوں پر فضیلت بخشی ہے

تشریح: فرمایا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور جو فضیلت اور شرف اس کو بخشا گیا ہے وہ کائنات کی کسی بڑی سے بڑی چیز کو بھی نہیں دیا گیا تو پھر اس سے بڑھ کر اور نادانی کیا ہو سکتی ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کو چھوڑ کر کسی اور شے کو اپنا معبود بنالے جو مرتبہ میں اس سے کہیں حقیر اور کم تر ہے۔ اپنے مسلک کی بڑی زوردار دلیل پیش فرمائی کہ میں اپنے خالق حقیقی کے سوا کسی غیر کی عبادت نہیں کرتا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے کلام میں اپنے نظریہ حیات اور اپنے رب کے بارے میں غیرت کی وجہ سے مزید جوش آجاتا ہے۔ ان کا نغمہ تیز تر ہو جاتا ہے اور وہ برہمی کے ساتھ ان کو یاد دلاتے ہیں کہ ابھی ابھی سمندر کے کنارے جو کچھ ہوا تم بھول گئے ہو، تم اپنے مرتبہ و مقام کا خیال بھی نہیں رکھتے۔ (قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ) ۔ : "پھر موسیٰ نے کہا "کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود تمہارے لیے تلاش کروں؟ حالانکہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں دنیا بھر کی قوموں پر فضیلت بخشی ہے"

اس دور میں تمام اقوام پر بنی اسرائیل کی فضیلت واضح ہے کہ تمام مشرک اقوام میں سے بنی اسرائیل کو منصب رسالت دیا گیا۔ اس سے بڑی فضیلت اور اس سے زیادہ احسان اور کیا ہو سکتا ہے۔ رسالت ایک عظیم فضل اور عظیم احسان ہے۔ نیز اس وقت بنی اسرائیل کو اس منصب کے لیے بھی چنا گیا۔ کہ وہ اس زمین پر مقتدر اعلیٰ ہوں گے۔ خصوصاً ارض مقدس کو ان کے ہاتھوں واگزار کرنے کا فیصلہ بھی ہوا، کیونکہ اس دور میں ارض مقدس پر غیر قوموں کا قبضہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ ان اعزازات کے بعد وہ کس منہ سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کے لیے کوئی الہ تجویز کیا جائے جیسا کہ دوسری قوم نے اپنے لیے الہ تجویز کر رکھے ہیں، جبکہ ان پر اللہ کا بڑا فضل و کرم تھا۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

معبود برحق اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کوئی نہیں: سو ارشاد فرمایا گیا کہ حضرت موسیٰ نے ان لوگوں سے مزید کہا کہ کیا میں اللہ کے سوا تمہارے لیے کوئی اور معبود تلاش کرلوں حالانکہ اسی وحدہ لاشریک نے تم لوگوں کو فضیلت بخشی ہے سب جہانوں پر۔ یعنی جب معبود حقیقی اس وحدہ لاشریک کے سوا کوئی ہے ہی نہیں اور اس نے تم لوگوں کو طرح طرح کے انعامات اور احسانات سے بھی نوازا ہے تو پھر یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ میں اس خالق و مالک حقیقی اور معبود برحق کے سوا تمہارے لیے کوئی اور معبود تلاش کروں؟ کہ اس کے سوا کوئی معبود ہے ہی نہیں۔ سو تم لوگ ذرا سوچو کہ تمہارے رب نے اپنی ہدایت اور شریعت کے لیے تمہارا انتخاب کرکے تم کو کس قدر عظمت اور فضیلت سے نوازا؟ تو کیا میں تمہارے لیے اس خدا کو چھوڑ کر کوئی اور معبود تلاش کروں؟ سو ذرا تم لوگ سوچو کہ اس سے بڑھ کر ناشکری اور بے انصافی اور کیا ہو سکتی ہے؟ تو پھر میں تمہارا یہ بیہودہ مطالبہ آخر کس طرح مان سکتا ہوں؟۔ والعیاذ باللہ العظیم ۔ (تفسیر مدنی کبیر)

اس سے دو مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ نبی کی اولاد ہونا اور نبی کی قوم ہونا فضیلت کا باعث ہے۔ بنی اسرائیل کی فضیلت کی وجہ یہ تھی کہ وہ انبیاء کی اولاد تھے۔ اسی طرح اب سید حضرات افضل ہیں بشرطیکہ مومن ہوں۔ ایمان چھوڑنے کے بعد تو سید ہی نہیں رہتا۔ خیال رہے کہ بنی اسرائیل اس وقت تمام جہانوں سے افضل تھے۔ دوسرے یہ کہ خیال کفر کفر نہیں ورنہ یہ لوگ افضل نہ رہتے۔ (تفسیر نور العرفان)

آیت مبارکہ:

وَاِذْ اَنْجَیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ یُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ۟۱۴۱

لغۃ القرآن: [وَاِذْ : اور جب] [اَنْجَیْنٰكُمْ : ہم نے نجات دی تم کو] [مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ : فرعون کے پیروکاروں سے] [یَسُوْمُوْنَكُمْ : وہ تکلیف دیتے تھے تم کو] [سُوْٓءَ الْعَذَابِ : برے عذاب کی] [یُقَتِّلُوْنَ : وہ قتل کرتے تھے] [اَبْنَآءَكُمْ : تمہارے بیٹوں کو] [وَ یَسْتَحْیُوْنَ : اور زندہ رکھتے تھے] [نِسَآءَكُمْ : تمہاری عورتوں کو] [وَفِیْ ذٰلِكُمْ : اور اس میں] [بَلَآءٌ: ایک آزمائش تھی] [مِّنْ : سے] [رَّبِّكُمْ : تمہارے رب] [عَظِیْمٌ: بہت بڑی]

ترجمہ: اور (وہ وقت) یاد کرو جب ہم نے تم کو اہل فرعون سے نجات بخشی جو تمہیں بہت ہی سخت عذاب دیتے تھے، وہ تمہارے لڑکوں کو قتل کر دیتے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے، اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے زبردست آزمائش تھی

تشریح: اللہ تعالیٰ نے موجودہ یہود سے فرمایا کہ ہماری یہ نعمت یاد کرو جب ہم نے تمہیں قوم فرعون سے نجات دی۔ وہ تمہارے بچوں کو قتل کرتے اور بچیوں کو زندہ رکھتے تھے تاکہ وہ نساء (عورتیں) بن کر ان کے کام آئیں تو اس نعمت کا شکرانہ یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے سب پیغمبروں اور اس کی سب کتابوں پہ ایمان لاؤ۔ چنانچہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پیغمبر اعظم ہیں اور قرآن کتاب اعظم ہے، تو نعمت کا یہ بدلہ نہیں ہے کہ نعمت دینے والے رب کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں سے انکار کیا جائے، مگر یہود پہ اس حکمت والے کلام کا کچھ اثر نہ ہوا۔ (تفسیر برہان القرآن)

بنی اسرائیل پر کیے گئے اور یہاں جتلائے گئے وہ ان کے دل و دماغ میں موجود تھے۔ اور ان کا مشاہدہ تازہ تھا۔ محض ان احسانات کی یاد دہانی ہی اس بات کے لیے کافی تھی کہ وہ سجدہ شکر بجالاتے۔ اللہ تعالیٰ ان کو متوجہ کرتے ہیں کہ یہ عبرت کا مقام ہے اور انسانوں پر مشکلات اور اس کے بعد مشکلات سے نجات سب کچھ انسان کے لیے ایک آزمائش ہے۔ وَفِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ "اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش ہے"۔ اس لیے کہ ان میں سے کوئی واقعہ بھی اتفاقی نہ تھا۔ سب کچھ تقدیر الٰہی کے مطابق تھا اور آزمائش تھی اور آزمائش سے مقصد عبرت آموزی تھی اور مسلمانوں کو تجربات سے دوچار کرکے کھرے اور کھوٹے کو جدا کرنا مطلوب تھا اور یہ مقصد تھا کہ جب ان کو سزا دی جائے تو ان کے لیے گلے شکوے کا کوئی موقعہ نہ رہے، اس وقت جب یہ تمام آزمائشیں ان پر کارگر نہ ہوں۔
اب یہ منظر بھی ختم ہو جاتا ہے، (تفسیر فی ظلال القرآن)

رکوع ایک نظر میں

بنی اسرائیل بحر قلزم کو عبور کرنے کے بعد جب صحرائے سینا میں داخل ہوئے تو ان کا رخ کوہ سینا کی طرف تھا بڑھتے بڑھتے جب وہاں پہنچے جو موجودہ نقشہ میں نبیؑ صالح اور کوہ سینا کے درمیان وادی الشیخ کے نام سے موسوم ہے اور جو آج کل میدان الراحہ کہلاتا ہے۔ اس وادی کے ایک سرے پر وہ پہاڑی واقع ہے جہاں مقامی روایت کے مطابق حضرت صالح (علیہ السلام) ثمود کے علاقے سے ہجرت کرکے تشریف لے آئے تھے آج وہاں ان کی یادگار کے طور پر ایک مسجد بنی ہوئی ہے دوسری طرف ایک اور پہاڑی جبل ہارون نام سے موسوم ہے تیسری طرف سینا کا بلند پہاڑ ہے جس کا بالائی حصہ اکثر بادلوں سے ڈھکا رہتا ہے اور جس کی بلندی سات ہزار تین سو انسٹھ فیٹ ہے اس پہاڑ کی چوٹی پر آج تک وہ کھوہ زیارت گاہ عام بنی ہوئی ہے جہاں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے چلہ کیا تھا اس میدان الراحہ میں بنی اسرائیل موجود تھے جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کو تورات دینے کے لیے کوہ طور پر بلایا اور قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکلے ابھی

صرف تین ماہ گزرے تھے چنانچہ اتنی مختصر مدت کے بعد جیسے ہی ان کو صحرا میں نسبتاً پرسکون ماحول میسر آیا اور وہ غلامانہ زندگی سے نکل کر اب اس قابل ہوئے کہ اپنی مرضی کی زندگی گزار سکتے ہیں اور جس طریق زندگی اور زندگی کی راہنمائی کو قبول کرنا چاہیں اس کے لیے ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں اب وہ نہ صرف کہ فیصلے کرنے میں آزاد ہیں بلکہ ایک ایسی ریاست کا نظام بھی چلا سکتے ہیں جس میں صرف اللہ ہی کی بندگی کارفرما ہو اور اللہ کے سوا کسی اور کی اطاعت پر مجبور نہ کیا جائے۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے خود ضرورت محسوس کرتے ہوئے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے گزارش کی کہ آپ مصر میں ہم سے یہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تمہیں مصر کی غلامی سے آزادی نصیب ہوگی تو تمہیں آزادانہ زندگی گزارنے کے لیے اللہ تعالیٰ کتاب عطا فرمائیں گے جس میں تمہارے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے راہنمائی ہوگی چنانچہ اب اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ وہ ہمیں وہ راہنمائی اور شریعت کتاب کی صورت میں عطا فرمائیں۔ چنانچہ اگلی آیات کریمہ میں اسی کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔ پیشتر اس کے کہ ہم ان آیات کو پڑھیں چند باتیں ایسی ہیں جن پر توجہ دینا از بس ضروری ہے سب سے پہلی بات یہ کہ جب کبھی کوئی قوم اپنے وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوتی ہے تو یقیناً وہ اپنے وطن سے خالی ہاتھ نکلتی ہے زندگی کے وسائل کے حوالے سے اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا اگر اسے نیا وطن نصیب ہو جائے تو اس کی سب سے پہلی ضرورت اس کی آبادکاری ' اس کے لیے وسائل کی فراہمی اور زندگی کی ضروریات کا مہیا کرنا ہوتا ہے اور پھر آگے چل کر جیسے جیسے یہ ضرورتیں پھیلتی جاتی ہیں ان کی فکر دامن گیر ہوتی جاتی ہے اور بچوں کے مستقبل کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے پھر ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اداروں کے وجود کو سب سے ضروری سمجھا جاتا ہے لیکن ہمیں یہاں یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے کہ اسرائیلی روایات کے مطابق چھ لاکھ افراد پر مشتمل یہ بنی اسرائیل کی قوم صحرا میں پڑی ہے جس میں رہنے کے لیے کوئی گھر نہیں ' زندگی کے وسائل بالکل نایاب اور زندگی کی ضروریات روز بروز افزوں تر۔ بایں ہمہ ! ان میں سے اگر کھانے پینے کا مطالبہ ہوتا ہے تو چند چشموں کے اجراء اور من و سلویٰ کے نزول سے پورا کر دیا جاتا ہے اور موسم کی تمازت سے بچنے کے لیے سر پر بادلوں کا سائبان تان دیا جاتا ہے بس اتنی سی ضروریات کی فراہمی کے بعد بنی اسرائیل کی طرف سے اگر کوئی مطالبہ ہوتا ہے تو وہ یہ کہ ہمیں اللہ کی کتاب چاہیے۔ اللہ سے ہمیں کتاب آئین لے کر دیں تاکہ ہم اس کی راہنمائی میں اللہ کی رضا کو حاصل کرنے کے لیے زندگی گزار سکیں۔ اور یہ صرف ان کا مطالبہ نہیں بلکہ مصر میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی مسلسل تربیت اور تعلیم کا یہ نتیجہ تھا کہ تمہاری اصل ضرورت تمہاری سیرت و کردار کی تعمیر ہے اور وہ اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتی جب تک تمہیں تعمیر سیرت کا پروگرام مہیا نہ کیا جائے۔ اس سے ہمیں یہ بات سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ قومیں وسائل سے زندہ ضرور رہتی ہیں لیکن قوموں کی تشکیل ان کے مقاصد کا حصول اور ان کی سیرت و کردار کی تعمیر وہ وسائل سے نہیں ہوتی بلکہ وہ اللہ کی راہنمائی میں زندگی گزارنے اور اسی کے مطابق مسلسل تعلیم و تربیت سے ہوتی ہے اس لیے جو قوم بھی معنوی اور اخلاقی زندگی کی ضرورت محسوس کرتی ہے اس کا سب سے پہلے فرض یہ ہے کہ قوم کو اگر مکان میسر نہ ہوں تو خیمے لگا دیئے جائیں اگر پر تکلف ضروریات بہم نہ ہو سکیں تو سادہ سے سادہ زندگی پر کفایت کر لی جائے اور کم سے کم ضروریات پر اکتفا کرنے کا ذوق پیدا کیا جائے لیکن جہاں تک سیرت و کردار کی تعمیر کا تعلق ہے اس میں کسی طرح کا تساہل بھی ممکن نہیں۔ جیسے ہی زندگی کے معمولی امکانات مہیا ہو جائیں تو سب سے پہلے اسی بات کی طرف توجہ دی جائے تاکہ قوم کی شیرازہ بندی ہو سکے ' ایک مہذب انسان مہذب معاشرہ ' مہذب سوسائٹی اور مہذب ریاست اور حکومت وجود میں آئے یہ ضرورت اگر پوری ہو جائے تو باقی ضرورتیں نہ صرف کہ تیزی سے پوری ہو جاتی ہیں بلکہ اس طرح پوری ہوتی ہیں کہ ہر ایک شخص دوسرے شخص کی ضرورت پورا کرنے میں لگ جاتا ہے اگر افراد سازی کا کام نہ کیا جائے اور تعمیر سیرت کو نظرانداز کر دیا جائے تو پھر قوم ' قوم نہیں رہتی انسانوں کی بھیڑ بن جاتی ہے اور وسائل کی فراہمی میں سب سے بڑی رکاوٹ خود اس ملک کے رہنے والوں کی خود غرضی اور حد سے بڑھی ہوئی ہوس بن جاتی ہے ملک میں وسائل ہوں گے لیکن حسن کردار سے محروم لوگ اسے اپنی ذات کے لیے سمیٹنے کی کوشش کریں گے۔ قوی ' قوی تر ہوتا جائے گا اور کمزور ' کمزور تر۔ رفتہ رفتہ یہ قوم طبقات میں تقسیم ہو جائے گی اور پھر خدانخواستہ اگر اس قوم کو کسی افتاد یا حادثے سے دوچار ہونا پڑے تو یہ ریت کا ایک انبار ثابت ہوگی۔

ہمارے لیے لمحہ فکریہ

پاکستان بھی بنی اسرائیل ہی کی طرح غلامی کی ایک طویل رات سے آزاد ہونے کے بعد وجود میں آیا تھا اور ہندوستان سے ہجرت کرنے والے ہر فرد کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ اب تم جس پاکستان میں جارہے ہو وہ تمہارے لیے ایک ایسا خوبصورت ملک ہوگا جس میں ممکن ہے کہ وسائل میں کمی ہو لیکن محبت ' خیر خواہی ' انسان دوستی

'اللہ کا خوف جیسی اقدار کی ایسی ہمہ ہمی ہو گی کہ تم ہزار مصیبتوں سے نکل کر جب وہاں پہنچوگے تو یوں محسوس کروگے جیسے جنت میں پہنچ گئے ہیں وہاں کا ایک ایک فرد خود بھوکا رہ کر دوسرے کو کھلانے کی کوشش کرے گا 'وہاں ملیں کپڑا بنیں گی تو وہ کپڑا ہر غریب اور امیر کی تن پوشی کے کام آئے گا وہاں کسی کو یہ گلہ کبھی نہیں ہوگا۔

ملیں اسی لیے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں

کہ دختران وطن تار تار کو ترسیں

وہاں کا ہر گھر 'گھر سے محروم لوگوں کی پناہ گاہ ہوگا وہاں کی سڑکوں پر چلنے والے لوگ ایک دوسرے کی حفاظت کے لیے مستعد ہوں گے ایک روٹی کھانے والا بھی آدھی روٹی دوسرے کو دینے کے لیے بیتاب ہوگا ہمیں یہ سراب دکھایا جاتا رہا لیکن جب ہم پاکستان میں آگئے تو ہم یہ بات بھول گئے کہ اس سراب کو حقیقت بنانے کے لیے حسن کردار اور مضبوط سیرت کی ضرورت ہے اور وہ جس چیز سے وجود میں آتا ہے ہمیں سب سے پہلے اپنے وعدے کے مطابق اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے سبق سیکھتے ہوئے اسی کی فکر کرنی چاہیے لیکن ہم نے ہر چیز کی فکر کی بجز اس فکر کے جس میں ہماری بقا کی ضمانت تھی۔ نتیجہ سامنے ہے کہ آج ہم اپنے بکھیرے ہوئے کانٹوں کو پلکوں سے چننے میں لگے ہوئے ہیں لیکن وہ کانٹے ختم ہونے میں نہیں آتے۔ آج بھی یہ آیات کریمہ ہمیں اسی حقیقت کی طرف متوجہ کر رہی ہیں۔ کاش! ہم آج بھی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ ہم نے 1948ء کی اسمبلی سے جو دھوکہ دینا شروع کیا تھا اور جس طرح ہم نے ہر موقع پر اس ریاست کے جواز کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اگر ہم نے اس رویے کو نہ بدلا تو اللہ بہتر جانتا ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

دوسری بات جو ان آیات سے سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو تورات دینے کے لیے کوہ طور پر طلب فرمایا لیکن اس سے پہلے چالیس دن تک انھیں اعتکاف میں رکھا گیا اور ان سے روزے رکھوائے گئے سوچنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا دستور نامہ (تورات) بنی اسرائیل کی راہنمائی کے لیے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے اس بات کی کیا ضرورت ہے کہ آپ سے چالیس دن تک ایک لمبی مشقت لی جائے لیکن ہم جب دوسری کتابوں کے نزول کی تاریخ پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی خصوصیت نہیں بلکہ جب بھی کسی پیغمبر کو اللہ نے کتاب عطا فرمائی ہے تو پہلے اس پیغمبر کو اسی تربیت سے گزارا گیا۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو پہاڑی پر اعتکاف کرنا پڑا۔

ہمارے رسول پاک احرا کی تنہائیوں میں مسلسل عبادت میں مصروف رہے۔ دن کو روزے سے رہتے رات کو اللہ سے لو لگائے بیٹھے رہتے۔ دنیا کی بے ثباتی 'اپنی ذات کی دریافت 'مخلوقِ خدا کی اصلاح اور نجانے کتنے سوالات بار بار دل میں اٹھتے رہے اور مسلسل اللہ کی طرف توجہ سمٹتی گئی۔ جب تربیت کا یہ عمل اپنی انتہا کو پہنچا تو تب آپ کی زبان مبارک پر قرآن پاک کا نغمہ سرمدی جاری ہوا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنا کلام نازل فرماتے ہیں اور زندگی کی راہنمائی کا سامان بہم پہنچاتے ہیں تو اس کے تحمل اور قبولیت کی استعداد کو پہلے پیدا فرماتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ اللہ کے نبی معصوم ہوتے ہیں وہ نبوت سے پہلے بھی نخل فطرت کا سب سے خوبصورت ثمر ہوتے ہیں انھیں یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ کے احکام کیا ہیں لیکن اپنے گرد وپیش میں پھیلے ہوئے تمام منکرات سے وہ فطرت کی راہنمائی میں ہر طرح سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس کے باوجود انھیں فوراً کتاب عطا نہیں فرما دی جاتی بلکہ مسلسل روزے اور اعتکاف کی تربیت سے ان کے دل و دماغ اور ان کی اندرونی قوتوں کو اتنا پاکیزہ اور اتنا مستعد بنا دیا جاتا ہے جن سے ان کے اندر کلام خداوندی کے برداشت کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی کبھی کوئی اللہ کے کلام اور اس کی کتاب سے استفادہ کرنا چاہے گا تو اسے حتی المقدور اپنی فطرت 'اپنی طبیعت اور اپنے احساسات کو پاکیزہ کرنا ہوگا تاکہ وہ اللہ کے کلام سے موافقت پیدا کر سکے۔ جب اس کے انوار اس کے دل پر اتریں تو جس طرح آئینہ روشنی کو سمیٹتا ہے وہ فوراً ان انوار کو جذب کر سکے اور جس طرح صاف سلیٹ پر عبارت لکھی جا سکتی ہے اسی طرح قرآن پاک کی ایک ایک ہدایت اس کے لوح قلب پر کندہ کی جا سکے اور اگر ایسا ہو کہ قرآن کریم جن بنیادی تصورات اور بنیادی ہدایات کو زندگی کی تطہیر کے لیے عطا فرماتا ہے 'دل و دماغ اسے قبول کرنے کی بجائے شک وارتیاب کی دیواریں کھڑی کر دے وہ کردار و عمل کی جس عمارت کو استوار کرنا چاہتا ہے بے عملی کے غار اور بداطواری کے خود رو پودے اسے جگہ بنانے کا موقع ہی نہ دیں تو اللہ کی کتاب کو پڑھنے کے باوجود بھی آدمی اس کی ہدایت سے محروم رہتا ہے چنانچہ یہاں بنی اسرائیل کی تاریخ کے ضمن میں ہمیں یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ لوگو! تمہاری سیرت سازی کا کام تمہاری انفرادی زندگی کی تعمیر '

تمہاری اجتماعی زندگی کی استواری صرف اللہ کی کتاب کی راہنمائی سے ممکن ہے لیکن یہ دیکھنا کہ تمہارے تعلیمی ادارے تمہارے ذرائع ابلاغ اور تمہاری معاشرتی روایات اس راستے میں رکاوٹ نہ بننے پائیں تم جب تک قرآن پاک سے استفادہ کے لیے پہلے ان کی اصلاح کی فکر نہیں کروگے اس وقت تک اللہ کی کتاب سے استفادہ کرنا اور اس کی راہنمائی سے فیض پانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ چنانچہ ان دونوں بنیادی باتوں کو ذہن میں رکھ کر آنے والی آیات کریمہ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ (تفسیر روح القرآن)

فوائد

۱: یا تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ شریف میں موجود یہود سے خطاب ہے، یا اس وقت کے یہود سے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی معرفت یہ خطاب ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ متبعین کو بھی آل کہا جاتا ہے کیونکہ فرعونی پولیس یہ عذاب دیتی تھی نہ کہ فرعون کی اولاد۔

۲: یعنی فرعوت تمہاری لڑکیوں کو اس لیے زندہ چھوڑتا تا کہ بڑی ہونے پر ان سے اپنی خدمت لے۔

۳: اس نجات دینے میں اس مصیبت میں تم پر اللہ کا فضل یا اس کی آزمائش ہے۔ پھر موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم ہوا کہ طور پر آکر ایک ماہ روزے رکھو تب تم کو توراۃ دی جاوے گی۔ آپ نے ذیقعدہ کا سارا مہینہ روزے رکھے۔ پھر مسواک کرکے بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوئے حکم ہوا کہ تمہارے منہ سے روزے کی خوشبو نہیں آتی۔ اچھا اب دس روزے اور رکھو تاکہ پھر وہی خوشبو تمہارے منہ میں پیدا ہو۔ ایسا ہی کیا اور دسویں ذی الحجہ کو توراۃ دی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ چالیس کا عدد فیضان الٰہی کے لیے بہت موزوں ہے۔ خیال رہے کہ روزے میں مسواک بالکل ممنوع ہونا اور مسواک کرلینے پر دس روزے اور رکھنا موسیٰ (علیہ السلام) کی خصوصیت ہے۔ اس سے ہم مسواک کو منع نہیں کرسکتے اور نہ مسواک روزہ توڑتی ہے۔ (تفسیر نور العرفان)

آیت مبارکہ:

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ○١٤٢

لغۃ القرآن: وَوٰعَدْنَا : اور ہم نے وعدہ کیا] [مُوْسٰي : موسیٰ سے] [ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً : تیس راتوں کا] [وَّاَتْمَمْنٰهَا : اور ہم نے مکمل کیا انہیں] [بِعَشْرٍ : دس سے] [فَتَمَّ : تو پورا ہوا] [مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ: ان کے رب کا طے شدہ وقت] [اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً : چالیس راتوں کا] [وَقَالَ : اور کہا] [مُوْسٰي : موسیٰ نے] [لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ : اپنے بھائی ہارون سے] [اخْلُفْنِيْ : تو میرے پیچھے رہ] [فِيْ قَوْمِيْ : میری قوم میں] [وَاَصْلِحْ : اور اصلاح کر] [وَلَا تَتَّبِعْ : اور پیروی مت کرنا] [سَبِيْلَ : راستے] [الْمُفْسِدِيْنَ : فساد کرنے والوں]

ترجمہ: اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے تیس راتوں کا وعدہ فرمایا اور ہم نے اسے (مزید) دس (راتیں) ملا کر پورا کیا، سو ان کے رب کی (مقرر کردہ) میعاد چالیس راتوں میں پوری ہو گئی۔ اور موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے بھائی ہارون (علیہ السلام) سے فرمایا: تم (اس دوران) میری قوم میں میرے جانشین رہنا اور (ان کی) اصلاح کرتے رہنا اور فساد کرنے والوں کی راہ پر نہ چلنا (یعنی انھیں اس راہ پر نہ چلنے دینا)

تشریح:

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی طور پر چلہ کشی، اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی اور حصول تجلی :

قوم فرعون کی غلط کے بعد بنی اسرائیل کو فرعونی ظالمانہ قوانین سے آزاد زندگی ملی کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جی سکیں۔ تب انھوں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے کہا کہ انھیں ایک کتاب چاہیے جس میں مذکور قوانین کے مطابق وہ زندگی گزاریں۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کوہ طور پر آجائے جہاں آپ کو نبوت ملی تھی۔ وہاں تیس دن روزہ رکھے اور عبادت کرے تب کتاب ملے گی۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کو مصر میں یا صحرائے سینا میں کسی جگہ ٹھہرایا اور تنہا کوہ طور پر تشریف لے گئے۔

طور پر موسیٰ (علیہ السلام) کے چالیس راتیں گزارنے کی تفصیل :

حضرت ابوالعالیہ (رض) سے مروی ہے کے اپنے ماہ ذیقعدہ کے 30 دن وہاں گزارے اس دوران آپ کا وضو نہیں ٹوٹا، نہ آپ کوہ طور سے نیچے اترے اور حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے مروی ہے کے اپنے تیس دن مسلسل روزہ رکھا۔ (نہ سحری کی نہ افطاری، اسے سوم وصال کہتے ہیں) مسلسل روزہ کی وجہ سے آپ کے منہ میں روزے کی مہک پیدا ہو گئی۔ (معدہ خالی ہو تو منہ سے ایک مہک سی آنے لگتی ہے) آپ نے اسے دور کرنے کے لیے ایک ٹہنی چبالی (کھالی) اللہ تعالیٰ نے آپ سے فرمایا کہ آپ نے اپنا روزہ کیوں چھوڑ دیا؟ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ روزے دار کے منہ کی مہک میرے نزدیک کستوری کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے آپ لوٹ جائیں اور دس دن مزید روزہ رکھیں۔ آپ نے ایسے ہی کیا (آپ نے ماہ الحجہ کے پہلے دس دن مزید گزارے) تب اللہ تعالیٰ نے آپ سے کلام فرمایا اور کتاب عطا فرمائی۔ (تفسیر ابن ابی حاتم جلد 5 صفحہ 1556 حدیث 8916 مطبوعہ مکہ)

مروی ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بنی اسرائیل کو 30 دن میں واپس آجانے کا کہہ گئے تھے جب آپ کو طور پر مزید رہنا پڑا تو انھوں نے سمجھا ضرور موسیٰ (علیہ السلام) کو کچھ ہو گیا ہے تب وہ ان سے بے خوف ہو گئے اور سامری کے بنائے ہوئے بچھڑے کی پرستش کرنے لگے۔

یاد رہے طور ایک پہاڑی سلسلہ ہے جو صحرائے سینا کے جنوب میں خلیج عقبہ و خلیج سویس کے درمیان شرم الشیخ سے 300 میں شمال میں واقع ہے۔ اس سلسلہ میں ایک پہاڑ سب سے اونچا ہے جس پر چڑھنے کے لیے کم از کم چار گھنٹے درکار ہیں۔ 2005ء میں دورہ مصر کے دوران راقم الحروف اس پہاڑ پر چڑھا تھا اور وہ جگہ دیکھی جہاں موسیٰ (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے تھے۔ آج وہاں یہود کا سینگاگ، عیسائیوں کا چرچ اور مسلمانوں کی مسجد تینوں اکٹھے بنے ہوئے ہیں راقم الحروف نے اس مسجد میں نماز فجر پڑھائی اور سورۃ والتین والزیتون وطور سینین تلاوت کی وہ ہزاروں برس پرانا منظر نگاہوں میں گھوم گیا جب موسیٰ (علیہ السلام) اس جگہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے تھے۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) جب طور پر جانے لگے تو آپ نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنی جگہ قوم میں خلیفہ بنایا اور انھیں فرمایا کہ اس قوم پر کڑی نگاہ رکھیں اور اگر ان میں کچھ فسادی لوگ فساد اٹھائے تو وہ اسے حکمت سے ختم کریں یعنی ایسا کوئی عمل نہ کریں کہ فساد زیادہ ہو۔

یاد رہے موسیٰ (علیہ السلام) نبی بھی تے اور اپنی قوم کے حاکم بھی اور انھوں نے اپنے بھائی کو نبوت میں نہیں حکومت میں اپنا خلیفہ بنایا۔ کیونکہ نبوت میں کوئی کسی کا خلیفہ نہیں ہوتا بلکہ ہر نبی کی نبوت مستقل ہوتی ہے۔ (مرزا قادیانی وہ پہلا گمراہ شخص ہے جس نے کہا کہ ایک نبوت مستقل ہوتی ہے دوسری غیر مستقل جو ظلی و بروزی ہوتی ہے، پھر اس نے خود کو غیر مستقل اور ظلی یا بروزی نبی کہا مگر یہ سب گمراہی وضلالت ہے)

امام علی کا یہودی شوشہ اور مسلمانوں میں نار فتنہ کا بھڑکنا :

اہل تشیع اس جگہ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنایا اور فرمایا اَخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ۔ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت سیدنا علی (رض) سے فرمایا: انت منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی۔ "اے علی! تم میرے ساتھ ایسے ہو جیسے موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ ہارون، مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں"۔ (بخاری مسلم) معلوم ہوا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد حضرت علی خلیفہ تھے مگر ابو بکر و عمر و عثمان نے ان پر ظلم کرتے ہوئے ان سے حق خلافت چھین لیا۔

اس کاجواب یہ ہے کہ یہ سب اہل تشیع کو یہود نے پڑھایا ہے تاکہ مسلمانوں میں پھوٹ پڑے۔ چنانچہ دور عثمان غنی (رض) میں ایک یہودی عالم عبداللہ بن سبا لبادۂ اسلام اوڑھ کر مسلمانوں میں داخل ہوا اور اس نے سب سے پہلے یہ بات کی کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد خلافت تو حضرت علی (رض) کا حق تھا، ابو بکر وعمر وعثمان یہ حق کیسے لے گئے۔ پھر اس نے اسی حدیث سے دلیل پکڑی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی (رض) سے فرمایا: انت منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ الخ۔ شواس نے مسلمانوں میں اختلاف کی بنیاد رکھی۔

اس حقیقت سے ایک شیعہ مورخ مرزا محمد تقی سپہر ایرانی پردہ اٹھاتا ہے۔ اس کی طویل عبارت کا خلاصہ میں چند الفاظ میں یوں لکھتا ہوں:

"عبداللہ بن سبا ایک یہودی شخص تھا اس نے زمانۂ عثمان بن عفان میں اسلام اختیار کیا۔ اسے خلافت عثمان پسند نہ آئی وہ ان کے خلاف باتیں کرنے لگا۔ انھوں نے اس کو مدینہ سے نکال دیا، وہ مصر چلا گیا۔ وہاں اس نے لوگوں میں یہ بات پھیلائیں کہ جب عیسیٰ (علیہ السلام) واپس دنیا میں آئیں گے تو یہ کیسے ممکن ہے کی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) واپس دنیا میں نہ آئیں (یہیں سے شیعوں کے عقیدۂ رجعت کی بنیاد پڑی) پھر اس نے لوگوں سے کہا: ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء میں سے ہر ایک کا کوئی وصی اور وزیر وخلیفہ ہوتا تھا، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دنیا سے جائیں اور اپنا نائب وخلیفہ نہ بنائیں اور آپ نے حضرت علی سے فرمایا تھا: انت منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ"۔

آگے اس نے کہا:

"ازیں می تواں بدانست کہ علی (علیہ السلام) خلیفۂ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) است وعثمان ایں منصب راغصب کردہ وباخود بستہ، یعنی اس سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ علی (علیہ السلام) ہی خلیفۂ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں اور عثمان نے اس منصب کو غصب کرکے خود پر لگا رکھا ہے"۔ (ناسخ التواریخ تاریخ خلفاء جلد سوم صفحہ 237 طبّی جدید مطبوعہ کتاب فروشی اسلام تہران ایران)

الغرض یوں اس نے مصری لوگوں کو حضرت عثمان (رض) عنہٗ کے خلاف بھڑکایا پھر اس نے بصرہ وکوفہ میں جاکر یہی آگ بھڑکائی اور انھیں تین علاقوں سے فتنہ پرداز بلوائی لوگ آئے اور انھوں نے عثمان غنی (رض) کو شہید کیا جس کے نتیجے میں جنگ جمل وجنگ صفین ہوئی اور مسلمانوں میں یہودی سازش کے تحت ایسی نار فتنہ بھڑکی کہ اب تک اس کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ جن میں کروڑوں انسانوں کا خرمن ایمان جل کر بھسم ہو رہا ہے، لوگ خلفاء راشدین کو گالیاں دے کر اپنا ایمان برباد کر رہے ہیں۔

رافضیت نے یہودیت کی کوکھ سے جنم لیا ہے:

بہر حال اس سے معلوم ہوا کہ انت منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ سے امام علی المرتضی کا اثبات سب سے پہلے ایک یہودی نے کیا۔ اس سے پہلے مسلمان اس عقیدہ سے متعارف نہ تھے اور اس حقیقت کا اعتراف خود اجلہ مورخین اہل تشیع بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ مشہور شیعہ عالم ملا ابو محمد بن موسیٰ نوبختی لکھتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

"اصحاب علی (علیہ السلام) میں سے اہل علم کی ایک جماعت حکایت کرتی ہے کہ عبداللہ بن سبا ایک یہودی تھا وہ اسلام لایا۔ اس نے ولایت علی کا اظہار کیا، وہ یہودیت میں یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ یوشع بن نون وصی موسیٰ تھے، تو اسلام لانے کے بعد اس نے یہی عقیدہ حضرت علی کے بارہ میں اپنایا۔ "آگے ملا نوبختی لکھتا ہے۔

وھو اول من اشھر القول بفرض اماۃ علی (علیہ السلام) واظھر البراءۃ من اعداءہ فمن ھناک قال من خالف الشیعۃ ان اصل الرفض ماخوذ من الیھودیۃ۔ یعنی عبداللہ بن سبا وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ اعلان کیا کہ امامت علی (علیہ السلام) کا ماننا فرض ہے اور اس نے سب سے پہلے اعداء علی پر تبرا کیا۔ تو یہیں سے مخالفین شیعہ کہتے ہیں کہ رافضیت نے یہودیت سے جنم لیا ہے۔ "(فرق الشیعہ صفحہ 22 مطبوعہ مکتبہ حیدریہ نجف اشرف)۔

اسی طرح اہل تشیع کا مشہور عالم عمر بن عبدالعزیز کشی لکھتا ہے:

وکان اول من اشھر بالقول بفرض اماۃ علی۔ فمن ھنا قال من خلاف الشیعۃ ان اصل التشیع والرفض ماخوذ من الیھودیۃ۔ یعنی عبداللہ بن سبا وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ کہہ کر شہرت پائی کہ امامت علی کا ماننا فرض ہے۔ تو یہیں سے مخالفین شیعہ کہتے ہیں کہ شیعیت ورافضیت کی جڑ یہودیت سے نکلی ہے۔ (رجال کشی صفحہ 133 مطبوعہ مرکز انتشارات العلامہ المصطفوی القاہرہ مصر)

اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ سے وقتی خلافت مراد ہے، نہ کہ خلافت بعد الوصال:

یہ بھی یاد رہے کہ اس آیت میں ہارون (علیہ السلام) کی خلافت سے مراد ان کی صرف چالیس دن کے لیے عارضی خلافت تھی کہ جتنے دن موسیٰ (علیہ السلام) قوم سے غائب رہے اتنے دن ہارون (علیہ السلام) ان کے خلیفہ رہے۔ اس سے خلافت بعد الوصال مراد نہیں، یعنی موسیٰ (علیہ السلام) نے حضرت ہارون سے یہ نہیں فرمایا کہ تم میرے وصال کے بعد میرے خلیفہ ہو کیونکہ ہارون (علیہ السلام) موسیٰ (علیہ السلام) کی زندگی ہی میں وصال فرما گئے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہارون (علیہ السلام) اپنے بھائی موسیٰ (علیہ السلام) کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے۔

چنانچہ شیعہ مفسر ملا فیض کاشانی لکھتا ہے:

وروی القمی عن الباقر (علیہ السلام): مات ہارون قبل موسیٰ وماتا جمیعا فی التیہ۔ قمی نے امام باقر سے روایت کیا ہے کہ ہارون (علیہ السلام) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے پہلے فوت ہوئے اور دونوں کی وفات میدان تیہ میں ہوئی۔ (تفسیر صافی سورۃ مائدہ زیر آیت 26 جلد اول صفحہ 435 مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ تہران ایران)

نبی کا کام وحی الٰہی سے ہوتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) اللہ کے حکم سے ہارون علیہ السلام کو اپنا مستقل نائب و خلیفہ بنائیں اور اللہ کو پتہ ہی نہ ہو کے ہارون تو ان کی زندگی ہی میں فوت ہو جائے گا؟ ممکن ہے شیعہ کہہ دیں گے اللہ کو بدا ہو گیا تھا یعنی غلطی ہو گئی تھی تو یہ الگ بات ہے۔ اور اللہ کو بدا ہو جانا ایک مستقل شیعہ عقیدہ ہے جس کے بیان کا یہ موقع نہیں۔

اسی طرح غزوہ تبوک پر جاتے ہوئے حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی (رض) کو خلیفہ بنایا اور ان سے فرمایا: انت منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی۔ کہ "تم میرے لیے ایسے ہو جیسے موسیٰ (علیہ السلام) کے لیے ہارون (علیہ السلام) تھے۔ البتہ میرے بعد کوئی نبی نہیں"۔ لہٰذا اس سے بھی یہی عارضی خلافت مراد ہے نہ کہ خلافت بعد الوصال۔ یعنی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی سے فرمایا کہ جیسے موسیٰ (علیہ السلام) نے کوہ طور پہ جاتے ہوئے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو عارضی طور پہ خلیفہ بنایا اسی طرح تم میرے بھائی ہو اور میں تمہیں تبوک پہ جاتے ہوئے چند دن کے لئے اپنا خلیفہ بنا رہا ہوں۔ لہٰذا اس حدیث کی بنیاد پر اہل تشیع کا ابو بکر و عمر و عثمان (رض) کی خلافت کو باطل ٹھہرانا خود باطل ہے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مختلف غزوات میں مختلف صحابہ کو مدینہ میں اپنا خلیفہ بنایا:

حضرت علی (رض) کو ایک بار غزوۂ تبوک کے موقعے پر اپنا نائب خلیفہ بنایا تو اہل تشیع نے اسی کو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مطابق اپنی دلیل بنایا۔ حالانکہ مختلف صحابہ کو مختلف غزوات میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مدینہ طیبہ میں اپنا نائب خلیفہ بنا کر گئے۔ سب سے زیادہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم (رض) کو نیابت دی گئی۔ ابن اثیر، ابن جریر طبری، واقدی، قرطبیؔ اور عسقلانی ان سب آئمہ کے نزدیک 13 غزوات میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ نے نابینا صحابی عبداللہ بن ام مکتوم (رض) کو مدینہ طیبہ میں اپنا نائب بنایا اور شیعہ مورخ مرزا محمد تقی نے بھی 7.8 غزوات میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم (رض) عنہٗ کی نیابت مدینہ بتائی ہے۔ دیکھئے ناسخ التواریخ حالات پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جلد اول اور جلد دوم۔

تو کیا وجہ ہے کہ اہل تشیع حضرت عبداللہ بن ام مکتوم (رض) عنہٗ کی امامت کے قائل نہیں ہیں؟ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ایک بار نائب مدینہ بنایا جائے تو وہ شیعہ کے نزدیک خلیفہ بلا فصل اور امام منصوص من اللہ بن جائیں اور حضرت عبداللہ بن ام مکتوم (رض) و تیرہ بار نائب بننے کے باوجود خلیفہ بلا فصل نہ ٹھہریں اور درجۂ امامت نہ پائیں؟ الیس منکم رجل رشید۔

اسی طرح غزوۂ سویق ہجری 2 میں حضرت ابو لبابہ (رض) عنہٗ کو نائب بنایا گیا۔ (ناسخ التواریخ جلد 1 صفحہ 281) غزوۂ غطفان ہجری 3 میں عثمان غنی (رض) خلافت دی گئی۔ (ناسخ جلد 1 صفحہ 285) غزوہ ابواء ہجری 2 میں حضرت سعد بن عبادہ (رض) کو خلیفہ بنایا گیا (ناسخ جلد ا صفحہ ۱۲۷) غزوہ ذات العشیرہ میں حضرت ابو سلمہ بن عبد الاسد (رض) کو نیابت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا شرف حاصل ہوا۔ (ناسخ جلد ا صفحہ ۱۳۳) اور غزوہ ذات الرقاع میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابوذر غفاری (رض) کو مدینہ میں اپنا نائب و خلیفہ مقرر فرمایا۔ (ناسخ جلد ۲ صفحہ ۱۵۷) تو کیا وجہ ہے کہ اہل تشیع ان سب صحابہ کرام (رض) کو امام منصوص من اللہ اور خلیفہ بلا فصل نہیں مانتے؟ افلا تعقلون۔ "کیا تم عقل نہیں رکھتے"۔ (بقرہ۔ 44) (تفسیر برہان القرآن)

ایک اور بات

بنی اسرائیل جب فرعون کی غلامی سے آزاد ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو کوہ طور پر بلایا تاکہ بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے انھیں توراۃ عطا کی جائے، چنانچہ موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم دیا گیا کہ وہ دنیا کے مشاغل سے الگ ہو کر کوہ طور پر تیس دن اور راتیں اللہ تعالیٰ کی یاد میں بسر کریں، بعد میں دس دنوں کا اضافہ کرکے چالیس کی تعداد پوری کر دی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ چالیس دنوں کے ذکر و فکر سے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے دل اور روح کو وہ قوت و توانائی حاصل ہو جائے جس سے وہ کلام الٰہی کے بار گراں کو اٹھا سکیں، اس کے بعد آپ کو توراۃ عطا کی گئی۔

اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر کے لیے صوفیائے کرام جو چالیس روز چلہ کشی کرتے یا کراتے ہیں اس کی اصل یہی آیت ہے، اسی لیے علامہ اسماعیل حقی (رح) لکھتے ہیں: کہ انبیائے کرام (علیہم السلام) کو کلام الٰہی سننے کا مستحق بنانے میں چالیس دن کی چلہ کشی کو خصوصیت حاصل ہے جس طرح اولیاء اللہ کے دلوں میں حکمت کے چشمے جاری ہونے میں اس کا خاصہ دخل ہے جیساکہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جو شخص چالیس دن تک خلوص نیت سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے حکمت کے چشمے اس کے دل سے اس کی زبان پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ (تفسیر روح البیان)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چالیس کے عدد میں کوئی خاص حکمت ہے۔

۔ جیسے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا اعلان چالیس سال کی عمر میں ہوا۔ (بخاری: کتاب الانصار: باب ۴۵)

۔ جو شخص مسجد نبوی میں چالیس نمازیں پڑھے اور اس عرصے میں کوئی نماز فوت نہ ہو، اس کے لیے جہنم سے برأت لکھ دی جاتی ہے۔ (احمد: جلد ۳، ص ۱۵۵)

۔ ماں کے پیٹ میں بچے پر ہر انقلاب چالیس دن کے بعد آتا ہے۔ پہلے چالیس دن نطفہ، دوسرے چالیس دن منجمد خون، اگلے چالیس دن گوشت کا لوتھڑا اور اس کے بعد اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔ (بخاری، بداء الخلق، باب ٦)

۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص نے میری امت کو ان کے دین کے متعلق چالیس حدیثیں پہنچائیں اللہ تعالیٰ اس کو اس حال میں اٹھائے گا کہ وہ فقیہ ہوگا اور میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں گا اور اس کے حق میں گواہی دوں گا۔ (شعب الایمان: جلد ۲: ص ۲۷۰: حدیث نمبر ۱۷۲۵)

۔ جس شخص کی نماز جنازہ میں چالیس اہل ایمان شفاعت کریں اللہ تعالیٰ ان کی شفاعت قبول فرماتا ہے۔ (ابن ماجہ: ابواب الجنائز: باب ۱۹)

غالباً یہی وجہ ہے کہ جب کوئی مسلمان فوت ہوتا ہے تو اس کے عزیز و اقارب اور دوست واحباب چالیس دن تک قرآن اور دیگر ذکر و اذکار پڑھتے رہتے ہیں اور پھر ایک خصوصی محفل کے ذریعہ مرحوم کی مغفرت کے لیے ایصال ثواب کرتے ہیں جسے عرف عام میں چالیسواں کہا جاتا ہے۔

۷۰۔ حضرت ہارون (علیہ السلام) نبی تھے مگر منصب نبوت میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے تابع تھے کیونکہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کرکے حضرت ہارون (علیہ السلام) کو اپنے وزیر کی حیثیت سے مانگا تھا۔ (قرآن: ۲۰، ۲۹) نیز بنی اسرائیل کی حکومت اور سرداری کا منصب بھی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو حاصل تھا، چنانچہ کوہ طور پر جاتے ہوئے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے حکومتی معاملات میں حضرت ہارون (علیہ السلام) کو اپنا جانشین مقرر کیا اور قوم کے انتظامی امور کے لیے ضروری ہدایات دیں تاکہ وہ قوم کی اصلاح کرتے رہیں اور مفسدین سے محتاط رہیں۔ اصلاح امت کا کام بحیثیت نبی اگرچہ حضرت ہارون (علیہ السلام) کے فرائض منصبی میں شامل تھا مگر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے صرف تاکید کی غرض سے انھیں یاد دہانی کرائی تھی کیونکہ بنی اسرائیل ابھی ابھی فرعون کی غلامی سے آزاد ہوئے تھے اور وہ کوئی بھی غلط قدم اٹھا سکتے تھے اس لیے زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔

بہر کیف یہ نبوت کی خلافت نہیں تھی کیونکہ وہ خود نبی تھے بلکہ یہ حکومتی نیابت تھی جیسے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب مدینہ منورہ سے باہر جاتے تو انتظامی امور حضرت علی (رض) یا کسی اور صحابی کے سپرد کر جاتے تو یہ نبوت کی خلافت نہیں تھی صرف انتظامی امور کی عارضی خلافت تھی۔ (تفسیر امداد الکرم)

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بنواسرائیل پر اپنی نعمتوں کا ذکر فرمایا تھا مثلاً ان کو فرعون کی غلامی اور اس کے بے گار لینے سے نجات دی اور ان کو مستقل امت بنایا اور ان کے دین کو ثابت کرنے کے لیے اتنے کثیر معجزات ظاہر فرمائے جو اس سے پہلے کسی امت کے لیے ظاہر نہیں فرمائے تھے اور اس آیت میں ان پر توراۃ کے نزول کا بیان ہے جس میں ان کی زندگی کے لیے دستور العمل تھا، اور اللہ تعالیٰ کے احکام تھے جن پر انھوں نے عمل کرنا تھا۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے مصر میں بنواسرائیل سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ ان کے دشمن کو ہلاک کردے گا تو وہ ان کے پاس اللہ کی کتاب لائیں گے جس میں یہ بیان ہوگا کہ ان پر کیا کام ان کے لیے ممنوع ہیں۔ اس آیت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنا خلیفہ اور نائب بنانے کا ذکر ہے۔

حضرت موسیٰ کے لیے پہلے تیس راتیں اور پھر دس راتیں مزید مقرر کرنے کی حکمت :

امام عبدالرحمٰن بن محمد بن ادریس ابن ابی حاتم الرازی المتوفی 327 ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے بنواسرائیل سے فرمایا : حضرت ہارون کی اطاعت کرنا کیونکہ میں نے ان کو تم پر اپنا جانشین (خلیفہ) مقرر کردیا ہے، میں اپنے رب کے پاس جارہا ہوں، اور ان کو بتایا کہ میں تیس دن کے بعد واپس آجاؤں گا۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے تیس دن روزے رکھے انھوں نے اس بات کو ناپسند کیا کہ وہ اپنے رب سے ہم کلام ہوں اور ان کے منہ سے بو آرہی ہو (روزہ رکھنے سے منہ سے ایک خاص قسم کی بو آتی ہے) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے زمین سے گھاس اٹھا کر اس سے اپنے منہ کو صاف کیا اور گھاس کو چبایا۔ جب اللہ تعالیٰ کے پاس گئے تو اللہ تعالیٰ نے پوچھا تم نے روزہ کیوں افطار کیا (گھاس کیوں چبائی) حالانکہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا خوب علم ہے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اے میرے رب ! میں نے اس چیز کو ناپسند کیا کہ میں تجھ سے اس حال میں کلام کروں کہ میرے منہ سے بو آرہی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : اے موسیٰ کیا تم نہیں جانتے کہ روزہ دار کے منہ کے بو مجھے مشک سے زیادہ پسند ہے۔ اب واپس جاؤ اور دس روزے مزید رکھو پھر میرے پاس آنا، سو حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کیا۔ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا تین راتوں سے مراد ذوالقعدہ کا مہینہ ہے اور بعد میں جو دس دن زیادہ کیے، ذوالحجہ کے دس دن ہیں۔ (تفسیر ابن ابی حاتم ج 5، ص 1556، مطبوعہ مکہ المکرمہ، جامع البیان جز 9، ص 247)

بعض علماء نے اس روایت سے اختلاف کیا ہے۔ کیونکہ احادیث صحیحہ میں مسواک کی بہت فضیلت ہے۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : اگر مجھے مسلمانوں پر دشوار نہ ہوتا تو میں انھیں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیا (صحیح مسلم، الطہارۃ، 42 (252) 578) اور حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دس چیزیں فطرت (سنت) ہیں اور ان دس چیزوں میں آپ نے مسواک کا ذکر فرمایا۔ (صحیح مسلم، الطہارۃ 56، (261) 593) اور حضرت عائشہ (رض) سے روایت ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : مسواک سے منہ کی پاکیزگی ہوتی ہے اور رب راضی ہوتا ہے۔ (صحیح البخاری : 1933) اس لیے مسواک کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو دوبارہ روزے رکھنے کا حکم دینا بظاہر محل نظر ہے۔

اب پھر یہ سوال ہوگا کہ تیس راتوں کے بعد الگ سے دس دنوں کو ذکر کرنے کی کیا توجیہ ہے۔ ایسا کیوں نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ ابتداء چالیس راتوں کا ذکر فرماتا، پہلے تیس راتوں کے وعدہ کا ذکر فرمایا پھر اس کے بعد دس راتوں کا اضافہ فرمایا۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہ چالیس راتوں کی مدت مکمل ہوگئی۔ اس کی حسب ذیل توجیہات ہیں :

1۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو تیس راتوں اور دنوں میں روزے رکھنے کا حکم دیا اور ان ایام میں عبادت کرنے کا حکم دیا، پھر باقی دس دنوں میں توراۃ نازل کی گئی اور ان ہی ایام میں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ سے ہم کلام ہوا۔

2۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) تیس راتیں پوری کرکے پہاڑ طور پر گئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو خبر دی کہ سامری نے ان کی قوم کو شرک میں مبتلا کردیا ہے، تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اس میعاد کو پورا کرنے سے پہلے اپنی قوم کی طرف واپس گئے پھر دوبارہ واپس آئے، اور دس دن کے روزے رکھے۔

3۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلی تیس دن کی مدت صرف حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے لیے ہو اور بعد کے دس دن کی مدت ان ستر منتخب اسرائیلیوں کے لیے ہو جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ پہاڑ طور پر گئے تھے۔ اس کا تفصیلی ذکر الاعراف : 155 میں آئے گا۔

میقات کا معنی اور کسی کام کی مدت مقرر کرنے کی اصل :

اس آیت میں فرمایا ہے حضرت موسیٰ کے ب کا میقات کا چالیس راتوں میں مکمل ہو گیا۔ علامہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے جس وعدہ کو پورا کرنے کے لیے کوئی وقت مقرر کیا گیا ہو اس کو میقات کہتے ہیں۔ اس طرح کسی کام کے وقت کے یلے جو جگہ متعین کی گئی ہو اس کو بھی میقات کہتے ہیں۔ جیسے حج کے مواقیت ہیں۔ (المفردات، ج 2، ص 686، طبع مکہ مکرمہ)

ہمارے علماء نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ کسی وعدہ کی تکمیل کے لیے مدت مقرر کرنا قدیم طریقہ ہے۔ اسی طرح کسی کام کے لیے مدت مقرر کرنا بھی قدیم طریقہ اور اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے، اور اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آسمانوں، زمینوں اور ان کے درمیان کی سب چیزوں کو بنانے کے لیے چھ دنوں کی مدت مقرر فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : " ولقد خلقنا السموات والارض وما بینھما فی ستۃ ایام وما مسنا من لغوب : اور بیشک ہم نے آسمانوں اور زمینوں کو اور ان کے درمیان کی سب چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کی اور ہم کو اس سے بالکل تھکاوٹ نہیں ہوئی "۔ اس اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک مدت مقرر کرنے کے بعد اس میں اضافہ کرنا بھی جائز ہے اور حاکم کسی مقدمہ کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک مدت کے بعد دوسری مدت مقرر کر سکتا ہے۔

بندوں کے اعذار کی آخری مدت ساٹھ سال ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بندوں کی لغزشوں سے درگزر کرنے کی بھی ایک مدت مقرر کردی ہے اور اس مدت کے بعد اس کی لغزشوں پر کوئی عذر قبول نہیں فرماتا۔

اما محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256 ھ روایت کرتے ہیں : حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جس کی اجل کو اللہ تعالیٰ نے ساٹھ سال تک پہنچا دیا ہو، اللہ تعالیٰ نے اس کے تمام اعذار (بہانوں) کو زائل کردیا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 6419۔ مسند احمد ج 3، رقم الحدیث : 8654)

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی 852 ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں :

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ سٹھ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد انسان کا کوئی عذر باقی نہیں رہا کہ وہ یہ کہہ سکے کہ اگر میری عمر زیادہ کردی جاتی تو میں اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرلیتا اور جب کہ وہ اب عزر کی انتہا کو پہنچ چکا ہے تو اب اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے کے لیے اس کا کوئی عذر باقی نہیں رہا جبکہ وہ جو عمر گزار چکا ہے اس میں وہ اللہ کی عبادت اور اس کے احکام کی اطاعت پر قادر تھا۔ سو اس کو چاہیے کہ اب وہ اللہ تعالیٰ سے صرف استغفار کرے اور اس کے احکام کی اطاعت کرے اور آخرت کی طرف بالکلیہ متوجہ ہو جائے، اور اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کے لیے اب کوئی عذر اور بہانہ نہیں چھوڑا۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر اپنی حجت پوری کرنے کے بعد ان کا مواخذہ فرماتا ہے۔

معمر کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو ساٹھ یا ستر سال کی عمر تک مہلت دیتا ہے اور جب وہ اس عمر کو پہنچ جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے اعذار کو زائل کردیتا ہے۔ یعنی اس عمر کے بعد اب ترک اطاعت پر کوئی عذر کارگر نہیں ہوگا۔

علامہ ابن بطال نے کہا کہ ساٹھ سال کی عمر کو اس لیے حد مقرر فرمایا ہے کہ یہ انسان کی عادۃ غالب عمر کے قریب ہے اور یہ وہ عمر ہے جس میں انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس سے ڈرتا ہے اور موت کے انتظار میں رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بندہ کو بار بار موقع عطا فرماتا ہے اور یہ اللہ سبحانہ کا بندوں پر لطف اور کرم ہے حتی کہ وہ ان کو حالت جہل سے حالت علم کی طرف منتقل کرتا ہے۔ پھر ان کو مہلت دیتا ہے حتی کہ واضح حجتوں کے بعد ان سے مواخذہ نہیں فرماتا۔ ہرچند کہ انسانوں کی فطرت میں دنیا سے محبت کرنا اور لمبی امیدیں رکھنا ہے لیکن ان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے نفسوں سے مجاہد کریں اور اللہ تعالیٰ نے جن نیک کاموں کا حکم دیا ہے وہ کام کریں اور جن برے کاموں سے روکا ہے ان سے باز رہیں۔ اور اس حدیث میں یہ اشارہ ہے کہ جب انسان ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کی

موت آنے کا غالب گمان ہے۔ امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہ (رض) روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میری امت کے عمریں ساٹھ سے ستر سال تک ہوں گی اور بہت کم ستر سال سے تجاوز کریں گے۔ بعض حکماء نے یہ کہا ہے کہ انسان کی عمر کے چار ادوار ہیں۔ (1) بچپن (2) جوانی (3) ادھیڑ عمر (4) بڑھاپا اور یہ عمر کا آخری دور ہے اور زیادہ تر یہ دور ساٹھ اور ستر سال کی عمر میں ہوتا ہے اور اس وقت انسان کی جسمانی قوت ضعف اور انحطاط کی طرف مائل ہوتی ہے، اور اب اس کو چاہیے کہ وہ بالکلیہ آخرت کی طرف متوجہ ہو جائے کیونکہ اب وہ قوت اور نشاط کی حالت کی طرف نہیں لوٹ سکتا اور اسی حدیث سے علماء شافعیہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ جو شخص ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ گیا پھر بھی اس نے قدرت اور استطاعت کے باوجود حج نہیں کیا تو وہ گناہ گار ہوگا اور اگر اس سے پہلے قدرت کے باوجود تاخیر کی تو وہ گناہ گار نہ ہوگا۔ (فتح الباری ج 11، ص 240، مطبوعہ لاہور، 1401 ھ)

امام مالک نے کہا ہمارے شہر کے علماء چالیس سال تک لوگوں سے مل جل کر رہتے ہیں اور دنیا کو طلب کرتے ہیں چالیس سال کے بعد وہ ان چیزوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن ج 8، ص 249، دار الفکر، 1415 ھ)

شمسی اور قمری تاریخ مقرر کرنے کا ضابطہ :

یہ آیت اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ تاریخ دنوں کی بجائے راتوں سے کرنا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے : ثلاثین لیلۃ، تیس راتیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قمری مہینہ کی ابتداء رات سے ہوتی ہے۔ صحابہ کرام کا بھی یہی معمول تھا اور عجمیوں کا معمول اس کے خلاف ہے، کیونکہ وہ تاریخ کا اعتبار شمسی مہینوں سے کرتے ہیں۔ علامہ ابن العربی نے کہا : دنیاوی امور اور منافع میں شمسی مہینوں کا حساب جائز ہے اور عبادات اور شرعی احکام میں قمری مہینوں کے حساب سے تاریخیں مقرر کرنا واجب ہے۔

حضرت ہارون (علیہ السلام) کو خلیفہ بنانا اور ان کو نصیحت فرمایا ان کی شان میں کمی کا موجب نہیں۔

اس کے بعد فرمایا : اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا تم میری قوم میں میری جانشینی کرنا۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے کوہ طور پر جا کر اللہ تعالیٰ سے مناجات کا ارادہ کیا تو اپنے فرائض حضرت ہارون (علیہ السلام) کو سونپ دیے۔ اس آیت میں کسی کو اپنا نائب بنانے کی اصل ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت ہارون (علیہ السلام) نبوت میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے شریک تھے تو انھوں نے حضرت ہارون کو اپنا خلیفہ کیسے بنایا ! کیونکہ جو شخص کسی انسان کا شریک ہو وہ اس کے خلیفہ سے بڑے مرتبہ کا ہوتا ہے اور کسی انسان کو بڑے مرتبہ سے کم مرتبہ پر مقرر کرنا اس کی توہین ہے تو حضرت ہارون (علیہ السلام) کو خلیفہ بنانا کس طرح جائز ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قاعدہ یہی ہے لیکن حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نبوت میں اصل تھے کیونکہ پہلے ان کو نبی بنایا گیا اور ان کی دعا سے حضرت ہارون کو نبی بنایا گیا اور وہ ان کے وزیر تھے اور فرعون اور بنو اسرائیل کے ساتھ تمام معاملات میں حضرت موسیٰ ہی کو خطاب کیا گیا، ان ہی سے کلام کیا گیا اور ان ہی پر کتاب نازل کی گئی ان ہی کو معجزات عطا کیے گئے اور فرعون اور قبطیوں کے نزدیک وہی مسؤل تھے اور رشد و ہدایت کا کا اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر بنو اسرائیل سے عمل کرانا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) ہی کے ذمہ تھا۔ اور حضرت ہارون (علیہ السلام) کو اپنا خلیفہ بنانے کا معنی یہ تھا کہ بنو اسرائیل کی رشد و ہدایت کے سلسلہ میں جو فرائض منصبی موسیٰ (علیہ السلام) انجام دیتے تھے وہ اب حضرت ہارون (علیہ السلام) نے انجام دینے ہیں اور اس معنی میں ان کو اپنا خلیفہ بنانے سے ان کے مرتبہ میں ہرگز کمی نہیں ہوئی۔

نیز حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے حضرت ہارون (علیہ السلام) سے فرمایا : " اور ٹھیک ٹھیک کام کرنا اور مفسدوں کے طریقہ پر کاربند نہ ہونا "

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت ہارون (علیہ السلام) نبی تھے اور نبی ٹھیک ٹھیک کام ہی کرتا ہے اور مفسدوں کی پیروی نہیں کرتا، پھر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے حضرت ہارون (علیہ السلام) سے اس طرح کیوں فرمایا ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بہ طور تاکید فرمایا تھا یا پھر بہ طور تعریض تھا یعنی صراحتاً حضرت ہارون کو خطاب تھا اور اشارتاً اپنی قوم سے خطاب تھا۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے : " فاستقم کما امرت : سو آپ اسی طرح قائم رہیں جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے " (ھود : 112)۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نبی معصوم ہیں، آپ سے یہ متصور نہیں ہے کہ آپ اللہ کے حکم کے خلاف کوئی کام کریں۔ اس لیے یہ ارشاد بھی تاکید اور تعریض کے طور پر ہے۔ اسی طرح اس آیت میں فرمایا : " ولئن اتبعت اھواء ہم من بعد ما جاءک من العلم انک اذا لمن الظلمین : اور اگر آپ نے (بالفرض) علم

آنے کے بعد بھی ان کی خواہشات کی پیروی کی تو بیشک آپ کا شمار ضرور ظالموں میں سے ہوگا" (البقرہ : 145) ۔ایک اور آیت میں ارشاد ہے : "لئن اشرکت لیحبطن عملک ولتکونن من الخسرین : اگر (بالفرض) آپ نے (بھی) شرک کیا تو آپ کے عمل ضائع ہو جائیں گے اور آپ ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے" (الزمر : 65)

آپ سے یہ متصور ہے کہ آپ یہودیوں کی پیروی کریں نہ یہ متصور ہے کہ آپ شرک کریں کیونکہ آپ نبی معصوم ہیں۔اس کے باوجود آپ کو ان دونوں کاموں سے بہ طور تاکید منع فرمایا پھر خطاب آپ کو فرمایا اور مراد آپ کی امت ہے۔اسی نہج پر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا کلام ہے انھوں نے حضرت ہارون سے بہ طور تاکید یا بہ طور تعریض کلام فرمایا۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے حضرت علی بہ منزلہ ہارون ہیں :

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی 261ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غزوہ تبوک میں حضرت علی بن ابی طالب (رض) کو (مدینہ میں اپنا) خلیفہ بنایا۔ حضرت علی نے کہا : یارسول اللہ ! آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں خلیفہ بنارہے ہیں ! آپ نے فرمایا کیا تم اس بات سے راضی نہیں ہو کہ تم میرے لیے ایسے ہو جیسے موسیٰ کے لیے ہارون تھے البتہ میرے بعد میں کوئی نبی نہیں ہوگا۔ (صحیح مسلم، فضائل الصحابہ : 31 (204) 6101۔ صحیح البخاری رقم الحدیث : 4416۔ سنن الترمذی، رقم الحدیث : 3752 ۔السنن الکبری للنسائی ج 3، رقم الحدیث : 8435۔ مسند احمد ج 1، ص 185)

حدیث مذکور سے روافض کا حضرت علی کی خلافت بلا فصل پر استدلال :

اس حدیث سے روافض، امامیہ اور شیعہ کے تمام فرقوں نے اس پر استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی (رض) کو تمام امت پر اپنا خلیفہ بنادیا تھا۔ اور اس بناپر روافض نے تین کے سوا تمام صحابہ کی تکفیر کردی، کیونکہ صحابہ کرام نے اس نص صریح کو چھوڑ کر اپنے اجتہاد سے حضرت علی (رض) کے غیر کو خلیفہ بنادیا۔

چوتھی صدی کے مشہور شیعہ عالم شیخ ابو عمرو محمد بن عمر بن عبدالعزیز کشی لکھتے ہیں :

ابو جعفر (علیہ السلام) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصال کے بعد تین شخصوں کے سوا سب مرتد ہوگئے تھے۔ میں نے پوچھا : وہ تین شخص کون ہیں ؟ انھوں نے کہا : مقداد بن اسود، ابوذر غفاری اور سلمان فارسی۔ (رجال کشی ص 12، مطبوعہ ایران)

اور شیخ ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی رازی متوفی 328ھ روایت کرتے ہیں :

عبدالرحیم قصیر بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابو جعفر (علیہ السلام) سے کہا کہ جب ہم لوگوں سے یہ کہتے ہیں کہ سب لوگ مرتد ہوگئے تھے تو لوگ گھبرا جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا اے عبدالرحیم ! رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات کے بعد سب لوگ دوبارہ جاہلیت کی طرف لوٹ گئے تھے (الروضہ من الکافی (فروع کافی ج 8) ص 296، مطبوعہ طہران، 1362ھ)

اور جن لوگوں نے تمام امت اور خصوصاً تمام صحابہ کی تکفیر کی ان کے کفر میں کوئی شک نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن مجید صحابہ کرام کے نقل کرنے اور جمع کرنے سے ثابت ہے اگر یہ ناقلین کافر تھے تو ان کی نقل پر بھی اعتماد نہیں ہوگا۔ نیز تمام احادیث بھی ان ہی صحابہ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کی ہیں، اگر یہ کافر تھے تو تمام احادیث بھی غیر معتبر قرار پائیں گی اور جب قرآن اور حدیث دونوں غیر معتبر اور غیر معتمد قرار پائے تو شریعت بالکلیہ باطل ہو گئی اور اللہ تعالیٰ کی حجت بندوں پر قائم نہ رہی۔

روافض کے استدلال مذکور کا جواب :

اور اس حدیث سے ان کا حضرت علی کی تمام پر خلافت کا استدلال کرنا باطل ہے۔ کیونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک خاص معاملہ میں ایک خاص وقت کے لیے حضرت علی کو اپنا خلیفہ بنایا تھا جیسا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ایک خاص وقت تک کے لیے حضرت ہارون (علیہ السلام) کو اپنا نائب نایا تھا اور جب

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اپنی مناجات سے واپس آ گئے تو حضرت ہارون اپنی سابق حالت پر لوٹ آئے۔ علاوہ ازیں حضرت ہارون (علیہ السلام) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ اصل رسالت میں شریک اور ان کے وزیر تھے اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے وصال کے بعد وہ ان کے خلیفہ نہیں تھے کیونکہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی زندگی ہی میں حضرت ہارون (علیہ السلام) کا میدان تیہ میں انتقال ہو گیا تھا، اس لیے اس حدیث سے روافض اور شیعہ کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس حدیث کی زیادہ سے زیادہ اس چیز پر دلالت ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غزوہ تبوک جاتے وقت حضرت علی (رض) کو صرف مدینہ میں بچوں اور عورتوں کی حفاظت کے سلسلہ میں اپنا نائب بنایا تھا اور نماز پڑھانے کے لیے ان کو اپنا خلیفہ نہیں بنایا تھا بلکہ یہ منصب حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم کے سپرد کیا تھا اور جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غزوہ تبوک سے واپس آ گئے تو حضرت علی (رض) اپنی پہلی حیثیت کی طرف لوٹ آئے اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مدینہ پر حضرت ابن ام مکتوم (رض) وغیرہ کو اپنا نائب بنایا تھا جیسا کہ ہم عنقریب باحوالہ بیان کریں گے۔ سو اس حدیث سے حضرت علی (رض) کا تمام امت پر دائماً خلیفہ بننا لازم نہیں آتا۔

حضرت ابن ام مکتوم کو تمام مغازی میں خلیفہ بنانا

امام محمد بن سعد متوفی 230ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

شعبی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تیرہ غزوات میں تشریف لے گئے اور ہر غزوہ میں آپ نے ابن ام مکتوم کو خلیفہ بنایا وہ مسلمانوں کو نماز پڑھاتے تھے، حالانکہ وہ نابینا تھے۔

شعبی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عمرو بن امکتوم کو غزوہ تبوک میں خلیفہ بنایا وہ مسلمانوں کو نماز پڑھاتے تھے۔

فائدہ: ابن ام مکتوم کے نام میں اختلاف ہے بعض نے کہا ان کا نام عبداللہ بن قیس ہے اور مشہور یہ ہے کہ ان کا نام عمرو بن قیس ہے۔ ان کی والدہ کا نام عاتکہ بنت عبداللہ ہے ان کی کنیت ام مکتوم ہے۔ عمرو بن ام مکتوم مکہ میں قدیم اسلام لانے والوں میں سے تھے۔ جنگ بدر سے کچھ عرسہ پہلے ہجرت کر کے مدینہ آئے اور دار القراء میں ٹھہرے۔ یہ مدینہ میں حضرت بلال (رض) کے ساتھ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے اذان دیتے تھے اور عام غزوات میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کو خلیفہ بناتے تھے اور یہ مسلمانوں کو نماز پڑھاتے تھے۔ ایک روایت یہ ہے کہ یہ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تھے اور جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بدر گئے ہوئے تھے تو یہ مسلمانوں کو نماز پڑھاتے تھے۔ (الطبقات الکبری ج 4، ص 205۔206، مطبوعہ دار صادر بیروت، 1388ھ)

امام ابن الاثیر علی بن محمد الجزری التوفی 630ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تیرہ غزوات میں حضرت ابن ام مکتوم (رض) کو مدینہ میں خلیفہ بنایا اور جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حجۃ الوداع کے لیے تشریف لے گئے تب بھی آپ نے ان ہی کو خلیفہ بنایا تھا۔ (اسد الغابہ ج 4، ص 252، رقم: 4011، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

حافظ ابو عمر یوسف بن عبداللہ بن عبدالبر القرطبّی التوفی 463ھ نے بھی واقدی کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تیرہ غزوات میں حضرت ابن ام مکتوم کو خلیفہ بنایا اور امام ابن اثیرہ کی طرح ان غزوات کا تفصیل سے ذکر بھی کیا ہے۔ (الاستیعاب ج 3، ص 276، رقم: 1969، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1415ھ)

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی 852ھ لکھتے ہیں: امام ابن اسحاق نے حضرت براء بن عازب (رض) سے روایت کیا ہے کہ سب سے پہلے ہمارے پاس حضرت مصعب بن عمیر (رض) ہجرت کر کے آئے، پھر حضرت ابن ام مکتوم (رض) آئے اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عام غزوات میں ان کو مدینہ میں خلیفہ بناتے تھے اور وہ مسلمانوں کو نماز پڑھاتے تھے۔

اس کے بعد حافظ عسقلانی نے امام عبدالبر کے حوالے سے ان تیرہ غزوات کی تفصیل ذکر کی ہے۔ (الاصابہ ج 4، ص 495، رقم: 8780، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1415ھ)

حضرت ابن ام مکتوم کی خلافت سے حضرت علی کے متعلق مزعوم خلافت بلا فصل پر معارضہ :

ابن کثیر حوالہ جات سے واضح ہوگیا کہ حضرت ابن ام مکتوم (رض) کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تیرہ مرتبہ مدینہ میں اپنا خلیفہ بنایا اور مسلمانوں کی نمازوں کا امام بنایا اور جب تیرہ مرتبہ خلیفہ بننے اور مسلمانوں کی نمازوں کا امام بننے سے یہ لازم نہیں آیا کہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصال کے بعد تمام امت کے امیر اور خلیفہ بننے اور مسلمانوں کی نمازوں کا امام بننے سے یہ لازم نہیں آیا کہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصال کے بعد تمام امت کے امیر اور خلیفہ بن جائیں تو صرف ایک مرتبہ مدینہ میں خلیفہ بننے سے حضرت علی (رض) کے لیے کیسے لازم آئے گا کہ وہ امت کے خلیفہ بن جائیں جبکہ نمازوں کے امام اس وقت بھی حضرت ابن ام مکتوم تھے۔ نیز اگر یہ حدیث حضرت علی (رض) کی خلافت بلا فصل پر دلیل تھی تو حضرت علی (رض) نے اس حدیث سے اس وقت کیوں نہیں استدلال کیا جب ان سے حضرت ابوبکر صدیق (رض) کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے کہا جا رہا تھا۔

نیز یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تھا کہ تم میرے لیے ایسے ہو جیسے حضرت موسیٰ کے لیے ہارون تھے۔ اور حضرت ہارون حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں امت پر کنٹرول نہیں کرسکے اور اس میں تفرقہ ہوا اور حضرت علی (رض) کے دور خلافت میں بھی ایسا ہی ہوا اور امت تفرقہ میں بٹ گئی، ہرچند کہ حق پر حضرت علی تھے جیسا کہ حق پر حضرت ہارون (علیہ السلام) تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر بالفرض اس حدیث میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد حضرت علی کی خلافت کی طرف اشارہ ہے، تو اس بشارت سے مراد وہی زمانہ ہے جس زمانہ میں حضرت علی (رض) کو خلیفہ بنایا گیا۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَلَمَّا جَآءَ مُوۡسٰى لِمِيۡقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِىۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَيۡكَ‌ ؕ قَالَ لَنۡ تَرٰٮنِىۡ وَلٰـكِنِ انْظُرۡ اِلَى الۡجَـبَلِ فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوۡفَ تَرٰٮنِىۡ‌ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلۡجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوۡسٰى صَعِقًا‌ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبۡحٰنَكَ تُبۡتُ اِلَيۡكَ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝۱۴۳

لغۃ القرآن: [وَلَمَّا : اور جب] [جَآءَ : آئے] [مُوْسٰي : موسیٰ] [لِمِيْقَاتِنَا : ہماری طے شدہ جگہ پر] [وَكَلَّمَهٗ : اور کلام کیا ان پر] [رَبُّهٗ : ان کے رب نے] [قَالَ : تو انہوں نے کہا] [رَبِّ : اے میرے رب] [اَرِنِيْٓ: تو مجھے دکھا] [اَنْظُرْ : تو میں دیکھوں] [اِلَيْكَ : تیری طرف] [قَالَ : (اللہ نے) کہا [لَنْ تَرٰىنِيْ : تو ہرگز نہیں دیکھے گا مجھ کو] [وَلٰكِنِ : اور لیکن] [انْظُرْ : تو دیکھ] [اِلَى الْجَبَلِ : اس پہاڑ کی طرف] [فَاِنِ : پھر اگر] [اسْتَقَرَّ : وہ برقرار رہا] [مَكَانَهٗ : اپنی جگہ پر] [فَسَوْفَ : تو عنقریب] [تَرٰىنِيْ : تو دیکھے گا مجھ کو] ۚ فَلَمَّا : پھر جب] [تَجَلّٰى: روشن ہوا] [رَبُّهٗ : ان کا رب] [لِلْجَبَلِ : اس پہاڑ کے لیے] [جَعَلَهٗ : تو اس نے کردیا اس کو] [دَكًّا : ہموار زمین] [وَّخَرَّ : اور گرپڑے] [مُوْسٰي : موسیٰ] [صَعِقًا : بیہوش ہوکر] [فَلَمَّآ : پھر جب] [اَفَاقَ : افاقہ ہوا] [قَالَ : تو انہوں نے کہا] [سُبْحٰنَكَ : تیری پاکیزگی ہے] [تُبْتُ اِلَيْكَ : میں توبہ کرتا ہوں] [وَاَنَا : اور میں] [اَوَّلُ : سب سے پہلا] [الْمُؤْمِنِيْنَ : مومن (جمع)]

ترجمہ: اور جب موسیٰ (علیہ السلام) ہمارے (مقرر کردہ) وقت پر حاضر ہوا اور اس کے رب نے اس سے کلام فرمایا تو (کلام ربانی کی لذت پا کر دیدار کا آرزومند ہوا اور) عرض کرنے لگا: اے رب! مجھے (اپنا جلوہ) دکھا کہ میں تیرا دیدار کر لوں، ارشاد ہوا: تم مجھے (براہ راست) ہرگز دیکھ نہ سکو گے مگر پہاڑ کی طرف نگاہ کرو پس اگر وہ اپنی جگہ ٹھہرا رہا تو عنقریب تم میرا جلوہ کر لوگے۔ پھر جب اس کے رب نے پہاڑ پر (اپنے حسن کا) جلوہ فرمایا تو (شدّت انوار سے) اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ (علیہ السلام) بیہوش ہو کر گر پڑا۔ پھر جب اسے افاقہ ہوا تو عرض کیا: تیری ذات پاک ہے میں تیری بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں اور میں سب سے پہلا ایمان لانے والا ہوں

تشریح:

جب چالیس روزہ مدت پوری ہو گئی اور ذکر الٰہی سے قلب و روح میں کلام الٰہی سننے کی توانائی پیدا ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے گفتگو فرمائی۔ جب کلام کی لذت رگ و پے میں سرایت کر گئی تو دل میں متکلم کے شوق دید کا طوفان امڈ آیا اور عرض کی کہ اے سراپا دلبری و رعنائی! چشم شوق اب ان حجابوں کو برداشت نہیں کر سکتی۔ از راہ لطف و کرم انھیں الٹ دے اور مجھے اپنا آپ دکھا۔ علامہ بیضاوی نے ارنی کے دو معنی بیان کیے ہیں:

۱ارنی نفسک بان تمکننی من رؤیتک یعنی مجھے اپنے دیکھنے کی قدرت عطا فرما تاکہ میں تجھے دیکھ سکوں۔

۲او تتجلی لی فانظر الیک یعنی خود حجابات عظمت کو سرکا تاکہ چشم شوق لطف دید حاصل کرسکے۔

یہ نہیں فرمایا لن اری: میں دیکھا نہیں جاسکتا۔ تاکہ یہ سمجھا جائے کہ رویت باری ممتنع ہے۔ جیسے معتزلہ کا مذہب ہے۔ بلکہ فرمایا لن ترنی: اے موسیٰ آپ مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ مجھے دیکھنے کی تاب فقط اس نگاہ میں ہے جو مازاغ کے سرمہ سے سرمگین ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دیدار الٰہی ناممکن نہیں اور یہی اہل السنتہ والجماعت کا مسلک ہے۔ عند اھل السنۃ الجماعۃ الرویۃ جائزۃ (قرطبیؒ) اگر توفیق الٰہی شامل حال رہی تو سورۃ النجم میں اس بحث کو ذرا تفصیلا لکھا جائے گا۔

حضرت کلیم (علیہ السلام) کی عرضداشت کا جواب تو لن ترانی سے دے دیا گیا۔ لیکن مزید کرم کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم اپنی ایک تجلی اس پہاڑ پر ڈالتے ہیں۔ اگر وہ اس کو برداشت کر سکا تو پھر ممکن ہے کہ آپ بھی برداشت کر سکیں۔ لیکن اگر اس کی سنگین چٹانیں اور فلک بوس چوٹیاں چور چور ہو جائیں تو پھر آپ کو خود بخود پتہ چل جائے گا کہ آپ کو بھی اس کا یارا نہیں تھا چنانچہ جب نور الٰہی کی ایک کرن کوہ طور پر جلوہ طراز ہوئی تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسیٰ (علیہ السلام) اس منظر کی ہیبت و جلال سے بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

جب کچھ وقت گزرنے کے بعد انھیں ہوش آیا تو اللہ کی پاکیزگی بیان کرتے ہوئے اپنے اس سوال پر معذرت پیش کی کیونکہ واصلان بارگاہ الٰہی کے لیے اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کوئی سوال کرنا بھی بہت بڑی بات ہے۔ اسی لیے توبہ کر رہے ہیں ۔

رضائے خاطر محبوب شرط دیدار است بحکم شوق ملاحظہ مکن کہ بے ادبی سب

یعنی اپنی امت کے مومنوں میں سے سب سے پہلے ایمان لانے والا میں ہوں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

چالیس دن کے روزے اور عبادات کی شرط مکمل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے طویل کلام فرمایا: وکلم اللہ موسیٰ تکلیما: "اور اللہ نے موسیٰ کے ساتھ خوب کلام کیا۔" ۔ (نساء: 164) ۔ جس سے آپ کے دل میں اللہ تعالیٰ کے دیدار کی خواہش پیدا ہوئی۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے اس کی درخواست کی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لن ترانی۔ آپ مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ یعنی آپ میرے جلوہ کی ہیبت وجلالت برداشت نہیں کر سکتے اس سے آپ کو نقصان ہو سکتا ہے۔ اگر اللہ رب العزت ارشاد فرماتا کہ مجھے دیکھا ہی نہیں جاسکتا تو موسیٰ (علیہ السلام) خاموش ہو جاتے مگر لن ترانی کہنے سے آپ کا شوق دیدار بڑھ گیا۔

اور حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے مروی ہے کہ آپ نے عرض کیا اے اللہ! اگر تیرے دیدار سے میری جان چلی جائے تو بھی پروا نہیں، تیرے دیدار کے بغیر زندہ رہنے میں کچھ مزا نہیں۔ (تفسیر ابن ابی حاتم جلد 5 صفہ 1559 حدیث 8932)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے اصرار پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ میں تمہارے سامنے پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالتا ہوں اگر وہ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تو پھر تم مجھے دیکھ سکو گے۔ جب اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر تجلی ڈالی تو وہ یوں پس گیا کہ اس کی جگہ ہموار زمین بن گئی اور موسیٰ (علیہ السلام) اس تجلی کی ہیبت کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے۔

حضرت انس (رض) سے مروی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی انگلی کے پور سے اشارہ کرکے بتایا کہ اللہ نے پہاڑ پر (اتنی معمولی اور چھوٹی) سی تجلی ڈالی۔ (ترمذی کتاب التفسیر سورۃ اعراف باب 1)

کلبی نے واقدی سے روایت کیا کہ موسیٰ (علیہ السلام) 9 ذی الحجہ بروز جمعرات تجلی دیکھ کر بے ہوش ہوئے اور اگلے دن 10 ذوالحجہ بروز جمعہ ہوش میں آئے اور آپ کو توراۃ دی گئی۔ (مظہری جلد 4 صفحہ 383) ہوش آنے پر آپ نے کہا اے اللہ میں توبہ کرتا ہوں میں اپنی قوم میں سب سے پہلے تیری عظمتوں پر ایمان لاتا ہوں۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی بے ہوشی اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اللہ کو آنکھ جھپکے بغیر دیکھنا:

یہاں موسیٰ (علیہ السلام) کا پہاڑ پر پڑھنے والی اللہ تعالیٰ کی ایک تجلی کو دیکھ کر بے ہوش ہونا بتایا گیا جب کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا شب معراج اللہ تعالیٰ کو دیکھنا یوں بتایا گیا۔ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی۔ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَھٰی۔ عِنْدَھَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی۔ اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی۔ اور انھوں نے (حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)) نے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اپنے رب کو دوبارہ دیکھا اور سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ہی جنت الماوی ہے جب سدرہ کو ڈھانپنے والی چیز (فرشتوں کی جماعت) ڈھانپ رہی تھی، تب (حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)) کی نگاہ دیکھنے میں نہ بھٹکی نہ حد سے بڑھی۔ " (النجم: 13)۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی۔ کے تحت حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں:

رای محمد ربہ مرتین۔ یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے رب کو دو بار دیکھا۔ (ترمذی کتاب التفسیر سورۃ النجم)

یہاں دو بار دیکھنے سے مراد یہ ہے کہ اپنے رب کو ایک سے زائد بار یعنی کئی بار دیکھا کیونکہ آپ شب معراج اللہ تعالیٰ کے حضور نمازیں کم کروانے کے لئے کئی بار گئے۔ مزید تفصیل سورۃ نجم میں آئے گی۔

حضرت ابوہریرہ (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:

لما تجلی اللہ لموسی کان یبصر دبیب النمل علی الصفا فی اللیلۃ الظلماء من مسیرۃ عشرۃ فراسخ۔ یعنی جب اللہ نے موسیٰ (علیہ السلام) پہ (ادنی) تجلی ڈالی تو وہ اندھیری رات میں دس فراسخ (قریبا چار میل) سے پتھر پر چلنے والی چیونٹی کو دیکھ لیتے تھے۔ (در منثور بروایت ابوالشیخ جلد 4 صفحہ 454 مطبوعہ دارالفکر بیروت)

جب ادنی تجلی پا کر بے ہوش ہو جانے والے موسیٰ (علیہ السلام) کی وسعت نظر کا یہ عالم ہے تو اندازہ کیجئے کہ اپنے رب کو آنکھ جھپکے بغیر دیکھنے والے محبوب خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وسعت نظر کا کیا عالم ہوگا۔ ان کی نظر سے آسمان و زمین کی کوئی شے کیسے مخفی رہ سکتی ہے؟

دیدار الٰہی ناممکن نہیں:

حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس دنیا میں اللہ کا دیدار حاصل کیا اور جنت میں ہر کوئی دیدار الٰہی حاصل کرے گا مگر اس کی کیفیت کو اللہ ہی جانتا ہے وہ رؤیۃ جسمانی نہیں ہے۔

معتزلہ رویت باری تعالیٰ کو ممتنع کہتے ہیں مگر اس آیت سے تین طرح سے دیدار الٰہی کا ممکن ہونا معلوم ہوتا ہے۔

اول: موسیٰ (علیہ السلام) نے اس کا تقاضا کیا اگر یہ ناممکن ہوتا تو آپ تقاضا کیوں کرتے۔

دوم: اللہ تعالیٰ نے لن ترانی۔ فرمایا کہ اے موسیٰ! تم نہیں دیکھ سکتے یہ نہیں کہا کہ مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا ہوں گویا بتادیا کہ کوئی ہے مجھے دیکھنے والا جو شب معراج مجھے دیکھے گا۔

سوم: پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ! اگر پہاڑ میری تجلی کے بعد اپنی جگہ ٹھہرا رہا تو تم مجھے دیکھ سکوگے۔ گویا دیدار الٰہی کو ممکن چیز پر معلق کیا گیا اور ممکن پر معلق بھی ممکن نہیں ہے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی جسم ہے جسے دیکھا جاسکتا ہے بلکہ اس سے مراد اللہ کی کوئی تجلی پانا ہے جس کی کیفیت کوئی نہیں جانتا۔

روز قیامت اہل ایمان کا اللہ کو دیکھنا کثیر احادیث میں مذکور ہے۔ چنانچہ حضرت جریر (رض) کہتے ہیں: ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھے تھے آپ نے چودھویں رات کے چاند کو دیکھا پھر فرمایا:

انکم ستر ون ربکم کماترون ھذاالقمر لا تضامون فی رؤیتہ۔ یعنی عنقریب تم اپنے رب کو یوں دیکھوگے جیسے اس چاند کو دیکھ رہے ہو، تمہیں اس کے دیکھنے میں کوئی شک نہ ہوگا۔ (بخاری کتاب مواقیت الصلوۃ حدیث 554۔ مسلم کتاب المساجد حدیث 633)

حضرت ابو سعید خدری (رض) سے مروی ہے کہ ہم نے عرض کیا: "یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کیا ہم روز قیامت اپنے رب کو دیکھیں گے؟ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

جب آسمان صاف ہو تو کیا تم شمس و قمر کے دیکھنے میں کوئی شک رکھتے ہو؟ ہم نے عرض کیا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: تو تم اپنے رب کے دیکھنے میں بھی کوئی شک نہیں پاؤگے۔" (بخاری کتاب التوحید حدیث 7439، مسلم کتاب الایمان حدیث 302)

حضرت عدی بن حاتم (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

مامنکم من احد الا سیکلمہ ربہ لیس بینہ وبینہ ترجمان ولا حجاب یحجبہ۔ "تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جس سے اس کا رب کلام نہ کرے گا، اس طرح کہ دونوں کے درمیان نہ کوئی ترجمان ہوگا نہ کوئی حجاب"۔ (بخاری کتاب التوحید حدیث 7443، مسلم کتاب الزکوۃ حدیث 1016)

کلیم اللہ اور حبیب اللہ میں فرق:

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اللہ سے کلام کرنے طور پر گئے، چالیس دن چلہ کیا تب شرف ہم کلامی ملا۔ دیدار پھر بھی حاصل نہ ہوا، مگر شب معراج حضور سیاح افلاک (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حطیم کعبہ میں محو آرام ہیں کہ آپ کو جگایا جاتا اور معراج پر لے جایا جاتا ہے۔ (بخاری کتاب التوحید) پھر دیدار الٰہی سے بھی مشرف کیا جاتا ہے۔

اس جگہ میرے فارسی کلام کے بعض اشعار بہت حسب حال ہیں۔

تا بارگاہ مولیٰ تعالیٰ رسیدہ ای

حق را بدیدہ ای و کلامش شنیدہ ای

موسیٰ بیک تجلی ادنیٰ بے ہوش گشت

تو عین ذات تا بتبسم بدیدہ ای

خالق شمارا مجمع افضال ساختہ

ہر فضل و ہر کمال بداماں چنیدہ ای

کفار ہم صفات شمار استودہ اند

اے جان جاں تو صاحب خلق حمیدہ ای

اللہ ترا آں شروع و نظامے بدادہ است

ہر دفتر نظام بشر را دریدہ ای

قرآں شمارا صاحب خلق عظیم گفت

تو آں جمال خلق بشر آفریدہ ای

بشنو صدائے طیبؔ رنجیدہ خستہ حال

فریاد ہر شرور زدہ را شنیدہ ای

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو طور پر توراۃ کا عطا کیا جانا:

جب موسیٰ (علیہ السلام) کو افاقہ کے بعد کتاب دے دی گئی تو آپ نے اس میں امت محمدیہ کے عظیم فضائل کو دیکھ کر اس امت میں سے ہونے کی تمنا کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ علیک السلام! ہم نے آپ کو اپنی رسالت اور ہم کلامی عطا فرما کر (ہر غیر نبی) انسان پر بزرگی دیدی ہے لہٰذا جو احکام اور کتاب آپ کو دی جاتی ہے اسے لے لیں اور شکر گزار ہوں۔

چنانچہ امام ابو نعیم اصفہانی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

جب موسیٰ (علیہ السلام) کو توراۃ دی گئی تو انھوں نے اسے پڑھا اس میں لکھا تھا کہ اللہ ایسی امت پیدا کرے گا ھم الآخرون السابقون جو آخری امت ہے مگر سب امتوں پر سبقت لے جانے والی ہے (یعنی دنیا میں سب سے آخر میں آنے والی ہے مگر جنت میں سب سے پہلے جائے گی) موسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کیا: اللھم اجعلھم امتی۔ اے اللہ انھیں میری امت بنادے۔ اللہ نے فرمایا تلک امۃ احمد۔ وہ احمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت ہے۔

آگے لکھا تھا:

ھم السابقون المشفوع لھم۔ اس امت کی شفاعت روز قیامت سب سے پہلے ہوگی۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے وہی دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے وہی جواب دیا۔ پھر لکھا تھا اللہ ان کی سنتا ہے وہ اللہ کی سنتے ہیں اور وہ اللہ کی آیات سینوں میں حفظ رکھتے اور زبانی پڑھتے ہیں۔ اور ان کے لیے مال غنیمت حلال ہے اور انھیں ایک نیکی پر دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے اور اگر گناہ کرے تو ایک ہی گناہ لکھا جاتا ہے اور اگر نیکی کا ارادہ کرلے اور اسے بجانہ لاسکیں تو وہ نیکی ان کے لیے لکھ دی جاتی ہے اور اگر برائی کا ارادہ کریں اور بجانہ لاسکیں تو وہ برائی نہیں لکھی جاتی۔ موسیٰ (علیہ السلام) ان میں سے ہر فضیلت پر یہی تمنا کرتے رہے کہ ایسے لوگوں کو ان کی امت بنایا جائے اور ہر بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہی جواب آتا رہا: تلک امۃ احمد کہ وہ احمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت ہے، تب موسیٰ (علیہ السلام) نے (جوش میں) کہا:

یارب فاجعلنی من امۃ احمد۔ اے اللہ! پھر مجھے بھی امت احمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں سے بنادے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یٰمُوْسٰٓی اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَبِكَلَامِیْ فَخُذْ مَآ اٰتَیْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ۔ (دلائل النبوۃ جلد اول صفحہ 76 تا 79 مطبوعہ مکتبہ عربیہ حلب شام)

یہاں سے دو فوائد حاصل ہوئے:

1۔ رسول کا غیر رسول سے افضل ہونا۔

یہاں اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ سے معلوم ہوا رسول ہر غیر رسول سے افضل ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی غیر انبیاء کو انبیاء سے افضل کہنا کفر ہے اور ائمہ دین نے اس کے کفر ہونے کی تصریح کی ہے مگر حیرت ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے خود کو سب انبیاء سے افضل کہا اس نے کہا: زندہ شد ہر نبی ب آمد نم۔ ہر رسولے نہاں بپیر اہنم۔ یعنی میرے آنے سے ہر نبی زندہ ہوگیا اور ہر رسول میرے لباس میں پوشیدہ ہے۔ (نزول المسیح مندرجہ روحانی خزائن جلد 18 صفحہ 478 مطبوعہ لندن) اس کے باوجود مرزائی گروہ مرزا قادیانی کو اپنا پیشوا مانتا اور خود کو مسلمان کہلانے پر مصر ہے مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ اسی طرح یہاں اہل تشیع کے اس عقیدہ کی برائی بھی معلوم ہوئی جو وہ آئمہ اہل بیت کو تمام انبیاء سے افضل بتاتے ہیں۔

2۔ فضیلت شکر:

اس جگہ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ سے فضیلت شکر بھی معلوم ہوئی۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کوئی نعمت دے تو اس کا شکر بجالانا چاہیے اور شکر کا طریقہ یہ ہے کہ زبان سے اللہ کے حمد اور جسم سے اس کی اطاعت کی جائے اور اللہ کی دی ہوئی نعمت سے اس کے بندوں کو فائدہ پہنچایا جائے۔ (تفسیر برہان القرآن)

اللہ تعالیٰ کے کلام کے متعلق مذاہب اسلام:

اس آیت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے کلام فرمایا اور اللہ تعالیٰ کے کلام میں حسب ذیل مذاہ ہیں:

1۔ حنبلیہ اور حشویہ کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام آواز اور حروف سے مرکب ہے اور یہ کلام قدیم ہے اور یہ مذہب بداہۃً باطل ہے کیونکہ جو چیز اجزاء سے مرکب ہو اس میں تقدیم اور تاخیر ہوتی ہے اس لیے وہ چیز قدیم نہیں ہوسکتی۔

2۔ کرامیہ کامذہب یہ ہے کہ اللہ کا کلام آواز اور حروف سے مرکب ہے اور اس کا محل اور موصوف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہ مذہب بھی باطل ہے کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کا محل حوادث ہونا اور حوادث سے موصوف ہونا لازم آتا ہے اور جو محل حوادث ہو وہ خود حادث ہوتا ہے۔

3۔ معتزلہ کامذہب یہ ہے کہ اللہ کا کلام آواز اور حروف سے مرکب ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی اور چیز کے ساتھ قائم ہے مثلاً درخت وغیرہ کے ساتھ۔

4۔ اہل سنت وجماعت ماتریدیہ کامذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ایک صفت ازلی ہے اس میں آواز اور حروف نہیں ہیں اور اس صفت کو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے نہیں سنا انھوں نے ان آوازوں اور حروف کو سنا جو درخت کے ساتھ قائم تھے۔

5۔ اہل سنت اشاعرہ کا یہ مزہب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ایک ازلی صفت ہے اس میں حروف اور آواز نہیں ہیں اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اسی صفت کو سنا تھا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا کوئی رنگ اور جسم نہیں ہے اور اس کے باوجود دکھائی دے گا حالانکہ جس چیز کا رنگ نہ ہو اس کا دکھائی دینا انسان کے لیے غیر متصور ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کلام بغیر آواز اور حروف کے حضرت موسیٰ نے سنا جبکہ انسان کے نزدیک بغیر آواز اور حروف کے کسی کلام کا سنائی دینا غیر متصور ہے۔ (تفسیر کبیر ج 5، ص 353، ملخصاً، مرتباً، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، 1415ھ)

یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح کلام لفظی ہوتا ہے اسی طرح کلام نفسی بھی ہوتا ہے۔ کلام لفظی وہ ہے جو عادتاً سنائی دیتا ہے جیسا کہ معروف کلام ہے اور کلام نفسی وہ ہے جو کلمات اور حروف پر مشتمل ہوتا ہے مگر عادتاً سنائی نہیں دیتا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ہماری تعریف میں یہ کہے کہ "میں نے آپ جیسا خوش اخلاق یا آپ جیسا حسین کوئی نہیں دیکھا" تو ہمیں یہ الفاظ اور جملے یاد آتے رہتے ہیں اور ہمارے ذہن میں ان الفاظ کی تصویر گھومتی رہتی ہے حالانکہ یہ الفاظ بعد میں سنائی نہیں دیتے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ہمیں کوئی دلخراش بات کہے تو وہ بات مدتوں ہمارے دل سے نہیں نکلتی اور ہمیں وہ بات یاد آتی رہتی ہے۔ خصوصاً جب ہم اس شخص کو دیکھیں تو اس کے کہے ہوئے الفاظ کی تصویر ہمارے ذہن میں آجاتی ہے سو یہ کلام نفسی ہے اور الفاظ نفسیہ ہیں۔ قرآن مجید میں جو اللہ کا کلام ہے وہ بھی کلام نفسی ہے اور قدیم ہے وہ ان ہی الفاظ نفسیہ پر مشتمل ہے اور الفاظ میں بغیر تقدم اور تاخر کے یہ کلام نفسی ہے اس کلام کی قراءت جو ہم کرتے ہیں وہ کلام لفظی ہے اور حادث ہے اور مقروء یعنی جن الفاظ نفسیہ کی ہم قراءت کرتے ہیں وہ قدیم ہے۔ مثلاً جب ہم الحمد للہ رب العالمین کی قراءت کریں گے تو پہلے الحمد پڑھیں گے پھر اللہ پھر رب العالمین لیکن یہ پورا قرآن کلام نفسی کے مرتبہ میں بغیر تقدم اور تاخر کے اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور قدیم ہے۔ اس کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ جب ہم کو کوئی بات یاد آتی ہے تو یوں نہیں ہوتا کہ پہلے اس ات کا ایک لفظ یاد آتا ہو پھر دوسرا پھر تیسرا پھر چوتھا، بلکہ بیک وقت مکمل کلام کی تصویر ہمارے ذہن میں آجاتی ہے۔ اسی طرح مکمل قرآن نفسی بغیر تقدم اور تاخر کے اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ علی ھذا القیاس۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ جو کلام کیا وہ بھی کلام نفسی تھا اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا اس کلام کو سننا خلاف عادت اور ان کا معجزہ تھا، کیونکہ بغیر آواز کے کسی کلام کو سننا انسان کی عادت اور اس کے معمول کے خلاف ہے۔ میں نے اس مقام کو اسی طرح سمجھا ہے اور امر واقعہ کیا ہے اس کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ قواعد اسلام کے مطابق ہے اور بعض متقدمین اور محققین کی عبارت میں بھی اس تفصیل کی طرف اشارات ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے کلام کی کیفیت کے متعلق احادیث اور آثار

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی 911ھ بیان کرتے ہیں:

امام بزار، امام ابن ابی حاتم، امام ابو نعیم نے الحلیہ میں اور امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں حضرت جابر (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) طور کے دن کلام فرمایا تو یہ اس دن کے کلام کا مغائر تھا جب ان کو اس نے ندا کی تھی۔ حضرت موسیٰ نے اللہ سے کہا اے میرے رب! جس طرح تو نے مجھ سے کلام کیا ہے، کیا تیرا کلام اسی طرح کا ہے؟ فرمایا اے موسیٰ! میں نے دس ہزار زبانوں کی قوت سے تجھ سے کلام کیا ہے اور مجھے تمام زبانوں کی قوت ہے اور اس سے بہت زیادہ ہے، حضرت موسیٰ جب بنو اسرائیل کی طرف واپس گئے تو انھوں نے کہا: اے موسیٰ! رحمٰن کے کلام کی صفت بیان کیجئے آپ نے کہا تم اس کی استطاعت نہیں رکھتے۔ کیا تم نے ایسی گرج اور کڑک کی آواز سنی ہے جو بہت شیریں لگتی ہو؟ اللہ کا کلام اس کے قریب ہے اور وہ اس طرح نہیں ہے۔

حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں کعب سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کلام کیا تو حضرت موسیٰ نے پوچھا: اے میرے رب! کیا تیرا کلام اسی طرح ہے؟ فرمایا: اے موسیٰ! میں دس ہزار زبانوں کی قوت سے کلام کر رہا ہوں اور مجھے تمام زبانوں کی قوت ہے اور اگر میں تمہارے ساتھ اپنے کلام کی کنہ اور حقیقت کے ساتھ کلام کروں تو تم فنا ہو جاؤ۔

امام عبدالرزاق، امام ابن جریر، امام ابن المنذر، امام ابن ابی حاتم اور امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں کعب سے روایت کیا ہے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ تمام زبانوں سے کلام کیا تو حضرت موسیٰ نے کہا: اے میرے رب میں نہیں سمجھ رہا، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان میں ان کی آواز کی مثل کلام فرمایا، تب حضرت موسیٰ نے پوچھا: اے میرے رب! کیا تیرا کلام اسی طرح ہے؟ فرمایا نہیں! میرا کلام جس طرح ہے اگر تم اس کو اسی طرح سن لو تو تم نیست و نابود ہو جاؤ۔ حضرت موسیٰ نے پوچھا: اے میرے رب! کیا تیری مخلوق میں کوئی چیز تیرے کلام کے مشابہ ہے؟ فرمایا نہیں! البتہ تم نے بہت زیادہ گرجدار بجلی کی کڑک جو سنی ہو اس کو اس کے قریب کہا جا سکتا ہے۔

امام ابن المنذر، امام ابن ابی حاتم اور امام حاکم نے سند کی تصحیح کے ساتھ عبدالرحمٰن بن معاویہ سے روایت کیا ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے ان کی طاقت کے مطابق کلام فرمایا اور اگر اللہ ان سے اپنے حقیقی کلام کے ساتھ کلام فرماتا تو حضرت موسیٰ اس کی بالکل طاقت نہ رکھتے۔ پھر موسیٰ (علیہ السلام) چالیس راتیں اس کیفیت میں رہے کہ جو شخص بھی ان کو دیکھتا تھا، وہ رب العالمین کی تاب نہ لا کر مر جاتا تھا۔ (الدر المنثور ج 3، ص 536۔537، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1414ھ)

اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے کلام کی بعض تفصیلات:

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی 911ھ بیان کرتے ہیں:

امام سعید بن منصور، امام ابن المنذر، امام حاکم، امام ابن مردویہ، اور امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں حضرت ابن مسعود (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کلام فرمایا تھا اس دن حضرت موسیٰ نے اونی جبہ پہنا ہوا تھا، اونی چادر تھی، اونی شلوار تھی اور غیر مذبوح دراز گوش کی کھال کی جوتیاں پہنی ہوئی تھیں۔

امام ابن ابی شیبہ نے اور امام احمد نے کتاب الزہد میں اور امام ابوخیثمہ نے کتاب العلم میں اور امام بیہقی نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے رب سے کلام کیا تو پوچھا اے میرے رب! تجھے اپنے بندوں میں سے کون سب سے زیادہ محبوب ہے؟ اللہ عزوجل نے فرمایا جو بندہ میرا بہت زیادہ ذکر کرتا ہو۔ پھر پوچھا تیرے بندوں میں کون سب سے اچھا حاکم ہے؟ فرمایا: وہ شخص جو لوگوں کے خلاف جس طرح فیصلہ کرتا ہو اسی طرح اپنے خلاف بھی فیصلہ کرے۔ پوچھا اے میرے رب! تیرے بندوں میں کون سب سے زیادہ غنی ہے؟ فرمایا جو اس چیز پر راضی ہو جو میں نے اس کو عطا کی ہے۔

امام حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں اور امام بیہقی نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ سے مناجات کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: دنیا میں زہد کی مثل کسی نے کوئی کام نہیں کیا اور میری حرام کردہ چیزوں سے بچنے سے بڑھ کر کسی نے میرا تقرب حاصل نہیں کیا اور میرے خوف سے رونے سے بڑھ کر کسی نے میری عبادت نہیں کی۔ حضرت موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! تو نے ان کے لیے کیا تیار کیا ہے اور ان کی کیا جزا ہے؟ فرمایا: جو لوگ دنیا میں زہد کرتے تھے میں ان کے لیے اپنی جنت مباح کردوں گا وہ اس میں جہاں چاہیں گے رہیں گے، اور جو لوگ حرام کاموں سے بچتے تھے، تو میں قیامت کے دن ہر شخص سے اس کا حساب لیتے وقت مناقشہ کروں گا اور اس کے اعمال کی تفتیش کروں گا لیکن میں ان سے حیا کروں گا اور ان کو عزت اور کرامت دوں گا۔

امام ابوبکر بن ابی عاصم نے کتاب السنہ میں اور امام ابونعیم نے حضرت انس (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کہ ایک دن حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کسی راستہ میں جا رہے تھے تو ان کو جبار عزوجل نے ندا کی: یا موسیٰ! حضرت موسیٰ نے فرمایا: کہ ایک دن حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کسی راستہ میں جا رہے تھے تو ان کو جبار عزوجل نے ندا کی: یا موسیٰ! حضرت موسیٰ نے دائیں بائیں دیکھا تو کچھ نظر نہیں آیا، پھر دوسری بار ندا کی یا موسیٰ بن عمران! انھوں نے پھر دائیں بائیں دیکھا تو کچھ نظر نہیں آیا اور ان پر خوف طاری ہو گیا پھر تیسری بار ندا کی: یا موسیٰ بن عمران! میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ نے کہا لبیک لبیک! اور سجدہ میں گر پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ بن عمران! اپنا سر اٹھاؤ! انھوں نے اپنا سر اٹھایا تو فرمایا: اے موسیٰ! اگر تم

چاہتے ہو کہ تم اس دن میرے عرش کے سائے میں رہو جس دن میرے عرش کے سوا اور کسی چیز کا سایہ نہیں ہو گا تو تم یتیم کے لیے شفیق باپ کی طرح ہو جاؤ اور بیوہ کی مہربان خاوند کی طرف کفالت کرو، اے موسیٰ بن عمران ! تم رحم کرو تم پر رحم کیا جائے گا۔ اے موسیٰ ! تم جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ اے موسیٰ، بنو اسرائیل کے نبی ! جس نے مجھ سے اس حال میں ملاقات کی کہ وہ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا منکر تھا میں اس کو دوزخ میں ڈال دوں گا۔ حضرت موسیٰ نے کہا محمد کون ہے ؟فرمایا: اے موسیٰ ! مجھے اپنی عزت اور جلال کی قسم ! میں نے ان سے افضل کوئی مخلوق پیدا نہیں کی، میں نے عرش، آسمانوں، زمینوں، سورج اور چاند کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے ان کا نام اپنے نام کے ساتھ ملا کر لکھا ہے اور مجھے اپنی عزت اور جلال کی قسم ! میری تمام مخلوق پر اس وقت تک جنت حرام ہے جب تک کہ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کی امت اس میں داخل نہ ہو جائے، حضرت موسیٰ نے پوچھا: اور (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کون ہے ؟فرمایا ان کی امت اترتے چڑھتے ہر حال میں حمد کرنے والی ہے، وہ دن کو روزہ رکھیں گے اور رات کو ڈرتے رہیں گے، میں ان کے کم عمل کو بھی قبول کرلوں گا اور ان کو لا الہ الا اللہ کی شہادت کی وجہ سے جنت میں داخل کر دوں گا۔ حضرت موسیٰ نے کہا: مجھے اس امت کا نبی بنا دے، فرمایا: اس امت کا نبی ان ہی میں سے ہو گا پھر کہا: اچھا مجھے اس نبی کی امت میں سے بنا دے، فرمایا: تم اس سے پہلے ہو۔ اے موسیٰ ! ٹھہرو میں تمہیں اور ان کو دار الجلال میں اکٹھا کر دوں گا۔ (کتاب السنہ ج 1، ص 305، الشریعہ ج 1، ص 244، حلیۃ الاولیاء ج 3، ص 429-430، طبع جدید، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1418ھ)

امام ابن الشاہین نے کتاب الترگیب میں حضرت ابو بکر صدیق (رض) سے روایت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: اے میرے رب ! اس شخص کے لیے کیا اجر ہے جو اس عورت سے تعزیت کرے جس کا بچہ فوت ہو چکا ہو ؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس دن کسی چیز کا سایہ نہیں ہو گا اس دن میں اس کو اپنے سایہ میں رکھوں گا۔

امام ابن ابی حاتم نے العلاء بن کثیر سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ ! کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمہیں کیوں اپنے کلام سے نوازا، عرض کیا نہیں اے میرے رب ! فرمایا اس لیے کہ میں نے کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کی جو تمہاری طرح متواضع ہو۔ (الدر المنثور ج 3، 537-542، ملتقطاً، ملخصاً، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1414ھ)

اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے کے متعلق اہل قبلہ کے مذاہب

اس کے بعد فرمایا: (حضرت موسیٰ نے کہا) اے میرے رب ! مجھے اپنی ذات دکھا کہ میں تجھے دیکھوں فرمایا: تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے۔ الایہ۔ (الاعراف: 143)

اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دکھائی دینا عقلا ممکن ہے، محال نہیں ہے اور اس پر اجماع ہے کہ یہ رویت آخرت میں واقع ہو گی، اور مومن اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے اور کافر نہیں دیکھیں گے اور اہل بدعت میں سے معتزلہ، خوارج اور بعض مرجہ کا مذہب یہ ہے کہ مخلوق میں سے اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے اور کافر نہیں دیکھیں گے، اور اہل بدعت میں سے معتزلہ، خوارج اور بعض مرجہ کا مذہب یہ یہ ہے کہ مخلوق میں سے اللہ تعالیٰ کو کوئی نہیں دیکھے گا اور اللہ تعالیٰ کا دکھائی دینا عقلاً محال ہے، ان کا یہ قول غلط اور باطل ہے، کتاب وسنت کی تصریحات، صحابہ، فقہاء تابعین اور اخیار امت کا اس پر اجماع ہے کہ مومنین آخرت میں اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے اور بیس سے زیادہ صحابہ سے اس قسم کی احادیث مروی ہیں۔

اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ رویت ایک قوت ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں پیدا کرتا ہے، اس کے لیے شعاع بصری کا دکھائی دینے والے کو احاطہ کرنا اور دکھائی دینے والے کا دیکھنے والے کے بالمقابل ہونا شرط نہیں ہے، لہٰذا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آخرت میں جب مسلمان اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے تو ان کی شعاع بصری اللہ تعالیٰ کا احاطہ کرلے یا اللہ تعالیٰ دیکھنے والوں کی بالمقابل جانب ہو، معتزلہ نے اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے کا اس لیے انکار کیا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا محاط ہونا اور اس کے لیے سمت اور جہت کا ہونا لازم آئے گا، ہاں ہم جو ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اس میں یہ چیز اتفاقاً پائی جاتی ہے لیکن یہ شرط نہیں ہے اور جب مومن اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے تو اس سے اللہ تعالیٰ کا مقابل جہت میں ہونا لازم نہیں آئے گا۔ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ بصیر ہے اور وہ ہمیں دیکھتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے دیکھنے سے اس کا جانب مقابل میں ہونا لازم نہیں آتا تو اس کے دکھائی دینے سے جانب مقابل میں ہونا کس طرح لازم آئے گا !

منکرین رویت کے دلائل اور ان کے جوابات

منکرین کی ایک دلیل تو سورۃالاعراف کی یہ مذکورہ آیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے فرمایا: تم مجھے ہر گز نہ دیکھ سکو گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے دیکھنے کی نفی ہے، اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے کی نفی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے: تم مجھے ہر گز نہ دیکھ سکو گے یہ نہیں فرمایا میں ہر گز دکھائی نہیں دوں گا۔

ان کی دوسری دلیل یہ آیت ہے: " لاتدرکہ الابصاری وھو یدرک الابصار: آنکھیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے " (الانعام: 103)۔

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اس میں دنیا میں اللہ کو دیکھنے کی نفی ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اس میں کفار کے دیکھنے کی نفی ہے اور ہمارا مسلک یہ ہے کہ مسلمان آخرت میں اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے۔

ان کی تیسری دلیل یہ آیت ہے: " واذ قلتم یموسی لن نومن لک حتی نری اللہ جھرۃ فاخذ تکم الصعقۃ وانتم تنظرون: اور یاد کرو جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم تم پر اس وقت تک کبھی ایمان نہیں لائیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا نہ دیکھ لیں پس تم کو کڑک نے اپنی گرفت میں لے لیا در آنحالیکہ تم دیکھتے تھے "

معتزلہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو دیکھنا جائز اور ممکن ہوتا تو اللہ تعالیٰ بنو اسرائیل کے اس مطالبہ کے سبب ان پر عذاب نازل نہ فرماتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اس لیے عذاب نازل نہیں فرمایا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی محبت میں اسے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور ایک امر محال کا سوال کیا تھا۔ بلکہ عذاب اس لیے نازل فرمایا تھا کہ انھوں نے سرکشی اور ہٹ دھرمی کا مظاہر کیا تھا اور ایمان لانے کو اللہ تعالیٰ کے دیکھنے پر موقوف کر دیا تھا گویا کہ وہ حالت کفر میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنا چاہتے تھے جبکہ اللہ تعالیٰ کافروں کو اپنا دیدار نہیں کرائے گا۔

رہا یہ امر کہ اس پر کیا دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنا جائز اور ممکن ہے اور محبت الٰہی کی وجہ سے اس کی رویت کا سوال کرنا جائز ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسی آیت میں ہے: موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! مجھے اپنی ذات دکھا کہ میں تجھے دیکھوں۔ (الاعراف: 143)

اگر اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی آرزو کرنا اور دعا کرنا ناجائز ہوتا تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نبوت کے علوم و معارف کے حامل ہو کر اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کیوں کرتے اور اگر بالفرض یہ دعا ناجائز ہوتی تو اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو ایسی دعا کرنے سے منع فرما دیتا۔ اور رویت کے امکان پر دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: " ولکن انظر الی الجبل فان استقر مکانہ فسوف ترانی: البتہ تم اس پہاڑ کی طرف دیکھو اگر (میری تجلی کے باوجود) یہ اپنی جگہ برقرار رہا تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے " (تفسیر کبیر، ج 5، ص 353)

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے دیکھنے کو پہاڑ کے برقرار رہنے پر معلق کیا ہے اور پہاڑ کا اپنی جگہ پر برقرار رہنا فی نفسہ ممکن ہے اور جو ممکن پر موقوف ہو وہ بھی ممکن ہوتا ہے، پس ثابت ہوا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا ممکن تھا۔

اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے پر اہل سنت کے قرآن مجید سے دلائل

" وجوہ یومئذ ناضرۃ۔ الی ربھا ناظرۃ: قیامت کے دن کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے، اپنے رب کی طرف دیکھنے والے ہوں گے " (القیامۃ: 23۔ 22)۔ " کلا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون: حق یہ ہے کہ وہ اس دن اپنے رب کے دیدار سے ضرور محجوب ہوں گے " (المطففین: 15)

اس آیت سے صراحتاً تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کفار اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکیں گے مگر اس سے اشارۃً یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان قیامت کے اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے اور اسی صورت میں یہ آیت کفار کے لیے حسرت اور محرومی کا موجب ہو گی، کیونکہ اگر مسلمان بھی اللہ تعالیٰ کو نہ دیکھ سکتے تھے کہ اس میں ہماری کیا تخصیص ہے۔ مسلمان بھی تو اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں کر سکتے۔

اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے کے متعلق احادیث

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256ھ روایت کرتے ہیں: حضرت جریر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے چودھویں شب کے چاند کی طرف دیکھا آپ نے فرمایا: سنو تم عنقریب اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح تم اس چاند کو دیکھ رہے ہو، تمہیں اس کو دیکھنے سے کوئی تکلیف نہیں ہو گی، پس اگر تم کو قدرت ہو تو طلوع شمس سے پہلے اور غروب شمس سے پہلے نماز پڑھنے سے مغلوب نہ ہونا۔ (صحیح البخاری، رقم

الحدیث : 554، صحیح مسلم، مساجد : 212 (633) 1408۔ سنن النسائی رقم الحدیث : 177۔ سنن ابو داود، رقم الحدیث : 4729۔ سنن الترمذی، رقم الحدیث : 592۔ مسند احمد، ج 4، ص 360۔ سنن اکبری للبیہقی، ج 1، ص 359۔ مسند حمیدی، رقم الحدیث : 799۔ مسند ابو عوانہ، ج 1، ص 376)

حضرت ابو سعید خدری (رض) یان کرتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا : یارسول اللہ ! کیا ہم قیامت کے دن اپنے رب کو دیکھیں گے ؟ آپ نے فرمایا : جب آسمان پر ابر نہ ہو تو کیا تمہیں سورج اور چاند کو دیکھنے سے کوئی تکلیف ہوتی ہے ؟ ہم نے عرض کیا نہیں ! آپ نے فرمایا اسی طرح تم کو اس دن اپنے رب کو دیکھنے سے کوئی تکلیف نہیں ہو گی جس طرح تمہیں سورج اور چاند کو دیکھنے سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث : 7439۔ صحیح مسلم، الایمان، 302 (1830) 447۔ سنن ابو داود، رقم الحدیث : 4730۔ مسند احمد، ج 2، ص 534، 293، 257، ج 3، ص 16۔ مسند حمیدی رقم الحدیث : 1178۔ مصنف عبدالرزاق، رقم الحدیث : 20856۔ المستدرک، ج 4، ص 582، مشکوۃ، رقم الحدیث : 5555، کنزل العمال رقم الحدیث : 39698)

حضرت عدی بن حاتم (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : تم میں سے ہر شخص کے ساتھ اس کا رب کلام فرمائے گا، اس شخص کے اور اس کے رب کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا اور نہ کوئی حجاب ہوگا جو اس کے رب کی دیکھنے سے مانع ہو۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث : 7443۔ صحیح مسلم، الزکوۃ : 67 (1016) 2309، سنن الترمذی رقم الحدیث : 2451۔ سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث : 1843۔ مسند احمد، ج 4۔ ص 377، 256)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : میرے پاس جبرائیل (علیہ السلام) آئے اور ان کے ہاتھ میں ایک سفید آئینہ تھا میں نے کہا : اے جبیل ! یہ کیا چیز ہے ؟ کہا یہ جمعہ ہے جس کو آپ کا رب آپ پر پیش کرتا ہے تاکہ وہ دن آپ کے لیے اور آپ کے بعد آپ کی قوم کے لیے عید ہو جائے، آپ اول ہیں اور یہود و نصاری آپ کے بعد ہیں، آپ نے فرمایا : ہمارے لیے اس عید میں کیا ہے ؟ کہا : اس دن میں آپ (سب) کے لیے خیر ہے، اس دن میں آپ (سب) کے لیے ایک ساعت ہے، اس ساعت میں جو شخص بھی اپنے رب سے خیر کی دعا کرے گا اور وہ اس کی قسمت میں ہو تو اللہ اس کو وہ خیر عطا فرمائے گا اور اگر وہ خیر اس کی قسمت میں نہ ہو تو اس سے عظیم چیز کو اس کے لیے ذخیرہ کر دے گا یا اس کی قسمت میں وشر ہو گا اس شر سے اس کو پناہ میں رکھے گا۔ میں نے کہا : اس آئینہ میں یہ سیاہ نکتہ کیسا ہے ! انھوں نے کہا : یہ وہ ساعت ہے جو جمعہ کے قائم ہوتی ہے اور ہمارے نزدیک جمعہ تمام دنوں کا سردار ہے اور آخرت میں ہمارے نزدیک اس کا نام یوم المزید ہے۔ میں نے کہا : تم اس دن کو یوم المزید کس وجہ سے کہتے ہو ؟ انھوں نے کہا : آپ کے رب عزوجل نے جنت میں مشک سے زیادہ خوشبودار ایک سفید وادی بنائی ہے، جب جمعہ کا دن آتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ علیین سے اپنی کرسی پر نازل ہوتا ہے، حتی کہ اس کرسی کے گرد نور کے منبر بچھا دیے جاتے ہیں اور نبی اء آ کر اس کرسی کے گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ان منبروں کے گرد سونے کی کرسیاں بچھادی جاتی ہیں پھر صدیقین اور شہداء آ کر ان کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں، پھر اہل جنت آتے ہیں اور ٹیلوں پر بیٹھ جاتے ہیں، پھر ان کا رب تبارک وتعالیٰ ان سب پر تجلی فرمائے گا حتی کہ وہ سب اس کے چہرے کی طرف دیکھیں گے۔ (الحدیث) (مسند البزار، رقم الحدیث : 3519 ۔ مسند ابویعلی رقم الحدیث : 4228۔ المعجم الاوسط، رقم الحدیث : 6713۔ مجمع الزوائد ج 10، ص 421، المطالب العالیہ ج 1، ص 157۔ 158، رقم الحدیث : 579، اس کی سند صحیح ہے)

اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے پر قرآن مجید سے ایک اور دلیل

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا : پھر جب ان کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اس کو ریزہ ریزہ کردیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گرپڑے۔ اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے پر دلیل ہے، کیونکہ کسی چیز کے علم سے وہ چیز منجلی (روشن) ہو جاتی ہے، اور کسی چیز کو دکھانا بھی اس چیز کو روشن کردیتا ہے اور علم کی بہ نسبت دکھانے سے چیز زیادہ منجلی (روشن) ہوتی ہے، اس لیے یہاں پر تجلی سے مراد دکھانا زیادہ اولیٰ ہے۔ اور اس آیت کے معنی یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو پہار نے دیکھا تو وہ ریزہ ریزہ ہوگیا۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ پہاڑ تو ایک پتھر ہے اس کا دیکھنا غیر متصور ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑ میں حیات، عقل اور فہم پیدا کی ہے اس طرح اس میں رویت اور بصارت بھی بعید نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : " یجبال اوبی معہ والطیر : اے پہاڑو ! داؤد کے ساتھ تسبیح کرو اور اے پرندو تم بھی ! " (سبا : 10)۔

نیز پہاڑ پتھروں کی جنس سے ہیں اور پتھروں کے متعلق فرمایا : " وان منہا لما یھبط من خشیۃ اللہ : بیشک بعض پتھر ضرور خوف خدا سے گرپڑتے ہیں " (البقرہ : 74)۔ اور جب پہاڑ تسبیح کرتے ہیں اور اللہ سے ڈرتے ہیں تو وہ دیکھ بھی سکتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب پہاڑ اور موسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بے ہوش ہوگئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کی طاقت پہاڑ سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔

منکرین رویت کے ایک اعتراض کا جواب

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور جب ان کو ہوش آیا تو کہا تو پاک ہے میں نے تیرے حضور توبہ کی، اور میں ایمان لانے والوں میں سب سے پہلا ہوں۔

معتزلہ نے کہا: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے رویت کا سوال کرنا گناہ ہے جب ہی تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اس سے توبہ کی، اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کے اذن اور اس کی اجازت کے بغیر رویت کا سوال کیا تھا اس لیے انھوں نے اپنے اس فعل پر توبہ کی اور ہر چند یہ سوال کرنا گناہ نہیں تھا لیکن ابرار کی نیکیاں بھی مقربین کے نزدیک گناہوں کے حکم میں ہوتی ہیں، اور میں سب سے پہلے اس پر ایمان لانے والا ہوں کہ تیرے اذن کے بغیر تجھ سے سوال کرنا جائز نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ نے جب دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے سے پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا اور وہ بے ہوش ہوگئے تو ہوش میں آکر کہا سبحانک۔ یعنی ہم پر ریزہ ریزہ ہونے اور بے ہوش ہونے کی آفت اور مصیبت پہنچی اور تو ہر قسم کی آفتوں اور مصیبتوں اور ہر قسم کے نقص اور عیب سے پاک ہے۔

انبیاء (علیہم السلام) کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دینے کے متعلق حدیث

اس آیت میں کوہ طور پر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے بے ہوش ہونے کا ذکر ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی ایک حدیث میں اس واقعہ کا ذکر فرمایا ہے اس کی تفصیل یہ ہے:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ایک یہودی اپنا کچھ سامان بیچ رہا تھا اس کو اس سامان کے عوض جو قیمت دی گئی اس کو اس نے ناپسند کیا اور کہا: نہیں! اس ذات کی قسم جس نے موسیٰ (علیہ السلام) کو تمام انسانوں پر فضیلت دی! ایک انصاری نے یہ سنا تو اس یہودی کے چہرے پر ایک طمانچہ مارا اور کہا: تو یہ کہتا ہے کہ اس ذات کی قسم جس نے موسیٰ (علیہ السلام) کو تمام انسانوں پر فضیلت دی، حالانکہ ہمارے درمیان رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) موجود ہیں! وہ یہودی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس گیا اور کہا: یا ابا القاسم! میرے لیے ذمہ اور عہد ہے (یعنی میں ذمی ہوں، اور آپ کے ذمہ میری حفاظت ہے) اور فلاں شخص نے میرے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس شخص سے پوچھا: تم نے اس کے منہ پر کیوں طمانچہ مارا ہے؟ اس نے کہا: یا رسول اللہ! اس نے کہا تھا اس ذات کی قسم جس نے موسیٰ (علیہ السلام) کو تمام انسانوں پر فضیلت دی ہے! حالانکہ آپ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غضبناک ہوئے حتیٰ کہ آپ کے چہرے سے غضب ظاہر ہو رہا تھا، پھر آپ نے فرمایا: انبیاء (علیہم السلام) کے درمیان فضیلت مت دو۔ ایک روایت میں ہے کہ مجھے انبیاء (علیہم السلام) کے درمیان فضیلت نہ دو۔ (بخاری: 4638) کیونکہ صور میں پھونکا جائے گا تو آسمان اور زمین میں سب بے ہوش ہوجائیں گے، سوا ان کے جن کو اللہ چاہے گا۔ پھر دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو سب سے پہلے مجھے اٹھایا جائے گا تو اس وقت موسیٰ (علیہ السلام) عرش کو پکڑے ہوئے ہوں گے، میں (از خود) نہیں جانتا کہ طور کے دن کی بے ہوشی میں ان کا شمار کرلیا گیا یا ان کو مجھ سے پہلے اٹھایا گیا تھا اور میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی شخص یونس بن متی (علیہ السلام) سے افضل ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 3414، 3407۔ صحیح مسلم، فضائل انبیاء: 159 (2373)۔ سنن ابو داؤد، رقم الحدیث: 4671۔ سنن النسائی، رقم الحدیث: 3245۔ مسند احمد ج 3، ص 31۔ 33۔ جامع الاصول، ج 8، رقم الحدیث: 6309۔ 6308)

"مجھے انبیاء (علیہم السلام) پر فضیلت مت دو" اس حدیث کے جوابات

اس حدیث پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بالاتفاق تمام انبیاء اور مرسلین سے افضل ہیں، پھر آپ نے یہ کیسے فرمایا: مجھے انبیاء (علیہم السلام) کے درمیان فضیلت مت دو، اس اعتراض کے جوابات حسب ذیل ہیں:

آپ کے ارشاد کا یہ معنی ہے کہ نفس نبوت میں کسی نبی کو دوسرے نبی پر فضیلت مت دو، کیونکہ نفس نبوت میں تمام نبیوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ قرآن مجید میں ہے: "لا نفرق بین احد من رسلہ: ہم (ایمان لانے میں) اللہ کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے" (البقرہ: 285)۔ اور اس ارشاد کا یہ معنی نہیں ہے کہ مراتب اور درجات کے لحاظ سے کسی رسول کو دوسرے پر فضیلت مت دو کیونکہ قرآن مجید سے یہ ثابت ہے کہ بعض رسول بعض رسولوں سے افضل

ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : " تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض منھم من کلم اللہ ورفع بعضھم درجت : یہ سب رسول، ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام فرمایا، اور ان میں سے کسی کو (تمام) درجات پر بلندی عطا فرمائی " (البقرہ : 253) ۔

دوسرے جواب کے ضمن میں تمام انبیاء پر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی فضیلت کے متعلق احادیث

دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ نے یہ ارشاد اس وقت فرمایا تھا جب آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس پر مطلع نہیں فرمایا تھا کہ اللہ عزوجل نے آپ کو تمام نبیوں اور رسولوں پر فضیلت دے دی، اور جب اللہ جل مجدہ نے آپ کو اس افضیلت پر مطلع فرمادیا تو آپ نے خود بیان فرمایا کہ آپ تمام نبیوں اور رسولوں سے افضل ہیں، جیسا کہ حسب ذیل احادیث میں اس کی تصریح ہے :

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : میں سب سے پہلے جنت کی شفاعت کرنے والا ہوں، جتنی زیادہ میری تصدیق کی گئی ہے اتنی کسی نبی کی تصدیق نہیں کی گئی اور بعض نبی ایسے تھے کہ ان کی امت میں سے صرف ایک شخص نے ان کی تصدیق کی تھی۔ (صحیح مسلم، الایمان : 332 (196 ۔ مشکوۃ، رقم الحدیث : 5743)

حضرت ابوسعید (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : قیامت کے دن میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں گا اور کوئی فخر نہیں، اور میرے ہی ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہوگا اور کوئی فخر نہیں، اور اس دن ہر نبی میرے جھنڈے کے نیچے ہوگا خواہ وہ آدم ہوں یا ان کے علاوہ، اور سب سے پہلے جس شخص سے زمین پھٹے گی وہ میں ہوں، اور کوئی فخر نہیں۔ (سنن الترمذی، تفسیر سورۃ بنی اسرائیل، 18، رقم الحدیث : 3148، مشکوۃ رقم الحدیث : 5761)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب بیٹھے ہوئے تھے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حجرہ سے نکلے اور ان کی باتیں سننے لگے، بعض صحابہ نے کہا : اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو خلیل بنایا، دوسرے نے کہا : حضرت موسیٰ سے اللہ نے کلام فرمایا، ایک اور نے کہا حضرت عیسیٰ اللہ کے کلمہ اور اس کی (پسندیدہ) روح ہیں، کسی نے کہا : حضرت آدم کو اللہ نے منتخب کرلیا۔ پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لائے اور فرمایا : میں نے تمہاری باتیں سن لیں، تم نے کہا : ابراہیم خلیل ہیں وہ ایسے ہی ہیں، تم نے کہا موسیٰ اللہ کے کلیم ہیں، وہ ایسے ہی ہیں، تم نے کہا عیسیٰ اللہ کا کلمہ اور اس کی (پسندیدہ) روح ہیں، وہ ایسے ہیں ہیں، تم نے کہا آدم اللہ کے صفی ہیں، وہ ایسے ہی ہیں، سنو میں اللہ کا محبوب ہوں اور فخر نہیں، اور میں قیامت کے دن حمد کا جھنڈا اٹھانے والا ہوں گا، اور فخر نہیں، اور میں سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا تو اللہ تعالیٰ اس کو میرے لیے کھول دے گا، اور میرے ساتھ فقراء مومنین داخل ہوں گے اور فخر نہیں، اور میں اولین اور آخرین میں اللہ کے نزدیک سب سے عزت والا ہوں اور کوئی فخر نہیں۔ (سنن الترمذی، رقم الحدیث : 3616۔ سنن الدارمی، رقم الحدیث : 47۔ مشکوۃ رقم الحدیث : 5762)

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : میں تمام رسولوں کا قائد ہوں اور کوئی فخر نہیں، میں خاتم النبیین ہوں اور کوئی فخر نہیں، میں سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوں اور میں وہ ہوں جس کی سب سے پہلے شفاعت قبول کی جائے گی اور فخر نہیں۔ (مشکوۃ، رقم الحدیث : 5763)

تیسرا جواب یہ ہے کہ ہرچند کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ علم تھا کہ آپ افضل الانبیاء ہیں، لیکن آپ نے تواضعاً اور ادباً انبیاء (علیہم السلام) پر خود کو فضیلت دینے سے منع فرمایا، لیکن اس جواب پر یہ اشکال ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو ملائمت سے منع فرماتے، جبکہ اس حدیث میں ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سخت غضبناک ہوئے حتی کہ آپ کے چہرے سے آثار غضب ظاہر ہوئے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے نزدیک یہ فضیلت دینا صرف نامناسب نہیں بلکہ حرام تھا۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ مجھے دوسرے انبیاء پر اس طرح فضیلت مت دو جو دوسرے نبیوں میں نقص کی موجب یا موہم ہو۔

پانچواں جواب یہ ہے کہ مجھے دوسرے نبیوں پر اس طریقہ سے فضیلت مت دو جو کسی لڑائی جھگڑے کا موجب ہو، جیسا کہ اس واقعہ میں ہوا تھا۔

چھٹا جواب یہ ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) کے درمیان تفضیل کے مسئلہ میں زیادہ بحث تمحیص اور غور و فکر نہ کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ دوران بحث تمہارے منہ سے ایسا لفظ نکل جائے جو نامناسب ہو اور اس سے دوسرے انبیاء (علیہم السلام) کے احترام میں کمی آئے۔

ساتواں جواب یہ ہے کہ اپنی آراء اور اپنی اہواء سے کسی نبی کو دوسرے نبی پر فضیلت مت دو، ہاں قرآن اور حدیث کے دلائل سے فضیلت کو بیان کرو۔

آٹھواں جواب یہ ہے کہ ایک نبی کو دوسرے نبی پر فضائل کی تمام انواع واقسام سے فضیلت مت دو، حتی کہ مفضول کے لیے کوئی فضیلت باقی نہ رہے۔

نواں جواب یہ ہے کہ کسی اہل کتاب مثلاً یہودی یا نصرانی کے سامنے تمام نبیوں پر میری فضیلت مت بیان کرو ہو سکتا ہے کہ وہ تعصب میں آ کر میرے متعلق کوئی تحقیر کا کلمہ کہے۔

دسواں جواب یہ ہے کہ میری دوسرے نبیوں پر فضیلت بیان کرنے میں اتنا مبالغہ نہ کرو کہ مجھے خدائی صفات سے متصف کر دو جیسا کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی شان میں مبالغہ کیا اور انھیں خدا اور خدا کا بیٹا کہا۔

گیارھویں جواب کے ضمن میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شان میں غلو کرنے کی ممانعت

گیارھواں جواب یہ ہے کہ دوسرے نبیوں پر میری فضیلت بیان کرنے میں اتنا مبالغہ نہ کرو کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے بڑھا دو۔

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میرے متعلق اس طرح غلو نہ کرو جیسے نصاریٰ نے ابن مریم کے متعلق غلو کیا، میں تو صرف اس کا بندہ ہوں پس تم کہو وہ اللہ کے بندہ اور اس کے رسول ہیں۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 3445۔ سنن دارمی، رقم الحدیث: 2784۔ مسند احمد ج 1، ص 23۔24)

اس غلو کی بعض یہ مثالیں ہیں

اذاں کیا جہاں دیکھو ایمان والو

پس ذکر حق ذکر ہے مصطفیٰ کا

کہ پہلے زباں حمد سے پاک ہو لے

تو پھر نام لے وہ حبیب خدا کا

یعنی ناپاک زبان سے اللہ کا نام لینا تو جائز ہے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام لینا جائز نہیں ہے، جب کہ جنبی کے لیے قرآن مجید کی تلاوت کرنا ممنوع ہے اور حدیث کا پڑھنا ممنوع نہیں ہے ہر چند کہ خلاف ادب ہے، اسی طرح بے وضو کا قرآن مجید کو چھونا جائز نہیں ہے اور حدیث کو چھونا جائز ہے اگرچہ خلاف ادب ہے، اسی طرح غلو پر مشتمل ایک شعر یہ ہے۔

خدا جس کو پکڑے چھڑائے محمد

محمد کا پکڑا چھڑا کوئی نہیں سکتا

اللہ تعالیٰ کفار اور منافقین کی گرفت فرمائے گا تو کیا نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کو چھڑائیں گے اور جن مسلمان گنہگاروں کو آپ چھڑائیں گے تو وہ اللہ کے اذن سے اس کی بارگاہ میں شفاعت کر کے چھڑائیں گے۔ اور دوسرے مصرع پر یہ اعتراض ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سرداران قریش کے ایمان کی طمع میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم سے بے توجہی فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کی طرف توجہ کرنے کا حکم دیا اور یہ آیات نازل فرمائیں "عبس و تولی ان جاءہ الاعمی۔ وما یدرک لعلہ یزکی۔ او یذکر فتنفعہ الذکری۔ اما من استغنی۔ فانت لہ تصدی۔ وما علیک الا یزکی۔ واما من جاءک یسع۔ وھو یخشی۔ فانت عنہ تلھی: انھوں نے تیوری پر بل ڈالے اور منہ پھیرا۔ اس پر کہ ان کے پاس نابینا حاضر ہوا۔ آپ کو کیا معلوم شاید کہ وہ پاکیزگی حاصل کرے۔ یا وہ نصیحت قبول کرے تو اس کو نصیحت نفع دے۔ اور جو بے پرواہی کرتے ہیں۔ تو آپ ان کے درپے ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ پاکیزگی حاصل نہ کریں تو آپ کو کوئی ضرر نہیں ہوگا۔ اور جو شخص دوڑتا ہوا آپ کے پاس آیا۔ درآنحالیکہ وہ اپنے رب سے ڈرتا ہے۔ تو آپ نے اس سے بے پرواہی کی" (سورۃ عبس: 1۔10)۔

اسی طرح تین صحابہ حضرت کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرار بن الربیع پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے گرفت فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو چھڑا لیا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت کعب بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ غزوہ تبوک کی مہم بہت سخت اور دشوار تھی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مسلمانوں کو عام تیاری کا حکم دیا مسلمان اپنی استطاعت کے مطابق تیاری کرنے میں مشغول تھے مگر میں بے فکر تھا کہ جب چاہوں گا تیار ہو کر چلا جاؤں گا۔ ایک چھوڑ، دو سواریاں میرے پاس موجود تھیں۔ میں اسی غفلت میں تھا کہ ادھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تیس ہزار مجاہدین اسلام کو کوچ کا حکم دے دیا۔ میں نے سوچا کہ آپ روانہ ہو گئے ہیں تو کیا ہوا میں اگلی منزل پر آپ سے جا ملوں گا، اسی سوچ و بچار اور آج کل میں وقت نکل گیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تشریف لے جانے کے بعد میں سخت پریشان تھا، سارے مدینہ میں پکے منافقوں یا معذور مسلمانوں کے سوا کوئی نظر نہ آتا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں تبوک میں نہ جانے کے متعلق کوئی عذار

بیان کرکے جان بچالوں گا، لیکن جب یہ معلوم ہواکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خیریت سے تشریف لے آئے ہیں ت سارے جھوٹے عذر کافور ہوگئے اور میں نے سوچا کہ سچ کے سوا کوئی چیز اس بارگاہ میں نجات دینے والی نہیں ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسجد میں رونق افروز تھے، صحابہ کرام جمع تھے، منافقین جھوٹے عزر پیش کرکے ظاہری گرفت سے چھوٹ رہے تھے۔ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے حاضر ہوا۔ میرے سلام کا آپ نے غضب آمیز تبسم کے ساتھ جواب دیا اور میری غیر حاضری کی وجہ دریافت کی، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اگر میں کسی دنیادار کے سامنے پیش ہوتا تو جھوٹے عذر بیان کرکے اپنی چرب زبانی سے صاف بچ جاتا مگر یہاں تو اس ذات کے سامنے معاملہ درپیش ہے کہ اگر میں نے جھوٹ بول کر وقتی طور پر اپنے آپ کو بچا بھی لیا تو اللہ تعالیٰ آپ کو حقیقت حال سے مطلع فرمادے گا، اس کے برعکس سچ بولنے سے مجھے آپ کی ناراضگی برداشت کرنی پڑے گی مگر اس کا انجام بہتر ہوگا۔ یارسول اللہ! امر واقعہ یہ ہے کہ میرے پاس غزوہ تبوک میں نہ جانے کا کوئی عذر نہیں ہے، جس وقت میں آپ کے ہمراہ تبوک نہیں گیا اس وقت سے زیادہ وسعت اور فراخی مجھے کبھی حاصل نہیں تھی، میں مجرم ہوں آپ جو چاہیں میرے متعلق فیصلہ فرمائیں۔ آپ نے فرمایا: اس شخص نے سچ کہا ہے اچھا جاؤ اللہ کے فیصلہ کا انتظار کرو، بعد میں معلوم ہوا کہ دو اور شخص (ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع) بھی میری طرح تھے۔ آپ نے ہم تینوں کے متعلق حکم دے دیا کہ کوئی ہم سے بات نہ کرے، سب علیحدہ رہیں، سو کوئی مسلمان ہم سے بات نہیں کرتا تھا نہ سلام کا جواب دیتا تھا، وہ دونوں تو خانہ نشین ہوگئے اور گھر میں روتے رہتے تھے۔ میں چونکہ سخت اور قوی تھا، مسجد میں نماز کے لیے حاضر ہوتا تھا، میں آپ کو سلام کرتا تھا اور دیکھتا تھا کہ آپ کے لب مبارک حرکت کرتے ہیں یا نہیں، جب میں آپ کو دیکھتا تھا تو آپ میری طرف سے منہ پھیر لیتے تھے۔ مخصوص رشتہ دار اور اعزہ بھی مجھ سے بےگانہ ہوگئے تھے ایک روز مجھے شاہ غسان کا ایک خط ملا کہ تم ہمارے ملک میں آجاؤ وہاں تمہاری بہت آؤ بھگت ہوگی۔ میں نے سوچا کہ یہ بھی ایک ابتلاء ہے اور وہ خط میں نے جلا دیا۔ چالیس دن بعد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے ایک حکم پہنچا کہ میں اپنی بیوی سے بھی الگ ہوجاؤں، چنانچہ میں نے اپنی بیوی کو میکے بھیج دیا، مجھے سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ اگر میں اسی حال میں مرگیا تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو میری نماز جنازہ بھی نہیں پڑھیں گے اور اگر بالفرض اس اثناء میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا وصال ہوگیا تو مسلمان میرا مستقل بائیکاٹ رکھیں گے اور میری میت کے بھی کوئی قریب نہیں آئے گا۔ غرض پچاس دن اسی کیفیت میں گزر گئے۔ زمین اپنی وسعت کے باوجود مجھ پر تنگ ہوگئی اور مجھے زندگی موت سے زیادہ سخت معلوم ہوتی تھی کہ اچانک جبل سلع (ایک پہاڑ) سے آواز آئی: "اے کعب بن مالک، مبارک ہو!" میں یہ سنتے ہی سجدہ میں گر گیا، معلوم ہوا کہ رات کے آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ خبر دی کہ ہماری توبہ قبول ہوگئی ہے، آپ نے نماز فجر کے بعد صحابہ کو مطلع کرکے فرمایا اور مجھے خوش خبری سنانے کے لیے ایک سوار میری طرف دوڑا، مگر دوسرے شخص نے پہاڑ پر زور سے ندا کی اور سوار سے پہلے اس کی آواز مجھ تک پہنچ گئی۔ میں نے اپنے کپڑے اتار کر آواز لگانے والے کو دیے۔ پھر میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا، مسلمان مجھے جوق در جوق مبارک باد دے رہے تھے۔ مہاجرین میں سب سے پہلے حضرت طلحہ نے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تیری توبہ قبول فرمالی۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 2757۔ صحیح مسلم، التوبہ، 53 (2769) 6883۔ سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 3318۔ سنن النسائی، رقم الحدیث: 3422۔ صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث: 2442۔ سنن الدارمی، رقم الحدیث: 2454۔ سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 1393۔ سنن الترمذی، رقم الحدیث: 3102، مسند احمد، ج 3، ص 456، جامع الاصول، ج 2، رقم الحدیث: 662)

حضرت کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع کی توبہ قبول کرنے اور ان کی نجات کے متعلق جو اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہوا اس کے متعلق قرآن مجید کی یہ آیات نازل ہوئیں: "وعلی الثلثۃ الذین خلفوا حتی اذا ضاقت علیھم الارض بمارحبت وضاقت علیھم انفسھم وظنوا ان لاملجا من اللہ الا الیہ۔ ثم تاب علیھم لیتوبوا ان اللہ ھو التواب الرحیم: اور ان تین مسلمانوں کی توبہ قبول فرمائی جن کا حکم موخر رکھا گیا تھا، حتی کہ جب زمین وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی جانیں بھی ان پر تنگ ہوگئیں اور انھوں نے یہ یقین کرلیا کہ اللہ کے سوا ان کی کوئی جائے پناہ نہیں ہے، پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی تاکہ وہ ہمیشہ توبہ کرتے رہیں، بیشک اللہ تعالیٰ ہی بہت توبہ قبول کرنے والا، بہت مہربان ہے' (التوبہ: 118)

ان مذکور الصدر احادیث میں تصریح ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان تین صحابہ پر گرفت فرمائی اور آپ کے حکم پر مسلمانوں نے پچاس دنوں تک ان سے مقاطعہ جاری رکھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرما کر ان کی خلاصی کرادی اس لیے یہ مصرع صحیح نہیں ہے کہ: "محمد کا پکڑا چھڑا کوئی نہیں سکتا"

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شان میں غلو کی ایک اور یہ مثال ہے

معنی حرفم کنی تحقیق اگر
بنگر بادیدہ صدیق اگر
قوت قلب و جگر گردد نبی
از خدا محبوب تر گردد نبی
(اگر میرے نظریہ کو جانو اور حضرت صدیق اکبر کی نظر سے دیکھو تو نبی، اللہ سے زیادہ محبوب ہیں)

یہ اشعار قرآن مجید کی اس آیت کے صراحتًہ خلاف ہیں: "والذین امنوا اشد حبا للہ: اور ایمان والے سب سے زیادہ محبت، اللہ سے کرتے ہیں" (البقرہ: 125)۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کائنات میں سب سے افضل ہیں اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تمام مخلوق سے زیادہ آپ سے محبت ہونی چاہیے لیکن ان تمام تر عظمتوں کے باوجود نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے بندہ اور اس کی مخلوق ہیں، اور خالق اور مخلوق کے درمیان اس طرح تقابل کرنا کہ مخلوق خالق سے زیادہ افضل یا زیادہ محبوب یا زیادہ بااختیار ہے صحیح انداز فکر نہیں ہے۔

امام ابویعلی احمد بن علی التمیمی المتوفی 307ھ روایت کرتے ہیں:

عمر بن قتادہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت قتادہ بن النعمان (رض) کی آنکھ جنگ بدر کے دن زخمی ہو گئی اور ان کی آنکھ کا ڈھیلا بہہ کر ان کے رخسار پر آگیا، مسلمانوں نے اس کو کاٹ کر نکالنے کا ارادہ کیا، پھر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا، آپ نے فرمایا: نہیں! پھر حضرت قتادہ کو بلا آپ نے اپنی ہتھیلی سے وہ ڈھیلا (اپنی جگہ رکھ کر) دبایا، پھر پتا نہیں چلتا تھا کہ ان کی کون سی آنکھ زخمی ہوئی تھی۔ (مسند ابویعلی، ج 3، رقم الحدیث: 1549، دلائل النبوۃ للبیہقی، ج 3، ص 99۔ تا۔ 100۔ اسد الغابہ، ج 4، ص 370، رقم: 4277۔ الاصابہ، ج 5، ص 318، رقم: 7091)

امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی متوفی 360ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت قتادہ بن النعمان (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایک کمان ہدیہ کی گئی، جنگ احد کے دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وہ کمان مجھے دے دی۔ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے کھڑا ہوا اس کمان سے تیر مار رہا تھا کہ وہ کمان ٹوٹ گئی، اور میں مستقل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے کھڑا رہا جو تیر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چہرے کی طرف آتا میں اس تیر کے سامنے اپنا چہرہ کر دیتا (اور کمان ٹوٹنے کی وجہ سے) میں اس وقت کوئی تیر نہیں مار رہا تھا، حتی کہ ایک تیر آکر میری آنکھ میں لگا جس سے میری آنکھ کا ڈھیلا نکل کر میرے چہرے پر آگیا، میں نے وہ ڈھیلا نکال کر اپنے ہاتھ میں رکھا، جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے میرے ہاتھ میں نکلی ہوئی آنکھ کا ڈھیلا دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور آپ نے دعا کی: اے اللہ! قتادہ نے تیرے نبی کے چہرے کو اپنے چہرے سے بچایا ہے تو اس کی اس آنکھ کو دونوں میں سے زیادہ حسین اور زیادہ تیز بنا دے، سو ان کی وہ آنکھ دونوں آنکھوں میں سے زیادہ حسین اور زیادہ تیز نظر والی تھی۔ (المعجم الکبیر، ج 19، ص 8، رقم الحدیث: 12، دلائل النبوۃ لابی نعیم، ج 2، رقم الحدیث: 417، المستدرک، ج 3، ص 295۔ الاستیعاب، ج 3، ص 338، رقم: 2131۔ اسد الغابہ، ج 4، ص 370، رقم: 4277۔ الاصابہ، ج 5، ص 318، رقم: 7091، مجمع الزوائد، ج 6، ص 113)

غیر محتاط واعظین اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا کی دی ہوئی آنکھ میں اتنی روشنی نہیں تھی جتنی مصطفٰی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دی ہوئی آنکھ میں روشنی تھی، اللہ اور اس کے رسول کی عطا میں تقابل کا یہ انداز بہت خطرناک ہے، یہ دونوں آنکھیں اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی تھیں فرق یہ ہے کہ ایک آنکھ ماں باپ کے جسمانی توسل سے ملی تھی اور دوسری آنکھ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعا سے ملی تھی اس لیے اس آنکھ کا حسن اور اس کی نظر دوسری آنکھ سے زیادہ تھی۔

بہر حال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی فضیلت بیان کرنے میں غلو اور مبالغہ نہیں کرنا چاہیے۔ آپ کی صفات خدا کے برابر بیان کی جائیں، نہ آپ کو خدا سے بڑھایا جائے۔ اسی لیے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھے انبیاء کے درمیان فضیلت مت دو۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 4638)۔ نیز آپ نے فرمایا: بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت مت دو۔ (مسند احمد ج 3، ص 41) اور فرمایا: مجھے انبیاء پر فضیلت مت دو، اور نہ یونس بن متی پر (البدایہ والنہایہ، ج 1، ص 171) اور ان سب احادیث کا ایک محمل یہ ہے کہ مجھے خدا کے برابر نہ کرو یا مجھے خدا سے نہ بڑھاؤ اور اس محمل کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں آپ نے فرمایا: میرے متعلق اس طرح غلو نہ کرو جس طرح نصاری نے عیسیٰ بن مریم کے متعلق غلو کیا تھا، پس تم کہو وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 3445) اس

توجیہ کے بیان کرنے کے سلسلہ میں کلام طویل ہوگیا کیونکہ ہمارے زمانہ میں انبیاء (علیہم السلام) کی شان بیان کرنے میں بہت افراط اور تفریط ہے، بعض لوگ آپ کی شان بیان کرنے سے مطلقاً منع کرتے ہیں اور آپ کے فضائل میں قطع برید کرتے ہیں اور بعض اس میں افراط کرتے ہیں اور حد سے گزر جاتے ہیں، میں نے اصلاح کی اپنی سی کوشش کی ہے، اللہ تعالیٰ ان سطور میں اثر آفرینی فرمائے۔ (آمین) اب میں اس حدیث کے بقیہ تشریح طلب اجزاء کی وضاحت کرتا ہوں۔ فاقول و باللہ التوفیق وبہ الاستعانۃ یلیق۔

صعقہ کا معنی

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: صورت میں پھونکا جائے گا تو جو آسمان میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب پر صعقہ طاری ہوگا، ماسوا ان کے جن کو اللہ چاہے۔ (الزمر: 68) صعقہ کا معنی موت ہے اور کبھی اس سے مراد بے ہوشی بھی ہوتی ہے، جیسے اس آیت میں ہے وخر موسیٰ صعقا (الاعراف: 143) اس آیت میں جن لوگوں کا صعقہ سے استثناء کیا ہے ان کے مصداقوں میں اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے کہ وہ فرشتے ہیں، دوسرا قول یہ ہے کہ وہ انبیاء ہیں اور تیسرا قول یہ ہے کہ وہ شہداء ہیں۔ اور صحیح یہ ہے کہ ان کی تعیین میں کوئی صحیح حدیث موجود نہیں ہے، اور ان میں سے ہر ایک محتمل ہے۔

پھر آپ نے فرمایا: پھر دوسری بار صور میں پھونکا جائے گا تو سب سے پہلے مجھے قبر سے اٹھایا جائے گا تو اس وقت موسیٰ (علیہ السلام) عرش کو پکڑے ہوئے ہوں گے، میں از خود نہیں جانتا کہ طور کے دن کی بے ہوشی میں ان کا شمار کر لیا گیا یا (وہ بے ہوش تو ہوئے تھے لیکن) ان کو مجھ سے پہلے اٹھا لیا گیا۔

انبیاء (علیہم السلام) کی حیات پر دلائل

علامہ ابو العباس احمد بن عمر قرطبی متوفی 656ھ نے فرمایا ہے کہ جب پہلی بار صور میں پھونکا جائے گا تو اس سے انبیاء (علیہم السلام) صرف بے ہوش ہوں گے اور عام انسان سب مر جائیں گے، سو عام لوگوں کے حق میں صعقہ کا معنی موت ہے اور انبیاء (علیہم السلام) کے حق میں صعقہ کا معنی بے ہوشی ہے، کیونکہ انبیاء (علیہم السلام) اپنی قبروں میں زندہ ہیں ان کے حق میں موت کا معنی ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہونا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ شہداء اپنے قتل ہونے اور موت کے بعد اپنے رب کے پاس زندہ ہوتے ہیں، ان کو رزق دیا جاتا ہے اور وہ خوش اور مسرور ہوتے ہیں اور یہ دنیا میں زندہ لوگوں کی صفات ہیں، اور جب شہداء کا یہ مقام ہے تو انبیاء (علیہم السلام) تو اپنی وفات کے بعد اس حال کے زیادہ لائق اور حقدار ہیں۔ اس کے علاوہ صحیح حدیث میں ہے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: بیشک اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کے اجسام کو کھانا حرام کر دیا ہے۔ (سنن ابو داود، رقم الحدیث: 1047۔ سنن النسائی، رقم الحدیث: 1373۔ سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 1636)

نیز شب معراج تمام انبیاء علیہم ہمارے نبی سید نا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مسجد اقصیٰ میں جمع ہوئے، خصوصا موسیٰ (علیہ السلام) کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قبر میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ (صحیح مسلم، فضائل انبیاء: 156، (2374) 6042)

اس طرح کی احادیث بہت زیادہ ہیں جن کے مجموعہ سے اس بات کا یقینی علم حاصل ہو جاتا ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) کی موت کا معنی یہ ہے کہ وہ ہم سے غائب ہو گئے بایں طور کہ ہم ان کا ادراک نہیں کر سکتے، ہر چند کہ وہ موجود اور زندہ ہیں اور ان کا حال فرشتوں کی طرح ہے کہ وہ بھی موجود اور زندہ ہیں اور ہماری نوع میں سے کوئی شخص ان کو نہیں دیکھتا سوائے اولیاء اللہ کے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کرامت کے ساتھ خاص کر لیا ہے، اور جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ انبیاء (علیہم السلام) زندہ ہیں تو وہ آسمان اور زمین کے درمیان ہیں اور جب صور میں پھونکا جائے گا تو آسمانوں اور زمینوں میں ہر شخص پر صعقہ طاری ہوگا ماسوا ان کے جن کو اللہ چاہے، غیر انبیاء کے صعقہ کا معنی ہے وہ مر جائیں گے اور انبیاء (علیہم السلام) صرف بے ہوش ہوں گے۔ اور جب دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو جو مر گئے تھے وہ زندہ ہو جائیں گے اور جو بے ہوش ہوئے تھے وہ ہوش میں آجائیں گے، اسی لیے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں وہ پہلا شخص ہوں گا جو ہوش میں آئے گا اور یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے نبی سید نا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حقیقتاً سب سے پہلے ہوش میں آئیں گے اور تمام لوگوں سے پہلے اپنی قبر مبارک سے باہر آئیں گے، خواہ وہ انبیاء ہوں یا ان کے غیر، ماسوا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے کیونکہ ان کے متعلق نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تردد تھا، آیا وہ آپ سے پہلے ہوش میں آ گئے تھے یا وہ پہلے صعقہ سے بے ہوش ہی نہیں ہوئے اور اس کے قائم مقام طور کی بے ہوشی تھی، بہر حال جو بھی شکل ہو اس حدیث کی رو سے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو ایک ایسی فضیلت حاصل ہے جو ان کے غیر میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں۔ (المفہم ج 6، ص 231۔234، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت، 1417ھ)

دوسرے انبیاء (علیہم السلام) کی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر فضیلت جزی کی تحقیق

علامہ قرطبیؒ کی اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر فضیلت جزی حاصل تھی کہ وہ یا تو پہلے صعقہ سے بے ہوش نہیں ہوئے یا بے ہوش تو ہوئے تھے لیکن آپ سے پہلے ہوش میں آ گئے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ بدرالدین عینی نے بھی یہ لکھا ہے کہ ہر صورت میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے لیے فضیلت ثابت ہے۔ (فتح البار، ج 6، ص 445، طبع لاہور، عمدۃ القاری، ج 12، ص 251)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی 1052 ھ لکھتے ہیں:

نیز یہ فضیلت جزی ہے جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے لیے ثابت ہے اور یہ فضیلت کلی کے منافی نہیں ہے (اشعۃ اللمعات، ج 4، ص 451، مطبوعہ تیج کمار لکھنؤ)

ملا علی بن سلطان محمد القاری المتوفی 1014 ھ لکھتے ہیں:

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا اس فضیلت کے ساتھ خاص ہونا اس بات کو واجب نہیں کرتا کہ وہ اس ذات سے بڑھ جائیں جو ان پر فضائل کثیرہ اور متعدد وجوہ سے مقدم ہیں۔ (مرقات ج 11، ص 17، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ، ملتان، 1390 ھ)

اسی طرح حضرت آدم (علیہ السلام) ابوالبشر اور اول انسان ہیں اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ان کی یہ فضیلت جزی ہے لیکن فضیلت کلی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہی حاصل ہے اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو یہ فضیلت ہے کہ وہ اپنی نانی کی دعا کی وجہ سے اپنی ولادت کے وقت میں شیطان سے محفوظ رہے اور انھوں نے پنگورے میں کلام کیا اور بچپن ہی میں اپنی نبوت کا اعلان کیا۔ لیکن فضیلت کلی کے حامل صرف نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ علامہ یحییٰ بن شرف نواوی متوفی 676 ھ نے ایک اور جواب دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

قاضی عیاض فرماتے ہیں: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو یہ فرمایا تھا کہ "میں (از خود) نہیں جانتا کہ حضرت موسیٰ بے ہوش ہی نہیں ہوئے یا مجھ سے پہلے ہوش میں آ گئے" یہ اس وقت کی بات ہے جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ علم نہیں دیا گیا تھا کہ حقیقتاً سب سے پہلے آپ ہوش میں آ کر قبر سے نکلیں گے۔ اور آپ ہی علی الاطلاق سب سے پہلے اٹھیں گے اور جو گروہ سب سے پہلے قبروں سے اٹھے گا، اس میں علی الاطلاق سب سے پہلے آپ اٹھیں گے اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بھی اسی گروہ سے ہوں گے۔ (صحیح مسلم بشرح النواوی، ج 10، ص 6233، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ، مکہ مکرمہ، 1417 ھ)

قاضی عیاض اور علامہ نووی کے اس جواب کے اعتبار سے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر فضیلت جزی بھی نہیں رہی، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) علی الاطلاق سب سے پہلے قبر سے اٹھیں گے۔ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں اور میں وہ ہوں جو سب سے پہلے قبر سے اٹھے گا۔ اور میں سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوں اور میں وہ ہوں جس کی شفاعت سب سے پہلے قبول کی جائے گی۔ (صحیح مسلم، فضائل: 3(2278) 5830۔ سنن ابو داؤد، رقم الحدیث: 4673۔ سنن الترمذی، رقم الحدیث: 3159، 3631۔ سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 4308، صحیح ابن حبان، رقم الحدیث: 6478۔ مسند احمد، ج 1، رقم الحدیث: 10987، طبع جدید دار الفکر، مسند احمد، ج 1، ص 281، ج 3، ص 332۔ المستدرک، ج 2، ص 365۔ دلائل النبوۃ، ج 1، ص 13۔ کنزالاعمال، رقم الحدیث: 31879)

قاضی عیاض مالکی متوفی 544 ھ اور علامہ نووی شافعی، متوفی 676 ھ کے جواب کو علامہ ابی مالکی متوفی 828 ھ، علامہ سنوسی مالکی متوفی 895 ھ، علامہ بدرالدین عینی حنفی متوفی 855 ھ، علامہ سیوطی شافعی متوفی 911 ھ اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی حنفی، متوفی 1052 ھ نے بھی اپنی شروحات میں نقل کیا ہے: (اکمال اکمال المعلم ج 8، ص 137۔ معلم اکمال الاکمال ج 8، ص 137۔ عمدۃ القاری ج 12، ص 251۔ الدیباج ج 2، ص 203۔ اشعۃ اللمعات، ج 4، ص 451)

بظاہر اس حدیث سے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر فضیلت لازم آتی ہے۔ مدت دراز سے میں اس اشکال کا جواب دینا چاہتا تھا اور اس حدیث کی مکمل تحقیق کرنا چاہتا تھا، اس کے باوجود نہ جانے کسی وجہ سے شرح صحیح مسلم میں اس کی تشریح مجھ سے رہ گئی، زیر تفسیر آیت میں چونکہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے کوہ طور پر بے ہوش ہونے کا ذکر ہے اور اس حدیث میں اس کا حوالہ ہے، اس مناسبت سے میں نے اس حدیث کو یہاں ذکر کیا اور اس کی تفصیل اور تحقیق کی۔ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور اس کو اثر آفریں بنائے۔ (آمین) اب پھر میں بقیہ آیات کی تفسیر کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ (تفسیر تبیان القرآن)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف سے دیدار کی درخواست :

چالیس دن کی میعاد پوری ہو چکنے پر حق تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کسی مخصوص و ممتاز رنگ میں شرف مکالمہ بخشا۔ اس وقت حضرت موسیٰ کو بلاواسطہ کلام الٰہی سننے کی لذت بے پایاں حاصل ہوئی تو کمال اشتیاق سے متکلم کے دیدار کی آرزو کرنے لگے اور بے ساختہ درخواست کر دی۔ (رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ) اے پروردگار! میرے اور اپنے درمیان سے حجاب اور موانع اٹھا دیجئے اور وجہ انور بے حجاب سامنے کر دیجئے کہ ایک نظر دیکھ سکوں۔

ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر تجلی ہوئی تو آپ کی نظر ایسی تیز ہو گئی کہ دس کوس کی مسافت سے تاریک رات میں بھی کسی چٹان پر چلتی ہوئی چیونٹی کو دیکھ لیتے تھے (ابن کثیر)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) ہر طرف سے کلام سن رہے تھے :

بیضاوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) ہر طرف سے کلام سن رہے تھے میں کہتا ہوں اس سے مراد یہ ہے کہ کسی جہت سے نہیں سن رہے تھے (یعنی وہ کلام کسی جہت کا محتاج نہیں تھا تمام جہات واطراف کی قیود سے آزاد تھا) جس طرف رخ کرتے تھے وہی کلام بے جہت سنتے تھے اس طرح موسیٰ (علیہ السلام) پر کلام رب کا انکشاف ہو گیا اور اس سے آگے دیدار کے مشاہدہ کا اشتیاق پیدا ہو گیا

دنیا میں دیدار الٰہی ممتنع ہے :

یعنی دنیا میں کسی مخلوق کا یہ فانی وجود اور فانی قویٰ اس ذوالجلال والاکرام لم یزل ولایزال کے دیدار کا تحمل نہیں کر سکتے۔ اس سے ثابت ہوا کہ دنیا میں کسی کو موت سے پہلے دیدار خداوندی کا شرف حاصل ہونا شرعاً ممتنع ہے گو عقلاً ممکن ہو کیونکہ اگر امکان عقلی بھی نہ مانا جائے تو موسیٰ (علیہ السلام) جیسے جلیل القدر پیغمبر کی نسبت یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایک محال عقلی کی درخواست کرتے۔ اہل السنت والجماعت کا یہی مذہب ہے کہ رویت باری دنیا میں عقلاً ممکن، شرعاً ممتنع الوقوع ہے اور آخرت میں اس کا وقوع نصوص قطعیہ سے ثابت ہے، رہی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رویت شب معراج میں، وہ اختلافی مسئلہ ہے جس کا ذکر انشاء اللہ سورۃ نجم میں آئے گا۔

لَنۡ تَرٰىنِیۡ، (یعنی آپ مجھے نہیں دیکھ سکتے) اس میں اشارہ ہے کہ رؤیت ناممکن نہیں مگر مخاطب بحالت موجودہ اس کو برداشت نہیں کر سکتا، ورنہ اگر رؤیت ممکن ہی نہ ہوتی تو لَنۡ تَرٰىنِیۡ کے بجائے لَنۡ اُرٰی کہا جاتا کہ میری رؤیت نہیں ہو سکتی اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار دنیا میں بھی عقلا ممکن تو ہے مگر اس آیت سے اس کا ممتنع الوقوع ہونا بھی ثابت ہوگا اور یہی مذہب ہے جمہور اہل سنت کا کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت عقلا ممکن ہے مگر شرعا ممتنع، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے لن یری احد منکم ربہ حتی یموت، یعنی تم میں سے کوئی شخص مرنے سے پہلے اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتا۔

پہاڑ بھی جھلک برداشت نہیں کر سکتا :

وَلٰكِنِ انۡظُرۡ اِلَى الۡجَبَلِ، اس میں اس امر کی شہادت ہے کہ بحالت موجودہ مخاطب رؤیت الٰہی کو برداشت نہیں کر سکتا اس لیے پہاڑ پر ادنی سی جھلک ڈال کر بتلا دیا گیا کہ وہ بھی برداشت نہیں کر سکتا، انسان تو ضعیف الخلقت ہے وہ کیسے برداشت کرے۔

قال لن ترانی اللہ نے فرمایا تو ہرگز مجھے نہیں دیکھ پائے گا نہ کوئی انسان دنیا میں میری طرف نگاہ کر سکتا ہے جو شخص میری طرف دیکھے گا مر جائے گا۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا الٰہی میں تیرا کلام سن کر تیرے دیدار کا مشتاق ہوا اگر میں تیری طرف دیکھ لوں اور مر جاؤں تو بغیر دیدار زندہ رہنے سے مجھے زیادہ پسند ہے۔ سیوطی (رح) نے لکھا ہے کہ لن ترانی (تو مجھے نہیں دیکھ پائے گا) فرمایا لا اولمی (میں نہیں دیکھا جا سکتا) نہیں فرمایا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کا دیدار فی نفسہٖ محال نہیں ہے (اگرچہ اس عالم میں اس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا)

الی الجبل مدین میں یہ سب سے بڑا پہاڑ تھا جس کو زبیر کہا جاتا تھا۔

تجلی پڑنے کا منظر :

وہب بن منبہ اور ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ جب موسیٰ نے دیدار کا سوال کیا تو کہر اور تاریکی چار چار فرسخ تک پہاڑ پر چھا گئیں بجلیاں تڑپنے لگیں بادل گرجنے اور کڑکنے لگے اور اللہ نے آسمانوں کے فرشتوں کو حکم دیا کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے سامنے آجائیں حسب الحکم اس نچلے آسمان کے ملائکہ بیلوں کی شکل میں بادل کی طرح گرجدار آواز میں اللہ کی تسبیح و تقدیس کرتے سامنے سے گزرے پھر دوسرے آسمان کے ملائکہ بشکل شیر سامنے آئے ان کے منہ سے بھی اللہ کی تسبیح و تقدیس کی چیخیں نکل رہی تھیں ضعیف بندہ (موسیٰ) بن عمران اس منظر کو دیکھ کر اور ان آوازوں کو سن کر خوف زدہ ہوگیا لرز گیا بدن کا رونگٹا رونگٹا کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا اب مجھے اپنی درخواست پر پشیمانی ہے کاش کوئی چیز مجھے اس مقام سے الگ کر دیتی (کہ میں یہ منظر نہ دیکھتا) اس پر ملائکہ کے سر گروہ نے جو سب کا بزرگ تھا کہا موسیٰ (علیہ السلام) ابھی اپنے سوال پر قائم رہو ابھی تو بہت میں سے تھوڑا تم نے دیکھا ہے۔ پھر تیسرے آسمان کے فرشتے اتر کر موسیٰ (علیہ السلام) کے سامنے آئے ان کی شکلیں بھی شیروں جیسی تھیں گرجیلی آوازوں سے متواتر تسبیح و تقدیس کا شور کر رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی لشکر کا مخلوط شور ہے۔ آگ کے شعلے کی طرح ان کی رنگت تھا موسیٰ (علیہ السلام) خوف زدہ ہوگئے اور زندگی کی آس نہ رہی سر گروہ ملائکہ نے کہا ابن عمران ابھی اپنی جگہ ٹھہرو تمہارے سامنے تو ایسا منظر آئے گا کہ برداشت نہ کر سکو گے پھر چوتھے آسمان کے ملائکہ موسیٰ کے سامنے آئے پچھلے ملائکہ کی شکلوں سے ان کی صورتیں تھیں رنگت تو شعلہ کی طرح تھا اور جسم برف کی طرح سفید تھا ان کی تسبیح تقدیس کی اونچی آوازیں ایسی تھیں کہ سابق فرشتوں کی آوازیں ان جیسی نہ تھیں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا جوڑ جوڑ چٹکنے اور دل دھڑکنے لگا اور شدت کے ساتھ گریہ طاری ہوگیا سید الملائکہ نے کہا ابن عمران ابھی اپنے سوال پر ٹھہرو کم دیکھا ہے زیادہ دیکھنا ہے پھر پانچویں آسمان کے ملائکہ اتر کر موسیٰ کے سامنے آئے جن کے سات رنگ تھے موسیٰ (علیہ السلام) کو دیکھتے رہنے کی تاب نہ رہی ایسی شکلیں تو انھوں نے پہلے نہیں دیکھی تھیں نہ ایسی آوازیں سنی تھیں۔ دل بھر آیا غم نے گھیر لیا اور خوب رونے لگے۔ سر گروہ ملائکہ نے کہا ابن عمران ابھی اپنی جگہ (یعنی اپنے سوال پر) صبر کئے رہو ایسی چیزیں سامنے آئیں گی کہ صبر نہ کر سکو گے۔ پھر حسب الحکم چھٹے آسمان کے فرشتے اتر کر موسیٰ (علیہ السلام) کے سامنے آئے ہر فرشتے کے ہاتھ میں سورج سے زیادہ روشن درخت کھجور کی طرح لمبا آگ کا ایک ڈنڈا تھا سب کا لباس آگ کے شعلوں کی طرح تھا ہر فرشتے کے ایک سر میں چار منہ تھے گزشتہ فرشتوں کی مجموعی آواز کی طرح اونچی آواز سے تسبیح و تقدیس کر رہے تھے انتہائی بلند آواز سے کہہ رہے تھے سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّ الْمَلٰئِكَةِ وَالرُّوحِ رَبُّ الْعِزَّةِ اَبَدًا لَا يَمُوتُ موسیٰ ان کی تسبیح کی آواز سن کر خود بھی تسبیح پڑھنے اور رونے لگے اور عرض کرنے لگے اے میرے رب مجھے یاد رکھنا اپنے بندہ کو نظر انداز نہ کرنا معلوم نہیں اس منظر سے میرا چھٹکارا ہوگا یا نہیں اگر میں (یہاں سے) نکلتا ہوں تو جل جاؤں گا اور رکتا ہوں تو مر جاؤں گا۔

فرشتوں کے سرداروں نے کہا ابن عمران تیرا خوف تو حد سے بڑھ گیا اور تیرا دل نکل پڑتا ہے مگر جس چیز کا تو نے سوال کیا ہے اس کے لیے صبر کر اس کے بعد ساتویں آسمان کے ملائکہ کو عرش الٰہی اٹھانے کا حکم ہوا جو نہی نور عرش نمودار ہوا پہاڑ کھل گیا اور تمام فرشتوں نے سبحان الملک القدوس رب العزۃ ابدا لا یموت کی آوازیں بلند کیں پہاڑ میں لرزہ آیا اور جو درخت بھی وہاں تھا پھٹ گیا اور بندہ ضعیف موسیٰ (علیہ السلام) منہ کے بل بے ہوش ہو کر گر پڑا پھر اللہ نے اپنی رحمت سے اس کے پاس روح کو بھیجا روح موسیٰ (علیہ السلام) پر سایہ فگن ہوگیا اور چھا گیا اور جس پتھر پر موسیٰ (علیہ السلام) کھڑے ہوئے تھے اسی پتھر کو موسیٰ پر الٹ کر قبہ کی طرح بنا دیا تاکہ موسیٰ (علیہ السلام) جل نہ جائیں کچھ دیر کے بعد روح نے ان کو کھڑا کیا موسیٰ (علیہ السلام) تسبیح پڑھتے اٹھ کھڑے ہوئے اور مناجات کرنے لگے میرے مالک میں تجھ پر ایمان لایا اور تصدیق کرتا ہوں کہ جو شخص بھی تجھے دیکھے گا زندہ نہ رہے گا جو شخص تیرے فرشتوں کو بھی دیکھے گا اس کا دل (خوف سے) باہر نکلنے لگے گا تیری عظمت بہت بڑی ہے تو سب کا رب اور معبود کل اور شاہنشاہ ہے تیرے مساوی اور مقابل کوئی شے نہیں اے میرے رب میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں۔ حمد تیرے ہی لیے ہے تیرا کوئی شریک نہیں تو بڑی بزرگی والا ہے تو بڑی عظمت رکھتا ہے تو رب العلمین ہے۔

ولکن انظر الی الجبل: یعنی تم پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو، ہم اپنے جمال مبارک کی ایک ذرا سی جھلک اس پر ڈالتے ہیں۔ اگر پہاڑ جیسی سخت اور مضبوط چیز اس کو برداشت کر سکے تو ممکن ہے تم کو بھی اس کا تحمل کرا دیا جائے۔ ورنہ سمجھ لیجئے کہ جس چیز کا تحمل پہاڑ سے نہ ہو سکے، کسی انسان کی مادی ترکیب اور جسمانی آنکھیں اسے کیسے برداشت کر سکتی ہیں اگرچہ قلبی اور روحانی طاقت کے اعتبار سے زمین، آسمان، پہاڑ، سب چیزوں سے انسان فائق ہو۔ اور اسی لیے موسیٰ (علیہ السلام) جس وحی الٰہی کے حامل تھے، بلکہ دوسرے انسان بھی جس امانت عظیمہ کے حامل ہیں، پہاڑ وغیرہ اس کے اٹھانے پر قادر نہیں۔ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ

(احزاب، رکوع ۹، آیت ۷۲) لَوۡ اَنۡزَلۡنَا ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیۡتَہٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡیَۃِ اللّٰہِ (الحشر، رکوع ۳، آیت : ۲۱) تاہم جس چیز کا تعلق ظاہری آنکھوں یا بدن کی مادی قوت سے ہو، اس میں انسان دوسری عظیم الخلقت چیزوں سے بہت کمزور ہوا ہے لَخَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اَکۡبَرُ مِنۡ خَلۡقِ النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ (المومن، رکوع ۶، آیت : ۵۷) وَخُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِیۡفًا (نسائی، رکوع ۵، آیت : ۲۸) اس جگہ موسیٰ (علیہ السلام) کو انسانی وجود کی اسی کمزوری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا :

حق تعالیٰ کی تجلیات بہت طرح کی ہیں اور یہ خدا کا ارادی فعل ہے کہ جس چیز پر جس طرح چاہے تجلی فرمائے۔ پہاڑ پر جو تجلی ہوئی اس نے معًا پہاڑ کے خاص حصہ کو ریزہ ریزہ کر ڈالا، اور موسیٰ (علیہ السلام) چونکہ محل تجلی سے قریب تھے، ان پر اس قرب محل اور پہاڑ کے ہیبت ناک منظر دیکھنے کا اثر ہوا کہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ بلا تشبیہ یوں سمجھ لیجئے کہ بجلی جس چیز پر گرتی ہے اسے جلا کر ایک آن میں کس طرح خاک سیاہ کر دیتی ہے اور جو لوگ اس مقام کے قریب ہوتے ہیں بسا اوقات انھیں بھی کم و بیش صدمہ پہنچ جاتا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے اس آیت کی تفسیروں میں آیا ہے کہ عظمت نور کی وجہ سے وہ پہاڑ چھ پہاڑوں میں منقسم ہو گیا تین مدینہ میں آپڑے احد ورقان رضوی اور تین مکہ میں ثور ثبیر 'حراء۔ سعاف نے تخریج بیضاوی میں لکھا ہے کہ ابن مردویہ نے حضرت علی (رض) : کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے موسیٰ کو سنایا اور فرمایا انی انا اللّٰہ یہ لکھا واقعہ عرفہ کی شام کو ہوا وہ پہاڑ جس پر تجلی ہوئی موقف (حج) میں تھا تجلی پڑتے ہی اس کے سات ٹکڑے ہو گئے ایک ٹکڑا سامنے گر گیا یہ ٹکڑا تو وہی ہے جس کے قریب امام موقف میں کھڑا ہوتا ہے تین ٹکڑے مدینہ میں جا پڑے طیبہ 'احد 'رضوی اور طور سینا شام میں چلا گیا اس کو طور کہنے کی وجہ ہی یہ ہے کہ یہ اڑ کر شام میں جا پہنچا تھا۔

میں کہتا ہوں اس روایت میں انتہائی غرابت ہے اللہ نے موسیٰ سے کلام تو طور سینا علاقہ شام میں کیا تھا وہیں توراۃ عطا فرمائی تھی مکہ میں نہ کلام کیا نہ کتاب عطا فرمائی۔

توراۃ میں امت محمدیہ کا ذکر :

بغوی نے حضرت کعب احبار کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے توراۃ کا مطالعہ کیا اور عرض کیا اے میرے رب میں (توریت میں) ایک امت کا ذکر پاتا ہوں جو خیر الامم ہو گی اس کو لوگوں کی ہدایت کے لیے پیدا کیا گیا ہو گا وہ لوگوں کو بھلائی کا حکم دے گی اور بری باتوں کی ممانعت کرے گی اس کا ایمان اللہ پر اور پہلی کتاب پر اور پچھلی کتاب پر ہو گا وہ گمراہوں سے جہاد کرے گی یہاں تک کہ کانے دجال سے لڑے گی اے میرے رب اس کو میری امت بنا دے اللہ نے فرمایا موسیٰ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت ہو گی۔ حضرت موسیٰ نے کہا میرے رب مجھے (توریت) میں ایک امت کا تذکرہ ملتا ہے جو بکثرت حمد کرنے والے ہوں گے اور سورج کی نگرانی رکھیں گے (یعنی اوقات صلوٰۃ کی تعیین سورج کے طلوع غروب سے کریں گے اور نمازوں کے منتظر رہیں گے) جب وہ کسی کام کا ارادہ کریں گے تو کہیں گے انشاء اللہ تعالیٰ ہم یہ کام کریں گے ان لوگوں کو میری امت بنا دے اللہ نے فرمایا وہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت ہو گی۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کیا میں (توریت میں) ایک امت (کا ذکر) پاتا ہوں جو اپنے کفارات اور صدقات کو باہم کھائیں گے (یعنی آگ میں نہیں جلائیں گے) گزشتہ شریعتوں والے نذر اور صدقہ کی چیز آگ میں جلا دیتے تھے۔ وہ دعائیں کریں گے اور ان کی دعائیں قبول ہوں گی وہ شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت قبول ہو گی ان لوگوں کو میری امت بنا دے اللہ نے فرمایا یہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : کی امت ہو گی موسیٰ نے عرض کیا مجھے ایسی امت کا بھی تذکرہ ملتا ہے کہ جب وہ لوگ کسی ٹیلہ پر چڑھیں گے تو اللہ اکبر کہیں گے اور نشیب میں اتریں گے تو حمد کریں گے (یعنی حاجی ہوں گے) ساری مٹی ان کے لیے طہور (پاک اور پاک کن) ہو گی ساری زمین ان کے لیے مسجد ہو گی جہاں ہوں گے جنابت سے طہارت کریں گے مٹی سے بھی ان کی طہارت ایسی ہو گی جیسی پانی سے بشرطیکہ پانی دست یاب نہ ہو ان کے چہرے اور ہاتھ پاؤں وضو کے اثر سے گورے ہوں گے (یعنی قیامت کے دن) اے میرے رب ان کو میری امت بنا دے اللہ نے فرمایا یہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت ہو گی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کیا اے رب مجھے ایسے لوگوں کا تذکرہ ملتا ہے کہ اگر وہ نیکی کا صرف ارادہ کریں گے عمل نہ کر پائیں گے

تب بھی ان کی ایک نیکی لکھی جائے گی اور اگر نیکی کرلیں گے تو دس گنے سے سات سو گنے تک ان کو ثواب ملے گا اور اگر گناہ کا صرف ارادہ کریں گے تو گناہ نہیں لکھا جائے گا اور اگر گناہ کرلیں گے تو اتنا ہی لکھا جائے گا جتنا انھوں نے کیا ہوگا۔ ان کو میری امت بنادے اللہ نے فرمایا یہ احمد کی امت ہوگی۔ موسیٰ نے عرض کیا میں ایک مرحوم امت کا تذکرہ پاتا ہوں جو کمزور ہوگی وہ ان لوگوں سے کتاب میراث میں پائیں گے جن کو (عطاء کتاب کا) تو نے امتیاز دیا ہوگا ان لوگوں میں سے کچھ تو اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہوں گے (یعنی گناہ گار ہوں گے) اور کچھ متوسط الحال ہوں گے (ان کی نیکیاں بدیاں مخلوط ہوں گی) اور کچھ نیکیوں کی طرف پیش قدمی کرنے والے ہوں گے اور ان میں سے ہر ایک (گروہ) مرحوم ہوگا کوئی بھی ایسا نہ ہوگا کہ مرحوم نہ ہو اے رب ان لوگوں کو میری امت بنادے اللہ نے فرمایا یہ احمد کی امت ہوگی۔ موسیٰ نے عرض کیا میں ایسے لوگ بھی (توریت میں) پاتا ہوں جن کے مصحف ان کے سینوں میں ہوں گے (یعنی حافظ قرآن ہوں گے) وہ اہل جنت کے لباس کے رنگ کے کپڑے پہنیں گے۔ نمازوں کے اندر ان کی صفیں ملائکہ کی صفوں کی طرح ہوں گی مسجدوں کے اندر ان کی (تلاوت وقرات کی) آوازیں شہد کی مکھیوں کی گونج کی طرح ہوں گی ان میں سے کوئی کبھی آگ میں نہیں داخل ہوگا۔ سوائے اس شخص کے جو نیکیوں سے اس طرح الگ ہوجائے جیسے پتھر درختوں کے پتوں سے الگ ہوجاتا ہے اے رب ان لوگوں کو میری امت بنادے اللہ نے فرمایا یہ احمد کی امت ہوگی۔ موسیٰ (علیہ السلام) کو جب اس بات پر تعجب ہوا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : کو اور آپ کی امت کو اللہ نے یہ بھلائیاں عطا فرمائی ہیں تو عرض کیا کاش میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھیوں میں سے ہوتا اس پر موسیٰ (علیہ السلام) کو خوش کرنے کے لیے اللہ نے تین چیزوں کی وحی بھیجی اور فرمایا (یموسٰی انی اصطفیتک علی الناس برسالاتی و بکلامی۔۔ سے۔۔ ساریکم دار الفسقین۔ ومن قوم موسیٰ امۃ یھدون بالحق وبہ یعدلون) موسیٰ اس سے کامل طور پر خوش ہوگئے۔ (تفسیر گلدستہ)

اور تفسیر منازل العرفان میں آیت 143 :

تفسیر۔ معارف و منازل :

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا دیدار الٰہی کے لیے درخواست کرنا اور پہاڑ کا چورا چورا ہونا :

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے لیے کوہ طور جانے کا جو وقت مقرر ہوا تھا وہ اس کے مطابق وہاں پہنچے۔ حضرت ابن عباس (رض) فرماتے ہیں ان راتوں کی ابتداء ذیقعدہ کی پہلی تاریخ سے تھی پھر مزید دس راتیں ماہ ذلحجہ کے شروع کی بڑھادی گئیں اور دس ذوالحجہ کو توراۃ شریف عطا کی گئی جب موسیٰ (علیہ السلام) کوہ طور پر پہنچے تو اللہ رب العزت جل مجدہ سے ہم کلام ہوئے یہ رب العزت عز سلطانہ کے ساتھ ہم کلام ہونے کا دوسرا قیمتی موقع تھا ہم کلامی کے ساتھ انہیں بے حد اشتیاق ہوا کہ اپنے رب عزوجل کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں لہٰذا درخواست پیش کردی کہ عزتوں اور قدرتوں کے مالک مجھے اپنا دیدار کرادیجئے۔

یہ سوال "ترقی من الادنی الی الاعلی" کے لیے تھا کیونکہ انہیں ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا تھا جو کہ یہ مرتبہ اور منقبت صرف حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ مخصوص رہا ہے۔ قرآن کریم نے ارشاد فرمایا : وکلم اللہ موسیٰ تکلیما۔ (النساء) اس لئے درخواست پیش کردی کہ میں آپ کی ذات پر یقین بھی رکھتا ہو اور ہم کلامی کا شرف بھی پاچکا ہوں بے پایاں لطف و کرم کا امیدوار بھی ہوں اب یہ اشتیاق بھی رکھتا ہوں کہ دیدار جمال بھی کرلوں۔

اللہ تعالیٰ کو جنت میں اہل جنت دیکھیں گے جن میں انبیاء کرام (علیہم السلام) ہوں گے اور ان کی امتیں بھی ہوں گی لیکن دنیا میں دنیوی آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں ہوسکتا جنت میں ایک نئی اور مخصوص قوت اور استعداد دی جائے گی وہ دنیا دار الفناء والغرور میں نہیں دی گئی اس لیے سورۃ انعام میں فرمایا لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری (رض) سے روایت ہے کہ سید کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک دن 5 باتیں بیان کرنے کے لیے کھڑے ہوئے فرمایا :

1۔ بیشک اللہ تعالیٰ نہیں سوتے اور اس کے شایان شان نہیں کہ وہ سوئے۔

2۔ وہ ترازو کو بلند کرتا ہے اور پست کرتا ہے یعنی اعمال کا وزن فرماتا ہے جن کا وزن کمال اور نقص اخلاص کے اعتبار سے کم و بیش ہوتا ہے۔

3۔ اس کی طرف دن کے اعمال سے پہلے رات کے اعمال اٹھائے جاتے ہیں۔

4۔ اور رات کے اعمال سے پہلے دن کے اعمال اٹھائے جاتے ہیں۔

5۔اس کا حجاب نور ہے اگر وہ اس حجاب کو ہٹا دے تو اس کی ذات عالی صفات کے انوار اس سب کو جلا دے جہاں تک مخلوق پر اس کی نظر پہنچتی ہے یعنی ساری کائنات جل کر ختم ہو جائے۔ (رواہ مسلم)

مطلب یہ ہے کہ مخلوق کے چھپنے چھپانے کے لیے مادی پردے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ایسا پردہ نہیں اس کا پردہ عزت و عظمت اور جلال کا پردہ ہے اگر اس کی ذات عالی کی تجلی ہو جائے تو ساری مخلوق جل کر ختم ہو جائے یہ بات عوام کے لیے متشابہات میں سے ہے اہل علم میں صرف ایک خاص طبقہ اسے سمجھ سکتا ہے۔ واللہ اعلم بصفاتہ وانوار ذاتہ وعظمۃ جلالہ وکمالہ۔

جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے دیدار کی درخواست کی تو اللہ عزوجل عنہ نے فرمایا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے لیکن تم ایسا کرو کہ پہاڑ کی طرف دیکھو اگر پہاڑ اپنی جگہ ٹھہرا رہے تو تم مجھے دیکھ سکوگے۔ انہوں نے پہاڑ کی طرف دیکھا جب پہاڑ پر اللہ تعالیٰ از شانہ کی تجلی ہوئی (جو اس کی شایان شان تھی) تو پہاڑ چورا چورا ہو گیا اور موسیٰ (علیہ السلام) بے ہوش ہو کر گر پڑے جب وہ ہوش میں آئے (بے ہوشی میں کتنا وقت گزرا وہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے) تو موسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ عز شانہ تیری ذات پاک ہے واقعی تو اس دنیا میں دیکھے جانے سے منزہ اور برتر و بالا ہے میں نے جو دیدار کی درخواست کی تھی اس سے توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلے اس بات کا یقین کرنے والا ہوں کہ واقعی آپ کا دیدار نہیں ہو سکتا۔

سورۃ انعام میں فرمایا: "لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر "رب العزّت سبحانہ کی علو شان کا یہ حال ہے کہ نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں، اور وہ سب نگاہوں کو پاتا ہے، وہ ذات پاک ہمارے ہر ادراک اور احاطہ سے وراء الوریٰ ہے۔ بندوں کی آنکھوں میں یہ طاقت کہاں اور حواس ظاہری اور باطنی میں یہ قوت کہاں کہ وہ اسے دیکھ سکیں اور پا سکیں اور ادراک کر سکیں۔ اور وہ سب آنکھوں ارادوں نیتوں پر احاطہ کیا ہوا ہے اور تمام کائنات پر اس کا علم احاطہ کیا ہوا ہے وہ نہایت لطیف باریک بین اور خبر والا ہے انسان کیا اسے مقرب درگاہ فرشتے آج تک نہ دیکھ سکے اور اس کی ذات کا ادراک نہ کر سکے۔ جلیل القدر عظیم پیغمبر موسیٰ (علیہ السلام) شرف مکالمہ سے نوازے گئے مگر رؤیۃ زیارۃ تک نوبت نہیں آئی۔ کہنے لگے: "رب ارنی انظر الیک "جواب آیا: "لن ترانی "تم ہر گز مجھے دیکھ نہیں سکوگے وہ ان چیزوں کا بھی ادراک کرتا ہے جن کے ادراک سے تمام نگاہیں قاصر ہیں۔ باریک بین سے مراد یہ ہے کہ وہ تمام اشیاء کے اندرونی حالات اور کیفیات سے بخوبی واقف ہے کوئی چیز خواہ کیسی ہی باریک اور دقیق کیوں نہ ہو وہ اس سے پوشیدہ نہیں۔ اس بیان سے یہ امر ظاہر ہو گیا کہ "لَطِیفٌ" کا تعلق "لاتدرکہ الابصار "سے ہے۔ اور "خَبِیرٌ" کا تعلق "وھو یدرک الابصار "سے ہے۔ بلا تشبیہ اور بلا تمثیل کے ایسا سمجھو کہ جیسے روح ہے کہ نگاہیں اس کے ادراک سے بالکل قاصر ہیں وہ کبھی نظر نہیں آتی اور خود روح نگاہوں کا اور تمام چیزوں کا ادراک کر سکتی ہے۔

اس وجہ سے افعال انسانی کو روح کی طرف نسبت کیا جاتا ہے کسی اور چیز کی طرف نسبت نہیں کی جاتی اس سے کافروں کے اس شبہ کا جواب بھی ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہم سے پوشیدہ کیوں ہے اور وہ ہمیں نظر کیوں نہیں آتا؟ جواب اس طرح ہو گیا کہ وہ معبود برحق لطیف و خبیر ہے کمال لطافت کی وجہ سے نظر نہیں آتا جیسے روح کمال لطافت کی وجہ سے نظر نہیں آتی اسی طرح وہ لطیف و خبیر بھی نظر نہیں آتا اور اس عالم اجسام میں ہوا بھی ایک جسم لطیف ہے اپنی لطافت کی وجہ سے نظر نہیں آتی۔ خلاصہ کلام یہ کہ معبود برحق وہ ہے کہ جو علیم و قدیر، لطیف و خبیر ہو اور یہ صفت سوائے اللہ تعالیٰ جل شانہ کے کسی دوسرے کے لیے ثابت نہیں پھر کیسے کوئی اسکا شریک اور سہیم ہو سکتا ہے۔

اس آیت "لاتدرکہ الابصار "سے معتزلہ، خوارج، شیعہ، مرجئہ اور اہل بدعت وغیرہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جنت میں حق تعالیٰ شانہ کا دیدار نہ ہوگا۔ معتزلہ نے اس آیت سے یہ سمجھا کہ دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ تعالیٰ جل شانہ کا دیدار ممکن نہیں ہے۔ اہلسنت والجماعت کا اعتقاد اور فیصلہ اس بارے میں یہ ہے کہ بہشت میں اللہ تعالیٰ شانہ کا دیدار جنتیوں کے لئے افضل ترین نعمت ہے اور اگر سچ پوچھا جائے کہ اصل بہشت اس کے دیدار کی لذت و شرف ہی کا نام ہے وہ بہشت ہی کیا ہو جس میں محبوب حقیقی کا دیدار نصیب نہ ہو۔ علاوہ ازیں بہشت میں دیدار معبود برحق اور رویت محبوب حقیقی آیات قرآنیہ اور احادیث متواترہ اور اجماع امت سے ثابت ہے جن کا انکار درپردہ شریعت مطہرہ کا انکار ہے۔

آیات قرآنیہ:

(1) - "وجوہ یومئذ ناضرۃ۔ الی ربھا ناظرۃ"

(2) - "للذین احسنوا الحسنی وزیادۃ"

(3) - "فمن کان یرجوا لقاء ربہ فلیعمل عملا صالحا ولا یشرک بعبادۃ ربہ احدا"

(4) - "واذا رایت ثم رایت نعیما وملکا کبیرا"

(5) - "کلا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون"

حضرت امام شافعی (رح) فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو عار دلائی ہے کہ وہ قیامت کے دن اپنے پروردگار سے محجوب ہوں گے یعنی ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حجاب اور پردہ ہوگا اس سے صاف معلوم ہوا کہ اہل ایمان اللہ تعالیٰ کو بغیر حجاب کے دیکھیں گے کیونکہ وہ بھی اگر کافروں کی طرح حجاب میں رہیں تو ان میں اور کافروں میں کوئی فرق نہیں رہا، اور محجوب ہونے میں کافروں کی تخصیص نہیں ہوئی۔

ان آیات کے علاوہ اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے رویت باری تعالیٰ پر صراحۃً، دلالۃً، اشارۃً، اقتضاءً اس مقصد پر واضح ثبوت موجود ہے۔

احادیث:

(1)۔ حضرت صہیب رومی سے روایت ہے کہ سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے فرمائیں گے کہ جو نعمتیں جنت میں مل چکی ہیں ان سے زائد کوئی اور نعمت چاہتے ہو کہ میں تمہیں عطا کروں؟ تو وہ عرض کریں گے کیا آپ نے ہمارے چہرے بارونق نہیں فرمائے؟ کیا آپ نے ہمیں دوزخ سے نجات نہیں بخشی؟ اس سے زیادہ ہمیں کیا چاہیے اس وقت درمیان سے حجاب اٹھا دیا جائے گا اور سب کو اللہ تعالیٰ کی زیارت نصیب ہوگی اور جنت کی اور جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہوگی پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ آیت تلاوت فرمائی "للذین احسنوا الحسنی وزیادۃ" وہ لوگ جنھوں نے نیک اعمال کئے ان کے لئے جنت ہے اور اس سے زائد (اللہ تعالیٰ کی زیارت) ہے۔ (مسلم، بدور سافرہ وغیرہ)

(2)۔ حضرت جریر بن عبداللہ البجلی روایت کرتے ہیں کہ ہم سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت اقدس میں حاضر تھے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے چودھویں کے چاند کی طرف دیکھا اور ارشاد فرمایا: سن لو، تم عنقریب (جنت میں) اپنے رب کی زیارت اسی طرح سے کروگے جیسے اس چودھویں کے چاند کو دیکھ رہے ہو اور اس کے نظر آنے میں تم کوئی تکلیف اور دقت محسوس نہیں کرتے ہو پس اگر تم ہمت کرو کہ نماز فجر اور نماز عصر کو نہ چھوٹنے دو تو اس کی پابندی کرو (متفق علیہ)

(3)۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے کہ سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ جنت والے کافور کے ٹیلوں پر بیٹھ کر ہر جمعہ اپنے رب جل شانہ کی زیارت کریں گے ان میں سب سے زیادہ قریب (سے زیارت کرنے) والا وہ شخص ہوگا جو جمعہ کے دن جلدی (مسجد میں) جائے گا اور صبح کو جلدی اٹھتا ہوگا (ابن مبارک، البدور حادی الارواح)

(4)۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) روایت کرتے ہیں کہ سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ سب سے کم درجہ کا جنتی وہ ہوگا جو اپنی جنتوں، بیویوں، نعمتوں، خدمتگاروں اور تختوں کو ایک ہزار سال کی مسافت تک دیکھتا ہوگا اور ان میں سے زیادہ مرتبہ کا شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہوگا جو اللہ تعالیٰ شانہ کے چہرہ اقدس کی صبح شام زیارت کرے گا پھر سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ آیت تلاوت فرمائی "وجوہ یومئذ ناضرۃ۔ الی ربھا ناظرۃ" (اس دن جنت میں بہت سے چہرے تروتازہ ہشاش بشاش چمک دار ہوں گے اپنے رب جل شانہ کی طرف دیکھتے ہوں گے) (ترمذی، حاکم، مسند احمد، مجمع الزوائد، بدور السافرۃ)

(5)۔ حضرت جابر (رض) سے روایت ہے کہ سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جنت میں مومنین کی طرف مسکراتے ہوئے تجلی فرمائیں گے۔" (ابن کثیر، خطیب فی التاریخ، اتحاف السادۃ المتقین، مشکل الحدیث وغیرہ)

اللہ تعالیٰ شانہ کے مسکرانے کے معنی علم عقائد کے مطابق یہ ہیں کہ رب العزت سبحانہ اہل جنت پر اپنے لطف وکرم فضل وعنایت اظہار شرافت کا نزول فرمائیں گے۔ زہے سعادت۔

اختصار کے ساتھ چند مختصر احادیث پر اکتفا کیا ورنہ اس سلسلے میں بڑی طویل احادیث اتنی بکثرت ہیں جن کا احصاء باعث طوالت ہوگا اگر کسی کو مزید احادیث کی ضرورت ہو تو علامہ سیوطی (رح) کی البدور السافرۃ اور علامہ ابن قیم (رح) کی حادی الارواح اور مولانا امداد اللہ انور کی جنت کے حسین مناظر کا مطالعہ کیا جائے۔
حضرت سیوطی (رح) نے تیس کے قریب راویوں کی روایات نقل کی ہیں۔
خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں کسی کو رب العزت سبحانہ کی زیارت نہیں ہو سکتی۔ حضرت عبادہ بن صامت جناب سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دجال کا ذکر کیا پھر فرمایا تم جان لو تم اس وقت تک اپنے پروردگار کی زیارت نہیں کر سکتے جب تک کہ تم وفات نہ پاؤ (مسند احمد، البدور السافرۃ) اور دار آخرت میں رب العزت سبحانہ کی زیارت سے تمام جنتی محظوظ ہوں گے۔ اور سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو شب معراج میں زیارت ہوئی وہ بھی در حقیقت عالم آخرت ہی کی زیارت ہے جیسا کہ شیخ محی الدین ابن عربی نے فرمایا کہ دنیا صرف اس جہاں کا نام ہے جو آسمانوں کے اندر محصور ہے پس آسمانوں سے اوپر آخرت کا نام ہے وہاں پہنچ کر جو زیارت ہوئی ہے اس کو دنیا کی زیارت نہیں کہا جا سکتا۔
اب سوال یہ باقی ہے کہ آیت قرآنی "لاتدرکہ الابصار" سے یہ معلوم ہوا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ سبحانہ کی زیارت ہو ہی نہیں سکتی تو پھر بیان شدہ احادیث میں جنتیوں کے لئے جنت میں زیارت کا کیا معنی ہوگا؟ سو اس کا جواب واضح ہے کہ آیت کریمہ میں ادراک واحاطہ کی نفی ہے اور وہ بھی دنیا میں، آخرت کی رویت کی نفی نہیں ہے تب ہی تو صحیح احادیث میں بکثرت تواتر کے ساتھ آخرت کی زیارت کا اثبات فرمایا۔ تو مطلب واضح ہے کہ آیت نے جس ادراک واحاطہ کی نفی کی ہے احادیث نے اسکا اثبات نہیں کیا اور احادیث نے جس رویت کا اثبات کیا ہے آیت کریمہ نے اس کی نفی نہیں فرمائی۔
مسئلہ بے غبار اور واضح ہے البتہ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ آخرت کی زیارت میں احاطہ کی اسی طرح نفی ہوگی جس طرح عام اوقات میں، کیونکہ رب العزت سبحانہ کی ذات وصفات غیر محدود ہیں اور انسانی عقل وحواس ظاہری و باطنی سب محدود ہیں، پس ظاہر ہے کہ ایک غیر محدود ولامتناہی چیز کسی محدود اور متناہی چیز میں نہیں سما سکتی۔ اسی لیے تمام جہاں کے عقلاء اور فلاسفہ اور مذہبی سطح پر صوفیاء کرام نے اپنی اپنی عمریں پتہ لگانے اور باری تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت کا کھوج لگانے میں پوری زندگیاں صرف کی ہیں مگر ادراک کلی بجائے خود ایک جزوی نقطہ پر بھی نہیں پہنچ سکے ہیں اور سب نے ہتھیار پھینک کر یہی کہا:
دور بینان بارگاہ الست۔

غیر ازین پے نبردہ اند کہ ہست
چہ شب ہانشستم در این سیر گم
کہ حیرت گرفت آستینم کہ قم

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم
واز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم وخواندہ ایم
دفتر تمام گشت بپایان رسید عمر
ماہمچنان در اول وصف تو ماندہ ایم

حضرت ابو سعید خدری (رض) روایت کرتے ہیں کہ سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ اگر جہاں کے سارے انسان اور جنات اور فرشتے اور شیاطین جب سے پیدا ہوئے ہیں اور جب تک پیدا ہوتے رہیں گے وہ سب کے سب مل کر ایک صف میں کھڑے ہو جائیں تو سب مل کر بھی اللہ تعالیٰ کی ذات کا اپنی نگاہوں میں احاطہ نہیں کر سکتے (مظہری)
اور حقیقت یہ ہے کہ نگاہ تو انسانی حواس میں سے ایک حاسہ ہے جسے صرف محسوس چیزوں کا علم ہو سکتا ہے رب العزت سبحانہ کی ذات پاک تو عقل، حواس، وہم اور خیال کے احاطہ سے بالاتر ہے۔
تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا

بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے

حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ کی مخلوقات، مصنوعات اور ایجادات میں غور و فکر کرو اور انہی چیزوں سے اس کی معرفت حاصل کیا کرو اور پختہ یقین کرو مگر اس کی ذات کے متعلق غور و فکر ہر گز نہ کرو۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر منازل العرفان)

آیت مبارکہ:

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝١٤٤

لغۃ القرآن: [قَالَ : (اللہ نے) کہا] [يٰمُوْسٰٓي : اے موسیٰ] [اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ : میں نے ترجیح دی تجھ کو] [عَلَي النَّاسِ : لوگوں پر] [بِرِسٰلٰتِيْ : اپنے پیغام کے لیے] [وَبِكَلَامِيْ : اور اپنے کلام کے لیے] [ۡفَخُذْ : پس تو پکڑ] [مَآ : اس کو جو] [اٰتَيْتُكَ : میں نے جو دیا تجھ کو] [وَكُنْ : اور تو ہوجا] [مِّنَ : سے] [الشّٰكِرِيْنَ : شکر کرنے والے]

ترجمہ: ارشاد ہوا: اے موسٰی! بیشک میں نے تمہیں لوگوں پر اپنے پیغامات اور اپنے کلام کے ذریعے برگزیدہ و منتخب فرما لیا۔ سو میں نے تمہیں جو کچھ عطا فرمایا ہے اسے تھام لو اور شکر گزاروں میں سے ہو جاؤ

تشریح:

حضرت موسیٰ نے دوسری بار رحمت الٰہیہ کا یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا، اب انھیں خوشخبری مل رہی ہے کہ وہ منتخب روزگار ہیں۔ آپ میرے کلام اور پیغام کے حامل ہیں۔ فرعون سے مطالبہ یہ تھا کہ میری قوم کو رہا کرو، اب آپ نے اپنی قوم میں کام کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو یہ بتایا "میں نے تمام لوگوں پر ترجیح دے کر تجھے منتخب کیا ہے کہ میری پیغمبری کرے" اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے زمانے کے سب لوگوں میں سے آپ کو رسول بنانے کے لیے منتخب کیا۔ کیونکہ موسیٰ (علیہ السلام) سے پہلے بھی رسول گزرے ہیں اور بعد میں بھی۔ لہٰذا انتخاب اور اصطفاء سے مراد ہے، قرائن کے مطابق اس دور کے لوگوں کے مقابلے میں ہے۔ رہی صفت ہم کلامی باری تعالیٰ تو اس صفت میں حضرت موسیٰ منفرد ہیں۔ وہی یہ بات کہ اللہ نے حضرت موسیٰ کو یہ حکم دیا کہ آپ وہ ہدایات پکڑیں اور شکر ادا کریں تو یہ اللہ کی جانب سے ہدایت اور راہنمائی اور یہ تذکیر ہے کہ اللہ کے ان انعامات کا جواب ایک ہی ہے یعنی شکر ادا کرنا۔ رسول چونکہ قائد ہوتے ہیں اور قائدین لوگوں کے لیے نمونہ ہوتے ہیں، اس لیے لوگوں کا بھی فرض بن جاتا ہے کہ وہ بھی اللہ کی ہدایات کو لیں اور اس پر اللہ کا شکر ادا کریں۔ یوں ان پر اللہ کے مزید انعامات نازل ہوں گے، ان کی اصلاح ہو گی اور وہ اللہ سے جڑ کر سرکشی سے بچ جائیں گے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو دیدار کے مطالبے پر منع فرما دیا تھا، اس آیت میں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام پر کئے گئے انعامات کو گنوا کر انھیں تسلی دیتے ہوئے شکر کرنے کا حکم دے رہا ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ارشاد فرمایا: "اے موسیٰ! دیدار کا مطالبہ کرنے پر اگرچہ تجھے منع کر دیا گیا لیکن میں نے تمہیں فلاں فلاں عظیم نعمتیں تو عطا فرمائی ہیں لہٰذا دیدار سے منع کرنے پر اپنا سینہ تنگ نہ کرو، تم ان نعمتوں کی طرف دیکھو جن کے ساتھ میں نے تمہیں خاص کیا کہ میں نے اپنی رسالتوں کے ساتھ تجھے لوگوں پر منتخب کر لیا اور تمہیں مجھ سے بلا واسطہ ہم کلامی کا شرف عطا ہوا جبکہ دیگر انبیاء و مرسلین (علیہ السلام) سے فرشتے کے واسطے سے کلام ہوا۔ (1)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا اپنے زمانے کے لوگوں پر انتخاب ہوا:

یاد رہے کہ آیت میں جو بیان ہوا کہ "اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اپنی رسالتوں اور اپنے کلام کے ساتھ لوگوں پر منتخب کر لیا "اس میں لوگوں سے مراد ان کے زمانے کے لوگ ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اپنے زمانے کے لوگوں میں سب سے زیادہ عزت و مرتبے والے، شرافت و وجاہت والے تھے کیونکہ آپ صاحب شریعت تھے اور آپ پر اللہ عَزَّوَجَلَّ کی کتاب توراۃ بھی نازل ہوئی۔ لہٰذا اس سے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی فضیلت ثابت نہیں ہوتی۔ (تفسیر صراط الجنان)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو مشفقانہ خطاب ہو رہا ہے کہ اگر دیدار نہ ہو سکا تو نہ سہی، یہ شرف امتیاز کیا تھوڑا ہے کہ ہم نے تجھے پیغمبر بنایا اور تورات جیسی جامع اور بابرکت کتاب عطا کی اور بلاواسطہ کلام فرمایا تو جس قدر بخشش ہماری طرف سے ہوئی اس کی قدر کرو اور خوب شکر گزار بندوں میں شامل ہو جاؤ۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو چالیس راتیں گزر جانے کے بعد تورات شریف عطا ہوئی جو کہ 7 یا 10 تختیوں پر لکھی ہوئی تھی یہ تختیاں یاقوت زبرجد موتی کی لکڑیوں کی تھیں، مختلف اقوال ہیں۔ اس میں احکام شرعیہ تفصیل سے لکھے ہوئے تھے اور زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل درج تھے۔ نور ہدایت کے تمام مواعظ حسنہ لکھے ہوئے تھے اور حلال و حرام، طاعات و عبادات، پیشین گوئیاں اور مبدا اور معاد کے سارے مسائل درج تھے، کیوں نہیں، رب العالمین عز سبحانہ کی ہدایت اور برکتوں کی کتاب تھی جو کہ ایسے پیغمبر پر نازل ہوئی جس کا مرتبہ اور شرف جماعت انبیاء کرام (علیہم السلام) میں تیسرے نمبر پر ہے اور اس کی امت تمام امتوں میں خاصی بڑی امتوں میں شمار ہے۔

الغرض یہ کتاب شریعت موسوی کا مکمل نظام اور دستور العمل کی جامع کتاب ہے اسی کو فرمایا "وکتبنا لہ فی الالواح من کل شیئ موعظۃ وتفصیلا لکل شیئ "بہر حال دیدار نہ ہو سکنے سے جو شکستگی موسیٰ علیہ سلام کو ہوئی اس کی تلافی اور جبر مافات کے طور پر الواح عطا کی گئیں اور تورات انہیں تختیوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

"فخذھا بقوۃ "یعنی خود بھی ان الواح کو مضبوطی اور احتیاط سے پکڑے رہو کہیں ہاتھ سے چھوٹ نہ جائیں اور اپنی قوم کو سمجھاؤ کہ وہ ان الواح کی بہترین ہدایات پر پختگی سے عمل کرتے رہیں اور یہ ساری ہدایات احسن اور پسندیدہ ہیں ان کو ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ اَحْسَنِهَا کے یہی معنی ہیں کہ یہ سب چیزیں احسن اور بہتر ہیں۔ (تفسیر منازل العرفان)

آیت مبارکہ:

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ۭ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ۱۴۵

لغۃ القرآن: [وَكَتَبْنَا : اور ہم نے لکھا] [لَهٗ : اس کے لیے] [فِي الْاَلْوَاحِ : تختیوں پر] [مِنْ كُلِّ شَيْءٍ : سب چیزوں میں سے] [مَّوْعِظَةً : نصیحت ہوتے ہوئے] [وَّتَفْصِيْلًا : اور تفصیل ہوتے ہوئے] [لِّكُلِّ شَيْءٍ : ہر چیز کے لیے] [فَخُذْهَا : پس تو پکڑ اس کو] [بِقُوَّةٍ : قوت سے] [وَّاْمُرْ : اور تو حکم دے] [قَوْمَكَ : اپنی قوم کو] [يَاْخُذُوْا : کہ وہ لوگ پکڑیں] [بِاَحْسَنِهَا: اس کے بہترین کو] [سَاُورِيْكُمْ : میں دکھاؤں گا تم لوگوں کو] [دَارَ الْفٰسِقِيْنَ : نافرمانی کرنے والوں کا گھر]

ترجمہ: اور ہم نے ان کے لیے (توراۃ کی) تختیوں میں ہر ایک چیز کی نصیحت اور ہر ایک چیز کی تفصیل لکھ دی (ہے)، تم اسے مضبوطی سے تھامے رکھو اور اپنی قوم کو (بھی) حکم دو کہ وہ اس کی بہترین باتوں کو اختیار کر لیں۔ میں عنقریب تمہیں نافرمانوں کا مقام دکھاؤں گا

تشریح: جس مقصد کے لیے موسیٰ (علیہ السلام) کو بلایا تھا آپ اس کی تکمیل فرمائی جارہی ہے۔ یعنی وہ نسخہ ہدایت و رحمت جس میں ہر طرح کی نصیحتیں اور احکام شرعیہ لکھے ہوئے تھے آپ کو دیا گیا۔ یہی توراۃ تھی جو پتھر کی سلوں پر لکھی لکھائی بیک وقت آپ کو دے دی گئی۔ من کل شیء مما یحتاج الیہ فی دینہ من الاحکام و تبیین الحلال والحرام۔ (قرطبیؒ) (تفسیر ضیاء القرآن)

قرآن مجید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کو تحریر کی شکل میں توراۃ عطا کی تھی شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ بنی اسرائیل اہم اور حساس معاملات میں بھی ظاہر پرست واقع ہوئے تھے۔ جس کی بنا پر انھوں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے یہ مطالبہ کیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتے ہیں۔ پھر اس پر اتنا اصرار کیا کہ موسیٰ (علیہ السلام) ان سے مجبور ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے لیے اپنی قوم کے ستر نمائندے ساتھ لے گئے جنھیں اللہ تعالیٰ نے فوت کرنے کے بعد موسیٰ (علیہ السلام) کی دعا پر دوبارہ زندہ کیا۔ تفصیل کے لیے اسی سورۃ کی آیت ۱۵۵ کی تلاوت کریں۔ پھر یہ بھی ان کی ظاہر پرستی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کی صرف چالیس دن کی غیر حاضری پر بچھڑے کو معبود بنالیا۔ ممکن ہے کہ اسی ظاہر پرستی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تحریری طور پر توراۃ نازل فرمائی تاکہ توراۃ کی لکھی ہوئی تختیاں دیکھ کر یہ ایمان لے آئیں۔ جس کے بارے میں ارشاد ہوا کہ ہم نے ان تختیوں میں ان کی رہنمائی کے لیے ہر مسئلہ لکھ دیا تھا۔ ظاہر ہے توراۃ کی تحریر کوئی عام تحریر اور اس کی تختیاں کسی انسان کی بنائی ہوئی نہ تھیں نہ معلوم ان تختیوں کے اندر کتنی جاذبیت، کشش اور نورانیت ہو گی۔ اس کی تحریر کتنی خوش نما اور خوبصورت اور دیکھنے والے کو اس تحریر اور تختیوں سے کتنا سکون ملتا ہوگا۔ پھر اس میں دین کے متعلق تمام مسائل کا اتنے موثر انداز سے احاطہ کیا گیا تھا جس کی نظیر اس سے پہلے دنیا میں نہیں پائی جاتی تھی۔ "موعظۃ" ایسی بات اور انداز کو کہتے ہیں جو انسان کے دل پر براہ راست دستک دے۔ اتنے اوصاف حمیدہ کی حامل کتاب کے بارے میں حکم ہوا کہ اے موسیٰ! اسے مضبوطی کے ساتھ تھام لو اور اپنی قوم کو حکم دو کہ وہ بھی اخلاص کے ساتھ نہایت اچھے طریقے سے اس کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں تھام رکھیں یعنی پوری طرح اس پر عمل کرتے رہیں۔ یہی کتاب الٰہی کا سب سے بڑا ادب اور اس کا تقاضا ہے۔ جس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ عنقریب اللہ تعالیٰ تمہیں اس سرزمین کا وارث بنائے گا جس پر فاسق و فاجر لوگ قابض ہو چکے ہیں۔ اس سے مراد اکثر مفسرین نے شام اور فلسطین کی سرزمین لی ہے جو اس وقت ایک ہی ملک شمار ہوتا تھا لیکن کچھ مفسرین نے شام اور فلسطین کے ساتھ مصر کا علاقہ بھی شامل کیا ہے فرعون اور ان کے بڑے بڑے لوگ غرق ہو جانے کے باوجود مصر کے لوگ اس زمانے میں سب سے زیادہ عیاش اور فسق و فجور میں مبتلا تھے۔ "دَارُ الْفٰسِقِيْنَ" سے مراد جہنم کا گھر بھی ہو سکتا ہے۔ جس میں فاسقین کا جانا یقینی ہے۔ اور مومنوں کو جہنم میں جہنمیوں کا انجام بھی دکھلایا جائے گا۔ تفصیل کے لیے سورۃ المدثر کی ۴۰ تا ۴۷ آیات تلاوت کریں۔

(عن عمر (رض) قال قال رسول اللّٰہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) إِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ أَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ آخَرِیْنَ)

[رواہ مسلم: کتاب صلوۃ المسافرین، باب فضل من یقوم بالقران]

"حضرت عمر (رض) بیان کرتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ساتھ اقوام کو بلند کرے گا اور دوسروں کو پست کر دے گا۔"

(إِنَّ رَسُولَ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ تَرَکْتُ فِیْکُمْ أَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا کِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّۃَ نَبِیِّہٖ)

[موطا امام مالک: کتاب الجامع، باب النھی عن القول بالقدر]

"بلاشبہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں تم میں دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں جب تک تم ان کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے کبھی گمراہ نہ ہو سکو گے ایک اللہ کی کتاب اور دوسری اس کے نبی کی سنت۔ (تفسیر فہم القرآن) نوٹ "دوسری روایت میں کتاب اللہ واہل بیت بھی آیا ہے

توراۃ کی تختیوں کا مادہ، تعداد اور نزول کی تاریخ

امام عبدالرحمٰن بن محمد بن ابی حاتم متوفی 327ھ روایت کرتے ہیں:

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ توراۃ سونے کے قلموں سے لکھی گئی تھی۔

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو توراۃ زمرد کی سات تختیوں میں عطافرمائی تھی، اس میں ہر چیز کا بیان تھا، اور اس میں نصیحتیں لکھی ہوئی تھیں، جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) توراۃ لے کر آئے تو انھوں نے دیکھا کہ بنو اسرائیل بچھڑے کے سامنے بیٹھے ہوئے عبادت کر رہے ہیں، تو جوش غضب سے ان کے ہاتھوں سے توراۃ گر کر ٹوٹ گئی، پھر وہ ہارون کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کو سر سے پکڑ لیا، پھر اللہ تعالیٰ نے توراۃ کے چھ حصے اوپر اٹھا لیے اور ایک حصہ رہ گیا۔

جعفر بن محمد اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر جو توراۃ نازل کی گئی تھی وہ بیری کے پتوں پر لکھی ہوئی تھی اور اس لوح کا طول بارہ ہاتھ تھا۔

سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ توراۃ کی تختیاں یاقوت کی تھیں اور میں کہتا ہوں کہ وہ زمرد کی تھیں اور اس پر سونے سے لکھا ہوا تھا، اور رحمٰن تبارک و تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا اور آسمان والوں نے قلم چلنے کی آواز سنی۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج 5، ص 1563، 1562، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ، مکہ مکرمہ، 1417ھ)

امام ابن ابی شیبہ، امام عبد بن حمید اور امام ابن المنذر نے حکیم بن جابر سے روایت کیا ہے کہ مجھے یہ خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین چیزوں کے سوا کسی چیز کو پیدا کرنے میں اپنا ہاتھ نہیں لگایا، اپنے ہاتھ سے جنت میں پودا لگایا، ورس (ایک قسم کی گھاس، جس سے سرخ رنگ نکلتا ہے) اور زعفران کو اس کی مٹی بنایا اور اس میں مشک کے پہاڑ بنائے، حضرت آدم کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور توراۃ کو اپنے ہاتھ سے لکھا۔ (الدرر المنثور ج 3، ص 549، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1414ھ)

امام عبدالرحمٰن بن محمد بن علی بن الجوزی الحنبلی المتوفی 579ھ لکھتے ہیں:

توراۃ کی الواح کے متعلق سات قول ہیں: حضرت ابن عباس نے فرمایا: وہ زمرد کی الواح تھیں، سعید بن جبیر نے کہا: یاقوت کی تھیں، مجاہد نے کہا: سبز زمرد کی تھیں، ابو العالیہ نے کہا: ایک قسم کے کپڑے کی تھیں، حسن بصری نے کہا: لکڑی کی تھیں، وہب بن منبہ نے کہا: پتھر کی تھیں، مقاتل نے کہا: زمرد اور یاقوت کی تھیں۔ ان کی تعداد میں بھی اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: سات الواح تھیں، ابو صالح نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے: دو تختیاں تھیں، اور یہ فرا کا مختار ہے۔ وہب بن منبہ نے کہا: دس تھیں، مقاتل نے کہا: نو تھیں۔ (زاد المسیر ج 3، ص 258، مطبوعہ المکتب الاسلامی، بیروت، 1407ھ)

امام رازی نے لکھا ہے کہ یوم عرفہ (9 ذوالحجہ) کو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بے ہوش ہوئے تھے اور یوم النحر (دس ذی الحجہ) کو اللہ تعالیٰ نے ان کو توراۃ عطافرمائی۔ (تفسیر کبیر ج 5، ص 310، مطبوعہ احیاء التراث العربی، بیروت، 1415ھ)

توراۃ میں ہر چیز کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل مذکور ہونے کی توجیہ

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی متوفی 606ھ لکھتے ہیں:

اس آیت میں فرمایا ہے: اور ہم نے ان کے لیے (توراۃ کی) تختیوں میں ہر چیز کی نصیحت لکھ دی تھی۔

ہر چیز سے مراد عموم نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی قوم کو اپنے دین میں حلال، حرام اور اچھی اور بری چیزوں کے متعلق جن احکام کی احتیاج تھی وہ سب توراۃ میں لکھی ہوئی تھیں۔ (تفسیر کبیر ج 5، ص 360، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1415ء)

علامہ ابن جوزی حنبلی متوفی 597ھ فرمایا ہے: ہر چیز سے مراد احکام شرعیہ ہیں مثلاً فرض، واجب، حلال اور حرام وغیرہ۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ہر چیز کی حکمتیں اور عبرتیں وغیرہ ہیں۔ (زاد المسیر ج 3، ص 258، طبع بیروت)

علامہ قرطبی مالکی متوفی 668ھ نے لکھا ہے کہ عرف اور محاورہ میں کل شیء سے مراد حقیقتاً عموم نہیں ہوتا جیسے کہتے ہیں فلاں آدمی کے پاس ہر چیز ہے، یا میں شہر میں گیا اور میں نے ہر چیز خرید لی۔ (الجامع لاحکام القرآن جز 8، ص 253)

میں کہتا ہوں اس سے عموم بھی مراد ہو سکتا ہے جب کہ اس کا یہ معنی کیا جائے کہ ان کو دنیا میں صلاح اور آخرت میں فلاح کے لیے جس قدر احکام کی احتیاج تھی، اللہ تعالیٰ نے وہ تمام احکام توراۃ کی الواح میں لکھ دیے تھے۔

اس کے بعد فرمایا: "اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی تھی"۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ان کو جس قدر احکام شرعیہ دیے تھے توراۃ میں ان تمام احکام کی تفصیل لکھ دی تھی، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اجمالی احکام بیان فرمائے ہیں اور ان کی تفصیل سنت اور قیاس سے معلوم ہوتی ہے، لیکن بنو اسرائیل کے لیے احکام کا ماخذ صرف توراۃ تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمام تفصیلات توراۃ ہی میں لکھ دی تھیں۔ مثلاً نماز کا قرآن مجید میں اجمالی حکم ہے، پانچ اوقات کی تفصیل اور تعیین درج نہیں نہ نماز کی رکعات کی تعداد کا بیان ہے اور ہر رکعت میں کیا پڑھنا ہے، اس کا بھی ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح زکوۃ کی مقدار اور نصاب کا قرآن مجید میں ذکر نہیں ہے۔ حج کے فرائض، ارکان، شرائط اور موانع کا ذکر نہیں ہے، ان تمام امور کی تفصیل سنت میں ہے، اسی طرح بعض احکام قیاس سے ثابت ہوتے ہیں مثلاً خمر کو قرآن مجید نے حرام کیا ہے لیکن دیگر نشہ آور چیزوں کی حرمت قیاس سے ثابت ہے۔ بنو اسرائیل کے لیے قیاس اور اجتہاد نہیں تھا نہ ان کے ہاں سنت اور حدیث کی شرعی حیثیت تھی۔ ان کے احکام کا ماخذ صرف توراۃ تھی، للذا جو تفصیلات ہم کو سنت اور اجتہاد سے معلوم ہوتی ہیں، وہ تمام تفصیلات اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے توراۃ میں لکھ دی تھیں۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے توراۃ میں احکام بھی لکھے اور تمام احکام سے متعلق ہر تفصیل لکھ دی، اس لیے فرمایا: ہم نے توراۃ کی الواح میں ہر چیز کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی۔

توراۃ کے احکام کا درجہ بہ درجہ ہونا

اس کے بعد فرمایا: اور اپنی قوم کو حکم دو کہ وہ اس کی بہترین باتوں پر عمل کریں۔

آیت کے اس حصہ پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ توراۃ میں کچھ ایسے حکم بھی ہیں جو بہترین نہیں ہیں۔ اس اعتراض کے حسب ذیل جوابات ہیں:

1۔ یہ معنی مفہوم مخالف کے اعتبار سے لیا گیا ہے، اور ہمارے نزدیک قرآن اور حدیث میں مفہوم مخالف معتبر نہیں ہے، اور توراۃ کے تمام احکام بہترین ہیں اور جن ائمہ کے نزدیک مفہوم مخالف معتبر ہے، ان کے اعتبار سے جواب یہ ہے کہ توراۃ کے احکام درجہ بہ درجہ ہیں اور بعض احکام بعض سے زیادہ بہتر ہیں۔

2۔ بنو اسرائیل کو برے کاموں سے روکا گیا تھا اور نیک کاموں کا حکم دیا گیا تھا اور برائی سے رکنا، نیکی کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔

3۔ معاف کر دینا قصاص لینے سے بہتر ہے، اور صبر کرنا بدلہ لینے سے بہتر ہے۔ سو ان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ قصاص لینے کی بجائے معاف کر دیں اور بدلہ لینے کی بجائے صبر کریں، اس کی نظیر قرآن مجید کی یہ آیت ہے: "والذین اذا اصابهم البغی هم ینتصرون : وجزاء سیئة سیئة مثلها فمن عفا واصلح فاجره علی الله انه لایحب الظلمین : اور وہ لوگ جن پر جب (کسی کا) ظلم پہنچے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ اسی کی مثل برائی ہے، پس جس نے معاف کر دیا اور نیکی کی تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ (کرم) پر ہے، بیشک وہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا" (الشوری: 39۔40)۔ اس کے بعد فرمایا: "ولمن صبر وغفر ان ذلک لمن عزم الامور : اور جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے تو یقیناً یہ ضرور ہمت کے کاموں (بہترین کاموں) میں سے ہے" (الشوری: 43)

3۔ توراۃ میں فرائض، نوافل اور مباح کاموں کے احکام ہیں، فرائض اور نوافل پر عمل کرنا، بہترین عمل ہے اور صرف فرائض پر عمل کرنا اس سے کم درجہ کا ہے اور مباح پر عمل کرنا اس سے بھی کم درجہ کا ہے۔ اسلام میں بھی احکام درجہ بہ درجہ ہیں، پہلے فرائض کا مرتبہ ہے پھر واجبات کا، پھر سنن کا، پھر مستحبات کا، پھر مباحات کا۔

اس کے بعد فرمایا: "عنقریب میں تم کو فاسقوں کا گھر دکھاؤں گا"۔ حسن اور مجاہد نے کہا: اس سے مراد جہنم ہے۔ عطیہ عوفی نے کہا: اس سے مراد فرعون اور اس کی قوم کا گھر ہے جو کہ مصر ہے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد جبابرہ اور عمالقہ کے گھر ہیں، جو ان کو اللہ نے شام میں دخول کے وقت دکھائے تھے۔ سدی نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ میں عنقریب تم کو ان لوگوں کا انجام دکھاؤں گا جنھوں نے میرے احکام کی مخالفت کی تھی، سو یہ تہدید اور تحذیر ہے۔ (زاد المسیر، ج3، ص260)

الواح توراۃ میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کی امت کی خصوصیات

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی 911ھ بیان کرتے ہیں:

امام عبد بن حمید، امام ابن ابی حاتم اور امام ابو الشیخ نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! میں نے توراۃ کی الواح میں یہ پڑھا ہے کہ ایک امت سب سے آخر میں پیدا ہو گئی اور سب سے پہلے جنت میں داخل ہو گی، تو ان کو میری امت بنا دے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ امت احمد ہے، کہا: اے میرے رب میں نے توراۃ کی الواح میں پڑھا ہے کہ ایک امت سب سے بہترین امت ہے وہ لوگوں کو نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے اور اللہ پر ایمان لائیں گے، تو ان کو میری امت بنا دے، فرمایا: وہ امت احمد ہے، کہا: اے میرے رب! میں نے توراۃ میں پڑھا ہے کہ ایک امت پہلی کتاب پر اور اخری کتاب پر ایمان لائے گی اور وہ گمراہوں سے قتال کرے گی، حتی کہ کانے کذاب سے قتال کرے گی تو ان کو میری امت بنا دے، فرمایا: وہ امت احمد ہے۔ کہا: اے میرے رب! میں نے توراۃ میں پڑھا ہے کہ

ایک امت اپنے صدقات کو کھائے گی اور اس کو اس پر اجر ملے گا تو اس کو میری امت بنا دے، فرمایا: وہ امت احمد ہے (قتادہ نے کہا: تم سے پہلی امتوں میں جب کوئی شخص صدقہ کرتا اور اس کا وہ صدقہ قبول ہو جاتا تو اللہ تعالیٰ اس پر ایک آگ بھیجتا وہ اس صدقہ کو کھا لیتی اور اگر وہ صدقہ قبول نہ ہوتا تو وہ یونہی پڑا رہتا اور اس کو درندے اور پرندے کھا جاتے اور بیشک اللہ نے تمہارے فقراء کے لیے تمہارے اغنیاء سے صدقات کو لیا اور یہ اس کی تم پر تخفیف اور رحمت ہے) کہا: اے میرے رب! میں نے تورات کی الواح میں پڑھا ہے کہ اس امت کا جب کوئی شخص کسی نیکی کا ارادہ کرے اور اس پر عمل نہ کرے تو اس کے لیے بھی ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور جب وہ اس نیکی پر عمل کرے تو اس جیسی دس نیکیوں سے لے کر سات سو نیکیاں اور اس کی دگنی نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں، تو ان کو میری امت بنا دے، فرمایا: یہ امت احمد ہے۔ کہا: اے میرے رب! میں تورات کی الواح میں یہ پڑھا ہے، اس امت کا کوئی شخص جب کسی گناہ کا ارادہ کرے تو اس کو اس وقت تک نہیں لکھا جاتا جب تک کہ وہ اس پر عمل نہ کر لے اور جب وہ عمل کر لے تو پھر اس کا ایک گناہ لکھا جاتا ہے تو اس کو میری امت بنا دے، فرمایا: یہ امت احمد ہے۔ کہا: اے میرے رب میں نے تورات کی الواح میں پڑھا ہے کہ وہ امت لوگوں کی دعوت قبول کرے گی اور ان کی دعا قبول کی جائے گی تو ان کو میری امت بنا دے، فرمایا: وہ وہ امت احمد ہے، پھر حضرت موسیٰ نے کہا: اے اللہ! مجھے امت احمد بنا دے! فرمایا میں تم کو دو ایسی چیزیں دے رہا ہوں جو میں نے کسی کو نہیں دیں، میں نے تم کو اپنی رسالت اور اپنے کلام کے ساتھ فضیلت دی ہے، یہ ایک چیز ہے، پھر موسیٰ (علیہ السلام) راضی ہو گئے اور دوسری چیز یہ ہے کہ موسیٰ کی قوم سے ایک امت ایسی ہو گی جو حق کے ساتھ ہدایت دے گی اور حق کے ساتھ عدل کرے گی۔ پھر موسیٰ (علیہ السلام) مکمل راضی ہو گئے۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج 5، ص 1564، رقم الحدیث: 8965)

امام ابوالشیخ نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے جب تورات میں ان خصوصیات کو پڑھا جو اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عطا کی ہیں تو اپنے رب سے کہا: اے رب! وہ کون سے نبی ہیں جن کو اور جن کی امت کو تو نے اول وآخر بنایا ہے؟ فرمایا وہ محمد نبی امی عربی حرمی تہامی ہیں جو قاذر بن اسماعیل کی اولاد سے ہیں ان کو میں نے محشر میں اول بنایا ہے اور ان کو میں نے (دنیا میں) آخر بنایا ہے اور ان پر رسولوں کو ختم کر دیا ہے، اے موسیٰ! میں نے ان کی شریعت کے ساتھ تمام شرائع کو منسوخ کر دیا ہے۔ اور ان کی کتاب کے ساتھ تمام کتابوں کو، اور ان کی سنت کے ساتھ تمام سنتوں کو، اور ان کے دین کے ساتھ تمام ادیان کو۔ کہا: اے رب! بیشک تو نے مجھے منتخب کیا ہے اور مجھ سے کلام فرمایا ہے، فرمایا: اے موسیٰ! بیشک تم میرے صفی ہو، اور وہ میرے محبوب ہیں، قیامت کے دن میں ان کو بلندی پر اٹھاؤں گا اور ان کے حوض کو سب سے بڑا حوض بناؤں گا اور ان کے حوض پر سب سے زیادہ لوگ آئیں گے، اور ان کے پیروکار سب سے زیادہ ہوں گے۔ کہا: اے رب! تو نے ان کو مکرم اور مشرف بنایا ہے، فرمایا: اے موسیٰ! مجھ پر حق تھا کہ میں ان کو مکرم بناتا اور ان کو اور ان کی امت کو فضیلت دیتا، یوں کہ وہ مجھ پر ایمان لائیں گے اور میرے تمام رسولوں پر ایمان لائیں گے اور میرے تمام کلمات پر ایمان لائیں گے اور میرے تمام غیب پر ایمان لائیں گے۔

کہا: اے میرے رب! یہ ان کی نعت ہے، فرمایا: ہاں! کہا: اے میرے رب! کیا تو نے ان کو جمعہ ھبہ کیا ہے یا میری امت کو؟ فرمایا بلکہ جمعہ ان کے لیے ہے نہ کہ تمہاری امت کے لیے، کہا: اے میرے رب! میں نے تورات میں ایک امت کی یہ صفت دیکھی ہے کہ ان کا چہرہ اور ان کے ہاتھ پیر سفید ہوں گے، وہ کون ہیں؟ آیا وہ بنو اسرائیل ہیں یا کوئی اور ہیں؟ فرمایا: وہ امت احمد ہے، وضو کے آثار سے (قیامت کے دن) ان کا چہرہ اور ان کے ہاتھ پیر سفید ہوں گے، کہا: اے میرے رب! میں تورات میں پڑھا ہے کہ ایک قوم پل صراط سے بجلی اور آندھی کی طرح گزرے گی، وہ کون ہیں؟ فرمایا وہ امت احمد ہے، کہا اے میرے رب! میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ ایک قوم پانچ نمازیں پڑھے گی، وہ کون ہیں؟ فرمایا وہ امت احمد ہے۔ کہا اے میرے رب! میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ ایک قوم کے نیک لوگ بدکاروں کی شفاعت کریں گے وہ کون ہیں؟ فرمایا وہ امت احمد ہے۔ کہا: اے میرے رب! میں تورات میں پڑھا ہے کہ ایک قوم کا کوئی شخص کوئی گناہ کرے گا پھر وضو کرے گا تو اس کا گناہ بخش دیا جائے گا اور جب وہ نماز پڑھے گا تو بغیر کسی گناہ کے نماز پڑھے گا، وہ کن ہیں؟ فرمایا: وہ امت احمد ہے، کہا: اے میرے رب! میں تورات میں پڑھا ہے کہ ایک قوم تیرے رسولوں کی تبلیغ کی گواہی دے گی، وہ کون ہیں؟ فرمایا: وہ امت احمد ہے، کہا: اے میرے رب! میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ ایک قوم کے لیے مال غنیمت کو حلال کر دیا جائے گا جو دوسری امتوں پر حرام تھا، وہ کون ہیں؟ فرمایا: وہ امت احمد ہے، کہا: اے میرے رب! میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ ایک قوم کے لیے تمام روئے زمین تیمّم کا آلہ اور مسجد بنا دی جائے گی، وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: وہ امت احمد ہیں، کہا: اے میرے رب! میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ ایک قوم ایسی ہو گی کہ اس کا ایک آدمہ پچھلی امتوں کے تیس آدمیوں سے افضل ہو گا، وہ کون ہیں؟ فرمایا: وہ امت احمد ہے، کہا: اے میرے رب! میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ ایک قوم تجھ سے محبت کرتے گی، تیرے ذکر میں پناہ لے گی، تیری خاطر غضب میں آئے گی وہ کون ہیں؟ فرمایا: وہ امت احمد ہے۔ کہا: اے میرے رب! میں تورات میں پڑھا ہے کہ ایک قوم کے اعمال کے لیے آسمان

کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور فرشتے ان کو گلے لگائیں گے، وہ کون ہیں، فرمایا: وہ امت احمد ہے، کہا: اے میرے رب! میں نے توراۃ میں پڑھا ہے کہ ایک قوم کے نیک لوگ جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے، اور ان کے درمیانی طبقہ کے لوگوں سے آسان حساب لیا جائے گا۔ اور ان کے ظالموں کو بخش دیا جائے گا، وہ کون ہیں؟ فرمایا وہ امت احمد ہے، کہا: اے میرے رب! مجھے اس امت میں سے کر دے، فرمایا: اے موسیٰ! تم ان میں سے ہو اور وہ تم میں سے ہیں، کیونکہ تم بھی میرے دین پر ہو اور وہ بھی میرے دین پر ہیں لیکن میں نے تم کو اپنی رسالت اور ہم کلام ہونے کی فضیلت عطا کی ہے سو تم شکر کرنے والوں میں سے ہو جاؤ۔ (الدر المنثور، ج 3، ص 552، 555، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1414ھ) (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰیٰتِیَ الَّذِیۡنَ یَتَکَبَّرُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ وَ اِنۡ یَّرَوۡا کُلَّ اٰیَۃٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡا بِہَا ۚ وَ اِنۡ یَّرَوۡا سَبِیۡلَ الرُّشۡدِ لَا یَتَّخِذُوۡہُ سَبِیۡلًا ۚ وَ اِنۡ یَّرَوۡا سَبِیۡلَ الۡغَیِّ یَتَّخِذُوۡہُ سَبِیۡلًا ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ کَانُوۡا عَنۡہَا غٰفِلِیۡنَ ﴿۱۴۶﴾

لغۃ القرآن: [سَاَصْرِفُ : میں پھیر دوں گا] [عَنْ اٰيٰتِيَ : اپنی نشانیوں سے] [الَّذِيْنَ : ان لوگوں کو جو] [يَتَكَبَّرُوْنَ : بڑے بنتے ہیں] [فِي الْاَرْضِ : زمین میں] [بِغَيْرِ الْحَقِّ: حق کے بغیر] [وَاِنْ : اور اگر] [يَّرَوْا : وہ لوگ دیکھیں] [كُلَّ اٰيَةٍ : ساری نشانیاں] [لَّا يُؤْمِنُوْا : تو (بھی) ایمان نہیں لائیں گے] [بِهَا : ان پر] [وَاِنْ : اور اگر] [يَّرَوْا : وہ دیکھیں] [سَبِيْلَ الرُّشْدِ : ہدایت کے راستے کو] [لَا يَتَّخِذُوْهُ : تو نہیں پکڑیں گے اس کو] [سَبِيْلًا : بطور راستے کے] [وَاِنْ : اور اگر] [يَّرَوْا : وہ دیکھیں] [سَبِيْلَ الْغَيِّ : گمراہی کے راستے کو] [يَتَّخِذُوْهُ : تو پکڑیں گے اس کو] [سَبِيْلًا : بطور راستے کے] [ذٰلِكَ : یہ ہے] [بِاَنَّهُمْ : بسبب اس کے کہ انہوں نے] [كَذَّبُوْا : جھٹلایا] [بِاٰيٰتِنَا : ہماری نشانیوں کو] [وَكَانُوْا : اور وہ لوگ تھے] [عَنْهَا : اس سے] [غٰفِلِيْنَ : غافل]

ترجمہ: میں اپنی آیتوں (کے سمجھنے اور قبول کرنے) سے ان لوگوں کو باز رکھوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں اور اگر وہ تمام نشانیاں دیکھ لیں (تب بھی) اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور اگر وہ ہدایت کی راہ دیکھ لیں (پھر بھی) اسے (اپنا) راستہ نہیں بنائیں گے اور اگر وہ گمراہی کا راستہ دیکھ لیں (تو) اسے اپنی راہ کے طور پر اپنا لیں گے، یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے غافل بنے رہے

تشریح: اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں انسان کی دنیا و آخرت کی بہتری کے لیے بڑے ہی موثر اور دل نشین انداز میں ہدایات فرمائی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جو شخص یا قوم اللہ تعالیٰ کی نصیحت اور اس کی خیر خواہانہ رہنمائی کو اپنی رعونت اور تکبر سے ٹھکرا دیتا ہے۔ اس کی دنیا میں یہ سزا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے ہدایت کو دور کر دیتا ہے ایسے شخص یا قوم کے پاس کوئی بھی نشانی اور معجزہ آئے تو وہ اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور اگر انھیں ہدایت کے راستہ کی طرف بلایا جائے تو وہ اس پر چلنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ ان کا مزاج اس قدر بگڑ جاتا ہے کہ وہ ہر برائی اور گمراہی کے راستہ پر چلنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ وہ اپنی رعونت اور تکبر کے سبب اللہ تعالیٰ کے احکام کو جھٹلاتے ہوئے تغافل کرتے ہیں۔ جو لوگ بھی اللہ تعالیٰ کے احکام جھٹلائیں اور آخرت کی جواب دہی کا انکار کریں ان کے سب کے سب اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو جھٹلاتے اور آخرت کی جواب دہی کے منکر تھے۔ یہاں متکبرین کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ہم

انھیں اپنی آیات سے پھیر دیتے ہیں یہ مضمون مختلف الفاظ میں پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ اللہ ہی ہدایت دینے والا اور گمراہ کرنے والا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی پر ہدایت مسلط نہیں کرتا جب مجرم ہدایت کو اپنی رعونت کی وجہ سے قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے تو اللہ تعالیٰ اس پر اپنی ہدایت کیوں مسلط کرے گا۔ یہاں آیات سے پھیر دینے کا یہی مطلب لینا چاہیے۔ جہاں تک آخرت میں متکبرین اور مکذبین کو دنیا کی کسی نیکی کے صلہ سے محروم رکھنے کا تعلق ہے وہ اس لیے ہے کہ ایسا شخص اگر کوئی نیکی کا کام کرتا ہے تو محض اپنی طبیعت کے سکون اور دنیا کی ناموری اور فائدے کے لیے کرتا ہے۔ اسے اچھی شہرت اور کسی نہ کسی شکل میں دنیا میں اس کا صلہ مل جاتا ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور آخرت پر یقین نہیں رکھتا اس لیے اس کی نیکی کا آخرت میں بدلہ نہیں دیا جائے گا۔

(عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ ابْنُ جُدْعَانَ كَانَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ يَصِلُ الرَّحِمَ وَيُطْعِمُ الْمِسْكِينَ فَهَلْ ذَاكَ نَافِعُهُ قَالَ لَا يَنْفَعُهُ إِنَّهُ لَمْ يَقُلْ يَوْمًا رَبِّ اغْفِرْ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ) [رواہ مسلم: کتاب الایمان]

"حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں میں نے رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے استفسار کیا اے اللہ کے رسول ابن جدعان جاہلیت کے زمانے میں صلہ رحمی اور مساکین کو کھانا کھلایا کرتا۔ تو کیا قیامت کے دن اسے یہ چیز فائدہ دے گی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا نہیں کیونکہ اس نے کبھی یہ بات نہیں کہی تھی اے میرے رب ! قیامت کے دن میری خطاؤں کو معاف فرمانا۔ "یعنی وہ قیامت کے دن پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ (تفسیر فہم القرآن)

اللہ تعالیٰ یہاں ان لوگوں کے بارے میں اپنی مشیت کا اعلان فرماتے ہیں جو اس زمین میں بغیر جواز کے تکبر کرتے ہیں اور بڑے بنتے ہیں۔ یہ لوگ کس قسم کے ہوتے ہیں ؟ ایسے کہ چاہے جو معجزانہ استدلال ان کے سامنے پیش کیا جائے وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ ان کو کسی اچھے کام کی دعوت دی جائے تو اس پر لبیک نہیں کہتے، اگر وہ برائی کا کوئی کام بھی دیکھیں اس کی طرف لپکیں لہٰذا ایسے لوگوں کا صحیح علاج یہ ہے کہ انھیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور ایسے لوگوں پر کام کیا جائے جو مانتے ہیں، یہ تو ماننے والے نہیں، آیات و دلائل جو اس کائنات میں ظاہر و باہر ہیں اور وہ آیات و دلائل جو اللہ کی کتابوں میں ہیں، اس لیے کہ انھوں نے پہلے سے تکذیب کا فیصلہ کر لیا ہے اور اعراض کا فیصلہ کر لیا ہے۔

قرآن کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ لوگ کیسے ہوں گے ان کی حرکات اور ان کی صفات یہ ہیں : الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔ جو بغیر کسی حق کے زمین پر بڑے بنتے ہیں۔

اس لیے کہ اللہ کے بندوں میں سے کسی بندے کا حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی زمین پر خود بڑا بنے۔ بڑائی تو اللہ کی صفت ہے، اور کبریائی میں اللہ کسی کو شریک نہیں کرتا کیونکہ یہ اللہ کی چادر ہے۔ لہٰذا کوئی انسان جو اس کرہ ارض پر بڑا بنتا ہے وہ بغیر جواز کے تکبر کرتا ہے اور سب سے بڑا تکبر یہ ہے کہ کوئی اس سرزمین پر قانون سازی کا حق اپنے لیے مخصوص کر لے اور اللہ کے بندوں پر اللہ کے بجائے اپنا اقتدار اعلیٰ استعمال کرے۔ اور لوگوں سے اپنے قوانین پر عمل کرائے۔ اس تکبر اور بڑائی سے تمام دوسری برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ تمام شرارتوں کی بنیاد ہے اور ہر قسم کا فساد اس سے برپا ہوتا ہے اور اس کے بعد دوسری صفات ایسے لوگوں کی یہ آتی ہیں۔

وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا۔ اگر سیدھا راستہ سامنے آئے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں۔ ان کی یہ فطرت ہے کہ سیدھے راستے کو دیکھ کر ہی اس سے ایک طرف ہو جاتے ہیں اور ٹیڑھے راستے کو دیکھتے ہی اس پر روانہ ہو جاتے ہیں اور یہ ان کی فطرت کا حصہ ہے۔ اور اس کے خلاف وہ نہیں جا سکتے۔ یہ ہے ان کی صفت۔ قرآن کریم اس انداز میں اس کی تعبیر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اللہ کی مشیت نے ایسے لوگوں کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے اور وہ سزا یہ ہے کہ ہدایت کے دروازے ان کے لیے بند کر دیے گئے ہمیشہ کے لیے۔

اس قسم کے لوگ ہمیں ہر معاشرے میں ملتے رہتے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ یہ لوگ حق سے اجتناب کرتے ہیں اور باطل کی طرف سخت میلان رکھتے ہیں اور بغیر تدبیر اور بغیر سوچے باطل کی طرف لپکتے ہیں۔ سچائی کا مستقیم راستہ ان کو مشکل اور باطل کا ٹیڑھا راستہ ان کو آسان نظر آتا ہے اور ایسے لوگ اللہ کی آیات و دلائل اور معجزات سے دور بھاگتے ہیں، ان پر غور و فکر نہیں کرتے، ان کے ذرائع فہم و ادراک پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور نہ فطرت اور حق کے اشارات ان پر اثر کرتے ہیں۔ سبحان اللہ، اس عجیب قرآنی ہدایات کی ان جھلکیوں سے اس قسم کے لوگ ممتاز طور پر نظر آتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کو اپنے ماحول اور معاشرے میں دیکھتے ہی ایک قاری کہہ اٹھتا ہے۔ ہاں ہاں اس قسم کے لوگوں کو میں جانتا ہوں۔ فلاں فلاں شخص ان قرآنی کلمات کا مصداق ہے۔

اس قسم کے لوگوں کو ایسی ایسی تباہ کن اور مہلک سزا دے کر اللہ تعالیٰ ان پر کوئی ظلم نہیں کرتا۔ نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ یہ وہ سزا و جزا ہے جس کے وہ لوگ ٹھیک طور پر مستحق ہیں جو آیات الٰہیہ کی تکذیب کرتے ہیں۔ اور ان کے بارے میں غفلت برتتے ہیں اور زمین میں بغیر حق اپنی بڑائی جماتے ہیں۔ ان کی روش یہ ہے کہ ہر اس راستے سے ایک طرف ہو جاتے ہیں جو ہدایت کا راستہ ہو اور ہر اس راستے کی طرف لپکتے ہیں جو گمراہی کا راستہ ہو، ایسے لوگوں کو تو ان کے عمل کی سزا مل رہی ہے اور یہ لوگ اپنے طرز عمل کی وجہ سے ہلاکت کے دروازے تک آپہنچے ہیں۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ۔ اس لیے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پرواہی کرتے رہے "ا (تفسیر فی ظلال القرآن)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "میں عنقریب ان لوگوں (کے دلوں) کو اپنی آیات سے پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں، وہ اگر تمام نشانیاں دیکھ لیں تب بھی ایمان نہیں لائیں گے اور اگر وہ گمراہی کا راستہ دیکھ لیں تو اس راستہ کو اختیار کر لیں گے، کیونکہ انھوں نے (ہمیشہ) ہماری آیتوں کی تکذیب کی اور وہ ان سے اعراض کرنے والے تھے"۔

اللہ کی آیات سے کفار کے دلوں کو پھیرنے کی توجیہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: میں عنقریب ان لوگوں (کے دلوں) کو اپنی آیات سے پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے کفار کے دلوں کو اپنی آیات سے پھیر دیا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے ایمان نہ لانے پر کفار کی مذمت کیوں فرمائی ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "فمالہم لا یومنون: ان کو کیا ہوا وہ ایمان کیوں نہیں لاتے؟" (فمالہم عن التذکرۃ معرضین: انھیں کیا ہوا کہ وہ نصیحت سے اعراض کر رہے ہیں۔ المدثر: 49)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حسن بصری سے منقول ہے کہ جب کفار اپنے کفر میں مبالغہ کرتے ہیں اور اس حد تک پہنچ جاتے ہیں جس میں ان کا قلب مر جاتا ہے تو پھر ان کو کوئی ہدایت مفید نہیں ہوتی اور ان لوگوں کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو اپنی آیات سے پھیر دیتا ہے اور ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔

تکبر کا لغوی اور شرعی معنی

اس آیت میں تکبر کرنے والوں پر بھی وعید فرمائی ہے۔ تکبر کا معنی بیان کرتے ہوئے امام راغب اصفہانی متوفی 502ھ فرماتے ہیں: دل میں اپنے آپ کو دوسروں سے اچھا اور بڑا سمجھنے کی وجہ سے انسان کو جو حالت حاصل ہوتی ہے اس کو تکبر کہتے ہیں اور سب سے بڑا تکبر یہ ہے کہ انسان اللہ کے سامنے تکبر کرے اور حق کو ماننے اور قبول کرنے سے انکار کرے اور عبادت کرنے سے عار محسوس کرے، اگر انسان بڑائی کو حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کرے تو یہ محمود ہے اور اگر انسان اپنی بڑائی ظاہر کرے اور اس میں وہ بڑے اوصاف نہ ہوں تو یہ مذموم ہے۔ (المفردات، ج 2، ص 545، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، 1418ھ)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی 606ھ لکھتے ہیں:

"وہ تکبر کرتے ہیں" اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو افضل الخلق سمجھتے ہیں اور ان کو وہ اختیار حاصل ہے جو ان کے غیر کو حاصل نہیں ہے اور یہ تکبر صرف اللہ کو زیبا ہے کیونکہ وہی ایسی قدرت اور ایسی فضیلت کا مالک ہے جو کسی اور کے لیے ممکن نہیں ہے، اس لیے وہی متکبر کی صفت کا مستحق ہے۔ بعض علماء نے یہ کہا کہ تکبر کی تعریف یہ ہے کہ انسان دوسروں پر اپنی بڑائی ظاہر کرے اور تمام بندوں کے حق میں تکبر کی صفت مذموم ہے، اور اللہ تعالیٰ کے حق میں تکبر کی صفت محمود ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات کا مستحق ہے کہ وہ دوسروں پر اپنی بڑائی ظاہر فرمائے اور اس کے لیے یہ حق ہے اور دوسروں کے لیے باطل ہے۔ (تفسیر کبیر ج 5، ص 366، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 115ھ)

امام راغب اصفہانی اور امام رازی نے تکبر کا جو معنی بیان کیا ہے وہ درست ہے لیکن تکبر کا شرعی معنی وہ ہے جو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اس حدیث سے مستفاد ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی تکبر ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ ایک شخص نے کہا: آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کا لباس اچھا ہو اور اس کی جوتی اچھی ہو، آپ نے فرمایا: اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے، تکبر حق بات کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔ (صحیح مسلم الایمان: 147 (91) 259۔ سنن ابو داود، رقم الحدیث: 4091۔ سنن الترمذی رقم الحدیث: 1998۔ سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: 59۔ مسند احمد ج 1 ص 451، رقم الحدیث: 4310۔ جامع الاصول رقم الحدیث: 8210)

تکبر کے معنی کی مزید وضاحت اس حدیث سے ہوتی ہے:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: روئے زمین پر کوئی ایسا شخص نہیں ہے کہ جو اس حال میں مرے کہ اس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی تکبر ہو مگر اللہ اس کو دوزخ میں (داخل) کردے گا، جب حضرت عبداللہ بن قیس انصاری نے یہ حدیث سنی تو وہ رونے لگے۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پوچھا: اے عبداللہ بن قیس تم کیوں رو رہے ہو؟ انھوں نے کہا: آپ کے ارشاد کی وجہ سے، آپ نے فرمایا: تمہیں مبارک ہو تم جنت میں ہوگے۔ پھر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک لشکر بھیجا اس میں انھوں نے جہاد کیا اور شہادت پائی۔ آپ نے پھر اس حدیث کو تین بار دہرایا، انصار میں سے ایک شخص نے کہا: یا نبی اللہ! میں جمال سے محبت کرتا ہوں، میں تلوار حمائل کرتا ہوں اور میلے کپڑے دھوتا ہوں اپنی جوتی اور اس کے تسموں کو حسین بناتا ہوں۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میری مراد یہ نہیں ہے، تکبر حق کا انکار کرنا ہے اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔ اس نے کہا: یا نبی اللہ! حق کے انکار کرنے اور لوگوں کو حقیر جاننے کا کیا معنی ہے؟ آپ نے فرمایا: حق کا انکار یہ ہے کہ تمہاری کسی شخص پر مال ہو وہ اس کا انکار کردے اور کہے کہ اس کے اوپر کوئی حق نہیں ہے، پھر کوئی شخص اس کو اللہ سے ڈرنے کا حکم دے تو وہ اس کا انکار کرے، اور لوگوں کو حقیر جاننا یہ ہے کہ ایک شخص ناک چڑھا کر آئے اور جب وہ پس ماندہ اور فقراء لوگوں کو دیکھے تو ان کو سلام نہ کرے اور ان کو بے وقعت جان کر ان کے پاس نہ بیٹھے، پس یہ وہ شخص ہے جو لوگوں کو حقیر جانتا ہے۔ پھر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص نے پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنے اور جوتی کی مرمت کی اور دراز گوش پر سوار ہوا اور نوکر جب بیماری ہوں تو ان کی عیادت کی اور بکری کا دودھ دوہا تو وہ تکبر سے بری ہوگیا۔ (المطالب العالیہ رقم الحدیث: 2675، علامہ احمد بن ابی بکر بوصیری متوفی 840ھ نے اس حدیث کو مسند عبد بن حمید اور حاکم سے نقل کیا ہے۔ اتحاف السادۃ المہرۃ بزوائد المسانید العشرۃ، ج8، ص290)

تکبر کی مذمت اور اس پر وعید کے متعلق قرآن مجید کی آیات

تکبر کی مذمت اور اس پر وعید کے متعلق قرآن مجید کی حسب ذیل آیت ہیں: "کذلک یطبع اللہ علی کل قلب متکبر جبار: اسی طرح اللہ ہر مغرور متکبر کے دل پر مہر لگا دیتا ہے" (المومن: 35)۔ "وخاب کل جبار عنید: اور ہر متکبر معاند ہلاک ہوگیا" (ابراہیم: 15)۔ "انہ لایحب المستکبرین: بیشک وہ تکبر کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا" (النحل: 23)۔ "ان الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جہنم داخرین: بیشک جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب ذلت کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے" تکبر کی مذمت اور اس پر وعید کے متعلق احادیث

حضرت ابوسعید اور حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے کہ عزت میرا تہبند ہے اور کبریاء (بڑائی) میری چادر ہے جس شخص نے ان میں سے کسی کو بھی کھینچا میں اس کو عذاب دوں گا۔ امام ابوداؤد کی روایت میں ہے جس نے ان میں سے ایک کپڑے کو بھی کھینچا میں اس کو دوزخ میں ڈال دوں گا۔ (صحیح مسلم البر والصلہ: 136 (2620) 6557۔ سنن ابوداود رقم الحدیث: 4090۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 4174۔ مسند حمیدی، رقم الحدیث: 1194۔ مسند احمد ج 2، رقم الحدیث: 248، 414)

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: متکبروں کو قیامت کے دن مردوں کی صورت میں چیونٹی کی جسامت میں جمع کیا جائے گا ان کو ہر طرف سے ذلت ڈھانپ لے گی، ان کو دوزخ کے قید خانہ کی طرف ہنکایا جائے گا جس کا نام بولس ہے، اس میں آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہوں گے، ان کو دوزخیوں کی پیپ پلائی جائے گی (سنن الترمذی رقم الحدیث: 2492۔ السنن الکبری للنسائی رقم الحدیث: 8800۔ مسند الحمیدی، رقم الحدیث: 598۔ مسند احمد ج 2، ص 179، رقم الحدیث: 6677، الادب المفرد رقم الحدیث: 557۔ جامع الاصول رقم الحدیث: 8212)

حضرت سلمہ بن اکوع (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ہمیشہ آدمی اپنے آپ کو بڑا سمجھتا رہتا ہے حتی کہ اس کو متکبرین میں لکھ دیا جاتا ہے اور اس کو متکبرین کا عذاب پہنچتا ہے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: 2007۔ جامع الاصول رقم الحدیث: 8213)

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فتح مکہ کے دن خطبہ دیا اور فرمایا: اے لوگو! بیشک اللہ عزوجل نے تم سے زمانہ جاہلیت کے بوجھ کو اتار دیا ہے اور تمہارے باپ دادا کی بڑائی کو ختم کردیا ہے، اب لوگوں کی دو قسمیں ہیں، نیک پرہیزگار، وہ اللہ عزوجل کے نزدیک کریم ہے اور فاجر بدبخت، وہ اللہ عزوجل کے نزدیک ذلیل ہے، تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد

اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور ہم نے تمہاری مختلف قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کی شناخت کرو، بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث : 3277۔ صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث : 2781۔ جامع الاصول رقم الحدیث : 8214)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: دوزخ اور جنت نے مباحثہ کیا، دوزخ نے کہا: مجھ میں متکبرین اور متجبرین داخل کیے گئے ہیں اور جنت نے کہا: مجھے کیا پرواہ ہے جب کہ مجھ میں صف کمزور، عاجز اور متواضع لوگ داخل کیے گئے۔ (الحدیث) (صحیح مسلم المنافقین : 35 (2846) 7040۔ صحیح البخاری، رقم الحدیث : 4850)

حضرت ثوبان (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: وہ شخص جنت میں داخل ہو جائے گا جو اس حال میں مرا کہ وہ ان تین چیزوں سے بری تھا: تکبر، خیانت اور قرض۔ (سنن الترمذی، رقم الحدیث : 1578۔ مسند احمد ج 8، رقم الحدیث : 22432)

حضرت حارثہ بن وھب (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: کیا میں تم کو اہل جنت کی خبر نہ دوں ؟ ہر کمزور شخص جس کو بے حد کمزور سمجھا جاتا ہو اگر وہ اللہ پر (کسی کام کی) قسم کھالے تو اللہ اس کی قسم ضرور پورا کرے گا، اور کیا میں تم کو اہل دوزخ کی خبر نہ دوں ؟ ہر سرکش، اکڑ کر چلنے والا متکبر (صحیح البخاری، رقم الحدیث : 6657، 6071، 4918۔ صیح مسلم رقم الحدیث : 2853۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 4116)

حضرت نعیم بن ھماز الغطفانی (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کیسا برا بندہ ہے وہ بندہ جو بڑا بنے اور تکبر کرے اور الکبیر المتعال (اللہ تعالیٰ جو حقیقتاً سب سے بڑا ہے) کو بھول جوائے، اور کیسا برا بندہ ہے وہ بندہ جو دین کے بدلہ میں دنیا لے، اور کیسا برا بندہ ہے وہ بندہ جو لہو ولعب میں وقت گزارے اور قبروں کو اور جسم کے بوسیدہ ہونے کو بھول جائے، اور کیسا برا بندہ ہے وہ بندہ جو شبہات سے حرام کو حلال کرے، اور کیسا برا بندہ ہے وہ بندہ جس کو خواہش (نفس) گمراہ کردے، اور کیسا برا ہے وہ بندہ جو اس چیز میں رغبت کرے جو اس کو ذلیل کردے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث : 2456۔ مجمع الزوائد ج 10، ص 234)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آزاد شدہ غلام نافع بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مسکین متکبر، بوڑھا، زانی اور اپنے عمل سے اللہ تعالیٰ پر احسان جتانے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ (مجمع الزوائد ج 6، ص 256، مطبوعہ دار الکتب العربیہ بیروت)

حضرت ابوسعید (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: بیشک تمہارا رب واحد ہے اور تمہارا باپ واحد ہے، پس کسی عربی کو عجمی پر اور کسی گورے کو کالے پر تقوی کے سوا اور کسی وجہ سے فضیلت نہیں ہے، اور مسند بزار میں اس طرح ہے: تمہارا باپ واحد ہے اور تمہارا دین واحد ہے۔ تمہارا باپ آدمی ہے اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا گیا تھا۔ (المعجم الاوسط، ج 5، رقم الحدیث : 4143۔ مسند البزار رقم الحدیث : 2044، 3583، حافظ الہیثمی نے لکھا ہے کہ مسند البزار کی سند صحیح ہے، مجمع الزوائد، ج 8، ص 160، مطبوعہ دار الفکر، 1414 ھ، طبع جدید)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دو غلام تھے ایک حبشی دوسرا نبطی تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو برا کہا اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سن رہے تھے، ایک نے دوسرے سے کہا اے نبطی، دوسرے نے اس کو کہا اے حبشی۔ آپ نے فرمایا تم دونوں اس طرح نہ کہو، تم دونوں (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب میں سے ہو۔ (مسند ابویعلی ج 7، رقم الحدیث : 4146۔ مجمع لازوائد ج 8، ص 86۔ المطالب العالیہ رقم الحدیث : 2524۔ اتحاف السادۃ المھرۃ ج 7 رقم الحدیث : 6107)

تکبر کی وجہ سے ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے کا مکروہ تحریمی ہونا اور تکبر کے بغیر مکروہ تحریمی نہ ہونا

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ قیامت کے دن اس شخص کی طرف نظر (رحمت) نہیں فرمائے گا جس نے اپنا کپڑا تکبر کی وجہ سے (ٹخنوں سے نیچے) لٹکایا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 5783۔ صحیح مسلم لباس : 42 (2085) 5353۔ سنن الترمذی رقم الحدیث : 1737۔ سنن النسائی رقم الحدیث : 5326۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 3569۔ موطا امام مالک رقم الحدیث : 570، مسند احمد ج 2، ص 56، رقم الحدیث : 5188، مسند الحمیدی رقم الحدیث : 636)

ابو وائل بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود (رض) کا تہبند ٹخنوں سے نیچے لٹکتا رہتا تھا، ان سے اس کے متعلق استفسار کیا گیا، انھوں نے کہا میں ایسا شخص ہوں جس کی پنڈلیاں پتلی ہیں۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج 8، ص 206، مطبوعہ ادارۃ القرآن، کراچی، 1406 ھ)

تکبر کے بغیر ٹخنوں سے نیچے لباس لٹکانے کے متعلق فقہاءِ احناف کی تصریحات

علامہ بدر الدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی 855ھ مذکور الصدر حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں :

جس شخص نے بغیر قصد تکبر کے تہبند ٹخنوں کے نیچے باندھا اس میں کوئی کراہت نہیں ہے نہ کوئی حرج ہے، اسی طرح کسی ضرر کو دور کرنے کے لیے بھی ٹخنوں سے نیچے لباس لٹکانا جائز ہے، مثلاً اس کے ٹخنوں کے نیچے کوئی زخم ہو یا خارش ہو یا اگر وہ ٹخنوں کو نہ ڈھانپے تو اس پر مکھیاں اور دیگر حشرات الارض کے بیٹھنے کا خطرہ ہو اور لمبی قمیص یا لمبا تہبند اور کوئی چیز ڈھانپنے کے لیے میسر نہ ہو۔ (عمدۃ القاری ج ۲۱ ص ۲۹۵ مطبوعہ ادارہ الطباعۃ المنیریہ مصر ۱۳۴۸ھ)

نیز علامہ عینی لکھتے ہیں :

حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ جب حضرت ابوبکر (رض) نے اپنے تہبند کے ایک جانب پھسل جانے کا ذکر کیا تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : تم تکبر سے ایسا نہیں کرتے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : ۵۷۸۴) اس حدیث سے معلوم ہوا ہے کہ جس شخص کا تہبند بلا قصد پھسل جائے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر یہ اعتراض ہو کہ حضرت ابن عمر (رض) ہر حال میں تہبند لٹکانے کو مکروہ کہتے تھے اس کے جواب میں علامہ ابن بطال نے کہا ہے کہ یہ حضرت ابن عمر کی تشدیدات میں سے ہے ورنہ حضرت ابن عمر تو خود اس حدیث کے راوی ہیں ان سے یہ حکم کیسے مخفی ہو سکتا ہے۔

(عمدۃ القاری ج ۲۱ ص ۲۹۶ مطبوعہ ادارہ الطباعۃ المنیریہ مصر ۱۳۴۸ھ)

علامہ بدر الدین عینی حنفی مزید لکھتے ہیں :

نماز کسوف کے موقع پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جلدی سے اپنا تہبند گھسیٹتے ہوئے کھڑے ہوئے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : ۵۷۸۵) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بغیر تکبر کے تہبند گھسیٹ کر چلنا حرام نہیں ہے لیکن مکروہ تنزیہی ہے۔

(عمدۃ القاری ج ۲۱ ص ۲۹۶ مطبوعہ ادارۃ الطباعہ المنیریہ مصر ۱۳۴۸ھ)

غیر ارادی طور پر تہبند قدموں سے نیچے گھسیٹ رہا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن ارادتاً تہبند یا شلوار اتنی لمبی رکھنا کہ وہ قدموں کے نیچے گھسٹ رہی ہو حرام ہے خواہ تکبر کی نیت نہ ہو۔ کیونکہ اس میں بہر حال اسراف ہے اور اپنے کپڑوں کو نجاست سے آلودگی کے خطرہ میں ڈالنا ہے۔ البتہ اگر لباس قدموں کے نیچے نہیں گھسٹ رہا تھا صرف ٹخنوں سے نیچے تھا تو یہ بغیر تکبر کے مکروہ تنزیہی ہے اور تکبر کے ساتھ مکروہ تحریمی ہے۔

ملا علی بن سلطان محمد القاری الحنفی المتوفی ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں :

بخاری کی حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ بغیر تکبر کے تہبند گھسیٹ کر چلنا حرام نہیں ہے لیکن یہ مکروہ تنزیہی ہے۔

(المرقات ج ۸ ص ۲۳۸ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان ۱۳۹۰ھ)

شیخ عبد الحق محدث دہلوی حنفی متوفی ۱۰۵۲ھ لکھتے ہیں :

اگر کوئی شخص تکبر اسراف اور طغیان (سرکشی) کی نیت سے اپنے تہبند کو لمبا بناتا ہے اور اس کو گھسیٹتا ہے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف لطف وعنایت کی نظر نہیں فرمائے گا۔ اس قید سے معلوم ہوا کہ اگر تہبند اس طرح نہ ہو تو حرام نہیں ہے لیکن مکروہ تنزیہی ہے۔ اور اگر کوئی عذر ہو مثلاً سردی ہو یا کوئی بیماری ہو (مثلاً ٹخنے کے نیچے کوئی زخم ہو جس پر مکھیاں بیٹھتی ہوں تو ان سے زخم کو بچانے کے لیے ٹخنہ ڈھانپے) تو بالکل مکروہ نہیں ہے۔

اشعۃ اللمعات ج ۳ ص ۵۳ مطبوعہ مطبع تیج کمار لکھنؤ)

نیز شیخ عبد الحق محدث دہلوی لکھتے ہیں :

حرام وہ صورت ہے جب کوئی شخص عجب اور تکبر سے کپڑا لٹکائے۔ (اشعۃ اللمعات ج ۳ ص ۵۵۵ مطبوعہ لکھنؤ)

نیز شیخ محقق فرماتے ہیں :

طعام اور لباس میں توسیع اسراف اور تکبر کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے اور اگر اس طرح نہ ہو تو پھر مباح ہے۔

(اشعۃ اللمعات ج ۳ ص ۵۵۸ مطبوعہ تیج کمار لکھنؤ)

فتاوٰی عالمگیری میں مذکور ہے :

مرد کا تہبند ٹخنوں سے نیچے لٹکانا اگر تکبر کی وجہ سے نہ ہو تو مکروہ تنزیہی ہے۔ اسی طرح غرائب میں ہے۔

(فتاوٰی عالمگیری ج ۵ ص ۳۳۳ مطبوعہ مطبعہ امیریہ کبریٰ بولاق مصر ۱۳۱۰ھ)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ لکھتے ہیں :

پائنچوں کا کعبین (ٹخنوں) سے نیچا ہونا جسے عربی میں اسبال کہتے ہیں اگر براہ عجب و تکبر ہے تو قطعاً ممنوع و حرام ہے اور اس پر وعید شدید وارد۔ امام محمد بن اسماعیل بخاری اپنی صحیح میں حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص نے تکبر کی وجہ سے اپنی چادر کو لٹکایا قیامت کے دن اللہ عزوجل اس کی طرف نظر (رحمت) نہیں فرمائے گا۔ امام ابوداؤد، امام بن ماجہ، امام نسائی اور امام ترمذی نے بھی الفاظ متقاربہ کے ساتھ اسی طرح روایت کیا ہے اور اگر بوجہ تکبر نہیں تو بحکم ظاہر احادیث مردوں کو بھی جائز ہے جیسے کہ تکبر کی قید سے تم کو خود معلوم ہوگا حضرت ابوبکر (رض) نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میری ازار ایک جانب سے لٹک جاتی ہے فرمایا تو ان میں سے نہیں ہے جو ایسا براہ تکبر کرتا ہو احادیث میں جو اس پر وعید ہے اس سے یہی صورت مراد ہے کہ بہ تکبر اسبال کرتا ہو ورنہ ہر گز یہ وعید شدید اس پر وارد نہیں مگر علماء درصورت عدم تکبر حکم کراہت تنزیہی دیتے ہیں۔ فتاوٰی عالمگیری میں ہے اگر اسبال تکبر سے نہ ہو تو مکروہ تنزیہی ہے اسی طرح غرائب میں ہے۔

بالجملہ اسبال اگر براہ عجب و تکبر ہے حرام ورنہ مکروہ اور خلاف اولیٰ نہ حرام و مستحق وعید اور یہ بھی اس صورت میں ہے کہ پائنچہ جانب پاشنہ نیچے ہوں اور اگر اس طرف کعبین سے بلند ہیں گو پنجہ کی جانب پشت پا پر ہوں ہر گز کچھ مضائقہ نہیں اس طرح کا لٹکانا حضرت ابن عباس (رض) بلکہ خود حضور سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ثابت ہے۔ امام ابوداؤد نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ عکرمہ نے دیکھا کہ حضرت ابن عباس (رض) نے چادر باندھی اور اگلی جانب سے چادر ان کے قدم کی پشت پر تھی اور چادر کی پچھلی جانب اوپر اٹھی ہوئی تھی میں نے پوچھا آپ نے اس طرح چادر کیوں باندھی ہے انھوں نے کہا میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس طرح چادر باندھے ہوئے دیکھا ہے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث : ۴۰۹۶) اس حدیث کے تمام راوی ثقہ اور عدول ہیں جن سے امام بخاری روایت کرتے ہیں۔ شیخ محقق مولانا عبدالحق محدث دہلوی اشعتہ اللمعات شرح مشکوۃ میں فرماتے ہیں اس جگہ سے معلوم ہوا کہ اسبال کی نفی میں ایک جانب سے اونچا کرنا کافی ہے۔ عالمگیری میں ہے کہ ہاں اس میں شبہ نہیں کہ نصف ساق تک پائنچوں کا ہونا بہتر و عزیمت ہے اکثر ازار پر انوار سید الابرار یہیں تک ہوتی تھی۔

(فتاوٰی رضویہ ج ۱۰ ص ۱۲۵ ایضاً ص ۱۱۰، ۲۹۵ مطبوعہ ادارہ تصنیفات امام احمد رضا کراچی ۱۹۸۸ئ)

تکبر کے بغیر ٹخنوں سے نیچے لباس رکھنے کے جواز پر شافعی مالکی اور حنبلی فقہاء کی تصریحات :

علامہ شرف الدین حسین بن محمد الطیبی الشافعی المتوفی ۷۴۳ھ لکھتے ہیں :

امام شافعی نے یہ تصریح کی ہے کہ کپڑا لٹکانے کی تحریم تکبر کے ساتھ خاص ہے۔ ظواہر احادیث کا یہی تقاضا ہے اور اگر بغیر تکبر کے ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکائے تو پھر یہ مکروہ تنزیہی ہے۔

(شرح الطیبی ج ۸ ص ۲۰۸ مطبوعہ ادارہ القرآن کراچی ۱۴۱۳ھ)

علامہ نووی شافعی اور علامہ کرمانی شافعی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(شرح مسلم ج ۲ ص ۱۱۵ مطبوعہ کراچی شرح کرمانی للبخاری ج ۲۱ ص ۵۳ مطبوعہ بیروت)

حافظ ابو عمر یوسف بن عبداللہ بن عبدالبر مالکی اندلسی متوفی ۴۶۳ھ لکھتے ہیں :

(موطا امام مالک کی) یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جس شخص نے بغیر تکبر کے اپنے تہبند کو گھسیٹا (یعنی تہبند اتنا دراز تھا کہ زمین پر گھسٹ رہا تھا) اور نہ اس میں کوئی اکڑ تھی تو اس کو وعد مذکور لاحق نہیں ہوگی۔ البتہ تہبند قمیص اور باقی کپڑوں کو گھسیٹتے ہوئے چلنا ہر حال میں مذموم ہے اور جو تکبر سے کپڑا گھسیٹے اس کو یہ وعید بہرحال لاحق ہوگی۔

(التمہید ج ۳ ص ۲۴۴ مطبوعہ مکتبہ قدوسیہ لاہور فتح المالک بتبویب التمہید لابن عبدالبر ج ۹ ص ۳۸۶ مطبوعہ دارالکتب العلیہ بیروت ۱۴۱۸ھ)

نیز حافظ ابن عبدالبر مالکی الاستذکار میں تحریر فرماتے ہیں :
اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ جس شخص نے اپنے تہبند یا کپڑے کو تکبر یا اکڑ سے نہیں گھسیٹا تو اس کو یہ وعید مذکور لاحق نہیں ہو گی اور خیلاء اور بطر کا معنی ہے تکبر کرنا اکڑ کر چلنا اور لوگوں کو حقیر جاننا۔
(الاستذکار ج ۲۶ ص ۱۸۷ : ۱۸۶ مطبوعہ موسسہ الرسالہ)
علامہ شمس الدین مقدسی محمد بن مفلح حنبلی متوفی ۷۶۳ ھ لکھتے ہیں :
صاحب النظم نے ذکر کیا ہے کہ جس شخص کو تکبر کا خوف نہ ہو اس کے لیے ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانا مکروہ نہیں ہے اور اولیٰ اس کو ترک کرنا ہے۔ (کتاب الفروع ج ۱ ص ۳۴۴ مطبوعہ عالم الکتب بیروت ۱۴۰۵ھ)
ان کثیر حوالہ جات سے یہ واضح ہو گیا کہ اگر تکبر اور اکڑ کر چلنے کی نیت کے بغیر تہبند یا شلوار یا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ مکروہ تنزیہی یا خلاف اولیٰ ہے۔ البتہ شلوار یا پاجامہ یا تہبند انسان کی قامت اور اس کے قد سے لمبا نہ ہو کہ قدموں کے نیچے سے گھسٹ رہا ہو اگر ایسا ہو تو یہ علامہ ابن عبدالبر کی تصریح کے مطابق مذموم ہو گا بلکہ اسراف اور زمانہ قدیم کی عورتوں کی مشابہت کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہو گا۔
ٹخنوں سے نیچے پائنچے لٹکانے میں علماء دیوبند کا موقف :
(سوال ۱۱۱۴) زید کا خیال ہے کہ ازار تحت الکعبین ممنوع اس وقت ہے جب کہ براہ تکبر و خیلاء ہو جیسا کہ عرب کا دستور تھا کہ اس پر فخر کیا کرتے تھے اور جب کہ تکبرانہ ہو محض خوبصورتی اور زینت کے لیے ایسا کرے تو جائز ہے (الی قولہ) چنانچہ احادیث میں اکثر یہ قید مذکور ہے کہ من جر ازارہ خیلاء (جس نے اپنے تہبند کو تکبر سے گھسیٹا) وغیرہ میں خیلاء کی قید ضرور ہے اور جو حدیثیں مطلق ہیں جیسے ما اسفل من الکعبین ففی النار (جو کپڑا ٹخنوں سے نیچے ہو وہ دوزخ میں ہے) وہ بھی حسب دستور عرب اسی قید پر محمول ہیں اور مطلق کا مقید پر محمول نہ ہونا اس وقت ہے جبکہ مطلق و مقید دونوں دو واقعہ پر آئے ہوں جیسے کفارہ قتل و کفارہ ظہار اور اتحاد واقعہ کے وقت حسب اصول حنفیہ مطلق مقید پر محمول ہو جاتا ہے جیسے کفارہ قسم کا۔ قرأت ابن مسعود میں متتابعات کے ساتھ مقید ہو جانا۔ نیز اس کی موید وہ حدیث ہے کہ حضرت نے ما اسفل من الکعبین کی وعید بیان کی اور فرمایا: من جر ثوبہ خیلاء لن ینظر اللہ الیہ یوم القیامہ (جس نے تکبر کی وجہ سے اپنا کپڑا گھسیٹا قیامت کے دن اللہ اس کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا) تو حضرت ابو بکر (رض) نے فرمایا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! میری ازار لٹک پڑتی ہے الا ان اتعاھد (مگر یہ کہ میں اس کی دیکھ بھال کروں) تو حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو تکبر کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں (رواہ البخاری کذا فی المشکوۃ) پس اگر مطلقاً جر ازار (تہبند گھسیٹنا) ممنوع ہوتا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اجازت نہ دیتے تو معلوم ہوا کہ یہ وعید خیلاء (تکبر) ہی کی صورت ہے اور بلا اس کے جائز ہے اس شبہ کا حل مطلوب ہے۔
شیخ اشرف علی تھانوی متوفی ۱۳۶۴ھ اس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں :
نور الانوار میں ایک حکم میں مطلق کو مقید پر محمول کرنے کی بحث میں ہے: صدقہ فطر کے سبب میں دو نصیں وارد ہیں اور اسباب میں کوئی مزاحمت نہیں ہے پس ان کے درمیان جمع کرانا واجب ہے یعنی ہم نے جو کہا ہے کہ حادثہ واحدہ اور حکم واحد میں مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا یہ اس وقت ہے جب مطلق اور مقید دونوں حکم میں وارد ہوں تضاد کی وجہ سے لیکن جب مطلق اور مقید اسباب یا شروط میں وارد ہوں تو پھر کوئی مضائقہ اور تضاد نہیں ہے پس یہ ممکن ہے کہ مطلق اپنے اطلاق کے ساتھ سبب ہو اور مقید اپنی تقسید کے ساتھ سبب ہو اور ما نحن فھو (زیر بحث صورت) میں حکم معصیت ہے اور مطلق جر اور جر للخیلاء اسباب اس کے ہیں یہاں مطلق کو مقید پر محمول کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے پس مطلق جر کو بھی حرام کہیں گے اور جو للخیلاء کو بھی۔ (مطلق تہبند گھسیٹنا بھی حرام ہے اور تکبر کی وجہ سے گھسٹینا بھی حرام ہے)۔
(امداد الفتاویٰ ج ۴ ص ۱۲۲، ۱۲۱۔ مطبوعہ مکتبہ دار العلوم، کراچی)
مطلق کو مقید پر محمول کرنے یا نہ کرنے کے قواعد :

شیخ تھانوی کا مذکور جواب صحیح نہیں ہے۔ اس جواب کا رد کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ فقہاء احناف کے نزدیک مطلق کو مقید پر محمول کرنے اور نہ کرنے کے قواعد کی وضاحت کردیں تاکہ عام قارئین بھی اس مسئلہ کو آسانی سے سمجھ لیں۔ فقہاء احناف کے نزدیک جب کسی واقعہ میں ایک حکم ایک جگہ مطلق ہو اور دوسری جگہ مقید ہو تو مطلق کو مقید پر محمول کرنا واجب ہے ورنہ حکم میں تضاد ہوگا۔ ایک جگہ مطلق ہے اور ایک جگہ مقید ہے اس کی یہ مثال ہے:

اللہ تعالیٰ نے قسم توڑنے کا کفارہ بیان فرمایا کہ وہ دس مسکینوں کو متوسط درجہ کا کھانا کھلائے یا ان کو کپڑے پہنائے یا ایک غلام آزاد کرے پھر اس کے بعد فرمایا:

فمن لم یجد فصیام ثلثۃ ایام:

اور جو ان میں سے کچھ نہ پائے تو وہ تین دن کے روزے رکھے۔

(المائدہ: ۸۹)

اس آیت میں تین دن کے روزے مطلق ہیں لیکن حضرت ابن مسعود (رض) کی قرأت میں ہے فصیام ثلاثۃ ایام متتابعات تین دن کے مسلسل روزے۔ پہلا حکم مطلق تھا اور دوسرا حکم مقید ہے۔ اب اگر مطلق کو مقید پر محمول نہ کیا جائے تو حکم میں تضاد لازم آئے گا۔ اس لیے یہاں مطلق کو مقید پر محمول کرنا واجب ہے اور تین دن کے پے در پے روزے رکھنا قسم کا کفارہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب مطلق اور مقید حکم میں وارد ہوں تو مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے لیکن جب مطلق اور مقید سبب میں وارد ہوں مثلاً ایک واقعہ میں ایک جگہ حکم کا سبب مطلق ہے اور دوسری جگہ اس واقعہ میں حکم کا سبب مقید ہے تو اب مطلق کو مقید پر محمول کرنا واجب نہیں ہے کیونکہ ایک حکم کئی سبب ہو سکتے ہیں تو جائز ہے کہ ایک سبب مطلق ہو اور دوسرا سبب مقید ہو اور اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ جیسے ایک حدیث میں ہے: ہر آزاد اور غلام کی طرف سے صدقہ فطر ادا کرو اور دوسری حدیث میں ہے: ہر آزاد اور مسلمان غلام کی طرف سے صدقہ فطر ادا کرو۔ پہلی حدیث میں مطلق غلام کا ذکر ہے اور دوسری حدیث میں مقید ہے یعنی مسلمان غلام کا ذکر ہے اب مطلق کو مقید پر نہیں محمول کیا جائے گا کیونکہ صدقہ فطر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کا سبب سر (شخص) ہے پہلی حدیث میں اس حکم کا سبب مطلق سر یعنی (مطلق) غلام ہے اور دوسری حدیث میں مقید سر (شخص) یعنی مسلمان غلام اس حکم کا سبب ہے اور ایک حکم کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ ان میں تضاد نہیں ہے اس لیے یہاں مطلق کو مقید پر محمول نہیں کیا جائے گا۔

(نور الانوار ص ۱۶۰۔ ۱۵۹، مطبوعہ کراچی التوضیح والتلویح ج ا ص ۱۲۲ مطبوعہ کراچی تیسیر التحریر ج ا ص ۳۳۴، ۳۳۰ کشف الاسرار ج ۲ ص ۵۳۵، ۵۳۴)۔

شیخ تھانوی کے دلائل پر بحث و نظر:

اس تمہید کے بعد ہم یہ واضح کرتے ہیں کہ شیخ تھانوی کا جواب صحیح نہیں ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ زیر بحث صورت میں حکم معصتم (نافرمانی) ہے اور مطلق جر اور جر للخیلاء اسباب اس کے ہیں۔ (امداد الفتاویٰ ص ۱۲۲)۔

جر ثوب یا جرث بللخیلا (کپڑا گھسیٹنا یا تکبر کی وجہ سے کپڑا گھسیٹنا) یہی تو بعینہٖ معصیت اور نافرمانی ہے۔ تھانوی صاحب اسی کو حکم بھی قرار دے رہے ہیں اور اسی کو حکم کے اسباب بھی قرار دے رہے ہیں اور یہ صریح کون الشئ سببالنفسہ (کسی چیز کا خود اپنا سبب ہونا) ہے اور یہ بداھتہ باطل ہے سبب مقدم ہوتا ہے اور اس کا حکم موخر ہوتا ہے اور جب ایک چیز خود اپنا سبب ہو گی تو وہ اپنے آپ پر مقدم ہو گی اور یہ علمی اصطلاح میں دور ہے جو عقلاً محال اور باطل ہے۔

نیز تھانوی صاحب نے لکھا ہے اس بحث میں حکم معصیت ہے۔ (امداد الفتاویٰ ص ۱۲۲) واضح رہے کہ حکم کے دو معنی ہیں ایک حکم منطقی یا نحوی ہے۔ اس کی تعریف ہے ایک امر کا دوسرے امر کی طرف ایجاباً یا سلباً اسناد اور دوسرا حکم شرعی ہے اس کی تعریف ہے اللہ تعالیٰ کا حکم جو مکلفین کے افعال سے متعلق ہو۔ (التعریفات ص ۶۶، ۶۵، مطبوعہ مکہ مکرمہ) اور مطلق اور مقید کی اس بحث میں حکم سے مراد حکم شرعی ہے یعنی اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حکم۔ پہلے حکم کی مثال ہے کفارہ قسم میں تین دن کے یا مسلسل تین دن کے روزے رکھنا یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور دوسرے کی مثال ہے ہر آزاد اور غلام کی طرف سے صدقہ فطر ادا کردیا ہر آزاد اور مسلمان غلام کی طرف سے صدقہ فطر ادا کرو یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم کی مثال ہے۔

اس جواب میں دوسری غلطی یہ ہے کہ اس جواب میں معصیت کو حکم کہا گیا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) معصیت کا حکم نہیں دیتے بلکہ معصیت نہ کرنے کا حکم دیتے ہیں اس حدیث میں سرے سے کوئی حکم ہی نہیں ہے بلکہ ایک مخصوص فعل پر اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت نہ کرنے کی وعید سنائی ہے زیادہ سے

زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حدیث اس مخصوص فعل (تکبر سے کپڑا گھسیٹنے) کی ممانعت یا اس سے اجتناب کے حکم کو متضمن ہے ہم اس حدیث کو بیان کرکے اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں :

عن سالم بن عبداللہ عن ابیہ (رض) عن النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قال من جر ثوبہ خیلاء لم ینظر اللہ الیہ یوم القیامۃ قال ابوبکر : یارسول اللہ ان احد شقی ازاری یسترخی الا ان اتعاھد ذالک منہ فقال النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لست ممن یصنعہ خیلائ۔

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے تکبر کے سبب سے اپنا کپڑا گھسیٹا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس پر نظر (رحمت) نہیں فرمائے گا۔ حضرت ابوبکر (رض) نے کہا : یارسول اللہ ! میرے تہبند کی ایک جانب ڈھلک جاتی ہے سوا اس کے کہ میں اس کی دیکھ بھال کروں۔ پس نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو یہ (تہبند گھسیٹنا) تکبر سے کرتے ہیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث : ۵۷۸۴)

اس حدیث میں تہبند گھسیٹنے پر وعید کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وجوداً اور عدماً خیلاء (تکبر) پر معلق فرمایا ہے۔ وجوداً کی دلیل یہ ہے کہ جو شخص تکبر سے تہبند گھسیٹے اس پر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وعید سنائی ہے اور عدماً کی دلیل یہ ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابوبکر (رض) سے فرمایا : تم تکبر سے ایسا نہیں کرتے یعنی تم کو یہ وعید لاحق نہیں ہوگی۔ شیخ تھانوی نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ چونکہ خیلاء سبب ہوتا ہے کا اس لیے سبب بول کر مسبّب مراد لیا گیا۔ (امداد الفتاوٰی ج ۴ ص ۱۲۳) یعنی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو فرمایا ہے کہ تم تکبر سے ایسا نہیں کرتے اس کا معنی ہے تم عمداً ایسا نہیں کرتے اور تکبر سے مراد عمد ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تاویل باطل ہے کیونکہ سبب بول کر مسبّب مراد لینا مجاز ہے اور مجاز کا ارادہ اس وقت کیا جاتا ہے۔ جب حقیقت محال یا متعذر ہو اور یہاں پر اس کلام کو حقیقت پر محمول کرنے اور تکبر کا معنی مراد لینے پر کوئی عقلی یا شرعی مانع نہیں ہے اس لیے کلام رسول کو اپنی خواہش کا معنی بلاوجہ پہنانا باطل ہے۔

جب یہ واضح ہوگیا کہ کپڑا لٹکانے یا گھسیٹنے کی علت تکبر ہے تو جس صورت میں تکبر نہیں ہوگا اس صورت میں وعید بھی لاحق نہیں ہوگی دیکھئے ربا بالفضل کی حرمت کی علت قدر اور جنس کا اتحاد اور بیع کا ادھار ہونا ہے اور جب یہ علت نہیں ہوگی تو ربا بالفضل حرام نہیں ہوگا۔ یا جیسے نماز کی شرط وضو ہے جب وضو نہیں ہوگا تو نماز نہیں ہوگی یا جیسے مثلاً مغرب کی نماز کا سبب غروب آفتاب ہے جب غروب آفتاب نہیں ہوگا تو نماز مغرب کی نماز فرض نہیں ہوگی۔ اسی طرح جب کپڑا لٹکانے میں تکبر نہیں ہوگا تو اس کی وعید بھی لاحق نہیں ہوگی اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ بعض احادیث میں کپڑا لٹکانے پر وعید ہے مگر وہاں خیلاء یا تکبر کا ذکر نہیں ہے۔ مثلاً :

عن ابی ہریرہ (رض) عن النبی (رض) ما اسفل من الکعبین من الازار ففی النار :

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں نبی پاک (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : تہبند کا جو حصہ ٹخنوں سے لٹک رہا ہو وہ دوزخ میں ہوگا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث : ۵۷۸۷)

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بعض اوقات کسی حکم یا کسی فعل کی کوئی شرط یا اس کا کوئی سبب بہ طور قید بیان فرماتے ہیں اور پھر اس حکم یا فعل کو اس قید کے بغیر بھی بیان فرماتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اب وہ قید معتبر نہیں ہے وہ قید اب بھی معتبر ہوتی ہے اور اس کے اعتبار کرنے پر وہ حدیث دلیل ہوتی ہے جس میں اس قید کا ذکر فرمایا ہوتا ہے۔ مثلاً یہ حدیث ہے :

عن النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لیس فی مال زکوۃ حتی یحول علیہ الحول :

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جب تک سال نہ گزر جائے کسی مال میں زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔

(سنن ابو داؤد رقم الحدیث ؛ ۱۵۷۳)

اس حدیث میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وجوب زکوۃ کے لیے سال گزرنے کی شرط کا ذکر فرمایا ہے حالانکہ بیشمار احادیث ہیں جن میں اس شرط کا ذکر نہیں کیا ہے اس کے باوجود وجوب زکوۃ میں اس شرط کا اعتبار کیا جاتا ہے کیونکہ اس حدیث میں اس شرط کا ذکر ہے ہم صرف ایک حدیث کا ذکر کر رہے ہیں جس میں وجب زکوۃ کے لیے اس شرط کا ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ ایسی بیشمار احادیث ہیں :

عن علی قال قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قد عفوت عن الخیل الرقیق فھاتوا صدقۃ الرقۃ من کل اربعین درھما درھم ولس فی تسعین ومائۃ شئ فذا بلغت مائتین ففیھا خمسۃ دراھم:

حضرت علی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میں نے گھوڑوں اور غلاموں سے زکوۃ معاف کردی تم ہر چالیس درہم سے ایک درہم چاندی زکوۃ دو اور ایک سو نوے درہم میں بالکل زکوۃ نہیں ہے اور جب وہ سو درہم ہو جائیں تو اس میں پانچ درہم زکوۃ ہے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۵۷۴ سنن الترمذی رقم الحدیث: ۶۲۰ سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۴۷۶)

اسی طرح رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک حدیث میں تہبند گھسیٹنے یا ٹخنوں سے نیچے لٹکانے پر عید بیان فرمائی ہے اور اس کو تکبر پر معلق فرمایا اور بعض احادیث میں اس قید کا ذکر نہیں فرمایا تو جہاں اس قید کا ذکر نہیں ہے وہاں بھی اس قید کا اعتبار کیا جائے گا اور اس کے اعتبار کرنے پر وہ احادیث دلیل ہیں جن میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس قید کا ذکر فرمایا ہے جس طرح ہم نے زکوۃ میں سال گزرنے کی شرط کے متعلق بیان کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے ہی حمد ہے جس نے مجھے اس مسئلہ کو حل کرنے کی توفیق دی اور شاید کہ قارئین کو کسی اور جگہ یہ تفصیل اور اس مسئلہ کا حل نہ مل سکے۔

شیخ کشمیری اور شیخ میر ٹھی کے دلائل:

شیخ انور شاہ کاشمیری ۱۳۵۲ھ لکھتے ہیں:

ہمارے نزدیک کپڑے کو گھسیٹنا مطلقاً ممنوع ہے اور امام شافعی نے ممانعت کو تکبر کی صورت میں منحصر کیا ہے اور اگر تکبر کے بغیر کپڑا گھسیٹا جائے تو وہ جائز ہے اور اس وقت یہ حدیث احکام لباس سے نہیں ہوگی اور حق کے زیادہ قریب فقہاء احناف کا مذہب ہے کیونکہ تکبر فی نفسہ ممنوع ہے اور اس کی کپڑا گھسیٹنے کے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابوبکر (رض) سے جو فرمایا تھا کہ تم تکبر کی وجہ سے تہبند نہیں گھسیٹتے تو اس میں تکبر کو ایک مناسب علت کے طور پر بیان فرمایا ہے ہر چند کہ تکبر پر ممانعت کا مدار نہیں ہے اور حضرت ابوبکر (رض) کے لیے تہبند گھسیٹنے کے جواز کی علت یہ تھی کہ جب تک وہ خوب احتیاط سے تہبند باندھیں ان کا تہبند پھسل جاتا تھا۔ البتہ عدم تکبر کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک زائد علت کے طور پر بیان فرمایا جو جواز کی مفید ہے اور اس کی تاکید کرتی ہے اور حضرت ابوبکر (رض) کا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس مسئلہ کو پوچھنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک ممانعت بہ طور عموم تھی۔ (یعنی تکبر ہو یا نہ ہو گھسیٹنا ممنوع ہے) اور اگر ان کے نزدیک یہ ممانعت تکبر کی وجہ سے ہوتی تو پھر ان کے سوال کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

حضرت ابوبکر (رض) نے یہ سوال کیا تھا کہ یارسول اللہ! میرے تہبند کی ایک جانب پھسل جاتی ہے ال یہ کہ میں اس کو خوب احتیاط سے باندھوں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو تکبر کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں وَ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۷۸۴) اور کسی مناسب امر کو بہ طور علت بیان کرنا معروف طریقہ ہے اور ہمارے لیے یہ کہنا جائز ہے کہ تکبر سے تہبند گھسیٹنا اس شخص کے لیے ممنوع ہے جو مضبوطی سے تہبند باندھ سکتا ہو اس لیے فقط تکبر پر ممانعت کا مدار نہیں ہے۔

شیخ بدر عالم میر ٹھی اس عبارت پر حاشیہ لکھتے ہیں:

میں یہ کہتا ہوں کہ شریعت نے صرف گھسیٹنے کو تکبر قرار دیا ہے کیونکہ جو لوگ اپنے کپڑوں کو گھسیٹتے ہیں وہ صرف تکبر کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں اور ہم نے اپنے زمانہ میں بھی اس کا تجربہ کیا ہے (مشاہدہ لکھنا چاہیے تھا۔ سعیدی غفرلہ) اور اگر ہمارے زمانہ میں اس طرح نہ ہوتا ہو تو عرب میں بہر حال اس طرح ہوتا تھا اور اب اس حکم میں سبب کو مسبّب کے قائم مقام کرنا ہے (کپڑا گھسیٹنا سبب ہے اور تکبر مسبّب ہے اور کپڑا گھسیٹنے سے اس لیے منع کیا ہے کہ وہ تکبر کا سبب ہے۔ سعیدی غفرلہ) جیسے نیند حدث (وضو ٹوٹنا) نہیں ہے لیکن وہ پٹھوں کے ڈھیلے ہونے کا سبب ہے جس سے عموماً ہوا خارج ہو جاتی ہے اس لیے نیند کو حدث کا سبب قرار دے دیا۔ اسی طرح سفر مشقت کے قائم مقام ہے اور مباشرت فاحشہ بھی کسی چیز کے نکلنے کا عادتاً سبب ہے اس لیے مباشرت فاحشہ کو حدث اکبر کا سبب قرار دے دیا۔ اسی طرح کپڑا گھسیٹنا بھی تکبر کا سبب ہے اور یہ ایک پوشیدہ چیز ہے جس کا ادراک کرنا مشکل ہے جیسے سفر میں مشقت اور نیند میں حدث اور مباشرت فاحشہ میں کسی چیز کا نکلنا۔ اس لیے کپڑا گھسیٹنے پر ممانعت کا حکم لگا دیا گیا علاوہ ازیں ہم نے تجربہ کیا ہے کہ ظاہر کا باطن میں اثر ہوتا ہے اسی وجہ سے نیک اور اچھے نام رکھنے کا حکم ہے اور جس شخص نے کپڑا گھسیٹا وہ

اس بات سے محفوظ نہیں ہے کہ اس کے باطن میں تکبر سرایت کر جائے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ حکم دیا ہے کہ نصف پنڈلیوں تک تہبند باندھو۔ اور اگر تم انکار کرو تو ٹخنوں میں تمہارا حق نہیں ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث : ۸۳ سنن نسائی رقم الحدیث : ۵۳۴۴)

اس میں یہ دلیل ہے کہ یہ حدیث احکام لباس سے ہے اور ٹخنوں سے نیچے ہمارا حق نہیں ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ممانعت میں تکبر کی خصوصیت نہیں ہے اور اس سے بھی زیادہ واضح یہ ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عورتوں کو بھی ایک بالشت سے زیادہ لباس لٹکانے کی اجازت نہیں دی حالانکہ ان کو لباس لٹکانے کی بہت زیادہ ضرورت ہے اور انھوں نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کے متعلق سوال کیا اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جواب میں تکبر یا عدم تکبر کا فرق نہیں کیا۔

(فیض الباری مع الحاشیہ ج ۴، ص ۳۷۴، ۳۷۳ مطبوعہ مجلس علمی سورت ھند ۱۳۵۷)

شیخ کشمیری شیخ میرٹھی اور جسٹس عثمانی کے دلائل پر بحث و نظر :

شیخ بدر عالم میرٹھی نے لکھا ہے جس طرح نیند حدث کا سبب ہے اور مباشرت فاحشہ حدث کا اکبر کا سبب ہے اور سفر مشقت کا سبب ہے اسی طرح ہم جر ثوب (کپڑا گھسیٹنے) کو تکبر کا سبب قرار دیتے ہیں۔ ان کی اتباع میں جسٹس محمد تقی عثمانی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ نیند کا حدث کے لیے سبب ہونا اور مباشرت فاحشہ کا حدث اکبر کے لیے سبب ہونا خلاف قیاس ہے اور خلاف قیاس اپنے مورد میں بند رہتا ہے۔ اس پر دوسری چیزوں کو قیاس کرنا جائز نہیں ہے۔ نیز ان چیزوں کو شارع (علیہ السلام) نے سبب قرار دیا ہے اس لیے وہ ثابت ہیں۔ اور ہماری اور آپ کی وہ حیثیت نہیں ہے کہ ہم از خود کسی چیز کو کسی چیز کا سبب قرار دیں اور وہ حجت شرعیہ ہو جائے۔ نیز شیخ کشمیری اور شیخ میرٹھی کا کلام جر ثوب (کپڑا گھسیٹنے) میں ہے اور وہ ہمارے نزدیک بھی ناجائز ہے ہمارے نزدیک وہ لباس جائز ہے جو بغیر تکبر کے ٹخنوں سے نیچے لٹکا ہوا اور پہننے والے کے قد سے متجاوز نہ ہو اور اس کے جواز میں مذاہب اربعہ کے فقہاء متفق ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس مسئلہ پر بہت طویل کلام کیا ہے جس کو جسٹس محمد تقی عثمانی بتمامہ نقل کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے شیخ بدر عالم میرٹھی کے کلام کا خلاصہ لکھا ہے اور آخر میں بہ طور حاصل بحث یہ لکھا ہے کہ اگر انسان قصداً اسبال (ٹخنوں سے نیچے تہبند باندھے) کرے تو وہ مطلقاً ممنوع ہے خواہ وہ تکبر سے ہو یا بغیر تکبر کے اور اگر اس کا تہبند بلا قصد ٹخنوں سے نیچا رہا تو وہ صورت ہے جس کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابوبکر (رض) کے لیے جائز فرمایا تھا۔

(تکملہ فتح الملہم ج ۴ ص ۱۲۳ ملتحصا مطبوعہ مکتبہ دار العلوم کراچی)

جو کام بلا قصد ہو وہ خارج از بحث ہے کیونکہ ارادتاً کسی کام پر مکروہ یا غیر مکروہ ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے۔ اور اسبال ثوب اگر انسان کی قامت سے متجاوز نہ ہو اور بغیر تکبر کے ہو تو وہ مذاہب اربعہ کے فقہاء کے نزدیک جائز ہے اور جر ثوب مطلقاً ممنوع ہے جیسا کہ گزر چکا ہے۔ اس لیے جسٹس صاحب کا اسبال ثوب کو مطلقاً ممنوع کہنا غیر مسموع ہے۔ البتہ مشہور دیوبندی محدث شیخ محمد ادریس کاندھلوی متوفی ۱۳۹۴ھ نے فقہاء مذاہب اربعہ کے مطابق لکھا ہے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بغیر تکبر کے کپڑا لٹکانا حرام نہیں ہے۔ مکروہ تنزیہی ہے۔

(التعلیق الصبیح ج ۴ ص ۳۹۵ ۳۸۳ ۳ مطبوعہ لاہور)

ٹخنوں سے نیچے لباس لٹکانے کے متعلق مصنف کی تحقیق :

ہماری تحقیق یہ ہے کہ احادیث میں جر ثوب اور اسبال الازار کے الفاظ ہیں جر ثوب کا معنی ہے کپڑا گھسیٹنا۔ اور اسباب الازار کا معنی ہے تہبند کا ٹخنوں سے نیچے ہونا۔ اگر کوئی مرد جر ثوب کرے یعنی اس کا تہبند یا شلوار کا پائنچہ ٹخنوں سے بہت نیچا ہو حتیٰ کہ اس کے قدموں کے نیچے سے گھسٹ رہا ہو تو یہ بغیر تکبر کے بھی مکروہ تحریمی ہے کیونکہ اس میں بغیر کسی ضرورت اور بغیر کسی فائدہ کے کپڑے کو ضائع کرنا ہے سو یہ اسراف کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جب کپڑا قدموں کے نیچے زمین پر گھسٹتا رہے گا تو نجاست کے ساتھ آلودہ ہوگا اور کپڑے کو محل نجاست میں ڈالنا بھی مکروہ تحریمی ہے۔

اور تیسری وجہ یہ ہے کہ اس میں عورتوں کے ساتھ مشابہت ہے کیونکہ عہد رسالت میں عورتیں کپڑا گھسیٹ کر چلتی تھیں اور مردوں کے لیے عورتوں کی مشابہتہ اختیار کرنا بھی مکروہ تحریمی ہے۔ اس لیے اگر جر ثوب بغیر تکبر کے ہو پھر بھی مکروہ تحریمی ہے۔ حافظ ابن عبدالبر مالکی نے اس کو مذموم فرمایا ہے۔ (تمہید ج ۳ ص ۲۴۴) اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کو مکروہ تحریمی فرمایا ہے۔ (فتح الباری ج ۱۰ ص ۲۶۳) اور اگر جر ثوب (کپڑا گھسیٹنے) کے ساتھ تکبر بھی ہو تو یہ شدید مکروہ تحریمی ہے بلکہ حرام ہے اور اگر اسبال ازار ہو یعنی تہبند یا شلوار کا پائنچہ ٹخنوں کے نیچے ہو لیکن اس کے قد اور قامت کے برابر ہو گھسٹ نہ رہا ہو تو اگر اس میں تکبر نہیں ہے صرف زینت کی وجہ سے ایسا کیا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں یہ صرف خلاف اولیٰ ہے اور اگر وہ اس کے ساتھ تکبر کرتا ہے اور اکڑ اکڑ کر چلتا ہے اور اتراتا ہے تو پھر یہ تکبر کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے یہ ملحوظ رہے کہ حرمت کی علت صرف تکبر ہے اگر ایک مرد نصف پنڈلیوں تک تہبند باندھتا ہے اور اس کے ساتھ تکبر کرتا ہے اپنے آپ کو دوسرے مسلمانوں سے زیادہ متقی اور پرہیزگار سمجھتا ہے اور ان کو حقیر سمجھتا ہے تو یہ بھی مکروہ تحریمی ہے بلکہ حرام ہے اس لیے حرمت میں اصل تکبر ہے۔

ہماری اس تحقیق کی تائید حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ کی اس عبارت میں ہے:

اگر کسی شخص کا لباس بغیر تکبر کے ٹخنوں سے نیچے لٹک رہا ہو تو اس کا حال مختلف ہے اگر وہ کپڑا اس ٹخنوں کے نیچے لٹک رہا ہو لیکن وہ کپڑا پہننے والے کے قد اور اس کی قامت کے برابر ہو تو اس میں تحریم ظاہر نہیں ہو گی خصوصاً جبکہ بلا قصد ایسا ہو (یعنی غیر ارادی طور پر تہبند یا شلوار پیٹ سے پھسل کر ٹخنوں سے نیچے لٹک گئی ہو) جیسا کہ حضرت ابو بکر (رض) کے لیے اس طرح واقع ہوا اور اگر کپڑا پہننے والے کے قد اور قامت سے زائد ہو تو اس سے منع کیا جائے گا کیونکہ اس میں اسراف ہے اور اس کو حرام کہا جائے گا اور یہ اس وجہ سے بھی ممنوع ہو گا کہ اس میں عورتوں کی مشابہت ہے اور یہ پہلی وجہ سے زیادہ قوی وجہ ہے۔ کیونکہ امام حاکم نے تصحیح سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس مرد پر لعنت فرمائی ہے جو عورتوں کے لباس کی نوع کا لباس پہنتا ہے۔ اور یہ اس وجہ سے بھی ممنوع ہو گا کہ اس طرح کا لباس پہننے والا اس خدشہ سے محفوظ نہیں ہو گا کہ اس کے لباس پر نجاست لگ جائے (کیونکہ اس کا لباس قدموں کے نیچے گھسٹ رہا ہے) اور اس ممانعت کی طرف اشارہ اس حدیث میں ہے جس کو امام ترمذی نے شمائل (رقم الحدیث: ۱۲۱) میں اور امام نسائی نے سنن کبریٰ (رقم الحدیث: ۹۶۸۳۔ ۹۶۸۲) میں حضرت عبید بن خالد (رض) سے روایت کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں ایک تہبند باندھے ہوئے جارہا تھا اور تہبند زمین پر گھسٹ رہا تھا ناگاہ ایک شخص نے کہا: اپنا کپڑا اوپر اٹھاؤ اس میں زیادہ صفائی اور زیادہ بقا ہے میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھے۔ میں نے کہا: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! یہ تو ایک سیاہ اور سفید دھاریوں والا تہبند ہے (یعنی اس معمولی کپڑے میں تکبر کرنے کا کوئی معنی نہیں ہے) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کیا تمہارے لیے میری شخصیت میں نمونہ نہیں ہے؟ میں نے دیکھا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے آدھی پنڈلیوں تک تہبند باندھا ہوا تھا۔ (مسند احمد ج ۵ ص ۳۶۴) اور اس وجہ سے بھی ممنوع ہے کہ کپڑا گھسٹنے میں تکبر کی بدگمانی ہوتی ہے۔ (الی قولہ) قامت سے نیچے کپڑا لٹکانا کپڑا گھسیٹنے کو مستلزم ہے خواہ پہننے والے نے تکبر کا قصد نہ کیا ہو اور اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے احمد بن منیع نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم تہبند کو گھسیٹنے سے بچو کیونکہ تہبند کو گھسیٹنا تکبر سے ہے۔ (الخ)۔

(فتح الباری ج ۱۰ ص ۲۶۴۔ ۲۶۳۔ مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور ۱۴۰۱ھ)۔

ٹخنوں سے نیچے لباس رکھنے کے متعلق حرف آخر:

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس طویل عبارت کے شروع میں ہی یہ تصریح کردی ہے کہ اگر کپڑا ٹخنوں سے نیچے لٹک رہا ہو اور وہ اس کی قامت کے برابر اور بغیر تکبر کے ہو تو اس میں تحریم ظاہر نہیں ہے اور اگر وہ اس کی قامت سے متجاوز ہو اور اس کے قدموں تلے گھسٹ رہا ہو تو پھر وہ حرام ہے۔ جسٹس تقی عثمانی نے یہ پوری عبارت نقل کی ہے پھر بھی نتیجہ یہ نکالا ہے کہ قصداً کپڑا لٹکانا مطلقاً حرام ہے اور یہ نتیجہ مذاہب اربعہ کے فقہاء کے خلاف ہے بلکہ اگر اس کو اجماع متقدمین کے خلاف کہا جائے تو بعید نہ ہوگا۔!

شیخ محمد زکریا سہارنپوری متوفی ۱۳۴۶ھ نے بھی اس حدیث کی شرح میں حافظ عسقلانی کی اس تمام عبارت کو نقل کیا ہے آخر میں انھوں نے لکھا ہے جو شخص تکبر کی وجہ سے کپڑا گھسیٹے اس کو وعید لاحق ہو گی اور جو شخص کپڑا لمبا ہونے کی وجہ سے اس کو گھسیٹے یا کسی اور عذر کی وجہ سے اس کو یہ وعید لاحق نہیں ہو گی۔ (اوجز المسالک ج ۶ ص ۲۰۹۔ ۲۰۸ مطبوعہ سہارنپور ھند)۔

ہمارے نزدیک اگر کسی شخص کا کپڑا اتنا لمبا ہے کہ وہ قدموں تلے آکر گھسٹتا ہے تو اس کو پہننا جائز نہیں ہے اس پر واجب ہے کہ وہ اس کو چھوٹا کرے یا دوسرا پورا لباس پہنے۔ اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اسبال ثواب اور جر ثوب میں فرق نہیں کیا۔

بہر حال یہ واضح ہو گیا کہ علماء دیوبند کا تہبند یا شلوار کے پائنچوں کو بغیر تکبر کے بھی ٹخنوں سے نیچے لٹکانے کو حرام قرار دینا مذاہب اربعہ کے تمام فقہاء کے خلاف ہے۔ مرد کی قامت تک کپڑے کا طول بلا تکبر جائز ہے اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور جو کپڑا قامت سے متجاوز ہو اور قدموں تلے آکر گھسٹ رہا ہو وہ بہر حال میں مکروہ تحریمی ہے۔

میں نے اس مسئلہ پر شرح صحیح مسلم میں بھی کافی سط سے لکھا ہے لیکن یہاں بہت زیادہ تفصیل اور تحقیق کی ہے کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ اس مسئلہ میں لوگ بہت تشدد کرتے ہیں اور جس کا پائنچہ ٹخنوں سے نیچے ہو اس کو نماز دہرانے کا حکم دیتے ہیں۔ چنانچہ مفتی رشید احمد نے احسن الفتاویٰ ج ۳ ص ۴۰۴ میں اسی طرح لکھا ہے اللہ تعالیٰ ان سطور کو نفع آور بنائے اور ان لوگوں کو ہدایت عطا فرمائے جو مسائل شرعیہ میں ایسی تشدید کرتے ہیں جس سے لوگ متنفر ہوتے ہوں جب کہ دین آسان اور سہل ہے اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دین میں سختی کرنے سے منع فرمایا ہے۔

وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی سیدنا محمد خاتم النبیین قائد الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ المطھرین واصحابہ الکاملین وازواجہ الطیبات امھات المومنین وسائر المسلمین۔ (تفسیر تبیان القرآن)

فوائد

ف 1: بڑائی حق بھی ہوتی ہے اور ناحق بھی۔ جہاد میں کفار کے مقابل اپنی شان بتانا اور دکھانا حق والی بڑائی ہے جو عبادت ہے۔ مسلمانوں کے مقابل شیخی مارنا ناحق بڑائی ہے جو حرام ہے۔ اولیاء اللہ انبیاء کرام کے مقابل بڑائی کفر ہے۔ اور شیطان کا طریقہ، یہاں یہی تیسری بڑائی مراد ہے۔

ف 2: معلوم ہوا کہ غرور وہ آگ ہے جو دل کی تمام قابلیتوں کو جلا کر برباد کر دیتی ہے خصوصاً جب کہ اللہ کے مقبولوں کے مقابل تکبر ہو۔ اللہ کی پناہ، قرآن وحدیث سے ہر کوئی ہدایت نہیں لے سکتا۔ رب فرماتا ہے یضل بہ کثیرا ویھدی بہ کثیرا۔ تکبر ہی نے ابلیس میں حسد کی آگ بھڑکائی، اور اس کی تمام عبادات برباد کر کے رکھ دیں۔

ف 3: یہاں آیات سے مراد انبیاء کرام اور ان کے معجزات ہیں۔ لہٰذا آیت میں دور لازم نہیں آتا۔ یعنی چونکہ انھوں نے ہمارے نبی اور ان کے معجزات کو جھٹلایا، لہٰذا وہ کتاب اللہ کی آیات سے فائدہ حاصل نہ کر سکے اسی لیے کافر کو کلمہ پڑھا کر مسلمان کرتے ہیں، قرآن پڑھا کر مسلمان نہیں کرتے۔ پہلے دل میں صاحب قرآن جلوہ گر ہوتے ہیں۔ پھر ہاتھ میں قرآن آتا ہے۔

آیت مبارکہ:

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۟ع ۱۴۷

لغۃ القرآن: [وَالَّذِيْنَ : اور جنہوں نے] [كَذَّبُوْا : جھٹلایا] [بِاٰيٰتِنَا : ہماری نشانیوں کو] [وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ : اور آخرت کی ملاقات کو] [حَبِطَتْ : اکارت ہوئے] [اَعْمَالُهُمْ: ان کے اعمال] [هَلْ يُجْزَوْنَ : انہیں کیا بدلہ دیا جائے گا] [اِلَّا : سوائے اس کے] [مَاكَانُوْا : جو وہ تھے] [يَعْمَلُوْنَ : عمل کرتے]

ترجمہ: اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ان کے اعمال برباد ہو گئے۔ انھیں کیا بدلہ ملے گا مگر وہی جو کچھ وہ کیا کرتے تھے

تشریح: نیک اعمال کا اجر قیامت کے دن صرف ان لوگوں کو ہی عطا فرمایا جائے گا جو اللہ تعالیٰ، اس کے رسولوں اور روز جزا پر ایمان لائے۔ کیونکہ انھیں کے اعمال کی غرض وغایت رضاءِ خداوندی اور نعیم جنت کا حصول تھا۔ لیکن وہ لوگ جو نہ خدا پر ایمان اور نہ روز جزاء پر یقین رکھتے ہیں قیامت کے دن ان کے اعمال کا کوئی معاوضہ انھیں نہیں ملے گا۔ کیونکہ یہ اعمال کرتے وقت ان کے ذہن میں اس اجر کا کوئی تصور نہ تھا۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اگر ایک مسلمان بھی لوگوں کے دکھاوے کے لیے کوئی نیک عمل کرتا ہے۔ یا کوئی زاہد شب زندہ دار بھی اپنی اس شبانہ روز زہد و ریاضت سے لوگوں کے دلوں پر اپنی ولایت کا سکہ جمانا چاہتا ہے تو اس کے سارے اعمال رائیگاں ہو جاتے ہیں۔ تو ایک کافر کے اعمال کو قیامت کے روز کیوں مستحق اجر سمجھا جائے۔ ہاں دنیا میں ان کو ان اعمال کا معاوضہ کاروبار میں ترقی، سیاسی قوت واقتدار وغیرہ کی شکل میں دے دیا جاتا ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں اور آخرت کی پیشی کی تکذیب کی ان کے سب (نیک) عمل ضائع ہو گئے ان کو ان ہی کاموں کی سزا ملے گی جو وہ کیا کرتے تھے۔ (الاعراف: ۱۴۷)

کفار کی نیکیوں کا ضائع ہو جانا:

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر فرمایا تھا جو ناحق تکبر کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں کی تکذیب کرتے تھے اور ان کے اسی تکبر اور تکذیب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو اپنی آیات سے پھیر دیا اب وہ تمام نشانیاں دیکھنے کے باوجود ایمان نہیں لائیں گے وہ نیکی کا راستہ دیکھنے کے باوجود اختیار نہیں کریں گے۔ اور اگر وہ برائی کا راستہ دیکھیں تو فوراً اس کی طرف لپک پڑیں گے اس مقام پر ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص یہ کہتا کہ ان میں سے بعض کافروں نے کچھ نیک عمل بھی تو کیے تھے مثلاً رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک ماں باپ کی خدمت کمزوروں کی مدد ناداروں یتیموں اور بیواؤں کی کفالت رفاہ عامہ کے کام مثلاً کنوئیں کھدوانا سرائے بنانا سڑکیں بنانا آیا ان کو ان نیک کاموں کی کوئی جزا ملے گی؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: چونکہ انھوں نے کفر کیا ہماری آیتوں کی تکذیب کی اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے سے انکار کیا اس لیے ان کے تمام نیک اعمال ضائع ہو گئے کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی نیک عمل مقبول نہیں ہوتا۔ اعمال صالحہ کے قبولیت کی شرط ایمان ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

من عمل صالحا من ذکر او انثی اھو ومن فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ ولنجزینھم اجرھم باحسن ماکانوا یعملون۔

(النحل: ۹۷)

مرد ہو یا عورت جس نے بھی نیک عمل کیا بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اسے ضرور پاکیزہ زندگی کے ساتھ زندہ رکھیں گے اور ہم ضرور ان کو ان کے کیے ہوئے نیک کاموں کا اجر عطا فرمائیں گے۔

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم کافروں کے تمام اعمال کو ضائع فرما دیں گے۔

وقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلنہ ھباء منثورا۔

(الفرقان: ۲۳)

کفار ہمارے پاس جو بھی اعمال لے کر آئیں گے ہم ان کو (فضا میں) بکھرے ہوئے غبار کے ذرے بنا دیں گے۔

من یکفر بالایمان فقد حبط عملہ۔

(المائدہ: ۵)

جس نے ایمان لانے سے انکار کیا اس کا عمل ضائع ہو گیا۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کفار کی نیکیوں کی وجہ سے آخرت میں ان کے عذاب میں تخفیف ہو جائے گی یہ نظریہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

فلا یخفف عنھم العذاب ولا ھم ینصرون۔

(البقرہ: ۸۶)

کفار کے عذاب میں تخفیف کی جائے گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں : میں نے عرض کیا : یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! زمانہ جاہلیت میں ابن جدعان رشتہ داروں سے حسن سلوک کرتا تھا اور مسکینوں کو کھانا کھلاتا تھا کیا یہ عمل اس کو نفع دے گا ؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : یہ عمل اس کو نفع نہیں دے گا اس نے ایک دن بھی نہیں کہا : اے میرے رب میری خطاؤں کو قیامت کے دن بخش دینا۔

(صحیح مسلم الایمان : ۳۶۵، (۲۱۴) ۵۰۷)

تاہم یہ معاملہ بہ طور عدل ہے اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے کسی کافر کو اسلام لانے کے بعد اس کے زمانہ کفر کی نیکیوں پر اجر عطا فرماتا ہے یا کسی کافر کی نیکیوں کے عوض اس کے عذاب میں تخفیف کردے تو یہ ممکن ہے چنانچہ ابولہب اور ابوطالب کے عذاب میں تخفیف اسی وجہ سے ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ قرابت اور حسن سلوک کی وجہ سے ابوطالب اور ابولہب کو عام قاعدہ سے مستثنیٰ کرلیا گیا۔

فرائض اور واجبات کے ترک پر مواخذہ کی دلیل :

اس آت میں فرمایا ہے : ان کو ان ہی کاموں کی سزا ملے گی جو وہ کرتے تھے اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو حرام اور ناجائز کام وہ کرتے تھے اس پر ان کو سزا ملے گی اور جو کام وہ نہیں کرتے تھے اس پر ان کو سزا نہیں ملے گی یعنی سزا فعل پر ہوگی اور ترک فعل پر سزا نہیں ہوگی۔ تو کافروں نے جو فرائض اور واجبات کر ترک کیا اس آیت کی رو سے ان کو اس پر سزا نہیں ملے گی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فرض اور واجب کی ادائیگی کے وقت میں فرض اور واجب کو ادا کرنے کے بجائے کسی اور کام میں مشغول ہونا حرام ہے سو ان کو ان کاموں پر سزا ملے گی جو وہ فرض اور واجب کی ادائیگی کے اوقات میں کرتے تھے کیونکہ جس وقت میں فرض ادا کرنا تھا اس وقت میں کوئی اور کام کرنا حرام تھا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں فرض اور واجب کے ترک پر بھی سزا کی وعید سنائی ہے۔

فی جنت یتساء لون۔ عن المجرمین۔ ماسلککم فی سقر۔ قالوالم نک من المصلین۔ ولم نک نطعم المسکین۔

وہ جنتوں میں ایک دوسرے سے مجرموں کے متعلق سوال کر رہے ہوں گے کہ (پھر مجرموں سے پوچھیں گے) تم کو کس گناہ نے دوزخ میں داخل کیا ؟ وہ کہیں گے ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔

(المدثر : ۴۴۔ ۴۰)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح حرام کاموں کے ارتکاب پر عذاب ہوگا اسی طرح فرائض اور واجبات کے ترک پر بھی عذاب ہوگا۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ○۱۴۸

لغۃ القرآن: [وَاتَّخَذَ : اور بنایا] [قَوْمُ مُوْسٰي : موسیٰ کی قوم نے] [مِنْۢ بَعْدِهٖ : ان کے بعد] [مِنْ حُلِيِّهِمْ : اپنے زیورات سے] [عِجْلًا : ایک بچھڑا] [جَسَدًا : جو ایک ڈھانچا تھا] [لَّهٗ : اس کے لیے] [خُوَارٌ: گائے کی ایک آواز تھی] [اَلَمْ يَرَوْا : کیا انہوں نے دیکھا ہی نہیں] [اَنَّهٗ : کہ وہ] [لَا يُكَلِّمُهُمْ : کلام نہیں کرتا ان سے] [وَلَا يَهْدِيْهِمْ : اور نہ ہی وہ ہدایت دیتا ہے ان کو] [سَبِيْلًا ۘ: کسی راستے کی] [اِتَّخَذُوْهُ : انہوں نے بنایا اس کو (الہ)] [وَكَانُوْا : اور وہ لوگ تھے] [ظٰلِمِيْنَ : ظالم (جمع)]

ترجمہ: اور موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم نے ان کے (کوہ طور پر جانے کے) بعد اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا بنالیا (جو) ایک جسم تھا، اس کی آواز گائے کی تھی، کیا انھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ نہ ان سے بات کر سکتا ہے اور نہ ہی انھیں راستہ دکھا سکتا ہے۔ انھوں نے اسی کو (معبود) بنالیا اور وہ ظالم تھے

تشریح:

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) تو کوہ طور پر تشریف لے گئے تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کامل ضابطہ حیات لا کر اپنی قوم کو دیں تاکہ ان کی زندگی اطاعت الٰہی کا ایک مکمل نمونہ بن جائے۔ لیکن ان بھلے مانسوں نے آپ کی غیر حاضری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی توحید سے ہی منہ موڑ لیا۔ وہ اللہ جس نے فرعون کی غلامی سے ان کو آزاد کیا۔ جس کی قدرت سے سمندر کی موجوں نے سمٹ کر ان کے لیے ایک شاہراہ بنادی۔ اور جب ان کا دشمن فرعون اپنے لشکر جرار سمیت ان کی زد میں آگیا تو وہ اس پر امڈ آئیں اور تنکوں کی طرح اسے بہالے گئیں۔ اس وحدہ لاشریک کو بھول گئے۔ اس محسن حقیقی سے اپنی بندگی کا رشتہ توڑ لیا اور ایک بچھڑے کی مورتی کی پرستش شروع کر دی۔ ان کی عقلیں اتنی اندھی تھیں کہ خدا بنانے کے لیے ان کی نظر انتخاب جس چیز پر پڑی وہ دھات کی بنی ہوئی بچھڑے کی مورتی تھی جو نہ بول سکتی تھی اور نہ کچھ سن سکتی تھی۔ آپ اس کے سامنے شور و غل مچائیں اس کی طرف سے ایک بے معنی صدا کے بغیر کچھ سنائی نہ دیتا۔ اس قوم نے جس نے ہر قدم پر آیات الٰہی کا مشاہدہ کیا تھا کیسے باور کر لیا کہ یہ ہمارا خدا ہے جس کا ڈھانچہ ان کے سامنے سامری نے تیار کیا تھا؟ اس کی توجیہ بجز اس کے اور کیا کی جاسکتی ہے کہ غلامانہ زندگی کا طویل عرصہ جو انھوں نے سرزمین مصر میں بسر کیا تھا۔ وہاں وہ اپنے قبطی آقاؤں کو گائے کی پوجا کرتے ہوئے اور ان کی مورتیوں کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا کرتے۔ اس چیز نے گائے کے تقدس کا ایسا نقشہ ان کی لوح ذہن پر کندہ کر دیا تھا کہ جہاں گائے یا بچھڑے کی کوئی مورتی نظر آئی وہاں وہ بے ساختہ اس کے سامنے جھکتے چلے گئے۔ اور عقل و فہم کے تمام تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی الوہیت کو تسلیم کر لیا۔ موجودہ توراۃ میں بچھڑا بنانے کا الزام حضرت ہارون پر لگایا گیا ہے لیکن قرآن جو تمام سابقہ انبیاء کی صداقت اور ان کی عظمت و پاکیزگی کا نقیب ہے۔ اس نے ہمیں صراحت سے بتادیا کہ حضرت ہارون (علیہ السلام) کا دامن اس الزام سے بالکل پاک ہے بلکہ یہ کارستانی سامری کی تھی جس نے بنی اسرائیل سے سونے کے زیور جمع کیے انھیں گلایا اور اس سے بچھڑے کا ڈھانچہ تیار کر لیا اور اپنی فنی مہارت سے اس میں یہ بات پیدا کر دی کہ جب اس میں ہوا کا گزر ہوتا تو ایک بے معنی سی ہیں ہیں کی آواز نکلتی۔ اور یہ کوئی مشکل نہیں۔ آج ہم بیسوں کھلونے ایسے دیکھتے ہیں جو بے جان ہوتے ہوئے طرح طرح کی حرکتیں کرتے ہیں اور مختلف نوعیت کی آوازیں نکالتے ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم نے ان کے (جانے کے بعد) اپنے زیوروں سے بچھڑے کا ایک مجسمہ بنالیا جس سے بیل کی آواز نکلتی تھی کیا انھوں نے یہ (بھی) نہ دیکھا کہ وہ ان سے نہ بات کر سکتا تھا نہ ان کو راستہ دکھا سکتا تھا (پھر بھی) انھوں نے اس کو معبود بنالیا اور وہ ظالم تھے۔ (الاعراف: ۱۴۸)

بنو اسرائیل کے بچھڑا بنانے اور اس کی پرستش کرنے کے متعلق روایات:

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:-

جب موسیٰ (علیہ السلام) فرعون سے فارغ ہو گئے طور پر جانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کو سمندر سے نجات دی اور فرعون کو غرق کر دیا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) ارض طیبہ میں پہنچے اللہ تعالیٰ نے وہاں ان پر من اور سلویٰ نازل کیا اور اللہ نے ان کو حکم دیا کہ وہ اس سے ملاقات کریں۔ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے رب سے ملاقات کا ارادہ کیا تو انھوں نے حضرت ہارون (علیہ السلام) کو اپنی قوم پر خلیفہ بنایا اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کے امر اور اس سے میعاد معلوم کیے بغیر ان سے وعدہ کر لیا کہ وہ تیس راتوں کے بعد واپس آجائیں گے۔ اللہ کے دشمن سامری نے کہا: تمہارے پاس موسیٰ (علیہ السلام) نہیں آئیں گے اور تمہاری اصلاح صرف خدا کرے گا جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ حضرت ہارون (علیہ السلام) نے ان کو قسم دی کہ تم ایسا نہ کرو تم ایک دن اور ایک رات حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا اور انتظار کر واگر وہ آجائیں تو فبہا ورنہ پھر تم جو جی میں آئے کرنا۔ پھر دوسرے دن بھی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نہیں آئے تو سامری نے پھر وہی بات کی۔ حضرت ہارون (علیہ السلام) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے دس دن اور بڑھا دیئے ہیں اور اب چالیس دن کی مدت ہو گئی ہے۔

ابو بکر بن عبداللہ المزلی بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے جانے بعد سامری حضرت ہارون (علیہ السلام) کے پاس آکر کہنے لگا ہم نے قطبیوں کی عید کے دن ان سے بہت سے زیورات عاریتہ لیے تھے اور جو لوگ آپ کے پاس ہیں وہ جلدی جلدی ان زیورات کو بیچ کر خرچ کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ فرعون کی قوم سے

عاریتہ لیتے تھے اور اب وہ زندہ نہیں ہیں کہ ہم ان کو وہ زیورات واپس کر دیں اور ہم کو پتا نہیں کہ آپ کے بھائی اللہ کے نبی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) جب آئیں گے تو ان کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہو گی یا تو وہ اس کی قربانی پیش کریں گے پھر آگ اس کو کھا جائے گی اور یا ان کو صرف فقراء کے لیے وقف کر دیں گے۔ حضرت ہارون (علیہ السلام) نے فرمایا: تم نے ٹھیک سوچا اور ٹھیک کہا۔ پھر آپ نے ایک منادی کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا کہ جس شخص کے پاس آل فرعون کے جتنے بھی زیورات ہیں وہ ہمارے پاس لے آئے۔ وہ ان کے پاس تمام زیورات لے آئے حضرت ہارون (علیہ السلام) نے فرمایا: اے سامری! تم اس خزانے کو رکھنے کے زیادہ حق دار ہو۔ سامری نے ان زیورات پر قبضہ کر لیا اور وہ خبیث دشمن خدا سونے کو ڈھالنے والا تھا اس نے اس سے ایک بچھڑے کا مجسمہ بنا لیا اس نے حضرت جبرائیل (علیہ السلام) کے گھوڑے کے نشان سے ایک مٹھی بھر مٹی لی تھی اس نے اس بچھڑے کے کھوکھلے پیٹ میں مٹی ڈال دی تب وہ مجسمہ بچھڑے کی سی آواز نکالنے لگا۔ اس نے صرف ایک بار یہ آواز نکالی تھی۔ سامری نے کہا تیس راتوں کے بعد جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نہیں آئے تو وہ دراصل اسی کو ڈھوڈ رہے تھے۔ قرآن پاک میں ہے:

فاخرج لھم عجلا جسدا لہ خوار فقالوا ھذا الھکم والہ موسیٰ فنسی۔

(طہ: ۸۸)

سامری نے ان کے لیے بچھڑے کا بے جان مجسمہ بنا کر نکالا لوگوں نے کہا: یہ ہے تمہارا اور موسیٰ (علیہ السلام) کا معبود موسیٰ (علیہ السلام) تو بھول گئے۔

سامری یہ کہتا تھا کہ موسیٰ (علیہ السلام) تو بھول گئے تمہارا اصل خدا تو یہ ہے۔

(جامع البیان جز ۹ ص ۶۶۔ ۶۵ مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۵ھ)

سامری کے متعلق علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبیؒ متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

سامری کا نام موسیٰ (علیہ السلام) بن ظفر تھا وہ سامرہ نامی ایک بستی کی طرف منسوب تھا۔ جس سال بنو اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کیا گیا تھا وہ اسی سال پیدا ہوا تھا۔ اس کی ماں نے اس کو پہاڑ کی ایک غار میں چھپا دیا تھا۔ حضرت جبرائیل (علیہ السلام) اس کا غذا پہنچاتے رہے تھے اس وجہ سے وہ حضرت جبرائیل (علیہ السلام) کو پہچانتا تھا جب حضرت جبرائیل (علیہ السلام) سمندر کو عبور کرنے کے لیے گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہے تھے تاکہ فرعون بھی سمندر میں آ جائے تو سامری نے گھوڑے کے پاؤں کے نیچے سے کچھ مٹی اٹھالی تھی۔ قرآن پاک کی حسب ذیل آیت کا یہی معنی ہے:

قال فما خطبک یسامری۔ قال بصرت بما لم یبصروا بہ فقبضت قبضۃ من اثر الرسول فنبذتھا وکذلک سولت لی نفسی۔

(طہ: ۹۶۔ ۹۵)

(موسیٰ (علیہ السلام) نے سامری) سے) کہا: اے سامری تو کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا: میں نے وہ چیز دیکھی جو دوسروں نے نہیں دیکھی تو میں نے رسول (جبرائیل (علیہ السلام) کی سواری) کے نقش قدم سے ایک مٹھی بھر لی پھر میں نے اس کو (بچھڑے کے پتلے میں) ڈال دیا اور میرے دل میں اسی طرح آیا تھا۔

(الجامع لاحکام القرآن جز ۱۱ ص ۲۵۵ مطبوعہ دار الفکر بیروت)

امام عبدالرحمٰن بن محمد بن ابی حاتم رازی متوفی ۳۲۷ھ روایت کرتے ہیں:-

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ حضرت ہارون (علیہ السلام) نے بنو اسرائیل کو خطبہ دیا اور فرمایا: تم جب مصر سے روانہ ہوئے تو تمہارے پاس قوم فرعون کی امانتیں تھیں اور عاریتہ لی ہوئی چیزیں تھیں اور میرا خیال ہے وہ چیزیں تمہارے پاس ہیں اور میں ان امانتوں کو اور مانگی ہوئی چیزوں کو تمہارے لیے حلال نہیں قرار دیتا۔ اب ہم وہ چیزیں ان کو واپس تو نہیں کر سکتے اور نہ ہی ہم ان چیزوں کو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ پھر حضرت ہارون (علیہ السلام) نے ایک گڑھا کھودنے کا حکم دیا اور قوم کو حکم دیا کہ جس شخص کے پاس بھی ان امانتوں اور مانگی ہوئی چیزوں میں سے جو کچھ بھی ہے وہ اس میں لا کر ڈال دے۔ جب لوگوں نے سب کچھ ڈال دیا تو حضرت ہارون (علیہ السلام) نے اس میں آگ لگا دی اور فرمایا یہ چیزیں ان کے لیے رہیں نہ ہمارے لیے ہوں گی۔ اور سامری کا اس قوم سے تعلق تھا جو بیل کی عبادت کرتی تھی۔ وہ بنی اسرائیل میں سے نہیں تھا ان کا پڑوسی تھا۔ اس نے بھی وہی مصائب اٹھائے تھے جو بنو اسرائیل نے اٹھائے تھے۔ اس کے لیے یہ

مقدر کر دیا گیا تھا کہ اس نے حضرت جبرائیل (علیہ السلام) کی سواری کے نقش قدم کو دیکھ لیا تھا اور اس سے ایک مٹھی خاک کی اٹھالی تھی۔ حضرت ہارون (علیہ السلام) نے اس سے پوچھا کہ تیری مٹھی میں کیا ہے اس نے کہا: میں یہ اس وقت تک نہیں بتاؤں گا جب تک کہ آپ یہ دعا نہ کریں کہ جب میں اس مٹھی کو ڈالوں تو جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ بن جائے۔ حضرت ہارون (علیہ السلام) نے فرمایا: تم اس کو گرادینا اور اس کے لیے دعا کی۔ اس نے کہا میں بیل بنانا چاہتا ہوں اس نے اس گڑھے میں سے تمام لوہے پیتل اور زیورات وغیرہ کو نکالا تو وہ ایک کھوکھلا بیل بن گیا اور اس سے بیل کی سی آواز آرہی تھی۔

قتادہ نے کہا: جب سامری نے بچھڑا بنایا تو اللہ تعالیٰ نے اسے گوشت اور خون کا بنادیا اور اس سے آواز آرہی تھی۔

سعید بن جبیر نے کہا: بہ خدا وہ بچھڑا از خود آواز نہیں نکالتا تھا لیکن اس کی دبر (مقعد، مبرز) سے ہوا اس کے اندر داخل ہوتی تھی اور اس کے منہ سے نکل جاتی تھی اور اس ہوا کے گزرنے سے وہ آواز پیدا ہوتی تھی۔

سعید بن جبیر حضرت ابن عباس سے روایت ہے کرتے ہیں کہ جب وہ آواز نکالتا تو بنو اسرائیل سجدہ میں گر جاتے اور جب وہ خاموش ہوتا تو وہ سجدہ سے اپنا سر اٹھا لیتے تھے۔

ضحاک سے روایت ہے کہ اس نے صرف ایک بار آواز نکالی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ ان سے بات کرتا تھا نہ ان کی بات کا جواب دیتا تھا (لیکن یہ استدلال ضعیف ہے کیونکہ بار بار بیل کی سی آواز نکالنا اس کے بات کرنے یا کسی بات کے جواب دینے کے ہم معنی نہیں ہے)۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵ ص ۱۵۶۹۔ ۱۵۶۷، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ ۱۴۱۷ھ)

کلام کرنے اور ہدایت دینے پر مدار الوہیت کی توجیہ:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: کیا انھوں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ ان سے بات کر سکتا ہے نہ ان کو راستہ دکھا سکتا ہے پھر بھی انھوں نے اس کو معبود بنالیا۔

اس آیت پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اگر وہ بچھڑا ان سے بات کر سکتا یا ان کو راستہ دکھا سکتا تو پھر بنو اسرائیل کا اس کو معبود قرار دینا صحیح ہوتا۔ حالانکہ محض کسی سے بات کرنے یا کسی کو راستہ دکھانے پر تو الوہیت کا مدار نہیں ہے! اس اعتراض کے متعدد جوابات دیں:

۱۔ الوہیت کا مدار سات صفات حقیقیہ پر ہے: حیات علم قدرت کلام سمع بصر اور ارادہ۔ ان میں سے ایک صفت کلام ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا یہ معنی ہے کہ وہ از خود کلام فرماتا ہے اور کسی غیر کی قدرت اور عطا کا اس میں دخل نہیں ہے اور جس کی یہ ایک صفت کلام حقیقی ہوگی اور بیر کت کسی احتیاج کے ہوگی اس کی تمام صفات حقیقی ہوں گی اور اب آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ بچھڑا تو مطلقاً کلام نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ کلام اس کی حقیقی صفت ہو اور وہ بغیر کسی احتیاج کے کلام کرے تو پھر اس کو معبود قرار دینا کس طرح صحیح ہوگا!

۲۔ اللہ تعالیٰ کے ہدایت دینے کا معنی یہ ہے کہ وہ ہدایت کو پیدا کرتا ہے اور یہ بچھڑا جو مطلقاً ہدایت نہیں دے سکتا وہ ہدایت کو پیدا کب کر سکتا ہے تو پھر اس کو معبود قرار دینا کس طرح صحیح ہوگا!

۳۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی ذات و صفات کی ہدایت حاصل ہونا اس پر موقوف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں اپنی ذات اور صفات پر جو دلائل قائم کیے ہیں اور زمینوں اور آسمانوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی جو نشانیاں ہیں انسان ان پر صحیح طریقہ سے غور اور فکر کرے پس وہی ہدایت دے سکتا ہے جو زمینوں اور آسمانوں میں ان نشانیوں کو پیدا کرے اور یہ بچھڑا جو اپنے وجود میں خود دوسروں کا محتاج تھا اور بظاہر سامری کے بنانے سے وجود میں آیا یہ ان نشانیوں کو کیونکر بنا سکتا تھا تو یہ ہدایت دینے پر کیسے قادر ہو سکتا تھا۔ تو اس کو معبود قرار دینا کس طرح صحیح ہوگا۔

۴۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی سخت مذمت فرمائی ہے کہ یہ بچھڑا جو ان چیزوں پر بھی قدرت نہیں رکھتا جن پر عام انسان قادر ہیں تو تف ہے تم نے ایسے کو خدا مان لیا ہے۔

۵۔ چونکہ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے ہم کلام ہوا تھا اور اس نے ان کی قوم کو ہدایت دی تھی اس وجہ سے اس آیت میں یہ تعریض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تو یہ شان ہے کہ وہ کلام فرمانے والا ہے اور ہدایت دینے والا ہے۔ تم اس خدا کو چھوڑ کر کہاں بچھڑے کی پرستش میں مشغول ہو۔

اس آیت کے آخر میں فرمایا ہے اور وہ ظالم تھے ظلم کا معنی ہے کسی چیز کو اس کے غیر محل میں رکھنا اور کسی کا حق کسی دوسرے کو دینا۔ عبادت اللہ کا حق ہے جب انسان اللہ کے علاوہ کسی اور کی عبادت کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا حق دوسروں کو دے رہا ہے اور یہی ظلم کرنا ہے بلکہ کائنات میں سب سے بڑا ظلم غیر اللہ کی عبادت اور شرک کرنا ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

علامہ قاری محمد طیب صاحب اپنی تفسیر برہان القرآن میں فرماتے ہیں:

بنی اسرائیل کی بچھڑا پرستی اور موسیٰ (علیہ السلام) کی ہارون (علیہ السلام) پر برہمی:

عِجل گائے کے بچے (بچھڑے) کو اور خوار گائے کی آواز کو کہتے ہیں۔ خار یخور کا معنی گائے یا بیل کی آواز نکالنا ہے۔ موسیٰ (علیہ السلام) قوم کو یہ کہہ کر گئے کہ وہ تیس دن تک واپس آ جائیں گے اور آپ کوہ طور پر اللہ تعالیٰ سے کتاب لینے چلے گئے جب آپ کو وہاں دس دن مزید رکنا پڑا تو قوم نے کہا ضرور آپ کو کچھ ہو گیا ہے تو وہ بے خوف ہوگئے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اپنی جگہ اپنے بڑے بھائی ہارون علیہ السلام کو چھوڑ گئے تھے مگر وہ موسیٰ (علیہ السلام) کی نسبت نرم مزاج تھے وہ بنی اسرائیل جیسی شر پسند قوم کو کنٹرول نہ کر سکے اور بنی اسرائیل کو سامری نے گمراہ کر دیا۔

اس نے بنی اسرائیل کے ان زیورات سے جو وہ مصر سے فرعونیوں سے مانگ کر لائے تھے اور موسیٰ (علیہ السلام) نے ان کے پھینک دینے کا حکم دیا تھا (کیوں کہ ان کی شریعت میں مال غنیمت حلال نہ تھا) ایک سنہری بچھڑا بنایا اور اس کے منہ میں اس نے وہ مٹی ڈالی جو اس نے حضرت جبرائیل (علیہ السلام) کی گھوڑی کے قدموں تلے سے اس وقت اٹھائی جب فرعون غرق ہوا تھا۔ جب اس نے اس بے جان سنہری بچھڑے کے منہ میں اس مٹی کو ڈالا تو اس میں زندگی کی کچھ رمق آ گئی۔ بس اتنی کے وہ گائے کی طرح بھاں بھاں کرنے لگا مزید اس میں کچھ حرکت نہ تھی۔ سامری نے کہا اے بنی اسرائیل ! حضرت موسیٰ جس خدا سے ملنے طور پر گئے ہیں وہ اس بچھڑے میں آگیا ہے اس نے یہ کہا ھذا الھکم والہ موسیٰ فنسی۔ یہ ہے تمہارا اور موسیٰ کا خدا موسیٰ تو بھول گیا ہے (طٰہ : 88) یہ دیکھ کر بنی اسرائیل کی اکثریت بچھڑے کے آگے سجدہ ریز ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بنی اسرائیل کس قدر جاہل تھے کہ انھوں نے یہ نہ دیکھا کہ وہ بچھڑا نہ کلام کر سکتا تھا نہ انھیں کوئی راہ نمائی دے سکتا تھا پھر بھی انھوں نے اسے خدا مان لیا وہ کس قدر ظالم تھے یعنی خود پر ظلم کرنے والے۔ بنی اسرائیل بچھڑا پرستی میں اس لیے مبتلا ہوئے کہ وہ صدیوں تک فرعونی قوم کے غلام رہے اور فرعونی لوگ گائے نما بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ (راقم الحروف نے 2005ء میں دورہ مصر کے دوران قاہرہ کے عجائب گھر میں فرعونی دور کے گائے نما بت دیکھے تھے جن کی پوجا کی جاتی تھی) تو بنی اسرائیل ابھی تک گائے پرستی کے اثرات سے آزاد نہ ہوئے تھے۔ اس لئے جب سامری نے انھیں گائے کا ایسا سنہری بچھڑا دکھایا جس سے زندہ گائے کی آواز آتی تھی تو وہ فوراً اس کے آگے سجدہ ریز ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعد میں انھیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا تا کہ ان کے دلوں سے گائے پرستی کی الفت ختم ہو۔

یہاں سے دو فوائد حاصل ہوئے:

1۔ بنی اسرائیل کی گمراہی اور امت محمدیہ کی استقامت:

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اپنی قوم سے صرف 40 دن غائب رہے اور آپ کی قوم نے اللہ کو چھوڑ کر بچھڑے کو پوچھنا شروع کر دیا جب کہ حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعلیمات کا یہ اثر ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصال کو چودہ صدیوں سے زیادہ زمانہ گزر جانے کے باوجود آپ کی امت عقیدہ توحید پر سختی سے قائم ہے۔ خود حضور سید کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ کی قسم مجھے ہر گز ڈر نہیں کہ میرے بعد میری امت شرک میں مبتلا ہو گی "۔

(بخاری کتاب الجنائز باب 72)

2۔ تعظیم ذوالجناح بچھڑا پرستی کی ایک تصویر ہے:

محرم الحرام کے مہینے میں ہر سال اہل تشیع اپنے اپنے شہر میں ایک گھوڑا نکالتے اور کہتے ہیں یہ اس گھوڑے کی تمثیل ہے جس پر امام حسین (رض) کربلا میں جہاد کیا اور شہید ہوئے تو وہ اس گھوڑے کو شبیہ ذوالجناح کہہ کر اسے چومتے اس کے نیچے سے گزرتے اور اس کے منہ سے دودھ اور پانی لگا لگا کر پیتے ہیں وہ اگرچہ گھوڑے کو خدا نہیں مانتے مگر اس کی تعظیم یوں بجالاتے ہیں جیسے بنی اسرائیل بچھڑے کی بجالائے تھے جو سراسر گمراہی ہے۔

امام حسین (رض) کے پاس کربلا میں اونٹ ہی تھے کوئی گھوڑا نہ تھا:

امام حسین (رض) کربلا میں اونٹ پر گئے تھے۔ خود اہل تشیع کی کتب پڑھی جائیں، لکھا ہے کہ محمد بن حنفیہؒ نے امام حسین (رض) عنہٗ کی اونٹنی کی لگام پکڑ لی اور آپ کو کوفہ جانے سے روکا (ذبح عظیم صفحہ 165 مطبوعہ لاہور)

کربلا میں پہنچ کر امام حسین (رض) عنہٗ نے فرمایا:

ھذا مناخ رکابنا و محور حالنا و مقتل رکابنا۔ اس جگہ ہمارے اونٹ بیٹھیں گے ہمارے کجاوے اتریں گے اور ہمارے مرد قتل ہوں گے (کشف الغمہ فی معرفتہ الائمہ جلد 2 صفحہ 47) اب طریقہ کام آنا ہے سواری کا اونٹ اس کی جمع رُکَب ہے (المنجد) اور رحال کا معنٰی اونٹوں کے کجاوے ہیں اس کا واحد رحل ہے۔ (المنجد) تو پھر کیا شک رہا کہ امام حسین (رض) عنہٗ کے پاس صرف اونٹ ہی تھے کوئی گھوڑا نہ تھا۔

پھر جب آپ کربلا میں پہنچے تو واقعہ کربلا کا سب سے پہلا شیعہ مورخ ابو مخنف کہتا ہے:

فلما نظر الطرماخ اخذ بزمام ناقتہ الحسین۔ جب طرماخ (ایک کوفی فوجی) نے دیکھا تو امام حسین (رض) عنہٗ کی اونٹنی کی نکیل پکڑ لی۔ (مقتل ابی مخنف صفحہ 45 مطبوعہ نجف اشرف عراق) گویا ہر جگہ اونٹنی ہی کا ذکر ہے، تو یہ گھوڑا کہاں سے آگیا؟ (تفسیر برہان القرآن)

وَاتَّخَذَ: اور بنالیا۔} اس آیت اور اس کے بعد والی 3 آیات میں جو واقعہ بیان ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُوَالسَّلَام اللہ عَزَّوَجَلَّ سے کلام کرنے کیلئے کوہ طور پر تشریف لے گئے تو ان کے جانے کے تیس دن بعد سامری نے بنی اسرائیل سے وہ تمام زیوارت جمع کر لیے جو انھوں نے اپنی عید کے دن قبطیوں سے استعمال کی خاطر لیے تھے۔ فرعون چونکہ اپنی قوم کے ساتھ ہلاک ہو چکا تھا، اس لیے یہ زیورات بنی اسرائیل کے پاس تھے اور سامری کی حیثیت بنی اسرائیل میں ایسی تھی کہ لوگ اس کی بات کو اہمیت دیتے اور اس پر عمل کرتے تھے۔ سامری چونکہ سونے کو ڈھالنے کا کام کرتا تھا اس لیے اس نے تمام سونے چاندی کو ڈھال کر اس سے ایک بے جان بچھڑا بنایا۔ پھر سامری نے حضرت جبرائیل (علیہ السلام) کے گھوڑے کے سم کے نیچے سے لی ہوئی خاک اس بچھڑے میں ڈالی تو اس کے اثر سے وہ گوشت اور خون میں تبدیل ہو گیا (اور بقول دیگر وہ سونے ہی کا بچھڑا تھا) اور گائے کی طرح ڈکارنے لگا۔ سامری کے بہکانے پر بنی اسرائیل کے بارہ ہزار لوگوں کے علاوہ بقیہ سب نے اس بچھڑے کی پوجا کی۔ یہ لوگ اتنے بیوقوف اور کم عقل تھے کہ اتنی بات بھی نہ سمجھ سکے کہ یہ بچھڑا نہ تو ان سے سوال جواب کی صورت میں کلام کر سکتا ہے، نہ انھیں رشد و ہدایت کی راہ دکھا سکتا ہے تو یہ معبود کس طرح ہو سکتا ہے۔ حالانکہ بنی اسرائیل جانتے تھے کہ رب وہ ہے جو قادر مُطْلَق، علیم، خبیر اور ہادی ہو اور نبی کے واسطے سے مخلوق سے کلام فرمائے۔ بچھڑا چونکہ راہ ہدایت نہ دکھا سکتا تھا اس اعتبار سے وہ جماد کی طرح تھا۔ بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی عبادت سے اعراض کر کے ایسے عاجز و ناقص بچھڑے کو پوجا تو وہ ظالم ٹھہرے۔ پھر جب اپنے اس کرتوت پر شرمندہ ہوئے اور سمجھ گئے کہ وہ یقیناً گمراہ ہو گئے تھے تو کہنے لگے: اگر ہمارے رب عَزَّوَجَلَّ نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہماری مغفرت نہ فرمائی تو ہم ضرور تباہ ہو جائیں گے۔ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کی مناجات سے مشرف ہو کر کوہ طور سے اپنی قوم کی طرف واپس پلٹے تو بہت زیادہ غم وغصے میں بھرے ہوئے تھے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں خبر دے دی تھی کہ سامری نے ان کی قوم کو گمراہ کر دیا ہے۔ آپ کو جھنجلاہٹ اور غصہ سامری پر تھا نہ کہ حضرت ہارون (علیہ السلام) پر، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُوَالسَّلَام کو پہلے سے بتا دیا تھا کہ انھیں سامری نے گمراہ کیا ہے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے (قوم سے فرمایا کہ تم نے میرے بعد کتنا برا کام کیا کہ شرک کرنے لگے اور میرے توراۃ لے کر آنے کا انتظار بھی نہ کیا۔ دوسرے قول کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے) حضرت ہارون (علیہ السلام) اور اپنی قوم کے ان لوگوں سے جنھوں نے بچھڑے کی پوجا نہ کی تھی فرمایا: تم نے میرے بعد کتنا برا کام کیا کہ لوگوں کو بچھڑا پوجنے سے نہ روکا۔ کیا تم نے اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کے حکم میں جلدی کی اور میرے توراۃ لے کر آنے کا انتظار نہ کیا؟ اس کے بعد حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے توراۃ کی تختیاں زمین پر ڈال دیں اور اپنے بھائی کے سر کے بال پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے کیونکہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی قوم کا ایسی بدترین معصیت میں مبتلا ہونا نہایت شاق اور گراں ہوا تب حضرت ہارون (علیہ السلام) نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے کہا: اے میری ماں کے بیٹے! میں نے قوم کو روکنے اور ان کو

وعظ و نصیحت کرنے میں کمی نہیں کی لیکن قوم نے مجھے کمزور سمجھا اور قریب تھا کہ مجھے مار ڈالتے تو تم مجھ پر دشمنوں کو ہنسنے کا موقع نہ دو اور میرے ساتھ ایسا سلوک نہ کرو جس سے وہ خوش ہوں اور مجھے ظالموں کے ساتھ شمار نہ کرو۔ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے اپنے بھائی کا عذر قبول کرکے بارگاہ الٰہی میں عرض کی: اے میرے رب! اگر ہم میں سے کسی سے کوئی اِفراط یا تفریط ہو گئی تو مجھے اور میرے بھائی کو بخش دے اور ہمیں اپنی خاص رحمت میں داخل فرما اور تو رحم کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔ یہ دعا آپ (علیہ السلام) نے اس لیے مانگی کہ دوسرے لوگ یہ سن کر خوش نہ ہوں کہ بھائیوں میں چل گئی اور اس کے ساتھ یہ وجہ بھی تھی کہ حضرت ہارون (علیہ السلام) کا غم غلط ہو جائے۔ (1)

نوٹ: یہ واقعہ اجمالی طور پر سورۃ بقرہ آیت 51 تا 54 میں گزر چکا ہے، مزید تفصیل کے ساتھ اس کے علاوہ سورۃ طٰہٰ میں بھی مذکور ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

علامہ آلوسی (رح) روح المعانی میں فرماتے ہیں واتخذ قوم موسٰی من بعدہ یعنی بنالیا موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم نے آپ کے طور کی طرف اپنے رب کی طرف مناجات کے لیے چلے جانے کے بعد ان کے زیوروں سے جو سبطی قوم نے قبطیوں سے عید کے بہانے سے عاریۃ لیا تھا۔

حلی۔ عرب میں اس چیز کو کہتے ہیں جو زینت کے لیے بنائی جائے اور متحلی ہو سونے اور چاندی سے۔ یہ زیور قوم قبط کا تھا جو فرعون کی قوم تھی۔ ان سے قوم سبط نے جو موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم تھی ان کے غرق ہونے سے پہلے استعارۃ لیا تھا جب وہ ہلاک و غرقاب ہو گئی تو ان کے پاس وہ زیور رہ گیا۔

ایک قول یہ ہے کہ سبطیوں نے قبطیوں سے زیور بایں خیال حاصل کر لیا تھا کہ ان کے غرق کے بعد وہ مسلمانوں کی ملک ہو گا۔

ایک روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اغراق فرعون کا معہ اس کی قوم کے ارادہ فرمایا اور یہ علم قوم موسیٰ کو ہو گیا کہ وہ ایمان نہ لائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ (علیہ السلام) کے ذریعہ بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ قبطیوں سے استعارۃ ان کے زیور لیں اور دریائے نیل کی طرف چلیں تاکہ قبطی اپنے زیورات کی وجہ سے ان کے تعاقب میں آئیں اور غرق نیل ہوں اور وہ مستعار زیور بنی اسرائیل کے ہاتھ آ جائے۔

اس پر اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ

غنائم صرف امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے حلال ہوئے اور اس سے پہلے کسی امت پر حلال نہ تھے۔ حیث قال النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خمس لم یعطھن احد قبلی احلت لی الغنائم۔ الحدیث اور آیہ کریمہ حملنا اوزارا من زینۃ القوم ہم سے بوجھ اٹھوائے گئے اس قوم (قبط) کے زیوروں سے فقذ فنھا تو ہم نے انھیں آگ میں ڈال دیا اس سے بھی اقتضاء یہی نکلتا ہے کہ قوم بنی اسرائیل اسے حلال نہ سمجھتی تھی چنانچہ اس نے ان زیورات کو بعد ہلاک قوم فرعون آگ میں ڈال دیا۔ پھر وہ روایت جو اوپر بیان ہوئی کیونکر صحیح مانی جا سکتی ہے۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ وہ قوم جب ناحق اپنی پوجا کراتی اور ظلماً است خدام کرتی بنی اسرائیل کا مال جبراً لیتی ان کی اولادوں کو قتل کرتی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی زمین اور جو کچھ اس میں تھا سب کا مالک بنی اسرائیل کو بنا دیا حیث قال تعالیٰ ان الارض للہ یورثھا من یشآء من عبادہ زمین اللہ کے لیے ہے اس کا وارث کرتا ہے جسے چاہے اپنے بندوں سے اور یہ قبضہ زیورات پر بطریق وحی ہوا نہ کہ بطور غنیمت۔ آگے ارشاد ہے۔

عجلاً جسداً لہ خوار۔ یعنی انھوں نے اس زیور کو آگ میں ڈال کر ایک عجل بنا لیا۔ عربی زبان میں عجل گائے کے بچے یعنی بچھڑے کو کہتے ہیں۔ عربی زبان میں ہر جانور کے بچے کے لیے علیحدہ علیحدہ نام ہیں چنانچہ گائے کے بچے کو جسے بچھڑا کہتے ہیں عجل کہا جاتا ہے۔

اور گھوڑے کے بچے کو مہر۔ ناقہ یعنی اونٹنی کے بچے کو حوار۔ گدھی کے بچے کو جمش۔ بکری کے بچے کو حمل۔ بھیڑ کے بچے کو جدی۔ شیر کے بچے کو شبل۔ ہاتھی کے بچے کو غفل۔ کتے کے پلے کو جرو۔ ہرن کے بچے کو خنف۔ نعام یعنی شتر مرغ کے بچے کو راعول۔ مرغی کے بچے کو فروخ۔ چوہے کے بچے کو ورص۔

اور جسداً اس لیے فرمایا کہ وہ صورت عجل میں تھا نہ کہ اصل بچھڑا بلکہ سونے چاندی کا جسم بچھڑے کی صورت میں ڈھلا ہوا تھا۔ لہ خوار۔ اس میں گائے کی سی آواز تھی۔ خوار عربی میں صوت بقر یعنی گائے کی آواز کو کہتے ہیں چنانچہ حیوان کی آوازوں کیلئے بھی عربی میں علیحدہ علیحدہ نام ہیں۔

ثغا بکری کے آواز کو کہتے ہیں۔ بعار بھیڑ کے آواز کو۔ اور تیس بھیڑ کے نر کی آواز کو۔ نباح کتے بھونکنے کو۔ زئیر شیر کی آواز کو۔ عواء یا دعوعہ بھیڑیئے کی آواز کو۔ جناح لومڑی کی آواز کو۔ قباع۔ سور کی آواز کو۔ اور مواء بلی کی آواز کو۔ صنی ہاتھی کی آواز کو۔ نہیق اور سحیل گدھے کی آواز کو۔ اور صہیل۔ ضبح۔ قنع۔ حمحمہ

گھوڑے کی آوازوں کو۔ رغا اونٹنی کی آواز کو۔ تبغم ہرن کی آواز کو۔ ضعیب خرگوش کی آواز کو۔ غرض کہ ہر جانور کی آواز کا علیحدہ نام ہے۔ ایک قرأت میں جوار بھی ہے۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جسداً لہ خوار پڑھا ہے جو صوت شدید کے معنی میں آتا ہے۔ اس کی آواز کی تحقیق میں ایک روایت ہے کہ سامری نے جب بچھڑا ڈھال لیا تو اس کے منہ میں حضرت روح الامین (علیہ السلام) کے گھوڑے کے نشان قدم سے خاک ڈال دی۔ تو وہ بچھڑا زندہ ہو گیا۔ بعض نے کہا اس میں یہ راز ہے کہ روح الامین (علیہ السلام) چونکہ روح اعظم ہیں۔ اس وجہ میں ان کے مرکب کی خاک قدم میں بھی اللہ عزوجل کے حکم سے یہ اثر تھا۔ معتزلہ کے نزدیک مادی تحقیق اس طرح ہے۔ کہ بچھڑا تو بلا روح تھا اور سامری نے اسے ڈھالا تھا اس میں ڈھلائی کے وقت مناسب جگہ ایسے سوراخ رکھ دیئے کہ ان میں سے ہوا جب گزرتی تو اس سے آواز آتی اس لیے اسے قرآن کریم نے خوار کہا اور یہ بھی قرین عقل ہے۔ بہر حال قوم بنی اسرائیل سامری کے دھوکا میں آئی اور اس بچھڑے کو پوجنے لگ گئی۔ اس میں بھی اختلاف ہے کہ وہ بچھڑا ایک بار بولا یا کتنی بار مگر یہ متفقہ بات ہے کہ جب وہ بولا تو قوم بنی اسرائیل نے اسے سجدہ کیا اور جب وہ خاموش ہوا تو انھوں نے سروں کو اٹھالیا۔ علامہ حسن کا قول ہے کہ سارے کے سارے بنی اسرائیل بچھڑا پوجنے میں مصروف ہو گئے مگر ہارون (علیہ السلام)۔ حرمت تصویر کی علت روح المعانی میں۔ آگے اسی علت کی تصریح فرماتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حرمت تصویر ہماری شریعت میں اسی بناء پر واقع ہوئی کہ وہ مظنہ شرک ہوتی ہے۔ درحقیقت مقصود اس حرمت سے انکار عبادت ماسوی اللہ عزوجل ہے۔ اس لیے آگے فرمایا۔

کیا نہیں دیکھا کہ وہ بچھڑے کا جسم نہ بات کرتا ہے اور نہ کچھ راہ بتاتا ہے اسے انھوں نے معبود بنالیا اور وہ ظالم مشرک تھے۔ ولما سقط فی ایدیھم۔ اس کے معنی مفسرین رحمہم اللہ نے ندموا کئے یعنی جب وہ شرمندہ ہوئے بقول سید المفسرین ابن عباس (رض) اس محاورہ کی توجیہ اس طرح فرمائی۔

یہ کنایہ ہے شدت ندامت اور غایت درجہ کی شرمندگی کی طرف اس لیے کہ نادم کو جب ندامت بدرجہ غایت ہوتی ہے تو وہ ہاتھ کاٹتا ہے غم میں تو اس کا ہاتھ گرنے لگتا ہے اور اصل اس کی منہ گرنے یا ہاتھ نوچنے کی طرف ہے تو خلاصہ معنی یہ ہوئے کہ جب وہ شرمندہ ہوئے اور پچھتائے ورا وا نھم قد ضلوا اور دیکھا انھوں نے کہ بیشک وہ گمراہی میں پڑ گئے تو بولے اگر ہمارا رب ہم پر رحم نہ کرے گا اور ہمیں ہماری خطا معاف نہ فرمائے گا تو ہم تباہ کار اور نقصان والوں میں ہیں۔ یہ بیان بنی اسرائیل کی طرف سے تھا اس کا تذکرہ فرما کر آگے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا کوہ طور سے واپسی کا حال بیان فرمایا جاتا ہے۔ (تفسیر الحسنات)

فوائد

۱: چونکہ سامری نے ساری قوم کے مشورہ اور ان کی مدد سے بچھڑا بنایا تھا۔ لہٰذا ساری قوم کو بنانے والا قرار دیا گیا۔

۲: اس طرح کہ سامری نے اس بچھڑے کے منہ میں حضرت جبرائیل (علیہ السلام) کی گھوڑی کی ٹاپ کی خاک ڈالی جس سے اس میں زندگی پیدا ہو گئی۔

۳: یعنی بنی اسرائیل جانتے تھے کہ رب وہ ہے جو قادر مطلق، علیم، خبیر اور بچھڑے کو رب مان بیٹھے۔

۴ حضرت جبرائیل کی گھوڑی کی ٹاپ کی مٹی اگرچہ طیب وطاہر تھی مگر فرعونی سونا گندہ تھا۔ لہٰذا بچھڑے کی آواز سے لوگ گمراہ ہوئے۔ اسی طرح خبیث انسان کے علم سے لوگ گمراہ ہوتے ہیں۔ اگر یہ سونا طیب وطاہر ہوتا تو اس کی آواز سے لوگوں کو ہدایت ملتی، گمراہ نہ ہوتے، قرآن وحدیث روحانی ریڈیو کی پٹی ہے۔ اگر دل کا کنکشن حضور سے ہے تو قرآن سے ہدایت ملے گی اور اگر دل کا تعلق ابلیس سے ہے تو عالم پڑھائے گا قرآن مگر سکھائے گا طغیان۔ الہ دل کا تعلق درست رکھے۔ جو ڈبہ انجن سے کٹ جائے اس کا کچھ کرایہ نہیں، نہ کچھ قدر و قیمت ہے۔

۵: کیونکہ انھوں نے غیر خدا کی پوجا کی، بچھڑے کے سامنے ناچتے گاتے تھے۔ تفسیر روح البیان نے فرمایا کہ ناچنا گانا بجانا، ان بچھڑے کے پجاریوں کی سنت ہے صوفیاء کرام کا وجد بے اختیاری ہوتا ہے جو اختیار سے یا ریا کے لیے وجد کرے وہ اسی سنت اسرائیلی کا عامل ہے۔ (تفسیر نور العرفان)

آیت مبارکہ:

وَلَمَّا سُقِطَ فِيٓ اَيۡدِيۡهِمۡ وَرَاَوۡا اَنَّهُمۡ قَدۡ ضَلُّوۡا ۙ قَالُوۡا لَئِنۡ لَّمۡ يَرۡحَمۡنَا رَبُّنَا وَيَغۡفِرۡ لَنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ۝۱۴۹

لغۃ القرآن: [وَلَمَّا : اور جب] [سُقِطَ فِيٓ اَيۡدِيۡهِمۡ : وہ لوگ پچھتائے] [وَرَاَوۡا : اور انہوں نے دیکھا] [اَنَّهُمۡ : کہ وہ] [قَدۡ ضَلُّوۡا ۙ: گمراہ ہوگئے ہیں] [قَالُوۡا : تو انہوں نے کہا] [لَئِنۡ : یقینا اگر] [لَّمۡ يَرۡحَمۡنَا : رحم نہ کیا ہم نے] [رَبُّنَا : ہمارے رب نے] [وَيَغۡفِرۡ لَنَا : اور نہ بخشا ہم کو] [لَنَكُوۡنَنَّ : تو ہم لازما ہوجائیں گے] [مِنَ : سے] [الۡخٰسِرِيۡنَ : خسارہ پانے والے]

ترجمہ: اور جب وہ اپنے کئے پر شدید نادم ہوئے اور انھوں نے دیکھ لیا کہ وہ واقعی گمراہ ہوگئے ہیں (تو) کہنے لگے : اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہمیں نہ بخشا تو ہم یقیناً نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے

تشریح: یہ محاورہ ہے اور شدت ندامت اور پشیمانی پر دلالت کرتا ہے۔ یقال للنادم المتحیر : قد سقط فی یدہ (قرطبی) کیونکہ انسان انتہائی ندامت کے وقت اپنے ہاتھ کاٹتا ہے تو گویا وہ ہاتھ اس سے کٹ کر الگ ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس حالت کو ہی ان الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کنایۃ عن اشتداد ندمھم کان لنادم المتحسر یعض یدہ غما فتصیر یدہ مسقوطا فیہا (بیضاوی) موسیٰ (علیہ السلام) جب توراۃ لے کر واپس تشریف لائے اور قوم کی آنکھوں سے غفلت کا پردہ اٹھا تو انھیں احساس ہوا کہ انھوں نے بڑی ہی زبردست حماقت کی ہے تو پچھتائے اور افسوس کرنے لگے اور اعتراف کیا کہ اگر ہم پر ہمارا رب مہربانی نہ کرتا تو ہم ہلاک ہو گئے تھے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

لماسقط فی ایدیھم کا معنی

ولماسقط فی ایدیھم : عربی محاورہ میں اس کا معنی ہے جب انھوں نے لغزش کی یا جب وہ پچھتائے زجاج نے کہا اس کا معنی ہے جب ان کے ہاتھوں میں ندامت گر گئی۔ بنو اسرائیل بچھڑے کی عبادت کرنے پر بہت نادم ہوئے تھے۔ اس لیے فرمایا۔ ولماسقط فی ایدیھم : جب کوئی ناپسندیدہ اور مکروہ چیزوں میں آئے تو یہ کہتے ہیں اور ہاتھوں سے دل کا استعارہ کرتے ہیں۔

سقوط کا معنی کسی چیز کا اوپر سے نیچے گرنا۔ عرب کہتے ہیں سقط المطر بارش گری اور حمل ساقط ہونا کہتے ہیں جب نا تمام بچہ پیدا ہو۔ جن انسان کسی عمل کا اقدام کرتا ہے تو اس کو یقین ہوتا ہے کہ یہ عمل اچھا اور درست ہے اور اس عمل سے اس کو عزت اور بلندی حاصل ہو گی۔ اور جب اس پر یہ منکشف ہو کہ یہ عمل باطل اور فاسد تھا تو وہ گویا بلندی سے نیچے گر گیا اور جو عزت اور بلندی اس کو حاصل تھی وہ جاتی رہی۔ اس لیے جب کسی شخص سے خطا یا لغزش ہو تو عرب کہتے ہیں ذالک سقطۃ منہ اس کی سربلندی اور سرفرازی گئی۔

اس کے بعد انھوں نے توبہ اور استغفار کیا۔ اور یہ معاملہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے طور سے واپس آنے کے بعد ہوا تھا۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آخر میں جب جوش و خروش ختم ہوا اور لوگوں کے حواس بحال ہوئے اور حقیقت سامنے آ گئی اور انھوں نے جان لیا کہ وہ تو گمراہ ہوگئے اور انھوں نے کھلے شرک کا ارتکاب کر لیا تو وَلَمَّا سُقِطَ فِيٓ اَيۡدِيۡهِمۡ وَرَاَوۡا اَنَّهُمۡ قَدۡ ضَلُّوۡا قَالُوۡا لَئِنۡ لَّمۡ يَرۡحَمۡنَا رَبُّنَا وَيَغۡفِرۡ لَنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ۔ پھر جب ان کی فریب خوردگی کا طلسم ٹوٹ گیا اور انھوں نے دیکھ لیا کہ درحقیقت وہ گمراہ ہوگئے ہیں تو کہنے لگے کہ "اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہم سے درگزر نہ کیا تو ہم برباد ہو جائیں گے "

سقط فی یدہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کسی کا حیلہ اور تدبیر اس کے سامنے فیل ہو جائے۔ جب بنی اسرائیل نے دیکھا کہ وہ جس گمراہی میں ملوث ہوگئے اب تو وہ اس سے صاف نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا، تو ایسے حالات میں بے بس ہو کر انھوں نے کہا : "اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہم سے درگزر نہ کیا تو ہم برباد ہو جائیں گے "

اس بات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ان میں اصلاح پذیری کا مادہ بہر حال موجود تھا۔ اور ان کے دل اس قدرت سخت نہ ہوگئے تھے جس طرح بعد میں ہوئے کہ قرآن مجید کو کہنا پڑا کہ وہ پتھر بن گئے یا پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہوگئے۔ بہر حال اس وقت جب انھیں معلوم ہوگیا کہ وہ غلطی پر ہیں اور اللہ کی رحمت اور مغفرت کے سوا ان کے لیے فلاح کا اور کوئی راستہ نہیں ہے تو انھوں نے اس طرح توبہ کی اور اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اس دور میں یہ لوگ قابل اصلاح تھے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

اس کو بھی آپ دیکھیں کہ ایک Mob psychology سامنے نظر آرہی ہے۔ ہجوم کی نفسیات۔ رو میں بہہ جانا جس کو ہم کہتے ہیں جب ایک رو چل پڑتی ہے جب لوگوں پر جذبات کا طوفان آجاتا ہے۔ اچھے اچھے عقل والوں کی بعض دفعہ عقل ماری جاتی ہے۔ وہ بھی اس رو میں بہہ جاتے ہیں اندر سے ان کے کوئی چٹکی لے رہا ہوتا ہے۔ غلط ہو رہا ہے۔ لیکن چونکہ سب کر رہے ہوتے ہیں تو اتنا پریشر ہوتا ہے لوگوں کے کام کرنے کا کہ بعض دفعہ جو راہ نما ہوتے ہیں یا قوم کے عقلمند لوگ ہوتے ہیں وہ بھی اس میں بہہ جاتے ہیں لگتا ہے یہی معاملہ بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا۔ کہ معدودے چند کے علاوہ سب اس رو میں بہہ گئے۔ لیکن اب جب وہ بچھڑا بن گیا۔ بن کر سامنے آگیا تو اسے دیکھ کر انھوں نے سر اپنا پیٹ لیا۔ کہ یہ کیا چیز بنی ہے آیت۔ سقط فی ایدیھم۔ وہ چیز گرا دی گئی ان کے ہاتھوں میں۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ سامنے کوئی چیز آگئی۔

تو ان کو افسوس ہوا کہ یہ ہم نے کیا کیا ہے پھر انھوں نے تو یہ کہا۔ سقط فی ایدیھم۔ یہ شرمندگی کے لیے بھی آتا ہے۔ جیسے انسان اپنے ہاتھوں میں اپنے آپ کو گراتا ہے افسوس کی وجہ سے لوگ یوں نہیں کر لیتے۔ اپنے ہاتھوں میں اپنے آپ کو گرانا۔ تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ افسوس اور تاسف کے لیے یہ محاورہ استعمال کیا گیا ہو۔ تو ان کو بڑا افسوس ہوا اور انھوں نے اللہ سے معافی مانگ لی۔ لیکن یہ ساری قوم نہیں تھی۔ صرف چند لوگ تھے جن کو غلطی کا احساس ہوا اور اپنے رب سے انھوں نے معافی مانگی۔ (تفسیر تنویر)

آیت مبارکہ:

وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ۭ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ڮ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَاۗءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۵۰

لغۃ القرآن: [وَلَمَّا : اور جب] [رَجَعَ : لوٹے] [مُوْسٰٓي : موسیٰ] [اِلٰى قَوْمِهٖ : اپنی قوم کی طرف] [غَضْبَانَ : غضبناک ہوتے ہوئے] [اَسِفًا ۙ: غم گین ہوتے ہوئے] [قَالَ : تو انہوں نے کہا] [بِئْسَمَا : کتنی بری ہے وہ جو] [خَلَفْتُمُوْنِيْ : تم لوگوں نے جانشینی کی میری] [مِنْۢ بَعْدِيْ : میرے بعد] [اَ : کیا] [عَجِلْتُمْ : جلدبازی کی تم لوگوں نے] [اَمْرَ رَبِّكُمْ : اپنے رب کے حکم سے (پہلے)] [وَاَلْقَى: اور انہوں نے ڈالا] [الْاَلْوَاحَ : تختیوں کو] [وَاَخَذَ : اور پکڑا] [بِرَاْسِ اَخِيْهِ : اپنے بھائی کے سر کو] [يَجُرُّهٗٓ: کھینچتے ہوئے اس کو] [اِلَيْهِ: اپنی طرف] [قَالَ : (ہارون نے) کہا] [ابْنَ اُمَّ : اے میری ماں

کے بیٹے] [اِنَّ الْقَوْمَ : بیشک قوم نے] [اسْتَضْعَفُوْنِيْ : کمزور سمجھا مجھ کو] [وَكَادُوْا : اور قریب تھا کہ وہ لوگ] [يَقْتُلُوْنَنِيْ : قتل کرتے مجھ کو] [فَلَا تُشْمِتْ : پس تو خوش مت کر] [بِيَ : مجھ سے] [الْاَعْدَاۗءَ : دشمنوں کو] [وَلَا : اور نہ] [تَجْعَلْنِيْ : بنا مجھے] [مَعَ : ساتھ] [الْقَوْمِ : قوم] [الظّٰلِمِيْنَ : ظالموں]

ترجمہ: اور جب موسیٰ (علیہ السلام) اپنی قوم کی طرف نہایت غم و غصہ سے بھرے ہوئے پلٹے تو کہنے لگے کہ تم نے میرے (جانے کے) بعد میرے پیچھے بہت ہی برا کام کیا ہے، کیا تم نے اپنے رب کے حکم پر جلد بازی کی؟ اور (موسیٰ (علیہ السلام) نے تورات کی) تختیاں نیچے رکھ دیں اور اپنے بھائی کے سر کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا (تو) ہارون (علیہ السلام) نے کہا: اے میری ماں کے بیٹے! بیشک اس قوم نے مجھے کمزور سمجھا اور قریب تھا کہ (میرے منع کرنے پر) مجھے قتل کر ڈالیں، سو آپ دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دیں اور مجھے ان ظالم لوگوں (کے زمرے) میں شامل نہ کریں

تشریح: کوہ طور پر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ تیرے بعد تیری قوم کو سامری نے گمراہ کر دیا ہے۔ (قرآن: ۲۰: ۸۵) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سخت غضب ناک ہو کر اپنی قوم کی طرف واپس آئے تو اس وقت بنی اسرائیل اس بچھڑے کی عبادت میں مصروف تھے۔ (فتح الباری) اپنی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی دیکھ کر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے غصہ میں اور اضافہ ہو گیا۔ سب سے پہلے قوم سے کہا: تم نے میرے بعد بہت برا کام کیا اور میرے تورات لے کر آنے کا انتظار بھی نہ کیا، اور پھر اپنے بھائی حضرت ہارون (علیہ السلام) کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا، حالانکہ آپ کو پہلے بتایا جا چکا تھا کہ اس ساری گمراہی کا ذمہ دار سامری ہے مگر قوم پر اس ظلم عظیم (شرک) کی قباحت کو اور واضح کرنے کے لیے اپنے بھائی کو بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور کہا: تم نے انھیں شرک سے منع کیوں نہیں کیا، تو حضرت ہارون (علیہ السلام) نے جواب دیا: اے میرے بھائی! میں نے ان کو روکنے اور نصیحت کرنے کی پوری کوشش کی مگر انھوں نے میری ایک نہ سنی، الٹا مجھے قتل کرنے کے درپے ہو گئے، لہٰذا مجھے اس ظالم قوم کے ساتھ شامل نہ کریں اور نہ ہی میرے ساتھ ایسا سلوک کریں جس سے دشمن خوش ہوں، کیونکہ میں ان کے شرک میں شامل نہیں ہوں۔ اس پر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے لگے: اے اللہ تعالیٰ! مجھ پر اور میرے بھائی پر رحم فرما اور ہمیں بخش دے۔ اس دعا کا مقصد یہ تھا کہ بھائی کے ساتھ جس سخت رویہ کا مظاہرہ کیا گیا اس کی تلافی ہو جائے اور دشمنوں کو بھی طعنہ کا موقع نہ ملے کہ بھائی آپس میں دست و گریباں ہیں۔ نیز امت کو تعلیم دینا بھی مقصود تھا کہ میں اور میرا بھائی اگرچہ تمہارے شرک میں شامل نہیں ہیں اور انبیائے کرام (علیہم السلام) گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں، اس کے باوجود ہم رحم اور مغفرت کی دعا مانگ رہے ہیں اور تم نے تو واقعہ شرک کا گناہ کیا ہے، لہٰذا تمہیں رحم و مغفرت کی دعا کی زیادہ ضرورت ہے۔ (تفسیر امداد الکرم)

انتہائی غصہ کی حالت کو اسف کہتے ہیں۔ قال ابوالدرداء الاسف نزلۃ وراء الغضب اشد من ذلک اس کا دوسرا معنی جو عام مشہور ہے وہ حزن وملال ہے۔ (قرطبیؒ)

شدت غضب میں ان پتھر کی تختیوں کو جن پر تورات لکھی ہوئی تھی ایک طرف رکھ دیا اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس میں حضرت ہارون (علیہ السلام) کی غفلت اور فرض ناشناسی کا بھی دخل ہے۔ آپ کو سر کے بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف زور سے کھینچا۔ کہتے ہیں کہ سات تختیاں تھیں۔ جب آپ نے انھیں غصہ سے رکھا تو وہ ٹوٹ گئیں۔ چھ تختیاں جن میں ہر چیز کی تفصیل تھی وہ واپس اٹھالی گئیں اور ایک تختی جس میں موعظت و ہدایت تھی وہ باقی رہ گئی۔ روی ان التورۃ کانت سبعۃ اسباع فی سبعۃ الواح فلما القاھا انکسرت فرفع ستۃ اسباعھا وکان فیہا تفصیل کل شیء وبقی سبع کان فیہ المواعظ والاحکام (قرطبیؒ وبیضاوی)

اگرچہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) حضرت ہارون کے ماں باپ دونوں کی طرف سے سگے بھائی تھے لیکن ان کی جذبہ شفقت و محبت کو برانگیختہ کرنے کے لیے "میری ماں کے بیٹے" کے الفاظ سے اپنی معذرت کا آغاز کیا۔ اور کہا کہ میں نے اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کی۔ میں تن تنہا تھا اور یہ ساری قوم ایک ہو گئی۔ انھوں نے مجھے بے بس اور کمزور سمجھتے ہوئے میرے سمجھانے کی ذرا پروا نہیں کی۔ الٹا مجھے مار ڈالنے کے درپے ہو گئے۔ آپ اگر میرے ساتھ اس طرح سختی کریں گے تو دشمن بغلیں بجائیں گے اور کہیں گے کہ ذرا دیکھو دونوں بھائی ایک دوسرے سے دست بگریباں ہیں۔ شماتہ کہتے ہیں کسی کی تکلیف سے مسرور اور خوش ہونا اور یہ چیز سخت معیوب ہے۔

حضور رحمت عالمیان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے۔ اپنے بھائی کی مصیبت پر مت خوش ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس مصیبت سے نجات دے دے اور تجھ کو اس میں مبتلا کر دے۔ لا تظھر الشماتۃ باخیک فیعافیہ اللہ ویبتلیک۔ اور حضور کریم یہ دعا فرمایا کرتے تھے۔ اللھم انی اعوذ بک من سوء القضاء ورک الشقاء وشماتۃ الاعداء (بخاری) ترجمہ: اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں بری تقدیر سے، بد بختی سے اور ایسی بات سے جس سے دشمن خوش ہوں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

ابو الشیخ زید بن اسلم رحمہم اللہ سے راوی ہیں کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) جب غصہ میں آتے تو سر اقدس پر آگ سی دھکتی معلوم ہوتی تھی۔

قاضی ناصر الدین (رح) نے والقی الالواح کی تفسیر میں فرمایا ای طرحھا من شدۃ الغضب وفرط الضجرۃ حمیۃ للدین۔ آپ نے حمیت دین اور توبیخ میں شدت غضب کا مظاہرہ فرماتے ہوئے وہ الواح ڈال دیں۔ گویا ظاہر فرمایا کہ جب تم اتنے گمراہ ہوگئے کہ شرک میں بھی تمیز نہ کرسکے تو پھر ان الواح کا کیا کرنا ہے۔

اسی بناء پر یہ بھی مشہور ہے کہ بعض لوحیں ٹوٹ گئیں۔ اس توجیہ میں افضل المتاخرین شیخ المشائخ صبغۃ اللہ الندی حیدری فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ غضب و غصہ اور افسوس حمیت دین کے لیے تھا اور الواح کا گر جانا بلا اختیار ہوا اس لیے کہ احترام کتاب اللہ کا اگر نبی ہی نہ کرے گا تو پھر کون کرے گا۔ تو صحیح صواب یوں ہے کہ فرط حمیت دین میں شدت غضب اس درجہ ہوئی کہ آپ الواح کے محفوظ رکھنے پر قادر ہی نہ رہے اور بدون اختیار وہ الواح گر گئیں اسی وجہ سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اور علامہ صالح افندی (رح) اس بحث میں آخر یہ فیصلہ دیتے ہیں۔

یعنی خلاصہ یہ ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے جب قوم کا یہ حال ملاحظہ کیا تو انتہائی درجہ تک غضب ناک ہوئے اور حمیت دین وغیرت شرک برب العالمین جلدی فرمائی وضع الواح میں تاکہ ہاتھ خالی ہو تو اپنے بھائی حضرت ہارون کے سر کے بال پکڑ کر جواب طلب کریں۔ یہ بال پکڑنا عادتاً تھا اور داڑھی پکڑنا بھی اس عادت کے ماتحت تھا۔ جیساکے سورۃ طہ میں مذکور ہے۔

یجرہ الیہ۔ اپنی طرف سے اسے کھینچنے لگے اس گمان سے کہ انھوں نے روکنے میں کوتاہی کی اور حضرت ہارون (علیہ السلام) ویسے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے تین سال بڑے تھے۔ مگر موسیٰ (علیہ السلام) مرتبہ کے لحاظ سے بڑے تھے مگر اس پر آپ کے غیظ و غضب پر حضرت ہارون قبضہ نہ کرسکے۔

دوسرے از روئے مرتبہ بھی آپ کا ادب کیا کہ آپ رسالت وریاست پر مستقل مامور تھے اور حضرت ہارون (علیہ السلام) آپ کے وزیر تھے اور مزاج کے لحاظ سے نہایت حمول اور نرم دل تھے اور اس میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا بھی یہ اقدام اہانت واستخفاف کی نیت سے نہ تھا بلکہ محض ملامت مقصود تھی جیساکہ آپ کا گمان تھا کہ ان کی کوتاہی ہدایت کرنے میں ہوئی۔

چنانچہ حضرت ہارون (علیہ السلام) نے فرمایا۔

قال یا ابن ام۔ اے میری ماں جائے یہ جملہ حضرت ہارون (علیہ السلام) کا شفقتہ تھا اسی وجہ سے اپنا انتساب ماں کے ساتھ فرمایا اور ابن ام کہا کہ۔ آپ کی والدہ کے نام میں اختلاف ہے۔

ایک قول میں آپ کی والدہ کا نام محیانہ بنت یصہر بن لاوی ہے۔

ایو قول میں یوحانذ ہے۔ ایک قول میں یارخا ہے۔ ایک قول میں یازخت ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی اور قول ہیں۔ اس نام کے عمل پر آلوسی (رح) فرماتے ہیں۔

یعنی بعض لوگ اس وہم میں ہیں کہ والدہ موسیٰ (علیہ السلام) میں فتوحات کے اعمال ہیں اور اس کے لیے مخصوص ریاضتیں ہیں۔ اصحاب طلاسم وحروف کے نزدیک لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ محض رہبانیت کا عقیدہ ہے جو ان کی ایجاد ہے۔ قرون اولیٰ میں اس کا ذکر نہیں تو ہارون (علیہ السلام) نے فرمایا مجھے قوم نے کمزور سمجھا اور ذلیل جانا اور مجھ پر تشدد کیا اور میری بات کی پروانہ کی اس لیے کہ میرے حمایتی کم تھے۔

وکادوا یقتلوننی۔ اور قریب تھے کہ وہ مجھے قتل کر ڈالیں اگر میں اور سختی سے انھیں منع کروں تو تم مجھے ایسی ذلت سے رسوانہ کرو اور مجھ پر دشمنوں کو ہنسنے کا موقعہ نہ دو اور مجھے ظالموں میں نہ ملاؤ۔ تو موسیٰ (علیہ السلام) نے عذر معقول سن کر دعا کی حیث قال رب اغفرلی ولاخی اے میرے رب مجھے معاف فرما اور میرے بھائی کو معاف کر اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما اور تو رحم فرمانے والا مہربان ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو مستجاب فرمایا۔ (تفسیر الحسنات)

قوم کی گمراہی پر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) آیا طور سے واپسی پر مطلع ہوئے یا پہلے:

اس میں مفسرین کااختلاف ہے کہ آیا بنو اسرائیل کی گوسالہ پرستی کا علم حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو پہاڑ طور سے واپس آنے کے بعد ہوا تھا یا پہاڑ طور پر ہی اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کی گمراہی اور گوسالہ پرستی سے مطلع کر دیا تھا۔

امام ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اپنی قوم کی طرف لوٹے اور ان کے قریب پہنچے تو انھوں نے کچھ آوازیں سنیں تو انھوں نے کہا میں لھو ولعب میں مشغول لوگوں کی آوازیں سن رہا ہوں اور جب انھوں نے یہ معائنہ کیا کہ وہ بچھڑے کی عبادت کر رہے ہیں تو انھوں نے توراۃ کی الواح کو ڈال دیا جس کے نتیجہ میں وہ ٹوٹ گئیں اور وہ اپنے بھائی کو سر کے بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹنے لگے۔

(جامع البیان جز ۹ ص ۸۶ مطبوعہ دارالفکر بیروت)

صحیح بات یہ ہے کہ قوم کی گمراہی پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو پہاڑ پر ہی مطلع فرمادیا تھا۔ قرآن مجید کی صریح آیات اور حدیث صحیح سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وما اعجلک عن قومک یا موسی۔ قال ھم اولاء علی اثری وعجلت الیک رب لترضی۔ قال فانا قد فتنا قومک من بعدک واضلھم السامری۔ فرجع موسیٰ الی قومہ غضبان اسفا۔

(طہ : ۸۶۔ ۸۳)

(اور ہم نے طور پر موسیٰ (علیہ السلام) سے فرمایا) آپ نے اپنی قوم کو چھوڑ کر آنے میں کیوں جلدی کی اے موسیٰ (علیہ السلام) ۔ عرض کیا وہ لوگ میرے پیچھے آرہے ہیں اے میرے رب ! میں نے آنے میں اس لیے جلدی کی کہ تو راضی ہو جائے۔ فرمایا تو ہم نے آپ کے بعد آپ کی قوم کو آزمائش میں ڈال دیا ہے اور سامری نے ان کو گمراہ کر دیا ہے۔ تو موسیٰ (علیہ السلام) بہت غم وغصہ کے ساتھ اپنی قوم کی طرف لوٹے۔

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا آنکھ سے دیکھنا سننے کی مثل نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے فرمایا تمہاری قوم فتنہ میں مبتلا کر دی گئی ہے تو انھوں نے تختیاں نہیں ڈالیں اور جب انھوں نے آنکھ سے دیکھ لیا تو تختیاں زمین پر ڈال دیں اور وہ نتیجتاً ٹوٹ گئیں۔

(المعجم الکبیر ۱۲ رقم الحدیث : ۱۲۴۵۱ المعجم الاوسط ج ا رقم الحدیث : ۲۵ مسند احمد ج ا رقم الحدیث : ۲۴۴۷ مسند البزار ج رقم الحدیث : ۲۰۰ صحیح ابن حبان رقم الحدیث : ۶۲۰۷۸، ۶۲۰۷۷ المستدرک ج ص ۳۲۱ تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵ ص ۱۵۷۰ الدرالمنشور ج ۳ ص ۵۶۴ حافظ الہیثمی نے کہنا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے ج ا ص ۱۵۳)۔

غضب کا معنی اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے غضب کا تعین :

اس آیت میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ غضب اور افسوس کے ساتھ لوٹے۔

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں :

غضب کا معنی ہے انتقام کے ارادہ سے دل کے خون کا کھولنا اور جوش میں آنا۔

(المفردات ج ۲ ص ۲۶۸ مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ ۱۴۱۸ھ)

علامہ مجدالدین محمد بن اثیر الجزری المتوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں :

اللہ کے غضب کا معنی ہے اپنی نافرمانی سے منع کرنا نافرمانی کرنے والے پر ناراض ہونا۔ اس سے اعراض کرنا اور اس کو عذاب دینا۔ اور مخلوق کے غضب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک محمود ہے اور دوسری مذموم ہے۔ اگر دین اور حق کی خاطر بندہ غضب میں آئے تو یہ غضب محمود ہے۔ اور اگر اپنی نفسانی خواہشوں کے پورا نہ ہونے یا ناجائز حکم کے نہ ماننے یا اس کی ممانعت کرنے کی وجہ سے غضب میں آئے تو یہ غضب مذموم ہے۔ (النہایہ ج ۲ ص ۳۳۳ مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۸ھ)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) جو غضب میں آئے تھے وہ اللہ کی نافرمانی اور شرک کی وجہ سے تھا آپ کا یہ غضب محمود تھا۔ انسان جو اپنے ذاتی نقصان کی وجہ سے غضب کرتا ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس غضب کے روکنے اور انتقام نہ لینے کی ترغیب دی ہے۔

غیظ وغضب کو ضبط کرنے اور بدلہ نہ لینے کے متعلق قرآن مجید کی آیات :

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

الذین ینفقون فی السرآء والضرآء والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس واللہ یحب المحسنین

(آل عمران : ۱۳۴)

جو لوگ تنگی اور فراغی (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور غصے کو ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے در گزر کرنے والے ہیں اور نیکوکاروں سے اللہ محبت کرتا ہے۔

والذین یجتنبون کبئر الاثم والفواحش واذا ما غضبوا ھم یغفرون۔

(الشوری : ۳۷)

اور جو لوگ کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جب وہ غضبناک ہوں تو معاف کر دیتے ہیں۔

والذین اذا اصابھم البغی ھم ینتصرون۔ وجزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ۔

(الشوری : ۴۰۔۳۹)

اور جن لوگوں کو (کسی کی) سرکشی پہنچے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ اسی کی مثل برائی ہے اور جس شخص نے معاف کر دیا اور اصلاح کر لی تو اس کا اجر اللہ (کے ذمہ کرم) پر ہے۔

ولمن صبر وغفر ان ذلک لمن عزم الامور۔

(الشوری : ۴۳)

اور جو صبر کرے اور معاف کردے تو بیشک یہ ضرور ہمت کے کاموں سے ہیں۔

غیظ وغضب کو ضبط کرنے اور بدلہ نہ لینے کے متعلق احادیث :

حضرت ابو سعید خدری (رض) نے ایک طویل حدیث روایت کی ہے اس میں غضب کے متعلق آپ کا ارشاد ہے۔

سنو ! غضب ایک انگارہ ہے جو ابن آدم کے پیٹ میں جلتا رہتا ہے کیا تم (غضبناک شخص کی) آنکھوں کی سرخی اور اس کی گردن کی پھولی ہوئی رگوں کو نہیں دیکھتے پس تم میں سے وہ شخص غضب میں آئے وہ زمین کو لازم پکڑے سنو ! بہترین آدمی وہ شخص ہے جو بہت دیر سے غضب میں آئے اور بہت جلد راضی ہو جائے اور بدترین آدمی وہ شخص ہے جو بہت جلد غضب میں آئے اور بہت دیر سے راضی ہو اور جو شخص دیر سے غضب میں آئے اور دیر سے راضی ہو اور جو شخص جلدی غضب میں آئے اور جلدی راضی ہو تو یہ (بھی) اچھی خصلت ہے۔

(مسند احمد ج ۱۰ رقم الحدیث ۱۱۰۸۶ مطبوعہ دار الحدیث قاہرہ ۱۴۱۶ ھ حافظ شاکر نے کہا اس حدیث کی سند حسن ہے سنن الترمذی رقم الحدیث ۲۱۹۸ امام ترمذی نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے سنن ابن ماجہ رقم الحدیث ۴۰۰۰ صحیح ابن حبان ج ۸ رقم الحدیث ۳۲۲۱)۔

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پوچھا : تم لوگ رقوب کسی کو شمار کرتے ہو ؟ ہم نے کہا جس شخص کے ہاں اولاد نہ ہو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا وہ رقوب نہیں ہے رقوب وہ شخص ہے جس کی (نابالغ) اولاد میں سے اس کی زندگی میں کوئی فوت نہ ہو (حتیٰ کہ وہ اس کے لیے فرط اور سلف ہو جائے) پھر فرمایا تم لوگ پہلوان کس کو شمار کرتے ہو ؟ ہم نے کہا کہ جس کو لوگ پچھاڑ نہ سکیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا وہ پہلوان نہیں ہے پہلوان وہ ہے جو غضب کے وقت خود کو قابو میں رکھنے پر قادر ہو۔

(صحیح مسلم البر والصلہ ۱۰۶ (۲۶۰۸) ۶۵۱۸ صحیح البخاری رقم الحدیث : ۶۱۱۴ سنن ابوداؤد رقم الحدیث : ۴۷۷۹ موطا امام مالک رقم الحدیث : ۵۶۵ مسند احمد ج ۴ ص ۲۳۶ الادب المفرد رقم الحدیث : ۱۳۱۷ جامع الاصول ج ۸ رقم الحدیث : ۶۱۹۹)۔

عروہ بن محمد السعدی اپنے باپ سے اور وہ اپنی دادی عطیہ (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا غضب شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ کو صرف پانی سے بجھایا جاتا ہے۔ پس جب تم میں سے کوئی شخص غضبناک ہو تو وہ وضو کرے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث : ۴۷۸۴ مسند احمد ج ۴ ص ۲۲۶ جامع الاصول رقم الحدیث : ۶۲۰۱)

حضرت ابوذر غفاری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص غضب میں آئے اور وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے۔ اگر اس کا غضب دور ہوگیا تو فبہا ورنہ لیٹ جائے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث : ۴۷۸۲ مسند احمد ج ۵ ص ۱۵۲ جامع الاصول رقم الحدیث : ۶۲۰۲)۔

کیونکہ جو شخص کھڑا ہوا ہو وہ اپنے ہاتھ پیر چلانے پر بیٹھے ہوئے شخص کے بہ نسبت زیادہ قادر ہوتا ہے اور بیٹھا ہوا شخص اس کی بہ نسبت کم قادر ہوتا ہے اور لیٹا ہوا شخص اور بھی کم قادر ہوتا ہے۔

حضرت سلیمان بن صرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے وہاں دو شخص ایک دوسرے پر سب وشتم کر رہے تھے اور جب ان میں سے ایک شخص دوسرے کو برا کہہ رہا تھا تو اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مجھے ایک ایسے کلمہ کا علم ہے اگر یہ شخص اس کو پڑھ لے تو اس کا غضب جاتا رہے گا تب ایک شخص اس کے پاس گیا اور کہا تم پڑھو اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم اس نے کہا کیا مجھے کوئی بیماری ہوئی ہے ؟ یا میں مجنون ہوں جاؤ یہاں سے۔

(صحیح مسلم البر والصلہ ۱۰۹ (۲۶۱۰) ۶۵۲۳ صحیح البخاری رقم الحدیث : ۳۲۸۲ سنن ابوداؤد رقم الحدیث : ۴۷۸۱ سنن الترمذی رقم الحدیث : ۳۴۵۹ مسند احمد ج ۶ ص ۳۹۴ الادب المفرد رقم الحدیث : ۴۳۴ جامع الاصول ج ۸ رقم الحدیث : ۶۲۰۳)۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا : مجھے وصیت کیجئے اور مجھے زیادہ احکام نہ بتائیں یا اس نے کہا مجھے حکم دیجئے اور مجھے کم سے کم باتیں فرمائیں تاکہ میں بھول نہ جاؤں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : تم غضب نہ کرو۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث : ۶۱۱۶ سنن الترمذی رقم الحدیث : ۲۰۲۷ موطا امام مالک رقم الحدیث : ۱۶۸۰ مسند احمد ج ۲ ص ۴۶۶ جامع الاصول ج ۸ رقم الحدیث : ۶۲۰۵)۔

حضرت معاذ بن انس جنسی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص اپنے غضب کے تقاضوں کو پورا کرنے پر قادر ہو اور وہ اپنا غضب ضبط کرلے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس شخص کو تمام لوگوں کے سامنے بلائے گا اور اس کو یہ اختیار دے گا کہ وہ جو حور چاہے لے لے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث : ۴۷۷۷ سنن الترمذی رقم الحدیث : ۲۰۲۸ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : ۴۱۸۶ مسند احمد ج ۳ ص ۴۳۸ جامع الاصول ج ۸ رقم الحدیث : ۶۲۰۶)۔

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس نے اپنا غضب دور کیا اللہ تعالیٰ اس سے اپنے عذاب کو دور کردے گا اور جس نے اپنی زبان کی حفاظت کی اللہ تعالیٰ اس کے عیوب پر پردہ رکھے گا۔

(المعجم الاوسط ج ۲ رقم الحدیث : ۱۳۴۲ اس کی سند میں عبدالسلام بن ھاشم ضعیف ہے مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۸ عقیلی نے اس کو ضعفاء میں بیان کیا ہے رقم الحدیث : ۱۱۵)۔

اگر انسان اپنے کسی ذاتی نقصان یا ذاتی معاملہ کی وجہ سے غضب میں آئے تو اس غضب کو ضبط کرنا چاہیے اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے غضب میں آئے تو اس میں غضب کے تقاضے پر عمل کرے اگر اس برائی کو طاقت سے بدل سکتا ہو تو طاقت سے بدلے ورنہ زبان سے اس کی مذمت کرے اور یہ بھی نہ کر سکے تو اس کو دل سے برا جانے۔

تورات کی تختیوں کو زمین پر ڈالنے کی توجیہ :

اس آیت میں فرمایا ہے انھوں نے (تورات کی) تختیاں ڈال دیں۔

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ٦٠٦ ھ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا تورات کی الواح کو زمین پر ڈال دینا ان کے شدت غضب پر دلالت کرتا ہے کیونکہ انسان اس قسم کا اقدام اسی وقت کرتا ہے جب وہ شدت غضب سے مدہوش ہو جائے۔ روایت ہے کہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے تورات کی تختیاں زمین پر ڈالیں تو وہ ٹوٹ گئیں۔ اس کے کل سات اجزاء تھے چھ اس وقت اٹھا لیے گئے اور صرف ایک حصہ باقی رہ گیا۔ جو اجزاء اٹھا لیے گئے ان میں ہر چیز کی تفصیل تھی اور جو ایک حصہ باقی رہ گیا اس میں ہدایت اور رحمت تھی۔

اور کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ قرآن مجید میں صرف یہ ہے کہ انھوں نے تورات کی تختیاں (زمین پر) ڈال دیں۔ رہا یہ کہ انھوں نے تورات کی تختیوں کو اس طرح پھینکا کہ وہ ٹوٹ گئیں یہ قرآن مجید میں نہیں ہے اور یہ کہنا اللہ تعالیٰ کی کتاب پر سخت جرأت ہے اور قسم کا اقدام انبیاء (علیہ السلام) کے لائق نہیں ہے۔

(تفسیر کبیر ج ٥ ص ٣٧٢ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ١٤١٥ ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ١٢٧٠ ھ لکھتے ہیں :

قاضی ناصر الدین نے کہا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے شدت غضب فرط صدمہ اور حمیت دین کی وجہ سے تورات کی تختیوں کو پھینک دیا اور جب انھوں نے وہ تختیاں پھینکیں تو ان میں سے بعض ٹوٹ گئیں۔ علامہ صبغتہ اللہ آفندی نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ حمیت دین کا تقاضا یہ ہے کہ کتاب اللہ کا احترام کیا جائے اور اس سے حفاظت کی جائے کہ وہ گر کر ٹوٹ جائے یا اس میں کوئی نقصان ہو یا اس کی بے حرمتی ہو اور صحیح بات یہ ہے کہ شدت غضب اور فرط غم کی وجہ سے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بے قابو ہو گئے اور غیر اختیاری طور پر ان کے ہاتھوں سے یہ تختیاں گر گئیں اور چونکہ ان سے ترک تحفظ صادر ہوا تھا تو اس ترک تحفظ کو تغلیظا ڈال دینے سے تعبیر فرمایا اور ابرار کی نیکیاں بھی مقربین کے درجہ میں گناہ کا حکم رکھتی ہیں۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں توجیہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس آیت میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے اس فعل پر کوئی عتاب نہیں کیا گیا حتیٰ کہ یہ کہا جائے کہ ان کے ترک تحفظ کو تغلیظا ڈال دینے سے تعبیر فرمایا اور یہ کہا جائے کہ ابرار کی نیکیاں بھی مقربین کے درجہ میں گناہ کا حکم رکھتی ہیں۔ ان آیات میں صرف حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم پر زجر و توبیخ کی گئی ہے اور میرے نزدیک اس مقام کی تقریر یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے شرک کو دیکھا تو وہ حمیت دین کی وجہ سے سخت غضب میں آگئے اور انھوں نے اپنے ہاتھ کو جلد فارغ کرنے کے لیے عجلت سے وہ الواح زمین پر رکھ دیں تاکہ وہ اپنے بھائی کا سر پکڑ سکیں جس کو قرآن مجید نے ڈالنے سے تعبیر فرمایا اور اس میں کسی وجہ سے بھی تورات کی تختیوں کی اہانت نہیں ہے اور وہ جو طبرانی وغیرہ کی روایت میں ہے کہ بعض تختیاں ٹوٹ گئیں تو وہ عجلت سے زمین پر رکھنے کی وجہ سے ٹوٹیں اور یہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی غرض نہ تھی اور نہ ان کو یہ گمان تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ یہاں پر صرف دینی حمیت اور فط غض کی وجہ سے بہ عجلت ان تختیوں کو زمین پر رکھنا مراد ہے اور بعض علماء نے تختیوں کے ٹوٹنے کے واقعہ کا انکار کیا ہے (جیسے امام رازی) ہرچند کہ یہ روایت مسند بزار مسند احمد اور معجم طبرانی وغیرہ میں ہے۔

(روح المعانی جز ٩ ص ٦٧۔ ٦٦ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

حضرت ہارون (علیہ السلام) کو سر کے بالوں سے پکڑ کر کھینچنے کی توجیہ اور دیگر فوائد :

اس کے بعد فرمایا اور اپنے بھائی کے سر (کے بالوں) کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے۔

جو لوگ عصمت انبیاء (علیہ السلام) پر طعن کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کسی شخص کے سر کے بالوں کو پکڑ کر کھینچنا اس شخص کا استخفاف اور اس کی اہانت ہے اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے حضرت ہارون (علیہ السلام) کی اہانت کی اور یہ عصمت کے خلاف ہے اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے حضرت ہارون (علیہ السلام) کا سر پکڑ کر اپنی طرف بہ طور اہانت نہیں کھینچا تھا بلکہ وہ ان کو اپنے قریب کرکے ان سے باتیں کرنا چاہتے تھے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے پھر حضرت ہارون (علیہ السلام) نے یہ کیوں کہا تھا کہ اے میری ماں کے بیٹے بیشک قام نے مجھے بے بس کردیا تھا اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ہارون (علیہ السلام) کو بنو اسرائیل کے جاہلوں اور عاقبت نااندیشوں سے یہ خدشہ تھا کہ وہ یہ گمان کریں گے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام)، حضرت ہارون (علیہ السلام) پر بھی اسی طرح غضب ناک ہیں جس طرح بنو اسرائیل پر ان کی گوسالہ پرستی کی وجہ سے غضب ناک تھے۔ اس لیے انھوں نے کہا اے میری ماں جائے قوم نے مجھے بے بس کردیا تھا اور بچھڑے کی عبادت ترک کرنے میں انھوں نے میرا حکم نہیں مانا۔ میں نے ان کو اس فعل سے روکا تھا لیکن میرے پاس ایسی قدرت نہیں تھی کہ میں ان کو بہ زور اس فعل سے روک دیتا۔ بنو اسرائیل میری بات نہیں سنتے تھے قریب تھا کہ وہ مجھے قتل کردیتے۔ تو آپ ہمارے دشمنوں یعنی بچھڑے کی پرستش کرنے والوں کو خوش ہونے کا موقع نہ دیں اور میرا شمار ان ظالموں میں نہ کیجئے جنھوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی۔ یعنی ان سے مواخذہ کرنے میں مجھے ان کے ساتھ شریک نہ کیجئے۔ تب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے دعا کی: اے میرے رب! مجھے معاف فرما کہ میں نے حمیت دین اور شدت غضب کی وجہ سے یہ اقدام کیا اور میرے بھائی کو معاف فرما کہ انھوں نے بچھڑے کی عبادت کرنے والوں پر ایسی شدت نہیں کی جو ان کو کرنی چاہیے تھی اور ہم کو اپنی رحمت میں داخل فرما بیشک تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے۔

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ٦٦٨ ھ لکھتے ہیں:

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے حضرت ہارون (علیہ السلام) کے سر کو پکڑ کر جو کھینچا تھا اس کی حسب ذیل چار تاویلیں ہیں:

ا۔ کسی کے سر کر پکڑ کر کھینچنا ان کے زمانہ میں متعارف تھا جیسا کہ اب عرب کسی شخص کے اکرام اور اس کی تعظیم کے لیے اس کی دارھی پکڑتے ہیں۔ سو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا ان کے سر کو پکڑ کر کھینچنا بہ طور اہانت نہ تھا۔

٢۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) ان کو قریب کرکے ان سے رازدارانہ بات کرنا چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر توراۃ کی الواح نازل کی ہیں اور انھوں نے اللہ تعالیٰ سے مناجات کی ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ حضرت ہارون (علیہ السلام) نے کہا میرے سر اور میری داڑھی کو نہ پکڑو ورنہ آپ کے اس خفیہ بات کرنے سے بنو اسرائیل کو یہ غلط فہمی ہوگی کہ آپ میری اہانت کررہے ہیں۔

٣۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے شدت غضب سے حضرت ہارون (علیہ السلام) کا سر پکڑ کر اپنی طرف کھینچا کیونکہ ان کا گمان یہ تھا کہ حضرت ہارون (علیہ السلام) نے بنو اسرائیل کو گوسالہ پرستی سے روکنے میں قرار واقعی سختی نہیں کی۔ اور چونکہ ان کا غضب اللہ تعالیٰ کے لیے تھا اس لیے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

٤۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے احوال سنانے کے لیے ان کو اپنے قریب کیا تھا حضرت ہارون (علیہ السلام) کو یہ ناگوار ہوا کیونکہ اس سے بنو اسرائیل کو یہ غلط فہمی ہوسکتی تھی کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) حضرت ہارون (علیہ السلام) سے مواخذہ کررہے ہیں۔ اس لیے انھوں نے اس سلسلہ میں اپنی معذرت پیش کی۔

حسن بصری نے کہا تمام اسرائیلیوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی کیونکہ اگر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت ہارون (علیہ السلام) کے علاوہ اگر کوئی مومن بچا ہوتا تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اس کے لیے بھی دعا کرتے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے لیے دعا کی کیونکہ انھوں نے شدت جذبات کی وجہ سے حضرت ہارون (علیہ السلام) سے کہا تھا:

قال یھرون مامنعک اذرایتھم ضلوا۔ الا تتبعن افعصیت امری۔

(طہ: ٩٣۔ ٩٢)

موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اے ہارون (علیہ السلام)! جب آپ نے ان کو گمراہ ہوتے ہوئے دیکھا تو اس موقع پر میری اتباع کرنے سے آپ کو کیا چیز مانع ہوئی؟ کیا آپ نے میری حکم کی نافرمانی کی۔

اس کی تلافی کرنے کے لیے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ان کے لیے بھی دعا کی۔

حضرت ہارون (علیہ السلام) نے بتایا ان کو اپنی جان کا خطرہ تھا۔ اس لیے انھوں نے اس برائی کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش نہیں کی اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو کسی برائی کے مٹانے میں اپنی جان جانے کا خطرہ ہو وہ صرف زبان سے منع کرنے پر اکتفا کرے اور اس میں بھی جان جانے کا خطرہ ہو تو خاموش رہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ غضب کی وجہ سے احکام نہیں بدلتے کیونکہ ہر چند کہ ان کی حالت غضب کی وجہ سے تورات کی تختیاں ساقط ہوئیں تھیں لیکن پھر بھی اس پر یہ حکم تب ہوا کہ چند تختیاں ان سے اٹھالی گئیں۔

حالت غضب میں طلاق دینے کا شرعی حکم:

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

حافظ ابن قیم حنبلی نے غضبناک شخص کی طلاق کے متعلق ایک رسالہ لکھا ہے اس میں یہ کہا ہے کہ غضبان شخص کی تین قسمیں ہیں ایک یہ کہ اس کو مبادی غضب حاصل ہوں یعنی غضب کی ابتدائی کیفیت ہو اس کی عقل متغیر نہ ہو اور اس کو علم ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیا قصد کر رہا ہے۔ اس قسم میں کوئی اشکال نہیں ہے دوسری قسم یہ ہے کہ وہ انتہائی غضب میں ہو اور اس کو علم نہ ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور نہ اس کا ارادہ ہو۔ اس قسم میں اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس کے اقوال نافذ نہیں ہوں گے اور تیسری قسم وہ ہے جو ان دونوں کے درمیان متوسط ہو بایں طور کہ وہ مجنون کی مثل نہ ہو یہ قسم محل نظر ہے اور دلائل کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے اقوال بھی نافذ نہ ہوں۔ حافظ ابن قیم کا کلام ختم ہوا لیکن صاحب الغایہ حنبلی نے اس تیسری قسم میں حافظ ابن قیم کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ اس میں اقوال نافذ ہوں گے اور اس کی طلاق واقع ہو جائے گی اور یہ ہمارے موقف کے مطابق ہے جیسا کہ ہم نے مدہوش کی بحث میں لکھا ہے۔ (الی قولہ) پس اس مسئلہ میں مدہوش کی تعریف پر اعتماد کرنا چاہیے اور اسی پر حکم دائر کرنا چاہیے۔ اور جس شخص کے اقوال اور افعال میں اکثر وبیشتر خلل رہتا ہو یا بڑھاپے یا بیماری کا کسی آفت کی وجہ سے کسی کی عقل میں خلل آگیا ہو تو جب تک اس کی یہ کیفیت رہے (یعنی الٹی سیدھی باتیں کرتا ہو اور الٹے سیدھے کام کرتا ہو) اس کے اقوال اور افعال کا اعتبار نہیں کیا جائے گا خواہ اس کو اس کو ان اقوال اور افعال کا علم ہو اور اس نے ان کا ارادہ کیا ہو کیونکہ اس کا یہ علم اور ارادہ معتبر نہیں ہے کیونکہ اس کو ادراک صحیح حاصل نہیں ہے۔ آخر میں علامہ شامی نے یہ لکھا ہے کہ جب کوئی شخص شدید غضب کی حالت میں طلاق دے اور بعد میں اس کو یاد نہ رہے کہ اس نے کیا کہا تھا اور دو آدمی یہ گواہی دیں کہ اس نے طلاق دی تھی تو اس کی طلاق واقع ہو جائے گی۔ ہاں اگر اس کی عقل میں خلل ہو اور اس کی زبان پر ایسے الفاظ جاری ہوں جن کو وہ سمجھتا ہو نہ ان کا ارادہ کرتا ہو تو یہ جنون کا اعلیٰ مرتبہ ہے اس میں طلاق واقع نہیں ہو گی اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ والوالجیہ میں مذکور ہے کہ اگر وہ غضب کی ایسی حالت میں ہو کہ اس کی زبان پر ایسے الفاظ جاری ہوں جو اس کو بعد میں یاد نہ رہیں تو دو گواہوں کے قول پر اعتماد کرنا جائز ہے کہ یہ عبادت ہمارے بیان کی صراحتاً تائید کرتی ہے۔

(ردالمحتار ج ۲ ص ۴۲۷ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۴۰۷ھ)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ لکھتے ہیں:

غضب اگر واقعی اس درجہ شدت پر ہو کہ حد جنون تک پہنچادے تو طلاق نہ ہو گی اور یہ کہ غضب اس شدت پر تھا یا تو گواہان عادل سے ثابت ہو یا وہ اس کا دعویٰ کرے اور اس کی یہ عادت مشہور و معروف ہو تو قسم کے ساتھ اس کا قول مان لیں گے ورنہ مجرد دعویٰ معتبر نہیں۔ یوں تو ہر شخص اس ادعا کرے اور غصہ کی طلاق واقع ہی نہ ہو۔ حالانکہ طلاق نہیں ہوتی مگر بحالت غصہ۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۵ ص ۴۳۹ مطبوعہ سنی دارالاشاعت فیصل آباد)

نیز تحریر فرماتے ہیں:

غصہ مانع وقوع طلاق نہیں بلکہ اکثر وہی طلاق پر حامل ہوتا ہے تو اسے مانع قرار دینا گویا حکم طلاق کا راسا ابطال ہے۔ ہاں اگر شدت غیظ وجوش غضب اس حد کو پہنچ جائے کہ اس سے عقل زائل ہو جائے خبر نہ رہے کیا کہتا ہوں زبان سے کیا نکلتا ہے تو بیشک ایسی حالت کی طلاق ہر گز واقع نہ ہو گی۔ (الی قولہ) اور اگر وہ دعویٰ کرے

کہ اس تحریر کے وقت میرا غصہ ایسی ہی حالت کو پہنچا ہوا تھا کہ میری عقل بالکل زائل ہو گئی تھی اور مجھے نہ معلوم تھا کہ میں کیا کہتا ہوں کیا میرے منہ سے نکلتا ہے تو اطمینان بندہ کے لیے اس کا ثبوت گواہان عادل سے دے کہ اگرچہ عنداللہ وہ اپنے بیان میں سچا ہو اور اسے عورت کے پاس جانا دیانۃ روا ہو مگر عورت کو بے ثبوت بقائے نکاح اس کے پاس رہنا ہر گز حلال نہیں ہو سکتا تو ضرور ہوا کہ زید اپنے دعویٰ پر گواہ دے یا اگر معلوم و معروف ہے کہ اس سے پہلے بھی کبھی اس کی ایسی حالت ہو گئی تھی تو گواہوں کی کچھ حاجت نہیں مجرد قسم کھا کر بیان کرے ورنہ مقبول نہیں۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۵ ص ۴۳۳۔ ۴۳۲ مطبوعہ فیصل آباد)

علامہ خیر الدین رملی حنفی متوفی ۱۰۸۱ھ لکھتے ہیں:

شرح الطحاوی سے نقل کر کے تاتار خانیہ میں یہ تصریح کی ہے کہ مدہوش کی طلاق واقع نہیں ہوتی اسی طرح محقق ابن ھمام نے فتح القدیر میں اور علامہ تمر تاشی غزی نے اپنے متن تنویر الابصار میں یہ تصریح کی ہے۔ فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ غیر عاقل کی طلاق واقع نہیں ہوتی سوا اس کے کہ اس کی عقل نشہ کے سبب سے زائل ہو جو کہ معصیت ہے تو اس صورت میں بہ طور سزا اس کی طلاق واقع ہو جائے گی۔ غیر عاقل میں ہر وہ شخص داخل ہے جس کی عقل ان امور سے زائل ہوتی ہو۔ جنون عتہ برسام اغماء (بے ہوشی) اور دھش جنون ایک مشہور بیماری ہے اور عتہ کا معنی ہے کم فہمی اور کلام کا غلط اور صحیح ہونا اور تدبیر کا فساد یہ عقل کے اختلال کی وجہ سے ہوتا ہے کبھی وہ عقل مندوں کی طرح کلام کرتا ہے اور کبھی مجنونوں کی طرح اور برسام ایک بیماری ہے جس میں بیمار ہذیان بکتا ہے (بے سروپا باتیں کرتا ہے) اور دھش کا معنی ہے عقل جاتی رہے بھول اور غفلت کی وجہ سے یا عشق کی وجہ سے اور جس نے مدہوش کی تفسیر حیرت زدہ کی ہے اس نے غلطی کی قاموس میں لکھا ہے کہ مدہوش وہ شخص ہے جس کی عقل ذہول یا عشق کی وجہ سے جاری رہی۔

مجنون کے متعلق حکم یہ ہے کہ جس کے متعلق معلوم ہو کہ اس کو جنون ہو چکا ہے اور اس نے طلاق دی اور اس نے کہا مجھے دوبارہ جنون ہوا اور میں نے طلاق دی تو اس کی قسم کے ساتھ اس کا قول قبول کر لیا جائے گا اور اگر پہلے اس کو جنون نہ ہوا ہو تو اس کا قول قبول نہیں کیا جائے گا۔ خانیہ تاتار خانیہ اور دیگر کتب میں اسی طرح ہے مدہوش کا معاملہ بھی اسی طرح ہے۔ اگر ایک مرتبہ پہلے وہ مدہوش ہو چکا ہے تو قسم کے ساتھ اس کا قول قبول کر لاد جائے گا اور اگر وہ پہلے مدہوش نہیں ہوا تو قضاء اس کا قول قبول نہیں ہوگا ہاں گواہوں کی گواہی سے ثابت ہو جائے گا اور دیانۃً اس کا قول قبول ہو جائے گا۔

(الفتاویٰ الخیریہ علی ھامش الحامدیہ ج ۱ ص ۶۸۔ ۶۷ مطبوعہ کوئٹہ)

شماتت کا معنی اور اس کا شرعی حکم:

اس آیت میں ہے: فلا تشمت بی الاعداء تو آپ مجھ پر دشمنوں کو ہنسنے کا موقع نہ دیں۔

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں۔

شماتت کا معنی ہے دشمن کی مصیبت پر خوش ہونا۔

(المفردات ج ۱ ص ۳۵۱ مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ النہایہ ج ۲ ص ۴۴۶ مطبوعہ دار لکتب العلیہ بیروت)

حضرت واثلہ بن اسقع (رض) بیان کرتے ہیں کہ اپنے (دینی) بھائی کی مصیبت پر خوشی کا اظہار نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا اور تم کو مصیبت میں مبتلا کر دے گا۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۵۱۴)۔

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شماتت اعداء سے محفوظ رہنے کی دعا فرمائی ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بری تقدیر سختیوں کے آنے شماتت اعداء اور سخت مصیبت سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے تھے۔

(صحیح مسلم الذکر ۵۳ (۲۷۰۷) ۶۷۴۷ صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۶۱۶، ۶۳۴۷ سنن النسائی رقم الحدیث: ۵۴۹۱ مسند احمد ج ۲ ص ۱۷۳) (تفسیر تبیان القرآن)

فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ : تو تم مجھ پر دشمنوں کو ہنسنے کا موقع نہ دو۔} شَماتت کا معنی ہے کسی کی تکلیف پر خوش ہونا۔(1)

شماتت کی مذمت:

فی زمانہ دینی اور دنیوی دونوں شعبوں میں شَماتت کے نظارے بہت عام ہیں، مذہبی لوگ اور اسی طرح کاریگر، دوکاندار، کارخانے، فیکٹری یا مل میں ملازمت کرنے والے، یونہی کسی کمپنی، ادارے یا بینک میں جاب کرنے والے، ان کی اکثریت بھی شَماتت یعنی اپنے مسلمان بھائی پر آنے والی مصیبت پر خوش ہونے کے مذموم فعل میں مبتلا نظر آتی ہے اور بعض اوقات تو یوں ہوتا ہے کہ اگر آپس میں کسی وجہ سے ناراضی ہو جائے تو پھر جس سے ناراضی ہوتی ہے اگر وہ یا اس کے گھر میں سے کوئی بیمار ہو جائے، اس کے یہاں ڈاکہ پڑ جائے یا اس کا مال چوری ہو جائے، یا کسی وجہ سے کاروبار ٹھپ ہو جائے، یا حادثہ ہو جائے، یا مُقَدّمہ قائم ہو جائے یا پولیس گرفتار کرلے، یا گاڑی کا نقصان یا چالان ہو جائے، الغرض وہ کسی طرح کی بھی مصیبت میں پھنس جائے تو ناراض ہونے والے صاحب بڑی خوشی کا اظہار کرتے ہیں بلکہ بعض حضرات جو کہ ضرورت سے زیادہ باتونی اور بے عمل ہونے کے باوجود اپنے آپ کو "بڑا پہنچا ہوا" سمجھ بیٹھتے ہیں وہ تو یہاں تک بول پڑتے ہیں کہ دیکھا! ہم کو ستایا تھا نہ تو اس کے ساتھ "ایسا" ہو گیا! گویا وہ چھپی باتوں اور سَربَستہ (یعنی خفیہ) رازوں کے جاننے والے ہیں اور آں بدولت (یعنی اِن) کو اپنے مخالف پر آنے والی مصیبت کے اسباب معلوم ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو چاہیے کہ ذیل میں مذکور روایت اور امام غزالی کے فرمان سے عبرت حاصل کریں، چنانچہ

حضرت واثلہ بن اسقع (رض) سے روایت ہے کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "لَا تُظْهِرِ الشَّمَاتَةَ بِاَخِيْكَ فَيَرْحَمُهُ اللهُ وَيَبْتَلِيْكَ" "اپنے بھائی کی شماتت نہ کر (یعنی اس کی مصیبت پر اظہارِ مَسَرَّت نہ کر) کہ اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے گا اور تجھے اس میں مبتلا کر دے گا۔

حضرت امام محمد بن محمد غزالی (رح) فرماتے ہیں: کہا گیا ہے کہ کچھ گناہ ایسے ہیں جن کی سزا "بُرا خاتمہ" ہے ہم اس سے اللہ عَزَّوَجَلَّ کی پناہ چاہتے ہیں۔ یہ گناہ " ولایت اور کرامت کا جھوٹا دعویٰ کرنا ہے۔(1)

یاد رہے کہ اگر کسی مسلمان کی مصیبت پر دل میں خود بخود خوشی پیدا ہوئی تو اس کا قصور نہیں تاہم اس خوشی کو دل سے نکالنے کی بھرپور سعی کرے، اگر خوشی کا اظہار کرے گا تو شماتت کا مرتکب ہوگا۔ لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ دوسرے مسلمان کی تکلیف پر خوشی کے اظہار سے بچے اور شیطان کے دھوکے میں آکر خود کو "بڑا پہنچا ہوا" نہ سمجھے اور اس سے بچنے کی دعا بھی کرتا رہے۔ حضرت ابوہریرہ (رض) فرماتے ہیں، رسولُ اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سخت مصیبت، بدبختی کے آنے، بری تقدیر اور دشمنوں کے طعن و تشنیع سے پناہ مانگا کرتے تھے۔(2)

{قَالَ: عرض کی۔} یہ دعائے مغفرت امت کی تعلیم کے لیے ہے، ورنہ انبیاء کرام (علیہ السلام) گناہوں سے پاک ہوتے ہیں اس لیے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے بھائی کو اس دعا میں شامل فرمایا حالانکہ ان سے کوئی کوتاہی سرزد نہ ہوئی تھی۔ نیز اس دعا میں حضرت ہارون (علیہ السلام) سے دلجوئی اور قوم کے سامنے ان کے اکرام کا اظہار بھی مقصود تھا۔ (تفسیر صراط الجنان)

آیت مبارکہ:

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝۱۵۱

لغۃ القرآن: [قَالَ : (موسی نے) کہا] [رَبِّ : اے میرے رب] [اغْفِرْ لِيْ : تو بخش دے مجھ کو] [وَلِاَخِيْ : اور میرے بھائی کو] [وَاَدْخِلْنَا : اور تو داخل کر ہم دونوں کو] [فِيْ رَحْمَتِكَ : اپنی رحمت میں] [وَاَنْتَ : اور تو] [اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ : سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے]

ترجمہ: (موسیٰ (علیہ السلام) نے) عرض کیا: اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی کو معاف فرمادے اور ہمیں اپنی رحمت (کے دامن) میں داخل فرمالے اور تو سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے

تشریح: حضرات انبیاء سے بڑھ کر رحمت الٰہی کا قدر شناسا اور اندازہ دان اور کون ہوسکتا ہے۔ صحیح صورت حال کا علم ہوتے ہی معاحضرت موسیٰ (علیہ السلام) کلیم اللہ استغفار و مناجات میں مشغول ہوگئے۔ (تفسیر ماجدی)

یعنی اے اللہ! اگر میں نے اپنے بھائی ہارون پر زیادتی کی ہے تو مجھے اور اگر اس نے اپنے فرض میں کمی کی ہے تو اسے بخش دے کہ تو ارحم الراحمین ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ موسیٰ (علیہ السلام) کا انکسار ہے۔ نہ ہارون (علیہ السلام) نے کوتاہی کی نہ موسیٰ (علیہ السلام) کا ان کے بال کھینچنا گناہ تھا بلکہ وہ خطاء اجتہادی تھا جس پر متجہد کو ایک نیکی ملتی ہے۔ یہاں سے معلوم ہوا اگر والدین اور اساتذہ، اولاد یا شاگردوں کو ضرورت سے زیادہ سزا دیدیں تو قصاص لازم نہیں۔ اور یہیں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص شدت غضب و غصہ سے مغلوب الحال ہو اور اسے معلوم نہ ہو کہ کیا کہہ رہا ہے تو اس حالت میں دی جانے والی طلاق مؤثر نہیں ہے۔ (در مختار جلد 3 صفحۃ 257 مطبوعہ مکتبہ مصطفیٰ البابی قاہرہ مصر) (تفسیر برہان القرآن)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی دعاء مغفرت کی توجیہ:

جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر اپنے بھائی کا عذر واضح ہوگیا اور انھوں نے یہ جان لیا کہ ان پر جو ذمہ داری تھی اس کو پورا کرنے میں انھوں نے کوئی کمی نہیں کی اور جاہل اسرائیلیوں نے جو گوسالہ پرستی کی تھی اس کو روکنے کی انھوں نے ہر ممکن کوشش کی تھی تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے جو سختی سے بازپرس کی تھی اس پر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی اور اپنے بھائی کے لیے معافی چاہی کہ اگر بالفرض ان سے اس سلسلہ میں کوئی کوتاہی ہوئی تو اس کو بھی معاف فرما۔ انبیاء (علیہ السلام) معصوم ہوتے ہیں ان سے کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ صغیرہ نہ کبیرہ۔ لیکن ابرار کی نیکیاں بی مقربین کے نزدیک گناہ کا حکم رکھتی ہیں اس لیے وہ استغفار کرتے ہیں۔ نیز ان سے جو اجتہادی خطا سرزرد ہوتی ہے اس پر بھی استغفار کرتے ہیں ہر چند کہ اجتہادی خطا پر مواخذہ نہیں ہوتا بلکہ ایک اجر ملتا ہے لیکن وہ مقام عالی کے پیش نظر اس پر بھی استغفار کرتے ہیں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے پہلے اپنے لیے دعا کی پھر اپنے بھائی کے لیے دعا کی اس میں اسلوب دعا کی تعلیم ہے کہ پہلے اپنے لیے دعا کرے تاکہ یہ ظاہر ہو کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت کا سب سے زیادہ محتاج ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

حضرات انبیائے کرام کی شان عبدیت ورجوع الی اللہ:

یعنی جب آپ کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا اور یہ امر واضح ہوگیا کہ حضرت ہارون کا اس معاملے میں کوئی قصور نہیں تھا تو آپ فوراً اپنے خالق ومالک کی طرف متوجہ ہوگئے تاکہ اس طرح اپنے بھائی کو بھی راضی کرسکیں اور اعداء کو شماتت کا موقع بھی نہ ملنے پائے۔ اور ان کے بارے میں جس سوئے ادب کا ارتکاب کیا تھا اس کی معافی بھی ہوجائے۔ سو آپ نے اپنے رب کے حضور عرض کیا کہ "میری بھی بخشش فرمادے اور میرے بھائی کی بھی" اگر ان سے کوئی لغزش و کوتاہی سرزد ہوگئی ہو۔ اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرمادے۔ سو یہی شان ہوتی ہے حضرات انبیائے کرام کی کہ وہ ایسے موقع پر فوراً اپنے رب کی طرف رجوع کرلیتے ہیں۔ سو صورت معاملہ کے ظاہر اور حضرت ہارون کی بے قصوری کے واضح ہوجانے کے بعد حضرت موسیٰ نے اپنے لیے اور اپنے بھائی کیلئے بخشش کی دعا کی۔ علی نبینا وعلیہما الصلاۃ والسلام

رحمت خداوندی میں داخلے کی دعا:

سو آنجناب نے حضرت حق۔ جل مجدہ۔ کی بارگہ اقدس واعلیٰ میں مزید عرض کیا "اور داخل فرمادے ہمیں اپنی رحمت میں کہ تو ہی ہے ارحم الراحمین" اور ہم سب تیری ہی رحمت کے محتاج ہیں۔ اور دنیا میں جہاں بھی کہیں رحمت کا کوئی نمونہ و مظہر پایا جاتا ہے وہ درحقیقت تیری ہی طرف سے ہوتا ہے اے ہمارے مالک۔ پس ہمیں ہمیشہ اپنی رحمتوں اور عنایتوں کے سائے میں رکھنا کہ تیری رحمت و عنایت کے ظل ظلیل کے ہم ہمیشہ اور ہر حال میں محتاج ہیں۔ سو یہ ہوتی ہے حضرات انبیائے کرام کی شان عبدیت۔ اور رجوع الی اللہ۔ کہ وہ ہر موقع پر اس کے حضور اپنے دست دعاء وسوال دراز کردیتے ہیں۔ (علیہ السلام)۔ سو اس آیت کریمہ نے معاملہ کو پوری طرح واضح کردیا کہ حضرت ہارون (علیہ السلام) کا دامن ہر طرح سے پاک تھا۔ اور اس پر کوئی شائبہ اور داغ دھبہ اس بارے موجود نہیں تھا۔ انھوں نے اپنے بس کی حد تک گوسالہ پرستی کے اس جرم کی تردید وانکار میں کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ جبکہ بائبل کے مصنفوں نے اس کا الزام حضرت ہارون ہی پر رکھا۔

والعیاذ باللہ العظیم۔ سو اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قرآن حکیم کے دنیا پر کتنے احسانات ہیں اور اس نے گزشتہ انبیاء و رسل کی بھی کس کس طرح صفائی پیش فرمائی ہے۔ والحمد للہ جل وعلا بکل حال من الاحوال ۔۔(تفسیر مدنی کبیر)

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ دوسروں کے لیے استغفار کا طریقہ بھی یہی ہے کہ اپنی ذات کے لیے اوّل استغفار کیا جائے تاکہ اپنے نفس کو پاک سمجھنے کا شبہ بھی باقی نہ رہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ گناہ دعا کو قبول ہونے سے روکتے ہیں اس لیے سب سے پہلے اپنے گناہوں کی معافی کی درخواست کی جائے اس کے بعد کوئی دعا کی جائے یہی وجہ ہے کہ جنازہ کی (نماز کی) دعا میں اللھم اغفر لحینا ومیتنا آتا ہے۔ زندوں کا ذکر مردوں سے پہلے آتا ہے کیونکہ دعا کرنے والا زندہ ہی ہوتا ہے اور اہل قبور کی دعا میں بھی یغفر اللّٰہ لنا و لکم آتا ہے۔ مخاطب سے پہلے متکلم کا ذکر کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگرچہ معصوم تھے آپ سے کسی گناہ کا صدور ہی نہ ہوتا تھا لیکن امت کی تعلیم کے لیے اللہ نے اپنے نبی کو خطاب کرکے فرمایا:

واستغفر لذنبک وللمومنین والمؤمنت۔ وادخلنا فی رحمتک یعنی دنیا میں ہم کو معصوم رکھ اور آخرت میں ہم پر رحم فرما اور دونوں جہان میں ہم کو ترقی درجات عنایت کروانت ارحم الراحمین یعنی تو سب سے زیادہ ہم پر مہربان ہے یہاں تک کہ جتنے مہربان ہم اپنے اوپر ہیں اس سے بھی زیادہ تو ہم پر مہربان ہے۔ (تفسیر مظہری)

آیت مبارکہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ۝۱۵۲

لغۃ القرآن: [اِنَّ : بیشک] [الَّذِيْنَ : جن لوگوں نے] [اتَّخَذُوا : بنایا] [الْعِجْلَ : بچھڑے کو (الہ)] [سَيَنَالُهُمْ : ان کو پہنچے گا] [غَضَبٌ: ایک غضب] [مِّنْ رَّبِّهِمْ : ان کے رب (کی طرف) سے] [وَذِلَّةٌ: اور کچھ ذلت] [فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا : دنیا کی زندگی میں] [وَكَذٰلِكَ : اور اس طرح] [نَجْزِي : ہم سزا دیتے ہیں] [الْمُفْتَرِيْنَ : بہتان باندھنے والوں کو]

ترجمہ: بیشک جن لوگوں نے بچھڑے کو (معبود) بنالیا ہے انھیں ان کے رب کی طرف سے غضب بھی پہنچے گا اور دنیوی زندگی میں ذلت بھی، اور ہم اسی طرح افترا پردازوں کو سزا دیتے ہیں

تشریح: جن لوگوں نے بچھڑے کی پرستش کی ان کی سزا۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) جب استغفار سے فارغ ہوئے تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق مشرکین کی سزا کا یہ فیصلہ کیا کہ جن لوگوں نے بچھڑے کی پرستش کی ہے ان کی سزا یہ ہے کہ ان کے قریبی عزیز ان کی گردنیں اڑادیں۔ اس کی تفصیل "سورۃ البقرہ" کی آیت ۵۴ میں بیان ہوچکی ہے۔ ان پر دنیا میں اللہ کا یہ غضب ہوا کہ اپنے ہی اعزاء و اقرباء کے ہاتھوں مارے گئے۔ جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں انھیں ایسی ہی سزا ہوتی ہے کیونکہ انھوں نے دین اور ثواب کا جھانسہ دے کر ایک دوسرے کو گمراہ کیا تھا۔ اس مقام پر امام رازی (رض) نے امام مالک بن انس (رح) کا قول نقل کیا ہے کہ جو شخص اپنی طرف سے کوئی مسئلہ گھڑتا ہے یا شریعت سازی کرتا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول پر جھوٹ باندھتا ہے۔ یہاں اس سزا کے مستحق جو لوگ بیان کیے گئے ہیں دو قسم کے ہیں۔

۱۔ جو موسیٰ (علیہ السلام) کی کوہ طور سے واپسی سے پہلے فوت ہوگئے انھیں قیامت کو سزا ملے گی۔

۲۔ جو زندہ تھے انھیں دنیا میں ہی موحدین کے ہاتھوں سزا دلوا کر معاف کردیا گیا۔

مشرکین کی سزا بیان کرنے کے بعد توبہ کے لیے عام اصول بیان کیا جارہا ہے کہ بیشک شرک جیسا عظیم گناہ ہی کیوں نہ ہو۔ جو سچے دل کے ساتھ توبہ کریں اور آئندہ کے لیے اپنی اصلاح کرلیں ان کے گناہ معاف کردیے جائیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا نہایت ہی مہربان ہے۔

(عَنْ اَنَسٍ (رض) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اَللّٰہُ اَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَۃِ عَبْدِہٖ حینَ یَتُوْبُ اِلَیْہِ مِنْ اَحَدِکُمْ کَانَتْ رَاحِلَتُہٗ بِاَرْضِ فَلَاۃٍ فَانْفَلَتَتْ مِنْہُ وَعَلَیْھَا طَعَامُہٗ وَشَرَابُہٗ فَاَیِسَ مِنْھَا فَاَتٰی شَجَرَۃً فَاضْطَجَعَ فِیْ ظِلِّھَا قَدْ اَیِسَ مِنْ رَّاحِلَتِہٖ فَبَیْنَمَا ھُوَ کَذٰلِکَ اِذْ ھُوَ بِھَا قَآءِمَۃٌ عِنْدَہٗ فَاَخَذَ بِخِطَامِھَا ثُمَّ قَالَ مِنْ شِدَّۃِ الْفَرَحِ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ عَبْدِیْ وَاَنَا رَبُّکَ اَخْطَاَ مِنْ شِدَّۃِ الْفَرَحِ۔) [مسلم]

”حضرت انس (رض) روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کوئی اللہ کا بندہ جب توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کرنے سے اس شخص سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جس کی سواری اس کے کھانے پینے کے سامان کے ساتھ کسی بے آب وگیاہ میدان میں گم ہو گئی ہو۔ وہ اس کی تلاش سے مایوس ہو کر ایک درخت کے سائے تلے لیٹ جائے۔ مایوسی کے بعد اچانک اس سواری کو اپنے سامنے کھڑا پائے۔ اس کی لگام تھامتے ہوئے اور انتہائی خوشی سے پکار اٹھے۔ اے اللہ ! تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا پروردگار ہوں۔ اس بے پناہ خوشی کی وجہ سے بےساختہ اتنی بری بات کہہ دیتا ہے۔ (تفسیر فہم القرآن)

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کا ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ بچھڑا پوجنے والے لوگ ہیں جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے کوہ طور سے واپس آنے سے پہلے ہی مر گئے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ یہودی ہیں کہ جنہوں نے بچھڑے کو پوجا اور بعد میں توبہ نہ کی۔ (1) تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے قتل ہو کر اللہ عَزَّوَجَلَّ کی بارگاہ میں توبہ کی۔ اس صورت میں غضب سے مراد قتل ہونا اور ذلت سے مراد گمراہی کا اعتراف کرنا اور قتل ہونے کا حکم تسلیم کرنا ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ اس سے مراد سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے کے یہودی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں ”یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضور سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پایا اور ان کے آباء واَجداد بچھڑے کی پوجا کرتے تھے اور غضب سے مراد آخرت کا عذاب اور دنیا میں ذلت سے مراد جزیہ دینا ہے۔ عطیہ عوفی کا قول ہے کہ ”غضب سے مراد بنو نضیر اور بنو قریظہ کا مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہونا اور ذلت سے مراد انھیں حجاز سے جلاوطن کرنا ہے۔ (2)

{ وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ : اور ہم بہتان باندھنے والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ } یعنی جس طرح ہم نے ان بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کو بدلہ دیا اسی طرح ہم ہر اس شخص کو بدلہ دیں گے جو اللہ عَزَّوَجَلَّ پر جھوٹ باندھے اور غیر خدا کی عبادت کرے۔ ابوقلابہ کہتے ہیں ”اللہ کی قسم ! یہ قیامت تک ہر بہتان باندھنے والے کی جزاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ذلیل کرے گا۔ حضرت سفیان بن عیینہ (رح) فرماتے ہیں ”یہ سزا قیامت تک آنے والے ہر بدعتی کے بارے میں ہے۔ حضرت مالک بن انس (رض) فرماتے ہیں ”ہر بدعتی اپنے سر کے اوپر سے ذلت پائے گا پھر یہی آیت تلاوت فرمائی۔ (3)

بدعت کی تعریف :

بدعت کے لغوی معنی ہیں نئی چیز اور بدعت کے شرعی معنی ہیں وہ عقائد یا وہ اعمال جو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ظاہری حیات کے زمانہ میں نہ ہوں بعد میں ایجاد ہوئے ہوں۔

بدعت کی اقسام :

بنیادی طور پر بدعت کی دو قسمیں ہیں (1) بدعتِ حَسنہ (2) بدعتِ سَیِّہ۔ بدعتِ حسنہ یہ ہے کہ وہ نیا کام جو کسی سنت کے خلاف نہ ہو۔ اور بدعت سیہ یہ ہے کہ دین میں کوئی ایسا طریقہ ایجاد کرنا کہ جس کی اصل کتاب وسنت میں نہ ہو اور اس کی وجہ سے شریعت کا کوئی حکم تبدیل ہو رہا ہو۔ (تفسیر صراط الجنان)

توبہ قبول کرنے کے باوجود بنو اسرائیل پر عذاب کی وعید کی توجیہ :

اس جگہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ بچھڑے کی عبادت کرنے والوں کی توبہ اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی تھی جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے۔

واذ قال موسیٰ لقومہ یقوم انکم ظلمتم انفسکم باتخاذکم العجل فتوبوا الی بارءکم فاقتلوا انفسکم ذلکم خیر لکم عند بارءکم فتاب علیکم انہ ھو التواب الرحیم۔ (البقرہ : ۵۴)

اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! بیشک تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا پس تم اپنے خالق کی طرف توبہ کرو سو ایک دوسرے کو قتل کرو یہ تمہارے خالق کے نزدیک تمہارے لیے بہتر ہے تو اس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی۔ بیشک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا ہے حد رحم فرمانے والا۔

اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی تھی یا اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ اس نے ان کی توبہ قبول فرما لینی ہے پھر یہ کس طرح فرمایا کہ یہ لوگ اپنے رب کے عذاب میں مبتلا ہوں گے اس سوال کے متعدد جواب ہیں۔

۱۔ اس آیت کا مصداق وہ لوگ ہیں جو توبہ کا حکم نازل ہونے سے پہلے یا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی طور سے واپسی سے پہلے مر چکے تھے۔

۲۔ اس آیت کا مصداق عام بنی اسرائیل ہیں اور عذاب سے مراد دنیاوی عذاب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ عنقریب اپنے رب کے عذاب میں مبتلا ہوں گے اور اس عذاب سے مراد انھیں یہ حکم دینا تھا کہ دینا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کریں۔

۳۔ اس آیت کے مصداق وہ یہودی ہیں جو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں تھے کیونکہ جس طرح آباء کے محاسن ابناء کے لیے باعث فخر ہوتے ہیں اسی طرح آباء کے عیوب ابناء کے لیے باعث عار ہوتے ہیں اور اس زمانہ کے یہودی بھی اپنے ان آباء کو مانتے تھے اس لیے ان کے متعلق فرمایا کہ وہ عنقریب اپنے رب کے عذاب میں مبتلا ہوں گے اور دنیا کی زندگی میں ذلت میں گرفتار ہوں گے۔

بدعت سیہ کی تعریف:

اس آیت کے آخر میں فرمایا ہے ہم افتراء کرنے والوں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں ان کا افترا یہ تھا کہ انھوں نے بچھڑے کو معبود قرار دیا جو شخص دین میں کوئی ایسا طریقہ ایجاد کرتا ہے جس کی اصل کتاب اور سنت میں نہ ہو اور وہ شریعت کے کسی حکم کا مغیر ہو اور اس طریقہ کو کار ثواب قرار دیتا ہو وہ شخص اللہ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر افتراء کرتا ہے اس لیے امام مالک بن انس نے بدعتی کو مفتری فرمایا اور اس آیت کو پڑھا۔

علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں کہ امام مالک بن انس رحمتہ اللہ نے فرمایا ہر بدعتی کے سر پر ذلت ہو گی اور پھر انھوں نے اس آیت کی تلاوت کی۔ (الجامع الاحکام القرآن جزء ۷ ص ۲۶۲ مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۵ھ)

ہم نے بدعت کی جو تعریف کی وہ بدعت سیہ کی تعریف ہے اور اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے شہداء کربلا پر ماتم کرنے اور نوحہ کرنے کو شیعہ باعث اجر و ثواب کہتے ہیں یا پیروں کو دھونے کی بجائے پیروں پر مسح کرنے کو کار ثواب کہتے ہیں اور چند صحابہ (رض) کے سوا باقی صحابہ (رض) کرام کو تبرا کرتے ہیں اور اس کو ثواب کا کام کہتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ میلاد النبی اور بزرگوں کے لیے ایصال ثواب اور عرس وغیرہ کو بغیر شرعی دلیل کے حرام کہتے ہیں اور ان کو عرفی تعین کے ساتھ بہ طور استحباب کرنے کو بھی بدعت ناجائز اور حرام کہتے ہیں ان امور مستحبہ کو حرام کہنا بھی شریعت پر افتراء اور بدعت سیہ ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

حضرت سید المفسرین ابن عباس (رض) فرماتے ہیں کہ رجفہ میں یعنی زلزلہ میں گھرنے کا سبب یہ تھا کہ جب قوم نے بچھڑا ڈھالا اور اسے پوجا تھا تو یہ بھی ان کے ساتھ رہے تھے جدا نہیں ہوئے تھے۔ (خازن)

میقات میں حاضر ہونے سے قبل تاکہ بنی اسرائیل ان کی ہلاکت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور انھیں موسیٰ (علیہ السلام) پر قتل کی تہمت لگانے کا موقع نہ ملے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کی اے میرے رب تو چاہتا تو انھیں پہلے مع میرے ہلاک کر دیتا کیا تو ہمیں اس فعل کی وجہ میں ہلاک فرمائے گا جو ہم میں سے بے عقلوں نے کیا وہ تو نہیں مگر تیرا آزمانا ہے گمراہ کرے اس سے جسے چاہے اور ہدایت دے جسے چاہے تو ہمارا مالک ہے تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو سب سے بہتر بخشنے اور ہمارے لیے لکھ دے اس دنیا میں بھلائی یعنی ہمیں ہلاک نہ کر اور اپنا لطف و کرم فرما اور ہمیں توفیق اطاعت بخش اور آخرت میں بھی بھلائی دے بیشک ہم تیری طرف رجوع لائے۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے میرا عذاب جسے میں چاہوں دوں اس لیے کہ سب کائنات میری مخلوق ہے اور سب میرے بندے ہیں کسی کو مجھ پر اعتراض کرنے کی مجال نہیں اور میری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے یعنی دنیا میں نیک و بد سب ہی ہیں اور سب ہی پر میری رحمت ہے تو عنقریب لکھ دوں گا نعمتوں کو ان کے لیے جو ڈرتے اور زکوۃ دیتے ہیں اور ان کے لیے جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔

اور وہ جو پیروی کریں گے ہمارے رسول امی کی یہاں لفظ نبی اس لیے خاص طور پر استعمال فرمایا گیا کہ امی عام طور پر بے پڑھا ہوتا ہے مگر یہ رسول نبی امی ہیں یعنی بغیر پڑھے خبریں دینے والے باخبر کو کہتے ہیں نبی خبر دینے والے کو ایسے نبی کو جسے لکھا پائیں گے اپنے پاس توراۃ اور انجیل میں یعنی توراۃ و انجیل میں آپ کی نعت اور صفت لکھی پائیں گے۔

حضرت عطاء بن یسار (رض) نے حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وہ اوصاف بیان کئے جو توراۃ میں مذکور ہیں اس کے بعد انھوں نے پڑھنا شروع کیا۔

اے نبی ہم نے تجھے بھیجا شاہد و مبشر و نذیر اور امیوں کا نگہبان بنا کر تم میرے بندے اور میرے رسول ہو میں نے تمہارا نام متوکل رکھا نہ بد خلق نہ بدمزاج نہ بازاروں میں آواز بلند کرنے والے نہ برائی کو برائی سے دفع کرو یعنی خطاکاروں کو معاف کرتے ہو اور ان پر احسان فرماتے ہو اللہ تعالیٰ تمہیں نہ اٹھائے گا جب تک کہ تمہاری برکت سے ٹیڑھی ملت کو سیدھا اس طرح نہ فرما دے کہ صدق دل سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پکارنے لگیں اور تمہاری بدولت اندھی آنکھیں بینا اور بہرے کان شنوا اور پردوں میں لپٹے ہوئے دل کشادہ ہو جائیں۔

حضرت کعب احبار (رض) سے توراۃ میں حضور کی صفات پر یہ مضمون بھی منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی صفت میں فرمایا کہ میں انھیں ہر خوبی کے قابل کروں گا اور ہر خلق کریم انھیں عطا فرماؤں گا اور اطمینان قلب و وقار کو ان کا لباس بناؤں گا اور اطاعت و احسان کو ان کا شعار کروں گا۔ اور تقویٰ ان کا ضمیر اور حکمت ان کا راز اور صدق و وفا ان کی طبیعت اور عفو و کرم ان کی عادات اور عدل ان کی سیرت اور اظہار حق ان کی شریعت اور ہدایت ان کا امام اور اسلام ان کی ملت بناؤں گا احمد ان کا نام ہے۔

اسی کے ہم معنی علامہ آلوسی (رح) نے روح المعانی میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صفات انجیل و زبور سے نقل کی ہیں۔ نقل کو ان کے صدقے میں گمراہی کے بعد ہدایت اور جہالت کے بعد علم و معرفت اور گمنامی کے بعد دولت اور تفرقے کے بعد ہدایت و محبت عنایت کروں گا اور انھیں کی برکت سے میں مختلف قبائل غیر مجتمع خواہشوں اور اختلاف رکھنے والے دلوں میں الفت پیدا کروں گا اور ان کی امت کو تمام امتوں سے بہتر کروں گا۔

ایک اور حدیث میں توراۃ سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے یہ اوصاف منقول ہیں۔ میرے بندے ان کی جائے ولادت مکہ مکرمہ اور جائے ہجرت مدینہ طیبہ ہے ان کی امت اس حال میں اللہ کی حمد کرنے میں سب سے زیادہ ہو گی۔

علاوہ ازیں کتب الٰہیہ عزوجل حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صفت و نعت سے مملو ہیں۔ باآں کہ اہل کتاب ان میں اپنی کتابوں سے تراش خراش کرتے رہے ہیں اور ان کی سعی ہمیشہ اسی کام میں ہوتی رہی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نعت ان کی کتابوں سے نکال دی جائے۔ لیکن کافی تبدیلیاں کر لینے کے باوجود بائیبل میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نعت و صفت اور بشارت کا کچھ نہ کچھ نشان ٹل جاتا ہے۔

یہاں رسول اور امی نبی سے مراد بہ اجماع مفسرین سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں اور آپ کا ہی ذکر اور وصف رسالت سے کیا گیا اس لیے کہ آپ کی ذات مقدس مخلوق اور اللہ تعالیٰ کے مابین واسطہ ہے۔ فرائض رسالت ادا فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اوامر و مناہی اور شرائع و احکام اس کے بندوں کو پہنچاتے ہیں اور اسی لحاظ سے رسول النبی الامی فرمایا گیا۔ اس لیے کہ ابناء اس خبر کو کہتے ہیں جو مفید علم ہو اور اس میں شائبہ کذب بھی نہ ہو۔ چنانچہ قرآن کریم میں یہ لفظ ایسے ہی معنی میں بکثرت مستعمل ہوا ہے۔ حیث قال اور لفظ نبی قرآن کریم میں تقریباً تیس جگہ استعمال ہوا ہے۔ سب جگہ غیبی خبر دینے والے کے ہی معنی بنتے ہیں اور نبی قرآن کریم میں پانچ جگہ استعمال ہوا وہاں بھی یہی معنی بنتے ہیں۔ نبی نہ صرف ایک جگہ نبی، دو جگہ نبینا ایک جگہ نبی نہ ایک جگہ نبین تیرہ مقام پر ان سب جگہ میں یہی معنی ہیں۔ مزید وضاحت کے لیے پارہ اور رکوع کا حوالہ پیش ہے۔

نبا۔ سے قرآن کریم میں نبو۔ نبئھم نبین بارہ طریقہ سے استعمال ہوا ہے سب جگہ معنی خبر مفید للعلم کے لیے ہی استعمال ہے۔

پھر یہ لفظ یا فاعل کے معنی میں ہوگا یا مفعول کے معنی دے گا۔ فاعل کے معنی دینے کی صورت میں غیب کی خبر دینے والا بنیں گے۔ مفعول کے معنی دینے کی صورت میں غیب کی خبریں دیئے ہوئے ہوں گے۔ اور دنوں معنوں کو قرآن کریم کی تائید حاصل ہے۔ پہلے معنی میں نبئ عبادی موجود ہے۔

قل او نبئکم اور انبئکم بما تاکلون وماتدخرون موجود ہے۔ دوسرے معنی میں نبانی العلیم الخبیر موجود ہے۔

اور حقیقت میں ہر نبی غیب کی خبریں دینے والا ضرور ہے۔ تفسیر خازن میں ہے کہ آپ کی وصف میں نبی فرمایا وہ اس لیے کہ نبی ہونا ہی مراتب علیا اور شرف عظمیٰ کو مستلزم ہے اور یہ لفظ نبی اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک غایت درجہ بلند ہیں اور یہ امر بھی اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ عزوجل کے مقربین خاص میں سے نبی ہی وہ مختار درجہ رکھتا ہے جو اس کی طرف خبر دے۔

اور نبی کے ساتھ امی فرمانا اس بناء پر ہے کہ امی ہونا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزات سے ہے۔ بقول سید المفسرین ابن عباس (رض) آپ فرماتے ہیں کہ یہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا معجزہ ہے کہ دنیا میں کسی کے آگے کبھی زانوئے تلمذ تہ نہیں فرمایا اور کتاب ایسی لائے کہ جس میں اولین وآخرین کے علوم اور غیوب ہیں۔ (خازن)

کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

امی و دقیقہ دان عالم بے سایہ و سائبان عالم

خاکی براوج عرش منزل امی و کتاب خانہ دردل

پھر یہ امر بھی یہاں واضح ہو جاتا ہے کہ نبی عام ہے اور رسول صرف چار ہیں یعنی و عیسیٰ، داؤد، نبی الانبیاء علیہم الصلوۃ والسلام میں مخصوص ہے اور نبیوں کی تعداد بعض روایات سے ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے مگر رسول صرف اور صرف چار ہی ہیں اور رسول کا نبی ہونا ضروری ہے اور نبی کا رسول ہونا ضروری نہیں ہے۔ (تفسیر الحسنات)

آیت مبارکہ:

وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا ۡ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۵۳

لغۃ القرآن: [وَالَّذِيْنَ : اور جنھوں نے] [عَمِلُوا : عمل کیے] [السَّيِّاٰتِ : برائیوں کے] [ثُمَّ : پھر] [تَابُوْا : انہوں نے توبہ کی] [مِنْۢ بَعْدِهَا : ان کے بعد] [وَاٰمَنُوْٓا : اور ایمان لائے] [اِنَّ : بیشک] [رَبَّكَ : آپ کا رب] [مِنْۢ بَعْدِهَا : اس کے بعد (یعنی باوجود)] [لَغَفُوْرٌ: بخشنے والا] [رَّحِيْمٌ: رحم کرنے والا]

ترجمہ: اور جن لوگوں نے برے کام کئے پھر اس کے بعد توبہ کرلی اور ایمان لے آئے (تو) بیشک آپ کا رب اس کے بعد بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے

تشریح:

اللہ کی رحمت بے پایاں کا ذکر ہے۔ آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص نے گناہ کا کوئی پہلو نہ چھوڑا یعنی کفر تک کاارتکاب کیا، پھر اس نے اللہ عَزَّوَجَلَّ کی بارگاہ میں اپنے تمام گناہوں سے سچی توبہ کرلی اور ایمان لایا اور اس توبہ پر قائم رہا تو اللہ تعالیٰ اس کے سب گناہ بخش دے گا اور اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔ (1)

اس کی رحمت بے پایاں اور اس کی بخشش بیکراں پر قربان ! کوئی کتنا ہی قصور وار اور خطاکار ہو اس کے در کرم پر حاضر ہو جائے تو اسے بھی محروم لوٹا نہیں دیا جاتا۔ اس آیت میں اس مقام پر ان ربکَ (اے مصطفیٰ! تیرا پروردگار) کے الفاظ کتنے پیارے اور کتنے معنی خیز ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

اس آیت سے ثابت ہوا کہ گناہ خواہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ جب بندہ ان سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی اپنے فضل و رحمت سے ان سب کو معاف فرماتا ہے۔

توبہ کے فضائل :

کثیر احادیث میں بھی گناہوں سے سچی توبہ کی قبولیت اور اس کے فضائل بیان کئے گئے ہیں، ترغیب کے لیے ان میں سے دو احادیث درج ذیل ہیں۔

(1)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، سرکارِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "اگر تم اتنے گناہ کرو کہ وہ آسمان تک پہنچ جائیں اور پھر تم اللہ عَزَّوَجَلَّ کی بارگاہ میں توبہ کرو تو اللہ عَزَّوَجَلَّ تمہاری توبہ قبول فرمالے گا۔ (1)

(2)۔۔ حضرت انس (رض) سے روایت ہے، تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ پر اس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جیسے تم میں سے کسی کا اونٹ جنگل میں گم ہونے کے بعد دوبارہ اسے مل جائے (2)۔ (3)

رحمتِ الٰہی کی وسعت :

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ذکر ہوا، اس مناسبت سے یہاں اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کے بیان پر مشتمل ایک حدیث پاک ملاحظہ فرمائیں، چنانچہ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، حضور پُر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا : "اللہ تعالیٰ کے پاس سو رحمتیں ہیں۔ ان میں سے ایک رحمت اس نے جن واِنس، حیوانات اور حشرات الارض میں نازل کی جس سے وہ ایک دوسرے پر شفقت اور رحم کرتے ہیں، اسی سے وحشی جانور اپنے بچوں پر رحم کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ننانوے رحمتیں بچار کھی ہیں، ان سے قیامت کے دن اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔ (تفسیر صراط الجنان)

توبہ کی حقیقت اور اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا عموم اور شمول :

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے برے عمل کیے پہلے وہ ان پر توبہ کرے بایں طور کہ ان برے اعمال پر نادم ہو اور ان سے رجوع کرے اور آئندہ ان برے کاموں کو نہ کرنے کا عزم صمیم کرے اور ان کا تدارک اور تلافی کرے مثلاً جو نمازیں اور روزے رہ گئے ہیں ان کو قضا کرے۔ اگر کسی کا مال غضب کیا تھا تو اس کو واپس کرے پھر کلمہ پڑھے اور یہ تصدیق کرے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے گا اور اس پر رحم فرمائے گا۔

اس آیت میں یہ تصریح ہے کہ توبہ سے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں تو جو شخص اپنے تمام گناہوں سے توبہ کرے وہ اللہ تعالیٰ کو بخشنے والا مہربان پائے گا اس آیت میں گنہگاروں کے لیے بہت بڑی بشارت ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے گناہ کی پھر کہا اے اللہ ! میرے گناہ کو بخش دے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا میرے بندہ نے گناہ کیا اور اس کو علم تھا کہ اس کا رب گناہ کو بخشتا بھی ہے اور گناہ پر گرفت بھی فرماتا ہے۔ اس نے پھر دوبارہ گناہ کیا اس کے بعد کہا اے میرے رب میرے بناہ کو بخش دے۔ پس اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا میرے بندہ نے گناہ کیا اور اس کو علم تھا کہ اس کا رب گناہ کو بخشتا بھی ہے اور گناہ پر گرفت بھی فرماتا ہے۔ اس نے پھر سہ بارہ گناہ کیا اور کہا اے میرے رب میرے گناہ کو بخش دے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا میرے بندہ نے گناہ کیا اور اس کو علم تھا کہ اس کا رب گناہ کو بخشتا بھی ہے اور گناہ پر گرفت بھی کرتا ہے (اے میرے بندے) تو جو عمل چاہے کر میں نے تجھ کو بخش دیا۔

(صحیح مسلم التوبہ ٢٩ (٢٧٥٨) ٥٨٥٢ صحیح البخاری رقم الحدیث : ٧٥٠٧ مسند احمد ج ٢ ص ٢٩٦ مسند احمد ج ٢ ص ٤٠٥ جامع الاصول ج ٨ رقم الحدیث : ٥٨٧٦)۔

علامہ ابوالعباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی المالکی المتوفی ٦٥٦ لکھتے ہیں :

یہ حدیث استغفار کے عظیم فائدہ پر دلالت کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل عظیم اس کی وسعت اس کی رحمت اس کے حلم اور اس کے کرم پر دلالت کرتی ہے اور اس حدیث میں استغفار سے یہ مراد نہیں ہے کہ انسان صرف زبان سے استغفار اور توبہ کرے بلکہ استغفار کا وہ معنی مراد ہے جو دل میں پیوست ہو جس سے گناہ اصرار کی گرہ کھل جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے پچھلے گناہوں پر نادم ہو۔ اس صورت میں استغفار اس کی توبہ کا ترجمان ہوگا حضرت علی (رض) بیان کرتے ہیں کہ

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو فتنہ میں مبتلا ہو اور بہت توبہ کرنے والا ہو۔ (شعب الایمان ج ۵ رقم الحدیث : ۷۱۲۱ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جس سے بار بار گنہا صادر ہو اور وہ بار بار توبہ کرے اور جب وہ گناہ کرے تو وہ توبہ کرے لیکن جو شخص صرف زبان سے استغفر اللہ کہتا ہے اور اس کا دل گناہ کرنے پر مصر ہوتا ہے تو اس کا ایسا استغفار بجائے خود استغفار کا محتاج ہے۔ اور ایسی زبانی توبہ سے صدق دل سے توبہ کرنی چاہیے کہ آئندہ وہ ایسی زبانی اور بے مغز توبہ نہیں کرے گا۔ اور صغیرہ گناہ کبیرہ گناہ کے ساتھ لاحق ہو جاتا ہے اور جب کسی صغیرہ گناہ پر اصرار کرے تو وہ صغیرہ نہیں رہتا کبیرہ ہو جاتا ہے اور جب کسی کبیرہ گناہ پر استغفار کرے تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس حدیث کا فائدہ یہ ہے کہ دوبارہ گناہ کرنا اگرچہ پہلی بار گناہ کرنے سے زیادہ قبیح ہے کیونکہ دوبارہ گناہ کرکے وہ خود اپنی توبہ توڑ رہا ہے لیکن جب وہ دوبارہ زیادہ گڑگڑا کر توبہ کرے گا اور کریم کے دروازہ پر فریاد کرے گا تو پہلی توبہ سے احسن ہے کیونکہ وہ اس یقین سے توبہ کر رہا ہے کہ اس کے سوا کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں ہے۔

اس حدیث کے آخر میں ارشاد ہے جو مرضی آئے کر میں نے تجھ کر بخش دیا ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ اس کو اب گناہ کرنے کی عام اجازت اور کھلی چھٹی ہے۔ بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے اور آئندہ کے لیے اس کو گناہوں سے محفوظ کر دیا ہے یا یہ کہ اگر اس سے پھر گناہ سرزد ہو گئے تو اللہ تعالیٰ اس کو مرنے سے پہلے توبہ کی توفیق دے دے گا۔ اس کا یہ معنی بھی ہے جب تک تم گناہوں پر توبہ کرتے رہو گے میں تم کو بخشتا رہوں گا۔

(المعصم ج ۷ ص ۸۶۔ ۸۵ مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت ۱۴۱۷ھ)

علامہ یحییٰ بن شرف نووی متوفی ۶۷۶ھ لکھتے ہیں۔

اس حدیث میں اس پر ظاہر دلالت ہے کہ اگر انسان سو مرتبہ یا ہزار مرتبہ یا اس سے بھی زیادہ بار گناہ کا تکرار کرے اور ہر بار توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہو گی اور اس کے گناہ ساقط ہو جائیں گے اور اگر تمام گناہوں سے ایک بار ہی توبہ کرے تو اس کی توبہ صحیح ہے اور یہ جو فرمایا ہے جو مرضی آئے کر و اس کا معنی یہ ہے کہ جب تک تم گناہوں پر توبہ کرتے رہو گے میں تم کو بخشتا رہوں گا۔

(صحیح مسلم مع شرحہ للنووی ج ۱۱ ص ۶۸۸۲۔ ۶۸۸۱ مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ ۱۴۱۷ھ)

اللہ تعالیٰ کے عفو و مغفرت کی وسعت اور اس کے رحم و کرم کے عموم و شمول میں بہت احادیث ہیں ہم یہاں پر صرف ایک حدیث اور پیش کر رہے ہیں۔

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ اے ابن آدم (علیہ السلام) ! تو نے مجھ سے دعا کی اور دعا قبول ہونے کی امید رکھی میں نے تیری پچھلی سب خطائیں بخش دیں اور مجھے کوئی پروا نہیں۔ اے ابن آدم (علیہ السلام) ! اگر تیرے گناہ آسمان کی بلندیوں کو پہنچ جائیں پھر تو مجھ سے استغفار کرے تو میں تجھے کو بخش دوں گا اور مجھے کوئی پروا نہیں۔ اے ابن آدم (علیہ السلام) ! اگر تو تمام روئے زمین کے برابر بھی گناہ کرکے آئے بشرطیکہ تو نے میرے ساتھ شرک نہ کیا ہو تو میں تیرے پاس تمام روئے زمن جتنی مغفرت لے کر آؤں گا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث ۳۵۴۷ جامع الاصول ج ۸ رقم الحدیث ۵۸۷۷) (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَلَمَّا سَكَتَ عَنۡ مُّوۡسَى الۡغَضَبُ اَخَذَ الۡاَلۡوَاحَ ‌ۖۚ وَفِىۡ نُسۡخَتِهَا هُدًى وَّرَحۡمَةٌ لِّلَّذِيۡنَ هُمۡ لِرَبِّهِمۡ يَرۡهَبُوۡنَ ۝۱۵۴

لغۃ القرآن: [وَلَمَّا : اور جب] [سَكَتَ : تھم گیا] [عَنْ مُّوْسَى: موسیٰ سے] [الْغَضَبُ : غصہ] [اَخَذَ : تو انہوں نے پکڑا] [الْاَلْوَاحَ : تختیوں کو] [وَفِيْ نُسْخَتِهَا : اور ان کی تحریر میں] [هُدًى: ہدایت

تھی] [وَّرَحْمَةٌ: اور رحمت تھی] [لِّلَّذِيْنَ : ان کے لیے جو] [هُمْ : وہ] [لِرَبِّهِمْ : اپنے رب سے] [يَرْهَبُوْنَ : وہ ڈرتے ہیں]

ترجمہ: اور جب موسیٰ (علیہ السلام) کا غصہ تھم گیا تو انھوں نے تختیاں اٹھالیں اور ان (تختیوں) کی تحریر میں ہدایت اور ایسے لوگوں کے لیے رحمت (مذکور) تھی جو اپنے رب سے بہت ڈرتے ہیں

تشریح: حضرت ہارون (علیہ السلام) کا معقول عذر سن کر اور قوم کو اپنی غلطی پر نام و پشیمان دیکھ کر آپ کا غصہ فرو ہوگیا اور وہ تختیاں جو آپ طور سے لائے تھے اور جنہیں فرط جلال میں پھینک دیا تھا اب ان کی طرف متوجہ ہوئے اور انھیں اٹھالیا اور اپنی قوم کو بتایا کہ یہ وہ نسخہ ہدایت ہے جس کا وعدہ میں نے تم سے کیا تھا۔ جس کے دل میں خوف خدا ہوگا اس کے لیے اس میں ہدایت بھی ہے اور رحمت بھی لیکن وہ لوگ جن کے دل پتھر ہو چکے ہیں اور خوف الٰہی سے خالی ہیں ان کے لیے اس میں حسرت و نامرادی کے سوا اور کچھ نہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

قرآن کا ذرا انداز تعبیر ملاحظہ ہو " گویا غضب اور غصہ ایک شخصی چیز ہے، جس نے حضرت موسیٰ پر تسلط حاصل کرلیا ہے اور اپنی مرضی سے ان کو چلاتا ہے اور حرکت میں لاتا ہے۔ اور جب یہ خاموش ہوگیا اور حضرت موسیٰ کو اس نے آزاد چھوڑ دیا تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بھی اپنے اختیار میں آ گئے۔ غصے کی وجہ سے جو تختیاں انھوں پھینک دی تھیں۔ وہ دوبارہ ہاتھ میں لے لیں۔ اب بتایا جاتا ہے کہ ان تختیوں میں اللہ کی ہدایات تھیں۔ اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرنے والے تھے ان کے لیے یہ رحمت تھیں ان کے دل راہ راست پر آنے کے لیے کھل گئے تھے۔ اور انھوں نے اللہ کی رحمتوں سے دامن بھر لیے تھے۔ اور ایک گمراہ اور بے راہ شخص سے اور کون بدبخت ہوگا جو اپنے سامنے کوئی راہ نہیں پاتا۔ اور اس روح سے اور کوئی بدبخت نہیں ہے جو ماری ماری پھرتی ہے اور جسے نہ کوئی صحیح راہ نظر آتی اور نہ اسے دولت یقین ملتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ اور خدا خوفی ہی وہ صفت ہے جس سے دل کھلتے ہیں اور جس سے غفلت دور ہوتی ہے اور انسان راہ راست پر آتا ہے اور حق کو قبول کرتا ہے۔ اللہ ان ربوں کا خالق ہے۔ اور وہی اس حقیقت کا فیصلہ اور اعلان کرنے والا ہے۔ ظاہر ہے کہ دلوں کا حال رب العالمین سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

اس سے پہلی آیت میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے حالت غضب میں جو کچھ صادر ہوا اس کا ذکر کیا گیا اب اس آیت میں غصہ تھم جانے کے بعد حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے جو واقع ہوا اسے بیان کیا گیا ہے، چنانچہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر قوم میں آکر تحقیق کرنے سے بھی یہ ظاہر ہوگیا کہ ان کے بھائی حضرت ہارون (علیہ السلام) سے کوئی کوتاہی سرزد نہ ہوئی تھی اور انھوں نے جو عذر بیان کیا وہ درست تھا تو آپ کا غصہ جاتا رہا اور آپ نے توراۃ کی تختیاں زمین سے اٹھالیں۔

یاد رہے کہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو غصہ آیا تو آپ نے دو کام کئے تھے (1) توراۃ کی تختیاں زمین پر ڈال دیں (2) حضرت ہارون (علیہ السلام) کو سر سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس کی تلافی میں بھی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے دو کام کئے (1) توراۃ کی تختیاں زمین سے اٹھالیں۔ (2) اپنے بھائی کے لیے دعا کی۔ (تفسیر صراط الجنان)

گوسالہ پرستی کے تعلق سے جو واقعہ اوپر مذکور ہوا اس سے ظاہر ہوا کہ سارے بنی اسرائیلیوں نے یہ کام نہیں کیا تھا مگر ان سب کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے اس کام سے دوسروں کو روکا بھی نہیں تھا۔ صرف حضرت ہارون ہی تھے جو شدومد کے ساتھ روکتے رہے گو قوم نے ان کا خیال نہ کیا مگر وہ خلافت موسوی کا حق ادا کرتے رہے ۔۔ بایں ہمہ ۔۔ اسرائیلیوں کو اخروی ہلاکت سے بچانے کیلئے حضرت موسیٰ کو رب کریم صاحب فضل عظیم نے یہ حکم فرمایا کہ بنی اسرائیل میں سے نیک لوگوں کی ایک جماعت اپنے ساتھ طور پر لیجائیں اور وہ لوگ وہاں بچھڑے کی پرستش سے عذر کریں اور توبہ و استغفار پیش کریں۔ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لوگوں سے یہ بات کہی تو انھوں نے مان لی۔۔ (تفسیر اشرفی)

امام رازی متوفی ٦٠٦ھ نے لکھا ہے الالواح سے مراد وہی الواح ہیں جو انھوں نے ڈالیں تھیں۔ (گویا الف لام عہد خارجی کا ہے) اور اس میں یہ ظاہر دلیل ہے کہ ان تختیوں میں سے کوئی تختی ٹوٹی تھی نہ باطل ہوئی تھی اور وہ جو بعض روایات میں ہے کہ توراۃ کے سات اجزاء میں چھ اجزا اٹھا لیے گئے تھے اور صرف ایک جز باقی رہ گیا

تھا وہ صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس (رض) نے کہا کہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے وہ تختیاں زمین پر ڈالیں تو وہ ٹوٹ گئیں۔ پھر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے چالیس دن روزے رکھے تو اللہ تعالیٰ نے ان تختیوں کو لوٹا دیا اور ان میں بعینہٖ وہ سب کچھ مذکور تھا جو پہلی تختیوں میں تھا اس تقدیر پر وفی نسختھا کا معنی یہ ہوگا اس میں جو کچھ لکھا ہوا تھا وہ ہدایت اور رحمت تھی اور اگر ہم یہ کہیں کہ وہ تختیاں ٹوٹی نہیں تھیں اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے تختیاں ڈالنے کے بعد بعینہٖ ان ہی تختیوں کو اٹھالیا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ لوح محفوظ میں لکھی ہوئی تھیں اور اب بھی فی نسختھا کا یہی معنی ہوگا کہ اس کی تحریر میں ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ (تفسیر کبیر ج ۵ ص ۳۷۴ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۴۱۵ ھ)۔

اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے اس میں نیک کاموں کی ہدایت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے طریقوں اور صالح حیات کے لیے اس میں مکمل دستور العمل ہے اور اگر اس میں کوئی کوتاہی ہو جائے تو پھر اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنے والوں کے لیے رحمت ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

یاد رہے کہ

اللہ تعالیٰ نے جو کتاب بھی انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے نازل فرمائی وہ اپنے دور میں لوگوں کی ہدایت کے لیے کافی تھی۔ آسمانی کتاب کا نزول اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت ہوتا ہے۔ جس میں انبیاء کرام (علیہ السلام) کے ذریعے لوگوں کی ہدایت کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارے گا اس پر دنیا و آخرت میں اللہ کی رحمت برسے گی۔ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب اس لیے بھی مجسمہ رحمت ہوتی ہے کیونکہ اس کی تلاوت سے اجر و ثواب اور قلبی سکون رکھا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے آدمی کو مشکلات سے نجات اور آخرت میں عظیم الشان اجر و ثواب سے نوازا جائے گا۔ قرآن مجید کے اوصاف حمیدہ میں بھی یہ اوصاف کامل اور اکمل انداز میں پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ قرآن مجید لوگوں کی ہدایت کے لیے آخری کتاب ہے اس لیے جو شخص مشکلات سے نجات، آخرت کا اجر و ثواب اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا حق دار بننا چاہتا ہے۔ اسے قرآن مجید کی تلاوت اور اس پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر قدم اور ہر لمحہ اس کی رہنمائی کرتے ہوئے اس پر اپنے فضل و کرم کا نزول فرمائے گا۔ بشرطیکہ اس کا دل اللہ تعالیٰ سے لرزاں و ترساں ہو۔

(عَنْ أَبِی ہُرَیْرَۃَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ۔۔ وَمَا قَعَدَ قَوْمٌ فِی مَسْجِدٍ یَتْلُونَ کِتَابَ اللّٰہِ وَیَتَدَارَسُونَہٗ بَیْنَہُمْ إِلَّا نَزَلَتْ عَلَیْہِمُ السَّکِینَۃُ وَغَشِیَتْہُمُ الرَّحْمَۃُ۔۔) [رواہ الترمذی: کتاب القراءت عن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، باب ماجاء إن القرآن انزل علی سبعۃ احرف]

”حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا۔۔ جو لوگ مسجد میں بیٹھ کر قرآن کی تلاوت کریں اور باہم درس و تدریس کریں تو ان پر سکینت نازل ہوتی ہے اور رحمت انھیں لپیٹ لیتی ہے۔۔“ (تفسیر فہم القرآن)

نسخہ کسی تحریر کی حرف حرف نقل کو کہتے ہیں۔ توراۃ اصل میں انھیں الواح کی نقل ہے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے انھیں الواح سے بارہ نسخے تیار کروائے ' اور ہر قبیلہ کے سپرد ایک ایک نسخہ کیا گیا اور پھر ایک الگ نسخہ بنی لاوی کو حفاظت کے لیے دیا گیا ' غالباً یہی وہ نسخہ ہے جسے تابوت سکینہ میں رکھا گیا تھا ' چونکہ یہ تمام کتاب کی جلدیں انہی الواح کی نقل تھیں اس لیے اس کو نسخہ سے تعبیر کیا گیا پھر اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کتاب میں ہدایت بھی ہے اور رحمت بھی ' ہدایت تو اس لحاظ سے کہ تمہیں پوری زندگی اس کی راہنمائی میں گزارنی ہے ' عبادت اسی کی راہنمائی میں کرنی ہے معاشرت کے اصول اسی سے لینے ہیں معاملات اسی کی روشنی میں طے کرنے ہیں ' انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام آداب اسی سے سیکھنے ہیں اگر تم نے پوری زندگی اس کی راہنمائی میں دے دی اور مکمل طور پر تم اس کے متبع بن گئے تو پھر یقین رکھو اللہ تعالیٰ تم سے رحمت کا سلوک فرمائے گا، یعنی دنیا میں تمہیں ایک اچھی زندگی اور خوشحال زندگی سے نوازا جائے گا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ تمہیں بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے گا۔ چنانچہ قرآن کریم نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے اہل کتاب سے یہ کہا تھا کہ اگر اہل کتاب ایمان لائیں اور تقویٰ کی زندگی اختیار کریں تو ہم ان کے لیے آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیں گے اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ زمین سے ان کے لیے رزق ابلے گا اور آسمان سے بھی رزق ان کے لیے برسے گا۔ یعنی وہ اپنے اوپر سے بھی کھائیں گے اور پاؤں کے نیچے سے بھی ' لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہیں اللہ انھیں غریبی میں رکھے یا امیری میں انھیں تخت و تاج عطا کرے یا صحرائی زندگی کی کلفتوں میں رکھے ہر حال میں انھیں اللہ سے ڈر کر اس کتاب ہدایت کی پیروی کرنی ہے انھیں اللہ نیکی کی توفیق دے تو ان میں نیکی کا پندار پیدا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ جو اللہ سے ڈرنے والا ہے وہ

جانتا ہے کہ نیکی اللہ کی توفیق کے بغیر نہیں ہوتی اور اگر میں نے طلب توفیق میں کوئی بھی کمی کی تو بعید نہیں کہ نیکی کی توفیق مجھ سے سلب کرلی جائے اور یہ بات بھی واضح رہے کہ یہاں جو کچھ فرمایا گیا ہے یہ بنی اسرائیل کی خصوصیت نہیں 'بلکہ اللہ کے ہر رسول نے اپنی قوم کو اسی بات کی ہدایت کی ہے اور قرآن کریم توان ہدایات سے لبریز ہے اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت کا عنوان ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ اگر تم اس دعوت کو قبول کرلو تو دنیا بھی تمہاری ہوگی اور آخرت بھی تمھاری۔ دنیا کی تمام نعمتوں اور سرفرازیوں کے تم مستحق بنادیے جاؤگے بلکہ ایک موقع پر فرمایا:

" اگر تم میری اس دعوت کو قبول کرلو تو تم دیکھوگے کہ تم عرب کے مالک بن جاؤگے اور عجم تمہارے سامنے جھک جائے گا۔"

تاریخ آج بھی گواہی دے رہی ہے کہ اللہ کے آخری رسول نے اس امت سے جتنے وعدے فرمائے تھے وہ سب حرف بہ حرف پورے ہوئے 'اور اس وقت تک یہ امت دنیا کی غالب قوت رہی جب تک اس کی زندگی اللہ کی کتاب کی راہنمائی میں گزرتی رہی اور اس امت کا ہر چھوٹا بڑا فرد اللہ سے ڈرنے والا اور اللہ کے رسول سے محبت کرنے والا تھا۔ لیکن جب سے یہ تعلق کمزور ہوا اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ آج یہ امت وسائل سے مالا مال ہے 'افرادی قوت کی کوئی کمی نہیں دنیا کے ایک چوتھائی حصے پر اس کا قبضہ ہے ہر قابل ذکر ساحل اس کی ملکیت میں ہے۔ ذہانتوں میں کوئی کمی نہیں لیکن اس کے باوجود یہ امت دنیا کی سب سے ذلیل امت بن کر رہ گئی ہے۔ ہر اٹھتی ہوئی بجلی کو سب سے پہلے ہمارے کاشانے کی خبر ہوتی ہے.بڑی قوتوں کے لیے ہم تر نوالہ ہو کر رہ گئے ہیں وجہ اس کی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ نے ہماری کامیابیوں کو اپنے دین سے وفاداری کے ساتھ اور اللہ اور رسول سے تعلق کے ساتھ مشروط ٹھہرایا ہے ہم نے اس شرط کو کھودیا ہے اس لیے اس کی رحمتوں سے محروم ہوگئے ہیں۔ (تفسیر روح القرآن)

فوائد

ف 1: اس سے معلوم ہوا کہ آپ کو اتنا غصہ آیا تھا کہ حالت جذب پیدا ہوگئی تھی اور جو کچھ صادر ہوا، اسی حالت جذب میں ہوا، اس حالت کے دور ہوتے ہی ادب واحترام سے تختیاں اٹھالیں۔ معلوم ہوا کہ بے خودی میں اگر عظمت والی کتاب ہاتھ سے گر جائے تو گناہ نہ ہوگا۔

ف 2: معلوم ہوا کہ اب اس ڈالنے کے بعد جو توراۃ کو اٹھایا، تو اس میں تفصیل کل شئی باقی نہ رہی، اٹھالی گئی۔ صرف ہدایت اور رحمت باقی رہ گئی، ورنہ جب آپ کو توراۃ طور پر دی گئی تھی تو اس میں تفصیل کل شئی بھی تھی جیسا کہ پچھلے صفحہ میں گزرا۔ معلوم ہوا کہ قرآن تفصیل کل شئی کے لیے آیا بھی تھا اور باقی بھی رہا۔ اور توراۃ اولاً تفصیل تھی مگر باقی نہ رہی۔ لہٰذا آیات میں تعارض نہیں۔ (تفسیر نور العرفان)

آیت مبارکہ:

وَاخۡتَارَ مُوۡسٰى قَوۡمَهٗ سَبۡعِيۡنَ رَجُلًا لِّمِيۡقَاتِنَا‌ ۚ فَلَمَّاۤ اَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ قَالَ رَبِّ لَوۡ شِئۡتَ اَهۡلَكۡتَهُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ وَاِيَّاىَ‌ ؕ اَتُهۡلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا‌ ۚ اِنۡ هِىَ اِلَّا فِتۡنَـتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنۡ تَشَآءُ وَتَهۡدِىۡ مَنۡ تَشَآءُ‌ ؕ اَنۡتَ وَلِيُّنَا فَاغۡفِرۡ لَـنَا وَارۡحَمۡنَا‌ وَاَنۡتَ خَيۡرُ الۡغٰفِرِيۡنَ ۝۱۵۵

لغۃ القرآن: [وَاخْتَارَ : اور چنا] [مُوْسٰي : موسیٰ نے] [قَوْمَهٗ : اپنی قوم سے] [سَبْعِيْنَ رَجُلًا : ستر مرد] [لِّمِيْقَاتِنَا : ہماری مقرر کردہ جگہ کے لیے] [فَلَمَّآ : پھر جب] [اَخَذَتْهُمُ : پکڑا ان کو] [الرَّجْفَةُ : زلزلے نے] [قَالَ : تو (موسیٰ نے) کہا] [رَبِّ : اے میرے رب] [لَوْ شِئْتَ : اگر تو چاہتا تو]

[اَهْلَكْتَهُمْ : تو ہلاک کردیتا ان کو] [مِّنْ قَبْلُ : اس سے پہلے] [وَاِيَّايَ: اور مجھ کو بھی] [اَ : کیا] [تُهْلِكُنَا : تو ہلاک کرتا ہے ہم کو] [بِمَا : بسبب اس کے جو] [فَعَلَ : کیا] [السُّفَهَاۗءُ : بیوقوفوں نے] [مِنَّا : ہم میں سے] [اِنْ : نہیں ہے] [هِيَ : یہ] [اِلَّا : مگر] [فِتْنَتُكَ: تیری آزمائش] [تُضِلُّ : تو بھٹکاتا ہے] [بِهَا : اس سے] [مَنْ : اس کو ، جس کو] [تَشَاۗءُ : تو چاہتا ہے] [وَتَهْدِيْ : اور تو ہدایت دیتا ہے (اس سے)] [مَنْ : اس کو ، جس کو] [تَشَاۗءُ : تو چاہتا ہے] [اَنْتَ : تو] [وَلِيُّنَا : ہمارا کارساز ہے] [فَاغْفِرْ لَنَا : پس تو بخش دے ہم کو] [وَارْحَمْنَا : اور تو رحم کر ہم پر] [وَاَنْتَ : اور تو] [خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ : بہترین بخشنے والا ہے]

ترجمہ: اور موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے ستر مردوں کو ہمارے مقرر کردہ وقت (پر ہمارے حضور معذرت کی پیشی) کے لیے چن لیا، پھر جب انھیں (قوم کو برائی سے منع نہ کرنے پر تادیباً) شدید زلزلہ نے آپکڑا تو (موسٰی (علیہ السلام) نے) عرض کیا: اے رب! اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے ہی ان لوگوں کو اور مجھے ہلاک فرما دیتا، کیا تو ہمیں اس (خطا) کے سبب ہلاک فرمائے گا جو ہم میں سے بیوقوف لوگوں نے انجام دی ہے، یہ تو محض تیری آزمائش ہے، اس کے ذریعے تو جسے چاہتا ہے گمراہ فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت فرماتا ہے۔ تو ہی ہمارا کارساز ہے، سُو تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے

تشریح: بنی اسرائیل بچھڑے کی پرستش کا جرم عظیم کرنے کے بعد سخت پشیمان ہوئے اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے عرض کی کہ ہماری مغفرت کے لیے بارگاہ الٰہی میں عرض کیجئے۔ حکم ہوا ان میں سے ستر آدمی منتخب کرکے اپنے ہمراہ لاؤ تاکہ وہ یہاں آکر ساری قوم کے نمائندوں کی حیثیت سے توبہ کریں۔ چنانچہ آپ اپنی قوم کے ستر نمائندوں کی معیت میں طور کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچے تو ایک بادل نمودار ہوا جس نے سارے پہاڑ کو گھیر لیا۔ وہاں پہنچ کر سجدہ میں گر گئے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے مولا کریم سے گفتگو کی جو انھوں نے سنی۔ جب بادل چھٹ گیا اور سلسلہ کلام بھی منقطع ہو گیا تو کہنے لگے۔ موسیٰ! ہم نے گفتگو تو سنی ہے جب تک ہم اپنی آنکھوں سے متکلم کو نہ دیکھ لیں ہم کیسے یقین کرلیں کہ وہ خداوند تعالیٰ تھا۔ ممکن ہے کوئی اور ہو۔ اس پر زلزلے کے شدید جھٹکے آنے لگے اور بجلی کڑکنے لگی۔ اس وحشت ناک منظر کی تاب نہ لا کر وہ بے ہوش ہو کر گرے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہوم منظر سے موت واقع ہو گئی۔ اور وہب کی رائے ہے کہ مرے نہیں تھے بلکہ بے ہوشی کی وہ کیفیت طاری ہو گئی تھی کہ قریب المرگ ہو گئے تھے۔ (بیضاوی۔ قرطبیؒ)

موسیٰ (علیہ السلام) نے جب ان کی یہ حالت دیکھی تو آپ کو اپنی قوم کے برہم ہو جانے کا اندیشہ ہوا۔ وہ لوگ جو بات بات پر بگڑ جانے کے عادی ہیں جب دیکھیں گے کہ ان کے ستر سر کردہ آدمی لقمہ اجل ہو گئے ہیں تو نہ معلوم کیا اودھم مچائیں گے اس لیے آپ نے عرض کی اے مالک! اگر تیری مشیت یہی تھی کہ انھیں ہلاک کر دیا جائے تو انھیں پہلے ہی ہلاک کر دیا ہوتا۔ اب جب یہ میرے ہمراہ آئے ہیں تو تو نے انھیں ہلاک کر دیا۔ میری قوم مجھے بدنام کرے گی۔ اور مجھے ملزم ٹھہرائے گی۔

سفہاء سے مراد یا تو بچھڑے کے پجاری ہیں یا دیدار خداوندی کا مطالبہ کرنے والے۔

۲۰۰ف فتنہ کہتے ہیں آزمائش اور امتحان کو۔ ای ماھذا الا اختبارک وامتحانک (قرطبیؒ)

اگر توفیق الٰہی انسان کی دستگری کرے تو امتحان و آزمائش کے میدان میں وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ اور اگر اس کی تائید اور توفیق شامل حال نہ ہوت معمولی سی آزمائش بھی انسان کی لغزش کا سبب بن جاتی ہے۔ اور زہد و تقدس کے سارے جبے تار تار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ اپنی عقل کی نارسائی اور اپنی بے بسی کو ہر وقت پیش نظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی دامن رحمت میں پناہ ڈھونڈھے۔ حضور رحمت عالمیان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے یہ دعائیہ کلمات کتنے دلکش اور کتنے حقیقت افروز ہیں۔ یا حی یا قوم برحمتک استغیث لاتکلنی الی نفسی طرفۃ عین واصلح لی شانی کلہ: اے زندہ جاوید! اے ہر چیز کو زندہ رکھنے والے! میں تیری رحمت سے فریاد کرتا ہوں آنکھ جھپکنے کی قدر بھی مجھے (اپنی توفیق سے محروم کرکے) میرے نفس کے سپرد نہ کر۔ اور میرے تمام حالات کی خود ہی اصلاح فرما۔

اللہ تعالیٰ کے قادر مطلق اور مختار کل ہونے کی اعتراف کرنے کے بعد اب اپنادامن طلب پھیلایا جارہا ہے۔ ولینا: ہمارے دین و دنیا کے تمام کاموں کا تو ہی محافظ و نگہبان ہے۔ ہم جب تک اس دنیا میں ہیں ہمیں صحت و عافیت اور توفیق ہدایت اور شوق عبادت عطا فرما اور جب یہاں سے رخصت سفر باندھ کر دار البقاء کی طرف کوچ کریں تو وہاں ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور اپنے جوار رحمت میں جگہ عنایت فرما۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

امام محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ اپنی قوم کی طرف لوٹے اور بچھڑے کی عبادت کرنے پر بنو اسرائیل کو ملامت کی اور بچھڑے کو جلا کر اس کے ذرات کو سمندر میں ڈال دیا۔ پھر حضرت موسیٰ نے اپنی امت میں سے انتہائی نیک افراد جن کی تعداد ستر تھی' سے فرمایا تم میرے ساتھ اللہ سے ملاقات کے لیے چلو اپنی اس گئ سالہ پرستی پر اللہ تعالیٰ سے معذرت کرو۔ جب حضرت موسیٰ ان کو لے کر پہاڑ طور پر گئے تو انھوں نے حضرت موسیٰ جب پہاڑ کے قریب پہنچے تو ایک بادل آیا اور اس نے پورے پہاڑ کو ڈھانپ لیا۔ حضرت موسیٰ اس بادل میں دال ہو گئے اور قوم سے کہا کہ تم قریب آجاؤ جب حضرت موسیٰ اپنے رب سے ہم کلام ہوتے تو ان کی پیشانی پر بہت چمکدار نور ظاہر ہوتا جس کو دیکھنے کو کوئی انسان تاب نہیں لاسکتا تھا۔ تو وہ اپنی پیشانی پر نقاب ڈال لیتے تھے۔ جب قوم اس بادل سے اندر داخل ہوئی تو سجدہ میں گر گئی۔

حضرت موسیٰ اللہ تعالیٰ سے کلام کر رہتے تھے اور وہ سن رہے تھے۔ جب موسیٰ (علیہ السلام) فارغ ہوئے اور بادل چھٹ گیا تو یہ لوگ حضرت موسیٰ سے کہنے لگے ہم ہر گز اللہ پر ایمان نہ لائیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو بالکل ظاہر عیاں اور بیاں دیکھ نہ لیں' اس وقت ان پر بجلی کی ایک کڑک آپڑی اور وہ سب مر گئے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور عرض کیا اے اللہ اگر تو چاہتا تو ان کو پہلے ہی ہلاک کر دیتا' جب میں اپنی قوم کے پاس جاؤں گا تو میرے کیسے تصدیق کریں گے کہ وہ سڑک سے ہلاک ہو گئے اور آئندہ مجھ پر کب اعتماد کریں گے' حضرت موسیٰ (علیہ السلام) مسلسل دعا کرتے رہے' بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان میں روحیں لوٹا دیں۔ پھر بنو اسرائیل نے جو بچھڑے کی پرستش کی تھی اس پر توبہ کی مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب تک کہ یہ ایک دوسرے کو قتل نہیں کریں گے' اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول نہیں فرمائے گا۔

(جامع البیان ج ۱' ص ۲۳۲۲۳۱' ۲۳' مطبوعہ دار المعرفہ بیروت' ۱۴۰۹ھ تفسیر کبیر ج ۵' ص ۳۷۶' معالم التنزیل ج ۲' ص ۱۷۰' تفسیر ابن کثیر ج ۳' روح المعانی جز ۹' ص ۷۲' تفسیر البیضاوی مع الکزرونی ج ۳' ۶۳)

امام ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ ان کو بجلی کی کڑک نے پکڑ لیا جس سے وہ مر گئے پھر ان کو زندہ کیا۔ نیز امام ابن ابی حاتم نے سعید بن حیان سے روایت کیا ہے کہ ان ستر اسرائیلیوں کو بجلی کر کڑک نے اس لیے بلاک کیا تھا کہ انھوں نے بچھڑے کی عبادت کا حکم دیا تھا نہ اس سے منع کیا تھا۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵' ص ۱۵۷۵' مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ' ۱۴۱۷ھ)

سورۃ بقرہ میں الصاعقہ اور سورۃ الاعراف میں الرجفہ فرمانے کی توجیہ

سورۃ البرقہ میں فرمایا تھا ان کو "الصاعقہ" نے پکڑ لیا (البقرہ: ۵۵) اور اس سورت میں فرمایا ہے ان کو "الرجفہ" نے پکڑ لیا۔ الصاعقہ کے معنی ہیں رعد یا بجلی کی کڑک اور الرجفہ کے معنی ہیں زلزلہ۔ علامہ بیضاوی اور علامہ آلوسی نے لکھا ہے اس سے مراد الصاعقہ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بجلی اس زور سے کڑکی ہو کہ پہاڑ میں زلزلہ آگیا ہو اس لیے ایک جگہ اس کو الصاعقہ سے تعبیر فرمایا اور دوسری جگہ الرجفہ سے۔

علامہ ابو الحسن الماوردی المتوفی ۴۵۰ھ لکھتے ہیں:

کلبی نے کہا اس سے مراد زلزلہ ہے۔ مجاہد نے کہا اس سے مراد موت ہے۔ وہ سب مر گئے تھے پھر ان کو زندہ کیا۔ فراء نے کہا وہ ایک آگ تھی جس نے ان جو جلا ڈالا تھا۔ حضرت موسیٰ کا یہ گمان تھا کہ یہ ہلاک ہو گئے ہیں لیکن وہ ہلاک نہیں ہوئے تھے۔

(النکت والعیون ج' ص ۲۶۵' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

علامہ عبد الرحمٰن بن علی بن محمد الجوزی التوفی ۵۹۷ لکھتے ہیں:

الرجفہ سے مراد ہے حرکت شدید اور ان کو حرکت شدیدہ نے جو اپنی گرفت میں لیا تھا اس کے سبب کے متعلق چار قول ہیں

۱۔ حضرت علی (رض) نے فرمایا انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حضرت ہاروں (علیہ السلام) کے قتل کا الزام لگایا تھا۔

۲۔ ابن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا کہ انھوں نے دعا میں حد سے تجاوز کیا تھا' انھوں نے اللہ تعالیٰ سے ایسی نعمت مانگی تھی جو پہلے کسی کو ملی ہو نہ آئندہ ملے۔

۳۔ قتادہ اور ابن جریج نے کہا یہ لوگ نیکی کا حکم دیتے تھے نہ برائے سے روکتے تھے۔

۴۔ سدی اور ابن اسحاق نے کہا انھوں نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو سننے کا مطالبہ کیا اور اللہ کا کلام سننے کے بعد کہا ہم اس کو دیکھے بغیر اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ (زاد المسیر ج ۳ ،ص ۲۶۹ ،مطبوعہ المکتب السلامی بیروت ،۱۴۰۷ھ)

کیا موسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ گمان تھا کہ وہ ستر اسرائیلوں کی وجہ سے ان کو ہلاکت میں مبتلا کرے گا؟

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ اسلام کو دعا نقل فرمائی : کیا تو ہم میں سے ان نادانوں کے کاموں کی وجہ سے ہم کو ہلاک کرے گا؟ اس جگہ یہ سوال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کے جرم کی سزا دوسرے کو نہیں دیتا۔ قرآن مجید میں ہے :

ولا تیزوِ وازرۃ وزر اخری (الذمر : ۷)

اور کوئی بوجھ اٹھانے وال کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے

تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ کے متعلق کیسے یہ گمان کرلیا کہ اللہ تعالیٰ ان ستر اسرائیلوں کے قصور کی وجہ سے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو ہلاکت میں مبتلا کرے گا۔ امام رازی اس اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ استفہام نفی کے معنی میں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرے گا جیسے کہتے ہیں : کیا تم اپنی خدمت کرنے والے کی بے عزتی کروگے ! یعنی تم ایسا نہیں کروگے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے قول کا معنی یہ ہے کہ تو ہم کو ہلاکت میں نہیں ڈالے گا۔ (تفسیر کبیر ج ۵ ،ص ۳۷۷)

اس اعتراض کا یہ جواب بھی نہیں دیا جاسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو یہ گمان نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ انھیں کسی پیریشانی میں مبتلا کرے گا۔ یہ وپنے اس کلام سے ان ستر اسرائیلوں کو شفاعت کرنا چاہتے تھے جو اپنی نادانی اور حماقت کی وجہ سے رعد کی کڑک میں مبتلا ہو کر مارے گئے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنی ذات کو درمیان میں ڈالا کہ یہ تو قصور وار ہیں لیکن اگر ان کی سزا برقرار رکھی گئ تو میں پریشانی میں مبتلا ہوں گا اور بنو اسرائیل ان کے متعلق مجھ سے سوال کریں گے سو تو مہربانی فرما اور میری خاطر ان کو زندہ کردے۔

اللہ کے معاف کرنے اور مخلوق کے معاف کرنے میں فرق

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے دعا میں کہا تو سب سے اچھا بخشنے والا ہے کیونکہ مخلوقات میں سیجب کوئی کسی کو بخشتا ہے تو یا تو دنیا میں اس سے اپنی تعریف و توصیف کا طالب ہوتا ہے یا آخرت میں ثواب کا طلب گار ہوتا ہے یا معافی مانگنے والے کے حال کو دیکھ کر اس کے دل میں رقت پیدا ہوتی ہے۔ دل سے اس رقت کو زائل کرنے کے لیے وہ معاف کردیتا ہے یا یہ نیت ہوتی ہے کہ آج میں اس کو معاف کروں گا تو کل مجھے معاف کردے گا۔ یا ماضی میں کبھی اس نے اس کو معاف کیا ہو تو اس کا احسان چکانے کے لیے وہ اس کو معافت کردیتا ہے۔ غرض معاف کرنے سے مخلوق کی کوئی نہ کوئی غرض ہوتی ہے اور بے غرض اور بلا عوض معاف کرنے والا صرف اللہ ہے۔

(تفسیر تبیان القرآن)

مفسرین کرام (رح) فرماتے ہیں کہ رحمت کی دو قسمیں ہیں ایک مطلقہ واسعہ جس کے متعلق حدیث میں ارشاد ہے "ان رحمتی سبقت غضبی" (بخاری) اللہ تعالیٰ شانہ کی صفت رحمان اسی کا مصداق ہے جو مومن و کافر سب کے لئے ہے۔ دوسری رحمت خاصہ جو کہ متقی مسلمانوں کے ساتھ خاص ہے جس کا مصداق الرحیم ہے اس رحمت خاصہ میں کافروں کا حصہ نہیں پس خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے یہودیوں اور نصاری کا شمار کافروں میں ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے وہ محروم ہی رہیں گے۔ آیت کریمہ میں "ورحمتی وسعت کل شیئ" میں رحمت عامہ کی طرف اشارہ ہے اور "فسا کتبھا للذین" میں رحمت خاصہ مراد ہے جس کے حقدار اہل ایمان ہیں۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی امت کے لئے اسی رحمت خاصہ کی دعا کی جو کہ قوم کی ہٹ دھرمی اور تکذیب انبیاء کرام (علیہم السلام) کی وجہ سے بنی اسرائیل کو عمومی طور پر یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی اور اس کے حقدار آخری امت قرار پائے جن کی سعادت اور ابدی نجات کا بیان آنے والا ہے البتہ بنی اسرائیل کے مومن اور متقی لوگ اس سعادت میں آخری امت کے ساتھ شریک رہیں گے۔ (منازل العرفان)

آیت مبارکہ:

وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝١٥٦ ۚ

لغۃ القرآن: [وَاكْتُبْ : اور تو لکھ دے] [لَنَا : ہمارے لیے] [فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا : اس دنیا میں] [حَسَنَةً : بھلائی] [وَّفِي الْاٰخِرَةِ : اور آخرت میں (بھی)] [اِنَّا هُدْنَآ : بیشک ہم نے رجوع کیا] [اِلَيْكَ: تیری طرف] [قَالَ : (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا] [عَذَابِيْٓ: میرا عذاب] [اُصِيْبُ : میں پہنچتا ہوں] [بِهٖ : اس کے ساتھ] [مَنْ : جس پر] [اَشَآءُ : میں چاہتا ہوں] [وَرَحْمَتِيْ : اور میری رحمت] [وَسِعَتْ : وہ وسیع ہوئی] [كُلَّ شَيْءٍ: ہر چیز پر] [فَسَاَكْتُبُهَا : پس میں لکھوں گا اس کو] [لِلَّذِيْنَ : ان کے لیے جو] [يَتَّقُوْنَ : تقوی کرتے ہیں] [وَيُؤْتُوْنَ : اور پہنچاتے ہیں] [الزَّكٰوةَ : زکوۃ کو] [وَالَّذِيْنَ : او وہ لوگ] [هُمْ بِاٰيٰتِنَا : ہماری آیتوں پر] [يُؤْمِنُوْنَ : ایمان رکھتے ہیں]

ترجمہ: اور تو ہمارے لیے اس دنیا (کی زندگی) میں (بھی) بھلائی لکھ دے اور آخرت میں (بھی) بیشک ہم تیری طرف تائب و راغب ہو چکے، ارشاد ہوا: میں اپنا عذاب جسے چاہتا ہوں اسے پہنچاتا ہوں اور میری رحمت ہر چیز پر وسعت رکھتی ہے، سو میں عنقریب اس (رحمت) کو ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو پرہیزگاری اختیار کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے رہتے ہیں اور وہی لوگ ہی ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں

تشریح: وَاكْتُبْ لَنَا : اور ہمارے لیے لکھ دے۔} حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے زلزلے کے وقت جو دعا مانگی اس آیت میں اس کا بقیہ حصہ ہے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کی: اے اللہ! ہمارے لیے اس دنیا میں اور آخرت میں بھلائی لکھ دے بیشک ہم نے تیری طرف رجوع کیا۔ دنیا کی بھلائی سے پاکیزہ زندگی اور نیک اعمال مراد ہیں اور آخرت کی بھلائی سے جنت، اللہ تعالیٰ کا دیدار اور دنیا کی نیکیوں پر ثواب مراد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ دنیا کی بھلائی سے مراد نعمت اور عبادت ہے اور آخرت کی بھلائی سے مراد جنت ہے اور اس کے علاوہ اور کیا بھلائی ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی دعا کے بعد فرمایا کہ: "میری شان یہ ہے کہ میں جسے چاہتا ہوں اپنا عذاب پہنچاتا ہوں کوئی اور اس میں دخل اندازی کر ہی نہیں سکتا اور میری رحمت کی شان یہ ہے کہ میری رحمت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے، دنیا میں ہر مسلمان، کافر، اطاعت گزار اور نافرمان میری نعمتوں سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ (1)

{فَسَاَكْتُبُهَا : عنقریب میں آخرت کی نعمتوں کو لکھ دوں گا۔} جب یہ آیت نازل ہوئی "وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ" تو ابلیس بہت خوش ہوا اور کہنے لگا میں بھی اللہ عَزَّوَجَلَّ کی رحمت میں داخل ہو گیا، اور جب آیت کا یہ حصہ "فَسَاَكْتُبُهَا" نازل ہوا تو ابلیس مایوس ہو گیا۔ (2)

یہودیوں نے جب اس آیت کو سنا تو کہنے لگے ہم متقی ہیں اور ہم زکوۃ دیتے ہیں اور اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں تو اگلی آیت نازل فرما کر اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ یہ فضائل امت محمدیہ کے ساتھ خاص ہیں۔ (تفسیر صراط الجنان)

حضرت موسیٰ نے دنیا اور آخرت کی جس بھلائی کا سوال کیا تھا وہ کیا چیز تھی؟

اس آیت میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی دعا کا بقیہ حصہ اور تمتہ ذکر فرمایا ہے۔ دعا میں اصولی طور پر دو چیزیں طلب کی جاتی ہیں مضر چیزوں سے نجات اور مفید چیزوں کا حصول یعنی دفع ضرر اور جلب منفعت۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے دعا میں پہلے یہ کہا کہ ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔ دعا کے اس حصہ میں اپنی امت کے لیے ہلاکت اور عذاب سے نجات کو طلب کیا اور دعا کے دوسرے حصہ میں کہا اور ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی لکھ دے اور آخرت میں ' اور اس میں جلب منفعت کی اور مفید چیزوں کو طلب کیا اور دنیا اور آخرت کی خیر اور حسنہ کو طلب کاے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس آیت میں تلقین فرمائی ہے:

ومنھم من یقول ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ (البقرہ: ۲۰۱)

اور ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا فرما اور آخرت میں (بھی) بھلائی عطا فرما۔

دنیا کی بھلائی کیا ہے اور آخرت کی بھلائی کیا ہے؟ علامہ ابوالحیان اندلسی متوفی ۷۵۴ ھ نے لکھا ہے "دنیا کی بھلائی سے مراد ہے پاکیزہ حیات اور اعمال صالحہ اور آخرت کی بھلائی سے مراد ہے۔ جنت ' اللہ تعالیٰ کا دیدار اور دنیا کی نیکیوں پر ثواب "اور زیادہ عمدہ بات یہ ہے کہ دنیا کی بھلائی سے مراد نعمت اور عبادت ہے اور آخرت کی بھلائی سے مراد جنت ہے اور اس کے علاوہ اور کیا بھلائی ہو سکتی ہے! (البحر المحیط ج ۵ ' ص ۱۹۰) علامہ بیضادی متوفی ۶۸۲ ھ نے لکھا ہے "دنیا کی بھلائی سے مراد اچھی زندگی اور عبادت کی توفیق ہے اور آخرت کی ھلائی سے مراد جنت ہے"۔ (الکازرونی مع الیضاوی ج ۳ ' ص ۶۴) علامہ ابن جریر متوفی ۳۱۰ ھ نے لکھا ہے دنیا کی بھلائی سے مراد اعمال صالحہ ہیں اور آخرت کی بھلائی سے مراد گناہوں کی بخشش ہے۔ (جامع البیان جز ۹ ' ص ۱۰۵) علامہ ابن جوزی متوفی ۵۹۷ ھ نے لکھا ہے دنیا کی بھلائی سے مراد اعمال صالحہ ہیں اور آخرت کی بھلائی سے مراد مغفرت اور جنت ہے۔ علامہ قرطبیؒ متوفی ۶۶۸ ھ نے لکھا ہے دنیا کی بھلائی سے مراد اعمال صالحہ ہیں اور آخرت کی بھلائی سے مراد اس کی جزا ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۷ ' ص ۱۵۷) باقی مفسرین نے بھی تقریباً اسی طرح لکھا ہے۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جو یہ دعا کی تھی کہ دنیا اور آخرت کی بھلائی لکھ دے اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں یہ بھلائی ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو رسول امی کی پیروی کریں گے جن کا ذکر توراۃ اور انجیل میں ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جو دنیا اور آخرت کی بھلائی مانگی تھی وہ اللہ تعالیٰ نے سید محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کی عطا کر دی۔

امام ابن حریر اور امام ابن ابی حاتم اپنی سندوں کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے جو سوال کیا تھا کہ ہمارے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی لکھ دے وہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لے منظور نہیں کیا اور فرمایا کہ یہ میں (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کو عطا کروں گا۔

(جامع البیان جز ۹ ' ص ۱۰۹ ' تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵ ' ص ۱۵۸۰)

اب یہاں پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ دنیا اور آخرت کی بھلائی کی جو تفسیر علامہ ابوالحیان اندلسی ' علامہ بیجاوی ' علامہ ابن جریر اور علامہ قرطبیؒ وغیرہ ہم نے کی ہے کہ دنیا کی بھلائی سے مراد اعمال صالحہ ہیں اور اخرت کی بھلائی سے مراد جنت ہے ' اس میں سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کی کیا خصوصیت ہے۔ دیگر انبیاء (علیہم السلام) کی امتیں بھی اعمال صالحہ کریں گی اور جنت میں جائیں گی جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے:

حضرت بریدہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اہل جنت کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی ان میں سے اسی صفیں اس امت کی ہوں گی اور چالیس صفیں باقی امتوں کی ہوں گی۔

(السنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۵۵۵ ' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۲۸۹ ' مسند احمد ج ۵ ' ص ۳۴۷ ' سنن الداری ج ۲ ' رقم الحدیث ۲۸۳۵ ' المسدرک ج ۱ ' ص ۸۲ ' مشکوۃ رقم الحدیث: ۵۹۴۴ ' کتاب الذہد لابن المبارک رقم الحدیث: ۱۵۷۲ ' کنزالعمال رقم الحدیث ۳۴۵۱۳ ' کامل ابن عدی ج ۳ ' ص ۸۵۵ ' ج ۴ ' ص ۱۴۲۰ ' مجمع الزوائد ج ۱۰ ' ص ۴۰۳ ' ۴۰۳)۔

اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس آیت میں دنیا کی بھلائی سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں احکام شرعیہ آسان ہوں۔ کیونکہ بنو اسرائیل پر بہت مشکل احکام تھے۔ ان کی توبہ یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کر دیں۔ ان کو تیمّم کی سہولت حاصل نہیں تھی۔ مسجد کے سوا کسی اور جگہ نماز پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ مال غنیمت حلال

نہیں تھا "قربانی کو کھانے کی اجازت نہیں تھی۔ کپڑے یا بدن پر جس جگہ نجاست لگ جائے اس کا کاٹنا پڑتا تھا۔گناہ گار اعضا کو کاٹنا ضروری تھا ' قتل خطا اور قتل محمد عمد میں قصاص لازمی تھا دیت کی رخصت نہ تھی۔ ہفتہ کے دن شکار کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ روزہ کا دورانیہ رات اور دن کو محیط تھا اور بہت سخت احکام تھے 'تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے یہ چاہا کہ دنیا میں ان کے لیے احکام شرعیہ آسان ہو جائیں۔ یہ دنیا کی بھلائی تھی اور آخرت کی بھلائی یہ تھی کہ کم عمل پر اللہ تعالیٰ زیادہ اجر عطا فرمائے۔ان کو ایک نیکی پر ایک ہی اجر ملتا تھا۔ حضرت موسیٰ چاہتے تھے کہ ایک نیکی دس گنا یا سات سو گنا اجر عطا کیا جائے اور اس معنی میں دنیا کی بھلائی اور آخرت کی بھلائی اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کے لیے مخصوص کر دی تھی۔اس لیے یہ بھلائی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی امت کی بجائے ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عطا کر دی اس لیے فرمایا میں دنیا کی بھلائی اور آخرت کی بھلائی ان لوگوں کو دوں گا۔ (تفسیر تبیان القرآن)

(عَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ (رض) عَنِ النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ اِنَّ اللّٰہَ لَمَّا قَضَی الْخَلْقَ کَتَبَ عِنْدَہٗ فَوْقَ عَرْشِہٖ اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ) [رواہ البخاری : کتاب التوحید، باب وکان عرشہ علی الماء]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کائنات کی تخلیق سے فارغ ہوا تو اپنی کتاب میں جو کہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے عرش کے اوپر لکھا میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔"

(عَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ اِنَّ لِلّٰہِ مِاءَۃَ رَحْمَۃٍ قَسَمَ مِنْہَا رَحْمَۃً بَیْنَ جَمِیْعِ الْخَلَاءِقِ فَبِہَا یَتَرَاحَمُوْنَ وَبِہَا یَتَعَاطَفُوْنَ وَبِہَا تَعْطِفُ الْوُحُوْشُ عَلٰی اَوْلَادِہَا وَاَخَّرَ تِسْعَۃً وَتِسْعِیْنَ رَحْمَۃً یَرْحَمُ بِہَا عِبَادَہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ) [رواہ ابن ماجۃ : کتاب الزہد، باب مایرجی من رحمۃ اللہ یوم القیامۃ]

"حضرت ابوہریرہ (رض) نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان نقل کرتے ہیں کہ نبی معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے پاس رحمت کے سو حصے ہیں اللہ تعالیٰ نے ایک حصہ تمام مخلوق میں تقسیم کیا ہے۔اسی وجہ سے وہ باہم محبت و شفقت سے پیش آتے ہیں اور اسی وجہ سے ہی وحشی جانور اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں۔ باقی ننانوے حصے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھے ہیں جن سے وہ قیامت کے دن اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔"

(عَنْ اَنَسٍ (رض) قَالَ کَانَ النَّبِیُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یَقُوْلُ اللّٰھُمَّ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ) [رواہ البخاری : کتاب تفسیر القران، باب ومنہم من یقول ربنا]

"حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرمایا کرتے تھے اے اللہ ! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی ہمیں بھلائی عنایت فرما اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔" (تفسیر فہم القرآن)

یعنی اس دنیا میں ہمارے لیے احکام شرعیہ کو آسان فرمادے۔

کیونکہ بنو اسرائیل پر بہت مشکل احکام تھے۔ان کی توبہ یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کردیں۔

انکو تیمم کی سہولت حاصل نہیں تھی۔ مسجد کے سوا کسی اور جگہ نماز پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔

روزہ کا دورانیہ رات و دن کو محیط تھا۔ مال غنیمت حلال نہیں تھا۔ قربانی کو کھانے کی اجازت نہیں تھی۔ کپڑے اور بدن پر جس جگہ نجاست لگ جائے اسے کاٹنا پڑتا تھا ۔گنہ کار اعضاء کو کاٹنا ضروری تھا۔ قتل خطا اور قتل عمد میں قصاص لازمی تھا دیت کی رخصت نہیں تھی۔ ہفتہ کے دن شکار کی اجازت نہیں تھی اور بہت سخت احکام تھے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے چاہا کہ دنیا میں ان کے لیے یہ احکام شرعیہ آسان ہو جائیں۔ یہ دنیا کی بھلائی تھی۔

تو اے رب کریم ! اپنے فضل و کرم سے ہمارے لیے دنیا کی مذکورہ بالا بھلائی لکھ دے (اور آخرت میں) بھی ہمارے لیے بھلائی مقدر فرمادے۔

آخرت کی بھلائی یہ تھی کہ کم عمل پر اللہ تعالیٰ زیادہ اجر عطا فرمائے۔ان کو ایک نیکی پر ایک ہی اجر ملتا تھا۔ حضرت موسیٰ چاہتے تھے کہ ایک نیکی پر دس گنا۔۔ یا۔۔ سات سو گنا اجر عطا کیا جائے۔

مولیٰ تعالیٰ ! یہ تیرا فضل و کرم ہی ہے کہ (بیشک ہم نے تیری راہ پائی) اور تیری طرف رجوع کیا اور طلب مغفرت و رحمت کیلئے تیری بارگاہ رحمت میں حاضر ہو گئے ۔ ہم اپنی اس غلطی سے بھی توبہ کرتے ہیں کہ ہم نے تیری رؤیت کا مطالبہ کر دیا تھا۔ اس کے باوجود تیرے لطف و کرم سے بعید ہے کہ ہماری توبہ قبول نہ ہو۔ اور ہم نے اپنی قوم کیلئے جو بھلائی چاہی وہ ہمیں حاصل نہ ہو۔

لیکن ۔۔ چونکہ ۔۔ مذکورہ بالا معنی میں دنیا کی بھلائی اور آخرت کی بھلائی اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کیلئے مخصوص کر دی تھی اس لیے یہ بھلائی حضرت موسیٰ کی امت کی بجائے ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کو عطا فرمائی۔

اور حضرت موسیٰ سے (فرمایا) کہ اے موسیٰ ! تم بخوبی واقف ہو کہ یہ میرا ضابطہ عدل و فضل ہے کہ (میرا عذاب) جس کی صفت یہ ہے کہ اسکو (بھیجوں) اور نازل فرماؤں کافروں میں سے (جس پر چاہوں) کوئی اس عذاب کو دفع کرنے والا نہیں۔ (اور میری رحمت) امتنانیہ جس کی شان یہ ہے کہ وہ (ہر چیز سے وسیع ہے) ۔ یہ میری رحمت ہی تو ہے جو دنیا مومن و کافر نیکوکار و گناہ گار سب کو شامل ہے۔ سب کو وجود بخشنے والا میں ہی ہوں ۔۔ نیز ۔۔ سب کو ہر حال روزی دینے والا پرورش فرمانے والا میرے سوا کون ہے ؟ یہاں تک کہ مخلوقات کے دلوں میں جو ایک دوسرے سے مہربانی کا جذبہ ہے وہ بھی میرا ہی عطا کردہ ہے۔

اور اگر یوں دیکھا جائے کہ یہ رحمت توبہ ہے کہ علی العموم سب پر اس رحمت کا دروازہ کھلا ہوا ہے تو بھی ہر ایک پر اس رحمت کا سایہ گستر ہونا صاف نظر آتا ہے۔ کوئی سوال کرے یا نہ کرے وہ سب کو عطا فرماتا ہے۔ کوئی مستحق ہو یا نہ وہ سب کو دیتا ہے۔ کسی طرح کی خدمت و دعا سے پہلے وجود کا استحقاق اور پھر فیض وجود کے بعد استفادہ کی لیاقت اور استفاضہ کی قابلیت عطا فرمانا یہ سب رحمت عامہ کی کارفرمائیاں نہیں ہیں تو اور کیا ہیں ؟

اب رہ گئی ہماری وہ رحمت خاص جس کو ہم نے خود اپنے ذمہء کرم میں رکھ لیا ہے تو اگرچہ بندوں کو اس رحمت کا استحقاق بھی ہماری رحمت امتنانیہ ہی کا نتیجہ ہے لیکن اسکو بندوں ہی کے فائدے کیلئے چند شرطوں کے ساتھ مشروط کر دیا ہے۔ تو اس لحاظ سے اس رحمت کو رحمت خاصہ و مقیدہ بھی کہہ سکتے ہیں جو خاص خاص بندوں ہی کا حصہ ہے ۔۔ لہٰذا ۔۔ ہماری رحمت عامہ کے جلووں کو دیکھ کر شیطان خود کو مستحق رحمت نہ گمان کرنے لگے۔ اس لیے کہ ہماری یہ رحمت انھیں کیلئے ہے جو اہل تقویٰ ہیں اور شرک و کفر سے بچنے والے ہیں۔

(تو) اس رحمت خاص کا دنیا و آخرت میں استحقاق (بہت جلد اسے لکھ دونگا) اور مقرر و ثابت کر دونگا (انکے لیے جو ڈریں) اللہ تعالیٰ سے اور اپنے کو کفر و شرک سے بچائیں۔ تو اب عزازیل جیسے سرکش اور متمرد کیلئے اس رحمت میں کیا حصہ رہ جاتا ہے ؟ یہ تو صرف تقویٰ والوں کا مقدر ہے جو خدا سے ڈرتے رہیں (اور) سارے فرائض و واجبات کی بجاآوری کے ساتھ ساتھ اس عمل خاص کو انجام دیں جس کی ادا انسان کو شاق محسوس ہوتی ہے یعنی (زکوۃ دیں) جذبہء اخلاص کے ساتھ (اور) جن کی یہ شان ہو اور (وہ) ایسے ہوں (جو ہماری) نازل فرمودہ (آیتوں کو مانیں) ۔

اس مقام پر یہود و نصاریٰ بھی کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں اور یہ نہ سوچنے لگیں کہ ہم بھی تو آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور مال کی زکوۃ بھی ادا کرتے ہیں تو ہمارے واسطے بھی یہ رحمت خاص ثابت ہو گی اور ہم بھی اس کے مستحق قرار پائینگے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی امید کو منقطع فرما دیا کہ جس رحمت خاص کا ذکر ہو رہا ہے یہ رحمت امت مرحومہ محمد یہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کے ساتھ مخصوص ہے ۔۔ چنانچہ ۔۔ دنیا و آخرت میں مذکورہ بالا تمام رعایتیں سہولتیں اور انعامات و عنایتیں ان لوگوں کیلئے مخصوص ہیں۔ (تفسیر اشرفی)

آیت مبارکہ: اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۵۷

لغۃ القرآن: [اَلَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [يَتَّبِعُوْنَ : پیروی کرتے ہیں] [الرَّسُوْلَ : ان رسول کی] [النَّبِيَّ : جو نبی ہیں] [الْاُمِّيَّ : امی ہیں] [الَّذِيْ : وہ] [يَجِدُوْنَهٗ : یہ لوگ پاتے ہیں جن کو] [مَكْتُوْبًا : لکھا ہوا] [عِنْدَهُمْ : اپنے پاس] [فِي التَّوْرٰىةِ : تورات میں] [وَالْاِنْجِيْلِ : اور انجیل میں] [يَاْمُرُهُمْ : وہ حکم دیتے ہیں ان کو] [بِالْمَعْرُوْفِ : نیکی کا] [وَيَنْهٰىهُمْ : اور منع کرتے ہیں ان کو] [عَنِ الْمُنْكَرِ : برائی سے] [وَيُحِلُّ : اور وہ حلال کرتے ہیں] [لَهُمُ : ان کے لیے] [الطَّيِّبٰتِ : پاکیزہ (چیزوں) کو] [وَيُحَرِّمُ : اور حرام کرتے ہیں] [عَلَيْهِمُ : ان پر] [الْخَبٰٓئِثَ : ناپاک (چیزوں) کو] [وَيَضَعُ : اور اتارتے ہیں] [عَنْهُمْ : ان سے] [اِصْرَهُمْ : ان کے بوجھ کو] [وَالْاَغْلٰلَ : اور ان طوقوں کو] [الَّتِيْ : جو کہ] [كَانَتْ : تھے] [عَلَيْهِمْ : ان پر] [فَالَّذِيْنَ : پس جو لوگ] [اٰمَنُوْا : ایمان لائے] [بِهٖ : ان پر] [وَعَزَّرُوْهُ : اور تقویت دی ان کو] [وَنَصَرُوْهُ : اور مدد کی ان کی] [وَاتَّبَعُوا : اور پیروی کی] [النُّوْرَ : اس نور کی] [الَّذِيْٓ : جو کہ] [اُنْزِلَ : اتارا گیا] [مَعَهٗٓ : ان کے ساتھ] [اُولٰۗىِٕكَ : تو وہ لوگ] [هُمُ : وہ] [الْمُفْلِحُوْنَ : فلاح پانے والے]

ترجمہ: (یہ وہ لوگ ہیں) جو اس رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیروی کرتے ہیں جو امّی (لقب) نبی ہیں (یعنی دنیا میں کسی شخص سے پڑھے بغیر من جانب اللہ لوگوں کو اخبارِ غیب اور معاش و معاد کے علوم و معارف بتاتے ہیں) جن (کے اوصاف و کمالات) کو وہ لوگ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، جو انھیں اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے منع فرماتے ہیں اور ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال کرتے ہیں اور ان پر پلید چیزوں کو حرام کرتے ہیں اور ان سے ان کے بارِ گراں اور طوقِ (قیود) جو ان پر (نافرمانیوں کے باعث مسلّط) تھے، ساقط فرماتے (اور انھیں نعمتِ آزادی سے بہرہ یاب کرتے) ہیں۔ پس جو لوگ اس (برگزیدہ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائیں گے اور ان کی تعظیم و توقیر کریں گے اور ان (کے دین) کی مدد و نصرت کریں گے اور اس نور (قرآن) کی پیروی کریں گے جو ان کے ساتھ اتارا گیا ہے، وہی لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں

تشریح:

اس آیت میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نو (۹) اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے:

۱۔ رسول ۲۔ نبی ۳۔ امی ۴۔ توراۃ وانجیل میں مذکور ہونا ۵۔ نیکی کا حکم دینا ۶۔ برائی سے روکنا ۷۔ پاک چیزوں کا حلال کرنا، مثلا یہود پر اونٹ کا گوشت اور گائے بکری کی چربی حرام ہوچکی تھی حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انھیں حلال کر دیا۔ ۸۔ ناپاک چیزوں کو حرام کرنا، مثلاً عیسائیوں پر شراب حلال تھی حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو حرام قرار دیا۔ ۹۔ سخت شرعی احکام کو نرم کرنا مثلاً پہلی شریعتوں میں اگر کپڑے کا کچھ حصہ ناپاک ہوجاتا تو اس کو کاٹ کر علیحدہ کر دیتے مگر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ناپاک کپڑا دھونے سے پاک ہو جاتا ہے، کاٹ کر پھینکنے کی ضروت نہیں ہے۔

اس آیت میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ایک وصف امی بیان کیا گیا ہے، اس سے کیا مراد ہے، ملاحظہ کریں:

۱۔ مکہ مکرمہ کا ایک نام ام القریٰ (ساری بستیوں کی اصل) ہے، اس اعتبار سے امی کا معنی ہوگا، مکہ والا، جیسا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ایک نام مکی بھی ہے یعنی مکہ والا۔

۲۔ جیسے مکہ سے مکی بنتا ہے اسی طرح امۃ سے امی یعنی امت والا، جس طرح دیگر انبیائے کرام (علیہم السلام) امت والے ہیں اسی طرح آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی صاحب امت ہیں۔ ابن حبان نے حضرت انس (رض) سے روایت کی ہے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قیامت کے دن ہر نبی کے لیے نور کا ایک منبر ہوگا اور میں سب سے اونچے اور سب سے زیادہ نور والے منبر پر متمکن ہوں گا کہ ایک منادی ندا کرے گا: نبی امی کہاں ہے؟ انبیائے کرام (علیہم السلام) کہیں گے: ہم میں سے ہر ایک نبی امی (امت والا) ہے، پھر کس کے پاس پیغام آیا ہے؟ منادی دوبارہ لوٹ کر آئے گا اور کہے گا: نبی امی عربی کہاں ہے؟ اس پر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) منبر پر اتر کر آئیں گے۔ سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا۔۔۔

(ابن حبان: جلد ۶: حدیث نمبر ۶۴۸۹: باب الحوض والشفاعۃ)

۳۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو امی کہنے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) امی یعنی ان پڑھ کر قوم کی طرف مبعوث ہوئے جیسا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ہم امی لوگ ہیں لکھتے ہیں نہ حساب کرتے ہیں۔ (بخاری، کتاب الصوم، باب ۱۳) کیونکہ اہل عرب میں عام طور پر تعلیم کا رواج نہیں تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان میں کوئی پڑھا لکھا نہیں تھا کیونکہ کاتبان وحی اسلام لانے سے پہلے بھی پڑھے لکھے تھے اور غزوہ بدر کے بعد جن کفار قیدیوں کو مدینہ کے بچوں کا استاد بنایا گیا وہ بھی پڑھے لکھے تھے، تاہم ان کی غالب اکثریت ان پڑھ تھی اسی لیے ان کو امی قوم کہا جاتا تھا۔

۴۔ ماں کو عربی میں ام کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے امی کا معنی ہوگا: ماں والا یعنی جو بچہ شکم مادر سے پیدا ہونے کے بعد اسی حالت پر رہے اور کسی استاد سے پڑھنا لکھنا نہ سیکھے اسے امی (ویسا ہی جیسا ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا) کہتے ہیں۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شکم مادر سے پیدا ہونے کے بعد کسی استاد سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا۔ اس اعتبار سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی امی تھے۔ اعلان نبوت سے پہلے چالیس سالہ زندگی میں نہ آپ نے کبھی کوئی کتاب پڑھی اور نہ ہی اپنے ہاتھ سے کچھ لکھا، اگر یوں ہوتا تو منکرین ضرور شک کرتے۔ (قرآن: ۲۹: ۴۸) کہ یہ قرآن پہلی کتابوں کے پڑھنے یا کسی کے لکھانے کا نتیجہ ہے، لیکن نبوت کے بعد جب اسلام پھیل گیا اور لوگوں کے شکوک کا خطرہ نہ رہا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو معجزہ طور پر تعلیم دی جیسے قرآن کہتا ہے۔ "اللہ تعالیٰ نے آپ کو تعلیم دی جو کچھ آپ نہیں جانتے تھے"۔ (قرآن: ۴: ۱۱۳) پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اللہ تعالیٰ نے امت کا معلم بنایا: "جو ان پر اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ (قرآن: ۳: ۱۶۴) پڑھنے لکھنے کے متعلق سب سے پہلی نازل ہونے والی پانچ آیات غور طلب ہیں: " اپنے رب کے نام سے پڑھیے۔۔ جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا"۔ (قرآن: ۹۶: ۱تا۵)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم اور لکھنے پڑھنے کی ترغیب دی ہے۔ جس طرح علم اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اسی طرح لکھنا پڑھنا بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ بعض صحابہ کرام (رض) کو لکھنے اور پڑھنے میں کمال حاصل تھا تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہ کمال عطا نہ فرمایا ہو، نیز حضرت آدم (علیہ السلام) پیدا ہوتے ہی عرش کے ستونوں پر لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا پڑھ لیں (البدایہ والنہایہ: جلد اول: ص ۸۱) اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) توراۃ کی لکھی ہوئی تختیاں پڑھ لیں تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ سارے انبیائے کرام (علیہم السلام) کے امام اور سردار حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نہ پڑھ سکیں۔ آج کسی عالم یا

معلم کو ان پڑھ کہنا اس کی توہین ہے تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو ساری مخلوقات سے بڑے عالم اور قرآن مجید جیسی عظیم کتاب کے معلم ہیں ان کو امی بمعنی ان پڑھ کہنا لمحہ فکریہ ہے۔ جب امی کے عظمت والے معانی موجود ہیں تو نقص والا معنی استعمال کرنا درست نہیں ہے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لکھنے اور پڑھنے کے بارے میں صلح نامہ حدیبیہ کا واقعہ ملاحظہ کریں:

"یہ وہ ہے جس پر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صلح کی۔ کفار نے کہا: ہم اس کو نہیں مانتے اگر ہم کو یقین ہوتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو ہم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو (عمرہ کرنے سے) منع نہ کرتے لیکن آپ محمد بن عبداللہ ہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میں رسول اللہ بھی ہوں اور میں محمد بن عبداللہ بھی ہوں پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی (رض) سے فرمایا: رسول اللہ (کے الفاظ) مٹادو (کیونکہ حضرت علی (رض) معاہدہ تحریر کر رہے تھے) حضرت علی (رض) نے کہا: خدا کی قسم! میں آپ (کے رسول اللہ کے الفاظ) کو کبھی نہیں مٹاؤں گا، تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس مکتوب کو پکڑا (رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے الفاظ مٹائے) اور لکھا: یہ وہ ہے جس پر محمد بن عبداللہ نے صلح کی۔۔ (بخاری: ۲۶۹۹: کتاب الصلح: باب ۶)

عمر بن شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ صلح حدیبیہ سے پہلے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لکھنا نہیں جانتے تھے اور یہ آپ کا عظیم معجزہ ہے کہ اس دن آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اچانک اپنے ہاتھ سے لکھنا شروع کر دیا۔ (خصائص کبریٰ: جلد دوم ص ۲۳۶) علامہ آلوسی نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لکھنے پڑھنے کی تصدیق کرتے ہوئے حضرت عتبہ (رض) کی ایک روایت نقل کی ہے کہ "نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس وقت تک فوت نہیں ہوئے جب تک آپ نے پڑھا اور لکھا نہیں"۔ (تفسیر روح المعانی) اس سے معلوم ہوا کہ اعلان نبوت سے پہلے آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، نبوت کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس طرح آپ کو علم عطا فرمایا اسی طرح لکھنا پڑھنا بھی سکھایا، البتہ تبلیغ اسلام میں آپ کو لکھنے پڑھنے کی ضرورت بہت کم پڑی کیونکہ اہل عرب کی اکثریت ان پڑھ تھی اور انھیں زبانی تبلیغ کی ہی ضرورت تھی۔ شہاب الدین خفاجی نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ایک حدیث ذکر کی ہے جس میں آپ نے نہ لکھنے کی وجہ بیان فرمائی ہے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "میں لکھنے کا ارادہ اس لیے نہیں کرتا تاکہ قلم کا سایہ اللہ تعالیٰ کے نام پر نہ پڑے۔" اس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا سایہ زمین سے اٹھالیا تاکہ کسی کا پاؤں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سایہ پر نہ پڑے۔
(نسیم الریاض: جلد ۲: ص ۳۹۸: النبی الامی)

توراۃ اور انجیل میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا تعارف اس قدر واضح تھا کہ اہل کتاب حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنے بیٹوں کی طرح پہچانتے تھے۔ ملاحظہ کریں۔ (سورۃ بقرہ آیت نمبر ۸۹ حاشیہ نمبر ۶۳ اور آیت نمبر ۱۴۶ حاشیہ نمبر ۱۰۴ اور سورۃ انعام آیت نمبر ۲۰ حاشیہ نمبر ۲۱)

موجودہ بائبل میں بھی ایسی آیات موجود ہیں جو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نشاندہی کرتی ہیں اس سلسلہ میں دی لیونگ بائبل برٹس ایڈیشن ۱۹۷۵ء سے درج ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

he will -and by the Comforter i mean the Holy Spirit-Wehn the father sender the comforter to represent me-1
.teach you much, as well as remind you of everthing i myself have told you

if i do -for if i don't the Comforter won't come-But the fact of the matter is that it is best for you that i go away-2
-oh, there is so much more i want to tell you, but you can't understand it now--for i will send him to you-he will
Wh is the truth, comes, he will guide you into all truth, for he will not be presnting his own -When the Holy Spirit
He shall praise me and -He will tell you about the future-ideas, but will be passing on to you what he has heard
(14-7-hohn:16)-bring me great honour by showing you my glory

حضرت عیسیٰ نے فرمایا:

ا۔جب باپ میری نمائندگی کے لیے مددگار کو بھیجے گا (مددگار سے میری مراد مقدس روح ہے) وہ تمہیں بہت کچھ سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب بھی تمہیں یاد دلائے گا۔ (یوحنا کی انجیل: باب ۱۴: آیت ۲۶

۲۔ درحقیقت تمہارے لیے بہتر یہ ہے کہ میں چلا جاؤں کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار نہیں آئے گا لیکن اگر میں چلا جاؤں تو وہ آجائے گا کیونکہ میں اس کو تمہارے پاس بھیجوں گا۔۔ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں مگر اب تم ان کو سمجھ نہیں سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گا بلکہ جو کچھ سنے گا وہی تم کو پہنچائے گا۔ وہ تمہیں مستقبل کی خبریں دے گا۔ وہ میری تعریف کرے گا اور تمہیں میری عظمت دکھا کر مجھے بہت عزت دے گا۔

(یوحنا کی انجیل: باب ۲۶: آیات ۷ تا ۱۴)

بائبل کی مذکورہ آیات میں جس مقدس روح کی صفات کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہمارے نبی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر صادق آتی ہیں گویا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا: میرے بعد جو مقدس روح یعنی آخری نبی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آئے گا وہ تمہیں میری شریعت سے آگاہ کرے گا اور اپنی شریعت کے تمام احکام سمجھائے گا چونکہ ان کی آمد کا وقت میرے بعد ہے اس لیے میرا جانا تمہارے لیے بہتر ہے تاکہ وہ نبی تشریف لائے اور جو احکام تم اب نہیں سمجھ سکتے وہ تمہیں تمام سچائی کی راہ دکھائے۔ نیز وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہے گا بلکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ سے سنے گا وہی کہے گا۔ تمہیں مستقبل کی خبریں بھی دے گا اور میرے معجزات کا ذکر کرکے مجھے عزت دے گا۔

اس آیت کے آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ فلاح دارین ان لوگوں کو ملے گی جو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے، ان کی تعظیم کی، ان کے دین کی مدد کی اور ان کے ساتھ نازل ہونے والے قرآن مجید کی پیروی کی۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعظیم سے مراد وہ اقوال، افعال اور احوال ہیں جو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سچی اطاعت اور خالص محبت میں اہل ایمان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ وہ کفر و شرک سے پاک ہوں۔

اہل ایمان پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعظیم لازم ہے، آپ کی تعظیم کے چند پہلو ملاحظہ کریں:

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعظیم قرآن مجید کی روشنی میں

ا۔ بیشک ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو گواہی دینے والا اور بشارت دینے والا اور عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا تاکہ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کی تعظیم اور توقیر کرو اور صبح و شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرو۔ (قرآن: ۴۸: ۸ تا ۹)

۲۔ اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آواز سے بلند نہ کرو اور نہ ان سے اس طرح بلند آواز سے بات کرو جیسے تم آپس میں بلند آواز سے بات کرتے ہو کہیں (ایسا نہ ہو کہ) تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔ (قرآن: ۴۹: ۲) اس سے معلوم ہوا جو لوگ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بے ادبی کا ارتکاب کرتے ہیں ان کی نیکیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔

۳۔ بیشک جو لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لیے پرکھ لیا ہے، ان کے لیے مغفرت اور بہت بڑا ثواب ہے۔ (قرآن: ۴۹: ۳)

۴۔ بیشک جو لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔ (قرآن: ۴۹: ۴)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعظیم حدیث پاک کی روشنی میں

ابو سعید بن معلیٰ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے پاس سے گزرے اور وہ نماز پڑھ رہا تھا تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو بلایا، ابوس سعید (رض) کہتے ہیں: میں نے نماز پڑھی اور پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس حاضر ہوا تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پوچھا: کس چیز نے تمہیں میرے پاس حاضر ہونے سے روکا؟ میں نے عرض کیا: میں نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: اے ایمان والو! جس وقت تمہیں اللہ اور اس کا رسول بلائے تو فوراً آ ہو جاؤ۔ (ابوداؤد: ۱۴۵۸: کتاب الصلوٰۃ: باب ۳۵۱)

فقہائے کرام نے اس آیت اور حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ جب کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کو بلائیں تو اس پر واجب ہے کہ وہ نماز چھوڑ کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو جائے۔ اس کی نماز نہیں ٹوٹے گی کیونکہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کرنا ہے۔ (تفسیر روح المعانی: سورۃ انفال: زیر آیت نمبر ۲۴) ویسے بھی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سلام کرنا نماز کا حصہ ہے جیسا کہ ہر نمازی اپنی نماز کے دوران نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مخاطب کرکے "السلام علیکم ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہتا ہے۔ (خصائص کبریٰ: جلد دوم: ص ۲۵۳)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعظیم کے متعلق اہل بیت اور صحابہ کرام کا طرز عمل

۱۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر عروہ بن مسعود ثقفی جب واپس مکہ گیا تو اس نے قریش سے کہا: "اے میری قوم! خدا کی قسم! میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی وغیرہ کئی بادشاہوں کے پاس وفود لے کر گیا ہوں، بخدا! میں نے کسی بادشاہ کی ایسی تعظیم نہیں دیکھی جیسی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعظیم کرتے ہیں۔ خدا کی قسم! جب بھی آپ تھوکتے تو کوئی نہ کوئی صحابی اس کو اپنی ہتھیلی پر لے لیتا، پھر اس لعاب کو اپنے چہرے اور جسم پر ملتا اور جب آپ کسی کام کا حکم دیتے تو سب اس کام کو کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرتے اور جب آپ وضو کرتے تو آپ کے وضو سے بچے ہوئے پانی کو لینے کے لیے وہ سب ایک دوسرے پر ایک طرح جھپٹ پڑتے جیسے وہ ایک دوسرے کو قتل کر دیں گے اور جب آپ بات کرتے تو آپ کے سامنے سب خاموش ہو جاتے اور آپ کی تعظیم کی وجہ سے آپ کو گھور کر نہیں دیکھتے۔ (بخاری: کتاب الشروط: باب ۱۵)

۲۔ ام المومنین عائشہ صدیقہ (رض) نے فرمایا کہ حضرت فاطمہ (رض) جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس حاضر ہوتیں تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے لیے کھڑے ہو جاتے، ان (کے سر) کو بوسہ دیتے اور ان کو اپنی جگہ پر بٹھاتے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب حضرت فاطمہ (رض) کے پاس تشریف لائے تو وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے کھڑی ہو جاتیں، آپ کے (دست مبارک) کو بوسہ دیتیں اور آپ کو اپنی جگہ پر بٹھاتیں۔ (ترمذی: ابواب المناقب: باب ۶۱)

۳۔ حضرت وازع بن عامر (رض) روایت کرتے ہیں: "جب ہم وہاں پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مبارک ہاتھ اور پاؤں چومنا شروع کر دیئے۔ (امام بخاری: الادب المفرد: ص ۲۸۸)

۴۔ صحابہ کرام (رض) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہاتھ چوما کرتے تھے اور تابعین جو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زیارت نہ کر سکے وہ صحابہ کرام (رض) کے ان ہاتھوں کو چوما کرتے تھے جن ہاتھوں نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہاتھوں میں بیعت کی تھی۔ ایک دن حضرت ثابت (رض) نے حضرت انس (رض) سے پوچھا: کیا آپ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنے ہاتھ سے چھوا؟ حضرت انس (رض) نے کہا: ہاں، تو حضرت ثابت (رض) نے حضرت انس (رض) کے ہاتھ کو چوم لیا۔ (امام بخاری: الادب المفرد: ص ۲۸۸، ۲۸۷)

۵۔ حضرت ابوہریرہ (رض) روایت کریت ہیں: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسجد میں ہمارے ساتھ بیٹھتے، گفتگو فرماتے اور جب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کھڑے ہوتے تو ہم بھی کھڑے ہو جاتے اور (اس وقت تک) کھڑے رہتے یہاں تک کہ ہم دیکھتے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ازواج مطہرات میں سے کسی ایک کے گھر میں داخل ہو گئے ہیں۔ (ابوداؤد: کتاب الادب: باب ۱)

۶۔ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف فرما ہوتے اور نعلین مبارک اتار دیتے تو حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) ان کو اٹھا کر اپنی آستین میں رکھ لیتے اور جب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کھڑے ہوتے تو حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نعلین مبارک پہناتے۔ (السیرۃ الحلبیۃ: جلد ۳: ص ۴۵۵)

وفات کے بعد نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعظیم

قاضی عیاض لکھتے ہیں: وفات کے بعد بھی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعظیم و توقیر لازم ہے جس طرح آپ کی حیات میں لازم تھی۔ ابوابراہیم نے کہا: ہر مومن پر واجب ہے کہ جب وہ آپ کا ذکر کرے یا اس کے پاس آپ کا ذکر کیا جائے تو وہ پورے خشوع و خضوع کے ساتھ اپنے اوپر ایسی باادب کیفیت طاری کرے

جیسے وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے کھڑا ہے۔ (شرح شفا: جلد دوم: ص ۷۱) قاضی عیاض آگے صفحہ ۷۲ پر لکھتے ہیں: بنی عباس کے دوسرے خلیفہ ابو جعفر نے مسجد نبوی میں امام مالک (رض) سے بحث کرتے ہوئے اپنی آواز بلند کی۔ امام مالک (رض) نے اس سے کہا: اے امیر المومنین! آپ اس مسجد میں اپنی آواز بلند نہ کریں۔ خلیفہ ابو جعفر نے امام مالک کی بات کو تسلیم کرلیا اور پوچھا: جب میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مواجہہ شریف میں کھڑا ہو کر دعا کروں تو آپ کی طرف منہ کروں یا قبلہ کی طرف منہ کروں؟ امام مالک (رض) نے فرمایا: آپ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اپنا رخ کیوں پھیرتے ہیں حالانکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کے اور آپ کے باپ حضرت آدم (علیہ السلام) کے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وسیلہ ہیں، بلکہ آپ کی طرف منہ کیجئے اور آپ سے شفاعت طلب کیجئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے حق میں ان کی شفاعت کو قبول فرمائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اور اگر یہ لوگ جب اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے تو آپ کے پاس آجاتے اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی ان کے لیے مغفرت طلب کرتے تو یقیناً یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا پاتے"۔ (قرآن ۴: ۶۴)

سائب بن یزید فرماتے ہیں کہ میں مسجد نبوی میں کھڑا تھا تو کسی آدمی نے مجھے کنکری ماری۔ میں نے دیکھا تو وہ عمر بن خطاب (رض) تھے۔ انھوں نے (دو آدمیوں کی طرف اشارہ کیا جو مسجد میں بلند آواز سے باتیں کر رہے تھے اور) فرمایا: ان دو آدمیوں کو میرے پاس لے آؤ، میں ان کو حضرت عمر (رض) کے پاس لے آیا تو حضرت عمر (رض) نے ان سے فرمایا: تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ انھوں نے کہا: وہ طائف کے رہنے والے ہیں۔ حضرت عمر (رض) نے فرمایا: اگر تم اس شہر (مدینہ منورہ) کے رہنے والے ہوتے تو میں تمہیں سزا دیتا، تم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مسجد میں آوازیں بلند کرتے ہو۔ (بخاری: کتاب الصلوٰۃ: باب ۸۳)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی احادیث کی تعظیم

امام مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے ابن مسیب (رض) سے ایک حدیث کے بارے میں سوال کیا۔ وہ اس وقت لیٹے ہوئے تھے، پس وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور پھر حدیث بیان کی (اگرچہ وہ بیمار تھے اور انھیں اٹھ کر بیٹھنے میں تکلیف بھی ہوئی) سائل نے کہا: میری خواہش تو یہی تھی کہ آپ اٹھ کر بیٹھنے کی تکلیف نہ کرتے (کیونکہ آپ بیمار ہیں) آپ نے کہا: میں نے اس کو ناپسند کیا کہ میں لیٹ کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حدیث بیان کروں۔ (شرح شفا: جلد دوم: ص ۷۷)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آثار و تبرکات کی تعظیم

حضرت نافع سے مروی ہے کہ "صحابی رسول حضرت عبداللہ بن ابن عمران مقامات کی زیارت کرنے کے لیے جاتے جہاں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کبھی نماز ادا فرمائی اور اس درخت کو بھی پانی دیتے کہ کہیں سوکھ نہ جائے جس درخت کے نیچے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے آرام فرمایا تھا۔ (کنزالعمال: جلد ۱۳: حدیث نمبر ۳۷۲۵۵) (تفسیر امدادالکرم)

نبی اور رسول کے معنی

علامہ مسعود بن عمر تفتازانی متوفی ۷۹۱ھ لکھتے ہیں۔

رسول وہ انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی طرف تبلیغ کے لیے بھیجا اور کبھی اس میں کتاب کی شرط بھی لگائی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف نبی عام ہے خواہ اس کے پاس کتاب ہو یا نہ۔ (شرح عقائد صفی ٗص ۱۴)

اس تعریف پر یہ اعتراض ہے کہ رسول تین سو تیرہ ہیں اور کتابیں اور صحائف ملا کر ایک سو چودہ ہیں۔ اور باقی رسولوں کے پاس کتاب نہیں تھی۔ اس لیے علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ تحقیق یہ ہے کہ نبی وہ انسان ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کی بغیر کسی بشر کے واسطے کے خبر دے اور ان امور کی خبر دے جن کو محض عقل سے نہیں جانا جاسکتا۔ اور رسول وہ ہے جو ان اوصاف کے علاوہ مرسل الیہم کی اصلاح پر بھی مامور ہو۔ (روح المعانی جز ۹ ٗص ۷۹) لیکن یہ فرق بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ نبی بھی انسانوں کی اصلاح پر مامور ہوتا ہے۔ اس لیے صحیح جواب یہ ہے کہ رسول کے پاس کتاب ہونا ضروری ہے خواہ کتاب جدید ہو یا کسی سابق رسول کی

کتاب ہو۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ رسول کے لیے ضروری ہے کہ اس پر فرشتہ وحی لائے اور نبی کے لیے یہ ضروری نہیں ہے یہ جائز ہے کہ اس کے دل پر وحی کی جائے۔ یا خواب میں اس پر وحی کی جائے۔

اس آیت میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نو اوصاف میں سے ایک تیسرا وصف امی ذکر فرمایا ہے ' ہم یہاں لفظ امی کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن مجید کی حسب ذیل آیات میں اللہ تعالیٰ نے لفظ امی کا ذکر فرمایا ہے۔

قرآن اور سنت میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر امی کا اطلاق

الذین یتبعون الرسول النبی الامی (الاعراف : ۱۵۷)

جو لوگ اس رسول ' نبی امی کی پیروی کریں۔

فامنو باللہ ورسولہ النبی الامی (الاعراف : ۱۵۸)

اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر جو نبی امی ہیں۔

نیز قرآن مجید میں ہے۔

ومنھم امیون لا یعلمون الکتاب الا امانی (البقرہ : ۷۸)

اور ان میں بعض لوگ ان پڑھ ہیں جو زبان سے لفظوں کو پڑھنے کے سوا (اللہ کی) کتاب (کے معانی) کا کچھ علم نہیں رکھتے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم (الجمعہ : ۲)

جس نے ان پڑھ لوگوں میں انھیں میں سے ایک عظیم رسول بھیجا۔

ان کے علاوہ سورت آل عمران میں دو جگہ (۷۵ ' ۲۰) امیین کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خود بھی اپنے لیے امی کا لفظ استعمال کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہم امی لوگ ہیں لکھتے ہیں نہ حساب کرتے ہیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث : ۱۹۱۳ ' صحیح مسلم الصیام ' ۱۵ (۱۰۸۰) ۲۴۷۲ ' سنن ابوداؤد رقم الحدیث : ۲۳۱۹ ' سنن النسائی رقم الحدیث : ۲۱۴۱ ' السنن الکبری للنسائی رقم الحدیث : ۲۴۵۱ ' مسند احمد ج ۲ ' ص ۴۴ ' طبع قدیم ' جامع الاصول ج ٦ ' رقم الحدیث : ۴۳۹۳)

امی کا لغوی معنی

علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ ھ لکھتے ہیں :

امی وہ شخص ہے جو نہ لکھتا ہو اور نہ کتاب سے دیکھ کر پڑھتا ہو۔ اس آیت میں امی کا یہی معنی ہے "ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم" قطرب نے کہا امیہ "کے معنی غفلت اور جہالت ہیں سو امی کا معانی قلیل المعرفت ہیں۔ اسی معنی میں ہے "ومنھم امیون لا یعلمون الکتاب الا امانی" یعنی وہ امی ہیں جب تک ان پر تلاوت نہ کی جائے وہ از خود نہیں جانتے۔ فراء نے کہا یہ وہ عرب لوگ ہیں جن کے پاس کتاب نہ تھی اور قرآن مجید میں ہے "والنبی الامی الذی یجدونہ مکتوبا عندھم فی التورۃ والانجیل" ایک قول یہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو امی اس لیے فرمایا ہے کہ آپ امین کے نبی تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ آپ کو امی اس لیے فرمایا کہ آپ لکھتے تھے نہ کتاب سے پڑھتے تھے ' اور یہ آپ کی فضیلت ہے کیونکہ آپ حفظ کرنے سے مستغنی تھے اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی ضمانت پر اعتماد تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : " سنقرئک فلا تنسی " عنقریب ہم آپ کو پڑھائیں گے اور آپ نہیں بھولیں گے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ آپ کو امی اس لیے فرمایا کہ آپ ام القریٰ یعنی مکہ مکرمہ کے رہنے والے تھے۔ (المفردات ج ۱ ' ص ۲۹ ' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ ' بیروت)

علامہ ابن اثیر جزری متوفی ٦٠٦ ھ لکھتے ہیں :

حدیث میں ہے "انا امۃ لانکتب ولا نحسب "ہم اہل عرب امی ہیں لکھتے ہیں نہ حساب کرتے ہیں "آپ کی مراد یہ تھی کہ ہم اسی طرح ہیں جس طرح اپنی ماؤں سے پیدا ہوئے تھے۔ یعنی اپنی جبلت اولیٰ پر ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ امی وہ ہے جو لکھتا نہ ہو۔ نیز حدیث میں ہے بعثت الی امۃ امیۃ "میں امی امت کی طرف بھیجا گیا ہوں "یا امی سے عرب مراد ہیں کیونکہ عرب میں لکھنا بالکل نہ تھا یا بہت کم تھا۔ (النہایہ ج ۱ ص ۶۹ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

علامہ محمد طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ ھ لکھتے ہیں:

حدیث میں ہے ہم امی لوگ ہیں لکھتے ہیں نہ حساب کرتے ہیں۔ یعنی اپنی ماں سے پیدائش کی اصل پر ہیں۔ لکھنا سیکھا ہے نہ حساب کرنا۔ تو وہ اپنی اصل جبلت پر ہیں اور اسی نہج پر ہے امیین میں رسول بھیجا گیا۔ علامہ کرمانی نے کہا اس میں ام القریٰ کی طرف نسبت ہے یعنی مکہ والوں کی طرف۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ عرب میں لکھنے والے بھی تھے اور ان میں سے اکثر حساب جاننے والے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لکھنا نہیں جانتے تھے اور حساب سے مراد ستاروں کا حساب ہے اور وہ اس کو بالکل نہیں جانتے تھے۔ علامہ طیبی نے کہا کہ ابن صیاد نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا آپ امین کے رول ہیں اس شیطان کا مطلب یہ تھا کہ آپ صرف عرب کے رسول ہیں دوسروں کے نہیں۔

(مجمع بحار الانوار ج ۱ ص ۱۰۷ مطبوعہ مکتبہ دار الامان المدینہ المنورہ ۱۴۱۵ ھ)

علامہ زبیدی متوفی ۱۲۰۵ ھ لکھتے ہیں:

قاموس میں ہے امی وہ شخص ہے جو لکھتا نہ ہو یا اپنی ماں سے پیدائش کے حال پر باقی ہو اور امی غبی اور قلیل الکلام کو بھی کہتے ہیں۔ اس کی تشریح میں علامہ زبیدی لکھتے ہیں: حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو امی اس لیے کہا جاتا ہے کہ عرب قوم لکھتی تھی نہ پڑھتی تھی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث کیا درآنحالیکہ آپ لکھتے تھے نہ کتاب کو پڑھتے تھے۔ اور یہ آپ کا معجزہ ہے کیونکہ آپ نے بغیر کسی تغیر اور تبدل کے بار بار قرآن مجید کو پڑھا۔ قرآن مجید میں ہے "وماکنت تتلو من قبلہ من کتاب " (الایۃ) حافظ ابن حجر عسقلانی نے احادیث رافعی کی تخریج میں لکھا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر لکھنے اور شعر گوئی کو حرام کر دیا گیا تھا۔ یہ اس وقت ہے اگر آپ شعر گوئی اور لکھنے کو اچھی طرح بروئے کار لاتے اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ ہر چند کہ آپ کو شعر اور خط میں مہارت تو نہیں تھی لیکن آپ اچھے اور برے شعر میں تمیز رکھتے تھے۔ اور بعض علماء کا یہ دعویٰ ہے کہ پہلے آپ لکھنا نہیں جانتے تھے لیکن بعد میں آپ نے لکھنا جان لیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وماکنت تتلوا من قبلہ (الایہ) آپ سے پہلے نہ کسی کتاب کو پڑھتے تھے نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اور "اس سے پہلے "کی قید کا یہ معنی ہے کہ بعد میں آپ نے اس کو جان لیا، کیونکہ آپ کا پہلے نہ جاننا معجزہ کے سبب سے تھا اور جب اسلام پھیل گیا اور لوگوں کے شکوک کا خطرہ نہ رہا تو پھر آپ نے اس کو جان لیا، اور امام ابن ابی شیبہ اور دیگر محدثین نے مجاہد سے روایت کیا ہے "مامات رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حتی کتب وقرء رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس وقت تک فوت نہیں ہوئے جب تک کہ آپ نے لکھ نہیں لیا، اور پڑھ نہیں لیا اور مجاہد نے شعبی سے کہا، اس آیت میں اس کے خالف نہیں ہے۔ ابن وحیہ نے کہا کہ علامہ ابوذر، علامہ ابو ذر، علامہ ابو الفتح نیشاپوری اور علامہ باجی مالکی کا بھی یہی نظریہ ہے۔ علامہ باجی نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے، بعض افیقی علماء نے بھی علامہ باجی کی موافقت کی ہے اور کہا ہے کہ امی ہونے کے بعد لکھنے کو جان لینا معجزہ کے منافی نہیں ہے بلکہ یہ آپ کا دوسرا معجزہ ہے، کیونکہ بغیر کسی انسان کے سکھائے کتاب کو پڑھنا اور لکھنا بھی معجزہ ہے۔ ابو محمد بن مفوز نے علامہ باجی کی کتاب کا رد لکھا ہے اور علامہ سمنانی وغیرہ نے کہا ہے کہ آپ بغیر علم کے لکھتے تھے، جیسے بعض ان پڑھ بادشاہ بعض حروف لکھ لیتے تھے حالانکہ ان کو حروف کی تمیز اور شناخت نہیں ہوتی تھی۔ (تاج العروس ج ۸ ص ۱۹۱ مطبوعہ المطبعہ الخیریہ مصر ۱۳۰۶ ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ ھ امی کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

زجاج نے کہا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو امی اس لیے کہا ہے کہ آپ امت عرب کی طرف منسوب ہیں جس کے اکثر افراد لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ اور امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابن عمر (رض) سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ اہم امی لوگ ہیں نہ لکھتے ہیں نہ گنتی کرتے ہیں۔ امام باقر نے کہا ہے کہ آپ ام القریٰ یعنی مکہ کے رہنے والے تھے اس لیے آپ کو امی فرمایا "آپ اپنی ام (ماں) کی طرف منسوب تھے، یعنی آپ اسی حالت پر تھے جس حال پر اپنی ماں سے پیدا ہوئے تھے "آپ کا یہ وصف اس تنبیہ کے لیے بیان کیا گیا ہے کہ آپ اپنی پیدائشی حالت پر قائم رہنے (یعنی کسی سے پڑھنا، لکھنا نہ سیکھنے) کے باوجود اس قدر عظیم علم

رکھتے تھے سو یہ آپ کا معجزہ ہے۔ امی کا لفظ صرف آپ کے حق میں مدح ہے اور باقی کسی کے لیے ان پڑھ ہونا باعث فضیلت نہیں ہے ' جیسا کہ تکبر کا لفظ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے باعث مدح ہے اور دوسروں کے حق میں باعث مذمت ہے۔

نیز علامہ آلوسی لکھتے ہیں : علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کسی وقت لکھنے کا صدور ہوا ہے یا نہیں ہوا؟ ایک قول یہ ہے کہ ہاں صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ نے صلح نامہ لکھا اور یہ بھی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا معجزہ ہے اور احادیث ظاہرہ کا بھی یہی تقاضا ہے ' اور ایک قول یہ ہے کہ آپ نے بالکل نہیں لکھا اور آپ کی طرف لکھنے کی نسبت مجاز ہے ' اور بعض اہل بیت سے روایت ہے کہ آپ لکھے ہوئے الفاظ کو دیکھ کر پڑھتے تھے لیکن اس روایت کی کوئی معتمد سند نہیں ہے ' ہاں ابوالشیخ نے اپنی سند کے ساتھ عقبہ سے روایت کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس وقت تک فوت نہیں ہوئے جب تک آپ نے پڑھا اور لکھا نہیں ' شعبی نے اس روایت کی تصدیق کی ہے۔ (روح المعانی ' ج ۹ ' ص ۷۷ ' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی ' بیروت)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لکھنے اور پڑھنے پر قرآن مجید سے دلائل

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وماکنت تتلو من قبلہ من کتاب ولاتخطہ بیمینک اذاالارتاب المبطلون۔ (العنکبوت : ۴۸)

اس (کتاب کے نزول) سے پہلے آپ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے ' اگر ایسا ہوتا تو باطل پرستوں کو شبہ پڑجاتا !

اس آیت کے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کسی استاد سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا ' قریش مکہ کے سامنے آپ کی پوری زندگی تھی ' آپ کے اہل وطن اور رشتہ داروں کے سامنے ' روز پیدائش سے اعلان نبوت تک آپ کی ساری زندگی گزری اور وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آپ نے کبھی کوئی کتاب پڑھی نہ قلم ہاتھ میں لیا اور یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ آسمانی کتابوں کی تعلیمات ' گزشتہ انبیاء ورسل کے حالات ' قدیم مذاہب کے عقائد ' تاریخ ' تمدن ' اخلاق اور عمرانی اور عائلی زندگی کے جن اہم مسائل کو یہ امی شخص انتہائی فصیح وبلیغ زبان سے بیان کر رہے ہیں ' اس کا وحی الٰہی کے سوا اور کوئی سبب نہیں ہوسکتا ' اگر انھوں نے کسی مکتب میں تعلیم پائی ہوتی اور گزشتہ مذاہب اور تاریخ کو پڑھا ہوتا تو پھر اس شبہ کی بنیاد ہوسکتی تھی کہ جو کچھ یہ بیان کر رہے ہیں وہ دراصل ان کا حاصل مطالعہ ہے۔ ہرچند کہ کوئی پڑھا لکھا انسان بلکہ دنیا کے تمام پڑھے لکھے آدمی مل کر اور تمام علمی وسائل بروئے کار لا کر بھی ایسی بے نظیر کتاب تیار نہیں کر سکتے ' تاہم اگر آپ نے اعلان نبوت سے پہلے لکھنے پڑھنے کا مشغلہ اختیار کیا ہوتا تو جھوٹوں کو ایک بات بنانے کا موقع ہاتھ لگ جاتا ' لیکن جب آپ کا امی ہونا ' فریق مخالف کو بھی تسلیم تھا تو اس سرسری شبہ کی بھی جڑ کٹ گئی اور یوں کہنے کو تو ضدی اور معاند لوگ پھر بھی یہ کہتے تھے :

وقالو اساطیر الاولین اکتتبہا فہی تملی علیہ بکرۃ واصیلا (الفرقان : ۵)

اور انھوں نے کہا یہ پہلے لوگوں کے لکھے ہوئے قصے ہیں جو اس (رسول) نے لکھوا لیے ہیں ' سو وہ صبح وشام اس پر پڑھے جاتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ سے لکھنے اور پڑھنے کی نفی کو آپ کے اعلان نبوت سے پہلے کی قید سے مقید کیا ہے اور یہی مقصود ہے۔ کیونکہ اگر اعلان نبوت اور نزول قرآن سے پہلے آپ کا لکھنا پڑھنا ثابت ہوتا تو اس شبہ کی راہ نکل سکتی تھی اور اس آیت سے آپ کی نبوت اور قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے پر استدلال نہ ہوسکتا۔ اور اس قید لگانے کا یہ تقاضا ہے کہ اعلان نبوت کے بعد آپ سے لکھنے اور پڑھنے کا صدور ہوسکتا ہے اور بعد میں آپ کا لکھنا اور پڑھنا اس استدلال کے منافی نہیں ہے۔

علامہ آلوسی نے بعض اجلہ علماء کا یہ قول نقل کیا ہے :

اس قد سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن مجدی کے نازل ہونے کے بعد نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لکھنے اور پڑھنے پر قادر تھے اور اگر اس قید کا اعتبار نہ کیا جائے تو یہ قید بے فائدہ ہوگی۔ (روح المعانی ج ۲۱ ' ص ۵ ' مطبوعہ بیروت)

اس استدلال پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ یہ مفہوم مخالف سے استدلال ہے۔ اور فقہاء احناف کے نزدیک مفہوم مخالف سے استدلال معتبر نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مفہوم مخالفت کا استدلال میں معتبر نہ ہونا اتفاقی نہیں ہے کیونکہ باقی ائمہ مفہوم مخالف کا اعتبار کرتے ہیں' خصوصاً جب کہ بکثرت احادیث صحیحہ سے بعثت کے بعد آپ کا لکھنا ثابت ہے' جیسا کہ ہم عنقریب انشاء اللہ با حوالہ بیان کریں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیگر علمی اور عملی کمالات عطافرمائے ہیں اسی طرح آپ کو لکھنے پڑھنے کا بھی کمال عطافرمایا ہے' لکھنے کا علم ایک عظیم نعمت ہے' قرآن مجید میں ہے: الذی علم بالقلم۔ علم الانسان مالم یعلم (العلق: ۵-۴) "جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا' اور انسان کو وہ علم دیا' جس کو وہ جانتا نہ تھا"۔ امت کے ان گنت افراد کو پڑھنے اور لکھنے کا کمال حاصل ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ کمال حاصل نہ ہو! اور امی ہونے کا فقط یہ مفاد ہے کہ آپ نے کسی مخلوق سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو براہ راست یہ علم عطافرمایا ہے اور بعثت سے پہلے آپ لکھنے اور پڑھنے میں مشغول نہیں رہے تاکہ آپ کی نبوت میں کسی شبہ نہ ہو اور بعثت کے بعد آپ نے پڑھا اور لکھا اور یہ ایک الگ معجزہ ہے۔ کیونکہ بغیر کسی مخلوق سے کسب فیض کے پڑھنا اور لکھنا خلاف عادت ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لکھنے پر سید مودودی کے اعتراضات اور ان کے جوابات

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لکھنے پر اعتراض کرتے ہوئے سید مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ لکھتے ہیں۔

ان لوگوں کی جسارت حیرت انگیز ہے جو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خواندہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں' حالانکہ یہاں قرآن صاف الفاظ میں حضور کے ناخواندہ ہونے کو آپ کی نبوت کے حق میں ایک طاقتور ثبوت کے طور پر پیش کر رہا ہے' جن روایات کا سہارا لے کر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضور لکھے پڑھے تھے یا بعد میں آپ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا' وہ اوّل تو پہلی ہی نظر میں رد کر دینے کے لائق ہیں کیونکہ قرآن کے خلاف کوئی روایت بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی' پھر وہ بجائے خود بھی اتنی کمزور ہیں کہ ان پر کسی استدلال کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی' ان میں سے ایک بخاری کی یہ روایت ہے کہ صلح حدیبیہ کا معاملہ جب لکھا جارہا تھا تو کفار مکہ کے نمائندے نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام کے ساتھ رسول اللہ لکھنے جانے پر اعتراض کیا۔ اس پر حضور نے کاتب (یعنی حضرت علی) حکم دیا کہ اچھا رسول اللہ کا لفظ کاٹ کر محمد بن عبداللہ لکھ دیا۔ (الی قولہ) ہو سکتا ہے کہ صحیح صورت واقعہ یہ ہو کہ جب حضرت علی نے "رسول اللہ" کا لفظ مٹانے سے انکار کر دیا تو آپ نے اس کی جگہ ان سے پچھ کر اور پھر ان سے یا کسی دوسرے کاتب سے ابن عبداللہ کے الفاظ کے الفاظ لکھوادیئے ہوں (الی قولہ) تاہم اگر واقعہ یہین ہو کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنا نام اپنے ہی دست مبارک سے لکھا ہو تو ایسی مثالیں دنیا میں بکثرت پائی جاتی ہیں کہ ان پڑھ لوگ صرف نام لکھنا سیکھ لیتے ہیں' باقی کوئی چیز نہ پڑھ سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں۔ (تفہیم القرآن ج ۳' ص ۱۳-۱۴ ملتحصا' مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور۔

الجواب

پہلی بات یہ ہے کہ سید مودودی کا یہ لکھنا غلط ہے کہ اعلان نبوت کے بعد نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا لکھنا قرآن مجید کی اس آیت اور اس استدلال کے خلاف ہے' کیونکہ قرآن مجید نے آپ کے لکھنے اور پڑھنے کی مطلقاً نفی نہیں کی' بلکہ نزول قرآن سے پہلے آپ لکھنے اور پڑھنے کی نفی کی ہے۔ لہذا نزول قرآن کے بعد جن احادیث میں آپ کے لکھنے کا ثبوت ہے وہ روایات قرآن مجید کے خلاف نہیں ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ صحیح بخاری' صحیح مسلم اور دیگر بکثرت کتب صحاح سے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا لکھنا ثابت ہے اور سید مودودی کا ان احادیث کو بجائے خود کمزور کہنا لائق التفات نہیں ہے۔ ثالثاً سید مودودی نے جو یہ تاویل کہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ آپ نے کسی اور کاتب سے لکھوادیا ہو سو یہ احتمال بلادلیل ہے اور الفاظ کو بلاضرورت مجاز پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے۔ رابعاً اس بحث کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ سید مودودی نے نبی امی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عام ان پڑھ لوگوں پر قیاس کیا ہے اور لکھا ہے اگر آپ نے اپنا نام اپنے ہی دست مبارک سے لکھا ہو تو ایسل مثالیں دنیا میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ کہ ان پڑھ لوگ صرف اپنا نام لکھنا سیکھ لیتے ہیں' باقی کوئی چیز نہیں پڑھ سکتے' نہ لکھ سکتے ہیں۔ عام لوگوں کا ان پڑھ ہونا ان کا نقص اور ان کی جہالت ہے اور رسول اللہ کا امی ہونا' آپ

کا کمال ہے ؛کہ دنیامیں کسی استاد کے آگے زانو تلمذ تمہ نہیں کیا ،کسی مکتب میں جا کر لکھناپڑھنا نہیں سیکھااور براہ راست خدائے لم یزل سے علم پا کر اولیں اور آخرین کے علوم بیان فرمائے اور پڑھ کر بھی دکھایااور لکھ بھی دکھایا۔

یتیمے کہ ناکردہ قرآن درست

کتب خانہ چند ملت بشت

اب ہم قارئین کے سامنے بکثرت حوالہ جات کے ساتھ وہ احادیث پیش کرتے ہیں ،جن میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف لکھنے کا اسناد کیا گیا ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لکھنے کے ثبوت میں احادیث

حضرت براء بن عازب ص بیان کرتے ہیں کی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ذوالقعدہ میں عمرہ کیا تو اہل مکہ نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے سے منع کر دیا ،حتی کہ اس بات پر صلح کی آپ آئندہ سال عمرہ کریں اور مکہ میں صرف تین دن قیام کریں ،جب انھوں نے صلح نامہ لکھا تو اس میں یہ لکھا کہ یہ وہ تحریر ہے جس پر محمد رسول اللہ نے صلح کی ،کفار مکہ نے کہا کہ ہم اس کو نہیں مانتے۔اگر ہم کو یہ یقین ہوتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو ہم آپ کو نہ منع کرتے لیکن آپ محمد بن عبداللہ ہیں۔ آپ نے فرمایا میں تو رسول اللہ ہوں اور میں محمد بن عبداللہ ہوں۔ پھر آپ نے حضرت علی بن ابی طالب سے فرمایا رسول اللہ (کے الفاظ) مٹادو ،حضرت علی نے کہا نہیں! خدا کی قسم! میں آپ (کے الفاظ) کو ہرگز نہیں مٹاؤں گا ،تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے (لکھنا شروع کیا ،اور آپ اچھی طرح (مہارت سے) نہیں لکھتے تھے۔ پس آپ نے لکھا یہ وہ ہے جس پر محمد بن عبداللہ نے صلح کی کہ کوئی شخص مکہ میں ہتھیار لے کر داخل نہیں ہوگا ،سوا اس کے کہ تلوار نیام میں ہو۔ (الحدیث)

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۲۵۱ ،مسند احمد ج ۴ ،ص ۲۹۸ ،جامع الاصول ج ۸ رقم الحدیث: ۶۱۳۳)

امام بخاری نے اس واقعہ کو ایک اور سند کے ساتھ حضرت براء بن عازب ص سے روایت کیا ہے اس میں اس طرح ہے:

جب انھوں نے صلح نامہ لکھا تو اس میں یہ لکھا کہ یہ وہ ہے جس پر محمد رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صلح کی کفار مکہ نے کہا ہم اس کو نہیں مانتے اگر ہم کو یہ یقین ہوتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو ہم آپ کو منع نہ کرتے ،لیکن آپ محمد بن عبداللہ ہیں ،آپ نے فرمایا میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہوں اور میں محمد بن عبداللہ ہوں ،پھر آپ نے حضرت علی سے کہا رسول اللہ (کے الفاظ) کو مٹادو ،حضرت علی نے کہا نہیں! خدا کی قسم! میں آپ (کے الفاظ) کو نہیں مٹاؤں گا ، تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس مکتوب کو پکڑا اور لکھا: وہ یہ ہے جس پر محمد بن عبداللہ نے صلح کی۔ (الحدیث) (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۶۹۹)

سید ابوالاعلی مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ ان احادیث پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضرت براء کی روایت میں اضطراب ہے اور راویوں نے حضرت براء کے جوں کے توں الفاظ نقل نہیں کیے۔ کسی روایت میں لکھنے کا مطلقاً ذکر نہیں ،کسی میں صرف "کتب" ہے اور کسی میں ہے "لیس یحسن یکتب"۔

تفہیم القرآن ،ج ۳ ،ص ۷۱۴ ،ملحصا ،مطبوعہ ادارہ ترجمن القرآن)

یعنی بعض روایات میں ہے۔آپ نے لکھا اور بعض روایات میں ہے آپ اچھی طرح یعنی مہارت سے نہیں لکھتے تھے۔

سید مودودی کا اس اختلاف کا اضطراب قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ یہ ایسا اختلاف نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے ان روایات کا معنی مضطرب ہو جائے۔ اگر اس قسم کی اختلاف کو اضطرا کہا جائے تو پھر تمام احادیث ساقط الاستدلال قرار پائیں گی۔

علاوہ ازیں جن احادیث میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لکھنے کا ثبوت ہے وہ اور بھی صحابہ کرام سے مروی ہیں اور ان میں "کتب" اور "لیس یحسن یکتب" کا اختلاف بھی نہیں ہے۔ اب ہم دوسرے صحابہ کی روایات کو پیش کر رہے ہیں:

سعید بن جبیر بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس (رض) عنھما نے کہا جمعرات کا دین! کیسا تھا وہ جمعرات کا دن! پھر وہ رونے لگے حتی کہ ان کے آنسوؤں سے سنگریزے بھیگ گئے۔ پس میں نے کہا اے ابن عباس! جمعرات کے دن میں کیا بات ہے؟ انھوں نے کہا اس دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دور زیادہ

ہو گیا تھا ' آپ نے فرمایا میرے پاس (قلم اور کاغذ) لاؤ میں تمہیں ایک ایسا مکتوب لکھ دوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہیں ہوگے ' پس صحابہ میں اختلاف ہو گیا اور نبی (علیہ السلام) کے پاس اختلاف نہیں ہونا چاہیے تھا ' صحابہ نے کہا آپ کا کیا حال ہے ؟ کیا آپ بیماری میں کچھ کہہ رہے ہیں ؟ آپ سے پوچھ لو۔ (الحدیث)

مسلم کی ایک روایت (۴۱۵۲) میں ہے حضرت ابن عباس نے فرمایا سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ان کا اختلاف اور شور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے لکھنے کے درمیان حائل ہو گیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث : ۴۴۳۱ ' صحیح مسلم ' الوصیۃ ' ۲۰ ' (۱۶۳۷) ۴۱۵۴ ' سنن ابوداؤد رقم الحدیث : ۳۰۲۹)

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں۔ کہ رول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے مرض میں مجھ سے فرمایا میرے لیے ابوبکر کو اور اپنے بھائی کو بلاؤ حتی کہ میں ایک مکتوب لکھ دوں ' کیونکہ مجھے خوف ہے کہ کوئی تمنا کرنے والا تمنا کرے گا اور کہنے الا کہے گا میں ہی (خلافت کا) مستحق ہوں ' اور اللہ اور مومنین ابوبکر کے غیر پر انکار کردیں گے۔ (صحیح مسلم ' فضائل الصحابۃ ۱۱ ' (۲۳۸۷) ۶۰۶۴)

حضرت انس بن مالک ص بیان کرتے ہیں کہ جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے روم کی طرف مکتوب لکھنے کا ارادہ کیا تو صحابہ نے کہا وہ صرف اسی مکتوب کو پڑھتے ہیں جس پر مہر لگی ہوئی ہو ' تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی گویا کہ میں اس کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہاتھ میں دیکھ رہا تھا اس پر نقش تھا " محمد رسول اللہ "۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث : ۶۵ ' صحیح مسلم ' لباس ' ۵۶ ' (۲۰۹۲) ۵۳۷۹ ' سنن التسائی رقم الحدیث : ۵۲۰۲ ' السنن الکبریٰ للنسائی رقم (الحدیث : ۸۸۴۸)

حضرت انس ص بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کسری کی طرف ' قیصر کی طرف ' نجاشی کی طرف اور ہر جابر بادشاہ کی طرف مکاتب لکھے۔ آپ ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے اور یہ وہ نجاشی نہیں ہے جس کی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نماز جنازہ پڑھتی تھی۔

(صحیح مسلم الجہاد والسیر ۷۵ ' (۱۷۷۴) ۴۵۲۹ ' سنن الترمذی رقم الحدیث : ۲۷۲۳ ' السنن الکبری للنسائی رقم الحدیث : ۸۸۴۷)

امام بخاری اور امام مسلم نے ایک طویل حدیث کے ضمن میں اور امام ابوداؤد اور امام داری نے صرف اس واقعہ کو روایت کیا ہے :

حضرت ابو حمید ساعدی ص بیان کرتے ہیں کہ یلہ کے بادشاہ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خط لکھا اور ایک سفید خچر آپ کو ہدیہ میں بھجی ' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی اس کو خط لکھا اور اس کو ایک چادر ہدیہ میں بھجی ' اور آپ نے حکم دیا کہ وہ سمندر کے ساتھ جس شہر میں رہتے ہیں اس میں ان کو جزیہ پر رہنے دیا جائے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث : ۱۴۸۱ ' صحیح مسلم ' فضائل ' ۱۲ ' (۱۳۹۲) ۵۸۳۹ ' سسن ابوداؤد رقم الحدیث : ۳۰۷۹ ' سنن واری رقم الحدیث : ۲۴۹۵ ' مسند احمد ج ۵ ' ص ۴۲۵)

حضرت سہل بن ابی حشمہ ص بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن سہل اور حضرت محیصہ کسی کام سے خیبر گئے ' پھر حضرت محیصہ کو خبر پہنچی کہ حضرت عبداللہ بن سہل کو تقل کرکے کنویں میں ڈال دیا گیا ' وہ یہود کے پاس گئے ' (الی ان قال) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تو یہود تمہارے مقتول کی دیت ادا کریں گے اور یا وہ اعلان جنگ کو قبول کرلیں ' پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ (فیصلہ) یہود کی طرف لکھ کر بھیج دیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث : ۷۱۹۲ ' صحیح مسلم الحدود ' ۶ (۱۶۶۹) ۴۰۷ ' سنن ابوداؤد رقم الحدیث : ۴۵۲۱ ' سنن النسائی رقم الحدیث : ۴۷۲۵۔۴۷۲۴ ' موطا امام مالک رقم الحدیث : ۱۶۳۰)

حضرت براء بن عازب ص کے علاوہ یہ حضرت عباس ' حضرت عائشہ ' حضرت انس ' حضرت ابو حمید ساعدی اور حضرت سہل بن ابی حشمہ (رض) عنہم کی روایات ہیں اور یہ سب صحاح ستہ کی روایات ہیں ' ان میں سے کسی حدیث کی سند ضعیف نہیں ہے ' اور ان تمام احادیث میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لکھنے کی تصریح ہے اور ان سب کی یہ تاویل کرنا کہ لکھنے سے مراد لکھنے کا حکم دینا ہے صحیح نہیں ہے ' کیونکہ یہ مجاز ہے اور جب تک کوئی عقلی یا شرعی استحالہ نہ ہو کسی لفظ کو حقیقت سے ہٹا کر مجاز پر محمول کرنا جائز نہیں ہے اور بلاوجہ حدیث کے الفاظ کو اپنی مرضی کا معنی پہنانا محض اتباع ہوس ہے ' خصوصاً اس صورت میں جب کہ قرآن مجید سے

نزول قرآن کے بعد آپ کے لکھنے اور پڑھنے کی تائید ہوتی ہے جیسا کہ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں ' نیز لکھنا اور پڑھنا اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت اور کمال ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت کو تو یہ نعمت عطا فرمائے اور آپ کو اس نعمت سے محروم رکھے ' اور اگر یہ مان لیا جائے کہ آپ کو لکھنا اور پڑھنا نہیں آتا تھا تو لازم آئے گا کہ اس نعمت اور کمال میں امت آپ سے بڑھ جائے اور یہ کسی طرح جائز نہیں ہے ' امت کو اپنے نبی پر مطلقاً فضیلت نہیں ہوتی ' جزوی نہ کلی۔

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لکھنے کے متعلق محدثین کی تحقیق

علامہ ابو العباس احمد بن عمر القرطبی المالکی التموفی ٦٥٦ ھ حضرت براء بن عازب ص سے روایت کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے ہاتھ سے لکھا محمد بن عبد اللہ اور ایک روایت میں ہے آپ نے یہ لکھا ' حالانکہ آپ مہارت سے نہیں لکھتے تھے (صحیح البخاری ٤٢٨١ ' ٢٦١٩) علامہ السمنانی ' علامہ ابوذر اور باجی نے اس حدیث کو اپنے ظاہر پر محمول کیا ہے اور ان کی تحقیق یہ ہے کہ یہ لکھنا نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے امی ہونے کے منافی نہیں ہے ' اور نہ اس آیت کے معارض ہے ' اور آپ نزول قرآن سے پہلے کسی کتاب کو نہ پڑھتے تھے اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے۔ (العنکبوت : ٤٨) اور نہ اس حدیث کے خلاف ہے ہم ان پڑھ امت ہیں نہ لکھتے ہیں نہ حساب کرتے ہیں۔ (صحیح مسلم ٧٦١ ' سنن ابو داؤد ٢٣١٩) بلکہ ان کی تحقیق یہ ہے کہ آپ کا لکھنا آپ کے معجزہ کا اور زیادہ ہونا ہے ' اور یہ آپ کے صدق اور آپ کی رسالت کی اور قوی دلیل ہے ' آپ نے کسی سے سیکھے بغیر اور اس کے عادی اسباب کے حصول کے بغیر لکھا ہے لہٰذا یہ اپنی جگہ ایک الگ معجزہ ہے ' اور جس طرح نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کسی سے پڑھے بغیر اور علم کے دیگر اسباب حاصل کیے بغیر لکھنا بھی آپکے امی ہونے کے خلاف نہیں اور یہ آپ کا بہت بڑا معجزہ ہے اور اعلیٰ درجہ کی فضیلت ہے ' اسی طرح کسی سے سیکھے بغیر لکھنا بھی آپ کے امی ہونے کے خلاف نہیں اور یہ آپ کا بہت بڑا معجزہ ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس وقت آپ نے محمد بن عبد اللہ لکھا اس وقت آپ نے چند لکیریں ڈالی ہوں اور ان کا مفہوم محمد بن عبد اللہ ہو ' یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ان حروف کی شناخت ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کو ان کی شناخت نہ ہو اور ہر تقدیر پر آپ سے امی کا لقب ساقط نہیں ہوگا ' اندلسی اور اندلس کے علاوہ دوسرے ممالک کے علماء نے اس نظریہ کی مخالفت کی بلکہ علامہ باجی کی تکفیر کی لیکن یہ درست نہیں ہے اور شریعت میں اس پر کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔

(المفہم ج ٤ ' ص ٦٣٨ ٦٣ '٧ ٦٣ ' مطبوعہ دار ابن کثیر ' بیروت ' ١٤١٧ ھ)

علامہ شرف الدین حسین بن محمد الطیبی التوفی ٧٤٣ ھ لکھتے ہیں :

قاضی عیاض نے کہا ہے کہ اس حدیث سے علماء نے اس پر استدلال کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے ' انھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر یہ لکھائی جاری کر دی ' یا تو آپ کے علم کے بغیر قلم نے لکھ دیا یا اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کے لکھنے کا علم دے دیا اور آپ کو پڑھنے والا بنا دیا جب کہ آپ اعلان نبوت کے بعد پڑھتے نہ تھے ' اور اس سے آپ کے امی ہونے پر اعتراض نہیں ہوتا اور انھوں نے اس موقف پر شعبی کی روایات سے استدلال کیا ہے ' اور بعض سلف سے منقول ہے کہ جب تک نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے لکھ نہیں لیا آپ کی وفات نہیں ہوئی ' اور اکثر علماء نے یہ کہا ہے کہ آپ کا لکھنا مطلقاً ممنوع ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے : اور آپ نزول قرآن سے پہلے کسی کتاب کو نہ پڑھتے تھے اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے۔ (العنکبوت : ١٤٨) اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے : ہم ان پڑھ امت ہیں نہ لکھتے ہیں ' نہ حساب کرتے ہیں۔ (صحیح مسلم : ٧٦١ ' ابو داؤد ٢٣١٩) اور بخاری اور مسلم کی حدیث میں جو ہے کہ آپ نے محمد بن عبد اللہ لکھا ' اس کا معنی ہے کہ آپ نے اس کے لکھنے کا حکم دیا ' جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حجرت معاز کو رحم کیا ' یا آپ نے چور کے ہاتھ کاٹے یا شرابی کو کوڑے لگائے۔

قاضی عیاض نے کہا لکھنے کے قائلین نے اس آیت کا یہ جواب دیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر نزول وحی سے پہلے آپ کتبا سے پڑھتے یا لکھتے تو کفار اس قرآن کے متعلق شک میں پڑ جاتے ' اور جس طرح آپ کا تلاوت کرنا جائز ہے۔ اسی طرح آپ کا لکھنا بھی جائز ہے اور یہ آپ کے امی ہونے کے منافی نہیں ہے۔ آپ کا صرف امی ہونا معجزہ نہیں ہے کیونکہ نزول وحی سے پہلے آپکا نہ پڑھنا اور نہ لکھنا ' اور پھر قرآن پیش کرنا اور ان علوم کو پیش کرنا جن کو امی نہیں جانتے یہ ایک معجزہ ہے۔

اور جن لوگوں نے اس حدیث میں یہ تاویل کہ ہے کہ لکھنے کا معنی ہے آپ نے لکھنے کا حکم دیا۔ یہ تاویل ظاہر حدیث سے بلا ضرورت عدول کرنا ہے 'جب کہ حدیث کی عبارت یہ ہے کہ آپ مہارت سے نہیں لکھتے تھے 'پھر آپ نے لکھا 'اس میں یہ تصریح ہے کہ آپ نے خود لکھااور جس طرح قرآن مجید میں ہے : ہم نے آپ کو شعر کہنا نہیں سکھایااور نہ یہ آپ کے لائق ہے۔ (یسین : ٦٩) اس کے باوجود آپ نے منظوم کلام کہامثلاً

ھل انت الا اصبع دمیت

وفی سبیل اللہ مالقیت

تو صرف ایک انگلی ہے جو زخمی ہوئی ہے 'حالانکہ تیرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ اللہ کی راہ میں ہوا ہے۔

کیونکہ آپ نے شعر گوئی کے قصد اور ارادہ کے بغیر یہ منظوم کلام فرمایااسی طرح ہو سکتا ہے کہ لکھنا بھی آپ سے اسی طرح صادر ہوا ہو۔ (شرح الطیبی ج ٨ 'ص ٧٧ : ٦٧ 'مطبوعہ ادارہ القرآن 'کراچی '١٤١٣ھ)

علامہ طیبّی کی اس آخری توجیہ سے ہم متفق نہیں ہیں۔ ہمارے نزدیک آپ کو لکھنے کا علم تھااور آپ نے قصداً لکھا تھا 'غیر ارادی طور پر آپ سے لکھنا صادر نہیں ہوا۔ جو شخص آپ کے امی ہونے کی وجہ سے آپ کے لکھنے اور پڑھنے کاانکار کرتا ہے ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے نزدیک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عالم ہیں یا نہیں۔ اگر وہ آپ کو عالم نہیں مانتا تو وہ مسلمان نہیں ہے اور اگر وہ آپ کو عالم مانتا ہے تو جس طرح لکھناپڑھنا امی کے منافی ہے 'اسی طرح عالم ہونا بھی امی کے منافی ہیں۔ خصوصاوہ جو تمام مخلوقات سے بڑے عالم ہوں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) احکام شرعیہ کے الم ہیں اور اسرار الٰہیہ کے عارف ہیں ایک امی کی یہ صفت کیسے ہو سکتی ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے امی ہونے کے باوجود آپ کو ان علوم سے نوازا 'اسی طرح آپ کو لکھنے اور پڑھنے کے علم سے بھی نوازا !

علامہ یحییٰ بن شرف نواوی متوفی ٦٧٦ھ 'علامہ ابی مالکی متوفی ٨٢٨ اور علامہ سنوسی متوفی ٨٩٥ھ 'ان سب نے قاضی عیاض کی عبارت نقل کی ہے اور ان لوگوں کا رد کیا ہے۔ جنہوں نے علامہ باجی مالکی متوفی ٤٩٤ھ پر تشنیع کی ہے۔

(صحیح مسلم مع شرح النوادی ج ٨ 'ص ٤٩٦٦ 'اکمال المعلم ج ٦ 'ص ٤٢٢۔٤٢١ 'معلم اکمال الاکمال 'ج ٦ 'ص ٤٢١) علامہ بدالدین محمود بن احمد عینی متوفی ٨٥٥ھ لکھتے ہیں :

میں یہ کہتا ہوں کہ یہ منقول ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے ہاتھ سے لکھا۔ (عمدہ القاری ج ٢ 'ص ٣٠ 'مطبوعہ مصر)

نیز لکھتے ہیں :

اور یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ (عمدۃ القاری ج ٢ 'ص ١٧١ 'مطبوعہ مصر)

صحیح بخاری میں ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے محمد بن عبداللہ لکھا 'اس پر یہ سوال ہوا کہ آپ تو امی تھے آپ نے اپنا نام کیسے لکھا؟

علامہ عینی نے اس کے تین جواب دیے ہیں :

پہلا جواب یہ ہے کہ امی وہ شخص ہے جو مہارت سے نہ لکھتا ہو نہ کہ وہ جو مطلّقاً نہ لکھتا ہو 'دوسرا جواب یہ ہے کہ اس میں اسناد مجازی ہے 'اور تیسرا جواب یہ ہے کہ آپ کا لکھنا آپ کا معجزہ تھا۔ (عمدۃ القاری 'ج ١٨ 'ص ١١٣ 'مطبوعہ مصر)

علامہ عینی کا دوسرا جواب صحیح نہیں ہے اور ان کی پہلی تصریحات کے بھی غلاف ہے۔ انھوں نے یہ جواب علامہ باجی کے مخالفین سے نقل کیا ہے 'صحیح جواب وہ ہے جس کو انھوں نے آخر میں ذکر کیا ہے۔

حافظ شہاب الدین احمد بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ٨٥٢ء نے اس مسئلہ پر بہت تفصیل سے لکھا ہے 'ہم یہ پوری عبارت پیش کر رہے ہیں ہر چند کہ اس کی بعض چیزیں علامہ طیبّی کی عبارت میں آچکی ہیں :

علامہ ابوالولید باجی مالکی نے صحیح بخاری کی اس حدیث سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لکھنے پر استدلال کیا ہے 'جس میں ہے "پس رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے لکھا "یہ محمد بن عبداللہ کا فیصلہ ہے 'حالانکہ آپ مہارت سے نہیں لکھتے تھے۔ ان کے زمانہ کے علماء اندلس نے ان پر اعتراض کیا اور کہا کہ یہ قول

قرآن مجید کے خلاف ہے ' کیونکہ قرآن مجید میں ہے : " وماکنت تتلوا من قبلہ من کتب ولا تخطہ بیمینک "آپ نزول قرآن سے پہلے نہ تو کتاب سے پڑھتے تھے نہ لکھتے تھے۔ علامہ باجی نے اس کے جواب میں کہا کہ قرآن مجید میں نزول قرآن سے پہلے آپ کے پڑھنے اور لکھنے کی نفی ہے ' اور جب معجزات سے آپ کی نبوت ثابت ہو گئی اور آپ کی نبوت میں شک کا خطرہ نہ رہا تو پھر آپ کے پڑھنے اور لکھنے سے کوئی چیز مانع نہیں تھی ' اور یہ آپ کا دوسرا معجزہ ہے۔ علامہ ابن وحیہ نے کہا ہے کہ علماء کی ایک جماعت نے علامہ باجی کے موقف کی حمایت کی ' ان میں شیخ ابوذر ہروی ' ابوالفتح نیشاپوری اور افریقہ اور دوسرے شہروں کے علماء شامل ہیں۔ بعض علماء نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لکھنے پر امام ابن ابی شیبہ کی اس روایت سے استدلال کیا ہے : مجاہد ' عون بن عبداللہ سے روایت کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس وقت تک فوت نہیں ہوئے ' جب تک آپنے لکھ اور پڑھ نہیں لیا ' مجاہد کہتے ہیں کہ نے شعبی سے اس روایت کا ذکر کیا انھوں نے کہا عون بن عبداللہ نے سچ کہا ہے ' میں اس روایت کا سنا ہے ' (حافظ ابن حجر لکھتے ہیں) سہل بن حنظلیہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت معاویہ سے کہا کہ وہ اقراع اور عینہ کے لیے لکھیں۔ عینہ نے اس پر کہا تمارا کیا خیال ہے کیا میں متلمس کا صحیفہ لے کر جاؤں گا؟ (یعنی تم نے کچھ کا کچھ تو نہیں لکھ دیا؟) اس پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس صحیفہ پر نظر ڈالی اور فرمایا معاویہ نے وہی لکھا ہے جو میں نے کہا تھا یونس کہتے ہیں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نزول قرآن کے بعد لکھا ہے (سہل بن حنظلیہ کی روایت مذکورہ میں آپکے پڑھنے کا ثبوت ہے۔ سعیدی غفرلہ) قاضی عیاض نے کہا ہے کہ بعض آثار سے پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو لکھنے اور خوش خطی کی معرفت تھی ' کیونکہ آپ نے کاتب سے فرمایا قلم اپنے کان پر رکھو یہ تم کو یاد دلائے گا اور آپ نے حضرت معاویہ سے فرمایا دوات رکھ اور قلم ایک کنارے رکھو ' باء کو لمبا کرکے لکھو ' سین دندانے دار لکھو اور میم کو کانا مت کرو۔ قاضی عیاض نے کہا ہر چند کہ اس روایت سے آپ کا لکھنا ثابت نہیں ہوتا لیکن آپ کو لکھنے کا علم دیا جانا مستبعد نہیں ہے ' کیونکہ آپ کو ہر چیز کو علم دیا گیا ہے ' اور جمہور نے ان احادیث کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ احادیث ضعیف ہیں اور حدیبیہ کی حدیث کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ ایک واقعہ ہے اور اس میں لکھنے والے حضرت علی تھے ' اور مسور کی حدیث میں یہ تصریح ہے کہ حضرت علی نے لکھا تھا اور صحیح بخاری کی حدیث میں تقدیر عبارت اس طرح ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صلح نامہ کو لیا اور اس میں محمد رسول اللہ کو مٹا دیا پھر حضرت علی کو وہ صلحنامہ دوبارہ دے دیا ' پھر حضرت علی نے اس میں لکھا۔ علامہ ابن التین نے اسی پر اعتماد کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ حدیث میں جو ہے "آپ نے لکھا " اس معنی ہے آپ نے لکھنے کا حکم دیا ' اور اس کی حدیث میں بہت مثالیں ہیں ' جیسے ہے آپ نے قیصر کی طرف لکھا اور آپ نے کسریٰ کی طرف لکھا ' اور اگر اس حدیث کو اپنے ظاہر پر بھی محمول کیا جائے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنا اسم مبارک لکھا تھا ' حالانکہ آپ مہارت سے نہیں لکھتے تھے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ لکھنے کے عالم ہوں اور آپ امی نہ ہوں ' کیونہ بہت سے لوگ مہارت سے نہیں لکھتے ' اس کے باوجود وہ بعض الفاظ کو پہنچانتے ہیں اور ان کو اپنی جگہ پر رکھ سکتے ہیں خصوصا اسماء کو ' اور اس وصف کی وجہ سے وہ امی (ان پڑھ) ہونے سے خارج نہیں ہوتے۔ جیسا اکثر بادشاہ اسی طرح ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت آپ کے ہاتھ پر لکھنے کا عمل جاری ہو گیا ہو اور آپ مہارت سے نہ لکھتے ہوں اور اس صلحنامہ کو آپ نے حسب منشا لکھ دیا ہو ' اور یہ اس خاص وقت میں الگ ایک معجزہ ہو ' اور اس سے آپ امی ہونے سے خارج نہ ہوں۔ اشاعرہ کے ائمہ اصول میں سے علامہ السمنانی نے یہی جواب دیا ہے ' اور علامہ ابن جوزی نے بھی ان کی اتباع کی ہے ' علامہ سہیلی نے اس جواب کا رد کیا ہے اور کہا ہے کہ ہر چند کہ یہ ممکن ہے اور آپ کے لکھنے سے ایک اور معجزہ ثابت ہوتا ہے ' لیکن یہ اس کے مخالف ہے کہ آپ امی تھے جو لکھتا نہیں ' اور جس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ "اگر آپ نزول قرآن سے پہلے لکھتے ہوتے تو منکرین آپ کی نبوت کے متعلق شک میں پڑ جاتے " اس آیت نے تمام شکوک و شبہات کی جڑ کاٹ دی ہے ' اگر نزول وحی کے بعد کے بعد آپ کا لکھنا جائز ہوتا تو منکرین پھر شبہ میں پڑ جاتے اور قرآن کے معاندین یہ کہتے کہ آپ مہارت سے لکھتے تھے لیکن اس کو چھپاتے تھے ' علامہ سہیلی نے اس کے جواب میں کہا یہ محال ہے کہ بعض معجزات ' بعض دوسرے معجزات کے مخالف ہوں ' اور حق یہ ہے کہ آپ کے لکھنے کا معنی یہ ہے کہ آپ نے حضرت علی (رض) کو لکھنے کا حکم دیا ' علامہ سہیلی کی بات ختم ہوئی ' حاظ عسقلانی فرماتے ہیں : یہ کہ ان کہ فقط اپنا نام لکھنا آپکے امی ہونے اور معجزہ کے مخالف ہے۔ سو یہ بہت قابل اعتراض ہے۔ (فتح الباری ج ۷ ' ص ۵۰۴ ' مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ ' لاہور ' ۱۴۰۱ ھ)۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کی اس آخری بات سے یہ معلوم ہوا کہ جس حدیث میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لکھنے کا ذکر ہے اس سے آپ کا لکھنا مراد ہے اور آپ کا لکھنا مراد ہے اور آپکا لکھنا آپ کے معجزہ یا آپ کے امی ہونے کے خلاف نہیں ہے۔ چنانچہ جسٹس محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں: حافظ کا میلان اس طرف ہے کہ اس باب کی حدیث (یعنی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اپنا نام لکھنا) اپنے ظاہر پر محمول ہے 'اور اس خاص وقت میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا امی ہونے کے باوجود اپنا نام لکھنا آپ کا معجزہ ہے۔

(تکملتہ فتح الملھم 'ج ۳ 'ص ۱۸۰ 'مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم کراچی '۱۴۱۴ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے کہا تھا کہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس حدیث کو ظاہر پر محمول کرنا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے امی ہونے اور معجزہ کے خلاف ہے اس میں نظر کبیر ہے یعنی بہت بڑا اعتراض ہے 'ملا علی قاری متوفی ۱۰۱۴ھ نے اس نظر کبیر کو بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

معجزہ قرانیہ وجوہ کثیرہ سے ثابت ہے۔ اگر اس سے قطع نظر کر لی جاتی کہ قرآنی لانے والے امی ہیں 'تب بھییہ معجزہ تھا 'اور جب اس پر یہ وصف زائدہ ہوا کہ قرآن کو لانے والے پہلے پڑھتے اور لکھتے نہ تھے تو اس سے اس کا معجزہ ہونا بہ طریق کمال ظاہر ہوا۔ اور معاندین کے اعتراضات منہدم ہو گئے 'اس سے ظاہر ہو گیا کہ اگر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ابتدا ہی سے قاری اور کاتب ہوتے اور قرآن پیش کرتے 'تب بھی یہ آپ کا معجزہ ہوتا اور بالکل واضح ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

(مرقات ج ۸ 'ص ۸۷ 'مطبوعہ مکتبہ امدادیہ 'ملتان '۱۳۹۰ھ)

نیز ملا علی قاری دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

قاضی عیاض نے کہا ہے کہ جس طرح نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا تلاوت کرنا آپ کے امی ہونے کے منافی نہیں ہے اسی طرح آپ کا لکھنا بھی آپ کے امی ہونے کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ آپ کا صرف امی ہونا معجزہ نہیں ہے 'آپ نے جب پہلے لکھے 'پڑھے بغیر قرآن مجید کو پیش کیا تو آپ کا معجزہ تھا 'پھر آپ نے قرآن مجید میں ایسے علوم پیش کیے جن کو امی نہیں جانتے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ نے ایسے علوم پیش کیے جن کو تمام علماء نہیں جانتے اور وہ ایسے علوم ہیں کہ اگر آپ بالکل امی نہ ہوتے تو پھر بھی ان علوم کو پیش کرنا آپ کا معجزہ تھا 'کیونکہ قرآن معجزات کثیرہ پر مشتمل ہے اور جن لوگوں نے یہ توجیہہ کی ہے کہ آپ کے لکھنے کا معنی یہ ہے کہ آپ نے لکھنے کا حکم دیا یہ بلاضرورت ظاہر معنی سے عدول کرنا ہے۔ یہاں پر قاضی عیاض کی عبارت ختم ہوئی '(ملا علی قاری کہتے ہیں) اس توجیہہ میں مجھے قاضی عیاض کے ساتھ توارد ہو گیا ہے۔ جیسا کہ ان لوگوں پر ظاہر ہو گیا۔ جنہوں نے میری پہلی تقریر (ج ۸ 'ص ۸۷) کو پڑھا ہوگا۔ (مرقات ج ۸ 'ص ۹۲۔۹۱ 'مطبوعہ مکتبہ امدادیہ 'ملتان '۱۳۹۰ھ)

شیخ امین احسن اصلاحی امی کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

امی 'مدرسی و کتابی تعلیم و تعلم سے ناآشنا کو کہتے ہیں 'امیین کا لفظ اسماعیلی عربوں کے لیے بطور لقب استعمال ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مدرسی اور رسمی تعلیم و کتابت سے ناآشنا اپنی بدویانہ سادگی پر قائم تھے۔ اور اسی طرح بنی اسرائیل جو کہ حامل کتاب تھے ان کے مقابل کے لیے امیت ایک امتیازی علامت تھی۔ (الی قولہ) چنانچہ قرآن نے اس لفظ کو عربوں کے لیے ان کو اہل کتاب سے محض ممیّز کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اسی پہلو سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے نبی امی کا لقب استعمال ہوا ہے۔ (تدبر قرآن ج ۲ 'ص ۵۳ 'مطبوعہ فاران فاؤنڈیشن '۱۴۰۶ھ)

یعنی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو امی اس لیے فرمایا ہے کہ آپ نے کسی مدرسہ میں جا کر لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا 'اگر اللہ تعالیٰ آپ کو براہ راست لکھنا پڑھنا سکھا دے اور آپ لکھیں اور پڑھیں تو وہ آپ کے امی ہونے کے خلاف نہیں ہے 'یا بنو اسرائیل سے امتیاز کے لیے آپ کو امی فرمایا سو یہ بھی آپ کے لکھنے پڑھنے کے خلاف نہیں ہے 'جیسا کہ قرآن مجید نے تمام اہل مکہ کو امین فرمایا حالانکہ ان میں لکھنے پڑھنے والے بھی تھے 'کاتیبین وحی تھے اور بدر کے بعض قیدیوں کے پاس فدیہ کے لیے رقم نہیں تھی تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کا فدیہ یہ مقرر فرمایا کہ وہ انصاری کی اولاد کو پڑھنا لکھنا سکھائیں۔ (مسند احمد رقم الحدیث: ۲۲۱۶ 'المستدرک ج ۲ 'ص ۱۴۰)

توراۃ اور انجیل میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بشارتوں کے متعلق احادیث

نیز اس آیت میں ارشاد ہے جس کو وہ اپنے پاس توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں اس میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا چوتھا اور پانچواں وصف مذکور ہے، توراۃ میں آپ کا لکھا ہوا ہونا چوتھا وصف ہے اور انجیل میں آپ کا لکھا ہوا ہونا پانچواں وصف ہے۔ احادیث صحیحہ معتبرہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ان صفات کا ذکر ہے جو توراۃ اور انجیل میں ہیں، ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں:

عطاء بن یسار بیان کرتے ہیں کہ میری حضرت عمرو بن العاص (رض) سے ملاقات ہوئی، میں نے کہا مجھے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اس صفت کے متعلق بتائیے جو توراۃ میں ہے۔ انھوں نے کہا اچھا! اللہ کی قسم توراۃ میں آپ کی ان بعض صفات کا ذکر ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہیں، وہ یہ ہیں: اے نبی! ہم نے آپ کو بھیجا درآنحالیکہ آپ شاہد اور مبشر اور نذیر ہیں، اور امیین کی پناہ ہیں، آپ میرے بندے اور رسول ہیں، میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے، آپ سخت مزاج اور درشت خو نہیں ہیں، اور نہ بازار میں شور کرنے والے ہیں اور نہ برائی کا جواب برائی سے دیتے ہیں، لیکن معاف کرتے ہیں اور بخش دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس وقت تک آپ کی روح ہرگز قبض نہیں کرے گا حتی کہ آپ کے سبب سے ٹیڑھی قوم کو سیدھا کردے گا، بایں طور کہ وہ کہیں گے لاالہ الا اللہ اور آپ کے سبب سے اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور پردہ پڑے ہوئے دلوں کو کھول دے گا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 2125، مسند احمد ج 2، ص 174، طبع قدیم، رقم الحدیث: 6622، طبع جدید، الادب المفرد رقم الحدیث: 247، 246، دلائل النبوۃ ج 1، ص 374۔ سنن دارمی رقم الحدیث: 5، 6۔ مجمع الزوائد، ج 8، ص 271۔ جامع الاصول ج 11، رقم الحدیث: 8837، المعجم الکبیر رقم الحدیث: 10046)

حضرت عبداللہ بن سلام (رض) بیان کرتے ہیں کہ توراۃ میں (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صفت لکھی ہوئی ہے، اور حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) آپ کے ساتھ مدفون ہوں گے اور حجرہ میں ایک قبر کی جگہ باقی ہے۔ (جامع الاصول ج 11، رقم الھدیث: 8838)

وہب بن منبہ نے حضرت داؤد نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قصہ میں ذکر کیا ہے کہ زبور میں داؤد (علیہ السلام) پر یہ وحی کی گئی تھی۔ اے داؤد! عنقریب تمہارے بعد ایک نبی آئے گا جس کا نام احمد اور محمد ہوگا، وہ صادق اور سید ہوگا، میں اس پر کبھی ناراض نہیں ہوں گا اور نہ وہ مجھ پر کبھی ناراض ہوگا، میں نے اس کے تمام اگلے اور پچھلے ذنب (بظاہر خلاف اولی سب کام) ان کے ارتکاب سے پہلے ہی معاف کردیے ہیں، ان کی امت پر رحم کیا گیا ہے، میں نے انبیاء کو جیسے نوافل عطا کیے ہیں ان کو بھی اسی طرح کے نوافل عطا کیے ہیں، اور میں نے نبیوں اور رسولوں پر جس طرح کے فرائض فرض کیے ہیں، ان پر بھی ویسے فرائض فرض کیے ہیں۔ حتی کہ

جب قیامت کے دن وہ میرے پاس آئیں گے تو ان کا نور نبیوں کے نور کی طرح ہوگا، کیونکہ میں نے ان پر فرض کیا ہے کہ وہ ہر نماز کے لیے وضو کریں جیسا کہ میں نے اس سے پہلے نبیوں پر وضو فرض کیا تھا، اور میں نے ان پر غسل جنابت فرض کیا ہے جس طرح نبیوں پر غسل جنابت فرض کیا تھا، اور میں نے ان کو حج کا حکم دیا ہے جیسا کہ اس سے پہلے نبیوں کو حج کا حکم دیا تھا، اور میں نے ان کو جہاد کا حکم دیا ہے، جیسا کہ اس سے پہلے نبیوں کو جہاد کا حکم دیا تھا، اے داؤد میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کی امت کو تمام امتوں پر فضیلت دی ہے، میں نے ان کو چھ ایسی فضیلتیں عطا کی ہیں جو کسی اور امت کو عطا نہیں کیں، میں خطا اور نسیان پر ان کی گرفت نہیں کرتا، اور وہ نادانشتہ طور پر جو گناہ کر بیٹھیں، پھر مجھ سے معافی طلب کریں تو میں ان کو معاف کردیتا ہوں اور وہ آخرت کے لیے جو نیکی کریں میں اس کو دگنا چوگنا کردیتا ہوں، اور ان کی نیکیوں کا میرے پاس اس سے بھی افضل ذخیرہ ہے۔ اور جب وہ مصائب پر صبر کرکے کہیں گے انا للہ وانا الیہ راجعون تو میں ان کو صلوۃ، رحمت اور جنات النعیم کی طرف ہدایت عطا کروں گا، اور جب وہ مجھ سے دعا کریں گے تو یا تو میں اس کو فوراً قبول فرماؤں گا، یا اس کے عوض ان سے کوئی برائی دور کردوں گا اور یا ان کے لیے آخرت میں اجر کو ذخیرہ کروں گا۔ اے داوؤد! محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت سے جو شخص یہ شہادت دے گا کہ میرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے اور میں واحد ہوں اور میرا کوئی شریک نہیں ہے اور وہ اس شہادت میں صادق ہوگا، تو وہ میری جنت میں اور میری کرامت میں میرے ساتھ ہوگا، اور جس نے مجھ سے اس حال میں ملاقات کی کہ اس نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تکذیب کی ہو اور ان کے پیغام کی تکذیب کی ہو اور

میری کتاب کامذاق اڑایا ہو تومیں اس کی قبر میں اس پر عذاب انڈیل دوں گا، اور جب وہ قبر سے اٹھے گا تو فرشتے اس کے چہرے اور اس کی دبر پر ضرب لگائیں گے۔ پھر میں اس کو دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ڈال دوں گا۔ (دلائل انبوۃ ج1، ص380۔381۔ البدایہ والنہایہ ج6، ص62۔ تہذیب تاریخ دمشق ج1، ص344۔345)

مقاتل بن حیان روایت کرتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے حضرت عیسیٰ کی طرف وحی کی کہ تم نبی امی عربی کی تصدیق کرنا جو اونٹ کی سواری کریں گے، زرہ پہنیں گے، عمامہ پہنیں گے جو کہ تاج ہے، اور نعلین پہنچیں گے اور ان کے پاس لاٹھی ہوگی، ان کے سر کے بال گھنگریالے ہوں گے، کشادہ پیشانی ہوگی، خوبصورت بھویں ہوں گی، بڑی بڑی آنکھیں ہوں گی، بڑا دہانہ ہوگا، اور گہری سیاہ آنکھیں ہوں گی، کھڑی ناک ہوگی، فراخ پیشانی، گھنی ڈاڑھی ہوگی، چہرے پر پسینہ موتیوں کی طرح ہوگا، ان سے مشک کی خوشبو آئے گی۔ ان کی گردن میں چاندی اور گلے میں سوچا چھلک رہا ہوگا، ان کے گلے کے نیچے سے ناف تک بال ہوں گے۔ ان کی ہتھیلیاں اور قدم پر گوشت ہوں گے، جب وہ لوگوں کے درمیان ہوں گے تو ان پر چھاجائیں گے اور جب وہ چلیں گے تو لگے گا جیسے بلندی سے ڈھلوان کی طرف آرہے ہوں اور ان کی اولاد کم ہوگی۔ (دلائل النبوۃ ج1، ص378، تہذیب تاریخ دمشق ج1، ص345)

موجودہ توراۃ کے متن میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق بشارتیں

موجودہ توراۃ میں بھی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کے متعلق بشارتیں موجود ہیں:

خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا۔ یہ تیری اس درخواست کے مطابق ہوگا جو تو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن جواب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تاکہ میں مر نہ جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا، اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔ (توراۃ استثناء، باب 18، آیت 15۔19، پرانا عہد نامہ ص184، مطبوعہ بائبل سوسائٹی لاہور)

اور مرد خدا موسیٰ نے جو دعائے خیر دے کر اپنی وفات سے پہلے بنی اسرائیل کو برکت دی وہ یہ ہے۔ اور اس نے کہا: خداوند سینا سے آیا۔ اور شعیر سے ان پر آشکار ہوا۔ اور کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا اور لاکھوں قدسیوں میں سے آیا۔ اس کے داہنے ہاتھ پر ان کے لیے آتشی شریعت تھی۔ وہ بیشک قوموں سے محبت رکھتا ہے۔ اس کے سب مقدس لوگ تیرے ہاتھ میں ہیں۔ ایک ایک تیری باتوں سے مستفیض ہوگا۔ (توراۃ استثناء، باب 33، آیت 2۔3، پرانا عہد نامہ ص201، مطبوعہ بائبل سوسائٹی، لاہور، 1992ء)

توراۃ کے پرانے (1927ء کے) اردو ایڈیشن میں یہ آیت اس طرح تھی، دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا۔ اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ مکرمہ میں دس ہزار صحابہ کے ساتھ داخل ہوئے تھے، اس طرح یہ آیت نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر پوری طرح منطبق ہوتی تھی، جب عیسائیوں نے یہ دیکھا تو انھوں نے اس آیت کے الفاظ بدل دیے اور یوں لکھ دیا: اور لاکھوں قدسیوں میں سے آیا۔ توراۃ کے پرانے (1927ء کے) ایڈیشن میں یہ آیات اس طرح تھیں: "اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیات اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی" (کتاب مقدس، استثناء باب 33، آیت 2، ص192، مطبوعہ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی، انارکلی لاہور، 1927ء)

اس کی تائید عربی ایڈیشن سے بھی ہوتی ہے، اس میں یہ آیت اس طرح لکھی ہے: "واتی من ربوات اقدس: دس ہزار قدسیوں میں سے آیا" (مطبوعہ دار الکتاب المقدس فی العالم العربی، ص334، 1980ء)

لوئیس معلوم نے ربوۃ کے معنی لکھے ہیں: الجماعۃ العظیمۃ نحو عشرۃ آلاف۔ (المنجد ص247) یعنی تقریباً دس ہزار افراد کی جماعت۔

دیکھو! میرا خادم (پچھلے ایڈیشنوں میں "بندہ" تھا۔ سعیدی غفرلہ) جس کو میں سنبھالتا ہوں، میرا برگزیدہ جس سے میرا دل خوش ہے۔ میں نے اپنی روح اس پر ڈالی، وہ قوموں میں عدالت جاری کرے گا۔ وہ نہ چلائے گا نہ شور کرے گا، اور نہ بازاروں میں اس کی آواز سنائی دے گی۔ وہ مسلے ہوئے سرکنڈے کو نہ توڑے گا اور

ٹمٹماتی بتی کو نہ بجھائے گا۔ وہ راستی سے عدالت کرے گا۔ وہ ماندہ نہ ہوگا اور ہمت نہ ہارے گا جب تک کہ عدالت کو زمین پر قائم نہ کرے۔ جزیرے اس کی شریعت کا انتظار کریں گے۔ جس نے آسمان کو پیدا کیا اور تان دیا جس نے زمین کو اور ان کو جو اس میں سے نکلتے ہیں پھیلایا۔ جو اس کے باشندوں کو سانس اور اس پر چلنے والوں کو روح عنایت کرتا ہے یعنی خداوند یوں فرماتا ہے میں خداوند نے تجھے صداقت سے بلایا میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا اور تیری حفاظت کروں گا۔ اور لوگوں کے عہد اور قوموں کے نور کے لیے تجھے دوں گا۔ تو اندھوں کی آنکھیں کھولے اور اسیروں کو قید سے نکالے اور ان کو جو اندھیرے میں بیٹھے ہیں قید خانہ سے چھڑائے۔ یہوداہ میں ہوں یہی میرا نام ہے، میں اپنا جلال کسی دوسرے کے لیے اور اپنی حمد کھودی ہوئی مورتیوں کے لیے روانہ رکھوں گا۔ دیکھو پرانی باتیں پوری ہو گئیں اور نئی باتیں بتاتا ہو، اس سے پیشتر کہ واقع ہوں میں تم سے بیان کرتا ہوں" (توراۃ، یسعیاہ، باب 42، آیت 109، مطبوعہ پاکستان بائبل سوسائٹی لاہور ص 694، 1980)

اس اقتباس کی آیت نمبر 2 میں ہے: وہ نہ چلائے گا اور نہ شور کرے گا اور نہ بازاروں میں اس کی آواز سنائی دے گی۔ اس آیت میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق پیش گوئی ہے: حضرت عمرو بن العاص کی یہ روایت گزر چکی ہے کہ توراۃ میں آپ کی یہ صفت لکھی ہوئی: اور نہ بازاروں میں شور کرنے والے ہیں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 2125)

اس باب کی آیت نمبر 6 میں ہے: میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا اور تیری حفاظت کروں گا۔

اس کی تائید قرآن مجید کی اس آیت سے ہوتی ہے: "واللہ یعصمک من الناس: اور اللہ آپ کی لوگوں سے حفاظت کرے گا" (المائدہ: 67)۔ عیسائی یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ پیش گوئی حضرت عیسیٰ کے متعلق ہے کیونکہ انجیل میں لکھا ہے کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو پھانسی دے دی اور حضرت عیسیٰ نے چلا کر کہا اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا، ملاحظہ ہو: "اور انھوں نے اسے مصلوب کیا اور اس کے کپڑے قرعہ ڈال کر بانٹ لیے۔ (الی قولہ) اور تیسرے پہر کے قریب یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا ایلی ایلی لما شقبتنی؟ یعنی اے میرے خدا! اے میرے خد! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟" (متی کی انجیل باب، 27، آیت 46،35، مطبوعہ پاکستان بائبل سوسائٹی لاہور، ص 33، 1992ء)

نیز اس باب کی آیت 7 میں ہے کہ تو اندھوں کی آنکھیں کھولے اور اسیروں کو قید سے نکالے اور ان کو جو اندھیرے میں بیٹھے ہیں قید خانہ سے چھڑائے۔

اس آیت میں بھی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق پیش گوئی ہے اور اس کی تصدیق ان آیتوں میں ہے: "قد جاء کم من اللہ نور وکتاب مبین۔ یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام ویخرجہم من الظلمات الی النور باذنہ ویہدیہم الی صراط مستقیم: بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور آگیا اور کتاب مبین۔ اللہ اس کے ذریعہ ان لوگوں کو سلامتی کے راستوں پر لاتا ہے جو اس کی رضا کے طالب ہیں اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نور کی طرف لاتا ہے اور ان کو سیدھے راستے کی طرف لاتا ہے" (المائدہ: 15۔16)

اور حضرت عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ توراۃ میں آپ کی یہ صفت ہے: اور اللہ اس وقت تک آپ کی روح ہر گز قبض نہیں کرے گا حتی کہ آپ کے سبب سے ٹیڑھی قوم کو سیدھا کر دے گا۔ بایں طور کہ وہ کہیں گے لا الہ الا اللہ اور آپ کے سبب سے اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور پردہ پڑے ہوئے دلوں کو کھول دے گا۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 2125)

موجودہ انجیل کے متن میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق بشارتیں

یسوع نے ان سے کہا کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے؟ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی۔ (متی کی انی، باب 21، آیت 42۔43، مطبوعہ بائبل سوسائٹی لاہور، ص 25، 1992ء)۔

یہ آیت بھی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بشارت ہے اور قرآن مجید کی اس آیت کے مطابق ہے: "اولئک الذین اتینٰھم الکتب والحکم والنبوۃ فان یکفر بھاھؤلاء فقد وکلنا بھا قوما لیسوا بھا بکافرین: یہ وہی لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حکم شریعت اور نبوت عطا کی ہے۔ پس اگر ان چیزوں کے ساتھ یہ لوگ کفر کریں تو بیشک ہم نے ان چیزوں پر ایسی قوم کو مقرر فرما دیا ہے جو ان سے انکار کرنے والے نہیں ہیں" (الانعام: 89)۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو مجھ پر ایمان رکھتا ہے یہ کام جو میں کرتا ہوں وہ بھی کرے گا بلکہ ان سے بھی بڑے کام کرے گا کیونکہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں۔ اور جو کچھ تم میرے نام سے چاہوگے میں وہی کروں گا تاکہ باپ بیٹے میں جلال پائے۔ اگر میرے نام سے کچھ چاہوگے تو میں وہی کروں گا۔ اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کروگے۔ اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے" (یوحنا کی انجیل باب 4، آیت 12-16۔ پاکستان بائبل سوسائٹی لاہور ص 99، 1992ء)

"لیکن جب وہ مددگار آئے گا جن کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی روح حق جو باپ سے صادر ہوتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا" (یوحنا کی انجیل، باب 14، آیت 26، پاکستان بائبل سوسائٹی لاہور، ص 100، 1992ء)

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔ گناہ کے بارے میں اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے۔ راستبازی کے بارے میں اس لیے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھوگے۔ عدالت کے بارے میں اس لیے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے۔ مجھے تم سے اور بھی بہت سے باتیں کہنا ہے مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا، اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا" (یوحنا کی انجیل، باب 16، آیت 7-14، پاکستان بائبل سوسائٹی، لاہور، ص 101، 1992ء)

ان آیات میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آمد کی بشارتیں دی ہیں، قرآن مجید میں ہے: "واذ قال عیسیٰ ابن مریم یبنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم مصدقا لما بین یدی من التورۃ ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد: اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل! بیشک میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں درآنحالیکہ میں اس توراۃ کی تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے سامنے ہے ایک عظیم رسول کی خوشخبری دینے والا ہوں جو میرے بعد آئیں گے ان کا نام احمد ہے" (الصّف: 6)

اس بشارت کی مزید تصدیق انجیل کی اس آیت میں ہے: "اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ سے اس کا کچھ نہیں" (یوحنا کی انجیل، باب 14، آیت 30، پاکستان بائبل سوسائٹی لاہور، ص 99، 1992ء)

نیز ان آیات میں ہے وہ میری گواہی دے گا۔ (یوحنا: باب 14، آیت 26)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں لوگوں کی بہ نسبت ابن مریم کے زیادہ قریب ہوں، تمام انبیاء علاتی (باپ شریک) بھائی ہیں، میرے اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ (صحیح مسلم فضائل، 143، (2365) 60۔ سنن ابوداود، رقم الحدیث: 4675)

ان آیات میں ہے: وہ تم کو سچائی کی راہ دکھائے گا۔ (یوحنا، باب 16 آیت 13)

اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فرماتا ہے: "انک لتھدی الی صراط مستقیم: بیشک آپ ضرور سیدھے راستے کی ہدایت دیتے ہیں" (الشوریٰ: 52)

نیز اس آیت میں ہے: وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا (یوحنا، باب 16، آیت 13)۔ اور قرآن مجید میں سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق ہے: "وماینطق عن الھوی۔ ان ھوالا وحی یوحی: اور وہ اپنی خواہش سے بات نہیں کرتے۔ ان کا فرمانا وہی ہوتا ہے جس کی ان کی طرف وحی کی جاتی ہے" (النجم: 3۔4)

نیز حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا وہ تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ (یوحنا، باب 16، آیت 13)۔ یہ پیش گوئی بھی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق ہے اور اس کی تائید اس حدیث میں ہے: حضرت حذیفہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے پاس ایک مقام پر تشریف فرما ہوئے اور آپ نے قیامت تک ہونے والے تمام امور بیان کردیے۔ جس نے ان کو یاد رکھا اس نے یاد رکھا جس نے ان کو بھلا دیا اس نے بھلا دیا۔ (صحیح مسلم الفتن 22، 2891، 7130۔ صحیح البخاری رقم الحدیث: 6604۔ سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 4240)۔

حضرت عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے درمیان تشریف فرما ہوئے اور آپ نے مخلوق کی ابتداء سے خبریں دینی شروع کیں، حتی کہ اہل جنت اپنے گھروں میں داخل ہوگئے اور اہل نار اپنے گھروں میں داخل ہوگئے، جس نے اس کو یاد رکھا اس نے یاد رکھا اور جس نے اس کو بھلا دیا اس نے بھلا دیا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 3192)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خصوصیات

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو ان کو نیکی کا حکم دے گا اور برائی سے روکے گا۔ یہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا چھٹا وصف ہے، نیکی کا حکم دینے سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لائیں اور ایمان کے تقاضوں کو پورا کریں، اور برائی سے روکنے سے مراد یہ ہے کہ وہ شرک نہ کریں، رشوت اور تھوڑے معاوضہ کے بدلہ میں تورات کی آیتوں کا سودا نہ کریں، سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صفات اور بشارت سے متعلق آیتوں کو لوگوں سے نہ چھپائیں، اللہ تعالیٰ کے صریح احکام کے مقابلہ میں اپنے علماء اور راہبوں کے اقوال کو ترجیح نہ دیں، اور ہر قسم کے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کو ترک کردیں۔

نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا کام دوسرے نبیوں اور رسولوں نے بھی کیا ہے، یہاں آپ کے اس وصف کو اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، کیونکہ آپ نہایت حکمت اور عمدہ پیرائے کے ساتھ نیکی کا حکم دیتے تھے، قرآن مجید میں ہے: "ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتیھی احسن: حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اپنے رب کے راستہ کی طرف بلایئے اور ان پر احسن طریقہ سے حجت قائم کیجیے" (النحل: 125)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم مسجد میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، اچانک ایک اعرابی آیا اور کھڑا ہو کر مسجد میں پیشاب کرنے لگا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابہ اس کو ڈانٹنے لگے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، اس کا پیشاب منقطع نہ کرو، اس کو چھوڑ دو، پس انھوں نے اس کو چھوڑ دیا، حتی کہ اس نے پیشاب کرلیا، (امام بخاری کی روایت میں ہے: آپ نے فرمایا اس کے پیشاب کے اوپر ایک ڈول پانی بہادو، تم آسانی کرنے کے لیے بھیجے گئے ہو، مشکل میں ڈالنے کے لیے نہیں بھیجے گئے (رقم الحدیث: 220) پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس اعرابی کو بلایا اور فرمایا یہ مساجد پیشاب یا کسی اور گندگی ڈالنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں، یہ تو صرف اللہ عزوجل کے ذکر، نماز اور قرآن پڑھنے کے لیے ہیں، یا جس طرح رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا پھر آپ نے ایک شخص کو ایک ڈول پانی لانے کا حکم دیا اور اس پر بہادیا۔ (صحیح مسلم الطھارۃ 100 (2850) 648۔ صحیح البخاری رقم الحدیث: 6025۔ سنن النسائی رقم الحدیث: 53۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 528)

حضرت معاویہ بن الحکم سلمی (رض) بیان کرتے ہیں: میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا، نمازیوں میں سے کسی شخص کو چھینک آئی۔ میں نے کہا یرحمک اللہ، تو نمازی مجھے گھور کر دیکھنے لگے، میں نے کہا اس کی ماں روئے تم مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ اور وہ اپنی رانوں پر اپنے ہاتھ مارنے لگے، تب میں نے جان لیا کہ وہ مجھے چپ کرانا چاہتے ہیں، سو میں چپ ہوگیا۔ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نماز پڑھ لی، آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوجائیں، آپ نے مجھے مارا نہ ڈانٹا نہ برا کہا۔ آپ نے فرمایا اس نماز میں لوگوں کے ساتھ باتیں کرنا جائز نہیں ہے۔ نماز میں تو صرف تسبیح، تکبیر اور قرآن کی

قراءت ہوتی ہے۔ امام ابوداود کی دوسری روایت میں ہے: انھوں نے کہا میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرح نرمی کرنے والا کوئی معلم نہیں دیکھا۔ (سنن ابو داؤد رقم الحدیث: 930۔931۔ سنن النسائی رقم الحدیث: 1217۔ سنن دارمی رقم الحدیث: 1502۔ مسند احمد ج5، ص448)

نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی یہ بھی خصوصیت تھی کہ آپ کسی کام سے منع فرماتے تو اس کی حکمت بھی بیان فرمادیتے۔ مثلاً یہ حدیث ہے: "حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو لعنت کرے۔ عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! کوئی شخص اپنے ماں باپ پر کیسے لعنت کرے گا؟ آپ نے فرمایا ایک شخص کسی کے باپ کو گالی دے گا تو وہ (جواب میں) اس کے باپ اور ماں کو گالی دے گا" (صحیح البکاری رقم الحدیث: 5973۔ صحیح مسلم الایمان 146 (90) 257۔ سنن ابوداود رقم الحدیث: 5141 ۔ سنن الترمذی رقم الحدیث: 1902۔ مسند احمد ج2، ص216،214،195،164)۔

آپ کا منشاء یہ تھا کہ کوئی شخص کسی کے ماں باپ کو گالی نہ دے، لیکن آپ نے اس کو ایسے موثر انداز میں فرمایا کہ جب تم کسی کے ماں باپ کو گالی دوگے تو وہ تمہارے ماں باپ کو گالی دے گا اور اس طرح تم اپنے ماں باپ کو گالی دینے کا سبب بنوگے۔ چنانچہ فرمایا تم اپنے ماں باپ کو گالی نہ دو۔

نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تیسری خصوصیت یہ تھی کہ آپ جس چیز کا حکم دیتے تھے خود اس پر زیادہ عمل کرتے تھے۔ آپ نے ہمیں پانچ فرض نمازیں پڑھنے کا حکم دیا اور خود بشمول تہجد چھ فرض پڑھتے تھے۔ آپ نے ہمیں طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب تک روزہ رکھنے کا حکم دیا اور خود وصال کے روزے رکھے جس میں بغیر افطار اور سحر کے روزے پر روزہ ہوتا ہے۔ اور یہ کئی کئی دن کے روزے ہوتے تھے۔ ہمیں مال کا چالیسواں حصہ زکوۃ دینے کا حکم فرمایا اور خود اپنے پاس مطلّقاً مال نہیں رکھتے تھے، ہمارے ترکہ میں وراثت جاری کی اور اپنا تمام ترکہ صدقہ قرار دیا، ہمیں چار بیویوں میں عدل کرنے کا حکم دیا اور خود نو ازواج میں عدل کرکے دکھایا۔

اور آپ کی چوتھی خصوصیت آپ کی اثر آفرینی تھی، آپ نے انبیاء سابقین کے مقابلہ میں تبلیغ کا سب سے کم وقت پایا اور سب سے زیادہ اپنے پیروکار چھوڑے۔ آپ نے خود فرمایا اہل جنت کی ایک سو بیس صفیں ہیں ان میں سے اسی (80) اس امت کی صفیں ہوں گی اور باقی چالیس صفیں دوسرے انبیاء کی ہوں گی۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: 2555)۔ انبیاء سابقین کی تبلیغ سے انسان بھی بمشکل مسلمان ہوتے تھے، آپ کی تبلیغ سے انسان مسلمان ہوئے، جنات مسلمان ہوئے، گوہ اور ہرنی نے کلمہ پڑھا، شجر و حجر سلام عرض کرتے تھے۔ حتی کہ آپ کا ہمزاد بھی مسلمان ہوگیا!

لاکھ ستارے ہر طرف ظلمت شب جہاں جہاں
ایک طلوع آفتاب دشت و جبل سحر سحر

آج دنیا میں کسی نبی کے پیروکار اپنے نبی کی صحیح تعلیم پر قائم نہیں ہیں صرف آپ کی امت ہے جو آپ کی تعلیم پر قائم ہے اور انشاء اللہ قیامت تک قائم رہے گی!

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی یہ صفت بیان کی کہ "جو ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرے گا اور ناپاک چیزوں کو حرام کرے گا" یہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ساتواں وصف ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ جن پاک چیزوں کو انھوں نے اپنی خواہش سے حرام کرلیا ہے ان کو یہ نبی حلال کرے گا اور جن ناپاک چیزوں کو انھوں نے اپنی مرضی سے حلال کرلیا ہے ان کو یہ نبی حرام کرے گا، یا اس کا یہ معنی ہے کہ جو پاک چیزیں بنی اسرائیل پر بطور سزا حرام کردی گئی تھیں ان کو یہ نبی حلال کردے گا مثلاً حلال جانوروں کی چربی، اور ناپاک اور گندی چیزوں کو حرام کردے گا۔ مثلاً خون، مردار جانور اور شراب وغیرہ۔ جو چیزیں حرام ذریعہ آمدنی سے حاصل ہوں ان کو بھی حرام کردے گا۔ مثلاً سود، رشوت اور جوا وغیرہ۔

اس آیت سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حلال اور حرام کرنے کا منصب عطا فرمایا ہے اور آپ کو یہ منصب عطا کیا ہے کہ آپ پاک چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام کردیں۔

حضرت مقدام بن معدی کرب (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا سنو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کی ایک مثل دی گئی ہے، سنو! عنقریب ایک شخص اپنے تخت پر سیر ہو کر بیٹھا ہوگا وہ یہ کہے گا کہ اس قرآن کو لازم رکھو، اس میں جو تم حلال پاؤ اس کو حلال قرار دو، اور اس میں جو

حرام پاؤاس کو حرام قرار دو، اور بیشک جس کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حرام قرار دیا وہ ایسا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا، سنو! تمہارے لیے پالتو گدھا حلال نہیں ہے، اور نہ ہر کچلیوں سے شکار کرنے والا درندہ اور نہ راستہ میں پڑی ہوئی ذمی کی چیز سوا اس کے کہ اس کا مالک اس سے مستغنی ہو۔ (سنن ابو داؤد رقم الحدیث: 4604۔ سنن الترمذی رقم الحدیث: 2674۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 22۔ سنن دارمی رقم الھدیث: 582۔ مسند احمد ج 4، ص 132۔ المستدرک ج 1، ص 109۔ المشکوۃ رقم الحدیث: 164)

الطیبات اور الخبائث کی تفسیر میں مذاہب اربعہ

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی متوفی 606ھ لکھتے ہیں:

اس آیت میں الطیبات سے یہ مراد لینا واجب ہے کہ جو چیزیں طبیعت کے نزدیک پاکیزہ اور لذیذ ہیں وہ حلال ہیں اور نفع بخش چیزوں میں اصل حلت ہے، لہٰذا یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ ہر وہ چیز جو نفس کے نزدیک پاکیزہ اور لذیذ ہے وہ حلال ہے، سوا اس کے کہ کسی اور شرعی دلیل سے وہ حرام ہو، اسی طرح الخبائث سے مراد وہ چیز ہے جو نفس اور طبیعت کے نزدیک گھناؤنی ہو اور اس کا استعمال صحت کے لیے مضر ہو وہ حرام ہے کیونکہ ضرر رساں چیزوں میں اصل حرمت ہے سو ایسی ہر چیز حرام ہے سوا اس کے کسی اور شرعی دلیل سے وہ حلال ہو، اسی قاعدہ کی بناء پر امام شافعی (رح) نے کہا کتے کی بیع حرام ہے، کیونکہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس (رض) سے روایت ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کتا خبیث ہے اور اس کی ثمن (قیمت) خبیث ہے اور جب وہ خبیث ہے تو پھر حرام ہے، کیونکہ اس آیت میں ہے وہ تم پر خبیث چیزوں کو حرام کرتے ہیں نیز خمر (انگور کے کچے شیرہ سے بنی ہوئی شراب) حرام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو رجس (نجس) فرمایا ہے۔ (المائدہ: 90) اور نجس چیز خبیث ہے اور خبیث چیز حرام ہے پس خمر حرام ہے۔ (تفسیر کبیر ج 5، ص 382، 381، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1415ھ)

قاضی عبداللہ بن عمر بیضاوی شافعی متوفی 686ھ لکھتے ہیں: "ان پاک چیزوں کو حلال کرتے ہیں جو ان پر حرام تھیں جیسے چربی (یا اونٹ) اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتے ہیں جیسے خون، خنزیر کا گوشت اور سود اور رشوت" (تفسیر البیضاوی مع الکازرونی ج 3، ص 64، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1416ھ)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد قرطبّی مالکی متوفی 668ھ لکھتے ہیں: "امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ پاک چیزیں حلال ہیں اور خبیث چیزیں حرام ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا خبائث خنزیر کا گوشت اور سود وغیرہ ہیں۔ اسی بنا پر امام مالک نے گھناؤنی چیزوں کو حلال قرار دیا ہے مثلاً سانپ بچھو اور گبریلا وغیرہ، اور امام شافعی کے نزدیک طیبات سے مراد لذیذ چیزیں ہیں لیکن یہ اپنے عموم پر نہیں ہے ورنہ شراب اور خنزیر بھی حلال ہو، بلکہ یہ ان کے ساتھ خاص ہے جن کو شریعت نے حلال قرار دیا، اور ان کے نزدیک خبیث کا لفظ محرمات شرعیہ میں عام ہے۔ اور ان کے نزدیک گھناؤنی چیزیں بھی خبیث ہیں، اس لیے وہ بچھو، گبریلے اور گرگٹ کو حرام کہتے ہیں" (الجامع لاحکام القرآن جز 7، ص 269، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415ھ) (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَاﰳ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۝۱۵۸

لغۃ القرآن: [قُلْ : آپ کہئے] [يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ : اے لوگو] [اِنِّيْ : بیشک میں] [رَسُوْلُ اللّٰهِ : اللہ کا رسول ہوں] [اِلَيْكُمْ : تم لوگوں کی طرف] [جَمِيْعًا : سب کی طرف] [الَّذِيْ : اس (اللہ) کا] [لَهٗ : جس

کی ہی] [مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ : زمین اور آسمانوں کی حکومت ہے] [لَآ اِلٰهَ : کوئی الہ نہیں ہے] [اِلَّا : مگر] [هُوَ : وہی] [يُحْيٖ : وہ زندگی دیتا ہے] [وَيُمِيْتُ : اور وہ (ہی) موت دیتا ہے] [فَاٰمِنُوْا : پس تم لوگ ایمان لاؤ] [بِاللّٰهِ : اللہ پر] [وَرَسُوْلِهِ : اور اس کے رسول پر] [النَّبِيِّ : جو نبی ہیں] [الْاُمِّيِّ : امی ہیں] [الَّذِيْ : جو] [يُؤْمِنُ : ایمان رکھتے ہیں] [بِاللّٰهِ : اللہ پر] [وَكَلِمٰتِهٖ : اور اس کے فرمانوں پر] [وَاتَّبِعُوْهُ : اور تم لوگ پیروی کرو ان کی] [لَعَلَّكُمْ : تاکہ تم] [تَهْتَدُوْنَ : ہدایت پاؤ]

ترجمہ: آپ فرمادیں: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول (بن کر آیا) ہوں جس کے لیے تمام آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی جلاتا اور مارتا ہے، سو تم اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لاؤ جو (شانِ امیّت کا حامل) نبی ہے (یعنی اس نے اللہ کے سوا کسی سے کچھ نہیں پڑھا مگر جمیع خلق سے زیادہ جانتا ہے اور کفر و شرک کے معاشرے میں جوان ہوا مگر بطنِ مادر سے نکلے ہوئے بچے کی طرح معصوم اور پاکیزہ ہے) جو اللہ پر اور اس کے (سارے نازل کردہ) کلاموں پر ایمان رکھتا ہے اور تم انہی کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پا سکو

تشریح: اس سے پہلے جتنے رسولوں کا ذکر ہوا وہ خاص خاص علاقوں اور مخصوص قوموں کے ایک مقررہ وقت تک مرشد و رہبر بن کر آئے تھے۔ لیکن اب جس مرشد اولین وآخری، جس میں رہبر اعظم کا ذکر خیر ہو رہا ہے اس کی شان رہبری نہ کسی قوم سے مخصوص ہے اور نہ کسی زمانہ سے محدود جس طرح اس کے بھیجنے والے کی حکومت و سروری عالم گیر ہے اسی طرح اس کے رسول کی رسالت بھی جہاں گیر ہے۔ ہر خاص و عام، ہر فقیر و امیر، ہر عربی و عجمی، ہر رومی و حبشی کے لیے وہ مرشد بن کر آیا۔ اسی لیے اس بات کا اعلان اس کی زبان حقیقت ترجمان لے کر آیا ہے اے اولاد آدم! میں تم سب کے لیے زمین وآسمان کے خالق ومالک کی طرف سے رشد و ہدایت کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ اب تمہارے لیے ہدایت اور فلاح کا راستہ یہی ہے کہ اس کتاب کی پیروی کرو جو میں لے کر تمہارے پاس آیا ہوں اور میرے نقوش پا کو اپنے لیے خضر راہ بناؤ۔ میری سنت سے انحراف نہ کرو۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے قوم اور ہر علاقہ کی طرف الگ الگ انبیائے کرام (علیہم السلام) مخصوص اوقات کے لیے آتے رہے۔ مثال کے طور پر حضرت ہود (علیہ السلام) کی قوم عاد کی طرف (قرآن: ۷: ۶۵) حضرت صالح (علیہ السلام) کو قوم ثمود کی طرف (قرآن: ۷: ۷۳) حضرت شعیب (علیہ السلام) کو اہل مدین کی طرف (قرآن: ۷: ۸۵) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو بنی اسرائیل کی طرف (قرآن: ۳: ۴۹) بھیجا گیا۔

سب سے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے پیارے نبی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دنیا کے ہر علاقے اور تمام انسانوں کے لیے مبعوث فرمایا، اس لیے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت قیامت تک آنے والی تمام نسلوں کو شامل ہے کیونکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آخری نبی ہیں۔

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عالمگیر نبوت قرآن پاک کی روشنی میں

۱۔ اے لوگو! بیشک میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ (قرآن: ۷: ۱۵۸)

۲۔ ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سارے جہانوں کے لیے سراپا رحمت بنا کر بھیجا۔ (قرآن: ۲۱: ۱۰۷)

۳۔ بڑی برکت والا ہے وہ اللہ تعالیٰ جس نے اپنے بندے پر قرآن اتارا تاکہ وہ سارے جہان والوں کو (عذاب الٰہی سے) ڈرانے والا بن جائے۔ (قرآن: ۲۵: ۱)

۴۔ ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا۔ (قرآن: ۳۴: ۲۸)

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عالمگیر نبوت احادیث کی روشنی میں

۱۔ پہلے نبی کسی ایک مخصوص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میں تمام انسانوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ (بخاری، کتاب التیمم، باب ۱)

۲۔ پہلے ہر نبی اپنی مخصوص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میں ہر سرخ اور سیاہ کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ (مسلم: کتاب المساجد: حدیث نمبر ۳)

۳۔ مجھے تمام مخلوقات کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا اور مجھ پر سلسلہ نبوت ختم ہو گیا ہے۔ (مسلم: کتاب المساجد: حدیب نمبر ۵) (تفسیر امداد الکرم)

یاد رہے ! حضور سرور کونین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نہ صرف یہ کہ تمام انسانوں کے لیے رسول ہیں بلکہ تمام کائنات اور ساری خلق خدا کے رسول ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعلمین۔ "اور ہم نے تو آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔" (انبیاء: 107) ان ھو الا ذکر للعلمین۔ "قرآن تمام جہانوں ہی کے لیے ذکر ہے۔" (تکویر: 27) تبرک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعلمین نذیرا۔ "برکت والا وہ ہے رب جس نے فرق کرنے والی کتاب (قرآن) کو اپنے بندۂ خاص (محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)) پر نازل کیا، تاکہ وہ (بندہ) تمام جہانوں کے لیے نذیر بنے۔" (فرقان: 1)۔

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھے پانچ وہ خصوصیات دی گئی ہیں جو مجھ سے قبل کسی (نبی) کو عطا نہیں کی گئیں: ایک ماہ کی مسافت سے میری مدد کی گئی ہے، میرے لیے ساری زمین کو مسجد اور پاک کرنے والی بنا دیا گیا ہے۔ پس جو شخص جہاں نماز کا وقت پائے وہیں نماز پڑھ لے۔ اور میرے لیے مال غنیمت حلال کیا گیا ہے جو مجھ سے قبل کسی کے لیے حلال نہیں کیا گیا تھا اور مجھے شفاعت عطا فرمائی گئی۔ وکان النبی یبعث الی قومہ و بعثت الی الناس عامۃ۔ اور ہر نبی کو اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور مجھے تمام نسل انسانی کی طرف بھیجا گیا ہے۔ (بخاری کتاب التیمم حدیث 335، مسلم کتاب المساجد حدیث 521)

حضرت ابوہریرہ (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

فضلت علی الانبیاء بست۔ مجھے چھ چیزوں کے ساتھ انبیاء پہ فضیلت دی گئی ہے: مجھے جوامع الکلم دیے گئے ہیں، رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی ہے، میرے لیے غنائم حلال کی گئی ہیں، میرے لیے ساری زمین کو مسجد اور پاک کرنے والی بنا دیا گیا ہے۔ وارسلت الی الخلق کافۃ وختم بی النبیوں، مجھے تمام مخلوق خدا کی طرف رسول بنایا گیا ہے اور مجھ پہ سلسلۂ نبوت ختم کر دیا گیا ہے۔ (مسلم کتاب الفضائل حدیث 523)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا جمادات نباتات اور حیوانات کے لئے رسول ہونا:

سیدنا علی المرتضیٰ (رض) سے مروی ہے کہ فرمایا میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مکہ میں تھا تو ہم مکہ کی بعد اطراف کی طرف نکلے۔ فما استقبلہ جبل ولا حجر الا وھو یقول السلام علیک یا رسول اللہ۔ تو جو پہاڑیاں درخت حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے آیا وہ یہ کہتا تھا: اے اللہ کے رسول! آپ کو سلام ہو۔ (ترمذی کتاب المناقب حدیث 3226)

حضرت یعلی بن مرہ (رض) سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مکہ کے ایک راستے پر جا رہا تھا آپ ایک عورت کے پاس سے گزرے جس کے بچے کو جنون تھا اپنے اس کے لئے دعا فرمائی اور وہ صحیح ہو گیا پھر آپ آگے چل دیے آپ ایک اونٹ کے پاس سے گزرے جو لوگوں پر حملہ آور ہو رہا تھا، آپ نے فرمایا یہ کون کہہ رہا ہے کہ میں ان لوگوں کے ہاں پیدا ہوا یہ مجھ سے عمر بھر کام لیتے رہے اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں تو یہ مجھے ذبح کرنا چاہتے ہیں۔ پھر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آگے گئے تو دو درخت نظر آئے آپ نے مجھے فرمایا جاؤ ان سے کہو باہم مل جائیں وہ دونوں فوراً ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے اپنے ان کے پیچھے قضا حاجت فرمائی، پھر ان سے فرمایا کہ اپنی اپنی جگہ چلے جاؤ تو وہ واپس اپنی اپنی جگہ چلے گئے۔ تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ما من شیئ الا یعلم انی رسول اللہ الا کفرۃ او فسقۃ الجن والانس۔ دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں جو یہ جانتی ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں سوا کافر انسانوں اور جنوں کے۔

(المعجم الکبیر للطبرانی جلد 22 صفحہ 268 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت۔ مستدرک جلد 2 صفحہ 618 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ایسے سینکڑوں معجزات ہیں کہ جانور آپ کو سجدے کرتے ہیں کنکر کلمہ پڑھتے ہیں جانور اپنی فریاد لے کر آپ کے پاس حاضر ہوتے ہیں درخت آپ کے حکم پہ دوڑتے ہیں بلکہ آپ کا حکم آسمان پر بھی جاری ہے شمس و قمر آپ کی اطاعت بجالاتے ہیں۔ وضع یہی ہے کہ آپ ساری کائنات کے رسول ہیں، بلکہ ساری کائنات آپ کے لیے بنائی گئی ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگرچہ ساری مخلوق کے رسول ہیں، مگر یہاں قرآن میں صرف انسانوں کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ انسان ہی آپ کی رسالت سے انکار کرتے ہیں تو انھیں سمجھایا گیا باقی کوئی مخلوق انکار نہیں کرتی (جنات بھی انکار کرتے ہیں مگر وہ عالم غیب کی بات ہے) آپ فرماتے ہیں جب میں پہلی وحی لے

کر غار حیرا سے گھر آیا تو مجھے ہر پتھر اور شجر سے آواز آتی تھی۔ السلام علیک یا رسول اللہ۔ (دلائل النبوہ لابی نعیم جلد اول صفحہ حدیث 157)۔ گویا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت ہر شجر و حجر کو محیط ہے۔

یہاں سے تین فوائد حاصل ہوئے:

1۔ افضیلت مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔ ہر نبی ایک قوم کی طرف یا ایک شہر یا علاقہ کی طرف بھیجا گیا۔ جیسے فرمایا گیا: والی مدین اخاھم شعیبا۔ والی عاد اخاھم ھودا۔ والی ثمود اخاھم صالحا۔ مگر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ساری کائنات کے رسول ہیں۔ درخت آپ کے حکم پر حاضر ہوتے پتھر آپ کے اشارے پر کلمہ پڑھتے اور جانور آپ کے پاس فریادیں لے کر آتے ہیں۔

جس کے گھیرے میں ہیں انبیاء وملک

اس جہاں گیر بعثت پہ لاکھوں سلام

2۔ مسلمان اہل کتاب کو تبلیغ کر سکتے ہیں وہ انھیں نہیں کر سکتے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام نہاد ماننے والے عیسائی دنیا بھر میں مسلمانوں کو تبلیغ کرتے پھرتے ہیں۔ یہاں برطانیہ میں اکثر عیسائی مبلغین ہمارے دروازے کھٹکھٹاتے ہیں جبکہ حضرت موسیٰ و عیسیٰ (علیہما السلام) صرف بنی اسرائیل کے رسول تھے توراۃ کے بارے میں فرمایا گیا۔ واذ اخذ نا میثا بنی اسرائیل۔ (بقرہ: 83) یعنی توراۃ صرف بنی اسرائیل کے لئے اتاری گئی اور عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: یبنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم (صف: 6) اور انجیل میں ہے آپ نے فرمایا میں صرف بنی اسرائیل کی بھیڑیں چرانے آیا ہوں۔ (انجیل متی باب 10 آیت 6)۔ جبکہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعَۨا۔ لہٰذا مسلمانوں کا حق ہے کہ وہ ساری اقوام عالم کو تبلیغ کریں مگر دوسری قوموں کا حق نہیں کہ ان کے دروازے کھٹکھٹائیں۔

3۔ انبیاء ہدایت کے ستارے ہیں اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آفتاب ہدایت۔ پہلے انبیاء اکرام نبوت کے ستارے بن کر خاص خاص قوموں یا علاقوں پر چمکے مگر حضور سید کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آفتاب نبوت بن کر سارے جہان پر چمکے۔ اسی لئے آپ کے بارے میں کہا گیا: وسراجا منیرا۔ (احزاب: 46)۔ جب آفتاب آجائے تو ستارے چھپ جاتے ہیں جب مدنی آفتاب چمکا تو سب نبوتیں اور ادیان اس کی ضوء میں چھپ گئے۔

یعنی اے پیارے نبی! آپ فرمادیں کہ ساری کائنات کے رب نے مجھے ساری انسانیت کا رسول بنایا ہے اور موت و حیات اس کے ہاتھ میں ہے لہٰذا میں موت کے ڈر سے قاری تبلیغ چھوڑ نہیں سکتا۔

لہٰذا اے تمام انسانو! رسول امی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لاؤ جو اللہ کے سارے کلمات پر ایمان رکھتے یعنی اس کی ساری کتابوں کی تصدیق فرماتے ہیں اور ان کی پیروی و غلامی اختیار کر لو تو اسی میں ہدایت مضمر ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شان ختم نبوت:

اس آیت مبارکہ سے چار لحاظ سے حضور سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خاتم النبیین ہونا معلوم ہوا۔

اول: آپ ساری نسل انسانی کے رسول ہیں (اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعَۨا) لہٰذا اب تا قیامت کسی انسان کو کسی نئے نبی یا نہیں کتاب کی ضرورت نہیں۔ آپ سے قبل کسی نبی و رسول کو یہ شان نہیں عطا فرمائی گئی۔

دوم: آپ تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنے والے ہیں کیونکہ فرمایا گیا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَکَلِمٰتِہٖ۔ اور سبب کہ مصدق کے لئے ضروری ہے کہ وہ سب سے آخر میں آئے۔ اسی لئے آپ کی شان یوں بیان فرمائی گئی: ثم جاء کم رسول مصدق لما معکم۔ یعنی پھر وہ رسول آجائیں جو اے انبیاء کرام! تمہاری سب باتوں کی تصدیق کرنے والا ہے۔ (آل عمران۔ 81)

سوم: اب ہیدایت آپ ہی کی اتباع سے وابستہ کر دی گئی ہے وَاتَّبِعُوْہُ لَعَلَّکُمْ تَہْتَدُوْنَ۔ اگر آپ کے بعد کسی نئے نبی کا آنا مانا جائے تو اس کے ماننے پر ہدایت موقوف ہو جائے گی آپ کا ماننا ہدایت کے لیے ناکافی ہو جائے گا۔

چہارم : فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں کے لیے قرآن اتارا گیا ہے ان کا ایک ہی رسول ہے۔ اسی لئے بار بار فرمایا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر۔ اگر اس امت کے لئے ایک سے زائد رسولوں نے آنا ہوتا تو فآمنوا باللہ ورسلہ کہا جاتا، یعنی صیغہ جمع بولا جاتا۔ (تفسیر برہان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ۝۱۵۹

لغۃ القرآن: [وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓي : اور موسیٰ کی قوم میں سے] [اُمَّةٌ: ایک ایسا گروہ ہے] [يَّهْدُوْنَ : جو ہدایت دیتا ہے] [بِالْحَقِّ : حق کے ساتھ] [وَبِهٖ : اور اس کے ساتھ] [يَعْدِلُوْنَ : وہ انصاف کرتے ہیں]

ترجمہ: اور موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم میں سے ایک جماعت (ایسے لوگوں کی بھی) ہے جو حق کی راہ بتاتے ہیں اور اسی کے مطابق عدل (پر مبنی فیصلے) کرتے ہیں

تشریح: قرآن مجید کا یہ اسلوب بیان ہے کہ وہ کسی بات کو واقعہ برائے واقعہ اور داستان گوئی کے لیے بیان نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کے قصہ کے سوا کسی ایک نبی کا قصہ کسی ایک مقام پر مسلسل بیان نہیں کیا گیا بلکہ قصہ کا وہی حصہ بیان کیا جاتا ہے جس سے ایک خاص نقطہ اور نصیحت بیان کرنا مقصود ہوتی ہے۔ پھر قرآن مجید کا کمال اور اس کی انصاف پسندی یہ ہے کہ اس نے کسی قوم کے جرائم بیان کرتے ہوئے اس قوم کو کلیتاً مجرم قوم قرار نہیں دیا بلکہ ان کے اچھے لوگوں کو مستثنیٰ قرار دے کر ان کے اچھے کردار کی تعریف کی ہے۔ اسی اصول اور اسلوب کے پیش نظر یہاں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم کے ان اچھے لوگوں کی تعریف کی جا رہی ہے جو حالات کی سنگینی کے باوجود نہ صرف حق پر قائم رہے بلکہ حق کی تلقین اور ہمیشہ عدل کی بات کرتے رہے۔ جنھیں تھوڑے ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ایک امت قرار دیا ہے کیونکہ حق پر قائم رہنے والے لوگ خواہ کتنے ہی تھوڑے کیوں نہ ہوں وہ اپنے صالح کردار اور توحید پر مبنی عقیدہ کی وجہ سے ایک امت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی لیے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو ایک امت قرار دیا ہے۔ (النمل، آیت : ۱۲۱)

قرآن مجید میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم کے جن پاکباز لوگوں کو امت کے درجے پر فائز کیا گیا ہے ان کی وضاحت کرتے ہوئے مفسرین نے لکھا ہے کہ ان سے مراد موسیٰ (علیہ السلام) کے سچے متبعین اور ان کے بعد عیسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لانے والے لوگ ہیں۔ جب نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کا اعلان ہوا تو جو آپ کی رسالت پر ایمان لائے ہیں۔ یہی لوگ حق کی رہنمائی کرنے اور اس کے مطابق عمل کرنے والے تھے۔

(عَنْ سَعِیْدِ بْنِ زَیْدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ نُفَیْلٍ، وَعُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ (رض) قَالَا لِرَسُوْلِ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اَتَسْتَغْفِرُ لِزَیْدِ بْنِ عَمْرٍو؟ قَالَ نَعَمْ فَاِنَّہٗ یُبْعَثُ اُمَّۃً وَّاحِدًا) [سیرۃ ابن ہشام]

"حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل اور عمر بن خطاب (رض) دونوں نے رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دریافت کیا آپ زید بن عمرو کے لیے استغفار کرتے ہیں؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہاں بلاشبہ وہ اکیلا ایک جماعت کی طرح ہے۔" تفسیر فہم القرآن)

اگرچہ بنی اسرائیل کی بڑی اکثریت کا طرز عمل حوصلہ شکن تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جانا، اناڑی بچوں کی طرح اپنی بات خواہ کتنی نامعقول ہو منوانے پر بضد ہونا، معمولی سے معمولی شبہ پر راہ حق سے روگرداں ہو جانا ان کا معمول تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو سچے مومن تھے۔ شریعت موسویہ کے پورے پورے پابند تھے۔ توراۃ کے احکام کی بجاآوری میں تندہی سے کوشاں تھے۔ مفسرین کرام سے بہت سے اقوال مروی ہیں کہ اس گروہ سے کونسا گروہ مراد ہے اور وہ کس زمانہ میں تھا۔ لیکن اگر اس آیت کو اپنے عموم پر رہنے دیا جائے تو کسی قسم کا اشکال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یعنی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی موجودگی میں بھی ایک فرمان بردار جماعت تھی۔ جب دوسری قوم نے بچھڑے کی پرستش شروع کی تو یہ اپنے مسلک توحید پر ثابت قدم رہی۔ آپ کے انتقال کے بعد بھی وہ احکام الٰہی پر صدق دل سے عمل پیرا رہی۔ اور عہد مصطفوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں بھی ایسا گروہ موجود تھا جو توراۃ پر کاربند تھا۔ جب انھوں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دیدار کیا اور حضور کی سیرت

کا بغور مطالعہ کیا اور ان نشانات کو جو نبی آخر الزمان کے متعلق توراۃ میں مذکور تھے اس ذات اقدس میں موجود پایا تو فوراً ایمان لے آئے۔ اور دوسرے یہودیوں کی طرح اپنی چودھراہٹ کی خاطر قبول حق سے انکار نہیں کیا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی امت کے نیک لوگوں کا مصداق

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا تھا کہ اس (عظیم) رسول نبی امی پر ایمان لانا تمام لوگوں پر واجب ہے، اب اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم میں بھی ایک ایسا گروہ تھا جو حق کے ساتھ ہدایت دیتا تھا اور حق کے ساتھ عدل کرتا تھا۔ اس گروہ کا مصداق کون ہے۔ اس میں مفسرین کا اختلاف ہے۔

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی 310ھ لکھتے ہیں:

یہ قوم چین کے پار رہتی ہے، یہ لوگ حق اور عدل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، یہ لوگ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے، انھوں نے ہفتہ کے دن شکار کرنے کو ترک کر دیا، یہ ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے ہیں، ان کا کوئی آدمی ہم تک پہنچ چکا ہے نہ ہمارا کوئی آدمی ان تک پہنچ سکتا ہے۔ روایت میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد اختلاف اللہ تعالیٰ نے ان کو مخلوق سے دور زمین کے ایک کونے میں پہنچا دیا، ان کے لیے زمین میں ایک سرنگ بنادی۔ وہ اس میں ڈیڑھ سال تک چلتے رہے حتی کہ وہ چیز کے پار پہنچ گئے۔ اور وہ اب تک وہاں دین حق پر قائم ہیں اور لوگوں اور ان کے درمیان ایک سمندر ہے جس کی وجہ سے لوگ ان تک نہیں پہنچ سکتے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز 7، س 271۔ جامع البیان جز 9، س 118، زاد المسیر ج 3، ص 274، معالم التنزیل ج 2، ص 173، الدر المنثور ج 3، ص 585، روح المعانی جز 9، ص 84)

لیکن محققین نے اس تفسیر کو رد کر دیا ہے کیونکہ عادۃً ایسا ممکن نہیں ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ہو اور دنیا اس سے ناواقف ہو، جب کہ ذرائع ابلاغ اور آمد و رفت کے وسائل بہت زیادہ ہیں۔

اس آیت کی دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں یہودیوں کا ایک گروہ تھا جو دین حق پر قائم تھا اور وہ لوگ ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لے آئے تھے، جیسے حضرت عبداللہ بن سلام (رض) اور ان کے اصحاب، اگر یہ کہا جائے کہ یہ لوگ تو بہت کم ہیں اور قرآن نے ان کو امت سے تعبیر فرمایا جو ان کی کثیر تعداد کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید نے ایک فرد پر بھی امت کا اطلاق فرمایا ہے: "ان ابراہیم کان امۃ: بیشک ابرایم (بہ نفس نفیس) ایک امت تھے" (النحل: 120)۔ (زاد المسیر ج 3، س 274۔ تفسیر کبیر ج 5، س 387۔ روح المعانی جز 9۔ ص 848)

میرے نزدیک اس آیت کی زیادہ عمدہ تفسیر یہ ہے کہ بنو اسرائیل میں ہرچند کہ زیادہ تر ضدی، ہٹ دھرم، نافرمان اور فساق فجار تھے لیکن ہر دور میں ان کے اندر چند صالح لوگوں کی بھی ایک جماعت موجود رہی ہے۔ جیسا کہ امۃ کی تنوین میں اس تقلیل کی طرف اشارہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے جہاں جہاں بنو اسرائیل کی عہد شکنیوں اور بداعمالیوں پر شدت کے ساتھ سرزنش کی ہے وہاں ان کے اندر اس قلیل گروہ کی تعریف و تحسین بھی فرمائی ہے، حق اور عدل کے الفاظ میں یہ اشارہ ہے کہ اس قلیل گروہ میں علماء بھی تھے اور قضاۃ بھی، جو دین حق پر قائم تھے اور حق کے ساتھ فیصلے کرتے تھے، ان ہی کی نسل سے ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں حضرت عبداللہ بن سلام (رض) اور ان کے اصحاب پیدا ہوئے، اس تفسیر کی تائید حسب ذیل روایات سے بھی ہوتی ہے:

امام عبدالرحمٰن بن محمد الرازی بن ابی حاتم متوفی 327ھ اپنے سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس (رض) نے بیان کیا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اے میرے رب میں نے ایک امت ایسی پائی جو اپنے اموال کا صدقہ دے گی، پھر اس کی طرف وہ مال لوٹ آئے گا اور وہ اس کو کھا لے گی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ امت تمہارے بعد ہوگی اور یہ امت احمد ہے، حضرت موسیٰؑ نے کہا اے میرے رب! میں نے ایک ایسی امت پائی جو پانچ نمازیں پڑھے گی اور وہ نمازیں ان کے درمیان کے گناہوں کے لیے کفارہ ہو جائیں گی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ امت تمہارے بعد ہوگی اور یہ امت احمد ہے، حضرت موسیٰ نے کہا اے میرے رب! مجھے امت احمد میں سے کر دے! تب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو راضی کرنے کے لیے یہ آیت نازل کی اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ ہے وہ لوگ حق کے ساتھ ہدایت دیتے ہیں اور اسی کے ساتھ عدل کرتے ہیں۔

ابو الصہباء البکری بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی ضی اللہ عنہ نے ایک یہودی عالم اور ایک عسائی عالم کو بلایا اور کہا میں تم لوگوں سے ایک چیز کے متعلق سوال کرتا ہوں اور میں اس کو تم سے بہتر جانتا ہوں، پھر آپ نے یہودی عالم سے کہا یہ بتاؤ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد بنو اسرائیل کے کتنے فرقے ہو گئے تھے ؟ اس نے کہا خدا کی قسم ! کوئی فرقہ نہیں ہوا، حضرت علی نے فرمایا تم نے جھوٹ بولا۔ ان کے اکہتر فرقے ہوئے تھے اور ایک کے سوا وہ سب دوزخ میں جائیں گے۔ پھر آپ نے عیسائی عالم سے کہا بتاؤ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بعد عیسائیوں کے کتنے فرقے ہو گئے تھے ؟ اس نے بھی کہا خدا کی قسم ان میں کوئی فرقہ نہیں ہوا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا تم نے جھوٹ بولا، اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، ان کے بہتر فرقے ہوئے تھے اور ایک کے سوا سب دوزخ میں جائیں گے، اور تم اے یہودی سنو ! اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے : اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ ہے وہ لوگ حق کے ساتھ ہدایت دیتے ہیں اور اسی کے ساتھ عدل کرتے ہیں۔ (الاعراف : 159) اور یہی گروہ نجات پائے گا اور تم اے نصرانی سنو ! بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : " منھم امۃ مقتصدۃ وکثیر منھم ساء مایعملون : اور ان میں سے کچھ لوگ اعتدال پر ہیں اور زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو بہت برے کام کر رہے ہیں " (المائدہ : 66)۔ اور جو لوگ اعتدال پر ہیں وہی نجات پائیں گے، اور رہے ہم ! تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : " وممن خلقنا امۃ یھدون بالحق وبہ یعدلون : اور جن کو ہم نے پیدا کیا ہے، ان میں سے ایک گروہ ہے وہ لوگ حق کی ہدایت دیتے اور اسی کے ساتھ عدل اور انصاف کرتے ہیں " (الاعراف : 181)۔

حضرت علی (رض) نے فرمایا اس امت میں سے یہی گروہ نجات پائے گا۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج 5، ص 1587۔ 1588۔ الدر المنثور ج 3، ص 585)

غرض یہ کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی امت میں نیک لوگوں کا گروہ بھی ہر دور میں رہا ہے اور ان ہی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝١٦٠

لغۃ القرآن: [وَقَطَّعْنٰهُمُ : اور ہم نے تقسیم کیا ان کو] [اثْنَتَيْ عَشْرَةَ : بارہ (قبیلوں) میں] [اَسْبَاطًا : نسلیں ہوتے ہوئے] [اُمَمًا: گروہ در گروہ ہوتے ہوئے] [وَاَوْحَيْنَآ : اور ہم نے وحی کیا] [اِلٰي مُوْسٰٓي : موسیٰ کی طرف] [اِذِ : جب] [اسْتَسْقٰىهُ : پانی مانگا ان سے] [قَوْمُهٗٓ: ان کی قوم نے] [اَنِ : کہ] [اضْرِبْ : آپ ماریے] [بِّعَصَاكَ : اپنی لاٹھی سے] [الْحَجَرَ : اس پتھر کو] [فَانْۢبَجَسَتْ : تو پھوٹ بہے] [مِنْهُ : اس سے] [اثْنَتَا عَشْرَةَ : بارہ] [عَيْنًا : چشمے] [قَدْ عَلِمَ : جان لیا] [كُلُّ اُنَاسٍ : سب لوگ نے (یعنی قبیلہ)] [مَّشْرَبَهُمْ : اپنی پینے کی جگہ کو] [وَظَلَّلْنَا : اور ہم نے سایہ کیا] [عَلَيْهِمُ : ان پر] [الْغَمَامَ : بادل کا] [وَاَنْزَلْنَا : اور ہم نے اتارا] [عَلَيْهِمُ : ان پر] [الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى : من وسلوی] [كُلُوْا : کھاؤ] [مِنْ طَيِّبٰتِ مَا : اسکی پاکیزہ (چیزوں) میں سے جو] [رَزَقْنٰكُمْ : ہم نے عطا کیا تم کو

] [وَمَا ظَلَمُوْنَا : اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا] [وَلٰكِنْ : اور لیکن (یعنی بلکہ)] [كَانُوْٓا : وہ تھے] [اَنْفُسَهُمْ : ان کی جانیں] [يَظْلِمُوْنَ : وہ ظلم کرتے]

ترجمہ: اور ہم نے انھیں گروہ در گروہ بارہ قبیلوں میں تقسیم کر دیا، اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس (یہ) وحی بھیجی جب اس سے اس کی قوم نے پانی مانگا کہ اپنا عصا پتھر پر مارو، سو اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، پس ہر قبیلہ نے اپنا گھاٹ معلوم کر لیا، اور ہم نے ان پر ابر کا سائبان تان دیا، اور ہم نے ان پر منّ و سلوٰی اتارا، (اور ان سے فرمایا:) جن پاکیزہ چیزوں کا رزق ہم نے تمہیں عطا کیا ہے اس میں سے کھاؤ، (مگر نافرمانی اور کفران نعمت کر کے) انھوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کر رہے تھے

تشریح: موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم ہدایت کے اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم تھی ایک طبقہ ہمیشہ حق پر قائم رہا جبکہ دوسرا طبقہ حق و باطل کی کشمکش میں پھسلتا اور سنبھلتا رہا۔ اب بار بار پھسلنے والے طبقے کا ذکر دوبارہ شروع ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم بنیادی طور پر مختلف قبائل میں بٹی ہوئی تھی جن کی تقسیم مفسّرین نے یوں بیان کی ہے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے دس بیٹے تھے اس قوم کے دس قبائل انھی کی طرف منسوب تھے۔ دو قبیلوں کی نسبت حضرت یوسف (علیہ السلام) کے دو بیٹوں کی طرف تھی اس طرح یہ بارہ قبائل بنے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں باہمی جنگ وجدال سے بچانے کے لیے بارہ چشموں کا انتظام فرمایا تاکہ یہ لوگ اپنے اپنے پڑاؤ میں رہ کر اپنے متعین کردہ چشموں سے پانی حاصل کریں۔ یہ واقعہ سورۃ البقرۃ کی آیات ۵۷ تا ۶۱ میں تفصیلی طور پر بیان ہو چکا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل بحر قلزم عبور کر کے صحرائے سینا میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا کہ تم بیت المقدس میں داخل ہو جاؤ فتح تمہارے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔ لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ وہاں رہنے والے لوگ بڑے جبار اور طاقتور ہیں ہم ان کے ساتھ جہاد نہیں کر سکتے، لہٰذا اے موسیٰ تو اور تیرا خدا جا کر ان سے جنگ کرے ہم تو یہیں ٹھہرے رہیں گے۔ اس پر انھیں سزا کے طور پر چالیس سال کے لیے صحرائے سینا میں مقید کر دیا گیا۔ (المائدہ، آیت: ۲۰ تا ۲۶) تاکہ ان کی پرانی نسل ختم ہو اور نئی نسل آزاد ماحول میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہ السلام) کی خصوصی تربیت میں جوان ہو۔ کیونکہ یہ لاکھوں کی تعداد میں تھے اور صحرائے سینا ایک لق ودق وادی تھی جس میں اکل و شرب کا کوئی انتظام نہیں تھا اور نہ ہی یہاں کسی قسم کی شادابی تھی کہ یہ لوگ درختوں کے سائے تلے گزارہ کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر عظیم احسان کرتے ہوئے ان کے لیے پانی کا انتظام یوں کیا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم دیا کہ پتھر پر اپنا عصا مارو اس سے بارہ چشمے جاری ہوں گے ان میں ہر ایک کے لیے الگ الگ چشمے مقرر کر دیے گئے اور کھانے کے لیے آسمان سے من سلویٰ اتارا جاتا رہا۔ حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے رزق سے کھاتے پیتے رہو مگر کسی قسم کا فساد نہ کرو۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد اس قوم نے یہ مطالبہ کر ڈالا کہ اے موسیٰ! ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔

اس پر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے انھیں سمجھایا کہ کیا تم بہتر کے مقابلہ میں کم تر چیز کو پسند کرتے ہو۔ اس کے بدلہ میں ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کر دی گئی۔ جس کی تفصیل سورۃ البقرہ، آیت: ۶۱ میں گزر چکی ہے۔

یہاں ان کی ناشکری اور سزا کا ذکر کرنے کی بجائے صرف اتنا فرمایا ہے کہ ان کا ایسا کرنا ہم پر کچھ زیادتی نہ تھی جو کچھ انھوں نے کیا اپنے ہی خلاف کیا۔ اور اپنے آپ پر زیادتی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی کوئی شخص گناہ کرتا ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ (تفسیر فہم القرآن)

چونکہ بنی اسرائیل حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے دس بیٹوں اور حضرت یوسف (علیہ السلام) کے دو فرزندوں کی اولاد تھے موسیٰ (علیہ السلام) جب انھیں لے کر وادی سینا میں پہنچے تو ان کی تعداد کئی لاکھ تھی۔ اتنی کثیر تعداد کا داخلی نظم و نسق، ان کی دینی تربیت اور ان کی ہر طرح کی نگرانی کے لیے بحکم الٰہی آپ نے یہ انتظام فرمایا کہ ان کو بارہ گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ اور ہر گروہ کے لیے ایک ایک نگران مقرر کر دیا تاکہ ان کے باہمی جھگڑوں کا تصفیہ کرے۔ اور ان میں اگر سرتابی کا رجحان پیدا ہو تو اس کا سدباب کرے۔ اسباط جمع ہے سبط کی۔ اس کا معنی ہے پوتا (ولدالولد) یہ ترکیب میں اثنی عشرہ کی تمیز نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں اسے سبطا (واحد) ہونا چاہیے تھا۔ بلکہ بدل ہے اور امما صفت ہے۔ اور اسباط موصوف ہے۔ (بیضاوی، مظہری)

تیہ کے لق ودق صحرا میں پانی بالکل ناپاب تھا۔ نہ کوئی نہر نہ دریا۔ نہ کوئی چشمہ نہ کنواں۔ آپ کی قوم نے شدت پیاس سے بے قابو ہو کر آپ سے پانی کا مطالبہ شروع کر دیا۔ آپ نے بارگاہ الٰہی میں عرض کی۔ حکم ہوا کہ اس پتھر کو اپنے عصا سے مارو۔ عصا مارنے کی دیر تھی کہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ اور آپ نے ایک ایک چشمہ ایک ایک قبیلہ کے لیے مختص کر دیا تاکہ باہمی جھگڑے کی نوبت نہ آئے۔

اس ریگستان میں جہاں پانی کی ایک بوند تک نایاب تھی وہاں سایہ دار درختوں کا وجود کہاں؟ لیکن بغیر سایہ کے اس تپتے ہوئے ریگستان، چلچلاتی دھوپ میں گزر ہو تو کیسے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ کرم فرمایا کہ جتنے علاقہ میں وہ فروکش تھے ان پر بادل کا سائبان تان دیا۔ نیز ریت کے ان ڈھیروں میں جہاں آبپاشی کا بھی کوئی انتظام نہ تھا وہاں کھیتی باڑی کیسے ہو سکتی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت خاص سے من وسلویٰ اتار کر ان کو فکر معاش سے بھی آزاد کر دیا۔ (ان تمام امور پر حواشی سورۃ البقرہ میں گزر چکے ہیں) ۲: ۵۷، ۵۸، ۵۹ (تفسیر ضیاء القرآن)

یاد رہے فرعون کی ہلاکت کے بعد جب بنی اسرائیل نے بیت المقدس (جو ان کا آبائی وطن تھا) کی آزادی کے لئے جہاد سے انکار کر دیا تھا تو انھیں صحرائے سینا کے علاقات یہ میں 40 برس تک بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ اربعین سنۃ یتیھون فی الارض (مائدہ: 26) اس وقت بنی اسرائیل میں پیاس سے جاں بلب ہو کر موسیٰ (علیہ السلام) سے پانی طلب کیا۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اللہ تعالیٰ نے آپ سے فرمایا کہ پتھر پر عصا ماریں اپنے عصا مارا تو اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے اور بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں سے ہر ایک نے ایک چشمہ اپنے لیے مقرر کر لیا وہ باہمی اختلاف کے سبب ایک چشمے پر متفق نہ ہو سکتے تھے۔

جواز توسل:

بنی اسرائیل نے موسیٰ (علیہ السلام) سے پانی مانگا اب آپ کے پاس کوئی مشین نہ تھی کہ انھیں زمین سے پانی نکال دیتے انھوں نے آپ کو محبوب خدا اور وسیلۂ قبولیت دعا سمجھ کر آپ سے پانی کی فریاد کی۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ مجھ سے کیوں مانتے ہو اللہ سے مانگو؟ بلکہ اپنے ان کے لیے دعا کی: واذ استسقی موسیٰ لقومہ۔ (بقرہ: 60) اللہ چاہتا تو بارش برسا دیتا مگر اللہ نے انھیں دست رسول سے پانی دیا۔ یہ توسل ہی کا ایک طریقہ ہے۔

پتھر سے چشم نکلنا اور ہاتھ سے چشمے نکالنا:

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کو پتھر سے بارہ چشمے نکال کر دیئے اور پتھروں سے چشم نکل ہی آتے ہیں۔ اس سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ حضور مختار کائنات سنن (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی پانچ انگلیوں سے پانچ چشمے جاری فرمادیے۔ حضرت انس (رض) روایت کرتے ہیں ایک بار سفر میں وضو کے لیے پانی نہ تھا۔ حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں تھوڑا سا پانی لایا گیا جس سے ایک آدمی وضو کر سکتا تھا اپنے اس نے اپنا دست مبارک رکھ دیا میں نے دیکھا کہ آپ کی انگلیوں کے نیچے سے پانی ابل رہا تھا چنانچہ اس سے 70 افراد نے وضو کر لیا (بخاری کتاب المناقب باب 25) بعض واقعات میں یوں ملتا ہے کہ آپ نے 300 افراد کو ایک برتن سے سیراب فرمایا۔ امام احمد رضا بریلوی (رح) فرماتے ہیں:

انگلیاں ہیں فیض پر ٹوٹے پیاسے جھوم کر

ندیاں پنجاب رحمت کی ہیں جاری واہ واہ۔

میدان تیہ ہی میں جب بنی اسرائیل کو بارہ چشمے دیے گئے تو اس وقت ان پر بادل کا سایہ بھی کیا گیا اور ان پر من وسلوی بھی اتارا گیا۔ من ایک میٹھی رطوبت سی تھی جو ان پر رات کو آسمان سے برستی وہ رات کو چادریں پھیلا دیتے صوبہ وہ اس سے بھری ہوتیں۔ اور سلویٰ پرندے تھے جو دن ڈھلے ان کے خیموں کے گرد اڑتے پھرتے۔ انھیں وہ جس قدر چاہتی ہاتھوں سے پکڑ لیتے اور ذبح کر کے کھاتے۔ یہ سلسلہ چالیس برس تک جاری رہا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا! یہ من وسلویٰ جیسی پاک حلال غذا کھاؤ۔ پھر جب انھوں نے اس حکم کہ من وسلوا کو ذخیرہ نہیں کرنا، کی مخالفت کی اور اسے ذخیرہ کرنا شروع کر دیا تو اس کا نزول ختم ہوگیا۔ یوں انھوں نے اپنی جانوں پر خود ظلم کیا۔ (تفسیر برہان القرآن)

ان سب چیزوں میں ان پر اللہ کی عظیم نعمتوں کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے دھوپ کی تکلیفوں کو دور کیا اور نہایت آسانی سے ان کو کھانے اور پینے کی چیزیں فراہم کیں۔ اس کے بعد فرمایا ان پاک چیزوں کو کھاؤ جو ہم نے تم کو دی ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ صرف ان ہی چیزوں کو کھاؤ اور ان کے علاوہ اور کسی چیز کو

طلب مت کرو، پھر فرمایا اور انھوں نے ہم پر کوئی ظلم نہیں کیا، اس میں یہ اشارہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے تجاوز کیا انھوں نے اللہ تعالیٰ کے منع کرنے کے باوجود کھانے کو ذخیرہ کیا یا اس وقت میں کھایا جس وقت ان کو کھانے سے منع فرمایا تھا اور یا انھوں نے اللہ تعالیٰ سے ان چیزوں کے علاوہ کھانے پینے کی اور چیزوں کو طلب کیا اور جب مکلّف وہ کام کرتا ہے جس سے اس کو منع کیا گیا تھا تو وہ دراصل خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے، اس لیے فرمایا انھوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے کیونکہ جب بندہ کسی معصیت کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو عذاب خداوندی کا مستحق بنادیتا ہے۔ البقرہ: 60 اور البقرہ: 57 میں ان امور کی بہت تفصیل سے تفسیر کردی گئی ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنے متعدد احسانات کا ذکر فرمایا ہے۔ اور یہ احسانات زندگی کی ضروریات اور قومی زندگی کی بقاء کے لیے اس قدر بنیادی ہیں کہ ان کے بغیر وادی سینا میں ایک محدود عرصے کے لیے زندہ رہنا اور بطور ایک قوم کے اپنا قومی فرض انجام دینا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ ان احسانات میں سے سب سے پہلے جس احسان کا ذکر کیا گیا ہے وہ بنی اسرائیل میں تنظیم پیدا کرنا ہے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوہ سینا کے بیابان میں سب سے پہلے بنی اسرائیل کی مردم شماری کرائی پھر ان کے بارہ گھرانوں کو جو حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے دس بیٹوں اور حضرت یوسف (علیہ السلام) کے دو بیٹوں کی نسل سے تھے ' الگ الگ گروہوں کی شکل میں منظّم کیا اور ہر گروہ پر ایک ایک سردار اور نقیب مقرر کیا تاکہ وہ ان کے اندر اخلاقی ' مذہبی ' تمدنی ' معاشرتی اور فوجی حیثیت سے نظم قائم رکھے اور احکام شریعت کا اجراء کرتا رہے نیز حضرت یعقوب کے بارہویں بیٹے لاوی کی اولاد کو جس کی نسل سے حضرت موسیٰ اور ہارون تھے ' ایک الگ جماعت کی شکل میں منظّم کیا تاکہ وہ ان سب قبیلوں کے درمیان شمع حق روشن رکھنے کی خدمت انجام دیتی رہے اس طرح ان بارہ خاندانوں کو قومی لڑی میں پرو کر اور ایک قوم کا تصور دے کر نئی اجتماعی زندگی کے لیے تیار کیا گیا اور غلامی نے جس طرح ان کے اندر ہر اجتماعی تصور کو تباہ کرکے رکھ دیا تھا اس کو از سر نو پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ قوم اپنی گزشتہ کمزوریوں کی تلافی کرتی اور موسیٰ کلیم اللہ کی صحبت میں بلند ہمتی اور اولوالعزمی کا سبق پڑھتی اور بلند مقاصد کے انجام دہی کے لیے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتی لیکن غلامی نے چونکہ ایسے تمام خصائص سے انھیں عاری کردیا تھا اس لیے ان کے یہاں ترجیح کے قابل وہ چیزیں تھیں جو انسان کی جسمانی ضرورتوں میں سب سے مقدم سمجھی جاتی ہیں اس لیے انھوں نے سب سے پہلے انھیں چیزوں کا مطالبہ کیا۔ بلاشبہ ان بنیادی ضرورتوں کے بغیر انسانی زندگی گزرنا ممکن نہیں لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ بڑی اہم ہے کہ جو پیغمبر اس قوم کو بحرہ قلزم سے نکال کر لایا ہے اور جس پروردگار نے ان پر یہ احسانات کیے ہیں کیا وہ انھیں ان بنیادی ضرورتوں سے محروم رکھے گا؟ اب بجائے اس کے یہ معاملات اللہ اور اس کے رسول پر چھوڑ دیئے جاتے انھوں نے ایک ایک ضرورت کے لیے تورات کی وضاحت کے مطابق واویلا کرنا شروع کردیا۔ تورات میں ان کی بے صبری اور بے چینی اور اللہ کی عنایت کو پوری تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ کتاب ' گنتی باب بیس میں ہے۔

" اور پہلے مہینہ میں بنی اسرائیل کی ساری جماعت دشت سین میں آگئی اور وہ لوگ قادس میں رہنے لگے۔۔ اور جماعت کے لوگوں کے لیے وہاں پانی نہ ملا۔ سو وہ موسیٰ (علیہ السلام) اور ہارون (علیہ السلام) کے خلاف اکٹھے ہوئے اور لوگ موسیٰ (علیہ السلام) سے جھگڑنے اور یہ کہنے لگے کاش! ہم بھی اس وقت مرجاتے جب ہمارے بھائی خداوند کے حضور مرتے۔ تم خداوند کی جماعت کو اس دشت میں کیوں لے آئے ہو کہ ہم بھی اور ہمارے جانور بھی یہاں مریں اور تم نے کیوں ہم کو مصر سے نکال کر اس بری جگہ پہنچایا ہے؟ یہ تو بونے کی اور انجیروں کی اور تاکوں اور اناروں کی جگہ نہیں ہے بلکہ یہاں تو پینے کے لیے پانی تک میسر نہیں موسیٰ (علیہ السلام) اور ہارون (علیہ السلام) جماعت کے پاس سے جاکر خیمہ اجتماع کے دروازے پر اوندھے منہ گرے ' تب خداوند کا جلال ان کے اوپر ظاہر ہوا اور خداوند نے موسیٰ (علیہ السلام) سے کہا کہ اس لاٹھی کو لے اور تو اور تیرا بھائی ہارون (علیہ السلام) تم دونوں جماعت کو اکٹھا کرو اور ان کی آنکھوں کے سامنے اس چٹان سے کہو کہ وہ اپنا پانی دے اور تو ان کے لیے چٹان ہی سے پانی نکالنا۔ یوں جماعت کو اور ان کے چوپایوں کو پلانا۔ چنانچہ موسیٰ (علیہ السلام) نے خداوند کے حضور سے اسی کے حکم کے مطابق وہ لاٹھی لی اور موسیٰ (علیہ السلام) اور ہارون (علیہ السلام) نے جماعت کو اس چٹان کے سامنے اکٹھا کیا اور اس نے ان سے کہا سنو! اے باغیو! کیا ہم تمہارے لیے اس چٹان سے پانی نکالیں۔ تب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اس چٹان پر دو بار لاٹھی ماری اور کثرت سے پانی بہہ نکلا اور جماعت نے اور ان کے چوپایوں نے پیا۔ (گنتی باب ۲۰ ' ۱۔ ۱۲)

قرآن کریم بتاتا ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے چٹان پر عصاء مارنے سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے اور بنی اسرائیل کے خاندان کیونکہ بارہ ہی تھے اسی لیے ہر خاندان نے اپنے اپنے گھاٹ الگ الگ متعین کر لیے اور اس چیز کا اندیشہ باقی نہیں رہا کہ پانی لینے پر کوئی جھگڑا ہوگا اگر اس بہتات کے ساتھ پانی نہ نکلتا یا پانی نکلتا لیکن بارہ الگ الگ چشمے نہ ہوتے تو صحرا کی اس گرمی میں جب پیاس کی شدت سے انسان اور حیوان بے قرار ہوتے تو ہر کوئی پانی کے چشمے کی طرف بھاگتا اور سب سے پہلے پانی لینے کی کوشش کرتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ روزانہ ان میں پانی لینے پر تلواریں نکلتی اور آپس میں خون ریزی ہوتی یہ اللہ کا کتنا بڑا احسان تھا کہ انھیں صرف پانی ہی عطا نہیں فرمایا بلکہ بارہ خاندانوں کے لیے بارہ الگ الگ چشمے رواں کر دیئے تاکہ ان میں تصادم کا کوئی اندیشہ نہ رہے۔

عبدالوہاب نجار نے اپنی کتاب قصص الانبیاء میں لکھا ہے کہ پانی کے وہ چشمے جن کا ذکر بنی اسرائیل کے واقعات میں آیا ہے بحر احمر کے مشرقی بیابان میں سویز سے زیادہ دور نہیں ہیں اور اب بھی عیون موسیٰ (موسیٰ کے چشمے) کے نام سے مشہور ہیں ان چشموں کا پانی اب بہت کچھ سوکھ گیا ہے اور بعض کے آثار بھی قریب قریب معدوم ہوگئے ہیں اور کہیں کہیں ان چشموں پر کھجور کے باغات نظر آتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں دوسرے جس احسان کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس صحرا میں کھلے آسمان کے نیچے جہاں نہ کوئی سایہ دار درخت تھا اور نہ مکانوں کی راحت میسر تھی۔ بنی اسرائیل نے محسوس کیا کہ یہ تپش اور تمازت تو ہماری زندگی کا خاتمہ کر دے گی۔ چنانچہ پھر وہ موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس شکایت لے کر گئے کہ پانی تو مل گیا ہے لیکن اس دھوپ اور گرمی کا کیا کریں؟ یہ تو ہمیں بالکل تباہ کر دے گی۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ سے دعا کی ' دعا قبول ہوئی اور آسمان پر بادلوں کے پرے کے پرے بنی اسرائیل پر سایہ فگن ہوگئے۔ بنی اسرائیل جہاں بھی سفر کرتے ہوئے جاتے بادلوں کا یہ سائبان ان کے سروں پر تنا رہتا اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو دھوپ اور گرمی کی تمازت سے محفوظ فرمایا۔ تیسرا احسان جس کا پروردگار نے یہاں ذکر فرمایا ہے وہ خاص غذا کا فراہم کرنا ہے جو اس صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کو بغیر کسی مشقت کے مہیا کی گئی نہ انھیں اس کے لیے ہل چلانے پڑے نہ تخم ریزی اور آبپاشی کی زحمتیں اٹھانی پڑیں۔ توراۃ میں اس کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے) اور یوں ہوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کے خیمہ کو ڈھانک لیا اور صبح خیمہ کے آس پاس اوس پڑی ہوئی تھی جب اوس جو پڑی ہوئی تھی سوکھ گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں چھوٹی چھوٹی گول چیز ایسی چھوٹی جیسے پالے کے دانے ہوتے ہیں زمین پر پڑی ہے۔ بنی اسرائیل اس کو دیکھ کر آپس میں کہنے لگے من کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہے؟ تب موسیٰ نے ان سے کہا یہ وہی روٹی ہے جو خداوند نے تمہیں کھانے کو دی ہے اور وہ ہر صبح کو اپنے کھانے کی مقدار کے مطابق جمع کر لیتے تھے اور دھوپ تیز ہوتے ہی وہ پگھل جاتی تھی (

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شبنم کی طرح ایک چیز زمین پر ٹپکتی تھی اور دھنیے کے بیج کی طرح زمین پر جم جاتی تھی۔ آفتاب کی تمازت بڑھنے سے پہلے پہلے اس کا جمع کر لینا ممکن ہوتا تھا تمازت بڑھنے کے بعد یہ دانے پگھل جاتے تھے۔ چونکہ یہ نعمت بغیر کسی زحمت و مشقت اٹھائے حاصل ہوئی تھی اور ایک ایسے بے آب و گیاہ صحرا میں حاصل ہوئی تھی جہاں فراہمی غذا کے اسباب و وسائل مفقود تھے اس وجہ سے اس کا نام "من "قرار پایا۔ عربی اور عبرانی دونوں زبانیں قریب الماخذ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں زبانوں میں اس کا معنی احسان ہے۔ تو بنی اسرائیل نے خود اسے اللہ کا احسان قرار دیا۔ لیکن توراۃ کے مرتب کرنے والوں نے نہ جانے اس کو استفہام کی شکل دے کر کیوں اپنی بدمذاقی کا ثبوت فراہم کیا ہے؟ مزید موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف جو تعبیر منسوب کی گئی ہے کہ انھوں نے اسے روٹی قرار دیا یہ بھی سراسر مترجمین کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے اسے رزق کہا ہوگا انھوں نے اس کا ترجمہ روٹی سے کر دیا۔ دوسری چیز جو ان کو کھانے کو ملی اسے قرآن کریم نے "سلویٰ" کا نام دیا ہے۔ من کی طرح لفظ سلویٰ بھی عربی میں اہل کتاب کے واسطے سے آیا ہے اور اہل عرب نے اس کو اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے یہ لفظ ان پرندوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے صحرائے سیناء میں بنی اسرائیل کی غذا کے لیے بھیجے۔ یہ بٹیروں سے ملتے جلتے تھے اور بٹیروں ہی کی طرح ان کا شکار نہایت آسان تھا۔ خروج میں اس کی تفصیل اس طرح آئی ہے

(پھر وہ ایلیم سے روانہ ہوئے اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت ملک مصر سے نکلنے کے بعد دوسرے مہینے کی پندرھویں تاریخ کو سین کے بیابان جو ایلیم اور سیناء کے درمیان ہے پہنچی 'اور اس بیابان میں بنی اسرائیل کی ساری جماعت موسیٰ اور ہارون پر بڑبڑانے لگی اور بنی اسرائیل کہنے لگے کہ کاش ہم خداوند کے ہاتھ سے ملک مصر میں جب ہی مار دیئے جاتے جب ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھ کر دل بھر کر روٹی کھاتے تھے کیونکہ تم تو ہم کو اس بیابان میں اسی لیے لے آئے ہو کہ سارے

مجمع کو بھوکا مارو۔ اور خداوند نے موسیٰ سے کہا میں نے بنی اسرائیل کا بڑبڑانا سن لیا ہے سو تو ان سے کہہ دے کہ شام کو تم گوشت کھاؤ گے اور صبح کو تم روٹی سے سیر ہو گے اور تم جان لو گے کہ میں خداوند تمہارا خدا ہوں اور یوں ہوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا) (خروج باب ۱۶ '۱۔ ۱۳)

اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے جو تم کو پاکیزہ نعمتیں بخشیں انھیں کھاؤ یعنی من اور سلویٰ جیسی پاکیزہ نعمتیں جو انھیں بے آب وگیاہ صحرا میں بغیر کسی محنت اور مشقت کے روزانہ تازہ بہ تازہ مل رہی تھیں ان سے فائدہ اور مزہ اٹھانے کا حکم دیا گیا اور ساتھ ہی یہ بات جو بین السطور میں جھلکتی ہے ضرور فرمائی گئی ہو گی کہ جس مقصد کے لیے تمہیں اس صحرا میں لایا گیا ہے اس مقصد کو کبھی نہ بھولو۔ یہ ضرورتیں یقینا تمہارا حق ہیں لیکن تمہارا مقصد زندگی اس سے بہت ارفع ہے۔ کھانے پینے کے بعد تمہاری ساری صلاحیتیں اس مقصد کے حصول کے لیے صرف ہونی چاہئیں اور وہ مقصد کیا ہے ؟ صرف یہ کہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ اللہ کے شکر گزار بندے اور اس کے دین کے علم بردار سپاہی ثابت کریں لیکن آیت کے آخری جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ان نعمتوں سے فائدہ تو خوب اٹھایا لیکن ان کا حق ہرگز نہیں پہچانا وہ ان نعمتوں کو پا کر شکر گزار بننے کی بجائے ان کی ناقدری اور اللہ کی نافرمانی کرتے رہے۔ یہ بات چونکہ سیاق کلام سے واضح ہے اس وجہ سے لفظوں سے واضح نہیں کی گئی بلکہ اس کی جگہ پر یہ بات کہہ دی گئی کہ انھوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ اللہ کی کسی نعمت کی ناقدری کرتے ہیں وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑتے بلکہ اپنا ہی بگاڑتے ہیں۔

بنی اسرائیل کے منتشر قبائل کو ایک تنظیم میں پرو کر ایک قوم کا تشخص عطا کرنا اور پھر ایک جزیرہ نما سیناء کے بیابانی علاقہ میں ان کی بنیادی تین ضروریات کا فراہم کرنا ایسے عظیم احسانات ہیں کہ اگر یہ تین اہم ترین ضروریات زندگی کا بندوبست نہ کیا جاتا تو یہ قوم جس کی تعداد کئی لاکھ تک پہنچی ہوئی تھی اس علاقے میں بھوک پیاس سے بالکل ختم ہو جاتی۔ صاحب تفہیم القرآن نے بالکل صحیح کہا ہے کہ آج بھی کوئی شخص وہاں جائے تو یہ دیکھ حیران رہ جائے گا کہ اگر یہاں پندرہ بیس لاکھ آدمیوں کا ایک عظیم الشان قافلہ یکایک آ ٹھہرے تو اس کے لیے پانی 'خوراک اور سائے کا آخر کیا انتظام ہو سکتا ہے ؟ موجودہ زمانے میں پورے جزیرہ نما کی آبادی ۵۵ ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور آج اس بیسویں صدی میں بھی اگر کوئی سلطنت وہاں پانچ چھ لاکھ فوج لے جانا چاہے تو اس کے لیے مدبروں کو رسد کے انتظام کی فکر میں دردسر لاحق ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے بہت سے محققین نے جو نہ کتاب کو مانتے ہیں اور نہ معجزات کو تسلیم کرتے ہیں یہ ماننے سے انکار کر دیا ہے کہ بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سیناء کے اس حصہ سے گزرے ہوں گے جس کا ذکر بائیبل اور قرآن میں ہوا ہے۔ ان کا گمان ہے کہ شائد یہ واقعات فلسطین کے جنوبی اور عرب کے شمالی حصہ میں پیش آئے ہوں گے۔ جزیرہ نمائے سینا کے طبعی اور معاشی جغرافیہ کو دیکھتے ہوئے وہ اس ات کو بالکل ناقابل تصور سمجھتے ہیں کہ اتنی بڑی قوم یہاں برسوں ایک ایک جگہ پڑاؤ کرتی ہوئی گزر سکتی تھی 'خصوصاً جب کہ مصر کی طرف سے اس کی رسد کا راستہ بھی منقطع تھا اور دوسری طرف خود اس جزیرہ نما کے مشرق اور شمال میں عمالقہ کے قبیلے اس کی مزاحمت پر آمادہ تھے۔ ان امور کو پیش نظر رکھنے سے صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ ان چند مختصر آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنے جن احسانات کا ذکر فرمایا ہے وہ درحقیقت کتنے بڑے احسانات تھے اور اس کے بعد یہ کتنی بڑی احسان فراموشی تھی کہ اللہ کے فضل و کرم کی ایسی صریح نشانیاں دیکھ لینے پر بھی یہ قوم مسلسل ان نافرمانیوں اور غداریوں کی مرتکب ہوتی رہی جن سے اس کی تاریخ بھری پڑی ہے۔

اگلی دو آیتوں میں اللہ کے مزید ایک احسان کا ذکر ہے اور ساتھ ہی بنی اسرائیل کی اس خصلت بد کا بھی جس کا انھوں نے ہر موقع پر اظہار کیا۔ (تفسیر روح القرآن)

آیت مبارکہ:

وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓــٰٔتِكُمْ ۭ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ○۱۶۱

لغۃ القرآن: [وَاِذْ : اور جب] [قِيْلَ : کہا گیا] [لَهُمُ : ان سے] [اسْكُنُوْا : تم لوگ سکونت اختیار کرو] [هٰذِهِ الْقَرْيَةَ : اس بستی میں] [وَكُلُوْا : اور کھاؤ] [مِنْهَا : اس میں] [حَيْثُ : جہاں سے] [شِئْتُمْ : تم

لوگ چاہو] [وَقُوْلُوْا : اور کہو] [حِطَّةٌ: معافی ہو] [وَّادْخُلُوا : اور داخل ہو] [الْبَابَ : دروازے میں] [سُجَّدًا : سجدہ کرنے والوں کی حالت میں] [نَّغْفِرْ : تو ہم بخش دیں گے] [لَکُمْ : تمہارے لیے] [خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ : تمہاری خطاؤں کو] [سَنَزِيْدُ : زیادہ دیں گے] [الْمُحْسِنِيْنَ : نیکی کرنے والوں کو]

ترجمہ: اور (یاد کرو) جب ان سے فرمایا گیا کہ تم اس شہر (بیت المقدس یا اریحا) میں سکونت اختیار کرو اور تم وہاں سے جس طرح چاہو کھانا اور (زبان سے) کہتے جانا کہ (ہمارے گناہ) بخش دے اور (شہر کے) دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا (تو) ہم تمہاری تمام خطائیں بخش دیں گے، عنقریب ہم نیکو کاروں کو اور زیادہ عطا فرمائیں گے

تشریح: بنی اسرائیل کے جس تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ اس آیت میں کیا گیا ہے اس کا تفصیلی بیان سورۃ بقرہ (درس 29) میں ہو چکا ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ واضح کرتی ہے کہ یہ لوگ ملک شام کے رہنے والے تھے جہاں ان کی جد امجد حضرت یعقوب (علیہ السلام) جن کا لقب اسرائیل تھا اور جو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے پوتے تھے رہا سہا کرتے تھے۔ حضرت یعقوب (علیہ السلام) جن کے بارہ بیٹے تھے جن میں حضرت یوسف (علیہ السلام) ایک عجیب طریقہ سے جن کا ذکر انشاء اللہ سورۃ یوسف بارھویں پارہ میں تفصیلاً آئے گا مصر پہنچ گئے اور رفتہ رفتہ وہاں کے فرمانروا ہو گئے۔ شام میں قحط پڑا تو حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اپنے ماں باپ اور تمام بھائیوں کو مصر میں بلا کر بسا لیا۔ حضرت یوسف (علیہ السلام) کے انتقال کے بعد مصر کی حکومت بنی اسرائیل کے ہاتھ سے نکل گئی اور وہاں کے اصلی باشندے بر سر اقتدار آ گئے۔ انھوں نے بنی اسرائیل پر بڑے ظلم و ستم شروع کر دیئے اور قوم بنی اسرائیل کو غلام بنا کر رکھا آخر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) تشریف لائے اور ان کو مصر سے نکال کر بیابان سینا جس کو وادی تیہ بھی کہتے ہیں وہاں لے آئے۔ ملک شام جو بنی اسرائیل کا قدیمی وطن تھا اس وقت قوم عمالقہ کے قبضہ تھا۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے بنی اسرائیل سے کہا کہ شام تمہارا موروثی ملک ہے۔ قوم عمالقہ سے جہاد کرو اور اپنے اصل وطن ملک شام کو ان کے قبضہ سے چھڑا لو۔ بنی اسرائیل پہلے تو اس ارادہ سے روانہ ہوئے مگر جب انھیں قوم عمالقہ کی طاقت اور قوت کی تحقیق ہوئی تو ہمت ہار بیٹھے اور جہاد سے صاف انکار کر بیٹھے جس کی سزا ان کو یہ دی گئی کہ اسی بیابان سینا یا وادی تیہ میں چالیس سال تک سر گرداں و پریشان پھرتے رہے۔ پھر بھی اس بیابان میں جہاں نہ پانی تھا نہ کھانا اور نہ سایہ وہاں اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ احسان فرمایا کہ پانی کے لیے ایک پتھر سے 12 چشمہ جاری فرما دیئے۔ کھانے کے لیے من و سلویٰ اتارا۔ اور سایہ کے لیے ابر سایہ فگن رہتا اور دھوپ اور گرمی سے امن ملتا۔ ان انعامات کا بیان گزشتہ آیت میں ہوا تھا۔ آخر جب 4 سا بعد اس وادی تیہ میں بیابانی زندگی کی مدت ختم ہوئی تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا تو انتقال ہو چکا تھا ان کے بعد حضرت یوشع (علیہ السلام) کی قیادت میں انھوں نے اریحا شہر فتح کیا جو بیت المقدس کے قریب ایک آباد اور سر سبز شہر تھا۔ یہ اسی شہر میں داخل ہونے اور بسنے کے ادب و طریقہ تھے جس کا ذکر ان آیات میں کیا جا رہا ہے اور بتلایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ جب تم لوگ اس شہر میں داخل ہو تو داخلہ کے وقت سجدہ کرتے یعنی عاجزی اور سرنگونی کرتے ہوئے داخل ہونا اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہوئے جانا۔ مزاج میں سرکشی اور غرور نہ آنے پائے۔ فاتحوں کی طرح شہر میں چیختے چلاتے اور بیہودہ شور و غل کرتے داخل نہ ہوں۔ اس رویہ کے اختیار کرنے سے اللہ تعالیٰ نے ان پر مہربانی فرمانے کا وعدہ فرمایا اور ساتھ ہی ان کی خطائیں معاف کر دینے اور نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ دینی و دنیوی نعمتیں دینے کا وعدہ فرمایا مگر بنی اسرائیل نے ان ہدایتوں کے بالکل خلاف کیا اور بجائے تواضع اور انکساری اختیار کرنے کے تکبر اور گستاخی کو اپنا شعار بنایا اور حکم الٰہی کا مذاق اڑانے لگے۔ بنی اسرائیل نے اس حکم سے بھی سرتابی کی کہ فتح کے وقت کوئی مال غنیمت پوشیدہ نہ رکھے اور نہ کوئی شخص کوئی چیز چوری کرے مگر انھوں نے لوٹ کا مال بھی چھپا لیا۔ آپ پر آسمانی بلا نازل ہوئی اور ان میں سخت طاعون پھیل گیا اور اکثر تباہ ہو گئے۔

ان آیات زیر تفسیر میں یہی مضمون بیان فرمایا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :۔

"وہ زمانہ یاد کرو جب ان کو حکم دیا گیا کہ تم لوگ اس آبادی میں جا کر رہو اور کھاؤ اس کی چیزوں میں سے جس جگہ تم رغبت کرو اور یہ بھی حکم دیا گیا کہ جب شہر میں اندر جانے لگو تو زبان سے یہ کہتے جانا کہ توبہ ہے توبہ ہے اور عاجزی سے جھکے جھکے دروازہ میں داخل ہونا۔ ہم تمہاری پچھلی خطائیں معاف کردیں گے۔ یہ تو سب کے لیے ہوگا اور جو لوگ نیک کام کریں گے ان کو مزید براں اور دیں گے۔ سو بدل ڈالا ان ظالموں نے ایک اور کلمہ جو خلاف تھا اس کلمہ کے جس کے کہنے کی ان سے فرمائش کی گئی تھی اس پر ہم نے ان پر ایک آفت سماوی بھیجی اس وجہ سے کہ وہ حکم کو ضائع کرتے تھے"۔ (تفسیر درس قرآن)

اللہ نے ان پر بہت بڑے انعامات کیے۔ لیکن دیکھیے ان کی کج رو طبیعت صراط مستقیم کی راہ پر جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ بغیر جواز کے انھوں نے نافرمانی شروع کردی۔ بات کو بدلنے کی جسارت کی۔ انھیں حکم دیا جاتا ہے کہ اس شہر میں داخل ہو جاؤ، یہ شہر تمہارا ہے، یہ کونسا شہر تھا، اس کا یہاں نام نہیں لیا گیا، کیونکہ سیاق کلام میں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ شرط صرف یہ عائد کی گئی کہ اس شہر میں داخل ہوتے وقت ایک مخصوص دعا مخصوص کلمات کی صورت میں پڑھتے جاؤ، اور اس شہر میں داخل ہوتے وقت سجدہ ریز ہوتے جاؤ اور تمہیں جو فتح و نصرت عطا ہوئی اس پر شکر ادا کرو، بعینہٖ اسی طرح جس طرح حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ میں داخل ہوئے تھے اور آپ اپنی سواری کے اوپر سجدہ ریز تھے۔ ان لوگوں سے اللہ وعدہ کر رہے تھے کہ اگر تم اس حالت میں اس شہر میں داخل ہوگے تو اللہ تمہاری تمام غلطیاں معاف کردے گا اور اگر تم م میں سے کوئی مزید نیکی کا راستہ اختیار کرے گا تو اللہ مزید بارش کرے گا اپنے انعامات کی۔ لیکن ان لوگوں کی حالت یہ تھی کہ ان میں بعض نے گستاخانہ انداز میں دعا کے الفاظ ہی بدل دیئے اور بعض نے داخلے کے لیے مقرر شکل بدل دی۔ انھوں نے یہ نافرمانی کیوں کی؟ الفاظ بدلنے یا سجدہ ریز نہ ہونے سے انھیں کیا فائدہ مل رہا تھا؟ محض سرکشی اور کج مزاجی کی تسکین! (تفسیر فی ظلال القرآن)

جب بنی اسرائیل پر بیت المقدس کے دروازے کھولے گئے تو انھیں کہا گیا کہ شہر میں داخل ہوتے ہوئے حِطَّةٌ حِطَّةٌ کہنا یعنی اے اللہ! بخشش ہو بخشش ہو، اور سجدہ کرکے داخل ہونا تھا کہ اس سے قبل تم نے جو بچھڑا پرستی، اللہ کو کھلم کھلا دیکھنے کا تقاضا، جہاد سے انکار اور کتاب الھی کے لینے سے اعراض جیسے اجتماعی گناہ کیے ہیں وہ سب معاف ہو جائیں اور آئندہ تم ایسے گناہوں سے بچ سکو۔ معلوم ہوا جب مسلم قوم کسی علاقہ کو فتح کرے تو انھیں وہاں تکبر کی بجائے عاجزی کے ساتھ داخل ہونا چاہیے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب مکہ مکرمہ فتح کیا تو عجز سے آپ کا سر مبارک جھک کر کجاوے کی لکڑی سے چھو رہا تھا۔ (تفسیر برہان القرآن)

حِطَّةٌ توبہ اور استغفار کا کلمہ ہے لیکن وہ بجائے اس کے براہ تمسخر حِنطَةٌ فِیْ شَعِیْرَةٍ کہتے ہوئے داخل ہوئے۔ اس بنا پر ان پر عذاب نازل ہوا اور وہ عذاب طاعون کی وبا تھی جس سے ایک ساعت میں چوبیس ہزار اسرائیلی فوت ہوگئے۔ (تفسیر صراط الجنان)

یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ تعمیل حکم الٰہی واجب ہے۔ نعمت شکر ادا کرنا۔ توبہ استغفار کرنا بارگاہ خداوندی میں عاجزی کرنا ضروری ہے۔ ملکی فتوحات بھی انعام ربانی ہے اور نعمت کا شکریہ ادا کرنے سے مزید نعمت ملتی ہے۔ اور احکام الٰہی کا مذاق اڑانا کفر ہے۔ اور عذاب خداوندی کو دعوت دینا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے ان واقعات و حالات سے بہت کچھ تنبیہ و عبرت مقصود ہے اسی لیے قرآن کریم نے ان کو بار بار بیان کرکے ہم کو بتلایا کہ جن باتوں میں پھنس کر یہود تباہ و برباد ہوئے اور عذاب خداواندی کے شکار ہوئے ان کے پاس بھی نہ پھٹکنا چاہیے۔ بنی اسرائیل کے اس واقعہ کو سورۃ بقرہ پارہ الم (درس نمبر 29) میں ذکر فرمایا گیا۔ جہاں اس واقعہ کی مزید تفصیلات دیکھی جاسکتی ہیں اور اس واقعہ سے جو عبرت و نصیحت حاصل ہوتی ہیں ان کو بھی وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ آگے بنی اسرائیل کی نافرمانی اور عدول حکمی اور حیلہ سازی کا ایک دوسرا واقعہ اگلی آیات میں ذکر کیا جاتا ہے جس کا بیان انشاء اللہ آئندہ درس میں ہوگا۔

دعا کیجئے

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذات گرامی کے طفیل سے امت مسلمہ صلاح و فلاح کی صورتیں غیب سے پیدا فرماویں۔ اور اپنی ہر نعمت کا ہم کو حقیقی شکر گزار بندہ بناویں۔ یا اللہ اپنی ہر چھوٹی بڑی نافرمانی سے عموماً اور یہود کی خصلتوں سے خصوصاً امت مسلمہ کو بچنے کی توفیق مرحمت فرما۔ اور انھیں اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ہدایات کی پیروی نصیب فرما۔ آمین۔

واخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین (تفسیر درس قرآن۔ محمد احمد)

آیت مبارکہ:

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۝۱۶۲

لغۃ القرآن: [فَبَدَّلَ : تو بدل دیا] [الَّذِيْنَ : ان لوگوں نے جنہوں نے] [ظَلَمُوْا : ظلم کیا] [مِنْهُمْ : ان میں سے] [قَوْلًا : بات کو] [غَيْرَ الَّذِيْ : اس کے علاوہ جو] [قِيْلَ : کہا گیا] [لَهُمْ : ان سے] [فَاَرْسَلْنَا : پھر ہم نے بھیجا] [عَلَيْهِمْ : ان پر] [رِجْزًا : ایک عذاب] [مِّنَ السَّمَآءِ : آسمان سے] [بِمَا : اس کے] [كَانُوْا : وہ تھے] [يَظْلِمُوْنَ : وہ ظلم کرتے]

ترجمہ: پھر ان میں سے ظالموں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی، دوسری بات سے بدل ڈالا، سو ہم نے ان پر آسمان سے عذاب بھیجا اس وجہ سے کہ وہ ظلم کرتے تھے

تشریح: حضرت ابوہریرہ (رض) سے مروی ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ! بنی اسرائیل سے کہا گیا بیت المقدس میں داخل ہوتے ہوئے سجدہ کرنا اور حِطَّۃٌ کہنا انھوں نے سجدہ کرنے کی وجہ سرینوں کے بل گھٹنا شروع کر دیا اور حِطَّۃٌ کی بجائے حِنْطَۃٌ (یعنی گندم چاہیے) کہنے لگے۔ (بخاری کتاب التفسیر سورۃ بقرہ باب 5 حدیث 4479) تب ان پر آسمان سے عذاب الٰہی بصورت طاعون اترا اور بعض روایات کے مطابق 70 ہزار افراد مارے گئے۔ (تفسیر برہان القرآن)

ظالم پھر بھی نہ چوکے :

انسان کی نجانے کیسی افتاد بڑھ گئی ہے کہ یہ ٹھیک بات بتانے والوں سے چڑتا ہے۔ اپنے خیر خواہوں پر طرح طرح کے الزام رکھ کر ان سے دور بھاگتا ہے اور جو وہ کہیں اس کے خلاف کرتا ہے وجہ سوائے اکڑ اور ضد کے اور کچھ نہیں ہوتی بنی اسرائیل کے حالات پڑھ کر یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے یہ لوگ ملک شام کے رہنے والے تھے جہاں ان کے جد امجد حضرت یعقوب (علیہ السلام) جنکا لقب اسرائیل تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے تھے رہا سہا کرتے تھے ان کے بارہ بیٹے تھے جن میں حضرت یوسف علیہ السلام ایک عجیب طریقے سے جس کا ذکر سورۃ یوسف میں مفصل آئے گا مصر پہنچ گئے اور رفتہ رفتہ وہاں کے بادشاہ ہو گئے شام میں قحط پڑا 2006 یوسف علیہ السلام نے اپنے ماں باپ اور تمام بھائیوں کو مصر میں بلا کر بسا لیا حضرت یوسف (علیہ السلام) کے انتقال کے بعد مصر کی سلطنت بنی اسرائیل کے ہاتھ سے نکل گئی اور وہاں کے اصلی باشندے برسر اقتدار آ گئے۔ انھوں نے بنی اسرائیل پر بڑے بڑے ظلم و ستم توڑنے شروع کر دیئے اور قوم کو غلام بنا کر رکھ دیا آخر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) آئے اور ان کو مصر سے نکال کر پھر شام لائے اور کہا کہ یہ ملک تمہارا موروثی ملک ہے اس پر قبضہ کرو اور چین سے اپنے وطن رہو انھوں نے کہا کہ وہاں تو بڑے بڑے زبردست اور لمبے تڑنگے لوگوں کا قبضہ ہے ان سے لڑنا اور وہاں سے انھیں نکال کر ملک پر قبضہ کرنا ہمارے بس کا روگ نہیں ہے۔ اس نافرمانی کی یہ سزا ملی کہ چالیس سال تک جنگلوں کی خاک چھاننی پڑی اور وادی تیہ میں بھٹکتے پھرے۔ اس خانہ بدوشی کی زندگی میں جو جو احسانات ان پر ہوئے ان کو یہاں گنوایا گیا ہے آخر جب آوارہ گردی کی مدت ختم ہوئی تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا انتقال ہو چکا تھا اور حضرت یوشع کی قیادت میں انھوں نے اریحا شہر فتح کیا یہ اسی شہر میں داخل ہونے اور بسنے کے آداب اور طریقے تھے جو انھیں سکھائے گئے اور جن کا ذکر پچھلی آیت میں گزرا لیکن انھوں نے ان ہدایتوں کے بالکل خلاف کیا اور اپنی اکڑ فوں سے کام خراب کر لیا انھوں نے بجائے تواضع اور انکساری اختیار کرنے کے تکبر اور گستاخی کو اپنا شعار بنایا اور منہ سے واہی تباہی کلمات بکنے لگے آخر اس کی سزا ملی اور ان میں سخت طاعون پھیل گیا۔ لکھا ہے کہ آدھے ہی دن میں ستر ہزار افراد مر گئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی نافرمانی سے بچائے اور ہر ایک آفت اور بلا سے محفوظ رکھے آمین۔

حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے قصہ سے ہمیں بہت کچھ سیکھنا ہے قرآن حکیم نے اس کو بار بار بیان کرکے ہمیں جتادیا ہے کہ جن باتوں میں پھنس کر یہود تباہ و برباد ہوئے ان کے قریب بھی نہ پھٹکنا چاہیے۔ (تفسیر درس قرآن آسٹریلیا)

یہاں سے دو فوائد حاصل ہے:

1۔ نصوص شرعیہ میں تبدیلی حرام ہے۔ بنی اسرائیل نے حِطَّةٌ کی جگہ حِنْطَةٌ کہا اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب اتارا۔ اسی طرح یہود نے توراۃ میں الفاظ تبدیل کیے۔ یحرفون الکلم عن مواضعہ۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لعنھم اللہ بکفرھم۔ (نساء: 46) یعنی اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان پر لعنت کی۔"

2۔ خوشی کے موقع پر غیر شرعی حرکات کی برائی۔ بنی اسرائیل نے فتح کے موقع پر حکم الٰہی کے الفاظ بدلے اور سجدہ کا مذاق اڑایا۔ اسی طرح آج کئی لوگ خوشی کے موقع پر کنجر نچواتے اور بے حیائی کے مظاہرے کرتے ہیں یہ غضب الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ (تفسیر برہان القرآن

آیت مبارکہ:

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۛ كَذٰلِكَ ۛ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝۱۶۳

لغۃ القرآن: [وَسْـَٔلْهُمْ : اور آپ پوچھیے ان سے] [عَنِ الْقَرْيَةِ : اس بستی کے بارے میں] [الَّتِيْ : جو] [كَانَتْ : تھی] [حَاضِرَةَ الْبَحْرِ : سمندر کی بستی] [اِذْ : جب] [يَعْدُوْنَ : وہ لوگ حد سے بڑھے] [فِي السَّبْتِ : ہفتہ (کے حکم) میں] [اِذْ : جب] [تَاْتِيْهِمْ : پہنچتی تھیں ان کے پاس] [حِيْتَانُهُمْ : ان کی مچھلیاں] [يَوْمَ سَبْتِهِمْ : ان کے ہفتہ کے دن] [شُرَّعًا : تیرتی ہوئی] [وَّيَوْمَ : اور جس دن] لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ: ہفتہ کا دن نہ ہوتا] [لَا تَاْتِيْهِمْ ۛ : وہ نہیں آتی تھیں ان کے پاس] [كَذٰلِكَ ۛ : اس طرح] [نَبْلُوْهُمْ : ہم نے آزمایا ان کو] [بِمَا : بسبب اس کے جو] [كَانُوْا : جو وہ تھے] [يَفْسُقُوْنَ : نافرمانی کرتے]

ترجمہ: اور آپ ان سے اس بستی کا حال دریافت فرمائیں جو سمندر کے کنارے واقع تھی، جب وہ لوگ ہفتہ (کے دن کے احکام) میں حد سے تجاوز کرتے تھے (یہ اس وقت ہوا) جب (ان کے سامنے) ان کی مچھلیاں ان کے (تعظیم کردہ) ہفتہ کے دن کو پانی (کی سطح) پر ہر طرف سے خوب ظاہر ہونے لگیں اور (باقی) ہر دن جس کی وہ یوم شنبہ کی طرح تعظیم نہیں کرتے تھے (مچھلیاں) ان کے پاس نہ آتیں، اس طرح ہم ان کی آزمائش کر رہے تھے بایں وجہ کہ وہ نافرمان تھے

تشریح: سبت سے مراد ہفتہ کا دن ہے، یہ دن بنی اسرائیل کے لیے مقدس اور عبادت کے لیے خاص تھا۔ اس دن میں دنیاوی کاموں یعنی تجارت، زراعت اور شکار کی سخت ممانعت تھی اور جو شخص اس حکم کی خلاف ورزی کرتا اس کو قتل کرنے کا حکم تھا۔

اس آیت میں بستی سے مراد ایلہ ہے جو مدین اور طور کے درمیان بحیرہ قلزم کے کنارے واقع تھی۔ حضرت داؤد (علیہ السلام) کے زمانے میں یہاں بنی اسرائیل آباد تھے اور ان کا زیادہ تر ذریعہ معاش مچھلیاں پکڑنا تھا۔ نیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی آزمائش کے لیے ہفتہ والے دن مچھلیاں کثرت سے ظاہر ہوتیں اور دوسرے دنوں میں بہت کم نظر آتیں، چنانچہ انھوں نے سمندر کے کنارے گڑھے کھودے اور نالیوں کے ذریعہ ان کو سمندر سے ملا دیا۔ ہفتہ والے دن وہ نالیاں کھول دیتے

اور جب مچھلیاں ان نالیوں کے ذریعہ ان کے گڑھوں میں آجاتیں تو وہ نالیاں بند کر دیتے اور اتوار والے دن گڑھوں میں پھنسی ہوئی مچھلیوں کو پکڑ لیتے۔ اس طرح حیلے اور فریب سے وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کرتے۔

یہ واقعہ بنی اسرائیل کے علماء اچھی طرح جانتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جب حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس واقعہ کا اعلان کیا تو کسی یہودی عالم نے اس کی تردید نہیں کی، نیز اس واقعہ کا بیان حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا ایک ثبوت بھی ہے کیونکہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس واقعہ کی خبر اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی عطا فرمائی۔ (تفسیر امداد الکرم)

شان نزول: سرکارِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مدینہ میں رہنے والے یہودیوں کو ان کے کفر پر سرزنش کرتے اور ان سے فرمایا کرتے کہ تم لوگ اپنے باپ دادا کے نقش قدم پر ہو کہ انھوں نے ہمیشہ پچھلے نبیوں (علیہ السلام) کی مخالفت کی۔ (اور تم میری مخالفت کر رہے ہو۔) اس پر یہودی بولے "ہمارے باپ دادا اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کے فرمان بردار اور اپنے نبیوں (علیہ السلام) کے اطاعت گزار تھے، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ واقعی ان کے باپ دادا اپنے نبیوں (علیہ السلام) کی مخالفت کرتے رہے ہیں مگر ان کا خیال تھا کہ ان واقعات کی کسی کو خبر نہیں، اس لیے اپنے باپ دادوں کی معصومیت کے ڈھنڈورے پیٹتے تھے۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں ان کے پول کھول دیئے گئے اور وہ لوگ حیران رہ گئے۔ (1)

اس آیت میں خطاب سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ہے کہ آپ اپنے قریب رہنے والے یہودیوں سے سرزنش کے طور پر اس بستی والوں کا حال دریافت فرمائیں۔ اس سوال سے مقصود کفار پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ سیّدِ عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت اور تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزات کا انکار کرنا یہ ان کیلئے کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ کفر و معصیت تو ان کا پرانا دستور ہے کہ ان کے آباؤ اَجداد بھی کفر پر قائم رہے۔ (2)

{عَنِ الْقَرْيَةِ: بستی کا حال۔} اس بستی کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کون سی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) نے فرمایا کہ وہ مصر و مدینہ کے درمیان ایک قریہ ہے۔ ایک قول ہے کہ مدین و طور کے درمیان ایک بستی ہے۔ امام زہری (رح) نے فرمایا کہ وہ قریہ، طبریہ شام ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے ایک روایت یہ ہے کہ وہ بستی مدین ہے۔ بعض کے نزدیک وہ بستی ایلہ ہے۔ (3)

{اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ: جب وہ ہفتے کے بارے میں حد سے بڑھنے لگے۔} اس آیت اور اس سے بعد والی 3 آیات میں جو واقعہ بیان ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس بستی میں رہنے والے بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے ہفتے کا دن عبادت کے لیے خاص کرنے اور اس دن تمام دنیاوی مشاغل ترک کرنے کا حکم دیا نیز ان پر ہفتے کے دن شکار حرام فرما دیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی آزمائش کا ارادہ فرمایا تو ہوا یوں کہ ہفتے کے دن دریا میں خوب مچھلیاں آتیں اور یہ لوگ پانی کی سطح پر انھیں دیکھتے تھے، جب اتوار کا دن آتا تو مچھلیاں نہ آتیں۔ شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا کہ تمہیں مچھلیاں پکڑنے سے منع کیا گیا ہے لہٰذا تم ایسا کرو کہ دریا کے کنارے بڑے بڑے حوض بنا لو اور ہفتے کے دن دریا سے ان حوضوں کی طرف نالیاں نکال لو، یوں ہفتے کو مچھلیاں حوض میں آجائیں گی اور تم اتوار کے دن انھیں پکڑ لینا، چنانچہ ان کے ایک گروہ نے یہ کیا کہ جمعہ کو دریا کے کنارے کنارے بہت سے گڑھے کھودے اور ہفتے کی صبح کو دریا سے ان گڑھوں تک نالیاں بنائیں جن کے ذریعے پانی کے ساتھ آکر مچھلیاں گڑھوں میں قید ہو گئیں اور اتوار کے دن انھیں نکال لیا اور یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے دی کہ ہم نے ہفتے کے دن تو مچھلی پانی سے نہیں نکالی۔ ایک عرصے تک یہ لوگ اس فعل میں مبتلا رہے۔ ان کے اس عمل کی وجہ سے اس بستی میں بسنے والے افراد تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔

(1)۔۔ ان میں ایک تہائی ایسے لوگ تھے جو ہفتے کے دن مچھلی کا شکار کرنے سے باز رہے اور شکار کرنے والوں کو منع کرتے تھے۔

(2)۔۔ ایک تہائی ایسے افراد تھے جو خود خاموش رہتے اور دوسروں کو منع نہ کرتے تھے جبکہ منع کرنے والوں سے کہتے تھے کہ ایسی قوم کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ عَزَّوَجَلَّ ہلاک کرنے والا یا انھیں سخت عذاب دینے والا ہے۔

(3)۔۔ اور ایک گروہ وہ خطاکار لوگ تھے جنہوں نے حکم الٰہی کی مخالفت کی اور ہفتے کے دن شکار کیا، اسے کھایا اور بیچا۔

جب مچھلی کا شکار کرنے والے لوگ اس معصیت سے باز نہ آئے تو منع کرنے والے گروہ نے ان سے کہا کہ "ہم تمہارے ساتھ میل برتاؤ نہ رکھیں گے۔ اس کے بعد انھوں نے گاؤں کو تقسیم کرکے درمیان میں ایک دیوار کھینچ دی۔ منع کرنے والوں کا ایک دروازہ الگ تھا جس سے آتے جاتے تھے اور خطاکاروں کا دروازہ جدا تھا۔

حضرت داؤد (علیہ السلام) نے ان خطاکاروں پر لعنت کی تو ایک روز منع کرنے والوں نے دیکھا کہ خطاکاروں میں سے کوئی باہر نہیں نکلا، تو انھوں نے خیال کیا کہ شاید آج شراب کے نشہ میں مدہوش ہوگئے ہوں گے، چنانچہ انھیں دیکھنے کے لیے دیوار پر چڑھے تو دیکھا کہ وہ بندروں کی صورتوں میں مسخ ہوگئے تھے۔ اب یہ لوگ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو وہ بندر اپنے رشتہ داروں کو پہچانتے اور ان کے پاس آکر ان کے کپڑے سونگھتے تھے اور یہ لوگ ان بندر ہو جانے والوں کو نہیں پہچانتے تھے۔ ان لوگوں نے بندر ہو جانے والوں سے کہا: "کیا ہم لوگوں نے تمہیں اس سے منع نہیں کیا تھا؟ اُنہوں نے سر کے اشارے سے کہا: ہاں۔ اس کے تین دن بعد وہ سب ہلاک ہوگئے اور منع کرنے والے سلامت رہے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے امی ہونے اور پچھلی کتابیں پڑھی ہوئی نہ ہونے کے باوجود بھی ان واقعات کی خبر دینا ایک معجزہ ہے کہ آپ نے یہودیوں کے سامنے ان کے آباء واجداد کے اعمال اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کی وجہ سے ان کا بندر و خنزیر کی شکلوں میں تبدیل ہو جانا سب بیان فرما دیا۔ (1)

شرعی احکام باطل کرنے کے لیے حیلہ کرنے والوں کو نصیحت:

اس واقعے میں ان لوگوں کے لیے بڑی عبرت ہے کہ جو شرعی احکام کو باطل کرنے اور انھیں اپنی خواہش کے مطابق ڈھالنے کیلئے طرح طرح کے غیر شرعی حیلوں کا سہارا لیتے ہیں، انھیں اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ کہیں اس کی پاداش میں ان کی شکلیں بھی نہ بگاڑ دی جائیں۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جیسا یہودیوں نے کیا تم اس طرح نہ کرنا کہ تم اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو طرح طرح کے حیلے کرکے حلال سمجھنے لگو۔ (2)

یاد رہے کہ حکم شرعی کو باطل کرنے کیلئے حیلہ کرنا حرام ہے جیسا کہ یہاں مذکور ہوا البتہ حکم شرعی کو کسی دوسرے شرعی طریقے سے حاصل کرنے کیلئے حیلہ کرنا جائز ہے جیسا کہ قرآن پاک میں حضرت ایوب (علیہ السلام) کا اس طرح کا عمل سورۃ ص آیت 44 میں مذکور ہے۔ عوام الناس کو چاہیے کہ پہلے حیلے سے متعلق شرعی رہنمائی حاصل کریں اس کے بعد حیلہ کریں تاکہ معلومات میں کمی کی وجہ سے گناہ میں پڑنے کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

جب ہفتہ کے دن شکار کرنے والے یہود کو بندر بنایا گیا:

یہود سمجھتے ہیں کہ وہ اللہ کے چہیتے ہیں انھیں کوئی عذاب نہ ہوگا۔ اللہ رب العزت نے انھیں مثال دی ہے کہ ہفتے کے دن شکار کرنے پر انھیں بندر بنایا گیا کیا چہیتوں کو بندر بنایا جاتا ہے؟ تو فرمایا: کہ اے محبوب کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ بنی اسرائیل (یہود) سے سمندر کے کنارے والی بستی کا حال پوچھیں اس سے بستی ایلہ مراد ہے جس میں داود علیہ السلام تشریف فرما تھے۔ یہ بحر احمر کی مشرقی شاخ کے آخری سرے پر فلسطین کے قریب واقع ہے۔ چونکہ اس بستی کے لوگ سمندر کے کنارے پر رہنے کی وجہ سے مچھلیاں پکڑ اور بیچ کر گزر اوقات کرتے تھے تو انھیں حکم ہوا کہ ہفتے والے دن عبادت کے لئے رکھ لیں باقی چھ دن کو کھل کر مچھلی کا شکار کریں۔ توراۃ کتاب برمیاہ باب 17 آیت 21 میں بھی اس کا ذکر موجود ہے کہ حضرت برمیاہ (علیہ السلام) نے انھیں کہا ہفتہ کے دن کو شکار مت کرو ورنہ یہ بستی تباہ کر دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں آزمائش میں ڈالا۔ ہفتے کے دن سمندر میں اس کثرت سے مچھلیاں آنے لگی کے وہ انھیں ہاتھ سے پکڑ سکتے تھے باقی دنوں میں مچھلیاں نیچے اتر جاتی اگر وہ صبر کرتے تو ساتوں دن کثرت سے مچھلیاں پاتے مگر انھوں نے ساحل سمندر پر گڑھے کھود دئے اور سمندر سے ان گڑھوں کی طرف راستے بنا دیے وہ ہفتے کو ان راستوں کے منہ کھول دیتے اور سارا دن مچھلیاں گڑھوں میں گرتی رہتیں۔ اتوار کو جا کر گڑھوں سے مچھلیاں نکال لیتے اور کہتے ہم نے تو اتوار کو مچھلیاں پکڑی ہیں۔ مگر یہ نہ سوچتے کہ ان کا شکار تو ہفتے کو ہوا ہے۔ گویا وہ اپنے گمان میں اللہ کو دھوکا دے رہے تھے (معاذ اللہ)

مال حرام کی آسان یابی امتحان عظیم ہے:

یہود کو ہفتے کے دن کثرت سے مچھلیاں نظر آتیں جنہیں وہ ہاتھوں سے پکڑ سکتے تھے یہ ان کے صبر کا امتحان تھا مگر وہ ناکام رہے اور حرام مال جمع کرنے لگے اور ہوش تب آیا جب بندر بنا دیئے گئے۔ جب حرام مال آسانی اور کثرت سے ہاتھ آسکتا ہو تو ایسے میں صبر کرنا ہی ایمان کی معراج ہے مگر ہم لوگ صبر چھوڑ کر حرام مال جمع کرنے لگتے ہیں اور ہوش تب آتا ہے جب فرشتۂ اجل گردن دبوچ لیتا ہے۔

ناجائز حیلوں سے حرام کو حلال نہیں بنایا جاسکتا:

یہود نے ناجائز حیلہ کیا ہفتے کو گڑھوں کے ذریعے مچھلیاں پکڑ کر سمجھے کہ انھوں نے اللہ کو دھوکا دے دیا ہے۔ (معاذ اللہ) اگر انسان گناہ کرے اور اسے گناہ سمجھے تو معافی مل سکتی ہے اور اگر حیلہ کرکے اسے جائز سمجھ لے تو معافی نہیں مل سکتی کیونکہ گناہ کو جائز قرار دینا قانون شریعت سے بغاوت ہے اسی لیے یہود کو بندر بنادیا گیا۔ (تفسیر صراط الجنان)

اس شہر میں رہنے والے ستر ہزار نفوس تھے۔ اور ان کو منع کرنے والے بارہ ہزار تھے، جب مجرموں نے ان کی نصیحت قبول کرنے سے انکار کردیا، تو مانعین نے کہا بہ خدا ہم ایک علاقہ میں نہیں رہیں گے، انھوں نے شہر کے درمیان ایک دیوار کھینچ دی، اور ان سے الگ رہنے لگے اور کئی سال اسی طرح گزر گئے، پھر معصیت پر ان کے مسلسل اصرار کی وجہ سے حضرت داؤد (علیہ السلام) نے ان پر لعنت کی اور اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا غضب فرمایا ایک دن منع کرنے والے اپنے دروازے سے نکلے تو دیکھا مجرمین میں سے کوئی نہیں نکلا، جب کافی دیر ہو گئی تو وہ دیوار پھاند کر گئے، دیکھا تو وہ تمام لوگ بندر بن چکے تھے، ایک قول یہ ہے کہ جوان بندر بن گئے تھے اور بوڑھے خنزیر بن گئے تھے، وہ دوسروں کو پہچان رہے تھے اور دوسرے ان کو نہیں پہچان رہے تھے۔ وہ تین دن تک اس حال میں روتے رہے، ھر سب ہلاک ہو گئے اور کوئی مسخ شدہ شخص تین دن سے زیادہ نہیں رہا اور نہ ان کی نسل چلی۔ (تفسیر خازن ج 1، ص 60، مطبوعہ دار الکتب العربیہ پشاور)

اس واقعہ کے بیان میں ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزہ کا اظہار ہے کیونکہ آپ امی تھے۔ آپ نے اعلان نبوت سے پہلے نہ کسی چیز کو پڑھا تھا نہ لکھا تھا اور نہ علماء اہل کتاب کی مجلس میں رہے تھے، اس کے باوجود آپ نے اس واقعہ کو بیان فرمایا جو ان کے علماء کے درمیان معروف تھا۔ ان کی کتابوں میں لکھا ہوا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے جو کچھ بیان فرمایا وہ وحی الٰہی ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو ہفتہ کے دن شکار کرنے سے منع کردیا تھا تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ سمندر میں ہفتہ ہی کے دن بکثرت مچھلیاں آتی تھیں، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آزمائش تھی اور بنو اسرائیل کا امتحان تھا کہ وہ مچھلیوں کی بہتات دیکھ کر پھسل جاتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کے حکم ماننے پر جمے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: " احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لا یفتنون : کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ (محض) اس کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی ' (العنکبوت : 2) ۔ اس امتحان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ فرمان برداروں اور نافرمانوں کو متمیز کردیتا ہے۔

اس آیت کے دیگر مباحث کہ موجودہ بندر، ان ہی بندروں کی نسل سے ہیں یا نہیں اور تماسخ اور تناسخ میں فرق کے لیے البقرہ : 65 کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ یہ قصہ یہودیوں کے درمیان معروف اور مشہور تھا۔ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس واقعہ کا علم اللہ تعالیٰ کی وحی سے ہوا، یہاں اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتا ہے کہ یہ وہ قوم ہے جس نے اتنی دیدہ دلیری سے اتنا زبردست گناہ کیا تھا اور ایسی کھلی نافرمانی کی تھی تو اگر یہ لوگ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزات اور صاف صاف نشانیاں دیکھنے کے باوجود آپ کی نبوت کا انکار کریں اور اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہیں تو ان سے کیا بعید ہے!
(تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝١٦٤

لغۃ القرآن: [وَاِذْ : اور جب] [قَالَتْ : کہا] [اُمَّةٌ: ایک گروہ نے] [مِّنْهُمْ : ان میں سے] [لِمَ : کیوں] [تَعِظُوْنَ : تم لوگ وعظ کرتے ہو] [قَوْمًا : ایک ایسی قوم کو ،] [اللّٰهُ : اللہ] [مُهْلِكُهُمْ : ہلاک کرنے والا ہے جن کو] [اَوْ : یا] [مُعَذِّبُهُمْ : عذاب دینے والا ہے ان کو] [عَذَابًا شَدِيْدًا : ایک شدید عذاب] [قَالُوْا : انہوں نے کہا] [مَعْذِرَةً : عذر پیش کرنے کے لیے] [اِلٰى رَبِّكُمْ : تمہارے رب کی طرف] [وَلَعَلَّهُمْ : اور شاید وہ لوگ] [يَتَّقُوْنَ : تقوی اختیار کریں]

ترجمہ: اور جب ان میں سے ایک گروہ نے (فریضہ دعوت انجام دینے والوں سے) کہا کہ تم ایسے لوگوں کو نصیحت کیوں کر رہے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا جنہیں نہایت سخت عذاب دینے والا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ تمہارے رب کے حضور (اپنی) معذرت پیش کرنے کے لیے اور اس لیے (بھی) کہ شاید وہ پرہیزگار بن جائیں

تشریح:

سنیچر (ہفتہ) کے روز مچھلیوں کے شکار کرنے نہ کرنے کے متعلق ایلہ کی آبادی تین مختلف الخیال گروہوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک گروہ تو وہ تھا جو اس کھلی ہوئی نافرمانی کا ارتکاب کیا کرتا تھا۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو خود تو شکار نہیں کرتا تھا لیکن شکار کرنے والوں کو اس حکم عدولی سے روکتا بھی نہ تھا۔ تیسرا گروہ وہ تھا جو فریضہ تبلیغ ادا کرنے میں ہمہ تن مشغول تھا۔ دوسرے گروہ نے اس تیسرے گروہ کو کہا کہ تم خواہ مخواہ کیوں اپنا سر کھپاتے ہو۔ ان کی ہلاکت مقدر ہو چکی ہے انھیں سمجھانے سے کیا حاصل۔ اس فرض شناس گروہ نے انھیں جواب دیا کہ اس تبلیغ کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر قیامت کے روز ہم سے باز پرس کی گئی تو ہم عرض کریں گے کہ اے خداوند! ہم نے توان نابکاروں کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن انھوں نے ہماری ایک نہ سنی۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ ہمارے وعظ و نصیحت کرنے سے کسی کا دل پسیج جائے اور وہ راہ حق اختیار کرلے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

ان لوگوں کے خیال کے مطابق ان حیلہ سازوں کو وعظ و نصیحت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ اس کا فائدہ ہے۔ کیونکہ اللہ نے ان کے لیے ہلاکت و بربادی کا فیصلہ کرلیا ہے اس لیے کہ انھوں نے احکام الٰہی کو مذاق بنایا ہے۔

لیکن منع کرنے والے گروہ نے جواب دیا کہ یہ ان پر ایک فریضہ ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور لوگوں کو انجام بد سے ڈرانا پیغمبروں کا فریضہ ہے اور اگر ہم نہ ادا کریں تو ہم قیامت میں معقول عذر پیش نہ کرسکیں گے۔ ایک تو یہ ہوگا کہ اللہ کے ہاں ہم سرخرو ہوں گے۔ دوسرے یہ امکان بھی ہے کہ شاید یہ لوگ راہ راست پر آجائیں اور ان کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہو جائے۔

یوں اس ساحلی بستی کے لوگ تین گروہوں میں بٹ گئے یا تین جماعتیں بن گئیں۔ اسلامی تصورات کے مطابق امت " لوگوں کا وہ مجموعہ ہے جو ایک نظریہ رکھتا ہو، جس کی سوچ ایک جیسی ہو، جس کی قیادت ایک ہو " امت سے مراد وہ قدیم جاہلی دور کی امت نہیں ہے اور نہ جدید جاہلی تصورات کے مطابق امت ہے، جاہلی تصورات کے مطابق امت " لوگوں کا وہ مجموعہ ہے، جو کسی ایک علاقے میں رہتا ہو، اور اس پر ایک حکومت ہو " یہ مفہوم امت کا اسلامی مفہوم نہیں ہے۔ یہ قدیم یا جدید جاہلیت کی اصطلاح ہے۔

امت کا لفظ عربی لغت میں محض آبادی یا لوگوں کے ایک گروہ کے لیے بھی آتا ہے۔ مثلا (ولما ورد ماء مدین وجد علیہ امۃ من الناس یسقون) جب وہ مدین کے پانی کے پاس آئے تو انھوں نے لوگوں کے ایک گروہ کو پانی پلاتے ہوئے پایا"۔ اور امت بمعنی قیادت اور امامت کے معنی میں بھی مستعمل ہے (ان ابراہیم کان امۃ قانتا للہ حنیفا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم ایک علیحدہ امت تھے یعنی قائد تھے۔ لیکن یہ لغوی مفہوم اس لفظ کے اصطلاح مفہوم کے متضاد نہیں ہیں " یعنی لوگوں کا وہ مجموعہ جس کا عقیدہ ایک ہو اور تصور ایک ہو "

غرض اس گاؤں کے لوگ تین جماعتوں میں بٹ گئے، ایک جماعت سرکشی اختیار کرنے والی، دوسری جماعت اس کا راہ روکنے والی جو اصلاح اور نصیحت کا فریضہ انجام دے رہی تھی، تیسری جماعت غیر جانبدار تھی، وہ نہ تو سرکشوں کا ساتھ دیتی تھی اور نہ ہی امر بالمعروف کرنے والوں کا ساتھ دیتی تھی۔ خیالات و سرگرمیوں کے ان تین طریقوں کو یہاں تین امتوں سے تعبیر کیا گیا۔

جب نصیحت اور وعظ سے ان کو کوئی فائدہ نہ ہوا اور گمراہی کی راہ پر چلنے والے چلتے ہی رہے تو ان پر اللہ کا عذاب آنا ہی ٹھہرا۔ اور اللہ نے جو ڈراوا ان تک پہنچایا تھا اس کا وقت آ پہنچا۔ صرف وہ لوگ نجات پانے والوں میں شامل رہے جو ینھون عن السوء برائیوں سے روکنے والے تھے اور جو سرکش تھے ان کو عذاب نے آ لیا۔

تفصیلات آگے آرہی ہیں۔ رہی وہ تیسری جماعت جو غیر جانبدار تھی اس کے بارے میں قرآن نے کچھ نہیں کہا۔ شاید ان غیر جانبداروں کو اس لیے یہاں نسیاً منسیا کردیا کہ ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے اور یہ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ ان کا یہاں ذکر کیا جائے۔ اس لیے کہ انھوں نے مثبت رویہ اختیار نہ کیا۔ محض منفی انکار کا کمزور موقف اختیار کیا۔ لہٰذا اللہ نے بھی ان کا تذکرہ نہ کیا۔ اگرچہ وہ سزا سے بچ گئے ہوں۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

تبلیغ کا فرض کفایہ ہونا

اس آیت کی تفسیر میں صحیح قول یہ ہے کہ اس شہر کے رہنے والے تین گروہوں پر منقسم تھے، ایک فریق وہ تھا جو ہفتہ کے دن ان مچھلیوں کا شکار کرکے اللہ تعالیٰ کی کھلی کھلی نافرمانی کرتا تھا، دوسرا فریق وہ تھا جو ان کو اس نافرمانی سے منع کرتا تھا اور ڈانٹتا تھا، اور تیسرا فریق وہ تھا جو خاموش رہتا تھا، نافرمانی کرتا تھا اور نہ نافرمانی سے روکتا تھا، اور اس فریق نے منع کرنے والوں سے کہا تم ان کو کیوں منع کرتے ہو جبکہ تمہیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کرنے والا ہے یا عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے، یعنی یہ لوگ گناہوں پر اصرار کرکے اب ایسی حد پر پہنچ چکے ہیں کہ اب ان کا گناہوں سے پلٹنا بہت مشکل ہے، اس لیے اب ان پر وعظ اور نصیحت بے اثر ہے، لہٰذا اب ان کو نصیحت نہیں کرنی چاہیے۔

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عکرمہ بیان ہیں کہ ایک دن میں حضرت ابن عباس (رض) کے پاس گیا تو وہ رو رہے تھے اور ان کی گود میں قرآن مجید تھا، میں نے کہا اے ابن عباس! میں آپ پر قربان ہوں، آپ کیوں رو رہے ہیں، حضرت ابن عباس نے سورۃ الاعراف کی ان آیتوں کی تلاوت کی اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجرمین کو سزا دی اور ان کو مسخ کرکے بندر بنادیا اور جو فریق ان کو برائی سے منع کرتا تھا اس کا ذکر فرمایا کہ اس کو نجات دے دی اور تیسرا فریق جو خاموش رہا تھا اور ان کو منع نہیں کرتا تھا اس کا ذکر نہیں فرمایا آیا ان کی نجات ہوئی یا نہیں۔ اور ہم بھی کئی کاموں کو برا سمجھتے ہیں لیکن منع نہیں کرتے اللہ جانے ہماری نجات ہوگی یا نہیں، عکرمہ کہتے ہیں کہ میں آپ پر قربان ہوں، کیا اس فریق نے ان کاموں کو برا نہیں سمجھا تھا جب کہ اس نے یہ کہا کہ تم ان کو کیونکر منع کرتے ہو جب کہ تمہیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کرنے والا ہے یا عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے، حضرت ابن عباس میرے اس جواب سے خوش ہوئے اور مجھے دو دبیز چادریں دینے کا حکم دیا۔ (جامع البیان جز 9، س 127-128، مطبوعہ دارالفکر بیروت، 1415ھ)

امام رازی نے فرمایا کہ برائی سے روکنا فرض علی الکفایہ ہے اور جب بعض لوگوں نے بنو اسرائیل کو اس برائی سے روک کر یہ فرض ادا کردیا تو باقی لوگوں سے یہ فرض ساقط ہوگیا، اس لیے اس تیسرے فریق پر عذاب نازل نہیں ہوا۔ (تفسیر کبیر ج 5، ص 393، مبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، 1415ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: " پھر جب انھوں نے اس چیز سے سرکشی کی جس سے ان کو روکا گیا تھا تو ہم نے ان سے کہا تم ذلیل بندر بن جاؤ"

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا صبح کو جب وہ نافرمان لوگ اٹھے تو وہ ذلیل بندر بن چکے تھے، وہ تین دن تک اسی کیفیت پر برقرار رہے، لوگوں نے ان کو دیکھا پھر وہ ہلاک ہوگئے۔ حضرت ابن عباس (رض) سے منقول ہے کہ ان میں سے جوان بندر بن گئے تھے اور بوڑھے خنزیر بن گئے تھے لیکن یہ قول اس آیت کے خلاف ہے، اس میں بھی اختلاف ہے کہ جن لوگوں کو مسخ کرکے بندر بنادیا گیا تھا، موجودہ بندر ان ہی کی نسل سے ہیں یا وہ اسی وقت ہلاک ہوگئے تھے اور ان کی نسل منقطع ہوگئی تھی، ان تمام امور کی تفصیل البقرہ : 65 میں گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمائیں، ان آیات سے حسب ذیل احکام مستنبط ہوتے ہیں :

بعض احکام کا استنباط

1۔ ایسے حیلے کرنا ممنوع ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کے احکام بالکلیہ معطل ہوجائیں، اور اللہ تعالیٰ کی ممانعت کا کوئی محل باقی نہ رہے، البتہ کسی آدمی کی شخصی ضرورت کے لیے کوئی ایسی خفیہ تدبیر کرنا جس سے وہ ممنوع کام کے ارتکاب سے بچ جائے یہ انفرادی طور پر جائز ہے لیکن اس کو قاعدہ کلیہ بنالینا جائز نہیں، جیسے لوگ سود کھانے کے لیے بیع عینہ کا حیلہ کریں یا دکان کی پگڑی لینے کے لیے اس دکان یا مکان میں ایک میز یا الماری رکھ کر اس کے عوض پگڑی کی رقم لے لیں۔

2۔ ان آیات میں سد ذرائع کی اصل ہے یعنی جو کام کسی حرام کا ذریعہ ہو وہ بھی ممنوع ہے، ان کا سمندر سے نالیاں کھود کر حوضوں کی طرف لانا مچھلیوں کے شکار کا ذریعہ تھا، اس لیے اس کو بھی منع کردیا۔

3۔ نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا فرض ہے، لیکن یہ فرض کفایہ ہے۔

4۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دنیا اور آخرت کے احوال آسان کردیتا ہے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو آزمائش میں ڈال دیتا ہے جیسے ان اسرائیلیوں کو آزمائش میں مبتلا کیا کہ ہفتہ کے دن مچھلیاں بہت آتی تھیں۔

5۔ اللہ تعالیٰ کا عذاب اچانک نہیں آتا بلکہ تدریجاً آتا ہے جیسے بنو اسرائیل پر مختلف انواع کے عذاب آتے رہے، پھر ان کو بندر بنایا گیا، پھر ان سے حکومت چھینی گئی اور اصل عذاب آخرت میں آئے گا۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَىِٕيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝١٦٥

لغۃ القرآن: [فَلَمَّا : پھر جب] [نَسُوْا : وہ لوگ بھولے] [مَا : اس کو] [ذُكِّرُوْا : انہیں یاد دلایا گیا] [بِهٖٓ: جس سے] [اَنْجَيْنَا : تو ہم نے نجات دی] [الَّذِيْنَ : ان کو جو] [يَنْهَوْنَ : منع کرتے تھے] [عَنِ السُّوْٓءِ : برائی سے] [وَاَخَذْنَا : اور ہم نے پکڑا] [الَّذِيْنَ : ان کو جنہوں نے] [ظَلَمُوْا : ظلم کیا] [بِعَذَابٍۢ بَىِٕيْسٍۢ : ایک سخت عذاب سے] [بِمَا : بسبب اس کے جو] [كَانُوْا : جو وہ تھے] [يَفْسُقُوْنَ : نافرمانی کرتے]

ترجمہ: پھر جب وہ ان (سب) باتوں کو فراموش کر بیٹھے جن کی انھیں نصیحت کی گئی تھی (تو) ہم نے ان لوگوں کو نجات دے دی جو برائی سے منع کرتے تھے (یعنی نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے تھے) اور ہم نے (بقیہ سب) لوگوں کو جو (عملًا یا سکوتاً) ظلم کرتے تھے نہایت برے عذاب میں پکڑ لیا اس وجہ سے کہ وہ نافرمانی کر رہے تھے

تشریح: نسیان جان بوجھ کر کسی چیز کو چھوڑ دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور یہاں اسی معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ والنسیان یطلق علی الساہی والعامد: التارک ای ترکوہ عن قصد (قرطبیؒ)۔ بئیس بمعنی شدید ہے۔ جب ان کی نافرمانی اور عصیان شعاری حد سے تجاوز کر گئی اور ان کے ہدایت پانے کی کوئی امید نہ رہی تو ان پر عذاب الٰہی آیا جس نے ان کو ہلاک و برباد کر دیا۔ اور ان تین گروہوں میں سے صرف وہی گروہ نجات پا سکا جو ان کو وعظ و نصیحت کیا کرتا تھا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہمیت و فرضیت:

پتہ چلا طاقت ہونے کے باوجود لوگوں کو گناہ سے نہ روکنا بھی گناہ کرنے کے برابر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَنۡجَیۡنَا الَّذِیۡنَ یَنۡہَوۡنَ عَنِ السُّوۡٓءِ وَ اَخَذۡنَا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا بِعَذَابٍ الخ۔ یعنی ہم نے صرف ان کو نجات دی جو برائی سے منع کرتے تھے اور باقی ظالموں کو ہم نے شدید عذاب میں پکڑ لیا۔ گویا جو لوگ ان میں سے ہفتہ کے دن نہ شکار کرتے تھے نہ شکار کرنے والوں کو منع کرتے تھے وہ بھی بندر بنا دیے گئے اور جب شکار کرنے والوں کے ساتھ ہی رہے اس لیے وہ بھی عذاب میں دھر لیے گئے۔ اس کی تفصیل امام بغوی نے معالم التنزیل اور امام خازن نے لباب التاویل میں اور قرطبیؒ نے الجامع لاحکام القرآن میں اور دیگر مفسرین و محدثین نے بیان کی ہے۔

اسی لیے حضرت ابو سعید خدری (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جو شخص ہاتھ سے برائی روک سکتا ہے وہ ہاتھ سے روکے اگر ہاتھ سے نہیں روک سکتا تو زبان سے روکے اگر زبان سے نہیں روک سکتا تو اس عمل کو دل سے برا جانے اور یہ ایمان کا کمزور تر درجہ ہے (کہ برائی کے خلاف زبان بھی نہ کھولی جاسکے)۔ (ابو داؤد کتاب الملاحم باب 17 حدیث 4340۔ ابن ماجہ کتاب الاقامہ باب 155)۔

کیا امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے؟

اس جگہ فاضل محقق اور معاصر مفسر شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ نے اس آیت کی تفسیر میں اس قول کو ترجیح دی ہے کہ عذاب صرف ان لوگوں پر آیا جو ہفتہ کے دن شکار کرتے تھے۔ رہے دوسرے دو گروہ کہ جو شکار نہیں کرتا تھا اور جو شکار سے منع نہیں کرتا تھا البتہ اسے برا جانتا تھا عذاب سے بچ گئے۔ اس پر انھوں نے ایک تو حضرت عبداللہ بن عباس (رض) کا قول پیش کیا ہے، دوسرا امام رازی کا استدلال پیش کیا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے جب بعض لوگوں نے بنی اسرائیل کو برائی سے روک دیا تھا تو باقی سے یہ فرض ساقط ہو گیا اس لیے تیسرے فریق پہ عذاب نازل نہیں ہوا۔ (تبیان القرآن جلد 4 صفحہ 404)

جہاں تک حضرت عبداللہ بن عباس (رض) کا تعلق ہے تو ان سے اس بارہ میں مختلف اقوال مروی ہیں۔ یہ بھی مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: لکنی اخاف ان العقوبۃ نزلت بھم جمیا۔ یعنی مجھے ڈر ہے کہ عذاب ان سب پر نازل ہوا تھا۔ (در منثور بروایت عبد بن حمید وابو الشیخ جلد 3 صفحہ 590)۔ اور یہی قول موافق قرآن ہے جیسا کہ ہم ابھی واضح کرتے ہیں۔

رہا علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہٗ کا امام رازی کا یہ قول نقل کرنا کہ برائی سے منع کرنا فرض کفایہ ہے تو ہم بصد ادب عرض کرتے ہیں کہ امام رازی کا یہ قول درست نہیں اور امام رازی کے سوا کسی نہیں بات نہیں کہی۔ اگر امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض کفایہ ہوا تو اس کا معنی یہ ہوا کے لاکھوں لوگ برائیاں کریں اور صرف ایک شخص اٹھ کر انھیں کہہ دے کہ تم غلط کر رہے ہو تو سب کی طرف سے ذمہ داری پوری ہو گئی۔ کیا اس طرح کوئی برائی رک سکتی ہے؟ نہیں، علامہ سعیدی اکثر امام رازی پر تنقید کرتے ہیں، مگر اس جگہ نہ جانے کیوں وہ ان کے آگے سپر انداز ہو گئے اور سر تسلیم خم کر دیا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر بقدر طاقت فرض عین ہے۔ ہر مسلمان پر ضروری ہے کہ بقدر طاقت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے کیوں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مطلّقاً فرمایا: من رای منکم منکرا فاستطاع ان یغیرہ بیدہ فلیغیرہ بیدہ۔ جو شخص تم میں اسے برائی دیکھے اور اسے ہاتھ سے روک سکتا ہوں تو اسے ہاتھ سے روکے، آگے فرمایا: فان لم یستطع فبلسانہ فبقلبہ و ذلک اضعف الایمان۔ اگر ہاتھ سے نہ روک سکے تو زبان سے روکے، نہیں تو دل سے برا جانے اور یہ کمزور ترا ایمان ہے۔ (ابو داؤد کتاب الملاحم حدیث 4340)

اس حدیث میں من رای منکم منکراً کے الفاظ عام ہیں جن میں کوئی تخصیص نہیں ہے، کلمۂ من عام ہے۔ یہ اسی طرح عام ہے جیسے فرمایا گیا: من عمل صالحا من ذکر اوانثی۔ (نحل، 97)۔ من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیھا مانشاء۔ (بنی اسرائیل 18) اور اس طرح کی آیات قرآن کریم میں ہزاروں ہیں۔ ان سب میں کلمۂ من کا جو

عموم ہے وہی من رای منکم منکرا الخ کا ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان پہ بقدر طاقت امر بالمعروف لازم ہے، تو سمجھ میں نہیں آتا کہ امام رازی نے یہ بات کیسے کہی اور علامہ سعیدی نے کیسے مانی۔

بلکہ خود قرآن کی صراحت ہے کہ لسان داؤد (علیہ السلام) پہ جن بنی اسرائیل پہ لعنت کی گئی یعنی ان کو بندر بنایا گیا ان کا گناہ یہ تھا کہ وہ برائی سے منع نہیں کرتے تھے یعنی مچھلی کے شکار سے روکتے نہیں تھے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۔ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۔ "بنی اسرائیل میں سے کفر کرنے والوں پر زبان داؤد و عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) لعنت کی گئی کیوں کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے بڑھتے تھے وہ جو برائی کرتے اس سے ایک دوسرے کو روکتے نہ تھے۔" (مائدہ: 78) اور جملہ تفاسیر متفق ہیں کہ زبانی داؤد علیہ السلام پہ جن بنی اسرائیل پہ لعنت کی گئی وہی ہیں ہفتہ کے دن شکار کرنے والے تھے۔ خود علامہ سعیدی صاحب نے بھی تبیان جلد 4 صفحہ 402 میں یہی لکھا ہے۔ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ کہ برائی سے نہ روکنے کی وجہ سے بنی اسرائیل کو بندر بنادیا گیا۔ لہٰذا امام رازی رحمہ اللہ اور علامہ سعیدی مدظلہٗ کا یہ نظریہ درست نہیں کہ بنی اسرائیل کے تیسرے فریق پہ عذاب نازل نہیں ہوا تھا۔ (تفسیر برہان القرآن)

آیت مبارکہ:

فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝١٦٦

لغۃ القرآن: [فَلَمَّا : پھر جب] [عَتَوْا : انہوں نے سرکشی کی] [عَنْ مَّا : اس سے] [نُهُوْا : انہیں منع کیا گیا] [عَنْهُ : جس سے] [قُلْنَا : تو ہم نے کہا] [لَهُمْ : ان سے] [كُوْنُوْا : ہوجاؤ تم] [قِرَدَةً : بندر] [خٰسِـِٕيْنَ : ذلیل]

ترجمہ: پھر جب انھوں نے اس چیز (کے ترک کرنے کے حکم) سے سرکشی کی جس سے وہ روکے گئے تھے (تو) ہم نے انھیں حکم دیا کہ تم ذلیل و خوار بندر ہو جاؤ

تشریح:

روایت میں ہے کہ جو لوگ ہفتہ کو مچھلی کا شکار خود بھی نہ کرتے تھے اور شکار کرنے والوں کو تنبیہ و سرزنش نہیں کرتے تھے جب انھوں نے سمجھا کہ ان کی بات نہیں مانی جاتی تو انھوں نے اپنے اور دوسرے لوگوں کے درمیان دیوار کھینچ دی اور ان سے میل ملاپ ختم کرکے اپنا رہنا سہنا الگ کر لیا۔ ایک دن صبح ہوئی اور دیوار کی دوسری طرف سے کوئی آواز نہ آئی تو انھیں فکر ہوا وہ دیوار سے کود کر دوسری طرف گئے۔ دروازے بند تھے وہ دروازے توڑ کر اندر داخل ہوئے تو اندر سے بندر ہی بندر نکلے، جو ان کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگے، مرد عورتیں بچے سب بندر بن گئے تھے۔ جب انھیں کہا گیا کہ تم کو اپنی ہی نہ فرمانے کی سزا ملی ہے تو انھوں نے سر ہلائے مگر جواب نہ دے سکے، صرف ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔ وہ بندر تین دن تک زندہ رہے پھر سب مار دیے گئے۔ (بغوی، ابن جریر، ابن کثیر، مظہری وغیرہ)

یہاں ایک تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ ان کی شکلیں بندروں والی نہیں بنی تھیں بلکہ ان کے دل بندروں جیسے بنائے گئے مگر یہ تفسیر الفاظ قرآن کے خلاف ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وجعل منہم القردۃ والخنازیر و عبد الطاغوت۔ "اللہ نے ان میں سے بندر، خنزیر اور شیطان کے پجاری بنائے۔" (مائدہ: 60)۔ یہاں بندر و خنزیر بننا مسخ صور ہے اور عبد الطاغوت (شیطان کے پجاری) بننا مسخ قلوب۔ معلوم ہوا یہود میں مسخ صور الگ ہوا ہے اور مسخ قلوب الگ۔ اس کے مزید دلائل ہم نے سورۃ بقرہ آیت 66 کے تحت لکھے ہیں وہاں دیکھیں۔

معلوم ہوا عبادت کا وقت کاروبار کی نذر کر دینا عذاب الٰہی کو دعوت دینا ہے۔ یہود کے لیے ایک دن عبادت اور چھ دن تجارت کا قانون تھا۔ انھوں نے عبادت کا دن بھی تجارت میں لگایا اور اس میں بھی مچھلیاں پکڑنے لگے تب بندر بنائے گئے۔ امت محمدیہ کے لئے ساتوں دنوں میں سے ہر دن میں چند گھنٹے نماز کے لیے رکھے گئے ہیں تو جو شخص انھیں عبادت کی بجائے تجارت میں لگاتا ہے وہ ہفتے میں شکار کرنے والوں کی طرح خود کو مستحق عذاب بناتا ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

غور و فکر کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اصلاح اور ہدایت کے لیے ان گنت انبیاء مبعوث فرمائے۔ جنھوں نے انتھک جد و جہد کی۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مختلف عذاب اور بیش بہا انعامات کے ذریعے صدیوں تک بار بار اپنی اصلاح کا موقعہ دیا۔ لیکن یہ قوم اصلاح کے بجائے بگاڑ اور فساد کو ترجیح دیتی رہی۔ جس بنا پر ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے آخری فیصلہ صادر فرماتے ہوئے اعلان کیا کہ اب قیامت تک ان پر ایسے لوگ مسلط کیے جائیں گے جو انھیں اذیت ناک سزاؤں اور عذاب میں مبتلا کرتے رہیں گے۔ تاریخ کا طالب علم قرآن کی اس سچائی کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ بخت نصر سے لے کر جرمنی کے ہٹلر تک جو شخص بھی ان پر مسلط ہوا۔ اس نے انھیں اس طرح اپنی گرفت میں جکڑا اور تشدد کا نشانہ بنایا کہ دنیا سمجھنے لگی کہ اب یہودیوں کا ایک فرد بھی باقی نہیں رہے گا۔ آئندہ بھی نہ معلوم حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی آمد سے پہلے ان کی بد اعمالیوں کی سزا دینے کے لیے اللہ تعالیٰ ان پر کتنے لوگ مسلط کرے گا جو انھیں وقفہ وقفہ کے بعد تہس نہس کرتے رہیں گے۔

قرب قیامت جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) تشریف لائیں گے تو وہ اس قدر ان کے خلاف جہاد کریں گے کہ کوئی یہودی ان سے بچ نہیں پائے گا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی یہودی کسی دیوار یا درخت کی اوٹ میں چھپنے کی کوشش کرے گا تو وہ درخت بھی پکار اٹھے گا۔ ایسا کیوں ہوتا رہا اور ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جب ظالم اور نافرمان کو پکڑتا ہے تو بسا اوقات اس کی پکڑ اس قدر آناً فاناً ہوتی ہے کہ ظالم سنبھلنا چاہے تو سنبھل نہ پائے یہاں تک کہ اسے معافی مانگنے کا موقعہ بھی نہیں نصیب ہوتا۔ لیکن یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کا عتاب ظالموں کے لیے ہے نیک اور تائب ہونے والوں کے لیے وہ بڑا معاف فرمانے اور انتہائی رحم و کرم کرنے والا ہے۔

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يُقَاتِلَ الْمُسْلِمُونَ الْيَهُودَ فَيَقْتُلُهُمُ الْمُسْلِمُونَ حَتَّى يَخْتَبِئَ الْيَهُودِيُّ مِنْ وَرَاءِ الْحَجَرِ وَالشَّجَرِ فَيَقُولُ الْحَجَرُ أَوِ الشَّجَرُ يَا مُسْلِمُ يَا عَبْدَ اللّٰهِ هٰذَا يَهُودِيٌّ خَلْفِي فَتَعَالَ فَاقْتُلْهُ إِلَّا الْغَرْقَدَ فَإِنَّهُ مِنْ شَجَرِ الْيَهُودِ)

[رواہ مسلم: کتاب الفتن واشراط الساعۃ]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں بلاشبہ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک مسلمان یہودیوں سے لڑائی نہ کریں مسلمان ان کو قتل کریں گے یہاں تک کہ یہودی پتھروں اور درختوں کے پیچھے چھپیں گے۔ تو پتھر اور درخت پکار اٹھے گا اے مسلمان اے اللہ کے بندے یہ میرے پیچھے یہودی ہے آؤ۔ اس کو قتل کرو غرقد کا درخت ایسا نہیں کرے گا کیونکہ وہ یہودیوں کا درخت ہے۔" (تفسیر فہم القرآن)

یاد رہے کہ:

انسان کی تخلیق بھی لفظ (کن) سے ہوئی تھی اور اس کی خلق میں تبدیلی بھی لفظ کونوا قردۃ خاسئین سے ہوئی یعنی "ذلیل و خوار بندر بن جاؤ" چنانچہ وہ ذلیل و خوار بندر بن گئے کیونکہ اللہ کے حکم کے مقابلے میں کوئی حکم نہیں۔ اور نہ اسے کوئی رد کر سکتا ہے۔

اس سزا کے بعد، سب پر اللہ تعالیٰ نے ابدی لعنت کا حکم فرمایا اور صرف ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا جو نبی آخر الزمان پر ایمان لائیں گے، اس لیے کہ وہ ایک عرصے تک یہی نافرمانیاں کرتے رہے اور اب ان کا زمانہ معصیت ختم ہو گیا اور مشیت الٰہیہ نے ان کے حق میں یہ دائمی حکم صادر کر دیا جو اٹل ہے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

اب ذرا تفصیل کے ساتھ

سب بندر بن گئے:

شاید پہلے اور عذاب آیا ہو گا، جب بالکل حد سے گزر گئے تب ذلیل بندر بنائے گئے، یا فَلَمَّا عَتَوْا الخ کو گزشتہ آیت فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهٖ کی تفسیر قرار دیا جائے یعنی وہ عذاب بئیس یہی بندر بنا دینا تھا۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ منع کرنے والوں نے شکار والوں سے ملنا چھوڑ دیا اور بیچ میں دیوار اٹھائی، ایک دن صبح کو اٹھے تو دوسروں کی آواز نہ سنی، دیوار پر سے دیکھا، ہر گھر میں بندر تھے وہ آدمیوں کو پہچان کر اپنے قرابت والوں کے پاؤں پر سر رکھنے لگے اور رونے لگے۔ آخر برے حال سے تین دن میں مر گئے۔

حضرت ابن عباس رونے لگے:

عکرمہ کہتے ہیں کہ ایک دن میں ابن عباس کے پاس آیا تو دیکھا کہ قرآن گود میں رکھے ہوئے رو رہے ہیں۔ اول اول تو میرا حوصلہ نہ پڑا کہ سامنے آؤں لیکن دیر تک جب یہی حالت رہی تو میں نے قریب آکر سلام کیا بیٹھ گیا اور رونے کی وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا دیکھو یہ سورۃ اعراف ہے اس میں ایلہ کے یہودیوں کا ذکر ہے کہ انھیں ہفتے کے روز مچھلی کے شکار کی ممانعت کردی گئی اور ان کی آزمائش کے لیے مچھلیوں کو حکم ھوا کہ وہ صرف ہفتے کے دن ہی نکلیں ہفتے کے دن دریا مچھلیوں سے بھرے رہتے تھے۔ تروتازہ موٹی اور عمدہ بکثرت مچھلیاں پانی کے اوپر اچھلتی کودتی رہتی تھیں اور دنوں میں سخت کوشش کے باوجود بھی نہ ملتی تھیں۔ کچھ دنوں تو ان کے دلوں کے اندر حکم الٰہی کی عظمت رہی اور یہ ان کے پکڑنے سے رکے رہے لیکن پھر شیطان نے ان کے دل میں یہ قیاس ڈال دیا کہ اس دن منع کھانے سے ہے تم نے آج کھانا نہیں۔ پکڑ لو اور جائز دن کھالینا۔ سچے مسلمانوں نے انھیں اس حیلہ جوئی سے ہر چند روکا اور سمجھایا کہ دیکھو شکار کھیلنا شروع نہ کرو شکار اور کھانا دونوں ممنوع ہیں۔ اگلے جمعہ کے دن جو جماعت شیطانی پھندے میں پھنس چکی تھی وہ اپنے بال بچوں سمیت شکار کو نکل کھڑی ہوئی۔ باقی کے لوگوں کی دو جماعتیں بن گئیں ایک ان کے دائیں ایک بائیں۔ دائیں جانب والی تو برابر انھیں روکتی رہی کہ اللہ سے ڈرو اور اللہ کے عذابوں کے لیے تیاری نہ کرو۔ بائیں والوں نے کہا میاں تمھیں کیا پڑی ؟ یہ تو خراب ہونے والے ہیں اب تم انھیں نصیحت کرکے کیا لوگے ؟ انھوں نے جواب دیا کہ خیر اللہ کے ہاں ہم تو چھوٹ جائیں گے اور ہمیں تو اب تک مایوسی بھی نہیں کیا عجب کہ یہ لوگ سنور جائیں تو ہلاکت اور عذاب سے محفوظ رہیں۔ ہماری تو عین منشا یہ ہے لیکن یہ بدکار اپنی بے ایمانی سے باز نہ آئے اور نصیحت انھیں کارگر نہ ہوئی تو دائیں طرف کے لوگوں نے کہا تم نے ہمارا کہنا نہ مانا۔ اللہ کی نافرمانی کی، ارتکاب حرمت کیا۔ عجب نہیں راتوں رات تم پر کوئی عذاب رب آئے۔ اللہ تمھیں زمین میں دھنسادے یا تم پر پتھر برسادے یا کسی اور طرح تمھیں سزادے۔ رات ہم تو یہیں گذاریں گے تمہارے ساتھ شہر میں نہیں رہیں گے۔ جب صبح ہوگئی اور شہر کے دروازے نہ کھلے تو انھوں نے کواڑ کھٹ کھٹائے، آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہ آیا آخر سیڑھی لگا کر ایک شخص کو قلعہ کی دیوار پر چڑھایا اس نے دیکھا تو حیران ہوگیا کہ سب لوگ بندر بنادیئے گئے۔ اس نے ان سب مسلمانوں کو خبر دی۔ یہ دروازے توڑ کر اندر گئے تو دیکھا کہ سب دم دار بندر بن گئے ہیں یہ تو کسی کو پہچان نہ سکے لیکن وہ پہچان گئے ہر بندر اپنے اپنے رشتے دار کے قدموں میں لوٹنے لگا ان کے کپڑے پکڑ پکڑ کر رونے لگا تو انھوں نے کہا دیکھو ہم تو تمھیں منع کر رہے تھے لیکن تم نے مانا ہی نہیں۔ وہ اپنا سر ہلاتے تھے کہ ہاں ٹھیک ہے ہمارے اعمال کی شامت نے ہی ہمیں برباد کیا ہے۔ تو اب یہ تو قرآن میں ہے کہ روکنے والے نجات یافتہ ہوئے لیکن یہ بیان نہیں کہ جو روکنے والوں کو منع کرتے تھے ان کا کیا حشر ہوا؟ اب ہم بھی بہت سی خلاف باتیں دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں کرسکتے، میں نے آپ سے یہ سن کر کہا اللہ مجھے آپ پر نثار کردے آپ یہ تو دیکھئے کہ وہ لوگ ان کے اس فعل کو برا سمجھتے رہے تھے ان کی مخالفت کرتے تھے جانتے تھے کہ یہ ہلاک ہونے والے ہیں ظاہر ہے کہ یہ بچ گئے، آپ کی سمجھ میں آگیا اور اسی وقت حکم دیا کہ مجھے دو چادریں انعام میں دی جائیں۔

حیلہ کی ابتداء: کہتے ہیں کہ ہفتے والے دن خوب مچھلیاں آتیں پانی ان سے بھر جاتا پھر بیچ کے کسی دن نظر نہ آتیں دوسرے ہفتے کو پھر یہی حال ہوتا، سب سے پہلے ایک شخص نے یہ حیلہ نکالا کہ ڈور اور کانٹا تیار کیا، مچھلی کو اس میں ہفتے کے دن پھنسالیا اور پانی میں ہی چھوڑ دیا اتوار کی رات کو جاکر نکال لیں بھونا لوگوں کو مچھلی کی خوشبو پہنچی تو سب نے گھیر لیا۔ ہر چند پوچھا لیکن اول تو یہ سختی سے انکار کرتا رہا آخر اسنے بات بنادی کہ دراصل ایک مچھلی کا چھلکا مجھے مل گیا تھا میں نے اسے بھونا تھا، دوسرے ہفتے کے دن اس نے اسی طرح دو مچھلیاں پھانس لیں اتوار کی رات کو نکال کر بھوننے لگا لوگ آگئے تو اس نے کہا میں نے ایک ترکیب نکال لی ہے جس سے نافرمانی بھی نہ ہو اور کام بھی نہ رکے اب جو حیلہ بیان کیا تو ان سب نے اسے پسند کیا اور اکثر لوگ یونہی کرنے لگے۔ یہ لوگ رات کو شہر پناہ کے پھاٹک بند کرکے سوتے تھے جس رات عذاب آیا حسب دستور یہ شہر پناہ کے پھاٹک لگا کر سوئے تھے۔ صبح کو جب باہر والے شہر میں داخل ہونے کو آئے تو خلاف معمول اب تک دروازے بند پائے آوازیں دیں کوئی جواب نہ ملا قلعہ پر چڑھ گئے دیکھا تو بندر بنادیئے گئے ہیں کھول کر اندر گئے تو بندر اپنے اپنے رشتہ داروں کے قدموں میں لوٹنے لگے اس سے پہلے سورۃ بقرہ کی ایسی ہی آیت کی تفسیر کے موقعہ پر بالتفصیل ان واقعات کو اچھی طرح بیان کرچکے ہیں وہیں دیکھ لیجئے۔

صرف منع کرنے والے محفوظ رہے:

دوسرا قول یہ ہے کہ جو چپ رہے تھے وہ بھی ان گنہگاروں کے ساتھ ہلاک ہوئے، ابن عباس سے منقول ہے کہ پہلے ہفتہ کے دن کی تعظیم بطور بدعت خود ان لوگوں نے نکالی اب اللہ کی طرف سے بطور آزمائش کے وہ تعظیم ان پر ضروری قرار دے دی گئی اور حکم ہوگیا کہ اس دن مچھلی کا شکار نہ کرو پھر مچھلیوں کا اس دن نمایاں ہونا

اور دنوں میں نہ نکلنا وغیرہ بیان فرما کر فرمایا کہ پھر ان میں سے ایک شخص نے ایک مچھلی ہفتے کے دن پکڑی اس کی ناک میں سوراخ کرکے ڈور باندھ کر ایک کیل کنارے گاڑ کر اس میں ڈور اٹکا کر مچھلی کو دریا میں ڈال دیا دوسرے دن جا کر پانی میں سے نکال لایا اور بھون کر کھالی سوائے اس پاک باز حق گو جماعت کے لوگوں کے کسی نے نہ اسے روکا نہ منع کیا نہ سمجھایا لیکن ان کی نصیحت کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس ایک کی دیکھا دیکھی اور بھی یہی کام کرنے لگے یہاں تک کہ بازاروں میں مچھلی آنے لگی اور اعلانیہ یہ کام ہونے لگا۔ ایک اور جماعت کے لوگوں نے اس حق والی جماعت سے کہا کہ تم ان لوگوں کو کیوں وعظ کرتے ہو اللہ تو انھیں ہلاک کرنے والا سخت عذاب کرنے والا ہے تو انھوں نے وہ جواب دیا یعنی اللہ کا فرمان دہرایا۔ لیکن لوگ فرمان ربانی کو بھول بیٹھے اور عذاب رب کے خود شکار ہو گئے۔ یہ تین گروہوں میں بٹ گئے تھے ایک تو شکار کھیلنے والا، ایک منع کرنے والا، ایک ان منع کرنے والوں سے کہنے والا کہ اب نصیحت بیکار ہے۔ بس وہ تو بچ گئے جو برابر روکتے رہے تھے اور دونوں جماعتیں ہلاک کر دی گئیں۔ سند اس کی نہایت عمدہ ہے لیکن حضرت ابن عباس کا حضرت عکرمہ کے قول کی طرف رجوع کرنا اس قول کے کہنے سے اولیٰ ہے اس لیے کہ اس قول کے بعد ان پر ان کے حال کی حقیقت کھل گئی واللہ اعلم۔ پھر فرمان ہے کہ ہم نے ظالموں کو سخت عذابوں سے دبوچ لیا۔ مفہوم کی دلالت تو اس بات پر ہے کہ جو باقی رہے بچ گئے۔ (بئیس) کی کئی ایک قراتیں ہیں اس کے معنی سخت کے، دردناک کے، تکلیف دہ کے ہیں اور سب کا مطلب قریب قریب یکساں ہے۔۔ واللہ وعلم خاسئین کے معنی ذلیل و حقیر کے ہیں

نصیحت کرنے والوں میں علیحدگی:

روایت میں آیا ہے کہ جب واعظ ناامید ہو گئے تو خطاکاروں کے ساتھ رہنا بھی ان کو گوارا نہ ہوا اور انھوں نے بستی کو تقسیم کر لیا مسلمانوں کی آبادی کا دروازہ الگ ہو گیا اور مجرموں کی آبادی کا دروازہ الگ ہو گیا اور دونوں آبادیوں میں دیوار حائل ہو گئی اور حضرت داؤد نے مجرموں کے لیے بد دعا کی ایک روزہ صبح کو جب نیکوکار گروہ اٹھا اور بدکاروں میں سے کوئی گھر سے نہیں نکلا تو انھوں نے کہا آج ضرور ان پر کوئی افتاد ہوئی ہے چنانچہ گھروں کے اندر جا کر دیکھا تو سب بندر نظر آئے یہ لوگ اپنے قرابتداروں کو نہ پہچان سکے۔ مگر بندروں نے ان کو پہچان لیا اور پاس آ کر ان کے کپڑے سونگھنے لگے روتے تھے اور ان کے آس پاس لوٹے پھرتے تھے نیک گروہ والے ان سے کہنے لگے کیا ہم تم کو منع نہیں کرتے تھے بندر جواب میں سر ہلا دیتے تھے تین روز تک اسی حال میں رہے لوگ ان کو دیکھتے تھے اور وہ لوگ تین روزہ کے بعد سب مر گئے۔ (تفسیر گلدستہ)

آیت مبارکہ:

وَاِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبۡعَثَنَّ عَلَيۡهِمۡ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ مَنۡ يَّسُوۡمُهُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ‌ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيۡعُ الۡعِقَابِ ۖۚ وَاِنَّهٗ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ‏ ﴿۱۶۷﴾

لغۃ القرآن: [وَاِذْ : اور جب] [تَاَذَّنَ : سنادیا] [رَبُّكَ : آپ کے رب نے] [لَيَبْعَثَنَّ : (کہ) وہ لازما بھیجتا رہے گا] [عَلَيْهِمْ : ان پر] [اِلٰي يَوْمِ الْقِيٰمَةِ : قیامت کے دن تک] [مَنْ : اس کو جو] [يَّسُوْمُهُمْ : تکلیف دے گا ان کو] [سُوْۗءَ الْعَذَابِ: برے عذاب کی] [اِنَّ : بیشک] [رَبَّكَ : آپ کا رب] [لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ : یقینا پکڑنے کا تیز ہے] [وَاِنَّهٗ : اور بیشک وہ] [لَغَفُوْرٌ: یقینا وہ بخشنے والا] [رَّحِيْمٌ: رحم کرنے والا]

ترجمہ: اور (وہ وقت بھی یاد کریں) جب آپ کے رب نے (یہود کو یہ) حکم سنایا کہ (اللہ) ان پر روز قیامت تک (کسی نہ کسی) ایسے شخص کو ضرور مسلّط کرتا رہے گا جو انھیں بری تکلیفیں پہنچاتا رہے۔ بیشک آپ کا رب جلد سزا دینے والا ہے، اور بیشک وہ بڑا بخشنے والا مہربان (بھی) ہے

تشریح: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے حبیب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، آپ کے رب عَزَّوَجَلَّ نے یہودیوں کے آباء واجداد کو ان کے انبیاء عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ عَزَّوَجَلَّ سے زبان سے یہ خبر دی تھی کہ اللہ تعالیٰ قیامت تک یہودیوں پر ایسے افراد مُسلَّط کرتا رہے گا جو انھیں ذلت اور غلامی کا مزہ چکھاتے رہیں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر بخت نصر، سنجاریب، اور رومی عیسائی بادشاہوں کو مسلط فرمایا جو اپنے اپنے زمانوں میں یہودیوں کو سخت ایذائیں پہنچاتے رہے۔ (1) پھر مسلمان سلاطین ان پر مقرر ہوئے، پھر انگریزوں کی غلامی میں رہے، قریب کے دور میں جرمنی میں ہٹلر نے انھیں چن چن کر قتل کیا اور اپنے ملک سے نکال دیا۔ یہودیوں کی حرکتیں ہی ایسی ہیں کہ کوئی سلطنت انھیں اپنے ملک میں رکھنے پر آمادہ نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں بھی کسی سلطنت نے اجتماعی طور پر انھیں اپنے ملک میں نہ رکھا بلکہ انھیں فلسطین میں آباد کیا اور یہیں سے اِنْ شَآءَ اللہ عَزَّوَجَلَّ ان کی بڑی تباہی کا آغاز ہوگا۔ (تفسیر صراط الجنان)

ارشاد ربانی کے مطابق یہود پہ آنے والے عذابات کی تفصیل:

چنانچہ ساری تاریخ یہود اسی چیز سے عبارت ہے۔ عہد یوسف (علیہ السلام) میں یہ لوگ حاکمان مصر بنے۔ پھر ان کی بدعنوانیوں کے سبب ان پر فرعونی قوم مسلط کردی گئی جنہوں نے انھیں غلام بنا کر ان پر خوب مظالم ڈھائے۔ تب موسیٰ (علیہ السلام) کے ذریعے انھیں فرعونیوں سے نجات دی گئی، پھر یہ لوگ گمراہ ہوئے تو ان پر قوم عمالقہ مسلط کردی گئی، تب داؤد (علیہ السلام) کے ذریعے انھیں آزاد کروایا گیا۔ پھر زکریا و یحییٰ (علیہما السلام) کے قتل اور عیسیٰ (علیہ السلام) کے قتل کی منصوبہ سازی کے سبب ان پر اہل روم کو مسلط کیا گیا۔ تب یہ دنیا میں تتر بتر ہوگئے۔ ان میں سے کچھ لوگ مدینہ طیبہ میں آکر نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے انتظار میں رہنے لگے۔ جب حضور سید کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مبعوث ہوئے تو یہ قوم حسد میں مبتلا ہو کر آپ سے منکر ہوگئی، تب ان کو قتل اور جلاوطن کیا گیا پھر اس قوم کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہ تھا۔ یہ اطراف عالم میں ٹھوکریں کھاتی پھرتی تھی۔

پھر سترھویں صدی عیسوی کے اواخر میں یہ قوم جرمنی میں جمع ہوگئی مگر اپنی شرارت پسند عہد شکن طبیعت کے سبب انھوں نے امریکہ و برطانیہ کا خفیہ ساتھ دیا۔ تب جرمنی کے ہٹلر نے ان کا وہ قتل عام کیا کہ انھیں جڑ سے اکھیڑ دیا، تب امریکہ و برطانیہ نے سازشوں کے جال پھیلا کر فلسطین میں سترہ صدیوں کے بعد اسرائیلی حکومت دوبارہ قائم کروادی۔ آج یہ قوم امریکہ کے بل بوتے پر دنیا میں قتل و غارت کا بازار گرم کیے ہوئے مگر امریکی عوام میں یہ شعور بیدار ہورہا ہے کہ یہودی قوم کی وجہ سے امریکہ کی مالی اور افرادی قوت تباہ ہورہی ہے اور وہ دن دور نہیں کہ یہود پر امریکہ ہی نئی تباہی لائے گا اور قرب قیامت میں یہ قوم حضرت امام مہدی (رض) اور عیسیٰ (علیہ السلام) کے ہاتھوں مکمل ختم کردی جائے گی۔ یوں ارشاد باری عالی: لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَن يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ، کی تکمیل ہوگی۔ معلوم ہوا کہ یہود کی موجودہ کامیابی عارضی ہے جو جلد یا بدیر ختم ہو جائے گی۔

اس آیت میں دو بار ربک فرمایا گیا گویا اللہ رب العزت اپنی ربوبیت کا تعارف اپنے محبوب کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حوالے سے کرواتا ہے کیونکہ آپ اس کی ربوبیت کے مظہر اتم ہیں۔ (تفسیر برہان القرآن)

صاحب مدارک فرماتے ہیں کہ یہ لوگ وہ ہیں جو عہد رسالت میں تھے اور یہودیت کی وجہ سے اسلام کے خلاف چلتے تھے۔ ان کا حال بتایا جاتا ہے کہ وہ لیتے ہیں دنیا کا مال یعنی بطور رشوت لے کر احکام میں تبدیلی اور کلام الٰہی میں تغیر و تحریف گوارہ کرتے ہیں باآنکہ وہ جانتے بھی ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام لیکن غرض دنیا کے لالچ میں اس گناہ عظیم پر مصر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں عنقریب ہماری بخشش ہو جائے گی اور جو گناہ ہم نے کیا ہے اس کا مواخذہ نہ ہوگا اور اگر ویسا ہی مال ان کے پاس اور آجائے تو پھر بھی لے لیں اور گناہ پر گناہ کرتے جائیں۔

علامہ سدی (رح) فرماتے ہیں کہ سارے بنی اسرائیل میں کوئی قاضی بھی ایسا نہ تھا جو رشوت خور نہ ہو اور اگر انھیں ملامت کی جاتی کہ یہ کام اچھا نہیں ہے تو کہہ دیتے یہ گناہ ہمیں معاف ہو جائے گا اور اگر یہ ملامت کرنے والوں کی جگہ ہوتا تو یہ خود بھی اسی طرح رشوت خوری کرتا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

کیا ان پر نہ لیا گیا عہد کتاب کا کہ نہ کہیں گے اللہ کی طرف سے مگر حق اور انھوں نے اسے پڑھا جو اس میں تھا لیکن باوجود اس کے انھوں نے خلاف کیا توراۃ میں گناہ پر اصرار کرنے والے کے لیے مغفرت کا وعدہ نہ تھا مگر وہ یہی افتراء کرتے رہے کہ ہم پر مواخذہ نہ ہوگا اور گناہ میں حد سے بڑھے اور توبہ نہ کی اور آخرت کا گھر

پرہیزگاروں کے لیے بہتر ہے جو اللہ کے عذاب سے خائف ہو کر رشوت ستانی اور حرام خوری سے اجتناب کریں اور حرام سے بچیں۔ اللہ کی فرمان برداری کریں تو کیا تمہیں عقل نہیں۔

اور وہ جو کتاب کو مضبوط تھامتے ہیں یعنی اس کے مطابق عمل کرتے ہیں اس میں اپنی خواہشات کے مطابق تغیر تبدل نہیں کرتے اور نماز قائم رکھتے ہیں ہم نیکوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ اس کا شان نزول اپنی کتاب میں سے حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ ایسے اصحاب رضوان کے حق میں ہے جنہوں نے تورات پر ایمان لا کر اس کا اتباع کیا اور تحریف نہ کی اس کے مضامین کو نہ چھپایا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے۔ (خازن ومدارک) (تفسیر الحسنات)

فلسطین میں اسرائیل کا قیام قرآن مجید کے خلاف نہیں ہے

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہود کی سرکشی اور معصیت پر دلیر کا ذکر فرمایا تھا اور یہ کہ اس کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے ان کو مسخ کرکے بندر بنا دیا اور اس آیت میں ذکر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے ان کے لیے ذلت اور غلامی مقدر کر دی ہے اور یہ بھی ان کی بداعمالیوں کی سزا ہے اور یہ ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے زمین میں مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے رسول مکرم! آپ کے رب نے یہود کے پہلے لوگوں کو ان کے انبیاء کی زبان سے یہ خبر دی تھی کہ اللہ تعالیٰ قیامت تک کے لیے یہود پر ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو ذلت اور غلامی کا مزا چکھائیں گے، ان پر جزیہ فرض کیا جائے گا، ان کی جمعیت ٹوٹ جائے گی اور ان کا شیرازہ بکھر جائے گا اور یہ مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر زمین پر زندگی گزاریں گے۔ سب سے پہلے ان پر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے خراج کو لازم کیا، پھر ان کو یونانیوں نے غلام بنایا پھر کشدانیوں، کلدانیوں اور بابلیوں نے ان کو محکوم بنایا، پھر روم کے نصاریٰ نے ان کو غلام بنایا اور ان سے جزیہ اور خراج لیا، پھر مسلمانوں نے ان سے جزیہ اور خراج لیا، اس کے بعد قریب کے دور میں جرمنی میں ہٹلر نے ان کو چن چن کر قتل کیا اور ملک بدر کر دیا۔

رہا یہ کہ اب انھوں نے فلسطین پر قبضہ کر لیا اور اسرائیل کے نام سے اپنی حکومت قائم کر لی ہے تو وہ قرآن مجید کے خلاف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ضربت علیہم الذلۃ این ماثقفوا الا بحبل من اللہ وحبل من الناس: وہ جہاں بھی پائے جائیں گے ان پر ذلت لازم کر دی گئی بجز اس کے (کبھی) اللہ کی رسی اور (کبھی) لوگوں کی رسی کے ساتھ انھیں سہارا مل جائے" (آل عمران: 112)۔ اور اسرائیل کی حکومت کا قیام برطانیہ اور امریکہ کے سہارے سے ہوا ہے اور اب بھی بظاہر وہاں یہویوں کی حکومت ہے اور درپردہ برطانیہ اور امریکہ ہی کی حکومت ہے، اگر آج ان کے سروں پر سے برطانیہ اور امریکہ کا سایہ اٹھ جائے تو وہ پھر محکومی اور غلامی کی زندگی گزاریں گے۔

یہودیوں میں نیکوکار اور بدکار

اور ان پر دوسرا عذاب یہ مسلط فرمایا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر دنیا میں رہتے ہیں، ان میں صالح اور نیک لوگ بھی تھے جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد دیگر انبیاء (علیہم السلام) پر ایمان لائے، اور ان میں وہ بھی تھے جو ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے اور وہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتے تھے۔ جیسے حضرت داؤد (علیہ السلام) کے زمانہ میں وہ لوگ تھے جو سنیچر کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کرتے تھے اور جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے اصحاب (رض) اور بعض وہ لوگ تھے جو نیکی اور پرہیزگاری میں ان سے کم تھے، ان میں سے بعض فاسق وفاجر تھے، اور بعض کافر تھے، یہ لوگ انبیاء (علیہم السلام) کو ناحق قتل کرتے تھے، یہ لوگ جھوٹ بولتے تھے اور سود کھاتے تھے اور رشوت لے کر احکام بدل دیتے تھے اور جھوٹے فیصلے کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ ان دونوں فریقوں کے ساتھ اسی طرح معاملہ فرمائے گا جیسے اوروں کے ساتھ معاملہ فرماتا ہے، نیک لوگوں کو جزا دے گا اور بدکاروں کو سزا دے گا اور اللہ تعالیٰ ان کو آزمائش میں ڈالتا ہے، ان کو نعمتیں اور راحتیں عطا فرماتا ہے تاکہ یہ شکر بجا لائیں اور مصائب اور آلام میں مبتلا کرتا ہے تاکہ یہ صبر کریں۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۡ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝۱۶۸

لغۃ القرآن: [وَقَطَّعْنٰهُمْ : اور ہم نے تقسیم کیا ان کو] [فِي الْاَرْضِ : زمین میں] [اُمَمًا : گروہوں میں] [مِنْهُمُ : ان میں سے] [الصّٰلِحُوْنَ : نیک (بھی) ہیں] [وَمِنْهُمْ : اور ان میں سے] [دُوْنَ ذٰلِكَ : اس کے علاوہ (بھی) ہیں] [وَبَلَوْنٰهُمْ : اور ہم نے ان کو آزمایا] [بِالْحَسَنٰتِ : بھلائیوں سے] [وَالسَّيِّاٰتِ : اور برائیوں سے] [لَعَلَّهُمْ : تاکہ وہ] [يَرْجِعُوْنَ : رجوع کریں]

ترجمہ: اور ہم نے انھیں زمین میں گروہ در گروہ تقسیم (اور منتشر) کر دیا، ان میں سے بعض نیکوکار بھی ہیں اور ان (ہی) میں سے بعض اس کے سوا (بدکار) بھی اور ہم نے ان کی آزمائش انعامات اور مشکلات (دونوں طریقوں) سے کی تاکہ وہ (اللہ کی طرف) رجوع کریں

تشریح: اس آیت کریمہ میں یہودیوں پر ایک اور عذاب کا ذکر ہے جو اسی دنیا میں ان کو دی گئی اور وہ یہ کہ ان کی آبادی دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر اور متفرق ہو گی انہیں ایک جگہ رہنے اور بسنے کی نعمت نصیب نہیں ہوئی اور کسی جگہ ایک ملک میں ان کا اجتماع نہ رہا۔ و قطعنھم فی الارض امما "کا یہی مطلب ہے یہ تقطیع سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دینا مطلب یہ ہے کہ ہم نے یہود کی قوم ٹکڑے ٹکڑے زمین کے مختلف حصوں میں متفرق اور منتشر کر دیے۔

کسی قوم کا منتظر ہونا ایک گونہ عذاب الٰہی ہے:

اس سے معلوم ہوا کہ کسی قوم کا ایک جگہ اجتماع اور اکثریت خداوند قدوس کا انعام اور احسان ہے اور اس کا مختلف جگہوں میں منتشر اور متفرق ہو جانا ایک طرح کا عذاب الٰہی ہے مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ انعام ہمیشہ رہا ہے اور انشاء اللہ تا قیامت رہے گا کہ وہ جس جگہ رہیں ان کی ایک زبردست اجتماعی قوت وہاں پیدا ہو گئی مدینہ طیبہ سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور مشرق و مغرب میں اسی کیفیت کے ساتھ حیرت انگیز طریقہ پر پھیلا مشرق بعید میں پاکستان بنگلہ دیش اور افغانستان ملائشیا انڈونیشیا وغیرہ مستقل اسلامی حکومت کے نتیجہ میں بنیں۔

اس کے بالمقابل یہودیوں کا حال ہمیشہ یہ رہا کہ وہ مختلف ملکوں میں منتشر رہے مالدار کتنے بھی ہوں مگر اقتدار اور اختیار سے محروم رہے چند سال پہلے فلسطین کے ایک حصہ میں ان کے اجتماع اور مصنوعی اقتدار سے دھوکہ نہ کھایا جائے اجتماع تو انکا اس جگہ میں آخری زمانہ میں ہونا ہی چاہیے تھا کیونکہ صادق و مصدوق سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی احادیث صحیحہ قرب قیامت کے لیے یہ خبر دی گئی ہے کہ آخری زمانہ میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نازل ہوں گے نصاری سب مسلمان ہو جائیں گے اور یہودیوں سے جہاد کرکے انہیں قتل کر دیں گے اللہ تعالیٰ کا مجرم وارنٹ اور پولیس کے ذریعہ پکڑ کر نہیں بلایا جاتا بلکہ وہ تکوینی اسباب ایسے جمع کر دیتے ہیں کہ مجرم اپنے پاؤں پر چل کر ہزاروں کوششیں کرکے اپنی قتل گاہ پر پہنچتا ہے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا آسمان سے نزول ملک شام دمشق میں ہونے والا ہے یہودیوں کے ساتھ معرکہ بھی یہیں ہوگا تاکہ عیسیٰ (علیہ السلام) کے لیے ان کا قلع قمع کرنا آسان ہو۔ قدرت نے دنیا کی پوری عمر میں تو یہودیوں کو مختلف ملکوں میں منتشر رکھ کر محکومیت اور ذلت کا عذاب انہیں چکھایا اور آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی سہولت کے لیے ان کو ایک مقتل میں جمع فرمایا اس لئے یہودیوں کا یہ اجتماع ان کے انتشار والے عذاب کے منافی نہیں۔

اسرائیل کی حکومت مستقل یہودیوں کی مملکت نہیں:

یہودیوں کی موجودہ حکومت مصنوعی اقتدار کا ایک ناتمام شوشہ ہے بلکہ یہ ایک مصنوعی دھوکہ ہے جس پر آج کی مہذب دنیا نے اگرچہ بہت خوبصورت ملمع سازی کا پردہ چڑھایا ہوا ہے لیکن کوئی دنیا کی سیاست سے باخبر انسان ایک منٹ کے لئے بھی اس سے دھوکا نہیں کھا سکتا کیونکہ آج جس خطہ کو اسرائیلی مملکت کا نام دیا جارہا ہے وہ درحقیقت عالم اسلام کے خلاف روس امریکہ برطانیہ اور فرانس کی ایک مشترکہ چھاؤنی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور ان کے تابع فرمان رہنے ہی میں اس کے وجود کا راز مضمر ہے۔

ظاہر ہے کہ اس حقیقی غلامی کو مجازی حکومت کا نام دینے سے اس قوم کو کوئی اقتدار حاصل نہیں ہو جاتا۔ قرآن کریم نے ان کے بارے میں تاقیامت رسوائی اور خواری کے جس عذاب کا ذکر کیا ہے وہ آج بھی بدستور موجود ہے جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے "واذ تاذن ربک لیبعثن علیھم الی یوم القیمۃ" یعنی جب کہ آپ کے رب نے پختہ ارادہ کرلیا کہ ان یہودیوں پر کسی ایسی طاقت کو قیامت تک مسلط کردے گا جو ان کو برا عذاب چکھائیں جیسا کہ پہلے حضرت سلیمان کے ہاتھ سے پھر بخت نصر کے ذریعے وغیرہ۔

"منھم الصلحون و منھم دون ذلک" یعنی ان لوگوں میں کچھ نیک ہیں اور کچھ دوسری طرح کے یعنی بدکار و فجار لوگ ہیں۔ نیک لوگ وہی ہیں جنہوں نے تورات پر عمل کیا پھر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لائے اور پھر نزول قرآن کے بعد قرآن کے تابع ہوگئے اور حضرت خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے اسی طرح وہ دوہرے اجر وثواب کے حقدار ہوگئے اور ان کے بالمقابل وہ لوگ ہیں جنہوں نے نہ تورات پر عمل کیا اور نہ انجیل پر اور نہ ہی قرآن کریم پر اس کے علاوہ وہ تورات میں بھی تحریف کر چھوڑے۔

"وبلونھم بالحسنت والسیات لعلھم یرجعون" اور ہم نے ان کی آزمائش کی انہیں خوشحالیوں میں بھی رکھا اور بدحالیوں میں بھی رکھا انسان کی فرمانبرداری اثر کشی کا امتحان لینے کے دو ہی طریقے ہیں ان پر دونوں استعمال کرلئے گئے مگر قوم یہود دونوں امتحانوں میں فیل ہوگی کیونکہ انہوں نے نعمتوں کے شکر تو کیا الٹا ناشکری اور تکذیب کی اور تکالیف و مصائب پر صبر کرنے کے بجائے "ان اللہ فقیر ونحن اغنیاء" اور اسی طرح "ید اللہ مغلولۃ" جیسے کفریہ کلمات کہتے رہے اور انبیاء کی تکذیب کی اور ان کے قتل کے مرتکب ہوئے یہاں تک کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے قتل کے درپے ہوئے۔

اسی بنیاد پر وہ مبغوض و ملعون قرار پائے اور دنیا کے مختلف ملکوں میں منتشر ہوئے انہیں اجتماعیت کی نعمت نصیب نہیں ہوئی اور ذلت و خواری میں مسکن تو محتاجی میں ڈالے گئے اور مستقل اقتدار سے محروم ہوئے۔ (تفسیر منازل العرفان)

بنی اسرائیل کا قومی انتشار

گزشتہ آیت کریمہ میں پروردگار نے انبیاء کرام کی معرفت بنی اسرائیل کو اس بات کو نوٹس جاری کیا تھا کہ اگر تم نے اپنی حالت نہ بدلی اور تم بداعمالیوں سے باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ تم پر ظالم حکمرانوں کو مسلط کرے گا وہ خود تمہارے اندر سے ہوں یا باہر سے۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ بعض ظالم حکمران جو قوم کے اندر سے ہوں وہ اپنی قوم کو اپنی خواہشات کو پوری کرنے کے لیے ظلم کا نشانہ بناتے ہیں لیکن جب قوم اپنی حدود سے بالکل نکل جاتی ہے اور ہر طرح اجتماعی صلاحیتوں سے محروم ہو جاتی ہے اور ان کا آپس کا ربط وضبط انتشار وافتراق میں بدل جاتا ہے تو پھر باہر سے ظالم لوگوں کو حملہ کرنے کا موقع ملتا ہے تو وہ بالعموم ایسی قوموں کی اجتماعی قوت کو توڑنے کے لیے انھیں منتشر کردیا کرتے ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے ساتھ اللہ کی نافرمانی کے باعث ایسے ہی حوادث پیش آئے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے مصریوں کی غلامی سے نجات دلا کر صحرائے سیناء میں انھیں ایک قوم بنانے اور اس میں تنظیم پیدا کرنے کی کوشش کی۔ آپ مسلسل اس کے لیے محنت فرماتے رہے لیکن یہ غلامی کی ماری ہوئی قوم آزاد قوم کی سی صلاحیت پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ جب بھی انھیں قومی توانائی کا ثبوت دینے کے لیے کسی بھی امتحان میں ڈالا گیا تو یہ بری طرح ناکام ہوئے یہ چونکہ چار سو سال تک انسانوں کی چاکری کرکے روٹی کھانے کے ہنر کے سوا اور ہر قومی خصوصیت سے محروم ہو چکے تھے اس لیے اپنے اندر عزت اور وقار کی زندگی کا شعور پیدا کرنا اور قومی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ان کے لیے آسان نہ تھا وہ روٹی حاصل کرنے کے لیے مزدوری تو کرسکتے تھے اور اپنے آقا کی خوشنودی کے لیے ذلت آمیز بیگار سے بھی انھیں انکار نہ تھا لیکن قوموں کو اپنا وجود ثابت کرنے کے لیے ایثار و قربانی کی جن کٹھن وادیوں سے گزرنا پڑتا ہے جو اں ہمتی اور اولوالعزمی کی جو تاریخ رقم کرنا پڑتی ہے وہ ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لیے موسیٰ (علیہ السلام) مسلسل محنت کے باوجود غلامی کی پروردہ نسل کو تو

کسی تبدیلی سے آشنا کرنے سے معذور رہے البتہ جو نسل صحرا میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی ان سے امیدیں وابستہ کی جاسکتی تھیں وہ لوگ جب اپنی ذمہ داریوں کی عمر کو پہنچے تو موسیٰ (علیہ السلام) اور ہارون (علیہ السلام) تو اللہ کو پیارے ہوگئے لیکن ان کے جانشینوں نے اس تنظیمی عمل کو آگے بڑھایا اور ان میں قومی شعور توانا کر کے ایک ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ تاریخ کا یہ سفر آگے بڑھتا رہا حتی کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے زمانے میں بنی اسرائیل اپنی تنظیم اور قومی خصوصیات میں اپنی معراج کو پہنچے لیکن جیسے ہی حضرت سلیمان (علیہ السلام) اللہ کو پیارے ہوئے تو بنی اسرائیل کے زوال کا سفر شروع ہوگیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہر قوم جب اپنی ترقی کے معراج پر پہنچتی ہے تو بالعموم وہیں سے اس کے زوال کا سفر شروع ہوتا ہے کیونکہ جب کسی چیز کو حاصل کرنا پیش نظر ہوتا ہے تو محنت اور کوشش کی لگن رواں دواں رہتی ہے اس سفر کے ہر شریک کار کو مسلسل یہ خیال رہتا ہے کہ ہم لوگ ایک منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں اگر ہم نے ذرا بھی محنت سے جی چرایا تو وہ منزل کبھی بھی ہمارے ہاتھ نہیں آئے گی لیکن جب وہ منزل کے قریب پہنچتے ہیں یا جب منزل حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو پھر عموماً لمبی تان کر سو جاتے ہیں۔ محنت وکاوش ،علم ودانش ، ربط و تنظیم اور ایثار وقربانی ہر چیز اپنی صف لپیٹ دیتی ہے اب ان کے پیش نظر محنت نہیں بلکہ محنت کا پھل ہوتا ہے ہر ایک کوشش کرتا ہے کہ میں اس پھل سے زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل کرسکوں۔ پہلے ان کا سرمایہ سفر ارادے کی قوت ،عملِ پیہم ، باہمی ارتباط اور دوسروں کے لیے ایثار ہوتا ہے لیکن منزل پر پہنچنے کے بعد ان کی منزل ان کے لیے خوان یغما بن جاتی ہے۔ ہر شخص اپنی ہمت سے بڑھ کر ہاتھ مارنے اور سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے ایسی صورت میں خود غرضی ، نفسانیت ، مفاد پرستی اور ہوس زر کا دور دورہ ہوجاتا ہے ایسی صورت میں زوال اور انحطاط کے سوا کسی اور چیز کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔

برصغیر میں مسلمانوں کے عروج کا دور اورنگزیب عالمگیر کا زمانہ ہے۔ جیسے ہی عالمگیر کی آنکھیں بند ہوئیں تو اس کے جانشینوں اور صوبوں کے امراء نے وہ لوٹ کھسوٹ مچائی کہ پورا ملک زوال کی گرفت میں آگیا۔ خلافتِ راشدہ کے بعد بنی امیہ کی تاریخ ، بنی امیہ کے بعد بنی عباس کی تاریخ اور پھر مختلف خاندانوں کی حکومتوں کی تاریخ ایک سے ایک بڑھ کر اس تاریخی حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کررہی ہے۔ بنی اسرائیل کے ساتھ بھی یہی حادثہ پیش آیا۔ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے دنیا سے جاتے ہی ان کا بیٹا ان کا جانشین ہوا اور اس نے اس زمانے کی سب سے اس بڑی حکومت کو اپنی میراث سمجھ کر اپنی خواہشات کی بھینٹ چڑھانا شروع کردیا۔ پورے ملک میں فسق وفجور کو پھیلنے کا موقع مل گیا۔ امراء میں رقابت شروع ہوگئی ہر کوئی حکومت کا خواب دیکھنے لگا اس انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے ایک غلام نے الگ حکومت بنالی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سلیمان (علیہ السلام) کی حکومت جس کی قوت و شوکت کے سامنے کبھی کسی دوسری ریاست کو سر اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی خلفشار کا شکار ہوگئی۔ ایک متحدہ سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی ایک کا نام اسرائیل ٹھہرا اور دوسری کا یہودیہ۔ ایک کا دارالحکومت سامرہ تھا اور دوسری کا یروشلم۔ اب ان دونوں حکومتوں میں تصادم شروع ہوا چنانچہ ۹۳۷ ق م سے لے کر ۵۸۶ ق م تک بنی اسرائیل کی تاریخ خانہ جنگی کی تاریخ ہے دونوں ریاستیں آپس میں ٹکراتی رہیں اور ان کے باہمی جنگ وجدل کے باعث قریبی ریاستوں کو یہ جرات ہوئی اور انھوں نے بار بار ان پر حملے کرنے شروع کیے کبھی مصر کا حکمران چڑھ دوڑتا اور کبھی صور وصیدا میں سے کوئی حکمران حملہ آور ہوتا لیکن بنی اسرائیل نے اس سے بھی کوئی سبق نہ سیکھا حتی کہ ان کا یہ اختلاف وانتشار اس وقت اپنی انتہاء کو پہنچ گیا جب بخت نصر نے ان پر حملہ کرکے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجادی ان کے ہزاروں لوگ قتل ہوگئے۔ ہزاروں لوگوں کو اپنی ریاست کے مختلف شہروں میں تتر بتر کردیا اور ہزاروں کو غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گیا اور پھر ان کا یہ انتشار وافتراق اور مختلف ملکوں میں ان کا بکھیرا جانا ایک ایسی حقیقت ہے کہ موجودہ اسرائیلی حکومت سے پہلے جسے اپنی آنکھوں سے دیکھا جاسکتا تھا اور اب بھی یہ بڑی طاقتوں کے سائے میں پلنے والا ناسور کسی لمبی عمر کی خبر نہیں دے رہا بلکہ اس کے طور اطوار یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ قدرت کی طرف سے کوئی بھی فیصلہ دوبارہ انھیں ان کے انجام سے دوچار کردے گا۔ چنانچہ اس پوری صورتحال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو زمین میں گروہ گروہ کرکے منتشر کردیا۔

اجتماعی اصلاح کے لیے اہل خیر کا مضبوط ہونا ضروری ہے

قطعنا تقطیع سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ٹکڑے ٹکڑے کردینا ، منتشر کردینا۔ اور امم امت کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ایک جماعت یا ایک فرقہ یا گروہ۔ ان الفاظ میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے اس کے بعد دوسرا جملہ ہے :

(مِنۡهُمُ الصّٰلِحُوۡنَ وَمِنۡهُمۡ دُوۡنَ ذٰلِكَ ان میں سے کچھ نیک لوگ تھے اور کچھ ان سے مختلف تھے۔)

اس جملہ میں بھی ایک بہت بڑی حقیقت منکشف کی گئی ہے وہ حقیقت یہ ہے کہ قوموں کا زوال جب آخری حدوں کو چھونے لگتا ہے اور ان کی قومی زندگی کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے اور ان میں ایک ایک کرکے قومی خصوصیات ختم ہوتی جاتی ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس قوم میں تمام لوگ بگڑ چکے ہیں اور سرے سے ان میں کوئی صالح طبقہ موجود نہیں ہے بلکہ زوال پذیر اور بگڑی ہوئی قوموں میں بھی نیک لوگ بھی موجود ہوتے ہیں اس کے باوجود ان کا زوال بڑھتا چلا جاتا ہے اس کی وجہ کیا ہوتی ہے ؟ اس وجہ کو بیان کرنے سے پہلے ہم یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ قوم کے اندر صالح لوگوں کے ہونے سے ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وہ عذاب جس سے قوموں کی جڑ کٹ جاتی ہے اور خیر کے تمام سوتے خشک ہو جاتے ہیں اور قدرت ایسی قوم کو دھرتی کا بوجھ سمجھ کر مٹا دیتی ہے ایسی قوم پر نہیں آتا جس میں کچھ نہ کچھ نیک لوگ موجود ہوں یعنی ان میں نیکی اور خیر کی دعوت دینے والے اور اپنی ہمت اور وسائل کے مطابق دین کی خدمات انجام دینے والے اور قوم کے انکار اور استہزاء کے باوجود انھیں آخرت یاد دلانے والے موجود ہوں ان کی وجہ سے قوم کا بڑا حصہ جو برائیوں میں مبتلا ہو چکا ہوتا ہے وہ فیصلہ کن عذاب سے بچا رہتا ہے اور قدرت ان کو ڈھیل دیتی رہتی ہے کہ تمہارے اندر خیر کی دعوت دینے والے ابھی تک موجود ہیں تمہارے لیے ابھی موقع ہے کہ ان کی دعوت قبول کرکے اپنے برے انجام سے بچ جاؤ۔

لیکن جہاں تک تباہی کی طرف بڑھنے کا سوال ہے یہ نیک لوگ اس سے انھیں نہیں روک سکتے وہ اپنی ساری کوششوں کے باوجود تباہی کی طرف جانے کے نتائج سے انھیں آگاہ تو کر سکتے ہیں لیکن ان کا رخ پھیرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے وجہ اس کی یہ ہے کہ قوموں کو لیڈ اور فیڈ کرنے والے پالیسیاں بنانے والے پالیسیوں پر عمل کرنے والے قوم اور ملک کو جہت سفر دینے والے اور ان کے اعصاب اور ان کے مرکز اعصاب کو کنٹرول کرنے والے صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو طبقہ خواص سے تعلق رکھتے ہیں ' جو عدالتوں میں ججز کی کرسی پر بیٹھتے۔ ایوانِ حکومت میں حکمرانی کرتے ' پارلیمنٹ میں قانون سازی کرتے ' تعلیمی اداروں کو نصاب تعلیم دیتے ' ابلاغ کو ابلاغ کی جہت دیتے، تربیتی اداروں میں مختلف شکلوں میں تربیت کا سامان کرتے اور انتظامی اداروں میں اختیارات پر قابض ہوتے اور انھیں استعمال کرتے ہیں۔ جب یہ طبقات بگڑ جاتے ہیں تو پھر عام لوگ آہستہ آہستہ ان کے رنگ میں رنگنا شروع ہو جاتے ہیں اور بے بسی کا شکار ہو کر ان کے اشاروں پر چلنے لگتے ہیں۔

زندگی کے مقاصد دم توڑ جاتے اور ضروریات زندگی مقاصد زندگی بن کر عام آدمی کی زندگی میں حکمرانی کرنے لگتے ہیں اس صورت حال میں اگر ان میں کچھ نیک لوگ موجود بھی ہوں تو ان کی نیکی عبادت گاہوں یا چند دینی اداروں تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ بنی اسرائیل اسی صورتحال سے دوچار تھے وہ مکمل طور پر برائی کی گرفت میں کبھی نہیں آئے ان میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی طبقہ نیکی اور خیر کے ساتھ وابستہ رہا ہے اور اسی وجہ سے وہ اجتماعی عذاب سے بچے رہے۔ لیکن یہ انفرادی نیکی اجتماعی تباہی کا راستہ نہ روک سکی جس کے نتیجے میں نہ ان کا کوئی ملک محفوظ رہا نہ قومی زندگی محفوظ رہی۔ وہ انفرادی یا جماعتی طور پر دولت کمانے یا دوسروں کے خلاف سازشیں کرنے میں تو ضرور کامیاب رہے لیکن اپنی اجتماعی زندگی کو بروئے کار لانے اور اپنے فیصلے آپ کرنے سے محروم ہو گئے۔

بنی اسرائیل کی زندگی کا یہ وہ آئینہ ہے جس میں ہم اپنی قومی زندگی کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہم نے یہ مملکت خداداد اسلامی زندگی گزارنے اور اسلامی نظام نافذ کرنے کے لیے اللہ سے مانگ کر لی تھی اور اس کے لیے ہم نے اتنی بڑی قربانی دی کہ معلوم تاریخ میں اس کی مثالیں کم کم ملیں گیں۔ لیکن جب ہم نے اللہ سے کیے ہوئے اس وعدے سے انحراف کیا بلکہ رفتہ رفتہ اس وعدے کے خلاف بغاوت کردی اس کا سب سے پہلا نتیجہ وہی نکلا جو بنی اسرائیل کو پیش آیا تھا کہ ہماری اجتماعی زندگی میں دراڑیں پڑیں حتیٰ کہ عالم اسلام کی یہ سب سے بڑی مملکت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں گروہوں میں منتشر کرکے رکھ دیا۔ آج آدھا پاکستان ہمارے پاس ہے لیکن اس میں بھی ہمارے صوبائی تعصّبات ' لسانی عصبیتیں ' گروہی مفادات پوری طرح اپنا رنگ دکھا رہے ہیں قوم میں نیک لوگوں کی کمی نہیں لیکن آہستہ آہستہ ہمارے اجتماعی فیصلہ کرنے کے سرچشمے لادینیت کے قبضے میں جا رہے ہیں۔ ہماری پارلیمنٹ اولاً تو خیر کی نمائندہ نہیں رہی اور اگر اس کی کچھ امید بھی کی جاسکتی ہو تو ایک پیر تسمہ پا ہے جو ان کے سروں پر بیٹھا ان کو کچھ کرنے کی اجازت نہیں دے رہا ہمارے تعلیمی ادارے نہ صرف لادینیت کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں بلکہ جہاں کہیں دین کی کوئی تھوڑی بہت خدمت ہو رہی ہے اس کا برداشت کرنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ ہمارے ذرائع ابلاغ تو پوری طرح شیطانی قوتوں کے نرغے میں ہیں اور یہ شیطانی قوتیں شب و روز کروڑوں لوگوں کے ذہنوں کو مسموم کرنے کا فرض انجام دے رہی ہیں۔ ہمارے اخبارات چند ایک کو چھوڑ

کر نہ جانے کس کی خدمت بجالا رہے ہیں اس طرح سے ہماری اجتماعی زندگی اس ملک کے مقصد وجود سے رفتہ رفتہ منحرف ہوتی جارہی ہے ایسی صورتحال میں خدشات بڑھتے جارہے ہیں اور بنی اسرائیل کی تاریخ کو دیکھتے ہوئے اس آخری امت کے بارے میں تشویش میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں بار بار بنی اسرائیل کی تاریخ سے سبق سیکھنے کا حکم دیا ہے اور قرآن کریم اسی لیے پلٹ پلٹ کر ان کی تاریخ ہمارے سامنے لارہا ہے تاکہ یہ حامل دعوت امت سابقہ حامل دعوت امت کے زوال کے اسباب سے آگاہ ہو کر اپنے بچاؤ کی کوشش کرسکے۔

آزمائش کے دو طریقے

اس آیتِ کریمہ میں تیسرا جملہ:

{ وَبَلَوۡنٰهُمۡ بِالۡحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ } ہے۔

" اور ہم نے ان کو خوشحالیوں اور بدحالیوں سے آزمایا شائد وہ رجوع کریں "۔

بنی اسرائیل کو راہ راست پر لانے کے لیے پروردگار نے دو طریقے اختیار فرمائے اور یہ بنی اسرائیل کی خصوصیت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہر قوم کو سمجھانے اور راہ راست پر لانے کے لیے یہی دونوں طریقے اختیار فرماتے رہے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ کوئی قوم اللہ کے راستے سے انحراف اختیار کرتی ہے تو پروردگار اسے مصیبتوں اور تکلیفوں میں مبتلا کرکے غور وفکر کرنے کی دعوت دیتا ہے اور انھیں یہ بات باور کروائی جاتی ہے کہ تم اس زمین پر اس طرح زندگی گزار رہے ہو جس طرح ایک ایسی قوم زندگی گزارتی ہے جس کا کوئی خدا نہ ہو اور اسے یہ یقین ہو کہ اسے کبھی موت نہیں آئے گی اور اسے کبھی کسی کے سامنے جواب دہی نہیں کرنی وہ زمین ہی کو اپنا اول وآخر مسکن سمجھتی ہے اور اسی میں مرمٹنا اس کی زندگی کی انتہاء ہے جو اس کے جی میں آتا ہے وہ فیصلے کرتی ہے اور جو چاہتی ہے وہ اپنی منزل متعین کرلیتی ہے اس کی کامیابی اور ناکامی کے اپنے پیمانے ہیں کیونکہ اس کی زندگی اس کے اپنے گرد گھومتی ہے ان کو یہ بتلانے کے لیے کہ تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ تم یہاں ہر فیصلہ کرنے کے مجاز ہو تمہارے اوپر کوئی اور بڑی ذات بھی ہے جس نے تمہیں بے مقصد پیدا نہیں کیا اور پھر تمہیں اندھیرے میں بھی نہیں رکھا بلکہ اس مقصد سے آگاہی دینے کے لیے وہ بار بار پیغمبر بھیجتا رہا ہے اب یہ مصیبتیں ' تکلیفیں ' وبائیں ' زلزلے اور بیماریاں بھیج کر وہ تمہیں توجہ دلانا چاہتا ہے کہ دیکھو! اگر تم اپنی زندگی اور اپنی قسمتوں کے خود مالک ہوتے تو تمہیں یہ حوادث پیش نہ آتے تم جب چاہتے ان حوادث کا راستہ روک لیتے یا انھیں اپنے سے دور کردیتے لیکن تم اس پر قادر نہیں ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اوپر ایک اور ذات ہے جس نے تمہیں زندگی گزارنے اور زمین پر رہنے کی آزادی بخشی ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ تم اس سے آزاد ہو کر زندگی گزار سکتے ہو اس کے احکام کو سمجھو ' قبول کرو اور اس کے مطابق زندگی گزارو۔ لیکن جب وہ قوم ان مصیبتوں کے باوجود بھی اللہ کی طرف رجوع نہیں کرتی اور وہ اس کی بھی کوئی نہ کوئی تاویل کرنے کی کوشش کرتی ہے اور اسے زمانے کے پھیر کا نتیجہ سمجھتی ہے تو پھر پروردگار اس سے سخت تر آزمائش میں انھیں مبتلا کردیتا ہے یہ سخت تر آزمائش بظاہر نرم دکھائی دیتی ہے لیکن اس آزمائش پر پورا اترنا چونکہ زیادہ مشکل ہے اس لیے میں اس کو سخت تر کہہ رہا ہوں وہ آزمائش یہ ہے کہ اب پروردگار بجائے مصیبتوں کے انھیں راحتوں ' آسانیوں ' نعمتوں ' آسائشوں ' عشرتوں اور مسرتوں سے گراں بار کردیتا ہے۔ ان کے کاروبار سنبھل جاتے ہیں۔ کھیتیاں سونا اگلنے لگتی ہیں بارشیں وقت پر ہونے لگتی ہیں ' بین الاقوامی دنیا میں ساکھ بڑھنے لگتی ہے ' مالی پریشانیاں کم ہونے لگتی ہیں اس تبدیلی کو دیکھ کر قوم یہ سمجھتی ہے کہ پہلے اگر پروردگار ہم سے ناراض تھا تو اب وہ راضی ہوگیا ہے یا پہلے زمانہ ہم سے بگڑا ہوا تھا تو وہ اب ہمارے موافق ہوگیا ہے اس لیے جیسے جیسے ان کی دولت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے ان کے عشرت کدے آباد ہونے لگتے ہیں۔ جیسے جیسے ان کا کاروبار سنبھلتا جاتا ہے ویسے ویسے اللہ کی نافرمانی کے مراکز پھلنے پھولنے لگتے ہیں انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ دکھوں میں مبتلا ہو کر تو بعض دفعہ سوچنے لگتی ہے لیکن عیش و عشرت کی زندگی تو عموماً بگاڑ کا ذریعہ بنتی ہے۔ چنانچہ قدرت جس قوم کو اس آزمائش میں مبتلا کرتی ہے انھیں ایک طوفان سے وابستہ کردیتی ہے۔ طوفان ان کے سر پر تلا کھڑا ہوتا ہے لیکن ان کی مستیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ بنی اسرائیل بھی انھیں دونوں آزمائشوں سے بار بار گزرتے رہے تاکہ وہ اللہ کی طرف رجوع کریں اور اپنی زندگی کو بدل سکیں۔ لیکن بنی اسرائیل کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ان آزمائشوں سے سبق سیکھنے کی بجائے وہ ہمیشہ اور بگڑتے چلے گئے اگر پروردگار نے انھیں بدحالیوں میں مبتلا کیا تو انھوں نے اللہ پر اعتراض

کرنے شروع کر دیئے معلوم ہوتا ہے آج کل اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں (ید اللہ مغلولۃ) اور اگر انھیں خوشحالیوں سے نوازا گیا اور اس کے بدلے میں انھیں اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی تو پکار اٹھے:

ان اللہ فقیر و نحن اغنیاء (بے شک اللہ تعالیٰ فقیر ہیں اور ہم غنی اور مال دار ہیں)

یعنی نعمتیں ملیں تو انھوں نے شکر نہیں کیا اور مصیبت میں مبتلا ہوئے تو صبر نہ دکھایا حالانکہ شکر اور صبر ہی تو اسلامی زندگی ہے جسے انھوں نے اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی اجتماعی زندگی اللہ کی نافرمانی اور اس سے بغاوت کی آئینہ دار بن گئی۔

بنی اسرائیل کے زوال کا یہ سفر ایک طویل داستان ہے جس میں ہم مختلف نشیب و فراز دیکھتے ہیں اسی کا ایک پہلو جو کئی پہلوؤں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے اگلی آیت کریمہ میں بیان کیا جارہا ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

آیت مبارکہ:

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۭ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ۭ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۶۹

لغۃ القرآن: [فَخَلَفَ : پھر جانشین ہوئے] [مِنْۢ بَعْدِهِمْ : ان کے بعد سے] [خَلْفٌ: کچھ ایسے جانشین] [وَّرِثُوا : جو وارث ہوئے] [الْكِتٰبَ : اس کتاب کے] [يَاْخُذُوْنَ : جو پکڑتے ہیں] [عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى: اس نزدیک (زندگی) کے عارضی سامان کو] [وَيَقُوْلُوْنَ : اور کہتے ہیں] [سَيُغْفَرُ لَنَا : ہم بخش دیے جائیں گے] [وَاِنْ : اور اگر] [يَّاْتِهِمْ : پہنچتا ہے ان کے پاس] [عَرَضٌ: کچھ (اور) عارضی سامان] [مِّثْلُهٗ : اس کے جیسا] [يَاْخُذُوْهُ: تو وہ پکڑتے ہیں اس کو (بھی)] [اَلَمْ يُؤْخَذْ : کیا نہیں لیا گیا] [عَلَيْهِمْ : ان سے] [مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ : کتاب کا عہد] [اَنْ : کہ] [لَّا يَقُوْلُوْا : وہ لوگ مت کہیں] [عَلَي اللّٰهِ : اللہ پر] [اِلَّا : مگر] [الْحَقَّ : حق] [وَدَرَسُوْا : اور انہوں نے مطالعہ کیا] [مَا : اس کا جو] [فِيْهِ : اس میں ہے] [وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ : اور آخری گھر] [خَيْرٌ: بہتر ہے] [لِّلَّذِيْنَ : ان کے لیے جو] [يَتَّقُوْنَ : تقوی اختیار کرتے ہیں] [اَفَلَا : تو کیا نہیں] [تَعْقِلُوْنَ : تم عقل رکھتے]

ترجمہ: پھر ان کے بعد ناخلف (ان کے) جانشین بنے جو کتاب کے وارث ہوئے، یہ (جانشین) اس کم تر (دنیا) کا مال و دولت (رشوت کے طور پر) لے لیتے ہیں اور کہتے ہیں: عنقریب ہمیں بخش دیا جائے گا، حالانکہ اسی طرح کا مال و متاع اور بھی ان کے پاس آ جائے (تو) اسے بھی لے لیں، کیا ان سے کتاب (الٰہی) کا یہ عہد نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ کے بارے میں حق (بات) کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے؟ اور وہ (سب کچھ) پڑھ چکے تھے جو اس میں (لکھا) تھا؟ اور آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو پرہیزگاری اختیار کرتے ہیں، کیا تم سمجھتے نہیں ہو

آیت مبارکہ: فَخَلَفَ مِنۡ وَسَلَّمَ کے بَعۡدِہِمۡ خَلۡفٌ : پھر ان کے بعد ایسے برے جانشین آئے۔} اس آیت میں بنی اسرائیل کے ناخلف جانشینوں کے چند عیب بیان کئے گئے ہیں:

(1)۔۔ وہ رشوت لے کر توراۃ کے احکام بدل دیتے۔

(2)۔۔ نافرمانی کے باوجود یہ کہتے کہ ہمارا یہ گناہ بخش دیا جائے گا اس پر ہماری پکڑ نہ ہو گی۔

(3)۔۔ اس جرم پر قائم رہے کہ جب رشوت ملی اسے لے کر شرعی حکم بدل دیا۔

(4)۔۔ یہ سارے جرم نادانی میں نہیں بلکہ دیدہ و دانستہ کرتے رہے۔

نافرمانیوں کے باوجود بخشش کی تمنا رکھنا کیسا ہے؟

اس آیت میں یہودیوں کی ایک سرکشی یہ بیان ہوئی کہ "نافرمانیوں کے باوجود وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور اس پر ان کی پکڑ نہ ہو گی" یہودیوں کی اس سرکشی کی بنیاد یہ تھی کہ یہ لوگ اس زعم میں مبتلا تھے کہ ہم انبیاء عَلَیۡہِمُ الصَّلٰوۃُ عَزَّوَجَلَّ سے اولاد ہیں، اللہ عَزَّوَجَلَّ کے پیارے ہیں اس لیے ان گناہوں پر ہم سے کچھ مُواخذہ نہ ہو گا۔ فی زمانہ بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں کہ جو اپنی بداعمالیوں کے باوجود خود کو آخرت کے اجر و ثواب کا حق دار سمجھتے ہیں یونہی بعض سمجھدار قسم کے لوگ شیطان کے اس دھوکے میں پھنس کر گناہوں میں پڑے رہتے ہیں کہ ہم اگرچہ گناہ گار ہیں لیکن فلاں کامل پیر صاحب کے مرید ہیں لہٰذا ہم بخشے جائیں گے اور گناہوں پر ہماری پکڑ نہ ہو گی۔ ایسے حضرات خود ہی غور کر لیں کہ ان کا یہ طرز عمل کن کی عکاسی کر رہا ہے، شائد یہ وہی دور ہے کہ جس کی خبر اس روایت میں دی گئی ہے، حضرت معاذ بن جبل (رض) فرماتے ہیں: "عنقریب لوگوں کے سینوں میں قرآن اس طرح بوسیدہ ہو جائے گا جس طرح کپڑا بوسیدہ ہو کر جھڑنے لگتا ہے، وہ کسی شوق اور لذت کے بغیر قرآن پاک کی تلاوت کریں گے، ان کے اعمال صرف طمع اور حرص ہوں گے۔ وہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے خوف کی وجہ سے گناہوں میں کمی نہیں کریں گے۔ وہ برے کام کرنے کے باوجود تبلیغ کریں گے اور کہیں گے کہ عنقریب ہماری بخشش کر دی جائے گی کیونکہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہیں کرتے۔ (1)

امام محمد غزالی (رح) فرماتے ہیں "ہر وہ تَوَقُّع جو توبہ یا عبادت میں سُرُور کی رغبت پیدا کرے وہ رجاء (یعنی امید) ہے اور ہر وہ امید جو عبادت میں فتور اور باطل کی طرف جھکاؤ پیدا کرے تو وہ دھوکا ہے جیسے کسی شخص کے دل میں خیال پیدا ہو کہ وہ گناہ کو ترک کر دے اور عمل میں مشغول ہو جائے اور شیطان اس سے کہے کہ تم اپنے آپ کو کیوں عذاب اور تکلیف میں ڈالتے ہو، تمہارا رب کریم ہے، غفور ہے، رحیم ہے اور وہ (اس وجہ سے) توبہ اور عبادت میں سستی کرنے لگے تو ایسا شخص دھوکے میں مبتلا ہے، اس صورت میں بندے پر لازم ہے کہ وہ نیک اعمال کرے اور اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کے بہت بڑے عذاب سے ڈرائے اور کہے کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کو بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہونے کے ساتھ ساتھ سخت عذاب دینے والا بھی ہے، وہ اگرچہ کریم ہے لیکن وہ کفار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں ڈالے گا حالانکہ ان کا کفر اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا بلکہ وہ عذاب، مشقت، بیماریاں، فقر اور بھوک وغیرہ جس طرح دنیا میں بندوں پر مُسلّط کرتا ہے اسی طرح وہ ان چیزوں کو ان سے دور بھی کر سکتا ہے تو جس کا اپنے بندوں کے ساتھ یہ طریقہ ہے اور اس نے مجھے اپنے عذاب سے ڈرایا ہے تو میں اس سے کیسے نہ ڈروں اور میں کس طرح اس سے دھوکے میں رہوں۔

پس خوف اور امید دو راہنما ہیں جو لوگوں کو عمل کی ترغیب دیتے ہیں اور جو بات عمل کی رغبت پیدا نہ کرے وہ تمنا اور دھوکا ہے اور اکثر لوگ جو امید لگائے بیٹھے ہیں اور اس کی وجہ سے وہ عمل میں کوتاہی کرتے ہیں، دنیا کی طرف متوجہ رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے منہ پھیرتے ہیں اور آخرت کے لیے عمل نہیں کرتے تو وہ دھوکے میں ہیں۔ نبیِّ اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس بات کی خبر دی اور بیان فرمایا کہ "عنقریب اس امت کے پچھلے لوگوں کے دلوں پر دھوکا غالب ہو جائے گا۔ آپ نے جو فرمایا وہ ہو کر رہا، جیساکہ پہلے زمانے کے لوگ دن رات عبادت اور نیک اعمال کرتے رہتے تھے اس کے باوجود ان کے دلوں میں یہ خوف رہتا تھا کہ انھوں نے اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے، وہ رات دن عبادت میں گزارنے کے باوجود اپنے نفسوں کے بارے میں خوفزدہ رہتے تھے، وہ بہت زیادہ تقویٰ

اختیار کرنے، خواہشات اور شبہات سے بچنے کے باوجود تنہائی میں اپنے نفسوں کے لیے روتے تھے۔ لیکن اب حالت یہ ہے کہ تم لوگوں کو مطمئن، خوش اور بے خوف دیکھوگے حالانکہ وہ گناہوں پر اوندھے گرتے ہیں، دنیا میں پوری توجہ رکھے ہوئے ہیں اور انھوں نے اللہ تعالیٰ سے منہ پھیر رکھا ہے، ان کا خیال ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر کامل یقین رکھتے ہیں، اس کے عفو و در گزر اور مغفرت کی امید رکھتے ہیں گویا ان کا گمان یہ ہے کہ انھوں نے جس طرح اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی معرفت حاصل کی ہے اس طرح انبیاء کرام (علیہ السلام)، صحابہ کرام (رض) اور پہلے بزرگوں کو حاصل نہ تھی، اگر یہ بات (یعنی عَفْو و مغفرت) محض تمنا اور آسانی سے حاصل ہو جاتی تو (نیک اعمال کے باوجود) ان بزرگوں کے رونے، خوف کھانے اور غمگین ہونے کا کیا مطلب تھا۔ (1)

اس کے علاوہ ان علماء کو بھی اپنے طرز عمل پر غور کی حاجت ہے کہ جو خود تو عوام میں مقتداء کی حیثیت رکھتے ہیں اور اپنی اولاد کی اچھی دینی تعلیم و تربیت سے غفلت کا شکار ہیں، جب ان کی اولاد جانشینی کی مسند پر جلوہ افروز ہوگی تو کہیں یہ بھی انہی خرابیوں کا شکار نہ ہو جائے جن کا بنی اسرائیل کے جانشین ہوئے۔ (تفسیر صراط الجنان)

یہود کی پہلی نسلیں تو انبیاء کی مخالفت بلکہ ان کے قتل کی مرتکب ہو کر العیاذ کا شکار ہوتی رہیں۔ پھر ان کے بعد جو نسل کتاب کی وارث ہوئی (یہ دور نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے یہود کی طرف اشارہ ہے) یعنی توراۃ کی حامل ہونے کی دعوے دار بنیں ان کی اخلاقی پستی یہ ہے کہ کتاب اللہ (توراۃ) کو بیچ کر حقیر دنیا کا مال کماتے ہیں (کیونکہ یہودی علماء دور نبوی میں یہودی سرداروں سے رشوتیں لے کر توراۃ کے احکام اور اس کی آیات بدل دیتے تھے) اور اس کے ساتھ سمجھتے ہیں کہ وہ پکے بخشے ہوئے ہیں مگر مال حرام کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ اتنا نہیں مل رہا ہے اگر اتنا اور ملے تو بھی نہ چھوڑیں۔ یہاں سے مال حرام کمانے کی برائی معلوم ہوئی کہ یہود جیسی بد فطرت قوم کا کام ہے مسلمانوں کا نہیں۔ (تفسیر برہان القرآن)

خَلف اور خَلَف کا معنوی فرق

اس آیت میں ارشاد ہے: فخلف من بعد ہم خلف اور خلف کے معنی کے متعلق علامہ راغب اصفہانی متوفی 502ھ لکھتے ہیں:

بعد میں آنے والے ردی اور برے لوگوں کو خَلْف کہتے ہیں۔ (المفردات ج 1، ص 207، مبطوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، 1418ھ)

خلف اگر لام پر زبر کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا معنی ہے بعد میں آنے والے نیک لوگ، اور اگر لام ساکن ہو تو اس کا معنی ہے بعد میں آنے والے برے لوگ، اور خلف (لام ساکن ہو تو) کی جمع خلوف ہے اور خلف (لام پر زبر ہو تو) کی جمع اخلاف ہے۔ اسی طرح سَلَف کا معنی ہے گزرے ہوئے نیک لوگ اور اس کی جمع اسلاف ہے اور سلف کا معنی ہے گزرے ہوئے برے لوگ اور اس کی جمع سلوف ہے۔ (مثلاً ہمارے اعتبار سے صحابہ کرام اسلاف ہیں اور یزید اور شمر سلوف ہیں اور صحابہ کے اعتبار سے امام ابو حنیفہ خَلَف ہیں اور یزید خلف ہے۔ (مجمع بحار الانوار ج 2، ص 91، مطبوعہ مکتبہ دار الایمان المدینہ المنورہ، 1415ھ النہایہ ج 2، ص 62، 63، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت 1418ھ، لسان العرب، ج 9، ص 84۔ 85، مطبوعہ ایران، 1404ھ)

گناہوں پر اصرار کے ساتھ اجر و ثواب کی طمع کی مذمت

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ پھر بنو اسرائیل کے نیک لوگوں کے جانشین برے لوگ ہوئے جو اپنے اسلاف سے توراۃ کے وارث ہوئے۔ انھوں نے توراۃ کا مطالعہ کیا اور اس کے احکام کو حاصل کیا۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں جو یہودی تھے وہ بھی اسی آیت کا مصداق تھے۔ انھوں نے توراۃ کے احکام کو پس پشت ڈال دیا اور آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی رنگینیوں اور زیب وزینت کو اختیار کر لیا۔ وہ مال جمع کرنے پر حریص تھے اور اس معاملہ میں حلال اور حرام کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ وہ رشوت لے کر توراۃ کے احکام بدل دیتے تھے۔ اپنی ریاست چھن جانے کے خوف سے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جو توراۃ میں صفات تھیں ان کو لوگوں سے چھپاتے تھے۔ اور بعض آیات میں لفظی اور معنوی تحریف کرتے تھے اور ان کا یہ زعم تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو بخش دے گا اور ان کی بداعمالیوں پر ان سے مواخذہ نہیں فرمائے گا وہ کہتے تھے ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں، ہمارا سلسلہ انبیاء (علیہم السلام) سے منسلک ہے، وہ مسلسل نافرمانیاں کرتے رہتے اور گناہوں پر اصرار کرتے، اور جس چیز کو وہ پہلے باطل طریقہ سے لے چکے تھے اس کو دوبارہ بھی باطل طریقہ سے لینے سے گریز نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ ان کا رد کرتے ہوئے فرماتا ہے " کیا ان سے کتاب میں یہ عہد نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ کے متعلق حق کے سوا کچھ نہیں کہیں گے " انھوں توراۃ کو پڑھا تھا اور اس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ دوسروں کا مال باطل طریقہ سے لینا حرام ہے۔ اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولنا حرام ہے۔ اس کے باوجود وہ اس عہد اور میثاق کی خلاف ورزی کرتے رہے۔ کیا ان کو اتنی سی بات معلوم

نہیں تھی کہ دار آخرت اور اس کی دائمی نعمتیں دنیا کی فانی لذتوں سے بہت بہتر ہیں تو پھر چاہیے تھا کہ وہ اللہ سے ڈرتے اور ان بداعمالیوں اور اپنی سرکشیوں سے باز آجاتے۔

قرآن مجید کی اس آیت میں جس طرح ان بداعمال یہودیوں کا ذکر فرمایا ہے جو اپنی نافرمانیوں کے باوجود اپنے آپ کو اخروی اجر وثواب کا امیدوار گردانتے تھے سو آج کل کے مسلمانوں کو بھی یہی حال ہے وہ بھی اپنی بداعمالیوں کے باوجود خود کو اجر آخرت کا امیدوار کہتے ہیں۔ جیسا کہ اس حدیث میں ہے :

حضرت معاذ بن جبل (رض) بیان کرتے ہیں کہ عنقریب لوگوں کے سینوں میں قرآن اس طرح بوسیدہ ہو جائے گا جس طرح کپڑا بوسیدہ ہو کر جھڑنے لگتا ہے، وہ بغیر کسی شوق اور لذت کے قرآن کریم کو پڑھیں گے، ان کے اعمال صرف طمع اور حرص ہوں گے وہ خوف خدا سے گناہوں میں کمی نہیں کریں گے وہ برے کام کرنے کے باوجود تبلیغ کریں گے اور یہ کہیں گے کہ عنقریب ہماری بخشش کردی جائے گی کیونکہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہیں کرتے۔ (سنن دارمی ج 2، رقم الحدیث : 3346، مطبوعہ دارالکتاب العربی بیروت، 1407 ھ) (تفسیر تبیان القرآن)

یہودیوں کی نسل در نسل حالت اور ذہنیت۔

اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو اپنے انعامات اور عذابوں کے ساتھ اس لیے آزمایا تاکہ نعمت عطا ہونے پر شکر گزار ہوں اور عذاب آنے کی صورت میں اس کی طرف رجوع کریں۔ لیکن ہوا یہ کہ ان کی ایک کے بعد دوسری نسل پہلے سے بھی بری ثابت ہوئی۔ اہل علم نے لکھا ہے کہ خلف کا لفظ لام کی جزم کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ناخلف اور برا ہوتا ہے۔ اس لیے کسی اچھے وارث کو صرف خلف نہیں بلکہ خلف الرشید کہا جاتا ہے۔ لہٰذا ناخلف اور نالائق لوگ ہی توراۃ کے وارث بنے یعنی ان کی رہنمائی کے لیے کسی نہ کسی حالت میں توراۃ موجود تھی۔ لیکن جس طرح ان کے آباؤاجداد نے آسمانی دستر خوان من وسلویٰ کے مقابلہ میں لہسن، پیاز اور دال کو ترجیح دی تھی۔ بیت المقدس میں داخلے کے وقت اللہ تعالیٰ سے بخشش اور اس کی رحمت مانگنے کی بجائے گندم کا مطالبہ کیا تھا گویا کہ جس طرح ان کے بڑے نیکی کے مقابلہ میں برائی، اعلیٰ کے مقابلہ میں ادنیٰ چیز پسند کرتے رہے اسی طرح ان کے نسل در نسل وارث بننے والے ناخلف لوگوں کا حال تھا اور ہے۔ اس گھٹیا ذہنیت اور بداعمالیوں کے باوجود یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ انھیں قیامت کے دن معاف کردیا جائے گا۔ جب کہ ان کی حالت جوں کی توں ہے اگر ان کو دنیا کا مال ملے تو یہ توراۃ میں رد وبدل کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔ ایسا کرنے کے بعد اس کو "ہٰذَا مِنْ عِنْدَ اللّٰہِ" کہہ کر اللہ تعالیٰ کے ذمہ لگا کر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسی طرح یہ حکم نازل کیا ہے حالانکہ انھیں اچھی طرح یاد ہے کہ یہ حکم توراۃ میں نہیں ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے ذریعے ہم سے عہد لے رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں حق کے سوا دوسری بات نہ کہی جائے اور انھیں اچھی طرح علم ہے کہ دنیا کے مقابلے میں آخرت کا گھر متقین کے لیے بہتر ہے۔ لیکن پھر بھی عقل سے کام لینے کی کوشش نہیں کرتے حالانکہ عقل کا تقاضا اور سمجھ داری یہ ہے کہ اللہ کی کتاب کے ساتھ پختہ تعلق قائم رکھتے ہوئے پانچ وقت نماز قائم کی جائے۔ یہی صالح اعمال کی بنیاد ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ صالح عمل کرنے والوں کے اجر کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ یہاں کتاب کے ساتھ مضبوط تعلق جوڑنے کے ساتھ اقامت صلوٰۃ کی تلقین کی ہے کیونکہ ایمان لانے کے بعد نماز ہی وہ پہلا عمل ہے جو ایک مسلمان پر فرض ہوتا ہے۔ نماز کی اقامت کا معنی یہ ہے کہ اسے سنت کے مطابق اور اس کے روحانی اور معاشرتی تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر ادا کیا جائے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نماز اور دین کو لازم ملزوم قرار دیا ہے۔

(عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ (رض) قَالَ مَنْ تَرَکَ الصَّلَاۃَ فَلَا دِیْنَ لَہٗ) [الترغیب والترہیب]

"حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں جس نے نماز چھوڑی اس کا کوئی دین نہیں ہے۔"

(عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ (رض) قَالَ سَیَبْلَی الْقُرْآنُ فِی صُدُورِ أَقْوَامٍ کَمَا یَبْلَی الثَّوْبُ فَیَتَہَافَتُ یَقْرَءُ وْنَہُ لَا یَجِدُونَ لَہُ شَہْوَۃً وَلَا لَذَّۃً یَلْبَسُونَ جُلُودَ الضَّأْنِ عَلَی قُلُوبِ الذِّءَابِ أَعْمَالُہُمْ طَمَعٌ لَا یُخَالِطُہُ خَوْفٌ إِنْ قَصَّرُوا قَالُوا سَنَبْلُغُ وَإِنْ أَسَاءُوا قَالُوا سَیُغْفَرُ لَنَا إِنَّا لَا نُشْرِکُ باللّٰہِ شَیْءًا)

[رواہ الدارمی : کتاب فضائل القرآن، باب فی تعاھد القرآن]

"حضرت معاذ بن جبل (رض) بیان کرتے ہیں کہ عنقریب لوگوں کے سینوں میں قرآن اس طرح ہلکا ہو جائے گا جس طرح کپڑا بوسیدہ ہو کر جھڑنے لگتا ہے لوگ بغیر کسی شوق اور لذت کے قرآن کریم پڑھیں گے ان کے کپڑے بھیڑوں کے چمڑوں کے ہوں گے، ان کے اعمال صرف دنیا کے طمع اور حرص کی بنیاد پر ہوں گے۔ وہ

خوف خدا اسے گناہوں سے پرہیز نہیں کریں گے وہ برے کام کرنے کے باوجود تبلیغ کریں گے اور یہ کہیں گے کہ عنقریب ہماری بخشش ہو جائے گی کیونکہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہیں کرتے۔" (تفسیر فہم القرآن)

بنی اسرائیل کے تدریجی زوال کے اسباب

دریا کے جب کسی بند میں دراڑیں پڑنے لگتی ہیں تو ہوش مند لوگ فوراً اس کی فکر کرتے ہیں وہ سمجھ لیتے ہیں کہ اگر ان دراڑوں کو برابر نہ کیا گیا اور بند کی کمزوریوں کو دور نہ کیا گیا تو کہیں نہ کہیں شگاف بھی پڑ سکتا ہے لیکن اگر بند کے نگران اور اس کے آس پاس رہنے والے لوگ اسے معمولی بات سمجھ کر نظر انداز کر دیں کہ ابھی صرف دراڑیں ہی پڑی ہیں پانی باہر نکلنا تو شروع نہیں ہوا نا 'تو پھر یہ بات یقینی ہے کہ یہ غفلت کسی بڑی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے اور ایک نہ ایک دن بند میں شگاف پڑ جاتا ہے۔ شگاف بھی اچانک نہیں پڑتا شروع میں پانی رسنے لگتا ہے پھر آہستہ آہستہ بہنے لگتا ہے پھر کہیں کہیں سوراخ ہونے لگتے ہیں اور جب اس کی فکر نہیں کی جاتی تو پھر شگاف کھل جاتا ہے اور کھلتا ہی چلا جاتا ہے۔ آغاز میں معمولی کوشش سے اصلاح ہو سکتی ہے لیکن جب شگاف بڑا ہو جائے تو پھر بعض دفعہ زندگیاں دے کر بھی اسے بند نہیں کیا جاسکتا یہی حال قوموں کی زندگی کا بھی ہے مقاصد زندگی کے حوالے سے جب ان میں دراڑیں پڑنے لگتی ہیں تو پیغمبر اس کی طرف متوجہ کرنے لگتے ہیں لیکن جب قوم ان کی بات نہیں سنتی تو پھر ایک تدریج کے ساتھ زوال کا عمل آگے بڑھنے لگتا ہے کہیں اخلاقی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں 'کہیں عقائد کو گھن لگتا ہے 'کہیں معاملات میں ناہمواری جنم لیتی ہے اور کہیں اجتماعی زندگی انتشار اور افتراق کا شکار ہوتی ہے لیکن جب قوم ان میں سے کسی بات کا بھی ادراک کرنے کو تیار نہیں ہوتی تو پھر زوال کا عمل بڑھتے بڑھتے ناقابل اصلاح ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کے اسی تدریجی زوال کو ان آیات میں بیان کیا جارہا ہے ایک ایسی امت جس کی بنیاد اللہ کے دین پر استوار ہو اور جس کی اجتماعی زندگی کا دارومدار تعلق باللہ 'اطاعت و خشیت اور خلق خدا کی خدمت پر ہو اس کے زوال اور تباہی کی تکمیل میں جو چیز سب سے اہم کردار ادا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ جن مذہبی علماء اور راہنماؤں نے لوگوں کے اندر ان بنیادی اقدار کو زندہ رکھنا اور توانا کرنا ہے وہ خود ان بنیادی اقدار سے تہی دامن ہو جائیں ان کے اہداف اور مقاصد زندگی تبدیل ہو جائیں اور ان کی ترجیحات یکسر بدل کر رہ جائیں اس وقت اس قوم کا حال ایک ایسی گاڑی کا ہو جاتا ہے جس کے سٹیئرنگ پر کوئی ڈرائیور نہ ہو اور اگر ہو تو اسے بالکل معلوم نہ ہو کہ مجھے اس گاڑی اور اس کے مسافروں کو لے کر کہاں جانا ہے مسافر کہیں اور جانا چاہتے ہوں اور اس کا رخ کسی اور طرف ہو ایسی صورت میں ان کی تباہی کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اس آیت کریمہ میں بنی اسرائیل کے زوال کی اسی آخری علامت کو بیان کیا جارہا ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ لوگ قومی خصوصیات سے محروم ہو چکے تھے۔ انتشار اور افتراق کے باعث ان کی اجتماعی زندگی تباہ ہو چکی تھی۔ بایں ہمہ! ان میں خیر بالکل ختم نہیں ہوا تھا صالحین کا ایک گروہ ان میں باقی تھا جو ان کی اصلاح کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ ان صالحین کے راہنما اور مقتداء یقینا کتاب اللہ کے علماء ہوں گے جو کسی نہ کسی حد تک اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کرتے ہوں گے لیکن اب ان کی بدنصیبی یہاں تک پہنچ گئی کہ اب کتاب کے جو وارث ہوئے اور جنھوں نے اللہ کی کتاب کے علم کو اپنی زندگی کا مقصد بنا کر لوگوں کی اصلاح کے فرض کو انجام دینا تھا ان کا حال یہ ہو گیا کہ اس کتاب نے ان کے لیے آخرت کے حصول کو مقصد زندگی ٹھہرایا تھا اور انھیں حکم دیا گیا تھا کہ تمہاری زندگی اس طرح گزرنی چاہیے کہ ہر دیکھنے والا محسوس کرے کہ یہ لوگ آخرت کے مسافر ہیں ہر کام کرنے سے پہلے تمہیں فکر اس بات کی ہونی چاہیے کہ اس بارے میں اللہ کی کتاب نے کیا احکام دیئے ہیں اور شریعت ہماری کیا راہنمائی کرتی ہے؟ تمہیں اپنی ضروریات زندگی کے حصول میں ہر قدم پر سوچنا چاہیے کہ میرے لیے کیا چیز حلال ہے اور کیا چیز حرام ہے؟ اور زندگی گزارتے ہوئے مجھے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے میرا اللہ ناراض ہو جائے لیکن اب جو لوگ کتاب کے وارث اور حامل ٹھہرے ان کی زندگی کا رخ بالکل دوسری طرف ہو گیا وہ بجائے آخرت کے دنیا کو اپنا ہدف بنا چکے بجائے آخرت کے مسافر بننے کے وہ دنیا کے حریص ہو گئے بالکل دنیاداروں کی طرح انھیں رات دن یہ فکر رہنے لگی کہ ہم ایک پر تعیش زندگی کس طرح اختیار کر سکتے ہیں انھوں نے کتاب خداوندی کو بھی دنیا طلبی کا ذریعہ بنا لیا اصحاب اقتدار اور امرائے دولت کی خوشنودی کے لیے اگر اللہ کی کتاب میں انھیں تحریف اور ترمیم کرنا پڑی تو اس سے بھی دریغ نہ کیا اور عوام کو ایسے ایسے مذہبی فریب دیئے جس سے ان کی مالی زندگی مستحکم ہوتی گئی۔

دنیا کی روایت یہ ہے کہ جب کسی قوم کے مذہبی رہنماء سیرت و کردار سے عاری ہو جاتے ہیں یا ان کے کردار میں کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں تو عوام ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مذہب کا قلادہ گلے سے اتار پھینکتے ہیں اور حکمران جب دیکھتے ہیں کہ یہی ایک طبقہ تھا جو ہمیں روکتا تھا اور اب وہ خود دنیا کی دلدل میں دھنس گیا

ہے تو پھر انھیں اپنے مقاصد مذمومہ کو حاصل کرنے میں کوئی روک نہیں رہتی نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ پوری قوم عقائد کی کمزوری 'اخلاق کی خرابی اور معاملات میں ناہمواری کا شکار ہو کر بے دریغ تباہی کی طرف دوڑنے لگتی ہے۔ بنی اسرائیل نے بھی جب دیکھا کہ ہمارے مذہبی راہنما خود حب دنیا کے اسیر ہو کر کہاں سے کہاں جا پہنچے ہیں تو اب انھیں دنیا طلبی کی نارواحدود تک پہنچنے سے کون روک سکتا تھا حقوق اللہ پہلے ہی تباہ ہو چکے تھے اب حقوق العباد بھی تباہ ہو گئے ہر چیز پر حب دنیا کے غلبے کے باعث ایک ایسی لوٹ کھسوٹ مچی جس نے اخلاقیات کا جنازہ نکال دیا۔ دیانت وامانت 'حلال و حرام کی پابندی 'قناعت اور سادگی 'بے غرضی اور بے لوثی قصہ پارینہ بن کر رہ گئیں۔ اجتماعی زندگی ان کی پہلے ہی تباہ ہو چکی تھی رہی سہی کسر حب دنیا کے بحران نے پوری کر دی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم جب بھی قوموں کے عروج وزوال پر غور کرتے ہیں تو حیرت انگیز حد تک یہ بات سامنے آتی ہے کہ قوموں نے نامساعد حالات 'وسائل کی کمی ' آسانیوں کے فقدان اور مالی حالات میں ابتری کے دور میں ہی ترقی کی ہے یہی وہ دور ہوتا ہے جب ان کے اندر ہمت و شجاعت اور محنت و جانکاہی کا جذبہ ابلتا ہے۔ اولوالعزمی اور بلند ہمتی ان کا راستہ روشن کرتی ہے ان کے پیش نظر مقاصد زندگی اور قومی اہداف کے سواء اور کچھ نہیں ہوتا وہ نان شبینہ پر گزارا کرتے ہیں 'پیوند لگے کپڑے پہنتے ہیں 'جھونپڑوں میں سکونت رکھتے ہیں لیکن تخت وتاج ان کے پاؤں کی ٹھوکروں میں ہوتے ہیں 'زمین ان کے لیے سمٹنے لگتی ہے 'سر اور دل ان کی عظمتوں کے سامنے جھکنے لگتے ہیں لیکن جیسے ہی ان کے اندر دنیا اپنا راستہ بنانے میں کامیاب ہوتی ہے اور وہ مظاہر دنیا کو عزت و عظمت کی علامت سمجھنے لگتے ہیں زمین پر بیٹھنے کی بجائے تخت پر بیٹھنا اور تاج پہننا ان کی معراج بن جاتا ہے اور طاقت اور قوت سے وہ لوگوں کی گردنوں پر سوار رہنا چاہتے ہیں اور درہم و دینار 'دولت کی ریل پیل 'معاشرت کا ٹھاٹھ بھاٹھ ان کا مقصود بن جاتا ہے تو پھر انھیں زوال کی طرف بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا قوت ہمیشہ جھونپڑوں سے نکلتی ہے اور محلات میں جا کر ڈوب جاتی ہے۔ سخت زندگی اولوالعزمی کو جنم دیتی ہے جس کے نتیجے میں فتوحات کا راستہ کھلتا ہے دنیا اور دولت دنیا سے محبت اور وابستگی ذلت اور نکبت کا سبب بنتی ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا ہے۔

سبب کچھ اور ہے تو خود جسے سمجھتا ہے
زوال بندہ مومن کا بے زری سے نہیں
جب بھی میرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں

بنی اسرائیل اپنے مقتداؤں اور راہنماؤں کی اسی کمزوری اور گمراہی کے باعث اپنے زوال کی انتہاء کو پہنچ گئے حتی کہ ان کا یہ حال ہو گیا کہ اگر کبھی انھیں توجہ دلائی جاتی کہ تم ایک حامل دعوت امت ہو لوگوں کی اصلاح تمہاری ذمہ داری ہے تمہیں لوگوں کو دین سکھانا اور اللہ کی دھرتی پر دین کو قائم کرنا ہے تو عوام تو عوام ان کے مذہبی راہنما ایسی باتوں کے جواب میں کہتے کہ ہمیں اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں کہ ہمارا طرز عمل قیامت کے دن ہمارے لیے عذاب کا باعث ہوگا کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ہم چونکہ انبیاء کرام کی اولاد ہیں اور ہمارا اللہ سے خاص رشتہ ہے اس لیے یقینا ہماری مغفرت کر دی جائے گی اور کسی صورت بھی اللہ کا عذاب ہماری طرف متوجہ نہیں ہوگا لیکن اگر ایسی کوئی بات ہوئی بھی تو ہمارے آباؤاجداد یقینا ہمیں اللہ کے عذاب سے بچالیں گے۔ اندازہ فرمائیں ! یہ ایسی امت ہے جن کے ہاتھوں میں اللہ کی کتاب موجود ہے اور اللہ کے کتنے انبیاء ورسل ان کی ہدایت کے لیے آچکے ہیں۔ بایں ہمہ ! اپنے گھڑے ہوئے غلط عقائد پر انھیں اس حد تک اعتماد ہے کہ وہ ایمان و عمل کو چھوڑ کر ایسے ہی عقائد کے سہارے مغفرت کو یقینی سمجھتے ہیں یہ باتیں پڑھ کر بظاہر حیرت ہوتی ہے لیکن اگر ہم امت مسلمہ کے بعض طبقات کی زندگی دیکھیں تو پھر یہ بات سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ امتیں جب زوال پذیر ہوتی ہیں تو ان کا حال ایسا ہی ہوتا ہے۔ اندازہ فرمائیے اس امت کے پاس اللہ کی آخری کتاب موجود ہے اور پھر یہ واحد امت ہے جس کے پاس اللہ کے رسول کی سنت محفوظ ہے زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے بارے میں ہمیں واضح راہنمائی میسر نہ ہو بایں ہمہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے غلط علماء اور پیشواؤں نے عوام کی ایک بہت بڑی تعداد کو یہ یقین دلا رکھا ہے کہ تمہیں اسلامی شریعت پر عمل کرنے اور ایمان کے تقاضوں کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تم نے جن لوگوں کے ہاتھ میں ہاتھ دیا ہے یعنی جن کو اپنا پیر اور مرشد مانا ہے تمہیں بس ان کی خدمت کرنی چاہیے وہ تمہاری بخشش کے لیے کافی ہیں۔ چنانچہ ملک کے مختلف حصوں میں دیہات ہی میں نہیں شہروں میں بھی آپ کو ایسے پیران کرام ملیں گے جن کی اپنی زندگی سراسر اسلامی

تعلیمات سے بیگانہ ہے۔ بعض تو ایسے بھی مشہور بزرگ ہیں کہ جن میں تمام شرعی عیوب پائے جاتے ہیں لیکن عوام کی سادگی کا کیا کہنا کہ وہ سال بسال ان کے درشن کو اپنی بخشش کا ذریعہ سمجھ کر بے تابانہ وہاں پہنچتے ہیں اور جیسے ہی انھیں ایک جھلک دیکھنے کو ملتی ہے وہ اپنی ساری جمع پونجی ان کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں لیکن جو تعلیم یافتہ لوگ اس حد تک سادہ نہیں ان کی بے خبری کا بھی یہ عالم ہے کہ انھیں ایمان و عمل سے کوئی بڑا تعلق نہیں رہا ہے وہ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اعمال چاہے کچھ بھی ہوں قیامت کے دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت ہماری نجات کے لیے کافی ہے ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ارکان اسلام کے تارک ہیں ایسے بھی ہیں جن کی کمائی سراسر حرام کے ذرائع کی مرہون منت ہے اور ایسے بھی ہیں جنھیں نہ حقوق اللہ کی فکر ہے اور نہ حقوق العباد کی لیکن جب کبھی انھیں ان سے آخرت کی بات ہوتی ہے تو وہ بڑے اطمینان سے جواب دیتے ہیں کہ ہم جس رسول پاک (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے ہیں وہ قیامت کے دن ہماری سفارش فرمائیں گے تو پھر ہمیں کسی عمل کی ضرورت کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کرلینا چاہیے کہ رمضان المبارک میں خیرات کرلی جائے 'ربیع الاول میں میلاد کی محفلیں رچا دی جائیں، کسی مسجد میں قالین بچھا دیا جائے 'شب برأت میں حلوہ پوری سے لوگوں کی تواضع کر دی جائے، یہ سب کچھ کرلینے کے بعد تو نجات میں کوئی شبہ ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ اسی طرح کے سہاروں نے بنی اسرائیل کی زندگی برباد کی تھی اور انہی سہاروں نے اس امت کی دینی زندگی تباہ کر دی ہے۔

اس آیت کریمہ میں آگے چل کر فرمایا گیا ہے کہ اے بنی اسرائیل کے لوگو! تم نے جن مفروضوں پر اپنی پوری دینی زندگی کو استوار کرلیا ہے اور جس میں آخرت کی بجائے دنیا طلبی تمہارا مقصود بن کر رہ گئی ہے۔ کیا تمہاری کتاب نے تمہیں یہی تعلیم دی تھی؟ اور آج بھی وہ اللہ کی کتاب تمہارے پاس موجود ہے بتاؤ کیا اس میں یہ باتیں موجود ہیں؟ تمہیں خوب معلوم ہے کہ اس میں ایسی کوئی بات موجود نہیں البتہ اسی کتاب میں تم سے یہ عہد ضرور لیا گیا تھا کہ تم اسی کتاب کے احکام کے مطابق زندگی گزاروگے اور اپنی طرف سے کوئی بات بنا کر اس کتاب یعنی اللہ کی طرف منسوب نہیں کروگے۔ تم میں ایسے لوگ بکثرت پائے جاتے ہیں جو اس کتاب کو پڑھتے بھی ہیں اور وہ خوب جانتے ہیں کہ اس کتاب میں کیا ہے اور کیا نہیں حتی کہ اس کتاب کو پڑھنے کا عالم یہ ہے کہ انھوں نے یہ کتاب پڑھ پڑھ کر گھس ڈالی ہے کیونکہ یہاں "دَرَسُوْا" کا لفظ استعمال ہوا ہے درس کا معنی گھسنا ہے جب کوئی کتاب ہر سطر پر انگلی رکھ کر بار بار پڑھی جائے تو عموماً اس کے الفاظ گھس جاتے ہیں آج بھی آپ نے بعض لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ قرآن کریم پر انگلی رکھ کر پڑھتے ہیں اور تورات کے زمانے میں کتابت اور طباعت کے اتنے خوبصورت انتظام بھی نہیں تھے یقینا اس وقت کتاب کو پڑھتے ہوئے ساتھ ساتھ انگلی بھی پھیرنا پڑتی ہوگی تاکہ کسی سطر کا اشتباہ نہ ہو جائے تو یہاں فرمایا جارہا ہے کہ تم نے کتاب پڑھ پڑھ کر گھس ڈالی ہے اور تمہیں خوب معلوم ہے کہ اس کتاب میں تمہیں کیا تعلیمات دی گئی ہیں اور تمہارے لیے کیا ترجیحات قائم کی گئی ہیں اور کس طرح آخرت کو تمہارا مقصود ٹھہرایا گیا تھا لیکن تم نے اس کی بجائے دنیا کے مال کو اپنا مقصود بنایا اور اس پوری تبدیلی کے لیے ان تصورات میں پناہ لی جنھیں تم نے اپنی خواہش سے پیدا کیا۔

حالانکہ اس کتاب نے تمہیں کھول کر یہ بات بتائی تھی کہ بخشش اور آخرت کا گھر کسی کا ذاتی اور خاندانی اجارہ نہیں بلکہ یہ تو ان لوگوں کو ملے گا جو دنیا میں خدا ترسی سے کام کریں گے جس کی زندگی ایک متقی کی زندگی ہوگی وہ بجائے دنیا کو اپنا مطلوب بنانے کے آخرت کی تیاری کی فکر کریں گے لیکن تم نے اس بنیادی تعلیم سے منحرف ہو کر اور کتاب خداوندی کی ہدایات کو نظر انداز کرکے نہ صرف دنیا طلبی کو اپنا محبوب اور مقصود بنایا بلکہ غلط عقائد اور تصورات گھڑ کر پوری دینی زندگی کو تباہ کرکے رکھ دیا تمہارے نزدیک بنی اسرائیل میں سے ہونا نجات کے لیے کافی ہے اگر ایسا ہوتا تو پھر کتابیں اور پیغمبر بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی کیا تم اتنی معمولی بات کو نہیں سمجھتے کہ جو لوگ بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے انھیں اگر اپنے نسب کے اعتبار سے جنت میں جانا ہے تو ان کی طرف موسیٰ (علیہ السلام) کا تشریف لانا اور پھر ان پر تورات کا نازل ہونا اور پھر تورات کے احکام کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے ان کا مصر سے نکل کر صحرائے تیہ اور وادیٔ سیناء میں آنا اور شہری زندگی کو چھوڑ کر صحرائی زندگی کو اختیار کرنا تاکہ اللہ کے دین کے تقاضوں کو پورا کیا جاسکے اس کی آخر کیا ضرورت تھی۔ اب بھی اگر تم سمجھنا چاہو تو ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں کہ اللہ کے یہاں نجات اور بخشش کا دار و مدار کس چیز پر ہے اور وہ کون لوگ ہیں جو اللہ کے ہاں مصلحین کہلا سکتے ہیں۔ (تفسیر روح القرآن)

ہمارے پیشوا سید کائنات فخر موجودات رحمۃ للعالمین محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب اس فانی جہان سے عالم بقا کی طرف تشریف لے گئے تو امت کی سیادت و قیادت آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عظیم و برحق خلفائے راشدین کے ہاتھوں میں آئی سیدنا صدیق اکبر سیدنا فاروق اعظم سیدنا عثمان غنی سیدنا علی مرتضی رضوان اللہ علیہم نے کتاب و سنت کی روشنی میں امت کی وہ بے مثال اور تاریخی راہنمائی اور نگرانی فرمائی جس کی نظیر اقوام عالم (گزشتہ اور آئندہ) میں ملنی مشکل

ہے ایک مختصر عرصہ میں آدھے عالم پر اسلام کا پرچم لہرا کر پورے عالم کو عدل وانصاف تقوی اور دیانت صدق وامانت سے بھر دیا جس کے اثرات اور فیوض و برکات چودہ سو سال گزرنے کے بعد آج بھی کائنات کے اکناف واطراف میں روز روشن کی طرح پیدا درخشاں اور تاباں نظر آرہے ہیں۔ اسی بناء پر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جانشینوں کو خلفائے راشدین اور ائمہ ربانیین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

دنیا اپنی شان و شوکت مال وثروت کے ساتھ ان کے قدموں پر سجدہ ریز ہوئی مگر فیض یافتگان نبوت نے اس کی طرف توجہ اور التفات تک گوارا نہ کیا۔ خلافت کی چوکھٹ پر قدم رکھتے وقت یہ حضرات مالدار و سرمایہ دار تھے اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت فقراء اور نادار تھے۔ (رض)۔

آیت بالا میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم کے نالائق، دنیا پرست، مذہب فروش احبار ورہبان کی تصویر وخلافت کی ایک جھلک کا ذکر ہے جنہوں نے مذہب اور تورات شریف کے احکام کو حطام دنیا کے عوض فروخت کیا اور احکام الٰہی میں من مانی اور تحریف کی۔ فرمایا:

فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ۔ پھر ان کے بعد برے جانشین آئے جو تورات شریف کے وارث ہوئے یعنی تورات کے عالم کہلائے لیکن حالت یہ ہوئی کہ علم دین اور دینی اقدار کو فروخت کرنے لگے۔

يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ ھٰذَا الْاَدْنٰى۔ کہ اس حقیر اور خسیس دنیا کا مال و متاع حاصل کرتے ہیں یعنی لوگوں سے رشوت لے کر ان کی خاطر احکام الٰہی میں تبدیلی اور خود ساختہ آسانی کرتے ہیں۔ اس سے زمانہ رسالت کے علماء یہود مراد ہیں جنہوں نے تورات میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صفات و کمالات کو دیکھنے کے باوجود چھپایا اور انکار کئے "یعرفونہ کما یعرفون ابناء ھم وان فریقا منھم لیکتمون الحق وھم یعلمون " (البقرۃ) پھر ان کی دلیری اور ہٹ دھرمی کا یہ حال ہے۔ وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا۔ کہتے ہیں کہ عنقریب ہماری مغفرت ہو جائے گی اور ہمارے گناہ معاف ہو جائیں گے ان کا گمان فاسد یہی رہا کہ ہم لوگ "ابناء اللہ واحباءہ" کے منصب پر فائز ہیں۔

وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ۔ رشوت کو حرام جانتے ہوئے پھر ان کا یہ حال تھا کہ اگر ان کے پاس پھر اس قسم کا حرام مال آجائے تو اس کو بھی بے دھڑک لے لیں گے۔ مطلب یہ کہ وہ گناہ پر بڑے دلیر ہیں اور کبھی حرام چھوڑنے پر تیار نہیں۔

اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ۔ کیا ان رشوت لینے والوں سے کتاب (تورات) میں یہ عہد نہیں لیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سوائے حق کے کوئی بات منسوب نہ کریں اور یہ لوگ رات دن اللہ تعالیٰ کے کلام میں تحریف کرتے ہیں اور من گھڑت اور خود ساختہ باتوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرکے نہیں شرماتے اور اللہ تعالیٰ پر ہر قسم کے بہتان باندھتے ہیں۔

وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ: حالانکہ ان لوگوں نے اس مضمون کو پڑھا بھی ہے جو تورات میں لکھا ہوا ہے اور وہ خوب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کمی بیشی اور تحریف صریح کفر ہے اور جانتے ہوئے گناہ کرنا اور گناہ کو حقیر سمجھنا اور اس جرم کو پیشہ کے طور پر اختیار کرنا اور اس کی مغفرت کا حوالہ دینا یہ سارے کفریہ اعمال ہیں اور گناہ کبیرہ بھی۔ یہ سب کچھ دنیا کی خاطر کر رہے تھے حالانکہ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ دار آخرت کا ثواب وصلہ ان لوگوں کے لئے ہے جو حرام سے بچتے ہیں اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں دنیائے فانی کے مال و متاع سے کہیں بہتر ہے کیا تم لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ دنیا چار روزہ ہے اور آخرت دائمی اور ابدی ہے۔ بڑا نادان و ناعاقبت اندیش وہ ہے کہ گناہ کو گناہ سمجھ کر کرتا ہے مغفرت کی امید پر۔

ونگ ہے پندار دان تاریک رائے۔

خواہد آمرزیدنش آخر خدائے

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ۔ جو لوگ ہیں کتاب توریت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے ہوئے ہیں یعنی اس میں تحریف نہیں کرتے اور تورات کے حکم کے مطابق نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لاتے ہیں اور نماز کو پابندی کے ساتھ قائم رکھتے ہیں جیسے عبد اللہ بن سلام وغیرہ۔ تو ہم نیکوکاروں کا ثواب ضائع نہ کریں گے بلکہ ان کو مزید انعام دیں گے۔ آگے اس عہد و میثاق کا شد و مد کے ساتھ بیان ہے اور اس کی کیفیت کا ذکر ہے کہ ان کے سروں پر پہاڑ کو مثل سائبان کے اٹھا لیا گیا اور وہ یہ سمجھے کہ پہاڑ ہم پر گرنے والا ہے، اس حال میں ان سے عہد و میثاق لیا گیا مگر سابقہ میثاقوں کی طرح انہوں نے اس عہد کا بھی وہی حشر کر دیا۔

وَاِذۡ نَتَقۡنَا الۡجَبَلَ فَوۡقَهُمۡ سے لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ۔اس وقت ہم نے پہاڑ کو اٹھا کر ان کے سروں پر ایسا معلق کر دیا گویا وہ ایک سائبان تھا اور انہوں نے گمان کیا کہ اگر انہوں نے توریت کے حکم کو تسلیم کرکے نہ مانا تو وہ پہاڑ ان کے سروں پر گرپڑے گا۔اس وقت ہم نے ان سے کہا کہ اگر انہوں نے تورات کے حکم کو تسلیم کرکے نہ مانا تو وہ پہاڑ ان کے سروں پر گرپڑے گا۔اس وقت ہم نے ان سے کہا کہ اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو اپنے ہاتھوں میں ، عمل کے لیے تھامے رکھو، تاکہ تم متقی بن جاؤ، اور نافرمانوں کی فہرست سے اپنا نام خارج کرو۔ سورۃ بقرہ میں پوری تفصیل گزر چکی، وہاں دیکھیں۔

رہا یہ مسئلہ کہ پہاڑ کو اٹھانا کوئی حیرت انگیز واقعہ ہوگا تو ظاہر ہوگا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ایک پہاڑ تو کیا سارے جہاں کے پہاڑوں کا اٹھانا کوئی مشکل نہیں۔ یہ بلند و بالا آسمانوں اور کھربوں ستاروں کو ذرا دیکھو، یہ بغیر کسی کھمبے اور ستون کے کیسے کھڑے ہیں ؟ اور کب سے کھڑے ہیں؟ سبحن اللہ لا الہ الا اللہ۔ (تفسیر منازل العرفان)

آیت مبارکہ:

وَالَّذِيۡنَ يُمَسِّكُوۡنَ بِالۡكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُصۡلِحِيۡنَ ○۱۷۰

لغۃ القرآن: [وَالَّذِيۡنَ : اور جو لوگ] [يُمَسِّكُوۡنَ : مضبوطی سے تھامتے ہیں] [بِالۡكِتٰبِ : کتاب کو] [وَاَقَامُوا : اور قائم رکھتے ہیں] [الصَّلٰوةَ: نماز کو] [اِنَّا : (تو) بیشک ہم] [لَا نُضِيۡعُ : ضائع نہیں کرتے] [اَجۡرَ : اجر] [الۡمُصۡلِحِيۡنَ : اصلاح کرنے والوں کا]

ترجمہ: اور جو لوگ کتاب (الٰہی) کو مضبوط پکڑے رہتے ہیں اور نماز (پابندی سے) قائم رکھتے ہیں (تو) بیشک ہم اصلاح کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے

تشریح: کتاب کو مضبوطی سے تھامنے سے مراد اس کے مطابق عمل کرنا، اس کے تمام احکام کو ماننا اور اس میں کسی طرح کی تبدیلی روا، نہ رکھنا ہے، اور اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ یہ آیت اہل کتاب میں سے حضرت عبداللہ بن سلام (رض) وغیرہ ایسے اصحاب کے حق میں نازل ہوئی جنہوں نے پہلی کتاب کی اتباع کی اور اس میں کوئی تحریف کی نہ اس کے مضامین کو چھپایا اور اس کتاب کے اتباع کی بدولت انھیں قرآن پاک پر ایمان نصیب ہوا۔ (1)

{ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ: اور انھوں نے نماز قائم کر رکھی ہے۔} نماز اگرچہ کتاب کو مضبوطی سے تھامنے میں داخل ہے البتہ اسے جداگانہ ذکر کرنے سے مقصود اس کی عظمت کا اظہار اور یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے بعد سب سے اہم عبادت نماز ہے۔ (2)

نماز کی اہمیت وفضیلت :

کثیر احادیث میں نماز پڑھنے کی بہت اہمیت اور فضیلت بیان کی گئی ہے، ترغیب کے لیے ان میں سے 3 احادیث درج ذیل ہیں :

(1)۔۔ حضرت عمر فاروق (رض) فرماتے ہیں : ایک صاحب نے عرض کی، یارسول اللہ ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، اسلام میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب کیا چیز ہے ؟ ارشاد فرمایا ” وقت میں نماز پڑھنا اور جس نے نماز چھوڑی اس کا کوئی دین نہیں، نماز دین کا ستون ہے۔ (1)

(2)۔۔ حضرت انس (رض) سے روایت ہے، حضور پرنور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ” سب سے پہلے قیامت کے دن بندے سے نماز کا حساب لیا جائے گا، اگر یہ درست ہوئی تو باقی اعمال بھی ٹھیک رہیں گے اور یہ بگڑی تو سبھی بگڑے۔ (2)

(3)۔۔ حضرت عبادہ بن صامت (رض) سے روایت ہے، حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ” پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے بندوں پر فرض کیں، جس نے اچھی طرح وضو کیا اور وقت میں پڑھیں اور رکوع و خشوع کو پورا کیا تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر عہد کرلیا ہے کہ اسے بخش دے، اور جس نے نہ کیا اس کے لیے عہد نہیں، چاہے بخش دے، چاہے عذاب کرے (3)۔ (4)

قرآنِ مجید کے احکام پر عمل کے معاملے میں ہماری حالت :

اس آیت میں کتاب کو مضبوطی سے تھامنے والوں کی فضیلت بیان ہوئی اسے سامنے رکھتے ہوئے قرآن مجید کے احکام پر عمل کے سلسلے میں ہم اپنے اسلاف کے حال اور اپنے حال کا موازنہ کریں تو موجودہ دور میں مسلمانوں کی مجموعی صورت حال انتہائی تشویشناک نظر آتی ہے کہ فی زمانہ مسلمان قرآن مجید پر عمل سے انتہائی دور ہو چکے اور دنیا کی نعمتوں اور رنگینیوں پر مطمئن بیٹھے نظر آ رہے ہیں۔ حضرت حسن بصری (رض) فرماتے ہیں "میں نے 70 بدری صحابہ کرام (رض) کو دیکھا وہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں سے (تقویٰ و وَرع کی وجہ سے) اس قدر اجتناب کرتے تھے جس قدر تم حرام چیزوں سے پرہیز نہیں کرتے۔ جس قدر تم فراخی کی حالت پر خوش ہوتے ہو اس سے زیادہ وہ آزمائشوں پر خوش ہوتے تھے۔ اگر تم انھیں دیکھ لیتے تو کہتے کہ یہ مجنون ہیں اور اگر وہ تمہارے بہترین لوگوں کو دیکھتے تو کہتے کہ ان لوگوں کا (آخرت میں) کوئی حصہ نہیں اور اگر وہ تمہارے برے لوگوں کو دیکھتے تو کہتے: ان لوگوں کا حساب کے دن پر ایمان نہیں۔ ان میں سے کسی کے سامنے حلال مال پیش کیا جاتا تو وہ یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیتے کہ مجھے اپنا دل خراب ہو جانے کا ڈر ہے (جبکہ تم حرام مال لینے میں بھی ذرا پرواہ نہیں کرتے)۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو عقل سلیم اور قرآن کریم پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (تفسیر صراط الجنان)

اور) یاد رکھو کہ (جو لوگ) حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے اصحاب وغیرہم کی طرح (تھامے ہیں کتاب کو) یعنی عہد موسوی میں توراۃ کو اور عہد محمدی میں قرآن کریم کو (اور قائم رکھا نماز کو) جو افضل العبادات ہے اور دین کا ستون ہے۔ اس لیے خاص طور پر اس کا ذکر فرما دیا گیا ایسے مقصود تمام عبادتوں اور فرائض الٰہیہ کی حفاظت ہے۔

تو جو تمام دینی فرائض وواجبات کی بجاآوری کرتا رہا اور محرمات شرعیہ کے ارتکاب سے اپنے کو بچاتا رہا (تو) یہ سن لے ! کہ (بیشک ہم نہیں ضائع فرماتے نیکوں اجر کو)۔ ذہن نشین رہے کہ کتاب کو مضبوطی سے پکڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اسکو یاد بھی کر لیا جائے اور اس میں تدبر و غور و فکر سے کام لیا جائے اور اس کے احکام پر عمل کرنے میں کوتاہی نہ برتی جائے۔۔ غور و فکر کے بغیر صرف تلاوت کر لینے سے مضبوطی سے پکڑنے والا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔۔ اسی لیے بنی اسرائیل کے اکثر وبیشتر لوگ تورات کے احکام پر عمل کرنے سے گریز کر رہے تھے۔ اسی لیے توریت کے احکام پر عمل کرنے کا عہد ان سے خوف وہراس کا ماحول بنا کر لیا گیا جس کا واقعہ مختصراً یہ ہے۔

جب حضرت موسیٰ بنو اسرائیل کے پاس توراۃ کی الواح لیکر آئے اور فرمایا کہ ان کو لو اور ان کی اطاعت کا اقرار کرو۔ تو انھوں نے کہا کہ جب تک اللہ تعالیٰ آپ کی طرح ہم سے کلام نہیں کرے گا، ہم یہ اقرار نہ کرینگے۔ تو پھر بجلی کی ایک کڑک کے ذریعہ وہ ہلاک کر دیئے گئے اور پھر زندہ کیئے گئے۔ حضرت موسیٰ نے ان سے پھر تورات کے قبول کرنے کیلئے فرمایا انھوں نے پھر انکار کر دیا

تب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ فلسطین کے پہاڑوں میں سے ایک فرسخ یعنی تین میل اور بقول بعض بارہ ۱۲ہزار گز تقریباً آٹھ ۸ کلومیٹر لمبے پہاڑ کو اکھاڑ کر سائبان کی طرح ان پر معلق کر دیں۔ ان کے پیچھے سمندر تھا اور ان کے سامنے سے آگ آ رہی تھی۔ ان سے کہا گیا کہ قسم کھا کر اقرار کرو کہ تم رات کے احکام پر عمل کروگے ورنہ یہ پہاڑ تم پر گر جائیگا تب انھوں نے توراۃ پر عمل کرنے کا پختہ عہد کیا اور توبہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ گر گئے۔ انھوں نے کروٹ کے بل سجدہ کیا تھا اور مارے خوف کے پہاڑ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

جب اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا تو انھوں کہا کہ اس سجدہ سے افضل کوئی سجدہ نہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے قبول کیا اور جس کی وجہ سے اپنے بندوں پر رحم فرمایا۔ پھر انھیں یہ حکم دیا گیا کہ وہ کروٹ کے بل ایک شق پر سجدہ کیا کریں۔۔ تو۔۔ اے محبوب ! اپنے عہد کے یہودیوں سے ان کے مورثین سے تعلق رکھنے والا یہ واقعہ سنا دو۔۔ (تفسیر اشرفی)

آیت مبارکہ:

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۱۷۱

لغۃ القرآن: [وَاِذْ : اور جب] [نَتَقْنَا : کھینچ کر اونچا کیا ہم نے] [الْجَبَلَ : پہاڑ کو] [فَوْقَهُمْ : ان کے اوپر] [كَاَنَّهٗ : گویا کہ وہ] [ظُلَّةٌ: ایک سائبان ہے] [وَّظَنُّوْٓا : اور انہوں نے گمان کیا] [اَنَّهٗ : کہ وہ] [وَاقِعٌ : پڑنے والا ہے] [بِهِمْ : ان پر] [خُذُوْا : (تب ہم نے کہا) تم لوگ پکڑو] [مَآ : اس کو جو] [اٰتَيْنٰكُمْ : ہم نے دیا تم کو] [بِقُوَّةٍ : مضبوطی سے] [وَّاذْكُرُوْا : اور یاد رکھو] [مَا : اس کو جو] [فِيْهِ : اس میں ہے] [لَعَلَّكُمْ : تاکہ تم] [تَتَّقُوْنَ : پرہیزگار ہوجاؤ]

ترجمہ: اور (وہ وقت یاد کیجئے) جب ہم نے ان کے اوپر پہاڑ کو (یوں) بلند کر دیا جیسا کہ وہ (ایک) سائبان ہو اور وہ (یہ) گمان کرنے لگے کہ ان پر گرنے والا ہے۔ (سو ہم نے ان سے فرمایا: ڈرو نہیں بلکہ) تم وہ (کتاب) مضبوطی سے (عملاً) تھامے رکھو جو ہم نے تمہیں عطا کی ہے اور ان (احکام) کو (خوب) یاد رکھو جو اس میں (مذکور) ہیں تاکہ تم (عذاب سے) بچ جاؤ

تشریح: لسان العرب میں ہے النتق: الزعزعة والهز والجذب والنفض: یعنی نتق کا معنی جھٹکا دینا، زور سے ملانا، کھینچنا اور جھاڑنا ہے۔ جب پہاڑ میں زلزلہ آتا ہے تو اسی قسم کی کیفیت رونما ہوتی ہے۔ اور جو لوگ پہاڑ کے دامن میں کھڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ انھیں یوا8 معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ ان پر ابھی گرا چاہتا ہے۔ اسی قسم کی صورت حال سے بنی اسرائیل کو دوچار کر دیا گیا۔ توراۃ سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ کتاب خروج باب ۱۹ کی آیات ۱۶ تا ۱۹ ملاحظہ ہوں:۔

جب تیسرا دن آیا تو صبح ہوتے ہی بادل گرجنے اور بجلی چمکنے لگی اور پہاڑ پر کالی گھٹا چھا گئی اور قرنا کی آواز بہت بلند ہوئی اور سب لوگ ڈیروں میں کانپ گئے۔ اور موسیٰ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملائے اور پہاڑ سے نیچے آ کھڑے ہوئے اور کوہ سینا اوپر سے نیچے تک دھوئیں سے بھر گیا کیونکہ خداوند شعلہ میں ہو کر اس پر اترا اور دھواں تنور کے دھوئیں کی طرح اوپر کو اٹھ رہا تھا اور وہ پہاڑ زور سے ہل رہا تھا۔

اس کے علاوہ نتق کا معنی اقتلع بھی ہے۔ یعنی کسی چیز سے اکھیڑ لینا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ذرا بعید نہیں کہ وہ اس پہاڑ کو اکھیڑ کر ان کے سروں پر آویزاں کر دے۔ تالمود ہیں جو روایت ہے وہ اسی معنی کی تصدیق کرتی ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جب توراۃ کے احکام سنائے تو بنی اسرائیل نے ان پر عمل کرنے سے معذرت کی جس پر اللہ تعالیٰ نے پہاڑ کو اٹھا کر سائبان کی طرح ان کے سروں پر معلق کر دیا اور انھوں نے یہ گمان کیا کہ وہ ان پر گرنے والا ہے، چنانچہ انھوں نے گھبرا کر توراۃ کے احکام پر عمل کرنے کا وعدہ کر لیا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین میں جبر نہیں ہے تو بنی اسرائیل کو احکام توراۃ قبول کرنے پر مجبور کیوں کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی غیر مسلم کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا درست نہیں ہے لیکن جو مسلمان ہو اور اسلامی حکومت کا باشندہ ہو، پھر اگر وہ اسلامی احکام کی خلاف ورزی کرے تو اس کو اسلامی قوانین کا پابند بنانا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ (تفسیر امداد الکرم)

قرآنِ کریم کا آہستہ آہستہ نزول اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے:

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کا 23 سال کے عرصے میں آہستہ آہستہ اترنا بھی اللہ عَزَّوَجَلَّ کی خاص رحمت ہے کہ اس طرح مسلمانوں کو تمام احکامات پر عمل آسان ہو گیا۔ آزاد طبیعت ایک دم سارے احکام کی پابندی میں دقت محسوس کرتی ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

یہود کی ایک اور برائی سے پردہ اٹھایا جارہا ہے۔ امام ابن جریر نے ابو بکر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ جب موسیٰ (علیہ السلام) کتاب لے کر آئے تو بنی اسرائیل نے کہا جب تک ہم اسے پڑھ نہ لیں ہم اسے قبول نہ کریں گے اللہ تعالیٰ نے پہاڑ کو حکم فرمایا وہ اکھڑ کر ان کے اوپر فضا میں بلند ہوا اور ان کے سروں پر آکر چھتری کی طرح ٹھہر گیا اور فرمایا گیا کہ توراۃ کو مانو ورنہ یہ پہاڑ تم پر گرادیا جائے گا۔ حضرت حسن بصری (رض) عنہٗ نے فرمایا: یہ دیکھ کر بنی اسرائیل سجدے میں گر گئے مگر ہر شخص نے بائیں ابرو پر سجدہ کیا دائیں آنکھ سے اوپر دیکھتے رہے جی کہیں پہاڑ ان پر گرنے والا تو نہیں۔ چنانچہ آج تک یہود بائیں رخسار ہی پر سجدہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں اسی سجدہ نے پہاڑ سے بچایا تھا۔ (تفسیر ابن جریر طبری جلد 9 صفحہ 75 مطبوعہ دار الباز مکہ مکرمہ)

اس جگہ بعض جدید مفسرین کہتے ہیں پہاڑ کو اٹھا کر ان کے اوپر نہ لایا گیا تھا بلکہ زلزلہ بپا ہوا اور انھیں یوں لگا کہ پہاڑ ان پر گر جائے گا مگر یہ تفسیر الفاظ قرآن کے خلاف ہے۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ورفعنا فوقکم الطور۔ "ہم نے تم پر طور پہاڑ بلند کیا۔" (بقرہ: 63) یہاں فرمایا گیا: کَاَنَّہٗ ظُلَّۃٌ۔ گویا وہ چھتری بن گیا۔ ان الفاظ سے خوب ظاہر ہے کہ پہاڑ اٹھا کر ان کے اوپر لایا گیا اور قدرت خداوندی سے کیا بعید ہو سکتا ہے؟ (تفسیر برہان القرآن)

حضرت حضرت موسیٰ بنو اسرائیل کے پاس توراۃ کی الواح لے کر آئے اور فرمایا کہ ان کو لو اور ان کی اطاعت کا اقرار کرو، تو انھوں نے کہا جب تک اللہ تعالیٰ آپ کی طرح ہم سے کلام نہیں کرے گا ہم یہ اقرار نہیں کریں گے، پھر وہ بجلی کی ایک کڑک کے ذریعے ہلاک کیے گئے، اور پھر زندہ کیے گئے۔ حضرت موسیٰ نے ان سے پھر توراۃ کے قبول کرنے کے لیے فرمایا انھوں نے پھر انکار کیا، تب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ فلسطین کے پہاڑوں میں سے ایک فرسخ لمبے پہار کو اکھار کر سائبان کی طرح ان پر معلق کر دیں، ان کے پیچھے سمندر تھا اور ان کے سامنے سے آگ آرہی تھی، ان سے کہا گیا کہ قسم کھا کر اقرار کرو کہ تم توراۃ کے احکام پر عمل کرو گے ورنہ یہ پہاڑ تم پر گر جائے گا، تب انھوں نے توراۃ پر عمل کرنے کا پختہ عہد کیا اور توبہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ میں گر گئے۔ انھوں نے کروٹ کے بل سجدہ کیا تھا اور مارے خوف کے پہاڑ کی طرف دیکھ رہے تھے، جب اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا تو انھوں نے کہا اس سجدہ سے افضل کوئی سجدہ نہیں ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے قبول کیا اور جس کی وجہ سے اپنے بندوں پر رحم فرمایا۔ پھر انھیں یہ حکم دیا گیا کہ وہ کروٹ کے بل یعنی ایک شق پر سجدہ کیا کریں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کو خوب کوشش سے لو اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد کرو، یعنی اس میں تدبر اور غور و فکر کرو، اور اس کے احکام کو ضائع نہ کرو، کیونکہ کتابوں کو نازل کرنے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ ان کے مقتضیٰ پر عمل کیا جائے، یہ نہیں کہ ان کے معنی پر غور و فکر کیے بغیر ان کی صرف تلاوت کر لی جائے۔ امام نسائی نے حضرت ابو سعید خدری (رض) سے روایت کیا ہے کہ لوگوں میں سب سے بدتر فاسق وہ ہے جو قرآن پڑھتا ہے اور اس کے کسی حکم کی طرف رجوع نہیں کرتا، اس حدیث میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ بتلا دیا ہے کہ قرآن مجید پڑھنے سے مقصود عمل ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن، ج 7، ص 436۔43، مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو، ایران، 1387ھ) (تفسیر تبیان القرآن)

بنی اسرائیل پر کوہ طور کو اٹھائے جانے کا واقعہ قرآن مجید میں چار مرتبہ بیان ہوا ہے سورۃ البقرۃ آیت: ۶۳، ۹۳ اور سورۃ النساء ۱۵۴ میں اس کے لیے "وَرَفَعْنَا" کا لفظ استعمال ہوا۔ جس کا معنی ہے ہم نے ان پر طور کو بلند کیا۔ جس کے بارے میں بعض مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ کوہ طور کو جڑ سے نہیں اٹھایا گیا تھا۔ بلکہ یہ شدید زلزلہ کے باعث اس طرح ڈولنے اور حرکت کرنے لگا کہ انھوں نے سمجھا کہ بس یہ پہاڑ ہمارے اوپر گرنے ہی والا ہے لیکن یہاں قرآن نے "نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَھُمْ" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ جن کا معنیٰ ہے کہ ہم نے کوہ طور کو بنیاد سے اٹھا کر ان کے سروں پر منڈلایا۔ مزید فرمایا کہ پہاڑ ان کے سروں پر "ظُلَّۃٌ" کی مانند ہوا۔ ظُلّہ کا معنی ہے سائبان جب انسان کا ذہن اللہ تعالیٰ کی قدرت و سطوت کے بجائے پہاڑ کی جسامت اس کی گہرائی اور اونچائی کی طرف مائل ہو تو پھر اسے یہ بات سمجھنے میں دقت محسوس ہوتی ہے کہ اتنا بڑا پہاڑ کس طرح ان کے سروں کے اوپر منڈلایا جا سکتا ہے۔ لیکن جب انسان کا ذہن اللہ تعالیٰ کی قدرت و سطوت کی طرف مائل ہو تو اسے یہ سمجھنے میں کوئی مشکل اور کسی تاویل کی ضرورت پیش نہیں آتی کیونکہ جو قادر مطلق ہمارے سروں پر آسمانوں کو بلا سہارا اربوں سال سے قائم رکھے ہوئے ہے اور جس نے زمین کو پانی کے اوپر بچھا رکھا ہے اور جو کھربوں ٹن بادلوں کو ہمارے سروں پر منڈلاتا ہے اس قادر مطلق کے سامنے کوہ طور کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے اس لیے قرآن کے الفاظ کا حقیقی مفہوم اور لفظی معنیٰ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے سروں پر پہاڑ لا کھڑا کیا تھا اور جب ان کو یقین ہو گیا کہ یہ تو ہمارے اوپر گرنے ہی والا ہے تب انھوں نے اقرار کیا تھا۔ قرآن مجید میں "ظن" کا لفظ اکثر مقامات پر یقین کے معنوں میں آیا ہے۔ یاد رہے کہ بنی اسرائیل جیسی مجرم قوم

محض گمان کی بنیاد پر ماننے والی نہ تھی۔ لہٰذا یہاں ظن سے مراد یقین کرلینا ہے۔ اس حالت میں انھیں حکم ہوا کہ جو کچھ ہم تمہیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی کے ساتھ تھام لو اور اس سے رہنمائی حاصل کرو تاکہ تم اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ سکو۔ لیکن یہ قوم اس قدر منافق اور ظالم تھی کہ انھوں نے بظاہر بلند آواز سے کہا کہ ہم نے سن لیا لیکن اپنے دلوں میں کہہ رہے تھے کہ ہم نہیں مانیں گے۔ قرآن مجید بیان کرتا ہے کہ اتنی بڑی سرکشی اور نافرمانی کا سبب ان کا شرک کرنا تھا۔ کیونکہ بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں پوری طرح سرایت کرچکی تھی۔

(وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهِ إِيمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ) [البقرۃ: ۹۳]

"اور جب ہم نے طور کو تمہارے اوپر اٹھا کر تم سے اقرار لیا کہ جو کتاب ہم نے تمہیں دی ہے اس پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونا اور غور سے سننا۔ تو تمہارے اسلاف کہنے لگے کہ ہم نے سن لیا اور (دل میں کہا) ہم مانیں گے نہیں۔ ان کے کفر کی وجہ سے بچھڑا ان کے دلوں میں رچ بس گیا۔ آپ ان سے کہیے اگر تم مومن ہو تو تمہارا یہ ایمان تمہیں بری باتوں کا حکم دیتا ہے۔"

ایسی کیفیت میں اللہ تعالیٰ کی توحید قبول کرنا اور ہدایت کے راستہ پر آنا مشکل ترین عمل بن جاتا ہے۔ اس واقعہ سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ جب تک انسان قلبی طور پر ہدایت کی طرف راغب نہ ہو۔ اسے جبراً کوئی بات منوائی نہیں جاسکتی۔ جبری ہدایت جبر کے قائم رہنے تک رہتی ہے۔ جو نہی جبر ختم ہوگا وہ شخص برائی کی طرف پلٹ جائے گا۔ البتہ کلمہ گو کو جبراً نماز، روزہ اور نیک کاموں کی طرف راغب کرنا حکومت کا فرض ہے لیکن غیر مسلم کو جبراً مسلمان نہیں بنایا جاسکتا۔ (تفسیر فہم القرآن)

آیت مبارکہ:

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚۛ شَهِدْنَا ۚۛ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝ۙ

لغۃ القرآن: [وَاِذْ : اور جب] [اَخَذَ : پکڑا (یعنی نکالا)] [رَبُّكَ : آپ کے رب نے] [مِنْ بَنِيٓ اٰدَمَ : آدم کے بیٹوں سے] [مِنْ ظُهُوْرِهِمْ : ان کی پیٹھوں سے] [ذُرِّيَّتَهُمْ : ان کی اولاد کو] [وَاَشْهَدَهُمْ : اور اس نے گواہ بنایا ان کو] [عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ : اپنے آپ پر] [اَلَسْتُ : (پھر پوچھا) کیا میں نہیں ہوں] [بِرَبِّكُمْ: تمہارا رب] [قَالُوْا : انہوں نے کہا] [بَلٰي ر : کیوں نہیں] [شَهِدْنَا ر : ہم نے گواہی دی] [اَنْ : کہیں] [تَقُوْلُوْا : تم لوگ کہو] [يَوْمَ الْقِيٰمَةِ : قیامت کے دن] [اِنَّا كُنَّا : کہ ہم تھے] [عَنْ : سے] [هٰذَا : اس سے] [غٰفِلِيْنَ : غافلوں]

ترجمہ: اور (یاد کیجئے!) جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشتوں سے ان کی نسل نکالی اور ان کو انہی کی جانوں پر گواہ بنایا (اور فرمایا:) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ وہ (سب) بول اٹھے: کیوں نہیں! (تو ہی ہمارا رب ہے،) ہم گواہی دیتے ہیں تاکہ قیامت کے دن یہ (نہ) کہو کہ ہم اس عہد سے بے خبر تھے

تشریح: علامہ قرطبیؒ نے اس آیت کو قرآن کی مشکل آیات سے شمار کیا ہے۔ اس لیے اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے ذرا تفصیل کی ضرورت ہے۔ معتزلہ کی رائے یہ ہے کہ جس سوال و جواب کا یہاں ذکر ہے وہ خارج میں وقوع پذیر نہیں ہوا کہ کہیں آدم (علیہ السلام) کی ساری اولاد کو جمع کرکے ان سے یہ سوال پوچھا گیا ہو اور انھوں نے بیک زبان بلیٰ کہہ کر جواب دیا ہو یہ کلام بطور تمثیل ذکر کیا گیا ہے۔ اور توحید باری کی آیات بینات جو بڑی دریا دلی سے انسان کے ظاہر و باطن میں بکھیر دی گئی ہیں۔ وہ

بزبان حال اس کی توحید کا اعتراف کرتے ہوئے بلیٰ بلیٰ کے نعرے لگا رہی ہے۔ علامہ بیضاوی کا میدان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کے ضمن میں وہ لکھتے ہیں ای نصب لہم دلائل ربوبیتہ ورکب فی عقولہم ما یدعوہم الی الاقرار بھا حتی صاروا بمنزلۃ من قیل لہم الست بربکم اوابل تنزل تمکینھم من العلم بھا و تمکنھم منہ منزلۃ الاشھاد والاعتراف علی طریق التمثیل یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کی روشن دلیلیں ان کے لیے قائم کر دی ہیں۔ اور ان کو اتنی سمجھ مرحمت فرمادی ہے کہ وہ ان دلائل کے پیش نظر اس کی الوہیت کا اعتراف کریں۔ گویا ان سے پوچھا جا رہا ہے کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ اور وہ اعتراف کر رہے ہیں۔ یہ کلام بطور تمثیل ہے۔ لیکن سلف صالحین کا مسلک یہ ہے کہ اس آیت کی صحیح تفسیر وہ ہے جو احادیث نبویہ سے ثابت ہے۔ حضرت عمر (رض) نے ایک دفعہ حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس آیت کا مطلب دریافت کیا تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جب آدم (علیہ السلام) کی تخلیق ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی پشت پر اپنا دست قدرت پھیرا۔ جس کی وجہ سے آپ کی ہونے والی ساری اولاد ظاہر ہو گئی۔ اور ان سے یہ سوال کیا گیا اور انھوں نے بلی سے اس کا جواب دیا۔ اس حدیث سے اور اس کے علاوہ متعدد احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سوال وجواب حقیقت میں ہوا تھا۔ یہ محض تمثیل ہی نہیں جیسے معتزلہ کا خیال ہے۔ ان احادیث صحیحہ کی موجودگی میں ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس بات کو تسلیم کرنے میں تامل کریں جو قادر مطلق اپنی قدرت کاملہ سے قیامت کے دن سب اولاد آدم کو میدان حشر میں جمع فرما سکتا ہے۔ اس کی قدرت سے کیا بعید ہے کہ وہ پشت آدم (علیہ السلام) سے ان کی ساری اولاد نکال کر اپنی بارگاہ میں پیش کر دے۔ علامہ قطب الدین شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے ان مختلف آراء میں بڑی عمدہ تطبیق کی ہے جس کو فضلاء امت نے بہت پسند کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم سے دو میثاق لیے ہیں ایک حالی اور دوسرا مقالی۔ حالی میثاق تو یہ ہے کہ اس کی فطرت میں عقیدہ توحید کی طرف جو میلان رکھ دیا اور اس کے باطن میں دلائل کے جو چراغ روشن کر دیئے ہیں وہ اپنی زبان حال سے بلی کہہ رہے ہیں۔ اور دوسرا میثاق وہ تھا جس کا ذکر حدیث پاک میں ہے جو روز میثاق کو لیا گیا تھا۔ (روح المعانی)

یہاں یہ شبہ دل میں کھٹکنے لگتا ہے کہ وہ عہد جس کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے اور جس کی خلاف ورزی کو جرم قرار دیا جا رہا ہے وہ آج کسے یاس ہے؟ کیا ایسی چیز جو بالکل فراموش ہو چکی ہو وہ بھی حجت قرار دی جا سکتی ہے۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس میثاق کی یاد اگرچہ ذہن اور شعور سے محو ہو چکی ہے لیکن تحت الشعور میں اب بھی موجود ہے اور انسانی فطرت میں اس کی ایسی تخم ریزی کر دیئی ہے کہ جب بھی اسے صحیح رہنمائی، صحیح تربیت اور مناسب ماحول نصیب ہوتا ہے تو فوراً یہ بیج اگتا ہے اور چشم زون میں توحید کا شجر طیب اپنی آفاقی وسعتوں کے ساتھ ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔ اگر توحید کو قبول کرنے کی صلاحیت انسان کی فطرت میں ودیعت نہ کی گئی ہوتی تو کوئی تعلیم، کوئی رہنمائی، کوئی ماحول اس کو توحید کا سبق نہ ازبر کرا سکتا۔ کیونکہ یہ ساری چیزیں فقط انھیں صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتی ہیں جو پہلے سے انسانی تحت الشعور میں موجود ہوتی ہیں۔ ایک آدمی تیر بھی نہیں سکتا اور ہوا میں اڑ بھی نہیں سکتا لیکن آپ اس کی مناسب تربیت کر کے اسے ایک بہترین تیراک تو بنا سکتے ہیں لیکن آپ ہزار جتن کریں اس کو ہوا میں اڑنا نہیں سکھا سکتے۔ اس کی وجہ یہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں تیرے کی استعداد رکھی ہے لیکن اڑنے کی صلاحیت نہیں رکھی۔ تو معلوم ہوا کہ یوم میثاق کو جو بلی ہم نے کہہ تھی وہ ہمیں بھول جائے تو بھول جائے لیکن وہ ہمارے رگ وپے میں سمائی ہوئی ہے۔ فقط کسی ماہر کے چھیڑنے کی منتظر ہے۔ ع تو ذرا چھیڑ تو دے تشنہ مضراب ہے ساز۔ وہ لوگ جو اس ابھرتی ہوئی فطری آواز کو دباتے رہتے ہیں۔ جو روح کی اس تشنگی کو سیراب کرنے سے دانستہ غفلت برتتے ہیں۔ قیامت کے دن ان کا کوئی عذر قابل قبول نہ ہوگا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

اللہ تعالیٰ نے جس طرح فرشتوں کو جمع کر کے انسان اول حضرت آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرایا اور زمین پر انسان کی خلافت کا اعلان کیا اسی طرح قیامت تک پیدا ہونے والی پوری نسل انسانی کو حضرت آدم (علیہ السلام) اور ان کی اولاد کی پشتوں سے نکالا اور عرفات پہاڑ کے متصل وادی نعمان میں جمع کیا۔ ان کو وجود، شعور اور قوت گویائی عطا فرما کر ان سے اپنی ربوبیت کی گواہی لی، اس کو میثاق الست کہا جاتا ہے۔ یعنی ان سے پوچھا: "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں "تو سب نے جواب دیا: کیوں نہیں! ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک تو ہی ہمارا رب ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "میں تم پر زمین وآسمان اور تمہارے باپ آدم کو گواہ بناتا ہوں تا کہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکو کہ ہم کو اس میثاق کا علم نہیں تھا۔ خوب جان لو کہ میرے سوا کوئی دوسرا عبادت کے لائق نہیں ہے اور نہ ہی میرے سوا کوئی دوسرا رب ہے۔ تم میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا۔ میں تمہارے پاس اپنے رسول بھیجوں گا جو تم کو میرے اس عہد ومیثاق کی یاد دہانی کرائیں گے۔ (مسند احمد: جلد ۵: ص ۱۳۵)

یہاں سوال یہ ہے کہ جب انسان اس دنیا میں پیدا ہوا تو وہ اس میثاق کو بھول چکا تھا تو پھر قیامت کے دن اس میثاق کو حجت بنانا اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دینا کیسے درست ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں چند نکات ملاحظہ ہوں:

۱۔ یہ درست ہے کہ اس دنیا میں پیدا ہونے کے بعد وہ میثاق انسان کے شعور میں حاضر نہیں ہوتا مگر انسانی فطرت اور تحت الشعور میں اس کے اثرات موجود ہوتے ہیں اور جب بھی کوئی انسان اپنی تخلیق کے مقصد اور نظام کائنات میں غور کرتا ہے تو اس میثاق کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں، جس طرح کوئی انسان سونے کی ایک اینٹ جنگل میں کہیں دفن کرے اور اس جگہ کے نشانات اپنے ذہن میں محفوظ کر لے، پھر کچھ عرصہ بعد اگر اسے وہ جگہ بھول جائے تو وہ اس کے تحت الشعور میں ضرور موجود ہوتی ہے اور جنگل میں چکر لگائے اور دماغ پر زور دینے سے بالآخر اسے وہ نشانات یاد آ ہی جاتے ہیں جہاں اس کی اینٹ دفن ہوتی ہے۔

۲۔ یہ اسی میثاق کا واضح اثر ہے کہ ابتداءِ آفرینش سے لے کر آج تک خدا کو مانا جاتا ہے اگرچہ اس کی تعریف میں اختلاف ہے، کسی نے پتھروں کو خدا بنالیا اور کسی نے سورج کو مگر اس کا بنیادی تصور ہر دور، ہر علاقہ اور ہر نسل میں موجود رہا ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے جب انبیائے کرام (علیہم السلام) کو بھیجا اور انھوں نے اس میثاق کی یاددہانی کا حق ادا کر دیا تو انبیائے کرام (علیہم السلام) کی یہ تبلیغ ایسی حجت ہے جس کا انکار ممکن نہیں ہے، اس کے باوجود جو نادان اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لائے گا وہ جہنم میں جانے کا خود ذمہ دار ہوگا۔ جس طرح ایک نماز چار رکعتوں کی بجائے تین رکعتیں پڑھ کر نماز سے فارغ ہو جاتا ہے اور چوتھی رکعت پڑھنا بھول جاتا ہے، اس جگہ موجود چند معتبر لوگ اسے بتاتے ہیں کہ اس نے ایک رکعت چھوڑ دی ہے، تو ان لوگوں کی یاددہانی اس نمازی پر حجت ہوگی۔ اب اگر وہ دوبارہ پوری چار رکعتیں نہیں پڑھے گا تو وہ مجرم ہوگا، اگرچہ خود اسے یاد نہیں کہ اس نے صرف تین رکعتیں پڑھی ہیں مگر معتبر لوگوں کے بتانے کے بعد اب اس کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح انبیاء کرام (علیہم السلام) نے ساری دنیا کو یہ بھولا ہوا میثاق یاد کرایا ہے، لہٰذا ان کی گواہی کے بعد اب کسی کافر کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

۴۔ جب ماں اپنے جوان بیٹے کو اس کے بچپن کی باتیں سناتی ہے تو اگرچہ اس کے بیٹے کو وہ باتیں یاد نہیں ہوتیں لیکن پھر بھی وہ بلاچون وچرا مان لیتا ہے کیونکہ اسے ماں پر اعتماد ہے۔ اسی طرح جب انبیائے کرام (علیہم السلام) نے آسمانی کتابوں کے ذریعہ وہ بھولا ہوا میثاق یاد دلایا تو بنی آدم کو بھی بلا تامل اسے مان کر آخرت کی فکر کرنی چاہیے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو فطرت اسلام پر پیدا فرمایا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی فطرت میں ایسی صلاحیت اور استعداد رکھی ہے جس کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر سکتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کی فطرت (اسلام کی مضبوطی سے پکڑ لو) جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔" (قرآن: ۳۰: ۳) اس آیت کی تفسیر میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

الف۔ ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی، عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

(بخاری: کتاب الجنائز: باب ۸۰)

ب۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے اپنے سب بندوں کو حنیف یعنی مسلمان پیدا کیا، پھر شیطان نے ان کو دین فطرت سے دور کر دیا۔

(مسلم: کتاب الجنتہ: باب ۱۶)

یہی وجہ ہے کہ جو بنی آدم بالغ ہونے سے پہلے بچپن میں ہی فوت ہو گئے چاہے وہ کفار اور مشرکین کی اولاد ہی کیوں نہ ہوں ان کو آخرت میں عذاب نہیں ہوگا اور حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشاد کے مطابق وہ بھی جنت میں جائیں گے۔

(بخاری: کتاب التعبیر: باب ۴۸)

۶۔ اس میثاق کو بھلا دینے میں بھی حکمت ہے تاکہ دنیا میں انسان کی آزمائش ہو سکے۔ اگر یہ میثاق شعور میں تازہ رہتا تو سارے انسان اہل ایمان ہوتے اور آزمائش کا مقصد فوت ہو جاتا۔ اس لیے اس میثاق کو انسان کو شعور سے ہٹا کر اس کے تحت الشعور میں محفوظ کر دیا گیا تاکہ انسان خود کوشش کر کے اس کو حاصل کرے اور کوشش کے ذریعہ صرف وہی چیز حاصل ہو سکتی ہے جس کی صلاحیت انسان کے تحت الشعور میں بالقوۃ موجود ہو کیونکہ جس چیز کی صلاحیت ہی موجود نہ ہو وہ کوشش

کے باوجود بھی حاصل نہیں ہو سکتی، مثلاً انسان کے اندر تیرنے کی صلاحیت ہے، لہٰذا وہ کوشش کرکے تیرنا سیکھ سکتا ہے مگر اس کے اندر اڑنے کی صلاحیت نہیں ہے، لہٰذا وہ کوشش کے باوجود بھی اڑنا نہیں سیکھ سکتا۔ آج دنیا میں ایک ارب سے زائد مسلمان موجود ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ میثاق الست کی برکت سے انسان کے اندر توحید پرستی کی صلاحیت موجود ہے جو کوشش کے ساتھ حاصل کی جا سکتی ہے اور جو اس تلاش حق کی کوشش نہ کرے وہ باطل پرستی کا مجرم ہے اور قیامت کے دن اس کا کوئی عذر قبول نہیں ہوگا۔ (تفسیر امداد الکرم)

{ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ: کہ تم قیامت کے دن کہو۔ } اس آیت اور بعد والی آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اے اللہ کی ربوبیت کا اقرار کرنے والو! یہ گواہ بنانا اس لیے تھا تاکہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکو کہ اے اللہ عَزَّوَجَلَّ! ہم جو شرک و کفر میں مبتلا رہے ہیں اس میں ہمارا قصور نہیں، کیونکہ ہمیں خبر تھی ہی نہیں کہ تو ہی ہمارا رب عَزَّوَجَلَّ ہے اور تیرے سوا کوئی بھی رب نہیں اور اے ربِّ کریم! تو بیخبر کو نہیں پکڑتا، لہٰذا ہمیں چھوڑ دے اور عذاب نہ دے اور نہ ہی یہ کہہ سکو کہ "ہم کفر و شرک میں اس لیے بے قصور ہیں کہ ہمارے باپ دادا مشرک تھے ہم تو ان کی وجہ سے شرک میں مبتلا ہوئے، قصور ان کا ہے نہ کہ ہمارا۔ انھیں یہ باتیں کہنے کا حق اس لیے نہ ہوگا کہ جب ان سے عہد میثاق لے لیا گیا اور یہ بات ان کے دلوں کی تہہ میں رکھ دی گئی اور اس عہد کی یاد دہانی کیلئے ان کے پاس رسول آئے اور انھوں نے اس عہد کو یاد دلایا، کتابیں اتریں اور ان کے سامنے حق بیان کر دیا گیا تو اب یہ عذر کرنے کا ان کے پاس موقع نہ رہا۔ (2)

سورہِ اعراف کی آیت نمبر 172 اور 173 سے معلوم ہونے والے احکام:

ان آیات سے 3 احکام معلوم ہوئے

(1)۔۔ عمومی طور پر شرعی احکام میں بیخبری معتبر نہیں، کوئی یہ عذر پیش کرکے کہ مجھے معلوم نہیں تھا اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں چھوٹ سکتا۔ ہر شخص پر فرض ہے کہ ضرورت کے مطابق دینی مسائل سیکھے۔

(2)۔۔ عقائد میں باپ دادوں کی تقلید درست نہیں، اللہ تعالیٰ نے عقل دی ہے لہٰذا خود تحقیق کرکے درست عقیدے اختیار کرنے چاہئیں۔ (3)۔۔ گناہ کی بنیاد ڈالنا اگرچہ سخت تر جرم ہے مگر بعد میں دوسرے لوگ یہ گناہ کرنے والے بھی مجرم ہوں گے، وہ یہ عذر نہیں کر سکتے کہ ہم چونکہ اس گناہ کو ایجاد کرنے والے نہیں اس لیے قصوروار بھی نہیں۔ (تفسیر صراط الجنان)

مروی ہے کہ اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ کے جواب میں سب سے اول نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بَلٰی کہا پھر سارے انبیاء نے پھر درجہ بدرجہ تمام مومنین نے خوشی کے ساتھ کہا اور کفار نے آخر میں مجبوراً کہا۔ (روح المعانی)

یہاں سے تین فوائد حاصل ہوئے:

1۔ ہر انسان کا نسب باپ کی طرف سے ہوتا ہے ماں کی طرف سے نہیں۔

مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّیَّتَهُمۡ سے پتہ چلا کہ کسی کی ذریت وہ ہے جو اس کی پشت سے نکلے گویا نسب میں باپ کی پشت کا اعتبار ہے ماں کے رحم کا نہیں۔

لہٰذا جس کی ماں سیدانی ہو باپ سید نہ ہو وہ سادات میں سے نہیں ہے، نہ ہی وہ خود کو اولاد فاطمۃ الزہراء (رض) سے کہلا سکتا ہے۔ مرزا قادیانی نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا جبکہ امام مھدی احادیث صحیحہ کے مطابق اولاد فاطمۃ الزہرہ میں سے ہوں گے۔ (سنن ابی داود کتاب المہدی حدیث 4384) اور مرزا کہتا تھا ہمارے خاندان میں میری کی دادیاں عورتیں سیدانی گزری ہیں میں ان کی اولاد ہوئی لہٰذا میں بنی فاطمہ میں سے ہوں (نزول مسیح صفحہ 50 مندرجہ روحانی خزائن جلد 18 صفحہ 426 مطبوعہ لندن) مگر یہ سب مرزا قادیانی کی مذبوحی حرکتیں ہیں یعنی مہدی موعود کہلانے کے لیے بے مقصد ہاتھ پاؤں مرنے کی سعی مذموم ہے۔

2۔ ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے:

جب ہر روح سے روز میثاق ربوبیت خداوندی کا اقرار لیا گیا تو معلوم ہوا کہ ہر بچے کی فطرت میں اسلام رکھا گیا ہے۔ اس لیے حضرت ابوہریرہ (رض) عنہٗ سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اسے یہودی عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ " (بخاری کتاب التفسیر سورۃ الروم۔ مسلم کتاب القدر حدیث 22)

3۔ کفار کے ناسمجھ بچے جنت میں جائیں گے :

جب ہر روح اللہ کی ربوبیت کا اقرار کر چکی ہے تو کفار کے جو بچے سن شعور سے قبل فوت ہو جائے وہ جنتی اور فطرت اسلام پر ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے بھی یوم میثاق میں ربوبیت خداوندی کا اقرار کیا تھا، پھر وہ سن شعور میں داخل ہونے سے قبل مر گئے تو گویا وہ اسی اقرار پہ مرے۔ (تفسیر برہان القرآن)

گزشتہ آیات میں ان معاہدات و مواثیق کا ذکر تھا جو بنی اسرائیل سے احکام تورات کی پابندی کے سلسلے میں لیے گئے تھے۔ مذکورۃ الصدر آیات میں اس عظیم الشان عالمگیر معاہدہ کا بیان ہے جو تمام اولاد آدم سے حضرت آدم کی پیدائش کے بعد وادی نعمان عرفات میں اس عالم دنیا میں آنے سے بھی پہلے (عالم ارواح) ازل میں لیا گیا، جو کہ عام زبانوں پر "عہدِ الست" کے نام سے معروف و مشہور ہے۔

قرآنی عہد و مواثیق کا مختصر تذکرہ :

قرآن کریم کی متعدد آیات میں بہت سے معاہدہ تو مواثیق کا ذکر کیا گیا ہے جو مختلف جماعتوں سے مختلف اوقات اور حالات میں لیے گئے ہیں انبیاء (علیہم السلام) سے عہد لیا کہ جو کچھ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام ضرور پہنچائیں اس میں ان کے لیے کسی کا خوف اور لوگوں کی ملامت توہین اور تکذیب کا کوئی اندیشہ حائل نہ ہوگا اللہ تعالیٰ کی اس مقدس جماعت نے اپنے اس معاہدے کا پورا حق ادا کر دیا پیغام رسالت کے پہنچانے میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ علیہم الصلوۃ والسلام۔

اسی طرح ہر رسول اور نبی کی امت سے اس کا عہد و میثاق لیا گیا کہ وہ اپنے اپنے انبیاء کرام (علیہم السلام) کا پیغام سنیں گے اور قبول کرکے اس کا اتباع کریں گے پھر خاص خاص اہم معاملات میں خصوصیت کے ساتھ اس کے پورا کرنے میں اپنی پوری توانائی اور استعداد صرف کرنے کا عہد لیا گیا۔ بعضوں نے اسے پورا کیا اور بعضوں نے (بنی اسرائیل وغیرہ) پورا نہیں کیا اور کفار نے بھی پورا نہ کیا انہیں معاہدات میں سے ایک اہم معاہدہ وہ ہے جو تمام انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام سے ہمارے پیشوا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں لیا گیا کہ سب انبیاء کرام (علیہ السلام) نبی امی سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اتباع کریں گے اور توثیق کریں گے اور جب موقع پائیں گے تو ان کی مدد کریں گے جس کا ذکر اس آیت میں ہے "واذ اخذ اللہ میثاق النبیین لما اٰتیتکم من کتب وحکمۃ" (آل عمران)

یہ تمام عہود و مواثیق رب العزت سبحانہ و تعالیٰ کی رحمت کاملہ کے مظاہر ہیں اور مقصد ان کا یہ ہے کہ انسان جو کثیر النسیان ہے اکثر اپنے فرائض کو فراموش کرکے بھول جاتا ہے اور اس کو بار بار ان معاہدات کے ذریعہ ہوشیار و بیدار کیا گیا تا کہ وہ ہر قسم کی خلاف ورزی کی تباہی و نقصانات سے بچا رہے اس کے علاوہ اور بھی کئی معاہدات ہیں جن کی تفصیل کتاب الاحکام میں دیکھیں۔

بیعت بھی ایک قسم کا معاہدہ ہے :

انبیاء (علیہم السلام) اور ان کے نائب علماء کرام اور مشائخ عظام میں بھی جو بیعت لینے کا دستور رہا ہے وہ بھی اسی معاہدہ کے ذریعہ سنت الٰہیہ کا اتباع ہے جو ہادی اعظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بہت سے معاملات میں کبھی اجتماعی اور کبھی انفرادی طور پر صحابہ کرام سے بیعت لی ہے جن میں سے بیعت رضوان کا تذکرہ قرآن کریم نے بڑے پیارے انداز میں یوں بیان فرمایا "لقد رضی اللہ عن المومنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ" اسی طرح یہ منقبت بھی سنیے۔ "ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم"

یہ ہے وہ عظیم بیعت جس کا تذکرہ قرآن کریم کی سورۃ الفتح میں نہایت دلکش اور روح پرور انداز میں ہے۔ کاش شیطان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے دشمنان اسلام روافض اس سے سبق اور عبرت سیکھتے۔

ہجرت سے پہلے انصار مدینہ کی بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانیہ بھی اسی قسم کے معاہدات میں شامل ہیں اسی طرح سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بہت سے صحابہ کرام سے ایمان نماز خیر خواہی جہاد اور دیگر اعمال صالحہ کی بجاآوری اور پابندی پر بیعت لی حتی کہ صحابہ کرام کے ایک جم غفیر سے اس بات پر بیعت لی کہ کسی بھی انسان سے کسی قسم کا کوئی سوال نہیں کریں گے۔ سبحان اللہ وبحمدہ۔ ان لوگوں نے اس پر اتنی پابندی سے عمل کیا کہ زندگی بھر کسی سے پانی تک نہیں مانگا۔ (رض) اجمعین۔

صوفیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم چاروں طریقوں کے علماء و مشائخ میں بھی جو بیعت مروج ہے وہ بھی ایمان عمل صالح اعتبار سنت ترک شرک و بدعت اکل حلال صدق مقال دنیا سے بے رغبتی اقبال علی الآخرۃ حقوق اللہ حقوق العباد کی ادائیگی وغیرہ پر مشتمل ہے جب مرید صادق اپنے متبع سنت پیر کے ہاتھ پر ان چیزوں کی ادائیگی اور تمام

منھیات کے ترک و بیزاری کا عہد کرتا ہے اور اس کے ہاتھ پر بیعت کرکے اللہ کا مخلص بندہ ہونے کا عہد کرتا ہے تو ایک مختصر مدت میں کندن بنتا ہے اور اس پر اسم ذات اللہ کے اسرار کھل جاتے ہیں اور نیکیوں پر توفیق کا بے پناہ ہجوم کے ساتھ تمام گناہوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔

بیعت کی حقیقت معلوم ہونے سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پہلی شرط یہ ہے کہ بیعت ان ہی لوگوں سے ہو جو تارک دنیا متبع شریعت لوگ ہوں۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ست۔

پس بہر دستے نباید داد دست

جو گدی نشین بیچارے رسمی پدری میراثی پیر فقیر بیٹھے ہیں ان غریب دکانداروں تعیذ فروشوں سے دور رہنا چاہیے، نہیں تو بچا کھچا ایمان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا آج کل ناواقف دنیادار جاھل مشرک بدعتی لوگوں میں بیعت کا جو رواج ہے یہ دین و ایمان کے لیے نہایت خطرناک ہیں اور یہ لوگ بھی عیسائیوں سے کفارہ کا مسئلہ سیکھ کر یہی سمجھتے ہیں کہ مرشد (خواہ وہ کچھ بھی ہو) کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے دین و دنیا اور آخرت کی کامیابی سب کچھ مل جاتا ہے واقعی ابلیس نے بہت محنت کی اور لوگوں کا ستیاناس کیا یاد رکھو بیعت ایک دینی شرعی معاہدہ ہے اور اس کا فائدہ اور اس کی برکت جب ہی حاصل ہوتی ہے جب اس معاہدہ پر اتباع شریعت کے ساتھ پورا عمل ہو ورنہ وبال کا خطرہ ہے اب آیت کریمہ کی مختصر تشریح یہ ہے:

عہد الست کا مختصر تذکرہ:

اس سلسلے میں بہت سے صحابہ کرام مثلا حضرت فاروق اعظم حضرت انس بن مالک حضرت ابوہریرہ حضرت ابی بن کعب حضرت ابوالدردار ضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ سے مختلف الفاظ معنی کے ساتھ حدیثی روایات مروی ہیں ان سب کا خلاصہ یہ ہے:

اللہ تعالیٰ شانہ نے وادی نعمان میں (جو کہ عرفات کے ساتھ ہے) حضرت آدم (علیہ السلام) کی تخلیق فرمائی پھر ان کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا جو چھوٹی چیونٹیوں کی صورتوں میں تھی اور پشت در پشت ان کی نسل سے جو بھی مخلوق قیامت تک پیدا ہونے والی تھی سب کو پیدا فرمایا اور ان کی وہی صورتیں بنادیں جو عالم ظہور میں پیدا ہونے والی تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں بولنے کی قوت دی اس کے بعد ان سے عہد لیا اور انھیں ان کے نفسوں پر گواہ بنایا ان سے فرمایا الست بربکم کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ ان سب نے کہا بلیٰ۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ واقعی آپ ہمارے رب ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم سے یہ عہد اس لیے لیا گیا کہ قیامت کے دن یوں نہ کہنے لگو گے ہم تو اس توحید سے بے خبر تھے یا یوں کہنے لگو کہ اصل شرک تو ہمارے باپ دادوں نے کیا تھا اور ہم ان کے بعد ان کی نسل میں تھے ان کے تابع ہو کر ہم نے بھی ان کے اعمال اختیار کیے سو کیا ان گمراھوں کے فعل پر آپ ہمیں ہلاکت میں ڈالتے ہیں؟

چونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے اس بات کا اقرار لے لیا کہ واقعی اللہ تعالیٰ ہی ہمارا رب ہے انہوں نے اقرار کر لیا اور اپنی جانوں پر گواہ بن گئے اس لیے قیامت کے دن کسی کے لئے کوئی عذر نہیں رہے گا اور اس بات کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی کہ کوئی شخص توحید سے منہ موڑ کر اور شرک کے اعمال اختیار کرکے یوں کہنے لگے کہ مجھے تو کوئی پتہ نہ تھا۔ مسند احمد میں ہے کہ جب سب نے بلیٰ کہہ کر اقرار کر لیا تو اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ میں تمہارے اوپر ساتوں آسمانوں اور سات زمینوں کو گواہ بناتا ہوں اور تمہارے باپ آدم کو گواہ بناتا ہوں ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن تم یوں کہنے لگا کہ ہمیں اس کا علم نہ تھا تم جان لو کہ بیشک میرے سوا کوئی معبود نہیں اور میرے سوا کوئی رب نہیں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا میں تمہاری طرف رسولوں کو بھیجوں گا جو تمہیں میرا عہد اور میثاق یاد دلائیں گے اور تمہیں تمہارے اوپر کتابیں نازل کروں گا۔

اس پر سب نے کہا کہ بیشک ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ آپ ہمارے رب ہیں اور ہمارے معبود ہیں آپ کے سوانہ کوئی رب ہے اور نہ کوئی معبود ہے اس موقع پر حضرات انبیاء (علیہ السلام) سے بھی عہد لیا گیا جو سورۃ احزاب کی آیت میں مذکور ہے "واذاخذ نا من النبیین میثا قھم ومنک ومن نوح وابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ ابن مریم" (مشکوۃ)

البتہ حضرت عمر اور حضرت ابو درداء (رض) کی روایت میں اتنا اور اضافہ ہے کہ پہلی مرتبہ حضرت آدم (علیہ السلام) کی پشت سے وہ لوگ نکلے جو جنتی تھے اور خوبصورت سفید رنگ میں تھے اور دوسری مرتبہ سیاہ رنگ کے تھے جو دوزخی تھے۔

قرآن کریم کی آیت میں جو "من بنی آدم من ظھورھم ذریتھم" کے الفاظ ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ "من آدم من بنی اٰدم من ظھورھم" پہلا جملہ محذوف ہے دوسرا جملہ اس پر دلیل ہے تو مطلب یہ ہوا کہ آدم کی بلاواسطہ اولاد، اور اولادوں کی اولاد (بالواسطہ) عدل میں سب کا اجتماع ہوا اور قیامت کا اجتماع بعینہ اسی اجتماع کا نمونہ ہوگا۔ البتہ جب سفید اور سیاہ رنگ کے الفاظ اور چیونٹیوں کی طرح چھوٹے چھوٹے جثوں کے الفاظ کا تقاضا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ اجتماع خالص روحانی نہ تھا بلکہ اجسام کے ساتھ ارواح کا تعلق بھی رہا یعنی اجسام وارواح دونوں کا اجتماع تھا کیونکہ مذکورہ اوصاف اجسام کے ساتھ مخصوص ہے ارواح کو سیاہ و سفید نہیں کہا جا سکتا واللہ اعلم۔

خلاصہ:

جب سے انسان دنیا میں آیا ہے سلسلہ نبوت بھی اس وقت سے جاری ہے سب سے پہلے انسان بھی اور سب سے پہلے نبی بھی حضرت آدم ہیں ان کے بعد ہر زمانہ ہر خطہ اور ہر قوم میں مسلسل پیغمبر آتے رہے ہیں آخر میں سردار دوجہاں سید کائنات حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت ہوئی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت سارے انسانوں کے لیے سارے زمانوں کے لئے اور سارے جہانوں کے لیے ہے۔ پوری دنیا میں ملکوں میں شہروں قصبوں دیہاتوں جنگلوں میں ایسا کوئی خطہ نہیں بلکہ پہاڑوں کے غاروں میں ایسا کوئی غار نہیں جہاں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دین آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کتاب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعلیمات کا وجود اور پہنچ نہ ہو۔

پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تمام ترقیوں کا دروازہ کھول دیا اور پورے جہان کی چابیوں کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہاتھ میں دے دیا۔ اب روئے زمین پر لاکھوں چیزوں کا وجود اور پوری دنیا کی ترقی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مرہون منت ہے کائنات میں کوئی ایک ایسا آدمی نہیں جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نام اور کام سے ناواقف اور بے خبر ہو۔ گویا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سارے جہاں کے سارے انسانوں پر کرم فرمایا اور ان سب پر اتمام حجت فرما کر قیامت کے روز ہر قسم کے عذر اور معذرت سے ان کا منہ بند کر کے ان پر اتمام حجت قائم فرمایا۔ ایک طرف سے اسلام اور توحید انسانوں کے لئے فطرت قرار پائی دوسری طرف ہر انسان میں اللہ تعالیٰ نے عقل و فہم اور ذہنی صلاحیتوں کی نہریں جاری فرمائی جس کی بدولت آج انسان ستاروں پر کمند ڈال کر وہاں جانے اور رہنے کا سوچ رہا ہے۔

اسی کے ساتھ نبوت اور رسالت کا پیغام اس امت کے علماء مشائخ مبلغین اور مصلحین کے ذریعہ گھر گھر پہنچ رہا ہے تو کیا پھر بھی قیامت کے دن کسی انسان کے لئے انکار یا معذرت کی گنجائش ہو سکتی ہے، ہر گز نہیں ادھر اور معذرت کے سارے دروازے بند ہوگئے اور کافر و مشرک انسان جس کا کفر محض ہٹ دھرمی اور بغض و عناد پر مبنی تھا ہمیشہ کے لئے عظیم رب العالمین کے عظیم تر ابدی نعمتوں سے سوائے محرومی کے کچھ نہیں پایا۔

فائدہ:

انسانوں کو ترتیب وار ان کے باپوں کی پشتوں سے نکال کر چیونٹیوں کے جثہ میں جو ظاہر فرمایا تھا آج کل جدید آلات اور ایٹمی توانائی سے جو چیزیں ذرات کی صورت میں بن رہی ہیں اور کمپیوٹر میں بڑی ہو کر سامنے آرہی ہے انہوں نے واضح کیا ہے کہ بڑی سے بڑی چیز کو چھوٹے نقطہ کی شکل دی جا سکتی ہے یعنی کی شکل میں اور چیونٹی کو ہاتھی کی شکل بتایا جاتا ہے۔

فائدہ:

رہا یہ مسئلہ کہ عہد الست کا وعدہ ہمیں یاد نہیں تو اس کے بارے میں پہلی بات یہ ہے کہ دنیا میں بچپن کی زندگی میں ہم ہزاروں کام کرتے ہیں پھر جوانی کی زندگی میں وہ ہمیں یاد نہیں رہتے بھول جاتے ہیں عہد الست بھی ہمارے ذہنوں سے خارج ہو چکا ہے دوسری بات یہ ہے کہ اس کا تعلق روحانی قوت کے ساتھ وابستہ ہے سارے انبیاء (علیہ السلام) دنیا میں تشریف لائے انہیں یہ پورا واقعہ یاد رہا انبیاء (علیہم السلام) کو چھوڑیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت حسن بصری (رح) حضرت رابعہ بصری (رح) حضرت جنید بغدادی (رح) حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (رح) شیخ اکبر رحمت اللہ علیہ حضرت جلال الدین رومی (رح) وغیرہ مشائخ سے منقول ہے کہ عہد الست ہمیں ایسا یاد ہے گویا ہم ابھی اس سے فارغ ہوئے ہیں اور اس کی پوری کیفیت ہمارے سامنے ہے۔

شکار پاکان را قیاس از خود مگیر
گرچہ در ظاہر نوشتن شیر و شیر (مثنوی)

اپنے آپ کو خالص عقیدت مندوں سے موازنہ نہ کریں۔
اگرچہ شیر اور شیر لکھنے کی صورت میں ایک جیسے ہیں
تیسری بات یہ ہے کہ عہد الست کا یہ اثر ضرور ہے کہ ہر انسان یہ ضرور سمجھتا ہے کہ جس خالق ومالک عز سلطانہ نے مجھے پیدا کیا ہے وہ مجھے بے مقصد پیدا نہیں کیا مجھے ضرور اس کا حکم ماننا چاہیے اور اس کی عبادت ضرور کرنی چاہیے اسی وجہ سے فطری طور پر انسان عبادت کے لیے کسی ایسی ذات کو تلاش کرتا ہے جس کی وہ عبادت کرے وہ بغیر کسی عبادت کے ہر گز قناعت نہیں کرتا پھر وہ شیطان کے ورغلانے پر اپنے معبود کے انتخاب میں غلطی کرتا ہے۔ (تفسیر منازل العرفان)

آیت مبارکہ:

اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝۱۷۳

لغۃ القرآن: [اَوْ : یا] [تَقُوْلُوْٓا : کہیں تم لوگ کہو] [اِنَّمَآ : کچھ نہیں سوائے اس کے کہ] [اَشْرَكَ : شرک کیا] [اٰبَآؤُنَا : ہمارے آباواجداد نے] [مِنْ قَبْلُ : پہلے سے] [وَكُنَّا : اور ہم تھے] [ذُرِّيَّةً : اولاد] [مِّنْۢ بَعْدِهِمْ : ان کے بعد] [اَفَتُهْلِكُنَا : تو کیا تو ہلاک کرے گا ہم کو] [بِمَا : بسبب اس کے جو] [فَعَلَ : جو کیا تھا] [الْمُبْطِلُوْنَ : گمراہ لوگ]

ترجمہ: یا (ایسا نہ ہو کہ) تم کہنے لگو کہ شرک تو محض ہمارے آباء واجداد نے پہلے کیا تھا اور ہم تو ان کے بعد (ان کی) اولاد تھے (گویا ہم مجرم نہیں اصل مجرم وہ ہیں)، تو کیا تو ہمیں اس (گناہ) کی پاداش میں ہلاک فرمائے گا جو اہل باطل نے انجام دیا تھا

تشریح: اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کا میثاق اس لیے لیا تاکہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکو کہ ہم بیخبر تھے یا شرک کی ابتداء تو ہمارے باپ داداوں نے کی تھی، ہم تو ان کے بعد ان کی اولاد تھے اور گھر کے ماحول سے متاثرہ ہو کر ہم نے بھی شرک اختیار کر لیا تو ہمارے بڑوں کے جرم کی سزا ہمیں کیوں دی جائے؟
دراصل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہر انسان کے شعور میں یہ بھولا ہوا میثاق تازہ کر دے گا اور انھیں یاد آجائے گا کہ واقعی انھوں نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا تھا اور انھیں یہ بھی یاد آجائے گا کہ دنیاوی زندگی میں کئی بار اس میثاق کے اثرات ان کے شعور میں ظاہر ہوئے اور ان کی فطرت نے انھیں ایک خدا کی نشاندہی کی مگر انھوں نے تعصب اور ماحول کے ڈر سے انھیں دبا دیا، لہٰذا اس دن وہ اپنے خلاف گواہی دینے پر مجبور ہوں گے اور اقرار کریں گے کہ واقعی وہ کافر تھے اور انھیں دنیاوی زندگی نے دھوکا میں ڈال رکھا تھا۔ (قرآن: ۶: ۱۳۰) اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی کے ماں باپ غلط عقائد کے حامل ہوں تو اولاد کو تلاش حق کی پوری کوشش کرنی چاہیے کیونکہ نیک اور متقی ماں باپ کی تقلید جنت کا راستہ ہے مگر مشرک اور غلط کار ماں باپ کی تقلید جہنم کا راستہ ہے۔ (تفسیر امداد الکرم)
لیکن یہ اللہ کی نہایت ہی مہربانی ہے کہ اللہ کو معلوم تھا کہ انسان میں ہدایت اور ضلالت دونوں کی استعداد ہے۔ اور یہ کہ انسان اپنے اس فطری عہد کے باوجود انحراف اختیار کر سکتا ہے۔ جب کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اسے صحیح راہ سے شیاطین جن وانس منحرف کرتے ہیں اور یہ جن وانس کے شیاطین بڑی ہوشیاری سے انسان کی کمزوریوں کو کام میں لاتے ہیں۔
اللہ تعالیٰ نے رحم یہ فرمایا کہ اس نے انسان کو محض اپنی فطری صلاحیت پر ہی ذمہ دار ہدایت نہیں ٹھہرایا۔ اور نہ اپنی عقلی اور فطری قوت ادراک اور تمیز پر اس سے جواب طلبی فرمائی۔ بلکہ اسکے باوجود اللہ نے رسول بھیجے، جنہوں نے تفصیلات کے ساتھ آیات ودلائل پیش کیے تاکہ وہ فطرت کے اوپر چڑھے ہوئے زنگ کو

اتاریں۔اسے صیقل کریں اور انسان کو خواہشات اور شہوات کی بندگی سے چھڑائیں۔ اگرچہ اللہ کو معلوم تھا کہ رسولوں اور دعوتوں کے بغیر بھی انسان کی ہدایت کے لیے اس کی فطری استعداد اور عقلی قوت کافی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اللہ نے حساب وکتاب کا مدار رسالت اور دعوت پر رکھا ہے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

عہد الست کی غرض : او تقولوا۔۔آباؤنا (الآیۃ) اس آیت میں وہ غرض بیان کی گئی جس کے لیے ازل میں پوری نسل آدم سے اقرار لیا گیا تھا اور وہ یہ کہ انسانوں میں سے جو لوگ اپنے خدا سے بغاوت کریں گے وہ اپنے جرم کے پوری طرح ذمہ دار ہوں گے ،انھیں صفائی میں نہ تو لاعلمی کا عذر پیش کرنے کا موقع ملے گا اور نہ وہ سابق نسلوں پر اپنی گمراہی کہ ذمہ داری ڈال کر خود بری الذمہ ہو سکیں گے۔ (تفسیر جلالین)

یہاں قرآن نے گویا تصریح کردی کہ نسل انسانی کا اصل اور ابتدائی دین توحید ہے اور شرک بہت بعد کی پیداوار ہے۔ "دانایان فرنگ"۔ابھی چند سال ادھر کی بات ہے کہ زور دے دے کر اس کے برعکس کہہ رہے تھے کہ نسل انسانی کا ابتدائی دین شرک ہے، اور توحید تک تو انسان بہت بعد کو رفتہ ہی رفتہ پہنچا ہے، لیکن اب ان کے ماہرین فن (Ethnologists.) کی آنکھیں کھلی ہیں اور اب علانیہ اقرار ہونے لگا ہے کہ انسان کا ابتدائی دین توحید ہی تھا۔ (تفسیر ماجدی)

عہد فطرت :

ان آیات میں بتایا کہ عہد ومیثاق کا تعلق فطرت وتکوین سے ہے، انبیاء محض اس لیے مبعوث ہوتے ہیں، تاکہ وہ اس عہد کو تاکید وتوضیح کے ساتھ ان کے سامنے دوبارہ پیش کردیں، ورنہ انسانوں کے ضمیر میں اور ان کی گھٹی میں توحید اور اعتراف حق ودیعت ہے، یعنی اللہ نے جب سے انسان کو پیدا کیا ہے اس کی رگ رگ اور نس نس سے اعتراف وایمان کے چشمے پھوٹ رہے ہیں، ناممکن ہے، کہ انسان اللہ سے بے نیاز ہوسکے، اور اس کی احتیاج کو برملا محسوس نہ کرے۔

عہد الست سے یہی مقصود ہے، (آیت) "قالوابلی"۔ میں قول زبان حال سے تعبیر ہے، جس طرح کہا جاتا ہے، اذامتلاء الحوض قال قطنی۔ یعنی انسانی بناوٹ انسانی اعضاء وجوارح میں قدرت الٰہی کا مظاہرہ، بند بند اور جوڑ جوڑ میں حکمت ودانائی کا ظہور، یہ اس بات کا بولتا ہوا ثبوت ہے کہ غالب ودانا خدا کی یہ سب صنعت گری ہے۔ (تفسیر سراج البیان)

سید ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن میں اس آیت پر یوں رقمطراز ہیں:

اس آیات میں وہ غرض بیان کی گئی ہے جس کے لیے ازل میں پوری نسل آدم سے اقرار لیا گیا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اپنے خدا سے بغاوت اختیار کریں وہ اپنے اس جرم کے پوری طرح ذمہ دار قرار پائیں۔ انھیں اپنی صفائی میں نہ تو لاعلمی کا عذر پیش کرنے کا موقع ملے اور نہ وہ سابق نسلوں پر اپنی گمراہی کی ذمہ داری ڈال کر خود بری الذمہ ہو سکیں گویا بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ اس ازلی عہد ومیثاق کو اس بات پر دلیل قرار دیتا ہے کہ نوع انسانی میں سے ہر شخص انفرادی طور پر اللہ کے الٰہِ واحد اور ربِّ واحد ہونے کی شہادت اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور اس بنا پر یہ کہنا غلط ہے کہ کوئی شخص کامل بے خبری کے سبب سے، یا ایک گمراہ ماحول میں پرورش پانے کے سبب سے اپنی گمراہی کی ذمہ داری سے بالکلیہ بری ہوسکتا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ ازلی میثاق فی الواقع عمل میں آیا بھی تھا تو کیا اس کی یاد ہمارے شعور اور حافظہ میں محفوظ ہے ؟ کیا ہم میں سے کوئی شخص بھی یہ جانتا ہے کہ آغاز آفرنیش میں وہ اپنے خدا کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور اس سے اَلَسْتُ بِرَبِّکُم کا سوال ہوا تھا اور اس نے بلٰی کہا تھا ؟ اگر نہیں تو پھر اس اقرار کو جس کی یاد ہمارے شعور وحافظہ سے محو ہو چکی ہے ہمارے خلاف حجت کیسے قرار دیا جاسکتا ہے ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس میثاق کا نقش انسان کے شعور اور حافظہ میں تازہ رہنے دیا جاتا تو انسان کا دنیا کی موجودہ امتحان گاہ میں بھیجا جانا سرے سے فضول ہو جاتا کیونکہ اس کے بعد تو اس آزمائش وامتحان کے کوئی معنی ہی باقی نہ رہ جاتے۔ لہٰذا اس نقش کو شعور وحافظہ میں تو تازہ نہیں رکھا گیا، لیکن وہ تحت الشعور (Sub-conscious mind) اور وجدان (Intuition) میں یقیناً محفوظ ہے۔ اس کا حال وہی ہے جو ہمارے تمام دوسرے تحت الشعوری اور وجدانی علوم کا حال ہے۔ تہذیب وتمدّن اور اخلاق ومعاملات کے تمام شعبوں میں انسان سے آج تک جو کچھ بھی ظہور میں آیا ہے وہ سب درحقیقت انسان کے اندر بالقوۃ (Potentially) موجود تھا۔ خارجی محرکات اور داخلی تحریکات نے مل جل کر اگر کچھ کیا ہے تو صرف اتنا کہ جو کچھ بالقوۃ تھا اسے بالفعل کر دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی تعلیم، کوئی تربیت، کوئی ماحول تاثیر اور کوئی داخلی تحریک انسان کے اندر کوئی چیز بھی، جو اس کے اندر بالقوۃ موجود نہ ہو، ہر گز پیدا نہیں کرسکتی۔ اور اسی طرح یہ سب موثرات اگر اپنا تمام زور بھی صرف کردیں تو ان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ ان چیزوں میں سے، جو انسان کے اندر بالقوۃ موجود ہیں، کسی چیز کو قطعی محو کردیں۔ زیادہ سے

زیادہ جو کچھ وہ کر سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اسے اصل فطرت سے منحرف (Pervert) کر دیں۔ لیکن وہ چیز تمام تحریفات و تمسیخات کے باوجود اندر موجود رہے گی، ظہور میں آنے کے لیے زور لگاتی رہے گی، اور خارجی اپیل کا جواب دینے کے لیے مستعد رہے گی۔ یہ معاملہ جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا، ہمارے تمام تحت الشعوری اور وجدانی علوم کے ساتھ عام ہے:

وہ سب ہمارے اندر بالقوۃ موجود ہیں، اور ان کے موجود ہونے کا یقینی ثبوت ان چیزوں سے ہمیں ملتا ہے جو بالفعل ہم سے ظاہر ہوتی ہیں۔

ان سب کے ظہور میں آنے کے لیے خارجی تذکیر (یاد دہانی)، تعلیم، تربیت اور تشکیل کی ضرورت ہوتی ہے، اور جو کچھ ہم سے ظاہر ہوتا ہے وہ گویا درحقیقت خارجی اپیل کا وہ جواب ہے جو ہمارے اندر کی بالقوۃ موجودات کی طرف سے ملتا ہے۔

ان سب کو اندر کی غلط خواہشات اور باہر کی غلط تاثیرات دبا کر، پردہ ڈال کر، منحرف اور مسخ کر کے کالعدم کر سکتی ہیں مگر بالکل معدوم نہیں کر سکتیں، اور اسی لیے اندرونی احساس اور بیرونی سعی دونوں سے اصلاح اور تبدیلی (Conversion) ممکن ہوتی ہے۔

ٹھیک ٹھیک یہی کیفیت اس وجدانی علم کی بھی ہے جو ہمیں کائنات میں اپنی حقیقی حیثیت، اور خالق کائنات کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں حاصل ہے:

اس کے موجود ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر دور میں، زمین کے ہر خطہ میں، ہر بستی، ہر پشت اور ہر نسل میں ابھرتا رہا ہے اور کبھی دنیا کی کوئی طاقت اسے محو کر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔

اس کے مطابق حقیقت ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جب کبھی وہ ابھر کر بالفعل ہماری زندگی میں کارفرما ہوا ہے اس نے صالح اور مفید نتائج ہی پیدا کیے ہیں۔

اس کو ابھرنے اور ظہور میں آنے اور عملی صورت اختیار کرنے کے لیے ایک خارجی اپیل کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے، چنانچہ انبیاء (علیہم السلام) اور کتب آسمانی اور ان کی پیروی کرنے والے داعیان حق سب کے سب یہی خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔ اسی لیے ان کو قرآن میں مذکّر (یاد دلانے والے) ذِکر (یاد) تذکرہ (یادداشت) اور اب ان کے کام کو تذکیر (یاد دہانی) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انبیاء اور کتابیں اور داعیان حق انسان کے اندر کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتے بلکہ اسی چیز کو ابھارتے اور تازہ کرتے ہیں جو ان کے اندر پہلے سے موجود تھی۔

نفس انسانی کی طرف سے ہر زمانہ میں اس تذکیر کا جواب بصورت لبیک ملنا اس بات کا مزید ایک ثبوت ہے کہ اندر فی الواقع کوئی علم چھپا ہوا تھا جو اپنے پکارنے والے کی آواز پہچان کر جواب دینے کے لیے ابھر آیا۔

پھر اسے جہالت اور جاہلیت اور خواہشات نفس اور تعصّبات اور شیاطین جن و انس کی گمراہ کن تعلیمات و ترغیبات نے ہمیشہ دبانے اور چھپانے اور منحرف اور مسخ کرنے کی کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں شرک، دہریت، الحاد، زندقہ اور اخلاقی و عملی فساد رونما ہوتا رہا ہے۔ لیکن ضلالت کی ان ساری طاقتوں کے متحدہ عمل کے باوجود اس علم کا پیدائشی نقش انسان کی لوح دل پر کسی نہ کسی حد تک موجود رہا ہے اور اسی لیے تذکیر و تجدید کی کوششیں اسے ابھارنے میں کامیاب ہوتی رہی ہیں۔

بلاشبہ دنیا کی موجودہ زندگی میں حق اور حقیقت کے انکار پر مصر ہیں وہ اپنی حجت بازیوں سے اس پیدائیشی نقش کے وجود کا انکار کر سکتے ہیں یا کم از کم اسے مشتبہ ثابت کر سکتے ہیں۔ لیکن جس روز یوم الحساب برپا ہوگا اس روز ان کا خالق ان کے شعور و حافظہ میں روز ازل کے اس اجتماع کی یاد تازہ کر دے گا جبکہ انھوں نے اس کو اپنا واحد معبود اور واحد رب تسلیم کیا تھا۔ پھر وہ اس بات کا ثبوت بھی ان کے اپنے نفس ہی سے فراہم کر دے گا کہ اس میثاق کا نقش ان کے نفس میں برابر موجود رہا اور یہ بھی وہ ان کی اپنی زندگی ہی کے ریکارڈ سے علیٰ رؤس الاشہاد دکھاوے گا کہ انھوں نے کس کس طرح اس نقش کو دبایا، کب کب اور کن کن مواقع پر ان کے قلب سے تصدیق کی آوازیں اٹھیں، اپنی اور اپنے گردوپیش کی گمراہیوں پر ان کے وجدان نے کہاں کہاں اور کس کس وقت صدائے انکار بلند کی، داعیان حق کی دعوت کا جواب دینے کے لیے ان کے اندر کا چھپا ہوا علم کتنی کتنی مرتبہ اور کس کس جگہ ابھرنے پر آمادہ ہوا، اور پھر وہ اپنے تعصّبات اور اپنی خواہشات نفس کی بنا پر کیسے کیسے حیلوں اور بہانوں سے اس کو فریب دیتے اور خاموش کر دیتے رہے۔ وہ وقت جبکہ یہ سارے راز فاش ہوں گے، حجت بازیوں کا نہ ہوگا بلکہ صاف صاف اقرار جرم کا ہوگا۔ اسی لیے قرآن مجید کہتا ہے کہ اس وقت مجرمین یہ نہیں کہیں گے کہ ہم جاہل تھے یا غافل تھے، بلکہ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ ہم کافر تھے۔ یعنی ہم نے جان بوجھ کر حق کا انکار کیا۔ وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ (الانعام، ۱۳۰)۔ (تفسیر تفہیم القرآن)

آیت مبارکہ:

وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ وَ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ۝۱۷۴

لغۃ القرآن: [وَكَذٰلِكَ : اور اس طرح] [نُفَصِّلُ : ہم کھول کھول کر بیان کرتے ہیں] [الْاٰیٰتِ : نشانیوں کو] [وَلَعَلَّهُمْ : اور تاکہ وہ] [یَرْجِعُوْنَ : رجوع کریں]

ترجمہ: اور اسی طرح ہم آیتوں کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ (حق کی طرف) رجوع کریں

تشریح: وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الاٰیٰتِ: اور ہم اسی طرح تفصیل سے آیات بیان کرتے ہیں۔} یعنی اے حبیب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، جس طرح آپ کی قوم کے سامنے ہم نے اس سورت کی آیات تفصیل سے بیان کی ہیں ہم ان کے علاوہ آیات بھی اسی طرح تفصیل سے بیان کرتے ہیں تاکہ بندے تَدَبُّر و تفکر کر کے حق و ایمان قبول کریں اور اس لیے تفصیل سے آیات بیان کرتے ہیں تاکہ وہ شرک و کفر سے توحید و ایمان کی طرف رجوع کر لیں اور صاحب معجزات نبی کے بتانے سے اپنے عہد میثاق کو یاد کریں اور اس کے مطابق عمل کریں۔ چونکہ قرآن کریم تمام لوگوں کی ہدایت کے لیے آیا ہے اور لوگوں میں سے بعض ڈر سے، بعض لالچ سے اور بعض دلائل سے مانتے ہیں، اس لیے قرآن کریم میں ہر طرح کی آیات مذکور ہیں کہ جو جس چیز سے مان سکے مان لے۔ (تفسیر صراط الجنان)

یہ آیات وہدایات اس لیے اتاری گئیں کہ انسان راہ فطرت پر واپس آجائے اور اس صلاحیت کو کام میں لائے جو اس کی فطرت کے اندر موجود ہے۔ یعنی ان فطری صلاحیتوں اور عقلی ادراک کی وجہ سے بھی وہ بجا طور پر حقیقت کا ادراک کر سکتا تھا لیکن اللہ نے رسول اور ہدایات اس لیے ارسال کیں کہ وہ راہ ہدایت پالے۔ اور یاد دہانی اور ڈراوے سے استفادہ کرے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن

ہم نشانیاں واضح طور پر پیش کرتے ہیں اور اس لیے کرتے ہیں کہ یہ لوگ پلٹ آئیں۔ تو یہ بتادیا کہ یہ عہد ہم نے تم سے لے لیا ہے کہیں کوئی قیامت کے دن یہ نہ کہے کہ بھئی ہم کو تو پتہ ہی نہیں تھا۔ ہم شرک کرتے رہے۔ نہیں تمہاری فطرت کے اندر ہم نے یہ تو نہ دیا ہے۔ اپنی پہچان ہم نے تمہاری فطرت کے اندر رکھ دی ہے۔ قرآن کو ذکری کہا جاتا ہے۔ یاد دہانی کہا جاتا ہے۔ یہ عہد جو یاد دلایا گیا۔ کوئی نئی تعلیم نہیں دی جارہی۔ پرانی بھولی بسری یاد تازہ کرائی جارہی ہے۔ اسی لیے قرآن میں جو الفاظ آتے ہیں ان کو آیات کہا جاتا ہے۔ نشانی۔ اس میں نشانیاں ہیں genes ہیں نشانیاں دیکھ کر انسان کو اپنا پرانا وقت یاد آجاتا ہے۔ تم قرآن پڑھو تمہیں اپنا یہ پرانا عہد یاد آجائے گا۔ یہ جو بات یہاں بیان کی گئی۔ الست بربکم قالو ابلی شھدنا۔ یہ سب باتیں تو ہماری فطرت کا حصہ میں۔ اللہ نے اپنی معرفت کا ایک چھوٹا سا چراغ ایک Pilot flame ہر انسان کے اندر رکھ دیا ہے۔ ایک زیرو واٹ کا بلب ہر انسان کے اندر موجود ہے۔ اب انسان کی اپنی مرضی ہے کہ اس نور کو وہ جتنا بڑھانا چاہتا ہے۔ نور وحی جذب کرے اپنے اندر۔ نور رسالت اپنے اندر جاذب کرے سنتوں کے نور سے اپنے آپ کو روشن کرے پھر دیکھے کیسے اس کے اندر اجالا ہوتا ہے۔ کیسے اپنے رب کی معرفت آتی ہے تو پتہ یہ چلا کہ By birth پیدائشی طور پر انسان توحید پرست ہوتا ہے اور یہ غلط نظریہ ہے فلاسفرز کا یا دوسرے لوگوں کا جو کہتے ہیں کہ انسانیت کے قافلے نے اپنا سفر جب آغاز کیا تو وہ شرک کے اندھیروں سے کیا وہ کہتے ہیں کہ جب انسانیت کی ابتدا ہوئی تو وہ شرک کرتے تھے۔ جس چیز سے ڈرتے تھے اس چیز کو پوجنا شروع کر دیتے تھے۔ جس چیز سے محبت کرتے تھے اس چیز کو پوجنا شروع کر دیتے تھے۔ اور رفتہ رفتہ وہ بہت سے معبودوں کو چھوڑ کر پھر وہ توحید کی طرف آئے۔ اور وہ یہ کہتے ہیں۔ کتابوں میں لکھا ہوتا ہے کہ توحید جو ہے وہ بڑا Sophisticated concept ہے۔ worshipping one God Instead of many gods یہ رفتہ رفتہ Evolution کے ساتھ انسان ایک خدا تک پہنچا۔ یہ آیات صریحا اس کی نفی کر رہی ہیں۔ ہرگز انسانوں نے شرک سے دنیا میں اپنی ابتدا نہیں کی۔ انسانیت کا قافلہ شرک کے اندھیروں میں نہیں بھٹکتا رہا تھا۔ بلکہ توحید کے نور میں انسانیت نے اپنے سفر کا آغاز کیا حدیث میں مضمون ہے متفق الیہ۔ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ اپنی

فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین ہوتے ہیں جو اس کو یہودی بنادیتے ہیں یا نصرانی بنادیتے ہیں یا مجوسی بنادیتے ہیں۔ انسان تو سب ایک اللہ ہی کی عبادت کرنے والے پیدا ہوتے ہیں پھر اپنی والدین، محبت۔ ماحول کا دباؤ شرک کی گمراہیوں میں شرک کے اندھیرے میں لے جاتی ہیں۔[تفسیر تنویر]

آیت مبارکہ:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْۤ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ

۱۷۵○

لغۃ القرآن: [وَاتْلُ عَلَيْهِمْ : اور آپ پڑھ کر سنائیں ان کو] [نَبَاَ الَّذِيْٓ: اس کی خبر] [اٰتَيْنٰهُ : ہم نے دیں جس کو] [اٰيٰتِنَا : اپنی نشانیاں] [فَانْسَلَخَ : پھر وہ نکل گیا] [مِنْهَا : ان سے] [فَاَتْبَعَهُ : پھر پیچھے لگا اس کے] [الشَّيْطٰنُ : شیطان] [فَكَانَ : تو وہ ہوگیا] [مِنَ : سے] [الْغٰوِيْنَ : گمراہوں]

ترجمہ: اور آپ انھیں اس شخص کا قصہ (بھی) سنادیں جسے ہم نے اپنی نشانیاں دیں پھر وہ ان (کے علم و نصیحت) سے نکل گیا اور شیطان اس کے پیچھے لگ گیا تو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا

تشریح: یہاں ایک ایسے شخص کا قصہ بیان کیا گیا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتاب کا علم عطافرمایا مگر اس نے اس علم سے روگردانی کرلی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہ ہو گیا۔ یہ عالم کون تھا؟ قرآن پاک نے اس کا نام ذکر نہیں کیا کیونکہ یہ مثال ایک دعوت فکر ہے اور ہر اس شخص پر صادق آتی ہے جو دین حق کی نعمت حاصل کر چکنے کے بعد پھر اس کا تارک ہو گیا اور ایسے دین فروش علماء ہر دور اور ہر مذہب میں ہوتے ہیں جو دنیا کے لالچ اور طمع کی خاطر احکام خداوندی کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ (تفسیر امداد الکرم)

وہ کون تھا جس کا قصہ ان آیات میں بیان کیا جارہا ہے؟ بعض علماء کی رائے ہے کہ وہ بنی اسرائیل کا ایک زاہد اور عالم تھا۔ جس کا نام بلعام بن باعوراء تھا۔ اپنے زمانہ میں علم و فضل میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں طلبہ اس کی علمی مجلسوں میں حاضر ہوتے اور اس کے خطبات کو قلمبند کرتے۔ لیکن حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے حسد کرنے کے باعث اپنے علم و فضل کے باوجود راہ حق سے منحرف ہو گیا۔ بعض کا خیال ہے یہ شخص امیہ ابن ابی الصلت الثقفی تھا۔ جس نے قدیم آسمانی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ اور اسے معلوم تھا کہ اس زمانہ میں ایک رسول مبعوث ہونے والا ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ یہ عہدہ اسے دیا جائے۔ لیکن جب تاج نبوت رحمت عالمیان کے سر مبارک پر رکھا گیا تو حسد کے مارے جل بھن یا اور کفر اختیار کیا۔ سعید بن مسیب (رض) نے ابو عامر بن صیفی کا نام لیا ہے زمانہ جاہلیت میں وہ زہد و ریاضت کی زندگی بسر کرتا تھا اور اون کے بنے ہوئے کپڑے پہنا کرتا تھا۔ وہ بھی نبوت کا امیدوار تھا۔ جب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مبعوث ہوئے تو اس نے بھی کفر اختیار کیا۔ لیکن محفوظ راستہ یہ ہے کہ جب قرآن حکیم نے اس کا نام نہیں لیا تو ہم بھی اس کی تعیین کے درپے نہ ہوں اور جو وقت اور کوشش اس کی شخصیت کا سراغ لگانے میں صرف کرنا ہے۔ وہ اس قصہ کو سمجھنے اور اس سے عبرت حاصل کرنے میں صرف کریں۔ (تفسیر ضیاالقرآن)

اس کے بارے تین اقوال ہیں

بلعم بن باعوراء کے بارے میں نازل ہوئی۔ (1)

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) فرماتے ہیں یہ آیت امیہ بن ابو صلت کے بارے میں نازل ہوئی۔ (2)

حضرت سعید بن مسیب (رض) فرماتے ہیں یہ آیت ابو عامر بن صیفی کے بارے میں نازل ہوئی۔ (3)

بلعم بن باعوراء کا واقعہ:

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جبّارین سے جنگ کا ارادہ کیا اور سرزمین شام میں نزول فرمایا تو بلعم بن باعوراء کی قوم اس کے پاس آئی اور اس سے کہنے لگی کہ "حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بہت تیز مزاج ہیں اور ان کے ساتھ بہت بڑا لشکر ہے، وہ یہاں اس لیے آئے ہیں تاکہ ہم سے جنگ کریں اور ہمیں ہمارے شہروں سے نکال کر ہماری بجائے بنی اسرائیل کو اس سرزمین میں آباد کریں، تیرے پاس اسم اعظم ہے اور تم ایسے شخص ہو کہ تمہاری ہر دعا قبول ہوتی ہے، تم نکلو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ انھیں یہاں سے بھگا دے۔ قوم کی بات سن کر بلعم نے کہا: افسوس ہے تم پر! حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، ان کے ساتھ فرشتے اور ایمان دار لوگ ہیں، اس لیے میں ان کے خلاف کیسے بد دعا کر سکتا ہوں! مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم ملا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر میں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے خلاف ایسا کیا تو میری دنیا و آخرت برباد ہو جائے گی۔ قوم نے جب گریہ وزاری کے ساتھ مسلسل اصرار کیا تو بلعم نے کہا: اچھا! میں پہلے اپنے رب کی مرضی معلوم کرلوں۔ بلعم کا یہی طریقہ تھا کہ جب کبھی کوئی دعا کرتا تو پہلے مرضیٔ الٰہی معلوم کرلیتا اور خواب میں اس کا جواب مل جاتا، چنانچہ اس مرتبہ اس کو یہ جواب ملا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے ساتھیوں کے خلاف دعا نہ کرنا۔ چنانچہ اس نے قوم سے کہہ دیا کہ "میں نے اپنے رب سے اجازت چاہی تھی مگر میرے رب نے ان کے خلاف بد دعا کرنے کی ممانعت فرمادی ہے۔ پھر اس کی قوم نے اسے ہدیئے اور نذرانے دیئے جنہیں اس نے قبول کرلیا۔ اس کے بعد قوم نے دوبارہ اس سے بد دعا کرنے کی درخواست کی تو دوسری مرتبہ بلعم نے رب تبارک وتعالیٰ سے اجازت چاہی۔ اب کی بار اس کا کچھ جواب نہ ملا تو اس نے قوم سے کہہ دیا کہ "مجھے اس مرتبہ کچھ جواب ہی نہیں ملا۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ "اگر اللہ تعالیٰ کو منظور نہ ہوتا تو وہ پہلے کی طرح دوبارہ بھی صاف منع فرمادیتا، پھر قوم نے اور بھی زیادہ اصرار کیا حتّٰی کہ وہ ان کی باتوں میں آگیا۔ چنانچہ بلعم بن باعوراء اپنی گدھی پر سوار ہو کر ایک پہاڑ کی طرف روانہ ہوا۔ گدھی نے اسے کئی مرتبہ گرایا اور وہ پھر سوار ہو جاتا حتّٰی کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے حکم سے گدھی نے اس سے کلام کیا اور کہا: افسوس! اے بلعم! کہاں جا رہے ہو؟ کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ فرشتے مجھے جانے سے روک رہے ہیں۔ (شرم کرو) کیا تم اللہ تعالیٰ کے نبی اور فرشتوں کے خلاف بد دعا کرنے جا رہے ہو؟ بلعم پھر بھی باز نہ آیا اور آخر کار وہ بد دعا کرنے کے لیے اپنی قوم کے ساتھ پہاڑ پر چڑھا۔ اب بلعم جو بد دعا کرتا اللہ تعالیٰ اس کی زبان کو اس کی قوم کی طرف پھیر دیتا تھا اور اپنی قوم کے لیے جو دعائے خیر کرتا تھا تو بجائے قوم کے بنی اسرائیل کا نام اس کی زبان پر آتا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کی قوم نے کہا: اے بلعم! تو یہ کیا کر رہا ہے؟ بنی اسرائیل کیلئے دعا اور ہمارے لیے بد دعا کیوں کر رہا ہے؟ بلعم نے کہا: "یہ میرے اختیار کی بات نہیں، میری زبان میرے قبضہ میں نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت مجھ پر غالب آگئی ہے۔ اتنا کہنے کے بعد اس کی زبان نکل کر اس کے سینے پر لٹک گئی۔ اس نے اپنی قوم سے کہا: میری تو دنیا و آخرت دونوں برباد ہو گئیں، اب میں تمہیں ان کے خلاف ایک تدبیر بتاتا ہوں "تم حسین و جمیل عورتوں کو بنا سنوار کر ان کے لشکر میں بھیج دو، اگر ان میں سے ایک شخص نے بھی بدکاری کرلی تو تمہارا کام بن جائے گا کیونکہ جو قوم زنا کرے اللہ تعالیٰ اس پر سخت ناراض ہوتا ہے اور اسے کامیاب نہیں ہونے دیتا، چنانچہ بلعم کی قوم نے اسی طرح کیا، جب عورتیں بن سنور کر لشکر میں پہنچیں تو ایک کنعانی عورت بنی اسرائیل کے ایک سردار کے پاس سے گزری تو وہ اپنے حسن و جمال کی وجہ سے اسے پسند آگئی۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے منع کرنے کے باوجود اس سردار نے اس عورت کے ساتھ بدکاری کی، اس کی پاداش میں اسی وقت بنی اسرائیل پر طاعون مُسلَّط کر دیا گیا۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا مشیر اس وقت وہاں موجود نہ تھا جب وہ آیا تو اس نے بدکاری کا قصہ معلوم ہونے کے بعد مرد و عورت دونوں کو قتل کر دیا۔ تب طاعون کا عذاب ان سے اٹھا لیا گیا، لیکن اس دوران ستر ہزار اسرائیلی طاعون سے ہلاک ہو چکے تھے۔ اس آیت میں اس کا بیان ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

ارشاد ہوتا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو اسے اپنے عطا کردہ علم کے ساتھ فکر کی بلندی اور کردار کی رفعت عطا کرتے۔ لیکن اس نے اپنی خواہش کی پیروی کرتے ہوئے رفعت و بلندی کے بجائے زمین کے ساتھ چمٹنا پسند کرلیا ہے یہاں زمین کے ساتھ چمٹنے سے مراد فکر و کردار کی پستی اور دنیا کی طرف مائل ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اصول اور ضابطہ یہ ہے کہ انسان کو ہدایت اور گمراہی کے راستے کی نشاندہی کرکے کھلا چھوڑ دیا جائے تاکہ انسان جس راستہ کو پسند کرتا ہے اسے اختیار کرسکے۔ علم کا بنیادی مقصد اس کے ذریعے رہنمائی پانا ہے اگر کوئی شخص صاحب علم ہو کر بھی جہالت اور گمراہی کے راستہ کو پسند کرتا ہے تو اسے ہدایت پر کیوں کر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ ایسے علم والے کی مثال تو اس کتے کی ہے جس پر حملہ کیا جائے یا نہ کیا جائے اور اس پر بوجھ ڈالا جائے یا نہ ڈالا جائے وہ ہر صورت زبان لٹکائے ہانپتا پھرتا ہے۔

کتے کو دیکھنے والا اس بات کا اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہے کہ کتا سدھایا ہوا ہو یا آوارہ، سردی ہو یا گرمی، بھوکا ہو یا اس کا پیٹ بھرا ہوا ہو۔ وہ ہر وقت ہانپتا ہے اور چلتے پھرتے زمین سونگھتا اور جگہ جگہ اپنی زبان مارتا پھرتا ہے۔ یہ ایسا جانور ہے جو کبھی سیر چشم نہیں ہوتا یہاں تک کہ اگر آپ اسے پتھر ماریں تو وہ اسے بھی چاٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ اتنا بد خصلت اور لالچی جانور ہونے کے باوجود اپنے مالک کا وفادار اور سدھایا ہوا کتا اپنے آقا کے حکم پر عمل کرتا ہے۔

لیکن ایک دنیا پرست عالم کا حال اس سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب کرتا ہے۔ اقبال کے بجائے زوال اور استغنا کے بجائے بھوک اور لالچ میں آگے ہی بڑھتا جاتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ ایسے علماء پکار اٹھتے ہیں کہ واقعی ہم نے اپنے آپ کو ہلاکت کے گڑھے میں ڈال لیا ہے اور ہم اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہیں۔ یہاں بین السطور یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کوئی زیادتی نہیں کی اگر یہ ہدایت کے طالب ہوتے تو انھیں ہدایت دی جاتی لیکن یہ ہدایت کے بجائے گمراہی کے طالب ہوئے اس لیے انھیں گمراہ ہی رہنے دیا گیا جس طرح اللہ تعالیٰ کائنات کے چپے چپے اور ذرے ذرے کا مالک ہے اسی طرح ہدایت اور گمراہی بھی اپنی ملکیت قرار دے کر اسے اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ لہٰذا گمراہ لوگ نقصان ہی اٹھائیں گے۔ (تفسیر فہم القرآن)

سانپ کے اپنی پرانی کینچلی کو اتار دینے کو عربی میں انسلخت الحیۃ من جلدھا کہتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح سانپ اپنی پہلی کینچلی کو اتار پھینکتا ہے اسی طرح اس شخص نے بھی ان آیات و ہدایات کو اتار کر پھینک دیا اور اس کی جگہ گمراہی اور ضلالت کا لباس اوڑھ لیا

اتبع کا معنی ہے کسی کے پیچھے لگنا۔ ای لحق بہ یقال اتبعت القوم ای لحقتھم (قرطبی) جب انسان دانستہ آیات ربانی کا انکار کرتا ہے اور انھیں پس پشت ڈال دیتا ہے تو شیطان اس پر مسلط ہو جاتا ہے اور ہر لمحہ اس کے دل میں وسوسہ اندازی کرنے لگتا ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

آیت مبارکہ:

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝۱۷۶

لغۃ القرآن: [وَلَوْ : اور اگر] [شِئْنَا : ہم چاہتے] [لَرَفَعْنٰهُ : تو ہم ضرور بلند کرتے اس کو] [بِهَا : ان سے (یعنی آیات کے علم سے)] [وَلٰكِنَّهٗۤ: اور لیکن] [اَخْلَدَ : وہ ہمیشہ کے لیے مائل ہوا] [اِلَى الْاَرْضِ : زمین کی طرف] [وَاتَّبَعَ : اور اس نے پیروی کی] [هَوٰىهُ : اپنی خواہش کی] [فَمَثَلُهٗ : تو اس کی مثال] [كَمَثَلِ الْكَلْبِ : کتے کی مثال کی مانند ہے] [اِنْ : اگر] [تَحْمِلْ : تو بوجھ ڈالے] [عَلَيْهِ : اس پر] [يَلْهَثْ : تو وہ ہانپے گا] [اَوْ : یا] [تَتْرُكْهُ : اگر تو چھوڑ دے اس کو] [يَلْهَثْ: تو (بھی) وہ ہانپے گا] [ذٰلِكَ : یہ] [مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ : ان لوگوں کی مثال ہے جنہوں نے] [كَذَّبُوْا : جھٹلایا] [بِاٰيٰتِنَا : ہماری نشانیوں کو] [فَاقْصُصِ : پس آپ بیان کریں] [الْقَصَصَ : واقعات] [لَعَلَّهُمْ : تاکہ وہ] [يَتَفَكَّرُوْنَ : غور و فکر کریں]

ترجمہ: اور اگر ہم چاہتے تو اسے ان (آیتوں کے علم و عمل) کے ذریعے بلند فرما دیتے لیکن وہ (خود) زمینی دنیا کی (پستی کی) طرف راغب ہو گیا اور اپنی خواہش کا پیرو بن گیا، تو (اب) اس کی مثال اس کتے کی مثال جیسی ہے کہ اگر تو اس پر سختی کرے تو وہ زبان نکال دے یا تو اسے چھوڑ دے (تب بھی) زبان نکالے رہے۔ یہ ایسے لوگوں کی مثال ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، سو آپ یہ واقعات (لوگوں سے) بیان کریں تاکہ وہ غور و فکر کریں

تشریح: بقول حضرت ابن عباس (رض) : بلعم بن باعور کا اور بقول مجاہد بلعام بن باعور کا ہے عطیہ نے حضرت ابن عباس (رض) : کا قول نقل کیا ہے کہ بلعم اسرائیلی تھا۔ ابو طلحہ (رض) نے حضرت ابن عباس (رض) کا قول نقل کیا ہے کہ وہ کنعانی تھا اور جبارون (یعنی عمالقہ) کے شہر کا رہنے والا تھا۔ مقاتل نے کہا وہ شہر بلقاء کا باشندہ تھا۔ حضرت ابن عباس (رض) : ' محمد بن اسحاق اور سدی وغیرہ نے اس کا قصہ حسب تفصیل ذیل بیان کیا ہے۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جب عمالقہ سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا اور ملک شام میں علاقہ کنعان میں جا کر قیام کیا تو کچھ (کنعان کے) آدمی بلعام کے پاس گئے کیونکہ بلعم کو اسم اعظم معلوم تھا اور اس سے کہا موسیٰ تیز مزاج کے آدمی ہیں ان کے پاس لشکر بھی بہت ہے وہ اس لیے ہمارے ملک میں آئے ہیں کہ ہم کو ہماری بستیوں سے نکال دیں اور ہم کو قتل کر دیں اور ہماری جگہ بنی اسرائیل کو آباد کر دیں آپ کی دعا قبول ہوتی ہے ہمارے لیے آپ دعا کر دیجئے کہ اللہ بنی اسرائیل کو ہماری طرف سے پھیر دے بلعم نے جواب دیا ارے کم بختو موسیٰ نبی ہیں ان کے ساتھ فرشتے اور مومن ہیں میں ان کے خلاف کس طرح بددعا کر سکتا ہوں اللہ کی طرف سے جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے اگر میں تمہارے کہنے کے موافق کروں گا تو دنیا اور آخرت دونوں میری تباہ ہو جائیں گی۔ لوگوں نے پھر اصرار کیا بہت زاری کی تو بلعم نے کہا اچھا میں اپنے رب سے استخارہ کر لوں بلعم کا قاعدہ تھا کہ جب تک خواب میں کسی بات کی اجازت اس کو نہیں مل جاتی تھی وہ دعا نہیں کرتا تھا چنانچہ بنی اسرائیل کے خلاف بددعا کرنے کے معاملہ میں بھی اس نے استخارہ کیا۔ مگر خواب میں اس کو بددعا نہ کرنے کی ہدایت کر دی گئی بیدار ہو کر اس نے قوم والوں سے کہہ دیا کہ میں نے استخارہ کیا تھا۔ مجھے بددعا کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے یہ انکاری جواب سن کر لوگوں نے اس کو کچھ تحفے ہدیہ پیش کئے اس نے قبول کر لیے تو لوگوں نے پھر بددعا کرنے کی مکرر درخواست کی اور بلعم نے حسب سابق جواب دیا کہ میں اپنے رب سے استخارہ کر لوں چنانچہ اس نے استخارہ کیا مگر اس مرتبہ اس کو کوئی جواب نہیں ملا بیدار ہو کر اس نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ میں نے استخارہ کیا تھا مگر مجھے کوئی جواب نہیں ملا لوگوں نے کہا اگر آپ کا بددعا کرنا اللہ کو پسند نہ ہوتا تو وہ ضرور اول مرتبہ کی طرح ممانعت فرما دیتا (اور اس مرتبہ اس نے ممانعت نہیں فرمائی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بددعا کرنا ناپسند نہیں ہے لہٰذا آپ بنی اسرائیل کے لیے بددعا کر دیجئے) لوگ اپنی درخواست پر برابر اصرار کرتے رہے اور اتنی زاری اور عاجزی کی کہ بلعم فریب کھا گیا اور قوم والے بہکانے میں کامیاب ہو گئے چنانچہ بلعم ایک خچر پر سوار ہو کر کوہ حبتان کی طرف گیا تاکہ اوپر چڑھ کر بنی اسرائیل کے لشکر کا معائنہ کر لے مگر پہاڑ پر کچھ ہی چڑھا تھا کہ خچر بیٹھ گیا بلعم نے اتر کر خچر کو مارا ' خچر اٹھ کھڑا ہوا ' بلعم پھر سوار ہو گیا مگر زیادہ نہ چلا تھا کہ پھر بیٹھ گیا بلعم نے پھر اسے مارا اب اللہ نے خچر کو بات کرنے کی طاقت عنایت کر دی اور خچر نے (اللہ کی طرف سے) حجت تمام کرتے ہوئے کہا کم بخت بلعم تو کہاں جا رہا ہے کیا تجھے میرے سامنے ملائکہ نظر نہیں آتے جو مجھے لوٹا رہے ہیں تو اللہ کے نبی اور مومنوں کے خلاف بددعا کرنے جا رہا ہے بلعم نے پھر بھی خچر کو نہیں چھوڑا اور اس پر سوار ہو کر ہی کوہ حبتان کے اوپر بددعا کرنے کے لیے پہنچ گیا لیکن بددعا کا جو کلمہ زبان سے نکلتا تھا وہ قوم کے لیے نکلتا تھا اور خیر کی دعا جو اپنی قوم کے لیے مانگنے کا ارادہ کرتا تھا اس وقت زبان بنی اسرائیل کی طرف پھر جاتی تھی۔ (گویا بنی اسرائیل کا لفظ زبان سے نکلتا تھا مگر اپنی قوم کا نام زبان سے نکلتا تھا اور اپنی قوم کا زبان سے لیتا تھا تو بنی اسرائیل کا لفظ زبان پر آ جاتا تھا) قوم والوں نے کہا بلعم آپ کو معلوم بھی ہے آپ کیا کر رہے ہیں ' بنی اسرائیل کے لیے دعا اور ہمارے لیے بددعا کر رہے ہیں بلعم نے جواب دیا اس پر میرا کچھ اختیار نہیں یہ تو اللہ ہی کی طرف سے کرا دیا جاتا ہے میں مجبور ہوں (بددعا کرنے کے وبال میں) بلعم کی زبان سینہ پر لٹک آئی کہنے لگا لو گو اب میری دنیا اور آخرت دونوں تباہ ہو گئیں اب سوائے چالبازی اور مکاری کے تمہارے کام کا اور کوئی راستہ نہیں رہا اب مجھے تمہارے لیے مکاری سے کام لینا پڑے گا جاؤ کچھ عورتوں کو بناؤ سنگھار کرا کے کچھ تجارتی سامان ان کے ہاتھوں میں دے کر بنی اسرائیل کے لشکر میں بیچنے کے لیے بھیج دو اور حکم دے دو کہ اگر بنی اسرائیل میں سے کوئی شخص اگر تمہاری طرف دست درازی کرے تو وہ انکار نہ کریں کیونکہ اگر ان میں سے کسی ایک نے بھی زنا کر لیا تو پھر سب لشکر کے مقابلہ میں تم کو میابی ہو جائے گی لوگوں نے اس مشورہ کو مان لیا جب عورتیں لشکر میں پہنچیں تو ایک کنعانی عورت جس کا نام کشتی بنت صور تھا ایک اسرائیلی سردار کی طرف سے گزری اس سردار کا نام زمری بن شلوم تھا یہ سبط شمعون کا سرگروہ

تھازمری عورت کے حسن پر ریجھ گیااور اٹھ کر اس نے عورت کا ہاتھ پکڑ لیااور عورت کو لے جا کر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے سامنے کھڑا ہو گیااور کہنے لگا میرا خیال ہے کہ آپ یہی کہیں گے کہ یہ عورت تیرے لیے حرام ہے۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا ہاں یہ تیرے لیے حرام ہے تو اس کے قریب بھی نہ جا۔ زمری بولا خدا کی قسم اس کے معاملہ میں میں آپ کی بات نہیں مانوں گا چنانچہ عورت کو لے کر خیمہ کے اندر چلا گیااور اس سے قربت کی۔ زنا کرنا تھا کہ فوراًاللہ نے طاعون کو بنی اسرائیل پر مسلط کر دیا جس سے ستّر ہزار آدمی ایک گھنٹہ میں مر گئے۔

فیحاص بن عیزار بن مرون حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا مقررہ کردہ ایک سردار تھا جو حاکم لشکر تھا۔ یہ شخص قوی الجثۃ اور طاقتور بھی تھا۔ زمری نے جس وقت یہ حرکت کی تھی اس وقت فیحاص لشکر میں موجود نہ تھا جب لشکر میں لوٹ کر آیا اور فوج میں طاعون پھیلا ہوا دیکھا اور زمری کی حرکت معلوم ہوئی تو فوراً اپنا چھوٹا برچھا جو پورے لوہا کا تھا لے کر زمری کے خیمہ میں گھس گیا زمری اور وہ عورت دونوں ہم خواب تھے فیحاص نے نیزہ چبھو کر دونوں کو ایک ہی نیزہ میں پرو لیا اور دونوں کو اسی حالت میں اٹھائے ہوئے باہر آیا ہاتھ میں نیزہ پکڑے ہوئے تھا ہاتھ اوپر کو تھا اور کہنی پہلو سے ٹکی ہوئی تھی اور دونوں لاشیں فیحاص کے جبڑوں سے لگی ہوئی تھیں اسی حالت میں رو کر دعا کرنے لگا الٰہی جو تیری نافرمانی کرتا ہے اس کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے اس پر (اللہ کو رحم آگیا اور اس نے) بنی اسرائیل سے طاعون اٹھالیا یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل جو ذبیحہ ذبح کرتے ہیں اس کا دست جبڑا اور پہلو فیحاص کی اولاد کو دیتے ہیں کیونکہ فیحاص نے زمری اور عورت کو نیزہ میں پرو کر نیزہ ہاتھ میں اٹھا کر کہنی کو اپنے پہلو سے ٹیکا تھا اور لاشوں کو اپنے جبڑوں سے لگا کر روک رکھا تھا اور بنی اسرائیل اپنے اونٹوں میں سے ایک نوجوان اونٹنی بھی فیحاص کی اولاد کو دیتے ہیں کیونکہ فیحاص عیزار کا جیٹھا بیٹھا تھا۔ بلعم ہی کے متعلق اللہ نے آیت (واتل علیھم نبا الذی اٰتینٰہ اٰیٰتنا الخ) نازل فرمائی۔ (تفسیر مظہری)

اس آیت میں بلعم بن باعوراء کا حال بیان ہوا، یہ شخص فضل و کمال کی اس منزل پر فائز تھا کہ گزشتہ کتابوں کا عالم تھا، اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم اسے معلوم تھا، جو دعا مانگتا وہ قبول ہوتی تھی، اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے عرش کو دیکھ لیتا تھا، بارہ ہزار طلباء اس کے درس میں شریک ہو کر اس کی باتیں لکھا کرتے تھے۔ (2)

فضل و کمال کا اتنا بڑا مرتبہ پانے والا شخص جب اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کرنے لگا، دنیا کے مال اور اس کی نعمتوں کی طرف راغب ہو گیا، آخرت اور اس کی نعمتوں کو پس پشت ڈال دیا تو انجام کار جو کچھ اسے عطا ہوا تھا سب چھین لیا گیا، اس کا ایمان برباد ہو گیا اور دنیا و آخرت میں خائب و خاسر ہوا۔ اس واقعے میں ان علماء کے لیے بڑی نصیحت ہے کہ جو اپنے علم کے ذریعے (یا اپنے علم کے باوجود) اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے اور دنیا کا مال اور اس کی نعمتیں طلب کرتے ہیں۔ (3)

یاد رہے کہ مال اور مرتبے کی حرص دین کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے اور قلبی لالچ کی وجہ سے لیے گئے مال میں برکت نہیں دی جاتی، چنانچہ حضرت کعب بن مالک انصاری (رض) سے روایت ہے، حضور سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: دو بھوکے بھیڑئے بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیئے جائیں تو وہ اتنا نقصان نہیں کرتے جتنا مال اور مرتبے کی حرص کرنے والا اپنے دین کیلئے نقصان دہ ہے۔ (4)

اور حضرت حکیم بن حزام (رض) فرماتے ہیں "رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھ سے ارشاد فرمایا: "اے حکیم! یہ مال تروتازہ اور میٹھا ہے، جو اسے اچھی نیت سے لے تو اس میں اسے برکت دی جاتی ہے اور جو اسے قلبی لالچ سے لے گا تو اس میں اسے برکت نہیں دی جاتی اور وہ اس شخص کی طرح ہو جاتا ہے جو کھائے اور شکم سیر نہ ہو اور (یاد رکھو) اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے فَمَثَلُہٗ کَمَثَلِ الْکَلْبِ: تو اس کا حال کتے کی طرح ہے۔} اس آیت میں دنیا کے مال و متاع کی وجہ سے دین کے احکام پس پشت ڈالنے والے عالم کو کتے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کتا ایک ذلیل جانور ہے اور ذلیل تر کتا وہ ہے جو تھکاوٹ، شدت کی گرمی اور پیاس ہونے یا نہ ہونے کے باوجود ہر وقت زبان باہر نکال کر ہانپتا رہتا ہو۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ علمِ دین کی عزت و کرامت سے سرفراز فرمائے اور اسے لوگوں کے مال سے بے نیاز کر دے، پھر وہ کسی حاجت و ضرورت کے بغیر صرف اپنی قلبی خساست اور کمینہ پن کی وجہ سے دین کے واضح احکام سے اعراض کر کے دنیا کے مال دولت اور منصب و مرتبے کی طرف جھکے اور اس خبیث عمل پر قائم رہے تو وہ ہانپنے والے کتے کی طرح ہے کہ ہر وقت ہانپنے والا کتا کسی حاجت کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی فطرت کی وجہ سے ہانپتا رہتا ہے۔ (1)

درباری علماء کے لیے عبرت:

اس آیت میں ان درباری علماء کیلئے بڑی عبرت ہے جو منصب و مرتبے، مراعات و وظائف کے حصول کی خاطر حکام کی طبیعت کے مطابق فتوے اور ان کے موافق بیان دیتے ہیں۔ اگر یہ فتوے قرآن و حدیث کی صریح نصوص سے ٹکراتے ہوں تو انھیں ڈر جانا چاہیے کہ کہیں ان کا انجام بھی بلعم کی طرح نہ ہو جائے۔ آیت سے معلوم ہوا کہ نبی کا گستاخ عالم اللہ تعالیٰ کے نزدیک کتے کی طرح ہے کہ نہ دنیا میں عزت نصیب ہو اور نہ آخرت میں کیونکہ بلعم اللہ عَزَّوَجَلَّ کا منکر نہ تھا، وہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا مخالف ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اسے کتے کی بدترین حالت سے تشبیہ دی۔ (تفسیر صراط الجنان)

یعنی بلعم بن باعور توراۃ کا جاننے والا تھا مگر شیطان نے اسے بہکا دیا اور وہ آیات خداوندی سے منکر ہو گیا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے توراۃ کی آیات پر ایمان لانے کی وجہ سے بلندی دیتے مگر ہم نے ایسا نہ چاہا کیونکہ وہ خود ہی بلندی والے راستہ پر چلنے کی بجائے پستی کی راہ پر چلا اور زمین سے چپک گیا اور جو اپنی حالت خود نہ بدلنا چاہے اللہ اس کی حالت نہیں بدلتا۔

یعنی جو شخص آیات خداوندی کا علم حاصل کرنے کے باوجود بلعم بن باعور کی طرح مال دنیا کے لالچ میں ان سے اعراض کرے اس کی حالت کتے جیسی ہے کتا سخت لالچی جانور ہے خواہ اس پر بوجھ لادو یا نہ لادو۔ وہ ہر وقت زبان باہر نکالے لالچ کی وجہ سے ہانپتا رہتا ہے اور ہر گندی چیز پر مارتا رہتا ہے جبکہ باقی جانور صرف بوجھ اٹھانے کی وجہ سے ہانپتے ہیں۔ یہی حالت حرام خور لالچی انسان کی ہے وہ زبان باہر نکالے مال حرام کے لئے ہر جگہ منہ مارتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ دنیا ایک مردار ہے اور اس کے طلبگار لوگ کتے ھیں جو اس کے ارد گرد جمع ہو کر اسے نوچ نوچ کر کھاتے ہیں۔ دور نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں علماء بنی اسرائیل لوگوں سے لے کر اللہ کی آیات کی تکذیب بل کے تحریف کر رہے تھے۔ گویا انھوں نے بلغم بن باعور کی میراث پائی اسی لیے یہ واقعہ یہاں لایا گیا تاکہ انھیں آئینہ دکھایا جائے۔ ابھی پیچھے (آیت 169) میں انہی کے بارہ میں کہا گیا: یاخذون عرض ھذا الادنی۔ (تفسیر برہان القرآن)

اگر وہ عالم احکام خداوندی پر عمل کرتا تو اس کا مرتبہ بہت بلند ہوتا لیکن وہ اپنی خواہشات کی پیروی کرکے پستی میں گر گیا۔ اس کی مثال کتے جیسی ہے، اگر کتے پر حملہ کیا جائے اور تنگ کیا جائے تو بھی وہ زبان باہر نکال کر ہانپتا ہے اور اگر اسے آزاد چھوڑ دیا جائے اور کچھ نہ کہا جائے تو بھی وہ زبان باہر نکال کر ہانپتا ہے یعنی سختی یا نرمی دونوں صورتوں میں ایک ہی قسم کی بے چینی ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح جو شخص عالم ہونے کے باوجود دنیا کے لالچ و طمع میں احکام خداوندی کی تکذیب کرتا ہے وہ امیر ہو یا غریب دونوں صورتوں میں دنیاوی حرص و ہوس میں سرگرداں رہتا ہے، جس طرح زبان باہر نکل کر ہانپنا کتے کی لازمی طبیعت ہے اسی طرح دنیاوی طمع اور لالچ اس کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے، لہٰذا اسے انجام بد سے ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے وہ ہر حال میں دنیاوی مال و دولت کا طالب رہتا ہے۔ حدیث میں دنیا کو مردار اور اس کے طالب کو کتا قرار دیا گیا ہے۔

دیلمی نے حضرت علی بن ابی طالب (رض) کی روایت بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد (علیہ السلام) کی طرف وحی کی کہ دنیا کی مثال ایسے مردار کی طرح ہے جس پر کتے جمع ہو گئے ہوں اور اس کو گھسیٹ رہے ہوں۔ (کنز الاعمال: جلد ۳: ص ۲۱۴) (تفسیر امداد الکرم)

حقائق کا جو علم اسے عطا کیا گیا تھا اگر وہ اس پر عمل پیرا ہوتا تو مقربین بارگاہ الٰہی میں شمار ہوتا۔ اور مناصب رفیعہ اور مراتب عالیہ پر فائز ہوتا۔ لیکن اس بدنصیب نے تو اس سے ایسی آنکھیں بند کرلیں۔ اور نفسانی خواہشات کا ایسا پرستار بن گیا۔ اور حرص و لالچ کا اس پر ایسا غلبہ ہو گیا کہ یوں دکھائی دینے لگا کہ اس نے ذلت کی پستیوں سے چمٹے رہنے کا عزم مصمم کرلیا ہے اور وہ کسی طرح بھی انھیں چھوڑ کر ہدایت کی بلندی کی طرف ایک قدم بھی اٹھانے کے لیے آمادہ نہیں۔ ولو شئنا یعنی اگر ہم چاہتے تو اسے اپنی من مانی نہ کرنے دیتے اور اسے مجبور کرتے کہ وہ ان دلائل کی روشنی میں راہ حق پر طوعاً او کرہاً قدم بڑھاتا چلا جائے۔ لیکن ایسی جبری مداخلت ہماری حکمت کے منافی ہے۔ جو شخص جان بوجھ کر ہلاکت کے گڑھے میں چھلانگ لگانے پر بضد ہوتا ہے اسے اس کا شوق پورا کرنے دیا جاتا ہے۔ اخلد کا صلی جب الی ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے اس چیز کی طرف مائل ہونا اخلد الیہ مال ور کن (منجد) (تفسیر ضیاء القرآن)

آیت مبارکہ:

سَآءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ○

لغۃ القرآن: [سَآءَ : کتنی بری ہے] [مَثَلًا : مثال] [الْقَوْمُ الَّذِيْنَ : اس قوم کی جس نے] [كَذَّبُوْا : جھٹلایا] [بِاٰيٰتِنَا : ہماری نشانیوں کو] [وَاَنْفُسَهُمْ : اور ان کی جانیں] [كَانُوْا : تھے] [يَظْلِمُوْنَ : وہ ظلم کرتے]

ترجمہ: مثال کے لحاظ سے وہ قوم بہت ہی بری ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور (در حقیقت) وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے

تشریح: یعنی جو لوگ مال دنیا کے لالچ میں اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے ہیں جیسے علماء یہود نے طریقہ اپنایا ان کی مثال کتے جیسی ہے اور یہ کیسی بری مثال ہے۔

یہاں سے دو فوائد حاصل ہوئے:

1۔ ہر ضمیر فروش عالم یا پیر دوسرا بلعم بن باعور ہے۔ بلعم بن باعور تورات کا عالم تھا اور اتنا عابد شخص تھا کہ اسے اسم اعظم مل گیا مگر جب اس نے مال کے بدلے ضمیر بیچا تو کتا بنا دیا گیا، امت محمدیہ صورتوں کے مسخ سے محفوظ ہے مگر یہاں بھی ایسے عالم اور صوفی ہیں جو مال کے لئے زمین بیچنے میں دیر نہیں لگاتے ان میں اور بلعم بن باعور میں کچھ فرق نہیں۔ آج ایسے پیر فقیر بھی ہیں جو حرام کاروبار کرنے والوں کو روکنے کی وجہ نذرانہ کی لالچ میں ان کے کاروبار میں برکت کے لیے دعا کر دیتے ہیں، بلاشبہ ان کا کردار بلعم بن باعور جیسا ہی ہے۔

2۔ گستاخ رسول عالم یا فقیر اللہ تعالیٰ کے ہاں کتے جیسا ذلیل ہے۔ بلعم بن باعور نے موسیٰ (علیہ السلام) کے خلاف دعا کرنا چاہی اللہ رب العزت نے اسے کتا بنا دیا۔ حالانکہ وہ عالم و عابد تھا یہی حالت اس شخص کی ہے جو دعویٰ علم معرفت رکھنے کے باوجود گستاخی رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارتکاب کرے۔ (تفسیر برہان القرآن)

اللہ کی آیتوں کو جھٹلانا خود اپنی جانوں پر ظلم کرنا ہے۔ وَالْعِيَاذُ بِاللّٰهِ : سو ارشاد فرمایا گیا کہ بڑی ہی بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور اس طرح وہ دراصل خود اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے تھے کہ نور حق اور راہ صدق و صواب سے محروم لوگ حیوانوں کی زندگی گزارتے ہیں اور اپنے آپ کو دوزخ کا ایندھن بنائے جا رہے ہیں۔ اور اس طرح وہ سراسر خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں مگر ان کو اس کا شعور و احساس نہیں جو کہ خسارہ در خسارہ اور ظلم بالائے ظلم ہے۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ سو اللہ کی آیتوں کو جھٹلانے والوں کی مثال نہایت بری اور انتہائی مکروہ اور گھناؤنی ہے۔ پس تم لوگ ایسے بد بختوں کے طور طریقوں سے بچ کر رہنا۔ اور یاد رکھو کہ اللہ کی آیات کی ناقدری اور تکذیب کرنے والے ان آیتوں کا کچھ نہیں بگاڑتے بلکہ وہ خود اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے ہاتھوں عزت کے تاج کی بجائے ذلت کا طوق اختیار کرتے ہیں۔ اور اس طور پر کہ ان کو اس کا احساس و شعور بھی نہیں ہوتا۔ تو وہ لوگ کس قدر گھاٹے اور خسارے کا سودا کر رہے ہیں۔ سو یہ خسارے پر خسارہ ہے۔ والعیاذ باللہ ۔(تفسیر مدنی کبیر)

تکذیب آیات الٰہی کے نتیجے میں ایسے لوگ حقیقی عزت و عظمت اور سچی رفعت و کرامت سے محروم ہو کر کتے کی طرح ہو جاتے ہیں، جس کی زندگی کا محور و مدار خواہشات بطن و فرج کی تحصیل و تکمیل ہی کیلئے سرگرداں رہنا ہوتا ہے اس کی ناک ہر وقت زمین ہی میں لگی رہتی ہے، کہ شاید کہیں سے کھانے کی کسی چیز کی بو مل جائے، یہاں تک کہ اگر اس کو پتھر مارا جائے تو وہ اس کو بھی اس توقع میں کہ شاید یہ روٹی کا کوئی ٹکڑا یا کوئی ہڈی پھینکی گئی ہو، اس کو بھی اپنے دانتوں سے پکڑ لیتا ہے، اور شہوت بطن کے ساتھ ساتھ اس کی دوسری خصوصیت شہوت فرج ہے، سو اس کی ساری تگ و دو اور دوڑ دھوپ کا محور و مدار بطن و فرج کی شہوتوں کی تحصیل و تکمیل کے گرد گھومنا، اور ان کیلئے سرگرداں رہنا ہے، اور یہی مثال ان لوگوں کی ہے جو آیات خداوندی اور نور حق و ہدایت سے منہ موڑ کر خواہشات بطن و فرج ہی کے پیچھے لگ جاتے ہیں، اور وہ ہمہ تن بطن اور ہمہ تن فرج بن کر رہ جاتے ہیں۔ سو اس سے بڑھ کر بری مثال اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ کہ انسان اپنی شرافت و کرامت کو ضائع کرکے، اور شہوات کے پیچھے لگ کر اس حد تک گر جائے۔ کہ کتے کی مثال بن جائے۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ (تفسیر مدنی آزاد کشمیر)

اللہ ہی بچانے والا ہے:

پہلے ان آدمیوں کو جو دنیا کی شان و شوکت اور دھوم دھڑکے کو اہمیت دیتے ہیں کتے سے تشبیہ دی گئی ہے یہ لوگ اس دنیا کی عشرت کے سامان جمع کرنے میں ہر وقت پریشان ہیں اور ہر وقت اسی ادھیڑ بن میں پریشان اور بدحواس رہتے ہیں ان کو نصیحت کرو یا نہ کرو کام کی باتیں سناؤ یا نہ سناؤ انھیں ہر وقت اپنی ہی دھن میں لگے رہنے سے کام ہے اس آیت میں بیان ہے کہ یہ لوگ انسانیت سے کوسوں دور جا پڑے ہیں جو کہ دنیا ہی کے جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں مال دولت اور قوت میں ایک دوسرے سے بڑھنا چاہتے ہیں اور اپنا ناس کر رہے ہیں۔

ارشاد ہے کہ ان دنیا کے دلدادوں نے اللہ کی آیتوں کو تو پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا اب انھیں نقصان سے بچانے والی کیا چیز باقی رہ گئی یہ دنیا کے نام و نمود کے پیچھے دیوانہ وار دوڑے چلے جا رہے ہیں اور چاروں طرف اندھیرا ہے کیونکہ روشنی تو فقط اللہ کی آیتوں سے حاصل ہو سکتی تھی ان کو انھوں نے جھوٹی اور من گھڑت کہہ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اب کوئی چیز نہیں جو انھیں راستے کے گڑھوں اور ٹھوکروں سے بچائے عنقریب کسی گڑھے میں اوندھے منہ جا پڑیں گے۔ یقیناً یہ ہماری آیتوں کو جھٹلا کر اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں اگر یہ کہیں کہ ہمارے پاس علم ہے ہم سائنس دان ہیں ہماری دھاک ہر جگہ بیٹھی ہوئی ہے ہمارے پاس روشنی کی کیا کمی ہے تو ان کو سنا دوں کہ علم اور سائنس سے ضروری نہیں کہ مفید باتیں ہی سوجھیں جب تک اللّٰہ دستگیری اور راہ نمائی نہ کرے علم بھی تباہی کا باعث ہے جنھوں نے اللہ سے منہ موڑ لیا اور اللہ نے انھیں غلط راستے سے بچانا چھوڑ دیا وہ آج نہ مرے تو کل مریں گے سوائے نقصان کے ان کے پلے کچھ نہیں پڑ سکتا۔

حقیقت یہی ہے کہ علم اور سائنس انسان کی نجات کے کفیل نہیں ہو سکتے ان پر کسی کو مغرور نہ ہونا چاہیے جو یہ سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنے علم سے سب کچھ تو حاصل کر لیا اب اللہ کی اور اس کی آیتوں کی کیا ضرورت رہی اسناد ان سے کہہ دو کہ اللہ کے علم اور قوت کے مقابلے میں تمہارے علم اور قوت کی رائی کے دانے کے برابر بھی حقیقت نہیں اگر چاہے تو تمہارے یہ مکڑی کے جالے ایک پل میں توڑ کر رکھ سکتا ہے بارہا ایسا ہوا اور اب بھی ایسا ہونا ناممکن نہیں ہے۔ معاذ اللہ۔

(درس قرآن آسٹریلیا)

آیت مبارکہ:

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۝۱۷۸

لغۃ القرآن: [مَنْ : جس کو] [يَّهْدِ : ہدایت دے] [اللّٰهُ : اللہ] [فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ : تو وہ ہی ہدایت پانے والا ہے] [وَمَنْ : اور جس کو] [يُّضْلِلْ : وہ گمراہ کرے] [فَ اُولٰٓئِكَ : تو وہی] [هُمُ الْخٰسِرُوْنَ : وہ خسارہ پانے والے]

ترجمہ: جسے اللہ ہدایت فرماتا ہے پس وہی ہدایت پانے والا ہے، اور جسے وہ گمراہ ٹھہراتا ہے پس وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں

تشریح:

انسان دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو اپنی فطری صلاحیتوں کا صرف اپنے اہل و عیال اور خوشی و مسرت اور عیش و آرام کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی ساری تگ و دو صرف دنیاوی مفادات حاصل کنے کیلئے ہوتی ہے۔

دوسرے وہ ہیں جو آخرت کو حاصل کرنے کے لیے دنیا کو ایک سیڑھی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ آخر کمانے کے لیے صرف اتنی ہی دنیا کماتے ہیں جو ان کی بنیادی ضروریات کو پورا کر دے۔

ان دونوں میں سے ایک کا مقصد زندگی برائے زندگی ہے اور دوسرے کا مقصد زندگی برائے بندگی ہے۔

یہاں ان لوگوں کو جانوروں سے تشبیہ دی گئی ہے جو صرف کھانے پینے اور عیش و آرام ہی کو زندگی کا مقصد بنا کر اس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں انھیں آخرت کی کوئی فکر نہیں ہے ان کے پاس جو دل ہے وہ فکر آخرت سے محروم ہے۔ ان کے کان ہیں مگر وہ دین کی بات سننے کے لیے نہیں ان کی آنکھیں ہیں مگر حقیقت کو دیکھنے کے لیے نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو جہنم میں جانے پر تلے ہوئے ہیں۔

لیکن وہ لوگ جن کا مقصد آخرت اور اس کی ابدی راحتیں ہیں ان کے قلب و نظر اور فکر کا دائرہ آخرت تک وسیع ہے اور یقینا یہی وہ لوگ ہیں جو دنیا و آخرت کی کامیابیاں حاصل کرنے والے ہیں۔ (تفسیر بصیرت القرآن)

اس شخص کی مثال جسے اللہ نے اپنی ہدایات دیں مگر وہ ان سے نکل گیا، تبصرہ یہ ہے کہ ہدایت دراصل وہی ہوتی ہے جو من جانب اللہ ہو، جسے اللہ ہدایت دینا چاہے وہی ہدایت پر ہے اور جسے اللہ ہدایت دینا چاہے وہی ہدایت پر ہے اور جسے اللہ گمراہ کر دے وہ ہمیشہ کے لیے خسارے میں پڑ جاتا ہے۔ اب وہ کسی معاملے میں بھی نفع نہیں کما سکتا۔

اور اللہ تعالیٰ صرف اس شخص کو ہدایت دیتا ہے جو ہدایت کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ دوسری سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے والذین جاھدوافینا لنھدینھم سبلنا۔ جو لوگ ہمارے بارے میں جدوجہد کرتے ہیں ہم ان کو ضرور اپنے راستوں کی طرف راہنمائی کریں گے۔ اور دوسری جگہ ہے۔ ان اللہ لایغیر مابقوم حتی یغیر واما بانفسھم۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی حالت کے بدلنے کی سعی نہ کرے اور دوسری جگہ ہے۔ ونفس وماسواھا فالھمھا فجورھا وتقواھا قد افلح من زکاھا وقد خاب من دساھا۔ اور وہ نفس کی اور یہ جو اسے برابر کیا اور اسے برائی اور خدا خوفی سے آگاہ کیا۔ وہ کامیاب ہوا جس نے اس نفس کو پاک کیا اور وہ ناکام ہوا جس نے اسے ناپاک کیا"۔

جو شخص دلائل ہدایت کو ترک کرکے اپنے لیے راہ ضلالت کو پسند کر لیتا ہے۔ اللہ بھی اسے گمراہ کر دیتا ہے کیونکہ ایسا شخص اپنے دل، اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں کو ہدایت کے لیے بند کر دیتا ہے اور اسی سیاق و سباق میں درج ذیل آیت اسی مفہوم کو ظاہر کر رہی ہے۔

اور دوسری جگہ فرمایا گیا فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضا۔ ان کے دل میں بیماری ہے، پس اللہ نے بھی ان کی بیماری کو زیادہ کر دیا"۔ اور ایک دوسری آیت میں ہے۔ ان الذین کفروا وظلموا لم یکن اللہ لیغفر لھم ولا لیھدیھم طریقا الا طریق جھنم خالدین فیھا" وہ لوگ جنھوں نے کفر کو اختیار کیا اور اپنی جانوں پر ظلم کیا، اللہ بھی ان کو بخشنے والا نہیں اور نہ انھیں صحیح راستے کی ہدایت دیتا ہے، ماسوائے جہنم کے راستے کے جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے"۔

ان تمام آیات پر غور و فکر کرنے کے بعد جن میں ہدایت و ضلالت کا ذکر ہے اور ان کے مفہوم کے اندر تطبیق اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے بعد صرف ایک ہی تشریح و تطبیق ممکن ہے جس میں دل کا اطمینان بھی ہے اور وہ ان لاہوتی جدلیات سے بھی پاک ہے جن میں اسلامی متکلمین، یہودی مسیحی اور دوسرے مذاہب فلسفہ ہمیشہ باہم دست و گریبان رہے ہیں، وہ یہ کہ اس کائنات میں اللہ کا نظام قضا و قدر اللہ کی مشیت کے ایک وسیع دائرے کے اندر کام کرتا ہے۔ اس دائرے کے اندر انسان کی تخلیق ہوئی ہے اور اس نظام قدر کے مطابق انسان کے اندر ہدایت اور ضلالت کی دہری صلاحیت رکھ دی گئی ہے۔ انسان کی فطرت مخلوق کے اندر ہی یہ فطری عہد رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اللہ وحدہ کی معرفت حاصل کرے اور ربوبیت کا اعتراف کرے، پھر انسان کو ہدایت و ضلالت کی دہری صلاحیت کے ساتھ عقل کی قوت تمیزہ بھی دی گئی ہے جو ہدایت و ضلالت کو پہچانتی ہے۔ اس پر مستزاد اسے رسولوں کے ذریعے دلائل و نشانات ہدایت بھی سمجھا دیے گئے تاکہ اگر اس کی فطرت پر موٹی تہ جم گئی ہو تو اسے صاف کرتا جائے لیکن ان تمام انتظامات کے ساتھ ساتھ اس میں قبولیت ہدایت و ضلالت کی دہری صلاحیت قائم رہتی ہے اور یہ تمام انتظام اللہ کے دائرہ مشیت، وسیع تر دائرہ مشیت کے اندر ہے۔

اللہ کی مشیت کے اندر اللہ کا نظام قضا و قدر جاری رہتا ہے اور اپنا کام کرتا ہے لہٰذا اس دائرے کے اندر جو شخص ہدایت کا انتخاب کرتا ہے وہ ہدایت کی راہ لیتا ہے، تقدیر اسے ہدایت دیتی ہے اور اگر وہ دلائل ہدایت اور اشارات فطرت کے مطابق نہیں چلتا تو یہ تقدیر اسے راہ ضلالت پر ڈال دیتی ہے۔ اس لیے کہ اس شخص نے اس عقل سے کام نہ لیا جو اسے عطا ہوئی تھی۔ اپنی آنکھوں اور کانوں سے کام نہ لیا جو اس کائنات کے اندر بکھری ہوئی نشانیوں کو دیکھنے کے لیے اسے دی گئی تھی۔ پھر ان ہدایات میں بھی موجود تھیں جو رسولوں کے ذریعے بھیجی گئیں۔

لیکن کوئی شخص جو راہ بھی اختیار کرکے وہ اللہ کے دائرہ مشیت کے اندر رہتا ہے اور جو واقعہ بھی ہوتا ہے اللہ کے نظام قضا و قدر کے اندر رہتا ہے اور اللہ کی قوت کے برعکس نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ کسی انسان کا کسی طرح کا علم بھی چلتا ہو اللہ کی مشیت کے دائرے کے اندر ہی رہتا ہے، کیونکہ جو کچھ ہوتا ہے تقدیر کے مطابق ہوتا ہے۔ کیونکہ کائنات میں صرف اللہ کی مشیت کام کرتی ہے اور تقدیر اس دائرے کے اندر ہے۔ کیونکہ اللہ کی قوت کے سوا کوئی اور قوت نہیں ہے جو اس قسم کے نظام و واقعات کو جود میں لا سکتی ہو۔ غرض انسان اس وسیع دائرے کے اندر متحرک ہے اور اسی دائرے کے اندر وہ جو راہ چلتا رہتا ہے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

ہدایت اور گمراہی کا اللہ کی جانب سے ہونے کا معنی

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے گمراہی کو بہت بری مثال سے واضح فرمایا ہے۔ اس لیے یہاں پر یہ فرمایا کہ ہدایت اور گمراہی دونوں اللہ کی جانب سے ہیں۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب ہدایت اور گمراہی دونوں اللہ کی جانب سے ہیں تو کسی شخص کا ہدایت یافتہ ہونا دنیا میں مدح اور آخرت میں ثواب کا مستحق نہیں ہونا چاہیے اور کسی شخص کا گمراہ ہونا دنیا میں مذمت اور آخرت میں عذاب کا مستحق نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ہدایت اور گمراہی کا پیدا کرنا اللہ کی جانب سے ہے اور ان کا اختیار کرنا بندہ کی طرف مفوض ہے، بندہ اگر ہدایت کو اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں ہدایت کو پیدا کر دیتا ہے اور اگر وہ گمراہی کو اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں گمراہی کو پیدا کر دیتا ہے۔ باقی رہا یہ کہ اس اختیار کو کس نے پیدا کیا ہے؟ یہ بہت غامض بحث ہے۔ اس کی تفصیل اور تحقیق کے لیے شرح صحیح مسلم ج 7، ص 269 - 271 کو ملاحظہ فرمائیں۔

اس آیت پر اشکال کے حسب ذیل جوابات بھی دیے گئے ہیں:

1۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ آخرت میں جنت اور ثواب کی طرف ہدایت دے گا وہ دنیا میں ہدایت یافتہ ہے اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ آخرت میں جنت سے گمراہ کر دے گا وہ نقصان اٹھانے والا ہے

2۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ آخرت میں جنت اور ثواب کی طرف ہدایت دے گا وہ دنیا میں ہدایت یافتہ ہے اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ آخرت میں جنت سے گمراہ کر دے گا وہ نقصان اٹھانے والا ہے۔

2۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اور اس نے اس ہدایت کو قبول کر لیا اور اس کے تقاضوں پر عمل کیا وہ ہدایت یافتہ ہے اور جس شخص نے اللہ کی دی ہوئی ہدایت کو قبول نہیں کیا اس کو اللہ تعالیٰ نے گمراہ کر دیا اور وہ نقصان اٹھانے والا ہے۔

3۔ جس نے ہدایت کو اختیار کر لیا اللہ تعالیٰ نے اس پر خاص لطف و کرم فرمایا وہ ہدایت یافتہ ہے اور جس نے گمراہی کو اختیار کا وہ اللہ تعالیٰ کے خاص لطف و کرم سے محروم ہو گیا اس کو اللہ تعالیٰ نے گمراہ کر دیا اور وہ نقصان اٹھانے والا ہے۔

بہت سے جنات اور انسانوں کو دوزخ کے لیے پیدا کرنے کی توجیہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور بیشک ہم نے دوزخ کے لیے بہت سے انسان اور جن پیدا کیے۔

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جن انسانوں اور جنات کے متعلق ازل میں یہ علم تھا کہ وہ کفر پر اصرار کریں گے اور ان کی موت کفر پر ہو گی ان کو اللہ تعالیٰ نے انجام کار دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس آیت میں لام تعلیل کا نہیں ہے بلکہ عاقبت کا ہے جس کا معنی ہے انجام کار۔ اس کی مثال حسب ذیل آیات ہیں:

و قال موی ربنا انک اتیت فرعون وملاہ زینۃ واموالا فی الحیوۃ الدنیا ربنا لیضلوا عن سبیلک: اور موسیٰ نے کہا اے ہمارے رب! تو نے فرعون کو اور اس کے عمال حکومت کو زینت کا سامان اور دنیا کی زندگی کے بہت اموال دیے ہیں تاکہ وہ انجام کار لوگوں کو تیرے راستہ سے گمراہ کریں۔ (یونس: 88)

فالتقطہ ال فرعون لیکون لھم عدوا وحزنا: سو اس (موسیٰ) کو فرون کے گھر والوں نے اٹھا لیا تاکہ انجام کار وہ ان کے لیے دشمن اور رنج و غم کا باعث ہو جائے۔

علامہ محمود بن عمر زمخشری متوفی 528ھ لکھتے ہیں:

یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے متعلق اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ ان کے اذہان حق کی معرفت کو قبول نہیں کریں گے اور یہ اپنی آنکھوں سے مخلوقات میں اللہ کی نشانیوں کو نہیں دیکھیں گے اور اللہ تعالیٰ کی آیات جب تلاوت کی جائیں گی تو یہ ان کو غور و فکر سے نہیں سنیں گے، کفر پر اصرار اور ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کے قلوب

ماؤف ہیں اور ان کی آنکھوں پر پردے ہیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹیں ہیں۔ اس آیت سے مقصود یہود کا حال بیان کرنا ہے کہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تکذیب میں انتہا کو پہنچ چکے ہیں، حالانکہ ان کو علم الیقین ہے کہ ان کی کتابوں میں جس نبی کی بعثت کا وعدہ کیا گیا ہے وہ یہی ہیں یعنی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، اور یہ ان بہت سے لوگوں میں سے ہیں جو ایمان لانے والے نہیں ہیں گویا کہ ان کو پیدا ہی دوزخ کے لیے کیا گیا ہے (الکشاف ج 2، ص 177۔ 178، مطبوعہ قم، ایران، 1413ھ)

اس آیت سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دینا مقصود ہے گویا کہ یوں کہا گیا ہے کہ اگر یہ ضدی اور معاند مشرکین ایمان نہیں لاتے اور آپ کی نصیحت کو قبول نہیں کرتے تو آپ پریشان نہ ہوں یہ ضدی مشرکین ان لوگوں میں سے ہیں جن کو انجام کار دوزخ کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ ان کی وجہ سے آپ ملول خاطر نہ ہوں آپ اپنے دینی معاملات میں اور اپنے متبعین کے ساتھ مشغول رہیے اور ان کی پروانہ کیجئے۔

اگر یہ کہا جائے کہ جنات تو آگ سے پیدا کیے گئے ہیں ان کو آگ کے عذاب کی کیا تکلیف ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے انسان مٹی سے پیدا کیا گیا ہے لیکن اگر اس کو اینٹ ماری جائے تو اس کو تکلیف ہوتی ہے حالانکہ اینٹ بھی مٹی سے بنی ہوئی ہے۔ سو اسی طرح جنات کو بھی آگ سے تکلیف ہوگی خواہ وہ آگ سے بنے ہوئے ہیں۔

ایک اور اعتراض یہ ہے کہ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وماخلقت الجن والانس الالیعبدون: اور میں نے جن اور انس کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں" (الذاریات: 56)۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جن اور انس کو پیدا کرنے سے مقصود یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، اور زیر تفسیر آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر جن اور انس کو دوزخ کے لیے پیدا فرمایا ہے اور یہ واضح تعارض ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں اور جنات کو اس لیے پیدا فرمایا ہے کہ وہ اپنے اختیار اور ارادہ سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، سو جو اپنے اختیار اور ارادہ سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے ان کو اللہ تعالیٰ جنت میں داخل فرمائے گا، اور دوزخ میں داخل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور جنات کو پیدا نہیں فرمایا لیکن جو اپنے اختیار اور ارادے سے کفر کریں گے اور اپنے مقصد تخلیق کے خلاف کام کریں گے ان کو اللہ تعالیٰ انجام کار دوزخ میں داخل فرمائے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ مقصد تخلیق اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے اور دوزخ میں داخل کرنا مقصد تخلیق نہیں ہے۔ اس لیے ان آیتوں میں تعارض نہیں ہے۔

عقل کا محل دل ہے یا دماغ؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان کے دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں (مگر) وہ ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں (مگر) وہ ان سے سنتے نہیں۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کی وحدانیت کے دلائل پر دل سے غور و فکر نہیں کرتے، اور اس کائنات میں اس کے وجود پر جو نشانیاں ہیں ان کا آنکھوں سے مشاہدہ نہیں کرتے، اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں کی جو تلاوت کی جاتی ہے اس کو کانوں سے غور سے نہیں سنتے اور نہ وعظ اور نصیحت کو سنتے ہیں۔

اس آیت میں فرمایا ہے جن کے دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں۔ امام فخر الدین رازی شافعی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں: علماء نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ علم کا محل قلب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بہ طور مذمت فقہ اور فہم کی ان کے دلوں سے نفی کی ہے اور یہ اسی وقت درست ہوگا جب فقہ اور فہم کا محل قلب ہو۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر کبیر ج 5، ص 411، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، 1415ھ)

حضرت نعمان بن بشیر (رض) نے اپنی دو انگلیوں سے اپنے کانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا حلال ظاہر ہے اور حرام ظاہر ہے اور ان کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں جن کا بہت سے لوگوں کو علم نہیں ہے سو جو شخص شبہات سے بچا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو محفوظ کر لیا اور جس شخص نے امور مشتبہ کو اختیار کیا وہ حرام میں مبتلا ہو گیا، جس طرح کوئی شخص کسی چراگاہ کی حدود کے گرد جانور چرائے تو قریب ہے کہ وہ جانور اس چراگاہ میں بھی چر لیں، سنو ہر بادشاہ کی ایک خاص حد ہوتی ہے اور یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کی حدود اس کی حرام کی ہوئی چیزیں ہیں اور سنو جسم میں گوشت کا ایک ایسا ٹکڑا ہے اگر وہ ٹھیک ہو تو پورا جسم ٹھیک رہتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے اور یاد رکھو وہ گوشت کا ٹکڑا قلب ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 2501۔ صحیح مسلم

المساقات، 107 (1599) 4017۔ سنن ابوداود رقم الحدیث : 3330، 3329۔ سنن الترمذی، رقم الحدیث : 1209۔ سنن النسائیر قم الحدیث : 4453۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 3984)

اس حدیث میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ ارشاد ہے : سنو! جسم میں ایک ایسا ٹکڑا ہے کہ اگر وہ ٹھیک ہو تو پورا جسم ٹھیک رہتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے اور یاد رکھو گوشت کا وہ ٹکڑا قلب ہے۔ علامہ یحییٰ بن شرف نووی شافعی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں : ایک جماعت نے اس حدیث سے اس پر استدلال کیا ہے کہ عقل قلب میں ہے سر میں نہیں ہے، اور اس میں اختلاف مشہور ہے۔ ہمارے اصحاب (شافعیہ) اور جمہور متکلمی9ن کا یہ نظریہ ہے کہ عقل قلب میں ہے، اور امام ابوحنیفہ نے فرمایا ہے کہ عقل دماغ میں ہے۔ علامہ ماری لکھتے ہیں عقل کے قلب میں ہونے کے قائلین اس آیت سے استدلال کرتے ہیں فتکون لہم قلوب یعقلون بہا کہ ان کے دل ایسے ہو جاتے جن سے وہ سمجھتے۔ اور اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے ان فی ذلک لذکری لمن کان لہ قلب۔ بیشک اس میں دل والے کے لیے نصیحت ہے۔ ان آیات کے علاوہ اس حدیث سے بھی اس پر استدلال کیا جاتا ہے کہ عقل دل میں ہے۔

علامہ نووی لکھتے ہیں کہ جو علماء یہ کہتے ہیں کہ عقل دماغ میں ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ جب دماغ فاسد ہو تو عقل فاسد ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عقل دماغ میں ہوتی ہے۔ علامہ نووی اس دلیل کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں : یہ دلیل صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ عقل دماغ میں نہ ہو لیکن اللہ تعالیٰ کی یہ عادت جاریہ ہو کہ وہ دماغ کے فساد کے وقت عقل کو فاسد کر دیتا ہو اور اس میں کوئی استحالہ نہیں ہے۔ (شرح مسلم ج 2، ص 28، مطبوعہ کراچی)

علامہ نووی کا یہ جواب صحیح نہیں ہے کیونکہ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ آنکھ سے بصارت کا ادراک نہیں ہوتا اور آنکھ ضائع ہونے بصارت اس لیے چلی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت جاریہ ہے کہ وہ آنکھوں کے فساد کے وقت بصارت کو فاسد کر دیتا ہے اور یہ بداہت کے خلاف ہے۔

دماغ کے محل عقل ہونے پر دلائل

عقل کا محل دماغ ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کام کی استعداد اور صلاحیت جس عضو میں رکھی ہے اس کا محل اسی عضو کو بنایا ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ ہے اور ہم بداہۃً جانتے ہیں کہ غور و فکر اور سوچ و بچار کا کام دماغ سے لیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ مطالعہ کرنے زیادہ غور و فکر کرنے اور زیادہ سوچ و بچار سے دماغ تھک جاتا ہے دل کو کوئی تھکاوٹ نہیں ہوتی۔ زیادہ پڑھنے سے سر میں درد ہو جاتا ہے دل میں کوئی درد نہیں ہوتا۔ اگر چربی بڑھ جانے اور مٹاپے سے عارضہ قلب کی بیماری لاحق ہو جائے اور دل کے دورے پڑنے لگیں تو اس سے انسان کی عقل متاثر نہیں ہوتی۔ اسی طرح بلڈ پریشر بڑھ جانے کی وجہ سے دل کو زیادہ مشقت اور محنت کرنا پڑے تو اس سے بھی عقل کی کارکردگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے برخلاف اگر دماغکو کوئی بیماری لاحق ہو جیسے عدم ارتکاز، ذہنی انتشار، انجانا خوف، نسیان، مالیخولیااور جنون وغیرہ تو ان بیماریوں سے عقل کی کارگکردگی کم یا فاسد ہو جاتی ہے۔ نیز اگر دماغ پر کوئی چوٹ لگ جائے تو اس سے بھی عقل متاثر ہوتی ہے۔ بعض اوقات دماغ کی چوٹ کی وجہ سے انسان کی یادداشت ختم ہو جاتی ہے۔ بعض دفعہ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کم یا ختم ہو جاتی ہے۔ یہ تمام چیزیں بکثرت مشاہدات اور بداہت سے ثابت ہیں اور ان کا انکار کرنا بداہت کا انکار کرنا ہے اور سب سے واضح دلیل ہے کہ مغربی ممالک میں بعض لوگوں کا آپریشن سے دل بدل دیا گیا اگر عقل اور ادراک کا محل دل ہوتا تو دل بدل جانے سے پوری شخصیت بدل جانی چاہیے تھے جبکہ ان لوگوں نے بتایا کہ ان کے علوم اور معلومات، احساسات اور جذبات میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا اور اس سے ثابت ہوا کہ عقل کا محل دماغ ہے دل نہیں ہے۔

قرآن اور حدیث میں دل کی طرف عقل اور ادراک کی نسبت کرنے کی توجیہ

رہا یہ سوال کہ قرآن مجید میں عقل اور ادراک کی نسبت دل کی طرف کی گئی ہے دماغ کی طرف نہیں کی گئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن سائنس کی زبان میں نہیں بلکہ عرف اور ادب کی زبان میں کلام کرتا ہے اور روزمرہ کی گفتگو، عرف، محاورات اور ادبی زبان میں علم وادراک، سوچ و بچار، احساسات، جذبات، خیالات بلکہ تقریباً دماغ کے تمام افعال کو سینے اور دل کی طرف منسوب کیا جاتا ہے حتی کہ کسی چیز کے یاد ہونے کو کہتے ہیں کہ وہ تو میرے سینے میں موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے دل میں یہ خیال آیا، میرا دل اس کو نہیں مانتا، حالانکہ دل میں تو صرف خون پمپ کرنے کا ایک آلہ ہے۔ سائنسی ترقی کے اس دور میں بھی پڑھے لکھے ادیب اور سائنس دان اپنی گفتگو میں الفت اور محبت اور علم اور ادراک کی نسبت دل کی طرف کرتے ہیں دماغ کی طرف نہیں کرتے۔

قرآن مجید میں عام لوگوں کے عرف اور محاورے کے مطابق خطاب ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وانزل من السماء ماء اور اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا (بقرہ: 22) حالانکہ یہ پانی بخارات کی صورت میں زمین سے اوپر جاتا ہے اور بارش کی صورت میں نازل ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ عرف اور محاورے میں کہا جاتا ہے کہ آسمان سے بارش ہوئی، اس لیے اس کے مطابق خطاب فرمایا۔ نیز ارشاد ہے حتی اذا بلغ مغرب الشّمس وجدھا تغرب فی عین حمئۃ (الکہف: 86) یہاں تک کہ جب وہ سورج کے غروب ہونے کی جگہ پہنچے تو انھوں نے اس (سورج) کو سیاہ دلدل کے چشمہ میں غروب ہوتا ہوا دیکھا، حالانکہ عقل اور سائنس کے نزدیک سورج کبھی غروب نہیں ہوتا وہ ہمیشہ اپنے مدار میں گھومتا رہتا ہے اور یہ تو بالکل بدیہی ہے کہ سورج چشمہ میں غروب نہیں ہو سکتا لیکن عرف میں ایسا ہی کہتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں سورج پہاڑ کے پیچھے چھپ گیا اسی طرح عرف کے مطابق یہاں ارشاد فرمایا ہے۔

میرے شیخ علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ نے فرمایا قرآن مجید میں عام سطح کے لوگوں اور عرف کے مطابق خطاب کیا ہے، اور عقلاء اور سائنس دانوں کی اصطلاح کے مطابق خطاب نہیں کیا، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ عقل اور سائنس اور اعلیٰ درجہ کے دماغوں کے مطابق خطاب کرتا تو یہ عام لوگوں کے لیے غیر مانوس ہوتا اور وہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکتے اور یہ چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کے بھی خلاف تھی اور اس کی رحمت کے بھی خلاف تھی۔

مذکورہ حدیث میں صراحتاً عقل اور ادراک کی دل کی طرف نسبت نہیں کی گئی بلکہ انسانی دل کو اخلاق اور عادات کا مرکز قرار دیا ہے اگر دل میں اچھے خیالات ہوں تو انسان کے تمام اعضاء سے اچھے افعال کا ظہور ہوگا لیکن چونکہ اخلاق کا اچھا یا برا ہونا بھی انسانی فکر پر موقوف ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس حدیث فکر کا مرکز دل کو قرار دیا ہے اور ہمارے نزدیک یہ بھی عرف اور محاورے کے مطابق اطلاق مجازی ہے۔ اس بحث کو مکمل کرنے کے لیے ہم اس سلسلے میں ائمہ مجتہدین اور فقہاء اسلام کے نظریات پیش کریں گے۔ علامہ نووی کے حوالے سے ہم امام شافعی کا نظریہ بیان کر چکے ہیں کہ وہ دل کو عقل کا محل قرار دیتے ہیں اب ہم باقی ائمہ اور فقہاء کے نظریات پیش کریں گے۔ تاہم اس سے پہلے ہم عقل کی تعریف بیان کریں گے۔

عقل کی تعریف میں علماء کے اقوال

علامہ محمد فرید وجدی لکھتے ہیں: عقل انسان میں ادراک کرنے کی قوت ہے اور یہ روح کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے اور اس کا محل مخ (مغز) ہے، جیسا کہ ابصار روح کے خصائص میں سے ایک خاصہ ہے اور اس کا آلہ آنکھ ہے۔ (دائرۃ المعارف القرن العشرین ج 6، ص 522، مطبوعہ بیروت)

علامہ میر سید محمد شریف لکھتے ہیں: عقل وہ قوت ہے جس سے حقائق اشیاء کا ادراک ہوتا ہے ایک قول یہ ہے اس کا محل سر ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اس کا محل قلب ہے۔ (کتاب التعریفات ص 65، مطبوعہ ایران)

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں: عقل وہ قوت ہے جس میں علوم اور ادراکات کی صلاحیت ہے اور ایک قول یہ ہے کہ عقل ایک جوہر ہے جس سے غائبات کا بالواسطہ اور محسوسات کا بالمشاہدہ ادراک ہوتا ہے۔ (شرح العقائد ص 16، مطبوعہ دہلی)

علامہ زبیدی نے الشبیطی سے نقل کیا ہے کہ عقل اگر عرض ہے تو وہ نفس میں ایک ملکہ ہے جس کی وجہ سے نفس میں علوم اور ادراکات کی صلاحیت ہے، اور اگر عقل جوہر لطیف ہے جس کی وجہ سے غائبات کا بالواسطہ اور محسوسات کا بالشماہدہ ادراک ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو دماغ میں پیدا کیا ہے اور اس کا نور قلب میں ہے۔ (تاج العروس، ج 8، ص 26، مطبوعہ مصر)

علامہ زبیدی نے علامہ مجد الدین کی اس تعریف کو ذکر کیا ہے: عقل وہ قوت ہے جس سے اچھی اور بری چیزوں میں تمیز حاصل ہوتی ہے اور علامہ راغب اصفہانی کی یہ تعریف ذکر کی ہے: عقل وہ قوت ہے جس سے قبول علم کی صلاحیت ہے اور لکھا ہے کہ حق یہ ہے کہ عقل قلب یا دماغ میں ایک روحانی نور ہے جس سے نفس علوم بدیہیہ اور نظریہ کا ادراک کرتا ہے۔ (تاج العروس، ج 8، ص 25، مطبوعہ مصر)

علامہ شرتونی نے لکھا ہے عقل ایک روحانی نور ہے جس سے نفس علوم بدیہیہ اور نظریہ کا ادراک کرتا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ وہ ایک طبعی صفت ہے جس کی وجہ سے انسان میں فہم خطاب کی صلاحیت ہوتی ہے۔ (اقرب الموارد، ج 2، ص 812، مطبوعہ ایران)

محل عقل کے بارے میں ائمہ مذاہب کے اقوال

امام ابو حنیفہ نے فرمایا ہے عقل دماغ میں ہے۔ شمس الائمہ سرخسی حنفی لکھتے ہیں:

اگر کوئی شخص کسی کے سر پر ضرب لگائے جس سے اس کی عقل چلی جائے تو عقل کے جانے کے اعتبار سے اس پر دیت لازم آتی ہے اور اس میں سر پر ضرب لگانے کا جرمانہ بھی داخل ہے۔ (المبسوط ج 26، ص 99، مطبوعہ بیروت)

شمس الائمہ سرخسی کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک اگر سر پر ضرب لگانے سے مکمل عقل زائل ہو جائے تو پوری دیت لازم آئے گی، ورنہ اس کے حساب سے لازم آئے گی اور اس مسئلہ میں یہ دلیل ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک عقل کا محل دماغ ہے۔

امام مالک کے نزدیک بھی عقل کا محل دماغ ہے۔ علامہ سحنون بن سعید تنوخی مالکی لکھتے ہیں:

میں نے امام عبدالرحمٰن بن قاسم سے سوال کیا کہ کسی شخص کے سر پر عمداً ایسی ضرب لگائی گئی جس سے اس کی ہڈی ظاہر ہو گئی اور اس کی سماعت اور عقل چلی گئی تو اس مسئلہ میں امام مالک کا کیا قول ہے؟ امام ابن قاسم نے فرمایا اگر اس نے ایسی ضرب لگائی جس سے ہڈی ظاہر ہو گئی اور وہ دماغ تک پہنچ گئی تو موضحہ کا قصاص لیا جائے گا اور مامومہ (ضرب دماغ تک پہنچنے میں) اس کی عاقلہ دیت ادا کریں گے، اور اگر اس نے کسی کے سر پر ایسی ضرب لگائی جس سے اس کی ہڈی ظاہر ہو گئی اور اس کی سماعت اور عقل چلی گئی تو اس کے علاج کے بعد دیکھا جائے گا اگر وہ ٹھیک ہو گیا تو موضحہ میں ضارب سے قصاص لیا جائے گا پھر دیکھا جائے گا آیا اس ضرب سے مضروب کی سماعت اور عقل زائل ہو گئی ہے اگر علاج کے بعد وہ ٹھیک ہو جائے اور اس کی سماعت اور عقل زائل نہیں ہوئی ہو تو اس کے مال سے سماعت اور عقل کی دیت وصول نہیں کی جائے گی۔ (المدونۃ الکبری، ج 4، ص 487، مطبوعہ بیروت)

اس مسئلہ سے واضح ہو گیا کہ امام مالک کے نزدیک بھی عقل دماغ میں ہے۔ امام شافعی کے بارے میں ہم پہلے علامہ نووی سے نقل کر چکے ہیں کہ ان کے نزدیک عقل قلب میں ہے۔ امام رازی شافعی کی بھی یہی رائے ہے اور امام احمد بن حنبل کی رائے بھی یہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ حنبلی علماء نے عقل کا مستقر قلب قرار دیا ہے۔ علامہ عبدالرحمٰن بن الجوزی حنبلی لکھتے ہیں: "القلب قطعۃ من دم جامدۃ سوداء وھو مستکن فی الفواد وھو بیت النفس ومسکن العقل: قلب سیاہ جمے ہوئے خون کا ایک لوتھڑا ہے یہ دل کی کوٹھڑی ہے نفس کا گھر ہے اور عقل کا مسکن ہے" (زاد المسیر ج 1، ص 28، مطبوعہ بیروت)

کفار کا جانوروں سے زیادہ گم راہ ہونا

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے زیادہ گمراہ ہیں وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

انسان اور باقی حیوانات غذا حاصل کرنے کی قوت، نشو و نما کی قوت اور تولید کی قوت میں مشترک ہیں، نیز حواس ظاہرہ اور باطنہ میں بھی مشترک ہیں اور تخیل، توہم اور تذکر کے احوال میں بھی مشترک ہیں، انسان اور باقی حیوانات کے درمیان صرف قوت عقلیہ اور فکریہ کی وجہ سے امتیاز ہے جو قوت حق اور خیر کی طرف ہدایت دیتی ہے تاکہ حق اور خیر کے تقاضوں پر عمل کیا جائے۔ جب کفار نے قوت عقلیہ اور فکریہ سے کام لینے سے اعراض کیا اور اس کے توسط سے حق کی معرفت حاصل کرنے اور نیک کام کرنے سے روگردانی کی تو وہ جانوروں کی مانند ہو گئے بلکہ ان سے زیادہ گمراہ، کیونکہ حیوانات کو ان فضائل کے حصول پر کوئی قدرت نہیں ہے اور انسان کو ان کے حصول کی قدرت دی گئی ہے، اور جو لوگ قدرت کے باوجود ان عظیم فضائل کے حصول روگردانی کریں ان کا حال ان سے زیادہ خسیس ہو گا جو عجز کی وجہ سے ان فضائل کو حاصل نہیں کر سکتے۔ اور اس لیے بھی کہ جانور اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار ہیں اور کفار اپنے رب کے اطاعت گزار نہیں ہیں اور اس لیے بھی کہ جب جانوروں کو کوئی راہ دکھانے والا ہو تو وہ اس کی اطاعت کرتے ہیں اور راستہ سے نہیں بھٹکتے اور کفار کو انبیاء (علیہم السلام) سیدھا راستہ دکھاتے تھے لیکن وہ ان کی مخالفت کر کے گمراہی کو اختیار کرتے تھے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَلَقَدۡ ذَرَاۡنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيۡرًا مِّنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ ‌ۖ لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا يَفۡقَهُوۡنَ بِهَا وَلَهُمۡ اَعۡيُنٌ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ بِهَا وَلَهُمۡ اٰذَانٌ لَّا يَسۡمَعُوۡنَ بِهَا ‌ؕ اُولٰٓـئِكَ كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ ‌ؕ اُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡغٰفِلُوۡنَ ۝۱۷۹

لغۃ القرآن: [وَلَقَدْ ذَرَأْنَا : اور بیشک ہم نے پیدا کیا ہے] [لِجَهَنَّمَ : جہنم کے لیے] [كَثِيْرًا : بہتوں کو] [مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ : انسانوں اور جنوں میں سے] [لَهُمْ : ان کے لیے] [قُلُوْبٌ: دل ہیں] [لَّا يَفْقَهُوْنَ : (لیکن) وہ لوگ علم کا احاطہ نہیں کرتے ہیں] [بِهَا : ان سے] [وَلَهُمْ : اور ان کے لیے] [اَعْيُنٌ: آنکھیں] [لَّا يُبْصِرُوْنَ : (لیکن) وہ لوگ دیکھ کر سمجھتے نہیں ہیں] [بِهَا : ان سے] [وَلَهُمْ : اور ان کے لیے] [اٰذَانٌ: کان ہیں] [لَّا يَسْمَعُوْنَ : (لیکن) وہ لوگ سن کر سمجھتے نہیں ہیں] [بِهَا : ان سے] [اُولٰٓئِكَ : وہ لوگ] [كَالْاَنْعَامِ : مویشیوں کی مانند ہیں] [بَلْ : بلکہ] [هُمْ : وہ لوگ] [اَضَلُّ : زیادہ بدتر] [اُولٰٓئِكَ : یہی لوگ] [هُمُ الْغٰفِلُوْنَ : یہی غفلت کرنے والے]

ترجمہ: اور بیشک ہم نے جہنم کے لیے جنّوں اور انسانوں میں سے بہت سے (افراد) کو پیدا فرمایا وہ دل (و دماغ) رکھتے ہیں (مگر) وہ ان سے (حق کو) سمجھ نہیں سکتے اور وہ آنکھیں رکھتے ہیں (مگر) وہ ان سے (حق کو) دیکھ نہیں سکتے اور وہ کان (بھی) رکھتے ہیں (مگر) وہ ان سے (حق کو) سن نہیں سکتے، وہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ (ان سے بھی) زیادہ گمراہ، وہی لوگ ہی غافل ہیں

تشریح: بظاہر اس آیت میں اور ماخلقت الجن والانس الا لیعبدون میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ جنوں اور انسانوں کی کثرت کی تخلیق اس لیے کی گئی ہے کہ وہ جہنم کا ایندھن بنیں۔ اور دوسری آیت میں جن وانس کی تخلیق کی غایت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ عبادت کریں۔ امام رازی (رح) کا پسندیدہ جواب یہ ہے کہ اس آیت میں لجھنم پر جو لام ہے وہ لام عاقبت ہے یعنی ان کی تخلیق کا انجام یہ ہوا کہ انھوں نے کفر و نافرمانی سے اپنے آپ کو جہنم کا ایندھن بنا دیا اور ماخلقت الجن والانس الا لیعبدون میں لام غایت کا ہے یعنی ان کی پیدائش کی حقیقی غرض وغایت یہ تھی کہ یہ عبادت اور رضاء خداوندی حاصل کریں اور نعیم ابدی سے متمتع ہوں۔ اس لیے آیات میں تعارض نہ رہا۔ اور لام کا استعمال عاقبت کے لیے قرآن حکیم اور فصحاء عرب میں کثیر ہے۔ ارشاد باری ہے فالتقطہ آل فرعون لیکون لھم عدوا۔ یعنی موسیٰ (علیہ السلام) کو فرعون کے گھر والوں نے اٹھا لیا تاکہ وہ بڑا ہو کر ان کا دشمن بنے۔ یہاں بھی لام عاقبت کے لیے ہے غایت کے لیے نہیں کیونکہ اٹھانے والوں کا مقصد یہ نہ تھا کہ موسیٰ (علیہ السلام) بڑے ہو کر ان کی ہلاکت و بربادی کا باعث بنیں۔ بلکہ ان کا مقصد تو یہ تھا کہ جب یہ بڑا ہو جائے گا تو ہمارے کام آئے گا۔ لیکن ان کے اٹھانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے بڑے ہو کر فرعون کو تباہ و برباد کر دیا۔ اسی طرح عربی کا ایک شعر ہے ف

وللموت تغذو الوالدات سخالھا کما لخراب الدھر تبنی المساکن

یہاں بھی لام غایت کا نہیں بلکہ عاقبت کا ہے۔ کیونکہ مائیں بچے اس لیے تو نہیں جنتیں کہ وہ لقمہ اجل بنیں۔ اور محلات اور حویلیاں اس لیے تو تعمیر نہیں کی جاتیں کہ وہ ویران ہو جائیں۔ لیکن ہوتا ایسا ہی ہے۔ جو پیدا ہوتا ہے اسے موت کا پیالہ پینا ہی پڑتا ہے اور جو عمارت کھڑی کی جاتی ہے وہ ایک نہ ایک دن پیوند خاک ہو کر رہتی ہے۔

یہاں ان کے ہول ناک انجام کی وجہ بیان کی جارہی ہے کہ وہ جہنم کا ایندھن اس لیے بنائے گئے کہ دعوت حق کو سمجھنے، پیغام ہدایت کو سننے اور اس کے روشن شواہد کو دیکھنے کی جو صلاحیتیں انھیں عطافرمائی گئی تھیں انھوں نے انھیں بیکار بنا کر چھوڑ دیا۔ اور بے عقل چارپایوں کی طرح ہو کر رہ گئے۔ جس طرح ان ڈنگروں کی ساری قوتیں اور اعضاء کھانے پینے اور خواہشات نفسانی کی تکمیل کے لیے وقف ہیں اسی طرح ان انسان نما حیوانوں کا مقصد وحید یہی ہے کہ اچھا کھائیں۔ اور دوسری لذتوں سے لطف اندوز ہوں۔ زندگی کا کوئی اعلیٰ مقصد پیش نظر نہیں بلکہ بعض حالات میں تو یہ حیوانوں سے بھی بدتر ہیں کیونکہ وہ بے عقل و بے سمجھ ہونے کے باوجود اپنے مالک کی خدمت گزاری سے منہ نہیں موڑتے اور اس کے بلانے پر بھاگے چلے آتے ہیں۔ مگر انھیں تو یاد تک نہیں کہ ہمارا بھی کوئی خالق ومالک ہے اس لحاظ سے تو یہ حیوانوں سے بھی بدرجہا بدتر ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور جنوں کو آنکھ، کان اور دل و دماغ دیئے تاکہ وہ دیکھ سن کر غور وفکر سے کام لیں اور جنت کا راستہ تلاش کریں مگر ان میں سے اکثر نے اپنی ان خداداد صلاحیتوں کا غلط استعمال کرکے جہنم کا راستہ اختیار کرلیا۔ یہ لوگ صورت میں تو انسان ہیں مگر سیرت کے اعتبار سے حیوانوں کی طرح ہیں کہ ان کو سوائے کھانے پینے اور عیش و عشرت کے اور کوئی کام ہی نہیں اور اگر غور کیا جائے تو حیوان بھی اپنے نفس اور نقصان کا خیال رکھتے ہیں اور جلتی ہوئی آگ کے قرب نہیں جاتے مگر یہ عقل کے اندھے حیوانوں سے بھی بدتر ہیں جو دانستہ جہنم کی آگ کی طرف دوڑے چلے جارہے ہیں۔ ان کے اس منطقی انجام کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کی تخلیق جہنم کے لیے کی گئی حالانکہ حقیقت یہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو انھیں اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔ (قرآن: ۵۱: ۵۶) جس کا نتیجہ جنت ہے مگر انھوں نے اپنی غفلت کے باعث جہنم کا راستہ اختیار کیا یعنی نفسانی خواہشات اور دنیاوی معاملات میں تو وہ خوب غور وفکر کرتے ہیں مگر آخرت سے غافل ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "یہ لوگ دنیاوی زندگی کے ظاہر کو خوب جانتے ہیں مگر آخرت سے غافل ہیں"۔ (قرآن: ۳۰: ۷)

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں میں صرف عقل رکھی ہے جس کی وجہ سے وہ صرف فرمان برداری ہی کرتے ہیں اور حیوانوں میں صرف شہوت رکھی ہے اس لیے وہ عیاشی کرتے ہیں لیکن انسان میں عقل اور شہوت دونوں کو اکٹھا کردیا ہے، لہٰذا اگر اس کی عقل شہوت پر غالب آجائے تو وہ فرشتوں سے بہتر ہو جاتا ہے اور اگر اس کی شہوت عقل پر غالب آجائے تو وہ حیوانوں سے بدتر ہو جاتا ہے۔

فرشتوں سے بہتر ہے انسان بننا مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ (تفسیر امداد الکرم)

مسئلہ تقدیر کی حقیقت اور اس کی مثال:

یعنی اللہ تعالیٰ ازل سے جانتا ہے کہ بعض جنات اور انسان کفر وشرک میں مبتلا ہو کر ہمیشہ کے لیے جہنمی ہو جائیں گے خواہ وہ شروع میں مومن تھے مگر آخر کار وہ بلعم بن باعور کی طرح جہنمی ہو جائیں گے وہ گویا جہنم ہی کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ جیسے عربی شعر ہے:

اموالنا لذوی المیراث نجمعها

ودورنا لخراب الدهر نبنیها

ترجمہ: ہم اپنے اموال اپنے وارثوں کے لیے جمع کرتے ہیں اور زمانے کی بربادی کے لئے اپنے گھر بناتے ہیں۔ یعنی آخرکار ہمارے اموال کو ہمارے بار چلے جائیں گے اور زمانہ ہمارے گھروں کو تباہ کردے گا۔

یوں ہی اللہ رب العزت نے تو سارے انسان عبادت ہی کے لیے پیدا کئے مگر ان میں سے بعض اپنی کرتوتوں کے باعث جہنمی ہو گئے وہ گویا جہنم ہی کے لئے بنے تھے اور اللہ جانتا تھا کہ وہ جہنم ہی میں جائیں گے۔ اگر وہ نہ جانے تو ان کا جاہل ہونا لازم آئے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (رض) روایت کرتے ہیں ایک بار نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے پاس تشریف لائے تو آپ کے ہاتھ میں دو کتابیں تھیں۔ اپنے دائیں ہاتھ والی کتاب کے بارے میں فرمایا: یہ اللہ کی طرف سے کتاب ہے اس میں ہر جنتی اور اس کے باپ اور قبیلہ کا نام ہے آخر میں اہل جنت کی مجموعی تعداد لکھی ہے اور بائیں ہاتھ والی کتاب کے بارے میں فرمایا یہ یہ رب العالمین کی طرف سے کتاب ہے اس میں ہر دوزخی انسان اور اس کے باپ اور قبیلہ کا نام ہے اور آخر میں اہل جہنم کی مجموعی تعداد لکھی ہے۔ اس میں کوئی کمی بیشی نہ ہوگی۔ آخر میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فر: فریق فی الجنۃ وفریق فی

السعیر۔ (ترمذی کتاب القدر، باب 4، مسلم کتاب القدر حدیث 11) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ رب العزت کو روز ازل سے معلوم تھا کہ کون کفر پر مر کر ہمیشہ کے لیے جہنمی بنے گا ارکان ایمان پر مر کر ہمیشہ کے لئے جنتی ٹھہرے گا۔

اس کی مثال ایسے ہے کہ چند چور باہم مل کر مشورہ کر رہے تھے کہ فلاں گھر میں فلاں رات کو چوری کریں گے اور گھر والا بھی کسی طرح ان کی باتیں سن رہا تھا اور انھیں دیکھ رہا تھا مگر چور نہ جانتے تھے کہ صاحب خانہ ان کے مشورہ کو سن رہا اور انھیں دیکھ رہا ہے۔ صاحب خانہ نے انھیں اس کے بعد کسی نہ کسی طرح سمجھایا کہ چوری کرنا گناہ ہے، اس کی سزا دنیا میں ہاتھ کا کٹنا اور آخرت میں عذاب نار ہے۔ مگر وہ سب کچھ جاننے کے باوجود اپنے منصوبہ پر عمل پیرا رہے۔ چنانچہ مقررہ وقت پر وہ چوری کرنے آئے تو صاحب خانہ ان کی تاک میں تھا اس نے انھیں پکڑ لیا اور قرار واقعی سزا دی۔ کیونکہ وہ پہلے سے جانتا تھا کہ وہ چوری کرنے آئیں گے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ پہلے سے جانتا ہے کہ کون کس دن اور کس وقت کیا کرے گا اور اسی کا نام تقدیر ہے اور وہ کسی کو کسی برے کام سے زبردستی منع نہیں کرتا جو وہ کرنا چاہیے وہی کچھ کرنے کی طاقت دے دیتا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اپنے رسولوں اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سمجھاتا ہے کہ وہ کفر و شرک اور فسق و فجور سے باز آجائیں اس کی سزا عذاب نار ہے۔ مگر جب انسان تمام خدائی تنبیہات کے باوجود گناہ کر ڈالتا ہے تو اللہ اسے پکڑ لیتا ہے، ہاں اگر وہ توبہ کر لے تو اللہ توبہ قبول فرماتا ہے اور جو توبہ کرنے کی وجہ گناہ کرتے کرتے مر جائے اس نے اپنے لیے خود جہنم تیار کر لی۔

جو لوگ بلعم بن باعور کی طرح جہنم ہی کے لیے بنے ہوتے ہیں۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ دین حق کو نہیں سمجھنا چاہتے، ان کی آنکھیں ہیں مگر وہ راہ حق کو نہیں دیکھنا چاہتے، ان کے پاس کان ہیں مگر وہ آواز حق نہیں سننا چاہتے۔ انہی کے بارہ میں کہا گیا صمٌّ بکمٌ عمیٌ۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بدتر ہیں۔ کیسی حالت بلعم بن باعور کی تھی وہ ان کی ہے یعنی ان میں جانوروں کی صفات ہیں کیوں کہ جان بوجھ کر اللہ کی آیات کی تکذیب کرنے والوں میں کتے جیسی حرص، گدھ جیسی کمینگی، خنزیر جیسی ناپاکی اور سانپ جیسا زہر ہے، یا وہ اس لیے جانوروں کی طرح ہیں کہ جس طرح جانوروں کی زندگی کا کوئی ارفع مقصد نہیں۔ بس وہ کھاتے پیتے اور مر جاتے ہیں یہی حالت کفار کی ہے کہ کھاؤ پیو عیش کرو اور مر و اور جیسے جانور ہر اخلاقی حد سے آزاد ہیں وہ کسی پاک و ناپاک حلال و حرام اور حیا و بے حیائی سے واسطہ نہیں رکھتے یوں ہی کفار ہیں۔ آج یورپ و امریکا میں ہمیں کفار مرد و زن جانوروں کی طرح باہم آزادانہ اختلاط کرتے نظر آتے ہیں۔

بلکہ کفار جانوروں سے بدتر ہیں جانور بھی اپنے نفع و نقصان کا بے حد خیال رکھتے ہیں وہ جان بوجھ کر خود کو کسی ہلاکت میں نہیں ڈالتے مگر کفار نے جان بوجھ کر اللہ کی آیات سے انکار کر کے خود کو ہلاکت میں ڈالا اور جانوروں سے بدتر ٹھہرے۔ اسی طرح جانور مرنے کے بعد کسی عذاب میں گرفتار نہ ہوں گے جبکہ کفار ہمیشہ کے لئے آگ میں جلیں گے تو ان کی حالت جانوروں سے بہت ہی بدتر ہے۔ جانور اپنی قوتوں کا بھرپور استعمال کرتے ہیں، جیسے دوڑنا اڑنا اپنے پنجوں دانتوں اور دیگر اعضاء کے ذریعے اپنا رزق تلاش کرنا اور خود کو کسی تکلیف سے بچانا وغیرہ۔ جب کہ انسان کو اللہ نے عقل و شعور اور غور و فکر کی قوت دی ہے، جب کفار نے اس قوت کو معطل کر دیا اور جان بوجھ کر کفر و ذلالت کا راستہ اپنایا تو وہ جانوروں سے بدتر ٹھہرے۔ یاد رہے کہ جنھوں نے کفر تو نہ کیا مگر اغوائے نفس و شیطان سے گناہوں میں مبتلا ہوئے انھوں نے بھی اپنی عقل شعور کو کسی حد تک معطل کیا، اس لیے ان کی بھی سزا ہے مگر کفار سے کمتر۔ (تفسیر برہان القرآن)

کفار کو جانوروں سے بدتر فرمانے کی متعدد وجوہات ہیں:

(1)-- جانوروں میں اللہ تعالیٰ کی آیات سمجھنے، دیکھنے اور سننے کی قوت ہی نہیں لہذا اگر وہ نہ سمجھیں تو معذور ہیں لیکن کفار کے اعضا میں یہ قوت ہے، پھر بھی وہ اس سے کام نہیں لیتے لہذا وہ جانوروں سے بدتر ہیں۔ (2)

(2)-- چوپایہ بھی اپنے نفع کی طرف بڑھتا ہے اور ضَرر سے بچتا اور اس سے پیچھے ہٹتا ہے لیکن کافر جہنم کی راہ پر چل کر اپنا ضرر اختیار کرتا ہے تو اس سے بدتر ہوا۔ (3)

(3)-- جانور اپنے مالک کے کہنے پر چلتے ہیں جبکہ کافر نافرمان ہیں کہ اپنے مالک حقیقی خداوندِ قُدوس کے احکام کی مخالفت کرتے ہیں اس لیے جانوروں سے بدتر ہیں۔

امام عبداللہ بن احمد نسفی (رح) فرماتے ہیں "آدمی روحانی، شہوانی، سَماوی، ارضی ہے جب اس کی روح شہوت پر غالب ہو جاتی ہے تو ملائکہ سے فائق ہو جاتا ہے اور جب شہوات روح پر غلبہ پا جاتی ہیں تو زمین کے جانوروں سے بدتر ہو جاتا ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو بغیر کسی مقصد کے پیدا کیا ہے۔ قرآن کریم نے ایک سے زیادہ جگہ اس بات کا ذکر فرمایا ہے کہ لوگ کسی نہ کسی حد تک اس بات کے قائل تو ہیں کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے لیکن وہ اس بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ تم مکان رہنے کے لیے بناتے ہو ' زمین کی کاشت غلہ حاصل کرنے کے لیے کرتے ہو ' تجارت کی مشقتیں معاش پیدا کرنے کے لیے برداشت کرتے ہو ' شادی بیاہ بچے پیدا کرنے کے لیے کرتے ہو یعنی تمہارے ہر کام کا اور تمہاری ہر محنت کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے لیکن اس بات کی طرف تم کبھی دھیان نہیں دیتے کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی کائنات اور بطور خاص انسان کو بغیر کسی مقصد کے پیدا کیا ہے اور پھر اس کا اگر کوئی مقصد ہے اور یقینا ہے تو کیا اس کا پیدا کرنے والا اور اسے مقصد دینے والا کبھی اس سے جواب طلبی نہیں کرے گا۔ ارشاد فرمایا:

افحسبتم انما خلقنکم عبثاً وانکم الینالاترجعون

کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں فضول پیدا کیا ہے اور تم (جواب دہی) کے لیے ہمارے پاس لوٹائے نہیں جاؤ گے۔

حقیقت یہ ہے جسے اس آیت میں واشگاف کیا جارہا ہے کہ انسان اپنے حواس سے بھی کام لیتا ہے اور اپنی عقل سے بھی لیکن اس کا یہ کام لینا حیوانیت سے آگے نہیں بڑھتا۔ اللہ تعالیٰ نے تمام حیوانات کو زندگی گزارنے کا طریقہ بھی سکھایا اور اس کے اسباب بھی عطا فرمائے۔ حشرات الارض سے لے کر جنگل کے بڑے بڑے جانوروں تک کوئی جانور ایسا نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے یہ نہ سکھایا ہو کہ اس نے بچے کس طرح پیدا کرنے ہیں، پھر بچے کس طرح پالنے ہیں، ضروریات زندگی کہاں سے مہیا کرنی ہیں، اپنا گھر کیسے بنانا ہے، موسم کی شدت سے کیسے بچنا ہے ' حشرات الارض کو اس نے رینگنا سکھایا ہے تو اسی کے مطابق ان کو ماحول بھی دیا ہے۔ پرندے اس نے فضاء میں بلند کیے ہیں تو انھیں اڑنا بھی سکھایا ہے ' مچھلیوں کو پانی میں رکھا ہے تو انھیں تیرنا بھی سکھایا ہے ' پرندے بھی اپنا آشیانہ بنا کر رہتے ہیں اور جنگل کے درندے بھی اپنے بھٹ یا اپنے کچھار میں رہتے ہیں یعنی ضروریات زندگی کے لیے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ ہر طرح کے جانور اور ہر طرح کے حیوان کو اس کی ضروری راہنمائی دے دی گئی ہے اور اس کے اسباب مہیا کر دیئے گئے ہیں اور انھیں ضروریات کو ان کے لیے مقاصد زندگی بنا دیا گیا ہے۔ اس لیے انھیں مقاصد کے حصول اور انھیں کی بجاآوری میں وہ پوری زندگی صرف کر دیتے ہیں۔ انسان کو اللہ نے انسانی شرف دے کر ان سے مختلف ہدایت عطا فرمائی تھی اسے بتایا گیا تھا کہ تیرے اندر ایک تو حیوانی زندگی ہے اس کے لیے تو تم باقی حیوانوں کی طرح اپنے حواس سے کام لے کر انھیں حاصل کرنے کی کوشش کرو گے لیکن ساتھ ساتھ تمہیں چونکہ عقل بھی دی گئی ہے اس لیے عقل کے ذریعے تم ان کے معیار کو یقینا بہتر بناؤ گے۔ وہ اگر کچا گوشت ' کچی سبزی ' کچا پھل اور گھاس پھونس کھا کر گزارا کریں گے تو تم انھیں چیزوں کو بہتر شکل وصورت دے کر اور حسب حال بنا کر اپنی ضرورتیں پوری کرنے کی کوشش کرو گے۔ وہ اگر کسی بل کو اپنی رہائش گاہ بنائیں گے یا کسی بھٹ میں گزارا کریں گے یا تنکوں کا آشیانہ بنالیں گے تو تم اپنے رہنے کے لیے بڑی بڑی بلڈنگیں اٹھاؤ گے۔ انھیں اگر پر دیئے گئے ہیں اڑنے کے لیے اور تیرنے کے لیے تو تم اپنی عقل کی مدد سے ان سے بہتر اڑ بھی سکو گے اور تیر بھی سکو گے۔ انھیں اگر دوڑنے کی ہمت تم سے زیادہ عطا کی گئی ہے تو تم ان سے تیز رفتار گاڑیاں ایجاد کرو گے لیکن یہ ساری وہی حیوانی ضرورتیں ہیں جنھیں حیوان اپنی سطح پر اپنے احوال کے مطابق بروئے کار لاتا ہے اور انسان انھیں بہتر سے بہتر صورت میں وجود دیتا ہے لیکن بنیادی خصوصیات میں دونوں میں کوئی فرق نہیں اب اگر انھیں ضروریات کا حصول حیوانوں کی طرح انسان کی پوری زندگی پر غالب آجائے وہ یہ سمجھے کہ میں علم اس لیے حاصل کر رہا ہوں تاکہ میں نوکری یا کاروبار کروں اور یہ نوکری یا کاروبار اس لیے کروں گا تاکہ اپنی حیوانی ضرورتوں کو بہتر سے بہتر طریقے سے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں میرے پاس ایک خوبصورت گاڑی ' خوبصورت کوٹھی اور اشیائے خورد و نوش کی بہتات اور دولت کی ریل پیل رہنی چاہیے تاکہ مجھے زندگی کی کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ تو سوال یہ ہے کہ آپ اس کو معیار کے اعتبار سے جو بھی نام دے دیں حقیقت میں تو یہ وہی چیزیں ہیں جو حیوانی ضرورتوں سے تعلق رکھتی ہیں اگر انسان کی ساری زندگی کا یہی چیزیں احاطہ کر لیتی ہیں تو یہ اس کی حیوانی زندگی کی معراج ہوئی انسانی زندگی کہاں ہوئی؟ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان ماشاء اللہ بہت اچھے حیوان بن گئے ہیں کوئی آدمی جتنا زیادہ پڑھا لکھا ہے کہہ لیجیے کہ وہ اتنا اچھا حیوان ہے۔

اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا

کیا کہوں احباب کیا کار نمایاں کر گئے

بی۔ اے کیا نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

ایک دفعہ ایک مغربی دانشور نے ایک مشرقی مفکر سے بڑے فخر کے ساتھ اپنی ایجادات اور کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ دیکھو ہم نے ایسے ایسے جہاز بنائے ہیں جو ایک گھنٹے میں ہزاروں میل اڑ سکتے ہیں، ہم نے ایسی کاریں ایجاد کی ہیں جو ایک گھنٹے میں کئی سو میل سفر کر سکتی ہیں، ہم نے ایسے کیمرے ایجاد کیے ہیں جو سمندر کے نیچے تک کی تصویریں لے سکتے ہیں، اپنی محیر العقول کامیابیوں کا ذکر کرتا رہا اور مشرقی مفکر خاموشی سے سنتا رہا بالآخر اس مفکر نے کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو کہ تم نے پرندوں سے بہتر اڑنا سیکھ لیا 'تم نے درندوں سے تیز دوڑنا سیکھ لیا 'تم مچھلیوں سے بہتر پانی میں تیرنے لگے ہو 'لیکن افسوس تمہیں انسانوں کی طرح چلنا نہ آیا۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ ان لوگوں کی زندگی کا اصل حادثہ یہ ہے کہ اللہ نے ان کو جتنی خصوصیات عطا فرمائی ہیں ان سے انھوں سے صرف یہ کام لیا ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ انعام کی طرح ہو گئے ہیں یعنی جو زندگی کا رویہ دنیا بھر کے حیوانوں کا ہے وہی ان کا ہے۔ وہ ضروریات زندگی کے حصول کے لیے پوری زندگی صرف کر دیتے ہیں کیونکہ وہ اسی کو زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں چنانچہ ان کا ہدف بھی اس سے مختلف نہیں۔ کسی ان پڑھ یا پڑھے لکھے سے بات کرکے دیکھ لیجیے وہ زندگی کی ضروریات حاصل کرنے کے لیے جس طریقے کو اپنا چکا ہے اس سے ہٹ کر کسی اور کام کے لیے اس کے پاس وقت نہیں حیوان تو پھر پیٹ بھر کر آرام سے سوتا ہے اور ایک آشیانہ بنا کر اسے دوسرے کی کبھی ہوس نہیں ہوتی لیکن انسان ایک مکان پر کبھی قانع نہیں ہوتا وہ ہر سال ایک نئی کوٹھی بنانا چاہتا ہے۔ اس کی ضرورتوں کے لیے ایک کارخانہ کافی نہیں وہ دس کارخانے لگا کر بھی کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ بہتر سے بہتر گاڑی مل جاتی ہے تو تب بھی لمبی گاڑی کے حصول یا ماڈل بدلنے کے لیے بے چین رہتا ہے یعنی جو قناعت اور اطمینان حیوانوں کو میسر ہے انسان اس سے بھی تہی دامن ہے۔ البتہ جس طرح حیوان اپنی ضروریات کے لیے دوسروں کے نقصان کی کبھی پروا نہیں کرتا اگر اس کے پاس اپنا بھٹ نہیں تو اپنے سے کمزور جانور کے بھٹ پر قبضہ کرلیتا ہے 'اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کسی چھوٹے جانور کی جان لے لیتا ہے۔ انسان اس معاملے میں بھی حیوان سے بھی آگے ہے کہ وہ تو کسی ایک بھٹ پر قبضہ کرتا ہے لیکن اسے آبادیاں بھی کھنڈر بنانا پڑیں تو دریغ نہیں ہوتا 'وہ تو پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ایک جانور کی جان لیتا ہے یہ تیل کے کنوؤں اور منڈیوں پر قبضہ کرنے کے لیے ملکوں کو تباہ کر دیتا ہے اور کبھی اسے ملال نہیں ہوتا۔ اس لیے ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ یہ لوگ جو دل دماغ اور حواس سے ٹھیک طرح سے کام نہیں لیتے یہ حیوانات جیسے نہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔ ان کا ظلم کہیں نہ کہیں جا کر رک جاتا ہے یہ بستیاں اجاڑ کر بھی نہیں رکتے وہ کبھی فوجیں بنا کر ملکوں پر یلغار نہیں کرتے ان کے اپنے نوکیلے پنجے ان کی درندگی کے لیے کافی ہیں لیکن انسان کی ٹیکنالوجی انسانی خدمت کے لیے کم 'انسانی تباہی کے لیے زیادہ استعمال ہوتی ہے۔ وجہ اس کی ظاہر ہے کہ انسانوں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ کیا قدرت نے ہمیں زندگی اور زندگی کی نعمتیں دے کر بے مقصد اس زمین پر بھیجا ہے؟ اور اگر اس نے کوئی مقصد دیا ہے تو آخر وہ کیا ہے؟ اس کے جاننے کا ذریعہ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ صرف اللہ کے نبی ہیں ان پر ایمان لا کر اور ان کی راہنمائی کو قبول کرکے حقیقی زندگی کا شعور حاصل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ چونکہ مقصد زندگی سے بالکل بے بہرہ اور بے خبر ہیں اور اسی پر انھیں اصرار بھی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ اللہ نے تو ان کو دل اور حواس عطا فرمائے تھے تاکہ وہ اس کے صحیح استعمال سے اپنی آخرت بنالیں لیکن انھوں نے آنکھوں سے صرف وہ کچھ دیکھا جو ان کی خواہشات کے لیے ضروری تھا اور کانوں سے صرف وہ سنا جن سے انھیں لذت گناہ میں مدد مل سکتی ہے اور دل سے صرف وہ باتیں سمجھنے کی کوشش کی جن کا تعلق ان کی دنیا سے تھا تو جب کوئی فرد یا کوئی قوم اس طرح صرف دنیا تک اپنے آپ کو محدود رکھ کر آخرت سے لاتعلق ہو جاتی ہے تو قرآن کریم انھیں غافل قرار دیتا ہے اور یہ بھی خبر دیتا ہے کہ یہی لوگ ہیں جو اللہ کے قانون کی گرفت میں آجاتے ہیں چونکہ اس کا قانون یہ ہے کہ ہماری عطا کردہ قوتوں سے کام لے کر جو حقیقی زندگی تک نہیں پہنچے گا ہم اس کو جہنم کا ایندھن بنادیں گے۔ چنانچہ ان لوگوں نے بھی جب یہی جرم کیا تو اللہ نے اپنے قانون کے تحت جہنم ان کا مقدر بنادیا اور یہ آخرکار چونکہ جہنم میں جائیں گے اور اللہ کے ازلی اور ابدی علم کے مطابق ان کا جہنم میں جانا چونکہ پہلے سے اللہ کے علم میں ہے اس لیے فرمادیا کہ ہم نے بہت سے جنوں اور انسانوں کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے۔ لیکن اس کے بعد ان کی علامتیں بھی بیان فرمادیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے ان کرتوتوں کے باعث جہنم میں جائیں گے نہ کہ ہمارے پیدا کرنے کی وجہ سے، کیونکہ ہم نے تو انھیں باقی انسانوں کی طرح یہ تمام صلاحیتیں دے کر پیدا کیا تھا وہ اگر چاہتے تو ان سے کام لے کر اپنے آپ کو جنت کا وارث بنا سکتے تھے۔ (تفسیر روح القرآن)

آیت مبارکہ: وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۠ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآىِٕهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○۱۸۰

لغۃ القرآن: وَلِلّٰهِ : اور اللہ کے لیے ہی ہیں] [الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى: تمام خوبصورت نام] [فَادْعُوْهُ : تو تم پکارو اس کو] [بِهَا ۠: ان سے] [وَذَرُوا : اور چھوڑ دو] [الَّذِيْنَ : ان کو جو] [يُلْحِدُوْنَ : کجروی اختیار کرتے ہیں] [فِيْٓ اَسْمَآىِٕهٖ: اس کے ناموں میں] [سَيُجْزَوْنَ : ان کو بدلہ دیا جائے گا] [مَا كَانُوْا : جو وہ تھے] [يَعْمَلُوْنَ : عمل کرتے]

ترجمہ: اور اللہ ہی کے لیے اچھے اچھے نام ہیں، سو اسے ان ناموں سے پکارا کرو اور ایسے لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں حق سے انحراف کرتے ہیں، عنقریب انھیں ان (اعمالِ بد) کی سزا دی جائے گی جن کا وہ ارتکاب کرتے ہیں

تشریح: آیات سابقہ سے ارتباط

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ بہت سے جنات اور انسانوں کو اللہ تعالی نے دوزخ کے لیے پیدا کیا اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ وہ اللہ کی یاد سے غافل ہیں، اور اس آیت میں فرمایا اور سب سے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں تو ان ہی ناموں سے اس کو پکارو، اس میں اس پر تنبیہ فرمائی ہے کہ غفلت اور عذاب جہنم سے نجات کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کا ذکر کرو اور اس کو یاد کرو، اور اصحاب ذوق اور ارباب مشاہدہ کا وجدان یہ ہے کہ دل جب اللہ کی یاد سے غافل ہو اور دنیا اور اس کی دلچسپیوں اور رنگینیوں کی طرف متوجہ اور راغب ہو تو وہ حرص کی آگ اور زمہریر کے بعد اور حجاب میں واقع ہو جاتا ہے اور جب دل میں اللہ کی یاد اور اس کی معرفت ہوتی ہے تو وہ آفتوں اور مصیبتوں کی آگ اور ناکامی اور نامرادی پر حسرتوں کے عذاب سے نجات حاصل کرلیتا ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

اب ذکر الٰہی کی ترغیب اور اس کا طریقہ بتایا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان قدوسیت اور سبوحیت پر دلالت کرنے والے بڑے پیارے پیارے اور معنی خیز نام ہیں۔ جب تم اللہ تعالیٰ کو یاد کرو تو ان پیارے ناموں سے یاد کرو۔ اپنی طرف سے اس کے لیے نئے نئے نام نہ گھڑو۔ کیونکہ تم اس کی رفعت شان کو نہیں پہچان سکتے۔ مبادا تمہاری زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکل جائے جو اس کی شان خداوندی کے شایان نہ ہو۔ اور پھر تمہیں الٹا لینے کے دینے پڑ جائیں۔

لغت میں الحاد کا معنی ہے سیدھی راہ سے منہ موڑنا موتی الالحاد فی اللغۃ المیل عن القصد قال ابن السکیت الملحد : العادل عن الحق المدخل فیہ مالیس منہ (خبیر) اور اللہ تعالیٰ کے ناموں میں کجروی اختیار کرنے کا یہ مطلب ہے کہ ان کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر پر کیا جائے جیسے مسیلمہ کذاب کے پیروکار اس کو رحمٰن یمامۃ کہا کرتے تھے۔ یا بت پرستوں نے اپنے بتوں کے نام اللہ تعالیٰ کے اسماء سے مشتق کرکے رکھے ہوئے تھے۔ جیسے الٰہ سے لات، عزیز سے عزیٰ اور منان سے منات وغیرہا یا اللہ تعالیٰ کے لیے ایسے اسماء تجویز کرنا جو اس کی شان عالی کے لائق نہیں یا اسماء الٰہیہ کو سحر وغیرہ کے لیے استعمال کرنا۔ یہ سب طریقے الحاد کے ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

اللہ تعالیٰ ایک ہے اور اس کا ذاتی نام بھی ایک ہے یعنی "اللہ "اس کی صفات بہت زیادہ ہیں اس لیے اس کے صفاتی نام بھی بہت زیادہ ہیں، مثلاً رحمٰن، رحیم، رازق، خالص وغیرہ جن کا ذکر قرآن وسنت میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات سب سے اکمل اور اعلیٰ ہیں اور ان صفات کی ترجمانی کرنے والے اسمائے گرامی میں سب سے اچھے اور اعلیٰ ہیں، لہٰذا جب تم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو یا اس سے دعا کرو تو موقع کی مناسبت سے اسمائے حسنیٰ میں سے انتخاب کرو اور اپنی طرف سے کوئی ایسا نام پیدا نہ کرو جو اس کے شایان شان نہ ہو، اور جو لوگ اس کے اسمائے گرامی میں کج روی کرتے ہیں تم ان سے کنارہ کشی کرو۔ وہ جیسا کریں گے ویسا بھگتیں گے۔

(تفسیر امداد الکرم)

حضرت مقاتل نے روایت کیا ہے کہ صحابہ اکرام دعاؤں میں اللہ رب العزت کو اس کے مختلف ناموں سے پکارتے تھے کفار مکہ نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے ساتھی سمجھتے ہیں کہ وہ ایک خدا کی عبادت کرتے ہیں مگر وہ تو کئی خداؤں کو پکارتے ہیں کبھی اللہ کو کبھی رحمان کو کبھی رحیم کو۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری (بغوی، خازن، مظہری، وغیرہم) یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سب اچھے نام اللہ کے ہیں تم ان ناموں میں سے جس کے ساتھ چاہو اسے پکارو۔ سب ناموں کا مصداق ایک ہی ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ کے ننانوے نام ہیں جس نے ان کا احاطہ کرلیا (انہیں یاد کرلیا اور اپنے اخلاق ان کے مطابق بنالیے) وہ جنت میں جائے گا۔ " (بخاری کتاب التوحید باب 12) دوسری حدیث میں وہ ننانوے نام مذکور ہیں مگر اللہ کے نام 99 میں منحصر نہیں ہے بلکہ ان 99 کی خاص تاثیر ہے اس لئے ان کا خصوصی ذکر کیا گیا۔ قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ کے دیگر اسماء الحسنٰی بھی مذکور ہیں جیسے الالہ، الرب، الشاکر، المضل، المبین۔ یاد رہے! اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنٰی میں اپنی طرف سے اضافہ جائز نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الحاد یہ ہے کہ اس کے نام بگاڑ کر بتوں کے لیے استعمال کرنا جیسے کفار مکہ نے اللہ کو بگاڑ کر اس کی تانیث اللات اور الاعز کو بگاڑ کر اس کی تانیث العزی بنالی تھی اور یہ اپنے بتوں کے نام رکھے تھے۔ یوں ہی بتوں اور جھوٹے خداؤں کے نام اللہ کے لیے استعمال کرنا جیسے اسے رام، کرشنا اور عیسائیوں کی طرح باپ کہہ کر پکارنا اور اللہ کو ایسی صفات سے پکارنا جس سے اس کی اہانت کا پہلو نکلے یہ سب اس کے ناموں میں الحاد ہے۔ جیسے ومکروا ومکر اللہ سے استدلال کرکے اسے ماکر اور خادع کہنا۔ بعض مسلمان جہالت کے سبب عبدالرزاق نام والے شخص کو رضاق اور عبدالخالق والے کو خالق کہہ کر پکارتے ہیں بلکہ عبدالرحمٰن کو رحمان بھی کہتے ہیں یہ بھی اللہ کے ناموں میں الحاد سے مشابہت ہے، یعنی غیر اللہ کو اللہ کے نام دے دیے گئے، مگر چونکہ ہے ایسا جہالت کے سبب ہے اس لیے اس پہ کفر یا ضلالۃ کا حکم نہیں لگایا جائے گا، تاہم اسے گناہ کے زمرہ میں رکھا جائے گا۔ (تفسیر برہان القرآن)

اسماءِ حُسنٰی کے فضائل:

اَحادیث میں اسماء حسنیٰ کے بہت فضائل بیان کئے گئے ہیں، ترغیب کے لیے دو احادیث درج ذیل ہیں:

(1)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "بیشک اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں یعنی ایک کم سو، جس نے انھیں یاد کرلیا وہ جنت میں داخل ہوا۔ (2)

حضرت علامہ یحییٰ بن شرف نووی (رح) فرماتے ہیں "علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اسمائے الٰہیہ ننانوے میں مُنْحَصِر نہیں ہیں، حدیث کا مقصود صرف یہ ہے کہ اتنے ناموں کے یاد کرنے سے انسان جنتی ہو جاتا ہے۔ (3)

(2)۔۔ ایک روایت میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جس نے ان کے ذریعے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو قبول فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء:

حدیث پاک میں اللہ تعالیٰ کے یہ ننانوے اسماء بیان کئے گئے ہیں: "ہُوَاللہُ الَّذِی لَا اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ الْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُہَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ الْغَفَّارُ الْقَہَّارُ الْوَہَّابُ الرَّزَّاقُ الْفَتَّاحُ الْعَلِیْمُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الْخَافِضُ الرَّافِعُ الْمُعِزُّ الْمُذِلُّ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ الْحَکَمُ الْعَدْلُ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ الْحَلِیْمُ الْعَظِیْمُ الْغَفُوْرُ الشَّکُوْرُ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ الْحَفِیْظُ الْمُقِیْتُ الْحَسِیْبُ الْجَلِیْلُ الْکَرِیْمُ الرَّقِیْبُ الْمُجِیْبُ الْوَاسِعُ الْحَکِیْمُ الْوَدُوْدُ الْمَجِیْدُ الْبَاعِثُ الشَّہِیْدُ الْحَقُّ الْوَکِیْلُ الْقَوِیُّ الْمَتِیْنُ الْوَلِیُّ الْحَمِیْدُ الْمُحْصِی الْمُبْدِئُ الْمُعِیْدُ الْمُحْیِی الْمُمِیْتُ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ الْوَاجِدُ الْمَاجِدُ الْوَاحِدُ الصَّمَدُ الْقَادِرُ الْمُقْتَدِرُ الْمُقَدِّمُ الْمُؤَخِّرُ الْاَوَّلُ الْاٰخِرُ الظَّاہِرُ الْبَاطِنُ الْوَالِی الْمُتَعَالِی الْبَرُّ التَّوَّابُ الْمُنْتَقِمُ الْعَفُوُّ الرَّءُوْفُ مَالِکُ الْمُلْکِ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ الْمُقْسِطُ الْجَامِعُ الْغَنِیُّ الْمُغْنِی الْمَانِعُ الضَّارُّ النَّافِعُ النُّوْرُ الْہَادِی الْبَدِیْعُ الْبَاقِی الْوَارِثُ الرَّشِیْدُ الصَّبُوْرُ " (1)

اسماءِ حسنیٰ پڑھ کر دعا مانگنے کا بہترین طریقہ:

اس موقع پر اسمائے باری تعالیٰ پڑھ کر دعا مانگنے کا ایک بہترین طریقہ حاضر خدمت ہے "بزرگ فرماتے ہیں: جو شخص اس طرح دعا مانگے کہ پہلے کہے "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ یَارَحْمٰنُ، یَارَحِیْمُ" پھر "رحیم" کے بعد سے تمام اسمائے مبارکہ حرف ندا کے ساتھ پڑھے (یعنی یَامَلِکُ، یَاقُدُّوْسُ، یَاسَلَامُ۔۔ یونہی آخر تک) جب اسماء مکمل

ہو جائیں تو یوں کہے "اَنۡ تُصَلِّیَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ وَاَنۡ تَرۡزُقَنِیۡ وَجَمِیۡعَ مَنۡ یَّتَعَلَّقُ بِیۡ بِتَمَامِ نِعۡمَتِکَ وَدَوَامِ عَافِیَتِکَ یَا اَرۡحَمَ الرَّاحِمِیۡنَ" پھر دعا مانگے، ان شاء اللہ عَزَّوَجَلَّ مراد پوری ہو گی اور کبھی دعا رد نہ ہو گی۔ (2)

{ اَلَّذِیۡنَ یُلۡحِدُوۡنَ فِیۡ اَسۡمَآئِہٖ : جو اس کے ناموں میں حق سے دور ہوتے ہیں۔} اللہ تعالیٰ کے ناموں میں حق و استقامت سے دور ہونا کئی طرح سے ہے ایک تو یہ ہے کہ اس کے ناموں کو کچھ بگاڑ کر غیروں پر اطلاق کرنا جیسا کہ مشرکین نے اِلٰہ کا "لات" اور عزیز کا "عُزّٰی" اور منان کا "مَنات" کرکے اپنے بتوں کے نام رکھے تھے، یہ ناموں میں حق سے تجاوز اور ناجائز ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ایسا نام مقرر کیا جائے جو قرآن و حدیث میں نہ آیا ہو یہ بھی جائز نہیں جیسے کہ اللہ تعالیٰ کو سخی کہنا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اسماء توقیفیہ ہیں۔ تیسرا یہ کہ حسنِ ادب کی رعایت نہ کرنا۔ چوتھا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی ایسا نام مقرر کیا جائے جس کے معنی فاسد ہوں یہ بھی بہت سخت ناجائز ہے، جیسے کہ لفظ رام اور پرماتما وغیرہ۔ پانچواں یہ کہ ایسے اسماء کا اطلاق کرنا جن کے معنی معلوم نہیں ہیں اور یہ نہیں جانا جاسکتا کہ وہ جلال الٰہی کے لائق ہیں یا نہیں۔ (1)

اِلْحاد فی الاسماء کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ غیر اللہ پر اللہ تعالیٰ کے ان ناموں کا اطلاق کیا جائے جو اللہ عَزَّوَجَلَّ کے ساتھ خاص ہیں۔ جیسے کسی کا نام رحمٰن، قدوس، خالق، قدیر رکھنا یا کہہ کر پکارنا، ہمارے زمانے میں یہ بلا بہت عام ہے کہ عبدالرحمٰن کو رحمٰن، عبدالخالق کو خالق اور عبدالقدیر کو قدیر وغیرہ کہہ کر پکارتے ہیں یہ حرام ہے، اس سے بچنا لازم ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنہ ہیں اور انسان اللہ تعالیٰ کو صرف ان ہی اسماء حسنہ کے ساتھ پکارے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء توقیفیہ ہیں نہ کہ اصطلاحیہ، لہٰذا اللہ تعالیٰ کو یا جواد کہنا جائز ہے اور یا سخی کہنا جائز نہیں ہے، اور اس کو یا عالم کہنا جائز ہے اور یا فقیہ کہنا جائز نہیں ہے۔ اور یا عاقل کہنا بھی جائز نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ہے یخادعون اللہ وھو خادعھم (النساء : 142) اور ومکروا ومکر اللہ (آل عمران : 54) لیکن دعا میں یا مخادع اور یا مکار کہنا جائز نہیں ہے کیونکہ افعال کے اطلاق سے مشتق کا اطلاق لازم نہیں آتا، اور یہ کہنا جائز ہے کہ اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور ہر چیز کا رب ہے لیکن یہ کہنا جائز نہیں ہے یا خالق الخنزیر، یا خالق الخبائث۔

مقاتل (رح) نے بیان کیا کہ ایک صحابی نے نماز میں اللہ اور رحمٰن سے دعا کی تو ایک مشرک نے کہا (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے اصحاب یہ کہتے ہیں کہ ہم رب واحد کی پرستش کرتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ دو خداؤں کو پکارتے ہیں (یعنی اللہ اور رحمٰن کو) تب یہ آیت نازل ہوئی کہ اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو، ان اسماء میں سے جس نام کے ساتھ بھی پکارو اس کے اسماء حسنہ ہیں (حاشیہ محی الدین شیخ زادہ علی البیضاوی ج 2، ص 286، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

اسم مسمّٰی کا عین ہے یا غیر

علامہ وشتانی ابی مالکی لکھتے ہیں :

اشاعرہ کہتے ہیں کہ اسم مسمّٰی کا غیر ہے اور معتزلہ کہتے ہیں کہ اسم مسمّٰی کا عین ہے، اس کی تحقیق یہ ہے کہ اسم کا اطلاق کبھی کلمہ پر ہوتا ہے اور کبھی اسم کا اطلاق ذات اور مسمّٰی پر ہوتا ہے اور اس میں اختلاف ہے کہ حقیقی اطلاق کونسا ہے، اشاعرہ نے کہا کہ اسم کا اطلاق کلمہ پر حقیقت ہے اور مسمّٰی پر مجاز ہے اور معتزلہ کا قول اس کے برعکس ہے اور استاذ ابو منصور نے کہا کہ اسم دونوں میں مشترک ہے۔

اشاعرہ کے دلائل میں سے یہ ہے کہ جب کسی معین شخص کا نام پوچھا جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس شخص کا اسم کیا ہے؟ پھر جواب میں وہ کلمہ ذکر کیا جاتا ہے۔ جس سے وہ شخص دوسروں سے ممتاز ہو جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسم کی حقیقت وہ کلمہ ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ تمام امت کا اس پر اجماع ہے اور اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء ہیں سو اگر اسم مسمّٰی کا عین ہو تو متعدد خداؤں کا ہونا لازم آئے گا۔

معتزلہ کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے سبح اسم ربک الاعلی (الاعلی : 1) "اپنے رب اعلی کے نام کی تسبیح کیجیے" اور تسبیح اللہ کی ذات کی ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسم اس کی ذات کا عین ہے۔ بہر حال اس مسئلہ میں ہر فریق کے دلائل اور ان کے جوابات موجود ہیں۔ (اکمال اکمال المعلم ج 9، ص 73۔74، بیروت)

اللہ تعالیٰ کے اسماء کے توقیفی ہونے کی تحقیق

علامہ وشتانی ابی مالکی لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کے اسماء توقیفی ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر اسی اسم کا اطلاق جائز ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پر اطلاق کیا ہو یا اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس اسم کا اطلاق کیا ہو یا اس اسم کے اطلاق پر اجماع منعقد ہو چکا ہو۔ (مثلاً اللہ تعالیٰ پر خدا کا اطلاق کرنا) اور جس اسم کے اطلاق پر اذن شرعی ہو نہ ممانعت ہو اس میں اختلاف ہے۔ اس میں ایک قول توقف کا ہے اور ایک قول ممانعت کا ہے۔ علامہ ابن رشد نے اس قول کو امام اشعری اور امام مالک کی طرف منسوب کیا ہے۔ مقترح نے اس قول کو رد کر دیا ہے کیونکہ ممانعت حکم شرعی ہے اور بغیر دلیل سمعی کے ممانعت شرعی کا حکم صحیح نہیں ہے۔ مقترح نے کہا اگر اس لفظ سے کسی محال معنی کا وہم ہو تو پھر اس اسم کا اطلاق ناجائز ہے اور اگر کسی محال معنی کا وہم ہو تو پھر اس اسم کا اطلاق ناجائز ہے اور اگر کسی محال معنی کا وہم نہ ہو تو پھر اس قسم کا اطلاق جائز ہے۔ علامہ باقلانی نے کہا ہر وہ صفت جو اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہو اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر جائز ہے بشرطیکہ اس کی ممانعت پر اجماع نہ ہو۔ اس لیے سید اور حنان کا اطلاق جائز ہے اور عاقل اور فقیہ کا اطلاق ناجائز ہے۔ البتہ امام مالک نے سید اور حنان کے اطلاق سے منع کیا ہے۔ علامہ باقلانی نے کہا اللہ تعالیٰ نے جن افعال کے ساتھ خود کو موصوف کیا ہے ان کے اسماء کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر لازم نہیں ہے کیونکہ جن چیزوں کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے لیے محال ہے اور وہ قرآن میں مذکور ہیں تو ان کا جتنا اطلاق قرآن مجید میں آگیا ہے بس اتنا اطلاق جائز ہے اس سے زیادہ جائز نہیں ہے۔ مثلاً اللہ یستہزئ بہم۔ اس کی وجہ مستہزی کا اور سخر اللہ منہم، اس کی وجہ سے ساخر کا اطلاق جائز نہیں ہے اور متکلمین اللہ تعالیٰ پر صانع، واجب الوجود اور موثر کا اطلاق بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ (اکمال اکمال المعلم ج 9، ص 76 - 77، مطبوعہ بیروت)

حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی لکھتے ہیں: اسماء حسنیٰ میں اختلاف ہے، آیا یہ توقیفی ہیں یا نہیں۔ توقیفی کا مطلب یہ ہے کہ کتاب اور سنت کی نص کے علاوہ کسی اسم کا اللہ تعالیٰ پر اطلاق جائز نہ ہو۔ امام فخر الدین رازی نے یہ کہا کہ ہمارے اصحاب کا مشہور قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء توقیفی ہیں اور معتزلہ اور کرامیہ کا قول یہ ہے کہ جب کسی لفظ کی اللہ پر دلالت عقلاً صحیح ہو تو اس کا اطلاق جائز ہے۔ قاضی ابوبکر اور امام غزالی نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء توقیفی ہیں اور صفات توقیفی نہیں ہیں۔ (اس کے برخلاف جمہور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اسماء غیر توقیفی ہیں اور صفات توقیفی ہیں۔ سعیدی غفرلہ) امام غزالی کی دلیل یہ ہے کہ ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا وہ نام رکھیں جو آپ کے والد نے رکھا نہ رکھا نہ آپ نے خود رکھا۔ اسی طرح مخلوق میں سے کسی بھی بزرگ شخص کا نام ہم از خود نہیں رکھ سکتے اور جب مخلوق کا نام از خود رکھنا ممنوع ہے تو خالق کا نام از خود رکھنا بہ طریق اولیٰ منع ہونا چاہیے۔ اس پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کسی ایسے اسم یا صفت کا اطلاق جائز نہیں ہے جس سے نقص کا وہم ہو خواہ نص میں اس لفظ کا اطلاق ہو، اس لیے اللہ تعالیٰ کو ماہد، زارع اور فالق کہنا جائز نہیں ہے اگرچہ نص قرآن میں یہ الفاظ موجود ہیں۔ فنعم الماہدون (الذاریات: 48)۔ ام نحن الزارعون (الواقعہ: 64)۔ فالق الحب والنوی (الانعام: 95)

امام ابوالقاسم قشیری نے کہا کہ کتاب، سنت اور اجماع سے جن اسماء کا ثبوت ہو ان اسماء کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر جائز ہے اور جس اسم کا ان میں ثبوت نہ ہو تو اس کا اطلاق جائز نہیں ہے خواہ اس کا معنی صحیح ہو، اور ضابطہ یہ ہے کہ ہر وہ لفظ جس کے اطلاق کی شریعت میں ثبوت ہو عام ازیں کہ وہ مشتق ہو یا غیر مشتق ہو وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے۔ اور ہر وہ لفظ جس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف صحیح ہے، عام ازیں کہ اس میں تاویل ہو یا نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے اور اس پر اسم کا اطلاق بھی ہوتا ہے۔

امام رازی نے کہا کہ وہ الفاظ جو اللہ تعالیٰ کی صفات پر دلالت کرتے ہیں ان کی تین قسمیں ہیں: پہلی قسم کی تفصیل یہ ہے:

1۔ جن صفات کا اللہ تعالیٰ کے لیے ثبوت قطعی ہے ان کا اطلاق مفرد اور مضاف دونوں اعتبار سے صحیح ہے جیسے قادر، قاہر، یا فلاں پر قادر فلاں پر قاہر۔

2۔ جن صفات کا بہ طور مفرد اطلاق صحیح ہے اور بطور مضاف خاص شرائط کے ساتھ صحیح ہے۔ مثلاً خالق یا ہر چیز کا خالق کہنا صحی ہے لیکن بندر اور خنزیر کا خالق کہنا صحیح نہیں ہے۔

3۔ جن صفات کا بطور مضاف اطلاق صحیح ہے اور بہ طور مفرد صحیح نہیں ہے مثلاً منشی کہنا صحیح نہیں ہے اور منشی الخلق کہنا صحیح ہے۔

دوسری قسم وہ ہے کہ اگر شریعت میں اس کا سماع ثابت ہو تو اس اطلاق کیا جائے گا ورنہ نہیں، اور تیسرے قسم وہ ہے کہ شریعت میں اس کا بہ حیثیت افعال سماع ہے تو انہی کا اطلاق کیا جائے گا اور ان پر قیاس کر کے ان مشتقات کا اطلاق نہیں کیا جائے گا جیسے مکر اللہ اور یستہزئ بہم سو اللہ تعالیٰ پر ماکر اور مستہزئ کا اطلاق نہیں کیا جائے گا۔ (فتح الباری ج 11، ص 223۔224، مطبوعہ لاہور)

علامہ آلوسی حنفی لکھتے ہیں: خلاصہ بحث یہ ہے کہ علماء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ جن اسماء اور صفات کے اطلاق کا اذن شرعی ثابت ہے ان کا اللہ تعالیٰ کی ذات پر اطلاق جائز ہے اور جن کی ممانعت ثابت ہے ان کا اطلاق منع ہے، اور جن اسماء کا شریعت میں اذن ہو نہ ممانعت ہو ان کے اطلاق میں اختلاف ہے بشرطیکہ وہ ان اسماء میں سے نہ ہوں جو باقی لغات میں اللہ تعالیٰ کے لیے علم (نام) ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اسماء اعلام کا اطلاق کسی کے نزدیک محل نزاع نہیں ہے۔ نیز ان اسماء کا اطلاق نقص کا موہم نہ ہو بلکہ مدح کا مظہر ہو، سو ایسے اسماء کے اطلاق کو اہل حق نے منع کیا ہے اور جمہور معتزلہ نے جائز کہا ہے۔ قاضی ابوبکر کا اسی طرف میلان ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر خدا اور تنکری کا اطلق جائز ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے لہٰذا اس پر اجماع ہو گیا۔ لیکن یہ استدلال مردود ہے کیونکہ اگر اجماعت ثابت ہو تو وہ ذن شرعی کے ثبوت کے لیے کافی ہے اور بحث ان اسماء کے اطلاق میں ہے جن کے لیے اذن شرعی نہ ہو۔ (روح المعانی ج 9، ص 121، مطبوعہ بیروت)

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں: اگر یہ اعتراض ہو تو اللہ تعالیٰ پر موجود، واجب اور قدیم وغیرہا کا اطلاق کیسے صحیح ہو گا کیونکہ ان کا شریعت میں ثبوت نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا اطلاق اجماع سے ثابت ہے اور جماع بھی دلائل شرعیہ میں سے ہے (شرح العقائد ص 31، مطبوعہ کراچی)

علامہ میر سید شریف لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ کے اسماء توقیفی ہیں یعنی ان کا اللہ تعالیٰ پر اطلاق اذن شرعی پر موقوف ہے اور یہ بحث ان اسماء میں نہیں ہے جو لغات میں اللہ تعالیٰ کے لیے بہ طور علم (نام) وضع کیے گئے ہیں بلکہ بحث ان اسماء میں ہے جو صفات اور افعال سے ماخوذ ہیں۔ سو ان اسماء میں معتزلہ اور کرامیہ کا مذہب یہ ہے کہ جب عقل کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا کسی صفت سے متصف ہونا صحیح ہو تو اس کا اطلاق جائز ہے خواہ اس کا شرع میں ثبوت ہو یا نہ ہو۔ اور ہمارے اصحاب میں سے قاضی ابوبکر نے یہ کہا کہ جب کوئی لفظ ایسے معنی پر دلالت کرے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہو اور اس میں نقص کا وہم نہ ہو تو اس کا اطلاق جائز ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ پر عارف کا اطلاق جائز نہیں، کیونکہ لفظ معرفت سے غفلت کے بعد علم کا ارادہ بھی کیا جاتا ہے، اسی طرح فقیہ کا اطلاق بھی جائز نہیں کیونکہ فقیہ اس شخص کو کہتے ہیں جو متکلم کی غرض کو سمجھ لگے۔ اسی طرح عاقل کا اطلاق بھی جائز نہیں کیونکہ عاقل اس شخص کو کہتے ہیں جو غلط کام کرنے سے رکے، اور شیخ اور ان کے متبعین نے یہ کہا ہے کہ توقیف ضروری ہے اور یہی مختار ہے۔ (شرح المواقف ص 685، مطبوعہ ہند)

واضح رہے کہ علامہ میر سید شریف نے شیخ کے جس قول میں توقیف کو مختار کہا ہے اس کا تعلق ان اسماء سے ہے جو صفات اور افعال سے ماخوذ ہوں کیونکہ نزاع اور بحث انہی میں ہے۔ رہے وہ اسماء جو لغات میں اللہ تعالیٰ کے لیے اعلام ہیں تو ان کے متعلق علامہ میر سید شریف نے تصریح کر دی ہے کہ وہ محل نزاع سے خارج ہیں اور ان کے اطلاق کے جواز پر سب کا اتفاق ہے اس لیے اللہ تعالیٰ پر خدا کا اطلاق اجماع اور اتفاق سے ثابت ہے اور اس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء کی تفصیل

اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جس نے ان کو یاد کر لیا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ اس اسماء کی تفصیل جامع ترمذی میں ہے۔

امام ترمذی اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں ایک کم سو، جس نے ان کو گن لیا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو الرحمٰن الرحیم الملک القدوس السلام المومن المہیمن العزیز الجبار المتکبر الخالق البارئ المصور الغفار القہار الوھاب الرزاق الفتاح العلیم القابض الباسط الخافض الرافع المعز المزل السمیع البصیر الحکم العدل اللطیف الخبیر الحلیم العظیم الغفور الشکور العلی الکبیر الحفیظ المقیت الحسیب الجلیل الکریم الرقیب المجیب الواسع الحکیم الودود المجید الباعث الشہید الحق الوکیل القوی المتین الولی الحمید المحصی المبدئ المعید المحی الممیت الحہ القیوم الماجد الواجد الصمد القادر المقتدر المقدم المؤخر الاول الاخر الظاھر الباطن الوالی المتعالی البر التواب المنتقم العفو الرؤوف مالک الملک ذوالجلال والاکرام المقسط الجامع الغنی المغنی المانع الضار النافع النور الھادی البدیع الباقی الوارث الرشید الصبور۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: 3518)

علامہ نووی لکھتے ہیں:

علماء کا اتفاق ہے کہ اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کے اسماء کا حصر نہیں ہے اور اس حدیث کا مقصود یہ ہے کہ یہ وہ ننانوے نام ہیں جس نے ان ناموں کو گن لیا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے ایک اور حدیث میں یہ ہے میں تجھ سے ہر اسم کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں جس اسم کے ساتھ تو نے اپنے آپ کو موسوم کیا ہے یا جس اسم کو تو نے اپنے علم غیب میں مخصوص کر لیا ہے، حافظ ابو بکر بن العربی مالکی نے بعض علماء سے یہ نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک ہزار نام ہیں۔ ابن العربی نے کہا یہ بہت کم ہیں۔ ان اسماء کی تعیین کا ذکر جامع ترمذی اور دیگر کتب حدیث میں ہے۔ بعض اسماء میں اختلاف ہے ایک قول یہ ہے کہ ان کا تعین اسم اعظم اور لیلۃ القدر کی طرح مخفی ہے۔ (شرح مسلم ج 2، ص 342، مطبوعہ کراچی)

علامہ قرطبّی نے کہا کہ جس شخص نے صحت نیت کے ساتھ جس طرح بھی ان کلمات کو گن لیا، اللہ تعالیٰ کے کرم سے امید ہے کہ وہ اس کو جنت میں داخل کر دے گا۔ (فتح الباری ج 11، ص 225، مطبوعہ لاہور)

اسم اعظم کی تحقیق

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

امام ابو جعفر طبری، امام ابو الحسن الاشعری، امام ابو حاتم بن حبان، قاضی ابو بکر باقلانی وغیرہ نے اسم اعظم کا انکار کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کے بعض اسماء کو بعض دوسرے اسماء پر فضیلت دینا جائز نہیں ہے، اور امام مالک نے اللہ تعالیٰ کے کسی اسم کو اعظم کہنا مکروہ قرار دیا ہے اور جن احادیث میں اعظم کا ذکر ہے اس سے مراد عظیم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء عظیم ہیں۔ امام ابو جعفر طبری نے کہا میرے نزدیک اس سلسلہ میں تمام اقوال صحیح ہیں۔ کیونکہ کسی حدیث میں یہ نہیں ہے کہ فلاں اسم اعظم ہے اور کوئی اسم اس سے زیادہ اعظم نہیں ہے۔ امام ابن حبان نے کہا کسی اسم کے اعظم ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس اسم کے ساتھ دعا کرنے والے کو عظیم اجر ملے گا۔ امام جعفر صادق اور جنید وغیرہ نے یہ کہا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے جس اسم میں ڈوب کر دعا کرے وہی اسم اعظم ہے، اور بعض علماء نے یہ کہا کہ اسم اعظم کا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور اس نے مخلوق میں سے کسی شخص کو اس پر مطلع نہیں کیا۔

بعض علماء اسم اعظم کے ثبوت کے قائل ہیں اور اس کی تعیین میں ان کا اختلاف ہے اور اس مسئلہ میں کل چودہ قول ہیں:

1۔ امام فخر الدین رازی نے بعض اہل کشف سے نقل کیا کہ اسم اعظم "ھو" ہے۔

2۔ اسم اعظم "اللہ" ہے۔ کیونکہ یہی وہ اسم ہے جس کا اللہ کے غیر پر اطلاق نہیں ہوتا۔

3۔ اسم اعظم "اللہ الرحمٰن الرحیم" ہے۔ اس سلسلہ میں امام ابن ماجہ نے حضرت عائشہ سے ایک حدیث روایت کی ہے لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔

4۔ اسم اعظم "الرحمٰن الرحیم الحہ القیوم" ہے۔ کیونکہ امام ترمذی نے حضرت عائشہ (رض) سے روایت کیا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کا اسم اعظم ان دو آیتوں میں ہے والٰہکم الہ واحد لا الہ الا ھو الرحمٰن الرحیم اور سورۃ آل عمران کی ابتداء اللہ لا الہ الا ھو الحہ القیوم۔ اس حدیث کو امام ابو داؤد اور امام ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔

5۔ الحہ القیوم۔ کیونکہ امام ابن ماجہ نے حضرت ابوامامہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ اسم اعظم تین سورتوں میں ہے۔ بقرہ، آل عمران، اور طہٰ۔ حضرت ابوامامہ کہتے ہیں میں نے ان سورتوں میں اسم اعظم کو تلاش کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ "الحہ القیوم" ہے۔ امام فخر الدین رازی نے بھی اس کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور ربوبیت پر ان کی دلالت سب اسماء سے زیادہ ہے۔

6۔ "الحنان المنان بدیع السموات والارض ذوالجلال والاکرام الحہ القیوم" امام احمد اور امام حاکم نے اس کو حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ سنن ابو داؤد اور سنن نسائی میں اس کی اصل ہے اور امام ابن حبان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

7۔ "بدیع السموات والارض ذوالجلال والاکرام، اس کو امام ابو یعلی نے روایت کیا ہے۔

8۔ "ذوالجلال والاکرام" امام ترمذی نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے یاذالجلال والاکرم کہا تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس کی دعا قبول ہوگی۔

9 - " اللہ لا الہ ھوالاحد الصمد الذی لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوااحد " - امام ابو داود، امام ترمذی، امام ابن ماجہ، امام ابن حبان اور امام حاکم نے اس کو حضرت بریدہ (رض) سے روایت کیا۔ اسم اعظم کی روایت کے سلسلہ میں اس روایت کی سند سب سے زیادہ قوی ہے۔

10 - " رَبِّ رَبِّ " امام حاکم نے حضرت ابو درداء اور حضرت ابن عباس سے روایت کیا : اللہ کا اسم اکبر " رب رب " ہے اور امام ابن ابی الدنیا نے حضرت عائشہ (رض) سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جب بندہ رب رب کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " لبیک میرے بندے ! تو سوال کر تجھے دیا جائے گا "۔

11 - " لاالہ الاانت سبحانک انی کنت من الظلمین " امام مسلم اور امام نسائی نے حضرت فضالہ بن عبید (رض) سے مرفوعاً روایت کیا کہ جو مسلمان شخص ان کلمات کے ساتھ دعا کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی دعا ضرور قبول فرمائے گا۔

12 - " ھواللہ الذی لاالہ الاھو رب العرش العظیم " امام رازی نے نقل کیا ہے کہ امام زین العابدین نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ ان کو اسم اعظم کی تعلیم دے تو انھوں نے خوب میں یہ کلمات دیکھے۔

13 - اسم اعظم اسماء حسنی میں مخفی ہے۔ کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عائشہ سے فرمایا اسم اعظم ان اسماء میں ہے جن سے تم نے دعا کی ہے۔

14 - اسم اعظم کلمتہ التوحید ہے۔ اس کو قاضی عیاض نے نقل کیا ہے۔ (فتح الباری ج 11، ص 224 - 225، مطبوعہ لاہور)

الحاد کا معنی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا : اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں الحاد (غلط راہ اختیار) کرتے ہیں جو کچھ وہ کرتے ہیں عنقریب ان کو اس کی سزا دی جائے گی۔

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی لکھتے ہیں :

الحاد کے معنی ہیں حق سے تجاوز کرنا، اور الحاد کی دو قسمیں ہیں ایک اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے یہ ایمان کے منافی ہے۔ دوسری قسم ہے اسباب کو شریک بنانا یہ ایمان کو کمزور کرتا ہے اور ایمان کی گرہ کو نہیں کھولتا۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں الحاد کرنے کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایسی صفت بیان کی جائے جس کے ساتھ اس کو موصوف کرنا جائز نہیں ہے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی ایسی تاویل کی جائے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے۔ (المفردات ج 2، ص 577، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، 1418 ھ)

اللہ تعالیٰ کے اسماء میں الحاد کی تفصیل

امام فخر الدین محمد بن عمر الرازی الشافعی المتوفی 606 ھ لکھتے ہیں :

محققین نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں الحاد تین قسم پر ہے :

1 - اللہ تعالیٰ کے اسماء مقدسہ طاہرہ کا غیر اللہ پر اطلاق کیا جائے جیسا کہ کفار نے اپنے بتوں پر اللہ کے ناموں کا ان میں تصرف کرکے اطلاق کیا۔ مثلاً انھوں نے لفظ اللہ سے اللات بنایا اور العزیز سے عزی بنایا اور المنان سے المناۃ بنایا اور مسیلمہ کذاب نے خود اپنا نام الرحمٰن رکھا۔

2 - اللہ کا ایسا نام رکھنا جو اس کے حق میں جائز نہیں ہے جیسا عیسائی اللہ تعالیٰ کو مسیح کا باپ کہتے ہیں اور کرامیہ اللہ تعالیٰ پر جسم کا اطلاق کرتے ہیں، اسی طرح معتزلہ اپنی بحث کے دوران کہتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا تو وہ جاہل ہوگا اور لائق مذمت ہوگا اور اس قسم کے الفاظ بےادبی کے مظہر ہیں۔ ہمارے اصحاب نے کہا ہے کہ ہر وہ لفظ جس کا معنی صحیح ہو اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر کرنا لازم نہیں ہے، کیونکہ دلیل سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق الاجسام ہے لیکن اس کو کیڑوں مکوڑوں اور بندروں کا خالق کہنا جائز نہیں ہے، بلکہ اس قسم کے الفاظ سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ واجب ہے۔

3 - بندہ اپنے رب کا ایسے الفاظ کے ساتھ ذکر کرے جس کا معنی وہ نہیں جانتا، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی ایسے لفظ کا ذکر کرے جس کا معنی اللہ کی جناب کے لائق نہیں ہے۔ (تفسیر کبیر ج 5، س 416 - 417، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

اللہ تعالیٰ کے اسماء توقیفی ہونے پر مذاہب اربعہ کے مفسرین کی تصریحات

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی الشافعی المتوفی 606ھ لکھتے ہیں:

اگر کوئی شخص یہ پوچھے کہ اگر ایک لفظ کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر ثابت ہو تو کیا اس کے تمام مشتقات کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر جائز ہے؟ تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ نہ اللہ تعالیٰ کے حق میں جائز ہے نہ انبیاء (علیہم السلام) کے، اور نہ ملائکہ کے، کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے علم کا لفظ آیا ہے۔ علم ادم الاسماء کلھا (البقرہ: 31)۔ علمک مالم تکن تعلم (النساء: 113) لیکن اللہ تعالیٰ کو یا معلم کہنا جائز نہیں ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کے لیے یحب کا لفظ آیا ہے یحبہم ویحبونہ (المائدہ: 54) لیکن اللہ تعالیٰ کو یا محب کہنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح انبیاء (علیہم السلام) کا معاملہ ہے۔ حضرت آدم (علیہ السلام) کے حق میں وارد ہے وعصی ادم ربہ فغوی (طہ: 121) لیکن یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ آدم عاصی و غاوی تھے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے حق میں ہے یاابت استاجرہ (القصص: 26) لیکن حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو اجیر (اجرت پر کام کرنے والا) کہنا جائز نہیں ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ یہ الفاظ موہم ہیں اس لیے ان کا انحصار ان ہی نصوص میں واجب ہے اور ان سے مشتق الفاظ کے اطلاق میں توسع میرے نزدیک ممنوع اور ناجائز ہے۔ (تفسیر کبیر ج 5 ص 417، مطبوعہ دار احیاء لتراث العربی بیروت، 1415ھ)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبّی المتوفی 668ھ لکھتے ہیں:

علامہ ابن العربی مالکی نے کہا ہے کہ صرف ان ہی اسماء کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور حدیث کی ان پانچ کتابوں میں ہے۔ صحیح البخاری صحیح مسلم سنن الترمذی سنن ابوداود۔ سنن النسائی۔ یہ وہ کتاب ہیں جن پر اسلام کے احکام کا مدار ہے اور ان کتابوں میں الموطا بھی داخل ہے جو تمام تصانیف حدیث کی اصل ہے اور ان کے علاوہ باقی اسماء کو چھوڑ دو۔ (الجامع لاحکام القرآن جز 7، ص 294، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی بن محمد جوزی حنبلی متوفی 597ھ لکھتے ہیں: زجاج نے کہا ہے کہ کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ کو اس نام کے علاوہ کسی اور نام سے پکارے جو اللہ تعالیٰ نے اپنا نام رکھا ہے، اس لیے یا جواب کہنا جائز ہے اور یا سخی کہنا جائز نہیں ہے اور یا رحیم کہنا جائز ہے اور یا رفیق کہنا جائز نہیں۔ علامہ ابو سلیمان خطابی نے کہا ہے کہ اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ اللہ کا نام لینے میں غلطی کرنا زیغ اور الحاد ہے۔ (زاد المسیر ج 3، ص 293، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، 1407ھ)

علامہ ابواللیث نصر بن محمد السمرقندی الحنفی المتوفیٰ 375ھ نے بھی زجاج کا مذکور الصدر قول نقل کیا ہے۔ (تفسیر السمرقندی ج 1، ص 858، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1413ھ) (تفسیر تبیان القرآن)

ہر کجا پستی ست و آب آنجا رود۔

ہر کجا دردیست دوا آنجا رود

گزشتہ آیات میں "صم بکم عمی" گونگے، بہرے، اندھے لوگوں اور ان کی بیماریوں کا تذکرہ تھا، اب اس آیت کریمہ میں بیماریوں کے روحانی علاج کا تذکرہ ہے یعنی رجوع الی اللہ اور ذکر اللہ تعالیٰ جس سے تمام امراض کا باآسانی خاتمہ ہو سکتا ہے فرمایا:

وللہ الاسماء الحسنٰی فادعوہ بھا۔ اللہ تعالیٰ کے لئے اسمائے حسنی ہیں۔ یہ مضمون قرآن کریم میں چار مقامات پر مذکور ہیں۔ ایک یہی آیت، دوم سورۃ الاسراء کے ختم پر، سوم سورۃ طہ کے شروع میں، چہارم سورۃ حشر کے ختم پر۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے اچھے نام تو تم پکارو اس کو انہی ناموں سے۔ اچھے نام سے مراد وہ نام ہے جو صفات کمال کے اعلیٰ درجہ پر دلالت کرنے والے ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ کسی کمال کا اعلی اور بلند ترین درجہ جس سے اوپر کوئی درجہ ممکن نہ ہو وہ صرف حق تعالیٰ شانہ خالق کائنات عزمجدہ ہی کو حاصل ہے جس کا اعلان پانچ وقت کی اذانوں میں اللہ اکبر سے ہوتا رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ عزوجل کے سوا کسی مخلوق کو یہ مقام اور بلند درجہ حاصل نہیں ہو سکتا جس کیونکہ اللہ تعالیٰ عزوجل کی تمام صفات ذاتی ہیں اور مخلوقات کی تمام صفات کی نسبت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہوتی ہے اور وہ سب عطائی اور وہبی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مخلوقات کی ذوات اور صفات سب عطائی ہیں اسی لیے آیت کریمہ میں ارشاد ہے کہ اسماء حسنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں دوسروں کو حاصل نہیں ہیں۔

"فادعوه بھا "اس کا ایک ترجمہ یہ ہے کہ انھی اسماء حسنی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو پکارو دعا کرو بلاؤ۔ بعض حضرات نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان ناموں سے موسوم کرو۔ دونوں ترجمہ صحیح بھی ہیں اور مطلوب و مراد بھی ہیں اور درست بھی۔ پھر لفظ دعا قرآن کریم میں دو معنی کے لیے مستعمل ہے ایک اللہ تعالیٰ کا ذکر اس کی حمد و ثنا تسبیح و تمجید اور تکبیر و تہلیل کے ساتھ دوسرے حاجات اور مشکلات و مصائب کے وقت اللہ تعالیٰ شانہ سے اپنی حاجت طلب کرنا اور مصائب و آفات سے نجات اور مشکلات کی آسانی کی درخواست کرنا۔

کلمہ "فادعوہ بہا "میں دونوں معانی مراد ہیں تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ حمد و ثنا اور تسبیح کے لائق بھی صرف اسی کی ذات پاک ہے اور مصائب و مشکلات سے نجات اور حاجت روائی اور مقصد بر آری بھی صرف اسی کے قبضہ قدرت میں ہے اس لئے حمد و ثنا کرو تو اسی کے کرم اور حاجت روائی مشکل کشائی کے لیے پکارو تو صرف اسی کو پکارو اور پکارنے کا طریقہ بھی خود ارشاد فرما کر بتادیا کہ انہیں اسماء حسنی کے توسل سے التجا کرو۔

مسند احمد میں ہے کہ سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو کبھی کوئی غم اور تکلیف پہنچے تو وہ یہ دعا پڑھے "اللھم انی عبدک وابن عبدک وابن امتک ناصیتی بیدک ماض فی حکمک عدل فی قضاءک اسالک بکل اسم ھو لک سمیت بہ نفس او انزلتہ فی کتاب او علمتہ احدا من خلقک او استثرت بہ فی علم الغیب عندک ان تجعل القرآن العظیم ربیع قلبی و نور صدری وجلاء حزنی وذھاب ہمی۔ لوگوں نے دریافت کیا گیا رسول اللہ کیا ہم یاد نہ کرلیں فرمایا جو بھی اسے سنے یاد کرلے۔ (ابن کثیر)

بعض علماء نے فرمایا کہ "ذھاب ھمی "کے بعد یہ کلمات اضافہ کرلے تو بہتر ہے: ذھاب ھمی و غمی و فقری و فاقتی و ذلتی و مرضی و وحشتی و جھلی و خوفی "یہ چند کلمات حدیث میں نہیں ہے بلکہ علماء نے اضافہ کیا ہے اور بہت بہتر ہیں۔ پس معلوم ہونا چاہیے کہ ماثورہ دعاؤں کے درمیانی حصے میں ایسے کلمات کا اضافہ اچھا نہیں ہوتا۔ جہاں دعاء ختم ہو پھر چند ایک کلمات کا اضافہ برا نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم۔

اسمائے حسنیٰ کے بحر بیکراں کے لیے سفینہ چاہیے سفینہ بھی وہ جسے حضرت نوح نے بنایا ہو۔ علماء کرام نے اسمائے حسنی کی شرح و فضائل پر مستقل کتابیں لکھی ہیں اور خوب بسط و تفصیل سے ان مبارک ناموں کے فضائل فوائد برکات اور خصوصیات و مناقب بیان کئے ہیں یہ سارے اسماء مبارکہ توقیفی ہیں۔

اس بڑی فہرست میں اللہ اسم ذات ہے باقی اسمائے صفات ہیں قرآن حکیم میں یہ اسم ذات "اللہ "2698 جگہ آیا ہے اس کی صفات میں سب سے زیادہ "اَلرَّبُّ "کا مقام ہے جو کہ قرآن کریم میں 900 مرتبہ جلوہ افروز ہے۔ یہ سارے مبارک اسماء مادہ اور صورت یعنی ہیولی اور صورت جسمیہ سے منزہ اور پاک ہیں ہاں اتنا معلوم ہے کہ کائنات علوی ہوں یا سفلی ہوں یا فضائی ہوں، جواہر ہوں، اعراض ہوں، اسمائے حسنی کا نور اور رنگ و کشش ان میں ضرور موجود ہوگا کوئی ذرہ کائنات کا ایسا نہیں ہے جس میں یہ نور نہ ہو البتہ کیفیت و کمیت کے اعتبار سے فرق ضرور ہوگا مگر کائنات کی روح یہی اسمائے حسنیٰ ہیں جنھیں قرآن و حدیث نے بیان فرمایا اور ان کے رنگوں اور کیفیتوں پر ایک حد تک سربستہ رازوں سے عبرت کے لئے پردہ اٹھایا۔

اسمائے حسنی کی حقیقت اور فوائد و برکات:

امام رازی (رح) فرماتے ہیں ایک ہزار اسماء الحسنیٰ تورات میں 1000 انجیل میں 1000 زبور میں اور ایک ہزار قرآن و سنت میں، یہ چار ہزار اسماء الحسنی ہوئے۔ اور جو قرآن و سنت میں ہیں وہ سب عربی میں ہیں اور گزشتہ آسمانی کتابوں میں جو تھے وہ انہی زبانوں اور لغات میں تھے۔ ہم دعوی سے کہتے ہیں کہ قرآن حکیم کی کوئی ایسی آیت نہیں جس میں اسمائے حسنہ میں سے کسی ایک کی خوشبو اور جھلک نہ ہو ہر آیت میں ان پاکیزہ اسماء کا رنگ اور اثر ضرور موجود ہے جو شخص ہر آیت میں ادنیٰ غور اور توجہ مبذول کرے گا وہ اس مقصد کو ایسا پائے گا جیسے کوئی شیشہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی شکل و صورت دیکھے اسی طرح تمام کائنات کی مخلوقات میں خواہ جمادات ہوں یا از قسم نباتات اسی طرح خشکی اور دریائی حیوانات حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑوں میں بھی اسمائے حسنی کا رنگ و جھلک نہایت واضح نظر آئے گا کوئی ایسی مخلوق نہیں کہ جس میں یہ رنگ و جھلک واضح طور پر موجود نہ ہو۔

اور اگر کوئی اشرف المخلوقات انسان میں یہ دیکھنا چاہے تو سب سے زیادہ واضح ربوبیت کی تصویر نمایاں ہے آپ دیکھیں شکم مادر میں ایک حساس طاقتور عضو ہے جو اس کی نگہداشت اور تربیت کرتا ہے اور ان پانی کے قطروں کی حفاظت کرتا ہے انہیں خون پلاتا رہتا ہے اور ایک خاص مدت تک اپنے اندر محفوظ رکھتا ہے اور پھر تکمیل

کے بعد اسے باہر پھینک دیتا ہے اور وہ اس میں نہ تو خود مختار ہے نہ خود تخلیق کا کام انجام دے سکتا ہے اور نہ مادر و پدر کو یہ پتہ چلتا ہے کہ حمل ٹھہر گیا ہے اور نہ انھیں اس کے اندرونی انقلاب اور تبدیلی کا حال معلوم ہوتا ہے نہ وہ یہ جانتے ہیں اس کے بچہ کب اور کس وقت کس نوعیت کے ساتھ پیدا ہو جائے گا۔

دہد نطفہ را صورتے چوں پری
کہ کرداست برآب صورت گری (سعدی)

اور جب پیدا ہوتا ہے تو اپنا رزق ساتھ لاتا ہے جس میں مناسب شکر نمک وٹامن ذائقہ اور قوت شامل حال رہتا ہے اور ماں کو پتہ نہیں چلتا کہ وہ دودھ جو پلا رہی ہے کب اور کیسے بنا اور کتنی مقدار میں بنا سفید براق دودھ کی شکل کیسے اختیار کی اس میں مٹھاس کہاں سے آئیں پھر بغیر علم و کوشش اور سعی کے اس خشک سینے سے دو فوارے جوش مارتے ہوئے کیسے پیدا ہوئے؟ پھر اس بچے کے اعضاء بغیر اس کی اور اس کے والدین کی کوشش و اختیار کے دن رات کیسے تناسب کے ساتھ بڑھتے رہے کہ ہر عضو کو اس کے مناسب غذا پہنچتی رہی کسی کو خون کسی کو پانی کسی کو بلغم کسی کو سودا کسی کو صفراء اور ہر غدود کو اس کے مناسب مقدار میں غذا پہنچی اور ہر رگ وریشہ کو مناسب رزق ملا۔

بچے کو صرف ایک غذا یعنی دودھ پلائی گئی یہ دودھ نے اندر جا کر کتنی شکل و صورت پیدا کرلیں یہ غذا ہضم ہو کر دونوں فضلات کیسے خارج ہوئے اور اس دودھ سے آنکھوں کی روشنی کے لیے بیٹری کیسے تیار ہوئی اور قوت سماعت کیسے پیدا ہوئی رگوں میں خون اور بدن کو گوشت کیسے مہیا ہوئے وغیرہ۔

اگر کوئی مغرب زدہ یورپ کا پجاری یہ کہے کہ یہ سارا کام دل اور جگر گردے اور تلی نے انجام دیے تو بتائے کہ ان اعضاء رئیسہ نے یہ کام کہاں سے سیکھا اور خود کس کی پیداوار اور مخلوق ہیں وہ کوئی اور کام کیوں انجام نہیں دیتے انہیں اس کام کی انجام دہی کی قوت و استعداد کس نے مہیا کی؟ سفید دودھ میں سرخی کہاں سے آئی؟ خشک روٹی میں خون بننے کی استعداد کس نے پیدا کی۔ تم ایک تیار لوہے کو جس طرح چاہو جیسے چاہو ہزاروں مختلف شکل صورت میں تبدیل کرکے اوزار، پرزے اور اسلحہ بناؤ پھر اپنی عقل و دانش اور کاریگری پر ناز کرو، بجا ہے، مگر ذرا یہ بتاؤ کہ یہ عقل تم کہاں سے لائے کس نے دی اور حیوانات کو چھوڑ کر یہ تمہیں کیوں عطا ہوئی؟ مگر یہ بتاؤ تم لوہے کو محنت کرکے سونے میں تبدیل کر سکتے ہو یا ایک دھات سے دوسری دھات بنا سکتے ہو؟ لوہے پر محنت کرکے اس کو خون بلغم اور صفرا میں تبدیل کر سکتے ہو؟ مٹی پر محنت کرکے اس کو منی یا ہڈی یا جگر یا دل یا گردہ بنا سکتے ہو؟ ان بیشمار مصنوعات میں جان اور روح ڈال سکتے ہو اپنے بدن اور وجود سے موت کو ٹال سکتے ہو؟ ان سب کا جواب نفی میں ہوگا تو ماننا پڑے گا کہ اوپر سے ایک ماورائی قوت موجود ہے جس کے حکم و چاہت سے یہ سارا نظام اور دستور العمل چل رہا ہے اسی کا نام ہے رب العالمین جس نے مٹی سے منی بنایا منی کے قطروں سے خون بنایا خون سے گوشت پوست ہڈی رگ وریشہ، دل، جگر، دماغ و سوچ، آنکھیں، سماعت اور بیشمار متضاد اعضاء، ترتیب دیے جس سے عالم صغیر انسان بنا پھر اس کے بدن و اعضاء بناوٹ اور ترتیب کا مطالعہ کرکے تم نے اپنے لیے ایک لامحدود مشینری اوزار مصنوعات کا جال بچھایا یہ سب رب العالمین کی ربوبیت و کاریگری کی مرہون منت ہے اور فرمایا "ویخلق مالا تعلمون"

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ایک مچھر اور مکھی یا ان سے بھی کمتر کوئی اگر سارا جہاں مل کر پیدا کرنا چاہیں تو ہرگز پیدا نہیں کر سکتے۔

اگر کوئی ظاہر بین مناظر قدرت سے خالی دامن نابینا یہ کہے کہ ان چیزوں میں پہلے سے سرخ ذرات موجود تھے تو ہم آپ سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ وہ سرخ ذرات از خود پیدا ہوئے یا کسی نے پیدا کیے؟ اگر اسباب کا سہارا لیتے چلے جاؤ گے تو تھک کر خود ہی لاجواب ہو جاؤ گے اور ضرور ایک مسبّب الاسباب کو مان کر ہی گلو خلاصی ہو گی۔

یہ دنیا عالم کبیر اتنا وسیع و عریض جہان ہے اور یہ بے چارے انسان عالم صغیر اس کی وسعتوں کا کیا احاطہ کر سکتا ہے؟ اس کے اندر سمندر، دریا، پہاڑ، راہیں، آبشاریں، لاسلکی تار، بجلی، ٹیلیفون، ٹیلیویژن، راڈار، کمپیوٹر، پرنٹنگ پریس، کیمرہ، انجن، کارخانے، فیکٹری، مشین، غرض سب کچھ ہے دیکھ لو خوب غور سے دیکھو اور حقیقی کاریگر اور مصور کو بھی دیکھو اور یاد کرو کہ یہ سب کچھ کس کے ہیں اور کس کے عطا کردہ ہیں؟

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں
یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں

ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیران ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

دہریت اور کیمونزم بالشویک پارٹی کا بانی لینن جس نے کہا تھا کہ سوویت یونین سے ہم نے خدا کا تصور ہمیشہ کے لئے ختم کیا اس کی بیٹی جو باپ سے بھی دو قدم آگے تھی اپنے باپ کو مرتے وقت نہایت نزدیکی سے دیکھا کہ جس کے مرنے کا منظر نہایت حیران کن عجیب تھا باپ کے مرنے کے بعد پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ : " میں دنیا سے دلبرداشتہ ہوئی میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ کائنات میں کوئی طاقت ضرور موجود ہے جس تک ہماری رسائی ممکن نہیں جو ہماری تدبیروں کو ناکارہ بنانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے"۔

کاش یہ ظلوم وجہول انسان بغاوت سرکشی چھوڑ کر اپنے رب جلد ثناء ہ کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہوتا اور انبیاء کرام (علیہم السلام) کے مقدس فرامین اور تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر اپنی ذات کی دشمنی سے بچ جاتا اور عذاب الہی سے نجات حاصل کرکے سعادت دارین کا مستحق بن جاتا اور ہمیشہ کے لئے نجات پا لیتا۔

اسماء حسنیٰ:

ان مبارک پاکیزہ ناموں کی کثرت، مسمّی کی عظمت وجلال اور بے پناہ بزرگی کی نشانی ہے، سارے عالم میں ظاہر یا پوشیدہ کوئی ایسی مخلوق نہیں جس کا ربط و تعلق کسی اسم مبارک کے ساتھ نہ ہو۔ یہ پورا نظام اور اس کی نشو ونما تروتازگی حیات وبقا انہیں مبارک ناموں کے مرہون منت ہے اور ہر مخلوق خواہ وہ کوئی بھی ہو انہی پاکیزہ ناموں کا ورد و وظیفہ جاری رکھ کر حیات زندگی حاصل کر رہی ہیں۔

حضرت امام غزالی (رح) فرماتے ہیں کہ درخت کی شاخ اس وقت خشک ہو جاتی ہے جب اس تک پانی نہیں پہنچتا اسی طرح حمد وثناء باری تعالیٰ جہاں منقطع ہو گئی وہاں مخلوقات پر بربادی اور تباہی آجاتی ہے۔ ہر شجر وحجر، ہر پرندہ وہر سبزہ اسی حمد وثنا کی برکت سے بقاء وحیات حاصل کر رہا ہے ہر مخلوق کے ساتھ الگ الگ اسمائے حسنیٰ کا تعلق قائم ہے انسان کا شمار افضل الذاکرینن میں ہے اس کو چاہیے کہ اپنے مطالبات اور بیشمار حاجات دنیا وآخر تکے لیے انہی مبارک ناموں کا انتخاب کرکے اس کا ورد جاری رکھیں۔ غنا حاصل کرنے کے لئے یا مغنی، بیماری سے شفا پانے کے لیے یا شافی، علم کے لیے یا علیم، روشنی کے لیے یا نور، حفاظت کے لیے یا حفیظ، کا فرد جاری رکھیں۔ علی ھذا القیاس ہر مطلب اور ہر مقصد کے لیے اسی کی مناسبت کا خیال رکھیں۔

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو ان اسماء کے وسیلہ سے دعا کرتے ہیں ارشاد گرامی ہے "وللہ الاسماء الحسنی فادعوہ بھا "اللہ ہی کے لیے ہیں مبارک نام، انہی کے وسیلہ سے دعا مانگا کرو۔

رب العزت سبحانہ کے سارے نام توقیفی مسموعی اور ماثور ہیں اور قیاس اور ہر قسم کے تخمینوں سے بالاتر ہیں جس طرح ذات باری تعالیٰ سبحانہ ہر عظمت اور بلندی کا مالک ہے یہی شان اسمائے حسنی کی بھی ہے۔ عن ابوہریرہ (رض)۔ قال: قال رسول اللہ ان للہ تعالیٰ تسعۃ وتسعین اسمًا من احصاھا دخل الجنتہ۔ (متفق علیہ)

حدیث پاک میں ننانوے ناموں کے تذکرہ سے حصر مقصود نہیں کیونکہ قرآن وحدیث میں مفرد و مرکب بہت سے دیگر اسماء کا بھی ذکر ہے۔ امام ترمذی نے اسمائے حسنی کو تفصیلًا روایت کیا ہے مگر بہت سارے اسماء وہاں بھی مذکور نہیں مثلا:

الرب۔ العالم۔ العلام۔ الخلاق۔ الوتر۔ المیسِّر۔ السامع۔ القاھر۔ المرید۔ الرفیع۔ المنعم۔ الوسیع۔ الحافظ المعطی۔ الستار۔ الوحید۔ الجمیل۔ القدیر۔ المقتدر۔ الولی۔ الشافی۔ الجابر۔ السبوح۔ الوھاب۔ الحاکم۔ الحکم۔ المفید۔ الملک۔ المحیط۔ الحنان۔ المنان۔ الدیان۔ التائب۔ الصادق۔ القدیم۔ الصانع۔ الشاکر۔ المولی۔ المسیتر۔ الحبی۔ الکاشف۔ الطیب۔ المحیط۔ الفعال۔ المدبر۔ الفاطر۔ الکفیل۔ الوفی۔ الوافی۔ اللمغیث۔ المرفق۔ الجواد۔ الرفیق۔ الکافی۔ القاضی۔ العاد۔ الرازق۔ الناجی۔ المنجی۔ البار۔ الراشد۔ الامان۔ الاکبر۔ الاقرب۔ المحسن۔ المجمل۔ المفضل۔ المنیر۔ الغلِب۔ الصاحب۔ الطاھر۔ الشاھد۔ الناظر۔ المحمود۔ السریع۔ الشدید۔ المنزل۔ المترقب۔ المظھر۔ الواضع۔ الشارع۔ العماد۔ السند۔ الذخر۔ المنقذ۔ الحرز الفرد۔ الکنز۔

اس کے علاوہ اور بھی اسماء ہیں جو کہ تتبع اور تلاش کے بعد معلوم ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح چند مرکب اسمائے جو کہ اکثر دعاؤں اور مناجات و میں مذکور ہیں مثلا:

الرحم الراحمین۔ مسھل المشکلات۔ خیر الرازقین۔ خیر الراحمین۔ مفتح الابواب۔ قاضی الحاجات۔ دافع البلیات۔ جامع الناس۔ ذوالفضل العظیم۔ ذوانتقام۔ ذوالقوۃ المتین۔ راحم المساکین۔ اول الاولین۔ آخر الاخرین۔ شدید العقاب۔ سریع الحساب۔ باسط الیدین بالرحمہ۔ عظیم العفو۔ حسن التجاوز۔ مفرج المکروبین۔ مروح المکروبین۔ مصرف القلوب۔ مقلب القلوب۔ فالق الاصباح۔ مثبت القلوب۔ رب العزت۔ رب العالمین۔ فاطر السموات والارض۔ غافر الذنب۔ قابل التوب۔ شدید العقاب۔ ذوالطول۔ ذوالعرش المجید۔ مجیب الدعوات۔ فعال لمایرید۔ غیاث المستغیثین۔ امان الخائفین۔ رب العرش الکریم۔ ذوالمجد والکرام۔ اکرم الاکرمین۔ اجود الاجودین۔ عالم الغیب۔ علام الگیوب۔ ستار العیوب۔ غفار الذنوب۔ کاشف الغم فارج الھم۔ رحمٰن الدنیا والاخرۃ۔ رحیم الاخرۃ۔ کنز الفقراء۔ عظیم الرجاء۔ منقذ الھل کی، رافع الدرجات، باریٔ المسموکات، ولی الاحسان۔ حرز الضعفاء، رافع السماوات، خیر الناصرین۔ احسن الخالقین۔ خیر المعطین۔ بدیع السموت والارض۔ فالق الحب والنوی۔ علیم بذات الصدور۔ سامع الدعاء، منتھی العائذین۔ صریخ المستسر خین۔ واسع المغفرۃ۔

ان کے علاوہ اور بہت سے مبارک اور مرکب اسماء ہیں۔ رزقنا الاستغاثۃ باسمائہ الحسنی آمین۔ امام ترمذی نے فہرست بیان کی ہے، یہ اسماء مبارکہ اس میں شامل نہیں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ تینوں عالم، دنیا، برزخ اور عالم آخرت کے ساتھ اسماء حسنی کا ربط و تعلق حقیقی ہے کیونکہ رب العزت سبحانہ قدیم واجب الوجود کی صفات سے بالذات علی الدوام موصوف ہے، اسی طرح اس کی صفات بھی قدیم ہیں جن کا انفکاک عن الموصوف جائز نہیں۔ بقول حضرت شیخ ابن عربی کے کہ ان مبارک ناموں کے معنی اور تقاضوں کے ساتھ عالم کا قیام وبقاء بطور لزوم ہے جب تک یہ تمام تقاضے اور سارے تقاضے پورے اور سارے مطالبے پورے نہیں ہوں گے اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی اور جب تقاضے سارے پورے ہو جائیں گے تو اتمام حجت بھی مکمل ہوگا جو کہ قیامت کے لیے پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

چونکہ سورۃالفاتحہ خلاصہ القرآن الکریم ہے اور قرآن حکیم خلاصہ الکتب السماویہ کے ساتھ خلاصہ لوح محفوظ بھی ہے اور جب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم خلاصہ الفاتحہ قرار پائی جس میں تینوں مبارک اسمامذکور ہوئے اول ایجاد دوسرے اوقات تیسرے الرحیم سے انتاج علم پر دلالت ہوئی تو تینوں عالم اس میں شامل ہوگئے۔ ان میں الرحمٰن صفت کا تعلق دنیا اور برزخ دونوں کے ساتھ مضبوط ہے کیونکہ دنیا میں دعا، استغفار، تلاوت قرآن، طاعات، صدقات اور صدقات جاریہ وغیرہ کا ثواب مسلسل اموات کو برزخ میں پہنچتا رہے گا باذن اللہ۔ اسی طرح بداعمالیوں کی سزا بھی گناہ گاروں کو برزخ میں پہنچتی رہے گی اور جب تسبیح میں اسم ذات آگیا تو ایسا سمجھو کہ تمام صفات باری تعالیٰ کا لحاظ ہوگیا کیونکہ موصوف کے اندر بدون ذکر صفات خود ساری صفات ملحوظ رہتی ہیں۔

پس اگر کوئی شخص دعا میں یااللہ کہے گا تو معنی یہ ہوگا کہ ابوذات جو تمام صفات کمالیہ سے موصوف و متصف ہیں تو یااللہ کہنے والے نے گویا کہ اللہ تعالیٰ کو جمیع صفات کے ساتھ پکارا مزید صفات ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ہاں توضیح و تعیین کی خاطر اگر کوئی صفت ذکر ہو تو بہتر ہے جیسے کہ تسمیہ میں اسم ذات کے ساتھ دونوں صفت الرحمٰن اور الرحیم مذکور ہوئیں۔ تکثیراً للفائدۃ وتتمیماً للدلالۃ۔ کیونکہ جب مخلوقات کی صفات عارضی ہوتی ہیں پھر بھی موصوف اپنی صفات کے ساتھ ملحوظ رہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ واجب الوجود کی ذاتی صفات کا کیا کہنا وہ تو ذات سے ہرگز الگ نہیں ہو سکتے۔

مگر وہ اسماء حسنی سارے ایک جیسے نہیں ہر ایک کے الفاظ کلمات معنی اغراض تقاضے ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں یہی تعدد و کثرت کی نشانی ہے جیسے اکثر عام صیغوں اور کلمات کا حال ہے بس جو معنی علیم کا ہے وہ حکیم کا نہیں علیٰ ہذا القیاس اور یہی اصلی بنیادی مسئلہ ہے کہ 80 ہزار عالم مختلف الحقائق واحوال مختلف منافع اور اغراض مختلف الوجود اور بقاپر مشتمل کائنات کی خلقت انتظام تربیت اصلاح وترقی نتائج وعواقب وغیرہ۔ ان مختلف اسماء اور صفات باری تعالیٰ کی نگہداشت اور حفاظت اور حمایت میں موجود اور باقی رہتے ہیں۔ اور آپ باآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صفت تخلیق ورزق وصفت ابقاء کا نتیجہ جس کا تعلق انسانوں کے ساتھ الگ اندازے کے ساتھ ہے حیوانات اور دیگر مخلوقات کے ساتھ دوسرے اندازے کے ساتھ ہوگا یہ ہر چیز میں بدیہی اور واضح ہے۔ اور حدیث میں ارشاد ہے: لن تموت نفس حتی تستکمل رزقھا۔ (الحدیث)

جب یہ تقاضے سارے پورے ہوں گے اور صفۃ الرحمٰن عزشانہ اس پر محیط ہوگی تو اتمام حجت ہو جائے گا اور بس اسی طرح موجودہ زمانہ کے حیران کن ایجادات جو آئے دن بڑھتے رہتے ہیں اور انسانی مصنوعات کا دائرہ وسیع تر ہوتا بڑھ رہا ہے مشرق و مغرب آپس میں مل کر ایک آواز میں منسلک ہوگئے بلکہ مشرق کا فوٹو اور عکس مغرب میں نظر آرہا ہے مختصر مدت میں انسان بذریعہ جنگی طیارہ ہزار میل کی مسافت طے کر کے کہاں سے کہاں تک پہنچ رہا ہے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ آنے

والے دنوں میں مزید ترقی کے کیا کیا مدارج طے ہوں گے؟ یہ سارے رب العزت سبحانہ کے صفاتی تقاضے ہیں جو کہ کسی نہ کسی حدیث میں زبان نبوت سے ان کی اطلاع اور خبر دے دی گئی تھی۔

ماضی کے مسلمانوں نے حسن ظن اور صداقت کی بنیاد پر ان چیزوں پر ایمان لائے اور کیفیت مشاہدہ اور وجود اشیاء سے مستغنی رہے جبکہ موجودہ وقت کے لوگ ان ایمانی صداقتوں سے ناواقف ہیں لہٰذا انہیں بالمشاہدہ عیاناً نہ دکھانا پڑا جو کہ سلسلہ چل رہا ہے اور اتمام حجت کا مقصد پورا ہو رہا ہے ارشاد ربانی ہے "ووجدوا ما عملوا حاضراً" (سورۃ الکھف) جو کچھ دنیا میں کیا تھا وہ سامنے پائیں گے دیکھیں گے۔ یہ مسئلہ موجودہ کمپیوٹر ریڈیو ٹیوی نے حل کیا جو پہلے ایمان بالغیب کے درجے میں تھا اب مشاہدہ میں آگیا۔ اسی طرح حدیث پاک میں ہے کہ ایک وقت تمہارے ہاتھ کی چھڑی (چابک) بات کرے گی یہ ماضی کے مسلمانوں نے ایمان بالغیب کہہ کر تصدیق کیا اب ہمارے زمانے میں مشاہدہ ہو رہا ہے ٹیپ ریکارڈر یا موبائل ہاتھ کی چھڑی وغیرہ بات کر رہے ہیں غرض یہ کہ یہ ساری پیشنگوئیاں مشاہدے میں آکر اتمام حجت کا راستہ صاف کر رہی ہیں۔

حدیث ابوہریرہ کا مطلب امام بخاری (رح) نے یہ بیان کیا ہے کہ من احصاھا ای حفظھا۔ یعنی جو کوئی ان 99 اسماء حسنی کو زبانی یاد کرے گا اس کو دخول جنت نصیب ہوگا بڑی خوش قسمتی ہوگی کہ ہر مسلمان کو یاد کر کے حرز جان بنائے اور ہر نماز کے بعد پابندی کے ساتھ ایک مرتبہ آیت الکرسی پڑھ کر بعد میں ان مبارک اسماء کی ایک مرتبہ تلاوت کرے اس پر صرف دو تین منٹ صرف ہوں گے اور کروڑوں کا ثواب ملے گا کیوں نہیں یہ اس ذات پاک کے نام ہیں جس کے احسانات کا کوئی اندازہ نہیں۔ ماں باپ اور سارے جہان سے زیادہ مہربان ہے۔ لطف یہ ہے کہ ثواب کے علاوہ اس ناکارہ بندہ کے ساتھ اس کا تعلق پختہ اور مضبوط رہے گا اس کے علاوہ دینی اور دنیوی بیشمار مقاصد اور حاجات بھی پورے ہو جائیں گے بد قسمتی ہوگی کہ ہم نے ہزاروں بازاری چیزوں کے نام تو یاد کئے ہیں اور اپنے رب بلکہ کائنات کے رب کے نام یاد نہیں کیے روز قیامت کتنی ندامت ہوگی؟ یہ اس کا لطف اور ذرہ نوازی ہے کہ ہم جیسے ناکاروں کو اپنے پاکیزہ ناموں کے پڑھنے کا اہل بنایا۔

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب

ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبیست

دوم یہ کہ اس کے پسندیدہ پاکیزہ ناموں کا معنی واثر کیفت و رنگ اپنے اندر پیدا کیا جائے۔ یہی مطلب ہے تخلقو باخلاق اللہ کا۔ الرحمٰن الرحیم کا مطلب شفقت و رحمت اپنے اندر پیدا کرنا۔ القدوس پاک اپنے ظاہر و باطن قلب انسان کو صاف ستھرا رکھنا۔ السلام سلامتی دینے والا۔ المسلمن سلم المسلمون من لسانہ و یدہ۔ (الحدیث) کیا خوش قسمتی ہوگی کہ یہ مبارک اسماء حسنی زبانی یاد بھی ہوں۔ اور عملی بھی۔ اللھم ارزقنا و جمیع عبادک من اخواننا واغفر لاتہ محمد والہ وصحبہ وسلم۔

"وذروا الذین یلحدون فی اسمائہ۔ سیجزون ماکانو یعملون۔

اسمائے حسن میں کجروی اختیار کرنے کا مطلب کیا ہے؟

اس بارے میں تفسیر قرطبیؒ اور تفسیر در منثور میں حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے نقل کیا ہے کہ مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے ناموں سے مشتق کر کے اپنے بتوں کے نام رکھ دیے تھے۔ مثلاً اللہ سے اللات کا۔ اور العزیز سے عزی کا۔ اور المنان سے منات کا۔ اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے مقدس ناموں سے اپنے ناپاک بتوں کا نام نکالا کرتے تھے۔ اور تفسیر در منثور میں حضرت سلیمان بن مہران اعمش (رح) سے اس کی تفسیر یوں نقل کی ہے کہ "یدخلون فیھا مالیس منھا "یعنی اللہ تعالیٰ کے ناموں میں ان ناموں کا اضافہ کر دیتے ہیں جو اس کے نام نہیں ہیں یعنی اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کے لیے نام مقرر کرتے ہیں۔

علماء امت کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنی توفیقی ہیں لہٰذا قرآن و حدیث میں جو اسماء وارد ہوئے ہیں خواہ کسی نوعیت کے ہوں یا کسی ماثور میں مذکور ہوں جیسے کہ تفصیل گزر چکی) ان کے علاوہ دوسرے ناموں سے (اگرچہ ان کے معنی بہتر ہوں) اللہ تعالیٰ شانہ کو موصوف نہ کیا جائے۔ بہت سے لوگ اللہ تعالیٰ کے نام مخلوق کے لئے استعمال کر لیتے ہیں وہ اس طریقے پر کے لفظ عبد کو چھوڑ کر مسمّٰی کا نام لیتے ہیں اور کہتے ہیں، قدوس خان، رحمٰن خان، غفور صاحب، شکور خان، غفار خان وغیرہ۔ یہ سب ناجائز اور مکروہ اور بے احترامی ہے۔ چاہیے کہ ان سب کے شروع میں لفظ "عبد "بول کر پکارا جائے یہاں تک کہ بعض جاھل اپنے بچوں کا نام "اللہ محمد "اور "محمد رسول اللہ "رکھتے ہیں انہیں سختی سے منع کیا جائے اور ایسے ناموں کو تبدیل کیا جائے۔

سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جو آتا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کا نام پوچھتے ہیں اور غیر شرعی نام فوراً تبدیل کرتے۔ علماء کرام کا فریضہ بنتا ہے کہ وہ ناموں کی اصلاح کریں۔ آج کل اکثر لوگ انگریزوں اور کافروں کے نام رکھنے پر فخر محسوس کرتے ہیں اور اسلامی ناموں کو پسند نہیں کرتے وہ بڑے مجرم ھوتے ھیں۔ چاہیے کہ لوگ اس طرف متوجہ ہو کر اپنی اصلاح کریں البتہ اگر اللہ تعالیٰ کے مقدس ناموں میں سے کسی ایک اسم مقدس کا کسی عجمی زبان میں ترجمہ استعمال ہو، تو علماء نے اس کی بامر مجبوری اجازت دے دی ہے۔ جیسے "خدا" یہ "اللہ" کا ترجمہ ہے، جو کہ چند زبانوں میں اتنی بکثرت مستعمل ہے کہ ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر جاری ہے، علی ھذاالقیاس۔

چند دوسرے اسماء جو مختلف عجمی لوگوں کے ہاں بکثرت رائج اور مستعمل ہیں۔ حدیث شریف میں روایت ہے کہ ماں باپ پر اولاد کے تین حقوق ہیں۔

1۔ پیدائش پر انکا شرعی نام رکھیں۔

2۔ ان کی تربیت اور دینی تعلیم کا اہتمام کریں۔

3۔ دیندار شریف خاندان میں ان کا نکاح کرائیں۔

پس ان تینوں حقوق میں خیانت ناجائز اور گناہ ہی ہوگا۔ واللہ الھادی۔ (تفسیر منازل العرفان)

آیت مبارکہ:

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۝۱۸۱

لغۃ القرآن: [وَمِمَّنْ : اور ان میں سے جن کو] [خَلَقْنَآ : ہم نے پیدا کیا] [اُمَّةٌ: کچھ ایسے لوگ ہیں] [يَّهْدُوْنَ : جو ہدایت دیتے ہیں] [بِالْحَقِّ : حق کی] [وَبِهٖ : اور اس کے ساتھ] [يَعْدِلُوْنَ : وہ عدل کرتے ہیں]

ترجمہ: اور جنہیں ہم نے پیدا فرمایا ہے ان میں سے ایک جماعت (ایسے لوگوں کی بھی) ہے جو حق بات کی ہدایت کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ عدل پر مبنی فیصلے کرتے ہیں

تشریح: ماضی کے ہر دور میں کچھ لوگ ایسے تھے جو اپنے اپنے نبی کے لائے ہوئے پیغام حق وانصاف پر ثابت قدم رہے ہیں۔ آج بھی اگرچہ غیر مسلموں کی تعداد زیادہ ہے مگر اہل ایمان حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لائے ہوئے دین حق پر قائم ہیں اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، جیسا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

"میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق پر جلوہ گر رہے گا۔ جو ان کو ناکام کرنا چاہے وہ ان کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ (یعنی وہ حق پر ثابت قدم رہیں گے) حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کا امر (اعلان قیامت) آجائے گا اور وہ اسی طرح (حق پر قائم) ہوں گے۔"

(مسلم: الامارۃ: حدیث نمبر ۱۹۲۰) (تفسیر امداد الکرم)

اس امت میں بھی حق کی ہدایت دینے والے اور حق کے ساتھ عدل کرنے والے ہیں

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: ہم نے بہت سے جن اور انسانوں کو جہنم کے لیے پیدا فرمایا ہے (الاعراف: 179) اور اس آیت میں فرمایا اور جن لوگوں کو ہم نے پیدا کیا ہے ان میں ایک گروہ ایسا (بھی) ہے جو حق کی ہدایت دیتا ہے اور اسی کے ساتھ عدل کرتا ہے۔ (الاعراف: 181) اس میں یہ خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے لیے بھی بہت مخلوق کو پیدا فرمایا ہے۔ اس سے پہلے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے قصہ میں فرمایا تھا اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ ہے جو حق کی ہدایت دیتا ہے اور اسی کے ساتھ عمل کرتا ہے۔ (الاعراف: 159) اور جب اس کلام کو دوبارہ ذکر فرمایا تو اکثر مفسرین کے مطابق اس سے مراد سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت ہے اور حسب ذیل روایات اس کی تائید کرتی ہیں۔ امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی 310ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

ابن جریج نے کہا ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ نبی اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہ میری امت ہے یہ حق کے ساتھ لیتے ہیں، دیتے ہیں اور فیصلہ کرتے ہیں۔ قتادہ نے کہا ہم کو یہ حدیث پہنچی ہے کہ نبی اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب اس آیت کی قراءت کرتے تو فرماتے یہ تمہارے لیے ہے اور تم سے پہلے ایک قوم کو بھی اس کی مثل دی گئی ہے۔ پھر یہ آیت پڑھتے ومن قوم موسیٰ امۃ یھدون بالحق وبہ یعدلون۔ (الاعراف: 159)۔ (جامع البیان جز9، ص180۔181۔ تفسیر ابن ابی حات ج5، ص1623، تفسیر امام عبد الرزاق ج1، رقم الحدیث: 962۔ زاد المسیر ج3، ص294۔ معالم التنزیل ج2، ص183۔ الدر المنثور ج3، ص616)

اجماع کے حجت ہونے پر احادیث

اس آیت میں اس کی صریح دلیل ہے کہ اجماع امت حجت ہے اور کی تائید میں حسب ذیل احادیث ہیں:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت معاویہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ اللہ کے امر (دین) پر قائم رہے گا جو شخص ان کو ناکام کرنا چاہے یا ان کی مخالفت کرنا چاہے وہ ان کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا حتی کہ ان کے پاس اللہ کا امر (موت) آجائے گا اور وہ اسی (طریقہ، دین) پر ہوں گے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 3641۔ صحیح مسلم رقم الحدیث 1923۔ مسند احمد ج4، ص101۔ سنن دارمی رقم الحدیث: 230۔ جامع الاصول ج1، رقم الحدیث: 6777)

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی 261ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ثوبان (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق کی خاطر لڑتا رہے گا اور قیامت تک غالب رہے گا۔ (صحیح مسلم الامارۃ، 173، (1923) 4871)

امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی 279ھ روایت کرتے ہیں: معاویہ بن قرۃ اپنے والد (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب اہل شام فاسد ہوجائیں تو اس میں تمہارے لیے کوئی خیر نہیں ہے اور میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ کامیاب رہے گا جو ان کو ناکام کرنا چاہے گا وہ ان کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا حتی کہ قیامت قائم ہوجائے گی۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: 2199، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 6، مسند احمد ج7، رقم الحدیث: 20383، طبع جدید، مسند احمد ج3، ص436، ج5، ص35، طبع قدیم، صحیح ابن حبان ج16، رقم الحدیث: 7302۔ المعجم الکبیر ج19، ص56، جامع الاصول ج9، رقم الحدیث: 6778)

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بیشک اللہ میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ کا جماعت پر ہاتھ ہے، اور جو جماعت سے الگ ہوا وہ دوزخ میں الگ ہوگا۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: 2173۔ جامع الاصول ج9، رقم الحدیث: 6761۔ کتاب الاسماء والصفات ص322، کتاب السنہ ج1، رقم الحدیث: 80، المستدرک ج1، ص115)

امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث روایت کرتے ہیں:

حضرت ابومالک اشعری (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ نے تم کو تین چیزوں سے پناہ دی ہے۔ تمہارے خلاف تمہارا نبی دعاء ضرر نہیں کرے گا جس سے تم سب ہلاک ہوجاؤ۔ اور اہل باطل اہل حق پر غالب نہیں ہوں گے اور تم کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہوگے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 4253۔ جامع الاصول ج9، رقم الحدیث: 6760۔ اس کی سند ضعیف ہے)

امام ابوعبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ متوفی 273ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بیشک میری امت گمراہی پر مجتمع نہیں ہوگی اور جب تم اختلاف دیکھو تو سواد اعظم کے ساتھ رہو۔ (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 3950)

امام احمد بن حنبل متوفی 241ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوبصر غفاری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں نے اپنے رب عزوجل سے تین چیزوں کا سوال کیا اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں مجھے عطا فرمادیں اور ایک دعا سے مجھے منع فرمادیا، میں نے اللہ عزوجل سے سوال کیا کہ میری امت گمراہی پر جمع نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ عطا کردیا، اور میں نے اللہ عزوجل سے سوال کیا کہ میری امت قحط سے ہلاک نہ ہو جیسا کہ پہلی امتیں ہلاک ہو گئی تھیں تو اللہ عزوجل نے مجھے یہ عطا کردیا، اور میں نے اللہ عزوجل سے یہ سوال کیا کہ ان کو مختلف فرقوں میں تقسیم نہ کرے جس کے نتیجہ میں بعض، بعض سے لڑیں تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس دعا سے منع کردیا۔ (مسند احمد بن حنبل ج 6، ص 396، طبع قدیم، دار الفکر، بیروت۔ مسند احمد بن حنبل ج 18، رقم الحدیث: 27101، دار الحدیث قاہرہ)

امام عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی السمرقندی المتوفی 255ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عمرو بن قیس انصاری (رض) روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرایا بیشک اللہ تعالیٰ نے مجھے وقت مرحوم پر پہنچایا اور میرے لیے مختصر مدت رکھی، ہم (بعثت میں) آخر ہیں اور قیامت کے دن سابق ہوں گے، اور میں یہ بات بغیر فخر کے کہتا ہوں کہ ابراہیم اللہ کے خلیل ہیں اور موسیٰ اللہ کے برگزیدہ ہیں اور میں اللہ کا حبیب ہوں، قیامت کے دن حمد کا جھنڈا میرے ساتھ ہوگا، اور بیشک اللہ عزوجل نے میری امت کے متعلق مجھ سے وعدہ کیا ہے اور ان کو تین چیزوں سے محفوظ رکھے گا۔ ان کو عام قحط سے ہلاک نہیں فرمائے گا اور نہ ان کو کوئی دشمن نیست و نابود کرے گا اور نہ ان کو گمراہی پر جمع کرے گا۔ (سنن دارمی رقم الحدیث: 54، مطبوعہ دار الکتاب العربی، 1407ھ)

حافظ ابوبکر عمرو بن عاصم الضحاک بن مخلد الشیبانی المتوفی 287ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت کعب بن عاصم الاشعری (رض) کہتے ہیں کہ انھوں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے میری امت کو اس بات سے محفوظ رکھا ہے کہ وہ مگراہی پر مجتمع ہو۔ (یہ حدیث حسن ہے)۔ (کتاب السنہ ج 1، رقم الحدیث: 82، مطبوعہ المکتب الاسلامی، 1400ھ)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری امت کو اس سے محفوظ رکھا ہے کہ وہ گمراہی پر مجتمع ہوں۔ (یہ حدیث حسن ہے) (کتاب السنہ ج 1، رقم الحدیث: 83)

حضرت ابومسعود (رض) نے فرمایا تم جماعت کے ساتھ لازم رہو، کیونکہ اللہ عزوجل سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا۔ (اس حدیث کی سند جید ہے اور اس کے راوی، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے راوی ہیں)۔ (کتاب السنہ ج 1، رقم الحدیث: 85۔ المعجم الکبیر للطبرانی ج 17، ص 240، مجمع الزوائد ج 5، ص 219) (تفسیر تبیان القرآن)

یہ امت محمدیہ کی طرف اشارہ ہے کہ وہ نہ صرف خود ہدایت یافتہ ہیں بلکہ دوسروں کو بھی ہدایت دیتے ہیں کیونکہ یہی ان کا فرض منصبی ہے جیسا کہ فرمایا گیا: کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔ (آل عمران: 110)

حجیت اجماع اور حقانیت خلافت راشدہ:

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس امت کا کسی مسئلہ پر اجماع کرلینا شرعی حجت ہے۔ کیونکہ حکومت کی یہ فضیلت بتائی گئی ہے۔ اُمَّۃٌ یَّھۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَبِہٖ یَعۡدِلُوۡنَ۔ کہ وہ راہ ہدایت پر چلنے والی اور اسی کا حکم دینے والی امت ہے۔ چنانچہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصال کے بعد آپ کے تمام صحابہ یعنی تمام مہاجرین وانصار وغیر مہاجرین وانصار اور تمام اہل بیت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یعنی سارے خاندان بنو ہاشم نے بالاجماع سیدنا ابوبکر صدیق (رض) عنہٗ کی بیعت کرکے ان کو مسلمانوں کا امام وحاکم مقرر کیا، یہ امت کا اجماع ہے اور نص قرآنی کے مطابق یہ امت یَّھۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَبِہٖ یَعۡدِلُوۡنَ کا منصب رکھتی ہے۔ پھر ابوبکر صدیق (رض) عنہٗ کے بعد عمر فاروق عثمان غنی اور حیدر کرار (رض) کا تقرر بھی اسی طرح ہوا اور اس حقیقت کو بعض علماء شیعہ بھی ذکر کرتے ہیں اور اس سے انکار تو کوئی بھی کر نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصال کے فوراً بعد مسجد نبوی کے قریب سقیفہ بنوساعدہ میں مہاجرین وانصار کی ایک تعداد میں ابوبکر صدیق (رض) کے ہاتھ پر بیعت کی پھر یہی لوگ اٹھ کر مسجد نبوی میں آگئے اس وقت رسول اللہ حجرہ سیدہ عائشہ میں غسل دیا جارہا تھا۔

مشہور شیعہ امامت نگار ابو منصور احمد بن علی طبرسی متوفی 620ھ لکھتا ہے۔

"سلمان فارسی (رض) کہتے ہیں: قلّت علی (علیہ السلام) حین یغسل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان القوم فعلوا کذا وکذا وان ابا بکر الساعۃ علی منبر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ومایرضی الناس ان یبایعوالہ بید واحدۃ انھم یبایعون بیدیہ جمیعا یمینا وشمالا۔ میں نے حضرت علی (رض) سے کہا جس وقت وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو غسل دے رہے تھے کہ لوگوں نے یہ یہ کیا ہے، اس وقت ابوبکر (رض) منبر رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر بیٹھے ہیں اور لوگوں نے ان کے ایک ہاتھ پر بیعت پر بس نہیں کی بلکہ ان کے دونوں ہاتھوں پر دائیں بائیں سے بیعت کر رہے ہیں۔ (احتجاج طبرسی جلد اول صفحۃ 81 مطبوعہ موسسۃ الاعلمی بیروت)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ وفات نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر صحابہ کرام بیعت ابوبکر صدیق (رض) عنہٗ پر ٹوٹ پڑے، حتیٰ کہ انھیں اپنے دونوں بازو پھیلانے پڑے تاکہ لوگ دونوں ہاتھوں پر بیعت کر سکیں۔ کیونکہ ایک ہاتھ پر باری باری بیعت کرنے سے زیادہ وقت صرف ہوتا۔ (اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل تشیع کا یہ کہنا کہ وفات نبوی کے بعد سارے صحابی سقیفہ میں جا کر بیٹھ گئے اور تین دن بیٹھے رہے اور تب لوٹے جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دفنا دیا گیا تھا، قطعی غلط ہے، بلکہ وہ تھوڑی دیر کے لئے سقیفہ گئے اور تجہیز و تکفین رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے قبل ہی لوٹ آئے، پھر صدیق اکبر (رض) کی بیعت عامہ مسجد میں ہوئی)

اور سیدنا علی المرتضی (رض) کا اپنا ارشاد بھی حجیت اجماع و صداقتِ خلافت راشدہ پہ دلیل قاطع ہے۔ آپ نے امیر معاویہ (رض) کو خط میں لکھا جس میں فرمایا: انما بایعنی القوم الذین بایعوا ابابکر و عمر و عثمان علی ما بایعوھم علیہ۔ وانما الشوری للمہاجرین والانصار فان اجتمعوا علی رجل وسموہ اماما کان ذلک للہ رضا۔ میری بیعت لوگوں نے انہی شرائط پہ کی ہے جن پہ انھوں نے ابوبکر و عمر و عثمان (رض) کی شرائط پہ بیعت کی تھی اور مشورہ سے حاکم بنانا (دور صحابہ میں) مہاجرین و انصار کا کام ہے، اگر وہ کسی شخص پہ جمع ہو کر اسے امام بنا دیں تو وہ اللہ کا پسندیدہ امام ہے۔ (نہج البلاغہ خط 6 صفحہ 526 مطبوعہ دار البلاغ بیروت)

اسکول علی المرتضٰی (رض) سے معلوم ہوا کہ امت کا اجماع حجت ہے اور اس کی روشنی میں خلفاء راشدین کی خلافت اللہ کی پسندیدہ ہے اور یہ کہ امام اللہ کی طرف سے منصوص نہیں ہوتا بلکہ لوگوں کے بنانے سے بنتا ہے۔

اور کیوں نہ ہو، حجیت اجماع کو کثیر احادیث میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ان اللہ لا یجمع امتی علی الضلالۃ و ید اللہ علی الجماعۃ و من شَذَّ شُذَّ الی النار۔ "بیشک اللہ میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے اور جو اس سے الگ ہوا وہ جہنم میں جا گرا" (ترمذی کتاب الفتن حدیث 6321۔ المستدرک جلد 1 صفحہ 115)

حضرت انس بن مالک (رض) سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ان امتی لا تجتمع علی الضلالۃ فاذا رایتم اختلافا فعلیکم بالسواد الاعظم۔ "بیشک میری امت گمراہی پہ جمع نہیں ہو گی اور جب تم اختلاف دیکھو تو تم پر بڑی جماعت کے ساتھ وابستہ ہونا ضروری ہے۔" (ابن ماجہ کتاب الفتن حدیث 3950)

اور محرر مذہب شیعہ ملا باقر مجلسی مولا علی المرتضی (رض) کا قول نقل کرتا ہے جس میں وہ امت محمدیہ کے بیس خصائص بیان کرتے ہیں، جس میں انھوں نے فرمایا: سیز دہم آن کہ خدا ایشاں را بہ گرسنگی نمے کشد وایشاں را بر گمراہی جمع نمے کند۔ تیرہ میں یہ خصوصیت ہے کہ اللہ ان کو بھوک سے نہیں مارے گا اور ان کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا۔ (حیات القلوب جلد 3 صفحۃ 253 مطبوعہ انتشارات سرور، قم)

حجیت اجماع اور عقائد اہل سنت:

جب امت محمدیہ بحکم قرآن اُمَّۃٌ یَّھْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِہٖ یَعْدِلُوْنَ کی شان رکھتی ہے تو اس امت کا اجماع ہے انبیاء و اولیاء کے نام سے بارگاہ خداوندی میں وسیلہ پکڑنا (توسل) جائز ہے۔ انبیاء کرام کی حیات بعد الممات ثابت ہے، سماع موتی برحق ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر مبارک کی نیت سے سفر کرنا اعلیٰ نیکی ہے، ایصال ثواب برحق ہے، ابوبکر صدیق (رض) سب صحابہ کرام سے افضل ہیں، موزوں پر مسح جائز ہے، ایک مجلس میں تین طلاقیں تین ہی ہیں، وغیرہ اور ان میں

سے ہر مسئلہ پر ہم اس تفسیر میں اپنے اپنے مقامات پر تفصیلی اور مدلل گفتگو کر چکے ہیں، تو ان میں سے کسی مسئلہ سے اختلاف کرنے والا شخص گمراہ و بد دین اور اہل سنت سے خارج ہے، اسے امام یا مرشد بنانا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ اہل ہوا اور مبتدع ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

امتِ مسلمہ کا حقیقی تعارف:

امام تفسیر ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس آیت کو تلاوت کرکے ارشاد فرمایا کہ یہ امت جس کا ذکر اس آیت میں ہے، میری امت ہے، جو اپنے سب جھگڑوں کے فیصلے حق و انصاف یعنی قانون الٰہی کے مطابق کریں گے اور لینے دینے کے تمام معاملات میں حق و انصاف کو سامنے رکھیں گے۔

عبد بن حمید کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ کرام (رض) کو خطاب کرکے فرمایا کہ یہ آیت تمہارے حق میں آئی ہے اور تم سے پہلے بھی ایک امت کو یہ صفات عطا ہو چکی ہیں، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: { وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ } مراد یہ ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی امت میں بھی ایک جماعت ان صفات کی حامل تھی کہ لوگوں کی راہنمائی میں اور باہمی جھگڑوں کے تصفیہ میں حق یعنی شریعت الٰہیہ کا مکمل اتباع کرتی تھی اور امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی حق تعالیٰ نے ان صفات میں خصوصی امتیاز بخشا ہے۔

خلاصہ اس کا دو خصلتیں ہیں ایک یہ کہ دوسرے لوگوں کی قیادت اور رہنمائی یا مشورہ میں شریعت کا اتباع کریں دوسرے یہ کہ اگر کوئی جھگڑا آپس میں پیش آجائے تو اس کا فیصلہ شریعت کے قانون کے مطابق کریں۔

غور کیا جائے تو یہی دو صفتیں ہیں جو کسی قوم اور جماعت کی خیر وخوبی اور فلاح دنیا و آخرت کی ضامن ہو سکتی ہیں کہ صلح و جنگ اور دوستی اور عداوت کی ہر حالت میں ان کا نصب العین حق و انصاف ہی ہو' اپنے دوستوں اور رفیقوں کو جو طریقہ کار بتلائیں اس میں بھی حق کا اتباع ہو اور دشمنوں اور حریفوں کے جھگڑوں میں بھی حق کے آگے اپنے سارے خیالات و خواہشات کو ترک کردیں، جس کا خلاصہ ہے حق پرستی۔

امتِ محمدیہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دوسری تمام امتوں پر فضیلت اور فوقیت کا راز اور ان کا طغرائے امتیاز یہی حق پرستی ہے کہ انھوں نے اپنی پوری زندگی کو حق کے تابع بنایا جس جماعت یا پارٹی کی قیادت اور راہنمائی کی وہ بھی خالص حق کے تقاضوں کے مطابق کی' اپنی ذاتی خواہشات اور خاندانی یا قومی رسوم کو اس میں مطلق دخل نہیں دیا اور باہمی نزاعات میں بھی ہمیشہ حق کے سامنے گردن جھکادی 'صحابہ وتابعین کی پوری تاریخ اس کی آئینہ دار ہے اور جب سے اس امت میں ان دو خصلتوں کے اندر خلل اور نقصان آیا اسی وقت سے اس کا تنزل و انحطاط شروع ہو گیا۔

نہایت رنج و افسوس کا مقام ہے کہ آج یہی حق پرست امت خالص ہوا پرست بن کر رہ گئی ہے اس کی پارٹیاں اور جماعتیں بنتی ہیں تو وہ بھی خالص نفسانی اغراض اور دنیا کی حقیر و ذلیل منفعت کی بنیادوں پر بنتی ہیں ایک دوسرے کو جن امور کی پابندی کی طرف دعوت دی جاتی ہے وہ بھی خالص ہوائے نفسانی یا خاندانی رسوم ہوتی ہیں کوئی ان کے خلاف کرنے لگے تو سب اس کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں لیکن حق و شریعت کے مطابق چلنے کا نہ کہیں معاہدہ ہوتا ہے نہ کوئی اس کی پیروی کرنے کے لیے کسی کو کہتا ہے نہ اس کی خلاف ورزی کرنے سے کسی کی پیشانی پر بل آتا ہے۔

اسی طرح باہمی جھگڑوں اور نزاعی مقدمات میں دنیا کے چند روزہ موہوم نفع کی خاطر اللہ کے قانون کو چھوڑ کر طاغوتی قوانین کے ذریعہ فیصلہ کرنے پر راضی ہیں۔ اسی کا یہ انجام بد ہے جو ہر جگہ ہر ملک میں مشاہدہ میں آرہا ہے کہ یہ امت ہر جگہ ذلیل و خوار نظر آتی ہے۔ الاماشاء اللہ انھوں نے حق سے منہ موڑا 'حق نے ان کی نصرت و امداد سے رخ پھیر لیا۔

حق پرستی کے بجائے ہوا پرستی اختیار کرکے شخصی طور پر کسی فرد کو جو دنیوی منافع مل گئے وہ اس پر مگن ہے، مگر پوری قوم و ملت کی تباہی جو اس کا لازمی نتیجہ ہے اس کا کوئی دیکھنے 'سننے والا نہیں۔ اگر پوری امت کی فلاح و ترقی پیش نظر ہو تو اس کے سوا کوئی راہ نہیں کہ ان قرآنی اصول کو مضبوطی سے پکڑا جائے 'خود بھی اس پر عمل کیا جائے اور دوسروں کو بھی اس کا پابند بنانے کی کوشش کی جائے۔ (تفسیر روح القرآن)

آیت مبارکہ:

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ۚ۱۸۲

لغۃ القرآن: [وَالَّذِيْنَ : اور جنہوں نے] [كَذَّبُوْا : جھٹلایا] [بِاٰيٰتِنَا : ہماری نشانیوں کو] [سَنَسْتَدْرِجُهُمْ : ہم بتدریج لے جائیں گے ان کو] [مِّنْ : سے] [حَيْثُ : جہاں] [لَا : نہیں] [يَعْلَمُوْنَ : وہ جانتے]

ترجمہ: اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے ہم عنقریب انھیں آہستہ آہستہ ہلاکت کی طرف لے جائیں گے ایسے طریقے سے کہ انھیں خبر بھی نہیں ہو گی

تشریح: بسا اوقات انسان گمراہی اختیار کرتا ہے۔ اور اپنے مالک حقیقی کی نافرمانی میں رات دن سرگرم رہتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے مال و دولت میں دن بدن اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کی قوت، اقتدار اور اختیار کی سرحدیں پھیلتی ہی چلی جاتی ہیں اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ یہی صحیح طریق کار ہے جو اس نے اختیار کر رکھا ہے۔ یہاں تک کہ وہ گمراہی کے آخری کناروں تک جا پہنچتا ہے۔ یا بعض گمراہ مرتاضوں (ریاضت کرنے والا) سے ایسے ایسے خرق عادت امور ظاہر ہوتے ہیں جو عام طور پر خاصان بارگاہ خداوندی سے مخصوص ہیں جن پر وہ پھسلتا ہی چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہلاکت و بربادی کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گرتا ہے۔ اسی چیز کو استدراج کہتے ہیں۔ اس کا معنی ہے آہستہ آہستہ کسی کو ہلاکت کے قریب کر دینا۔ یعنی سنقربھم الی الھلاک قلیلا قلیلا (مظہری) الاستدراج ھو الاخذ بالتدریج منزلۃ بعد منزلۃ (قرطبیؒ) (تفسیر ضیاء القرآن)

اسلوبِ قرآن کے فہم کے لیے ضروری ہدایات

اگلی آیات کریمہ کی تشریح سے پہلے ضروری ہے کہ چند ایسی باتیں ذکر کر دی جائیں جن سے قرآن کریم کے اسلوب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قرآن کریم اپنے متنوع مضامین اور موضوعات کے اعتبار سے اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کرتا ہے وہ کسی بھی موضوع پر جب اظہار خیال کرتا ہے تو کبھی تو ایک رواں دواں ندی کی طرح آگے بڑھتا ہے اور کبھی اس کے انداز میں دریا کی روانی سمٹ آتی ہے جو صرف ایک موضوع میں سمٹ کر نہیں رہ جاتی بلکہ انسانی طبیعت اور فطرت کے تنوع کو دیکھتے ہوئے ذیلی مضامین اور متعلقات کو بھی ساتھ ساتھ سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ جب تک ایک قاری کے ذہن میں موضوع کے تمام گوشے نہ ہوں وہ قرآن کریم کی بعض باتوں کو سمجھنے میں دشواری محسوس کرتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر سورت کے آخری چند رکوع میں عموماً چند خصوصیات نمایاں دکھائی دیتی ہیں جن میں ایک تو یہ کہ اس سورت کے نزول کے وقت دعوت کے مخاطبین کی جو ذہنی کیفیت ہوتی ہے اسے مختلف طریقوں سے کبھی خفی اور کبھی جلی طریقے سے زیر بحث لایا جاتا ہے۔ چونکہ لوگوں کی طبیعتوں میں ایک تفاوت قدرتی طور پر موجود ہے وہی تفاوت قرآن کریم کی آیات میں بھی ہمیں دکھائی دیتا ہے ان آیات میں چونکہ مختلف طبیعتوں اور صلاحیتوں کے حوالے سے بات کی جاتی ہے اس لیے ہر طبیعت اور صلاحیت کا حامل اپنے سے متعلق بات کو خود بخود سمجھتا چلا جاتا ہے لیکن دوسری طبیعت اور صلاحیت کا شخص بعض دفعہ اس کا پوری طرح ادراک نہیں کر سکتا اس بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب تک مخاطبوں کی ذہنی کیفیت 'صلاحیتوں اور طبعی رجحانات کو پوری طرح نہ سمجھ لیا جائے قرآن پاک کی گفتگو کے ہدف کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ قرآن کریم عام معمول کی کوئی درسی کتاب نہیں اور نہ ایسی دعوتی کتاب ہے جس میں اسلام کے تمام ضروری امور کی وضاحت کے بعد قارئین کو اپنے طور پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے بلکہ یہ تو ایک ایسی کتاب ہے جو خطبات کی شکل میں اللہ کے رسول پر ضرورت کے مطابق نازل ہوتی رہی ہے اور وہ اسی کی مدد سے قوم کے سامنے اسلام کی دعوت کو پیش کرتا رہا ہے چنانچہ دعوت کو پیش کرتے ہوئے اسے جس صورتحال سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور جن سوالات سے واسطہ پڑتا ہے اور جن جن مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے اور مخالفین کی جانب سے جیسے جیسے الجھاؤ پیش کیے جاتے ہیں، قرآن کریم کبھی تو ساتھ ساتھ ان تمام ضرورتوں کا تدارک کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن بہت ساری باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنھیں دعوت کی روا روی میں پیش کرنا آسان نہیں ہوتا، وہ چونکہ گہرے غور و

فکر کی متقاضی ہوتی ہے اور مخالفین غور و فکر تو دور کی بات ہے سننے کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ اس لیے ایسے سوالات اور ایسی ضرورتوں کے حوالے سے ہر سورت کے آخر میں توضیحی آیات نازل کی جاتی ہیں جس میں ایسے تمام سوالات کے جوابات دیئے جاتے اور ذہنی الجھنوں کو دور کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والوں کو تسلی بھی دی جاتی اور استقامت کی تلقین بھی کی جاتی ہے۔

یہ باتیں تو وہ ہیں جنھیں تمام مفصل سورتوں کی آخری آیات کو پڑھتے ہوئے ذہن میں رکھنا چاہیے لیکن پیش نظر آیات کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جب یہ آیات نازل ہو رہی تھیں وہ حق و باطل کے درمیان شدید کشمکش کا وقت تھا مشرکین مکہ مخالفت میں شدت پیدا کر چکے تھے لیکن اسلام کے اثر و نفوذ سے خوف زدہ بھی تھے اس لیے اگر ایک طرف وہ سختی اور تشدد کے ذریعے مسلمانوں کو ہراساں کر کے اس دعوت کو روک دینا چاہتے تھے تو دوسری طرف عجیب و غریب سوالات اٹھا کر ذہنوں کو مسموم بھی کرنا چاہتے تھے اور اپنے معاشرے کے ہم مذہب لوگوں کو بدگمان کر کے اسلام سے دور رکھنے کی بھی کوشش کر رہے تھے۔ اس لیے ان آیات کریمہ میں ایسے ہی تمام سوالات کا جواب بھی دیا گیا ہے اور مسلمانوں اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کامیابی کی نوید سنا کر تسلی بھی دی گئی ہے۔ اس رکوع کی سب سے پہلی آیات کریمہ میں ایسے ہی سوالات کا جواب دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ وَاُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۔ (الاعراف : ۱۸۳، ۱۸۲)

" اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہم ان کو آہستہ آہستہ پکڑیں گئے ایسی جگہ سے جہاں سے ان کو خبر بھی نہ ہوگی اور میں انھیں ڈھیل دوں گا بیشک میری تدبیر محکم ہے"۔

اس آیت کریمہ میں سَنَسْتَدْرِجُهُمْ کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا مصدر استدراج ہے۔ استدراج کا معنی درجہ بدرجہ "آہستہ آہستہ کوئی کام کرنے کے آتے ہیں۔ قرآن و سنت کی اصطلاح میں استدراج اس کو کہا جاتا ہے کہ آدمی کے گناہ پر دنیا میں جلدی گرفت نہ ہو بلکہ جوں جوں وہ گناہ میں آگے بڑھتا چلا جائے دنیاوی مال و اسباب اور منصب و اقتدار میں اضافہ ہوتا جائے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسا شخص اپنی بدعملی اور بدکرداری میں اور پختہ ہو جائے گا اور وہ یہ سمجھنا شروع کر دے گا کہ اگر یہ میرے اعمال برے ہوتے تو مجھ پر اللہ کی یہ عنایات نہ ہوتیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ان آیات کریمہ میں ایک شبہ یا ایک سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے ذہنوں میں بعض دفعہ یہ سوال پیدا ہوتا تھا اور آج بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر راست بازی کی زندگی اختیار کرنا اللہ کو پسند ہے اور اس کے تمام وعدے ایسے ہی لوگوں کے لیے ہیں جو اللہ کے دین پر عمل کرتے ہوئے راست بازی کی زندگی گزارتے ہیں تو پھر ہونا یہ چاہیے کہ دنیا میں اللہ کی نعمتیں بھی ایسے ہی لوگوں کو نصیب ہوں اور جن لوگوں کی زندگیاں اس راستے سے بالکل متصادم ہیں وہ اسلامی تعلیمات کو نہ تسلیم کرتے ہیں اور نہ انھیں قابل عمل سمجھتے ہیں وہ اللہ کی نعمتوں سے نہ صرف محروم رہیں بلکہ دنیا ہی میں انھیں اس طرح اللہ کی گرفت میں آنا چاہیے کہ ہر دیکھنے والا محسوس کرے کہ یہ لوگ اللہ کے نافرمان تھے اس لیے اپنے پاداش عمل میں پکڑے گئے ہیں لیکن دنیا کے حالات دیکھتے ہوئے صاف نظر آتا ہے کہ معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ بڑے سے بڑا کافر اور مشرک اور بڑے سے بڑا اللہ کا باغی اس دنیا میں بڑے سے بڑے منصب پر فائز اور دنیا کے وسائل پر قابض ہے مسلمان قومیں روز بروز پستی کی طرف جا رہی ہیں اور کافر قومیں آئے دن ترقی کی طرف بڑھ رہی ہیں آخر یہ تضاد کیوں ہے؟ اس شبہ اور اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تم جن لوگوں کو بظاہر بہت سرفراز اور نہایت خوشحال دیکھ رہے ہو یہ ان کے اعمال کا صلہ نہیں بلکہ انھیں انجام کی طرف لے جانے کی ایک ایسی تدبیر ہے جس کو نہ وہ سمجھتے ہیں نہ سرسری نگاہوں سے دیکھنے والے سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ ہے کہ راہ راست سے ہٹے ہوئے لوگوں کو سیدھے راستے کی طرف لانے کے لیے اللہ اپنے نبیوں کو بھیجتا اور اپنی کتابیں اتارتا ہے نبی ان کی اصلاح کے لیے اپنی امکانی مساعی کو بروئے کار لاتے ہیں لیکن جب وہ بگڑے ہوئے لوگ ان پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہوتے تو اللہ تعالیٰ انھیں مختلف قسم کے مصائب میں مبتلا کرتا ہے تاکہ وہ تکلیفوں سے پریشان ہو کر اللہ کے سامنے جھکیں اور اپنی سرکشی سے باز آجائیں لیکن جب یہ تکلیفیں اور مصیبتیں بھی انھیں راہ راست پر لانے کے لیے کافی نہیں ہوتیں بلکہ وہ اس کی بھی کوئی نہ کوئی توجیہ کر کے اپنے آپ کو حق بجانب قرار دیتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ ان کو دوسری آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے مصیبتوں کو ختم کر کے آسانیوں اور سہولتوں کے دروازے ان پر کھول دیتا ہے اور

زندگی کی کامرانیاں اس طرح ان کی طرف بڑھتی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے ہر چیز کے دروازے ان پر کھول دیئے ہیں کاروبار روز بروز چمکتا چلا جاتا ہے ' فصلیں لہلہانے لگتی ہیں ' صنعتی پیداوار میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے ' لوگ جس چیز میں ہاتھ ڈالتے ہیں وہ سونا بن جاتی ہے ان نعمتوں سے سرشار لوگ دولت کی اس ریل پیل کو اپنے لیے کامیابی سمجھتے ہوئے اپنے رویہ میں مزید پختہ ہو جاتے ہیں اور پہلے اگر کوئی نصیحت کی بات سننے کی زحمت کر ہی لیتے تھے تو اب وہ اس کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ ہماری زندگی کے طور اطوار اور ہمارے فیصلے بالکل صحیح اور حق بجانب ہیں۔ اس طرح ان کا حالات کے تاثر میں ڈوب جانا اور اپنی خواہشات کی گرفت میں آ جانا یہ درحقیقت اللہ کی جانب سے ہلاکت کا وہ پھندا ہے جس کی طرف وہ قوموں کو آہستہ آہستہ لے کر جاتا ہے وہ مادی عیش و عشرت میں ڈوب کر اسے اپنی کامیابی سمجھتی رہتی ہیں حالانکہ وہ اپنی ہلاکت کی طرف بڑھ رہی ہوتی ہیں جس طرح مچھلی کا شکاری مچھلی کے شکار کے لیے جب کنڈی لگاتا ہے تو کنڈی پانی میں پھینکنے سے پہلے وہ اس کی نوک پر گوشت کا کوئی ٹکڑا بھی لگاتا ہے تاکہ مچھلی اسے اپنی خوراک سمجھے چنانچہ مچھلی جب اسے اپنی خوراک سمجھ کر آ کر کھانا شروع کرتی ہے تو وہ اپنی ڈور ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے مچھلی یہ سمجھتی ہے کہ آج مجھے بہت مزیدار خوراک ملی ہے لیکن شکاری خوب سمجھتا ہے کہ یہ بیوقوف مچھلی جسے خوراک سمجھ رہی ہے درحقیقت اس کی موت کا پروانہ ہے وہ جیسے جیسے منہ مارتی ہے ویسے ویسے وہ کانٹا اس کے حلق میں اترتا چلا جاتا ہے جب شکاری سمجھتا ہے کہ مچھلی نے خواہش نفس سے مغلوب ہو کر کانٹا حلق میں اتار لیا ہے تو وہ بڑی آسانی سے اسے کھینچ لیتا ہے مچھلی اگر ڈور سے زور آزمائی کرتی بھی ہے تو وہ شکاری اسے کھینچنے میں جلدی نہیں کرتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میری ڈور اتنی مضبوط ہے کہ مچھلی ہزار کوشش سے بھی اسے توڑ نہیں سکتی۔ یہی حال ایسے افراد اور قوموں کا بھی ہے جو مادی ترقی اور وسائل کی ہمہ ہمی کو زندگی کی کامیابیاں سمجھ کر اسی کے حصول میں ڈوب جاتے ہیں اور پھر اسی کو اپنا مقصد بنا لیتے ہیں قدرت جیسے جیسے ان کو آگے بڑھنے کا موقع دیتی ہے وہ ویسے ویسے بدکردار اور بداطوار ہوتے چلے جاتے ہیں قدرت ان کو ڈھیل دیتی چلی جاتی ہے تاکہ وہ اچھی طرح اپنے پیمانے کو بھر لیں اور جب اللہ کی جانب سے پکڑ آئے تو پھر ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے لیکن اپنی پکڑ اور گرفت میں اللہ تعالیٰ کبھی جلدی نہیں کرتا کیونکہ جلدی وہ کیا کرتا ہے جسے شکار کے نکل جانے کا اندیشہ ہو یا وہ حکمران مجرموں کو پکڑنے میں بے صبری کا مظاہرہ کرتا ہے جسے یہ خطرہ ہو کہ مجرم اگر طاقت پکڑ گئے تو میری گرفت سے نکل جائیں گے اور پھر اگر میں کوشش بھی کروں گا تو ان پر قابو نہ پاسکوں گا اس لیے ان آیتوں میں فرمایا کہ تم جن قوموں کو بظاہر بہت خوشحال اور سرفراز دیکھ رہے ہو وہ تو استدراج کا شکار ہیں ہم انھیں آہستہ آہستہ ان کے انجام کی طرف لے جا رہے ہیں جب وہ اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے تو پھر اچانک ہم ان کو دبوچ لیں گے مزید فرمایا کہ میں ان کو مسلسل ڈھیل دیتا رہتا ہوں تاکہ وہ اپنے خبث نفس کو پوری طرح کھلنے دیں اور اپنے بغاوت کے سوتوں کو پوری طرح ابلنے دیں اور اپنی فائل کو اچھی طرح مکمل ہونے دیں تاکہ کل کو ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے لیکن میری تدبیر ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور وہ اس قدر محکم ہے کہ یہ اس سے بچ کر نکل نہیں سکتے تم یہ سمجھ رہے ہو کہ پروردگار کا ان کو گرفت نہ کرنا شاید ان کے برسرحق ہونے کی دلیل ہے یا اللہ کے کمزور ہونے کی۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں وہ خود اپنے انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں اور میں پکڑنے میں اس لیے جلدی نہیں کرتا کیونکہ میری تدبیر نہایت محکم اور مضبوط ہے جب میں پکڑنا چاہوں گا تو اس وقت انھیں میری پکڑ سے کوئی بچا نہیں سکے گا۔

اس استدراج کے حوالے سے ایک اور بات بھی قابل غور ہے وہ یہ کہ جس طرح استدراج کفار کے ساتھ ہوتا ہے جس کی تفصیل ابھی آپ نے پڑھی اسی طرح استدراج مسلمان گناہ گاروں کے ساتھ بھی ہوتا ہے جو اسی مرض کا شکار ہوتے ہیں جس مرض نے کافروں کو ان کے انجام تک پہنچایا وہ یہ ہے کہ جب ایک مسلمان، مسلمان کہلاتے ہوئے بھی اسلامی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرتا بلکہ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی اسلام سے سرکشی اور بغاوت میں بسر ہوتی ہے وہ فرائض کا تارک ' واجبات سے لاپرواہ ' حقوق العباد سے یکسر بے نیاز ' حلال و حرام کی پابندیوں سے لاتعلق، اس کے ذہن پر صرف دنیا اور دولت دنیا کا بھوت سوار ہوتا ہے اور اسی میں شب و روز لگے رہنا اس کی زندگی کا معمول بن جاتا ہے ایسے لوگوں کے لیے استدراج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں پکڑنے کی بجائے ڈھیل دیتے چلے جاتے ہیں وہ رشوت لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے رشوت کے اسباب اور پیدا فرما دیتے ہیں وہ ظلم کرتے ہیں تو اللہ ان کی رسی کھلی چھوڑ دیتا ہے ان کے عہدہ و منصب میں اور ترقی دے دیتا ہے وہ اپنی اس حالت میں ایسے سرشار اور گم ہو جاتے ہیں کہ کوئی نصیحت کی بات ان پر اثر نہیں کرتی ان کی اس حالت کا برقرار رہنا بلکہ روز افزوں ترقی ہونا یہ وہ استدراج ہے جس کے پھندے میں پھنس کر شاید ہی کوئی بدقسمت نکل سکا ہو۔ چنانچہ اسی کو محسوس کرتے ہوئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور

سلف صالحین جب یہ دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ انھیں دنیا کی نعمتیں فراوانی سے عطافرمارہا ہے تو وہ اللہ سے پناہ طلب کرنے لگتے اور اپنی حالت کا مسلسل جائزہ لینے لگتے کہ دولت کی یہ فراوانی اللہ کی جانب سے کہیں استدراج نہ ہو۔ اے کاش ! امت مسلمہ کے سربرآوردہ لوگ اور طبقہ امراء کے افراد کبھی اس طرف توجہ دینے کی زحمت کریں تو شائد ہماری قومی زندگی میں کچھ بہتری کے آثار پیدا ہو جائیں۔ (تفسیر روح القرآن)

گناہوں کے باوجود نعمتیں ملنا کہیں اللہ تعالیٰ کی ڈھیل نہ ہو :

اس آیت میں ان مسلمانوں کے لیے بھی بڑی عبرت ہے جو دن رات گناہوں میں مصروف رہنے کے باوجود عیش و فراوانی کی زندگی گزار رہے ہیں اور آئے دن ان کی عیش و عشرت اور مال دولت میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے، انھیں بھی اس بات سے ڈر جانا چاہیے کہ کہیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کیلئے ڈھیل نہ ہو اور عین غفلت کی حالت اللہ تعالیٰ ان کی گرفت نہ فرمالے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے : فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۖ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ " (1)

پھر جب انھوں نے ان نصیحتوں کو بھلا دیا جو انھیں کی گئی تھیں تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ اس پر خوش ہو گئے جو انھیں دی گئی تو ہم نے اچانک انھیں پکڑ لیا پس اب وہ مایوس ہیں۔

حضرت عقبہ بن عامر (رض) سے روایت ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جب تم یہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو ان کے گناہوں کے باوجود ان کے سوالوں کے مطابق عطا فرمارہا ہے تو یہ ان کے لیے صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِستِدراج اور ڈھیل ہے۔ (2)

حضرت عمر بن خطاب (رض) کی بارگاہ میں جب کسریٰ کے خزانے لائے گئے تو اس وقت انھوں نے دعا کی "اے اللہ ! عَزَّوَجَلَّ ، میں اس بات سے تیری پناہ چاہتا ہوں کہ میں ڈھیل دیئے جانے والوں سے ہوں کیونکہ میں نے تیرا یہ ارشاد سنا ہے :

"سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ "

ترجمہ کنزالعرفان : عنقریب ہم انھیں آہستہ آہستہ (عذاب کی طرف) لے جائیں گے جہاں سے انھیں خبر بھی نہ ہو گی۔ (تفسیر صراط الجنان)

آیت مبارکہ:

وَأُمْلِي لَهُمْ ۚ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ۝١٨٣

لغۃ القرآن: [وَأُمْلِيْ : اور میں مہلت دیتا ہوں] [لَهُمْ : انہیں] [اِنَّ : بیشک] [كَيْدِيْ : میری تدبیر] [مَتِيْنٌ: بہت مضبوط]

ترجمہ: اور میں انھیں مہلت دے رہا ہوں، بیشک میری گرفت بڑی مضبوط ہے

تشریح: اللہ کی تدبیر بڑی ہی سخت ہوتی ہے : اتنی سخت اور اس قدر مضبوط کہ اس کا مقابلہ تو درکنار۔ ایسے لوگ اس کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ اور ان کو اس کا شعور و احساس تک نہیں کہ ہمیں پکڑا اور جکڑا جارہا ہے۔ بلکہ یہ بتانے پر بھی اس کو ماننے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ ان کو ان کے کفر و باطل پر فوراً پکڑتا نہیں بلکہ ڈھیل پر ڈھیل دیئے جاتا ہے جس سے یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم ٹھیک ہیں اور اپنی اصلاح کرنے کی بجائے یہ الٹا اپنے کفر و باطل پر اڑ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ دھر لیے جاتے ہیں اور اپنے آخری انجام کو پہنچ کر رہتے ہیں۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ سو اللہ پاک کی بغاوت و سرکشی اور معاصی و ذنوب کے باوجود ایسے عناصر کو ڈھیل ملنا اطمینان کی بات نہیں بلکہ یہ نہایت ہی سخت خطرے کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور اس کا انجام بڑا ہی ہولناک ہوتا ہے۔ والعیاذ باللہ ۔ (تفسیر مدنی کبیر)

گرفت کو کید سے اس لیے تعبیر کیا کہ اللہ کی گرفت بظاہر انعام نظر آتی ہے اور حقیقت میں تباہی آفریں ہے۔ حضرت ابن عباس (رض) نے ترجمہ کیا میری پوشیدہ تدبیر سخت ہے بعض روایات میں آیا ہے کہ اس آیت کا نزول ان لوگوں کے حق میں ہوا جو اللہ کا اللہ کے رسول کا اور اہل ایمان کا مذاق اڑاتے تھے چنانچہ ایک ہی رات میں اللہ نے سب کو قتل کرا دیا۔ (تفسیر مظہری)

ان کافروں کی عقل ویسے بھی ماری گئی ہے۔ غور و فکر کی صحیح راہ سے یہ دور ہٹ چکے ہیں جبھی تو رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے افعال کی حکمتوں تک ان کے ذہن و فکر کی رسائی نہیں ہوتی۔۔ (تفسیر اشرفی)

اسلام دشمن قوتوں کو اللہ تعالیٰ پہلے ڈھیل دیتا رہتا ہے حتی کہ وہ اللہ کی پکڑ سے بالکل بے خوف ہو جاتے ہیں۔ تب انھیں اچانک پکڑا جاتا ہے یہ کہہ کر کفار مکہ کو خصوصاً اور قیامت تک نے والی دوسری اسلام دشمن قوموں کو خبر دار کیا گیا ہے اور پہلی کافر قوموں کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا گیا چنانچہ فرمایا گیا: فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَیْءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ۔ "جب وہ یاد دلائی گئی نصیحت بھول گئے تو ہم نے ان پر ہر نعمت کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ دی گئی نعمتوں پر خوش ہو گئے تو ہم نے انھیں اچانک پکڑ لیا تب وہ مایوس پڑے تھے۔" (انعام: 44)

چنانچہ کفار مکہ کی رسی دراز کی گئی حتی کہ وہ غزوہ بدر کے موقع پر تکبر و غرور میں ڈوب کر اپنی طاقت کی بد مستی میں نکلے انھیں شعور بھی نہ تھا کہ وہ اللہ کی پکڑ میں آنے والے ہیں تو اللہ نے انھیں یوں پکڑا کہ ان کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ اس میں موجودہ اسلام دشمن طاغوتی قوتوں کے لیے درس عبرت ہے کہ وہ اللہ کی پکڑ سے غافل نہ ہوں اور مسلمانوں کے لیے نوید مسرت ہے کہ ان کے دشمن ہمیشہ دندناتے رہیں گے۔ (تفسیر برہان القرآن)

گناہوں کے باوجود عمر لمبی ہو تو اسے بہتر نہ سمجھا جائے:

یاد رہے کہ کفر اور گناہوں کے باوجود لمبی عمر ملنا، فوری عذاب نہ ہونا اور مصائب و آلام کا نہ آنا ایسی چیز نہیں کہ جسے اپنے حق میں بہتر سمجھا جائے بلکہ توبہ نہ کرنے کی صورت میں یہی مہلت گناہوں میں اضافے اور تباہی و بربادی کا سبب بن جاتی ہے، ارشادِ رَبّانی ہے:

"وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ خَیْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ؕ اِنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ لِیَزْدَادُوْۤا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ" (2)

اور کافر ہرگز یہ گمان نہ رکھیں کہ ہم انھیں جو مہلت دے رہے ہیں یہ ان کے لیے بہتر ہے، ہم تو صرف اس لیے انھیں مہلت دے رہے ہیں کہ ان کے گناہ اور زیادہ ہو جائیں اور ان کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔

حضرت ابوبکرہ (رض) فرماتے ہیں: ایک شخص نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، لوگوں میں سب سے بہتر کون ہے؟ ارشاد فرمایا "جس کی عمر لمبی ہو اور عمل نیک ہوں۔ اس نے عرض کی: لوگوں میں سب سے بدتر کون ہے؟ ارشاد فرمایا "جس کی عمر لمبی ہو اور عمل برے ہوں۔ (تفسیر صراط الجنان)

قانون امہال و تدریج:۔

اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ مجرم لوگوں پر سرزنش اور تنبیہ کے طور پر پہلے چھوٹے چھوٹے دکھ اور تکلیفیں نازل فرماتا ہے اگر لوگ ان سے عبرت حاصل کرلیں تو خیر ورنہ انھیں ایک دوسرے طریقہ سے آزماتا ہے۔ یعنی ان پر خوش حالی اور آسودگی کا دور آتا ہے جس میں وہ ایسے مگن اور مستغرق ہو جاتے ہیں کہ انھیں سابقہ تکلیفیں یاد ہی نہیں رہتیں اور وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر مہربان ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ انھیں محض اس لیے مہلت دے رہا ہوتا ہے کہ جس انتہا کو پہنچنا چاہتے ہیں پہنچ جائیں تو پھر یکدم انھیں ان کے انجام سے دوچار کر دیتا ہے اس وقت لوگوں کو کوئی طاقت اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا نہیں سکتی۔ (تفسیر تیسیر القرآن)

ایسے ہی جب شکاری کو اپنی ڈور پر پورا اعتماد ہوتا ہے تو وہ مچھلی کو آخری حد تک ڈھیل دیتا ہے۔ مچھلی سمجھتی ہے کہ اب اس نے بازی مار لی، حالانکہ شکاری اس لیے اس کو ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ کتنا ہی زور لگائے، لیکن وہ اس کے قابو سے باہر نہیں جا سکتی۔ اس کی بھاگ دوڑ اس کے لیے نجات کی راہ نہیں کھولے گی، بلکہ اس کو تھکا کر اتنا چور کر دے گی کہ بالآخر وہ بے جان ہو کر خود بخود گھسٹتی ہوئی کنارے پر آ لگے گی۔ یہی حال خدا کی تدبیر کا ہے۔ اس کی تدبیر نہایت محکم اور اس کی گرفت نہایت شدید ہوتی ہے۔ کوئی اس کے احاطے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس وجہ سے وہ لوگوں کو ان کی سرکشی کے باوجود ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے۔ اس

ڈھیل کو سرکش اپنی کامیابی سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ جتنی ہی زور آزمائی کرتے ہیں، اتنے ہی اپنی ہلاکت کے گڑھے سے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ جلد بازی وہ کرتا ہے جس کو اپنی تدبیر کے ناکام ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ جس کا تیر بے خطا اور جس کا وار بے پناہ ہو، اس کو جلد بازی کی کیا ضرورت ہے؟" (تفسیر البیان)

آیت مبارکہ:

اَوَلَمۡ يَتَفَكَّرُوۡا ۗ مَا بِصَاحِبِهِمۡ مِّنۡ جِنَّةٍ ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ ○ ۱۸۴

لغۃ القرآن: اَوَ : اور کیا] [لَمْ يَتَفَكَّرُوْا : انہوں نے غور نہیں کیا] [مَا : (کہ) نہیں ہے] [بِصَاحِبِهِمْ : ان کے ساتھی کو] [مِّنْ جِنَّةٍ : کسی قسم کا کوئی جنون] [اِنْ : نہیں] [هُوَ : وہ] [اِلَّا : مگر] [نَذِيْرٌ: ڈرانے والا] [مُّبِيْنٌ: کھلا]

ترجمہ: کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ انھیں (اپنی) صحبت کے شرف سے نوازنے والے (رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جنون سے کوئی علاقہ نہیں، وہ تو (نافرمانوں کو) صرف واضح ڈر سنانے والے ہیں

تشریح: اہل مکہ کے ہاں زندگی کا مقصد اور کامیابی کا معیار یہ تھا کہ اس زندگی کی سہولیات اور خواہشات کو زیادہ سے زیادہ حاصل کیا جائے مگر جب انھوں نے دیکھا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دنیاوی خواہشات سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ کی یاد اور آخرت کی فکر میں سرگرم رہتے ہیں تو انھوں نے آپ کو مجنون کہنا شروع کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کو متنبہ کیا کہ مجنون تو وہ ہوتا ہے جس کو اپنے اور اپنی قوم کے نفع و نقصان کا علم نہ ہو مگر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بچپن، جوانی شادی اور دیگر مشاغل سب تمہارے سامنے ہیں، کیا کوئی ایسا واقعہ پیش کر سکتے ہیں جہاں آپ نے دیوانگی کا مظاہرہ کیا ہو بلکہ ان کے کردار کو دیکھ کر تم خود ان کو صادق اور امین کہتے تھے۔ نیز جو شخص اللہ تعالیٰ کا علم و حکمت سے لبریز فصیح و بلیغ کلام سناتا ہے اور تمہیں برے انجام سے بچانے کے لیے پیشگی خبردار کرتا ہے۔ تو کیا تم غور نہیں کرتے کہ ایسا شخص مجنون ہو سکتا ہے ہرگز نہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نبوت کے لیے منتخب فرمایا اور نبی مجنون نہیں ہوتا بلکہ تمام لوگوں سے زیادہ ذمہ دار اور عقل مند ہوتا ہے۔ (تفسیر امداد الکرم)

کفار کیوں اسلام قبول نہیں کرتے؟

ان کی طرف جو نبی مکرم ﷺ مبعوث فرمایا گیا ہے اس کے فضل و کمال، صدق مقال کا انھیں اعتراف ہے۔ اس کی قبل از نبوت چالیس سالہ زندگی کے سارے روز و شب ان کے سامنے ہیں۔ اور یہ کائنات کی کتاب جو کھول کر ان کے سامنے رکھ دی گئی ہے۔ اور جس کے ہر صفحہ پر اللہ تعالیٰ کی توحید کے روشن دلائل ثبت ہیں ان میں کیوں تامل نہیں کرتے؟ کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایمان لانے کی ابھی اتنی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو بڑا وقت پڑا ہے۔ ایمان لانا اگر ضروری بھی ہوا تو بڑھاپے میں لے آئیں گے۔ لیکن وہ کتنے نادان ہیں۔ انھیں کیا پتہ کہ موت کا پیغام ابھی آ جائے اور انھیں یہاں سے عین عنفوان شباب میں کوچ کرنا پڑے۔ پھر وہ کیا کریں گے؟ اگر قرآن جیسی پاکیزہ اور موثر کتاب پر وہ ایمان نہیں لاتے تو پھر اور کونسی ایسی کتاب آئے گی جس کو پڑھ کر وہ ایمان لے آئیں گے؟ انہیں بار بار جھنجھوڑا جا رہا ہے۔ ان کے سارے شبہات کو دور کیا جا رہا ہے۔ ان کے سارے بہانوں کا جواب دیا جا رہا ہے تاکہ کسی کو مجال معذرت نہ رہے۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جس دل فگی سے انھیں اسلام کی دعوت دے رہے تھے۔ ان کے انکار کے باوجود جس خلوص سے انھیں گمراہی سے بچانا چاہتے تھے اسے دیکھ کر کفار یہ گمان کرنے لگے۔ کہ ان کا دماغ درست نہیں۔ انھیں جنون کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے۔ ورنہ اس سرد مہری اور جفا کشی کے بدلے اس سرگرمی اور خلوص و محبت کا کیا معنی؟ ان کی اس غلط فہمی کو دور کیا جا رہا ہے کہ وہ نذیر مبین ہے۔ اسے ایسا ہی کرنا چاہیے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

ان کے صاحب کے ساتھ جنون کا کوئی تعلق نہیں۔ } کفار مکہ میں سے بعض جاہل قسم کے لوگ سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف جنون کی نسبت کرتے تھے، اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے افعال کفار کے افعال سے جدا تھے کیونکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دنیا اور اس

کی لذتوں سے منہ پھیر کر آخرت کی طرف متوجہ تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے اور اس کا خوف دلانے میں شب و روز مشغول تھے، یوں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا عمل ان کے طریقے کے مخالف ہوا تو انھوں نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مجنون سمجھا۔ حضرت حسن بصری (رض) فرماتے ہیں "نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رات کے وقت کوہ صفا پر چڑھ کر قبیلے قبیلے کو پکارتے ہوئے فرماتے "اے بنی فلاں! اے بنی فلاں! اللہ تعالیٰ کی پکڑ اور اس کے عذاب سے ڈراتے تو کفار میں سے کوئی کہتا کہ تمہارے صاحب مجنون ہیں، رات سے لے کر صبح تک چلاتے رہتے ہیں اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معمولات میں انھیں غور و تفکر کرنے کی دعوت دی تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کسی جنون کی وجہ سے نہیں بلکہ انھیں عذاب الٰہی سے ڈرانے کے لیے پکارتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وحی نازل ہوتے وقت رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر عجیب حالت طاری ہوتی، چہرہ مُتَغَیّر ہو جاتا، رنگ پیلا پڑ جاتا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آپ پر غشی طاری ہو۔ یہ دیکھ کر جاہل لوگ آپ کی طرف جنون کی نسبت کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان جاہلوں کا رد کرتے ہوئے اس آیت میں فرمایا کہ میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر کسی قسم کا جنون نہیں یہ تو انھیں اللہ عَزَّوَجَلَّ کی طرف بلاتے ہیں اور اپنے فصیح الفاظ کے ساتھ قطعی دلائل پیش کرتے ہیں، ان کی فصاحت کا مقابلہ کرنے سے پوری دنیائے عرب عاجز آچکی ہے۔ میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اخلاق بہت عمدہ اور معاشرت بڑی پاکیزہ ہے، ان کی ہر عادت و خصلت انتہائی نیک ہے ہمیشہ اچھے کام کرتے ہیں اور اسی وجہ سے تمام عقلمندوں کے مقتدا و پیشوا ہیں اور یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ جو انسان عمدہ اور پاکیزہ شخصیت کا حامل ہو اسے مجنون قرار دینا کسی طرح بھی درست نہیں۔

(تفسیر صراط الجنان)

امام ابن جریر نے حضرت قتادہ سے اس آیت اور اس سے قبل والی آیات کا شان نزول یوں روایت کیا ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک رات کوہ صفا پر تشریف لے گئے اور ساری رات قریش کے ایک ایک قبیلہ کا نام لے کر اسے پکارتے رہے کہ او بنی فلاں او بنی فلاں اللہ کے عذاب سے ڈر جاؤ اور آنے والے واقعات سے قبل توبہ کرلو۔ قریش کی طرف سے کسی جواب دینے والے نے جواب دیا کہ تمہارا ساتھی (قوم کا یہ فرد) مجنون ہے ساری رات بے کار چیختا رہا ہے۔ تب یہ آیات اتریں۔ (تفسیر ابن جریر جلد 9 صفحہ 93 مطبوعہ مکہ) یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا منکرین دیکھتے نہیں کہ ان کے ساتھی یعنی ان کے نبی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کچھ جنون نہیں بلکہ وہ کھلے طور پر عذاب جہنم سے ڈراتے ہیں۔ یعنی جب کفار سے ان کی باتوں کا جواب نہیں بن پڑتا تو انھیں مجنون کہنا شروع کر دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے جواب دیتا ہے:

کفار نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مجنوں کہا۔ آپ خاموش رہے آپ کی طرف سے آپ کا رب پکارتا ہے۔ مَابِصَاحِبِہِمْ مِّنْ جِنَّۃٍ۔ کہ ان کے ساتھی کو کوئی جنون نہیں۔ اس کے برعکس نوح (علیہ السلام) سے قوم نے کہا۔: انا لنرک فی ضلیل مبین (اعراف: 60) نوح (علیہ السلام) نے خود جواب دیا۔ لیس بی ضلٰلۃٌ (اعراف: 61) ہود (علیہ السلام) سے قوم نے کہا: انا لنراک فی سفاھۃ (اعراف: 66) ہود (علیہ السلام) نے خود جواب دیا: لیس بی سفاھۃ (اعراف: 67)۔ مگر حضور کونین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے محبوب خاص ہیں اور محبوب کی طرف سے اللہ رب العزت خود جواب دیتا ہے۔

تفکر کا معنی

اولم یتفکروا: فکر وہ قوت ہے جو علم کو معلوم کا راستہ دکھاتی ہے، بہ اعتبار نظر عقل کے اس قوت کی جولانی کو تفکر کہتے ہیں، یہ قوت صرف انسان میں ہوتی ہے حیوان میں نہیں ہوتی۔ اور اسی چیز کا تفکر کرنے کے لیے کہا جاتا ہے جس کی صورت عقل میں حاصل ہو سکے، اس لیے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں تفکر کرو اور اللہ تعالیٰ کی ذات میں تفکر نہ کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے منزہ ہے کہ اس کی صورت عقل میں حاسل ہو۔ اس لیے فرمایا: "اولم یتفکروا فی انفسہم ما خلق اللہ السموات والارض وما بینہما الا بالحق: کیا انھوں نے اپنے دلوں میں کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو اور جو کچھ ان کے مابین ہے صرف حق کے ساتھ پیدا کیا ہے" (الروم: 8)

اسی طرح اس آیت میں بھی فرمایا ہے کیا انھوں نے اس پر غور نہیں کیا (الایہ) غرض ہر جگہ حقائق کائنات میں تفکر کے لیے فرمایا کہیں یہ نہیں فرمایا کہ انھوں نے اللہ میں تفکر نہیں کیا۔ (المفردات ج 2، ص 496-497، مطبوعہ مکہ مکرمہ)

امام فخر الدین رازی متوفی 606ھ لکھتے ہیں: عقل سے کسی چیز کے معنی کی تلاش اور طلب کو تفکر کہتے ہیں اور کسی شے میں غور و فکر اور تدبر کرنے کو تفکر کہتے ہیں۔ جیسے جب ہم بصر (آنکھ) سے دیکھتے ہیں تو انکشاف اور جلاء کی حالت مخصوصہ حاصل ہوتی ہے اور اس کا مقدمہ یہ ہے کہ ہم آنکھ کی پتلی کو مرئی (دکھائی دینے والی چیز) کی طرف متوجہ کریں تاکہ ہمیں آنکھ سے یہ رویت حاصل ہو۔ اسی طرح بصیرت کی رویت ہے جس کو علم اور یقین کہتے ہیں اور یہ بھی انکشاف اور جلاء کی حالت مخصوصہ ہے اور اس کا مقدمہ یہ ہے کہ ہم انکشاف اور تجلی کو حاصل کرنے کے لیے عقل کی آنکھ کو مطلوب کی جانب متوجہ کریں اور اس فعل کو نظر عقل کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا انھوں نے تفکر نہیں کیا۔ اس میں انھیں تامل اور تدبر کرنے اور اشیاء کی معرفت کے لیے غور و فکر کرنے کا حکم دیا ہے، کیونکہ اگر وہ غور و فکر کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جنون نہیں ہے۔ (تفسیر کبیر ج 5، ص 419-420، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1415ھ) (تفسیر تبیان القرآن)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب اہل مکہ کے سامنے اللہ کے دین کی دعوت پیش کی تو شروع شروع میں تو قریش مکہ نے اسے زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا لیکن رفتہ رفتہ جب اس دعوت نے نفوذ اختیار کرنا شروع کیا اور لوگ آہستہ آہستہ اس سے متاثر ہونے لگے اور ہر گھرانے اور خاندان میں یہ دعوت اپنے حامی پیدا کرنے لگی تو اب ان کو فکر ہوئی لیکن ان کے لیے مشکل یہ تھی کہ اس دعوت کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا وہ اگرچہ نہایت بہترین عربی زبان جانتے تھے اور ان میں بڑے بڑے ادیب اور شاعر بھی پائے جاتے تھے اور ان کی فصاحت و بلاغت میں بھی کوئی شبہ نہ تھا لیکن قرآن کریم کے سامنے ان کی زبانیں گنگ ہو کر رہ گئی تھیں۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دل آویز شخصیت آپ کا بے عیب کردار آپ کی خاندانی وجاہت آپ کا زور بیان آپ کا دلوں میں اتر جانے والا اخلاق بجائے خود اپنے اندر بے پناہ دعوتی اثر رکھتا تھا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ جب آپ قرآن پاک کی تلاوت کرتے تو چھوٹے بڑے اپنا دل تھام کر رہ جاتے قریش کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ ہم آخر اس دعوت کا راستہ کیسے روکیں آخر انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جہاں بھی قرآن پڑھا جائے اس کے قریب شور مچاؤ تاکہ لوگ قرآن کو سن نہ سکیں اور جہاں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دعوت پیش کریں اس کا تمسخر اڑاؤ تاکہ لوگ اسے سنجیدگی سے لینے کے بجائے محض ایک مذاق سمجھیں لیکن جب اس کے باوجود بھی دعوت کے اثرات رکنے کی بجائے مزید آگے بڑھنے لگے تو اب انھوں نے بہت سوچ بچار کے بعد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات کو نشانہ بنانا شروع کیا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ساحر یعنی جادوگر کہا گیا لیکن جب یہ بات نہ چل سکی تو پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مجنون اور دیوانہ کہا جانے لگا۔ قرآن کریم نے ان کے اس الزام اور ان کی اس حرکت کا نہایت سنجیدگی اور دلیل کے ساتھ جواب دیا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں اس جواب کو واضح کروں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کس بنیاد پر مجنون اور پاگل قرار دیتے تھے یا یہ کہتے تھے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں جنون کے آثار پائے جاتے ہیں اور کبھی کبھی آپ سے اس کا اظہار بھی ہونے لگتا ہے۔ اس حوالے سے قرآن کریم نے دو باتوں کی طرف راہنمائی کی ہے پہلی بات یہ کہ قریش دیکھ رہے تھے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے سامنے جو دعوت پیش کر رہے ہیں وہ کسی طرح بھی اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں حضور جیسے جیسے دعوت میں تیزی پیدا کرتے جا رہے ہیں ویسے ویسے قریش کی جانب سے مخالفت میں شدت پیدا ہوتی جا رہی ہے اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ حضور یا تو مایوس ہو کر دعوت بند کر دیتے اور یا دعوت کی تیزی میں کمی کر دیتے لیکن آپ نے اس کے بالکل برعکس دعوتی کوششوں میں اضافہ فرما دیا اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہ اب آپ صرف دعوت ہی پیش نہیں فرماتے تھے بلکہ یہ وارننگ بھی دیتے تھے کہ اگر تم نے میری دعوت کو قبول نہ کیا تو یاد رکھو تمہارا انجام وہی ہوگا جو اس سے پہلے قوم عاد و ثمود کا ہو چکا ہے تم دنیا میں ہی اللہ کے عذاب کی گرفت میں آ جاؤ گے اور اگر پروردگار نے تمہیں مزید ڈھیل دے بھی دی تو قیامت کے عذاب سے تم کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ آپ کا تمام مخالفتوں اور اذیتوں کے باوجود نہایت ہمدردی، غم گساری اور جان کاہی کے ساتھ ایک ایک شخص تک دعوت پہنچانا اور اس کے اذیت ناک رویے کی پروانہ کرتے ہوئے خون جگر پی پی کر راہ راست پہ لانے کی کوشش کرنا یہ ایک ایسا طرز عمل تھا جو ایک طرف اگر قریش کے لیے نا قابل فہم تھا تو دوسری طرف عام افراد کے لیے اثر انگیز تھا ایک خالی الذہن آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ یہ ہمارے شہر کا ایک عالی نسب شخص جسے ہم سے کوئی غرض نہیں وہ ہم سے کسی معاوضہ کا طالب نہیں وہ محض ہماری بھلائی کے لیے جس طرح دکھ اٹھا اٹھا کر اور ٹوٹ ٹوٹ کر ہماری ہدایت کے لیے کوششیں کر رہا ہے آخر اس میں

کوئی تو صداقت ہوگی۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ لوگ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس رویہ کے باعث پہلے سوچنے پر مجبور ہوتے اور پھر ایمان کی طرف بڑھنے لگتے۔

قریش کو اس صورت حال نے پریشان کر دیا کہ آخر لوگوں کو اس دعوت کے اثر سے کیسے بچایا جائے انھوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ دیکھو تم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دل آویز شخصیت اور اس کے خیر خواہانہ رویے پر نہ جاؤ بلکہ یہ دیکھو کہ وہ جس طرح بار بار تمہیں عذاب سے ڈرا رہا ہے اور کبھی آنے والی قیامت کی خبریں دیتا ہے اور پھر تم ہزار انکار کرو وہ کبھی اپنی بات کہنے سے نہیں رکتا۔ کسی عقلمند آدمی کا یہ رویہ تو نہیں ہوتا معلوم ہوتا ہے کہ اسے اس بات کا فوبیا ہوگیا ہے اور اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی ہے اور اس نے ایک جنون کی شکل اختیار کر لی ہے وہ اپنی ذات میں چاہے کتنا ہی عظیم سہی لیکن بڑے بڑے لوگ بھی بعض دفعہ اختلال دماغ یا وہم کا شکار ہو جایا کرتے ہیں چنانچہ یہ بھی ایسے ہی کسی عارضہ میں مبتلا ہے جو باتیں وہ محض اپنے جنون کی وجہ سے کہہ رہا ہے تم اسے چنداں اہمیت نہ دو اور مجنون سمجھ کر اس کی بات کو ٹال دو اس طرح قریش نے وقتی طور پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت کو بے اثر کرنے کی کوشش کی۔ قرآن کریم نے دو باتیں اس سلسلے میں ارشاد فرمائی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ تم جس شخص کے بارے میں جنون کا الزام لگا رہے ہو وہ کوئی اجنبی آدمی تو نہیں کسی دوسرے ملک یا کسی دوسرے شہر سے تو نہیں آیا وہ کسی دور کے خاندان سے تعلق بھی نہیں رکھتا تمہارے اپنے شہر کا رہنے والا ہے 'تمہارے ہی قبیلے قریش کا ایک معزز فرد ہے ' تمہارے سامنے اس کا بچپن 'اس کا لڑکپن 'اس کا بے داغ شباب گزرا تم ہمیشہ اس کے بے داغ کردار 'اس کی اصابت رائے 'اس کی سلامت روی 'اس کی صداقت شعاری 'اس کی بے غرضی 'اس کی پاک بازی اور اس کی دانش و بینش کی پختگی کے ہمیشہ گواہ رہے ہو وہ جوان تھا تو تمہارے بڑے بوڑھے اپنے جوان بیٹوں کو اس کا حوالہ دے دے کر سمجھایا کرتے تھے 'بنی ہاشم اس کی ذات اور اس کے طور اطوار پر فخر کیا کرتے تھے وہ عملی زندگی میں داخل ہوا اور تجارتی اسفار کیے تو اس کی تجارت کی دھوم مچ گئی اور اسی شہرت کی وجہ سے حضرت خدیجہ (رض) نے اپنا مال تجارت لے جانے کے لیے ان سے درخواست کی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ تعمیر کعبہ کے وقت تم میں اس بات پر اختلاف پیدا ہوا کہ حجر اسود کو کون اٹھا کر اس کی جگہ پر نصب کرے؟ یہ چونکہ ایک یادگار بن جانے والا عمل تھا اور اس کے سبب سے ایک افتخار اور اعزاز ملنے والا تھا تو اس لیے ہر قبیلہ کے سردار کی خواہش تھی کہ یہ عزت میرے حصے میں آئے چنانچہ جب سب نے اسے حاصل کرنے پر اصرار کیا تو نوبت خون ریزی تک پہنچ گئی قریب تھا کہ تلواریں بے نیام ہو جاتیں کہ کسی نے مشورہ دیا کہ تم یہ معاملہ اللہ پر چھوڑ دو اور اس بات پر راضی ہو جاؤ کہ صبح سب سے پہلے جو شخص حرم میں داخل ہوا سے منصف بنا لیا جائے اور اس کے فیصلے کو قبول کر لیا جائے۔ چنانچہ صبح کے وقت اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سب سے پہلے حرم میں داخل ہوئے آپ کو دیکھ کر تمام سرداران قریش خوشی سے چیخ اٹھے کہ الامین آگیا اور الصادق آگیا ہم اس کے فیصلے پر راضی ہیں چنانچہ آپ نے نہایت تدبر کا ثبوت دیتے ہوئے ایک ایسا فیصلہ کیا جس سے تمام سرداران قریش کو برابر کی عزت ملی اور ایک بڑا خطرہ جو بہت بڑا فتنہ بن سکتا تھا ٹل گیا۔ آپ نے اپنی چادر زمین پر بچھائی اس پر حجر اسود رکھا فرمایا کہ تمام سردار چادر کے پلو پکڑ کر اوپر اٹھائیں جب حجر اسود اتنا بلند ہوگیا کہ اسے اٹھا کر اپنی جگہ پر نصب کیا جاسکتا تھا تو آپ نے خود اٹھا کر اسے نصب فرما دیا۔ کہنا یہ ہے کہ جس ذات عزیز کے بارے میں نبوت سے پہلے تمہارے یہ تصورات تھے کہ تم اس کے سیرت و کردار اور اس کی اصابت فکر کے بارے میں دو رائے نہیں رکھتے تھے بلکہ پورا مکہ بیک زبان اس کی عقل و دانش کا معترف اور اس کے بے داغ سیرت و کردار کا گواہ تھا آج آخر ایسی بات کیا ہوگئی ہے کہ تم نے اس کو مجنون قرار دینا شروع کر دیا ہے۔ تمہارا یہ رویہ خود اس بات کا گواہ ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دماغ میں تو کوئی جنون نہیں البتہ تمہاری نیت میں فتور ضرور ہے۔

رہی یہ بات کہ تمہاری ساری مخالفتوں اور اذیتوں کے باوجود حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی دعوتی کاوشوں میں کمی کرنے کی بجائے روز بروز اضافہ فرماتے جارہے ہیں تم ان سے بدسلوکی کرتے، گالیاں بکتے اور مذاق اڑاتے ہو اور ہر ممکن طریق سے ان کی دعوت کو بے اثر کرنے کی کوشش کرتے ہو لیکن ان کے اندر کوئی منفی رویہ پیدا نہیں ہوتا جس طرح ایک ماں اپنے بگڑے ہوئے بچہ کی بدتمیزیاں دیکھ کر ناراض ہونے کی بجائے آنکھوں میں آنسو بھر کر پھر اسے پکار کے اور سمجھانے کی کوشش کرتی ہے۔ اسی طرح حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی ان کی ساری بدتمیزیوں کے باوجود اپنی اصلاحی کوششوں کو کسی طرح بھی روکنے کو تیار نہیں ہوتے تھے تو اس کا سبب کوئی جنون نہیں بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نذیر مبین بنا کر بھیجا ہے۔ عربوں کا طریقہ یہ تھا کہ جب وہ کسی طرف سے

خطرہ محسوس کرتے تھے کہ شائدرات کی تاریکی یا ہماری غفلت میں فلاں قبیلہ ہم پر حملہ کر دے تو اس قبیلے سے آگاہ رہنے کے لیے کسی شخص کو مقرر کر دیا جاتا تھا کہ وہ کسی بلند جگہ سے اس قبیلہ کی نگرانی کرے اور جب بھی اسے خطرہ کا احساس ہو وہ اپنی قوم اور اپنے قبیلے کو فوراً آگاہ کرے۔ چنانچہ جب اسے خطرہ کا یقین ہو جاتا اور وہ دیکھتا کہ فلاں قبیلہ ہم پر حملہ آور ہونے والا ہے تو وہ کپڑے پھاڑ کر چیختا ہوا اپنی قوم کی طرف بھاگتا اور انھیں آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیتا قوم چونکہ اس سے بے خبر ہوتی لیکن یہ خبر دار کرنے والا چونکہ اس خطرہ کو دیکھ چکا ہوتا اس لیے اپنی ساری صلاحیتیں اپنی قوم کو بچانے کے جذبے سے بروئے کار لاتا 'چیختا چلاتا جو بھی اس سے ہو سکتا وہ قوم کو اس خطرے سے بچانے اور خبر دار کرنے کے لیے کر گزرتا ایسے شخص کو عرب نذیر عریان یعنی برہنہ خبر دار کرنے والا کہتے تھے۔ قرآن کریم نے ان کے اسی تصور کے حوالے سے انھیں بتلایا ہے کہ ہمارے پیغمبر کی تمہارے لیے بے چینی اور بے کلی صرف اس لیے ہے کہ وہ نذیر مبین یعنی کھلا کھلا ڈرانے والا اور خبر دار کرنے والا ہے۔ وہ جن خطرات سے تمہیں آگاہ کر رہا ہے جس عذاب سے تمہیں ڈرا رہا ہے جس آنے والی قیامت سے تمہیں ہوشیار کر رہا ہے یہ اس کے لیے دیکھی بھالی حقیقتیں ہیں وہ ان خطرات کا پوری طرح یقین رکھتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ اگر تم نے غفلت نہ چھوڑی اور ان خطرات سے بچنے کی کوشش نہ کی تو آخر تم تباہ ہو جاؤ گے ہونا تو یہ چاہیے کہ تم اس کے اس خیر خواہانہ جذبے اور اس کے ہمدردانہ رویے کی قدر کرو اور اس کی دعوت کو قبول کر کے اپنی زندگی بنالو لیکن تم نے اس کی بجائے اسے مجنون کہنا شروع کر دیا ہے ہر پیغمبر اللہ کی جانب سے جب مبعوث ہوتا ہے تو وہ اللہ کی جانب سے ان صفات کا حامل ہو کر آتا ہے اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو تمام صفاتِ نبوت کے جامع تھے اور آپ نے جب عام دعوت کا آغاز کیا ہے تو اس کے لیے جو طریقہ اختیار فرمایا ہے اس میں اسی حقیقت کا اظہار کیا گیا تھا آپ نے کوہ صفا کی بلندی پر چڑھ کر تمام قبائل کو پکارا لوگ جب پہاڑ کے دامن میں جمع ہو گئے تو آپ نے سب سے پہلے ان سے یہی بات پوچھی کہ اے آل غالب تمہاری میرے بارے میں کیا رائے ہے؟ تم مجھے ایک سچا آدمی سمجھتے ہو یا جھوٹا؟

جب سب نے آپ کی سچائی کا اقرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر تم واقعی مجھے ایک سچا آدمی سمجھتے ہو تو میں تمہیں اگر یہ کہوں

کہ فوج گراں پشت کوہ صفا پر
پڑی ہے کہ لوٹے تمہیں گھات پا کر
تو بتاؤ تمہارا کیا جواب ہو گا؟
کہا تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے
کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے
کہا گر مری بات یہ دل نشیں ہے
تو سن لو خلاف اس میں ہر گز نہیں ہے
کہ سب قافلہ ہے یاں سے ہے جانے والا
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

اس میں آپ غور کیجیے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک بلند جگہ پر کھڑے ہیں اور تمام لوگ پستی میں بیٹھے ہیں اس سے یہ بتانا مقصود تھا کہ میں نبوت کے بلند مقام سے بول رہا ہوں جس سے میں سامنے بھی دیکھ رہا ہوں اور پیچھے بھی۔ تم اس پہاڑ کے پیچھے کچھ نہیں دیکھ سکتے میں تمہیں دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ کوئی حملہ آور ہے کہ نہیں۔ چنانچہ زندگی کے اس پہاڑ کے پیچھے دیکھ کر میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ یہ قافلہ یہاں سے ایک نہ ایک دن چلا جائے گا یعنی سب کو ایک نہ ایک دن موت کا شکار ہونا ہے اور اس کے بعد اللہ کے روبرو حاضری ہو گی۔ حاصل کلام یہ کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) چونکہ اللہ کے نبی اور رسول ہیں۔ آپ اللہ کی جانب سے جس عظیم منصب پر فائز ہوئے ہیں اس کی خصوصیت یہ ہے کہ نبی جو بات کہتا ہے وہ پورے یقین سے اور دیکھ کر کہتا ہے اس لیے جب لوگ اس کی بات کو قبول نہیں کرتے تو اس کی بے چینی اور بے کلی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے وہ دیکھ رہا ہوتا ہے خطرہ ان کے سر پر کھڑا ہے اور اگر انھوں نے اس کی فکر نہ کی تو یہ

خطرے کا شکار ہو جائیں گے وہ جیسے جیسے انکار کرتے ہیں یہ ویسے ویسے خطرے کو محسوس کرکے بے چین ہوتا جاتا ہے۔ قریش مکہ سے یہ کہا جارہا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی یہ بے چینیاں اس لیے نہیں ہیں کہ آپ پر جنون کا اثر ہے بلکہ اس لیے ہیں کہ آپ کو اللہ نے نذیر مبین بنا کر بھیجا ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

کسی نبی کو کوئی دماغی مرض لاحق نہیں ہوسکتا اور مراق مرزا قادیانی:

مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ۔ سے معلوم ہوا جو اللہ کی طرف سے نذیر ہوا سے جنون نہیں ہوسکتا، بلکہ نبی کو کوئی بھی ایسا مرض لاحق نہیں ہوسکتا جس کی وجہ سے لوگ اُس سے گھن کریں یا اس کا مذاق اڑائیں، خصوصاً عقل کا فتور۔ کیونکہ فاتر العقل شخص خود کچھ نہیں جانتا وہ کسی کو کیا سمجھائے گا۔ بے عقلی اور پیغمبر دو متضاد چیزیں ہیں۔ اسی لیے حضرت ہود (علیہ السلام) نے فرمایا: لیس بی سفاھۃ ولکنی رسول من رب العالمین۔ "مجھ میں کوئی بے عقلی نہیں، بلکہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں۔" (اعراف: 67) بلکہ اللہ کا نبی تو پوری قوم اور پوری امت سے بڑھ کر دانا و مدبر ہوتا ہے۔

مگر یہ سچے نبی کی شان ہے، جبکہ جھوٹے دعویدارانِ نبوت عموماً مجنون ہی ہوتے ہیں بلکہ جنون ہی میں دعویٰ نبوت کرتے ہیں۔ مرزا قادیانی کو بھی مراق تھا اس نے خود کہا: "میرے اوپر والے حصہ جسم میں مراق (دماغی فتور) ہے اور نیچے والے حصہ میں کثرت بول۔" (رسالہ تشحیذ الاذہان جون 1906 بحوالہ رئیس قادیان صفحہ 88) اور برصغیر کے مشہور طبیب حاذق حکیم اعظم خان مرحوم لکھتے ہیں: "اگر مریض دانشمند بودہ باشد دعویٰ پیغمبری و کرامت کند"۔ یعنی اگر مراق کا مریض دانش مند آدمی ہو تو وہ نبوت اور کرامت کا دعوی کرنے لگتا ہے۔ (اکسیر اعظم جلد اول صفحہ 188 مطبوعہ نول کشور) صاف معلوم ہوا مرزا قادیانی کا دعوی نبوت اس کے دماغی فتور کا نتیجہ تھا مگر افسوس ان پر ہے جنہوں نے ایک دماغی مریض کا نبی تسلیم کرلیا۔ (تفسیر برہان القرآن)

آیت مبارکہ:

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓي اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۝ ۱۸۵

لغۃ القرآن: اَوَ: اور کیا] [لَمْ يَنْظُرُوْا: انہوں نے نظر نہیں ڈالی] [فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: زمین اور آسمانوں کی بادشاہت میں] [وَمَا: اور اس میں جو] [خَلَقَ: پیدا کیا] [اللّٰهُ: اللہ نے] [مِنْ شَيْءٍ ۙ: کسی چیز سے] [وَّاَنْ: اور یہ کہ] [عَسٰٓي: ہوسکتا ہے] [اَنْ: کہ] [يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ: قریب آچکا ہو] [اَجَلُهُمْ: ان کے خاتمے کا وقت] [فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ: تو کون سی بات پر] [بَعْدَهٗ: اس کے بعد] [يُؤْمِنُوْنَ: وہ ایمان لائیں گے]

ترجمہ: کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت میں اور (علاوہ ان کے) جو کوئی چیز بھی اللہ نے پیدا فرمائی ہے (اس میں) نگاہ نہیں ڈالی؟ اور اس میں کہ کیا عجب ہے ان کی مدت (موت) قریب آچکی ہو، پھر اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے

تشریح: کیا یہ منکرین زمین وآسمان کی عظیم مملکت اور بیشمار مخلوقات میں غور نہیں کرتے کہ ان کو کس نے پیدا کیا ہے؟ کیا وہ سوچتے نہیں کہ ہوسکتا ہے ان کی موت کا وقت بالکل قریب آ گیا ہو اور اس کے بعد ایمان لانے کی فرصت ہی ختم ہو جائے۔ کیا وہ قرآن مجید میں غور نہیں کرتے، اس سے زیادہ سچی اور واضح کتاب اور کوئی کتاب ہے، اگر وہ اس پر ایمان نہیں لاتے تو پھر اور کس چیز پر ایمان لائیں گے؟ یعنی اب ان کے ایمان لانے کی کوئی توقع نہیں اور ان کی مسلسل ضد اور ہٹ دھرمی کے باعث انھیں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور کردیا گیا ہے اور وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے ہوئے بالآخر جہنم رسید ہو جائیں گے۔ (تفسیر امداد الکرم)

اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ کیا ان کفار نے آسمانوں اور زمین کی سلطنت اور جو جو چیز اللہ عَزَّوَجَلَّ نے پیدا کی ہے اس میں غور نہیں کیا تاکہ وہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی قدرت و وحدانیت پر استدلال کرتے کیونکہ ان سب میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حکمت و قدرت کے کمال کی بیشمار روشن دلیلیں موجود ہیں اور کیا انھوں نے اس بات میں غور نہیں کیا کہ شاید ان کی موت کی مدت نزدیک آگئی ہو اور وہ کفر کی حالت میں مرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے جہنمی ہو جائیں ؟ ایسے حال میں عقل مند پر لازم ہے کہ وہ سوچے، سمجھے اور دلائل پر نظر کرے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت اور قرآن عظیم کے کتاب الٰہی ہونے پر ایمان لائے کیونکہ قرآن پاک کے بعد اور کوئی کتاب اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد اور کوئی رسول آنے والا نہیں جس کا انتظار ہو کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اور حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آخری نبی ہیں، اگر ان پر ایمان نہیں لایا تو پھر کس پر ایمان لائے گا۔ (تفسیر صراط الجنان)

اس عجیب کائنات کے بارے میں یہ ایک دوسری کھڑکی ہے اور اس عظیم اور وسیع و عریض کائنات کو کھلی آنکھوں اور بیدار دل کے ساتھ دیکھنے کی دعوت ہے۔ اگر غور سے اس عظیم کائنات ہی پر نظر ڈال لی جائے تو انسانی فطرت جہالت کے جن دبیز پردوں کے نیچے گم ہے وہ باہر نکل آئے اور انسانی شخصیت کے سامنے حق کی راہیں کھل سکتی ہیں اس کائنات میں تخلیق کی عجیب و غریب کارفرمائیاں اور ایسے کارنامے جو معجز ہیں اور جو قادر مطلق اور وحدہ لاشریک کی ذات پر دال ہیں۔ کیا وہ کسی ایک چیز کی تخلیق پر غور نہیں کرتے، جبکہ اس کائنات میں بیشمار قابل غور چیزیں ہیں جن پر غور کرنے سے انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے، انسانی فکر عاجز رہ جاتی ہے اور عقل ان کاریگریوں کے صناع اور کاریگر کی تلاش میں نکل جاتی ہے۔ اور پھر وہ اس ارادے کو جاننا چاہتی ہے جس نے اس خلق کو پیدا کیا اور اس کے لیے اس نظام کو جاری کیا۔

یہ مخلوقات اس طرح کیوں ہے ؟ اس کے علاوہ اس کائنات کے لیے ہزاروں امکانیات تھے۔ یہ کائنات دوسری طرح کیوں نہ بنی۔ دوسرے طریقوں کو چھوڑ کر کیوں یہ کائنات اس موجودہ طریقے پر چل پڑی اور پھر وہ کون سی قوت ہے جو اسے اس نہج پر چلائے رکھتی ہے۔ اس پوری کائنات میں ایک ہی نظام طبیعت جاری و ساری ہے، یہ کیوں ؟ اگر اس کے پیچھے ایک ہی فعال لمایرید نہیں ہے تو اس پوری کائنات میں جاری و ساری اور اس کے پیچھے کیوں ایک ہی ارادہ اور ایک ہی ناموس نظر آتا ہے۔ اور ایک ہی تقدیر اور اندازہ مسلسل چل رہا ہے۔

ایک زندہ جسم ! نہیں بلکہ ایک خلیہ ایک عظیم معجزہ ہے جس کے عجائبات ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ اس کا وجود اس کی ترکیب اور اس کے تصرفات اور اس کے اندر پیدا ہونے والی مسلسل تبدیلیاں جو مسلسل اس کے وجود کا تحفظ کرتی ہیں اور اس کے اندر پھر کئی نسلوں تک تجدید نسل کا انتظام۔ پھر تمام نسلوں میں اس کے فرائض کا تعین، جو شخص اس ایک خلیے کا مطالعہ کرے تو اس کا ضمیر اور اس کی عقل کبھی بھی اس بات پر مطمئن نہیں ہو سکتی کہ یہ کائنات بغیر کسی الہ اور مدبر کے نہیں چل سکتی یا کوئی عقل کبھی بھی اس نتیجے تک نہیں پہنچ سکتی کہ اللہ کے سوا کوئی اور الہ بھی ہو سکتا ہے۔

زندگی کا یہ تسلسل بذریعہ نظام نسل کشی بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کائنات ایک خالق اور مدبر کے قانون کے مطابق چل رہی ہے ورنہ کروڑوں سال کے عرصہ میں وہ کون سی طاقت ہے جو نسل کشی کے لیے مرد اور عورت کا ایک تناسب قائم رکھے ہوئے ہے۔ ایسا دور کیوں نہیں آتا کہ مرد ہی مرد پیدا ہوں صرف عورتیں ہی پیدا ہوں۔ اگر کبھی ایسا واقعہ ہو جائے تو اس دور میں نسل کشی کا خاتمہ ہی ہو جائے۔ سوال یہ ہے کہ نسلاً بعد نسل اس تناسب اور توازن کو کس قوت نے قائم کر رکھا ہے۔

یہ توازن زمین و آسمان کے نظام میں مکمل طور پر کارفرما ہے۔ صرف اس زندہ مخلوق ہی اندر نہیں ہے۔ ایک ایٹم کی ساخت اور کسی مرکب چیز کی ساخت میں مکمل توازن موجود ہے۔ زندہ اور مردہ تمام مخلوقات کے اندر مکمل توازن موجود ہے۔ اور اگر ایک لمحہ بھر کے لیے یہ توازن بگڑ جائے تو یہ کائنات ڈھیر ہو کر رہ جائے۔ لٰہذا یہ بہت ہی اہم سوال ہے کہ وہ ذات کون سی ہے جس نے یہ توازن زمین و آسمان میں قائم کر رکھا ہے۔

جزیرۃ العرب کے باشندے جن کو سب سے پہلے اس قرآن نے مخاطب کیا، وہ علوم و فنون میں اس قدر زیادہ ترقی یافتہ نہ تھے کہ وہ زمین اور آسمانوں کے نظام میں پائے جانے والے نہایت ہی لطیف توازن پر غور کر سکتے یا اللہ کی پیدا کردہ کسی ایک ہی چیز کا سائنسی تجزیہ کر سکتے۔ لیکن انسانی فطرت اس کائنات کے ساتھ اپنی

گہرائیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ انسانی فطرت اور کائنات کی فطرت کے درمیان قائم ربط سائنسی مکالمات کا محتاج نہیں ہے۔ ان کے درمیان ایک توازن پایا جاتا ہے۔ ہر انسان جس کا دل کھلا ہوا اور آنکھوں میں بصیرت ہو وہ اس ہم آہنگی کو محسوس کر سکتا ہے اور اس کے اشارات کو قبول کر کے راہ ہدایت لے سکتا ہے۔

جب انسان اپنی فطرت صافی کے ذریعے فطرت کائنات کے ان اشارات کو پاتا ہے تو وہ یقین کر لیتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی الہ ضرور ہے اور اس کے احساس پر یہ حقیقت اور یقین اسی طرح چسپاں ہو جاتا ہے کہ کبھی غائب نہیں ہوتا۔ انسان نے اگر کوئی غلطی کی ہے تو اس نے الہ کی صفات میں کی ہے۔ رسولوں کی بعثت کا مقصد زیادہ تر یہی رہا ہے کہ انھوں نے اس لہ کا تعارف کرایا ہے۔ اس کی صفات کا صحیح تصور دیا ہے۔ رہے جدید ملحد، یعنی سائنٹیفک اشتراکیت کے داعی تو یہ وہ مسخ شدہ لوگ ہیں جن کی فطرت بگڑ چکی ہے بلکہ دراصل وہ فطرت کے منکر ہیں اور ان کی اپنی فکر میں اگر کچھ اشارات پائے جاتے ہیں تو وہ ان کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان میں سے ایک شخص جب فضائے آسمان میں قدرے بلند ہوا اور وہاں سے اس نے یہ حیران کن منظر دیکھا کہ زمین اس عظیم فضا کے اندر ایک چھوٹی سی گیند نظر آتی ہے، اس کی فطرت نے اس وقت اسے آواز دی کہ ذرا سوچو تو سہی، اس فضا میں اسے کس چیز نے معلق کر رکھا ہے، لیکن جب وہ زمین پر اترا اور حکومت کی جانب سے تشدد کا خوف اسے لاحق ہوا تو اس نے یہ بیان دیا کہ اسے فضا آسمانی میں خدا نہیں ملا۔ اس شخص نے اپنی فطرت کی آواز اور فطرت کی جانب سے اصرار کو دبا دیا اور آسمان و زمین کے نظام میں اس کے لیے جو سامان عبرت تھا، اسے نظر انداز کر دیا۔

اللہ تعالیٰ انسان سے مخاطب ہے کیونکہ انسان کی تخلیق اسی نے کی ہے۔ وہ اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہے آخر میں ان کو حادثہ موت سے ڈرایا جاتا ہے، جو مستقبل کے پردوں میں چھپا ہوا اور بہت قریب ہے اور عالم الغیب میں وہ وقت طے شدہ ہے اگرچہ یہ لوگ اس وقت سے غافل ہیں۔

وَّاَنۡ عَسٰۤى اَنۡ يَّكُوۡنَ قَدِ اقۡتَرَبَ اَجَلُهُمۡ‌ فَبِاَىِّ حَدِيۡثٍۢ بَعۡدَهٗ يُؤۡمِنُوۡنَ۔ اور کیا یہ بھی انھوں نے نہیں سوچا کہ شاید ان کی مہلت زندگی پوری ہونے کا وقت قریب آ لگا ہو؟ پھر آخر پیغمبر کی اس تنبیہ کے بعد اور کون سی بات ایسی ہو سکتی ہے جس پر یہ ایمان لائیں؟

ان کو کیا پتہ ہے کہ ان کا وقت قریب ہے یا دور ہے، اور کیا وجہ ہے کہ وہ غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں حالانکہ انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور ان کے کوچ کا وقت پردہ غیب میں مستور ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موت کی یاد دہانی، خصوصاً جب وہ کسی بھی وقت میں آ سکتی ہے، انسان کے دل کو جھنجھوڑنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ اس کی یاد سے انسان کے دل کے دروازے ہدایت کے لیے کھل سکتے ہیں اور انسان معاملات کو حقیقت پسندی کے ساتھ دیکھ سکتا ہے۔ اللہ اس قرآن کو نازل کرنے والا اور انسان کو پیدا کرنے والا ہے۔ اللہ کو معلوم ہے کہ موت کا تصور ہر انسان پر اپنا اثر ضرور کرتا ہے لیکن بعض لوگ اس قدر ضدی ہوتے ہیں کہ وہ یہ اثر قبول کرنے کے باوجود انکار کرتے ہیں اور مکابرے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو لوگ حدیث رحلت سے بھی متاثر نہیں ہوتے۔ آخر ان پر کیا چیز اثر کر سکتی ہے؟ یہی تو بات ہے جو دلوں کو پگھلا دیتی ہے اور وہ نرم ہو جاتے ہیں۔ تذکرہ موت کا ٹچ جو انسانی شخصیت کو اس آیت میں دیا گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم انسانی شخصیت کے خطاب میں کیا منہاج اختیار کرتا ہے۔ وہ انسانی شخصیت کے ہر پہلو کو مخاطب کرتا ہے۔ وہ ہر زاویہ اور ہر وتر سے اس پر اثرات چھوڑتا ہے۔ قرآن کریم انانی عقل کو مخاطب نہیں کرتا مگر عقل کو مہمل بھی نہیں چھوڑتا بلکہ وہ انسانی شخصیت کو ہمہ پہلو خطاب کرتا ہے اور اس کے ہر گوشے کو روشن کرتا ہے۔ قرآن کریم خشک بحث و مباحثے کا طریقہ بھی اختیار نہیں کرتا۔ قرآن کریم عقل اور سوچ زندہ کرتا ہے تاکہ انسان فکر کرے، لیکن اس کی زندگی سرد اور جامد نہ ہو بلکہ حرارت سے پر ہو اور انسانی شخصیت بھرپور انداز میں آگے بڑھے۔ اسلام کی طرف دعوت دینے والوں کو یہی انداز اختیار کرنا چاہیے کیونکہ انسان بہر حال وہی انسان ہے اور اس کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں واقع ہوئی۔ قرآن بھی وہی قرآن ہے اور یہ قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔ انسان کو اللہ نے جو خطاب کیا ہے وہ اسی طرح قائم ہے، چاہے دنیا جس قدر بھی ترقی کرے اور حالات جس قدر بھی بدل جائیں۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور وحدانیت پر دلائل

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبوت کا بیان فرمایا تھا اور چونکہ نبوت کا ثبوت الوہیت کے ثبوت پر موقوف ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنی الوہیت اور توحید کا بیان فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے آسمانوں، زمینوں اور ان کے درمیان جو کچھ ہے ان کی نشانیوں سے اپنی الوہیت پر استدلال فرمایا ہے، آسمانوں، زمینوں اور ان کے درمیان کی چیزوں میں سے ہم صرف سورج کی شعاع کے ایک ذرہ کو لیتے ہیں، کسی کھڑکی یا روشن دان سے جب سورج کی شعاع اندر آتی ہے تو ہم چمکیلے ذرات پر مشتمل ایک غبار کو دیکھتے ہیں، ہم ان ذرات میں سے ایک ذرہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ ایک خاص سمت اور خاص وضع پر ہے، سوال یہ ہے کہ سمتیں اور اوضاع اور احیاز تو غیر متناہی ہیں تو اس خاص سمت، خاص حیز اور خاص وضع کے لیے اس کا مخصص کون ہے، اس طرح وہ ذرہ اپنے حجم، اپنی صورت و شکل، اپنے رنگ، اپنی طبیعت اور اپنے اثرات میں تمام اجسام اور تمام صور اور اشکال اور تمام رنگوں اور تمام طبائع اور اثرات میں مساوی ہے تو اس خاص حجم، خاص شکل و صورت، خاص رنگ، خاص طبیعت اور اثرات میں ان کا مخصص کون ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ یہ مخصص کوئی جسم ہے تو وہ جسم بھی ممکن ہوگا تو پھر ہم اس میں کلام کریں گے کہ اس ممکن کو عدم سے وجود میں لانے کا مرجح کرن ہے اور یونہی سلسلہ چلتا رہے گا اور قطع تسلسل کے لیے یہ ماننا پڑے گا کہ وہ مخصص اور مرجح جسم ممکن اور حادث نہیں ہے بلکہ وہ جسم کا غیر ہے اور قدیم اور واجب ہے اور یہ ضروری ہے کہ وہ قدیم اور واجب واحد ہو کیونکہ ایک سے زیادہ قدیم اور واجب ہوں تو وہ قدم اور وجوب میں مشترک ہوں گے اور کسی اور جز کی وجہ سے باہم ممتاز اور متمیز ہوں گے، سو ان میں ایک جز مشترک ہوگا وہ قدم اور وجوب ہے اور ایک جز متمیز ہوگا، جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے ممتاز ہوں گے اور جو چیز دو جزوں سے مرکب ہو وہ اپنے اجزاء کی محتاج ہوگی اور ہر مرکب اور محتاج ممکن ہوتا ہے اور امکان اور احتیاج وجوب، قدم اور الوہیت کے منافی ہے، اور ایک آسان دلیل یہ ہے کہ یہ آسمان، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے وہ سب ایک نظم اور ایک طریقہ پر ہیں، اس پوری کائنات کا نظام نظم واحد پر چل رہا ہے، سورج ہمیشہ ایک مخصوص جانب سے طلوع ہو کر دوسری جانب غروب ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس چاند کا طلوع اور غروب ہوتا ہے اور کبھی اس نظام کے خلاف نہیں ہوا، اسی طرح ہمیشہ آسمان پانی برساتا ہے اور غلہ زمین سے پیدا ہوتا ہے اور کبھی اس نظام کے خلاف نہیں ہوا، سیب کے درخت سے کبھی اخروٹ پیدا نہیں ہوا، کبھی کسی حیوان سے انسان یا کسی انسان سے حیوان پیدا نہیں ہوا اور اس پوری کائنات کا نظم واحد پر جاری رہنا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کا ناظم بھی واحد ہے۔

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی 606ھ فرماتے ہیں:

اللہ سبحانہ نے اس عالم کے سوا کروڑوں عالم بنائے ہیں اور ہر عالم میں اس سے عظیم عرش ہے، اور اس سے اعلی کرسی ہے اور ان آسمانوں سے وسیع آسمان ہیں، لہٰذا انسان کی عقل اللہ کے ملک اور ملکوت کا کس طرح احاطہ کر سکتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "ومایعلم جنود ربک الاھو: اور آپ کے رب کے لشکر کی تعداد کو اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا" اور جب انسان اللہ کی نشانیوں میں اور کائنات کی وسعتوں میں غور و فکر کرے گا اور اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کے اسرار میں سوچ و بچار کرے گا تو اس کے لیے یہ کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ "سبحانک لاعلم لنا الا ماعلمتنا: تو پاک ہے ہمیں صرف ان ہی چیزوں کا علم ہے جن کا علم تو نے ہمیں دیا ہے" (البقرہ: 32)

آیا بغیر دلیل کے ایمان لانا صحیح ہے یا نہیں؟

قرآن مجید کی متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو مظاہر کائنات میں غور و فکر کرکے اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت پر استدلال کرنے کا حکم دیا ہے۔

قل انظروا ماذا فی السموات والارض: آپ کہیے کہ غور سے دیکھو آسمانوں اور زمینوں میں کیا کیا نشانیاں ہیں (یونس: 101)

افلم ینظروا الی السماء فوقھم کیف بنینھا وزینھا ومالھا من فروج۔ والارض مددنھا والقینا فیھا رواسی وانبتنا فیھا من کل زوج بھیج۔ تبصرۃ وذکری لکل عبد منیب: کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کو غور سے نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیسا کیسا بنایا ہے، اور کس طرح اس کو مزین کیا ہے اور اس میں کوئی شگاف نہیں ہے۔ اور ہم نے زمین کو پھیلا اور اس میں مضبوط پہاڑوں کو پیوست کر دیا اور اس میں ہر طرح کے خوش نما پودے اگائے۔ یہ (اللہ کی طرف) ہر رجوع کرنے والے بندے کے لیے بصیرت اور نصیحت ہیں۔ (ق: 6۔8)

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت: کیا یہ لوگ بغور اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے بنایا گیا ہے؟ (الغاشیہ: 17)

وفی الارض ایت للموقنین۔ وفی انفسکم افلا تبصرون: اور یقین رکھنے والوں کے لیے زمین میں بہت نشانیاں ہیں اور خود تمہارے نفسوں میں تو کیا تم (ان نشانیوں کو) بغور نہیں دیکھتے (الذاریات: 20۔21)

ان آیات کی وجہ سے بعض علماء نے یہ کہا کہ جو شخص غور و فکر کرکے دلیل سے اسلام قبول کرے اسی کا اسلام معتبر ہے، اسی وجہ سے امام بخاری نے "کتاب العلم" میں ایک باب (11) کا یہ عنوان قائم کیا ہے قول اور عمل سے پہلے علم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: " فاعلم انہ لا الہ الا اللہ: جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں" (محمد: 19)

اللہ تعالیٰ نے علم سے ابتداء کی ہے، امام بخاری کا منشا یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ پر ایمان لانے سے پہلے دلیل سے اس کا علم حاصل کرنا ضروری ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص بغیر دلیل کا کلمہ پڑھے اس کا ایمان معتبر نہیں ہے۔

لیکن یہ نظریہ صحیح نہیں ہے ورنہ جب مسلمان کفار سے اسلام کے لیے جہاد کرتے تو کفار کے لیے یہ کہنا صحیح ہوتا کہ تمہارا ہم سے جنگ کرنا اور ہم کو قتل کرنا جائز نہیں ہے حتی کہ تم ہمیں دلائل کے ساتھ اسلام کی حقانیت پر غور و فکر کرنے کی مہلت دو، نیز امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مجھے لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے حتی کہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں اور جب وہ یہ کہہ لیں گے تو وہ مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کرلیں گے ماسوا حق اسلام کے اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 25)

نیز اس پر تمام اہل علم کا اجماع ہے کہ جب کافر یہ کہے کہ اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمدا عبدہ ورسولہ، اور کہے کہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو دین لے کر آئے ہیں وہ حق ہے اور میں دین اسلام کے مخالف ہر دین سے بری ہوتا ہوں۔ اور وہ شخص بالغ اور صحیح العقل ہو تو اس شہادت اور اقرار کے بعد وہ مسلمان ہوگا اور اگر وہ اس شہادت اور اقرار سے منحرف ہوگیا تو وہ مرتد ہوگا، اور علامہ سمنانی نے کہا ہے کہ سب سے پہلا واجب یہ ہے کہ انسان، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے اور ان تمام امور پر ایمان لائے جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لے کر آئے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ کی معرفت کے دلائل پر غور و فکر کرے، بغیر حجت اور دلیل کے ایمان صحیح ہوتا ہے اس پر واضح دلیل یہ حدیث ہے:

حضرت عمر بن الحکم (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا یارسول اللہ! میری ایک باندی ہے جو میری بکریوں کو چراتی ہے، ایک دن میں اس کے پاس گیا تو بکریوں میں سے ایک بکری کم تھی، میں نے اس کے متعلق سوال کیا تو اس نے کہا اس کو بھیڑیا لے گیا تو مجھے افسوس ہوا اور میں بھی آخر بنو آدم میں سے ہوں، میں نے اس کو ایک تھپڑ مار دیا۔ مجھ پر ایک غلام کو آزاد کرنا تھا کیا میں اس باندی کو آزاد کردوں؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس باندی سے پوچھا اللہ کہاں ہے؟ اس نے کہا، آسمان میں؟ آپ نے فرمایا میں کون ہوں؟ اس نے کہا آپ اللہ کے رسول ہیں، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس کو آزاد کردو۔ (الموطا رقم الحدیث: 1511۔ صحیح مسلم المساجد 33 (537) 1179۔ سنن ابوداود، رقم الحدیث: 3282۔ 3909۔ سنن النسائی رقم الحدیث: 1218۔ سنن کبری للنسائی رقم الحدیث: 1141۔ الاستذکار ج 23، رقم الحدیث: 1483، ص 165) (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ○۱۸۶

لغۃ القرآن: [مَنْ : جس کو] [يُّضْلِلِ : گمراہ کرے] [اللّٰهُ : اللہ] [فَلَا هَادِيَ : تو کوئی بھی ہدایت دینے والا نہیں ہے] [لَهٗ: اس کے لیے] [وَيَذَرُهُمْ : اور وہ چھوڑ دیتا ہے ان کو] [فِيْ : میں] [طُغْيَانِهِمْ : ان کی سرکشی] [يَعْمَهُوْنَ : سرگرداں پھرتے ہیں]

ترجمہ: جسے اللہ گمراہ ٹھہرادے تو اس کے لیے (کوئی) راہ دکھانے والا نہیں، اور وہ انھیں ان کی سرکشی میں چھوڑے رکھتا ہے تاکہ (مزید) بھٹکتے رہیں

تشریح: ہدایت و گمراہی اللہ کے قبضہ میں ہے:

ہدایت وضلالت، ہر چیز خدا کے قبضہ میں ہے۔ وہ نہ چاہے تو سارے سامان ہدایت کے رکھے رہ جائیں۔ آدمی کہیں سے بھی منتفع نہ ہو ہاں عادۃً وہ جب ہی ہدایت کی توفیق دیتا ہے جب بندہ خود اپنے کسب واختیار سے اس راستہ پر چلنا چاہے۔ باقی جو دیدہ و دانستہ بدی اور شرارت ہی کی ٹھان لے تو خدا بھی راستہ دکھلانے کے بعد اسی حال میں اسے چھوڑ دیتا ہے۔ (تفسیر گلدستہ)

اگر سوال کیا جائے کہ جس کو اللہ نے گمراہ کر دیا اس کا کیا قصور ہے؟ پھر اس کو عذاب دینے کا کیا معنی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کا کسی کو گمراہ کرنا یہ ہے کہ جب کوئی شخص حق دیکھ کر اسے قبول کرنے کی بجائے اس سے دشمنی کرتا ہے تو اللہ اسے کچھ عرصہ مہلت دیتا ہے جب وہ باز نہ آئے تو اس کے مسلسل کفر کی وجہ سے اس کے دل پر اسقدر سیاہی چڑھ جاتی ہے کہ اسے کوئی چیز ہدایت نہیں دے سکتی، اسی بات کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ اس کے دل پر پکی مہر ضلالت لگا دیتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بل طبع اللہ علیہا بکفرہم۔ (نساء: 155) فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم۔ (صف: 5) پھر اسے کوئی انسان ہدایت نہیں دے سکتا۔

اللہ تعالیٰ کے کسی کو گمراہ کرنے کا معنی اور اس کی مثال:

اس کی مثال یوں ہے کہ ایک مریض گوشت اور مرغن غذائیں زیادہ کھاتا ہے جس سے اس کے خون میں چربی زیادہ ہو جاتی ہے، یوں اس کے دل کی شریانے بند ہونے لگتی ہیں، حتیٰ کہ اسے ہارٹ اٹیک ہونے لگتا ہے۔ ڈاکٹر اسے کہتا ہے کہ گوشت اور مرغن چیزیں مت کھاؤ، اس کی بجائے سبزیاں اور غیر مرغن غذائیں کھاؤ اور یہ دوا استعمال کرو۔ مگر وہ ضدی مریض ڈاکٹر کی باتوں کی کچھ پروا نہیں رکھتا، ڈٹ کر گوشت، انڈے، روسٹ اور تیل میں بھیگی ہوئی غذائیں کھاتا ہے۔ پھر یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کے دل کی شریانیں بند ہو جاتی ہیں اور اس کی کوئی دوا فائدہ نہیں دے سکتی۔ گویا اس کے دل پہ مرض کی پکی مہر لگ جاتی ہے اور بالآخر ایک دن دل کی حرکت بند ہو جاتی اور اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

یہی حالت اس کافر کی ہے جسکے مسلسل کفر کی وجہ سے اس کے دل پر کفر کی سیاہی بڑھتی جاتی ہے۔ اس کو انبیاء و کتب الٰہیہ کی زبانی بار بار سمجھایا جاتا ہے کہ کفر وشرک چھوڑو، ایمانی و روحانی غذائیں کھاؤ اور تلاوت، ذکر الٰہی اور درود کی دوا استعمال کرو، مگر وہ اللہ کی کوئی بات نہیں سنتا بلکہ اللہ اور رسول سے دشمنی کرتا ہے۔ طب اس کے دل کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس پر کوئی آیت یا حدیث اثر نہیں کر سکتی۔ اسی بات کو یوں تعبیر کیا گیا کہ اللہ نے اس کے دل پر گمراہی کیف کی مہر لگا دی، لہٰذا اس کا کوئی ہادی نہیں ہے جو اسے ہدایت دے سکے۔ (تفسیر برہان القرآن)

اس آیت کا یہ معنی نہیں ہے کہ کفار کو اللہ تعالیٰ نے گمراہ کیا ہے کیونکہ اگر یہ معنی ہو تو کفار قیامت کے دن حجت پیش کریں گے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں گمراہ کر دیا تھا تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ کس قانون کی بنا پر ہمیں ہماری گمراہی کی سزا دی جارہی ہے؟ بلکہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جب مسلسل کفریہ عقائد پر جمے رہنے کی وجہ سے کفار کے دلوں میں گمراہی راسخ ہو گئی اور وہ اپنی سرکشی میں حد سے بڑھ گئے حتّٰی کہ انھوں نے اپنے اختیار سے اس چیز کو ضائع کر دیا جو انھیں ہدایت اور ایمان کی دعوت دیتی تو پھر ان کے دل و دماغ سے دعوت حق قبول کرنے کی اِستعداد جاتی رہی اور وہ اس طرح ہو گئے گویا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں گمراہی پر پیدا کیا ہے۔

گناہ پر جلدی پکڑ نہ ہونا عذاب ہے:

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا کسی بندے کو چھوڑے رکھنا اور اس کی گرفت نہ کرنا عذاب ہے یعنی یوں کہ بندہ کفر وشرک اور گناہ کرتا رہے لیکن کوئی پکڑ نہ ہو جبکہ اس کے برعکس بندے کی معمولی بات پر گرفت ہو جانا اللہ عَزَّوَجَلَّ کی رحمت ہے۔ حضرت انس (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے جلد ہی دنیا میں سزا دیتا ہے اور اگر کسی بندے سے برائی کا ارادہ کرتا ہے تو گناہ کے سبب اس کا بدلہ روک رکھتا ہے یہاں تک کہ قیامت کے دن اسے پورا بدلہ دے گا۔ (تفسیر صراط الجنان)

سچ ہے کہ (جسکی گمراہی اللہ تعالیٰ) (بتادے) اور ظاہر فرمادے کہ اس کی تقدیر میں گمراہ ہونا ہی ہے اور اس وجہ سے وہ قرآن پر ایمان نہیں لارہا ہے (تو) کوئی بھی (اسکا ہادی نہیں) جس کی ہدایت وہ قبول کرسکے۔ تو اسکو تو گمراہ ہی رہنا ہے (اور) خدا کی بھی یہ سنت ہے کہ انھیں اور ان جیسے سب کو (چھوڑ دیتا ہے کہ) وہ سب (اپنی سرکشی میں اندھرایا کریں) اور گمراہی میں بھٹکتے رہیں۔۔۔

کفار ومشرکین اور یہودیوں کی یہ عجیب روش رہی کہ کافر تو اپنی جہالت میں اور یہودی جان بوجھ لینے کے بعد بھی نبی کریم کی نبوت کو آزمانے کیلئے عجیب و غریب اور غیر ضروری سوال کیا کرتے تھے۔۔ چنانچہ۔۔ یہود نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر تم پیغمبر ہو تو ہمیں قیامت کی خبر دو اس واسطے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ قیامت کب آئیگی۔

یہ سوال امتحانی تھا اس لیے کہ وہ اپنی کتابوں سے بخوبی جان چکے تھے کہ قیامت کا علم ان علوم الٰہیہ میں سے ہے جس کو بتانا کسی بھی نبی کے فریضہء نبوت میں سے نہیں بلکہ اس کا اچانک آجانا ہی حکمت خداوندی کے نزدیک طے ہے۔ تو اگر بالفرض رب قادر مطلق اپنی کسی حکمت۔۔ یا۔۔ نوازش کے تحت کسی رسول و نبی کو قیامت کا وقت بتا بھی دے جب بھی وہ پیغمبر اس بات پر مامور ہو گا کہ وہ کسی اور کو نہ بتائے اس لیے کہ رب نے فرمادیا ہے کہ قیامت اچانک آئیگی تو اب اگر کسی نے اسکو ظاہر کر دیا تو پھر قیامت آنا اچانک نہ رہا تو یہ سراسر کلام الٰہی کی تکذیب ہوئی۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ کا پیغمبر اللہ تعالیٰ کے کلام کی تصدیق کیلئے آتا ہے نہ کہ اس کی تکذیب کیلئے۔۔۔

یہودی اس صورت حال سے بخوبی باخبر تھے اور وہ سوچ رہے تھے کہ اس سوال کے جواب میں پیغمبر اسلام جو بھی صورت اختیار فرمائینگے اس میں ہمارا ہی فائدہ ہو گا۔ اگر وہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس کا علم نہیں تو ہم کو اس پروپیگنڈہ کا موقع مل جائے گا کہ یہ کیسے نبی ہیں جنھیں قیامت کے آنے کے وقت کی خبر بھی نہیں اور پھر یہ قیامت سے ڈرا بھی رہے ہیں؟۔۔ اور اگر جواب میں کسی وقت کا نام لے لیا تو پھر ہمیں اور بھی شور مچانے کا موقع مل جائے گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر نہیں ہیں اس لیے کہ ساری آسمانی کتابیں قیامت کے اچانک آنے ہی کی باتیں کر رہی ہیں ان کے اس جواب نے تو سارے انبیاء کرام کی تکذیب کر دی ہے اور ساری آسمانی کتابوں کو جھوٹا قرار دیدیا ہے۔۔ الختصر۔۔ یہودیوں کے سوال کے بعد ارشاد خداوندی ہوتا ہے کہ اے محبوب۔۔ (تفسیر اشرفی)

اب بات قدرے ایک مختصر وقفے کے لیے رک جاتی ہے اور اس وقفے میں اللہ کی اس سنت کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ جو اللہ نے ہدایت وضلالت کے لیے اسی دنیا میں جاری کی ہوئی ہے۔ یعنی اس قانون کے مطابق کہ جو شخص ہدایت کے لیے جدوجہد کرے گا، وہ ہدایت پائے گا، طلب صادق کے ساتھ اور جو شخص منہ موڑے گا اور دلائل ایمان اور اشارات ہدایت کو پکڑنے کی سعی نہ کرے گا، گمراہ ہو جائے گا۔

یہاں یہ اشاہ ان لوگوں کے حالات کی مناسبت سے کیا جارہا ہے، جن کو قرآن خطاب کر رہا تھا اور قرآن کا یہ انداز اور خاص طریق کار ہے کہ قرآن کریم ایک انفرادی واقعہ کے بیان کے بعد اس سے اصول عامہ اخذ کرتا ہے اور اسے بطور اٹل سنت الٰہیہ پیش کر دیتا ہے۔ وہ واقعہ تو انفرادی ہوتا ہے اور وقوع کے بعد حصہ تاریخ بن جاتا ہے لیکن اصول اپنی جگہ رہتا ہے اور بار بار سامنے آتا رہتا ہے۔

جو لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں، وہ کیوں گمراہ ہوتے ہیں؟ اس لیے کہ وہ نہ ہدایت کی فکر کرتے ہیں اور نہ واقعات ومسائل پر تدبر کرتے ہیں اور جو شخص آیات الٰہیہ سے غفلت کرتا ہے اور ان پر تدبر نہیں کرتا اسے اللہ گمراہ کر دیتا ہے اور جسے اللہ نے اپنی سنت کے مطابق گمراہ کر دیا پھر وہ ہدایت نہیں پا سکتا اور نہ اس کے لیے کوئی ہادی بن سکتا ہے۔

من یضلل اللہ فلا ھادی لہ جس کو اللہ رہنمائی سے محروم کر دے اس کے لیے پھر کوئی رہنما نہیں ہے۔ اور جس شخص پر اللہ ضلالت مسلط کر دے، اپنی سنت جاریہ کے مطابق تو وہ ہمیشہ کے لیے گمراہ ہو جاتا ہے اور وہ ہدایت کے معاملے میں مادر زاد اندھا ہو جاتا ہے اور پھر کیا ہوتا ہے؟

و یذرھم فی طغیانہم یعمھون۔ اور اللہ انھیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔

ان لوگوں کو اللہ نے اس تاریکی میں چھوڑ کر، ان پر کوئی ظلم نہیں کیا، کیونکہ ان کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے خود اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ انھوں نے اپنے دلوں کو معطل کر دیا تھا۔ اپنے اعضائے مدرکہ سے کام لینا بند کر دیا تھا۔ انھوں نے اس دنیا کی تخلیق کے عجائبات پر غور نہ کیا اس کائنات کے رازوں کو پانے کی سعی نہ کی۔ خصوصاً ہر ایک پیدا کردہ چیز کی حقیقت اور اس کے راز جس کی طرف سابقہ آیات میں اشارہ کیا گیا تھا، انھوں نے اس حقیقت کی شہادت کو قبول نہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی انسان نے اس کائنات میں نظر دوڑائی اسے اس کے عجائبات نظر آئے۔ جب بھی اس نے آنکھیں کھولیں اسے کوئی نہ کوئی دلیل نظر آئی۔ جب بھی انسان نے اپنی ذات اور اپنے ماحول کا مطالعہ کیا۔ اسے اپنی تخلیق کا اعجاز معلوم ہوا، اسے اپنے ماحول کی ہر مخلوق ایک اعجاز نظر آئی، لیکن جب انسان نے اپنے آپ کو اندھا

کر لیا تو وہ اندھا ہو گیا اور اللہ نے بھی اسے اندھیرے میں چھوڑ دیا اور اس کے بعد جب اس نے سر کشی شروع کر دی تو اللہ نے اسے اس میں ڈھیل دی۔ یہاں تک کہ وہ ہلاکت تک پہنچ جاتا ہے۔" اور اللہ انھیں ان کی سر کشی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے" (تفسیر فی ظلال القرآن)

آیت مبارکہ:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝١٨٧

لغۃ القرآن: [يَسْـَٔلُوْنَكَ : وہ لوگ پوچھتے ہیں آپ سے] [عَنِ السَّاعَةِ : قیامت کے بارے میں] [اَيَّانَ : ایان [کب ہے [مُرْسٰىهَا : اس کے قیام ہونے کا وقت] [قُلْ : آپ کہہ دیجئے] [اِنَّمَا : کچھ نہیں سوائے اس کے کہ][عِلْمُهَا : اس کا علم] [عِنْدَ رَبِّيْ : میرے رب کے پاس ہے] [لَا يُجَلِّيْهَا : ظاہر نہیں کرے گا (کوئی) اس کو] [لِوَقْتِهَاۤ : اس کے وقت پر] [اِلَّا : مگر] [هُوَ ہ : وہی] [ثَقُلَتْ : وہ بھاری ہوئی (یعنی ہوگی)] [فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: زمین اور آسمانوں میں] [لَا تَاْتِيْكُمْ : وہ نہیں پہنچے گی تم لوگوں کو] [اِلَّا : مگر] [بَغْتَةً: اچانک] [يَسْـَٔلُوْنَكَ : وہ پوچھتے ہیں آپ سے] [كَاَنَّكَ : جیسے آپ] [حَفِيٌّ: پورا علم رکھنے والے ہیں] [عَنْهَا : اس کے بارے میں] [قُلْ : آپ کہئے] [اِنَّمَا عِلْمُهَا : اس کا علم تو بس] [عِنْدَ اللّٰهِ : اللہ کے پاس ہے] وَلٰكِنَّ : اور لیکن] [اَكْثَرَ النَّاسِ : اکثر لوگ] [لَا : نہیں] [يَعْلَمُوْنَ : وہ جانتے]

ترجمہ: یہ (کفار) آپ سے قیامت کی نسبت دریافت کرتے ہیں کہ اس کے قائم ہونے کا وقت کب ہے ؟ فرمادیں کہ اس کا علم تو صرف میرے رب کے پاس ہے، اسے اپنے (مقررہ) وقت پر اس (اللہ) کے سوا کوئی ظاہر نہیں کرے گا۔ وہ آسمانوں اور زمین (کے رہنے والوں) پر (شدائد و مصائب کے خوف کے باعث) بوجھل (لگ رہی) ہے۔ وہ تم پر اچانک (حادثاتی طور پر) آجائے گی، یہ لوگ آپ سے (اس طرح) سوال کرتے ہیں گویا آپ اس کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں، فرمادیں کہ اس کا علم تو محض اللہ کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے

تشریح: روز قیامت پر ایمان اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے۔ قرآن کریم نے انتہائی کوشش کی ہے کہ اپنے ماننے والوں کے دلوں میں یہ یقین راسخ کر دے کہ اس زندگی کے بعد انھیں ایک دن بارگاہ رب العزت میں پیش ہونا ہے جب کہ ان کے اعمال کا محاسبہ ہوگا۔ اور ہر ایک سے ان اعمال کے مطابق سلوک کیا جائے گا جو وہ اس دنیوی زندگی میں بجالاتا رہا ہے۔ لیکن جس طرح موت کا وقت لوگوں سے مخفی رکھنے میں حکمتیں ہیں اسی طرح قیامت کے دن کو بھی ظاہر نہیں کیا گیا بلکہ اس کو انتہائی طور پر پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں یہاں بھی اور اس کے علاوہ متعدد مقامات پر قیامت کے وقوع کے علم کو علم الٰہی کی طرف تفویض کیا گیا ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

قرآن مجید کے بنیادی مضمون چار ہیں توحید، رسالت، تقدیر اور قیامت، اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے توحید، رسالت اور قضاء و قدر کے متعلق آیات نازل فرمائی تھیں تو اب قیامت کے متعلق آیت نازل فرمائی، دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے فرمایا: شاید ان کا مقررہ وقت قریب آچکا ہے (الاعراف: 185) تاکہ انھیں توبہ اور اصلاح پر برانگیختہ کیا جاسکے۔ اس کے بعد فرمایا یہ لوگ قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں، تاکہ ان کے دلوں میں یہ بات جاگزیں ہو کہ قیامت کا وقت لوگوں سے مخفی رکھا گیا ہے اور اس سے مسلمانوں کو توبہ اور اداء واجبات میں جلدی کرنے پر برانگیختہ کیا جائے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

عقیدہ آخرت انسانی تصور میں وسعت پیدا کرتا ہے، نفس انسانی میں کشادگی آجاتی ہے، زندگی جس کے تسلسل کے بارے میں انسان کی شخصیت کے اندر تمنا پائی جاتی ہے، وہ تمنا پوری ہوتی ہے اور پھر امت مسلمہ کے ذمہ جو فراض ہیں ان کی ادائیگی کے لیے یہ عقیدہ ضروری ہے۔ پھر اس عقیدے کی وجہ سے انسان کے سفلی جذبات اور محدود دنیاوی خواہشات پر بھی کنٹرول ہوتا ہے۔ نیز اس سے انسان کا دائرہ حرکت وسیع ہو جاتا ہے اور انسان کو دنیا کے محدود نتائج مایوس نہیں کر سکتے اور نہ اسے دردناک قربانیاں اپنے مقصد کے حصول سے روک سکتی ہے نیکی کے کاموں اور دعوت اسلامی کے پھیلانے اور بھلائی کی طرف لوگوں کی قیادت کرنے میں وہ کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتا۔ اگرچہ اس کی جدوجہد کے فوری نتائج اس کی منشا کے خلاف ہوں اور اس کی راہ میں دردناک رکاوٹیں ہوں۔ یہ شعور اور یہ اوصاف ہر اس فرد اور جماعت کے لیے ضروری ہیں جس کے کاندھوں پر یہ عظیم ذمہ داری ڈالی گئی ہو۔

آخرت کا عقیدہ دو تصورات کے درمیان ایک دوراہا ہے۔ ایک تصور حیوانی تصور ہے، جو احساس کے حدود کے اندر محدود ہے۔ دوسرا تصور ایک انسانی تصور ہے جو اس دنیا کو ایک وسیع دائرے کے اندر دیکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس جماعت نے پوری انسانیت کی قیادت کا فریضہ سرانجام دینا ہے وہ حیوانی تصور کے ساتھ یہ فریضہ انجام نہیں دے سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ دین اسلام میں امت مسلمہ کے لیے عقیدہ آخرت کے یقین کو ایک اساسی عقیدہ قرار دیا گیا ہے۔ دین اسلام نے عقیدہ آخرت کو نہایت ہی گہرا، نہایت ہی وسیع اور نہایت ہی واضح شکل میں پیش کیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مسلمان کے شعور اور عمل میں عالم آخرت، اس محدود دنیا کے مقابلے میں زیادہ گہرائی تک، زیادہ وسعت کے ساتھ اور زیادہ واضح طور پر بیٹھا ہوا ہے۔ حالانکہ مسلمان بہر حال اس جہان میں رہ رہے ہیں، اور یہی وہ خوبی تھی جس کی وجہ سے امت مسلمہ نے انسانیت کی قیادت کا فریضہ سرانجام دیا اور یہ قیادت راشدہ تھی جسے اسلامی اور عالمی تاریخ نے خوب سمجھا۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

شان نزول:

حضرتِ عبداللہ بن عباس (رض) سے مروی ہے کہ یہودیوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا تھا کہ اگر آپ نبی ہیں تو ہمیں بتائیے کہ قیامت کب قائم ہو گی کیونکہ ہمیں اس کا وقت معلوم ہے۔ (1) اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

{ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ : تم فرماؤ: اس کا علم تو میرے رب کے پاس ہے۔ } اس آیت میں بتادیا گیا کہ قیامت کے مُعَیَّن وقت کی خبر دینا رسول کی کوئی ذمہ داری نہیں کیونکہ یہ علم شریعت نہیں جس کی اشاعت کی جائے بلکہ قیامت کا علم اللہ تعالیٰ کے اسرار میں سے ہے جس کا چھپانا ضروری ہے، لہٰذا اگر اس سربستہ راز کو ہر طرح سے ظاہر کر دیا جائے تو پھر قیامت کا اچانک آنا باقی نہ رہے گا حالانکہ اسی آیت میں تصریح ہے کہ ”لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ”تم پر وہ اچانک ہی آجائے گی۔ عوام سے قیامت کا علم مخفی رکھنے کی وجہ سے متعلق علماء فرماتے ہیں ”بندوں سے قیامت کا علم اور اس کے وقوع کا وقت مخفی رکھنے کا سبب یہ ہے کہ لوگ قیامت سے خوف زدہ اور ڈرتے رہیں کیونکہ جب انھیں معلوم نہیں ہوگا کہ قیامت کس وقت آئے گی تو وہ اس سے بہت زیادہ ڈریں گے اور ہر وقت گناہوں سے بچنے کی کوشش کریں گے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کوشاں رہیں گے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ گناہوں میں مشغول ہوں اور قیامت آجائے۔ (1)

اہل مکہ نے سوال کیا کہ قیامت کب آئے گی؟ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میں قیامت کی تحقیق کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا۔ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، وہی اس کو اس کے مقررہ وقت پر ظاہر فرمائے گا۔ قیامت کے متعلق بائبل میں بھی لکھا ہوا ہے: ”دنیا کے اختتام کا وقت اور تاریخ کوئی نہیں جانتا حتیٰ کہ فرشتے اور بیٹا (عیسیٰ) بھی نہیں جانتے، صرف باپ (خدا) جانتا ہے“۔ (دی لیونگ بائبل: متی کی انجیل: ۲۴: ۳۶) تاہم نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قیامت کی نشانیاں بیان فرمادیں، مثلاً خروج دجال، نزول عیسیٰ اور سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، البتہ قیامت کی آمد زمین وآسمان پر بہت گراں ہو گی

کیونکہ وہ اچانک آجائے گی جس سے ساری کائنات ہلاک ہو جائے گی اور کسی کو ایک لمحہ بھی مہلت نہیں دی جائے گی جیساکہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھے قسم ہے اللہ تعالیٰ کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! انسان لقمہ اٹھا کر منہ میں لے جانا چاہتا ہو گا مگر قیامت اس قدر اچانک قائم ہو جائے گی کہ انسان کو وہ لقمہ منہ میں ڈالنے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔ (تفسیر کبیر)

اس آیت کی تفسیر میں علامہ فخر الدین رازی نے محققین کا قول نقل کیا ہے کہ: قیامت کے وقت کو لوگوں سے مخفی رکھنے کا سبب یہ ہے کہ جب انھیں یہ معلوم نہیں ہو گا کہ قیامت کب آئے گی تو وہ اس سے ڈریں گے اور ہر وقت گناہوں سے بچنے کی کوشش کریں گے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ گناہوں میں مشغول ہوں اور قیامت آجائے اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی فرمان برداری میں کوشاں رہیں گے۔ (تفسیر کبیر) اسی حکمت کے پیش نظر عوام سے موت کے وقت کو مخفی رکھا گیا ہے کیونکہ اگر کسی کو بتا دیا جائے کہ وہ دس سال بعد مر جائے گا تو ہو سکتا ہے اس پر شیطان آجائے اور وہ یہ فیصلہ کر بیٹھے کہ ۹ سال تو عیاشی میں گزارتا ہوں اس کے بعد توبہ کر لوں گا یا اتنا ڈر جائے کہ سارے کام چھوڑ کر صرف عبادت میں مصروف ہو جائے اور اس کے اہل خانہ بھوک اور فقر کا شکار ہو جائیں یہ دونوں صورتیں اس کے لیے اچھی نہیں ہیں۔ الغرض عوام سے قیامت کا وقت اس لیے مخفی رکھا گیا تاکہ وہ ہر وقت گناہوں سے بچنے میں کوشاں رہیں مگر انبیائے کرام (علیہم السلام) کو تو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی گناہوں سے پاک کر رکھا ہے اور وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں، لہٰذا ان سے قیامت کو مخفی رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں شیخ احمد صاوی لکھتے ہیں: قیامت کا وقت ان مخفی امور میں سے ہے جن کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ خاص کر رکھا ہے، وہ اس پر کسی کو مطلع نہیں فرماتا مگر رسولوں میں جن کو چاہے، لہٰذا یہ ایمان رکھنا واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ دنیا چھوڑنے سے پہلے دنیا وآخرت اور جنت و دوزخ کے تمام غیوب پر مطلع فرمایا لیکن ان میں سے بعض کو مخفی رکھنے کا حکم دیا۔ (حاشیہ صاوی) اسی لیے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قیامت کی نشانیاں تو بتا دیں مگر اس کے سن کو مخفی رکھا۔ نیز اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے کہ قیامت اچانک آئے اور لوگوں کو پہلے سے پتہ نہ چلے جیساکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "بیشک قیامت آنے والی ہے۔ میں اس (کے وقت) کو (لوگوں سے) مخفی رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر شخص (قیامت کے ڈر سے نیک کام کرنے کی کوشش کرے اور قیامت میں اس) کی اس کی کوشش کا بدلہ دیا جائے۔ (قرآن: ۲۰: ۱۵) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے لیلۃ القدر کو مخفی رکھا تاکہ لوگ زیادہ راتیں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزاریں اور جمعہ کے دن قبولیت کی گھڑی کو بھی مخفی رکھا تاکہ لوگ جمعہ کے اکثر اوقات اللہ تعالیٰ کی یاد میں بسر کریں۔ (تفسیر امداد الکرم)

حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ قریش نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا آپ کے اور ہمارے درمیان قرابت داری ہے۔ آپ ہمیں آہستہ سے بتا دیں قیامت کب آنے والی ہے۔ اس کے جواب میں یہ آیت اتری۔ (ابن جریر طبری جلد 9 صفحہ 93) یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قیامت اچانک آئے گی لہٰذا انھیں اس کے آنے کے وقت کا نہیں بتایا جا سکتا اور قیامت کو الساعۃ (گھڑی) اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ آن واحد میں یکدم اچانک بپا ہو جائے گی۔ حدیث میں ہے کپڑا بیچنے والا اور خریدنے والا دونوں آپس میں کپڑا پھیلائے بیٹھے ہوں گے۔ ابھی خرید و فروخت مکمل نہ ہو گی کہ قیامت بپا ہو جائے گی۔ (صور پھونک دیا جائے گا) ایک آدمی اونٹنی کا دودھ دوھ کر گھر کو چلے گا ابھی گھر نہ پہنچے گا کہ قیامت بپا ہو جائے گی ایک شخص لقمہ اٹھائے گا ابھی لقمہ منھ تک نہ آئے گا کہ قیامت تباہ ہو جائے گی (بخاری کتاب الرقاق باب 40)

قیامت کب آئے گی اسے مخفی رکھنے میں حکمت یہ ہے کہ اگر بتا دیا جاتا کہ قیامت فلاں تاریخ پر آئے گی تو لوگ اس وقت کے آنے سے قبل ہی خوف کی وجہ سے مرنے لگتے یہ اسی طرح ہے جیسے انسان سے اس کا وقت موت مخفی رکھا گیا ہے کیونکہ اگر اسے مخفی نہ رکھا جاتا تو انسان وقت موت آنے سے قبل ہی مرنے لگتا اور وقت قیامت کو اس لئے بھی مخفی رکھا گیا تاکہ لوگ ہر وقت اس کا خطرہ محسوس کریں اور ہمہ وقت اس کی تیاری میں مصروف رہیں۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قیامت کا علم رکھتے ہیں، مگر آپ کو اخفاء کا حکم ہوا:

یاد رہے! حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قیامت کی ساری نشانیاں بتا دی ہیں۔ اس پر سینکڑوں احادیث مروی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بتایا کہ قیامت سے قبل کیا کچھ واقع ہو گا، آپ نے قیامت کی دو قسم کی نشانیاں بتائی ہیں اول کے سنگ و جن کا انسانوں کے روزمرہ کے حالات سے تعلق ہے مثلاً یہ کہ علم دین اس قدر گھٹ جائے گا کہ مسجد میں بہت سے لوگ جمع ہوں گے مگر ان میں سے کوئی شخص امامت نہیں کرا سکے گا (ابو داؤد) وقت تیز ہو جائے گا

سال ہفتوں میں، ہفتے دنوں میں اور دن گھنٹوں میں گزر جائیں گے۔ زنا عام ہو جائے گا شراب پی جائے گی، قتل زیادہ ہو جائے گا۔ (مسلم) لوگ بیوی کی اطاعت اور ماں کی نافرمانی کریں گے، ذلیل لوگوں کے ڈر سے ان کی عزت کی جائے گی۔ (ترمذی) برہنہ پا، برہنہ بدن بکریاں چرانے والے لوگ اونچے محلات کے مالک بن جائیں گے، لونڈی اپنی مالکہ کو جنم دے گی یعنی ماں کی حیثیت لونڈی والی اور بیٹی کی ماں والی بن جائے گی۔ (بخاری) وغیرہ۔ دوسرے قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو ظہور قیامت سے فوری پہلے اچانک نمودار ہوں گی وہ دس ہوں گی۔ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے ظہور کے احوال بھی بتائے ہیں، مثلاً سورج کا مغرب کی بجائے مشرق سے طلوع کرنا، دجال کا ظہور، دابۃ الارض کا نکلنا، تین بڑے زلزلوں کا آنا، عیسیٰ (علیہ السلام) کا نازل ہونا، یاجوج وماجوج کا نمودار ہونا اور ایک بڑے دھوئیں کا آنا۔ (بخاری ومسلم) لہٰذا یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قیامت کا مکمل علم رکھتے ہیں۔

اور حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ بھی بتادیا ہے کہ وہ جمعہ کو آئے گی۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جمعہ سب سے افضل دن ہے اس میں آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے اور اسی میں قیامت قائم ہوگی (مسلم کتاب الجمعۃ حدیث 854) اور دس محرم کی تاریخ ہوگی اور حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: یوم القیامۃ یوم العاشوراء۔ یعنی قیامت کا دن دس محروم کو ہوگا۔ (فضائل الاوقات حدیث 237) گویا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قیامت کا دن مہینہ تاریخ سب بتادیا ہے صرف آپ نے نہیں بتایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کا سن بھی جانتے تھے، مگر آپ نے حکم ربی کے تحت اس کو مخفی رکھا ہے۔

اسی لیے امام سیوطی فرماتے ہیں: ذھب بعضھم الی انہ اوتی علم الخمس ایضا وعلم الساعۃ والروح وانہ امر بکتم ذلک۔ بعض ائمہ اس طرف گئے ہیں کہ حضور سرور کونین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو علوم خمسہ بھی دیئے گئے ہیں اور قیامت اور روح کا علم بھی دیا گیا مگر اس کے چھپانے کا حکم فرمایا گیا۔ (خصائص الکبریٰ جلد 2 صفحہ 195 مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت)

علامہ محمود آلوسی بغدادی فرماتے ہیں: یہ کہنا جائز ہے کہ اللہ نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قیامت کا علم علی وجہ الکمال دیا تھا۔ مگر ایسا نہیں کہ وہ علم الٰہی کے مماثل ہو۔ الاانہ سبحانہ اوجب علیہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کتمہ لحکمۃ۔ تاہم اللہ سبحانہ نے آپ کو حکمت کے تحت اس کے مخفی رکھنے کا حکم فرمایا۔ (روح المعانی جلد 21 صفحہ 13 زیر آیت ان اللہ عندہ علم الساعۃ۔ لقمان: 36 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

اور شیخ احمد صاوی مالکی حاشیہ جلالین میں فرماتے ہیں: ولذلک قال العلماء الحق انہ لم یخرج من الدنیا حتی اطلعہ اللہ علی تلک الخمس الاانہ امر بکتمھا۔ اسی لئے علماء فرماتے ہیں: حق یہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دنیا سے تشریف لے گئے حتیٰ کہ اللہ نے انھیں ان علوم خمسہ کی اطلاع عطا فرمائی اور آپ کو ان کے چھپانے کا حکم دیا۔ (صاوی حاشیہ جلالین جلد 3 صفہ 261 سورۃ لقمان مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت) (تفسیر برہان القرآن)

علم قیامت کے متعلق لوگوں کے سوالات اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جوابات

امام ابن اسحٰق، امام ابن جریر اور امام ابو الشیخ حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ حمل بن ابی قشیر اور سموئیل بن زید نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا اگر آپ برحق نبی ہیں تو ہمیں بتایئے کہ قیامت کب آئے گی؟ کیونکہ ہمیں معلوم ہے وہ کیا چیز ہے، تب یہ آیت نازل ہوئی: یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں وہ کب آئے گی! آپ کہئے کہ اس کا علم تو صرف میرے رب کے پاس ہے۔ الایۃ۔

امام عبد بن حمید اور ابو الشیخ نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی حضرت جبرائیل سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا السلام علیک یا روح اللہ! انھوں نے جواب دیا وعلیک یا روح اللہ! حضرت عیسیٰ نے کہا اے جبرائیل قیامت کب ہوگی؟ تو جبرائیل نے اپنے پر جھاڑے پھر کہا جس سے سوال کیا گیا ہے وہ سائل سے زیادہ نہیں جانتا وہ آسمانوں اور زمینوں پر بھاری ہے اور وہ اچانک ہی آئے گی۔ (الدر المنثور ج 3، ص 619۔620، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256 ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ دیہاتیوں میں سے ایک شخص نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا اور کہنے لگا یارسول اللہ ! قیامت کب قائم ہوگی ؟ آپ نے فرمایا تم پر افسوس ہے ! تم نے قیامت کے لیے کیا تیار کی ہے ؟ اس نے کہا میں نے قیامت کے لیے اس کے سوا اور کوئی تیاری نہیں کی کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں، آپ نے فرمایا تم اس کے ساتھ رہو گے جس سے محبت کرتے ہو، ہم نے پوچھا: ہم بھی اسی طرح ہیں ؟ آپ نے فرمایا ہاں ! تو ہم اس دن بہت زیادہ خوش ہوئے۔ امام مسلم کی روایت 6589 میں ہے حضرت انس (رض) نے کہا، میں اللہ اور اس کے رسول اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر سے محبت کرتا ہوں۔ ہرچند کہ میرے عمل ان کے اعمال کی طرح نہیں ہیں، امام مسلم کی روایت 6591 میں ہے اس اعرابی نے کہا یارسول اللہ ! میں نے قیامت کے لیے بہت بھاری نمازوں، روزوں اور صدقات کی تیاری تو نہیں کی لیکن میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 3688، 7153،6167۔ صحیح مسلم فضائل الصحابہ : 164،163،161 (2639) 6586،689،6591)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک مجلس میں مسلمانوں سے گفتگو فرما رہے تھے اسی اثناء میں ایک اعرابی آیا اور اس نے پوچھا قیامت کب ہوگی ؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا، بعض مسلمانوں نے کہا آپ نے اس کا سوال سن لیا تھا اور اس کو پسند نہیں فرمایا اور بعض نے کہا آپ نے سنا نہیں، جب آپ نے اپنی گفتگو مکمل فرمالی تو آپ نے پوچھا وہ شخص کہاں ہے جس نے قیامت کے متعلق سوال کیا تھا، اس نے کہا میں حاضر ہوں یارسول اللہ ! آپ نے فرمایا جب امانت ضائع کردی جائے تو قیامت کا انتظار کرنا، اس نے پوچھا امانت کیسے ضائع ہوگی ؟ آپ نے فرمایا جب منصب نااہل کے سپرد کردیا جائے تو قیامت کا انتظار کرنا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 59، 6496۔ مسند احمد ج 2، ص 361۔ جامع الاصول ج 10، رقم الحدیث : 7904)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی 1270 ھ لکھتے ہیں :

قرآن مجید کی ظاہر آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو وقوع قیامت کے وقت کا علم نہیں تھا، ہاں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قرب قیامت کو اجمالی طور پر جانتے تھے اور آپ نے اس کی خبر بھی دی ہے۔ (روح المعانی ج 9، ص 134، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

میں کہتا ہوں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تفصیلی طور پر قیامت کے وقوع اور اس کے احوال کا علم تھا اور اس سلسلہ میں آپ سے بہت احادیث مروی ہیں جن کو ہم باحوالہ جات بیان کر رہے ہیں۔ فنقول و باللہ التوفیق۔

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا علامات قیامت کی خبر دینا

1۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ ارض حجاز سے ایسی آگ نمودار نہ ہو جس سے بصری کے اونٹوں کی گردنیں روشن ہوجائیں (صحیح البخاری رقم الحدیث : 7118، صحیح مسلم الفتن 42 (2902) 7156۔ جامع الاصول ج 10، رقم الحدیث : 7887)

2۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ تیس کذابوں کا خروج نہ ہو ان میں سے ہر ایک یہ زعم کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔ (صحیح مسلم الفتن 184 (2923) 7209۔ سنن ابوداود رقم الحدیث : 4334۔ سنن ترمذی رقم الحدیث : 2225۔ مسند احمد ج 2، ص 450، 527، جامع الاصول، ج 10، رقم الحدیث : 7895)

3۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ سورج مغرب سے طلوع نہ ہو، پس جب سورج مغرب سے طلوع ہوگا تو سب لوگ ایمان لے آئیں گے اور جو لوگ اس سے پہلے ایمان نہ لائے ہوں ان کا اس دن ایمان لانا مفید نہ ہوگا یا جن لوگوں نے اس سے پہلے ایمان لے آئیں گے اور جو لوگ اس سے پہلے ایمان نہ لائے ہوں ان کا اس دن ایمان لانا مفید نہ ہوگا یا جن لوگوں نے اس سے پہلے ایمان کے ساتھ کوئی نیکی نہ کی ہو۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 6506۔ صحیح مسلم الایمان 248 (157) 389۔ سنن ابوداؤد رقم الحدیث : 4002۔ سنن ترمذی رقم الحدیث : 2191، 3235۔ مسند احمد، ج 5، ص 145، 165۔ جامع الاصول ج 10، رقم الحدیث : 7897)

4۔ حضرت ابوسعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایااس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ درندے انسانوں سے باتیں نہ کریں اور انسان سے اس کے کوڑے کا پھندا بات نہ کرے اور اس سے اس کی جوتی کا تسمہ بات نہ کرے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث : 2188، جامع الاصول ج10، رقم الحدیث : 7899)

5۔ حضرت سلامہ بنت حر (رض) بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت کی علامتوں میں سے یہ ہے کہ اہل مسجد امامت کرنے کے لیے ایک دوسرے سے کہیں گے اور انھیں نماز پڑھنے کے لیے کوئی امام نہیں ملے گا۔ (سنن ابوداود رقم الحدیث : 581، جامع الاصول ج 10، رقم الحدیث : 7908)

6۔ قیس بن ابی حازم حضرت مرداس اسلمی (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا نیک لوگ ایک ایک کرکے چلے جائیں گے اور تلچھٹ (بھوسی) باقی رہ جائیں گے جیسے جو کی بھوسی یا ردی کھجوریں باقی رہ جاتی ہیں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 6434۔ مسند احمد ج4، ص193۔ سنن الدارمی رقم الحدیث : 2722۔ جامع الاصول ج10، رقم الحدیث : 7909)

7۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایااس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے قیامت اس وقت تک نہیں قائم ہوگی حتی کہ ایک آدمی کسی آدمی کی قبر کے پاس سے گزرے گااور کہے گاکاش اس کی جگہ میں ہوتا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 7115۔ صحیح مسلم الفتن 53(2907)7168۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 4037۔الموطا رقم الحدیث : 165۔ مسند احمد ج2، ص36۔ جامع الاصول رقم الحدیث : 7911)

8۔ حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی حتی کہ زمانہ متقارب ہوجائے سال ایک ماہ کی طرح گزرے گااور مہینہ ہفتہ کی طرح گزرے گا، اور ہفتہ ایک دن کی طرح اور ایک دن ایک گھنٹہ کی طرح گزرے گااور ایک گھنٹہ آگ کی چنگاری کی طرح گزر جائے گا۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث : 3929۔ جامع الاصول رقم الحدیث : 7913)

9۔ حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ قیامت صرف اشرار (بدترین لوگوں) پر قائم ہوگی۔ (صحیح مسلم الفتن 131، (2949)7268۔ جامع الاصول رقم الحدیث : 7916)

10۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایااس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ دو عظیم جماعتوں میں جنگ نہ ہو ان میں بہت بڑی جنگ ہوگی اور ان کا دعوی ایک ہوگا، اور حتی کہ تیس دجالوں کذابوں کا ظہور ہوگا ان میں سے ہر ایک یہ گمان کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے، اور حتی کہ علم اٹھالیا جائے گااور زلزلے بکثرت ہوں گے اور زمانہ متقارب ہوگااور فتنوں کا ظہور ہوگااور بکثرت قتل ہوگا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 3609، صحیح مسلم الفتن 17(28880)7123۔ مسند احمد ج2، ص313، جامع الاصول ج10، رقم الحدیث : 7920)

11 :۔ حضرت عقبہ بن عامر (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے دین کے لیے قتال کرتی رہے گی اور اپنے دشمنوں پر غالب رہے گی اور کسی کی مخالفت سے ان کو ضرر نہیں ہوگا حتی کہ ان پر قیامت آجائے گی اور وہ اسی حال پر ہوں گے، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (رض) نے کہاہاں اللہ تعالیٰ ایک ہوا بھیجے گا جس کی خشبو مشک کی طرح ہوگی اور اس کا مس ریشم کی طرح ہوگااور جس شخص کے دل میں ایک رائی کے برابر بھی ایمان ہوگا وہ اس کی روح قبض کرلے گی پھر اشرار (بدترین لوگ) باقی رہ جائیں گے اور ان پر قیامت قائم ہوگی۔ (صحیح مسلم الامارۃ176 (1924)4874۔ جامع الاصول رقم الحدیث : 7917)

12 :۔ حضرت حذیفہ بن اسید الغفاری (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم آپس میں بحث کررہے تھے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لے آئے آپ نے فرمایا تم کسی چیز کا ذکر کررہے ہو؟ ہم نے کہاہم قیامت کا ذکر کررہے ہیں، آپ نے فرمایا قیامت ہرگز اس وقت تک قائم نہیں ہوگی حتی کہ تم اس سے پہلے دس نشانیاں نہ دیکھ لو، پھر آپ نے دھوئیں کا، دجال کا، دابۃ الارض کا، سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کا، حضرت عیسیٰ بن مریم کے نزول کا، یاجوج ماجوج کااور تین مرتبہ زمین کے دھنسنے کا ذکر فرمایا، ایک مرتبہ مشرق میں، ایک مرتبہ مغرب میں ایک مرتبہ جزیرہ عرب میں اور سب کے آخر میں ایک آگ ظاہر ہوگی جو لوگوں کو

محشر کی طرف لے جائے گی۔ (صحیح مسلم الفتن 39 (2901) 7152۔ سنن ابو داؤد رقم الحدیث : 4311۔ سنن الترمذی رقم الحدیث : 2183۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 4041۔ جامع الاصول رقم الحدیث : 7921)

13 :۔ حضرت انس بن مالک (رض) نے کہا کیا میں تم کو وہ حدیث نہ سناؤں جس کو میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا اور میرے بعد کوئی ایسا شخص نہیں ہوگا جس نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کو سنا ہو، آپ نے فرمایا قیامت کی علامتوں میں سے یہ ہے کہ علم اٹھا یا جائے گا، اور جہل کا ظہور ہوگا، اور زنا عام ہوگا، اور شراب پی جائے گی اور مرد چلے جائیں گے اور عورتیں باقی رہ جائیں گی، حتی کہ پچاس عورتوں کا کفیل ایک مرد ہوگا۔ (صحیح مسلم العلم 9 (2671) 6660۔ صحیح البخاری، رقم الحدیث : 81۔ سنن الترمذی رقم الحدیث : 2212۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 4045۔ مسند احمد ج 3، ص 120۔ جامع الاصول، رقم الحدیث : 7922)

14 :۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کی علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ زمانہ متقارب ہو جائے گا اور علم کم ہو جائے گا اور فتنوں کا ظہور ہوگا، اور قتل بہت زیادہ ہوگا۔ (صحیح مسلم العلم 10، (2672) 6662۔ صحیح البخاری، رقم الحدیث : 7062، 6064۔ سنن الترمذی : 2207۔ سنن ابوداود، رقم الحدیث : 4255، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث : 4050، 4051۔ مسند احمد ج 2، ص 525۔ جامع الاصول، رقم الحدیث : 7924)

15 :۔ حضرت علی بن ابی طالب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب میرے امت پندرہ کاموں کو کرے گی تو اس پر مصائب کا آنا حلال ہو جائے گا، عرض کیا گیا : یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہ کیا کام ہیں ؟ آپ نے فرمایا جب مال غنیمت کو ذاتی دولت بنا لیا جائے گا، اور امانت کو مال غنیمت بنا لیا جائے گا اور زکوۃ کو جرمانہ سمجھ لیا جائے گا، جب لوگ اپنی بیوی کی اطاعت کریں گے اور اپنی ماں کی نافرمانی کریں گے، اور جب دوست کے ساتھ نیکی کریں گے اور باپ کے ساتھ برائی کریں گے، اور جب مسجدوں میں آوازیں بلند کی جائیں گی، اور ذلیل ترین شخص کو قوم کا سردار بنا دیا جائے گا اور جب کسی شخص کے شر کے ڈر سے اس کی عزت کی جائے گی، شراب پی جائے گی اور ریشم پہنا جائے گا اور گانے والیاں اور ساز رکھے جائیں گے، اور اس امت کے آخری لوگ پہلو کو برا کہیں گے اس وقت تم سرخ آندھیوں، زمین کے دھنسنے اور مسخ کا انتظار کرنا۔ (سنن الترمذی، رقم الحدیث : 2217۔ جامع الاصول، رقم الحدیث : 7925)

16 :۔ حضرت ابومالک اشعری (رض) بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میری امت میں ضرور ایسے لوگ ہوں گے جو ریشم کو شراب کو اور گانے بجانے کے آلات کو حلال کہیں گے اور ضرور کچھ لوگ پہاڑ کے دامن میں رہیں گے جب شام کو وہ اپنے جانوروں کا ریوڑ لے کر لوٹیں گے اور ان کے پاس کوئی فقیر اپنی حاجت لے کر آئے گا تو وہ کہیں گے کہ کل آنا، اللہ تعالیٰ پہاڑ گرا کر ان کو ہلاک کر دے گا اور دوسرے لوگوں کو (جو ریشم، شراب اور باجوں کو حلال کہیں گے) مسخ کر کے قیامت تک کے لیے بندر اور خنزیر بنا دے گا۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث : 5590۔ سنن ابوداود، رقم الحدیث : 4039، جامع الاصول، رقم الحدیث : 4937)

17 :۔ حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دنیا اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک کہ عرب کا حاکم وہ شخص نہیں ہوگا جو میرے اہل بیت سے ہے اس کا نام میرے نام کے موافق ہوگا (یعنی محمد) اور دوسری روایت میں ہے اگر ایام دنیا میں سے صرف ایک دن باقی رہ جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو اتنا لمبا کر دے گا حتی کہ اس دن میں ایک شخص کو میرے اہل بیت سے مبعوث کرے گا جس کا نام میرے نام کے موافق اور جس کے باپ کا نام میرے باپ کے نام کے موافق ہوگا وہ زمین کو اس طرح عدل اور انصاف سے بھر دے گا جس طرح وہ پہلے ظلم و جور سے بھری ہوئی تھی۔ (سنن ابوداود رقم الحدیث : 4282۔ سنن الترمذی رقم الحدیث : 2237)

18 :۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ مال بہت زیادہ نہ ہو جائے اور حتی کہ ایک آدمی اپنے مال کی زکوۃ لے کر نکلے تو اس کو کوئی شخص نہ ملے جو اس کو قبول کرے۔ (صحیح مسلم الزکوۃ 60 (1012) 2302)۔ المشکوۃ رقم الحدیث : 5440)

19۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے عنقریب تم میں ابن مریم نازل ہوں گے، وہ حاکم عادل ہوں گے، وہ صلیب کو توڑ دیں گے اور خنزیر کو قتل کر دیں گے اور جزیہ موقوف کر دیں گے اور مال کو بہائیں گے حتی کہ اس کو کوئی قبول نہیں کرے گا، حتی کہ ایک سجدہ کرنا دنیا اور مافیہا سے بہتر ہوگا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 2222۔ صحیح مسلم الاسیمان 242 (155) 1382۔ المشکوۃ رقم الحدیث: 5505)

20:۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس وقت تمہاری کیا شان ہوگی جب تم میں ابن مریم نازل ہوں گے اور امام تم میں سے ہوں گے (صحیح البخاری رقم الحدیث: 3449۔ صحیح مسلم الایمان 244 (155) 385۔ المشکوۃ رقم الحدیث: 5506)

21:۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا عیسیٰ ابن مریم زمین کی طرف نازل ہوں گے اور ان کی اولاد ہوگی، اور وہ زمین میں پینتالیس سال رہیں گے پھر فوت ہوں گے اور میرے ساتھ قبر میں دفن کیے جائیں گے، پس میں اور عیسیٰ بن مریم ایک قبر سے ابوبکر اور عمر کے درمیان سے کھڑے ہوں گے۔ (الوفا لابن الجوزی ص 814۔ المشکوۃ رقم الحدیث: 5508)

22:۔ حضرت زینب بنت جحش (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نیند سے بیدار ہوئے درآنحالیکہ آپ کا چہرہ سرخ تھا اور آپ فرما رہے تھے لا الہ الا اللہ اور اس کو آپ نے تین مرتبہ دہرایا، آپ نے فرمایا عرب کے لیے اس شر سے ہلاکت ہو جو قریب آپہنچا ہے یاجوج ماجوج کی بندش آج کے دن کھل گئی، اس کی طرح پھر آپ نے دس کا عقد کیا، حضرت زینب نے کہا یا رسول اللہ! کیا ہم ہلاک ہو جائیں گے حالانکہ ہم میں نیک لوگ موجود ہیں! آپ نے فرمایا ہاں! جب خباثت زیادہ ہو جائے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: 2194۔ صحیح البخاری رقم الحدیث: 3346۔ صحیح مسلم رقم الحدیث: 2880۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث 3953۔ صحیح ابن حبان ج 2، رقم الحدیث: 327۔ مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: 20749۔ مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: 19061۔ مسند الحمیدی رقم الحدیث: 308۔ السنن الکبری للبیہقی ج 10، ص 93، مسند احمد ج 10، رقم الحدیث: 27486)

23:۔ مجمع بن جاریہ الانصاری (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ابن مریم، دجال کو باب لد پر قتل کریں گے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: 2258۔ صحیح ابن حبان ج 15، رقم الحدیث 6811۔ المعجم الکبیر ج 19، رقم الحدیث: 1077۔ مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: 20835)

24:۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دابۃ الارض نکلے گا اس کے پاس حضرت سلیمان بن داؤد کی انگوٹھی ہوگی اور حضرت موسیٰ بن عمران (علیہم السلام) کا عصا ہوگا، وہ مومن کے چہرے کو عصا سے روشن کرے گا اور کافر کی ناک پر انگوٹھی سے نشان لگائے گا حتی کہ قبیلہ کے لوگ جمع ہو جائیں گے اور وہ کہے گا یا مومن یا کافر۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: 3187۔ مسند احمد ج 3، رقم الحدیث: 7942)

25:۔ امام ابوبکر احمد بن حسنین بیہقی نے حضرت ابن عباس (رض) سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ایک طویل ارشاد روایت کیا ہے جس کے آخر میں آپ نے فرمایا یوم القیامۃ یوم عاشوراء ہے۔ (یعنی محرم کے مہینہ کی دس تاریخ)۔ (فضائل الاوقات رقم الحدیث: 237، ص 441، مکتبۃ المنارۃ مکہ مکرمہ، 1410ھ)

26:۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا سب سے بہتر دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے وہ جمعہ کا دن ہے جس میں حضرت آدم پیدا کیے گئے اور اسی دن جنت سے باہر لائے گئے اور قیامت بھی صرف جمعہ کے دن قائم ہوگی۔ (صحیح مسلم الجمعہ 18، 854، 1944۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 1084۔ سنن النسائی رقم الحدیث: 1373)

27:۔ حضرت عبداللہ بن سلام (رض) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دو دنوں میں زمین کو پیدا کیا اور دو دنوں میں اس کی روزی پیدا کی، پھر استواء فرمایا پھر دو دنوں میں آسمانوں کو پیدا فرمایا، زمین کو اتوار اور پیر کے دن پیدا کی اور دو دنوں میں اس کی روزی پیدا کی، اور آسمانوں کو جمعرات اور جمعہ کے دن پیدا کیا اور جمعہ کی

آخری ساعت میں عجلت سے حضرت آدم کو پیدا کیا اور اسی ساعت میں قیامت قائم ہوگی۔ (یہ حدیث حکماً مرفوع ہے) ۔ (کتاب الاسماء والصفات للبیہقی، ص 383، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قیامت واقع ہونے سے پہلے اس کی تمام نشانیاں بیان فرمائیں اور موخر الذکر تین حدیثوں میں یہ بھی بتادیا کہ محرم کے مہینہ کی دس تاریخ کو جمعہ کے دن، دن کی آخری ساعت میں قیامت واقع ہوگی، مہینہ، تاریخ، دن اور خاص وقت سب بتادیا صرف سن نہیں بتایا، کیونکہ اگر سن بھی بتادیتے تو ہم آج جان لیتے کہ قیامت آنے میں اب اتنے سال باقی رہ گئے ہیں اور ایک دن بلکہ ایک گھنٹہ پہلے لوگوں کو معلوم ہوتا کہ اب ایک گھنٹہ بعد قیامت آئے گی اور قیامت کا آنا اچانک نہ رہتا اور قرآن جھوٹا ہو جاتا کیونکہ قرآن نے فرمایا ہے: "لا تاتیکم الا بغتۃ: قیامت تمہارے پاس اچانک ہی آئے گی" (الاعراف: 187) ۔ اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قرآن مجید کے مکذب نہیں مصدق تھے اس لیے آپ نے قرآن مجید کے صدق کو قائم رکھنے کے لیے سن نہیں بتایا اور اپنا علم ظاہر فرمانے کے لیے باقی سب کچھ بتادیا۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو علوم خمسہ اور علم روح وغیرہ دیے جانے کے متعلق علماء اسلام کے نظریات

قیامت کب واقع ہوگی، بارش کب ہوگی، ماں کے پیٹ میں کیا ہے، انسان کل کیا کرے گا اور کون شخص کس جگہ مرے گا، یہ وہ امور خمسہ ہیں جن کا ذاتی علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، بحث اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو ان پانچ چیزوں کا علم عطا فرمایا ہے یا نہیں۔ بعض علماء سلف نے نیک نیتی کے ساتھ یہ کہا کہ یہ علوم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں اور اس نے مخلوق میں سے کسی کو ان پانچ چیزوں پر مطلع نہیں فرمایا، اور اکثر اہل اسلام نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء (علیہم السلام) کو عموماً اور حضرت محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خصوصاً ان پانچ چیزوں کے علوم میں سے بھی حظِ وافر عطا فرمایا ہے۔

اعلی حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفی 1340ھ لکھتے ہیں:

ان تمام اجماعات کے بعد ہمارے علماء میں یہ اختلاف ہوا کہ بیشمار علوم غیب جو مولی عزوجل نے اپنے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عطا فرمائے، آیا وہ روز اول سے یوم آخر تک تمام کائنات کو شامل ہیں جیسا کہ عموم آیات واحادیث کا مفاد ہے یا ان میں تخصیص ہے۔

بہت اہل ظاہر جانب خصوص گئے ہیں کسی نے کہا متشابہات کا، کسی نے خمس کا، کثیر نے کہا ساعت کا اور عام علماء باطن اور ان کے اتباع سے بکثر علماء ظاہر نے آیات و احادیث کو ان کے عموم پر رکھا۔ (خالص الاعتقاد ص 27، مطبوعہ امام احمد رضا اکیڈمی، کراچی)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو علوم خمسہ وعلم روح وغیرہ دیے جانے کے متعلق جمہور علماء اسلام کی تصریحات

علامہ ابوالعباس احمد بن عمر بن ابراہیم المالکی القرطبّی المتوفی 656ھ لکھتے ہیں: "فمن ادعی علم شیء منہا غیر مسند الی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کان کاذبا فی دعواہ: جو شخص رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وساطت کے بغیر ان پانچ چیزوں کے جاننے کا دعوی کرے وہ اس دعوی میں جھوٹا ہے" (المفہم، ج 1، ص 156، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت، 1417ھ)

علامہ بدر الدین عینی حنفی، علامہ ابن حجر عسقلانی، علامہ احمد قسطلانی، ملا علی قاری اور شیخ عثمانی نے بھی اپنی شروح میں علامہ قرطبّی کی اس عبارت کو ذکر کیا ہے: (عمدۃ القاری ج 1، ص 290، فتح الباری ج 1، ص 124، ارشاد الساری ج 1، ص 138، مرقات ج 1، ص 65، فتح الملہم ج 1، ص 172)

علامہ ابن حجر عسقلانی شافعی لکھتے ہیں: "قال بعضہم لیس فی الایۃ دلیل علی ان اللہ لم یطلع نبیہ علی حقیقۃ الروح بل یحتمل ان یکون اطلعہ ولم یامرہ انہ یطلعہم وقد قالوا فی علم الساعۃ نحو ھذا واللہ اعلم: بعض علماء نے کہا ہے کہ (سورۃ بنی اسرائیل کی) آیت میں یہ دلیل نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو روح کی حقیقت پر مطلع نہیں کیا، بلکہ احتمال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو روح کی حقیقت پر مطلع کیا ہو اور آپ کو اس کی اطلاع دینے کا حکم نہ دیا ہو، قیامت کے علم کے متعلق بھی علماء نے اسی طرح کہا ہے۔ واللہ اعلم" (فتح الباری ج 8، ص 403)

علامہ احمد قسطلانی الشافعی نے بھی یہ عبارت نقل کی ہے۔ ارشاد الساری ج 7، ص 203)

علامہ زرقانی "المواہب" کی شرح میں لکھتے ہیں: " (وقد قالوافی علم الساعۃ) و باقی الخمس المذکورۃ فی ایۃان اللہ عندہ علم الساعۃ (نحو ھذا) یعنی انہ علمھا ثم امر بکتمھا: علم قیامت اور باقی ان پانچ چیزوں کے متعلق جن کا سورۃ لقمان کی آخری آیت میں ذکر ہے علماء نے یہی کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان پانچ چیزوں کا علم عطا فرمایا اور آپ کو انھیں مخفی رکھنے کا حکم دیا گیا" (شرح المواہب اللدنیہ ج 1، ص 265)

علامہ جلال الدین سیوطی الشافعی لکھتے ہیں: "ذھب بعضھم الی انہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اوتی علم الخمس ایضا و علم وقت الساعۃ والروح وانہ امر بکتم ذالک: اور بعض علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو امور خمسہ کا علم دیا گیا ہے اور وقوع قیامت کا اور روح کا بھی علم دیا گیا ہے اور آپ کو ان کے مخفی رکھنے کا حکم دیا گیا ہے" (شرح الصدور ص 319، مطبوعہ بیروت، الخصائص الکبری ج 2، ص 335، بیروت، 1405ھ)

علامہ صاوی مالکی لکھتے ہیں:

قال العلماء الحق انہ لم یخرج نبینا من الدنیا حتی اطلعہ اللہ علی تلک الخمس ولکنہ امرہ بکتمھا: علماء کرام نے فرمایا کہ حق بات یہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دنیا سے اس وقت تک وفات نہیں پائی، جب تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان پانچ چیزوں کے علوم پر مطلع نہیں فرمادیا، لیکن آپ کو ان علوم کے مخفی رکھنے کا حکم فرمایا (تفسیر صاوی ج 3، ص 215)

اور علامہ آلوسی حنفی فرماتے ہیں: لم یقبض رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حتی علم کل شئی یمکن العلم بہ۔ رسول اللہ اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس وقت تک وفات نہیں پائی جب تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر اس چیز کا علم نہیں دے دیا جس کا علم دینا ممکن تھا۔ (روح المعانی ج 15، ص 154)

نیز علامہ آلوسی لکھتے ہیں: و یجوزان یکون اللہ تعالیٰ قد اطلع حبیبہ (علیہ الصلوۃ والسلام) علی وقت قیامھا علی وجہ کامل لکن لا علی وجہ یحاکی علمہ تعالیٰ بہ الا انہ سبحانہ اوجب علیہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کتمہ لحکمۃ ویکون ذلک من خواصہ (علیہ الصلوۃ والسلام) ولیس عندی مایفید الحزم بذلک: اور یہ بات جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب (علیہ الصلوۃ والسلام) کو وقوع وقت قیامت پر مکمل اطلاع دی ہو مگر اس طریقہ پر نہیں کہ اس سے علم الٰہی کا اشتباہ ہو الا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے کسی حکمت کی وجہ سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اس کا اخفاء واجب کر دیا ہو اور یہ علم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خواص میں سے ہو، لیکن مجھے اس پر کوئی قطعی دلیل حاصل نہیں ہوئی۔ (روح المعانی ج 21، ص 113)

امام رازی لکھتے ہیں: عالم الغیب فلایظھر علی غیبہ المخصوص وھو قیام القیامۃ احدا ثم قال بعدہ لکن من ارتضی من رسول: اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے وہ اپنے مخصوص غیب یعنی قیامت قائم ہونے کے وقت پر کسی کو مطلع نہیں فرماتا، البتہ ان کو مطلع فرماتا ہے جن سے وہ راضی ہوتا ہے اور وہ اللہ کے رسول ہیں۔ (تفسیر کبیر ج 10، ص 678)

علامہ علاؤالدین خازن نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔ (تفسیر خازن ج 4، ص 319)

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں: والجواب ان الغیب ھھنا لیس للعموم بل مطلق او معین ھو وقت وقوع القیمۃ بقرینۃ السیاق ولایبعد ان یطلع علیہ بعض الرسل من الملئکۃ او البشر: اور جواب یہ ہے کہ یہاں غیب عموم کے لیے نہیں ہے بلکہ مطلق ہے یا اس سے غیب خاص مراد ہے یعنی وقت وقوع قیامت، اور آیت کے سلسلہ ربط سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور یہ بات مستبعد نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض رسولوں کو وقت وقوع قیامت پر مطلع فرمائے خواہ وہ رسل ملائکہ ہوں یا رسل بشر۔ (شرح المقاصد ج 5، ص 6، طبع ایران)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

و حق آنست کہ در آیت دلیلے نیست بر آنکہ حق تعالیٰ مطلع نگردانیدہ است حبیب خود را (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بر ماہیت روح بلکہ احتمال دارد کہ مطلع گردایندہ باشد وامر نکرد اور کہ مطلع گرداند ایں قوم را و بعضی از علماء در علم ساعت نیز ایں معنی گفتہ اند الی ان قال ولے گوید ھندہ مسکین خصہ اللہ بنور العلم والیقین و چگونہ جرات کند مومن عارف کہ نفی علم بہ حقیقت روح سید المرسلین و امام العارفین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کند و دادہ است او را حق سبحانہ علم ذات و صفات خود و فتح کردہ بروے فتح مبین از علوم اولین و آخرین روح انسانی چہ باشد کہ در جنب حقیقت جامعہ وے قطرہ ایست از دریائے ذرہ از بیضائے فافہم و باللہ التوفیق۔ حق یہ ہے

کہ قرآن کی آیت میں اس بات پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو روح کی حقیت پر مطلع نہیں کیا بلکہ جائز ہے کہ مطلع کیا ہو اور لوگوں کو بتلانے کا حکم آپ کو نہ دیا ہو۔ اور بعض علماء نے علم قیامت کے بارے میں بھی یہی قول کیا ہے اور بندہ مسکین۔(اللہ اس کو نور علم اور یقین کے ساتھ خاص فرمائے) یہ کہتا ہے کہ کوئی مومن عارف حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روح کے علم کی کیسے نفی کر سکتا ہے وہ جو سید مرسلین اور امام العارفین ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات اور صفات کا علم عطا فرمایا ہے اور تمام اولین اور آخرین کے علوم آپ کو عطا کیے ہیں، ان کے سامنے روح کے علم کی کیا حیثیت ہے۔ آپ کے علم کے سمندر کے سامنے روح کے علم کی ایک قطرہ سے زیادہ کیا حقیقت ہے۔ (مدارج النبوہ ج 2، ص 40)

سید عبدالعزیز دباغ عارف کامل فرماتے ہیں: وکیف یخفی امر الخمس علیہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) والواحد من اھل التصرف من امتہ الشریفۃ لایمکنہ التصرف الا بمعرفۃ ھذہ الخمس: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ان پانچ چیزوں کا علم کیسے مخفی ہوگا، حالانکہ آپ کی امت شریفہ میں سے کوئی شخص اس وقت تک صاحب تصرف نہیں ہو سکتا جب تک اس کو ان پانچ چیزوں کی معرفت نہ ہو۔ (الابریز ص 483)

علامہ احمد قسطلانی شافعی متوفی 911ھ تحریر فرماتے ہیں: لایعلم متی تقوم الساعۃ الا اللہ الا من ارتضی من رسول فانہ یطلعہ علی من یشاء من غیبہ والولی تابع لہ یاخذ عنہ: کوئی غیر خدا نہیں جانتا کہ قیامت کب آئے گی سوا اس کے پسندیدہ رسولوں کے کہ انھیں اپنے جس غیب پر چاہے اطلاع دے دیتا ہے۔ (یعنی وقت قیامت کا علم بھی ان پر بند نہیں) رہے اولیاء وہ رسولوں کے تابع ہیں ان سے علم حاصل کرتے ہیں۔ (ارشاد الساری ج 7، ص 178)

اعلی حضرت احمد رضا فاضل بریلوی کے تفحص اور تتبع سے حسب ذیل حوالہ جات ہیں:

علامہ بیجوری شرح بردہ شریف میں فرماتے ہیں: لم یخرج (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) من الدنیا الا بعد ان اعلمہ اللہ تعالیٰ بھذہ الامور ای الخمسۃ: نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دنیا سے تشریف نہ لے گئے مگر بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کو ان پانچوں غیبوں کا علم دے دیا۔

علامہ شنوانی نے جمع النہایہ میں اسے بطور حدیث بیان کیا ہے کہ: قد ورد ان اللہ تعالیٰ لم یخرج النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حتی اطلعہ علی کل شئی: بیشک وارد ہوا کہ اللہ تعالیٰ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دنیا سے نہ لے گیا جب تک کہ حضور کو تمام اشیاء کا علم عطا نہ فرمایا

حافظ الحدیث سیدی احمد مالکی غوث الزماں سید شریف عبدالعزیز مسعود حسنی (رض) سے راوی:

ھو (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لا یخفی علیہ شیء من الخمس المذکورۃ فی الایۃ الشریفۃ وکیف یخفی علیک ذالک والاقطاب السبعۃ من امتہ الشریفۃ یعلمونہا وھم دون الغوث فکیف بالغوث فکیف بسید الاولین والاخرین الذی ھو سبب کل شئی ومنہ کل شیء: یعنی قیامت کب آئے گی، مینہ کب اور کہاں اور کتنا برسے گا۔ مادہ کے پیٹ میں کیا ہے، کل کیا ہوگا۔ فلاں کہاں مرے گا۔ یہ پانچوں غیب جو آیہ کریمہ میں مذکور ہیں ان میں سے کوئی چیز رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر مخفی نہیں اور کیونکر یہ چیزیں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوشیدہ ہیں حالانکہ حضور کی امت سے ساتوں قطب ان کو جانتے ہیں اور ان کا مرتبہ غوث کے نیچے ہے۔ غوث کا کیا کہنا پھر ان کا کیا پوچھنا جو سب اگلوں پچھلوں سارے جہان کے سردار اور ہر چیز کے سبب ہیں اور ہر شے انھیں سے ہے۔ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔ (خالص الاعتقاد ص 43، مطبوعہ امام احمد رضا اکیڈمی، کراچی)

اللہ تعالیٰ کی ذات میں علوم خمسہ کے انحصار کی خصوصیت کا باعث

سورۃ لقمان کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: ان اللہ عندہ علم الساعۃ وینزل الغیث ویعلم مافی الارحام وماتدری نفس ماذا تکسب غدا وماتدری نفس بای ارض تموت ان اللہ علیم خبیر: بیشک اللہ ہی کے پاس ہے قیامت کا علم، اور وہی بارش نازل کرتا ہے اور وہی جانتا ہے جو رحموں میں ہے، اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا، اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں مرے گا، بیشک اللہ ہی جاننے والا، (جسے چاہے) خبر دینے والا ہے۔

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان پانچ چیزوں کا ذاتی علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ ہر چیز کا ذاتی علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، پھر ان پانچ چیزوں کی تخصیص کی کیا وجہ ہے؟ اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ مشرکین ان چیزوں کے متعلق سوال کرتے تھے اس لیے بتایا گیا کہ ان چیزوں کا علم صرف اللہ

تعالیٰ ہی کو ہے، دوسرا جواب یہ ہے کہ مشرکین کا اعتقاد یہ تھا کہ ان کے کاہنوں اور نجومیوں کو ان کا علم ہے اس لیے بتایا گیا کہ ان کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔

علامہ اسماعیل حقی لکھتے ہیں :

اس آیت میں ان پانچ چیزوں کا شمار کیا گیا ہے، حالانکہ تمام مغیبات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ان چیزوں کے متعلق سوال کرتے تھے، روایت ہے کہ دیہاتیوں میں سے حارث بن عمر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے اور آپ سے قیامت کے وقت کے متعلق سوال کیا اور یہ کہ ہماری زمین خشک ہے میں نے اس میں بیج ڈالنے ہیں، بارش کب ہوگی؟ اور میری عورت حاملہ ہے اس کے پیٹ میں مذکر ہے یا مونث، اور مجھے گزشتہ کل کا تو علم ہے لیکن آئندہ کل میں کیا کروں گا؟ اور مجھے یہ علم تو ہے کہ میں کس جگہ پیدا ہوا ہوں لیکن میں کہاں مروں گا؟ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

نیز اہل جاہلیت نجومیوں کے پاس جا کر سوال کرتے تھے اور ان کا یہ زعم تھا کہ نجومیوں کو ان چیزوں کا علم ہوتا ہے، اور اگر کاہن غیب کی کوئی خبر دے اور کوئی شخص اس کی تصدیق کرے تو یہ کفر ہے، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص کاہن کے پاس گیا اور اس کے قول کی تصدیق کی تو اس نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل شدہ دین کا کفر کیا۔

اور یہ جو بعض روایات میں ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) اور اولیاء کرام غیب کی خبریں دیتے ہیں تو ان کا یہ خبر دینا، وحی، الہام اور کشف کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم دینے سے ہوتا ہے، لہٰذا ان پانچ چیزوں کے علم کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہونا اس بات کے منافی نہیں ہے کہ ان غیوب پر انبیاء، اولیاء اور ملائکہ کے سوا اور کوئی مطلع نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: " عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احدا۔ الا من ارتضی من رسول : (اللہ) غیب جاننے والا ہے تو اپنے غیب پر کسی کو (کامل) اطلاع نہیں دیتا مگر جن کو اس نے پسند فرما لیا، جو اس کے (سب) رسول ہیں "۔ (جن : 26۔27)

اور بعض غیوب وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی آت کے ساتھ خاص کر لیا، جن کی اطلاع کسی مقرب فرشتے کو ہے اور نہ کسی نبی مرسل کو، جیسا کہ اس آیت میں اشارہ ہے : " وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو : اور اسی کے پاس غیب کی چابیاں ہیں، اس کے سوا (بذات خود) انھیں کوئی جانتا" (الانعام : 59)

قیام کا علم بھی انہی امور میں سے ہے، اللہ تعالیٰ نے وقوع قیامت کے علم کو مخفی رکھا، لیکن صاحب شرعی کی زبان سے اس کی علامتوں کو ظاہر فرما دیا، مثلاً خروج دجال، نزول عیسیٰ اور سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، اسی طرح بعض اولیاء نے بھی الہام صحیح سے بارش ہونے کی خبر دی اور یہ بھی بتایا کہ ماں کے پیٹ میں کیا ہے، اسی طرح ابو العزم اصفہانی شیراز میں بیمار ہوگئے انھوں نے کہا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے طرطوس میں موت کی دعا کی ہے اگر بالفرض شیراز میں مر گیا تو مجھے یہودیوں کے قبرستان میں دفن کر دینا۔ (یعنی ان کو یقین تھا کہ ان کی موت طرطوس میں آئے گی) وہ تندرست ہوگئے اور بعد میں طرطوس میں ان کی وفات ہوئی۔ اور میرے شیخ نے بیس سال پہلے اپنی موت کا وقت بتا دیا تھا اور وہ اپنے بتائے ہوئے وقت پر ہی فوت ہوئے تھے (روح البیان ج 7، ص 103۔105۔ مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ، کوئٹہ)

اللہ تعالیٰ اور انبیاء (علیہم السلام) کے علم میں فرق کے متعلق اعلیٰ حضرت کا نظریہ

1۔ بلاشبہ غیر خدا کے لیے ایک ذرہ کا علم ذاتی نہیں، اس قدر خود ضرورت دین سے اور منکر کافر۔

2۔ بلاشبہ غیر خدا کا علم معلومات الٰہیہ کو حاوی نہیں ہو سکتا، مساوی درکنار تمام اولین وآخرین وانبیاء ومرسلین وملائکہ مقربین سب کے علوم مل کر علوم الٰہیہ سے وہ نسبت نہیں رکھ سکتے جو کروڑہا کروڑ سمندروں سے ایک ذرا سی بوند کے کروڑویں حصے کو کہ وہ تمام سمندر اور یہ بوند کا کروڑواں حصہ، دونوں متناہی ہیں اور متناہی کو متناہی سے نسبت ضرور ہے۔ بخلاف علوم الٰہیہ کے غیر متناہی در غیر متناہی ہیں، اور مخلوق کے علوم اگرچہ عرش وفرش، شرق وغرب وجملہ کائنات از روز اول تا روز آخر کو محیط ہو جائیں آخر متناہی ہیں کہ عرش وفرش دو حدیں ہیں، شرق وغرب روز اول وروز آخر دو حدیں ہیں اور جو کچھ دو حدوں کے اندر ہو سب متناہی ہے۔ بالفعل غیر متناہی کا علم تفصیلی مخلوق کو مل ہی نہیں سکتا، تو جملہ علوم خلق کو علم الٰہی سے اصلاً نسبت ہونی ہی محال قطعی ہے نہ کہ معاذ اللہ تو ہم مساوات۔

3۔یوں ہی اس پر اجماع ہے کہ اللہ عزوجل کے دیے سے انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو کثیر و وافر غیبوں کا علم ہے یہ بھی ضروریات دین سے ہے، جو ان کا منکر ہو وہ کافر ہے کہ سرے سے نبوت ہی کا منکر ہے۔

4۔اس پر بھی اجماع ہے کہ اس فضل جلیل میں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حصہ تمام انبیاء تمام جہان سے اتم و اعظم ہے۔ اللہ عزوجل کی عطا سے حبیب اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اتنے غیبوں کا علم ہے جن کا شمار اللہ عزوجل ہی جانتا ہے۔ مسلمانوں کا یہاں تک اجماع تھا۔ (خالص الاعتقاد ص 23۔24، ملخصاً، مطبوعہ امام احمد رضا اکیڈمی، کراچی)

علم کی ذاتی اور عطائی کی تقسیم کے متعلق علماء اسلام کی تصریحات

اعلی حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی لکھتے ہیں:

علم یقیناً ان صفات میں ہے کہ غیر خدا کو بہ عطائے خدا مل سکتا ہے تو ذاتی و عطائی کی طرف اس کا انقسام یقینی، یوں ہی محیط و غیر محیط کی تقسیم بدیہی، ان میں اللہ عزوجل کے ساتھ خاص ہونے کے قابل صرف ہر تقسیم کی قسم اول ہے۔ یعنی علم ذاتی و علم محیط حقیقی۔

تو آیات واحادیث و اقوال علماء جن میں دوسرے کے لیے اثبات علم غیب سے انکار ہے، ان میں قطعاً یہی دو قسمیں مراد ہیں۔ فقہاء کہ حکم تکفیر کرتے ہیں انھیں قسموں پر حکم لگاتے ہیں کہ آخر مبنائے تکفیر یہی تو ہے کہ خدا کی صفت خاصہ دوسرے کے لیے ثابت کی۔ اب یہ دیکھ لیجئے کہ خدا کے لیے علم ذاتی خاص ہے یا عطائی۔ حاشا اللہ علم عطائی خدا کے ساتھ خاص ہونا در کنار خدا کے لیے محال قطعی ہے۔ کہ دوسرے کے دیے سے اسے علم حاصل ہو پھر خدا کے لیے علم محیط حقیقی خاص ہے یا غیر محیط۔ حاشا اللہ علم غیر محیط خدا کے لیے محال قطعی ہے، جس میں بعض معلومات مجہول رہیں تو علم عطائی غیر محیط حقیقی، غیر خدا کے لیے ثابت کرنا، خدا کی صفت خاصہ ثابت کرنا کیوں کر ہوا۔

تکفیر فقہاء اگر اس طرف ناظر ہو تو معنی یہ ٹھہریں گے کہ دیکھو تم غیر خدا کے لیے وہ صرف ثابت کرتے ہو جو زنہار خدا کی صفت نہیں ہو سکتی لہٰذا کافر ہوا۔ یعنی وہ صفت غیر کے لیے ثابت کرنی چاہیے تھی جو خاص خدا کی صفت ہے۔ کیا کوئی احمق اس احمق ایسا اخبث جنون گوارا کر سکتا ہے۔ (خالص الاعتقاد ص 18، مطبوعہ امام احمد رضا اکیڈمی، کراچی)

علامہ ابن حجر مکی متوفی 911ھ تحریر فرماتے ہیں: وماذ کرناہ فی الایۃ صرح بہ النووی (رح) فتاواہ فقال معناھا لایعلم ذالک استقلالا وعلم احاطۃ بکل المعلومات للہ تعالیٰ: یعنی ہم نے جو آیات کی تفسیر کی، امام نووی (رح) نے اپنے فتاوی میں اس کی تصریح کی فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ غیب کا ایسا علم صرف خدا کو ہے جو بذات خود اور جمیع معلومات الٰہیہ کو محیط ہو۔ (فتاوی حدیثیہ ص 268، مطبوعہ مطبعہ مصطفیٰ البابی واولادہ بمصر، 1356ھ)

علامہ ابن حجر مکی نے علامہ نووی کی جس عبارت کا حوالہ دیا ہے وہ حسب ذیل ہے:

معناہ لا یعلم ذالک استقلالا وعلم احاطۃ بکل المعلومات الا اللہ واما المعجزات والکرامات فحصلت باعلام اللہ تعالیٰ للانبیاء والاولیاء لا استقلالا: جن آیات میں اللہ تعالیٰ کے غیر سے علم غیب کی نفی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی استقلالاً علم غیب کو نہیں جانتا یا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی کل معلومات کا احاطہ نہیں کر سکتا اور معجزات اور کرامات میں اللہ کے خبر دینے سے علم حاصل ہوتا ہے استقلالاً نہیں ہوتا۔ (فتاوی الامام النووی ص 173، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

امام فخر الدین رازی متوفی 606 البقرہ 34 کی تفسیر میں الانعام 50 کے متعلق لکھتے ہیں:

یدل علی اعترافہ بانہ غیر عالم بکل المعلومات: یہ آیت آپ کے اس اعتراف پر دلالت کرتی ہے کہ آپ کل معلومات کو نہیں جانتے تھے (تفسیر کبیر ج 1، ص 436، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، 1415ھ)

نیز امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی 606ھ (الانام: 50) کی تفسیر میں لکھتے ہیں: المراد من قولہ لا اقول لکم عندی خزائن اللہ انی لا ادعی کونی موصوفا بالقدرۃ اللائقۃ بالالہ تعالیٰ ومن قولہ ولا اعلم الغیب انی لا ادعی کونی موصوفا بعلم اللہ تعالیٰ وحصل بمجموع الکلامین انہ لا یدعی الالہیۃ: میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ میں اس قدرت کا دعوی نہیں کرتا جو اللہ کی شان کے لائق ہے۔ اور میں غیب نہیں جانتا اس سے مراد یہ ہے کہ میں اللہ کے

علم سے موصوف ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا اور ان دونوں باتوں کا حاصل یہ ہے کہ میں الوہیت کا دعویٰ نہیں کرتا۔ (تفسیر کبیر ج 4، ص 538۔ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1415ھ)

علامہ محی الدین محمد بن مصطفیٰ قوجوی متوفی 951ھ علامہ احمد شہاب الدین خفاجی متوفی 1069ھ اور علامہ سید محمود آلوسی متوفی 1270ھ نے بھی اس آیت کی تفسیر میں یہی لکھا ہے: (حاشیۃ الشیخ زادہ علی الجلالین ج 2، ص 167، عنایت القاضی ج 4، ص 65، روح المعانی ج 7، ص 155)

علامہ احمد شہاب خفاجی متوفی 1069ھ شفا کی عبارت کے ساتھ مزج کر کے لکھتے ہیں۔

(ھذہ المعجزۃ) فی اطلاعہ علی الغیب (معلومۃ علی القطع) بحیث لا یمکن انکارھا اوالتردد فیہا لاحد من العقلاء (لکثرۃ رواتھا واتفاق معانیہا علی الاطلاع علی الغیب) وھذا لا ینافی الایات الدالۃ علی انہ لا یعلم الغیب الا اللہ وقولہ ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر فان المنفی علمہ من غیر واسطۃ واما اطلاعہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) علیہ باعلام اللہ تعالیٰ فلہ فامر متحقق لقولہ تعالیٰ فلا یظھر علی غیبہ احدا الا من ارتضی من رسول: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا معجزہ علم غیب یقیناً ثابت ہے جس میں کسی عاقل کو انکار یا تردد کی گنجائش نہیں کہ اس میں احادیث بکثرت آئیں اور ان سب سے بالاتفاق حضور کا علم غیب ثابت ہے اور یہ ان آیتوں کے کچھ منافی نہیں جو بتاتی ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا اور یہ کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ کہنے کا حکم ہوا کہ میں غیب جانتا تو اپنے لیے بہت خیر جمع کر لیتا۔ اس لیے کہ آیتوں میں نفی اس علم کی ہے جو بغیر خدا کے بتائے ہو اور اللہ تعالیٰ کے بتائے سے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو علم غیب ملنا تو قرآن عظیم سے ثابت ہے کہ اللہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا سوا اپنے پسندیدہ رسول کے (نسیم الریاض ج 3، س 150، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

علامہ نظام الدین حسین بن محمد نیشاپوری متوفی 728ھ لا اعلم الغیب (الانعام: 50) کی تفسیر میں لکھتے ہیں: لا اعلم الغیب فیہ دلالۃ علی ان الغیب بالاستقلال لا یعلمہ الا للہ: آیت کے معنی ہیں کہ علم غیب جو بذات خود ہو وہ خدا کے ساتھ خاص ہے۔ (تفسیر نیشاپوری علی ھامش جامع البیان ج 8، ص 148، مطبوعہ دار المعرفت بیروت، 1409ھ)

علامہ سید ابن عابدین شامی صاحب جامع الفصولین سے نقل فرماتے ہیں:

یجاب بانہ یمکن التوفیق بان المنفی ھو العلم بالاستقلال لا العلم بالعلام او المنفی ھو المجزوم بہ لا لمظنون ویویدہ قولہ تعالیٰ اتجعل فیہا من یفسد فیہا الایۃ لانہ غیب اخبرہ بہ الملائکۃ ظنا منہم او باعلام الحق فینبغی ان یکفر لو ادعاہ مستقلا لا لو اخبر بہ باعلام فی نومہ او یقظتہ بنوع من الکشف اذ لا منافاۃ بینہ و بین الیۃ لما مر من التوفیق: (یعنی فقہاء نے دعویٰ علم غیب پر حکم کفر کیا اور حدیثوں اور ائمہ ثقات کی کتابوں میں بہت غیب کی خبریں موجود ہیں جن کا انکار نہیں ہو سکتا) اس کا جواب یہ ہے کہ ان میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ فقہاء نے اس کی نفی کی ہے کہ کسی کے لیے بذات خود علم غیب مانا جائے، خدا کے بتائے سے علم غیب کی نفی نہ کی یا نفی قطعی کی ہے نہ کہ ظنی کی، اور اس کی تائید یہ آیت کریمہ کرتی ہے فرشتوں نے عرض کیا تو زمین میں ایسوں کو خلیفہ کرے گا جو اس میں سفاد و خون ریزی کریں گے، ملائکہ غیب کی خبر نہی بولے مگر ظنا یا خدا کے بتائے سے، تو تکفیر اس پر چاہیے کہ کوئی بغیر خدا کے بتائے علم غیب کا دعویٰ کرے نہ یوں کہ براہ کشف جاگتے یا سوتے میں خدا کے بتائے سے، ایسا علم غیب آیت کے کچھ منافی نہیں۔ (رسائل ابن عابدین، ج 2، ص 311، مطبوعہ سہیل اکیڈمی، لاہور، 1396ھ)

علامہ شامی فرماتے ہیں کہ متعدد کتب حنفیہ میں مذکور ہے: لو ادعی علم الغیب بنفسہ یکفر، اگر بذات خود علم غیب حاصل کر لینے کا دعویٰ کرے تو کافر ہے۔ (رسائل ابن عابدین، ج 2، ص 311)

نیز علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں: قال فی التتار خانیۃ وفی الحجۃ ذکر فی الملتقط انہ لا یکفر لان الشیاء تعرض علی روح النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وان الرسل یعرفون بعض الغیب قال اللہ تعالیٰ عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احدا الا من ارتضی من رسول اھ قلت بل ذکروا فی کتب العقائد ان من جملہ کرامات الاولیاء الاطلاع علی بعض المغیبات وردوا علی المعتزلۃ المستدلین بہذہ الایۃ علی نفیہا: تاتار خانیہ اور فتاوی حجہ میں ہے ملتقط میں فرمایا کہ جس نے اللہ و رسول کو گواہ کر کے نکاح کیا کافر نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اشیاء نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر عرض کی جاتی ہیں۔ اور بیشک رسولوں کو بعض علم غیب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اللہ غیب کا جاننے والا تو اپنے غیب پر کسی کو مسلط نہیں کرتا مگر اپنے پسندیدہ رسولوں کو۔ علامہ شامی نے فرمایا کہ بلکہ ائمہ اہلسنت نے کتب عقائد میں ذکر فرمایا کہ بعض غیبوں کا علم ہونا اولیاء کی

کرامت سے ہے اور معتزلہ نے اس آیت کو اولیاء کرام سے اس کی نفی پر دلیل قرار دیا۔ ہمارے ائمہ نے اس کا رد کیا یعنی ثابت فرمایا کہ اس آیہ کریمہ نے اولیاء سے بھی مطلقاً علم غیب کی نفی نہیں فرمائی۔ (ردالمحتار، ج 2، ص 76، مطبوعہ دار احیاء التراث لاعربی بیروت، 1407ھ)

علامہ علی بن محمد خازن متوفی 725ھ اور علامہ سلیمان جمل متوفی 1204ھ الاعراف: 188 کی تفسیر میں لکھتے ہیں: والمعنی لااعلم الغیب الاان یطلعنی اللہ علیہ ویقدر لی: لااعلم الغی کا معنی یہ ہے کہ میں اللہ کے مطلع اور قادر کیے بغیر غیب کو نہیں جانتا (لباب التاویل للخازن، ج 2، ص 167، مطبوعہ پشاور، حاشیۃ الجمل علی الجلالین ج 2، ص 217، مطبوعہ کراچی)

قاضی عبداللہ بن عمر بیضاوی متوفی 686ھ الانعام: 50 کی تفسیر میں لکھتے ہیں: لااعلم الغی مالم یوحی الی ولم ینصب علیہ دلیل: آیت کے یہ معنی ہیں کہ جب تک وحی یا کوئی دلیل قائم نہ ہو، مجھے بذات خود غیب کا علم نہیں ہوتا۔ (انوار التنزیل علی ھامش عنایہ القاضی ج 4، ص 64، مطبوعہ دار صادر، بیروت)

علامہ احمد شہاب الدین خفاجی متوفی 1069ھ لکھتے ہیں: وعندہ مفاتح الغیب وجہ اختصاصہا بہ تعالیٰ انہ لایعلمہا کما ھی ابتداء الاھو: یہ جو آیت میں فرمایا کہ غیب کی کنجیاں اللہ ہی کے پاس ہیں، اس کے سوا انھیں کوئی نہیں جانتا۔ اس خصوصیت کے معنی یہ ہیں کہ ابتداً بغیر بتائے ان کی حقیقت دوسرے پر نہیں کھلتی۔ (عنایہ القاضی ج 4، ص 73، مطبوعہ دار صادر، بیروت)

علامہ احمد شہاب الدین خفاجی متوفی 1069ھ الجن: 25۔27 کی تفسیر میں لکھتے ہیں: کانہ قیل ماادری قرب ذالک الموعد وبعدہ الاان یطلعنی اللہ علیہ لان علم الغیب مختص بہ وقد یطلع علیہ بعض خلقہ: گویا کہ یہ کہا گیا ہے کہ میں از خود نہیں جانتا کہ قیامت کا وعدہ قریب ہے یا بعید ہے سوا اس کے کہ اللہ مجھے اس پر مطلع فرمادے۔ کیونکہ علم غیب اللہ کے ساتھ خاص ہے اور وہ اپنی بعض مخلوق کو اس پر مطلع فرماتا ہے۔

اور اس کے دو تین سطر بعد لکھتے ہیں: واختصاصہ بہ تعالیٰ لانہ لایعلم بالذات ولکنہ علماحقیقیایقینیابغیر سبب کاطلاع الغیر الااللہ وعلم غیرہ لبعضہ لیس علماللغیب الابحسب الظاہر وبالنسبۃ لبعض البشر (الی قولہ) ولایقدح فی ھذاالاختصاص کونہ معلوماللغیر باعلامہ تعالیٰ اذاالاختصاص اضافی بالنسبۃ الی من عداالمستثنی: غیب اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس لیے خاص ہے کہ غیب کا بالذات، حقیقی اور یقینی بلا سبب علم (مثلا غیر کو مطلع کر دینا) اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے علاوہ بعض مخلوق کو غیب کا علم جو عطا فرماتا ہے وہ حقیقت میں غیب نہیں وہ صرف ظاہر کے اعتبار سے غیب ہے، یا جن بعض لوگوں سے وہ پوشیدہ ہے ان کے اعتبار سے غیب ہے۔ اور اس اختصاص کے یہ منافی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خبر دینے سے یہ غیب لوگوں کو معلوم ہے کیونکہ یہ اختصاص مستثنی کے ماسوا کے اعتبار سے ہے اور اضافی ہے (یعنی رسولوں کے سوا اور کسی کو یقینی علم غیب نہیں ہوتا) (عنایۃ القاضی ج 8، ص 261، طبع دار صادر، بیروت)

شیخ اشرف علی تھانوی متوفی 1364ھ الانعام: 50، میں لااعلم الغیب کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اور نہ میں (یہ کہتا ہوں کہ میں) تمام غیبوں کو (جو کہ معلومات الٰہیہ ہیں) جانتا ہوں۔

شیخ شبیر احمد عثمانی متوفی 1369ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: یعنی کوئی شخص جو مدعی نبوت ہو اس کا دعوی یہ نہیں ہوتا کہ تمام مقدورات الٰہیہ کے خزانے اس کے قبضہ میں ہیں کہ جب اس سے کسی امر کی فرمائش کی جائے وہ ضرور ہی کر دکھلائے یا تمام معلومات غیبیہ و شہادیہ پر خواہ ان کا تعلق فرائض رسالت سے ہو یا نہ ہو اس کو مطلع کر دیا گیا ہے۔

نیز شیخ عثمانی "قل لایعلم من فی السموات والارض الغیب الااللہ" (النمل: 65) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

کل مغیبات کا علم بجز خدا کے کسی کو حاصل نہیں (اللہ کا علم حصولی نہیں، حضور ہے، سعیدی غفرلہ) نہ کسی ایک غیب کا علم کسی شخص کو بالذات بدون عطائے الٰہی کے ہو سکتا ہے اور نہ مفاتیح غیب اللہ نے کسی مخلوق کو دی ہیں ہاں بعض بندوں کو بعض غیوب پر باختیار خود مطلع کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شخص کو حق تعالیٰ نے غیب پر مطلع فرمادیا یا غیب کی خبر دے دی۔

ان عبارات میں علماء دیوبند نے بھی علم غیب کی ذاتی اور عطائی کی طرف تقسیم کا اعتراف کر لیا ہے اور دیگر کثیر علماء اسلام کی عبارت سے بھی ہم نے اس بحث میں علم غیب کی ذاتی اور عطائی کی طرف تقسیم کو واضح تر کر دیا ہے۔

قرآن اور سنت میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علم کے عموم اور علم ماکان ومایکون کی تصریحات

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وانزل اللہ علیک الکتاب والحکمۃ وعلمک مالم تکن تعلم وکان فضل اللہ علیک عظیما: اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل کی اور ان تمام چیزوں کا علم دے دیا جن کو آپ پہلے نہیں جانتے تھے اور اللہ کا آپ پر فضل عظیم ہے۔ (النساء: 113)

اس آیت سے علم کلی کے استدلال پر ہم نے اپنی کتاب مقام ولایت و نبوت میں بہت تفصیل سے بحث کی ہے اور اس استدلال کی تائید میں بکثرت حوالہ جات نقل کیے ہیں اور اس استدلال پر وارد ہونے والے اعتراضات کا مکمل ازالہ کر دیا ہے۔ جو لوگ اس بحث و تفصیل اور تحقیق سے جاننا چاہتے ہوں ان کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

امام بخاری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

1۔ عن عمرو قال قام فینا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مقاما فاخبرنا نبدء الخلق حتی دخل اھل الجنتہ منازلھم واھل النار منازلھم حفظ ذالک من حفظہ ونسیہ من نسیہ۔

حضرت عمرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے درمیان ایک مجلس میں کھڑے ہوئے پھر آپ نے ابتداء خلق سے خبریں بیان کرنا شروع کیں، حتی کہ جنتیوں کے اپنے ٹھکانوں تک جانے اور جہنمیوں کو اپنے ٹھکانوں تک جانے کی خبریں بیان کیں، جس شخص نے اس کو یاد رکھا اس نے یاد رکھا اور جس نے اس کو بھلا دیا اس نے اس کو بھلا دیا۔ (صحیح بخاری ج 1، ص 453، مطبوعہ کراچی)

نیز امام بخاری روایت کرتے ہیں:

2۔ عن حذیفۃ قال لقد خطبنا النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خطبۃ ماترک فیھا شیئا الی قیام الساعۃ الا ذکرہ علمہ من علمہ وجھلہ من جھلہ الحدیث۔

حضرت حذیفہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم میں ایک تقریر فرمائی اور اس میں قیامت تک ہونے والے تمام امور بیان فرمادیے جس شخص نے اسے جان لیا اس نے جان لیا اور جس نے نہ جانا اس نے نہ جانا۔ (صحیح بخاری ج 2، ص 977، مطبوعہ کراچی)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

3۔ عن ابی زید قال صلی بنا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) الفجر وصعد المنبر فخطبنا حتی حضرت الظھر فنزل فصلی ثم صعد المنبر فخطبنا حتی حضرت العصر ثم نزل فصلی ثم صعد المنبر فخبنا حتی غربت الشمس فاخبرنا بماکان وماھو کائن فاعلمنا احفظنا۔

حضرت ابوزید (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں صبح کی نماز پڑھائی اور منبر پر رونق افروز ہوئے اور ہمیں خطبہ دیا حتی کہ ظہر کا وقت آگیا پھر منبر سے اترے اور ظہر کی نماز پڑھائی اور پھر منبر پر رونق افروز ہوئے اور ہمیں خطبہ دیا حتی کہ عصر کا وقت آگیا پھر آپ منبر سے اترے اور عصر کی نماز پڑھائی پھر آپ نے منبر پر چڑھ کر ہمیں خطبہ دیا حتی کہ سورج غروب ہوگیا پھر آپ نے ہمیں تمام ماکان ومایکون کی خبریں دیں سو جو ہم میں زیادہ حافظہ والا تھا اس کو ان کا زیادہ علم تھا۔ (صحیح مسلم ج 2، ص 390، مطبوعہ کراچی)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

4۔ عن ابی سعید الخذری قال صلی بنا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یوما صلوۃ العصر بنھار ثم قام خطیبا فلم یدع شیئا یکون الی قیام الساعۃ الا اخبرنا بہ حفظہ من حفظہ ونسیہ من نسیہ۔

حضرت ابوسعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں عصر کی نماز پڑھائی۔ پھر آپ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور آپ نے قیامت تک ہونے والے ہر واقعہ اور ہر چیز کی ہمیں خبر دے دی، جس نے اس کو یاد رکھا اس نے یاد رکھا اور جس نے اس کو بھلا دیا اس نے بھلا دیا۔ (سنن الترمذی، ص 319، مطبوعہ کراچی)

5۔ عن ثوبان قال قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان اللہ زوی لی الارض فرایت مشارقہا و مغاربہا: حضرت ثوبان (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بیان فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمام روئے زمین کو میرے لیے لپیٹ دیا اور میں نے اس کے تمام مشارق و مغارب کو دیکھ لیا۔ (صحیح مسلم ج 4، ص 390، کراچی)

اس حدیث کو امام بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔ نیز امام ابو داؤد اور امام احمد نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ (دلائل النبوۃ ج 6، ص 527، سنن ابو داؤد ج 2، ص 328، مسند احمد ج 5، ص 278)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

6۔ عن معاذ بن جبل قال احتبس عنا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ذات غداۃ من صلوۃ الصبح حتی کدنا نترای عین الشمس فخرج سریعا فثوب بالصلوۃ فصلی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وتجوز فی صلوتہ فلما سلم دعا بصوتہ فقال لنا علی مصافکم کما انتم ثم انفتل الینا فقال اما انی ساحدثکم ما حبسنی عنکم الغداۃ انی قمت من اللیل فتوضات فصلیت ما قدر لی فنعست فی صلوتی فاستثقلت فاذا ابربی تبارک وتعالیٰ فی احسن صورۃ فقال یا محمد قلت رب لبیک قال فیم یختصم الملاء الاعلی قلت لا ادری رب قالہا ثلاثا قال فرایتہ وضع کفہ بین کتفی قد وجدت برد انامله بین ثدی فتجلانی کل شیء وعرفت۔ الحدیث الی ان قال، قال ابو عیسیٰ ھذا حدیث حسن صحیح سالت محمد ابن اسماعیل عن ھذا الحدیث فقال ھذا صحیح۔

حضرت معاذ بن جبل (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صبح کی نماز میں آنے کے لیے دیر کی، حتی کہ قریب تھا کہ ہم سورج کو دیکھ لیتے، پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جلدی سے آئے اور نماز کی اقامت کہی گئی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مختصر نماز پڑھائی، پھر آپ نے سلام پھیر کر باآواز بلند ہم سے فرمایا جس طرح اپنی صفوں میں بیٹھے ہو بیٹھے رہو، پھر ہماری طرف مڑے اور فرمایا میں اب تم کو یہ بیان کروں گا کہ مجھے صبح کی نماز میں آنے سے کیوں دیر ہو گئی۔ میں رات کو اٹھا اور وضو کر کے میں نے اتنی رکعات نماز پڑھی جتنی میرے لیے مقدر کی گئی تھی پھر مجھے نماز میں اونگھ آئی، پھر مجھے گہری نیند آ گئی۔ اچانک میں نے اچھی صورت میں نے اپنے رب تبارک وتعالیٰ کو دیکھا، اس نے فرمایا اے محمد! میں نے کہا اے میرے رب میں حاضر ہوں، فرمایا ملاء اعلی کس چیز میں بحث کر رہے ہیں؟ میں نے کہا میں نہیں جانتا۔ آپ نے کہا میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ میرے دو کندھوں کے درمیان رکھا اور اس کے پوروں کی ٹھنڈک میں اپنے سینے میں محسوکی پھر ہر چیز مجھ پر منکشف ہو گئی اور میں نے اس کو جان لیا۔ (الحدیث) (سنن الترمذی ص 466، کراچی)

امام ترمذی کہتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے، میں نے امام بخاری سے ایک حدیث کے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا یہ حدیث صحیح ہے۔

7۔ نیز امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

عن ابن عباس ان النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قال اتانی ربی فی احسن صورۃ فقال یا محمد فقلت لبیک ربی وسعدیک قال فیم یختصم الملاء الاعلی قلت ربی لا ادری فوضع یدہ بین کتفی حتی وجدت بردھا بین ثدیی فعلمت ما بین المشرق والمغرب۔

حضرت ابن عباس (رض) روایت کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں نے (خواب میں) اپنے رب کو حسین صورت میں دیکھا، میرے رب نے کہا اے محمد! میں نے کہا حاضر ہوں یا رب! فرمایا ملاء اعلی کس چیز میں بحث کر رہے ہیں، میں نے کہا اے میرے رب! میں نہیں جانتا، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ میرے دو کندھوں کے درمیان رکھا، جس کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینے میں محسوس کی، پھر میں نے جان لیا جو کچھ مشرق اور مغرب کے درمیان ہے۔ (الحدیث سنن الترمذی ص 466، کراچی)

8۔ امام احمد بن حنبل اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔

عن ابن عباس ان النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قال اتانی ربی عزوجل اللیلۃ فی احسن صورۃ احسبہ یعنی فی النوم فقال یا محمد تدری فیم یختصم الملاء الاعلی قال قلت لا قال النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فوضع یدہ بین کتفی حتی وجدت بردہا بین ثدیی او قال نحری فعلمت ما فی السموات والارض۔

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا آج رات کو نیند میں میرا رب عزوجل حسین صورت میں میرے پاس آیا اور فرمایا اے محمد! کیا تم جانتے ہو کہ ملاء اعلی کس چیز میں بحث کر رہے ہیں؟ حضرت ابن عباس کہتے ہیں آپ نے فرمایا نہیں! نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ میرے دو کندھوں کے درمیان رکھا حتی کہ میں نے اپنے سینے میں اس کی ٹھنڈک محسوس کی اور میں نے ان تمام چیزوں کو جان لیا جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں۔ (مسند احمد ج 1، ص 368)

9۔ امام احمد بن حنبل نے ایک اور سند سے بھی یہ حدیث روایت کی ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں: فوضع کفیہ بین کتفی فوجدت برد ھا بین ثدیي حتی تجلی لی مافی السموات والارض۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو میرے کندھوں کے درمیان رکھا، میں نے اس کی ٹھنڈک کو اپنے سینہ میں محسوس کیا حتی کہ میرے لیے وہ تمام چیزیں منکشف ہو گئیں جو آسمانوں میں ہیں، اور جو زمینوں میں ہیں۔ (مسند احمد ج 4 ص 366)

حافظ الہیثمی ذکر کرتے ہیں:

10۔ عن عمر قال قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان اللہ عزوجل قد رفع لی الدنیا فانا انظر الیہا والی ماھو کائن فیہا الی یوم القیامۃ کانما انظر الی کفی ھذا۔ رواہ الطبرانی ورجالہ وثقوا علی ضعف کثیر۔

حضرت عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ عزوجل نے میرے دنیا اٹھا کر رکھ دی اور میں دنیا کو اور جو کچھ قیامت تک دنیا میں ہونے والا ہے اس کو دیکھ رہا ہوں جیسا کہ میں اپنی اس ہتھیلی کو دیکھ رہا ہوں، اس حدیث کو طبرانی روایت کیا ہے، ہرچند کہ اس حدیث کے راوی ضعیف ہیں لیکن ان کی توثیق کی گئی ہے۔ (مجمع الزوائد ج 8، ص 277، بیروت)

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علم کے عموم اور علم ماکان ومایکون کے متعلق علماء اسلام کی تصریحات

حضرت سواد بن قارب (رض) بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اجازت سے آپ کی شان میں چند اشعار سنائے، جن میں سے ایک شعر یہ ہے۔

فاشھد ان اللہ لارب غیرہ

وانک مامون علی کل غائب

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی رب نہیں اور آپ اللہ تعالیٰ کے ہر غیب پر امین ہیں۔

حضرت سواد بن قارب (رض) کہتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اشعار سن کر مجھ سے بہت خوش ہوئے، آپ کے چہرہ اقدس سے خوشی کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ فرمایا افلحت یا سواد اے سواد! تم کامیاب ہوگئے۔ اس حدیث کو بکثرت علماء اسلام نے اپنی تصنیفات میں ذکر کیا ہے۔ بعض علماء کے اسماء یہ ہیں، امام ابو نعیم، امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی، علامہ ابن عبدالبر، علامہ سہیلی، علامہ ابن الجوزی، حافظ ابن کثیر، علامہ بدرالدین عینی، علامہ جلال الدین سیوطی، علامہ حلبی، شیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب نجدی، علامہ محمد بن یوسف الصالی الشامی۔ (دلائل النبوت لابی نعیم ج 1، ص 114۔ دلائل النبوت للبیہقی ج 2، ص 251۔ استیعاب علی ھامش الاصابہ ج 2، ص 124، الروض الانف ج 1، ص 140۔ الوفاج 1، ص 153۔ السیرۃ النبویہ لابن کثیر ج 1، ص 346۔ عمدۃ القاری ج 17، ص 8۔ الخصائص الکبری ج 1، ص 171، بیروت، انسان العیون ج 1، ص 324۔ مختصر سیرت الرسول ص 69۔ سبل الہدی والرشاد ج 2، ص 209)

علامہ ابن جریر طبری لکھتے ہیں: وعلمک مالم تکن تعلم من خبر الاولین والاخرین وماکان وماھو کائن

اولین اور آخرین کی خبروں اور ماکان ومایکون میں سے جو کچھ آپ نہیں جانتے تھے وہ سب اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتلا دیا۔ (جامع البیان جز 5، ص 373، بیروت)

قاضی عیاض لکھتے ہیں: واما تعلق عقدہ من ملکوت السموت والارض وخلق اللہ وتعیین اسماء الحسنی وایاتہ الکبری وامور الاخرۃ واشراط الساعۃ واحوال سعداء والاشقیاء وعلم ماکان ومایکون مما لم یعلمہ الا یوحی۔

آسمانوں اور زمینوں کی نشانیاں، اللہ تعالیٰ کی مخلوق، اللہ تعالیٰ کے اسماء کی تعیین، آیات کبری، امور آخرت، علامت قیامت، اچھے اور برے لوگوں کے احوال اور ماکان ومایکون کا علم اس قبیل سے ہے جس کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بغیر وحی کے نہیں جانا۔ (الشفاء ج 2، ص 100، ملتان)

ملا علی قاری لکھتے ہیں: ان علمہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) محیط بالکلیات والجزئیات۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا علم کلیات اور جزئیات کو محیط ہے (المرقات ج 10، ص 151)

نیز ملا علی قاری فرماتے ہیں:

کون علمہا من علومہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان علومہ تتنوع الی الکلیات والجزئیات و حقائق و دقائق و عوارف و معارف تتعلق بالذات والصفات و علمہا انما یکون سطرا من سطور علمہ و نہرا من بحور علمہ ثم مع ھذا ھو من برکۃ وجودہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔

لوح و قلم، علوم نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ایک ٹکڑا اس لیے ہے کہ حضور کے علم انواع انواع ہیں، کلیات، جزئیات، حقائق، دقائق، عوارف اور معارف کہ ذات و صفات الٰہی سے متعلق ہیں اور لوح و قلم کا علم تو حضور کے مکتوب علم سے ایک سطر اور اس کے سمندروں میں سے ایک نہر ہے۔ پھر بایں ہمہ وہ حضور ہی کی برکت سے تو ہے (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔ (الزبدۃ شرح قصیدہ بردہ، ص 116، مطبوعہ پیر جو گوٹھ سندھ، 1406ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

الثانیۃ والاربعون اطلاع علی ما سیکون الثالثۃ والربعون الاطلاع علی ماکان مما لم ینقلہ احد قبلہ

نبوت کی بیالیسویں صفت یہ ہے کہ ان کو ماسیکون (امور مستقبلہ) کا علم ہو اور تینتالیسویں صفت یہ ہے کہ ان کو ماکان (امور ماضیہ) کا علم ہو، جن کو ان سے پہلے کسی نے نہ بیان کیا ہو۔ (فتح الباری ج 12، ص 367)

علامہ سید محمود آلوسی لکھتے ہیں:

(انزلہ بعلمہ) ای متلبسا بعلمہ المحیط الذی لایعزب عنہ مثقال ذرۃ فی السموات والارض و من ھنا علم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ماکان وماھو کائن۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت علم کے ساتھ تجلی کرکے حضور پر قرآن نازل کیا، جس صفت علم سے آسمانوں اور زمین کا کوئی ذرہ غائب نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ماکان ومایکون کو جان لیا۔ (روح المعانی ج 6، ص 22)

نیز علامہ آلوسی لکھتے ہیں: فلم یقبض النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حتی علم کل شیء یمکن العلم بہ۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اس وقت تک وصال نہیں ہوا جب تک کہ آپ نے ہر اس چیز کو نہیں جان لیا جس کا علم ممکن ہے (روح المعانی ج 15، ص 154)

شیخ اشرف علی تھانوی کے خلیفہ مجاز شیخ مرتضی حسین چاند پوری لکھتے ہیں:

حاصل یہ ہے کہ سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو علم مغیبات اس قدر دیا گیا تھا کہ دنیا کے تمام علوم بھی اگر ملائے جائیں تو آپ کے ایک علم کے برابر نہ ہوں۔ (توضیح البیان فی حفظ الایمان، ص 12) (تفسیر تبیان القرآن)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قیامت کا علم عطا کیا گیا ہے:

سرکارِ دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بڑی تفصیل کے ساتھ قیامت سے پہلے اور اس کے قریب ترین اوقات کے بارے میں تفصیلات بیان فرمائی ہیں جو اس بات کی علامت ہیں کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قیامت کا علم تھا۔ ان میں سے 8 اَحادیث درج ذیل ہیں:

(1)۔۔ حضرت انس بن مالک (رض) سے روایت ہے، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "قیامت اس وقت تک قائم نہ ہو گی حتّٰی کہ زمانہ جلد جلد گزرنے لگے گا۔ سال ایک ماہ کی طرح گزرے گا۔ مہینہ ہفتہ کی طرح گزرے گا۔ ہفتہ ایک دن کی طرح، ایک دن ایک گھنٹے کی طرح اور ایک گھنٹہ آگ کی چنگاری کی طرح گزر جائے گا۔ (2)

(2)۔۔ حضرت سلامہ بنت حر (رض) سے روایت ہے، حضور سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "قیامت کی علامتوں میں سے یہ ہے کہ اہل مسجد امامت کرنے کیلئے ایک دوسرے سے کہیں گے اور انھیں نماز پڑھنے کے لیے کوئی امام نہ ملے گا۔ (3)

(3)۔۔ حضرت انس بن مالک (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "قیامت کی علامتوں میں سے یہ ہے کہ علم اٹھایا جائے گا اور جہل کا ظہور ہوگا، زنا عام ہوگا اور شراب پی جائے گی، مرد کم ہو جائیں گے اور عورتیں زیادہ ہوں گی حتّٰی کہ پچاس عورتوں کا کفیل ایک مرد ہوگا۔ (4)

(4)۔۔ حضرت علی المرتضٰی کَرَّمَ اللہ تعالٰی وَجْہَہُ الْکَرِیْم سے روایت ہے، نبیّ اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جب میری امت پندرہ کاموں کو کرے گی تو اس پر مصائب کا آنا حلال ہو جائے گا۔ عرض کی گئی: یارسول اللہ! وہ کیا کام ہیں؟ ارشاد فرمایا: "جب مال غنیمت کو ذاتی دولت بنالیا جائے گا، امانت کو مال غنیمت بنالیا جائے گا، زکوٰۃ کو جرمانہ سمجھ لیا جائے گا، جب لوگ اپنی بیوی کی اطاعت کریں گے اور اپنی ماں کی نافرمانی کریں گے، جب دوست کے ساتھ نیکی کریں گے اور باپ کے ساتھ برائی کریں گے، جب مسجدوں میں آوازیں بلند کی جائیں گی، ذلیل ترین شخص کو قوم کا سردار بنادیا جائے گا، جب کسی شخص کے شر کے ڈر سے اس کی عزت کی جائے گی، شراب پی جائے گی، ریشم پہنا جائے گا، گانے والیاں اور ساز رکھے جائیں گے اور اس امت کے آخری لوگ پہلوں کو برا کہیں گے۔ اس وقت تم سرخ آندھیوں، زمین کے دھنسنے اور مسخ کا انتظار کرنا۔ (1)

(5)۔۔ حضرت حذیفہ بن اسید غفاری (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "قیامت ہرگز اس وقت تک قائم نہ ہو گی جب تک کہ تم اس سے پہلے دس نشانیاں نہ دیکھ لو، پھر آپ نے دھویں، دجّال، دابّۃُالارض، سورج کے مغرب سے طلوع ہونے، حضرت عیسٰی بن مریم کے نزول، یاجوج ماجوج کا اور تین مرتبہ زمین دھنسنے کا ذکر فرمایا، ایک مرتبہ مشرق میں، ایک مرتبہ مغرب میں، ایک مرتبہ جزیرہ عرب میں اور سب کے آخر میں ایک آگ ظاہر ہوگی جو لوگوں کو محشر کی طرف لے جائے گی۔ (2)

(6)۔۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے منقول ایک طویل روایت کے آخر میں ہے کہ قیامت یوم عاشوراء یعنی محرم کے مہینہ کی دس تاریخ کو ہو گی۔ (3)

(7)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "سب سے بہتر دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے وہ جمعہ کا ہے، اسی دن حضرت آدم (علیہ السلام) پیدا کئے گئے، اسی دن جنت میں داخل کئے گئے اور اسی دن جنت سے باہر لائے گئے اور قیامت بھی جمعہ کے دن قائم ہو گی۔ (4)

(8)۔۔ حضرت عبداللہ بن سلام (رض) فرماتے ہیں "اللہ تعالٰی نے جمعہ کی آخری ساعت میں حضرت آدم (علیہ السلام) کو پیدا کیا اور اسی ساعت میں قیامت قائم ہو گی۔ (5)

حضور سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قیامت کی اس قدر تفصیلی علامات بیان فرمائی ہیں کہ دیگر نشانیوں کے ساتھ ساتھ قیامت کا مہینہ، دن، تاریخ اور وہ گھڑی بھی بتادی کہ جس میں قیامت واقع ہو گی البتہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ نہیں بتایا کہ کس سن میں قیامت واقع ہو گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر سن بھی بتادیتے تو ہمیں معلوم ہو جاتا کہ قیامت آنے میں اب کتنے سال، کتنے دن اور کتنی گھڑیاں باقی رہ گئی ہیں یوں قیامت کے اچانک آنے کا جو ذکر قرآن پاک میں ہے وہ ثابت نہ ہوتا لہٰذا سال نہ بتانا قرآن پاک کے صدق کو قائم رکھنے کیلئے اور اس کے علاوہ بہت کچھ بتادینا اپنا علم ظاہر کرنے کیلئے ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

آیت مبارکہ:

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝١٨٨ۧ

لغۃ القرآن: [قُلْ : آپ کہہ دیجیے] [لَّآ اَمْلِكُ : میں مالک نہیں ہوں] [لِنَفْسِيْ : اپنی جان کیلئے] [نَفْعًا : کسی نفع کا] [وَّلَا ضَرًّا : اور نہ ہی کسی تکلیف کا] [اِلَّا : مگر] [مَا : وہ جو] [شَآءَ : چاہا] [اللّٰهُ: اللہ نے] [وَلَوْ : اور اگر] [كُنْتُ اَعْلَمُ : میں جانتا ہوتا] [الْغَيْبَ : غیب کو] [لَاسْتَكْثَرْتُ : تو میں ضرور جمع کرتا] [مِنَ الْخَيْرِ : بھلائی میں سے] [وَمَا مَسَّنِيَ : اور نہ چھوتی مجھ کو] [السُّوْۗءُ : برائی] [اِنْ : نہیں] [اَنَا : ہوں میں] [اِلَّا : مگر] [نَذِيْرٌ: ڈرانے والا] [وَّبَشِيْرٌ: اور خوشخبری دینے والا] [لِّقَوْمٍ : اس قوم کے لیے] [يُّؤْمِنُوْنَ : جو ایمان لاتے ہیں]

ترجمہ: آپ (ان سے یہ بھی) فرمادیجئے کہ میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع اور نقصان کا خود مالک نہیں ہوں مگر (یہ کہ) جس قدر اللہ نے چاہا، اور (اسی طرح بغیر عطاء الٰہی کے) اگر میں خود غیب کا علم رکھتا تو میں از خود بہت سی بھلائی (اور فتوحات) حاصل کرلیتا اور مجھے (کسی موقع پر) کوئی سختی (اور تکلیف بھی) نہ پہنچتی، میں تو (اپنے منصب رسالت کے باعث) فقط ڈر سنانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں ☆

تشریح:

جب بھی کوئی پیغمبر کسی قوم کی طرف مبعوث ہوتا ہے یا اللہ کا کوئی نیک بندہ کسی قوم کی اصلاح کے لیے اٹھتا ہے تو حیرت کی بات ہے کہ افراد قوم اس کی ہدایت اور اصلاح قبول کرنے کے لیے تو کم کم آتے ہیں البتہ بیشتر آنے والوں کا تعلق دو ہی حوالوں سے ہوتا ہے۔ کبھی تو وہ آنے والے حالات یا قسمت کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ میں کاروبار کر رہا ہوں مجھے بتایئے کہ میرا کاروبار کیسا رہے گا؟ بچوں کی شادیاں کرنی ہیں فلاں فلاں رشتے ان کے لیے کیسے رہیں گے؟ اللہ انھیں بیٹا دے گا یا بیٹی دے گا؟ مستقبل میں فلاں فلاں معاملے کے حوالے سے میرے ساتھ کیا ہوگا؟ اور یا پھر اس طرح کے مطالبات لے کر آئیں گے کہ آپ کوئی ایسا تعویذ دے دیں جس سے مجھے فلاں ملازمت مل جائے، میرے گھر میں دولت کی ریل پیل ہو جائے، میں فلاں فلاں نقصان سے بچ جاؤں، فلاں منصب اور عہدہ مجھے مل جائے، میں حکومت میں شامل کرلیا جاؤں یعنی نفع و ضرر کے حوالے سے مختلف قسم کے مطالبات کیے جائیں گے اور یہ سمجھا جائے گا کہ جسے اللہ نے نبی بنایا ہے یا جسے ہم ولی سمجھتے ہیں وہ تمام امور غیبیہ سے واقف ہوتے ہیں، ماضی اور مستقبل کی ایک ایک بات ان کے سامنے روشن ہوتی ہے اور نفع و ضرر کے حوالے سے بھی وہ کلی اختیارات کے مالک ہیں، جسے جو چاہیں دے دیں اور جو چاہیں چھین لیں۔ اس آیت کریمہ میں اس بنیادی گمراہی پر توجہ دلاتے ہوئے واضح کیا ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

اس آیت کریمہ میں حضور رحمۃ العالمین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی ذات مقدسہ سے الوہیت کی نفی فرمارہے ہیں کہ میں خدا نہیں۔ کیونکہ خدا وہ ہے جس کی قدرت کامل اور اختیار مستقل ہے جو چاہے کرسکتا ہے۔ نہ کسی کام سے اسے کوئی روک سکتا ہے اور نہ اسے کسی کام پر مجبور کرسکتا ہے۔ اور مجھ میں یہ اختیار کامل اور قدرت مستقلہ نہیں پائی جاتی۔ میرے پاس جو کچھ ہے میرے رب کا عطیہ ہے اور میرا سارا اختیار اسی کا عنایت فرمودہ ہے۔ لا املک کے کلمات سے اپنے اختیار کامل کی نفی فرمائی اور الا ماشاء اللہ سے اس غلط فہمی کا ازالہ کردیا کہ کوئی نادان یہ نہ سمجھے کہ حضور کو نفع و ضرر کا کچھ اختیار ہی نہیں۔ فرمایا مجھے اختیار ہے اور یہ اختیار اتنا ہی ہے جتنا میرے رب کریم نے مجھے عطا فرمایا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ کتنا عطا فرمایا ہے تو انسانی عقل کا کوئی پیمانہ اور کوئی اندازہ اس کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ کوئی بناوٹی حد قائم نہیں کی جاسکتی۔

اس ایک آیت کریمہ میں ہی غور فرمایئے ولسوف یعطیک ربک فترضٰی (اے حبیب!) تیرا رب تجھے اتنا دے گا کہ تو راضی ہو جائے گا۔ کیا لطف ہے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی ساری توانائیوں اور قوتوں سے برات کرتے ہوئے ہر بات اپنے خالق ومالک کی مرضی اور مشیت کے سپرد کر دی اور اس بندہ نواز نے اپنی مشیت کو اپنے محبوب بندے کی رضا و خوشنودی پر منحصر کر دیا۔ بتا دیا۔ تجھے دینے والا میں ہوں۔ خود تمہیں دوں گا اور اتنا دوں گا جتنا تو چاہے گا۔ اب اس عالی ظرف آقا کی وسعت ظرف کو ملاحظہ فرمایئے جب ولسوف یعطیک ربک فترضٰی کا مژدہ پہنچا تو عرض کی اے کریم! میں تو اس وقت تک راضی نہیں ہوں گا جب تک میری امت کا آخری فرد بھی جنت میں نہ پہنچ جائے۔ انصاف کرو کیا آتش جہنم سے بچا لینا دفع ضرر باذن اللہ نہیں۔ کیا جنت میں پہنچا دینا نفع رسانی باذن اللہ نہیں؟ ہے اور یقیناً ہے۔

آیت کے پہلے حصہ کی طرح یہاں بھی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی ذات مقدسہ سے الوہیت کی نفی فرما رہے ہیں۔ کیونکہ خدا وہ ہے جس کا علم ذاتی اور محیط ہو۔ اور میرا علم ایسا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ اس مقام کی توضیح کرتے ہوئے علامہ خازن لکھتے ہیں کہ امور غیبیہ کی خبر دینا تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اعظم معجزات سے ہے تو یہاں اس کی نفی کیوں کی جا رہی ہے۔ خود ہی جواب دیتے ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمانا بر سبیل تواضع اور انکسار اور ادب تھا۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جب تک اللہ تعالیٰ مجھے مطلع نہ کرے میں غیب نہیں جان سکتا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد اس وقت ہو جب غیب پر آگاہی نہیں بخشی گئی تھی اور جب آگاہ فرما دیا تو ارشاد فرمایا فلا یظھر علی غغیبہ احداالا من ارتضٰی من رسول الخ۔

اگر آیت کے الفاظ میں غور کیا جائے تو علامہ خازن کی یہ تحقیق بالکل درست معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں حروف شرط میں سے لو مستعمل ہوا ہے اور علامہ جمال الدین ابن ہشام نے اپنی گراں قدر تالیف المغنی میں لو پر طویل بحث کرنے کے بعد لکھا ہے۔ یتلخص علی ھذا ان یقال ان تدل لو علی ثلاثۃ امور عقد السببیۃ والمسببیۃ وکونھما فی الماضی وامتناع السبب (المغنی جلد اول صفحہ ۲۰۶) یعنی اس طویل بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ لو تین امور پر دلالت کرتا ہے۔

(۱) شرط کو سبب اور جزاء کو مسبّب بناتا ہے۔ (۲) دونوں کا تحقق زمانہ ماضی میں ہوتا ہے۔ (۳) سبب ممتنع ہوتا ہے۔

اس تحقیق کو ذہن نشین کر لینے کے بعد آیت میں غور کیجئے کہ اگر یہاں علم غیب سے مراد علم ذاتی جو قدرت ذاتی کو مستلزم ہے نہ لیا جائے تو یہ سبب نہیں بن سکتا۔ کیونکہ صرف علم، خیر کثیر جمع کر لینے اور دفع ضرر کو دور کرنے کا سبب نہیں ہوا کرتا۔ کیونکہ کسی تکلیف کے وقوع کا علم قبل از وقت ہو جاتا ہے۔ لیکن انسان اس سے بچ نہیں سکتا۔ موٹی سی بات ہے۔ کسی شخص کو عدالت عالیہ سے اگر پھانسی کا حکم ہو جائے تو وہ یہ جانتے ہوئے کہ مجھے پھانسی دے دی جائے گی اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔ اس لیے حصول خیر اور دفع ضرر کا سبب علم ذاتی ہی ہو سکتا ہے جو قدرت ذاتی کو مستلزم ہے۔ تب ہی لو شرط اور جزا میں سببیت کا علاقہ پیدا کر سکتا ہے جو اس کا پہلا خاصہ ہے۔ اس کا دوسرا خلاصہ کلام کو زمانہ ماضی کے ساتھ مخصوص کرنا ہے اور زمانہ ماضی میں کسی چیز کی نفی اس امر کو مستلزم نہیں کہ آئندہ بھی یہ نہ پایا جائے۔ لو کا تیسرا خاصہ یہ ہے کہ وہ سبب کے ممتنع ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اور علم غیب جس کا حصول ممتنع ہے وہ علم غیب ذاتی ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بتانے سے کسی غیب کو جان لینا کسی کے نزدیک بھی ممتنع نہیں بلکہ سب اس کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سکھلا دینے سے علم غیب حاصل ہو جاتا ہے۔ اب لو سے جس علم غیب کی نفی کی جا رہی ہے وہ وہ ہے جس کا حصول ممتنع ہے وہ علم غیب ذاتی ہے۔ اس لیے اس آیت کریمہ سے علم غیب عطائی کی نفی نہیں ہوتی اور ہم یہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضور نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو باعلام اللہ تعالیٰ غیب کا علم حاصل تھا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

شان نزول:

غزوہ بنی مصطلق سے واپسی کے وقت راہ میں تیز ہوا چلی چوپائے بھاگے تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خبر دی کہ مدینہ طیبہ میں رفاعہ کا انتقال ہو گیا اور یہ بھی فرمایا کہ دیکھو میرا ناقہ کہاں ہے؟ عبد اللہ بن اُبَیّ منافق اپنی قوم سے کہنے لگا ان کا کیسا عجیب حال ہے کہ مدینہ میں مرنے والے کی تو خبر دے رہے ہیں اور اپنا ناقہ معلوم ہی نہیں کہ کہاں ہے۔ سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اس کا یہ قول بھی مخفی نہ رہا، حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا منافق لوگ ایسا ایسا کہتے ہیں اور میرا ناقہ اس گھاٹی میں ہے اس کی نکیل ایک درخت میں الجھ گئی ہے چنانچہ جیسا فرمایا تھا اسی شان سے وہ ناقہ پایا گیا اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (تفسیر کبیر) (تفسیر خزائن العرفان)

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اہل مکہ کو فرمایا: میں اپنے نفس کو نفع یا نقصان پہنچانے کا کوئی ذاتی اختیار نہیں رکھتا۔ میرے پاس اپنے آپ کو یا کسی دوسرے کو نفع یا نقصان پہنچانے کا صرف اتنا اختیار ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا ہے اور وہ عطا کردہ اختیار کتنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے پیارے

نبی ! "تیرے رب تجھے اتنا دے گا کہ تو راضی ہو جائے گا"۔ (قرآن : ۹۳ : ۵) یعنی رب تعالیٰ اعلان کر رہا ہے تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو مانگیں اور جتنا مانگیں انھیں راضی کیا جائے گا۔ اب حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کتنا مانگا اور اللہ تعالیٰ نے کتنا عطا فرمایا؟ اس کا صحیح اندازہ کرنا ہمارے بس کا روگ نہیں ہے۔

ذرا غور تو کرو کوئی شخص اس وقت تک جنت کا مستحق نہیں ہو سکتا جب تک وہ "محمد رسول اللہ" پر ایمان نہ لائے۔ سبحان اللہ ! جن کا نام اتنا نفع بخش ہے ان کی ذات کتنی نفع بخش ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بیشمار خزانے عطا فرمائے جن کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تقسیم کرکے لوگوں کو نفع پہنچا رہے ہیں جیسا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خود فرمایا: "بیشک میں تقسیم کرنے والا اور خازن ہوں اور اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے"۔ (بخاری : خمس : باب ۷)

اے منکرو! اگر غیب کا علم میرا ذاتی ہوتا تو قوت بھی میری ذاتی ہوتی اور ذتی قوت کے ذریعہ میں بہت سی خیر جمع کر لیتا یعنی تم سب کو مسلمان کر ڈالتا اور تمہیں کفر کی حالت میں دیکھنے کی مجھے تکلیف نہ ہوتی۔ (خزائن العرفان) مگر حقیقت یہ ہے کہ نہ میرا علم ذاتی ہے اور نہ ہی میری قوت۔ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی عطا ہیں اور میں ان کو اس کی رضا کے مطابق استعمال کرتا ہوں۔ جتنی خیر وہ عطا کرتا ہے میں اس پر شاکر ہوں اور جو تکلیف وہ نازل کرتا ہے میں اس پر صبر کرتا ہوں۔ اگر میں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم غیب کے ذریعہ ہمیشہ راحتوں کا طالب رہتا اور تکلیفوں سے دور رہتا تو عام مسلمانوں کے لیے میری زندگی نمونہ کیسے بنتی اور تکلیفوں میں انھیں حوصلہ کہاں سے ملتا؟ اس لیے میں نے فتح مکہ کی عظمت حاصل کرنے کے لیے پہلے غزوہ احد میں پیشانی کو زخمی کرانا برداشت کیا تاکہ آنے والی نسلوں کو علم ہو جائے کہ حق کو سربلند کرنے کے لیے باطل سے ٹکرانا پڑتا ہے۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

اس آیت میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے علم غیب کی نفی کی گئی ہے حالانکہ آپ نے شام و عراق کی فتوحات، حضرت عثمان (رض) اور حضرت علی (رض) کی شہادت جیسی بیشمار غیب کی خبریں دیں جو بعد میں صحیح ثابت ہوئیں تو ان دونوں میں تطبیق کیسے ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ خازن لکھتے ہیں : یہاں ایک احتمال تو یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ ارشاد اس وقت کا ہو جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیب پر آگاہی نہیں بخشی تھی اور پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو مطلع کر دیا تو آپ نے غیب کی خبریں دیں۔ (تفسیر خازن) علامہ صاوی لکھتے ہیں : اللہ تعالیٰ نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے انتقال سے پہلے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دنیا و آخرت کے تمام غیبی امور سے آگاہ کر دیا (حاشیہ صاوی) علامہ خفاجی لکھتے ہیں : اس آیت میں اس علم غیب کی نفی ہے جو اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر ہو (اور ایسا علم کسی کو بھی حاصل نہیں ہو سکتا) لیکن اللہ تعالیٰ کے بتانے سے جو علم غیب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حاصل ہے، وہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ غیب جاننے والا ہے اور وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں فرماتا سوائے اس رسول کے جس کو وہ پسند کرے"۔ (قرآن : ۷۲ : ۲۸۔۲۷) ابن عطاء نے کہا ہے : غیب پر اطلاع اللہ تعالیٰ کے نور کے ذریعہ ہوتی ہے جس کی دلیل یہ حدیث ہے : مومن کی فراست سے بچو وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے۔ (ترمذی، تفسیر القرآن، سورۃ الحجر) اور یہی معنی ہے اس حدیث قدسی کا جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا بندہ ہمیشہ نوافل کے ذریعہ میرا اقرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں اس کو عطا کرتا ہوں، اگر وہ مجھ سے پناہ چاہے تو اس کو پناہ دیتا ہوں۔ (بخاری : کتاب الرقاق : باب ۳۸) سو جس کی آنکھ کا نور اللہ تعالیٰ ہو جائے تو اس کا غیب پر مطلع ہونا کوئی عجیب نہیں ہے۔ (نسیم الریاض : جلد ۳ : ص ۱۵۰) حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علم غیب کے متعلق چند آیات اور احادیث ملاحظہ ہوں :

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا علم غیب قرآن مجید کی روشنی میں :

۱۔ اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ تمہیں (عام لوگوں کو) غیب پر آگاہ کرے، البتہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے (غیب کے علم کے لئے) چن لیتا ہے۔ (قرآن : ۳: ۱۷۹)

۲۔ یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جن کو ہم آپ کی طرف وحی فرماتے ہیں۔ (قرآن : ۳: ۴۴)

۳۔ اللہ تعالیٰ غیب جاننے والا ہے اور وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں فرماتا سوائے اس رسول کے جس کو وہ پسند کرلے۔ (قرآن : ۷۲: ۲۷۔۲۶)

نبی کریم کا علم غیب احادیث کی روشنی میں

۱۔ ابوزید (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں صبح کی نماز پڑھائی اور منبر پر تشریف فرما ہوئے، پھر ہمیں خطبہ دیا حتیٰ کہ ظہر ہو گئی، آپ منبر سے اترے اور نماز پڑھائی، پھر منبر پر تشریف فرما ہوئے اور ہمیں خطبہ دیا حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا، پھر آپ نے ہمیں ماکان ومایکون (جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ ہونے والا ہے) کی خبریں دیں، سو ہم میں سے جس کا حافظہ زیادہ تھا اسی کا علم بھی زیادہ تھا۔ (مسلم : کتاب الفتن : باب ٦)

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : بیشک اللہ تعالیٰ نے میرے سامنے دنیا کو پیش فرمادیا تو میں اسے اور اس میں قیامت تک ہونے والی چیزوں کو اس طرح دیکھتا ہوں جس طرح میں اپنی ہتھیلی کو دیکھتا ہوں۔

(کنزالعمال : حدیث نمبر ۳۱۹۷۱: جلد ۱۱: ص ۴۲۰)

۳۔ حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) احد پر چڑھے، آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر (رض)، حضرت عمر (رض) اور حضرت عثمان (رض) تھے۔ وہ پہاڑ لرزنے لگا، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا (اے پہاڑ!) ساکن ہو جا تجھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید کھڑے ہیں۔

(بخاری، فضائل اصحاب : باب ۷) (تفسیر امداد الکرم)

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں کفار مکہ نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کیا آپ کا رب آپ کو بتا نہیں سکتا کہ چیزوں کا بھاؤ کب تک کم رہے گا تاکہ ہم بھاؤ چڑھنے سے قبل خریداری کرلیں اور بعد میں مہنگا مال بیچیں اور یہ کہ قحط سالی کب آنے والی ہے تاکہ ہم پہلے بندوبست کرلیں۔ (خازن جلد 3 صفحہ 323، بغوی جلد 3 صفحہ 323 مطبوعہ دارالفکر بیروت) چونکہ کفار کا یہ سوال ضد وعناد کی وجہ سے تھا اگر انھیں یہ چیزیں بتائی جاتی تو بھی وہ ایمان لانے والے نہ تھے اس لیے ان کے جواب میں فرمایا گیا کہ اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ فرمائیں اگر اللہ نہ چاہے تو میں اپنے نفع نقصان کا مالک نہیں ہوں۔ کیونکہ یہ اللہ کے چاہے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔

یعنی اگر اللہ چاہے تو میں اپنے نفع ہی نہیں اپنی ساری امت کے نفع کا مالک ہو سکتا ہوں۔ کیونکہ اللہ نے چاہا تو اپنے حبیب کو یہ شان دی وَلَوْ اَنَّھُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ جَاءُوْکَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰہَ وَاسْتَغْفَرَ لَھُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰہَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا۔ (نساء : 64) جب آپ کی سفارش سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور بخشش مل جاتی ہے تو پھر یہ کہنا کیسے جائز ہے کہ آپ کسی نفع کے مالک نہیں اور یہ کہ جس کا نام محمد یا علی ہے وہ کسی چیز کا مالک و مختار نہیں۔ اور روز قیامت حضور شافع محشر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں کی شفاعت سے در جنت ملے گا اور جس کو بخشش ملے گی آپ کی شفاعت سے ملے گی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں : مجھے زمین کے خزانوں کی چابیاں دی گئی ہیں (بخاری کتاب الجنائز باب 72)

اس آیت کے تحت امام خازن فرماتے ہیں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزات میں سے غیب کی خبریں دینا بھی ہے اور اپنے غیب کی کثیر خبریں دی ہیں اس کے باوجود آپ کا فرمانا وَلَوْ کُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَکْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ۔ بناء بر تواضع ہے۔ (کئی بار آدمی سب کچھ جاننے کے باوجود تواضعاً کہتا ہے میں کچھ نہیں جانتا)۔ یا اس کا یہ معنی ہے کہ اگر میں اللہ کی اطلاع کے بغیر از خود غیب جانتا ہوتا تو بہت سی بھلائی جمع کرلیتا اور مجھے کبھی کوئی برائی (تکلیف) نہاتی اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ آیت آپ کی غیب پر مطلع کیے جانے سے پہلے کی ہو ورنہ اللہ تعالیٰ آپ کے بارے میں خود فرماتا ہے : عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احدا۔ الا من ارتضی من رسول۔ (تفسیر خازن جلد 3 صفحہ 324 مطبوعہ دارالفکر بیروت) اس آیت کے تحت امام بغوی، امام صاوی، امام سلیمان جمل، امام خفاجی اور دیگر ائمہ نے وہی کچھ لکھا ہے جو امام خازن کے حوالے سے ابھی نقل کیا گیا۔ (تفسیر برہان القرآن)

آیت کاخلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت میں حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کمال درجے کی عاجزی، عظمتِ الٰہی اور عقیدہ توحید کے اظہار کا حکم فرمایا گیا کہ سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جو قدرت واختیار اور علم ہے خواہ اپنی ذات کے متعلق یا دوسروں کے بارے میں، یونہی دنیاوی چیزوں کے بارے میں یا قیامت، آخرت اور جنت کے بارے میں وہ تمام کا تمام اللہ عَزَّوَجَلَّ کی عطا سے ہے لہٰذا حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اَوّلین وآخرین سے افضل ہونا، دنیاوآخرت کے امور میں تَصَرُّف فرمانا، صحابہ (رض) کو شفا عطافرمانا بلکہ جنت عطافرمانا، انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری کرنا وغیرہا جتنی چیزیں ہیں سب اللہ عَزَّوَجَلَّ کے چاہنے سے ہیں۔

{ وَلَوۡ كُنۡتُ اَعۡلَمُ الۡغَيۡبَ : اور اگر میں غیب جان لیا کرتا۔ } اس آیت مبارکہ میں علم غیب کی نفی کی علماء کرام نے مختلف توجیہات بیان کی ہیں، ان میں سے چار توجیہات درج ذیل ہیں جنہیں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان (رح) نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علوم کے بیان پر مشتمل اپنی لاجواب کتاب "اِنۡبَاۦُ الۡحَیِّ اَنَّ کَلَامَہُ الۡمَصُوۡنَ تِبۡیَانٌ لِکُلِّ شَیۡئٍ " (اللہ تعالیٰ کا کلام قرآن مجید ہر چیز کا روشن بیان ہے۔) میں بیان فرمایا ہے۔

(1)۔۔اس آیت میں علم عطائی کی نفی نہیں بلکہ علم ذاتی کی نفی ہے۔

امام قاضی عیاض (رح) شفاشریف میں فرماتے ہیں "نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزات میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو غیوب پر مُطّلع فرمایا اور آئندہ ہونے والے واقعات سے باخبر کیا۔ اس باب میں احادیث کا وہ بحرِ ذخّار ہے کہ کوئی اس کی گہرائی جان ہی نہیں سکتا اور نہ اس کا پانی ختم ہوتا ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزات میں سے یہ ایک ایسا معجزہ ہے جو یقین اور وثوق سے معلوم ہے اور ہم تک اس کی خبریں متواتر طریقے سے کثرت سے پہنچی ہیں اور غیب پر اطلاع ہونے پر ان احادیث کے معانی ومطالب آپس میں متحد ہیں۔ (1)

علامہ شہاب الدین احمد بن محمد خفاجی (رح) فرماتے ہیں "یہ وضاحت ان قرآنی آیات کے منافی نہیں جن میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی غیب نہیں جانتا اور اس آیت کریمہ "وَلَوۡ كُنۡتُ اَعۡلَمُ الۡغَيۡبَ لَاسۡتَكۡثَرۡتُ مِنَ الۡخَيۡرِ "میں کسی واسطے کے بغیر (یعنی علم ذاتی) کی نفی کی گئی ہے البتہ اللہ تعالیٰ کے بتانے سے حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا غیب پر مطلع ہونا ثابت ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔

"عٰلِمُ الۡغَيۡبِ فَلَا يُظۡهِرُ عَلٰى غَيۡبِهٖۤ اَحَدًا (ۙ۲۶) اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰى مِنۡ رَّسُوۡلٍ " (2)

ترجمہ کنزالعرفان: غیب کا جاننے والا اپنے غیب پر کسی کو مکمل اطلاع نہیں دیتا۔ سوائے اپنے پسندیدہ رسولوں کے۔ (2)۔۔یہ کلام ادب وتواضع کے طور پر ہے۔

علامہ علی بن محمد خازن (رح) فرماتے ہیں "اس آیت میں اس بات کا احتمال ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ کلام تواضع اور ادب کے طور پر فرمایا ہو اور مطلب یہ ہے کہ میں غیب نہیں جانتا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جس کی مجھے اطلاع دی اور جو میرے لیے مقرر فرمایا میں صرف اسی کو جانتا ہوں۔ (1)

(3)۔۔اس آیت میں فی الحال غیب جاننے کی نفی ہے مستقبل میں نہ جاننے پر دلیل نہیں ہے۔

علامہ علی بن محمد خازن (رح) فرماتے ہیں "اس آیت میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غیب پر مطلع ہونے سے پہلے یہ کلام فرمایا، پھر جب اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو علم غیب کی اطلاع دی تو حضور انور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی خبر دی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"فَلَا يُظۡهِرُ عَلٰى غَيۡبِهٖۤ اَحَدًا (ۙ۲۶) اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰى مِنۡ رَّسُوۡلٍ " (2)

غیب کا جاننے والا اپنے غیب پر کسی کو مکمل اطلاع نہیں دیتا۔ سوائے اپنے پسندیدہ رسولوں کے۔ (3)

(4)۔۔یہ کلام کفار کے سوال کے جواب میں صادر ہوا۔

علامہ علی بن محمد خازن (رح) فرماتے ہیں "اس آیت میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ کلام کفار کے سوال کے جواب میں صادر ہوا، پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے غیبی اشیاء کو حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ظاہر کیا اور حضور پُر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کی خبر دی تاکہ یہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا معجزہ اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت صحیح ہونے پر دلیل بن جائے۔ (4)

{ لَاسۡتَكۡثَرۡتُ مِنَ الۡخَیۡرِ : تو میں بہت سی بھلائی جمع کرلیتا۔ } اعلیٰ حضرت امام اہلسنّت، امام احمد رضا خان (رح) فرماتے ہیں " بھلائی جمع کرنا اور برائی نہ پہنچنا اسی کے اختیار میں ہو سکتا ہے جو ذاتی قدرت رکھے اور ذاتی قدرت وہی رکھے گا جس کا علم بھی ذاتی ہو کیونکہ جس کی ایک صفت ذاتی ہے اس کے تمام صفات ذاتی، تو معنی یہ ہوئے کہ اگر مجھے غیب کا علم ذاتی ہوتا تو قدرت بھی ذاتی ہوتی اور میں بھلائی جمع کرلیتا اور برائی نہ پہنچنے دیتا۔ بھلائی سے مراد راحتیں اور کامیابیاں اور دشمنوں پر غلبہ ہے اور برائیوں سے تنگی و تکلیف اور دشمنوں کا غالب آنا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بھلائی سے مراد سرکشوں کا مطیع اور نافرمانوں کا فرمان بردار اور کافروں کا مومن کرلینا ہو اور برائی سے بدبخت لوگوں کا باوجود دعوت کے محروم رہ جانا تو حاصل کلام یہ ہوگا کہ اگر میں نفع و ضَرر کا ذاتی اختیار رکھتا تو اے منافقین و کافرین ! تمہیں سب کو مومن کر ڈالتا اور تمہاری کفری حالت دیکھنے کی تکلیف مجھے نہ پہنچتی۔ (تفسیر صراط الجنان)

شیخ اسماعیل دہلوی کا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آخرت میں نفع رسانی پر انکار

اس آیت سے بعض لوگ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تنقیص کرتے ہیں اور آپ کی شفاعت کی نفی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب آپ کو اپنے لیے نفع اور ضرر کا اختیار نہیں ہے تو دوسروں کو نفع کب پہنچا سکتے ہیں اور اس کی تائید میں ایک حدیث سے بھی استشہاد کرتے ہیں۔

شیخ اسماعیل دہلوی متوفی 1246ھ لکھتے ہیں :

مشکوٰۃ کے باب الخلافت والامارت میں لکھا ہے کہ بخاری اور مسلم نے ذکر کیا کہ نقل کیا ابوہریرہ نے کہ جب اتری یہ آیت کہ ڈرا دے تو اپنی برادری کو جو ناتا رکھتے ہیں تجھ سے تو پکارا پیغمبر نے اپنے ناتے والوں کو، پھر اکٹھا کرکے پکارا اور جدا جدا بھی۔ سو فرمایا اے اولاد کعب بن لوی کی بچاؤ تم اپنی جانوں کو آگ سے کیونکہ بیشک میں نہیں اختیار رکھتا تمہارا اللہ کے یہاں کچھ، یا یوں فرمایا کہ بیشک میں نہیں کام آنے کا تمہارے اللہ کے یہاں کچھ، اور اے اولاد مرہ بن کعب، اے اولاد عبد الشمس کی بچاؤ تم اپنی جانوں کو آگ سے کیونکہ بیشک میں نہ کام آؤں گا، تمہارے اللہ کے یہاں کچھ، اور اے اولاد عبد مناف کی بچاؤ تم اپنی جان کو آگ سے کیونکہ بیشک میں نہ کام آؤں گا تمہارے اللہ کے یہاں کچھ، اور اے فاطمہ بچاؤ تم اپنی جان کو آگ سے، مان لگے مجھ سے جتنا چاہے میرا مال نہ کام آؤں گا میں تیرے اللہ کے یہاں کچھ، ف یعنی جو لوگ کسی بزرگ کے قرابتی ہوتے ہیں ان کو اس کی حمایت پر بھروسہ ہوتا ہے اور اس پر مغرور ہو کر اللہ کا خوف کم رکھتے ہیں۔ سو اس لیے اللہ صاحب نے اپنے پیغمبر کو فرمایا کہ اپنے قرابتیوں کو ڈرا دیوے۔ سو انھوں نے سب کو اپنی بیٹی تک کو کھول کر سنا دیا کہ قرابت کا حق ادا کرنا اسی چیز میں ہو سکتا ہے کہ اپنے اختیار میں ہو، سو یہ میرا مال موجود ہے اس میں مجھ کو کچھ بخل نہیں اور اللہ کے یہاں کا معاملہ میرے اختیار سے باہر ہے وہاں میں کسی کی حمایت نہیں کر سکتا، اور کسی کا وکیل نہیں بن سکتا، سو وہاں کا معاملہ ہر کوئی اپنا اپنا درست کرلے اور دوزخ سے بچنے کی ہر کوئی تدبیر کرے، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فقط قرابت کسی بزرگ کی اللہ کے یہاں کچھ کام نہیں آتی جب تک کچھ معاملہ اللہ ہی سے صاف نہ کرے تو کچھ کام نہیں نکلتا۔ (تقویت الایمان کلاں ص 29، مطبوعہ مطبع علیمی لاہور)

شیخ اسماعیل دہلوی کی تقریر کا رد اور ابطال

شیخ اسماعیل دہلوی کی یہ تقریر حسب ذیل وجوہ سے باطل ہے :

1۔ شیخ اسماعیل دہلوی نے اس حدیث کا حوالہ غلط دیا ہے یہ حدیث مشکوٰۃ کے باب الخلافت والارمات میں نہیں، باب الانذار والتحذیر کی فصل ثانی میں ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے مطبوعہ نسخوں میں ص 460 پر ہے اور بیروت کی طبع شدہ مشکوٰۃ رقم الحدیث : 5373 ہے۔ صحیح البخاری میں رقم الحدیث : 2753 ہے اور صحیح مسلم میں الایمان، 348 (204) 491 ہے۔ ترمذی میں قم الحدیث : 3192۔ سنن النسائی میں رقم الحدیث : 3644۔ السنن الکبری للنسائی میں قم الحدیث : 11377 اور مسند احمد میں، ج 6، ص 187 پر ہے۔

2۔ مشکوٰۃ میں اس حدیث کو امام مسلم کی روایت سے ذکر کیا ہے اور حضرت فاطمہ (رض) کو آگ کے عذاب سے ڈرانے کے بعد یہ جملہ ہے البتہ میرا تمہارے ساتھ رحم کا تعلق ہے میں عنقریب صلہ رحم کروں گا۔

غیر ان لکم رحما سابلھا ببلالھا شیخ اسماعیل دہلوی نے حدیث کے اس جملہ کو چھوڑ دیا، حالانکہ مشکوٰۃ میں مسلم کے حوالے سے یہ جملہ موجود ہے جہاں سے انھوں نے اس حدیث کو شروع کیا ہے۔

3۔ملا علی قاری متوفی 1014ھ حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں :

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دینا چاہے تو میں تم سے اللہ کے عذاب کو بالکل دور نہیں کر سکتا، اور یہ قرآن مجید کی اس آیت سے مقتبس ہے۔" قل فمن یملک لکم من اللہ شیئاان ارادبکم ضرااوارادبکم نفعا: آپ کہیے کہ اگر اللہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا کوئی نفع پہنچانا چاہے تو اللہ کے مقابلہ میں کون ہے جو کسی چیز کا اختیار رکھتا ہو " (الفتح : 11)۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا " قل لااملک لنفسی نفعاولاضراالاماشاء اللہ : آپ کہئے کہ میں اپنے نفس کے لیے کسی نفع اور ضرر کا مالک نہیں ہوں، مگر جو اللہ چاہے' (الاعراف : 188)۔ اور اس میں توحید کی بیان ہے اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہرچند کہ مومنین کو اپنی شفاعت سے نفع پہنچائیں گے کیونکہ آپ شفاعت کریں گے اور آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی لیکن آپ نے یہاں مطلقاً نفع رسانی سے منع فرمایا تاکہ انھیں عذاب سے ڈرائیں کہ وہ صرف شفاعت پر تکیہ نہ کرلیں اور ان کو آخرت کے لیے کوشش کی ترغیب دیں اور فرمایا میرا تمہارے ساتھ رحم کا تعلق ہے۔ میں عنقریب صلہ رحم کروں گا، میں یعنی میں اپنے قرابت داروں کے ساتھ قرابت کی وجہ سے نیکی اور احسان کروں گا۔ (المرقات ج10، ص105، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان، 1390ھ)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی 1052ھ لکھتے ہیں :

اس کا معنی یہ ہے کہ چونکہ مجھ پر تمہارے رحم اور قرابت کا حق ہے میں اس کی تری سے اس کو تر کروں گا اور صلہ اور احسان کا پانی چھڑکوں گا۔ اس حدیث میں بہت زیادہ مبالغہ کے ساتھ ڈرایا گیا ہے اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت اس امت کے گنہگاروں کے لیے بھی ہوگی چہ جائیکہ اپنے اقرباء اور خویشان کے لیے، اور احادیث سے ان کے حق میں شفاعت ثابت ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی بے نیازی کا خوف باقی ہے۔ (اشعۃ اللمعات ج4، ص371، 372، مطبوعہ مطبع تیج کمار لکھنؤ)

اہل بیت اور اپنے دیگر قرابت داروں کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا آخرت میں نفع پہنچانا

امام احمد بن حنبل متوفی 241ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابوسعید خدری (رض) نہ بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس منبر پر فرمارہے تھے : ان لوگوں کا کیا حال ہے جو یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قرابت آپ کی قوم کو نفع نہیں پہنچائے گی، بیشک میری قرابت دنیا اور آخرت میں مجھ سے ملی ہوئی ہے۔ اور اے لوگو ! جب تم حوض پر آؤ گے تو میں حوض پر تمہارا پیشوا ہوں گا۔ (الحدیث)۔ (مسند احمد ج3، س18، دارالفکر طبع قدیم، اس حدیث کی سند حسن ہے، مسند احمد ج10، رقم الحدیث : 11081)

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے میں اپنی امت میں سے اپنے اہل بیت کی شفاعت کروں گا، پھر جو ان سے زیادہ قریب ہوں، اور پھر جو ان سے قریب ہوں، پھر انصار کی شفاعت کروں گا، پھر ان کی جو مجھ پر ایمان لائے اور انھوں نے میری اتباع کی، پھر اہل یمن کی، پھر باقی عرب کی، پھر اعاجم کی۔ (المعجم الکبیر ج12، رقم الحدیث : 13550۔ الکامل لابن عدی ج2، س790۔ کنزالعمال رقم الحدیث : 34145۔ مجمع الزوائد ج10، ص381، 380۔ الفردوس بماثور الخطاب، رقم الھدیث : 29، اس حدیث کی سند میں حفص بن ابی داؤد متروک ہے اور لیث بن سلیم ضعیف ہے، اللآلی المصنوعہ ج2، ص374)

حضرت عمران بن حصین (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے رب عزوجل سے سوال کیا کہ میرے اہل بیت میں سے کسی کو دوزخ میں داخل نہ فرمائے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ عطا فرمادیا۔ (الفردوس بماثور الخطاب 3403، کنزالعمال، رقم الحدیث : 34149)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت فاطمہ (رض) سے فرمایا بیشک اللہ عزوجل نے فرمایا کہ وہ نہ تمہیں عذاب دے گا اور نہ تمہاری اولاد کو۔ (المعجم الکبیر ج11، رقم الحدیث : 11685، حافظ الہیثمی نے کہا ہے کہ اس حدیث کے رجال ثقہ ہیں)

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مجھ سے میرے رب نے میرے اہل بیت کے متعلق یہ وعدہ کیا ہے کہ ان میں سے جس نے توحید کا اقرار کیا۔ میں ان کو عذاب نہیں دوں گا۔ (المستدرک ج 3، ص 150، حاکم نے کہا یہ حدیث صحیح الاسناد ہے، الکامل لابن عدی، ج 5، ص 1704، کنز العمال رقم الحدیث: 34156)

زید بن اسلام اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر (رض) نے حضرت علی (رض) سے سرگوشی کی، پھر حضرت علی نے صفہ میں عقیل، حضرت حسین اور حضرت عباس سے حضرت ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر سے کرنے کے متعلق مشورہ کیا۔ پھر حضرت علی نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ہر سب (نکاح) اور نسب قیامت کے دن منقطع ہو جائے گا سوا میرے سبب اور نسب کے۔ (المستدرک ج 3، س 142۔ المعجم الکبیر ج 3، رقم الحدیث: 2633، 2634، 2635۔ مصنف عبدالرزاق رقم الحیدث: 10354۔ السنن الکبری ج 7، ص 114۔ المطالب العالیہ، رقم الحدیث: 4258، ج 4، ص 271۔ 272۔ الجامع الصغیر رقم الحدیث: 6309)

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں نے اپنے رب سے سوال کیا کہ میں اپنی امت میں سے جس عورت کے ساتھ بھی نکاح کروں اور میں اپنی امت میں سے جس شخص کو بھی نکاح کا رشتہ دوں میرے ساتھ جنت میں ہی رہے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ عطا کر دیا۔ (المعجم الاوسط رقم الحدیث: 5758۔ مجمع الزوائد ج 10، ص 17۔ المستدرک ج 3، ص 137۔ المطالب العالیہ رقم الحدیث: 4018۔ کنز العمال رقم الحدیث: 34147۔ اسی سے متقارب روایت حضرت عبداللہ بن عمرو سے بھی مروی المعجم الاوسط ج 4، رقم الحدیث: 3856)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے یہ سوال کیا میں جس کو بھی نکاح کا رشتہ دوں اور جس سے بھی نکاح کروں وہ اہل جنت سے ہوں تو اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ عطا کر دیا۔ (کنز العمال رقم الحدیث: 34148)

حضرت علی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے بھی میرے اہل بیت کے ساتھ کوئی نیکی کی تو میں قیامت کے دن اس کا بدلہ دوں گا۔ (کامل ابن عدی ج 5، ص 1884۔ کنز العمال رقم الحدیث: 34152)

حضرت عثمان (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے عبد المطلب کی اولاد میں سے کسی کے ساتھ بھی کوئی نیکی کی اور اس نے اس کو دنیا میں اس کا صلہ نہیں دیا تو کل جب وہ مجھ سے ملاقات کرے گا تو مجھ پر اس نیکی کا صلہ دینا واجب ہے۔ (المعجم الاوسط ج 2، رقم الحدیث: 1469۔ مجمع الزوائد ج 9، ص 173۔ کنز العمال رقم الحدیث: 34153)

حضرت عباس بن عبد المطلب (رض) بیان کیا کرتے تھے کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نے ابو طالب کو کوئی نفع پہنچایا وہ آپ کی مدافعت کرتا تھا، اور آپ کی وجہ سے غضب ناک ہوتا تھا۔ آپ نے فرمایا ہاں! اب وہ ٹخنوں تک آگ میں ہے اور اگر میں نہ ہوتا تو وہ دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوتا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 3883، 6208، 6572۔ صحیح مسلم ایمان 357، (209) 500۔ مسند احمد ج 1، ص 206، رقم الحدیث: 1763۔ جامع الاصول رقم الحدیث: 6833)

نفع رسانی کی بظاہر نفی کی روایات کی توجیہ

موخر الذکر پانچ حدیثوں کے علاوہ باقی مذکور الصدر تمام احادیث کو علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی نے بھی بیان کیا ہے (رسائل ابن عابدین ج 1، ص 405) ان احادیث کے ذکر کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

ہم نے جو یہ احادیث ذکر کی ہیں ان کے یہ بات معارض نہیں ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کسی ایک کو بھی اللہ سے مطلقاً نفع یا نقصان پہنچانے کے مالک نہیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس بات کا مالک بنائے گا کہ آپ اپنے اقارب کو نفع پہنچائیں بلکہ آپ شفاعت عامہ اور شفاعت خاصہ کے ذریعہ تمام امت کو نفع پہنچائیں گے، سو آپ صرف اسی چیز کے مالک ہوں گے جس کو آپ کا مولی عزوجل مالک کرے گا، اسی طرح نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو یہ فرمایا ہے: میں تم کو اللہ کے عذاب سے بالکل مستغنی نہیں کروں گا، اس کا معنی یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ مجھے یہ عزت اور مقام نہیں دے گا یا جب تک مجھے منصب شفاعت نہیں

دے یا جب تک میری وجہ سے مغفرت کرنے کا مرتبہ مجھے نہیں دے گا، اس وقت تک میں تم کو اللہ کے عذاب سے نہیں چھڑاؤں گا۔ اور چونکہ یہ مقام اللہ کے عذاب سے ڈرانے کا تھا اور نیک اعمال پر برانگیختہ کرنے کا تھا اس لیے آپ نے یہ قیود ذکر نہیں فرمائیں۔ علاوہ ازیں آپ نے اپنے رحم کے حق کی طرف اشارہ بھی فرمایا کہ میرا تمہارے ساتھ رحم کا تعلق ہے اور میں عنقریب اس کی تراوٹ تمہیں پہنچاؤں گا، یعنی تم کو نفع پہنچاؤں گا اور یہ ان احادیث میں تطبیق کا بہت عمدہ طریقہ ہے، نیز نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے: قیامت کے دن میرے اولیاء، متقی ہوں گے (الادب المفرد) اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میرا ولی اللہ ہے اور صالح مومنین ہیں۔ (صحیح مسلم الایمان: 366 (215) 508۔ مسند احمد ج 4، ص 203۔ مسند ابو عوانہ ج 1، رقم الحدیث: 96) سو یہ احادیث آپ کے رحم اور اقارب کو نفع پہنچانے کے خلاف نہیں ہیں، اسی طرح نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے: جس شخص نے اپنے عمل میں دیر کر دی تو اس کا نسب اس پر سبقت نہیں کرے گا (صحیح مسلم الذکر 38 (2699) 6726۔ سنن ابو داؤد رقم الحدیث: 4946۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 225۔ کنز العمال رقم الحدیث: 28847)

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ جس شخص نے اپنے عمل کو موخر کر دیا، اس کا نسب اس کو بلند درجات تک پہنچانے میں جلدی نہیں کرے گا۔ اس لیے یہ حدیث نجات کے منافی نہیں ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا باب بہت وسیع ہے، اور یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی حدود کی پامالی پر بہت غیور ہے، اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے عبد ہیں اور وہ صرف اسی چیز کے مالک ہیں جس کا آپ کے مولی نے آپ کو مالک بنادیا ہے اور آپ کی وہی خواہش پوری ہوتی ہے جس کو پورا کرنا اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ (رسائل ابن عابدین ج 1، ص 6۔ 7، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، 1396ھ)

اس پر دلیل کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نفع اور ضرر کی نفی ذاتی نفع اور ضرر پر محمول ہے

عباس بن ربیعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمر (رض) حجر اسود کو بوسہ دے رہے تھے اور یہ فرما رہے تھے کہ بیشک مجھے علم ہے کہ تو ایک پتھر ہے، نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان اور اگر میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 1597،1610۔ صحیح مسلم الحج 248 (1270) 3014۔ سنن ابو داود، رقم الحدیث: 1873۔ سنن الترمذی رقم الحدیث: 861۔ سنن النسائی رقم الحدیث: 2937۔ الموطا رقم الحدیث: 835۔ مسند احمد ج 1، ص 16، طبع قدیم، رقم الحدیث: 99 طبع جدید دار الفکر، جامع الاصول ج 3، رقم الحدیث: 1439)

اس حدیث میں حضرت عمر نے حجر اسود کے نفع اور نقصان پہنچانے کی نفی کی ہے لیکن چونکہ بعض دلائل سے حجر اسود کا نفع اور نقصان پہنچانا ثابت ہے، اس لیے جمہور علماء نے بشمول علماء دیوبند اس حدیث میں بالذات کی قید لگائی ہے یعنی تو بالذات نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، لیکن اللہ کی عطا سے نفع بھی پہنچاتا ہے اور نقصان بھی۔

شیخ شبیر احمد عثمانی متوفی 1369ھ لکھتے ہیں: حجر اسود بذاتہ نفع اور نقصان نہیں پہنچاتا۔ (فتح الملہم، ج 3، ص 322، مطبوعہ مکتبہ الحجاز کراچی)

شیخ خلیل احمد سہارنپوری متوفی 1346ھ لکھتے ہیں: حضرت عمر کی مراد یہ تھی کہ حجر اسود بذاتہ نفع اور نقصان نہیں پہنچاتا۔ (بذل المجہود ج 3، ص 140، طبع ملتان)

علامہ عینی نے لکھا ہے کہ حجر اسود بغیر اذن الٰہی کے نفع اور نقصان نہیں پہنچاتا (عمدۃ القاری ج 9، ص 240) علامہ باجی نے لکھا ہے کہ حجر اسود بالذات نفع اور نقصان نہیں پہنچاتا۔ (المنتقی ج 2، س 287) علامہ قسطلانی نے لکھا ہے کہ حجر اسود بالذات نفع اور نقصان نہیں پہنچاتا۔ (ارشاد الساری ج 3، ص 156) ملا علی قاری نے بھی لکھا ہے کہ حجر اسود بالذات نفع اور نقصان نہیں پہنچاتا۔ (مرقات ج 5، ص 325) اور علماء دیوبند میں سے شیخ عثمانی نے (فتح الملہم ج 3، ص 322) اور شیخ خلیل احمد نے (بذل المجہود ج 3، ص 40) میں لکھا ہے کہ حجر اسود بالذات نفع اور نقصان نہیں پہنچاتا، حضرت عمر نے جو حجر اسود کو مخاطبت کر کے فرمایا تھا کہ تو ایک پتھر ہے اور میں خوب جانتا ہوں کہ تو نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتا، اس میں حضرت عمر (رض) کی مراد بیان کرتے ہوئے متقدمین علماء اسلام اور خصوصاً علماء دیوبند سب ہی نے بالذات کی قید لگائی ہے کہ حضرت اسود بالذات نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتا، جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں جو نفع رکھا ہے کہ وہ مسلمانوں کے حق میں حج کی گواہی دے گا وہ یہ نفع ضرور پہنچائے گا۔ اسی اسلوب پر کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں ہے: قل لا املک لنفسی نفعا ولا ضرا الا ماشاء اللہ (اعراف: 188) آپ کہیے کہ میں اپنے نفس کے لیے کسی نفع اور ضرر کا مالک نہیں ہوں مگر اللہ تعالیٰ جو چاہے۔ علماء اہل سنت یہاں بھی بالذات کی قید لگاتے ہیں

کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بذاتہ نفع اور ضرر نہیں پہنچاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے جو آپ میں نفع رکھا ہے وہ نفع آپ پہنچاتے ہیں کہ آپ کا کلمہ پڑھنے، آپ کی تبلیغ اور آپ کی شفاعت سے ارب ہا انسانوں کو نفع پہنچے گا اور وہ سب آپ کی وجہ سے جنت میں جائیں گے۔ یہ کوئی کم نفع ہے؟ لیکن بعض لوگ اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بالذات کی قید لگانا اور ذاتی اور عطائی اختیارات کی تقسیم خالص مشرکانہ عقیدہ ہے اور یہ قید خانہ زاد اور سینہ زاد ہے۔ قرآن مجید نے آپ کی ذات سے مطلقاً نفع رسانی کی نفی کردی ہے اور ذاتی اور عطائی کی تقسیم اہل بدعت کی ایجاد اور اختراع ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ ایک پتھر (حجر اسود) کی نفع رسانی ثابت کرنے کے لیے حضرت عمر کے قول لاتنفع میں بالذات کی قید لگالیں تو کوئی حرج نہیں ہے اور اگر ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نفع رسانی ثابت کرنے کے لیے قل لااملک لنفسی میں بالذات کی قید لگائیں تو مجرم قرار پائیں! یہ کہاں کا انصاف ہے؟

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اس نفع رسانی سے کون انکار کرسکتا ہے کہ انسان محمد رسول اللہ کہے تو جنت کا مستحق ہو جاتا ہے بلکہ اس وقت تک کوئی شخص جنت کا مستحق نہیں ہوگا جب تک وہ محمد رسول اللہ نہیں کہے گا، اللہ اکبر! جن کے نام کی نفع رسانی کا یہ عالم ہے ان کی ذات کی نفع رسانی کا کیا عالم ہوگا! اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نفع رسانی کا انکار کرتا ہے وہ آپ کا نام نہ لے اور ہمیں جنت میں جا کر دکھلادے۔!

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نفع رسانی میں افراط، تفریط اور اعتدال پر مبنی نظریات

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نفع رسانی میں افراط پر مبنی یہ عقیدہ ہے

خدا جس کو پکڑے چھڑالے محمد

محمد کا پکڑا چھڑا کوئی نہیں سکتا

الاعرا: 143 کی تفسیر میں ہم نے اس شعر کے رد اور ابطال پر دلائل قائم کیے ہیں۔

اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نفع رسانی میں تفریط پر مبنی یہ عبارات ہیں:

شیخ محمد عبدالوہاب نجدی متوفی 1206ھ لکھتے ہیں: وعرفت ان اقرارہم بتوحید الربوبیۃ لم یدخلہم فی الاسلام وان قصدھم الملائکۃ والانبیاء یریدون شفاعتہم والترقب الی اللہ بذلک ھوالذی احل دماءہم واموالہم:

اور تم جان چکے ہو کہ ان لوگوں کا توحید ربوبیت کا اقرار کرنا ان کو اسلام میں داخل نہیں کرتا، اور ان لوگوں کا انبیاء اور ملائکہ کی شفاعت کا قصد کرنا اور ان سے اللہ کا قرب حاصل کرنا یہی وہ چیز ہے، جس نے ان کی جانوں اور مالوں کو مباح کردیا ہے (یعنی ان کو قتل کرنا اور ان کا مال لوٹنا جائز ہے)۔ (کشف الشبہات ص 9، مطبوعہ المکتبہ السّلفیہ، بالمدینۃ المنورہ، 1389ھ)

شیخ اسماعیل دہلوی متوفی 1246ھ لکھتے ہیں: پیغمبر خدا کے وقت میں کافر بھی اپنے بتوں کو اللہ کے برابر نہیں جانتے تھے بلکہ اسی کا مخلوق اور اسی کا بندہ سمجھتے تھے اور ان کو اس کے مقابل کی طاقت ثابت نہیں کرتے تھے، مگر یہی پکارنا اور منتیں ماننی اور نذر و نیاز کرنی اور ان کو اپنا وکیل اور سفارشی سمجھنا یہی ان کا کفر و شرک تھا سو جو کوئی کسی سے یہ معاملہ کرے گو کہ اس کو اللہ کا مخلوق اور بندہ ہی سمجھے سو ابوجہل اور وہ شرک میں برابر ہے۔ (تقویت الایمان کلاں ص 6، مطبوعہ مطبع علیمی لاہور)

مخلوق کی نذر اور منت ماننی ہمارے نزدیک ناجائز اور حرام ہے اور انبیاء (علیہم السلام) کو جب کہ مستقل سامع اعتقاد نہ کرے جیسا کہ ان کو بندہ سمجھنے سے ظاہر ہوتا ہے تو ان کو پکارنا اور ان سے مدد طلب کرنا بھی جائز ہے اور عہد صحابہ اور تابعین میں یا محمداہ کہنے کا رواج تھا۔ (کامل ابن اثیر ج 4، ص 246، البدایہ ج 6، ص 324، فتاوی رشیدیہ کامل ص 68)

یہ دونوں چیزیں غیر نزاعی ہیں، ہمارا اعتراض اس پر ہے کہ انھوں نے انبیاء (علیہم السلام) کو وکیل اور سفارشی سمجھنے پر بھی شرک کا فتوی دیا ہے اور اس کو ابوجہل کے برابر شرک قرار دیا ہے اور مسئلہ شفاعت میں اس سے بڑھ کر تفریط کیا ہوگی!

اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نفع رسانی میں توازن اور اعتدال پر مبنی نظریہ وہ ہے جس کو اس مقام پر اہل سنت کے مفسرین نے بیان فرمایا ہے۔

علامہ محمد بن یوسف ابوالحیان اندلسی التوفی 754ھ لکھتے ہیں: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ میں ان ہی امور پر قادر ہوں جن پر اللہ عزوجل نے مجھے قدرت دی ہے، یعنی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تمام تصرفات اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت کے تابع ہیں۔ (البحر المحیط ج 5، ص 241۔ عنایۃ القاضی ج 5، ص 243۔ زاد المسیر ج 3، س 299۔ الجامع لاحکام القرآن جز 7، ص 301)

امام رازی کی تفسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے غیر سے علم محیط اور قدرت کاملہ کی نفی کی گئی ہے۔ (تفسیر کبیر ج 5، ص 425، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت، 1415ھ)

علامہ بیضاوی متوفی 686ھ نے کہا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بطور اظہار عبودیت یہ کہلوایا گیا ہے۔ (انوار التنزیل علی ھامش عنایۃ القاضی ج 4، ص 243، مطبوعہ بیروت)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی 1270ھ لکھتے ہیں:

اور مراد یہ ہے کہ میں اپنے نفس کے لیے نفع اور ضرر کا کسی وقت بھی مالک نہیں ہوں مگر جس وقت اللہ تعالیٰ سبحانہ چاہتا ہے تو مجھے اس پر قادر فرماتا ہے اور اس وقت میں اس کی مشیت سے اس کا مالک ہوتا ہوں، اور یہ استثناء متصل ہے، شیخ ابراہیم کورانی نے کہا یہ آیت داس پر دلیل ہے کہ بندہ کی قدرت اللہ تعالیٰ کے اذن اور اس کی مشیت سے موثر ہوتی ہے۔ (روح المعانی ج 9، ص 136، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی، بیروت)

علم غیب کی تحقیق

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا (آپ کہیے:) اگر میں (از خود) غیب کو جانتا تو میں (از خود) خیر کثیر کو جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔ (الاعراف: 188)

اس آیت سے بظاہر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علم غیب کی نفی ہوتی ہے، لیکن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے چونکہ غیب کی بیشمار خبریں دی ہیں جیسا کہ ہم نے قیامت کی بتائی ہوئی نشانیوں کے سلسلہ میں غیب کی خبروں پر مشتمل بکثرت احادیث بیان کی ہیں اور انشاء اللہ ابھی مزید احادیث بیان کریں گے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کی آیات کا بھی ذکر کریں گے جن سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو علم غیب دیا جانا واضح ہوتا ہے اس لیے اس آیت میں علم غیب کی نفی از خود غیب جاننے کی نفی پر محمول ہے اور ہم اس کی تائید میں مفسرین کرام کے اقوال بھی نقل کریں گے، سو پہلے ہمغیب کا لغوی اور اصطلاح معنی بیان کریں گے، پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے علم غیب کے ثبوت میں قرآن مجید کی آیات کو ذکر کریں گے، پھر اس سلسلہ میں احادیث کا ذکر کریں گے اور آخر میں اس آیت کی توجیہ میں مفسرین کے اقوال ذکر کریں گے، فنقول و باللہ التوفیق وبہ الاستعانۃ یلیق۔

غیب کا لغوی معنی

علامہ مجد الدین مبارک بن محمد بن الاثیر الجزری التوفی 606ھ لکھتے ہیں:

احادیث میں علم بالغیب اور ایمان بالغیب کا بکثرت ذکر ہے اور ہر وہ چیز جو آنکھوں سے غائب ہو وہ غیب ہے عام ازیں کہ وہ دل میں حاصل ہو یا نہ ہو۔ امام احمد روایت کرتے ہیں کہ المغیبۃ (وہ عورت جس کا شوہر غائب ہو) کو مہلت دو حتی کہ وہ اپنے بکھرے ہوئے پراگندہ بالوں کو سنوار لے اور موئے زہار صاف کر لے۔ (مسند احمد، ج 3، ص 289) حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک مغیب عورت کسی شخص کے پاس کچھ خریدنے گئی اس نے اس سے چھیڑ چھاڑ کی تو اس عورت نے کہا تم پر افسوس ہے میں مغیب ہوں (یعنی میرا شوہر غائب ہے) تو اس شخص نے اس کو چھوڑ دیا۔ (مسند احمد ج 1، ص 269) نیز حضرت ام الدرداء (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص اپنے بھائی کے لیے ظہر غیب (اس کے غیاب) میں دعا کرتا ہے تو اس دعا کے ساتھ جو فرشتہ موکل ہوتا ہے وہ کہتا ہے کہ آمین! (صحیح مسلم الذکر 87 (2732) 6800۔ سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 1534۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 2895) حضرت علی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مسلمان کے مسلمان پر چھ حق ہیں: جب لاقات ہو تو اس کو سلام کرے، جب اس کو چھینک آئے تو اس کو جواب دے (یرحمک اللہ کہے) جب وہ بیمار ہو تو عیادت کرے، جب وہ دعوت دے تو اس کو قبول کرے، جب وہ فوت ہو تو اس کے جنازہ پر جائے، اس کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور غیب میں (اس کی غیر حاضر میں) اس کی خیر خواہی کرے۔ (سنن دارمی رقم الحدیث: 2633)

سنن ترمذی میں ہے: جب وہ حاضر ہو یا غائب ہو تو اس کی خیر خواہی کرے۔ (رقم الحدیث: 2746) (النہایہ ج 3، ص 358-357، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1418ھ مع زیادات)

علامہ محمد بن مکرم بن منظور افریقی متوفی 711ھ لکھتے ہیں:

الگیب کا معنی ہے: ہر وہ چیز جو تم سے غائب ہو، امام ابو اسحاق نے یومنون بالغیب کی تفسیر میں کہا وہ ہر اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو ان سے غائب ہے اور اس کی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خبر دی ہے جیسے مرنے کے بعد جی اٹھنا، جنت اور دوزخ، اور جو چیز ان سے غائب ہے اور اس کی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خبر دی ہے وہ غیب ہے، نیز غیب اس کو کہتے ہیں جو آنکھوں سے پوشیدہ ہو، خواہ وہ دل میں ہو، کہا جاتا ہے کہ میں نے وراء غیب سے آواز سنی یعنی اس جگہ سے سنی جس کو میں نہیں دیکھ رہا۔ (لسان العرب ج 1، ص 654، مطبوعہ ایران، 1405ھ)

علامہ محمد طاہر پٹنی متوفی 986ھ لکھتے ہیں:

ہر وہ چیز جو آنکھوں سے غائب ہو وہ غیب ہے عام ازیں کہ وہ دل میں ہو یا نہ ہو۔ (مجمع بحار الانوار ج 4، ص 82، مطبوعہ مکتبہ دار الایمان، المدینۃ المنورہ، 1415ھ)

غیب کا اصطلاحی معنی

قاضی ناصر الدین عبداللہ بن عمر بیضاوی متوفی 686ھ لکھتے ہیں: غیب سے مراد وہ مخفی امر ہے جس کا نہ حواس (خمسہ) ادراک کر سکیں اور نہ ہی اس کی بداہت عقل تقاضا کرے اور اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ قسم ہے جس کے علم کی کوئی دلیل (ذریعہ) نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمہا الا ھو: اور اسی کے پاس غیب کی چابیاں ہیں، ان کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا" (الانعام: 59)

اور دوسری قسم وہ ہے جس کے علم کے حصول کا کوئی ذریعہ ہو (خواہ عقلی دلیل سے اس کا علم ہو خواہ خبر سے) جیسے اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات اور قیامت اور اس کے احوال کا علم۔ (انوار التنزیل مع الکازرونی ج 1، ص 114، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1416ھ)

علامہ محی الدین شیخ زادہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

غیب کی دوسری قسم میں جو قاضی بیضاوی نے کہا ہے کہ جس کے علم پر کوئی دلیل ہو اس سے مراد عام ہے وہ دلیل عقلی ہو یا نقلی ہو، کیونکہ اللہ عزوجل اور اس کی صفات پر عقلی دلائل قائم ہیں (اور ان کو عقل سے جانا جاسکتا ہے) اور قیامت اور اس کے احوال پر دلائل نقلیہ قائم ہیں (اور ان کو قرآن اور احادیث سے جانا جاسکتا ہے) اور یہ دونوں قسمیں غیب ہیں، اور غیب کی اس دوسری قسم کو انسان ان دلائل سے جان سکتا ہے، اور وہ غیب جس کا علم اللہ سبحانہ کے ساتھ مختص ہے وہ غیب کی قسم اول ہے اور سورۃ الانعام کی اس آیت کریمہ میں وہی مراد ہے۔ (حاشیہ شیخ زادہ علی تفسیر البیضاوی ج 1، ص 89، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی 502ھ لکھتے ہیں:

الغیب وہ چیز ہے جو نہ حواس کے تحت واقع ہو اور نہ بداہت عقول اس کا تقاضا کریں اور اس کا علم صرف انبیاء (علیہم السلام) کی خبر سے ہوتا ہے۔ (المفردات ج 2، ص 475، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، 1418ھ)

علامہ احمد شہاب الدین خفاجی متوفی 1069ھ لکھتے ہ

گیب کا معنی ہے جو چیز آنکھوں سے پوشیدہ ہو، اسی طرح جو چیز حواس سے اور انسان سے غائب ہو اس پر بھی غیب کا اطلاق ہوتا ہے، اور غیب لوگوں کے اعتبار سے ہے اللہ کے اعتبار سے کوئی چیز غیب نہیں ہے، کیونکہ رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی چیز اللہ تعالیٰ سے غائب نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے عالم الغیب والشہادۃ اس کا معنی ہے جو چیز تم سے غائب ہے اور جس کا تم مشاہدہ کرتے ہو اللہ ان سب کا عالم ہے، اور یومنون بالغیب میں غیب کا معنی ہے جن چیزوں کا حواس سے ادراک نہ ہو سکے اور جن کا بداہت عقل تقاضا نہ کرے، اور ان کا علم صرف رسل (علیہم السلام) کے خبر دینے سے ہوتا ہے۔ (نسیم الریاض ج 3، ص 150، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو علم غیب دیے جانے کے متعلق قرآن مجید کی آیات

وماکان اللہ لیطلعکم علی الغیب ولکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء : اور اللہ کی شان نہیں کہ وہ تم کو غیب پر مطلع کردے لیکن (غیب پر مطلع کرنے کے لیے) اللہ چن لیتا ہے جسے چاہے اور وہ اللہ کے رسول ہیں (آل عمران : 179)

ذالک من انباء الغیب نوحیہ الیک : یہ غیب کی بعض خبریں ہیں جن کی ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں (آل عمران : 44)

علم الغیب فلایظھر علی گیبہ احداالا من ارتضی من رسول : (اللہ) عالم الغیب ہے سو وہ اپنا غیب کسی پر ظاہر نہیں فرماتا ماسوا ان کے جن سے وہ راضی ہے اور وہ اس کے (سب) رسول ہیں (الجن : 26۔27)

مفتی محمد شفیع دیوبندی متوفی 1394ھ لکھتے ہیں :

حق تعالیٰ خود بذریعہ وحی اپنے انبیاء کو جو امر غیبیہ بتاتے ہیں وہ حقیقتاً علم غیب نہیں بلکہ غیب کی خبریں ہیں جو انبیاء کو دی گئی ہیں جس کو خود قرآن کریم نے کئی جگہ انباء الغیب کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔ (معارف القرآن ج 2، ص 248، مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی، 1414ھ)

ہمارے نزدیک یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) کو جو غیب کی خبریں بتلائی گئیں ہیں اس سے ان کو علم غیب حاصل نہیں ہوا، کیونکہ شرح عقائد اور دیگر علم کلام کی کتابوں میں مذکور ہے کہ علم کے تین اسباب ہیں، خبر صادق، حواس سلیمہ اور عقل، اور وحی بھی خبر صادق ہے تو جب انبیاء (علیہم السلام) کو اللہ نے غیب کی خبریں دیں تو ان کو علم غیب حاصل ہوگیا۔ اس لیے صحیح یہ ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) کو وحی سے علم غیب حاصل ہوتا ہے لیکن یہ علم محیط یا علم ذاتی نہیں ہے۔

آل عمران : 179 کی تفسیر میں شیخ محمو حسن دیوبندی متوفی 1339ھ لکھتے ہیں :

خلاصہ یہ ہے کہ عام لوگوں کو بلاواسطہ کسی یقینی غیب کی اطلاع نہیں دی جاتی، انبیاء (علیہم السلام) کو دی جاتی ہے مگر جس قدر خدا چاہے۔

شیخ اشرف علی تھانوی متوفی 1362ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

اور اس آیت سے کسی کو شبہ نہ ہو کہ جو علم غیب خصائص باری تعالیٰ سے ہے اس میں رسل کی شرکت ہوگئی کیونکہ خواص باری تعالیٰ سے دو امر ہیں اس علم کا ذاتی ہونا اور اس علم کا محیط ہونا۔ یہاں ذاتی اس لیے نہیں ہے کہ وحی سے ہے اور محیط اس لیے نہیں کہ بعض امور خاص مراد ہیں۔ (بیان القرآن ج 1، ص 150، مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور، کراچی)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علم غیب کے متعلق احادیث

قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفی 544ھ لکھتے ہیں :

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جس قدر غیوب پر مطلع فرمایا گیا تھا اس باب میں احادیث کا ایک سمندر ہے جس کی گہرائی کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا اور آپ کا یہ معجزہ ان معجزات میں سے ہے جو ہم کو یقینی طور پر معلوم ہیں، کیونکہ وہ احادیث معنیً متواتر ہیں اور ان کے راوی بہت زیادہ ہیں اور ان احادیث کے معانی غیب کی اطلاع پر متفق ہیں اور وہ درج ذیل ہیں : (الشفاء ج 11، ص 249، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415ھ)

1۔ حضرت حذیفہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم میں تشریف فرما ہوئے اور قیامت تک جو امور پیش ہونے والے تھے آپ نے ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑا اور وہ سب امور بیان کردیے جس نے ان کو یاد رکھا اس نے یاد رکھا اور جس نے ان کو بھلا دیا اس نے بھلا دیا، اور میرے ان اصحاب کو ان کا علم ہے، ان میں سے کئی ایسی چیزیں واقع ہوئیں جن کو میں بھول چکا تھا جب میں نے ان کو دیکھا تو وہ یاد آگئیں، جیسے کوئی شخص غائب ہوجائے تو اس کا چہرہ دیکھ کر اس کو یاد آجاتا ہے کہ اس نے اس کو دیکھا تھا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 6604۔ صحیح مسلم الجنتہ 23 (2891) 7130۔ سنن ابوداود رقم الحدیث : 4240۔ مسند احمد ج 5، ص 385، جامع الاصول، ج 11، رقم الحدیث : 8882)

2۔ حضرت ابوزید عمرو بن اخطب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم کو صبح کی نماز پڑھائی اور منبر پر رونق افروز ہوئے، پھر آپ نے ہمیں خطبہ دیا حتی کہ ظہر آ گئی، آپ منبر سے اترے اور نماز پڑھائی، پھر منبر پر رونق افروز ہوئے اور ہمیں خطبہ دیا حتی کہ عصر آ گئی، پھر آپ منبر سے اترے اور نماز پڑھائی، پھر منبر پر تشریف فرما ہوئے اور ہم کو خطبہ دیا حتی کہ سورج غروب ہو گیا، پھر آپ نے ہمیں ماکان ومایکون (جو ہو چکا ہے اور جو ہونے والا ہے) کی خبریں دیں، پس ہم میں سے زیادہ عالم وہ تھا جو سب سے زیادہ حافظہ والا تھا۔ (صحیح مسلم الجنۃ: 26 (2892) 7134۔ مسند احمد ج 3، ص 315۔ مسند عبد بن حمید رقم الحدیث: 1029۔ البدایہ والنہایہ ج 6، ص 192۔ جامع الاصول ج 11، رقم الحدیث: 8885۔ الاحاد والمثانی ج 4، رقم الحدیث: 2183۔ دلائل النبوۃ للبیہقی ج 6، ص 313)

3۔ حضرت عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم میں تشریف فرما ہوئے اور آپ نے ہمیں مخلوق کی ابتداء سے خبریں دینی شروع کیں، حتی کہ اہل جنت اپنے ٹھکانوں میں داخل ہو گئے اور اہل دوزخ اپنے ٹھکانوں میں داخل ہو گئے، جس نے اس کو یاد رکھا اس نے یاد رکھا اور جس نے اس کو بھلا دیا اس نے بھلا دیا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 3192۔ امام احمد نے اس حدیث کو حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت کیا ہے، مسند احمد ج 14، رقم الحدیث: 18140، طبع دار الحدیث، قاہرہ)

امام ترمذی نے کہا اس باب میں حضرت حذیفہ، حضرت ابو مریم، حضرت زید بن اخطب اور حضرت مغیرہ بن شعبہ سے احادیث مروی ہیں انھوں نے ذکر کیا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو قیامت تک تمام ہونے والے امور بیان کر دیے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: 2198)۔ (مسند احمد ج 5، ص 153۔ مسند احمد رقم الحدیث: 21258۔ مطبوعہ قاہرہ۔ المعجم الکبیر رقم الحدیث: 1647۔ مسند البزار رقم الحدیث: 147۔ صحیح ابن حبان رقم الحدیث: 265۔ حافظ الہیثمی نے کہا اس حدیث کے راوی صحیح ہیں۔ (مجمع الزوائد ج 8، ص 264۔ مسند ابویعلی، رقم الحدیث: 5109)

ائمہ حدیث نے ایسی احادیث روایت کی ہیں جن میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے اصحاب کو ان کے دشمنوں پر غلبہ کی خبر دی اور مکہ مکرمہ، بیت المقدس، یمن، شام اور عراق کی فتوحات کی خبریں دیں اور امن کی خبر دی اور یہ کل خیبر حضرت علی کے ہاتھوں سے فتح ہوگا، اور آپ کی امت پر دنیا کی جو فتوحات کی جائیں گی اور وہ قیصر وکسری کے خزانے تقسیم کریں گے، اور ان کے درمیان جو فتنے پیدا ہوں گے، اور امت میں جو اختلاف پیدا ہوگا اور وہ پچھلی امتوں کے طریقے پر چلیں گے، اور کسری اور قیصر کی حکومتیں ختم ہو جائیں گی اور پھر ان کی حکومت قائم نہیں ہوگی اور یہ کہ روئے زمین کو آپ کے لیے لپیٹ دیا گیا ہے اور آپ نے اس کے مشارق اور مغارب کو دیکھ لیا ہے اور یہ کہ آپ کی امت کا ایک گروہ قیامت تک حق پر قائم رہے گا اور آپ نے بنوامیہ اور حضرت معاویہ کی حکومت کی خبر دی اور اہل بیت کی آزمائش اور حضرت علی (رض) کی شہادت کی خبر دی اور حضرت عثمان (رض) کی شہادت کی خبر دی، حضرت معاویہ اور حضرت علی کی لڑائی کی خبر دی، حضرت عمار کی شہادت کی خبر دی، آپ کے اہل بیت میں سب سے پہلے حضرت سیدنا فاطمہ زہراء (رض) کی وفات کی خبر دی، اور یہ کہ آپ کے بعد صرف تیس سال تک خلافت رہے گی، اور پھر بادشاہت ہو جائے گی۔ تیس دجالوں کے خروج کی خبر دی، قریش کے ہاتھوں امت کی ہلاکت کی خبر دی۔ قدریہ اور رافضیہ کے ظہور کی خبر دی، ابناء فارس کے دین حاصل کرنے کی خبر دی، اپنی گمشدہ اونٹنی کی خبر دی، جنگ بدر میں کافر کس جگہ گر کر مریں گے یہ خبر دی، حضرت حسن کے صلح کرانے کی خبر دی، حضرت سعد کی حیات کے متعلق خبر دی اور یہ خبر دی کہ آپ کی ازواج میں سے جس کے ہاتھ زیادہ لمبے ہوں گے وہ آپ سے سب سے پہلے واصل ہوگی، حضرت زید بن صوحان کے ہاتھ کے متعلق پیش گوئی کی، سراقہ کے لیے سونے کے کنگنوں کی خبر دی اور بہت باتوں کی خبر دی، اب ہم ان تمام امور کے متعلق تفصیلاً احادیث بیان کر رہے ہیں۔

5۔ حضرت ثوبان (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ عزوجل نے تمام روئے زمین کو میرے لیے سکیڑ دیا ہے، سو میں نے اس کے مشارق اور مغارب کو دیکھ لیا، اور میری امت کی حکومت عنقریب وہاں تک پہنچے گی جہاں تک کی زمین میرے لیے سکیڑ دی گئی تھی اور مجھے سرخ اور سفید دو خزانے دیے گئے ہیں۔ (الحدیث)

(دلائل النبوت للبیہقی، ج 6، ص 227، صحیح مسلم الفتن 19 (2889) 7125،7126۔ سنن ابوداود رقم الحدیث : 4252۔ سنن ترمذی رقم الحدیث : 2183۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 3952)

6۔ سعید بیان کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ (رض) نے دوات پکڑی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے پیچھے گئے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا اے معاویہ ! اگر تم کو کسی علاقہ کا والی بنادیا جائے تو اللہ سے ڈرنا اور عدل کرنا، حضرت معاویہ نے کہا مجھے اس وقت سے یہ یقین تھا کہ مجھے کسی منصب کا والی بنایا جائے گا اور اس کی وجہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ ارشاد تھا۔ (مسند احمد ج 4، ص 101۔ دلائل النبوت ج 6 ص 446۔ البدایہ والنہایہ ج 8، ص 123)

7۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا خلافت مدینہ میں ہوگی اور ملوکیت شام میں۔ (سنن ابو داؤد رقم الحدیث : 4888۔ دلائل النبوت ج 6، ص 447)

8۔ حضرت حرام (رض) بیان کرتی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے گھر آئے انھوں نے آپ کو کھانا کھلایا اور آپ کا سر سہلایا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سو گئے، پھر ہنستے ہوئے بیدار ہوئے، میں نے عرض کیا : یارسول اللہ ! آپ کو کس چیز نے ہنسایا ؟ آپ نے فرمایا مجھے میری امت کے کچھ لوگ دکھائے گئے جو سمندر کے راستے جہاد کریں گے۔ حضرت ام حرام نے کہا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ سے دعا کیجئے کہ اللہ مجھے ان میں سے کردے آپ نے ان کے لیے دعا کی، پھر سو گئے۔ پھر آپ ہنستے ہوئے بیدار ہوئے، میں نے عرض کیا : یارسول اللہ ! آپ کس بات پر ہنس رہے ہیں، فرمایا مجھے میری امت کے کچھ لوگ دکھائے گئے جو اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے۔ (بخاری کی روایت میں ہے : میری امت کا جو پہلا لشکر قیصر کے شہر میں جہاد کرے گا وہ بخشا ہوا ہے۔ رقم الحدیث : 2924)۔ میں نے کہا یارسول اللہ ! میرے لیے دعا کریں کہ اللہ مجھے ان میں سے کردے۔ آپ نے فرمایا تم پہلے لشکر میں سے ہو۔ حضرت ام حرام بنت ملحان حضرت معاویہ کے زمانے میں سمندر کے راستہ جہاد میں گئیں وہ اپنی سواری سے گر گئیں، ان کو سمندر سے نکالا گیا تو جان بحق ہوچکی تھیں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 2788۔ صیح مسلم الجہاد 160 (1912) 4851۔ سنن ابوداود، رقم الحدیث : 2491۔ سنن الترمذی رقم الحدیث : 1652۔ سنن النسائی رقم الحدیث : 3171۔ دلائل النبوت ج 6، ص 451۔ 452)

9۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میری امت کی ہلاکت قریش کے لڑکوں کے ہاتھوں ہوگی، حضرت ابوہریرہ نے کہا اگر تم چاہو تو میں بنو فلاں، اور بنو فلاں کا نام لوں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 3604۔ 3605۔ صحیح مسلم الفتن 74 (2917) 7192۔ دلائل النبوۃ ج 6، ص 464۔ 465)

10۔ حضرت عدی بن حاتم (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ کے پاس ایک شخص آیا جس نے فاقہ کی شکایت کی، پھر دوسرا شخص آیا جس نے راستہ میں ڈاکوؤں کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا اے عدی ! کیا تم نے الیحیرہ دیکھا ہے، میں نے کہا میں اس کو دیکھا تو نہیں لیکن مجھے اس کی خبر دی گئی ہے، آپ نے فرمایا اگر تمہاری زندگی دراز ہوئی تو تم اپنے دل میں کہا پھر اس شہر کے ڈاکو کہاں چلے جائیں گے جنہوں نے شہروں میں فتنہ اور فساد کی آگ بھڑکا دی ہے۔ (پھر فرمایا) اور اگر تمہاری زدنگی دراز ہوئی تو تم دیکھوگے کہ ایک شخص مٹھی بھر سونا یا چاندی لے کر نکلے گا اور اس کو لینے والے کو ڈھونڈے گا اور اسے کوئی شخص نہیں ملے گا جو اس کو قبول کرلے، اور تم میں سے ضرور ایک شخص قیامت کے دن اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا جو ترجمہ کرے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا میں نے تمہاری طرف کوئی رسول نہیں بھیجا تھا جس نے تم کو تبلیغ کی ؟ وہ کہے گا کیوں نہیں ! اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا میں نے تم کو مال نہیں دیا تھا جو تم سے زائد تھا ؟ وہ کہے گا کیوں نہیں ! پھر وہ اپنی دائیں طرف دیکھے گا تو صرف جہنم نظر آئے گا اور بائیں طرف دیکھے گا تو صرف جہنم نظر آئے گا۔ حضرت دی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آگ سے بو، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے (کے صدقہ) سے، اور جس کو کھجور کا ٹکڑانہ ملے تو وہ کوئی نیک بات کہہ دے، حضرت عدی کہتے ہیں کہ میں نے ایک مسافرہ کو دیکھا جس نے الیحیرۃ سے سفر کرکے خانہ کعبہ کا فواف کیا اور اس کو اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں تھا، اور میں ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے کسریٰ بن ہرمز کے خزانوں کو کھولا اور

اگر تمہاری زندگی دراز ہوئی تو تم ضرور وہ نشانی دیکھ لوگے جو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمائی تھی کہ ایک آدمی مٹھی بھر (سونا یا چاندی) لے کر نکلے گا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 3595۔ دلائل انبوۃ ج 6، ص 323)

11۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کسریٰ فوت ہوگیا اور اس کے بعد کوئی کسری نہیں ہے اور جب قیصر ہلاک ہو جائے گا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں ہوگا اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے تم ضرور ان کے خزانوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کروگے۔ (صحیح مسلم الفتن 75 (2918) 7194۔ سنن الترمذی رقم الحدیث: 2223۔ صحیح البخاری رقم الحدیث: 3027۔ صحیح ابن حبان ج 15، رقم الحدیث: 6689۔ مسند احمد ج 3، رقم الحدیث: 7272، طبع جدید۔ مسند الشافعی ج 2، ص 186، مسند الحمیدی رقم الحدیث: 1094۔ مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: 20814۔ السنن الکبری للبیہقی ج 9، ص 177)

12۔ حسن بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب (رض) کے پاس کسری کی پوستین لائی گئی اور ان کے سامنے رکھ دی گئی، اور قوم میں حضرت سراقہ بن مالک بن جعشم بھی تھے، حضرت عمر نے کسریٰ بن ہرمز کے کنگن، حضرت سراقہ بن مالک کو دیے، انھوں نے ان کو اپنے ہاتھوں میں پہن لیا جو ان کے کندھوں تک پہنچ گئے۔ جب حضرت عمر نے حضرت سراقہ کے ہاتھوں میں کنگن دیکھے تو فرمایا الحمد للہ! امام شافعی نے کہا حضرت عمر نے حضرت سراقہ کو یہ کنگن اس لیے پہنائے تھے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت سراقہ کی کلائیوں کو دیکھتے ہوئے فرمایا تھا، گویا کہ تمہارے ہاتھ کسریٰ کے کنگن پہنے ہوئے ہیں، امام شافعی نے کہا جب حضرت عمر نے کسریٰ کے کنگن حضرت سراقہ کو پہنائے تو کہا تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، جس نے کسریٰ بن ہرمز سے کنگن چھین کر سراقہ بن جعشم کو پہنا دیے جو بنو مدلج کا ایک اعرابی ہے۔ (دلائل النبوۃ ج 6، ص 325۔ 326)

13:۔ حضرت انس اور ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بیشک اللہ عزوجل نے دنیا کو میرے یلے اٹھا لیا اور میں دنیا کی طرف اور قیامت تک دنیا میں جو کچھ ہونے والا ہے اس کو اس طرح دیکھ رہا ہوں جیسے اپنے ان ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو دیکھ رہا ہوں، جو اللہ عزوجل کے حکم سے روشن ہیں، اس نے اپنے نبی کے لیے ان کو روشن کیا، جس طرح پہلے نبیوں کے لیے روشن کیا تھا۔ (حلیۃ الاولیاء ج 6، ص 101۔ الجامع الکبیر رقم الحدیث: 4849۔ کنزالعمال رقم الھدیث: 31810، 31979، حافظ الہیثمی نے کہا اس حدیث کے راویوں کی توثیق کی گئی ہے، اس میں سعید بن سنان رھاوی ضعیف راوی ہے، مجمع الزوائد ج 8، ص 282)

14۔ حضرت عبداللہ بن حوالہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، ہم نے آپ سے سامان کی کمی، غربت اور افلاس کی شکایت کی آپ نے فرمایا تمہیں خوش خبری ہو کیونکہ مجھے تم پر اشیاء کی قلّت کی بہ نسبت اشیاء کی کثرت کا زیادہ خوف ہے، بہ خدا دین تم میں رہے گا حتی کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے سرزمین فارس، سرزمین روم اور سرزمین حمیر فتح کردے گا۔ (الحدیث) (دلائل النبوت ج 6، س 327)

15۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ پر سورۃ جمعہ نازل ہوئی جب آپ نے یہ آیت پڑھی: " واخرین منہم لما یلحقوا بہم: اور وہ نبی ان میں سے دوسروں کو بھی (کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کا باطن صاف کرتے ہین) جو ابھی ان سے لاحق نہیں ہوئے "۔ تو ایک شخص نے پوچھا: یارسول اللہ! یہ لوگ کون ہیں! نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو جواب نہیں دیا، حتی کہ اس نے دو یا تین مرتبہ سوال کیا اور ہم میں حضرت سلمان فارسی (رض) بھی تھے تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت سلمان فارسی پر اپنا ہاتھ رکھا اور فرمایا اگر ایمان ثریا (ستارے) کے پاس بھی ہو تو ان کی طرف کے لوگ اس کو حاصل کرلیں گے (صحیح البخاری رقم الحدیث: 4897۔ صحیح مسلم فضائل الصحابہ 230 (2546) 6379۔ سنن الترمذی رقم الحدیث: 3317)

16۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بنواسرائیل کا ملکی نظام ان کے نبی چلاتے تھے، جب ایک نبی فوت ہو جاتا تو اس کی جگہ دوسرا نبی آجاتا، اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا اور عنقریب خلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے، صحابہ نے پوچھا پھر آپ کیا حکم دیتے ہیں۔ فرمایا پہلے کی

بیعت سے وفا کرو، پھر پہلے کی، اوران کے حقوق ادا کرو، کیونکہ اللہ عزوجل ان سے سوال کرے گا کہ انھوں نے عوام کے ساتھ کس طرح معاملہ کیا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 3455۔ صحیح مسلم الامارۃ 44 (1842) 4691۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 2871)

حضرت سفینہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا خلافت تیس سال رہے گی پھر اللہ جس کو چاہے گا ملک دے دے گا۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث : 4646۔ مسند احمد ج 5، ص 44۔ دلائل النبوت ج 6، ص 431)

حضرت ابوبکر کی خلافت دو سال چار ماہ رہی (دس دن کم تھے) حضرت عمر کی خلافت دس سال چھ ماہ چار دن رہی، حضرت عثمان کی خلافت بارہ دن کم بارہ سال رہی اور حضرت علی کی خلافت دو یا تین ماہ کم پانچ سال رہی۔ (دلائل النبوت ج 6، ص 341۔ 342، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

18۔ حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھ سے اپنے مرض الموت میں فرمایا میرے لیے ابوبکر کو اور اپنے بھائی کو بلاؤ کیونکہ مجھے یہ خوف ہے کہ کوئی (خلافت کی) تمنا کرنے والا تمنا کرے گا اور کہے گا کہ میں (خلافت کے) زیادہ لائق ہوں اور اللہ اور مومنین ابوبکر کے غیر انکار کردیں گے۔ (صحیح مسلم فضائل الصحابہ 11، (2387) 6064۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 1465۔ مسند احمد ج 6، ص 228۔ دلائل النبوت ج 6، ص 343)

19۔ حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) احد پہار پر چڑھے (ایک راوی کا خیال ہے کہ حضرت انس نے حراء پہاڑ کہا تھا) اور آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان (رض) تھے۔ وہ پہاڑ لرزنے لگا۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا (اے پہاڑ !) ساکن ہوجا، تجھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید ہیں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 3675، 3686، 3699۔ سنن الترمذی رقم الحدیث : 3717۔ سنن ابوداؤد رقم الحدیث : 4651۔ مسند احمد ج 5، ص 346، 331۔ دلائل النبوت ج 6، ص 350)

20۔ حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی : " یاایھاالذین امنوالاترفعوااصواتکم فوق صوت النبی : اے ایمان والو ! نبی کی آواز کے اوپر اپنی آوازوں کو بلند کرو" (الحجرات : 2)۔ تو حضرت ثابت بن قیس (رض) اپنے گھر میں بیٹھ گئے اور کہا میں : اہل دوزخ سے ہوں اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مجلس میں حاضر نہیں ہوئے، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت سعد بن معاذ سے ان کے متعلق پوچھا اور فرمایا اے ابوعمرو ! ثابت کا کیا حال ہے ؟ کیا وہ بیمار ہے ؟ حضرت سعد نے کہا وہ میر پڑوسی ہے اور مجھے اس کی بیماری کا کوئی علم نہیں، پھر حضرت سعد نے ان سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دریافت کرنے کا ذکر کیا، حضرت ثابت نے کہا یہ آیت نازل ہوچکی ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے میری آواز سب سے اونچی ہے، پس میں اہل دوزخ سے ہوں، حضرت سعد نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس بات کا ذکر کیا آپ نے فرمایا بلکہ وہ اہل جنت میں سے ہے، امام مسلم کی ایک روایت میں ہے (رقم الحدیث : 310) کہ جب حضرت ثابت ہمارے درمیان چلتے تھے تو ہم یقین کرتے تھے کہ یہ جنتی ہیں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 4846۔ صحیح مسلم الایمان، 187 (119) 307)

حضرت ثابت مسیلمہ کذاب کے خلاف جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ (دلائل النبوۃ ج 6، ص 355، المستدرک ج 3، ص 234، مجمع الزوائد ج 9، ص 322)

21۔ حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے یہ بیان کیا گیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ ایک دن میں سویا ہوا تھا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے ہاتھوں میں سونے کے دو کنگن رکھے گئے ہیں، میں ان سے گھبرا گیا اور مجھ کو وہ ناگوار لگے پھر مجھے اجازت دی گئی کہ میں ان کو پھونک سے اڑادوں، سو میں نے پھونک مار کر ان کو اڑا دیا۔ عبیداللہ نے کہا ان میں سے ایک عنسی تھا جس کو فیروز نے یمن میں قتل کیا اور دوسرا مسیلمہ تھا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 7034۔ صحیح مسلم الرویا 22 (2274) 5826۔ سنن الترمذی رقم الحدیث : 2299۔ صحیح ابن حبان ج 15، رقم الحدیث : 6654۔ مسند احمد ج 1، ص 263، طبع قدیم۔ مسند احمد ج 3، رقم الحدیث : 8256، طبع جدید)

22۔ حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا شیطان اس سے مایوس ہو گیا ہے کہ جزیرہ عرب میں نمازی اس کی عبادت کریں لیکن وہ ان میں اختلاف اور نزاع پیدا کرنے کے لیے مایوس نہیں ہے۔ (صحیح مسلم المنافقین 65 (2812) 6970۔ سنن الترمذی رقم الحدیث : 1944۔ مسند احمد ج 3، ص 3131)

23:۔ حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی صاحبزادی سیدتنا فاطمہ (رض) کو بلایا اور ان سے سرگوشی کی وہ رونے لگیں، پھر دوبارہ سرگوشی کی تو وہ ہنسنے لگیں، حضرت عائشہ نے حضرت فاطمہ سے پوچھا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کیا سرگوشی کی تھی جس پر آپ روئیں اور پھر سرگوشی کی تو آپ ہنسیں، حضرت فاطمہ نے فرمایا آپ نے مجھ سے سرگوشی کر کے مجھے اپنی وفات کی خبر دی تو میں روئی پھر سرگوشی کر کے یہ خبر دی کہ آپ کے اہل میں سے سب سے پہلے میں آپ کے ساتھ لاحق ہوں گی تو پھر میں ہنسی۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 3625، صحیح مسلم فضائل صحابہ، 98) 2450☆6196۔ السنن الکبری للنسائی رقم الحدیث : 8367۔ مسند احمد ج 6، ص 282، الطبقات الکبری ج 2، ص 247۔ دلائل النبوت، ج 6، ص 365)

24۔ حضرت ام ورقہ بنت عبداللہ بن الحارث کی ملاقات کے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لے جاتے اور آپ نے ان کا نام الشہیدۃ رکھا تھا، وہ قرآن کی حافظہ تھیں، جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غزوہ بدر کے لیے تشریف لے گئے تو انھوں نے کہا آپ مجھے اجازت دیں تو میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں اور زخمیوں کی مرہم پٹی اور بیماروں کی تیمارداری کروں، شاید اللہ تعالیٰ مجھے شہادت عطا فرمائے، آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تم کو شہادت عطا فرمائے گا اور آپ ان کو الشہیدہ کہتے تھے، اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے گھر کی خواتین کی امامت کیا کریں، ان کو مال غنیمت میں سے ایک باندی اور ایک غلام ملا تھا، جن کو انھوں نے مدبر کر دیا تھا (یعنی ان سے کہہ دیا تھا کہ میرے مرنے کے بعد تم آزاد ہو) حضرت عمر کے دور خلافت میں ان دونوں نے حضرت ام ورقہ کو قتل کر دیا اور دونوں بھاگ گئے۔ حضرت عمر (رض) کے حکم سے ان کو پکڑ لیا گیا اور ان دونوں کو سولی پر لٹکایا، مدینہ میں ان کو سب سے پہلی سولی دی گئی تھی، حضرت عمر (رض) نے کہا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سچ فرمایا تھا، آپ فرماتے تھے چلو الشہیدہ کی زیارت کے لیے چلیں۔ (مسند احمد ج 6، ص 405، طبع قدیم احمد شاکر نے اس کی ایک سند کو ضعیف اور دوسری سند کو صحیح کہا ہے۔ مسند احمد ج 18، رقم الحدیث : 27157، 27158، طبع دار الحدیث قاہرہ، حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے اور ذہبی نے ان کی موافقت کی۔ المستدرک ج 1، ص 161، رقم الحدیث : 592۔ صحیح ابن خزیمہ، ج 3، ص 89، رقم الحدیث : 1676۔ سنن کبری للبیہقی ج 3، ص 130۔ دلائل النبوۃ ج 6، ص 381۔ الاصابہ رقم الحدیث : 12298۔ الستیعاب رقم الحدیث 3686۔ اسد الغابہ رقم، 7226۔ کتاب الثقات ج 3، ص 463)

25:۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے گھر میں وضو کیا اور سوچا آج میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ رہوں گا، آپ مسجد میں نہیں تھے، میں آپ کی تلاش میں نکلا، آپ اریس نامی کنوئیں کی منڈیر پر کنویں میں ٹانگیں لٹکائے ہوئے بیٹھے تھے، میں اس کے دروازہ پر چلا گیا اور میں نے سوچا کہ میں آج رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دربان بنوں گا، تھوڑی دیر بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا میں نے پوچھا: کون ہے، آنے والے نے کہا ابوبکر ! میں نے کہا ٹھریں، پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ان کے لیے اجازت طلب کی آپ نے فرمایا ان کو اجازت دے دو، اور ان کو جنت کی بشارت دو، حضرت ابوبکر آ کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دائیں جانب منڈیر پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد حضرت عمر نے دروازے پر دستک دی، میں نے کہا ٹھہریں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ان کے لیے اجازت طلب کی، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ان کو اجازت دے دو، اور جنت کی بشارت دو ان مصائب اور فتنوں کے ساتھ جو ان کو لاحق ہوں گے۔ (ملخصاً)۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 3693۔ صحیح مسلم فضائل الصحابتہ، 29 (2403) 6097۔ سنن الترمذی رقم الحدیث : 3710۔ صحیح ابن حبان رقم الحدیث : 6912۔ مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث : 20402۔ مسند احمد ج 7، رقم الحدیث : 19662)

26:۔ حضرت مرہ بن کعب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فتنوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ عنقریب واقع ہونے والے ہیں، اس وقت ایک شخص کپڑے سے اپنے آپ کو ڈھانپے ہوئے گزرا، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہ شخص اس وقت ہدایت پر ہوگا، میں نے کھڑے ہو کر دیکھا تو

وہ حضرت عثمان بن عفان (رض) تھے، میں نے پھر آپ کی طرف رخ کرکے پوچھا یہ ؟آپ نے فرمایاہاں !۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث : 3724۔ صحیح ابن حبان رق الحدیث : 6914۔ مصنف ابن ابی شیبہ ج 12، ص 40۔ المعجم الکبیر ج 20، ص 752۔ مسند احمد ج 7، رقم الحدیث : 20374)

27 :۔ حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فتنوں کا ذکر کیا۔ پھر آپ نے حضرت عثمان بن عفان کے متعلق فرمایا کہ یہ شخص فتنوں میں مظلوماً قتل کیا جائے گا۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث : 3728، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1414ھ)

28 :۔ ابو سہلہ بیان کرتے ہیں کہ جن دنوں میں حضرت عثمان غنی (رض) اپنے گھر میں محصور تھے۔ انھوں نے کہا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھ سے ایک عہد لیا تھا اور میں اس پر صابر ہوں۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث : 3731۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 113۔ صحیح ابن حبان رقم الحدیث : 6918۔ مصنف ابن ابی شیبہ ج 12، ص 44۔ مسند احمد ج 1، رقم الحدیث : 407، طبع جدید)

29 :۔ حضرت ابو سعید خدری بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عمار بن یاسر کے متعلق فرمایا جس وقت وہ خندق کھود رہے تھے آپ نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا اے ابن سمیہ افسوس ہے ! تم ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔ (صحیح مسلم الفتن 170 (2915) 7187۔ سنن کبری للنسائی رقم الحدیث : 8048۔ دلائل النبوۃ ج 6، ص 420)

30۔ فضالہ بن ابی فضالہ (رض) عہ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے والد حضرت ابو فضالہ (رض) کے ساتھ حضرت علی (رض) کی عیادت کے لیے گیا، میرے والد نے کہا کاش آپ کی جگہ مجھے اجل آجاتی ! حضرت علی (رض) نے فرمایا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھ سے یہ عہد لیا تھا کہ میں اس وقت تک نہیں مروں گا حتی کہ مجھے امیر بنادیا جائے اور میری یہ داڑھی خون سے رنگین ہوجائے یعنی میں شہید ہوجاؤں، حضرت علی شہید کردیے گئے اور حضرت ابو فضالہ حضرت علی کی طرف سے لڑتے ہوئے جنگ صفین میں شہید ہوئے۔ (مسند احمد ج 1، ص 102، طبع قدیم، احمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ مسند احمد ج 1، رقم الحدیث : 802، بع دار الحدیث قاہرہ، المستدرک، ج 3، ص 113۔ الطبقات الکبری ج 3، ص 34۔ مجمع الزوائد ج 9، ص 136۔ 137۔ دلائل النبوت ج 6، ص 438)

31 :۔ حضرت ابو بکرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) منبر پر بیٹھے ہوئے تھے اور حسن بن علی (رض) آپ کے پہلو میں تھے آپ کبھی لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور کبھی ان کی طرف متوجہ ہوتے، آپ نے فرمایا میرا یہ بیٹا سردار ہے، امید ہے کہ اللہ اس کے سبب سے مسلمانوں کی دو جماعتوں میں صلح فرمادے گا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 2704، مشکوۃ رقم الحدیث : 6144۔ مسند احمد ج 5، ص 49)

32 :۔ عمار بن ابی عار بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس نے کہا میں نے خواب میں دیکھا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بال بکھرے ہوئے اور غبار آلود ہیں اور آپ دوپہر کے وقت ایک شیشی اٹھائے ہوئے ہیں جس میں خون بھرا ہوا ہے، میں نے عرض کیا : یارسول اللہ ! آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں یہ کیا چیز ہے ؟ آپ نے فرمایا یہ حسین اور ان کے اصحاب کا خون ہے میں آج دن سے لے کر اب تک یہ خون جمع کرتا رہا ہوں۔ ہم نے وہ دن یاد رکھا پھر معلوم ہوا کہ حضرت حسین (رض) کو اسی دن شہید کیا گیا تھا۔ (مسند احمد ج 1، ص 242، 283۔ شیخ احمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ مسند احمد ج 2، رقم الحدیث : 2165، ج 3، رقم الحدیث : 2553، طبع دار الحدیث : قاہرہ، المعجم الکبیر ج 12، رقم الحدیث : 12837، ج 2، رقم الحدیث : 2822) حافظ الہیثمی نے کہا امام احمد کی سند صحیح ہے۔ مجمع الزوائد ج 9، ص 194۔ البدایہ والنہایہ ج 6، ص 231۔ المستدرک ج 2، ص 314۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے)

33 :۔ حضرت عباس بن عبدالمطلب بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے بیٹے حضرت عبداللہ کو کسی کام سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بھیجا، انھوں نے آپ کے پاس ایک شخص کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو وہ لوٹ آئے۔ حضرت عباس نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا میں نے اپنے بیٹے کو آپ کے پاس کسی کام سے بھیجا تھا وہ آپ کے پاس ایک شخص کو دیکھ کر لوٹ آئے اور بات نہ کرسکے، آپ نے فرمایا کیا تم کو معلوم ہے کہ وہ شخص کون تھا، وہ شخص جبرائیل

(علیہ السلام) تھے اور (حضرت ابن عباس) اس وقت تک فوت نہیں ہوں گے جب تک کہ نابینا نہ ہو جائیں اور ان کو علم دیا جائے گا۔ (مسند احمد رقم الحدیث: 2679،2848، طبع جدید۔ المعجم الکبیر رقم الحدیث: 10584،12836۔ حافظ الھیثمی نے کہا ہے کہ مسند احمد کی سند صحیح ہے۔ مجمع الزوائد ج6، ص276)

34:۔ حضرت ابوذر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا عنقریب تم مصر کو فتح کروگے اور یہ وہ زمین ہے جس میں قیراط کا ذکر کیا جاتا ہے تم وہاں کے رہنے والوں کے ساتھ خیر خواہی کرنا کیونکہ ان کا ذمہ اور رحم ہے۔ (ذمہ سے مراد حرمت اور حق ہے اور رحم سے مراد یہ ہے کہ حضرت ہاجر، حضرت اسماعیل کی والدہ مصری تھیں)۔ (صحیح مسلم فضائل الصحابہ، 227(2543)6375۔ مسند احمد ج6، ص173)

35:۔ حضرت ابوواقد لیثی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب حنین کی طرف گئے تو مشرکین کے ایک درخت کے پاس سے گزرے جس کو ذات انواط کہا جاتا تھا، جس پر وہ اپنے ہتھیار لٹکاتے تھے۔ مسلمانوں نے کہا یارسول اللہ! ہمارے لیے بھی ایک ایسا ذات انواط بنا دیجئے جیسا ان کے لیے ذات انواط ہے۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا سبحان اللہ! یہ تو ایسا ہے جیسا موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم نے کہا تھا ہمارے لیے بھی ایسا خدا بنادیں جیسے ان کے خدا ہیں، اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے تم ضرور اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقوں پر سوار ہوگے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: 2187۔ صحیح ابن حبان ج15، رقم الحدیث: 6702۔ مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: 20763۔ مصنف ابن ابی شیبہ ج15، ص101۔ المعجم الکبیر ج3، رقم الحدیث: 3290،3291)

36:۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ ہر سو سال کے سر پر (صدی کی انتہا یا ابتداء پر) اس امت کے لیے اس شخص کو مبعوث کرے گا جو ان کے لیے ان کے دین کی تجدید کرے گا۔ (یعنی بدعات کو مٹائے گا اور جن احکام پر مسلمانوں نے عمل کرنا چھوڑ دیا تھا ان پر عمل کروائے گا)۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 4291۔ جامع الاصول ج11، رقم الحدیث: 8881)

37:۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی آخری زندگی میں ایک رات میں عشاء کی نماز پڑھائی اور جب سلام پھیر لیا تو فرمایا مجھے بتاؤ یہ کون سی رات ہے کیونکہ اس کے ایک سو سال بعد ان لوگوں میں سے کوئی زندہ نہیں رہے گا جو روئے زمین پر اب زندہ ہیں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 601۔ صحیح مسلم فضائل الصحابہ، رقم الحدیث: 217(2537)6361۔ سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 4348۔ سنن الترمذی رقم الحدیث: 2258۔ سنن کبری للنسائی رقم الحدیث: 5871)

38:۔ حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ اہل خیبر میں سے ایک یہودیہ نے ایک بھنی ہوئی بکری میں زہر ملایا پھر وہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پیش کی۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس بکری کا ایک دست لیا اور اس میں سے کھایا اور آپ کے اصحاب میں سے ایک جماعت نے بھی اس میں سے کھایا، پھر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے اصحاب سے کہا اپنے ہاتھ روک لو، اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس یہودیہ کو بلوایا اور فرمایا کیا تم نے اس بکری میں زہر ملایا تھا؟ اس نے کہا ہاں! آپ کو کس نے خبر دی؟ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے دست کی طرف اشارہ کیا مجھے اس نے خبر دی ہے۔ اس نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا تم نے کس لیے ایسا کیا تھا؟ اس نے کہا میں نے سوچا اگر یہ نبی ہیں تو ان کو اس زہر سے نقصان نہیں ہوگا اور اگر یہ نبی نہیں ہیں تو ہماری خلاصی ہو جائے گی۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو معاف کر دیا اور اس کو سزا نہیں دی، اور آپ کے بعض اصحاب جنہوں نے اس بکری کا گوشت کھایا تھا وہ فوت ہوگئے اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس بکری سے کھائے ہوئے گوشت کی وجہ سے پیٹھ کے اوپر گردن کے نیچے فصد لگوائی۔ بنوبیاضہ کے آزاد شدہ غلام نے یہ فصد لگائی تھی۔ (سنن دارمی رقم الحدیث: 68۔ سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 4510۔ الادب المفرد، رقم الحدیث: 243۔ جامع الاصول ج11، رقم الحدیث: 8887)

39:۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب خیبر فتح ہوگیا تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایک بکری تحفہ میں پیش کی گئی جو زہر آلود تھی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہاں جتنے یہودی ہیں ان سب کو جمع کرو، یہودیوں کو جمع کیا گیا تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں تم سے ایک چیز کے متعلق سوال کرتا ہوں؟ کیا تم مجھ سے سچ بولوگے؟ انھوں نے کہا ہاں! اے ابوالقاسم! تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تمہارا باپ کون

ہے ؟انھوں نے کہا ! ہمارا باپ فلاں ہے۔ پس رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم نے جھوٹ بولا بلکہ تمہارا باپ فلاں ہے۔ تب یہودیوں نے کہا آپ نے سچ کہا اور نیک کام کیا، پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں تم سے ایک چیز کے متعلق سوال کرتا ہوں کیا تم مجھے سچ سچ بتا دوگے ؟انھوں نے کہا ہاں ! اے ابوالقاسم، اور اگر ہم نے جھوٹ بھی بولا تو آپ کو ہمارے جھوٹ کا علم ہو جائے گا جیسا کہ آپ کو ہمارے باپ کے متعلق علم ہو گیا۔ تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اہل دوزخ کون ہیں ؟انھوں نے کہا ہم اس میں تھوڑی دیر رہیں گے، پھر ہمارے بعد تم لوگ دوزخ میں جاؤگے ! تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم دوزخ میں دفع ہو جاؤ، بہ خدا ہم تمہارے بعد اس میں کبھی بھی نہیں جائیں گے، پھر آپ نے فرمایا اگر میں تم سے کسی چیز کے متعلق سوال کروں تو کیا تم سچ سچ بتاؤگے ؟انھوں نے کہا ہاں ! آپ نے فرمایا تم نے اس بکری میں زہر ملایا تھا ؟انھوں نے کہا ہاں ! آپ نے پوچھا تم کو اس کام پر کس چیز نے برانگیختہ کیا ؟انھوں نے کہا ہم نے یہ ارادہ کیا تھا کہ اگر آپ جھوٹے ہیں تو ہم کو آپ سے نجات مل جائے گی اور اگر آپ جھوٹے ہیں تو ہم کو آپ سے نجات مل جائے گی اور اگر آپ نبی ہیں تو یہ زہر آپ کو ضرر نہیں دے گا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 5777۔ مسند احمد ج 2، ص 451۔ سنن دارمی رقم الحدیث : 69۔ جامع الاصول، ج 11، رقم الحدیث : 8886)

40 :۔ انصار کے ایک آدمی سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ ایک جنازہ میں گئے، آپ قبر کھودنے والے کو وصیت فرمارہے تھے کہ پیروں کی جانب سے قبر کو کشادہ کرو، اور سر کی جانب سے قبر کو کشادہ کرو، جب آپ واپس ہوئے تو ایک عورت کی طرف سے دعوت دینے والا آیا، آپ نے اس کی دعوت کو قبول کر لیا اور ہم بھی آپ کے ساتھ تھے، پس کھانا لایا گیا، آپ نے اپنا ہاتھ رکھا، پھر قوم نے اپنا ہاتھ رکھا، سب نے کھایا، ہم نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف دیکھا آپ اپنے منہ میں ایک لقمہ چبا رہے تھے، آپ نے فرمایا مجھے یہ علم ہوا کہ یہ اس بکری کا گوشت ہے جس کو اس کے مالک کی مرضی کے بغیر لیا گیا ہے، پھر اس عورت کو بلایا گیا اس نے کہا یا رسول اللہ ! میں نے کسی کو نقیع (بکریاں فروخت کرنے کی جگہ، منڈی) کی طرف بھیجا تھا، تاکہ میرے لیے بکری خرید لی جائے، تو بکری نہیں ملی، میں اپنے پڑوسی کو پیغام بھیجا جس نے ایک بکری خریدی تھی کہ وہ بکری مجھے قیمت کے عوض بھیج دے تو وہ پڑوسی نہیں ملا، میں نے اس کی بیوی کو پیغام بھیجا تو اس نے وہ بکری مجھے بھیج دی، تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہ کھانا قیدیوں کو کھلا دو۔ (سنن ابوداود، رقم الحدیث : 3332۔ مسند احمد ج 5، ص 293۔ جامع الاصول ج 11، رقم الحدیث : 8889۔ مشکوۃ رقم الحدیث : 5942)

41 :۔ حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ (جنگ بدر کے دن) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کل یہ فلاں کے گرنے کی جگہ ہے اور آپ نے زمین پر ہاتھ رکھا اور کل یہ فلاں کے گرنے کی جگہ ہے اور زمین پر ہاتھ رکھا اور کل یہ فلاں کے گرنے کی جگہ ہے اور زمین پر ہاتھ رکھا۔ پھر حضرت انس (رض) نے کہا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے جس جگہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہاتھ رکھا تھا کوئی شخص اس سے بالکل متجاوز نہیں ہوا (اسی جگہ گر کر مرا) پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم سے ان کو گھسیٹ کر بدر کے کنویں میں ڈال دیا گیا۔ مسلم اور نسائی کی روایت میں ہے کل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمیں کفار بدر کے گرنے کی جگہیں بتا رہے تھے اور فرمارہے تھے، کل فلاں یہاں گرے گا۔ انشاء اللہ۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث : 2681۔ صحیح مسلم المنافقین : 75 (2872) 7088۔ سنن نسائی رقم الحدیث : 2073۔ مسند احمد ج 3، ص 219۔ 258۔ مشکوۃ رقم الحدیث : 5938)

42 :۔ حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک سفر سے تشریف لائے اس وقت بڑے زور سے آندھی چلی لگتا تھا کہ سوار دفن ہو جائیں گے، تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ایک منافق کی موت کی وجہ سے یہ آندھی بھیجی گئی ہے، جب ہم مدینہ پہنچے تو ایک بہت بڑا منافق مر چکا تھا۔ (صحیح مسلم المنافقین : 15 (2782) 6908۔ مسند احمد ج 3، ص 315۔ مسند عبد بن حمید رقم الحدیث : 1029۔ جامع الاصول ج 11۔ رقم الحدیث : 8885)

43 :۔ حضرت ابوموسی (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کچھ چیزوں کے متعلق سوال کیا گیا جن کو آپ نے ناپسند کیا، جب بکثرت سوال کیے گئے تو آپ غضب ناک ہوئے پھر آپ نے لوگوں سے کہا تم جو چاہتے ہو مجھ سے سوال کرو، ایک شخص نے کہا میرا باپ کون ہے ؟آپ نے فرمایا تمہارا باپ

سالم ہے شیبہ کا آزاد کردہ غلام، جب حضرت عمر نے آپ کے چہرے پر غضب کے آثار دیکھے تو عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم اللہ عزوجل سے توبہ کرتے ہیں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 92، 7291)

44:۔ حضرت سہل بن سعد (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جنگ خیبر کے دن فرمایا کل میں یہ جھنڈا ضرور اس شخص کو دوں گا جس کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ فتح عطا فرمائے گا، وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوگا اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں، وہ تمام رات مسلمانوں نے اس بے چینی میں گزاری کہ آپ کس کو جھنڈا عطا فرماتے ہیں، صبح کو تمام مسلمان رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سب کو اس جھنڈے کے عطا کیے جانے کی امید تھی، آپ نے پوچھا علی بن ابی طالب کہاں ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! ان کی آنکھوں میں تکلیف ہے، پھر حضرت علی کو مسلمانوں نے بلایا، وہ لائے گئے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کی آنکھوں میں لعاب دہن ڈالا اور ان کے لیے دعا کی، وہ تندرست ہوگئے گویا کہ ان کی آنکھوں میں کبھی تکلیف ہی نہ تھی، آپ نے ان کی آنکھوں میں لعاب دہن ڈالا اور ان کے لیے دعا کی، وہ تندرست ہوگئے گویا کہ ان کی آنکھوں میں کبھی تکلیف ہی نہ تھی، آپ نے ان کو جھنڈا عطا فرمایا، حضرت علی نے کہا یارسول اللہ! میں ان سے اس وقت تک قتال کرتا رہوں گا حتی کہ وہ ہماری طرح (مسلمان) نہ ہو جائیں، آپ نے فرمایا اطمینان سے جانا، حتی کہ تم ان کے علاقہ میں پہنچ جاؤ، پھر ان کو اسلام کی دعوت دینا، اور ان کو یہ بتانا کہ ان پر اللہ کا کیا حق واجب ہے، اللہ کی قسم! اللہ تمہارے سبب سے کسی ایک شخص کو ہدایت دے دے تو وہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 3701، 3009۔ صحیح مسلم فضائل الصحابہ، 34 (2406) 6160۔ سنن کبری للنسائی رقم الحدیث: 8403۔ جامع الاصول ج 8، رقم الحدیث: 6495)

45:۔ حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حجۃ الوداع میں میری اس بیماری میں عیادت کی جس کی وجہ سے میں موت کے کنارے پہنچ گیا تھا، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ دیکھ رہے ہیں کہ مجھے کتنی تکلیف ہے! میں مال دار ہوں اور میری صرف ایک بیٹی ہے کیا میں اپنا دو تہائی مال صدقہ کردوں؟ آپ نے فرمایا نہیں! میں نے کہا کیا نصف مال صدقہ کردوں؟ آپ نے فرمایا نہیں، پھر آپ نے فرمایا تہائی مال صدقہ کرو، تہائی مال بہت ہے، اگر تم اپنے وارثوں کو خوشحال چھوڑو تو وہ اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو فقراء چھوڑو اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں، اور تم اللہ کی رضا جوئی کے لیے جو خرچ بھی کروگے تم کو اس میں اجر دیا جائے گا حتی کہ تم جو لقمہ اپنی بیوی کے منہ میں رکھوگے اس پر بھی اجر ملے گا، میں نے عرض کیا: یارسولاللہ! کیا میں اپنے احباب کے پیچھے رہ جاؤں گا۔ (یعنی حج کے بعد ان کے ساتھ مدینہ نہ جاسکوں گا؟) آپ نے فرمایا تم ہرگز پیچھے نہیں رہوگے، تم اللہ کی رضا جوئی کے لیے جو بھی کروگے، تمہارے درجے اس سے زیادہ اور بلند ہوں گے اور شاید کہ تم بعد میں زندہ رہو اور تم سے ایک قوم کو فائدہ اور دوسری کو نقصان ہو، اے اللہ! میرے اصحاب کی ہجرت کو قائم رکھ اور ان کو ان کی ایڑیوں پر نہ لوٹا، لیکن سعد بن خولہ پر افسوس ہے، حضرت سعد نے کہا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان پر اس لیے افسوس کیا کہ وہ مکہ میں ہی فوت ہوگئے تھے۔ (حضرت سعد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصال کے بعد تک زندہ رہے انھوں نے ایران کو فتح کیا جس سے مسلمانوں کو نفع اور مجوسیوں کو نقصان ہوا)۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 4409۔ صحیح مسلم الوصیۃ 5 (1628) 4131۔ سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 2864۔ سنن الترمذی رقم الحدیث: 2123۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 2708۔ سنن النسائی رقم الحدیث: 3226۔ سنن کبری للنسائی رقم الحدیث: 6453۔ مسند احمد ج 1، ص 179، 175، ج 3، ص 32۔ 365)

46:۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ تم اس قوم سے جنگ نہ کرو جو بالوں والے چمڑے کی جوتیاں پہنیں گے اور حتی کہ تم ترکوں سے قتال نہ کرو، جن کی آنکھیں چھوٹی ہوں گی اور ناک چپٹی ہوگی اور ان کے چہرے ہتھوڑوں سے کوٹی ہوئی ڈھالوں کی مانند ہوں گے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 3578۔ صحیح مسلم الفتن 62 (2912) 7177۔ سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 4304۔ سنن ترمذی رقم الحدیث: 2222۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 4096۔ مسند احمد ج 2، ص 239۔ مسند حمیدی رقم الحدیث: 1100۔ جامع الاصول ج 10، رقم الحدیث: 7870)

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: تم یہود سے قتال کروگے اور تم ان پر مسلط ہو جاؤ گے، حتیٰ کہ ایک پتھر یہ کہے گا کہ اے مسلمان! میرے پیچھے ایک یہودی ہے۔ اس کو قتل کردو۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 3593۔ صحیح مسلم الفتن 79 (2922) 7202۔ مسند احمد ج 2، ص 417)

47:۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم سے غزوہ ہند کا وعدہ کیا کہ اگر میں اس غزوہ کو پالوں تو میں اس میں اپنی جان اور مال کو خرچ کروں اگر میں اس میں شہید ہو گیا تو میں سب سے افضل شہید ہوں گا اور اگر میں لوٹ آیا تو میں جہنم سے آزاد ہوں گا۔ (سنن النسائی رقم الحدیث: 3174، 3173، مطبوعہ دار المعرفۃ، بیروت)

48:۔ حضرت عقبہ بن عامر (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لے گئے اور اہل احد پر نماز جنازہ پڑھی، پھر آپ منبر کی طرف مڑ گئے، (یعنی مسجد کی طرف تشریف لے گئے) آپ نے فرمایا میں تمہارا پیش رو ہوں، اور میں تم پر گواہ ہوں، اور بیشک اللہ کی قسم! میں اب بھی اپنے حوض کی طرف ضرور دیکھ رہا ہوں، اور بیشک مجھے تمام روئے زمین کے خزانوں کی چابیاں عطا کی گئی ہیں، اور بیشک اللہ کی قسم! مجھے یہ خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم (سب) مشرک ہو جاؤ گے البتہ مجھے یہ خوف ہے کہ میرے بعد تم دنیا میں رغبت کروگے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 1344۔ صحیح مسلم الفتن 30 (2296) 5864۔ سنن ابوداود رقم الحدیث: 3223، 3224۔ سنن النسائی رقم الحدیث: 1954)

49:۔ حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جنگ بدر کے دن اہل جاہلیت کا فدیہ چار سو (درہم) مقرر کیا، اور حضرت عباس نے یہ دعویٰ کیا کہ ان کے پاس بالکل مال نہیں ہے، تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا پھا تو وہ مال کہاں ہے جو تم نے اور ام الفضل نے مل کر دفن کیا تھا اور تم نے کہا تھا کہ اگر میں اس مہم میں کام آگیا تو یہ مال میرے ان بیٹوں کا ہے: الفضل، عبداللہ اور قثم۔ حضرت عباس نے کہا اللہ کی قسم! مجھے اب یقین ہو گیا کہ آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں، اس بات کا میرے اور ام الفضل کے سوا کسی کو علم نہیں تھا۔ (سبل الہدیٰ والرشاد ج 4، ص 49، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1414ھ)

50:۔ امام ابن سعد، عبداللہ بن حارث بن نوفل سے روایت کرتے ہیں کہ جب جنگ بدر کے دن نوفل کو قید کیا گیا تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے فرمایا اپنی جان کے فدیہ میں وہ نیزہ دو جو جدہ میں ہے، انھوں نے کہا اللہ کی قسم! اللہ کے بعد میرے علاوہ کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ میرے پاس جدہ میں نیزہ ہے۔ (سبل الہدیٰ والرشاد ج 4، ص 69)

51:۔ عاصم بن زید السکونی بیان کرتے ہیں کہ حضرت معاذ (رض) کو جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یمن کی طرف بھیجا، ان کے ساتھ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی باہر نکلے، آپ ان کو وصیت فرما رہے تھے، حضرت معاذ سوار تھے اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ جب آپ نصیحت سے فارغ ہوئے تو فرمایا اے معاذ! امید ہے کہ اس سال کے بعد تم مجھ سے ملاقات نہیں کروگے اور شاید کہ تم میری مسجد اور میری قبر کے پاس سے گزرو، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جدائی کے خیال سے حضرت معاذ رونے لگے، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اے معاذ مت روؤ کیونکہ (آواز سے) رونا شیطان کا کام ہے۔ (مسند احمد ج 5، ص 235، شیخ احمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے، مسند احمد ج 16، رقم الحدیث: 21953۔ دلائل النبوت للبیہقی ج 5، ص 404۔ 405)۔۔ (اس آیت کی تفسیر کا بقیہ حصہ ملاحظہ ہو اگلی آیت کی تفسیر میں) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بالخصوص قیامت کے احوال کی جو خبریں دی ہیں، ان کے متعلق ہم نے متعدد کتب حدیث کے حوالہ جات سے پچیس احادیث بیان کی ہیں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علم ماکان ومایکون کے متعلق ہم نے متعدد کتب حدیث کے حوالہ جان سے دس احادیث بیان کی ہیں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے منجملہ غیب کی جو خبریں دی ہیں اس کے متعلق ہم نے متعدد کتب حدیث سے اکیاون احادیث بیان کی ہیں، سو آپ کے علم غیب کے متعلق یہ کل چھیاسی احادیث ہیں اور ہر ہر حدیث متعدد کتب حدیث کے حوالوں سے مزین ہے۔ ہم نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علم غیب سے متعلق تمام احادیث کا احاطہ اور احصاء نہیں کیا اور طوالت کی وجہ سے بیشمار احادیث کو

ترک کر دیا، اس سے قارئین کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اللہ تعالیٰ نے جو علم غیب عطافرمایا تھا، وہ علم کا ایسا عظیم سمندر ہے جس کا تصور بھی ہم لوگ نہیں کر سکتے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ کہلوانے کی توجیہ کہ اگر میں غیب کو جانتا تو خیر کثیر جمع کر لیتا

علامہ علی بن محمد خازن متوفی 725ھ لکھتے ہیں:

اگر تم یہ اعتراض کرو کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بکثرت واقعات کی خبر دی ہے اور یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عظیم معجزوں میں سے ہے تو ان احادیث اور آیت کریمہ "لو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر" (الاعراف: 188) میں کیسے تطبیق ہو گی، تو میں کہوں گا کہ ہو سکتا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بطور تواضع اور ادب یہ کلمات کہلوائے ہوں اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے مطلع اور قادر کیے بغیر میں غیب کو نہیں جانتا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو غیب پر مطلع کرنے سے پہلے یہ کلمات کہلوائے ہوں، پھر جب اللہ نے آپ کو مطلع کر دیا تو آپ نے غیب کی خبریں دیں، جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے: عالم الغیب فلا یظہر علی غیبہ احدا الا من ارتضی من رسول۔ (الجن: 26۔27)

یا اس آیت میں کفار کے سوال کا جواب ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت سارے مغیبات پر مطلع فرمایا تو آپ نے ان کی خبریں دی اور یہ آپ کا معجزہ ہو گیا اور آپ کی نبوت کی صحت پر دلیل۔ (لباب التاویل للخازن ج 2، ص 167، مطبوعہ پشاور)

علامہ سلیمان جمل متوفی 1204ھ اور علامہ آلوسی متوفی 1270ھ نے بھی ان جوابات کو ذکر کیا ہے۔ علامہ سلیمان نے ان جوابات کو اختیار کیا ہے اور علامہ آلوسی نے ان جوابات میں تامل کی دعوت دی ہے۔ (حاشیۃ الجمل علی الجلالین ج 2، ص 217، روح المعانی ج 9، ص 137)

علامہ آلوسی کا مختار جواب یہ ہے کہ اس آیت میں علم غیب کے استمرار کی نفی ہے یعنی اگر میں ہمیشہ غیب کو جانتا ہوتا تو خیر کثیر کو جمع کر لیتا۔ (روح المعانی ج 9، ص 137، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ خفاجی متوفی 1069ھ نے یہ جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر علم کی نفی کرائی گئی ہے اور جن احادیث میں علم کا ثبوت ہے وہ اللہ کے بتانے سے ہے۔ (نسیم الریاض ج 3، ص 150، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

صدر الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی 1367ھ لکھتے ہیں:

یہ کلام براہ ادب و تواضع ہے، معنی یہ ہیں کہ میں اپنی ذات سے غیب نہیں جانتا جو جانتا ہوں وہ اللہ تعالیٰ کی عطا اور اس کی اطلاع سے (خازن) حضرت مترجم (اعلی حضرت) قدس سرہ نے فرمایا بھلائی جمع کرنا اور برائی نہ پہنچنا اسی کے اختیار میں ہو سکتا ہے، جو ذاتی قدرت رکھے اور ذاتی قدرت وہی رکھے گا جس کا علم بھی ذاتی ہو، کیونکہ جس کی ایک صفت ذاتی ہے تو اس کے تمام صفات ذات، تو معنی یہ ہوئے کہ اگر مجھے غیب کا علم ذاتی ہوتا، تو قدرت بھی ذاتی ہوتی اور میں بھلائی جمع کر لیتا اور برائی نہ پہنچنے دیتا، بھلائی سے مراد راحتیں اور کامیابیاں اور دشمنوں پر غلبہ ہے اور برائیوں سے مراد تنگی اور تکلیف اور دشمنوں کا غالب آنا ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بھلائی سے مراد سرکشوں کا مطیع اور نافرمانوں کا فرماں بردار اور کافروں کا مومن کر لینا ہو، اور برائی سے بدبخت لوگوں کا باوجود دعوت کے محروم رہ جانا، تو حاصل کلام یہ ہوگا کہ اگر میں نفع اور ضرر کا ذاتی اختیار رکھتا تو اے منافقین و کافرین تمہیں سب کو مومن کر ڈالتا اور تمہاری کفری حالت دیکھنے کی تکلیف مجھے نہ پہنچتی۔ (خزائن العرفان علی حاشیۃ کنزل الایمان ص 282، مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور)

علماء دیوبند نے بھی اس سے ملتی جلتی اس آیت کی تفسیر کی ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عالم الغیب کہنے اور آپ کی طرف علم غیب کی نسبت کرنے میں علماء دیوبند کا نظریہ

مفتی محمد شفیع دیوبندی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ اس کا اعلان کر دیں کہ میں اپنے نفس کے لیے بھی نفع نقصان کا مالک نہیں، دوسروں کے نفع نقصان کا تو کیا ذکر ہے۔

اسی طرح یہ بھی اعلان کر دیں کہ میں عالم الغیب نہیں ہوں کہ ہر چیز کا علم ہونا میرے لیے ضروری ہو، اور اگر مجھے علم غیب ہوتا تو میں ہر نفع کی چیز کو ضرور حاصل کر لیا کرتا اور کوئی نفع میرے ہاتھ سے فوت نہ ہوتا۔ اور ہر نقصان کی چیز سے ہمیشہ محفوظ ہی ہوتا تو میں ہر نفع کی چیز کو ضرور حاصل کر لیا کرتا اور کوئی نفع میرے ہاتھ سے فوت نہ ہوتا۔ اور ہر نقصان کی چیز سے ہمیشہ محفوظ ہی رہتا اور کبھی کوئی نقصان مجھے نہ پہنچتا۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں نہیں ہیں، بہت سے کام ایسے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو حاصل کرنا چاہا مگر حاصل نہیں ہوئے اور بہت سی تکلیفیں اور مضرتیں ایسی ہیں جن سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بچنے کا ارادہ کیا مگر وہ مضرت وتکلیف پہنچ گئی۔ غزوہ حدیبیہ کے موقع پر آپ صحابہ کرام کے ساتھ احرام باندھ کر عمرہ کا ارادہ کرکے حدود حرم تک پہنچ گئے مگر حرم میں داخلہ اور عمرہ کی ادائیگی اس وقت نہ ہو سکی سب کو احرام کھول کر واپس ہونا پڑا۔

اسی طرح غزوہ احد میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو زخم پہنچا اور مسلمانوں کو عارضی شکست ہوئی، اسی طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زندگی میں معروف ومشہور ہیں۔

اور شاید ایسے واقعات کے ظاہر کرنے کا مقصد ہی یہ ہو کہ لوگوں پر عملاً یہ بات واضح کر دی جائے کہ انبیاء (علیہم السلام) اگرچہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مقبول اور افضل خلائق ہیں مگر پھر بھی وہ خدائی علم وقدرت کے مالک نہیں تاکہ لوگ اس غلط فہمی کے شکار نہ ہو جائیں جس میں عیسائی اور نصرانی مبتلا ہو گئے کہ اپنے رسول کو خدائی صفات کا مالک سمجھ بیٹھے اور اس طرح شرک میں مبتلا ہو گئے۔

اس آیت نے بھی یہ واضح کر دیا کہ انبیاء (علیہم السلام) نہ قادر مطلق ہوتے ہیں نہ عالم الغیب بلکہ ان کو علم وقدرت کا اتنا ہی حصہ حاصل ہوتا ہے جتنا من جانب اللہ ان کو دے دیا جائے۔

ہاں اس میں شک وشبہ نہیں کہ جو حصہ علم کا ان کو عطا ہوتا ہے وہ ساری مخلوقات سے بڑھا ہوا ہوتا ہے خصوصاً ہمارے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اولین وآخرین کا علم عطا فرمایا گیا تھا۔ یعنی تمام انبیاء (علیہم السلام) کو جتنا علم دیا گیا تھا وہ سب اور اس سے بھی زیادہ آپ کو عطا فرمایا گیا تھا۔ اور اسی عطا شدہ علم کے مطابق آپ نے ہزاروں غیب کی باتوں کی خبریں دیں جن کی سچائی کا ہر عام وخاص نے مشاہدہ کیا۔ اس کی وجہ سے یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہزاروں لاکھوں غیب کی چیزوں کا علم عطا کیا گیا تھا، مگر اس کو اصطلاح قرآن میں علم غیب نہیں کہہ سکتے ہیں اور اس کی وجہ سے رسول کو عالم الغیب نہیں کہا جا سکتا۔ (معارف القرآن ج4، ص 147۔148، مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی، 1993ء)

اس کی مزید وضاحت اس تفسیر سے ہوتی ہے جو شیخ شبیر احمد عثمانی متوفی 1369ھ نے النمل: 65 میں سپرد قلم کی ہے۔

ہاں بعض بندوں کو بعض غیوب پر باختیار خود مطلع کر دیتا ہے جس کی وجہ سے کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شخص کو حق تعالیٰ نے غیب پر مطلع فرمایا یا غیب کی خبر دے دی، لیکن اتنی بات کی وجہ سے قرآن وسنت نے کسی جگہ ایسے شخص پر عالم الغیب یا فلاں یعلم الغیب کا اطلاق نہیں کیا۔ بلکہ احادیث میں اس پر انکار کیا گیا ہے کیونکہ بظاہر یہ الفاظ اختصاص علم الغیب بذات الباری کے خلاف موہم ہوتے ہیں، اس لیے علماء محققین اجازت نہیں دیتے کہ اس طرح کے الفاظ کسی بندہ پر اطلاق کیے جائیں۔ گو لغۃً صحیح ہوں (الی قولہ) واضح رہے کہ علم غیب سے ہماری مراد محض، ظنون وتخمینات نہیں اور نہ وہ علم جو قرائن ودلائل سے حاصل کیا جائے بلکہ جس کے لیے کوئی دلیل وقرینہ نہ ہو وہ ماد ہے۔ اور الاعراف: 188 کی تفسیر کے آخر میں لکھتے ہیں: بہر حال اس آیت میں کھول کر بتلا دیا کہ اختیار مستقل یا علم محیط نبوت کے لوازم میں سے نہیں جیسا کہ بعض جہلاء سمجھتے ہیں۔ ہاں شرعیات کا علم جو انبیاء (علیہم السلام) کے منصب سے متعلق ہے کامل ہونا چاہیے، اور تکوینات کا علم خدا تعالیٰ جس کو جس قدر مناسب جانے عطا فرماتا ہے۔ اس نوع میں ہمارے حضور تمام اولین وآخرین سے فائق ہیں۔ آپ کو اتنے بیشمار علوم ومعارف حق تعالیٰ نے مرحمت فرمائے ہیں جن کا احصاء کسی مخلوق کی طاقت میں نہیں۔

ہمارے نزدیک بھی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو باوجود عالم ماکان ومایکون ہونے کے عالم الغیب کہنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح مطلقاً یوں نہیں کہنا چاہیے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غیب جانتے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو غیب کا علم دیا گیا یا نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو غیب پر مطلع کیا گیا۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عالم الغیب کہنے اور آپ کی طرف علم غیب کی نسبت کرنے میں اعلی حضرت کا نظریہ

اعلی حضرت امام احمد رضا متوفی 1340ھ لکھتے ہیں:

علم غیب عطا ہونا اور لفظ عالم الغیب کا اطلاق اور بعض اجلہ اکابر کے کلام میں اگرچہ بندہ مومن کی نسبت صریح لفظ یعلم الغیب وارد ہے کما فی مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح للملا علی القاری بلکہ خود حدیث سیدنا عبداللہ بن عباس (رض) میں سیدنا خضر (علیہ السلام) کی نسبت ارشاد ہے کان یعلم علم الغیب مگر ہماری تحقیق میں لفظ عالم الغیب کا اطلاق حضرت عزت عزجلالہ کے ساتھ خاص ہے کہ اس سے عرفاً علم بالذات متبادر ہے۔ کشاف میں ہے المراد بہ الخفی الذی لاینفذ فیہ ابتداء الا علم اللطیف الخبیر ولہذا لا یجوز ان یطلق فیقال فلان یعلم الغیب (غیب سے مراد وہ پوشیدہ چیز ہے جس میں ابتدا صرف اللہ تعالیٰ کا علم نافذ ہوتا ہے۔ اس لیے مطلقاً یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ فلاں شخص غیب کو جانتا ہے)

اور اس سے انکار معنی لازم نہیں آتا۔ حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قطعاً بیشمار غیوب وماکان ومایکون کے عالم ہیں مگر الم الغیب صرف اللہ عزوجل کو کہا جائے گا، جس طرح حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قطعاً عزت وجلالت والے ہیں تمام عالم میں ان کے برابر کوئی عزیز و جلیل نہ ہے نہ ہوسکتا ہے مگر محمد عزوجل کہنا جائز نہیں بلکہ اللہ عزوجل و محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔ غرض صدق و صورت معنی کو جواز اطلاق لفظ لازم نہیں نہ منع اطلاق لفظ کو نفی صحت معنی، امام ابن المنیر اسکندری کتاب الانصاف میں فرماتے ہیں کم من معتقد لایطلق القول بہ خشیۃ ایھام غیرہ ممالا یجوز اعتقادہ فلاربط بین الاعتقاد والاطلاق (کتنے عقائد ایسے ہیں جن کا مطلقاً قول نہیں کیا جاتا۔ مبادا ان کے غیر کا وہم کیا جائے جن کا اعتقاد جائز نہیں ہے، اس لیے کسی چیز کا اعتقاد رکھنے اور اس کا اطلاق کرنے میں کوئی تلازم نہیں ہے) یہ سب اس صورت میں ہے کہ مقید بقید اطلاق اطلاق کیا جائے یا بلا قید علی الاطلاق مثلا عالم الغیب یا عالم الغیب علی الاطلاق اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ بالواسطہ یا باالعطا کی تصریح کردی جائے تو وہ محذور نہیں کہ ایمان زائل اور مراد حاصل۔ علامہ سید شریف قدس سرہ حواشی کشاف میں فرماتے ہیں وانمالم یجز الاطلاق فی غیر تعالیٰ لانہ یتبادر منہ تعلق علم بہ ابتداء فیکون منا قضا واما اذا قید وقیل اعلمہ اللہ تعالیٰ الغیب اواطلعہ علیہ فلا محذور فیہ (اللہ تعالیٰ کے غیر کے لیے علم غیب کا اطلاق کرنا اس لیے جائز نہیں ہے کیونکہ اس سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ علم کا تعلق ابتداءً ہے، تو یہ قرآن مجید کے خلاف ہوجائے گا لیکن جب اس کو مقید کیا جائے اور یوں کہا جائے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے غیب کی خبر دی ہے یا اس کو غیب پر مطلع فرمایا ہے تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں ہے)۔ (فتاوی رضویہ ج 9، ص 81، مطبوعہ دار العلوم امجدیہ، کراچی)

نیز اعلی حضرت امام احمد رضا فرماتے ہیں :

علم مافی الغد (کل کا علم) کے بارے میں ام المومنین کا قول ہے کہ جو یہ کہے کہ حضور کو علم مافی الغد تھا (کل کا علم تھا) وہ جھوٹا ہے۔ اس سے مطلق علم کا انکار نکالنا محض جہالت ہے علم جب کہ مطلق بولا جائے خصوصاً جب کہ غیب کی خبر کی طرف مضاف ہو تو اس سے مراد علم ذاتی ہوتا ہے۔ اس کی تصریح حاشیہ کشاف پر میر سید شریف (رح) نے کردی ہے اور یہ یقیناً حق ہے کہ کوئی شخص کسی مخلوق کے لیے ایک ذرہ کا بھی علم ذاتی مانے یقیناً کافر ہے۔ (ملفوظات ج 3، ص 34، مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی)

اعلی حضرت فاضل بریلوی اور شیخ شبیر احمد عثمانی دونوں نے ہی یہ تصریح کی ہے کہ علوم اولین وآخرین کے حامل ہونے اور بکثرت غیوب پر مطلع ہونے کے باوجود نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عالم الغیب کہنا اور آپ کی طرف علم غیب کی نسبت کرنا ہرچند کہ از روئے لغت اور معنی صحیح ہے لیکن اصطلاحاً صحیح نہیں ہے۔
(تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَىِٕنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝١٨٩

لغۃ القرآن: [هُوَ : وہ] [الَّذِيْ : وہ ہے جس نے] [خَلَقَكُمْ : پیدا کیا تم لوگوں کو] [مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ : ایک جان سے] [وَّجَعَلَ : اور اس نے بنایا] [مِنْهَا : اس (جان) سے] [زَوْجَهَا : اس کا جوڑا] [لِيَسْكُنَ : تاکہ وہ سکون پکڑے] [اِلَيْهَا : اس سے] [فَلَمَّا : پھر جب] [تَغَشّٰىهَا : اس (مذکر) نے ڈھانپ لیا اس (مؤنث) نے اٹھایا] [حَمَلَتْ : تو اس (مونث) نے اٹھایا] [حَمْلًا خَفِيْفًا : ایک ہلکا بوجھ] [فَمَرَّتْ : پھر وہ چلی] [بِهٖ : اس کے ساتھ] [فَلَمَّآ : پھر جب] [اَثْقَلَتْ : اس نے بوجھ لادا] [دَّعَوَا : تو دونوں نے پکارا] [اللّٰهَ : اللہ کو] [رَبَّهُمَا : جو دونوں کا رب ہے] [لَىِٕنْ : بیشک اگر] [اٰتَيْتَنَا : تو دے گا ہم کو] [صَالِحًا : ایک نیک (اولاد)] [لَّنَكُوْنَنَّ : تو ہم ضرور ہوں گے] [مِنَ : سے] [الشّٰكِرِيْنَ : شکر کرنے والوں]

ترجمہ: اور وہی (اللہ) ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا فرمایا اور اسی میں سے اس کا جوڑ بنایا تاکہ وہ اس سے سکون حاصل کرے، پھر جب مرد نے اس (عورت) کو ڈھانپ لیا تو وہ خفیف بوجھ کے ساتھ حاملہ ہو گئی، پھر وہ اس کے ساتھ چلتی پھرتی رہی، پھر جب وہ گراں بار ہوئی تو دونوں نے اپنے رب اللہ سے دعا کی کہ اگر تو ہمیں اچھا تندرست بچہ عطا فرما دے تو ہم ضرور شکر گزاروں میں سے ہوں گے

تشریح: توحید کا بیان تب ہی مکمل ہو سکتا ہے جب اس کے ساتھ شرک کا رد بھی کیا جائے۔ چنانچہ اس آیت میں شرک کی تردید کر کے مسئلہ توحید کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ خدا اور معبود تو وہ ذات ہے جس نے تمہیں پیدا فرمایا اور تمہاری تسکین قلب اور راحت و آرام کے لیے تمہاری جنس سے صنف نازک کی تخلیق فرمائی اور تمہارے درمیان میاں بیوی کا رشتہ استوار کر دیا۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ تم ہمیشہ اپنے مولائے کریم کے حضور میں سر نیاز خم کیے رہتے اور اس کی عبادت اور یاد میں سرشار رہتے۔ لیکن تمہاری حالت یہ ہے کہ جب تمہیں امید لگتی ہے تو تم دونوں میاں بیوی التجائیں کرتے ہو کہ اے ہمارے رب! اگر تو نے ہمیں صحیح اور تندرست فرزند عطا کیا تو ہم عمر بھر تیرے شکر گزار رہیں گے۔ لیکن جب وہ کرم فرماتا ہے اور تمہاری شاخ آرزو پر امید کا پھول کھلتا ہے اور تمہاری اداس گود ایک خوبصورت بچے سے آباد ہو جاتی ہے تو تم جھٹ اس دینے والے کو بھول جاتے ہو اور کہتے ہو کہ یہ تو عمل مباشرت کا طبعی نتیجہ ہے۔ یا یہ فلاں ستارے کی تاثیر ہے یا یہ ہمیں فلاں بت نے بخشا ہے۔ یہ کتنی احسان فراموشی اور حق ناشناسی ہے محققین علماء کرام کے نزدیک یہ روایت مردود ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) و حوا نے شیطان کے بہکانے سے اپنے ایک بیٹے کا نام عبد الحارث رکھا تھا (حارث شیطان کا نام تھا جس سے وہ فرشتوں میں پکارا جاتا تھا) امام رازی (رح) نے اس کی سخت تردید کی ہے۔ آیت کا مفہوم مختصراً ذہن نشین کر لینے کے بعد اب آیت کی لفظی تشریحات ملاحظہ فرمائیے۔ لیسکن میں ھو ضمیر کا مرجع نفس ہے جو مونث سماعی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ لتسکن ہوتا۔ لیکن کیونکہ نفس سے مراد یہاں مرد ہے اس لیے معنی کا لحاظ کرتے ہوئے صیغہ مذکر (لیسکن) استعمال کیا۔ اگر یہاں لفظ کی رعایت کی جاتی تو کلام میں خلط ہو جاتا اور یہ پتہ نہ چلتا کہ اس سے مراد خاوند ہے یا بیوی۔ کیونکہ یہاں دونوں مذکور ہیں۔ اس لیے معنی اور مفہوم میں التباس کو رفع کرنے کے لیے نفس کے مدلول

(خاوند) کو پیش نظر رکھتے ہوئے صیغہ مذکر استعمال کیا (فلما تغشٰھا) کنایہ ہے صحبت سے۔ مرت بہ ای استمرت بہ والمراد بقیت بہ کماکانت قبل حیث قامت وقعدت واخذت وترکت (قرطبیؒ) (تفسیر ضیاء القرآن)

اس آیت کے شروع میں بطور تمہید حضرت آدم و حوا (علیہما السلام) کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ان ہی سے انسانیت کا سلسلہ شروع ہوا مگر بعد میں ایک عام جوڑے کو بطور تمثیل بیان کیا گیا ہے جس کے ذریعہ مشرکین کی حالت اور سوچ کو اجاگر کرنا مقصود ہے۔ (تفسیر کبیر) یعنی مشرک میاں بیوی کے ہاں جب اولاد کی امید لگتی ہے، ماں کا پیٹ بڑھ جاتا ہے تو میاں بیوی کو خوشی کے ساتھ ساتھ یہ اندیشہ بھی دامن گیر ہو جاتا ہے کہ اگر یہ بچہ اندھا، بہرا یا جسمانی و ذہنی اعتبار سے معذور پیدا ہوا تو ماں باپ کی زندگی بھی عذاب بن جائے گی، لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر یہ بچہ صحیح وسالم پیدا ہوا تو ہم ضرور تیرے شکر گزار رہیں گے مگر جب اللہ تعالیٰ نے انھیں صحیح وسالم اولاد عطا فرمائی تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کو بھول گئے اور اس کو بتوں کی طرف منسوب کرنے لگے حالانکہ بت تو خود مخلوق ہیں، وہ نہ تو کوئی چیز پیدا کر سکتے ہیں اور نہ کسی کی مدد کر سکتے ہیں بلکہ وہ تو اپنی مدد کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ ان کے منہ پر مکھی بیٹھ جائے تو اسے اڑانے کی طاقت بھی نہیں رکھتے اور ان کی حالت یہ ہے کہ اگر تم بتوں کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ تمہاری پیروی نہیں کر سکتے کیونکہ وہ بے جان ہیں، لہٰذا ان کو بلایا اور نہ بلانا دونوں برابر ہیں۔ (تفسیر امداد الکرم)

دراصل عقیدہ توحید دین کی روح اور اس کی بنیاد ہے۔ اسے سمجھانے کے لیے قرآن مجید نے کائنات کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیزوں سے استدلال کرکے عقیدہ توحید کو واضح کیا ہے۔ سب سے پہلا توحید کے لیے جو استدلال پیش کیا گیا ہے وہ انسان کی تخلیق کے متعلق ہے۔ پہلی وحی میں فرمایا گیا کہ اس رب کے نام کے ساتھ پڑھیے جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا سورۃ النساء آیت (۱) میں ارشاد ہوا کہ لوگو! اس رب کی نافرمانی سے بچو جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا فرمایا۔ اس سے اس کی بیوی کو جنم دیا اور پھر دونوں سے بیشمار مرد اور عورتیں پیدا فرمائیں۔ وہاں خَلَقَ اور یہاں جَعَلَ کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا معنی پیدا کرنا اور بنانا ہے۔ پھر یہاں بیوی کے رشتے کی غرض وغایت بیان فرمائی کہ یہ رشتہ باہمی سکون کا باعث ہے۔ تاکہ باہم سکون حاصل کرتے ہوئے سلسلہ تخلیق کی بنیاد بن سکے۔ ازدواجی تعلقات کے یہاں دو مقاصد بیان کیے ہیں۔

۱۔ میاں بیوی کے درمیان باہم اطمینان اور سکون کا رشتہ ہونا چاہیے جس کی تفصیل سورۃ الروم آیت ۲۱ میں یوں بیان کی ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کہ اس نے مردوں کی جنس سے ہی ان کی بیویوں کو پیدا کیا تاکہ ان سے سکون حاصل کریں۔ اس نے تمہارے درمیان محبت اور مہربانی کا جذبہ قائم فرمایا ہے۔

سورۃ البقرۃ آیت ۱۸۷ میں ازدواجی رشتہ کو ایک دوسرے کے لیے لباس قرار دیا گیا ہے۔ یعنی ازدواجی زندگی میں چار باتیں ہونی چاہیں۔

۱۔ باہم اطمینان اور اعتماد۔

۲۔ باہمی محبت۔

۳۔ ایک دوسرے پر شفقت و مہربانی کرنا۔

۴۔ ایک دوسرے کی پردہ پوشی کرنا۔

یہ وہ چار بنیادی تقاضے ہیں کہ اگر ان کا خیال رکھا جائے تو گھر کی زندگی پر سکون، امن وامان اور محبت و مہربانی کا گہوارا بن سکتی ہے۔ یہاں تخلیق انسانی کی ابتدائی کیفیت کا تذکرہ کرتے ہوئے تَغَشّٰہَا کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس کا معنیٰ ڈھانپ لینا ہے جو میاں بیوی کی صحبت اور تعلق کی طرف اشارہ ہے۔ جس کے نتیجہ میں بیوی صاحب امید ہوتی ہے اور اس پر کچھ مہینے ایسے گزرتے ہیں جن میں وہ اپنے معمول کے مطابق زندگی گزارتی ہے لیکن جب مادہ منویہ خون کے بعد لوتھڑے میں تبدیل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں روح پیدا کرتا ہے۔ اس کے بعد عورت محتاط ہونے کے ساتھ اپنے وجود میں دن بدن ایک بوجھ محسوس کرتی ہے امید کے یہ ایام ایسے ہوتے ہیں جن میں میاں بیوی اپنے رب کے حضور مسلسل دعائیں کرتے ہیں کہ الٰہی! ہمیں خوبصورت اور خوب سیرت بیٹا عنایت فرما۔ ہم تیرے شکر گزار بن کر رہیں

گے لیکن جب انھیں صحت مند بیٹا عنایت ہوتا ہے تو پھر اپنے خالق ومالک کے ساتھ دوسروں کو شریک گردانتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ شرک سے مبرا اور ان باتوں سے بلند و بالا ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں کرتے ہیں۔ (تفسیر فہم القرآن)

یہاں سے اہمیت نکاح معلوم ہوئی۔ جب عورت مرد کے سکون کے لیے بنائی گئی ہے تو وہ سکون نکاح ہی سے حاصل ہو سکتا ہے اور وہ سکون جسمانی بھی ہے روحانی بھی کیونکہ مرد جب بیوی سے جسمانی تقاضے پورے کرتا ہے تو نہ صرف اس کے جسم کو سکون ملتا ہے بلکہ اس کا ایمان بھی محفوظ ہو جاتا ہے اور یہ نکاح ہی کے ثمرات ہیں۔ اس لیے حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) سے مروی ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "نکاح میری سنت ہے جس نے میری سنت سے اعراض کیا اس کا مجھ سے تعلق نہیں۔" (ابن ماجہ کتاب النکاح باب 1)

عورت مرد کے تابع ہے:

لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا۔ میں یہ اشارہ ہے کہ گھر کی گاڑی چلانے والا مرد ہے اور عورت اس کی خادمہ ہے وہ مرد کی تسکین کے لیے پیدا کی گئی ہے کہ اپنے شوہر کے بچوں کی پرورش کرے شوہر کے گھر کی حفاظت کرے اور اس کے جسمانی تقاضے پورے کرے۔ گویا نظام حیات کا چلانے والا مرد ہی ہے، عورت اس کی مددگار ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا: الرجال قوامون علی النساء۔ "مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔" (نساء: 34) (تفسیر برہان القرآن)

وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔ اب یہاں پر ایک نعمت کا ذکر کیا گیا کہ اپنے رب کو پہچانو۔ اللہ نے تم کو پیدا کیا۔ تمہاری تخلیق فرمائی اور اسی سے ایک جنس سے اس کا جوڑا بنا دیا۔ بیویوں کا ذکر کیا گیا۔ آیت۔ زوجھا لیسکن الیھا۔ بیوی کا ذکر کیا۔ سکون جیسی نعمت۔ peace جیسی نعمت عورتوں کے پاس اور عورت بھی کون بیوی کی حیثیت سے جو وہ ہوتی ہے۔ سکون کی دولت اللہ نے بیوی کے پاس رکھوائی ہے۔ آج ساری دنیا سکون تلاش کر رہی ہے۔ کبھی دواؤں کے اندر کبھی میوزک کے اندر کبھی ڈرگز کے اندر لیکن سکون وہ چیز نہیں ہے جو دواؤں سے حاصل کیا جا سکے۔ بازار جا کر خرید کر لایا جا سکے۔ بازاروں میں سکون نہیں ملتا۔ سکون اللہ نے بیوی کے پاس رکھوایا ہے۔ اور اگر کوئی مرد اپنی بیوی کو پریشان کرتا ہے۔ بے سکون کرتا ہے۔ تنگ کرتا ہے۔ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارتا ہے۔ کبھی نہیں اس کو سکون ملے گا۔ ایسی انمول اکیسر priceless دولت ہے اللہ نے بیوی کے پاس رکھوا دی۔ بیوی کی خوبیوں میں بہت بڑی یہ کہ Home maker ہے۔ گھر بنانے والی ہو۔ کہاوت ہے انگریزی کی کہ be hind every great man there is a woman سورۃ روم میں بھی اس سے ملتا جلتا مضمون آیا ہے۔ آیت و من ایتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا۔ کہ اللہ کی آیات میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جانوں سے جوڑا بنایا۔ تمہاری بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو۔ عورت کی فطرت کے اندر نرمی ہے۔ خیال کرنا ہے۔ محبت ہے۔ رحمت ہے اس کی فطرت کے اندر کتنا بھی شوہر پریشان ہو۔ کتنا بھی شوہر up set ہو۔ اگر اچھی بیوی اس کو مل گئی ہے تو بیوی اس کو پرسکون کر دیتی ہے۔ اطمینان دلا دیتی ہے۔ وہ بہت بڑے بڑے کام تو نہیں کر سکتی۔ حالات تبدیل تو نہیں کر سکتی۔ مگر وہ بہر حال پریشان شوہر کو پرسکون کر سکتی ہے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرمایا کرتے تھے۔ خدیجہ (رض) کے بارے میں کہ کوئی پریشانی کوئی مشکل ایسی نہیں تھی کہ جس کو آ کر میں خدیجہ (رض) سے ڈسکس کرتا اور خدیجہ (رض) میری پریشانی ہلکی نہ کر دیتیں۔ مکہ کا دور تھا۔ کفار اتنا تنگ کر رہے تھے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کس قدر مخالفت کر رہے تھے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی۔ آپ up set ہو جاتے تھے پریشان ہو جاتے تھے۔ غمزدہ ہو جاتے تھے۔ خدیجہ (رض) مکہ والوں کی مخالفت تو دور نہیں کر سکتی تھیں۔ لیکن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دے دیا کرتی تھیں۔ انھیں پرسکون کر دیتی تھیں۔ جس کام کو شوہر کہے حتی الامکان بیوی کو چاہیے کہ وہ کرے۔ اطاعت کرے۔ اگر شوہر اس کے بھروسے پر کسی سے کوئی وعدہ کر بیٹھے شریعت کے اندر اندر رہے۔ حتی الامکان بیوی کوشش کرے کہ اس کو پورا کرے۔ شوہر کے وعدے کی لاج رکھے۔ شوہر کی عزت کی اسی کے پیسے کی وہ حفاظت کرے، گھر ایسے ہوں جہاں شوہر کو آ کر سکون ملے۔ اور یہ کب ہوگا جب بیوی خوش مزاج ہو گی۔ خوش مزاج بیوی اور کام کرنے والی بیوی جو Active ہوتی ہے اور اس کے اندر تقویٰ ہوا اگر یہ چیزیں کسی بیوی کے اندر ہیں اس سے اچھی بیوی نہیں ہو سکتی۔ وفاداری ہو۔ اس کی Loyalty اپنے شوہر کے ساتھ ہو پرسکون کرے شوہر کو۔ پریشان نہ کرے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر تنگ نہ کرے۔ اور گھر کو گھر بنا کر رکھے۔ میوزیم بنا کر نہ رکھے کوئی شوروم بنا کر نہ رکھے۔ آج یہ ہو گیا کہ گھر جو ہے وہ سکون کی جگہ نہیں رہے۔ اس لیے کہ اتنی زیادہ ہم House proud ہو گئیں ہیں۔ کہ ہم ایک چیز ادھر سے

ادھر برداشت نہیں کر سکتیں۔ توHousesجو ہیں وہhomesنہیں رہے۔ شوہر گھر میں داخل ہوا نہیں کہ وہاں سے ایک چیخ کی آواز آتی ہے کہ جوتے جگہ پر رکھئے گا ۔بریف کیس وہاں کیوں رکھا۔ تولیہ وہاں کیوں پھینکا۔ اب ان کو نہیں پتہ کہ تولیہ باہر ڈالنا ہوگا یا الماری کیسے ٹھیک رکھنی ہوتی ہے۔ اب آپ ان کو کہاں تک سکھائیں گی۔ رہنے دو۔ کیا کرنا ہے اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اتناclashکرکے۔ آپ خود اٹھا کر رکھدیں۔ بجائے اس کے کہ اس کو ایسا لگے آفس سے گھر آنے کے بجائے کہ کسی ہوسٹل میں آگیا۔ تو ہوسٹلز تھوڑی میں۔ پرسکون رکھیں اپنےHusbandکو۔ اور مزاج شناس ہونا چاہیے بیوی کو اپنے شوہر کا اس کا مزاج سمجھیں۔ مزاج شناس ہونا یہ بڑی چیز ہے۔ کہ اس وقت میرا شوہر مجھ سے کیا چاہ رہا ہے۔ کسی نے ایک بڑی خوبصورت بات کہی ہے انھوں نے کہا کہ اچھی بیوی سکون دینے والی بیوی کیا ہوتی ہے۔She is a friend and a mother and a mistressاب یہ شوہر کا مزاج دیکھیں کہ وہ آپ سے کیا چاہ رہا ہے۔ اچھی بیویاں تو شوہر کی آواز سن کر فون پر ہی پہچان لیتی ہیں کہ آج ان کا مزاج کیسا ہے۔ ھیلو کہنے کے طریقہ سے آپ پہچان جائیں گی کہ آج کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ دروازہ بند ہونے اور قدموں کی آواز سے چلنے کے انداز سے پتہ چل جاتا ہے کہ آج میری شامت ہے۔ آج تو خیر نہیں۔ اللہ ہی کرے۔ تو اس طرح سے مزاج سمجھیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں کن باتوں پرirritateہوتے ہیں ان چیزوں کو مت touchکیا کریں۔ جن باتوں پر ان کو چڑ ہو رہی ہے۔ ان باتوں کا کیا ذکر کرنا۔ یا چھوٹی چھوٹی باتوں پر شکایتوں کا ایک پلندہ جمع کرکے رکھتا کہ شوہر گھر آئے گا تو اب یہ کہوں گی۔ یہ کہوں گی۔ بچوں کی شکایتیں۔ نوکر کی شکایتیں۔ اپنی بیماری کے تذکرے۔ وہ تھکا ہارا گھر آیا ہے۔ اس کو سکون کی ضرورت ہے اس کو سکون پہنچائیں۔ اپنے ٹمپریچر کو نارمل رکھنے کی ضرورت ہے ایک دمhyperنہ ہو جایا کریں۔ جب بیویاں اتنیhyper ہو جاتی ہیں تو شوہر کو بھی اپنا سارا ٹمپریچر ٹرانسفر کر دیتی ہیں۔ اسی لیے آج کل ہم دیکھ رہے ہیں کہ مردوں میں کتنی زیادہ بیماریاں بڑھ گئیں ہیں بلڈ پریشر ان کو ہوتا ہے ہارٹ پرابلم ان کو ہوتا ہے۔ کونسی بیماری ہے جو آج کل مردوں کو نہیں ہو رہی۔ اس کا مطلب ہے۔ کہ بیویوں نے خیال نہیں کیا جیسا کرنا چاہیے۔ سکون کا سامان نہیں فراہم کیا ہو کیونکہ اس میں عین ممکن ہے کہ شوہر کا اپنا قصور ہو۔ اس نے بیوی کی قدر نہیں کی۔ اور اس میں ہو سکتا ہے کہ بیوی کا قصور ہو کہ اس نے شوہر کی قدر نہیں کی۔ وَج کل توwomenکا زمانہ ہے۔ وہ کہتی ہیں ہم کیوں گھر میں رہیں۔ تو جب بیوی گھر میں نہیں ہوگی تو وہ سکون کا سبب کیسے بنے گی۔ تو پوری کوشش کیا کریں کہ اس سے پہلے کہ شوہر گھر میں آئیں آپ موجود ہوں تب ہی شوہر کو گھر گھر لگتا ہے۔ ورنہ سارا گھر موجود ہو لیکن بیوی نہ ہو۔ ان کو لگتا ہے کہ گھر میں کوئی ہے ہی نہیں جیسے۔ تو مزاج پہچان لیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہر ایک کے شوہر کا یہ مزاج نہ ہو۔ لیکن اگر آپ کو اپنے شوہر کی یہTendencyلگتی ہے تو ان کی یہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کا خیال رکھ لینا چاہیے۔ تب ہی سکون کا باعث بنتی ہے بیوی۔ اور یہ بہت بڑاComplimentاللہ تعالیٰ نے یہاں بیوی کو دیا ہے۔ آیت لیسکن الیھا ۔تاکہ وہ سکون پائے اس کے پاس۔ اچھی بیوی جب ہوتی ہے تو شوہر کو اس کے پاس آکر لگتا ہے کہ ساری فکریں ساری پریشانیاں سارے غم لگتا ہے بہت دور چلی گئیں ۔لگتا ہے کہ بس بیوی ہی میری پریشانی دور کر سکتی ہے۔ اور کوئی نہیں بعض اوقات شوہر ایسی بیوی کو تلاش کرنے میں لگتا ہے کہ بچہ ماں کو ڈھونڈ رہا ہے۔ واقعی ایک وہ ماں والی میچورٹی ہوتی ہے بیوی کے اندر۔ اور شوہروں میں بعض دفعہ بالکل بچوں والی چیز پیدا ہو جاتی ہے چھوٹے بچوں کی طرح ہوتے ہیں اگر بیوی ان کو اچھا سمجھتی ہے اپنے آپ کو بہت بڑا چیمپئن سمجھتے ہیں اگر بیوی ان کی بے عزتی کرتی ہے۔ سمجھتے ہیں کہ میری کوئی ویلیو ہی نہیں تو چاہیں تو اپنے شوہر کو آپ سر کا تاج بنا کر رکھیں چاہیں تو پیر کی جوتی بنادیں۔ یہ سب بیوی کا ہی ہوتا ہے کرنے کا کام۔ بیوی کاperceptionہوتا ہے۔ اگر بیوی عزت نہیں کرتی شوہر کی وہ اپنے آپ کو قابل عزت نہیں سمجھتا چاہے ساری دنیا کاpresidendکیوں نہ ہو۔ اور اگر بیوی عزت کرتی ہے اور چاہے وہ سڑک پر جھاڑو ہی دیتا ہو وہ اپنے گھر کا بادشاہ ہوتا ہے۔ تو گھر کا بادشاہ بنانا بیوی کا کام ہے کہ ہم نے کیا مقام دیا ہے شوہروں کو۔ اور جیسی آپ عزت کریں گی اپنے شوہر کی ویسے ہی آپ کے بچے کریں گے۔ اگر آپ عزت نہیں کریں گی تو بچے بھی عزت نہیں کریں گے۔ گھر کے نوکر نہیں عزت کرتے۔ صاحب آئے ہیں آتے رہیں۔ انھیں کوئی پروا نہیں ہوتی۔ تو فرمایا۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانپ لیا۔ تو اسے ایک خفیف سا حمل رہ گیا۔ جیسے لیے لئے وہ چلتی پھرتی رہی۔ شروع شروع کی پریگننسی ہوتی ہے پتہ بھی نہیں چلتا کبConcive کیا پھر کیا ہوتا ہے۔ فرمایا۔ پھر جب وہ بوجھل ہو گئی تو دونوں نے مل کر اللہ اپنے رب سے دعا کی۔ کہ اگر تو نے ہمیں صحیح سالم بچہ دے دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔ صالحا۔ سے مراد ہے یہاں اصطلاحی صالح نہیں ہے جیسے ہم عمل صالح پڑھتے ہیں۔ نیک عمل۔ یہ صرف نیک بچے کی بات نہیں ہے۔ مراد ہے صحیح سلامت بچہ۔Healthy۔physically۔Mentlyہر طرح سے، صحیح سلامت، تندرست بچہ اللہ تو نے ہمیں دے دیا۔ ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔ اور ہر

پریگننسی کے اندر دھڑ کالگارہتا ہے۔ کہ بچہ پتہ نہیں ٹھیک ہوگا۔ نہیں ہوگا۔ جتنی جتنی سائنس ترقی کر رہی ہے اس طرح کے اندیشے اور وسوسے اور انسان کے بڑھ رہے ہیں اتنے زیادہ ٹیسٹ ہوتے ہیں اب کسی ٹیسٹ کی رپورٹ ٹھیک نہ آئی تو اب پریشانی شروع ہو جاتی ہے۔ تو بہت دعا کرتے ہیں والدین کہ اللہ تو نے ہمیں صحیح سلامت بچہ دیا ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔ (تفسیر تنویر)

امام ابن جریر متوفی 310 ھ اور امام ابن ابی حاتم متوفی 327 ھ نے اپنی اپنی سندوں سے روایت کیا ہے:

سعید بن جبیر بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت آدم اور حوا کو زمین پر اتارا گیا تو حضرت آدم کی طبیعت میں شہوت ڈال دی گی اور انھوں نے حضرت حوا سے عمل زوجیت کیا، جس کے نتیجہ میں وہ حاملہ ہو گئیں اور ان کے پیٹ میں بچہ حرکت کرنے لگا اور وہ سوچتی تھیں کہ یہ کیا چیز ہے؟ ان کے پاس ابلیس گیا اور کہنے لگا تم نے زمین پر اونٹنی، گائے، بکری، دنبہ اور بھیڑ کو دیکھا ہے؟ ہو سکتا ہے تمہارے پیٹ سے ایسی ہی کوئی چیز نکلے، حضرت حوا یہ سن کر گھبرا گئیں، اس نے کہا میری بات مان لو، اس کا نام عبدالحارث رکھو تو پھر تمہارے مشابہ بچہ پیدا ہوگا۔ حواء نے حضرت آدم (علیہ السلام) سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ حضرت آدم نے فرمایا یہ وہ شخص ہے جس نے ہم کو جنت سے نکلوایا تھا، وہ بچہ مر گیا، حضرت حوا دوبارہ حاملہ ہوئیں ابلیس پھر ان کے پاس گیا اور کہا میری بات مان لو اس کا نام عبدالحارث رکھو، اور ابلیس کا نام فرشتوں میں حارث تھا، اس نے کہا ورنہ کوئی اونٹنی یا گائے یا بکری یا بھیڑ پیدا ہوگی یا تمہارے مشابہ بچہ ہوا تو میں اس کو مار دوں گا جیسے میں نے پہلے بچہ کو مار دیا تھا۔ حواء نے اس واقعہ کا حضرت آدم سے ذکر کیا انھوں نے گویا اس پر ناگواری ظاہر نہیں کی، تو حواء نے اس بچہ کا نام عبدالحارث رکھ دیا۔ سعید بن جبیر نے ان آیات کا مصداق حضرت آدم اور حوا کو قرار دیا ہے۔

(جامع البیان جز 9، ص 193، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج 5، ص 1632۔ الدر المنثور ج 3، ص 624)

یہ روایت بھی باطل ہے۔ کیونکہ حضرت آدم نے اگر اپنے بیٹے کا نام عبدالحارث بہ طور علم رکھا تھا اور اس کے لفظی معنی کا لحاظ نہیں کیا تھا تو پھر یہ نام رکھنا شرک نہ ہوا کیونکہ اسماء اعلام میں الفاظ کے معانی اصلیہ کا اعتبار نہیں ہوتا۔ پھر حضرت آدم (علیہ السلام) کو ان آیات کا مصداق قرار دینا صحیح نہ ہوا اور اگر حضرت آدم نے اپنے بیٹے کا نام عبدالحارث بہ طور صفت رکھا تھا تو پھر یہ شرک ہے اور حضرت آدم (علیہ السلام) نبی معصوم ہیں ان سے شرک کیسے متصور ہو سکتا ہے یہ کیوں کر متصور ہو سکتا ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) اپنے بیٹے کو ابلیس کا بندہ قرار دیں۔

جعلالہ شرکاء (انہوں نے اللہ کے شریک بنا لیے) کی توجیہات

اب پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں ہے تو دونوں نے اللہ سے دعا کی نیز دوسری روایت میں ہے جب اللہ نے انھیں صحیح وسالم بیٹا دے دیا تو انھوں نے اس کی عطا میں شریک ٹھہرا لیے یہ دعا کرنے والے اور شریک ٹھہرانے والے کون تھے؟ مفسرین کرام نے ان آیات کی حسب ذیل توجیہات کی ہیں:

1۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کا جہل اور ان کا شرک بیان فرمایا ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تم میں سے ہر شخص کو پیدا کیا ہے، اور اسی کی جنس سے اس کی بیوی بنائی اور جب شوہر نے اپنے بیوی سے عمل زوجیت کر لیا اور وہ حاملہ ہو گئی تو دونوں میاں اور بیوی نے اللہ سے دعا کی، جو ان کا رب ہے کہ اگر تو نے ہمیں صحیح وسالم بیٹا دیا تو ہم تیرے شکر گزاروں میں سے ہو جائیں گے اور جب اللہ تعالیٰ نے انھیں صحیح وسالم بیٹا دے دیا تو وہ اللہ کی دی ہوئی نعمت میں شرک کرنے لگے۔ دہریے کہوتے ہیں کہ بچہ کا اس طرح پیدا ہونا انسان کی فطرت کا تقاضا ہے۔ ستارہ پرست کہتے ہیں کہ یہ ستاروں کی چال اور ان کی تاثیر سے پیدا ہوا اور بت پرست یہ کہتے ہیں کہ یہ ان کے بتوں اور دیوی دیوتاؤں کی دین ہے۔ اور یہ لوگ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ فطرت ہو یا ستارے، بت ہوں یا دیوی اور دیوتا، سب کا پیدا کرنے والا اللہ ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے اسی نے اولاد کو بھی پیدا کیا ہے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو بڑھاپے میں اسی نے بیٹا دیا، حضرت زکریا جب بڑھاپے میں اولاد سے ناامید ہو چکے تھے تو انھوں نے اسی کو پکارا اور اسی سے دعا کرنے کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان کی بوڑھی اور بانجھ بیوی کو فرزند عطا کیا۔ سو اولاد کی طلب کے لیے اسی کے آستانہ پر سر جھکانا چاہیے اور اولاد پانے کے بعد اسی کا شکر ادا کرنا چاہیے، البتہ اولاد کی طلب کے لیے نیک لوگوں اور بزرگوں سے دعا کرانا جائز ہے اور ان کے وسیلہ سے دعا مانگنا بھی جائز ہے۔

طلب اولاد کے لیے اگر نذر ماننی ہو تو اللہ کی عبادت مقصودہ کی نذر مانی جائے، نذر عبادت ہے اس لیے کسی ولی یا بزرگ کی نذر ماننا جائز نہیں ہے، اگر کسی بزرگ کی دعا سے اولاد ہو یا ان کے وسیلہ کے ساتھ دعا کرنے سے اولاد ہو، تب بھی اللہ کا شکر ادا کرے اور یوں کہے کہ فلاں بزگ کے وسیلہ سے یا ان کی دعا سے اولاد ہوئی، اور اگر عقیدہ یہ ہو کہ اللہ کے عطا کرنے سے اولاد ہوئی ہے اور فلاں بزرگ وسیلہ ہیں، اور یوں کہے کہ فلاں بزرگ نے اولاد عطا کی ہے تو یہ سبب کی طرف نسبت ہونے کی وجہ

سے شرک نہیں ہے لیکن افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ اس مجازی نسبت کا ذکر کرنے کی بجائے حقیقی نسبت کا ذکر کرے اور اللہ تعالیٰ ہی کا شکرادا کرے جس نے اس بزرگ کی دعا قبول فرمائی اور جائز حد اس بزرگ کی بھی تعظیم کرے کیونکہ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ جو شخص لوگوں کا شکرادا نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکرادا نہیں کرتا۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث : 4811۔ سنن الترمذی، رقم الحدیث : 1961۔ مسند احمد ج 2، ص 258۔ مشکوۃ رقم الحدیث : 3025۔ مجمع الزوائد ج 5، ص 217)

2 :۔ اس آیت میں ان قریش سے خطاب ہے جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد میں تھے، اور وہ قصی کی اولاد تھے، اور اس آیت سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو ایک نفس یعنی قصی سے پیدا کیا اور اس کی جنس سے اس کی بیوی عربیہ قرشیہ بنائی تاکہ وہ اس سے سکون حاصل کرے اور جب اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کے موافق ان کو صحیح وسالم بیٹا عطا فرمادیا تو ان دونوں میاں بیوی نے اس کی دی ہوئی نعمت میں اللہ تعالیٰ کے شریک گھڑ لیے اور انھوں نے اپنے چار بیٹوں کے یہ نام رکھے۔ عبد مناف، عبدالعزی، عبد قصی اور عبداللات اور اس کے بعد ان کے متبعین کے متعلق فرمایا سو اللہ اس سے بلند ہے جس میں وہ شرک کرتے ہیں۔

3 :۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ آیات حضرت آدم اور حواء کے متعلق ہیں تو یہ آیتیں مشرکین کے رد میں نازل ہوئی ہیں اور اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہاں ہمزہ استفہام کا مقس ہے یعنی اجعلالہ شرکاء اور ان آیتوں کا معنی اس طرح ہوگا کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور حواء کی دعا کے موافق ان کو صحیح وسالم بیٹا عطا کردیا تو کیا انھوں نے اللہ کے شریک گھڑ لیے تھے ؟ تو اے مشرکو ! تم کیوں اللہ کے لیے شریک گھڑتے ہو ؟ اور اللہ اس چیز سے بلند ہے جس میں یہ مشرک اللہ کے لیے شریک بناتے ہیں۔

4۔ اس صورت میں دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں جعلا کا فاعل اولادھما ہے اور مضاف کو حذف کرکے مضاف الیہ کو اس کا قائم مقام کردیا جو جعلا میں ضمیر فاعل ہے اور معنی اس طرح ہے اور جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور حواء کی دعاء کے موافق ان کو صحیح وسالم بیٹا دیا تو ان کی اولاد نے اللہ کی ہوئی نعمت میں شرک گھڑ لیے۔

5۔ قتادہ نے حسن سے روایت کیا ہے کہ یہ آیتیں یہود اور نصاریٰ سے متعلق ہیں یعنی جب اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی دعا کے موافق صحیح سالم بیٹا دے دیا تو انھوں نے اس اولاد کو یہود و نصاریٰ بنادیا اور یوں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا۔ (جامع البیان جز 9، ص 197، زاد المسیر ج 3، ص 303)

6۔ حوا ہر مرتبہ ایک مزکر اور یک مونث دو بچے جنتی تھیں اور جعلا کا فاعل یہ دو بچے ہیں۔ یعنی جب ان کی دعا سے حضرت حوا کے دو صحیح وسالم بچے ہوگۓ تو ان بچوں نے بڑے ہو کر اللہ کے شریک بنالیے یا پھر ان کی اولاد در اولاد نے۔ (زاد المسیر ج 3، ص 303، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، 1407 ھ)

غلط طریقہ سے نام لینے اور نام بگاڑنے کی مذمت

بعض تفاسیر کے مطابق ان آیتوں میں شرک فی التسمیہ (نام رکھنے میں شرک) کی مذمت فرمائی ہے۔ یعنی عبدالحارث، عبدالعزی، عبداللات وغیرہ نام رکھنا شرک ہیں۔ اور عبداللہ اور عبدالرحمٰن ایسے نام رکھنے چاہئیں۔ ہمارے زمانہ میں نام کے سلسلہ میں بہت فرو گزاشت پائی جاتی ہے بعض لوگ اپنے بچے کا نام عبدالرحمٰن یا عبدالخالق رکھتے ہیں اور لوگ اس کو رحمٰن صاحب خالق صاحب کہتے ہیں۔ کسی کا نام عبدالغفور ہوتا ہے اس کو لوگ غفورا، غفورا کہتے ہیں۔ کسی کا نام انعام الٰہی ہوتا ہے اور لوگ اس کو الٰہی صاحب کہتے ہیں یہ پڑھے لکھے لوگوں کا حال ہے اور پنجاب میں جو ان پڑھ لوگ ہیں وہ غلام محمد کو گاما اور غلام رسول کو سولا کہتے ہیں اور جس کا نام کنیز فاطمہ ہو اس کو پھتو کہتے ہیں۔ یہ نام تو صحیح اور مستحب ہیں لیکن ان ناموں کو غلط طریقہ سے پکارنے والے سخت بےادبی اور گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے : " ولا تنابزوا بالالقاب بئس الاسم الفسوق بعد الایمان ومن لم یتب فاولئک الم الظلمون : اور ایک دوسرے کو برے القاب سے نہ بلاؤ کیسا برا نام ہے ایمان کے بعد فاسق کہلانا، اور جو لوگ توبہ نہ کریں سو وہی لوگ ظلم کرنے والے ہیں " (الحجرات : 11)

بچوں کا نام رکھنے کی تحقیق

دوسری بڑی خرابی نام رکھنے کے سلسلہ میں ہے لوگوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ نام رکھنے میں انفرادیت ہو اور ان کو یہ شوق ہوتا ہے کہ ان کے بچے کا نام نیا اور اچھوتا ہو۔ خواہ اس کا مطلب، معنی کچھ نہ ہو۔ اس کی ایک عام مثال یہ ہے کہ لوگ شر جیل نام رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ مہمل لفظ ہے اصل لفظ شر حبیل ہے۔ اسی طرح بچی کا نام ثوبیہ رکھتے ہیں یہ بھی مہمل لفظ ہے اصل لفظ ثوبیہ ہے۔ بہترین نام عبداللہ اور امۃ اللہ ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ نام رکھنے کے سلسلہ میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو ہدایات دیں ان پر مشتمل احادیث کو یہاں بیان کردیں۔

پسندیدہ اور ناپسندیدہ ناموں کے متعلق احادیث

حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کے نزدیک تمہارے سب سے پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں۔ (صحیح مسلم الآداب 2 (2132) 5483۔ سنن الترمذی رقم الحدیث : 2841۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 3728)

حضرت زینب بنت ابی سلمہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ میرا نام برہ (نیکوکار) رکھا گیا تھا تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم اپنی پاکیزگی اور بڑائی مت بیان کرو، اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ تم میں سے کون نیکوکار ہے۔ صحابہ نے پوچھا ہم ان کا کیا نام رکھیں؟ آپ نے فرمایا اس کا نام زینب رکھو۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 6192۔ صحیح مسلم الاداب 19 (2142) 5504۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 3732)

جن اسماء سے صاحب اسم کی پاکیزگی اور بڑائی ظاہر ہوتی ہو ایسے نام رکھنا ناپسندیدہ اور مکروہ ہیں، جیسے آج کل لوگ نام رکھتے ہیں شمس الزمان، شمس الہدی، اعظم خان، اکبر خان وغیرہ۔ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ شمس الدین اور محی الدین نام رکھنا ممنوع ہے اس میں خود ستائی کے علاوہ جھوٹ بھی ہے۔ علامہ قرطبی مالکی نے بھی ایسے ناموں کو ممنوع لکھا ہے اور علامہ نووی شافعی نے مکروہ لکھا ہے۔ (ردالمحتار ج 5، ص 268)

حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر کی بیٹی کا نام عاصیہ (گنہ کرنے والی) تھا۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کا نام بدل کر جمیلہ رکھ دیا۔ (صحیح مسلم الاداب، 15 (2139) 5500۔ سنن ابوداؤد رقم الحدیث : 4952۔ سنن الترمزی رقم الحدیث : 2847۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 3733)

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) برے نام کو تبدیل کردیتے تھے۔ (سنن الترمذی، رقم الحدیث : 2848، مطبوعہ دارالفکر، بیروت)

شریح بن ھانی اپنے والد (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اپنی قوم کے ساتھ وفد میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے قوم سے سنا کہ وہ ان کی نیت ابوالحکم کے ساتھ ان کو پکارتے تھے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو بلا کر فرمایا بیشک اللہ ہی حکم ہے اور اسی کی طرف مقدمات پیش کیے جاتے ہیں تم نے اپنی کنیت ابوالحکم کیوں رکھی ہے؟ انھوں نے کہا میری قوم کا جب کسی معاملہ میں اختلاف ہوتا ہے تو وہ میرے پاس آتے ہیں اور میں ان کے درمیان حکم دیتا ہوں (فیصلہ کرتا ہوں) تو میرے حکم پر دونوں فریق راضی ہوجاتے ہیں (سو اس لیے میری کنیت ابوالحکم۔ یعنی حکم دینے والا)۔ آپ نے فرمایا یہ اچھا نہیں ہے، تمہارے بیٹے ہیں، شرح نے کہا میرے تین بیٹے ہیں۔ شریح، مسلم اور عبداللہ۔ آپ نے پوچھا ان میں سے بڑا کون ہے؟ میں نے کہا شریح، آپ نے فرمایا پس تم ابو شریح (شریح والا) ہو۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث : 4955۔ سنن النسائی رقم الحدیث : 5378)

اللہ کے اسماء صفات کی طرف اب کی اضافت کرکے کنیت رکھنا ممنوع ہے تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ یہ شخص اللہ کی صفت والا ہے جیسے کوئی شخص ابوالغفور، ابوالرحیم یا ابوالاعلیٰ کنیت رکھ لے۔

عبدالنبی نام رکھنے کا شرعی حکم

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص یہ نہ کہے میرا عبد، (بندہ) اور میری بندی، تم سب اللہ کے عبد ہو اور تمہاری عورتیں اللہ کی بندی ہیں۔ لیکن تم کو کہنا چاہیے میرا غلام اور میری باندی یا میرا نوکر اور میری نوکرانی۔ (صحیح مسلم الفاظ الادب، 13 (132249 (2249) 2765۔ صحیح البخاری رقم الحدیث : 2552۔ سنن کبری للنسائی رقم الحدیث : 10070۔ مسند احمد ج 2، ص 444)

کسی شخص کا اپنے مملوک کو میرا عبد کہنا خلاف اولی یا مکروہ تنزیہی ہے، حرام نہیں ہے۔ کراہت کی وجہ یہ ہے کہ اس کا مملوک اللہ کا عبد ہے اور اس کی عبادت کرتا ہے، اب اگر اس کا مالک بھی اس کو اپنا عبد کہے تو اس میں شرک کی مشابہت کا خدشہ ہے، لہٰذا اس سے احتراز کے لیے اولیٰ ہے کہ اس کو میرا نوکر اور میرا خادم کہے، اور یہ حرام اس لیے نہیں ہے کہ قرآن مجید میں مالک کی طرف عبد کی اضافت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : " وانکحوا الایامی منکم والصلحین من عبادکم وامئکم : اور تم اپنے بے نکاح (آزاد) مردوں اور عورتوں کا اپنے نیک عباد (غلاموں) اور باندیوں سے نکاح کردو "

اسی طرح احادیث میں بھی عبد کی اضافت مسلمان کی طرف کی گئی ہے۔

" عن ابی ہریرہ ان رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قال لیس علی المسلم فی عبدہ ولا فی فرسہ صدقتہ : حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مسلمان کے بعد اور اس کے گھوڑے میں زکوۃ نہیں ہے " (صحیح البخاری رقم الحدیث : 1463۔ صحیح مسلم زکوۃ 8 (982) 2237۔ سنن ابوداؤد رقم الحدیث : 1594۔ سنن الترمزی 9 رقم الحدیث : 628۔ سنن النسائی رقم الحدیث : 2467۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث : 1812)

علامہ ابن بطال نے کہا کہ اس آیت کی رو سے کسی شخص کا اپنے غلام کو میرا عبد کہنا جائز ہے اور احادیث میں ممانعت تغلیظ کے لیے ہے تحریم کے لیے نہیں، اور یہ مکروہ اس لیے ہے کہ یہ لفظ مشترک ہے کیونکہ اس کا غلام بہر حال اللہ کا عبد ہے اب اگر وہ اسے میرا عبد کہے تو اس سے اس غلام کا مشترک ہونا لازم آگیا۔ (عمدۃ القاری ج 13، ص 110، مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، 1348ھ)

بعض لوگوں کا نام عبد النبی اور عبد الرسول رکھا جاتا ہے۔

شیخ اشرف علی تھانوی نے کفر اور شرک کی باتوں کا بیان، اس عنوان کے تحت لکھا ہے۔ علی بخش، حسین بخش، عبد النبی وغیرہ نام رکھنا۔ (بہشتی زیور، ج 1، ص 35، مطبوعہ ناشران قرآن لمیٹڈ، لاہور)

ظاہر ہے کہ یہ دین میں غلو اور زیادتی ہے۔ عبد النبی اور عبد الرسول نام رکھنا سورۃ نور کی اس آیت کے تحت جائز ہے اور احادیث میں جو ممانعت وارد ہے، اس کی وجہ سے خلاف اولیٰ یا مکروہ تنزیہی ہے۔ ہمارے نزدیک مختار یہی ہے کہ عبد النبی، عبد الرسول اور عبد المصطفیٰ نام رکھنا، ہر چند کہ جائز ہے لیکن چونکہ احادیث میں اس کی ممانعت ہے، اس لیے خلاف اولیٰ یا مکروہ تنزیہی ہے، اس لیے افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ ان کے بجائے غلام نبی، غلام رسول اور غلام مصطفیٰ نام رکھے جائیں۔

علامہ ابن اثیر جزری متوفی 606ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) کی حدیث میں ہے کوئی شخص اپنے مملوک کو میرا عبد نہ کہے بلکہ میرا نوکر یا خادم کہے۔ یہ ممانعت اس لیے کی گئی ہے تاکہ مالک سے تکبر اور بڑائی کی نفی کی جائے اور مالک کی طرف غلام کی عبودیت کی نسبت کی نفی کی جائے اس کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے اور وہی تمام بندوں کا رب ہے۔ (النہایہ ج 3، ص 155، ص مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، مجمع بحار الانوار ج 3 ص 512، مطبوعہ مکتبہ دار الایمان المدینہ المنورہ، 1415ھ)

علامہ عبد الرؤف مناوی شافعی متوفی 1021ھ لکھتے ہیں: اجلاء الشافعیہ میں سے علامہ ازرعی نے کہا فتاوی میں مذکور ہے کہ ایک انسان کا نام عبد النبی رکھا گیا میں نے اس میں توقف کیا۔ پھر میرا اس طرف میلان ہوا کہ یہ نام حرام نہیں ہے، جب اس کے ساتھ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نسبت سے مشرف ہونے کا ارادہ کیا جائے اور لفظ عبد سے خادم کے معنی کا ارادہ کیا جائے اور اس نام کی ممانعت کی بھی گنجائش ہے جب جاہلوں کے عقیدہ شرکیہ کا خدشہ ہو یا کوئی شخص لفظ عبد سے حقیقت عبودیت کا ارادہ کرے، علامہ دمیری نے یہ کہا ہے کہ عبد النبی نام رکھنے کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ جب اس سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف نسبت کرنے کا قصد کیا جائے تو جائز ہے اور اکثر علماء کا میلان اس نام رکھنے کی ممانعت کی طرف ہے، کیونکہ اس میں اللہ کا شریک بنانے کا خدشہ ہے اور حقیقت عبودیت کے اعتقاد کا خطرہ ہے۔ جس طرح عبد الدار نام رکھنا منع ہے اور اسی قیاس پر عبد الکعبہ نام رکھنا حرام ہے۔ (فیض القدیر ج 1، ص 321۔322۔ مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، 1418ھ)

شیخ محمد حنفی لکھتے ہیں:

عبد النبی نام رکھنے کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ یہ حرام ہے، کیونکہ اس سے یہ وہم ہوگا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو پیدا کیا ہے۔ اور اس دلیل کو مسترد کر دیا گیا ہے کیونکہ جو شخص بھی عبد النبی کا لفظ سنتا ہے وہ اس سے خادم کا معنی سمجھتا ہے مخلوق کا معنی نہیں سمجھتا۔ ہاں اولیٰ یہ ہے کہ یہ نام نہ رکھا جائے تاکہ یہ وہم نہ ہو۔ (حاشیہ فیض القدیر علی ھامش السراج المنیر ج 1، ص 51، المطبوعہ المطبعہ الخیریہ، 3104ھ)

علامہ شامی لکھتے ہیں: فقہاء نے عبد فلاں نام رکھنے سے منع کیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبد النبی نام رکھنا ممنوع ہے، علامہ مناوی نے علامہ دمیری (شافعی) سے نقل کیا ہے کہ ایک قول جواز کا ہے جبکہ اس نسبت سے مشرف ہونا مقصود ہو، اور اکثر فقہاء نے اس خدشہ سے منع کیا ہے کہ کوئی حقیقت عبودیت کا اعتقاد کرے، جیسے عبد الدار نام رکھنا جائز نہیں ہے۔ (رد المحتار ج 5 ص 368، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1407ھ)

اعلی حضرت متوفی 1340ھ نے لکھا ہے کہ حضرت عمر (رض) نے برسر منبر خطبہ میں فرمایا میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ تھا میں آپ کا عبد اور خادم تھا۔ (النور والضیاء ص 24، مطبوعہ پروگریسو بکس لاہور)

حضرت عمر (رض) کا یہ ارشاد خلاف اولیٰ نہیں ہے۔ کیونکہ آپ نے عبد کے ساتھ خادم کے لفظ کا ذکر فرمایا ہے جس سے عبد بمعنی مخلوق کا وہم پیدا نہیں ہوتا۔

قیامت کے دن انسان کو اس کے باپ کے نام کی طرف منسوب کرکے پکارا جائے گا یا ماں کے نام کی طرف؟

قیامت کے دن انسان کو اس کے باپ کے نام کی طرف منسوب کرکے پکارا جائے گا۔ امام بخاری نے کتاب الاداب میں ایک باب کا یہ عنوان قائم کیا ہے لوگوں کے آباء کے نام سے پکارا جائے گا اور اس باب کے تحت یہ حدیث ذکر کی ہے۔

حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اولین اور آخرین کو جمع فرمائے گا اور ہر عہد شکن کے لیے ایک جھنڈا بلند کیا جائے گا پھر کہا جائے گا یہ فلاں بن فلاں کی عہد شکنی ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 6177۔ صحیح مسلم جہاد 9 (1735) 4448)

حضرت ابوالدرداء (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بیشک تم قیامت کے دن اپنے ناموں سے اور اپنے باپوں کے ناموں سے پکارے جاؤ گے تو اپنے اچھے نام رکھو۔ (سنن ابو داؤد رقم الھدیث: 4948۔ صحیح ابن حبان رقم الحدیث: 5818۔ سنن دارمی رقم الحدیث: 2694۔ مسند احمد ج 5، ص 194، طبع قدیم، اس کی سند صحیح ہے۔ مسند احمد ج 16، رقم الحدیث: 21859، مطبوعہ دار الحدیث قاہرہ۔ موارد الظمآن رقم الحدیث: 1944۔ سنن کبری للبیہقی ج 9، ص 306۔ مشکوۃ، رقم الحدیث: 4767)

بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص کو اس کی ماں کے نام کی طرف منسوب کرکے پکارا جائے گا۔ ان کا استدلال اس حدیث سے ہے:

سعید بن عبداللہ اودی بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابوامامہ (رض) کے پاس گیا اس وقت وہ نزع کی کیفیت میں تھے۔ انھوں نے کہا جب میں مر جاؤں تو میرے ساتھ اس طرح عمل کرنا جس طرح رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مردوں کے ساتھ عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب تمہارے بھائیوں میں سے کوئی شخص فوت ہو جائے تو تم اس کی قبر کی مٹی ہموار کرنے کے بعد اس کی قبر کے سرہانے کھرے ہو جانا پھر کہنا اے فلاں بن فلانہ، کیونکہ وہ تمہاری بات سنے گا اور جواب نہیں دے سکے گا۔ پھر کہنا اے فلاں بن فلانہ تو پھر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ جائے گا۔ پھر کہنا اے فلاں بن فلانہ تو وہ کہے گا اللہ تم پر رحم کرے ہم کو ہدایت دو، لیکن تم کو اس کے کلام کو شعور نہیں ہوگا۔ پھر اس سے یہ کہنا کہ یاد کرو جب تم دنیا سے گئے تھے تو ان لاالہ الا اللہ وان محمد عبدہ ورسولہ کی شہادت دیتے تھے اور تم اللہ کو رب مان کر، اور اسلام کو دین مان کر، اور (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نبی مان کر اور قرآن کو امام مان کر راضی تھے۔ پھر منکر اور نکیر میں سے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہے گا یہاں سے چلو ہم اس شخص کے نہیں بیٹھتے جس کو جواب تلقین کر دیا گیا ہے۔ ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! اگر ہم کو اس کی ماں کا نام یاد نہ ہو تو؟ آپ نے فرمایا پھر پکارنے والا اس کو حواء کی طرف منسوب کرے اور کہے یا فلاں بن حواء: (المعجم الکبیر ج 8، رقم الحدیث: 7979۔ تہذیب تاریخ دمشق ج 6، ص 424، مجمع الزوائد ج 2، ص 324، کنز العمال رقم الحدیث: 42406،42934)

اس کا جواب یہ ہے کہ ہماری بحث اس میں ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص کو اس کے باپ کی طرف منسوب کرکے پکارا جائے گا اور اس حدیث میں یہ مذکور ہے کہ دفن کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر اس شخص کو اس کی ماں کی طرف منسوب کرکے پکارا جائے لہٰذا یہ حدیث ہمارے خلاف نہیں ہے۔

اس موضوع پر حسب ذیل احادیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا پردہ رکھتے ہوئے قیامت کے دن ان کو ان کے ناموں سے پکارے گا۔ (المعجم الکبیر ج 11، رقم الحدیث: 11242۔ البدور السافرہ ص 335۔ الدر المنثور ج 8، ص 53)

حافظ سیوطی نے البدور السافرہ میں یہ حدیث اسی طرح ذکر کی ہے لیکن الدر المنثور میں امام طبرانی اور امام ابن مردویہ کے حوالوں سے اس طرح ذکر کی ہے: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں کا پردہ رکھتے ہوئے ان کو ان کی ماؤں کی طرف منسوب کرکے پکارے گا۔ لیکن امام طبرانی کی روایت میں ماؤں کا ذکر نہیں ہے۔ حافظ الہیثمی نے کہا ہے اس حدیث کا ایک راوی اسحاق بن بشر ابوحذیفہ متروک ہے (مجمع الزوائد ج 10، ص 359) حافظ محمد بن احمد ذہبی متوفی 748ھ اس کے متعلق لکھتے ہیں: امام ابن حبان نے کہا اس کی احادیث کو اظہار تعجب کے سوا لکھنا جائز نہیں ہے۔ امام دار قطنی نے کہا یہ کذاب متروک ہے۔ علی بن مدینی نے بھی اس کو کذاب قرار دیا، یہ شخص 260ھ میں بخاری میں فوت ہو گیا تھا۔ (میزان الاعتدال ج 1، ص 335، رقم 740، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1416ھ)

امام ابن عدی، اسحاق بن ابراہیم الطبری کی سند سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت انس (رض) نے بیان کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن اللہ عزوجل کی طرف سے لوگوں پر ستر کرتے ہوئے ان کو ان کی ماؤں کی طرف منسوب کرکے پکارا جائے گا۔ امام ابن عدی نے کہا یہ حدیث اس سند کے ساتھ منکر ہے۔ (الکامل فی ضعفاء الرجال ج 1، ص 335، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

علامہ شمس الدین ذہبی اسحاق بن ابراہیم الطبری کے متعلق لکھتے ہیں امام ابن عدی اور امام دار قطنی نے اس کو منکر الحدیث قرار دیا اور امام ابن حبان نے کہا یہ ثقات سے موضوعات کو روایت کرتا ہے، اس کی احادیث کو اظہار تعجب کے سوا روایت کرنا جائز نہیں ہے۔ امام ابن حبان نے اس کی متعدد باطل روایتوں کی مثال ذکر کی ہے، حافظ ذہبی نے اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے اور کہا ہے۔ یہ منکر ہے۔ (میزان الاعتدال ج1، ص327، رقم: 719، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

علامہ بدرالدین محمد بن احمد عینی حنفی متوفی 855ھ اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں:

امام بخاری کی صحیح حدیث میں ان لوگوں کا رد ہے جو یہ کہتے ہیں کہ قیام کے دن لوگوں کو صرف ان کی ماؤں کی طرف منسوب کرکے پکارا جائے گا تاکہ ان کے آباء پر پردہ رہے۔ نیز اس حدیث سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ اشیاء پر حکم ان کے ظاہر کے اعتبار سے لگایا جاتا ہے۔ (عمدۃ القاری ج22، ص201، مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر، 1348ھ)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی 852ھ لکھتے ہیں:

علامہ بن ابطال نے کہا ہے کہ اس حدیث میں ان لوگوں کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ قیامت کے دن لوگوں کو صرف ان کی ماؤں کی طرف منسوب کرکے پکارا جائے گا تاکہ ان کے (اصل) آباء پر پردہ رہے۔ (علامہ عسقلانی فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ یہ وہ حدیث ہے جس کو امام طبرانی نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے اور اس کی سند بہت ضعیف ہے اور امام ابن عدی نے اس کی مثل حضرت انس سے روایت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ منکر ہے۔ علامہ ابن بطال نے کہا کسی شخص کی پہچان اور شناخت کے لیے اس کو اس کے باپ کی طرف منسوب کرنا بہت زیادہ واضح ہے۔ اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چیزوں کے ظاہر پر حکم لگانا جائز ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ کسی شخص کی اس کے اسی باپ کی طرف نسبت کی جائے گی جو دنیا میں اس کا باپ مشہور تھا نہ کہ اس کے حقیقی باپ کی طرف اور یہی قول معتمد ہے۔ (فتح الباری ج10، ص563، مطبوعہ لاہور، 1401ھ)

بچوں کا نام محمد رکھنے کی فضیلت

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میرا نام رکھو اور میری کنیت نہ رکھو، کیونکہ میں ہی قاسم ہوں اور تمہارے درمیان تقسیم کرتا ہوں۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 6196۔ صحیح مسلم الاداب 5 (2131) 5487۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 3728)

حضرت ابو وہب جشمی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا انبیاء کے نام رکھو۔ اور تمام اسماء میں اللہ کو محبوب عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں اور حارث اور ہمام تمام ناموں میں سچے ہیں۔ اور سب سے قبیح نام حرب (جنگ) اور مرہ (کڑوہ) ہے۔ (سنن ابوداود رقم الھدیث: 4950۔ سنن النسائی رقم الحدیث: 3568)

حارث کے صادق ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حارث کا معنی ہے کسب اور کام کرنے والا اور ہر انسان کوئی نہ کوئی کام کرتا ہے۔ سو یہ نام اپنے معنی کے مطابق ہے اور ہمام کا معنی ہے ارادہ کرنے والا اور ہر انسان کسی نہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے۔

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی متوفی 1252ھ لکھتے ہیں:

علامہ مناوی نے کہا ہے کہ عبداللہ نام رکھنا مطلقاً افضل ہے، اس کے بعد عبدالرحمٰن ہے، اس کے بعد محمد نام رکھنا افضل ہے، پھر احمد نام رکھنا، پھر ابراہیم نام رکھنا۔ ایک اور جگہ یہ ہے کہ عبداللہ اور عبدالرحمٰن کے ساتھ ان کی مثل دوسرے نام لاحق ہیں مثلاً عبدالرحیم اور عبدالمالک وغیرہ۔ اور یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ محمد اور احمد نام، اللہ تعالیٰ کو تمام ناموں میں سب سے زیادہ محبوب ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نبی کو وہی نام رکھا ہے جو اس کو تمام ناموں میں سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ جس کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور اس نے اس کا نام محمد یا احمد رکھا تو وہ شخص اور اس کا بچہ دونوں جنت میں ہوں گے۔ اس حدیث کو امام ابن عسا کر نے حضرت ابوامامہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ حافظ سیوطی نے کہا ہے اس باب میں یہ سب سے عمدہ حدیث ہے اور اس کی سند حسن ہے۔ (ردالمحتار ج5، ص268، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، 1407ھ)

" محمد " نام رکھنے کے متعلق متعدد احادیث وارد ہیں ان میں سے بعض کی اسانید ضعیف ہیں لیکن چونکہ فضائل میں احادیث ضعیفہ کا اعتبار ہوتا ہے اس لیے ہم وہ احادیث بیان کررہے ہیں۔

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ جس شخص کے ہاں تین بیٹے ہوئے اور اس نے کسی کا نام محمد نہیں رکھا اس نے جہالت کا کام کیا۔ (الکامل لابن عدی ج 6، ص 2107۔ المعجم الکبیر ج 11۔ رقم الحدیث : 11077۔ مجمع الزوائد ج 8، ص 49۔ کنزالعمال رقم الحدیث : 45204۔ مسند الحارث ص 199۔ 200)

حافظ سیوطی نے کہا ہے کہ اس کی سند میں موسیٰ، لیث سے متفرد ہے اور وہ ضعیف ہے لیکن اس کا ضعف وضع تک نہیں پہنچا۔ امام مسلم، امام ابو داود، امام ترمذی، امام ابن ماجہ اور امام طبرانہ نے اس سے احادیث کو روایت کیا ہے، اور امام ابن معین نے اس کی توثیق کی ہے۔ یہ حدیث مسند الحارث میں بھی ہے اور یہ مقبول کی قسم میں داخل ہے۔ (اللآلی المصنوعہ ج 1، ص 93، 94، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1417ھ)

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص کے تین بیٹے ہوں اور وہ کسی کا نام محمد نہ رکھے تو یہ بے وفائی کے کاموں میں سے ہے اور جب تم اس کا نام محمد رکھو تو نہ اس کو برا کہو (گالی دو) اور نہ اس پر سختی کرو، نہ اس پر ناک چڑھاؤ اور نہ اس کو مارو، اس کی قدر منزلت اور تعظیم و تکریم کرو اور اس کی قسم پوری کرو۔ (الکامل لابن عدی، ج 3، ص 890)

امام ابن عدی متوفی 365ھ نے اس حدیث کو منکر قرار دیا ہے۔ حافظ سیوطی لکھتے ہیں اس حدیث کی تقویت اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو امام دیلمی متوفی 509ھ نے حضرت علی (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص کے چار بیٹے ہوں اور وہ میرا نام کسی کا نہ رکھے اس نے مجھ سے بے وفائی کی۔ (الفردوس بماثور الخطاب ج 3، رقم الحدیث : 5981)۔ نیز امام بکیر نے اپنی سند کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے : جب تم کسی کا نام محمد رکھو تو اس نام کی تعظیم کے سبب سے اس کی تعظیم اور توقیر کرو اور اس کی تکریم کرو، اس کی تذلیل اور تحقیر نہ کرو اور اس پر سختی نہ کرو۔ (الجوامع رقم الھدیث : 2010۔ اللآلی المصنوعہ ج 1، ص 94، مطبوعہ بیروت، 1417ھ)

حضرت ابورافع (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب تم کسی کا نام محمد رکھو تو نہ اس کو مارو نہ محروم کرو۔ امام دیلمی کی روایت میں یہ اضافہ ہے (نام) محمد میں برکت رکھی گئی ہے اور جس گھر میں محمد ہو، اور جس مجلس میں محمد ہو۔ (مسند البزار رقم الحدیث : 1359۔ مجمع الزوائد، ج 8، ص 48۔ الفردوس بماثور الخطاب رقم الحدیث : 1354۔ کنزالعمال رقم الحدیث : 45197، 45220 (اس حدیث کی سند ضعیف ہے)

امام فراوی اپنی سند کے ساتھ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک منادی ندا کرے گا اے محمد ! کھڑے ہوں اور جنت میں بغیر حساب کے داخل ہو جائیں تو ہر وہ شخص جس کا نام محمد ہوگا وہ کھڑا ہو جائے گا اور یہ گمان کرے گا کہ یہ اس کو نداء کی گئی ہے تو نام محمد کی کرامت کی وہ سے ان کو منع نہیں کیا جائے گا۔ (تنزیہ الشریعہ مطبوعہ القاہرہ)

حافظ سیوطی لکھتے ہیں : اس حدیث کی سند معضل (منقطع) ہے اور اس کی سند سے کئی راوی ساقط ہیں۔ (اللآلی المصنوعہ ج 1، ص 97، مطبوعہ بیروت)

حضرت ابوامامہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور اس نے میری محبت کی وجہ سے اور میرے نام سے برکت حاصل کرنے کی وجہ سے اس کا نام محمد رکھا تو وہ شخص اور اس کا بچہ دونوں جنت میں ہوں گے۔ (تنزیہ الشریعہ ج 1، ص 198، جامع الاحادیث الکبیر رقم الحدیث : 23255۔ کنزالعمال رقم الحدیث : 45223)

حافظ سیوطی نے لکھا ہے کہ اس باب میں جنتی احادیث وارد ہیں یہ ان سب میں عمدہ حدیث ہے اور اس کی سند حسن ہے۔ (اللآلی المصنوعہ ج 1، ص 97، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت) (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۱۹۰

لغۃ القرآن: [فَلَمَّآ : پھر جب] [اٰتٰىهُمَا : اس نے دیا انہیں] [صَالِحًا : ایک نیک (اولاد)] [جَعَلَا : تو دونوں نے بنایا] [لَهٗ : اس کے لیے] [شُرَكَآءَ : کچھ شریک] [فِيْمَآ : اس میں جو] [اٰتٰىهُمَا : اس نے دیا ان کو] [فَتَعٰلَى: تو بلند ہے] [اللّٰهُ : اللہ] [عَمَّا : جو وہ] [يُشْرِكُوْنَ : شریک کرتے ہیں]

ترجمہ: پھر جب اس نے انھیں تندرست بچہ عطافرمادیا تو دونوں اس (بچے) میں جو انھیں عطافرمایا تھا اس کے لیے شریک ٹھہرانے لگے تو اللہ ان کے شریک بنانے سے بلند و برتر ہے

تشریح: قرآن میں انسانی فطرت کا یہ خاص پہلو جگہ جگہ بیان ہوا ہے کہ انسان انی اصل ضرورت اور اصل احتیاج کے وقت تو اپنے رب ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن جب وہ احتیاج پوری ہو جاتی ہے تو اس کو دوسرے اسباب و وسائل کا کرشمہ قرار دینے لگتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس کا تجربہ ہر شخص خود اپنے اندر کر سکتا ہے۔ انسان کی عام حالت یہی ہے اور یہاں عام حالت ہی بیان ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ ایسے بلید بھی پائے جاتے ہوں جو کسی حال میں بھی خدا کی طرف متوجہ نہ ہوتے ہوں لیکن فرعون تک کا حال قرآن میں بیان ہوا ہے کہ ڈوبتے وقت اسے بھی خدا یاد آیا۔ بہر حال مستثنیات سے یہ کلیہ ٹوٹ نہیں جاتا۔ آدی پر جب حقیقی افتقار کی حالت طاری ہوتی ہے تو وہ دل دل میں یا زبان اور دل دونوں ہی سے خدا کو پکارتا ہے اور یہ عہد بھی کرتا ہے کہ اگر اس مرحلہ یا اس بھنور سے وہ گزر گیا تو آئندہ وہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بن کر زندگی گزارے گا لیکن جونہی اس مرحلہ سے گزر جاتا ہے، وہ یہ سارا عہد و پیمان بھلا کر انہی خود فراموشیوں میں پھر گم ہو جاتا ہے جن میں پہلے کھویا ہوا تھا۔ اس مسئلہ پر ہم نے اپنی کتابوں میں سے حقیقت شرک، اور حقیقت توحید میں بھی بحث کی ہے۔ تفصیل کے طالب ان کو پڑھیں۔

نظم کے پہلو سے یہ آیات اس مضمون سے تعلق رکھتی ہیں جو اوپر 172، 174 میں عہد فطرت کا بیان ہوا ہے۔ بیچ میں کچھ آیتیں تنبیہ و تذکریر اور انذار کی نوعیت کی آگئی ہیں۔ اب یہ پھر اس مضمون کو لے لیا ہے اور یہ دکھاہے کہ انسان کی فطرت کی اصل صدا کیا ہے اور انسان (یہاں خاص اشارہ قریش کی طرف سے) اپنی فطرت کی اس صدا سے کان بند کر کے کس طرح مختلف وادیوں میں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ میں ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ خدا کی صفات کے ساتھ ایسی صفات کا جوڑ ملانا جو اس کی بنیادی صفات کو باطل کر دیں بالکل خلاف عقل ہے۔ شرک، جس نوعیت کا بھی ہو، تمام صفات کمال کی نفی کر دیتا ہے اس وجہ سے خدا ایسی تمام نسبتوں اور شرکتوں سے منزہ اور ارفع ہے۔ (تفسیر تدبر القرآن)

ازدواجی حقوق وفرائض کا مقصد:

ازدواجی زندگی کے جتنے حقوق وفرائض زوجین پر عائد ہوتے ہیں ان سب کا خلاصہ اور اصل مقصد سکون ہے، دنیا کی نئی معاشرت اور نئی رسموں میں جو چیزیں سکون کو برباد کرنے والی ہیں وہ ازدواجی تعلق کی بنیادی دشمن ہیں، اور آج کی مہذب دنیا میں جو گھریلو زندگی عموماً تلخ نظر آتی ہے اور چار طرف طلاقوں کی بھرمار ہے، اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ معاشرت میں ایسی چیزوں کو مستحسن سمجھ لیا گیا ہے، جو گھریلو زندگی کے سکون کو سراسر برباد کرنیوالی ہیں، عورت کی آزادی کے نام پر اس کی بے پردگی اور بے حیائی جو طوفان کی طرح عالم گیر ہوتی جارہی ہے اس کو ازدوجی سکون کے برباد کرنے میں بڑا دخل ہے اور تجربہ شاہد ہے جوں جوں یہ بے پردگی و بے حیائی عورتوں میں بڑھتی جاتی ہے اس رفتار سے گھریلو سکون واطمینان ختم ہوتا جاتا ہے۔) (تفسیر فوائد القرآن)

جب شوہر اپنی بیوی سے صحبت کرتا ہے تو اسے حمل ٹھہر جاتا ہے۔ ابتداء میں اس کا بوجھ ہلکا سا ہوتا ہے جسے اٹھا کر عورت آسانی سے چلتی پھرتی اور گھر کے کام کاج کرتی رہتی ہے پھر جب حمل بھاری ہو جاتا ہے اور بچے کی ولادت قریب آ جاتی ہے تو ہر میاں بیوی کی خواہش ہوتی ہے کہ اے اللہ ! اگر تو ہمیں صالح بیٹا دے (جو جسمانی لحاظ سے تندرست اور اخلاقی لحاظ سے نیک ہو) تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔ پھر جب اللہ مرد و عورت کو بیٹا دے دیتا ہے تو شرک کرنے والے شرک کرنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں ہمارے بتوں اور جھوٹے خداؤں نے بیٹا دیا ہے چنانچہ مشرکین عرب اپنے بچوں کے نام عبدالعزی، عبداللات، عبدالشمس وغیرہ رکھتے تھے جبکہ اللہ اس شرک سے بلند تر ہے یعنی اللہ تعالیٰ ہی اولاد عطا فرماتا ہے۔ اور مومن اپنی اولاد کو اللہ ہی کی بندگی میں دیتا ہے اور ان کا نام عبداللہ، عبدالرحمٰن اور عبدالرحیم وغیرہ رکھتا ہے نہ کہ عبدالعزی و عبداللات۔

یاد رہے ! کہ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ اسے فلاں بزرگ کی دعا سے اولاد ملی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں نہ یہ شرک ہے کیونکہ نیک لوگوں کی دعا سے اولاد کا ملنا حقیقت ہے۔ صحابہ کرام (رض) بھی حصول اولاد کے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دعا کرواتے تھے اور مولانا اشرف علی تھانوی صاحب فرماتے تھے کہ وہ خود ایک مجذوب کی دعا سے پیدا ہوئے ہیں۔ (اشرف السوانح جلد اول)

حضرت آدم و حوا کی طرف نسبت شرک کا ردّ :

اس آیت کی تفسیر میں بعض ضعیف روایات ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت آدم و حواء کے ہاں اولاد نہ ہوتی تھی۔ انھوں نے اپنے بیٹوں کے نام عبداللہ و عبیداللہ رکھے تو وہ بیٹے فوت ہو گئے تب شیطان نے انھیں کہا کہ اگر وہ اپنے بیٹے کا نام اس کے نام پر عبدالحارث رکھیں تو وہ فوت نہ ہو گا تو انھوں نے ایسے ہی کیا اس بارہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا : فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَاۗءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا۔ (ترمذی کتاب التفسیر سورۃ اعراف حدیث 3077)۔

اس حدیث کی سند میں عمر بن ابراہیم ہے جس نے یہ حدیث قتادہ سے لی ہے اور قتادہ نے سمرہ بن جندب (رض) سے، اب سنیے اس بارہ میں ائمہ رجال کیا کہتے ہیں۔ چنانچہ تہذیب التہذیب میں ہے : قال احمد ھو یروی عن قتادۃ احادیث منکرۃ یخالف و قال ابن عبدی یروی عن قتادۃ اشیاء لایوافق علیھا و حدیثہ عن قتادۃ خاصۃ مضطرب، یعنی امام احمد نے کہا یہ شخص (عمر بن ابراہیم) قتادہ سے منکر احادیث روایت کرتا ہے، جو (قرآن و سنت سے) مخالف ہیں اور ابن عدی نے کہا : وہ قتادہ سے ایسی روایات لاتا ہے جن سے موافقت نہیں کی جا سکتی، خصوصاً قتادہ سے اس کی روایت مضطرب ہے۔ دار قطنی نے کہا : عمر بن ابراہیم ضعیف اور متروک راوی ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد 4 صفحہ 267 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

اسی لیے امام ابن کثیر نے بجا فرمایا : کہ یہ تمام روایات پایہ اعتبار سے ساقط اور اسرائیلیات میں سے ہیں۔ اللہ کے نبی آدم (علیہ السلام) کی طرف شرک کی نسبت کیسے جائز ہے۔ اس جگہ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ ان میں مشرکین کی حالت بتائی گئی ہے نہ کہ آدم (علیہ السلام) جیسے نبی کی۔ (تفسیر برہان القرآن)

یاد رہے حضرت آدم نبی و رسول تھے جو کفر و شرک کے ارتکاب سے معصوم ہیں ان سے شرک کا وقوع ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسے بھی قرآن کریم میں شرک کے مرتکبین کا ذکر جمع کے صیغے سے کیا ہے جس سے واضح ہو گیا کہ جن ارتکاب کرنے والوں کی طرف قرآنی اشارہ ہے وہ کثیر ہیں۔

اس مقام پر یہ ذہن نشین رہے کہ قرآن و حدیث میں عبدیت بمعنی غلام کی نسبت غیر خدا کی طرف جا بجا کی گئی ہے اس لیے عبدالنبی اور عبدالمصطفیٰ وغیرہ کہنا اگرچہ کفر و حرام نہیں ہے اور نہ ہی مکروہ تحریمی ہے لیکن اس طرح کا نام رکھنے سے احتراز بہتر ہے تاکہ کوتاہ نظر اور فہم و ادراک سے کورے لوگ جن کو اس میں شرک کا شائبہ نظر آتا ہے ان کی زبان بندی ہو جائے اور انھیں بلا وجہ عام لوگوں کو گمراہ کرنے کا موقع نہ ملے۔

عبد کا ایک معنی عابد کے ہیں اور ایک معنی خادم کے ہیں تو اگرچہ بولنے والے کا عقیدہ و نظریہ واضح دلیل ہے کہ وہ اپنے کلام میں عبدالمصطفیٰ سے مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خادم اور پیروکار ہی مراد لے رہا ہے لیکن سننے والے مختلف ذہن و فکر اور الگ الگ فکری سطح کے ہوتے ہیں تو انھیں عبداللہ اور عبدالنبی میں مذکورہ لفظ عبد کی باریکیوں کو سمجھانے سے زیادہ آسان یہ ہے ایسے لفظ کے استعمال سے احتراز برتا جائے اور کم فہموں کو اپنی ذات سے بدگمان ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔۔ اب جو لوگ غیر خدا کی طرف لفظ عبد کی نسبت کریں اور عبد سے عابد اور پجاری ہی مراد لیں۔۔۔

(تو) وہ سن لیں کہ (بہت بلند) اور بزرگ و بالا۔۔ نیز۔۔ پاک و صاف (ہے اللہ تعالیٰ) (انکے شرک سے)۔ (تفسیر اشرفی)

آیت مبارکہ:

اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝١٩١

لغۃ القرآن: [اَيُشْرِكُوْنَ : کیا یہ لوگ شریک بناتے ہیں] [مَا : اس کو جو] [لَا يَخْلُقُ : تخلیق نہیں کرتا ہے] [شَيْـًٔا : کوئی چیز] [وَّهُمْ : اور وہ] [يُخْلَقُوْنَ : پیدا کیے جاتے ہیں]

ترجمہ: کیا وہ ایسوں کو شریک بناتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے اور وہ (خود) پیدا کئے گئے ہیں

تشریح:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: کیا یہ ان کو شریک بناتے ہیں جو کچھ پیدا نہیں کر سکتے۔ یہ آیت اس مطلب پر قوی دلیل ہے کہ ان آیات میں جن لوگوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے ان کا تعلق حضرت آدم (علیہ السلام) سے نہیں ہے، بلکہ اس سیاق اور سباق کا تعلق مشرکین سے ہے۔

اس آیت سے علماء اہل سنت نے یہ استدلال کیا ہے کہ انسان اپنے افعال کا خالق نہیں ہے، کیونکہ اس آیت کا یہ تقاضا ہے کہ مخلوق کسی چیز کو خلق کرنے پر قادر نہیں ہے۔

بتوں کی بے مائیگی اور بے چارگی

دوسری آیت کا مفاد یہ ہے کہ معبود کے لیے ضروری ہے کہ وہ نفع پہنچانے اور ضرر دور کرنے پر قادر ہو اور بت اپنی پرستش کرنے والوں کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان، تو ان کی پرستش اور عبادت کرنا کیوں کر درست ہو گی۔ بلکہ بتوں کا حال تو یہ ہے کہ اگر کوئی ان بتوں کو توڑ دے تو وہ اپنے آپ کو اس سے بچا نہیں سکتے، تو جو اپنی ات سے ضرر کو دور کرنے پر قادر نہیں ہے تو وہ تمہیں تکالیف اور مصائب سے کب بچا سکتے ہیں۔

تیسری آیت میں یہ فرمایا ہے کہ جس طرح یہ بت حصول نفع اور دفع ضرر پر قادر نہیں ہیں، اسی طرح ان کو کسی چیز کا علم بھی نہیں ہے، اس لیے جب تم انھیں کسی نیک کام کے لیے پکارو تو یہ تمہارے پیچھے نہیں لگیں گے، اور اس آیت کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم ان کو کسی خیر اور اچھائی کے لیے پکارو تو یہ تمہاری پکار کا جواب نہیں دیں گے یا تم ان سے کوئی دعا کرو تو یہ تمہاری دعا کو قبول نہیں کریں گے۔ اس لیے فرمایا کہ تمہارے لیے برابر ہے کہ تم ان کو پکارو یا خاموش رہو۔

(تفسیر تبیان القرآن)

سورۃ الاعراف چونکہ اختتام پر ہے چنانچہ اس سورت کی تمام باتوں کو شرک کی نفی میں مختصر جملوں میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ اور یاد دھانی کے طور پر ان کا نچوڑ پیش کر دیا گیا ہے بلکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی ضروری ہدایات دی جا رہی ہیں۔

یہ سورۃ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی جس سے اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ مکہ کی زندگی میں مشرکین مکہ کا سلوک آپ کے ساتھ اور آپ کے صحابہ (رض) کے ساتھ کیا ہو گا۔

شرک میں تین چیزیں ملی جلی ہوتی ہیں (۱) عقیدہ (۲) مظاہر عقیدہ یعنی بت درخت، سانپ، آگ، جادو، بارش، کڑک، وغیرہ۔ (۳)۔ رسومات پرستش۔

ان تینوں باتوں میں سب سے اہم مظاہر عقیدہ ہیں ان کے گرد ہی عقیدے اور پرستش کے سارے طریقے گھومتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ان آیات کا ہدف یہ مظاہر ہی ہیں ان دنوں بیم اور آج بھی بتوں اور شرک کی دوسری چیزوں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے یہاں قرآن کریم کے دلائل درج ذیل ہیں۔

۱) یہ بت جو لوگوں کے ہاتھوں سے تراشتے ہوئے ہیں اپنی تخلیق میں دوسروں کے ہاتھوں کے محتاج ہیں نہ خود ہل سکتے ہیں نہ چل سکتے ہیں ایک چیونٹی کو بھی پیدا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اگر کوئی ان کو توڑ دے تو یہ اپنا بچاؤ نہیں کر سکتے جس کا جی چاہے وہ توڑ دے یا پھینک دے یہ احتجاج بھی نہیں کر سکتے۔ جو اس قدر بے بس اور بے حس ہوں وہ نہ تو خالق ہیں نہ مالک ہیں نہ کسی کو نفع دے سکتے ہیں نہ کسی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

۲) ان کے پاس نہ دماغ ہے نہ دل ہے جو صحیح اور غلط راہ کے درمیان تمیز کر سکے۔

۳) یہ اسی طرح کی مخلوق ہیں جیسے اور مجبور و محکوم ہیں۔

۴) ان میں دعا قبول کرنے یا نہ کرنے کی کوئی صلاحیت نہیں۔ ان کے پاس کچھ نہیں ہے جو وہ اپنے مانگنے والوں کو دے

۵) ان کے پاس نہ پاؤں ہیں، نہ ہاتھ، نہ آنکھیں نہ کان۔ ان کے چہروں پر قلم سے یا پینٹ سے آنکھیں بنا دی گئی ہیں مگر وہ ایسی آنکھیں ہیں جن میں کوئی نور اور روشنی نہیں ہے۔

۶) یہ مجہول و مفعول اگر سارے کے سارے جمع ہو جائیں تو نہ کسی کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں اور نہ بگڑے ہوئے کو سنوار سکتے ہیں۔ پھر ایسی بے حقیقت چیزوں سے مانگنا اور ان کو اپنا حاجت روا ماننا کہاں کا انصاف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے مومنو! آج ساری دنیا اس دھوکے میں مبتلا ہے ان کو ہماری طرف سے باخبر کر دو اور ان کی بند آنکھوں کو کھول دو۔ اور اس راستے میں کسی طرح کی فکر مت کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور اس کے راستے پر چلنے والوں کو خوف محافظ ہے۔ یہ بت اور ان کے ماننے والے اہل ایمان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔

یہ وہ دلائل ہیں جو ان کے من گھڑت معبودوں کے خلاف بیان کئے گئے ہیں ان دلائل کی موجودگی میں کسی ہٹ دھرمی، کج بحثی اور کسی طرح کی باتوں کی گنجائش نہیں ہے لیکن پھر بھی ان بتوں کا بازار کیوں گرم ہے۔ غور کیا جائے تو صرف یہ بات نکل کر آئے گی کہ اس میں ذاتی مفاد اور ہر عمل کرنے کی آزادی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ (تفسیر بصیرت قرآن)

اہل مغازی نے یہاں ایک قصہ بیان کیا ہے کہ جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مدینہ منورہ میں ہجرت کرکے آئے تو دو نوجوان معاذ بن عمرو الجموح اور معاذ بن جبل آپ کے پاس آکر مسلمان ہوگئے۔ یہ دونوں راتوں کو جا کر بتوں کو توڑتے تھے تاکہ ان کی قوم کو عبرت ہو۔ ایک اور شخص عمرو بن الجموح اپنی قوم میں سردار شمار کیا جاتا تھا اس کے ہاں ایک بت تھا جس کو وہ روز خوشبو مل کر عبادت کرتا تھا۔ یہ دونوں رات کو جا کر اس بت کو اوندھا کر دیتے اور نجاست مل دیتے تھے۔ عمرو بن الجموح صبح آکر دیکھتا تھا اور پھر دھو دھلا کر اس کو آخو شبو ملتا تھا۔ ایک روز اس نے اس بت کے پاس تلوار رکھ دی تاکہ جو شخص اس بت کو تکلیف دینے آتا ہے اس سے بدل لے لیوے، مگر اس بت سے کیا ہو سکتا تھا۔ ایک روز دونوں نے اس بت کو کھینچ کر ایک مردار کتے کے پاس ڈال دیا۔ پھر ایک روز پیر میں رسی باندھ کر اس کو کنوئیں میں لٹکا دیا۔ آخر عمر بن الجموح کے دل میں خیال گزرا کہ یہ دین محض ڈھکوسلا ہے، یہ بت کچھ بھی قدرت نہیں رکھتے اور توبہ کرکے مسلمان ہوگیا اور ایسا پکا مسلمان ہوا کہ شہادت کا درجہ پایا۔ جنگ احد میں شہید ہوگیا۔ (تفسیر مظہر القرآن)

کسی ذات کے معبود ہونے کے لئے اس میں چند صفات کا ہونا لازمی ہے مثلاً یہ کہ :

وہ ذات واجب الوجود ہو یعنی اس کا وجود خود بخود ہو نہ کہ کسی دوسری ذات کا عطا کردہ۔ یہ الوہیت کی سب سے پہلی صفت ہے تو ظاہر ہے کہ کے واجب الوجود صرف ذات خداوندی ہے اس کے علاوہ ہر ذات کا وجود اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔

اسی طرح الوہیت کی دوسری صفت خالقیت ہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خالق نہیں

الوہیت کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ علیم کل ہو یہ صفت بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی میں نہیں

اسی طرح الوہیت کی چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ قادر مطلق ہو یعنی علی کلی شیء قدیر ہو یہ صفت بھی اللہ تعالیٰ ہی کی ہے

الوہیت کی پانچویں صفت یہ ہے کہ وہ تمام کائنات پر مدبر و متصرف ہو پورا نظام کلی اور جزئی طور پر اس کے قبضہ قدرت میں ہو۔ علیٰ ہذا القیاس۔ تمام صفات کمال سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی بھی ذات میں متحقق جب نہیں تو اس کے سوا کوئی کسی بھی قسم کی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں۔ سارا جہاں عاجز و ناتواں ہے ساری مخلوق اپنی اپنی حاجتوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ادنیٰ غور و فکر سے بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کوئی حاجت مند ہرگز الوہیت کا حقدار نہیں ہوسکتا الوہیت اسی ذات عالی صفات کے لیے موزوں ہے جو سارے جہانوں کی حاجتوں کی برآری پر مطلقاً قادر ہو سارا عالم اس کا محتاج و دست نگر ہو وہ کسی چیز کا محتاج ہونا تو بجائے خود بلکہ احتیاج کے تصور سے بھی پاک اور منزہ ہو۔ کتنا ظالم و جاہل ہے وہ انسان جو بے جان و بے حس عاجز و مردہ مخلوقات کو خداوند ذوالجلال کا شریک ٹھہرایا اور اپنے سے بھی کمتر عاجز بتوں کی پرستش پر آمادہ ہوا۔ (خلاصہ از حجۃ اللہ البالغۃ) (تفسیر منازل العرفان)

آیت مبارکہ:

وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ۝۱۹۲

لغۃ القرآن: [وَلَا : اور نہ] [يَسْتَطِيْعُوْنَ : وہ استطاعت رکھتے] [لَهُمْ : ان کے لیے] [نَصْرًا : کسی مدد کی] [وَّلَآ : اور نہ] [اَنْفُسَهُمْ : اپنی جان کی] [يَنْصُرُوْنَ : وہ مدد کرتے ہیں]

ترجمہ: اور نہ وہ ان (مشرکوں) کی مدد کرنے پر قدرت رکھتے ہیں اور نہ اپنے آپ ہی کی مدد کرسکتے ہیں

تشریح: اس آیت میں بتوں کی بے قدری اور شرک کے بطلان کا بیان اور مشرکین کے کمال جہل کا اظہار ہے اور بتایا گیا ہے کہ عبادت کا مستحق وہی ہوسکتا ہے جو عبادت کرنے والے کو نفع پہنچانے اور اس کا ضرر دور کرنے کی قدرت رکھتا ہو، مشرکین جن بتوں کو پوجتے ہیں ان کی بے قدرتی اس درجے کی ہے کہ وہ کسی چیز کے بنانے والے نہیں، کسی چیز کے بنانے والے تو کیا ہوتے خود اپنی ذات میں دوسرے سے بے نیاز نہیں۔ خود مخلوق ہیں اور بنانے والے کے محتاج ہیں۔ اس سے بڑھ کر بے اختیاری یہ ہے کہ وہ کسی کی مدد نہیں کرسکتے اور کسی کی کیا مدد کریں گے خود انھیں کوئی ضرر پہنچے تو اسے دور نہیں کرسکتے۔ کوئی انھیں توڑ دے، گرا دے الغرض جو چاہے کرے وہ اس سے اپنی حفاظت نہیں کرسکتے لہٰذا ایسے مجبور و بے اختیار کو پوجنا انتہا درجے کا جہل ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

بتوں کی بے بسی:

جن بتوں کو تم نے معبود ٹھہرایا ہے اور خدائی کا حق دیا ہے، وہ تمہارے کام تو کیا آتے، خود اپنی حفاظت پر بھی قادر نہیں اور باوجود مخلوق ہونے کے ان کمالات سے محروم ہیں جن سے کسی مخلوق کو دوسری پر تفوق و امتیاز حاصل ہوسکتا ہے۔ گو ان کے ظاہری ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان سب کچھ تم بناتے ہو، لیکن ان اعضاء میں وہ قوتیں نہیں جن سے انھیں اعضاء کہا جاسکے۔ نہ تمہارے پکارنے پر مصنوعی پاؤں سے چل کر آسکتے ہیں، نہ ہاتھوں سے کوئی چیز پکڑ سکتے ہیں، نہ آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، نہ کانوں سے کوئی بات سنتے ہیں۔ اگر پکارتے پکارتے تمہارا اگلا پھٹ جائے گا تب بھی وہ تمہاری آواز سننے والے اور اس پر چلنے والے یا اس کا جواب دینے والے نہیں۔ تم ان کے سامنے چلاؤ یا خاموش رہو، دونوں حالتیں یکساں ہیں۔ نہ اس سے فائدہ نہ اس سے نفع، تعجب ہے کہ جو چیزیں مملوک و مخلوق ہونے میں تم ہی جیسی عاجز و درماندہ بلکہ وجود و کمالات وجود میں تم سے بھی گئی گزری ہوں انھیں خدا بنالیا جائے اور جو اس کا رد کرے اسے نقصان پہنچانے کی دھمکیاں دی جائیں۔

مشرکین مکہ کی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دھمکی:

چنانچہ مشرکین مکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کہتے تھے کہ آپ ہمارے بتوں کی بے ادبی کرنا چھوڑ دیں ورنہ نہ معلوم وہ کیا آفت تم پر نازل کردیں۔ (وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ) اسی کا جواب قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ الخ سے دیا۔ یعنی تم اپنے سب شرکاء کو پکارو اور میرے خلاف اپنے سب منصوبے اور تدبیریں پوری کرلو، پھر مجھ کو ایک منٹ کی مہلت بھی نہ دو۔ دیکھوں تم میرا کیا بگاڑ سکو گے۔ (تفسیر گلدستہ)

آیت مبارکہ

وَاِنۡ تَدۡعُوۡهُمۡ اِلَى الۡهُدٰى لَا يَتَّبِعُوۡكُمۡ‌ ؕ سَوَآءٌ عَلَيۡكُمۡ اَدَعَوۡتُمُوۡهُمۡ اَمۡ اَنۡتُمۡ صَامِتُوۡنَ ۝١٩٣

لغۃ القرآن: [وَاِنْ : اور اگر] [تَدْعُوْهُمْ : تم پکارو گے ان کو] [اِلَى: طرف] [الْهُدٰى: ہدایت] [لَا يَتَّبِعُوْكُمْ : تو وہ پیروی نہیں کریں گے تمہاری] [سَوَآءٌ: برابر ہے] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [اَدَعَوْتُمُوْهُمْ : تم لوگ پکاروان کو] [اَمْ : یا] [اَنْتُمْ : تم] [صَامِتُوْنَ : خاموش رہنے والے]

ترجمہ: اور اگر تم ان کو (راہِ) ہدایت کی طرف بلاؤتو تمہاری پیروی نہ کریں گے۔ تمہارے حق میں برابر ہے خواہ تم انھیں (حق وہدایت کی طرف) بلاؤیا تم خاموش رہو

تشریح:

بت پرستی پر تنقید

مخلوقات میں سے اللہ تعالیٰ نے جسے بھی خلق فرمایا ہے اس کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے لیے زندگی گزارنے کا طریقہ کیا ہے اور یہ ضرورت ایسی ہے جس میں انسان کی تخصیص نہیں بلکہ ہر مخلوق اس ضرورت کی پوری طرح محتاج ہے۔ البتہ ! یہ ضرور ہے کہ انسان اس ضرورت کے حوالے سے دوسری مخلوقات کی نسبت کچھ زیادہ ہی محتاج واقع ہوا ہے کیونکہ انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو سب سے بے بس ہوتا ہے۔ بلی کا بچہ بھی آنکھیں کھلتے ہی اپنی ماں کو ڈھونڈتا اور اس کے پستان تلاش کرلیتا ہے، مرغی کا بچہ چند گھنٹوں کے بعد ہی ماں کی آواز پر پیچھے پیچھے چلنے لگتا اور دانہ چگنے لگتا ہے، بھینس کا بچہ چند گھنٹوں کے بعد لڑکھڑاتا ہوا ماں کے نیچے پہنچ کر دودھ پینے لگتا ہے، لیکن انسان کا بچہ اس طرح بے بس اور ناتواں پیدا ہوتا ہے کہ نہ اپنی ماں کو پہچانتا ہے اور نہ اپنے باپ کو۔ ماں اس کو اٹھا کر اگر اپنے سینے سے نہ لگائے تو وہ رونے کے سوا کچھ نہیں کرتا۔ باقی مخلوقات کے بچے بڑی تیزی سے بڑھتے، پروان چڑھتے اور طبعی قوتوں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں، لیکن انسان کا بچہ آہستہ آہستہ پروان چڑھتا ہے، کئی مہینوں کے بعد بیٹھنے لگتا ہے، پھر گھٹنوں چلنا سیکھتا ہے، پھر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا اور چلنے لگتا ہے۔ ایک وقت تک لوگ اس کی راہنمائی کرتے ہیں پھر جب ضرورت اس سے آگے بڑھتی ہے تو اس کی عقل اس کی راہنمائی کے لیے اپنا فرض انجام دینے لگتی ہے، لیکن انسانی ضرورتیں باقی حیوانات کی طرح صرف جسمانی ضرورتوں تک محدود نہیں بلکہ اس کی ذہنی ذوقی اور روحانی ضرورتیں بھی ہیں جو عقل کے بعد کسی اور راہنمائی کی بھی طالب ہوتی ہیں۔ ان پہلوؤں سے غور کیا جائے تو انسان کی ضرورتوں کی وسعت سمجھ میں آتی ہے کہ یوں تو اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کی ضرورتوں کو پورا کرنا اپنے ذمہ لے رکھا ہے اور اس کے لیے جس راہنمائی کی ضرورت ہے وہ ہمہ وقت ان کو فراہم کی جاتی ہے۔ حشرات الارض کو رینگنا سکھایا جاتا ہے۔ پرندوں کو اڑنا، مچھلیوں کو تیرنا اور جنگل کے جانوروں کو دوڑنا بھاگنا اور شکار کرنا سکھایا جاتا ہے، چھوٹے سے چھوٹا جانور بھی جانتا ہے کہ مجھے غذا کیسے حاصل کرنی ہے۔ بچے کیسے پیدا کرنے ہیں۔ انھیں پالنا کیسے ہے۔ اپنا گھر کیسے بنانا ہے۔ موسم کی شدت سے کیسے بچنا ہے۔ حوادث کے مقابلے میں اپنا تحفظ کیسے کرنا ہے۔ لیکن انسانی ضرورتیں اور انسان کے لیے راہنمائی ان سے زیادہ وسعت رکھتی ہے کیونکہ وہ جبلت تک محدود نہیں رہتی، حواس پر کفایت نہیں کرتی، عقل بھی عالم محسوسات اور روحانی زندگی کے بعد ساتھ چھوڑنے لگتی ہے۔ اس لیے یہ سب سے زیادہ اس بات کا محتاج ہے کہ جب وہ کسی کو معبود مانے تو اس سے راہنمائی طلب کرے، گھر کی زندگی سے لے کر معاشرتی زندگی تک، مزدوری سے لیکر معاشی اداروں تک، باہمی معاملات سے لے کر ایوان حکومت تک، انفرادی زندگی سے لے کر

اجتماعی تہذیب و تمدن تک، انسانی زندگی حقوق و فرائض اور فضائل و مکارم کے بندھنوں میں بندھی ہوئی ہے۔ جب تک ان تمام حوالوں سے راہنمائی کی ضرورتیں پوری نہیں کی جاتیں۔

انسان کی زندگی میں خوش اطواری پیدا نہیں ہوتی اور ان ضرورتوں کو پورا کرنا کماحقہٗ انسان کے بس کی بات نہیں، یہ تو سراسر اس ذات کا فیضان ہے کہ جس کو انسان اپنا معبود بنالیتا ہے۔ اس بنیادی ضرورت کے حوالے سے یہاں ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ جن کو تم اللہ کے سوا پوجا کرتے ہو ان کی بے بسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم انھیں اس راہنمائی کی ضرورت کے حوالے سے پکارو تو وہ تمہاری اس ضرورت کو تو کیا پورا کریں گے وہ تو اس قابل بھی نہیں ہیں کہ اس کی حقیقت کو سمجھ کر تمہارے پیچھے چلنے پر بھی قادر ہوسکیں اور پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ تمہارے بار بار پکارنے سے شاید اس طرف متوجہ ہوسکیں تم انھیں ہزار مرتبہ پکارو، چیخو چلاؤ کہ ہم تمہارے سامنے سر جھکا چکے، دست سوال دراز کرچکے، عبودیت کا سرمایہ تمہارے آستانوں پر ڈھیر کرچکے، اب اگر تم ہماری یہ ضرورتیں پوری نہیں کروگے تو کون کرے گا؟ لیکن تمہاری یہ آہ وزاری اور چیخ و پکار ان پر کوئی اثر نہیں کرے گی کیونکہ وہ سرے سے اس کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تو تم خود سوچو کہ تم نے آخر سرِ نیاز کس آستانے پر جھکایا۔ (تفسیر روح القرآن)

صاف ظاہر ہے کہ یہ آیات بتوں اور بت پرستوں کے حق میں اتری ہیں مگر افسوس ہے کہ بعض ناسمجھ لوگ انھیں انبیاء و اولیاء پر اور ان کے وسیلہ سے دعا کرنے والے مسلمانوں پر چسپاں کرتے اور مسلمانوں کو کافر و مشرک قرار دیتے ہیں حالانکہ صحابہ کرام (رض) نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ظاہری زندگی میں اور آپ کے وصال کے بعد اپنی مشکلات میں آپ سے دعا کی التجاء اور آپ کے وسیلہ سے دعا کا معمول رکھتے تھے۔ ابوبکر صدیق (رض) کے زمانہ میں جنگ یمامہ میں صحابہ کرام یا محمداہ کے نعرے لگاتے تھے اور یہ نعرہ حضرت خالد بن ولید (رض) نے شروع کیا۔ (البدایہ جلد 6 صفحہ 329 مطبوعہ دار الریان بیروت، تاریخ طبری جلد 2 صفحہ 281 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت) گویا صحابہ کرام (رض) نے جنگ جیسے مشکل وقت میں رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مدد کے لیے پکارا۔

اور حافظ بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت مالک (اشعری) (رض) سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر فاروق (رض) کے زمانہ میں قحط پڑا تو ایک شخص (وہ صحابی رسول حضرت بلال بن حارث مزنی (رض) تھے) نے قبر رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر حاضر ہو کر کہا: یارسول اللہ استسق لامتک فانھم قد ھلکوا اے اللہ کے رسول! اپنی امت کے لیے بارش طلب کیجئے کہ وہ ہلاک ہو رہے ہیں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے خواب میں تشریف لائے اور فرمایا عمر کے پاس جاؤ اسے میرا اسلام کہو اور بتاؤ کہ بارش آنے ہی والی ہے اور اسے کہو کہ کچھ نرمی کرے۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں: وھذا اسناد صحیح۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (البدایہ جلد 7 صفحہ 94، ذکر سن 18ھ، مطبوعہ دار الریان بیروت) یعنی صحابہ کرام نے روضہ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر حاضر ہو کر قحط سالی جیسی شدید مشکل کے حل کے لیے آپ سے مدد چاہی تو آپ نے مدد فرمائی۔ تو کیا یہ لوگ صحابہ کرام (رض) کو بھی مشرک قرار دیں گے؟ (تفسیر برہان القرآن)

آیت مبارکہ:

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَاۗءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ١٩٥؁

لغۃ القرآن: [اَ : کیا] [لَهُمْ : ان کے لیے] [اَرْجُلٌ: پیر ہیں] [يَّمْشُوْنَ : وہ چلتے ہیں] [بِهَآ : جن سے] [اَمْ : یا] [لَهُمْ : ان کے لیے] [اَيْدٍ : ہاتھ ہیں] [يَّبْطِشُوْنَ : وہ پکڑتے ہیں] [بِهَآ : جن سے] [اَمْ : یا] [لَهُمْ : ان کے لیے] [اَعْيُنٌ: آنکھیں ہیں] [يُّبْصِرُوْنَ : وہ دیکھتے ہیں] [بِهَآ : جن سے] [اَمْ : یا

] [لَهُمْ : ان کے لیے] [اٰذَانٌ: کان ہیں] [یَّسْمَعُوْنَ : وہ سنتے ہیں] [بِهَا : جن سے]] [قُلِ : آپ کہہ دیجیے] [ادْعُوْا : تم لوگ پکارو] [شُرَكَآءَكُمْ : اپنے شریکوں کو] [ثُمَّ : پھر] [كِيْدُوْنِ : تدبیر کرو] [فَلَا : اور نہ] [تُنْظِرُوْنِ : تم مجھے مہلت دو]

ترجمہ: کیاان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چل سکیں، یاان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑ سکیں، یاان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھ سکیں یاان کے کان ہیں جن سے وہ سن سکیں؟آپ فرمادیں: (اے کافرو!) تم اپنے (باطل) شریکوں کو (میری ہلاکت کے لئے) بلالو پھر مجھ پر (اپنا) داؤچلاؤاور مجھے کوئی مہلت نہ دو

تشریح: ان کی جہالت اور حماقت کومزید آشکار کیا جارہا ہے کہ تم صاحب عقل وہوش ہوتے ہوئے لکڑی اور پتھر کے بنائے ہوئے بے جان مجسموں کی پوجا کرتے ہو جن کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ نہ توان کے پاؤں ہیں کہ ان سے چل سکیں۔ نہ ہاتھ ہیں کہ ان سے کچھ پکڑ سکیں، نہ آنکھیں ہیں کہ کچھ دیکھ سکیں۔(تفسیر ضیاء القرآن)

مشرکین مکہ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دھمکی دی کہ اگر تم بتوں کی مخالفت سے باز نہ آئے اور بتوں کو غصہ آگیا تو تمہاری خیر نہیں ہوگی۔ اس پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے انھیں چیلنج دے دیا کہ تم اپنے بتوں کو پکارو اگر وہ میرا کچھ بگاڑ سکتے ہیں تو مجھے ذرا مہلت نہ دیں، مگر سن لو تم بھی اور تمہارے بت میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ میرا حامی و ناصر اللہ تعالیٰ ہے جو نیک لوگوں کی حمایت کرتا ہے، چنانچہ مشرکین مکہ نے آپ کو شہید کرنے کی پوری کوشش کی اور ہجرت کی رات آپ کے گھر کا محاصرہ بھی کرلیا۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے شر سے بچالیا۔ (امداد الکرم)

معلوم ہوا اللہ کا نبی طاغوتی طاقتوں سے نہیں ڈرتا بلکہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انھیں للکارتا ہے اور یہی ہر دور میں مردان حق کا شیوہ رہا ہے۔ مگر یہ سچے نبی کی شان ہے۔ جھوٹے نبی تو طاغوتی و شیطانی قوتوں کے پیدا کردہ و پروردہ ہوتے ہیں وہ ہمیشہ انہی کے گن گاتے ہیں جیسے مرزا غلام احمد قادیانی زندگی بھر انگریزوں کی قصیدہ خوانی کرتا رہا۔ (تفسیر برہان القرآن)

اس مقام پر علامہ فخر الدین رازی اپنی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں کہ امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیز (رض) اپنی اولاد کے لیے کچھ مال جمع نہیں کرتے تھے۔ ان سے اس کا سبب پوچھا گیا تو فرمایا: اگر میری اولاد نیک ہوئی تو یہ آیت نمبر ١٩٦ تلاوت کی یعنی اللہ تعالیٰ اس کا حامی و ناصر ہوگا اور جس کو اللہ تعالیٰ حامی ہو اس کو میرے مال کی ضرورت نہیں ہے، اور خدانخواستہ اگر میری اولاد میری مجرم ہوئی تو میں اپنے مال سے اس کی مدد نہیں کرنا چاہتا اور سورۃ قصص (٢٨) کی آیت نمبر ١٧ تلاوت فرمائی جس میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کیا: اے میرے رب! جیسے تو نے مجھ پر انعام فرمایا میں بھی ہرگز کسی مجرم کا مددگار نہیں بنوں گا۔
(تفسیر امداد الکرم)

شان نزول: رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب بت پرستی کی مذمت کی اور بتوں کی عاجزی اور بے اختیاری کا بیان فرمایا تو مشرکین نے دھمکایا اور کہا کہ بتوں کو برا کہنے والے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں اور یہ بت انھیں ہلاک کردیتے ہیں، اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی اور اس آیت اور اس کے بعد والی تین آیات میں فرمایا گیا کہ اے حبیب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، آپ ان سے فرمادیں کہ اگر تم بتوں میں کچھ قدرت سمجھتے ہو تو انھیں پکارو اور مجھے نقصان پہنچانے میں ان سے مدد لو اور تم بھی جو مکروفریب کرسکتے ہو وہ میرے مقابلے میں کرو اور اس میں دیر نہ کرو، مجھے تمہاری اور تمہارے معبودوں کی کچھ بھی پروا نہیں اور تم سب مل کر بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ میری حفاظت کرنے والا اور میرا مددگار وہ رب تعالیٰ ہے جس نے مجھ پر قرآن نازل کرکے مجھے عظمت عطا کی اور وہ اپنے نیک بندوں کو دوست رکھتا اور ان کی مدد فرماتا ہے اور اے بت پرستو! اللہ تعالیٰ کے سوا جن کی تم عبادت کرتے ہو وہ کسی کام میں تمہاری مدد کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ اپنی مدد کرسکتے ہیں تو میں پھر ان کی کس طرح پروا کروں اور ویسے بھی یہ تمہاری مدد کیا کریں گے کیونکہ ان کا اپنا حال یہ ہے کہ اگر تم انھیں اپنے مقاصد کے حصول کی طرف رہنمائی کرنے کے لیے بلاؤ تو وہ تمہاری پکار نہ سنیں گے اور تم انھیں دیکھو تو یوں لگے گا کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ انھیں کچھ دکھائی نہیں دیتا کیونکہ وہ دیکھنے سے ہی عاجز ہیں۔ (1)

اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں سے مدد چاہنا اور انھیں وسیلہ بنانا توحید کے برخلاف نہیں:

علامہ اسماعیل حقی (رح) فرماتے ہیں "اس آیت (نمبر 198) میں بتوں کا جو حال بیان ہوا انبیاء کرام (علیہ السلام) اور اولیاء عظام (رح) کا حال ان کے برخلاف ہے اگرچہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں کیونکہ اس طور پر مقبولانِ بارگاہِ الٰہی سے مدد چاہنا، انھیں وسیلہ بنانا اور ان کی طرف (کسی چیز کی عطا وغیرہ کی) نسبت کرنا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کے مظاہر، اس کے انوار کی جلوہ گاہیں، اس کے کمالات کے آئینے اور ظاہری و باطنی امور میں اس کی بارگاہ میں سفارشی ہیں، انتہائی اہم کام ہے اور یہ ہرگز شرک نہیں بلکہ یہ عین توحید ہے (2)۔ (3)

{ وَتَرٰىهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ : اور تم انھیں دیکھو (تو یوں لگے گا) کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں۔} اس آیت کی ایک تفسیر یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اے حبیب ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، آپ ان کافروں کو دیکھیں کہ یہ اپنی آنکھوں سے تو آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں لیکن انھیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا کیونکہ یہ نگاہ بصیرت سے آپ کو نہیں دیکھ رہے تو اگرچہ فی الوقت یہ آپ کے سامنے ہیں لیکن درحقیقت یہ آپ سے غائب ہیں البتہ اگر یہ میری وحدانیت کا اقرار اور آپ کی رسالت کی تصدیق کرلیتے ہیں تو یہ حقیقی طور پر دیکھنے والے بن جائیں گے۔ (1)

نگاہِ بصیرت سے دیکھنا ہی حقیقی طور پر فائدہ مند ہی

اس سے معلوم ہوا کہ صرف ظاہری نگاہوں سے حضور پُر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھ لینا حقیقی طور پر فائدہ مند نہیں بلکہ نگاہ بصیرت سے دیکھنا فائدہ مند ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب ابو جہل کے بیٹے حضرت عکرمہ نے نگاہ بصیرت سے حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زیارت کی تو صحابیت کے اعلیٰ منصب پر فائز ہو کر ہمیشہ کے لیے جنت کے حق دار ٹھہرے اور خود ابو جہل صرف ظاہری نگاہوں سے دیکھتا رہا جس کی وجہ سے اسے بد بختی سے نجات نہ ملی اور ہمیشہ کے لیے جہنم کا حقدار ٹھہرا۔

ایک مرتبہ سلطان محمود غزنوی (رح) شیخ ابو الحسن خرقانی (رح) کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے اور کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر عرض کی: یا شیخ ! آپ حضرت ابو یزید بسطامی (رح) کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔ حضرت ابو الحسن خرقانی (رح) نے فرمایا "وہ ایسے شخص ہیں کہ جس نے ان کی زیارت کی وہ ہدایت پا گیا اور اسے واضح طور پر سعادت حاصل ہو گئی۔ حضرت محمود غزنوی (رح) نے عرض کی: یا شیخ ! یہ کس طرح ہوا کہ ابو جہل نے حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھا لیکن اس کے باوجود اسے نہ کوئی سعادت ملی اور نہ وہ شقاوت و بد بختی سے خلاصی پا سکا؟ آپ (رح) نے فرمایا "ابو جہل نے درحقیقت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھا ہی نہیں جس کی وجہ سے وہ بد بختی سے چھٹکارا نہ پا سکا بلکہ اس نے محمد بن عبد اللہ کو دیکھا ہے، اگر وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھ لیتا تو وہ بد بختی سے نکل کر سعادت مندی میں داخل ہو جاتا اور اس کا مصداق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے "وَتَرٰىهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ وَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ" تو سر کی آنکھوں سے دیکھنے سے یہ سعادت نہیں ملتی بلکہ دل کی نگاہوں سے دیکھیں تو یہ سعادت نصیب ہوتی ہے، اس لیے جس نے حضرت ابو یزید (رح) کو دل کی نگاہوں سے دیکھا تو وہ سعادت پا گیا۔ اس واقعے سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء کو بھی نگاہ بصیرت سے دیکھنا ہی فائدہ دیتا ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

آیت مبارکہ:

اِنَّ وَلِیِّ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ ۝۱۹۶

لغۃ القرآن: اِنَّ : بیشک] [وَلِیِّ ـ : میرے کارساز] [اللّٰهُ الَّذِیْ : وہ اللہ ہے جس نے] [نَزَّلَ : اتارا] [الْكِتٰبَ : کتاب کو] [وَهُوَ : اور وہ] [یَتَوَلَّى: کارسازی کرتا ہے] [الصّٰلِحِیْنَ : نیک لوگوں]

ترجمہ: بیشک میرا مددگار اللہ ہے جس نے کتاب نازل فرمائی ہے اور وہی صلحاء کی بھی نصرت و ولایت فرماتا ہے

تشریح: میرا حامی و ناصر وہ حی وقیوم ہے جس کی حمایت و نصرت ہمیشہ اپنے نیک اور فرمان بردار بندوں کے شامل حال رہا کرتی ہے۔ مجھے اس پر بھروسہ ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت میرا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ سچ یہ ہے کہ اہل حق کے پاس یہی ایک قوت ہے جس کے بل بوتے پر وہ بڑی بے باکی سے ہر طاغوتی طاقت سے ٹکرا جاتے ہیں۔ علی الشی : الذی یحفظہ ویمنع عنہ الضرر (قرطبیؒ) جو شخص کسی کی حفاظت کرے اور ہر قسم کے ضرر سے اسے بچائے اس کو اس کا ولی کہتے ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

اللہ اور رسول کے مقرب نیک لوگ ہیں

اس سے پہلی آیتوں میں یہ فرمایا تھا کہ بتوں کو حصول نفع اور دفع ضرر پر مطلقاً قدرت نہیں ہے اور اس آیت میں یہ واضح فرمایا ہے کہ صاحب عقل کو یہ چاہیے کہ صرف اللہ کی عبادت کرے جو دین اور دنیا کے منافع پہنچانے کا ولی ہے۔ دین کے منافع اس طرح پہنچائے کہ اس نے یہ کتاب یعنی قرآن مجید کو نازل فرمایا جس میں معیشت اور آخرت کا مکمل اور جامع نظام ہے اور دنیا کے منافع اس طرح پہنچائے کہ اس نے فرمایا وہ صالحین کا ولی ہے یعنی نیک لوگوں کا مددگار ہے۔

حضرت عمرو بن العاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بہ آواز بلند فرماتے ہوئے سنا ہے۔ آپ نے فرمایا سنو! میرے باپ کی آل میرے مددگار نہیں ہیں، میرا ولی اللہ ہے اور نیک مسلمان ہیں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 5990۔ صحیح مسلم الایمان : 366 (215) 508۔ مسند احمد ج 4، ص 203)

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ میرے والی (دوست یا مقرب) نیک مسلمان ہیں خواہ وہ نسبتاً مجھ سے بعید ہوں۔ اور جو نیک نہیں ہیں وہ میرے ولی (مقرب) نہیں ہیں خواہ وہ نسبتاً مجھ سے قریب ہوں۔ (تفسیر تبیان القرآن)

نیکوکاروں کا کارساز

فرمایا وہ باری تعالیٰ نہ صرف میرا کارساز ہے بلکہ وھو یتولی الصلحین وہ تمام نیکوکاروں کا کارساز ہے اور ان کی فلاح اور ہدایت کا سامان مہیا کرتا ہے مگر مشرکوں کو وہ سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتا صالح اس شخص کو کہتے ہیں جو حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں ادا کرتا ہے اسی طرح قرآن پاک میں ابرار اور مقربین کی اصطلاحات بھی استعمال ہوئی ہیں قوت القلوب والے بزرگ لکھتے ہیں کہ ابرار وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی نگاہ ہر وقت نیکی پر لگی رہتی ہے اور مقربین وہ ہوتے ہیں جن کی نگاہ ہمیشہ خاتمہ پر مرتکز رہتی ہے وہ ہمیشہ اسی فکر میں رہتے ہیں کہ پتہ نہیں خاتمہ کیسا ہوگا یعنی خاتمہ بالخیر ہوگا یا بالشر اور بالآخر وہ جنتی ہوں گے یا دوزخی، وہ ہمیشہ اسی فکر میں مبتلا رہتے ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز (رح) خلفائے بنوامیہ میں سے ہیں آپ کا دور خلافت تو صرف اڑھائی سال ہے مگر اس بات پر سب متفق ہیں کہ آپ کی خلافت خلفائے راشدین کا ہو بہو نمونہ تھی آپ کچھ عرصہ گورنر بھی رہے مگر مکمل خلافت کا موقع زیادہ دیر نہیں ملا آپ کے متعلق صاحب تفسیر کبیر لکھتے ہیں کہ جب خلافت کی ذمہ داری سنبھالی تو اپنی اولاد کے لیے کوئی مال و دولت اور جائیداد نہ چھوڑی کسی نے کہا کہ آپ کی اولاد ہے آپ ان کی بہتری کے لیے بھی کوئی بندوبست کر دیتے آپ نے فرمایا میری اولاد دو حالتوں سے خالی نہیں ہو سکتی یا تو وہ صالحین یا مجرمین اگر وہ صالح ہوں گے تو اس آیت کے مصداق وھو یتولی الصلحین اللہ تعالیٰ ان کا کارساز ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی ضرور کارسازی کرے گا لہٰذا مجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں اور اگر وہ مجرمین ہوئے تو اللہ تعالیٰ مجرمین کا مددگار نہیں ہو سکتا لہٰذا میں بھی ان کا پشت پناہ ہیں بن سکتا اللہ تعالیٰ کا واضح فرمان ہے انہ لا یفلح المجرمون (یونس) وہ مجرموں کو فلاح نصیب نہیں کرتا اس نے اپنے پاک انبیاء سے بھی فرمایا فلن اکون ظہیراً للمجرمین میں مجرموں کا مددگار کیوں بنوں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے بھی سورۃ قصص میں یہی کہا تھا، پروردگار! میں مجرموں کا مددگار نہیں بن سکتا۔ تو حضرت عمر بن عبدالعزیز (رح) نے بھی یہی جواب دیا کہ اگر میری اولاد مجرم ہوگی تو میں ان کا مددگار نہیں بن سکتا۔ (تفسیر معالم العرفان)

معلوم ہوا کہ جو نبی کی غلامی سے نکل جاوے وہ اللہ کی کتاب، اللہ کی رحمت، اللہ کے فضل، ایمان و عرفان غرضیکہ سب سے نکل جاتا ہے۔ بلعم نے یوشع (علیہ السلام) پر بددعا کرنی چاہی تو تمام چیزوں سے نکال دیا گیا۔ (تفسیر نور العرفان)

قوت ایمانی :

ان آیتوں میں یقین واطمینان کی اس قدر قوت بھری ہوئی ہے کہ جس کا اندازہ کرنا عقل بشری کے لئے بہت مشکل ہے اس لیے اس کو انہی الفاظ میں ظاہر کیا جاسکتا ہے کہ یہ قوت اندازہ سے باہر ہے اور سوائے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اور کسی کا قلب اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ (درس قرآن آسٹریلیا)

آیت مبارکہ:

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ۝۱۹۷

لغۃ القرآن: [وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ جن کو] [تَدْعُوْنَ : تم لوگ پکارتے ہو] [مِنْ دُوْنِهٖ : اس کے علاوہ] [لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ : وہ استطاعت نہیں رکھتے] [نَصْرَكُمْ : تمہاری مدد کی] [وَلَآ : اور نہ] [اَنْفُسَهُمْ : اپنی جان کی] [يَنْصُرُوْنَ : وہ مدد کرسکتے ہیں]

ترجمہ: اور جن (بتوں) کو تم اس کے سوا پوجتے ہو وہ تمہاری مدد کرنے پر کوئی قدرت نہیں رکھتے اور نہ ہی اپنے آپ کی مدد کرسکتے ہیں

تشریح: اور جن کی تم عبادت کرتے ہو، اللہ کے سوا وہ طاقت نہیں رکھتے تمہاری امداد کی اور نہ اپنی ہی مدد کرسکتے ہیں۔ میرا حامی و ناصر تو وہ ہے جس کی یہ شان ہے۔ اور تمہارے باطل اور جھوٹے معبودوں کی بے بسی کا یہ عالم ہے۔ اب تم ہی فیصلہ کرو کامیاب وکامران کون ہوگا۔ اس مضمون کو دوبارہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ بات اچھی طرح ان کے ذہن نشین کرادی جائے کہ ان کے معبود نہ اپنے پجاریوں کو کوئی فائدہ پہنچاسکتے ہیں اور نہ اپنے مخالفین کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

یہ آیت بھی ان بتوں کی عبادت کے عدم استحقاق کو بیان کرتی ہے جن کی یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں، کیونکہ یہ خود اپنی مدد کرنے کی استطاعت اور قدرت رکھتے ہیں نہ اپنے عبادت گزاروں کی مدد کرسکتے ہیں ان میں قوت عقل ہے نہ جواب دینے کی طاقت۔ اگر تو ان کو ہدایت کی طرف بلائے تو ان کی طرف نہیں آئیں گے کیونکہ یہ تو زندگی کے بغیر محض تصویریں ہیں تو ان کو دیکھے گا کہ گویا وہ تیری طرف دیکھ رہے ہیں مگر حقیقت میں وہ دیکھ نہیں سکتے، کیونکہ مصوروں نے ان کو انسانوں وغیرہ جانداروں کی صورت دی ہے، ان کی آنکھیں اور دیگر اعضاء بنائے ہیں۔ جب تو ان کی طرف دیکھے گا تو کہہ اٹھے گا کہ یہ زندہ ہیں مگر جب تو ان کو غور سے دیکھے گا تو پہچان لے گا کہ یہ تو جامد پتھر ہیں جن میں کوئی حرکت ہے نہ زندگی۔ تب کس بنا پر مشرکین نے ان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ الہ ٹھرالیا؟ کونسی مصلحت اور کون سے فائدے کی خاطر یہ لوگ ان کے پاس اعتکاف کرتے ہیں اور مختلف عبادات کے ذریعے سے ان کا تقرب حاصل کرتے ہیں؟

جب اس چیز کی معرفت حاصل ہوگئی تو یہ بات واضح ہوگئی کہا گر مشرکین اور ان کے معبود، جن کی یہ عبادت کرتے ہیں، اکٹھے ہو کر ان لوگوں کے خلاف چالیں چل لیں جن کو زمین اور آسمانوں کی تخلیق کرنے والے نے اپنی سرپرستی میں لے رکھا ہے اور اپنے نیک بندوں کے احوال کا والی ہے، وہ اپنی چال سے ذرہ بھر نقصان پہنچانے پر قادر نہیں کیونکہ وہ کامل طور پر عاجز اور ان کے معبود بھی عاجز ہیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ پوری قوت اور کامل اقتدار کا مالک ہے اور وہ شخص بھی قوی ہے جو اس کے جلال کی پناہ لیتا اور اس پر بھروسہ کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد (آیت) : ”میں ضمیر مشرکین کی طرف لوٹتی ہے جنہوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تکذیب کی (تب اس کے معنی یہ ہوں گے) اے اللہ کے رسول! آپ سمجھتے ہیں کہ مشرکین آپ کو اعتبار کی نظر سے دیکھتے ہیں تاکہ جھوٹے میں سے سچے کا امتیاز ہوسکے گا۔ مگر وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے اور وہ جمال و کمال اور صدق کی ان علامتوں کو نہیں دیکھ سکتے جن کے ذریعے سے پہچاننے والے حقیقت کو پہچانتے ہیں۔ (تفسیر سعدی)

اگر ان سے دیوی دیوتا یا مقدس شخصیتیں مراد لی جائیں تو حقیقت یہ ہے کہ ان کی حقیقت بھی ماسوائے مفروضوں اور ماسوائے تمہارے رکھے ہوئے ناموں کے اور کچھ بھی نہیں یعنی تم نے اپنے تئیں کسی کو لکشمی دیوی، کسی کو جل دیوتا یا اسی طرح کے کچھ نام دے رکھے ہیں کسی کو تم لات کہتے ہو اور کسی کو منات اور کسی کو تم نے عزیٰ

بنا رکھا ہے لیکن یہ تمہارے اپنے رکھے ہوئے نام ہیں ان کی حقیقت تو پتھروں کے سوا کچھ بھی نہیں تم نے جو صفات ان کی طرف منسوب کر رکھی ہیں وہ بھی تمہارے خود ساختہ انتساب کے سوا کسی حقیقت کی آئینہ دار نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے مفروضہ اعتقادات کے نام سے شرک کا جو ایک کاروبار شروع کر رکھا ہے اس کی حقیقت سوائے جہالت، نادانی، خود فریبی، آباء پرستی کے سوا کچھ نہیں اور نتیجہ اس کا دنیا کی تباہی اور آخرت کی بربادی ہے۔ خود سوچ لو تم نے جو راستہ اختیار کر رکھا ہے اس میں کتنی معقولیت ہے۔

اگلی آیت کریمہ سے رکوع کا دوسرا حصہ شروع ہو رہا ہے جس میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اور آپ کے واسطے سے مسلمانوں کو اس کٹھن فریضہ کو انجام دینے کی نزاکتیں سکھائی جارہی ہیں اور ہدایات دی جارہی ہیں جس کے لیے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مبعوث کیے گئے تھے۔ (تفسیر روح القرآن)

آیت مبارکہ:

وَاِنۡ تَدۡعُوۡهُمۡ اِلَى الۡهُدٰى لَا يَسۡمَعُوۡا‌ ؕ وَتَرٰٮهُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَيۡكَ وَهُمۡ لَا يُبۡصِرُوۡنَ ۝۱۹۸

لغۃ القرآن: [وَاِنْ : اور اگر] [تَدْعُوْهُمْ : تم لوگ پکاروان کو] [اِلَى: طرف] [الْهُدٰى: ہدایت] [لَا : نہیں] [يَسْمَعُوْا : وہ سنتے]]وَتَرٰىهُمْ : اور آپ دیکھتے ہیں ان کو] [يَنْظُرُوْنَ : وہ تکتے ہیں] [اِلَيْكَ : آپ کی طرف] [وَهُمْ : حالانکہ وہ] [لَا يُبْصِرُوْنَ : نہیں دیکھتے]

ترجمہ: اور اگر تم انھیں ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ سن (بھی) نہیں سکیں گے، اور آپ ان (بتوں) کو دیکھتے ہیں (وہ اس طرح تراشے گئے ہیں) کہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ (کچھ) نہیں دیکھتے

تشریح: یعنی اگر تم بتوں کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ نہ سنیں گے کیونکہ ان کے مصنوعی کان بنائے گئے ہیں جن میں سننے کی صلاحیت نہیں ہے، اسی طرح ان کی آنکھیں بھی مصنوعی ہیں۔ دیکھنے والے کو لگتا ہے کہ یہ بت اسے دیکھ رہے ہیں حالانکہ ان کی آنکھیں دیکھنے سے قاصر ہیں۔ اور اگر ان سے مراد مشرکین ہوں تو وہ بھی ہدایت قبول کرنے والے نہیں کیونکہ وہ آپ کو دیکھتے تو ہیں مگر حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور آپ کی تعلیمات میں غور نہیں کرتے اس لیے ان کا دیکھنا دیکھنے کے برابر ہے۔ (تفسیر امداد الکرم)

ان کی پتھریلی آنکھوں میں کوئی نور نہیں۔ دراصل مشرکین شیطانی وسوسے کے تحت سمجھتے ہیں کہ ان کے بتوں کی آنکھوں میں چمک ہے اور وہ انھیں دیکھ رہے ہیں مگر وہ کیا خاک دیکھیں گے؟ مروی ہے کہ قبول اسلام سے قبل حضرت زلیخاہ (رض) نے جب یوسف علیہ السلام کو دعوت گناہ دینا چاہی تو انھوں نے کمرے میں موجود بت کے اوپر کپڑا ڈال دیا تاکہ وہ بزعم خود دیکھ نہ سکے۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔ اگر تم اس بے جان بت سے شرم رکھتی ہوں جو دیکھ نہیں سکتا تو کیا میں اس حقیقی رب سے شرم نہ کروں جو مجھے ہر حالت میں دیکھ رہا ہے۔ (تفسیر برہان القرآن)

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی ذات میں نبوت کے جو دلائل اور نشانیاں رکھی ہیں جب یہ اس کا اثر قبول نہیں کرتے تو ایسا ہی ہے کہ گویا وہ آپ ﷺ کو نہیں دیکھتے۔ یہ تو آپکو عربی قرشی ابن عبداللہ برادرزادہ ابوطالب اور بنی روعبد المطلب وغیرہ کی حیثیت سے دیکھ رہے ہیں۔ اگر محمد رسول اللہ سمجھ کر اور تمام دنیوی رشتوں کا بالائے طاق رکھ کر دیکھتے تو ضرور ایمان قبول کر لیتے۔۔ الغرض۔۔ ان کا دیکھنا نتیجہ کے لحاظ سے غیر مفید ہونے میں نہ دیکھنے ہی کی طرح ہے۔ یہ تو بظاہر بالکل اپنے بتوں کی طرح ہیں جن کو دیکھو تو ایسا لگتا ہے کہ وہ ہمیں دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ نہیں دیکھتے۔

سابقہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی اور نیک مسلمانوں کا حامی و ناصر ہے اور بت اور اس کے پجاری کسی کو نفع و نقصان پہنچانے پر قادر نہیں ہیں۔ اور اب اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے ساتھ سلوک کرنے کا صحیح اور معتدل طریقہ بیان فرمایا ہے کیونکہ صالح اور نیک ہونے کا تقاضایہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کے ساتھ ساتھ کیونکہ صالح اور نیک سلوک کیا جائے۔ اور حقوق اللہ حقوق العباد دونوں کی رعایت کی جائے۔ (تفسیر اشرفی)

روایات میں وارد و منقول ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مدینہ منورہ تشریف آوری پر جب حضرت معاذ بن عمرو بن الجموع اور حضرت معاذ بن جبل ۔ (رض)۔ دونوں اسلام میں داخل ہوئے، اور یہ دونوں نوجوان تھے، تو انھوں نے اس کے بعد بتوں کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ چنانچہ یہ دونوں رات کے وقت مشرکین کے بتوں کی خبر لیتے اور ان کو توڑ پھوڑ ڈالتے۔ اور ان کو توڑ کر بیواؤں کے لیے ایندھن بنا لیتے تاکہ ان کی قوم اس سے سبق لے اور عبرت پکڑے۔ اور عمرو بن جموح جو کہ اپنی قوم کے سردار تھے ان کا ایک خاص بت تھا جس کی وہ پوجا کرتے اور اس کی خدمت و سیوا میں لگے رہتے۔ تو یہ دونوں نوجوان رات کے وقت جا کر اس کو اوندھا کر دیتے اور اس پر گندگی مل دیتے۔ صبح ہونے پر جب عمرو بن جموع اپنے ٹھاکر کا یہ حال دیکھتے تو افسوس کرتے اور اس کو صاف کر کے پھر سیدھا کر کے رکھ دیتے۔ لیکن وہ نوجوان پھر آ کر ایسے ہی کر دیتے۔ ابن جموع پھر اس کو صاف کرتے۔ اور ایک دن اس کے پاس ایک تلوار بھی رکھ دی کہ آئندہ جب ایسا کوئی شخص آئے تو اس کی اس تلوار سے خبر لینا۔ مگر پھر بھی ویسے ہی ہوتا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ انھوں نے اس کو ایک رسی کے ساتھ باندھ کر ایک مرے ہوئے کتے کے ساتھ جوڑ کر ایک کھڈے میں ڈال دیا تو اس پر عمرو بن جموح کی آنکھ کھلی اور انھوں نے ایک شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ "اگر تو معبود ہوتا تو اس طرح اس مرے ہوئے کتے کے ساتھ کھڈے میں نہ پڑا رہتا" تو اس پر آپ (رض) کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہو گئے اور ایک اچھے اور سچے مسلمان بن گئے۔ یہاں تک کہ احد میں شہید ہو گئے۔ (رض) وارضاہ۔ بہر کیف اس ارشاد سے واضح فرما دیا گیا کہ اللہ کے سوا جن کو پوجا پکارا جاتا ہے وہ سب بے حقیقت ہیں۔ ان کو حاجت روائی و مشکل کشائی کے لیے پکارنا کھلم کھلا ظلم ہے۔ والعیاذ باللہ العظیم ۔ (تفسیر مدنی کبیر)

یہ آیات بتوں کے لئے ہیں انہیں اور کسی جگہ استعمال کرنا بھی ظلم وزیادتی ہے۔

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ کفار نبی کو دیکھتے ہیں مگر دیکھتے نہیں۔ کیونکہ دیکھنے والی نگاہ ان کے پاس نہیں۔ وہ صرف ان کی بشریت کو دیکھتے ہیں۔ انھیں نبوت نظر نہیں آتی۔ بصیرت سے حضور کو دیکھنے والا صحابی ہو جاتا ہے۔ اور صرف بصر سے دیکھنے والا صحابی نہیں۔ بعض حضرات نابینا تھے اور صحابی تھے کہ وہ بصیرت رکھتے ایک بزرگ نے فرمایا کہ جو مجھے دیکھ لے وہ جنتی ہو جاوے۔ کسی نے کہا کہ ابو جہل نے حضور کو دیکھا وہ جنتی نہ ہو تو تمہارے دیکھنے سے جنتی کیسے ہو سکتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ اس نے محمد بن عبداللہ کو دیکھا تھا محمد رسول اللہ کو نہ دیکھا، اور یہ ہی آیت پڑھی (روح) (تفسیر نور العرفان)

آیت مبارکہ:

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ۝۱۹۹

لغۃ القرآن: [خُذِ : آپ پکڑیں] [الْعَفْوَ : درگزر کو] [وَاْمُرْ : اور حکم دیں] [بِالْعُرْفِ : نیکی کا] [وَاَعْرِضْ : اور اعراض کر] [عَنِ : سے] [الْجٰهِلِيْنَ : جاہلوں]

ترجمہ: (اے حبیب مکرّم !) آپ در گزر فرمانا اختیار کریں، اور بھلائی کا حکم دیتے رہیں اور جاہلوں سے کنارہ کشی اختیار کر لیں

تشریح: حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب بتوں اور بت پرستوں کے خلاف ان افکار کی تبلیغ فرمائی جو گزشتہ آیات میں بیان ہوئے تو مشرکین نے آپ کے خلاف زبان درازی اور ایذا رسانی کا سلسلہ شروع کر دیا تب آپ سے فرمایا گیا کہ آپ عفو و درگزر سے کام لے اور بھلائی کا حکم فرماتے رہیں اور جاہلوں سے الجھنے کی کوشش نہ کریں ان کی زبان درازیوں سے اعراض کریں تاکہ وہ آپ کے اخلاق سے متاثر ہو کر آپ کے حلقہ بگوش ہوں۔ (تفسیر برہان القرآن)

اس آیت میں تین امور کے متعلق ہدایت فرمائی گئی ہے۔ (۱) جو قصوروار معذرت طلب کرتا ہو آپ کے پاس آئے اسے کمال فراغ دلی اور شفقت سے معاف کر دیجئے اور بدلہ وانتقام لینے پر اصرار نہ کیجئے۔ ای خذ العفو عن المذنبین والمعاد اعف عنھم (روح المعانی)۔ (۲) یہ کہ اچھی اور مفید چیزوں کے کرنے کا آپ لوگوں کو حکم دیجئے۔ العرف: المعروف المستحسن من الافعال (بیضاوی)۔ (۳) جاہل اور ناسمجھ لوگ اگر آپ کو برا بھلا کہیں تو ان سے الجھئے نہیں۔ حضرت امام جعفر صادق (علیہ السلام) نے فرمایا ہے کہ قرآن میں اخلاق حسنہ کے متعلق یہ جامع ترین آیت ہے۔ ولیس فی القرآن اجمع لمکارم الاخلاق من ھذہ الایۃ (قرطبی) ہر مومن کو ان

صفات حسنہ سے متصف ہونا چاہیے اور خصوصاً اس طبقہ کو جن کے ذمہ اشاعت دین اور تبلیغ اسلام کا فریضہ ہے انھیں تو خصوصی طور پر ان خصائل حمیدہ سے اپنے آپ کو مزین کرنا چاہیے۔ اسی مضمون کو زیادہ تفصیل کے ساتھ حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے اس ارشاد میں بیان فرمایا ہے۔ امرنی ربی بتسع الاخلاص فی السر والعلانیۃ والعدل فی الرضاء والغضب والقصد فی الغنی والفقر وان اعفو عمن ظلمنی واصل من قطعنی واعطی من حرمنی وان یکون نطقی ذکرا وصمتی فکرا ونظری عبرۃ (قرطبیؒ)

ترجمہ: مجھے میرے پروردگار نے نو باتوں کا حکم دیا ہے:۔

(۱) ظاہر و باطن میں اخلاص کو اپنا شعار بناؤں۔ (۲) خوشنودی اور ناراضگی میں عدل کروں۔

(۳) خوشحالی اور تنگ دستی میں میانہ راوی اختیار کروں۔ (۴) جو مجھ پر ظلم کرے اس کو معاف کر دوں۔

(۵) جو قطع تعلّق کرے اس سے صلہ رحمی کروں۔ (۶) اس کو دوں جو مجھے محروم رکھے۔

(۷) میری زبان گویا ہو تو ذکر الٰہی سے۔ (۸) خاموشی کی حالت میں اس کی آیتوں میں غور و فکر کروں۔

(۹) اور میرے دیکھنے میں عبرت پذیری ہو۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

امام جعفر صادق (علیہ السلام) نے فرمایا: قرآن مجید میں اخلاق حسنہ کے متعلق یہ جامع ترین آیت ہے۔ (تفسیر قرطبیؒ)

اخلاق حسنہ کے متعلق نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دو ارشادات ملاحظہ ہوں:

ا۔ ابو تمیمہ (رض) بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کی کہ مجھے نصیحت فرمائیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کسی نیکی کو ہرگز حقیر نہ سمجھو اور (یہ بھی نیکی ہے کہ) جب تم اپنے کسی بھائی سے ملاقات کرو تو خندہ پیشانی اور مسکراتے ہوئے چہرہ کے ساتھ ملاقات کرو اور پانی مانگنے والے کو اپنے ڈول سے پانی دو اور اگر کوئی شخص تمہارے کسی عیب کی وجہ سے تمہیں برا کہے تو تم اس کے کسی عیب کی وجہ سے اسے برا نہ کہو، تمہیں اس در گزر کا اجر ملے گا اور اسے برا کہنے کا گناہ ہوگا اور تکبر سے تہبند نہ لٹکاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ تکبر کو پسند نہیں کرتا اور کسی شخص کو ہرگز گالی نہ دو (ابو تیمیہ (رض) کہتے ہیں) اس نصیحت کے بعد میں نے کسی انسان کو گالی نہیں دی حتیٰ کہ کسی بکری اور اونٹ کو بھی گالی نہیں دی۔

فتح مکہ کے دن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے معاف کرنے کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا تاریخ انسانیت اس کی مثال لانے سے قاصر ہے۔ ایسے دشمن جنھوں نے مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے، انھیں مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو شہید کرنے کی سازش کی، حضرت حمزہ (رض) کے کلیجہ کو چبایا۔ اس کے باوجود آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مکہ فتح کرکے ان سب کو معاف کر دیا۔ (تفسیر امداد الکرم)

دعوتِ حق کی انجام دہی کے لیے ناگزیر ہدایات

ان آیات پر غور کرتے ہوئے مختلف باتوں کی طرف راہنمائی ملتی ہے جن میں سے ایک ایک بات دعوتی نقطہ نگاہ اور انسانی نفسیات کے حوالے سے اس قابل ہے کہ اسے سونے میں تولا جائے ہم میں وہ بصیرت تو نہیں جس سے ہم ان آیات میں بیان کردہ حکمتوں کو پوری طرح سمجھ سکیں تاہم جو باتیں ہم ناچیز لوگوں کے فہم وادراک میں آتی ہیں انھیں ہم ایک ترتیب سے ذکر کرتے ہیں۔

1 آیات میں بیان کردہ حکمتوں کو دیکھ کر سب سے پہلا تاثر جو دل و دماغ میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عظیم پیغمبر اور ان کے واسطے سے مسلمانوں کو ایک ایسے کام کی ہدایات ارشاد فرما رہے ہیں جو اپنی ذات میں نہایت کٹھن ہے جس کی نہایت گہری نزاکتیں ہیں جس میں ذرا سی بے احتیاطی تبلیغی مشن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جس کے لیے صرف علم کافی نہیں بلکہ جب تک علم کے ساتھ حکمت نصیب نہ ہو، انسانی نفسیات کا گہرا ادراک نہ ہو اور طبیعت پر بے پناہ قابو نہ ہو، اس وقت تک اس کام کا ارادہ کرنا بھی مشکل ہے۔ یہ آرام کرسی پر بیٹھ کر اسلامی علوم مطالعہ کرنے کا نام نہیں، یہ محض حکیمانہ طریقے سے مسلسل غور و فکر سے بھی انجام نہیں پاتا، اس کے لیے انسانوں سے ملنا، ان کے احساسات کو جاننا، ان کے ہر طرح کے رد عمل کو برداشت کرنا، طبیعت کے ہیجان پر قابو پانا، اپنی ذات کو اس کام میں گم کر دینا اور سب کچھ کرکے بھی کسی طرح کا ادعا پیدا نہ ہونے دینا یہ اس کے کم سے کم تقاضے ہیں، جس کے بغیر اس وادی میں

داخل ہونا بھی نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان آیات کا پہلا تاثر یہ ہے کہ جس کام کے لیے یہ ہدایات دی جارہی ہیں سب سے پہلے اس کام کا صحیح احساس دل و دماغ میں پیدا ہونا چاہیے۔

2 کوئی پیغمبر یا پیغمبر کا پیروکار ایسا نہیں گزرا جس نے اللہ کے دین کی دعوت لوگوں کے سامنے پیش کی ہو اور پھر لوگوں نے اسے نہایت آسانی سے قبول کر لیا ہو بلکہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ہر پیغمبر اور ہر مصلح کو اپنے مخاطبوں کی جانب سے ہمیشہ شدید رد عمل سے واسطہ پڑا ہے اور اگر اللہ کے فضل و کرم سے لوگوں کی ایک معقول تعداد دعوت قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئی ہے کہ تو ان کی تربیت کا کام بجائے خود ایسا کٹھن کام ہے جس میں پیغمبر اور مصلح کو قدم قدم پر اپنا خون جلانا پڑتا ہے، ان کی صدیوں کی روایات کو بدلنا، ان کی عادات کو تبدیل کرنا، ان کے معمولات میں تبدیلی لانا، ان کی ترجیحات میں انقلاب برپا کرنا بلکہ ایک ایک فرد میں نئی شخصیت پیدا کرنا اور ان کے واسطے سے ایک نیا معاشرہ جنم دینا، ایک ایسا مشکل ترین کام ہے جس کے لیے جب تک ان مذکورہ بالا ہدایات پر عمل نہ کیا جائے اس وقت تک اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔

3 اللہ کے نبی معصوم پیدا ہوتے ہیں اور وحی الٰہی کا نور ان کا راستہ روشن رکھتا ہے اور ان پر ایمان لانے والے اس مینارہ نور سے ہمیشہ اکتساب فیض کرتے ہیں۔ بایں ہمہ ! انھیں اس طرح ہدایت دی جارہی ہیں جیسے انگلی پکڑ کر انھیں چلایا جارہا ہے۔ ان ہدایات کے لیے تین عنوانات اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا ہے { عفو } مقصود یہ ہے کہ اے پیغمبر آپ کو اور آپ کی امت کو اپنا فرض انجام دینے کے لیے سب سے پہلی جو چیز اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے وہ یہ ہے کہ عفو کو اپنی عادت بناؤ یعنی ایسا نہیں کہ کسی ایک آدھ موقع پر عفو و درگزر سے کام لو بلکہ یہ صفت تمہاری خصلت، تمہاری عادت اور تمہاری طبیعت ثانیہ بن جانی چاہیے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ عفو سے مراد کیا ہے ؟ عربی لغت کے اعتبار سے عفو کے کئی معنی ہو سکتے ہیں اور اس موقع پر ہر معنی کی گنجائش ہے ان میں سے ایک معنی یہ ہے کہ عفو ہر ایسے کام کو کہا جاتا ہے جو آسانی کے ساتھ بغیر کلفت اور مشقت کے ہو سکے۔ مراد یہ ہے کہ اے پیغمبر ! جس طرح آپ کا واسطہ غیر مسلموں سے ہے، اسی طرح اپنے فرمان برداروں سے بھی ہے۔ فرمان برداروں کے حوالے سے یہ ہدایت دی جارہی ہے کہ آپ کا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ اگر حقوق و فرائض کی تعمیل میں یا آپ کے اتباع و اطاعت میں یا عبادت کی ادائیگی میں بظاہر مسلمانوں میں کچھ کمی بھی محسوس ہو تو آپ اسے قبول فرمائیں اور اعلیٰ معیار کا نمونہ دیتے ہوئے اس پر اصرار نہ فرمائیں آہستہ آہستہ یہ لوگ خود بخود اعلیٰ معیار کی گھاٹی پر چڑھتے چلے جائیں گے۔ لیکن فی الحال آپ کا رویہ ان کے ساتھ نہایت نرمی اور سہولت کا ہونا چاہیے۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس آیت کے نازل ہونے پر فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے اعمال واخلاق میں سرسری اطاعت قبول کرنے کا حکم دیا ہے میں نے عزم کر لیا ہے کہ جب تک ان لوگوں کے ساتھ ہوں ایسا ہی عمل کروں گا۔ اسی سے متعلق اس کا دوسرا پہلو بھی ہے کہ غیر مسلموں میں آپ کے بعض ایسے قرابت دار بھی تھے جن سے آپ کو معاملات پیش آتے رہتے تھے اور خود مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ تھے جو ابھی تک پوری طرح مکارم اخلاق کی تربیت نہیں پا سکے تھے اس لیے اخلاقی معاملات میں خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ بعض دفعہ ان سے کوتاہیاں سرزد ہوتی تھیں۔ چنانچہ اس آیت کریمہ میں عفو کے ذریعہ سے آپ کو یہ ہدایت دی جارہی ہے کہ آپ ان لوگوں کے معاملات میں حد درجہ نرمی اختیار فرمائیں کیونکہ یہی وہ اخلاق ہے جو آہستہ آہستہ ان کے دلوں میں آپ کی محبت اور اسلام کے لیے استقامت پیدا کرے گا۔ اسی چیز کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک اور موقع پر اس طرح ارشاد فرمایا کہ

میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ غضب اور رضا دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کرو جو مجھ سے کٹے، میں اس سے جڑوں، جو مجھے میرے حق سے محروم کرے میں اسے اس کا حق دوں اور جو میرے ساتھ ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں۔

یہی وہ اخلاق کریمانہ ہیں جس نے عرب کے بدوؤں اور اجڈ لوگوں کو آہستہ آہستہ آپ کا گرویدہ بنا دیا لیکن ایسے اخلاق کا پیکر بننا اور ہر طرح کے حالات میں ایسے مکارم اخلاق کا ثبوت دینا یہ اللہ کے فضل و کرم کے سوا ممکن نہیں۔ اس لیے پروردگار نے احسان کے طور پر اس کا ذکر فرمایا :

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ

اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے نرم ہو ورنہ اگر تم درشت خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب لوگ تمہارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔ (آلِ عمران : ۱۵۹)

انسانوں کو راہ راست پر لانے اور ان میں مطلوبہ صفات پیدا کرنے میں اگرچہ حقیقی موثر عامل وہ الہامی تعلیم ہی ہے جو پیغمبر اللہ کی طرف سے انسانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں لیکن انسانوں میں اجتماعی شیرازہ بندی اور گہرا ربط وضبط وہ صرف الہامی تعلیم سے نہیں بلکہ پیغمبر، مصلح یا قائد کی خوش اخلاق شخصیت سے وجود میں آتا ہے، الہامی تعلیم کا راہنما اور مبلغ بھی اگر حسن اخلاق سے تہی دامن اور درشت خو ہو تو لوگ کبھی اس کے گرد جمع نہیں ہوں گے اور اگر برائی کی دعوت دینے والا بھی خوش اخلاق ہو تو اس کے گرد لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ اقبال نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

ہجوم زیادہ ہے کیوں شراب خانے میں

فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مرد خلیق

عفو کا دوسرا معنی ہے درگزر کرنا اور معاف کر دینا۔ عربی زبان میں محض زبان سے معاف کرنا اور وقتی طور پر درگزر کرنا یعنی سزا نہ دینا لیکن دل سے معاف نہ کرنا عفو اس کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور دل سے معاف کر دینے کے لیے بھی بولا جاتا ہے، یہاں دونوں ہی معنی مراد لیے جاسکتے ہیں۔ اللہ کے پیغمبروں کو لوگوں کی جانب سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے جیسے دعوت دین کا کام آگے بڑھتا ہے ویسے ویسے لوگوں کی جانب سے مخالفت میں شدت آتی جاتی ہے۔ وہ زبان سے بھی پیغمبر کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے ہیں، اتہامات اور الزامات کا بھی طوفان اٹھاتے ہیں، سازشیں بھی کرتے ہیں، ہر طرح کی تکلیف پہنچانے کی تدبیریں بھی سوچتے ہیں، بس چلے تو قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتے، معاشی قطع تعلق بھی کرنا پڑے تو یہ بھی ان کے لیے مشکل نہیں ہوتا، جسمانی تشدد سے بھی گریز نہیں کرتے، غرضیکہ زندگی کا کوئی دکھ ایسا نہیں جو پیغمبر کو اپنی قوم کی طرف سے برداشت نہیں کرنا پڑتا۔ ایسی صورتحال میں یہ کیسے ممکن ہے کہ پیغمبر کی طبیعت میں اشتعال پیدا نہ ہو، ناگوار باتوں پر غصہ نہ آئے، تلخ گفتاری پر طبیعت میں ہیجان پیدا نہ ہو لیکن دعوت کا عمل ایسا صبر آزما عمل ہے کہ اس میں ان سب باتوں کو برداشت کرنا اس عمل کا لازمی تقاضہ ہے، اگر ان سب باتوں کو برداشت نہ کیا جائے تو آج کے دشمن کل کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ یہاں اسی بات کا حکم دیا جارہا ہے کہ آپ کو ان تمام باتوں کے مقابلہ میں عفو و درگزر سے کام لینا ہے۔ مخالفوں کی طرف سے کیسی ہی سخت کلامی، بہتان تراشی، ایذارسانی اور تکلیف دہ مزاحمت کا اظہار ہو آپ کو اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے درگزر ہی سے کام لینا ہے۔ چنانچہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسی پر عمل کرتے ہوئے نہ کبھی اہل مکہ سے انتقام لیا، نہ مدینہ کے یہود اور منافقین سے، آپ نے طائف کے پتھر کھائے لیکن بجائے انتقام لینے کے ان کے لیے ہدایت کی دعا فرمائی، جنگ احد میں آپ کو بری طرح زخمی کیا گیا لیکن آپ نے ان کے لیے کوئی کلمہ سخت کہنا بھی گوارا نہ کیا اور جب فتح مکہ کے بعد آپ کے دشمن اپنی تمام مخالفتوں، ہرزہ سرائیوں، ایذارسانیوں اور تہمت تراشیوں کا پشتارہ اٹھائے آپ کے سامنے کھڑے تھے تو آپ نے صرف درگزر ہی نہیں کیا بلکہ دل سے معاف فرمایا اور یہ نتیجہ تھا اسی عفو کے حکم کا۔

اور دوسرا ہے { وأمر بالعرف } اور آپ انھیں معروف کا حکم دیں۔ معروف ایسی بات کو کہتے ہیں جو عقل اور فطرت اور معقول لوگوں کے نزدیک جانی پہچانی ہو اسلام کے بنیادی عقائد نیکی اور عدل کی تعلیمات اور تمام مکارم اخلاق یہ ایسی باتیں ہیں جو عقل و فطرت کی شہادت پر مبنی اور سلیم الفطرت طبائع کے لیے ان کے دل کی آواز ہیں اسی طرح ہر وہ اچھی اور مستحسن بات یا کام جو کسی بھی معاشرے میں سنجیدہ فکر اور صالح عمل لوگوں کے نزدیک پسندیدہ ہو اور شریعت اسلامی نے اس کی مخالفت نہ کی ہو اور اسلامی مزاج اس سے ابا نہ کرتا ہو وہ بھی معروف میں داخل ہے آپ کو حکم دیا جارہا ہے کہ آپ ان لوگوں کی مخالفتوں کے باوجود معروف کا کام جاری رکھیں ہر اچھائی کی طرف ان کو بلائیں اور ہر نیکی کی انھیں ترغیب دیں آخر ایک وقت ایسا آئے گا کہ صالح طبیعتیں آپ کی دعوت پر استقامت اور دشمنوں کی شقاوت کو دیکھتے ہوئے سوچنے پر مجبور ہو جائیں گی کہ ایک طرف ایک شریف النفس اور بلند اخلاق انسان ہے جو سیدھی بھلائیوں کی دعوت دے رہا ہے اور دوسری طرف بہت سے لوگ اس کی مخالفت میں ہر قسم کی اخلاق وانسانیت سے گری ہوئی تدبیریں کر رہے ہیں تو رفتہ رفتہ ان کے دل خود بخود داعی حق کی طرف متوجہ ہوتے چلے جائیں گے یہاں تک کہ آخر کار میدان مقابلہ میں صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جن کے ذاتی مفادات نظام باطل کے قیام ہی سے وابستہ ہیں یا جن کی گروہی مجبوریاں اور جاہلانہ تعصّبات اس روشنی کے قبول کرنے کی اجازت نہ دیں۔

معروف کا حکم دینے اور اس کی تبلیغ کرنے کا یہ بھی مطلب ہے کہ لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق ان کے سامنے اسلامی دعوت پیش کی جائے۔ فلسفہ طرازی اور دقیقہ سنجی کی بجائے سیدھے سادے طریقے سے بات سمجھانے کی کوشش کی جائے جسے لوگ اپنے دل کی آواز محسوس کریں۔ چنانچہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا

اسی ہدایت کے مطابق یہ مزاج بن گیا تھا کہ آپ دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں ہر شخص کی ذہنی سطح کے اور اس کے مدارج کا پورا پورا خیال فرماتے تھے۔ شہری لوگوں سے ان کے انداز اور معیار کے مطابق گفتگو فرماتے اور دیہاتی اور بدوی لوگوں سے ان کی ذہنیت کے مطابق بات کرتے۔ حضرت ابوہریرہ (رض) نے اس سلسلے میں بنی فنزارہ کے ایک شخص کا ذکر کیا ہے جو بدوی تھا۔ وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میرے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا ہے جو سیاہ رنگ کا ہے۔ میں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے کیونکہ ہم میاں بیوی میں سے کوئی بھی سیاہ رنگ کا نھیں ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی سمجھ اور پیشہ کے مطابق جواب مرحمت فرمایا۔ اس سے پوچھا: کیا تمہارے پاس اونٹ ہیں؟ اس نے کہا: جی ہاں! آپ نے پھر دریافت فرمایا: وہ کس رنگ کے ہیں؟ اس نے کہا: سرخ رنگ کے۔ آپ نے پھر سوال کیا: ان میں کوئی خاکستری رنگ کا یا کم سیاہ رنگ کا کوئی اونٹ بھی ہے؟ اس نے کہا: ہاں ہے۔ حضور نے فرمایا کہ اب تم ہی بتاؤ کہ سرخ رنگ کے اونٹوں میں یہ سیاہی کیسے آ گئی؟ اس نے اس کے جواب میں کہا ممکن ہے کہ اس کی نسل میں کوئی خاکستری یا سیاہ رنگ کا ہو اور یہ اس کی جھلک آ گئی ہو۔ جب بات یہاں تک پہنچی تو آپ نے یہ فرما کر اس کے شک کو دور کر دیا کہ تمہارے بیٹے کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہو سکتا ہے۔ یہ نسب کا کرشمہ ہے اور اس میں تمہاری بیوی کا کوئی قصور نہیں ہے۔

اس طرح طبرانی کی ایک روایت میں ہے کہ قریش کا ایک نوجوان جو حیوانیت کے جذبات سے مغلوب تھا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا اور کہنے لگا مجھے بدکاری کی اجازت فرما دیجئے اس کا یہ کہنا تھا کہ حاضرین اس پر لپکے اور اس گستاخی پر اس کو خوب ڈانٹا۔ آپ نے یہ دیکھا تو فرمایا کہ اس سے تعرض نہ کرو اور اس کو قریب بلا کر پوچھا کہ کیا تم اس بات کو پسند کرو گے کہ جن رشتوں کا تم احترام کرتے ہو ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی یہ بری حرکت کرے؟ اس نے کہا میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ نے فرمایا کہ تم جس برائی کا ارادہ کر رہے ہو وہ برائی بھی تو آخر کسی کی بہن، بیٹی کے ساتھ ہو گی۔ اس کے بعد آپ نے اس کے لیے مغفرت کی دعا فرمائی۔ وہ اس سادہ تفہیم کے انداز سے جو اس کی ذہنی سطح کے عین مطابق تھی اس قدر متاثر ہوا کہ ہمیشہ کے لیے اس سے تائب ہو گیا۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حضور اپنی دعوت میں آسانی، تیسیر اور تدریج کو ملحوظ رکھتے تھے۔ آپ کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ احکام اور مسائل میں تنگی پیدا نہ ہونے پائے اور اس کی خاطر اپنے اللہ سے دعا بھی فرماتے تھے اور جب دوسرے لوگوں کو تعلیم یا تبلیغ کے لیے بھیجتے تو ان کو بھی حکم دیتے کہ لوگوں کو تعلیم دو اور آسانی پیدا کرو اور مشکلات سے پرہیز کرو۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ اغلوطات سے منع فرمایا کرتے تھے۔ امام اوزاعی کہتے ہیں کہ اس سے مقصود یہ تھا کہ لوگوں کے سامنے مشکل و پیچیدہ مسائل بیان نہ کیے جائیں جن سے وہ کچھ اخذ نہ کر سکیں بلکہ صرف وہ باتیں بیان کی جائیں جن کو وہ آسانی سے سمجھ سکیں بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ حکمت تبلیغ کا دارومدار چونکہ اس بات پر تھا کہ اپنی دعوت کو لوگوں کے دماغوں میں اتارا جائے۔ اس لیے آپ بعض دفعہ حسب ضرورت گفتگو میں اپنے مخاطب کے لب و لہجہ کا بھی خیال رکھتے اور یہ بھی دیکھتے کہ اس کا تعلق کس قبیلے سے ہے اور اس قبیلے میں کس نوعیت کی زبان رائج ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ نے عاصم الاشعری سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا۔

لیس من امبر امصیام فی امسفر (سفر کے دوران روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے)

حالانکہ اصل جملہ اس طرح ہے (لیس من البر الصیام فی السفر)

عاصم چونکہ قبیلہ اشعر سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی عادت یہ تھی کہ اکثر لام کو م کے ساتھ بدل دیتے تھے۔ چنانچہ آپ نے انہی کے لب و لہجہ میں بات فرمائی اور مقصود صرف یہ تھا کہ مخاطب بات کو پوری طرح سمجھ سکے۔ صحابہ روایت کرتے ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عادت میں یہ بات بھی تھی کہ جب کسی اہم دینی بات کو دل و دماغ میں اتارنا چاہتے تو عموماً اسے تین مرتبہ دہراتے تاکہ بات دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ اس معاملے میں آپ کی احتیاط کا عالم یہ تھا کہ جس طرح آپ لوگوں کے لب لہجہ اور احساسات کا خیال فرماتے تھے اسی طرح ان کی نفسیات کا بھی خیال فرماتے۔ انسانی فطرت ہے کہ آدمی ہر وقت بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور اگر موقع بے موقع اسے بات سننے پر مجبور کیا جائے تو اس کا ذہن، اس کا دل اسے قبول نہیں کرتا۔ حضرت علی (رض) اسی حکمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "دلوں میں خواہشات اور میلانات ہوتے ہیں اور کسی وقت وہ بات سننے کے لیے تیار ہوتے ہیں اور کسی وقت وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ لوگوں کے دلوں میں ان میلانات کے اندر داخل ہو کر اس وقت بات کہنی چاہیے جب وہ سننے کے لیے تیار ہوں۔ اس لیے کہ دل کا حال یہ ہے کہ جب اس کو

کسی بات پر مجبور کیا جاتا ہے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے اور بات قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے"۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کا ہمیشہ لحاظ رکھتے تھے اور ہر وقت اور موقع بے موقع وعظ و نصیحت سے احتراز فرماتے تھے۔ حضرت ابن مسعود (رض) کہتے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وعظ و نصیحت میں تخول سے کام لیتے تھے یعنی وقفہ دے کر بات کرتے تھے تاکہ روزانہ اور ہر وقت کی نصیحت سے طبیعتیں اکتا نہ جائیں۔

مختصر یہ کہ معروف کا حکم دینے سے مراد ہر بھلائی کی بات کا حکم دینا ہے، جس کی تفصیل آپ نے پڑھ لی ہے اور اسلوب دعوت کو ایسا رکھنا ہے جو عام معروف سے ہٹا ہوا نہ ہو بلکہ مخاطب کی حیثیت، اس کی ذہنی سطح اور اس کے احساسات کا پورا لحاظ بھی اس میں شامل ہونا چاہئے۔

تیسرا حکم دیا گیا ہے: "واعرض عن الجٰھلین "اور جاہلوں سے اعراض کیجیے۔ دعوت حق کا کام کرنے والوں کو ہمیشہ تین طرح کے لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ایک تو وہ ہوتے ہیں جو دعوت کو سنتے، اس پر غور کرتے ہیں اور آہستہ آہستہ اس کی قبولیت کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد اگرچہ تھوڑی ہوتی ہے دوسرے وہ لوگ ہیں جنھیں پیغمبر یا کسی بھی داعی حق کی بات سننا بھی گوارا نہیں ہوتا۔ ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ کہنے والی زبان بند کر دی جائے اور لکھنے والا قلم چھین لیا جائے یعنی وہ خیر کے سرچشموں کو بند کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ تیسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو نہ صرف اس دعوت کو قبول نہیں کرتے بلکہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ دعوت اور داعی کے حوالے سے لوگوں کے ذہنوں میں جتنی غلط فہمیاں پیدا کر سکتے ہوں کریں۔ وہ آئے دن کوئی نہ کوئی نیا شگوفہ چھوڑتے ہیں، نئے نئے الزامات لگاتے ہیں، نئی نئی الجھنیں پیدا کرتے ہیں اور نئے نئے مطالبات پیش کرتے ہیں۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ داعی حق کو اصل کام نہ کرنے دیا جائے بلکہ انھیں باتوں میں الجھا کر اس کی ساری قوت اور سارا وقت ضائع کر دیا جائے۔ یہاں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے واسطے سے تمام داعیانِ حق کو یہ ہدایت دی جاری ہے کہ ایسے جاہل لوگ جن کا کام نئے نئے الجھاوے پیدا کرنا اور آپ کو انھیں میں الجھا کر منزل کھوٹی کرنا مقصود ہے۔ آپ ان سے اعراض کریں یہاں جاہل سے مراد بے علم نہیں بلکہ ایسا شخص مراد ہے جو جاہلیت قدیمہ اور قدیمیہ میں، گروہی اور مذہبی تعصّبات میں اس قدر شدید ہے کہ وہ اس سے ہٹ کر کوئی بات سوچ بھی نہیں سکتا وہ ہر بات کو انھیں جذبات کی نگاہ سے دیکھتا اور انہی جذبات سے پرکھتا ہے، یہ جاہل علم کے مقابلے میں نہیں بلکہ حلم کے مقابلے میں بولا جاتا ہے۔ یہاں یہ توجہ دلائی جارہی ہے کہ ایک داعی کو اس معاملے میں نہایت محتاط ہونا چاہیے، اس کا خطاب صرف ان لوگوں سے رہے جو معقولیت کے ساتھ بات کو سمجھنے کے لیے تیار ہوں، لیکن جب کوئی حجت بازی جھگڑالوپن اور طعن و تشنیع پر اتر آئے تو داعی کو اس کا حریف بننے سے انکار کر دینا چاہیے۔ اس لیے کہ اس جھگڑے میں الجھنے کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ داعی کی جس قوت کو اشاعت دعوت اور اصلاح نفوس پر خرچ ہونا چاہیے وہ اس فضول کام میں ضائع ہو جائے گی۔

صحیح بخاری میں ایک واقعہ حضرت عبداللہ بن عباس سے نقل کیا گیا ہے کہ حضرت فاروق اعظم (رض) کی خلافت کے زمانے میں عینیہ ابن حصن مدینہ میں آیا اور اپنے بھتیجے حرّ ابن قیس (رض) کا مہمان ہوا۔ حضرت حر بن قیس ان اہل علم حضرات میں سے تھے جو حضرت فاروق اعظم (رض) کی مجلس مشاورت میں شریک ہوا کرتے تھے۔ عینیہ نے اپنے بھتیجے حر بن قیس سے کہا کہ تم امیر المومنین کے مقرب ہو میرے لیے ان سے ملاقات کا کوئی وقت لے لو۔ حر بن قیس نے فاروق اعظم (رض) سے درخواست کی کہ میرا چچا عینیہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ آپ نے اجازت دے دی مگر عینیہ نے فاروق اعظم (رض) کی مجلس میں پہنچ کر نہایت غیر مہذب اور غلط گفتگو کی کہ نہ آپ ہمیں ہمارا پورا حق دیتے ہیں نہ ہمارے ساتھ انصاف کرتے ہیں فاروق اعظم (رض) کو اس پر سخت غصہ آیا تو حر بن قیس نے عرض کیا کہ امیر المومنین اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ { خذالعفو وامر بالعرف واعرض عن الجٰھلین } اور یہ شخص بھی جاہلین میں سے ہے۔ یہ آیت سنتے ہی فاروق اعظم (رض) کا سارا غصہ ختم ہو گیا اور اس کو کچھ نہیں کہا۔ حضرت فاروق اعظم (رض) کی یہ عادت معروف و مشہور تھی کہ { کان وقافا عند کتاب اللہ عزوجل "کتاب اللہ کے احکام کے آگے گردن ڈالتے تھے" } یہ مطلب بھی ہے جاہلوں سے اعراض کرنے کا۔ (تفسیر روح القرآن)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا عفو درگزر:

یہ آیت حضور رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اخلاق کریمانہ کا خوبصورت بیان بھی ہے۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ آپ کی راہوں میں کانٹے بچھائے گئے۔ آپکو شاعر جادوگر مجنوں اور نجانے کیا کچھ کہا گیا نماز کے دوران آپ کی پشت مبارک پر اونٹ کی اوجھڑی لا کر رکھی گئی طائف میں پتھروں سے آپ کو لہولہان کیا گیا مگر

آپ پتھر مارنے والوں کے حق میں دعائے خیر کرتے رہے کہ یا اللہ انھیں ہدایت عطافرمادے جب طائف میں آپ پر سنگ باری ہوئی تو فرشتہ جبال حاضر ہو کر کہنے لگا میں بحکم خداوندی حاضر ہوا ہوں کہ اگر آپ چاہیں تو طائف کے اطراف میں واقع پہاڑ اٹھا کر ان لوگوں کے اوپر رکھ دیئے جائیں مگر آپ نے فرمایا "مجھے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے عذاب بنا کر نہیں اور مجھے امید ہے کہ ان لوگوں کی پشتو سے وہ لوگ پیدا ہوں گے جو اللہ کے ساتھ شرک نہیں کریں گے"۔ (سیرت نبویہ امام ابن کثیر جلد 2 صفحہ 152) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی یہ رحمت و شفقت رنگ لائی اور چند ہی برسوں میں سارا عرب آپ کے قدموں میں آ گرا۔

جب حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مکہ مکرمہ فتح کیا تو تمام سرداران مکہ آپ کے سامنے لائن میں کھڑے کئے گئے آپ نے فرمایا تم کیا سمجھتے ہو میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ انھوں نے کہا کہ آپ ہمارے کرم نواز بھائی ہیں اور کرم نواز بھائی کے بیٹے ہیں آپ نے فرمایا اذھبوا فانتم الطلقاء جاؤ تم سب آزاد ہو تو وہ سب ایمان لے آئے (المواہب اللدنیہ جلد اول صفہ 580 مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت)

یہاں سے عفو و درگزر کی فضیلت معلوم ہوئی:

جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ تو آپ نے فرمایا اے لوگو کیا میں تمہیں دنیا وآخرت میں سب سے اعلی اخلاق نہ بتاؤں؟ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا جو تم پر ظلم کرے تم اسے معاف کر دو جو تمہیں محروم کرے تم اسے عطا کرو اور جو تم سے کاٹے تم اس سے جوڑو (در منثور بروایۃ ابن مردویہ جلد 3 صفحہ 628)

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَکُمْ اور تمہارا معاف کر دینا تقوی سے قریب تر ہے اور ایک دوسرے پر فضل کرنا نہ بھولو (بقرہ: 237)

حضرت معاذ بن انس جہنی (رض) سے روایت ہے کی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص اوسان نکالنے پر قادر ہو پھر وہ اس کو پی جائے اللہ اسے روز قیامت تمام مخلوق کے سامنے بلائے گا اور اختیار کر دے گا کہ جنت کی جس خوبصورت حور سے چاہو نکاح کر لو (ترمذی کتاب البر والصلۃ حدیث 2021، ابو داؤد حدیث 4777)

حضرت عقبہ بن عامر (رض) کہتے ہیں: میں نے ایک بار عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے سب سے اچھے اخلاق کی تعلیم فرمائیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے فرمایا: یاعقبۃ صل من قطعک واعط من حرمک واعرض عمن ظلمک۔ اے عقبہ! جو تجھ سے رشتہ کرتے تم اس سے جوڑو، جو تجھے محروم رکھے تو اسے عطا کرو اور جو تم سے زیادتی کرے تو اس سے درگزر کرو۔" (مسند احمد بن حنبل جلد 4 صفحہ 148 مطبوعہ دارالفکر بیروت) (تفسیر برہان القرآن)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے ساتھ سلوک کرنے کا صحیح اور معتدل طریقہ بیان فرمایا ہے، کیونکہ صالح اور نیک ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کے ساتھ ساتھ مخلوق کے ساتھ بھی نیک سلوک کیا جائے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی رعایت کی جائے۔

معاف کرنے، نیکی کا حکم دینے اور جاہلوں سے اعراض کرنے کے الگ الگ محامل

بندوں کے حقوق کی تفصیل یہ ہے کہ بعض چیزوں میں ان سے تساہل اور درگزر کرنا مستحسن ہے اور بعض چیزوں میں ان سے اغماض اور چشم پوشی کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کو کوئی انسان ذاتی نقصان پہنچائے تو اس کو معاف کر دینا مستحسن ہے اور اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرے اور حدود اللہ کو پامال کرے تو اس کے ساتھ مداہنت کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے معاف کرنے کے حکم کا تعلق انسان کے ذاتی معمالت سے ہے اور جہاں اللہ تعالیٰ کے احکام سے بغاوت اور روگردانی کا معاملہ ہو وہاں نیکی کا حکم دینا اور برائی پر ٹوکنا ضروری ہے، اور اگر نیکی کا حکم دینے پر کوئی شخص بدتمیزی اور جہالت سے پیش آئے تو پھر اس سے اعراض کرنے کا حکم ہے۔

امام ابن جریر طبری متوفی 310ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت جبرائیل سے پوچھا: اے جبرائیل اس کا کیا معنی ہے؟ حضرت جبرائیل نے کہا میں اللہ تعالیٰ سے پوچھ کر بتاؤں گا، پھر کہا اللہ تعالیٰ آپ کو یہ حکم دیتا ہے کہ جو آپ پر ظلم کرے اس کو معاف کر دیں جو آپ کو محروم کرے اس کو عطا کریں اور جو آپ سے تعلق توڑے اس سے آپ تعلق جوڑیں۔ (جامع البیان جز 9، ص 207، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

امام احمد بن حنبل متوفی 241ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عقبہ بن عامر (رض) بیان کرتے ہیں کہ میری رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ملاقات ہوئی تو آپ نے فرمایا اے عقبہ بن عامر جو تم سے تعلق توڑے، تم اس سے تعلق جوڑو اور جو تم کو محروم کرے اس کو عطا کرو، اور جو تم پر ظلم کرے اس کو معاف کر دو۔ میں دوبارہ ملاقات کے لیے گیا تو آپ نے فرمایا اے عقبہ بن عامر! اپنی زبان پر قابو رکھو، اپنے گناہوں پر روؤ اور تمہارے گھر میں گنجائش رہنی چاہیے۔ (مسند احمد ج 6، رقم الحدیث: 17458، 17457۔ شیخ احمد شاکر نے کہا ہے اس حدیث کی سند صحیح ہے، مسند احمد ج 13، رقم الحدیث: 17383)

عفو اور در گزر کرنے کے متعلق قرآن مجید کی آیات

والذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش واذا ما غضبوا ھم یغفرون: اور جو لوگ کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے اجتناب کرتے ہیں اور جب وہ غضبناک ہوں تو معاف کر دیتے ہیں۔ (الشوری: 37)

ولمن صبر وغفر ان ذلک لمن عزم الامور: اور جو صبر کرے اور معاف کر دے تو یقیناً یہ ضرور ہمت کے کاموں سے ہے (الشوری: 43)

وجزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ: اور برائی کا بدلہ اسی کی مثل برائی ہے، پھر جو معاف کر دے اور نیکی کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ (کرم پر) ہے۔ (الشوری: 40)

وان تعفوا وتصفحوا وتغفروا فان اللہ غفور رحیم: اور اگر تم معاف کر دو، اور در گزر کرو اور بخش دو تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے: (التغابن (22:

ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبون ان یغفر اللہ لکم: اور انھیں چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور در گزر کریں (اے ایمان والو) کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہیں بخش دے۔ (النور: 22)

فاعف عنھم واصفح ان اللہ یحب المحسنین: آپ ان کو معاف کر دیجئے اور ان سے در گزر کیجئے، بیشک اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے (النور: 13)

عفو اور در گزر کرنے کے متعلق احادیث

حضرت معاذ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص اپنے غضب کے تقاضے کو پورا کرنے پر قادر ہو، اس کے باوجود وہ اپنے غصہ کو ضبط کرلے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو تمام مخلوق کے سامنے بلائے گا اور اس کو یہ اختیار دے گا کہ وہ جس بڑی آنکھوں والی حور کو چاہے لے لے۔ (سنن ابو داؤد رقم الحدیث: 4777۔ سنن الترمذی رقم الحدیث: 2028۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 4186۔ مسند احمد ج 5، رقم الحدیث: 15637)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پوچھا: تم کس شخص کو پہلوان کہتے ہو؟ ہم نے کہا جو لوگوں کو پچھاڑ دے۔ آپ نے فرمایا نہیں پہلوان وہ شخص ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ (سنن ابو داؤد رقم الحدیث: 4779۔ صحیح مسلم البر والصلہ 106، (2608)

حضرت عائشہ (رض) نے فرمایا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جب بھی دو چیزوں کا اختیار دیا جاتا تو آپ ان میں سے آسان کو اختیار کرتے بشرطیکہ وہ گناہ ہو اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کبھی اپنی ذات کا انتقام نہیں لیا۔ البتہ اگر اللہ کی حدود پامال کی جاتیں تو آپ اللہ کی طرف سے انتقام لیتے۔ (سنن ابو داؤد رقم الحدیث: 4785۔ صحیح البخاری رقم الحدیث: 3560۔ صحیح مسلم فضائل 77 (2327)۔ الموطا رقم الحدیث: 1671

حضرت عائشہ (رض) فرماتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کبھی کسی خادم کو مارا نہ عورت کو۔ (سنن ابو داؤد رقم الحدیث: 4786)

حضرت ابو تمیمہ ھجیمی (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے درخواست کی کہ مجھے نصیحت فرمائیں توآپ نے فرمایا کسی نیک کام کو حقیر نہ جاننااور جب تم اپنے کسی بھائی سے ملاقات کرو، توکشادہ جبیں اور مسکراتے ہوئے ملاقات کرواور پانی مانگنے والے کو اپنے ڈول سے پانی دینا۔ اگر کسی شخص کو تمہارے کسی عیب کا علم ہو اور وہ تمہیں اس کے ساتھ برا کہے تو تمہیں اس کے جس عیب کا علم ہو تم اس کو اس کے عیب کے ساتھ برا نہ کہنا، تمہیں اس پر اجر ملے گا اور اسے اس کا گناہ ہوگا اور تم تکبر سے تہبند نہ لٹکانا کیونکہ اللہ عزوجل تکبر کو پسند نہیں کرتا اور کسی شخص کو گالی نہ دینا، میں نے اس کے بعد کسی کو گالی نہیں دی نہ بکری کو نہ اونٹ کو۔ (مسند احمد ج 7، رقم الحدیث : 20660، مطبوعہ دار الفکر طبع جدید)

حضرت ابو امامہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس نے قدرت کے باوجود کسی کو معاف کردیا تنگی کے دن اللہ تعالیٰ اس کو معاف کردے گا۔ (المعجم الکبیر ج 7، رقم الحدیث : 7585)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے درگزر کرنے کے متعلق احادیث

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں جنگ حنین کے دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مال غنیمت تقسیم کرتے ہوئے بعض لوگوں کو ترجیح دی۔ اقرع بن حابس اور عیینہ کو سوسو اونٹ دیے اور عرب کے سرداروں کو بھی عطا فرمایا، اور ان کو اس دن تقسیم میں ترجیح دی۔ ایک شخص نے کہا اللہ کی قسم ! اس تقسیم میں عدل نہیں کیا گیا، اور اس میں اللہ کی رضاجوئی کا قصد نہیں کیا گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا میں نے دل میں سوچا کہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس کی اطلاع ضرور دوں گا، میں آپ کے پاس گیا اور آپ کو اس واقعہ کی خبر دی۔ یہ سن کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا چہرہ متغیر ہوگیا، پھر آپ نے فرمایا اگر اللہ اور اس کا رسول عدل نہیں کرے گا تو پھر کون عدل کرے گا۔ پھر آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ پر رحم فرمائے ان کو اس سے زیادہ اذیت پہنچائی گئی تھی تو انھوں نے صبر کیا تھا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 4336۔ صحیح مسلم زکوۃ: 140 (1062) 2408۔ مسند احمد ج 1، ص 380۔ 396)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میری ماں مشرکہ تھی میں اس کو اسلام کی دعوت دیتا تھا، ایک دن میں نے اس کو اسلام کی دعوت دی تو اس نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق بہت ناگوار اور بری باتیں کہیں جن سے میں بہت رنجیدہ ہوا، میں روتا ہوا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے کہا یارسول اللہ ! میں اپنی ماں کو اسلام کی دعوت دیتا تھا اور وہ انکار کرتی تھی، آج میں نے اس کو اسلام کی دعوت دی تو اس نے مجھے ایسی باتیں سنائیں جن سے مجھے بہت رنج ہوا آپ اللہ سے دعا کیجیے کہ وہ ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت دے، آپ نے دعا کی اے اللہ ! ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت دے، آپ نے دعا کی اے اللہ ! ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت دے۔ میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعا کی وجہ سے خوش خوش گھر لوٹا، ماں نے میرے قدموں کی آہٹ سنی تو کہا وہیں ٹھہرو اور میں نے پانی گرنے کی آواز سنی، اس نے غسل کیا، کپڑے بدلے، پھر کہا اے ابوہریرہ ! اشھدان لا الہ الا اللہ واشھدان محمدا عبدہ ورسولہ میں خوشی سے روتا ہوا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں پہنچا۔ میں نے کہا یارسول اللہ ! مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول کرلی اور ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت دے دی ہے آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کی اور فرمایا اچھا ہوا۔ (صحیح مسلم فضائل صحابہ 158 (2491) 6279)

امام ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صاحبزادی حضرت زینب (رض) کو ان کے شوہر ابوالعاص نے بدر کے بعد مدینہ منورہ کے لیے روانہ کیا، وہ اونٹ پر ھودج میں سوار تھیں، قریش مکہ کو ان کی روانگی کا علم ہوا تو انھوں نے حضرت زینب کا پیچھا کیا حتی کہ مقام ذی طوی پر ان کو پالیا، ھبار بن الاسود نے ان کو نیزہ مارا حضرت زینب گرگئیں اور ان کا حمل ساقط ہوگیا۔ (السیرۃ النبویہ لابن ہشام ج 2، ص 465، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1415 ھ)

حضرت جبیر بن مطعم (رض) بیان کرتے ہیں کہ جعرانہ سے واپسی پر میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اچانک دروازہ سے ھبار بن الاسود داخل ہوا مسلمانوں نے کہا یارسول اللہ یہ ھبار بن الاسود ہے، آپ نے فرمایا میں نے اس کو دیکھ لیا، ایک شخص اس کو مارنے کے لیے کھڑا ہوا، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو اشارہ کیا کہ وہ بیٹھ جائے، ھبار کھڑا ہوا اور اس نے کہا السلام علیک یا نبی اللہ اشھدان لا الہ الا اللہ واشھدان محمدا رسول اللہ، یارسول اللہ !

میں آپ سے بھاگ کر کوئی شہروں میں گرگیا اور میں نے سوچا میں عجم کے ملکوں میں چلا جاؤں، پھر مجھے آپ کی نرم دلی، صلہ رحمی اور دشمنوں سے آپ کا در گزر کرنا یاد آیا، اے اللہ کے نبی ہم مشرک تھے اللہ نے آپ کے سبب سے ہمیں ہدایت دی، اور ہم کو ہلاکت سے نجات دی۔ آپ میری جہالت سے در گزر فرمائیں اور میری ان تمام باتوں سے جن کی خبر آپ تک پہنچی ہے، میں اپنے تمام برے کاموں کا اقرار کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں نے تم کو معاف کر دیا، اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا کہ تم کو اسلام کی ہدایت دے دی اور اسلام پچھلے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ (الاصابہ ج6، ص413، رقم: 8951، اسد الغابہ رقم: 2709۔ الاستیعاب رقم: 2710)

ایک ھبار بن الاسو کو معاف کر دینے کی مثال نہیں ہے، آپ نے ابو سفیان کو معاف کر دیا جس نے متعدد بار مدینہ پر حملہ کیا۔ وحشی کو معاف کر دیا جس نے آپ کے عزیز چچا حضرت حمزہ بن عبد المطلب کو شہید کیا تھا۔ ہند کو معاف کر دیا جس نے حضرت حمزہ کا کلیجہ نکال کر دانتوں سے چبایا تھا، فتح مکہ کے بعد تمام ظالموں کو معاف کر دیا۔ عبداللہ بن ابی جو رئیس المنافقین تھا جو آپ کو ہمیشہ اذیتیں پہنچاتا رہا، جس نے کہا تھا آپ کی سواری سے بدبو آتی ہے، جو غزوہ احد میں عین لڑائی سے پہلے اپنے تین سو ساتھیوں کے ساتھ لشکر اسلام سے نکل گیا تھا، جس نے کہا تھا کہ مدینہ پہنچ کر عزت والے، ذلت والوں کو نکال دیں گے، جس نے آپ کے حرم محترم ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ (رض) پر تہمت باندھی اور آپ کو رنج پہنچایا۔ اس نے بھی جب مرتے وقت آپ کی قمیص اپنے کفن کے لیے منگوائی تو آپ نے عطا کر دی، آپ سے نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی تو آپ نے اس کی درخواست کو قبول فرمالیا۔ صفوان بن معطل، عمیر بن وہب، اور عکرمہ بن ابو جہل کو معاف کر دیا۔ سراقہ کو امان لکھ دی اور بہت سے ظالموں اور ستم شعاروں کے مظالم اور ان کی جفاؤں سے اعراض کر کے انھیں معاف کر دیا۔ غرض آپ کی پوری زندگی خذ العفو وامر بالمعرف واعرض عن الجاہلین سے عبارت تھی۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَاِمَّا يَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِؕ اِنَّهٗ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ○

لغۃ القرآن: [وَاِمَّا : اور اگر] [يَنْزَغَنَّكَ : اکسائے ہی آپ کو] [مِنَ الشَّيْطٰنِ : شیطان سے] [نَزْغٌ: کوئی اکساہٹ] [فَاسْتَعِذْ : تو آپ پناہ مانگیں] [بِاللّٰهِ : اللہ سے] [اِنَّهٗ : بیشک وہ] [سَمِيْعٌ: سننے والا] [عَلِيْمٌ: جاننے والا]

ترجمہ: اور (اے انسان!) اگر شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ (ان امور کے خلاف) تجھے ابھارے تو اللہ سے پناہ طلب کیا کر، بیشک وہ سننے والا جاننے والا ہے

تشریح: نزغ شیطان کا معنی

علامہ راغب اصفہانی متوفی 502ھ لکھتے ہیں:

نزغ کا معنی ہے کسی چیز کو فاسد اور خراب کرنے کے لیے اس میں داخل ہونا۔ (المفردات ج2، ص631، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، 1418ھ)

علامہ ابن اثیر الجزری المتوفی 606ھ نے لکھا ہے:

نزغ کا معنی ہے، کسی نوکدار چیز کو چبھونا۔ کسی کو کسی کے خلاف بھڑکانا، فساد ڈالنا، نزغ الشیطان بینہم کا معنی ہے شیطان نے ان کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکایا اور ان کے درمیان فساد ڈال دیا۔ (النہایہ ج5، ص36، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1418ھ)

اس آیت میں خطاب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ہے اور مراد اور لوگ ہیں کیونکہ شیطان آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر مُسلّط نہیں ہو سکتا، اور اس کا معنی یہ ہے کہ اے انسان! اگر شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ تجھے (اللہ تعالیٰ کی نافرمانی وغیرہ پر) ابھارے تو اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ اور اپنے آپ سے اس وسوسے کو دور کئے جانے سے متعلق اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کر، بیشک وہ تیری دعا کو سننے والا اور تیرے حال کو جاننے والا ہے۔ (1)

شیطان کو مغلوب کرنے کے طریقے:

امام محمد غزالی (رح) فرماتے ہیں: صوفیائے کرام اور مجاہدات کرنے والی بزرگ ہستیوں کے نزدیک شیطان سے جنگ کرنے اور اسے مغلوب کرنے کے دو طریقے ہیں:

(1)۔۔ شیطان کے مکر و فریب سے بچنے کے لیے صرف اللہ تعالیٰ کی پناہ لی جائے، اس کے علاوہ (شیطان کے شر سے) بچنے کا اور کوئی راستہ نہیں، کیونکہ شیطان ایک ایسا کتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تم پر مسلط فرما دیا ہے، اگر تم اس سے مقابلہ اور جنگ کرنے اور اسے دور کرنے میں مشغول ہو گئے تو تم تنگ آ جاؤ گے اور تمہارا قیمتی وقت ضائع ہو جائے گا اور آخر کار وہ تم پر غالب آ جائے گا اور تمہیں زخمی کر کے ناکارہ بنا دے گا، اس لیے بہر حال اس کتے کے مالک کی طرف ہی متوجہ ہونا پڑے گا اور اسی کی پناہ لینی ہو گی تا کہ وہ شیطان کو تم سے دور کر دے اور اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنا تمہارے لیے شیطان سے جنگ اور مقابلہ کرنے سے بہتر ہے۔ (2)۔۔ شیطان سے مقابلہ کرنے، اسے دور کرنے اور اس کی تردید اور مخالفت کرنے کے لیے بندہ ہر وقت تیار رہے۔

میں (امام محمد غزالی) کہتا ہوں: میرے نزدیک اس کا جامع اور بہترین طریقہ یہ ہے کہ (مذکورہ بالا) دونوں طریقوں پر عمل کیا جائے، لہٰذا سب سے پہلے شیطان مردود کی شرارتوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ لی جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ ہمیں شیطان لعین کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے کافی ہے، اس کے بعد بھی اگر تم یہ محسوس کرو کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ لینے کے باوجود شیطان تم پر غالب آنے کی کوشش کر رہا ہے اور وہ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تو تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تمہارا امتحان لینا چاہتا ہے تا کہ اللہ تعالیٰ عبادت وغیرہ میں تمہاری قوت اور صبر کو ظاہر فرما دے جیسا کہ کافروں کو ہم پر مسلط فرمایا گیا حالانکہ اللہ تعالیٰ کافروں کے عزائم اور ان کی شر انگیزیوں کو ہمارے جہاد کئے بغیر ملیامیٹ کر دینے پر قادر ہے لیکن وہ انھیں صفحہ ہستی سے ختم نہیں فرماتا بلکہ ہمیں ان کے خلاف جہاد کرنے کا حکم دیتا ہے تا کہ جہاد، صبر، گناہوں سے چھٹکارے اور شہادت سے ہمیں بھی حصہ مل جائے اور ہم اس امتحان میں کامیاب و کامران ہو جائیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ" (1)

اور یہ اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ ایمان والوں کی پہچان کرا دے اور تم میں سے کچھ لوگوں کو شہادت کا مرتبہ عطا فرما دے اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

اور ارشاد فرماتا ہے:

"اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ" (2)

کیا تم اس گمان میں ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تمہارے مجاہدوں کا امتحان نہیں لیا اور نہ (ہی) صبر والوں کی آزمائش کی ہے۔

تو (جس طرح کافروں کے ساتھ جہاد کا حکم ہے) اسی طرح ہمیں شیطان سے بھی انتہائی جاں فشانی کے ساتھ مقابلہ اور اس سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، نیز علماءِ کرام نے شیطان سے مقابلہ کرنے اور اس پر غلبہ حاصل کرنے کے (مزید) تین طریقے بیان فرمائے ہیں:

(1)۔۔ تم شیطان کے مکر و فریب اور اس کی حیلہ سازی سے ہوشیار اور باخبر ہو جاؤ کیونکہ جب تمہیں اس کی حیلہ سازیوں کا علم ہو گا تو وہ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا، جس طرح چور کو جب معلوم ہو جاتا ہے کہ مالک مکان کو میرے آنے کا علم ہو گیا ہے تو وہ بھاگ جاتا ہے۔

(2)۔۔ جب شیطان تمہیں گمراہیوں کی طرف بلائے تو تم اسے رد کر دو اور تمہارا دل اس کی طرف بالکل متوجہ نہ ہو اور نہ ہی تم اس کی پیروی کرو کیونکہ شیطان ایک بھونکنے والے کتے کی طرح ہے، اگر تم اسے چھیڑو گے تو وہ تمہاری طرف تیزی کے ساتھ لپکے گا اور (حملہ کر کے) تمہیں زخمی کر دے گا اور اگر تم اس سے کنارہ کشی اختیار کر لو گے تو ممکن ہے کہ وہ خاموش رہے۔

(3)۔۔ تم ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہو اور اپنے آپ کو ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں مصروف رکھو۔ (1)
اللہ تعالیٰ ہمیں شیطان کے وسوسوں اور اس کے مکر و فریب سے محفوظ فرمائے اور اس کے واروں سے بچنے کے لیے مُؤثّر اقدامات کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین ۔ (تفسیر صراط الجنان)

وساوس شیطان سے نجات کا طریقہ

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ جاہلوں سے اعراض کیجیے اور جاہلوں کی جفا اور جہالت پر انسان کو طبعی طور پر غصہ آتا ہے۔ ابن زید نے کہا کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: اے میرے رب اگر مجھے ان کی باتوں پر غصہ آئے تو کیا کروں، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اگر شیطان آپ کو غضب میں لائے تو آپ اللہ کی پناہ طلب کریں (جامع البیان جز 9، ص 208، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد قرطبّی مالکی متوفی 668ھ لکھتے ہیں:

نزغ شیطان کا معنی ہے شیطان کا وسوسہ۔ سعید بن مسیب کہتے ہیں کہ میں حضرت عثمان اور حضرت علی (رض) کی خدمت میں تھا، ان کے درمیان شیطان نے وسوسے ڈال دیے تھے ان میں سے ہر ایک دوسرے کو برا کہتا رہا، پھر وہ اس وقت تک مجلس سے نہیں اٹھے جب تک کہ ہر ایک نے دوسرے سے معافی نہیں مانگ لی۔

متقدمین میں سے ایک استاذ نے اپنے شاگرد سے کہا اگر شیطان تمہیں گناہوں پر اکسائے تو تم کیا کرو گے؟ اس نے کہا میں اس کے خلاف کوشش کروں گا، استاذ نے کہا اگر وہ پھر اکسائے؟ کہا، میں پھر کوشش کروں گا، کہا اگر وہ پھر اکسائے؟ کہا میں پھر کوشش کروں گا۔ استاذ نے کہا یہ سلسلہ تو دراز ہو جائے گا۔ استاذ نے کہ یہ بتاؤ اگر تم بکریوں کے ریوڑ کے درمیان سے گزرو اور بکریوں کا محافظ کتا تم پر بھونکنے لگے تو تم کیا کرو گے؟ اس نے کہا میں اس کو دور بھگانے کی کوشش کروں گا استاذ نے کہا یہ سلسلہ تو دراز ہو جائے گا لیکن اگر تم بکریوں کے چرواہے سے مدد طلب کرو تو وہ کتے کو تم سے دور کر دے گا، اسی طرح جب شیطان تم کو کسی گناہ پر اکسائے تو تم اللہ کی پناہ طلب کرو، وہ شیطان کو تم سے دور کر دے گا۔ (الجامع لاحکا القرآن جز 7، ص 311، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415ھ)

وسوسہ شیطان کی وجہ سے عصمت انبیاء پر اعتراض اور اس کے جوابات

عصمت انبیاء کے منکرین نے اس آیت سے اپنے موقف پر استدلال کیا ہے کہ اگر انبیاء (علیہم السلام) کا گناہ اور معصیت پر اقدام ناممکن ہوتا تو اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا کہ اگر شیطان تم کو کوئی وسوسہ ڈالے تو تم اللہ کی پناہ طلب کرو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو اس آیت میں عام مسلمانوں سے خطاب ہے۔ ثانیاً جواب یہ ہے کہ اگر اس آیت میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خطاب ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ اگر بالفرض شیطان آپ کو کوئی وسوسہ ڈالے تو آپ اللہ کی پناہ طلب کریں اور اس سے شیطان کا آپ کو وسوسہ ڈالنا لازم نہیں آتا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "لئن اشرکت لیحبطن عملک: اگر بالفرض آپ نے شرک کیا تو آپ کے عمل ضائع ہو جائیں گے" (الزمر: 65)۔ اور اس آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ العیاذ باللہ شرک کریں۔ اور اس کی نظیر یہ آیت ہے: " قل ان کان للرحمٰن ولد فانا اول العابدین: آپ کہیے اگر (بہ فرض محال) رحمٰن کی اولاد ہوتی تو میں (اس کی) سب سے پہلے عبادت کرنے والا ہوتا" (الزخرف: 81)

ثانیاً شیطان کا صرف وسوسہ ڈالنا عصمت کے منافی نہیں ہے، عصمت کے منافی یہ ہے کہ آپ شیطان کا وسوسہ قبول کریں اور یہ اس آیت سے ثابت نہیں، بلکہ اس کے خلاف ثابت ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔ "ان عبادی لیس لک علیھم سلطان الا من اتبعک من الغاوین: بیشک میرے خاص بندوں پر تیرا کوئی غلبہ نہیں ہے۔ ماسوا گمراہوں کے جو تیری پیروی کریں" (الحجر: 42)

حضرت ابن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم میں سے ہر شخص کے ساتھ ایک شیطان کا قرین لگا دیا گیا ہے اور ایک قرین فرشتوں میں سے لگا دیا گیا ہے، صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ آپ کے ساتھ بھی؟ فرمایا ہاں میرے ساتھ بھی۔ لیکن اللہ نے اس کے خلاف میری مدد فرمائی وہ مسلمان ہو گیا وہ مجھے نیک باتوں کے سوا کوئی مشورہ نہیں دیتا۔ (صحیح مسلم منافقین 69 (2814) 6975، مشکوۃ رقم الحدیث: 67)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ایک بہت بڑا جن گزشتہ رات مجھ پر حملہ آور ہوا تاکہ میری نماز کو خراب کرے، اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر قدرت دی تو میں نے اس کو دھکا دے کر بھگا دیا، اور میں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ میں اس کو مسجد کے ستونوں میں سے کسی ایک ستون کے ساتھ باندھ دوں حتی کہ صبح کو تم سب اسے دیکھتے۔ پھر مجھے اپنے بھائی سلمان کی یہ دعا یاد آئی: " قال رب اغفرلی وھب لی ملکالاینبغی لاحد من بعدی: سلیمان نے دعا کی اے میرے رب مجھے بخش دے اور مجھے ایسی سلطنت عطا فرما جو میرے بعد کسی اور کو زیبا نہ ہو " (ص: 35)۔ (صحیح مسلم المساجد 39 (549) 1189۔ سنن کبری للنسائی رقم الحدیث: 1440)

اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ شیطان کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر کوئی غلبہ نہیں بلکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی غالب تھے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شیطان کا وسوسہ قبول کریں۔

ثالثاً اس آیت میں بظاہر آپ کو خطاب ہے لیکن مراد آپ کی امت ہے کہ جب شیطان مسلمانوں کو کسی چیز کا وسوسہ ڈالے تو وہ اس کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کریں۔ (تفسیر تبیان القرآن)

مسند احمد کی روایت میں آتا ہے ان للشیطن لمۃ با بن آدم یعنی ابن آدم کے ساتھ شیطان کی ضرور چھیڑ چھاڑ ہوتی ہے وہ انسان کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے جب کوئی شخص نیکی کے راستے پر جانا چاہتا ہے تو شیطان اس کے راستے میں آکر بیٹھ جاتا ہے اور اس کے دل میں برے خیال ڈال کر اسے راستے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عام لوگوں کو بھی شیطان کے برے عزائم سے آگاہ فرمادیا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ بھی فرمایا کہ شیطان کی وسوسہ اندازی شر پر مشتمل ہوتی ہے ایعاد بالشر وتکذیب بالحق یہ حق کی تکذیب اور برائی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے فرمایا وان للملک لمۃ اللہ کے فرشتے بھی انسان کے دل میں خیالات ڈالتے ہیں جو کہ نیکی اور سچائی پر مبنی ہوتے ہیں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ بھی فرمان ہے کہ جب کوئی شخص اپنی طبیعت میں برائی محسوس کرے تو اس وقت اسے اللہ کی پناہ میں آنا چاہیے اور برے خیالات کو شیطان کی چھیڑ خانی سمجھنا چاہیے اور اگر انسان کے دل میں اچھے خیالات وارد ہوں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کیونکہ اچھی باتیں اللہ کے فرشتے دل میں ڈالتے ہیں۔

بہر حال فرمایا کہ اگر شیطان کی طرف سے کوئی ابھار ہو تو اللہ کی پناہ طلب کرنی چاہیے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے استعاذہ کے لیے کئی ایک کلمات کی تعلیم دی ہے جیسے اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم لاحول ولا قوۃ الا باللہ، وقل رب اعوذ بک من ھمزات الشیطین، واعوذ بک رب ان یحضرون (المومنون) اے اللہ! میں شیطانوں کے وسوسے اور ان کی حاضری سے پناہ مانگتا ہوں۔

ذکر الٰہی بطور قلعہ

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے شیطانی وساوس کے متعلق خطاب کے بعد اللہ تعالیٰ نے عام اہل ایمان کو بھی شیطان کے وسوسے سے بچنے کی ترکیب بیان فرمائی ہے ارشاد ہوتا ہے ان الذین اتقوا اذا مسھم طئف من الشیطن بیشک وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کے خوف سے ڈرتے ہیں جب کہ پہنچتا ہے انھیں خیال شیطان کی طرف سے امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (رح) نے تقویٰ کی تعریف یہ بیان فرمائی ہے۔

" تقویٰ محافظت بر حدود شرع است "

یعنی شریعت کی حدود کی حفاظت کرنا تقویٰ ہے کفر، شرک، نفاق، بدعقیدگی اور برائی سے بچنا تقویٰ کی تعریف میں آتا ہے اس دنیا میں سنبھل کر چلنا کہ کہیں دامن برائی کے کانٹوں میں نہ الجھ جائے یہی تقویٰ ہے طائف کا لفظی معنی چکر مارنے والا ہے اور مراد خیال اور وسوسہ ہے خواب کے دوران جو خیالات آتے ہیں ان کو بھی طائف کہتے ہیں تو فرمایا کہ بیشک وہ لوگ کہ جب انھیں شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پہنچتا ہے تذکروا تو یاد کرتے ہیں یعنی ذکر الٰہی میں مشغول ہوتے ہیں اور خبردار ہو جاتے ہیں فاذا ھم مبصرون پس وہ اچانک صاحب بصیرت یعنی سمجھ دار ہو جاتے ہیں مطلب یہ ہے کہ دل میں خوف خدا رکھنے والے لوگوں کا شیوہ یہ ہے کہ جب ان کے خیالات پر شیطان کا حملہ ہوتا ہے تو وہ فوراً اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل کرنے کے لیے اس کے ذکر میں مصروف ہو جاتے ہیں اور اس طرح وہ شیطان سے بچنے کے لیے ذکر کے قلعہ میں قلعہ بند ہو جاتے ہیں۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کافرمان ہے کہ سوتے وقت جب انسان کے جسم کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں تو شیطان اس کی ناک پر آ کر بیٹھ جاتا ہے اور وہاں سے آدمی کے قلب میں پھونکیں مارتا ہے پھر سونے والا اگر رات کو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ہے تو خنس الشیطن شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور اس کی وسولہ اندازی موثر نہیں ہوتی اور اگر سونے والے شخص نے سونے سے پہلے اللہ کا ذکر نہیں کیا یعنی نماز بھی ادا نہیں کی وہ سوتا رہا حتیٰ کہ فجر طلوع ہو گئی پھر سورج نکل آتا ہے اور سونے والا سویا رہتا ہے تو پھر شیطان اس کے کان میں پیشاب کرکے چلا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں کامیاب ہو گیا ہوں کیونکہ میں نے اس شخص کو رات بھر خدا تعالیٰ کے ذکر سے غافل رکھا بہر حال فرمایا کہ شیطان کی وسوسہ اندازی کا علاج اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔

شیطان کے بھائی

فرمایا واخوانھم یمدونھم فی الغی شیاطین کے بھائی لوگوں کو گمراہی کی طرف کھینچتے رہتے ہیں شیطان کے بھائی ہمیشہ گمراہ لوگ ہی ہوتے ہیں جو دوسروں کو بھی گمراہی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں یہاں پر اخ کا لفظ آیا ہے جس سے نسبی بھائی مراد ہوتا ہے تاہم تمام لوگ چونکہ ایک ہی سلسلہ انسانی سے منسلک ہیں اس لیے سارے ایک دوسرے کے بھائی ہیں بعض لوگ دینی طور پر ایک دوسرے کے بھائی ہوتے ہیں جیسے سورۃ حجرات میں آتا ہے انما المومنون اخوۃ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں تو گویا جس طرح مومن نیکی اور ایمان میں اکٹھے ہو کر بھائی بھائی بن جاتے ہیں اسی طرح گمراہ لوگ گمراہی میں اکٹھے ہو کر ایک دوسرے کے بھائی ہوتے ہیں اور پھر وہ سارے شیطان کے بھائی بن جاتے ہیں کیونکہ سب سے بڑا گمراہ وہی ہے فضول خرچی کرنے والوں کو بھی شیطان کا بھائی کہا گیا ہے ان المبذرین کانوا اخوان الشیطین (بنی اسرائیل) کیونکہ اسراف شیطانی فعل ہے چنانچہ ایسے لوگوں کو شیطان گمراہی کی طرف کھینچتے رہتے ہیں ثم لایقصرون پھر وہ اس معاملہ میں کوتاہی بھی نہیں کرتے بلکہ برائی سے روکنے میں ہمیشہ ہمیشہ پیش رہتے ہیں اور گمراہی کی طرف لانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے سورۃ زخرف میں بھی آتا ہے کہ جو شخص اللہ کے ذکر سے اعراض کرتا ہے نقیض لہ شیطناً فھولہ قرین ہم اس پر شیطان مسلط کر دیتے ہیں جو اس کا ساتھی بن جاتا ہے اور پھر وہ عمر بھر اسے گمراہی میں مبتلا رکھتا ہے حتیٰ کہ موت کے وقت کف افسوس ملتا ہوا شیطان سے کہتا ہے یلیت بنی وبینک بعد المشرقین فبئس القرین (الزخرف) کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کا فاصلہ ہوتا میں نے تیری بات کیوں مانی، تو بہت برا ساتھی ہے مگر اس وقت کا افسوس کرنا کسی کام نہ آئے گا غرضیکہ شیطان انسان کو ہمیشہ گمراہی کی طرف لگائے رکھتے ہیں۔ (تفسیر معالم العرفان)

آیت مبارکہ:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّہُمۡ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیۡطٰنِ تَذَکَّرُوۡا فَاِذَا ہُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ ۞۲۰۱

لغۃ القرآن: [اِنَّ : یقینا] [الَّذِیْنَ : جو لوگ] [اتَّقَوْا : تقوی کرتے ہیں] [اِذَا : جب کبھی] [مَسَّهُمْ : چھوتا ہے ان کو] [طٰٓئِفٌ: کوئی وسوسہ] [مِّنَ الشَّیْطٰنِ : شیطان سے] [تَذَكَّرُوْا : تو وہ خود کو یاد کراتے ہیں] [فَاِذَا : پھر جب] [هُمْ : وہ] [مُّبْصِرُوْنَ : چونک پڑتے ہیں ناگہاں]

ترجمہ: بیشک جن لوگوں نے پرہیزگاری اختیار کی ہے، جب انھیں شیطان کی طرف سے کوئی خیال بھی چھو لیتا ہے (تو وہ اللہ کے امر و نہی اور شیطان کے دجل و عداوت کو) یاد کرنے لگتے ہیں سو اسی وقت ان کی (بصیرت کی) آنکھیں کھل جاتی ہیں

تشریح: نیک نہاد اور پرہیزگاروں کو اور کوئی شیطانی وسوسہ راہ حق سے بھٹکانے لگتا ہے اور اپنے دام فریب میں گرفتار کرنے لگتا ہے تو فوراً ان کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے اور وہ ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاتے ہیں اور توبہ واستغفار شروع کر دیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شکوک و شبہات کی گرد چھٹ جاتی ہے۔ غفلت کی تاریکی کافور ہو جاتی ہے اور شیطان کا دام ہمرنگ زمین صاف دکھائی دینے لگتا ہے اور وہ خطرے کے اس مقام سے بخیریت گزر جاتے ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

طائف من الشیطان کا معنی

علامہ راغب اصفہانی متوفی 502ھ لکھتے ہیں :

انسان کو ورغلانے کے لیے انسان کے گرد گردش کرنے والے شیطان کو طائف کہتے ہیں، کسی چیز کا خیال یا اس کی صورت جو نیند اور بیداری میں دکھائی دے اس کو طیف کہتے ہیں۔ (المفردات ج 2، ص 406، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، 1418ھ)

علامہ المبارک بن محمد المعروف بابن الاثیر جزری متوفی 606ھ لکھتے ہیں :

طیف کا اصل معنی جنون ہے پھر اس کو غضب، شیطان کے مس کرنے اور اس کے وسوسہ کے معنی میں استعمال کیا گیا اور اس کو طائف بھی کہتے ہیں۔ (النہایہ ج 3، ص 139، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1418ھ)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد قرطبی مالکی متوفی 668ھ لکھتے ہیں :

طیف کا معنی تخیل ہے اور طائف کا معنی شیطان ہے اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جو لوگ گناہوں سے بچتے ہیں انھیں کوئی وسوسہ لاحق ہو تو وہ اللہ عزوجل کی قدرت میں اور اللہ نے ان پر جو انعام کیے ہیں ان میں غور کرتے ہیں اور پھر معصیت کو ترک کر دیتے ہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن جز 7، ص 313، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

انسان کس طرح غور و فکر کرکے انتقام لینے کو ترک کرے

امام فخر الدین رازی متوفی 606ھ لکھتے ہیں :

جب انسان کسی دوسرے شخص پر غضب ناک ہو اور اس کے دل میں شیطان یہ خیال ڈالے کہ وہ اس سے انتقام لے تو پھر وہ انتقام نہ لینے کی وجوہات پر غور و فکر کرے اور انتقام لینے کے ارادہ کو ترک کر دے۔ وہ وجوہات حسب ذیل ہیں :

1۔ انسان کو یہ سوچنا چاہیے کہ وہ خود کتنے گناہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو سزا دینے پر قادر ہے، اس کے باوجود اس سے در گزر کرتا ہے اور اس سے انتقام نہیں لیتا سو اس کو بھی چاہیے کہ وہ انتقام لینے کا ارادہ ترک کر دے۔

2۔ جس طرح اس کا مجرم بے بس اور مجبور ہے اسی طرح وہ بھی اللہ کا مجرم ہے اور اس کے سامنے مجبور اور بے بس ہے۔

3۔ غضب ناک شخص کو ان احکام پر غور کرنا چاہیے جن میں اسے انتقام کو ترک کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

4۔ اس کو اس پر غور کرنا چاہیے کہ اگر اس نے غضب اور انتقام کے تقاضوں کو تو پورا کر دیا تو اس کا یہ عمل موذی درندوں کی طرح ہو گا اور اگر اس نے صبر کیا اور انتقام نہیں لیا تو اس کا یہ عمل انبیاء (علیہم السلام) اور اولیاء کرام کی مثل ہو گا۔

5۔ اس کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ جس کمزور شخص سے آج وہ انتقام لینا چاہتا ہے ہو سکتا ہے کل وہ قوی اور قادر ہو جائے اور یہ کمزور اور ناتواں ہو جائے اور اگر وہ اس کو معاف کر دے تو پھر یہ شخص اس کا احسان مند رہے گا۔ (تفسیر کبیر ج 5، ص 437، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، 1415ھ)

انسان کس طرح غور و فکر کرکے گناہوں کو ترک کرے

امام رازی نے ترک انتقام کی جو یہ وجوہات بیان کی ہیں ان کو معصیت کی دیگر انواع میں بھی جاری کیا جا سکتا ہے۔ جب بھی شیطان انسان کو کسی معصیت اور گناہ پر اکسائے وہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے انعامات پر غور کرے کہ اللہ اس پر اتنی مہربانی کرتا ہے تو کیا یہ انصاف ہو گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے۔ نیز اس پر غور کرے کہ اگر اس نے یہ گناہ کیا تو اس سے شیطان راضی ہو گا اور اللہ ناراض ہو گا تو کیا یہ جائز ہے کہ وہ اللہ کو ناراض اور شیطان کو راضی کرے۔ نیز یہ سوچنا چاہیے اگر آج اس نے اللہ کے حکم کو بھلا دیا تو ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن اللہ اس کو بھلا دے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : " وقیل الیوم ننساکم کما نسیتم لقاء یومکم ھذا : اور کہا جائے گا آج ہم تمھیں اس طرح بھلا دیں گے جس طرح تم نے اس دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا " (الجاثیۃ : 34)

اور یہ سوچنا چاہیے کہ اللہ نے اس کو دنیا میں رزق دینے اور پرورش کرنے کا جو وعدہ کیا ہے وہ اس کو پورا کر رہا ہے تو اس نے کلمہ پڑھ کر اللہ کی اطاعت کا جو وعدہ کیا ہے، وہ اس کو کیوں پورا نہیں کر رہا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "واوفوابعهدی اوف بعهدکم: تم میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا" (البقرہ :40)

اور یہ سوچنا چاہی کہ وہ اللہ سے جو دعا کرتا ہے، اللہ اسے قبول کرلیتا ہے تو پھر کیا یہ انصاف کا تقاضا نہیں ہے کہ اللہ اس سے جو کچھ کہے وہ بھی اس پر عمل کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اجیب دعوۃالداعی اذادعان فلیستجیبوالی: جب دعا کرنے والا دعا کرے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں تو انھیں بھی چاہیے کہ وہ بھی میرا حکم مانیں" (186)

اور یہ غور کرنا چاہیے کہ اگر اس نے وہ گناہ کرلیا تو وہ فساق و فجار کی مثل ہوگا اور اگر اس نے اس گناہ سے دامن بچالیا تو وہ انبیاء کا متبع اور اولیاء کی مانند ہوگا۔ اور جو شخص فساق و فجار کے کام کرے گا وہ کیسے یہ توقع کرسکتا ہے کہ اس کی دنیا اور آخرت کی زندگی اللہ کے نیک بندوں کی طرح ہوگی! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ام حسب الذین اجترحواالسیئات ان نجعلھم کالذین امنواوعملواالصالحات سواء محیاھم ومماتھم ساء مایحکمون: جن لوگوں دلیری سے گناہ کیے ہیں کیا انھوں نے یہ گمان کرلیا ہے کہ ہم انھیں ان لوگوں کی طرح کردیں گے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے کہ ان (سب) کی زندگی اور موت برابر ہوجائے۔ وہ کیا ہی برا فیصلہ کرتے ہیں" (الجاثیہ :21)

اور یہ بھی سوچنا چاہیے کہ وہ اپنے بچوں، اپنے شاگردوں، مریدوں اور اپنے ماتحت لوگوں کے سامنے بے حیائی کے اور برے کام نہیں کرت اور جب تنہا ہو اور صرف اللہ دیکھ رہا ہو تو وہ بے حیائی اور برائی کے کاموں سے باز نہیں آتا تو کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوگا کہ اس کے دل میں اللہ کا اتنا خوف بھی نہیں ہے جتنا اپنے ماتحت لوگوں کے سامنے بے حیائی کے اور برے کام نہیں کرتا اور جب تنہا ہو اور صرف اللہ دیکھ رہا ہو تو وہ بے حیائی اور برائی کے کاموں سے باز نہیں آتا تو کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوگا کہ اس کے دل میں اللہ کا اتنا خوف بھی نہیں ہے جتنا اپنے ماتحت لوگوں اور چھوٹوں کا ہے! حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "فلاتخشواالناس واخشون: تم لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ سے ہی ڈرو" (المائدہ :44)

اور یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ اگر اس نے لوگوں کے ڈر سے برے کام چھوڑ بھی دیے تو وہ اس کو کوئی انعام نہیں دیں گے جب کہ اللہ کے ڈر سے اس نے گناہ اور برے کام چھوڑ دیے تو اللہ نے اس سے بہت بڑے انعام کا وعدہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وامامن خاف مقام ربہ ونھی لنفس عن الھوی۔ فان الجنتہ ھی الماوی: اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا، اور اس نے اپنے نفس (امارہ) کو (اس کی) خواہش سے روکا تو بیشک جنت ہی اس کا ٹھکانا ہے" (النازعات :40۔41)

نیز فرمایا: ولمن خاف مقام ربہ جنتا: اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اس کے لیے دو جنتیں ہیں (الرحمٰن :46)

خوف خدا سے مرنے والوں نوجوان کو دو جنتیں عطا فرمانا

خوف خدا سے مرنے والے نوجوان کو دو جنتیں عطا فرمانا

امام ابوالقاسم علی بن الحسن بن عساکر متوفی 571ھ روایت کرتے ہیں:

یحیٰی بن ایوب الخزاعی بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا کہ حضرت عمر بن خطاب کے زمانہ میں ایک عبادت گزار نوجوان تھا جس نے مسجد کو لازم کرلیا تھا، حضرت عمر اس سے بہت خوش تھے، اس کا ایک بوڑھا باپ تھا، وہ عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے باپ کی طرف لوٹ آتا تھا، اس کے راستہ میں ایک عورت کا دروازہ تھا وہ اس پر فریفتہ ہوگئی تھی، وہ اس کے راستہ میں کھڑی ہوجاتی تھی، ایک رات وہ اس کے پاس سے گزرا تو وہ اس کو مسلسل بہکاتی رہی حتیٰ کہ وہ اس کے ساتھ چلا گیا، جب وہ اس کے گھر کے دروازہ پر پہنچا تو وہ بھی داخل ہوگئی، اس نوجوان نے اللہ کو یاد کرنا شروع کیا اور اس کی زبان پر یہ آیت جاری ہوگئی: "ان الذین اتقوااذامسھم طائف من الشیطان تذکروافاذاھم مبصرون: بیشک جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں انھیں اگر شیطان کی طرف سے کوئی خیال چھو بھی جاتا ہے تو وہ خبردار ہوجاتے ہیں اور اسی وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں" (الاعراف :201)

پھر وہ نوجوان بے ہوش ہو کر گر گیا، اس عورت نے اپنی باندی کو بلایا اور دونوں نے مل کر اس نوجوان کو اٹھایا اور اسے اس کے گھر کے دروازہ پر چھوڑ آئیں۔ اس کے گھر والے اسے اٹھا کر گھر میں لے گئے، کافی رات گزرنے کے بعد وہ نوجوان ہوش میں آیا۔ اس کے باپ نے پوچھا اے بیٹے تمہیں کیا ہوا تھا؟ اس نے کہا خیر ہے، باپ نے پھر پوچھا تو اس نے پورا واقعہ سنایا۔ باپ نے پوچھا اے بیٹے تم نے کون سی آیت پڑھی تھی؟ تو اس نے اس آیت کو دہرایا جو اس نے پڑھی تھی اور پھر بے ہوش ہو کر گر گیا گھر والوں نے اس کو ہلایا جلایا لیکن وہ مر چکا تھا۔ انھوں نے اس کو غسل دیا اور لے جا کر دفن کر دیا، صبح ہوئی تو اس بات کی خبر حضرت عمر (رض) تک پہنچی۔ صبح کو حضرت عمر اس کے والد کے پاس تعزیت کے لیے آئے اور فرمایا تم نے مجھے خبر کیوں نہیں دی؟ اس کے باپ نے کہا رات کا وقت تھا۔ حضرت عمر نے فرمایا ہمیں اس کی قبر کی طرف لے چلو، پھر حضرت عمر اور ان کے اصحاب اس کی قبر پر گئے، حضرت عمر نے کہا اے نوجوان! جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے اس کے لیے دو جنتیں ہیں؟ تو اس نوجوان نے قبر کے اندر سے جواب دیا: اے عمر! مجھے میرے رب عزوجل نے جنت میں دو بار دو جنتیں عطا فرمائی ہیں۔ (مختصر تاریخ دمشق ترجمہ عمرو بن جامع، رقم: 114، ج 19 ص 190۔ 191، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

حافظ ابن عساکر کے حوالہ سے اس حدیث کو حافظ ابن کثیر متوفی 774ھ، حافظ جلال الدین سیوطی متوفی 911ھ اور امام علی متقی ہندی متوفی 975ھ نے بھی ذکر کیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر الاعراف 201، ج 3، ص 269، طبع دار الاندلس بیروت، شرح الصدور ص 13، طبع دار الکتب العلمیہ بیروت، 1404، کنز العمال ج، ص 516۔ 517، رقم الحدیث: 4634)

حسن بصری بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب کے زمانہ میں ایک نوجوان نے عبادت اور مسجد کو لازم کر لیا تھا، ایک عورت اس پر عاشق ہو گئی، وہ اس کے پاس خلوت میں آئی اور اس سے باتیں کیں اس کے دل میں بھی اس کے متعلق خیال آیا، پھر اس نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ اس کا چچا آیا اور اس کو اٹھا کر لے گیا جب اس کو ہوش آیا تو اس نے کہا اے چچا! حضرت عمر کے پاس جائیں ان سے میرا سلام کہیں اور پوچھیں کہ جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے اس کی کیا جزا ہے؟ اس کا چچا حضرت عمر کے پاس گیا، اس نوجوان نے پھر چیخ ماری اور جاں بحق ہو گیا۔ حضرت عمر (رض) اس کے پاس کھڑے ہوئے اور کہا تمہارے لیے دو جنتیں ہیں، تمہارے لیے دو جنتیں ہیں۔ (شعب الایمان، ج 1، ص 468۔ 469، رقم الحدیث: 736، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت 1410 ھ)

امام بیہقی کے حوالے سے اس حدیث کو حافظ سیوطی متوفی 911ھ امام علی متقی ہندی متوفی 975ھ اور علامہ آلوسی متوفی 1270ھ نے بھی ذکر کیا ہے۔ (الدر المنثور ج 6، ص 147، طبع قدیم ج 7، ص 708، طبع جدید دار الفکر، کنز العمال رقم الحدیث: 4635، روح المعانی ج 27 ص 116)

حافظ ابن عساکر نے جو حدیث تفصیلاً روایت کی ہے اس پر حافظ ابن کثیر نے بھی اعتماد کیا ہے اور اس کو اپنی تفسیر میں درج کیا ہے اور اس حدیث سے حسب ذیل امور ثابت ہوتے ہیں۔

1۔ گناہ کی ترغیب کے موقع پر اللہ کو یاد کر کے اس کے خوف سے گناہ کو ترک کر دینا دو جنتوں کے حصول کا سبب ہے۔

2۔ نیک مسلمان اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔

3۔ نیک مسلمانوں اور اولیاء اللہ کی قبروں کی زیارت کے لیے جانا حضرت عمر (رض) کی سنت ہے۔

4۔ کسی فوت شدہ مسلمان کی تعزیت کے لیے اس کے والدین اور اعزہ کے پاس جانا حضرت عمر کا طریقہ ہے۔

5۔ صاحب قبر سے کلام کرنا اور صاحب قبر کا جواب دینا، اس حدیث سے یہ دونوں امر ثابت ہیں۔

6۔ جن احادیث میں ہے کہ قبر والے ایسا جواب نہیں دیتے جن کو تم سن سکو، ان کا معنی یہ ہے کہ تم ان کا جواب عادۃً نہیں سن سکتے۔

(تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ۝۲۰۲

لغۃ القرآن: [وَاِخْوَانُهُمْ : اور ان کے بھائی] [يَمُدُّوْنَهُمْ : کھینچتے ہیں ان کو] [فِي : میں] [الْغَيِّ : گمراہی] [ثُمَّ : پھر] [لَا : نہیں] [يُقْصِرُوْنَ : کمی کرتے]

ترجمہ: اور (جو) ان شیطانوں کے بھائی (ہیں) وہ انھیں (اپنی وسوسہ اندازی کے ذریعہ) گمراہی میں ہی کھینچے رکھتے ہیں پھر اس (فتنہ پروری اور ہلاکت انگیزی) میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے

تشریح: شیطان کے بھائی بند کی دو تفسیریں ہیں۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد انسان میں سے شیطان ہیں اور وہ لوگوں کو گمراہ کرکے شیاطین جنات کی مدد کرتے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ شیاطین کے بھائی بند وہ کفار ہیں جو لوگوں کو گمراہ کرکے شیاطین کی مدد کرتے ہیں۔ (تفسیر تبیان القرآن)

ارشاد فرمایا کہ شیطانوں کے بھائی یعنی مشرکوں کو شیطان گمراہی میں کھینچتے ہیں یہاں تک کہ وہ گمراہی پر پکے ہو جاتے ہیں، پھر وہ نہ تو گمراہی سے رکتے ہیں اور نہ گمراہی چھوڑتے ہیں۔

متقی مسلمان اور کافر کا حال:

اس سے متقی مسلمان اور کافر کا حال واضح ہوا کہ مسلمان کو جب شیطان کی طرف سے کوئی خیال آتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا حکم یاد کرتا ہے اور پہچان جاتا ہے کہ یہ شیطان کا وار ہے، پھر وہ اس سے رک جاتا ہے اور توبہ استغفار کرتا ہے جبکہ کافر اپنی گمراہی میں ہی پختہ ہوتا چلا جاتا ہے، نہ وہ اللہ تعالیٰ کا حکم یاد کرتا ہے اور نہ ہی اپنی گمراہی سے رجوع کرتا ہے۔ (تفسیر صراط الجنان)

اس آیت کریمہ میں اخوانھم کی ضمیر کا مرجع شیطان بھی ہو سکتے ہیں اور وہ جاہلین بھی جن کا گزشتہ آیت میں ذکر ہے۔ مراد یہ ہے کہ جنوں میں سے شیاطین ہوں یا انسانوں میں سے جو لوگ ان کے ساتھ بھائی چارے کا تعلق رکھتے ہیں وہ جن سے فکری اکتساب کرتے ہیں یا ان کی مجالس میں اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے تہذیبی اثرات قبول کرتے ہیں یا ان کے ہم خیال ہونے کے باعث ژولیدہ فکری پیدا کرنے میں ان کی ہم نوائی کرتے ہیں ان کے بارے میں فرمایا جارہا ہے کہ جن شیاطین سے ان کا تعلق ہے وہ ان سے اپنے ڈھب سے کام لینے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے وہ ہر ممکن طریقے سے انھیں دینی قوتوں کو بدنام کرنے، دینی اعتقادات کے بارے میں بدگمانیاں پھیلانے، مسلمان نوجوانوں میں فکری انتشار پیدا کرنے اور اسلامی تہذیب سے برگشتہ کرنے کے لیے مسلسل استعمال کرتے ہیں کبھی تو باقاعدہ انھیں معاوضہ دے کر یہ کام لیا جاتا ہے اور کبھی ان کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر ان سے یہ خدمت لی جاتی ہے۔ روشن خیالی کے نام سے انھیں برائیوں کی تاریکی پھیلانے میں لگایا جاتا ہے، فکری آزادی کے حوالے سے ان کے ذریعے نفس کی بندگی یا استعمار کی غلامی یا تہذیبی خود سپردگی کو عام کرنے کے لیے ان کی خدمات مستعار لی جاتی ہیں وہ بظاہر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تعلیم کی نشرواشاعت میں بعض قوتوں کا ساتھ دے کر ملک کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کر رہے ہیں لیکن انھیں کبھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہم سے اصلاً تعلیم کے ذریعے سے مسلمان نوجوانوں کو گمراہ کرنے اور بگاڑنے کا کام لیا جارہا ہے کیونکہ پورے مشرق وسطیٰ اور برصغیر میں جہاں جہاں بھی استعماری قوتوں نے اپنی حکومتیں قائم کیں وہاں انھوں نے تعلیم ہی کے واسطے سے بالخصوص مسلمانوں کو ان کے مذہب، تہذیب اور ان کی ثقافت سے برگشتہ کرنے میں کامیابی حاصل کی کیونکہ انسانی اعمال کا دارومدار انسانی فکر پر ہے اور فکر ہمیشہ تعلیم کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ ایک بچے کو ابتدائی تعلیم سے جب ایک خاص ڈھب پر ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ صاف دماغ ہونے کی وجہ سے اس کوشش کے مطابق پروان چڑھتا ہے اور جب وہ تعلیم مکمل کرکے تعلیمی اداروں سے نکلتا ہے تو وہ بالکل ویسا انسان ہوتا ہے جیسا تعلیم دینے والوں نے اسے بنانے کی کوشش کی ہو، وہ اپنے مذہب کا نام بھی لیتا ہے لیکن مذہب اس کی زندگی میں باقی نہیں رہتا۔ لارڈ میکالے نے یہی بات برطانوی پارلیمنٹ سے کہی تھی کہ تعلیم کے ذریعے سے ہم جن لوگوں کو تیار کر رہے ہیں وہ نام کے مسلمان ہوں گے لیکن حقیقت میں مسلمان نہیں ہوں گے۔ تعلیم سب سے بڑا ہتھیار ہے جس سے لوگوں کو بگاڑا جاسکتا ہے اور سنوارا بھی جاسکتا ہے اسی لیے اقبال نے کہا تھا۔

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے ایک ڈھیر

انسانی قوتیں اسی تعلیم کے مقدس نام سے مسلمانوں کو بگاڑنے کا کام لیتی ہیں اور خود مسلمان اسے ایک عبادت سمجھ کر انجام دیتے ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم جہالت دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن انھیں معلوم نہیں ہوتا کہ جہالت دور کرنے کے ساتھ ساتھ ہم دین اور دین کے تمام متعلقات کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی طرح تفریح کے نام پر شیطانی قوتوں نے خود کو مسلمانوں ہی سے شرم وحیاء کو ختم کرنے کا جو کام لیا ہے وہ ہمارے سامنے ہے جو لوگ اس کام کے رسیا ہو جاتے ہیں ان کی نفسانیت اس طرح ان کے ایمان بلکہ عقل پر بھی غالب آ جاتی ہے کہ صرف تفریح ان کا مقصد بن جاتی ہے، چاہے اس کے نتیجہ میں شرم وحیاء کا جنازہ نکل جائے۔ انہی مثالوں پر قیاس کرکے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ شیطانی قوتوں نے تعلیم، تفریح، ذریعہ ابلاغ، سیاست، فنون لطیفہ، آرٹ، ادب لٹریچر حتیٰ کہ دین کو بھی اپنے مقاصد کے لیے اس طرح استعمال کیا ہے کہ مسلمان سادگی سے اسے نیکی سمجھتے رہے اور انھوں نے نہایت دانش مندی سے اپنے مقاصد حاصل کر لیے ان کا اور مسلمانوں کا معاملہ کچھ ایسا ہی رہا ہے۔

بڑے وثوق سے دنیا فریب دیتی ہے
بڑے خلوص سے ہم اعتبار کرتے ہیں

اور کمال کی بات یہ ہے کہ جناتی قوتیں تو خیر چھپ کر کام کرتی ہی ہیں انسانی شیاطین بھی اس طرح پس پردہ رہ کر اور پاکیزہ اصطلاحات کی آڑ میں مسلمانوں کو بگاڑنے کے لیے کوششیں انجام دیتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں میں کھیلنے والوں کو کبھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم جن کاموں کو جائز اور نیک سمجھ کر کر رہے ہیں یہ تو ہم اصلاً شیاطین کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ہمارے ادب اور سیاست میں استعماری قوتوں نے جس طرح ففتھ کالم تیار کیے اور پھر ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا وہ ایک ایسی کہانی ہے جو تاریخ پر گہری نظر رکھنے والا ہر شخص بڑی آسانی سے دیکھ سکتا ہے اور قومی بیداری اور اصلاح کے نام پر جس طرح کچھ لوگوں کو دینی مسلمات میں اختلافات پیدا کرنے اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے وہ بھی ایک تکلیف دہ داستان ہے جس کے نتائج آج امت مسلمہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ جس طرح اللہ کی پناہ طلب کرنے والے اور ہر ناگفتہ بہ صورتحال میں محض اللہ کی توفیق سے کام کرنے والوں نے خدمات انجام دی ہیں اسی طرح شیطانی قوتوں نے اپنے ایجنٹوں اور گماشتوں سے اس طرح کام لیا ہے کہ کبھی اس میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں ہونے دی۔ اس لیے اللہ کے راستے میں کام کرنے والوں کی ہمیشہ دونوں باتوں پر توجہ رہنی چاہیے ایک تو اپنے آپ کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ ہمارے کام میں کہیں نفسانیت کا شائبہ تو نہیں اور دوسرے ان شیطانی عناصر پر گہری نگاہ رہنی چاہیے جو اپنے کام میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے اور ان کی کوششیں مسلمانوں کو بگاڑنے میں کبھی کمزوری نہیں دکھاتیں۔

گزشتہ آیات میں آپ نے دیکھا کہ سارا زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ شیطانی قوتیں حق کی مخالفت میں جو بھی کریں داعیان حق کو کبھی ان نصیحتوں کو نظر سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہیے جو گزشتہ آیات میں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ اب اگلی آیت کریمہ میں دونوں باتوں کی مثال دی گئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حق کی مخالف قوتیں کس طرح داعی حق کو قلبی اور ذہنی اذیتیں پہنچاتی ہیں لیکن اس کے مقابلے میں داعی حق کا طرز عمل کیا ہوتا ہے چونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسلمانوں کے لیے اسوہ کاملہ ہیں اس لیے یہ مثال آپ ہی کے حوالے سے دی جارہی ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

لیکن جو اللہ سے نہیں ڈرتے، اور شیطان کے بھائی ہوتے ہیں، انھیں اللہ کے ذریعہ شیطان کے وسوسوں سے پناہ مانگنا یاد نہیں آتا اور شیاطین ان کے دل ودماغ میں کثرت سے شبہات پیدا کرتے ہیں، گناہوں کے ذریعہ شیطان کو وسوسوں سے پناہ مانگنا یاد نہیں آتا اور شیاطین ان کے دل ودماغ میں کثرت سے شبہات پیدا کرتے ہیں گناہوں کی خوشنما بنا کر پیش کرتے ہیں اور انھیں کر گذرنے کو ان کے لیے آسان بنادیتے ہیں آخر کار وہ لوگ ان معاصی کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں، اور مستقبل میں اسی راہ پر چل پڑتے ہیں۔ (تفسیر تیسیر القرآن)

خوف خدا سے مرنے والے عابد کی قبر سے آواز آئی :

حافظ بن عساکر اپنی تاریخ میں عمر (رض) و بن جامع کے حالت میں سے نقل کرتے ہیں کہ ایک نوجوان عابد مسجد میں رہا کرتا تھا اور اللہ کی عبادت کا بہت مشتاق تھا ایک عورت نے ان پر ڈورے ڈالنے شروع کئے یہاں تک کہ اسے بہکالیا، قریب تھا کہ وہ اس کے ساتھ کوٹھڑی میں چلا جائے تو اسے یہ آیت " اذا مسھم طائف من الشیطان " الخ یاد آئی اور غش کھا کر گر پڑا، بہت دیر کے بعد جب اسے ہوش آیا اس نے پھر اس آیت کو یاد کیا اور اس قدر اللہ کا خوف اس کے دل میں سمایا کہ اس کی جان نکل گئی حضرت عمر (رض) نے اس کے والد سے ہمدردی اور غمخواری کی، چونکہ انھیں رات ہی کو دفن کر دیا گیا تھا آپ ان کی قبر پر گئے آپ کے ساتھ بہت سے آدمی تھے آپ نے وہاں جا کر ان کی قبر پر نماز جنازہ ادا کی اور اسے آواز دے کر فرمایا اے نوجوان ! " ولمن خاف مقام ربہ جنتان " جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا ڈر رکھے اس کیلئے دو دو جنتیں ہیں، اسی وقت قبر کے اندر سے آواز آئی کہ مجھے میرے رب نے وہ دونوں دو دو مرتبے عطا فرما دیئے۔) (ابن کثیر) (تفسیر فوائد القرآن)

آیت مبارکہ:

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۭ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۲۰۳

لغۃ القرآن: [وَاِذَا : اور جب] [لَمْ تَاْتِهِمْ : آپ نہیں لاتے ان کے پاس] [بِاٰيَةٍ : کوئی آیت] [قَالُوْا : تو وہ کہتے ہیں] [لَوْلَا : کیوں نہیں] [اجْتَبَيْتَهَا: تصنیف کیا آپ نے اس کو] [قُلْ : آپ کہہ دیجیے] [اِنَّمَآ اَتَّبِعُ : میں تو بس پیروی کرتا ہوں] [مَا : اس کی جو] [يُوْحٰٓى: وحی کیا گیا] [اِلَيَّ : میری طرف] [مِنْ رَّبِّيْ : میرے رب سے] [هٰذَا : یہ] [بَصَاۗىِٕرُ : دلیلیں ہیں] [مِنْ : سے] [رَّبِّكُمْ : تمہارا رب] [وَهُدًى: اور ہدایت] [وَّرَحْمَةٌ: اور رحمت] [لِّقَوْمٍ : اس قوم کے لیے] [يُّؤْمِنُوْنَ : جو ایمان رکھتے ہیں]

ترجمہ: اور جب آپ ان کے پاس کوئی نشانی نہیں لاتے (تو) وہ کہتے ہیں کہ آپ اسے اپنی طرف سے وضع کرکے کیوں نہیں لائے ؟ فرمادیں : میں تو محض اس (حکم) کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی جانب سے میری طرف وحی کیا جاتا ہے یہ (قرآن) تمہارے رب کی طرف سے دلائل قطعیہ (کا مجموعہ) ہے اور ہدایت ورحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں

تشریح: اگر کبھی چند روز کے لیے آیات کا نزول بند ہو جاتا تو مشرکین مکہ بطور مذاق کہتے کہ جیسے آپ پہلے آیات خود بنا کر سناتے تھے اب کیا ہو گیا ہے آیات کیوں نہیں بناتے ؟ اس پر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : میں تو صرف وہی آیات سناتا ہوں جو اللہ تعالیٰ میرے اوپر نازل فرماتا ہے، اور اس قرآن میں بیان کر دو روشن دلائل بھی اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ میرا کلام نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے مگر اس سے ہدایت اور رحمت وہی حاصل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں۔ (تفسیر امداد الکرم)

کفار کے فرمائشی معجزات نہ دکھانے کی توجیہ

اس سے پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ شیاطین الانس اور شیاطین الجن لوگوں کو گمراہ کرنے میں کوئی کمی نہیں کرتے۔ اس آیت میں ان کے گمراہ کرنے کی ایک خاص نوع کو بیان فرمایا ہے کہ وہ بطور سرکشی معجزات مخصوصہ طلب کرتے ہیں مثلاً وہ کہتے تھے : " وقالوالن نومن لک حتی تفجر لنا من الاض ینبوعا۔ او تکون لک جنۃ من نخیل وعنب فتفجر الانہار خللہا تفجیرا۔ او تسقط السماء کما زعمت علینا کسفا او تاتی باللہ والملائکۃ قبیلا۔ او یکون لک بیت من زخرف او ترقی فی السماء ولن نومن لرقیک حتی تنزل علینا کتبا نقرءہ قل سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا : اور انھوں نے کہا ہم ہر گز آپ پر ایمان نہیں لائیں گے حتی کہ آپ زمین سے ہمارے لیے کوئی چشمہ جاری کردیں۔ یا آپ کے لیے کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو جس کے درمیان آپ بہتے ہوئے دریا جاری کردیں۔ یا آپ اپنے قول کے مطابق ہم پر آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے گرادیں یا آپ ہمارے سامنے فرشتوں کو لے آئیں۔ یا آپ کے لیے سونے کا کوئی گھر ہو یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم آپ کے چڑھنے پر (بھی) ہرگز ایمان نہیں لائیں گے حتی کہ آپ ہم پر ایک کتاب نازل کریں جس کو ہم پڑھیں آپ کہیے کہ میرا رب پاک ہے میں تو صرف بشر ہوں اور اللہ کا فرستادہ (رسول) "

جب آپ نے ان کے فرمائشی معجزات پیش نہیں کیے تو وہ کہنے لگے کہ اگر اللہ نے آپ کو یہ معجزات نہیں دیے تو آپ اپنی طرف سے یہ معجزات کیوں نہیں پیش کردیتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا آپ کہئے کہ میرے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ میں اللہ سے کوئی مطالبہ یا فرمائش کروں، اللہ تعالیٰ از خود جو چاہتا ہے میرے ہاتھ سے نشانی یا معجزہ صادر فرمادیتا ہے۔ اور ان کے فرمائشی معجزات کو پیش نہ کرنا اسلام کی تبلیغ، ہدایت اور میری نبوت کے اثبات کے منافی نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن نازل فرمایا ہے اور اس کا معجز ہونا بالکل ظاہر ہے، اور جو واقعی ہدایت کا طالب ہوں اس کے لیے تو یہ قرآن ہی کافی ہے اور جس نے خواہ مخواہ کی حجت بازی کرنا ہو اس کے لیے سینکڑوں دلائل بھی ناکافی ہیں۔ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت پر قرآن مجید کی دلالت تو علمی اور عقلی اعتبار سے ہے۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بہ کثرت حسی دلائل بھی پیش کیے، جن کو دیکھ کر بغیر غور و فکر کے بداہۃً آپ کا دعوی نبوت میں صادق ہونا ظاہر ہوجاتا ہے۔ مثلاً آپ نے چاند کے دو ٹکڑے کیے، آپ کی دعا سے ڈوبا ہوا سورج طلوع ہوگیا، پتھر نے آپ کو سلام کیا، درخت اور اس کے خوشے آپ کے حکم پر چل کر آئے، مختلف جانوروں نے آپ کا کلمہ پڑھا، کئی بار آپ کی انگلیوں سے پانی جاری ہوا اور کتنی مرتبہ کم کھانا بہت زیادہ آدمیوں کے لیے کافی ہوگیا۔ اس طرح کے اور بہت معجزات ہیں، ان تمام معجزات کو دیکھنے کے باوجود سرکش اور ضدی کفار ایمان نہیں لائے، چونکہ یہ لوگ طلب ہدایت کے لیے نہیں بلکہ محض حجت بازی اور ضد بحث کے طور پر معجزات کو طلب کرتے تھے اس لیے ان کے فرمائشی معجزات پیش نہیں کیے گئے۔ نیز سابقہ امتوں میں کفار نے فرمایشی معجزات طلب کیے اور معجزات دکھائے جانے کے باوجود جب وہ ایمان نہیں لائے تو ان پر آسمانی عذاب آیا، اب اگر ان کے فرمائشی معجزات طلب کیے اور معجزات دکھائے جانے کے باوجود جب وہ ایمان نہیں لائے تو ان پر آسمانی عذاب آیا، اب اگر ان کے فرمائشی معجزات پیش کردیے جاتے اور پھر بھی یہ ایمان نہ لاتے تو ان پر عذاب آنا چاہیے تھا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماچکا ہے : " وماکان اللہ لیعذبہم وانت فیہم : اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ ان کو عذاب دے جب کہ آپ ان میں موجود ہیں " (الانفال : 33) (تفسیر تبیان القرآن)

فرمائشی معجزہ طلب کرنے والوں کو جواب :

سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزات اتنے بکثرت ہیں کہ علماء کرام نے مستقل کتابیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزات پر لکھی ہیں علامہ سیوطی (رح) کی خصائص الکبری اس بارے میں نہایت عمدہ اور جامع کتاب ہے اسی طرح علامہ یوسف البھانی کی کتاب رحمۃ للعالمین فی معجزات سید المرسلین بینظیر اور جامع کتاب ہے اسی طرح دوسرے علماء کرام کے متفرق چھوٹی بڑی کتابوں کی ایک معتدبہ ذخیرہ موجود ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزات دس ہزار سے زائد ہو سکتے ہیں۔

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا سب سے بڑا اور روح پرور معجزہ قرآن حکیم ہے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مشرکین عرب کے سامنے شق القمر کا معجزہ بھی دکھایا مگر نتیجہ مطلب خیز نہ ہوا کیونکہ وہ لوگ اسلام نہ لائے اور معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود اپنے کفر پر جمے رہے۔ اسی طرح مکی زندگی میں معراج کا معجزہ ظاہر ہوا جو کہ بڑا عمدہ دلچسپ رہا صبح لوگوں نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے مسجد اقصی شریف کے متعلق بہت سے سوالات پوچھے حضرت جبرئیل نے پوری

مسجد اقصیٰ کا نقشہ سامنے پیش کیا لوگ پوچھتے رہے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہر ہر چیز انہیں کو بتاتے رہے آخر وہ سارے اپنے ضمیر میں قائل ہو گئے اور باور کیا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مسجد اقصیٰ دیکھی اور معراج پر گئے ہیں مگر "وان یروا ایۃ یعرضوا ویقولوا سحر مستمر"

قرآن کریم نے جابجا آگاہ فرمایا کہ ان معاندین نے یہ طے کیا ہوا ہے کہ وہ کسی بھی معجزہ یا دلائل قدرت کے واضح ہونے کے باوجود ایمان نہیں لائیں گے البتہ خواہ مخواہ بطور استہزاء آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے معجزات کی طلب کریں گے اور ان کا مقصد ایمان لانا نہیں ہوتا وہ بار بار فرمائشی معجزات مانگ مانگ کر ان کا مقصد آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تنگ کرنے اور پریشان کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ بات واضح ہے کہ معجزہ کا اظہار پیغمبروں کے اختیار میں نہیں ہوتا کہ وہ جب چاہیں لوگوں کے مطالبہ پر معجزہ صادر فرمائیں معجزہ صادر کرنا صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار اور اس کی مرضی پر معلق ہے یہی حال کرامت اولیاء کا بھی ہے۔ اتنے کثیر معجزات کے صدور پر جب معاندین قائل نہیں ہوئے تو انہوں نے یہ بہانہ شروع کیا کہ جو معجزہ ہم چاہیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایسا معجزہ ظاہر فرمائیں کیونکہ یہ چیز آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دائرہ اختیار میں نہ تھی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو فرمائشی اور غیر فرمائشی معجزے صادر فرماتا یہ اس کی مرضی پر موقوف ہے نہ کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے۔

اب مسئلہ واضح ہے کہ معجزہ کے ظہور سے وہ ہٹ دھرمی چھوڑ کر ایمان لانے پر جب تیار نہ تھے بلکہ محض عناد کی بنیاد پر معجزات طلب کرتے تھے تو جواب دیا وَاِذَا لَمۡ تَاۡتِہِمۡ بِاٰیَۃٍ قَالُوۡا لَوۡلَا اجۡتَبَیۡتَہَا۔ میں معاندین کا شر پسندانہ معاندانہ اعتراض نقل فرمایا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نبوت اور رسالت کے دعویدار ہیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے پاس سے کوئی معجزہ کیوں ظاہر نہ کیا کیا یہ مطلب تھا کہ اللہ تعالیٰ سے کیوں یہ بات منظور نہ کرائی تاکہ وہ ہمارا فرمائشی معجزہ ظاہر کر دیتا۔ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا قُلۡ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ مِنۡ رَّبِّیۡ۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرما دیجئے کہ میں تو صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے میری طرف وحی کی جاتی ہے مطلب یہ ہے کہ میرا کام تو بس یہ ہے کہ وحی کا اتباع کروں میرے اختیار میں معجزہ کا ظاہر کرنا نہیں ہے اور فرمائشی معجزہ ظاہر ہونے پر ایمان قبول کرنے کو موقوف رکھنا تمہاری حماقت ہے اور ضد و عناد ہے میرے بہت سے معجزات ظاہر ہو چکے ہیں لیکن تم لوگ انھیں سحر اور جادو کہ کر ایمان نہیں لائے اور محروم رہے اور سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم ہے جو تمہارے سامنے ہے جس کی فصاحت و بلاغت اور بے مثال نظم و عبادت تم نے دیکھا اور اس کی چھوٹی سی مختصر سورۃ کی نظیر پیش کرنے کے باوجود اہل لسان ہونے کے عاجز و ناتوان رہے جس میں بصیرت و ہدایت اور رحمت کے خزانے تمہارے سامنے موجزن ہیں۔

اگر تمہارا مطلب ایمان لانا ہوتا تو اس کے ہوتے ہوئے کسی اور معجزے کے مطالبہ سے تم دستبردار ہوتے اور اسی صحیفہ ہدایت رحمت کو قبول کرتے اور ایمان لاتے مگر چونکہ تم سے ضد و عناد کے سوا کچھ بھی نہیں جانتے اس لیے محروم و بے بہرہ ہو چکے ہو اور جو طالب حق ہوگا قرآن مجید کے ہوتے ہوئے کسی اور معجزہ کا خواہاں نہیں ہوتا۔

ہٰذَا بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّکُمۡ وَ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃٌ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے بصیرت اور قلبی راحت و سکون کی باتیں ہیں اور یہ قرآن ان لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں جیسے فرمایا "ھدیً للمتقین" کیونکہ اہل ایمان و تقوی نے اسے قبول کیا اور اس سے دنیاوی و اخروی فائدہ اٹھایا۔ اللھم اجعلنا منھم۔ آمین۔ (تفسیر منازل العرفان)

یہ شیطان کی شیطنت کا نتیجہ ہے کہ دلائل اور معجزات دیکھنے اور جاننے کے باوجود کفار ہر روز نئے سے نیا مطالبہ کرتے تھے کہ ہمیں مزید معجزات دکھائے جائیں۔ یہاں اس کا جواب دیا گیا ہے کہ قرآن سے بڑھ کر کونسا معجزہ ہو سکتا ہے۔ مکہ کے کفار اور مدینہ کے اہل کتاب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ایک سے ایک بڑھ کر سوال اور معجزات طلب کیا کرتے تھے۔ ان کے ہر معقول سوال کا موثر اور مدلل جواب دیا گیا اور ان کے مطالبہ پر بڑے بڑے معجزات بھی پیش کیے گئے۔ لیکن ان کے دل میں کھوٹ اور طبیعت میں بہانہ سازی کا عنصر غالب تھا جس وجہ سے وہ ایک مطالبہ پورا ہونے کے بعد دوسرا پیش کر دیا کرتے تھے۔ اور کبھی کہتے یہ تو تیری جادو گری کا کرشمہ ہے۔ ان باتوں کا جواب دینے کے لیے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم ہوا کہ آپ فقط یہ فرمائیں میں تو ایک رسول ہونے کی حیثیت سے وحی الٰہی کی اتباع کا پابند ہوں۔ جہاں تک دلائل اور معجزہ کا تعلق ہے وہ قرآن مجید فرقان حمید کی شکل میں تمہارے سامنے ہے جس کا جواب آج تک تم سے نہیں بن سکا

اور قیامت تک اس کا جواب پیش نہیں کر سکو گے۔ اگر تم اپنی ہٹ دھرمی کو چھوڑ دو اور قرآن مجید کو توجہ اور خاموشی کے ساتھ سنو تو یقیناً تم پر اللہ کا کرم اور اس کی مہربانی نازل ہو گی کیونکہ یہ قرآن لوگوں کے لیے ہدایت اور ان کی مشکلات کے مداوا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ لیکن کفار کا وطیرہ تھا اور ہے کہ قرآن پڑھنے اور سننے کے بجائے جونہی قرآن کی تلاوت شروع ہو تو اتنا شور و غوغا کرو کہ تم قرآن پر غالب آ جاؤ۔ (سورۃ حٰم السجدہ، آیت: ۲۶) (تفسیر فہم القرآن)

آیت مبارکہ:

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ○۲۰۴

لغۃ القرآن: [وَإِذَا : اور جب بھی] [قُرِئَ : پڑھا جائے] [الْقُرْآنُ : قرآن] [فَاسْتَمِعُوْا : تم لوگ کان لگا کر سنو] [لَهُ : اس کو] [وَاَنْصِتُوْا : اور خاموشی سے سنو] [لَعَلَّكُمْ : تاکہ تم] [تُرْحَمُوْنَ : رحم کیے جاؤ]

ترجمہ: اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے

تشریح: قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری بابرکت صحیفہ رحمت اور کتاب ہدایت ہے اس کے فضائل و مناقب نہایت عجیب و غریب اور بیشمار ہیں انہی فضائل و مزایا کے طفیل اس کے قاری اور حاملین کو پوری امت پر شرف و برتری حاصل ہے سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد گرامی ہے کہ "اشراف امتی حملۃ القرآن و اصحاب اللیل" (مشکوۃ)۔ میری امت کے اشراف قرآن کے حاملین اور تہجد گذار لوگ ہیں۔

اس آیت میں قرآن کریم کے آداب و فضائل پر واضح تنبیہ ہے اور اس کے سننے اور اس کی تلاوت کے وقت خاموش رہنے کا حکم ہے۔

پہلے تو یہ فرمایا کہ جب قرآن کریم پڑھا جائے تو اسے دھیان اور اور سے سنو اور خاموش رہو۔ اوّل تو قرآن پڑھنے والے قاری کو چاہیے کہ قرآن پڑھنے میں اس بات کا خیال رکھے کہ جن کانوں تک آواز پہنچ رہی ہے وہ لوگ کام کاج نیند اور کسی ضروری کام میں تو مشغول نہیں ہیں۔ اگر لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہوں یا سو رہے ہوں تو اونچی آواز سے تلاوت نہ کرے کیونکہ کام میں لگے ہوئے لوگ قرآن حکیم کی طرف توجہ نہیں کر سکتے پڑھنے والے پر لازم ہے کہ ایسی صورتحال پیدا نہ کرے کہ حاضرین کے کانوں میں قرآن مجید کی آواز آ رہی ہو اور کام کاج میں مشغولیت کی وجہ سے قرآن مجید سننے کی طرف توجہ نہ کر سکیں۔

قاری جب یہ دیکھے کہ توجہ سے سننے والے موجود ہیں تو زور کی آواز سے تلاوت کرے جو لوگ مشغول نہیں ہیں ان پر لازم ہے کہ خاموش رہیں جیسے کہ عام مذہبی جلسوں میں ہوتا ہے کہ لوگ اسی خاطر جمع ہوتے ہیں کہ قرآن سنیں اور وعظ کی سماعت کریں پس اگر قرآن مجید پڑھا جا رہا ہو اور لوگ باتیں کر رہے ہو تو یہ ناقدری اور سخت بے ادبی شمار ہو گا یہ حکم کہ جب قرآن مجید پڑھا جائے تو سنو اور خاموش رہو یہ حکم نماز اور خارج نماز دونوں کو شامل ہے جو لوگ امام کے پیچھے نماز میں کھڑے ہوں ان کے لئے تو غافل ہونے کا موقع ہی نہیں ہے کاروبار اور دکان چھوڑ کر آتے ہیں اور مسجد میں موجود ہیں اور جب تک نماز میں ہی دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتے پھر بھی امام کی قرات کی طرف متوجہ نہ ہوں تو یہ سخت محرومی کی بات ہو گی۔

امام اعظم حضرت ابو حنیفہ (رح) کا مذہب اور امام کے پیچھے خاموش رہنے کا حکم:

امام اعظم حضرت امام ابو حنیفہ (رح) کے نزدیک مقتدی کو امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ یا کوئی سورت پڑھنا ممنوع ہے آیت بالا میں قرآن مجید کی آیت کی تلاوت کے سننے اور تلاوت کے وقت خاموش رہنے کا جو حکم فرمایا ہے یہ حکم نماز کی مشروعیت کے وقت کو اور خارج نماز کو عام ہے۔ اور یہ حکم قطعی ہے جو کہ قرآنی آیت میں ہے نیز صحیح مسلم میں ہے کہ سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "واذا قرا فانصتوا" کہ جب امام رکوع کرے تو رکوع کرو اور جو سجدہ کرے تو سجدہ کرو اور جب قراءت پڑھے تو تم خاموش رہو۔ امام مسلم (رح) نے نہ صرف اس حدیث کی تخریج کی بلکہ بتصریح یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اس کے الفاظ بھی عام ہیں جہری اور سری نمازوں دونوں کو شامل ہے۔

ترک القراءۃ خلف الامام کے بارے میں صحابہ کرام کے ارشادات :

حضرات صحابہ کرام کے آثار واقوال سے بھی امام ابو حنیفہ (رح) کے مسلک کی تائید ہوتی ہے حضرت زید بن ثابت انصاری (رض) سے حضرت عطاء بن یسار (رح) نے امام کے ساتھ قرات پڑھنے کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا "لاقراءۃ مع الامام فی شیئ (صحیح مسلم) یعنی امام کے ساتھ نماز میں کوئی بھی قراءت نہیں ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری نے فرمایا "من صلی رکعۃ لم یقرأ فیھا بام القرآن فلم یصل الا ان یکون وراء الامام " (سنن ترمذی باب ماجاء فی ترک القراءۃ خلف الامام اذا جھر بالقراءۃ) مزید تفصیل کتب حدیث اور فقہ میں دیکھیں۔

تلاوت قرآن کے متعلق چند ضروری مسائل :

قرآن حکیم ایک عجیب کتاب ہے جس کا پڑھنا اور پڑھانا تعلیم دینا اور ارشاد کرنا لکھنا ترجمہ کرنا درس دینا اور کسی بھی طرح اس کی خدمت کرنا اس کی تلاوت سننا خاموش رہنا اس میں غور و فکر کرنا سب کار ثواب اور عبادت شمار ہیں۔ اسی لئے حضرت عثمان بن عفان (رض) کی روایت ہے سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا خیرو م من تعلم القرآن وعلمہ (رواہ البخاری) تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو قرآن پڑھتے اور پڑھاتے ہیں یہ بات اہل قرآن کے لیے باعث فخر و مباہات ہے کہ ان کے خیر ہونے کا فیصلہ زبان نبوت سے صادر ہوا وقت اہل قرآن کو چاہیے کہ وہ مساجد اور مدارس میں پابندی کے ساتھ اس نعمت عظیمہ کی خدمت کا تندہی کے ساتھ اہتمام کریں تاکہ روز قیامت انبیاء کرام کے بعد ساری خلقت پر فوقیت و برتری حاصل کریں۔

اور یہ بات قابل غور ہے کہ اگر قرآن کی خدمت تمام سعادتوں کا سرچشمہ ہے اسی طرح اس کی بے احترامی اور بے ادبی سارے گناہوں سے بڑھ کر بھی تو ہے نماز کے اندر قرآن کو غور و تدبر سے سننا اور خاموش رہنا لازم ہے یہ۔ بڑی بدقسمتی ہے کہ پڑھے لکھے لوگ بھی برابر اس جرم میں شریک ہیں انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ امام کہاں سے اور کس سورت سے قرات کر رہا ہے اسی طرح جمعہ اور عیدین کے نمازوں کا حکم ہے کہ خاموشی کے ساتھ سننا ضروری ہے اگر کسی بولنے والے کو خاموش کرنا مقصود ہو تو اشارہ سے کام لے زبان سے کچھ نہ کہے۔

البتہ نماز اور خطبہ کے علاوہ عام حالات میں کوئی شخص بطور خود تلاوت کر رہا ہو تو دوسروں کو خاموش رہ کر اس پر کان لگانا واجب ہے یا نہیں ؟ اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں بعض حضرات کے نزدیک سننا اور خاموش رہنا لازم ہے لیکن بعض دوسرے فقہانے یہ تفصیل فرمائی ہے کہ کان لگانا صرف ان مقامات میں ہے جہاں قرآن کریم کو سنانے کے لیے ہی پڑھا جا رہا ہو جیسے نماز و خطبہ وغیرہ میں۔

اور اگر کوئی شخص خود ہی تلاوت کر رہا ہو یا چند آدمی کسی مکان یا مسجد میں اپنی اپنی تلاوت کر رہے ہوں تو دوسرے کی آواز پر کان لگانا اور خاموش رہنا واجب نہیں ہے۔ کیونکہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رات کی نماز میں جہری تلاوت فرماتے تھے اور ازواج مطہرات اس وقت نیند میں ہوتی تھیں۔ بعض اوقات حجرہء مبارکہ سے باہر بھی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آواز سنی جاتی تھی یہی راجح ہے اور اس قسم کی روایات سے فقہاء نے خارج نماز کی تلاوت کے معاملہ میں کچھ گنجائش دی ہے لیکن اولی اور بہتر سب کے نزدیک یہی ہے کہ خارج نماز بھی جب کہیں سے تلاوت قرآن کی آواز آئے تو اس پر کان لگائے اور خاموش رہے اور اسی لئے ایسے مواقع میں جہاں لوگ سونے میں اور کام کاج میں کھانے میں یا نماز میں یا تعلیم میں مشغول ہوں باآواز بلند تلاوت کرنا بہتر نہیں ہے بلکہ جہالت ہے اور نہ سننے والے اور کان نہ لگانے کا گناہ قاری کی گردن پر ہوگا۔

اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح طور پر معلوم ہوگی جو تلاوت قرآن کے وقت ریڈیو وغیرہ کھول دیتے ہیں یا کیسٹ لگاتے ہیں یا رمضان المبارک کے مہینے میں شبینوں میں لاؤڈ سپیکر لگا کر محلوں میں بازاروں میں قرآن کریم کی آواز پہنچاتے ہیں جہاں لوگ سننے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور لوگوں کی نیند میں خلل پیدا ہوتا ہے بیماروں میں بے چینی پیدا ہوتی ہے یہ سراسر جہالت اور غیر دانشمندی اور بے ادبی ہے چاہیے کہ اس عمل کو ترک کیا جائے اور لوگوں کو بے ادبی اور گناہ سے بچایا جائے۔

علامہ ابن ہمام (رح) نے لکھا ہے کہ جس وقت امام نماز میں یا خطیب خطبہ میں کوئی مضمون جنت دوزخ کے متعلق پڑھ رہا ہو تو اس وقت جنت کی دعا یا دوزخ سے پناہ مانگنا بھی جائز نہیں یعنی زبان سے کیوں کہ اس آیت کی رو سے اللہ تعالی کی رحمت کا وعدہ شخص کے لیے ہے جو تلاوت قرآن کے وقت خاموش رہے اور جو

خاموش نہ رہے وہ اس وعدہ میں شامل نہیں۔ البتہ نفل نمازوں میں ایسی آیات کی تلاوت کے بعد آہستہ دعا مانگنا سنت سے ثابت ہے اور موجب ثواب ہے۔ (مظہری)

لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ تاکہ تم پر رحم کیا جائے اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ قرآن مجید کے آداب بجالائیں گے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے حقدار اور مستحق ہوں گے اس سے بات کا دوسرا رخ بھی معلوم ہو گیا کہ جو لوگ قرآن مجید کی بے حرمتی اور بے احترامی کریں گے وہ قہر و غضب کے مستحق ہونگے۔ (تفسیر منازل العرفان)

قرآن مجید پڑھنے کے آداب

علامہ طاہر بن عبدالرشید بخاری حنفی متوفی 542ھ لکھتے ہیں:

فتاویٰ میں مذکور ہے کہ جو شخص قرآن مجید پڑھنے کا ارادہ کرے اس کو چاہیے کہ وہ بہترین کپڑے پہنے، عمامہ باندھے اور قبلہ کی طرف منہ کرے، اسی طرح عالم پر علم کی تعظیم واجب ہے۔ گرمیوں میں صبح کے وقت قرآن مجید کو ختم کرے اور سردیوں میں اول شب میں۔ اگر وہ قرآن مجید پڑھنے یا نماز پڑھنے کا ارادہ کرے اور اس کو ریاکاری کا خدشہ ہو تو اس وجہ سے قران کریم پڑھنے اور نماز پڑھنے کو ترک نہ کرے، اسی طرح باقی فرائض کو بھی خوف ریا کی وجہ سے ترک نہ کرے۔ لیٹ کر قرآن مجید پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور قراءت کے وقت اپنی ٹانگیں ملالے۔ کسی شخص نے قرآن مجید کا کچھ حصہ یاد کیا ہو پھر اس کو باقی قرآن مجید یاد کرنے کی فرصت مل جائے تو نفلی نماز پڑھنے سے قرآن مجید کو یاد کرنا افضل ہے اور فقہ کا علم حاصل کرنا باقی قرآن مجید کے حفظ کرنے سے افضل ہے، اور بغیر علم کے زہد کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ قرآن مجید خوش الحانی کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔ حضرت براء بن عازب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قرآن کو اپنی آوازوں سے مزین کرو۔ (سنن ابو داؤد رقم الحدیث: 1468، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 1342، خلاصہ الفتاوی ج 1، ص 102۔103، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

علامہ ابراہیم بن محمد حلبی متوفی 956ھ لکھتے ہیں:

قرآن مجید کی جتنی مقدار سے نماز جائز ہوتی ہے قرآن مجید کی اتنی مقدار کو حفظ کرنا ہر مکلّف پر فرض عین ہے۔ اور سورۃ فاتحہ کو اور کسی ایک سورت کو حفظ کرنا واجب ہے اور پورے قرآن کو حفظ کرنا فرض کفایہ ہے۔ اور سنت عین پڑھنا نفل پڑھنے سے افضل ہے اور قرآن مجید کو مصحف سے پڑھنا افضل ہے کیونکہ اس میں قرآن مجید کے مصحف کو دیکھنے اور قرآن مجید کو پڑھنا دونوں عبادتوں کو جمع کرنا ہے، اور باوضو ہو کر قبلہ کی طرف منہ کرکے اچھے کپڑے پہن کر تعظیم اور اکرام کے ساتھ قرآن مجید کو پڑھنا مستحب ہے۔ قراءت سے پہلے اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھے۔ اعوذ باللہ ایک بار پڑھنا مستحب ہے بشر طیکہ قرات کے دوران کوئی دنیاوی کام نہ کرے حتی کہ اگر اس نے سلام کا جواب دیا یا سبحان اللہ یا لا الہ الا اللہ کہا تو اعوذ باللہ کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ فتاویٰ الحجہ میں مذکور ہے، اور النوازل میں مذکور ہے کہ محد بن مقاتل سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے سورۃ توبہ کو بغیر بس اللہ پڑھے پڑھنا شروع کیا تو انھوں نے کہا اس نے خطا کی۔ علامہ سمرقندی نے کہا سورۃ توبہ کو اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھ کر پڑھنا شروع کرے اور یہ قول قراء کی تصریح کے خالف ہے انھوں نے کہا سورۃ توبہ سے پہلے بسم اللہ کو اس لیے نہیں لکھا کہ بسم اللہ امت ہے اور سورۃ توبہ رفع امان کے لیے ہے۔ یہ حضرت علیل اور حضرت ابن عباس سے منقول ہے اور حضرت عثمان نے فرایا کہ جب بھی کوئی سورت یا آیت نازل ہوتی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بتادیتے تھے کہ اس کو فلاں جگہ رکھو اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فوت ہوگئے اور آپ نے سورۃ توبہ کا مقام نہیں بتایا، اور میں نے دیکھا کہ اس کا قصہ الانفال کے قصہ کے مشابہ ہے کیونکہ الانفال میں عہود کا ذکر ہے اور اس میں رفع العہود کا ذکر ہے اس لیے میں نے ان دونوں کو ملا دیا اور ایک قول یہ ہے کہ اس میں صحابہ کا اختلاف تھا بعض نے کہا الانفال اور براءۃ (توبہ) ایک سورت ہیں جو قتال کے لیے نازل ہوئیں اور بعض نے کہا یہ الگ الگ سورتیں ہیں، اس لیے ان کے درمیان فاصلہ کو رکھا گیا اور بسم اللہ کو نہیں لکھا گیا۔ اولیٰ یہ ہے کہ چالیس دن میں ایک بار قرآن مجید ختم کیا جائے، دوسرا قول یہ ہے کہ سال میں دو بار قرآن مجید ختم کیا جائے، امام ابو حنیفہ سے منقول ہے کہ جس نے سال میں دو بار قرآن مجید کو ختم کیا اس نے قرآن کریم کا حق ادا کر دیا۔ ایک قول یہ ہے کہ ہفتہ میں ایک بار ختم کرے البتہ تین دن سے کم میں قرآن مجید ختم نہ کرے۔ کیونکہ سنن ابوداود ترمذی، اور نسائی میں حضرت عبداللہ

بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے تین دن سے کم میں قرآن مجید کو ختم کیا اس نے قرآن مجید کو نہیں سمجھا۔ (سنن ابو داؤد رقم الحدیث : 1394۔ سنن الترمذی رقم الحدیث : 2949)

بستر پر لیٹ کر قرآن مجید پڑھنا جائز ہے۔ سنن ترمذی میں شداد بن اوس سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص بستر پر لیٹ کر قرآن مجید کی کوئی سورت پڑھے، اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کے لیے ایک فرشتہ مقرر کردیتا ہے جو اس کی ہر موذی چیز سے حفاظت کرتا ہے البتہ ادباً ٹانگیں ملائے، غسل خانہ میں اور مواضع نجاست میں قرآن مجید پڑھنا مکروہ ہے۔ امام بیہقی نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ دفن کے بعد قبر پر سورۃ بقرہ کی ابتدائی اور آخری آیتیں پڑھنا مستحب ہے۔ (سنن کبری ج 4، ص 56۔ 57، مطبوعہ بیروت، غنیۃ المستحملی، ص 496۔ 497، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، 1412ھ)

قران مجید سننے کا حکم آیا نماز کے ساتھ مخصوص ہے یا خارج از نماز کو بھی شامل ہے

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی 310ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں :

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم میں سے بعض، بعض کو نماز میں سلام کیا کرتے تھے کہ سلام علی فلاں، سلام علی فلاں۔ حتی کہ یہ آیت نازل ہوئی واذاقرء القرآن فاستمعوالہ وانصتوا۔

بشیر بن جابر (رض) روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود نے نماز پڑھائی۔ انھوں نے لوگوں کو امام کے ساتھ نماز میں قرآن پڑھتے ہوئے سنا، جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو انھوں نے کہا ابھی تک تمہاری سمجھ داری کا وقت نہیں آیا ؟ کیا ابھی تک تمہیں عقل نہیں آئی ؟ جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو، جس طرح تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے۔

یہ حدیث فقہاء احناف کی دلیل ہے کہ نماز میں امام کے پیچھے قراءت نہیں کرنی چاہیے۔ اس حدیث کو امام ابن جریر کے علاوہ امام ابن ابی حاتم متوفی 327ھ نے بھی روایت کیا ہے۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج 5، رقم الحدیث : 830)

انکے علاوہ حافظ ابن کثیر اور حافظ سیوطی نے بھی اس روایت کا ذکر کیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ج 3، ص 271، الدر المنثور ج 3، ص 635)

طلحہ بن عبیداللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ ایک واعظ وعظ کر رہا تھا اور عبید بن عمیر اور عطا بن ابی رباح باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کہا آپ دونوں وعظ نہیں سن رہے اور وعید کے مستحق ہو رہے ہیں، ان دونوں نے میری طرف دیکھا اور پھر اپنی باتوں میں مشغول ہوگئے۔ میں نے پھر اپنی نصیحت دہرائی، انھوں نے میری طرف دیکھا اور پھر باتوں میں مشغول ہوگئے، جب میں نے تیری بار کہا تو انھوں نے میری طرف دیکھا اور کہا یہ حکم صرف نماز کے متعلق ہے۔

مجاہد، سعید بن جبیر اور ضحاک سے بھی روایت ہے کہ قرآن مجید کو غور سے سننے اور خاموش رہنے کا حکم اس وقت ہے جب قرآن مجید کو نماز میں پڑھا جائے۔

حضرت ابن عباس، ابراہیم نخعی، عامر، قتادہ، ابن زید اور زہری سے بھی یہی مروی ہے کہ یہ حکم نماز کے ساتھ مخصوص ہے۔ صحابہ نے کہا نماز کے علاوہ تلاوت کے دوران قراءت میں کوئی حرج نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا نماز کے علاوہ قرآن مجید کی تلاوت نفل ہے خواہ وعظ میں ہو، اس تلاوت کے دوران خاموش رہنا فرض نہیں ہے۔

مجاہد اور عطا بن ابی رباح سے یہ روایت بھی ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کے دوران سننے اور خاموش رہنے کا حکم نماز اور خطبہ میں ہے۔ مجاہد سے روایت ہے کہ یہ حکم جمعہ کے خطبہ کے متعلق ہے۔ نیز مجاہد سے روایت ہے کہ یہ حکم نماز اور خطبہ کے متعلق ہے۔ عطا بن ابی رباح سے روایت ہے کہ دو وقتوں میں خاموش رہنا واجب ہے جب امام نماز میں قرآن پڑھ رہا ہو یا وہ خطبہ دے رہا ہو۔

حسن بصری، سعید بن جبیر اور عطا بن ابی رباح سے بھی یہ روایت ہے کہ یہ حکم نماز اور خطبہ دونوں کے متعلق ہے۔ (جامع البیان جز 9، ص 216۔ 220، ملخصاً مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

قرآن مجید کی اس ظاہر آیت کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن مجید کو خواہ نماز میں پڑھا جائے یا خطبہ اور وعظ میں یا اس کی عام تلاوت کی جائے ہر صورت میں قرآن مجید جب پڑھا جائے تو اس کا سننا فرض ہے اور تلاوت اور قراءت کے وقت خاموش رہنا بھی فرض ہے۔

علامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی حنفی متوفی 710ھ لکھتے ہیں:
ظاہر آیت کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن مجید کی قراءت کے وقت اس کو سننا اور خاموش رہنا لازم ہے خواہ یہ قراءت نماز میں ہو یا غیر نماز میں۔
آیا قرآن مجید سننا فرض عین ہے یا فرض کفایہ
علامہ طاہر بن عبدالرشید بخاری متوفی 542ھ لکھتے ہیں:
ایک شخص فقہ لکھ رہا ہو اور اس کے پہلو میں دوسرا شخص قرآن مجید پڑھا رہا ہو، اور فقہ میں مشغول شخص کے لیے قرآن مجید سننا ممکن نہ ہو تو نہ سننے والے کا گناہ قرآن مجید پڑھنے والے کو ہوگا، اسی اصل پر اگر کوئی شخص رات کو چھپ بلند آواز سے قرآن مجید پڑھے اور لوگ سوئے ہوں تو وہ شخص گناہ گار ہوگا۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج 1، ص 103، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)
علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متوفی 1252ھ لکھتے ہیں:
نماز اور خارج نماز میں قرآن مجید کو سننا مطلقاً واجب ہے، کیونکہ یہ آیت ہر چند کہ نماز کے متعلق وارد ہے، لیکن اعتبار خصوصیت سبب کا نہیں عموم الفاظ کا ہوتا ہے، اور یہ حکم اس وقت ہے جب کوئی عذر نہ ہو۔ قنیہ میں مذکورہ ہے کہ گھر میں بچہ قرآن مجید پڑھ رہا ہو اور گھر والے کام کاج میں مشغول ہوں تو وہ نہ سننے میں معذور ہوں گے بشر طیکہ انھوں نے اس کے پڑھنے سے پہلے کام شروع کیا ہو، ورنہ وہ معذور نہیں ہوں گے۔ اس کے بعد علامہ شامی نے خلاصہ الفتاویٰ کی عبارت نقل کی ہے کہ اگر فقہ میں مشغول شخص کے پاس کوئی قرآن پڑھے یا رات کو چھت پر پڑھے جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوں تو ان کے نہ سننے کا گناہ پڑھنے والے پر ہوگا۔ کیونکہ ان کے نہ سننے کا سبب پڑھنے والا ہے۔ یا وہ سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار کرکے اذیت پہنچا رہا ہے، اس میں غور کرنا چاہیے، اور شرح المنیہ میں یہ مذکور ہے کہ اصل میں قرآن کریم کا سننا فرض کفایہ ہے۔ کوین کہ قرآن مجید کی تلاوت کا حق یہ ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے اور اس کی تلاوت کو ضائع نہ کیا جائے اور بعض کے خاموش ہو جانے سے یہ حق ادا ہو جاتا ہے، جیسے سلام کا جواب دینا واجب ہے تاکہ مسلمان کے حق کی رعایت ہو اور بعض کے جواب دینے سے یہ حق ادا ہو جاتا ہے اور باقی مسلمانوں سے یہ وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔ البتہ قرآن کریم پڑھنے والے پر اس کا احترام کرنا واجب ہے بایں طور کہ وہ بازاروں میں قرآن مجید نہ پڑھے اور نہ ان مقامات پر قرآن کریم پڑھے جہاں لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہوں اور اگر اس نے وہاں پڑھا تو قرآن مجید کی حرمت کو ضائع کرنے والا وہی شخص ہوگا، سو وہی گناہ گار ہوگا نہ کہ مشغول لوگ، تاکہ لوگوں کو اپنی ضروریات پوری کرنے میں حرج نہ ہو۔ (غنیۃ المستملی ص 97، مطبوعہ لاہور، 1412ھ) قاضی القضاۃ یحییٰ منقاری زادہ نے اس موضوع پر ایک رسالہ لکھا ہے اور اس میں یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کا سنن فرض عین ہے۔ (رد المحتار ج 1، ص 366۔ 367، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1407ھ)
علامہ سید احمد طحطاوی حنفی متوفی 1231ھ نے غنیۃ المستملی کے حوالے سے یہی لکھا ہے کہ قرآن مجید کا سننا فرض کفایہ ہے۔ (حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار، ج 1، ص 237، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، 1395ھ)
علامہ ابراہیم حلبی صاحب غنیۃ المستملی متوفی 956ھ نے قرآن مجید سننے کے حکم کو فرض کفایہ قرار دیا ہے اور علامہ شامی اور علامہ طحطاوی نے ان کی اتباع کی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں مسلمانوں کے لیے آسانی ہے، لیکن ان کی دلیل دو وجہ سے صحیح نہیں ہے اولاً اس لیے کہ انھوں نے قرآن مجید سننے کے حکم کو سلام کو جواب دینے کے حکم پر قیاس کیا ہے حالانکہ سلاکا جواب دینے کا حکم خبر واحد سے ثابت ہے اور اس کا وجوب ظنی ہے اور قرآن مجید سننے کا حکم خود قرآن کریم سے ثابت ہے اور اس کی فرضیت قطعی ہے، سو یہ اعلیٰ کو ادنیٰ پر قیاس کرنا ہے، اور ثانیاً اس لیے کہ سلام کا جواب دینے میں مسلمان کے حق کی رعایت ہے اور قرآن مجید سننے میں اور تلاوت کے وقت خاموش رہنے میں اللہ کے کلام کے حق کی رعایت ہے اور اللہ کے کلام کے حق کی رعایت بندہ کے حق کی رعایت سے کئی درجہ افضل ہے۔ نیز اس سے یہ لازم آتا ہے کہ قرآن مجید کی ایک محفل میں تلاوت کی جارہی ہو اور ایک آدمی خاموش ہو کر سنے اور باقی شرکاء محفل تلاوت کی طرف توجہ نہ کریں اور آپس میں باتیں کرتے رہیں تو یہ امر جائز ہو حالانکہ اس میں قرآن مجید کی صریح بے حرمتی ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک قاضی منقاری زادہ کا یہ قول صحیح ہے کہ قرآن مجید کا سننا فرض عین ہے۔

قرآن مجید سننے کے حکم میں مذاہب فقہاء

اس سلسلہ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ فقہاء احناف میں سے علامہ منقاری زادہ کے نزدیک قرآن مجید سننا فرض عین ہے اور یہی صحیح ہے اور علامہ حلبی کے نزدیک فرض کفایہ ہے۔

امام مالک کے نزدیک قرآن مجید نماز میں پڑھا جائے یا خارج از نماز، اس کا سننا واجب ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز 7، ص 316، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1415 ھ)

امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ واذاقرء فانصتوا (صحیح مسلم رقم الحدیث: 404) جب امام قراءت کرے تو خاموش رہو

حافظ ابو العباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی المالکی المتوفی 656ھ اس کی شرح میں لکھتے ہیں: یہ حدیث امام مالک کی اور ان فقہاء کی دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ جب امام بلند آواز سے قراءت کرے تو مقتدی قراءت نہ کرے، اور امام دار قطنی کا اس حدیث پر یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کہ اس حدیث کی صحت پر حفاظ کا اجماع نہیں ہے۔ کیونکہ امام مسلم نے اس حدیث کے صحیح ہونے کی تصریح کی ہے۔ (المفہم ج 2، ص 39، مطبوعہ دار ابن کثیر، بیروت، 1417ھ)

امام احمد بن حنبل کے نزدیک بھی قرآن مجید کا سننا فرض ہے کیونکہ علامہ موفق الدین عبداللہ بن مقدامہ حنبلی متقی 620ھ لکھتے ہیں:

مقتدی پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا واجب نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے واذاقرء القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا (الاعراف: 204) اور حضرت ابوہریرہ نے روایت کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس نماز سے فارغ ہوئے، جس میں آپ نے بلند آواز سے قراءت کی تھی۔ پھر فرمایا کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قراءت کی تھی؟ ایک شخص نے کہا ہاں! یا رسول اللہ! میں نے قراءت کی تھی۔ تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تب ہی میں سوچ رہا تھا کہ مجھے قرآن پڑھنے میں دشواری کیوں ہو رہی ہے۔ پھر لوگ ان نمازوں میں قراءت کرنے سے رک گئے جن نمازوں میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بلند آواز سے قراءت کرتے تھے۔ جب انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ ارشاد سنا۔ (الموطار قم الحدیث: 194۔ سنن النسائی رقم الحدیث: 918۔ سنن ابو داود، رقم الحدیث: 312۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 348۔ 349۔ مسند احمد ج 2، ص 240۔ 487، ج 5، ص 345۔ الکافی ج 1، ص 246، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1414ھ)

فقہاء شافعیہ کے نزدیک جب قرآن کریم پڑھا جائے تو اس کا سننا مستحب ہے۔ قاضی عبداللہ بن عمر بیضاوی شافعی متوفی 685ھ لکھتے ہیں: اس آیت کے ظاہر الفاظ کا تقاضا یہ ہے کہ جب بھی قرآن پڑھا جائے تو اس کا سننا مطلقاً واجب ہو اور عامۃ العلماء کے نزدیک خارج از نماز قرآن مجید کا سننا مستحب ہے اور جو علماء امام کے پیچھے مقتدی کی قراءت کو واجب نہیں کہتے وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں اور یہ استدلال ضعیف ہے۔ (انوار التنزیل واسرار التاویل مع حاشیہ الکازرونی، ج 3، ص 86)

ڈاکٹر وھبہ زحیلی مصر لکھتے ہیں: جن محفلوں میں قرآن مجید کی قرآت کی جائے ان میں قرآن کریم سننے اور خاموش رہنے کو ترک کرنا بہت سخت مکروہ ہے مومن پر لازم ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کے وقت اس کے سننے پر حریص ہو، جیسا کہ وہ مجلس میں قرآن مجید کی تلاوت پر حریص ہوتا ہے۔ (التفسیر المنیر ج 9، ص 229۔ 230، مطبوعہ دار الفکر، بیروت 1411ھ)

صحیح یہ ہے کہ جب قرآن مجید کی تلاوت کی جائے تو اس کا سنن اور خاموش رہنا ہر حال میں اور ہر کیفیت میں واجب ہے خواہ نماز ہو یا غیر نماز ہو۔ (التفسیر المنیر ج 9، ص 232، مطبوعہ بیروت)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے اللہ کی کتاب کی کسی ایک آیت کو بھی غور سے سنا ہے اس کے لیے دگنی چوگنی نیکی لکھی جائے گی اور جس نے اس آیت کی تلاوت کی وہ قیامت کے دن اس کے لیے نور ہو گی۔ (اس حدیث کی سند ضعیف ہے)۔ (مسند احمد ج 2، ص 341۔ مسند احمد ج 8، رقم الحدیث: 8475، طبع قاہرہ۔ الجامع الصغیر رقم الحدیث: 8425)

امام کے پیچھے قرآن سننے میں مذاہب اربعہ

امام ابو اسحاق ابراہیم بن علی الفیروزآبادی الشیرازی الشافعی المتوفی 455ھ لکھتے ہیں:
آیا مقتدی پر بھی سورۃ فاتحہ کی قراءت واجب ہے اس میں غور کیا جائے گا اگر وہ ایسی نماز ہے جس میں آہستہ قراءت کی جاتی ہے تو مقتدی پر سورۃ فاتحہ کی قراءت واجب ہے اور اگر وہ ایسی نماز ہے جس میں بلند آواز سے قراءت کی جاتی ہے تو اس میں دو قول ہیں، کتاب الام اور البویطی میں مذکور ہے کہ اس میں مقتدی پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے، کیونکہ حضرت عبادہ بن الصامت (رض) سے مروی ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم کو صبح کی نماز پڑھائی آپ پر قراءت دشوار ہو گئی، آپ نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد فرمایا میں دیکھ رہا تھا کہ تم اپنے امام کے پیچھے قراءت کر رہے تھے! ہم نے کہا اللہ کی قسم ہاں ہم ایسا کر رہے تھے، آپ نے فرمایا سورۃ فاتحہ کے سوا ایسا نہ کیا کرو، کیونکہ جو شخص سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی، اور امام شافعی کا قدیم قول یہ ہے کہ جہری نماز میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھے کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں آپ نے بلند آواز سے قراءت کی تھی آپ نے پوچھا: کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قراءت کی تھی۔ ایک شخص نے کہا ہاں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا (تبھی) میں یہ سوچ رہا تھا کہ میری تلاوت میں دشواری کیوں ہو رہی ہے، جب مسلمانوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ سنا تو جن نمازوں میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بلند آواز سے قراءت کرتے تھے، ان نمازوں میں انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ قراءت کرنا ترک کر دیا۔
(المہذب ج 1، ص 72، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)
فقہاء حنبلیہ کے اس مسئلہ میں مختلف اور متضاد اقوال ہیں
علامہ شمس الدین محمد بن مفلح المقدسی الحنبلی المتوفی 763ھ لکھتے ہیں:
اثرم نے نقل کیا ہے کہ مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے، ابن الزاغوانی نے شرح الخرقی میں اسی طرح ذکر کیا ہے، اور ہمارے اکثر اصحاب اس کے وجوب کو نہیں پہچانتے، اس کو نوادر میں نقل کیا ہے اور یہی قول زیادہ ظاہر ہے۔ ابن المنذر نے ذکر کیا ہے کہ ایک قول یہ ہے کہ جس نماز میں آہستہ قراءت ہوتی ہے اس میں مقتدی سورۃ فاتحہ پڑھے۔ ابو داؤد نے نقل کیا ہے کہ ہر رکعت میں جب امام بلند آواز سے قراءت کرے تو مقتدی اس کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھے اور انھوں نے کہا کہ پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ پڑھنا کفایت کرے گا اور سری نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھنا مستحب ہے اور سکتات میں پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔ (کتاب الفروع ج 1، ص 427، مطبوعہ عالم الکتب بیروت، 1405ھ)
علامہ ابن قدامہ حنبلی متوفی 620ھ نے لکھا ہے کہ مقتدی پر سورۃ فاتحہ پڑھنا واجب نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے واذا قرء القرآن فاستمعوا وانصتوا۔
(الاعراف: 204)۔ (الکافی ج 1، ص 246، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1414ھ)
علاہ ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ بن علی الخرشی المالکی المتوفی 1101ھ لکھتے ہیں: فرض نماز اور نفل نماز میں امام پر سورۃ فاتحہ پڑھنا واجب ہے اور مقتدی پر واجب نہیں ہے کیونکہ حدیث میں ہے امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہے خواہ نماز سری ہو یا جہری۔ البتہ سری نماز میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنا مستحب ہے۔ (حاشیۃ الخرشی علی مختصر سیدی خلیل ج 1، ص 269، مطبوعہ دار صادر بیروت)
فقہاء احناف کے نزدیک نماز سری ہو یا جہری، امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنا جائز نہیں ہے
علامہ علاء الدین ابو بکر بن مسعود الکاسانی الحنفی المتوفی 587ھ لکھتے ہیں:
ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: واذا قرء القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون: اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے (الاعراف: 204)
اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو غور سے سننے اور خاموش رہنے کا حکم دیا ہے اور جن نمازوں میں آہستہ قراءت کی جاتی ہے ان میں اگرچہ سننا ممکن نہیں ہے لیکن خاموش رہنا ممکن ہے۔ پس اس سے ظاہر نص کے اعتبار سے ان نمازوں میں خاموش رہنا واجب ہے۔ حضرت ابی بن کعب (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں نے امام کے پیچھے قراءت کرنے کو ترک کر دیا اور ان کے امام رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھے۔ پس ظاہر ہے کہ انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم) کے امر سے قراءت کو ترک کیا تھااور حدیث مشہور میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے امام کو اس لیے امام بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے سو تم اس سے اختلاف نہ کرو جب وہ تکبیر پڑھے تو تم تکبیر پڑھو اور جب وہ قرآن پڑھے تو تم خاموش رہو۔ اس حدیث میں امام کی قراءت کے وقت خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: 404)

ہمارے نزدیک بغیر قراءت کے کوئی نماز صحیح نہیں ہوتی اور مقتدی کی نماز بغیر قراءت کے نہیں ہے بلکہ یہ نماز قراءت کے ساتھ ہے اور وہ امام کی قراءت ہے کیونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے جس شخص کا امام ہو تو امام کی قراءت اس شخص کی قراءت ہے۔

(یہ حدیث حضرت جابر، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابوسعید خدری، حضرت ابوہریرہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت انس اور حضرت علی ابن ابی طالب (رض) سے مروی ہے۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 850، شرح معانی الآثار ج 1، ص 128، سنن دار قطنی رقم الحدیث: 1250، حلیۃ الاولیاء ج 7، ص 389، رقم الحدیث: 10957، طبع جدید، زوائد البوصیری ج 2، ص 434، رقم الحدیث: 1440۔ المعجم الاوسط ج 8، رقم الحدیث: 7575۔ مجمع الزوائد ج 2، ص 111، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: 2797، مسند احمد ج 3، ص 339، السنن الکبری للبیہقی ج 2، ص 160۔ 161۔ کامل ابن عدی ج 6، ص 2107۔ مصنف ابن ابی شیبہ ج 1، ص 377۔ کتاب الآثار للامام محمد ص 17۔ کتاب الآثار لابی یوس ص 24، رقم الحدیث: 113۔ بدائع الصنائع ج 1، ص 524، دار الکتب العلمیہ بیروت، 1418ھ)

اس حدیث کی سند اگرچہ ضعیف ہے لیکن یہ حدیث متعدد اسانید سے مروی ہے اس لیے تعدد اسانید کی وجہ سے یہ حدیث حسن لغیرہ ہے اور اسی (80) کبار صحابہ سے امام کے پیچھے قراءت کی ممانعت منقول ہے جن میں حضرت علی مرتضی، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر بھی ہیں اور کئی صحابہ سے یہ منقول ہے کہ امام کے پیچھے قراءت کرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، جبکہ صحیح یہ ہے کہ امام کے پیچھے قراءت کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

امام کے پیچھے قراءت نہ کرنے کے متعلق احادیث

نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے جب یہ سوال کیا جاتا کہ کیا کوئی شخص امام کے پیچھے قراءت کرے تو وہ فرماتے جب تم میں سے کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قراءت اس کے لیے کافی ہے۔ اور جب وہ اکیلا نماز پڑھے تو قراءت کرے۔ نافع نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن عمر امام کے پیچھے قراءت نہیں کرتے تھے۔ (یہ صحیح حدیث ہے)۔ (الموطا رقم الحدیث: 193، سنن دار قطنی رقم الحدیث: 1488۔ سنن کبری ج 2، ص 161، موطا امام محمد ص 94۔ شرح معانی الآثار ص 129)

امام بو جعفر احمد بن محمد طحاوی متوفی 321ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن مسعود (رض) نے فرمایا قراءت کے لیے خاموش رہو کیونکہ نماز میں صرف ایک شغل ہے اور تمہیں امام کی قراءت کافی ہے۔ حضرت ابن مسعود (رض) نے فرمایا جو شخص امام کے پیچھے قراءت کرتا ہے کاش اس کے منہ میں مٹی بھر دی جاتی۔

عبیداللہ بن مقسم نے حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت جابر بن عبداللہ سے سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ کسی نماز میں بھی امام کے پیچھے قراءت نہ کرو۔

ابو حمزہ نے حضرت ابن عباس سے سوال کیا کہ کیا وہ امام کے پیچھے قراءت کریں، حضرت ابن عباس نے فرمایا نہیں۔ (شرح معانی الآثار ص 129، مطبوعہ مجتبائی پاکستان، لاہور)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی 852ھ لکھتے ہیں: حضرت ابن عمر، حضرت جابر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن مسعود سے امام کے پیچھے قراءت کی ممانعت ثابت ہے اور حضرت ابو سعید، حضرت عمر اور حضرت ابن عباس سے بھی روایات وارد ہیں۔ (الدرایہ مع الہدایہ الاولین ص 121، مطبوعہ مکتبہ شرکت علمیہ، ملتان)

جریر از سلیمان از قتادہ از حضرت عبداللہ بن مسعود روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب امام قراءت کرے تو خاموش رہو۔ (امام مسلم نے کہا یہ حدیث صحیح ہے)۔ (صحیح مسلم صلوۃ:63 (404) 880۔ مسند احمد ج 4، ص 396۔ سنن ابو داؤد رقم الحدیث: 972-973)
ان احادیث کے علاوہ ہم متعدد حوالہ جات کے ساتھ یہ بیان کر چکے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص کا امام ہو تو امام کی قراءت ہی اس کی قراءت ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت مبارکہ:

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ۝۲۰۵

لغۃ القرآن: [وَاذْكُرْ : اور آپ یاد رکھیں] [رَّبَّكَ : اپنے رب کو] [فِيْ نَفْسِكَ : اپنے جی میں] [تَضَرُّعًا : گڑگڑاتے ہوئے] [وَّخِيْفَةً : اور ڈرتے ہوئے] [وَّدُوْنَ الْجَهْرِ : اور نمایاں کیے بغیر] [مِنَ الْقَوْلِ : قول میں سے (کچھ)] بِالْغُدُوِّ : صبح کے وقت] [وَالْاٰصَالِ : اور شام کے وقت] [وَلَا تَكُنْ : اور نہ آپ ہوں] [مِّنَ : سے] [الْغٰفِلِيْنَ : غافلوں]

ترجمہ: اور اپنے رب کا اپنے دل میں ذکر کیا کرو عاجزی وزاری اور خوف و خستگی سے اور میانہ آواز سے پکار کر بھی، صبح وشام (یادِ حق جاری رکھو) اور غافلوں میں سے نہ ہو جاؤ

تشریح: دل کے آئینہ سے غفلت کا غبار اور روح کے رخ تاباں سے نافرمانی کے داغ دھونے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کی صبحیں اور شامیں یاد الٰہی میں بسر کرے۔ ذکر تب اپنا پورا اثر دکھاتا ہے جب اس میں مذکورہ شرائط موجود ہوں۔ (۱) ذکر کرتے وقت انسان عاجزی اور انکساری کا مجسمہ بنا ہوا ہو۔ کبر و غرور اور غفلت وکاہلی سے کوسوں دور ہو۔ (۲) اسے اس بات کا ہر وقت شدید احساس ہو کہ اس کے اعمال اور اس کا ذکر اس بارگاہ رفعت وجلال کے شایان شان نہیں۔ (۳) ذکر گلا پھاڑ پھاڑ کر نہ کرے۔ جس میں بے ادبی کا شائبہ ہو بلکہ درمیانہ آواز سے کیا جائے جس میں ادب اور سنجیدگی ہو۔ ایک رات حضور رحمت عالمیاں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت صدیق (رض) کے گھر کے پاس سے گزرے تو دیکھا کہ وہ چپکے چپکے ذکر میں مشغول ہیں۔ اور حضرت فاروق (رض) کے گھر کے پاس سے گزرے تو ملاحظہ فرمایا کہ بلند آواز سے محو ذکر ہیں۔ صبح ہوئی تو دونوں کو بلایا۔ حضرت ابو بکر (رض) کو ہدایت فرمائی کہ ذرا بلند آواز سے ذکر کیا کریں۔ اور حضرت عمر (رض) کو فرمایا کہ ذرا آہستہ ذکر کیا کرو۔ وصلی وسلم علیٰ ہادیہما ومرشدہما۔ امام نووی (رح) نے مختلف احادیث میں تطبیق دیتے ہوئے خوب فرمایا ہے کہ اگر ذاکر کو ریاء کا اندیشہ ہو یا نمازیوں اور آرام کرنے والوں کو تکلیف کا اندیشہ ہو تو پھر آہستہ ذکر کرنا مستحب ہے۔ بصورت دیگر ذکر بالجہر افضل ہے۔ وقد جمع النووی بین الاحادیث الواردۃ فی استحباب الجہر بالذکر والواردۃ فی استحباب الاسرار بہ بان الاخفاء افضل حیث خاف الریاء اوتاذی المصلون اوالنائمون الراسخۃ فیہ (روح البیان) تشریح لفظی : خیفۃ اصل میں خوفۃ تھا۔ واؤ ی سے بدل گئی۔ الغدو جمع غدوۃ۔ قال الجوھری الاصیل الوقت بعد العصر الی المغرب وجمعہ اصل وآصال واصائل۔ (قرطبی، تفسیر ضیاالقرآن)
اس آیت میں ذکر الٰہی کے آداب بتائے گئے ہیں۔ ابتدائی طور پر ذکر کی دو قسمیں ہیں یعنی دل میں خاموشی کے ساتھ یا زبان سے معتدل آواز کے ساتھ۔ ذکر کی یہ دونوں صورتیں درست ہیں۔ قرآن وحدیث میں ان دونوں کی فضیلت موجود ہے۔ وقت اور موقع کے مطابق کبھی دل میں ذکر کرنا بہتر ہے تاکہ ریاکاری کا اثر نہ ہو اور کسی دوسرے کی نماز، نیند اور عبادت میں خلل پیدا نہ ہو اور کبھی آواز سے ذکر کرنا بہتر ہے تاکہ دوسروں کو ترغیب ہو۔ بہر حال ذکر دل میں ہو یا زبان سے

دونوں صورتوں میں عاجزی وانکساری اور اللہ تعالیٰ کا ڈر موجود رہنا ضروری ہے تاکہ تکبر وغرور سے محفوظ رہے۔ نیز دن کا آغاز کرتے وقت صبح سویرے نماز فجر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو تاکہ سارا دن اللہ تعالیٰ کی یاد تازہ رہے اور گناہوں سے محفوظ رہو۔ اسی طرح رات کا آغاز ہوتے ہی مغرب وعشاء کی نماز کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو تاکہ ذکر کی برکت شامل حال رہے اور غفلت کا شکار نہ ہو۔ (تفسیر امداد الکرم)

اس آیت میں خطاب رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ہے اور اس خطاب میں امت مصطفیٰ بھی داخل ہے کہ یہ حکم تمام مکلّفین کو عام ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے مروی ہے کہ اس آیت میں ذکر سے مراد نماز میں قراءت کرنا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ذکر میں تلاوتِ قرآن، دعا اور تسبیح و تہلیل وغیرہ تمام اذکار شامل ہیں۔ (1)

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر دل میں کیا جائے یا درمیانی آواز میں، حد سے زیادہ بلند آواز میں چیختے ہوئے نہ کیا جائے، نیز اللہ تعالیٰ کا ذکر عاجزی اور خوف کے ساتھ ہو۔ نیز ذِکْرُ اللہ صبح وشام کیا جائے۔ بلند آواز سے اور آہستہ آواز سے ذکر کرنا دونوں کے بارے میں احادیث موجود ہیں، اگر ذکر کرنے والے کو ریاکاری کا اندیشہ ہو یا نمازیوں اور آرام کرنے والوں کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو تو آہستہ ذکر کیا جائے ورنہ بلند آواز سے کرنے میں حرج نہیں۔

{ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ: صبح اور شام۔ } ان دونوں اوقات میں ذکر کرنا افضل ہے، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ صبح کے وقت انسان نیند سے بیدار ہوتا ہے تو اس وقت ذکر کرنے سے اس کے نامہ اعمال میں سب سے پہلے اللہ عَزَّوَجَلَّ کا ذکر کرنا لکھا جائے گا اور شام کے وقت انسان سوتا ہے اور نیند ایک طرح کی موت ہے، لہٰذا اس وقت بھی ذکر کرنا مناسب ہے کہ ممکن ہے سوتے میں ہی انتقال ہو جائے، اگر ایسا ہوا تو قیامت کے دن اللہ عَزَّوَجَلَّ کا ذکر کرتا ہوا اٹھے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ طلوع فجر کے بعد طلوع آفتاب تک اور اسی طرح نماز عصر کے بعد غروب تک نفل نماز ممنوع ہے، اس لیے ان وقتوں میں ذکر کرنا مستحب ہے تاکہ بندے کے تمام اوقات قربت وطاعت میں مشغول رہیں۔ (1) (تفسیر صراط الجنان)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے میں اپنے بندہ کے گمان کے موافق ہوں، اور میں اس کے اتھ ہوتا ہوں جب وہ میرا ذکر کرتا ہے، اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرے تو میں بھی اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں، اور اگر وہ ایک جماعت میں میرا ذکر کرے تو میں اس سے بہتر جماعت میں اس کا ذکر کرتا ہوں، اگر وہ ایک بالشت میرے قریب ہو تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ ایک ہاتھ میرے قریب ہو تو میں دونوں ہاتھوں کے پھیلاؤ کے برابر اس کے قریب ہوتا ہوں، اور اگر وہ میرے پاس چلتا ہوا آئے تو میں اس کے پاس دوڑتا ہوا آتا ہوں۔ (صحیح مسلم الزکر 21، 2675، 6679۔ مسند احمد ج 2، ص 453، طبع قدیم۔ مسند احمد ج 8، رقم الحدیث: 8635، طبع قاہرہ)

آہستہ آہستہ ذکر کرنے یا دل میں ذکر کرنے کی فضیلت یہ ہے کہ آہستہ آہسۃ ذکر کرنا اخلاص کے زیادہ قریب ہے اور اس کا قبول ہونا زیادہ متوقع ہے۔ اور ذکر فی نفسہ سے مراد یہ ہے کہ جن اذکار کا وہ زبان سے ذکر کر رہا ہے ان کے معانی سے واقف ہو، اور اس کا دل ذکر کے معانی کی طرف متوجہ ہو اور اس کا ذہن اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلالت میں ڈوبا ہوا ہو، کیونکہ اگر وہ خالی زبان سے ذکر کرے اور دل اس کے معنی کے تصور، اس کی یاد، اور خضوع اور خشوع سے خالی ہو تو وہ ذکر بے سود ہے، بلکہ بعض علماء نے ذکر کیا ہے کہ ایسے ذکر سے کوئی ثواب نہیں ملتا۔

معتدل آواز کے ساتھ جہر بالذکر ممنوع نہیں ہے

دون الجہر من القول زبان سے آواز بلند کیے بغیر اس کا معنی ہے چلا چلا کر ذکر نہ کیا جائے یا گلا پھاڑ کر ذکر نہ کیا جائے جیسے کوئی شخص بہرے سے بات کر رہا ہو یا کسی دور کھڑے ہوئے آدمی سے چلا کر بات کر رہا ہو۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ ایک سفر میں تھے مسلمان بلند آواز کے ساتھ اللہ اکبر اللہ اکبر کہہ رہے تھے۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اے لوگو! اپنے نفسوں کے ساتھ نرمی کرو تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے تم سننے والے اور قریب کو پکار رہے ہو جو تمہارے ساتھ ہے، پھر آپ نے فرمایا در آنحالیکہ میں آپ کے پیچھے تھا اور میں کہتا ہوں لا حول ولا قوۃ الا باللہ گناہوں سے بچنا اور نیکی کی طاقت اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں پھر فرمایا اے عبداللہ بن قیس! کیا میں تمہیں جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ کی رہنمائی نہ کروں، میں نے عرض کیا: کیوں نہیں! یا رسول اللہ

!آپ نے فرمایا کہو لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث : 6409۔ صحیح مسلم ذکر 44 (2704) 6735۔ سنن ابو داؤد رقم الحدیث : 1528، 1527، 1526۔ سنن الترمذی، رقم الحدیث : 3472۔ مسند احمد ج 4، ص 394، 403)۔

اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ آپ نے گلا پھاڑ کر اور چلا چلا کر ذکر کرنے سے منع فرمایا ہے اور قرآن مجید کی یہ آیت اور یہ حدیث معتدل آواز کے ساتھ ذکر بالجہر کے منافی نہیں ہے۔

ذکر کے لیے صبح اور شام کے اوقات کی تخصیص کی حکمت

صبح اور شام کے اوقات کو ذکر کے ساتھ خاص فرمایا ہے، یوں تو ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہیے اور کسی وقت اس کے ذکر اور اس کی یاد سے غافل نہیں رہنا چاہیے لیکن ان اوقات کی خصوصیت یہ ہے کہ صبح کے وقت انسان نیند سے بیدار ہوتا ہے اور نیند بہ منزلہ موت ہے اور بیداری بہ منزلہ حیات ہے اور اس وقت جہاں بھی ظلمت سے نور کی طرف منتقل ہوتا ہے اس لیے اس وقت میں اس خاص نعمت پر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہیے۔ اور شام کا وقت جو بہ منزلہ موت ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے کیونکہ موت کے بعد ہی انسان اخروی نعمتوں سے ہم کنار ہوتا ہے، نیز ان اوقات میں انسان پر سکون ہوتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی یاد کے لیے بہت مناسب اوقات ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فجر کے وقت رات کے فرشتے جا رہے ہوتے ہیں اور دن کے فرشتے آ رہے ہوتے ہیں تو دونوں فرشتے اس کے ذکر کو لکھ لیں گے اور اسی طرح شام کے وقت میں بھی۔ (تفسیر تبیان القرآن)

آیت کریمہ والیٰ کے بعد اس آیت کریمہ کے پڑھنے سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ شاید قرآن سننے والے کو خاموش رہتے ہوئے بلا آواز نکالے دل میں ذکر کرنا اور عظمت الٰہی اور جلال الٰہی عزوجل غیر متناہی کا استحضار لازم ہے یعنی ذکر قلبی رکھتے ہوئے استماع تلاوت لازم ہے تفسیر ابن جریر میں بھی یہی ہے کہ امام کے پیچھے آواز سے قرأت کی ممانعت ہے اور ذکر قلبی افضل ہے۔ ایک مسئلہ اس سے یہ بھی نکلتا ہے کہ ذکر جہر اور ذکر خفی دونوں بہ نص ثابت ہیں اسی وجہ سے ردالمختار وغیرہ میں تصریح ہے کہ خفی یا جہری ذکر دونوں منصوص ہیں جس سے ذوق و شوق تام اور اخلاص کامل میسر ہو اس کے لیے وہی ذکر افضل ہے۔ اور غدوے مراد صبح کا وقت ہے اور آصال سے شام کا وقت مراد ہے جو عصر و مغرب کے مابین ہے ان دونوں وقتوں میں ذکر افضل ہے اس لیے کہ نماز نفل فجر کے بعد سے طلوع آفتاب تک اور عصر کے بعد سے غروب تک ممنوع ہے لیکن ذکر خواہ جہری ہو خواہ خفی مستحب ہے اور اس سے بندے کے تمام اوقات قربت و اطاعت میں گزر سکتے ہیں۔ (تفسیر الحسنات)

ذکر اللہ کا حکم اور اس کے آداب

اس سے پہلی آیات میں قرآن مجید کو بصائر اور ہدایت و رحمت بتایا اور قرآن کا ادب سمجھایا کہ جب قرآن پڑھا جائے تو دھیان سے سنو اور چپ رہو، اب یہاں مطلق ذکر کا حکم فرمایا ہے اور اس کے بعض آداب بتائے ہیں۔ اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے اسی کی وجہ سے ساری دنیا آباد ہے۔ صحیح مسلم ص ۸۴ ج ۱ میں ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ قیامت قائم نہ ہو گی جب تک زمین پر اللہ اللہ کہا جاتا رہے گا نماز بھی اللہ کے ذکر کے لیے ہے کما قال تعالیٰ (وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ) سورۃ عنکبوت میں فرمایا (وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ) (اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے) سورۃ بقرہ میں فرمایا (فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ) (سو تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو)۔

صحیح مسلم ص ۱۶۲ ج ۱ میں ہے کان النَّبِیُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یَذْکُرُ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ اَحْیَانِہٖ (کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے تھے) مومن بندے دل کو بھی اللہ کے ذکر سے معمور رکھیں اور زبان سے بھی اللہ کی یاد میں مشغول رہیں۔ تسبیح تحمید تکبیر تہلیل یہ سب اللہ کا ذکر ہے ان کی فضیلتیں بہت سی احادیث میں وارد ہوئی ہیں۔ اگر زندگی کے مختلف اوقات میں متعلقہ مسنون دعائیں پڑھیں اور ان دعاؤں کا اہتمام کریں تو زندگی کے عام حالات میں اور مختلف اوقات میں اللہ کی یاد ہوتی رہے گی، سوتے جاگتے کھاتے پیتے وقت، گھر سے نکل کر اور گھر میں داخل ہو کر اور کپڑا پہنتے وقت سواری پر سوار ہوتے وقت، سفر کے لیے روانہ ہوتے وقت، کسی منزل پر اترنے کے بعد، جہاد کرتے وقت، ابتلاء مصائب کے مواقع میں، بازار میں پہنچ کر اور ہر مجلس میں وہ دعائیں پڑھی جائیں جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ثابت ہیں اور صبح شام کے اوقات کو خاص طور پر ذکر میں مشغول رکھا جائے۔ ان اوقات کی مسنون دعائیں بھی اہتمام سے

پڑھی جائیں، علامہ جزری (رح) نے حصن حصین میں مختلف احوال و اوقات کی دعائیں لکھ دی ہیں اور راقم الحروف نے بھی اپنی کتاب فضائل دعاء میں جمع کر دی ہیں۔ تلاوت بھی ذکر ہے اور دعاء بھی، تہلیل تحمید تکبیر بھی ذکر ہے اور درود شریف بھی ذکر میں شامل ہے کیونکہ اس میں اللہ سے سوال کیا جاتا ہے کہ اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر رحمت بھیجے، استغفار بھی ذکر ہے ان سب چیزوں میں مشغول رہنا چاہیے۔

ذکر خفی کی فضیلت :

اللہ کا ذکر آہستہ آہستہ کرنا افضل ہے جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ خیر الذکر الخفی (رواہ احمد فی مسندہ ص ۱۷۲ ج ۱ عن سعد بن مالک مرفوعاً) (کہ بہتر ذکر وہ ہے جو پوشیدہ ہو) اور صرف دل دل میں بلا حرکت زبان اللہ کی ذات وصفات کا دھیان کرنا جس کو تفکر و مراقبہ کہا جاتا ہے یہ بھی ذکر خفی ہے۔ ذکر پوشیدہ ہو اور تضرع اور زاری کے ساتھ ہو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے ہو اس کا بہت بڑا مرتبہ ہے اور زور سے ذکر کرنا بھی درست ہے لیکن ایسا نہ چیخے کہ جان کو تھکا ڈالے، بلند آواز بھی ہو تو ہلکی آواز ہو اسی کو فرمایا (وَدُوْنَ الْجَھْرِ مِنَ الْقَوْلِ) حضرت ابو موسیٰ اشعری (رض) نے بیان فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ سفر میں ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ تھے لوگوں نے زور زور سے اللہ اکبر کہنا شروع کیا، آپ نے فرمایا کہ اے لوگو! اپنی جانوں پر رحم کھاؤ تم ایسے معبود کو نہیں پکار رہے ہو جو بہرا ہو اور غائب ہو، تم تو ایسی ذات کو پکار رہے ہو جو سمیع ہے اور بصیر ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے۔ قسم اس ذات کی جسے تم پکار رہے ہو وہ تم سے اس سے بھی زیادہ قریب ہے جتنی قریب تمہاری اونٹنی کی گردن ہے، یہ بیان فرما کر حضرت ابو موسیٰ (رض) نے بیان فرمایا کہ میں آپ کے پیچھے تھا اور دل میں لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ پڑھ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اے عبداللہ بن قیس (یہ ابو موسیٰ (رض) کا نام ہے) کیا میں تمہیں جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ نہ بتادوں؟ پھر فرمایا کہ وہ خزانہ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۰۱ از بخاری و مسلم)

ذکر جہر کرنے میں یہ بھی دھیان رہے کہ نمازیوں کو تشویش نہ ہو اور سونے والوں کی نیند خراب نہ ہو۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ ہر نیک کام اللہ کی رضا کے لیے ہونا چاہیے جو بھی کوئی کام دکھاوے کے لیے یا مخلوق کو معتقد بنانے کے لیے یا اپنی بزرگی جمانے کے لیے ہو گو بظاہر نیک ہی ہو وہ حقیقت میں نیک نہیں ہوتا اور نہ صرف یہ کہ اس کا ثواب نہیں ملتا بلکہ وبال اور عذاب کا سبب بن جاتا ہے۔

اور اگر کوئی شخص (احکام وآداب کی رعایت کرتے ہوئے) زور سے ذکر کرے لیکن مقصود اللہ کی رضا ہو تو اس کا ثواب ملے گا اور اگر کوئی شخص ذکر خفی کرے اور پھر ترکیب سے لوگوں کو ظاہر کر دے تاکہ لوگ اس کے معتقد ہوں تو ایسا ذکر خفی بھی مقبول نہیں ہوگا اور یہ عمل باعث مواخذہ ہوگا، ریاکاری کا تعلق اندر کے جذبہ سے ہے لوگوں کے سامنے عمل کرنے کا نام ریا نہیں ہے بلکہ لوگوں میں عقیدت جمانے کے جذبہ کا نام ریا ہے۔ آیت شریفہ میں اول تو یہ فرمایا کہ اپنے رب کی عاجزی کے ساتھ اپنے دل میں اور ڈرتے ہوئے یاد کرو پھر یہ فرمایا کہ ایسی آواز سے یاد کرو جو زور کی آواز کی بہ نسبت کم آواز ہو۔

صبح شام اللہ کا ذکر کرنا :

پھر فرمایا (بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ) کہ صبح شام اپنے رب کو یاد کرو، صاحب روح المعانی (ص ۱۰۰ ج ۹) لکھتے ہیں کہ صبح شام کا خصوصی ذکر اس لیے کیا گیا کہ یہ فراغت کے اوقات ہیں۔ ان اوقات میں دل کی توجہ ذکر کی طرف زیادہ ہوتی ہے اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ ان اوقات میں فرشتوں کا آنا جانا ہوتا ہے ایک جماعت آتی ہے دوسری جاتی ہے۔ اس لیے ان اوقات کو خاص طور سے ذکر فرمایا اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے دوام ذکر مراد ہے کہ ہر وقت ذکر کرو۔

غافلوں میں سے نہ ہو جاؤ :

پھر فرمایا (وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ) (غفلت والوں میں سے نہ ہو جانا) یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگے رہنا اور اس کی یاد سے غافل نہ ہونا۔ (تفسیر انوار البیان)

آیت مبارکہ:

اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّکَ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ یُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ یَسْجُدُوْنَ ۩

لغۃ القرآن: [اِنَّ : بیشک] [الَّذِیْنَ : وہ لوگ جو] [عِنْدَ رَبِّکَ : آپ کے رب کے نزدیک ہیں] [لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ : وہ بڑائی نہیں چاہتے] [عَنْ : سے] [عِبَادَتِهٖ : اس کی عبادت] [وَیُسَبِّحُوْنَهٗ : اور تسبیح کرتے ہیں] [وَلَهٗ : اور اسی کو] [یَسْجُدُوْنَ : وہ سجدہ کرتے ہیں]

ترجمہ: بیشک جو (ملائکہ مقربین) تمہارے رب کے حضور میں ہیں وہ (کبھی بھی) اس کی عبادت سے سرکشی نہیں کرتے اور (ہمہ وقت) اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز رہتے ہیں

تشریح: الذین سے مراد ملائکہ ہیں۔ اس سورۃ کا اختتام فرشتوں کے ذکر خیر سے کیا جارہا ہے۔ اور بتایا جارہا ہے کہ جب یہ نورانی اور پاک مخلوق ہر وقت اپنے پروردگار کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے۔ ان کی زبانیں اپنے رب قدیر کی حمد و ثنا اور تسبیح و تمہید میں زمزمہ سنج ہیں۔ اور ان کے دل اس کی یاد میں محو ہیں اور ان کی پیشانیاں اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہیں۔ تو انسان جو مسجود ملائکہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے اس کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے مولائے کریم کی عبادت اور اطاعت میں صبح و شام کوشاں رہے۔ ہر دم اس کی یاد، اس کا ذکر اور اس کی محبت میں سرشار رہے۔ اللھم اجعلنا من عبادک القانتین المخلصین الذاکرین بجاہ رحمۃ للعلمین علیہ و علی آلہ افضل الصلوات واطیب التسلیمات۔

یہ آیت سجدہ ہے اور اس طرح کی بقول اصح چودہ آیتیں ہیں جن کو جب انسان پڑھے یا سنے تو سجدہ کرے۔ اسے سجدہ تلاوت کہتے ہیں۔ اس کے ادا کرنے کی بھی وہی شرطیں ہیں جو سجدہ نماز کی ہیں۔ یعنی باوضو ہو، پاک جگہ ہو تفصیلی احکام کتب فقہ میں مذکور ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

گزشتہ آیت میں ذکر الٰہی کا حکم اور اس کے آداب بتائے گئے۔ اس آیت میں ذکر کی مزید ترغیب دینے کے لیے فرشتوں کی مثال دی گئی ہے کہ فرشتے گناہوں سے پاک اور بارگاہ ایزدی کے مقربین ہیں اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے ذکر اور عبادت سے غفلت نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور اس کے سامنے سجدہ ریز رہتے ہیں اور انسان جو خطائیں بھی کرتا رہتا ہے اس کا تو زیادہ فرض بنتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی زیادہ عبادت کرے۔ (امداد)

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جب فرشتے اپنے بے انتہا شرف، پاک اور معصوم ہونے، شہوت اور غضب سے بری ہونے، کینہ اور حسد سے مُنَزّہ ہونے کے باوجود ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور خشوع و خضوع کے ساتھ سجدہ ریز ہوتے ہیں تو انسان جو کہ جسمانی ظلمتوں، بشری کثافتوں اور شہوت و غضب کی آماجگاہ ہے، وہ اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت زیادہ کرے۔ (تفسیر صراط الجنان)

فرشتوں کی کثرت عبادت ان کی افضیلت کو مستلزم نہیں

قرآن مجید کی اس آیت میں فرشتوں کی طہارت اور عصمت اور قدر و منزلت کے باوجود ان کی اطاعت اور عبادت کو بیان کرکے عام مسلمانوں کو اللہ کی اطاعت اور عبات پر برانگیختہ فرمایا ہے۔ ان آیات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فرشتے انبیاء (علیہم السلام) سے افضل ہیں کیونکہ ان آیات میں خطاب عام مسلمانوں کی طرف متوجہ ہے اور جہاں تک افضیلت کا تعلق ہے تو ہمارے متکلمین نے تصریح کی ہے کہ رسل بشر رسل ملائکہ سے افضل ہیں اور رسل ملائکہ عامۃ البشر سے افضل ہیں اور عامۃ البشر (نیک مسلمان) عامۃ الملائکہ سے افضل ہیں اور جہاں تک فرشتوں کی کثرت عبادت اور اطاعت کا معاملہ ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ فرشتوں میں شہوت اور غضب کا مادہ نہیں رکھا گیا اور ان میں بھوک اور پیاس اور دیگر انسانی اور بشری تقاضے نہیں رکھے گئے، اور ان کو اطاعت اور عبادت سے روکنے اور منع کرنے والی کوئی چیز نہیں، نہ ان پر کسی کی کفالت کی ذمہ داری ہے، اور انسان کے ساتھ یہ تمام عوارض ہیں سو ان عوارض اور ان تقاضوں کے باوجود انسان کا گناہوں سے رکنا

اور اللہ کی عبادت کرنا فرشتوں کی عبادت سے کہیں افضل ہے جو ان عوارض اور موانع کے بغیر عبادت کرتے ہیں۔ حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے ولہ یسجدون کا تعارض اور اس کے جوابات

اس آیت کے آخر میں فرمایا ہے اور فرشتے اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔ اس آیت پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس آیت کا تقاض ایہ ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو سجدہ نہیں کرتے حالانکہ فرشتوں نے حضرت ادم (علیہ السلام) کو سجدہ کیا تھا امام رازی نے امام غزالی سے اس سوال کا یہ جواب نقل کیا ہے کہ زمین کے فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ کیا تھا اور آسمان کے عظیم فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ نہیں کیا تھا۔ اس لیے اثبات اور نفی کے محل الگ الگ ہیں۔ پھر امام رازی نے خود اس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ اس آیت میں نفی عموم ہے اور حضرت آدم کے قصہ میں خاص فرشتوں کے سجدہ کا ذکر ہے اور خاص عام پر مقدم ہوتا ہے۔ (تفسیر کبیر ج 5، ص 446، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، 1415ھ)

امام غزالی اور امام رازی کی عظمتیں مسلم ہیں لیکن میرے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں سجدہ عبودیت کی نفی ہے یعنی فرشتے اللہ کے سوا کسی کو عبادت کا سجدہ نہیں کرتے اور حضرت آدم (علیہ السلام) کو فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے سجدہ تعظیم کیا تھا، اور اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ حضرت آدم کو صرف زمینی کے فرشتوں نے سجدہ کیا تھا جب کہ قرآن مجید میں یہ تصریح ہے کہ حضرت آدم کو سب فرشتوں نے سجدہ کیا تھا۔ فسجد الملائکۃ کلھم اجمعون الا ابلیس (الحجر: 30) تو ابلیس کے سوا سب کے سب فرشتوں کے اکٹھے ہو کر آدم کو سجدہ کیا نیز البقرہ: 34 کی تفسیر میں خود امام رازی نے یہ تصریح کی ہے کہ اکثرین کا مذہب یہ ہے کہ سب فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ کیا تھا اور اس پر دو دلیلیں ہیں ایک یہ کہ سورۃ الحجر کی آیت میں جمع کا صیغہ ہے پھر اس کو کل اور اجمعون کی تاکیدات سے موکد کیا ہے۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں صرف ابلیس کا استثناء کیا ہے، اور پھر لکھا ہے کہ البتہ بعض لوگوں نے اس کا انکار کیا اور کہا کہ صرف زمین کے فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ کیا تھا اور انھوں نے اس کو مستبعد جانا کہ اکابر ملائکہ کو حضرت آدم کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیا جائے۔ تفسیر کبیر ج 1، ص 448، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، 1415ھ)

اس لیے محفوظ جواب یہی ہے کہ سب فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ تعظیم ادا کیا تھا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو فرشتے سجدہ عبادت نہیں کرتے اور سیاق کلام بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تلقین کی جا رہی ہے کہ فرشتے اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں اس کے غیر کو سجدہ عبادت نہیں کرتے۔

سجدہ تلاوت کی تحقیق

سورۃ الاعراف کی یہ آخری آیت ہے اور قرآن مجید میں یہ پہلی آیت سجدہ ہے اور آخری آیت سجدہ سورۃ العلق کی آخری آیت ہے واسجد واقترب (العلق: 19)۔
آیات سجدہ کے متعلق فقہاء کے دو قسم کے اختلاف ہیں، ایک اختلاف اس میں ہے کہ آیت سجدہ کا حکم کیا ہے آیا اس آیت کو پڑھنے یا سننے کے بعد اس آیت پر سجدہ کرنا سنت ہے و یا واجب؟ اور دوسرا اختلاف آیات سجدہ کی تعداد میں ہے۔ ہم پہلے آیات سجدہ کے حکم میں فقہاء کا اختلاف بیان کریں گے اور پھر ان کی تعداد میں فقہاء کے مذاہب بیان کریں گے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

قرآن مجید میں چودہ آیات ہیں جن کے اختتامی نشانات کے اوپر یا حاشیہ کے ساتھ سجدہ کا لفظ لکھا ہوا ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک آیت کو پڑھنے یا سننے کے بعد سجدہ کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب ان آیات میں سے کسی کی تلاوت کرے تو اسی وقت اللہ اکبر کہتے ہوئے سجدہ کرتے۔ اس سجدہ کو سجدہ تلاوت کہا جاتا ہے۔

علامہ ابوبکر محمد بن عبداللہ المعروف بابن العربی المالکی متوفی 543ھ لکھتے ہیں:

قرآن مجید میں پندرہ سجدے ہیں۔ پہلا سجدہ سورۃ الاعراف کی آخری آیت میں ہے ولہ یسجدون (الاعراف: 206)۔ دوسرا سجدہ وظلالہم بالغدو والاصال (الرعد: 15)۔ تیسرا سجدہ ویفعلون مایومران (النحل: 50)۔ چوتھا سجدہ ویزیدھم خشوعا (بنی اسرائیل: 109)۔ پانچواں سجدہ خروا سجدا وب کیا (مریم: 58)۔ چھٹا سجدہ یفعل مایشاء (الحج: 18)۔ ساتواں سجدہ تفلحون (الحج: 77)۔ آٹھواں سجدہ نفورا (الفرقان: 60)۔ نواں سجدہ رب العرش العظیم (النمل: 26)۔ دسواں سجدہ وھم

لایستکبرون (السجدہ: 15)۔ گیارہواں سجدہ۔ خر راکعا واناب (ص: 24)۔ بارھواں سجدہ ان کنتم ایاہ تعبدون (حم السجدہ: 15)۔ تیرھواں سجدہ واعبدوا (النجم: 62) چودھواں سجدہ لایسجدون (الانشقاق: 21)۔ پندرھواں سجدہ، واسجد واقترب (العلق: 19)۔ (احکام القرآن ج 4، ص 368۔ 369، دار الکتب العلمیہ بیروت، 1408ھ) (تفسیر تبیان القرآن)

سجدہ تلاوت کے چند احکام:

یہ آیت آیات سجدہ میں سب سے پہلی آیت ہے، اس مناسبت سے ہم یہاں سجدہ تلاوت کے چند احکام بیان کرتے ہیں

(1)۔۔ آیتِ سجدہ پڑھنے یا سننے سے سجدہ واجب ہوجاتا ہے پڑھنے میں یہ شرط ہے کہ اتنی آواز سے ہو کہ اگر کوئی عذر نہ ہو تو خود سن سکے، سننے والے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ بالقصد سنی ہو بلکہ بلا قصد سننے سے بھی سجدہ واجب ہوجاتا ہے۔ (1)

(2)۔۔ سجدہ واجب ہونے کے لیے ایک قول کے مطابق پوری آیت پڑھنا ضروری ہے اور ایک قول کے مطابق پوری آیت پڑھنا ضروری نہیں بلکہ وہ لفظ جس میں سجدہ کا مادہ پایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ پہلے یا بعد کا کوئی لفظ ملا کر پڑھنا کافی ہے۔ (2)

(3)۔۔ اگر اتنی آواز سے آیت پڑھی کہ سن سکتا تھا مگر شور و غل یا بہرے ہونے کی وجہ سے نہ سنی تو سجدہ واجب ہوگیا اور اگر محض ہونٹ ملے آواز پیدا نہ ہوئی تو واجب نہ ہوا۔ (3)

(4)۔۔ فارسی یا کسی اور زبان میں آیت کا ترجمہ پڑھا تو پڑھنے والے اور سننے والے پر سجدہ واجب ہوگیا۔

سجدہ تلاوت کی فضیلت:

سجدہ تلاوت کی فضیلت کے بارے میں حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جب آدمی آیت سجدہ پڑھ کر سجدہ کرتا ہے تو شیطان ہٹ جاتا ہے اور رو کر کہتا ہے: ہائے میری بربادی! ابنِ آدم کو سجدہ کا حکم ہوا تو اس نے سجدہ کیا، اس کے لیے جنت ہے اور مجھے سجدہ کا حکم دیا گیا تو میں نے انکار کیا میرے لیے دوزخ ہے۔" (تفسیر صراط الجنان)

سجدہ تلاوت

سجدہ تلاوت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان تکبیر کہہ کر ایک سجدہ کے اس میں تین مرتبہ سبحان ربی الاعلیٰ یا کوئی مسنون دعا پڑھے اور پھر تکبیر کہہ کر سجدہ سے سر اٹھائے۔ پہلی تکبیر کے وقت کانوں تک ہاتھ اٹھانے یا زیر ناف ہاتھ باندھنے کی ضرورت نہیں بلکہ تکبیر کہتے ہوئے سیدھا سجدہ میں چلا جائے اور سجدہ سے فارغ ہو کر دوسری تکبیر کہنے کے بعد سلام پھیرنے کی ضرورت نہیں بلکہ سجدہ سے سر اٹھانے سے ہی سجدہ تلاوت مکمل ہوجاتا ہے۔ جو شخص بیٹھ کر آیت سجدہ تلاوت کرے اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ کھڑا ہو جائے اور سجدہ کرے۔ سجدہ تلاوت کے لیے وہی شرطیں ہیں جو نماز کے لیے ہیں یعنی باوضو اور قبلہ رخ ہو کر سجدہ کرے۔ سجدہ تلاوت کے متعلق حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جب آدمی سجدہ پڑھ کر سجدہ کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا وہاں سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور کہتا ہے: ہائے افسوس! آدم کے بیٹے سجدے کا حکم ملا تو اس نے سجدہ کیا، پس اس کے لیے جنت ہے اور مجھے سجدے کا حکم ملا تو میں نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا، پس میرے لیے جہنم کی آگ ہے"۔ (مسلم ۲۲۴: کتاب الایمان: باب ۳۵) (تفسیر امداد الکرم)

سجدہ تلاوت کی دعاء

سجدہ تلاوت میں اگر سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم تین مرتبہ کہے تو یہ بھی درست ہے اور اگر دعاء ماثور پڑھ لے تو زیادہ بہتر ہے۔ دعاء ماثور یہ ہے۔

سَجَدَ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ خَلَقَہٗ وَشَقَّ سَمْعَہٗ وَبَصَرَہٗ بِحَوْلِہٖ وَقُوَّتِہٖ (رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی کمافی المشکوٰۃ ص ۹۴)

(میرے چہرہ نے اس ذات کے لیے سجدہ کیا جس نے اسے پیدا فرمایا اور اس میں سے کان اور آنکھ نکال دیئے اپنی قدرت سے)۔ (تفسیر انوار البیان)

الحمد للہ آج مورخہ 2 ذی الحج ۱۴۴۶ھ مطابق ۳۰ مئی، بروز جمعہ سورۃ اعراف کی تفسیر مکمل ہوئی۔

وصلی اللہ علی حبیبہ محمد وآلہ وصحبہ اجمعین۔